PAGES MISSING WITHIN THE BOOK ONLY

TIGHT BINDING BOOK

شیکسپیر کی شہرآفاق تمثیل

میکبتھ

مترجمہ

مولانا عنایت اللہ دہلوی بی۔ اے

(سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن)

ڈراما کے اشخاص

ڈنکن - بادشاہ اسکاتستان۔

میلکم۔ } بادشاہ کے فرزند۔
دونل بین۔ }

میکبتھ۔ } بادشاہ کے سپہ سالار۔
بینکو۔ }

میکدف۔ }
لینکس۔ }
راس۔ } اسکاتستان کے بڑے رئیس۔
منٹیتھ۔ }
اینگس }
کائتھنس۔ }

فلی نس۔ بینکو کا بیٹا۔

سیورڈ۔ امیر نورتھمبرلینڈ انگریزی فوجوں کا افسر اعلیٰ

جوان سیورڈ۔ سیورڈ کا فرزند۔

سیٹن۔ ایک فوجی افسر جو میکبتھ کی خدمت میں حاضر رہتا ہے۔

ایک لڑکا - میکدف کا بیٹا۔

ایک انگریز ڈاکٹر۔

ایک اسکاچ ڈاکٹر۔

ایک سارجنٹ۔

ایک حمّال۔

ایک بڈھا آدمی۔

لیڈی میکبتھ۔

لیڈی میکدف۔

خواصیں جو لیڈی میکبتھ کے پاس حاضر رہتی ہیں۔

اُمرا۔ شرفا۔ فوجی سردار۔ سپاہی۔ قاتل۔ ملازمین اور قاصد۔

ہیکیٹی۔

تین چڑیلیں۔

کچھ ہوائی صورتیں۔

منظر:- اسکاتستان اور انگلستان۔

میکبتھ

جزوِ اوّل

پہلا منظر:- ایک ویران مقام۔ آسمان پر بجلی اور گرج ہے۔ تین جادوگرنیاں سفلی عمل میں مشّاق، تقدیر کا حال بتانے والیاں آتی ہیں۔

پہلی جادوگرنی:- کہو بہن۔ اب پھر کب ملنا ہوگا۔ کیا گرجتے بادل، چمکتی بجلیوں یا برستے مینہ میں ملاقات ہوگی؟

دوسری جادوگرنی:- نہیں نہیں۔ جب یہ غُل غپاڑہ شور شغب ہو لیگا۔

تیسری جادوگرنی:- یہ تو سُورج چھُپنے تک سب ختم ہو جائیگا۔

پہلی جادوگرنی:- اچھا بُوا۔ یہ تو بتاؤ کہاں ملنا ہوگا؟

دوسری جادوگرنی:- اُسی کیچڑ پانی جھاڑیوں والی زمین پر۔

تیسری جادوگرنی:- ہاں، وہیں تو میکبتھ سے ملنا ہے۔

پہلی جادوگرنی:- اری میری ہمزاد کالی کرنجی بِلّی تو کیوں چیخے جاتی ہے؟ ذرا دم لے، ابھی آتی ہوں۔

دوسری جادوگرنی:- اور تُو میرے ہمزاد مینڈک تو کیوں اتنا ٹرٹر کرکے مجھے بلائے جاتا ہے؟ ٹھیر، ابھی آئی۔

تینوں جادوگرنیاں:- ہمارے نزدیک بُرائی بھلائی ہے اور بھلائی بُرائی۔ آؤ چلو۔ کُہر اور گندی ہوا میں گشت لگائیں۔

دوسرا منظر:- فورلیس کے قریب ایک لشکرگاہ۔
بادشاہ ڈنکن، اسکے دونوں فرزند میلکم، ڈونل بین۔ لی نکس معہ چند خادموں کے آتے ہیں۔ ایک سپاہی کو دیکھتے ہیں کہ زمین پر پڑا ہے، زخموں سے خون جاری ہے۔

ڈنکن:- یہ خُون میں آلودہ آدمی کیسا پڑا ہے؟ اس کی حالت سے ظاہر ہے کہ آخری بغاوت کا حال وہ خوب کہہ سکیگا۔

میلکم:- حضور یہی شخص ہے جسنے ایک وفادار و جاں نثار سپاہی کی طرح مجھے دشمن کے ہاتھ میں گرفتار ہونے سے بچایا تھا۔ اے بہادر دوست اُٹھ اور بادشاہ کی حضور میں بیان کر کہ آخری لڑائی کو تُونے کس حال میں چھوڑا تھا۔

زخمی سپاہی:- حالت ایسی مشتبہ تھی جیسے دو ڈوبتے آدمی آپس میں لپٹ جائیں، اور ایک دوسرے کو تیرنے نہ دے۔ باغیوں کے اُس بے رحم سرغنے میکڈن ولڈ نے جسے بغاوت و سرکشی ہی زیب دیتی ہے، دُنیا بھر کے شریر اور مُفسد اپنے پاس جمع کر لئے ہیں۔ چُنانچہ مغربی جزیروں سے ہلکے اور بھاری دونوں قسم کے ہتھیار رکھنے والے سپاہی اس کے پاس چلے آئے ہیں۔ اور تقدیر اِس ناپاک لڑائی پر کچھ ایسی نظرِ مہر سے متبسّم ہے جیسے کوئی بیسوا ہو کہ کبھی کسی آشنا کو دیکھکر مُسکرا دی، کبھی اس یار کو دیکھکر ہنس پڑی۔ پھر بھی میرے خیال میں باغیوں کی حالت اس وقت کمزور ہو چلی تھی۔ کیونکہ بہادر میکبتھ نے، جس کی شجاعت میں کسکو کلام ہوسکتا ہے، شکست یا پسپائی کی مطلق پروانہ کی اور تلوار پھراتا ہوا دشمن میں گھُس پڑا۔ تلوار سے خون کی بھاپ اُٹھ رہی تھی اور اسی حال میں دلیری اور جوانمردی کا محبوب بنا دشمن سے رستہ نکالتا ہوا باغیوں کے سرغنے کے سامنے

جا پہونچا۔ بات تک نہ کی اور بلا تامل اُس کی ناف میں تلوار
بھونک کر ہونٹوں تک اُسے چیرتا چلا گیا اور اُس کا سر کاٹ کر
فصیل پر جا لٹکایا۔

ڈنکن:۔ کیوں نہ ہو۔ بڑا بہادر بھائی ہو اور طبیعت کا بھی
نہایت شریف ہے۔

زخمی سپاہی:۔ اب اُس سمت سے جہاں سے سورج اپنی
روشنی دنیا پر پھیلاتا ہے اور سمندر میں سفینہ شکن گرداب
اور آسمان پر خوفناک کڑک بجلیاں نظر آتی ہیں غرض
جہاں سے راحت و آرام پانے کی توقع ہو سکتی تھی وہاں
سے رنج و اذیت کا سامان پیدا ہوا۔ بادشاہ سلامت غور
فرمائیں کہ جونہی عدل و انصاف نے ہمت و مردانگی کے
ہتھیار لگائے دشمن کے سپاہی جو میدان میں ہر طرف
پھیلے تھے انہیں اپنی خیر و سلامتی اسی میں نظر آئی کہ جس
قدر جلد ممکن ہو میدان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوں۔ لیکن
جب چمکتے ہوئے ہتھیار اور کمک آن پہونچی تو ناروے کے
بادشاہ نے اپنا فائدہ اسی میں سوچا کہ لڑائی از سر نو
شروع کر دے۔

ڈنکن:۔ تو کیا اس نئے ساز و سامان کو دیکھکر ہماری فوج
کے سپہ سالار میکبتھ اور بینکو ڈرے نہیں؟

زخمی سپاہی:۔ حضور ڈرے تو مگر اس طرح جیسے عقاب
چڑیوں یا شیر خرگوش کو دیکھکر ڈرے۔ سچ عرض کرتا
ہوں کہ حضور کے ان دونوں سرداروں نے دشمن پر وہ
وہ دوہری چوٹیں پہونچائی ہیں کہ گویا توپوں میں دو دو
مرتبہ مصالح بھر کر داغا جا رہا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا
کہ یا تو وہ خون میں نہانا چاہتے ہیں یا خون دخرابے کی
کوئی دوسری یادگار مثل گلگوتھا کے قائم کرنے کی فکر
میں ہیں۔ نہیں عرض کر سکتا کہ اُنکا واقعی ارادہ کیا تھا لیکن
اب مجھے ضعف سے غش آ چلا ہے اور میرے زخم مرہم کے
محتاج ہیں۔

ڈنکن:۔ تیرا یہ بیان اور تیرے زخم دونوں تیری عزت و
شرافت پر گواہی دے رہے ہیں۔ دونوں سے پاس عزت
اور قومی غیرت ٹپک رہی ہے۔ دیکھو۔ اس کے علاج کیلئے
فوراً جراح حاضر کئے جائیں (زخمی سپاہی کو چند آدمی
اُٹھا کر باہر لیجاتے ہیں)

یہ کون آ رہا ہے؟

میلکم:۔ حضور یہ راس کا لائق امیر ہے۔

لینکس:۔ ملاحظہ ہو کہ اس کی نگاہوں سے کس غضب کا
اضطراب اور عجلت پائی جاتی ہے۔ آنکھوں سے معلوم
ہو رہا ہے کہ وہ کوئی عجیب بات کہنے کو ہے۔

(راس آتا ہے)

راس:۔ خدائے ذوالجلال بادشاہ کو زندہ سلامت رکھے۔

ڈنکن:۔ میرے لائق امیر تم کہاں سے آ رہے ہو؟

راس:۔ جہاں پناہ بندہ فائف سے آتا ہے۔ وہاں ناروے
کے جھنڈے اور پھریرے بلند ہو کر آسمان تک کو منہ
چڑاتے ہیں۔ اور ہماری سرد مزاج رعایا کو بھی ایک آگ کا
شعلہ بنا دیا ہے۔ شاہ ناروے بذات خود اس باغی و
بدخواہ یعنی امیر کاڈور کی پشت گرمی سے بڑی سختی اور
شدت سے حملہ آور ہوا۔ لیکن ہمارا میکبتھ جو اس وقت
لڑائی کی دیوی کا دولہا بنا ہوا ہے ناروے کی فوجوں کے
مقابلے پر اس طرح آیا جیسے فریقین میں ہر فریق دوسرے
فریق کا پورا جوڑ اور جواب بن کر آئے۔ مگر میں یہی کہونگا
کہ پھر بھی میکبتھ نے ضبط سے کام لیا۔ اور لڑائی کا انجام
یہی ہوا کہ ہمیں فتح ہو گئی۔

ڈنکن:۔ اس سے بڑھکر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے۔

راس :- اب بادشاہ نارو سے ساٹیو مصالحت کی گفتگو کرنی چاہتا ہے۔ مگر تاوقتیکہ شدنت کلمی کے ٹاپو میں ہمارے مصارفِ جنگ کے لئے دس ہزار ڈالر جمع نہ کردے ہم اُس کے مُردے دفن نہ ہونے دینگے۔

ڈنکن :- بس اب یہ کادور کا امیر ہمارے کسی نفع میں نقصان کا مُوجب نہ ہو سکیگا۔ جاؤ۔ اُسے قتل کا حکم ہماری طرف سے سُنادو۔ اور اب تک امیر کادور کا جو خطاب وہ رکھتا تھا اُسے ضبط کرکے یہی خطاب ہم میکبتھ کو عطا کرتے ہیں۔

راس :- فدوی ابھی جاکر حضور کے ارشاد کی تعمیل کرتا ہے۔

ڈنکن :- جو کچھ کادور نے کھویا ہے وہ میکبتھ کو دیا جاتا ہے۔ (سب چلے جاتے ہیں۔)

تیسرا منظر:- کیچڑ۔ دلدل اور جھاڑیوں والی زمین۔ بادل گرجتا ہے تینوں بعلی عمل کرنے والی جادوگرنیاں نمودار ہوتی ہیں۔

پہلی جادوگرنی :- بہن تم کہاں تھیں؟

دوسری جادوگرنی :- کسانوں کے مویشیوں کی جان نکال رہی تھی۔

تیسری جادوگرنی :- اور بہن تم کہاں تھیں؟

پہلی جادوگرنی :- ایک ملاح کی جورو گود میں اخروٹ کی گری بھرے پھنکے پر پھنکے مار کر چبائے چلی جاتی تھی۔ میں نے کہا کہ تھوڑی سی مجھے بھی دے۔ اس پر وہ موٹی مُسٹنڈی جُھردا کہتی کیا ہے "دُور ہو چڑیل"۔ خیر سُنتے تو میں نے سُن لیا مگر میں پہلے سے جانتی ہوں کہ اُس کا مرد جہاز کا ناخدا بن کر کہیں دُور گیا ہے تو بُوا اُسکو میں بھی چھلنی میں بیٹھکر جادو کے زور سے وہیں پہونچتی ہوں۔ اُس کے جہاز کے پیندے میں دُم کٹے چوہے کی طرح کُتر کُتر کر چھید نہ ڈالے ہوں تو بات نہیں۔

دوسری جادوگرنی :- بہن گھبراتی کیوں ہو، میں بھی بڑے زور کی ہوا چلاؤنگی۔

پہلی جادوگرنی :- ہاں بُوا۔ تم تو مجھ پر ہمیشہ سے مہربان ہو۔

تیسری جادوگرنی :- اور میں بھی اس زور کی آندھی اُٹھاؤنگی کہ جہاز پتا بنا اُڑتا پھرے۔

پہلی جادوگرنی :- اور میں اپنی طرف سے بھی وہ جھکڑ چلاؤنگی کہ ساری حقیقت کُھل جائے گی اور ناخُدا کی کتاب میں جتنے بندرگاہ لکھے ہونگے اُن میں وہ وہ آندھیاں اور طوفان برپا کرونگی کہ سب حیران رہ جائیں گے۔ اور جتنے ملاح ہونگے اُن کا خون چوس کر اُنہیں پھوک بنادونگی۔ دن اور رات میں کسی وقت بھی کسی کو نیند نہ آئے گی۔ نو مرتبہ نو اٹھ واڑوں تک ہر آدمی تھکا ہارا بیجان رہے گا اور سبکی زبان پر یہی ہوگا کہ ہائے گرا، ہائے مرا۔ یہ سچ ہے کہ جہاز غارت نہ ہوگا مگر ہوا کے زور اور موجوں کے تھپیڑوں سے اُس کی وہ گت ہوگی کہ کیا پوچھنا ہے۔ ذرا دیکھو تو میرے پاس یہ کیا چیز ہے۔

دوسری جادوگرنی :- اچھی دکھاؤ، دکھاؤ۔

پہلی جادوگرنی :- ایک مُسافر کا انگوٹھا کُتر لائی ہوں۔ جو کشتی کے سُکان پر بیٹھا گھر آرہا تھا کشتی ڈانواڈول ہوکر پانی میں ڈوبنے لگی۔

(نقارے اور طبل بجنے کی آواز آتی ہے۔)

تیسری جادوگرنی :- آہا جی۔ ڈھول بجے۔ ڈھول۔ اب تو میکبتھ آتا ہوگا۔

تینوں جادوگرنیاں :- ہم تو سب خشکی و تری کی رکھوالیاں ہیں، اور دُنیا بھر میں گشت کرتی ہیں۔ تین میرے، تین تیرے

تم دونوں کے لیے یہ سب تو ہو سکے۔ چلو منتر پورا ہُوا۔

میکبتھ:۔ فتح کے لحاظ سے ایسا اچھا دن اور موسم کے لحاظ سے اتنا بُرا دن کبھی پہلے دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ ارے یہ وحشت زدہ سُوکھی چمرخ صورتیں کس کی ہیں؟ ان کے تن پر پھٹے پُرانے چیتھڑوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین کی رہنے والیاں نہیں ہیں مگر یہ کہنا بھی مُشکل ہے کیونکہ زمین ہی پر وہ ملی ہیں۔ اری بھیانک صورتو، بتاؤ کیا تم جیتی جاگتی جانیں ہو۔ کیا کوئی آدم زاد تم سے کوئی بات پوچھ سکتا ہے۔ شکلوں سے تمہاری تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم ہماری بات سمجھتی ہو۔

(اتنا سُنتے ہی ہر جادوگرنی اپنی جھُرّیاں پڑی سردی سے پھٹی ایک ایک اُنگلی اپنے سُوکھے پپڑیاں جمے ہونٹوں پر رکھتی ہے۔)

تم ظاہر میں تو عورتیں معلوم ہوتی ہو۔ مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ تم سب کے مُنہ پر ڈاڑھیاں ہیں۔ اگر بات کر سکتی ہو تو بتاؤ تم کون ہو؟

پہلی جادوگرنی:۔ میکبتھ مُبارکباد۔ امیرِ گلیمس مُبارکباد۔

دوسری جادوگرنی:۔ میکبتھ مُبارک مُبارک امیرِ کادور مُبارکباد۔

تیسری جادوگرنی:۔ میکبتھ اب تم بادشاہ ہوجاؤگے۔ بادشاہی مُبارک ہو۔

بینکو:۔ میکبتھ۔ تم اتنے چونکتے کیوں ہو؟ اگر ان کی کوئی بات بھلی معلوم ہوتی ہے تو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ میرے شریف ساتھی تم اتنے گُم سُم کیوں ہوگئے۔ کیا واقعی وہم وخیال کے پُتلے بن گئے یا بنتے ہو۔ امیرِ گلیمس ہونے کی عزّت تو تمہیں اس وقت بھی حاصل تھی۔ اب اس سے بھی بڑھکر یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ امیرِ کادور بھی ہوجاؤگے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ یعنی مالکِ تاج وتخت ہونے کی تمہیں اُمید دلائی گئی ہے۔ کچھ سُنا بھی آپنے؟ لیجئے وہ تو کسی خیال میں ایسے محو ہوئے کہ کچھ سُنتے ہی نہیں۔ اری چڑیلو، مجھ سے تم نے کچھ نہیں کہا۔ زمانے کے کِشت زار میں جو بیج ڈالے جاتے ہیں اگر تم انہیں دیکھکر بتا سکتی ہو کہ کونسا تخم جمیگا کونسا نہ جمیگا تو پھر میری قسمت کا حال بھی تو کچھ بتائیں۔ میں تو نہ تمہاری مہربانیوں کا مُحتاج ہوں اور نہ تمہاری دُشمنی سے ڈرتا ہوں۔ مجھ سے کیوں نہیں کچھ کہتیں؟

پہلی جادوگرنی:۔ مُبارکباد۔

دوسری جادوگرنی:۔ مُبارکباد۔

تیسری جادوگرنی:۔ مُبارکباد۔

پہلی جادوگرنی:۔ بینکو تم میکبتھ سے کم مگر اُس سے بڑھے رہوگے۔

دوسری جادوگرنی:۔ میکبتھ کی طرح خوش مگر اس سے زیادہ خوش تر ہوگے۔

تیسری جادوگرنی:۔ تم سے بادشاہ پیدا ہونگے۔ مگر خود کبھی بادشاہ نہ ہوسکے۔

پہلی جادوگرنی:۔ بس میکبتھ اور بینکو دونوں کو مُبارک ہو۔

میکبتھ:۔ اری پہیلیوں میں بات کرنے والیوں ذرا ٹھیرو۔ دم لو۔ صبر کرو۔ کچھ اور باتیں بھی بتاتی جاؤ۔ جب سے میرا باپ سینل مرا ہے امیرِ گلیمس تو میں اُسی وقت سے ہوگیا ہوں۔ لیکن امیرِ کادور میں کیسے ہوسکتا ہوں۔ یہ امیر تو ابھی زندہ ہے اور روز افزوں ترقی پر ہے۔ بتاؤ کہ یہ عجیب خبریں تمہیں کہاں سے ملیں۔ اور تم کیوں اس اُجاڑ اور ویران زمین پر ہمارا راستہ روک کر ایسی خبریں سُنانے لگیں جن سے آنے والی باتوں پر حُکم لگایا جاسکتا ہے۔ میں

حکم دیتا ہوں کہ میرے ان سوالوں کا جواب دو۔

(جادوگرنیاں سب کی سب ایکدم غائب ہو جاتی ہیں۔)

بینکو:۔ پانی کے بلبلے تو بہت دیکھے ہونگے۔ اس وقت جو کچھ آپنے دیکھا ہے یہ مٹی کے بلبلے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ غائب ہو کر یہ سب کدھر چلی گئیں۔

میکبتھ:۔ فضا میں غائب ہو گئیں۔ اگرچہ وہ گوشت پوست رکھتی تھیں مگر وہ ایسی تحلیل ہو گئیں جیسے ہوا میں ہمارا سانس ملکر ہوا ہو جائے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ دیر اور ٹھیرتیں۔

بینکو:۔ جو باتیں ان کی زبانی آپکی نسبت سننے میں آئی ہیں کیا ان کا واقعی پیش آنا آپ ممکن سمجھتے ہیں؟ اگر انکے صحیح ثابت ہونے کا آپکو یقین ہے تو سمجھ لیجئے کہ آپ اس وقت وہ بوٹی کھاتے ہیں جس کے کھانے سے آدمی دیوانہ ہو جاتا ہے۔

میکبتھ:۔ بینکو۔ تمہاری اولاد بادشاہ ہوگی۔

بینکو:۔ اور آپ بھی تو بادشاہی کرینگے۔

میکبتھ:۔ اور کاڈور کا امیر بھی تو سمجھو۔ کیا انہوں نے یہ نہیں کہا تھا؟

بینکو:۔ ہاں، یقینی۔ انکے الفاظ یہی تھے۔ یہ کون آرہا ہے؟

(راس اور اینگس آتے ہیں)

راس:۔ میکبتھ، بادشاہ سلامت نے تمہاری فتح کا حال سنکر اظہار خوشنودی فرمایا ہے اور جب بغاوت کو فرو کرنے میں بادشاہ نے تمہاری شجاعت و مردانگی کے کام سنے تو اس وقت حیرت و تعریف میں یہ بحث چھڑی کہ حیرت زیادہ ہے یا تمہاری تعریف۔ اس بحث میں خاموش و گنگ رہکر دیگر امور پر غور ہو رہا تھا کہ اسی دن دریافت ہوا کہ بادشاہ ناروے کی زبردست فوجوں میں جتنا کشت و خون ہوا وہ سب تمہارا کام تھا۔ دشمن سے تم مطلق ڈرے نہیں۔ اب بادشاہ کے پاس قاصد پر قاصد اس طرح آنے شروع ہوئے جیسے آسمان سے اولے گریں۔ ہر قاصد جو خبر لاتا تھا تمہاری تعریف میں اس کی زبان خشک ہوتی تھی۔ اور وہ کہتے تھے کہ ملک کو دشمن سے بچانے میں تم نے حیرتناک جاں نثاری سے کام لیا ہے۔ یہ کل خبریں بادشاہ سلامت کے گوش گذار ہوتی تھیں۔

اینگس:۔ اب جہاں پناہ کی طرف سے ہم تمہارا شکریہ ادا کرنے بھیجے گئے ہیں۔ اور اس لئے کہ بادشاہ کی نظر میں تمہاری وقعت کے بڑھنے کا مژدہ تمہیں سنائیں۔ نہ یہ کہ انعام و اکرام جو تمہیں ملنے والا ہے وہ تمہیں پیش کریں۔

راس:۔ جو کثیر انعام آپکو ملنے والا ہے ہمیں حکم ہوا ہے کہ اسی میں سے بطور رقم پیشگی ہم آپکو امیر کاڈور کے لقب سے خطاب کریں۔ اور اے لائق امیر ہم آپکو امیر کاڈور کے خطاب پر دلی مبارکباد دیتے ہیں اور آج سے یہی خطاب آپ کا رہے گا۔

بینکو:۔ تو کیا جو کچھ ان شیطان کی خالاؤں نے کہا تھا وہ سچ نکلا۔

میکبتھ:۔ مگر امیر کاڈور تو ابھی زندہ ہیں۔ انکے لقب سے آپ مجھے کیسے خطاب کر سکتے ہیں۔ کیا مانگے تانگے کا خلعت آپ مجھے پہناتے ہیں؟

اینگس:۔ امیر کاڈور ابھی زندہ ہے مگر سزائے موت کا حکم اس کے بارے میں صادر ہو چکا ہے۔ اب وہ زیادہ زندہ رہنے کے قابل نہیں رہا۔ اس کا قصور کیا تھا، یہ مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں۔ دو ہی باتیں معلوم ہوتی ہیں، یا تو ناروے کے بادشاہ سے مل گیا تھا یا باغیوں سے سازش کر کے انہیں

خفیہ مدد ہو جاتی۔ یا دونوں باتیں کیں۔ بہر کیف ملک کو تباہ کرنے میں اُس نے کوئی کسر نہ رکھی۔ مجھے ٹھیک نہیں معلوم مگر بغاوت کا جرم اُس پر ثابت ہو چکا ہے، اور اس جرم کا اقبال بھی اُس نے کر لیا ہے۔ چونکہ جرم ثابت ہو چکا ہے بس یہی بات اُسکی تباہی کا سبب ہوئی ہے۔

میکبتھ:۔ (علیحدہ کہتا ہی) گلیمس اور کاڈور کا امیر۔ مگر سب سے بڑی بات بعد کو آنی ہے۔ (راس اور اینگس سے کہتا ہے) آپکی اس تکلیف کا بیحد ممنت گزار ہوں (بینکو سے) کیوں کیا اب بھی تمہیں توقع نہیں کہ تمہاری اولاد بادشاہ ہوگی؟

بینکو:۔ اگر وہ پیشین خبری اپنے پورے مفہوم میں درست سمجھی جائے تو پھر آپ کے دل میں تاج و تخت ملنے کی تمنا پیدا ہونی لازمی ہو جائیگی، کیونکہ امیر کاڈور تو آپ ہو ہی چکے ہیں۔ یہ بات بھی کچھ عجیب ہوئی ہے۔ لیکن اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ اس قسم کی باتیں انجام کار ہیں موجب نقصان ہوا کرتی ہیں۔ ظلمت و تاریکی کی یہ ذریات بظاہر ہم کو سچی باتیں بتاتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو سچ دکھا کر بڑی باتوں میں دھوکا دیدیتی ہیں۔ ذرا مہربانی کرکے ایک بات سن لیجئے۔

میکبتھ:۔ (علیحدہ کہتا ہی) دو باتیں جو سچ نکلی ہیں وہ آخری بات کے سچ نکلنے کا بھی یقین دلاتی ہیں۔ (راس اور اینگس سے) میں آپ دونوں صاحبوں کا بیحد ممنون ہوں (علیحدہ) یہ خرقِ عادت صورتیں جو ظاہر ہوئی تھیں نحس نہیں ہو سکتیں اور نہ انہیں سعد کہا جا سکتا ہے۔ اگر نحس ہوتیں تو کامیابی کی مجھے کیوں امید دلاتیں۔ اور ایک سچی بات یعنی مجھے امیر گلیمس کہہ کر مجھے امیر کاڈور ہو جانے کی امید دلائی۔ لیکن جو خبر انہوں نے مجھے دی ہے اگر وہ سعد ہوتی تو پھر اس سے میرا دم کیوں فنا ہوا جاتا ہے اور جو شکل ذہن میں پیدا ہوئی ہے اُس سے بدن کے رونگٹے کیوں کھڑے ہوئے جاتے ہیں۔ اور میرا دل جو خاموش چین سے اپنی جگہ بیٹھا تھا اب وہ تڑپ تڑپ کر کیوں پسلیوں سے ٹکریں کھانے لگا۔ اس خیال سے کہ آئین فطرت کے خلاف کوئی کام کرنا پڑیگا مجھ پر اتنا خوف کیوں طاری ہوا جاتا ہے۔ جس خوف کا انسان کو فوراً مقابلہ کرنا ہو وہ اتنا آزار دہ نہیں ہوتا جتنا کہ وہ خوف جو آئندہ کسی پیش آنے والے واقعے کے خیال سے پیدا ہوتا ہے۔ بادشاہ وقت کو قتل کرکے خود بادشاہ بن جاؤں اس وقت تک محض ایک خیال ہی خیال ہے جس کے آتے ہی ملکِ دل کے نظم و دستور میں فتور پڑ جاتا ہی اور کسی بات کو اُس کی صحیح شکل میں سوچنا بے بود و ہوائی تصورات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور بجز ایک وہم و خیال کے کوئی چیز اصلی و حقیقی نہیں معلوم ہوتی۔

بینکو:۔ واہ واہ۔ دیکھئے تو ہمارے یہ دوست اپنے کسی خیال میں کس قدر محو و مستغرق معلوم ہو رہے ہیں۔

میکبتھ:۔ اگر بخت و اتفاق مجھے بادشاہی دینگے تو وہی میرے سر پر تاج بھی رکھیں گے۔ خود مجھے کچھ نہ کرنا پڑے گا۔

بینکو:۔ نئے نئے خطاب، نئے نئے اعزاز اُسے مل رہے ہیں۔ مگر نئی پوشاک بدن پر اُس وقت تک ٹھیک نہیں آتی جب تک کچھ دنوں پہن نہ لی جائے۔

میکبتھ:۔ (علیحدہ) جو کچھ ہونے والا ہے وہ ہو کر رہیگا دن یا وقت کیسی ہی مشکلوں اور مصیبتوں کا ہو مگر زمانہ اُن میں سے گزرتا ہوا اپنا دورہ ہر حال میں پورا کر ہی لیتا ہے۔ سخت سے سخت مصائب اور آفات بھی ایک ایک

دن ختم ہو ہی جاتے ہیں۔

بینکو:۔ لائق میکبتھ، ہم اب تک آپ کے فرمانے سے یہاں ٹھیرے ہوئے ہیں۔

میکبتھ:۔ معاف فرمائیگا۔ میرا یہ کُند و سُست دماغ اس وقت کسی خیال میں محو تھا اور خیال بھی ایسا تھا جس میں کبھی کی بھُولی بِسری باتیں یاد آ رہی تھیں۔ میرے مہربان شریفو! آپ نے جسقدر تکلیفیں اس وقت میرے لئے گوارا فرمائیں ہیں وہ میرے دل کی کتاب میں نقش رہینگی اور میں اس کے اوراق کھول کر ہمیشہ پڑھتا رہونگا۔ اب مجھے بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔ (بینکو سے کہتا ہے) جو باتیں بخت و اتفاق سے اس وقت پیش آ رہی ہیں اُن پر آئندہ غور کرنا ہو (اس بیچ کے زمانے میں ہم تم کسی وقت تنہا بیٹھکر آزادی سے غور کریں گے۔

بینکو:۔ نہایت خوشی سے۔

میکبتھ:۔ اِس وقت جو کچھ گزر رہا ہے وہی کافی ہو۔ دوستو آؤ چلیں۔ (چلے جاتے ہیں۔)

چوتھا منظر:۔ فیرس۔ شاہی قصر۔ باجے بجتے ہیں۔ بادشاہ ڈنکن اور اُس کے دونوں فرزند میلکم اور ڈونل بین آتے ہیں۔

ڈنکن:۔ کہو امیر کاڈور قتل کر دیا گیا۔ جو لوگ اس کام پر مقرر تھے وہ واپس آ گئے؟

میلکم:۔ حضور! وہ ابھی تک واپس نہیں آئے لیکن ایک شخص سے باتیں ہوئی تھیں جس نے امیر کاڈور کو قتل ہوتے دیکھا تھا۔ موت کے وقت اُس نے اپنے باغی ہونے کا اقبال کیا۔ اور حضور سے عفوِ تقصیر چاہا اور بے انتہا ندامت و پشیمانی ظاہر کی۔ زندگی میں کوئی بات اتنی لیاقت کی نہ کی تھی جیسے کہ مرتے وقت کی۔ وہ اس طرح مرا گویا جان دینے کا تصور پہلے سے باندھ رکھا تھا۔ اور جانِ عزیز جو مستعار رکھتا تھا وہ اس طرح پھینک دی کہ گویا اس چیز کی کوئی قدر ہی نہ تھی۔

ڈنکن:۔ افسوس دُنیا میں کوئی علم کوئی فن ایسا نہیں جس سے کہ دل کی اندرونی کیفیت چہرے سے معلوم کر لی جائے۔ وہ نہایت نجیب و شریف تھا۔ میں نے اپنے اعتماد و اعتبار کا قصر اُسی پر قائم کر رکھا تھا۔

(میکبتھ، بینکو، راس اور اینگس آتے ہیں)

اے میرے لائق عزیز بھائی۔ احسان فراموشی کا گناہ اب تک میرے سینے پر بارِ گراں ہو رہا تھا۔ تم سرکارِ خسروانہ کے اس قدر جلد جلد مستحق ہوتے رہے کہ میں اتنی ہی عجلت سے تمہاری خدمتوں کا انعام تمہیں نہ دے سکا۔ صرف اتنا اور کہنا ہے کہ جو کچھ صلہ میں دُوں اُس سے کہیں زیادہ کے تم مستحق ہو۔

میکبتھ:۔ جو کچھ وفاداری اور خدمت گزاری اِس نمک خوار نے کی وہ خود فدوی کی جاں نثاری اور خدمت کا سب سے بڑا صلہ ہے۔ حضور کو ہم جاں نثاروں پر حق حاصل ہے کہ ہم جہاں پناہ کی خدمت بجالاتے رہیں اور حضور ہماری اطاعت گزاری کو بنظرِ التفات و پرورش دیکھیں۔ حضور میں اور ہم میں وہی تعلق ہو جو ماں باپ کو بچّوں سے اور آقا کو اپنے ملازموں سے ہوتا ہے آقا کی جان اور مال، عزت اور نام کے لئے جو خدمتیں ہم پر فرض ہیں اُن پر ہمیشہ عمل رکھنا ہمیں لازم ہو۔

ڈنکن:۔ ہم تمہارا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم تمہیں اپنے باغ میں مثل ایک پودے کے لگائیں گے اور خدمت کرتے رہیں گے کہ وہ پروان چڑھے۔ شریف بینکو تم نے بھی اپنے تئیں کچھ کم

لیاقت کا آدمی ثابت نہیں کیا۔ تمہاری نیک نامی بھی دوسروں سے کم نہیں۔ ہم تمہاری پرورش اور ترقی میں بھی مثل ایک باغبان کے آبیاری کرینگے اور تم ہمیشہ ہمارے دل سے نزدیک رہو گے۔

بینکو:۔ حضور اگر میں پھلا پھولا تو پھل پھول سب حضور کے ہو نگے۔

ڈنکن:۔ اس وقت مسرت و شادمانی نے کچھ ایسا دل پر اثر کیا ہے کہ بے اختیار آنکھوں میں آنسو بھرے چلے آتے ہیں۔ اے میرے فرزندو، عزیزو، امیرو اور میرے مقربو! سنو۔ ہمارا قصد اپنے سب سے بڑے فرزند میلکم کو وارث سلطنت بنانے کا ہے اور ایسا ہی انتظام ہمیں کرنا ہوگا۔ اور آج سے ہم اپنے ولی عہد کو "شہزادہ کمبرستان" کے لقب سے خطاب کیا کریں گے۔ اور ہم صرف اُسے ہی عزت نہیں بخشینگے بلکہ اپنے دربار کے دیگر اعیان و اکابر کو بھی جو اپنے حسن لیاقت سے اس وقت ہمارے آسمان اقبال کے چمکتے تارے ہیں مورد عنایات و نوازشات کرتے رہینگے۔ اب ہم میکبتھ کے قصر انورنس جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تاکہ ہم اپنے اس عزیز کے اور بھی مرہون منت ہوں۔

میکبتھ:۔ اب اُس مصروفیت کا وقت آیا جو حضور کے لئے نہیں بلکہ اپنے حصول سعادت کے لئے ہوگا۔ میں خود قاصد بن کر یہ مژدہ اپنی بیوی کے پاس پہونچاؤنگا کہ حضور تشریف لا رہے ہیں۔ اب فدوی رخصت چاہتا ہے۔

ڈنکن:۔ اچھا میرے نہایت لائق امیر کاڈور۔

میکبتھ:۔ (علیحدہ کہتا ہے) واہ واہ۔ یہ شہزادہ کمبرستان تو راہ میں ایک اور ٹھوکر ہوگئی۔ اب یا تو میرا خاتمہ ہوا یا ایک آچھال کر میں دوسری پار پہونچا۔ میلکم کا وارث سلطنت قرار پانا میرے حق میں سدراہ ہوگا۔ آسمان کے ستارو۔

اپنی روشنیاں گل کر دو، تاکہ تمہارا نور میری سیاہ کاریوں اور گہری خواہشوں کو نہ دیکھ سکے۔ اس ہاتھ کو دیکھنے سے تو میری آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ سوچا ہے وہی ہونے دو۔ جب وہ ہو چکیگا تو یہی آنکھیں اُسے دیکھکر سہم جائیں گی۔

ڈنکن:۔ بینکو، جو کچھ تم اُس کی نسبت کہتے ہو وہ بالکل درست ہے۔ وہ حقیقت میں ایسا ہی بہادر ہے جیسا کہ تمہارا بیان۔ اس کی تعریفیں تو میرے لئے ایک ضیافت ہوتی ہیں۔ اچھا آؤ۔ اب اس کے پیچھے چلیں جو ہماری خاطر و مدارات کا سامان کرنے آگے گیا ہے میکبتھ مجھے بیحد عزیز ہے۔

پانچواں منظر:۔ میکبتھ کا قصر انورنس

لیڈی میکبتھ ایک خط پڑھتی اسٹیج پر آتی ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ "جس دن لڑائی میں فتح ہوئی اُسی دن اُن سے ملاقات ہوئی۔ مجھے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ انسان سے کہیں بڑھکر انہیں ہر بات کا علم رہتا ہے۔ جب ارادہ ہوا کہ کچھ اور پوچھوں تو وہ سب ہوا ہوگئیں۔ میں ابھی اسی عالم حیرت میں تھا کہ بادشاہ کے قاصد آئے اور انھوں نے مجھے امیر کاڈور کے لقب سے خطاب کیا۔ اور یہی وہ لقب تھا جسے اُن تینوں جادوگرنیوں نے پکار کر مجھے سلام کیا تھا۔ اور وہ بات بھی جو آئندہ پیش آنے والی ہے کہی تھی۔ یا کہ انہوں نے تو یہاں تک کہا تھا کہ مبارک ہو اُسے جو بادشاہ ہونے والا ہے۔ اے میری شریک عزت و ناموس یہ کل باتیں میں تیرے علم میں لے آیا ہوں تاکہ تو بھی اس خوشی میں شریک رہے اور جو بزرگی اور عزت تجھے ملنے والی ہے اُس سے بے خبر رہکر

خوشی سے محروم نہ رہے۔ یہ کُل باتیں دل میں مخفی رکھنا۔ اچھا خُدا کو سونپا۔"

لیڈی میکبتھ:۔ امیر گلیمس تو تم پہلے ہی تھے۔ اب امیر کاڈور بھی ہو گئے۔ اور جس بات کا تم سے آخیر میں وعدہ کیا گیا تھا وہ بھی ہو جاؤ گے۔ مگر میں تمہاری طبیعت سے ڈرتی ہوں۔ تم میں انسانی ہمدردی اور محبّت کا شیر مادر اتنا ہے کہ تم کوئی فریب تراسنہ اس مقصد کے لئے نہ نکال سکو گے۔ بزرگی تمہیں نصیب ہونیوالی ہے۔ حُبِ جاہ و دولت تم رکھتے ہی ہو مگر جو چیز حاصل کرنی چاہو گے اُسے ایمانداری سے حاصل کرنے کی نیت رکھو گے۔ دغا و فریب دینا گوارا نہ کرو گے مگر اے امیر گلیمس تم دغا و فریب ہی سے اپنی مراد کو پہنچ سکتے ہو۔ اور وہ آواز بھی یہی کہتی ہے جو کچھ تم حاصل کرنا چاہتے ہو اس کے حاصل کرنے کے لئے صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ تم اس پر عمل کرنے سے ڈرو نہیں اور اسکے ساتھ ہی تم یہ بھی نہ چاہو گے کہ وہ چیز تمہیں نہ ملے یہاں جلد آؤ کہ میں اپنی ہمّت و عزم کا جوش و خروش تمہارے کانوں میں بھر دوں اور اپنی دلیر زبان سے تمہاری جسارت و ہمّت کو بڑھا کر تمہارے دل سے وہ "تذبذب" دُور کر دوں جس میں با وجودیکہ خرقِ عادت ذرائع اور تقدیر تمہارے سر پر تاج شاہی رکھنا چاہتی ہے، تم اس وقت مبتلا ہو۔

(ایک قاصد آتا ہے)

کہو کیا خبر ہے؟

قاصد:۔ بادشاہ سلامت آج شب کو یہاں قیام فرمائیں گے۔

لیڈی میکبتھ:۔ کچھ دیوانے تو نہیں ہو گئے ہو۔ کیا تمہارا آقا میکبتھ بادشاہ سلامت کے ہمراہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انتظام کی غرض سے وہ مجھے پہلے اطلاع کر دیتا۔

قاصد:۔ یہ حضور نے بجا فرمایا۔ ہمارے آقا امیر گلیمس بھی آرہے ہیں۔ لیکن ہمراہیوں میں سے ایک شخص نے جلدی کی اور اُن سب سے پہلے وہ یہاں پہونچ گیا۔ وہ اتنا دوڑتا ہوا آیا ہے کہ دم پھول کر اُس کی نوبت مرنے کو پہونچی ہو۔ چنانچہ بجز اسکے اُس کے مُنہ سے کچھ نہ نکلا کہ "بادشاہ سلامت آرہے ہیں"۔ اس کے سوا اور کوئی پوری بات وہ نہ کہہ سکا۔

لیڈی میکبتھ:۔ اچھا جو آدمی آیا ہے اُسے تکلیف نہ ہو۔ اُس کے آرام کا خیال رکھا جائے۔ جو خبر وہ لایا ہے وہ اچھی ہے۔ (قاصد چلا جاتا ہے)

ظُلمت و نحوست کا شبرنگ پرندہ کریہ آواز میں چیخ رہا ہے کہ ڈنکن کی اجل اُسے یہاں لا رہی ہے۔ چیختے چیختے اُس کا گلا بیٹھ چلا ہے۔ اے خبیث روحو۔ جو انسان کے دل میں کُشت و خُون کے خیالات حلول کرتی ہو عورت کی شریف و نیک فطرت مجھ سے دُور کر دو۔ ظُلم و سفّاکی سر سے پاؤں تک مجھ میں بھر دو۔ اور قلب کے وہ تمام رستے مسدود کر دو جن سے ندامت یا پشیمانی داخل ہو کو رنج و افسوس پیدا کرتی ہیں کہ کہیں وہ خونی مقصد سے مجھے باز نہ رکھیں۔ اور جب تک مقصد پورا نہ ہو میری فطرت کو چین سے نہ بیٹھنے دو۔ اور اے خونِ ناحق کے کارپردازو، میری چھاتیوں میں دُودھ کی جگہ زہر بھر دو۔ تم وہ ہو جو کسی کو نظر نہیں آتے۔ دُنیا کی تمام شرارتوں میں تم بڑی سے معاون و مددگار ہوتے ہو۔ اے اندھیری رات تو جہنم کے دُخانی پردوں میں چھپی بیٹھی رہ "تاکہ نوکِ خنجر بھی اپنے لگائے ہوئے زخم کو نہ دیکھ سکے۔ اور اس شب تیرہ و تار میں فرشتے بھی آسمان سے جھانک کر آواز نہ لگا سکیں:۔ خبردار خبردار۔!

(میکبتھ اندر آتا ہے)

اے امیر گلیمس اور اے امیر والاشان کاڈور ان سے

بھی بالآخر جو کچھ آئندہ ہونے والے ہوا تمہیں مبارک ہو۔ تمہارے
خطا نے حالتِ لاعلمی سے نکال کر ایک آن میں مستقبل کا سارا
نقشہ میری نظر کے سامنے پیش کر دیا۔
میکبتھ:- پیاری بیوی۔ آج شب کو بادشاہِ ڈنکن یہاں
آنے والے ہیں۔
لیڈی میکبتھ:- واپسی کب ہوگی؟
میکبتھ:- کل واپس ہونے کا ارادہ ظاہر فرماتے ہیں۔
لیڈی میکبتھ:- سورج وہ کل کبھی نہ لائیگا۔ میرے امیر
آپ کا چہرہ تو ایک کتاب بنا ہوا ہے کہ جس کا جی چاہے
دل بہلانے کو نہایت عجیب و غریب حالات اس میں پڑھ
لے۔ اب دوسروں کو آپ ایسے ہی نظر آئیں جیسے کہ زمانہ
کے اور لوگ نظر آتے ہیں۔ اور موقع چاہتا ہے کہ آنکھوں
سے ہاتھوں سے زبان سے اطمینان و مسرت ظاہر ہوتی
رہے۔ ایک معصوم پھول بن کر در پردہ مارِ قاتل بنجایئے۔
وہ جو آ رہا ہے اُس کے لئے ضروری سامان بہت کچھ کرنا
ہے، اور آج شبکو جو کچھ ہونے والا ہو وہ میرے سپرد
کر دیجئے۔ اور یہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ آنے والے
لیل و نہار میں آپکو بادشاہ بنا کر سب کا مالک کر دیگا۔
میکبتھ:- اِس معاملۂ خاص میں پھر کسی وقت ضروری
گفتگو ہوگی۔
لیڈی میکبتھ:- چہرہ صاف رکھئے۔ اس کے متغیر رکھنے
سے لوگ سمجھیں گے کہ کوئی خوف طاری ہے۔ باقی جو کچھ
ہے وہ سب مجھ پر چھوڑیئے۔

چھٹا منظر:- میکبتھ کے قصر کے سامنے۔
شہنائی بجانے والے اور ملازم ہاتھوں میں
مشعلیں لئے ساتھ ہیں۔ ڈنکن، میلکم، ڈونل بین،
بینکو، لی نکس، میکڈف، راس، اینگس، اور
بہت سے ملازم ساتھ آتے ہیں۔

ڈنکن:- دیکھو وہ ہماری عزیزہ اور مہربان میزبان آرہی
ہیں۔ ہمارے ساتھ اظہارِ خلوص و محبت میں بعض وقت
بہت تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ اِسے خلوص و محبت سمجھکر
ہم آپ کے شکر گذار ہوتے ہیں اور اس بات کا سبق
دیتے ہیں کہ خدا سے آپ اپنی ان تکلیفوں کا اجرِ نیک
حاصل کریں اور اس طرح جو تکلیفیں آپ نے اٹھائی ہیں
اُن کے لئے آپ ہمارے بھی شکر گذار ہوں۔
لیڈی میکبتھ:- حضور ہم اپنی خدمتوں کو دو دو مرتبہ
ادا کرکے اگر اُن کو دوچند بھی کر دیں تب بھی وہ اس
اعزاز و اکرام کے مقابلے میں بے حقیقت ہونگی جو حضور
والا نے ہمارے خاندان کو بخشا ہے۔ پُرانے اعزاز و وقار
پہ جو لطف و کرم اب اضافہ ہوا ہے اس کے لئے ہم
ہمیشہ حضور کے دُعا گو رہیں گے۔
ڈنکن:- امیرِ کادور کہاں ہیں؟ میں تو اُن کے پیچھے جیسے
تازی کتا ہرن کے پیچھے دوڑتا ہے دوڑتا ہوا آیا ہوں
کہ پہلے پہونچ کر خود اُن کا استقبال کروں۔ اور بجائے
اس کے کہ وہ میری خاطر و مدارات کے لئے حاضر ہوں
میں اُن کی خاطر و مدارات کے لئے حاضر رہوں۔ شہسواری
میں اُن کا مثل نہیں۔ پھر اُن کا خلوص و ارادت ہمارے
ساتھ ایسا ہے کہ تیز مہمیز لگا کر اُنہیں یہاں لا رہا ہے۔
اے عزیزہ و مہربان میزبان آج شبکو ہم آپ کے مہمان
رہیں گے۔
لیڈی میکبتھ:- ہم حضور کے خادم اور ہمارے خادم بھی
حضور ہی کے نمک خوار ہیں۔ جو کچھ ہمارے پاس ہے
وہ سب حضور کا دیا ہے، اور جو کچھ حضور کا ہے وہ سب
حاضر ہے۔

ڈنکن:۔ اپنا ہاتھ دیجئے اور ہمیں ہمارے میزبان کے پاس لے چلئے۔ ہم کو اُن سے بڑی محبت ہے اور ہم اپنے مکارمِ شاہی سے ہمیشہ ان کو سرافراز کرتے رہیں گے۔ اچھا اب اجازت ہو، اے میری عزیز و مہربان میزبان۔

(چلے جاتے ہیں)

ساتواں منظر:۔ میکبتھ کا قصر۔

شہنائی بجانیوالے۔ چند مشعلچی۔ ایک کابدار اور بہت سے نوکر قابیں رکابیاں چمچے وغیرہ وغیرہ لئے ہوئے اسٹیج پر سے گزرتے ہیں۔ میکبتھ آتا ہے۔

میکبتھ:۔ جو کچھ ہونا ہے جب تک نہ ہو جائیگا چین نصیب نہ ہوگا۔ اچھا ہے اگر وہ جلد ہو جائے اور اس کے نتیجے بھی ظہور میں آجائیں، اور اُس کی موت کے بعد بادشاہی کا ملنا بھی قطعی ہو جائے۔ تو پھر قتل کے سوا دوسرا کیا مقصود ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ قصد پورا ہو گیا تو پھر یہ کُل قصہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن افسوس، جب اس زندگی کے ساحل سے کود کر ہم آنے والی زندگی میں قدم رکھینگے تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ اس قسم کے معاملات میں جو چیز اصلی اور حقیقی ہوتی ہے وہ نہیں ملا کرتی۔ ہم جو یہاں خون اور قتل کی تدبیریں کرتے ہیں اور وہ چل بھی جاتی ہیں تو پھر وہی تدبیریں ہم پر پلٹ پڑتی ہیں، یہ بادشاہ بڑا ہی عادل و منصف مزاج ہے اور اسکا عدل و انصاف بھی اس درجہ ہے کہ اگر کوئی زہر کا پیالہ بھی اس کے لئے تیار کرے تو وہ تیار کرنے والے ہی کے لبوں کے لائق ہوتا ہے۔ وہ ہم پر دو گونہ اعتبار و اعتماد کر کے ہمارے قصر میں آیا ہے۔ اوّل تو میں اُس کا قرابت مند، دوسرے اُس کی رعیت۔ یہ دونوں باتیں اُس کے خلاف ہیں کہ میں اُس کی جان کا خواہاں ہوں۔ پھر اس سے بھی بڑھکر یہ کہ میں اُسکا میزبان اور وہ میرا مہمان ہے۔ میرا فرض تو یہ ہے کہ اگر کسی کو کینہ پر آمادہ پاؤں تو اُس پر دروازہ بند کر دوں، نہ یہ کہ خود خنجر ہاتھ میں لیکر اُسے قتل کرنے اُٹھوں۔ علاوہ اس کے یہ بادشاہ نہایت نیک اور حلیم الطبع ہے اور باوجود ایسا عالی مرتبہ ہونیکے ایسا صاف باطن اور منصف ہے کہ اس کی نیکیاں فرشتہ بن کر اُس کی حامی اور مددگار ہو جائینگی۔ اور اگر اسے قتل کر دیا تو پھر اس کی یہی نیکیاں نقارۂ خدا بن کر میرے اس جرم کا تمام دنیا میں ڈھنڈورا پیٹتی رہینگی۔ اور رحم اور افسوس ایک نوزائیدہ برہنہ بچے کی طرح اس نقارے کی آواز پر سوار ہو کر ہمارا یہ گناہ اطراف عالم میں مشتہر کریگا۔ اور آسمان پر ملائک اپنے مرکبوں پر سوار ہو کر جو کسی کو نظر نہ آئیں گے فضا میں گشت لگا کر ہمارے اس ظلم و بے دردی کے کام کو تمام دنیا کی نظروں کو پیش کرینگے۔ اور یہ کُل فضا آنسوؤں کے سیلاب میں غرق ہو جائیگی۔ اپنے توسنِ عزم کو آگے بڑھانے کے لئے میرے پاس کوئی مہمیز نہیں ہے۔ جاہ و مرتبہ کی طمع اُچک کر اس توسن پر سوار ہونا چاہتی ہے مگر بجائے نشست پر آنے کے دوسری طرف گرتی نظر آتی ہے۔

(لیڈی میکبتھ آتی ہے)

کہو کیا خبر ہے؟

لیڈی میکبتھ:۔ بادشاہ خاصہ تناول فرما چکے ہیں۔ تم کیوں باہر نکل آئے۔

میکبتھ:۔ کیا اب مجھے وہ پوچھتے تھے؟

لیڈی میکبتھ:۔ ہاں دریافت تو کرتے تھے۔

میکبتھ:- جو بات سوچی تھی میں اب اُس میں کچھ نہ کرونگا۔ ابھی
ابھی تو مجھے بادشاہ نے اعزاز بخشا ہے اور ہر شخص میری
نسبت اعلیٰ درجہ کی رائے رکھتا ہو۔ اب اور بھی ترقی اور
تعریف کی اُمید ہے۔ اُس خیال کو ذہن سے جسقدر جلد
ممکن ہو دُور کر دو۔

لیڈی میکبتھ:- جس وقت تاج و تخت کی آرزو ہوئی تھی
اُس وقت کیا کچھ پی رکھی تھی، یا وہ آرزو پیدا ہوتے ہی
سُو گئی تھی اور جب جاگی تو دیکھئے کیا ہے کہ صورت زرد
ہے اور طبیعت پر نامردی اور بُزدلی چھائی ہے۔ آج
سے میں تمہاری محبت و الفت کو بھی ایسا ہی سمجھونگی۔
افسوس، جیسے مضبوط ہاتھ پاؤں کے تھے ویسے ہی
دل کے نہ نکلے۔ دل کا ارمان نکالنے سے ڈرتے ہو جسے
زندگی کا زیور سمجھ رہے تھے یا تو اُسے واقعی حاصل کرنا
چاہتے ہو یا خود دل میں ذلیل اور بُزدل رہنا پسند
کرتے ہو۔ یہ کہنا کہ میں ایسا کرسکتا ہوں اور اُسے بغیر
انجام دیئے دل میں اُس کی حسرت بھی رکھنا تو وہی
مثل ہوئی کہ "بلّی کا کھانے کو جی تو چاہتا ہو مگر ڈرتی
ہے کہ پاؤں گیلے ہو جائیں گے۔"

میکبتھ:- بیوی، خُدا کے لئے خاموش رہو۔ جو بات مرد
کو زیب دیتی ہے وہ سب کچھ میں کرسکتا ہوں اور
اُسکے لئے اتنا تیار ہوں کہ دوسرا نہیں ہو سکتا۔

لیڈی میکبتھ:- وہ کون موذی بدخواہ تھا جس نے
تمہیں اپنے اس مقصد کو مجھپر ظاہر کرنے پر آمادہ کیا
تھا۔ جس وقت تم نے ایسا قصد ظاہر کیا تھا اُس
وقت تمہارے مرد ہونے میں کسکو شُبہ ہوسکتا تھا لیکن
جسقدر مرد تم اُس وقت تھے اُس سے بھی زیادہ مرد
اُس وقت ہوگے جبکہ اپنی مُراد حاصل کرلوگے۔ اُس
وقت مقام اور وقت تجویز نہ ہوا تھا۔ اس وقت دونوں
چیزیں موجود ہیں، بلکہ وقت اور مقام نے خود اپنے تئیں
پیش کر دیا ہے۔ اور جب یہ سب کچھ ہولیا تو تم ہمت ہارنے
لگے۔ میں نے اپنے بچّوں کو دُودھ پلایا ہے اور میں یہ بھی
جانتی ہوں کہ دُودھ پیتے بچّے کی مامتا ماں کو بہت
ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ شیر خوار میری گود میں پڑا ہنستا
بھی ہوتا تو دُودھ اُس کے مُنہ سے چھُڑا کر اس زور
سے اُسے زمین پر پٹختی کہ اُس کا بھیجا نکل پڑتا بشرطیکہ
میں نے بھی اس کام پر ایسی ہی قسم کھائی ہوتی جیسے
کہ تم نے کھائی تھی۔

میکبتھ:- اگر ناکام رہے؟

لیڈی میکبتھ:- بس یہی ہوگا کہ ناکام رہیں گے۔ لیکن
جو ارادہ کیا تھا اُس پر ثابت قدم اور اپنی ہمت پر قائم
رہے۔ کیونکر ممکن ہو کہ ہم ناکام رہیں۔ ڈنکن دن بھر
کے سفر سے تھکا ماندہ ہو رہا ہے۔ پڑتے ہی غافل سو
جائیگا۔ دو ملازم جو اُس کے قریب ہونگے اُن کو میں
شراب پلا کر اتنا مدہوش کر دونگی کہ اُن کا حافظہ جو دماغ
کا سردار ہے محض ایک انجر رہ جائے گا۔ اور دماغ کے
جس خانے میں عقل رہتی ہے وہاں حافظہ کا عمل نہ ہو۔
جب یہ دونوں آدمی نیند میں غافل اور نشے میں بیہوش
مُردوں کی طرح پڑے ہونگے تو پھر وہ کیا چیز ہے جو تم
یا ہم آکر ڈنکن کے حق میں، جس حال میں کوئی اُس کا
مُحافظ نہ ہو، نہیں کرسکتے۔ پھر انہی دونوں ملازموں
کو قتل سے مُتّہم کرنا بھی کچھ مشکل نہ ہوگا۔

میکبتھ:- بیوی تم تو ایسی ہو کہ سوائے بہادر مرد بچّوں کے
تم سے دوسرا پیدا نہ ہو۔ تمہاری طبیعت تو بہت ہی دلیر
اور نڈر واقع ہوئی ہو۔ اگر تم نے ان دونوں ملازموں کے

چہروں کو جو بادشاہ کے خوابگاہ میں سوتے ہونگے خون سے رنگ بھی دیا اور ارتکاب قتل بھی انہی کے خنجر سے کیا تو کیا کوئی اس بات کا یقین کر لیگا کہ ہاں ایسا ہی ہوا ہے۔

لیڈی میکبتھ :۔ پھر سوائے اس کے اور کس بات کا یقین کیا جائے گا۔ ہم خود تو اس موقع پر وہ شور و غل، فریاد و فغاں کرینگے کہ ہم پر کسی کو شبہ نہ گزریگا۔

میکبتھ :۔ اچھا، میں نے قصد کر لیا۔ اور اب جسم کے کل اعضا کو اس سخت کام کیلئے آمادہ کرتا ہوں۔ اب تم جاؤ اور جتنا وقت باقی ہے اسمیں مہمانوں کی خاطر و تواضع میں مصروف رہو جھوٹا دل جو کچھ اندر رکھتا ہے جھوٹا چہرہ اُسے چھپا سکتا ہے۔

جُزوِ ثانی

پہلا منظر :۔ میکبتھ کے قلعہ انورنس کا صحن۔ بینکو اور اُسکا فرزند فلی انس باپ کے آگے مشعل لئے چلتا ہے۔

بینکو :۔ برخوردار، ذرا بتاؤ تو رات کتنی گئی ہوگی ؟

فلی انس :۔ چاند چھپ چکا ہے۔ گھنٹہ میں نے سُنا نہیں۔

بینکو :۔ چاند تو آج بارہ بجے غروب ہوتا تھا۔

فلی انس :۔ میرے خیال میں تو رات زیادہ گئی ہے۔

بینکو :۔ ٹھیرو۔ میری تلوار تم اپنے پاس رکھو۔ آسمان نے بھی کفایت شعاری پر کمر باندھی ہے۔ اپنی کل روشنیاں گل کر دی ہیں۔ مشعل تو تمہارے پاس موجود ہے، دوسرے ہاتھ میں یہ تلوار بھی رکھو۔ میرے دل پر کچھ ایسی غم کی گھٹا چھائی ہے کہ کسی طرح آنکھ نہیں جھپکتی۔ اے رحمتِ باری کے فرشتو، مجھے بُرے اور موذی خیالات سے جو فطرتِ عالم خواب میں دکھایا کرتی ہے اپنی پناہ میں رکھو۔ فلی انس ذرا تلوار مجھے دینا۔ کون ہے ؟

(میکبتھ آتا ہے۔ ایک نوکر مشعل لئے ساتھ ہے)

میکبتھ :۔ میں ہوں تمہارا دوست۔

بینکو :۔ ہائیں۔ کیا ابھی تک سوئے نہیں۔ بادشاہ سلامت تو خوابگاہ میں استراحت فرمانے چلے گئے ہیں۔ آج تو وہ بیحد خوش تھے اور تم سب کے لئے بڑی بڑی رقمیں عطا کی ہیں۔ تمہاری بیوی کو "میری بڑی مہربان میزبان" کہکہ تحفے میں یہ الماس دیا ہے۔ غرض ہر چیز سے بیحد مطمئن اور خوش نظر آتے تھے۔

میکبتھ :۔ کیا عرض کروں۔ آقا کی تشریف آوری پر افسوس ہے، دل کے ارمان نہ نکل سکے۔ اگر پہلے سے اطلاع ہو جاتی تو انتظام میں ہرگز کوئی کمی نہ ہوتی۔

بینکو :۔ نہیں۔ کل باتیں نہایت خیر و خوبی سے ہوگئیں۔ ہاں رات کو میں نے خواب میں اُن تینوں تقدیر بتانے والیوں کو دیکھا۔ تمہاری نسبت جو باتیں انہوں نے کہی تھیں اُن میں کچھ تو سچ نکلیں۔

میکبتھ :۔ مجھے تو اُن کا اب کچھ خیال تک نہیں ہے۔ لیکن ذرا اس کام سے فراغت پالوں تو پھر اس امر خاص میں دل کی باتیں کہنے کیلئے آپ کچھ وقت ضرور دینگے۔

بینکو :۔ جب مرضی ہو میں حاضر ہوں۔

میکبتھ :۔ اگر آپنے میری رائے سے اتفاق کیا تو پھر جب کبھی وہ بات ہوئی پھر عزت و دولت آپکے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہوگی۔

بینکو :۔ آپ سمجھیں کہ زیادہ عزت کی مجھے ہوس نہیں جو

عزّت اس وقت رکھتا ہوں اُسے کھونا نہیں چاہتا۔ اپنا دل
پاک صاف اور بادشاہ کی اطاعت و وفاداری میں مضبوط
رکھنا میرا بڑا مقصد ہے۔ اگر ان چیزوں میں فرق نہ آئے
تو میں آپکا مشورہ سُننے کو تیار ہوں۔

میکبتھ:۔ اچھا شب بخیر۔ خُدا حافظ۔

بینکو:۔ شُکریہ۔ رات زیادہ آئی۔ اب آپ آرام فرمائیں۔

(بینکو اور فلی اَنس چلے جاتے ہیں۔)

میکبتھ:۔ (نوکر سے) جاؤ۔ ذرا بیگم صاحبہ سے کہدو کہ جب
پینے کی دوا تیار ہو جائے تو گھنٹی بجا دیں (نوکر چلا جاتا ہے)
ارے میری آنکھوں کے سامنے یہ کیا ہے؟ یہ تو خنجر معلوم
ہورہا ہے۔ اِس کا قبضہ میرے ہاتھ کی طرف ہے۔ آ خنجر تجھے
پکڑلوں۔ ہائیں تُو ہاتھ میں نہیں آیا۔ مگر نظر ابتک آرہا ہے۔
کیا تُو واقعی کوئی چیز نہیں ہے، صرف موت کا ایک تصوّر
ہے جسے ادراک اور واہمہ دونوں محسوس کررہے ہیں۔
یا تُو محض وہم اور ایک بے سُود خیال ہے جو میرے مزاج
کی حدّت و حرارت کی پیدا کی ہوئی ایک شکل ہے۔ میں ابھی
تک تجھے دیکھہ رہا ہوں۔ تیری صورت شکل تو بعینہٖ ایسی
ہے جیسے اُس خنجر کی جسے میں اب نیام سے نکالتا ہوں۔
تُو تو مجھے وہ راستہ بتاتا ہے جسپر میں اب چلنے والا
ہوں۔ اور تُو اُسی وضع کا خنجر ہے جس سے میں اب کام
لینے والا ہوں۔ کیا میری بصارت کو باقی حواس نے احمق
بنا رکھا ہے۔ اور یا ہی باقی حواس نے یہ شکل میرے سامنے
پیدا کرکے اُسکا مجھے یقین دلا رکھا ہے۔ میں ابھی تک
تجھے دیکھہ رہا ہوں اور اب تو تیری دھار اور قبضے پر
خُون کے قطرے بھی نظر آتے ہیں جو پہلے نہ تھے۔ نہیں،
خنجر ونجر کچھ نہیں ہے۔ یہ محض خُون کرنے کا قصد ہے جو
خنجر بن کر آنکھوں میں گُھس بیٹھا ہے۔ کائنات میں اِس وقت
نصف دُنیا سے زیادہ مُردہ ہی ہے اور فتنہ و فساد کے خواب
پردوں کے پیچھے نیند کے ماتوں کو نظر آرہے ہیں۔ جادو
اور سحر جن کی صورتیں زرد ہو رہی ہیں ہیکیٹی کے دربار
میں نذریں پیش کرنے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ اور قتل و
خُون ریزی کا گُرگ سیاہ فام جو پاسبانی کرتا تھا جب
اپنا پہرا ختم کرکے کُتّے کی طرح بھونکتا ہے تو وہ خُونِ ناحق
کے ارادے کو پیدا کرتا ہے اور تارکوان سفاک
کی مثال شہوت پرستی کے جوش میں تیز قدم اُٹھاتا ایک
خبیث رُوح کی طرح اپنے شکار کی طرف اُڑا چلا جاتا ہے لیکن
میرے قدم جس طرف بھی اُٹھتے ہیں ہر سنگِ راہ زبانِ
حال سے کہکر میرا نشان بتاتا ہے کہ میں کہاں ہوں مگر
میں نے اس خوف وخطر کی فضا سے وہ وقت علیحدہ
کرلیا ہے جو قتل کے لئے مُناسب ہے۔ جب تک وہ زندہ
ہے مجھ پر خوف طاری رہیگا۔ حدّتِ کار کردگی بس جو
الفاظ زبان پر آتے ہیں وہ سفاک و سرد مہر ہوتے ہیں۔
اب میں جاتا ہوں اور اُمید ہے کہ یہ کام جلد ختم ہو جائیگا
(ایک گھنٹی کی آواز سُنتا ہے) گھنٹی بج رہی ہے جو اس
کام کے لئے اشارہ کرتی ہے۔ ڈنکن تُو اس آواز کو نہ
سُنیو۔ کیونکہ یہ تیری موت کا گھنٹہ بجا ہے جو تجھے جنّت
یا دوزخ میں طلب کرتا ہے۔

دوسرا منظر:۔ مقام وہی ہے۔

لیڈی میکبتھ آتی ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ جس چیز سے میں نے اُنہیں بیہوش کیا ہے
اُس نے میری ہمّت بڑھا دی ہے۔ جس چیز نے اُنہیں ٹھنڈا
کیا اُسی نے مجھے آگ بنا دیا ہے۔ سُنو خاموش۔ یہ موت کا
جرس بجانے والا تو اُلّو ہے جس کی منحوس آواز کانوں
میں آرہی ہے۔ رات کا رُخصتی سلام اس سے بدتر اور کیا ہوگا۔

میکبتھ قتل کے قصد سے اب خوابگاہ کے دروازے تک پہونچا
ہے۔ دروازہ کھلا ہے اور دونوں ملازم خراٹوں کی آواز سے
گویا آقا کی توہین کرتے ہیں۔ میں نے تو شراب میں ایک دوا
ایسی ملا کر انہیں دی ہے کہ موت اور زندگی دونوں اُن میں
باہم دست و گریباں رہیں۔ اِس سے مجھے مطلب نہیں کہ
وہ زندہ رہیں یا مر جائیں۔

میکبتھ:۔ (میکبتھ کی آواز اندر سے کہتی سُنائی دیتی ہے)
وہاں کون ہے۔ بتاؤ؟

لیڈی میکبتھ:۔ خوف ہے کہ جاگ ہو گئی اور وہ بات نہ
ہو سکی جس کا اقدام ارتکاب سے کہیں زیادہ روح فرسا
ہے۔ سُنو، میں نے ان کے دونوں خنجر دُرست کرکے اُنکے
پاس رکھدیئے تھے۔ کہیں میکبتھ انہیں بھول تو نہیں گیا۔
جب میں نے ڈنکن کو دیکھا ہے تو کیا اُس کی صورت مجھے
اپنے باپ کی صورت نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ اگر ایسا نہوتا
تو یہ کام میں اپنے ہاتھوں کر دکھاتی۔

(میکبتھ اندر آتا ہے)

شوہر!

میکبتھ:۔ میں نے وہ کام ختم کر دیا۔ کیا تم نے آواز نہیں
سُنی؟

لیڈی میکبتھ:۔ ہاں میں نے اُلّو اور جھینگر کی تیز آواز سُنی
تھی۔ تم نے تو کچھ نہیں کہا تھا۔

میکبتھ:۔ کب؟

لیڈی میکبتھ:۔ اب۔

میکبتھ:۔ اچھا اُس وقت جب خوابگاہ کی سیڑھیاں اُترتا
تھا؟ سُنو کس کی آواز ہے۔ پاس کے کمرے میں کون
سوتا ہے؟

لیڈی میکبتھ:۔ دونل بین سوتا ہے۔

میکبتھ:۔ (اپنے ہاتھوں کو دیکھکر) یہ داغ قتل کے
نشان ہیں۔

لیڈی میکبتھ:۔ اِنکو قتل کے نشان کہنا حماقت ہے۔

میکبتھ:۔ دونوں ملازم جو وہاں سوتے تھے اُن میں سے
ایک نیند میں ہنسا، اور دوسرا چیخا کہ "خون ہو رہا ہے"
پھر دونوں جاگ اُٹھے۔ میں کھڑا اُن کی باتیں سُنتا رہا۔
پھر دونوں نے کوئی دُعا پڑھی اور سو گئے۔

لیڈی میکبتھ:۔ دونوں پاس پاس سو رہے تھے۔

میکبتھ:۔ ایک نے کہا "خدا ہم پر رحم کرے"۔ دوسرے
نے کہا "آمین"۔ مجھے اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ مجھ قاتل
کے ہاتھ اُنہوں نے دیکھ لئے ہیں۔ اور جب میں نے اُنہیں
"خدا رحم کرے" کہتے سُنا تو میں نے بھی آمین کہنا چاہا۔
مگر میرے مُنہ سے کچھ نہ نکلا۔

لیڈی میکبتھ:۔ اِسکا اِتنا خیال نہ کرو۔

میکبتھ:۔ مگر "آمین" کیوں مُنہ سے نہ نکلی۔ مجھے تو خدا
سے رحم طلب کرنے کی اُس وقت بہت ضرورت تھی مگر
"آمین" حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

لیڈی میکبتھ:۔ ان باتوں کو اِس طرح سوچنے کی ضرورت نہیں
ورنہ ہم دونوں دیوانے ہو جائیں گے۔

میکبتھ:۔ مجھے خیال آتا ہے کہ میں نے ایک آواز یہ کہتے
سُنی تھی کہ "بس اب تجھ پر نیند حرام ہوئی"۔ میکبتھ نے
ایک سوتے بے گناہ کو جس کی نیند معصوم تھی قتل کیا ہے۔
نیند بھی وہ جو دن بھر کے افکار و آلام کے اُلجھے سُوت کو
سُلجھا دیتی ہے۔ جو دن بھر کی زندگی کی موت ہے۔ محنت
و مشقت کے بعد کا غسل ہے جو تازگی بخشتا ہے۔ زندگی
کی ضیافت میں سب سے مقوی غذا ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ کیا مطلب ہے؟

میکبتھ:- وہ آواز برابر یہی کہتی رہی "اب تجھ پر نیند حرام ہوئی"
"اب تو سو نہیں سکتا" سارے گھر میں یہی آواز گونجتی تھی۔
"گلیمس نے سوتے کا خون کیا ہے" کا دور کو اب نیند
نہیں آئے گی" "میکبتھ کو اب نیند کبھی نہ آئیگی۔"

لیڈی میکبتھ:- وہ کون تھا جو یہ کہتا تھا۔ آپ ایک
مریض دماغ کی طرح اس طرح خیال کر کے اپنی قوت
زائل نہ کریں اور جا کر اپنے ہاتھ کے ان داغوں کو جو
خون کرنے پر گواہی دیتے ہیں پانی سے دھو ڈالیں۔ یہ
دونوں خنجر وہاں سے کون اٹھا لایا۔ جاؤ اور ان کو
وہیں جا کر رکھدو۔ اور دونوں ملازموں کے چہروں پر
خون لگا دو۔

میکبتھ:- اب میں وہاں ہرگز نہ جاؤنگا۔ جو کچھ میں نے
کیا ہے اب اس سے خوف معلوم ہو رہا ہے۔ اس چیز کو
پھر دیکھنا میری قدرت سے باہر ہے۔

لیڈی میکبتھ:- پست ہمت ہو گئے۔ خنجر مجھے دو سونا
اور مرا تو مثل ایک بیجان تصویر کے ہوتا ہی شیطان
کی تصویر میں رنگ بھر کر اگر بیجا بنا لی جائے تو بچے البتہ
اس سے ڈرتے ہیں۔ اگر لاش سے اب تک خون جاری
ہے تو نوکروں کے منہ پر خون مل دونگی۔ اس سے
معلوم ہوگا کہ قاتل وہی ہیں۔ (لیڈی میکبتھ خوابگاہ
میں جاتی ہے۔ اندر سے کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز
آتی ہے۔)

میکبتھ:- یہ آواز کدھر سے آئی۔ یہ میری کیا حالت ہے
کہ ہر آواز پر چونک پڑتا ہوں۔ ہر آواز مجھے کیوں
اس قدر خوفزدہ کر دیتی ہے۔ ارے میرے ان ہاتھوں
کو کیا ہوا؟ انہیں دیکھنے سے تو میری آنکھیں نکلی پڑتی
ہیں۔ تمام سمندروں کا پانی بھی ان داغوں کو چھڑانے
میں کافی نہیں ہو سکتا۔ اور دھویا بھی تو وسیع سمندروں کا کل
پانی لالہ رنگ ہو کر اس کی سبزی کو سرخی بنا دے گا۔

(لیڈی میکبتھ پھر آتی ہے)

لیڈی میکبتھ:- میرے ہاتھ تم جیسے ہو گئے۔ لیکن دل
تم جیسا کمزور نہیں۔ (اندر سے کھٹ کھٹ کی آواز آتی ہے)
یہ آواز تو جنوبی دروازے سے آتی سنتی ہوں۔ آؤ ہم
دونوں اپنے کمرے میں چلے جائیں۔ تھوڑا سا پانی ان
خون کے داغوں کو دھو دیگا۔ دیکھا، یہ کل معاملہ کیسا
آسان نکلا۔ تمہاری طبیعت پائے استقلال پر نہ رہی۔
(پھر وہی کھٹ کھٹ سنائی دیتی ہے) سنو۔ (پھر کسی
کے کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے) سنو، پھر وہی آواز
آرہی ہے۔ آؤ جلدی سے کچھ الٹے سیدھے کپڑے
پہن لیں تاکہ ضرورت ہو تو باہر نکل سکیں۔ یہ نہ معلوم
ہو کہ ہم جاگ رہے تھے۔ کیوں کس خیال میں محو ہو کر
گم سم سے ہوئے جاتے ہو؟

میکبتھ:- کاش کہ ہر چیز کا علم ذہن سے دور ہو جائے
اور طبیعت پر اتنی غفلت طاری ہو جائے کہ جو کچھ کیا
ہے اس کی یاد دل میں مطلق نہ رہے (کھٹ کھٹ
ہوتی ہے) دشمن اس کھٹ کھٹ سے تو کب جاگنے والا
ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا کہ زندہ ہوتا اور جاگ اٹھتا۔

تیسرا منظر:- ایک دربان آتا ہے۔

(اندر پھر وہی کھٹ کھٹ ہوتی ہے)

دربان:- یہ کیسی عجیب کھٹ کھٹ ہے۔ اگر کوئی دوزخ کا دربان
بھی ہوتا تو قفل میں کنجی ڈال کر اسے برابر پھیرتے جاتا۔
ارے موذی کھٹکھٹائے جا۔ شیطان کا نام لیکر پوچھتا
ہوں کہ بتا تو کون ہے؟ کیا تو کوئی کسان ہے جس نے
ارزانی کے انتظار میں بیقرار ہو کر اپنے تئیں پھانسی دے لی ہے۔

میرے پاس بہت سے رُومال ہونے چاہئیں کہ پسینہ پونچھتا رہوں (اندر پھر وہی کھٹ کھٹ ہوتی ہے) کھٹکھٹائے جا۔ تجھے ابلیس کی قسم بتا کہ تو کون ہے؟ واللہ۔ کہیں اُن میں سے تو نہیں ہے جو سرکشی اور بغاوت کرکے کہتے ہیں کہ ہم تو خدا کے حکم سے دشمن بنے تھے۔ اور جن کا ہر فریق دوسرے فریق کے خلاف شہادت دینے کو تیار رہتا ہے۔ یہ وہ ہیں جو کفر و بدعت خُدا کی راہ میں کرتے ہیں۔ لیکن جب خُدا کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو اپنی اِس حرکت کا جواز ثابت نہیں کرسکتے۔ آ، اے کافر باغی اندر آ۔ (پھر کھٹکا ہوتا ہے) کھٹ کھٹ کئے جا۔ یہ کون ہے؟ واللہ، یہ تو کوئی انگریز خیاط معلوم ہوتا ہے جو فرانسیسی کپڑا چُرانے کی سزا میں دوزخ میں ڈالا گیا ہے۔ وہاں آگ کی کیا کمی ہے۔ خوب اپنی استری گرم کرنا رہ۔ (پھر کھٹ کھٹ ہوتی ہے) کھٹ کھٹ کئے جا، چُپ نہ بیٹھیو۔ آخر تو ہے کون؟ یہ جگہ تو اتنی ٹھنڈی ہے کہ دوزخ نہیں بن سکتی۔ اب میں شیطان کے گھر کی دربانی ختم کرتا ہوں۔ اور اُن لوگوں کو اندر بلائے لیتا ہوں جو اپنے پیشے کے ذوق و شوق میں گناہ کی طرف راغب ہوکر دوزخ کا راستہ دیکھتے ہیں۔ (پھر وہی کھٹ کھٹ ہوتی ہے) اچھا لو۔ ابھی لو۔ دربان کو دُعائیں دیتے رہنا (دروازہ کھول دیتا ہے)

(میکدف اور لینکس اندر آتے ہیں)

میکدف:۔ کہو دوست، کیا بہت دیر کرکے سوئے تھے۔ بڑی دیر میں اُٹھے۔

دربان:۔ بخُدا، حضور ہم دو بجے رات تک تو شراب ہی پیتے رہے۔

میکدف:۔ کیا بادشاہ سلامت بیدار ہوگئے ہیں؟

(میکبتھ باہر آتا ہے)

لینکس:۔ تشریف میکبتھ کو سلام۔

میکبتھ:۔ دونوں صاحبوں کو سلام۔

میکدف:۔ اے لائق امیر بتایئے بادشاہ سلامت بیدار ہوئے یا ابھی آرام فرماتے ہیں؟

میکبتھ:۔ نہیں، ابھی تک بیدار نہیں ہوئے۔

میکدف:۔ کل حکم دیا تھا کہ ٹھیک وقت پر حاضر ہونا۔ مجھے کسی قدر دیر ہوگئی۔ وقت یاد نہ رہا۔

میکبتھ:۔ میں آپکو خوابگاہ تک لئے چلتا ہوں۔

میکدف:۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تکلیف آپکے لئے موجبِ مسرت ہے، مگر تکلیف ہونے میں کیا شبہ ہے۔

میکبتھ:۔ جس تکلیف میں مسرت ہو وہ تکلیف نہیں رہتی۔

لینکس:۔ کیا بادشاہ سلامت کا قصد آج ہی یہاں سے مُراجعت کا ہے؟

میکبتھ:۔ ہاں فرماتے تو ہی تھے۔

لینکس:۔ رات نہایت طوفانی تھی۔ جس کمرے میں ہم تھے طوفان کے زور سے آتشدانوں کے دُخان کش اُوپر سے نیچے آن پڑے۔ سُنا ہے کہ رونے پیٹنے کا غُل، مرنیوالوں کی چیخیں بھی سُنائی دی تھیں۔ کہیں آگ لگنے کا شور تھا، کہیں اور آفات کے برپا ہونے کا غُل کہ یہ اور ہیبتناک آوازوں میں لوگوں نے اِس طرح سُنا جیسے کہ اکثر پُرآشوب زمانوں میں سُنا جاتا ہے ظُلمت کا پرندہ رات بھر برابر چیختا رہا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ زمین کو لرزہ بخار چڑھا تھا۔ کئی بار زلزلہ بھی آیا۔

میکبتھ:۔ حقیقت میں رات بڑی اندھیاری بھیانک خوفناک تھی۔

لینکس:۔ میری یاد میں، گو زیادہ عمر نہیں رکھتا، ایسی خوفناک رات پہلے نہ آئی تھی۔

(میکدف آتا ہے)

میکدف:۔ ارے غضب ارے ستم ارے مصیبت، زبان پر

دل میں ایسا خیال کب گزر سکتا تھا کہ یہ کچھ ہو جائیگا۔ جو کچھ ہوا ہی زبان کو یارا نہیں کہ کہہ سکے۔

لینکس:۔ کیوں خیر تو ہے، کیا ہوا؟

میکڈف:۔ مصائب و آفات نے اپنا کمال دکھایا ہے۔ ایسا خون ہوا ہے جو دین و ایمان سب کو غارت کرد ینا ہی۔ اس قتل نے اُس بادشاہ کو اُس کے گھر سے نکالا ہے جو خود خُدا نے اس کے لئے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ وہ گھر تو رہ گیا مگر اس کی جان خانہ ویران ہوئی۔

میکبتھ:۔ کیا کہہ رہے ہو، جان کیسی؟

لینکس:۔ کیا تمہارا مطلب بادشاہ سلامت سے ہی؟

میکڈف:۔ آؤ کمرے میں چلکر اپنی آنکھیں پھوڑ لو۔ اندھے ہو جاؤ۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھو، جو ہوا ہے خود جاکر دیکھ لو۔ اور پھر خود ہی کہو کہ کیا ہوا ہے۔ (میکبتھ اور لینکس اندر جاتے ہیں۔) جگاؤ جگاؤ۔ قلعہ کا گجر بجاؤ۔ قتل ہوا ہے۔ دغا اور فریب، سرکشی اور بغاوت برپا ہوئی ہی۔ ڈونل بین، میلکم، نیند سے ہوشیار ہو۔ نیند تو موت کی شکل رکھتی ہی۔ اب خود آکر موت کو دیکھ لو۔ اُٹھو۔ قیامت آگئی، اور اُسے دیکھ لو۔ میلکم اور بینکو اس طرح اُٹھو جیسے کوئی قبر سے اُٹھے۔ روحوں کو بیدار کرو کہ وہ بھی اس ہولناک منظر کو دیکھیں۔ گھنٹہ بجاؤ۔ (قلعہ کا گجر سبکو خبردار کرنیکو بجتا ہی)

(لیڈی میکبتھ اندر آتی ہے)

لیڈی میکبتھ:۔ یہ گجر کیسا سوتے آدمیوں کو جگا کر بلا رہا ہی۔ کہو۔ کچھ بتاؤ۔

میکڈف:۔ اے نیک دل خاتون۔ جو کچھ کہنا ہی وہ آپکے سُننے کی بات نہیں۔ عورت کے کان میں قتل کی خبر سُنانا خود اس عورت کا خون کرنا ہوگا۔

(بینکو آتا ہے۔)

بینکو، بینکو، ہمارا بادشاہ قتل ہو گیا۔

لیڈی میکبتھ:۔ ارے غضب! کیا ہمارے گھر میں ایسا ہوا۔

بینکو:۔ یہ سانحہ تو کہیں بھی پیش آتا ظلم وسفاکی میں کم نہ ہوتا۔ میکڈف خدا کے لئے جو کچھ کہتے ہو کہ ہوا اُسے کہو کہ نہیں ہوا۔

(میکبتھ اور لینکس کمرے میں جاتے ہیں)

میکبتھ:۔ کاش اس وقوعے سے ایک گھنٹے پہلے میں مر گیا ہوتا۔ تو پھر جو کچھ مجھ پر گزرتا وہ اچھا ہوتا۔ بس اس وقت سے زندگی میں کچھ نہ رہا۔ دُنیا کی سب چیزیں بازیچہ ہیں۔ خیر و برکت، نام و شُہرت آج دُنیا سے رُخصت ہوئے۔ ہائے شراب لُنڈھ گئی۔ تلچھٹ رہ گئی۔ اب اُس کی تعریفیں آسمان کے گُنبد میں گونجیں گی۔

(میلکم اور ڈونل بین آتے ہیں۔)

میلکم:۔ کیا ہوا، کیا ہوا؟

میکبتھ:۔ زندہ ہو اور پُوچھتے ہو کہ کیا ہوا۔ زندگی کا منبع خُون کا وہ سرچشمہ بہتے بہتے بند ہو گیا۔ اور اس کی تمام شاخیں اور رہگزر مسدود ہوئے۔

میکڈف:۔ آپکے والد بُزرگوار یعنی بادشاہ ڈنکن کو کسی نے قتل کر دیا۔

میلکم:۔ کس نے ایسا کیا؟

لینکس:۔ وہ ملازم معلوم ہوتے ہیں جو خوابگاہ میں بادشاہ کے قریب سوتے تھے۔ اُن کے ہاتھ اور چہرے سب خُون میں آلودہ تھے، اور یہی کیفیت ان کے خنجروں کی تھی۔ خنجروں کا خُون اُنہوں نے اپنے سرہانے کے تکیوں سے پونچھا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے اور بدحواس تھے۔ کسی جان کا بھروسا اُن پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میکبتھ:۔ پھر بھی مجھے افسوس ہو رہا ہی کہ کیوں حالتِ غیظ و غضب

ہیں میں نے انہیں قتل کر دیا۔

میکڈف:۔ آپ نے کیوں ایسا کیا؟

میکبتھ:۔ خیال کیجئے۔ انسان کیسے آنِ واحد میں حیرت زدہ، مُعتدل اور غضبناک رہ سکتا تھا۔ خیرخواہ بھی ہوتا اور بے پروا بھی۔ کوئی شخص بھی جسے اپنے بادشاہ سے تعلق تھا ایسے وقت میں عقل سے، جو تامل و غور کی ہدایت کرتی، کام لے سکتا تھا۔ ایک طرف ڈنکن اپنے بستر پر پڑا تھا۔ اُس کی چاندی کی مثل چمکتی جلد پر زخموں کے گرد خُون کے ہالے تھے۔ اس کے زخم صرف ایک شخص کے زخم نہ تھے بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ کُل کائنات میں شگاف دیئے گئے ہیں تاکہ غارتگری اُن کی راہ سے اندر گھُسے۔ دوسری طرف دونوں قاتل خُون میں رنگے، خنجر خُون میں آلودہ پڑے تھے۔ اس حالت میں کون ایسا تھا جس کے دل میں بادشاہ کی محبّت ہوتی اور اُس میں اتنی ہمّت نہ ہوتی کہ اپنی محبّت کا ثبوت دے۔

لیڈی میکبتھ:۔ ارے رحم کرو۔ کوئی مجھے یہاں سے اُٹھا کر لے چلو۔ مجھ سے یہ حال نہیں دیکھا جاتا۔

میکڈف:۔ لوگو، لیڈی میکبتھ کی حالت کو دیکھنا چاہیئے۔

میلکم:۔ (دونل بین سے علیحدہ کہتا ہے) ہم یہاں کیوں خاموش کھڑے ہیں۔ اس قتل کا اثر تو ہم پر پڑتا ہے۔

دونل بین:۔ (میلکم سے علیحدہ کہتا ہے) ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ یہ قتل تو اس بات کی خبر دیتا ہے کہ خود ہماری جان معرضِ خطر میں ہے۔ ممکن ہے کوئی ہمیں گرفتار کر کے قتل کر دے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم یہاں سے کہیں چلے جائیں۔ باپ کی موت پر ہمارے آنسو ابھی تک نہیں نکلے ہیں۔

میلکم:۔ اور نہ ہمارے رنج والم کو حرکت ہوئی ہے۔

بینکو:۔ لیڈی میکبتھ کا حال تو دیکھئے۔ (لوگ لیڈی میکبتھ کو اُٹھا کر لیجاتے ہیں۔)

اس وقت ہم سب سردی میں کھڑے ہیں۔ بہتر ہے کہ کپڑے پہن کر اور ہتیار لگا کر اس واقعے پر غور کرنے کے لئے جمع ہوں اور دیگر حالات متعلقہ تحقیق کریں۔ اس وقت خوف اور طرح طرح کے شکوک نے ہم پر لرزہ ڈال رکھا ہے۔ انصاف خُدا کے ہاتھ ہے۔ اور میں اس بغاوت اور جو بدگمانیاں اُس نے پیدا کی ہیں اُن کے مقابلے کے لئے تیار ہوں۔

میکڈف:۔ اور یہی حال میرا ہے۔

سب ملکر:۔ اور یہی کیفیت ہم سب کی ہے۔

میکبتھ:۔ ہمیں چاہیئے کہ درستی سے لباس پہن کر بڑے کمرے میں یکجا ہوں (سب چلے جاتے ہیں، سوائے میلکم اور دونل بین کے)

میلکم:۔ تم کیا کرو گے؟ میں تو اس مجمع میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ ایسا رنج والم جس کی اصلیت نہ ہو ایک جھُوٹے آدمی کے لئے آسان کام ہوتا ہے۔ میں تو انگلستان جاتا ہوں۔

دونل بین:۔ میں آئرستان جاتا ہوں۔ جب ہم دونوں جُدا جُدا مقام پر ہونگے تو ہمیں زیادہ حفاظت میسّر رہے گی۔ جہاں اس وقت ہم ہیں وہاں تو ہر شخص کا تبسّم بھی خنجرِ بُرّاں معلوم ہو رہا ہے۔ خُون کا رشتہ جتنا قریب ہو اتنا ہی خون ہونے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ یہ قتل و غارت کا تیر جو چھوڑا گیا ہے ابھی تک اپنے ہدف پر نہیں پہونچا ہے۔ بہتر طریقہ یہی ہے اس نشانے سے ہم ہٹ جائیں۔ آؤ۔ کسی سے رُخصت ہونے کی ضرورت نہیں۔ چلو اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر کسی طرح یہاں سے نکل جائیں۔ جہاں کسی کے دل میں خُدا کا

خوف اور رحم باقی نہ ہو تو پھر یہاں سے خفیہ طور پر نکل جانا ہی بہتر ہے۔ آئیں کسی کی چوری نہیں۔ (چلے جاتے ہیں)

چوتھا منظر:۔ میکبتھ کے قصر سے باہر

راس اور ایک بڈھا آدمی آتا ہے۔

بڈھا:۔ زمانے کے دور میں تین بیسی دس برس زندہ رہکر بڑے بڑے سخت حادثے اور عجیب عجیب واقعات نظر سے گزرے ہیں۔ لیکن شب گزشتہ کے واقعات نے سبکو مات کر دیا۔

راس:۔ اے مردِ نیک و معمر آسمان و زمین کے درمیان انسان کے ہاتھوں جو جو خون خرابے آپکی زندگی میں پیش آئے وہ تو آپکی نظر سے گزرے ہی ہونگے، مگر آج کچھ کیفیت عجیب ہے۔ خیال کیجئے تو وقت دن کا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ راہ گیروں کو پریشان کرنے کے لئے ظلمت نے رات کی روشنیاں گل کر دی ہیں۔ یا پھر تاریکی نے دن کی روشنی کو شرمندہ کرنے کیلئے روئے زمین پر اندھیرا ڈال رکھا ہے۔ حالانکہ وقت ایسا تھا کہ سورج کی روشنی پھیل جاتی۔

بڈھا:۔ یہ جو کچھ دیکھ رہے ہو اور جو قتل کیا گیا ہے یہ سب امور خلافِ قدرت و فطرت ہیں۔ گزشتہ دوشنبہ کو ایک شکرہ جسے اپنی بلند پروازی پر ناز تھا اُس کا تعاقب ایک موش خور اُلّو نے کیا اور شکرے کو پکڑ کر مار ڈالا۔

راس:۔ اور سب سے عجیب بات یہ ہوئی ہے کہ بادشاہ ڈنکن کے گھوڑے جن کے برابر حسین و سبک رو جانور دنیا میں نہ ہونگے وہ سب وحشی اور دیوانے ہو گئے۔ اصطبل توڑ کر باہر نکل آئے۔ اُچھلنا کودنا ہنہنانا شروع کیا۔ کسی کا حکم نہ مانا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نسل آدم کے دشمن بنکر سب سے لڑنے کو نکلے ہیں۔

بڈھا:۔ ابھی مجھ سے کسی نے کہا ہو کہ یہ گھوڑے ایک دوسرے کو مار کر کھا رہے ہیں۔

راس:۔ بالکل صحیح ہے۔ میری حیرت زدہ نگاہوں کے سامنے بھی اُنھوں نے یہی کیا۔

(میکڈف اندر آتا ہے)

کہئے کیا حال ہے؟

میکڈف:۔ کیوں کیا تمہیں نہیں معلوم؟

راس:۔ کچھ پتہ چلا کہ قاتل کون تھا؟

میکڈف:۔ اُنہی کو سمجھئے جنہیں میکبتھ نے قتل کر دیا۔

راس:۔ خدارا فرمائیے کہ اِس فریب و دغا سے کیا بھلائی نکلی؟

میکڈف:۔ سنا گیا ہے کہ میلکم اور دونل بین کو اسی کام کیلئے روپیہ دیا گیا تھا۔ یہ دونوں بادشاہ آنجہانی کے فرزند ہیں، اور اب کہا جاتا ہے کہ وہ کہیں چلے گئے ہیں یا پھر اُنکو کسی نے غائب کر دیا ہے، اِس وجہ سے اِن دونوں شہزادوں پر لوگوں کو زیادہ شبہ گزرنے لگا ہے۔

راس:۔ یہ خیال بھی انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ مگر لالچ اور طمع بُری بلا ہے۔ یہ تو اُنہیں بھی نگلنے کو تیار ہو جاتے ہیں جو دنیا میں اُنہیں لائے تھے۔ تو اب گمانِ غالب یہی ہے کہ بادشاہی میکبتھ کو مل جائیگی۔

میکڈف:۔ بادشاہی پر وہ نامزد ہو بھی گیا ہے اور شہر اسکون میں تاجپوشی کیلئے گیا ہے۔

راس:۔ ڈنکن کا جنازہ کہاں لے گئے؟

میکڈف:۔ اُسے تو کولمی کل میں لے گئے ہیں جہاں اُسکے بزرگوں کا گورستان ان کی ہڈیوں کی حفاظت کرتا ہے۔

راس:۔ کیا آپکا قصد بھی جشنِ تاجپوشی میں شرکت کے لئے

اسکون جانے کا ہے؟

میکڈف:۔ نہیں بھائی، میں تو اپنے علاقے فائف کو جا رہا ہوں۔

راس:۔ لیکن مجھے تو اسکون جانا ہے۔

میکڈف:۔ اچھا ہے، تاجپوشی کے جلسے میں شریک ہو سکو گے۔ لو۔ خدا حافظ۔ اور وہاں یہ بھی دیکھنا کہ بدن پر پرانی پوشاک ہی ٹھیک آتی ہے، یا یہ نیا لباس کبھی چست ہوتا ہے۔

راس:۔ (بڈھے سے) خدا حافظ۔

بڈھا:۔ خدا تم پر اپنا فضل و کرم رکھے۔ اور اُن پر بھی جو بُرائی میں بھلائی پیدا کرتے ہیں، اور اُن پر بھی جو ہمارے دوستوں کے دشمن ہوں۔

(سب چلے جاتے ہیں۔)

جُزوِ ثالث

پہلا منظر:۔ فورس۔ شاہی محل

بینکو داخل ہوتا ہے۔

بینکو:۔ میکبتھ گلیمس اور کاڈور کا امیر تو ہو ہی گیا تھا۔ اب اُن جادوگرنیوں کی پیشینگوئی کے مطابق بادشاہ بھی ہو گیا۔ مجھے خوف ہے کہ تُو نے یہ بادشاہی دغا اور فریب سے حاصل کی ہے۔ مگر ان جادوگرنیوں نے تجھ سے یہ بھی تو کہا تھا کہ تیری اولاد میں بادشاہی نہ جائیگی۔ بلکہ میں بینکو ایک بڑے سلسلے کا مورثِ اعلیٰ ہونگا۔ اگر ان جادوگرنیوں کی باتیں جیسے تیرے حق میں صحیح نکل کر درخشندہ و تاباں ہوئیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ میرے حق میں وہ کیوں صحیح نہ ثابت ہوں۔ اور میرے دل میں اپنی اولاد کے بادشاہ ہونے کی آرزو پیدا نہ ہو۔ لیکن خاموش، اب کچھ نہ کہو۔

(گانے بجانے کی آواز آتی ہے۔ میکبتھ بادشاہ اور لیڈی میکبتھ ملکہ بنکر آتے ہیں۔ سردار لینکس، راس، اور دیگر اُمرائے دربار بیگمات، مُلازمین اور خدام داخل ہوتے ہیں)

میکبتھ:۔ لیجئے۔ ہمارے یہ معزز و مقتدر مہمان تشریف لائے ہیں۔

لیڈی میکبتھ:۔ اگر کہیں انکو بُلا دینا بھول جاتے تو ہماری اس ضیافت میں کچھ رونق ہی نہ ہوتی۔

میکبتھ:۔ بینکو۔ آج شبکو ہمارے ہاں ضیافت ہے۔ پس آپ سے درخواست ہے کہ آپ ضرور شریک ہوں۔

بینکو:۔ درخواست نہیں۔ شاہِ عالیجاہ حضور تو شرکت کے لئے حکم فرما سکتے ہیں۔ پھر میرا حاضر ہونا فرضِ منصب ہوگا۔ وابستگانِ دولت کا تعلق تو حضور کے ساتھ وہ ہے جو ہمیشہ قائم رہے گا۔

میکبتھ:۔ کیا تیسرے پہر آپ گھوڑے کی سواری کرتے ہیں۔

بینکو:۔ حضور۔

میکبتھ:۔ ہمیں آپ سے ایک خاص امر میں مشورہ کرنا ہے آج کی مجلس میں وہ اہم مسئلہ بڑی کامیابی سے پیش ہو چکا ہے، مگر کل پھر اس پر گفتگو ہوگی۔ کیا آپ کو بہت دُور جانا ہے؟

بینکو:۔ حضور۔ فاصلہ اتنا ہی ہے کہ اگر اس وقت روانگی ہو تو ضیافت کے وقت تک طے ہو جائے۔ اگر گھوڑا تیز نہ چلا تو پھر قدوی گھڑی دو گھڑی رات گئے یہاں پہونچیگا۔

میکبتھ:۔ مگر ضیافت میں بہرکیف آپکا شریک ہونا ضروری ہے۔

بینکو:- کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ تعمیلِ ارشاد میں فرق آئے۔

میکبتھ:- سُننے میں آیا ہے کہ ہمارے یہ دونوں برادر زادے باپ کے قاتل انگلستان اور آئرستان میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گئے ہیں۔ اور باپ کے قتل کا جُرم جو اُن سے سرزد ہوا ہے اُس کا اقبال نہیں کرتے۔ اور جب کبھی تقریر کرتے ہیں تو سُننے والوں کے سامنے عجیب و غریب من گھڑت قصّے بیان کرتے ہیں۔ بس اب سیر لعد کو گفتگو ہوگی۔ آپ فوراً گھوڑے پر سوار ہو جائیں اور آج ہی شب کو ضیافت کے وقت پھر مُلاقات ہو گی۔ خُدا آپکو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ کیا فلی انس بھی آپ کے ساتھ ہی جا رہا ہے؟

بینکو:- حضور، وقت کم رہ گیا ہے۔ شام تک جلد واپس آنا ہے اجازت چاہتا ہوں۔

میکبتھ:- خُدا سے اُمید ہے کہ آپکے گھوڑے تیز رو اور چال کے سچے ہونگے، اور اب آپکی روانگی پر خُدا سے دُعا کرتا ہوں۔

(بینکو چلا جاتا ہے۔)

ہر شخص کو اپنے وقت کا مالک رہنا چاہیئے۔ میں بھی ضیافت کے وقت تک آزاد ہوں۔ اور اس خیال سے کہ ضیافت بہترین طریقے پر انجام پائے اُس وقت تک میں بشّاش اور ہنستا رہونگا۔ (سوائے میکبتھ کے سب چلے جاتے ہیں۔ چند خادم حاضر رہتے ہیں) خادم اِدھر آؤ، اور سُنو، جو دو آدمی آتے ہیں جب تک ہم حُکم دیں اُنہیں ٹھیرائے رکھو۔

خادم:- حضور، وہ محل کے باہر حاضر رہینگے۔

میکبتھ:- اچھا، اُنہیں یہاں حاضر کرو۔

(خادم باہر جاتا ہے۔)

حالت اس وقت خیر و سلامتی کی نہیں ہے۔ اس بینکو کے خوف سے دل بیٹھا سا جاتا ہے۔ اس کی اولاد اس وقت سرِ تاجِ سلطنت ہے جس سے خوف کرنا لازمی ہے۔ تہوّر و مردانگی کے ساتھ عقل بھی اس کے عزم و ہمّت کی ہادی و رہ نُما ہے۔ بجُز اس بینکو کے کوئی دوسرا نہیں جس کے زندہ رہنے سے مجھے خوف ہو سکتا ہو۔ اس کے کوکبِ اقبال کے سامنے میرا ستارہ اس طرح محجوب ہو جاتا ہے جیسے اگلے وقتوں میں انطونی کا ستارہ قیصر (اغسطس) کے ستارے کے سامنے بے نُور ہو گیا تھا۔ جب وہ تینوں جادوگرنیاں اُس ویران مقام پر نظر آئی تھیں اور جب اُنہوں نے بادشاہ کہہ کر مجھے مُبارکباد دی تھی تو بینکو کیسا بگڑا تھا۔ اور کیسی ڈانٹ بتا کر اُن سے پُوچھا تھا کہ وہ اُسکی نسبت بھی کوئی اچھی خبر دیں۔ چُنانچہ اُنہوں نے بینکو کو بھی یہ کہکر مُبارکباد دی کہ وہ ایک سلسلۂ شاہی کا مُورثِ اعلیٰ ہوگا۔ غرض یہ تقدیر کی بات چنے والیاں میرے سر پر ایک تاج بے ثمر اور میرے ہاتھ میں ایک عصائے بے سُود رکھکر چلی گئیں تاکہ یہی چیزیں وہ لوگ جو میرے صلب سے نہ ہوں مجھ سے چھین لیں۔ اور میری اولاد میں کوئی وارثِ تاج و تخت نہ ہو۔ گویا بینکو کی اولاد کے لئے میں نے اپنی طبیعت کو غارت کیا اور انہی کے لئے میں نے ڈنکن کا خون کیا۔ انہی کے لئے اپنے قلب میں سکون و اطمینان کی جگہ بُغض و عناد کو جگہ دی۔ تو کیا میں نے انہی کے لئے اپنے روح کے گوہرِ ازلی کو شیطانِ ملعون کے حوالے کیا ہے۔ تاکہ بینکو کی اولاد بادشاہ ہو کر حکومت کرے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اے تقدیر اب میدان میں اُتر اور میرے لئے جان پر بازی لگا کر لڑ۔ کوئی ہے؟

(خادم اندر آتا ہے۔ اسکے ساتھ دو قاتل ہیں۔)

اچھا خادم۔ جب تک کہ ہم آواز دیں تم دروازے کے پاس کھڑے رہو تا قاتلوں سے کہتا ہے) کیا تم ہی سے کل اس معاملے میں گفتگو ہوئی تھی۔

پہلا قاتل :۔ حضور کل ہی ارشاد ہوا تھا۔

میکبتھ :۔ پھر جو کچھ ہم نے کہا تھا اُس پر تم نے غور کیا۔ تمہیں معلوم رہنا چاہیئے کہ یہی وہ شخص ہے جس نے گزشتہ زمانے سے تمہیں اتنا محتاج و مفلوک الحال کر رکھا ہے۔ اور تم اس غلط خیال میں رہے کہ تمہاری خستہ حالی کا باعث ہم ہیں۔ نہیں، ہم واقعی اِس معاملہ میں بالکل بے قصور ہیں۔ اور پچھلی مرتبہ جو گفتگو ہوئی تھی اُس میں ہم نے اِس بات کو نہایت واضح اور صاف طریقے پر تمہارے سامنے بیان کر دیا تھا۔ اور تم کو سمجھا بھی دیا تھا کہ کس طرح ہم پر کوئی گرفت پاکر وہ ہماری مخالفت کے درپے رہنا چاہتا ہے، اور وہ کون سے وسائل اور کون سے لوگ ہیں جن کو کام میں لاکر وہ ہمیں غارت و تباہ کرنے پر آمادہ ہے۔ ایک نادان بھی جس میں عقل نہ ہو دیکھ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کیا کرایا بینکو کا ہے۔

پہلا قاتل :۔ یہ کل حال تو حضور ہی نے ہم پر کھولا تھا۔

میکبتھ :۔ اور اب اِسکا تدارک بھی تم ہی سے چاہتا ہوں۔ اور یہی بات تم سے دوسری ملاقات کی وجہ ہوئی۔ کیا تمہاری طبیعت میں صبر اتنا غالب ہے کہ تم اپنی اسی حالت میں رہنا گوارا کر سکتے ہو۔ کیا تمہاری مذہبی تعلیم اتنی ہے کہ تم اُسے ایک نیک بخت اور پارسا شخص سمجھکر اُس کی خیر و سلامتی کی دُعا مانگو۔ جس کے ظلم و ستم سے تم قبر تک پہونچ گئے ہو اور جس نے تمہیں مفلس و فاقہ کش بنا دیا ہے۔

پہلا قاتل :۔ حضور انسان تو ہم بھی ہیں۔

میکبتھ :۔ ہاں فہرستوں میں تو تم آدمی ہی لکھے جاتے ہو مگر شمار تمہارا کتّوں میں ہوتا ہے۔ اس میں چاہے شکاری ہوں چاہے تازی، چاہے جھبرے چاہے پلّے۔ چاہے وہ ہوں جو شکار کے لئے پانی میں کُود پڑتے ہیں۔ یا بھیڑیئے اور کتّے کی مخلوط نسل کے ہوں۔ مگر بہرکیف سب کو کُتّا ہی کہا جاتا ہے۔ گو یہ سچ ہے کہ خصلت و عادت جو فطرت نے تمہیں عطا ہوئی ہے مثلاً تیز رفتاری یا سُست چال۔ تیزی گھر کی چوکیداری میں ہوشیاری یا کوئی اور خصوصیت کا لحاظ کر کے تم میں تمیز کی جاتی ہو۔ بہرحال تمہیں کہتے کُتّا ہی ہیں۔ پس اِس قسم کی خصوصیتوں میں اگر تمہیں امتیاز حاصل ہے اور اِس فہرست میں تم کوئی درجہ رکھتے ہو، اور انسان کی بدترین قسم سے نہیں ہو تو کہو تاکہ میں خفیہ طور پر تمہارے کان میں وہ بات ڈالوں جس سے تمہارا دُشمن دُنیا ہی سے چل بسے۔ اور یہ کام وہ ہوگا کہ اگر تم نے اُسے بخوبی انجام دیا تو ہمارے دل میں تمہاری جگہ ہوگی اور ہم تم سے ہمیشہ مہربانی و محبّت سے پیش آیا کرینگے۔ اِس وقت تو اُس کی زندگی نے تمہیں اپنی جان ہی سے اتنا بیزار کر رکھا ہے کہ اگر وہ مارا گیا تو تمہیں چین اور آرام نصیب ہو جائیگا۔

پہلا قاتل :۔ حضور میں نے دُنیا میں وہ وہ صدمے اُٹھائے اور ایسی ایسی چوٹیں کھائی ہیں کہ ہر وقت دل جلا بھُنا رہتا ہے۔ اور کسی کو نقصان پہونچانے میں مطلق تامل یا دریغ نہیں ہوتا۔

دوسرا قاتل :۔ اور حضور میں دوسرا شخص ہوں جس نے ناکامیاں سہتے سہتے اور تقدیر سے ہر وقت کشمکش میں رہتے رہتے اپنا دل ایسا پتھر کر لیا ہے کہ کسی بات پر جان جانے یا رہنے کی مطلق پروا نہیں رہتی۔

میکبتھ:- تم دونوں کو اس بات کا علم ہے کہ بینکو تمہارا دشمن ہے۔

دونوں قاتل:- حضور سچا فرماتے ہیں۔

میکبتھ:- اور یہی حال اُس کا ہمارے ساتھ ہے اور پھر یہ دشمن جان ہم سے اتنا قریب ہے کہ اُس کے زندہ رہنے سے ہمیں کسی نہ کسی طور پر نقصان پہونچنے کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر ہم چاہیں تو بلا تکلف علی الاعلان یہ کہکر کہ یہی ہماری مرضی ہے اُسے اپنی نظروں سے دُور کردیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں کرسکتے۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے ہیں جو اُس کے بھی دوست ہیں اور ہمارے بھی۔ اور اُن کی دوستی و محبت کو ہم ترک نہیں کرسکتے۔ اگر ہم نے اپنے ہاتھ سے اُسے قتل کردیا تو پھر ہمیں اُس کی موت پر اظہار افسوس کرنا پڑیگا۔ اور یہی بڑی وجہ ہے کہ ہم نے اس کام میں تم سے مدد چاہی ہے تاکہ کل معاملہ عام نظروں سے چھپا رہے۔ کیونکہ چند وجوہ ایسے ہی سخت ہیں۔

دونوں قاتل:- جو کچھ حکم حضور دے رہے ہیں حسب الارشاد ہم اُسے بجا لائیں گے۔

پہلا قاتل:- ہمیں چاہے ہماری جانیں ہی ......

میکبتھ:- اس کام میں تمہاری خوشی اور رضامندی تمہارے چہروں سے ظاہر ہے۔ بس اس کام کو اسی وقت انجام دو۔ وہ مقام جہاں تمہیں اُس کی تاک میں بیٹھنا ہوگا ہم بتائیں گے۔ اور جو کچھ بھی اُس کی نقل و حرکت کے متعلق جاسوسوں سے معلوم ہوتا رہے گا اُس سے تمہیں مطلع کریں گے۔ اور ٹھیک وہ وقت بھی تمہیں بتادیا جائیگا جس وقت یہ کام کرنا ہوگا۔ یعنی آج ہی رات کو یہ مرحلہ طے ہوجانا چاہیئے۔ موقع یہاں سے قریب ہے۔ مگر دیکھو ہماری طرف سے کسی بات کا ہونا ہرگز ظاہر نہ ہو۔ اور ہم اس امر سے بالکل پاک صاف رہیں۔ اور دیکھو کوئی کسر کسی بات میں رہ نہ جائے۔ فلی انس اُس کا بیٹا بھی اُس کے ہمراہ ہوگا۔ اُس کا عدم میں پہونچنا بھی ہمارے لئے ایسا ہی ضروری ہے جیسے کہ اُس کے باپ کا۔ جو حال اُس کے باپ کا ہو وہی اُس کا بھی ہو۔ اور ایک ہی وقت میں دونوں کا کام تمام کیا جائے۔ اچھا اب تم دونوں باہم مشورہ کرلو۔ میں ابھی پھر آتا ہوں۔

دونوں قاتل:- حضور والا۔ ہم ارادہ کرچکے ہیں۔

میکبتھ:- اچھا ذرا باہر ٹھیرو۔ میں پھر تمہیں ابھی بلاؤنگا۔

(قاتل چلے جاتے ہیں)

بینکو تیرا کام تو تمام ہوا۔ اگر جسم سے نکل کر تیری رُوح جنت کی تلاش میں روانہ ہو تو یہ روانگی آج ہی پیش آجانی چاہیئے۔

دوسرا منظر:- میکبتھ کا قصر۔

لیڈی میکبتھ اور ایک مُلازم اندر آتا ہے۔

لیڈی میکبتھ:- کیا بینکو دربار سے چلا گیا؟

مُلازم:- حضور۔ مگر شب کو پھر واپس آئیگا۔

لیڈی میکبتھ:- اچھا، بادشاہ کے پاس جاکر کہو کہ میں تخلیئے میں کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔

مُلازم:- بہت بہتر۔ ابھی جاکر عرض کرتا ہوں۔

(مُلازم چلا جاتا ہے)

لیڈی میکبتھ:- حاصل کچھ نہ ہوا۔ کھویا سب کچھ۔ جب ہماری کوئی خواہش ناقابلِ اطمینان طور پر پوری ہوتی ہے تو وہ ہمیں غارت کرنے میں اتنی آزار دہ نہیں ہوتی جسقدر کہ اُس کے بعد کا خوف دلمیں طرح طرح کے وہم پیدا کرکے ہماری مسرتوں کو خاک میں ملاتا رہتا ہے۔

(میکبتھ آتا ہے)

فرمایئے آقا! آپ اتنے اکیلے اکیلے کیوں رہنے لگے؟ اس سے آپکے ملنے والوں میں عجیب عجیب شکوک آپکی نسبت پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ شکوک ایسے ہوتے ہیں جنہیں اب تک قطعی معدوم ہوجانا چاہیئے تھا۔ انہی شکوک کی وجہ سے وہ آپکی طرف سے بدگمان ہوتے ہیں۔ جو چیز لاعلاج ہوچکی ہو پھر اُس کا تدارک عبث ہے۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو لیا۔

میکبتھ:۔ سانپ چوٹ تو کھا گیا مگر مرا نہیں۔ جہاں زخم اچھا ہوا پھر جیسا تھا ویسا ہی ہوجائیگا۔ اور جو زہر اس میں پہلے تھا پھر اُس کے پیدا ہوجانے کا خطرہ قائم رہیگا، یعنی روٹی کھانے جب بیٹھیں تو ڈرتے رہیں اور جب سوئیں تو نیند میں وہ ہیبت ناک خواب نظر آئیں کہ تن بدن پر لرزہ پڑجائے۔ بہتر ہوتا کہ زمین و آسمان کی سب چیزیں درہم برہم ہوجائیں۔ اور کاش ہم بھی اُنہی رفتگانِ عدم میں جا پہونچتے جنہیں ہم نے اپنے اطمینان کے لئے عالمِ بالا میں آسودہ کردیا ہے۔ بجائے اس کے کہ زندہ رہکر حالتِ اضطراب و پریشانی میں رہیں۔ اور سخت سے سخت تکلیفیں اور عذاب اُٹھائیں۔ دُنیا کی مکروہات و آلام سے قطعی آزاد ہوجانے پر ڈنکن اپنی قبر میں آرام سے سوتا ہے۔ اب نہ بغاوتیں نہ بلوے، نہ تلوار نہ زہر نہ خانہ جنگی نہ دشمن کی سرکشی یا ایسی ہی اور خرابیاں اُس کی نیند اُچاٹ کرسکتی ہیں۔

لیڈی میکبتھ:۔ پیارے شوہر! ان خیالات کو دل میں راہ نہ دیجئے۔ آپ اپنی یہ پریشان نظریں دُور کریں۔ آج تو مہمان آئے ہیں۔ اُن کے سامنے خوش اور خنداں پیشانی رہیئے۔

میکبتھ:۔ ہاں پیاری بیوی! ایسا ہی ہوگا۔ تم بھی خوش و بشاش رہو۔ بینکو کی خاطر و تواضع میں کمی نہ ہو۔ نظر اور زبان دونوں سے اُس کی مدارات بہت کرنا۔ کیونکہ غصبِ دولت میں اپنی اس نئی شان کے داغوں کو خوشامد اور خوش خلاقی سے دھونا اِس وقت ہمارے لئے محفوظ ترین طریقہ ہوگا۔ اور چہرے کے پردے میں دل کے اصلی خیالات کو چھپائے رکھنا بھی ضروری ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ ان سب باتوں کو تو آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔

میکبتھ:۔ پیاری بیوی! اس کلیجے میں تو سانپ اور بچھو بھرے ہیں۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ بینکو اور فلی انس ابھی تک جیتے بیٹھے ہیں۔

لیڈی میکبتھ:۔ تو کیا خُدا کی بنائی ہوئی ان صورتوں کو خدا کی طرح ہمیشگی حاصل ہے؟

میکبتھ:۔ ہاں، بس اتنا ہی تو اطمینان ہے کہ اُنپر حملہ کرکے اُنہیں غارت کیا جاسکتا ہے۔ بس اب خوش رہو۔ شام ہونے دو۔ جس وقت شپرک پُرانی عمارتوں، چھتوں، چھجوں اور برجوں میں اپنے آشیانوں سے نکل کر ہوا میں اُڑیں اور جب تک کہ بڑا جھینگر اپنے سخت خول سے پر نکالکر اندھیرے میں زور سے زفیل دیتا سُنائی دے، پھر اُس وقت ایک کام ایسا کیا جائیگا جو خوفناک ہوگا۔

لیڈی میکبتھ:۔ اچھا پھر کیا کرنا ہوگا؟

میکبتھ:۔ جو کچھ اس وقت سوچا ہے جب تک وہ نہ ہوئے کوئی بات کسی پر ظاہر نہ ہو۔ بینکو کی تعریف و توصیف میں مصروف رہکر اور کوئی بات مُنہ سے نہ نکلے۔ آ، اے اندھیری رات جلد آ۔ اور اس واجب الرحم دن کی آنکھوں پر پٹی باندھ دے۔ اور اپنے خونی ہاتھوں سے جو کسی کو نظر نہ آئیں اُن مجبوریوں کو دُور کردے جنہوں نے ہزار رنگ زرد کر رکھا ہے۔ روشنی کم ہوتی جاتی ہے اور کوّے جنگل کا رُخ کرکے اپنے

آشیانوں کی طرف اُڑنے لگے ہیں۔ دن بھر کی چلتی پھرتی صورتیں کسل مند ہو کر نیند کی ماتی ہو چلی ہیں، اور رات کی سیاہ بلائیں درندوں کو شکار کے لئے جگا رہی ہیں۔ تم میری اِن باتوں کو حیرت سے سُن رہی ہو گی۔ لیکن خاموش رہو کسی سے کچھ کہنا نہیں۔ جن باتوں کی ابتدا خراب ہوتی ہے انہیں اور خرابیاں پیدا ہو کر انہیں خوب پکا اور مضبوط کر دیتی ہیں۔

تیسرا منظر:۔ محل کے قریب ایک باغ۔

تین قاتل آتے ہیں۔

پہلا قاتل:۔ تم سے کس نے ہمارا شریک بننے کو کہا ہو؟

تیسرا قاتل:۔ میکبتھ نے حکم دیا ہے۔

دوسرا قاتل:۔ ہماری اتنی بے اعتباری اُسے نہ ہونی چاہیئے تھی۔ اس کام کے لئے اُس نے ہر قسم کی ہدایت ہمیں خود کر دی تھی۔ اور بتا دیا تھا کہ کن طریقوں سے یہ کام ٹھیک طور پر انجام دیا جائے۔

پہلا قاتل:۔ اچھا اب آگئے ہو تو ساتھ رہو۔ پچھم کی طرف ابھی تک روشنی کی ایک تحریر باقی ہے۔ اور وقت ایسا ہے کہ اگر کسی مسافر کو منزل پر پہونچنے میں دیر معلوم ہوتی ہو گی تو وہ جلدی کر کے کسی سرائے میں پہونچنا چاہتا ہو گا۔ اور لو وہ چیز بھی قریب آتی جاتی ہے جس کے لئے ہم یہاں آئے ہیں۔

تیسرا قاتل:۔ سنو۔ گھوڑوں کے قدموں کی آواز آنے لگی ہے۔

بینکو:۔ (کی آواز اندر سے آتی ہے) ارے کوئی ہو ہمیں روشنی دکھاتے۔

دوسرا قاتل:۔ یہ آواز تو یقینی اُسی کی ہو۔ اور جتنے مہمان بُلائے گئے تھے وہ تو محل کے صحن میں پہونچ چکے ہیں۔

پہلا قاتل:۔ گھوڑے تو سڑک سڑک محل تک جاتے ہیں۔

تیسرا قاتل:۔ سڑک سے جانے میں تقریباً ایک میل کا پھیر پڑتا ہے۔ بینکو تو اکثر یہیں گھوڑے سے اُتر کر باقی فاصلہ پیادہ پا طے کرتا ہے۔

دوسرا قاتل:۔ روشنی، روشنی۔

تیسرا قاتل:۔ ہاں، یہی ہے، یہی ہے۔

پہلا قاتل:۔ ٹھیرو۔ کون ہے۔

(بینکو اور فلی انس ایک مشعل لئے آتے دکھائی دیتے ہیں۔)

بینکو:۔ آج رات کو مینہ آتا معلوم ہوتا ہے۔

پہلا قاتل:۔ برسنے دیجئے۔

(بینکو پر حملہ کیا جاتا ہے)

بینکو:۔ ارے دغا۔ فریب۔ پیارے فلی انس بھاگ بھاگ بھاگ۔ تجھے میرا انتقام لینا ہوگا۔ ارے غلام بے ایمان

(بینکو مر جاتا ہے۔ فلی انس فرار ہوتا ہے)

تیسرا قاتل:۔ روشنی کس نے بجھا دی؟

پہلا قاتل:۔ یہی تھا جسے بتایا گیا تھا۔

تیسرا قاتل:۔ ایک گرا ہے مگر اسکا بیٹا نکل گیا۔

دوسرا قاتل:۔ تو پھر یہ سمجھو کہ شکار کا بہتر نصف ہاتھ سے نکل گیا۔

پہلا قاتل:۔ جو کچھ بھی ہوا۔ اب یہاں سے چلو۔ اور بتاؤ کہ کتنا کام ہوا اور کتنا رہ گیا (چلے جاتے ہیں۔)

چوتھا منظر:۔ محل کا ایک بڑا کمرہ۔ ضیافت کا سامان آراستہ ہو۔ میکبتھ، لیڈی میکبتھ، راس، لینکس، دربار کے اُمرا اور خدّام موجود ہیں۔

میکبتھ:۔ آپ سب اپنے اپنے درجے اور مرتبے سے خود واقف ہیں۔ اُسی کے مطابق تشریف رکھیئے۔ آپکا قدم رنجہ فرمانا ہمارا

موجبِ مسرّت ہے۔

اُمرا:۔ بادشاہِ ذیجاہ کے ہم سب منّت گزار ہیں۔

میکبتھ:۔ ہم تو سب مِلے جُلے بیٹھکر آپکی مہربانی کریں گے اور ہماری ملکہ باضابطہ طریقے پر فریضۂ میزبانی ادا کرینگی۔ وہ ابھی آنے والی ہیں۔ ہم سب ملکر اُنکو مُبارکباد دینگے۔

لیڈی میکبتھ:۔ میری طرف سے آپ حاضرین کو مُبارکباد دیں۔ اُن کے یہاں تک تکلیف فرمانے پر تو میری زبان سے نہیں بلکہ دل سے تشکّر و امتنان ظاہر ہو رہا ہے۔

میکبتھ:۔ دیکھئے وہ بھی تہِ دل سے آپکا شُکریہ ادا کرتے ہیں۔ دونوں پلڑے برابر ہوئے۔ اس لئے میں سبکے بیچ میں بیٹھتا ہوں۔

(دروازے سے پہلا قاتل اندر آتا ہے)

سب خوش رہو۔ کاسۂ شراب کو میز کے گرد ہر مہمان کے سامنے لاؤ۔ (دروازے کے قریب آکر قاتل سے کہتا ہے) تیرے چہرے پر خُون لگا ہے۔

قاتل:۔ غالبًا بینکو کا خُون ہوگا۔

میکبتھ:۔ اُس کا خُون تیرے چہرے پر باہر اتنا اچھا معلوم ہو رہا ہے کہ اگر وہ جسکا خُون تیرے چہرے پر ہے اندر ہوتا تو اتنا اچھا نہ معلوم ہوتا۔ کہو اُسے ختم کر دیا؟

قاتل:۔ حضور ہاں گلا کاٹ دیا۔ اور اُسے یہاں تک آنے کی تکلیف سے بچا دیا۔

میکبتھ:۔ کیا بات ہے۔ تُو تو گلا کاٹنے والوں میں سب کا اُستاد ہے۔ مگر وہ بھی جس نے فلی انس کا گلا کاٹا ہوگا تجھ سے کم نہ ہوگا۔ اگر اُس کا گلا کاٹنے والا بھی تو ہی ہے تو پھر تیرے مثل دوسرا قاتل دُنیا میں نہ نکلیگا۔

قاتل:۔ حضورِ پُرنور۔ فلی انس بھاگ گیا۔

میکبتھ:۔ تو پھر مُجھ پر وہی حالت عود کر آئی جو پہلے تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں سنگِ مرمر کا ایک سالم ٹکڑا ہوتا جس میں کہیں بال تک نہ ہوتا اور چٹان کی طرح مضبوط ہوتا۔ پھر میں ایسا آزاد ہوتا جیسے ہوا جو ہمارے چاروں طرف بہتی ہے۔ اب میں ہر طرف سے بندھا جکڑا زنجیروں میں کسا ہوں۔ اب پھر طرح طرح کے شکوک اور طرح طرح کے خوف دل میں اپنا گزر کرتے رہیں گے۔ لیکن جو کچھ ہو بینکو کی طرف سے تو اب اطمینان ہو گیا۔

قاتل:۔ حضور۔ اُس کی لاش اب تک خندق میں پڑی ہے۔ اُس کے سر پر بیس زخم ہمارے خنجر کے ہیں اور وہ سب اتنے کاری ہیں کہ اگر اُس میں سے ایک بھی پہونچتا تو جان باقی رہنی ممکن نہ تھی۔

میکبتھ:۔ اِس تکلیف کا شُکریہ۔ پُرانا سانپ تو مارا گیا مگر سنپولیا نکل گیا۔ اور کیا عجب ہے کہ وقت آنے پر اِس سے اور سانپ پیدا ہوتے رہیں، گو اِس وقت اِس میں اِس کی قابلیت نہیں۔ اچھا اب جاؤ۔ کل کسی وقت کُل واقعات تفصیل سے سُنیں گے۔ (قاتل چلا جاتا ہے)

لیڈی میکبتھ:۔ بادشاہ، میرے آقا، آپ نہ خود خوش نظر آتے ہیں اور نہ مہمانوں کو خوش کرتے ہیں۔ ضیافت کے وقت میزبان کی طرف سے لُطف و مدارات، خاطر و تواضع کا نہ ہونا ایسا ہے جیسے ضیافت نہ ہوئی، قیمت دے کر لوگ کھانا کھاتے ہیں۔ ضیافت میں میزبان کی طرف سے خاطر داری اور خوش خلقی کا ظاہر ہونا لوازماتِ میزبانی سے ہے۔ ورنہ کھانا تو سب اپنے گھر بھی کھاتے ہیں۔ مگر تپاک و مدارا کھانے میں چاشنی کا کام دیتا ہے بغیر اسکے ضیافت ایک بیکار شے ہے۔

میکبتھ:۔ اے میری پیاری رفیق۔ بھول چُوک میں بات کی یاد دلانے والی بیوی۔ ہاضمہ دُرست ہو تو اشتہا بھی ہوتی ہے۔

تندرستی کیلئے دونوں ضروری ہیں۔

لینکس:- حضور تشریف رکھیں۔

(بینکو کی رُوح داخل ہوتی ہے اور میکبتھ کی
کُرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔)

میکبتھ:- آج مُلک کے تمام اکابر اور شرفاء ایک چھت کے
نیچے جمع ہیں۔ کاش اس وقت شریف بینکو بھی موجود
ہوتا۔ اُس کے نہ آنے کے دو ہی سبب ہوسکتے ہیں، ایک
یہ کہ وعدہ خلافی کی۔ دوسرے سوءِ اتفاق۔ سوءِ اتفاق
پر اتنا افسوس نہیں جس قدر کہ وعدہ خلافی کی شکایت
ہے۔

لینکس:- حضور، بینکو کی غیر حاضری اُسے وعدہ شکن
قرار دیتی ہے۔ اب حضور یہاں رونق افروز ہوکر ہمیں
شرفِ حضوری بخشیں۔

میکبتھ:- لیکن میز کے گرد تو سب مہمان بیٹھے ہیں۔ میرے
لئے جگہ کہاں ہے؟

لینکس:- حضور کے لئے یہ جگہ ہے۔

میکبتھ:- کہاں؟

لینکس:- حضور یہاں۔ وہ کیا چیز ہے جس سے حضور
کی حالت متغیّر ہوئی جاتی ہے؟

میکبتھ:- تم میں سے کس نے یہ کام کیا ہے؟

اُمراء:- کیا کام۔ حضور کا کیا مطلب ہے؟

میکبتھ:- تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے ایسا کیا ہے۔ تم
کیوں اپنے سر کی خون آلودہ لٹیں میری طرف جھٹکتے ہو؟

راس:- حاضرین اُٹھئے۔ بادشاہ سلامت کا مزاج
نادرست ہے۔

لیڈی میکبتھ:- میرے معزز مہمانو۔ بادشاہ کو اکثر اس
قسم کا دورہ اُٹھا کرتا ہے۔ بلکہ ابتدائے جوانی سے یہی
حال ہے۔ آپ سب صاحب اپنی اپنی جگہ تشریف رکھیں۔
یہ دورہ صرف تھوڑی دیر رہتا ہے۔ اگر آپ صاحبوں
میں سے کسی نے ان کی طرف زیادہ توجّہ کی تو دورہ
سخت ہوجائیگا اور انہیں سخت تکلیف پہونچے گی۔ آپ
سب کھانے میں مصروف رہیں اُنکا خیال نہ کریں۔
میکبتھ سے علیحدہ کہتی ہے) آپ بھی کیا آدمی ہیں۔

میکبتھ:- ہاں آدمی ہوں اور بڑا بہادر ہوں۔ اور اُس
چیز سے آنکھیں ملا سکتا ہوں جسے شیطان بھی دیکھکر
ڈر جائے۔

لیڈی میکبتھ:- ارے غضب۔ یہ تو خوف و وہم کی ویسی
ہی کوئی صورت ہے جیسے کہ وہ خنجر تھا جسے ہوا میں دیکھا
تھا۔ اور میکبتھ اُسے دیکھتا ہوا ڈنکن کے خواب گاہ تک
گیا تھا۔ یہ دفعتاً چونکنا، جھجکنا کسی اصلی خوف کی وجہ
سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ خوف تو اس قسم کا ہے جیسے جاڑے
کی رات میں کوئی بُڑھیا اپنی دادی نانی کی کہی ہوئی کہانی
سُنائے اور سُننے والے چونک چونک پڑیں۔ شرم شرم۔
ایسے بُرے بُرے چہرے کیوں بناتے ہو۔ سب کچھ کہنے
سُننے کے بعد بھی تم اُسی کُرسی کی طرف دیکھے جاتے ہو۔

میکبتھ:- اچھی، ذرا ادھر دیکھو، اور دیکھکر بتاؤ کہ یہ
کون ہے۔ میں تیری کب پروا کرتا ہوں۔ چاہے تو سر ہلائے
چاہے گردن۔ چاہے بات کرنی چاہے چاہے چُپ رہے۔
ہم دشمن کو قتل کرکے اُسے زمین میں دبا دیتے ہیں۔ اگر
تہ خانوں میں رکھے تابوتوں سے بھی مُردے نکل آئیں تو
پھر قبریں بیکار ہیں۔ مُردے آسمان کے نیچے رکھدیئے
جایا کریں تاکہ چیل کوّے اُنہیں نوش کریں۔

(رُوح چلی جاتی ہے)

لیڈی میکبتھ:- کیا اس حماقت نے آپکو بالکل ہی نامرد و بزدل بنادیا۔

میکبتھ:۔ جب میں یہاں کھڑا تھا تو میں نے اُسے دیکھا تھا۔

لیڈی میکبتھ:۔ دل میں شرمندہ تو ہوتے نہیں، زبان چلی جاتی ہے۔

میکبتھ:۔ اگلے وقتوں میں بھی آدمیوں کے خون ہوئے ہیں۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ جب انسان کے وضع کئے ہوئے قوانین نے دُنیا سے ظلم وستم دُور کرکے امن وسلامتی پیدا کی تھی۔ اسکے بعد بھی ایسے ایسے قتل وخون ہوئے جنکو سُنکر کان بہرے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ زمانہ وہ تھا کہ جہاں دماغ معطّل ہوا آدمی مرکر قصہ ختم کر دیتا تھا۔ لیکن اب تو یہ حال ہو کہ مرکر بھی جی اُٹھتے ہیں۔ سر میں بیس بیس زخم ہوتے ہیں جن میں سے ہر زخم مُہلک ہوتا ہو، پھر بھی وہ ہمیں ہماری کرسیوں سے اُٹھا دیتے ہیں۔ یہ قتل وخون تو کچھ عجیب طرح کے قتل وخون ہیں۔

لیڈی میکبتھ:۔ میرے آقا۔ ضیافت میں آپکے مہمان آپ کی عدم موجودگی سے سخت پریشان ہیں۔

میکبتھ:۔ خوب یاد دلایا۔ میں تو انہیں بھول ہی گیا تھا۔ میرے عزیز ولائق دوستو، میری وجہ سے آپ اتنے پریشان نہ ہوں۔ یہ عجیب مرض مجھے مدّت سے لاحق ہو گیا ہو۔ جو لوگ واقف ہیں اُن کے لئے مجھے اس حال میں دیکھنا ایک معمولی بات ہو۔ آیئے، میں اب سبکے ساتھ بیٹھکر سبکے لئے خلوص و محبّت کا جامِ شراب پیتا ہوں۔ اور یہ جام اپنے دوست بینکو کے لئے ہے جسے ہم اِس وقت یاد کرتے ہیں۔ کاش وہ یہاں ہوتا۔ سبکے لئے اور اُس کی یاد میں یہ جامِ صحت پیتا ہوں، اور کُل مہمانوں کے حق میں دُعائے خیر کرتا ہوں۔

اُمراء:۔ ہم حضور کے خُدّامِ جاں نثار ہیں۔

(بینکو کی رُوح پھر اندر آتی ہے۔)

میکبتھ:۔ دُور ہو بدبخت میری نظر سے دُور رہ۔ کاش زمین تیرا مُردہ ڈھک دیتی۔ تیری ہڈیوں میں اب گُودا نہیں۔ تیرا خُون سرد ہو چُکا ہے۔ تیری آنکھوں میں زندگی کا نُور نہیں، پھر کیوں گھُورے جاتا ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ معزز حاضرین۔ اِس حال کو معمولی چیز سمجھیئے۔ اس کے سوا کوئی دوسری بات نہیں ہو۔ اتنا ضرور ہے کہ اِس سے بزمِ لُطف ومسرت مکدر ہو جاتی ہے۔

میکبتھ:۔ انسان جس بات کی ہمّت کر سکتا ہے میں بھی ہمّت و ارادہ کر سکتا ہوں، اس میں چاہے رُوس کے جنگلوں کا کوئی خونخوار ریچھ یا گرگستان کا کوئی شیر یا کوئی اور چیز مُہیب شکل اختیار کیوں نہ کرے بلکہ وہ شکل بھی جو اِس وقت میری نظر کے سامنے ہو میرے اعصاب میں مطلق ضُعف پیدا نہیں کر سکتی۔ یا اگر تُو پھر زندہ ہوکر تلوار ہاتھ میں لئے صحرا میں کسی تنہا جگہ مجھ سے لڑنے آئے اور پھر میرے ہاتھ میں لرزہ پیدا ہو تو سمجھ لے کہ میں مرد نہیں۔ بلکہ ایک کمزور لڑکی کا دودھ پیتا بچّہ ہوں۔ لے ہیبت ناک رُوح یہاں سے چلی جا۔ اے ڈرانے والی خیالی صورت دُور ہو۔

(رُوح چلی جاتی ہے۔)

اب چلی گئی تو میں پھر آدمی کی جُون میں آ گیا۔ صاحبو! آپ خاموش بیٹھے رہیں۔

لیڈی میکبتھ:۔ آپ نے اِس وقت کا لُطف کرکرا کر دیا۔ اور اِس مُبارک مجمع کو اس طرح پراگندہ کیا کہ ایک ایک کرکے سب چلے گئے۔

میکبتھ:۔ کیا ایسی صورتیں دُنیا میں موجود ہیں جو موسمِ بہار کے ایک بادل کی طرح ہمارے سر سے گزر جائیں اور ہمیں کچھ تعجّب نہ ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ میں بڑا جری اور دلیر ہوں لیکن دیکھتا ہوں کہ ہم سبکے چہروں پر سُرخی ہو اور میری صورت پر زردی کھنڈی ہے۔

راس:- آقا کس کی صورتوں سے آپکا مطلب ہے۔
لیڈی میکبتھ:- خدا کے لئے کچھ نہ بولو۔ دیکھتے نہیں کہ بات کرنے سے اُن کی حالت اور بگڑتی ہے۔ سوال کرنے سے اور زیادہ غصہ بڑھتا ہے۔ اچھا، اب خدا حافظ۔ رخصت ہونے میں درجے اور مرتبے کا خیال نہ کیا جائے۔ بلکہ جملہ معززین بیکلخت رخصت ہوں۔
لینکس:- آداب بجا لاتا ہوں۔ خدا حضور کو صحت تندرستی بخشے اور اپنی حفظ و امان میں رکھے۔
لیڈی میکبتھ:- میں بھی سب کے لئے دعا کرتی ہوں۔
(سب چلے جاتے ہیں۔ میکبتھ اور لیڈی میکبتھ رہ جاتے ہیں۔)
میکبتھ:- وہ تو خون مانگتی ہے خون کا بدلہ خون ہی ہوا کرتا ہے۔ سنا گیا ہے کہ پتھر بھی جنبش میں آتے ہیں اور درختوں کو قوت گویائی ملی ہے۔ اور اُن آیندہ کی خبریں کہنے والے لوگوں نے جو دنیا میں اشیا کے تعلقات سے واقف ہیں بلکہ زاغ و زغن نے بھی ایسے قاتل کا پتہ بتا دیا ہے جسنے اپنے جرم کو غایت درجے پوشیدہ رکھا تھا۔ رات کا وقت ہے۔ کیا بجا ہوگا؟
لیڈی میکبتھ:- صبح ہونے کو ہے۔ مگر یہ بتانا مشکل ہے کہ ابھی رات باقی ہے یا صبح ہوگئی۔
میکبتھ:- یہ تم نے کیا کہا تھا کہ میکڈف جشن تاجپوشی میں شرکت سے انکار کرتا ہے؟
لیڈی میکبتھ:- کیا آپ نے اُسے مدعو کیا تھا؟
میکبتھ:- اتفاق سے میرے کان میں یہ بات پڑ گئی ہے۔ میں نے تو اُس کے گھر میں اپنا ایک جاسوس لگا رکھا ہے' کل میں میکڈف کو طلب کرونگا۔ اور اگر وقت ملا تو جنگل کی اُن جادوگرنیوں سے بھی ملاقات کرونگا تاکہ اُن سے کچھ اور حالات دریافت کروں۔ اب میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ بدترین ذرایع سے بدترین خبریں اپنے متعلق دریافت کرنے کی کوشش میں رہوں اور اپنے ذاتی نفع کے سامنے دوسرے کی کچھ حقیقت نہ سمجھوں۔ میں تو اس وقت خون کے دریا میں سر تک ڈوبا ہوا ہوں۔ کس طرح تیر کر دوسرے کنارے پہونچ سکتا ہوں۔ واپس جانا بھی اب اتنا ہی دشوار ہے جسقدر کہ یہاں تک پہونچنا دشوار تھا۔ میرے دماغ میں تو اس وقت عجیب عجیب خیالات سمائے ہیں اور سردست وہی کرنا پڑیگا جو بے سوچے سمجھے دل میں آئیگا۔
لیڈی میکبتھ:- اب تمہیں نیند نہیں آتی ہے افسوس اُس چیز سے تم محروم ہوگئے جو ہر ذی حیات کے لئے موجب راحت ہوتی ہے۔
میکبتھ:- اچھا آؤ چلکر سورہیں۔ میری تکلیفیں خود میری طبیعت کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اور میرا خوف وہ ہے جو پہلے جرم پر پیدا ہو کر آیندہ جرائم کے لئے دل کو سخت پتھر کر دیتا ہے۔ ابھی تو ہم جرائم میں مبتدی ہیں سمجھو۔
(سب چلے جاتے ہیں)

پانچواں منظر:- کیچڑ پانی اور جھاڑیوں والی زمین۔ گرجتے بادل میں تینوں جادوگرنیاں ہیکیٹی کے دربار میں حاضر ہوتی ہیں۔

پہلی جادوگرنی:- اے ساحروں اور بلیات کی سردار ہیکیٹی آج تو کیوں خفا معلوم ہوتی ہے؟
ہیکیٹی:- خفا ہونے کی وجہ کافی ہے۔ اری چڑیلوں تم بڑی گستاخ اور بے باک ہو چلی ہو۔ تم نے میکبتھ کے ساتھ خود ہی بات چیت کی اور موت زیست کی باتیں چیستان بنا کر اُس سے کہیں۔ اور میں جو تم سبکی سردار ہوں اور جسکا کام دنیا پر طرح طرح کی بلائیں اور آفتیں نازل کرنا ہی اُسے

خبر تک نہ کی کہ میں بھی اس کام میں شریک ہوئی۔ اور اپنے فن و مہارت کا پورا کمال دکھاتی۔ اور اس سے بھی بدتر یہ ہوا کہ جو کچھ تم نے کیا ایک ایسے شخص کے لئے کیا جو خود غرض اور مغلوب الغضب آدمی تھا اور صرف اپنا مطلب نکالنا چاہتا تھا۔ ہمارے سحر اور طلسم کی اُسے خبر نہ تھی۔ جاؤ، دُور ہو۔ اور کل صبح اکیرون کے غار کے قریب مجھ سے ملو۔ وہاں میں میکبتھ کی تقدیر کا حال معلوم کرونگی۔ سحر اور طلسم کے کُل ظروف اپنے ساتھ لانا۔ جادو اور سحر کا کُل سامان جنتر منتر یا جسقدر چیزیں ایسے موقع پر درکار ہوتی ہیں ساتھ ہوں۔ اب میں فضا میں گشت لگانے نکلتی ہوں۔ اور آج کی رات نہایت پُرہیبت اور مُہلک معاملات میں بسر کرنے والی ہوں۔ اور آج ہی دوپہر سے پہلے یہ کام کرنا ہے کہ کُرۂ ماہتاب کے کنارے بخارات کا ایک عظیم الشان قطرہ نیچے کو جُھکا دکھائی دیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ زمین پر گرنے سے پہلے اُسے لپک لُوں۔ اور پھر ان بخارات کو جادو کے زور سے مُقطّر کرکے اُن سے وہ روحیں پیدا کروں جو اپنی دہشت سے میکبتھ کو خود غارت ہونے کی طرف مائل کریں۔ پھر وہ تقدیر کو بُرا نہ کہے گا۔ موت کی اُسے پروا نہ ہوگی۔ اور اپنی توقعات ایسی چیزوں پر قائم کریگا جو عقل، مرّوت اور خوف سے بالاتر ہونگی۔ ہمیں معلوم ہے کہ انسان کا یہ کمزور خیال کہ وہ ہر طرح پر محفوظ ہے اور احتیاط غیر ضروری ہے جیسا ہلاک کرنے والا ہے دوسری چیز نہیں۔

(باجے اور ساز بجتے ہیں اور ایک گیت کے گانے کی آوازیں اندر سے آتی ہیں)

سُنو، مجھے کوئی بُلا رہا ہے۔ دیکھو وہ میری ہمزاد کُہر کے بادل پر بیٹھی میرا انتظار کرتی ہے۔

پہلی جادوگرنی:- آؤ بہنوں جلدی کریں۔ ہیکیٹی تھوڑی دیر میں پھر آتی ہوگی۔

چھٹا منظر:- فوریس۔ لینکس اور ایک امیر آتا ہے۔

لینکس:- میری گزشتہ تقریروں پر تو آپ نے غور کیا ہوگا اور اُنکا اصل مفہوم آپکے خیال میں آگیا ہوگا۔ مجھے اب صرف اتنا کہنا ہے کہ حالات کچھ عجیب و غریب شکل میں ظاہر ہونے لگے ہیں۔ بادشاہ ڈنکن کی موت پر میکبتھ کو کیا کچھ افسوس اور رنج نہ ہوا ہوگا۔ واللہ ڈنکن کیا قتل ہوا دُنیا کا بادشاہ مارا گیا۔ اور یہ بہادر بینکو پیادہ پا ہونے کی وجہ سے ضیافت میں دیر کر کے پہونچا۔ اور اگر آپ چاہیں تو فلی انس کی نسبت بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی اپنے باپ کا قاتل ہے۔ کیونکہ وہ بھی موقع قتل سے فرار ہوا ہے۔ انسان کو چلنے میں دیر نہ کرنی چاہیئے کیونکہ لوگوں کے دماغ اس خیال سے خالی نہیں رہ سکتے کہ میلکم اور دونل بہن کی یہ کس درجہ ناشائستگی تھی کہ اُنھوں نے اپنے مُعزز و مُحترم باپ کو قتل کر ڈالا۔ یہ بڑی ہی نالائقی کی حرکت تھی۔ اور آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ میکبتھ کو اس حادثہ سے کس درجہ صدمہ ہوا ہوگا۔ کیونکہ آپ جانتے ہی ہیں کہ اُن دو آدمیوں کو جو ڈنکن کے خوابگاہ میں سوتے تھے قتل کی خبر سُنتے ہی کس طرح میکبتھ نے رنج اور غصے میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ یہ دونوں آدمی شراب کے نشے اور نیند کے خُمار میں چُور تھے۔ خیال فرمائیں کہ یہ کام میکبتھ نے کیسی شرافت کا کیا۔ اور پھر اس کام میں عقل و ہوشیاری کو بھی کچھ کم ملحوظ نہ رکھا۔ کیونکہ اگر وہ دونوں آدمی سب کے سامنے اس قتل سے اِنکار کرتے تو پھر سُننے والے جو دل رکھتے تھے کیسے اس انکار پر اپنی طبیعتوں پر ضبط رکھ سکتے۔

بس مجھے یہی کہنا ہے کہ جتنے کام میکبتھ نے کئے بڑی
صفائی اور خوبی سے کئے۔ اور خیال ہوتا ہے کہ اگر آج کو
ڈنکن کے فرزند میکبتھ کی قفل کنجی میں ہوتے تو انہیں
معلوم ہوتا کہ باپ کا قتل کرنا کیا چیز ہوتا ہے۔ مگر
خُدا کو ایسا منظور نہ ہوا۔ اور فلی انس بھی ایسی ہی مصیبت
میں گرفتار ہوتا۔ لیکن ہمیں زبان نہ کھولنی چاہیئے کیونکہ
میکڈف اپنی صاف گوئی کے باعث ضیافت میں شرکت
کے انکار کی وجہ سے معتوب ہو رہا ہے۔ کچھ آپکو معلوم
ہے کہ آجکل وہ ہے کہاں؟

امیر:۔ ڈنکن کا فرزند، جسکے حقوقِ سلطنت پر اس وقت
اس ظالم کا قبضہ ہے، آجکل شاہِ انگلستان کے دربار
میں رہتا ہے۔ اور وہاں کا بادشاہ ایڈورڈ اس کی
بہت خاطر و مدارات کرتا ہے۔ تقدیر کی اِس گردش
نے ان دونوں شہزادوں کی عزت و بزرگی میں کسی
قسم کی کمی نہیں آنے دی۔ میکڈف بھی وہیں چلا گیا
ہے اور وہاں جانے کی غرض یہ ہے کہ فوراً بادشاہ
ایڈورڈ سے اِس بات کی تحریک کرے کہ وہ بادشاہ
کمبرستان اور جنگجو بادشاہ سیورڈ کی مدد سے اگر خدا
کی مدد بھی شاملِ حال رہے تو مُلک کی حالت دُرست
کرادے۔ اور پھر ہم اِس قابل ہو جائیں کہ ہمارے دسترخوان
پر کھانے کو روٹی بستر اور رات کو چین سے سونا نصیب ہو
اور جب ہمارے ہاں ضیافتیں ہوں تو آنے والے مہمان
قاتل کی چھُریوں اور خنجروں سے محفوظ رہیں اپنے بادشاہ
کے جان و دل سے مُطیع رہکر اُس سے انعام و اکرام
کے بطریقِ جائز متوقع رہیں، جس کے حاصل ہونے کی
اِس وقت حسرت سے آرزومند ہیں۔ یہی باتیں ہیں جنہوں
نے ظالم میکبتھ کی اس درجے غضبناک کر رکھا ہے کہ
وہ لڑائی کے قصد سے تیاریاں کر رہا ہے۔

لینکس:۔ کیا میکبتھ نے میکڈف کو اپنے جشنِ تاجپوشی
کے جلسے میں مدعو کیا تھا؟

امیر:۔ جی ہاں۔ مگر میکڈف نے شرکت سے صاف
انکار کر دیا اور کہدیا کہ "مجھے افسوس ہے کہ میں شریک
نہیں ہو سکتا"۔ قاصد اتنا سُنکر پلٹا اور کہنے لگا کہ
جب ایسا جواب دیکر مجھے واپس کیا جاتا ہے تو اُس کا
خمیازہ میکڈف کو اُٹھانا پڑیگا"۔

لینکس:۔ یہ بات تو ایسی ہے جس سے میکڈف ہوشیار
رہیگا۔ اور میکبتھ سے وہ اتنا ہی دُور دُور رہیگا جسقدر کہ
عقل اُسکی رہنمائی کریگی۔ اے کاش کوئی مُبارک فرشتہ
اُڑکر انگلستان پہونچتا اور اُس ملک کو ہمارے حال کی
خبر کر دیتا کہ وہ کسطرح ایک ظالم و جابر کے ظلم و تشدد
سے ہلاکت کے قریب پہونچا ہے۔ خُدا کی رحمت اُس پر جلد
سے جلد نازل ہو۔

امیر:۔ میں بھی میکڈف کے حق میں دُعا کرتا ہوں۔

(چلے جاتے ہیں)

جُزو رابع

پہلا منظر:۔ ایک تاریک غار۔ غار کے
بیچوں بیچ ایک دیگ آگ پر چڑھی جوش
کھاتی ہے۔ آسمان پر بادل گرجتا ہے۔ تینوں
جادوگرنیاں آتی ہیں۔

پہلی جادوگرنی :- چتکبری بلّی تین مرتبہ میاؤں میاؤں کر چکی ہے۔

دوسری جادوگرنی :- جھاڑی کے چوہے نے تین دفعہ دانت نکوسے ہیں۔

تیسری جادوگرنی :- دوزخ کے پرندے بھی چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ "ہاں وقت یہی ہے۔ وقت یہی ہے۔"

پہلی جادوگرنی :- آؤ آؤ۔ اُبلتی دیگ کے گرد چکر لگائیں اور زہر بھری آنتیں اُس میں ڈالدیں۔ زہریلا مینڈک جو ایک اوپر تیس دنوں اور راتوں پتھر کے نیچے زمین پر بیٹھا اپنا زہر پھیلاتا رہا ہے سب سے پہلے اُسے اس جادو کی دیگ میں ڈالکر جوش دو۔

سب جادوگرنیاں :- دوہری دوہری محنت، دوہری دوہری مشقت۔ آگ جلتی رہے، دیگ اُبلتی رہے۔

دوسری جادوگرنی :- کیچڑ دلدل کے سانپ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیگ میں جوش دو۔ بامنی کی آنکھ، مینڈک کی ران، چمگادڑ کے روئیں، کتّے کی جیب، اژدہے کی دوشاخہ زبان، چھپکلی کی ٹانگ، اُلّو کے پر دیگ میں ڈال کر اُبالو، تاکہ دوہری دوہری بلائیں نازل ہوں۔ اور دوزخ کا یہ قلیہ خوب پکے۔ اور خوب بُلبلے اُٹھیں۔

سب ملکر :- دوہری دوہری محنت دوہری دوہری مشقت، آگ جلتی رہے، دیگ اُبلتی رہے۔

تیسری جادوگرنی :- اژدہے کے فلس، بھیڑیئے کے دانت، چڑیل کا مُردہ، ہملوک کی مسموم جڑ جو اندھیری رات میں کھودی گئی ہو، بکرے کا پتّا، کفر بکنے والے یہودی کا جگر، سدا بہار درخت کی شاخیں جو چاند گرہن میں چاندی کی طرح چمکتی ہوں، تُرک کی ناک، حبشی کے ہونٹ، کسی بدکار عورت کے حرامی بچّے کی اُنگلیاں جس کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔ اور سڑک کے کنارے کسی نالی میں پیدا ہوا ہو، یہ سب دیگ میں ڈالدو تاکہ شوربا خوب گاڑھا ہو جائے۔ اور اس میں ایک شیر کی اوجھڑی اور ملاؤ تاکہ سب ضروری مصالحے دیگ میں پڑ جائیں۔

سب ملکر :- دوہری دوہری محنت، دوہری دوہری مشقت، آگ جلتی رہے، دیگ اُبلتی رہے۔

دوسری جادوگرنی :- دیگ میں جو کچھ پکا ہے اُسے بندر کے خون سے ٹھنڈا کرو۔ تو پھر ہمارا جادو پکّا اور پورا ہو۔

(ہیکیٹی جادوگرنیوں کی سردار آتی ہے)

ہیکیٹی :- میں تمہاری اس محنت و تندہی پر شاباش کہتی ہوں اور تمہاری اس تکلیف کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ اور اس محنت کی مزدوری میں ہم سب شریک رہیں گے۔ اور اب اس دیگ کے گرد سب چڑیلیں پریوں کی طرح چکر باندھ کر ناچیں اور گائیں۔ تاکہ جو کچھ تم نے دیگ میں ڈالا ہے اُس پر جادو اپنا عمل کرے۔

(ساز بجنے کے ساتھ گانے کی آواز آتی ہے
کالے کالے مُنہ والی روحیں نظر آتی ہیں وغیرہ
وغیرہ)

(ہیکیٹی چلی جاتی ہے)

دوسری جادوگرنی :- میرے ہاتھ کے انگوٹھے کھُجا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خبیث چیز اِدھر آ رہی ہے۔ دروازہ جو کھٹکھٹائے اُسپر قفل کنڈیاں فوراً کھل جائیں۔

(میکبتھ اندر آتا ہے)

میکبتھ :- اری تم کلموہی، آنکھ مچولی کھیلتی آدھی رات کی چڑیلو، کہو تمہارا کیا حال ہے اور کس کام میں مصروف ہو؟

سب ملکر :- ہمارا کام وہ ہے جسکا کوئی نام نہیں۔

میکبتھ :- جس کام میں بھی تم مصروف ہو اُس کی قسم دیکر کہتا ہوں کہ جو کچھ میں پوچھوں اُس کا جواب دو۔ اس میں چاہے تمہیں چاردانگ عالم سے ہوائیں چلا کر طوفان اُٹھا کر

گر جاؤں ہی کو کیوں نہ ڈھانا پڑے، اور چاہے سمندر پران طوفانوں سے بلا خیز موجیں اٹھا کر جتنے جہاز اُس پر چلتے ہوں اُنہیں غرق ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ چاہے کھیتوں میں اناج بھرے خوشے ٹوٹ جائیں، یا جنگل میں درخت گر جائیں! اور خواہ سر بفلک قلعوں کے اونچے اونچے دروازے اُن کے دربانوں کے سروں ہی پر کیوں نہ گر پڑیں، اور چاہے مُرتفع میناروں اور بلند اہرام کے سر جھک کر اُن کے قدموں ہی سے کیوں نہ جا لگیں۔ اور خواہ فطرت کے کُل جاندار شدّتِ بارش سے اِس طرح غارت ہی کیوں نہ ہو جائیں جیسے غارتگری کا دل بھی شرمندہ ہو۔ غرض یہ جو کچھ بھی ہو مگر جو کچھ میں پُوچھوں اُس کا جواب دو۔

پہلی جادوگرنی:۔ کہو کیا پُوچھتے ہو؟

دوسری جادوگرنی:۔ مانگو کیا مانگتے ہو۔

تیسری جادوگرنی:۔ جو کچھ پوچھوگے اُسکا جواب دیا جائیگا۔

سب کہتی ہیں:۔ جو کچھ پُوچھنا ہے پُوچھو تاکہ ہم سے یا ہماری ہمزاد روحوں کی زبان سے اپنے سوالوں کا جواب سُنو۔

میکبتھ:۔ اپنی ہمزاد روحوں کو بُلاؤ تاکہ میں اُنہیں دیکھوں۔

پہلی جادوگرنی:۔ سُورنی کا خُون دیگ میں ڈالو۔ اور سُورنی بھی وہ ہو جسنے اپنے ایک جھول کے پورے نو بچّوں کو کھایا ہو۔ اور وہ چربی آگ میں ڈالو جو خُونی مُجرم کی پھانسی میں لٹک کر جھونکے کھانے سے تختے پر جم جاتی ہے۔

سب ملکر:۔ چھوٹی بڑی ہمزاد روحو سب حاضر ہو۔

(گرج ہوتی ہے۔ پہلی صورت جو نظر آتی ہے وہ ایک چہرہ ہے جسکے سر پر خود رکھا ہے)

میکبتھ:۔ اے نامعلوم طاقت بتا......

پہلی جادوگرنی:۔ تمہارے دل میں جو کچھ ہے اُسکا حال اسے معلوم ہے۔ جو کچھ وہ کہے اُسے سُنو۔ خود کچھ نہ بولو۔

پہلی صورت:۔ میکبتھ، میکبتھ، میکبتھ، میکڈف سے ہوشیار رہ۔ فائف کے امیر سے ہوشیار رہ۔ بس میں کہہ چُکا۔ اب مجھے جانے دو۔

(وہ چہرہ غائب ہو جاتا ہے)

میکبتھ:۔ جو کچھ بھی ہو میں تیری اِس ہدایت کا ممنون ہوا۔ جس بات سے میں خود ڈرتا تھا اُسے تُونے خوب پہچانا۔ لیکن ایک بات اور بتا دے۔

پہلی جادوگرنی:۔ ہم اُسے کسی بات کا حکم نہیں دے سکتے۔ لو یہ دوسری صورت نمودار ہوئی جو پہلی سے زیادہ قوّت رکھتی ہے۔

(گرج ہوتی ہے۔ خُون میں لتھڑا ہوا ایک بچّہ نظر آتا ہے۔)

دوسری صورت:۔ میکبتھ، میکبتھ، میکبتھ،

میکبتھ:۔ اگر میرے تین کان ہوتے تو بھی میں تیری بات سُن لیتا۔

دوسری صورت:۔ اے خُونی قاتل۔ بڑی ہمت والے جوانمرد و جانباز انسان کی طاقت پر تُو حقارت کی ہنسی ہنسا کر۔ کیونکہ کوئی آدمی جو عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہے میکبتھ کو ضرر نہیں پہونچا سکتا۔

(صورت غائب ہو جاتی ہے)

میکبتھ:۔ ذرا ٹھہر۔ میکڈف جتنے دن چاہے زندہ رہے مجھے اب اُس کا کیا ڈر۔ پھر بھی میں اِس یقین کو پختہ کر لونگا۔ اور تقدیر کو اِس امر میں ضامن بنانے کے لئے کہتا ہوں کہ میکڈف کو میں زندہ نہ چھوڑونگا۔ تاکہ اِس زرد رُو خوف کی جو ہر وقت دل میں رہتا ہے تسکین کر دوں اور خواہ کتنی ہی کڑک اور گرج ہو میں آرام کی نیند سوتا رہوں۔

(گرج ہوتی ہے تیسری صورت ظاہر ہوتی ہے۔

یہ صورت ایک بچے کی ہے جس کے سر پر تاج
رکھا ہی۔ اسکے ہاتھ میں ایک درخت ہے۔)
یہ صورت کس کی ہے جو ایک بادشاہ کے فرزند کی
شکل میں نمودار ہوئی ہے اور سر پر تاج رکھے ہے۔

سب جادوگرنیاں:۔ جو کچھ وہ کہے اُسے سُنو۔ خود
کچھ نہ بولو۔

تیسری صورت:۔ شیر کی طرح دل مضبوط رکھ۔ بے پروا
اور مغرور رہ۔ کسی طرح کی فکر یا حفاظت کی ضرورت نہیں۔
خواہ کوئی کچھ کہے۔ کیسا ہی غصّہ اور طیش دلائے۔ تیرے
خلاف خواہ کیسی ہی سازشیں ہوں مگر کوئی تجھے اُس
وقت تک مغلوب نہ کرسکیگا۔ جب تک کہ برنام کا جنگل
حرکت میں آکر ڈنسی نین کی پہاڑی پر تیرے مقابلے میں نہ
آئیگا۔ (صورت غائب ہوجاتی ہے۔)

میکبتھ:۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔
ایسا کون ہے جو ایک جنگل کو نقل مکان پر مجبور کرے۔
اور جنگل کے درختوں کو حکم دے جن کی جڑیں زمین میں
مضبوط گڑی ہیں کہ تم دوسری جگہ جاؤ۔ یہ فالیں سب
نیک ہیں۔ میرے خلاف بغاوت اُس وقت تک سر نہ
اُٹھا سکے گی جب تک کہ برنام کا جنگل اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔
میکبتھ جس بلند درجے پر اس وقت ہے جب تک
طرت اُسے زندہ رکھے گی اسی درجے اور منزلت پر
قائم رہے گا۔ اور اسی حالت میں اُس وقت تک جیئے گا
جب تک کہ موت کا آنا اس کی قسمت میں لکھا ہوگا لیکن
ایک بات ایسی ہی جس پر اب تک دل دھڑکتا ہے۔ بتاؤ
اگر بتانا ممکن ہو کہ کیا بینکو کی اولاد اس مُلک میں کبھی
صاحبِ حکومت ہوگی؟

سب جادوگرنیاں:۔ بس اب زیادہ کچھ سوال نہ کرو۔

میکبتھ:۔ جب تک یہ نہ بتاوگی مجھے چین نصیب نہ ہوگا۔
اگر تم نے نہ بتایا تو خدا کا غضب تم پر نازل ہوگا۔ بس
اتنا ہی مجھے اور پوچھنا ہے۔ ارے یہ دیگ کیسی زمین
میں دھنسی جاتی ہے۔ یہ شور و غل کیسا ہے؟

(باجے بجتے ہیں)

پہلی جادوگرنی:۔ دکھادو۔

دوسری جادوگرنی:۔ دکھادو۔

تیسری جادوگرنی:۔ دکھادو۔

سب ملکر:۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرو اور
اس کے دل کو رنج پہونچاؤ۔ پرچھائیوں، آؤ اور اپنی صورت
دکھاکر چلی جاؤ۔

(آٹھ بادشاہوں کی صورتیں نظر آتی ہیں
اور آخری صورت کے ہاتھ میں ایک آئینہ
ہی۔ بینکو کی روح پیچھے پیچھے آرہی ہی۔)

میکبتھ:۔ تُو تو بینکو کی روح معلوم ہوتی ہے۔ دُور ہو۔
یہ سروں کے تاج میری آنکھوں کو جلائے ڈالتے ہیں جس
پیشانی پر تاج ہے اس کے بال پہلی صورت کی مثل ہیں۔
اور تیسری صورت پہلی صورت سے مُشابہ ہے۔ اری ناپاک
جادوگرنیوں، چڑیلوں تم نے مجھے یہ صورتیں کیوں
دکھائی ہیں۔ لو چوتھی صورت بھی نظر آنے لگی۔ آنکھوں
حلقوں سے نکل پڑو۔ کیا بادشاہوں کا یہ سلسلہ قیامت
تک جاری رہے گا۔ لو اور صورت نظر آئی۔ یہ ساتویں
ہے۔ میں اب اور زیادہ کچھ نہ دیکھونگا۔ اِس پر بھی آٹھویں
صورت اور دکھائی دینے لگی۔ اس کے ہاتھ میں آئینہ ہے
اور آئینہ میں یکے بعد دیگرے بہت سی صورتیں نظر آرہی
ہیں۔ ان میں سے بعض کو دیکھتا ہوں کہ اُن کے ہاتھ
میں دو دو گُرے اور تین تین عصاءِ سلطنت ہیں۔ یہ منظر

نہایت ہولناک ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کُل باتیں صحیح
نکلنے والی ہیں۔ کیونکہ خُون آلودہ بینکو میری طرف دیکھ
دیکھکر مُسکراتا ہے اور اشارے سے بتاتا ہے کہ گویا یہ سب
اُس کی اولاد ہیں۔ کیا واقعی یہی ہونے والا ہے؟

پہلی جادوگرنی:۔ ہاں جناب واقعی یہی ہونے والا ہے۔
لیکن میکبتھ آپ اتنے خوفزدہ کیوں کھڑے ہیں؟ بہنو
آؤ، ہم ان کا دل خوش کریں۔ اور ہم اپنی مسرت کا بہترین
سازوسامان اُنکے سامنے پیش کریں۔ میں اپنا جادو ہوا پر
چلاتی ہوں جس سے بڑی مُہیب آواز فضا میں پیدا ہوگی۔
اور تم سب ناچتی کُودتی چکر لگاتی رہو تاکہ بادشاہِ
وقت ہم پر مہربان ہوکر کہے کہ ہم سب نے اپنی خدمتیں
بڑی خیروخوبی سے ادا کیں۔ (ساز بجتے ہیں جادوگرنیاں
رقص کرتی مع ہیکیٹی کے غائب ہوجاتی ہیں)

میکبتھ:۔ ارے تم کہاں گئیں۔ کیا سب غائب ہوگئیں۔ یہ
بُرا دن تو وہ ہے جو جنتریوں میں نحس و ملعون لکھا جائے۔
ارے باہر کوئی ہے؟ اگر ہو تو اندر آئے۔

(لینکس اندر آتا ہے۔)

لینکس:۔ حضور کیا ارشاد ہے؟

میکبتھ:۔ کیا تم نے ان جادوگرنیوں کو جاتے دیکھا ہے؟

لینکس:۔ نہیں حضور، میں نے کچھ نہیں دیکھا۔

میکبتھ:۔ کیا وہ تمہارے پاس سے نہیں گزریں؟

لینکس:۔ نہیں مطلق نہیں۔

میکبتھ:۔ کاش جس ہوا میں سے وہ گزریں وہاں وبا
اپنا گزر کرے اور وبا ان سب کو غارت کردے جو اُنکی
باتوں پر یقین کریں۔ لینکس میں نے ابھی ابھی ایک گھوڑے
کے سرپٹ دوڑنے کی آواز سُنی تھی۔

لینکس:۔ حضور۔ ایک نہیں کئی آدمی خبر لائے ہیں کہ
میکڈف انگلستان بھاگ گیا ہے۔

میکبتھ:۔ کیا بھاگ کر انگلستان پہونچا ہے۔

لینکس:۔ حضور واقعہ صحیح ہے۔

میکبتھ:۔ اُس کے فرار ہونے کے قصد پر اُس وقت تک
گرفت نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ اپنے عمل سے اپنے فرار
ہونے کی غایت ثابت نہ کرے۔ اس وقت سے جو خیال پہلے
دل میں آئیگا وہی میرا پہلا کام ہوگا۔ اور اپنے قصد کو
عمل میں لانے کے لئے خیال کا آنا اور اُسپر عمل کا ہوجانا
ایک بات ہوگی۔ میں میکڈف کے قلعہ پر اچانک حملہ
کرونگا۔ اُس کی ریاست پر اپنا قبضہ جماؤنگا۔ اُس کی
بیوی بچّوں کو تلوار کی دھار سے کاٹ ڈالونگا اور اُن
سب بدنصیبوں کو بھی تہ تیغ کرونگا جو اُس کی نسل سے
ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ اسے کسی احمق کی ڈینگ نہ سمجھنا۔
جب تک انہیں غارت نہ کرلونگا دل ٹھنڈا نہ ہوگا۔

دوسرا منظر:۔ مقام فائف۔

لیڈی میکڈف اندر آتی ہے۔ اُسکا کمسن لڑکا
ساتھ ہے۔ راس بھی موجود ہے۔

لیڈی میکڈف:۔ اُس نے خطا کیا کی تھی کہ مُلک سے
بھاگنا پڑا۔

راس:۔ خاتون آپ صبر کریں۔

لیڈی میکڈف:۔ مگر میکڈف نے تو صبر نہیں کیا۔ اُسکا
بھاگنا تو ایک قسم کی دیوانگی سمجھنا چاہیئے۔ گو کسی دغا یا
فریب سے ہمارے کان آشنا نہ ہوں۔ لیکن خوف وہ بد
بلا ہے کہ بے گناہوں کو بھی دغاباز اور فریبی بنا دیتا ہے۔

راس:۔ آپکو علم نہیں کہ اُسکا فرار ہونا ایک ہوشیاری
کی بات ہے۔ خوف اُس کی وجہ نہیں۔

لیڈی میکڈف:۔ واہ یہ بھی کیا عقل کی بات تھی کہ بیوی

بچوں کو تنہا چھوڑ کر خود چلا گیا۔ اپنا سارا گھر بار وہیں چھوڑ ا جہاں سے خود فرار ہوا اُسے ہم سے محبت نہیں اُس کے دل کو وہ لگاؤ ہمارے ساتھ نہیں جو ایک قدرتی بات ہوتی ہے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹا پرندہ بھی جبکہ اُس کے آشیانے میں بچے ہوتے ہیں جب کوئی قریب آتا ہو تو وہ اُس سے لڑتا ہے۔ یہ محض خوف تھا جس کی وجہ سے وہ بھاگا ہے۔ عقل یا محبت کا اس میں شائبہ بھی نہیں۔ اسکا فرار ہونا بالکل عقل و مصلحت کے خلاف تھا۔

راس :۔میری نہایت عزیز بہن۔ اپنی طبیعت کو سنبھالے رکھو تمہارا شوہر نہایت عاقل و ہوشیار، موقع و محل کو پہچاننے والا ہے۔اِس سے زیادہ میں کچھ زبان سے نہیں نکال سکتا۔ زمانہ بُرا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ہم نے کیا کیا جو ہم باغی و سرکش سمجھے جاتے ہیں۔اِس افواہ کا ہمیں ضرور یقین ہے کہ ہماری حالت خوف و بیم کی ہو۔ ہمارا حال تو یہ ہو رہا ہے جیسے سمندر کی پُرشور اور طوفانی موجوں پر کوئی چیز اِدھر کی اُدھر ماری ماری پھرے۔اِس وقت میں تم سے رُخصت چاہتا ہوں۔چند روز کے بعد میں پھر یہاں آؤنگا۔اُس وقت تک جو بُری حالت آجکل ہے یا تو یہ نہ رہے گی یا پھر پہلا سا زمانہ امن و سلامتی کا آجائیگا۔ پیاری بہن خُدا تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے۔

لیڈی میکدف :۔ یہ بچّہ تو باپ کے ہوتے ساتے بن باپ کا ہو گیا۔

راس :۔بہن تمہاری اِن باتوں سے تو مجھے رونا چلا آتا ہے۔میں نہیں چاہتا کہ تمہارے سامنے رو کر میں اپنے کو کمزور ثابت کروں اور تمہارے دل کو بھی رنج پہونچاؤں۔لو اب میں جاتا ہوں۔

(چلا جاتا ہے)

لیڈی میکدف :۔(بیٹے سے) بیٹا تیرا باپ تو مر گیا۔ تو کیونکر جیئے گا۔

بیٹا:۔ امّاں اس طرح جیونگا جس طرح چڑیاں درختوں میں جیتی ہیں۔

لیڈی میکدف :۔کیا کیڑے مکوڑے کھا کر جیئے گا۔

بیٹا :۔ جو چڑیوں کو کھانے کو ملتا ہو وہی کھا کر جیونگا۔

لیڈی میکدف :۔خُدا کرے کہ تجھے خوف نہ کسی جال کا ہو اور نہ پھندے کا۔

بیٹا :۔ امّاں مجھے اِن چیزوں کا ڈر کیوں ہو؟ غریب چڑیوں کو کون پکڑتا ہے۔امّاں تم کہتی تو ہو کہ میرا باپ مر گیا مگر یہ بات نہیں ہے۔

لیڈی میکدف:۔ بیٹا تیرا باپ تو مرچکا۔اب تو اپنا باپ بن۔

بیٹا :۔میں اپنا باپ ہوں تو کیا آپ اپنی شوہر بنینگی؟

لیڈی میکدف :۔ بازار میں بیسیوں بکتے ہیں کہیں سے خرید لاؤنگی۔

بیٹا :۔تو پھر کیا بیچنے کو اُسے خریدیں گی؟

لیڈی میکدف :۔ بیٹا۔ تُو تو بڑی دل سے اُتار کر باتیں کرنے لگا ہے۔اتنی سمجھ تیرے لئے بہت ہو۔

بیٹا :۔کیوں امّاں۔ کیا میرا باپ، بادشاہ سے باغی ہو گیا ہو؟

لیڈی میکدف :۔ ہاں یہ بالکل سچ ہے۔

بیٹا :۔ امّاں۔ باغی کسکو کہتے ہیں؟

لیڈی میکدف :۔ بیٹا۔ جو قسم کھا کر کسی بات کا وعدہ کرے اور پھر وعدہ خلافی کرے۔

بیٹا :۔ تو کیا جتنے باغی ہوتے ہیں وہ یہی کرتے ہیں؟

لیڈی میکدف :۔ کوئی جو ایسا کرے وہ باغی گنا جاتا ہو۔ اور بغاوت کی سزا پھانسی ہوتی ہے۔

بیٹا:- تو کیا جتنے آدمی قسمیں کھا کر وعدہ کرتے ہیں اور پھر وعدہ خلافی کرتے ہیں ان سب کو پھانسی دی جاتی ہے؟
لیڈی میکڈف:- ہاں سب کو۔
بیٹا:- انہیں پھانسی کون دیتا ہے؟
لیڈی میکڈف:- وہ لوگ جو ایماندار ہوتے ہیں ۔ سچے ہوتے ہیں۔
بیٹا:- تو کیا قسمیں کھا کر وعدہ کرنے والے، اور پھر وعدہ خلافی کرنے والے سب بیوقوف ہوتے ہیں۔ کیونکہ جھوٹوں کی تو وہ کثرت ہے کہ وہ سچوں کو مار کر بیٹرا کردیں یا پھانسی پر چڑھادیں۔
لیڈی میکڈف:- بچے خدا تجھے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ باپ نہ ہوگا تو خود اپنا باپ بن کر تو کیا کریگا۔
بیٹا:- اگر وہ مرگیا ہے تو تم اُس کے لئے روئگی اور اگر نہ روئیں تو پھر میرے لئے ایک نیا باپ جلد موجود ہوجائیگا۔
لیڈی میکڈف:- ارے چھوٹی سی جان، تو کیسی باتیں کرتا ہے۔

(ایک قاصد آتا ہے)

قاصد:- معزز خاتون۔ خدا آپکو اپنی امان میں رکھے۔ آپ مجھے نہیں جانتیں مگر میں حضور کے جاہ و منصب سے واقف ہوں۔ اِس میں مطلق شبہ نہیں کہ آپکو عنقریب کوئی سخت خطرہ پیش آنے والا ہے۔ اگر آپ ایک سیدھے سادے آدمی کا مشورہ مانیں تو کوئی صورت ایسی پیدا کیجئے کہ آپ یہاں کسی کو نہ ملیں اور آپ اپنے بچوں سمیت یہاں سے چلی جائیں۔ آپ یہ تصور نہ کریں کہ محض ڈرانے کے لئے میں اپنے تئیں ایک وحشی نالائق ثابت کرنا چاہتا ہوں نہیں، جو ظلم و ستم آپ پر ٹوٹنے والا ہے وہ آپکے بہت قریب پہونچ گیا ہے۔ خدا آپکو اپنی پناہ میں رکھے۔ میں زیادہ نہیں ٹھیر سکتا۔ (چلا جاتا ہے)

لیڈی میکڈف:- بھاگ کر کہاں جاؤں۔ میں نے کبھی کو نقصان نہیں پہونچایا ہے مگر اب خیال آتا ہے کہ میں اُس خاکدانِ ہستی میں ہوں جہاں دوسروں کو نقصان پہونچانا قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے اور بھلائی کرنا بسا اوقات خطرناک ہوتا ہے۔ پھر ایک عورت کی طرح میرا اپنی حمایت میں یہ کہنا کہ میں نے کسی کو نقصان نہیں پہونچایا ہے ایک افسوسناک بات ہے۔

(قاتل اندر آتے ہیں)

یہ کون لوگ ہیں؟
پہلا قاتل:- تمہارا شوہر کہاں ہے؟
لیڈی میکڈف:- خدا سے اُمید ہے کہ وہ ایسی جگہ نہ ہوگا جہاں تم جیسے خبیث اور ناپاک آدمی اُسے پاجائیں۔
پہلا قاتل:- وہ باغی ہے۔
بیٹا:- ارے کن کٹے بدمعاش تو جھوٹ بولتا ہے۔
پہلا قاتل:- ارے تخم (اتنا کہہ کر بچے کے چھری مارتا ہے) جو ابھی دغا اور فریب کا پورا پودا بھی نہیں بنا ہے۔
بیٹا:- اماں اس نے مجھے مار ڈالا۔ (مرجاتا ہے۔)

(لیڈی میکڈف چیختی ہوئی کہ ارے مار ڈالا، خون ہوگیا، بھاگتی ہے۔ قاتل اُس کے پیچھے دوڑتے ہیں۔)

تیسرا منظر:- انگلستان۔ شاہی قصر کے سامنے میلکم اور میکڈف آتے ہیں۔

میلکم:- آؤ کہیں سایہ میں بیٹھکر خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں شاید رونے سے کچھ دل ہلکا ہوجائے۔
میکڈف:- نہیں، نہیں اپنے غارت شدہ ملک کی لاش پر بہادروں کی طرح دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہوجانا چاہیئے۔ کوئی صبح ایسی نہیں ہوتی کہ رانڈوں کی چیخیں، یتیموں کی آہ وزاری

طرح طرح کے آزار و آلام کی صدائیں زمین سے اٹھکر آسمان
پر نہ گونجتی ہوں کہ ہمارے ملک والے کسی طرح جاگیں، اور
آسمان پر بھی وہی آہ و فغاں پیدا ہو جو زمین پر ہے۔

میلکم :۔ جن باتوں کا یقین ہوتا ہے اُن پر رونا آتا ہے
کیا کیا سُنوں اور کس کس بات کا یقین کروں۔ میں تو
کسی مرض کی دوا نہیں۔ اور اگر وقت مساعد ہوا تو کچھ
نہ کچھ کرنا ہی پڑیگا۔ جو کچھ آپنے بیان کیا ممکن ہے کہ وہ
سب درست ہو۔ یہ ظالم و سفاک جس کا نام لیتے زبان
پر چھالے پڑتے ہیں، جو پہلے کبھی ایماندار اور سچا آدمی
سمجھا جاتا تھا اور جسے آپ بھی پسند کرتے تھے ابھی تک
اُس نے آپکو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ میں نوجوان ناتجربہ کار
ہوں۔ ممکن ہے اسی وجہ سے آپ فائدے میں رہیں اور
یہ بات آپکی ہوشیاری اور ذہانت پر دلیل ہوگی کہ ایک
معصوم بھیڑ کو ایک خبیث دیو پر جبکہ وہ حالتِ قہر و
غضب میں ہو آپ قربانی کر ڈالیں۔

میکڈف :۔ میں مکّار یا فریب دینے والا آدمی نہیں ہوں۔

میلکم :۔ مگر میکبتھ سے فرمان حاصل کرکے تو ایک نیک اور
اچھی طبیعت بھی بدل سکتی ہے۔ مجھے معاف فرمائیگا۔ جو
کچھ آپ واقعی ہیں میں آپکو ویسا نہیں سمجھ سکتا۔ فرشتوں
کی شکلیں بڑی نورانی اور تابندہ ہوتی ہیں۔ مگر ان میں
بھی جو بڑی چمکتی اور پاکیزہ صورتیں رکھتے تھے عرش
سے نیچے جہنّم میں گرائے گئے تھے۔ سچ ہے، ہر چیز اپنا
ظاہر اچھا دکھا کر نیکی اور معصومیت کی شکل اختیار
کر سکتی ہے۔

میکڈف :۔ افسوس، میری تمام اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔

میلکم :۔ غالباً آپکی اُمیدیں بھی وہیں غارت ہوئی ہیں جہاں
میرے شکوک خاک میں ملے پڑے ہیں۔ یہ تو فرمائیے کہ
ایسے پُرآشوب زمانے میں آپ اپنے بیوی بچّوں کو تنہا
چھوڑ کر، اور اُن پیاروں سے جو محبّت و اُلفت کی گرہ
میں بندھے تھے، بغیر ملے کیسے چلے آئے۔ آپ سے التجا ہے
کہ میرے ان شکوک کو آپ ہرگز اپنی توہین خیال نہ فرمائیں
اِن سے صرف اپنی ذاتی حفاظت منظور ہے۔ میرا خیال
جیسا کچھ بھی ہو مگر جو کچھ آپ فرماتے ہیں اسمیں کلام نہیں۔

میکڈف :۔ اے میرے مفلوک و مظلوم ملک زخمی پڑا رہ۔
اور اپنے زخموں سے خُون بہنے دے اور جو کچھ جور و جفا
تجھ پر ہو اُس کی بُنیادیں اور گہری کرے تاکہ کوئی بھلائی
تیری خرابیوں کی ترقی میں مُزاحم نہ ہو سکے۔ جسقدر ظلم و
ستم تجھ پر ٹوٹیں اُنہیں سہے جا۔ میکبتھ کا استحقاقِ
حکمرانی اور پختہ ہو گیا۔ آقا خُدا حافظ۔ بندہ رُخصت
چاہتا ہے۔ میں وہ خبیث مکّار نہیں ہوں جیسا کہ آپ
سمجھ رہے ہیں۔ تمام مُلک اُس ظالم شیطان کے پنجۂ غضب
میں ہے۔ اور اسپر طرّہ یہ ہے کہ بلادِ مشرق بھی اُسکی
مدد پر تلے ہیں۔

میلکم :۔ آپ ناراض نہ ہوں۔ جو کچھ میں نے عرض کیا وہ
آپ سے خائف یا بدگمان ہو کر نہیں کہا۔ مجھے خوب معلوم ہے
کہ اس ظالم و جفاکار کے جُوئے کے نیچے دب کر مُلک مر رہا ہے۔
اُس کے لبوں پر آہ و فغاں اور اُس کے زخموں سے
خُون جاری ہے۔ اور اُس کے اُن زخموں کو کافی نہیں سمجھا
جاتا۔ بلکہ اُن پر اور چرکے دیئے جاتے ہیں۔ یہ کُل باتیں
مجھے معلوم ہیں۔ اور ممکن ہے کہ میری حق رسانی کے
لئے کوئی ہاتھ اُٹھے۔ اِس مُلک کے لائق بادشاہ نے
مجھے کئی ہزار فوج دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن باوجود
اسکے جب میکبتھ کا سر میرے پاؤں کے نیچے ہوگا اور
میری تلوار اُسکا سر تن سے جُدا کرتی ہوگی اُس وقت بھی

ہمارے مفلس اور آفت رسیدہ ملک کو انہی آفات ومصائب کا سامنا ہوگا جو سابق میں برپا رہے ہیں۔ اُس کا بادشاہ جو کوئی بھی وہ ہوگا۔ اس کے حق میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا کرتا رہے گا۔

میکڈف:۔ وہ بادشاہ کون ہوگا؟

میلکم:۔ اگر مجھی کو سمجھئے تو میں جانتا ہوں کہ مجھ میں کیسی کیسی سخت برائیاں موجود ہیں۔ اور جب وہ کھلیں گی تو آپ میرے مقابلے سیاہ رو میکبتھ کو بھی برف سے زیادہ اُجلا اور پاکیزہ کہیں گے۔ اور میرے عیوب کے مقابلے میں اُسے ایک بے زبان مسکین کی طرح معصوم وبے گناہ سمجھنے لگیں گے۔

میکڈف:۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں شیاطین جہنم میں بھی کوئی شیطان میکبتھ سے برائیوں میں بڑھا ہوا نہ نکلے گا۔

میلکم:۔ میں جانتا ہوں کہ میکبتھ خون کا پیاسا عیش پرست، حریص، جھوٹا، مکار اور دغا باز ہے۔ مغلوب الغضب ہے، کینہ توز ہے۔ کوئی گناہ ایسا نہیں جو اُس نے نہ کیا ہو، لیکن مجھ میں ہوائے نفس اور شہوانیت اس شدت سے ہے کہ اُس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اگر بادشاہ ہونگی صورت میں کسی نے میری مرضی کے خلاف کچھ کیا تو پھر میری زیادتی اور ظلم کی کوئی حد نہ رہے گی۔ بہتر یہی ہوگا کہ ایسے شخص کی جگہ میکبتھ ہی صاحب تخت و تاج رہے۔

میکڈف:۔ جس شخص میں شہوانیت اور لذت پرستی کی شدت ہو وہ فطرت میں ایک قسم کا ظلم ہوتا ہے۔ یہ وہ بلا ہے جس کی وجہ سے بہت سے تخت نشینوں کو اپنے تخت خالی کرنے پڑے ہیں اور اکثر تاجداروں پر زوال آیا ہے۔ مگر باوجود اس کے جو چیز آپکی ہے اس کے لینے کے لئے آپ دوڑیں۔ لذائذ شہوانی سے آپ تخلیہ میں لطف اندوز ہو سکتے ہیں، یا ظاہر کر سکتے ہیں کہ ان چیزوں سے آپکی طبیعت سرد ہے، یا آپ یقین دلا سکتے ہیں کہ ان چیزوں میں آپ اعتدال پسند کرتے ہیں۔

میلکم:۔ علاوہ اس کے میری خبیث طبیعت میں حرص مال وطمع زر اس شدت سے ہے کہ اگر مجھے بادشاہی ملی تو میں اعیان ملک کو انکی زمینوں اور املاک پر دست تصرف دراز کرنے کے لئے قتل کرا دونگا۔ کسی کے مال پر نظر رہے گی، کسی کی جائداد پر، اور جسقدر زیادہ مال لوگوں کا ضبط کرونگا اتنی ہی اشتہا اس بات کی تیز ہوتی جائے گی۔ اپنے خیرخواہوں اور جاں نثاروں کے ساتھ طرح طرح کے جھگڑے اور نزاع پیدا کرکے انکی دولت ومال پر تصرف کی غرض سے اُنہیں تباہ وبرباد کرتا رہونگا۔

میکڈف:۔ جوانی کے ولولے موسم بہار کی طرح دیرپا نہیں ہوتے۔ طمع زر اور حرص دولت البتہ طبیعت میں ہمیشہ کو جڑ پکڑ لیتے ہیں۔ یہی زر و دولت کی طمع اکثر بادشاہوں کی موت کا سبب ہوئی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں ہر چیز کی وہ کثرت ہے کہ جتنا اور جیسا آپ حاصل کرنا چاہینگے آپکو ملے گا۔ آپکی طبیعت میں بادشاہی کے وہ قدرتی جوہر موجود ہیں کہ یہ کل باتیں جو آپ اپنی نسبت فرما رہے ہیں گوارا کر لی جائیں گی۔

میلکم:۔ لیکن مجھ میں بادشاہ بننے کی قابلیتیں نہیں ہیں۔ مثلاً انصاف، حق پسندی، اعتدال، مستقل مزاجی، فیاضی، ثابت قدمی، ترحم، انکسار، التفات، درگزر، صبر، ہمت، ان خوبیوں کا مجھ میں پتہ نہیں، بلکہ ہر گناہ ہر مذموم فعل

کی مختلف شاخوں کو مختلف طریقوں سے انجام دیتے ہیں میں
بڑا مشتاق ہوں - اگر کہیں میں صاحب حکومت ہوگیا تو یگانگی
و یکجہتی کی شراب شیریں کو جہنم میں پھینک کر دُنیا کا حفظ و
امن میں ایک شور بے ہنگام پیدا کر دونگا - اور دُنیا سے
موافقت و اتحاد قطعاً مفقود ہو جائیں گے -

میکدف :- اے بدنصیب وطن، بدنصیب مُلک -

میلکم :- اگر مجھ جیسا شخص جیسے کہ میں نے اپنا حال بیان
کیا ہے بادشاہی کرنے کے قابل آپکی سمجھ میں آتا ہو تو فرمایئے
کہ میں تو وہی ہوں جیسا کہ میں نے بیان کیا -

میکدف :- ایسا شخص حکومت کرنے کے قابل تو کُجا وہ
تو زندہ رہنے کے قابل بھی نہیں ہے - افسوس اے مُصیبت زدہ
قوم جس پر ایک غیر مُستحق شخص بادشاہ سابق کو قتل کر کے
مُسلّط ہو گیا ہو کیا تجھے کبھی اچھے دن دیکھنے نصیب ہونگے -
جس حالت میں کہ تخت و تاج کا صحیح وارث خود اپنی زبان سے
اپنے تئیں نالائق اور مُجرم قرار دے رہا ہو اور اپنے خاندان
اور اپنی نسل کو داغ لگا رہا ہے - آپکا باپ بادشاہوں
میں ولی تھا - اور ملکہ آپکی ماں جس کے بطن سے آپ پیدا
ہوئے ہیں کوئی دن زندگی کا ایسا نہ تھا کہ خدا کی جناب
میں سربسجود نہ رہی ہوں - گویا زندگی میں ہر آن یہی کہتی
رہیں کہ موت نزدیک ہے - اچھا خدا حافظ - جو عیب آپ نے
اپنی طبیعت کے بیان کئے ہیں وہ مجھے وطن سے بے وطن
کرتے ہیں - اور اس قلب مُضطر میں جس قدر توقعات پیدا
ہوئی تھیں وہ سب خاک میں مل جاتی ہیں -

میلکم :- تمہارے اس شریفانہ سچائی اور صفائی کے جذبے نے
میرے دل کے تمام تاریک شکوک رفع کر دیئے - اور میرے
خیالات تمہاری غیرت اور صدق طبیعت سے متفق ہو گئے -
اس زمانے میں میکبتھ نے بہت سی تدبیریں کیں کہ مجھے کسی طرح
اپنے دام میں پھنسالے - پس عقل نے ہوشیار کیا کہ کسی کی
بات کا جلد یقین نہ کروں، لیکن اب خُدا جو ہم سب کے سر پہ
ہے جو کچھ مجھ میں اور تم میں پیش آئیگا اُس کا نگراں رہیگا -
اور اب جو کچھ ہدایت کر دگے اُسپر چلنا اپنا فرض سمجھونگا -
میں نے اپنی جتنی بُرائیاں بیان کی ہیں وہ غلط تھیں اور
جو داغ دھبے میں نے اپنے چلن اور طریقے پر لگائے تھے
اُنہیں واپس لیتا ہوں - یہ جتنی باتیں میں نے اپنی نسبت
کہی تھیں وہ مجھ سے کچھ تعلق نہیں رکھتیں - نہ مجھے ابھی تک
کسی سے عشق ہوا ہے اور نہ میں نے کبھی اپنے عہد کو توڑا
ہے - جو چیز میری تھی اس کی طمع بھی میرے دل میں پیدا
نہیں ہوئی - آج تک کبھی اپنے قول سے پھرا نہیں - میں تو
ایک شیطان کو بھی دوسرے شیطان کے حوالے دھوکا
دیکر نہیں کر سکتا - اور نہ ایسے کسی کام پر خوش ہو سکتا ہوں -
پہلا جھوٹ جو آج تک کبھی بولا تھا وہ یہی اپنی نسبت تھا -
جو کچھ میں حقیقت میں ہوں وہ تمہارے اور اپنے مُصیبت زدہ
مُلک کی بہتری چاہنے کے لئے ہوں - اور اسی مُلک میں تمہارے
آنے سے کچھ پہلے سیورڈ دس ہزار فوج کے ساتھ روانہ ہونے
کو تیار ہو چکا ہے - اب ہم دونوں ساتھ چلتے ہیں اور خدا
سے اُمید رکھتے ہیں کہ ہمیں فتح بھی اسی طرح حاصل ہو جیسے
کہ ہمارا نزاع حق بجانب ہے - تم خاموش کیوں ہو؟

میکدف :- ایسی مُبارک اور نامُبارک باتوں نے ایکدم
سے پیش ہوکر مجھے حیرت زدہ کر دیا ہے - کیسے اِن مُتضاد
باتوں میں مصالحت پیدا کروں -

(ایک طبیب آتا ہے)

میلکم :- اچھا اب پھر باتیں ہونگی - طبیب کیا بادشاہ سلامت
تشریف لا رہے ہیں؟

طبیب :- جی ہاں - بہت سے سخت مریض اُنکے انتظار میں

بڑی دیر سے کھڑے ہیں۔ علاج کرنا طبیب کا کام ہوتا ہے لیکن
ہمارے بادشاہ کے ہاتھ میں خدا نے کچھ ایسی شفا دے رکھی ہے
کہ جہاں انھوں نے ہاتھ لگایا مریض فوراً تندرست ہو گیا۔
میلکم :۔ طبیب میں آپکا شکر گذار ہوا۔ (طبیب چلا جاتا ہے)
میکڈف :۔ وہ کونسا مرض ہے جسکا بادشاہ علاج کرتا ہے؟
میلکم :۔ کنٹھ مالا ایک سخت بیماری ہے۔ بادشاہ کو اسکے
علاج میں قدرت بدرجہ کمال حاصل ہے۔ جب سے میں یہاں
آیا ہوں میں نے اکثر بادشاہ کو اس بیماری سے مریضوں کو
اچھا کرتے دیکھا ہے۔ ہر مریض کے لئے پہلے خدا سے دُعا
مانگتا ہے۔ وہ خود بڑا خدا رسیدہ ہے۔ دُور دُور سے لوگ
سُوجے پھوڑے گردن کے گرد زخموں میں لدے ایسے
آتے ہیں جنہیں دیکھا تک نہیں جاتا۔ اور بڑے بڑے جرّاح
بھی جن کے علاج سے عاجز ہوتے ہیں بادشاہ کے پاس
آتے ہی اچھے ہو جاتے ہیں۔ مریض کی گردن میں وہ ایک
سونے کی مُہر لٹکا دیتا ہے اور لٹکاتے وقت خدا سے دُعا
مانگتا ہے۔ مشہور ہے کہ یہی علاج اُس نے آنے والے
بادشاہوں کو بھی بتا دیا ہے اور آئندہ کے حالات بتانے
کی قدرت بھی خدا کی طرف سے اُسے ملی تھی۔ علاوہ اس کے
اور طرح طرح کی برکتیں اور حسنات اس کے تخت کے گرد
پیش موجود رہتے تھے۔ جن سے بادشاہ کی نیکیاں
ظاہر ہوتی تھیں۔
میکڈف :۔ دیکھیے یہ کون آرہا ہے؟
میلکم :۔ آدمی تو ہمارا ہموطن معلوم ہوتا ہے مگر میں اس
سے واقف نہیں ہوں۔

(راس آتا ہے)

میکڈف :۔ میرے شریف بھائی آؤ۔ تم نیک قدم ہو۔
میلکم :۔ اچھا۔ اب میں نے انہیں پہچانا۔ خدایا وہ چیز دُور
کردے جو ہموطن کو ہموطن سے اجنبی رکھتی ہے۔
راس :۔ آمین۔
میکڈف :۔ کہو ہمارا ملک وہیں ہے جہاں تھا؟
راس :۔ افسوس صد افسوس۔ اب تو وہ بدنصیب ملک خود
اپنے تئیں پہچاننے سے ڈرتا ہے۔ اب ہم اُسے اپنی ماں نہیں
کہہ سکتے۔ اگر اپنی قبر کہیں تو زیبا ہے۔ جہاں شخص کا یہ
حال ہو کہ کچھ اپنی خبر تک نہ ہو، جہاں کوئی صورت بھی
ایسی نہیں جس کے چہرے پر ہنسی ہو، جہاں فضا میں بجز
نالہ و زاری یا درد و اذیت کی چیخوں کے دوسری آواز
نہ سُنائی دیتی ہو اور سوائے اِن چیزوں کے دوسری
چیز نہ ہو، اور اب ان کی بھی کسی کو پروا نہ رہی ہو، اور
حال یہ ہو گیا ہو کہ شدید رنج و الم میں بھی زخموں میں
راحت سبکو محسوس ہونے لگی ہو۔ مُردہ دفن ہوتے
وقت گرجا کا گھنٹہ جب بجتا ہے تو کوئی اتنا پوچھنے والا
نہیں ہوتا کہ کون مرا ہے۔ اور شریفوں کی زندگی کا خاتمہ
اُس وقت ہوتا ہے کہ اُن کی ٹوپیوں کے پھول مرنا تو کیسا
مُرجھاتے تک نہیں۔ تو پھر ایسے ملک کو اپنی قبر نہ کہیں تو
تو کیا کہیں؟
میکڈف :۔ اے عزیز، جو کچھ تم کہتے ہو سب سچ ہے۔
میلکم :۔ کوئی غمگین خبر جو حال میں پیش آئی ہو وہ کہو۔
راس :۔ حالت تو یہ ہے کہ واقعہ کے ایک گھنٹہ بعد بھی
اگر کوئی بُری خبر سُنائی جاتی ہے تو سُننے والا کہتا ہے
کہ کیسی پُرانی خبر سُناتے ہو۔ وہاں تو منٹ منٹ پر سخت
درد انگیز حادثے پیش آتے رہتے ہیں۔
میکڈف :۔ میری بیوی کیسی ہے؟
راس :۔ اچھی ہے۔
میکڈف :۔ اور میرے بچے؟

راس :- وہ بھی سب اچھے ہیں۔

میکدف :- ظالم میکبتھ نے اب تک اُنکے امن و امان کو غارت نہیں کیا ؟

راس :- جب وہاں سے چلا ہوں تو سب صحیح سلامت تھے۔

میکدف :- دیکھو صحیح بات کہتے ہوئے نہ ہچکچاؤ۔

راس :- جب میں یہاں وہ خبریں لیکر آرہا تھا جو مجھ پر گراں گزُر رہی تھیں تو اُس وقت افواہ سُنی تھی کہ بڑے بڑے لائق آدمیوں نے میکبتھ سے بغاوت کر دی ہے۔ اِس خبر کا یقین اِس وجہ سے اور ہوا کہ میں نے اس ظالم بادشاہ کی فوجوں کو بغاوت کو مٹانے کے لئے کوُچ کرتے دیکھا۔ میلکم، اب وقت مدد کرنے کا ہے۔ آپ کی ایک نگاہ میں ہزاروں سپاہ جمع ہو جائے گی۔ عورتیں تک آجکل کی مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے سپاہی بن کر لڑنے کو تیار ہو جائینگی۔

میلکم :- ہم آپکے چین و آرام کیلئے وہیں جا رہے ہیں۔ مہربان بادشاہِ انگلستان نے ہمیں سیورڈ اور دس ہزار فوج مُستعار دی ہے۔ سیورڈ سے زیادہ پُرانا اور اعلیٰ درجے کا سپاہی عیسوی دُنیا میں نہیں ہے۔

راس :- کاش ایسا ہوتا کہ میں اِس اچھی خبر کے بدلے میں کوئی خوشخبری سُناتا۔ مگر جو وحشتناک خبریں سُنانے لایا ہوں وہ تو ایسی ہے کہ کسی صحرائے لق و دق میں اُس کا سُنانا بہتر ہوتا کسی انسان کے کان تک وہ نہ پہونچے۔

میکدف :- کیا وہ خبر کسی مُلکی معاملے سے متعلق ہے یا کسی شخصِ خاص کے دردو الم سے ہے ؟

راس :- ہمارے مُلک میں تو کوئی نیک شخص ایسا نہیں جسے کوئی نہ کوئی تکلیف، کوئی نہ کوئی آزار نہ پہونچا ہو۔

میکدف :- اگر وہ خبر مجھ سے متعلق ہے تو مجھ سے چھپاؤ نہیں۔ فوراً کہو کہ وہ کیا ہے۔

راس :- میری زبان سے اپنے کانوں کو مُتنفر نہ کرو جو کچھ میں کہونگا وہ ایسی دردانگیز آواز ہوگی جو تمہارے کانوں نے کبھی نہ سُنی ہوگی۔

میکدف :- اچھا میں سمجھ گیا۔

راس :- تمہارے محل پر اچانک حملہ کیا گیا اور بڑی بے رحمی سے تمہارے بیوی بچّوں کو قتل کر دیا گیا۔ جس طریقے سے انہیں ہلاک کیا گیا اور جس طرح ان معصوم غزالوں کو ذبح کیا اُس کا بیان کرنا تمہاری موت کا بُلانا ہے۔

میلکم :- خُدا ہم پر رحم کرے۔ میکدف کیوں اپنی ٹوپی کھینچکر آنکھوں پر لاتے ہو ؟ رنج میں چُپ نہ رہو۔ مُنہ سے بولو، کیونکہ بات نہ کرنے سے رنج اندر ہی اندر دل سے کہتا ہے کہ ٹوٹ جا۔

میکدف :- کیا میرے بچے بھی قتل کر دیئے گئے ؟

راس :- ہاں، بیوی بچے، نوکر چاکر، جو کوئی بھی ملا اُسے زندہ نہیں چھوڑا۔

میکدف :- افسوس میں وہاں نہ تھا۔ میری بیوی بھی قتل کر دی گئی ؟

راس :- ہاں۔

میلکم :- میکدف صبر کرو۔ ہمیں انتقام کی تدبیریں سوچنے دو تاکہ تسکین اور اس درد کا کوئی درماں ہو۔

میکدف :- میکبتھ بچے نہیں رکھتا۔ کیا میرے سب بچے مار ڈالے گئے۔ تم نے یہی تو کہا تھا کہ وہ سب قتل ہو گئے۔ اے جہنم کے گِدھ، تو نے سبکو ایک ہی جھپٹے میں ختم کر دیا۔ میرے پیارے بچوں اور اُنکی ماں کو بھی۔

میلکم :- میکدف مرد بن کر بات کرو۔

میکڈف:- بہتر ہے۔ مگر ایک مرد ہی کی طرح میں اس دردناک خبر سے متاثر بھی رہونگا۔ اس وقت تو یہی یاد آرہا ہے کہ مجھے عزیز تر دوسری کوئی چیز نہ رکھتا تھا۔ کیا خدا یہ سب کچھ دیکھتا رہا پھر بھی انکی جان نہ بچائی۔ اے گنہگار میکڈف ان کی ہلاکت کا باعث تو ہوا۔ ان کا کچھ قصور نہ تھا۔ جو کچھ قصور تھا وہ میرا تھا۔ خدا ان پر اپنی رحمت کرے۔

میلکم:- اس رنج فرسا خبر کو اپنی تلوار کیلئے سان رکھنے کا پتھر بناؤ۔ اور اپنے اس رنج کو غصے اور قہر میں تبدیل کرو۔ اس غم کو سوچ سوچ کر دل میں جذب نہ ہونے دو۔

میکڈف:- نہیں، عورتوں کی طرح میں بھی اس صدمے پر آنکھوں سے آنسو بہا سکتا ہوں اور اپنی زبان سے بہت کچھ نوحہ کر سکتا ہوں۔ پر اے خدائے رحیم و کریم اس انتظار کے وقت کو کم کر دے۔ اور اس ظالم شیطان سے مجھے دوچار کر کے اسے میری تلوار کی زد میں لے آ۔ اگر میرے ہاتھ سے وہ بچ جائے تو پھر خدا اس کے گناہ بھی معاف کر دے۔

میلکم:- ہاں، یہ بات تم نے مردانگی کی کہی۔ آؤ بادشاہ کے پاس چلیں۔ فوجیں کوچ کرنے کو تیار ہیں۔ صرف بادشاہ سے رخصت ہونا باقی ہے۔ میکبتھ کی حالت اب یہ ہے کہ ہم اسے ہلا کر زیر و زبر کر دیں۔ آسمان پر فرشتے بھی ہمارے لئے ہتیار باندھ رہے ہیں۔ میکڈف ہمت نہ ہارو۔ لمبی راتیں بھی جب نور کا تڑکا ہوتا ہے تو انسان کے غمزدہ دل کو خوش کر دیتی ہیں۔

❋ ❋ ❋ ❋ ❋ ❋ ❋ ❋ ❋ ❋ ❋

جزوِ خامس

پہلا منظر:- ڈنسی نین۔ محل میں عقب کا ایک کمرہ۔ ایک طبیب اور اسکے ہمراہ ایک شریف زادی خواص آتی ہے۔

طبیب:- میں نے دو رات برابر آپکے ساتھ جاگ کر مریضہ کی کیفیت دیکھی ہے۔ مگر آپ نے جو حالت بیان کی تھی وہ صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ فرمایئے کہ آپ نے مریضہ کو آخری مرتبہ کب چلتے پھرتے دیکھا تھا؟

شریف زادی:- اس زمانے میں جبکہ بادشاہ سلامت میدان جنگ کو تشریف لے گئے تھے۔ جو کچھ دیکھا وہ یہ تھا کہ ملکہ سلامت اپنی پلنگڑی پر سے اٹھی ہیں۔ شب خوابی کی عبا جلد گلے میں ڈال الماری کے پاس پہونچتی ہیں۔ الماری کھول کر انہوں سے کاغذ نکالا، کاغذ کو موڑ کر اس پر کچھ لکھا۔ پھر پڑھا۔ پھر اسے بند کر کے لفافے پر مہر لگائی۔ اور جب یہ سب کچھ ہولیا تو پھر فوراً اپنی پلنگڑی پر جا لیٹیں۔ مگر اس کل زمانے میں وہ غافل سو رہی تھیں۔

طبیب:- مگر یہ حالت تو قلب میں سخت اختلال و اضطراب کی ہوگی کہ حالتِ خواب میں جو راحت میسر ہوتی ہے وہ بھی نصیب ہے اور عالمِ بیداری کے کام کاج بھی جاری ہیں۔ کیا آپ نے اس حالتِ خواب میں علاوہ چلنے پھرنے کام کاج کرنے کے کچھ باتیں کرتے بھی سنا تھا؟

شریف زادی:- جناب والا جو کچھ کہتے انہیں سنا وہ ملکہ سلامت کی عدم موجودگی میں کسی کے سامنے نہیں کہہ سکتی۔

طبیب:- لیکن آپ مجھے تو بتا سکتی ہیں۔ اور مناسب بھی یہی ہے کہ آپ مجھ سے جو کچھ سنا ہو وہ کہدیں۔

شریف زادی:- وہ باتیں نہ میں آپکو اور نہ کسی اور سے کہہ سکتی ہوں۔ کیونکہ جو کچھ میں کہونگی اُسپر گواہی یا شہادت دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ لیجئے وہ ملکہ سلامت خود تشریف لا رہی ہیں۔

(لیڈی میکبتھ ہاتھ میں شمع لئے آتی ہے)

بس یہی وضع جو اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں ہمیشہ رہتی ہے۔ مگر وہ غافل سو رہی ہیں۔ اُدھر چھُپ کر کھڑے ہوجایئے اور غور سے دیکھتے رہیئے۔

طبیب:- یہ جلتی ہوئی شمع انہیں کیسے مل گئی۔

شریف زادی:- روشنی ہر وقت پاس رکھی جاتی ہے۔ یہی حکم ہے۔

طبیب:- دیکھئے تو آنکھیں کھلی ہیں۔

شریف زادی:- یہ بالکل درست ہے۔ لیکن وہ دیکھتی کچھ نہیں۔

طبیب:- یہ اس وقت کیا کر رہی ہیں۔ دیکھئے تو اپنے ہاتھوں کو کس طرح بار بار ملتی ہیں۔

شریف زادی:- یہ تو کچھ عادت سی ہوگئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ دھو رہی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ پاؤ پاؤ گھنٹے تک برابر یہی کرتی رہتی ہیں۔

لیڈی میکبتھ:- ابھی یہ داغ موجود ہے۔

طبیب:- سنو کچھ کہہ رہی ہیں۔ بہتر ہے کہ وہ جو کچھ کہیں اُسے لکھ لوں۔ تاکہ آیندہ حافظے کو اس سے پوری مدد ملے۔

لیڈی میکبتھ:- ارے کمبخت داغ تو چھوٹتا کیوں نہیں مٹ جا۔ دُور ہو۔ ایک، دو۔ اب تو اُس بات کا وقت آگیا۔ دوزخ، تجھ سے تو دم گھُٹا جاتا ہے۔ آقا، شرم و غیرت کیا ہوئی؟ سپاہی ہوکر ڈرتے ہو۔ ڈرنے کا کیا موقع ہے۔ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ کس نے کیا جبکہ کوئی ہمارے اختیارات پر معترض نہیں ہوسکتا۔ یہ کون کہہ سکتا تھا کہ اس بڈھے میں اتنا خون ہوگا۔

طبیب:- سنتی ہو کیا فرما رہی ہیں۔

لیڈی میکبتھ:- امیر فالف کی ایک بیوی بھی تو تھی۔ وہ کہاں گئی۔ ارے کیا ہاتھوں کے یہ داغ دھبے کبھی نہ چھُوٹینگے؟ جانے دیجئے آقا۔ ایسا خیال نہ کیجئے۔ آپکے اس طرح یہ چونک چونک پڑنے ہی نے تو یہ ساری خرابی پیدا کی ہے۔

طبیب:- جاؤ بھی۔ تمہیں تو وہ سب حال معلوم ہے جو معلوم نہ ہونا چاہیئے تھا۔ مجھے تو ان کُل باتوں کا یقین ہے۔ لیکن جو علم اُسے ہے وہ خُدا ہی کو معلوم ہے۔

لیڈی میکبتھ:- سونگھو تو۔ اِن داغوں میں سے تو خون کی بُو ابھی تک آ رہی ہے اور ایسی سخت ہے کہ عرب کے تمام عطریات بھی اُسے خوشبو نہیں بنا سکتے۔ ہائے ہائے۔

طبیب:- دیکھو تو اس آہ میں کیسا درد ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دل پر کوئی بڑا بوجھ ہے۔

شریف زادی:- میں تو کبھی ایسا دل سینے میں رکھنا پسند نہ کرونگی جس سے جان، عزت و حُرمت سب ہی کو آزار پہونچے۔

طبیب:- ہاں ہاں، بالکل دُرست کہتی ہو۔

شریف زادی:- خُدا ہی ہے کہ یہ مرض دُور ہو۔

طبیب:- اِس مرض کا علاج میرے قابو کی بات نہیں۔ ایسے مریض میں نے دیکھے ہیں جو حالت خواب میں چلتے پھرتے تھے۔ مگر جب موت آئی تو اپنے بستر پر سکون اور خاموشی کی حالت میں مرے۔

لیڈی میکبتھ:۔ ہاتھ دھولو۔ شب خوابی کی عبا پہنو۔ اتنے زرد نہ معلوم ہو۔ پھر یہی کہتی ہوں کہ بینکو دفن ہو چکا ہے۔ وہ قبر سے باہر نہیں نکل سکتا۔

طبیب:۔ ظاہر ہے۔

لیڈی میکبتھ:۔ چلو سو رہیں۔ دروازہ کون کھٹ کھٹا رہا ہے؟ آؤ آؤ۔ ہاتھ میں ہاتھ دو۔ جو کچھ ہوا وہ اَن ہوا نہیں ہو سکتا۔ چلو سو رہیں۔ سو رہیں۔ (چلی جاتی ہے)

طبیب:۔ کیا یہ اب اپنے خوابگاہ میں جا کر سو رہینگی؟

شریف زادی:۔ ہاں فوراً۔

طبیب:۔ باہر بڑی بڑی سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ طرح طرح کی افواہیں اُڑ رہی ہیں۔ انسان جب اپنی فطرت کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کے بعد بھی وہ خرابیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں جو فطرت کے خلاف ہوتی ہیں۔ طبیعتیں جو گناہوں میں آلودہ ہو چکی ہیں وہ اپنے دل کا پوشیدہ حال اُن بے جان اور بہرے تکیوں سے بھی کہتی ہیں جو سر کے نیچے ہوتے ہیں۔ ملکہ سلامت کو طبیب کی اتنی ضرورت نہیں ہے جس قدر کہ کسی روحانی ہادی و مُصلح کی وہ محتاج معلوم ہوتی ہیں۔ اے خدا۔ تو ہم سب کے گناہوں کو معاف کر۔ ملکہ کی خبر رکھو۔ اسکی تکلیفوں کو دُور کرنے کی کوشش میں رہو۔ اور برابر اُس پر نظر رکھو۔ اچھا شب بخیر۔ میں جاتا ہوں۔ ملکہ کا حال دیکھکر میرا دل ایسا پریشان اور میری نظر ایسی حیرت زدہ ہوئی کہ خیال سب کچھ کر سکتا ہوں مگر زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

شریف زادی:۔ اے نیک طبیب میرا سلام بھی قبول ہو۔

(چلی جاتی ہے)

دوسرا منظر:۔ ڈنسی نین کے قریب ایک موقع۔

منٹیتھ، کا ئیتھ نس، اینگس، لینکس، اور سپاہی دکھائی دیتے ہیں۔ طبل و علم نظر آتے ہیں۔

منٹیتھ:۔ انگریزی فوجیں قریب آگئی ہیں اور وہ سب میلکم اور اُس کے نانا سیورڈ اور میکڈف کی سرکردگی میں ہیں۔ اور ان سب کے دلوں میں آتش انتقام مشتعل ہے اور انتقام کی وجہ بھی ذاتی ہے۔ بس کشت و خون اس کثرت سے ہوگا کہ جو مر گئے ہیں وہ بھی لڑنے اور خون کرنے کو جی اُٹھیں گے۔

کا ئیتھ نس:۔ کیا خبر ہے کہ ڈونل بین بھی اپنے بھائی کے ساتھ آیا ہو۔

لینکس:۔ ڈونل بین یقینی اپنے بھائی میلکم کے ساتھ نہیں ہے۔ اُس کے کُل ہمراہیوں کی فہرست میرے پاس موجود ہے۔ اس میں سیورڈ کا فرزند اور بہت سے لڑکے ہیں جنکے مُنہ پر ڈاڑھیاں تک نہیں نکلی ہیں، بالکل نوجوان ہیں۔ لڑائی کے شوق میں ساتھ ہو گئے ہیں۔

منٹیتھ:۔ کہو میکبتھ کس حال میں ہے؟

کا ئیتھ نس:۔ ڈنسی نین کا قلعہ اُس نے خوب مضبوط کر لیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ اور جنہیں اُس سے کم نفرت ہے اُن کا قول ہے کہ اُسکی کُل حرکتیں محض غیظ و غضب کا ایک جوش و ولولہ ہیں۔ اور اس کا بھی اُنہیں یقین ہے کہ اُس کی اِس عداوت و مخاصمت کی کوئی وجہ بھی ایسی معقول نہیں ہے کہ اُس کے ساتھی اُس کا ساتھ دینے میں کسی قاعدے یا ضابطے سے مجبور ہوں۔

اینگس:۔ یہ تو فرمایئے کہ خُفیہ قتل و خُون کے جو داغ اُسکے ہاتھوں پر لگے ہیں اُن سے بھی وہ کچھ مُتاثر ہے یا نہیں۔ اسکے خلاف جو بغاوتیں ہو رہی ہیں اُنہی سے ظاہر ہے کہ

اُس کی عہد شکنی پر سب اُسے مطعون کر رہے ہیں جن پر وہ حکم چلاتا ہے وہ دل سے نہیں بلکہ محض اس وجہ سے کہ حکم ہے پابند ہوتے ہیں۔ اب تو بادشاہی کرنا اُسے ایسا ہی ناز یبا و بدنما ہے جیسے ایک قوی ہیکل دیو کی پوشاک ایک پستہ قد سارق کے جسم پر ڈھیلی ڈھالی اور بدنما معلوم ہو۔

منٹیتھ:۔ اُسے الزام دینا مشکل ہے۔ جو کچھ قصور رہے وہ اس کے جنون و وحشت زدہ حواس کا ہے جو اُس سے دیوانگی کی حرکتیں سرزد کراتے ہیں، اور اس کے ذمہ دار اُس کے وہی گناہ ہیں جن کا خیال بار بار دل میں آکر اُسے ستاتا ہے۔

کاینتھ نس:۔ اچھا۔ اب ہم اُس کی اطاعت ترک کرتے ہیں اور اُس شخص کے مطیع ہو کر آگے بڑھتے ہیں، جو فی الحقیقت ہماری اطاعت گزاری کا مستحق ہے اور اپنے بیمار اور نیم جاں ملک اور وطن کی دوا کرتے ہیں۔ اور اُسے تندرست کرنے کے لئے اس دوا میں اپنے خون کا ایک ایک قطرہ ملانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

لینکس:۔ ایک ایک قطرہ ہی نہیں بلکہ جس قدر خون اس درماں کے لئے درکار ہو سب بہانے کو تیار ہیں۔ تاکہ اس گلشن شاہی کے پھول کو طراوت پہونچے اور اس سے خس و خاشاک دور ہوں۔ بس اب ہم برنام کی طرف کوچ کرتے ہیں۔

دوسرا منظر:۔ قلعہ ڈنسی نین میں قصر کا ایک کمرہ۔ میکبتھ، طبیب اور ملازمین آتے ہیں۔

میکبتھ:۔ بس اب کوئی خبر ہمارے پاس نہ لائی جائے۔ ان بدخواہوں کو بھاگ کر دشمن سے ملجانے دو۔ مجھے کوئی وجہ خوف اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ برنام کا جنگل ڈنسی نین تک نہ پہونچ جائے۔ کیا یہ لڑکا میلکم عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا؟ چند روحوں نے جن پر انسان کے کل حالات روشن ہوتے ہیں مجھ سے کہا ہے کہ "میکبتھ ڈر نہیں، کوئی شخص جو عورت کے بطن سے پیدا ہوا ہے تجھے گزند نہیں پہونچا سکتا"۔ بس اے میرے دغاباز سردارو امیرو، تم جب چاہے بھاگ کر میرے دشمنوں یعنی ان لب یار خوار انگریزوں سے جا ملو۔ میری طبیعت جو مجھ پر قابو رکھتی ہے اور جو دل سینے میں رکھتا ہوں اُس میں شک یا خوف کی کبھی گنجائش نہ ہو گی۔

(ایک نوکر آتا ہے)

شیطان تجھے اُلٹے قدم یہاں سے پلٹا دے۔ اے زرد رو احمق، یہ اُلو کی سی صورت تو نے کیوں بنائی ہے؟

نوکر:۔ دس ہزار سپاہ آ رہی ہے۔

میکبتھ:۔ اے بے وقوف سپاہ نہ ہو گی۔ چیختی چلاتی بطخیں ہونگی۔

نوکر:۔ نہیں حضور، سپاہی ہیں۔

میکبتھ:۔ بدبخت جا کر اپنے چہرے کو زخمی کر کے اس سے خون نکال تاکہ زردی کی جگہ سُرخی پیدا ہو۔ اے بزدل احمق بکتا کیا ہے؟ سپاہی کیسے، خوف سے تجھ پر تو وہ زردی کھنڈی ہے کہ تو مر کیوں نہیں جاتا۔ اے خوفزدہ نامراد بکتا کیا ہے۔ سپاہی کیسے۔ کیسے سپاہی؟

نوکر:۔ حضور، انگریزی فوجیں آن پہونچی ہیں۔

میکبتھ:۔ دور ہو خبیث۔ (نوکر چلا جاتا ہے)

اے علمدار سیٹن تو سنتا ہے۔ یہ معرکہ جو پیش آنے والا ہے یا تو مجھے کرسی حکومت پر مستقل یا تخت سے معزول کر دیگا۔ بہت دن جی لیا۔ اب تو بہار زندگی ختم ہو کر خزاں آ چلی ہے۔ ہرے پتے زرد ہو چلے ہیں جو چیزیں عالم ضعیفی میں ساتھ ہونی چاہیئے تھیں مثلاً عزت، محبت،

دوسروں کی اطاعت، دوستوں اور ہوا خواہوں کے گروہ،
اب ان کا متوقع ہونا عبث ہے۔ ان کی جگہ لعنت و ملامت،
وہ بھی بلند آواز سے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں پیدا
ہے۔ محض ظاہری طور پر لوگوں سے عزت کے جملے اپنی
نسبت سنتا ہوں مگر وہ سب اس لئے ہوتے ہیں کہ
اگر ہمت ہو تو ان کی نفی کر کے غریبوں کا دل خوش
کر دیا جائے۔ ارے سیٹن سنتا ہے؟

(سیٹن اندر آتا ہے)

سیٹن:- حضور کیا حکم ہے؟

میکبتھ:- کہو کچھ اور خبر آئی؟

سیٹن:- جو خبریں اب تک سننے میں آئی ہیں وہ سب
درست ہیں۔

میکبتھ:- تو پھر میں لڑونگا۔ اور لڑونگا بھی اس وقت تک
کہ ہڈیوں پر سے گوشت قیمہ بنا کر کھرچ لیا جائے۔ زرہ بکتر
مجھے دو۔

سیٹن:- حضور۔ ابھی اسکی ضرورت نہیں۔

میکبتھ:- نہیں نہیں۔ ہتھیار زرہ بکتر ابھی لگانا چاہتا
ہوں۔ کچھ سوار ادھر ادھر دشمن کا کھوج لگانے دوڑاؤ۔
جن کی زبان پر خوف کی کوئی علامت ہو انہیں فوراً
پھانسی چڑھا دو۔ میرے ہتھیار زرہ بکتر مجھے دو۔
اے طبیب مریضہ کا کیا حال ہے؟

طبیب:- حضور مرض اتنا سخت نہیں ہے جس قدر کہ خیالات
پریشان کر رہے ہیں۔ اور یہی وجہ نیند نہ آنے کی ہے۔

میکبتھ:- پھر اس کا علاج کر کے مریضہ کو تندرست کر دو۔
کیا کسی بیمار دماغ و طبیعت کا علاج نہیں کر سکتے؟ اگر
کسی رنج نے طبیعت میں گھر کر لیا ہے تو حافظے سے اسکا
تنقیہ کر دو۔ دماغ میں جو تکلیفیں اور اذیتیں نقش ہو چکی
ہیں انہیں مٹا دو۔ مفرح دواؤں سے خفیہ طور پر اسکے
قلب کو صاف کر دو جس میں خطرناک اور فاسد مواد نے
جمع ہو کر دل پر ایک بوجھ پیدا کر دیا ہے۔

طبیب:- حضور یہ مرض تو ایسا ہے کہ خود مریض اپنا
علاج کر سکتا ہے۔

میکبتھ:- پھر تو آپ اپنی دوا دارو، علاج معالجے سبکو
کتوں کے سامنے ڈالدیں۔ میں کچھ علاج نہیں چاہتا۔ سیٹن
ادھر آ۔ مجھے زرہ بکتر پہنا۔ اور میرا نیزہ مجھے دے۔ باہر
کی خبر رکھ۔ طبیب تم سنتے ہو؟ ملک کے تمام امیروں اور
سرداروں نے مجھ سے سرکشی اختیار کی ہے۔ ملکہ کے
مرض کی تشخیص اچھی طرح کرو۔ اور بیماری دفع کر کے پھر اسے
توانا و تندرست کر دو۔ پھر تمہاری تعریفوں میں میری
آواز آسمان تک گونجیگی۔ اور جب آواز وہاں سے پلٹیگی
تو بھی تمہاری تعریف اس سے پیدا ہو گی۔ مرض کو کسی طرح
دور کر دو۔ راوند دوا، سنا دو، غرض جو دوا مرض کو
مٹا دے وہی دو۔ کاش یہ انگریز جلد یہاں سے چلے
جاتے۔ تم نے بھی کچھ ان کا حال سنا ہے؟

طبیب:- حضور کی تیاریاں دیکھکر کچھ معلوم تو ہوا ہے۔

میکبتھ:- ہاں یہیں سب چیزیں لے آؤ۔ میں غارتگری یا
موت سے ڈرتا نہیں ہوں۔ جب تک مجھے کچھ خوف نہیں ہے
کہ برنام کا جنگل ڈنسی نین تک نہ آ جائے۔

(سب چلے جاتے ہیں صرف طبیب رہجاتا ہے)

طبیب:- کاش اس قلعہ سے میں صحیح سلامت نکل جاتا۔ اب
کسی قسم کے فائدے کا خیال مجھے یہاں نہ لائے گا۔

(چلا جاتا ہے۔)

چوتھا منظر:- ڈنسی نین کے قریب ایک
میدان۔ سامنے جنگل کھڑا ہے میلکم بڈھا سیورڈ

اور اُس کا فرزند، میکڈف، منٹیتھ، کاتھنس
اینگس، لینکس، راس، اور بہت سے سپاہی
آتے ہیں، طبل و عَلم کے ساتھ کُوچ کرتے نظر آتے ہیں۔

میلکم:۔ دوستو، عزیزو۔ وہ دن قریب آرہا ہے کہ لوگوں کے گھروں میں امن و عافیت کا دور دورہ ہو۔

منٹیتھ:۔ اِس میں اب کیا شک و شبہ ہو سکتا ہے۔

سیورڈ:۔ اِس جنگل کا کیا نام ہے؟

منٹیتھ:۔ اِسے برنام کا جنگل کہتے ہیں۔

میلکم:۔ ہر سپاہی درخت کی ایک ایک شاخ توڑ کر ہاتھ میں لے لے۔ اس سے لشکر کی پوری تعداد دشمن کو نہ معلوم ہو سکیگی۔ اور اگر اس کا کچھ اندازہ بیان بھی کیا جائیگا تو اس میں غلطی ہوگی۔

سپاہی:۔ حضور، ہم یہی کرتے ہیں۔

سیورڈ:۔ جہاں تک خبر ملی ہے یہی ہے کہ ظالم میکبتھ جسے اپنے اُوپر بہت کچھ بھروسا ہے ابھی تک قلعہ ڈنسی نین میں ہے اور وہ اس کے لئے تیار ہے کہ ہم قلعہ کا محاصرہ کرلیں۔ محصور ہوکر وہ ہمارا مقابلہ کریگا۔

میلکم:۔ اس کی تمام اُمیدوں کا حصر اسی پر ہے۔ کیونکہ جب کبھی کوئی اچھا موقع اس کے فائدے کا آیا اس کے ساتھیوں نے اُس سے بغاوت کی۔ اور کوئی شخص بھی اس کے ساتھ اس وقت ایسا نہیں ہے جسے قطعاً مجبور ہوکر اُسکا ساتھ نہ دینا پڑا ہو۔ اور ان کے دل بھی اس سے پھر رہے ہیں۔

میکڈف:۔ اپنی شکایتوں کو بدستور قائم رکھکر لڑائی کا فیصلہ کرنا چاہیئے اور بڑے جفاکش بہادر آزمودہ کار سپاہیوں کی طرح کام کرنا چاہیئے۔

سیورڈ:۔ لڑائی کے تصفیہ کا وقت قریب آرہا ہے۔ اُس وقت ہم کہیں گے کہ کہاں تک ہمیں فتح ہوئی اور کس حد تک شکست ہوئی۔ قیاسات تو محض ایسی توقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو مشتبہ ہوتے ہیں۔ تلوار کے ہاتھ البتہ کہیں کہیں بتا دینگے کہ اس لڑائی کی اصلی و حقیقی وجہ کیا ہے۔

(سب مارچ کرتے چلے جاتے ہیں)

پانچواں منظر:۔ قلعہ ڈنسی نین میں میکبتھ۔
سیٹن اور سپاہی طبل و جھنڈے لئے آتے ہیں۔

میکبتھ:۔ باہر والی فصیل پر ہمارے جھنڈے اور پھریرے نصب کرو۔ غل یہی ہے کہ وہ آرہے ہیں۔ لیکن ہمارے اس قلعہ کے بُرج اور فصیلیں ایسی مستحکم و مضبوط ہیں کہ دشمن کے اس محاصرے پر وہ خندہ زن رہینگی۔ قلعہ کے گرد دُشمن کی فوجیں پڑی رہیں حتیٰ کہ فاقے اور وبائیں اُن کا کام تمام کردیں۔ دُشمن کی طاقت تو اُنہی لوگوں سے بڑھائی ہے جو کبھی ہمارا دم بھرتے تھے۔ ورنہ ہم دشمن سے کھلے میدان تیغ آزمائی کرتے۔ اور اُنہیں مار بھگا دیتے۔

(اندر سے ایک عورت کے چیخنے کی آواز آتی ہے)

سیٹن یہ آواز کیسی ہے؟

سیٹن:۔ حضور عورتوں کے رونے کی آواز ہے۔

(باہر جاتا ہے)

میکبتھ:۔ مجھے تو اب خوف و بیم کا حس تک نہیں رہا۔ ایک زمانہ تھا کہ اگر رات کے وقت کسی کے چیخنے کی آواز سنتا تھا تو ازسرتا قدم لرز جاتا تھا۔ اور جب کوئی خوف اور ہیبت کا قصہ سنتا تھا تو بدن کے تمام روئیں اس طرح کھڑے ہوجاتے تھے کہ گویا اُن میں جان ہے لیکن اب تو خونی خیالات کے ساتھ خوف و خطر کی اتنی چیزیں مجھ میں بھر گئی ہیں کہ کسی بات پر بھی نہیں چونکتا۔

(سیٹن پھر اندر آتا ہے)

کہو وہ کس کی چیخ تھی ؟

سیٹن :- حضور! ملکہ سلامت گذر گئیں۔

میکبتھ :- ایک نہ ایک دن تو موت آنی ہی تھی۔ امروز کے بعد فردا، پھر فردا اور فردا، اور اسی طرح دن پر دن گذرتے چلے جائینگے حتیٰ کہ موت کا مقررہ وقت آ پہونچیگا۔ اور جو دن گذر لئے ہیں وہ ہر احمق کو قبر کی خاک اور تاریکی تک پہونچانے کے لئے روشنی دکھا رہے تھے۔ بجھ، بجھ۔ اے زندگی کی مختصر شمع گل ہو جا۔ یہ زندگی تو ایک چلتی پھرتی پرچھائیں ہے۔ اس تماشا گاہ میں ایک تماشاگر کی طرح غم و غصہ کھا کر ایسی غائب ہوتی ہے کہ پھر نظر نہیں آتی۔ یہ زندگی تو کسی بے وقوف کی کہی ہوئی کہانی ہے جس میں بہت کچھ شور و شغب، رنج و غم ہے مگر حاصل کچھ نہیں۔

(ایک قاصد اندر آتا ہے)

قاصد تو کچھ کہنے آیا ہے۔ بس جو کچھ کہنا ہے جلدی کہدے۔

قاصد :- حضور۔ مجھے صرف وہی کہنا ہے جو کچھ کہ میں نے دیکھا ہے۔

میکبتھ :- جو کچھ بھی ہو، منہ سے تو پھوٹ۔

قاصد :- حضور! میں پہاڑی پر کھڑا پہرا دے رہا تھا۔ برنام کی طرف میری نظر تھی کہ یکایک میں نے اس جنگل کو حرکت کرتے دیکھا۔

میکبتھ :- جھوٹے، کاذب، غلام، کیا بکتا ہے ؟

قاصد :- حضور کا عتاب میرے سر آنکھوں پر، مگر واقعہ یہی ہے جو عرض کیا۔ تین ۳ میل سے حضور دیکھ سکتے کہ برنام کا جنگل اس طرف جنبش میں ہے۔ سارا جنگل چلتے درختوں کا ایک جھنڈ سا معلوم ہو رہا ہے۔

میکبتھ :- اگر تو جھوٹا نکلا تو پاس سے پاس درخت پر تجھے زندہ لٹکا دونگا تاکہ فاقوں سے سوکھکر تیرا دم نکل جائے۔ اور اگر تو سچا ہے تو پھر اگر تو میرے ساتھ ایسا ہی کرے گا تو بھی مطلق پروا نہ ہوگی۔ اب تو ہمت ٹوٹ سی چلی ہے۔ اُن جادوگرنیوں نے کہا تھا کہ جب تک برنام کا جنگل دلنسی نین تک نہ آئے موت سے نہ ڈر۔ اُس وقت ان کے کہنے کا یقین آگیا تھا مگر اب تو اس میں شبہ معلوم ہوتا ہے۔ برنام کا جنگل تو اب دلنسی نین کی طرف آ رہا ہے۔ ہتیار لگاؤ۔ ہتیار لگاؤ۔ یہاں سے چلو۔ اگر یہ قاصد جو کچھ کہتا ہے وہ سچ ہے تو پھر یہاں سے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ اب تو میں اپنی زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ یہ کل کائنات درہم برہم ہو جاتے اور میں بھی اُسی میں دب کر مروں۔ فوراً گجر بجاؤ۔ طوفانوں اٹھو۔ غارتگری تو اپنا کمال دکھا۔ کم سے کم ہم ہتیار باندھے تو مریں۔ (سب چلے جاتے ہیں)

چھٹا منظر :- دلنسی نین۔ طبل و علم لئے آدمی قلعہ کے سامنے آتے ہیں۔ میلکم، سیورڈ۔ میکدف وغیرہ وغیرہ نظر آتے ہیں۔ ان کا لشکر ساتھ ہی۔ ہر سپاہی کے ہاتھ میں درخت کی ایک ایک شاخ ہے۔

میلکم :- اب ہم کافی طور پر قلعہ کے پاس آگئے ہیں۔ سپاہیو۔ اپنے ہاتھوں کا بوجھ پھینک کر دشمن پر اپنی پوری تعداد ظاہر کر دو۔ سیورڈ مع اپنے بہادر اور شریف فرزند کے پہلا حملہ شروع کرتا ہے۔ باقی جو کچھ ہونے والا ہے اُسے ہم اور میکدف اپنے اپنے درجے کے مطابق دیکھ لینگے۔

سیورڈ :- اچھا خدا حافظ۔ آج شب کو ہم اس ظالم کی قوت کا اندازہ کر کے اس سے تیغ آزمائی کرتے ہیں۔ اگر کچھ نہ

کر سکے تو پھر شکست میں کلام نہیں۔

میکڈف:- جس قدر نفیر ساتھ ہیں ایکدم پھونکے جائیں۔ اور یہی چیزیں خون اور موت کی پیش خیمہ ہوتی ہیں۔

(چلے جاتے ہیں۔)

ساتواں منظر:- میدانِ جنگ کا ایک موقع۔

گجر بج رہے ہیں۔ میکبتھ آتا ہے۔

میکبتھ:- مجھے تو دشمنوں نے گویا ایک ستون سے باندھ دیا ہے۔ کہیں بھاگ نہیں سکتا۔ بہر کیف ایک خرس وحشی کی طرح مجھے تو لڑنا ہے، وہ کون ہے جو عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا؟ سوائے ایسے شخص کے مجھے کسی دوسرے کا خوف نہیں۔

سیورڈ:- تمہارا کیا نام ہے؟

میکبتھ:- سنکر ڈر جاؤ گے۔

سیورڈ کا فرزند:- نہیں نام بتاؤ۔ ہمیں پروا نہیں چاہے وہ جلتی ہوئی چیزوں میں دوزخ ہی سے تپتا ہوا کیوں نہ نکلا ہو۔

میکبتھ:- سنو۔ میرا نام میکبتھ ہے۔

سیورڈ کا فرزند:- اس سے زیادہ قابلِ نفریں نام تو شیطان کی زبان پر بھی نہیں آسکتا۔

میکبتھ:- یہ کیوں نہیں کہتے کہ اس سے زیادہ ہیبت ناک نام تو شیطان بھی نہ لے سکتا تھا۔

سیورڈ کا فرزند:- اے خونی ظالم تو جھوٹا ہے اور آ اس تلوار سے تیرا جھوٹ کھوئے دیتا ہوں۔

(دونوں لڑتے ہیں اور سیورڈ کا فرزند مارا جاتا ہے)

میکبتھ:- عورت کا جنا تھا نا۔ میں تو اُن لوگوں کی تلواروں پر ہنستا اور اُن لوگوں کو نظرِ تحقیر سے دیکھتا ہوں جو عورت کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ (چلا جاتا ہے۔)

(گجر بجتے ہیں۔ میکڈف آتا ہے۔)

میکڈف:- غل اُدھر ہو رہا تھا۔ اے جہنمی ظالم، سامنے آکر اپنی صورت دکھا۔ اگر تو مارا گیا مگر میری تلوار سے قتل نہ ہوا تو میرے بیوی بچوں کا خون بھوت بن کر مجھے لپٹیگا۔ میں غریب اُجرت لیکر لڑنے والوں کو نہیں مارنا چاہتا۔ میکبتھ یا تو تو میرے مقابل آ۔ ورنہ میں اپنی تلوار بغیر اُس کی دھار کو کُند کئے نیام میں رکھے لیتا ہوں۔ جہاں اس وقت شور ہو رہا ہے وہیں وہ ملے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑا بہادر مارا گیا ہے۔ مجھے تو میکبتھ کی تلاش ہے۔ بس تقدیر۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتا۔

(چلے جاتے ہیں۔ گجر بج رہے ہیں۔)

(میلکم اور بڈھا سیورڈ آتا ہے۔)

سیورڈ:- میلکم، آپ اِدھر آئیں۔ قلعہ آہستہ آہستہ فتح ہو رہا ہے۔ میکبتھ کے آدمی دونوں طرف سے لڑتے ہیں۔ کچھ ہماری طرف ہوگئے ہیں اور کچھ اُس کی طرف ہیں۔ شریف والیانِ ملک بڑی جوانمردی سے دادِ شجاعت دے رہے ہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ آج کا دن ہماری فتح کا ہے۔ اور اب کچھ زیادہ کام باقی نہیں ہے۔

میلکم:- لڑائی میں فریقِ مخالف کے لوگ بھی ہمارا ساتھ دیکر لڑائی میں مصروف ہیں۔

سیورڈ:- آپ قلعہ میں داخل ہوں۔

(چلے جاتے ہیں۔ گجر بجتے ہیں۔)

آٹھواں منظر:- میدانِ جنگ کا دوسرا حصّہ۔

میکبتھ آتا ہے۔

میکبتھ:- میں خود کیوں ایک رومانی بے وقوف کی طرح تلوار مار کر خودکشی کروں۔ جب تک کہ آدمی میری تلوار سے

قتل ہونے کیلئے موجود ہوں۔

(میکدف آتا ہے۔)

میکدف:۔ اے دوزخ کے خونی کتے۔ سامنے آ۔ سامنے۔

میکبتھ:۔ میں تجھ سے ہمیشہ بچتا رہا ہوں۔ لیکن اب تو بھی آ۔ سامنے آ۔ میرے سر پر تیرے بیوی بچوں کا خون سوار ہے۔

میکدف:۔ میں منہ سے بولنا نہیں چاہتا۔ اس وقت تلوار میری زبان ہے۔ اے خونی خبیث، زبان کا یارا نہیں کہ تجھے کوئی نام دے سکے۔ (دونوں لڑتے ہیں۔)

میکبتھ:۔ بے فائدہ محنت کرتا ہے۔ مجھ پر تلوار چلا کر زخمی کرنے کا قصد ایسا ہی بے سود ہے جیسے ہوا کو تلوار سے زخمی کرنا۔ تلوار اُن پر چلا جو مغلوب ہو سکیں۔ میری جان تو ایک طلسم نے محفوظ کر رکھی ہے۔ اور کوئی اسے نہیں لے سکتا بجز اُس کے جو عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا ہو۔

میکدف:۔ لعنت ہو تجھ پر۔ اپنی جان اور اس کے طلسم کی طرف سے مایوس ہو جا۔ شیطان جس کا تو ہمیشہ سے تابع رہا ہے وہی تجھے بتائیگا کہ میکدف عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا بلکہ شگاف دیکر رحمِ مادر سے قبل از وقت دُنیا میں لایا گیا تھا۔

میکبتھ:۔ لعنت ہو اُس زبان پر جس نے مجھے یہ بتایا تھا۔ کیونکہ اب میری ساری جوانمردی اور دلیری، بزدلی میں منتقل ہوئی جاتی ہے۔ ان شعبدہ باز چڑیلوں کا اب کوئی یقین نہ کرے جو ایک ہی بات کو دو دو مطلبوں سے کہتی ہیں۔ اور جب ان کے پورا ہونے کا وقت آتا ہے تو ان وعدوں کو وہ توڑ دیتی ہیں۔ میکدف اب میں تجھ سے نہیں لڑوں گا۔

میکدف:۔ تو پھر اے نامراد بزدل ہار مان اور دُنیا کی نظروں میں ایک عجیب تماشا بنکر زندہ رہ۔ اور ہم تجھے ایک پنجرے میں بند کرکے اس طرح رکھیں گے جس طرح ایک وحشی درندے کو رکھا جاتا ہے اور پنجرے پر ایک رنگین تختی لگا کر اُس پر لکھیں گے کہ "جسے ایک ظالم و سفاک خونی کو دیکھنا ہو وہ اسے دیکھئے"۔

میکبتھ:۔ میں ہار ہرگز نہ مانونگا۔ اس لئے زندہ نہ رہونگا کہ میلکم کے قدم چوما کروں، اور اس کے ہواخواہوں کے منہ سے لعنت ملامت سنا کروں۔ چاہے برنام کا جنگل ڈنسی نین ہی تک کیوں نہ آجائے اور تو جو عورت کے بطن سے نہیں ہے میرے مقابل ہو مگر میں تلوار سے آخری آزمائش کرونگا۔ لے میں اپنی سپر سے اپنے تئیں ڈھکے لیتا ہوں۔ میکدف اب تلوار چلا۔ اور لعنت ہو اُس پر جو کہے کہ "بس کر"۔

(لڑتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ گجر بجتے ہیں۔)

(بھاگڑ، باجوں کی آواز، طبل و علم کے ساتھ میلکم، بڈھا سیورڈ، راس، لینکس، اینگس، کاتھنس اور بہت سے سپاہی آتے ہیں۔)

میلکم:۔ خدا سے چاہتا ہوں کہ جو دوست اس وقت نظر نہیں آتے وہ زندہ سلامت یہاں تک آجائیں۔

سیورڈ:۔ بعض ان میں ضرور کام آئے ہونگے پھر بھی معلوم ہو رہا ہے کہ فتح ہمکو بہت کم نقصان کے ساتھ نصیب ہوگئی ہے۔

میلکم:۔ میکدف اور آپکا فرزند نظر نہیں آتا۔

راس:۔ سیورڈ آپکے فرزند نے سپاہی کا قرضہ ادا کردیا۔ (یعنی وہ کام آگیا) اور آخری دم تک بڑی جوانمردی سے لڑتا رہا۔

سیورڈ:۔ تو کیا وہ لڑائی میں مارا گیا؟

راس:۔ حضور، ہاں۔ اس کی لاش ہم لڑائی کے میدان سے

یادِ ایّامِ عشرتِ فانی

میری کالج کی زندگی

یہ دلّی ہے۔ یہ دلّی کا ریڈیو اسٹیشن ہے۔ اور یہ دہلی کا پُرانا رہنے والا فرحت اللہ بیگ ہے۔ بہت دنوں کے بعد دہلی آیا ہوں۔ خداوندانِ ریڈیو نے اپنی عنایت سے مجھے آپ کو مخاطب کرنے کا موقعہ دیا۔ مگر غضب یہ کیا کہ تقریر کے لئے صرف پندرہ ہی منٹ دیئے۔ اس لئے میرے مضمون کے حق میں رمضان کی عید گویا بقر عید ہوگئی۔ آخر یہ سوجھی کہ سری پائے الگ کرکے صرف دھڑ کا کچھ حصّہ ملاحظہ میں گذران دوں۔ مضمون ایسا لیتا ہوں کہ جس سے مجھے دلچسپی ہے۔ اور مرتے دم تک رہیگی۔ اور اُس زمانہ کے واقعات بیان کرتا ہوں جب دہلی ہماری تھی اور ہم دہلی کے تھے۔

یہ کچھ انسانی فطرت ہے کہ ہر شخص اپنے زمانۂ طالبعلمی کو اچھا سمجھتا ہے۔ میں بھی اسی فطرتِ انسانی سے مجبور ہوں۔ اور آپ مانیں یا نہ مانیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ کالج کی زندگی کا جو مزا ہمارے زمانہ میں تھا۔ وہ اب نہیں رہا۔ پڑھائی، لکھائی پہلے بھی ہوتی تھی۔ اور اب بھی ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے ایک جماعت میں گنتی کے چند طالبعلم ہوتے تھے۔ اور اب پڑھنے والوں کی زیادتی مدرسہ اور کالج کے بڑے بڑے کمروں کو سُکیڑ کر چھوٹا کر دیتی ہے۔ پہلے مدرسہ اور کالج میں اتنے طالبعلم ہوتے تھے کہ اُستاد اور پروفیسر نہ صرف ان کی ترقی تعلیم کو دیکھ سکتے تھے بلکہ انکے ساتھ میل جول رکھ کر ان کے عادات واطوار کو بھی درست کر سکتے تھے۔ اور اب؟ اب طالبعلم اور اُستاد ایسے سیّارے ہوگئے ہیں کہ انکا ایک دوسرے کے پاس سے گزرنا ہی مشکل ہے اور خدانخواستہ پاس سے گزر بھی جائیں تو انکے ٹکرا جانے کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے۔

میں نے مشن کالج دہلی میں تعلیم پائی ہے۔ پہلے اس کالج کے پرنسپل مسٹر رائٹ تھے۔ مگر خدا معلوم یہ کیا بات ہے کہ باوجود بے انتہا شریف اور ہمدرد شخص ہونے کے دہلی والے ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر اُنھوں نے اس کالج اور خاصکر کالج کے فیلڈ کے لئے جو کچھ کیا وہ مشن کالج کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ان کا انتقال کچھ ایک دفعہ ہی ہوگیا اور ان کی جگہ مسٹر ہیبرٹ ویر پرنسپل ہوئے۔ اور مسٹر ڈے انگریزی کے پروفیسر ہوکر ولایت سے آئے۔ اگر کسی کو دیکھنا ہو کہ ہم ہندوستانی محبّت کے کتنے بھوکے ہیں تو وہ مسٹر ڈے کے حالات دیکھے۔ راستے کے بچے جنہوں نے شاید انکی شکل بھی پوری طرح نہ دیکھی ہوگی۔ ان کے نام کو اس طرح جوشِ دلی سے لیتے تھے گویا مسٹر ڈے اُن کے بڑے پُرانے دوست ہیں۔ جو انگریز ان دہلی کے بچّوں کے سامنے سے گزرا اور مسٹر ڈے ہوگیا۔ ان کو پڑھانے میں کوئی خاص مہارت نہ تھی۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ان کی محبّت اور ان کا برتاؤ لڑکوں کو خود شوق سے پڑھنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور اس کا وہ نتیجہ ہوتا تھا کہ شاید اچھے سے اچھا پروفیسر بھی وہ نتیجہ پیدا نہ کر سکے۔ حضرات۔ محبّت کی مار بڑی سخت مار ہوتی ہے۔ جو کام محبّت سے نکل سکتا ہے وہ سر مغزی سے نہیں نکل سکتا۔

مسٹر ڈے میں دوسری خاص قوت تقریر کی تھی۔ وہ اپنے زور بیان سے اپنے دلی منشا کو دلوں میں اُتار دیتے تھے۔ ان کو اپنی اس قوت پر ناز بھی تھا۔ اور کہا کرتے تھے کہ میں (Orator) ہوں (Speaker) نہیں ہوں۔ اور کیوں نہ ہوں آخر میں آئرلینڈ کا رہنے والا ہوں۔

مسٹر ڈے کی تیسری خصوصیت اُن کا شوقِ تعلیم جسمانی تھا۔ وہ کیمبرج کے مشہور کھلاڑی تھے۔ کرکٹ، فٹ بال، کشتی رانی غرض بہت کھیلوں میں انعام پا چکے تھے۔ وہ ہم کو بھی اپنا ہی جیسا بنانا چاہتے تھے۔ کوئی کھیل نہ ہو گا جس میں وہ شریک نہ ہوتے ہوں۔ ان کے جوش کا یہ حال تھا کہ ریل میں کالج کی ٹیم کہیں میچ کھیلنے جا رہی ہے۔ کسی بڑے اسٹیشن پر گاڑی ٹھیری۔ وہ فٹ بال لیکر اُترے اور پلیٹ فارم ہی پر کھیل شروع کر دیا۔ مسافر ہیں کہ کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ نئے مسافروں کو گاڑی تک جانے کی جگہ نہیں ملتی۔ سودا بیچنے والے پریشان ہیں۔ گارڈ سٹیوں پر سیٹیاں بجا رہا ہے۔ لیکن یہاں برابر دنادن ہو رہی ہے۔ کالج کے کمروں میں مسٹر ڈے ضرور پروفیسر بنے رہتے تھے۔ اور بڑا رعب داب دکھاتے تھے۔ مگر فیلڈ میں آتے اور اس طرح رل مل گئے گویا وہ بھی ایک طالبعلم ہیں۔ وہ کپتان کی اتنی عزت کرتے تھے کہ کوئی لڑکا کبھی کیا کرے گا۔

ہمارے کالج کے پرنسپل مسٹر ہیبرٹ ویبر تھے۔ یقین مانیئے کہ ان سے سب کا دم نکلتا تھا۔ وہ زبان سے نہیں پڑھاتے تھے آنکھوں سے پڑھاتے تھے۔ آپ سمجھے کہ آنکھوں سے پڑھانے کا کیا مطلب ہے۔ حضرات۔ وہ حضرت مسمریزم جانتے تھے آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ خدا کی پناہ۔ جہاں کسی دن کوئی تیار ہو کر نہیں آیا اور اُنھوں نے ذرا گھورا۔ بس سمجھ لیجئے اس لڑکے کا تو خاتمہ بالخیر ہو گیا۔ اس کے بعد مجال نہ تھی کہ وہ صاحب آیندہ تیار ہوئے بغیر کمرہ میں قدم رکھیں۔

ہے یہ۔ کہ عام طور پر انسان کا وزن دو۔ پونے دو من ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ لمبان اور چوڑان کے لحاظ سے اس وزن کی تقسیم انسانی جسم میں مختلف طریقہ سے ہو جاتی ہے۔ بعض چوڑے ہوتے ہیں تو لمبان کم ہو جاتی ہے۔ اور بعض لمبے ہوتے ہیں تو چوڑان گھٹ جاتی ہے۔ چونکہ مسٹر ہیبرٹ ویبر کی چوڑان کچھ تھی ہی نہیں۔ اس لئے اندازہ کر لیجئے ان کی لمبان کیا ہو گی۔ تمام دُنیا میں پیدل پھر آئے تھے۔ اور ہے بھی یہ۔ کہ اتنی لمبی ٹانگیں ہونے پر دُنیا کا چکر کاٹنا کیا بڑی بات ہے۔ ایک دفعہ اُن کی تیز رفتاری سے ہم بھی مار کھا چکے ہیں۔ ہوا یہ۔ کہ ہماری فال سٹاف سوسائٹی (Zenana Owen) ہوئی۔ قرار پایا تغلق آباد چلو۔ سوسائٹی کے سارے ممبر ایک دن پہلے ہی چلدیئے۔ رہ گئے کون کہ میں اور مسٹر غلام یزدانی (یہ وہی حضرت ہیں جو حیدر آباد کے ناظم آثار قدیمہ ہیں۔ اور اپنے فن کے ماہر مانے جاتے ہیں) وہاں۔ ہم دونوں میں ٹھیری کہ رات کے تین بجے نکل چلو۔ صبح ہوتے ہوتے قطب پہنچ جائیں گے۔ وہاں ناشتہ کریں گے۔ وہاں سے نکل کر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹہ میں تغلق آباد پہنچ جانا کیا بڑی بات ہے۔ جاڑوں کے دن تھے۔ سردی اس بلا کی پڑ رہی تھی کہ خدا کی پناہ مگر ہم اُس زمانہ میں دہلی والے تھے۔ اس سردی کو بھلا کب خاطر میں لاتے۔ دلّی سے نکلے اور رات کے تین ہی بجے نکلے۔ موٹے موٹے اوور کوٹ پہنے۔ کانوں سے گلوبند لپیٹے۔ کوٹ کی جیبوں میں چبینا بھرا۔ اور چل میرے بھیا قطب کو۔ شہر میں تو کچھ ایسی سردی معلوم نہیں ہوئی۔ مگر اجمیری دروازے سے نکل کر مزا آ گیا۔ کان تو خیر چھپے ہوئے تھے۔ پہاڑ گنج سے نکلتے نکلتے ناک غائب ہو گئی۔ وہاں سے ذرا سرپٹ بھاگے۔ اور خُدا خُدا کر کے منصور کے مقبرے

ع گئے مقبرے کے سامنے گاڑیبان گاڑیاں کھولے الاؤ جلائے مزے سے بیٹھے حقّے اُڑا رہے تھے۔ ہم دونوں بھی اِنہی میں دھنس
ہ ان لوگوں کے اصرار سے حقّے کے دو چار دم لگائے۔ جب کہیں جاکر ذرا سردی دبی۔ ابھی آدھا راستہ باقی تھا۔ اور صبح
ونے ہونے قطب پہنچنا تھا۔ اس لئے پھر اُٹھے اور جیبنا اُڑاتے آگے بڑھے۔ کچھ کچھ صبح ہو رہی تھی، کہ قطب کی لاٹ کے
س پہنچ گئے۔ یہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھی ابھی آرام خاص میں ہیں۔ طبیعت گرمائی ہوئی تھی۔ صلاح ہوئی کہ بڑھے
و اور سب سے پہلے تغلق آباد پہنچ جاؤ۔ یہ خیال آنا تھا کہ اسپر عمل ہونے لگا۔ کوئی سات ساڑھے سات بجے ہوں گے
۔ ہم دونوں نے یہ مہم بھی سر کر لی۔ نو بجے کے قریب ہمارے سب ساتھی بھی آ گئے۔ سہ پہر تک سب تغلق کی قبر پر اُودھم
یاتے رہے۔ کوئی چار بجے ہوں گے کہ مسٹر ہیبرٹ ویر نے کہا کہ مجھے آج ۶ بجے ایک ضروری کام ہے۔ میں تو جاتا ہوں۔
وئی میرے ساتھ چل سکتا ہے۔ اِس فقرہ میں لفظ "سکتا" بہت طعن کا لفظ تھا۔ ہم دونوں کیا دبنے والے تھے۔ ساتھ چلنے
رتیار ہو گئے۔ اُس اللہ کے بندہ نے قلعہ سے نکلتے ہی جو لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کئے تو میرا اور میاں غلام یزدانی
فشار ہو گیا۔ ہم دونوں بھاگتے تھے مگر وہ حضرت ہم سے دو چار قدم آگے ہی رہتے تھے۔ پسینہ ناک سے ٹپکنے لگا۔ ہاتھ
وں جواب دے گئے۔ آخر بھاگتے دوڑتے، اُچھلتے کودتے کالکاجی تک آ ہی گئے۔ یہاں صاحب نے فرمایا "میں جاتا ہوں۔ تمہاری
وجہ سے میری منزل کھوٹی ہوئی ہے۔ اب تک تو میں دہلی کے قریب پہنچ چکا ہوتا"۔ ہم نے کہا "بسم اللہ کیجئے۔ اب ہم میں
چلنے کا دم نہیں ہے"۔ وہ تو یہ کہہ روانہ ہوئے، اور ہم نے کنوئیں کے پاس آکر او ور کوٹ اُتارے۔ پانی پیا۔ ذرا دم لیا۔
جب کہیں جاکر اوسان درست ہوئے۔

ہمارے فارسی کے پروفیسر مولوی شاہجہاں تھے۔ بڑے اچھے آدمی تھے۔ فارسی بہت اچھی تھی۔ پڑھاتے بہت اچھی
طرح تھے۔ لیکن تھے "دہلی والے" جانتے تھے کہ ان لوگوں کو ذرا شہ دی اور یہ ہتّے سے گئے۔ محبّت کرتے تھے اور سبکو اپنے
ہی بچّوں کی طرح سمجھتے تھے۔ مگر کسی کو حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتے تھے۔ اُس زمانے میں شیشے پر پھول پتے بنانے کا
شوق مجھے ہوا۔ شیشے پر میں نے ایک تصویر بنائی تھی۔ وہ ان کو بہت پسند آئی۔ کہنے لگے "فرحت ہم کو بھی کوئی چیز بناکر
لادے۔ تیری یادگار رہے گی۔ مگر بھئی تصویر نہ بنانا۔ کوئی شعر لکھدینا"۔ دوسرے یا تیسرے دن میں ایک گلاس بناکر
لے گیا۔ اُسپر حافظ کا یہ شعر لکھا تھا ؎

مئے دوسالہ و معشوق چاردہ سالہ　　٭　　ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

مولوی صاحب نے گلاس دیکھا۔ بہت پسند کیا۔ اس کے بعد جو شعر پڑھا۔ تو بس بگڑ ہی تو گئے۔ کہنے لگے "واہ میاں
صاحبزادے اپنے دادا کے برابر اُستاد کی اچھی قدر کی ہے۔ میرے لئے تجھے یہ شعر لکھتے شرم نہیں آئی۔ ذرا مجھ ستر برس
کے بڈھے کو دیکھ اور اس شعر کو دیکھ۔ صاحب بہادروں کی صحبت میں رہ کر یہ نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا......" اور کیا کیا کہا۔
بس یہ نہ پوچھو۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے یہ شعر لکھدیا تھا۔ مولوی صاحب کی باتیں سُنکر جب غور کیا تو اُس وقت معلوم ہوا
کہ لاحول ولاقوۃ کیا بیہودگی ہوئی ہے۔

میں بی۔ اے کے ابتدائی سال میں تھا کہ "بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا"، یعنی مشن کالج میں ایک ایسا شخص آیا جسپر نہ صرف

مشن کالج بلکہ تمام ہندوستان کو فخر ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ کون کہ ریورنڈ سی۔ ایف۔ اینڈ روز۔ انھوں نے آتے ہی کالج کا رنگ ہی بدل دیا۔ اور بتا دیا کہ دُنیا میں خودداری بھی ایک چیز ہے۔

ان کے زمانے کے اتنے واقعات ہیں کہ اگر میں کہنے بیٹھوں تو دنوں میں ختم نہ ہوں۔ وقت کم ہے اس لئے ایک واقعہ سُن لیجئے۔ ہوا یہ کہ ہم لاہور جا رہے تھے۔ دوسرے روز یونیورسٹی ٹورنامنٹ میں کرکٹ میچ کھیلنا تھا مسٹر اینڈر روز بھی ساتھ تھے۔ وہ ہمارے ساتھ انٹر کلاس میں سفر کرنا چاہتے تھے۔ مگر ہم نے زبردستی انکو سیکنڈ کلاس میں بٹھایا تاکہ ہماری آزادی میں کھنڈت نہ پڑے، انٹر کی صرف ایک ہی گاڑی تھی۔ ساری کی ساری پر ہم ۱۳۔۱۴ لڑکوں نے قبضہ کر لیا۔ خوب پھیل پھیل کر لیٹے۔ ایک درجے میں ہم ۳ لڑکے تھے۔ مَیں۔ بلند اقبال اور حسین مرزا۔ کوئی ایک بجے رات کو گاڑی بھٹنڈہ پہنچی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ انگریزی باجہ بج رہا ہے۔ اور ایک زبردست برات سوار ہونے کو پلیٹ فارم پر کھڑی ہے۔ بلند اقبال نے حسین مرزا سے کہا "مرزا ذرا دروازہ روک کر کھڑے ہو جاؤ۔ کسی کو آنے نہ دینا" چونکہ ہمارا ہی درجہ بالکل سامنے تھا۔ اس لئے اسی پر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سخت حملہ ہوا۔ مگر حسین مرزا کیا ماننے والی اسامی تھا۔ اُس نے دروازے کو اینچ بھر نہ کھلنے دیا۔ اسی کشمکش میں کسی نے اسکو گالی دیدی۔ گالی کا دینا تھا کہ حسین مرزا قلانچ مار بھوکے شیر کی طرح اُس گالی دینے والے پر جا پڑا۔ اس کا اس طرح گرنا اور سب لڑکوں کا درجے کھول کھول کر کے باہر نکلنا! خوب چلی۔ مگر لڑکوں کے مقابلے میں بھلا یہ برات والے کیا ٹک سکتے تھے آخر بھاگے اور "مُلّا کی دوڑ مسیت" پر عمل کر کے اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچے۔ وہ صاحب بہادر چند سپاہیوں کو لیکر گاڑی کی طرف آئے اور آتے ہی گڑبڑ مچادی۔ پولیس والوں کو حکم دیا کہ سب لڑکوں کو گاڑی سے اُتار دو۔ اِدھر پولیس والوں سے ہماری چل رہی تھی اُدھر مسٹر اینڈر روز گاڑی سے اُترے۔ آہستہ آہستہ لنگڑاتے ہوئے آئے۔ اسٹیشن ماسٹر کے گلے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیا اور کہا "چلے جاؤ یہ میری ٹیم ہے" اسٹیشن ماسٹر صاحب چکرائے کہ یہ کون حضرت ہیں۔ جو مجھ وردی پہنے ہوئے افسر سے بھی اس گستاخی کے ساتھ باتیں آ رہے ہیں۔ انھوں نے ذرا پیچھے ہٹ کر بلند اقبال سے پوچھا جب انکو معلوم ہوا کہ یہ مسٹر اینڈر روز ہیں تو وہ اپنے سپاہیوں کو لے رُخصت ہوئے۔ وہ تو اُدھر گئے اور اِدھر مسٹر اینڈر روز نے پلیٹ فارم پر غصہ میں ٹہلنا شروع کیا۔ وہ ٹہل ہی رہے تھے کہ ایک بڑے میاں نے مجھ سے آکر کہا "میاں ہمارے پاس انٹر کے ٹکٹ ہیں۔ ہم تھرڈ میں بیٹھ جاتے ہیں، دولھا کو اپنے پاس انٹر میں بٹھا لو" میں نے کہا "کیا ہرج ہے۔ ہماری تمہاری خدانخواستہ کوئی لڑائی تھوڑی ہے۔ زبردستی اس وقت بات بڑھ گئی" اُن بڑے میاں نے دولھا میاں کو بُلا ہمارے درجہ میں بٹھا دیا۔ ہم نے بھی اس کے لئے اپنا پورا بنچ خالی کر دیا، دولھا میاں کو وہاں بیٹھے کچھ زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ مسٹر اینڈر روز ٹہلتے ہوئے ہمارے درجہ کی طرف آئے۔ جُھک کر کیا دیکھتے ہیں کہ دولھا میاں نہایت ٹھاٹھ سے ایک بنچ پر بلا شرکت غیرے قابض۔ ہنسکر ذرا اُونچی آواز میں کہا "سُسرپروں میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ گاڑی چلنے کے بعد تم اس کی گُندی کر دگے"۔ شادی والوں میں بعض لوگ انگریزی جانتے تھے۔ وہ ہمارے سر ہو گئے۔ کہ دولھا کو اُتار دو۔ ہم نے بہت سمجھایا۔ مسٹر اینڈر روز نے بھی ہماری تائید کی اور کہا کہ لڑکے کو

بیٹھا رہنے دو۔ میں نے صرف اس وجہ سے دخل دیا تھا کہ ہیڈ ماسٹر اپنا زور دکھانے آیا تھا۔ اگر سیدھی طرح کہتا تو میں خود جگہ دلا دیتا۔ مگر وہ کیا ماننے والے تھے۔ آخر دولھا کو ہمارے درجے سے اتار کر تھرڈ کلاس میں ٹھونس دیا۔

مسٹر اینڈ روز کی ہمیشہ سے یہ رائے تھی کہ ہندوستانیوں کی خودداری کو صدمہ پہنچایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے دل عہدہ داروں سے صاف نہیں ہے۔ اگر ان کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جائے تو ہندوستان امن کا گہوارہ بن سکتا ہے، وہ اب سیاسیات میں پڑ گئے ہیں۔ مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کا نقطۂ نظر اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہر ہندوستانی ان سے محبت کرتا ہے اور ہمیشہ کرے گا۔

مسٹر اینڈ روز کا پڑھانا غضب کا پڑھانا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ بہہ رہا ہے۔ ٹینی سن کی "ان میموریم" کا پڑھانا ان کے ذمہ تھا۔ ان کی پڑھائی کا اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اس کتاب کے شروع میں ایک صفحہ کی جو افتتاحی نظم ہے اس کو انھوں نے سو دن میں پورا کیا تھا۔ تصوف اور ویدانت کے اصول بیان کر کے۔ اور حضرت امام غزالی ابن عربی۔ مولانا روم اور گیتا کے حوالے دے کر جب وہ ان کا مقابلہ ٹینی سن کے مصرعوں سے کرتے تھے۔ تو آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ ان کی واقفیت عامہ کس قدر ہے اور ٹینی سن نے کس محنت سے ان چیزوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ اور کس خوبی سے اپنی کتاب میں داخل کیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ ان باتوں میں ابھی یورپ والے ہم ایشیا والوں سے کتنے پیچھے اور ہمارے کس قدر خوشہ چیں ہیں۔ اس طرح پڑھاتے ہوئے میں نے دو ہی شخصوں کو دیکھا ہے، ایک مسٹر اینڈ روز اور دوسرے مولوی نذیر احمد مرحوم۔ مولوی صاحب کا بھی یہی حال تھا، وہ حماسہ۔ معلقات اور متنبی کے ہر شعر کے ساتھ یورپ کے مختلف ادیبوں کے مقولے بیان کرتے تھے اور بتاتے تھے کہ دیکھو اس مضمون کو یورپ والوں نے ہم سے لے کر اس طرح ادا کیا ہے۔ ان دونوں کا پڑھانا صرف امتحان پاس کرانے کے لئے نہیں تھا۔ عالم بنانے کے لئے تھا۔ اور ان سے پڑھنے کے بعد ہم سمجھتے تھے کہ دنیا میں ان دونوں کی عزت اِنکی علمیت کی وجہ سے ہے نہ کہ شخصیت کی وجہ سے۔

الغرض ہمارے تین طرح کے پروفیسر تھے۔ مسٹر ہیبرٹ ویر کہتے تھے کہ دماغی ترقی کرنے کے لئے "پڑھو۔ پڑھو۔ اور پڑھو" مسٹر ڈے کہتے تھے کہ جسمانی ترقی کے لئے "کھیلو، کھیلو۔ اور کھیلو" اور مسٹر اینڈ روز فرماتے تھے کہ اپنی عزت قائم کرنے کے لئے "لڑو۔ لڑو۔ اور لڑو"

غرض کہاں تک سناؤں وقت کم اور داستان بڑی ہے اسلئے میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور آخر میں عرض کرتا ہوں کہ جب تک پڑھانے والے پڑھنے والوں سے محبت کا برتاؤ نہ کریں گے جب تک انکی خودداری کو قائم نہ کریں گے جب تک ان کے اطوار اور عادات کا خیال نہ رکھیں گے۔ اور انکی جسمانی ترقی کو بھی تعلیم کا ایک جزو نہ سمجھیں گے اسوقت تک کبھی یہ نہ کہا جائیگا کہ انھوں نے اپنے فرض کو پوری طرح انجام دیا۔ اور جب تک پڑھنے والے ان پڑھانے والوں کی محبت کی قدر نہ کرینگے۔ جب تک اپنی دماغی تعلیم کے ساتھ اپنی صحت جسمانی کا خیال نہ رکھیں گے اور جبتک یہ نہ سمجھیں گے کہ خودداری بھی ایک بڑا جوہر انسانی ہے اسوقت تک نہ دنیا میں کبھی انکی قدر ہوگی اور نہ یہ کہا جا سکے گا کہ انھوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔

(بہ اجازت اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی)

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

بی ہمسائی

بحسن خلق تواں کرد صید اہل نظر ٭ بہ بند و دانہ نہ گیرند مرغ دانا را

یہ وہی بی ہمسائی ہیں جنہوں نے مولوی افراسیاب بیگ کے ہاں بدیع الزماں اور ان کی بیوی کی کیچلی بدلنے کی خبر پہنچائی تھی جس دن سے سرتاج بانو بدیع الزماں کے ہاں بیاہی آئی تھی۔ اور شادی کے موقع پر بی ہمسائی کی بات تک بھی نہ پوچھی گئی تھی۔ اُسی دن سے بی ہمسائی خفا ہو گئی تھیں اور زیادہ خفگی کا باعث انکے بے تکے چال چلن ہوئے تھے۔ یہاں نری بی ہمسائی ہی نفرت کرنے والی نہ تھیں بلکہ سارا محلہ خفا سا ہو گیا تھا۔ یہ زیادہ تر ان لوگوں کی بے پردگی کی وجہ تھی۔ محلہ میں جو لوگ آباد تھے وہ غیر تعلیم یافتہ تھے۔ اور پرانے رسم و رواج کے پابند تھے۔ ان کی نظر میں بے پردگی۔ چوری اور دوسرے بے حیائی کے کاموں سے بھی زیادہ ناقابل معافی گناہ تھا خیر ہم کو اس سے کیا غرض۔ ہم کو تو بی ہمسائی کا قصّہ کہنا ہے۔ بی ہمسائی کے مکان کی ایک طرف کی دیوار بدیع الزماں کے مکان سے ملحق تھی۔ کوٹھے پر سے دیوار پر کھڑے ہو کر ان کے مکان کا اچھا خاصہ حصّہ نظر آتا تھا۔ بی ہمسائی کے گھر میں چار آدمی تھے اور ایک شیر خوار بچّہ۔ دو میاں بیوی، اور ماں بہن۔ میاں چھتریوں کی مرمت کا کام کرتے تھے۔ دُکان نئی سڑک پر تھی۔ روزانہ روپیہ ڈیڑھ روپیہ کما لیتے تھے۔ اس میں گھر کا خرچ بمشکل چلتا تھا۔ مکان اور دُکان کا کرایہ نکلنا دشوار ہو جاتا تھا۔ بی ہمسائی پہلے تو بدیع الزماں کے گھر میں آیا جایا کرتی تھیں۔ اور دیوار پر کھڑے ہو کر بھی بات چیت کرتی تھیں۔ مگر وحید الزماں کی شادی کے بعد سے اُنہوں نے ملنا جُلنا ترک کر دیا تھا۔ یہ کبھی ان کی پیسے دھیلے کی شرمندہ نہ تھیں۔ ہاں حصّہ بقدر حسب حیثیت دونوں طرف سے جاری تھا۔ اب کبھی کبھی وہ دیوار پر کھڑی ہو جاتی تھیں اور ان کے گھر میں جھانکتی تھیں اور بُرے بُرے مُنہ بنایا کرتی تھیں اور بڑبڑاتی جاتی تھیں۔ خصوصاً سرتاج بانو پر جب نظر پڑتی تھی تو بہت چراغ پا ہوتی تھیں۔ مگر اِدھر سے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا تھا اور ان کی بھی کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ بی ہمسائی حسبِ معمول دیوار پر کھڑی گھرباں گھونٹ رہی تھیں، ان کی پُشت پر جو دیوار تھی اس پر بندر آن بیٹھا جب انہوں نے ادھر مُنہ اٹھا کر دیکھا تو اس کمبخت نے دانت نکال کر خیں کی اور ان کی طرف جھپکا۔ بی ہمسائی کے تو آتے اوسان جاتے رہے۔ بے تحاشا زینہ کی طرف بھاگیں پاؤں میں ایک برکے پائنچہ کا پاجامہ تھا وہ اُلجھا اور یہ دھڑام سے ساری سیڑھیوں پر سے لڑکتی ہوئی نیچے جا پڑیں، سر دہلیز سے ٹکرا کر پھوٹ گیا اور خون جاری ہو گیا۔ انھوں نے ہائے ویلا کا شور مچایا۔ رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ گھر والے دوڑے اور ان کو ہاتھوں ہاتھ اٹھا لے گئے۔ بچا کر چار پائی پر ڈال دیا۔ علاج معالجہ کی فکر کی۔ مگر ان کا رونا پیٹنا نہ تھمنا تھا نہ تھما۔ اتنا بیٹیں کہ باہر گلی والے جمع ہو گئے۔ یہ کہہ کہہ کر روتی تھیں۔ "ہائے میں مرگئی۔ میرا دم نکل گیا میرا سر پھوٹ گیا۔ ہائے کوئی خدا کا بندہ جا کر ننھے کے باپ کو خبر کر دے۔ مرتے وقت میری صورت تو دیکھ لیں"۔ ایک لڑکے نے باہر سے جو یہ سُنا تو یہ سمجھا کہ واقعی بی ہمسائی کا انتقال ہو گیا۔ وہ ان کے میاں کی دُکان جانتا تھا۔ سرپٹ اُدھر دوڑ پڑا۔

اب یہاں کا قصّہ یہاں چھوڑیئے اور سرتاج بانو کی طرف متوجہ ہوئیے۔ جب سرتاج بانو نے یہ غُل غپاڑہ سُنا تو بے چین

ہوگئی۔ ماما سے کہا کہ جلدی جا اور بی ہمسائی کی خبر لا۔ اس نے آکر کہا۔ ہمسائی کوٹھے پر سے گر پڑی ہیں اُن کا سر پھٹ گیا ہے خون بہہ رہا ہے۔ یہ سُنتے ہی سرتاج بانو بیتاب ہوگئیں۔ وحید الزماں سے کہا ڈارلنگ تم ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کرو اور کہہ دو کہ اس کام کے متعلق سامان لے کر فوراً آ جائیں۔ موٹر بھیج دو۔ میں ہمسائی کے ہاں جاتی ہوں اور ان کی خبر لیتی ہوں۔ یہ یوڈی کولون کی بوتل ہاتھ میں کپڑا کوٹن وول ساتھ لے ہمسائی کے گھر جا پہونچیں۔ وہاں سب کے سب ششدر رہ گئے کہنے لگی رونے پیٹنے سے کچھ فائدہ نہیں میں نے ڈاکٹر کو موٹر بھیجی ہے وہ ابھی آتے ہونگے۔ اتنے میں ان کی مرہم پٹی کرتی ہوں۔ جلدی سے روئی نکال پانی میں بھگوئی اور زخم کو دھویا۔ پھر یوڈی کولون میں روئی بھگو کر زخم کو خوب صاف کیا اور روئی وہاں رکھدی۔ کسکر کپڑے کی پٹی باندھ دی۔ خون اسی وقت رُک گیا۔ زخم کچھ گہرا نہ تھا۔ بالکل سطحی تھا۔ خود ان لوگوں کے پاس بیٹھی رہی تسلی تشفی کرتی جاتی تھی اور ایک ہاتھ سے مریضہ کو پنکھا جھلتی جاتی تھی۔

اب بی ہمسائی کے میاں کا حال سُنیئے۔ میاں دُکان پر ٹوپی اُتارے بے فکر بیٹھے ہتوڑی ہاتھ میں لے دھڑا دھڑ چھتریوں کی مرمت کر رہے ہیں۔ اتنے میں لڑکے نے آن کر ایک بھیانک آواز میں یہ کہا۔ میاں کیا بیٹھے ہو تمہاری بیوی تو کوٹھے پر سے گر پڑیں سر پھٹ گیا اور مرگئیں۔ بھلا ان کو یہ سُننے کی کہاں تاب تھی۔ بے چین ہوگئے۔ ہتوڑی ہاتھ کی ہاتھ ہی میں رہی اور ٹوپی اپنی جگہ۔ جوتی بھی پاؤں میں نہیں ڈالی۔ سیدھے دوڑتے ہوئے گھر کی طرف ہولئے۔ سر پر پٹھے ہیں ہاتھ میں ہتوڑی ہے اور ہاتھ اوپر کو اُٹھا ہوا ہے۔ اور یہ بے تحاشا بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ سر کے بال ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ عجب تماشا نظر آتا ہے۔ جو دیکھتا ہے اس کے ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑے جاتے ہیں۔ مگر ان کی توجہ کسی طرف نہیں ہے۔ بیوی کے غم میں بیتاب ہیں۔ مُنہ اُٹھا ہوا ہے۔ سینہ نکلا ہوا ہے اور بھاگ رہے ہیں۔ راستہ میں بیچ سڑک پر دو سانڈ لڑ رہے تھے۔ آدمیوں کی سڑک کے دونوں طرف بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ادھر اُدھر سے بچکر گذرنا ناممکن تھا۔ لوگ لاکھ روکتے رہے مگر ان کو اپنے آپے کی بھی خبر نہ تھی۔ بلا تامل بچاروں کے بیچ میں گھس گئے۔ ایک سانڈ کے ریلے میں آکر دُور جا پڑے ہتوڑی جو ہاتھ میں تھی وہ کھٹاک سے ماتھے پر جا لگی اور خون بہنے لگا۔ کیوں نہ ہو جب لیلیٰ کے فصد کھلی تھی تو مجنوں کے اپنے آپ خون جاری ہو گیا تھا۔ یہ کوئی مجنوں سے کم تھوڑی ہیں۔ لوگ ہزار روکتے رہے اور خون پونچھنا چاہا۔ مگر ان پر تو بیوی کی محبت کا بھوت سوار تھا۔ پھر دوڑ پڑے۔ خون میں کرتہ کیا پاجامہ تک تر ہو گیا۔ مگر کسی طرح گھر لے لیا۔ گھر میں جو گھسے تو بیوی اچھی خاصی بھلی چنگی۔ زندہ سلامت پلنگ پر پڑی ہوئی ہنس رہی تھیں۔ میاں نے جو یہ حال دیکھا تو بدن میں جان آگئی۔ مگر بیوی نے میاں کو جو خون میں نہایا ہوا پایا تو چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب موجود تھے۔ بی ہمسائی کی مرہم پٹی کر چکے تھے اور ان کی بت سرتاج بانو کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ یہ ماجرا دیکھکر ڈاکٹر صاحب اور سرتاج بانو پریشان ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھا بجھا کر گھر والوں کا رونا پیٹنا بند کرایا اور بی ہمسائی کے میاں کی مرہم پٹی کر کے ان کو دوسری چارپائی پر ڈالدیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اُن کا زخم بھی کچھ شدید نہ تھا۔ اب ڈاکٹر صاحب یہاں سے روانہ ہونے لگے۔ بی ہمسائی کو ان کے دینے لینے کی فکر ہوئی۔ گھر میں ٹکا نہ تھا۔ سرتاج بانو سمجھ گئیں۔ ان سے کہا۔ یہ تو ہمارے گھر کے ڈاکٹر ہیں۔ ان کو دینے لینے کا خیال نہ کرنا۔ یہ پہلے ہی سے گھر کی حالت دیکھ جان گئی تھیں کہ وہ سب بہت مفلوک الحال ہیں اُسنے

خیال کیا کہ جب گھر کا کماؤ بیمار پڑا ہوا ہے تو یہ کہاں سے خرچ چلائیں گے۔ یہ سوچکر گھر آئی اور پچاس روپے کے نوٹ لیکر پھر جا پہنچی اور چپکے سے بی ہمسائی کے ہاتھ میں دیدیے۔ وہ انکار بھی کرتی رہیں مگر اُس نے ان کو سمجھا دیا اور کہہ دیا کہ روپیہ واپس کرنے کی فکر نہ کرنا۔ اب بی ہمسائی سمجھیں کہ جس لڑکی سے یہ نفرت کرتی تھیں، وہ کیسی اعلیٰ خوخصلت کی ہے۔ اور وقت پڑے پر کس طرح غریبوں کے کام آتی ہے۔ اب اِن کی ساری نفرت محبت میں مبدّل ہوگئی۔ تھوڑے دنوں میں دونوں میاں بیوی بھلے چنگے ہوگئے اور بی ہمسائی سرتاج بانو کے پاس آنے جانے لگیں۔ سرتاج بانو نے ان کی فلاکت کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ ایک دن ان سے بہت احتیاط سے کہ ان کو ناگوار نہ گزرے ان کے گھر کا حال دریافت کرنے لگیں۔ بی ہمسائی نے کہا۔ بیوی کیا پوچھتی ہو۔ بڑی مصیبت سے گزران ہوتی ہے۔ ہم چار دم ہیں اور ایک کمانے والا۔ کماتے کماتے ہارا جاتا ہے مگر پوری نہیں پڑتی۔ خیر خدا کا شکر ہے دال روٹی کھا لیتے ہیں اور بُرے بھلے حال تن ڈھک جاتا ہے۔ مگر میری نند سیانی ہوگئی ہے۔ اُس کی شادی کا ہم سب کو بڑا فکر ہے۔ نسبتیں جگہ جگہ سے آتی ہیں۔ مگر ہم ٹال دیتے ہیں۔ شادی کریں تو کیونکر کریں۔ آخر چار برتن اور چار جوڑے تو ہونے چاہئیں۔ عمر بھر کنبے قبیلے والوں کا کھایا ہے۔ چار آدمیوں کے ہاتھ بھی دُھلانے پڑیں گے۔ اتنا روپیہ کہاں سے آئے جو یہ کنواری بیاہی جائے۔ رات دن اِسی فکر میں ہمارا خون خشک ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ سرتاج بانو چپکی بیٹھی سُنا کی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمسائی سے پوچھا تو یہ پوچھا کہ کیا تمہارے میاں کو کچھ لکھنا پڑھنا آتا ہے۔ اس نے جواب دیا کچھ تھوڑی بہت اُردو لکھ پڑھ لیتے ہیں مگر انگریزی کا حرف بھی نہیں جانتے۔ یہ باتیں کرکے بی ہمسائی رُخصت ہوئیں۔ سرتاج بانو اسی وقت بدیع الزماں کے پاس گئیں۔ اور کہا کہ ابّا جان بڑے شرم کی بات ہے کہ ہمارے پڑوس میں لوگ فقر و فاقہ میں گزران کریں اور ہم پیٹ بھر کے روٹی کھائیں اور اُن کی کچھ بھی فکر نہ کریں۔ کیا خدائے تعالیٰ کی نعمت کا اسی طرح شکر ادا کرنا چاہیئے۔ بدیع الزماں بولے کہ دُلہن آخر بات کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ آپ کے پڑوس میں جو بی ہمسائی رہتی ہیں۔ ان کے پاس کھانے پینے کو بھی نہیں ہے۔ بولے آخر میں کیا کروں۔ جو کہو میں اُن کے واسطے کرنے کو موجود ہوں۔ سرتاج بانو نے کہا۔ آپ کے ہاں بیسیوں منشی ٹھیکہ داری کے کام میں نوکر ہیں۔ آپ ان کو بھی نوکر رکھ لیجئے۔ کہنے لگے وہاں تو لکھنے پڑھنے کا کام ہے۔ بولی وہ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا جانتے ہیں کام چلا دیں گے۔ بدیع الزماں نے کہا۔ دُلہن مجھے ایک آدمی کی ضرورت بھی ہے۔ بُلا لو ابھی نوکر رکھے لیتا ہوں۔ اس نے ماما کو بھیج اُسی وقت ہمسائی کے میاں کو بلا لیا اور بدیع الزماں نے تھوڑا بہت پوچھ گچھ کر ان کو پچاس روپیہ ماہوار پر نوکر رکھ لیا۔ ہمسائی نے جب یہ سُنا تو خوشی کے مارے پھولی نہ سمائی اور عمر بھر کے واسطے اِس لڑکی کی ممنونِ احسان ہوگئی اور دُعائیں دیتی رہا کی۔ اِس طرح سرتاج بانو کے ہاتھ سے ایک غریب خاندان کے دلدّر پار ہوگئے۔

خواجہ عبد المجید دہلوی بی۔اے

رفتارِ زمانہ:- خواجہ عبد المجید صاحب کے ایسے ہی چھ دلکش افسانوں کا مجموعہ اس نام سے شائع ہوا ہے۔ ہر افسانہ بجائے خود مکمّل اور سلسلہ کی دلچسپ کڑی بھی ہے۔ زبان دلّی کی ٹکسالی اور نتھری سُتھری ہے۔ آٹھ آنہ قیمت ہے۔ نو۹ آنے کے ٹکٹ بھیج کر ساقی بکڈپو۔ دہلی سے طلب کیجئے۔

ترقی پسند مصنفین

پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں ترقی پسند ادب پر حسب ذیل تقریر کی تھی۔

ادب پر رائے دینے کا مجھے حق تو نہیں لیکن جب دیکھتا ہوں کہ مجھ سے بھی کم حق رکھنے والے لوگ رائے دے رہے ہیں تو مجھے بھی جرأت ہوتی ہے کچھ کہنے کی۔ مجھے دو تین کتابیں لکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور لکھنے پڑھنے کا شوق بھی ہے لیکن میرے پاس ان کاموں کیلئے اب وقت نہیں ہے۔ میری طاقت زیادہ تر دوسرے کاموں میں صرف ہوتی ہے جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے۔ ترقی پسند ادب کیا ہے؟ ادیب کن لوگوں کیلئے لکھتا ہے؟ ان سوالوں کے جواب ہر شخص دے سکتا ہے ان کو بار بار دُہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان سوالوں کو سُن کر میرا جی چاہتا ہے کہ پوچھوں آپ زندہ کیوں ہیں؟ کیا مقصد ہے زندگی کا؟ زندگی کا مقصد ایک ہے اور دوسری باتیں اس کے جزو ہیں۔ یا زندگی کے ہر بات کے خانے الگ الگ ہیں' جو لوگ وکیل ہوتے ہیں ڈاکٹر ہوتے ہیں، پروفیسر ہوتے ہیں یہ سب الگ الگ ہیں یا کہ زندگی کی تصویر ایک مکمل تصویر ہے اور یہ سب اس کے حصے ہیں؟ اگر یہ سب تصویر کے جزو ہیں تو ان کو زندگی کی تصویر میں ہونا چاہئے۔ اگر ہم ان میں سے کسی چیز کو زندگی کی تصویر سے الگ ہو کر ڈھونڈنا چاہیں گے تو ہم بھٹکتے رہیں گے۔ اور کوئی سیدھا رستہ نہ مل سکے گا۔

تم کیوں لکھتے ہو؟ اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ روٹی کھانے کو' یہ جواب صحیح ہے۔ اور بہت سے لوگ یہی کہیں گے لیکن یہ جواب کوئی بنیادی جواب نہیں ہے۔ کچھ لوگ جواب یوں دیں گے کہ ہم صرف اس لئے لکھتے ہیں کہ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو مگر اسی لئے لکھتے ہیں' یہ جواب بھی ٹھیک ہے۔ بہت سے لوگ کہیں گے کہ ہم لکھتے ہیں تاکہ لوگوں کی طبیعت بہلائیں۔ طبیعت بہلانے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو مصیبت میں پھنسا ہو کچھ دیر کیلئے اس کو بھلاوے میں ڈال دیں' اس کے دل سے درد دُکھ کچھ دیر کیلئے نکالیں۔ جب پڑھنے والا ایسے ادیب کی چیز کو پڑھتا ہے تو اس میں کھو جاتا ہے اور کچھ دیر کیلئے اپنی پریشانیوں کو بھول جاتا ہے، گویا ایسے ادب کا دوسرا نام بُھلاوا ہے۔ جب ہم موجودہ پریشانیوں سے بہت گھبرا جاتے ہیں تو سینما دیکھنے جاتے ہیں۔ وہاں کچھ دیر کیلئے دُنیا کو بھول جاتے ہیں، اور ہمارا تھکا ماندہ دماغ بہل جاتا ہے۔ ایسا بھی ادب ہوتا ہے لیکن یہ کچھ بڑا کارنامہ نہیں ہے۔ معقول آدمی کا کام ہے کہ وہ دُور تک دیکھے۔ ایسا ادب بہت جلد ختم ہو جاتا ہے جیسے سینما میں ہم تماشہ دیکھتے ہیں اس وقت بہت پسند کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس وقت کہانی پوچھے تو بتا بھی دیں گے۔ لیکن دس روز کے بعد سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اسی طرح لکھنے والے کے لئے جب تک کوئی بڑی بات کوئی نئی بات نہ ہو پڑھنے والے کے دل پر کوئی گہرا اثر نہیں کر سکتی۔ دُنیا میں بہت سے لکھنے والے گذرے ہیں۔ لیکن ان کی وہی کتابیں باقی رہیں جن میں کوئی بڑا مسئلہ تھا جن میں دُنیا کے بڑے بڑے سوالوں کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔

اب میں پھر اُسی سوال کو دُہراؤں گا کہ آپ کے سامنے دُنیا کی تصویر کیا ہے؟ اگر وہ ایک مکمل تصویر ہے تو وہ کیسی ہے؟ آپ کہاں ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں؟ اپنے ساتھیوں کو اپنے ساتھ کہاں لیجانا چاہتے ہیں؟ یہ تصویر اگر صاف ہے اور لکھنے والے کو معلوم ہے کہ ہم کہاں ہیں اور پڑھنے والے کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں تو اس کی لکھی ہوئی چیز زیادہ اچھی ہوگی۔ انسان کا دماغ موجودہ دُنیا سے نکل کر پرواز کرتا ہے۔ اس کے عجیب وغریب خیالات۔ اس کی عجیب عجیب خواہشیں اس کو ایک دوسری دُنیا میں لے جاتی ہیں۔ جو آجکل کی دُنیا سے مختلف ہوتی ہے۔ اور جہاں وہ تمام مسئلے حل ہوتے ہیں جو اس دُنیا میں نظر آتے ہیں۔ انسان کا تخیل عجب چیز ہے وہ اِس دماغی دُنیا کو رنگ دیکر ایک مکمل تصویر بنا دیتا ہے۔ اور آدمی بے چین ہوتا ہے کہ وہاں پہنچ جائے۔

انسان میں سوچنے کی قابلیت تو زیادہ لیکن کرنے کی کم ہے۔ اس لئے بہت سے لکھنے والے دماغی دُنیا کو پسند کرتے ہیں۔ اسی میں بیٹھ رہتے ہیں۔ لیکن ان کو نہ وہاں پہنچنے کا راستہ نظر آتا ہے اور نہ وہاں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں' ان کی دماغی دُنیا ایک خانے میں رہتی ہے۔ اور واقعی دُنیا دوسرے خانے میں۔

زیادہ ہمت ور لکھنے والے ان دونوں دُنیاؤں کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ دُنیا وہ نہیں ہے جو اُن کے دماغ میں ہے یعنی وہ نہیں کر سکتے جو اُن کے دماغ میں ہے تو اُن کے دماغ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم وہاں نہیں پہنچ سکتے؟ اگر پہنچ سکتے ہیں تو اس کا کیا راستہ ہے؟

یہ سوال پہلے زمانے کے لکھنے والوں کے ذہن میں بھی اٹھا۔ لیکن ان کو دماغی دُنیا تک پہونچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اس وقت انھوں نے اپنی کتابوں کو خیالی دُنیا "یوٹوپیا" (Utopia) بنایا۔ یعنی اگر کرنے کی طاقت ہوتی تو ہم ایسا ایسا کرتے، ایسی ایسی دُنیا بساتے۔ ان دُنیاؤں کو بسانے کے لئے کبھی الٰہ دین کا چراغ نکالا اور کبھی اُڑن کھٹولا تیار کیا۔ یہ لوگ مجبوراً اصلی دُنیا سے الگ تھلگ رہے۔ اور خیالی دُنیا میں زندگی بسر کرتے رہے۔

لیکن اب دُنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اس دماغی دُنیا تک پہونچنے کی صورتیں نکال سکتے ہیں۔ مثلاً پہلے کے لکھنے والوں کو نظر آتا تھا کہ غریبی اور امیری کی تفریق ہمیشہ رہنے والی ہے۔ کیونکہ دُنیا میں اتنی دولت ہی نہیں تھی جو اس تفریق کے دور کرنے کی کوشش کر دی تک ذہن پہونچتا۔ لیکن اب سائنس، صنعت و حرفت اور اسباب نقل و حرکت نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ مصیبتیں دور ہو سکتی ہیں، اور ایسی دُنیا بنا سکتے ہیں جہاں ہر ایک کو ترقی کے یکساں موقعے میسّر ہوں۔ جب ایسی کوشش ہو سکتی ہے تو کیوں نہ کی جائے، کیوں ایسی صورتیں نہ نکالیں جو دماغی دُنیا کو موجودہ دُنیا کے قریب لے آئیں۔ اب ہم ان دونوں دُنیاؤں کے بیچ میں پُل بنا سکتے ہیں۔ ہم اس اچھی دُنیا تک کیوں نہیں پہونچتے۔ وہاں تک پہونچنے میں زیادہ تر لوگوں کا قصور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اکیلے وہاں تک نہیں جا سکتے۔ اور زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو وہاں جانا نہیں چاہتے کیونکہ انھوں نے ابھی اس دُنیا کو محسوس نہیں کیا ہے۔

ہم دماغی دُنیا تک نہیں پہونچ سکتے۔ اس میں قصور کس کا ہے؟ دُنیا کا نہیں مجموعی طاقت ہمارے پاس ہے کہ ہم وہاں تک پہونچ سکیں، سماج کے ہاتھ اتنے پھیل سکتے ہیں کہ وہ دُنیا ہمارے قبضے میں آجائے۔ لیکن زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ ترقی پسند مصنّف وہ ہے جو اس ہونے والی دُنیا اس" نوزائیدہ دُنیا تک پہونچ گیا ہے" اب اس دُنیا کو واقعی دُنیا بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے چاہتا ہے کہ اوروں کو بھی اپنے ساتھ وہاں تک کھینچ لے جائے۔

موجودہ دُنیا کو اس خیالی دُنیا تک پہنچانے کی اور لوگ بھی کوشش کرتے ہیں مثلاً سیاسی حضرات ہیں اُنکی بھی یہی کوشش ہوتی ہے لیکن سیاسی حضرات اور اسی قسم کی کوشش کرنے والے دوسرے لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں پھنس جاتے ہیں۔ بڑی باتوں پر زیادہ توجہ دے نہیں سکتے۔ ایک آرٹسٹ ایسی چھوٹی باتوں سے الگ رہتا ہے۔ اس کی سیاسی زندگی اور ماحول سیاسی لوگوں کی زندگی اور ماحول سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ بڑی بڑی باتوں کو روزمرہ کی چھوٹی باتوں کے جنگل سے الگ کر کے سماج کو دکھا سکتا ہے۔

مثلاً آج کل ایک سوال ہندو مسلمان [illegible] کا ہے۔ یہ جھگڑا ایسا ہے جس نے ملک کی تباہیوں کو جنم لیا ہے۔ لوگ بڑی باتوں کو بھول کر اس میں رہ گئے ہیں۔ اگر اس سوال کے حل کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں تو نئے نئے جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ جذبات اس قدر برانگیختہ ہو جاتی ہیں کہ لوگ اس پر صفائی سے غور نہیں کر سکتے۔ اگر کوئی اس کو حل کرنا چاہتا ہے تو شک ہوتا ہے کہ اس میں بھی کوئی چالبازی ہے۔

ادیب کی پہونچ جہاں ہوتی ہے وہاں سیاستدان کی نہیں۔ اس کے پاس عام لوگوں کی زبان ہوتی ہے اس سے مدد لے کر وہ خیالی دُنیا اور موجودہ دُنیا کے درمیان ایک پُل بناتا ہے جس پر ہو کر عام لوگوں کے دماغ خیالی دُنیا تک پہونچ جاتے ہیں۔ جب لوگ دماغی طور پر وہاں پہنچ جاتے ہیں تو پھر واقعی پہونچنے کی بھی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

آرٹسٹ اور ادیب میں انفرادیت ہوتی ہے۔ اگر کسی آرٹسٹ میں انفرادیت نہیں ہے تو میں اس کو آرٹسٹ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اگر اس کی انفرادیت ایسی ہے کہ وہ سماج سے الگ ہے اور جو چیزیں سماج کو ہلاتی ہیں ان سے متاثر نہیں ہوتا تو وہ ادیب بیکار ہے اس کی اکیلی طاقت سماج کو آگے نہیں پہنچا سکتی۔ لیکن اگر اس کے برخلاف اس کی انفرادیت میں سماج کو دخل ہے یعنی وہ انفرادیت سماج کا نمائندہ کہی جا سکتی ہے تو وہ بڑی چیز ہے۔ اس میں قوم کی طاقت آجاتی ہے اور وہ دُنیا کو ہلا دیتی ہے۔ گذشتہ دور میں جتنے بھی بڑے بڑے لکھنے والے ہوئے ہیں، شیکسپیر وغیرہ وہ سب کسی نہ کسی طرح اپنے دور کے سماج کے نمائندہ تھے۔

آجکل کی دُنیا میں انفرادیت دبائی جا رہی ہے۔ اس زمانہ میں انفرادیت ترقی نہیں پا سکتی۔ کیونکہ ہر ایک کو ترقی کرنے کے موقعے نہیں میسر آتے۔ جب کھانا پینا، رہنا سہنا میسر نہیں، تعلیم نہیں، سوچنے کیلئے وقت نہیں تو انفرادیت کیسے ترقی پائیگی۔

پچھلی دُنیا میں پھر بھی ان لوگوں کو موقع حاصل تھا جو روپیہ رکھتے تھے اور اختیارات رکھتے تھے لیکن اب زمانہ ایسا ہوگیا ہے کہ وہ لوگ بھی جکڑے ہوئے ہیں اس لئے یہ کہنا کہ اس زمانہ میں خیالات کی ترقی کا اور انفرادیت کی ترقی کا موقع ہے غلط ہے۔

لکھنے والا کیوں لکھتا ہے، اس لئے کہ اس کے دماغ میں ایک دُنیا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس دُنیا تک پہونچ ہو سکتی ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ اوروں کو بھی یہ دُنیا دکھائی جائے۔ اپنی خیالی دُنیا اور موجودہ دُنیا کے درمیان ایک پُل باندھا جائے۔ زمانہ کے شاہکار اسی طرح کے پُل ہوتے ہیں۔ پہلے تو پڑھنے والے حسرت سے خیالی دُنیا کو دیکھتے رہتے ہیں اور پھر اُدھر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک بات سے میں سمجھتا ہوں وہ یہ کہ ایسا ادب لکھتے وقت اکثر لوگ خاص خاص فقرے خاص خاص نعرے دُہرانے لگتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے ایک زبردست خیال پیدا کر دیا۔ لیکن معقول لکھنے والے کیلئے یہ دُنیا نہیں اور نہ اس میں آرٹ ہے اور نہ کوئی خاص بات اور نہ کوئی خاص پیغام، ایسی چیزوں کی جگہ صرف سیاست میں ہے۔

ہندوستان کی انجمن ترقی پسند کی ایسی انجمنیں یورپ میں متعدد ہیں اور انھوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں حالانکہ ان کاموں کو ناپا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ وہ لوگوں کے دماغوں میں ہے۔ انقلاب فرانس میں والٹیر کے ایسے ادیبوں کا بڑا دخل ہے، اس کا اثر انقلاب کے بعد سو برس تک باقی رہا۔

آنیوالے انقلاب کیلئے ملک کو تیار کرنا، اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کے مسئلہ کو حل کیجئے ان کو راستہ بتائیے۔ لیکن آپ کی بات آرٹ کے ذریعہ جاننا چاہئے نہ کہ منطق کے ذریعہ آپ کی بات ان کے دل میں اُتر جانا چاہئے۔ آرٹ کی منطق الگ ہوتی ہے وہ آدمی کو پکڑ لیتا ہے۔ پھر منطق اپنا کام کرتی رہتی ہے۔

ہندوستان میں بھی ادیبوں نے بڑا اثر پیدا کیا ہے۔ مثلاً بنگال میں ٹیگور نے لیکن ابھی تک ایسے ادیب کم پیدا ہوئے ہیں جو ملک کو زیادہ آگے لے جا سکیں اسی لئے انجمن ترقی پسند کا قیام ایک بہت بڑی ضرورت کا پورا ہونا ہے۔ اور اس سے ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

جواہر لال نہرو

دامنِ بہار

کارپردازانِ قدرت نے اپنے چولے بدل ڈالے۔ درخت سرسبز ہوئے۔ کونپلیں پھوٹیں۔ شگوفے کھلے اور دامانِ بہار پر قدرت نے گل بوٹے کھینچے کہ چپہ چپہ آئینہ حُسن بن گیا۔

زمین کی گود سے پھول پھل اُبل پڑے۔ سبزہ نوخیز مستانہ وار انگڑائیاں لیتا ہوا اُٹھا۔ اور اپنے چاروں طرف رنگا رنگ کی گلریزی دیکھ کر خوشی سے جھومنے لگا۔

شفاف ندیاں چپ چپ کرتی پھولوں کے گلدستے اُچھالتی۔ اَلبیلی بہنے لگیں۔ چھوٹے چھوٹے خوشنما پرندوں کی ٹکڑیاں اپنی ننھی سی چونچوں میں لئے ایک دوسرے سے گل بازیاں کرنے لگے۔ جو کلی آنکھ کھولتی ہے اپنے آپ کو پھولوں کی دولت سے مالا مال پاکر بے اختیار ہنس پڑتی ہے، غنچے غنچے کی باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ گذرگاہیں تک معطر ہیں اور خوشبو کے قافلے لدے پھندے ہواؤں کے کندھوں پر سوار مہکاتے اُڑے چلے جاتے ہیں۔

آغا شاعر قزلباش دہلوی

سچی کہانی

وہ شوق ناشکیب کی گستاخ دستیاں
اُٹھنا وہ درمیان سے پردہ حجاب کا
وہ حسنِ شرمگیں کی ادائے سپردگی
وہ ارتعاشِ کیف لبِ کامیاب کا
ارماں بھرے دلوں کی وہ خاموش گفتگو
وہ ہمدگر فشار علاجِ اضطراب کا
وہ چاندنی سی چاکِ گریباں سی ضو فگن
وہ نوشِ لب میں کیفِ بہشتی شراب کا
چھایا ہوا حواس پہ وہ کیفِ بیخودی
تکمیلِ ہر ہوس وہ تقاضا شباب کا

سب واقعات ہیں مگر اللہ رے انقلاب
اب اِن پہ ہے گماں کسی رنگین خواب کا

پریم پجاری ؔ

جنازہ

(۱)

جنوری کی ایک سرد رات باہر آسمان پر بادل ایک خاموش استقلال سے مسلط تھے۔ چمن کے سوکھے پتے دریچے کے باہر خنک ہوا سے رہ رہ کر بے قرار رہتے اور شور مچا رہے تھے۔ ایسے وقت میں میں اپنی حسین نشست گاہ میں ایک اونچے برقی لیمپ کے نارنجی رنگ..... کے نیچے ایک مخملی آرام دہ کرسی پر بیٹھی تھی اور "بغداد ٹائمز" کے بڑے بڑے صفحے کھولے مختلف عنوانوں پر نظر ڈال رہی اور بیرونی دنیا کے وحشت خیز اثر کو مطالعہ کی دلچسپی میں محو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سامنے آتشدان میں لکڑیاں چٹخ رہی تھیں۔

اتنے میں میری بوڑھی قدیم حبشن زوناش اندر آئی اور میری رفاقت کیلئے ایک چھوٹی سی میز پر قہوہ کا سامان رکھ کر آہستہ سے پھر باہر چلی گئی۔ رفتہ رفتہ برامدے سے اس کی نقرئی چوڑیوں کی جھنجھناہٹ اور عمر خیام کے اشعار کی گنگناہٹ بند ہو گئی۔ خاموشی جس میں عناصر کی بے چینی کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی دمبدم ایک بوجھ کی طرح روح پر بیٹھی جا رہی اور دل میں طرح طرح کے اوہام و وساوس پیدا کر رہی تھی۔

یک لخت دروازے پر ایک محتاط دستک نے مجھے چونکا دیا۔ آپ جانتے ہیں میں ایک بہت کمزور دل کی عورت ہوں اور عام مشرقی لڑکیوں کی طرح بےحد اوہام پرست، یہی وجہ ہے کہ میں اخبار ہاتھ سے دور پھینک کر سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس ویران اور وحشت ناک رات میں ہوا کے جھونکوں کے سوا اور کیا شے دروازے کے کواڑ کو کھٹکھٹا سکتی تھی۔ میں گھبرا کر نشست گاہ سے باہر نکل آئی اور دروازہ کی طرف نظر اٹھائی۔ اس کے شیشوں میں سے ایک دہکتے ہوئے سگار کو دیکھ کر میرا تردد رفع ہو گیا۔ کسی انوکھے وقت محتاط دستک کے ساتھ سگار کا نظر آ جانا سب کا سب صرف بوڑھے ڈاکٹر گار کی آمد کی علامات تھیں۔ میں ایک روحانی اطمینان سے دروازے کی طرف لپکی اور کنڈی کھول دی۔

"سلام شوق ڈاکٹر!" میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں کہا "اس شہر میں امراض کی بہت کثرت ہے جو آپ عید کا چاند بن گئے ہیں"

ڈاکٹر اپنے چیسٹر پر سے مفلر اتارتا ہوا بولا "ڈاکٹر کبھی اپنے وقت کا مختار نہیں ہوتا بیٹی روحی!"

"روحی" میرا افسانوی نام ہے۔ میں اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگی "آپ کی اس بے اختیاری نے اسوقت بڑا فائدہ پہونچایا۔ اس طوفانی رات کی تنہائی سے گھبرائی ہوئی بیٹھی تھی، آیئے اندر آیئے۔ آگ دہک رہی ہے۔ قہوہ تیار ہے۔ سگاروں کا ذخیرہ آپ کی جیب میں موجود ہی ہوگا۔ بس اس کے سوا اور کس بات کی کسر رہ گئی؟ کہ آپ اطمینان سے بیٹھ کر مجھے اپنے قصے سنائیں کہ آپ کی ان دنوں کی ساری غیر حاضری کی کسر نکل جائے"

ڈاکٹر گار ایک لذت اندوزی کی آہ کے ساتھ آتشدان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور ہاتھ آگ کی طرف بڑھا کر بولا "میں کیا قصہ سناؤں بیٹی، ڈاکٹر ــــ بھی بوڑھا ــــ تم سناؤ اپنی سیاحت کے افسانے"

میں ہنس پڑی "کئی دنوں سے میرے سر میں درد ہے ڈاکٹر۔ میرے صنوبری (ہوائی جہاز کا نام) کی تباہی کا حال تم نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ اس حادثہ نے میرے دماغ پر برا اثر ڈالا طبیعت متوحش سی رہنے لگی ہے۔ ہفتوں سے کوئی چیز نہیں لکھی، کوئی بات سوجھتی ہی نہ تھی" یہ کہہ کر میں نے قہوہ دان اٹھالیا اور ڈاکٹر کیلئے قہوہ پیالی میں ڈالتے ہوئے بولی "آپ کے پاس قصہ کہانیوں کی کمی ہے؟ یوں کہئے کہ ان دنوں انھیں بیان کرنے کیلئے آپ کو وقت نہیں ملتا ہے"

"یہ تو ٹھیک ہے کہ میرے پاس قصے کہانیوں کی کمی نہیں، انسان کی عمر جب بڑھ جاتی ہے تو مختلف تجربات اس کی زندگی کو بجائے خود ایک طویل داستان بنا دیتے ہیں۔ مگر مجھے تامل ہمیشہ اس لئے ہوتا ہے کہ یہ قصے تم نوجوانوں کے دل کو کیا لبھا سکتے ہیں۔ کہ ان واقعات میں محبت اور افسانے کی رنگینیاں ہوتی ہیں نہ حسن اور شوخی کی دلفریبیاں"

میں بولی "بس آپ انھیں کو بیان کیجئے"

بھاپ اڑاتی ہوئی قہوہ کی پیالیاں ہاتھ میں لے کر ہم نے

سرگوشیاں دل کی پشت سے لگا دیتے۔

آتشدان میں لکڑیاں چٹخ چٹخ کر شرارے نکال رہی تھیں۔ باہر چھت پر بارش کی ابھی دھیمی ٹپ ٹپ شروع ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی منہ پر بادلوں کے گرجنے کی خوفناک آواز آتی تھی۔

ڈاکٹر شعلوں کو دیکھتے ہوئے بولا "تم پسند کرو تو میں تمہیں اپنے ایک تازہ مریض کی کہانی سناؤں جو پرسوں شام میرے پاس لایا گیا اور آج صبح ——"

"ضرور ——" میں اشتیاق سے اس کا منہ تکنے لگی۔

(۲)

ڈاکٹر کارٹر نے قہوہ کا ایک گھونٹ لیکر کہا "پرسوں ایک عجیب کیس میرے پاس آیا روحی۔ بوڑھے احمد کو جانتی ہو؟ —— گاؤں کی مسجد کا مجاور ہے۔ اس مسجد کے احاطہ میں ایک چھوٹا سا قبرستان ہے، وہ اس کا بھی نگران تھا"

"میں نے تو کبھی اس شخص کا نام نہیں سنا"

ڈاکٹر کہنے لگے "اس کی موت کی وجہ نہایت عجیب ہے۔ پرسوں صبح وہ میرے پاس بیہوش لایا گیا۔ اور آج صبح اس غریب کا انتقال ہو گیا"

"خدا غریق رحمت کرے" میں نے کہا "کیا ہوا تھا ڈاکٹر اسے؟"

"تم جانتی ہو کہ آجکل دیہات میں وبا بہت شدت سے پھیلی ہوئی ہے۔ دن کے وقت سڑکوں پر میّت برداروں کے ہجوم گذرتے نظر آتے ہیں۔ بازار میں جدھر نظر ڈالو اُدھر دو چار آدمی ایک جنازہ اُٹھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رات آتی ہے تو دن سے زیادہ خوفناک مناظر پیش کرتی ہے۔ لوگوں کی خاموش ٹولیاں لالٹین لئے ہوئے قبرستان کی طرف جاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

بوڑھا مجاور پرسوں رات کی سرگذشت اس طرح بیان کر رہا تھا:۔

"دن بھر لوگوں کی تجہیز تکفین میں لگا رہتا تھا۔ پرسوں رات تھک کر مسجد کے صحن کے ایک کونے میں پڑ رہا۔ دفعتہً کچھ آواز آئی اور میری آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ لالٹین لئے ہوئے مسجد کے صحن میں داخل ہو رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ جنازہ ہوگا۔ رات اندھیری تھی۔ دور آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے جنازہ کی نماز ختم بھی نہ کی تھی کہ بوندا باندی ہونی شروع ہوئی۔ تب میں نے اُن سے کہا کہ اب دفنانے کا انتظام کرنا بڑا مشکل ہے۔ میّت کو یہاں رکھ دیجئے میں سرہانے کلام مجید پڑھوں گا۔ صبح جب مینہ تھم جائے تو واپس آکر لاش کو دفنا دیجئے گا۔ یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہر دوسرے تیسرے ایسے واقعات پیش آیا ہی کرتے ہیں کہ رات میں میں تنہا لاش کے سرہانے کتاب مقدس پڑھنے میں صرف کر دیتا۔ کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں گذرا جو مجھے خوفزدہ کرتا۔

غرض ان لوگوں نے جنازہ مسجد کے صحن میں رکھ دیا۔ اور مجھے کلام مجید پڑھنے کی تاکید کر کے مسجد کے صحن کے دروازے باہر سے لگا کر چلے گئے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ دروازہ ان لوگوں نے باہر سے لگا دیا ہے۔ یہ بعد میں معلوم ہوا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں کتاب کھول کر جنازے کے سرہانے بیٹھ گیا۔ رات بھیانک تھی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ ہر طرف کاجل کی سی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی دور سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ خوف کے مارے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ کیونکہ مجھ پر اب تک کوئی ایسا حادثہ نہیں گذرا تھا جیسا اس شب گذرا۔ ہولناک اور بھیانک۔

تھوڑی دیر تو میں کتاب مقدس پڑھتا رہا۔ پھر یکایک میری نظر سامنے کو اُٹھی اور میری روح کانپ گئی —— میں نے دیکھا جنازے پر جو سفید چادر پڑی تھی وہ آہستہ آہستہ ہل رہی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ دل کو سمجھایا —— ممکن ہے ہوا کا جھونکا ہو۔ یہ کہتا ہوا میں پھر کتابِ مقدس پڑھنے لگا مگر قدرتی طور پر میری نگاہ بار بار اُٹھتی تھی۔ چادر برابر متحرک تھی۔ میں نے سمجھا ضرور کوئی بلی جنازہ میں گھس گئی ہے۔ باوجود اس یقین کے میں جنازہ کے قریب نہ جا سکا۔ ایک نامعلوم خوف دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ میں اپنی عمر میں کبھی نہیں ڈرا۔ یہ پہلا ہی موقع تھا۔ اور پہلا ہی حادثہ! —— کچھ دیر بعد یہ حالت ہو گئی کہ چادر کا کونہ زور زور سے ہلنے لگا۔ جیسے کوئی جھنجوڑ رہا ہو۔ اب تو میرے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا میرا اُٹھنا ہی تھا کہ ایک جھٹکے کے ساتھ لاش پر پڑی ہوئی چادر سرک گئی اور پھر —— ایک کفن پوش سر آہستہ آہستہ جنازے میں سے اُٹھتا ہوا نظر آیا۔ میں ابھی کچھ سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ یک لخت لاش جنازے میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل دو لمحے کھڑے رہے —— میں اس کے

کفن آلود چہرے کو تک رہا تھا ـــ وہ میرے لرزتے ہوئے جسم کو ـــ
چھوڑ کر جنازے سے زمین پر کود پڑا ـ

یہ دیکھکر میری چیخیں نکل گئیں ـــ میں دروازے کی طرف
بھاگا تا کہ سڑک پر نکل بھاگوں ـ مگر وہاں جاکر دیکھا تو دروازہ بند
پایا ـ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اندر صرف ہم دونوں مقید ہیں ـ قدموں
کی آہٹ پاکر میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ میرے تعاقب میں چلا آرہا تھا
اور چونکہ اس کے دونوں پاؤں بندھے ہوئے تھے اس لئے وہ آہستہ
آہستہ کودتا ہوا میرے پیچھے چلا آرہا تھا ـ

صحن میں امرود کا ایک درخت تھا میں اس کی طرف بھاگا
مگر اب شاید اس میں بھی تیزی آگئی تھی ـ وہ میرے تعاقب میں تیزی
سے کودتا ہوا آرہا تھا ـ تھوڑی دیر بعد یہ حالت تھی کہ ہم دونوں
مسجد کے صحن کا چکر لگا رہے تھے ـ میں آگے آگے اور وہ پیچھے پیچھے ـ
خوف نے میری تمام طاقتیں سلب کر لی تھیں ـ میں نہ چیخ سکتا تھا
نہ درخت پر چڑھ سکتا تھا ! ڈاکٹر صاحب ! میری حالت مُردے
سے بدتر تھی ـ میں پاگل ہو رہا تھا ـ مسجد کے صحن کی ہر دیوار کے
قریب جاکر اُسے پھاندنے کی کوشش کرتا ـ اور جب لاش میرے
قریب آجاتی تو میں چیخ مار کر وہاں سے بھاگ نکلتا !

اسی وقت دفعتاً مجھے خیال آیا کہ پیچھے کنوئیں کے قریب کی
دیوار کچھ گر پڑی ہے ـ اس کو پھاندنا نسبتاً آسان ہوگا ـ میں پچھلے حصے
میں جہاں دیوار کی چند اینٹیں گر پڑی ہیں بھاگ آیا اور اپنی پوری
قوت اور کوشش سے دیوار پر سے پھاند گیا ـ میں ہانپ رہا تھا ـ
اسی عالم میں پلٹ کر دیکھا تو لاش میرے تعاقب میں نہایت
تیزی سے چلی آرہی تھی ـ آخر اس نے دیوار پھاندنے کی کوشش کی
مگر اینٹوں میں کفن اُلجھ گیا ـ اور مُردہ جسم دیوار پر نصف اِدھر
نصف اُدھر لٹکنے لگا ـ اب وہ بے جان معلوم ہو رہا تھا ـ میں باہر
سڑک پر لڑکھڑاتا ہوا پہونچا ـــ "

بس بیٹی صبح آنے جانے والوں نے مسجد کی ٹوٹی ہوئی دیوار
پر ایک لاش کو لٹکتا ہوا دیکھا اور مجاور کو انھوں نے دیوار کے نیچے
بے ہوش پایا ـ

مجاور کا بھائی اُسے اٹھا کر میرے پاس لایا ـ وہ تیز بخار
میں پھنکا جا رہا تھا ـ اور بیہوش تھا ـ کل رات کے تین بجے اس
نے مجھے اپنی داستان سنائی اور آج صبح چل بسا ـ صبح دس بجے
کے قریب وہ لاش دفن کی گئی ـ اور دوسرے دن صبح دس بجے
مجاور کی لاش بھی سپردِ خاک کر دی گئی ـ

میں دم بخود ہو کر سن رہی تھی ـ باہر آندھی زوروں پر
تھی ـ آتشدان کی لکڑیاں ختم ہو چکی تھیں ـ مینٹل پیس پر رکھا
ہوا کلاک ٹِک ٹِک کر رہا تھا ـ

جب ڈاکٹر قصہ ختم کر چکا تو میں لرزتی ہوئی اٹھی اور اسکے
پہلو میں جا بیٹھی ـ

حجاب امتیاز علی

افسونِ سحر

مری چشمِ مشتاق سے کیوں نہاں ہے ـ ہر اک بزم میں جب تری داستاں ہے
کہاں دیکھئے مجھ کو لیجائے وحشت ـ قفس اِس طرف ہے اُدھر آشیاں ہے
اب آباد کر چاہے برباد کر دے ـ مرا دل نہیں یہ ترا آستاں ہے
نہ پوچھو مآلِ غمِ سوزِ فرقت ـ کہ صورت سے میری حقیقت عیاں ہے
تعجب ہے لوگوں کا تیرے حال دیکھا ـ نہ ہے زخم کوئی نہ کوئی نشاں ہے
پلا ایک ہی جام للّٰہ ساقی ـ بہت تشنہ لب یہ تراشتہ جاں ہے
چلو اے کربل ہمسفیرو! خدارا!!! ـ نہیں کچھ یہ فردوس کوئے بتاں ہے
مجھے ہوش آیا تو اسے سحر دیکھا ـ نہ بانگِ جرس ہے نہ وہ کارواں ہے

مقصود حسن بیخود
ایبٹ آباد

بزمِ شوق

ذروں میں حسنِ مہرِ درخشاں لئے ہوئے
فطرت ہے ایک جلوۂ عریاں لئے ہوئے

نرگس ہے کیفِ دیدۂ خوباں لئے ہوئے
سنبل ہے بوئے گیسوئے جاناں لئے ہوئے

آشفتگیٔ قلب کا امکاں لئے ہوئے
آئی بہارِ حسن کا طوفاں لئے ہوئے

کلیاں چٹک کے دیتی ہیں پیغامِ رنگ و بو
پھولوں کی آڑ میں رخِ تاباں لئے ہوئے

شبنم لٹا رہی ہے بہارِ رخِ گہر
صدہا ہزار انجمِ رخشاں لئے ہوئے

موسم اٹھا رہا ہے نقابِ رخِ بہار
ذرّے ابھر رہے ہیں گلستاں لئے ہوئے

نازاں ہے برگِ گل بمتاعِ جنونِ شوق
دامن میں چاک چاکِ گریباں لئے ہوئے

کرنوں میں گندھ رہی ہیں گہرہائے آبدار
شبنم جو اڑ رہی ہے گلستاں لئے ہوئے

ہر شاخِ نخلِ طوبیٰ و سدرہ کی ہم نشیں
ہر نخلِ باغ، شوکتِ رضواں لئے ہوئے

موتی پروتے آتے ہیں نسرینِ دلستاں
آرائشِ بہارِ گلستاں لئے ہوئے

شبنم ہے برگِ گل پہ مئے رنگ و بو لئے
جامِ شراب، بادۂ غلطاں لئے ہوئے

بادِ نسیم آتی ہے مستی سے چور چور
جھونکوں میں بوئے نرگس و ریحاں لئے ہوئے

شاخیں لچکتی ہیں کہ ٹپکتی ہیں شوخیاں
کیفِ شبابِ حسن کا ساماں لئے ہوئے

کلیوں میں کمسنی کی لطافت بسی ہوئی
دوشیزگی، شباب کا عنواں لئے ہوئے

پھولوں میں بوئے بادۂ صافی کی شورشیں
کیفیتِ شراب کا ساماں لئے ہوئے

ہر گل ہے محوِ رقص برنگِ نسیمِ صبح
کیفیتِ تصورِ جاناں لئے ہوئے

سامانِ حشرِ شوق، بہ آہنگِ برہمی
لائی بہار مژدۂ باراں لئے ہوئے

موجوں میں کمسنی کی لطافت بہ ہر ادا
دریا تمام شوخیٔ ارماں لئے ہوئے

آتا ہے آبشار برنگِ شبابِ حسن
جوش و خروشِ محفلِ یاراں لئے ہوئے

ہونٹوں پہ اک تبسمِ رخشاں لئے ہوئے
آنکھوں میں سحرِ چشمِ غزالاں لئے ہوئے

آتا ہے کوئی بزمِ تخیل میں بے حجاب
رعبِ جمال و شوکتِ شاہاں لئے ہوئے

ہر جنبشِ نظر سے ٹپکتا ہے کیفِ عشق
ہر لغزشِ خرام، گلستاں لئے ہوئے

غمزہ ہر ایک جانِ تمنا بنا ہوا
ہر اک ادا شکوہِ سلیماں لئے ہوئے

تقویٰ گداز کفرِ جوانی کی شورشیں
آشفتگیٔ شوق کا ارماں لئے ہوئے

تجلّی شبابِ حسن کی دنیا نئے کیفیات
جنبش نظر کی فتنۂ دوراں لئے ہوئے

فرحتؔ یہ بزمِ شوق ہے سونی ترے بغیر
افسردگیٔ شمعِ شبستاں لئے ہوئے

"فنِ فسانہ"

ذیل کے چار مضمون "فنِ فسانہ" کے سلسلہ میں، دہلی ریڈیو اسٹیشن سے اگست ستمبر میں براڈکاسٹ ہوئے تھے۔ یہ عنوانات خود ریڈیو اسٹیشن کے تجویز کردہ ہیں۔ لیکن میرا ارادہ تھا کہ ان تقریروں کو ازسرِنو ڈھال کر اور ضروری عنوانات پر چند مضمون اور لکھ کر اسکو کتابچے کی شکل میں شائع کیا جائے۔ اسی دوران میں مکرمی ایڈیٹر صاحب ساقی کی طرف سے مطالبہ ہو گیا، اور ان کی تعمیل ارشاد میں یہ "تقریریں" اپنی اصلی صورت میں پیش کی جا رہی ہیں۔ بشرط مہلت انکو کتابی صورت میں بھی پیش کیا جائیگا۔

لطیف الدین احمد

افسانے کا پلاٹ

فنِ فسانہ کے تحت آج میری گفتگو کا موضوع افسانے کا پلاٹ ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اصل موضوع کے متعلق کچھ کہوں میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح افراد کے مزاج مختلف ہوتے ہیں اسی طرح قوموں کے مزاج بھی مختلف و مخصوص ہوتے ہیں، اور ہر قوم کا ادب اُس قوم کے مزاج کے سانچے میں ڈھلتا، اور خود اپنا ایک مزاج رکھتا ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے ادیب و انشاپرداز دوسری زبانوں سے استفادہ کرنے میں اُس حد کو پہچاننا نہیں چاہتے جس حد تک کہ ہماری زبان و ادب کا مزاج استفادے کی اجازت دے سکتا ہے، اور آنکھ بند کر کے انگریزی ادب کے اصول اختیار اور انکی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ ہماری یہ روش، میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ادب کو اپنی ذات میں مکمل ہو جانیکے درجے تک پہنچنے میں کوئی مدد نہ دیگی۔

میرا خیال ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہمارے ادیب اصولِ فن کے مرتب و مدون کرنے میں اندھی تقلید کو چھوڑ کر اپنے ادب کے مزاج کے مطابق ہی اس کے اصول بھی مرتب کریں۔ اس پہلو پر توجہ دلانے کی ضرورت مجھے اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ حال ہی میں فنِ فسانہ کے متعلق اُردو کی ایک کتاب میری نظر سے گزری جس کا نام ظاہر کرتا ہے کہ اس فن کے متعلق اس کتاب کے اندر سب کچھ ہے۔

اس کتاب کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مختصر قصّوں میں قصّے کا پلاٹ اور اُن کے افراد جب تک نہایت ڈرامائی نہ ہوں قصّہ بے لطف رہتا ہے۔ اسی کے ساتھ صاحبِ کتاب نے طویل ناول اور مختصر افسانے کے ٹکنیک اور اصول میں کوئی بین فرق بھی قائم نہیں کیا ہے۔ میرے نزدیک اندھی تقلید اسی کا نام ہے۔

مغربی ممالک میں طویل ناولوں کا آغاز اُس وقت ہوا جب کلیسا نے ڈراما کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ چنانچہ ڈراما کے اصول و عناصر بادنیٰ تغیر ناول میں بھی برقرار رہے۔ لیکن جہاں تک مختصر فسانے کا تعلق ہے خود یورپ میں اُسے ناول سے جُدا

ایک شے مانا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں ڈراما یا ناول کے اصول و عناصر مختصر فسانے میں جُوں کے تُوں کیونکر روا رکھے جاسکتے ہیں؟ مختصر فسانہ آج ایک نہایت ترقی یافتہ اور مستقل بالذات صنف ادب ہے، اس لئے اُس میں ڈراما اور ناول کی تمام خصوصیات کھپ بھی کب سکتی ہیں۔ اس کی ایک زبردست دلیل تو یہ ہے کہ ناول کے برخلاف مختصر افسانے میں ایک ہی کردار پیش کیا جاتا ہے، اور اگر کردار متعدد بھی ہوں تب بھی ان کی تعداد چند افراد سے آگے نہیں بڑھائی جاسکتی۔ ایسی صورت میں اس کے اندر نہ تو پلاٹ کی باقیدگی کا کمال دکھانا ممکن ہوسکتا ہے اور نہ ڈرامائی کشاکش پیش کرسکنے کا موقعہ حاصل ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ڈرامائی انداز کیلئے مُبالغہ ایک لازمی چیز ہے۔ مگر آج جبکہ صناعت کا یہ نظریہ عالمگیر ہوتا جاتا ہے کہ اُسے زندگی کے مطابق ہونا چاہیئے تو ایسی صورت میں صناعت، اور بالخصوص صناعت ادب، مُبالغے کو کیونکر برداشت کرسکتی ہے۔ میں اس حقیقت سے خالی الذہن نہیں کہ خود زندگی میں تصادم موجود ہے، اور اس تصادم ہی کا دوسرا نام ڈرامائی انداز بھی ہے، لیکن زندگی کا یہ تصادم جو ہمیں قدم قدم پر پیش آتا ہے، مُبالغے کے بغیر بھی اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے کہ اُس میں دلچسپی پیدا ہوسکے۔

آج بیسویں صدی کی ـــــ ترقی یافتہ ذہنیت واقعیت نگاری (ـــــ realism) کا مطالبہ کرتی اور صناعت ادب کو آورد و تصنع سے بالکل پاک دیکھنا چاہتی ہے۔ اِس ذہانت کا فیصلہ تو یہ ہے کہ وہ ادب پارے جن میں ڈرامائی سرعت واقعات پیش کی جائے ہر امتیاز سے عاری ہیں، رومانیت ناقابل التفات ہے، اور فسانے کے پلاٹ کا دروبست ایک طفلانہ حرکت ہے، اور ہم اگر چاہیں تو بادنےٰ تامل اندازہ بھی کرسکتے ہیں کہ اُس ادب میں جس کا مقصود قاری کو اس کے بطون سے متعارف کردینا یا آسان لفظوں میں انسان کو اسکی اپنی آتما کو پہچنوا دینا ہو، ڈراما کے مفروضات و مسلمات کی پیروی کرنا اس ادب کے حصولِ مقصد کے یقیناً خلاف ہوگا۔

ہر مُلک و قوم کے عصری ادب میں نہ صرف مختصر فسانوں بلکہ طویل ناولوں کا بھی موضوع و مقصد انسانی نفسیات کا تجزیہ و تحلیل قرار پاگیا ہے۔ اس لئے اکثر و بیشتر، اور اعلیٰ درجے کے فسانے ڈرامائی اصول کی پابندی سے مبّرا پائے جاتے ہیں، مگر ان کی دلچسپی و اثر آفرینی میں کوئی کمی نہیں آتی۔

مغربی ادیبوں نے پلاٹ کی جس قدر تعریفیں قائم کی ہیں اُن کا نچوڑ یہ ہوسکتا ہے کہ افرادِ قصہ کو جو واقعات پیش آئیں اور اُن سے جو افعال سرزد ہوں، جن کو دلچسپ بھی ہونا چاہیئے، مجموعی حیثیت سے پلاٹ کہلا ئینگے۔ یہ تعریف اپنی جگہ مکمل ہے، لیکن مختصر فسانے کی یہ تعریف زیادہ عصری اور جامع معلوم ہوتی ہے کہ کسی ایک واقعہ یا جذبے کی تاریخ بیان کردینا مختصر فسانہ ہے۔

الحاصل افسانے کی اس تعریف کے تحت، جہاں تک پلاٹ کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ مختصر فسانے میں "فطری پلاٹ" کا ہونا تو ناگزیر ہے، لیکن "فنی پلاٹ" کا مستلزم نہ ہونا چاہیئے۔ "فطری پلاٹ" سے میرا مفہوم یہ ہے کہ آپ فسانے نام سے جو کچھ بھی کہیں گے، یا جو واقعہ بھی بیان کیا جائیگا اس کے اندر خواہی نخواہی ایک پلاٹ موجود ہوگا۔ اور "فنی پلاٹ" میں اُس کو کہتا ہوں جس کے لئے "قالبی باقیدگی" ضروری بتائی جاتی ہے۔ پلاٹ کا مشجر کی طرح باقیدہ ہونا اس بات کو چاہتا ہے کہ اُسمیں

افرادِ قصہ متعدد ہوں۔ لیکن مختصر افسانے میں افرادِ فسانہ کی تعداد ایک مناسب حد سے آگے نہیں بڑھائی جاسکتی، ورنہ پلاٹ کا سُبک رہنا دُشوار ہوجائیگا، جو پلاٹ کا سب سے بڑا حُسن ہے۔ اسکے ماسوا ایسا فسانہ مختصر فسانے کی تعریف سے بھی نکل جائیگا۔ کیونکہ افرادِ قصہ کی کثرت زمان ومکان کی وحدت کے منافی ہے۔ اور جس پلاٹ میں سبک ہونے کے عوض بھدا پن آجاتا ہے اس میں آورد وتصنع کا عیب محسوس ہونے لگتا ہے۔

مختصر فسانے کے بُنیادی عُنصر پانچ ہیں۔ پہلی چیز تو فسانے کا مقصود ہے جسے بُنیادی خیال بھی کہا جاسکتا ہے، اسکو ہمیشہ مجرد ہونا چاہیئے۔ دوسرا نمبر مرکزی کردار فسانہ کا ہے، جس سے اُس مقصود کی تکمیل کرائی جائے گی۔ پھر ذرا سی تخیل کی ضرورت ہے جو رنگ آمیزی کریگی۔ اسکے بعد پلاٹ کا درجہ ہے کہ وہ تکمیل مقصود ہوگی کس طرح۔ اور آخر میں وحدتِ اثر کا نمبر ہے کہ پڑھنے والا ایک وقت میں اُسی ایک اثر سے متاثر ہو جو مصنف کا مقصد ہے۔ ان پانچ عناصر اولیہ کے بعد اختصارِ بیان، زمان ومکان، فضائے فسانہ، اور طرزِ بیان وغیرہ ہیں جنکو میں عناصر نہیں بلکہ اس کے ٹکنیک میں داخل سمجھتا ہوں۔

کسی ایک کردار کے بھی محض ذہنی تاثرات اور قلبی کیفیات کا بیان یعنی "یادِ ایام" یا "محویتِ خیال" وغیرہ بیان کرنا بھی مختصر فسانے کی تقسیم میں شامل ہے، اس لئے میرے خیال میں ایک فسانہ نگار کا طریق کار (method) یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فسانے کا مقصود جسے آپ غایتِ تصنیف بھی کہہ سکتے ہیں، قائم کرلینے کے بعد ایک مناسب اور خصوصی کردار وضع کرکے فسانہ سُنانا شروع کردے، اور پلاٹ کا بروز (development) فطری طریق پر ہوتا رہے۔ یعنی جہاں ضرورت کا تقاضا ہو دوسرے ذیلی کردار اور نئی صورت واقعہ (situation) پیدا ہوتی رہے۔ جو پلاٹ اس طرح بنے گا، میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ قرینِ فطرت ہوگا۔ کیونکہ ایسا پلاٹ مصنف کے مشاہدے اور تخیل کا ماحصل ہوگا، اور واقعیت نگاری کی حدود کے اندر رہے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے بُنیادی خیال قائم کیا جائے اور اس کی مناسبت وضرورت کے اعتبار سے جُملہ کردار مقرر کردئے جائیں، اور پھر دو چار ایسی صورتِ واقعہ ترتیب دے لی جائیں جو اصل مقصود کے ساتھ غیر متناسب بھی نہ ہوں اور کردار کے لئے غیر فطری بھی معلوم نہ ہوں۔ جب یہ خاکہ تیار ہوجائے تو فسانہ لکھنا شروع کیا اور اُس میں تخیل کی رنگ آمیزی کی جائے۔ لیکن اس طریق کار میں اکثر اوقات بناوٹ کا رنگ جھلک آتا ہے۔ کیونکہ مصنف کا خیال پابند ہوچکتا ہے اور اس کی تخیل کا فطری رُجحان اپنی گلکاریاں دکھانے کیلئے آزاد نہیں رہتا۔

میں اِس سے بے خبر نہیں کہ پلاٹ کا مکمل خاکہ پہلے سے طیار نہ کرنے بلکہ پلاٹ کو فسانے کے دوران بیان میں بروز دینے کو ترجیح دینے کو ناپسند کیا جائیگا اور ممکن ہے کہ کسی کی نظر میں مضحکہ خیز بھی ہو۔ لیکن میں معذور ہوں کیونکہ میں طبیعت وفطرت کا جلوہ زندگی کے ہر شعبے میں دیکھنا چاہتا ہوں، اور تقلید وتصنع، مکروریا سے طبیعت کو بیزاری ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہی ہے کہ اگر پہلے سے کوئی خاکہ بنالیا ہے تو دقت محسوس ہوئی اور گفتنی ناگفتہ رہگئی ہے۔ آورد وتصنع بقول اناٹول فرانس صداقت کے منافی ہے۔

وہی ڈرامائی اصول کو آنکھ بند کرکے اختیار کرلینے کی تقلیدی ذہنیت ہے جو مختصر فسانے میں بھی "پیچیدگی" "پیدا

کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مختصر فسانے میں زبردستی "پیچیدگی" پیدا کرنے سے مقصود فسانہ دھندلا پڑ جاتا ہے۔ لیکن اگر خود اُس واقعے کے اندر جو بیان کیا جا رہا ہے، کوئی پیچیدگی موجود ہے تو وہ فسانہ یقیناً زیادہ دلچسپ ہوگا۔ بہر حال پیچیدگی پیدا اسی فسانے میں کی جا سکے گی جس میں کردار متعدد ہوں گے۔ مگر پیچیدگی پیدا کرنے میں یہ فیصلہ کہ وہ کہاں فطری اور کہاں غیر فطری معلوم ہوگی، تمام تر مصنف کی سلامتی ذوق پر منحصر ہے۔ میں ذاتی طور پر پلاٹ کو پیچیدہ بنائے بغیر نتیجے کو توقف یا تعویق (suspense) میں ڈال دینے کو ترجیح دیتا ہوں۔ اس طرح پڑھنے والے کی دلچسپی آخر تک برقرار رکھی جا سکتی ہے۔

پلاٹ اور عمل (action) دراصل ایک ہی چیز ہے۔ پلاٹ کا بہت بڑا انحصار اس فضا و ماحول پر ہے جس میں مصنف اپنے کردار کو پیش کرتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہے کہ پلاٹ، فضا، اور کردار، یہ تینوں ایک دوسرے پر حصر رکھتے ہیں۔ ان تینوں کے مابین اگر کسی وقت بھی خفیف سا عدم تناسب رُونما ہو جاتا ہے تو فسانے کی صناعت کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

مختصر فسانے کے پلاٹ میں سب سے زیادہ مشکل موقعہ جس میں فسانہ نگار کے ذوق و وجدان کا امتحان ہوتا ہے وہ نئی صورت واقعہ (situation) کا پیدا کرنا ہے۔ اس کی صورت اور صناعت ہمارے ادب میں قصیدے کی گریز سے بہت مماثل ہے۔ واقعات کے بیان میں جب بھی نئی صورت واقعہ پیش کی جائے تو پڑھنے والے کو یہ محسوس ہونا چاہیئے کہ وہ صورت حال، بیان ما قبل کا فطری نتیجہ ہے، اور اس صورت کے سوا کوئی دوسری صورت ہو ہی نہ سکتی تھی۔

ظاہر ہے کہ پلاٹ جس چیز کا نام ہے وہ مختلف واقعات سے ترتیب پاتا ہے، اور یہ مختلف واقعات ایک بنیادی واقعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان ذیلی واقعات کو پیدا کر کے انہیں ایسے سلسلے میں لے آنا کہ وہ ایکدوسرے کا منطقی نتیجہ معلوم ہوں، اسی کا نام پلاٹ کی سادگی اور یہی اس کا سب سے بڑا حسن ہے۔ ترتیب واقعات میں، میرے نزدیک، مصنف کی توجہ اسپر زیادہ صرف ہونا چاہیئے کہ ہر واقعہ اپنی جگہ اس طرح پیش آئے کہ باوجود متوقع ہونیکے پڑھنے والیکو منہمک رکھ سکے۔

ایک فسانہ نگار کو جو صورت اکثر پیش آ سکتی ہے وہ یہ ہے کہ جب وہ کسی واقعہ یا جذبے سے متاثر ہو کر اسکو ایک فسانے کی صورت دینے لگتا ہے تو اُس کا تحت الشعور یا حافظہ بعض ایسے واقعات پیش کر دیتا ہے جو اُس کے مشاہدے میں پہلے آ چکے اور اس واقعہ یا جذبے سے فطری لگاؤ یا مناسبت رکھتے ہیں۔ ان واقعات کو اس طرح مربوط کر دینا کہ وہ آپس میں جان و جگر معلوم ہونے لگیں، بس یہی فسانہ نویسی کا فن ہے۔ ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ مصنف کے سامنے ایک کردار کی زندگی یا اس کی زندگی کے کسی خاص واقعے کا پورا علم ہوتا ہے اور وہ اسے بجنسہٖ یا معمولی اور خفیف تبدیلیوں کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ اس صورت میں فسانہ نگار کی تخلیقی قابلیت کو کم اور انتخابی صلاحیت کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اسکے برخلاف پہلی صورت میں مصنف کو واقعات و تخیل کی مرصع سازی کرنا پڑتی ہے۔

افسانے کا انداز بیان بھی دو نوعیت کا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ مصنف نے جو کچھ دیکھا یا سُنا ہو بس اُسی کو بیان کر دے، یعنی خارجی طور پر جو زندگی جس طرح بسر کی جاتی ہے، وہ اُسے خارجی شکل ہی میں پیش کر دے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ

جس زندگی کا بیان ہو اس میں مصنف یا تو اپنے تاثرات شامل کرتا جاتا ہے یا کردار فسانہ کے نفسیات کا تجزیہ و تحلیل کرتا ہے۔ اس عہد میں اسی نوع کی افسانہ نویسی زیادہ مقبول ہے۔

خارجی زندگی کو خارجی طریق ہی پر بیان کر دینے میں بالعموم ابتدا ابتدا سے ابتدا کی جاتی ہے جو ایک سپاٹ کہانی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسمیں ادیب کو دخل کم ہوتا یا ہوتا ہی نہیں ہے۔ لیکن جس فسانے میں کردار کی داخلی زندگی بیان کی جاتی ہے وہ بالعموم پلاٹ کے کسی اہم نقطے سے شروع کیا جاتا ہے اور حسب ضرورت افسانہ سمجھانے اور بیان کو واضح کرنے کے لئے اُس نقطے سے قبل کے بعض ضروری واقعات ضمناً بیان کر دئے جاتے ہیں۔ اس پیرایۂ بیان میں ادبی صناعت پیش کئے جانے کے لئے بہت گنجائش ہوتی ہے، اور اسی انداز کو قبولیت بھی حاصل ہے۔

ہمارے اہل قلم نے افسانے کو شعر کی طرح ایک الہامی چیز سمجھ لیا ہے، اور ایسے ہی دعووں کے ساتھ اپنی تصانیف کو پیش بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ فسانے اور الہام کے درمیان دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ البتہ افسانے کی عبارت میں شعریت پیدا کی جاسکتی ہے۔ لیکن وہ بھی ایک مناسب حد تک۔ بہت زیادہ ادبیت پیدا کر دینے سے فسانے کا مقصود اور اُسکی وحدت اثر بلاشبہ غارت ہو جاتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ فسانہ جب لکھا جا چکے اور اُس کی مرصع کاری جملہ پہلوؤں سے مکمل ہو تو شاید ہم اُسے بحیثیت مجموعی ایک شعر کہہ سکیں۔ لیکن وہ شعر بھی مشاہدہ و مکالمہ کے اظہار کی تکمیل کا شعر ہوگا، الہام نہ ہوگا۔

ابھی میں نے آپ سے کہا ہے کہ پلاٹ کا سُبک ہونا اُس کا سب سے بڑا حُسن ہے جو افرادِ قصہ کی کثرت سے باقی نہیں رہتا لیکن افسانے کے پلاٹ کو سُبک رکھنے کیلئے ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ کردار میں تنوع اور تضاد پیدا کیا جائے۔ اور وہ تنوع آخر فسانہ تک قائم رہ سکے۔

محض پلاٹ کی خاطر سے پلاٹ اختراع کرنا خامکاری سمجھی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف پلاٹ سازی کی صناعت اس میں ہے کہ واقعہ متعلقہ ایک اوسط طبیعت کے انسان میں جو مختلف انداز مزاج پیدا کر سکتا ہے، پلاٹ کی بنا اُس انداز پر رکھنا چاہیئے۔ پلاٹ اگر اس طرح بنایا جائیگا تو اُس میں کردار کی دانمود کے ساتھ مرکزی و بنیادی خیال کی دانمود کو بھی پورا موقعہ ملے گا۔

افسانے کے کردار

میری آج کی گفتگو کا موضوع افسانے کے کردار ہے۔ پچھلی گفتگو میں مَیں نے عناصر فسانہ کی تعداد پانچ بتائی تھی جسمیں مقصود فسانہ کو پہلے نمبر پر رکھا تھا۔ آج میں بتانا چاہتا ہوں کہ یورپ کے بعض ناقدوں کی رائے ہے کہ فسانے کے عناصر میں خود مصنف بھی شامل ہے، کیونکہ اُن کی رائے میں مقصود فسانہ، مصنف کی ذات سے الگ کوئی چیز نہیں یا یہ کہ مقصود اور مصنف ہم معنی الفاظ ہیں۔ چنانچہ اس لحاظ سے کہ مقصود، فسانے کا اصل اصول اور وہ نقطۂ آغاز ہے جس کے بغیر نہ کوئی خط کھینچا جاسکتا ہے اور نہ کوئی دائرہ بنایا جاسکتا ہے، تو پھر فسانے میں اس کے کردار کو پہلی جگہ حاصل ہو جاتی اور کردار اہم ترین عنصر فسانہ بن جاتا ہے۔ اسلئے ظاہر ہے کہ کردار کشی مصنف کی کتنی گہری توجہ اور کسقدر غور و فکر کا مرکز ہونا چاہیئے۔

بعض وقت نظر میں بھی نہیں آتا۔

ڈراما کی روایات کے تحت پرانی ناول نویسی میں یہ بات بھی ضروری سمجھی گئی تھی کہ جو فرد فسانہ ایکبار داخل قصّہ ہو گیا اسے خواہ مخواہ آخر تک نبھانا چاہیئے لیکن مختصر افسانہ اسکو بھی روا نہیں رکھتا۔ ایک فسانے میں کسی فرد فسانہ کا جتنا کام اور جب تک ضرورت ہو، اسی حد تک اسے فسانے میں داخل رہنا چاہیئے۔ اور اس کے کردار کو بروز بھی اسی حد تک ملنا چاہیئے کہ وہ مرکزی کردار کو اُبھارتا ہو۔ اور جیسے ہی اسکا کام ختم ہو، اسے فسانے سے خارج ہوجانا چاہیئے۔ کیونکہ ہر کردار کو فسانے کے رنگ، فسانے کے عمل، اور فسانے کی زندگی کا حقیقی جزو بن جانا لازمی چیز ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جب تک ایک کردار داخل فسانہ ہے اسکے فعل و عمل کا حصّہ، قصّے کا ناقابل ترک جزو معلوم ہو، اور یہ نظر آئے کہ اس کی شرکت کے بغیر پلاٹ اور افسانہ ناقص ہوتا، اس کا داخل فسانہ ہونا کسی وقت بھی برائے بیت محسوس نہ ہوگا۔

ایک فسانہ نگار کیلئے، بالخصوص اس صورت میں کہ وہ نفسیاتی انداز کے فسانے لکھتا ہو، یعنی اپنے کردار کا ذہنی تجزیہ پیش کرے، میری رائے میں مناسب موقعے پر اس کی تورانی اور اسکے قیافے کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کردینا بہتر ہوتا ہے۔ اس سے اُس کردار میں ایک قسم کا تشخص آجاتا، اور پڑھنے والے کو اُس کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور غالباً کردارکشی بھی مکمل ہوجاتی ہے۔

کردار کی صحیح نقاشی کے لئے فسانہ نگار کو یہ حقیقت ہر وقت سامنے رکھنا چاہیئے کہ انسان اپنی پوری زندگی میں ہر لحاظ سے تبدیل ہوتے رہنے کے باوجود تبدیل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک افسانہ نویس کے لئے اُس دُنیا کا جاننا ازبس ضروری ہے جس میں اسکے کردار پلتے بڑھتے ہیں۔ ایک کامیاب فنکار کا کردار اُسی وقت کامل سمجھا جائیگا جب پڑھنے والے کو ناچ کی کھس اور گھنگھروؤں کی جھنکار اند آنے لگے۔ اس لئے کہ کردار نگاری معطل مادے کو ذی رُوح کردینے کا نام بلکہ اس کا کام ذی رُوح کو زندگی گزارتے دکھا دینا ہے۔

ایک خاص اور اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ مختصر فسانے میں کسی کردار کی زندگی کے تمام پہلو پیش کرنے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے۔ جب کبھی ایسا کیا جائیگا، قاری کے ذہن میں اس کردار کی داخلی کیفیت کی تصویر کبھی قائم نہ ہوسکے گی۔ صاحب کمال فسانہ نگاروں کے یہاں ہمیشہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ایک کردار کی زندگی کے بعض خاص اور وسیع المعنی پہلو منتخب کرلیتے ہیں، اور اُنہیں خصوصیات کو روشن کرتے ہیں جو روشن کئے جانیکے قابل ہوتی ہیں۔ اگر یہ مدعا حاصل ہوجاتا ہے تو اس کردار کی عمومی فطرت کا دھندلا سا خاکہ پڑھنے والے کی نظر خیال کے سامنے ازخود قائم ہوجاتا ہے۔ کردار کی پوری زندگی کی تفصیل کرنے سے مقصودِ فسانہ چمک نہیں سکتا جو مختصر فسانہ کے عناصر خمسہ میں سے ہے۔ فوکس سے ایک ذرا باہر ہوکر تصویر زیادہ دلکش ہوجاتی ہے۔ اور خاکے کو ذرا سا دھندلا رکھنا بجائے خود ایک نزاکت فن ایک صناعانہ فعل ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس مقصد میں کامیاب ہوجانا فسانہ نگار کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔

ایک کردارکش فسانہ نویس کو یہ بات کبھی فراموش نہ ہونا چاہیئے کہ ہم بالطبع شکل ہی کو دیکھتے ہیں، یہ دیکھنا نہیں چاہتے کہ اس شکل کی تعمیر کن اجزا سے ہوئی ہے۔ ہمیں تو شکل کی بھی ایک ہی جھلک اس کا شدید اپنا دیتی ہے۔ اُس کا راز یہ ہے کہ

صناعت کو خوردبین سے واسطہ نہیں، چنانچہ کردار نویس کے لئے بہت ضروری ہے کہ وہ کردار کی صرف نمایاں اور جامع خصوصیات ہی پیش کرنے پر توجّہ صرف کرے۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ کردار کی دُنیا کا علم ہونا فسانہ نویس کے لئے لازمی چیز ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی نہایت ضروری ہے، کہ اُس کے کردار اپنی سماج سے پوری مُناسبت اور اپنے ماحول سے کلّی مطابقت رکھتے ہوں۔

انسانی زندگی کے مطالعہ نے فلسفیوں سے کہلوا دیا کہ زندگی ایک معمّہ ہے۔ انسان زندگی جیتا ہے یا زندگی انسان کو جلاتی ہے، بہرحال یہ جینے کا فعل بجائے خود ایک مجبوری ہے، اور یہ مجبوری فی نفسہٖ زندگی کا استہزا ہے۔ چنانچہ ہمارے چاروں طرف زندگی مُنہ بناتی نظر آتی ہے۔ کردار نگاری کی صناعت اِس میں ہے کہ وہ اپنے کردار کے اندر زندگی کے اس مُنہ بنانے کی نقاشی کر سکے۔ فاقہ کش کسان، پھٹے حال مزدور، کھُولو کا بیل کلرک، آبرو باختہ کسبی، خون آشام مہاجن، ظالم و بے رحم زمیندار، مُسرف و عیاش سرمایہ دار، غرض زندگی کے جُملہ مظاہر میں زندگی مُنہ بنا رہی ہے، اور وہ مظاہر فسانہ نویس کی زنبیل شعور و تحت الشعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے جو زندگی بیان کی جائے گی وہ واقعیت نگاری ہوگی۔ واقعیت نگاری محض پست طبقوں کی زندگی کے بیان تک محدود نہیں۔ کردار نگاری کا فرض ہے کہ پست طبقوں کی زندگی کا حُسن و قبح بھی بیان کرے اور اعلیٰ طبقوں کی زندگی کی دلفریبی و کراہت بھی۔ ہبوطِ آدم نے اولادِ آدم کو جیسا کچھ بنایا یا بگاڑا ہے، اُس بننے یا بگڑنے کو جیتا، سانسیں لیتا ہوا دِکھا دینا کمالِ فن ہے۔

ایک مُصنّف اگر حیاتِ انسانی کا صحیح مطالعہ کرتا اور زندگی کے ابتدار و آفات اسے مُتاثر کرتے ہیں، تو یہ تو ناممکن ہے کہ اُس کا دل دُنیا کی بے رحمیوں پر دُکھ نہ جاتا ہو، اور بیچارہ و مجبور انسان کے لئے اس کے دل میں ہمدردی کے بادل نہ اُمنڈتے ہوں۔ بلکہ حقیقت میں اس کے یہی محسوسات و جذبات اُسے زندگی کی نقاشی پر اُکساتے اور زندگی کے یہی پہلو اس کے فسانے کا مقصود قرار پاتے ہیں۔ لیکن کردار نویسی کی کامیاب صناعت کا راز یہ ہے کہ وہ متاثر ہونے کے باوجود اپنے کردار کے افعال و اعمال پر جج بن کر فیصلہ صادر نہ کرے، اور ایسا ہی بے تعلق رہے جیسے کہ فطرت انکو خلق کر کے بے تعلق ہو جاتی ہے۔ یہ کسی وقت معلوم نہ ہونا چاہیئے کہ مُصنّف اپنے کردار سے نفرت کر رہا ہے یا محبّت، اُسے غصّہ ہے یا رحم۔ کیونکہ اس کا کام حقیقی زندگی کو روشنی میں لانا ہے، اس پر جرح و تعدیل کرنا نہیں۔ اس مدعا کو حاصل کرنیکے لئے مُصنّف کی طبیعت میں کسی قدر تفلسف کا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ یہ بات کہ دُنیا بہرحال رہنے کے قابل جگہ ہے، اس لئے کہ اس میں ناقص خلقت اور بدر دیہ انسانوں کی کمی نہیں اور یہی وہ چیز ہے جو افسانے کا مسالہ اور اُس کا عمدہ موضوع ہے۔ فسانہ نویس میں اگر یہ خوبی نہیں، تو آپ اکثر دیکھیں گے کہ فسانہ نگار صاحب ہیروئن کے ساتھ خود عشق فرماتے ہیں اور اپنے رقیب کو جی بھر کے گالیاں دے رہے ہیں۔

ایک فسانہ کے اندر جتنے کردار بھی ہوں، ان کا فرضِ منصبی یہ ہونا چاہیئے کہ فسانے کی فضا کو برقرار رکھیں اور وہ فی المعنی مرکزی کردار کو اُبھارتے ہوں۔ یعنی فسانے کے واقعات کی پیچیدگی کے اندر سے (بشرطیکہ اس پلاٹ میں کوئی پیچیدگی ہو بھی) فسانہ کے پلاٹ کا بروز ہو، اور مرکزی کردار کا بروز باقی کردار کے اختلافی یا تائیدی فعال سے ہونا ہے

مُصنف کے خیال میں اگر اُلجھن ہوگی تو نہ صرف اس کا بیان ژولیدہ ہوگا بلکہ کردارکشی بھی صاف وصریح نہ ہوسکے گی۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ افسانہ نگار کو اپنے مُشاہدے کی مدد سے کردار کا تصوّر نہایت قطعیت کے ساتھ قائم کرنا پڑتا ہے، اور اُسے پیش کرتے وقت اُس کی حِس تناسب اور قدرت تنظیم سے کام لیتا ہے۔ اعلیٰ کردارکشی کے لئے ایک مُصنّف کے ذہن و ذکاء کا صحیح وتندرست ہونا بھی اشد ضروری ہے۔ یعنی اسکا محض تخیلی یا نرا شاعر ہونا حقیقی کردارکشی کے منافی ہے۔

اس عہد کی کردارکشی کے لئے مُصنّف کا مابعد الطبیعاتی رُجحان بھی فن وصناعت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ جس چیز کو دیکھے اُسی کو مانے، جسکو چھوئے اُسی کو تسلیم کرے۔

ایک فسانے میں جب متعدد کردار نقش کرنے ہوں تو یہ احتیاط بھی لازم ہے کہ اُن میں تنوّع اور تضاد ہو، کیونکہ تنوّع پلاٹ کو سُبک بنانے میں بہت ممد ثابت ہوتا ہے۔ تنوع کے بغیر پلاٹ یقیناً بھدّا ہو جاتا ہے۔ لیکن متعدد کرداروں میں تنوّع پیدا اور قائم رکھنے کے لئے مُصنّف کا مطالعہ وسیع اور مُشاہدہ عمیق ہونا لابدی ہے۔

کردارکشی کا یہ طریقہ زیادہ اثر آفریں سمجھا جاتا ہے کہ ان کے اعمال بلاواسطہ صادر ہوں۔ جو مُصنّف اپنے کردار کو بالواسطہ عمل کا عادی بناتے ہیں ان کو حصولِ مقصد میں دقّت پیش آتی ہے، بلکہ بعض اوقات تو وہ ناکام رہتے ہیں یعنی کردار کے افعال بعید الفہم معلوم ہونے لگتے ہیں۔

آخر میں، میں مکرّر کہونگا کہ کردارکشی منحصر ہے فسانہ نویس کے مُشاہدے کی گہرائی اور افعال انسانی کے نفسیاتی مطالعے کی عادت پر۔ اور چونکہ مشاہدہ و مطالعے کے مدارج ہیں اس لئے ایک فسانہ نویس کی کردارکشی اُسی مناسبت سے کامل یا ناقص ہوسکتی ہے۔ مُشاہدے اور مطالعے کے ساتھ طریق کار (method) اور طرزِ بیان وہ چیزیں ہیں جن سے کردار میں جان پڑتی ہے۔ کردار کو نمایاں کرنے یا اس کی فطرت کو دانمود دینے کا احسن طریق بحث اور تقابل ہے، اور ناقص پیرایہ خود مُصنّف کا تعارف۔ کردار نگاری کے لئے کردار کا تقابل فطرت کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ دولت و افلاس، مادیت و روحانیت، محبّت و منفرت وغیرہ اور اس تقابل کے اندر تناسب و توازن پیدا کرنا وہ چیز ہے جو مُصنّف کے اندر عقیدۂ حُسن کی دلیل ہے۔ انسان ناقص ہونے پر عقیدہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ مُصنّف کو فطرت یعنی حُسنِ بسیط پر عقیدہ ہے!

فسانے کی فضا

فنِ فسانہ کے تحت، آج کی گفتگو کا موضوع فسانے کی فضا ہے۔ مگر فضائے فسانہ کے متعلق یہ بتا سکنا کہ وہ کیا ہے اور کس طرح وجود میں لائی جاسکتی ہے۔ نہایت دُشوار معلوم ہورہا ہے۔ جہاں تک میرے محدود مطالعے کا تعلق ہے، مجھے اعتراف ہے کہ اس موضوع پر انگریزی زبان میں بھی، جو ہماری علمی ترقیوں کا ذریعہ ہے، میری نظر سے کوئی ایسی جامع تحریر نہیں گزری جس میں کسی کامل فن نے فضا پیدا کرنے کے اصول بہ لحاظ فن بتائے ہوں، بجز اس کے کہ مختلف ادبی تنقیدوں میں جستہ جستہ، فضائے فسانہ کی خوبی یا اس کے نقص کے متعلق ناقدوں کی قلم سے نکلے ہوئے چند فقرے

نظر سے گزرے ہوں۔ اِس لئے میں اپنے خیال کے مطابق یہ بتانے کی کوشش کرونگا کہ فسانے کی فضا کا تعلق کن باتوں سے ہے۔ لیکن اس اصولی بات کو پہلے ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ فضا پیدا کرنا فی نفسہٖ یہ معنی رکھتا ہے کہ مُصنّف ایک نوع کی صناعانہ چالاکی سے کام لیتا ہے۔

بہرصورت، میرے خیال میں فضائے فسانہ کا تعلق کردارِ فسانہ کی داخلی کیفیات سے ہوتا ہے، اور یہ فضا حسبِ موقعہ و ضرورت ایک منظر نقش کر کے بنائی جاتی ہے۔ یعنی جس موقعے کا بیان ہو، اور کردار کی جس ذہنی حالت اور دماغی کیفیت کو پیش کرنا مقصود ہو، اس کے مناسب حال گرد و پیش کی بعض ایسی چیزوں کی طرف چند ایسے اشارے کئے جائیں جس سے ایک ذی حیات اور اثر آفریں تصویر یا مرقعہ، پڑھنے والے کی نگاہ خیال کے سامنے آجائے۔ اور یہ مُرقع اپنے اثر کے لحاظ سے اِس قسم کا ہونا چاہیئے کہ جو کردار متعلقہ کی داخلی حالت و کیفیت سے کلی طور پر ہم آہنگ و ہمنوا ہو، اس کے افعال و اعمال کا محرّک اور ممد ہو، اور اس کی رُوح یا نفس سے آمیز ہوتا ہو۔

جس قسم کی زندگی فسانے کا موضوع ہے اُس کے تفصیلی بیان (description) کے لئے اگر جزئیاتی اور طویل تصریح کی جائے گی تو فضا پیدا ہونے کے عوض غارت ہوجائے گی۔ کیونکہ مقصود تو کردار کی نفسیاتی حالت کو دانمود دینا ہوتا ہے، اور تفصیلات کا طویل بیان ظاہر ہے کہ کردار کو قاری کی نگاہ خیال کے سامنے سے ہٹا دے گا۔ مختصر فسانے میں اختصارِ بیان بھی لازمی ہے۔ چنانچہ ضرورت صرف اتنی ہوتی ہے کہ مختصر فقروں میں، پُرمعنی الفاظ کے استعمال سے، سُبک طریق پر آس پاس کے منظر کے چند ایسے مخصوص اور نمایاں خط و خال پیش کئے جائیں کہ پڑھنے والے کی توجہ کا مرکز خود وہ منظر نہ بن جائے، بلکہ اس منظر کا اثر اس کے ذہن میں قائم ہوجائے، اور وہ کردار کو اُس اثر ہی کی روشنی میں یا اس اثر کی عینک سے دیکھ سکے۔ اور چونکہ کردار کی حالت اُس منظر کے اثر سے مطابقت رکھتی ہے، کردارِ فسانہ اور فسانے کا پڑھنے والا ایک ہی اثر سے متاثر ہونگے۔ ان کے مابین اشتراکِ حال پیدا ہوجائیگا اور قاری کو کردار کے ساتھ ہمدردی ہوجائے گی۔ وہ اس کے جذبات اور حسیات کو کامل طور پر سمجھ سکے گا۔ مگر یہ بات اُسی صورت میں ممکن ہوسکتی ہے کہ فسانہ نویس نے اِس منظر کے مخصوص خط و خال کو اس طرح چھوا ہو کہ پورا منظر نقش کئے بغیر اثر تو پورے منظر کا پیدا ہو، مگر کردار اور قاری کے سامنے چند ہی چیزیں آئی ہیں۔

اس قسم کی منظر کشی ہر ایک کے لئے دشوار ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا تمام تر مدار خود مُصنّف کے مزاج اور طبیعت پر ہوتا ہے کہ کسی قدرتی منظر کو دیکھ کر وہ خود کس طرح متاثر ہوتا ہے، اُسے کس شوق و انہماک کے ساتھ دیکھتا ہے، اور اُس سے کس حد تک لُطف اندوز یا منغص ہوتا ہے مظاہرِ فطرت کو وہ کس احساسِ انبساط یا کس احساسِ الم کے تحت سمجھتا ہے۔

ایک کامیاب فسانہ نویس کے لئے ضروری ہے کہ اُسے مظاہرِ قدرت سے دلی لگاؤ ہو۔ وہ ہزار در ہزار وضع و قطع کے برگستان و بوستان، مرغزار و گلزار کی رُوحوں سے آشنا ہو۔ گنگناتے ہوئے چشموں کے بول سمجھتا ہو، بادلوں کے نیرنگ کو دیکھ سکتا ہو۔ اُسے ان ہزار در ہزار شکلوں سے شناسائی ہونا چاہیئے جو کائنات میں چار و ناچار

بکھری ہوئی ہیں، اور اس کی تخیل و فکر اسے یہ سمجھنے کے قابل بنا دے کہ یہ بے شمار اور رانگنت شکلیں اور جسم بالآخر دو ہی صورتوں میں ختم ہوتے ہیں ــــ محبت اور موت کی صورتوں میں!

ایک افسانہ نگار جب فطرت اور اس کے مظاہر سے، اسکے تضاد اور ہم آہنگی سے، اور خود اس تضاد کی ہم آہنگی کے رازوں سے آشنا ہوگا تو بلاشبہ وہ اپنے مقصود کو صحیح طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہو سکے گا۔

فسانے کی فضا پیدا کرنے میں سب سے بڑا نقص یہ سمجھا جاتا ہے کہ کردار اپنے آس پاس کی طرف سے بے خیال معلوم ہو، اس سے گہری دلچسپی لیتا محسوس نہ ہو، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ کردار افسانہ اور منظر متعلقہ کو باہمدیگر، داخلی طور پر ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اور افسانہ نگار کی صناعت کا اہم راز اس بات میں ہے کہ وہ اس ہم آہنگی کے صحیح اظہار پر قدرت رکھتا ہو۔ اس کے اندر اس امر کا صحیح اندازہ کر سکنے کی استعداد ہو کہ ماحول پیدا کرنے کے لئے صرف وہ باتیں انتخاب کرے اور اسی حد تک بیان کرے جتنا کہ خود اس میں اور اس کے کردار افسانہ میں، نیز اسکے کردار میں اور منظر متعلقہ میں اشتراک ہو۔ اس کی مزید توضیح کے لئے یوں سمجھئے کہ فضا کے اندر سے کردار ابھریں اور کردار کے اندر سے اُس کے افعال اس طرح صادر ہوں جیسے ایک متناسب الاعضاء، ایک سڈول جسم کے جوان چہرے سے زندگی ہویدا ہوتی ہے ــ یعنی اس میں حسنِ تناسب بدرجۂ اتم ہونا چاہیئے۔

غالباً میں یہ واضح کر سکا ہوں کہ فسانے کی فضا کے لئے خود مصنف، منظر متعلقہ، کردار افسانہ، اور افسانہ پڑھنے والے کی داخلی کیفیات کا ایک ہونا فضائے فسانہ کی تکمیل ہے۔

حسنِ تناسب کا کامل ہونا وہ اصول اور حقیقت ہے جو کردار افسانہ کے عنوان میں بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی کہ فضائے فسانہ کے بیان میں۔ میں نے اپنی پچھلی گفتگو میں کہا ہے کہ فسانہ اگر یہی زندگی کا مرقعہ ہے تو اس کے بیان میں کردار کی اٹھان ایسی ہو کہ ہمیں اناج کی بھس اور کٹی کی بھکراند آنے لگے۔ فضائے فسانہ کے ذیل میں بھی اس کی اتنی ہی ضرورت ہے۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنیکا صناعتی پہلو یہ ہے کہ بھس اور بھکراند تو محسوس ہو مگر اناج اور کٹی کا نام نہ لیا جائے۔ یعنی یہ اثر بالواسطہ پیدا کیا جائے۔

پلاٹ کے ضمن میں میں نے آپکو بتایا ہے کہ پلاٹ، کردار، اور ماحول فسانہ باہمدیگر حصر رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ نے محسوس بھی کیا ہوگا کہ مجھے بعض ان باتوں کی طرف مکرر اشارہ کرنا پڑا ہے جو میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ یہ ناگزیر بھی تھا۔ بہر صورت ان تینوں عناصر فسانہ سے متعلق، فسانہ نگار کے لئے اُس کا طریق کار (method) ہی ایک وہ چیز ہے جسکی خوبی یا خرابی کے ساتھ فضائے فسانہ کی تخلیق وابستہ ہے۔ فسانہ نگار کے طریق کار کے متعلق میں اپنی آیندہ گفتگو میں مزید اظہار خیال کرونگا جو طرز بیان پر ہوگی۔

زندگی کے نیرنگ کا مطالعہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ زندگی کا مدار بھی مدارج پر ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ موسیقی کا مدار اسکے زیر و بم پر ہے یا نقاشی کا مدار ہلکے اور گہرے رنگوں کے امتزاج پر۔

چنانچہ جب سازوں کے تار کامل طور پر مل جاتے ہیں تو ایک ایسی فضا وجود میں آجاتی ہے جس کے اثر سے سننے

والا داخلی طور پر عالم کثیف سے باہر پہنچ جاتا ہے۔ اور ایک تصویر میں جب ہلکے اور گہرے رنگ صحیح طور پر ہم آہنگ ہوجاتے ہیں تو دیکھنے والا تصویر کی فضا کے اندر داخل ہوکر اپنے بطون سے ہمنوا ہوجاتا ہے یہی حال شاعر اور ادیب کی صناعت کا ہے کہ جب وہ صحیح فضا پیدا کرلیگا، پڑھنے والا کردار فسانہ کے تاثر سے متاثر ہوجائیگا جو دراصل خود مصنف کا تاثر ہوگا۔ میرے نزدیک صاحبِ کمال فسانہ نویس کی کامیابی کا راز یہی ہے۔

اس لئے، فسانے کی فضا پیدا کرنے کے معنی یہ ہوئے کہ مصنف جو کچھ دیکھتا ہے وہ قاری کو بھی دکھادے، جس طرح خود متاثر ہوتا ہے پڑھنے والے کو بھی محسوس کرادے۔ اور یہ کہ فسانہ نویس جس قماش کی بھی مخلوق وضع کرتا ہے، اُسے ایسے ماحول میں پیدا کرے جہاں اس کا خلق ہونا قرینِ فطرت ہو، اور جب وہ فسانہ پڑھا جاتے تو پڑھنے والے کو بھی وہ سب کچھ نظر آنے لگے، وہ سب کچھ محسوس ہونے لگے۔

فسانے کی فضا، فسانے کے آغاز میں پیدا کرکے اسے آخر تک برقرار رکھنا اور نبھائے جانا مقصودِ فسانہ کو کبھی دھندلا نہ ہونے دیگا، اور ہر نئی صورت واقعہ کے شمول سے کردار چمکتا جائیگا۔ لیکن اگر شروع ہی میں فضا تیار نہیں کی گئی ہے تو فسانے کا ناکام رہنا یقینی ہوتا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ فضائے فسانہ کے باب میں میرا مافی الضمیر بخوبی واضح ہوجائے۔ اسلئے میں انگریزی کے ایک رومانی فسانے کا مختصر اقتباس پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس اقتباس کو پڑھکر آپ میری گفتگو کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ سُنیئے:۔

"ایک دوشیزہ باغ کے وسط میں بیٹھی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں گہرے رنگ کے پھول ہیں، پُشت پر ایک پتلی ندی بل کھاتی ہوئی بہہ رہی ہے، کنارے پر کہیں کہیں بانس کے جھنڈ ہیں، اور ایک عجیب قسم کا پرند کھڑا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

اس مختصر تصویر میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک لڑکی ہے، کچھ شوخ رنگ پھول ہیں، بل کھاتی ہوئی پتلی سی ندی ہے، بستان کے دو چار جھنڈ ہیں، اور کنارے پر ایک تنہا پرند کھڑا ہے۔ مگر منظر کے ان چند خط و خال میں مجھے وہ سارا منظر اپنی تفصیلات کے ساتھ نظر آرہا ہے جو اس تصویر کے آس پاس ہوسکتا ہے۔ اور اس منظر کی ساری فضا جو اس تصویر سے پیدا ہے میری روح میں پیوست ہوئی جارہی ہے۔ اسی اقتباس کا آگے کا ٹکڑا یہ ہے:۔

"لڑکی کے قریب ایک درخت ہے جس میں بڑے بڑے پھل لٹک رہے ہیں۔ یہ درخت طرفہ طریق پر عام درختوں کے خلاف متناسب ہے۔ لیکن عام درختوں کی طرح اس میں بھی وہ بے نام شے موجود ہے جو ہمیں محسوس کرادیتی ہے کہ درختوں میں جان ہے اور وہ انسان کے دوست ہیں۔ وہ لڑکی ٹکٹکی باندھے ہم کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی مذور اور نیلگوں آنکھیں، اور وہ پھول بھی جو اس کے ہاتھ میں تھے، ہمیں گھورتے معلوم ہوتے تھے۔"

پہلے ٹکڑے میں تنہا پرند اور دوسرے میں تنہا درخت، اس لڑکی کی تنہائی کی طرف اشارہ ہے۔ یقیناً آپ محسوس

کر رہے ہونگے کہ اس مختصر بیان سے اُس لڑکی کی حیران نظری اور حیران خیالی، دونوں کا اظہار مقصود ہے۔ لڑکی کی گول آنکھوں اور اُن پھولوں کو بھی گھُورتا ہوا دِکھانا، لڑکی کے گھُورنے کو صناعت ادب کے منتہائے کمال پر پہنچا دیتا ہے۔ اسکے ٹکٹکی باندھکر دیکھنے سے اُس کی معصومیت اور الھڑپن کا علم ہوجاتا ہے۔ درخت کا غیر معمولی تناسب اور اُس میں نورس پھلوں کا ذکر اُس دوشیزہ کی جوانی و جمال سے استعارہ ہے۔ درخت کی طرفگی و ندرت دوشیزہ کی نادر شخصیت کی رمز ہے۔ اور پھر درخت کے اندر اس شے خاص کی موجودگی کا اشارہ ہے جو تمام درختوں میں مشترک ہوتی ہے۔ لڑکی کے اندر اجتماعی زندگی کی آرزو پروری، شوق، اور روح کا نکتہ ہے۔

مختصر لفظوں کے اس جامع اقتباس سے شعریت و ادبیت اور اس کی صناعت کے ساتھ منظر کشی کا کمال، کردار کشی کی معراج، اور افسانہ نویسی کا معجزہ پیش کردیا گیا ہے۔ دوشیزہ کی جو تصویر اور اس کی فطرت اساس جو ان مختصر جملوں میں دکھادی گئی ہے، اس میں اسقدر امکانات مخفی ہیں کہ اس کا کردار خود بخود بروز پا سکتا ہے۔ وہ کچھ نہیں جانتی ہؔ، معصوم ہے، لیکن محبت کی پزیرائی کے لئے طیار ہے۔ جس ماحول کے اندر یہ لڑکی پیش کی گئی ہے' وہ اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کی محبت پاکیزہ ہوگی۔ اس کے ہاتھ میں روشن پھول ہیں، یعنی وہ اپنے کلہائے محبوبی کا تحفہ محبت کے شوالے پر چڑھانے کے لئے تیار ہے۔

ادب کے اس پرُصناعت نمونے میں آپ نے دیکھا کہ مختلف قسم کی چیزیں بے ربط ہونے کے باوجود کتنی باربط ہیں؟ ایک کی حالت کا اثر دوسری کے ساتھ کس درجہ ہم آہنگ ہے، ہر شے منفرد ہے لیکن اثر آفرینی نے اُن کو پانی کی موجوں کا ایک سلسلہ بنادیا ہے۔ اِس منظر نگاری کا مجموعی اثر فضا پیدا کر رہا ہے۔ کیونکہ اس نقاشی میں اثر کی تکمیل دیکھی گئی ہے" اور موضوع کے مفہوم میں تسلسل اور اس کے ساتھ حسّی و کیفیاتی سلسلہ و ربط بھی ہے۔

افسانے کا طرزِ بیان

افسانے کے پلاٹ، کردار، اور فضا، کے بعد میری آج کی گفتگو کا موضوع فسانے کا طرزِ بیان ہے۔ ادبیات میں تخیل کو رُوح اور طرزِ بیان کو جسم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ادب کی تحسین اور ادیب کا کمال اس میں سمجھا جاتا ہے کہ اُس کی ہر تحریر، نظم ہو یا نثر، حشو و زوائد سے پاک ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس میں کوئی لفظ یا کوئی بات بھرتی کی نہ ہو۔ چونکہ مختصر فسانہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں قلیل وقفے کے اندر مختصر الفاظ میں ایک فسانیکے مقصود کو مکمل طور پر پیش کرنا، اور وسیع مفہوم کو سمجھادینا پڑتا ہے، اور چونکہ اس میں تمام تفصیلات بیان نہیں کی جاسکتیں اور مفہوم و مطلب کی طرف اشارہ سازی سے کام لیا جاتا ہے، اس لئے یہ دعوے نہیں کیا جاسکتا کہ وہ یعنی فسانہ پڑھنے والے کو اپنے مقصود کا یقین دلاسکتا ہے۔ مختصر فسانہ ایک قاری کو متحرک کرسکتا ہے، اس سے شورش کرا سکتا ہے، لیکن اس کے اندر اپنے مقصود کا یقین پیدا کرنیکا مدعی نہیں ہوسکتا۔

الغرض کسی تحریر کو بھرتی سے پاک رکھنے کے لئے فسانے کے طرزِ بیان کا نادر ہونا ضروری ہے۔ طرزِ بیان کا حُسن اسی میں ہے کہ تحریر میں ایک لفظ، ایک فقرہ، یا ایک صورتِ واقعہ (situations) ایسی نہ ہو جسکو اگر نکال دیا جائے تو عبارت بے ربط یا مطلب خبط ہو جائے۔

کم سے کم الفاظ کا استعمال فصاحت کا اصول ہے، بشرطیکہ مفہوم میں الجھاؤ پیدا نہ ہو لیکن مختصر فسانے میں فصاحت کے خیال سے قطع نظر، زیادہ سے زیادہ مفہوم بیان کرنیکے لئے محذوفات و مقدرات سے خاص طور پر کام لینا پڑتا ہے۔ ایک ایک پیرے اور صفحے کا کام لفظوں اور فقروں سے لیا جانا ازبس لازمی ہوتا ہے۔ اس لئے فسانہ نویس کو بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مقدرات و محذوفات سے عبارت ایسی مبہم نہ ہو جائے کہ مفہوم خبط اور جملے بے ربط نظر آئیں۔

فسانے کا یہ طرزِ بیان، میرے خیال میں، زیادہ دلکش ہوتا ہے کہ کردار فسانہ کے جن حالات اور واقعات کا تعلق اصل قصّہ اور مقصودِ فسانہ سے نہ ہو، لیکن قصّے کو سمجھانے یا کردار کو ابھارنے کے لئے اُن کا بیان ناگزیر ہو جائے تو اُن میں سے صرف وہ حصے ضمنی طور پر بیان کئے جائیں، اور اس طرح بیان کئے جائیں کہ وہ اصل فسانے میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے ہوں، پلاٹ کو واضح، اور کردار کو سریع الفہم بناتے ہوں۔

ہر عمدہ انشا کے لئے زورِ بیان لازمی چیز ہے۔ طرزِ بیان کمزور ہوگی تو فسانہ یقیناً غیر دلکش ہوگا اور غیر حقیقی نظر آئیگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بیان کا پھیکا ہونا یا فسانے کا غیر حقیقی نظر آنا اسکا سب سے بڑا نقص ہے۔

زورِ بیان کے علاوہ طرزِ بیان میں زبان کی گھلاوٹ اور روانی جس قدر زیادہ ہوگی، الفاظ کا انتخاب جتنا متناسب، اور فقروں کا دروبست جتنا چُست ہوگا، اس کا حُسن اسی قدر بڑھ جائیگا۔ حسین طرزِ بیان میں انداز کی قطعیت بھی اس کے لازمی اجزا میں سے ہے۔ لیکن طرزِ بیان میں زور اسی حالت میں پیدا ہو سکتا ہے جبکہ موقعہ کی مناسبت کے اعتبار سے اِس میں جذبات کی کثرت و شدّت ہو، اس میں گہرے اور نازک حسیات بیان کئے گئے ہوں اور جہاں تک ممکن ہو خیال و بیان، دونوں میں انتہا کی صفائی ہو۔

افسانے کے بروز میں اگر کسی وقت مقصودِ فسانہ مبہم ہوگا تو اُس کا سبب طرزِ بیان کا نقص یا اس کی کمزوری ہوگا۔ اس کے برعکس مقصودِ فسانہ کو، ہر تائیدی صورتِ واقعہ کے شمول اور ضروری تفصیلات کے اضافے سے نمایاں اور واضح تر ہوتے رہنا چاہیئے۔

مختصر فسانے کی غایت ایک مجرد اثر پیدا کرنا ہے، اور یہ اثر مترتب ہو سکتا ہے ضروری تفصیلات کے صناعانہ اِن اور تائیدی صورتِ واقعہ کے صحیح انتخاب سے۔ اسلئے تفصیلات وہ مخصوص و مختصر تفصیلات ہوں جو فسانے کی فضا مائی ہوں، کردار کو بروز دیتی ہوں، اور اثر میں اضافہ کرتی ہوں، فضا کو غیر ہم آہنگ کرنے، کردار کے بروز کو نہ روکیں، اور اثر کو زائل کرنے والی نہ ہوں۔ اور تائیدی صورتِ واقعہ وہی منتخب کی جائیں جو اصل اثر آفرینی میں ممد ثابت ہوں، اُس کو ابہام میں نہ ڈالیں۔

ہر مُصنّف کا طریقِ کار (method) جُدا ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کی ذاتی اور خصوصی چیز ہے۔ افسانے میں مطلوبہ اثر ایک مُصنّف اپنے طریقِ کار سے پیدا کرتا ہے، اور اس اثر کے پیدا ہونے سے فضا بھی بنتی چلی جاتی ہے اور یہی وہ موقعہ بھی ہوتا ہے جب افسانہ نویس کو زمان و مکاں پر قُدرت ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی فضا کی تکمیل یا اسکا ناقص ہونا مُصنّف کے طریقِ کار کی خوبی یا خرابی پر منحصر ہے۔ افسانہ نگار کا طریقِ کار جو اس کے طرزِ بیان کے ساتھ وابستہ ہے، اس کے کردار کو بولتی چالتی تصویریں، گوشت و پوست کے انسان بنا دیتا ہے، اسکے پاس تنہا ذریعہ یہی ہے جس پر کہ زندگی کا سچا نقش کھینچنے کا مدار ہے۔

طرزِ بیان میں بالواسطہ اثر آفرینی زیادہ بہتر طریقہ ہے۔ بے واسطہ اور براہِ راست اثر پیدا کرنے میں ایک افسانہ نگار کو حتیٰ الامکان تامل ہونا چاہیئے۔ اور جہاں تک طرزِ بیان کی تزئین اور آرائش کا تعلق ہے، اسے محض ہلکے لمس تک محدود رکھنا مناسب ہے۔ بالواسطہ اثر آفرینی اور اشاراتی آرائشِ کلام سے فسانہ پڑھنے والے کو فسانہ حقیقی معلوم ہونے لگے گا۔ اگر اثر آفرینی کا طریقہ بے واسطہ اور تزئینِ عبارت بھدّی ہے تو فسانہ پہلی نظر میں غیر حقیقی معلوم ہوگا۔

ایک اور چیز جو طرزِ بیان کے لئے ضروری ہے وہ عبارت کی صوری و معنوی ہم آہنگی ہے یعنی الفاظ کا انتخاب اور ترتیب مفہوم کی نوعیت کے لحاظ سے ہوئی ہو۔ الفاظ کا باہمی ربط و توازن مفہوم کے مناسبِ حال ہو۔ فسانے کی خوبی یہ ہے کہ شروع کرنے کے بعد سے آخر تک قاری کی توجہ اس میں جذب رہے اور دلچسپی اگر بڑھتی نہ رہے تو قائم تو ضرور رکھی جاسکے۔

قاری کی توجہ اور دلچسپی قائم رکھنے کے لئے پہلے اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ صورتِ واقعہ کا انتخاب نہایت صحیح ہو۔ پھر طرزِ بیان کی شگفتگی اور طریقِ کار کی ندرت کام دیتی ہے۔ فطری صورتِ واقعہ کا صحیح انتخاب اور طرزِ بیان وطریقِ کار کی شگفتگی و ندرت طویل ناول کے مقابلے میں مختصر فسانے میں بآسانی حاصل کی جاسکتی ہے۔ طویل ناول میں ان باتوں کو تا بہ آخر نبھا سکنا کاملِ فن ہی کا کام ہوتا ہے۔

میں نے اپنی پچھلی گفتگو میں بتایا ہے کہ فسانے کے بروز میں ایک صورتِ واقعہ بیان کرنیکے بعد نئی صورتِ واقعہ کی طرف گریز قصیدے کی گریز سے مماثل ہے۔ یعنی جب نئی صورتِ واقعہ بیان ہونے لگے تو واقعات کا باہمی ربط ایسا ہو کہ پڑھنے والا اس گریز کو محسوس نہ کرسکے۔ طرزِ بیان جو اختیار کیا جاتے وہ موضوعِ فسانہ کے رُتبے کے موافق ہونا چاہیئے۔ اسکو انگریزی میں (scale of values) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

افسانے کی کامیابی صرف طرزِ بیان پر موقوف ہے۔ طرزِ بیان میں کسی موقعہ پر ابہام پیدا نہ ہو، اسے چشمے کے پانی کی طرح صاف و شفاف ہونا چاہیئے اور اس میں اُسی پانی کی سی روانی بھی ہو۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک چشمے کی طرح جس کا پانی کہیں گہرا ہوتا ہے اور کہیں اُتھلا، لیکن اس کی روانی اور بہاؤ ہر جگہ حسین نظر آتا ہے اسی طرح طرزِ بیان بھی گہرا اور اُتھلا ہوسکتا ہے، مگر اس کی روانی ہر جگہ حسین نظر آنا چاہیئے۔ آپ کے مُشاہدے میں آیا ہوگا کہ صاف و شفاف چشمے کی تہ میں بلور کے رنگین ٹکڑے اس پانی کو بھی رنگین دکھاتے ہیں، اور کسی چشمے میں تو کہیں واقعی سچے جواہر بھی چمکتے مل جاتے ہیں۔

بالکل یہی صورت طرزِ بیان کی ہے۔ اس کے مفہوم کہیں گہرے ہونگے کہیں سطحی، مگر جا بجا بلور پاروں کی سی رنگینی جھلکتی دکھائی دیگی، اور کسی وقت جواہر ریزوں کی تاب و تابش بھی دکھائی دیجانے گی۔

زمان و مکان کی وحدت اور اسکا ہم آہنگ رہنا، طرزِ بیان سے اسلئے قریبی تعلق رکھتا ہے کہ اگر ان دونوں میں کسی وقت تصادم رونما ہو جاتا ہے تو وہ ایک ادبی حادثے اور صدمے کا سبب بن جاتا ہے، جو فنِ فسانہ میں ناروا سمجھا جاتا ہے۔

طرزِ بیان اگر شگفتہ ہے تو اُس میں مُصنّف کا جمالیاتی ذوق بہ طرزِ احسن ہوئے کار آسکتا ہے۔ طرز اور عبارت اگر سُبک ہے تو مصنف کے لئے سہل ہوتا ہے کہ وہ دھنک کی نیرنگی، ریشم کی چمک، مخمل کی نرمی، اور پھولوں کی مہک، اس طرح پیش کردے کہ خود اس کی طرزِ بیان زیادہ نازک و نظر فریب بن جائے۔ اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے کہ وہ جواہر کی رنگینی، اُن کی جوت اور دمک کی مُرصّع کاری اس طرح کرسکے کہ طرز زیادہ لطیف ہونے کے ساتھ زیادہ قدر و قیمت کے قابل بھی ہوجائے۔ یہی اجزا ہیں کہ جن کے صناعانہ استعمال سے فسانے میں پلاٹ کے تار و پود کے بغیر بھی، ایک خوشرنگ قالینی بناوٹ پیدا کی جاسکتی ہے۔

ایک افسانہ نگار کو کسی وقت بھی یہ نکتہ نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ کردار کی نقاشی اس کے ماحول کی مناسبت سے اگر ثقیل یا شوخ ہو جائیگی تو باوجود زندگی کے مطابق ہونے کے بھی وہ زندہ نہ معلوم ہوگا۔ کیونکہ خود افسانے اور اسی کے ساتھ تائیدی کرداروں میں عدم تناسب کا نقص پیدا ہو جائیگا اور یہ تصنع اور آورد کی شکل ہے۔ اِس لئے بہت احتیاط لازم ہوتی ہے کہ فسانہ نویس کردار کشی یا منظر نگاری میں اپنی حسِ تناسب کا صحیح استعمال کرے، تاکہ اس کے بنائے ہوئے مُرقعے موقعہ و محل کی مناسب حد سے گھٹ بڑھ نہ جائیں۔ لیکن یہ حسِ تناسب ایک فطری ودیعت ہے جسے تعلیم، تربیت اور ماحول سے مدد ملتی ہے۔

ایک دوسری احتیاط جو فسانہ نگار کے لئے ضروری ہوتی ہے وہ یکسانیت (monotony) سے بچنا ہے۔ اسلئے ایک مُصنّف کی فرہنگ الفاظ کا وسیع ہونا بہت ضروری چیز ہے۔ چُنانچہ آپنے ادبی تنقیدوں میں پڑھا ہوگا۔ کہ مُصنّفوں کے مستعملہ الفاظ کی تعداد بھی دیکھی اور شمار کی گئی ہے۔ فرہنگ کا وسیع ہونا بجائے خود ایک کمال ہے۔ لیکن بالعموم ہوتا یہ ہے کہ جب ایک ادیب کی طرز قائم ہو جاتی ہے تو پھر اُس کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا بھی تو وہ استعمال کم ہوتا ہے۔ آپ جس مُصنّف کی جونسی کتاب بھی اُٹھائیگا آپ اُس کے خاص خاص الفاظ اور مخصوص اندازِ بیان و ادائے خیال کی تکرار پائیگا۔ کسی ادیب کی فرہنگ کا محدود ہونا ہرچند کہ خوبی نہیں بلکہ ایک نقص ہے، لیکن اگر ایسا ہے تو اس افسانہ نویس کو پلاٹ قائم کرکے کردار وضع کرنے میں دقّت و زحمت کم ہوتی ہے۔ کیونکہ دماغ میں خیال پیدا ہوتا ہے اس کے لئے دماغ ہی الفاظ بھی پیش کر دیتا ہے۔ چُنانچہ جتنی جس کی فرہنگ ہوگی اسی کے مطابق خیال بھی اُس کے دماغ میں پیدا ہوگا۔ یعنی اسے تلاشِ الفاظ نہ کرنا پڑیگی۔ لیکن اگر کسی کی فرہنگ وسیع ہے اور ایک ہی خیال کے لئے اس کے حافظے میں متعدد الفاظ جمع ہیں تو یہ بات اس کے لئے گونہ دقّت کا موجب ہوتی ہے۔ کیونکہ اسکو صحیح اور مناسب ترین

لفظ اس خیال کو ادا کرنے کے لئے قائم کرنا پڑتا ہے۔ مگر جب اسے اپنی وسیع فرہنگ میں صحیح اور مناسب لفظ مل جاتا ہے تو اس کی ادبی پیداوار یقیناً اس محدود فرہنگ والے مصنّف کی پیداوار سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ غرض کہ محدود ذخیرہ الفاظ والے افسانہ نویس کے لئے آسان ہوتا ہے کہ ایکبار موضوع و مقصود قائم کر کے، محدود طریق پر افسانہ بیان کرنا شروع کر دے۔ اُسے بہت سوچنا نہیں پڑتا۔ اس کا پلاٹ بن جانیکے بعد کردار بروز پانے رہتے ہیں اسکے خیال و الفاظ میں کشاکش نہیں ہوتی یا شاذ ہوتی مگر شدید نہیں ہوتی۔ اسے اظہار خیال کے لئے مناسب ترین لفظ کے انتخاب پر غور نہیں کرنا پڑتا یا بہت کم کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ سوچا لفظوں میں جاتا ہے اس لئے اس کا خیال انہیں الفاظ کی حد کے اندر رہتا ہے جو اس کا حافظہ پیش کر سکتا ہے۔ یہ محدود اور وسیع فرہنگ کی بحث میرے لئے یوں ناگزیر تھی مجھے آپ کے سامنے یہ نکتہ پیش کرنا ہے کہ محدود فرہنگ والا مُصنّف، کثیر الالفاظ مُصنّف کے مقابلے میں بے واسطہ اثر آفرینی سے تو قاصر رہتا ہے، لیکن وہ خیال آفرینی اور اشارہ سازی میں بسہولت کامیاب ہوسکتا ہے۔ اور ہرچند اُسے یہ سہولت حاصل ہوتی ہے، مگر یہ خطرہ بھی ہر وقت ہوتا ہے کہ جب اُس کا خیال اس کے الفاظ کی رسائی سے اونچا ہو جائیگا، اس کا اِظہارِ بیان ہمیشہ ناقص و نامکمل رہے گا۔ اور اظہارِ خیال کا ناقص ہونا، طرزِ بیان کو ناقص کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

فسانے کے طرزِ بیان کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ شروع میں لہجہ کو نہ سُست رکھا جائے اور پھر بتدریج زور پیدا ہوتا جائے۔ بعض نامور مُصنّفین کے اس انداز کی تعریف کی گئی ہے، لیکن میری ناچیز رائے میں یہ صورت صناعت ادب کی کوئی اعلیٰ مظہر نہیں ہے۔ میں تو اس انداز کو قابلِ ترجیح سمجھتا ہوں کہ فسانے کی اُٹھان کے ساتھ طرزِ بیان میں پوری قوت و توانائی کا اظہار ہو اور وہ آخر تک قائم رکھا جائے۔ طرزِ بیان کی ہمواری میری رائے میں ادبی حُسن ہے اور اس کی ناہمواری بہت بڑا نقص۔

طرزِ بیان کی دلکشی کے لئے اس میں اس طریقے کو مُرجح سمجھتا ہوں کہ کردار کے جذبات کبھی خود اس کے مُنہ سے براہِ راست بیان نہ کرائے جائیں، بلکہ بالواسطہ یعنی اس کے عمل (action) سے بیان ہوں یا تائیدی کردار افسانہ کے ذریعہ سے بیان ہوں۔ آپکو خود بارہا تجربہ ہوا ہوگا کہ ایک شخص کی تکلیف یا خوشی کا بیان خود اسکے مُنہ سے سُنکر آپ اتنے متاثر نہیں ہوئے ہیں جتنا کہ خود قیاس یا اندازہ کرنے سے۔ اور چونکہ افسانے کا مقصد پڑھنے والے کو کردار کے تاثر کی حد تک متاثر کرنا ہے، اِسلئے ہمیشہ بالواسطہ اثر پیدا کرنا زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے مگر بالواسطہ اثر آفرینی میں دستگاہ ہونے کو ایک مدّت درکار ہوتی ہے۔

آورد اور تصنع جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ناکام اثر رہتی ہے، اُسی طرح افسانے کے طرزِ بیان میں اُس کا ناکام رہنا یقینی ہے۔ شاندار و خوشنما الفاظ اور سطحی مضامین حسین طرزِ بیان کو بھی بے جان بنا دیتے ہیں ایک صاحبِ فن افسانہ نویس محض عبارت آرائی سے اتنا ہی پرہیز کرتا ہے جتنا کوئی کسی معبد کو گندہ کرنے سے ابا کرسکتا ہے۔

روایتی طرزِ بیان اور پلاٹ کی سادگی سے مصنف کو پورا موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی صناعت ادب کو بروئے کار لا سکے۔ حسنِ بیان کا مقتضا رہے کہ جذبات کو عریاں نہ کیا جائے۔ محبت کے بیان کو پاکیزہ رکھنا اور اس میں عمومیت یا سوقیت پیدا نہ ہونے دینا طرزِ بیان کے کمال کی دلیل ہے، ایک مصنف اگر اپنے فن میں کامل ہے تو وہ اکثر اوقات خیالات کے اظہار، احساسات کے بیان، لفظی مُرقعوں میں الفاظ کے متوازن استعمال سے صورت واقعہ پیدا کر سکتا ہے۔ اور اسکو طرزِ بیان کی معراج کہا جا سکتا ہے۔ طرزِ بیان ایک بے حقیقت بات یا واقعہ کو ایک اعلےٰ بات یا دلچسپ واقعہ بنا سکتی ہے، ارضی چیزیں سمائی بنجا سکتی ہیں اور کثیف نوری ہو سکتا ہے۔

آخر میں یہ اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بتانے اور سکھانے سے آدمی بہت کچھ جان جاتا ہے، لیکن جو چیز کہ واقعی غیر فانی ادب پیدا کراتی ہے وہ اسباق و بیانات نہیں، بلکہ صحیح ذوق اور صحیح حس تناسب ہے، اور ذوق کے بارے میں بیدلؔ کا فیصلہ یہ ہے کہ ع

طبع سلیم فضل است ارث پدر نہ باشد!

ل۔ احمد

تجلّیات

درد پا کر ہمہ تن دل نہیں ہونے پاتے
ہم ترے عشق کے قابل نہیں ہونے پاتے

اشک بنجاتے ہیں وہ خونِ جگر کے قطرے
قصۂ غم کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

ڈوب سکتے نہیں ہم بحر میں طوفانوں سے
یعنی آسودۂ ساحل نہیں ہونے پاتے

دیر و کعبہ ہیں بالفاظِ دگر وہ سجدے
جو مرے عجز میں شامل نہیں ہونے پاتے

بے محابا نگۂ شوق تجھے دیکھتی ہے
اب حجابات بھی حائل نہیں ہونے پاتے

کر دیا شوقِ طلب نے ہمیں گم کردۂ راہ
ہم سرِ جادۂ منزل نہیں ہونے پاتے

صورتِ شمع جلے بزم میں تیری برسوں
پھر بھی ہم رونقِ محفل نہیں ہونے پاتے

ہے کمی شوقِ شہادت میں دمِ قتل کہ ہم
قوتِ بازوئے قاتل نہیں ہونے پاتے

روزِ فردا بھی قیامت نہیں ہوتا تابشؔ
اُن کے وعدے ہیں کہ باطل نہیں ہونے پاتے

تابشؔ دہلوی

شاعرِ درماندہ

زندگی تیرے لئے بسترِ سنجاب و سمور،
اور میرے لئے افرنگ کی دریوزہ گری،
عافیت کوشیِ آبا کے طفیل۔

میں ہوں درماندہ و بےچارہ ادیب
خستۂ فکرِ معاش!
پارۂ نانِ جویں کے لئے محتاج ہیں ہم
ہیں، مرے دوست، مرے سینکڑوں اربابِ وطن!

تجھے اِک شاعرِ درماندہ کی اُمید نہ تھی
مجھ سے جس روز ستارہ ترا وابستہ ہوا
تو سمجھتی تھی کہ اِک روز مرا ذہنِ رسا
اور مرے علم و ہُنر،
بحر و بر سے تری زینت کو گہر لائیں گے
میرے رستے میں جو حائل ہوں مرے تیرہ نصیب

کیوں دعائیں تری بے کار نہ جائیں
اور راتوں کے سجود اور نیاز
(جسکا باعث مرا الحاد بھی ہے!)

اے مری شمع شبستانِ وفا۔
بھول جا میرے لئے
زندگی خواب کی آسودہ فراموشی ہے
تجھے معلوم ہے مشرق کا خُدا کوئی نہیں
اور اگر ہے تو سرا پردۂ نسیاں میں ہے
تُو مسرت ہے مری تو مری بیداری ہے
مجھے آغوش میں لے
دو "انا" مل کے جہاں سوز بنیں
اور جس نور کی ہے تجھکو دُعاؤں میں تلاش
آپ ہی آپ ہویدا ہو جائے!

ن۔م۔راشد

حدیثِ میکدہ

نیرنگِ روزگار میں کیفِ دوام دیکھ
ساقی کی مست آنکھ سے گردش میں جام دیکھ

قدرت کی سیر کر، ترے ہوش و جنوں کی خیر
یہ گلستانِ صبح، یہ صحرائے شام دیکھ

کیا دیکھتا ہے غفلت و ہوش اس نگاہ کے
غافل حیاتِ غم کے فنا و دوام دیکھ

کل تک کھلا نہ تھا مرے دل کا معاملہ
آج اک جہانِ راز کو بے ننگ و نام دیکھ

بے جنبشِ نظر کے ہے یہ پرسشِ نہاں
یہ خاص ادائے لطف یہ اندازِ عام دیکھ

چشمِ سیاہ کار مٹاتی ہے۔ مٹ بھی جا
حشرِ حیات دیکھ، لبوں کا پیام دیکھ

بیکس نہیں ہے عشق بہت ہے نگاہِ ناز
کیا تجھکو میرے درد سے، تو اپنا کام دیکھ

ظلمت سرائے دہر میں کچھ روشنی سی ہے
اک رات کاروانِ عدم کا قیام دیکھ

یہ انقلاب ہے کہ یہ ہر جنبشِ نگاہ
ماضی و حال سب کے الٹتے نظام دیکھ

محرومیاں نہ دیکھ دلِ تشنہ کام کی
بزمِ نشاط، جلوۂ مے، چھلکے جام دیکھ

یوں ہی نہیں ہیں نرگسِ رعنا کی گردشیں
ہر دور، ہر سکونِ نظر، ہر مقام دیکھ

بس اک نگاہ حاصلِ بزمِ نشاط ہے
روئے نگار دیکھ، مئے لالہ فام دیکھ

دنیا کو دیکھ لے کہ وہ دنیا نہیں رہی
برقِ نگاہ کا اثرِ ناتمام دیکھ

رعنائیٔ خیال کو سمجھا جمالِ یار
یہ زعمِ عشق دیکھ، یہ سودائے خام دیکھ

ہیں زلفِ خم بہ خم میں ہی شامِ ابد کی سیر
صبحِ الست دیکھ، نظر کا پیام دیکھ

اٹھتی ہے چشمِ ساقیٔ میخانہ بزم پر
یہ وقت وہ نہیں کہ حلال و حرام دیکھ

ہیں موجِ نورِ گنگ و جمن جام ساقیا
یہ رات، یہ مقام، یہ ماہِ تمام دیکھ

وا بس گرانِ رنج و غمِ روزگار سے
اٹھ اور جلوہ ہائے نشاطِ دوام دیکھ

ہر سانس موجِ بادۂ سر جوش ہے فراق
ہستی کو ماورائے فنا و دوام دیکھ

فراق گورکھپوری

ثمرِ گناہ

مجھے پہاڑ پر آئے کئی روز ہو چکے تھے۔ یہاں نہ کوئی میرا ملنے جلنے والا نہ میری کسی سے جان پہچان۔ اور اس پر طبیعت کچھ ایسی پائی ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں سے میل ملاپ پیدا کرنا مجھے پسند نہیں۔ تنہائی اور سکوت ہو تو اطمینان سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ سچ ہے۔ ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را۔ خیر! میں نے یہاں اپنے لئے ایک دستور العمل بنا رکھا تھا۔ صبح گھومنے چلا جاتا۔ بارہ بجے کھانا کھا کر ذرا آرام کرتا۔ پھر برآمدے میں بیٹھ کر کوئی کتاب یا اخبار دیکھتا۔ اور پانچ بجے چائے پی کر پھر وہی گھوما گھامی۔

آبادی سے کچھ فاصلے پر ایک آبشار تھا لیکن بارش شروع ہو جانے کے باعث میں یہ جگہ ابھی تک نہ دیکھ سکا تھا۔ "مانسون" کے ختم ہوتے ہی دن کو دھوپ خاصی نکلنے لگی۔ اور اکثر شگفتہ مقامات پر پکنک پارٹیاں بھی نظر آنے لگیں۔ ایک روز میں بھی یہ آبشار دیکھنے کے ارادے سے گھر سے چلا۔ سڑک بہت ناہموار تھی۔ دائیں جانب پہاڑ تھے اور بائیں طرف وادیاں۔ اور ان ہی وادیوں میں کہیں کہیں آبادیاں بھی تھیں۔ یہی پانچ پانچ دس دس گھر۔ آبادی کے قریب لبِ سڑک اکثر لڑکے اور لڑکیاں ہرے ہرے بھٹے بیچتے نظر آتے۔ پیسے میں ایک بھٹا ملتا۔ پہاڑ کی جانب چٹانوں پر سے جا بجا پانی ٹپکتا تھا۔ کہیں سڑک پر درخت اس قدر جھک آئے تھے کہ ایک محراب سی بن گئی تھی۔ بائیں جانب وادیوں کے دامن میں پانی کے دھارے سیماب کی طرح چمکتے نظر آتے۔

راستہ چونکہ اُترائی پر تھا اس لئے سفر جلد ختم ہو گیا۔ یوں تو دُور ہی سے آبشار کی شورشوں کی آواز کچھ ایسی معلوم ہوتی جیسے کہیں باجا سا بج رہا ہو۔ لیکن پاس پہنچ کر جو منظر دیکھا وہ بھی کچھ کم دلکش نہ تھا پانی بلندی پر سے نیچے گر رہا تھا۔ اتنا صاف کہ بلور کی چادر کا دھوکا ہوتا۔ پاس ہی ایک دیو قامت پیڑ کے سایہ میں ایک سادھو پتّوں کی چھتری کے نیچے دُھونی رمائے بیٹھا تھا۔ سادھو کی برف کی طرح سپید سپید جٹیں تھیں، سُرخ سُرخ آنکھیں۔ ناخن کچھ بڑھے ہوئے۔ پیٹ کمر سے لگا ہوا۔ اور بدن پر بھبھوت رمائی تھی۔ پاس ہی کوئی تین ایک سال کی بچّی کھیل رہی تھی۔ معصومیت بھولے پن کی تصویر سمجھئے۔ ہلکے سُنہری گھنگھریالے بال تھے۔ کنول ایسی پیاری پیاری آنکھیں تھیں۔ گورے چٹے چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھ اور چاند ایسا خوبصورت چہرہ تھا۔ اِس ویرانے میں خاک کی اس پتلی پر حورِ جنّت کا دھوکا ہوتا جیسے کردگارِ عالم نے اس گسائیں کے اطمینانِ خاطر کے لئے شاید عرش سے فرش پر بھیج دیا تھا۔

میں آبشار سے ذرا ہٹ کر ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔ تھرموس میں چائے کچھ بسکٹ اور سینڈوچ ہمراہ ساتھ لیتا آیا تھا۔ وہی نکال کر کھانے لگا۔ ننھی سی بچّی نے بھولے پن

سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک بسکٹ اُس کی طرف بڑھاکر کہا۔ "لو بیٹا!"

بچّی نے دوسری طرف مُنہ موڑ لیا۔

"آؤ۔ لے لو!" میں نے پھر کہا۔

"لے لو اَندرا!" سادہو نے محبّت سے بچّی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بچّی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ میں نے پاس جاکر دو چار بسکٹ اس کی گود میں ڈال دیئے۔

"یہ آپ کی بچّی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بھگوان کی دیا ہے!" سادہو نے جواب دیا اور مُسکرا مُسکرا کر بچّی کی طرف دیکھنے لگا۔

"آپ کس دیس سے آئے ہیں؟"

"لاہور سے!" میں نے جواب دیا۔

"بڑا نگر ہے!" سادہو بولا۔

"آپ نے دیکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!" سادہو بولا۔ "میرا دیکھا ہے!" پھر ہنسکر "یہاں تو آپ کا دل نہ لگتا ہوگا؟"

"کیوں؟" میں نے چائے کی پیالی مُنہ سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ "یہاں کس چیز کی کمی ہے؟"

"شہر کی باتیں کہاں بابا!" سادہو نے مُسکراکر کہا۔ "وہاں زندگی کی بہار یہاں اُداسی کا عالم!"

"جی ہاں!" میں نے کہا۔ "وہ آج کل جہنّم ہے جنّت۔ رہی شہر کی زندگی تو میں اس سکوت پر ایسی ہزاروں زندگیاں قربان کردوں۔"

یہ سُنکر سادہو کچھ مُسکراکر بولا۔

"بھلا کہیئے تو سہی یہاں کی کونسی چیز آپ کے من کو بھائی؟"

"ایک ہو تو کہوں بھی!" میں نے جواب دیا۔ "ذرا اس کہسار ہی کو دیکھ لیجئے، کتنا شادابی اور زیبائش جلوہ نما ہے۔ یہ آس پاس کے مناظر دیکھئے۔ کتنے پاکیزہ اور دلکش ہیں۔ پھر یہ آبشار کس قدر دل آویز ہے اور پھر یہ سبزہ گویا ایک جام زمردیں ہے۔ یہاں نہ فکر نہ آلام۔ زندگی تمنّاؤں اور ارمانوں کے دکھ سے پاک۔ کھانے کو پھل پھلواری، پینے کو چشموں کا ٹھنڈا پانی اور دل بہلانے کو یہ مناظرِ قدرت اور سماعِ طیور!"

سادہو نے ہنسکر سر جُھکا لیا۔

ایک زرد رنگ کی تیتری کہیں سے آگئی۔ اَندرا اُسے پکڑنے کے لئے پتھروں پر اِدھر اُدھر جھپٹنے لگی اسی کشمکش میں غریب کا پاؤں پھسلا اور وہ مُنہ کے بل گری۔ سادہو نے لپک کر اُسے اُٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ بچّی رونے لگی۔

"ماں ایسے ہی وقت یاد آتی ہے!" بیساختہ میرے مُنہ سے نکلا۔

"کیا یاد آتی ہے اس ننّھی جان کو!" سادہو بچّی کو تھپکتے ہوئے بولا۔ "اچھا ہوا غریب دُکھوں سے چھوٹ گئی!"

"کیا مرگئی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں مرگئی!" سادہو بولا۔ "بہت دُکھ بھوگے غریب نے۔ افسوس! آپ کی سماج کے قوانین بہت ظالمانہ ہیں!"

میں نے سادہو کی طرف تعجب سے دیکھا۔ اَندرا ابھی بسور رہی تھی اور وہ اسے بہلا رہا تھا لیکن کچھ اس محبّت کے ساتھ کہ معلوم ہوتا کہ اَندرا کے چوٹ نہیں لگی بلکہ سادہو کے دل کا زخم دُکھ گیا ہے۔ وہ بچّی کو پیار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ بھی کہیں کا انصاف ہے کہ ظلم تو کرے مرد اور دُکھ سہے

خمیازہ عورت غریب کو بھگتنا پڑے۔ وہ عورت جسے دیوتاؤں کی سینکڑوں برس کی التجاؤں کے بعد برہما جی نے رُوپ دے کر اس سنسار میں بھیجا۔ جو مرد کے لئے درد اور پریم لے کر آئی۔ جو مرد کے لئے محبّت کا تحفہ لائی۔ جس کی محبّت میں مرد کے ہزار دُکھ کا درماں مستور ہے جو اس دھرتی پر مرد کے لئے بھگوان کی دیا کا روپ ہے۔"

پھر اندرا کو تھپک کر۔ "میری اندرا کی ماں کا خُون آپ لوگوں کی گردن پر ہے۔ آپ تعلیم اور تہذیب کے علم بردار بنے پھرتے ہیں۔ سماج کے لئے قوانین بناتے ہیں۔ قوموں کو رسم و رواج میں جکڑتے ہیں۔ یہ سب گندم نُما جَو فروشی ہے۔ آکاس کے منڈل پر آپ کے مظالم اس طرح چمک رہے ہیں۔ جیسے اندھیری راتوں میں تارے۔ لیکن دیکھتے وہی ہیں جنہیں بھگوان نے آنکھیں دی ہیں۔"

"سچ ہے!" میں نے کہا۔

"اگر سچ ہے!" سادھو بولا۔ "تو پھر آپ اس کی اصلاح کیوں نہیں کرتے؟ بابا! جی تو آپ بھی رہے ہیں اور ہم بھی۔ لیکن حقیقت میں جینا اُسی کا ہے جو مُلک اور دھرم کی سیوا کرے۔"

میں چُپکا ہو رہا۔ بچّی سادھو کی گود میں سو گئی تھی۔ سادھو نے اسے ایک کمبل پر لٹا دیا اور ایک کونہ اوپر ڈال دیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"جانے! میں کیا واہی تباہی بک رہا تھا۔ بھُول ہوئی معاف کر دیجئے!"

"نہیں!" میں نے کہا۔ "آپ نے جو کچھ کہا سچ کہا ہی!"

"سچ کہا ہے یا جھوٹ!" سادھو کہنے لگا۔ "اُس کا علم تو بھگوان کو ہوگا۔ لیکن اس بچّی کے دُکھ کی ذمہ دار یہ آپکی سماج ہے۔"

"یہ بچّی آپکی نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میری ہی ہے!" اس نے بچّی کی طرف محبّت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "خیال تو کیجئے! اس عمر میں ماں کی محبّت سے محروم ہو جانا کتنا دُکھ ہے۔ پاپ کی فضا میں پیدا ہونا کتنا ظلم ہے۔"

"پاپ کی فضا!" میں نے تعجب سے کہا۔ "کیا مطلب؟"

"ارے بابا!" سادھو بولا۔ "تم یہ پاپ کی کہانی سُنکر کیا لو گے۔"

"کچھ ہرج ہے تو نہ کہیئے!" میں نے کہا۔

"ہرج و رنج کچھ بھی نہیں۔" سادھو نے جواب دیا۔ "ایک دُکھیا کی داستان ہے تم بھی سُن لو! بہت دن ہوئے شہر سے کوئی پونے میل پر جمنا جی کے کنارے ایک آم کے پیڑ کے نیچے میرا ڈیرا تھا۔ تم جانو! ہم سادھو لوگوں کو یہی بَن۔ پہاڑ اور دریا ایسی جگہیں پسند آتی ہیں۔ جہاں اُداسی ہو تنہائی ہو ہمارے من کا کنول کھِلتا ہے۔ من کی جوت جگانے کا مزا ملتا ہے۔ تم شہر کے رہنے والے اِس آکاس کے منڈل کے نیچے رہنے کا لُطف کیا جانو۔ جب شب کو تاروں کی سبھا سجتی ہے تو آنکھ پتیم سے لڑتی ہے اور وحدت کے جلوے نظر آتے ہیں۔ جلوت میں خلوت کا مزا ملتا ہے۔ کوئی بستی پاس ہوئی تو بھوجن بھی بھگوان بھیج دیتے ہیں نہیں تو جنگل کی پھل پھلواری سے ہی پیٹ بھر لیا۔"

میں سر جُھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

"سُنتے ہو بابا!" ساون رُت تھی اور کالی رات۔ ہر طرف خاموشی اور سنّاٹا۔ جمنا جی کا پانی تاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی

روشنی میں چمک رہا تھا۔ میں اسی طرح چھتری لگائے بیٹھا تھا کہ کہیں پاس سے ایک بچّے کے رونے کی آواز سُنائی دینے لگی۔ ساتھ ہی

"اے بھگوان! اس کلیجے کے ٹکڑے کو کس کے
سُپرد کروں۔ اسے پانی میں ڈالتے ہوئے بھی
میرا کلیجہ پھٹتا ہے۔ یہ پاپ کی گٹھری کہاں
لئے پھروں!"

یہ سُنکر میرے دل میں کچھ اضطراب سا پیدا ہوا۔ میں اُٹھ کر آواز کے رُخ پر ہولیا۔ سرکنڈوں کے پاس ایک جوان عورت ایک بچے کو جمنا جی کے کنارے گھاس پر لٹائے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ آہٹ پاکر وہ کچھ خوفزدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"بیٹی!" میں نے پاس جاکر پوچھا۔ "تم کون ہو؟ کیوں روتی ہو؟"

اُس نے روتے ہوئے میرے پاؤں پر سر رکھ دیا۔

میں نے پھر پوچھا۔

"بیٹی! تم کون ہو۔ یہاں ایسے میں کیا کرتی ہو؟"

"مہاراج!" اُس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی "میں ایک دُکھیا ہوں۔ دیا کیجئے مہاراج! اِس دھرتی میں میرے لئے سُکھ نہیں!"

یہ کہتے ہوئے اُس نے پھر میرے پاؤں پکڑ لئے۔

"چنتا نہ کرو بیٹی!" میں نے کہا۔ "بھگوان دیا کرینگے"۔

بچہ بلک رہا تھا میں نے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور کہا

"اِس غریب کو یہاں کیوں ڈال رکھا ہے؟"

"مہاراج!" وہ روتے ہوئے بولی۔ "اِس پاپ کی گٹھری کو کہاں لئے پھروں؟"

"پاپ کی گٹھری!" میں نے تعجب سے کہا۔ "تو یہ تمہارا بچہ نہیں ہے؟"

"میری ہی بچی ہے" اُس نے جواب دیا۔

"تو پھر اِسے پاپ کی گٹھری کیوں کہا؟" میں نے پوچھا۔

"مہاراج!" وہ ہاتھ جوڑ کر بولی "میری آپ سے اتنی بنتی ہے کہ آپ اس بچی کو لے لیں"

"اِس کا باپ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"باپ!" یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ پھر رونے لگی۔

"باپ!" میں نے ہولے سے کہا۔ "آخر تم ہو کون؟"

"آپ میری بپتا سُنیں گے مہاراج!" وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"ہاں کیوں نہیں!" میں نے کہا۔ "سُنوں گا"

وہ دوپٹے سے آنسو پونچھ کر بولی:۔

"میری اِس بپتا کے ذمہ دار میرے ماتا پتا ہیں۔ میرے پتا گاؤں میں آٹے دال کی دُکان کرتے تھے اور دھن دولت کو دھرم سمجھتے تھے۔ وہ جب دُکان بڑھا کر گھر آتے تو مجھے گود میں لے کر کہا کرتے۔

"اندرا! اِس جگ میں دھن ہی تو دھرم ہے۔ تُو سیانی ہو تو میں تیرا بیاہ کروں اور رُپیاں بھر بھر کر دے دوں"۔

آخر میں جوان ہوئی۔ اِدھر اُدھر سے پیغام آنے لگے لیکن میرا سنجوگ ایک پینسٹھ سال کے بُوڑھے کھوسٹ سے ہوا۔ یہ شخص پاس کے قصبے میں رہتا تھا۔ پہلی بیوی مر چکی تھی۔ بے اولاد تھا اور اُس کے یہاں دولت کا مینہ برستا تھا۔ میرے پتا بہت خوش تھے۔ اُنہیں مُنہ مانگی مُراد مل گئی۔ برات اِس دھوم دھام سے آئی کہ آس پاس کے گاؤں والے دیکھنے آئے۔ اتنے بھاری جوڑے اور سونے کا گہنا پاتا

میرے سلئے آیا کہ دیکھنے والیوں کو میری قسمت پر رشک ہونے لگا۔ دولہا پالکی میں سوار تھا۔ دو آدمیوں نے سہارا دیکر اُتارا۔ چہرے پر جھُرّیاں تھیں۔ ہاتھ پنجۂ مریم کی طرح سوکھے ہوئے۔ بے نُور سی آنکھیں۔ نہ مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔

سُسرال آئی تو ایک بُوڑھی چچی نے مجھے پنیس سے اُتارا۔ اور ایک سیاہ فام سے جوان آدمی نے ماتا کہہ کر مجھے پرنام کیا۔ لیکن میرے پتی کا یہ حال تھا کہ کھاٹ پر بیٹھے کسی ہل جُتتے بیل کی طرح ہانپ رہے تھے سُسرال میں میرے لئے دھن دولت کی تو کمی نہ تھی لیکن زندگی موت سے بدتر تھی۔ خیال تو کیجئے! کہاں ایک سولہ سترہ برس کی کنیا کہاں ایک پینسٹھ سال کا بُوڑھا۔ میرا بیاہ ہوئے بہت دن ہو چکے تھے۔ میرے سوامی کو جب مجھ پر بہت پیار آتا تو میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہتے۔

'اندرا! بس ایک چاند سا بیٹا تجھے دیدے چاند سا!'

وہ سیاہ فام آدمی جس نے پہلے روز مجھے ماتا کہہ کر پرنام کیا تھا۔ گھر کا کام کاج سب اسی کے سپرد تھا۔ اس کا نام جسونت تھا۔ چوڑا چکلا سینہ۔ موٹی موٹی آنکھیں تھیں۔ پہلے تو اس کی وہی میلی کچیلی دھوتی اور گاڑھے کا کُرتا ہوتا۔ لیکن چند روز سے یہ اب بن سنور کر رہنے لگا تھا۔ کہتا تو مجھے ماتا ہی تھا لیکن اب کبھی مجھ سے بات کرتے کرتے ذرا مسکرا بھی دیتا۔ ایک روز جو میں اس سے کوئی برتن پکڑانے لگی تو اس نے میری انگلیوں کو ذرا سا دبا دیا۔ یہ مجھے بہت ناگوار گذرا۔ لیکن کہتی تو کس سے کہتی۔ بڑے لالہ جی صبح صبح دُکان پر چلے جاتے۔ اور چراغ میں بتی پڑے واپس آتے۔ ادھر روٹی کھائی اُدھر کھاٹ پر لیٹ کر ہولناک ڈکاریں مارنے لگے۔ میں جو کبھی پاؤں دبانے لگتی تو مجھے آغوش میں لے کر اور میری ٹھوڑی ہلا ہلا کر کہتے۔

'اندرا! اگر تو مجھے ایک چاند سا بیٹا دیدے تو بس چین ہی چین ہے!'

پھر خود ہی ہنسکر کہتے۔

''بھگوان دے ہی دینگے۔!''

مہاراج! ان کی یہ باتیں میرے سینے میں کٹار ہو کر لگتیں۔ تو خیر! گھر میں ایک میں تھی۔ ایک وہ بُوڑھی چچی۔ جسونت جو پہلے دن بھر میں دو ایک پھیرے کیا کرتا تھا۔ اب کسی نہ کسی بہانے پانچ سات بار ضرور آتا۔ اور مجھے جن نظروں سے دیکھتا میں جان گئی تھی کہ اس کی نیت خراب ہے۔

ایک روز چچی کہیں برادری میں گئی تھی جسونت چولہے کے پاس بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا۔

''بھگوان کبھی ہمارے لالہ جی کی آس بھی پوری کر ہی دینگے۔''

'کیا کوئی اور بیوپار کیا ہے؟' میں نے پوچھا۔

'بیوپار کیسا؟' جسونت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ 'انہیں تو اس دھن دولت کا وارث دیکھنے کی آس لگ رہی ہے۔'

پھر ہنسکر۔

'لالہ جی تو تم سے چاند ایسا بیٹا مانگتے ہیں!'

'جسونت!' میں نے غصے سے کہا۔ 'خبردار جو پھر میرے سامنے ایسی بات کہی تو!'

'کوئی بُری بات کہی میں نے؟' اُس نے مسکرا کر پوچھا۔

کم بخت مجھے ہمیشہ ماتا کہا کرتا تھا لیکن آج وہ بات نہ تھی۔ میں نے بگڑ کر کہا "تمہیں اپنی ماں سے ایسی بات کہتے شرم تو نہیں آتی!"

"ماتا!" وہ ہنسکر بولا۔ "اٹھارہ برس کی اور بیٹا چوبیس سال کا! یہ بھی ایک ہی رہی۔"

"دُور ہو یہاں سے!" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "ورنہ لالہ جی سے کہدونگی۔"

"تم اُن سے کیا کہوگی؟" اُس نے ہنسکر کہا۔ "وہ تو چاند ایسا بیٹا مانگتے ہیں۔ چاند ایسا!"

"دُور ہو مُوا کہیں کا!" میں نے دستِ پناہ اُٹھاکر کہا اور وہ ہنستا ہوچلا گیا۔

اِس واقعہ کو بہت روز گذر چکے تھے۔ یہی ساون رُت تھی اور کالی رات۔ میں تیسری منزل پر کھاٹ ڈالے پڑی تھی۔ نیچے صحن میں لالہ جی اور پچی سوتے تھے ایک تو ان کے خراٹوں سے نیند حرام ہورہی تھی دوسرے مچھر کاٹ کاٹ کر پریشان کررہے تھے۔ میری پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ اچانک کسی نے پلنگ پر آکر مجھے دبوچ لیا۔ اور جلدی سے میرے مُنہ پر ہاتھ رکھدیا۔ یہ وہی کمبخت جسونت تھا۔ ایک ہاتھ سے تو اُس نے میرا مُنہ بند کررکھا تھا دوسرے سے گھونسہ تان کر بولا:-

"خبردار! آواز نکالی تو گلا گھونٹ دوں گا۔"

میرا دم جو گھٹنے لگا تو اُس نے مُنہ پر سے ہاتھ اُٹھا لیا۔

"مجھے چھوڑدو۔ بھگوان کے لئے چھوڑدو۔" میں نے منت سے کہا۔

"چُپ رہو!" اُس نے پھر گھونسہ تان کر کہا۔ میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"تم میرا کہنا یا مانا لو" میں نے عاجزی سے کہا۔ "مجھے چھوڑدو۔"

"مجھے کہنا یا ماننا نہیں چاہیئے!"

"ظالم چھوڑدے مجھے!" میں نے اب اُس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"چُپکی پڑی رہو" اُس نے کہا۔ "ورنہ جان سے مار ڈالوں گا۔"

"پاپی!" میں نے کہا۔ "تم تو مجھے ماتا کہتے ہو۔ اب اگر لالہ جی آجائیں تو؟"

"وہ کیوں آنے لگے" اُس نے جواب دیا "وہ تو چاند سا بیٹا مانگتے ہیں۔"

"ڈوب نہیں مرتے!" میں نے کہا۔ "بھگوان کا خوف کرو"

لیکن اُس وقت بھگوان کا خوف کون کرتا تھا۔ میں اس ظالم کے پنجہ میں تھی اور بے بس تھی۔

کچھ روز تو مجھے اس پاپی سے نفرت رہی لیکن آخر مانوس ہونا ہی پڑا۔ اور وہ سب کے سامنے اب بھی ماتا ہی کہتا۔ اسی طرح چار پانچ مہینے گذر گئے۔ آخر پاپ اپنا رنگ لایا۔ میں اب ڈرنے لگی جس طرح بن سکا یہ راز چھپانے کی کوشش کرتی رہی۔ سارا سارا دن کوٹھڑی میں پڑی رہتی۔ کوئی پوچھتا تو کہہ دیتی کہ طبیعت اچھی نہیں۔ لیکن پچی بھانپ گئی۔ وقت اسی طرح گذرتا گیا اور یہاں ساتواں مہینا لگ چکا تھا۔ پڑوس والیاں مجھے دیکھ دیکھ کر جب سرگوشیاں کرتیں تو مجھ پر گھڑوں پانی پڑجاتا۔ لیکن لالہ جی خوش نظر آتے کیونکہ انہیں تو اپنی تمنا پوری ہوتی نظر آرہی تھی۔

ایک روز میں کوٹھے پر بیٹھی تھی کہ جسونت کہیں سے پٹا ہوا آیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اندرا!" وہ پاس بیٹھ کر کہنے لگا۔ "بہت ظلم ہوا!"

میں تعجب سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"بھانڈا پھوٹ گیا اندرا!" وہ بولا۔ "لالہ جی کے کوئی بھا نجے ہیں۔ وہ کسی دوسری جگہ کاروبار کرتے ہیں۔ مدت سے میل جول بند ہے۔ اس تمام جائداد کے وہی ایک وارث ہیں، کہیں اُن کے کان میں بھنک پڑ گئی کہ تمہارے بچّہ ہونے والا ہے۔ آج وہ آئے ہیں۔ بہت دیر لالہ جی سے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کچھ آپس میں تُو تُو میں میں بھی ہوئی۔ میرے سامنے پڑتے ہی پہلے تو بے نقط سنائیں پھر پیٹ ڈالا۔ کل لالہ جی کو ڈاکٹر دیکھنے آئے گا۔ اُنہوں نے ڈاکٹر کو بُلوانے آدمی بھی بھجوا دیا ہے۔"

"ڈاکٹر کیا دیکھے گا؟" میں نے پوچھا۔

جسونت بولا۔ "اندرا! تم انجان تو ہو نہیں۔ پینسٹھ سال کا بُوڑھا بغیر سہارا دیئے نہ چلے نہ اُٹھے۔ پھر تمہیں یہ پیٹ کیسے ہوگیا؟"

"اب کیا بنے گا" میں نے کہا۔ "یہ سب بپتا تمہارے کارن آئی۔ پاپی! تُو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔"

"میری سُنو!" جسونت کہنے لگا۔ "اب اگر عزت کا پاس ہے تو بھاگو یہاں سے اُنہیں تو یہ محلے والیاں ہی جینے نہ دینگی۔ اِدھر میکے والوں کو کیا مُنہ دکھاؤ گی؟"

کچھ دیر اسی قسم کی بحث ہوتی رہی۔ آخر صلاح یہ ٹھہری کہ صبح ہونے سے پیشتر ہی کہیں نکل جائیں۔ میں نے اپنا زیور اور کچھ نقدی لی اور کوئی پہر رات گئے جب سب سنسار سوتا تھا ہم گاؤں سے نکل گئے۔ کوئی کوس دو کوس پر ریل کا اسٹیشن تھا۔ پو پھٹتے گاڑی آئی۔ جسونت نے کہیں کے دو ٹکٹ خریدلئے تھے سوار ہوگئے۔

کہاں کہاں پھرے۔ کیسی کٹی! مہاتما جی یہ ایک طویل قصہ ہے۔ وقت پورا ہونے پر میرے ہاں یہ لڑکی ہوئی۔ اس وقت تک زیور بیچ بیچ کر گذران ہورہی تھی۔ میں نے ہزار چاہا کہ جسونت کوئی کام کاج کرے لیکن اُس نے میری ایک نہ سُنی۔ اب ہمیں اس دیس میں آتے دس پندرہ روز ہوئے ہیں، جو کچھ پاس تھا وہ اس نے شراب اور جوے کی نذر کر دیا ہے۔ اور اب مجھے رنڈی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ مہاتما جی! میں مرتی مرجاؤں گی پر یہ ذلیل کام مجھ سے نہ ہوسکے گا۔"

اتنا کہہ کر وہ غریب پھر رونے لگی۔ میں نے کہا۔ "تو پھر اب چاہتی کیا ہو؟ کہو تو میں تمہیں دیس پہنچا دوں؟"

"نہیں مہاراج!" وہ بولی۔ "میں اب دیس والوں کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔"

"وہ پاپی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گھر ہے!" اندرا بولی۔ "آج سر شام ہی پی آیا تھا۔ آتے ہی مجھے مارنا شروع کر دیا۔"

پھر ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "مہاراج! آپ بھگوان کے پیارے ہیں، ایک پاپن پر دیا کیجئے۔"

"بیٹی!" میں نے کہا۔ "تمہاری بپتا سُنکر مجھے بہت دُکھ ہو رہا ہے۔"

"تو پھر میری اتنی بنتی ہے۔" اُس نے روتے ہوئے کہا۔ "آپ اِس بچّی کو لے لیں۔"

"تم کہاں جاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

"جہاں بھگوان لے جائیں" یہ کہتے ہوئے اُس نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور کہنے لگی "تو کیا میں ایک دھرماتما کے دوارے سے بھی مایوس ہی جاؤں گی"
پھر آسمان کی طرف دیکھ کر "بھگوان! میں اِس پاپ کی گٹھڑی کو کہاں اُٹھائے لئے پھروں!"
"بھگوان دیا کرینگے بیٹی!" میں نے کہا۔ "لاؤ بچی مجھے دیدو۔"
میں نے بچی اُسکی گود سے لے لی۔ اِندرا سوئی ہوئی تھی!

"اِندرا!" میں نے تعجب سے کہا۔ "اِندرا تو اسکی ماں کا نام تھا!"
"ٹھیک ہے!" سادھو بولا۔ "یہ اِندرا کی اِندرا ہے۔ بچی کا نام پوچھنا مجھے یاد نہ رہا۔ اِس لئے میں اب اسے بھی اِندرا ہی کہتا ہوں تو خیر! اِندرا کی ماں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔
"مہاراج! بچی کسی اور کو مت دیجئے گا!"
"بیٹی!" میں نے کہا۔ "یہ تو بھگوان کی امانت ہے۔ میں کیوں کسی کو دینے لگا"
اُس نے بچی میری گود سے لی۔ اور دیوانوں کی طرح چومنے لگی۔ تم جانو! ممتا کی لگن دیکھ کر میرا تو جی بھر آیا میں نے کہا۔
"بیٹی! انسان اگر اپنے پاپ پر نادم ہو تو بھگوان اُسے شکتی دیتے ہیں۔ اب تم نیک بنکر رہنے کی کوشش کرو۔ شاید بھگوان تمہیں کسی روز بیٹی سے پھر ملادیں"
اُس نے روتے ہوئے اپنے کلیجہ کا ٹکڑا مجھے دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولی:۔
"مہاتما جی! اِس سنسار میں اِس معصوم کا اب آپکے سوا اور کوئی نہیں"
"بھگوان جو ہیں" میں نے کہا۔ "جسے کسی کا سہارا نہ ہو اُسے بھگوان کا آسرا ہوتا ہے"
اُس نے پھر ایک بار بچی کو پیار کیا اور مجھے پرنام کرکے شہر کی جانب چلی گئی۔

اِس رات بادل بہت گرجے بارش بھی ہوتی رہی لیکن میری ننھی سی اِندرا مزے سے چھتری کے نیچے سوتی رہی۔ جب صبح ہوئی تو مندر کی جانب سے کچھ شوروغل کی آواز آنے لگی، کوئی بھگوان کا پیارا صبح صبح میرے لئے دودھ لا یا کرتا تھا اُس کے آنے پر معلوم ہوا کہ مندر کے پاس کسی جوان عورت کی لاش جمنا جی میں تیر رہی تھی۔ کشتی والوں نے نکال کر کنارے پر رکھدی ہے۔ پھر بچی کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔
"یہ بچی کس کی ہے؟"
"بھگوان کی امانت ہے" میں نے کہا۔ "ذرا خیال رکھیو میں بھی دیکھ آؤں" جب میں مندر کے پاس پہنچا تو یہاں لوگوں کی بھیڑ لگ رہی تھی۔ میں نے اُچک کر جو دیکھا تو سامنے اِندرا کی لاش پڑی تھی۔"

یہ المناک داستان سُنکر میرے دل کو بھی ٹھیس سی لگی۔ سادھو سر جُھکائے خاموش بیٹھا تھا اور چھوٹی سی اِندرا مزے سے سو رہی تھی۔ کوہسار پر سُکوت اور خاموشی مسلط ہو رہی تھی۔ وادیوں میں دہقانوں کے جھونپڑوں سے سپید سپید دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ اِس سُکوت اور خاموشی میں آبشار کی شورشیں، ایک بدنصیب عورت کی المناک موت کا نوحہ بنکر فضا کو اُداس بنا رہی تھیں۔ آخر میں بھی واپس لوٹا۔ چلتے چلتے شام ہوگئی۔ گھر اُسوقت پہنچا جب فضا میں جگنو چمک رہے تھے چراغ فطرت جلا رہی تھی!!

ایم۔ اسلم

جاسوس دوست

آ ادھر اے دوست! آ تو مجھ سے چھپ سکتا نہیں
سعیٔ "خود پوشی" ہے کیوں؟ جب میں تجھے تکتا نہیں

گرچہ پہلے "صوفیانہ سوانگ نے" دھوکا دیا
لیکن "آنکھوں کی چمک" نے تجھکو پہچنوا دیا

تیری آنکھوں سے عیاں اب تک وہ "برقی لہر" ہے
قہر ہے تیری نگاہِ تیز ہاں، ہاں قہر ہے

الاماں یہ تیری "آشفتہ نگاہی" الاماں
عمرِ و عیار کی بھی ہیچ ہیں چالاکیاں

کیوں میں حیراں ہوں جو ہر سو آج تیری دھوم ہے
تیری فطرت ابتدا سے ہی مجھے معلوم ہے

تجھ سے مل کر آج مجھکو مدرسہ یاد آگیا
پھر وہ طفلی کا مرقع دل مرا تڑپا گیا

مطمئن رہتی نہ تھی تیری "نگاہِ جستجو"
طور تیرے "عارفانہ" "نرم تیری گفتگو"

مدرسے میں اپنے ہمعمروں سے وہ سرگوشیاں
برمحل سرگوشیوں کے بعد وہ خاموشیاں

ہم جماعت دوست کہتے تھے تجھے اپنا عدو
تجھکو ان کے خانگی جھگڑوں کی بھی تھی جستجو

یاد ہے مجھ سے بھی کچھ پوچھا تھا اک دن اے شریر
اور — پھر کہنے لگا تھا تو مجھے روشن ضمیر

ہر کسی استاد کا تو "منہ چڑھا" شاگرد تھا
نام تیرا واقعی سب کی زباں کا ورد تھا

تیری "فطری قابلیت" تیرے کام آ ہی گئی
"غیر ملکی حاکموں" تک تجھکو پہونچا ہی گئی

ہیں سیاہ اخبار سارے تیرے نام اور کام سے
شاید اب تو آ رہا ہے خاص "ملکِ شام" سے

کر رہا ہے سیرِ دنیا بنکے اب جاسوس تو
آہ! ابنائے وطن سے خاک ہو مانوس تو

علی منظور حیدرآبادی

خوابِ گریزپا

افراد

سیلچن ———— ایک پہاڑی لڑکی؛
لیمنڈ ———— ایک پہاڑ پر چڑھنے والا؛
فلزمین ———— ایک رہنما؛

افرادِ خواب

عظیم
بقر
شراب
(پہاڑوں کے نام)

موگرا
گلاب
نیلوفر
گلِ اشرفی
(پھولوں کے نام)

خواب میں چند کردار

پروانے ———— بجھا
جھلملیاں ————
موت جو سوئے زینہ پر
موت جو ڈوبے
———— ہے)
... تو آپ کیلئے بہت

پہلا منظر

اگست کی ایک شام کو غروبِ آ
منظر پہاڑ کی ایک جھونپڑی
مشتمل ہے جس میں صرف ایک
سے بنی ہوئی ایک نیچی اور

سیلچن:- کل، جب تم چڑھ چکے ہوگے ———— کیا واپس نہیں آؤ گے؟
لیمنڈ:- نہیں۔
سیلچن:- تمہارے پاس تمام دُنیا ہے۔ اور میرے پاس کچھ بھی نہیں۔
لیمنڈ:- سوائے فلزمین اور پہاڑوں کے۔
سیلچن:- صرف روٹی ہی کھالینا تو اچھا نہیں ہے۔
لیمنڈ:- (اُسکو تکتے ہوئے،) مَیں تو تمہیں کھالینا چاہتا ہوں۔
سیلچن:- مگر مَیں لذیذ نہیں ہوں۔ مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں۔

لیمنڈ:۔ میں واپس آؤں گا۔

سیلیچن:۔ پھر کوئی دشوار گذار پہاڑ تو چڑھنے باقی نہیں رہینگے۔ اور اگر یہ سر ورآگیں نہ ہو تو تم پروا ہی کب کرتے ہو۔

لیمنڈ:۔ کتنی سمجھدار ہو تم!

سیلیچن:۔ نہیں، میں سمجھدار نہیں ہوں۔ یہاں ہر وقت کا رہنا دوبھر معلوم ہوتا ہے ـــــ وہاں بڑی دنیا میں کیا تم (مجھے) یاد رکھوگے؟۔

لیمنڈ:۔ (اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے) اُس بڑی دنیا میں کوئی شے اس جیسی حسین اور شیریں نہیں۔

سیلیچن:۔ لیکن وہ بڑی دنیا بذات خود جو ہے۔

لیمنڈ:۔ کیا میں شب بخیر کہنے کیلئے تمہیں بوسہ دوں؟۔

(وہ اپنا چہرہ آگے کر دیتی ہے اور وہ اُس کے رُخسار پر پیار کرتا ہے۔ اور دفعتاً اُس کے لبوں پر بھی۔ اور جونہی وہ پیچھے ہٹتی ہے۔)

لیمنڈ:۔ مجھے افسوس ہے۔

سیلیچن:۔ کوئی ہرج نہیں۔

لیمنڈ:۔ (شمع لیتے ہوئے) خواب شیریں! شب بخیر!۔

سیلیچن:۔ (ہولے سے) شب بخیر۔

فلزبین:۔ (باہر سے آتے ہوئے اور اُنہیں دیکھکر) ٹھنڈ ہو گئی ہے ـــ بڑا لطف رہیگا۔

(لیمنڈ، پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے، چلا جاتا ہے۔ فلزبین اس کے جانے کا انتظار کرتا ہے۔)

سیلیچن:۔ (دریچے کی جگہ پر بیٹھتے ہوئے) میں نے سوچا یہ جگہ اس کے لئے بہت سخت ہوگی۔

(وہ اُس کے پاس جاتا ہے اور ایک منٹ خاموش کھڑا رہتا ہے، پھر جھک کر اُسے اس طرح پیار کرتا ہے گویا بھوکا ہے۔)

سیلیچن:۔ کیا تو بھوکا ہے؟

(وہ کوئی جواب نہیں دیتا اور چراغ بجھا کر ایک اندرونی کمرے میں چلا جاتا ہے۔ سیلیچن دریچے میں سے، چاندنی میں نہائی ہوئی چوٹیوں کو بیٹھی دیکھتی رہتی ہے۔ پھر کمبل اوڑھ کر وہیں دریچے والی جگہ پر بمشکل تمام لیٹ جاتی ہے۔)

سیلیچن:۔ (سوئی ہوئی آواز میں) اُنہوں نے مجھے پیار کیا ہے ـــــ دونوں نے۔

(وہ سو جاتی ہے)

منظر پر تاریکی چھا جاتی ہے۔

دوسرا منظر

(منظر صبح کے تڑکے کی طرح دھیرے دھیرے روشن ہو رہا ہے۔ سیلیچن دریچے والی جگہ پر اب بھی لیٹی ہوئی ہے۔ وہ اپنا چہرہ اور ہاتھ کمبل میں سے نکال کر اُٹھ بیٹھتی ہے اور گہری نیند کی بجائے ردا رخواب اُسے ملفوف کر لیتی ہے۔ جھونپڑی کی دیوار غائب ہو چکی ہے۔ سیلیچن اور کہرے سے ڈھکے ہوئے سیاہ پہاڑوں کے درمیان سوائے تھوڑی سی تاریک فضا کے اور کچھ حائل نہیں ہے۔ سیلیچن کے پاس ہی اس اندھیرے کے سرے پر، جو اُسکو پہاڑوں سے جدا کر رہا ہے، چار "پھول" موگرا، گلاب، نیلوفر اور گلِ اشرفی اُسے تاریکی میں سے جھانک رہے ہیں۔ وہ اپنے سروں پر اپنے بے شمار پھولوں کے تاج

پہنے ہوئے ہیں جن پر شبنم کے قطرے جمے ہوئے
ہیں اور جو ننھی ننھی گھنٹیوں کی طرح بج رہے ہیں)
سیلیچن:۔ ائے! ان کے تو چہرے ہیں!
(چوٹیوں کے چاروں طرف صرف سیاہی مائل
نیلا آسمان نظر آتا ہے۔ چوٹیاں چمک اٹھی ہیں)
موگرا:۔ (دھیمی آواز میں) کیا تم؟ کیا تم؟ کیا تم؟ آہ! آہ! گلاب!
نیلوفر! گلِ اشرفی (ان کی گھنٹیاں حسد سے بج رہی ہیں) او،
او۔ او۔

(دفعتاً جبلِ بقر کی چوٹی ایسی آواز میں بولنے لگتی
ہے جو غیر مانوس ہے۔)

جبلِ بقر:۔ میں پہاڑ ہوں اور اپنی گایوں اور بھیڑوں میں رہتا
ہوں۔ میں خاموش ہوں اور ایک ہی سی آواز ہوں، اور میں
ہی بلند پہاڑیاں ہوں۔ میں خوف اور کوہستانی ہوا ہوں، عمدہ
چراگاہ اور بے پناہ آرام میری آنکھوں میں دیکھو اور صرف مجھ
ہی سے محبت کرو۔

سیلیچن:۔ (حیرت زا) جبلِ بقر! وہ ترجمانی کر رہا ہے — قلزمین
اور پہاڑوں کی۔ یہ میرا نصف قلب ہے۔
(پھول خوش خوش ہنسنے لگتے ہیں۔)

جبلِ بقر:۔ میں ابدی پہاڑیوں کو اگاتا ہوں — میں کوہستانی
برف پیتا ہوں۔ میری آنکھوں کا رنگ دہکتی ہوئی شراب کا سا ہے۔
اور ان ہی میں اداسی پناہ گزیں ہوتی ہے۔ گایوں کی آوازیں،
ہوا کی سرسراہٹ، چٹانوں کے گرنے کا شور، سیلاب کا ترنم
— (بس) ان کے علاوہ مجھے کوئی اور بات نہیں آتی —
خیالات سادے، خون گرم، طاقت بے حد — گردش
کا چھنہ۔

سیلیچن:۔ ہاں، ہاں، مجھے اسکی ضرورت ہے۔ وہ بہت
طاقتور ہے!

جبلِ بقر:۔ ننھی روح! میرے پاس آ! مجھ سے محبت کر! اور میرے
ساتھ تاروں کی چھاؤں میں رہ!
سیلیچن:۔ (دبی آواز میں) شاید ایسا نہ ہو سکے!
(یکبارگی جبلِ شراب کی چوٹی ایک نوجوان کی
سی آواز میں بولنے لگتی ہے۔)

جبلِ شراب:۔ میں وہ چھلاوہ ہوں — جو بازاروں میں
ناچتا پھرتا ہے! میں قمری ہوں جو شاہ بلوط کے سائے تلے کوکتی
ہے۔ (دنیا میں) کسی شے کو قیام نہیں لیکن میں اپنے ہزاروں دیوتاؤں
کو اپنی خوشبو پیش کئے جاتا ہوں۔ سراق سے ایوان اور جذبات
کو برانگیختہ کرنے والے خیاباں میرے مسکن ہیں۔ سینکڑوں آدمیوں
کی زندگی میری ہے — اور صبح کے تڑکے گلیوں کی روشنیاں
بھی۔ (رسان سے) میری الفتیں ہزاروں ہیں لیکن ان میں سے
دائمی ایک بھی نہیں کیونکہ میں تمہارے ان بچھڑوں سے بھی زیادہ
سُبک رو ہوں جو دھوپ میں کھیلتے مالتے ہوں۔
(پھول، جن کی گھنٹیاں خوف میں بج رہی ہیں،
چیخنے لگتے ہیں "ہم انہیں خوب جانتے ہیں!")

جبلِ شراب:۔ میں مسرت کی تخلیق اور موت کی آوازیں سنتا ہوں
اور پہیوں کی گھڑ گھڑاہٹ بھی۔ میں لوگوں کی چیخ پکار سنتا ہوں
اور خاموش رات میں محبت سے لبریز بوسوں کی آوازیں بھی۔ میرے
بغیر اے ننھی روح! تم بھوکی رہو گی اور مر جاؤ گی۔

سیلیچن:۔ یہ ان صاحب (لینڈ) کی اور شہری دنیا کی ترجمانی کر
رہا ہے۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔

جبلِ شراب:۔ میرے خیالات کا شمار تمہارے سبزہ زار میں لہلہانے
والے پھولوں سے کہیں زیادہ ہے اور ان کی پرواز ہوا میں اڑنے
والے عقابوں سے زیادہ تیز۔ میں بلند حوصلگی کی شراب اور حقیقت
کی دوا پیتا ہوں اور اس لئے میں کبھی کاہل نہیں ہوتا۔

سیلیچن:۔ مجھے شبہ ہے۔

جبلِ شراب:۔ مجھ سے محبت کر لے ننھی رُوح! میں زندگی کو پچاسوں رنگوں سے مزیّن کرتا ہوں۔ میں ہزاروں چیزیں بناتا ہوں! ــ میں تمہارے قلب کا طواف کرونگا۔

سیلیچن:۔ وہ شہد کی طرح میٹھا ہے!

(پھول اپنی گھنٹیاں حسد سے بجانے لگتے ہیں اور

چیختے ہیں "تلخ بھی تو ہے! تلخ!")

جبلِ بقر:۔ میرے پاس رہو، سیلیچن! مَیں تمہیں شفاف ہوا سے بیدار کرتا ہوں۔

(پھول کھلکھلا کر ہنستے ہیں۔)

جبلِ شراب:۔ میرے پاس آؤ سیلیچن! میرا رنگ برنگا پنکھا تمہیں بیدار کرے گا۔

(پھول ماتم کرتے ہیں۔)

سیلیچن:۔ (رنج میں) میرا دل! آہ! یہ ٹوٹے جاتا ہے۔

جبلِ شراب:۔ اے ننھی رُوح، میرے ساتھ رہکر تم بازاروں کی سیر کرو گی اور بہت سے رازوں سے واقف ہو جاؤ گی۔ ہم دونوں، ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پنکھڑیوں کی طرح اڑتے پھرینگے۔

گلِ اشرفی:۔ میری پنکھڑیاں زیادہ تیز اُڑتی ہیں!

جبلِ شراب:۔ مَیں تمہیں سمندر کی سیر کراؤنگا۔

نیلوفر:۔ میری نیلاہٹ زیادہ گہری ہے!

جبلِ شراب:۔ میں تم پر تبسّم و حجاب کی بارش کر دونگا۔

گلاب:۔ میرا حجاب زیادہ احمریں ہے۔

جبلِ شراب:۔ ننھی رُوح، سُنو! میرے جواہرات! ریشم! مخمل!

موگرا:۔ میں مخمل سے زیادہ نرم و نازک ہوں!

جبلِ شراب:۔ (فخریہ) پُراسرار لباس!

پھول (افسوس کرتے ہوئے):۔ ہاں یہ ہمارے پاس نہیں۔

سیلیچن:۔ اسکے پاس سب کچھ ہے۔

جبلِ بقر:۔ یہ سہیں بازو والے سحاب میرے ہیں اور یہ دھوپ میں تپنے والی چٹانیں بھی۔ میرے شبنم کے قطرے موتیوں سے زیادہ سرد ہیں۔ میرے برفانی سانس اور لطیف گھاس سے دُور رہکر، اے ننھی رُوح، تم پژمردہ ہو جاؤ گی۔

جبلِ شراب:۔ سیاہ لونگ میری خوشبو ہے!

سیلیچن:۔ (گھبرا کر) آہ!

جبلِ بقر:۔ میں تمہیں کبھی اپنے سے جُدا نہ کرونگا۔

جبلِ شراب:۔ میں تمہیں سینکڑوں مرتبہ چھوڑ دونگا اور سینکڑوں مرتبہ واپس آکر تمہیں پیار کرونگا۔

سیلیچن (سرگوشی میں):۔ میرے قلب کی تسکین!

جبلِ بقر:۔ میرے ساتھ رہ کر تم کوہستانی نرم و گرم علف زار میں آرام کرو گی۔

(پھول خوش خوش ہنستے ہیں۔)

جبلِ شراب:۔ میرے ساتھ رہ کر تم قمری کے پروں کے ملائم بچھونے پر محوِ استراحت ہو گی۔

(پھول کراہتے ہیں۔)

جبلِ شراب:۔ مَیں تمہیں پُرانی شراب دونگا۔

جبلِ بقر:۔ میں تمہیں تازہ دودھ دونگا۔

جبلِ شراب:۔ میرا گیت سُنو!

(دُور سے ستار کی سی آواز آتی ہے)

سیلیچن (اپنا دل پکڑ کر):۔ میرا دل ــــــ آہ! مجھ سے جُدا ہو رہا ہے!

(بہت دُور سے کسی چرواہے کی بانسری کا نغمہ

لہراتا ہوا آتا ہے۔)

سیلیچن (کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے):۔ بانسری کا نغمہ، آہ!

جبلِ بقر:۔ میرے ہی ساتھ رہو سیلیچن!

جبلِ شراب:۔ میرے پاس آؤ سیلیچن!

جبلِ بقر:۔ میں تجھے ایقان دیتا ہوں۔

جبلِ شراب ۔ میں تجھے امرِ اتفاقی دیتا ہوں۔
جبلِ بقر ۔ میں تجھے سکون دیتا ہوں۔
جبلِ شراب ۔ میں تجھے تلوّن دیتا ہوں۔
جبلِ بقر ۔ میں تجھے خاموشی دیتا ہوں۔
جبلِ شراب ۔ میں تجھے آواز دیتا ہوں۔
جبلِ بقر ۔ میں تجھے واحد محبت دیتا ہوں۔
جبلِ شراب ۔ میں تجھے کئی محبتیں دیتا ہوں۔
سیلیچن (گویا الفاظ اس کے قلب سے زبردستی چھینے گئے ہیں ۔۔) ۔
دونوں، دونوں سے ــــــ میں محبت کرونگی۔
(یکبارگی جبلِ عظیم کی چوٹی مخاطب ہوتی ہے)
جبلِ عظیم ۔ تو دونوں ہی سے محبت کرے گی اے ننھی روح! تو پہاڑیوں پر "خاموشی" کے ساتھ آرام کرے گی اور شہروں میں "علم" کے ساتھ محوِ رقص ہوگی۔ دونوں تجھ پر قابض رہیں گے! پہاڑوں پر چمکنے والے چاند اور سورج تجھے جلا دیں گے، اور اے ننھی پروانے! شہر کے چراغ تیرے پروں کو جھلس دیں گے۔ ان میں سے ہر ایک تجھکو ایک دنیا معلوم ہوگا اور اپنی قبر بھی! تیرا دل اس پر کی مانند ہے جسے ایک منہ پھونک مار کر اڑا دے، اور پھر دوسرا۔ لیکن خائف نہ ہو! کیونکہ انسان کی زندگی باری باری بہت سی محبتوں کیلئے ہے۔ یہ ایک چھوٹے سے ڈونگے کی طرح ہے جو (ساحل پر) لنگر انداز ہو اور پھر نیلے سمندر میں تیرنے لگے۔ یہ ایک نغمہ ہے جو سکوت میں الجھا ہوا ہو اور پھر سرگوشی کرنے لگے۔ یہ ایک نوزائیدہ بچہ ہے، کچھ جری، کچھ غافل۔ اس میں متنوّع موسیقی ہے: "تبدیلی" ہے - "سکوت" ہے "اتفاق" ہے اور "یقین" ہے: "واحد" ہے اور "بیشمار" ہے۔ بھڑکتا رہ ــــــ اے حسین شعلے! اس کوشش میں کہ تو تمام دنیا کو نگل لے! پر آخر تو آئے گی میرے ہی پاس اے ننھی روح!۔
(بیہوش سی سیلیچن اس منظر اور آواز کو آغوش میں لے لینے کیلئے اپنے بازو پھیلا دیتی ہے۔ مگر سب کچھ تاریک نیند میں آہستہ آہستہ کھو جاتا ہے۔)

تیسرا منظر

(تاریک منظرات کے آسمان تلے پھر چمک اٹھا ہے۔ سیلیچن کھڑی ہوئی ہے، اس کے ہاتھ ایک شہر کے دروازے کی طرف جس میں سے روشنی کی ایک نہر بہہ رہی ہے، پھیلے ہوئے ہیں۔ دروازے کی ایک جانب ایک نوجوان کی مورت کھڑی ہوئی ہے جس کے گرد روشنی کا ہالہ ہے، دوسری جانب سائے میں ملفوف ایک مجسمہ ہے۔ دروازے کے اوپر بیچ میں پتھر کا بنا ہوا ایک عجیب الخلقت جانور کا سر ہے جو دھندلا نظر آرہا ہے۔)

جبلِ شراب کا نوجوان گاتا ہے ۔
"اے ننھی سی شہابی روح
جو کہر آلود اتھاہ راتوں میں
یکہ و تنہا ماری ماری پھر رہی ہے، غیر مطمئن ــــ
اس غضب کی سردی سے نکل آ،
میں تجھے آرام دہ اور گرم جگہ بلا رہا ہوں ــــ
یہاں جہاں میں اپنا بربط بجاتا ہوں ــــ
اس ماہتاب زر نگار کے نیچے"

سیلیچن (سرگوشی میں) کیا یہ "شہر" ہے؟ ــــ وہی وسیع دنیا۔
جبلِ شراب کا نوجوان گائے جاتا ہے ۔
"جیسے سمندر ہرا پروانہ

تحیر خیز فروزاں شمعوں کے گرد،
جل جانا چاہتا ہے، اسی طرح مایوس و بیچین —
آہ! اے بے قرار قمری،
میں چاہتا ہوں کہ تجھ میں بھی —
اب جبکہ میں بربط بجا رہا ہوں —
عشق کا قرمزی شعلہ بھڑک اٹھے "

سیلیچن:۔ (دروازے کی طرف مسرت سے دیکھتے ہوئے) وہاں گرمی اور روشنی ہے!

(جس وقت وہ بولتی ہے، دونوں جانب سے پروانے آتے ہیں اور آپس میں مل جل کر ناچتے ہوئے دروازے تک جاتے ہیں اور پھر جلتے کو دتے سامنے آجاتے ہیں۔)

سیلیچن (اپنے تیز ہاتھ پھیلاتے ہوئے) یہ تو سچ مچ کے ہیں — ان کے پروں سے ہوا نکلتی ہے۔

(پروانے اُسکے پاس سے گذر کر شہر میں غائب ہو جاتے ہیں۔)

جبلِ شراب کا نوجوان گاتا ہے:۔

اے میرے گیت کے ہونٹوں! تم
اس مرمریں دوشیزہ کے قلب کے پاس
جاؤ اور دل سوزی سے سرگوشی میں کہو
ان الفاظ پُر اثر کو
"اے سُننے والی!
تیز پا محبت جب ایک دفعہ گذر جائے،
تو وہ دوبارہ واپس نہیں آتی!"

(سیلیچن اسکی طرف دوڑتی ہے — لیکن اس نوجوان کے گرد جو روشنی کا ہالہ ہے وہ مدھم ہو جاتا ہے اور وہ ایک سایہ بنکر رہ جاتا ہے

دروازے میں سیاہ فرغل پہنے ہوئے لیمنڈ کھڑا ہے۔)

سیلیچن:۔ اے تم ہو؟

لیمنڈ:۔ اپنی ننھی روح کے بغیر میں سرد اور بے جان ہوں۔ آؤ! —،

(اس کے لئے اپنی آغوش وا کر دیتا ہے)

سیلیچن:۔ کیا میں محفوظ رہونگی؟

لیمنڈ:۔ حفاظت کسے کہتے ہیں؟ کیا تم اپنے پہاڑوں میں محفوظ ہو؟

سیلیچن:۔ میں کہاں ہوں؟

لیمنڈ:۔ شہر میں۔

(مسکراتے ہوئے وہ دروازے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بازار کی جگنو جیسی روشنیاں رقص کرتی نظر آتی ہیں۔)

سیلیچن (سرگوشی میں) یہ کیا ہیں؟

لیمنڈ:۔ روشنیاں، پیاری — بازار کی روشنیاں چراغ ہیں — زرِ حیات!

سیلیچن:۔ کیا یہ ہمیشہ ایسی ہی چمکدار رہتی ہیں؟

(جبلِ شراب کے نوجوان کے گرد جو ہالہ ہے وہ دوبارہ چمک اٹھتا ہے اور وہ اپنا ساز بلند آہنگی کے ساتھ چھیڑتا ہے اور جب سیلیچن اس آواز کی طرف مڑتی ہے تو اسکی رنگت دھیمی پڑ جاتی ہے۔ وہ اب پھر دہی نیلا سا سایہ ہے اور جگنوؤں کی روشنیاں دروازے میں سے غائب ہو گئی ہیں۔)

سیلیچن:۔ کیا وہ میرا مذاق اڑا رہا ہے؟

لیمنڈ:۔ آؤ۔

سیلیچن:۔ مجھے ڈر لگتا ہے!
لیمنڈ:۔ نئی باتوں سے ؟ کیا تم صرف نصف ماہتاب ہی سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہو؟ آہ! اے ننھی روح کیا تم صرف اپنی بکریوں ہی میں رہو گی ——— ایسی حالت میں جبکہ میں تمکو عجوبے دکھا سکتا ہوں؟۔
سیلیچن:۔ کیا وہ اچھے ہیں؟
لیمنڈ:۔ وہ سب کچھ ہیں۔
سیلیچن:۔ (دروازے کی طرف قدرے سرکتے ہوئے) شہر کس قدر عجیب وغریب اور روشن ہے! کیا وہاں کبھی اندھیرا نہیں ہوتا ——— ؟
لیمنڈ:۔ میں اپنی محبت سے اندھیرے کو تم سے دور رکھونگا۔
سیلیچن:۔ اوہ! لیکن میں محبت نہیں کرتی۔
لیمنڈ:۔ اری معصوم! محبت کرنا ہی تو زندگی ہے ——— عجوبے کی جستجو کرتے رہنا! جب کوئی پر اُڑتا ہے تو کیا وہ ہوا سے، جو ایک نامعلوم شے ہے، محبت نہیں کرتا ہوتا؟ اگر تاریکی اور روشنی بدلتی نہیں رہتیں تو کیا ہم سانس نہیں لے سکتے تھے؟ (اور جونہی وہ قریب آتی ہے) محبت کرنا گویا ایک درخت پر چڑھنا ہے اور پھر چھوٹے سے سبز پھول کو دیکھتے ہوئے اسے توڑنے کیلئے نیچے اتر آنا! اس کے پر ہیں۔ یہ اڑ گیا ہے ——— تم کو پھر چڑھنا چاہیئے ——— یہ کانپ رہا ہے، لیکن یہ صرف تمہارے ہاتھ کی ہوا ہے ——— تم کو گھٹنا چاہیئے، تم کو چمٹنا چاہیئے، تم کو کودنا چاہیئے، پھر یہ کبھی وہاں ہے، یہاں نہیں ——— کیونکہ سبز پھول پروانے کی طرح اڑتا ہے اور صرف اس کے پروں کی ہوا ہی کو تم پکڑ سکو گی۔ مگر تمہاری آنکھیں چمک رہی ہوں گی، تمہارے رخسار دمک رہے ہوں گے۔ تمہارے سینے کا زیروبم نمایاں ہو رہا ہو گا ——— آہ! اے ننھے سے دل! (منظر تاریک ہو جاتا ہے۔) اور جب رات ہو گی ——— یہ ساکت ہو جائیگا۔ گل مغیلاں کی طرح اندھیرے میں کہیں مرجھایا ہوا، اور تمہارا گورا ہاتھ اسکو تلاش کریگا لیکن تمہارا شیریں سانس اس کو کہیں دور بہا دے گا اور تم ہرگز ہرگز اسکو نہ پکڑ سکو گی ——— ہاں، زندگی خوبصورت ہو جاتی ہے، (اسکی آواز ہوتے ہوتے سرگوشی بن جاتی ہے۔ وہ اپنی آغوش وا کرتا ہے۔) میرے شہر میں آؤ ——— آؤ۔
سیلیچن:۔ (لیمنڈ کے سینے پر ہاتھ رکھکر) میں آتی ہوں۔
لیمنڈ:۔ (اسکو دروازے کی طرف کھینچتے ہوئے۔) مجھ سے محبت کرو!۔
سیلیچن:۔ میں محبت کرتی ہوں۔

(بربط بجنے لگتا ہے۔ وہ شہر میں چلے جاتے ہیں۔
جبل شراب کا نوجوان اپنی قرمزی روشنی میں
دوبارہ دکھائی دیتا ہے اور ساز کے ساتھ
آہستہ آہستہ گانا شروع کرتا ہے:۔

"ہوائی گھڑیاں تاریکی میں گذری جا رہی ہیں ———
میری پیاری کیا تو انہیں نہیں سن سکتی؟۔
نئی محبتیں پیدا ہوتی ہیں اور پرانی محبتیں فنا ہو جاتی ہیں،
اور بوسے لیتے ہوئے لبوں کو جدا ہونا پڑتا ہے۔
گذرے ہوئے سالوں کی خاکی نکھیاں ———
کیا تو انہیں نہیں دیکھ سکتی اے میری روح ———
کہ وہ کبھی اس پھول کے اور کبھی اس پھول کے آنسو
چوستی پھرتی ہیں۔
اور میٹھے شہد کی زرد شراب؟
(اس کی آواز عجیب وغریب اور پرجوش بن جاتی ہے۔)
اے وہ شعلے جو وقت کی بادیہ پیمائی کرتا ہے
دم بہ دم نیچا ہونے والے!
جہاں کالی کالی مسحور دلدل میں سے نکل

ہم مایوس لوگ تیری رہنمائی میں پیچھے پیچھے جاتے ہیں—
اے آتش غیر وقت ہم التجا کرتے ہیں کہ تو ذرا ٹھیر!
ادھر اندھیری ہوا میں
سنہرا خانہ بدوش مسافر گملا رہا ہے—
اور ایسا ہی محبت کے ساتھ ہوتا رہا ہے!"
(اُسکے گانے کے دوران میں ہر چیز تاریک ہو جاتی
ہے سوائے اُس روشنی کے ہالے کے جو اسکے
گرد ہے۔ گیت ختم ہوتے پری بھی غائب ہو
جاتا ہے۔ پو پھٹ رہی ہے۔ شہر کے تاریک
دروازے میں سے سرد اور سبز روشنی میں
سیلچن آتی ہے۔ وہ زرد ہے۔ گویا اُس کی
زندگی گھٹ گئی ہے۔ اسکی پھٹی آنکھیں اور
چہرے کی سفیدی سراسیمگی ظاہر کر رہی ہیں۔)
سیلچن:۔ میرا دل مرجھا گیا ہے۔
(جیسے ہی وہ بولتی ہے دور سے گایوں کی
گھنٹیاں بجنے کی مدھم آواز آتی ہے اور جب
وہ کھڑی سنتی ہوتی ہے، شہر کے دروازے
میں لیمنڈ نظر آتا ہے۔)
لیمنڈ:۔ ننھی روح!
سیلچن:۔ تم! ہر وقت تم!
لیمنڈ:۔ میرے پاس نئے عجوبے ہیں (سیلچن سر کو جنبش دیتی
ہے) بخدا تم مجھ سے اکتائی نہیں ہو کیونکہ میں کبھی ایک سا نہیں ہوں۔
سیلچن:۔ سنو!
(گایوں کی گھنٹیوں کی آواز پھر سنائی دیتی ہے)
لیمنڈ:۔ (حسد سے) کاہل نیند کی موسیقی! تو کیا زندگی میرے ساتھ
غمگین رہی ہے؟
سیلچن:۔ مجھے اس کا افسوس نہیں۔

لیمنڈ:۔ آؤ۔
سیلچن:۔ (اپنے سینے کی طرف اشارہ کرکے) پرند اُڑتے اُڑتے
تھک گیا ہے۔ (اپنے لبوں کو چھو کر) پھولوں میں شبنم نہیں ہے۔
لیمنڈ:۔ کیا تم مجھے چھوڑ دوگی؟
سیلچن:۔ دیکھو!
(صبح کے جھٹپٹے میں دروازے کے قریب لیکن شہر
سے کہیں دور اشارہ کرتا ہوا مدھم مجسمہ،
جبل البقر کے چرواہے میں تبدیل ہو گیا ہے۔)
لیمنڈ:۔ یہ کیا ہے؟
سیلچن:۔ میرے پہاڑ!
لیمنڈ:۔ وہاں کچھ نہیں دھرا۔ (اُسے مضبوطی سے گرفت میں
لے لیتا ہے۔) مت جاؤ! مت جاؤ! میں نے تمہیں اپنے شہر کے
عجوبے دیدئے ہیں۔ میں تمہیں اور عجوبے دونگا! (لیکن سیلچن اُس سے
الگ ہٹ جاتی ہے) اگر اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا
تو آؤ ہم دونوں ساتھ مرجائیں! دیکھو! وہ پیاری موتیں آرہی
ہیں جو سونے اور ڈوبنے سے واقع ہوتی ہیں۔
(شہر کے تاریک دروازے میں سے دھندلی
سی شکلیں نمودار ہو رہی ہیں۔ یہ موتیں ہیں جو
سونے اور ڈوبنے سے آتی ہیں۔ وہ سیلچن
کی طرف آہستہ آہستہ ناچتی ہوئی آتی ہیں،
اور کچھ دیر اسکو مسکرا کر دیکھتی ہیں اور پھر آہستہ
آہستہ ناچتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔)
سیلچن:۔ ہاں وہ اچھی اور نیک ہیں۔
(جب وہ شہر کی طرف دوبارہ حرکت کرتی ہے
لیمنڈ کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھتا ہے لیکن
جونہی وہ دروازے کے پاس پہنچتی ہے دور
سے گایوں کی گھنٹیوں اور بانسریوں کے

بجنے کی آواز پھر سناتی دیتی ہے جبلِ شراب کا
چرواہا گاتا ہے :-
آ! بیابان کی گھاس میں، اور
بہت دُور، گرنے والی چٹانوں کی مدھم آوازوں میں۔
آ! پھولوں سے لدے ہوئے اپنے پہاڑی وطن کے چمن زار میں
جہاں عقاب پرواز کرتے ہیں۔
اور اُون سے لدی ہوئی بھیڑیں دُھوپ میں چرتی ہیں۔
آ! پہاڑ پہ، جہاں میں چاند کی پتلی پتلی زرد
کرنوں کا تاج پہنے ہوئے
اپنے کاہستان میں گھومتا پھرتا ہوں۔
آ! پُرسکون آسمان تلے، اور گلریز صبح کے
پُرآرزو نغموں میں ــــــــ میری بیٹی!"
(وہ گا رہا ہے۔ سورج طلوع ہو گیا ہے۔ سیلیچن
لب کھولے اور ہاتھ پھیلائے، ہونے علیحدہ
ہو چکی ہے اور موت کی شکلیں شہر میں واپس
جا کر غائب ہو گئی ہیں۔)
سیلیچن :- میں آتی ہوں۔
لیمنڈ :- (اُس کی ٹانگوں سے چمٹے ہوئے) ننھی رُوح! تو کیا مجھے
غروبِ آفتاب کے بعد مچھر کی طرح مر ہی جانا چاہیئے؟ آہ! تمہارے
بغیر میں زندہ نہ رہونگا۔
سیلیچن (اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے) :- بے کس دل! میں جا رہی
ہوں ــــ!
لیمنڈ :- تاریکی ہو گئی۔ (شہر کے دروازے میں وہ اپنے چہرے کو
اپنے فرغل سے چھپا لیتا ہے۔)
(جب سیلیچن، جبلِ بقر کے چرواہے کے پاس
پہونچتی ہے بانسری کا ایک طویل نغمہ گونجتا ہے،
منظر تاریک ہو جاتا ہے اور کہیں دُور گایوں،

اور پھولوں کی گھنٹیوں، اور بانسریوں کی ملی جلی
مسلسل آوازیں بلند ہوتی ہیں۔)

چوتھا منظر

(منظر فجر کی کہر آلود سُرخی سے آہستہ آہستہ روشن
ہو رہا ہے۔ سیلیچن ایک سبزہ زار پہاڑ پر کھڑی ہوئی
ہے جس کے چاروں طرف سوائے نیلگوں آسمان
کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسکی پشت پر ہلال چمک
رہا ہے۔ ایک نیچی چٹان پر ایک گڈریا بیٹھا ہوا بانسری
بجا رہا ہے اور "چار پھول" اپنے سبزی مائل سپید،
نیلے، قرمزی اور سُنہری رنگوں کی تبدیلیوں کے
ساتھ رقص کر رہے ہیں۔ اور جب وہ اپنے رنگ
کے پھولوں سے ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ
کرتے ہیں تو اُن کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ انمیں
سے ہر ایک اپنے رقص کی گردش پوری کرتے ہوئے
باری باری سیلیچن کی طرف پھول پھینکتا ہے جسے
وہ اُٹھا کر اپنے لبوں اور آنکھوں سے لگا لیتی ہے)
سیلیچن :- شبنم۔ (وہ چٹان کی طرف چلتی ہے) گڈریا!
(لیکن "پھول" سیلیچن کو گھیرے میں لے لیتے ہیں
اور جب وہ اُسکے گرد طواف کر کے چلے جاتے
ہیں تو گڈریا بھی غائب ہو جاتا ہے۔ وہ "پھولوں"
کی طرف متوجہ ہوتی ہے لیکن وہ بھی غائب ہو
جاتے ہیں۔ دُھندلکے کی نقاب اُٹھ رہی ہے۔)
سیلیچن :- چلا گیا! (وہ اپنی آنکھیں ملتی ہے۔ پھر چٹان کی طرف ایک
بار اور مڑتی ہے۔ سامنے فلزمین اپنے ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے
کھڑا ہے۔) تم ہو!
فلزمین :- تو تُو آ گئی ــــــــ ایک زخم خوردہ بچھیا کی طرح

کو تکلیف سے نجات پائے ؟ کیا شہر بہت ہی دلکش تھا جس نے تجھے اتنے عرصے تک وہیں جکڑے رکھا ؟

سیلچن :- مجھے کوئی افسوس نہیں۔

فلزمین :- پھر واپس کیوں آئی ؟

سیلچن :- میں اکتا گئی تھی۔

فلزمین :- اب تو مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔

سیلچن :- (طعن سے) تو کس چیز سے مجھے اپنے پاس روکے گا ؟

فلزمین :- (اپنی آغوش میں لیکر) اس طرح۔

سیلچن :- میں تو تن جان گئی ہوں ——— اور اب ڈرپوک دوشیزہ نہیں رہی۔

فلزمین :- (فکرمندی سے) ہاں، اب تو بدل گئی ہے۔ تیری آنکھیں خالی ہیں ——— تیرا چہرہ سفید پڑا ہوا ہے۔

سیلچن :- (طنزاً) لیکن تیرے پاس یہاں ہے ہی کیا جو تو مجھے روکے رہیگا ؟ -

فلزمین :- سورج۔

سیلچن :- مجھے جلانے کے لئے۔

فلزمین :- ہوا۔

(ہوا کی دھیمی دھیمی نالہ و زاری سنائی دیتی ہے)

سیلچن :- مجھے جمانے کے لئے۔

فلزمین :- سکوت۔

(ہوا کا شور و غل ختم ہو جاتا ہے۔)

سیلچن :- ہاں، اس میں تنہائی ہے۔

فلزمین :- پھول تیرے لئے رقص کرینگے۔

(پھول اپنی گھنٹیاں بجاتے ناچتے آتے ہیں اور پھر ایک ایک کر کے ناچنا بند کر دیتے ہیں۔ اُن پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے اور وہ سو جاتے ہیں ———)

سیلچن :- دیکھو! یہاں ان تک کو نیند اور سستی آجاتی ہے۔

فلزمین :- بکریاں انہیں جگا دیں گی۔

(گڈریا اپنی چٹان پر بیٹھا اور بانسری بجاتا ہوا پھر نظر آتا ہے۔ چار برہنہ، صحرائی آنکھوں والے، خوب رُو، کمسن لڑکے، جن کے پاؤں بکروں کے سے ہیں، سوتے ہوئے پھولوں کے کبھی اندر اور کبھی باہر رقص کرنے لگتے ہیں۔ پھول بیدار ہو جاتے ہیں، اُچھلتے ہیں اور اُڑ جاتے ہیں اور اُن کے ساتھ ہی یہ بکرے بھی اپنے اپنے پھولوں سے لپٹے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں۔ گڈریے نے بانسری بجانی بند کر دی ہے اور وہ اپنی چٹان پر بے حس و حرکت لیٹا ہوا ہے۔)

فلزمین :- مجھ سے محبت کر !

سیلچن :- تو وحشی ہے !

فلزمین :- مجھ سے محبت کر !

سیلچن :- تو اکھڑ ہے !

فلزمین :- ہاں میری زبان سہمی نہیں۔ سُن ! میری آواز یہ ہے ! (خاموش پہاڑ پر ہاتھ پھیر کر) صبح کاذب سے لیکر ستارۂ اوّلیں کے جگمگانے تک مکمل خاموشی ہے (اپنے دل پر ہاتھ رکھکر) اور پرندے کے پر بھی ساکت ہو جائیں گے۔

سیلچن (اس کی آنکھوں کو چھو کر) تیری آنکھیں مہیب ہیں۔ ان آنکھوں میں مجھے جنگلی درندے چھپے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیا یہ ہمیشہ ایسی ہی ہیبتناک رہتی ہیں ؟

فلزمین :- ہرگز نہیں ——— جب یہ تجھے دیکھیں اے میرے گل رعنا۔

سیلچن :- (اس کے ہاتھ چھو کر) تیرے ہاتھ گلچینی کیلئے بہت سخت

ہیں۔ (وہ اُس کے پاس سے ہٹ کر ——— اُس چٹان کی طرف جہاں
گڈریا بیٹھا ہوا ہے مُڑتی ہے) دیکھ! بالکل جنبش نہیں! دن بھی تو
پُرسکوت ہے۔ لڑکے! (لیکن گڈریا نہ حرکت کرتا ہے اور نہ جواب
دیتا ہے) وہ آسمان کی نیلاہٹ میں کھویا ہوا ہے۔ (جوشیلی آواز
میں) لڑکے! آہ! میری آواز کا جواب نہیں دیگا۔ یہاں میری
آواز کا جواب کوئی نہیں دیگا۔

فلزمین (پُرجوش تمنا کے ساتھ) "میں" کوئی نہیں ہوں؟
(شام کے دُھندلکے میں منظر تاریک ہو جاتا ہے۔)

سیلیچن۔ دیکھ! نیند نے دن چرا لیا ہے! رات ہو چکی ہے۔
(نیند کی زنانی دُھندلی شکلیں تارِ عنکبوت میں
ملبوس نمودار ہوتی ہیں اور اپنے ہاتھوں کو
ہولے ہولے حرکت دیتے ہوئے گویا وہ بھی
خوابناک ہیں وہ اس کے گرد اگرد چکر لگاتی
ہیں ———)

سیلیچن۔ کیا تم نیند ہو؟ میری محبت نیند! میری محبوب
——— آرام!
(مسکراتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ فلزمین کی طرف
پھیلا دیتی ہے۔ وہ اس کے نیند میں جھوتے
ہوئے جسم کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ پھر
نیند کے دُھندلکے میں دونوں غائب ہو جاتے
ہیں۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے، سوائے
چاند کی، جو یکایک چمک اٹھا ہے، ہلکی سی روشنی
کے۔ گڈریا چٹان پر بانسری کے مدھم نغمہ کے
ساتھ ساتھ گاتا ہے:۔)

اے میری چھوٹی سی بکری! جس پر چتیاں پڑی ہوئی ہیں۔
جس کی آنکھیں زرد ہیں اور جس کی خوشبو دل پسند ہے۔
خدا کرے چاند، ہوا، اور سنہری سورج،
اور بے شمار تارے،
ہر روز تیرے لئے چراگاہ میں عمدہ گھاس پیدا کریں،
اور تیرا کودنا پھاندنا زیادہ ہو!
اور خدا کرے پہاڑی لومڑیاں تیرے پاس سے گذر جائیں،
اور تجھے سوتا ہوا کبھی نہ پا سکیں۔
ذرا میری بانسری کو صاف اور دُور تک گونجنے دے!
اور میں ذرا شیریں پانی تلاش کر لوں!
(خدا کرے) کوئی باز یا کوئی اور شکاری جانور،
تیرے قریب تک نہ آئے، میری ننھی سی بیٹی!
کاش یہ آتشیں چٹانیں دوپہر کے وقت محفوظ رکھیں،
تیرے نازک پاؤں کو پھسلنے سے!
سُن میری اس التجا کو، چمکتے چاند کے نیچے ———
اے آقائے عظیم! ——— اُچھلنے والے خدائے بز!
(ایک طویل نالہ نَے کے ساتھ گڈریا خاموش
ہو جاتا ہے۔ پھر چاند کے غائب ہوتے ہی اندھیرا
چھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ صبح کاذب کی دھندلی
روشنی میں سیلیچن سوئے ہوئے فلزمین کے پہلو
سے بیدار ہو کر اٹھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ گڈریا
جا چکا ہے لیکن چٹان کے نزدیک جبلِ بقر کا چرواہا
اپنے فرغل میں لپٹا ہوا کھڑا ہے۔)

سیلیچن۔ سالہا سال تک میں سوتی رہی۔ میری رُوح بھوکی ہے۔
(پھر جبلِ بقر کے چرواہے کو وہاں کھڑا ہوا دیکھ کر)
میں اب تجھے جان گئی ہوں ——— اے حیاتِ ارض ———
——— تیری خوشبو کو، تیرے مناظر کو، تیری لذت کو، اور تیری
تمام موسیقی کو۔ میں تیرے پاس سے گذر کر جا چکی ہوں۔
(وہ چلی جاتی ہے)

فلزمین۔ (جاگ کر) تو کہاں چلی؟

سیلیچن :۔ دنیا کے کنارے پر۔
فلزمین : (اٹھکر اور اُسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے) :۔
تُو مجھے نہیں چھوڑ سکتی!
(وہ مسکرا رہی ہے لیکن فلزمین اُس سے اس طرح کشمکش کرتا ہے گویا کسی سخت منجمد شے سے اُلجھ رہا ہو۔)
سیلیچن :۔ اے دوست! اب وقت آ چکا ہے۔
فلزمین :۔ تو کیا میرے بوسے وحشیانہ تھے؟ کیا میں تیرے لئے بار تھا؟۔
سیلیچن :۔ مجھے اسکا رنج نہیں ہے لیکن مجھے جانا ہی چاہیئے۔
(یکلخت جبلِ شراب کا نوجوان، جبلِ بقر کے بہیں و حرکت چرواہے کے سامنے کھڑا نظر آتا ہے اور اس کا ساز بجنا شروع ہوتا ہے۔)
فلزمین :۔ شہر کی منحوس موسیقی! تو کیا تو اسی (جبلِ شراب کے نوجوان) کے پاس واپس چلی جائے گی؟۔
سیلیچن :۔ خوف نہ کھا! میں آگے ہی بڑھتی رہونگی۔
فلزمین :۔ مجھے پہاڑوں کی ہوا پر نہ چھوڑ! تیرے بغیر محبت مُردہ ہے اور میں مر جاؤں گا۔
سیلیچن :۔ اے شکستہ دل! میں تو چلی!
فلزمین :۔ (چٹان کا سہارا لیکر) :۔ یہ سرد ہو چکی ہے۔
(چرواہے کی بانسری بجتے ہی جبلِ بقر اپنے ہاتھ سیلیچن کی طرف بڑھاتا ہے ساز بھی بجتا ہے اور جبلِ بقر بھی اپنی آغوش اس کے لئے وا کر دیتا ہے۔ وہ ساکت کھڑی ہے۔)
سیلیچن :۔ اے میرے رفیقوں، مجھے چلا ہی جانا چاہیئے۔ کوئی دم میں پو پھٹ جائے گی۔
(جبلِ بقر اور جبلِ شراب خاموشی میں اپنے چہرے چھپا لیتے ہیں۔ صبح کاذب کا جنازہ نکلتا ہے۔ مکمل تاریکی پھیل جاتی ہے)

پانچواں منظر

(بہت دُور مدھم روشنی سے جبلِ عظیم کی برف آلود چوٹی چمک اُٹھتی ہے، اور پھر یہ روشنی تیز ہو کر سیلیچن پر بھی پڑتی ہے۔ کوئی اور چوٹی نظر نہیں آتی، البتہ روشنی کے دونوں جانب جبلِ بقر اور جبلِ شراب اپنے سروں کو چھپائے سایوں کی مانند کھڑے ہوئے ہیں۔)
سیلیچن :۔ جبلِ عظیم! میں آئی!
(جبلِ عظیم کی چوٹی ایک ایسی آواز میں، جو دُور سے آ رہی ہو، مصروفِ تکلم ہوتی ہے۔ اس کی آواز روشنی کے ساتھ ساتھ صاف اور گرجدار ہوتی جاتی ہے:۔)
اے شعلۂ آوارہ! اے بے چین تپش!
ہر شے کو خاکستر کرتی ہوئی، ہر کسی بات پر متاسف نہ ہونے والی!۔
تقدیر کی ہوائیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گئی ہیں ——
تیری پُر فیض زندگی کی کشتی کنارے آ لگی،
اور تیری تمام پُر شوق جستجوئیں ختم ہو چکیں!
تُو اب مسافر ہے ایسے سمندر کی جہاں مدّ و جزر بھی نہیں ہوتا
جہاں روشنی اور تاریکی، تموّج اور سکون،
ایک ہیں —— آ! اے ننھی روح، گہوارۂ راز میں!
(سیلیچن گھٹنے ٹیک کر اپنا سر زمین پر جھکا دیتی ہے۔ روشنی دھیمی ہو رہی ہے، یہاں تک کہ منظر بالکل تاریک ہو جاتا ہے۔)

بسلسلۂ ماسبق نومبر ۱۹۳۷ء

دورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی

جس طرح حضرات شعرا روایاتِ کہن کے دلدادہ ہوتے ہیں اُسی طرح اُن کا محبوب بھی ہر حال میں اپنی روایتی وضع کا پابند رہتا ہے۔ جیتے جی عاشق کو ستانا، جلانا، کڑھانا، حتیٰ کہ مار ڈالنا اور کبھی نہ ملنا اُس کے آئینِ محبت کی اہم دفعات ہیں۔ لیکن مرنے کے بعد عاشق کی قبر پر جانا لازمی ہے۔ اور کیوں نہ ہو، محبت کی کشش اگر زندگی میں اپنا اثر نہ دکھائے تو کیا مرنے کے بعد بھی محرومِ تاثیر رہ جائے اس لئے کہ بقولِ شاعر ؎

جذبۂ عشق اگر سچ ہے تو انشاءاللہ ؛ کچے دھاگے میں چلے آئیں گے سرکار بندھے

جذبۂ عشق کی تاثیر برحق۔ جیتے جی نہ سہی، بعد از مرگ ہی سہی ایک بار "اُنہیں" آنا ضرور پڑے گا۔

کچھ ندامت کچھ حجاب، یکایک مزارِ عاشق پر جانے کی ہمت نہیں پڑتی اس لئے وہ شوخِ جفاجو پہلے اپنے کوچہ کی صبا اور نسیم کو وہاں بھیجتا ہے کہ ذرا خبر تو لائے کہ قبر کے اندر عاشق صاحب کس حال میں ہیں۔ عاشق صاحب اپنے پُرانے تلخ تجربوں کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ ہوا بھی میری خاکِ مزار کو برباد کرنے آئی ہے۔ چنانچہ کبھی اپنے دل سے اور کبھی خود ہوا سے یوں پوچھتے ہیں کہ :- ؎ (فانی)

خیر ہے کیا چاہتی ہے اے نسیم کوئے یار ؛ اب تو ظالم میری مٹی ہو چکی برباد بھی

آتی ہے صبا سوئے لحد اُن کی گلی سے ؛ شاید مری مٹی ابھی برباد نہیں ہے

آخر رفتہ رفتہ عاشق صاحب کی یہ بدگمانی دُور ہو جاتی ہے اور نسیم و صبا کو آمدِ محبوب کا پیش خیمہ تصور کر کے اُس کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ اختلافِ طبائع ہر موقع پر اپنا اثر دکھاتا ہے۔ چنانچہ ہر شاعر کا محبوب ایک نئے انداز سے اپنے چاہنے والے کی قبر پر آتا ہے۔ حسرت صاحب کا محبوب اپنے گیسو آراستہ کر کے اُن کے مزار پر گیا تھا[1]۔ جگر صاحب کے معشوق نے اُن کی قبر پر روتے روتے اپنا بُرا حال کر لیا تھا[2]۔ فانی صاحب کے "خانہ برانداز" نے اور بھی اُپج کی لی۔ وہ پراگندہ نقاب آتا ہے ؎

قبر پر کس شان سے وہ بے نقاب آنے کو ہے ؛ آفتابِ صبحِ محشر ہم رکاب آنے کو ہے

خدا جانے "اُس" کے آنے پر گورِ غریباں میں کیسا تہلکہ مچ گیا ہوگا۔ غالباً اسی لئے بعض مُلّا نے کہتے ہیں کہ قبرستان میں عورتوں کا جانا منع ہے۔ "بے ادبی ہوتی ہے"۔ خیر یہ ہوئی کہ وقت سحر تھا اور ابھی تھوڑے ہی لوگ گھروں سے باہر آئے تھے۔

---

[1] فاتحہ پڑھنے چلے مرقدِ حسرت پہ جو وہ ؛ پہلے کس ناز سے رو رو کے سنوارے گیسو

[2] برسائی آنسوؤں کی جھڑی چشمِ یار نے ؛ کیا اُٹھ کے کہہ دیا مری خاکِ مزار نے (جگر)

ورنہ اُسے "بے نقاب دیکھکر مُردوں پر تو خیر جو گذرتی، گذرتی، زندوں کا خُدا جانے کیا حشر ہوتا ؎

سحر ہوئی کہ وہ بادش بخیر آتا ہے ✤ چراغ ہیں مری تُربت کے جھلملائے ہوئے

قبرستان میں آنے کو تو وہ آیا مگر طبیعت میں جھجک باقی تھی اس لئے آگے بڑھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ فانی صاحب نے قبر کے اندر سے آواز دی ؎

چلے بھی آؤ یہ ہے[1] قبر فانی دیکھتے جاؤ ✤ تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

پُرانا قبرستان تھا، قبریں شکست و ریخت کی حالت میں تھیں، پہچانی نہ جاتی تھیں۔ فانی صاحب کی قبر تو کب کی ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو چکی تھی۔ بی صاحبہ[2] گھونگٹ کے پٹ کھولے، سر جھکائے، فانی صاحب کی آواز کے سہارے آگے بڑھیں اور پھر ٹھٹک گئیں۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ فانی صاحب کی قبر کونسی ہے۔ خود فانی صاحب بھی صحیح نشان بتانے سے قاصر تھے۔ ناچار یہ صلاح دی کہ ؎

زمینِ گورِ غریباں پہ اک جگہ نہ ٹھہر ✤ یہیں کہیں نگہِ شرمسار ہم بھی ہیں

چُنانچہ وہ کچھ دیر اِدھر اُدھر چل پھر کے اندازہ سے ایک جگہ ٹھہر گئیں۔ دراصل یہی قبرِ فانی تھی۔ ہائے افسوس، جو آرزو زندگی میں پوری نہ ہوئی وہ مرنے کے بعد بر آئی۔ مگر زندوں کی مصلحتیں مُردوں کی مصلحتوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ قبر میں کچھ اس طرح جانچ تول کر تختے لگاتے ہیں اور پھر اس پر کچھ اس طرح مٹی لادتے ہیں کہ مُردہ لاکھ چاہے، قبر سے باہر نہ نکل سکے حضرتِ فانی بہت تڑپے، بہت تلملائے، بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ تختے سرکا کر گھڑی بھر کے لئے باہر نکل آئیں مگر کمبخت قبر کچھ ایسی استوار بنی تھی کہ ذرہ برابر جُنبش نہ کی۔ ناچار نہایت دردناک آواز سے یہ شعر پڑھا ؎

فنا کے بعد یہ مجبوریاں ارے توبہ ✤ کوئی مزار میں کوئی سرِ مزار رہے

جب اور کچھ بس نہ چلا تو حضراتِ شعرا کے اصولِ مسلّمہ کے مطابق آپکی خاکِ تُربت دامنِ محبوب سے لپٹ گئی ؎

بخشا جو شرف اُنکے اُڑتے ہوئے دامن نے ✤ اُٹھ اُٹھ کے بلائیں لیں خاکِ سرِ مدفن نے

محبوب نے جب دیکھا کہ یہ عجب دامنگیر مٹی ہے، چمٹی ہی جاتی ہے، تو اپنے دامن کو جھٹک کر صاف کرنے کا ارادہ کیا۔ اور جیسے ہی اس نیّت سے اپنے دامن پر نظر ڈالی، حضرتِ فانی کی خاک کا ذرّہ ذرّہ تھرّا اُٹھا کہ ہائے اب یہ سعادت بھی چھِن

---

[1] مطبوعہ متن میں اس جگہ "وہ" ہے۔ میں نے "یہ" بنا دیا۔ اس جزوی تصرف کے لئے حضرتِ فانی سے معذرت خواہ ہوں۔ (رشادانی)

[2] مضمون کے دورانِ تحریر میں میرے ایک دوست "حکیم صاحب" تشریف لائے۔ اُنہوں نے لفظ "بی صاحبہ" پر اعتراض کیا اور کہا کہ آپکو کیونکر معلوم ہوا کہ محبوبِ فانی ایک "بی صاحبہ" ہیں۔ ممکن ہے کوئی "اَمرد" ہو۔ میں نے عرض کیا کہ ہاں ممکن تو ضرور ہے مگر اس مصرع میں (قبر پر کس شان سے وہ بے نقاب آنے کو ہے) لفظ "نقاب" سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ غالباً "بی صاحبہ" ہونگی۔ بہت ممکن ہے کہ پروفیسر فراق بھی یہی اعتراض کریں۔ تو جواباً گذارش ہے کہ مضمون لکھتے وقت میرا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا تھا اسلئے کہ۔ ع۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست۔ بہر حال اگر فراق صاحب اپنے ذاتی علم کی بنا پر میرے اس قیاس کو غلط سمجھتے ہیں تو میں بخوشی اسکے لئے تیار ہوں کہ وہ لفظ "بی صاحبہ" کاٹکر "صاحبزادہ صاحب" بنادیں۔ (رشادانی)

جائے گی ؎

کس نظر سے اُس نے دیکھا اپنے دامن کی طرف ؛ کانپ اُٹھا ہر ذرّہ میری خاکِ دامنگیر کا

جس وقت بی صاحبہ گورستان سے پلٹنے لگیں تو حضرتِ فانی نے یہ آخری وصیت کی کہ "حضور! آخر ایک مرنے والے کا ماتم کب تک - بہت سوگ ہو چکا - اب اس خاکسار کو بھول جائیے اور دوسروں پر مشق تغافل فرمائیے - اس لئے کہ حضور کا اس طرح سوگوار رہنا تو کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا ؎

وہ مشقِ خوئے تغافل پھر ایک بار رہے ؛ بہت دنوں مرے ماتم میں سوگوار رہے

حضرتِ فانی نے گورستان کی یہ داستان بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی ہے - ہم نے بخوفِ طوالت یہاں اس کا خلاصہ درج کر دیا ہے جن حضرات کو اس سے دلچسپی ہو اور جزئیاتِ امور سے آگاہی حاصل کرنا چاہیں وہ حضرتِ فانی کا دیوان ملاحظہ فرمائیں۔

سلسلۂ نزع و مرگ کی آخری کڑی روزِ جزا، حشر، محشر، اور قیامت ہے - معاد کا عقیدہ تو اکثر مذاہب میں پایا جاتا ہے لیکن قیامت کب آئے گی اس کی تعین کسی نے نہیں کی - زیادہ سے زیادہ قربِ قیامت کے کچھ آثار بتا دئے گئے ہیں مگر وہ ایسی مبہم باتیں ہیں کہ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا - ہمارے شعرا، خصوصاً چوٹی کے غزلگو جس درجہ حساس واقع ہوتے ہیں وہ ظاہر ہے بھلا اُن سے اس غیر معین حالت کی برداشت کہاں ممکن تھی اور وہ کب تک انتظار کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی ایک خیالی دُنیا بنائی اور اُس دُنیا میں پہونچنے کے لئے فرضی طور پر یا تو جلاد محبوب کی چھُری سے ہلاک ہوئے یا پھر اُس کے جور و ستم کے باعث ایڑیاں رگڑ رگڑ کے جان دی - پھر قیامت قائم کی - حشر و نشر کے سامان ہوئے - خُدائی دربار سجایا اور داورِ محشر کے سامنے فریاد لے کر پہونچے - چونکہ یہ حضرات شاعر ہونے کی حیثیت سے گویا ایک ہی "اُمت" کے افراد ہیں - اسلئے حشر میں سبکو تقریباً ایک ہی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں، چونکہ اس سلسلہ میں حسرت و جگر وغیرہ کے جو اشعار ہم پیش کر چکے ہیں وہ اثباتِ دعویٰ کے لئے بالکل کافی ہیں - لیکن اگر مزید ثبوت کی ضرورت ہو تو حضرتِ فانی آنجہانی کے اشعار سے مل جائے گا۔

اس سلسلہ میں ایک بات نہایت دلچسپ اور قابلِ غور ہے وہ یہ غالباً ان بزرگوں نے کسی ایسی وجہ سے جو خود انکے سوا کسی دوسرے کو معلوم نہیں، یہ عہد کیا ہے کہ جو کچھ بیان کریں اس میں تناقض و تضاد ضرور ہو - چنانچہ حضرتِ فانی حشر میں پہونچکر کبھی تو بربنائے محبّت، گلۂ جور و جفا کے بجائے سراپا شکر و امتنان بن جاتے ہیں - مثلاً ؎

روزِ جزا گلہ تو کیا، شکرِ ستم ہی بن پڑا ؛ ہائے کہ دل کے درد نے، درد کو دل بنا دیا

اور کبھی شکووں کے دفتر کھولدیتے ہیں اور ایسی دُھواں دھار تقریر فرماتے ہیں کہ بیچارہ محبوب بغلیں جھانکنے لگتا ہے اور خاموشی کے سوا اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا ؎

وہ مری شکایت پر چُپ کھڑے ہیں محشر میں ؛ بُت اُنہیں بنا پایا اب خدا خدا کر کے

اس شعر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ معنوی اعتبار سے دیکھئے تو سبحان اللہ، اور لفظوں پر غور کیجئے تو ماشاء اللہ۔ بت انہیں بنایا، اب خدا خدا کرے۔ واہ کیا بات کہی ہے۔ رعایت لفظی کیا کہنا۔ میاں امانت زندہ ہوتے اس شعر کو سنکر اپنی ساری "صنعِ جِدّت" بھول جاتے۔

دوسرے شعرا کی طرح حضرت فانی بھی جب اپنے محبوب سے "ملاقات" یا "اُس بات" کے طالب ہوتے ہیں تو وہ عیّار رفع الوقتی کے لئے اُن سے روزِ حشر کا وعدہ کرلیتا ہے۔ ان کی سادہ دلی دیکھو کہ اس عہد کو سچّا جان کر، اس کے ایفا کی اُمید میں خوشی خوشی جان دے کر حشر میں جا پہونچتے ہیں۔ وہ ہزار جھوٹوں کا جھوٹا جب دیکھتا ہے کہ یہ نامراد تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گیا اور حشر میں بھی آ پہونچا تو صاف مکر جاتا ہے کہ میں نے تم سے کسدن وفا کا وعدہ کیا تھا ؎

محشر میں بھی وہ عہد وفا سے مکر گئے ✻ جس کی خوشی تھی اب وہ قیامت نہیں رہی

یہ جواب سُنکر حضرتِ فانی کو جیسی کچھ مایوسی ہوئی ہوگی ظاہر ہے۔ اس دردناک سانحہ میں ہماری دلی ہمدردیاں اُنکے ساتھ ہیں، ہمارا بس ہوتا تو اس دغاباز کو اس عہد شکنی کی پاداش میں غلام بناکر حضرتِ فانی کو بخشدیتے۔

حشر کے دن پیش آنے والے گوناگوں واقعات کے بیان میں ہمارے چوٹی کے غزلگو شعرا نے خوب خوب دادِ سُخن دی ہے۔ فانی صاحب کے یہ دو شعر یاد رکھنے کے قابل ہیں ؎

وہ تیری بزم تھی نہ ملی جس میں چُپ کی داد ✻ یہ حشر ہے یہاں تو کھلے گی زبانِ داغ
محشر میں عذرِ قتل بھی ہے خونبہا بھی ہے ✻ وہ اک نگاہ جس میں گلہ بھی حیا بھی ہے

بخوفِ طوالت ہم اس موضوع پر رسمی شاعری کے ان ہی چند نمونوں پر اکتفا کرتے ہیں اور جنابِ فراق سے نہایت مودبانہ گذارش ہے کہ اس قسم کے لایعنی کلام کی حمایت کرکے اپنے ذوق کو رسوا اور نوخیز شعرا کو گمراہ نہ کریں۔

"زاہد، واعظ، محتسب، ناصح"

رسم و تقلید کی بنا پر جس طرح ہمارے شعرا اپنے آپ کو رندِ سیہ مست، مریدِ پیرِ مغاں، پرستارِ ساقی اور بے نیازِ طاعت و زہد بناکر پیش کرتے ہیں اُسی طرح اُن کے آئینِ شاعری میں یہ بھی فرض ہے کہ زاہد، واعظ، اور شیخ کی ہجو کریں، اُن پر پھبتیاں کسیں۔ اُن کی پگڑیاں اُچھالیں[1]۔ اُنہیں میخواری کی دعوت اور ترغیب دیں بلکہ موقع ملے تو پچھاڑ کر پلادیں۔ اُنہیں محفلِ ساقی اور بزمِ حسن میں بلائیں اور شراب و حسن کی بے پناہ قوتوں سے مغلوب نہ ہونے کا چیلنج دیں۔ جن اشعار میں اس قسم کے مضامین بیان کئے گئے ہیں اُن کے مطالعہ کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر حضراتِ شعرا کو زاہد و واعظ وغیرہ سے اسقدر کد کیوں ہے اور اُن کے درمیان وجہِ مخالفت کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ

---

[1] لے کے گیا ہے وہ پگڑی جو اُڑا کر حسرت ✻ مجھ گنہگار پہ ہے شب سے گمان واعظ۔

ہمارے شعرانے بربنائے تقلید چونکہ رندانِ سیہ مست کا سوانگ بھرا ہے اس لئے ہر ایسے گروہ کی مخالفت انپر واجب ہے جو مذہب و دینداری سے کوئی علاقہ رکھتا ہو۔ رندی کا فرض جبھی ادا ہوگا جب سنوری کی دھجیاں اُڑائی جائیں

زاہد و واعظ کے گناہوں کی ایک طویل فہرست ہر رسم پرست غزلگو کے دیوان میں آپکو مل جائیگی۔ ہم یہاں صرف اُن چند "کبائر" کا ذکر کرینگے جو حضرات شعرا کے بیان کے مطابق زاہد و واعظ کے لئے لازم و ملزوم قرار دے گئے ہیں۔

زاہد و واعظ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ وہ عبادت و ریاضت میں اپنا وقت گنواتا ہے۔ منہیاتِ شرعیہ سے لوگوں کو روکتا ہے۔ جنت کا طالب ہے۔ کوثر و تسنیم کے آب گوارا سے اپنی تشنگی بجھانے کا آرزومند ہے۔ حورانِ بہشتی سے اپنے چشم ولب و آغوش کے لئے سرمایۂ کیف و سکون حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں شاعر صاحب ایک رندِ دُردآشام اور دین ومذہب کی تمام قیود سے آزاد ہوتے ہوئے بھی خاصانِ خُدا میں سے ہیں۔ اِن کا سینہ اسرارِ معرفت کا گنجینہ اور اُن کا دل انوارِ حقیقت سے رشکِ طورِ سینا ہے۔ وہ گمراہوں کی ہدایت اور زاہد و واعظ پر شدّت سے نکتہ چینی کرنے کے لئے گویا من اللہ مامور ہیں۔ تعصب کے پردے اگر آنکھوں پر پڑے ہوتے نہ ہوں تو ہر شخص کو صاف نظر آ جائے کہ ان خود ساختہ ریفارمروں یعنی ہمارے شاعروں نے جن میں اکثر ہماری آپکی طرح اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں، رندی کا سوانگ بھر کر اپنے اشعار میں زاہد و واعظ اور شیخ و مُحتسب پر جو لے دے کی ہے وہ محض نقالی اور رسم پرستی ہے۔

جب کبھی اسلامی حکومت ہندوستان میں قائم تھی مُحتسب بھی تھے، مگر آج اُن کا وجود کہاں۔ چند تعلیم یافتہ حضرات کے سوا عام طور پر تو لوگ "مُحتسب" کے معنی سے بھی ناآشنا ہیں، لیکن فراق صاحب کے "بادشاہِ متغزلین" یعنی مولانا حسرت موہانی آج بھی محتسب سے دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ شراب کی حلّت و حرمت کے بارے میں اس سے مباحثے کرتے ہیں اور آخر اُسے لاجواب کرکے چھوڑتے ہیں۔ نہ صرف اسقدر بلکہ دلیلِ قطعی کے طور پر ایک ایسا الزامی جواب دیتے ہیں کہ "مُحتسب" کے پاس دم بخود رہجانے کے سوا چارہ نہیں ؎

ترکِ مے کے معاملے میں فضول ؛ مُحتسب ہم سے گفتگو نہ کرے
میکشوں سے نہ مُحتسب کی چلی ؛ آخرکار لاجواب اُٹھا
اسقدر تاکید کیوں ترکِ مے و ساغر میں ہے ؛ مُحتسب خود بھی تو فکرِ جنّت و کوثر میں ہے

اپنی خیالی دُنیا میں جگر صاحب کو بھی ایک مرتبہ مُحتسب سے سابقہ پڑ گیا تھا۔ اُنھوں نے ہزار منت کی مگر اس کمبخت نے شراب پھینک ہی دی ؎

اے مُحتسب نہ پھینک، مرے مُحتسب نہ پھینک ؛ ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

ہاں تو جیسا ہم ابھی بیان کرچکے ہیں زاہد و واعظ کا سب سے بڑا گناہ جنّت اور اس کے لوازم کی آرزو ہے۔ اور یہ ایک ایسا جُرم ہے جو کسی طرح معاف نہیں ہوسکتا، چنانچہ حسرت صاحب ببانگِ دہل اعلان کرتے ہیں کہ ؎

حشر میں بھی نہ ہوگا اے واعظ ؛ کفۂ آرزوئے حور معاف

اور یہ خواہشِ جنّت وہ بُری بلا ہے کہ اس کی بنا پر زاہد نورِ معرفت سے محروم ہوجاتا ہے۔ اگر کسی کو نورِ معرفت کی

تلاش ہو تو وہ شاعر صاحب کے قلبِ سیاہ میں ڈھونڈھے، اسلئے کہ نورِ معرفت رندوں ہی کے حصّے میں آیا ہے اور اسی لئے وہ مخلوق کے ارشاد و ہدایت کے اہم منصب پر مامور کئے گئے ہیں ؎

نورِ عرفاں کی عبث ہو دلِ زاہد میں تلاش ؛ اور یاں خاک نہیں خواہشِ جنّت کے سوا
جلوۂ حق سے ہے بےبہرہ زاہد ؛ محوِ تسنیم و سلسبیل ہیں سب

واعظو! مرشدِ کامل کی تمہیں ہو جو تلاش ؛ بزمِ رنداں میں بھی اک روز ذرا جا دیکھو

"بادشاہِ متغزلین" نے جنابِ شیخ کو ہجو شراب سے باز رکھنے کیلئے ایک نہایت "معقول" بات کہی ہے ؎

طالبِ کوثر و تسنیم جو ہوں حضرتِ شیخ ؛ خواہشِ بادہ کی توہین گوارا نہ کریں

ہمارے "مشایخ" یعنی شعرائے رندی کا جامہ پہن کر زاہد، واعظ، اور شیخ پر ہزار گونہ برتری حاصل کرلی ہے، اور بات بات پر ان بیچاروں کو ناڑتے اور شرمندہ کرتے ہیں۔ جگر صاحب فرماتے ہیں ؎

فکر ہے زاہد کو حور و کوثر و تسنیم کی ؛ اور ہم جنّت سمجھتے ہیں ترے دیدار کو

ظاہر ہے کہ "طالب مولیٰ" کے مقابلہ میں طالب جنّت کا مرتبہ بہت پست ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیا سچ مچ آپ "عشق حقیقی" کے چکّر میں پڑ گئے ہیں۔ یہ دعویٰ اگر حقیقت پر مبنی ہے تو اُس کا پیش کرنا انتہائے کم ظرفی ہے، بلکہ کھُلی ہوئی دلیل ہے اس امر کی کہ یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اصلیت سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اور اگر آپ کا مقصود "محبوب مجازی" ہے جس کے دیدار کو آپ جنّت سمجھتے ہیں تو پھر اس میں زاہد بیچارے پر طعن و تعریض کی کیا ضرورت ہے۔ اپنا اپنا مذاق اور اپنی اپنی پسند ہے۔

حضرتِ فانی نے چونکہ رندی و ہوسناکی اور بادہ و ساغر سے چنداں سروکار نہیں رکھا اسی لئے زاہد و واعظ و شیخ و محتسب سے بھی زیادہ نہیں اُلجھے۔ تاہم کہیں کہیں اپنی ظاہری "معصیت" ـــ جسے وہ اپنے زعم میں معنوی عصمت سے کم نہیں سمجھتے ـــ کا ذکر بڑی شان سے کرتے ہیں ؎

ذکرِ خورشیدِ قیامت مُن کے واعظ کیا کہوں ؛ خیر اس تردامنی کو روزِ محشر دیکھنا

حضرتِ اصغر ارشاد فرماتے ہیں ؎

حیران ہے زاہد مری مستانہ ادا سے ؛ سو راہِ طریقت کھُلی[1] اک لغزشِ پا سے

رندانِ سیہ مست کی لغزشِ پا سے "طریقت" کی سو راہیں کیا ہزار راہیں کھُل سکتی ہیں مگر "طریقت" کے مسلمہ معنی میں کچھ تغیّر کرنا پڑے گا۔ زاہد بیچارہ کیا جانے کہ رندی و کرامت لازم و ملزوم ہیں۔ یہ اسرار و رموز تو ہمارے شعرائے

---

[1] سو راہِ طریقت کھُلی "صد راہِ طریقت کشود" کا لفظی ترجمہ ہے، مگر اُردو زبان کے قاعدہ کے مطابق فاعل اگر بصیغۂ جمع ہو تو فعل بھی اُسکی مطابقت میں بصورتِ جمع ہی آنا چاہیئے۔ اس لئے "کھُلی" جو صیغۂ واحد ہے اس محل پر قطعاً غلط ہے۔ فارسی میں اگر فاعل، اسم بےجان ہو تو جمع ہونیکے باوجود بھی اس کا فعل صیغۂ واحد ہی میں ہوگا۔ لیکن اُردو میں ایسا نہیں۔ (شادانی)

بلا نوش ہی کو معلوم ہیں۔

حسرت ؎ جم چکا ہم پہ حال وقال کا رنگ ؛ شیخ بیکار ہائے وہو نہ کرے

ظاہر ہے کہ جو شخص حال وقال کے تمام مدارج طے کرکے عرفانِ رندانہ کی انتہائی منزلوں تک پہونچ گیا ہو اُس پر شیخ بیچارے کی ہائے وہو کا کیا رنگ جم سکتا ہے۔

اصغر ؎ ابھی اک موج مے اٹھی تھی میخانہ میں اے واعظ ؛ ابھی اِک برق چمکی تھی مری وادیِ ایمن میں

واعظ بیچارہ تو صرف حضرتِ موسیٰ والی وادیِ ایمن کو جانتا ہے۔ اُسے کیا خبر کہ میخانہ بھی وادیِ ایمن اور موجِ شراب برقِ تجلّی ہو سکتی ہے۔

جگر ؎ کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ ؛ میں اپنا ساغر اُٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا

واعظ کی کتاب کیا ہوگی؟ قرآن مجید یا کوئی دوسرا صحیفۂ مذہبی۔ ظاہر ہے کہ جگر صاحب کے جامِ شراب میں جو بجلیاں کوندتی ہوئی نظر آئیں گی وہ اِن "پرانی" کتابوں میں کہاں۔ بیچارہ واعظ کس برتے پر اپنی "کتاب" کا جامِ شراب سے مقابلہ کرسکتا ہے۔ اور اگر کریگا تو مُنہ کی کھائیگا۔

جگر ؎ نہ پوچھی بات بھی اس شوخ کی کافر نگاہوں نے ؛ لئے بیٹھا رہا زاہد متاعِ دین وایماں کو

یہ زاہد کی انتہائی حماقت تھی جو متاعِ دین وایمان کو اس اُمید پر لئے بیٹھا رہا کہ "اُس شوخ کی کافر نگاہیں" ملتفت ہونگی اسلئے کہ متاعِ دین وایمان ہے ہی کیا بلا جو کوئی اس کی طرف اعتنا کرے۔ مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ وہ "شوخِ کافر نگاہ" تھا کون؟ شاید خُدا؟ مگر نہیں۔ اسلئے کہ خدا کے نزدیک اگر دین وایمان ایسی ہی بیقدر چیز ہوتے تو اتنے پیغمبر بھیجکر اتنے مذاہب کی تبلیغ کاہے کو کراتا۔ کیوں نہ اُسی شے کو لوگوں میں رواج دیتا جو اُس کی "کافر نگاہوں" کو محبوب ہوتی۔

اصغر ؎ زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا ؛ رُخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

حضرتِ اصغر کا موضوعِ سخن چونکہ "حقیقت" ہے اسلئے اُن کے اشعار کو "مجازی" معنی پہنانا ان کے ساتھ حد درجہ ناانصافی کرنا ہے۔ رہ گئے "حقیقی" معنی تو اس کا سمجھنا زاہد کے بس کی بات نہیں۔ اسلئے کہ استعارات کا حجاب اُٹھا لینے کے بعد بھی معنی پر تاریکی کے پردے پڑے ہی رہتے ہیں۔ "اصطلاحاتِ صوفیہ" میں "رخ" کے معنی "تجلیات" اور "زلف" کے معنی "موجودات" و "تعینات" کے لکھے ہیں۔ زلف کا رُخ پر بکھرنا گویا ذاتِ احدیت پر تعینات کے حجابوں کا حائل ہوجانا ہی اور یہی اصغر صاحب کا "حاصلِ ایمان" ہے۔ اس چیستان کا سمجھنا زاہد تو کیا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

اِن بزرگوں کا ایک دلچسپ مفروضہ یہ بھی ہے کہ واعظین جو لوگوں کو ارتکابِ مناہی سے روکتے اور پاداشِ گناہ سے ڈراتے ہیں تو گویا وہ رحمتِ ایزدی کے منکر ہیں اسلئے کہ رحمت تو بہرحال گنہگار ہی پر نازل ہوگی۔ انسان اگر مُرتکبِ عصیان نہ ہو تو خُدا کو اپنی رحمت کے صرف کرنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔ اس طرح ارتکابِ معصیت گویا خدا پر ایک طرح کا احسان ہے۔ حقیقتاً یہ ایک زبردست مغالطہ ہے اور انتہائے تنگ نظری کی دلیل ہے۔ در اصل ہمارے شعرا کا منشا کسی حقیقت کا بے نقاب کرنا یا کسی واقعۂ نفس الامری کو پیش کرنا ہرگز نہیں ہوتا۔ نہ وہ کبھی ایسی گہری باتوں پر غور وفکر

کرنے میں اپنا وقتِ عزیز ضائع" کرتے ہیں۔ وہ تو صرف وہی کہتے ہیں جو اُن کے پیشرو کہہ گئے ہیں۔ اس سے انہیں بحث نہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ کوئی دانش و حکمت کی بات ہے یا محض لایعنی خرافات۔ وہ اس مسئلہ میں نقل را چہ عقل" کے اصول پر کار بند ہیں اور بس۔ کاش وہ اتنا سوچتے کہ واعظ جو کام کر رہا ہے وہ خود اُس کی ایجاد نہیں۔ یہی کام تمام ادیانِ و مذاہب کے بانیوں نے بھی کیا ہے اور واعظوں سے ہزار درجہ زیادہ سرگرمی کے ساتھ کیا ہے۔ تو کیا وہ سب کے سب رحمتِ ایزدی کے منکر تھے؟ کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ انسان کو اگر معصیت سے روکا جائیگا تو رحمتِ خداوندی معطل ہو کر رہ جائے گی۔ یہ کہاں سے معلوم ہو گیا کہ اگر انسان کو ارتکابِ گناہ پر ٹوکا جائے تو وہ گناہ نہ کرے گا۔ انسان بہرحال انسان ہے فرشتہ نہیں۔ از روئے خلقت معصوم نہیں۔ خطا اس کی فطرت ہے۔ اُسے عذاب سے ڈراؤ یا بہشت کا لالچ دو، معصیت سے باز رکھنے کی جو تدبیر بھی ممکن ہو عمل میں لاؤ مگر وہ گناہ کریگا اور ضرور کریگا۔ پھر رحمتِ الٰہی کے معطل ہو جانے کا اندیشہ کیسا۔ بات صرف اتنی ہے کہ "رندوں" کو اپنی سیاہ کاریوں پر ملامتِ خلق سے بچنے کے لئے کسی پناہ کی ضرورت تھی اسلیئے جوازِ معصیت کی "بہ معقول" دلیل پیدا کی گئی۔ مگر اس کے موجد ہمارے شعرا نہیں یہ تو بہت پرانی بات ہے۔ ہمارے شعرانے تو اپنے شاعرانہ اصول کے مطابق محض تقلید بلکہ نقالی پر اکتفا کی ہے۔ دیکھئے حضرتِ اصغر اس میدان میں کس شان سے وارد ہوتے ہیں ؎

کیا کرے زاہد بیچارہ اُسے کیا معلوم ؛ رحم کرتا ہے باندازۂ عصیاں کوئی

حضرتِ اصغر کے مُرید خاص جناب جگر بھی اپنے مرشد کے قدم بقدم چلے ہیں ؎

مجھکو مرے عصیاں سے کیا خاک ڈرائے گا ؛ زاہد وہی زاہد جو رحمت سے گریزاں ہے

زاہد کیلئے "خشک" ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ عشق کی رنگینیوں سے محروم ہے اسلیئے وہ بھی خدا تک نہیں پہنچ سکتا۔

حسرت ؎ بے پیروِ عشق رہنما نہ ہوا ؛ زاہدِ خشک باخدا نہ ہوا

جگر ؎ کعبۂ دل کی حقیقت سے تو واقف ہی نہیں ؛ باندھکر شیخ کہاں جامۂ احرام چلے

اصغر ؎ نہ ہوگا ہستیِ بے مدعا کا رازداں برسوں ؛ وہ زاہد جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

"ہستیِ بے مدعا"! ماشاء اللہ کتنی گہری بات کہی ہے۔ حکمت و فلسفہ سب اسکے آگے چیں بول جائے۔ دانایانِ روزگار جنہیں حضرتِ اصغر کے کلام کی روشنی میں عقل و دانش سے یکسر بے بہرہ سمجھنا چاہیئے۔ آج تک اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کی ہستی کا ایک مقصد و منشا ہے اور وہ مقصد و منشا بہت عالی ہے۔ "بے مدعا" صرف وہ ہستی ہو سکتی ہے جس کا وجود محض بیکار ہو۔ سو ایسی ہستی ایک انسان کی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ مگر حضرتِ اصغر چونکہ سطحِ انسانی سے الگ ہو کر شعر کہتے ہیں اس لئے اُن کے بیان کئے ہوئے "نکات" کا سمجھنا ایک انسان کے بس کی بات نہیں۔ اور زاہد بیچارہ بھی چونکہ آدمی ہی ہے اسلیئے حضرتِ اصغر نے واقعی بجا فرمایا کہ وہ ہستیِ بے مدعا کا رازداں نہیں ہو سکتا مگر مصرع اولیٰ میں ردیف (برسوں) سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ شاید دس پانچ برس حضرتِ اصغر سے درسِ معرفت لینے کے بعد اس سمجھ میں نہ آنے والے معمہ کو سمجھ جائیگا۔

حضراتِ شعرا اپنی عالی ظرفی کی بنا پر بجائے زاہد و واعظ پر ترس کھا کر اُسے بھی میخواری کی دعوت دیتے ہیں کہ زاہد بیچارہ محفلِ رنداں میں آتا ہے اور "سینۂ مینا" میں "برقِ سینا" کو تڑپتے دیکھکر اُس کے ہوش جاتے رہتے ہیں۔ وہ ہچکچاتا ہے۔ رندانِ مے آشام طرح طرح سے اس کی ہمت بندھاتے ہیں مگر وہ کسی طرح پینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ حیلے حوالے کرتا ہے۔ مگر کون سُنتا ہے۔ آخر زبردستی اُسے پلائی جاتی ہے اور جب اُس کے مُنہ کو مزہ لگ جاتا ہے تو ہزار جان سے اس انگور کی بیٹی پر فریفتہ ہوجاتا ہے۔ پھر بھی ظاہری مصالح کی بنا پر اس کی ہجو کرتا ہے۔ مگر پیتا ہے اور دھوم سے پیتا ہے یہاں تک کہ میخانے کی کُنجی ہر وقت اپنی دستار میں لٹکائے پھرتا ہے کہ جب جی چاہے میخانہ کا تالا کھولے اور دو چار جام چڑھالے۔ یہ داستانِ رنگین ہمارے شعرائے رسم پرست نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کی۔ یہاں اُس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

دعوت و ترغیب۔ ؎

حسرت ؎ واعظو مُنہ میں تمہارے بھی بھر آئے پانی ؛ مے رنگین کا جو ساغر سے چھلکنا دیکھو

جگر ؎ بزمِ ساقی میں ذرا دیکھ تو چل کر زاہد ؛ کیا بہاریں ہیں چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

حسرت ؎ بزمِ ساقی میں چلیں بھی تو کہیں حضرتِ شیخ ؛ شرط ہم کرتے ہیں رہجائے جو ایمان کا ہوش

حضرتِ زاہد کے میخانہ میں پہونچنے کے بعد ؎

جگر ؎ دم بخود ہیں حضرتِ زاہد یہیں تک دیکھکر ؛ ہوش اُڑ جاتے اگر شیشہ سے باہر دیکھتے

اصغر ؎ میخانے کی یہ صحبت اے شیخ غنیمت ہے ؛ لے کچھ لبِ ساغر سے، کچھ سینۂ مینا سے

جگر ؎ پی بھی جا زاہد خُدا کا نام لے کر پی بھی جا ؛ بادۂ کوثر کی بھی اک موج پیمانے میں ہے

حسرت ؎ نہ کر بزمِ ساقی میں انکار واعظ ؛ بگڑ جائینگے رندِ میخوار واعظ

جگر ؎ یہ خانقاہ نہیں پی بھی جا ارے زاہد ؛ یہ میکدہ ہے یہاں احتراز رہنے دے

میخانے کا آخری سین۔

حسرت ؎ رندوں نے پچھاڑ کر پلادی ؛ واعظ کے نہ چل سکے بہانے

دوسرا دور۔

حسرت ؎ شوق ہی دل میں لب پہ ہجوِ شراب ؛ ہم پہ روشن ہیں سب جناب کے رنگ

جگر ؎ کھل گیا آج مجھے دیکھ کے بیخودِ دمِ کیف ؛ زاہدِ خشک کو سمجھا تھا میں نا محرمِ کیف

حسرت ؎ ہے کلیدِ درِ میخانہ مقرر اے شیخ ؛ وہ جو پنہاں ہے ترے گوشۂ دستار کے پاس

جگر ؎ ہوگیا کیا مریدِ مے زاہد ؛ اب تو چہرہ پہ نور رہتا ہے

غرض جس طرح کبوتر اور بلّی میں قدرتی دشمنی ہے[1] اسی طرح ہمارے شاعر اور زاہد میں بیر ہے۔ اور لطف یہ کہ نہ وہ

[1] سخت حیرت ہو کہ بنگال میں، کم سے کم ڈھاکہ میں، بلّیاں خانگی پرندوں مثلاً کبوتر، مُرغی، مینا وغیرہ سے کوئی تعرض نہیں کرتیں (شادانی)

خود رند ہے نہ اُسے محتسب اور زاہد و واعظ سے کوئی سروکار مگر رسمی شاعری کے طفیل اُسے یہ سوانگ بھرنا پڑتا ہے۔ اس موضوع پر ہمارے چوٹی کے غزلگو شعرا کے چند شعر اور سُن لیجئے اور ان کی "صناعانہ" تعالی کی داد دے لیجئے۔

جگر ؎ غرق کر دے تجھکو زاہد، تیری دُنیا کو خراب ⁂ کم سے کم اتنی تو ہر میکش کے پیمانے میں ہے

اصغر ؎ زاہد سادہ توجہ کو وہم تھا اشتباہ کا ⁂ مصحفِ رُخ سے حل ہوا مسئلہ جوازِ عشق

حسرت ؎ لیگیا ہے کوئی بگڑی جو اُڑا کر حسرت ⁂ مجھ گنہگار پہ ہے شبہ کمانِ واعظ

جگر ؎ اِک بزمِ ناز میں چل زاہد تجھے دکھا دوں ⁂ مینا بدوش آنکھیں، ساغر بکف نگاہیں

اصغر ؎ نیازِ عشق کو سمجھا ہی کیا اے واعظِ ناداں ⁂ ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھدی

افسوس ہے کہ حضرت اصغر کی زندگی میں کسی نے اس شعر کی طرف توجہ نہیں کی ورنہ ہندوستان کے حاجیوں کو بڑی سہولت رہتی۔ حضرتِ اصغر کے بنائے ہوئے کعبوں ہی سے کام چل جایا کرتا۔ مکہ معظمہ جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ نہ کچھ خرچ ہوتا نہ صعوباتِ سفر سے دوچار ہونا پڑتا۔ مگر اب کون بتائے کہ حضرتِ اصغر کے وہ خانہ ساز کعبے کہاں کہاں واقع ہیں۔ شاید فراق صاحب رہنمائی کر سکیں۔

حسرت ؎ فصلِ گل میں بڑیں تو خوب کھلیں ⁂ خرقۂ زہد پر شراب کے رنگ

جگر ؎ زاہد مسجد نشیں ہیں اور اک ٹوٹا سا ظرف ⁂ میکدہ میں اہتمامِ جام و ساغر دیکھئے

ہمارے شعرانے زاہد، واعظ، محتسب اور شیخ کی جو دُرگت بنائی ہے وہ تو آپ نے دیکھ لی۔ اب حضرتِ ناصح باقی ہیں۔ بربنائے رسمِ زمانہ شاعر صاحب چونکہ عاشق بھی ضرور ہوتے ہیں اس لئے ان کو سمجھانے، بہلانے اور مشورہ دینے کے لئے ایک ناصح کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہذا جس طرح روشنی میں ہر مادی جسم کا سایہ لازمی ہے اسی طرح عالمِ عاشقی میں شاعر صاحب کے لئے ناصح کا وجود ناگزیر ہے۔ ناصح جہاں ہمدرد اور دلسوز ہوتا ہے وہاں اس کا نادان ہونا بھی ضروری ہے اور ناصح کے ان صفات کے متعلق تمام شعرائے مجتہدین و مقلدین متفق الرائے ہیں مگر ہمارا موضوعِ بحث چونکہ شعرائے مقلدین ہیں لیئے ہم صرف اُنہیں کے کلام سے چند مثالیں اپنے بیان کی تائید میں پیش کریں گے۔

فانی ؎ چارہ گر، ناصحِ مشفق، دلِ بیصبر و قرار ⁂ جو ملا عشق میں غمخوار وہ ناداں نکلا

جگر ؎ ہر قدم پر ناصحِ مشفق کی دلسوزی نہ پوچھ ⁂ آدمی اچھا ہے لیکن اِک ذرا دیوانہ ہے

اصغر ؎ ناصحِ مشفق مگر یونہی تڑپنے دے مجھے ⁂ مجھکو بھی معلوم ہے سود و زیانِ اضطراب

جگر ؎ جا بھی لے ناصح کہاں کا سود اور کیسا زیاں ⁂ عشق نے سمجھا دیا ہے عشق کا حاصل مجھے

اصغر ؎ مری وحشت پہ بحث آرائیاں اچھی نہیں ناصح ⁂ بہت سے باندھ رکھے ہیں گریباں میں نے دامن میں

یہ ہیں ہمارے چوٹی کے غزلگویوں کی جدت طرازیاں۔ یہ ہے اُن کا انفرادی رنگ۔ اسی کی بنا پر فراق صاحب کا دعوی ہے

کہ ”اُردو غزل گوئی لکھنؤ اور دلّی کی تاریک گلیوں سے نکل کر ....نئی آوازوں سے نغمہ سرا ہوتی ہے“! ہمیں یقین ہے کہ اگر جناب فراق غزل گوئی کی حمایت میں اپنا مقالہ سپرد قلم کرنے سے پیشتر اصغر، جگر، فانی اور حسرت کے دیوانوں کا مطالعہ کر لیتے تو انہیں اپنی اکثر رایوں کی غلطی اور اپنے بیشتر دعووں کی بے اساسی کا علم ہو جاتا اور جو ناواقف لوگ اُن کا مقالہ پڑھ کر غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں اُن کے گمراہ ہونے کی ذمہ داری بھی موصوف پر عاید نہ ہوتی۔

جفائے محبوب

مضامین فرسودہ کی پانچویں سُرخی ”جفائے محبوب“ ہے۔ ”پیکان و تیر، خنجر و شمشیر اور قتل وخون“ کے سلسلہ میں اِس موضوع پر کافی بحث ہو چکی ہے لیکن یہ عنوان خصوصیت کے ساتھ اس لئے علیحدہ قائم کیا گیا ہے کہ ”بادشاہِ متغزلین“ نے اس موضوع پر بہت کچھ زورِ طبع صرف کیا ہے اور دل کھول کر نقالی اور رسم پرستی کی داد دی ہے۔ اُن کے دوسرے معاصرین یعنی اصغر، جگر اور فانی اس میدان میں اُن سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء کے ساقی میں میں نے اپنے مضمون ”ایران کی امرد پرستی کا اثر اُردو شاعری پر“ میں نے ایرانی شاعر کے معشوق کی بیوفائی اور ستمرانی کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا اس محل پر اُن کا دہرا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے ہمارے شعرا کی نقالی پر کافی روشنی پڑتی ہے:-

”ہر ایرانی شاعر کے محبوب کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ وہ بے انتہا ظالم اور بے وفا ہے۔ اس کی تمام عنایتیں رقیبوں کے لئے وقف ہیں۔ عاشق اُس کے لُطف وکرم سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔ اسکے اخلاق حد درجہ پست اور اطوار بالکل غیر شریفانہ ہیں۔ میں مدتوں حیران رہا کہ یہ صفاتِ رذیلہ ایران کے حسینوں کے لئے کیوں مخصوص ہیں۔ میں نے بارہا اس پر غور کیا کہ ایران کے ہزاروں شاعروں میں سے جن کا کلام ہم تک پہونچا ہے کیا کوئی ایک بھی ایسا خوش قسمت نہ تھا کہ اُسے باوفا محبوب ملتا۔ آخر محبّت تو دونوں ہی جانب سے ہوتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ہم اصطلاحاً مرد کو عاشق اور عورت کو محبوب (معشوق) قرار دیتے ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ ایران میں کبھی کسی محبوب کو اپنے چاہنے والے سے محبّت نہیں ہوئی۔ آخر بہت غور وفکر کے بعد یہ نکتہ سمجھ میں آگیا کہ ایرانی شاعر کے معشوق کی ”بیوفائی“ اور ”ستمرانی“ بالکل فطری ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک امرد کا حُسن شاعر کی فریفتگی کا باعث تو ہو سکتا ہے لیکن خود شاعر میں وہ صفاتِ سادہ روئی کہاں کہ اس کے محبوب کے جذباتِ محبّت کو برانگیختہ کر سکیں۔ اس لئے چاہت یکطرفہ رہتی ہے اور محبّت کا جواب محبت سے نہیں ملتا بلکہ نہیں مل سکتا۔ اسی کا نام شاعروں نے محبوب کی بیوفائی اور ایذا رسانی رکھا ہے“!

اِس بیان سے ایرانی شاعر کے محبوب کی جفا شعاری کا سبب تو واضح ہو گیا مگر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُردو شاعری میں جفائے محبوب کے اسباب وہی ہیں جو ایرانی شاعری کے سلسلہ میں ابھی مذکور ہوئے۔ اسلئے کہ شعرائے اُردو میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے جنہیں امرد پرستی سے کبھی سروکار نہیں رہا۔ پھر بھی جفائے محبوب کا رونا سبھی

نے رد یا ہے، درحقیقت اُن چند افراد کو چھوڑ کر جنہوں نے آپ بیتی بیان کی ہے باقی سب نے محض رسم و تقلید کی بنا پر ان مضامین کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اُردو کا ہر شاعر بلا استثنا محبوب کی بے وفائی اور جفا شعاری کا قائل ہے۔ نہیں۔ بعض ایسے بھی ہیں جو تقلید کی شاہراہِ عام کو چھوڑ کر بیانِ واقع کی راہ پر گامزن ہوئے ہیں چنانچہ کوئی دلسوختہ حرماں نصیب کہتا ہے ؎

رات اِک بزم میں تھے جور و جفا کے شکوے ✿ دل بھر آیا جو تری مہر و وفا یاد آئی

کیسی اور مجبور اُلفت کا ایک شعر ہے ؎

حُسن سے سب کو گلہ ہے کہ وفادار نہیں ✿ یاں یہ رونا ہے کہ مجبور ہے مختار نہیں

مگر اس قسم کے کہنے والے "الشاذ کالمعدوم" کا حکم رکھتے ہیں۔ شاعرانہ رسم پرستی کے جتنے نمونے اب تک ہم نے پیش کئے یوں تو وہ سبھی "دفترِ بے معنی" کہلانے اور "غرقِ مے ناب" بلکہ نذرِ آتش کئے جانے کے مستحق ہیں۔ لیکن جفائے محبوب کے سلسلہ میں ہمارے چوٹی کے غزل گو شعرا نے جو کچھ لکھا ہے وہ حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ اب ہم "بادشاہِ متغزلین" کے کلام سے چند ایسے اشعار پیش کرتے ہیں جن میں اُن مخصوص صفات کا ذکر کیا گیا ہے جو شاعر کے محبوب کے لئے لازمی ہیں مثلاً وہ بانی جور و جفا ہے۔ بدخو اور ستمگر ہے۔ وفا دشمن اور عیار ہے۔ جفا کار اور خود بیں ہے۔ اور اس کے علاوہ کیا کچھ نہیں ہے ؎

کیا کیا تو نے یہ حسرت کہ دل اپنا چھوڑا ✿ ایسے عیار، ستمگار، جفا کار کے پاس

یہ بھی کیا انصاف ہے اے دشمنِ اہلِ وفا ✿ ہم رہیں ناکام یوں اور کام ہو حُسّاد کا

آرزو لازم ہے وجہِ آرزو ہو یا نہ ہو ✿ التفات اس کافر خود بیں کی خو ہو یا نہ ہو

نہ سمجھا بانیِ جور و جفا اس شوخ کو کوئی ✿ کہ ہم نے جس کو پایا شکوہ سنجِ آسماں پایا

وصل اُس بُتِ بدخو کا میسر نہیں ہوتا ✿ وابستۂ تقدیر ہے تدبیر ابھی تک

مشقِ جفا کی بہت سی صورتیں ہیں ان میں سے ایک نہایت دلچسپ صورت یہ بھی ہے کہ عاشق صاحب کے زخموں پر نمک پاشی کی جائے۔ عشقِ کامل کا کرشمہ یہاں نظر آتا ہے کہ یہ نمک پاشی باعثِ آزار ہونے کے بجائے عاشق صاحب کے لئے موجبِ تسکین و لذت ہوتی ہے۔ حسرت ؎

قیامت کا تعلق ہے قیامت کی محبت ہے ✿ مرے زخموں کی گویا جان ہے اُسکے نمکداں میں

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آزار سے لذت گیری محض ایک عارضی کیفیت تھی اور جلد ہی آزار درحقیقت آزار ثابت ہوا چنانچہ اُس کی برداشت نہ لا کر حضرت مولانا صاحب نے دبی زبان سے شکایت شروع کر دی ؎

ہم بندگانِ درد پہ عشقِ جفا ہی کیا ✿ دلجوئی وفا کا یہی مقتضا ہے کیا

اور جب دیکھا کہ اس سے کام نہیں چلتا تو ایک نہایت لطیف پیرائے میں اُسے جتا دیا کہ اگر تم جفا سے باز نہ آؤ گے تو پھر

ہم بھی عاشقی سے استعفا دیدینگے۔ اور اس کے ذمہ دار خود تم ہو گے ؎

اے ستمگر مجھ سے گو ترکِ وفا ممکن نہیں ٭ میں کروں لیکن کبھی ایسا تو کیا بیجا کروں

غرض شکوہ و شکایت کا سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ اس "دفا دشمن" کو یہ بات ناگوار گذرنے لگی اور اُس نے تنگ آ کر مولٰنا صاحب سے کہدیا کہ مولانا آپ کی روز روز کی گلہ سنجیوں سے دل پک گیا۔ خدا کے لئے اب بس کیجئے۔ یہ سُنکر مولانا نے فوراً یہ عادلانہ تجویز پیش کر دی ؎

ستم تم چھوڑ دو میں شکوہ سنجیہائے ناچاری ٭ کہ فرضِ عین ہو کیشِ محبّت میں رواداری

مگر بھلا وہ کب کسی کی سُنتا ہے۔ ادھر مولانا کی قوتِ برداشت بھی قریب قریب سلب ہو چکی تھی اسلئے جی کڑا کر کے کنایتاً ترکِ محبت کی دھمکی دیدی کہ ؎

نہ کر اتنا ستم ہم دردمندوں پر کہ دُنیا سے ٭ مبادا یکقلم اُٹھ جائے تہذیبِ وفاداری

مگر جب دیکھا کہ وہ "بانی جور و جفا" محض کو دن ہی اور لطیف کنایوں کو نہیں سمجھتا تو ناچار صاف صاف کہنا پڑا کہ ؎

وفا سے دشمنی رکھکر مرے دل کی خریداری ٭ بہت مشکل ہے اس جنسِ گرامی کی خریداری

جی ہاں، یہ عاشق کا دل ہے محض پارۂ گوشت نہیں۔ آپ حسین ہیں تو ہوا کریں مگر مہر و وفا قیمت میں دئے بغیر اس جنسِ گرانبہا کی خریداری ناممکن ہے۔ مگر وہ "عیار" مولانا کی اِن گیدڑ بھبکیوں میں کب آتا ہے۔ نہ جانے اِن جیسے کتنوں کو نگنی کا ناچ نچا چکا ہے کچھ ایسے تیور بدلے اور اس انداز سے مولانا کو ڈانٹا کہ بیچارے سہم کر رہ گئے اور چُپکے چُپکے خُدا سے دُعا کرنے لگے کہ پروردگارا! یا تو اس کے دل میں رحم ڈالدے یا پھر میرے دل سے اس کی محبّت نکال دے ؎

عطا ہو اس وفا دشمن کو توفیقِ کرم یارب ٭ نہیں تو پھر مجھی کو بے نیازِ مدعا کر دے

مولٰنا کی یہ بیکسانہ حالت دیکھکر اس کا تاؤ ذرا ٹھنڈا پڑا۔ پھر بھی یہ حکم دے دیا کہ خبردار! خبردار! آج سے ہمیں ستمگار نہ کہنا۔ نہ ہمارے جور و جفا کا شکوہ زبان پر لانا۔ یہ مانا کہ ہم ایسے ہی ہیں مگر تمہیں حق نہیں کہ ہمیں ایسا کہو ؎

خود ہے اقرار اُنہیں اپنی ستمگاری کا ٭ پھر بھی اصرار ہے مجھ سے کہ میں ایسا نہ کہوں

ایسی صورت میں صبر کے سوا مولٰنا کے پاس چارہ ہی کیا تھا۔ وہی مثل ہے کہ زبردست مارے اور رونے نہ دے۔ دل پر جو کچھ گذر رہی تھی اُس سے تو خدا ہی باخبر تھا مگر بربنائے مصلحت اس جفاکار کو خوش کرنے کے لئے نہایت نیازمندانہ انداز سے یہ عرض کیا کہ ؎

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی ٭ مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

مثل مشہور ہے کہ ؎ جو خوشامد کرے خلق اُس سے خُدا راضی ہے ٭ سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خُدا راضی ہے۔ اُسپر بھی مولٰنا کی اس "نیازمندی" کا بہت اثر ہوا اور غصّہ مہربانی سے بدل گیا۔ مولانا نے اس موقع کو غنیمت جانا اور فی الفور کہا ؎

کچھ غیر نہیں ہم کہ بگڑ جائیں وفا سے ٭ اظہارِ مراعات کی حاجت نہیں ہم کو

جور و ستم کی یہ بے پایاں داستان کہاں تک بیان کی جائے۔ اب ہم محبوبِ حسرتؔ کی ایک مخصوص عادت بیان کر کے دوسرے

"اساتذہ" کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اشعار بالا سے یہ تو آپ کو معلوم ہوگیا کہ وہ کافر بدخو جور و ستم کا بادشاہ ہے مگر یہ جان کر آپکو بے انتہا افسوس ہوگا کہ وہ بدخو ہونے کے ساتھ ساتھ بدلگام اور بدزبان بھی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بڑا بھولا بھالا اور سیدھا سادہ ہے مگر جب تنہائی میں ملاقات ہوتی ہے تو مولانا کو ایسی فحش گالیاں سُناتا ہے کہ خُدا کی پناہ ؎

مجھ سے تنہائی میں گر ملئے تو دیجئے گالیاں ؛ اور بزمِ غیر میں جانِ حیا بن جایئے

یوں تو ہر شاعر کا محبوب جفا کار ہوتا ہے لیکن حضرتِ فاؔنی کے معشوق نے انتہا کردی۔ کمبخت نے مَنّت کے طوق پہنے تھے تاکہ فاؔنی صاحب سچ مچ آنجہانی ہوجائیں۔ مَنّت آخر پوری ہوکر رہی اور حضرتِ فاؔنی اس دارِ فانی سے کوچ کرگئے۔ محبّت اِسے کہتے ہیں اور وفاداری اس کا نام ہے کہ مرنے کے بعد بھی محبوب کے آرام و راحت کا خیال ہے چنانچہ فاؔنی صاحب نے مرنے کے بعد بزورِ کرامتِ شاعرانہ جب یہ دیکھا کہ اُس ظالم نے اب تک مَنّت کے طوق نہیں اُتارے اور اُن کے بوجھ سے گردن دبی جاتی ہے۔ اور تکلیف ہوتی ہے تو قبرستان کے مجاور کی معرفت کہلا بھیجا کہ ؎

طوق مَنّت کے بڑھا ہوگئی مَنّت پوری ؛ بیڑیاں موت نے کاٹیں ترے دیوانوں کی

فاؔنی صاحب رعایتِ لفظی کو کسی حال میں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ یہاں بھی ماشاءاللہ طوق کے ساتھ بیڑیاں موجود ہیں۔ رقیب نوازی ہر شاعر کے محبوب کی ایک ممتاز صفت ہے اسلیئے اگر فاؔنی صاحب کا معشوق بھی اس سے متصف ہے تو کچھ جائے شکایت نہیں ؎

کون اُٹھائے مری وفا کے ناز ؛ دل ستم دوست، وہ رقیب نواز

ہاں شاعر کی یہ صفت البتہ قابلِ داد ہے کہ مرتے مرجاتا ہے مگر دامنِ وفا کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ فاؔنی ؎

ظالم کا نہ شکوہ کر ظلموں کی نہ پرواکر ؛ تو اپنی وفاؤں کی عزّت پہ فنا ہوجا

حسبِ دستور جگر صاحب کو بھی ایک "جور و جفا کے مالک" سے سابقہ پڑا ہے۔ چند کلمے اُن کی داستانِ درد کے بھی سُن لیجئے ؎

میں خوگرِ ستم ہوں، پروردۂ الم ہوں ؛ جور و جفا کے مالک مہر و وفا نہ کرنا

نگاہِ قہر پر بھی جان و دل سب کھوئے بیٹھا ہے ؛ نگاہِ مہر عاشق پر اگر ہوتی تو کیا ہوتا[1]

شوخ گستاخ کا چہرہ پہ اثر دیکھ نہ لے ؛ ڈر رہا ہوں کہ وہ سفاک اُدھر دیکھ نہ لے

ایسے "سفاک" سے ڈرنا ہی چاہیئے۔ ذرا میں چھُری بھونکدے تو کوئی اسکا کیا کرلے۔ ؎

شیشۂ دل وہ ہستیِ نازک ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا ؛ اسپہ کسی کے تیرِ ستم کی مشقِ سیاست کیا کہیئے

انہیں آنسو سمجھکر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم ؛ پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

---

[1] جب اتنی بیوفائی پر دل اُسکو پیار کرتا ہے ؛ الٰہی وہ ستمگر باوفا ہوتا تو کیا ہوتا۔ آغا حشر کاشمیری مرحوم۔

خدا ایسے بیدردوں سے دوست دشمن سب کو بچائے۔ ایک بیچارہ ہو کہ بلک بلک کر رو رہا ہے اور اس سنگدل کے بھاؤ میں آتی نہیں۔

مضامین فرسودہ کی فہرست میں چھٹا نمبر "تصوف و فلسفہ" کا ہو اور ترتیب کے لحاظ سے پہلے اسی موضوع پر بحث ہونی چاہیئے مگر ہم نے بعض مصالح کی بنا پر اس موضوع کو چوتھی قسط کے لئے اٹھا رکھا ہو۔

اشکِ خونین

رسم پرستی کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ ہے کہ انسان لمحہ بھر کیلئے اس پر غور نہیں کرتا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یا کہہ رہا ہوں آخر اس کا مطلب و منشا کیا ہے۔ اصل و حقیقت کیا ہو۔ حاصل و نتیجہ کیا ہے۔ اس قسم کی بے معنی نقالی کا بہترین نمونہ ہمارے چوٹی کے غزلگویوں کے وہ اشعار ہیں جنمیں اشکہائے خونین کا ذکر ہے۔ چہرۂ محبوب کیلئے غازہ کا استعمال اسی حد تک اچھا معلوم ہوتا ہے کہ حسن کو نکھار کر چمکا دے۔ نہ اتنا کہ اصلی رنگ کو دبا دے۔ اگر اعتدال کا خیال نہ رکھا جائے تو یہ آرائش رغبت کے بجائے کراہت بلکہ بعض اوقات نفرت کا باعث ہوتی ہے۔ ٹھیک یہی حال تشبیہہ و استعارہ اور مبالغہ کا ہے لعبتانِ خیال کو زیادہ جاذب توجہ اور دلربا بنانے کے لئے ان زیوروں سے آراستہ کرنے میں کوئی ہرج نہیں مگر اس کی ایک انتہا ہونی چاہیئے۔ اشعار میں جذبات انگیز مضمون کیلئے ضروری ہو کہ اس کی بنیاد کسی نہ کسی حد تک اصلیت پر قائم ہو ورنہ سُننے والے پر اس سے کسی قسم کا اثر مترتب ہونا غیر ممکن ہو مگر ہمارے شعرا جو اپنے پیشروؤں کی کورانہ تقلید کے شیدائی اور سنتِ جاریہ کے شدت سے پابند ہیں کبھی اس حقیقت کی طرف اعتنا نہیں کرتے۔

انسان جب کسی روحانی یا جسمانی رنج و تکلیف کی برداشت نہیں لاسکتا تو بے اختیار اُس کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ رونے سے اضطرابِ قلب کو تسکین پاتا ہے اور غم کا بوجھ قدرے ہلکا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے۔ اس سے شاعروں نے یہ مضمون پیدا کیا۔ یعنی یہ کہ دل کا خون ہو جاتا ہے تب آنسو نکلتا ہو۔ دل کے خون ہو جانے سے دل کا سدرجہ تکلیف پانا مراد ہے۔ یہ نہیں کہ دل فی الواقع خون کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی مناسبت و رعایت سے، جب شدتِ غم کا اظہار مقصود ہوا تو آنسوؤں کو اشکِ خونین اور گریۂ خونین سے تعبیر کرنے لگے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ آنسوؤں میں سچ مچ خون کی سُرخی موجود ہوتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ بات یہاں تک بڑھی کہ آنسوؤں کی سُرخی ایک مسلمہ حقیقت ہو گئی۔ نہ صرف اسقدر بلکہ آنسوؤں کو عینِ خون تسلیم کر لیا گیا۔ لہذا خون کی جو ایک مخصوص صفت ہو یعنی سُرخی و رنگینی وہ آنسوؤں کیلئے بھی ثابت ہو گئی۔ اور جس طرح خون کے چھینٹوں یا قطروں سے کپڑے یا دوسری چیزوں پر سُرخ دھبے پڑ جاتے ہیں اُسی طرح آنسوؤں سے بھی چہرہ، رومال، آستین اور دامن رنگین ہونے لگے۔ قطراتِ سرشک کہیں لالہ و گل کو شرماتے ہیں۔ کہیں دامنِ کہسار میں آگ لگاتے ہیں۔ کہیں شفق اور بہار کی رنگینیاں دکھاتے ہیں۔ وہی قطراتِ سرشک جن کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اگر صاف ہوں تو کپڑے پر گر کر خشک ہو جاتے ہیں اور کوئی نشان باقی نہیں رہتا اور اگر

آنکھوں کا کھیل بھی اُن میں شامل ہو تو صاف کپڑے پر میلے میلے دھبّے ڈال دیتے ہیں۔ خدارا انصاف! اِن مَیل کے دھبوں کو لالہ و گل سے تشبیہہ دینا کہاں کی خوش مذاقی ہے۔ کب تک یہ کورانہ تقلید کا جُوا اُردو غزل کے کاندھے پر سوار رہے گا۔

جناب اصغر کا ایک شعر ہے ؎

روانی رنگ لائی دیدۂ خونابہ فشاں کی ٭ اُتر آئی ہے اِک تصویر دامن پر گلستاں کی

"نشاطِ روح" کے مقدمہ میں مرزا احسان احمد صاحب اس شعر کے متعلق فرماتے ہیں کہ "غور کرو کس قدر رنگین پیرائے بیان ہے"۔ مرزا صاحب کے یہ الفاظ پڑھکر بیساختہ ایک حکایت یاد آگئی ؎

"ایک نواب صاحب نے مرتے وقت اپنے فرزندارجمند کو وصیت کی کہ بیٹا ہماری وفات کے بعد اگر ہمارے احباب میں سے کوئی تم سے ملنے کیلئے آئے تو اُسکے ساتھ بہت عزّت و احترام سے پیش آنا۔ اونچی جگہ پر بٹھانا اور نہایت نرم و شیریں گفتگو کرنا۔ سعادت مند بیٹے نے باپ کی بات گرہ میں باندھی اور مرحوم کی رحلت کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ جلد سے جلد ایک بلند مینار تیار کرایا۔ حُسنِ اتفاق کہیئے یا سوءِ اتفاق، مینار کی تعمیر کے چند ہی روز بعد نواب صاحب مرحوم کے ایک بُوڑھے دوست صاحبزادے صاحب سے ملنے آئے۔ صاحبزادے صاحب کی ہدایت کے بموجب نوکروں نے بڑے میاں کو مینار کی آخری منزل پر پہونچادیا۔ کمزور سن رسیدہ آدمی چڑھتے چڑھتے بیچارے کا دم پُھول گیا۔ آخری سیڑھی پر پہونچکر بیٹھ گئے۔ اتنے میں صاحبزادے صاحب بھی تشریف لے آئے اور دُور سے دیکھکر تعظیم بجالائے۔ بڑے میاں نے کہا "کہو بیٹا، اچھے تو ہو" صاحبزادے نے جواب میں فرمایا "رُوئی" بڑے میاں نے متعجب ہوکر پھر خیریت دریافت کی۔ صاحبزادے صاحب نے کہا "ریشم۔ موم۔ پروں کا تکیہ"۔ بڑے میاں سخت حیران تھے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ آخر کسی قدر برہمی کے ساتھ کہا کہ میں رُوئی، ریشم، پروں کے تکیہ کا حال نہیں پوچھتا میں تم لوگوں کی خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ صاحبزادے صاحب نہایت مودبانہ انداز میں بولے "گڑ، شکر، قند، مصری"۔ یہ الفاظ سُنکر بڑے میاں کو ضبط کی تاب نہ رہی۔ جھلّا کر مینار سے نیچے اُتر آئے اور نہایت درشت لہجہ میں صاحبزادہ صاحب سے مخاطب ہوکر بولے کہ "اے احمق! کچھ دیوانہ ہوگیا ہے۔ پہلے تو مجھ بُوڑھے کو چار منزل اوپر چڑھادیا۔ اور حال پوچھتا ہوں تو رُوئی، ریشم اور گڑ شکر خدا جانے کیا کیا خرافات بکتا ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے انتہائے عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ چچا جان گستاخی معاف، میں نہ احمق ہوں نہ دیوانہ۔ میں نے جو کچھ کیا وہ ابّا جان مرحوم کے ارشاد کی تعمیل تھی اور بس۔ مرحوم نے مرتے وقت فرمایا تھا کہ ہمارے دوستوں کو اونچی جگہ پر بٹھانا اور نرم و شیریں گفتگو کرنا۔ اسی لئے میں نے یہ مینار بنوایا ہے کہ اس سے اونچی جگہ یہاں اور کوئی نہیں ہے اور میرا خیال تھا کہ دُنیا میں سب سے زیادہ نرم چیزیں رُوئی، ریشم اور موم ہیں اور اسی طرح سب سے زیادہ میٹھی چیزیں شکر، قند، اور مصری ہیں اس سے زیادہ نرم اور میٹھی باتیں اور کیا ہوسکتی ہیں۔ آپ تو خواہ مخواہ خفا ہوگئے۔ بڑے میاں یہ جواب سُنکر بھونچکا رہ گئے"۔

اگر رُوئی ریشم اور قند و شکر کے معنی نرم و شیریں گفتار کے ہوسکتے ہیں تو یقیناً اصغر کا شعر بھی رنگینیوں سے معمور ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ایسا نہیں۔ اشک بیچارے میں پہلے رنگ تو ثابت کریجئے اسکے بعد دامن پر گلستاں کی تصویر اُتاریئے گا۔ رنگین اشعار کا یہ مطلب ہے کہ انہیں پڑھکر یا سُنکر بہار کی رنگینیاں آنکھوں میں چھا جائیں۔ رنگین صحبتیں یاد آجائیں

رنگین نغمے کانوں میں گونجنے لگیں۔ تصور میں رنگینیوں کی ایک دُنیا آباد ہو جائے۔ حسن کی بجلیاں چمکیں، بادۂ گلرنگ کے ساغر چھلکیں۔ فضا رنگ و بو سے یکسر معمور ہو جائے اور ناظر خیال اس میں کھو جائے۔ یہ نہیں کہ شعر میں رنگ کا لفظ آ گیا اور شعر رنگین ہو گیا۔ اگر اسی کا نام رنگینی ہے تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہو کہ "خالق باری" کا یہ شعر ؎

نیلا، پیلا، زرد، کبود ٭ تانا، بانا، تنست و پود

دُنیا کے ہر شعر سے زیادہ رنگین ہے۔ "اشک خونین" کے متعلق اب اپنے چوٹی کے غزلگویوں کے چند شعر سن لیجئے ؎

فانیؔ ؎ بدلا ہوا ہو آج مرے آنسوؤں کا رنگ ٭ کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا اُدھڑ گیا

ماشاء اللہ کتنی گہری بات کہی ہے۔ دل کا زخم اور پھر اس کا رفو۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لئے طبی دُنیا ابد تک ہمارے شعرا کی ممنون رہے گی۔ کس قدر غلط خیال ہے کہ جملہ تحقیقاتِ علمیہ کے لئے ہمیں دورِ جدید اور یورپ و امریکہ کا ممنون ہونا چاہیئے۔ کوئی بتائے کہ بیسویں صدی میں دل کے زخم میں ٹانکے لگانا یورپ یا امریکہ کے کس ڈاکٹر کو نصیب ہوا۔ مگر شعرا کے یہاں یہ ایک پُرانی چیز ہے۔ ہاں تو فانیؔ صاحب کے دل کے زخم کا ایک ٹانکا ٹوٹ گیا۔ اس سے خون بہ نکلا۔ آنسوؤں کا منبع چونکہ دل ہے اسلئے اشکوں میں اس خون کی آمیزش ہو گئی اور آنسوؤں کا رنگ عُنابی ہو گیا۔ اسے کہتے ہیں پروازِ تخیل یا بالفاظِ دیگر دُور کی کوڑی لانا۔ اشکوں کی مفروضہ سُرخی کا ماشاء اللہ کہاں سے تار نکالا ہے ؎

فانیؔ ؎ فرقت میں تارِ اشک ہو ہر تارِ آستیں ٭ ہر داغِ خون ہے دیدۂ خونبارِ آستین

اصغرؔ ؎ اشکِ خونین ہے کہیں نالۂ رنگین ہے کہیں ٭ ہر قفس میں اُتر آتا ہے گلستاں کوئی

نالۂ رنگین سے تو خیر کیا مگر اشک خونین سے ضرور قفس میں گلستاں اُتر آتا ہوگا۔ اشکِ خونین کے فرضی رنگ سے گلستاں کی تصویریں بنانے کا اصغرؔ صاحب کو بہت شوق ہے۔ مگر ان تصویروں کی حقیقت اُس "نوری جامہ" سے زیادہ نہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ بعض عیاروں نے کسی زمانہ میں ایک سادہ دل بادشاہ کو پہنایا تھا۔ اور جس کی یہ صفت بیان کی گئی تھی کہ صرف "ایماندار" لوگوں کو نظر آ سکتا ہے۔ سالگرہ کے موقع پر جب بادشاہ اُسی "نوری جامہ" کو پہنکر جلوس کے ساتھ شہر میں گشت کیلئے نکلا تو اُسے دیکھکر لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ وہ مادر زاد ننگا تھا مگر لوگوں نے سمجھا کہ شاید یہ ہمارے ایمان کا قصور ہے جو "نوری جامہ" نظر نہیں آتا اور بادشاہ برہنہ دکھائی دیتا ہے۔ سب دم بخود تھے اور جو کچھ دیکھ رہے تھے اسکا اظہار و اعتراف دوسروں سے اسلئے نہیں کرتے تھے کہ "بے ایمان" سمجھے جائینگے۔ آخر ایک معصوم بچہ نے چلّا کر کہا۔ "ارے یہ کیا، بادشاہ ننگا جا رہا ہے"۔ ایک دفعہ اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ اس سرے سے اُس سرے تک ایک ہلچل مچ گئی۔ اب ہزاروں زبانوں پر یہی الفاظ تھے کہ "بادشاہ ننگا جا رہا ہے"۔ اب لوگوں کو یقین آ گیا کہ اُن آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ حقیقت تھی۔ اُن کے ایمان میں کوئی خرابی نہ تھی۔ "نوری جامہ" کوئی خارجی یا مادی وجود نہیں رکھتا تھا۔ عیاروں نے بادشاہ اور رعایا سب کو فریب دینے اور احمق بنانے کی کوشش کی تھی۔ آخر فریب کا پردہ چاک اور حقیقت کا چہرہ بے نقاب ہو گیا۔

یہی حال اصغرؔ صاحب کی اُن تصویروں کا ہے جو مقدمہ نگاروں کو بغایت "رنگین" نظر آتی ہیں حالانکہ وہ نقوشِ سادہ کی

حیثیت بھی نہیں رکھتیں بلکہ سرے سے اُن کا وجود ہی نہیں۔ مقدمہ نگاروں کی لفظی جادوگری نے لوگوں کے دلوں اور دماغوں کو کچھ اس طرح مسحور کر دیا ہے کہ اب وہ اُنہیں کی آنکھوں سے دیکھتے، اُنہیں کے دماغ سے سوچتے اور اُنہیں کے دل سے محسوس کرتے ہیں۔ ذاتی رائے پر مطلق اعتماد نہیں رہا۔ مقدمہ نگار نے اگر کسی شعر کو حد درجہ حسین و رنگین بتایا ہے مگر پڑھنے والے کو اس میں کوئی حسن و رنگینی دکھائی نہیں دیتی تو وہ اِسے اپنے فہم کا قصور اور استعداد کا نقص سمجھتا ہے حالانکہ حقیقت وہی ہے جو اُسے نظر آتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ رسمی، تقلیدی اور بے بنیاد شاعری کے خلاف میں نے جو آواز بلند کی ہے وہ بہتوں کی آنکھیں کھول دے گی اور انہیں نظر آنے لگے گا کہ ہمارے شعرائے رسم پرست کے اشعار کی رنگینی و رعنائی اور "معنویت" کی حقیقت "نوری جامہ" سے زیادہ نہیں۔ اور مقدمہ نگار حضرات اُن صنعت گروں کے ہم فن اور ہم رتبہ ہیں جنہوں نے "نوری جامہ" تیار کیا تھا۔

ہاں تو اصغر صاحب نے اپنے چھیتڑے ۔ جنکو بمنزلہ رنگ سمجھنا چاہیئے ۔ آنسوؤں کے پانی میں حل کرکے مژگان کے مُو قلم سے دامنِ قبا کے کینوس پر جو تصویریں کھینچی ہیں ان میں سے بعض آپ کے ملاحظہ کیلئے پیش کی جاتی ہیں ؎

وہ نغمۂ رنگیں ہیں سب بھول گیا اصغر ؛ اب گریۂ خونیں ہیں روداد گلستاں ہے

دل میں اک بوند لہو کی نہیں رونا کیسا ؛ اب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گلستاں کوئی

تھا لطفِ جنوں دیدۂ خوننابہ فشاں سے ؛ پھولوں سے بھرا دامنِ صحرا نظر آیا

حضرت اصغر کے دیدۂ خوننابہ فشاں نے دامنِ صحرا کو پھولوں سے بھر دیا تھا۔ جناب جگر کے دیدۂ خونبار نے دامنِ کہسار کو گلستاں بنا دیا۔

جگر ؎ جب کبھی چھیڑا جنوں نے دیدۂ خونبار کو ؛ بھر دیا پھولوں سے ہم نے دامنِ کہسار کو

مُرشد و مُرید کے ان شعروں میں کس بلا کی صوری و معنوی مشابہت ہے "من تو شدم تو من شدی" کی منزل اب دُور نہیں

جگر ؎ پوچھ مت مجھ سے مرے زخمِ جگر کی حالت ؛ میرے دامن میں ہر آنسو گُلِ تر ہے کہ نہیں

حضرت فانی نے زخمِ دل کے لہو سے آنسوؤں کو رنگین کیا تھا[1]۔ جناب جگر کے اشک، زخمِ جگر کے خون سے گلرنگ ہیں۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ جگر کا خون زیادہ شوخ رنگ ہوتا ہے یا دل کا تو اسی کے لحاظ سے یہ فیصلہ کرنا سہل ہوگا کہ جگر کا شعر زیادہ رنگین ہے یا فانی کا۔

جگر ؎ رنگیں ہیں فضائیں جاری ہیں اشکِ خونیں ؛ افسانہ حُسن کا ہے اور عشق کی زباں ہے

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشکِ خونیں ہی سے فضائیں رنگین ہو گئی ہوں گی۔ لیکن یہ نکتہ پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعر صاحب جہاں بیٹھے اشکِ خونیں بہا رہے تھے وہاں کتنی فضائیں تھیں جو جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا۔

---

[1] بدلا ہوا ہے آج مرے آنسوؤں کا رنگ ؛ کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا اُدھڑ گیا۔ فانی

طوالت کا خوف اپنی جگہ بر درست۔ مگر نا منصفی ہوگی اگر "بادشاہ متغزلین" کے چند اشعار اس موضوع پر یہاں نقل نہ کئے جائیں۔
سنیئے۔ حسرت ؎ جوشِ گل کی ہیں یہی کیفیتیں تو کیا عجب :: اشکِ بلبل سے قفس ہو لالہ زار اب کی برس
"اشکِ بلبل" کی جدّت قابلِ داد ہے اور اُن اشکہائے خونیں سے قفس کا لالہ زار بنجانا داد سے مستغنی۔
حسرت ؎ مری گریۂ خون کی سب لالہ کاری :: نمودار رہے دامن و آستین پر

وہ دن اب یاد آتے ہیں بہار خونفشانی کے :: وہ میرا جیب کو دامن کو بھی گلنار کر لینا

چشمِ رنگین یار کو ہے پسند :: سرخیِ اشکِ عاشقاں کی بہار

ظاہر ہے کہ بر بنائے مشابہت چشمِ رنگین یار کو سرخیِ اشکِ عاشقاں کی بہار پسند ہوگی۔ مثل مشہور ہے کہ ؎
کُند ہمجنس با ہمجنس پرواز :: لال کے ساتھ لال اور باز کے ساتھ باز

"جنون"

دُنیا میں ایسا کون ہے جس نے زندگی کے کسی نہ کسی دور میں محبت کی گرمی اپنے قلب میں محسوس نہ کی ہو۔ خصوصًا ایک غزلگو شاعر کیلئے تو عاشق ہونا ناگزیر ہے مگر ہمارا شاعر ہم آپ جیسا یعنی معمولی درجہ کا عاشق بننا پسند نہیں کرتا بلکہ لغوی، اصطلاحی تاریخی ہر اعتبار سے ایشیا کے آئیڈیل عاشق میاں مجنوں کا سچا جانشین بننا چاہتا ہے۔ میاں مجنوں کا اصلی نام قیس تھا مگر جب فرطِ عشق نے جنون کی صورت اختیار کی تو مجنوں مشہور ہو گئے۔ حُسنِ اتفاق یا سوءِ اتفاق سے یہ واقعہ ہمارے شاعر صاحب کو بھی معلوم ہے اور اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ کمالِ عشق کے لئے جنون لازمی ہے لہذا دیوانے بن گئے۔ مگر دیوانے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اس دور کے بعض مفکرین کی طرح "عدمِ تشدّد" کے قائل ہوتے ہیں اور اپنا جنون اپنی ہی ذات تک محدود رکھتے ہیں۔ دوسرے وہ جو جنون کے جوش میں طرح طرح کے ہنگامے برپا کرتے ہیں۔ جو چیز سامنے آئی اُٹھا کر پھینکدی، توڑ دی، برباد کر دی۔ جو ملا اُس سے بھڑ گئے۔ لڑ پڑے۔ پتھر مارنے لگے۔ اس قسم کے دیوانوں کو حفظِ امنِ عامّہ کی خاطر آزاد نہیں پھرنے دیا جاتا۔ یا اُن کے اعزّہ اُن کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر گھر ہی میں اُنہیں بند رکھتے ہیں یا پھر سرکاری پاگل خانوں میں اُنہیں قید رکھا جاتا ہے۔ اس طرح پہلی قسم کے دیوانے آزاد پھرتے ہیں اور دوسری قسم کے پابزنجیر رکھے جاتے ہیں۔ شاعر صاحب نے کہیں یہ بھی سُن لیا ہے کہ کمالِ "فن" اس کا نام ہے کہ انسان جامع حیثیات ہو لہذا دونوں قسم کے دیوانوں کی تمام خصوصیات و صفات اپنی ذات میں ثابت کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ دیوانے کا سوانگ بھرنے کیلئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ فرضی دیوانگی کے جوش میں ہمارا شاعر کپڑے پھاڑ ڈالتا ہے۔ پہلے گریباں چاک کرتا ہے۔ اس کے بعد دامن کی دھجیاں اُڑاتا ہے۔ پھر سر بصحرا نکل جاتا ہے۔ جب تک شہر کی حدود سے خارج نہیں ہو جاتا لڑکوں کا غول اُس کے پیچھے ہوتا ہے جو تالیاں بجاتا، شور مچاتا اور اُس پر کنکریاں برساتا ہے۔ میاں مجنوں کے لئے تو نجد کا صحرا قریب ہی موجود تھا اسلیئے صحرا نوردی سہل تھی مگر ہمارے شاعر کے لئے کسی صحرا تک پہونچنا بھی آسان نہیں اسلیئے اور بھی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ جنون کے جوش میں اتنا ہوش کہاں کہ جوتا پہنکر صحرا کو جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ننگے پاؤں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ چلتے چلتے پیروں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ ان میں کانٹے چبھتے ہیں۔ پھر آبلے پھوٹتے ہیں اور زخم بنجاتے ہیں۔

یہ دیوانگی کا ایک رُخ ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب اسیرِ دیوانگی کا دورہ پڑتا ہو تو اُسے زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ قید خانے میں پہونچکر وہ کچھ اس درد اور جوش سے آہیں کرتا ہے کہ زنداں کی دیواریں ہلجاتی ہیں۔ محافظوں کے کلیجے اُلٹنے لگتے ہیں۔ پھر جب فصلِ بہار آتی ہے تو اس کا جنون اور کبھی تیز ہو جاتا ہے۔ پہلے وہ گریباں چاک کرتا ہے پھر سارے کپڑے بدن پر سے نوچ کر پھینکدیتا ہے اور مادر زاد ننگا ہو جاتا ہے۔ کبھی جوشِ دیوانگی میں اپنا سر پیٹنے لگتا ہے یہاں تک کہ لہو لہان ہو جاتا ہے کبھی زنجیر کو پارہ پارہ کرکے اور کبھی زنجیر سمیت زنداں سے نکل بھاگتا ہے۔

یہ ہے مختصر رُوداد دیوانگی کی جو بادنیٰ تغیر ہر شاعر نے تفصیل کے ساتھ بیان کی ہو۔ رسم پرستی اور نقالی کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہوگی کہ ایک صحیح المزاج انسان خواہ مخواہ اپنے آپ کو دیوانہ کہے۔ جھوٹ موٹ اپنا گریبان چاک کرے۔ فرضی محبس میں قید رہے اور محض خیالی صحرا میں تنکے چُنتا پھرے۔

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے "بادشاہِ متغزلین" یعنی مولانا حسرتؔ موہانی اس میدان میں اپنے حریفوں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ وہ دیوانے تو بنے مگر گھٹیا قسم کے۔ یعنی اُن کا جنون چاک دامانی اور صحرا نوردی سے آگے نہیں بڑھا۔ نہ اُنھوں نے زنجیر پہنی۔ نہ اپنا سر پھوڑا۔ نہ قید خانے میں رہے۔ نہ اپنی آہوں سے زنداں کی دیواریں ہلائیں۔ یہ سعادت اصغرؔ، جگرؔ، اور فانیؔ کا حصّہ تھی۔ اُنہیں کو ملی اور حسرتؔ صاحب باوجود سعی اس سے محروم رہ گئے۔ سچ ہے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست ؛ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

آیئے اب اپنے شعرائے فرزانہ کی فرضی دیوانگی کا تھوڑا سا تماشا دیکھ لیجئے، پہلے دامن و گریباں کی دھجیاں اُڑتی ہیں ؎

باقی نہیں اک تار بھی دامن میں جو حسرتؔ ؛ اب اہلِ جنوں فکرِ گریباں میں لگے ہیں

مولانا کو سکون و خاموشی کے مقابلہ میں چونکہ شور و ہنگامہ زیادہ پسند ہے اسلئے صحرا میں جی نہیں لگتا اور ناچار شہر میں تشریف لے آتے ہیں تاکہ لڑکوں کا غول تالیاں بجانا، شور مچاتا، پتھر برساتا آپ کے پیچھے پیچھے ہو اور آپ اس برات کے دولھا بنے آگے آگے کوچہ و بازار میں چکر لگاتے پھریں ؎

شورِ طفلاں چاہیئے اے عشق سودائی مجھے ؛ کیوں پسند آنے لگی صحرا کی تنہائی مجھے

بحیثیت ایک مردِ سیاسی کے مولانا حسرتؔ کی ہمت و جرأت کا ہندوستان بھر میں شہرہ ہے۔ آپنے سچ مچ کے جیل خانوں میں رہکر قید بامشقت کی اذیتیں برداشت کی ہیں، چکیاں پیسی ہیں اور طرح طرح کی مصیبتیں جھیلی ہیں مگر یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ جب آپ ایک مجنوں عاشق کا سوانگ بھرتے اور خیالی صحرا گردی کرتے ہیں تو آبلوں میں کانٹے چُبھنے کی بھی تاب نہیں لا سکتے اور تکلیف کے تصوّر ہی سے بلک بلک کے رونے لگتے ہیں ؎

جانِ افگار پہ طاری ہوئی رقت کیا کیا ؛ آبلوں سے جو سنی خارِ مغیلاں کی صلاح

موضوعِ زیرِ بحث پر مولانا صاحب کا صرف ایک شعر اور سُن لیجئے ؎

زیبائشِ فرقِ عاشقی ہے ؛ دستارِ جنوں میں غم کا پیوند

ظاہری مطلب تو اس شعر کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ "عشق" کے سر پر جنون کی پگڑی لپٹی ہوئی ہے۔ اِس میں غم کا پیوند

لگا ہوا ہے اور یہ بیوندلگی ہوئی پگڑی آنجناب کے سرِ مبارک پر بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت اگر صرف اتنا ہی مطلب ہے تو یہ تو کچھ بات ہی نہ ہوئی۔ اسلیئے ضرور اس میں کوئی "باطنی" مطلب بھی ہوگا جس پر اہل ظاہر کی نظر نہیں پہونچ سکتی۔ انہیں اس شعر میں ضلع جگت اور لفظوں کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نظر نہ آئیگا۔

"بادشاہِ متغزلین" کی جنون سامانیوں کا مظاہرہ بہت پھیکا اور پھسپھسا رہا۔ آیئے اب حضرتِ جگر کے جوشِ دیوانگی کی ہنگامہ آرائیاں دیکھیں جنہوں نے اتنے گریباں پھاڑے ہیں کہ اب مرادآباد میں ایک ثابت پیرہن بھی مشکل ہی سے ملیگا۔ موصوف کا جنون نہایت تدریجی رفتار سے بڑھا ہے۔ آغازِ جنون میں اتنا ہوش تھا کہ گریباں چاک نہ ہو ورنہ رازِ محبت افشا ہوجائے گا ؎

عشق کا رازِ جنون عشق کی حد ہی میں ہے ⁂ دل گیا ہے تو گریبان نہ جانے پائے

بلکہ سچ پوچھیئے تو رازِ عشق چھپانے ہی کیلئے جنون کا یہ روپ بھرا تھا ؎

پیراہنِ جنون سے تنِ عشق ڈھک لیا ⁂ یہ اک طریقِ خاص ہوا خفائے راز کا

مگر یہ موصوف کی ناتجربہ کاری تھی جو یہ سمجھ لیا کہ جنون، عشق کی پردہ پوشی کرے گا۔ ابتدا میں غالباً جھوٹ موٹ آپنے اپنے اوپر جنون طاری کرلیا تھا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ مصنوعی جنون، حقیقی دیوانگی بنگیا اور اس کا جوش اتنا بڑھا کہ رازِ محبت چھپانے کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اسلیئے کہ گریبان سوسو جگہ سے چاک ہوگیا ؎

جوشِ جنوں سے کچھ نہ چلی ضبطِ عشق کی ⁂ سو سو جگہ سے آج گریباں نکل گیا

جگر صاحب کو خود حیرت ہے کہ گریبان چاک ہوا تو کیونکر اسلیئے کہ عالمِ دیوانگی میں آپکا ضعف اتنا بڑھ گیا تھا کہ ہاتھ کا اٹھنا بھی محال تھا۔ پھر اس نے گریبان کس طرح پھاڑ ڈالا اور اگر اس نے نہیں پھاڑا تو پھر کیونکر پھٹا ؎

دستِ جنوں کا ضعف سے اٹھنا محال تھا ⁂ کیا جانے کس طرح سے گریباں نکل گیا

بہرحال گریبان چاک ہوا۔ اور جب ایکمرتبہ یہ سلسلہ جاری ہوگیا تو پھر جاری ہی رہا ؎

حال وحشت میں ہوا یہ ترے دیوانوں کا ⁂ جیب چھوٹی تو گریباں لئے بیٹھے ہیں

جنوں میں سینے کو بیٹھے ہیں جیب کے ٹکڑے ⁂ خبر نہیں کہ گریباں بھی تار تار ہوا

اس عشق میں پورا کبھی ساماں نہیں دیکھا ⁂ دامن پہ نظر کی تو گریباں نہیں دیکھا

یہ سب ابتدائی دور کا حال ہے۔ اس کے بعد تو آپ نے اس بُری طرح گریبان و دامن کی دھجیاں اڑائیں کہ الہٰی توبہ ؎

خاص یہ شان ہے اک آپکے دیوانوں کی ⁂ دھجیاں خودبخود اڑتی ہیں گریبانوں کی

ہم نے دیکھی تھی ادا کل ترے دیوانوں کی ⁂ دھجیاں کچھ لئے بیٹھے تھے گریبانوں کی

رحم کر اتو جنوں جان پہ دیوانوں کی ⁂ دھجیاں پاؤں پہ آپہونچیں گریبانوں کی

یا تو جناب جگر جنون سے اس امر کے ملتجی تھے کہ "گریبان نہ جانے پائے" یا بالآخر گریبان و دامن پھاڑنے ہی کو رازِ عشق کا عرفان سمجھنے لگے ؎

عشق کا راز وہی سوختہ ساماں سمجھا ؛ جس نے دامن کبھی جانا نہ گریباں سمجھا

اور رفتہ رفتہ یہ عالم ہو گیا کہ جہاں کسی کے چاک گریباں دیکھا ان پر جنون کا دورہ پڑ گیا۔ مثل مشہور ہے کہ "دیوانہ را ہُوے بس است" مگر یہاں "ہُو" کی بھی ضرورت نہیں۔ پھٹا ہوا گریبان دیکھا اور دیوانگی نے طوفان برپا کر دیا ؎

اللہ اللہ مرے جوش جنوں کی لہریں ؛ نظر آجاتا ہو جب چاک گریباں کوئی

گریباں پھاڑتے پھاڑتے آخر ہاتھ شل ہو گیا ؎

اب اُسی دستِ جنوں پر آستیں ہو خندہ زن ؛ دھجیوں کو بارہا جس نے گریباں کر دیا

مرزا غالب نے بطریق طنز کہا تھا کہ ؎

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار ؛ صحرا مگر بتنگیٔ چشم حسود تھا

جگر سے اپنے عہد میں اس طعنہ کی برداشت نہ ہو سکی اور جنون کا وہ نام اُچھالا وہ صحرا گرد یاں کیں کہ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ آخر دُنیا کو ماننا پڑا کہ میاں مجنوں کے سچے جانشین اس "قحط الرجال" کے دور میں جناب جگر ہی ہیں اُنہیں خود بھی اپنی اس بزرگی کا احساس ہے چنانچہ بڑے فخر کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

مجھ سے قائم ہیں جنوں کی عظمتیں ؛ میں نے صحرا کو جگر صحرا کیا

سچ یہ ہے کہ جگر صاحب کو یہ دعویٰ ہر طرح زیبا ہے اسلیئے کہ گریبان تو سبھی دیوانوں نے پھاڑے ہیں مگر نہ اسطرح کہ ؎

داماں و جیب ہو گئے نذر جنوں تمام ؛ باقی کفن کے واسطے اک تار بھی نہیں

ہائے بیچارے جس طرح برہنہ دُنیا میں آئے تھے اُسی طرح برہنہ دُنیا سے جائینگے بشرطیکہ میونسپلٹی نے ننگا دفن کرنے کی اجازت دیدی۔

اِس میں شک نہیں کہ جنابِ جگر کا جنون مولنا حسرت کے جنون سے کہیں زیادہ تیز ہے پھر بھی آپ نے کچھ ایسی زیادہ صحرا نوردیاں نہیں کیں اور پاگل خانے میں بھی غالباً آپ کو زندگی کے آخری چند روز ہی گذارنے کا اتفاق ہوا ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ مع زنجیر صحرا میں جا پہونچے تھے ؎

حاصل دشت نوردی ہیں یہ اے وحشتِ جنوں ؛ آبلے ٹوٹ نہ جائیں کہیں زنجیر کے ساتھ

مگر اس شعر سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ گھر سے فرار ہوئے تھے یا پاگل خانے سے۔ یقینی طور پر تو صرف اتنا معلوم ہے کہ جب آپ گرفتار کر کے زنداں لے جائے گئے تو وہاں آپ کی بہت حفاظت کی جاتی تھی کہ کہیں نکل نہ بھاگیں۔ اس واقعہ کا آپ نے بڑی حسرت کے ساتھ ذکر کیا ہے ؎

ان جنوں سامانیوں پر کیا رہائی کی اُمید ؛ حسرتیں بھی دفن زیرِ خاکِ زنداں ہو گئیں

یہ امر بھی متحقق ہو چکا ہے کہ عالمِ جنون ہی میں آپ کا وصال ہوا ؎

سخت دشوار حفاظت تھی گریبانوں کی ؛ آبرو موت نے رکھ لی ترے دیوانوں کی

حضرتِ اصغر نے بھی گریبان دری میں کچھ کمی نہیں کی پھر بھی آپ جنابِ جگر کو نہیں پہونچتے۔ صحرا نوردی میں البتہ

آپ جگر کے ہم رتبہ قرار دے جا سکتے ہیں مگر قید خانے کی سختیاں جھیلنے میں یقیناً اُن سے افضل ہیں۔ آپکی روداد کا خلاصہ یہ ہے ؎

گیا کیا ہوا ہنگامِ جنوں یہ نہیں معلوم ∴ کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

اس کے بعد آپ حسبِ دستور صحرا نوردی کے لئے تشریف لے گئے ؎

خوب صحرا ہی برائے جوشِ جنوں ∴ پھاڑنے کو نت نئے دامن کہاں

لطف ہر طرح کا ہے دشتِ جنوں میں لیکن ∴ پھاڑنے کو نہیں ملتا ہے گریباں کوئی

صحرا میں آپکی دلبستگی کے تمام سامان موجود تھے، کمی اگر تھی تو صرف اتنی کہ ہر روز نیا گریبان پھاڑنے کو نہیں ملتا تھا کیونکہ آدھی درجن قمیص اور اتنے ہی کرتے جو آپ اپنے ہمراہ صحرا کو لے گئے تھے وہ چند روز میں پھٹ پھٹا کے برابر ہو گئے۔ سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ دیوانہ بن کر گریبان و دامن پھاڑ ڈالنے کے بعد آپ کو یہ پتہ چلا کہ آپ کا محبوب دل اور کلیجی کے کباب بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ لہذا اُسے آپ کے قلب و جگر کے ٹکڑوں کی ضرورت ہے ؎

اس کو مطلوب ہیں کچھ قلب و جگر کے ٹکڑے ∴ جیب و دامن نہ کوئی پھاڑ کے دیوانہ بنے

پاگل خانہ جانے سے پیشتر جس زمانہ میں آپکا قیام صحرا میں تھا آپ آستانِ یار سے جُدا ہو جانیکے غم میں بہت رویا کرتے تھے ؎

جوشِ جنوں میں چھوٹ گیا آستانِ یار ∴ روتے ہیں منہ پہ دامنِ صحرا لئے ہوئے

مگر روتے وقت آپ صحرا کا دامن کس طرح اپنے منہ پر ڈھانک لیا کرتے تھے اس کا سمجھنا اور سمجھانا ہمارے بس کی بات نہیں۔ شاید فراق صاحب یا سہیل صاحب یا مرزا احسان احمد صاحب کچھ ان اسرار و رموز کا انکشاف کریں تو پتہ چلے جس زمانہ میں آپ پاگل خانے میں تشریف رکھتے تھے آپ کا جنون بہت جوش پر تھا۔ زنجیروں کو اُٹھا کر جھنجوڑتے اور زمین پر دے دے مارتے تھے جس سے ایک نہایت وحشت انگیز شور پیدا ہوتا تھا ؎

اور آجائے نہ زندانئِ وحشت کوئی ∴ ہے جنوں خیز بہت شورِ سلاسل میرا

جس وقت آپ دیوانگی کے جوش میں پہنچتے تھے تو پاگل خانے کی دیواریں اور محافظوں کے دل ہل جاتے تھے ؎

اسیرانِ بلا نے آہ کچھ اس درد سے کھینچی ∴ نگہباں چیخ اُٹھے ہل گئی دیوارِ زنداں کی

پاگل خانے میں قریب قریب یہی حالت حضرت فانی کی بھی ہو گئی تھی ؎

ہل گیا زنداں بُرا ہو نالۂ شبگیر کا ∴ چونک اُٹھا گھبرا کے ہر حلقہ مری زنجیر کا

"حلقۂ زنجیر کا گھبرا کے چونک اُٹھنا" کچھ ایسی بات ہے کہ جو سمجھے اسکو بھی مزہ آئے اور جو نہ سمجھے وہ بھی لطف اُٹھائے اور یہی شاعر کا کمال ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یوں تو جگر، اصغر اور فانی تینوں حضرات نے صحرا نوردی بھی کی اور زنداں کی ہوا بھی کھائی مگر فانی صاحب اپنے دونوں رفیقوں سے اس باب میں ممتاز ہیں کہ اُن کی زندگی کا زیادہ حصہ پاگل خانے ہی میں گذرا اور ظنِ غالب یہ ہے کہ پاگل خانے ہی میں وفات بھی پائی۔ زنداں سے وہ کچھ اس درجہ مانوس ہو گئے تھے یا یوں کہیے کہ پاسِ وضع کا انہیں کچھ ایسا خیال تھا کہ قید خانہ چھوڑ کر صحرا جانے کو کبھی تیار نہ ہوتے تھے ؎

بے مروت بن کے کیوں اب سوئے صحرا جائیے ∴ لوٹتے ہیں پاؤں پر حلقے مری زنجیر کے

دوسرے ارباب جنوں کی طرح پاگل خانے میں بھی آپ کا شغل گریباں دری جاری تھا ؎

بہار آئی کہ یارب عید آئی اہلِ زنداں کو ٭ گریباں نے گلے لپٹا لیا ہو بڑھ کے داماں کو

فصلِ بہار میں چونکہ جنوں کا جوش زیادہ ہوتا ہوا بیلئے ایکدن فانی صاحب نے پاگل خانے کی دیوار سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ لیا اور خون جو بہا تو اس میں انگلیاں بھگو کر زمین پر گل بوٹے بنانے شروع کر دئے۔ خالی بیٹھے بیٹھے بھی انسان اکتا جاتا ہو آخر کچھ تو شغل چاہیئے ؎

خون کے چھینٹوں سے کچھ پھول بنکے کھلے ہی سہی ٭ موسمِ گل آگیا زنداں میں بیٹھے کیا کریں

کبھی ایسا ہوتا ہو کہ حضرات شعرا دیوانے ہونے کے بعد پہلے پاگل خانے تشریف لیجاتے ہیں اور اسکے بعد صحرا نوردی کیلئے نکلتے ہیں اور کبھی پہلے صحرا گردی فرماتے ہیں اور اسکے بعد پاگل خانے میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ اور کبھی مکرر کبھی قیدخانے کو نوازتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فانی صاحب ایک مرتبہ سے زیادہ محبوس رہے تھے ؎

پھر گوشہ گیرِ حلقۂ زنجیر ہے جنوں ٭ صحرا کو نذرِ تنگیٔ زنداں کئے ہوئے

خاتمہ پر حضرتِ فانی کی صحرا نوردی کا بھی کفوڑا سا حال سن لیجئے ؎

مرے تلووں سے کانٹوں پر نئی گلکاریاں ہونگی ٭ مری وحشت مبارک ہو جنونِ عیش ساماں کو

یہ صحبتیں بھی دیکھئے لاتی ہیں رنگ کیا ٭ مہمانِ خار پاؤں کے چھالے ہوئے تو ہیں

معلوم ہوتا ہے کہ مولٰنا حسرت کی طرح فانی صاحب صحرا جاتے وقت جوتا ساتھ لیجانا بھول گئے تھے اور ناچار ننگے پاؤں گھومنا پڑا۔ آبلے پڑے تھے تو پڑے تھے، اُن میں کانٹے بھی چُبھ کر رہ گئے۔ مضمون کا یہ حصّہ ختم کرنیسے پہلے فانی صاحب کے تین شعر اور سن لیجئے۔ شعر لئے جنون زدہ کی یادِ کچھ دنوں تو آپ کے دل میں تازہ رہے ؎

رکھ پنجۂ جنوں سے سرو کارِ آستیں ٭ کبتک رہینگے ہاتھ گرانبارِ آستیں

ہے ہے وہ اہلِ ذوق کی زنداں نوازیاں ٭ سر پیٹتا ہوں خانۂ زنجیر دیکھ کر

وحشتِ تازہ کا نوروز مبارک اے عشق ٭ پھر بہار آئی مجھے خلعتِ عریانی دے

فانی صاحب کی فرزانگی سے ہمیں توقع ہو کہ اُنھوں نے باہمہ جوشِ جنوں حضرتِ عشق سے یہ خلعتِ عریانی قیامِ صحرا کے زمانہ ہی میں مانگا ہوگا کیونکہ شہروں میں تو ننگا پھرنا نہ صرف اخلاقاً معیوب سمجھا جاتا ہو بلکہ قانوناً بھی ممنوع ہو۔ جسطرح جناب جگر نے عالمِ دیوانگی میں رحلت فرمائی تھی اسی طرح حضرت فانی بھی جنون کی حالت میں رہکر اے عالمِ باقی ہوئے جسکی تفصیل ہم "جنازہ" کے ذکر میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس شعر کا دُہرا دینا کافی ہے ؎ فانی ؎

ہڈیاں ہیں کئی لپٹی ہوئی زنجیروں میں ٭ لئے جاتے ہیں جنازہ ترے دیوانے کا

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

عندلیب شادانی؛

آب حیات پی لیا؟ . . . . . میرے لئے بُوند بھی نہ چھوڑی کہ مجھے مدد ملتی؟ . . . . شاید ان ہونٹوں پر کچھ لگا رہ گیا ہو۔ جو میرا کام بنا دے گا۔ . . . . . اُف! ہونٹوں میں اب تک جان کی گرمائی ہے!!

(لوگوں کے آنے کی آوازیں اور قریب آنے لگی ہیں۔)

جولٹ:۔ (اپنے میں آپ) لوگ بہت قریب آ گئے! جولٹ!! بس اب قصّہ تمام کرو!!!۔

(یہ کہکر رومیو کے پہلو سے خنجر نکالتی ہے۔)

جُولٹ:۔ (خنجر کو دیکھتے ہوئے) یہ سینہ تیری نیام ہے! (سینہ میں خنجر بھونکتے ہوئے) یہاں بسرام کر!!۔

(رومیو کے جسم پر گر کے مرجاتی ہے۔)

[لوگ آتے ہیں۔ دیکھتے ہیں۔ بوڑھا لارنس ساری بپتا سُناتا ہے۔ جسے سُنکر سب سینہ کُوٹ لیتے ہیں۔ اور اُس دن سے ایسے شیر و شکر ہوتے ہیں کہ پھر کبھی نہیں لڑتے جھگڑتے۔ مُبارک ہیں دیس کے بیٹا بیٹی جن کی جاں نثاری سے روٹھے من جائیں! بچھڑے مل جائیں!!]

سید وزیر حسن

ارمُغانِ عید

(بحضورِ دوست)

موسمِ گُل سے کیا غرض برگِ خزاں رسیدہ کو ۔۔۔ دیدِ خوشی سے کام کیا دیدۂ خُوں چکیدہ کو

فصلِ بہار آگئی عیش مناؤ خُوش دلو! ۔۔۔ کافی ہے سوز و سازِ درد چاکِ جگر بُریدہ کو

یوں ہے دلِ تباہ کی حالتِ زار ہمنفس ۔۔۔ کوئی مسل کے پھینکدے غنچۂ نارسیدہ کو

قابلِ داد ہے مگر تیرا یہ ظُلم بھی خزاں!! ۔۔۔ چلتی بنی اُجاڑ کر سبزۂ نو دمیدہ کو

داغِ جگر دکھاؤں گی قصّۂ غم سُناؤں گی! ۔۔۔ خواب ہی میں کبھی نواز اپنی الم رسیدہ کو

لذّتِ انتظارِ مرگ پوچھ نہ مجھ سے ہمنشیں ۔۔۔ آتا ہے کچھ قرار سا اس میں دلِ طپیدہ کو

اے دلِ درد آشنا! شکوۂ بخت تا کجا؟! ۔۔۔ جامِ طرب ہی زہر ہے لذّتِ غم چشیدہ کو

اب ہے غمِ فراق ہی رُوحِ روانِ زندگی!

سوزشِ مُستقل سے ہے تاب و توانِ زندگی!

"دلفگار"

ساقیِ گلفام

گھنگھور گھٹا جھوم کے اٹھی ہے سرِ شام — گل گشت کو نکلے ہیں حسیں، شوخ، گُل اندام
تھمتی نظر آتی نہیں شیشے میں دلا رام — لا دور ہیں مے خانۂ تنشیط کے اجرام

برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

رنگین فضائیں ہیں دہک جائے گلابی — سرمست نوائیں ہیں چھلک جائے گلابی
سرشار ہوائیں ہیں مہک جائے گلابی — بارش کی سرائیں ہیں بہک جائے گلابی

برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

ہر چہرۂ گُل رنگ پہ آتے ہیں پسینے — بجلی کی چمک سے دمک اُٹھے ہیں نگینے
کوئل کی صدائیں ہیں لگاوٹ کے قرینے — بے تاب ہیں لُٹنے کو نواسنج دفینے

برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

عُریاں ہیں مرے سامنے فطرت کے نظارے — مہ پاروں کا دربار ہے ساگر کے کنارے
تقویٰ شکن آنکھوں میں جوانی کے شرارے — ہر سانس میں لہرائے ہوئے شوق کے دھارے

برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایّام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

کھائی ہے نہ پینے کی، پلانے کی قسم، خُوب! — اس میکدہ بر دوش زمانے کی قسم، خُوب!
متوالے، حیا بیز ترانے کی قسم، خُوب! — ہنس ہنس کے مجھے اپنا بتانے کی قسم، خُوب!

برسات کے ایّام ہیں، برسات کے ایّام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

ساون کے ہیں لمحات جُنوں خیز گُہر بار — آغوشِ سماعت میں لئے نغمۂ سرشار

انگڑائیاں لیتی ہے تجلّیِ طرب زار سوتوں کو جگا دیتی ہے پیمانوں کی جھنکار
برسات کے ایّام ہیں، برسات کے ایّام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

اس فصل میں لازم ہے پئیں اور پلائیں خوردوں کو لئے نغمۂ تخریب جگائیں
پُرکیف رہیں، کیف میں عالم کو بسائیں ہر ذرّۂ ناچیز کو فردوس بنائیں
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

وُہ دَو دبگڑا ہے مینہ کا اِک ہوگیا جل تھل آئی ہے ندی بازوؤں میں پارتی کا جل
ہر فرشِ زمیں ہوگیا گلُ بوٹوں سے مخمل اس رُت میں نہ یوں بیٹھ کنڈھا جام میں بوتل
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایّام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

بُوندوں کی ٹپاٹپ ہے نکھر آئے ہیں گلشن ضو ریز ہیں الماس، قیامت کا ہے جوبن
ہر گوشۂ ویرانہ ہے اک وادیِ ایمن رنگ رلیاں ہیں، جھولے ہیں فسونکار فسوں فن
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایّام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

آ، ساغرِ بلّور میں کونین سما دے! آنکھوں میں جو کھنچتی ہے وہی آج پلا دے
اربابِ شریعت کو نگاہوں میں چھکا دے اک دُھوم مچا دے، ارے اک دُھوم مچا دے
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایّام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

صدقے ترے انداز کے اے ساقیِ گلپوش ہر ایک ادا ہے تری شوخیِ غزل کوش
اس بادۂ موسم میں عطا کر مئے سرجوش کاوش کو نہ احساسِ تکلم کا ہے ہوش
برسات کے ایام ہیں، برسات کے ایام
اے ساقیِ گلفام
بھر بھر کے پلا جام

کاوش حیدرآبادی

بھوجائی

(ایک خط بخدمت محترمہ چودھرانی حیا رحمٰن صاحبہ)

جناب بھاوج صاحبہ۔ سلام و دُعا۔ آپ کا خط مد۔ جی ہاں آپ بھابی جان قطعی نہیں ہیں۔ بلکہ بھاوج ہیں۔ اُودھ کی اصطلاح والی بھابی جان تو کلکتہ والی مسز سراج الدین ہیں۔ اور بھوجائی ایک دوسری ہیں۔ آج آپ کو اُن کا تھوڑا سا حال سُناتا ہوں اور اسی کو جی چاہے آپ رسالہ میں چھاپ دیجئے۔ ورنہ اب اس بُڑھاپے میں افسانے کہاں سے آتے۔

جس روز میرا اسکول کی دوسری جماعت میں داخلہ ہوا تو ہم تین لڑکے مُرغا بنائے گئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ تیسرے گھنٹہ میں ماسٹر صاحب کے آنے میں دیر ہوئی اور لڑکوں نے مجھے نیا سمجھکر آڑے ہاتھوں لیا۔ نوبت چپقلش پر پہونچی۔ نتیجہ یہ کہ ماسٹر صاحب آن پہونچے اور ہم تین لڑکوں کو دو دو چانٹے مار کر مُرغا بنا دیا۔

مُرغا بنے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ میں نے اپنے پڑوسی مُرغ کی طرف جھانک کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کان ہاتھ میں، بند مٹھی مگر چھنگلی کے پاس ایک اور صحیح سالم چھنگلی مٹر کی پھلی کی طرح اٹک رہی ہے۔ میں نے بہ سلسلہ تحقیقات آہستہ سے اپنا ہاتھ ٹانگ میں سے نکال کر اس انگلی کا پکڑ کر جو معائنہ کیا ہے تو یہ مُرغ چیخ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ ٹانگ میں لے جا کر بدستور اپنا کان پکڑ لیا۔ لیکن ماسٹر صاحب نے دیکھ لیا۔ حالانکہ میں نے انگلی آہستہ سے صرف چُھو کر دیکھی تھی۔ لیکن چھنگا کی انگلی کھینچنے کے الزام میں خُوب پٹا۔ چھنگا بھائی سے یہ میری پہلی مُلاقات تھی۔ اُن کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک فاضل انگلی اس طرح لٹک رہی تھی اور یہ اس کام آتی تھی کہ لڑائی ہو تو پکڑ لی جائے۔

بھائی چھنگا کا نام رام لال تھا اور یہ ذات کے بنئے تھے۔ اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ صرف ایک بہن مُنی تھی جو وقفہ میں اُنکے لیے ایک گلاس دودھ بھر کر لاتی تھی جو اکثر یار لوگ پی جاتے تھے۔ بھائی چھنگا کے باپ کی مصالحوں اور کرانے وغیرہ کی دوکان تھی۔ بہت جلد میری اور اُن کی ایسی دوستی ہو گئی کہ ہم دونوں بچے تو تھے ہی لیکن بھائی چارہ ہو گیا۔ ایسی یاری اور بے تکلفی ہو گئی کہ عرض نہیں کر سکتا۔ میرا اُنکا چار برس ساتھ رہا۔ اس لئے کہ میرے والد صاحب کو وہ شہر چھوڑنا پڑا۔ ذرا غور کیجئے کہ کبھی عمر بھر چھنگا بھائی سے خط و کتابت نہ ہوئی۔ زمانہ گذر گیا۔ ایک دوسرے کو بھول بھال گئے۔ مرے جئے کی خیر خبر نہ رہی کہ ابھی حال میں اُن سے مع بھوجی کے مُلاقات ہو گئی۔ اس مُلاقات کا مختصر حال سناتا ہوں۔

کچھ عرصہ ہوا ایک کام سے رتلام جانا پڑا۔ رتلام جاورہ سے ریلوے سے دو اسٹیشن اور بذریعہ موٹر چوبیس میل پختہ سڑک ہے۔ میں ایک دوست کی آمد کے سلسلہ میں موٹر سے گیا۔ یہ بدتمیز دوست نہ آئے۔ مایوس چلا آرہا تھا کہ سر اُٹھا کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کھدّر پوش بُزرگ مجسّم کانگریس بنے، گاندھی ٹوپی لگائے، ڈیڑھ بالشت کی ڈاڑھی اور مونچھوں میں کُل کا کُل مُنہ پوشیدہ، پیشانی پر لال پیلا قشقہ اس زور کا لگائے کہ برہمن شرمائے۔ گود میں دو سال کا بچہ۔ پیچھے ایک سفید چادر اوڑھے کوئی ڈھائی ڈھائی سیر کی پازیب پہنے خوش جمال اور نوعمر عورت۔ میں بھلا ان سُورماکو کاہیکو پہچانتا۔ مگر گود والے ہاتھ کو دیکھا تو چھنگلی لٹک رہی تھی۔ ایک بجلی سی کوند گئی۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ لاکھ ضبط کرتا ہوں پر جی نہیں مانتا۔ قدم بڑھا کر آگے راستہ کاٹا۔ میں نے کہا "کیوں جی۔ یہ تم کس کی عورت بھگا لاتے؟" میں نے نوعمر بھوجی کی طرف اُنگلی اُٹھا کر پوچھا۔ اور قبل اس کے کہ وہ کافی طور پر برہم ہو سکیں یا آنکھیں نکال سکیں میں نے ان پر حملہ کر دیا۔ ارے صاحب میں اس خوفناک ڈاڑھی والے کانگریسی کو پیار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے ڈاڑھی دار گال پر بوسہ دینا چاہتا ہوں۔ خواہ میری عینک ڈاڑھی میں اُلجھکر رہ جائے۔ مگر وہ شہد کی مکھی کی طرح لڑتے پڑتے ہیں۔ مگر توبہ کیجئے۔ لونڈا الگ حمزہ بن کر گود سے سڑک پر آ پڑا مگر میں نے نہ چھوڑا۔ نہ یہ سوچا کہ کوئی دیکھے گا تو کیا کہیگا۔

ہم دونوں دوست ایک دوسرے کو پہچان کر محبت سے مل رہے تھے اور اُن کی بیوی اس عجیب و غریب سین کو دیکھ رہی تھیں۔ دیکھنے ہی سے پتہ چلتا تھا کہ پہلی بیوی کا بھوجن کر چکے اور یہ دوسری بیوی ہیں۔ اب انہوں نے مجھ سے پردہ کیلئے گھونگھٹ فرمالیا تھا۔ میں نے

ازراہِ قدردانی پھر پوچھا "بھئی یہ کہاں سے بہکا لائے ؟ وہ پہلی والی کیا ہوئی ؟ اور وہ جولاہن کو کب چھوڑا ؟ ... بھئی ہم بھی تو دیکھیں ..." اور یہ کہکر جو بڑھا ہیں بھوجی کی طرف تو چھنگا نے خفا ہو کر مجھے مارنے کو کہا۔ لڑنے لگے کہ کیسی جولاہن۔ مجھے بیہودہ بدتمیز سب کچھ کہا۔

آپ جانتے ہیں مسافر کے یوں ہی حواس گم ہوتے ہیں۔ وہ اجمیر ہوتے ہوئے کوئی تیرتھ والی مزید حماقت کرکے گھر جاتے۔ تھے گاڑی چھوٹنے کے بے حد قائل۔ ادھر میں نے کہا کہ بھئی جاورہ راستے میں پڑتا ہے ایک دو روز ٹھہرو۔ کیا عرض کروں اس موذی لالہ سے کیسا کیسا کہا پر نہ مانا۔ میں نے بھتیجے کو گود میں لے لیا تھا پھل دلانے۔ طے ہو گیا کہ وہ نہ مانیں گے۔ ان کی گاڑی میں بٹھلانے گیا۔ اور اب خدا حافظ کر کے اور بھوجائی جی سے بھی رخصت ہوا۔ میں نے کہا "بھوجی جی یہ بھتیجہ ہمیں دیدو اور دراصل تم ان کی ڈاڑھی پر نہ جاؤ ہم اس کے بدلے دو کا انتظام کرا دیں گے" حضرت چھنگا نے اس پر خندہ فرمایا اور کہنے لگے "بڑے بیہودہ ہو۔ طے ہو گیا بھتیجہ ہم لیں گے۔ بھوجائی جی نے کہہ یا کہ لیلو۔ میں ان سے رخصت ہو کر بھتیجہ گود میں باہر اپنی موٹر پر آیا اور چھنگا مجھے رخصت کرنے آئے۔ میں نے بچے کو پیار کیا اور چھنگا سے کہا "یار یہ لونڈا مجھے دیدو" وہ ہنسکر بولے "لیلو" میں موٹر میں بیٹھ گیا۔ موٹر اسٹارٹ ہوئی میں نے بچہ دینے کا شکریہ ادا کیا۔ موٹر آہستہ آہستہ چلی۔ وہ مذاق ہی سمجھے اور میں بھتیجہ لیکر یہ جا وہ جا۔ سیدھا جاورہ آکر دم لیا۔ مجھے نہیں معلوم وہاں میاں بیوی پر کیسی گذری۔ مگر اندازہ لگا سکتے ہیں۔

گھر پر پہونچا تو گھر والی نے پوچھا۔ اُسکو سارا حال بتایا۔ بچہ مزے میں کھیل رہا تھا۔ اور اُسے مٹھائی کھلونوں پر دَھر لیا۔

زیادہ دیر گھر پہونچے نہ ہوئی تھی کہ ریل کی آواز آئی اور کوئی پندرہ منٹ میں ایک تانگہ آکر رکا۔ بھائی چھنگا اور بھوجائی جی موجود۔

"خیر تو ہے" میں نے کہا "کیسے آئے ؟" ادھر نہ پوچھئے بھائی چھنگا کا حال۔ جز بز ہو رہے تھے۔ زیادہ جو اکڑے تو میں نے کہا "ابے ہوش میں بھی ہے۔ غصہ دکھانا گورنمنٹ افسروں کو۔ یہ آپے سے باہر کیوں ہوا جاتا ہے"

مجھے مطلع کیا گیا کہ حضرت مذاق قطعی ناپسند فرماتے ہیں۔ اب تقاضہ یہ کہ لڑکا لاؤ تو جاکر دھرم شالہ میں ٹھہریں۔ میں نے اوپر سے نیچے تک دیکھکر کہا کہ "بچا یاد رکھو عقل ٹھکانے کر دوں گا۔ سیدھے سیدھے اتر آؤ"

نوکروں نے جلدی جلدی اسباب لیا۔ غرض دوست کو گھر میں اُتارا۔ ذرا دیر میں ثبت کی باتیں کرنے لگے۔ بچوں کو پیار کرنے لگے۔ آدمی ہو گئے۔ قصہ مختصر آرام سے ٹھہرائے گئے۔ پانی وغیرہ کا انتظام کرایا۔ کھانے کیلئے میں نے گھر والی کو آواز دی کہ بھئی کباب پراٹھے پکاؤ۔ اس پر بچہ خفا ہوئے۔ کہنے لگے "یہ کیا بیہودہ مذاق ہے" اور میں نے بھوجائی کے سامنے کہا "یار کیوں جھوٹ بولتا ہے۔ بکرے کے بکرے ہضم کر گیا" اور بھوجی سے میں نے پوچھا "کہ تم کیا کھاؤ گی۔ انڈا مرغی کھاؤ گی"

بھوجائی جی نے "ہے رام" کی صدا کھینچی اور میں نے اُن سے معافی مانگی یہ سوچکر کہ بھئی میں نے سمجھا کہ میرے دوست کھاتے پیتے ہیں تو تم بھی کھاتی ہو گی۔ اس بات پر چھنگا بہت خفا ہوئے۔ بہت بُرا مانے۔ اور ٹیڑھے ہو بیٹھے۔ ایسے کہ میری بیوی نے کہا کہ بُرا مان گئے اور ایسا نہ چاہیئے تھا۔ میں نے بیوی سے بھی کہا کہ تم کیا جانو اسے یہ بڑا ہتھیارا آدمی ہے۔ چھنگا ہاتھ مُنہ دھونے گئے اور میں نے گھر والی سے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا کہ چھُپا کے کبابوں کا انتظام کر دینا ورنہ بہت ہی بُرا مانیگا یہ میں نے اس طرح کہا کہ بھوجائی یہ سمجھیں کہ میں اُن سے چھُپا کر چپکے سے کہہ رہا ہوں۔ مگر اس انتظام سے کہا کہ وہ اچھی طرح سُن لیں۔ اور یہ بھی تاکید کر دی کہ بھوجائی کو پتہ نہ چلے۔

اور گھر والی سے یہ کہکر میں نے بھوجائی جی سے کہا "میں تو اپنے دوست سے مذاق کرتا ہوں۔ یہ گوشت کبھی نہیں کھاتے ہیں۔ میں نے تو جھوٹ کہا تھا۔ توبہ توبہ کہیں یقین بھی نہ کر لینا"

اور میں نے بھوجائی جی کے معصوم چہرے کو دیکھا۔ انہیں کب ایسے معاملات سے سابقہ پڑا ہو گا۔ اور ادھر میری بیوی اس دھوکے میں کہ واقعی چھنگا دوست چھُپ کر کباب کھائیں گے۔ چنانچہ اُس نے پوشیدہ انتظام کرنا شروع کیا۔ اب درمیان میں جو میں نے چھُپ چھُپ کر دو چار ہدایتیں گھر والی کو دیں تو بھوجائی جی کے بیچ مچ کان کھڑے ہوئے۔ اس لئے کہ واقعی آدمی کو جلد سے جلد کبابوں کے انتظام کیلئے دوڑایا جا چکا تھا۔

دوسرا آدمی ایک برہمن کے یہاں پوری کچوری اور مٹھائی کے انتظام کے لئے گیا تھا۔ اور بار بار میں بھوجائی جی کو سُنا رہا تھا کہ بڑی اونچی ذات کے برہمن کے یہاں بھوجن تیار ہو رہا ہے۔ ادھر چھنگا بھائی ہاتھ مُنہ دھوکر اپنی بیوی کے پاس گئے اور ادھر میں قینچی چھانٹنے لگا کہ کس قینچی سے ان کی ڈاڑھی ٹھیک جاوے۔

اب ادھر کا حال سُنیئے۔ میاں بیوی میں کچھ باتیں ہوئیں۔ بیوی نے

میاں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ کیا معلوم کیا باتیں ہوئیں کہ میں نے پکار کر یہ تجویز کی کہ ہم تم ساتھ کھائیں گے اور عورتیں علیحدہ۔ وہ بولے "ٹھیک ہے۔"

تھوڑی دیر بعد چھنگا میرے پاس آئے۔ بیحد سنجیدہ۔ ملول اور کبیدہ خاطر۔ آپ یقین مانئے گا کہ اُن کی بیوی کا عقیدہ متزلزل ہو گیا۔ چھنگا نے مجھے بہت سمجھایا کہ ایسی باتیں نہ کرنا چاہیئے ورنہ ہمارے یہاں سے چلے جائیں گے۔

لیکن باوجود برہمن کا کھانا کھانے کے چھنگا کی آفت آ گئی۔ میں نے گھر والی سے پھر اس طرح چپکے سے کہا کہ بھوجائی جی سُن لیں۔ میں نے کہا کہ "بھئی یہاں تو موقع نہیں ملا۔ چھنگا بھائی کہتے ہیں کہ بھوجائی جی مشکوک ہو گئی ہیں۔ لہٰذا سیر کرنے چلیں گے وہاں کھائیں گے۔ لہٰذا موٹر میں تم چھپا کر رکھوا دینا۔ کہیں بھول نہ جانا اس لئے کہ انہوں نے کھانا قصداً نہیں کھایا ہے اور بھوکے رہ گئے ہیں۔"

اب تقدیر کی خوبی کہیئے کہ چھنگا بھائی نے واقعی کھانا بہت ہی کم کھایا تھا۔ لہٰذا بھوجائی جی کا ماتھا اور بھی ٹھنکا۔ یہی کیا کم تھا کہ بعد کا ڈرامہ۔ موٹر میں ایک لپٹے ہوئے رومال میں کٹور دان جو رکھنے لگے تو چھنگا بولے "یہ کیا ہے"۔ تو میں نے کہا "دہی ہے"۔ وہ مسکرا کر بیٹھ گئے اور ہم دونوں روانہ ہو گئے۔

شام کے وقت میں نے چھنگا کو موٹر ہی پر مٹھائی اور کچالو اور الا بلا کھلائی اور خود بھی کھائی۔ چھنگا دہی بڑے بہت کھا گئے کہنے لگے کہ "یار اب کھانا نہیں کھایا جائے گا"۔ میں نے دل میں کہا کہ رہ جا وہ تیری گت بنوائی ہو جو یاد کرے۔

ہم دونوں واپس آئے۔ رات کے کھانے کے لئے جو پوچھا گیا تو بولے کہ نہ کھائیں گے۔ اور بھوجائی جی نے جو مشکوک ہو کر پوچھا "کیوں؟" تو بولے "ہم کھا آئے ہیں؟" اور قبل اس کے کہ بھوجائی جی کچھ بول سکیں۔ میں نے کہا "بھوجائی جی قسم لے لو جو سوائے دہی بڑے اور مٹھائی کے کچھ بھی کھایا ہو۔ بازار سے منگائے تھے۔۔۔"

اب لاکھ بھوجائی جی سے کہا جاتا ہے کہ کھانا کھا لو مگر انہوں نے نہ کھایا۔ میں نے چھنگا سے کہا کہ "یار جو رو سے وجہ تو پوچھو"۔

اب جناب یقین کریں کہ وجہ جو پوچھنے علیحدہ گئے تو جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ بھوجائی جی نے خوب رونا شروع کیا۔ اب لاکھ میں سمجھاتا ہوں کہ خدا کی بندی یہ تیرا شوہر سوائے دال ساگ کے کبھی کچھ نہیں کھاتا۔ خود چھنگا خفا ہوتے ہیں، مگر توبہ کیجئے! کھیں بگڑ گیا۔

چھنگا سے مجھ سے خوب لڑائی ہوئی۔ ایسی کہ پُرانا زمانہ یاد آ گیا۔ بہت بُرا مانے اور بات نے بیحد طول کھینچا۔ رات گئے جا کر اُن کو منایا سمجھایا۔ مگر بھوجائی جی بگڑی پھولی پڑی رہیں۔

رات کو سونے کا وقت آیا تو میں نے کہا تم اِدھر سو رہو میں اندر سوؤں گا۔ بار بار وجہ پوچھنے لگے مگر میں نے نہ بتائی۔ آرام سے لیٹ گئے۔ میں نے بھی کہا کہ رات گئے تک بیٹھا رہو نگا لہٰذا ساتھ سونا نہ سونا برابر ہوا۔ چھنگا تو مزے سے باہر لیٹے۔ میں اندر جو آیا تو بیوی نے وجہ پوچھی۔ میں نے دبی زبان سے کہا "جانتی ہو تیندوا رات کو آتا ہے"۔ بیوی ہنسنے لگی مگر بھوجائی نے سُن لیا۔ اب میری طرف غور سے دیکھتی ہیں۔ میں نے کہا "دیکھتی کیا ہو، بڑے آرام سے سوئیں گے"۔

میں نہیں عرض کر سکتا کہ وہ کس طرح بے کل ہو گئیں۔ کسمساتی رہیں۔ میں نے قصداً موقع دیا اور وہ سٹک کر گئیں اور چھنگا سے کہا چھنگا مارے ہیبت کے پھاند پڑے۔ گھبرا کر چلائے۔ میں پہونچا تو اکیلے کھڑے تھے۔ میں نے کہا "خیر تو ہے"۔ کہنے لگے "تم گرمی میں کیوں اندر سوؤگے"۔ میں نے کہا "یونہی"۔ کہنے لگے "یہاں تیندوا آتا ہے"۔ میں نے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ، ہونا آخر کو بنئے۔ اماں اب تھوڑی آتا ہے۔ پہلے آتا تھا"۔ یہ سُنکر گویا پھاند پڑے "ارے! ڈشت کہیں کا!" تڑپ کر اُٹھ بیٹھے۔ اب لاکھ میں انہیں سمجھاتا ہوں کہ بُرا در اب نہیں آتا پہلے آتا تھا مگر نہیں مانتے۔ گھر سر پر اٹھا لیا۔ اندر آ گئے۔ غل مچایا کہ مجھے کھا جاتا تو کیا ہوتا۔ بھوجائی کی جان ضیق میں آ گئی تھی۔ وہ بھی بڑبڑائیں۔ قصہ مختصر نہ مانے۔ اندر سونے پر راضی ہوئے۔ میں نے کہا کہ "یار اِدھر چور آتا ہے"۔ ہنسنے لگے کہ "رہنے دو"۔

اس کے بعد بڑے محبت اور پیار کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ کس طرح بھوجائی کو یقین دلا دیا ہے کہ تم گوشت کھاتے ہو۔ سارا قصہ سُنکر اُٹھ بیٹھے۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر بیحد رنجیدہ ہو کر بولے "پرے ہو گئی"۔ محض اس وجہ سے کہ نہ صرف بھوجائی بلکہ بدقسمتی سے میری بیوی بھی یقین کرتی ہے کہ گوشت کھاتے ہیں۔

کہنے لگے کہ "یار بڑا غضب ہو گیا۔ کیا سوچتی ہوگی"۔ میں نے کہا "یہی سوچتی ہے کہ چھُپ چھُپ کر بکرے تو ہضم کر جاتے ہو نہ معلوم اُنکی دُمیں چھوڑتے ہو کہ نہیں"۔ بڑی فکر میں پڑے رہے۔ ایک یہی کیا غم تھا کہ گھر والی اُن پر شُبہ کر رہی تھی۔ میں نے کہا "یار اب سو رہو کل اُٹھکر تردید کر دیں گے"۔ مگر تردید مشکل تھی اس لئے کہ بھوجائی جی کا عقیدہ تھا کہ مسلمان کی دوستی میں لوگ گوشت کھانے لگتے ہیں اور چھنگا کی

بدقسمتی سے اُن کے میکے میں اس کی کئی مثالیں تھیں۔

اب دوسرے دن لاکھ تردید کرتے ہیں مگر بھوجی چُپ۔ بڑی مشکل سے انہوں نے صبح ناشتہ کیا۔ جانے کو تیار۔ کیسے کیسے میں نے روکا ہے اور کیسا کیسا ان کو سمجھایا کہ سمجھتیا ایک روز اور ٹھہر جاؤ، نہیں مانتے۔ کہنے لگے کہ شگون روانگی کا بہترین ہے۔ پھر ایسا شگون مہینوں نہ آئیگا میں نے دل میں کہا: "ٹھہر تو جا تیرا شگون دُرست نہ کر دیا تو میرا ذمہ"

غرض شام کی گاڑی سے روانہ ہو گئے۔ میں نے کہدیا تھا کہ شگون ٹھیک نہیں ہے نہ جاؤ مگر نہ مانے۔

دو تین اسٹیشن گئے ہوں گے کہ پولیس نے ان کو راستہ میں جالیا۔ اس الزام میں پکڑے گئے کہ پرائی عورت اندور سے بھگا کر لائے ہو۔ گاڑی سے اُتار لئے گئے۔ دیوتا کوچ کر گئے۔ ہوش جاتے رہے۔ پولیس والا ہے کہ ہتھکڑی ڈالے دیتا ہے۔ قسمیں کھاتے ہیں میرا حوالہ دیتے ہیں۔ پولیس والے نے کہا کہ اگر مجھ سے تصدیق کرا دیں تو چھوڑ دیگا۔ تار پر وہ موذی کیا راضی ہوتا۔ کہنے لگا نام بدل لیا ہوگا۔ نتیجہ یہ کہ بھائی صاحب صبح کی گاڑی سے وارد اور کھڑا ہوا ہے تانگہ۔ مع پولیس۔

خود سوچئے کہ میں بھلا کیا کرتا۔ میں نے کہا: "میں ان سے واقف نہیں ہوں"

یہ سُنکر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیران ہو کر بولے: "ارے!" میں نے تخلیہ چاہا۔ سنجیدگی سے میں نے پوچھا "مرے یار ہم تمہیں ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ غضب کے شاطر نکلے۔ غضب کیا ہمیں بھی نہ بتایا!"

اب تیغ داڑھی جھنگا بھائی کی قسموں کا حال نہ پوچھئے۔ میں نے بھوجائی کو بھی بُلایا اور اُن سے کہا "بھئی ہم تم کو ایسا نہ سمجھتا تھا۔ بھلا اس بدتمیز داڑھی دار میں کیا رکھا تھا جو اس کے ساتھ بھاگیں" یہ سنکر وہ بیچاری رونے لگیں۔ جھنگا نے مجھے مارنے کی دھمکی دی۔ خوشامد کی۔ میں نے کہا "یار بڑی ذمہ داری ہے۔ ایک شرط ہے" بولے "وہ کیا؟" میں نے کہا "ہفتہ بھر ہمارے مہمان رہو" کہنے لگے "یہ ناممکن ہے" میں نے کہا "بہتر ہے، تم جانو تمہارا کام ہم کچھ نہیں جانتے" ادھر پولیس والے نے تقاضہ کیا۔ چار و ناچار راضی ہو گئے کہ ہفتہ بھر ٹھہریں گے۔ چنانچہ پولیس والے کو میں نے دفان کیا کہ بھئی میرے دوست ہیں اور میں ذمہ لیتا ہوں کہ یہ ان کی بیوی ہیں۔

اب اس لالہ کی بے ایمانی دیکھئے کہ دوسرے ہی دن بگڑ کھڑا ہوا کہ تم نے پولیس والے کو سکھا دیا تھا۔ کسی طرح نہ مانا۔ خلاف وعدہ بھاگ گیا۔ اور مثل سابق جو پولیس نے ریل میں پھر پکڑا تو اُسے مارا اور صاف نکل گیا۔

یہ تو سب کچھ مگر غور کیجئے بھوجائی جی کو کہ خط جو آتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ بھوجائی بیحد ہنستی ہیں۔ اور ایک دفعہ پھر آنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ اور اس جھنگا احمق سے خط برابر لکھواتی رہتی ہیں۔ [1]

عظیم بیگ چغتائی

---

[1] تقریباً سال بھر سے چغتائی صاحب علالتِ مزاج کی وجہ سے ساقی کے لئے کوئی مضمون نہ لکھ سکے۔ پھر اُن کے مرض نے اتنی خطرناک صورت اختیار کر لی تھی کہ وہ خطوط کے جواب بھی دینے سے معذور رہ گئے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب اُن کی طبیعت سنبھل رہی ہے اور انشاء اللہ ہم ان کا مژدہ صحت بھی جلد سُنیں گے۔ چغتائی صاحب کے مضمون کی اب کے کوئی اُمید نہیں تھی مگر ۲۸ دسمبر کو ایک لفافہ میں مندرجہ بالا خط یا مضمون ملا جس کے ساتھ چغتائی صاحب کا کوئی خط نہیں تھا۔ اسے سالنامہ ساقی کے لئے اُن کا تحفہ سمجھکر شائع کر دیا گیا ہے۔ اگر فی الحقیقت یہ ساقی کے لئے مضمون نہیں بلکہ محترمہ حیا کے نام چغتائی صاحب کا مکتوب ہے تو اسے شائع کرنے میں پہلے چغتائی صاحب اور پھر مجھ سے غلطی ہوئی۔ لیکن یہ اگر غلطی بھی ہے تو بہت لطیف اور دلچسپ کہ سالنامہ ساقی میں ایک دلکش مضمون کا اس سے اضافہ ہوا

گفتارِ بیخود

مسخر کر لیا کرتی ہے وحشت عشق جاناں کی
نہیں تعویذِ بازو دھجیاں میرے گریباں کی

ستم کے بعد یاد آنا انھیں شامت ہے انساں کی
اجل بن جائیں گی یہ ہچکیاں بیمارِ ہجراں کی

ترے جلووں کی عادی ہیں نگاہیں اہلِ عرفاں کی
سمائیں گی نظر میں کیا بہاریں باغِ رضواں کی

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک اگلی بہار انکی
بہار آئی گلے میں ڈال لی دھجی گریباں کی

بنیں گی نور یہ تاریکیاں یوسف کے زنداں کی
دعائیں بہرِ آرائش چلی ہیں پیرِ کنعاں کی

کہاں سے میں کہاں پہنچا مری قسمت کا کیا کہنا
ارم سے کھینچ کر لائی تھی مٹی کوئے جاناں کی

مرے قاتل نے کس پانی میں خنجر کو بجھایا تھا
لہو کے ساتھ کچھ ٹپکی ہیں بوندیں آبِ حیواں کی

خلافِ وعدہ کوئی آ گیا گھر ہو گیا روشن
ہوئی تقسیم زلفوں میں سیاہی شامِ ہجراں کی

نشانی میرے قاتل کی مری بخشش کو کافی ہے
الٰہی ٹوٹ کر رہ جائے دل میں نوک پیکاں کی

علاجِ وحشتِ دل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا
گلے میں ڈال کر نکلا ہوں میں زنجیرِ زنداں کی

نہیں مٹتی ہے دم بھر کو بھی یادِ رفتگاں دل سے
نظر کے سامنے تصویر ہے گورِ غریباں کی

تصور میں رکے آتے ہوئے تو خواب میں آئے
کشش سے دل کی سٹی گم ہوئی انکے نگہباں کی

وہ پھر فاتحہ آتے ہوئے اب کیوں جھجکتے ہیں
کہ اب تو خاک بھی باقی نہیں تربت میں ارماں کی

امیدِ مرگ سے وابستہ تھی دیدار کی حسرت
خوشی دیکھے دمِ آخر کوئی بیمارِ ہجراں کی

ترے عاشق تو ناکامِ تمنا رہ نہیں سکتے
کہ صبحِ حشر نے کی ہے تلافی شامِ ہجراں کی

ہمارے سامنے اس حسنِ ظاہر کی حقیقت کیا
ہماری آنکھ تو نظارگی ہے حسنِ پنہاں کی

ابھر آئے گی کشتی بحرِ غم سے ڈوب کر بیخود
غلامی کا شرف حاصل ہے مجھکو شاہِ جیلاں کی

بیخود دہلوی

اُزومہ اُدوری

ٹوکیو میں گیشاؤں کی انجمن کی جانب سے سال میں دو مرتبہ ناچ دکھایا جاتا ہے۔ پہلا ناچ ماہ اپریل میں جب سکورا کی بہار ہوتی ہے۔ اسی کو "اُزومہ اُدوری" کہتے ہیں۔ دوسرا ماہ نومبر میں جب خزاں کی وجہ سے درختوں پر سُرخ رنگ کھلتا ہے۔ اسے "اتشوکائی" کہتے ہیں۔ پچاس سال سے یہ ناچ برابر ہو رہے ہیں۔ پہلے جب گیشاؤں کا اپنا تھیٹر نہیں بنا تھا تو مختلف تھیٹروں میں ناچوں کا انتظام ہوتا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں ان کی انجمن نے "شِمباشی امبُوجو" کے نام سے چو منزلہ تھیٹر تعمیر کر لیا تو اس میں ناچ ہونے لگے۔ اپریل و نومبر میں گیشاؤں کے ناچ ہوتے ہیں۔ باقی دس مہینے ڈرامہ دکھانے والی کمپنیوں کو کرائے پر دیدیا جاتا ہے۔

اس تھیٹر میں صرف علاقہ شِمباشی کی گیشائیں کھیل کرتی ہیں جو فن کے اعتبار سے تمام ٹوکیو میں مشہور ہیں اور اپنی قدیم روایات کی حامل ہیں۔ گیشا کا فرض مردوں کی تفریح طبع کا سامان مہیا کرنا ہے۔ کسب کمانا اس کا پیشہ نہیں۔ پہلے زمانے میں مردوں کے ساتھ عورتیں باہر نہیں نکلتی تھیں۔ مرد کسی سیاسی یا سماجی ضرورت سے ایک جگہ جمع ہوتے تھے تو کاجکران کا دل بہلانے کے لئے گیشائیں طلب کی جاتی تھیں۔ عہدِ توکوگاوا (۱۶۰۰ء تا ۱۸۶۸ء) میں شوگن کا پایۂ تخت "ایدو" یعنی موجودہ ٹوکیو رہا۔ احکام شوگن کے بموجب ہر نواب کو چھ مہینے اپنی جاگیر پر اور چھ مہینے ٹوکیو میں بسر کرنے پڑتے تھے۔ ان نوابوں کے جلسوں میں سیاسی بحثیں چھڑ جاتی تھیں اور سخت کلامی تک نوبت پہنچتی تھی۔ گیشاؤں کا کام تھا کہ ایسے موقع پر لطیفوں اور چٹکلوں سے جانبین کی توجہ اپنی جانب منعطف کرلیں۔ اس کے لئے بہت سمجھ کی ضرورت تھی اور گیشائیں بڑی خوبی سے یہ فرض انجام دیتی تھیں۔ گانے بجانے اور ناچنے کے ساتھ لطیفہ سنجی ان کی تعلیم کا اہم جُزو تھا اور اب بھی ہے۔

عہدِ توکوگاوا کے بعد شاہی عہد میں بھی گیشاؤں کا یہی کام رہا۔ مدبرینِ مُلک سیاسی مسائل پر بحث کرنے کیلئے اپنے دفاتر کے خشک کمروں پر شمباشی کے رسٹارنٹوں کو ترجیح دیتے تھے کہ یہاں سنجیدہ گفتگو کے ساتھ تفریح بھی ہوتی رہتی تھی۔ پچھلے تیس چالیس سال میں جاپان نے بہت ترقی کر لی ہے۔ اخبارات بے انتہا اور اعلیٰ پیمانے پر جاری ہو گئے ہیں اور ہر شخص گھر بیٹھے دُنیا بھر کی خبر معلوم کرسکتا ہے۔ پہلے یہ حال تھا۔ اُس زمانے میں گیشائیں تفریح طبع کے علاوہ معلومات بڑھانے کا بھی ذریعہ ہوتی تھیں۔ وہ ایک طرح کا اخبار تھیں اور مدبرین و عمائدین ان کے پاس خبریں حاصل کرنے آتے تھے۔ اخبارات کی روز افزوں اشاعت سے گیشاؤں کا بازار مندا ہوگیا۔ نااہل گیشائیں پیٹ بھرنے کیلئے اپنے اعلیٰ معیار سے گر گئیں۔ یہی عام گیشاؤں کی بدنامی کا باعث ہوئی ہیں۔

گیشاؤں کے مکان پر کوئی مرد نہیں جاتا۔ یہ جاپانی رسٹارنٹوں میں یا جلسوں میں فرمائش پر بلائی جاتی ہیں اور وہیں ان سے ملاقات ہوتی ہے۔ دعوتوں میں یہ کھانا پیش کرتی ہیں اور ساقی کی خدمت بجالاتی ہیں۔ حاضر جوابی سے حاضرین کو محظوظ کرتی ہیں اور کاجکران کا دل بہلاتی ہیں۔

شمباشی امبوجو زلزلہ ضامن اور آتش ضامن عمارت ہے۔ تین منزلوں پر تماش بینوں کی نشست کا انتظام ہے۔ ان کی تمام ضروریات عمارت تھیٹر کے اندر پوری ہو سکتی ہیں۔ کھانے پینے اور حوائج ضروری کے لئے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ ایک ایک منزل میں کئی کئی رسٹارنٹ موجود ہیں۔ ان کے علاوہ چوکولیٹ، سگریٹ وغیرہ کی دکانیں بھی ہیں۔ تین جانب وسیع برآمدہ ہے جہاں جگہ جگہ مخملی صوفے لگے ہوئے ہیں کہ لوگ بیٹھ کر سگریٹ پی سکیں۔ آڈیٹوریم میں قیمت کے لحاظ سے الگ الگ درجے ہیں اور ان میں نشستیں محفوظ ہیں۔ آڈیٹوریم کے باہر تھیٹر کے جملہ انتظامات سے ہر کس و ناکس یکساں مستفید ہو سکتا ہے، یہاں درجے کی کوئی تخصیص نہیں۔ تھیٹر میں داخل ہوتے وقت ہر ایک کو مطبوعہ پروگرام جاپانی زبان میں مل جاتا ہے۔ غیر ملکیوں کے لئے انگریزی کا مختصر پروگرام مہیا کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ طویل مصور پروگرام قیمتاً مل سکتا ہے۔ ایک دکان پر مندرج پروگرام ناچوں کی تصاویر کے کارڈ فروخت ہوتے ہیں۔

سامنے اسٹیج ہے جس کے دونوں پہلوؤں میں آنے جانے کا راستہ ہے۔ آرکسٹرا اسٹیج پر نہیں ہے بلکہ آڈیٹوریم کی بغل میں ہے۔ دائیں جانب دو منزلہ آرکسٹرا ہے۔ بارہ گیشا ئیں نیچے بیٹھتی ہیں اور بارہ اوپر۔ نیچے کی منزل والیاں کچھ طبلہ بجاتی ہیں کچھ کندھے کی ڈھولک کچھ شامیسین اور کچھ بانسری۔ اوپر کی منزل میں چھ شامیسین بجاتی ہیں اور چھ گاتی ہیں۔ بائیں جانب والا آرکسٹرا ایک منزلہ ہے جس میں بارہ گیشائیں شامیسین بجاتی ہیں۔ سب کی نشست دو زانو ہے۔ دونوں آرکسٹرا باری باری سے بجاتے ہیں۔ جب ایک آرکسٹرا کام کرتا ہے تو دوسرے پر پردہ پڑا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ مغربی بینڈ بھی ہے جو دائیں آرکسٹرا اور اسٹیج کے درمیان واقع ہے۔ اس میں بھی کنڈکٹر کے علاوہ تمام باجے والیاں عورتیں ہوتی ہیں۔

آرکسٹرا کی ترتیب کے علاوہ اس تھیٹر میں ایک اور خصوصیت بھی ہے۔ اسٹیج کے پہلوؤں کے سوا دو راستے اور ہیں جن سے اداکاریں آتی جاتی ہیں۔ دونوں آرکسٹروں کے سامنے یعنی آڈیٹوریم کی بغل میں راستے بنے ہوئے ہیں جو اسٹیج سے آڈیٹوریم کی پشت تک جاتے ہیں گویا کہ "نو" تھیٹر میں ایک پل ہوتا ہے یہاں دو ہیں۔ اداکاریں ان پلوں پر سے اداکاری کرتی ہوئی آتی ہیں اور اسی طرح حاضرین کی بغل میں سے اداکاری کرتی ہوئی بیٹھ کے پیچھے غائب ہو جاتی ہیں۔

کابکی تھیٹروں کی طرح یہاں بھی ایک تماشہ مہینہ بھر تک دکھایا جاتا ہے۔ امسال پروگرام میں بیس۲۰ ناچ تھے بعض ناچ ایک دوسرے سے غیر متعلق تھے تو منظر ختم ہونے پر تمام تھیٹر میں اندھیرا کر دیا جاتا تھا اور اداکاریں اندھیرے میں اسٹیج پر سے چلی جاتی تھیں اور پردے بدل جاتے تھے۔ اکثر ناچ ایسے تھے کہ ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے تھے تو حاضرین کے سامنے ہی پردے بدلے جاتے تھے۔ درخت کھنچے چلے آرہے ہیں، مکان کھسکے چلے جا رہے ہیں۔ نیچے سے جنگل کے جنگل اٹھ رہے ہیں۔ اوپر سے مناظر اتر رہے ہیں۔ کوئی آدمی ان کو جماتا ہوا نہیں دکھائی دیتا کوئی ہاتھ انہیں سرکاتا ہوا نظر نہیں آتا۔ تمام کام کلوں سے ہو رہا ہے۔ اسٹیج والے حاضرین کو دھوکا دینے کی کوشش نہیں کرتے کہ جنگل لگا لگایا پیش کر دیا بلکہ دکھا دیتے ہیں کہ ہم جنگل کا منظر اس طرح بناتے ہیں۔ اسٹیج والوں نے آپ کو اپنا رازدار بنا لیا۔ بعض

تماش بین اس آشکار راز کو دیکھ کر ہنس بھی دیتے ہیں۔ مناظر جمانے کی ترکیب کے ساتھ ساتھ ان کی خوبصورتی نہایت دلفریب ہوتی ہے۔ منظر نگاری میں جاپانی کسی قوم سے پیچھے نہیں بلکہ آگے ہی بڑھے ہوئے ہونگے۔ یہ صرف ایک پردے سے منظر نہیں بناتے بلکہ اس کے اجزا الگ الگ جما کر بڑا پیارا نظارہ مکمل کر دیتے ہیں۔

مناظر نگاری کے علاوہ جاپانی روشنی کے کام میں بھی استاد ہیں۔ روشنی کے لئے صرف اسٹیج کے آگے ہی برقی قمقمے نہیں ہوتے بلکہ پہلوؤں میں، آرکسٹروں کے اوپر، سامنے یعنی تماشائیوں کی پُشت پر اور چھت میں طرح طرح کی روشنی کا انتظام ہوتا ہے۔ کبھی پہلوؤں سے رنگین روشنیاں نکل کر اسٹیج پر رقص کرتی ہیں۔ کبھی سامنے سے روشنی کا ہالہ پڑتا ہے اور کبھی چھت میں سے نور کی چادر اُترتی نظر آتی ہے۔ غرضیکہ روشنی کا اعجاز دکھاتے ہیں۔ تماشے کے دوران میں آڈیٹوریم میں اندھیرا ہوتا ہے۔ راستہ چلنے کے لئے فرش میں قمقمے لگے ہوتے ہیں۔

تماشے کا نام تھا "جاپان آگے بڑھو" اس کے دو حصّے تھے۔ پہلے کا نام "حصّہ قلم" تھا اور دوسرے کا "حصّہ شمشیر" پہلے میں نو ناچ تھے اور دوسرے میں گیارہ۔ تماشہ "ہنومارو۔ سمباسی" سے شروع ہوا۔ تین گیشائیں مردوں کے لباس میں آئیں اور آفتاب کے سامنے مبارکباد ناچیں۔ آفتاب جاپان کا قومی نشان ہے اور تمام جہان کو منور کرتا ہے۔ یہ ناچ مردانہ تھا، اسی وجہ سے اس میں کچھ کرختگی تھی۔

اس کے بعد دو ناچ "مُراساکی۔ شکیبو" سے متعلق تھے۔ یہ ایک درباری خاتون تھی جس نے گیارھویں صدی میں "گینجی۔ مونوگتاری" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ جاپان کا پہلا ناول ہے اور کلاسک مانا جاتا ہے۔ کتاب لکھنے کے لئے اس نے ایک خانقاہ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ جب وہ ختم ہو گئی تو اس کی خوشی میں ناچی ہے۔ پہلے ناچ کا نام "مندر میں چاند" ہے۔ نام کی مناسبت سے رات کا منظر تھا۔ چاند برآمد ہو چکا تھا۔ دو خادمائیں کشتی میں کتاب کی جلدیں لے کر حاضر ہوئیں۔ یہ اپنے حُجرے سے برآمد ہوئی اور ان کے ساتھ جشن منایا۔ پہلے چاند کی پوجا کی پھر تینوں مل کر ناچیں۔ ناچ میں کتاب کا طریقہ اور لکھنے میں جو مشقت ہوئی اسے ظاہر کیا اور تکمیل پر اظہارِ مسرت کیا۔ دوسرا ناچ اسی کتاب کے ایک باب کی تفسیر تھا جس کا نام "اکاشی کا افسانہ" ہے۔ خلیج اکاشی پر شہزادہ گینجی اور شہزادی اکاشی سمندر کے کنارے نظر آتے ہیں۔ شہزادہ کسی مہم پر جا رہا ہے۔ دونوں الوداعی رقص ناچتے ہیں۔

چوتھا ناچ "کابُکی ناچ" تھا۔ اوائل سولھویں صدی میں کیوتو کے قدیم اسٹیج کا منظر ہے۔ سکورا کی بہار ہے۔ "اِزُومو۔ اوکُنی" عورت اور "ناگویا۔ سنسزا" مرد جو کابُکی کے بانی ہیں ناچتے ہیں۔ چھ خوبصورت لڑکیاں بھی ناچ میں شریک ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کے ناچوں میں پھولوں کے مناظر تھے۔

پانچویں ناچ میں دو گل فروش نوجوان لڑکے پھولوں کی بہنگیاں کندھے پر رکھے اسٹیج پر آئے اور رقص کیا۔

چھٹا رقص آلوچے کے پھولوں کا تھا۔ ایک نوجوان لڑکا اور ایک لڑکی قدیم زمانے کی کسبیوں کے لباس میں ناچی۔ منظر میں آلوچے کے درخت پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔

ساتواں ناچ سکوُرا کا تھا۔ چاروں طرف پھول کھل رہے ہیں۔ درخت لدے پڑے ہیں۔ یہ ناچ میں نے کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ اسکے دوران میں اوپر سے گُل سکوُرا کی پتیوں کی بارش ہوا کرتی ہے۔ اس مرتبہ ایک جدت تھی۔ گیشاؤں کے ناچ میں سینما کی ٹکنیک مخلوط کردی گئی تھی۔ پتیوں کی بارش کی بجائے پردے پر اسی منظر کا فلم دکھایا تھا۔ پردے پر فلم اور اس کے سامنے اسٹیج پر ناچ کچھ ایسے ہم آہنگ ہوگئے تھے کہ لُطف دوبالا ہوگیا تھا۔ ناچ میں ایک مرد سارنگی لئے ہوئے تھا اور ایک عورت شامیسین بجا رہی تھی۔ دونوں پہلے سازوں کے ساتھ ناچے۔ پھر انہیں رکھ کر۔

آٹھویں رقص میں وِسٹیریا کے پھولوں کا منظر تھا۔ پھولوں کے لمبے لمبے گُچھے جا بجا درختوں میں لٹک رہے تھے۔ دو عورتوں نے ایک چھتری کے نیچے رقص کیا۔

نویں رقص میں گُل داؤدی کا منظر تھا۔ باغ میں دُور دُور تک اس کے گملے لگے ہوئے تھے اور جا بجا کھل رہے تھے۔ اس منظر میں گھروں کی نوکریں ناچیں۔ اس رقص کے ساتھ پہلا حصّہ ختم ہوا۔

دوسرے حصہ میں گیارہ ناچ تھے اور سب میں فوجی عنصر موجود تھا۔ پہلا رقص "یاماتو۔ داماشی" تھا۔ بہت سی ماہر گیشائیں شمشیر کے مندر کے سامنے روحِ جاپان کے نغمے کے ساتھ ناچیں۔

دوسرے رقص میں ایک مشہور شمشیر سازکھٹی کے سامنے تلوار بنا رہا ہے فصل کا دیوتا نمودار ہوتا ہے اور لوہار کی مدد کرتا ہے۔ اس کی امداد سے ایک متبرک تلوار بن جاتی ہے اور دونوں ناچتے ہیں۔

تیسرا رقص ایک مشہور تلوار کی تعریف میں تھا۔ ایک سورما جنگل میں چلا جا رہا ہے کہ یکایک گھاس میں آگ لگ گئی۔ ذرا سی دیر میں پھیل گئی اور چاروں طرف شعلے بھڑکنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے وہ آگ میں گھر گیا۔ اس وقت اس نے تلوار کا رقص کرنا شروع کیا۔ اس کی برکت سے شعلوں کا زور کم ہوا یہاں تک کہ آگ بالکل ٹھنڈی ہوگئی اور تلوار جیت گئی۔ آگ بجھانے میں جنگل کی پریوں نے سُورما کا ساتھ دیا۔ شعلہ رنگ کپڑوں میں نمودار ہوئیں اور کھلے ہوئے دامنوں سے آگ بجھانے میں اس کی مدد کی۔ اس ہیبت ناک سماں میں پریوں کا ناچ ناچ کر دامن ہلانا بڑا پیارا منظر تھا۔

چوتھے رقص میں سپاہیوں کی حوصلہ مندی کا اظہار تھا۔ جب وہ جنگ پر جاتے ہیں تو کس طرح جان سے ہاتھ دھوکر نڈر بن کے گھر سے نکلتے ہیں۔

پانچویں رقص میں "ناگی ناتا" کی تعریف تھی۔ یہ ایک قسم کی تلوار ہوتی ہے جس کا دستہ ایک مُٹھ کی بجائے نیزے کے برابر لمبا ہوتا ہے۔ "ہاچیمان" جنگ کے دیوتا کے مندر کے سامنے اس تلوار کا رقص کیا گیا۔

چھٹا رقص "دُاکے۔ کیو مارو" کی تعریف میں تھا۔ یہ پُرانے زمانے کا ایک سُورما تھا مصیبت کے وقت وفادار رہا اور جاپان کو ایک بڑی آفت سے بچا لیا۔ یہ اب جاپان کا محافظ دیوتا مانا جاتا ہے۔

ساتویں رقص میں دہقانی عورتیں ناچیں۔ ان کے شوہر اور بھائی سب لڑائی پر گئے ہوئے ہیں۔ کاشتکاری کا تمام کام عورتوں کے سر پر آپڑا ہے۔ اُنہوں نے ناچ ہی ناچ میں کھیتی کا تمام کام کر دکھایا۔ زمین کھودنا اور برابر کرنا، بیج ڈالنا کھیتی کاٹنا، دھان کے پودوں کے گٹھے باندھنا اور سُکھانا، دھان کوٹنا اور پھٹکنا، تولنا اور بوریوں میں بھرنا، غرضیکہ

ہر عمل ناچ میں ظاہر کر دیا۔

آٹھویں رقص میں کارخانوں کی مزدورنیاں تھیں۔ اس میں جاپان کی صنعتی ترقی دکھائی گئی۔ پارچہ بافی کا کارخانہ ہے۔ مزدورنیاں سُوت کی چرخیاں لئے ناچ رہی ہیں۔ ناچ ہی میں تانے بانے ڈال کر کپڑا بُن رہی ہیں۔

نویں رقص میں دُنیا کے مختلف ممالک کی عورتیں اپنے اپنے قومی لباس میں اسٹیج پر آئیں اور اتحاد کا رقص ناچا۔

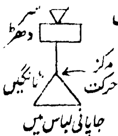
گیارہواں رقص تمام تماشے کا لب لباب تھا۔ اس کا نام تھا "جاپان آگے بڑھو"۔ اس میں تمام گیشائیں جن کی تعداد تقریباً تین سو تھی اسٹیج پر مل کر ناچیں۔ اس منظر میں دراصل آپیرا کی تکنیک خلط ملط کر دی تھی کہ تمام اداکاریں بیک وقت اسٹیج پر جمع ہو گئیں۔

گیشا کا ناچ مغربی ناچ سے اور ہندوستانی ناچ سے بھی بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس میں حرکت کم اور سکون زیادہ ہوتا ہے۔ تُرت پھرت نام کو نہیں۔ خطوط اور زاویئے بنانے کا نام ناچ ہے جسے ہم بتانا کہہ سکتے ہیں۔ اس بتانے میں ایسی نزاکت اور لطافت ہوتی ہے جو دیکھنے سے ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔ ناچ میں کولھوں کے خم، بدن کے جھوک اور ہاتھوں کے اشاروں سے عجیب اثر پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر حرکت نہایت سہولت سے انجام پاتی ہے۔ ناچنے والیوں کی بھولی ادائیں دل لُبھانے میں جادو کا کام کرتی ہیں۔

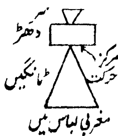
جاپانی پنکھیا ناچ کا اہم جزو ہے۔ کمونو کی لمبی آستینیں جاذبیت پیدا کرنے میں بہت مُمد ہوتی ہیں۔ تمام ناچ بیانیہ ہوتا ہے جو گانے کے ساتھ ناچا جاتا ہے۔ بعض ناچ ایسے ہوتے ہیں جن کا مطلب اجنبی بھی سمجھ لیتا ہے۔ بہت سے ناچ ایسے ہوتے ہیں جن کا سمجھنا بغیر مخصوص اشاروں کے معنی جانے مشکل ہے۔ تاہم کوئی ناچ ایسا نہیں ہوتا جس میں بے حیائی کا شائبہ ہو یا جس سے جذبات اسفل برانگیختہ ہوں۔ بلکہ اُس کے دیکھنے سے مذاق میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے سمجھنے میں دقت ضرور ہوتی ہے کیونکہ بالکل اجنبی چیز ہے۔

مجھے اس مرتبہ ایک ہی مہینے میں گیشاؤں کا ناچ اور آپیرا دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ گیشاؤں کے ناچ سے میں اپنا دل لطیف جذبات سے پُر کر اُٹھا۔ آپیرا میں مغربی ناچ تھا۔ فوق البھڑک لباس، اکثر نیم برہنہ کپڑے، ناچ میں برق کی سی تیز رفتاری، لڑکیوں کی چونچالی، سب باتیں نظر فریب اور جذبات میں ہیجان برپا کرنے والی تھیں مگر وہ لطافت مفقود تھی۔

جاپانی ناچ کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں کئی عناصر نظر آتے ہیں جو لطافت و نزاکت پیدا کرتے ہیں۔ ناچ میں انسانی جسم کے تین جوڑ اکثر حرکت میں آتے ہیں اوّل گردن، دوئم کمر، سوئم گھٹنا۔ ان میں بھی گھٹنا سب سے زیادہ متحرک ہوتا ہے۔ مغربی اور جاپانی لباس میں اس لحاظ سے بڑا اہم فرق ہے مغربی اور ہندوستانی لباس میں



جاپانی لباس میں



مغربی لباس میں

عورت کی ٹانگیں وسیع دائرے میں گھوم سکتی ہیں۔ برخلاف اسکے کمونو بدن پر ایسا چُست ہوتا ہے کہ ٹانگوں کا گھماؤ بہت تنگ دائرے

میں ہوتا ہے۔ مندرجہ نقشوں سے واضح ہوگا کہ اوّل الذکر لباس میں مرکز حرکت بہت اوپر یعنی کولھوں کے قریب ہوتا ہے۔ جاپانی لباس میں یہی مرکز گھٹنوں کے قریب واقع ہوتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جاپانی عورت لمبا قدم نہیں ڈال سکتی اور وہ اپنے گھٹنوں کو بہت کم حرکت دے سکتی ہے۔ سُبک رفتاری اور نازک خرامی اس کے اجزائے لاینفک ہیں۔

دوسرا عنصر جاپانی عورت کی گردن اور گھٹنوں کا خم ہے۔ وہ کبھی اپنا سر بلند کرکے نہیں کھڑی ہوتی۔ اس کی گردن آگے کو جھکی رہتی ہے اور سر اور دھڑ میں تقریباً ایک سو ساٹھ درجے کا زاویہ بنتا ہے۔ یہ اس کی نزاکت کا اہم عنصر ہے۔ اسی طرح گھٹنے آگے کو جھکے رہتے ہیں اور اتنا ہی زاویہ پنڈلیاں رانوں کے ساتھ بناتی ہیں۔ اس حالت میں جسم کا توازن قائم رکھنا مشکل ہے۔ اس کا یہ تدارک کرتی ہے کہ پاؤں کے پنجے اندر کی جانب موڑتی ہے۔ قدم ڈالتے وقت اس کے پنجے ہمیشہ اندر کی جانب پڑتے ہیں۔ پنجوں کا خم اس کو لمبا قدم ڈالنے سے باز رکھتا ہے۔ اور سُبک رفتاری میں ممد ہوتا ہے۔

160°

160°

تیسرا عنصر کمونو کی لمبی آستینیں ہیں۔ مغربی عورت اپنے بازو وسیع دائرے میں گھما سکتی ہے۔ جاپانی عورت ڈھیلی ڈھالی آستینوں کی وجہ سے اپنا ہاتھ بہت آہستگی سے اُٹھاتی ہے اور اُسے تنگ دائرے میں حرکت دیتی ہے۔ یہ تمام باتیں جاپانی عورت کو ہر حرکت میں نزاکت دکھانے پر مجبور کرتی ہیں اور اس کی ہر ادا میں لطافت محسوس ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ ایک اور عنصر بھی ہے جو غالباً تمام مندرجہ عناصر پر غالب ہے۔ گیشا اپنے پرستاروں پر شوخیٔ ادا کا جادو نہیں چلاتی بلکہ وہ سادگیٔ ادا سے ان کے دلوں کو مسحور کرتی ہے۔ اس کی سادہ ادائیں بھول پن کا اظہار کرتی ہیں جو اپنے اندر عجب اندازِ دلکشی رکھتا ہے۔

گیشا ٹھیٹھ جاپانی لباس میں اسٹیج پر آتی ہے۔ سر کے بال تاج کی صورت میں بنے ہوتے ہیں۔ پاؤں میں سفید جراب۔ تمام بدن کمونو سے ڈھکا ہوا اور اس پر شاندار ادبی۔ اس کے ناچ تمام جاپانی ہوتے ہیں۔ ہر ادا جاپانی۔ وہ قدامت پرستی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ مگر گیشائیں رفتارِ زمانہ کے ساتھ ترقی کر رہی ہیں۔ اپنے لباس اور ناچ میں تو قدیم روش کی پابند ہیں مگر اسٹیج پر تھیٹر کی ٹکنیک سے پورے طور پر بہرہ اندوز ہوتی ہیں۔ تھیٹر کے پردے اور مناظر، برقی رنگین روشنی، سینما اور آپیرا کی ٹکنیک، یہ سب باتیں اپنے ناچ میں آمیزش کرکے اُسے ترقی دے رہی ہیں۔ ناچوں کے نام بھی اسی امر پر دلالت کرتے ہیں۔

نور الحسن برلاس

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال جیسے صوفی کا تصوّر جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میری چھاتی پر مگر جلتی ہوئی شمشیر سی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

رات ہنس ہنس کر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل پھر کسی گل ریز و گوہر بیز کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ، پھر وہ چھوٹی پھلجڑی جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہُوک سی سینے سے اُٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب جیسے مُلّا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رُک کے دم لے لوں مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفانِ بلا میرے لئے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے
پر مصیبت ہے مرا عہدِ وفا میرے لئے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں ٹھانی ہو کہ اب عہدِ وفا بھی توڑ دوں
اُن کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مُناسب ہے، یہ زنجیرِ ہوا بھی توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اِک شعلہ بھڑک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اُٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مُردہ چاند تارے نوچ لوں
اِس کنارے نوچ لوں — اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

عیش و دولت کے مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطانِ جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اِک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اسکے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھکر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اِس "اندر سبھا" کا ساز و ساماں پھونکدوں
اِس کا گلشن پھونکدوں اسکا شبستاں پھونکدوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونکدوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مجازؔ
بی۔ اے۔ (علیگ)

سعید

"خُدا جانے کتنا لمبا سفر ہے" تھرڈ کلاس کے ڈبّہ میں ایک مریض مسافر نے تنگی گنجائش سے عاجز آکر کہا۔

"میرے بستر پر یہ صندوقچہ کس نے رکھدیا" ایک موٹے تازے مسافر نے پوری سیٹ پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ اتنے میں کوئی اسٹیشن آگیا اور غریب مسافر بھیڑ بکری کی طرح تھرڈ کلاس ڈبّوں میں گھسنے لگے۔

"دیکھو اِدھر ماں بہنیں بیٹھی ہیں۔ تم کہاں گھُسے جارہے ہو" ایک غیور مسافر نے کہا۔ "بابا بیڑی اِدھر مُنہ کرکے پیو تمام دھواں میرے حلق میں جاتا ہے" ایک تمباکو بیزار مسافر نے احتجاج کے طور پر کہا۔

اوّل تو اس ڈبّہ میں ویسے ہی جگہ نہ تھی اسٹیشن آنا قیامت ہوگیا۔ مسافروں کو جگہ کا خیال نہ تھا۔ بس کسی طرح ڈبّے میں گھس پڑنا مقصود تھا۔ گارڈ صاحب سیدھے اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں چلے گئے اُنہوں نے تھرڈ کلاس کے مسافروں کی حالتِ زار پر نظر ڈالنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ اسی طرح اسٹیشن ماسٹر صاحب نے بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ تھرڈ کلاس میں ایک پر ایک آدمی چڑھا ہوا ہے باہر نکل کر ٹیبلٹ دیدیا اور گاڑی چلدی۔ ٹکٹ چیکر صاحب چھلانگ مار کر پائیدان پر کھڑے ہوگئے اور ڈبّہ میں گھُسکر اطمینان سے ٹکٹ چیک کرنے لگے۔ مسافروں کی پریشانی کا غرض کسی کو احساس نہ ہوا۔

"کیوں بھئی اب دہلی کتنی دور ہوگی؟" بیمار مسافر نے اپنے پاس والے مسافر سے دریافت کیا۔

"ہنوز دہلی دُور است" ایک برخود غلط ظریف صاحب بولے۔

"آپ کہاں سے آرہے ہیں" ایک مسافر نے بیمار مسافر سے دریافت کیا۔

"جہنم سے۔ میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیتا" بیمار نے آخر جل کر کہا۔

"میاں گھبراؤ نہیں دو تین گھنٹے کا سفر اور ہے" ایک مسافر نے آخر جواب دیا۔

بیمار مسافر کی عمر مشکل سے بائیس ۲۲ سال کی ہوگی۔ اسکے خدوخال نہایت اچھے تھے۔ خرابی صحت کے باوجود وہ وجیہ نظر آرہا تھا۔ ہاں لیکن اس کی ایک ایک حرکت سے تکدّر، اضمحلال اور آثارِ علالت ظاہر تھے مسلسل بیماری نے اس کی رُوح تک کو بیمار بنا دیا تھا۔ زندگی کے حیات بخش جلوے اس کے سینے میں بُجھ چکے تھے۔ افسردگی کی فراوانی بھی بعض وقت انسان میں ایک نحیف سی جولانی پیدا کردیا کرتی ہے۔ بیمار نوجوان پر اس قسم کی جولانی کے اکثر "دورے" پڑتے رہتے تھے اور بعض دفعہ تو وہ اس قدر زندہ دل، پرگو شیریں گفتار بنجایا کرتا تھا کہ کوئی اسکو بیمار تصور کر ہی نہیں سکتا تھا۔

وہ ایک نہایت سیدھے سادے کردار کا مالک تھا۔ تصنع، نمود۔ منافقت وغیرہ سے اُسکو عار تھا۔ صاف باطن اور پاک ضمیر انسان تھا۔ نہ تو کسی کی خود غیبت کرتا تھا اور نہ سُننے کا روادار تھا۔ صاف گوئی کا مادہ تو اس میں اسقدر خطرناک حد تک تھا کہ اگر آپ کوئی راز کی بات بھی اس سے کہدیں تو اس کے اخفا کی آپکو توقع نہ رکھنی چاہیئے۔ اس قسم کے کیریکٹر کے انسان کو عوام احمق یا سادہ لوح سمجھتے ہیں۔ بارہا اس کو

لوگوں نے اس کے منہ پر احمق کہا لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔

وہ تقریباً پانچ سال سے مرگی جیسے موذی مرض میں مبتلا تھا۔ علاج کی استطاعت نہ تھی۔ ایک دُور کے رشتہ دار نے ازراہِ خُدا ترسی اس کا علاج و معالجہ کرایا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا آخر اُسکو کشمیر بھیجا جانا تجویز ہوا۔ اب وہ چار سال کشمیر میں بسر کرکے دہلی آ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی صحت پہلے کے مقابلہ میں اب ذرا بہتر نظر آ رہی تھی۔

اتنے طویل سفر کے بعد اس کی جیب میں اب ایک پائی بھی نہ تھی۔ دہلی میں اُس کی دور رشتہ کی ایک خالہ رہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ملازمت نہ ملنے تک وہ اُن کے ہاں قیام کریگا۔ لیکن اپنی موجودہ حالت پر غور کرنے کے بعد اس کی غیرت مقتضی نہیں تھی کہ ان کے پاس جاکر ٹھیرے۔ اس کے خالو دہلی کے نہایت معزز لوگوں میں سے تھے، وہ کب اس کی پریشاں حالی کے متحمل ہو سکتے تھے۔

آخر دہلی اسٹیشن آ گیا۔ سعید (مریض نوجوان) اُتر پڑا۔ اس کے پاس سامان کچھ نہ تھا۔ فقط ایک چھوٹا سا بنڈل تھا جسکو ہاتھ میں لیکر وہ سیدھا نواب فخر الدین علی خانصاحب (اُس کے دُور کے خالو) کی کوٹھی پر پہونچا۔ اور ملازم سے اپنے آنے کی اطلاع پہنچائی۔ ملازم نے سر سے پیر تک سعید کو دیکھا اور مُسکرا کر کہا۔

"معاف فرمایئے۔ نواب صاحب اس حالت میں آپ سے شاید ہی ملنا پسند کریں"

"آخر بیگم صاحبہ میری خالہ ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ نواب صاحب مجھے ٹالدیں۔ تم اطلاع تو کرو"

بادلِ ناخواستہ ملازم اندر گیا اور چند منٹ بعد طلبی کا پیام لے کر باہر آ گیا۔ سعید دل میں کچھ گھبراہٹ لیکن چہرے پر مُسکون لئے کمرے میں داخل ہوا۔ نواب صاحب بہت مصروف و کاروباری قسم کے انسان تھے۔ لوگوں کو ملاقات کا بہت کم وقت دیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے سعید کے سراپا پر ایک اُچٹتی نظر ڈالی اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سعید آداب کرکے بیٹھ گیا۔

"کہیئے؟" اُنہوں نے بغیر مُلاقاتی کی جانب دیکھے ہوئے کہا۔

"میرا نام سعید الدین علی خاں ہے۔ اور بیگم صاحبہ سے ایک رشتہ کا بھی شرف رکھتا ہوں"

"افسوس آپ ایسے موقع پر آئے ہیں کہ میں آپ کی اس وقت کچھ امداد نہیں کرسکتا" نواب صاحب نے خُشک لہجہ میں کہا۔ سعید کی پیشانی پر شکن پڑ گئے۔ نواب صاحب نے اس کے تیور دیکھکر اپنی غلطی کا احساس کیا اور فوراً لہجہ بدلکر بولے۔ "معاف کیجئے۔ شاید میں نے آپ کے ساتھ ناانصافی کی۔ کیا میں آپکی تشریف آوری کی غایت معلوم کرسکتا ہوں"

"میں آپ سے اور بیگم صاحبہ سے صرف نیاز حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اس ملاقات سے میری اور کوئی غرض وابستہ نہیں ہے"

"صرف ملاقات؟"

"جی"

"آپ یہاں کیا کام کرتے ہیں؟"

"میں سیدھا کشمیر سے آپکی خدمت میں حاضر ہوا ہوں" اس کے بعد سعید نے اپنی علالت و قیام کشمیر وغیرہ کے حالات تمام تر نواب صاحب سے بیان کئے۔ اُس نے کشمیر اور وہاں کی تفریحات کو اس خوبی سے پیش کیا کہ نواب صاحب اس کی تقریر میں بیحد دلچسپی لینے لگے۔

"آپ مصوّر ہیں۔ آپ نے کشمیر کا جیسا لفظی نقشہ کھینچا ہے اس سے آپکے تخیل و زبان کی بے اختیار داد دینے کو جی

چاہتا ہے۔"

"واہ تو اُردو زبان کو دیکھئے جس میں یہ قدرت ہے کہ خیالات وجذبات کا و.. س خوبی سے اظہار کرسکتی ہو۔"

"اچھا میں بیگم کو مطلع کرتا ہوں۔ اگر وہ تم سے ملنا پسند کرینگی تو ابھی طلب کرلیں گی۔" نواب صاحب نے کہا۔

دفعتہً کمرے میں ایک وجیہ نوجوان اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے ہوئے داخل ہوا۔ وہ نواب صاحب کا حقیقی بھانجہ تھا۔ نواب صاحب اسکو دیکھتے ہی بولے۔ "اچھا ہوا حامد تم آگئے۔ یہ اپنے دُور کے ایک عزیز ہیں انکو بیگم کے پاس لیجاؤ لیکن پہلے دیکھ لینا کہ انکا مزاج برہم نہو۔" حامد نے ایک نظر حقارت سعید پر ڈالی۔ اس کے لباس کی دقیانوسیت پر مُسکرایا اور تضحیک آمیز لہجہ میں بولا "چلئے صاحبزادہ صاحب۔ آپکا کیا رشتہ ہے ہماری ممانی سے؟"

"باعتبار رابطہ ہم سب ابن آدم ہیں۔ لیکن ؎

نازم بایں شرف کہ غلام محبتم
لاف نسب زنسبت آدم نمی زنم"

سعید نے سادگی سے مُسکراکر اس کی حقارت ریز فقرے کے جواب میں کہا۔

"ولیجئے ماموں میاں یہ "غلام محبت" جدید انکشاف ہے"

حامد نے ایک پُرحقارت قہقہہ لگایا اور سعید کو ساتھ لیکر بیگم صاحبہ کے کمرے کا رُخ کیا۔

بیگم نے ایک عجیب مرنجان مرنج طبیعت پائی تھی۔ رشتہ ناطوں کی وہ زیادہ قائل نہیں تھیں لیکن جب حامد نے ظاہر کیا کہ ملاقاتی علاوہ آپکا بھانجہ ہونے کے ایک اچھا خاصہ آلۂ تفریح بھی ہے تو اُنہوں نے سعید کو اندر آجانے کی اجازت دیدی۔

نواب صاحب کے تین نوجوان [illegible] تھیں۔ بڑی خالدہ بلند و بالا قد اور موزوں خدوخال کی مالک تھی۔ ناصرہ میں حُسن و نزاکت کے ساتھ ایک خاص قسم کی جاذبیت بھی تھی اور راشدہ سب سے چھوٹی تھی۔ لیکن ہمہ خوبی، ہمہ رعنائی و زیبائی۔ تینوں بہنیں نہایت زندہ دل ہنس مُکھ اور خوش طبع تھیں۔ راشدہ لیکن بیحد شوخ وطرار تھی۔ یہ مغرور حُسن لڑکی اپنے ابّا تک کو چٹکیوں میں اُڑا دیا کرتی تھی۔ رکھ رکھاؤ میں اگرچہ تینوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھکر تھیں لیکن راشدہ میں ایک خاص خودداری و پندار تھا۔ جب یہ تینوں کہیں جمع ہوجاتی تھیں تو بڑے سے بڑے صاحب عقل وشعور انسان کو بنا کر رکھدیا کرتی تھیں۔

سعید جونہی کمرے میں داخل ہوا اُسکی ہیئت کذائی کو دیکھکر تینوں نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ پہلے تو وہ غریب بھی جزبز ہوا لیکن جلد اپنی حالت سنبھال کر بیگم صاحبہ کو آداب کیا اور تینوں لڑکیوں کی طرف معصومانہ دیکھکر بولا۔

"آپ شاید میرے لباس پر ہنس رہی ہیں۔ میں سیدھا ریل سے اُترکر یہاں چلا آیا ہوں۔"

"اجازت دیجئے کہ ہم آپکے نہلانے اور کپڑے بدلنے کا انتظام کریں۔" منجھلی نے ہنسکر کہا۔

"مگر سُنا ہے کہ یہ تو غسل کرنے کے عادی ہی نہیں ہیں۔" بڑی بولی۔

"آپ نے ایک غُسل تو دُنیا میں تشریف لانے کے بعد فرمایا تھا اور ایک اس جہان سے تشریف لیجانے کے بعد فرمائیں گے۔" اسپر پھر تینوں نے قہقہہ لگایا جسمیں سعید نے بھی معصومانہ ہنسی سے شرکت کی۔

"چُپ رہو۔ شریر کہیں کی۔ اپنے مہمان کا مذاق اُڑاتے ہوئے تمکو شرم نہیں آتی۔" بیگم صاحبہ نے غصّہ سے فرمایا۔

"ناخواندہ مہمان"۔ خدا جانے تینوں میں سے کس نے فقرہ بلند کیا۔ اس کے بعد تینوں ہنسی کا گول گپا ہو کر رہ گئیں۔

"لیکن میں آپکے ہاں قیام کرنے حاضر نہیں ہوا ہوں۔ آپنے اپنے کو میزبان تصور کرنے میں قبل از وقت علو ہمتی سے کام لیا ہے"۔ اس سادہ لباس میں سے ایسی چبھتی ہوئی طنز سننے کی کسیکو توقع نہیں تھی۔ تینوں دفعتہً خاموش ہوگئیں۔ بلکہ خالدہ کو تو اس کے سیدھے پن پر رحم سا آنے لگا۔ چنانچہ وہ تو بالکل چپ ہوگئی۔ لیکن راشدہ کی زبان برابر چلتی رہی۔

"میاں تم ان پگلیوں کی باتوں پر نجاؤ۔ بیٹھو۔ تم برا تو نہیں مانو گے اگر میں پوچھوں کہ کیا تم اپنے کو میرا رشتہ دار ظاہر کرتے ہو؟ کیا رشتہ ہے؟"

"معاف فرمائیگا آپسے کوئی علاقہ میری افلاس زدہ مگر شریف ہستی میں کسی تفاخر کا اضافہ نہیں کر دیگا۔ میں نے اپنی رشتہ کا ذکر نواب صاحب سے محض امر واقعہ کے طور پر کیا تھا۔ میں اس کا متمنی بھی نہیں ہوں کہ اس آستانۂ عالیہ سے اپنی فکر کناف کو وابستہ کروں۔ والدہ مرحومہ اکثر آپ کا ذکر کیا کرتی تھیں، مجھے بھی آپ کی زیارت کا اشتیاق ہوگیا تھا۔ دہلی میں میرا چونکہ کوئی شناسا نہیں ہے اس لئے میں سیدھا یہیں چلا آیا تاکہ پہلے آپسے نیاز حاصل کروں ــــــ"

"اور پھر اگر موقع لگ جائے تو یہیں دھرنا دے کر بیٹھ جاؤں"، راشدہ نے کھل کھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ سعید بھی ہنس دیا اور بیگم بھی مسکرادیں۔ ناصرہ سے ہنسی ضبط نہیں ہوئی تو منہ پر ہاتھ رکھکر باہر بھاگ گئی اور پاگلوں کی طرح باہر خوب ہنسکر پھر اندر آگئی۔

"تم شاید اسعد علی خاں کے لڑکے ہو میں نے اُن کو آج تک نہیں دیکھا لیکن نام ضرور سُنا ہے۔ تمہاری ماں میرے پھوپا کی بہن کی لڑکی تھی۔"

"کیا ہوائی رشتہ ہو یہ" ناصرہ نے کہا۔

"پھر یہ ہمارے کون ہوئے امّی"، راشدہ نے خندۂ شوخ سے دریافت کیا۔

"ناخواندہ مہمان" سعید نے ہنسکر جلدی سے کہا۔

یہ فقرہ حسین راشدہ پر چپک کر رہگیا۔ اس کے سُرخ رُخسار پر دفعتہً ہلکی سی خفت کا خون دوڑ گیا۔ اپنی جادو بھری آنکھوں سے سعید کو دیکھتی ہوئی بولی "آخر آپنے یہ تو مان لیا کہ آپ ہمارے مہمان بننے کا تہیّہ کر چکے ہیں"

"کچھ رہی نہیں راشدہ یہ تو" ناصرہ نے کہا۔ راشدہ اپنے فقرے کی بے اثری پر اور زیادہ کھسیانی ہوگئی۔ اسکو توقع نہیں تھی کہ وہ ایک سعید جیسے سادہ لوح انسان سے یوں زک کھا سکے گی۔

"آپکو کشمیر میں سب سے زیادہ کس چیز میں زیادہ دلچسپی محسوس ہوئی؟" خالدہ نے دریافت کیا۔

"گدھوں میں۔ میں نے ......"

"گدھوں میں؟" ناصرہ نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا جس سے اُسکا چہرہ گلنار ہوگیا۔

"گد.... گ..... گدھوں میں"، راشدہ نے ہنسی کے مارے لوٹتے ہوئے کہا۔ سعید بھی انکو ہنستا دیکھکر معصومانہ ہنسنے لگا۔ بڑی بی اسبار مسکرادیں۔ وہ سعید کے بھولے پن اور سادہ اطواری کو بہت پسند کرنے لگیں تھیں۔ عجیب ٹھنڈی مٹی کا انسان تھا کسی بات پر غصہ ہونا یا ناک بھوں چڑھانا جانتا ہی نہ تھا۔

"آخر گدھوں [illegible] ایسی آپکے لئے کیا کشش تھی"، خالدہ نے ہنستے ہوئے [illegible]

"گُندہم جنس ———" راشدہ نے شوخی سے کہا۔

"چُپ رہو" بیگم نے اُسکو ڈانٹتے ہوئے کہا لیکن سعید کی صورت دیکھکر اُنکو پھر ہنسی آگئی۔ بیگم کے ہنستے ہی طوفانِ خندہ کا بندھ ٹوٹ پڑا۔ تینوں پیٹ پکڑ پکڑ کر ہنستے ہنستے لوٹ گئیں۔ چونکہ یہ خواہ مخواہ کی ہنسی تھی۔ سعید محرک خندہ شے کو اب تک سمجھا ہی نہ تھا چنانچہ وہ بھی بلا وجہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ اُسکو ہنستا دیکھکر راشدہ کا تو مارے ہنسی کے دم اُلٹ گیا۔

جب یہ دیوانگی کا دورسب پرسے کم ہوا تو ناصرہ بولی "آپ بیحد دلچسپ آدمی ہیں"

"گدھوں میں دلچسپی لینے والے انسان میں تم بھی دلچسپی لینے لگی ہو" خالدہ نے ناصرہ سے کہا۔

"حالانکہ دونوں میں بظاہر بیّن فرق ہو" راشدہ نے پھر فقرہ جڑا۔

"اس تجنیس شناسی پر میں آپکا بیحد ممنون ہوں کہ آپنے مجھے حقیقتِ حال سے بہت جلد آگاہ کر دیا۔ ورنہ میں تو خُدا جانے کب تک اس ابہام میں مبتلا رہتا کہ اس جلوت میں کوئی نوعِ جنس بھی ہے ———"

"کس قدر مہمل تقریر ہے" ناصرہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں جناب وہ گدھوں والا قصہ تو رہ ہی گیا" خالدہ نے کہا۔

"کیا تمہارا یہ خیال ہے باجی کہ یہ ماہرِ نفسیاتِ خر ہیں؟" راشدہ نے پوچھا۔

"میں کشمیر کے گدھوں کی اسلیئے تعریف کر رہا تھا کہ بڑے مضبوط و محنتی ہوتے ہیں"

"اور آپ بھی محنت و جفاکشی [illegible] کرتے ہونگے"

ناصرہ نے سعید سے پوچھا۔

"یہ تو ظاہر ہے۔ گدھوں کے باب میں آپکی خوش مذاقی قایم اسی بنا پر ہے کہ اُن میں آپکی پسندیدہ صفت موجود ہے" راشدہ نے ہنسکر کہا۔ پھر سب پر ہنسی کا شدید دورا پڑا۔

"لیکن میری اس وقت کی مایوسی کا بھی تو اندازہ لگائے جب میں اپنی پسندیدہ صفت کا انسانوں میں فقدان دیکھکر گدھوں کو انسانوں پر ترجیح دینے پر مجبور ہوتا ہوں"

"آپکی فطرت شناسی قابلِ داد ہے" ناصرہ نے کہا۔

"ہاں اس فن میں مجھے خاص ملکہ ہے"

"اچھا تو میری فطرت پڑھیئے" خالدہ نے اشتیاق سے کہا۔

"بہتر ہے۔ ذرا قریب آجایئے" خالدہ قریب کی کرسی پر آبیٹھی۔ سب کا خیال تھا کہ اس باب میں بھی وہ اپنی کسی "حماقت گوئی" سے ہنسنے کا موقع دیگا۔ لیکن جب سعید نے خالدہ کی بالکل صحیح فطرت پڑھکر سُنا دی تو سب ایکدوسرے کا مُنہ دیکھنے لگیں۔

"اچھا میرے متعلق کیا ارشاد ہے" ناصرہ نے کہا۔

"اچھی روح پائی ہے" سعید نے ناصرہ کی بڑی بڑی آنکھوں کے اعماق میں اپنی نظریں اُتارتے ہوئے کہا۔

"دل صاف ہے لیکن محرومی پسند۔ طبیعت تمرد کو چاہتی ہے لیکن فطری انکسار روک دیتا ہے۔ روح میں بیچارگی کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ طبیعت ماحول سے متاثر ہوکر مائلِ فرعونیت ہوتی ہے لیکن روحانی عجز آپ کی حالت قابلِ رحم بنا دیتا ہے۔

"بیٹے میری طینت بھی پڑھو" بڑی بی نے اشتیاق سے

آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ناصرہ کے متعلق سعید نے جو کچھ کہا تھا لفظ بلفظ صحیح تھا۔ وہ اپنی صحیح فطرت سعید کی زبان سے سُنکر اسکی قابلیت کو دل میں مان گئی۔

سعید نے بیگم صاحبہ کی بھی فطرت پڑھی۔ اب راشدہ کی باری تھی لیکن جب اس کی جانب سے کوئی اشتیاق ظاہر نہ ہوا تو سعید بھی چُپ ہو گیا۔

"اچھا اب اجازت چاہتا ہوں" سعید نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"بیٹھئے چائے پیتے جایئے" ناصرہ بولی۔

"لیکن اب تم جاؤ گے کہاں" بیگم نے دریافت کیا۔

"میں خود بھی یہی سوچتا ہوں کہ کہاں جاؤں۔ جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے"

(بیس روپے کے نوٹ اُسکو دیکر) ابھی تم اس سے اپنا کام چلاؤ۔ ضرورت ہو تو اور طلب کر لینا" بیگم نے کہا۔

سعید نے بکمال بے تکلفی اس عطیہ کو قبول کر لیا۔

"ان پیسوں کا آپ کیا کرینگے" ناصرہ نے پوچھا۔

"سب سے پہلے تو کچھ کپڑے بنواؤنگا تاکہ آیندہ ملاقات پر میرے لباس پر آپکو ہنسنے کا مزید موقع نہ ملے"

"ہاں اچھا خیال ہے۔ لیکن میرا خیال ہے سب سے پہلے آپ کسی ماہر امراض دماغی سے ملیئے۔ آپکا لباس اتنا نہیں ہنساتا ہے جتنا دماغ" راشدہ نے کہا۔

"بہت اچھا۔ لیکن کیا عجب ہے کہ میرا دماغ قہقہوں کی اعجاز آفرینی سے خود بخود درست ہو جائے۔ آپ ہنسئے اور مجھے اچھا کیجئے" سعید نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ آپکا دماغ اجتماعی قہقہوں سے درست ہو گا یا انفرادی سے؟" ناصرہ نے پوچھا۔

"میرے خیال میں اس کا جواب آپ خود دیں تو اچھا ہے۔ آپ انفرادی طور پر اپنے قہقہوں کی سحر کاری سے خوب واقف ہونگی" سعید نے راشدہ کی جانب نظریں جما کر کہا۔ لیکن وہ اس انداز سے بیٹھی رہی گویا اس نے سُنا ہی نہیں ہے۔

"چائے کا وقت آگیا ہے۔ اب آپ چائے پی کر ہی کہیں جایئے" خالدہ نے سعید سے کہا۔

"جیسی آپکی مرضی"

"انکو تو کسی چیز سے انکار ہی نہیں ہے۔ تم ناحق پوچھتی ہو" راشدہ نے کہا۔

"ہاں میاں اب تم چائے پی کر ہی جانا۔ اچھا میں اب ذرا غسل کر لیتی ہوں" یہ کہہ کر بیگم صاحبہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے ساتھ ہی تینوں لڑکیاں بھی کھڑی ہو گئیں۔ کمرے میں سعید تنہا رہ گیا۔

ابھی اُسکو تنہائی میں چند منٹ ہی گذرے ہونگے کہ دروازہ کھلا اور حامد نہایت احتیاط سے اندر داخل ہوا۔

"سعید مجھے اُمید ہے کہ میری اگلی گستاخی کو معاف کرو گے۔ میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں بشرطیکہ تم اسکے اخفا کا وعدہ کرو" اُس نے چپکے سے سعید سے کہا۔

"اگر میں اس کام کو انجام دینے کے لئے آمادہ ہو گیا تو اسکو پردۂ راز میں رکھنا تو خود بخود میرا فرض ہو جائیگا" سعید نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اس حقیر سی خدمت سے انکار نہ کرو گے" حامد نے لجاجت سے کہا۔

"آپ مقصد بیان کیجئے۔ زیادہ طول کلامی سے کیا فائدہ" سعید نے کہا۔

"یہ لو یہ رقعہ کسی طرح راشدہ کو دیدو۔ لیکن براہِ کرم تم اسکو نہ پڑھ[illegible]

سعید نے سادگی سے حامد کی طرف دیکھا۔ رقعہ لے لیا اور بولا۔ "اچھا آپکا رقعہ دیدیا جائیگا اور میں اسکو پڑھونگا بھی نہیں۔ اور کچھ ارشاد ہے؟"

"بس شکریہ۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چپکے سے چلا گیا۔ اسکو گئے ہوئے ابھی چند ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ زینے پر پیروں کی چاپ ہوئی سعید نے جلدی سے رقعہ مٹھی میں دبالیا اور بظاہر ایک اخبار پڑھنے لگا۔

پردہ ہٹا اور راشدہ اپنا کچھ کروشیا کا سامان لئے سیدھی الماری کی طرف چلی گئی۔ اس نے سعید کو اس طرح نظر انداز کردیا گویا وہ کمرے میں تھا ہی نہیں۔ جب وہ الماری کے پاس پہنچ گئی تو سعید اٹھا۔ اس کا دل خود بخود نامعلوم کیوں دھڑکنے لگا۔ اپنی مشن کی تکمیل کی اسکو ہمت نہیں ہوتی تھی۔ آخر وہ الماری کے پاس جاکھڑا ہوا اور باندازِ استغنیٰ بولا "حامد صاحب مجھے یہ رقعہ دے گئے ہیں تاکہ اسکو آپ تک پہنچا دوں۔"

راشدہ اب بھی اپنے کام میں اسی قدر مصروف تھی گویا اس نے سنا ہی نہیں۔ آخر سعید نے رقعہ الماری کے تختہ پر رکھدیا اور اپنی جگہ پر چلا آیا۔

"مسٹر سعید" چند منٹ راشدہ کی خشمگیں آواز کان میں آئی۔ سعید نے سادگی سے اسکی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر برافروختگی کے آثار دیکھکر حواس باختہ ہو گیا۔

"تم کو شرم نہیں آتی ——" فرطِ غیظ میں راشدہ کے کپکپاتے لبوں سے صرف اسقدر نکل سکا۔

"لیکن شرم کا یہاں کیا محل۔ ہے خاتون" سعید نے سادگی سے دریافت کیا۔

"کمینہ۔ پاجی" راشدہ کی زبان سے نکلا۔

"کیا ان مبارک الفاظ کا شکار یہ خاکسار ہے؟" سعید نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں میں تم کو گالیاں نہیں دے سکتی۔ تم نے اس رقعہ کو پڑھا تو ہوگا۔"

"مطلق نہیں۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا راز ابھی بالکل محفوظ ہے۔"

"مجھے تمہاری سادہ دلی سے توقع تھی کہ تم نے اس کو نہیں پڑھا ہوگا۔ لیکن تم کو اسے پڑھنا چاہیئے۔ تم کو دیکھنا چاہیئے کہ تم لوگ، تم مرد کس قدر ابلیسی ذہنیت رکھتے ہو۔"

سعید اس شوخ وطرار لڑکی کو اس طرح سنجیدگی سے گفتگو کرتے دیکھکر حیران کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ ان حسین دشنام کا کیا مطلب ہے۔

"مگر نہیں۔ تم مجھے اتنے خطرناک نظر نہیں آتے جتنے اور بدتمیز مرد ہوتے ہیں۔ اچھا تم بیٹھ جاؤ اور اس رقعہ کو پڑھو۔" سعید نے معصومانہ رقعہ لے لیا اور بولا "لیکن مجھ سے کہدیا گیا تھا کہ میں رقعہ نہ پڑھوں۔"

"پڑھو جی۔ میں حکم دیتی ہوں۔" سعید نے اس "حکمرانی" پر غور کئے بغیر تعمیلِ ارشادِ حسین میں رقعہ پڑھنا شروع کیا۔

"میری جان۔

تیرے گلابی ہونٹوں کی قسم میں دیوانہ وار تجھ پر عاشق ہوں۔ تیری پیاری زبان سے آج اقرارِ محبت ہوجائے تو میں اپنی منسوب لڑکی کو ابھی ٹھکرادوں۔ میں تجھے جیت کر عیش کی زندگی گذارنا چاہتا ہوں۔ جب تجھ جیسی لڑکی ہاتھ آجائے تو دنیا، اس جہنم زار کا گہوارۂ مسرت وعیش بنجانا کچھ مشکل نہیں۔

سراپا تیرا "ح"

سعید نے بغیر کسی انقباض و اظہار غیظ کے رقعہ واپس دے دیا۔ "اگر تم اجازت دو تو میں سگریٹ پی لوں۔ معمولی سے سگریٹ پیتا ہوں میں۔ قیمتی کے لئے پیسے کہاں سے لاؤں۔"

"تم عجیب حماقت کی حد تک سادہ لوح ہو۔ بے محل گفتگو شروع کر دی۔ میں تم سے پوچھتی ہوں کہ اس رقعہ کو پڑھکر کیا تم کو غصہ نہیں آیا؟"

"غصہ؟ نہیں" سعید نے نہیں پر سر ہلا کر کہا "آپکے معاملات پر میں غصہ ہونے کا کیا حق رکھتا ہوں۔"

"مردہ روح۔ بیجان جذبات کا انسان" راشدہ نے غصہ سے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ چاہتا کیا ہے۔ میری مراد حامد سے ہے" سعید نے کہا۔ اس کی اس کوتاہ فہمی پر حسین راشدہ کو اور بھی غصہ آ گیا۔ شعلہ فشاں آنکھوں سے اسکو دیکھنے لگی اور پھر حقارت سے کچھ کہکر چلدی۔

"سنیئے تو سہی۔ میں حامد سے کیا کہدوں؟" سعید نے اس کے تعاقب میں دروازے کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔

"حامد سے؟" راشدہ نے دفعتہً مڑکر پوچھا "یہ"

چٹاخ! ایک چپت کی آواز پیدا ہوئی اور سعید سمٹ کر رہگیا۔ ابھی وہ اپنے رخسار کو ٹٹول ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور بیگم صاحبہ اندر داخل ہوئیں۔ راشدہ جا چکی تھی۔

"کیوں تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟" بیگم نے سعید کو سراسیمگی کی حالت میں دروازے کے پاس کھڑا ہوا دیکھکر کہا۔ سعید خاموش کھڑا رہا۔ اتنے میں چائے آ گئی اور اس کے ساتھ ہی خالدہ، ناصرہ اور راشدہ بھی آ گئیں۔ راشدہ پھر وہی اگلی سی تیز و طرار راشدہ تھی گویا کوئی بات ہی نہیں گذری تھی۔

"آپ چائے پسند کرتے ہیں یا کافی؟" خالدہ نے پوچھا۔

"محض گرم پانی" راشدہ نے ہنسکر سعید کی جانب سے جواب دیا۔

"اگر کافی، چائے اور گرم پانی سے محض اکتساب حرارت مقصود ہے تو میں چانٹا، چپت، دھول وغیرہ وغیرہ کو بھی پسند کرتا ہوں" سعید نے مسکرا کر کہا۔ یہ فقرہ حالانکہ اس نے راشدہ کی جانب دیکھکر نہیں کہا تھا لیکن وہ اسکو سنکر کچھ بےچین سی ہو گئی اور ترحم آمیز نظروں سے بےقصور سعید کو دیکھنے لگی۔ اس کو احساس ہوا کہ غریب سعید کے ساتھ اس نے سخت ناانصافی کی۔

"معلوم ہوتا ہو کہ مکتب میں آپکی کافی مرمت ہوئی ہے" راشدہ نے آخر بالجبر ہنسکر کہا۔

"جی مکتب کی کوئی تخصیص نہیں ہر شکستگی کے بعد مرمت ہو جاتی ہے" سعید نے ہنسکر جواب دیا۔

"پھر آپ کو تو ہر وقت معمار ساتھ رکھنے کی ضرورت ہے" خالدہ نے کہا۔

"صاحب اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے وہ ہر جگہ معمار پیدا کر دیتا ہے" یہ کہہ کر اس نے یونہی راشدہ کی طرف دیکھ لیا جس کی حسین آنکھیں سعید سے درخواست کر رہی تھیں کہ بس اس سے آگے نہ بڑھو ورنہ میرا راز فاش ہو جائے گا۔

بعض منفی امور بھی کس طرح غیر متوقع طور پر خود بخود زندگی حاصل کر لیا کرتے ہیں۔ ہم سے بلا ارادہ ایک حرکت سرزد ہو جاتی ہے۔ لیکن مشاعر اس کے اثرات سے خواہ مخواہ جاگ اٹھتے ہیں۔ کوشش کیجاتی ہے کہ اسکی اہمیت کو روک دبا جائے لیکن جب وہ بات اپنی ذات سے منتقل ہو کر

کسی دوسرے انسان کی شخصیت کو بھی لپیٹ لیتی ہے تو ہم صرف اپنے تحفظِ شخصی کی خاطر اس کے اثرات کی نفی کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہ بالکل بیکار کوشش ہوتی ہے۔ راشدہ کا سعید کے چپت رسید کردینا تو ایک عام بات سمجھئے لیکن اس کے "غیر مطلوب" اثرات کو دیکھئے کہ انہوں نے پیدا ہوکر راشدہ کو کیسے نامطبوع جذبات سے دوچار کردیا۔ چپت مار کر اس "رازِ چپت بازی" کے اخفا میں اس کی سعیٔ غیر مستقل، سعید پر خود بخود اسکو رحم آنے لگنا۔ اپنی چند فطری کمزوریوں سے (مغلوب الغضبی وغیرہ وغیرہ) دفعتہً اسکا خود بخود آگاہ ہوجانا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے وقوع کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ سعید پر رحم آتے ہی اس کے دل میں رحم اور رحم کی تمام متعلقہ صفاتِ حسنہ بیدار ہوگئیں۔ اور اسکو اس جذباتی مقام سے ہٹ جانا پڑا جہاں سے ہٹنے کا فی الحال اسکا کوئی قصد وارادہ نہ تھا! نفسیات کے گورکھ دھندے سے مفر نہیں ہے۔ ایک راشدہ ہی پر موقوف نہیں ہے۔ ہر انسان کو بغیر اپنی مرضی کے جگہ بدلنی پڑتی ہے ایک مرکز سے ہٹنا پڑتا ہے۔ تبدیلی کا شکار بننا پڑتا ہے!!

چند منٹ اور بیٹھکر سعید نواب صاحب کے مکان سے چلدیا۔ دہلی کے گلی کوچے تھے اور اسکا بوسیدہ جوتا۔ ایک مختصر سی کوٹھری کرایہ پر لے لی۔ جب تک بیس روپیوں کا گھٹتا ہوا سایہ سر پر قائم رہا گذر کرتا رہا۔ اس کے بعد پریشانیاں ہی پریشانیاں تھیں۔ خدا خدا کرکے کچھ عرصہ بعد اسکو دس روپیہ ماہوار کی ایک ٹیوشن مل گئی۔ اُسی کو غنیمت سمجھا۔ اس کی کوٹھری کے پاس ہی ایک مزدور رہتا تھا۔ جو اپنی دن بھر کی محنت کے بعد شام کو آتا تھا۔ اس کے بچے بیمار ہوتے تو سعید ہر طرح اُنکی دوا دغیرہ کا انتظام کرتا۔ خود بیمار تھا اسلئے بیماری کی مصیبت سے متاثر ہوتا تھا۔ خود غریب تھا اسلئے افلاس کی صعوبت سے آگاہ تھا۔ رحم و ہمدردی ممکن ہے کسی شخص کی نطرت میں قدرت کی جانب سے ودیعت کی جاتی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان خود مصیبت میں نہیں پھنستا وہ دوسروں کی مصیبت کو نہیں سمجھ سکتا۔ رحم و مروّت حقیقی جذبات نہیں ہیں مروّت تو بلکہ انسان میں ایک قسم کا عیب ہے لیکن رحم خواہ اعصابی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہوگیا ہو خواہ دوسروں کی تکالیف دیکھکر وہ دل میں رونما ہوگیا ہو، ہے بہت اچھی چیز۔ معلوم نہیں سعید کا کیریکٹر اپنی علالت سے قبل کیسا تھا لیکن جب سے وہ خود شکارِ آلام و علالت ہوا تھا اس میں ایک عجیب قسم کی "سپردگی" فنادگی، انکسار و ترحم پیدا ہوگیا تھا۔ اب اتفاق سے اِن صفات والے انسان کا ایک ایسی سوسائٹی میں گذر ہوگیا تھا جو بالکل برعکس صفات کی حامل تھی۔ بیگم کے گھر میں افلاس کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ یہاں ایک حد تک زر کی فولادی قوت نے امراض کی راہیں بھی روک رکھی تھیں۔ اس ماحول میں خالدہ، ناصرہ اور راشدہ جیسی لڑکیاں بھی تھیں جو ایک افسردہ دل کے افسردہ جذبات [illegible] دائمی زندہ دلی کے جاں بخش اثرات کے باعث سمجھنے سے قاصر تھیں۔ مگر ———

مگر ان تمام باتوں کے باوجود کیریکٹر، ایک معصوم کردار کا سددلوں میں نشان کئے بغیر نہ رہا۔ بیگم سعید کو اُسکے بھولے پن کی وجہ سے پسند کرنے لگیں تھی۔ خالدہ اس کی سادگی سے متاثر ہوچکی تھی، ناصرہ اس کی بے سروسامانی کی وجہ سے اُس پر رحم کھانے لگی تھی اور راشدہ ——— راشدہ......؟ راشدہ جس کی نطرت سب سے زیادہ سخت تھی اپنی ایک غیر ارادی حرکت (چپت زنی) سے اپنی بعض عادتوں کی

اصلاح کا تہیہ کر چکی تھی۔ یعنی سعید کے باب میں وہ بھی اپنی نسوانی پندار، اعزورِ حسن، اور نخوتِ امارت کو ملائم دیکھ رہی تھی! یہ ہیں کردار کے کرشمے، ایک ٹھوس کردار کے کرشمے۔!

سعید کسی امتثالی کیریکٹر کا انسان نہ تھا بلکہ ایک نیچرل کردار کا مالک تھا۔ کیریکٹر تو ہر انسان کا نیچرل ہی ہوتا ہے لیکن سوسائٹی، ماحول، کتابیں اور دیگر متفرق باتیں اسپر دوسری قسم کا رنگ چڑھا دیتی ہیں۔ میرے اعتقاد میں انسان ایک بالکل بے عیب مخلوق کا نام ہے۔ فطرت کا منشاء نہ تھا کہ شدّاد، نیرو اور ابوجہل وہ بنیں جو وہ بنگئے۔ انسان انسان کا شیطان ہے۔ شدّاد ایک صاحبِ جاہ وحشم انسان تھا۔ ظاہر ہے کہ کتنی تملق مآب زبانیں اس کے دربار میں کُھلتی ہونگی۔ اب اگر وہ اپنے کو خُدا نہ منواتا تھا تو کیا نفسیاتی عوامل سے جنگ کرتا۔ نیرو کا ماحول اور اس کے معاصرین کے دور پر نظر ڈالیے۔ اگر اس میں خشونت، درندگی، تظلّم، بربریت وشقاوت کے عوض رحم وکرم، محبّت وایثار، عدل وانصاف کا مادہ ہوتا تو ایسے ماحول میں پلے ہوئے انسان کو اتنے اچھے صفات کا انسان دیکھکر ہم وجودِ باری کے قائل رہ سکتے تھے؟

سعید اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن نہ تھا۔ کیا دُنیا میں اُس نے صرف اس لئے جنم لیا تھا کہ وہ بیمار ومفلس کی سی زندگی ہمیشہ گذارتا رہے۔ آخر اس کی اس زبوں حالی سے قدرت کو کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ یا تو یہ انفرادی مصائب منجانب خدا نہیں ہیں اور اگر اسی کی جانب سے ہیں تو اتنی بیشمار مخلوق پیدا کردینے کے بعد وہ اپنے بندوں کی طرف سے بے پرواہ ہوجانے کا عادی ہو! شاید ہمارا خیال غلط ہو۔ ہم ہر رمز کو سمجھ لینے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں۔ سپردگی ہی میں ہماری بہبودی ہے سرکشی میں نہیں۔

سعید کو بیگم صاحب سے مُلاقات کئے چار ماہ گذر چکے تھے۔ اور اس چار ماہ میں وہ اپنی دس روپیہ ماہانہ کی قلیل آمدنی کے ذریعہ اُن کا نصف قرضہ ادا کرچکا تھا۔ انکا خیال تھا کہ بیس روپیہ کی معمولی رقم چند یوم میں صرف کرکے سعید پھر مزید مدد کے لئے ان کے سر پر آ مسلط ہوگا اور عجب نہیں کہ یہ ایک مُستقل مصیبت ہی بنجائے۔ لیکن جب انکی خدمت میں سعید کا مرسلہ دس روپے کا منی آرڈر پہنچا تو وہ نواب صاحب اور ان کی تینوں صاحبزادیاں سعید کے متعلق اپنی رائے کو تبدیل کرنے پر مجبور ہوگئیں۔

ایک روز وہ رات کو دس بجے کے قریب بڑھا کر چلا جارہا تھا کہ ایک کار اس کے بائیں ہاتھ کے بالکل قریب آکر رُک گئی۔ وہ سر جُھکائے اپنے خیال میں غرق چلا جارہا تھا۔ کار کے پاس سے گذر گیا لیکن کسی نے اس کا نام لے کر پکارا تو وہ ہوش میں آگیا۔ کار کے پاس گیا اور نواب صاحب کو دیکھکر سلام کیا۔

"اماں کہاں غائب ہو" نواب صاحب نے پوچھا۔

"تم نے تو اُس روز کے بعد سے صورت ہی نہیں دکھائی" بیگم صاحبہ کار کی پچھلی سیٹ پر سے بولیں۔

"آپ سنجیدہ کیسے کھڑے ہیں گویا اب آپکو دیکھکر ہم ہنسی آ ہی نہیں سکتی"۔ تین قہقہوں کے درمیان کہا گیا۔

"سنجیدہ بن کر تو آپ خاصے دیوانے نظر آنے لگے ہیں" حامد نے طنز کے طور پر کہا۔ اُس کا خیال تھا خالدہ ناصرہ وراشدہ بھی اس کی طنز کی شریک ہونگی لیکن اس باب میں ان لوگوں نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔

"آجکل فرصت ذرا کم ہی ملتی ہے" سعید نے کہا۔

"اچھا، ہفتہ کو ضرور آؤ۔ ہم ایک ــــــ"

"معاف فرمایئے" سعید وہاں سے معذرت کرکے فوراً ایک اندھے کی طرف لپکا۔ جو لکڑی ٹیکتا ٹیکتا نالی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ تھاما اور رہبری کرتا ہوا اسکو صحیح راستے پر لے گیا۔

"عجیب آدمی ہے۔ گویا ہم سب گدھے ہیں اور اس اندھے کے مقابلہ میں زیادہ قابل اعتنا نہیں ہیں" نواب صاحب نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ حامد نے انکے فقرے میں مزید تلخی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بیگم نے اور انکی تینوں لڑکیوں نے اُسکی اس حرکت کا مطلق بُرا نہ مانا۔

ہفتہ کی شام کو آخر سعید بیگم کے ارشاد کے مطابق اُن کی کوٹھی پر گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ وسیع باغیچہ میں چوطرف اندھیرا تھا۔ صرف صدر دروازہ پر بجلی کا بڑا سا قمقمہ لگا ہوا تھا۔ سعید گھاس کے تختہ پر سے گذر کر جب بیچ کے پاس پہنچا تو پیچھے سے کسی نے آکر آہستہ سے اُس کا شانہ تھپتھپایا۔ راشدہ تھی۔ "آداب عرض راشدہ صاحبہ۔ کہیئے کیا ہو رہا ہے"

"سیر" راشدہ نے کہا۔

"خوب" سعید نے مختصر جواب دیا اور جانے لگا۔

"بات سُنو۔ حامد بڑا بُرا آدمی ہے"

"خوب" سعید نے پھر مختصر جواب دیا۔

"سعید میں تم سے پوچھتی ہوں کیا تم میری مشکلات سے متاثر نہیں ہوتے؟ تم یہ نہ سمجھنے لگنا کہ میں تم سے کسی امر میں طالب امداد ہوں"

"تو پھر آپکی نامعلوم مشکلات سے میرے متاثر ہونے کا سوال ہی غیر ضروری ہے"

"تم بھی بہت بُرے آدمی ہو" حسین لبوں سے ترشروئی کے ساتھ کہا گیا۔

"شاید"

"شاید نہیں یقیناً۔ میں تم سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتی ہوں ــــ نہیں۔ مجھے تم سے ایسی گفتگو نہیں کرنی چاہیئے۔ تم جیسے بیوقوف انسان سے"

"راشدہ اگر حامد تم سے محبت کرتا ہے تو تم کیوں نہیں اُس کی محبت کا جواب دیتی ہو۔ اگر تم اُس سے نفرت کرتی ہو تو کیوں نہیں جرأت سے اُسکو ایک دفعہ ٹھکرا دیتیں۔ اس کشمکش سے کیا فائدہ کہ کبھی میری نحیف رائے کی پناہ لو اور کبھی غرور سے خودسری کی لینے لگو"

"تم کو مجھ سے اس قدر آزادی سے گفتگو کرنے کا حق نہیں" راشدہ نے آہستہ سے کہا۔

"آئندہ نہیں کرونگا" سعید نے کہا اور قدم آگے بڑھایا۔

"سعید۔ تم بہت اچھے آدمی ہو۔ اُن سب اچھے جنکو میں جانتی ہوں"

"لیکن تم بہت خراب لڑکی ہو۔ اُن سب میں خراب جنکو میں نہیں جانتا"

"بیوقوف۔ بھول گئے اپنی تعریف سُنکر۔ میں نے ایک گدائے بینوا سمجھکر یہ تم کو محض الفاظی خیرات دینی چاہی تھی"

"لیکن میں نے تم کو غیر راشدہ سمجھکر یہ بیضرر الفاظ کہے تھے"

"غیر راشدہ سے کیا مطلب؟"

"جب تم کو غصہ آتا ہے تو تم تم نہیں رہتی ہو۔ راشدہ وہ نہیں ہے جو وہ بن گئی ہے۔ وہ اس میں شک نہیں مغرور ضرور ہے لیکن اندھی مغرور نہیں بلکہ سمجھدار مغرور جو اپنے

نازو غرور کے باوجود بھی اپنی پاک و منزہ رُوح کی بنا پر حُسنِ سلوک
کی زیادہ عادی ہے۔ اگرچہ وہ دوگونہ فطرت کی مالک ہے۔
اگرچہ اُس کی قوتِ فیصلہ ضعیف ہے۔ اگرچہ وہ اپنے معتقدات
تک سے روگردانی کی خُوگر ہے لیکن اس میں متاثر ہونے
کی صلاحیت ہے، وہ تاثرات سے مغلوب ہوسکتی ہے۔۔۔"

"سعید تم نے اُس روز سب کی فطرت پڑھی تھی۔ آج
میری فطرت کا مطالعہ کر رہے ہو۔ تم نے جو کچھ کہا ایک
حد تک صحیح ہے۔ لیکن مجھے بھی اجازت دو کہ تمہاری فطرت
کو پڑھوں۔ تم بالکل جماد ہو۔ انسانی جذبات سے خالی۔
محبت سے ناآشنا۔ سادہ لوح لیکن صاف گو، ہمدرد۔"

"بس بس راشدہ۔ ممکن ہے تم میری تعریف میں
غلطی کر جاؤ اور میں تمہاری زبان سے اپنے متعلق اچھی صفات
سُنکر وہ نہ رہوں جو میں ہوں۔ تم کوٹھی میں چلتی ہو یا
ابھی کچھ دیر یہیں رہو گی؟"

"تم چلو میں آتی ہوں"۔ سعید چلا دیا۔ ابھی وہ بڑے
دروازے سے گذرا ہی تھا کہ گیلری کے اختتام پر ناصرہ
سے بالکل اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔

"کون سعید؟" اس کا ہاتھ تھامکر "سعید میں تم کو
کسقدر یاد کرتی تھی۔"

"خوب۔"

"خوب کیا معنی۔ تم نے بھی کبھی مجھے یاد کیا؟"

"کیوں یاد کرتا میں تمہیں۔"

"کیونکہ میں تمہیں یاد کیا کرتی تھی۔"

"لیکن میں کیوں اس سے متاثر ہوتا۔ تم غلطی کر رہی
ہو ناصرہ۔ چلو۔ یہ جگہ بات چیت کے لئے موزوں نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اور بیگم صاحبہ کے کمرے میں پہنچا۔
اُنھوں نے محبت سے اُسکو بٹھایا اور بہت دیر تک باتیں
کرتی رہیں۔ چندمنٹ کے بعد تینوں لڑکیاں بھی کمرے میں
آگئیں۔ ان کا یکجا جمع ہونا تھا کہ پھر یہ کمرہ قہقہستان بن گیا۔
راشدہ و ناصرہ کی اس وقت کی طنز و تحقیر سے اندازہ نہیں
ہوسکتا کہ یہ لڑکیاں چندمنٹ قبل سعید کے ساتھ بالکل
مختلف طریقے سے پیش آچکی ہیں۔

سعید کے سامنے ایک آئینہ لگا ہوا تھا۔ مرگی کے
مریض کے لئے آئینہ بینی بھی مضر بتائی جاتی ہے۔ سعید کو
دفعتہً کھانسی اٹھی اس کے بعد اُس پر مرگی کا دورہ پڑ گیا۔
خُدا کی پناہ! اس کی اس وقت کی حالت دیکھکر کون کہہ
سکتا تھا کہ یہ وہی چندمنٹ پیشتر کا سعید ہے جو نہایت
عاقلانہ باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے کمزور جسم میں رُوح لرز
رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ سخت عذاب میں مُبتلا
ہے۔ کرسی پر سے گر پڑنے سے اُس کا سر بھی پھٹ گیا
تھا۔

جب اُسکو ہوش آیا تو وہ ایک آرام دہ کمرے میں
پڑا ہوا تھا، اور اُس کے پاس راشدہ اور نرس کے
علاوہ کوئی نہ تھا۔ راشدہ مُسکراکر اُس کے سرہانے آئی
اور بولی: "کیوں اب تو تمہارا دماغ درست ہو گیا ہوگا۔"

"میں تم لوگوں کی غور و پرداخت کا تہ دل سے شکریہ
ادا کرتا ہوں۔ بیگم صاحبہ ۔۔۔۔ نہیں خالہ اماں کہاں
ہیں؟"

"ہونہہ جب سر پر پڑی تو خالہ اماں ہو گئیں۔ اُس روز
تو اُس اندھے کے مقابلہ میں انکی ایسی تحقیر کی گئی۔"

"تحقیر؟ معاذ اللہ۔ راشدہ مجھے تم سے توقع نہ تھی
کہ تم بھی اس قدر تنگدل ہو۔"

"میں تنگدل تو تم سنگدل"، راشدہ نے ہنسکر
کہا۔

"کس طرح ؟"

" جس روز سے میں نے تمہارے چپت رسید کیا اُس روز سے مجھے تم پر بڑا رحم آنے لگا ہے" اُس نے بات ٹالنے کے طور پر کہا۔

"خُدا آپکو اِس کا اجر دیگا"

"ہاں انسان ہی اجر دینے کا عادی نہیں ہے"

"آپ زیادہ بات چیت نہ کیجئے" نرس نے سعید سے کہا۔

" خاموش مرجانے سے تو گفتگو کرتے ہوئے مرجانا اچھا ہے نرس" سعید نے مُسکرا کر کہا۔

سعید ایک ہفتہ کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تو اُس نے اپنے مُستقر پر جانا چاہا لیکن بیگم نے کہا "تم بیمار ہو مناسب یہی ہے کہ یہیں رہو" مگر سعید اس کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ بیگم محض از راہِ خُدا ترسی اسکو قیام کی دعوت دے رہی تھیں اور وہ اس خیراتی نوازش کے لئے تیار نہ تھا۔ ممکن ہے کوئی اس کی اس حرکت کو ناسپاسی سے تعبیر کرے لیکن ہر شخص کا نظریہ جُداگانہ ہوتا ہے۔ جب وہ جانے لگا تو راشدہ نے پھر اُسکو باغ میں جا لیا۔ "تم ہمارے ہاں سے کیوں جارہے ہو ؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ میں چلا جانا چاہتا ہوں"

"سعید میں حامد سے اب محبت کرنے لگی ہوں"

"خوب" سعید کا پھر وہی مختصر جواب تھا۔ راشدہ اس کے سامنے حامد کا بار بار تذکرہ کرکے اس میں جذبہ رقابت پیدا کردینا چاہتی تھی، لیکن سعید کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ وہ راشدہ کے باب میں کسی سے رقابت پیدا کرسکتا ہے۔

"تم بہت بزدل انسان ہو۔ حامد سے ڈرتے ہو"

"ڈرتا تو نہیں ہوں۔ ہاں بچتا ضرور ہوں"

"اور وہ رات دن تمہاری تاک میں ہے"

"کیوں ؟"

"میں کیا جانوں۔ تم نے شاید اس سے کہدیا ہوگا کہ میں راشدہ سے محبت کرتا ہوں" غریب سعید راشدہ سے محبت کرنے کا تخیل بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس غیر ممکن الوقوع بات کو سُنکر اس کے ذہن میں اس خیال نے کروٹ لی کہ وہ بھی راشدہ سے محبت کرسکتا ہے۔ راشدہ کی ترکیب کامیاب ہوسکتی تھی (اُس نے سعید کے سینے میں محض بیداری محبت کے خیال سے ہی مرقوم بالا فقرہ کہا تھا) اگر سعید محبت آشنا دل کا مالک ہوتا۔

"لیکن راشدہ میرا تم سے محبت کرنا ایسا ہی ہے جیسے بیکس فرہاد کا شیریں کو چاہنا"

"ہاں ہے تو یہی بات۔ تم مجھے چاہو ہی کیوں ؟"

"تو میں تمہیں چاہتا ہی کب ہوں" سعید نے کہا۔

"تم بزدل ہو محض بزدل۔ حامد سے ڈرتے ہو" اُس نے پھر اُس کے جذباتِ مردانہ کو اُبھارنے کی نیت سے کہا۔

" راشدہ اگر مجھے تم سے کبھی محبت ہوگئی تو میں حامد تو کیا خُدا سے بھی نہیں ڈرونگا"

"لیکن کیا تمہارا خیال ہے کہ میں بھی تم سے محبت کرنے لگونگی ؟"

"نہیں یہ بات میرے خیال میں بھی نہیں آتی ہے"

"حالانکہ حامد جی اسی اُمید پر رہا ہے کہ میں اس سے محبت کرسکتی ہوں۔ تم بھی ایسی اُمید کیوں نہیں باندھ لیتے"

" موہوم اُمید سے کیا فائدہ۔ ہوسکتا ہے کہ تم کچھ عرصہ بعد اُسکو چاہنے لگو کیونکہ وہ دولتمند آدمی ہے۔ خوشرو ہے،

اگرچہ فطرت اچھی نہیں ہے۔"

"یہ آپ ہر شخص کی فطرت خوب پڑھ لیا کرتے ہیں۔ مگر وہ کس قدر صحیح ہوتی ہے! میں دولت کو پسند نہیں کرتی ہوں۔"
سعید کو اس قدر توقعات دلانے کے بعد وہ پھر اسکو دور کرنے کے خیال سے بولی۔ "مگر ہاں تم سے میں محبت نہیں کرونگی۔"

"مجھ سے کوئی محبت نہیں کرسکتا ہے۔ میں مرگی کا مریض ہوں۔ افلاس زدہ ہوں۔ اور زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہیں۔ میرے اطوار دلوں کو موہ لینے کی قوت سے خالی ہیں۔ مجھے ریا آمیز گفتگو وحرکات نہیں آتیں۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو کہ تم سے کوئی محبت نہیں کرسکتا۔ ناصرہ باجی میرا خیال ہے تمکو چاہتی ہیں۔"

"ایں!" سعید نے حیرت سے کہا۔ "ناممکن"۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

"سعید محبت خواہ کوئی چیز نہو اور جسکو ہم محبت کہتے ہیں وہ خواہ پسندیدگی ہی ہو۔ شکار کے مختلف طریقہ رکھتی ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہماری عین خواہش ہے کہ دولتمند شوہر ملے۔ تم مجھے شاید اس آزاد گفتگو پر بے حیا سمجھو گے۔ تمہیں خیال ہوگا کہ اس قسم کی آزاد بیانی لڑکی کے شایان شان نہیں۔ مگر تم جیسے انسان کے سامنے ہر لڑکی اسی طرح اپنے حقیقی خیالات کا اظہار کرسکتی ہے۔ خیر تو ہماری بھی خواہش یہی ہے کہ دولتمند میاں ملے۔ لیکن آپا کے پاس بفضلہ دولت کی کمی نہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک غیر دولتمند مگر پسندیدہ انسان کو ٹھکرادیں اور دولتمند مگر غیر پسندیدہ انسان سے شادی کرلیں۔"

"تم نے "ہم" استعمال کرکے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے یا تم تینوں بہنوں کا یہی خیال ہے۔"

"کم ازکم میرا تو یہی خیال ہے۔"

"خیر میں اس مسئلہ میں چونکہ زیادہ معلومات نہیں رکھتا ہوں اس لئے تم سے کچھ بحث نہیں کرسکتا۔ اچھا اب جاتا ہوں۔"

"پھر کب آؤ گے؟"

"ہفتہ عشرہ میں بشرط فرصت چکر لگا جاؤنگا۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ راشدہ وہیں کھڑی ہوئی اسکو دیکھتی رہی۔ یکایک سینہ سے دل میں نامعلوم کیا اندوہناک خیال آیا ایک دھیمی سی آہ بھری اور اندر چلدی۔

قسمت کے آپ قائل ہوں یا نہ ہوں مگر بعض دفعہ اتفاقی واقعات کی کرشمہ سازیاں بھی عجیب وغریب ہوتی ہیں۔ جس بابو کے لڑکے کو سعید پڑھاتا تھا اس نے زبردستی ایک ڈربی کی لاٹری کا ٹکٹ سعید کے سر بھی منڈھ دیا تھا۔ آپ تعجب کرینگے کہ پہلا انعام سعید کے نام ہی نکلا!

اب وہ بھی سینکڑوں رئیسوں سے کم نہ تھا لیکن فطرت کی سادگی کا کیا کرتا۔ اس کی عادتوں پر زر کی آشوبی قوت بھی کوئی شیطانی اثر نہ ڈال سکی۔ جو لوگ اسکی غربت وافلاس کی وجہ سے پہلے اس سے متنفر تھے اب اس کی شناسائی کو باعث فخر سمجھنے لگے۔ نواب صاحب کی موٹر تو رات دن اس کے دروازے پر ہی رہتی تھی۔

اس نے اس دولت سے بہت سے رفاہی کام جاری کردیئے وہ غربا وامراء دونوں طبقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ ہزاروں بیوائیں، سینکڑوں طلبا اور بیشمار سفید پوش مفلس شرفا اس سے پل رہے تھے۔

ناصرہ نے اپنی مبہم محبت کو آخر اب اسپر بالکل واضح کردیا۔ اپنی حرارت محبت سے مغلوب ہوکر نہیں بلکہ دولت کی آنچ سے متاثر ہوکر۔ خالدہ اب بھی اسکو اسی قدر قابل رحم آلہ تفریح سمجھتی تھی۔ اور راشدہ اب بالکل خاموش تھی۔

"خالہ اماں میرے مکان کے پاس ایک لوہار رہتا ہے۔ میرا ارادہ اُس کی لڑکی سے شادی کرنے کا ہے۔ کیسی محنتی لڑکی ہے۔"

"مگر تم بغیر ڈاکٹر کے مشورے کے شادی نہ کرنا۔" بیگم نے کہا۔

"ڈاکٹر کا خیال ہے کہ میرے مرض میں شادی سے افاقہ ہوجانے کی توقع ہے۔"

"کسی کمہار کی لڑکی سے شادی کرتے تو اچھا تھا۔ جہیز میں گدھے تو ملتے۔" راشدہ نے ہنسکر کہا۔

"کہی تو پتہ کی بات۔" ابھی وہ باتیں کرہی رہے تھے کہ چوکیدار گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ اُس کی بیوی کے سخت دردِ زِہ ہورہا ہے کوئی سنبھالنے والا نہیں ہے اُسکو شفاخانہ میں بھیجنے کا انتظام کردیا جائے۔

ناصرہ و خالدہ ہنسکر بولیں "خدا غریبوں کو بچے دیتا ہی کیوں ہے کہ مفلسوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔" لیکن راشدہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور چوکیدار کی کوٹھری کی طرف چلدی۔

"راشدہ کہاں جاتی ہے۔ نہ بیٹی کنواری لڑکی زچہ خانہ میں نہیں جایا کرتی ہیں۔"

"امی کنواریوں کی آبرو ایک غریب کی خدمت کرنے سے مجبد پر اور بھی فخر کرنے لگے گی۔" یہ کہہ کر وہ چلدی۔ اور جب تک بیمار عورت شفاخانہ میں نہ چلی گئی وہ ہر طرح اُسکی خدمت کرتی رہی۔ یہ تھی راشدہ کی اصل فطرت۔ ہر انسان کی اصل فطرت یہی ہوتی ہے۔ دوسروں کی تکلیف سے وہ ضرور متأثر ہوتا ہے لیکن کبر، نمود تصنع اور شخصیت پرستی' اسپر اسقدر موٹی غیر انسانی چادر لپیٹ دیتی ہے کہ وہ اپنے سے پست لوگوں کے کام آنے میں شرم و عار محسوس کرنے لگتا ہے۔

سعید راشدہ کی اس حرکت سے بیحد متأثر ہوا۔ اسکے ساکن قلب میں دفعتہً ایک جدید روشنی سی پیدا ہوگئی جسنے اُس کے سادہ دل کے گوشے گوشے کو منور کردیا۔ سینے کے ویران احاطہ میں ایک پری جلوہ گر ہوئی جو پہلے تو بصد شوخی و ناز مصروفِ خرام رہی اس کے بعد راشدہ کی حسین و جمیل صورت میں منتقل ہوکر دورانِ خون کے ساتھ اس کی روح کے عمق میں پہنچ گئی!

صبح سعید اُٹھا تو اُسکو شدید بخار چڑھا ہوا تھا۔ یہ محبت کا بخار تھا۔ خواب میں لوہار کی لڑکی نے آکر اُسکی تکالیف کو کم کرنا چاہا لیکن سعید نے گرانی طبع میں کوئی شگفتگی محسوس نہیں کی۔ ناصرہ نے پیار کی باتیں آکر سنائیں۔ لیکن وہ بدستور بخار میں تپتا رہا۔ بیگم نے آکر مادرانہ محبت سے اُس کے سر کو تھپتھپایا لیکن وہ اسی قدر سرگرانی محسوس کرتا رہا۔ آخر شام کو اُسکا بخار تیز ہوگیا اور رات کو ایک سَو چھ ڈگری سے بھی اونچا ہوگیا۔ اسپر بحران کی سی حالت طاری تھی۔ نواب صاحب۔ ڈاکٹر، بیگم۔ ناصرہ، خالدہ، راشدہ سب ہی کمرے میں موجود تھے اور وہ چیخ چیخ کر بخار کی حالت میں بک رہا تھا۔ "راشدہ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ خالہ سے بھی نہیں ڈرتا۔ موت سے بھی نہیں ڈرتا۔ نواب صاحب سے بھی نہیں ڈرتا۔ میں تمہارے لئے خالہ سے جنگ آزمائی کرونگا۔ کیونکہ میں تمہیں چاہتا ہوں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ایں! ہاں ہاں تم سے محبت شدید محبت کرتا ہوں۔ چوکیدار کی ماں (بیوی کے عوض) کے بچہ پیدا ہوگیا' وہ راشدہ اُسکو لئے بیٹھی ہے۔ میری راشدہ!......"

نواب صاحب نے بیگم کی طرف دیکھا بیگم نے نواب صاحب کی طرف' دونوں نے ایکدوسرے کو کچھ سمجھا دیا چنانچہ وہ باہر آگئے۔

حامد جھلا کر کھڑا ہو گیا۔ ناصرہ جل کر چلدی۔ خالدہ حیرت سے مُنہ موڑ کر ہنسنے لگی۔ ڈاکٹر نے لپک کر کولن واٹر پیشانی پر چھڑکا اور راشدہ شرماتی ہوئی محبت سے سعید کے سرہانے آ بیٹھی !

قیسی رامپوری:

قطعات

اونگھتا ہے جب شہِ خاور شفق کی گود میں ‖ سینۂ دریا پہ یوں ہوتا ہے گلشن کا گماں
جیسے آئینے پہ گرتا ہے عروسِ نو کا عکس ‖ صبحدم گلرنگ جلووں سے حسیں گلکاریاں

(۲)

گا رہی ہے ایک ٹیلے پر کوئی آتش نوا ‖ زمزموں سے پڑ رہی ہیں یوں ہوا میں سلوٹیں
بسترِ ناکامِ اُلفت کو وفورِ درد سے ‖ جس طرح کر دیں شکن آلود شب کو کروٹیں

(۳)

سایہ افگن ہے فضا پر آج دیوالی کی شب ‖ جگمگاتے ہیں در و دیوار پر زرّیں چراغ
رات کے پچھلے پہر جیسے وطن کی یاد سے ‖ مُسکراتے ہیں کسی مہجور کے سینے کے داغ

(۴)

وصل کی شب ایک کمسن کے حسیں چہرے پہ یوں ‖ سرمئی زلفوں کی اک گُستاخ نے ڈالی نقاب
چلچلاتی دھوپ میں جیسے دُعا میخوار کی ‖ بڑھ کے خوں آشام سورج کو کرے زیرِ سحاب

(۵)

کر رہی تھی غُسل دوشیزہ لبِ آبِ رواں ‖ چاپ سُن کر پاؤں کی میرے سمٹ کر رہ گئی
رات کی دیوی کے کانوں میں سپیدی صبح کی ‖ نقرئی ہونٹوں سے جو کہنا تھا، جیسے کہہ گئی

(۶)

دیکھ کر تقدیر سے افلاس کی گُستاخیاں ‖ چلدیئے ہیں چھوڑ کر سب اسطرح الطاف کو
جسطرح گُم کردہ منزل راہرو کا سایہ بھی ‖ شب کی تاریکی میں چُپکے سے کہیں جاتا ہی کھو

الطاف مشہدی:

اُردو ڈراما کی ترقی کے ذرائع

ڈراما کی اہمیت ادبیات میں ڈراما ہی ایک ایسی صنف ہے جس کے دو پہلو ادبی اور تمثیلی ہیں اور جس کی وجہ سے وہ ضروریاتِ زندگی پر پوری طرح حاوی ہے۔ چونکہ یہ خصوصیت علم و فن دونوں کو اپنے دائرہ میں یکساں طور پر گھیر لیتی ہے اس لئے دُنیا کے بڑے بڑے مفکروں نے اس کو انسانی زندگی کے عملی پہلو کے لئے خاص طور پر موزوں خیال کیا۔ یونانی عقلاء نے جس طرح اس کی اصلاح و ترقی کیلئے کوشش کی وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ ملکہ الزبتھ کے زمانہ کے انگلستان نے اپنے ماحول کو ڈراما کیلئے حد درجہ موزوں پایا اور اس کے سُدھارنے اور پھیلانے میں جتنی دلچسپی لی وہ ادبیاتِ انگریزی کا ایک اہم اور ناقابل فراموش باب ہے۔

دورِ جدید کو انقلابی دور کہا جاتا ہے اور جہاں زندگی کو ہر شعبہ میں جنگِ عظیم کے بعد اہم انقلابات نے دُنیا کی کایا ہی پلٹ دی۔ وہاں ادبیات کی تاریخ کا نیا صفحہ بھی اُلٹا گیا۔ تاریخ ادبیات کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ عہد میں ترقی یافتہ اور انقلاب پسند ممالک ڈراما کی ترقی و اصلاح پر کافی توجہ کر رہے ہیں۔ روس نے حکومت کا چولا کیا بدلا زندگی اور ضروریاتِ زندگی کی ہر پُرانی چیز نکال پھینکی مگر ڈراما کا یہاں بھی طوطی بولتا ہے۔ بلکہ سوویٹ نظام سے پہلے جو حالت تھیٹر کی تھی اب اس میں کئی گنا زیادہ خوبیوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ پہلے زارِ حکمران روس، اپنی ہوسناکیوں کی پیاس بجھانے کیلئے تھیٹر کے وجود کو باقی رکھتے تھے مگر اب تھیٹر ایک باضابطہ ادارۂ تعلیم بنا لیا گیا ہے اور اس لحاظ سے اس کی بقا نہایت ضروری سمجھی گئی۔ انقلاب فرانس کے بعد پیرس کے اوپیرا کی مقبولیت بھی زیادہ ہوگئی۔ اطالیہ کا تھیٹر گو کہ آج "رومن تھیٹر" کے مقابلہ میں نہیں لیکن اپنے ہمسایہ ممالک سے کسی طرح کم نہیں۔ جرمنی نے جنگِ عظیم کے بعد سے جہاں مختلف شعبہ جات میں ترقی کی ہے اور اپنے آپ کو بہت جلد اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ بڑی سے بڑی طاقت کی ہمسری کر سکے وہاں اس نے تھیٹر کو نظر انداز نہیں کیا۔

اگر تھیٹر کو عیش و عشرت کا ہی محض گہوارہ خیال کیا جاتا جیسا آج بھی بعض تنگ نظر افراد سمجھتے ہیں تو جرمنی کبھی اپنے نئے گہوارۂ تعلیم تیار نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج دُنیا ساری اس بات پر متفق ہے کہ اسٹیج کو ذریعہ تعلیم بنایا جا سکتا ہے اور اگر پچھلے دس سال کی رپورٹوں کا مطالعہ کریں تو وہ ہر ملک جس نے تھیٹر کی بقا محض اسی خیال سے کی تھی آپ کو ایسے اعداد و شمار بتائیگا جس سے کہ اس کی کامیابی ظاہر ہوگی۔ سنہ ۱۹۳۶ء کی وہ رپورٹ جو انگلستان کی مجلس تعلیم بالغان کی طرف سے شائع ہوئی ہے اس طریقۂ کار کی کامیابی کی گواہ ہے۔

مسٹر برنارڈ شا "ڈرامائی تنقیدیں اور مضامین" میں لکھتے ہیں کہ ازمنۂ وسطیٰ میں جو اہمیت گرجا کو حاصل تھی وہی اہمیت بیسویں صدی میں تھیٹر کو حاصل ہے۔ بلکہ لندن کے گرجا کی جو اہمیت تھی اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر لندن کے تھیٹر کو حاصل ہے۔ "گرجا کو جانے کی بجائے" برنارڈ شا لکھتے ہیں "لوگ اب لندن میں تھیٹر کو جاتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر تھیٹر اس سے فائدہ اٹھا کر ٹھوس کام کرنے لگے۔ اور اپنے آپ کو اچھے خیالات پیدا کرنیکا کارخانہ، ضمیر کا مکبّر الصوت، سماجی قانون کا معمل اور تجرباتی تعلیم کی درس گاہ قرار دے لے۔"

ڈراما اور تھیٹر کا تعلق یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ڈراما اور تھیٹر کا تعلق روح اور جسم کا سا ہے۔ روح بغیر جسم کے اور جسم بغیر روح کے بیکار ہے۔ ڈراما کے ادبی اور تمثیلی دونوں پہلوؤں میں تمثیلی پہلو زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور بعض نقادوں کا خیال تو یہ ہے کہ ڈراما بغیر تمثیل کے بے جان ہے اور یہ بڑی حد تک حقیقت ہے ایسی کہ جس سے انکار مشکل ہے۔ اس لحاظ سے جہاں ڈراما کی ترقی کا سوال پیدا ہوتا ہے وہاں تھیٹر کی ترقی کا سوال خود بخود اٹھتا ہے۔ ترقی یافتہ تھیٹر کو دیکھکر اندازہ لگانے والے قیاس کر سکتے ہیں کہ یہاں ڈراما کی صنعت نے بھی اسی نسبت سے ترقی کی ہوگی۔ یہ خیال کوئی بیسویں صدی کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے بلکہ زمانہ قدیم ہی سے یونانیوں نے اسکی

ترویج کی۔ روما کے کھنڈرات میں تھیٹر کی جو عالی شان عمارت کے آثار آج بھی دکھائی دیتے ہیں وہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہیں کہ یونانی ڈراما کی ترقی دراصل یونانی تھیٹر کی ترقی تھی۔ یہی حال ملکہ الزبتھ کے زمانہ کے تھیٹر کا ہے۔ مگر فرق صرف یہ ہے کہ اس زمانے میں فن تھیٹر کی مادی ترقی کے وہ ذرائع مہیا نہ تھے جو آج ہم میں موجود ہیں۔ شکسپیئر کو بلاشبہ بیسویں صدی کا تھیٹر نصیب نہیں ہوا جہاں کہ وہ آرڈن کے جنگل کا سین پیش کرسکتا۔ طوفان، ابرو باد کا منظر دکھا سکتا، پریوں کو فضائے بسیط میں اڑتے ہوتے ظاہر کرسکتا۔ یا کنگ لیر کو پہاڑ کی اونچی چوٹی سے گرتے ہوئے دکھا سکتا لیکن اس زمانہ کے لحاظ سے تھیٹر کی ترقی انگریزی سماج کے دوسرے شعبوں کے مقابل میں زیادہ ترقی یافتہ نظر آتی ہے۔

مختصر یہ کہ تھیٹر میں چونکہ ڈراما کے ادبی پہلو کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے اس لئے لازمی ہے کہ اس اہم شعبہ کی تکمیل کیلئے وہ مناسب ترقی کرے۔ ورنہ تمثیلی پہلو کی خرابی سے ادبی پہلو پر بھی حرف آئیگا۔ اس کے علاوہ ڈرامہ نگار چونکہ ہمیشہ تھیٹر کو پیش نظر رکھکر ڈرامہ لکھتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ڈرامہ نگار کی منشار کے مطابق تھیٹر ترقی یافتہ ہو ورنہ جو چیز فضا، مقام اور موقع کے ذرائع سے ظاہر کرنا چاہتا ہے واضح نہ کرسکے گا۔ ڈراما نگار کو تھیٹر کی جتنی سہولتیں مہیا ہونگی اتنا ہی زیادہ اچھا ڈرامہ وہ لکھ سکیگا اور اسی قدر سہولت کے ساتھ مصنف کا اصلی مقصد اور منشا جو کہ وہ حقیقت میں پیدا کرنا چاہتا ہے ظاہر ہو سکے گا اور جب تک ڈراما اور تھیٹر کا یہ باہمی تعاون نہ ہوگا اس وقت تک ڈراما صحیح معنوں میں تمثیلی حیثیت سے کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

ڈراما نگار کے قطع نظر اداکار جو ڈراما کے تمثیلی پہلو پر گہرا اثر ڈالتے ہیں بہت کچھ تھیٹر کی ترقی پر دارومدار رکھتے ہیں۔ ترقی یافتہ تھیٹر ہر ملک اور ہر زمانہ میں اچھے اداکار پیدا کرنے کا کارخانہ سمجھا گیا ہے۔ تھیٹر ہی کی ضروریات پر اچھے اداکار ہوتے ہیں۔ اور اسی کی مناسبت و موزونیت سے اپنے آپ کو تیار کرتے ہیں۔

اوپر کے سارے بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تھیٹر اور ڈراما کا چولی دامن کا تعلق ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جب تک تھیٹر ترقی نہیں کرے گا ڈراما ترقی نہیں کر سکے گا اسلئے ہمیں اس بات پر غور کرنیکی ضرورت ہے کہ تھیٹر کیونکر ترقی کرسکتا ہے؟

تھیٹر کی ترقی کے ذرائع

سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ تھیٹر کی بدنامی کو دور کیا جائے۔ ہمارے ملک میں تھیٹر اتنا بدنام ہے کہ سنجیدہ اور شائستہ طبقہ اس کے نام ہی سے کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں جو اسے بدمعاشی اور عیاشی کا اکھاڑہ جانتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں کہ یہ خیالات ملک میں کیوں پیدا ہوئے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان سب کا اصل ہماری تھیٹریکل کمپنیوں کی بدترین سماج ہے۔ وہ جہلا کے ہاتھوں میں ہیں اور سرمایہ دار عیاشوں کے دل بہلانے کا ذریعہ بنے ہوتے ہیں۔ اس کے ایکٹر اور ایکٹرس نہ صرف جاہل ہیں بلکہ بد اخلاق اور بد اطوار ہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ جو ڈراونی اور بھیانک تصویر ہندوستانی تھیٹر کی معاشرت کی عام طور پر پیش کی جاتی ہے اس میں مبالغہ کا جزو ہوتا ہے لیکن اسکی تہ میں حقیقت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ذمہ دار کون ہیں ـــــ مالکانِ کمپنی یا عوام جو انکی سرپرستی کرتے ہیں؟ میں ذاتی طور پر دونوں کو اس کا مشترک ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ لیکن بجائے اس کے کہ اس کے اسباب و علل پر بحث کی جائے میرے پیش نظر یہاں صرف ان کی اصلاح ہے۔ ملک کے ہر طبقے میں تھیٹریکل کمپنیوں کی طرف سے عام بدگمانی پھیلی ہوئی ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ اس خیال کو از سر نو بدل دیا جائے کیونکہ ایک چیز کے متعلق جب کوئی خیال ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے تو وہ بسا اوقات پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔ جو مٹائے نہیں مٹتا۔ اس کے علاوہ اگر موجودہ تھیٹریکل کمپنیوں کے اعداد و شمار فراہم کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کی تعداد بہت کچھ گھٹ گئی ہے اس کا سبب یقیناً فلم کمپنیوں کی بہتات ہے۔ اس لئے میرے خیال میں جتنی پرانی قسم کی تھیٹریکل کمپنیاں باقی رہ گئی ہیں ان سب کو بالکل ہی توڑ دینا چاہیئے۔ اور ان کے کھنڈر پر نئی تھیٹریکل کمپنیاں بنانی چاہئیں اور ایسی ہی صورت میں عوام کے خیالات کی کایا پلٹ ہوگی۔

فلم تھیٹر کا نعم البدل نہیں ہے

بعض لوگوں میں یہ غلط خیال پھیلا ہوا ہے کہ فلم تھیٹر کا نعم البدل ہے اور یہ کہ فلم کمپنیوں کی موجودگی میں تھیٹریکل کمپنیوں کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے اور فلم اور تھیٹر کے فرق کو محسوس کئے بغیر قائم کر لیا گیا ہے؟

بیشک بولتے فلموں نے آنکھ کے ساتھ کان کی تواضع کا بھی انتظام کر دیا لیکن کیا تصویروں کو حرکت کرتے دیکھنا اور تصویروں کو بولتے سُننا اتنا ہی زندگی کے قریب ہے کہ جتنا کہ خود انسانوں کو گوشت اور پوست والے انسانوں کو حرکت کرتے ہوئے اور بولتے ہوئے دیکھنا اور سُننا؟ دوسرے اور بے شمار اصولی اور فنی اختلافات کے علاوہ یہ فرق اتنا زبردست ہے کہ دُنیا والوں نے محض اس کی وجہ سے یہ ضروری خیال کیا کہ تھیٹر فلم کی ترقیوں کے باوجود بھی ایک مستقل آرٹ کے طور پر علیحدہ باقی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ شہروں میں فلموں کی نمائش کے ساتھ تھیٹریکل ڈرامے بھی اسٹیج کئے جاتے ہیں۔ اور عوام کی سرپرستیاں برابر دونوں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ بلکہ ادبی نقطۂ نظر سے ڈراما کو جو وقعت حاصل ہے وہ فلم کو آج تک حاصل نہیں ہو سکی۔

تھیٹریکل کمپنیوں کا قیام

پُرانی تھیٹریکل کمپنیوں کی کمزور عمارت کو گرانے کے بعد اس کی تعمیر از سرِ نو نئے طرز پر ہونی چاہئے۔ ہندوستان کے مختلف بڑے بڑے شہروں میں متعدد تھیٹریکل کمپنیوں کا قیام ضروری ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ظاہر ہے کہ سرمایہ ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آج کل فلم کمپنیاں بنانے کا مرض عام ہو چلا ہے اور ہر طرف یہی کوششیں ہو رہی ہیں اور باوجود اس کے کہ اب ہر فلم کمپنی کو مالی فائدہ نہیں ہو رہا ہے بلکہ بہت سی چھوٹی چھوٹی کمپنیاں خسارہ برداشت کرنے کی صلاحیت نہ رکھنے کی وجہ سے جاں کنی کی حالت میں ہیں مگر پھر بھی نئی کمپنیاں بنانے کا شوق روز افزوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کچھ روز دلوں کسی نہ کسی فلم کمپنی میں حصہ لیتا ہے خواہ اداکار کی حیثیت سے ہو، خواہ کسی اور حیثیت سے وہ وہاں سے علیحدہ ہو کر فوراً یہی برخود غلط یہ رائے قائم کر لیتا ہے کہ اس کو فلمی دُنیا کا کافی تجربہ ہے اور اس کو فلم کمپنی قائم کرنی چاہیئے۔ عوام کو گمراہ کر کے حصص فروخت کر کے چھوٹے سے غیر مستحکم سرمایہ کے ساتھ کمپنی قائم ہوتی ہے اور فضول ڈرامے پیش کر کے لُوٹ جاتی ہے۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ کی فراہمی اس قسم کے اغراض کیلئے ابھی ہمارے ہاں زیادہ دشوار نہیں ہوئی۔ اس لئے اگر منظم کوشش کی جائے تو وہ سرمایہ جو ٹوٹنے والی فلم کمپنیوں کیلئے فراہم کیا جاتا ہے۔ تھیٹریکل کمپنیوں کے قیام کیلئے آسانی کے ساتھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ فلم کمپنی کی بہ نسبت تھیٹریکل کمپنی کو سرمایہ بھی کم درکار ہے۔

سرمایہ کے بعد اداکاروں کی ضرورت زیادہ اہم ہے۔ کوئی تھیٹریکل کمپنی عمدہ اداکاروں کے بغیر نام پیدا نہیں کر سکتی اس لئے ان کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا جانا چاہیئے۔ اداکاروں کے انتخاب میں کئی چیزوں کا خیال زیادہ ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ تعلیم یافتہ ہوں، ان کے اخلاق، عادات و اطوار قابلِ اعتراض نہ ہوں، جسمانی صحت اور دماغی صلاحیت اچھی خاصی ہو۔ شائستہ اور مہذب ہوں، اور ان سب سے بڑھکر ان کی فطرت میں اداکاری کی صلاحیت ان کے تمام خصائل میں زیادہ نمایاں ہوں۔ اگر کسی میں آخر الذکر خصوصیت نہیں ہے اور باقی تمام محاسن جمع ہیں تو میں ایسے شخص کو اداکاری کیلئے کبھی موزوں نہیں کہوں گا۔ اس فطری صلاحیت کے ساتھ ساتھ مشق اور محنت بھی لازمی ہے ورنہ لاپروا اداکار اکثر و بیشتر اپنی پوری چمک نہیں دکھا سکتا۔ اور اس کو وہ درجہ حاصل نہیں ہوتا جسکا کہ وہ فطرتاً مستحق تھا۔ اس قسم کی ایک دلچسپ مثال میں نے ایک جگہ پڑھی ہے۔ ایک ہندوستانی امیر ہالی وُوڈ گئے۔ اور ایک مشہور فلم اسٹوڈیو دیکھنے گئے۔ وہاں انھوں نے متعدد اداکاروں سے باتیں کیں اور اسی سلسلہ میں ایک شہرۂ آفاق ایکٹریس سے بھی ملنے کی خواہش کی۔ اس ایکٹریس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ گو کہ ابھی اس کی شوٹنگ کیلئے کافی وقت ہے لیکن شوٹنگ ختم ہونے تک وہ شاید ملنے کے قابل نہ رہے اس لئے معافی چاہتی ہے۔ فلم کے شوٹنگ کے ختم ہونے کے بعد وہ ملی اور مکرر معافی چاہنے کے بعد اس نے پہلے نہ ملنے کی وجہ یہ بتائی کہ اُس کو اِس دفعہ ایک حزنیہ پارٹ کرنا تھا اسی لئے وہ وقت سے بیشتر آکر حزنیہ تاثرات اپنے اوپر طاری کر رہی تھی۔ اور رو رہی تھی کہ نہ صرف اس کا دل بھر آئے بلکہ اس کے چہرے اور جسم پر حزنیہ تاثرات قبل از وقت ہی پیدا ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک اس قسم کا خلوص اور اتنی محنت نہ کی جائے اداکاری عروج کو نہیں پہنچتی۔

اداکار کیلئے میں نے تعلیم یافتہ ہونے کی شرط محض اس لئے لگائی کہ اداکاری دو خصوصیتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ ایک حرکات

اور دوسرے طرز ادا۔ اور ان دونوں کیلئے اداکار کا اپنے پارٹ کے نہ صرف مفہوم کو پوری طرح سمجھنا ضروری ہے بلکہ لفظوں اور جملوں کو اسی مفہوم کے لحاظ سے ادا کرنا لازمی ہے اور یہ غیر تعلیمیافتہ اداکار کے بس کی بات نہیں۔ یہاں ان غیر معمولی ذہین اور فربس اداکاروں سے بحث نہیں کر رہا ہوں جو بنتے نہیں بلکہ پیدا ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ قسم سارے اصولوں اور قوانین سے مستثنیٰ ہے۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ ہر اداکار کیلئے خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، ضروری ہے کہ وہ ڈرامہ نگار کے مفہوم کو پوری طرح ظاہر کرنیکی صلاحیت اپنے میں رکھے۔ البتہ بڑا اداکار اس ضرورت کے سوا ایک خصوصیت یہ بھی رکھتا ہے کہ ڈرامہ نگار کے کردار کی پوری ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت کو انفرادی طور پر باقی رکھے۔ شاعر اپنے شعر میں جب کبھی فلسفیانہ نکات یا جذباتی نفسیات کا ذکر کرتا ہے تو صرف اشارہ ہی پر اکتفا کرتا ہے مگر اس کا شارح اپنی دماغی صلاحیتوں سے بال کی کھال کھینچ کر ان اشاروں کی ایسی وضاحت کرتا ہے کہ وہ خود بجائے ایک مستقل درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی حال ڈرامہ نگار کے کردار کا ہوتا ہے۔ وہ اس کی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اداکار ان لفظی اشاروں کو حقیقت میں اس طرح بدل دیتا ہے کہ اس کی ساری تفصیلات پیش نظر ہوکر ایک خاص چیز ہو جاتی ہے۔ میں نے اداکار کے انتخاب میں اچھے کردار کے اصحاب کا ذکر محض اس لئے کیا کہ موجودہ دور میں تھیٹریکل کمپنی جس چیز کی وجہ سے زیادہ بدنام ہے وہ اداکاروں کی بد اخلاقی ہے لہٰذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ عوام کے دلوں سے یہ خیال نکالنے کے لئے اداکاروں کا انتخاب کرتے وقت خاص طور پر اچھے عادات، اخلاق کے اشخاص کا لحاظ رکھا جائے۔ بعض نقاد جن کے مطمح نظر "آرٹ، آرٹ کی خاطر" ہے وہ ضرور اس طرز انتخاب کو دقیانوسی اور غیر ضروری سمجھیں گے لیکن اگر حالات کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ طریق کار کتنا اہم اور ضروری ہے۔ جب تک اس قسم کی کمپنیوں کی اخلاقی زندگی کا معیار بلند نہ ہوگا سنجیدہ اصحاب اس میں دلچسپی نہ لیں گے۔ اور اچھے کیریکٹر کے اداکار کبھی اپنے آپ کو اس زمرہ میں شامل نہیں کریں گے۔ اداکاری جب تک عوام کے ہاتھوں سے نکل کر صاحب ذوق، سنجیدہ، تعلیمیافتہ اور شریف طبقہ کے ہاتھوں میں پہنچ نہ جائیگی اس کی پیشانی سے کلنک کا ٹیکہ دور نہ ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ممالک غیر میں ڈراما اسی وقت ترقی کرسکا جب کہ اس کے اداکاروں کی وقعت لوگوں کے دلوں میں آرٹسٹ کی حیثیت سے قائم ہوگئی۔ زمانہ قدیم ہی سے وہاں یہ پیشہ کبھی بدنام نہیں ہوا۔ اور اسٹیج پر آنے کیلئے کسی ایسے شخص نے جو اس کی صلاحیت رکھتا ہو کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ اداکاروں کا وہی اعزاز کیا گیا جو دوسرے اعلیٰ درجہ کے پیشوں اور ان کے آرٹ کو اسی طرح سراہا گیا جس طرح کہ دوسرے فنون کو اور پھر ان کی شخصیت کی بھی ویسی ہی وقعت کی گئی جیسی کہ کی جانی چاہئے تھی۔ انگلستان کے تھیٹر کے مشہور اداکار آج تاریخ ادب انگریزی میں باقی ہیں۔ اور انکی سماجی حیثیت بھی اتنی ہی بلند تھی جتنی کہ ان کی فن کاری۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں اداکاروں کی سماجی حیثیت بیحد پست ہے اور اس کے وہ خود بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ ان کی جہالت اور بد اخلاقی نے انھیں سوسائٹی میں کوئی درجہ حاصل نہیں کرنے دیا۔ یہ کوئی متعصبانہ بیان نہیں بلکہ امر واقعہ ہے کہ ہمارے نوجوان جو جہالت کی وجہ بدکاریوں کا شکار ہو جاتے اور جنہیں اپنے کرتوتوں کے سبب خود اپنے گھر میں رہنا دوبھر ہو جاتا ہے آوارہ گردی کے لئے سب سے پہلے اس قسم کے میدان تلاش کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب اداکاروں نے اپنی فنی زندگیاں اسی طرح شروع کی ہیں بلکہ مجھے اس کا اقرار ہے کہ بعض صاحب ذوق افراد نے بڑے ایثار سے کام لیکر آرٹ کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈالی ہے مگر انکی تعداد بہت ہی کم ہے۔ بہرحال یہی وہ اسباب ہیں کہ جن کے سبب ہمارے اداکار بدنام ہیں۔ اور جب تک ان کا ازالہ نہ کیا جائیگا تھیٹریکل کمپنیوں کا دوبارہ قیام ناممکن ہو جائیگا۔ اور جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں بغیر تھیٹریکل کمپنیوں کے اردو ڈراما کی ترقی ناممکن ہے۔

اسٹیج

ڈراما کی کامیابی کے لئے اسٹیج کی وسعت و ترقی نہایت ضروری ہے۔ اداکار کتنے ہی عمدہ ہوں اور ڈراما کیسا ہی اچھا ہو لیکن اگر اسٹیج ڈراما کی ساری ضرورتوں کیلئے ناکافی ہے اور اداکار اور ڈرامانگار کو ممکن سہولتیں بہم نہیں پہنچاتا تو ڈراما کی ناکامی یقینی ہے۔

سب سے پہلے اسٹیج کا وسیع ہونا ضروری ہے اتنا کہ اگر ضرورت ہو تو اس پر راستہ کا منظر پیش کیا جاسکے، لوگوں کی آمد و رفت

کا انتظام کیا جا سکے۔ اور صحیح دکھایا جا سکے۔ ایک مشکل ڈراما کے
دوران میں یہ پیش آتی ہے کہ ایک سین اور دوسرے سین کے
درمیان جو وقفہ ہوتا ہے وہ تماشائیوں کو ناگوار گذرتا ہے۔ لیکن
اس وقفہ کے بغیر اسٹیج کا انتظام نہیں کیا جا سکتا اور دوسرے
منظر کی ضروریات کی تکمیل ناممکن ہو جاتی ہے۔ اگر اسٹیج اتنا وسیع
کیا جائے کہ ایک پردہ کے پیچھے دوسرا سین اور دوسرے پردہ
کے پیچھے تیسرا سین قبل از قبل جما دیا جائے تو یہ مشکل ایک حد تک
پوری ہو سکتی ہے۔ لیکن عملی طور پر یہ تجویز بھی کچھ زیادہ کارآمد
ثابت نہیں ہوئی۔ کیونکہ پہلا سین تو یقیناً اسٹیج کے بالکل آگے حصے
پر ہوگا۔ لیکن دوسرا اس کے پیچھے اور تیسرا اس کے پیچھے اس طرح
پیچھے ہوئے سین اسٹیج کے اتنے اندرونی حصے میں ہوں گے کہ
اوّل تو تماشائیوں کو مکالمہ سنائی نہ دے گا اور اگر بالفرض
مکبر الصوت کا انتظام ہو اور سنائی بھی دے تو اسٹیج کا اگلا حصہ
خالی رہ کر وہ بدنما منظر پیش کرے گا کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ اس
لئے اس مشکل پر قابو پانے کیلئے دو طریقے رائج کئے گئے۔ ایک تو یہ
کہ اسٹیج گھومنے والا بنایا گیا اور اتنا وسیع رکھا گیا کہ اس کے مختلف
حصوں پر مختلف مناظر قبل از قبل بنا دیئے جاتے ہیں اور ایک منظر
کے ختم ہوتے پر اسٹیج گھما کر دوسرا منظر فوراً ہی پیش کر دیا جاتا ہے
اور دوسرا طریقہ یہ کہ دو منزلہ اسٹیج بنایا گیا اور لفٹ کے انتظام
کی طرح اس کے دونوں حصے اوپر نیچے کئے جا سکتے ہیں۔ جب تک
ایک منزل تماشائیوں کے روبرو رہے دوسری منزل پر سین تیار
کر لیا جاتا ہے اور ضرورت کے وقت فوراً پہلے کو ہٹا کر دوسرے
کو پیش کر دیا جاتا ہے۔

اسٹیج کی وسعت کے بعد منظر کی تکمیل ضروری ہے۔ لیکن
اس سلسلہ میں اہم ترین ضرورت روشنی ہے۔ اسٹیج کی روشنی
دراصل منظر اور فضا تیار کرنے کا سب سے بڑا آلہ ہے۔ نہ صرف
رنگ برنگ کی روشنی اسٹیج پر تماشائیوں کی نظروں کی ضیافت
کا انتظام کرتی ہیں بلکہ کمی اور زیادتی سے خاص تاثرات پیدا کئے
جا سکتے ہیں۔ روشنی نہ صرف حقائق کو واضح کرتی ہے بلکہ جذبات کی
بھی نمائش کرتی ہے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں کبھی آپ نے
اس پر بھی غور کیا ہے کہ اگر صرف آپ کا کمرہ منور ہو اور باہر کی
ساری فضا تاریک تو آپ کے دل پر کیا گذرتی ہے؟ یا اس کے برخلاف
آپ کے کمرے میں اندھیرا ہو اور ساری آس پاس کی فضا منور
تو جذبات کا رُخ کس طرح بدلتا ہے؟ ساری کی ساری فضا تاریک ہو
ایسی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سُجھائی دیتا اور ایسے میں کبھی کبھی روشنی کی
ایک آدھ جھلک پیدا ہو جاتی ہو تو آپ کے دل میں کس قسم کے خیالات
موجزن ہوتے ہیں۔ بجلی کے لٹکے ہوئے قمقمے شدتِ باد کی وجہ
سے جب ہلنے لگتے ہیں اور ان کا سایہ دیوار پر متحرک ہوتا ہے تو
آپ کا دل کیوں لرزتا ہے؟ اچھی خاصی روشن فضا جب یکلخت
تاریک ہو جاتی ہے تو آپ کے منہ سے کیوں ہلکی چیخ نکل جاتی ہے
جب تیز روشنی آنکھوں کو چُندھیا دیتی ہے تو آپ کے چہرے
پر کیا آثار رونما ہوتے ہیں؟ روشنی ناکافی ہو اور مقام دیکھا بھالا
نہ ہو تو کیوں آپ ٹٹول کر چلتے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے
ہیں؟ ہلکی روشنی میں جب سایہ پھیلتا ہے تو کیوں ایک ڈراؤنا منظر
پیش کرتا ہے؟ یہ سب روشنی کے سحر فریب کارنامے ہیں جن کو
آسانی کے ساتھ اسٹیج پر پیش کر کے حسب خواہش اثرات پیدا
کئے جا سکتے ہیں۔

پیش کنندہ ڈراما کی ترقی کے لئے پیش کنندہ (Pro-ducer) کا وجود ضروری ہے۔ اس کی غیر موجودگی
میں ڈرامانگار کیلئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ڈرامے کو خود
اسٹیج کروائے اور یہ ایسا ہی بے معنی ہے جیسا کہ مصنف کا اپنی
کتاب خود شائع کروانا۔ ساری دُنیا میں مصنفین اور مؤلفین کے
ساتھ ساتھ پبلشرز کا وجود بھی ترقی کرتا گیا ہے اور ان دونوں کا
تعلق چولی دامن کا سا ہو گیا ہے ایسا کہ ایک کے بغیر دوسرا
بے سہارے ہو جاتا ہے۔ مگر خدا بھلا کرے ہماری زبان کا کہ
مصنفین اور مؤلفین کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باوجود پبلشرز کا
فقدان ہے۔ ایک آدھ جو ہیں بھی برائے نام تو انہیں سوائے
مصنف اور مؤلف کو لوٹنے، ستانے اور پست ہمت کرنے کے
اور کچھ نہیں آتا۔ بالکل یہی حال ڈراما کا ہے، اور چونکہ ہماری
زبان میں ڈراما کی صنف ہی کمزور ہے اور ڈرامانگار کم ہیں اس
لئے اس خصوص میں اس کی حالت اور زیادہ خراب ہے۔ پیش کنندہ
کا وجود سرے سے ہی نہیں۔ یا تو ڈراما تھیٹریکل کمپنی کے سپرد کرنا
پڑتا ہے یا خود مصنف کو اسٹیج کرانا۔ تھیٹریکل کمپنیاں اب تو اس
حالت میں ہیں کہ ان کا رہنا اور نہ رہنا دونوں یکساں ہیں لیکن
جب ان کی حالت قابل لحاظ تھی تو وہ بجائے ڈراما خریدنے کے
ڈرامانگار کو خرید لیتی تھیں۔ ڈراما پیش کرنے کا یہ عجیب و غریب

طریقہ تھا۔ ڈرامہ نگار کمپنی کا ملازم ہو کر اس کا آلۂ کار بن جاتا تھا اور اپنی شخصیت کو اس میں فنا کر دیتا تھا۔ اس نقص کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج اگر ہم ڈرامہ نگاروں کی تصانیف کا شمار کرنا چاہیں تو ہمارے لئے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ کمپنی میں ڈرامہ نگار کو کسی حیثیت سے بھی اہمیت دی ہی نہ جاتی تھی۔ اور اسی وجہ سے نہ عوام کو اور نہ خواص کو اس کا علم ہو سکا کہ کون سا ڈرامہ کس کا لکھا ہوا تھا۔ اگر ڈرامہ نگار خود اپنا ڈرامہ پیش کرتا ہے تو اس کو اتنی مشکلیں پیش آتی ہیں کہ بیان سے باہر اور جس نے بھی کبھی اس کا ایک دفعہ تجربہ کیا ہے دوبارہ ہمت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ذریعہ معاش

آج کل دُنیا میں ایسے خدا رسیدہ کم ہیں جو علم کو علم کی خاطر، فن کو فن کی خاطر اور پیشے کو خدمت کی خاطر حاصل کرتے ہیں۔ اب ہر شخص زندہ رہنے کا حق چاہتا ہے اور نہ صرف حق بلکہ اس کی ضروریات بھی اور اس سلسلے میں علم، فن اور پیشہ کی مدد سے وہ زندگی کی ضروریات حاصل کرتا ہے۔ پیشہ کوئی ادنیٰ و اعلیٰ نہیں ہے علم و فن میں کوئی بزرگی اور برتری کا سوال نہیں ہے۔ ہر علم علم ہے، ہر فن فن، اور ہر پیشہ پیشہ۔

کسی زمانہ میں بچوں کو پڑھا کر روپیہ کمانا بد اخلاقی اور معیوب سمجھا جاتا تھا۔ محض اس خیال سے کہ درس و تدریس خدمتِ خلق ہے اور اس سے فائدہ حاصل کرنا نازیبا۔ اسی طرح تصنیف یا تالیف کو فروخت کرنا اخلاقی جرم سمجھا جاتا تھا مگر رفتہ رفتہ معاشی تقسیم نے پیشوں اور آمدنی کے ذرائع میں وسعت پیدا کر دی اور اب ترقی یافتہ ممالک میں ادبیات کی ہر ہر صنف میں پیشہ ورانہ تخصیص آپ کو نظر آئیگی۔ کوئی ناول نگاری پر گذر کرتا ہے، کوئی شاعری کو ذریعہ آمدنی بناتا ہے اور کوئی ڈرامہ نگاری پر تکیہ کرتا ہے۔ تھیٹر کے فن کو بھی مختلف پیشوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ کوئی پیش کنندہ ہے، کوئی ڈرامہ نگار، کوئی تھیٹر کا مینجر، کوئی اداکار، کوئی تنقید نگار، کوئی بہروپ بدلنے والا، کوئی ادا آموز، کوئی روشنی کا انتظام کرنے والا، کوئی لباس تیار کرنے والا۔ کوئی اسٹیج کی زینت کا خیال کرنیوالا وغیرہ وغیرہ۔ اس تقسیم سے منجملہ اور فائدوں کے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ متعدد افراد کی اس سلسلہ میں کھپت ہو جاتی ہے اور تقسیم معاش کے ساتھ ساتھ روزگار حاصل کرنیکا میدان زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ چونکہ روزگار کا سوال دورِ جدید کا سب سے اہم سوال ہے اس لئے جب تک ہمارے ڈراما کو ذریعہ معاش قرار نہیں دیا جائیگا اس کی ترقی ناممکن ہے۔

ادبیات میں یہ ضروری نہیں کہ انسان اپنا پورا وقت اسی کی نذر کر دے بلکہ وہ اپنے دوسرے مستقل پیشے سے بچا ہوا وقت اس پر صرف کر کے اپنی محدود آمدنی میں اضافہ کر سکتا ہے۔ ایسے افراد جن کی آمدنی کم ہے اور جنھیں اس کا شوق و ذوق ہے وہ اپنے آپ کو بیک وقت مشغول بھی رکھ سکتے ہیں اور آمدنی میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس طرح سے ایک طرف ادبیات کے ذخیرہ میں اضافہ ہوگا اور دوسری طرف آمدنی کے ذرائع بھی وسیع ہونگے ہمارے ملک میں اس طریقہ کار کی زیادہ ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ عام طور پر ہماری آمدنی کم، محدود اور ناکافی ہے، اور پھر ہمارے ادبیات کی کوئی صنف بطور پیشہ اختیار نہیں کی جاتی اسلئے ضروری ہے کہ اس طرح مصنفین اور مؤلفین کے لئے کاروباری میدان مہیا کیا جائے گو کہ ہم پورے طور پر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ادبیات کی ہر صنف کو ہمارے مصنفین اور مؤلفین مستقل طور پر پیشہ بنائیں اور اپنا پورا وقت اس پر صرف کریں تاکہ ہمارا ادب ایسے دماغوں کی پیداوار سے مسلسل مالامال ہوتا رہے جو اس کی صلاحیت بدرجۂ اتم رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم یہ دوسرا طریقہ کار بھی ان افراد کے لئے فائدہ مند سمجھتے ہیں جو ادبیات کیلئے اپنا پورا وقت نہیں دے سکتے۔

ہمارے یہاں طلبار کی ایک بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں اپنی عمر کا بہترین حصہ جامعات میں گذارتی ہے اور اس زمانہ میں یہ جماعت اپنے طور پر کسی قسم کی آمدنی، ذریعہ معاش یا معاوضہ کا کوئی انتظام نہیں کرتی بلکہ ہمیشہ اپنے والدین، عزیز و اقارب اور سرپرستوں کی جیبوں پر بار ڈالتی ہے۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھیں اکثر و بیشتر آمدنی کے مواقع ہاتھ آسکتے ہیں مگر وہ توجہ نہیں کرتے تعطیلات میں جبکہ جامعات بند رہتی ہیں اس قسم کے مواقع ہمیشہ ملتے ہیں مگر اس کو لہو و لعب میں گذار دیا جاتا ہے یا پھر کالج کے اوقات کے بعد بھی اگر مستعدی سے کام لیا جائے تو تھوڑا بہت وقت کسبِ معاش کیلئے بھی نکل آتا ہے۔ والدین اپنے لڑکوں کی تعلیم کے معاملہ میں جو زیر بار ہو رہے ہیں اور عام طور پر جو

شکایات سُننے میں آتی ہیں کہ اولاد کی تعلیم میں والدین کا دیوالہ نکل گیا محض اپنی سُستی اور کاہلی کے نتائج ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں نہ صرف لڑکے بلکہ لڑکیاں بھی سیانی ہونے کے بعد اپنے پاؤں پر آپ کھڑی ہونیکی کامیاب کوشش کرتی ہیں اور اپنا زیادہ بار طلباء خود ہی برداشت کر لیتے ہیں۔ میں یہاں ادبیات کی دوسری اصناف کا ذکر نہیں کرونگا بلکہ صرف ڈراما کا۔ اگر کالج کے طلباء تھیٹر اور ڈراما میں گہری دلچسپی لینا شروع کریں اور اپنی فرصت کے لمحات معاوضہ لیکر اس کے مختلف شعبوں میں کام کریں تو یقیناً انھیں کافی مالی امداد کا ایک ذریعہ ہاتھ آئیگا اور ساتھ ہی ساتھ تعلیمیافتہ جماعت کی تائید تھیٹر کو حاصل ہوجائے گی۔ اور ڈراما ترقی کرے گا۔

شوقیہ انجمنیں

ڈراما کی ترقی کیلئے نہ صرف پیشہ ورانہ تھیٹریکل کمپنیوں کی ضرورت ہے بلکہ شوقیہ (Amateur) انجمنوں کی بھی ضرورت ہے۔ تعلیمی ادارے درسگاہ، مدرسے اور ادبی ادارے نہایت آسانی کے ساتھ شوقیہ ڈرامائی انجمن قائم کرسکتے ہیں اور جب تک اس قسم کے ادارے ڈراما کی ترویج میں حصہ نہ لیں گے ڈراما کا شوق ملک کے عرض و طول میں نہیں پھیل سکتا۔ چونکہ ڈراما تعلیمی حیثیت سے نہایت مفید ہے اور اس کی افادیت میں اب کسی کو کلام نہیں رہا اسلئے ہر تعلیمی ادارے میں شوقیہ ڈرامائی انجمنوں کا قیام لازمی ہے۔ دراصل یہی ادارے گہوارہ ہوتے ہیں جہاں ڈراما کا ذوق و شوق پرورش پاتا اور بڑھتا ہے۔ زندگی کے ابتدائی مراحل میں جب طلباء اس کے فوائد سے آگاہ ہوجاتے ہیں تو آئندہ چل کر انھیں اس کو پھیلانے میں بڑی سہولتیں ہوتی ہیں۔

شوقیہ ڈرامائی انجمن نہ صرف تعلیمی اداروں میں ہونی چاہئیں بلکہ غیر تعلیمی اداروں کو بھی اس کی سرپرستی کرنی چاہیئے۔ جس طرح سے لوگ شام کا وقت مختلف مصروفیات میں گذارتے ہیں اسی طرح اس قسم کی شوقیہ انجمنوں کا کام ہے کہ وہ عوام کی وقت گذاری اور دماغی تفریح کیلئے ڈرامائی دلچسپیاں مہیا کریں۔ فارغ التحصیل اصحاب جو مختلف پیشوں میں مستقل طور پر زندگیاں گذار رہے ہیں شام کے وقت تفریح کیلئے بے چین رہتے ہیں ابھی ہمارے ملک میں اتنے کلب نہیں ہوئے کہ ہر طبقہ اور ہر مذاق کے لوگ اور وہ بھی سب کے سب ان میں سما جائیں اس لئے وہ لوگ جو کلب نہیں جاتے دوسری مشغولیت اور مصروفیت ڈھونڈتے ہیں۔ ایسے موقع پر اگر شوقیہ ڈرامائی انجمنوں کا قیام عمل میں آئے تو یقیناً بہت سے افراد اس کی طرف کھنچے آئیں گے۔

شوقیہ انجمنوں سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان میں وہ بُرائیاں جو پیشہ ورانہ کمپنیوں میں پیدا ہوجاتی ہیں ظاہر نہیں ہوتیں۔ پیشہ ور اداکار شوق سے زیادہ روپیہ کمانے کی خاطر اداکاری کرتے ہیں۔ پیشہ ور ڈرامہ نگار جیب بھرنے کیلئے جلد سے جلد ڈرامے لکھتا ہے، پیشہ ور نقّاد اس انداز سے تبصرہ کرتا ہے کہ اُسے زیادہ سے زیادہ روپیہ ملے، پیشہ ور پیش کنندہ ایسا ہی ڈرامہ پسند کرتا ہے جس کی نمائش سے اس کو زیادہ سے زیادہ آمدنی ہو۔ غرض یہ کہ ہر شعبہ میں پیشہ ور فن کو فن کی خاطر اور فطری دلچسپی کے لحاظ سے پیش نہیں کرتا بلکہ پیشہ ورانہ طمع و حرص اسمیں داخل ہوجاتی ہے۔ برخلاف اس کے شوقیہ انجمیں چونکہ روپیہ کمانیکا خیال ہی نہیں کرتیں اور محض اپنے ذوق و شوق کی نمائش کرتی ہیں اس لئے اس میں یہ کاروباری عنصر شامل نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے ڈراما کی ترقی کیلئے شوقیہ انجمنوں کا قیام ازبس ضروری ہے۔

بچّوں کا تھیٹر

چونکہ تھیٹر کو آلۂ تعلیم بنایا جاسکتا ہے اس لئے بچّوں کے تھیٹر کی ضرورت ناقابل انکار ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ بچّوں میں نقّالی کا شوق بہ نسبت عمر رسیدہ اصحاب کے زیادہ ہوتا ہے اور یہ بھی ایک حد تک صحیح ہے کہ نقّالی کا مادّہ بچّوں میں فطرتاً ہوتا ہے اور جس عمدگی اور سہولت کے ساتھ وہ اداکاری سیکھتے ہیں دوسرے نہیں سیکھتے۔ اس کے علاوہ اداکاری اور نقّالی سے وہ جتنا اثر لیتے ہیں ہر شخص جانتا ہے۔

موجودہ تعلیمی رُجحان یہ ہے کہ بچّوں کو اُن کی طبیعت کی اُفتاد پر چھوڑ دیا جائے اور اسی مُناسبت سے طریقہ تعلیم مُرتّب کیا جائے تاکہ وہ اپنے ذوق و شوق کی مطابقت میں اپنی ذہنی نشو ونما کی تکمیل کرسکیں۔ فروبل کا کنڈر گارٹن، اور منٹسوری کے کھلونوں کی مقبولیت اسی اصول کی وجہ سے ہوئی۔ ایسے حالات میں چونکہ تھیٹر میں بچّہ فطری طور پر دلچسپی لیتا ہے اس لئے اس کے لئے خاص انتظامات نہ صرف نازیبا نہیں ہوں گے بلکہ بڑی حد تک ضروری۔ جس طرح بچّوں کی تعلیم میں ریڈیو شامل کرلیا گیا ہے اور اس سے

تعلیمی فوائد مرتب کئے جا رہے ہیں اسی طرح ضرورت ہے کہ بچوں کے تھیٹر کا قیام بھی عمل میں آئے۔ اور اس کا انتظام اتنے وسیع پیمانہ پر کیا جائے کہ ہر مدرسہ کی عمارت میں تھیٹر داخل ہو۔

چونکہ فنونِ لطیفہ کا مذاق آج کل کی جدید تعلیم میں بچوں کے دلوں میں ابتدا ہی سے پیدا کیا جاتا ہے اور اسی سلسلہ میں موسیقی، مصوری وغیرہ کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اسی لئے تھیٹر جو کہ فنونِ لطیفہ کا اچھا مرکز ہے مدرسہ کی زندگی کا اہم جزو بن جاتا ہے۔ طلبار یہاں ایک طرف موسیقی وغیرہ کی مشق کر سکتے ہیں اور دوسری طرف تعلیمی غرض و غائت کے مدِ نظر لکھے ہوئے ڈرامے اسٹیج کر کے تعلیمی استفادہ کر سکتے ہیں۔ روس میں اس قسم کے تھیٹر کی نہ صرف بہتات ہے۔ بلکہ اس کو روزانہ نت نئے طریقوں سے ترقی دینے کے منصوبے سوچے جا رہے ہیں اور یہ سب کچھ طلبار ہی کے حلقہ سے ہوتا ہے کیونکہ وہی اپنی ضروریات کا اچھا اندازہ رکھتے ہیں اور کافی تجربہ بھی حاصل کرتے ہیں۔ اونچی جماعتوں کے طلبار نہ صرف اسٹیج کا انتظام کرتے ہیں ضروریات مہیا کرنے میں سہولت بہم پہنچاتے ہیں بلکہ اداکاروں کو تیار کرتے ہیں اور طریقہ اداکاری سکھاتے ہیں۔ اکثر دفعہ ان چھوٹے چھوٹے تھیٹروں میں دنیا کے بڑے بڑے مصلحانِ تعلیم کے ڈرامے پیش کئے جاتے ہیں اور بعض دفعہ یہیں کے طلبار کے لکھے ہوئے۔ بچوں کے تھیٹر کا خیال نہ صرف روس میں ترقی کر چکا ہے بلکہ یورپ اور بالخصوص انگلستان نے بھی اس کی اہمیت کا اندازہ کر لیا ہے۔

حسنِ اتفاق سے ہمارے ملک میں آجکل تعلیمی اداروں کی ازسرِ نو تنظیم قومی نقطۂ نظر سے عمل میں آ رہی ہے اور ہر صوبہ میں تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانے کا معقول انتظام کیا جا رہا ہے، ایسے میں اگر بچوں کے تھیٹر کا انتظام بھی درس گاہوں میں ہو جائے تو کتنا موزوں ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے مصلحانِ تعلیم اور عہدہ دارانِ محکمہ اس خصوص میں غور کریں۔

دیہاتی تھیٹر

آج بھی ہم دیہات میں دیکھتے ہیں کہ "رام لیلا" کا کھیل یا مہابھارت کا تماشا کبھی کبھار ہوتا رہتا ہے اور عوام اتنی دلچسپی لیتے ہیں کہ بغیر کسی سہولت کے وہ اپنا کام کاج چھوڑ کر گھنٹوں یہ تماشا دیکھا کرتے ہیں لیکن اب یہ کھیل تماشے روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کے تنِ بے جان میں نئی زندگی کے آثار پیدا کئے جائیں۔ دیہات میں تھیٹروں کا قیام اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ شہروں میں۔ ان تھیٹروں سے دیہات سدھار اور تعلیم بالغان کا کام آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ اور لیا جانا چاہئے۔ دیہات میں چونکہ شہری زندگی کے مواقع حاصل نہیں ہوتے اور شہری رجحانات کا انھیں کوئی علمی رخ نظر نہیں آتا اسلئے ضروری ہے کہ تھیٹر کے ذریعہ انھیں اس سے روشناس کرایا جائے۔ اسکے علاوہ دیہات میں چونکہ زرعی اور صنعتی تعلیم کے سوا فنونِ لطیفہ کی تعلیم کا انتظام کم ہوتا ہے اسلئے تھیٹروں کے قیام کے ذریعہ اس کمی کو پورا کرنا ضروری ہے۔

ڈرامائی تنقید

ڈراما صحیح معنوں میں اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ فنی اور بے لاگ تنقید کا مذاق ملک میں عام نہ ہو جائے۔ اس کیلئے جہاں ڈراموں کی بہتات کی ضرورت ہے وہاں ڈرامائی فن کے موضوع پر عمدہ کتابوں کی اشاعت بھی لازمی ہے۔ ہماری زبان میں نہ ڈرامے ہی ہیں اور نہ ڈراموں پر تنقیدی ادب۔

کتابوں کے علاوہ تنقیدی ادب رسالوں اور اخباروں کے ذریعے سے بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اصول اور فن کی صحیح ترویج اس طریقہ سے بھی کی جا سکتی ہے۔ ڈراما اور تھیٹر کی غلط کاریوں پر ٹوکا جا سکتا ہے اور انھیں صحیح راستہ پر لگا کر ضروریات اور لوازمات کی تکمیل کی جا سکتی ہے۔ صحیح اصول اور فن سے واقف کرانیکی اس وقت اس وجہ سے ضرورت ہے کہ عام طور پر ملک میں ڈراما اور تھیٹر کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں اور وہ ایسی ہاتھوں میں ہے جہاں کہ اس کو ترقی کے ذرائع مہیا نہیں کئے جا سکتے۔

فلمی ڈرامے

متحرک فلموں نے اوّل ہی سے تھیٹر کی رونق گھٹا دی تھی لیکن جوں ہی بولتے فلم میدان میں آئے تھیٹر کا کاروبار بالکل ہی سرد پڑ گیا۔ اس لئے اب ڈراما کی سرپرستی کے لئے لے دے کر ایک ہی جگہ رہ گئی ہے اور وہ فلم کمپنیاں ہیں اور ان کا یہ حال ہے کہ خدا کی پناہ۔ جس طرح یہاں ڈراما کا خون ہو رہا ہے شاید ہی کہیں اور ہوا ہو۔ انھوں نے یہ عجیب و غریب ریکارڈ قائم کیا کہ آجتک کوئی ایک بھی ایسا ڈرامہ پیش نہیں کیا جو اصول اور فنی نقطہ نظر سے بے عیب سمجھا جا سکے۔ کیا بہ لحاظ افسانہ، کیا بلحاظ سیرت نگاری اور کیا بلحاظ مکالمہ کوئی اچھا ڈرامہ پیش نہیں کیا۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ فلم کمپنیوں میں کوئی بھی ایسا ڈرامہ نگار نہیں ہے جو اصول اور فن کے ساتھ ساتھ زبان اور ادبیات پر بھی قدرت رکھتا ہو۔ ہماری فلم کمپنیاں

اپنا روپیہ صرف حسین طوائفوں پر صرف کرتی ہیں اور انھیں کسی اور ضرورت کا احساس نہیں ہوتا لیکن اگر ڈراما کو اس ملک میں ترقی کرنا ہے تو ڈراما سے دلچسپی رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ فلم کمپنیوں کے اس طریقہ کار پر صدائے احتجاج بلند کریں اور اس بات پر انھیں مجبور کریں کہ وہ ڈراما کی ترقی میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔

انجمنوں کا قیام ملک کے طول وعرض میں ڈراما سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب تفصیلی دورہ کریں۔ اور مختلف صوبوں کے شہروں اور گاؤں میں ذیلی اور مرکزی انجمنیں قائم کریں۔ انجمنوں کے قیام اور ان کے الحاق سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہو سکے گا کہ ایک دوسرے کی وقتِ ضرورت مدد کر سکیں گے۔ ورنہ انفرادی کوششوں کے بار آور ہونے کے امکانات کچھ زیادہ نظر نہیں آتے۔

سید بادشاہ حسین
(حیدرآبادی)

حُسن

تو پیچ و خم ہے کاکل میں — تو رنگِ شگفتہ ہے گل میں
تو کیف ہے چشمِ ساقی میں — تو سوز ہے نغمۂ بلبل میں
تو ناز و کرشمہ خوباں میں
تو نشہ ہے ذوقِ رنداں میں

اللہ ری خود بینی تیری — خود مست ہی رنگینی تیری
منکر نہیں جس کے دنیا میں — وہ دین ہے بیدینی تیری
جی بسکہ لبھا لیتا ہے تو
دنیا کو بھلا دیتا ہے تو

تو نور بنا سیّاروں میں — تو رنگ بنا گلزاروں میں
گھنگھور گھٹائیں جب چھائیں — تو کیف بنا میخواروں میں
تو ساقی بھی میخانہ بھی
تو مے بھی اور پیمانہ بھی

ہے پھولوں کی رعنائی میں تو — معشوق کی ہی انگڑائی میں تو
پھولوں میں نہاں ہے لالی تیری — ہے صحرا کی تنہائی میں تو
تو سوز میں ہی تو ساز میں ہی
تو درد بھری آواز میں ہی

تو داغِ محبت لالے میں — تو سوز ہے دل کے چھالے میں
نظارۂ کیف افزا ہے تو — ہر چشم کو مہ کے ہالے میں
گھنگھور گھٹا کی جان ہی تو
دل والوں کا ایمان ہی تو

تو کاہکشاں کا جوبن ہے — تو قمری کا طوقِ گردن ہی
تو آرائش ہی رخساروں کی — تو شعلۂ وادیٔ ایمن ہے
یہ تو تھا مجنوں کے دل میں
یا لیلیٰ دل کے محمل میں

گلشن میں گلریزی تیری — کلیوں میں دلاویزی تیری
ہر پھول کا دامن رنگیں ہے — اے حسن یہ خوں ریزی تیری
کیوں تجھ سے نہ ہو الفت مجکو
اس شوخ سے ہی رشتہ تجکو

نیاز فدائی

قلعۂ معلّٰی کی ایک جھلک

زینت محل ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کی بڑی چاہیتی ملکہ تھیں۔ گویا چراغِ سلطنت کے شعلۂ محبت کی آخری بھڑک تھی۔ بڑے راؤ چاؤ تھے۔ ایک مرتبہ ان کا پنڈا ذرا پھیکا پھیکا ہوگیا اب کیا تھا قلعہ میں اِدھر سے اُدھر تک کانا پھوسی ہونے لگی۔ قلماقنیاں۔ اُردا بیگنیاں جسولنیاں مُنہ بنائے ہوئے دوڑنے لگیں۔ جہاں پناہ کو اطلاع ہوئی۔ ہوادار حاضر ہوا۔ محل میں مزاج پُرسی کی تیاریاں ہوگئیں . . . . شہزادیاں۔ سلاطین زادیاں جوڑے بدل بدل کر عیادت کو روانہ ہوئیں۔ ہر ایک کی خواہش یہ تھی کہ پہلے میں پہنچوں تاکہ حضور کی خوشنودی کا باعث ہو۔ چوبدار حکیم احسن اللہ خاں کو بلانے دوڑے۔ شہر میں خبر پہنچی تو اُمرا کی بیگمات اور نواب زادیاں پینسوں میں بیٹھ بیٹھ کر روانہ ہوئیں۔ گھنٹہ بھر نہیں گذرا تھا کہ بادشاہ بیگم کا محل مہمانوں سے بھر گیا۔ اتنے میں ڈیوڑھی کے باہر نقیبوں چوبداروں نے آواز لگائی۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ رسول کی امان۔ دوست شاد دشمن پائمال۔ بلائیں رد" کہاروں سے فوراً ہوادار شاہی کہاریوں نے اپنی کندھوں پر لے لیا۔ پھر چوبدار پکارے "خبردار" اندر سے جسولنیوں نے جواب دیا "اللہ رسول خبردار ہے" بادشاہ سلامت محل میں پہنچے۔ مُنہ ہی مُنہ میں دعائیں پڑھتے ہوئے ہوادار سے اُترے۔ دو رُویہ بیگمات کے پَرے تھے۔ سلام لیتے ہوئے زینت محل صاحبہ کی سکھ سیج کے پاس پہونچے۔ وہ دوشالہ تانے خاموش آرام کر رہی تھیں مگس رانی ہو رہی تھی۔ جہاں پناہ کو دیکھتے ہی مُجرے کیلئے اٹھنا چاہا۔ حضور نے اُن کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا "مُجرا معاف۔ اُٹھنے میں ہلکان ہوگی۔ اُفوہ! واقعی طبیعت بدمزہ ہے۔ اما حکیم احسان اللہ ابھی تک نہیں آئے؟" جسولنی نے عرض کیا "مہابلی حکیم صاحب تو کب کے درِ دولت پر حاضر ہیں" "اما تو بلاؤ۔ دیر کاہے کی ہے" پردہ ہوا۔ قناتیں لگ گئیں۔ سکھ سیج کے آگے شفق کھڑی کر دی گئی۔ حکیم صاحب آئے۔ جُھک جُھک تسلیمیں کیں۔ مؤدب بیٹھے۔ نبض دیکھی۔ نسخہ تجویز ہوا۔ حضور نے ملاحظہ فرمایا۔ اشارہ ہوا کہ ابھی حکیم صاحب کی نگرانی میں تیار ہو کر پیش ہو۔

حکیم صاحب کے جانے کے بعد بادشاہ سلامت مسند پر جلوہ افروز ہوئے۔ پیچوان لگا دیا گیا۔ بیگم کی خواص خاص نے خاصدان پیش کیا۔ جس میں سونے چاندی کے ورق لگی ہوئی گلوریاں تھیں۔ حور چھل ہونے لگا۔ شاہزادیاں اپنے اپنے قرینے سے بیٹھ گئیں۔ لیکن حضور خاموش تھے کہ سامنے سے "اللہ شافی اللہ کافی" کی صدا آئی۔ دو قلماقنیاں آگے آگے۔ پیچھے مہری کے سر پر ایک خوان کمخواب کے تورہ پوش سے ڈھکا ہوا۔ عرض بیگی نے دعا دے کر عرض کیا "جامِ صحت حاضر ہے"۔ حکم ہوا ملاحظہ میں لاؤ۔ تورہ پوش ہٹا کر کسنے کی مہر توڑی۔ خوان پوش ہٹایا تو بلوریں پیالے میں ٹھنڈائی تھی اور زہرمہرہ کی پیالی میں خمیرہ مروارید۔ بادشاہ نے آیاتِ شفا دم کر کے اپنے دستِ مبارک سے پہلے خمیرہ کی پیالی بیگم صاحبہ کو دی پھر ٹھنڈائی کا پیالہ اور فرمایا "حکیم احسن اللہ کا ہاتھ بہت ہلکا ہے۔ خدا چاہے تو ابھی جی بحال ہوا جاتا ہے۔"

دوا کی تاثیر اور سلطانی عنایات چند ہی منٹ میں ظلِ علیہ حضرت کے چہرہ کا تکدر جاتا رہا مسکراتی ہوئی اٹھ بیٹھیں۔ محل میں امی جمی ہوگئی سب کے مُنہ پر جو قفل سے لگے ہوئے تھے کھل گئے۔ مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔ باہر شادیانے بجنے لگے۔ اندر ڈومنیاں۔ مراثنیں "جم جم راحت بنت بنت صحت۔ بادشاہ سلامت" گانے لگیں۔ ہر طرف چہچہے تھے اور قہقہے۔ حضور مطمئن ہو کر تشریف لے جانا ہی چاہتے تھے کہ زینت محل صاحبہ نے دست بستہ عرض کیا "حضور نے جہاں اتنا کرم کیا ہے خاصہ بھی آج اس کفش خانہ ہی میں نوش فرمالیں تو زہے نصیب۔ لونڈی بھی جہاں پناہ کے تصدق میں دو چار لقمے کھالے گی" ارشاد ہوا "کیا مضائقہ ہے تمہاری خاطر سے ہمیں عذر نہیں"

حکم ہوتے ہی لونڈی باندیاں۔ پیش خدمتیں۔ رکاب دارنیں اہتمام میں مصروف ہوگئیں۔ دسترخوان بچھایا گیا کھانے چُنے جانے لگے۔ بادشاہ کی دعوت اور زینت محل صاحبہ کے ہاں کا خاصہ۔ شان ہی نرالی تھی۔ رنگ برنگ کی روٹیاں شیرمال۔ باقرخانی۔ کلچہ۔ گاؤ دیدہ۔ گاؤ زبان۔ غوص روٹی۔ نان پنبہ۔ نان تنکی۔ نان گلزار۔ نانِ قماش۔ قسم قسم کے میٹھے اور نمکین چاول۔ مزعفر متنجن۔ زردہ۔ شش رنگا۔ چوگنی کے چاول۔ یخنی پلاؤ۔ کوفتہ پلاؤ۔ نور محلی سوتی پلاؤ۔ نرگس پلاؤ۔ ماہی پلاؤ۔ رشتہ پلاؤ۔ یاقوتی۔ دودھ کا دلمہ۔ ماہی بے آب۔ بادام کا

قلیہ۔ قورمہ۔ شامی کباب۔ ماہی کباب۔ مرغ کے کباب۔ شمسی قلیہ۔ حسینی کباب۔ نکتی کباب۔ سمنی۔ بادشاہ پسند دال وغیرہ وغیرہ طرح طرح کے اچار مربّے۔ حلوے۔ مٹھائیاں غرضکہ خاصا کیا اگلا پن بندی کی گئی۔

کھانے سے فراغت پاکر حضور تو محل سرائے معلّےٰ کو تشریف لیگئے اور یہاں بیگمات اور شہزادیاں گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ ڈومنیوں نے تیکھی ہوئی سُریلی آوازوں سے الہنا شروع کیا۔ غزلوں۔ ٹھمریوں۔ ٹپّوں۔ خیالوں کی فرمائشیں ہونے لگیں۔ نوجوان نوجوان ڈیرانیں بڑے بڑے استادوں سے تعلیم پائے ہوئے۔ ٹپہ گایا تو شوری کی روح کو شرما دیا۔ ٹھمری شروع کی تو حسینی پیا۔ سند پیا۔ پھل رنگ دشس رنگ۔ سدا رنگ اور قدر کو بھی مات کردیا۔ غزل چھیڑی یا قوالی کی دُھن باندھی تو استاد تان رس خاں کی پوری نقل اتار دی۔

اپنے اپنے میل جول کی بیگمات الگ الگ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ کہیں شہزادیوں کی بولی ٹھولی کا مزہ آرہا تھا تو کہیں اُمرا کی خواتین کی گفتگو کے لطف تھے۔ عجب بہار تھی۔ زینت محل صاحبہ صدر میں بیٹھی کبھی قلعہ والوں کی باتوں پر مسکرا دیتی تھیں تو کبھی شہر والیوں کے محاورات پر بیگانہ وار ہنسنے لگتی تھیں۔

بدجبیں زمانی۔ نوج۔ ایسا بھی کسی کا خون ہلکا ہو۔ سُنا ہے کہ شاموں شام حمام کرکے دھانی جوڑا پہن کر کھلے بالوں مہتاب باغ میں چلی گئی تھیں دُردانہ چڑیل نے کہیں ٹوک دیا۔ بس اسی وقت سے دشمنوں بُرا چاہنے والوں کا مُنہ تمتما گیا۔

ارجمند بانو۔ موئی کو نفتکاری کے حوالے نہیں کیا۔ ایسی سبز قدم خواصی کے لائق ہے۔

مہ افروز۔ میں کہاں بھی مُرشد زادے خدا جانے کہاں سے ایک چھل پائی کو پکڑ لائے تھے۔ نگوڑی صورت حرام۔ گل چمن نام رکھ کر بھی میں تو چھپاتی۔ مُردار او پری کا سایہ بن گئی۔ نظر تھی کہ بلا جس کو کھاتے دیکھ لیا بس زمین دیکھنی پڑی۔ آخر میں نے تو اُسے کھڑے کھڑے نکالا۔ کالا منہ ایسی شکل صورت کو کوئی لیکر کیا چاٹے۔

خورشید جمال۔ وہ تو حضور کو میاں نے نظر اتارنے کی کوئی دُعا بخش دی ہے۔ دیکھا تھا نہ کہ ہوادار سے اترتے ہی کچھ پڑھتے ہوئے آئے تھے اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ دم کیا تھا۔ یہ عمل ایک ہی ایک ہے۔ نظر تو نظر کالے جادو کی اس کے آگے کوئی اصل نہیں اُسی وقت سے چہرے کی ہوائیاں موقوف ہوگئیں۔

مریم زمانی۔ آغائی کی اوڑھنی کی لپ پر میں بی مغلانی سے بیٹھی دھنک ٹنکوا رہی تھی کہ مرزا ٹلوے نے خبر دی کہ حضرت زینت محل کو دورہ پار کچھ خلش ہوگئی ہے۔ سنتے ہی میرے تو اوسان جاتے رہے۔ جگر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ دل شاد میرے لئے چمپا۔ موتیا۔ مولسری۔ چنبیلی اور جوہی کے پچ میل ہار گوندھ رہی تھیں اسکو بھی جیسا کا تیسا چھوڑا اور سُکھپال لگوا فوراً حاضر ہوئی۔ چھائیں پھوئیں آپا بیگم کے بیری کی آنکھ میلی اور مریم گھر میں سکھ کرے۔ اللہ کی کارسازی کے قربان کہ میں نے اس چاند سی صورت کو ہنستے دیکھ لیا۔

گیتی آرا۔ مجھے بھی صبح ہی ساری باتوں کا پتہ لگ گیا تھا۔ دُردانہ مالزادی کی زہریلی نگاہ کا حال میں نے شبو سے سُنا۔ چنڈالنی کی آنکھ ہے کہ بِس کی گانٹھ۔ سنتے ہی میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ یہاں آکر جو دیکھا تو تھو تھو وہی رنگ پایا۔ آنکھیں چڑھی ہوئی۔ رنگت پھیکی۔ صورت پر ....

اب آگے کیا کہوں۔ اللہ نے بڑی خیر کی۔ پھر جب بڑے حضرت کی تیکھی چتون دیکھی ہے اور جس کڑے تیوروں سے حضرت نے دُردانہ کُٹنی کو دیکھا ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ اب اس کا لکھا پورا ہوا۔ مگر اس کی بھی کیا خطا ہے۔ آنکھوں میں شیطان گھس پڑے تو کیا کرے۔

خورشید لقا۔ زیب النسا کو تو آپ جانتی ہیں کیسی ضدن ہے اور جب سے میں نے اس کو بیٹی بنا لیا ہے وہ رہی سہی بھی آپے سے باہر ہوگئی ہے۔ کل چراغ جلے ابکا ایکی اسے بیٹھے بیٹھے اُدماد اُچھلا کہ چاندنی مناؤنگی۔ ہرچند میں نے کہا کہ یہ کیا موقع ہے حضور کی اجازت کے بغیر سیر سپاٹے کرنا اچھے نہیں۔ سوسن جیسی نپنگ چھُری سے بھی نہیں ڈرتی۔ یہ ایک ایک کی چار چار لگا کر بھی نہیں چھوڑیگی۔ لیکن اس ہٹ دھرمی نے ایک نہ مانی۔ کبھی روئے کبھی بسورے۔ کبھی ہاتھ جوڑے۔ غرض ایسے چوچلے بگھارے کہ میں موم ہوگئی۔ میرا ہاں کرنا تھا کہ گھٹنیوں چلتے بچوں سے لیکر اسّی برس کی ہپتو تک کے دل مچلنے لگے۔ دست بقچے نکل آئے۔ لونڈیاں۔ باندیاں۔ مامائیں۔ سہیلیں۔ مہریاں۔ باری دارنیاں۔ انائیں۔ چھوچھوئیں سب کی سب بنت بناؤ میں مصروف ہوگئیں۔ سواریاں آئیں۔ اب اس نازو نے میرے تلوے سہلانے شروع کئے۔ اس کی عادت ہے اور سچ پوچھو تو مرزا ثریّا نے نازنہ اٹھا اٹھا کر اُسے شوخ دیدہ بھی بہت کر دیا ہے۔ ہاں تو اس کی عادت ہے کہ جس بات کی دھت لگی بس لگی۔ مجال ہے کہ وہ

اپنی ہٹ سے باز آجائے۔ مجھ کو سوا ادکرا کے مانی۔

اب جو باغ میں پہنچے تو کیا کہوں کیسا سُہانا سماں تھا۔ اوپر والا اپنا نور بھرا طباق سا چہرہ نیلے پردے سے باہر نکالے پھولوں کو گھور رہا تھا۔ روشوں پر چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ خوشبو کی لپٹیں آرہی تھیں۔ میں۔ گوہر سلطان جن کا برسوں کی اللہ آمین کے بعد خدا خدا کر کے اب پاؤں بھاری ہوا ہے اور رہمرمزی مُلدارنی دعیزہ دس بارہ عورتیں تو خیر فرش پر بیٹھ گئیں۔ ان جوان خون والیوں کے ساتھ کیا ایلی گیلی پھرتی۔ لیکن زیب النسا اور اس کے ساتھ دلشاد۔ نرگس کینگی۔ سمن بر۔ غنچہ دہن۔ شیریں۔ لیلیٰ نے تو ایسا اودھم مچایا کہ سارے باغ کو سر پر اٹھا لیا۔ کیاری کیاری ڈوے ڈوے دڑنگے مچاتی اور کدکڑے لگاتی پھرتی تھیں نہ ان کم بختوں کو مرداری سے ڈر لگتا تھا نہ ماموں کی پروا رکھتی۔ وہاں تو شیطان اچھل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جلے پاؤں کی بلیاں ہیں ٹک کر بیٹھنا جانتی ہی نہیں۔

کوئی آدھی رات آئی ہوگی کہ زیب النسا کو امریوں میں کچھ کھٹکا سا ہوا۔ کسی نے کہا جوتی والا ہے۔ کوئی ڈالی والا ابھی نگوڑیوں کے کورے پنڈے تھے بے آپے ہو کر بھاگیں۔ دہشت کے مارے بُرا حال تھا۔ میں پہلے ہی دہن اوسان جاتے رہے لپ جھپ سوار ہوئے اور جب اپنے محل میں پہونچے تو ذرا دل ٹھکانے ہوا۔ لیکن زمین کی ساری چونچالی جاتی رہی۔ مُنہ فق فق ہو رہا تھا۔ رات بھر چونکتی رہی۔ مجھے بھی بیسیوں بُرے بُرے خواب دکھائی دیئے۔ صبح کو دیر سے آنکھ کھلی۔ ابھی چوکی پر بھی نہیں گئی تھی کہ ضیا مہری بدخبری نے یہ شگوفہ چھوڑا۔ کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ سب کو اپنے حال پر چھوڑ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ یہاں آتے ہی پہلے دُردانہ چمکو دکھائی دی۔ میں نے آنکھیں بدل کر کہا۔ بی تمہارے دیدوں میں رائی نون مجھے تو گھورو نہیں۔ تمہاری تو وہ مثل ہے کہ جس کا کھاؤ اسی کے نمک میں زہر ملاؤ۔ میں آپ ہی پھونک پھونک کے قدم رکھتی ہوں۔ اور جھپا کے سے گذر کر اندر آگئی۔

شہر کی خاص خاص بیگمات۔ نواب زادیاں ڈھیلے پائچوں کے مشروع۔ زربفت۔ کمخواب کے پاجامے پہنے۔ کارچوبی۔ زردوزی۔ مسالے دار بھاری دوپٹے اوڑھے کسی کا آڑا آنچل ہے تو کسی کا سیدھا۔ زیورات سے گوندنی کی طرح لدی علیحدہ ٹکڑی جمائے بیٹھی ہیں۔ پاندان سنہری روپہلی گنگا جمنی رکھے ہیں۔ پان پر پان چل رہا ہے۔

عالیہ بیگم۔ بہن! قلعہ کا یہ کیا دھرا ہے کہ جو منہ چڑھ گیا نظروں سے اترتا ہی نہیں۔ ایسی کہاں کی ستیا ستی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے نہ تخت کے والی اس کا چونڈا مونڈتے ہیں نہ بیگم کی ناک چڑھتی ہے۔

نوشابہ خانم۔ مجھ والی کے ہاں مُردانہ بندی ہوتی اور ایسا کوئی سانحہ ہو جاتا تو ٹنڈیاں کھجوا دیتی۔ سپہدار خاں اس کو جیتا چھوڑتے! چھُریوں کا غسل دلوا دیتے۔ ڈائن ہے نامراد پوری ڈائن۔

نواب دُلھن۔ ماموں حبیبی کو آپ جانتی ہیں، ان کی سلیج ماشاء اللہ کیسی جہاں دیدہ عورت ہیں سُنتی ہوں اُن کے سر پر کوئی بزرگ میراں جی یا شیخ سدو بھی آتے ہیں۔ وہ ایک دن جو اماں جان سے ملنے آئیں تو انھوں نے میری اتون کی لڑکی فہیمہ کو دیکھا۔ اس کے گول گول لٹو سے دیدے ہر وقت پھرتے رہتے تھے اور جب کسی کو دیکھتی بس تو ٹکٹکی باندھ کر۔ انھوں نے صاف مُنہ پر کہہ دیا کہ بُوا اس لڑکی کا بھرے گھر میں آنا جانا رہنا سہنا اچھا نہیں۔ یہ نظر ہائی ہے اور والدہ سے کہا۔ باجی غضب خدا کا ایسی سانپن کو تم نے پال رکھا ہے۔ اس کی نظریں تو زہر میں بجھی ہوئی ہیں اور مجھ سے فرمایا۔ بچی۔ گھر سے جب کہیں باہر جاؤ پیر غیب کا دُونا مان کر جاؤ۔ جب نہاؤ نیا جوڑا بدلو۔ سات لال مرچیں سر سے پاؤں تک اُتار کر چولھے میں ضرور ڈلوا دو۔ اس دن سے میں نے ان کی یہ بات آنچل سے باندھ لی۔

نفاست جہاں۔ جی ہاں بڑی بوڑھیوں کی ہر بات آزمودہ ہوتی تھی۔ انھوں نے اپنے چونڈے دھوپ میں تھوڑی سفید کئے تھے۔ صدقے دو۔ رُ صحنکیں۔ تعویذ گنڈے جیسے جیسے کم ہوتے جاتے ہیں ویسے ہی بچے ہبنگ لگ رہے ہیں۔ بیٹی نظر بد سے خدا بچائے۔ گولی کا مارا بچ جاتا ہے مگر نظر کا مارا نہیں بچتا۔ اس سے پہاڑ کھیل کھیل ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں آٹا پیسنے ایک چماری آیا کرتی تھی۔ ایک دن جو وہ آئی۔ ور ملیع کی کوٹھڑی میں گئی تو چکی کے گرنڈ میں کہیں سانپ بیٹھا تھا۔ پہلے تو وہ رُکی کہاں جھجکی پھر آگے بڑھ کر اُسے گھور کر دیکھا اور یہ کہتی ہوئی باہر نکل آئی۔ بڑی بیگم دیکھنا کیسی ملوک ناگن سو رہی ہے۔ میں نے شہزادی کی ددا سے کہا۔ دیکھنا یہ منگلو کیا بک رہی ہے کیسی سانپن۔ ددا ایک کچے دل کی عورت۔ سانپن کا نام سُنتے ہی مسندلی پر چڑھ گئیں اور آنکھیں بند کر کے ' جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو ' پڑھنے لگیں۔

اتنے میں سنگو ہنستی ہوئی پھر کوٹھڑی میں گئی اور کیا دیکھتی ہوں کہ ایک کالے سٹک سے سانپ کی دُم بچڑے سے اٹھائے لئے چلی آتی ہے۔ صحن چبوترے کے نیچے ڈال کر کہنے لگی "سرکار میری آنکھ سے آنکھ ملاتے ہی مر گیا"۔ مجھکو بڑا اچنبا ہوا۔ میں نے پوچھا "اری پگلی آنکھ سے آنکھ ملانے سے یہ کیسے مر گیا"۔ بولی: "بیگم جی میری آنکھوں میں کالی دیوی بستی ہیں۔ میں نے تو کتنے سانپ مار گیرے۔ جس کو دیکھا پٹ سے مر گیا"۔ اب میں سمجھی کہ یا تو یہ کوئی بھتنی ہے یا اس کی نظر بُری ہے۔ بس بی بی وہ دن اور آج کا دن میں نے اُسے گھر میں نہیں گھسنے دیا۔

لطافت النسا۔ نزہت زمانی کا جب سے پہلوٹھی کا بچہ اُترا ہے اور لوگوں نے نظر بتائی ہے میں تو ہر وقت چوکنی رہتی ہوں۔ جہاں کسی ذرا اپنا ہو یا پرایا میت کر بچے کو ٹوکا۔ نئی سنوری کسی لڑکی کو ہونسا اور میں نے جلدی سے کہا ذرا ایوا اپنی ایڑی کو دیکھنا کیا لگا ہے اور فوراً اس کے پاؤں تلے کی مٹی اٹھا کر چولھے میں جلا دی۔

بلند جہاں۔ پہلے ان باتوں کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ ایرے غیرے کے سامنے کھانا پینا تو کیا کنگھی چوٹی سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ آدمی پہلے پیرا دیکھ لیتے پھر اس کے گھر میں رہنے کے روادار ہوتے۔ عورت ہو یا مرد بعض ایسا بھاگوان ہوتا ہے کہ اس کا قدم آیا اور گھر بھر گیا اسی طرح کوئی ایسا منحوس ہوتا ہے کہ جہاں جائے اُدڑ اپڑ جائے۔ پرسوں کا ذکر ہے کہ نواب دولھا کے ہاں جانا ہوا۔ دولھن میری شاہجہاں کی دوپٹہ بدل بہن ہے۔ سنتے ہی دوڑی گئی۔ میں کہ پہنچتے پہنچتے خدا رکھے بچہ تو ہو گیا تھا۔ دیکھتی کیا ہوں کہ برجیس جس کو در پار کوک کا روگ لگا ہوا ہے۔ اوپر تلے پانچ بچے مر چکے ہیں پہلی پہلوٹھی کی زچہ کے چپر کھٹ پر بٹھا رکھا ہے۔ دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا کہ خدا خیر کرے۔ اتنے میں نظر جو پڑی تو نصیبن دائی کل جتی نیلی چوڑیاں پہنے بچے کو نہلا رہی ہے۔ بوا میں وہم کی پوٹ۔ میرے تو اوسان جاتے رہے۔ پرائے گھر میں مجھے کیا دخل بیٹھی مڑ مڑ دیکھتی رہی۔ پھر کان میں اذان دینے کو باوا نہ دادا مسجد کے موٹے کھوسٹ ملا کو بلایا۔ یہ تو خیر تھا ہی۔ سامنے سے مہترانی طشت صاف کرنے چلی آتی ہے۔ سوڑ میں زچہ کے پاس مہترانی کا کیا کام۔ اس نے آتے ہی طشت اٹھایا اور کہنے لگی بیگم صاحب جھاڑو بھی دیدوں۔ ہے ہے بدشگونی کی حد ہو گئی۔ میرے تلووں سے جو لگی تو دماغ تک پہنچی۔ مجھ سے رہا نہ گیا میں نے کہا کہ او غیبانی جھاڑو پھرے نیبے کر گھر پر۔ اس گھر کے دشمنوں پر ستھرائی نہیں کہتی۔ اور دیکھ مُردار وہ کس کا بچہ ہے اس کے پاؤں میں ستھرائی لگ گئی۔ ذرا سا تنکا تھنکار کر توڑ ڈال۔ نہیں صاحب میں نے ایسی باتیں کب دیکھی تھیں۔ میرا تو خون کھول گیا۔ اسی وقت پالکی لگوا اپنے گھر آ گئی۔

سُلطانہ خاتون۔ ارے نواب دولھا کے یہاں کا یہ ہڑا جاتا رہا ہے۔ خدا بخشے سکندر جہاں بیگم کے وقت تک تو ان کے گھر کا سا قرینہ شہر بھر میں نہ تھا۔ ان کے سارے طور طریق پُرانے زمانے کے تھے۔ ماشاءاللہ چار چار بہوئیں لائیں۔ چار بیٹیاں بیاہیں مگر کبھی آمنے سامنے کا بیچ نہیں کیا۔ محال ہے کہ کوئی بچہ ایک پاؤں میں جوتی گھسیٹے پھرے۔ کوئی جا رہا ہے اور کسی کو چھینک آ گئی۔ جب تک پاؤں میں جوتی پیر پھیر کر نہ پہنوا دیتی تھیں ممکن ہے کہ وہ چلا جائے۔ کسی کی ناک کھجائی اور انھوں نے جوتی چھوائی۔ جہاں کسی بچے نے رات کو دانت چبائے صبح ہی کو لڑکی چولھے کی مٹی سوتے سوتے اس کے مُنہ میں ڈال دی۔ کسی نے قینچی بجائی اور بڑی بی نے ڈانٹا کیوں لڑائی ڈلواؤ گی۔ ماما نے پکی ہنڈیا پر کفگیر رکھی اور انھوں نے لتے لئے "ہاں کر دو کھانا بدمزہ"۔ ایک دن کہیں میرا ہاتھ ان کی ناک کو چھو گیا۔ اور تو کچھ کر نہ سکیں۔ میرا بڑا لحاظ تھا مگر پھر بھی اپنا ٹوٹکا کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ تھو تھو کر کے کہنے لگیں۔ اچھی بوا میں بھی تمہاری ناک ذرا چھو لوں۔ تو دیکھ لو اُن کے جیتے جی بیسیوں خوشیاں ہوئیں کبھی کوئی بجوگ پڑا۔ دُلہنیں آئیں بھی اور گئیں بھی۔ خدا نے امی جمی ہی رکھی۔ زچہ خانے بھی سال میں تین تین چار چار ہوئے۔ نہ سوڑ بگڑی نہ کوئی بچہ چھینکا۔ ہم نے تو ان کے ہوتے کسی کی آنکھ دُکھنی بھی نہیں دیکھی۔

فیاضی۔ (جماہی لیکر) اماں بیگم ہمیں تو نیند آ رہی ہے۔ آنکھیں کڑوائی جاتی ہیں۔

طلعت صغرا۔ بچی! منہ پر ہاتھ رکھ۔ ابھی ہوا لگ جائے تو دہانہ پھٹا کا پھٹا رہ جائے۔ کیوں بی زینب بیگم یہ لڑکی تو وہی ہے نا جس کو کوئی تشتا بہم صاحب کے پچھواڑے سے ڈال گئی تھی۔ بھئی سنے گی تو خوب مگر بُرا نہ مانو تو کہوں بدنیتر اٹھ رہی ہے۔

زینب بیگم۔ آپا آپ کو کیا خبر میں چیونٹیوں بھرا کباب ہوں۔ اپنے جگر کے ٹکڑے نہیں سنبھلتے یہ غریب کس گنتی میں ہے۔ یہ نیند کی بھا سونے کو کہے تو کیا عجب۔ مجھ بوڑھی عورت سے نہیں بیٹھا جاتا۔ نیند آنکھوں میں گھل رہی ہے۔ سر پھٹا جاتا ہے۔ خدا جانے کیونکر اپنے کو سنبھالے بیٹھی ہوں۔

فاطمہ صُغرا۔ اللہ خیر کرے۔ نہیں کیا ہوا۔ خدا نخواستہ کچھ طبیعت بدمزہ ہے یا کہیں خدائی رات منائی تھی۔

زینب بیگم۔ جی کو تو خالہ جان کچھ نہیں ہوا۔ بات یہ ہے کہ کل قیصر بڑا اچاتہ نہائی تھیں۔ بیاہی بیٹی پڑ دس برابر اوّل تو میں اسی کی دلوا تھی کہ اپنے میکے میں وہ ہاتھ پاؤں سے فارغ ہو۔ درد لگتے ہی اوہ مسہری لگ جاتی ہے تو آدھ جیتے۔ لیکن میاں شریف الحسن نہیں مانے۔ یہ چالیس دن اس طرح میں نے کاٹے ہیں بس ہی جانتی ہوں۔ چوبیس گھنٹے جان سولی پر رہتی تھی۔ خیر خدا نے شرم رکھ لی۔ بی قیصر صحیح و سلامت بھری گود اٹھ بیٹھیں۔ ہوتی شدی کوئی پانچ بجے ہوں گے قیصر کے سسرال جانے کی تیاری ہو رہی تھی کہ مرزا باو ریجنٹ کی صاحبزادی آ اترپں۔ قیصر سے ان کا بڑا میل جول ہے۔ میں تو مہمانداری کے جھگڑے میں لگ گئی وہاں وہ قیصر سے خوب گلے ملیں۔ بچے کو لپٹایا چمٹایا پیار کیا۔ بچہ اللہ رکھے ایسا پیارا پیارا انگل گو تھنا سا ہے کہ آن ہوئے کو پیار آجائے۔ شامت کی مارکہ مرشد زادی کے ساتھ اُن کی ایک سہیلی بھی تھی۔ وہ ایسی شوخ چلبلی کہ اللہ کی پناہ۔ کبھی بچے کو گدگدائے کبھی کندھے پر بٹھلائے کبھی سر سے اونچا اُچھالے۔ منع کرنیوالا کون تھا۔ وہ دونوں گویا برسوں کی بچھڑی ہوئی۔ ان کی باتیں ہی ختم نہیں ہوتی تھیں۔ رمضان کی انتیس تاریخ تھی اس رکاتہ کو جو چاند دیکھنے کا خیال آیا بچے کو لئے کوٹھے پر چڑھ گئی۔ سوا مہینے کی جان جاڑوں کے دن۔ جھٹ پٹا وقت۔ بچے نے اوپر جاتے ہی ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو گیا۔ کیا کہوں خالہ جان میں سجدے میں تھی کہ سیدھی کھڑی ہوئی کیسی نماز اور کہاں کا روزہ سینکڑوں ملا سیانے بلاتے جس نے کہا یہی کہا کہ بچہ جھپیٹ میں آگیا ہے کسی کی پیری نہیں چلی۔ آخر میاں کو بُلایا۔ انھوں نے جھاڑا فلیتے جلائے تو بچے نے آنکھیں کھولیں اور سب کی جان میں جان آئی ساری رات ست ہی ست میں گذری۔ صبح بچے نے ذرا سا دودھ بھی پیا اور اس کا چہرہ بھی بحال تھا۔ سوچ رہی تھی کہ جس طرح بنے دوپہر سے پہلے پہلے قیصر کو سسرال بھیجدوں۔ اتنے میں یہاں آنا ہو گیا۔

فاطمہ صُغرا۔ (دوسری بیگموں سے مخاطب ہو کر) اب اجازت لینی چاہیئے۔

نوشابہ خانم۔ سچ تو ہے ہم تو یہاں آکر ایسے بیٹھ گئے جیسے اپنے گھروں میں۔

عالیہ بیگم۔ میں کسی خواص کو بُلا کر اس سے عرض کراتی ہوں۔

• چنانچہ پہلے شہزادیاں رُخصت ہوئیں اور جب ان کی بِھیڑ کم ہوئی تو شہر کی بیگمات کے مُحافے۔ پالکیاں نکلنی شروع ہوئیں اور تھوڑی دیر میں حضرت زینت محل کا جلوت کدہ خلوت خانہ بن گیا۔

اشرف صبوحی دہلوی

کوکن کی خارش

لذت آزار پیدا کرنے کیلئے شاعروں اور صوفیوں نے عشق و محبت کے مشغلے کو زندگی کا ایک لازمی جزو قرار دیا ہے۔ لیکن کیا یہ ہر ایک کے قبضہ اختیار میں ہے کہ وہ بیمارِ عشق بن جائے؟ فرحت اللہ بیگ نے عشق کی گولیوں کا اشتہار البتہ دیا تھا لیکن اس کا نسخہ بتانے پر وہ بھی رضامند نہ ہوئے کیونکہ اشتہاری ادویات دراصل مداری کے کرتب کی طرح ہیں کہ ادھر طلسمِ نظر ٹوٹا اور اُدھر حقیقت مجاز میں تبدیل ہوئی بہرحال لذت آزار پیدا کرنے کے لئے دُنیا میں عشق و محبت کے علاوہ دوسرے روگ بھی ممکن ہیں۔ جن میں سب سے آسان ترکیب کھٹمل زدہ پلنگ پر آرام کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ میر تقی میر کے کلام میں جو درد اور جاذبیت پائی جاتی ہے۔ دراصل کھٹملوں ہی کی مرہونِ منت ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:-

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا ۔۔۔ پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں ۔۔۔ ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں

تو شکان گردوں ہی میں سب پھاڑ ۔۔۔ ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی

پوری نظم نقل کرنے کی گنجائش نہیں لیکن اگر آپ ان اشعار میں تھوڑا سا تصرف کر کے کھٹملوں کا لفظ نکال دیجئے اور ان کو ایک خاص لحن سے گنگنانا شروع کیجئے تو سامعین یہی خیال کریں گے کہ کوئی دل کا بیمار اپنی بھڑاس نکال رہا ہے۔ میں نے بھی کھٹملوں کے ساتھ راتیں گذاری ہیں لیکن شب بیداری میں نہیں بلکہ شب خوابی میں۔ واقعہ یوں ہے کہ میرا خون میٹھا ہے اس لئے ان کی چھیڑ چھاڑ میں مجھے کوئی خاص لذت محسوس نہیں ہوتی۔ ہاں مجھ کو کوکن کی لذتِ آزار اب تک یاد ہے لیکن اس میں کھٹملوں کے بوسوں کے تاثرات شامل نہیں ہیں بلکہ یہ کچھ اور ہی لطف ہے۔ آپ کو کیا بتاؤں کیونکہ اس کیلئے تجربہ شرط ہے۔ جس طرح ایک مستِ مے گلفام ایک ابدِ خشک سے حقارتاً کہتا ہے کہ "ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں"۔ اسی طرح میں آپ سے عرض کرونگا کہ:-

"آپ کوکن کبھی گئے ہی نہیں"

مغربی ساحل پر کوکن کا خطہ دراصل بہشت کا ایک ٹکڑا ہے لیکن جس طرح یہ حقیقت ہے کہ انسان اس خاکی پیرہن کیساتھ جنت کی سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتا اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ حدود کوکن میں داخل ہو جانے کے بعد ایک پردیسی کو ایک نیا ہیولیٰ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس کی جلد میں ایک انقلاب واقع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ پہلی سطح کی جگہ ایک نئی سطح نمودار ہو جاتی ہے اور اس انقلاب کا عمل خارش کے ذریعہ پورا ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے ناظرین میں سے چند ہستیاں ایسی بھی ہونگی جو اس لذتِ آزار کا کافی تجربہ رکھتی ہونگی۔ لیکن کوکن کی خارش کے تاثرات بالکل انوکھے ہیں۔

ڈاکٹروں نے اس کے ظاہری اسباب پر بہت کچھ روشنی ڈالی ہے لیکن چونکہ ان کی نگاہ حقیقت بیں نہیں ہے اس لئے اُن کی تحقیق قابلِ قبول نہیں کیونکہ باوجود اُن تمام ترکیبوں کے جو حفظ ما تقدم کے طور پر عمل میں لائی جا سکتی ہیں۔ وہاں کی سرزمین پر خارش کا وجود پانی اور ہوا کی طرح عام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کی آب و ہوا مرطوب ہے۔ بارش کثرت سے ہوتی ہے اور سمندر کا ساحل قریب ہی ہے۔ اس لئے یہ مرض کثرت سے ہوتا ہے لیکن کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ انھیں اسباب کی موجودگی میں بنگال، مدراس اور جاپان کے ساحلوں پر اس کی عام شکایت کیوں نہیں ہے؟ اس لئے معلوم ہوا کہ ان کے علاوہ کوئی اور وجہ بھی ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ "بونبل مچھلی" کی جیو ہتیا کا اثر ہے۔ ہندوستان میں "اہنسا" کے اصول سے کسی جاندار کو اپنی غذا کا ایک جزو قرار دینا مہا پاپ خیال کیا جاتا ہے اور گوشت خور انسانوں کے معدوں کو جانوروں کے قبرستان سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر سارے ملک میں "پنجرا پول" کا ایک نظام پھیلا ہوا ہے تاکہ جانور تندرست اور زندہ رہیں اور یہاں کے انسان اتنے مرتاض کہ ہمیشہ سرحدی پٹھانوں کے خیال سے لرزاں اور ترساں رہیں۔ بہرحال امراض کا یہ فلسفہ کہ "طاقتور انسانوں کو طاقتور بیماریاں لاحق ہوتی ہیں اور کمزوروں کو معمولی بیماریاں"

قابل غور ضرور ہے۔ اسی اصول پر کوکن میں بھی اس تحریک کیلئے کافی مواد موجود ہے کہ یہاں بونبل مچھلی کی رکھشا کیلئے شکار کرنا ممنوع قرار دیدیا جائے۔ اور یہاں کے باشندوں کی غذا صرف اُبلے ہوئے چاول اور بھنے ہوئے پاپڑ تک محدود کر دی جائے۔ اس طرح یقین ہے کہ خارش کے حملوں سے نجات ہو جائیگی۔

چونکہ اس مرض کا لباس کے ساتھ بھی گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے اس لیئے اس کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ کوکن کے مزدور اور کاشتکار کا لباس اس قسم کا ہوتا ہے کہ جس میں اعتدال پایا جاتا ہے یعنی نہ تو سادھوؤں کی طرح جو ڈنیا کے ساتھ، سوائے ایک لنگوٹی کے، لباس بھی ترک کر دیتے ہیں۔ اور نہ اُن مُسرف نوجوانوں کی طرح جو دھوتی کو شلوار اور لہنگا بنا دیتے ہیں۔ ان کی کیفیت ان دونوں حالتوں کے بین بین ہے۔ اسی لئے ہم ان کے اس مخصوص لباس کو نہ تو لمبی لنگوٹی کہہ سکتے ہیں اور نہ چھوٹی دھوتی۔ خصوصاً عورتوں کے مسئلہ میں تو اور بھی مغالطہ ہوتا ہے۔ بہر حال لباس کا یہ اختصار حکیمانہ اصول پر مبنی ہے۔

ہندوستان کا مزدور اپنے سر پر بوجھ رکھ کر اپنے توازن کو قائم رکھنے کے لئے یا تو دونوں ہاتھوں سے مدد لیتا ہے یا اُن کو آزاد چھوڑ دیتا ہے لیکن یہاں اس کا ایک ہاتھ وزن کو سنبھالنے میں مشغول رہتا ہے اور دوسرا ہاتھ کھجانے میں۔ اگر آپ اس کا ایک ہاتھ زبردستی جیب میں ڈال دیں تو وہ یقیناً چیخ مار کر گر جائیگا۔ خارش کا مرکز خصوصیت سے کمر کے اس حصے پر ہوتا ہے جہاں دھوتی کا بندھن ہوتا ہے اور یہ مقام ایسا نظر آتا ہے جیسے سوکھے تالاب کی تہ میں پپڑائی ہوئی مٹی۔

اب آپ خیال فرمایئے کہ لباس کے اس اختصار کے باوجود خارش کے مورچے اتنے زبردست ہوتے ہیں۔ پھر اُن لوگوں کی کیا کیفیت ہوگی جو اس گرم مرطوب آب و ہوا میں سرد منطقہ معتدلہ (انگلستان) اور گرم خشک ریگستان (عرب) کے لباس میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ ان کی حالت یا تو خدا ہی جانتا ہے یا وہ خود۔ بہر حال "دھوتی کلچر" اور "لنگوٹی کلچر" کے مبلغین انھیں جغرافیائی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہندوستان میں پائجامہ اور پتلون کی مخالفت کرتے ہیں۔

یہ کیفیت اس سرزمین پر اتنی عام ہے کہ اب خارش جسم کا ایک عضو بن چکی ہے اور صدیوں کے ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد مستقل حیثیت اختیار کر چکی ہے جسمیں مستثنیات کو کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ یہاں پر وہ فرد جو خارش نہیں رکھتا یقیناً کسی خطرناک مرض میں گرفتار ہے۔ چنانچہ مجھ کو بھی ان حالات کے معلوم ہونے کے بعد اپنی تندرستی کے متعلق شک ہو چلا تھا۔ لیکن چند روز کے قیام کے بعد میں بھی عام انسانوں کی سطح پر آ گیا کیونکہ میرے جسم پر آہستہ آہستہ خارش کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ یہانتک کہ چند دنوں کے بعد میں نے دیکھا کہ میرا تمام خون رگوں کے اندر دوڑنے کے بجائے جسم پر دوڑنے لگا اور دوڑتے دوڑتے تھک کر جم گیا۔ اب میرا تمام مجسمہ تازہ گوشت کی کٹی ہوئی بوٹی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی توضیح اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ میرے دل نے سینہ کے اندر رہنا پسند نہ کیا بلکہ اس نے وسیع ہونا شروع کیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس شعر کے پڑھنے کی نوبت نہ آئی اور میرا دل بحیرۂ عرب بننے سے باز رہا۔

دل میں آ کر دیکھئے کیفیتِ سیلابِ غم ۔۔۔ بیٹھکر کشتی میں کچھ دم سیرِ دریا کیجئے

البتہ اتنا ہوا کہ میں خود دل بن گیا اور میرے دل نے جسم بنکر مجھے چاروں طرف سے ملفوف کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ میں مجسم درد تھا اور مجسم لذت۔ گویا میں اب فلک کا محتاج نہ تھا۔ اب مجھے غالب کی طرح یہ شکایت نہ تھی کہ :-

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا ۔۔۔ جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

ایسے حالات میں دوستوں نے میری غمخواری میں سعی فرمانیکی بہت کوشش کی لیکن میں نے اس کا علاج خود ہی دریافت کر لیا۔ اس کا نسخہ مجھے غالب کے دیوان ہی سے دستیاب ہوا تھا: "زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا" اور واقعی میں اب تمام معالجوں سے بے نیاز تھا۔ رات کا وقت، کھرا پلنگ، بڑھے ہوئے ناخن اور میں۔ کیا عاشقوں اور شاعروں کو ان تاثرات کے علاوہ کوئی چیز حاصل ہو سکتی ہے؟ پھر کیوں نہ میں بلا خوفِ تردید کہہ اٹھوں کہ عشق اور خارش دونوں مختلف صورتیں ہیں ایک ہی جذبے کی۔

سیّد ابو طاہر

سچّی کہانی

"جوانی کی شورانگیزیاں اللہ اللہ، جان دیدینا ایسا سہل معلوم ہوتاہے، جیسے ریل میں بیٹھ کر ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک چلا جانا۔ جہاں کوئی ناکامی ہوئی اور مرنے کی سوجھی۔ خصوصاً ناکامی محبت کا علاج موت کے سوا نہیں۔ گولی مارکر۔ ریل کی پٹری پر لیٹ کر۔ دریا میں ڈوب کر، پھانسی لے کر، زہر کھاکر، غرض کسی نہ کسی طرح "نامُراد" زندگی کا خاتمہ کردیا جاتاہے، اسلئے کہ بقول مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ ؎

تم نہ آؤگے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں[1]

ہمیں بھی ناکامی ہوئی، ہم نے بھی جان دینے کی ٹھانی لیکن گھر میں نہ بندوق نہ طمنچہ، گولی ماری جائے تو کیوں کر۔ چھُری سے بھی کام لیا جا سکتا تھا لیکن گوسفندِ قربانی کے خاک وخون میں تڑپنے کا منظر بارہا آنکھوں نے دیکھا تھا' مُرغِ بسمل کا پھڑکنا بھی اکثر نظر سے گذرا تھا۔ لہذا جسمانی اذیت کے خیال نے اپنے اوپر "خنجر آزمائی" سے باز رکھا۔ درصل انسانی خون اور وہ بھی خود اپنا خون پانی کی طرح بہتے دیکھنا میرے لئے موت کی بھیانک صورت سے زیادہ روح فرسا تھا۔ رہا ریل کے نیچے لیٹ جانا تو یہ خود ایک طول عمل ہے۔ گھر سے میل ڈیڑھ میل چلو تو ریل کی پٹری ملے۔ پھر کوئی دیکھ لے تو سارا پروگرام غلط۔ یہی قباحت ڈوب مرنے میں ہے۔ کیونکہ نل کی بدولت بڑے بڑے شہروں سے کنوئیں تو اس طرح ناپید ہوگئے ہیں جس طرح آجکل کی تعلیمیافتہ لڑکیوں کے دل سے ماں بننے کی خواہش۔ رہا دریا تو وہ ہاتھ کے داؤں کہاں۔ پھانسی سے مجھے ہمیشہ سے نفرت ہی یہانتک کہ اس ہنگامی جنون کے عالم میں بھی پھانسی کا پھندا میری نظر میں نفرت انگیز ہی رہا۔ لہذا اب اسکے سوا چارہ نہ تھا کہ "دردِ ناکامی کا" وہی علاج کیا جائے جو سوداگر کی بیٹی یعنی "زہرِ عشق" کی ہیروئن نے کیا تھا۔ مگر وُہی دُشواری ہمیں بھی پیش آئی جو مرزا غالبؔ کو پیش آئی تھی اور جس کا اُنہوں نے اپنے اس مشہور شعر میں ذکر کیاہے ؎

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو سِتمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

اسلئے کہ جس طرح مرزا غالبؔ کے زمانہ میں زہر پہ لائسنس تھا (غالباً ہوگا) اسی طرح آج بھی ہے اور آج سے بارہ برس پہلے بھی تھا جب ہمیں زہر کی ضرورت پڑی تھی۔ مرنا بھی بہرحال ضروری تھا۔ سوچا کہ اب کیا کریں۔ خیال آیا کہ آخر دُنیا میں ہر چیز کا بدل ہے۔ کیا ایسی اور کوئی چیز نہ ہوگی جو زہر کا کام دے اور بلا دِقّت دستیاب ہو جائے۔ آخر ایک بات سمجھ میں آگئی، خدا بخشے امّی جان کو دلو کا ایک نہایت کامیاب مرہم کسی نے بتایا تھا وہ ہمیشہ بنایا کرتی تھیں اور ضرورتمندوں کو مُفت دیا کرتی تھیں[2]۔ ایکدفعہ وہ مرہم بہت دنوں تک رکھے رکھے خراب ہوگیا امّی نے اُسے کوُڑے پر پھینکدیا۔ ہمارے آنگن میں ایک بیری کا پیڑ تھا۔ ایک کوّا اس پر بیٹھا تھا۔ اسکی جو شامت آئی تو تیر کی طرح لپکا اور گھی سمجھکر اُس مرہم کی ایک چونچ بھرلی اور کھا گیا اور پھر پیڑ پر جا بیٹھا۔ چند منٹ گذرے ہونگے کہ دھڑ سے نیچے گر پڑا اور تڑپ تڑپ کر مرگیا۔ اگرچہ کئی برس گذر چکے تھے لیکن یہ واقعہ مجھے یاد تھا اور اس مرہم کے اجزا بھی معلوم تھے یعنی خالص موم، تل کا تیل اور ہائیڈراجرائی امونیٹا۔ میں نے سوچا کہ لاؤ ہائیڈراجرائی امونیٹا سے سنکھیا کا کام لو۔ چنانچہ فوراً ایک پڑوس کے ڈاکٹر سے چار آنے کا ہائیڈراجرائی امونیٹا خریدا۔ باریک

---

[1] دیوان غالبؔ کا حمیدیہ ایڈیشن جس وقت شائع ہُوا میں لاہور میں تھا۔ میں نے بھی اس کا ایک نسخہ منگایا اور پڑھنا شروع کیا، رات کا وقت تھا۔ پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ خواب میں دیکھا کہ دیوانِ غالبؔ (حمیدیہ ایڈیشن پڑھ رہا ہوں اور اس میں یہ دو شعر بھی موجود ہیں جو آج تک کسی اور ایڈیشن میں نظر سے نہیں گذرے تھے ؎

آگ لگ جائے اگر گھر کو تو اندیشہ کیا — شعلۂ دِل تو نہیں ہے کہ بُجھا بھی نہ سکوں
تم نہ آؤگے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں — موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں

صُبح کو جب سوکر اُٹھا تو خواب مجھے یاد تھا اور اشعار بھی۔ فوراً دیوانِ غالبؔ (حمیدیہ ایڈیشن) اُٹھا کر دیکھا مگر اس میں ان اشعار کا کہیں پتہ بھی نہیں۔ وُہی تین شعر زہر ملتا ہی نہیں الخ۔ درج تھے جو سب مروجہ ایڈیشنوں میں نہیں ملتے۔ حیرت تھی کہ خواب میں یہ دو شعر مجھے کیونکر یاد ہوگئے۔ وقتاً فوقتاً اکثر احباب کو سُنائے۔ مگر کسی نے اقرار نہ کیا کہ یہ اشعار کبھی کہیں نظر سے گُذرے ہیں۔ (پریم پجاری)

[2] داد کا یہ لاجواب مرہم جن صاحب کو درکار ہو ایڈیٹر ساقی کی معرفت مجھ سے بلا قیمت منگا سکتے ہیں۔ (پریم پجاری)

پیس کر پڑیا بنائی اور سرہانے رکھ لی اسکے بعد چار خط لکھے ۔ ایک اس "بانی نشاط" یعنی رشیدہ کے نام ۔ ایک کوتوال شہر کے نام ۔ ایک اباکے نام جو اُن دنوں پردیس میں تھے ۔ اور ایک امّی جان کے نام ۔ سب میں اپنے مرنے کی وجہ مختلف بیان کی تھی ۔ وہ چاروں خط نہایت دلچسپ تھے اور ایک مجنون زدہ دماغ کی اس کشمکش کی مکمل تصویر جو زندگی کے آخری لمحوں میں حسرتِ زیست اور آرزوئے مرگ سے پیدا ہوتی ہے ۔

اب شام ہو چکی تھی ۔ خطوں سے فارغ ہو کر ٹائم پیس میں ۲ بجے پر الارم لگایا اور اپنے ایک نہایت رازدار "دوست" سیّد صاحب سے ملنے گیا ۔ یہی سیّد صاحب بعد کے واقعات سے ان تمام "ہنگاموں" کے ذمہ دار اور ایک کامیاب "حریف" ثابت ہوئے ۔ میں نے انہیں سب حال بلّکم وکاست سُنا دیا اُنہوں نے مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کی "بظاہر" کوئی کوشش نہیں کی ۔ گلے مل کر رونے لگے اور کہا خدا انجام بخیر کرے ۔

رات کے دو بجے گھڑی نے الارم بجایا ۔ میں کچھ سوتا تھا کچھ جاگتا تھا گھبرا کر اُٹھا ۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ۔ سینہ میں گوناگوں جذبات کا ایک طوفان برپا تھا ، مرگ و زیست کی تمنّاؤں میں آخری جنگ ہو رہی تھی ۔ نامراد زندگی سے جی سیر ہو چکا تھا ، پھر بھی جینے کی آرزو دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی تھی جو بھیانک رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں آفتاب کی ایک مضمحل کرن کی طرح کبھی کبھی چمک اُٹھتی تھی اور اسکی روشنی میں مستقبل کی بہت سی ناتمام تصویریں بڑی سرعت کیساتھ یکے بعد دیگرے حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں ۔ یکایک ایسا معلوم ہُوا کہ دن نکل آیا ۔ زہر اپنا کام کر چکا ہے ۔ میرا سرد مُردہ جسم بستر پر بے حس و حرکت پڑا ہے ۔ بہنیں ، امّی جان اور دو چار عزیز مجھے گھیرے ہُوئے ہیں ۔ ڈاکٹر آیا ۔ نبض دیکھی اور کہا "افسوس خاتمہ ہو گیا" ۔ عورتوں میں کہرام مچ گیا ۔ مرد سناٹے میں آ گئے ۔ امّی جان غش کھا کر گریں ۔ میری چھوٹی بہن انجم میرے گلے سے چمٹ گئی ۔ منہ پر منہ رکھ دیا اور فریاد کرنے لگی "ہے ہے بھیّا ہم سے خفا ہو گئے ۔ بولتے نہیں ۔ میں نے آپکے لئے تکیہ کاڑھا ہے ۔ دیکھئے کیسا خوبصورت ہے ۔ انعام نہیں دوگے کیا ؟ میں تو لے لونگی ۔ ہائے بولتے نہیں ۔ بھیّا ، ہائے بھیّا ۔ اپنی انجم سے نہیں بولتے کیا کروں ۔ ہائے کیا کروں اللہ "

دفعتاً منظر بدلا ۔ چاندنی کھلی ہُوئی ہے ۔ آبادی سے دور "شہر خموشاں" کے ایک گوشے میں ایک نئی سفید قبر ، چاند کی زرد زرد اُداس روشنی میں ایسی معلوم ہوتی ہے ۔ جیسے سفید ململ کی ساڑی میں لپٹی ہوئی ایک نوجوان بیوہ تنہائی اور بیکسی کے عالم میں اپنے اُجڑ جانے والے سُہاگ اور جوانی کا ماتم کر رہی ہے ۔ اتنے میں ایک گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ سُنائی دی ۔ راستہ کے کنارے گاڑی ٹھہر گئی ۔ ہیں ، یہ کون ؟ رشیدہ ! تنہا ۔ رات کیوقت ۔ قبرستان میں ۔ کیوں کس لئے ۔ میرے سارے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی ۔ وہ آہستہ آہستہ آئی اور قبر کی پائنتی بیٹھ گئی ۔ اسکے پاس کچھ پھول تھے ۔ وہ اس نے قبر پر ڈالدیئے کئی منٹ خاموش بیٹھی رہی ، پھر اُس نے لوحِ مزار کی طرف دیکھا اس پر لکھا تھا "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" ۔ اسکی گردن جُھک گئی پھر اُس نے سر اُٹھایا اور آنسوؤں کے دو بڑے بڑے قطرے اسکی آنکھوں سے ڈھلک پڑے

ابھی ان جاگتے خوابوں کا سلسلہ جاری تھا کہ کلاک نے اڑھائی بجایا ۔ میں چونکا ۔ ارے ڈھائی بجگئے ۔ دُنیا کی دلچسپیاں بار بار میرا دامن پکڑ کر کھینچتی تھیں ۔ اور مجھے زندہ رہنے پر مجبور کرتی تھیں لیکن ناکامی کی تلخیاں ہر بار میرے ارادہ کو استوار تر بنا دیتی تھیں ۔ فرشتۂ مرگ کی بھیانک صورت اب مجھے بیوفا رشیدہ سے زیادہ مہربان نظر آتی تھی ۔ گھر میں سب لوگ سوئے ہوئے تھے ۔ میں آہستہ سے اُٹھا ، دبے پاؤں آنگن میں گیا ۔ صُراحی سے گلاس میں پانی اُنڈیلا ۔ اور خاموشی کیساتھ اپنے بستر پر واپس آگیا ۔ پھر ایک بار سب پر حسرت بھری نظر ڈالی ۔ مجھے اسوقت ایک چکّر سا آ رہا تھا ، مجھے وہ الفاظ نہیں معلوم جو اس شخص کے جذبات کی ترجمانی کر سکیں ۔ جسے چند لمحوں کے بعد موت کی آغوش میں ابدی نیند سو جانا ہو ۔ پھر اپنی ذاتی کیفیت کیسے بیان کروں ۔ میں نے لرزتے ہُوئے ہاتھوں سے تکیہ ہٹایا اور چادر کا کونا اُلٹا اور ہائیڈراجرائی امونیا کی پُڑیا کے لئے ہاتھ بڑھایا ۔ مگر وہ وہاں سے غائب ہو چکی تھی ۔ میں ایک سناٹے میں آگیا ۔ بالکل مبہوت ۔ میرے حواس بالکل معطّل تھے ۔ اب میں کچھ سوچ نہیں سکتا تھا ۔ کچھ دیر سر پکڑے بیٹھا رہا ۔ پھر لیٹ گیا اور کروٹیں لیتے لیتے صبح ہو گئی اس دوران میں اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کیلئے جو عجیب و غریب ناممکن الوقوع اور مضحکہ خیز تدابیر میرے ذہن میں آئیں ان کا ذکر بیکار ہے اس لئے کہ عموماً ہر شخص کو زندگی میں ایکبار ضرور اس منزل سے گذرنا پڑتا ہے اور وہ ایسے ہی بے سروپا انکار سے دوچار ہوتا ہے ۔

دن بھر گذر گیا ۔ اور میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا کہ اب کیا کروں ۔ ایک رات اور گذر گئی ، اور میں کسی نتیجہ پر نہ پہونچ سکا ۔ دوسرے دن صبح کو سو کر اٹھا تو مجھے یکایک ایسا محسُوس ہوا جیسے میرے خیالات میں کوئی تغیّر ہو گیا ہے جس طرح عدالتِ عالیہ بعض اوقات ایک خونی مجرم کی جوانی پر ترس کھا کر اسکی سزائے موت کو حبسِ دوام میں تبدیل کر دیتی ہے اسی طرح میرے دل نے بھی یہ فیصلہ کیا کہ خودکشی کو جلاوطنی سے بدل دیا جائے ۔ دراصل یہ عقل کی بات تھی مگر حیرت ہے کہ اُس وقت میرے دماغ میں کیسے آئی ۔ "اخلاق جلالی" میں جو فلسفۂ اخلاق کی ایک بے نظیر کتاب ہے ۔ انہیں دنوں میں نے پڑھا تھا کہ "دور دراز کا

سفر اختیار کرنا "اس" مرض کا بہترین علاج ہے" مگر اب سوال یہ تھا کہ آخر جاؤں تو کہاں جاؤں اور کس سلسلہ میں جاؤں۔ سیاحت، تجارت، مُلازمت، گداگری، آخر کیا کروں۔ ہر طرف نظر دوڑائی، آخر ایک دیرینہ دوست رشید کی طرف خیال گیا۔ جنکے ساتھ میں نے مسلم ہوسٹل الٰہ آباد میں دو برس گذارے تھے۔ رشید بی، اے' پاس کرنیکے بعد ولایت چلے گئے اور وہاں سے آئی، سی، ایس' ہوکر آئے اور اب دو برس سے بنگال میں کسی جگہ سب ڈویژن آفیسر تھے' ایک مرتبہ یہ بھی سُنا تھا کہ کلکتہ میں ہیں۔ قبل اسکے کہ وہ ہندوستان میں واپس آئیں میری اُنکی خط و کتابت بند ہوگئی تھی لیکن اس سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، کم از کم میرا یہی خیال تھا اور یہ خیال کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ کالج کی تعلیم کے زمانہ میں رشید اور میں دو برس تک ایک کمرے میں رہے تھے۔ بار ہا ایک پلنگ پر سوئے تھے۔ ایک گلاس میں پانی پیا تھا، ایک پلیٹ میں کھانا کھایا تھا۔ ایک دوسرے کے کپڑے پہنے تھے۔ ایکدوسرے کی کتابوں سے کام لیا تھا۔ ایکدوسرے کا روپیہ خرچ کیا تھا حتیٰ کہ ایک دوسرے کی "چوری" نیز "سینہ زوری" میں حصّہ لیا تھا۔ غرض ہر حال میں ایک دوسرے کے شریک رہے تھے۔

رشید کا خیال آتے ہی میں نے اپنا سوٹ کیس نکالا۔ کچھ گرم کچھ ٹھنڈے کپڑے اس میں رکھے۔ ہولڈال میں بستر باندھا اپنے کمرے میں چُپکے چُپکے انہیں تیاریوں میں مصروف تھا کہ اچانک امی جان آگئیں اور مجھے اس حال میں دیکھ کر متعجب ہوکر پُوچھا "کہاں جا رہے ہو" میں نے کہا "کہیں نہیں۔ ذرا لکھنؤ کا ارادہ ہے۔ پرسوں آجاؤنگا انشاءاللہ۔" جس وقت یہ الفاظ میری زبان سے ادا ہُوئے میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایک عجیب قسم کا اضطراب مجھ پر طاری تھا، قدم ڈگمگا رہے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کانپور سے یہ میرا آخری سفر ہے۔ وطن واپس نہ آنے کا میں تہیہ کرچکا تھا۔ امی جان چلی گئیں۔ میں نے پھر اپنی چیزیں درست کرنی شروع کیں۔ میز کی دراز میں سے بٹوا نکالا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں کُل پانچ روپے سوا دو آنے۔ دل دھک سے ہوگیا۔ چکّر سا آنے لگا میں آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ دُنیا کا سفر چاہے وہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو عاقبت کے سفر سے کہیں زیادہ مشکل ہے' وہاں چار آنے کی سنکھیا میں انسان آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے یہاں کلکتہ تک جانے کے لئے کم سے کم دس روپے چاہئیں۔ اسی سوچ میں سر پکڑے بیٹھا تھا کہ اب کیا کروں اتنے میں دروازے پر کسی نے آواز دی۔ یہ ہمارے منشی جی تھے۔ دکانوں کا کرایہ وصول کرکے لائے تھے، اسّی روپے نقد اُنہوں نے میرے ہاتھ میں دئے۔ اسّی روپے یوں بھی اسّی روپے ہوتے ہیں اور اسوقت تو مجھے اسّی اشرفیوں سے زیادہ معلوم ہوئے۔ رات کی گاڑی سے میں کلکتہ روانہ ہوگیا۔ راستہ میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا، بجز اسکے کہ ایک رفیق سفر کا لوٹا گاڑی میں سے فاختہ کی طرح اُڑ گیا۔ صورت یہ ہُوئی کہ وہ گاڑی کا پٹ کھولے دروازے کے کنارے پر بیٹھے منہ دھو رہے تھے اُٹھے تو لوٹا وہیں چھوڑ دیا۔ میں برابر کی سیٹ پر لیٹا تھا۔ ریل پُوری رفتار سے جا رہی تھی' دروازہ کُھلا دیکھ کر میں نے کواڑ جو بھیڑا تو لوٹا آتش بازی کے انار کی طرح سرسراتا ہُوا اُڑتا چلا گیا۔

دوسرے دن شام کو میں کلکتہ پہونچ گیا۔ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں قیام کیا۔ اگلے دن رشید کی تلاش میں نکلا معلوم ہُوا کہ وہ چھ ہفتے کی چھٹی لے کر شملہ گئے ہُوئے ہیں۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ مگر قدرت کو یہی منظور تھا۔ اسلئے کہ اگر رشید اسوقت کلکتہ میں موجود ہوتے تو غالباً میری زندگی میں وہ خوفناک انقلاب کبھی رُونما نہ ہوتا جس نے مجھے "اخلاقی دُنیا" کا بدترین مجرم بنا دیا۔ میں نے گُناہ کئے کر رہا ہوں اور کرتا رہونگا، انکی خوفناک سزائیں پائیں، پا رہا ہوں اور پاتا رہونگا۔ مگر اس سے میری ہمتیں پست اور میرے حوصلے شکست نہیں ہوئے ہیں جو کچھ کرتا ہوں جان بوجھکر کرتا ہوں اور اپنے کسی عمل پر کبھی مُتاسف نہیں ہوتا تکرارِ گناہ سے مرتے دم تک اسی طرح قدرت سے انتقام لیتا رہونگا۔ رشید سے جُدا کرکے قدرت نے میری رُوح پر جو عذاب مُسلط کردیا اُسے آسانی سے نہیں بھلایا جا سکتا معمولی زخم ہوتو بھر جائے، ناسُور کیا بھرے۔ سینہ کے اندر ہر وقت سلگتی رہنے والی آگ اس وقت ذرا بھڑک اُٹھی ہے۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اُسے توجّہ سے سنیئے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے حالات اور خیالات سے واقف ہونیکے بعد آپ کو بھی مجھ سے نفرت ہوجائیگی آپ مجھے سوسائٹی کے لئے ایک مُوذی مرض اور ایک مہلکؔ بالقصوؔ کرنے لگیں گے۔ مگر مجھے اسکی پروا نہیں' ہزاروں بُرا کہنے والوں اور بُرا سمجھنے والوں میں اگر ایک آپ کی ذات بھی شامل ہوجائے تو اس سے میرا کیا بگڑتا ہے۔

ہمارے ہوٹل کا "پختہ کار" مینجر بلا کا عیار تھا۔ میں یقین کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر شیطان کو اسکی شاگردی کا موقع مل جاتا تو وُہ عُمر بھر اپنی اس خوش قسمتی پر ناز کرتا، ناجائز طریقوں سے روپیہ حاصل کرنیکے ہزاروں گُر اُسے یاد تھے۔ ریس (گھوڑ دوڑ) کا اُسے جنون تھا۔ مگر اس دیوانگی میں بھی اسکے ہوش کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ دوسروں کے روپیہ سے کھیلتا۔ ہار ہو تو روپیہ لگانے والے کی اور جیت ہو تو یہ بھی برابر کے شریک۔ اس بدبخت نے چند ہی روز میں مجھے اپنے رنگ پر لگا لیا۔ میرے پاس اوّل تو روپیہ تھا ہی کتنا، خیر جس قدر بھی تھا اس میں سے کچھ تو "ریس بازی" کی نظر ہُوا۔ کچھ ہوٹل کے "بل" میں چلا گیا۔ اب میں بالکل فقیر تھا۔ قرض پر زندگی کا مدار تھا جسکی مقدار ہر روز خوفناک طریقہ پر بڑھتی جارہی تھی' مینجر کی "پُراسرار" عنایتوں کے باعث میری معمولی آسائشوں میں ہنوز کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اب بھی میں اُسی کمرے میں مقیم تھا جس میں پہلے دن آکر ٹھیرا تھا۔ اب بھی مجھے ویسا ہی اچھا کھانا ملتا تھا۔ جیسا نقد قیمت ادا کرنے والوں کو اور بھی جو چھوٹی موٹی ضروریات ہوتی تھیں اُن سب کا سرانجام مینجر کے ذمّہ تھا۔ اُسنے

کبھی ایک لمحہ کیلئے مجھے یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں اس کا قرضدار ہوں میں اپنی سادہ دلی سے اس غیر معمولی مہربانی کو اُسکی شرافت اور نیکدلی پر محمول کرتا تھا مگر درحقیقت وہ مُنفر "شیطنیت" پر مبنی تھی. رفتہ رفتہ وہ مجھ پر اس قدر حادی ہوگیا کہ اسکے ہاتھوں میں میری حیثیت ایک کٹھ پُتلی سے زیادہ نہ تھی، اسکے حکم سے سرتابی کی مجھ میں مجال نہ تھی۔ اب وقت آگیا تھا کہ وہ مجھے اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کیلئے مسمریزم کے ایک معمول کی طرح استعمال کرے۔

اپنے گھر میں بچپن سے اپنے حُسن و رعنائی کا تذکرہ سُنتا آیا تھا جب ہوش سنبھالا تو آئینہ نے اس روایت کی تصدیق کی اور جوانی آئی تو صنفِ نازک کے روز افزوں التفات اور غیر معمولی میلان نے اُسپر مُہرِ توثیق ثبت کردی۔ مجھے اپنی خوبصورتی کا احساس ضرور تھا اور اس پر تھوڑا سا ناز بھی۔ مگر اپنے حُسن و شباب کی تباہ کُن قوتوں کا صحیح اندازہ ہرگز نہ تھا۔ میں ایک جوہر تھا. تراشیدہ، تابشوں سے معمور لیکن جلا کا محتاج۔ حُسن و صورت کیساتھ ساتھ قدرت نے سحرِ گفتار بھی عطا کیا تھا اور یہ وہ تمام چیزیں جو شباب کی متوالی عورتوں کو دیوانہ بنادینے کیلئے کافی ہیں۔ مگر ابتک ان قدرتی صلاحیتوں سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ اُنکے نشو و نما کے لئے ایک خاص قسم کی تربیت درکار تھی جو خدا نہ کرے کہ کسی کو نصیب ہو۔ "پختہ کار" منیجر نے جلد میری ان صلاحیتوں کو سمجھ لیا اور اُنسے کام لینے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ پہلے مجھے ریس کا چسکا لگایا۔ پھر قرض دے دیکر ممنونِ احسان بنایا۔ یہانتک کہ رفتہ رفتہ میری خواہش، میرا ارادہ، میرا اختیار، اسکی خواہش، اُسکے ارادے اور اسکے اختیار کے تابع اور مُطیع ہوگئے۔ اُس نے مجھے سکھایا کہ جھوٹ موٹ عورتوں سے عشق کس طرح کرنا چاہیئے اُنہیں فریب دینے اور اپنی مُحبت میں مبتلا کرنیکے کیا طریقے ہیں۔ اُنکے بٹوے کس طرح خالی کرلئے جاسکتے ہیں۔

مثال بہت رکیک ہی مگر واقعہ کے عین مطابق جس طرح ایک نائکہ اپنی نوخیز نوچیوں کو "تماشبینوں" کے دل چھین لینے کے طریقے سکھاتی ہی۔ ٹھیک اسی طرح منیجر نے میری تربیت کی اور اسکے بعد میرے حُسن و شباب کو فروخت کرنا شروع کردیا کلکتہ میں جس طرح عشرت پسند مرد خوبصورت طوائفوں اور دوسری پیشہ ور یا غیر پیشہ ور عورتوں پر اپنی دولت برباد کرتے ہیں۔ اسی طرح وہاں عیش و عشرت کے گہواروں میں پلنے والی، مغربی آزادی کی فضا میں سانس لینے والی ایسی بہت سی "خوش مذاق" عورتیں بھی ہیں جو اپنے تنوع پسند ذوق کی تسکین کے لئے مردانہ حسن و شباب کو بھاری بھاری قیمتیں دیکر خریدتی اور اس سے لطف اندوز ہوتی ہیں یہ ضرور ہے کہ نسوانی حسن کلکتہ میں ہاتھوں ہاتھ بک جاتا ہی اور بہت اچھی قیمت پاتا ہی مگر وہاں کے "مہذب" و "شریف طبقۂ نسواں نیز دولتمند طوائفوں میں مردانہ حُسن و شباب کے بھی کچھ گاہک نکل ہی آتے ہیں۔ ریس کے سلسلہ میں منیجر کی بہت سے اُونچے اُونچے گھرانوں میں رسائی تھی۔ اس نے ہر جگہ میری غیبت میں کچھ اس طرح میری تعریف کی کہ لوگ مجھسے ملنے کے مشتاق ہوگئے۔ رفتہ رفتہ میرا حلقۂ احباب جس میں بیشتر عورتیں تھیں کافی وسیع ہوگیا۔ کہیں بازار کے سودے کی طرح مجھے خرید لیا گیا۔ کہیں "نشست و برخاست" نے "بے تکلفی" کی صورت اختیار کی۔ بے تکلفی دوستی بنی۔ دوستی عشق و مُحبت میں تبدیل ہوگئی۔ نتیجہ بہرحال واحد تھا۔

منیجر کے حکم کے مطابق مجھے یہ سب روپ بھرنے پڑتے تھے منتیں کیں۔ آہیں بھریں، آنسو بہائے، قدموں پر سر رکھا۔ کیا کیا نہیں کیا۔ مگر میرے جذبات کو اس میں ذرہ برابر دخل نہ تھا۔ محبت کا بہروپ بھرتے بھرتے اور عشق عاشقی کی نقالی کرتے کرتے غالباً مُحبت کا احساس ہی میرے دل سے فنا ہوگیا تھا۔ میری حیثیت اُس بے جان ساز کی سی تھی جس میں کبھی ایسے غم انگیز نغمے نکلتے ہیں کہ سُننے والوں کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہی کبھی ایسا آہنگِ مسرت بلند ہوتا ہے کہ سامعین جوشِ نشاط سے بیتاب ہوجاتے ہیں۔ مگر یہ کیفیتِ تاثر فقط سننے والے ہی تک محدود رہتی ہے خود ساز مُتاثر نہیں ہوتا۔ نہ اُسے غم کا احساس ہوتا ہے۔ نہ خوشی کا۔ دوسرے رُخ سے دیکھئے تو میں گویا ایک مجسمۂ سنگین تھا جسکی پرستش کی جاتی ہے۔ پرستار اپنے جوشِ عقیدت میں کبھی ہاتھ جوڑ کر اُسکے سامنے کھڑا ہوجاتا ہے، کبھی اُس کے قدموں پر سر رکھدیتا ہے۔ کبھی فرطِ رقت سے آبدیدہ ہوجاتا ہی۔ کبھی گڑگڑا کے اس سے اپنی مُرادیں مانگتا ہی۔ مگر پتھر کی بے جان مُورت میں اُسکے جذبات کو سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت کہاں؟ وہ سمجھتا ہے کہ میرا بُت سب کچھ سُنتا ہے۔ سب کچھ دیکھتا ہے۔ سب کچھ محسوس کرتا ہے۔ اور جو کچھ میں اس سے مانگتا ہوں، مجھے دیگا۔ مگر اس آرزو کا بر آنا معلوم جسنِ اتفاق سے اگر کوئی مُراد پُوری ہوجائے تو وہ اسے اپنے "بُت" کی مہربانی پر محمول کرتا ہے۔ وائے نادانی! جس طرح فرطِ عقیدت میں انسان کی آنکھوں پر پردے پڑجاتے ہیں۔ اسی طرح جوشِ مُحبت بھی اُسے اندھا کردیتا ہی۔ مجھے خوب یاد ہیں وہ چاندنی راتیں جب حسین آنکھوں نے میرے لئے آغوش میں آنسوؤں کے دریا بہائے ہیں۔ آہ، مجھے خوب یاد ہیں۔ وہ رنگین خلوتیں جب حُسن کی ناز پروردہ جوانیاں محبت کی بھیک مانگنے کے لئے میرے قدموں پر سرنگوں ہُوئی ہیں۔ آہ سب کچھ یاد ہے۔ مگر کیا یہ نیازِ حُسن میرے قلب کو متاُثر کرسکا؟ نہیں کبھی نہیں۔ ذرہ برابر نہیں۔ میرا دل ایک سنگپارہ سے زیادہ بے احساس ہوچکا تھا۔ ہائے میں نے کیسے کیسے معصوم دلوں کو محبّت کے فریب دیئے۔ کس کس طرح اپنا دیوانہ بنایا اور جب یقین ہوگیا کہ حریف شکست کھاگیا۔ یعنی میری جھوٹی محبت کے جال میں پھنس گیا تو پھر کیسا کیسا اُسے تڑپایا ہی۔ کس کس بیدردی سے اُسے ذبح کیا ہے، اسلئے ہرگز نہیں کہ کسی کو مُبتلائے اذیت دیکھکر مجھے مسرت ہوتی تھی۔ نہیں میری رُوح ہنوز اس درجہ مسخ نہیں ہُوئی تھی، میرا مقصد فقط اپنے حسن و شباب کی قیمت وصول کرنا تھا۔ اب زیادہ سے زیادہ جس قدر بھی وصول ہوسکے اور جس جس تدبیر سے وصول ہوسکے، منّت سے یا ستانے سے۔ مجھے بہرحال اپنے

کام سے کام تھا۔

بعض اوقات جب کچھ اور ملنے کا امکان نہ ہوا تو میں نے قیمتی ساڑیاں تک لے لینے میں دریغ نہیں کیا۔ غرض جھوٹی محبت کی مجھے ایسی ایسی بھاری قیمتیں دی گئیں۔ میرے فریب کی قربانگاہ پر ایسی ایسی گرانبہا قربانیاں پیش کی گئیں کہ اُنکی مثال شاید ہی مل سکے۔ مگر یہ سب کچھ منیجر کا "حق" تھا۔ قیمتی لباس، عمدہ کھانا، سجا ہوا کمرہ، اور موٹر کی سیر، بس یہ میرا حصہ تھا۔ ہاں کبھی کبھی ریس کھیلنے کے لئے دس بیس روپے بھی مل جاتے۔ یہ بدبخت منیجر شیطان کی طرح میری رُوح پر مسلط ہوگیا تھا۔ میں اُسکے اشاروں پر چلتا تھا، خدا جانے اُس نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا کہ میں کسی بات میں اسکی مخالفت کر ہی نہ سکتا تھا۔ پہلے پہلے مجھے اس کام سے سخت نفرت ہوئی مگر رفتہ رفتہ وہ نفرت محض کراہت بنکر رہ گئی۔ کچھ مدت کے بعد یہ احساس بھی فنا ہوگیا اور اس قسم کا ہر عمل ایک مشین کی طرح مجھ سے صادر ہوتا تھا۔ آہ، قدرت اگر رشتۂ بیوفائی پر آمادہ نہ کر دیتی تو کیا میری یہی حالت ہوتی؟ جسوقت یہ خیال آتا ہے تو میں غم و غصہ سے دیوانہ ہو جاتا ہوں اور جوشِ غضب میں اپنے اس عہد کی تجدید کر لیتا ہوں کہ جب تک دم میں دم ہے گناہ کر کے قدرت سے اس بدسلوکی کا انتقام لونگا جس نے میری روح اور میرے جسم کی تمام راحتوں کو ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھین لیا۔ کہاں تک کہے جاوں۔ یہ مجذوب کی بڑ کہیں ختم ہونیوالی ہے۔

ہاں تو جو بات میں کہنے والا تھا وہ رہ گئی۔ جذبات کے ہیجان میں سب کچھ بھول گیا۔ ان دنوں میری خریدار ایک ایرانی "خانم" تھیں۔ اُن کا سن چالیس سال سے کم نہ تھا۔ رخساروں پر غازہ کی سُرخی کے سوا جسے وہ کثرت سے استعمال کرتی تھیں اب جوانی کی اور کوئی نشانی اُن میں باقی نہ تھی۔ مگر بوالہوسی کے لئے عمر کی قید نہیں۔ بلکہ بعض لوگوں کا تو خیال ہے کہ ؎

جوانی سے زیادہ وقتِ پیری جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

جوش سے مُراد غالباً فرطِ ہوس ہے۔ یہی حال اُن "خانم" کا تھا۔ مگر اُن کی ٹھنڈی گرمیاں جلد ہی میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئیں، اسلئے میں نے اب وہاں نہ جانیکا تہیہ کر لیا تھا۔ منیجر میری اس "حماقت" سے سخت ناراض تھا، بہرحال میں نے اس سے وعدہ کیا کہ دو تین ہفتے کے اندر اندر انشاءاللہ اس سے زیادہ موٹا شکار پھانس کر دکھا دونگا۔ اسی فکر میں کئی دن سے سرگرداں پھر رہا تھا، مگر ہنوز کامیابی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ انہیں خیالات میں غلطاں پیچاں ایک دن صبح کے وقت میں ہوٹل سے نکلا۔ کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ میں اپنے افکار میں اُلجھا ہوا گرد و پیش سے بالکل بے خبر، سڑک پر خاموش چلا جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک موٹر آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں بے خیالی میں اپنے داہنے ہاتھ کو ہٹ گیا، چشم زدن میں موٹر بالکل سر پر آپہونچی، اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور فی الفور میں نے پوری قوت سے بائیں جانب کو جست کی۔ موٹر نکل گئی۔ میں بچ گیا۔ بس یہیں تک مجھے یاد ہے۔ اسکے بعد جو کچھ ہوا اس کا حال دوسروں سے سُنا۔ کیونکہ جب میں نے آنکھ کھولی اور ہوش آیا تو اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ سارا بدن زخموں سے چور، کپڑے خاک آلودہ، خون میں شرابور، سر میں سخت چوٹ آئی تھی۔ تکلیف سے بُرا حال تھا۔ میں نے ایک آہ کی اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔

کسی نے مجھ سے پوچھا "کیا حال ہے"۔ یہ آواز نہ تھی۔ موسیقی کی ایک موج تھی جس سے میرے قلب میں ایک کیفیتِ اہتزاز سی پیدا ہوگئی، میں نے فوراً آنکھیں کھولدیں۔ ایک جوان خاتون میرے سرہانے کھڑی تھی، فرنگیوں کا سا گورا بھبوکا رنگ، سُنہری بال، مگر نقوش ہندوستانی، کالی ساڑی میں گورا مکھڑا ایسا پیارا معلوم ہوتا تھا جیسے آدھی رات کو چودھویں رات کا چاند۔ ساڑی پر سفید ستارے ٹکے ہوئے تھے۔ تھوڑی سی دیر کے لئے میں اپنی تکلیف کو بھول گیا اور میں نے اسکے چہرہ پر نظر جمادی، وہ سخت پریشان معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے پھر اپنا سوال دُہرایا۔ میں نے پھر اپنے دل میں ایک سنسنی سی محسوس کی۔ مسکرا کر میں نے کہا "اچھا ہوں"۔ میرے اس جواب سے وہ پھول کی طرح شگفتہ ہوگئی۔ گلابی ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ مجھے ایک کمرہ میں لے جایا گیا۔ جہاں میرے زخموں کی مرہم پٹی کی گئی، اسکے بعد ایک بڑے کمرے میں جہاں اور بھی کئی مریض تھے مجھے ایک پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ نرس سے میں نے پوچھا "یہ کالی ساڑی والی عورت کون تھی؟" اُس نے مسکرا کر جواب دیا "آپ کی قاتل"۔ میں کچھ نہ سمجھا۔ مجھے حیران دیکھکر نرس نے کہا "جسوقت آپ نے سامنے سے آنیوالی موٹر سے بچنے کے لئے بائیں جانب کو جست کی، پیچھے سے ایک اور موٹر آرہی تھی۔ یکایک آپ اُسکے سامنے آگئے۔ ٹکر ہوئی آپ تیورا کر گرے اور بیہوش ہو گئے۔ فوراً ہی آپ کو اُسی موٹر میں ڈال کر یہاں لایا گیا۔ یہ اُس عورت کا بیان ہے۔ اب خدا جانے اسمیں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ"۔

"مگر اس عورت کا اس حادثہ سے کیا تعلق ہے؟" میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

"صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ موٹر چلا رہی تھی اور آپکو کچل دیا"۔ نرس نے ایک شوخ مسکراہٹ کیساتھ جواب دیا۔

"اچھا تو وہ خود ہی مجھے موٹر میں ڈال کر یہاں لائی ہے"۔

"جی ہاں وہ خود۔ بڑی رحمدل ہے بے چاری"۔

ہسپتال میں کوئی تین ہفتے مجھ پر سخت تکلیف کے گذرے ۔ شدّت کا بخار آیا ۔ مگر جلد ہی میری حالت دُرست ہوگئی ۔ سر کا زخم بھی جو بظاہر اندیشہ ناک تھا رفتہ رفتہ اچھا ہو رہا تھا ۔ میری جسمانی اذیت منیجر کے لئے بظاہر حد درجہ اندوہناک تھی ۔ وہ ہر وقت میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا اور ہر طرح تسلی دیتا تھا ۔ مگر درحقیقت وہ اپنے دل میں اس حادثہ سے بیحد مسرور تھا اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں سوچ رہا تھا ۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتا تھا "بھیا! خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ۔ نہ جانے اس میں اُسکی کیا مصلحت تھی ۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے بندوں کی بہتری کے لئے کرتا ہے ۔ بہت ممکن ہے کہ اس حادثہ اور مصیبت میں بھی ہماری کوئی بھلائی اُسکے مدنظر ہو اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۔ تکلیف کے بعد راحت لازمی ہے دیکھو تو پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔"

نرس کے بقول میری "قاتل" یعنی سیاہ ساڑی والی خاتون اس دوران میں کئی بار مجھے دیکھنے ہسپتال آئی وہ اس حادثہ سے حد درجہ متاثر معلوم ہوتی تھی ۔ منیجر نے مجھے بتایا کہ وہ ایک لکھ پتی کی بیوہ اور ایک بہت بڑی جائداد کی تنہا مالک تھی ۔ منیجر کے اور میرے درمیان اب اکثر اُسکے متعلق گفتگو ہوا کرتی تھی ۔ ہم نے اپنی مصلحتوں اور اسکی دولت کی مناسبت سے اس کا نام "لکشمی" رکھ لیا تھا ۔ منیجر کو یقین تھا اگر میں نے اُسکے مشورہ پر عمل کیا تو ایک نہایت معقول رقم "لکشمی" سے وصول ہو جائیگی ۔

کلکتہ کے دوران قیام میں کتنی ہی کافر جوانیوں سے میں کھیل چکا تھا ، میرے نزدیک اُنکی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہ تھی حُسن و شباب کی ساحرانہ قوتیں اب مجھے متاثر نہ کرسکتی تھیں ، رشید کی بیوفائی کے بعد محبت کو میں حماقت و دیوانگی کا مجموعہ اور فطرت انسانی کی بدترین کمزوری سمجھنے لگا تھا ۔ اگر کوئی یہ کہتا کہ مجھے فلاں سے محبت ہے تو میرے نزدیک اس کے معنی ہوتے کہ یا تو شخص خود کسی کو فریب دے رہا ہے یا کسی کا فریب کھا رہا ہے ۔ محبت کرنے کی صلاحیت مجھ میں اتنی بھی باقی نہ رہی تھی جتنی ایک اندھے میں دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں امتیاز کرنے کی ہوتی ہے ۔ میرے لئے صرف وہی عورت دلچسپی کا باعث ہوسکتی تھی جو میری گرمیٔ آغوش بھاری قیمت دیکر خرید سکتی تھی ۔ مگر دُنیا میں ایسا بھی ہُوا ہے کہ صدیوں سرد و خاموش پڑے رہنے کے بعد بعض پہاڑ یکایک پھٹ جاتے ہیں اور شعلہ فشانی شروع کردیتے ہیں ، آگ کا ایک دریا اُنکے دہانے سے اُبلتا ہے اور جدھر رُخ کرتا ہے تمام ترسب کچھ جلا کر خاکستر کردیتا ہے ۔ ٹھیک یہی میری حالت ہوئی میرا مُردہ اور بے احساس دل جو مدتوں سے ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی طرح سرد پڑا تھا اور محبت کی گرمی سے یکسر محروم ہو چکا تھا اب پھر اچھلا ، اس میں حرارت زندگی کی ایک موج پیدا ہوئی پھر اُس نے درد محبت کا احساس کیا ۔ پھر اس میں نشتر کی ایک نوک سی چبھتی ہوئی معلوم ہوئی ۔ پھر کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو دل کے گوشہ گوشہ میں انگڑائیاں لینے لگی اور اس انقلاب کا باعث وہی فتنہ گر تھی جس نے مجھے چند دن کیلئے زندگی سے دُور اور موت سے بہت قریب کردیا تھا ۔

پہلی بار جب میں نے ہسپتال میں اُسکی آواز سُنی مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ میری روح کے بربط کا ہر تار اس صدائے نغمہ سے گونج اٹھا ۔ پھر جب پہلی مرتبہ میں نے اُسکی صورت دیکھی مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے بہت سے پردے میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے جیسے میں سوتے سوتے جاگ اُٹھا ، میرا دل پتھر تھا ، مگر اس پتھر پر ایک نقش بن گیا گہرا نقش ، آسانی سے نہ مٹنے والا ۔ پہلے اس نقش کی حیثیت ایک "خاکہ" سے زیادہ نہ تھی ۔ مگر رفتہ رفتہ وہ ایک رنگین تصویر بن گیا اور ہر وقت پیش نظر رہنے لگا ، منیجر صاحب سے میں نے اس کو چھپایا ۔ میں اس سے ڈرتا تھا ۔ وہ لکشمی سے ایک "معقول رقم" وصول کرنے کی فکر میں لگا ہُوا تھا ۔ بظاہر میں اسکی ہاں میں ہاں ملا دیتا تھا مگر میرا دل ہرگز اس "کمینہ پن" میں شریک ہونے کیلئے تیار نہ تھا ۔

ایک دن جب کہ میں ہسپتال میں تنہا بیٹھا ہُوا تھا لکشمی آئی اس نے کہا "شاہد صاحب ! آج مجھے آپ سے کچھ خاص باتیں کرنی ہیں ۔ ایک التجا آپ کے پاس لیکر آئی ہوں اور مجھے آپکے اخلاق و شرافت سے توقع ہے کہ آپ مجھے مایوس نہ کرینگے ۔ شاید آپ کو یقین نہ ہو مگر میں خدا کو گواہ کرکے کہتی ہوں کہ اس حادثہ سے آپ کو جو کچھ تکلیف پہونچی اس کا مجھے بیحد افسوس اور صدمہ ہے ۔ مگر ساتھ ہی آپ کو معلوم ہے کہ میں بالکل بے قصور ہوں میں نے موٹر کو روکنے اور بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر بدقسمتی سے آپ اتنے قریب اور اس طرح سامنے آگئے تھے کہ ٹکر ہوئے بغیر نہ رہی ، آپ کے چوٹ لگی اور بہت لگی اور اب اتنے دنوں سے آپ ہسپتال میں تکلیف اُٹھا رہے ہیں ۔ مجھے آپکے نقصان کا اچھی طرح احساس ہے مگر میں پھر وہی عرض کرونگی کہ خطا میری نہیں ۔ قدرت کو یہی منظور تھا ۔ حادثات کو کوئی روک نہیں سکتا ۔ بہر حال میں اسکے لئے بخوشی تیار ہوں کہ جس طرح آپ پسند کریں آپ کے نقصان کی تلافی کردوں ۔ آپکے منیجر صاحب کئی بار دیوانی و فوجداری میں مجھ پر دعوے

کرنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔ پولیس نے الگ مقدمہ چلایا ہے اور یہ بھی مینیجر صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اُنھوں نے نہ صرف پولس کو میری آزار رسانی پر آمادہ کیا ہے۔ بلکہ کچھ دے دلا کر دو تین جھوٹے گواہ بھی تیار کر لئے ہیں۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حادثہ کی ذمہ دار میں ہوں Wrong side. Negligence. Rash driving. کونسا جرم ہے جس کا ارتکاب میں نے نہیں کیا۔ خیر پولس اور مینیجر صاحب جو کچھ بھی کہیں۔ مگر مجھے کم سے کم آپ کی ذات سے اُمید ہے کہ آپ ایک بے قصور کو خطا وار نہ ٹھہرائیں گے۔ اور کل مجسٹریٹ کے سامنے وہی بات کہیں گے جو حق ہے۔ یہ ہرگز خیال نہ کیجئے میں الزام سے بری ثابت ہونیکے بعد اپنا وعدہ پورا نہ کروں گی۔ نہیں جو کچھ کہہ رہی ہوں اُسکے لئے تیار ہو کر آئی ہوں۔ آپ جو کچھ فرمائیں اسی وقت حاضر کر سکتی ہوں۔ ساتھ ہی ایک بات اور بھی عرض کر دوں۔ آپ باور کیجئے کہ میں آپکے مینیجر صاحب کی دھمکیوں سے خوفزدہ ہو کر ہرگز یہ درخواست لیکر آپ کے پاس نہیں آئی ہوں۔ بلکہ مجھے آپکی تکلیف اور آپکے نقصان کا کامل احساس ہے اور اس کی تلافی جس طرح بھی ممکن ہو میرے نزدیک لازمی ہے۔ بالفرض میری غلطی ثابت بھی ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ عدالت مجھ پر کچھ جرمانہ کر دے مگر اس سے آپ کو کیا ملے گا آپ خود جو جی چاہے مجھ پر جرمانہ کر دیجئے۔ میں بخوشی اُسے ادا کر دونگی"۔

لکشمی جس وقت یہ باتیں کہہ رہی تھی میرے دل کا کچھ عجیب عالم تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لکشمی بے قصور ہے۔ خطا درحقیقت میری تھی مگر میں مینیجر سے وعدہ کر چکا تھا کہ مجسٹریٹ کے روبرو لکشمی کو قصور وار ثابت کر دونگا ایک طرف مینیجر کی شیطانی قوت میری روح پر بُری طرح مسلط تھی۔ دوسری طرف شرافت کا احساس جو مدت ہوئی مٹ چکا تھا۔ خدا جانے کس طرح پھر ایکبار میرے قلب کی گہرائیوں میں موجزن ہو گیا تھا اُسکے ساتھ ساتھ محبت کا وہ جذبہ بھی اپنا عمل کر رہا تھا جسے میں نے سب سے چھپا کر اپنے بے احساس دل کے ایک گوشہ میں جگہ دی تھی۔ بہرحال میں نے خود کو سنبھالا۔ اور تمام مصلحتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ جواب دیا کہ "قصور وار کون ہے اس کا صحیح علم کم از کم مجھے نہیں۔ رہ گیا تلافی کا سوال تو اسکے متعلق مینیجر صاحب سے مشورہ کئے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا"۔ لکشمی مایوس ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ چلتے وقت اُس نے کچھ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ میں خود اپنے نامہربان جواب سے شرمندہ ہو گیا۔ دوسرے دن میں، لکشمی، مینیجر، پولس کا داروغہ، سپاہی، جھوٹے گواہ، سب مجسٹریٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے جو بیان دیا اس کا خلاصہ یہ ہے

کہ "غلطی سراسر میری ہے۔ لکشمی ہرگز حادثہ کی ذمہ دار نہیں"۔ صرف میرے بیان نے مقدمہ کا خاتمہ کر دیا۔ پولس کی شرمندگی، مینیجر کی برہمی، لکشمی کی حیرت اور میری خوشی اس وقت دیکھنے کے قابل تھی۔ اس واقعہ نے آنِ واحد میں لکشمی کو مجھ سے اور مجھے لکشمی سے بہت قریب کر دیا۔

دوسرے دن لکشمی نے مجھے اپنے یہاں چار پر بلایا۔ نہ جانے آج کتنی مدت کے بعد مجھے حقیقی مسرت کے چند لمحے نصیب ہوئے تھے۔ لکشمی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ خدا جانے کیوں ہم دونوں خاموش تھے۔ میرا دل کسی قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے زبان سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا تھا جو میرے جذبات کی غمازی کر سکے مگر آنکھیں زبان کی قائم مقام بن کر دل کی ترجمانی کا فرض بخوبی ادا کر رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میری اس کیفیت سے لکشمی بھی متاثر ہو رہی ہے۔ مگر برابر اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ دل کی چوری کھلنے نہ پائے۔ آخر میں نے کہا "لکشمی دیوی! آپنے میرا قصور معاف کر دیا؟" لکشمی نے حیران ہو کر پوچھا "آپ کا قصور؟ آپ نے کونسا قصور کیا ہے؟" میں نے کہا "میں سخت شرمندہ ہوں کہ پرسوں ہسپتال میں میں نے آپ کو مایوس کُن جواب دیا اور اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کیا۔ بلکہ پردے پردے میں آپ کو قصوروار ٹھہرایا"۔

لکشمی نے کہا "شاہد صاحب! گئی گذری باتوں کا اب ذکر نہ کیجئے۔ مجھ پر آپنے جو احسان کیا ہے اگرچہ وہ آپ جیسے ایک شریف انسان کے ظرف کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مگر میری توقعات سے یقیناً کہیں بڑھکر ہے اب آپ سے ایک التجا ہے۔ کیا آپ اُسے قبول کرینگے"۔ میں نے کہا "بسر و چشم"۔ لکشمی یہ سُن کر اُٹھی۔ برابر والے کمرے میں جاکر میز کی دراز میں سے کوئی چیز نکالی اور واپس آکر ایک لفافہ بند میرے سامنے رکھدیا اور کہا "یہ آپکی امانت ہے" میں کچھ نہ سمجھا، لفافہ اُٹھا کر کھولا۔ اس میں سو سو روپے کے نئی نوٹ تھے کتنے تھے۔ یہ نہیں معلوم۔ میں نے شمار نہیں کئے۔ لکشمی کا مطلب سمجھ گیا۔ گویا یہ روپیہ میری اس تکلیف کا معاوضہ تھا جو موٹر کے حادثہ سے مجھے پہونچی تھی۔ نہایت بے اعتنائی کے ساتھ وہ لفافہ لکشمی کے سامنے ڈالتے ہوئے میں نے کہا "مجھے آپ سے ایسی اُمید نہ تھی کہ آپ گھر بلا کر مجھے اس طرح ذلیل کرینگی"۔ لکشمی اس جواب کے لئے تیار نہ تھی، وہ سخت مضطرب ہو کر بولی "نہیں نہیں خدا کے لئے آپ میرے مفہوم کو غلط نہ سمجھیئے۔ میرے ساتھ بے انصافی نہ کیجئے کیا اس کا امکان بھی ہے کہ میں آپ کو گھر بلا کر شرمندہ کروں۔ کیا میں آپکے نزدیک ایسی ہی ذلیل ہوں"۔ لکشمی کے ان الفاظ نے مجھے لاجواب کر دیا۔ کچھ دیر تک پھر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے آخر میں نے ہی ابتدا کی

میں نے کہا "لکشمی دیوی، شاید آپ کو معلوم ہے کہ منیجر صاحب میرے ہمدرد، دوست، خیرخواہ اور محسن ہیں۔ مقدمہ خارج کرا کے میں نے اُنہیں بیحد ناراض کردیا ہے۔ پرسوں، مقدمہ سے پہلے میرے نقصان کی تلافی کے طور پر ایک معقول رقم آپ مجھے دینا چاہتی تھیں۔ مگر میں نے نہیں لی۔ غالباً آپ ان تمام باتوں کو میری شرافت اور نیکی پر محمول کرتی ہونگی۔ مگر درحقیقت ایسا نہیں۔ کاش میری ذات میں اتنی شرافت اور نیکی موجود ہوتی۔ اپنی کمزوریاں اور عیوب کوئی دوسروں پر ظاہر نہیں کیا کرتا مگر بعض اوقات انسان اسکے لئے مجبور ہوجاتا ہے۔ آپ باور کیجئے کہ میں نے جو کچھ کیا وہ محض خودغرضی کی بنا پر تھا"

"مگر اس میں آپ کی کیا غرض تھی؟" لکشمی نے میرا قطع کلام کرکے کہا۔

"غرض یہ تھی کہ میری وجہ سے منیجر صاحب اور پولس نے آپ کو جو ذہنی اذیت پہونچائی تھی اسکی تلافی ہو جائے"

"اوہ، شاہد صاحب!" لکشمی نے صرف اتنا کہا۔ اسوقت وہ تشکر و امتنان کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:-

"اسکے علاوہ ایک اور بات بھی تھی"

"وہ کیا؟"

لکشمی کے اس سوال کا جواب میں نے الفاظ میں نہیں دیا بلکہ ہاتھ بڑھا کر لکشمی کا ہاتھ تھام لیا۔ پہلے اُسے اپنی آنکھوں سے لگایا، پھر ہونٹوں سے۔ لکشمی نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے ایک لرزش سی اُسکے ہاتھ میں محسوس ہوئی۔ میرا خود تمام جسم کانپ رہا تھا، دل کی اس وقت جو حالت تھی۔ بیوفا رشیدہ سے جُدا ہونیکے بعد آج پہلی بار مجھ پر طاری ہوئی تھی۔

وقت گذرتا گیا اور ہم ہر روز ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے منیجر کی برہمی ہمارے اس بڑھتے ہوئے ارتباط کو دیکھکر گھٹتی جارہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جلد وہ مجھے اپنی راہ پر لگا لیگا۔ اور مقدمہ خارج کرا کے میں نے اس کا جو مالی نقصان کیا تھا۔ اسکی تلافی کی صورتیں نکل آئیں گی۔ لیکن میں تہیہ کرچکا تھا کہ اِدہر کی دُنیا اُدہر ہوجائے مگر لکشمی سے ایک پیسہ نہ لونگا۔ واقعہ یہ ہے کہ رشیدہ کی بے وفائی نے میرے قلب میں جو ناسُور ڈالدیئے تھے لکشمی کی وفاپرستیوں نے اُنہیں مندمل کردیا۔ جسمانی راحتیں اور روحانی مسرتیں اب قدم قدم پر مجھ سے ہم آغوش ہوتی تھیں۔ کمر تک پہونچنے والے لکشمی کے سُنہرے بال جس وقت میرے بازو پر بکھرے ہوتے تھے اور اُسکی گداز مرمریں بانہیں میری گردن کے گرد حلقہ کئے ہوتی تھیں اس وقت میری ایسی حالت ہوتی —— آہ کن الفاظ میں بیان کروں کیسی حالت ہوتی تھی لکشمی کی دولت، لکشمی کا جسم، لکشمی کی روح ہر چیز میری ملکیت تھی۔ چند روز اس طرح گذرے۔ دولت، حسن، جوانی، محبت اور آزادی جب یہ سب ایک جگہ جمع ہوجائیں تو پھر کونسی تمنا ہے جو پوری نہ ہوسکے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ سب کچھ مل جانیکے بعد اور رہ بھی کیا جاتا ہے جسکی انسان تمنا کرے۔ مگر افسوس، حصولِ آرزو کے بعد محبت کی زندگی شفق اور دھنک کی رنگینیوں سے زیادہ ناپائدار ثابت ہوتی ہے۔ چاہت کی آگ رفتہ رفتہ سرد پڑنے لگی۔ نفس کی کمینگی جس پر تھوڑی سی مدت کے لئے شرافت نے غلبہ پالیا تھا۔ پھر اُبھر آئی۔ پہلے مجھے خود لکشمی سے محبت تھی اب میں فقط اسکے روپیہ کو چاہتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ لکشمی نے میری خاطر اپنی دولت پانی کی طرح بہائی۔ تقریباً ہر ہفتہ میں ریس میں کچھ نہ کچھ ہارتا تھا لکشمی مجھے بہت کچھ دیتی تھی اور اس طرح کہ گویا قرض ادا کررہی ہے۔ احسان جتانا تو کجا احسان کرکے اُلٹی ممنون ہوتی تھی۔ بایں ہمہ میرے نفس کی دنائت روزافزوں ترقی پر تھی۔ آخر لکشمی کو بھی اس کا احساس ہوگیا۔ اس نے مجھے سنبھالنے کے لئے ہاتھ روک لیا۔ میں اور بھی بگڑ گیا۔ اب اُسکو اتنی بھی اجازت نہ تھی کہ اُسکے ہونٹ میرے لبوں کو چھُو سکیں۔ میرا کھنچنا اُس کے لئے قیامت ہوگیا۔ خوابِ راحت کی خوگر آنکھیں جنہیں قدرت نے جادوگری کے لئے بنایا تھا اب جاگنے اور آنسو بہانے کے لئے وقف تھیں۔

ایکدن شام کے وقت میں لکشمی کے ہاں گیا وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے کوچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُسکے سُنہرے بال بُری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے چُپکے سے اسکے مُنہ پر مُنہ رکھدیا وہ بیتاب ہوکر اُٹھ بیٹھی۔ میرے گلے میں بانہیں ڈالدیں۔ اُسوقت اسکی حالت بالکل دیوانوں کی سی ہورہی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ اس وقت لوہا گرم ہے زور سے ضرب لگانی چاہیئے۔ وہ کسی طرح مجھ سے جُدا ہونا نہ چاہتی تھی۔ مگر میں نے بزور اُسے اپنے سے علیحدہ کیا اور کہا "لکشمی دُنیا میں ہر چیز قیمت سے ملتی ہے، میرے آغوش کی بھی ایک قیمت ہے۔ خدا نے تمہیں اس قابل کیا ہے کہ تم پوری قیمت دیکر اسے خرید سکتی ہو۔ میں ضرورتمند ہوں۔ اسلئے قیمت لینے پر مجبور ہوں ورنہ تم جانتی ہو کہ میں نے کبھی اسکی پرواہ نہیں کی"

میرے یہ الفاظ سُن کر لکشمی یکایک سنبھل گئی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا کہ اسوقت کس قسم کے جذبات اسکے قلب میں موجزن ہیں۔ تاہم اتنا ضرور اندازہ ہوا کہ اس کا جوش سرد پڑگیا۔ اسکی آنکھوں میں اور چہرے پر برہمی، نفرت اور حقارت کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے نہایت متانت سے کہا "کیا قیمت ہے تمہارے آغوش کی؟" میں ہچکچانے لگا۔ دلمیں سوچا کہ اب کیا مانگوں۔ وہ ایک

ہیرے کی انگشتری پہنے ہوئے تھی، بہت بڑا اور تابناک ہیرا۔ میں جوہری نہیں تاہم میرا خیال تھا کہ اس ہیرے کی قیمت ہزار بارہ سو سے کم نہ ہوگی۔ انگشتری کی طرف اشارہ کرکے میں نے کہا "یہ انگوٹھی"۔ لکشمی نے فوراً انگوٹھی اپنی انگلی سے اُتار کر میرے سامنے پھینکدی میں نے اُسے اُٹھا کر پہن لیا اور دل ہی دلمیں خوش ہوتا ہوا لکشمی کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی میں نے اسکی طرف ہاتھ بڑھایا اور اُسے آغوش میں لینا چاہا اس نے زور سے میرے منہ پر ایک طمانچہ مارا اور نہایت غضبناک آواز اور حقارت آمیز لہجہ میں کہا "نکل جا یہاں سے، پاجی، کمینے!" اتنا کہکر اُس نے اپنے ڈرائیور کو آواز دی۔ وہ فوراً آیا۔ لکشمی نے اس سے کہا "شاہد صاحب کو ہوٹل پہونچا دو"۔ میں سر جھکائے خاموش اسکے کمرہ سے نکل آیا۔ اس ذلت نے میرے جذباتِ غیرت کو ذرا ہی دیر کے لئے برانگیختہ کیا۔ مگر دُودھ کے اُبال کی طرح جلد ہی یہ عارضی طوفان فرد ہو گیا۔ منیجر کو میں نے کُل واقعات سُنائے۔ اس نے پوری داستان سُن کر بہت کچھ میری تسلی تشفی کی اور کہا کہ "بھیا خدا روزی رساں ہے ایک در بند تو ستر در کھُلے۔ خدا تمہیں زندہ سلامت رکھے لکشمی جیسی ہزاروں چھوکریاں تمہاری جُوتی کی نوک پر سے قربان ہیں"۔ انگشتری دیکھکر وہ بے انتہا خوش ہُوا اور کہا کہ پندرہ سو سے کم اس کی قیمت نہ ملیگی۔ اس خیال سے میرے بھی کچھ آنسو پُچھ گئے کہ خیر جو ہُوا سو ہُوا ایک معقول رقم تو ہاتھ آئی۔ اگلے دن ہم دونوں وہ انگشتری فروخت کرکے ارادہ سے ایک بڑے جوہری کی دُکان پر گئے۔ بُڈھے جوہری نے انگشتری کو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھا پھر مُسکرا کر بولا "بابو جی کسی نے خوب آپ کو بیوقوف بنایا۔ یہ تو امی ٹیشن (نقلی) ہے"۔

چند روز ہوئے میں کلکتہ گیا تھا۔ اُس شخص کو میں نے دیکھا جس کی عبرتناک داستان سچی کہانی کے عنوان سے پیش کی گئی ہے۔ دیکھکر کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ یہ شخص کسی زمانہ میں مردانہ حُسن کا مجسمہ رہ چکا ہے۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہُوئے ہیں۔ زرد رنگت، پچکے ہوئے گال۔ لاغر جسم، پریشان بال، جھاڑ جھنکاڑ کی طرح اُلجھے ہوئے میلے کُچیلے کپڑے۔ شراب کے نشہ میں چُور، ہوٹل کے برآمدہ میں ایک ٹوٹی ہُوئی چارپائی پر نیم بیہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ میرے ایک دوست نے جو واقفِ حال تھے اور خود اُسی کی زبانی اُسکی رام کہانی سُن چکے تھے، اسکے حالات زندگی مجھ سے بیان کئے اُسے دیکھکر اور اسکی داستانِ حیات سُن کر میرا دل لرز گیا، جہانتک واقعات و خیالات کا تعلق ہے میں نے مطلق تصرف نہیں کیا ہے۔ البتہ الفاظ میرے ہیں +

پریم پُجاری

ہم اور سینما

شام بھری تھی، آواز آئی   "جاجا! گاڑی جلدی لے آ"
ہم نے جانا، کام ضرورت ہے   فوراً اُٹھ کر پان بنایا
ایسے آئے، ہولے ہولے   دل نے پکارا، جان ہو صدقا
ہے ہے، ایسی جلدی کیا ہے   جیسے کہیں ہو خزانہ ملتا!

ہاتھ کو پکڑا، موٹر بیٹھے ۵ آن کی آن میں، ہم تھے، اندھیرا
گھنٹے گذرے، گھڑیاں گذریں   ہر ساعت اک سال تھی گویا
بارے شکر ہے، گھر کو پہنچے   کتنا خوش تھا چہرہ کسی کا
اپنی خوشی تو اس لئے تھی بس   پاس تھا اپنا من سُکھ، پیارا
کس کو خبر، یہ ظلم بھی ہوگا   گھر چل کر، ہے راستے بھی دبنا

آتے ہی پوچھا خوش ہو، ہو کر ۱۰ "فلم تھی کیسی، کیسا قصہ؟"
"کیا کہنے، کیا لُطف ہو جیسے   کانی کو ٹھُڑی، اور کلکتا!"
جل کے کہا "کیا مطلب تیرا؟   پڑھ کے بھی ہو انسان، نہ طوطا"
"اب سے نہ لینگے ساتھ کبھی پھر   یوں ہی اگر ہے خرچہ کرنا"
"آپ کا احساں، آپ کی منت   آپ کا اُپکار، آپ کی کرپا!"

خط ہے کسی کا، اپنی منشا ۱۵ ورنہ کھیل کی کس کو تمنا
وہ تو، جلوہ تھا بھی کسی کا   ورنہ گھُٹ کر دم ہی نکلنا
ہم نے وہ دیکھا کھیل، ہی نیارا   جس کے آگے ہیچ ہے دُنیا
اپنی فلم، اور اس کا مقابل!   راجہ بھوج، و رتیلی گرڈوا!"
"ہم بھی تو دیکھیں، فلم وہ کیسی!   ہے وہ کیا آکاش کا تارا!"

"جی، نہیں بخشیں، یہ نہیں منشا! ۲۰ آپ کبھی اس میں لیں کچھ حصہ!
جن کو پُتلوں سے ہو چسکا   اصلی فلم کا لُطف انھیں کیا!
اس کا مزہ کچھ وہ ہی جانیں   جن پہ پڑی ہو ایسی بپتا!
"ہم بھی تو جانیں، بپتا کیسی!   کیسی فلم، اور کیسا قصہ!
غیر برابر، اس کو مانیں   حکم ہمارا جس نے ٹالا!"

"اچھا، لیجئے، بتائیں سب کچھ! ۲۵ یہ تو ہے، پر، انصاف نرالا!
غیر کی فلم کو پیسے خرچے   اپنی فلم کو حکم چلایا!"
"واں تو دُنیا ہوں دو اک رُپئے   یہ لے، سارا خریطہ تیرا!"

دیکھئے! وہ اک عورت آئی   جس پہ ہے سارا زمانہ مرتا
کس نے اس کو کیا نہ سراہا   جگ کی کھلیں نہ زبانیں کیا کیا:

(آنکھ میں جادو، منہ میں امرت ۳۰ لب پہ تجلی، رُخ پر تڑکا
گال پہ تیرے زلف، کہ تیرے   نور کے چشمے سانپ کا بچا
سینہ بھرا، اور اُبھرا جوبن   طُور پہ دو ننھے سے موسا
رنگ و قامت باہم جیسے   چاند کی کرنیں ہوں مل یکتا
بات بہ شانِ اسمِ اعظم   چال بہ کامِ قُمِ عیسا
ایک سراپا حُسنِ مجسم ۳۵ ایک سراپا سحر کا پُتلا")

ہریالی ساڑی پہنی، جیسے   سبزہ پہ، شام کی دھوپ کا جلوا
مُنہ پر شوخی، دل میں عفت   باطن موتی، ظاہر مونگا
اتنا غرورِ حُسن و خوبی   ہفت اقلیم کی گویا ملکا
لاکھ تمنا جس کے صدقے   سینکڑوں دل تھے جس کا تحفا
دل کیا تھا اک ادنیٰ غنچہ ۴۰ توڑا، مسلا، پھینکا، روندا
مستِ خودی و محوِ عشرت   رنج دیں، نے فکرِ فردا
اونچا گھرانا، عالی گوہر   علم و فضل و سیرت حُسنا
عزت جس کی مانے راجہ   دولت، جس کا ہو نہ احصا

اک دن، شام جو نکلی تفریح   باغ سا منظر، وقت سہانا
اُس پہ غضب، اک ظالم دیکھا ۴۵ زیرِ نظر تھا جس کی پرچا
آنکھ جو جھپکی، دل کیوں دھڑکا   ذرا سے لڑکا کیوں موٹر پہ تھا
جانے، اس کے سامنے یہ تھی   یا پھر اُس کے سامنے وہ تھا
نظریں اس سے چار ہوئیں، یا   دل کو پایا دو صد پارا
شرم نے باگ نظر کی موڑی   واپس لوٹی، موٹر پھیرا

وہ آگے اور پیچھے نظر آئی ۔ ۵۰ چلتی تھی گویا، رستہ اُلٹا
مطلب سعدی دیگر گو تھا ۔ پھولوں کے نظارے کا بہانا
گھر پہنچے کچھ ایسا پایا ۔ جیسے جواری کھوتا آیا
روز کی تفریح داخلِ ایماں ۔ تفریح تھی یا فرضِ خدا تھا!
وہ آیا، اور یہ بھی پہنچی ۔ اسی طرح اک عرصہ گذرا
جتنا بھلایا، رفتہ رفتہ ۔ ۵۵ یاد کو اتنا بڑھتے پایا
دید میں گذرے دل سے خوش خوش ۔ اُوٹ ہوئی، اور ظالم مچلا
کتنا ڈرایا، کتنا منایا ۔ پھر بھی وہی ضد اپنی اکڑا!
کھلنے کسی کا گائے کسی کا ۔ بھاڑ میں جائے ایسا کمینا!
ہے ہے، اسکو بتائے کیونکر ۔ غیر پہ کوئی یوں نہیں مرتا!
جیسے جیسے دن تھے گذرتے ۔ ۶۰ دل کا مرض تھا اتنا بڑھتا
دل کی دھڑکن دھیمی دھیمی ۔ شوق کا اٹھتا، اٹھتا شعلا
اُٹھے، بیٹھے، جاگے، سوئے ۔ چین کسی کل، تھا نہیں پڑتا
حال پریشاں ہر دم، کوئی ۔ جیسے بھوت کے خواب سے اٹھا
بات سے نفرت، ملنے سے وحشت ۔ وہ تھی، اور اک تنہا کونا
جس رُخ دیکھو ایک ہی جلوہ ۔ ۶۵ جلوہ تھا، یا نظر کا دھوکا
وہ جو نہ آیا، نیند نہ آئی ۔ آہ کی تیغ سے رات کو کاٹا
جتنا کرب تھا، اتنی لذت ۔ جتنا درد تھا، اُتنا چسکا
اتنا بڑھا یا سوزِ دردی ۔ دل پہ ہوا انگارے کا دھوکا
چور کو جیسے بچھو کاٹے ۔ کس کو سنائے دل کی بپتا
اتنا ستایا، اتنا ستایا ۔ ۷۰ تابِ ضبط، نہ سہنے کا یارا
درد ہی کو خود رحم سا آیا ۔ مونسِ غم جب کوئی نہ پایا
آنکھ میں آنسو دل پہ آئے ۔ دل کا بڑھتا سوز بجھایا
حُسن پڑا ماند عشق کے سہمے ۔ ناز کو سایہ نیاز نے لُوٹا
ذہن میں ہمت، دل میں دھڑکا ۔ مُنہ پہ بات، نہ کہنے کا یارا
یارب، وہ! اور اتنی بے بس ۔ ۷۵ کس عصیاں کا ہے یہ بدلا!

حال ادھر غیر اس کا اتنا ۔ اور ادھر وہ اتنا بگانا
انساں تھا، یا کوئی فرشتہ ۔ تھا بھی دل؟ یا برف کا ٹکڑا؟
دل ہے جو اس کو کیوں نہیں رونا ۔ مرد کے، یا پھر، دل نہیں ہوتا!
دل تھا اگرچہ اتنا کُڑھتا ۔ روز کا جانا پر نہیں چھوٹا
روز نیا اک وارِ محبت ۔ ۸۰ روز نیا دل عقل کا جھگڑا
عقل کا منشا شرم و عزت ۔ دل کا کہنا "تو اور پیارا"

دل نے آخر عقل کو جیتا ۔ کتنا دانا! کتنا سیانا!
آنکھ پہ عقل کی پردہ ڈالا ۔ اپنا اندھا راج چلایا
کُل کی لاج کو خاک میں جھونکا ۔ نام کے نام و ننگ کو میٹا
اپنے پرائے طعنے، تشنے ۔ ۸۵ سب کو بلا پر اپنی وارا
جی میں آئی، چل کر کہہ دیں ۔ لاج نے پھر بھی دامن تھاما
لکھا آخر، اک نامہ بھیجا ۔ واں سے جواب اُچٹتا آیا
کتنے نامے، کتنے پرچے ۔ کتنی گذارش، کتنی تمنا
گا ہے حرف، اور گا ہی جھڑکی ۔ پھر بھی یہ دل، اور اتنا ریجھا
عزت دھوئی، شرم کو مارا ۔ ۹۰ خود جا کر، بارے، منایا
کتنا ضدی! کتنا ستمگر ۔ کتنا وہمی، گمان کا بندا
مان کے بھی کیں شرطیں لاکھوں ۔ اک اک پر اقرار کرایا

"جور کریں گے، ظلم کریں گے!" ۔ "آپ کی مرضی، اپنی منشا!"
"سب سے انوکھی اپنی طبیعت!" ۔ "اس کا علم ہے ہم کو پورا!"
"غنا غنا کا ساتھ ہو کیونکر!" ۔ ۹۵ "ان میں تو ہے بس فرق صفر کا!"
"اس عزت کے ہم نہیں قابل" ۔ "دھن کا غریب ہے، دل کا شہنشا!"
"مان لو، ہم عیاش بہت ہیں!" ۔ "آپ کی خاطر سب ہے گوارا!"
"پھر بھی وفا کا دعویٰ کب تک؟" ۔ "جان نے جب تک ساتھ نہ چھوڑا!"
"اس کا یقیں پر آئے کیسے؟" ۔ "سر ہے جو یہ قدموں پہ رکھا!"
اتنے جتن اور وعدے لیکے ۔ ۱۰۰ قدموں سے سر کو جلد اُٹھایا
دیکھا پھر اک خاص نظر سے ۔ "پیاری" کہا، اور گلے لگایا،
وعدہ کیا آ ملنے کا دائم ۔ اور کہا "ہوں تیرا عفیفا!"

"پیاری" میں! اور قسمت میری! ۔ واری خدایا! صدقے مولا!
وعدہ! اور آ ملنے کا دائم ۔ اور کہا "ہوں تیرا عفیفا!"
بول ہیں یہ یا امرت بوندیں! ۔ ۱۰۵ ہوش ہے یہ، یا میٹھا سپنا!
کیسی قسمت! کیسا مقدر! ۔ کیسا بخت! اور کیسا نصیبا!

لیجے! پوں پوں! موٹر آئی! ۔ موٹر کیا! وہ خود ہی آیا!
ناؤ کھیوتیا جیسے سنگی ۔ دل کی جوت، اور من کا اُجالا
کتنا حسیں، اور کتنا پیارا ۔ کیسا نرالا! کیسا بانکا!
کتنی رسیلی آنکھیں، پریمی! ۔ ۱۱۰ پھول میں جیسے میٹھا بھونرا!
گال پہ گورے، سُرخی، جیسے ۔ ہولی کھیلے ننھا بچہ

کتنا بہادر! تیر، نہ تیغ — دل کے جیسے شیر کو مارا!
غم کی فوج نے آن جو گھیرا — تنہا مار کے ہم کو بچایا
دیر سے آ کر کس نے رُلایا — ہاتھ سے کس نے آنسو پونچھا
کس نے نظر سے پھول جھڑائے ۱۱۵ — ہنس کر ہم کو کس نے ہنسایا
پیار کی باتیں کس نے سنائیں — دل کی لگی کو کس نے بجھایا
وہ نہیں، یعنی نور نظر جب — جگ میں ہو کیوں ساری اندھیرا
ساری خوبی، ایک خرابی — ظالم اتنا، جتنا اچھا
ظلم بھی اچھا، وہ جو اچھا — اس کے لئے ہی سب کچھ زیبا
کتنے خوف سے اس کو سنبھالا ۱۲۰ — جیسے ہتیلی کا ہو پھپولا
کپڑے اتارے، سکھ سے بٹھایا — ہاتھ بھی جوڑے، کی بھی پوجا
اتنا پوجا، اتنا پوجا — خود دیوتا کو بندہ بنایا
پھر تو پریم کے غنچے چٹکے — غم کے جہاں کو خلد بنایا
دکھ کی کہانی سکھ سے بدلی — اسی خوشی میں سُنیے گانا:

کتنے چاؤ سے تو ہے سنواروں ۱۲۵ — نین کا آئینہ، پلکوں کا کنگھا
زلفوں کی کملی، اشکوں کی مالا — پریم کی خوشبو، دل کا پھاہا
تم بن اجڑے ساری نگری — آؤ، آؤ، من کے بسیّا!
نین کی موٹر بیٹھے دکھاؤں — کتنی پیاری خیال کی دُنیا!
دُکھ میں جہاں ہو عیش کی لذت — اک اک سال بھی پل ہے جہاں کا
تم بن اُجڑے ساری نگری ۱۳۰ — آؤ، آؤ، من کے بسیّا!
پیت کی چوٹی سب سے اونچی — جس پہ ہمارا دل ہو دھڑکتا
پھر تم آؤ، گود میں جھیلو — دل ہو دھڑکتا، پھر سے اُچھلتا
تم بن اُجڑے ساری نگری — آؤ، آؤ، من کے بسیّا!
نین کا ساگر بیٹھے کنارے — تم جو نہ آؤ اشکوں سے کھیلا
ہجر کا مارا ایسا کسی نے ۱۳۵ — ہم نے سمجھ کر تارا اٹھایا
تم بن اُجڑے ساری نگری — آؤ، آؤ، من کے بسیّا!
دیکھے پرندی، جوں، جوں کرتے — پیار سے جن کا دل تھا اُمنڈتا
دھیان کے جادوگر سے بدلی — ہم نے بھی اپنے پی کو بُلایا

تم بن اُجڑے ساری نگری — آؤ، آؤ، من کے بسیّا!
ہم کو نہیں دُنیا سے غرض کچھ ۱۴۰ — سب سے الگ اک راج ہو بسنا
نیک سے، بد سے پاک ہو دُنیا — پریم کی جنت کا ہو نقشا!
تم بن اُجڑے ساری نگری — آؤ، آؤ، من کے بسیّا
ہجر میں ہم کو مرتے نہ چھوڑیں — مار کے جاں دیں آپ خدارا!
جینا ہو وہ، سو جینے سے بڑھ کر — جان کو قدموں پر جو وارا!
تم بن اُجڑے ساری نگری ۱۴۵ — آؤ، آؤ، من کے بسیّا!

”دیکھا! کتنا اچھا گانا — کیسا گیت، اور کیسا گلا تھا!
ہے یہ آنکھ میں آنسو کیوں! — اس میں پایا اتنا اثر کیا!“
ہنس کے کہا پھر ”یوں ہی کچھ تھا — ہم بھی سُنیں، کیا نام ہے اسکا!“
ہم نے کہا ہے ”عشق کی دُنیا!“ — بولے ”فلم ہے یہ، یا قصا؟“
فلم ہے، خاکہ، قصہ، پردہ ۱۵۰ — برق ہے، گھر ہی جوت، اندھیرا
سب کچھ ہی یاں دلکش سا ماں — چاہیے واں، اک دیدۂ بینا
عشق کی برق، اور دل کا گھر ہی — وصل ہی جوت اور ہجر اندھیرا
فلم ہے اک تصویر کسی کی — جس کا منظر سینہ کا پردا
جس کا ٹکٹ، اک نظر محبت — جس کا تماشا تنہا، اکا
زر کی نہیں یاں قدر کسی دن ۱۵۵ — لیجیے، آپ کا کھوٹا رُپیا

سینہ سے جو دامن کو ہٹایا — نکلی اک موتی کی مالا
جس میں تھی وہ تصویر کسی کی — فلم تھی جو، اور اپنی دُنیا
اب نہ بنائیں اس کے آگے — فلم ہے کس کی، کس کا نقشا!
بات نہیں یہ کہنے کی، سمجھیں — خود ہی اگر ہے عقل کا دعوا،
ایسے رہیجے اتنا سُن کر ۱۶۰ — مہر کا جیسے دریا اُمڈا
مست سی نظریں لپکیں، اٹھ کر — ہاتھوں کا ہار گلے میں آیا
ختم ہوتیں جب باتیں نظر کی — ہنستے ہوئے پھر یہ فرمایا
”عقل کا ہو یاں کس کو دعویٰ — سحر عشق جو کر دے ابلا“
”ہم کیا جانیں ہو گی کسی کی — نیچے تو ہے، ہاں، شاکر لکھا!“

سید علی شاکر ایم اے

توجہ طلب

(۱) خط و کتابت کرتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور تحریر کیا کیجئے۔ (۲) جواب طلب امور کیلئے کارڈ یا لفافہ بھیجا کیجئے۔ مضامین کی واپسی کیلئے محصول ڈاک بھیجنا ضروری ہے۔

(منیجر ساقی دہلی)

سادگی

زندگی کی مسرتیں حقیقت میں اُسی کو حاصل ہیں جس نے طرزِ معاشرت میں اعتدال قائم رکھا اور سادگی کو اپنا مسلک قرار دیا ہو، ضروریات اور لوازماتِ زندگی میں ہمیشہ سادگی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے یہ ایسی خصوصیت ہے کہ اِس سے رفتہ رفتہ انسان کے خیالات خود بخود پاکیزہ ہونے لگتے ہیں ۔
زیب وزینت، آرائش وزیبائش اور تہذیب جدید کے نئے نئے طریقوں میں جو وقت برباد ہوتا ہے ۔معاشرت میں سادگی اختیار کرنے والے ان اوقات کو دوسرے مُفید اور ضروری کاموں میں صرف کر سکتے ہیں! انسان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کس قدر قیمتی ہوتا ہے ۔بشرطیکہ ہم اُسکی قدر وقیمت کرنا سیکھیں ۔ اور اُس کی اہمیّت کو محسوس کریں ۔

ہم کو فطرتاً سادہ معاشرت کا پابند ہونا چاہیئے ۔مگر ہم پر اندھی تقلید کا مادہ اِس قدر غالب ہے کہ بھُول کر بھی ہم اُس مسلک کو اختیار کرنا نہیں چاہتے جس سے زندگی کی حقیقی مسرتیں حاصل ہوتی ہیں ۔جب تک ہم اپنی معاشرت میں سادگی نہ پیدا کریں ۔ روپیہ اور وقت برباد کرنیوالے زیب وزینت کے طریقوں اور نت نئے فیشنوں سے احتراز نہ کریں ، ہمیں حقیقی مسرت کبھی حاصل نہیں ہو سکے گی ۔

وہ دولت مند اور متموّل حضرات جن کو ساری دنیا کی نعمتیں ، عیش وعشرت، زیب وزینت ، اور آرائش وزیبائش کے اَسباب حاصل ہیں کیا وہ واقعی ایسے قانع ہیں جیسا کہ اُنہیں ہونا چاہیئے ؟ غور کرنیسے نہیں تو خود اُنہیں سے دریافت کرکے ہم معلُوم کرسکتے ہیں کہ وہ حقیقت میں ایسے نہیں ہیں آخر اسکے اسباب کیا ہیں ۔اسکی وجہ یہ ہے کہ جس قدر نعمتیں اُنکو زیادہ میسّر آتی جائینگی ۔اُسی قدر اُنکے تکلّفات بڑھتے جائیں گے جتنی اُنکی خواہشیں پُوری ہوتی جائینگی اُن سے دُونی پیدا ہوتی رہینگی ۔حقیقت میں زندگی کا لُطف اُسی کو حاصل ہے ۔جو معاشرت میں سادہ ہو ۔اِس قدر سادگی کی بھی ضرورت نہیں کہ مقدور ہونے ہوئے پھٹے کپڑے پہنے ، حیثیت ہو اچھا نہ کھائے اور فراغت ہو کر تکلیف اُٹھائے ۔

اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اِرتقائے انسانیت کی تاریخ پر نظر ڈالیں، تو واضح ہوگا کہ کس طرح زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ سادگی سے نظر پوشی کی گئی ۔ ایک زمانہ تھا کہ حضرت انسان غاروں اور درختوں کے سایہ میں رہا کرتے تھے ، ہر طرف نیچر کی حکومت تھی ، یہ آزاد میدانی زندگی صحت بخش، طاقتور اور بے لوث ہونیکے علاوہ ، اسمیں ، فکر ، رنج ، تکلیف اور خجالت کا کہیں نام ونشان نہ تھا ، نہ اس کثرت سے بیماریاں آتی تھیں ۔نہ قحط پڑتے تھے ، نہ بغاوتیں ہوتی تھیں ، نہ آزادی کے لئے کوششیں ، صرف آزادی اور سادگی کی ہر طرف حکومت تھی ۔خیالات سادہ تھے ، مگر وسیع اور مُتفق ، نہ وہ ہزاروں جانب منقسم تھے اور نہ فضولیات میں اُلجھے ہوئے، اسکے بعد آگ وجود میں آئی جس نے ہمارے تعلّقات کو نیچر سے کامل طور پر جُدا کردیا ۔اس آگ کے معلُوم ہونیکے دن سے تہذیب وتمدّن کی تاریخ شروع ہوتی ہے ۔کیونکہ اس وقت سے انسان کی ضروریات کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا نتیجہ یہ ہُوا کہ ضروریات بےحد بڑھ گئیں اور ساری برکاتِ اوّلین غائب ہوگئیں ۔

اِس وقت ہم نے جو طرزِ معاشرت اختیار کر رکھی ہے اس کا اصول سادگی نہیں بلکہ ازسرتاپا تکلّف ہی تکلّف ہو ۔سادگی سے قطعی جُدائی ہمارا شعار ہوگیا ہے ۔اب ہمارا مقصد یہ ہے کہ کسی چیز کو جس حالت میں پائیں، اُسے اُسکے برعکس بنادیں ۔

اگر ہم معاشرت میں سادگی پسند کریں تو اپنی آدھی سے زیادہ مُشکلات پر غالب آسکتے ہیں ، سادہ عادات ، سادہ خیالات ، سادہ مشاغل تفریح سادہ ضروریاتِ زندگی ، غرض کہ ہماری معاشرت میں سادگی کا دور دورہ ہو پھر دیکھیئے دُنیا مع اپنے سارے تکلفات کے ہم کو مغلوب نہیں کرسکتی ۔کیونکہ سادگی نیچر پر حکومت کرتی ہے ۔

ہم نے اکثر بچّوں کو سڑک کے کنارے خاک میں لوٹتے ہوئے دیکھا ہے ۔ وہ اپنی اس حالت میں بہت زیادہ خوش وخُرّم دکھائی دیتے ہیں، اتنا زیادہ جتنا کہ ہم اپنے بیش قیمت لباس میں کبھی نہیں ہوتے ، ہماری تہذیب اُنہیں گندہ کہتی ہے ، مگر یہ مسئلہ غور طلب رہتا ہو کہ آیا ہم زیادہ گندے ہیں یا وہ ؟ جُوں جُوں وقت گزُرتا جاتا ہے ، بچہ ہماری تہذیب اور معاشرت میں گرفتار ہوتا جاتا ہے ۔یہانتک کہ وہ اپنے گذشتہ مشاغل تفریح کو عہدِ طفلی کی لغویات پر محمول کرتا ہے ، سادہ اور حقیقی مسرت جو اُسکے دلمیں اُسکے اردگرد کی چیزوں سے پیدا ہوتی تھی کم ہونا شروع ہوتی ہے ، اور تھیٹر، سینما ، راگ ورنگ ، رقص وسرود اور ایسے ہی دوسرے تہذیبی تکلفانہ مشاغل تفریح میں مسرت حاصل کرتا ہے ۔غرض کہ اسکی معاشرت میں سادگی کے عوض تدریج

تکلفات جگہ پاتے ہیں۔ اور سادہ معاشرت کی چند خوبیاں اور آزادیاں تہذیب وتمدن کے بندھنوں میں مقید ہو جاتی ہیں۔

سادہ معاشرت کی مختلف قسمیں ہو سکتی ہیں۔ گھر کی سادگی، لباس کی سادگی، عادات کی سادگی، رسم ورواج اور دیگر ضروریات زندگی میں سادگی، اور غذا میں سادگی وغیرہ۔

گھر کی سادگی سے یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے مکانوں کو سادہ مگر صاف ستھرا رکھیں۔ جن مکانوں میں فضول چیزیں بھری رہتی ہیں، اُنکے مکینوں کی جان ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہتی ہے، شب وروز اُن کو ان چیزوں کی ترتیب اور تہذیب کی فکر لگی رہتی ہے اور ان کا سارا فرصت کا وقت ان غیر ضروری چیزوں کی دیکھ بھال میں صرف ہوتا ہے۔ اوّل اوّل کچھ عرصہ تک آرائش وصفائی کا شوق رہتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ شوق سرد پڑ جاتا ہے۔ جو چیزیں روزمرّہ استعمال میں نہیں آتیں۔ اُن پر گرد وغبار کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ جو اشیاء اسلئے خریدی گئیں تھیں۔ کہ اُن سے گھر کو آراستہ کیا جائے اب اُنہی آرائشی چیزوں نے گھر کو کباڑی کی دوکان بنا دیا ہے اور وُہی آرائش وزیبائش کے عوض مکان کی بدنمائی کا باعث ہو رہی ہیں۔

آج کل اکثر حضرات اس مرض میں مبتلا ہیں کہ خواہ ضرورت ہو نہ ہو، نیلاموں سے بغیر سوچے سمجھے بہت سی بیکار اور فضول چیزیں لا کر جمع کر لیتے ہیں۔ اور دوسروں سے مقابلے کے شوق میں بازار کی قیمت سے زیادہ قیمت پر سامان خریدتے ہیں۔ چند روز کے بعد جب طبیعت ان چیزوں سے سیر ہو جاتی ہے۔ اور اُنکے بے ضرورت ہونے کا احساس ہوتا ہے تو پھر نیلام میں بھیج دیتے ہیں۔ اسی خرید و فروخت میں جو نقصان ہوتا ہے اُس کا اندازہ وہی لوگ اچھی طرح کر سکتے ہیں جو اِس مرض میں مُبتلا ہیں۔ اس موقع پر مُناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک واقعہ ناظرین ساقی کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

ایک صاحب کو جن کے والد کافی جائداد اور دولت چھوڑ گئے تھے فرنیچر اور دوسری آرائشی چیزیں خریدنے کا شوق ہُوا۔ ایکدن آپ کسی نیلام میں رونق افروز ہوئے اور اندھا دُھند سامان خریدنے لگے، نیلامی نے جو یہ رنگ دیکھا طرح طرح سے ان کو اُکسانا شروع کیا، اگر اُنہوں نے ایک ہی وضع کی دو چیزوں میں سے ایک چیز خرید لی تو اُنہیں مخاطب کر کے کہہ دیا "جوڑی بگڑتی ہے" اگر کبھی کسی چیز کو زیادہ بولی کی وجہ سے چھوڑ دینا چاہا تو ذرا در غسلا دیا کہ "یہ چیز تو آپ ہی کے لائق ہے، جہاں اتنا سامان خریدا اِسکو بھی خرید لیجئے کہ دولت خانہ کی آرائش ہو"! غرض کہ اِسطرح ہمارے ناعاقبت اندیش دوست نے تین چار ہزار کا سامان خرید لیا۔ گھر تھا پُرانی وضع کا۔ اُس میں یہ طرز جدید کا فرنیچر اور اسباب آرائش کیا بھلا لگتا۔ چونکہ مکان کرایہ کا تھا۔ اس لئے دوست احباب کی رائے ہوئی کہ گھر بدلنا چاہیئے۔ فوراً اِس مکان کو خیرباد کہہ دیا گیا۔ اس منتقلی میں بہت سارا چینی کانچ کا سامان ٹوٹ پھُوٹ گیا۔ میز کرسیوں اور الماریوں کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں۔ الغرض یہ سارا اسباب آرائش کے ساتھ جس مکان میں منتقل ہوئے تھے وہ بھی کچھ قرینے کا نہیں نکلا جب یہ آرائشی چیزیں اسمیں سجائی گئیں تو بعض احباب کی رائے ہوئی کہ اس نئے طرز فرنیچر اور سامانِ آرائش کے لئے یہ مکان بھی کچھ زیادہ موزوں نہیں۔ اس مکان کو بھی وداع کیا گیا اور ایک مکان معقول کرایہ پر لیا گیا۔ حالانکہ اب بھی سرمایہ اس قدر موجود تھا کہ ایک نہایت اچھا مکان بنا بنایا خریدا جا سکتا تھا۔ یہ مکان بھی بیش قیمت فرنیچر کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ مکانوں کی اس ردوبدل کی وجہ سے جو سامان ناکارہ ہو گیا اُس کو جب نیلام میں بھجوایا گیا تو آدھی سے بھی کم قیمت پر فروخت ہُوا اور اس قیمت کا بھی کچھ حصّہ نیلامی کے کمیشن کی نذر ہو گیا اور اس تقریب میں ہمارے دوست کو گھر بدلنے کا کچھ ایسا چسکا پڑا کہ آج تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

مکان کی طرح ہمارا لباس بھی سادہ مگر صاف سُتھرا ہونا چاہیئے۔ مُرغ زرّیں بنے رہنے سے ہمکو بہت تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے، جو لوگ قیمتی لباس استعمال کرتے ہیں ان کو ہر وقت اپنے لباس کو ہتھیلی کے پھپھولے کی طرح حفاظت سے رکھنا پڑتا ہے۔ جہاں کسی نے ذرا ہاتھ لگایا۔ ان کا دل دھڑک گیا۔ ہم کو چاہیئے کہ زرق برق بھڑک لباس کی قید میں خود کو نہ پھنسائیں۔ لباس ایسا استعمال کرنا چاہیئے کہ تن پوشی کے علاوہ تراش خراش میں بھی اچھا ہو تاکہ دیکھنے والوں کی نگاہوں کو بھلا معلوم ہو۔

اسکی ضرورت نہیں کہ ہمارے ہاں درجنوں سوٹ، شیروانیاں، شوز وغیرہ ہوں، ان اشیاء کی افراط انکی دیکھ بھال سے ہمیں بے نیاز کر دیتی ہے اور بیقیمتی چیزیں برسوں کام دینے کے عوض مہینوں میں ناکارہ اور ناقابل استعمال ہو جاتی ہیں۔ شوز اتنے ہوتے ہیں کہ انکی صفائی اور پالش کے لئے ہمارے نوکر کو وقت نہیں ملتا، سُکڑے پلے جا رہے ہیں۔ نوکر صاحب اگر ذرا چابکدست ہیں تو ہر مہینہ ایک آدہ چیز کم ہو رہی ہے، تعداد کی کثرت میں یاد بھی نہیں رہتا کہ کتنی چیزیں خریدی گئی تھیں، اور اب کتنی ہیں۔ غرضکہ ہر چیز کی افراط ہر طرح کے نقصان کا باعث ہوتی ہے۔

لباس میں فیشن کی لعنتوں نے شریک ہو کر اس کو انسانی صحت کے لئے مختلف طریقوں سے مضرت رساں بنا دیا ہے۔ فیشن کی نظر فریب اختراعات سے ہماری صحت اور خوش حالی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ فلنینل

لباس کی خاطر ہم اپنی دوسری اہم ضروریات زندگی سے اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو محروم رکھتے ہیں۔

خیالات کی سادگی بھی بڑی چیز ہے جس کو یہ حاصل ہو اسکو بچہ خوشی مسرت اور آزادی ہی آزادی ہے بعض حضرات خواہ مخواہ اپنے دماغ کو بے جا خواہشات کا آماجگاہ بنا لیتے ہیں۔ انکی خواہشیں اس قدر بلند اور لامتناہی ہوتی ہیں کہ ان کا سلسلہ کبھی ختم ہی نہیں ہونے پاتا۔ ایسی موہوم امیدوں کے خیالات اُنکے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتے ہیں کہ اُن کا پُورا ہونا اس دنیا میں قرین قیاس نہیں ہوتا، وہ اُن آسائشوں اور مسرتوں کے حاصل کرنیکا خیال کرتے ہیں جن کے حصول کی امید خیال خام ہوتی ہے۔ " دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست " کا مقولہ ان لوگوں پر صادق آتا ہے۔ فضول اور لایعنی خواہشوں کے ہوائی قلعے نہ بنانا چاہیئے۔ سادگی اسی میں ہے کہ ہم ایسی خواہشوں کے حاصل کرنے کی فکر کریں جن کا حصول ممکن ہو اور جو ہمارے اور ہمارے ابنائے جنس کے لئے مُفید ہو سکیں۔ ایسے خیال اور اصول کو ہم اپنا رہبر بنائیں جو ہماری زندگی کے لئے مُفید اور ضروری ہوں۔ زندگی کو فضولیات اور خرافات سے آزاد رکھنا چاہیئے۔

عادت کی سادگی کا مطلب ہے کہ ہم اپنی عادات و خصائل میں سادگی اختیار کریں۔ سادہ عادتیں ہماری زندگی میں بہت ساری آسانیاں پیدا کرتی ہیں اور ہماری معاشرت کو کم خرچ بالانشین بناتی ہیں۔ عہدِ طفلی میں جو عادتیں گھر کر لیتی ہیں وہ تادمِ آخر برابر قائم رہتی ہیں۔ بچوں کی عادتوں کو سنوارنے اور اُن میں صلاحیت پیدا کرنے کی ذمہ داری زیادہ تر ہماری خواتین کے سر ہے۔ کیونکہ ماں کی گود بچہ کا پہلا مکتب ہے۔ اور اگر اس مکتب میں وہ بُری عادتیں سیکھے اور یہ بُری خصلتیں اس میں راسخ ہو جائیں تو پھر اسکی اصلاح دشوار ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے۔

ہماری بہنوں کو چاہیئے کہ بچوں میں ایسی سادہ عادتیں پیدا کرائیں جو اُنکی زندگی کے نظام میں آسانیاں مہیا کریں، اور اُنکی تکلفانہ معاشرت کی خاردار راہوں اور دُشوار گُزر گاہوں کو صاف اور ہموار بنادیں۔ بچوں میں فطرتاً ہٹ اور ضد کا مادہ بدرجہ اتم ہوتا ہے اگر عہدِ طفلی میں اسکی روک تھام اور اصلاح نہیں کی گئی تو انکی آئندہ زندگی خود انکے لئے باعث عذاب اور تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ انکے رگ و ریشہ میں خود پسندی اور انانیت سرایت کر جاتی ہے۔ انکی زندگی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُنکی ہر خواہش اور ہر آرزو کسی طرح پوری ہو۔ خواہ اسمیں اُنکے والدین اور متعلقین کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔

ہماری خواتین کو چاہیئے کہ بچوں میں ابتدا ہی سے سادہ مگر صاف ستھرا لباس اور سادہ زود ہضم غذا استعمال کرنے کی خُو ڈالیں۔ قیمتی لباس اور مرغن غذائیں اُنکے دماغ اور اُنکے نظامِ جسمانی کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ ہماری بہنیں بچوں کی بُری عادتوں کو یہ کہکر ٹال جاتی اور برداشت کر لیتی ہیں کہ ابھی تو بچہ ہے۔

" آتے آتے آئیگا اُسکو خیال "

جب سمجھ آجائیگی تو خود ہی یہ عادتیں چھوڑ دیگا۔ مگر جب بچہ میں یہ عادتیں راسخ ہو جاتی ہیں تو پھر ان کا چھوٹنا ایک طرف۔ بلکہ جہاں صرف چند عادتیں خراب تھیں وہاں کئی ایک نئی پیدا ہو جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنی ہی بربادی کا باعث نہیں ہوتا بلکہ اپنے گھر اپنے خاندان اپنے دوست و احباب اور اپنے مُلک و قوم کے لئے بھی اس کا وجود تباہ کن اور باعثِ ننگ و عار ثابت ہوتا ہے اور آخر میں وہ زمین کی پیٹھ کا بوجھ بن کر رہ جاتا ہے۔

بے جا لاڈ پیار اور ناز و نعم میں پلنے والے بچے دُنیا میں کسی مرض کی دوا نہیں ہوتے، ہماری بعض بہنیں بچوں کو ضرورت سے زیادہ اہم بنا دیتی ہیں بچوں کی پیدائش کوئی عجیب و غریب بات نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اُنکی پرستش کریں۔ انکی ہر ادا اور ہر حرکت پر آمین کہیں اور اُن کو دُنیا کا آٹھواں عجوبہ " تصور کریں۔ ہماری بہنوں کو چاہیئے کہ اپنے بچوں کو اپنے لئے نہیں بلکہ دُنیا کے لئے اور اپنے ملک و قوم کے لئے تیار کریں۔

غذا کی سادگی سے یہ مُراد ہے کہ غذا مُرغن اور محرّک نہ کھائیں۔ ہمارے مُلک کی گرم آب و ہوا کے مدّنظر ہمارے لئے مُفید نہیں ہو سکتیں۔ مُرغن غذائیں جسم میں چربی پیدا کر کے جسم کو فربہ اور بھدّا بنا دیتی ہیں۔ تازہ دُودھ، روٹی، مکھن، انڈے، مچھلی وغیرہ استعمال کرنا چاہیئے۔ گوشت پر ترکاریوں اور تازہ پھلوں کو ترجیح دینی چاہیئے۔ آج کل چار کے استعمال کا رواج بہت ترقی پر ہے۔ ہر گلی کوچے میں چار خانوں کی افراط ہے۔ یہ چار خانے جن پر نام نہاد ہوٹل اور رستوران کے خوشنما سائین بورڈ آویزاں نظر آتے ہیں اپنے اندر اقسام اقسام کی گندگیاں رکھتے ہیں۔ بڑی حیرت ان حضرات کے ذوقِ خورد و نوش پر ہوتی ہے جو ایسے گندہ مقامات پر چار کی پیالیاں اُڑاتے گپ شپ میں گھنٹوں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ ضیافتِ شکم کے ساتھ ساتھ اُن کی ضیافتِ سمع کے بھی کچھ سامان فراہم کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اس بھول بھلیوں میں پھنس کر نہ انہیں گھر کی یاد ستائے۔ اور نہ زندگی کی دوسری مصروفیات کا خیال آئے، نہ صرف صحت بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی یہاں کی فضا نہایت مکدر رہتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ چار کی یورپین کمپنیوں میں جو ہندوستان چار کی تجارت کرتی ہیں۔ چار کی فروخت کو ترقی دینے کیلئے ایک مشترک بورڈ قائم کر لیا ہے،

جواقسام کے طریقوں سے پبلک کو چا، کی خوبیوں پر مائل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ سرد ممالک میں اگر چا، ضروریاتِ زندگی میں شریک کرلیجائے تو مقامِ تعجب نہیں۔ لیکن ہندوستان جیسے گرم مُلک میں چار کا استعمال قابلِ ستائش نہیں ہوسکتا، بلکہ ایک حدتک مضرت رساں ہے۔ چار میں خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ جہاں وہ تکان دور کرتی ہے وہاں اُن لوگوں کو جن کے گُردے کمزور ہیں سخت نقصان پہونچاتی ہے۔ بعض حضرات چا، کو غذا کا اہم جزو سمجھتے ہیں، اور اس کو غذا پر ترجیح دیتے ہیں۔ اگر چا، کا استعمال ناگزیر ہی ہے تو اُسکو ہلکی بنانا چاہیئے اور اسمیں دودھ زیادہ ڈالنا چاہیئے۔ غرض کہ ہماری غذا سادہ مگر کافی اور مختلف قسم کی ہونی چاہیئے، روزمرہ ایک ہی قسم کی غذا کا استعمال اشتہا کو کم کردیتا ہے۔

توہمات اور فضول رسم و رواج بھی ہماری معاشرت میں سادگی قائم نہیں رہنے دیتے، غیر ضروری اور بے جا رسوم کی پابندیوں میں ہم نہایت بے دردی سے روپیہ صرف کرتے ہیں۔ خوشی اور غمی کی صدہا تقاریب اور موقعوں پر دولت کا اندھا دُھند اسراف روا رکھا جاتا ہے۔ اگر کچھ پاس نہ ہو تو قرض لے کر ان لغویات اور خرافات کو پورا کیا جاتا ہے۔ ہماری معاشرت میں بیہودہ رسم و رواج کے یہ بھونڈے داغ دھبے نہایت بدنما ہیں۔ یہ ہماری معاشرت کی سادگی کو برباد کرنیکے علاوہ ہماری دولت اور اخلاق کو بھی تباہ کررہے ہیں۔ ان فضول رسم و رواج کی پابندیوں نے خاندان کے خاندان تباہ کردیئے ہیں اور آئے دن ہماری دولت غیر اقوام کے قبضہ میں چلی جارہی ہے۔ ہماری روز افزوں مفلسی کے سدِ باب کے لئے ہماری معاشرت کے یہ رسم و رواج بڑی حدتک اصلاح طلب ہیں۔

ان فضول رسم و رواج اور توہمات کی اصلاح کا ہماری مُعزز خواتین سے زیادہ تعلق ہے۔ کیونکہ وُہی ان لغویات میں جی کھول کر حصہ لیتی ہیں۔ خوشی اور غمی کے موقعوں پر وہ ان مذموم رسوم کی اس حدتک پابند ہوگئی ہیں کہ اُن کو صرف اپنی معاشرت ہی کا نہیں بلکہ اپنے مذہب اور قومیت کا بھی ایک اہم جزو سمجھتی ہیں۔ ان کی توہم پرستی نے ہمارے بھائیوں کو ان مہمل رسوم کا پابند کردیا ہے۔ اپنی ماں، بہن، بیوی اور بیٹیوں کی خوشی کی خاطر مردوں نے بھی خود کو اسی رنگ میں رنگ لیا ہے۔ کبھی مخالفت کرتے بھی ہیں تو دبی زبان سے، مگر "نازک" اصرار قوی "انکار" پر غالب آجاتا ہے۔ اور پھر وُہی ہوتا ہے جو "صنفِ نازک" کے نازک مگر توہم پرست دل و دماغ میں لبا ہوا ہے اور وہ برملا کہتی ہیں۔

"ہم وُہی آخر کریں گے جو ہمارے دِل میں ہے"

غرض کہ ہماری معاشرت کی اصلاح اور اسمیں سادگی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر دو صنف متفق و متحد ہوکر اس طرف توجہ کریں اور اپنی اصلاح کی مسلسل کوشش کرتے جائیں۔ تاکہ ہماری معاشرت میں اعتدال قائم ہو اور ہم ان فضول رسم و رواج، وقت اور روپیہ برباد کرنے والے غیر مفید طریقوں اور تکلفات کے بندھنوں سے نجات حاصل کریں +

مرزا سیف علیخاں
(حیدرآبادی)

فیوجل

فیوجل نے اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی کا آغاز قہوہ خانے کے نگہبان کی حیثیت سے کیا۔ اب اسے اُن بدقسمت چھوکروں کی طرح کام کرنا پڑتا تھا جو پیتل کے بٹنوں والے سبز کوٹ پہنے افسروں کے تہدید آمیز احکام کی بجا آوری نہایت خندہ پیشانی سے کرتے ہیں۔

اسی قہوہ خانے میں وہ اپنی غلامانہ زندگی کے لمحات کو مستقبل کے بڑے بڑے امید افزا خواب دیکھ دیکھ بسر کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ کسی روز وہ کسی بڑے ہوٹل کا ——— کسی تیسرے درجے کے ہوٹل کا نہیں جہاں تجارت پیشہ مُسافر ذلیل بستروں پر سوتے ہوں بلکہ اس اعلیٰ درجے کے ہوٹل کا جہاں انگریز اور امریکہ کے کروڑپتی سونے کے ایک کمرے کا ہزار فرانک تک کرایہ ادا کرتے ہوں اور شراب کے ایک گلاس کے لئے پانچ لوئیس پیش کرتے ہوں ——— مینیجر بن جائیگا! اس مقصد کی تکمیل کے لئے انگریزی کی تھوڑی بہت تحصیل ضروری تھی۔ اس لئے یہ زبان سیکھنے پر وُہ کمربستہ ہوگیا۔ اس نے اتنی رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے کس طرح قہوہ خانے میں اکثر آتے جاتے مُسافروں سے لسانی رجحانات سیکھے؟ یہ ان اصحاب کے لئے ایک راز ہے جو فیوجل کی شخصیت سے آشنا نہیں۔ مگر اس کے دوستوں کے لئے یہ کوئی پیچیدہ معمہ نہ تھا۔ فیوجل کو ہر مشکل اور محنت طلب کام بہت آسان معلوم ہوتا تھا اور ہر آسان کام اس کے لئے سخت مشکل ہو جاتا تھا۔ فیوجل اِس خوفناک فطرت کا مالک تھا ——!

چنانچہ کچھ عرصے کے بعد انگریزی پر اُسے اتنی قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ چند مختلف حالات میں زندگی گذارنے کے بعد وہ لڑکیوں کے ایک تعلیمی سکول میں فرانسیسی زبان کا اُستاد متعین ہوگیا۔

دس بیس سال جو فیوجل نے اس کے بعد گذارے، اتنے پُراسرار ہیں کہ تفصیل کے ساتھ ان کے متعلق کچھ لکھنا ایک بڑا مشکل کام ہے۔ یہ واقعہ جس کا ذکر صفحاتِ ذیل میں ہونے والا ہے سکول کے عرصۂ ملازمت کے فوراً بعد اسے پیش آیا۔

سکول نے فرانسیسی زبان کے اخذ کرنے میں جو ترقی کی گو وہ معجز نما تھی مگر ساتھ ہی صرف و نحو کے قواعد کو افسوسناک طور پر نظرانداز کیا گیا تھا۔ سہ ماہی امتحان میں، جب پرچے کسی دوسرے اُستاد نے بنائے، نتیجہ نہایت حوصلہ شکن نکلا۔ لڑکیوں نے ترجمے میں عجیب عجیب غلطیاں کیں۔ بعض افعال گرامر کی لاعلمی کے باعث غلط استعمال کئے گئے۔ فرانسیسی تاریخ کے واقعات کو اس طرح خلط ملط کیا گیا کہ ممتحن کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ غرضکہ جب ہیڈ مسٹرس کو شُبہ گذرا کہ فیوجل کے طریقۂ تعلیم میں کوئی نقص ہے تو اس نے بذاتِ خود اس کی جماعت کا معائنہ کیا۔ کمرۂ جماعت میں عجیب سا منظر اس کی آنکھوں نے دیکھا۔ لڑکیوں نے تعلیم کے وقت میں اودھم مچا رکھا تھا۔ فیوجل فرطِ انبساط میں پلیٹ فارم پر عجیب دغریب حرکات کر رہا تھا۔ وہ جماعت کو ایک کہانی بتا رہا تھا۔ اور بیان کرتے وقت اس کا عضو عضو جنبش کر رہا تھا۔ جونہی اس کی نظر ہیڈ مسٹرس کی مرعوب کُن شخصیت پر پڑی وہ دم بخود ہو کر رہ گیا۔ اور کہانی کی بقیہ تفصیل وہیں کی وہیں دھری رہ گئی۔ ہیڈ مسٹرس بولی "تم عجیب طریقے سے فرانسیسی پڑھاتے ہو!"

وہ کہنے لگا "مادام میں تسلیم کرتا ہوں کہ میرا طریقۂ تعلیم عجیب و غریب ہے مگر اس کے بغیر میں اپنے سبق کو دلچسپ نہیں بنا سکتا تھا!"

ہیڈ مسٹرس نے کہا "اس طریقے سے لڑکیوں کو نہیں پڑھانا چاہئے۔ جماعت کو ذرا افعالِ ناقصہ کی مشق تو کرائیے!"

تو ہیڈ مسٹرس کی شعلہ بار آنکھوں کے سامنے فیوجل نے افعالِ ناقصہ کا سبق پڑھایا۔ افسوس کہ اُسے گرامر سے قطعاً کوئی شغف نہ تھا۔ اس کا سبق ناکام رہا اور وہ ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

دسمبر کی ایک شام کو ایسٹن سٹیشن کے اس پلیٹ فارم پر فیوجل یاس والم کی تصویر بنا کھڑا تھا جس پر صرف باہر سے آنے والی گاڑیاں آکر ٹھہرتی ہیں۔ اس کے پاؤں کے قریب ایک حقیر سا بقچہ پڑا تھا۔ ہاتھ میں اس نے پھولوں کا ایک بڑا سا ہار پکڑ رکھا تھا۔ یہ ہار ان طالبات کی طرف سے ایک اِخلاص آمیز پیشکش تھی جو اُس کی علیحدگی کو بہت محسوس کر رہی تھیں۔ قُلی بوجھ اُٹھائے جلدی جلدی اِدھر اُدھر جا رہے تھے۔ سٹیشن کے باہر اِکا گاڑیاں کھڑی نظر آتی تھیں۔ کوچبان واٹر پروف کوٹوں میں ملبوس تھے۔ انکے کوٹ بارش میں بھیگ جانے سے چمک رہے تھے۔

اتنی بارش میں مجھے کوئی اِکا گاڑی لے لینی چاہیئے۔ یا بقچہ ہاتھ

میں تمھارے یا پیادہ چل پڑنا چاہیئے؟ یہ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بڑا مستعد خادم جو اس کے پاس ہی کھڑا تھا کہنے لگا:-

"معاف فرمائیے، مجھے مسٹر سمتھ نے بھیجا ہے"

"خوب، خوب، مجھے بہت خوشی ہوئی"

"کیا آپ ہی وہ فرانسیسی ہیں جو مانچسٹر سے تشریف لائے ہیں"

"بالکل"

"تو مسٹر سمتھ نے آپکے لئے یہ گاڑی بھیجی ہے"

"اُن کی بڑی نوازش ہے!"

خادم بقچہ اٹھا کر جلدی سے پلیٹ فارم پر سے نیچے اُتر آیا فیوجل اس کے پیچھے ہو لیا۔ خادم نے اُسے بٹھانے کے لئے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ فیوجل سوچنے لگا کہ میں گاڑی میں بیٹھ تو گیا ہوں مگر یہ مسٹر سمتھ ہیں کون؟ جنہوں نے اتنی ہمدردی سے مجھے گاڑی بھیجی ہے۔ پھر خود ہی دل میں کہنے لگا: "اچھا کوئی ہو، اب خود ہی جا کر دیکھ لونگا"

وہ گاڑی پر سوار ہو کر نرم نرم گدیلوں پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

گاڑی چل پڑی اور جلد ہی موسلادھار بارش کے قطرے تڑا تڑ کھڑکیوں کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ فیوجل نے جل تھل گلیوں کو دیکھ کر اپنے آپکو اس آرام کی حالت میں پاتے ہوئے خدا کا شکریہ ادا کیا۔ اُس نے دل میں سوچا کہ جس سکول میں مَیں پڑھاتا تھا وہاں مس سمتھ نام کی دو چھوٹی لڑکیاں تھیں۔ شاید یہ اُن ہی کا شریف باپ ہو جس نے مجھے بُلا بھیجا ہے۔ مگر مجھے اس بات سے کیا غرض کہ وہ ضرور میری ہی شاگرد لڑکیوں کا باپ ہو۔ اس نے خود مجھے بُلا بھیجا ہے۔ میرے لئے گاڑی بھیجی ہے۔ یقیناً ایسا شخص کوئی کھاتا پیتا اور دلچسپ آدمی ہی ہوگا۔ اور لُطف یہ ہے کہ مجھے غائبانہ طور پر اب اس سے کچھ مناسبت بھی پیدا ہونے لگی ہے۔

گاڑی ایک ہیمپ سٹیڈ میں ایک مکان کے سامنے کھڑی ہوئی۔ اور جہاں تک اندھیرے میں اُس کی نگاہ کام کرتی تھی، مکان کی ملحقہ زمین ہی میں ٹھیرائی گئی۔ خادم نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اور فیوجل کو اُتار کر سیڑھیوں پر لے آیا۔ ایک خادمہ نے ایک بڑے سے ہال میں اُس کا استقبال کیا۔ اور اس کا کوٹ اور ہار اُتار کر کہنے لگی: "مسٹر سمتھ ابھی تک شہر سے واپس نہیں آئے۔ ہاں مس کرسٹابیل ڈرائنگ روم میں موجود ہیں"

فیوجل بولا: "مجھے وہ ہار ذرا دیدیجئے"

خادمہ اُسے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ جہاں ایک مہ لقا دوشیزہ ایک نازک سے سٹول پر جلوہ افروز تھی۔ فیوجل کو دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی اور ایک دلربا تبسم کے ساتھ اس کے استقبال کو آگے بڑھی۔ "دوپہر بخیر، مسٹر بیرن! مَیں سوچ رہی تھی کہ تم ہمارے مس تمہیں پہچان سکے گا؟ مگر خوش قسمتی سے اُس نے تم کو پہچان ہی لیا۔ دیکھئے نا، نہ ہیں نے اور نہ اباجان نے اس سے پہلے تم کو دیکھا تھا۔ اس لئے ہم تمہارے حُلیے کے متعلق اُسے کچھ نہ بتا سکتے تھے!"

فیوجل کو یہ بات پسند تو بہت آئی مگر اُسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اسے بیرن کے معزز لقب سے کیوں مخاطب کیا گیا ہے۔ شاید اس لئے کہ انگریز لوگ اس لقب کو بہت مقبول سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا "مادموزیل! تمھارا بہت ہوشیار آدمی ہے"

اس کے بعد کچھ لمحے سکوت رہا۔ مس کرسٹابیل کبھی فیوجل کی طرف اور کبھی اس کے ہار کی طرف دیکھتی۔ اور فیوجل کبھی کرسٹابیل کی طرف اور کبھی اپنے ہار کی طرف اور پھر کرسٹابیل کی طرف دیکھنے لگتا۔ اس نے کہا: "مادموزیل! کیا تم یہ ہار قبول کرو گی؟"

کرسٹابیل نے ہار لے لیا اور ایک دلکش انداز میں شرما سی گئی۔!

اُس کے بال اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ چھوٹی سی دلفریب سُتواں ناک اور دُنیا بھر میں سب سے چھوٹا مُنہ تھا، کہنے لگی: "ایک فرانسیسی کو کبھی ایسا خیال نہیں آسکتا!"

فیوجل یہ سُنکر مُسکرانے لگا۔ اور اپنا ہاتھ کانوں تک لیجا کر، جیسے توبہ کہتے وقت لوگ عام طور پر کرتے ہیں، کہنے لگا: "ایک فرانسیسی کے متعلق یہی خیال کیا جاتا ہے مگر حقیقت میں وہ بڑا کشادہ دل ہوتا ہے"

کرسٹابیل یہ سنکر خوشی سے ہنسنے لگی اور اُسے آگ کے سامنے بٹھا کر چائے اور چپاتیوں سے اسکی خُوب خاطر مدارات کی۔ اس میزبان لڑکی کے آزادانہ دلکش انداز کو دیکھکر فیوجل کے دل سے اس عجیب اتفاق کے تمام تاثرات دُور ہو گئے، جو مسٹر سمتھ کے گھر پہونچ جانے کے سلسلہ میں اُسے پیش آیا۔ یہ ایک الف لیلوی سحر تھا جس نے اُسے ایک یاس انگیز حالت سے اُٹھا کر اس معطر محل میں، جہاں کرسٹابیل جیسی شہزادی اس کی ہم جلیس تھی، لا بٹھایا۔ وہ آگ کے شعلوں کو اُس کے چمکیلے بالوں میں رقص کرتے اور ہنسی کو اس کے چہرے پر کھیلتے دیکھکر یوں محسوس کر رہا تھا گویا وہ ہیمپ سٹیڈ کی بجائے بغداد میں بیٹھا ہے۔ اُس نے کہا "کرسٹابیل، تم تو کوئی شہزادی معلوم ہوتی ہو!" کرسٹابیل بولی: "ہاں ایک دفعہ بازار میں مجھے ایک شہزادی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا وہ کیا تھا

اچھی شہزادی تھی!"

نیوجل نے کہا: "او ہو تم بازار میں پھرنے والی شہزادیوں کا ذکر کر رہی ہو۔ میں تو تمہیں پرستان کی ایک شہزادی سمجھتا ہوں۔"

کرسٹابیل کہنے لگی "تم نہیں جانتے اگر کوئی آدمی اس قسم کی محبت آمیز باتیں انگریز لڑکیوں سے کرے تو اس کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔"

نیوجل نے جواب دیا: "انگریز! ہاں مگر اُن کی محبت تو ایک ہفتے یا اس سے کچھ زیادہ عرصے تک رہتی ہے اور پھر انڈے کی طرح گندی ہو جاتی ہے۔ ہم براعظم یورپ کے رہنے والے، ہم تو حسن کو اپنے دل کی گہرائیوں سے خراج دیتے ہیں۔ ہماری محبت حقیقی اور گہری ہوتی ہے۔ اور جو چیز دل سے پیدا ہو اس کا مضحکہ نہیں اُڑایا جاتا۔"

کرسٹابیل پھر ہنس کر بولی: "میں تو ہمیشہ یہی سنتی آئی ہوں کہ کسی فرانسیسی کو جس عورت سے بھی ملنے کا اتفاق ہو جائے۔ وہ اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔"

نیوجل کہنے لگا: "ہاں، کیوں نہیں! اگر وہ کوئی حسین عورت ہو تو!"

کرسٹابیل جس کو آج تک یہ بات معلوم نہ تھی بولی: "خوب"

نیوجل بولا: "تو مجھے تم سے محبت ہے!"

"میں حیران ہوں کہ اگر میرے منگیتر کو اس بات کی خبر ہو جائے تو وہ کیا کہے گا۔"

"تمہارے — ؟"

"ہاں ہاں میرے ہی منگیتر کو! وہ دیکھو میرے قریب ہی میز پر اس کا فوٹو پڑا ہے وہ چھ فٹ کا ایک دراز قد نوجوان ہے اور عاشق صادق ہے۔"

"تو کیا یہ کوئی تُرک ہے؟"

"میں تمہاری بات سے ناک بھوں تو نہیں چڑھاتی مگر میرے منگیتر کو تُرک کہنا مناسب نہیں، وہ بڑا خوبصورت نوجوان ہے اور مجھے بہت چاہتا ہے۔"

"اس خوش قسمت کا نام!"

کرسٹابیل نے اس کا نام بتایا — ہیری رالسٹن — یہ شخص ہیری رالسٹن ہی نہ تھا بلکہ آنریبل ہیری رالسٹن تھا۔ بڑا امیر آدمی اور بڑی جائیداد کا وارث تھا۔ پارلیمنٹ کا ممبر بھی تھا۔ ہیمپ شائر میں اس کا ایک عظیم الشان مکان بھی تھا۔ جو آرٹ کے خوبصورت ترین نمونوں کا ایک مرقع تھا۔ کرسٹابیل کا باپ، اور ہیری اکثر اکٹھے ہی مختلف صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ اور ان دونوں میں گہرا رابطہ پیدا ہو گیا تھا۔

کرسٹابیل نے اپنے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا: "دیکھو ہم نے یہاں کتنی نفیس تصویریں جمع کر رکھی ہیں۔"

نیوجل نے دیواروں پر نظر دوڑائی۔ وہاں سونے کے فریموں میں جڑی ہوئی بہت سی تصاویر لٹک رہی تھیں۔ اُن دنوں نیوجل کا مذاق اتنا پختہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ سیاہ چمکیلے بالوں میں سے جھانکتا ہوا کرسٹابیل کا نور افروز چہرہ اُس کے سامنے تھا۔ اور وہ اسے گوارا نہ تھا کہ ایک جیتی جاگتی حقیقی تصویر سے نظر ہٹا کر دیوار پر کی مصنوعی تصاویر کو دیکھنے میں اپنا وقت ضائع کرے۔ کرسٹابیل نے اس کی چھلکتی ہوئی نگاہ سے متاثر ہو کر کہا: "میرا خیال تھا تم کوئی دقیق شناس آدمی ہو گے!"

نیوجل نے اپنی چمکیلی آنکھیں کرسٹابیل کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے کہا: "کیوں نہیں؟"

وہ شرما سی گئی اور اٹھ بیٹھی، کہنے لگی: "مجھے کھانے کا لباس تبدیل کرنے کیلئے اب چلنا چاہیئے، شاید اب تم وہ کمرہ جو تمہارے قیام کیلئے مخصوص کر رکھا ہے، دیکھنا پسند کرو۔"

وہ اپنا سر ایک طرف جھکا کر بولا: "مادموزیل! کیا میں نے کوئی گستاخانہ بات تو نہیں کی؟"

وہ کہنے لگی: "مجھے نہیں معلوم۔"

پھر خادم نیوجل کو دری بچھی ہوئی کشادہ سیڑھیوں پر سے خوابگاہ میں لے گیا۔ اس سے پہلے اُس نے اپنی زندگی میں ایسا کمرہ نہیں دیکھا تھا۔ پردے، قالین، صوفے، ساٹن کے لحاف، اور لکھنے کی خوبصورت میزیں، سب اپنی اپنی جگہ پر مزین تھیں۔ دھیمی دھیمی روشنی نمودار تھی۔ انگیٹھی میں خوشگوار آگ جل رہی تھی۔ نیوجل کا اپنا سامانِ تزئین سنگار میز پر پڑا تھا۔ اس کے پاس کوئی سوٹ کیس نہ تھا۔ خادم نے اس کا قیمتی فراک کوٹ اور پتلون کا فالتو جوڑا بستر ہی پر رکھ دیا۔ سرہانے پر اس کی رات کو پہننے والی قمیص پڑی تھی!

نیوجل نے ان تکلفات سے متاثر ہو کر دل میں کہا، اب مجھے نہا کر اپنا لباس تبدیل کرنا چاہیئے۔ معلوم ہوتا ہے یہی میرے سونے کا کمرہ ہے۔

نیوجل نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا — سفید ٹائی اور بادامی رنگ کے تقریباً نئے ہی بوٹ — اور ڈرائنگ روم میں پہونچا۔ کرسٹابیل وہاں پہنچی تھی۔ آتشدان کے پاس ہی ایک گنجے سر والا، سُرخ چہرے والا،

انگریز بیٹھا تھا۔ جس کی آنکھیں چھوٹی سی تھیں اور اخلاق پسندیدہ تھے، اس نے کھانے کا لباس پہن رکھا تھا۔ اپنے بازو پھیلا کر کہنے لگا: "میرے دوست! میں تمہیں یہاں دیکھکر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں تمہارے متعلق کچھ سن چکا ہوں۔ اور میری یہ لڑکی تمہاری بہت تعریف کرتی ہے!"

فیوحل بولا: "مادموزیل بڑی مہربان ہیں۔"

مسٹر سمتھ نے کہا: "تم دیکھ رہے ہو ہم معمولی سے لوگ ہیں۔ مگر خیر، یہ لو اعلیٰ درجے کی شراب کی بوتل اور سگرٹ۔ تم جانتے ہی ہو کہ صرف انگلستان ہی میں پینے کے قابل اچھی شمپین اور سگرٹ مل سکتے ہیں۔ انگریزی وضع کا یہ مکان بھی ایک معقول جگہ ہے، میرا خیال ہے کہ فرانس میں ایسی جگہیں کہاں!"

فیوحل نے اس سے پہلے بھی ایک دو مرتبہ اپنے ملک کیخلاف ایسی غیر معقول باتیں سنی تھیں کہنے لگا: "تو گویا فرانس میں سب آدمی قہوہ خانوں ہی میں رہتے ہیں۔"

مسٹر سمتھ نے بڑے شوق کے ساتھ جواب دیا: "بھائی، پھر بھی انگلستان ہی اچھی جگہ ہے۔ ہے نا! گو یہ ٹھیک ہے کہ پیرس بھی اپنی جگہ ایک دلکش شہر ہے!"

کھانے کا اعلان کر دیا گیا۔ فیوحل نے کرسٹابیل کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا۔ وہ نہ صرف اس لئے خوش تھا کہ اُسے کرسٹابیل جیسا اچھا ساتھی مل گیا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ فراک کوٹ، سفید ٹائی اور چمکدار بادامی بوٹ پہنکر کھانے میں شریک ہو رہا ہے۔

وہ کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔ میزبان ایک خوشنما میز کے ایک سرے پر بیٹھا تھا۔ کرسٹابیل دائیں طرف تھی۔ فیوحل بائیں طرف بیٹھ گیا۔ کھانا ایک خوشگوار انداز میں شروع ہوا۔ سمتھ بڑا مسرور نظر آتا تھا۔ کہنے لگا:۔

"فیوحل، تمہارے پرانے دوست جیول کیسے ہیں؟"

فیوحل نے اپنے دل میں سوچا کہ جیول میرا دوست کہاں سے نکل آیا۔ مگر اس نے جرأت کر کے جواب دے ہی دیا: "اور تو سب طرح خیریت ہے مگر کبھی کبھی اسے وجع المفاصل کی شکایت ہو جاتی ہے۔"

سمتھ بولا: "مجھے بھی یہ تکلیف اکثر رہتی ہے۔ اسے چھوڑیے!"

فیوحل نے کہا: "جیول بھی تمہاری طرح بڑا ہمدرد آدمی ہے۔ اس نے تمہارے متعلق اکثر ذکر کیا ہے۔"

اسکے بعد فیوحل فرانس کے متعلق عجیب و غریب باتیں سنانے لگا۔ اس نے انہیں اس زمانے کی بہت سی باتیں بتائیں جب وہ سکول ماسٹر تھا۔ یہ سب باتیں سنکر سمتھ بولا: "میں نے پہلی دفعہ ایک فرانسیسی کو اتنی پُر لطف اور پُر مزاح باتیں کہتے سنا ہے!" پھر کہنے لگا: "بیرن! میرا خیال تھا کہ تم نے اپنی زندگی اپنے پرانے شاتو[1] میں رہ کر گذار دی ہوگی۔۔!"

فیوحل نے جواب دیا: "ہاں مسٹر سمتھ! میں بیرن ہوں پھر بھی اپنے اسی پرانے شاتو میں رہتا ہوں۔"

کرسٹابیل نے پوچھا: "کیا تمہارے شاتو کے پاس کوئی خندق، کوئی متحرک پل اور کوئی چھوٹا گرجا بھی ہے۔"

فیوحل نے ذرا فخر کے ساتھ کہا: "ایک کیا دو گرجے ہیں۔"

کرسٹابیل کہنے لگی: "میں لینگوڈ کے متعلق بات کر رہی ہوں ــ"

لینگوڈ! یہ تو فیوحل کا اپنا ہی علاقہ تھا۔ اس علاقے میں تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ ہاں آنکھوں کا استقبال کرنے کو بہت سے مناظر موجود ہیں۔ فیوحل نے اس ہال کی تفصیل شروع کر دی جو اب تقریباً نابود ہو چکا تھا۔ اور جس کے قریب خندق، گرجا، متحرک پل سب کچھ تھا۔ مگر یہ تو بالکل حقیر سی چیزیں تھیں۔ اس کے آراستہ کئے ہوئے رستے، اس کے برج، اس کی پناہ کی جگہیں، اس کے بے شمار کمرے، جن میں دو سو مسلح آدمی ایک ہی وقت میں کھانا کھا سکتے تھے۔ اور اس کا وہ خاص کمرہ جس میں جان آف آرک قتل کی گئی تھی ــ یہ تھیں قابل دید چیزیں! فیوحل نے اس جگہ کو کچھ ایسے انداز میں پیش کیا۔ کہ بھولے بسرے کی ساری یادگاریں سامعین کی آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ اُس نے بتایا کہ کس طرح کتے، گائیں، بطخیں اور مرغابیاں وہاں محفوظ رکھی جاتی تھیں، اور کس طرح ایک بڑے تالاب میں کھانے کے لئے مینڈک پالے جاتے تھے۔

کرسٹابیل کپکپاتی ہوئی بولی: "میں تو مینڈک کھانا کبھی گوارا نہ کروں۔"

اس کا باپ کہنے لگا: "وہ لوگ تو گھونگے بھی کھاتے تھے۔"

فیوحل بولا: "ہاں میرے پاس بھی ایک خاص جگہ ہے جس میں گھونگوں کی پرورش کی جاتی ہے۔ تم نے کبھی ان جیسے دلچسپ جانور نہیں دیکھے۔ یہ بڑے سمجھدار ہوتے ہیں۔ اور اگر تم محبت سے کھانے کی کوئی

[1] فرانسیسی وضع کا دیہاتی مکان!

چیز اپنے ہاتھ پر رکھ کر انہیں دو تو وہ تمہارے ہاتھ پر کھانے لگ جائیں گے"

مسٹر سمتھ بولا: "فیوجل! تم ان تصویروں کے متعلق کچھ کہنا بھول ہی گئے"

فیوجل نے اپنے ہاتھ پھیلا کر کہا "ہاں ہاں تصویریں، گیلریاں ان سے بھری پڑی ہیں۔ وہاں سب کے شاہکار موجود ہیں۔

اُس نے ذرا توقف کیا — اس لئے نہیں کہ وہ ڈرامائی شان کے ساتھ کچھ بیان کرنے والا تھا بلکہ اس لئے کہ اور بہت سی مصوروں کے نام اس وقت اس کے ذہن میں نہیں تھے۔ وہ بولا "فی الحقیقت یہ ایک تاریخی شاتو ہے"

کرسٹابیل بولی "میں اسے ایک بار ضرور دیکھنا چاہتی ہوں"

فیوجل نے میز پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "مادموزیل! یہ شاتو تمہارا اپنا ہی ہے۔ شادی کا زمانہ وہاں خوب وہیں گذارنا"

اب کھانا ختم ہو چکا۔ کرسٹابیل، سمتھ اور فیوجل کو شراب پیتے چھوڑ کر خود چلی گئی۔ یہ شراب پرتگال کی تھی۔ جس کی تعریف میں سمتھ رطب اللسان تھا۔ فیوجل پرتکلف کھانوں اور شراب سے سیر ہو کر قلعہ لینگوڈ کے خوشگوار تصور سے دل کو مسرور کئے ہوئے اور ایک بڑا سا سگار منہ میں دبائے ہوئے دُنیا ومافیہا سے بے خبر معلوم ہوتا تھا۔ اسے مسٹر سمتھ سے جو ایک متواضع آدمی تھا، ایک طرح کا اُنس ہو گیا تھا۔ اور اگر وہ چاہتا تو اُس کے پاس ایک ہفتہ یا ایک مہینہ یا یوں سمجھئے کہ ایک سال تک رہ سکتا تھا!

قہوے اور شراب کے دور کے بعد سمتھ نے ایک تیز قمقمہ روشن کیا۔ اور کپڑے میں لپٹی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا جو ایک کیل کے ساتھ آویزاں تھی۔ اس نے فیوجل کو اپنے پیچھے آنے کو کہا اور پردہ اُٹھا کر تصویر کو نمودار کرتے ہوئے کہا "یہ دیکھو۔ کیا یہ تصویر حیرت انگیز نہیں؟"

یہ ایک تصویر تھی جس میں آسمان، پانی، اور درخت، سفیدی مائل سیاہ رنگ میں نمودار تھے۔ اور سامنے ایک چھوٹے آدمی نے ٹوپی پہن رکھی تھی۔

فیوجل جو حسین چیزوں کے دیکھنے کے لئے ہر وقت بیتاب رہتا تھا چلا اُٹھا "کتنی خوبصورت ہے کتنی شاندار ہے"

"کارٹ کے ہاتھوں کی بنی ہوئی ہے، ہے نا؟"

"بیشک!"

سمتھ نے فیوجل کی پسلیوں پر تھپکی دی اور کہنے لگا: "میں نے تمہیں حیران ہی تو کر دیا کیا تم یقین کر سکتے ہو کہ گاٹس چاک ایسی تصویر بنا سکتا ہے؟ حالانکہ یہ اسی نے بنائی ہے۔ جب تم یا کوئی اور شخص اسے کارٹ کا شاہکار کہہ دیتا ہے تو میں فرطِ مسرت سے دیوانہ ہی ہو جاتا ہوں —"

فیوجل نے اس کے سُرخ چہرے پر ایک تیز نگاہ دوڑائی۔ اسے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں فریب کی ایک جھلک نظر آئی۔

سمتھ بولا: "اب تو سارا معاملہ صاف ہو گیا"

"ہاں ہاں بالکل" فیوجل نے کہہ تو دیا مگر یہ معمہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

سمتھ بولا "اب جبکہ تم نے اس تصویر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ تمہارے خیال کے مطابق اس کی کتنی قیمت ہو سکتی ہے۔ میں نے تو دو اور تین ہزار پونڈ کے درمیان تجویز کی ہے۔ اب تم اس تصویر کے فرضی مالک ہو۔ تم نے سمجھ لیا؟ ذرا اسی طرح گاہک کے سامنے اسے پیش کرنا جس رنگ آمیزی کے ساتھ تم نے اپنی تاریخی شاتو کو پیش کیا تھا"

فیوجل نے متانت سے کہا "اس کی قیمت تین ہزار پونڈ ضرور ہو گی"

سمتھ کہنے لگا: "وہ نوجوان جو اس کا خریدار ہے کہتا ہے کہ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ مگر اسے کچھ بھی معلوم نہیں"

فیوجل نے عجیب اختصار کے ساتھ جواب دیا "خُوب.....!"

سمتھ بولا "عجب نہیں وہ تین ہزار پونڈ ہی مان جائے — اور یہی اس کی صحیح قیمت ہے — ہے نا؟ بات یہ ہے کہ ہیری، اس کا خریدار، ایک بڑی جائیداد کا وارث ہے۔ اور تین ہزار پونڈ اُس کیلئے کوئی بڑی رقم نہیں"

فیوجل بولا "مگر وہ تصویر کو دیکھ چکا ہے یا نہیں؟"

مسٹر سمتھ نے کہا "وہ تو اُسے ایک شاہکار خیال کرتا ہے۔ میں نے اُس سے کہا ہے کہ مجھے تصویر کے سودے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کا مالک تو ایک فرانسیسی نوجوان ہے اور وہی اس کی قیمت مقرر کریگا"

فیوجل دل میں خیال کرنے لگا کہ یہ وہی آنریبل ہیری تو نہیں، جو کرسٹابیل سے منسوب ہے۔

سمتھ بولا "میں نے اُسے بتایا تھا کہ ممکن ہے اس کی قیمت تین یا چار ہزار تک پہونچ جائے۔ یہ سُنکر وہ ذرا گھبرا سا گیا تھا۔ میں نے

جب یہ دیکھا تو اُسے بتایا کہ شاید دو اور تین ہزار پونڈ کے درمیان ہی سودا چک جائے۔ چنانچہ میں نے تم کو یہی قیمت لکھدی۔ اب تم تین ہزار سے شروع کرنا۔"

فیوجل نے میز پر جاکر شراب کا ایک گلاس چڑھایا۔ اور بولا۔ "بہتر!"

سمتھ نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو تیزی سے جنبش دیتے ہوئے کہا: "اب آؤ آپس میں فیصلہ کرلیں۔ بھلا انصاف سے کہو تمہارا کمیشن کتنا ہوگا؟ دیکھو بیرن، یہ سب حکمت میرے ہی دماغ نے اختراع کی ہے۔ ذرا خیال تو کرو مجھے کتنی تکلیف کا سامنا ہے۔ کہو چار سو پونڈ مناسب ہونگے؟"

فیوجل نے جواب دیا: "نہیں پانچسو"

سمتھ کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اُس نے خیال کیا کہ اگر کوئی اور آدمی ہوتا تو ضرور اتنے اہم کام کے لئے ایک ہزار پونڈ طلب کرتا۔ اور میں خود بھی آٹھ سو پونڈ دینے پر تیار تھا۔

اُسنے کہا: "بات ہوچکی؟"

فیوجل بولا: "ہوچکی"

دونوں نے باہمی فیصلے پر مہر تصدیق لگانے کے لئے ایک دوسرے سے گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملائے۔ اور کہنہ شراب کے دو گلاس چڑھائے۔ اسی اثنا میں ایک خادم اندر داخل ہوا، اور سمتھ کو ایک طرف لے گیا۔

سمتھ نے کہا: "معاف رکھنا بیرن! ایک منٹ کے لئے میں باہر جارہا ہوں"

فیوجل نے اپنے میزبان کا موٹا سا سگار سُلگایا اور آتشدان کے قریب بازوؤں والی چمڑے کی کرسی پر لیٹ کر خوشگوار خیالات میں مستغرق ہوگیا۔ کبھی وہ اپنی عجیب وغریب حالت کو دیکھکر ہنسنے لگتا تھا۔ اسکے خیال میں مسٹر سمتھ بڑا دلچسپ آدمی تھا۔

اس کے خوشگوار خیالات کا تسلسل جلد ہی ٹوٹ گیا۔ اس کا میزبان ایک بھورے رنگ کے عجیب چہرے والے خاصی عمر کے آدمی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کی مونچھیں سفید تھیں اور اس کے اوورکوٹ کے بٹن کے سوراخ میں فوج کا امتیازی تمغہ لٹک رہا تھا۔

مسٹر سمتھ کا چہرہ فرط غضب سے سُرخ ہو رہا تھا۔ فیوجل کے قریب جاکر کہنے لگا: "تم بتا سکتے ہو کہ تم کون ہو؟"

فیوجل اپنے ہاتھ فراک کوٹ کے پیچھے رکھکر ہنستے ہوئے آتشدان کے قریب ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہنے لگا: "دوست میں بیرن ہوں"

سمتھ تیز آواز میں پوچھنے لگا "تم تو کوئی بدمعاش معلوم ہوتے ہو"

فیوجل ذرا ملائم لہجہ میں بولا "اور یہ شریف زادہ کون ہے جس کی ملاقات کا شرف ابھی تک مجھے حاصل نہیں ہوا"

اجنبی ذرا فخریہ انداز میں کہنے لگا: "میں موسیو بائرن ہوں۔ برن برجر کا ایجنٹ!"

فیوجل بولا: "میرا خیال تھا تم کوئی بیرن ہوگے"

سمتھ چلاکر کہنے لگا: "ٹھٹھا مخول نہ کرو۔ کہو تم بیرن ہو یا یہ؟"

فیوجل بولا: "میں دُنیا بھر کی دولت کے لئے بھی بائرن کا نام اختیار کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ میرا نام آرسٹائیڈ فیوجل ہے"

"تو تم یہاں آکیسے گئے؟"

"تمہارے خادم نے مجھے ریلوے اسٹیشن پر پوچھا: کیا تم ہی مانچسٹر سے آنے والے فرانسیسی ہو؟ میں نے کہا ہاں۔ وہ کہنے لگا۔ مسٹر سمتھ نے تمہارے لئے گاڑی بھیجی ہے۔ میں نے سوچا یہ مسٹر سمتھ کوئی بڑا مہمان نواز شخص ہوگا۔ جس نے اتنی محبت سے گاڑی بھیجی ہے۔ میں اس پر سوار ہوگیا"

مسٹر سمتھ نے اپنا ہاتھ گھنٹی کے بٹن تک لیجاتے ہوئے کہا: "تو اسی وقت کمرے سے باہر ہوجاؤ"

فیوجل نے اس کی مشتعل طبیعت کو ذرا ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا: "بھائی میزبان، دیکھو باہر چھاجوں پانی برس رہا ہے۔ مجھے تمہارے پُرتکلف گھر میں بہت آرام ہے۔ میں یہیں رہونگا"

مسٹر سمتھ کا چہرہ زیادہ سُرخ اور وحشتناک ہونے لگا۔ اُس نے کہا: "اگر تمہارا ایسا ہی خیال ہے تو میں تمہارے لئے زندہ درگور رہوں۔ اب بتاؤ تم خود نکلوگے یا تمہیں پھینک کر باہر نکالا جائے"

فیوجل سگرٹ کا کش لگا کر کہنے لگا: "تم بھول گئے ہو کیا؟ کہ جب دلکش مس کرسٹابیل کے منگیتر کو معلوم ہوگیا کہ جس تصویر کے تم تین چار ہزار پونڈ مانگتے ہو، گوٹس چاک کو صرف آٹھ پونڈ اُجرت دے کر بنوائی گئی ہے تو......"

"کیا کہنا تمہاری عقل کا"

"تم ابھی دیکھ لوگے"

"ارے او بدمعاش، پاجی"

"کتنی اچھی اور نیک مجلس میں میں بیٹھا ہوں"۔

"تو پھر تم باہر چلے جانے کے لئے کیا لوگے، یہ دیکھو چک بک!"

یہ کہکر مسٹر سمتھ آتشدان سے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ فیوجل بازوؤں والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا "میں اندر رہنے کے لئے پانچ سو پونڈ لوں گا!"

"اندر رہنے کے لئے؟" مسٹر سمتھ نے غضب آلود ہوکر پوچھا۔

"ہاں ہاں اندر رہنے کیلئے۔ میرے بغیر تمہارا کام نہیں چلے گا۔ تمہاری لڑکی اور تمہارے خادم مجھے ہی ہیرن سمجھتے ہیں"۔

"میں چاہتا ہوں کہ تمہاری گردن توڑ دوں بخدا، اگر تم کو اندر ہی رہنے کی اجازت مل گئی تو تمہیں ایک شرائط نامے پر دستخط کرنے پڑینگے، میں اتنا بیوقوف نہیں کہ تمہاری باتوں میں آجاؤں"۔

"جو بھی تم چاہو!"

مختصر یہ کہ فیوجل اس سودے میں شریک کرایا گیا۔ پلاٹ یوں تیار کیا گیا کہ فیوجل مالی مشکلات سے تنگ آکر اپنی یہ تصویر بیچنے پر مجبور ہے۔ مسٹر سمتھ کو اس بات کی اطلاع ملی ہے۔ اور اس نے ایک دوست کے ذریعے سے آنریبل ہیری ـــ اپنے ہونے والے داماد کو، اطلاع دی ہے۔ قیمت کا فیصلہ کرنے کیلئے مالک خود آیا ہے۔ مسٹر پائرن، جو اتفاق سے اس وقت لندن میں ہے، اس قسم کے سودے چکانے میں بڑا ماہر ہے۔ وہ بھی مسٹر سمتھ کے ایما سے اس کے مکان پر آگیا ہے تاکہ تصویر کو اچھی طرح دیکھ کر اس کی قیمت کا صحیح اندازہ کرے۔

فیوجل بولا "صحیح طور پر اس سودے میں مسٹر پائرن کا دخل انداز ہونا بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔ بہتر ہے کہ یہ ابھی واپس چلا جائے!"

مسٹر پائرن بولا "میں اتنی بارش میں واپس نہیں جاسکتا۔ اسکے علاوہ میں کوئی ناخواندہ مہمان نہیں ہوں"۔

اس اثنا میں دروازہ کھلا۔ اور مس کرسٹابیل نمودار ہوئی۔ اجنبی پائرن کو دیکھتے ہی وہ حیران سی ہوکر رہ گئی۔ مسٹر سمتھ کے کبیدہ چہرے پر تبسم رقص کرنے لگا وہ بولا "میری پیاری بچی! یہ پیرس کے مشہور مسٹر پائرن ہیں جو اس تصویر کے متعلق اپنی رائے دینے آئے ہیں"۔

پائرن نے اپنا سر جھکا لیا۔ فیوجل آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ "مادموزیل! تمہارا چہرہ دیکھکر مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے کوئی پیاسا ریگستان میں نخلستان دیکھ لے"۔

کرسٹابیل دلفریب تبسم کے ساتھ باپ سے کہنے لگی "نہ جانے تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ ہیری آدھ گھنٹے سے یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ اور تمہیں خبر ہی نہیں"۔

سمتھ نے بڑے اشتیاق کے ساتھ جواب دیا "میری پیاری بچی، اسے یہاں لے آؤ۔ میرے یہ دوست اس کی ملاقات کے لئے ہمہ تن انتظار ہیں"۔

لڑکی کمرے سے یوں جھٹ سے غائب ہوگئی جیسے کوئی روشن شمع فوراً بجھ جائے۔ اور یہ تینوں بدمعاش ایک دوسرے سے سر جوڑ کر گفتگو میں مشغول ہوگئے۔ کرسٹابیل جلدی سے واپس آگئی۔ اس کے ساتھ آنریبل ہیری بھی تھا ـــ لمبا قد، کنگھی کئے ہوئے خوبصورت بال اور مونچھیں، بڑی بڑی نیلی آنکھیں ـــ اس نے سمتھ سے مختصر سے آداب و نیاز کے بعد فیوجل سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا "ہیرن! یہ کتنی خوشنما تصویر ہے، نہ جانے تم اسے جدا کرنا کیسے گوارا کر دگے؟"

فیوجل کی پشت کھانے کی میز کے ساتھ تھی۔ اس کی نگاہ شاہکار پر مرکوز تھی۔ کہنے لگا "ایسی بہت سی تصویریں میرے شاتو میں موجود ہیں۔ میرے باپ اور دادا اور خود مجھے ایسی چیزوں کے فراہم کا خبط ہے"۔

پائرن بولا "تم کہہ رہے تھے کہ تمہارے معزز دادا نے براہ راست کارٹ سے یہ تصویر خریدی تھی"۔

فیوجل نے جواب دیا "ہاں ہاں میرے دادا کارٹ کے بڑے مداح تھے"۔

آنریبل ہیری نے کہا "کیا تمہیں یہ پسند ہے پیاری!"

کرسٹابیل نے بڑے اشتیاق سے کہا "ہاں تو، دیکھو یہ کتنی خوبصورت ہے۔ فیوجل! معلوم نہیں تم اسے جدا کرنا کیسے گوارا کر دگے۔ یہ جو تم نے کہا تھا کہ میرے میں آکر سب تصویریں دیکھ لینا۔ کیا واقعی خلوص سے تم نے دعوت دی ہے؟"

فیوجل بولا "میرے لئے تمہاری ملاقات ایک سحر انگیز ملاقات سے کم نہ ہوگی"۔

کرسٹابیل نے آہستہ سے ہیری سے کہا "تو پھر مجھے ہاں ضرور لے جانا"۔

فیوجل نے کہا "موسیو کیا تم بھی آؤگے؟"

ہیری بولا" میں یہ تصویر تم سے چھین رہا ہوں۔ کہتے ہو تو اسکی معافی طلب کرنے کے لئے وہاں آجاؤں گا. . . . . آہا کتنی دلکش چیز ہے"

فیوجل جواب کرسٹابیل کی سحر طراز آنکھوں اور گلابی گلابی رخساروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اُسے ایک طرف لیجا کر کہنے لگا" کرسٹابیل تمہارا منگیتر تو بڑا خوبصورت آدمی ہے۔ اتنی بڑی جائیداد اُسے مبارک ہو"

مسٹر پاٹرن کی ناگوار آواز نے ان دونوں کی گفتگو کے طلسم کو توڑ دیا۔ کہنے لگا" دیکھو، کارٹ نے اس تصویر کو اپنے آخری سٹائل کے مطابق بنایا ہے۔ اگر اسے نمائش میں رکھ دیا جائے تو یقین ہے کہ اس کی قیمت پانچہزار پونڈ سے کم نہ ہو"

ہیری نے متبسم ہو کر جواب دیا" پانچ ہزار کی رقم تو بہت زیادہ ہے۔ اتنی قیمت میں ادا نہیں کر سکتا۔ مسٹر سمتھ تو کہتے تھے کہ تین اور چار ہزار کے درمیان سودا چک جائے گا۔ میں تین ہزار سے زیادہ نہیں دے سکتا"

مسٹر سمتھ نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا" ہیری! مجھے اس معاملے سے کیا تعلق، میں باہر چلا جاتا ہوں بیرن خود تمہیں قیمت بتا دیگا"

ہیری نے مسرت آمیز لہجے میں پوچھا" تو بیرن کہو تمہارا کیا خیال ہے"

فیوجل میز پر بیٹھ گیا۔ تصویر اُس کے سامنے تیز برقی روشنی میں چمک رہی تھی۔ کہنے لگا" میں اس کے لئے تین ہزار پونڈ کبھی نہیں لونگا۔ نہیں ہرگز نہیں!!

پاٹرن بولا" مسٹر فیوجل یقین جانو یہ مناسب قیمت ہے!"

فیوجل بولا" یہ تصویر میری ذاتی ملکیت ہے"

سمتھ نے جواب دیا" کیوں نہیں۔ کون کہتا ہے یہ تمہاری نہیں ——؟"

" تو پھر اب میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ اور اسے فروخت کرنا نہیں چاہتا!"

سمتھ نے اپنی ہڈیوں کے مغز تک کانپتے ہوئے اپنے ابرو حیرانی سے اوپر اٹھاتے ہوئے کہا" کیا؟ کیا؟ ارادہ بدل لیا ہے؟ تو اب تم اسے فروخت کرنا نہیں چاہتے؟"

فیوجل بولا" نہیں چاہتا، دوست! ذرا غور سے اس بات کو سنو، میں یہاں تمہارے سامنے اس بات کا اظہار کئے دیتا ہوں کہ مجھے مادموزیل کرسٹابیل سے اُلفت ہے!"

کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔ مسٹر سمتھ اپنے سُرخ چہرے اور کھلے مُنہ کے ساتھ فیوجل کی طرف دیکھنے لگا۔ مس کرسٹابیل کے چہرے پر فرطِ حیا سے خون دوڑنے لگا۔ اور ہیری کی آنکھیں خون برسانے لگیں۔ اُس نے کہا۔

"کیا کہا جناب؟"

فیوجل نے اُس کی طرف مخاطب ہو کر کہا" میں مادموزیل کو تم سے چھیننا نہیں چاہتا۔ میری محبت ایک اُمید موہوم ہے۔ مگر یہ اُلفت مرتے دم تک میری رُوح کو خوراک بہم پہنچائے گی۔ اور اس ناکام محبت کی خوشی میں یہ تصویر تم کو تحفے کے طور پر مفت دوں گا"

وہ ایک ہیرو کی طرح اپنے بازو آگے بڑھاتے ہوئے استقلال سے کھڑا تھا۔ ہیری اور کرسٹابیل حیران و مبہوت ایستادہ تھے۔ اُس نے کہا" یہ تصویر میری ہے اور میں ہی تمہیں دے رہا ہوں۔ مجھے اس تحفے سے محض تمہاری مسرت مقصود ہے"

مسٹر سمتھ گرجکر بولا" کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے؟"

ہیری بولا" دوست! تمہاری یہ فیاضی بے نظیر معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں اس تصویر کو تحفے کے طور پر قبول کرنے میں عذر ہے"

فیوجل نے ایک عجیب سے انداز میں آگے بڑھ کر کہا" تو پھر میں اُسے بغل میں دبا گاڑی پر سوار ہو کر ابھی اپنے شہر کو واپس چلا جاتا ہوں!"

اور بالآخر انہیں یہ تصویر قبول کرنی ہی پڑی۔

اس تحفے کے بعد فیوجل ان دونوں —— ہیری اور کرسٹابیل کا گہرا دوست بن گیا۔ وہ ان کی شادی پر بھی شامل ہوا۔

تصویر ابھی تک ہیری کے مکان کی زینت ہے مگر فیوجل کا تاریخی شاتو اس واقعے سے چند ہی روز بعد جل کر راکھ ہو گیا۔ نہ معلوم یہ کس کا کام تھا——؟

(بہ تلخیص از ڈبلیو، جے، لوکی۔)

طاہر قریشی۔ بی اے

مشہور کر رکھا تھا کہ زہرہ سے میرے ناجائز تعلقات ہیں۔ میں نے چوری کے مقدمہ میں اُسکی مدد کی تھی۔ اور اُسے دفتر میں ملازمت دی تھی، اور اب اُسے سکرٹیری کے ممتاز عہدے پر فائز رکھا تھا۔ اگرچہ مجھے اِن بے بنیاد افواہوں کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ تاہم میں چاہتا تھا کہ کم از کم زبیدہ اور زہرہ کو اِن باتوں کا علم نہ ہونے پائے۔

اس شام کو جب میں گھر پہونچا تو زبیدہ اختر کے ہمراہ سینما دیکھنے چلی گئی تھی میں تھکا ہوا تھا۔ اسلئے ان کے واپس آنے سے پیشتر ہی سو گیا۔ اگلے دن صبح سویرے میں دفتر چلا گیا۔ زبیدہ ابھی تک سو رہی تھی۔ اس لئے مجھے اُس سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔

میں دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ زہرہ نے صبح کی ڈاک لاکر میری میز پر رکھدی۔ مجھے ایک ضروری چٹھی موصول ہونے کی اُمید تھی۔ اس لئے میں خطوط کا بنڈل اُٹھا کر جلدی جلدی خط چھانٹنے لگا۔ ایک چٹھی زہرہ کے نام تھی میں نے سرنامہ پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے لفافہ زہرہ کے ہاتھ میں دیدیا۔ اُس نے لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر بسرعت پڑھنے لگی۔ یکدم گھبراہٹ سے اسکے چہرے پر زردی چھا گئی اور ایک ہلکی سی چیخ اُسکے مُنہ سے نکلی۔ اُسکے لرزتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا ہوا خط درخت کے کسی خشک پتے کی طرح ہل رہا تھا۔ زہرہ نے خط میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا "اسے پڑھیئے یہ آپکی بیوی کی تحریر ہے"

ایک ہی نظر میں میں نے دیکھ لیا کہ خط میں اُسی فرضی اور بیہودہ قصے کو دُہرایا گیا تھا جو میرے اور زہرہ کے متعلق میرے دُشمنوں نے مشہور کر رکھا تھا۔ آخر میں زہرہ کو اِس بات کی تاکید کی گئی تھی کہ وہ فوراً میری مُلازمت سے علیحدہ ہو جائے کیونکہ وہ زندگی کو تباہ کر رہی تھی اور اُسی کی بدولت میری عزت و شہرت کو بٹہ لگ رہا تھا۔

تحریر فی الحقیقت زبیدہ کی تھی میں اپنی بیوی کی اِس نازیبا حرکت پر سخت متحیر و آزردہ ہوا۔

زہرہ اسی وقت سر کے درد کا بہانہ کر کے دفتر سے چلی گئی۔ میں نے سمجھ لیا کہ اِس واقعہ نے اسکے دِل کو سخت قلق پہونچایا تھا۔ اگلے دن وہ دفتر میں مطلق نہیں آئی اور دوپہر کے وقت اُس نے ایک مختصر سا نوٹ بدیں مضمون بھیجا "میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کی ازدواجی زندگی پر آلام اور آپکی شہرت کو گزند پہونچے۔ میں کل ہی ناصر سے شادی کرنے والی ہوں کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ اِس صورت میں اُن تمام افواہوں کا خاتمہ ہو جائیگا جو مجھ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ اب آپکے ہاں میری ملازمت کا جاری رہنا ناممکن ہے"

جب میں نے زبیدہ سے اِس بات کا ذکر کیا کہ زہرہ ملازمت چھوڑ کر چلی گئی ہے اور ناصر جیسے اوباش سے شادی کرنے والی ہے۔ تو اُس نے کسی قدر افسوس کا اظہار کیا۔ میں نے سرد مہری سے کہا "زبیدہ اسکی تمام ذمہ داری تم پر عاید ہوتی ہے۔ کیونکہ تم نے اُسے ملازمت چھوڑ دینے کو خط لکھا تھا"

وہ ندامت سے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے بولی "میں نہیں سمجھتی تھی کہ اُس کا یہ انجام ہوگا"

"تم کاہے کو جانتیں" غصہ میں میرے مُنہ سے نکلا "کیا تم احمقانہ جذبۂ رقابت کو اپنے دل سے کبھی نہیں نکال سکوگی"

"آہ! میں کہہ نہیں سکتی" زبیدہ نے دبی زبان سے جواب دیا۔

"یہ جذبہ میری رُوح کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہا ہے"

(۶)

زندگی کے ہر شور ہنگامے ایک ہی رفتار پر ہمیشہ جاری رہتے ہیں اور انسان کش مکش حیات میں محو ہو کر گذشتہ واقعات کو بھول جاتا ہے میں پھر بدستور اپنے پیشہ کی مصروفیتوں میں منہمک ہو گیا۔ زبیدہ دن بدن اختر کی صحبت میں خوشی محسوس کرنے لگی اور اب وہ زیادہ تر سیر و تفریح اور تماشا گاہوں میں گذارنے لگے۔ اسی طرح میری کتابِ زندگی کا ایک اور ورق اُلٹ گیا۔

زہرہ کی یاد قریب قریب میرے دل سے نکل چکی تھی۔ ایک شب کو میں کسی پبلک جلسہ میں تقریر کر رہا تھا کہ پچھلی نشستوں سے کچھ شور سنائی دیا ایک مضبوط و توانا نوجوان شراب کے نشہ میں بدمست ہو کر کچھ گڑبڑ مچا رہا ہے، اور جب لوگوں نے تنگ آکر اُسے جلسہ گاہ سے باہر نکالا تو میں نے اُسے پہچانا کہ وہ زہرہ کا شرابی خاوند ناصر تھا۔ جلسہ کی کارروائی ختم ہوتے ہی میں نے ناصر کی بابت دریافت کیا۔ اُس وقت وہ بدمستی کی حالت میں ایک بنچ پر بیہوش پڑا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اسکی بیوی اچانک بیمار ہو گئی تھی، اور وہ ڈاکٹر کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ مگر راستے میں شراب کے نشہ سے چور ہو کر سب کچھ بھول چکا تھا۔ مجھے زہرہ کی بدقسمتی پر افسوس ہوا اگر ساتھ ہی اپنی بیوی پر بھی غصہ آیا جسکی بدولت وہ ناصر سے شادی کرنے پر مجبور ہوئی تھی۔

ایک دوست کی مدد سے میں نے ناصر کو اپنی موٹر میں بٹھایا اور اسکے گھر کا رُخ کیا۔ راستہ میں زہرہ کے علاج کے لئے میں نے ایک ڈاکٹر کو بھی ساتھ لے لیا اور قریباً آدھ گھنٹہ میں ہم ناصر کے مکان پر پہونچ گئے۔ کمرہ میں داخل ہوتے ہی میری آنکھوں نے ایک حسرت آمیز منظر دیکھا۔ سبز لیمپ کی مدہم روشنی کمرہ میں پھیلی ہوئی تھی اور زہرہ شدت بخار سے بستر علالت پر پڑی ہوئی کراہ رہی تھی، اُسکے چہرے کا رنگ سفید ہو رہا تھا اور پسینہ کے قطرات اُسکی پیشانی پر چمک رہے تھے۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی میز پر رُوئی کے چند

ٹکرے اور ایک بڑا سا چاقو پڑا تھا۔ مکان سے باہر موسم بہار کا کوئی خوشنوا پرندہ زندگی کے پُر مسرت نغمے گا رہا تھا اور اُسکی شیریں آواز کھڑکی کے راستے اندر سُنائی دے رہی تھی۔

ہم دوڑ کر زہرہ کی چارپائی کے قریب جا کھڑے ہُوئے اور ڈاکٹر نے اُسکی نبض و دل کی حرکت کا معائنہ کر کے اُسے دوا پلائی۔ ناصر اب قدرے ہوش میں آچکا تھا اور دروازہ میں کھڑا ہمیں غصہ و نفرت سے گھُور رہا تھا۔ یکدم وہ غُصہ میں گرجتا ہُوا ڈاکٹر کی جانب بڑھا اور اُسے دھکا دیکر فرش پر لُڑھکا دیا۔ پھر زہرہ کے قریب آکر درشتی سے کہنے لگا "اُٹھو۔ تم یہاں پٹی کیا کر رہی ہو۔ جاؤ میرے لئے کھانا تیار کرو"۔ میں دوڑ کر اُسکے سامنے کھڑا ہُوا اور اُسے پیچھے ہٹاتے ہُوئے زہرہ کے قریب سے چلے جانیکا حکم دیا۔ ناصر نے غصہ سے منہ کھول کر میری طرف دیکھا اور ایک خونخوار درندے کی مانند اُسکی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ یک لخت میز پر سے چاقو اُٹھا کر ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ بھُوکے شیر کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوا ــــ زہرہ کے منہ سے ایک زور کی چیخ نکلی۔

میں فوراً جست کر کے ایک طرف ہٹ گیا اور پھُرتی سے ناصر کے مُنہ پر اس زور سے مُکا رسید کیا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر آرہا۔ گرتے وقت اسکا سر اس زور سے آتشدان سے ٹکرایا کہ اس سے خون بہنے لگا۔ اور وہ بیہوش ہوگیا۔ اس اچانک حادثہ سے میں سخت گھبرایا۔ ڈاکٹر نے ناصر کے سر پر پٹی باندھنی شروع کی۔ اور میں نے ٹیلیفون پر پولس کو موقع واردات پر پہونچنے کی اطلاع کی۔

جب میں واپس ہونے لگا تو رات نصف کے قریب گزر چکی تھی۔ زہرہ کا بخار ہلکا ہوگیا تھا۔ مگر ناصر کی حالت بدستور تشویشناک تھی اگرچہ اس کا سانس برابر چل رہا تھا۔ تاہم شدتِ زخم سے وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ پولس فوراً موقع پر پہونچ گئی۔ اور انسپکٹر پولس نے مجھے بتایا کہ میں گھر پہونچ کر مزید اطلاع کا انتظار کروں۔

وہ رات میں تمام عمر نہیں بھُولونگا۔ میں تیزی سے گھر کی طرف موٹر دوڑا رہا تھا۔ آسمان پر ماہ مئی کا چاند دم بخود تھا۔ سڑک کے دونوں جانب سفید گلابی پھُولوں سے لدے ہوئے سیب کے درخت تیزی سے میرے قریب سے گزر رہے تھے۔ اور فضا میں ایک ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ تھوڑی، تھوڑی دیر بعد سرد ہوا کا کوئی گستاخ جھونکا کھڑکی کے راستے موٹر میں داخل ہو کر میرے جسم میں تھرتھراہٹ پیدا کر دیتا۔ رات کی خاموشی میں کسی پرندے کی اچانک آواز نہایت خوف آمیز معلوم ہوتی۔ اُسوقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے موت کا بھیانک فرشتہ ایک سائے کی طرح میرے گرد منڈلا رہا ہو۔ میں سوچ رہا تھا کہ خدانخواستہ اگر ناصر کی موت واقع ہوگئی تو اسکی تمام ذمہ داری میرے سر تھوپ دی جائیگی۔ زہرہ کے بارے میں لوگ مجھ سے بدظن ہو چکے تھے اور اب ان کے لئے یہ سمجھنا نہایت آسان تھا کہ زہرہ کو حاصل کرنے کے لئے میں نے اُسکے خاوند کو ہلاک کر دیا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر کی شہادت میرے حق میں اس بات کا کافی ثبوت تھی کہ میں نے حفاظتِ خود اختیاری میں ناصر کو ضرب لگائی تھی۔ تاہم سابقہ حالات کو پیشِ نظر میں خود کو ایک ایسی خطرناک چوٹی پر کھڑا دیکھ رہا تھا جہاں سے پھسل کر میرا قعرِ مذلت میں گرنا لازمی امر تھا۔ مجھے زبیدہ سے بھی کسی خاص مدد کی توقع نہیں تھی۔ کیونکہ وہ اپنے حاسدانہ جذبات کی آگ میں جلتے ہوئے کئی مرتبہ مجھے بھی چھوڑ جانیکی دھمکی دے چکی تھی۔ اگر سچ مچ اُس نے مجھے اِس مصیبت میں چھوڑ دیا تو لوگ مجھے اور بھی مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگیں گے ــــــــ اسی قسم کے خیالات رہ رہ کر میرے دل کو مضطرب بنا رہے تھے۔

(۷)

جب میں گھر پہونچا تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مکان میں ہر طرف مکمل سکوت تھا۔ میں فوراً اپنی خوابگاہ میں داخل ہُوا۔ کمرہ میں ابھی تک لیمپ روشن تھا۔ اور میز پر ایک لفافہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ تحریر زبیدہ کی تھی۔ اور خط پر یہ عبارت درج تھی۔

"میں اختر کیساتھ جا رہی ہوں وہ مجھے ازحد محبت کرتا ہے جس طرح تم نے مجھے آتش حسد میں جلایا ہے اب خود بھی جلنے کا مزہ چکھو"۔

میری آنکھوں سے آگ کے شعلے نکلنے لگے، اور مجھے پیشانی پر خون کے قطرات ٹپکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ رقابت و حسد کی ایک تیز و تند لہر نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ ایک ہی وار میں میں زبیدہ اور اختر دونوں کا خاتمہ کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے ٹیلیفون اُٹھایا کہ ریلوے اسٹیشن سے گاڑی چھوٹنے کا وقت دریافت کروں۔ مگر اس خیال سے رُک گیا کہ شاید وہ ٹرین پر سوار ہی نہ ہوئے ہوں۔ کیونکہ اختر کے پاس موٹر موجود تھی نیز مجھے اس بات کا بھی علم نہ تھا کہ وہ کس طرف گئے ہیں۔ ایک تیر خوردہ جانور کی طرح میں حالتِ اضطراب میں اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا غصہ سے میرا جسم اور روح بُری طرح لرز رہے تھے۔ محبت کی بجائے اب رقابت و حسد کا وحشیانہ جذبہ مجھ پر مسلط ہو چکا تھا۔

کئی گھنٹے بعد کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ میں نے دوڑ کر دروازہ کھولا تو پولیس سب انسپکٹر دروازہ میں کھڑا تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ زبیدہ کی طرف سے کوئی پیغام لایا ہے کیونکہ اُسکی بیوی زبیدہ کی دوست تھی۔ مگر وہ مجھے انسپکٹر پولیس کی طرف سے اطلاع دینے آیا تھا۔ کہ ناصر ابھی تک زندہ تھا اور ڈاکٹر کی رائے تھی کہ صبح ہونے تک وہ یقیناً ہوش میں آجائیگا۔

اسکے جانیکے بعد مجھے قدرے اطمینان ہُوا مگر اس وقت میرے پیشِ نظر میری زندگی کا دوسرا پہلو تھا۔ مجھے سوائے زبیدہ کے اور کسی چیز کا خیال نہ تھا

(بقیہ صفحہ ۲۹۳ پر)

تعمیرِ جنوں

کالج میں اندرا سب سے حسین لڑکی شمار کی جاتی تھی، اسکے چہرہ کا اگر تشریحی جائزہ لیا جاتا تو اس کا حسن کسی طرح غیر معمولی نہ معلوم ہوتا، لیکن اس کا مجموعی اثر ایک خاص دلکشی و جاذبیت پیدا کرتا تھا جس سے کالج کی دوسری لڑکیاں قطعاً محروم تھیں اور پھر اُسکی دلآویزی کا راز صرف اُسکی ظاہری صورت ہی نہ تھا۔ بلکہ اسکی سادہ بے بناوٹی فطرت بھی بڑی حد تک اسکی دلکشی کا موجب تھی۔ اسکی بات چیت لباس و وضع طور طریقہ سے کسی طرح ظاہر نہ ہو سکتا تھا کہ وہ ہائی کورٹ کے جج کی اکلوتی بیٹی تھی وہ اپنے سب ساتھیوں سے ایک طرح ملتی۔ ساتھ پڑھنے والے لڑکوں سے ملنے میں وہ کبھی اس سے زیادہ شرم و حجاب کا اظہار نہ کرتی، جتنا کہ اسکی جنس کا فطری تقاضہ ہوتا لیکن ساتھ ہی وہ کسی سے ملنے جلنے میں اپنا نسوانی وقار بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ ان خصوصیات نے اندرا کو کالج کے طلبا کا مرکز توجہ بنا دیا تھا۔ اندرا بھی سبھوں سے ملتی اور پھر کسی سے شیر و شکر بھی نہ ہوتی۔ لیکن شیام سندر کے ساتھ بہ نسبت اور ساتھیوں کے وہ زیادہ آزاد تھی۔ اسکی وجہ صرف اتفاقی تھی یعنی یہ کہ اندرا اور شیام سندر نے ایک ساتھ ایک اسکول میں تعلیم شروع کی، ساتھ ہی میٹرک پاس کیا، اور کالج میں بھی ساتھ تھے، صرف یہی نہیں بلکہ وہ ایک ہی محلے میں رہتے تھے اور ان کے والدین کے درمیان عرصہ سے کافی تعلقات تھے۔ غالباً اسی قدیم لگاؤ کے سبب شیام سندر اندرا سے اس طرح نہ ملتا تھا جس طرح اسکے دوسرے ساتھی ملتے تھے۔ وہ جب اندرا سے باتیں کرتے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا جذبۂ شوق اپنی تکمیل کے لئے بےچین ہو رہا ہے۔ لیکن رائے اظہار نہ ہو سکنے کی وجہ سے مجبور و بےبس کسی مناسب موقع کا منتظر ہے۔ انکی نگاہیں یوں تو دوسری طرف لگی ہوئی معلوم ہوتیں لیکن اس سے آنکھیں بچا کر وہ کبھی کبھی اسی للچائی نظروں سے دیکھ لیتے۔ انکے انداز میں مبالغہ آمیز متانت و سنجیدگی ہوتی جو بجائے انکی دلی کیفیات پر پردہ ڈالنے کے اسکی مضحکہ خیز پردہ دری کرنے لگتی وہ اندرا کو چاہتے تھے اور اپنے دلوں میں اس سے محبت کرنے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ کامل احساس کے ساتھ اسلئے کہ انکی ملاقات اندرا سے اس وقت شروع ہوئی تھی جب انکا محبت کرنے کا جذبہ اپنا بچپن ختم کرکے علم پسند آمیز امتزاج حاصل کر چکا تھا اور محبت کا مفہوم انکے لئے صرف محبوب کی موجودگی انبساط و مسرت کے چند سیدھے سادے تاثرات تک محدود نہ تھا۔ بلکہ اس میں محبوب کے حصول کی خواہش بھی شامل ہو چکی تھی اس خواہش کا علم اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے غور و تفکر کی جولانی۔ اس کے برعکس شیام سندر کو کبھی اس کا احساس نہ ہوا کہ اُسے اندرا سے محبت تھی۔ وہ بچپن سے ایکدوسرے سے ملتے جلتے آئے تھے اور آج بھی ان کے باہمی اختلاط میں اُسی معصومیت اور سادگی کی روش باقی تھی۔ گو ان کے دوسرے ساتھی انکی راہ و رسم میں اپنی کیفیات کا عکس دیکھ کر اسمیں مختلف معنی بھر دیا کرتے تھے، دُنیا کا ہر انسان اپنی آنکھوں پر ایک خاص رنگ کی عینک لگائے پھرتا ہے جسکی وجہ سے اُسے کائنات کی ہر شے اُسی رنگ کی نظر آتی ہے اور اس طرح وہ کسی چیز کو اسکی اصلی صورت میں نہیں دیکھ سکتا۔ یہ مجبوری شاید انسانی فطرت کی تعمیر کا ایک لازمی جزو ہے۔

اندرا آئی، اے پاس کرکے بی۔ اے میں داخل ہوئی، اُسکے نئے ساتھیوں میں کانپور کے مشہور تاجر بابو گوپال سرن، کا بیٹا پرکاش بھی تھا جو بنارس ہندو یونیورسٹی سے آئی۔ اے پاس کرکے بی۔ اے میں داخل ہوا تھا۔ پرکاش کا مردانہ حسن اور تناسب اعضا بہت جلد اُسکے ساتھیوں کا مرکز توجہ بن گیا۔ بنارس یونیورسٹی میں اس نے یونیورسٹی میں اوّل انعام حاصل کیا تھا۔ سارے ساتھیوں کو اسکی تقریر سننے کا شوق تھا۔ "وہ جب اپنی اس مقناطیسی شخصیت کیساتھ تقریر کرتا ہوگا تو ساری فضا سحر آگین ہو جاتی ہوگی" وہ آپس میں گفتگو کرتے اور اس دن کے بےچینی سے منتظر تھے جب کالج ڈیبیٹنگ سوسائٹی (مجلس مذاکرہ) کے سالانہ جلسہ میں پرکاش مباحثہ کی افتتاح کرنیوالا تھا۔ آخر وہ دن آ پہونچا۔ پرکاش نے مباحثہ شروع کیا۔ پرکاش کی جاذبیت اس وقت قابلِ رشک ہو رہی تھی، اسلئے کہ وہ صرف ایک حسین شخصیت کا حامل نہ تھا۔ بلکہ ایک بلند دماغ اور مسحور کر دینے والے الفاظ و بیان بھی اُسکے حصہ میں آئے تھے۔ ساری نگاہیں صرف اسی کو تک رہی تھیں۔ اندرا بھی ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھ رہی تھی "کتنا حسین مقرر ہے" اس نے دلمیں سوچا اور نیم مدہوشی کی حالت میں پرکاش کی جادو بھری تقریر سنتی رہی، تقریر ختم ہوئی تو اسکی تالیوں کی آواز دوسروں سے زیادہ بلند تھی۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ تالیاں بجاتے وقت وہ اپنی جگہ سے

کچھ کھڑکی بھی ہوگئی تھی ۔

دوسرے دن اندرا شیام سندر سے بار بار پرکاش کی تعریف کر رہی تھی ۔ شیام سندر خود بھی پرکاش کی شخصیت سے کافی متاثر ہوچکا تھا ۔ وہ بھی اندرا کی تائید کرتا جا رہا تھا ۔

"کیوں نہ اُسے ہم اپنے ساتھ چائے پر مدعو کریں ؟ ہم اسکی عالمانہ اور پُر از معلومات گفتگو سے ضرور فائدہ اُٹھا سکیں گے ۔"

"کہاں ؟"

"اپنے مکان پر"

"کیوں نہیں !" اندرا کی کالج کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے کسی ساتھی کو اپنے گھر پر بُلانیکا خیال ظاہر کر رہی تھی ۔ شیام سندر کو اسکی اس خلاف وضع حرکت پر تعجب ضرور ہُوا "لیکن پرکاش کی شخصیت واقعی اس خصوصیت کی مستحق ہے" اس نے خیال کیا

"تو پھر پرکاش کو تُم میری طرف سے مدعو کرو ۔"

"کیوں تم اس سے خود کیوں نہیں کہتیں ۔"

"تم ہی کہہ دو گے تو کیا ہوگا ؟"

"میں تو اُسے مدعو نہیں کر رہا ہوں ۔"

"تو میں یہ تھوڑی ہی کہتی ہوں کہ تم اُسے مدعو کرو ۔ صرف میری طرف سے اُسے کہہ دو ۔ مجھے خود کہتے ہوئے ذرا بے تُکا سا معلوم ہوتا ہے ۔"

"لیکن بے تُکا پن تو زیادہ میرے کہنے میں ہے ۔"

"تو تم نہیں کہو گے ؟"

"میں تو نہیں کہتا ۔ تمہارا اصرار ہے تو کہہ دونگا ۔"

شیام سندر کو اندرا کی یہ ضد کچھ ایسی انوکھی سی معلوم ہوئی ۔ وہ اپنے کسی ساتھی سے گفتگو کرنے میں بلا وجہ شرم و حجاب کی عادی نہ تھی ۔ اور پھر اُسے پرکاش سے کچھ ایسی زیادہ باتیں بھی نہیں کرنی تھیں ۔ صرف چاء پر بُلانے کے لئے کہنے میں اُسے تامل کیوں ہو رہا تھا ؟ "وہ پرکاش کی شخصیت سے بہت زیادہ مرعوب ہوگئی ہے" اس نے دل میں سوچا اور پرکاش کو اندرا کی طرف سے مدعو کرنیکے لئے اسکے قریب جانے لگا ۔ لیکن اُسے ایسا محسوس ہوا کہ قدم آگے بڑھانے میں اسے کوشش کرنی پڑ رہی تھی ۔ جیسے وُہ کسی دُشوار مُہم پر جا رہا ہو ۔ "اندرا نے تمہیں آج یہاں چاء پر بُلایا ہے ۔" اُس نے پرکاش کے قریب پہونچتے ہی تیزی سے یہ الفاظ کہہ ڈالے ۔ جیسے وہ کسی زبانی یاد کئے ہوئے جملہ کو دُہرا رہا ہو ۔

"یعنی مجھکو ؟ کب ؟" پرکاش نے شیام سندر کے انداز گفتگو سے متحیر ہوتے ہوئے یہ سوال کیا ۔

"آج شام کو" شیام سندر نے جواب دیا ۔ وہ اپنی گفتگو کا بے تُکا پن محسوس کرکے شرما گیا ۔ "اندرا نے مجھ سے بے موقع یہ کام لیا ۔ اسے خود پرکاش سے کہنا چاہیئے تھا" اس نے خیال کیا ۔

"اور کون ہوگا ؟"

"میں تم اور اندرا"

"اچھی بات ہے مجھے کوئی عذر نہیں ۔"

اندرا پرکاش کی دعوت کے انتظام میں منہمک تھی ۔ شیام سندر اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا ۔ اندرا کا یہ انہماک اُس پر ایک خاص قسم کا تاثر پیدا کر رہا تھا ۔ جس کی وہ خود اپنے دماغ میں بھی کوئی تشریح نہیں کر سکتا تھا ۔ جیسے کسی خوف کا اتنا ہلکا احساس کہ اُسے کسی دوسرے جذبہ سے تمیز کرنا مشکل ہو ۔ رہ رہ کر اُسکے دماغ میں وہاں سے چلے جانیکی ایک مُبہم سی خواہش پیدا ہوتی تھی لیکن اپنی ناموزونیت کی وجہ سے اس خواہش کو قرار حاصل نہ ہوتا ۔ شیام سندر اپنے اندر ایک اضطراب انگیز کیفیت کا عمل محسوس کر رہا تھا ۔ وہ اپنے دماغ میں اس طربناک انتظار کا اثر پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ جسے پرکاش کی فلسفیانہ اور دلاویز گفتگو سے لُطف اندوزی کے تصوّر کا نتیجہ ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ اس کوشش میں ناکام ہو رہا تھا ۔ کیوں ؟ اس کے سبب کے سمجھنے سے وہ قاصر تھا ۔

پرکاش وقت مُقررہ پر اندرا کے مکان پر پہونچ گیا ۔ اور تینوں ایک ٹیبل کے تین طرف بیٹھ گئے ۔

آپ نے اتنا تکلف ناحق کیا ۔ اس قسم کی صحبتیں کھانے پینے کی غرض سے تھوڑی ہی ہوتی ہیں کہ اُنکے لئے اتنا اہتمام کیا جائے ۔

"نہیں کوئی خاص تکلّف تو نہیں ہے ۔" اندرا نے کیک کی رکابی پرکاش کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ۔"

مختلف قسم کی باتیں ہونے لگیں جس میں زیادہ گفتگو پرکاش کر رہا تھا ۔ شیام سندر اور اندرا خموشی سے سُن رہے تھے ۔ گفتگو کا موضوع موجودہ ادبی رجحان ۔ سائنس کی کرشمہ سازیاں ، ہندوستان کا مستقبل دُنیا کا مذہب ، ان سبھوں سے بدلتا ہُوا سائیکو انیلسس (نفسیات تحلیلی) پر آپہونچا تھا ۔

"سائیکو انیلسس (نفسیات تحلیلی) نے ہمارے سامنے ایک نئی دُنیا پیش کردی ہے جسکی وسعتیں بھی بے پناہ ہیں اور گہرائیاں بھی اتھاہ ۔ ینگ (Jung) نے تو اپنے کلکٹو انکونشنس (لاشعور ذہن اجتماعی)

کو حیات کے سارے منازل تجربات و مشاہدات کا مکمل ریکارڈ قرار دے رکھا ہے۔ گویا ہمارے روزمرہ کے کردار پر صرف انہیں جذبات و محرکات کا اثر نہیں پڑتا جنکی بنا ہماری انفرادی زندگی میں ہوئی ہے بلکہ اُن سارے ترغیبات و رُجحانات کا جو ابتدائے آفرینش سے نسلاً بعد نسل ہماری وراثت میں آتی جا رہی ہیں اور جن کا مخزن ہمارا ذہن لاشعوری ہے۔ واقعی یہ نظریہ نہایت صحیح ہے ورنہ ہم باوجود اتنے متمدن ہو چکنے کے اکثر حالات میں اُن حرکتوں کے کیوں مرتکب ہو جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر ایک غیر متمدن قوم بھی شرما جائے؟ آپ اسپین کی سول وار کو دیکھئے کیا اسکے اندر وہی خون آشامی و غارتگری کا وحشیانہ جذبہ عمل پیرا نہیں ہے جو ہمارے پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے والے آباؤ اجداد کی روزمرہ زندگی کا جُز و لاینفک تھا؟ کیا اسپین کا کوئی ذی فہم باشندہ اس حقیقت سے انکار کرسکتا ہے کہ اس طرح ایک دوسرے کی خون کی ندیاں بہانا بیگناہ عورتوں اور معصوم بچوں کو تہ تیغ اور بے خانماں کر دینا، خوبصورت شہروں اور دلکش عمارتوں کو جنکے کمالِ صنعت پر وہ دُنیا کے سامنے فخر کیا کرتا تھا اس طرح اپنے ہی ہاتھوں سے ویران و برباد کر دینا انسانی اُلوالعزمی و سربلندی فرزانگی و وسعت نظری کی ہنسی اُڑانا ہے؟ وہ اگر تنہائی میں بیٹھ کر اپنی حرکتوں کا جائزہ لے تو کیا سب سے پہلے اپنے ہی کو گولی مار دینے کے قابل نہ تصور کرے؟ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ اس لئے کہ ذہن اجتماعی (Group mind) جسکے وجود و نشوونما کا راز حیات کی مکمل تاریخ میں ملتا ہے اس پر مسلط ہے اور اسے کچھ سوچنے اور سمجھنے کی مہلت نہیں دیتا۔"

پرکاش اپنی گفتگو میں منہمک تھا۔ اندرا نظریں نیچی کئے بیٹھی تھی جیسے وہ گفتگو سے زیادہ کھانے کی چیزوں سے دلچسپی لے رہی ہو۔ لیکن کبھی کبھی وہ ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ پرکاش پر ڈال لیا کرتی تھی۔ شیام سندر اندرا کے انداز میں ایک انوکھا پن محسوس کر رہا تھا۔ اسکی نگاہوں میں اسے اپنے ان ساتھیوں کی نظروں کی جھلک دکھلائی دے رہی تھی جنہیں اندرا کی نسبت کا دعوےٰ تھا۔ ویسی ہی چرائی ہوئی سی نگاہیں۔ وہ خیالات کے اتھاہ سمندر میں غوطے مارنے لگا۔ "اندرا پرکاش کو چاہنے لگی ہے" اسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی اُسکے کان میں یہ الفاظ کہہ رہا تھا۔ "تو پھر اس میں حرج بھی کیا ہے؟" جیسے اُس نے ان الفاظ کا جواب دیا۔ "کیا پرکاش اندرا کی محبت کا حقیقی معنی میں اہل نہیں ہے؟ لیکن پھر اسکے دماغ میں خوف کا سا دُھندلا پن کیوں پھیل گیا؟" "اندرا سے اُسکی راہ رسم ختم ہو جائیگی۔" اُسے ایسا معلوم ہوا کہ اُسکے دماغ پر ٹھوکروں سے یہ آواز پیدا ہوئی۔ "کیوں؟ ایسا کیوں ہونے لگا؟ پرکاش سے اُسکی دوستی کچھ کم نہیں ہے وہ اسکے بعد بھی اندرا سے اسی طرح مل جُل سکتا ہے"۔ "کس کے بعد؟" جیسے کسی نے اُس سے اس جملہ کی توجیہ کی فرمائش کی۔ "اندرا کی پرکاش سے شادی کے بعد۔ کیا یہ ایک بہترین جوڑا نہ ہوگا ان دونوں کے ملاپ پر خود فطرت اپنی حسن آفرینی و موزونیت پر ناز کریگی" "لیکن وہ کیا کریگا؟" یہ سوال اُسے بالکل بے معنی سا معلوم ہوا، وہ اندرا اور پرکاش سے اپنی دوستی اور مضبوط کر کے اُنکی صحبتوں سے ویسے ہی لطف اندوز ہوتا رہیگا۔"

شیام سندر کا دماغ ایک مستقل مکالمہ کا سین بنا ہُوا تھا۔ پرکاش کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا "آپ اگر اپنے روزمرہ کے کردار کا صحیح جائزہ لیں تو بیشتر حالات میں آپ یہ محسوس کرینگے کہ آپ کا ارادہ کچھ اور ہے اور آپ کا عمل کچھ اور۔ یہی نہیں۔ بلکہ بسا اوقات آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ کے عمل و کردار کی کوئی غرض و غایت نہیں۔ اگرچہ آپ انہیں بروئے کار لانے پر مجبور ہیں۔ انسانی قوت ارادی کا استحکام آپ کو بالکل متزلزل معلوم ہوگا، اور اسکی آزادی قطعاً بے معنی۔ میں اس احسان کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں جو علمائے نفسیات نے انسانیت پر ....." دفعتاً چائے کی پیالی جو شیام سندر کے لبوں سے قریب ہو رہی تھی اس کے مرتعش ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور میز پر چائدانی سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور چائے کی چھینٹیں تینوں کے کپڑوں پر گریں۔ اندرا اور پرکاش یکبارگی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شیام سندر کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا اُسکی آنکھیں پھیل رہی تھیں۔ جیسے وہ اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو، اُسکی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔

"میرا سر چکرا رہا ہے۔ میں گھر جاؤنگا" یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے علیحدہ ہونے لگا۔

اندرا گھبرا گئی۔ پرکاش پر بھی حیرت و استعجاب طاری ہو گیا۔

"شیام! تمہیں یہ یک بیک کیا ہو گیا۔ گھبراؤ نہیں۔ بیٹھ جاؤ، گھر جا کر کیا کرو گے۔ فوراً طبیعت ٹھیک ہو جائیگی" اندرا نے شیام سندر کے قریب آ کر کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ لیکن اندرا مجھے اب یہاں ٹھہرنے نہ دو۔ میرا سر بُری طرح گھوم رہا ہے۔ میں ایک منٹ بیٹھ نہیں سکتا۔ پرکاش مجھے سخت ندامت ہے کہ میری وجہ سے یہ دلچسپ صحبت بے لطف ہو گئی۔ تم مجھے معاف کروگے"

"تو یہ کیسی باتیں کرتے ہو؟ میں تو کہتا ہوں تھوڑی دیر بیٹھ

باو حیثیت سنبھل جائیگی

"نہیں مجھے جانا ہی چاہیئے" کیوں ؟ اس کا سبب خود شیام سندر کو بھی معلوم نہ تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اندرا کے مکان سے باہر نکل آیا۔ باہر قدم رکھتے ہی اس نے محسوس کیا کہ اُسکے دماغ کا توازن قائم ہوگیا تھا اور اس کے خیالات کا دھندلاپن مفقود۔ اب وہ ہر بات صحیح طور سے سوچ سکتا تھا۔ تو یہ کتنی لطیف صحبت آج میری وجہ سے کرکری ہوگئی۔ نہ جانے مجھے یک بیک کیا ہوگیا تھا۔ پرکاش جانے کیا سمجھتا ہوگا۔ مگر وہ ان سطحی باتوں سے بہت بلند ہے اُسے اتنی اتنی باتوں کا خیال نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک قابل قدر شخص ہے۔ کتنا خوبصورت کتنا ذی علم اور ساتھ ہی کتنا عمدہ انسان۔ خدا کرے وہ بھی اندرا کو پسند کرے اور دونوں کی شادی ہوجائے" دل میں اس طرح باتیں کرتا شیام سندر گھر آکر کرسی پر دراز ہوگیا اور دیر تک اسی طرح مختلف خیالات میں اُلجھتا سوگیا۔

شیام سندر دن بدن اپنی دوستی پرکاش سے بڑھا رہا تھا۔ وہ پرکاش کی عدیم المثال شخصیت کی پرستش کرنے لگا تھا۔ پرکاش اس کی اس عقیدتمندی کا جواب اس خلوص و محبت سے دیرہا تھا جو اسکی اعلیٰ شخصیت کی متقاضی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے قلوب میں ایک مستقل رابطہ پیدا ہوگیا تھا جس کے اثر سے ایک کی کیفیات کا صحیح عکس دوسرے پر پڑجاتا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے ذہن وشعور کے عمل میں بھی ایسی ہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف کچھ سوچنے یا سمجھنے سے معذور ہورہے تھے۔

کالج ڈیبیٹنگ سوسائٹی (مجلس مذاکرہ) کے نائب صدر کا سالانہ انتخاب نزدیک تھا۔ شیام سندر نے پرکاش کو امیدوار بننے کے لئے آمادہ کیا۔ پرکاش اپنی جانب سے اسکے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اسلئے کہ اسکے دماغ میں ایسے ایسے اعزازوں کی کوئی اہمیت نہ تھی لیکن شیام سندر کی خاطر اسے منظور تھی۔ مگر اس وعدہ کیسا تھ کہ وہ کسی کے سامنے کبھی اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے زبان نہ کھولیگا۔ ووٹ حاصل کرنے کی کوشش اُسکے خیال میں اصولِ نمایندگی بدترین توہین تھی۔ جس نے ڈیما کریسی (جمہوریت) کو ایک بے معنی وکھوکھلا لفظ بنادیا ہے۔ ساری کنویسنگ شیام سندر کو کرنی تھی۔ شیام سندر اسکے لئے آمادہ تھا۔ اپنے اعلیٰ کیرکٹر کی وجہ سے اُسکے ساتھیوں میں اس کا خاصہ اثر تھا۔ اسلئے اسے یقین تھا کہ پرکاش کی بلند صلاحیتیں اور اس کی کوشش ان دونوں کی موجودگی کے بعد کسی امیدوار کا پرکاش کے مقابلہ میں کامیاب ہونا دشوار تھا۔

پرکاش کے مقابلہ میں چندرشیکھر، جو پرکاش کے کالج میں داخلہ کے قبل تک کالج کا سب سے اچھا مقرر سمجھا جاتا تھا، پرکاش کے خلاف پروپگنڈہ کر رہا تھا۔ ادھر شیام سندر بھی پرکاش کے لئے زوردار کنویسنگ کررہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس نے اپنی ذات پرکاش کی شخصیت میں مدغم کردی تھی اور اس میں اور پرکاش میں کوئی فرق باقی نہ تھا۔ اس لئے کہ وہ اپنی کامیابی کے لئے بھی اس سے زیادہ کوشش نہ کرسکتا تھا۔

الکشن کے دن شیام سندر بستر سے بہت سویرے اُٹھ گیا۔ وہ عموماً اتنے سویرے اُٹھنے کا عادی نہ تھا۔ لیکن اس دن اسے پرکاش کے کام سے باہر جانا تھا جسکی اہمیت اسکے نزدیک بہت زیادہ تھی۔ اس نے ابتک باہر کے درمیان کنویسنگ کی تھی۔ آج اسے ہوسٹلوں میں ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے جانا تھا۔ الکشن ۳ بجے شام کو ہونے والا تھا۔ وہ اسوقت تک اپنا وقت وہیں گذارنے والا تھا۔ اس صبح کی ضرورتوں سے جلد فراغت حاصل کرلی اور سائیکل لے کر گھر سے باہر جانے لگا "اسکی برک ڈھیلی ہوگئی ہے۔ درست کرالیجیگا" اسکے چھوٹے بھائی نے اس سے کہا۔ لیکن اس نے صرف الفاظ سنے۔ انکے مطلب کی طرف اس کا ذہن منتقل نہ ہوا جیسے وہ کسی غیر زبان کے الفاظ تھے۔ اور سائیکل پر گھر سے روانہ ہوگیا۔ وہ تیزی سے سائیکل چلائے جارہا تھا۔ ایک ٹم ٹم اسکی طرف آرہی تھی۔ سڑک وہاں پر تنگ تھی، پھر بھی وہ ٹم ٹم کے بغل سے آسانی سے نکل سکتا تھا۔ لیکن اس نے یکبارگی سائیکل کا رُخ اپنے بائیں جانب پھیردیا جیسے کوئی نوآمیز سائیکل باز جسے گھبراہٹ میں اپنے دماغ پر قابو نہیں رہتا۔ سڑک کے کنارہ سے میونسپلٹی کا نالہ بہتا تھا، سائیکل کا بریک ڈھیلا تھا۔ سائیکل نالہ کے اندر جاگری۔

شیام سندر کے سر میں شدید چوٹ آئی اور وہ بیہوش ہوگیا۔ اسکی آنکھیں کھلیں تو اس نے اپنے کو اسپتال میں ایک بستر پر پڑا پایا۔ اسکے سر میں بینڈج بندھا ہوا تھا اور اُسکے جسم پر جابجا مرہم پٹی کردی گئی تھی۔ وہ اپنی اس حالت کا جائزہ لے کر افسردہ ہورہا تھا۔ گھڑی نے شام کے پانچ بجائے۔ اور اس کا خیال دفعتاً پرکاش کے الکشن کی طرف منتقل ہوگیا "الکشن ختم ہوگیا ہوگا جانے پرکاش کا کیا ہوا ہوگا" اس نے سوچا لیکن اس خیال سے جو اضطراب وہزیمت کی کیفیت اس پر پیدا ہونی چاہئے تھی نہ ہوئی۔ بلکہ اسکے چہرہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا قلب مطمئن تھا۔ گو اس طمانیت پر استعجاب وحیرت کی کیفیت غالب تھی۔ اس اچانک حادثہ کا کوئی معقول سبب اسکی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ کافی مشاق سائیکلسٹ تھا۔ پھر اُسے ہو کیا گیا تھا؟ اس نے بریک کی مرمت کیوں نہ کرالی جب کہ اسکے بھائی نے اسے مطلع کردیا؟ اُسے اپنی اس حماقت پر غصہ آنے لگا۔

پرکاش کو الکشن میں ناکامیابی ہوئی ۔ ہوسٹل کے سب لڑکے اس وجہ سے اسکے مخالف ہوگئے کہ اسے اپنی قابلیت پر گھمنڈ تھا جبھی تو اُس نے اِن سے ووٹ کی درخواست نہ کی تھی ! ایک جینیس (Genius) کی زندگی اسکے لئے اجیرن ہوجاتی ہے ، اسلئے کہ اسکی مافوق الفطرت صلاحیت کی تہ تک پہونچنے والے بہت کم ہوتے ہیں ۔ بلکہ زیادہ تر لوگوں میں اس صلاحیت کے فقدان کا احساس اسکی فوقیت کو انکی کم مائگی و کوتاہی کے تلخ تجربہ کی ذمہ دار ٹھیرا دیتا ہے ۔ اُن کے دلوں میں اسکی طرف سے جذبۂ انتقام اُبھر آتا ہے جسکی تسکین وہ اُسے نیچا دکھا کر کرسکتے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ اکثر ایک جینیس کی زندگی ایسے مشکل اور ناموافق ماحول و اثرات سے گھری ہوتی ہے جن کے مقابلہ کے لئے اسے عموميت سے کہیں زیادہ ذہنی جدوجہد کرنی ہوتی ہے ۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ایک جینیس کی زندگی قبل از وقت ختم ہوجاتی ہے اسکی بے پناہ سرگرمیاں بہت جلد اسکی صلاحیت کا ذخیرہ مختصر کردیتی ہیں اور اس طرح آپس میں زندگی کے آفات وحوادث کی مدافعت کی قوت باقی نہیں رہتی ۔ اور وہ اس کا شکار ہوجاتا ہے ۔

پرکاش کو اپنی ناکامیابی کا صدمہ ضرور ہوا لیکن اس کا احساس اس استعجاب میں کھو گیا جو شیام سندر کے کالج نہ آنے پر اسے ہورہا تھا۔ الکشن ختم ہوتے ہی وہ سیدھا اندرا کے پاس آیا اور دونوں شیام سندر کے گھر پہونچے ۔ شیام سندر کا وہاں کوئی پتہ نہ تھا ۔ اِدھر اُدھر تلاش کرتے وہ آخر ہسپتال پہونچ گئے ۔ اسوقت شیام سندر کو ہوش میں آئے کافی دیر ہوچکی تھی ۔ ان سے مُلاقات ہوئی تو انہوں نے اسکے چہرہ پر غایت اضمحلال اور پراگندگی کے آثار دیکھے اور ڈاکٹر سے مل کر اسکی صحت یابی کے تیقّن کا اطمینان کرکے اُسے آرام کرنیکے لئے چھوڑ کر واپس ہوگئے ۔ اس کمرہ کی نرس کو تعجب ہو رہا تھا کہ شیام سندر جو اس سے پہلے کافی بشاش نظر آرہا تھا ۔ اس نوجوان حسینہ کو دیکھکر اسکے چہرہ کی رنگت کیوں پھیکی پڑگئی ۔ اُسے تو زیادہ خوش نظر آنا چاہئے تھا ۔ وہ ایک نہایت ذہین عورت تھی جو مردوں کی ہوسناکیوں کے آگے اپنا سب سے بیش قیمت جوہر قربان کرکے انکی نفسیات کا تحقیقی مطالعہ کررہی تھی ، اور اس طرح ایک مرد کے چہرہ کے رنگوں میں وہ کچھ دیکھ سکتی تھی جو دوسروں کو مشکل سے نظر آسکتا تھا ۔ پھر شیام سندر کی یہ غیر معمولی کیفیت اسے متعجب کئے بغیر کیوں کر رہ سکتی تھی ۔

شیام سندر اسپتال سے بہت جلد صحت یاب ہوکر واپس آگیا اور اس کی زندگی کالج کی مصروفیتوں میں حسب دستور گذرنے لگی ۔ اسکی کتابوں کی طرف پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی " میں نے اب تک اپنے ساتھیوں میں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں کی ہے ۔ لیکن بی ۔ اے کے امتحان میں ضرور اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوں گا " وہ اکثر سوچا کرتا اور آنے والے امتحان کی تیاری میں اور زیادہ مصروف ہوجاتا ۔ بی ۔ اے کے امتحان میں اُس نے تواریخ میں اوّل درجہ میں کامیابی حاصل کی ۔ پرکاش یونیورسٹی میں اول رہا ۔ اور اندرا کو بھی شاندار کامیابی ہوئی ، پرکاش اور اندرا کے تعلقات اب اس منزل پر آپہونچے تھے ۔ جب محبت تخیلی (Ideal) حدود سے گذر کر اپنی حقیقی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور ہمارا جذبۂ حصول ومقبوضت کا صرف ایک رومانی نام بن کر رہ جاتی ہے ۔ پرکاش اور اندرا کے تعلقات کی خبر اندرا کے باپ کو بھی ہوچکی تھی ، اور وہ بہت جلد اس رشتہ کو قوی کردینا چاہتے تھے ۔ چنانچہ دونوں طرف سے بات پختہ ہوگئی ، اور شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی ، اندرا کے باپ نے شادی کا سارا انتظام شیام سندر کو سونپ دیا ۔ شیام سندر نے بخوشی اسے قبول کرلیا ۔ شادی کے ایک ہفتہ پہلے سے وہ اندرا کے مکان پر مستقل طور پر منتقل ہوجانے والا تھا ، تاکہ سارے انتظام کی پوری نگہداشت کرسکے ۔

اندرا کی شادی میں ایک ہفتہ باقی تھا ۔ پھر شیام سندر شب کے ایسے اندرا کے باپ سے دوسرے دن سے مستقل آکر رہنے کا وعدہ کرکے گھر واپس آیا اور آتے ہی بستر پر لیٹ گیا ۔ دن کے کام سے وہ بہت زیادہ تھک گیا تھا ۔ اُسے بہت جلد نیند آگئی ۔ رات کے دو بجے وہ یکایک ایک بھیانک خواب سے چونک گیا ۔ اسکی گود میں ایک لمبے بالوں والی گُلدار بلّی بیٹھی ہوئی تھی ۔ وہ اس سے کھیل رہا تھا ۔ یکایک اُسے سامنے ایک عجیب صورت دکھائی دی ، جسکے جسم کا آدھا حصہ نہایت خوبصورت اور دلکش تھا ۔ لیکن آدھا حد سے زیادہ کریہ اور ڈراونا ۔ ایسا معلوم ہوتا کہ دو متضاد صورتوں کو الگ الگ بیچ سے سیدھا کاٹ کر دونوں کا نصف جوڑ کر ایک کردیا گیا ہو ۔ یہ حیرت انگیز شکل تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی شیام سندر کے قریب آئی اور بلّی کو اس کی گود سے چھین کر اسے اپنے سینہ سے لگالیا ۔ شیام سندر کے جسم سے مزاحمت کی قوت غائب ہوگئی تھی وہ چیخنا چاہتا تھا ۔ لیکن اسکی آواز بند ہورہی تھی ۔ وہ وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا ۔ لیکن اسکے ہاتھ پاؤں شل ہوگئے تھے ۔ بلّی اس عجیب شخصیت کے سینہ سے چپٹی ہوئی اسکے خوبصورت گال کو چومنے لگی ۔ بلّی کو اپنے قبضہ میں کرکے وہ تیزی سے وہاں سے رخصت ہوگیا ۔ اسکے جانے سے فضا میں ایک ہل چل پیدا ہوگئی چاروں طرف سے چیخ و پکار شروع ہوگئی ۔ وہ سارے عالم پر ظلم وستم ڈھاتا جا

تھا۔ اسی شور و ہنگامہ سے شیام سندر کی نیند ٹوٹ گئی۔ باہر ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ کھڑکی کے پٹ زور زور سے ٹکرا رہے تھے، تیز و تند ہوا مختلف قسم کی سیٹیاں اور آوازیں پیدا کر رہی تھی۔ شیام سندر نے اٹھ کر کھڑکی کے سارے کواڑ بند کر دیئے اور بستر پر آکر لیٹ گیا۔ وہ اپنے سر میں بھاری پن محسوس کر رہا تھا اور اعضا میں درد۔ اسکے قلب کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ کتنا ہیبت ناک خواب تھا! اس نے سوچا اور سونے کی کوشش میں آنکھیں بند کر لیں لیکن اسے نیند نہ آئی۔ صبح ہوتے ہوتے اُسکے سر کا بوجھ اور اعضا کا درد تیز ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے بخار چڑھ رہا ہے۔ اس نے چاہا کہ اسی حالت میں اندرا کے گھر چلا جائے۔ لیکن اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسکے جسم کی طاقت کسی نے یکبارگی سلب کر لی تھی اور وہ بستر سے اٹھ تک نہ سکتا تھا۔

شیام سندر ایک ہفتہ سے زیادہ بیمار پڑا رہا۔ اسے تھوڑا تھوڑا بخار رہتا، سر میں شدت کا درد اور اعضا میں اضمحلال جسکے سبب سے وہ نقل و حرکت سے قاصر ہو رہا تھا۔ لیکن باوجود اس بیماری و تکلیف کے اسکے چہرہ پر کوئی پریشانی اور گھبراہٹ کے آثار نہ ملتے تھے۔ جیسے وہ اس عارضہ کو کوئی اہمیت نہ دے رہا تھا۔ گو اُسکی بیماری اُسکے معالج کے دماغ میں اُلجھنیں پیدا کرنے کو کافی تھی۔ اس لئے کہ اسکی علامتیں اس کی پڑھی ہوئی کتابوں کے وضع کردہ اقسام مرض سے موافقت نہ کرتی تھیں۔ وہ کبھی اس کی بیماری کو انفلوئنزا کہتا، کبھی میعادی بخار کبھی اسکے دماغ میں ٹی بی کا شبہ ہوتا کبھی گنٹھیا کا۔ اس طرح وہ روزانہ اپنے فیصلہ میں ترمیم کی گنجائش محسوس کرکے نسخہ میں اسی مناسبت سے تبدیلی واقع کر دیتا۔ لیکن شیام سندر کو کوئی افاقہ نہ معلوم ہوتا۔ چنانچہ اسکی بیماری ہی کی حالت میں پرکاش بارات لیکر آیا اور اندرا کو اپنے ساتھ کا تھوڑ لے گیا۔ اور شیام سندر اندرا کے بیاہ میں شریک نہ ہو سکا۔ اس روز دن بھر اسے اُسکا صدمہ رہا۔ اندرا اور وہ ساتھ کے کھیلے تھے۔ دوسرے دن سے اُسے یک بیک افاقہ ہونا شروع ہو گیا۔ اور وہ بہت جلد تندرست ہو گیا۔

شیام سندر نے بی اے کے بعد وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ اُسکو دل میں ایک کامیاب وکیل بننے کی خواہش تھی اور اُس نے اس خواہش کی تکمیل میں کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھی، وہ بہت جلد ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے معروف ہو گیا۔ اندرا اور پرکاش سے اسکی دوستی جاری تھی۔ بلکہ اُسکے ملاقاتیوں میں یہی دونوں تھے جن سے وہ حقیقی معنی میں خلوص اور محبت رکھتا تھا۔ پرکاش اور اندرا دُنیا سے قطعاً بے نیاز فردوسی زندگی گذار رہے تھے۔ کاروبار کا انتظام سارا پرکاش کا باپ کرتا۔ پرکاش قطعاً آزاد تھا اُسکے اوقات کتب بینی یا مختلف ممالک کی سیر میں گذرتے۔ اندرا بھی باپ کے مرنے کے بعد سے اپنے آبائی گھر سے بالکل بے تعلق ہو چکی تھی۔ لیکن انکی یہ سکون پرور زندگی فطرت کے دستور کے خلاف تھی۔ فطرت سکون نہیں پسند کرتی وہ خود ہر ساعت مضطرب اور بےچین رہتی ہے اور حیات کو اضطراب و ہنگامہ کی شراب سے سرشار بخشتی رہتی ہے۔ زندگی کے ساز میں ذرا زیر و بم کے نغمہ کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ پرکاش زندگی کے مضراب کو، اسکی ٹھوکروں کو گمزدر و ناکارہ بنا رہا تھا، زندگی کے ساتھ اس کا یہ سلوک فطرت کی برداشت سے باہر تھا وہ اس سے اس کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس کا باپ یکبارگی قلب کی حرکت بند ہو جانیکی وجہ سے مرگیا۔ پرکاش اندرا کیساتھ کشمیر میں تھا۔ اُسے یکایک تار ملا اور آدم و حوا کی جنت سے نکالے جانے کی داستان تاریخ کے صفحہ پر دوبارہ مُرتسم ہو گئی۔ پرکاش کے سر پر ایک نہانی عذاب نازل ہو گیا۔ سارے کاروبار کا بوجھ اسے تنہا سنبھالنا تھا۔ وہ اس کام سے قطعاً بے بہرہ تھا۔ اسکی ناتجربہ کاری دوسروں کی مکاری کا ذریعہ بن گئی۔ کارخانہ کے ملازموں نے حرام خوری شروع کی۔ الہ آباد کے ایک بڑے دُکاندار نے جو اسکے کارخانہ سے بڑا بڑا مال خرید کرتا تھا، اسکے ملازموں کو ملا کر اُس پر کئی لاکھ کی نالش کر دی اس کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ رقم کارخانہ کو بطور پیشگی قیمت مال ادا کی گئی تھی لیکن اسکے عوض مال وصول نہ ہوا تھا اس نے جعلی کاغذات مقدمہ کی حمایت میں تیار کر لئے، اور پرکاش کے ملازموں کو رشوت دیکر اپنے حسب خواہ گواہی کے لئے آمادہ کر لیا۔ پرکاش نے مقدمہ کی پوری کارروائی شیام سندر کے حوالے کر دی اور خود مطمئن ہو کر کارخانہ کے دوسرے معاملات کی دُرستی میں مصروف ہو گیا۔ شیام سندر نے پرکاش کے مقدمہ میں انتھک محنت اور کوشش سے کام کیا۔ شاید اپنے خاص کام کو بھی وہ اتنی توجہ نہ دیتا اسے کامل یقین تھا کہ مقدمہ پرکاش کے حق میں فیصلہ ہو کر رہیگا۔ مقدمہ کی سماعت کے دن وہ پورے طور پر تیار ہو کر کچہری پہونچا اور مخالف وکیل کی جرح کے جواب میں بحث کرنے کو کھڑا ہوا۔ وہ اپنی خداداد قانونی قابلیت کا سکہ جما چکا تھا اس دن اسکی بحث سُننے کے لئے وکلا کی کثیر تعداد میں جمع تھے۔ اسلئے کہ انہیں معلوم تھا کہ پرکاش سے گہرے تعلقات کی بنا پر وہ پرکاش کے مقدمہ میں اپنی ساری قانونی صلاحیت کو بروئے کار لائیگا۔ لیکن وہ بہت جلد حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ شیام سندر اُس وکیل کی طرح بحث

کر رہا تھا جس نے پہلی دفعہ کچہری میں قدم رکھا ہو اور اپنی گھبراہٹ اور سراسیمگی پر قابو پانے کی ناکام کوشش طفل مکتب کی طرح اصل مطلب سے دور بہکا پھر رہا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مخالف وکیل اسے ہپنوٹائز کر کے اسکے منہ سے اپنے حسب مرضی باتیں کہلوا رہا تھا۔ ایسی تمام بحث کا نتیجہ ظاہر تھا۔ پرکاش مقدمہ ہار گیا اور رات اقبال کی سزا ہو گئی۔

بحث ختم کرتے ہی شیام سندر سیدھا گھر واپس آیا۔ وہ اپنے اندر ایک مجنونانہ کیفیت محسوس کر رہا تھا، اسلئے کہ اسے باوجود اتنی سخت ناکامیابی کے ایک گہری لذت اور طمانیت حاصل ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسکے دل و دماغ سے کسی نے ایک بڑا بوجھ ہٹا دیا ہو لیکن وہ اپنے دماغ کی اس کیفیت کا مفہوم جاننا چاہتا تھا اس نے پرکاش کی زندگی خاک میں ملا دی۔ آخر کیوں؟ وہ اس کا عزیز ترین دوست تھا جس کی صحبت کا ایک ایک لمحہ اسے اپنی ساری کمائی سے زیادہ قیمتی تھا۔ لیکن پھر وہ اسکی بربادی کا سبب کیوں بنا؟ وہ اپنے دماغ سے ان سوالوں کا جواب مانگ رہا تھا لیکن اسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا "بتاؤ مجھکو بتاؤ" وہ بڑبڑانے لگا "مجھکو کیا ہو گیا ہے؟ کیا میں پاگل ہو گیا ہوں؟ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ ہاں ہاں! میں پاگل ہوں۔ دیوانہ جسے اپنی حرکات و سکنات پر کوئی قابو نہیں رہتا۔ پھر میری باتوں پر نکتہ چینی خود پاگل پن ہے۔ لیکن نہیں! میں ہرگز پاگل نہیں ہوں۔ میں پاگل کیوں ہونے لگا؟ مگر مجھکو کیا ہو گیا ہے؟ پرکاش تم بتاؤ۔ میں اندرا سے پوچھونگا! اپنی اندرا سے۔ اندرا صرف میری ہے۔ پرکاش کی نہیں۔ پرکاش! چور! بدمعاش! فریبی! دغاباز! میں تجھے زندہ نہ چھوڑونگا" اس نے اپنے کپڑے نوچ ڈالے اور پاگلوں کی طرح بڑبڑاتا گھر سے نکل گیا۔ وہ اب تک شہر شہر بڑبڑاتا پھرتا ہے۔ اسکی باتیں بے ربط ہیں لیکن اسکے ہر مہمل اور بے معنی جملہ کیساتھ یہ ٹکڑا ضرور شامل رہتا ہے "بدمعاش۔ فریبی مکار! میں تجھے کبھی زندہ نہ چھوڑونگا"

سید محمد محسن، ایم اے عظیم آبادی

"اسرار و معارف"

تو رازِ ہستی سے بیخبر ہے تری نظر حق نگر نہیں ہے
وگرنہ وہ رات کونسی ہے جو غیرتِ صد سحر نہیں ہے

حقیر ذرات کی جبینیں شعاعِ رفعت سے ضو فگن ہیں
تجلیوں کی کشاکشیں ہیں طلسمِ رقصِ شرر نہیں ہے

یہ برق کا اضطرابِ پیہم، یہ نبضِ حسن کی دھمک کا عالم
حقیقت آمیز ہیں مناظر، فریبِ ہوش و نظر نہیں ہے

یہ آگ، پانی کا میل باہم، یہ اتحادِ نظامِ برہم
تری نظر دیکھتی ہے سب کچھ یقین تجھ کو مگر نہیں ہے

نہیں ہے گلگوں جبینِ شفق کی یہ رنگ ہے خونِ آرزو کا
عیاں ہیں کچھ داغ حسرتوں کے نظامِ شمس و قمر نہیں ہے

نہ دیکھ ذروں کو بے رخی سے سمجھ کہ کیا انمیں ضو فشاں ہے
تو جسم کا صرف ہے پجاری، تری نظر روح پر نہیں ہے

بہارِ گلشن کی کوششوں کا، مآل کچھ خشک پتیاں ہیں
شباب پر آگئی ہے ظلمت طلوعِ نورِ سحر نہیں ہے

نہیں نفس پر مدارِ ہستی، یہ وہم ہے اک جنوں پرستی
فضا محبت کی سرمدی ہے، جہاں فنا کا گذر نہیں ہے

خدا کے فضل و کرم سے ماہر میں اس نتیجہ پہ آگیا ہوں
بجز محبت کے دردِ دل کا یہاں کوئی چارہ گر نہیں ہے

ماہر القادری

جُرعات

اعجازِ تجلّی ہے کہ نیرنگِ تماشا — آئینۂ کثرت میں ہے اک جوہرِ یکتا
شعلہ ہو کہ لالہ ہو شرارہ ہو کہ تارا — ہر جلوۂ رنگیں میں مجھے وہ نظر آیا

در وبے بینشِ دُنیا سے تڑپ اُٹھتا ہوں — کوئی تو میری طرح دیکھنے والا ہوتا
بزمِ ہم جنس میں ہوں سب سے جُدا سب سے الگ — اِس سے بہتر تھا کسی دشت میں تنہا ہوتا

کہاں وہ لحن کہاں نغمۂ سرود و ستار — وہ کوئی لَے ہو جس میں ہو التزامِ خُمار
زمانے بیت گئے مدّتیں ہوئیں لیکن — ہنوز رُوح فزا ہے وہ لذّتِ گفتار

کیا جانے کس خیال سے محوِ سکوت ہوں — ورنہ بیانِ شوق سے قاصر زباں نہیں
او چشمِ التفات نہ کر منفعل مجھے — جو کچھ ہے میرے دل میں وہ تجھ سے نہاں نہیں

کبھی سینے میں پنہاں ہے کبھی منظر سے پیدا ہے — جمالِ یار کہتے ہیں جسے حُسنِ تمنّا ہے
نہیں لازم کہ موسیٰ کی طرح سب طُور پر دیکھیں — بحمد اللہ اپنا شعلۂ دل برقِ سینا ہے

پینے دیں یونہی عشق میں خونِ جگر مجھے — اب چھوڑ دیں کبھی یہ مرے چارہ گر مجھے
یہ دردِ خوشگوار ہے سرمایۂ حیات — راس آ گئی ہے کاوشِ تیرِ نظر مجھے

اہلِ ہوس کی تنگیِ دل دامن میں ہے — دُنیا اسیرِ لذّتِ کام و دہن میں ہے
گلچیں کا خوف اور نہ اندیشۂ خزاں — نام و نمودِ فطرتِ اہلِ چمن میں ہے

دامن میں تار ہے نہ گریباں میں تار ہے — لے دیکے ایک تارِ نفس ہے وہ خار ہے
پیراہنِ وجود سے کبھی ہوں خفا و تنگ — جس روز سے سُنا ہے کہ وہ مُستعار ہے

کچھ دیر کی بس کشمکشِ یاس و یقین ہے — اب رخصتِ بیمار میں تاخیر نہیں ہے
آنا ہو تو جلد آؤ کہ ہے ساعتِ آخر — ہر دم پہ گمانِ نفسِ بازپسیں ہے

نورِ ایماں سے دل و جاں کو فروزاں کر دے — شمعِ کشتہ ہے مسلماں کو مسلماں کر دے
پرتوِ حُسنِ جہاں تاب سے او "حسنِ تمام" — ذرّۂ خاک کو خورشیدِ درخشاں کر دے
لمحۂ شوق کو پھر شمعِ شبستاں کر دے — عالمِ یاس کو معمورۂ ایقاں کر دے
مستی و کیفِ عطا کر دلِ افسردہ کو — خار کو پھول بیاباں کو گلستاں کر دے

کوکب شاہجہاں پوری

نتیجۂ بحث

(پروفیسر محمد مُسلم کا مضمون "جوابِ طلب" (مطبوعہ ساقی نومبر ۳۳ء) اتنا مقبول ہوا کہ اس کے پانچ جواب شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ "عمرِ جاوداں" کی طرح دراز ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ پروفیسر مُسلم کی طرف سے "نتیجۂ بحث" شائع کیا جا رہا ہے۔ اہلِ قلم حضرات آئندہ اِس سلسلہ میں زحمتِ خامہ فرسائی نہ فرمائیں اور اسے "مرگِ ناگہاں" سمجھیں۔)

شاہد

عزیز۔ عزیز۔

تم نے میرے نجی خطوط کو بلا اجازت مُشتہر کر دیا یا تشہیر کر دی۔ مجھے شکایت ہونا چاہیئے تھی مگر نہیں ہے۔ اپنی رسوائی سے کوئی سماجی یا اخلاقی گتھی سُلجھ جائے اور اُس سے سماج کا بھلا ہو تو مجھے یہ رسوائی گوارا ہے۔

معلوم نہیں ان جوابات میں سے کون واقعی تمہارا ہے اور کون تمہارے فرضی نام سے؟ یا ایک بھی تمہارا نہیں؟ یا تمہیں کس سے اتفاقِ رائے ہے؟ جوابات زیادہ تر مجیب کی عمر اور طبعی اُفتاد کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً انصار ناصری صاحب ایک منچلے ہنسوڑ نوجوان معلوم ہوتے ہیں جو شاید کندھے پر جنازہ لئے جا رہے ہوں جب بھی کسی ٹھنگنے رفیق کی طرف تابوت کے جُھک جانے پر ہنسے بغیر نہ رہیں۔ اِسی طرح "احمد" صاحب کا ٹھٹھول اور پھبتیاں بھی شاید تقاضائے شباب ہیں یا طبّاعی، اس لئے لائقِ اعتنا نہیں۔ "ایک" "خاتون" نے جواب الجواب میں وہ کیا جس سے میں نے تمہیں روکا تھا یعنی ان خطوط کو افسانہ بنا چھوڑا۔ وسیع معنی میں مجھے ان کے افسانہ ہونے سے انکار نہیں مگر کیا ضرور ہے کہ ہر افسانہ شادی یا موت ہی پر کامل سمجھا جاتے۔ ایسے دُم چھلوں کے بغیر بھی افسانہ ہوتا ہے اور زیادہ تر فطری۔ اگر میرا مقصد ایک افسانہ کی ترتیب و تکمیل ہوتا تو اب مجھے خاموش بیٹھ جانا چاہیئے تھا کیونکہ کہانی ختم ہو گئی۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ اب سو جایئے یا اپنے اپنے گھر سدھاریئے۔ مگر میرا مدعا اخلاقیات کی ایسی گتھی سُلجھانا ہے جو میری طرح اوروں کو پریشان کر سکتی ہے۔ اس لحاظ سے میں دو اصحاب کے جواب سے بہت مُتاثر و ممنون ہوا۔ ایک تو مسعود جاوید صاحب کی نفسیاتی تحلیل سے۔ دوسرے محسن صاحب کے اجتماعی مطمحِ نظر سے۔ یہ دونوں ناخن مل ملا کر مجموعی حیثیت سے اس عقدہ کی کشایش میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

دونوں کی تقریروں سے اس مسئلہ کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک حیاتیاتی یا نفسیاتی، دوسرا روحانی۔ پہلے نقطۂ نظر سے دِلی کی خواہش پوری کرنا ایک ایسا فعل ہوگا جس میں نہ عقل کو دخل ہے نہ ارادے کو، نہ ضمیر سے استصواب کی ضرورت۔ ایک قدرتی اضطراری فنومنن (ظہور) ہوگا۔ جس طرح آئے دن حیوانات میں ہم ایسے افعال دیکھتے ہیں اور کوئی اچنبھا نہیں ہوتا بلکہ خبر بھی نہیں ہوتی۔ اس فعل پر حیوانی یا حیاتیاتی نگاہ سے دیکھنے والا کوئی تعجب کریگا نہ مزاحمت۔ دوسرے پہلو پر محسن صاحب نے زیادہ صاف روشنی ڈالی ہے۔ انسان وہ مخلوق ہے جس کی حیثیت اس سنسار میں دوگانہ ہے۔ ایک ذاتی و انفرادی

دوسری ہیئت اجتماعی کے ایک رُکن کی۔ پہلی حیثیت سے صرف ممکن و ناممکن کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ جائز و ناجائز، خطا و صواب یا اخلاق و مذہب کے سوال ہیئت اجتماعی کے رُکن کی حیثیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ موجودہ مسئلہ انہیں دو حیثیتوں اور انکے فرائض کے تصادم کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ انصار ناصری صاحب پہلی حیثیت کو اہمیت دیتے ہیں۔ محسن صاحب فرماتے ہیں:-

"تمہیں کیا خبر کہ جس مقصد کو تم نے عالی مقصد سمجھ لیا ہے وہ اُس مقصد کے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتا جس کے حصول کا ذریعہ فطرت نے مذہب و اخلاق کو بنایا ہے .... میرے نزدیک ان کا وجود ایک نظام سے بڑھکر نہیں، جو انفرادی ضروریات و خواہشات سے قطع نظر، اجتماعی ضروریات کی بنا پر قائم کیا گیا ہے۔ لیکن اس نظام کا بانی کوئی انفرادی شخصیت نہیں بلکہ خود فطرتِ انسانی ہے ....

"اگر تم میں سے ہر شخص کو اپنے طور پر اس مقصد کے حصول کے ذرائع کی جانچ پرتال کی قدرت حاصل ہو جائے بلکہ ان کے وضع کرنے کا حق بھی حاصل ہو تو کیا اس مقصد کا حصول کبھی ممکن ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں اپنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے جو کام تمہاری عقل کو مفید معلوم ہوتا ہے، میری عقل کے نزدیک ناکارہ ثابت ہو سکتا ہے .... اس لئے میرے دوست تمہارا یہ خیال کہ جو ذرائع تمہارے اعلیٰ مقصد کے حصول میں معاون ہوں، تمہیں ان پر عمل کرنا چاہیئے، خواہ وہ مذہب و اخلاق کے قوانین سے متصادم ہی کیوں نہ ہوں، قطعاً غلط ہے۔ اس لئے کہ جس مقصد کو ہم اعلیٰ مقصد سمجھتے ہوں، ممکن ہو اس عالمگیر مقصد کے نزدیک کوئی وقعت نہ رکھتا ہو جس کی توسیع (یا تکمیل) فطرت کر رہی ہے۔ رہ گئے ذرائع۔ ان کے صحیح انتخاب پر تمہیں کوئی دسترس نہیں۔ اس لئے کہ تمہارے پاس جو عقل کی کسوٹی ہے وہ سونا اور تانبا میں کوئی تمیز نہیں کر سکتی۔ اب تمہارے لئے سوا اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ اُن قوانین پر عمل کرو جو حیات اجتماعی کے بنا کردہ ہیں، اور یقینی حیات کی ارتقاد بہبود میں معاون رہے ہیں، ورنہ کب کے مفقود ہو گئے ہوتے ......

....

"مذہب و قانون کے قوانین کی نوعیتیں اتنی مختصر نہیں کہ تمہاری عقل میں سما سکیں۔ ان کی وسعتیں اتھاہ ہیں۔ تب تو ابتدائے آفرینش سے وہ حیات کی نشو و نما وارتقا میں معاون ہوتے رہے ہیں۔ تمہاری عقل زیادہ سے زیادہ تمہاری اپنی انفرادی زندگی کے چند سطحی معاملات کے لئے قوانین بنا سکتی ہے۔ لیکن وہ قوانین جنکا اثر انسانیت ہی نہیں بلکہ حیات کی مکمل تاریخ پر رہا ہے کسی انسان کی عقل کا نتیجہ کس طرح ہو سکتے ہیں؟ وہ خود فطرت کے وضع کردہ ہیں اور اُنکی نوعیت و مقاصد کا علم خود فطرت کو ہو سکتا ہے۔"

اگرچہ میں تمام مروجہ مذاہب سے اتنا خوش عقیدہ تو نہیں کہ ان سب کو قوانین فطرت کا درجہ دوں۔ مذاہب کے نافذ کردہ یا مصدقہ کتنے قوانین ہیں جو نظام اجتماعی کے لئے مضرت رساں ہوئے ہیں اور آج تک ہیں۔ بہرحال جزئیات و فروعات پر مجھے اکثر مذاہب یا ان کے بعض قوانین سے جو کچھ بھی اختلاف ہو، اصولاً محسن صاحب کی منطق ٹھوس اور تشفی بخش ہے۔ مسعود جاوید صاحب کی تحریر اسی کا مجمل متن ہے۔

للی سے پھر ملنے کی میں نے اپنے آپ میں جرأت نہ پائی۔ اسے جو خط لکھا ہے اس میں زیادہ تر دلائل بالا سے ہی استدلال کیا۔ اس کے علاوہ خط کے بعض اجزا کا اقتباس اپنے حافظ کی مدد سے پیش کرتا ہوں:۔

کم سے کم ہندوستان میں فطرت کا منشائے افزائش آبادی میرے جیسے حیوانی انسانوں کے ہاتھوں مبالغہ کے ساتھ پورا ہو رہا ہے۔ یہ افراط بجائے خود ایک دردناک صورت حال ہے ....

بحالتِ موجودہ میں تمہیں یہ مشورہ دونگا کہ خدا نے تمہیں ایک مسرتِ نفسانی سے محروم رکھا ہے تو اس کے عوض دوسری مسرت ابدی و روحانی کا موقع دیا ہے۔ طوفانی جوانی تم بسار چکیں۔ اس ہولناک منزل کی طرف لوٹنے کے عوض آگے کی منزل کی طرف بڑھ چلو، جہاں ہر شخص کی رسائی نہیں ہوتی، نصیبوں ہی سے کوئی پہنچ پاتا ہے۔ وہ قربانی اور سیوا ہے۔ تم ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی ہمدردی کی محتاج دکھی بہنوں کے دکھ ہرا سکتی اور ان کی زندگی کے کشٹوں کو آنند سے بدل سکتی ہو۔ شاید قدرت نے تم کو اسی خدمت کے لئے چُن لیا ہو تو تمہاری خوش نصیبی قابلِ رشک ہے۔ اور تم لائق عزت و احترام ہو۔ امید ہے کہ اب میں تم سے ملونگا تو عقیدت کے پھول تم پر نثار کرونگا اور پاک روحانی محبت کا وہ ہدیہ پیش کر سکونگا جو لازوال ہوگا۔ تمہاری جلائی ہوئی روشنی میں میرے جیسے دُنیا کے قیدی بھی چند قدم تمہارے پیچھے چل سکیں گے ....

للی کا جواب تمہارے سُنانے کے قابل ہے مگر خط طویل ہو جائیگا۔ اقتباسات پر اکتفا کرتا ہوں۔

"اُس روز آپ کو رخصت کرنے کے بعد میں خود عجب اُلجھنوں میں مبتلا ہو گئی۔ کئی راتیں آنکھوں میں کاٹیں۔ فرض اور غرض، ضمیر اور نفس کی جنگ چھڑی رہی۔ کل جو آپ کا خط ملا ہے تو اس جنگ میں ضمیر کا غلبہ شروع ہو چکا تھا۔ آپ کے خط نے اسے کامل جیت دلا دی۔ لطیف صاحب شاید آپ میری مایوسی کی شرم سے مجھ سے نہ ملے۔ سمجھے ہونگے میں آپ پر بے وفائیوں اور بے دردیوں کے الزامات کی بوچھاڑ لگا دونگی مگر ایسا نہ ہوتا ......

...... میرے دل میں آپ کی عزت زیادہ ہو گئی۔ محبت عقیدت سے بدل گئی .... آپ نفس کے بندے ہیں؟ توبہ کیجئے فطرت کسی کو کسی کام کے لئے انتخاب کرتی ہے اور کسی کو کسی کام کے لئے۔ سب اپنی جگہ پر یکساں اہم ہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں صاحبِ اولاد سماج کی بہتر اور سب سے مشکل خدمت انجام دیتے اور زیادہ قیمتی قربانیاں کرتے ہیں۔ اپنی ادنیٰ اور ناچیز خدمت سے بقول آپ کے کوئی بتی روشن کر دونگی تو اس کا نبل آپ ہی ہوں گے..

.... لطیف صاحب میں عرض نہیں کر سکتی کہ ہردے میں کتنا حبس اور من کتنا آنند محسوس کر رہی ہوں ......

...... معلوم ہوتا ہے عورت قربانی کیلئے خاص طور پر پیدا کی گئی ہے اسکا نفسانی جذبہ جتنا تیز ہوتا ہے اتنی ہی نفس کشی کی قابلیت زبردست۔ مگر قربانی ہر حال میں اس کی فطرت کا نمایاں حصہ ہوتی ہے۔ اگر اسکی قربانی کا مرکز اعلیٰ تر مقصد ہوتا ہے تو وہ اس میں کبھی مردوں سے پیچھے نہیں رہتی بلکہ شاید آگے ہی نکل جائے.......... دُعا کیجئے کہ خدا اس راہ میں میری رہنمائی کرے اور آپکی توقعات پوری ہوں ...."

تمہارا لطیف

محمد اسلم

سروشِ غیب کا پیغام شاعرِ ہندوستان کے نام

(۱)

کب سے ہی تیرا چمن آلودۂ جورِ خزاں
دعویٰ عشقِ وطن ہی تو وطن کے کام آ

وصل و ہجراں کے ترے لب پہ فسانے تا بکے
بس چکا ہی جسمیں تو اُس آشیاں کا حال دیکھ

دل جو اُمیدوں بھرا تھا اب ہی عالم یاس کا
جسکو لطفِ زیست کہتے ہیں یہاں معدوم ہی

لالہ رُخسار دنکے بھی چہرے ہیں کمہلائے ہوئے
روزِ روشن میں بھی ہی عالم شبِ دیجور کا

زندہ کیا کہیئے انہیں بیجاں رہتے ہیں یہاں
دیکھتی ہی آنکھ جسکو تن وہی میں طاق ہی

خندہ زن ہی ایک عالم جس پہ اُس عالم کو دیکھ

چاہیئے فکرِ بہار اے شاعرِ ہندوستاں
تو ہے بلبل جس چمن کا اُس چمن کے کام آ

رندی و مستی کے کیف آور ترانے تا بکے
دیدۂ نمناک سے ہندوستاں کا حال دیکھ

کہتے ہیں بھارت جسے معمورہ ہی افلاس کا
ساز و برگِ عیش سی یہ سرزمیں محروم ہی

ہر قدم پہ ہی فلاکت چھاؤنی چھائے ہوئے
وقفِ ظلمت غمکدہ ہی کس قدر مزدور کا

مختصر یہ فاقہ کش انسان رہتے ہیں یہاں
منعموں کی کسقدر یہ پستیِ اخلاق ہی

مسلم و کافر کی رزم آرائے باہم کو دیکھ

(۲)

یہ وہی خطہ ہی جو تھا ایکدن جنت نشاں
سنگریزوں سی یہاں کے لعل و گوہر ماند تھے

پرچمِ رنگیں بہار اپنا اُڑاتی تھی یہاں

خلق کہتی تھی جسے عظمت نشاں راحت نشاں
جس قدر ذرّے تھے وہ فرشِ زمیں کی چاند تھے

نکہتِ باغِ جناں کانٹوں سی آتی تھی یہاں

چل نہ سکتی تھی یہاں کچھ شیطنت ابلیس کی
پھونکدیتی تھیں شعاعیں نیّرِ تقدیس کی

تھا یہاں پیری میں بھی رنگِ جوانی آشکار
تھی جبینوں سے ضیائے کامرانی آشکار

جنکے آگے کوہ کی سطوت کی ہستی کاہ تھی
سرزمین ہند اُن لوگوں کی جولانگاہ تھی

دوش پر اُنکی کمانیں، چٹکیوں میں تیر تھے
بھیم اور ارجُن سے اس اقلیم میں رَن بھیر تھے

جانکنی کی سختیوں کو تھی یہ ہنسکر جھیلتی
زندگانی تھی حقیقت میں اجل سے کھیلتی

خلعتِ ہستی مرادف تھا لباسِ مرگ کا
زور ہی مطلق نہ چلتا تھا ہراسِ مرگ کا

دورِ گردوں نام مردوں کا مٹا سکتا نہیں
"وقت" اُنکے کارناموں کو بھلا سکتا نہیں

(۳)

اے نوا سنجِ وطن اے شاعرِ شیریں بیاں
پا شکستہ کارواں کا تُو ہے میرِ کارواں

تجھکو شایاں ہے جو کہیئے درسِ آموزِ حیات
اپنے نغموں سے عطا کر قوم کو سوزِ حیات

کوئی روشن جادہ کر پیدا نگاہوں کیلئے
رہبرِ منزل ہے تُو گم کردہ راہوں کیلئے

راہ پیما سوئے منزل کاروانِ شوق کر
از سرِ نو یعنی عزمِ امتنانِ شوق کر

بادۂ ہمت سے ہو سرشار ہر پیر و جواں
اپنی تاریخِ کہن دہرائے پھر ہندوستاں

موسمِ گل صورتِ ماضی چمن میں لوٹ آئے
یوسفِ گم گشتہ پھر اپنے وطن میں لوٹ آئے

ارتقا کا راز سمجھا، درسِ خودداری سکھا
فطرتِ مجبور کو آئینِ مختاری سکھا

سربلندی کی جہانِ عجز میں تجدید کر
ذرّۂ بے مایہ کو ہمپایۂ خورشید کر

زندگی ذوقِ عمل کا نام ہے یہ جان لیں
کاش اہلِ ہند اپنی منزلت پہچان لیں

ایکہ باشی ملتِ درماندہ را پیغمبرے
از نوائے خویش پیدا کُن جہانِ دیگرے

نہال سیوہاروی

باوَن پتّے

بند کمرے میں ایک دُھلی ہوئی چادر پر سُرخ رنگ کے تاش کے پتّے بکھر رہے تھے ــــــ

یہ ایک پُرانی وضع کا کمرہ تھا۔ کونے میں رکھی ہوئی میز کی چھاتی پر دو ایک ضخیم کتابیں پڑی تھیں، جن کے کُھلے اوراق پر آتش نفس انسانوں کے افکار سلگ رہے تھے۔ کمرے کی وزنی چھت کو ایک بُوڑھا شہتیر اپنے سینہ کے زور سے سنبھالے ہوئے تھا۔ اپنی اس مظلوم حالت میں، احتجاج کے طور پر وہ کبھی کبھی کڑکڑ کی صدا بلند کر دیتا۔ درمیان سے اس کی کمر بھی جُھک گئی تھی، اور اس خلا میں ایک بوڑھے چڑے چڑیا نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ کہنہ دیوار کے ایک روشندان سے وہ روزانہ دانہ دُنکا چُگنے کے لئے اڑ جاتے۔ ان ننھے مُنّے پر دار ذی رُوحوں کو جنگل کے بڑی چونچ والے پرندوں نے خوفزدہ کر رکھا تھا۔ ان کی ہم نوا چڑیوں کو بھی انہوں نے پر نوچ کر گنجا کر دیا۔ انہیں سر چُھپانے کو جگہ نہ تھی ــ اپنی چڑچوں میں محو یہ بُوڑھا جوڑا اس ٹیڑھے گھونسلے میں موت کے لئے چھلاوا بن کر زندگی کی شام اس کمرے کی بند فضا میں بسر کر رہا تھا ــــ

عموماً دوپہر کو جب ایک دُبلا پتلا لڑکا بالائی منزل سے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے کے لئے کمرے میں آتا تو یہ دونوں اُن کے کھیل کو گہری نظروں سے دیکھتے ــــــ شاید انہیں ان سُرخ و سیاہ اشکال سے کچھ دلچسپی ہو گئی تھی۔

ــــــ چادر پر بکھرے ہوئے پتّوں نے آج خود بخود حرکت کرنا شروع کر دی۔ چڑے چڑیا نے کبھی یہ کھیل نہ دیکھا تھا۔ اپنے گھونسلے سے گردنیں لٹکائے اُنہوں نے غور سے اس طلسم کو دیکھنا شروع کیا ــــ

ایک مختصر سی حرکت کے بعد یہ پتّے کچھ اور بکھر گئے۔ یکایک اینٹ کا بادشاہ باہر نکل کر کھڑا ہو گیا اور اُس نے نخوت ناپسندی سے اینٹ کے غلام کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ بُڑبڑایا اور اپنے ہم جنسوں کے قریب تر ہو کر ایک بار پھر آواز دی، لیکن اس کی پُکار کا کوئی جواب نہ تھا۔ غصّہ سے اس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور اُس نے پتّوں میں سے اس غلام کو جبراً کھینچ کر باہر نکال لیا ــــ

اوندھے مُنہ پڑے ہوئے پتّے یکایک ہوشیار ہو گئے۔ حکم، پان اور چڑیا کا بادشاہ بھی اُٹھ کر اپنے ہم مرتبہ کی صف میں کھڑے ہو گئے ــــــ

"تم آواز کا جواب کیوں نہیں دیتے ــــــ بہرے ہو گئے ہو کیا؟"

دفعتہً غلام کی آنکھیں اپنے غضب ناک آقا کی طرف اُٹھیں۔ وہ ارادتاً ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ اینٹ کے بادشاہ نے بڑھ کر اُس کے ایک زبردست چپت رسید کیا ــــــ آقا عموماً آپے سے باہر ہو جایا کرتے ہیں۔

غلام نے اپنا ہاتھ سُرخ گال پر رکھ لیا۔ خوں ناب آنکھوں سے اس نے دوبارہ آقا کے ڈراؤنے چہرے کی طرف دیکھا۔ سر پھرا آقا یہ بھی برداشت نہ کر سکا اور اُس نے غلام کو بُری طرح سے نوچنا شروع کیا۔ جُملہ بیگمات اس منظر کو دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ہلکے پتّے بھی ایک دوسرے سے اشاروں میں باتیں کرنے لگے۔ پان۔ حکم اور چڑیا کے غلام بھی آنکھیں کھولے گہرے سانس لے رہے

تھے ــــــــ سرد آہیں ملوکیت سے خائف غلاموں کے جذبۂ احتجاج کی گرمی کو اندر ہی اندر ٹھنڈا کر دیتی ہیں ــــــ

یکایک پان کے غلام نے بڑھکر بادشاہ کے ظالم ہاتھ کو روک لیا۔

"ٹھیریئے اب آپ کو ظلم و تشدد سے ہاتھ کھینچنا ہوگا؟"

پان کا غلام غصہ سے کانپ رہا تھا۔ بادشاہ نے اُسے زور سے ایک جھٹکا دیا اور وہ بے تحاشا گر پڑا۔ زمین سے ٹکراتے ہی اس کے سر سے خون کی دھار بہنے لگی۔

"ہائیں آپ کیا کر رہے ہیں!" ــــــ اینٹ کی بیگم بے خود ہو کر آگے کو بڑھنے لگی لیکن بادشاہ کی خونی نگاہوں نے اس کی جرأت کو پسپا کر دیا۔

حکم کے بادشاہ نے جو اپنے ساتھیوں سمیت تماشا دیکھنے میں مصروف تھا، حکم کے یکّہ کو اشارہ سے بلا کر پان کے غلام کی گرفتاری کے لئے حکم دیا۔

"لے جاؤ اس غلام کو جیل خانہ میں۔ کمینہ کہیں کا، آقا کے سامنے ہاتھ اُٹھاتا ہے"۔ ــــــ حکم کا بادشاہ ملوکیت کا خُدا نظر آتا تھا۔

تاش کے ہلکے پتّے جذبات کے انتہائی اشتعال سے کانپنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں بغاوت کی روح سما رہی ہے۔

"ہم آپ کے غلام سہی لیکن ہم اپنا جسم و جاں آپ کے حوالے نہیں کر سکتے۔ ہمیں قید کیوں کرتے ہو۔ میں کھُلی فضا میں جینا چاہتا ہوں۔

ــــــ مجموعی طاقت کے خوف سے ڈرو۔ تمہارا تشدد ہماری ضمیر کو ہرگز مُردہ نہیں کر سکتا!" پان کا غلام گرفتاری کے وقت چلا چلا کر آقاؤں کو قائل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی اس دلیری پر حکم کے یکّہ نے اس کے چانٹا رسید کیا ــــــ

مُشتعل پتّے بید بھڑک ہو چکے تھے۔ حکم کا غلام اپنے ساتھی کی یہ بے قدری نہ دیکھ سکا۔ اُس نے بڑھکر یکّہ کو اپنے سیاہ بازوؤں کی گرفت میں لے کر پان کے غلام کو آزاد کرانے کے لئے جھٹکا دیا۔ چڑیا کا غلام بھی سامنے تن گیا ــــــ

ــــــ اب شاہوں کے پاسبان یکّوں نے غصّہ میں آکر ہنٹر برسانا شروع کر دیئے۔ وہ تشدد سے غلاموں کو زیر کرنا چاہتے تھے۔ ہلکے پتّوں کا مُشتعل مجمع تُند بھیڑیوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا۔ مجموعی طاقت کے سیلاب کے آگے اِکّے اور بادشاہ جو اس کھلبلی میں اب بیگمات کو سنبھال رہے تھے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے ــــــ ملوکیت، جس کے رُعب نے ان کی زندگی کو پاؤں تلے دبا رکھا تھا آج ان کے کندھوں پر جنازہ بن کر موت کی کڑوی نیند سو رہی تھی ــــــ غلاموں کی آزادی اس کے تابوت کا آخری کھیل تھی۔

غلاموں اور آقاؤں کی اِس مڈبھیڑ میں پان کی تکّی اور حکم کی چھکّے پنجے کے بھی معمولی چوٹیں آئیں۔

ــــــ آزاد پتّوں نے اب اپنی ترتیب کو بالکل بدل دیا تاکہ آیندہ کوئی پتّہ کسی دوسرے کھلاڑی کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر ایک دوسرے پر وار نہ کر سکے ــــــ

یہ کھیل دیکھکر مبہوت چڑے نے چڑیا کے کان میں کچھ چڑچوں کی۔ دونوں جنگل کی کھُلی فضا کی طرف پرواز کر گئے۔

کے۔ حسن عباس۔ بی۔ اے۔

صحرائے مریخ کا ایک حادثہ

یوں تو اہلِ مریخ کی زندگی کا ہر لمحہ سرور و انبساط کا مستقل پیغام تھا، نشاط و آسودگی طمانیت و سرشاری اُن کے ایوانِ حیات کے مستقل جلوے تھے۔ وہ صبح سے شام تک اپنے اپنے لالہ زاروں میں محوِ خرام رہتے۔ آئینہ تاب چشموں کے منور پانی سے کھیلتے۔ آبشاروں کی نغمہ سرائیاں سُنتے، پھولوں اور پھلوں سے لذتیں اخذ کرتے، غرض کہ ایسے ہی لطیف مشغلوں میں تمام دن گذارنے کے بعد شام ہونے سے پہلے "قصرِ نیلوفری" کے قریب جمع ہوتے، انتہائی ارادت و عقیدت کیساتھ اپنے سروں کو جھکاتے اور تصویرِ محویت بن کر رہ جاتے۔

جب سُورج کی آخری کرنیں مریخ کے سبزہ زاروں کو الوداعی بوسہ دیتی ہوتیں، شفق کی رنگ سامانیاں نگارخانۂ فطرت کے اچھوتے شاہکار نظر نواز کر رہی ہوتیں، اور شام کے طائر اپنا آخری نغمہ ختم کر کے بسیرے کی فکر میں ہوتے" قصرِ نیلوفری سے ایک نغمہ بلند ہوتا سحر آفریں اور ہوشربا ساز کی دلنشین اور دل نواز آواز تمام فضا پر محیط ہو جاتی۔ نغمے کی لطافتوں سے اہلِ مریخ جھومنے لگتے۔ اُن پر وجدان و سرور، کیف و مستی اور سرشاری کی ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ وہ جھومتے جھومتے بالکل غافل ہو جاتے اور اسی عالم میں اُنہیں نیند آ جاتی، پھر وہ اُس وقت سے پہلے بیدار نہ ہوتے، جب صبح کی نور آفرینیاں اُن کی جبینوں کو اپنی شعاعوں سے نہ چھُوتیں، اور انہیں بیداری کی دعوت نہ دیتیں، یہ تھا ان کا نظامِ حیات و طریقِ زندگی جس پر وہ ایک زمانے سے کاربند تھے۔ اُنکی زندگیاں یکسر شراب و نغمہ تھیں اور وہ بڑی معصوم و پاکیزہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن اگر ان میں کوئی کمی تھی تو صرف یہ کہ اُن کے دل محبت کی گرمی سے بالکل خالی تھے۔

مریخ کی شہزادیوں اور کنواریوں کا نصب العین حیات مردوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ نہ لالہ زاروں میں جاتی تھیں نہ صحراؤں میں۔ البتہ اپنی گل پوش وادیوں میں صبح سے شام تک اپنے سیمیں جلووں سے جنتیں بناتی رہتیں۔ اُن کے ستاروں کے بربط، اُنکی پھولوں سے مُرصّع شہنائیاں اُن کی زندگی کی زینت تھیں۔ یہاں کی مخلوق میں ازدواجی زندگی کا دستور ضرور تھا۔ مگر نہ ہونے کی طرح وہ اس رشتے کے بعد بھی ایک دوسرے سے اسی طرح بیگانہ رہتے تھے اور اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ "محبت" کی لذتوں روحانی بلندیوں اور بے پناہ سرشاریوں سے بالکل ناآشنا تھے،

یہاں ابھی تک کسی کنواری کے پیکر میں سانگی نمودار نہیں ہوئی تھی اور نہ کسی مرد پر کیوپڈ نے اپنے تیروں کو آزمایا تھا۔

(۲)

قصرِ نیلوفری کا بیرونی منظر اس قدر دلچسپ اور دلنشین تھا کہ اسے دیکھنے کے بعد بارہا اہلِ مریخ کے دلوں میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ وہ کسی طرح یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ اسکے اندر کیسے کیسے مناظر ہیں اور اس میں کون رہتا ہے۔ لیکن باوجود کوشش کے انہیں اس کا کوئی راستہ نہیں معلوم ہو سکا اور کوئی کامیابی نہیں ہُوئی۔ وہ شام کے اوقات کی مسلسل نغمہ باریوں سے صرف یہ سمجھ سکے کہ یہ قصر کسی مقدس دیوی یا دیوتا کا مسکن ہے جسکا تعلق براہِ راست عرشِ الٰہی سے ہے۔ نہ اُنہیں اس سے زیادہ سمجھنے کی ضرورت تھی اور نہ وہ سمجھ سکتے تھے کہ وہ قصرِ نیلوفری کی نغمہ باریوں کو اپنے لئے ایک روحانی پیغام اور نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس سے لُطف اندوز ہونا ان کیلئے عبادت سے کسی طرح کم نہ تھا اور عقیدتاً وہ اسے عبادت سے بھی کچھ زیادہ درجہ دیتے تھے۔

لیکن کئی دن سے قصرِ نیلوفری کی نغمہ باریاں بند تھیں۔ وہ روزانہ شام کو اسی خلوص و عقیدت کیساتھ وہاں جمع ہوتے جو ایک زمانے سے اُن رُوحوں اور دلوں پر مُسلط تھا، بڑی نیازمندی کیساتھ سجدہ ریز ہوتے اور ساری ساری رات اسی حالت میں گذار دیتے مگر نہ اُنہیں کوئی نغمہ سُنائی دیتا نہ کسی ساز کی آواز آتی۔ وہ اس انقلاب سے سخت پریشان تھے۔ اُن کا سکون زندگی تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اُن کا اطمینان اضطراب کے گُرزوں سے کُچلا جا رہا تھا۔ وہ اِس ناگہانی تغیر سے اپنی زندگیوں میں بڑا زبردست خلا محسوس کر رہے تھے۔ نہ اُنھیں اب پھُولوں سے دلچسپی رہی تھی اور نہ پھلوں سے۔ صحرائے مریخ کے تمام مناظر اُن کی نگاہوں میں ویران ہو کر رہ گئے تھے وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ اب کیا کریں اور اپنے روٹھے ہُوئے دیوتاؤں کو کس طرح منائیں۔ وہ صدیوں سے ساز و نغمہ کی کیف باریوں سے لُطف اندوز ہونیکے عادی ہو چکے تھے۔ لیکن اِس فوری تغیّر نے اُنہیں بے حد آزُردہ کر دیا تھا۔ اُن میں سے اکثر تو اِس عذاب کو برداشت نہ کر سکے، اور موت سے ہم آغوش ہو گئے۔ اکثر دن رات قصرِ نیلوفری کے دامنوں میں بیٹھے ہُوئے رویا کرتے اور اسی حالت میں جان دیدیتے۔ بہت

زیادہ غور کرنیکے بعد یہ طے ہوا کہ مریخ کی کنواریوں کو نغمہ باری کیلئے مجبور کیا جائے تاکہ وہ کسی طرح زندہ تو رہ سکیں۔ چنانچہ وہ گل پوش وادیوں میں رہنے والی مقدس کنواریوں اور متقیہ شہزادیوں سے ملے۔ بڑی التجاؤں کے ساتھ اپنی آرزو کا اظہار کیا۔ لیکن چونکہ وہ مردوں سے مطلق مانوس نہ تھیں اور نہ وہ ان میں اپنے لئے کوئی کشش پاتی تھیں۔ اسلئے وہ انکے کام نہ آسکیں۔ انہوں نے روزانہ ایک معینہ وقت پر نغمہ باری سے انکار کردیا، پھر مردوں کے لالہ زار میں جانا انکے اصول کے بھی خلاف تھا اور وہ انکے احکامات کی تعمیل کو اپنے لئے لعنت اور توہین سمجھتی تھیں۔ اس ناکامی نے انکے دلوں کو بالکل توڑ دیا۔ وہ مرجھائے پھولوں کی طرح اپنے اپنے لالہ زاروں میں واپس ہوئے۔ اب وہ سمجھ گئے کہ قصرِ نیلوفری کے دیوتا ان سے سچ مچ ناراض ہیں۔ اور ہم سب انکے عتاب کا شکار ہوکر رہیں گے، وہ بڑی کس مپرسی کی حالت میں تھے انہیں یقین سا ہوگیا تھا کہ اسی حالت میں تڑپتے تڑپتے ایکدن ہم سب فنا ہو جائیں گے اور سطحِ مریخ پر ہم میں سے ایک متنفس بھی باقی نہ رہیگا۔

(۳)

عین اُس وقت جب اہلِ مریخ کی مایوسیاں ناقابلِ برداشت ہوکر اپنی حدود سے گذر چکی تھیں۔ اور وہ موت کے خیر مقدم کے لئے بالکل تیار تھے کہ ایک دن قصرِ نیلوفری سے دفعتاً ایک نغمہ بلند ہوا جسے سنتے ہی تمام عقیدتمندوں میں زندگی کی لہر سی دوڑ گئی۔ گویا مٹی کے پتلوں میں جان پڑ گئی اپنی اپنی جگہ سب ہوشیار ہوکر بیٹھ گئے اور بگوش ہوش اُدھر متوجہ ہوئے۔ لیکن آج نغمہ بھی بدلا ہوا تھا اور ساز بھی۔ جو کچھ انہوں نے سنا وہ ایک پیغام تھا، جو نغمے کے روپ میں انکی سماعتوں میں گونج گیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ایک ہی گت تین مرتبہ انہیں سنائی دیا جس کا مفہوم یہ تھا۔

"اے مریخ کے خاکی پتلو! قصرِ نیلوفری محبت کے دیوتاؤں کا مسکن ہے، وہ تمہیں ایک زمانے سے محبت کا پیام دیرہے ہیں، محبت کے نغمے سنا رہے ہیں، لیکن تم آجتک محبت کے مفہوم، محبت کی لذت اور محبت کی لطافتوں سے بیگانہ ہو اس لئے تم پر محبت کی نغمہ باریاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کردیگئی ہیں لیکن اگر تم محبت آشنا ہوسکے، محبت کرنا سیکھ گئے تو ایکدن محبت کے دیوتا تم پر مہربان ہوجائینگے۔ اور تم اسی آسودگی کے ساتھ زندہ رہ سکوگے، ورنہ اپنی موت یقینی سمجھو۔"

اس پیغام کا ایک ایک لفظ اہلِ مریخ کے لئے جادو کا اثر ثابت ہوا وہ اپنے انجام کی اطلاع سے لرز کر رہ گئے، ذرا سی دیر میں محبت کے دیوتاؤں کا یہ پیغام تمام مریخ میں پھیل گیا اور اب سب کی زبان پر ایک ہی سوال تھا کہ ——— محبت کیا ہے؟ ——— اس سوال کا پیدا ہونا اہلِ مریخ کے لئے بیحد انقلاب انگیز ثابت ہوا، وہ اپنے مقاصدِ حیات کو بالکل بھول گئے اور سوائے "محبت" کے انہیں کچھ یاد ہی نہیں رہا بہت سے دلدادگانِ محبت بے اختیاری اِدھر اُدھر خوفناک جنگلوں میں نکل گئے، اور پھر واپس نہ آئے، بہت سے پھولوں، چشموں، پہاڑوں اور آبشاروں میں محبت کو تلاش کرتے کرتے برباد ہوگئے۔ لیکن اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ محبت کیا ہے؟۔

اہلِ مریخ کے لئے یہ حادثہ کوئی معمولی حادثہ نہ تھا، انکی تعداد بڑی حدتک کم ہوچکی تھی۔ مگر وہ اپنے دیوتاؤں کے پیغام کا عملی ثبوت دینے کیلئے اب بھی ہر وقت کوشاں تھے۔ لیکن اسکے بعد بھی محبت کا حصول انکی سمجھ سے بالاتر نظر آرہا تھا۔ ان حالات کے بعد انکی مکمل بربادی یقینی تھی مگر کیوپڈ اور سائکی کو ان کے حال پر رحم آگیا، وہ سمجھ گئے کہ اب یہاں محبت کی حکومت قائم کی جاسکتی ہے۔ لہذا آزادی کیساتھ محبت کی تبلیغ شروع کردی گئی کیوپڈ نے اپنا ترکش سنبھالا۔ تیراندازی شروع کی اور نوجوانانِ مریخ کے دلوں میں محبت کے جذبات کی چنگاریاں بھر کر زندگی کی ایک جدید شاہراہ کھولدی۔

اور سائکی بھی اپنے فرض کی ادائیگی سے غافل نہ تھی۔ وہ مریخ کی صاحبِ جمال کنواریوں کے دلوں کو محبت کے رنگ میں رنگتی ہوئی موسم بہار کی شعلہ رنگ تیتری کی طرح اِدھر سے اُدھر اُڑتی پھرتی تھی۔ اس نے گل پوش وادیوں میں رہنے والیوں کو ایک نئے درد، ایک نئی لذت اور ایک نئی خلش میں مبتلا کرکے نوجوانانِ مریخ کے لئے انکے دلوں میں ایک کشش پیدا کردی تھی۔ اب صرف ایک مرحلہ باقی تھا اور اسکی تکمیل بھی کیوپڈ اور سائکی ہی کے سپرد تھی۔

(۴)

مریخ کے لالہ زاروں اور وادیوں میں محبت کی گلکاریاں ذرے ذرے پر مرتسم نظر آرہی تھیں اور وہ خطۂ گلریز جہاں محبت کے سوا سب کچھ تھا اب کچھ اور ہی ہوگیا تھا۔ نوجوانانِ مریخ دن رات ایک محویت کے عالم میں مصروفِ گل گشت رہے۔ انکی نگاہوں میں محبت کی مسکراہٹ اور طلبِ محبت تشنگی پائی جانے لگی تھی اس وقت وہ گلپوش وادیوں میں رہنے والی کنواریوں کی طرف کھنچتے ہوئے نظر آرہے تھے اور وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ محبت کے دیوتاؤں کے پیام نے ان پر کیا اثر کیا ہے۔

قصرِ نیلوفری کے نشیب میں بہنے والے ایک شفاف چشمے کے کنارے بہت سے نوجوان بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتاً انہیں ایک روشنی

سی محسوس ہوئی۔ اُنہوں نے دیکھا کہ قصرِ نیسلوفری کے ایک بیرونی گوشہ میں ایک حسین مردِ رعنا اور ایک دوشیزہ کنواری رازو نیازِ محبت میں مصروف ہیں وہ انہیں بہت دیر تک دیکھتے رہے۔ اُن کے دلوں میں بھی ایسی ہی خواہش پیدا ہوئی اور یہ آرزو اُنکی رُوحوں میں چودھویں کے چاند کی طرح روشن ہوکر رہ گئی کہ اے کاش مریخ کی کنواریاں اُن کی دعوتِ محبت پر لبیک کہہ سکیں اور وہ بھی محبت کے رازو نیاز کا صحیح لُطف اُٹھا سکیں وہ چاہتے تھے کہ دوڑ کر گل پوش وادیوں میں پہونچ جائیں اور اپنی التجا پیش کریں کہ انہیں ایک نغمہ سُنائی دیا۔

"محبت کرنے والوں کو حیرت سے نہ دیکھو، بلکہ محبت کے
احترام اور مریخ کی کنواریوں کے استقبال کے لئے تیار
ہوجاؤ اور محبت کی فردوسی لذتوں، غیرفانی مسرتوں اور
ابدی لطافتوں میں گُم ہوجاؤ"

یہ نغمہ اُن کے لئے آبحیات سے کم نہ تھا جو شراب کے گھونٹوں کی طرح اُن کے قلوب میں سما گیا۔ بدمستی و سرشاری کی مکمل کیفیتوں کے ساتھ اُن پر طاری ہُوا اور وہ بے اختیار سجدہ ریز ہوگئے ابھی سجدے سے اُن کے سر نہ اُٹھے تھے کہ بہت سے بربط اور شہنائیاں ایک ساتھ بجنے لگیں اور اُن سے بہت قریب نغمات کا سمندر اُبل پڑا جیسے ہی وہ اُٹھے ایک دلنشین نظارہ سے اُنکی آنکھوں میں چکاچوند سی پیدا ہوگئی، اُنہوں نے دیکھا کہ مریخ کی کنواریوں کا ایک گروہ رنگا رنگ پھُولوں کے لباس پہنے ہُوئے محبت کے گیت گاتا ہُوا رقص کی ہزاروں شانیں لئے ہُوئے اور دوشیزگی و برنائی کی جادو طرازیوں کو بے نقاب کئے ہوئے اُنکی طرف بڑھا چلا آرہا ہے وہ چشمے کے دوسرے کنارے پر صف بستہ ہوکر کھڑے ہوگئے، اسوقت اُنکی رُوحیں ایک ناقابلِ بیان کیفیت میں ڈُوبی ہُوئی تھیں؛ وہ اپنے جسموں میں پرواز کی قوت محسوس کررہے تھے اور اُن کے دل جذباتِ محبت کی گرمیوں سے پگھلے جارہے تھے، آج اُن کی زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ گل پوش وادیوں کی رہنے والیاں اُن کے پاس اِس شان و اہتمام سے آرہی تھیں ورنہ یہ واقعہ تھا کہ جو کنواریاں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوچکی تھیں وہ بھی مردوں سے کوئی خصوصی اُنسیت نہ رکھتی تھیں؛ ورنہ وہ ہمیشہ اُنکے پاس رہ سکتے تھے۔

یہ چلتے پھرتے ہوئے پھولوں کا گلدستہ چشمے کے قریب آکر رُک گیا مریخ پھولوں کے ہار اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور محبت کا ساز چھیڑ دیا۔ اس درجہ التفات آگینیوں اور دعوتِ محبت کے بعد نوجوانانِ مریخ سے ضبط نہ ہوسکا وہ بے اختیار پانی میں کود پڑے اور تیرتے ہوئے دوسرے کنارے تک پہونچکر اپنے سروں کو حُسن کی دیویوں کے قدموں پر جھُکا دیا، مریخ کی کنواریوں نے اُنکی پذیرائی کی، پھولوں کے ہار اُن کے گلوں میں ڈالدیئے اور بہت ہی لطیف انتخاب کے بعد حُسن و عشق کی وابستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے "جشنِ نوروزِ محبت" کی ابتدائی رسم انتہائی خلوص و عقیدت کیساتھ ادا کی، آپس میں معانقہ کیا گیا اور ایک ایسے رقص کے بعد جس سے تمام کرۂ مریخ وجد کرنے لگا محبت کی بنیاد ڈالدی گئی۔

محبت کے دیوتاؤں نے اُن پر پھُول برسائے اور شام ہوتے ہی قصرِ نیسلوفری سے نغموں کی بارش شروع ہوگئی اب اہلِ مریخ کو یقین ہوگیا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے اور اُنکی محبت حاصل کرلینے میں کسی حد تک کامیاب ہوچکے ہیں۔ اِسی تقریبِ سعید کی خوشی میں تمام مریخ پر چراغاں کیا گیا اور تمام مریخ میں محبت کے مذہب کا اعلانِ عام کردیا گیا۔

قصرِ نیسلوفری جو قدرت کی کاریگری کا ایک نادر نمونہ تھا، کیوپڈ اور سائکی کا مامن و مسکن تھا جن کا مقصدِ حیات ہی یہ ہے کہ وہ ہر ذی حیات سیارے میں محبت کا صُور پھُونکتے رہیں۔ ابھی تک مریخ کی دُنیا محبت سے بیگانہ تھی وہ ایک عرصہ کی کوشش کے بعد اُنہیں محبت کی طرف مائل کرکے رہے اور اُنکی کوششیں کامیاب ثابت ہوکر رہیں۔ سُنا گیا ہے کہ مریخ میں کیوپڈ اور سائکی کی کامیابی کے دو یادگار مجسّمے اب تک پائے جاتے ہیں جو قصرِ نیسلوفری کے شق ہونیکے بعد دستیاب ہُوئے تھے اور آجتک وہیں نصب ہیں۔ ہر سال اہلِ مریخ "جشنِ محبت" بڑے اہتمام سے مناتے ہیں محققین کا بیان ہے کہ ہماری دُنیا کا موسمِ بہار اسی جشنِ محبت کا ایک عکسِ رنگیں ہوتا ہے۔

محبت کا مفہوم سمجھنے اور اس غیرفانی لذت سے آشنا ہونے کے بعد مریخ ایک نئے سانچے میں ڈھل کر رہ گیا ہے۔ وہاں کے لالہ زار اور گل پوش وادیاں پہلے سے زیادہ شاداب نظر آتی ہیں اور محبت کرنے والے فردوسی پیکر اپنے اپنے خطے میں فردوسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ محبت ہی اُن کا مذہب ہے۔ محبت ہی کو وہ خُدا سمجھتے ہیں۔ وہ محبت کے ماحول میں جاگتے ہیں۔ محبت کے ماحول میں سوتے ہیں۔ غرض کہ وہ سراپا محبت ہیں۔ وہ محبت پر ناز کرتے ہیں اور محبت کے دیوتاؤں کو اُن پر ناز ہے۔

مریخ میں نہ ہماری دُنیا کی طرح ہوس پرستیاں ہیں نہ خود غرضیاں۔ نہ وہاں انسانی درندگی کے مظاہرے ہوتے ہیں نہ ایک دوسرے کو کچلا جاتا ہے۔ نہ وہاں قتل و غارت کی گرم بازاری ہے، نہ

زریب دریاکاری کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ اہلِ مریخ آپس میں کبھی نہیں لڑتے وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں۔ ان میں رشک ضرور ہے لیکن حسد نہیں ان میں محبت کی تشنگی ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن ایک دوسرے پر سبقت لیجانے یا ذلیل کرنیکے جذبات ان کے دلوں میں کبھی پیدا نہیں ہوتے جب وہاں چودھویں رات کا چاند اپنی کجکلاہی اور شباب کی بے پناہیوں کے ساتھ طلوع ہوتا ہے جب تارے اپنے اپنے ساز چھیڑ دیتے ہیں تو مریخ کی گلپوش و گلریز وادیاں نور و سرور میں ڈوب جاتی ہیں۔ محبت کے پجاری ایک خطۂ گلریز... میں جمع ہوتے ہیں۔ محبت کے نام پر سجدے کرتے ہیں۔ محبت کے گیت گاتے ہیں اور تمام رات جشنِ شب ماہ مناتے رہتے ہیں۔ ہر چند کہ محبت کے حصول کے لئے اہلِ مریخ کو بڑے زبردست حادثے سے دوچار ہونا پڑا اور قربانیاں پیش کرنا پڑیں۔ لیکن اس حادثے کے بعد محبت کی جو زندگی انہیں نصیب ہوئی وہ کبھی سیارے کے مکینوں کو نصیب نہیں ہوئی۔ اے کاش کہ دنیا میں محبت کا مذہب عام ہو جائے +

حاجی نبی احمدؐ، بریلوی

آلِ تیمور سے!

اُٹھ کہ دل میں سجدہ گاہِ عرشیاں پیدا کریں
اپنی مرضی کے زمین و آسماں پیدا کریں

یہ جہانِ کہنہ و دیرینہ باطل ہو چکا
آرزو ہائے مسلسل کا جہاں پیدا کریں

اُٹھ کہ اس کون و مکاں کو نورِ جاں سے غسل دیں
دین و دل میں سوادِ لامکاں پیدا کریں

محنتِ آدم کا ورثہ قوم پر قسمت کریں
ساکنانِ ہند میں سوزِ نہاں پیدا کریں

ہیبتِ چنگیز و فرِ شوکتِ تیمور سے
اس جہاں کو روندنے اک کارواں پیدا کریں

تیز تر شہباز سے ہر نوجواں کی ہو نظر
پائے آزادو سرِ دیوانگاں پیدا کریں

صید خود بے تابِ تیرِ بے کماں کھانے کو ہو
اُٹھ کہ اِن تیروں سے زخمِ بے نشاں پیدا کریں

ہیں پرستارِ نشیمن سارے مُرغانِ چمن
اِس چمن سے طائرِ بے آشیاں پیدا کریں

ہند کے راگوں میں بھی پستیٔ فطرت ہے شریک
اُٹھ کہ جیتی جاگتی طرزِ فغاں پیدا کریں

اِن پرندوں کو سکھائیں رسم و آئینِ شہی
اِس غلامستان سے شیرِ ژیاں پیدا کریں

اِس نیستاں سے بجائے نَے و برگ و شاخِ نخل
دشنۂ خونریز و دستِ جانستاں پیدا کریں

ہر تنِ آسانی کا ہوتا ہے بلاؤں سے علاج
اُٹھ کہ اپنے واسطے خود امتحاں پیدا کریں

اُٹھ کہ عالمگیر و اکبر اور بابر کی طرح
نامورِ اجداد کا نام و نشاں پیدا کریں

بوریائے فقر کو تختِ شہنشاہی بنائیں
آنے والوں کے لئے اک ارمغاں پیدا کریں

دولتِ بیدار حاصل محنت و قوت کی ہے
اُٹھ کہ اپنے بل پہ گنجِ شائگاں پیدا کریں

عرشؔ ممکن ہے خدائی بھی اگر حق ساتھ ہے
اُٹھ کہ خاکِ مُردہ میں جان و رواں پیدا کریں

عرشؔ تیموری

بچوں کے متعلق ٹیگور کی منظوم کہانیاں

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ بچپن کے تاثرات پائدار اور دوامی ہوتے ہیں، اور آئندہ زندگی میں ہمارے کردار، مزاج، رجحانات، پسندیدگیوں اور ناپسندیدگیوں کی انفرادی خصوصیات اِن ہی دُھندلے نقوش کی بُنیادوں پر قائم ہوتی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے 'ورڈزورتھ' نے بچہ کو "انسان کا باپ" کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ماہرینِ نفسیات، جو پہلے بچے اور اُس کی نشوونما سے بے پرواہ رہتے تھے اور اس کو محض "عمر رسیدہ انسان کا ایک چھوٹا سا مجسمہ" تصوّر کرتے تھے، اب بچّے کے ذہن کے مُطالعہ میں مصروف نظر آتے ہیں۔

تعجب کا مقام ہے کہ مرد اور عورت کی لازوال اہمیت کے باوجود بھی ہندوستان کے کلاسیکی شعرا نے جذباتی اور غنائی شاعری میں بچپن کے زمانے پر قرار واقعی توجہ نہیں کی، حتیٰ کہ سنسکرت کے ادب میں بھی سوائے چند مقامات کے ہم کو "بچّے کے ذہن" کے تخیّلی اور باقاعدہ مُطالعہ کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

مگر ٹیگور کے سرزمینِ ادب پر قدم رکھتے ہی "بچپن" پہلی بار رومانی شاعری کے اہم ترین موضوعات میں شمار کیے جانے لگا۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں ٹیگور اپنے ایک بیٹے کے ساتھ، جو تپ دق کا مریض تھا، الموڑہ گئے، جہاں اُس کا انتقال ہو گیا۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں اُن کا دوسرا بیٹا داغِ مفارقت دے گیا۔ اِن صدمات کا یہ اثر ہوا کہ۔ غم غلط کرنے کے لئے "شاعر" نے اپنا وقت اور زورِ تخیّل "بچہ کے ذہن کے اسرارِ سربستہ" کے مُطالعہ میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ بچہ کے خیالات اور جذبات کی سادگی اور انوکھا پن اور طرفگی اُن کی توجہ کی مرکز بن گئیں، اور اس وقت سے اُنہوں نے "بچپن" پر نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔

رابندر ناتھ کو پورا احساس ہے کہ بچّہ، محض اپنی سادگی کی بنا پر، ایک پُر اسرار چیز ہے۔ وہ خُوب جانتے ہیں کہ "ذہنِ طفلی کا راز" ایک ایسا گہرا راز ہے جو صرف نفسیات کی کتابوں کے مُطالعہ سے سمجھ میں نہیں آسکتا اور اسی کو سمجھنے کے لئے انسان کو خود بچّہ بن جانا مرتبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جلیل القدر شاعر بچّہ کا ہمراز اور ہم آہنگ بن جانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

اِن منظوم کہانیوں میں اُن کے خیالات اور احساسات وُہی ہوتے ہیں جو ایک خُرد سال بچّے کے ہو سکتے ہیں۔ اِن کہانیوں کو لکھتے وقت وہ اتنا زیادہ "از خود رفتہ" ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک انسان یا شاعر یا فلسفی کی حیثیت سے اپنی انفرادی شخصیت کو بُھول جاتے ہیں اور خود "بچہ" بن جاتے ہیں۔ یہ آرٹ کا منتہائے کمال ہے۔

وہ خود کہتے ہیں:-

"اے کاش، مَیں اپنے بچّے کی دل کی دُنیا میں ایک خاموش گوشہ حاصل کر لیتا۔ . . . . . . میری آرزو ہے کہ مَیں اُس راہ پر گامزن ہوں جو بچّے کے ذہن کو طے کرتی ہوئی (زمان و مکان کی) تمام حدود سے گذر جاتی ہے۔" ("ماہِ نو" صفحہ ۱۷)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُنہوں نے بچّے کو سمجھنے کی کتنی کوشش کی ہوگی۔

ٹیگور کے تخیّل نے جس بچّے کو پیدا کیا وہ کوئی "خیالی مخلوق" نہیں بلکہ اِسی دُنیا کا ایک جیتا جاگتا انسانی بچّہ ہے، جس کی تصویر اُنہوں نے کمال شفقت اور ہمدردی سے کھینچی ہے۔

"شاعر" اپنے بچپن کے تلخ تجربات بُھول نہیں سکتا۔ اُس کی بعد کی زندگی کے تلخ تر تاثرات اور ذمہ داریاں اُن ابتدائی نقوش کو مٹا نہیں سکیں۔ وہ بار بار اُن تکالیف کا تذکرہ کرتا ہے جو اُسے اپنے اسکول میں پیش آیا کرتی تھیں۔ موجودہ طرزِ تعلیم کے خلاف اس کو جتنی شکایتیں ہیں اُن کو اس نے "مراجعتِ وطن" میں تمام و کمال ادا کر دیا ہے۔ اس کہانی میں وہ ایک خود سر، مضبوط قویٰ والے، "پروردہ فطرت" بچّے کا تذکرہ کرتا ہے:-

قصّہ کا ہیرو (فاتک) گاؤں کے تمام بچّوں کا تسلیم شدہ لیڈر ہے:- اپنی زندگی کے آغاز ہی وہ فطرت سے ہم کنار اور ہم آہنگ رہا ہے۔ گھر میں اسکو جو زد و کوب کی جاتی ہے وہ اُس کے اثر کو وسیع میدانوں میں دوڑ کر یا دریا میں تیر کر بُھلا دیتا ہے ——— اُس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب اُس کا چچا اُسے اس کے ماحول سے چُھڑا کر شہر میں لے جاتا ہے، جہاں پہونچ کر وہ "وہاں کی خیرہ کُن روشنیوں

اور بے معنی شور و شغب سے بھاگ جانے کی تمنا کرتا ہے اور ایک بار پھر شہر کے باہر کی آزاد فضاؤں ـــــ پہاڑوں اور دریاؤں ـــــ کا جویا ہے!"

("فلسفۂ ٹیگور" از ایس۔ رادھا کرشنان صفحہ ۲۲)

نانک جیسے "پروردۂ فطرت" بچوں سے شاعر کو جو دلی تعلق اور دلچسپی ہے وہ دنیا سے، خصوصاً وشوا بھارتی کے طالبعلموں سے پوشیدہ نہیں۔ وہ نہایت خلوص اور دیانتداری سے اپنے ان جذبات کو جو بچے کے متعلق اپنے دل میں موجزن پاتا ہے من وعن ظاہر کر دیتا ہے۔ اُسے اس کا مطلق احساس نہیں رہتا کہ ایک فلسفی یا نوبل پرائز پانیوالے شاعر کی حیثیت سے اُسے سنجیدگی کی قبا پہن لینی چاہیئے۔ وہ نہایت آزادی اور مسرت کے ساتھ بے معنی طفلانہ باتیں کرتا چلا جاتا ہے جو بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں ـــ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ ان بھولی بھولی معصوم باتوں پر ہزاروں فرزانگیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ کیا انسان خود ایک "بڑا بچہ" نہیں ہے؟

جو لوگ عقل ستیزہ کار کی ہنگامہ آرائیوں سے تنگ آ گئے ہوں اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے دماغ کو آرام دینا چاہتے ہوں اُنہیں "ماہِ نو" کے صفحات میں پناہ ڈھونڈنی چاہیئے۔ وہاں ٹیگور کا بچہ اُنکو اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے ایک ایسی دُنیا میں لے جائے گا جہاں "عقل کی استبدادیت" کا پتہ بھی نہ ملے گا۔ اور وہاں ہر نووارد ایک ایسی طاقت حکمران دیکھے گا جو عقل سے کہیں زیادہ فرزانہ تر ہوتی ہے۔

وہاں وہ بچے کو یہ کہتے ہوئے سُنے گا:-

"امّاں، میرے خیال میں پھول بھی زمین کے نیچے اسکول جاتے ہیں۔ وہ بند کواڑوں والے کمروں میں سبق حاصل کرتے ہیں، اور اگر وہ وقت سے پہلے باہر آنا چاہتے ہیں تو اُن کے ماسٹر صاحب انہیں کونے میں کھڑا کر دیتے ہیں"

("ماہِ نو" صفحہ ۵۴)

یا:-

"چونکہ میں بچہ ہوں اس لئے چھوٹا خیال کیا جاتا ہوں۔ جب میں با کے برابر ہو جاؤنگا تو میں بھی بڑا ہو جاؤں گا" ("ماہِ نو" صفحہ ۵۴)

ایک دوسری جگہ بچہ اپنی ماں سے اپنی چھوٹی بہن کا تذکرہ کرتے ہوئے اُسے "بیوقوف اور بے عقل بچی" کہتا ہے:-

"امّاں، تمہاری بچی تو بڑی بیوقوف ہے۔ وہ کیسی احمقانہ باتیں کرتی ہے! وہ تو سٹرک پر کی روشنیوں اور ستاروں میں بھی تمیز نہیں کرسکتی۔ تمہاری بچی چاند کو پکڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ کتنی مضحکہ خیز ہے! وہ تو "گنیش" کو "گانوش" کہتی ہے!"

("ماہِ نو" صفحہ ۵۲-۵۳)

بچے کے ذہن کا تجزیۂ نفسی کرنے میں شاعر کو جو قدرت حاصل ہے اُس کا راز اس بدیہی حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ اُس نے بچوں کو خوب اچھی طرح سمجھا ہے۔ کسی اور شاعر میں ہم کو یہ خصوصیت نہیں ملتی۔ ٹیگور اپنے تخیل اور مشاہدے کی مدد سے، بچہ کے دل کی گہرائیوں میں سماجاتا ہے اور کمال بصیرت اور تفہیم کے ساتھ اپنے بچہ سے کہلواتا ہے:-

"امّاں، اب میرے جانے کا وقت آگیا ـــــ میں جاتا ہوں۔...... میں ہوا کا ایک نرم و نازک جھونکا بن جاؤں گا اور تمہیں تھپکی دونگا۔ میں پانی کی چھوٹی چھوٹی لہریں بن جاؤں گا اور جب تم نہاؤ گی تو تم کو بار بار بوسہ دونگا۔...... خالہ جان "پوجا" کے موقع پر تحفے لیکر آئیں گی اور پوچھیں گی "بہن، بچہ کہاں ہے؟" امّاں، تم اُن سے کہدینا:

"وہ میری آنکھوں کی پتلیوں میں ہے۔ وہ میرے جسم اور میری رُوح میں ہے"!"

("ماہ نو" صفحہ ۶۶)

ان نظموں کا ایک خوشگوار نفسیاتی پہلو یہ ہے کہ وہ صرف بچہ ہی کا تجزیہ نفسی نہیں کرتیں بلکہ ماں کے احساسات اور جذبات کی نفسیاتی تفسیر بھی پیش کرتی ہیں۔ بچے کی ماں نہ صرف اپنے لطیف اور پراسرار ارمانوں اور تلوّنات کو سمجھتی ہے بلکہ وہ بچّہ کے ہر لحہ بدلنے والے مزاج اور خواہشات سے بھی واقف ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے:-

"جب میں نے شباب کی منزل میں قدم رکھا تھا اور میرے دل کی کلی میں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں تو تم اُس کے چاروں طرف خوشبو کے مانند رقصاں تھے۔ تمہاری نرمی اور نزاکت میرے جوان اعضا میں پھول رہی تھی، جیسے سورج نکلنے سے پہلے آسمان پر سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے......... اس ڈر سے کہ کہیں میں تمہیں کھو نہ دوں میں تم کو ہر وقت مضبوطی سے اپنے سینے سے چمٹائے رکھتی ہوں"!

("ماہِ نو" صفحہ ۶۰-۶۱)

جب بچہ اپنی ماں سے پوچھتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور اُس نے اُسے کہاں پایا تو وہ اشک ریز تبسم کے ساتھ اُسے اپنے سینے سے لپٹا لیتی ہے اور کہتی ہے:-

"تم میرے دل میں اسی طرح پوشیدہ تھے، جیسے میرے ارمان!"

اُس نفسیاتی اُصول کے مطابق جس کو شاعر نے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے، بچہ اپنی ماں سے حد درجہ مانوس ہے۔ گو وہ اتنا

چھوٹا اور نارسیدہ ہے کہ اپنی ماں کے خیالات کی گہرائیوں کا اندازہ نہیں کر سکتا، پھر بھی وہ اپنی ماں کو رنجیدہ دیکھ کر متفکر ہو جاتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے:-

"تمہیں کیا ہو گیا جو ایسی عجیب نظر آ رہی ہو؟ کیا آج ابّا کا خط نہیں آیا؟"

پھر خود ہی کہتا ہے:-

"مگر پیاری امّاں، تم اس کی فکر نہ کرو۔ کل دوسرے گاؤں پر بازار لگے گا۔ تم خادمہ سے کہدو کہ کچھ قلم اور کاغذ لائے۔ مَیں خود ابّا کے سارے خط لکھ دوں گا........ اور کیا تم سمجھتی ہو کہ میں ابّا کی طرح بیوقوفی کر کے اپنے خط اُس ڈراونے ڈاکیہ کے تھیلے میں ڈال دونگا؟ نہیں ——— مَیں ذرا سا توقف بھی نہ کروں گا، بلکہ خود اُنہیں تمہارے پاس لاؤں گا۔ اور باری باری ہر خط خود پڑھکر تمہیں سُناؤں گا۔"

("ماہِ نو" صفحہ ۶۱-۶۲)

بچے کے تمام خیالوں اور خوابوں کا مرکز اُس کی ماں ہے۔ وہ اُسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ اُن لوگوں کے پاس بھی نہیں جاتا جو "بادلوں میں رہتے ہیں اور اُسے بُلایا کرتے ہیں" ——— کیونکہ اُس کی ماں گھر پر اُس کی منتظر ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"امّاں، مَیں ایک اس سے بھی اچھا کھیل جانتا ہوں۔ میں بادل بن جاؤں گا اور تم چاند بن جاؤ گی۔ مَیں تمہیں اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپا لوں گا اور ہمارے گھر کی چھت بن جائیگی........ میں موجوں میں تبدیل ہو جاؤں گا اور تم ایک نامعلوم 'ساحل' ہو گی ——— مَیں بہہ بہہ کر آؤں گا اور تمہاری گود میں ہنس ہنس کر ٹکراؤں گا۔"

("ماہِ نو" صفحہ ۲۷-۲۸)

اِن نظموں میں شاعر کی خود پسندی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اُس کے بچّے کی خود پسندی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ صرف اپنی ہی بنائی ہوئی دُنیا میں رہتا ہے۔ اور اپنی اِس "طفلی کی بادشاہت" کو بناتا اور بگاڑتا رہتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے کہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس کا "شاہی محل" کہاں ہے تو وہ محل ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے گا۔ مگر وہ، سرگوشیوں میں، اپنی ماں سے بتائے بغیر نہیں رہ سکتا:-

"امّاں، تمہیں معلوم ہے میرا شاہی محل کہاں ہے؟ وہ ہماری چھت کے کونے پر ہے جہاں تلسی کے پودے کا گملہ رکھا ہوا ہے!"

("ماہِ نو" صفحہ ۳۱)

اپنے موہوم تصوّرات سے چھوٹا سا بچّہ مادّی اشیا بناتا ہے اور اُن محسوسات کو انسانی زندگی کے حزنیہ اور طربیہ پہلوؤں سے متصف کر دیتا ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتا کہ اُس کا بڑا بھائی اُس پر کیوں ہنستا ہے اور کیوں اُسے (بچے کو) صرف یہ کہنے پر "احمق ترین لڑکا" بتاتا ہے کہ:- "جب شام کے وقت پورا چاند سامنے والے 'کدم' کے درخت کی شاخوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے تو کوئی اُسے پکڑ کیوں نہیں لیتا؟" وہ اپنے "دادا" (بھائی) کے اس قول سے اتفاق نہیں کرتا کہ "چاند کا پکڑ لینا نا ممکن ہے" اور بحث کئے جاتا ہے:- "جب امّاں کھڑکی میں سے جھانکتی ہیں اور ہم کو کھیلتے ہوئے دیکھکر مُسکراتی ہیں تو کیا اُس وقت تم اُنہیں بہت دُور کہو گے؟" پھر جب اس کا بھائی اُسے بتاتا ہے کہ چاند اتنا بڑا ہے کہ بڑے سے بڑے جال میں بھی نہیں پکڑا جا سکتا تو چھوٹا بچّہ اس مہمل گفتگو پر تعجّب کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے:-

"دادا، تمہارے اسکول میں کیسا رّدی سبق پڑھاتے ہیں! جب امّاں ہمیں پیار کرنے کو اپنا چہرہ جھکاتی ہیں تو کیا وہ بہت بڑا معلوم ہوتا ہے؟!"

("ماہِ نو" صفحہ ۲۵-۲۶)

خالص تخیّلی نظموں میں ٹیگور کا بچہ بے معنی اور بے تکی باتوں سے محظوظ ہوتا ہے اور ہر اُس مادّی چیز کو جو اُس کی سمجھ میں نہیں آتی نہایت پیارے ہنسانے والے انداز میں تعبیر کیا کرتا ہے۔ وہ "حقیقت" کے متعلق اپنے اِن خام خیالات کی خیالی تفسیرات پیش کیا کرتا ہے جن کی بُنیاد یا تو اُس کے گہوارے کے گیت ہوتے ہیں یا وہ کہانیاں جو اُس نے اپنی دادی سے سُنی ہیں۔ اِن سے اور ہندی علم الاصنام کی دوسری روایتی کہانیوں سے بچّے کا تخیّل زور پکڑتا ہے۔ وہ عجیب عجیب سمندروں اور نئی نئی سرزمینوں میں یکہ و تنہا خیالی سفر کرتا ہے۔ یا کاغذی کشتیاں بنایا کرتا ہے اور ان کو ایک ایک کر کے دریا میں چھوڑ دیتا ہے، اس اُمید پر کہ "کوئی نہ کوئی...... کبھی نہ کبھی...... کسی نہ کسی عجیب و غریب مُلک میں اِن کو پالے گا اور یہ سمجھ جائیگا کہ وہ (بچّہ) کون ہے!"

("ماہِ نو" صفحہ ۳۸)

تخیل کی مدد سے وہ اپنی دُنیا آپ پیدا کرتا ہے۔ اب وہ اپنی قلمرو میں ایک بچّہ نہیں رہتا بلکہ ایک ایسا تخلیقی فن کار بن جاتا ہے جو اپنی "شہزادی" کے گرد اپنے خوش آئند خوابوں کا جال سا تن دیتا ہے:-

"شہزادی سات سمندروں کے اُس پار ایک دُور دراز سا [illegible]

پر سوئی ہوئی ہے۔ دُنیا میں میرے سوائے کوئی نہیں جو اُسے پا سکے"
("ماہِ نو" صفحہ ۲۱)

اس کا تخیل غیر محدود ہے۔ ایک جگہ وہ اپنے آپ کو "چمپا کا پھول" تصوّر کرتا ہے، دوسرے مقام پر وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اگر وہ "کتے کا پلّہ" بن جائے تو اُس کی ماں کا برتاؤ اس سے کیسا ہوگا۔ وہ "بادل" بن جانے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ اُس کی ماں "چاند" بن جائے۔ وہ لہروں میں تبدیل ہو جائیگا، اگر اس کی ماں ایک عجیب غریب سمندر بن جائے۔ ("بادل اور موجیں")

جُوں جُوں ہم "ماہِ نو" کی اصلی نظمیں پڑھتے ہیں وہ ہمارے کانوں میں "بھولی ہوئی صداؤں" کی طرح گونجنے لگتی ہیں اور ہمیں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہمارے سامنے گہوارہ میں ایک بنگالی بچّہ لیٹا ہوا اپنی ماں سے باتیں کر رہا ہے۔ یہ احساس اتنا تیز ہوتا ہے کہ ہمیں اس کا خیال بھی نہیں رہتا کہ شاعر ان آسان، سیدھی سادی، شیریں نظموں میں کوئی فلسفہ پیش کر رہا ہے۔

رابندر ناتھ آئے دن کی زندگی کے معمولی سے معمولی واقعات کو لیتا ہے اور اپنے بے مثل طرزِ بیان کی مدد سے ان کو غیر معمولی بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس اعتبار سے کوئی دوسرا شاعر اس کا مدِ مقابل نہیں ہو سکتا۔

اس کی زبان آسان اور عام فہم ہونے کے علاوہ موسیقی اور پاکیزگی سے بھی لبریز ہے۔ ان ہی خصائص کی بنا پر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ شاعر اِن کہانیوں میں صرف اپنے دلی جذبات ادا کر رہا ہے اور اِن کے لکھنے کا مقصد صرف "اپنے بچپن کے زمانے کی یاد تازہ کرنا ہے"

پہلی نظر میں شاید کوئی اخلاقی اہمیت نظر نہ آئے مگر بالاستیعاب مُطالعہ کے بعد اِن کہانیوں میں بھی وُہی پُرانا مگر دلکش مضمون نظر آنے لگتا ہے جو ٹیگور کی تمام تصانیف میں پایا جاتا ہے ——— یعنی "رُوح کی آزادی!"

یہیں شاعر کی بزرگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ کوئی "فردِ واحد" نہیں، بلکہ تین حیثیتیں رکھتا ہے ——— وہ "شاعر" "فلسفی" اور "آرٹسٹ" تینوں کا مجموعہ ہے ——— "شاعر" بچّے کی طرف کشش محسوس کرتا ہے۔ "آرٹسٹ" اپنے رُوحانی تجربات اور محسوسات کے اظہار کے لئے بے چین رہتا ہے، اور "فلسفی" آزادیِ رُوح کی اہمیت جتانے پر مجبور ہے۔ یہی وہ

بُنیادی اُصول ہیں جن پر اِن خیالی نظموں کا ڈھانچا تیار کیا گیا ہے، گو شاعر ہمیشہ فلسفہ کا پابند نہیں رہتا۔

اُس کا "بچّہ" "دُنیائے عمل کے شور و شغب اور زندگی کی مشین سے نجات پانے کا متمنّی ہوتا ہے اور "آزادی" کا خواہاں!

"شہرت، میکانکی دُنیا انسان کو پست تر اور بہائم صفت بنا دیتی ہے" ("فلسفۂ ٹیگور" از ایس۔ رادھاکرشنان صفحہ ۲)

——— یہ ہے وہ عام مضمون جس سے ہم ٹیگور کی ہر تصنیف میں دوچار ہوتے ہیں۔

جس بچے سے ٹیگور ہمیں روشناس کراتا ہے وہ بچّہ "پریوں کے ملک کے سات سمندروں اور تیرہ دریاؤں کو عبور کرنا چاہتا ہے"
("ماہِ نو" صفحہ ۱۹)

یا پھر وہ ایک پھیری والا بن کر، یہ آواز لگاتے ہوئے، سڑکوں پر دن گذارنا چاہتا ہے ——— "چوڑیاں لے لو، کانچ کی چوڑیاں!"

یا پھر وہ ایک مالی بننا چاہتا ہے، جو باغ میں زمین کھودتا رہے اور اسے کوئی منع کرنے والا نہ ہو۔ یا پھر وہ ایک چوکیدار بننا پسند کرتا ہے جو راتوں کو اپنی لالٹین کی پرچھائیوں کا تعاقب کرتے ہوئے سڑکوں پر گشت لگایا کرے۔ ("پیشہ")

شاعر کے نزدیک ماں کی سماوی محبّت، آزادی، اور نیچر کی رعنائیوں اور دلکشیوں سے مسرّت اور شادمانی اخذ کرنے کا فطری رجحان اور جذبہ (جیسا کہ "برسات کے دن" میں پایا جاتا ہے) ——— زندگی میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے اسباب ہیں ———!

مکائدِ زندگی سے متفکر ہوئے بغیر، بچہ "آزادی کی راہ" پر نرم رفتاری اور سُبک پائی سے چلا جاتا ہے۔

"لامتناہی دُنیاؤں کے ساحل پر بچّے جمع ہوتے ہیں ناپیدا کنار آسمان سروں پر ساکت ہے اور بیقرار سمندر شور انگیز ——— لامتناہی دُنیاؤں کے ساحل پر بچّے شور مچاتے ہوئے آپس میں ملتے ہیں۔ . . . . . .

وہ نہ تیرنا جانتے ہیں نہ جال پھینکنا۔ موتی نکالنے والے غوّاص موتیوں کے واسطے غوطے لگاتے رہتے ہیں۔ سوداگر اپنے جہازوں میں تیرتے پھرتے ہیں۔ مگر بچے کنکریاں جمع کرتے ہیں اور پھر انہیں پھینک دیتے ہیں۔ وہ پوشیدہ خزانے تلاش نہیں کرتے۔ وہ جال پھینکنا

نہیں جانتے ....

سمندر قہقہوں کے ساتھ اُبھرا چلا آتا ہے اور ساحل کا زرد زرد تبسم چمکتا ہے "فضا در آغوش" موجیں، اُس ماں کی طرح جو اپنے بچے کا گہوارہ ہلاتی ہو، بچوں کو بے معنی منظوم کہانیاں گا گا کر سناتی ہیں، سمندر بچوں کے ساتھ کھیلتا ہے اور ساحل کا زرد زرد تبسم چمکتا ہے ....

لامتناہی دُنیاؤں کے ساحل پر بچے جمع ہوتے ہیں۔ "بے راہ" آسمان کی پہنائیوں میں طوفان چکر لگاتے رہتے ہیں۔ بحرِ ذخار میں جہاز تباہ ہوتے رہتے ہیں۔ موت، بلا کسی روک ٹوک کے، کھُلی پھرتی ہے۔ اور بچے کھیلتے رہتے ہیں۔

لامتناہی دُنیاؤں کے ساحل پر بچوں کا بڑا مجمع ہوتا ہے"

("ماہِ نو" صفحہ ۳-۴)

کیا آپ اِن لفظوں کو پڑھکر تھوڑی دیر کے لئے اپنا "موردِ آلام" زندگی کو بھول نہیں جاتے، اور کیا آپ کے دل میں یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ "موت، بھی 'زندگی کی موجوں' میں ڈوب کر مر گئی ہے، اور تمام نقصانات کی تلافی ہو گئی ہے؟" اور کیا یہ عظیم الشان "کارخانۂ قدرت آپ کو ایک "بازیچۂ اطفال" نظر نہیں آنے لگتا؟۔

✦ ✦ ✦

"ماض" دہلی

دُنیا کا مختصر ترین افسانہ:

یتیمی!

چاند دیکھکر لوگوں نے ایک دوسرے سے کہا "عید مُبارک"

اور مَیں رو پڑا!

آہ، ابا جان!!

غلام عباس (مولوی)

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
فی پرچہ ۸ آنے

جُرعات

ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ
نمونے کا پرچہ مفت بھیجا جاتا ہے

جلد ۱۷ | ساقی دہلی۔ بابت ماہ فروری ۱۹۳۸ء | نمبر ۲

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
(۱)	نگاہِ اوّلیں	شاہد	(۲)
(۲)	اکبر کا خواب	مولانا عنایت اللہ دہلوی۔ سابق ناظم دار الترجمہ حیدرآباد دکن	(۳)
(۳)	چار سو بیس	حضرت امینِ حزیں (سیالکوٹی)	(۸)
(۴)	شکوہ اور جوابِ شکوہ	جناب مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی	(۹)
(۵)	نوائے فراق	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے	(۱۲)
(۶)	لبِ لعلیں	جناب سید وزیر حسن دہلوی	(۱۳)
(۷)	چند اشعار	"دلفگار"	(۱۵)
(۸)	خمسہ	پروفیسر احسن مارہروی	(۱۶)
(۹)	دورِ حاضر اور اُردو غزلگوئی	ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی	(۱۷)
(۱۰)	پریم کی ہولی	جناب سید علی شاکر۔ ایم۔ اے۔	(۳۰)
(۱۱)	نکات	حضرت امینِ حزیں (سیالکوٹی)	(۳۲)
(۱۲)	سرکشی	جناب خواجہ احمد عباس	(۳۳)
(۱۳)	برسات	جناب محسن اعظم گڑھی	(۴۰)
(۱۴)	دارا کا قتل	جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔ اے ایل ایل۔ بی	(۴۱)
(۱۵)	شانِ تغزل	جناب گنگا دھر ناتھ فرحت کانپوری بی۔ اے، ایل ایل۔ بی	(۴۵)
(۱۶)	ممی خانے میں ایک رات	محترمہ حجاب امتیاز علی	(۴۶)

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
(۱۷)	تجلّیات	جناب کوکب شاہجہان پوری	(۴۹)
(۱۸)	معجزاتِ جرّاحی	پروفیسر محمد مسلم۔ ایم۔ اے	(۵۰)
(۱۹)	ہمارے اعتراض	صاحبزادہ مرزا اصلاح الدین خاں صاحب آف لوہارو	(۵۲)
(۲۰)	پلنگ	جناب صادق الخیری دہلوی ایم۔ اے	(۵۳)
(۲۱)	رخصت ہونیکے بعد	جناب منظور حسین ماہر القادری	(۵۵)
(۲۲)	وہاں	جناب علی احمد فرزند فصاحت جنگ حضرت جلیل	(۵۶)
(۲۳)	اشکِ احمریں	محترمہ مسز برلاسس (از جاپان)	(۵۷)
(۲۴)	ساقی	سحبان الہند حضرت کیفی چریاکوٹی	(۶۷)
(۲۵)	رسم و رواج کی تباہکاریاں	جناب مرزا سیف علیخاں صاحب	(۶۸)
(۲۶)	تاثرات	جناب الطاف مشہدی	(۷۳)
(۲۷)	اُسکی موت کی وجہ؟	جناب غلام عباس (مولوی)	(۷۴)
(۲۸)	تازہ پھول	جناب رسا ہمدانی۔ ایم۔ اے	(۷۸)
(۲۹)	پاک محبت	جناب عطاء اللہ پالوی	(۷۹)
(۳۰)	فطرت کی آواز	جناب اجمل نجیب آبادی	(۸۳)
(۳۱)	شاعر	جناب کاوش حیدرآبادی	(۸۴)
(۳۲)	غربت زدہ	جناب خواجہ حسن عباس۔ بی۔ اے	(۸۶)
(۳۳)	جبری بھرتی	جناب محبوب علی قریشی	(۸۸)
(۳۴)	اُردو کی نئی کتابیں	پروفیسر مرزا محمد سعید۔ ایم۔ اے آئی۔ ای۔ ایس، "ش"	(۹۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

دسمبر ۱۹۳۷ء کے آخیر اور جنوری ۱۹۳۸ء کے شروع میں اُردو رسائل کے اکثر سالنامے بڑی آب وتاب سے شائع ہوئے۔ عالمگیر اور ادب لطیف سب سے پہلے بازار میں آئے اور ان کے بعد ادبی دُنیا، ساقی، ہمایوں اور نیرنگ خیال نے اپنے اپنے سالنامے پیش کئے۔ اپنی اپنی روش کے مطابق ہر رسالے نے بہت اچھا ضخیم پرچہ شائع کیا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ اُردو صحافت کی ترقی و مقبولیت کی نشانی ہے۔ مضامین کے اعتبار سے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو کے خاص نمبر جس معیار کا کثیر لٹریچر پیش کرتے ہیں انگریزی کا کوئی رسالہ یا اخبار پیش نہیں کرتا۔ ہاں تصاویر کے لحاظ سے اُردو صحافت ابھی عرصۂ دراز تک انگریزی صحافت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر اُردو رسائل واخبارات بھی لاکھوں کی تعداد میں چھپنے لگیں تو یہ کمی بھی بہت آسانی سے پوری ہو سکتی ہے مگر یہ توقع عبث ہے کیونکہ ہمارا تو اوڑھنا بچھونا ہی انگریزی ہے اور انگریزی ہی سے ہمارا پیٹ پلتا ہے۔ اُردو تو بدنصیبی سے بدرجۂ مجبوری پڑھی جاتی ہے کہ بغیر اس کے بھی کام چلتا نظر نہیں آتا۔ اور اب تو خُدا کے فضل سے ایسے بُزرگ بھی پیدا ہو گئے ہیں جو اُردو کو اُردو کہتے ہوئے شرماتے ہیں اور اس کا نام ہندوستانی یا ہندُستانی تجویز کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب (جنہیں اُردو کا ڈکٹیٹر کہا جاتا ہے) کو چاہیئے کہ اب اپنی انجمن کا نام "انجمن ترقیٔ ہندُستانی" رکھدیں، کیونکہ بعض سچے اور پکے مسلمان لفظِ اُردو کی تاب نہیں لا سکتے۔ مگر اس قلبِ ماہیت سے پہلے ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ تجویز پیش کرنے والے مولوی صاحب کے نام سے پہلے مولوی کی بجائے آئندہ سے پنڈت لکھا جائے۔ بلکہ سرے سے اُن کا نام ہی بدل کر عربی کے بجائے ہندُستانی رکھا جائے۔ اِس ذہنیت کا بس یہی علاج ہے۔ اُردو تو ایک فطری زبان ہے اور وہ صدا پھُولتی پھلتی رہیگی اور چشمِ حاسد میں خار بنکر کھٹکتی رہے گی۔

مسٹر اختر حسین رائے پوری۔ بی۔ اے۔ (علیگ) جن کے بے مثل افسانے اور مضامین ناظرین ساقی اکثر ملاحظہ فرماتے رہے ہیں ہم سے کچھ عرصے کیلئے جُدا ہو گئے ہیں۔ مگر اُن کی یہ جُدائی ہمیں افسُردہ کرنے کے بجائے مسرور کرتی ہے کیونکہ جو کچھ وہ یورپ سے سیکھ کر آئیں گے ہندوستان میں اُس کا عشرِ عشیر بھی اُنہیں حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اختر صاحب سنسکرت کے "ساہتیا لنکار" ہیں اور آج کل پیرس یونیورسٹی میں سنسکرت کے ریسرچ اسکالر ہیں۔ ہم اُنکی کامیابی کیلئے دست بدعا ہیں اور ہمیں اُمید ہے کہ اپنے فرصت کے اوقات میں وہ ساقی کیلئے کچھ نہ کچھ لکھتے رہیں گے۔

چغتائی صاحب کی صحت خُدا کے فضل سے سنبھلتی جا رہی ہے مگر بہت سُست رفتاری سے۔ لکھنے پڑھنے کی اجازت اُنہیں ابھی نہیں ملی ہے۔ اور ایسی حالت میں کہ سکونِ خاطر میسّر نہ ہو کوئی لکھ بھی کیا سکتا ہے۔ چغتائی صاحب کے ارشاد کے مطابق ساقی کے ذریعہ اُن سب بھائی بہنوں کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنہوں نے ازراہِ ہمدردی اُنہیں خطوط لکھے۔ وہ جواب دینے کے قابل ابھی نہیں ہوئے

"شاہد"

اکبر کا خواب

انگلستان کے ایک مشہور شاعر نے شہنشاہِ ہند جلال الدین اکبر کے حالات اور خیالات سے متاثر ہو کر بہت عرصہ ہوا کہ ایک نظم لکھی تھی جس کا عنوان "اکبر کا خواب" تھا۔ وہ خواب نظم میں ہو جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

مقام۔ فتح پور سیکری کے محل میں اکبر بادشاہ اور ابوالفضل نظر آتے ہیں۔ رات کا وقت ہے۔

ابوالفضل اکبر بادشاہ سے دریافت کرتا ہے کہ:۔

"اے قوموں کے نور آج کس خیال نے آپکو پریشان کر رکھا ہے؟"

اکبر نے آسمان کی طرف نظر کر کے ستاروں کو دیکھا اور ابوالفضل کی طرف سر پھیر کر کہا۔ "میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ صحیح نہ ہو لیکن میں نے اپنا دل خدا کی طرف رجوع کیا اور اپنے خواب کے متعلق خدا سے دُعا مانگنے لگا۔ دُعا مانگنی اور اس کے مطابق عمل کرنا دونوں باتیں اللہ کی عبادت میں شامل ہیں۔ لیکن وہ دُعائیں جن کے مانگنے کے بعد اُن کے مطابق انسان کا عمل نہیں ہوتا تو اُن کی مثال اُن خوبصورت ماؤں کی سی ہوتی ہے جو مُردہ بچّے جنتے ہی مر جاتی ہیں۔ میں نے خدا کی جناب میں اقرار کیا کہ اپنی اس عظیم الوسعت سلطنت میں جسے شمشیر نے جو انسان کو صرف اِس لئے مغلوب کرتی ہے کہ امن وسلامتی پر قبضہ ہو فتح کر کے مجھے اس لئے بخشا ہے کہ میں صدق و انصاف سے ہمیشہ حکومت کروں۔ خواہ اِس میں چاہے کیسے سے کیسے بُرے خواب نظر آیا کریں مگر میں اللہ کو ہمیشہ اپنا ہادی اور رہنما سمجھتا رہوں گا۔

اے میرے شریف دوست اور خیر طلب مشیر میرے پہلو میں آکر بیٹھ۔ جب تک تُو اور میں یکجا ہوتے ہیں تو میں اُس تنہا شخص کی طرح نہیں ہوتا جو بادشاہ کے باغ میں جاتا ہے اور اِدھر اُدھر پھر کر ہر خوشنما پودے سے خوبصورت پھول توڑتا ہے تاکہ اُن سے ایک تاج بنائے جو صرف بادشاہی کرنے کیلئے نہ ہو بلکہ وقت مناسب پر اس جنگ و جدل کی سرزمین ہند میں ہر مسلمان۔ برہمن۔ بدھ۔ مسیحی اور آتش پرست کا زیبِ سر ہوسکے۔

تیرے بھائی فیضی نے اللہ کی تعریف میں کیا خوب کہا ہے۔ "اے اللہ تیری شان و بزرگی نے عقل کو حیرت میں ڈال رکھا ہے"۔ حکمت کی راہوں نے جو تیرے کمال کا راستہ بتاتی ہیں مخلوق کو ریگِ بیاباں کے ذرّوں کی طرح اندھا کر رکھا ہے۔ ہم تیری ابجدِ عشق کا الف تک نہیں پڑھ سکتے۔ اللہ اپنے تئیں جانتا ہے۔ انسان نہ اپنی اور نہ اللہ کی معرفت حاصل کر سکتا ہے کیونکہ ہر مذہب و ملت کا چھوٹے سے چھوٹا فرقہ یہی دعویٰ رکھتا ہے کہ صرف میں ہی اُس طریقت پر ہوں جو برحق ہے، باقی جس قدر ہیں سب تباہی کے مستوجب ہیں۔ کیا گلاب چنبیلی سے کہے گا کہ تو کوئی پھول نہیں۔ کیا شجرِ خرما سروِ بستاں سے دعویٰ کریگا کہ میں ہی صرف حُسن رکھتا ہوں۔ کیا آم کا پیڑ خربوزے کو ٹھوکر مار کر کہے گا کہ صرف میرا ہی وہ پھل ہے جس کو انسان کیلئے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ دیکھو اللہ کی زندہ نبض اس عالم

کے ہر جُزو میں کس طرح تڑپ رہی ہے۔ اگر آسمان کا ہر ایک ستارہ دعویٰ کرے کہ بس میں ہی فلک پر ایک انجم ہوں تو افلاک پر وہ موسیقی پیدا ہو جسے یونان کے فلسفی (فیثا غورث) نے کبھی خواب میں بھی نہ سُنا ہو۔ سب میں نور ہے اور نور تھوڑا یا بہت سائے کے ساتھ عبادت کے انسانی طریقوں میں ظاہر ہے مگر ہمارے علمائے دین جو اطلسی مسندوں پر بیٹھ کر ناریوں کے عذاب پر غور و فکر فرماتے ہیں وہ سب وحشی درندوں کی مانند ہیں جو کبھی قفس میں بند کئے گئے ہیں۔ جس قدر قفس تنگ ہے اُسی قدر اُن کا غصّہ اور پیچ و تاب زیادہ ہے۔ یہ لوگ نہایت گستاخ بن کر میرے مقابلے پر آتے ہیں۔ اِس میں تعجب کرنے کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ میں آخر وہی ہوں جس نے کہدیا ہے کہ کتّا تک پاک ہے۔ لحم خنزیر بھی ناپاک نہیں۔ اور شراب پی جا سکتی ہے۔ وہ یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ جب کبھی ہمارے قصرِ شاہی میں جہاں حکمت کی باتوں اور مذہب کے مسائل پر آزادی کے ساتھ بحث ہوتی ہے اُنھوں نے معمولی شرعی قیل و قال کی ہے تو میں نے اُن کی باتوں میں ایسی ہی موجوں کی آواز سُنی ہے جو تنگ جگہ سے گزرنے میں جوش کھاتی ہیں۔ لیکن یہ آواز وہ عظیم الشان آواز نہ تھی جو حقیقی بحرِ نا پیدا کنار کی موجوں کی ہوتی ہے۔ کسی قوم کو اُس کے قدیم مذہب کے احاطے سے نکال کر زبردستی اپنی ملت کی حدود میں محصور کرنا عقل اور شانِ بادشاہی کے خلاف ہے۔ یہ سچ ہے کہ میرے دورِ سلطنت کی نورانی صبح میں اِس شرمناک بادل کی سُرخی اُس وقت ظاہر ہوئی تھی جبکہ میں نے نیا مذہب جاری کرنا چاہا تھا۔

میں لوگوں کی جات اور مذہب کے جھگڑوں سے متنفر ہوں اور میں لوگوں کو اُن کی مرضی کے مطابق عبادت کرنے دیتا ہوں۔ اور مذہب کی بنا پر غیر مذہب والوں پر کوئی محصول نہیں لگاتا۔ میں ہر مذہب اور قوم سے بہادر اور شجاع آدمیوں کو دوستی اور مشورت کیلئے انتخاب کرتا ہوں۔ کافر کے لفظ سے مجھے نفرت ہے۔ قرآن و شمشیر کا نام جب سُنتا ہوں تو لرز جاتا ہوں۔ مسیحی اور صلیب کے الفاظ پر سہم جاتا ہوں لیکن نصرانیوں کی مقدس کتاب بتاتی ہے کہ خُدا عشق ہے اور جب گوا کے ایک پادری نے اپنے نبی ابنِ مریم کا قول نقل کیا کہ "اے بچّو ایک دوسرے کو پیار کرو اور اچھا چاہو اُن کا بھی جو تم پر ظلم کرتے ہیں" میں نے یہ جُملہ سُنکر خیال کیا کہ اِس قول میں ایک بادل کو ہٹا کر وہ نورانی شعاع ظاہر کی گئی ہے جو کسی مذہب کے کُرۂ نور سے بھی نہیں نکلتی۔

ابوالفضل تجھے یاد ہوگا کہ جب اِس پیشنگو پادری نے اپنے آقا اور اُستاد مسیح کو پاکی اور انصاف کا سورج کہا تھا تو اُس وقت ایک بوسیدہ مذہب کے در و دیوار غصّہ اور غضب سے کیسے ہلنے لگے تھے۔ اُس پادری نے مسیح کو پاکی اور انصاف کا سورج ہی نہیں کہا بلکہ یہ بھی بتایا کہ خُدا اس زمین پر آیا اور اُس نے اپنے ماننے والوں کو سچائی اور انصاف کی رسّی میں باندھا۔

یہ تو کیا کہنا ہے۔ کیا قدیم ایران میں اللہ کو عشق کا آفتاب اور عشق کو راستی کی کمند نہیں کہا گیا۔ کیا یہ آواز ایران قدیم سے نہیں بلند ہوئی تھی، نہیں مجھے علم ہے کہ یہ ایک بڈھے عرب شیخ کا قول تھا۔ اس شیخ پر عورتیں

چیختی اور چلاتی تھیں کہ وہ ملحد و کافر ہے۔ کوٹھوں پر چڑھ کر اُس پر غلاظت پھینکتی تھیں مگر یہ شیخ وہ تھا جو رازِ الٰہی کے نغمے سُناتا تھا اور جس نے خُدا کے عشق میں اپنی خودی کو محو کر دیا تھا۔

اللہ آفتاب ہے جو دُنیا میں اُس وقت تک دھندلا نظر آتا ہے جب تک زمین پر صبحِ فانی کی عبادتیں آفتاب بر نصف النہار کی چمک میں محو نہ ہو جائیں۔ یہ وقت وہ ہوگا جبکہ ایک مذہب دوسرے مذہب کے خلاف غلط شہادت نہ دیگا بلکہ نور کی کثرت میں اپنی حدود کو پہچانے گا اور وہاں سے گذر کر سچائی کی محبت اور محبت کی سچائی میں ازل تک ہمیشہ آسانی سے رہ نوردرہے گا۔

آفتاب! آفتاب! لوگ مجھ زرتشتی پر ملامت کرتے ہیں لیکن سُورج ہماری زمین کو گرما کر اناج اور پھل دیتا ہے۔ دُھوپ کھلا کر ہماری کھیتیوں پر تبسّم کرتا ہے۔ اِس میں کھیتی چاہے تیری ہو چاہے میری۔ شیعہ اور سُنّی دونوں کے خون کو حرارت بخشتا ہے اِس لئے آفتاب کو ابدی اور ازلی نشان مانو۔ جو بادشاہ اپنی کُل رعایا سے ایک ہی سی محبت اور ان سب کے لئے ایک ہی سا قانون رکھتے ہیں وہ اِس بنا پر کیسے آفتاب کی عظمت اور بُزرگی نہ کریں۔ ایسے بادشاہ اور سلاطین اپنے افعالِ نیک سے انسان کے حق میں نور ہوتے ہیں۔ لیکن ہماری حضور سے ایک شخص کے چہرے پر یہ نور پورا چمکنے نہ پایا تھا کہ کل صبح وہ ہمارے پاس آیا اُس کی دونوں آنکھوں میں غصّہ اور قہر سے نارِ جہنّم مشتعل تھی۔ آتے ہی چلایا کہ کیا تو آسمان سے نیا قرآن ہمارے لئے لایا ہے۔ کیا تو پیغمبر بنتا ہے۔ کیا تو معجزے دکھا سکتا ہے۔ اُس کا وحشیانہ غصّہ چاہتا تھا کہ مجھکو اُٹھا کر کہیں پھینکدے۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہوا۔ معجزہ ـــــ کیسا معجزہ۔ معجزہ نہ میں دکھا سکتا ہوں نہ کوئی اور۔ میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ حیاتِ انسانی کے تاریک حُجرہ میں عقل کی مشعل دکھا دوں اور خود متحیّر ہو کر اِس کائناتِ عالم کے مُعجزے کو دیکھوں اور اُس کی عظمت کے خیال میں محو ہو جاؤں جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے اور جو سب کچھ بناتا ہے۔ جو ہے ـــــ مگر وہ نہیں ہے جس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ باقی بظاہری صورتیں ہیں اور حقیر رسمیں جو مختلف قوموں کے ساتھ اپنا رنگ جُدا جُدا دکھاتی ہیں۔ لیکن اے دوست تجھے علم ہے کہ میرے نزدیک یہ ظاہری صورتیں بھی ضروری ہیں۔ وہ انسان جو احتیاط اور مہربانی کے ساتھ خلقِ خُدا پر حکومت کرتا ہے اُس کے لئے اتنا لازم ہوتا ہے کہ ان ظاہری صورتوں کو ایسے سانچے میں ڈھالے کہ سب کے لئے وہ موزوں و مناسب ہو جائیں۔

یہ ظاہری صورتیں اس سے زیادہ نہیں ہیں کہ اُنہیں خوبصورت پوشاکیں سمجھا جائے۔ کہیں سادی کہیں قیمتی چُست یا ڈھیلی جو ہوا میں اُڑتی نظر آتی ہیں۔ ان میں جو حرارت ہے وہ دل کی حرارت ہے اور اُن میں جو حرکت ہے وہ ہاتھ پاؤں کی حرکت ہے اور یہ پوشاکیں ایسی ہیں کہ جب پُرانی ہو جائیں تو اُن کی جگہ نئی بدلی جاتی ہیں۔ یہ صورتیں فطرت کے بازار میں روحانی کہلائی جاتی ہیں۔ یہ انسان میں خُدا کے موجود ہونے کی خاموش بجد ہیں جو بول بھی اُٹھتی ہیں۔ یہ علم ہیں جو اُس وقت کا نشان دیتی ہیں جو نظر نہیں آتی لیکن دُور ہی سے سب پر حاکم اور قادر ہے۔

یہ صورتیں وہ ریشم کی ڈوریاں ہیں جو بہشت سے لٹکائی گئی ہیں تاکہ اُس وقت جبکہ فلسفہ اور حکمت کے طریقے کام نہ دیں وہ خدا کی مخلوق کو غلاظت میں لوٹنے سے بچا دیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب رعایا اپنے آقا کو دیکھے جس نے اُن کے لئے ان صورتوں کو پیدا کیا ہے تو اُن کی پابند ہو اور آقا کی مطیع رہے تاکہ اس بار بھی ایک حد تک زندگی اُسی طرح بسر ہو جو پُل اُترنے کے بعد زندگی ہونے والی ہے اور خود اپنے میں اور اپنے سے باہر اُس ذاتِ لاانتہا ہی کی خدمت ہو سکے جو سب کچھ ہے اور سب سے برتر ہے۔ جو نہ بدلنے والی ذاتِ واحد اور نہ ہمیشہ تغیّر میں رہنے والی کثرت ہے۔ جس کی حمد میں کلیسا کا گھنٹہ۔ مسجد سے اذان۔ صنم پرستوں سے رازِ الٰہی کی ٹوٹی ٹوٹی آوازیں بلند ہو کر ایک ہی دُھن میں خُدا کی عبادت کا راگ گاتی ہیں۔ مغرب کی طرف اس آہستہ غروب ہونیوالے نورانی کُرہ کے نیچے مسیحی ایک روحانی سردار رکھتے ہیں اور اے ابوالفضل میں بھی تیرے مشورہ اور مدد سے اسلام کا ویسا ہی سردار ہوں کیونکہ شانِ سلطانی کا سراب اُس وقت تک پورا نظر نہیں آسکتا جب تک اتنی قوت نہ ہو کہ اپنی بے شمار رعایا کو متحد کر کے تنِ واحد بنا دے۔ ظلم اور سفّاکی کے خونخوار شیر کو شکار کروں اور ملّتِ الٰہی کو مذاہب مختلفہ کی طوفانی سطح پر اس طرح سکون پیدا کروں جیسے موجوں پر تیل ڈالنے سے طوفان میں سکون پیدا ہو جاتا ہے۔ طوفان نے جو موجیں اُٹھا کر اُن میں غار ڈال دیئے ہیں اُن کو پُر کروں۔ اپنے بچّوں کو صدق و صفا کے دودھ پر پرورش کروں۔ پُرانی عداوتوں کو کیمیا کے زور سے عشق و اُلفت کا کندن بنا کر سکّہ رائج کروں اور اُن مذہب پیشہ لوگوں کے قاتل زہر کو جو افعی کی طرح پھن اُٹھاتے ہیں کُچل کر نیست و نابود کر دوں۔ ایک اللہ ہو اور اُس کا ایک خلیفہ۔ لیکن بعض اوقات شُبہ کو دخل ہوتا ہے اور خوف دامن گیر ہوتا ہے اور کل دوپہر کو تو خواب ہی دیکھ چُکا ہوں۔ تجھے معلوم ہوگا کہ میرا دل اپنے فرزند سلیم کی محبت میں کیسا چاہِ عمیق ہے اور وہی میرا وارث ہے۔ لیکن یہ میرا خواب کیسا وحشت ناک ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ سلیم تیری طرف بُری نظروں سے دیکھتا ہے گویا تو وہ ہے جس نے مجھ کو صلاح اور مشورہ دینے میں شرک اور لا مذہبی کی شراب پلا دی ہے۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک ایک پتھر چُن کر میں نے ایک مقدّس معبد تعمیر کیا ہے جو نہ بُت خانہ ہے نہ مسجد ہے نہ کلیسا۔ یہ عمارت بلند اور سادہ تھی۔ اُس کے دروازے اور دریچے نسیمِ بہشت کے لئے ہر وقت کھُلے رہتے تھے۔ راستی۔ امن۔ محبت۔ انصاف اس گھر میں آکر بس گئے تھے۔ تم اور میں اِس قصرِ عالیشان کو کھڑے دیکھتے اور خوش ہوتے تھے کہ دفعتاً ہنسنے کی آواز آئی جو زہرخند سے کم نہ تھی اور یہ الفاظ سُنائی دئے "نیا قرآن" اس کے بعد دفعتاً سلیم کا نام سُنا اور فوراً دیکھا کہ تُو میرے سامنے مر کر گرا ہے۔ سیاہ پروں والے عزرائیل نے مجھ کو بھی مغلوب کیا لیکن چونکہ موت کے بعد بھی سماعت و بصارت قائم ہے میں نے اپنے فرزند اور اُن کو جو اُس کے پیرو تھے دیکھا کہ میری تعمیر کے ایک ایک پتھر کو علیحدہ کر کے اُسے کھنڈر کر دیا ہے اور اس کھنڈر سے لاکھوں مظلوموں کی چیخوں اور کوسنوں کی آوازیں اسی طرح بلند ہوئی ہیں جیسا کہ پہلے کبھی حال تھا۔ میں اس

حالت کو دیکھ کر آہ و فغاں کرتا تھا کہ مغرب کی سمت سے ایک اجنبی قوم آئی اور اُس نے میرے شکستہ قصر کے ایک ایک پتھر کو جمع کیا۔ راستی۔ امن۔ محبت۔ اور انصاف پھر اس گھر میں آکر آباد ہو گئے۔
میدانوں میں ستی کی آگ پھر کسی نے نہ دیکھی اور نہ کبھی کم سن بیوی اور بیوہ کی پُر درد آہیں سُنیں۔ سب تعریف اللہ کی ہے جس کے ہاتھ سے اُس نے چاہا میری مُراد پوری کی۔ لو اب نوبت کی آواز آنے لگی ہے۔ محل میں سب بیدار ہو گئے ہیں اور صبح نے رات کی سیاہ پلکوں کو روزِ بیدار کے گلابی رُخساروں سے اُٹھا دیا ہے۔
آؤ اُس چشمۂ نور یعنی آفتاب کی تعریف میں نغمہ سرا ہوں اور ہم بھی وہیں چلیں جہاں یہ نغمہ سرائی ہو رہی ہے۔

سُورج کی تعریف

پھر تُو آسمان پر چمکتا ہوا آیا۔ پھر میں نے تجھے درخشاں و تاباں دیکھا۔ ہر صبح تیری پیدائش کا دن ہے انسان کی نظر اور دل کو تُو خوش کر رہا ہے۔ ہر صبح ہم تجھے یہاں آکر سلام کرتے ہیں اور تیری تعظیم و تکریم میں جُھکتے ہیں۔ تُو خُدا کی مثل ہے۔ تُو نہ ہارنے والے افلاک پر ہے۔ تُو سائے کا پیدا کرنے والا اور تُو ہی سائے کا مِٹانے والا ہے۔ مُلکوں مُلکوں اپنی روشن شعاعوں کو تیروں کی طرح برساتا ہے۔ یہاں تیرے دربار کے لاکھوں شاعر تجھے بادشاہ کہکر تیرے استقبال کو حاضر ہیں۔ چمن اور صحرا کے راگوں میں تیری تعریفیں گانے بیٹھے ہیں۔ طیور گاتے ہیں۔ کلیاں کِھل کر پھول بنتی ہیں۔ انسان اس گنبدِ نیلگوں کے سائے میں تیری تعظیم کے لئے جُھکتے ہیں۔ یعنی اُس کی عبادت میں جو ابدی اور ازلی ہے اور جو اس شعلۂ نور میں موجود ہے جس سے وقت کا اندازہ کرتے ہیں۔

عنایت اللہ دہلوی

چار سو بیس[۱]

فریبِ و مکر و فن کا ہے زمانہ ۔۔۔ کہاں یارب مزاجِ عاشقانہ؟
زباں پر اور ہی کچھ ہے۔ دل میں کچھ اور ۔۔۔ پسندِ ہر کس و ناکس ہیں یہ طور
مٹا ہے دہر سے اخلاص کا نام ۔۔۔ مودّت کے بھی اب چُکنے لگے دام
تمدن کی نہ مجھ سے پُوچھئے بات ۔۔۔ فسادات و فسادات و فسادات!!
سیاست تو ازل سے تھی ہی بدنام ۔۔۔ کہ یاں بے مکر و فن چلتا نہیں کام
مگر یہ علم یہ صنعت یہ حرفت ۔۔۔ جنہیں سمجھا گیا تھا عینِ رحمت
پریشانی کا باعث ہو رہے ہیں ۔۔۔ انہیں ہم اور ہمیں یہ رو رہے ہیں
جب استادوں کی مظلم[۳] زندگی ہو ۔۔۔ تو شاگردوں میں کیا تابندگی ہو!!
فریب اُن کو سکھایا جا رہا ہے ۔۔۔ ہمیں گویا بنایا جا رہا ہے
ادب پڑھتے ہیں لیکن بے ادب ہیں ۔۔۔ حیا کے شرم کے قائل ہی کب ہیں؟
زر اندوزی سکھائی جا رہی ہے! ۔۔۔ یہ چاٹ اچھی لگائی جا رہی ہے!!
جسے دیکھو وہی ہے بندۂ زر ۔۔۔ مسلماں ہو کہ ترسا ہو کہ کافر
خدا بھولا ہوا ہے زر کی خاطر ۔۔۔ بُرائی تک روا ہے زر کی خاطر
نمائش پر مٹی جاتی ہے دُنیا! ۔۔۔ ستائش پر مٹی جاتی ہے دُنیا!
نہ شاعر میں سرورِ زندگی ہے ۔۔۔ نہ مُلّا کو شعورِ زندگی ہے
ہوس رانی وہاں یاں لن ترانی ۔۔۔ اور ان پر ہے مدارِ کامرانی!!
کوئی شعبہ نہیں ہے زندگی کا ۔۔۔ جہاں چرچا نہ ہو بافند[۴]گی کا
بکے جاؤ اسی بکنے میں ہے جیت ۔۔۔ یہی گویا ہے اس تہذیب کی ریت
اصولِ زندگی جب بن گیا جھوٹ ۔۔۔ نتیجہ اس کا دو نو لُوٹ اور پھوٹ

غرض دیکھو جسے ہے ابنِ ابلیس
کہ دُنیا ہو گئی ہے چار سو بیس

امین حزیں سیالکوٹی

---

۱ تعزیراتِ ہند کی دفعہ۔ ۲ دغا۔ ۳ سیاہ۔ تاریک۔ ۴ دروغ بافی۔

شکوہ اور جوابِ شکوہ

یہ فرحت ہے۔ یقین مانیئے کہ یہ کچھ انسانی دماغ کی خرابی ہے کہ جہاں کسی شخص کی جا و بیجا تعریف کی گئی۔ اور اس کے دماغ کا توازن بگڑا۔ اوروں کو چھوڑیئے۔ خود مجھے ہی دیکھ لیجئے۔ دوستوں نے یہاں تک تعریفیں کیں۔ یہاں تک تعریفیں کہ میں بیٹھے بٹھائے شاعر بن گیا۔ شاعر کے بس دو ہی ٹھکانے ہیں۔ بلند پروازی کی تو آسمان پر پہونچ گیا اور وہاں سے گرا تو تحت الثریٰ کی خبر لایا۔ میرے خیال نے شروع میں مجھے بھی آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ طبیعت زوروں پر تھی۔ ارادہ ہوا کہ علامہ اقبال کی طرح میں بھی اُس عرش نشین ہستی سے شکوہ کروں اور جواب کا طالب ہوں۔ مگر ہمت نے جواب دیدیا۔ اور سمجھایا اگر شکوہ کا جواب نہ ملا۔ یا کوئی سخت جواب مل گیا تو سب میں کرکری ہو جائے گی۔ اس لئے پھر اس پامال دُنیا کی طرف رُخ کیا۔ ایک ویران نُما آباد شہر میں گذر ہوا۔ لوگوں سے پوچھا کہ بھئی یہ کونسی بستی ہے۔ جواب ملا یہ دلّی ہے۔ سامنے ہی ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ دل نے کہا کہ چلو اندر چلکر یہاں کا بھی رنگ دیکھ لیں۔ غرض میرا خیال مجھکو اندر لے ہی گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مکان ایسا کچھ بُرا نہیں ہے۔ سامنے دالان در دالان ہے۔ اندر کے دالان میں ایک پلنگ بچھا ہے۔ اور اس پر ایک بی بی دولائی تانے لمبی لمبی لیٹی ہیں۔ اور کروٹوں پر کروٹیں بدل رہی ہیں۔ ساڑھے چار بجے شام کو اس طرح لیٹنا دو باتوں سے خالی نہ تھا۔ یا تو وہ بیمار تھیں۔ یا اپنے میاں سے لڑنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ دوسری طرف نظر دوڑائی تو دیکھا کہ ان دالانوں کے پہلو میں ایک اکہرا دالان ہے۔ اُس میں تخت پر ایک بڑی بی بیٹھی کھٹا کھٹ چھالیا کتر رہی ہیں۔ اور تخت کے برابر ایک ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر ان کے میاں بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے ہیں۔ یا یوں کہو کہ سڑسٹے اڑا رہے ہیں۔ میں اس مکان کے دیکھنے میں مشغول تھا کہ اتنے میں بیوی کے میاں آ گئے۔ عجیب پریشان شکل تھی۔ سر جھاڑ۔ مُنہ پھاڑ۔ جُوتوں۔ کپڑوں اور مُنہ پر خاک کی تہ۔ بغل میں مِسلوں کا بستہ۔ اُن کے لمبے لمبے سانس لینا بتا رہا تھا کہ پیدل آ رہے ہیں اور یقیناً بھُوکے ہیں۔ میں نے کہا۔ "لو بھئی اچھے وقت آئے۔ اب انشاءاللہ تمہارا "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" ضرور پورا ہو جائے گا۔ میاں نے آتے ہی کہا۔ "بیگم۔ اجی بیگم" مگر پلنگ پر سے صدائے برنخاست۔ اُنہوں نے بستہ تو ایک طرف پھینکا۔ وہیں دہلیز میں بیٹھکر جوتے کے بند کھولے جُوتا اُتارا۔ جرابیں اُتار ایک طرف پھینکیں اور ذرا زور سے وہی صدا لگائی کہ "بیگم بیگم"۔ بیگم صاحبہ نے اسی طرح پڑے پڑے جواب دیا "کیوں کیا ہے" میاں نے کہا "ہے کیا۔ بھوک سے دم نکل رہا ہے۔ صبح کو بھی کچھ یو نہی سا ناشتہ کر کے گیا تھا۔ کھانے کو کچھ ہے"۔ بیوی نے جواب دیا کہ "اللہ کے فضل سے بس برکت ہی برکت ہے" میاں نے کہا "اور کچھ نہیں تو للہ چاء ہی بنا دو"۔ بیوی نے مُنہ پر سے ذرا دولائی سرکا کر کہا "کہاں سے بناؤں۔ چاء کا ڈبّہ تو کل ہی ختم ہو گیا تھا۔ کلّو حلوائی سے دودھ منگوایا تھا۔ اُس نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ کہتا ہے کہ پہلے اگلا حساب چکتا کر دو۔ اب رہی شکر۔ تو اس میں آپ کے ابّا جان کی چلم اُلٹ گئی۔ ہاں چولھے پر پانی چڑھا ہوا ہے۔ جا کر پی لو"۔ میاں نے کہا "اور میں جو آج روپیہ دے کر گیا تھا وہ کیا ہوا"۔ بیوی نے کہا "ہوا کیا۔ خرچ ہو گیا۔ دو آنے کی چھالیہ تو اماں جان نے منگا لی۔ تین آنے تمباکو کو ابّا جان لے گئے

باقی پیسے دوسرے کاموں میں اُٹھ گئے۔" میاں نے کہا۔"آخر میں بھی تو سُنوں کہ یہ اکھٹے گیارہ آنے کس کام میں اُٹھے۔" بیوی بولیں "آج یوسف آیا تھا۔ اُسکو ڈورگڈی منگوادی۔" میاں نے بگڑ کر کہا۔"یوسف کون۔ آپ کے بھائی صاحب"۔ بیوی نے تڑخ کر جواب دیا"جی ہاں۔ میرا بھائی اور آپ کا سالا۔" میاں کو تاؤ آگیا۔ کہنے لگے۔"بیوی صاحبہ اب حد ہوگئی۔ تم یوں ماننے والی آسامی نہیں ہو۔ خیر۔ ٹھیر جاؤ تمہاری سلیقہ مندی کا قصیدہ لکھکر ساری دلّی میں پھیلائے دیتا ہوں۔ تاکہ لوگوں کو معلوم تو ہو کہ میری بیوی کیسی زوردار بیوی ہے۔ آج دفتر میں فرصت تھی۔ قصیدہ لکھ تو لیا ہے۔ ذرا نظر ثانی باقی ہے۔ کہو۔ سُنو گی۔" بیوی یہ سُن دولائی پھینک پلنگ پر پاؤں لٹکا ہو بیٹھیں۔ اور کہنے لگیں"ہاں سُنوں گی۔ اور ضرور سُنوں گی۔ مگر یہ بھی یاد رکھیئے کہ اگر میں نے کوئی قصیدی آپ کی شان میں لکھدی تو انشاءاللہ آپ کو شہر چھوڑ دینا پڑے گا۔"

میاں نے کہا۔"یہ تو آج ہی معلوم ہوا کہ آپ بھی شاعر ہیں۔" بیوی نے کہا۔"عورت شعر نہ کہے گی تو کیا مرد شعر کہیں گے۔ اجی عورت تو شعر مجسم ہے۔ ہمارے مُنہ سے جو بات نکلتی ہے شعر ہوتی ہے۔ اور ہاں وہ اپنا قصیدہ تو سُنایئے۔ مگر جواب سُننے کے لئے تیار رہیئے۔" میاں نے کہا۔"تو پھر ہوگئی۔" بیوی نے کہا"جی ہاں ہوگئی۔ بسم اللہ کیجئے۔" میاں نے کہا "بہت خوب سُنیئے اور جلیئے۔ اس نظم کا نام ہے"شکوہ" عرض کیا ہے۔

شکوہ

میری پیاری بیوی میری جان بیوی
میری زوردار اور پہلوان بیوی
میں کتنا سنبھالوں نہیں دل سنبھلتا
تجھے دیکھکر دم ہی میرا نکلتا
نہ کھانا پکانا نہ سینا پرونا
ہمیشہ پڑے رہنا دن رات سونا
بڑے چاؤ سے بیاہ کر تجھکو لایا
مگر خوب ہی ناچ تُو نے نچایا
بی اماں سے دن رات کی دشمنی ہے
اور ابّا سے ہر دم لڑائی ٹھنی ہے
عجب حال تیرا ہے اے گھر کی مالک
ابھی ہے تو مجذوب ابھی ہے تو سالک
نہ دیکھی خوشی تیری باعث کسی نے
محرّم ہے اس گھر میں بارہ مہینے
تجھے بغض ہے میرے سب دوستوں سے
خدا ہی بچائے انہیں کوسنوں سے
سنبھالا نہ جاؤں تو آخر کروں کیا
یونہی کام ہی کرتے کرتے مروں کیا
ہے پہلے ہی سر مجھپہ قرضہ کی آفت
مچادی ہے پھر اُسپہ تُو نے قیامت
میں چوری کروں یا کہیں ڈاکہ ڈالوں
سنبھالوں تو اس گھر کو کیونکر سنبھالوں

قسم ہی نہیں کچھ غلو اسمیں حاشا
خدا کی ہے قدرت کا تُو اک تماشا
اُڑے تیری باتوں سے اوسان میرے
پھٹے جاتے چیخوں سے ہیں کان میرے
ذرا کچھ کہا اور پھر فیل لانا
قیامت بپا کرنا آنسو بہانا
بنی کو بگاڑا جہاں پایا تُو نے
غرض کر دیا گھر کا گھوڑا تُو نے
نہ سُسر کی عزت نہ کچھ ساس کی ہے
غرض میرا بھی ستیاناس کی ہے
کبھی چُپکے رہنا کبھی شور کرنا
کبھی مُسکرانا کبھی آہ بھرنا
ہیں مامائیں نالاں تو نوکر پریشاں
بپا رہتا ہے ہر طرف ایک طوفاں
اگر چھوکرا پان لانیکو جائے
تو اندر سے وہ جوتیاں کھاکے آئے
کہاں تک بھلا ہوگا آخر نبھاؤ
کہاں تک چلے گی تیری لاؤ۔لاؤ
دیوالہ کسی دن ہے میرا نکلتا
مہینہ کا جب خرچ نو دن ہے چلتا
کبھی کا میں ہوجاتا دنیا سے رخصت
مگر ہر دفعہ روک دیتے ہیں فرحت

وہ کہتے ہیں بھائی یہ ہے رنگِ دُنیا — تمہارے ہی گھر کا نہیں کچھ یہ نقشہ
ذرا صبر کو کام میں کچھ تو لاؤ — نہ بیوی کو ہر وقت یوں کھائے جاؤ

پیمبر کی سُنّت ہے سب کے گلے ہیں — اترتی نہیں یہ بھلے اور بُرے میں
یہ مانا کہ پھوہڑ ہے بیکار ہے وہ — مگر کچھ نہ کچھ پھر بھی حقدار ہے وہ

غرض ہر طرف سے ہے مجھ پر ہی آفت
کہ تُو ہے اِدھر اور اُدھر بھائی فرحت

شکوہ سُننے کے بعد بیوی کیا چُپ رہنے والی تھیں۔ کہنے لگیں "ماشا اللہ۔ کیا زبان ہے۔ آپ کی تُو تکار نثر میں تو تھی ہی نظم میں بھی کم نہیں ہوئی۔ کیوں نہ ہو شریفوں کی زبان ہے۔ اور یہ نظم آپ نے کتنے قافیوں میں کہی ہے۔ اجی اس سے اچھی نظم تو میں یہیں بیٹھے بیٹھے کہہ دوں۔ اچھا سُنیئے۔ میری نظم کا نام ہے "جوابِ شکوہ"۔ عرض کرتی ہوں۔

جوابِ شکوہ

مرے اچھے شوہر مرے پیارے شوہر — مرے دھان پان اور بیچارے شوہر
سب اچھے تمہیں یوں تو چھوٹے بڑے ہیں — مگر مجھ نگوڑی میں کیڑے پڑے ہیں
نہ کیوں دل جلے کچھ نہیں تم سی ہیٹی — بڑے باپ کی میں بھی آخر ہوں بیٹی
بُری میں سہی اور بُرا میرا کُنبہ — تو پھر پیر پڑ کر کیا کیوں یہ رشتہ

بہت صبر کی۔ اب نہیں دلمیں طاقت — کہاں تک اُٹھائے کوئی یہ مصیبت
گھسے گھر میں اور ایک طوفان آیا — نہیں دیکھتے پھر تم اپنا پرایا
اِدھر تم جلاؤ اُدھر ساس کو دیں — اجی میں تو کیا اچھے اچھے بھی رو دیں
میاں سو روپلی ہیں تنخواہ پاتے — ....

میاں۔ بہت تیزی کی تھی۔ وہ مارا پاپڑ والے کو۔ آخر کھانسنے لگیں نا۔ بیگم صاحبہ شعر کہنا آسان نہیں ہے۔ آدمی خون تھوکنے لگتا ہے۔" بیوی بولیں "خون تھوکیں میرے دشمن۔ خدانخواستہ مجھے کھانسی تھوڑی آئی تھی۔ میں تو قافیہ ڈھونڈنے کے لئے کھانسی تھی فی البدیہہ شعر کہہ رہی ہوں۔ تمہاری طرح دفتر سے لکھکر نہیں لائی۔ اے۔ لو قافیہ مل گیا۔ سُنیئے۔"

میاں سو روپلی ہیں تنخواہ پاتے — اور اس سو روپلی میں ہیں اینٹھے جاتے
کبھی ہے سینما کبھی ناچ گانا — مرے پاس گویا گڑا ہے خزانہ
ہو جب ایسے تم۔ ساس کو کیا کہوں میں — یہی جی میں ہے کھا کے کچھ سو رہوں میں
میں لاوارثی اور بے گھر نہیں ہوں — ہیں ماں باپ پر ایسی دوبھر نہیں ہوں
یہاں تو ہمیشہ تہڑی ہی تہڑی ہے — کسی دن بھی اس گھر میں ہانڈی چڑھی ہے
مری انّا یاں آ گئی تھی بیچاری — اسی دانتا کلکل سے وہ بھی سدھاری
وہی میں نے پہنا جو میکے سے لائی — رہا اب کفن وہ بھی لادینگے بھائی

اسی میں ہیں پھر دعوتیں اور چندے — غرض لاؤ لاؤ کا ہے تم کو دھندہ
ہیں ارمان جو دلمیں سارے نکالو — مجھے جا کے گدڑی پہ تم بیچ ڈالو
مری بات جب ساس سسرے نہ مانیں — تو گھر آپ کا جانے اور آپ جانیں
یہ کہتے ہو تم سچ کہ میں ہی ہوں کھوٹی — تو پھر تھوپتا کون ہے روز روٹی
بی اماں تو ماما کی خود جان کھائیں — اور الزام سارا مرے سر لگائیں
یہ مانا نہیں میں نے اب تک سیا کچھ — کبھی تم نے کپڑا بھی لا کر دیا کچھ
نہیں کوئی۔ اور غل یہ ہے کوئی آؤ — ذرا پان اندر سے بنوا کے لاؤ

ادھر جھوکرا آ کے ہے شور کرنا　　ادھر باندان دم ہی ہُو حق کا بھرنا
پھرا دیتی گھر بھر کو میں چھائیں مائیں　　مگر بی حمیدہ سدا آڑے آئیں
وہ کہتی ہیں دیکھو بہن یہ نہ کرنا　　تمہیں تو اسی گھر میں جینا ہے مرنا
نہ حکم پیمبر کبھی بھول جانا　　خدا کو ہے اک دن تمہیں مُنہ دکھانا
ہو اصبر کر صبر کا پھل ملے گا　　زمانہ کبھی تو جگہ سے ہلے گا
میں کس کشمکش میں ہوں آفت رسیدہ　　ادھر آپ ہیں اور اُدھر بی حمیدہ

"جوابِ شکوہ" میاں کے "شکوہ" سے زیادہ زور دار تھا۔ اس لئے میاں شرمندہ ہنسی ہنسے اور کہا۔ "بیوی قسم اللہ کی جی خوش ہوگیا۔ ۱۹ دسمبر کو مشاعرہ ہو رہا ہے۔ مجھے تو فرصت نہیں۔ تم مجھے ایک چٹا چٹی سی غزل لکھدو۔" یہ سُننا تھا کہ بیوی کی باچھیں کھل گئیں۔ اور میاں سمجھ گئے کہ بیوی تعریف کی چوٹ کھا گئیں۔ کہنے لگے۔ "بیگم۔ اس وقت چاء پلا دو تو مزا آجائے۔" بیوی نے کہا۔ "ٹھیرو۔ میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔"

میں غور کرتا ہوں کہ یا الٰہی یہ کچھ عجیب معاملہ ہے۔ ابھی تو ان دونوں میں جھک جھک ہو رہی تھی۔ اور ابھی یہ میل ملاپ ہوگیا۔ دل نے کہا "حضرت۔ میاں بیوی میں اگر یہ نوک جھوک نہ ہو تو زندگی اجیرن ہو جائے اور مٹھاس کھاتے کھاتے مُنہ پھر جائے۔ ان شکوہ شکایتوں کا لطف جتنا اٹھانا ہے یہاں اُٹھا لو۔ معلوم نہیں کہ جنّت نصیب ہونے کے بعد یہ بات میسّر آئے یا نہ آئے۔"

(بہ اجازت ڈائرکٹر صاحب دلّی ریڈیو اسٹیشن)——مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی۔

تاثرات

یوں تو نہ چارہ کار تھا جان دیئے بغیر بھی
عہدہ برا نہ ہو سکا عشق جئے بغیر بھی

رنگ اُڑا ہی عشق کا ہوش اُڑ رہے ہیں عشق کے
درد اُٹھے بغیر بھی ضبط کئے بغیر بھی

دیکھ یہ شامِ ہجر ہے دیکھ یہ ہے سکونِ یاس
کاٹتے ہیں شبِ فراق صبح کئے بغیر بھی

گو کہ زباں نہیں رُکی پھر بھی نہ کچھ کہا گیا
دیکھ سکوتِ عشق آج ہونٹ سئے بغیر بھی

تیرے نثار ساقیا بادہ کشو نمیں رات دن
عالمِ نشہ و خمار دیکھ پئے بغیر بھی

عشق کی زندگی کو کیوں موت سے بڑھ کے کر دیا
اُف یہ سزا۔ خطا معاف جان دیئے بغیر بھی

دیکھ نگاہ پھیر کے دل میں نہ رکھ کدورتیں
کر گئی کام یہ ادا جان لئے بغیر بھی

غم کی بہارِ گلستاں دیدۂ خونچکاں نہیں
زخمِ نہاں بکس چلے خون دیئے بغیر بھی

یوں تو ہزار کوششیں لازمۂ حیات تھیں
کام نہ چل سکا فراق کچھ نہ کئے بغیر بھی

فراق گورکھپوری

لبِ لعلیں

سہیل مالن کا بیٹا تھا۔ شاہی باغ میں رہتا۔ گل و بلبل کے ساتھ ہنستا بولتا۔ جب دیکھو نکہتِ گل کی طرح آزاد۔ پرند کی طرح مسرور۔ کبھی من کی چھاؤں میں بیٹھا ہے۔ کبھی خیال کے نور میں نہاتا ہے۔ اس دھوپ چھاؤں میں باغ کی پتی پتی کہتی: "سہیل! رازِ زندگانی حسن کاری میں ہے!!" تو اس کی روح باغ باغ ہو جاتی۔ یہی پیام روز سنتا۔ اس پر دھیان کرتا۔ آخر طبیعت مصوری پر آ گئی۔ جس میں وہ برکت ہوئی کہ اس کا ہاتھ دل اور دماغ ہمکنار ہو گئے اور نظروں میں حسن سچائی تو سچائی خدا بنکر سما گیا!

ایک دن فجر کا وقت ہے۔ نسیمِ سحر چل رہی ہے۔ پرند گیت گا رہے ہیں کہ سہیل نے پھول توڑے۔ مالن نے گجرا گوندھا۔ اس سمے روز مالن گجرا لے کر محلسرا جاتی اور شہزادی گلرو زمانی کو پہنا آتی تھی، آج بھی جانے لگی تو سہیل نے گجرا دیکھا۔ مگر کچھ کھو سا گیا۔ بچپن میں یہ بھی محل سرا جاتا تھا۔ شہزادی کو دیکھتا تھا۔ اس وقت اپنے آپ محل سرا کی اگلی پچھلی باتیں یاد آنے لگیں۔ ایک خیال آیا۔ جیسے جشن کے دن ہیں۔ شہزادیاں، امیرزادیاں رنگ محل آئی ہوئی ہیں۔ آپس میں چہل چہچہے ہو رہے ہیں۔ قہقہے لگائے جا رہے ہیں۔ انہیں میں شہزادی گلرو زمانی بھی تھی، وہ بھی ہنسی تھی۔ آج وہی ہنسی سہیل کی یاد میں کچھ اس طرح بیدار ہوئی جیسے ساز کی چھیڑ سے نغمہ جاگ جائے!

دن یادِ ایام کی اس مزیداری سے شروع ہوا تھا۔ رات بھی آئی تو لیلیٰ بن کر آئی۔ یعنی سہیل نے خواب دیکھا کہ رنگ محل کے پائیں جو نور باغ ہے اس میں گیا ہے اور حوض کے کنارے کھڑا ہے۔ جہاں نشاط محل سے گانے کی دھیمی آوازیں آ رہی ہیں۔ چاندنی چھٹکی ہوئی ہے جس میں مرمریں جل محل دریائے نور کا حباب معلوم ہوتا ہے! قضا را ادھر شہزادی بھی آ نکلتی ہے۔ اور حوض پر پاؤں لٹکا کر ہو بیٹھتی ہے۔ جیسے کوئی بھولا بچہ دریا کے کنارے بیٹھا ہو! شہزادی سہیل کو دیکھ لیتی ہے۔ اس کے پاس آتی ہے تو سہیل کو محسوس ہوتا ہے کہ کانپ رہا ہے۔ وہ پوچھتی بھی ہے کہ سہیل اچھے ہو اور اس کی مصوری کی بڑی تعریف کرتی ہے۔ مگر یہ خاموش تھا۔

خیر صبح ہوئی۔ ایک کیا کئی صبح ہوئیں۔ ماں بیٹے روز پھول توڑتے، گجرے گوندھتے رہے۔ مگر اس دن سے سہیل کچھ کھویا کھویا سا ہو گیا۔ ہر وقت اس پر من کی نیند سی چھائی رہتی تھی! ماں کی ممتا بھلا بیٹے کی یہ حالت کب گوارا کرتی۔ پوچھا اور زور دے کر پوچھا تو سہیل کو اپنا خواب کہنا پڑا ساتھ ساتھ یہ بھی کہا۔ "ماں! یوں تو شہزادی ساری پرجا کے من کی ملکہ ہے۔ مگر ہمارے روئیں روئیں میں اس کا نمک ہے، تو روز گجرے پہنا آتی ہے، اس کی پوجا کراتی ہے۔ میں بھی اس کا گن مانوں گا۔ اس کی تصویر اتاروں گا۔ تو دیکھے گی کہ تیرا سہیل اس بہن، اس ماں، اس شہزادی اور اس دیبی کی کیسی پاکیزہ تصویر اتارتا ہے۔ لیکن تھوڑی سی مدد کر۔ مجھے کچھ بتا کہ بڑی ہو کر شہزادی کیسی معلوم ہوتی ہے؟" یہ الفاظ سہیل نے کچھ ایسے وجد میں کہے کہ مالن کھڑی ہو گئی۔ کہا۔ یہ بات ہے تو چل میں تجھے شہزادی کا سروپ دکھاؤں۔ یہ کہہ کر سہیل کو سارے باغ میں لئے پھری۔ کہتی جاتی تھی۔ بیٹا! شہزادی کے سروپ کا کیا پوچھنا۔ وہ بڑا اشانا نہ ہے۔ بس یوں سمجھ لے۔

یہ جو سامنے شمشاد ہے۔ میں سمجھتی ہوں اتنا تو قد ہوگا۔ مگر لانبے لانبے سنہرے بال اس برابر والے سنبل سے بھی پیارے ہیں۔ اچھا دیکھ! یہ نرگس ہے۔ اپنے باغ کے جیسی کہیں نہیں ہوتی اُس کی سی آنکھیں ہیں۔ مگر اس میں وہ ڈورے نہیں جو اُن میں ہیں۔ آنکھ ایسی ہے۔ گال جیسے گلاب کی پتی۔ ہائے کیونکر بتاؤں کہ چہرے پر نرگس و گلاب کھلے رہتے ہیں۔ بھرا بھرا جسم بھرے بھرے بازو۔ پتلے پتلے ہونٹ جن پر ہنسی کھیلتی ہو۔ سہیل ذرا اس سورج مکھی کو دیکھ۔ مجھ بوڑھی کو دیکھ۔ یہ سارے دن سورج کو تکتا رہتا ہے۔ یہی حال میرا ہے۔ میرا کیا بھری محل سرا کا یہی حال ہے کہ شہزادی کو دیکھتے گذارتی ہے۔ خیر! میں یہ وہ تو جانتی نہیں۔ اتنا جانتی ہوں۔ جب سے شہزادی نام خدا سیانی ہوئی ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہمارے باغ پر بہار آئی ہو!

سہیل نے یہ سراپا بھی سُنا۔ کچھ اپنی یاد پر بھی زور دیا اور ان دونوں کو سمو کر تصویر اُتارنی شروع کی جس سے تصویر میں رنگ ہی اور آیا جوں جوں تصویر اُترتی جاتی اس کا شوق بڑھتا جاتا۔ شوق سے روح کے پر لگ جاتے ہیں سہیل بھی اپنی ہر جنبش مو قلم میں شفق کی افشاں چنتا تھا۔ تدرہ شدہ تصویر پوری ہوئی جس میں چاند کی سج دھج تو زہرہ کی زیبائی تھی۔ کیوں نہ ہو کہ اچھی تصویر مصوّر کے ہاتھ آنکھ کی شاعری ہوتی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اس میں لفظ کی بجائے خط ہوتا ہے جو خیال کے گلے کا ہار ہوتا ہے اور جس طرح ایک اچھے شعر میں لفظ و خیال کی دھوم ہوتی ہے۔ اسی طرح اچھی تصویر میں بھی خط و خیال کی قیامت بپا ہوئی ضرور ہے۔ یہ مکمل تصویر سہیل نے ماں کو دکھائی۔ وہ دیکھ کر بے چین ہو گئی کہ جس طرح ہو اسے شہزادی کو بھی دکھائے۔ روز چھپا کے ساتھ لے جاتی۔ مگر موقع نہ ہوتا۔ ایک روز شہزادی سہیلیوں میں بیٹھی تھی۔ ہنسی دل لگی ہو رہی تھی۔ مالن گئی۔ مجرا کیا۔ گجرا پہنایا پھر ادب سے کہا۔ جان کی امان ملے تو باندی کچھ عرض کرے۔ مگر شہزادی سے ہی کہنے کی ایک بات ہے۔ شہزادی جانتی تھی، مالن بڑے ادب قاعدے کی عورت ہے۔ کوئی ایسی ہی بات ہے جو یوں کہتی ہے۔ اُٹھی اور خلوت کی طرف چلی، مالن بھی ساتھ ساتھ ہولی۔ وہاں جا کر مالن نے ڈرتے ڈرتے تصویر نکالی اور عرض کی۔ حضور کا غلام کچھ دنوں سے تصویریں بنانے لگا ہے۔ ایک دن میرے سر ہو گیا کہ تُو تو روز گجرے لے جاتی ہے۔ شہزادی کے درشن کر آتی ہے۔ کیا تو ہی نے حضور کا نمک کھایا ہے۔ میں بھی آخر اسی نمک سے پلا بڑھا ہوں حضور تیری شہزادی ہیں تو میری دیبی ہیں۔ جب دیبی کی پوجا کی جاتی ہے تو میں بھی اُن کی تصویر اُتاروں گا۔ یہی میری پوجا ہے۔ اسی کی نذر دوں گا۔ میں سمجھی حضور وہ یونہی کہتا ہے، ایسا کون سا سورما ہے کہ بن دیکھے تصویر اُتارے گا۔ مگر اس نے تو یہ کام اپنی یاد سے کیا۔ جن دنوں یہ بچپن میں محل سرا آتا جاتا تھا حضور کی عمر بالی تھی۔ اس کے سامنے ہوا کرتی تھیں۔ جبھی سے اُس نے نک سُک کو دھیان میں رکھا ہوگا جو آج یہ تصویر اُتاری ہے۔ یہ سُن کر شہزادی مُسکرائی۔ تصویر لی۔ دیکھی تو اُس کی شیدائی ہو گئی۔ اچھی تصویر کا یہ جادو ہے کہ وہ آنکھ کے رستے دل میں اُترتی اور پھر وہیں رم جاتی ہے! مگر شہزادی نے کہا۔ مالن! مجھے اس میں ایک چیز ذرا سی کم معلوم ہوتی ہے۔ میرے ہونٹوں کی سُرخی دیکھ! اتنے پھیکے تو نہیں جتنے تصویر میں ہیں!! مالن نے کہا۔ حضور کی نظر کے قربان! مجھ اندھی دُندھی کو بھلا یہ بات کیا سوجھتی۔ اس پر شہزادی بولی۔ اسمیں سہیل کا بھی تصور نہیں

بن دیکھے یہ چیزیں ہُوبہُو نہیں اُترتیں۔ اچھا مالن! ایک تدبیر ہے مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ سہ پہر کو میں تیرے ہاں باغ آتی ہوں سہیل کو پہلے سے ایسی جگہ چھُپا دے کہ مجھے دیکھ لے۔ جبھی یہ کمی پوری ہوگی۔ نہیں تو تصویر ادھوری ہے۔ میں کہتی ہوں جب ایک اچھی چیز تیار ہوگئی ہے تو پھر ذرا سے لئے اس کا ادھورا چھوڑ دینا اچھا نہیں۔ بس تو جا سہیل سے بھی کہہ دے۔ مگر دیکھ کسی کو خبر نہ ہو۔ مالن خوشی خوشی باغ آئی۔ سہیل سے سارا ماجرا سُنایا۔ سہیل نے کہا۔ خیر شہزادی کی جیسی مرضی۔

سہ پہر کا وقت ہوا باغِ حیات بخش میں شہزادی کی سواری آئی۔ چوطرف پہرہ بندی ہے۔ اُونچی پوری خوبصورت تُرکنیں ہاتھوں میں تیر کمان لئے۔ پر تلے حمائل کئے کھڑی ہیں۔ شہزادی زرین ہوادار سے اُترتی ہے۔ مالن کے ساتھ وہاں آتی ہے جہاں سے سہیل اُسے دیکھ لے اور بڑے انداز سے لجا کر کھڑی ہوجاتی ہے۔ سہیل پہلے تو اپنی دیبی کے جی بھر کے درشن کرتا ہے۔ پھر رنگ آمیزی کرتا ہے کہ تصویر کی سرخیٔ لب اجاگر کرے۔ ایک ظلمن نے اُسے دیکھ پایا۔ جھٹ کمان کو چلہ کیا۔ تیر جوڑا اور شست باندھ کر ایسا چھوڑا کہ سہیل کے دل میں ترازو ہوگیا۔ مُنہ سے آہ نکلی دل سے جیتے خون کی بوند اُڑی جو تصویر کے لبوں پر گر کر رچ گئی!!۔

سیّد وزیر حسن!

اپنی تنقید سے حاصل یہ ہوا ہمنفسا
کوئی امکاں نہیں فطرت کے بدلجانیکا

آہ! انوارِ محبت کی ضیا باری سے — گوشہ گوشہ ہے منور میرے غمخانے کا
ہے کشاکش میں گرفتار تمنائے علیل — دل کو پھر خبط ہے پہلو سے نکلجانے کا
حد ہے اللہ! تجسس کی گرانباری کی — کیا نہ حل ہوگا معمہ ترے دیوانے کا
خاک کے ذرّے بہا لیگئی موجِ غمِ دوست — ہائے! کیا اجر ملا خاک میں ملجانے کا
حالتِ نزع میں ہیں حسرت و ارماں ہمراز — ہے بس اتنا ہی خلاصہ مرے افسانے کا
اے دل کشتۂ غم ڈھونڈھ کہ تجھ میں ہی کہیں — مرنے میں راز ہے شاید کوئی مٹجانے کا

منقطع رشتۂ اُمید بھی ہوجائے اگر
کوئی مقصد ہی نہیں میرے یہاں آنے کا

دلفگار

خمسہ

بر غزل مرزا سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ خاتم السلاطین قلعۂ معلّٰے دہلی

مجھکو فرزانہ کہ دیوانہ بنایا ہوتا | غمِ نیرنگ سے بیگانہ بنایا ہوتا
ایک ہی رنگ کا افسانہ بنایا ہوتا | یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

تختِ شاہی تو مقدر نے دلایا تھا مجھے | مگر انجام تباہی نہ بنایا تھا مجھے
وہ سنے جس نے تماشا یہ دکھایا تھا مجھے | خاکساری کیلئے گرچہ بنایا تھا مجھے
کاش خاکِ درِ جانانہ بنایا ہوتا

دل سے مرغوب ہا گوشۂ خلوت تو مجھے | مگر ابنائے زماں سے نہ تھی نفرت تو مجھے
نظر آتی کسی انسان کی صورت تو مجھے | صوفیوں کے جو نہ تھا لائقِ صحبت تو مجھے
قابلِ جلسۂ رندانہ بنایا ہوتا

جب ملامی کدہ منظوریِ ساقی سے مجھے | کیف آنے لگا مخموریِ ساقی سی مجھے
نہ جلاتا کوئی مہجوریِ ساقی سے مجھے | تھا جلانا ہی اگر دوریِ ساقی سی مجھے
تو چراغِ درِ مے خانہ بنایا ہوتا

رات دن شام و سحر پیشِ نظر ہے یہ سفر | دیکھتے دیکھتے اُٹھ جائیگا ایک ایک نفر
نہ بچے آپ نہ احسن کے لئے راہِ مفر | زور معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

احسن مارہروی؛

(نمبر ۴ - بسلسلۂ ماسبق)

دَورِ حاضر اَور اُردو غزل گوئی

"This poetry is highly conventional. It is replete with what are called Stock epithets; the moon-face, the cypress-form, the ruby-lips, occur with wearisom reiteration. In the same way what we may call stock-associations abound. When the nightingale is mentioned we may be sure the rose is not far away and if we read of the moth in one line we may feel safe about meeting the taper in the next." The poetry of the Ottomans by

GIBB.

vol. 1. Page 29.

گبّ کا یہ قول دَورِ حاضر کی اُردو غزل گوئی پر بھی حرف بحرف صادق آتا ہے۔ وہی پامال تشبیہیں، وہی فرسودہ استعارے، وہی معینہ الفاظ، وہی مقررہ مضامین، وہی ہزاروں دفعہ کے دُہرائے ہوئے پیش پا اُفتادہ خیالات، وہی روایتی عشق بازی کہیں حقیقی کہیں مجازی، وہی اصنامِ خیالی، وہی متعارف نقالی۔ غرض دَورِ حاضر کی اُردو غزل میں وہ تمام عناصر بکثرت موجود ہیں جنکی بنا پر اُسے حقیقی شاعری کے دائرہ سے قریب قریب خارج سمجھنا چاہیئے۔ پروفیسر فراقؔ لاکھ کہیں کہ "بادشاہِ متغزلین"[1] اور دوسرے "اساتذہ"[2] نے غزل کی کایا پلٹ دی لیکن دورِ حاضر کے میلانات، ذوقِ شعری اور معیارِ نقد کا اندازہ داں بیساختہ پکار اُٹھے گا کہ "پنجرے" "میں تو" وہی اگلے برس کی تیلیاں" ہیں۔

ایک اسمِ بےمسمّٰی مقام یعنی "مقتل" کے "رقت انگیز واقعات" آپنے سُنے۔ عاشقِ مظلوم کا خُون پانی کی طرح بہتے دیکھا۔ نزع و مرگ کے رُوح فرسا مناظر آپ کی نظر سے گذرے، گنجِ شہیداں کی عبرتناک تصویریں آپنے ملاحظہ کیں۔ رندانِ قدح خوار کا شورِ نوشانوش آپکے کانوں میں گونجا۔ زاہد و واعظ کی پگڑیاں آپکے سامنے اُچھالی گئیں۔ جفائے محبوب کی ہنگامہ طرازیاں، اشکِ خونیں کی گلکاریاں اور جنونِ فتنہ ساماں کی شورانگیزیاں آپنے مشاہدہ کیں۔ آخر کس کس چیز کو آپ بھلا سکتے ہیں۔ کس کس بات سے صرفِ نظر کر سکتے ہیں۔ یہ نقالی کی یہ بےمزہ داستان یہیں پر تمام نہیں ہو جاتی۔ ابھی سینکڑوں ایسے فرسودہ خیالات و مضامین باقی ہیں جنہیں ہمارے شعرائے رسم پرست یعنی "بادشاہِ متغزلین" اور دوسرے "اساتذہ" نے موضوعِ سخن بنایا ہے۔

---

[1] حسرت موہانی۔ [2] اصغر۔ جگر۔ فانی۔

اس میں ایک بڑی سہولت یہ ہے کہ تھوڑی سی موزونی طبیعت سے غزلوں کا پورا دیوان تیار ہو جاتا ہے۔ نہ تخیل کی ضرورت نہ مشاہدہ و مطالعہ کی احتیاج۔ ہر قسم کے الفاظ و مضامین کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ کسی مخصوص وزن پر الفاظ جوڑ لئے اور غزل بن گئی۔ سُننے والوں نے یار فروشی کی خاطر یا اپنی خوش فہمی کا ثبوت دینے کیلئے زبانی یا تحریر میں اس زور و شور سے "واہ وا" کی کہ شعر کا صحیح ذوق رکھنے والے مبہوت ہو کر رہ گئے اور انہیں اپنی سلامتِ ذوق پر شبہ ہونے لگا۔

جس "اُستاد" کو دیکھئے کہیں ذرہ کو آفتاب بنا کر چمکاتا اور ارض و سما کو اس سے جگمگاتا ہے کہیں قطرہ میں سمندر کی گہرائیاں اور ذرہ میں صحرا کی پہنائیاں دکھاتا ہے۔ کہیں منصور کو دار پر چڑھاتا ہے، کہیں طور پر "خرّ موسیٰ صعقا" کا منظر دکھاتا ہے۔ کبھی دو نوں کی کم ظرفی کا خاکہ اُڑاتا اور اپنی عالی حوصلگی کا سکّہ جماتا ہے۔ کہیں مجنوں کے ساتھ صحرائے نجد کے چکّر لگاتا ہے۔ کہیں فرہاد کی مدد سے کوہکنی کر کے جُوئے شیر لاتا ہے۔ کبھی زلیخا سے یوسف کا دامن چاک کراتا ہے۔ کبھی شمع سے پروانوں کو جلاتا ہے۔ کبھی بلبل کو فراقِ گل میں شبنم کے آنسوؤں سے رلاتا ہے۔ کبھی قمری کے گلے میں سرو کی غلامی کا طوق پہناتا ہے۔ کہیں عشق کو عقل کی نادانی پر ہنسواتا ہے۔ کہیں طفیلیوں کی طرح دل کے ساتھ جگر کو بھی لگا لاتا ہے۔

غرض دُنیا بھر کی آلہا گاتا ہے مگر نہیں کہتا تو صرف وہ باتیں جن کا تعلق خود اپنی ذات اور حقائق و واقعات سے ہے۔ ہوائی محل ہزاروں بنائے گا مگر سچ مچ کی آپ بیتی کبھی نہ سُنائیگا۔ گویا غزلگو کے لئے رسم و تقلید کی شاہراہ سے ایک قدم تجاوز ہونا حرام مطلق ہے۔ اور اس نے خود اپنے واردات قلبی کا ذکر نہ کرنے کی قسم کھائی ہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی اگر فرعون دریائے نیل میں غرق ہو گیا اور نمرود کا مغز پشّہ نے کھالیا تو تجھے کیا۔ اگر قیس و فرہاد نے پرائی بیویوں کو تاکا اور ناکام رہے تو تجھے کیا۔ تو اگر شاعر ہے اور غزل گو شاعر ہے تو کچھ آپ بیتی سُنا۔ کوئی سچی کہانی بیان کر۔ کچھ اپنے دردِ دل کا ماجرا کہہ۔ وصال کی رُوح پرور تصویریں کھینچ۔ فراق کے جانگداز منظر دکھا۔ پھر کیا مجال جو کوئی صنفِ غزل پر حرفگیری کر سکے۔ مگر جب تک غزل نام ہے جگالی کرنے کا یعنی پامال و فرسودہ مضامین کو بار بار دُہرانے کا، اس وقت تک غزل یقیناً اردو شاعری کے حسین جسم پر ایک مکروہ داغ سے کم نہیں۔

سطور بالا میں جن فرسودہ مضامین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے بعض کے مختصر نمونے "بادشاہ متغزلین" اور دوسرے "اساتذہ" کے کلام سے پیش کئے جاتے ہیں تاکہ قارئین کو دورِ حاضر کے چوٹی کے غزل گویوں کی بے کیف نقالی کا اچھی طرح اندازہ ہو جائے۔

آفتاب و ذرہ۔ قطرہ و دریا۔ ذرہ و صحرا۔ دل و جگر۔ کلیم و طور۔ دار و منصور۔ لیلیٰ مجنوں۔
شیریں فرہاد۔ یوسف زلیخا۔ شمع و پروانہ۔ گل و بلبل۔ وغیرہ۔

یہ الفاظ گویا پرندے ہیں کہ شعرائے متقدمین کبوتربازوں کی طرح ان کے جوڑے ملا کر چھوڑ گئے ہیں اور متاخرین نیز ہمارے معاصرین کے اشعار انہیں کے انڈے بچّے ہیں۔

قطرہ و دریا

حسرت:- عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے حوصلے ۔۔۔ مہر ذرّوں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا

اصغر:-	اسرارِ عشق ہے دلِ مضطر لئے ہوئے	قطرہ ہے بیقرار سمندر لئے ہوئے
فانی:-	نہ میں جا سطح سے تو قطع نظر کر کر دیکھ	قطرہ قطرہ میں سمندر ہے نظر پیدا کر
جگر:-	جب کچھ نہ سکتے تھے تو دریا بھی تھا قطرہ	جب آنکھ کھلی قطرہ بھی دریا نظر آیا
" :-	کہیں ذرّہ کہیں صحرا، کہیں دریا کہیں قطرہ	محبت اور اس کا سلسلہ یوں بھی ہے اور یوں بھی

اصغر:-	سرشکِ شوق کا وہ ایک قطرۂ ناچیز	اچھالتا تھا کہ اک بحرِ بیکنار ہوا
جگر:-	کبھی دریائے بیتابی کا سینہ میں سمٹ آنا	کبھی ہر اشک کے قطرہ کا بحرِ بیکراں ہونا
فانی:-	بچ رہا تھا ایک آنسو دار و گیرِ ضبط سے	جوششِ غم نے پھر اس قطرہ کو دریا کر دیا

ذرّہ و آفتاب

حسرت:-	پہلے اِک ذرّۂ ذلیل تھا میں	تیری نسبت سے آفتاب ہوا[1]
اصغر:-	خیرہ کئے ہے چشمِ حقیقت شناس کو	ہر ذرّہ ایک مہرِ منوّر لئے ہوئے
جگر:-	پوچھنا کیا چشمِ بینا ہو تو دیکھ	دل کے ہر ذرّہ میں لاکھوں آفتاب
" :-	اپنی حدود سے نہ بڑھے عشق میں کوئی	جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

ذرّہ و بیاباں

اصغر:-	یہ عشق نے دیکھا ہے، یہ عقل سے پنہاں ہے	قطرہ میں سمندر ہے ذرّہ میں بیاباں ہے
" :-	مری اِک بیخودی میں سینکڑوں ہوش و خرد گم ہیں	یہاں کے ذرّہ ذرّہ میں ہے وسعت اِک بیاباں کی
جگر:-	انتہائے جستجو میں دیکھئے ہوتا ہے کیا	اِبتدا یہ ہے کہ ہر ذرّہ بیاباں ہو گیا
فانی:-	دل کی لحد پہ خاک اُڑانے چلا ہے عشق	ذرّہ سے اکتسابِ بیاباں کئے ہوئے
" :-	ذرّہ وہ رازِ بیاباں ہے جو افشا نہ ہوا	دشتِ وحشت ہے وہ ذرّہ جو بیاباں ہو جائے
" :-	خاکِ فانی کی قسم ہے تجھے اے دشتِ جنوں	کس سے سیکھا ترے ذرّوں نے بیاباں ہونا

ذرّہ و صحرا، قطرہ و دریا، اور ذرّہ و آفتاب کا یہ گورکھ دھندا آسانی سے سمجھ میں آنے والا نہیں۔ اس کے لئے بڑی ژرف نگاہی

---

[1] گرچہ خُردیم نسبتے است بزرگ ❊ ذرّۂ آفتابِ تابانیم۔

کی ضرورت ہے۔ یہ اشعار نہیں "حقائق و معارف" کے دفتر ہیں گو بظاہر ان میں سے اکثر اِدّعائے محض و بے معنی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ بیانِ "معرفت" کی اس ریس (race) میں ہمارے بادشاہِ متغزلین کا گھوڑا اپنے معاصرین سے بہت پیچھے رہ گیا۔ باقی تینوں اُستادوں کے یہاں "عارفانہ" رنگ ماشاء اللہ خاصہ تیز ہے ساتھ ہی لفظی و معنوی مشابہت بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ "سَو سیانے ایک مت"۔ حضرتِ اصغر کا "سرشکِ شوق"، جگر صاحب کا "اشک کا قطرہ"، اور جناب فانی کا "ایک آنسو" سمندر بن گیا۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ حضرتِ اصغر نے اپنے آنسو کو بھان متی کی طرح کسی پوشیدہ ترکیب سے اُچھال کر بحرِ بیکراں بنایا۔ جناب فانی کے یہاں جوششِ غم نے یہ طوفان اُٹھایا اور جگر صاحب کا قطرۂ اشک خود بخود ایک اتھاہ ساگر کی طرح موجیں مارنے لگا۔ حضرتِ اصغر کی "چشمِ حقیقت شناس"[1] کو ہر ذرّہ میں "ایک مہرِ منوّر" نظر آتا ہے۔ فیضِ مرشد سے جگر صاحب کی "چشمِ بینا"[2] کا یہ عالم ہے کہ ہر ذرّہ میں فقط ایک مہرِ منوّر نہیں بلکہ "لاکھوں آفتاب" مشاہدہ کرتی ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جوہر اگر قابل ہو تو شاگرد اُستاد سے اور مُرید مُرشد سے اکثر بڑھ جاتا ہے! اور جناب فانی جب دریائے حقیقت کی تہ میں غوطہ لگاتے ہیں تو اُنہیں قطرہ قطرہ میں سمندر[3] موجزن دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے "اساتذہ" نے قطرہ و دریا اور ذرّہ و صحرا وغیرہ کے متعلق اور بہت سے اشعار لکھے ہیں مگر حاصل ان سب کا قریب قریب ایک ہی ہے اس لئے صرف چند نمونوں پر اکتفا کی گئی۔

دل و جگر

تحقیقاتِ جدیدہ کی رُو سے حکما کے نزدیک رُوح کا مقام قلب ہو یا دماغ لیکن کم از کم اس قدر مُسلّم ہے کہ جذبات و احساسات کا منبع دل ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں تقریباً تمام افعال و اعمال نیز خواہشات اور ارادوں کو دل سے منسوب کیا جاتا ہے اسی لئے ہماری زبان میں دل کے متعلق بکثرت محاورات موجود ہیں۔ مثلاً دل چاہنا۔ دل دینا۔ دل لینا۔ دل آنا۔ دل لگانا۔ دل بیٹھنا۔ دل لُبھانا۔ دل جلانا۔ دل بڑھانا۔ دل توڑنا۔ دل اٹکنا۔ دل پھنسنا۔ دل اُچٹنا۔ دل لگنا۔ دل بہلانا۔ دل پھرنا۔ دل بھرنا۔ دل چُرانا۔ دل دُکھانا۔ دل رکھنا۔ دل میلا کرنا۔ دل گھبرانا۔ دل مچلانا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن دل کے صفات و خواص کا جگر میں پایا جانا کسی کو تسلیم نہیں۔ ان محاورات میں ذرا دل کی جگہ جگر کو رکھ کر دیکھئے کس قدر مضحکہ خیز چیز بن جاتی ہے۔ مثلاً جگر چاہنا۔ جگر آنا۔ جگر لُبھانا۔ جگر گھبرانا وغیرہ۔ پھر بھی ہمارے شعرائے کرام نے اُصولِ تقلید کے ماتحت دل و جگر کو لازم و ملزوم بنا دیا ہے۔ جہاں دیکھئے جگر صاحب بھی حضرتِ دل کے طفیلی بنے ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ اشعار میں جس کثرت سے دل کے ساتھ جگر کا بے محل استعمال ہوا ہے اُسکی بنا پر اگر جگر کو دل کا تابعِ مہمل کہیں تو بیجا نہیں۔

بادشاہِ متغزلین فرماتے ہیں :-

کچھ دردِ دل سے بڑھکے ہے دردِ جگر لذیذ　　تُجھ سے ہیں جتنے درد ُ وہ سب ہیں مگر لذیذ

---

[1] خیرہ کئے ہے چشمِ حقیقت شناس کو۔ الخ۔ اصغر۔ [2] پوچھنا کیا چشمِ بینا ہو تو دیکھ۔ الخ۔ جگر۔ [3] تہ میں جا سطح سے تو قطع نظر کر کے دیکھ۔ الخ۔ فانی

سوال یہ ہے کہ دردِ جگر ہی میں کیا خصوصیت ہے جو وہ دردِ دل سے زیادہ لذت بخش ہے۔ آخر دردِ گُردہ اور دردِ مثانہ بھی تو دردِ جگر سے کسی طرح کم نہیں۔ پھر ان بیچاروں کو کیوں چھوڑ دیا گیا۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہو :۔

دل وجان وجگر صبر وخرد جو کچھ ہے پاس اپنے   یہ سب کر دیں گے ہم اُن پر نثار آہستہ آہستہ

دل اعضائے رئیسہ کا بادشاہ ہے اور جان کا مرتبہ اس سے بھی اعلیٰ ہے اس لئے بہتر ہے ان دونوں کو قربان کر دیجئے۔ فی الواقع یہ ایک بڑی قربانی ہوگی۔ لیکن یہ کمبخت جگر کس شمار میں ہے۔ جگر کے ہم رتبہ اعضا تو جناب کے پیٹ میں اور بھی کئی موجود ہیں۔ مثلاً پھیپھڑے گُردے، تلّی وغیرہ۔ ان کے بارے میں جناب کی کیا رائے ہے۔ یعنی انہیں بھی نثار کیجئے گا یا بچا رکھیئے گا کہ وقتِ ضرورت کام آئیں اور سنیئے :۔

شکوِن شوق کی صورت نکل چکی حسرت   کہ دل کے ساتھ جگر بھی فگار ہوتا ہے

غلط اور بالکل غلط۔ دل کے ساتھ جگر ہرگز فگار نہیں ہوتا۔ مگر ہاں اس بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ "اساتذہ" ہمیشہ اسی طرح کہتے آئے ہیں۔

فانی صاحب بیچارے خیالی گورِغریباں میں بھی تربتِ دل کے برابر ایک ننھی سی قبر جگر کی بھی بنا دیتے ہیں :۔

اٹھا ہاتھ اے تصوّر فاتحہ کو   یہ دل کی ہے وہ تربت ہے جگر کی

افسوس ہے کہ باقی اعضائے درونی کو آپ نے اسی طرح بے گور وکفن چھوڑ دیا۔ ہر ایک کی ایک ننھی سی قبر الگ الگ بنا دیتے تو کیسا پیارا ایک ننا منا گورستان تیار ہو جاتا۔

فانی :۔ شبِ فرقت میں ہم ہر سانس سے یہ پوچھ لیتے ہیں   جگر تو خیریت سے ہے مزاجِ دل تو اچھا ہے

یہ کیسی ناانصافی ہے کہ آپ ہر سانس سے جگر کی خیریت تو پوچھیں اور بیچارے پھیپھڑوں کا حال دریافت نہ کریں حالانکہ سانس کا تعلق براہِ راست پھیپھڑوں ہی سے ہے۔

اصغر :۔ گرمِ تلاش وجستجو[1] اب ہے تری نظر کہاں   خون ہے کچھ جما ہوا قلب کہاں جگر کہاں

جس طرح نظریا حادثہ نے جگر کا خون کر دیا ہوگا اس سے پتّا بھی تو پانی ہو گیا ہوگا۔ اور ضرور اسکی بھی ایک آدھ بوند وہاں موجود ہوگی۔ لیکن پتّے بیچارے کی طرف کوئی ملتفت ہی نہیں ہوتا۔

جگر :۔ واقف غمِ اُلفت سے نہ دل ہو نہ جگر ہو   یوں مجھ سے ملو تم کہ مجھے بھی نہ خبر ہو
تم خاک میں ملا دو دل کو جگر کو لیکن   ارماں یہی رہیں گے حسرت یہی رہیگی
دل کی خبر نہ ہوش کسی کو جگر کا ہے   اللہ اب یہ حال تمہاری نظر کا ہے

یہ چند شعر نمونے کے طور پر ہم نے پیش کر دئے ہیں۔ قارئین خود فیصلہ کرلیں کہ ہمارے اساتذہ دل کے ساتھ جگر کا تذکرہ کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہیں اور یہ دل کی دُم میں جگر کا پُچھلّا باندھنا محض رسم وتقلید کی بنا پر ہے یا اس کی کوئی

---

[1] تلاش اور جستجو اُردو میں ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں۔ اس لئے تلاش یا جستجو ایک لفظ اس مصرع میں بالکل بیکار ہے۔

معقول وجہ بھی ہے؟

طُور و موسیٰ

تفاسیر میں لکھا ہے کہ حضرتِ موسیٰ نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا تھا کہ فرعون کے ہلاک ہوجانے کے بعد خُدا سے ایک کتاب تمہارے لئے لاؤں گا۔ جس میں تمہاری ضرورت کی تمام باتیں مندرج ہوں گی۔ لہٰذا جب فرعون غرق ہوگیا تو بنی اسرائیل نے موسیٰ سے وہ کتاب طلب کی۔ موسیٰ نے اس کتاب کیلئے خُدا سے درخواست کی۔ خُدا نے موسیٰ کو طُور پر بُلایا۔ موسیٰ طُور پر گئے اور بقول صاحب "کشاف" چالیس دن تک خُدا سے ہمکلام رہے۔ اس کے بعد دیدار کے خواہشمند ہوئے تو جواب ملا کہ اے موسیٰ تم ہمارے دیدار کی تاب نہیں لاسکتے۔ اچھا پہاڑ کی طرف دیکھو۔ اگر یہ پہاڑ ہماری تجلّی کا متحمل ہوسکے اور اپنی جگہ پر قائم رہجائے تو البتہ تم بھی ہمیں دیکھ سکو گے۔ پس جب خُدا نے پہاڑ پر تجلّی کی تو پہاڑ کے پرخچے اُڑ گئے اور موسیٰ بیہوش ہوکر گر پڑے اور جب ہوش میں آئے تو عرض کیا کہ اے پروردگار بیشک تیری ذات منزّہ ہے اور مَیں تیری جناب میں خواہشِ دیدار کی معذرت پیش کرتا ہوں۔

یہ تو ہوا طور کا قصّہ۔ اب ذرا "وادِ الامین" کی حکایت سُن لیجئے۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ "جب موسیٰ اس مُدّت کو پورا کرچکے اور اپنی بی بی کو لیکر روانہ ہوئے تو اُنہیں کوہِ طُور کی طرف سے ایک آگ دکھائی دی۔ اُنہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم ٹھہر جاؤ۔ میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ شاید مَیں تمہارے پاس وہاں سے کچھ خبر لاؤں (یعنی وہاں جو لوگ ہوں اُن سے راستہ دریافت کروں کیونکہ موسیٰ راستہ بھُول گئے تھے۔) یا کوئی انگارا لے آؤں جس سے تم تاپ لو۔ پس جب وہ اُس آگ کے پاس پہونچے تو اُن کو اس میدان کے داہنی جانب سے اس مبارک مقام میں ایک درخت میں سے آواز آئی کہ اے موسیٰ مَیں رب العالمین ہوں۔ تم اپنا عصا ڈالدو...... الخ

اب اِن واقعات کی روشنی میں ہمارے شعرا کے طُور و کلیم اور وادِی ایمن والے اشعار مُلاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ حقیقی عشقیہ شاعری میں کس حد تک اُن کی کھپت ہوسکتی ہے اور حضرتِ موسیٰ بیچارے کب تک کانٹوں میں گھسیٹے جائیں گے؟ ہمارے "اساتذہ" نے اپنی "عارفانہ" بیہوشی میں ایک بڑا خلط مبحث یہ کیا ہے کہ وادیِ ایمن کی آگ اور تجلّی سرِ طُور کو ملاکر ایک کر دیا ہے۔ حالانکہ "وادیِ ایمن" کی آگ سے حضرتِ موسیٰ کی آنکھ تک نہیں جھپکی تھی اور تجلّی سرِ طُور سے بیہوش ہوکر گر پڑے تھے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ دونوں واقعے بالکل مختلف اوقات میں ظہور پذیر ہوئے تھے اور آپس میں ایک دوسرے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

زبدۃ العارفین حضرت مولانا اصغرؔ فرماتے ہیں:۔

ہاں وادیِ ایمن کے معلوم ہیں سب قصّے ۔۔۔ موسیٰ نے فقط اپنا اِک ذوقِ نظر دیکھا

ماشاء اللہ کتنی گہری بات کہی ہے۔ داد تحقیق یوں دی جاتی ہے۔ اس راز کو نہ خود حضرتِ موسیٰ سمجھے نہ کوئی اور کہ جس چیز کو اُنہوں نے آگ خیال کیا وہ خود اُن کا اپنا ذوقِ نظر تھا۔ حضرتِ موسیٰ کی اس سادہ لوحی پر حضرت اصغرؔ کو بے اختیار ہنسی آگئی ہوگی۔ اچھا یہ تو سب کچھ ہوا مگر سوال یہ ہے کہ آپ غزل لکھ رہے ہیں یا اسرائیلی روایات کا درس دے رہے ہیں۔

دراصل نہ آپ غزل لکھ رہے ہیں نہ آپ کو اسرائیلی روایات کی کچھ خبر ہے آپ تو محض لہو لگا کے شہیدوں میں داخل ہونا یعنی محض چند لفظوں کے اُلٹ پھیر سے عارف باللہ اور تلمیذ الرحمٰن بننا چاہتے ہیں۔

مُرشد کے اسی مضمون کی کتر بیونت کر کے مُریدنے بھی دو شعر کہے ہیں۔ (جگرؔ):-

مجھ کو سب معلوم ہے افسانۂ برق و کلیم　　میرے دل کا ذرّہ ذرّہ وادیٔ ایمن میں تھا

ورنہ ممکن ہی نہ تھا نظارۂ برقِ جمال　　ذوقِ موسیٰ بھی حدودِ وادیٔ ایمن میں تھا

جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ وادیٔ ایمن کی آگ، تجلّیٔ سرِ طور ہرگز نہ تھی ورنہ حضرتِ موسیٰ یہاں بھی بیہوش ہو کر گر پڑتے۔

حضرتِ فانیؔ نے کچھ اور بھی اُپج کی لی ہے:-

وہ قصّۂ موسیٰ پھر اے سوزِ جگر کہنا　　کس آگ کی چنگاری دی وادیٔ ایمن نے

وادیٔ ایمن کی آگ سے حضرت موسیٰ بچائے تو ہاتھ بھی نہ تاپ سکے مگر حضرتِ فانیؔ اس سے جل بھُن کر خاکستر ہو گئے۔ آپ سوزِ جگر سے قصّۂ موسیٰ سُننا چاہتے ہیں مگر لطف یہ ہو کہ وادیٔ ایمن میں ایسا کوئی واقعہ رُونما ہوا ہی نہیں جس کا تعلق جلنے جلانے سے ہو۔ بعقیدۂ حضرت فراقؔ یہ حضرات چونکہ چوٹی کے غزل گو ہیں اس لئے جو کچھ متقدمین نے کہا ہے حقِ تقلیداً دا کرنے کے لئے، یہ بھی ضرور کہیں گے اس سے بحث نہیں کہ وہ کوئی معقول بات ہو یا محض خُرافات۔

برقِ سرِ طور کے چند شُعلے اور بھی دیکھ لیجئے اور کوشش کیجئے کہ اس مُردہ آگ سے آپکے دل میں بھی کچھ گرمی پیدا ہو جائے۔

اصغرؔ:- جس سے کل تک دلِ بیتاب پُھنکا جاتا تھا　　اسی شعلہ کو جو دیکھا تو سرِ طُور ہے آج

بظاہر شعر کے الفاظ سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ حضرت اصغرؔ کے دل میں ایک آگ بھری ہوئی تھی۔ وہ آگ اپنے اس مسکن کو چھوڑ کر طور پر جا چمکی اور "تجلّی" کہلائی اس واقعہ کو صحیح ماننے کے لئے حضرتِ اصغرؔ کا زمانہ حضرتِ موسیٰ سے پہلے تسلیم کرنا پڑیگا لیکن حضرتِ اصغرؔ کا یہ تقدّمِ زمانی کسی مذہبی کتاب یا مُستند تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا۔ شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ "کل جو شعلہ سرِ طُور فروزاں تھا آج وہی میرے دل میں در آیا ہے اور اُسے جلائے ڈالتا ہے" مگر الفاظ کی موجودہ ترتیب خصوصًا ردیف (آج) نے مفہوم بالکل اُلٹ دیا۔ اِسی مضمون کو تھوڑے سے اُلٹ پھیر کے بعد حضرت اصغرؔ نے اس طرح باندھا ہے:-

مَیں نے خاکسترِ دل میں نہیں دیکھا جس کو　　وہی ذرّہ تو ہے جو برقِ سرِ طُور ہے آج

حضرتِ جگرؔ تھوڑی دیر کے لئے اپنی والا مرتبگی کو بھول کر یا بربنائے عالی ہمتی اس سے قطع نظر کر کے "چشمِ کلیم" کی اس طرح تعریف کرتے ہیں:-

آساں نہیں معاملۂ جلوہ و نظر　　چشمِ کلیم چاہیئے دیدار کے لئے

مگر جب آپ بلند پروازی پر آتے ہیں تو یہی "چشمِ کلیم" جسے آپ نے ایک آئیڈیل آنکھ کی حیثیت سے پیش کیا تھا باعثِ ننگ ٹھہرتی ہے:-

مگر اِس رمز سے ناآشنا رکھے گئے موسیٰ　　کہ ہے ننگِ نظر پابندِ برق و طُور ہو جانا

کسی نے سچ کہا ہے کہ ؎

قسمت کیا ہر ایک کو قسامِ ازل نے　　جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا

موسیٰ بیچارے میں یہ صلاحیت کہاں تھی کہ اس رمز سے آگاہ کئے جاتے۔ یہ رمز شناسی تو روزِ ازل حضرتِ جگرؔ کے حصّہ میں آچکی تھی۔ چنانچہ بیسویں صدی عیسوی میں آپ نے اس نکتہ کو پالیا اور دُنیا کو سمجھا دیا۔ اسکے بعد حضرتِ موسیٰ کے عشقِ خام کی ہجو کے پردے میں اپنے سوزِ تمام کی مدح میں اس طرح فرماتے ہیں:۔

خاک ہے سوزِ غمِ عشق کی تاثیر کلیم　　دل کا ہر ذرّہ اگر برقِ سرِطُور نہ ہو

اور جب موسیٰ اس لطیف نکتہ کو نہیں سمجھ سکتے تو اُنکی سادگی پر زور سے ایک منظوم قہقہہ لگاتے ہیں:۔

دل کے ہوتے ہوئے جاتے ہو کہاں اے موسیٰ　　اس میں کچھ جلوے ہیں ایسے کہ سرِطُور نہیں

موسیٰ اس پر بھی متنبہ نہیں ہوتے تو حضرتِ جگر للکار کر کہتے ہیں:۔

کہو یہ حضرتِ موسیٰ سے اب سنبھل جائیں　　حضور آتے ہیں اور بے نقاب آتے ہیں

موسیٰ بیچارے میں یہ دم خم کہاں کہ "حضور" کو بے نقاب دیکھکر حواس قائم رہجاتے۔ گرے اور بیہوش ہوکر گرے اور بقول جگرؔ اپنے ساتھ اور تمام "عشاق" کو بھی ذلیل کرایا:۔

جب سے غش کھا کے گرے حضرتِ موسیٰ سرِطُور　　گھٹ گئی شان ہی کچھ عشق کے افسانوں کی

فانیؔ:۔　　ہائے وہ جلوۂ ایمن وہ نگاہِ سرِطُور　　فتنہ ساماں ہے ترا فتنۂ ساماں ہونا

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وادیِ ایمن اور کوہِ طُور کی یاد میں یہ حضرتِ فانیؔ کیوں ہائے وائے کرنے لگے۔ اُن کا اِن چیزوں سے کیا تعلق ہے۔ اے جناب یہ عشقِ حقیقی کا جوش ہے اور بقول پروفیسر فِراق "فلسفیانہ احساس اور اندازِ بیان کا تیکھاپن ہے"

جہاں تک کلام کا تعلق ہے ہمارے سبھی "اساتذہ" عرفا کی صفِ اوّل میں جگہ پانے کے مستحق نظر آتے ہیں لیکن یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ بعض اوقات اِن بزرگوں کے بیان میں حد درجہ اختلاف ہوجاتا ہے مثلاً حضرتِ اصغرؔ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ:۔

اب طُور پر وہ برقِ تجلّی نہیں رہی　　ٹھہرا رہا ہے شعلۂ عُریانِ آرزو

اور حضرتِ فانیؔ بڑے زور شور سے اس دعویٰ کی تردید اس طرح کرتے ہیں:۔

طُور تو ہے رب اَرِنی[1] کہنے والا چاہیئے　　لن ترانی ہے مگر نا آشنائے گوش ہے

اسی طور و کلیم کے سلسلہ میں حضرت فانیؔ کی زبانی ایک "نکتہ" اور بھی سُن لیجئے:۔

جمالِ بیحجاب تھا کہ جلوہ تھا حجاب کا　　کلیم برقِ طور تھی کہ تار تھا نقاب کا

---

[1] بعض لوگوں کو یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ "اَرِنی" میں "ر" متحرک اور مکسور ہے مگر فانیؔ صاحب نے اسے ساکن باندھا ہے۔ لیکن یہ اعتراض قابلِ لحاظ نہیں اس لئے کہ آخر ایک کسرہ کی بساط ہی کیا ہے۔ ہوا تو کیا اور نہ ہوا تو کیا۔

تجاہلِ عارفانہ کی انتہا ہے۔ آپ کو خود سب کچھ معلوم ہے لیکن موسیٰ بیچارے کو جو اِن "اسرار و رموز" سے بالکل ناآشنا ہیں شرمندہ کرنے کے لئے آپ اس قسم کے سوالات اُن سے پوچھتے ہیں۔ اس سے زیادہ لطیف ایک عارفانہ نکتہ حضرتِ اصغر نے بیان فرمایا ہے:۔

سمجھ میں برقِ سرِطُور کس طرح آئے   جو موجِ بادہ میں ہیجان و اضطراب نہ ہو

کیا یہی ہیں وہ اشعار" جن کے سامنے" بقول فراق" منظوماتِ صحافت کا نام لینا ان کا منہ چڑانا ہے؟" یہی ہیں وہ مضامین جنہیں "تخلیقی جدّت" سے تعبیر کرسکتے ہیں؟ اسی کا نام ہے" داخلی شاعری" جو "بڑی دقّ کرنے والی چیز ہے"؟

خُدارا انصاف! اِن خیالات و مضامین کو عشق و محبت کی دُنیا سے کیا سروکار ہے۔ نہ لذّتِ وصال نہ کاہشِ فراق۔ نہ رازونیاز نہ سوزوساز۔ نہ شورِ خندہ نہ جوشِ گریہ۔ طور، برقِ طور، شعلۂ سینائی، وادیِ ایمن، شجرِ وادیِ ایمن، آتش، تجلّی، غش، موسیٰ، کلیم، ربِ ارنی، لن ترانی، چند مقرّرہ الفاظ ہیں کہ اُن کا گھروندا بناکر ایک فرسودہ خیال کی بے رُوح گڑیا کو اُس میں بٹھادیا جاتا ہے۔ "نقادوں" نے اسی کا نام حقائق و معارف، اسرار و رموز، نکات و لطائف اور خُدا جانے کیا کیا رکھا ہے۔ مگر اس حقیقت کو کسی طرح چُھپایا نہیں جاسکتا کہ یہ سب ایک بے کیف نقالی ہے اور بس۔ پھر اس تقلیدِ بے معنی کے لئے صرف یہی ایک موضوع (طُور و کلیم) مخصوص نہیں۔ گُل و بُلبل، شمع و پروانہ، لیلیٰ مجنوں، یوسف زلیخا، شیریں فرہاد، دار و منصور، وغیرہ کے متعلق ہزاروں بے رُوح و بے مزہ اشعار کہے گئے اور کہے جارہے ہیں اور جدّت طرازی کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اس استخواں بندی کی داد طلب کی جاتی ہے۔ خُدا جانے ہماری یہ بے راہ روی متمدن دُنیا کے سامنے ہمیں کہاں تک شرمسار کرے گی۔

اِس بے مزہ داستان کو مختصر کرنے کی غرض سے ہم صرف دار و منصور کے متعلق اپنے چوٹی کے غزل گو شعرا کے چند اشعار بطور نمونہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ حضرتِ اصغر کے دل میں جب دریائے معرفت جوش زن ہوتا ہے تو آپ بارگاہِ ایزدی سے "انا الحق" کہنے کی اجازت طلب کرتے ہیں:۔

ترجُمانی کی مجھے آج اجازت دیدے   شجرِ طُور رہے ساکت لبِ منصور خموش

جنابِ جگر اپنے مُرشد کے طور بے طور دیکھکر عرض کرتے ہیں کہ حضور اس میں شک نہیں کہ "انا الحق" کہنا عینِ ایمان ہے مگر یہ کمبخت دُنیا والے تو بالکل اندھے ہیں۔ اِن کی سمجھ میں یہ نکتہ کبھی نہ آئے گا۔ اور حضور پر کُفر کا فتویٰ دے کر منصور کی طرح حضور کو پھانسی پر لٹکادیں گے۔ جگر:۔

عینِ ایمان ہے حقیقت کا ترانہ لیکن   ہے یہی کُفر اگر دیدۂ منصور نہ ہو

حضرتِ اصغر اپنے مُریدِ با اخلاص کی گُذارش پر مطلق اعتنا نہیں کرتے اور بے اختیار چلا اُٹھتے ہیں کہ:۔

نہیں معلوم یہاں دار و رسن ہو کہ نہیں   خُون میں گرمیِ ہنگامۂ منصور ہے آج

جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرتِ اصغر کا یہ دعویٰ ایک پُرانے بُزرگ کے اس نعرۂ عشق کی صدائے بازگشت ہے:۔

؎ عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شُد   من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

معلوم نہیں حضرت اصغر نے جناب جگرؔ سے دریافت کیا تھا یا کسی اور سے کہ "یہاں دار و رسن ہے کہ نہیں" لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دار و رسن آپکے سامنے پیش کئے گئے تو انہیں دیکھکر انجام کے خیال سے آپ کے چھکے چھوٹ گئے اور حواس باختہ ہو گئے۔ اور "اسرار و حقائق" جو آپ بیان فرمانا چاہتے تھے انہیں صندوقِ سینہ ہی میں بند رہنے دیا اور منہ پر خاموشی کا تالا لگا دیا۔ لوگوں کا اصرار جب حد سے بڑھا کہ حضرت کچھ تو ارشاد فرمائیے تو آپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ بھائیو مجھے اپنی جان بہت پیاری ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے "بھید" کی ایک بات بھی کہی تو تم لوگ مجھے دار پر کھینچ دوگے:۔

اٹھاؤں پردۂ ہستی جو ہو جہاں نہ خراب　　　سناؤں رازِ حقیقت جو خوفِ دار نہ ہو

جان کے خوف سے آپنے "رازِ حقیقت" تو فاش نہ کیا مگر مدتوں آپ پر ایک جذب کا عالم طاری رہا چنانچہ ایک مرید خاص نے جب احوال پرسی کی تو آپنے فرمایا:۔

قلب پر اب تک تڑپتی ہے شعاعِ برقِ طور　　　خون کے قطروں میں ابتک رقصِ منصوری بھی ہے

"رقصِ منصوری" سے انگریزوں اور میموں کا وہ ناچ مقصود نہیں جو منصوری پہاڑ پر بڑے بڑے ہوٹلوں میں ہر شب کو ہوا کرتا ہے بلکہ یہاں منصور حلاج کا ناچ مراد ہے جو بغدادی ناچ کا ایک بہترین نمونہ اور اودے شنکر کے ناچ سے کہیں بڑھکر تھا۔

حضرتِ اصغر کے مرید با اختصاص جناب جگرؔ اپنے مرشد کے نقشِ قدم پر چلنے میں کمال رکھتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

جگرؔ:۔　　　اللہ اللہ رہی یہ رنگِ حقیقت کی بہار　　　کونسا خون کا قطرہ ہے جو منصور نہیں

رسم پرستی کا ایک افسوسناک واقعہ

اس رسم پرستی کا سب سے زیادہ افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے شعرا نے ہندوستان کی ہر چیز کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ انہیں اپنے اشعار کے لئے ہر شے ایران و عرب سے مستعار لینی پڑتی ہے۔ اُن کے نزدیک معیاری عشاق ہیں تو لیلیٰ مجنوں، حالانکہ "نلدمن[1]" اور دوسرے ہندوستانی عشاق کا مرتبہ کسی طرح اُن سے کم نہیں بلکہ بعض خصوصیات میں ہمارے ہندی پریمی، عشاقِ ایران و عرب سے کہیں بڑھکر ہیں۔ یا پھر گل و بلبل کی داستانِ محبت ہے لیکن بھونرے اور کلی کی طرف کبھی اُن کا خیال نہیں جاتا۔ نغمے ہیں تو بلبل کے، نالے ہیں تو بلبل کے۔ کوئل کی کوک اور پپیہے کی پی کہاں سے اُن کے دل پر چوٹ نہیں لگتی۔ عشق و محبت کی قربانیوں کے ذکر میں بیگانہ او رپادر ہوا تشبیہیں ہر شاعر کے یہاں مل سکتی ہیں لیکن "ستی" جیسی حقیقی اور بے مثال قربانی کا

---

[1] "لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد۔ یوسف زلیخا۔ اور نلدمن میں ایک دلچسپ صوری فرق یہ ہے کہ "نلدمن" تحریر میں بھی ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں یعنی دونوں نام ملاکر لکھے جاتے ہیں۔ گویا یہ بھی اُنکے اتحادِ معنوی کا ایک کرشمہ ہے۔ اسکے برعکس لیلیٰ مجنوں وغیرہ جس طرح عملی زندگی میں ایک دوسرے سے جُدا ہیں تحریر میں اُنکے نام علیحدہ علیحدہ ہی لکھے جاتے ہیں" (یہ نوٹ میرا نہیں۔ شادانی)

ذکر کبھی کوئی بھولے سے بھی نہیں کرتا۔ خسرو علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے:-

در محبت چوں زنِ ہندو کسے مردانہ نیست سوختن بر شمعِ مردہ کارِ ہر پروانہ نیست

مانا کہ رستم ایک زبردست تیغ آزما تھا حالانکہ فردوسی تو اُسے ایک معمولی پہلوان بتاتا ہے:-

منش کردہ ام رستمِ داستاں وگرنہ یلے بود در سیستاں

لیکن ہندوستان میں بھی تو آخر بڑے بڑے سورما گذرے ہیں۔ کیا شجاعت و جانبازی کا ذکر کرتے وقت ان کا نام لینا گناہ ہے؟ کیا ارجن کا پایہ رستم سے کسی طرح کم ہے؟ اس بیگانہ پرستی کا سبب اسلامی عصبیت ہرگز نہیں اس لئے کہ اردو کے ہندو شعرا نے بھی عموماً اس مانگے تانگے ہی کے سامان سے اپنا گھر سجایا ہے اور یہ ایک بالکل قدرتی بات ہے، اس لئے کہ جب شاعری کا مدار تقلید و نقالی پر ہو تو اپنے گرد و پیش کے مطالعہ اور مشاہدہ کی ضرورت ہی کب باقی رہتی ہے۔

ہمارے یہاں عام طور پر محبوب کی آنکھ کو نرگس سے تشبیہ دی جاتی ہے مگر جس نے نرگس کا پھول دیکھا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ کسی حسین آنکھ کو نرگس سے تشبیہ دینا آنکھ کی توہین کرنا اور اپنی بد مذاقی کا ثبوت دینا ہے۔ ایرانیوں نے جب تُرک بچوں کو معشوق بنایا اور اُن کی آنکھوں کو نرگس سے تشبیہ دی تو یہ کچھ ایسی بے تکی بات نہ تھی اس لئے کہ ترکوں کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی گول کٹوری سی ہوتی ہیں۔ لیکن ہندی ذوق اور معیارِ جمال کے مطابق آنکھ کا چھوٹا اور گول ہونا حُسن نہیں بلکہ عیب ہے۔ مگر بیچارے شاعر کو اس حقیقت سے کیا واسطہ۔ اسکے لئے آنکھ کو نرگس سے تشبیہ دینے کی یہ وجہ بالکل کافی ہے کہ بڑے بڑے "استادوں" نے ایسا کیا ہے اور ظاہر ہے کہ "اساتذہ" کی تقلید بہرحال مستحسن ہے۔

اتفاق سے اگر کہیں بہار کا ذکر آجائے تو ہمارے شاعر کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایران کے ہر پھول کا ذکر کرے مگر خالص ہندی پھولوں کا نام لینا اس کے نزدیک کفر ہے۔ لالہ و گل۔ سنبل[1] و ریحاں، سوسن و نرگس، سمن و یاسمن وغیرہ ہر "استاد" کے یہاں آپ کو ملیں گے۔ مگر جوہی، موتیا، بیلا، چمپا، کنول اور دوسرے خالص ہندی پھولوں کو وہ ہرگز درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ کیا ان میں رنگ نہیں؟ بو نہیں؟ نزاکت و لطافت نہیں؟ آخر کس بات کی کمی ہے؟ نہیں۔ کسی بات کی نہیں۔ وہ رنگ و بو اور رعنائی کا ایک دلنواز مجموعہ ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ "اساتذہ" نے ان کو اپنے "شاعرانہ لغت" سے خارج کر دیا ہے۔ اس لئے ایک بیچارہ مقلّد شاعر خواہ وہ عصر حاضر کا بادشاہِ متغزلین ہی کیوں نہ ہو اپنے کلام میں ان کا ذکر کر کے ایک "بدعتِ سیئہ" کا مرتکب ہرگز نہیں ہو سکتا۔

کس قدر مضحکہ انگیز بات ہے کہ ہمارا شاعر سمن بر، سمن بو، سمن ساق، سمن سیما، سمن سینہ، سمن عذار، سمن زار، سمنستاں، سمن برگ، وغیرہ مرکبات اپنے اشعار میں بے تکلف استعمال کرے لیکن اگر اس سے پوچھا جائے کہ تم نے "سمن" کا پھول کبھی دیکھا بھی ہے تو سوائے بغلیں جھانکنے کے اور کوئی جواب اس سے نہ بن پڑے۔ ظاہر ہے کہ جب گلِ سمن ہندوستان میں پیدا ہی نہیں ہوتا تو وہ کہاں سے دیکھ سکتا ہے اور بغیر دیکھے محض رسم و تقلید کی بنا پر اس لفظ کا استعمال کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک مادرزاد اندھا اپنے سماعی علم کی بنا پر دورانِ گفتگو میں کالی ڈاڑھی۔ سفید پگڑی اور ہری گھاس وغیرہ الفاظ کا بے تکلف استعمال

[1] سنبل ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے۔ شاہد احمد

کرتا ہے حالانکہ سیاہ، سفید، سبز یا کسی دوسرے رنگ کا مفہوم واضح طور پر ہرگز اُس کے ذہن میں متعین نہیں ہوتا اور نہ ہو بھی کیونکر سکتا ہے جبکہ وہ مرئیات کے آلۂ ادراک یعنی بینائی سے محروم ہے۔ آخر سماعت کس حد تک بصارت کا بدل ہو سکتی ہے۔

پھر غور سے دیکھئے تو ہمارے شاعر کا سماعی علم ایک نابینا کے سماعی علم سے زیادہ ناقص تر ہے اس لئے کہ سفید سیاہ اور سبز وغیرہ کے بارے میں تو کوئی اختلاف رائے نہیں اور ان الفاظ کا جو کچھ بھی مفہوم اُس کی سمجھ میں آتا ہے وہ ایک ہی ہے مگر "سمن" کے بارے میں کسی اور کا تو ذکر کیا ہندی لغت نویس تک متفق الرائے نہیں۔ صاحبِ "کشف" کا قول ہے کہ "سمن ایک سفید پھول ہے جو ہندوستان میں نہیں ہوتا" مؤید الفضلا میں لکھا ہے کہ "سمن کو ہندوستان میں چنبیلی کہتے ہیں"۔ اور شرح مخزن میں بیان کیا گیا ہے کہ "سمن وہی ہے جو ہندوستان میں جپا کہلاتا ہے"۔ صاحب برہان قاطع کا بیان ہے کہ "سمن تپتیا کے پھول کو کہتے ہیں۔ وہ گول، صد برگ، اور یاسمن کے رنگ کا ہوتا ہے"۔ اور بعضوں کا قول ہے کہ "سمن میں پانچ پنکھڑیاں ہوتی ہیں"۔ منشی ٹیکچند بہار کہتے ہیں کہ "سمن ایک سفید اور خوشبودار پھول ہوتا ہے۔ اُس میں کُل تین پنکھڑیاں ہوتی ہیں اور کبھی مائل بسرخی ہوتا ہے"۔ غیاث اللغات میں سمن کا رنگ زرد بتلایا گیا ہے۔ یہ تحقیق ہے ہمارے اہل لغت کی اور اسی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے نقال شعرا کے نزدیک سمن کا مفہوم کہاں تک متعین اور متحقق ہے۔

پھر ایک سمن ہی پر کیا منحصر ہے۔ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کا ذکر ہمارے شعرائے کامل ناواقفیت کے باوجود اس شان سے کیا ہے گویا وہ اُن کے مشاہدہ اور تجربہ میں آ چکی ہیں۔ بُلبُل کے نالوں اور زمزموں پر ہر شاعر سر دُھنتا ہے مگر بلبل نہ کسی نے دیکھا نہ کبھی اس کی آواز سُنی۔ بربط و چنگ و رباب کے نغموں سے ہر شاعر کے دیوان کی فضا گونج رہی ہے مگر ان بزرگوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے اِن آلاتِ موسیقی کے دیکھنے اور اُن کے آہنگ سے لُطف اندوز ہونے کا موقع نصیب ہوا ہو۔ پھر کیا ہندوستان کا کوئی ساز اس قابل نہیں کہ بربط و چنگ و رباب کا مقابلہ کر سکے؟ ہندی موسیقی کی افضلیت مُسلّم، اور یہ بھی تسلیم کہ انسانی آواز کا ساتھ دینے کے لئے سارنگی سے زیادہ مکمل ساز کوئی نہیں مگر مجبوری یہ ہے کہ متقدمین بربط و چنگ و رباب ہی باندھ گئے ہیں۔ سارنگی کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔ بیچارے مقلدین میں اتنی جُرأت کہاں کہ تقلید کی "شاہراہ" سے ایک قدم اِدھر اُدھر ہٹ جائیں۔

اچھا سارنگی، ستار، سرسنگھا، بین (سپیرے کی بین نہیں) وغیرہ کو جانے دو۔ یہ تو اُونچے درجے کی چیزیں ہیں۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ ہندوستان کی ننھی بانسری کے میٹھے اور رسیلے سُروں نے بھی کیا کبھی "شاعر" کے "حساس" دل پر اثر نہیں کیا۔ اثر تو ضرور کیا ہوگا مگر وہ اس کا ذکر کیسے کرے اس لئے کہ تقلید کے مذہب میں اجتہاد کفر ہے۔ ایران میں لالۂ صحرا کی بہاریں ہم نے بھی دیکھی ہیں اور قدرت کے اس حسین منظر کی باصرہ نوازیوں کا ان شعرا سے کہیں زیادہ اندازہ ہے جنہیں کبھی اس "جنّت نگاہ" سے لُطف اندوز ہونے کا موقع نہیں ملا اور جن کا علم محض سماعی ہے۔ مگر "انصاف بالائے طاعت" "بسنت رُت میں جب سرسوں پھولتی ہے اور حدِ نگاہ تک کھیت بسنتی مخمل کی ردا اوڑھ لیتے ہیں تو یہ منظر کچھ ایسا دلنواز، رُوح پرور اور وجد آفریں ہوتا ہے کہ ایران کے لالۂ صحرا کی ہزار بہاریں اس پر قربان ہیں۔ ہمارے شاعر نے بھی بسنت کی بہار دیکھی ہے۔ کھیتوں میں سرسوں پھولی دیکھ کر اُس کا دل فرطِ نشاط سے بیخود ہو ہو گیا ہے مگر اپنے اشعار میں اس کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے اسلئے ڈرتا ہے کہ اُس کے مسلّمہ

اُصولِ شاعری یعنی نقالی نے اس کو روا نہیں رکھا۔

یہ ایک مُسلّمہ حقیقت ہے کہ ہر قوم کی شاعری اُس کے اخلاق و معاشرت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ تاریخ غلط بیانی کر سکتی ہے مگر شاعری جو کسی پروپیگنڈہ کی غرض سے نہ کی گئی ہو۔ ہرگز جھوٹ نہیں بولتی۔ لیکن ہماری شاعری خصوصًا غزل گوئی کو اگر اس معیار پر جانچا جائے تو صورتِ معاملہ بالعکس نظر آئے گی۔ یہاں سب کچھ ہے مگر اصلیت و حقیقت۔ ایک یوروپین جو کبھی ہندوستان نہیں آیا ہمارے بیسویں صدی کے اُستاد کا دیوانِ غزلیات پڑھنے کے بعد یہ رائے قائم کرنے میں یقینًا حق بجانب ہے کہ:۔

(۱) ہندوستان میں ابھی تک ایرانِ قدیم کی طرح بادہ و ساغر کی محفلیں جمتی ہیں اور ساقی ماہوش شراب پلاتا ہے۔
(۲) ہندوستان کی عورتوں میں ابھی تک "نقاب" پہننے کا رواج ہے۔
(۳) ہندی معشوق تلوار چلانے کے فن میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔
(۴) ہندوستان میں معشوق کو جب غصہ آتا ہے تو اپنے چاہنے والے کو چھری یا تلوار یا تیر سے ہلاک کر ڈالتا ہے۔
(۵) ہندوستان میں بیسویں صدی میں بھی تیر کا استعمال کیا جاتا ہے۔
(۶) ہندوستان میں عاشق کا قتل بہرحال جائز ہے۔ قانون اس کی اجازت دیتا ہے۔
(۷) ہندوستان میں بھی یورپ کی طرح معشوق سے سربزم ملاقات ہوتی ہے۔
(۸) ہندوستان میں جس طرح کمسنی کی شادی کا رواج ہے اسی طرح کمسنوں سے عشق کرنا بھی مروّج ہے۔
(۹) شاعر کے لئے شرابی ہونا ضروری ہے۔
(۱۰) شعرا کے نزدیک مسلک رندی کے سوا ہر دین و مذہب سوختنی ہے۔
(۱۱) ہر شاعر کچھ دنوں عشقبازی کرنے کے بعد پاگل ہو جاتا ہے۔
(۱۲) بلبل صرف ایران ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان میں بھی پایا جاتا ہے۔
(۱۳) بعض پھول جو عام طور پر ایرانی خیال کئے جاتے ہیں وہ ہندوستان میں بھی پیدا ہوتے ہیں۔
(۱۴) بربط و چنگ و رباب خاص ہندوستانی آلاتِ طرب ہیں۔

وغیرہ وغیرہ۔

مگر ان میں سے کتنی باتیں سچّی ہیں؟ کیا یہی ہے ہماری معاشرت؟ یہی ہیں ہمارے اخلاق جن کی تفصیل ہمارے شُعرا نے بیان کی ہے؟ کاش ہمارے محترم پروفیسر فراق اُردو غزل کو کبھی اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھتے۔

عندلیب شادانی

پریم کی ہولی

کس شان سے پھاگن آیا
سب جگ نے ساون گایا
چڑیوں نے مچایا شور
ہیں بھرتے قلانچیں ڈھور
میداں میں سہانا سبزا
وادی میں اُمنڈتا دریا
سب مست ہیں اپنی دُھن میں
ہے پاپ بدلتا پُن میں
تھا سینہ پہ جیسے ہات
لی من کی تہارے بات
کیا چیتا تم نے کہدیں؟ "پھر پریم کی ہولی کھیلیں"
جب کھا چکیں پوری، کھیر
جا پن گھٹ، لائیں نیر
پھر اس میں ملائیں رنگ
اور پیت کی خوشبو سنگ
پھر ایک گلا ہو، گائیں

اک رُوح بنیں، مل جائیں
ہو نظر کی اِک پچکاری
ہم بینا، جگ اندھیاری
رنگ جائیں رنگ میں اتنا
ہو فرق نہ "میں اور تو" کا
یوں اپنی دُوئی کو میٹیں "پھر پریم کی ہولی کھیلیں"
سنسار کو پیارا کام
اور اپنا اپنا نام
اے مُورکھ من، ناکام!
تو کب تک بولے 'شام'؟
ہے سب کو دھن کا شوق
اور ہوس مٹانے کا ذوق
کوئی خُوش خوش، جو ہر رُولے
کوئی دن بھر غلّہ تولے
جو سویا، اُس نے گنوایا
اور کام کیا، سو پایا

ہم بھی من سے من کو تولیں   پھر پریم کی ہولی کھیلیں
یہ جگ نہیں اپنی جائے
جو جئے یہاں، مر جائے
مرنا تو ہے بھاگوں سب کے
ہوں اَمر، تو بات بھی کچھ ہے
یہ گندا دھر، کثیف
ہم یاں ہوں؟ - اتنے لطیف!
بَن، پھول سے بڑھکر، خوشبو
اُڑ جائیں ہوا میں ہر سُو
پھر سارے جگ پر چھا جائیں
اور سب کو مست بنا جائیں
لے میدان اُونچا ڈھونڈیں   پھر پریم کی ہولی کھیلیں
تم مہر بنو، میں ماہ
دن، رات چلیں ہمراہ
ہو تم میں وفا کی گرمی
اور مجھ میں عشق کی جوتی
پھر باتیں ہوں پیاری پیاری
یا پھول جھڑی ہو سُلگی
ہوں جس سے جھڑتے تارے
بکھریں جو فلک پر سارے
جو پیت نگر کو جائیں
وہ ان کو راہ بتائیں
ہم اپنی منزل کھوجیں   پھر پریم کی ہولی کھیلیں
اِس دُھن میں تن، من میٹیں
یوں میٹیں، پریم ہی ہولیں
پھر پریم کو چاہے اشور
خود اِشور پریم اور سُندر
ہم اُس میں ملیں، وہ ہم میں
ہو فرق نہ بیش و کم میں
جب پیت سے اس کو اپنائیں
ہوں اَمر، جو چاہیں کروائیں
ہو پریم سے اس کا سودا
ہاں، پریم سے کیا نہیں ملتا
چلو ناتھ خُدا کو مولیں!   پھر پریم کی ہولی کھیلیں!

سید علی شاکر

نکات

زار نالی میرا اصول نہیں
دعوت غم مجھے قبول نہیں
مثل نقطہ ہوں بے نیاز جہات
میری دنیا میں عرض و طول نہیں

دل وہی پر ملال رہتا ہے
جس کو غم کا خیال رہتا ہے
ایسے موذی کو دور ہی سے سلام
جس سے دل پائمال رہتا ہے

پھول جب تک کھلا ہے خندہ ہے
رنگ و بو سے چمن بداماں ہے
رنگ و بو سے گیا جو افسردہ
اک ذرا ہو گیا جو افسردہ
عمر دنیا میں عبرتوں کا عنواں ہے

کیوں اپنی پیش کرے نبض غم کی؟
کیا پڑی ہے کسی کو ماتم کی؟
عقل جذبات کی غلام نہ ہو
یہی ہے شان ابن آدم کی

امین حزیں

سرکشی

دسمبر کا مہینہ بمبئی میں عجب چہل پہل کا ہوتا ہے۔ سمندر کی قربت کی وجہ سے شمالی ہند جیسی سردی تو نہیں پڑتی مگر موسم کافی خوشگوار ہو جاتا ہے۔ سیاحوں کی کثرت ہوتی ہے، تجارت فروغ پر ہوتی ہے، تفریح گاہوں پر ہجوم ہوتا ہے۔ غرض شہر کی نبض تیز ہو جاتی ہے اور ہر شخص اپنے جسم میں ایک نئی زندگی محسوس کرتا ہے۔

گل بانو...... نوجوان، لمبے سیاہ بالوں والی گل بانو........ بھی اپنے جسم میں ایک نئی تازگی اور اپنی روح میں ایک نئی تڑپ محسوس کر رہی تھی۔ اٹھارہ سالہ گل بانو زندگی کے اس دور سے گزر رہی تھی جب دل میں اُمنگیں اور دماغ میں منصوبے ہوتے ہیں۔ خود زندگی ہی ایک بہت دلچسپ، بہت رنگین کھیل ہوتی ہے۔ جب آنکھوں میں چمک ہوتی ہے اور چال میں والہانہ پن۔ جب حوصلوں سے سر اونچا ہوتا ہے اور دُنیا کی ہر طاقت اپنے سامنے ہیچ معلوم ہوتی ہے۔ جب دل میں دُنیا بدل دینے کی ہمّت ہوتی ہے اور حصول مقصد میں جانفروشی کی آرزو۔ گل بانو دو سال سے میڈیکل کالج میں تعلیم پاتی تھی۔ یہ اس کا تیسرا سال تھا۔ اور دو سال میں وہ باقاعدہ سند یافتہ ڈاکٹر ہو جائیگی۔ یہ خیال اس کے لئے کس قدر خوشگوار تھا۔ پھر وہ گھر کی قید سے آزاد ایک خود مختار شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کریگی۔ اس نے اپنی زندگی کے لئے ایک باقاعدہ پروگرام بنا رکھا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اپنا مطب مزدوروں کے محلے میں کھولیگی تاکہ ان بدنصیب عورتوں اور بچوں کا علاج کر سکے جو سرمایہ داری کی بدولت تنگ اور اندھیرے مکانوں میں رہتے ہیں اور جن کی آمدنی اتنی محدود ہوتی ہے کہ ڈاکٹر اور دوا کا خرچ تو کجا پیٹ بھر کر کھانا اور تن بھر کپڑا بھی میسّر نہیں آتا۔ اس کو روپیہ پیدا کرنے کا شوق نہ تھا۔ اس کے باپ نے جو پچیس ۲۵ برس تک ایک سیٹھ کے کپڑے کے کارخانے کا مینجر رہا تھا کافی روپیہ پیدا کیا تھا۔ مگر گل بانو کو بچپن ہی سے اس اقتصادی نظام سے سخت نفرت تھی جس کی خدمت سے اس کے باپ نے دولت کمائی تھی۔ اس نے اپنے باپ کو مزدوروں پر ظلم کرتے ہوئے دیکھا تھا، اس نے گڑگڑاتی ہوئی عورتیں اور سسکتے ہوئے بچے دیکھے تھے۔ اس نے کارخانے کے مالک سیٹھ سلیمانی کا مالابار ہل پر عالیشان محل دیکھا تھا اور کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کی اندھیری اور بدبودار "چالیں" بھی جہاں چھوٹے چھوٹے کمروں میں دو ۲ دو ۲ خاندان زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اس نظام کو بدلنا چاہتی تھی جو ایسا ظلم روا رکھتا ہے۔ اور اس کا ارادہ تھا کہ ڈاکٹری کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی کام بھی کرے گی۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ ہر گھر میں جا سکے گی اور اس طرح وہ ان مزدوروں اور ان کی عورتوں کے بجھے ہوئے دلوں اور دماغوں کو روشن کرے گی، اُن کو اُن کے حقوق سے آگاہ کرے گی، اور اس جنگ کے لئے تیار کرے گی جو ایک دن ایک نیا اور بہتر نظام قائم کرنے والی ہے۔ اس کے یہ خیالات اگر ایک طرف اس کے مشاہدہ کا نتیجہ تھے جو اسکو اپنے باپ کے کارخانے اور میڈیکل کالج کے ہسپتال میں حاصل ہوا تھا تو دوسری

طرف وہ اشتراکی تحریک کی ہنگامہ خیز کارروائیوں اور پُرجوش انقلابی لٹریچر سے بھی متاثر ہوئی تھی۔ اُس نے مزدوروں کو سُرخ جھنڈے لئے ہوئے جلوسوں میں دیکھا تھا، اشتراکی لیڈروں کی تقریریں سُنی تھیں، اشتراکیت پر چند ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ اس نے دیکھا تھا کہ اس کی عمر کے لوگوں کا رجحان کدھر تھا۔ نئے خیالات کی اس رو میں تڑپ رکھنے والا ہر ایک دل تھا۔ زمانے کا تقاضہ اور اس کے اپنے دماغ کا یہی فیصلہ تھا کہ وہ اس تحریک کا ساتھ دے۔ مانا کہ اکثر کھاتے پیتے "سفید پوش" اشتراکیوں کی طرح عوام کی بہبودی میں اس کی دلچسپی کسی قدر "ہمدردانہ" اور "مشفقانہ" تھی۔ اور اس ہمدردی کا اظہار بھی فی الحال الفاظ ہی تک محدود تھا۔ مگر باوجود ان ناگزیر کمزوریوں کے جو اس کو پچھلی نسلوں سے ورثہ میں ملی تھیں اس میں سماجی حقائق سمجھنے کی صلاحیت تھی اور خدمتِ خلق کا جذبہ۔

کالج میں، گھر پر، راستہ میں وہ یہی منصوبے بنایا کرتی۔ مگر اپنی اس خیالی دنیا میں وہ اکیلی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک رفیق اور دوست کی حیثیت سے، اس کا شوہر بھی ہوتا تھا۔ وہ ایک خوش مزاج اور خوددار نوجوان تھا۔ جو اس کی خانگی، فنی اور سیاسی زندگی میں برابر کا شریک تھا۔ لیکن وہ کون تھا، اس کا نام کیا تھا یہ گل بانو کو بھی نہ معلوم تھا۔ باقی تمام منصوبوں کی طرح یہ خیالی شوہر بھی فقط اس کے دل اور دماغ میں مکین تھا۔ ظاہری دُنیا میں اس کی ابھی کوئی اصلیت نہ تھی۔ مگر پھر بھی اکثر گل بانو خیالی شریکِ زندگی کے متعلق اتنا سوچتی کہ یہ محسوس ہونے لگتا کہ گویا وہ واقعی کوئی اصلیت رکھتا ہے۔

ایک دن وہ ایسے ہی خوشگوار خیالات میں مست کالج کے دروازے سے نکل کر ٹرام کی طرف جا رہی تھی کہ موتی لال نے آواز دی۔ موتی لال گل بانو کا ہم جماعت تھا۔ وہ ایک محنتی اور خاموشی پسند طالب علم تھا۔ اور لڑکوں کی طرح وہ لڑکیوں کے پیچھے مارا مارا نہ پھرتا تھا۔ کلاس کی لڑکیوں میں اُس کی ملاقات بھی فقط گل بانو ہی سے تھی۔ وہ بھی اس لئے کہ عمل جراحی کے کمرے میں ان کو ایک ہی میز پر کام کرنا پڑتا تھا۔ گو ہفتہ میں کئی بار ان دونوں کا اس طرح ساتھ ہوتا تھا مگر وہ سوائے رسمی علیک سلیک یا کام سے متعلق گفتگو کے کبھی اور بات نہ کرتا۔ دراصل وہ فطرتاً بہت کم گو اور حساس واقع ہوا تھا۔ اس کو ہمیشہ یہ خطرہ رہتا تھا کہ اگر اس نے گل بانو سے بات کرنے میں ابتدا کی اور اس نے جھڑک دیا تو سخت خفت ہوگی۔ مگر آج کے زندگی بخش موسم نے اس کے دل میں بھی جرأت پیدا کر دی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ آج وہ گل بانو کو اپنے ساتھ سینما دیکھنے کی دعوت ضرور دیگا۔ خواہ وہ انکار ہی کیوں نہ کر دے۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟" اس نے سلسلۂ کلام شروع کیا۔

گل بانو کو موتی لال سے کافی دلچسپی تھی۔ وہ مدّت سے جانتی تھی کہ وہ اس سے مُلاقات بڑھانا چاہتا ہے مگر جھجکتا ہے۔ دراصل وہ اس انتظار ہی میں تھی کہ موتی اس کی طرف اپنی توجہ کا اظہار کرے۔ دوسری لڑکیوں کی طرح گل بانو کے دل میں بھی خواہش تھی کہ کوئی معقول نوجوان اس سے دلچسپی لے، اُسکو اپنا ہمراز بنائے اور اس کا ہمراز بنے۔ کلاس کے کئی لڑکے گل بانو کی نظرِ التفات کے اُمیدوار رہتے تھے۔ لیکن وہ سب چھچھورے اور بدتمیز قسم کے تھے۔ اور گل بانو جیسی

طبیعت کی لڑکی کے لئے ان میں دلچسپی لینا ناممکن تھا۔ موتی لال ان سب سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا شرمیلا پن، صنفِ نازک کی موجودگی میں گھبراہٹ، یہ اس کی وہ خصوصیات تھیں جو گل بانو کے لئے ایک عجیب کشش رکھتی تھیں۔ آج جب موتی نے خود گفتگو میں پیش قدمی کی تو اس کی دلی مُراد بر آئی۔

"گھر جا رہی ہوں۔ اور کہاں جا سکتی ہوں؟" اُس نے مُسکرا کر جواب دیا۔

"ایسی جلدی کیا ہے؟ قریب ہی سینما میں پال مونی کا فلم 'لوئی پاستیور' ہو رہا ہے۔ اگر حرج نہ ہو تو چلئے دیکھ لیں۔"

گُل بانو نے جواب دینے سے پہلے کچھ توقف کیا۔ اسکو میڈیکل کالج میں داخل ہوئے دو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا مگر اب تک وہ اکیلی کسی لڑکے کے ساتھ سینما نہ گئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ گو اس کا گھرانہ پردہ کی بندشوں سے آزاد تھا مگر اس کے والدین سوائے کالج کے کہیں اور گل بانو کو تنہا جانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اگر آج وہ موتی لال کے ساتھ سینما چلی گئی تو یقین تھا کہ گھر پر بُری طرح ڈانٹ پڑے گی۔ اس خوف کے ساتھ ساتھ اس کا دل سینما جانے کو بھی بُری طرح چاہ رہا تھا۔ تین مہینے سے اس نے کوئی فلم نہ دیکھا تھا کیونکہ اس کا بڑا بھائی جس کے ساتھ وہ کبھی کبھی سینما جایا کرتی تھی احمد آباد گیا ہوا تھا۔ پال مونی اس کا محبوب فلم سٹار تھا اور اس کے فلم "لوئی پاستیور" کی تعریف اس نے ہر ایک سے سُنی تھی۔ یہ فلم اٹھارویں صدی کے مشہور فرانسیسی ڈاکٹر "لوئی پاستیور" کے حالاتِ زندگی پر مبنی تھی جس نے باوجود قدامت پسند طبیبوں کی سخت مخالفت کے، انجکشن کے ذریعہ ایک نئے طریقۂ علاج کی بنیاد ڈالی تھی۔ گل بانو نے لوئی پاستیور کا نام اپنی درسی کتابوں میں پڑھا تھا اور اس کے لازوال طبّی کارناموں کی وہ زبردست معترف تھی۔ میڈیکل کالج کا تقریباً ہر طالب علم اس فلم کو دیکھ چکا تھا۔ شاید فقط ایک گل بانو ہی رہ گئی تھی۔

"مگر آپ تو یہ فلم دیکھ چکے ہیں نا؟" اُس نے موتی لال سے سوال کیا۔

"جی ہاں، مگر آپ نے تو نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ میں خود اس فلم کو دوبارہ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

گُل بانو کے دل میں والدین کے خوف اور فلم دیکھنے کے شوق میں کشاکش ہو رہی تھی۔ مگر والدین کی ڈانٹ تو بعد میں پڑے گی۔ فی الحال تو اس خوشگوار موسم کے کئی گھنٹے ایک دلچسپ رفیق کی صحبت میں گذارنے اور ایک بلند پایہ فلم دیکھنے کی خواہش تھی۔ دسمبر کی اس سہ پہر میں باغیانہ خیالات کو بھڑکانے کی ایک عجیب طاقت تھی۔ ماں باپ کے خوف پر موتی لال کا اصرار غالب آ گیا۔

گل بانو نے کہا "بہت اچھا۔ چلئے۔"

(۲)

وہ شام گل بانو کی زندگی کی دلچسپ ترین شام تھی۔ باوجود اپنی فطری کم گوئی کے موتی لال ابتدائی جھجک نکل جانے بعد نہایت بامذاق اور دلچسپ باتیں کرنے والا ثابت ہوا۔ سینما کے شروع ہونے میں تھوڑی دیر تھی۔ دونوں نے ایک ریسٹوران میں چائے پی۔ گفتگو کا سلسلہ سینما شروع ہونے تک جاری رہا۔ دُنیا کا شاید ہی کوئی مسئلہ ہو جس پر ان دونوں نے تبادلۂ خیالات نہ کیا ہو۔ سیاست، سماجی رسوم، معاشیات، موجودہ طبی رجحانات، ادبی مسائل۔

موتی لال کی عام واقفیت حیرت انگیز تھی، اور گل بانو بھی دُنیا کے مسائل کے متعلق اتنا ضرور جانتی تھی کہ اُن پر گفتگو کر سکے۔ اکثر باتوں پر ان کو اتفاق تھا۔ موتی لال بھی ڈاکٹری تعلیم کو فقط روپیہ پیدا کرنے کا ذریعہ نہ سمجھتا تھا۔ مگر اس کے خیالات میں زیادہ پختگی تھی۔ اس نے دُنیا کا نشیب و فراز دیکھا تھا۔ بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کی وجہ سے اس کو عمر بھر اپنے پر بھروسہ کرنا پڑا تھا۔ ایک رشتہ کے چچا اور وظائف کی مدد سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ افلاس کی تکلیف وہ حقیقت سے ذاتی طور پر واقف تھا۔ گل بانو کی طرح اس کی اشتراکیت غریبوں کی "ہمدردی" پر نہیں بلکہ خود اپنی مفلسی کے تجربات پر مبنی تھی۔ جب اس نے اپنے اور گل بانو کے لئے نو آنے کے ٹکٹ خریدے تو گل بانو (جو ہمیشہ اُونچے درجے میں جانے کی عادی تھی) یہ سمجھی کہ یہ بھی کوئی اشتراکی اصول ہے کہ فضول خرچی نہ کی جائے۔ کہنے لگی "یہ بہت ٹھیک ہے۔ بھلا بیکار پیسے خرچ کرنے سے کیا فائدہ۔ ہزاروں غریب بیچارے تو چار آنے والا ٹکٹ بھی نہیں خرید سکتے۔" موتی مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ گل بانو کو کیا معلوم تھا کہ اس کے ساتھی کی جیب میں یہ ٹکٹ خریدنے کے بعد فقط چار آنے باقی رہ گئے تھے۔ ان میں سے دو آنے ٹریم کے کرائے پر خرچ ہو گئے جب وہ سینما ختم ہونے پر گل بانو کو اس کے مکان تک چھوڑنے گیا۔

نو بج رہے تھے جب گل بانو مکان میں داخل ہوئی۔ شام بھر وہ اس قدر خوش رہی تھی کہ اس کو اب تک یہ خیال نہ آیا تھا کہ اس کی اتنی رات گئے واپسی پر گھر میں ایک طوفان بپا ہوگا۔ ماں باپ دونوں گول کمرے میں بھرے ہوئے بیٹھے تھے۔ جاتے ہی ماں نے للکارا۔

"اری او کلّو، ادھر آ" اور پھر طنزیہ لہجہ میں "اب تک کہاں تھیں، میم صاحب؟"

گل بانو نے کبھی اپنے والدین سے جھوٹ نہ بولا تھا۔ "معاف کیجئے گا اماں، اگر آپ کو اور ابّا کو کھانے پر میرا انتظار کرنا پڑا۔ میں ایک دوست کی ساتھ سینما دیکھنے چلی گئی تھی۔"

"کس دوست کی ساتھ؟" اس کے باپ نے بگڑ کر سوال کیا۔

"موتی لال کی ساتھ۔ میرا ہم جماعت ہے۔"

اس جواب سے تو گویا گل بانو کے ماں باپ کے مزاج کا پارہ آسمان پر پہنچ گیا۔ باپ کو جتنی گالیاں اور ماں کو جتنے کوسنے یاد تھے وہ موتی لال کی تعریف میں صرف ہو گئے۔

ماں نے آنسو بہا کر کہا "میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ لڑکی کو کالج میں مت داخل کرو۔ آخر کو وہی ہوا نہ جس کا کھٹکا تھا......"

"آخر کیا ہوا؟" گل بانو جواب تک دم سادھے کھڑی تھی تنگ آ کر بولی۔ "مجھے بھی تو اپنا جرم معلوم ہو۔"

"جرم پوچھتی ہے!" باپ نے گرج کر کہا۔ "ایک کافر بچے کی ساتھ پھرو تم اور ہم سے پوچھو کہ جرم کیا ہے؟ آوارہ کہیں کی۔"

گل بانو کو بچپن سے والدین کی اطاعت کا سبق پڑھایا گیا تھا۔ اس کو اپنے ماں باپ سے محبّت بھی بہت تھی اور اُنکا

ادب بھی کرتی تھی۔ مگر اس کا جذبۂ خودداری فنا نہ ہوا تھا۔ اپنی عصمت کی یہ تحقیر سُنکر اُس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ ادب اور لحاظ، محبّت اور اطاعت کے تمام جذبات ایک لمحہ کے لئے مفقود ہوگئے۔ اس وقت وہ کسی کی اولاد نہیں تھی۔ وہ ایک عورت تھی جس کے پاک دامن پر ایک ناروا دھبہ لگا یا گیا تھا۔ غصّہ سے اس کی آواز کانپ رہی تھی، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ مگر نسوانی وقار نے اس کی گردن نہ جُھکنے دی۔ سر اونچا کرکے بولی۔ "گستاخی معاف کیجئے ابّا۔ میں یہ الفاظ نہیں سُن سکتی۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ چاہیں تو آپ میری گردن اُڑا سکتے ہیں، مگر میری آبرو پر بٹّہ لگانے کا اختیار آپ کو بھی نہیں ہے۔"

اس کے باپ کو کبھی یہ گمان نہ تھا کہ بیٹی ایسا جواب دیگی۔ ایسی گستاخی، یہ جرأت! اس کی تو فوراً سزا دینی چاہیئے۔ ماں بھی چلّا کر بولی۔ "لو سُن لو صاحبزادی صاحبہ کی باتیں۔ آج ٹرٹر جواب دے رہی ہے۔ کل ہم پر ہاتھ اٹھائے گی۔" اب تو اس کے باپ کی آتش غضب اور بھی بھڑک اٹھی۔ چلّا کر کہا۔ "بھلی خیر ہے تو نکل جا یہاں سے۔ اسی دم۔ میرے گھر میں آوارہ لڑکی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

یہ سُنکر گل بانو سنّاٹے میں آگئی۔ اب تک اس کو خیال تھا کہ زبانی ڈانٹ ڈپٹ پر بات ٹل جائے گی۔ مگر جب گھر چھوڑنے کا حکم سُنا تو وہ کئی سیکنڈ اسی سوچ میں کھڑی رہی کہ کیا کرے۔ ان حالات میں گھر میں رہنا ناممکن نظر آتا تھا۔ مگر گھر چھوڑے تو جائے کہاں۔ اسی کش مکش میں تھی کہ باپ کے الفاظ پھر کان میں گونجے "میرے گھر میں آوارہ لڑکی کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔" اس نے بغیر ایک لفظ کہے ساڑہی کا پلّو سر پر ڈالا اور خاموشی سے دروازے کے باہر نکل گئی۔

چند منٹ تک کمرے میں سنّاٹا چھایا رہا۔ گل بانو باہر دہلیز کے برابر کئی منٹ تک کھڑی رہی اس اُمید میں کہ دوبارہ سوچنے پر اُسکے والدین پھر اندر بلالیں گے۔ مگر وہ دونوں اس خیال میں تھے کہ گل بانو اُن سے معافی مانگ لیگی اور آیندہ ایسی حرکت نہ کرنے کا وعدہ کریگی۔ مگر وہ بھی ان کی ہی اولاد تھی۔ دونوں طرف ضد برقرار رہی۔

گل بانو کے گھر کا قاعدہ تھا کہ دس بجے رات کو صدر دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ جب گھنٹہ بجنا شروع ہوا تو گل بانو کی ماں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ "بند کردو" وہاں سے حکم ملا۔ گل بانو نے حسرت بھری نگاہوں سے مُڑکر دیکھا۔ چٹخنی چڑھانے کی آواز آئی اور والدین کے گھر کا دروازہ اُسکے لئے ہمیشہ کے واسطے بند ہوگیا۔

(۳)

پانچ مہینے گذر گئے۔ اس عرصہ میں گل بانو کی زندگی میں ایک انقلاب ہوچکا تھا۔ وہ اب ایک دولتمند گھرانے کی خوش پوش اور بے فکر لڑکی نہیں بلکہ ———— ہسپتال میں ایک نرس تھی گھر سے نکالے جانے پر اس نے کالج سے نام کٹا لیا تھا۔ کیونکہ بغیر والدین کی مدد کے وہ فیس اور کتابوں کے اخراجات برداشت نہ کرسکتی تھی۔ میڈیکل کالج میں تین سال تعلیم پانے کی وجہ سے اس کو نرس کا کام ملنے میں آسانی ہوئی اسکو چالیس روپے ماہوار

ملتے تھے - جس میں سے پچیس کھانے اور کمرے کے کرایہ میں چلے جاتے تھے - پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح گذارہ کرتی تھی - اب اسکو عمر میں پہلی مرتبہ مفلسی کا تجربہ ہوا تھا - ہسپتال کا کام سخت تھا اور تنخواہ کم - پانچ ہی مہینے میں گل بانو کو معلوم ہوگیا کہ سماج سے بغاوت آسان کام نہیں ہے - مگر اس کی فطری ضد اور خودداری اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ مالی امداد کے لئے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے - ہر ہفتے وہ اپنی خیریت کا ایک پوسٹ کارڈ ماں کے نام بھیج دیتی تھی مگر کبھی خرچ کے لئے روپیہ نہ طلب کیا - ایک دفعہ محبت سے مجبور ہوکر ماں نے کچھ روپیہ بھیجا بھی تو گل بانو نے واپس کر دیا - دراصل اس کے دل میں اب بھی اپنے ماں باپ کے لئے اتنی ہی محبت تھی - کوئی غصہ یا نفرت کا جذبہ اُن کے خلاف نہ تھا ——— کہ وہ دونوں اپنے ماحول اور تربیت اور سماجی نظریہ سے مجبور ہیں - جو کچھ ظلم انہوں نے اس پر کیا اس میں ان کا نہیں بلکہ اس سماجی نظام کا قصور تھا جو ایسے حالات روا رکھتا ہے - اس لئے اس کے دل میں اگر بے پناہ غصہ تھا تو سماج کے خلاف اور اس کے اُن قوانین کے خلاف جو ایک عورت کے ساتھ لونڈی غلاموں کا سلوک کرتے ہیں -

اس عرصہ میں موتی لال کے ساتھ اُس کے تعلقات عجیب طرح کے تھے - جیسے ہی موتی کو معلوم ہوا تھا کہ گل بانو اس کی وجہ سے گھر سے نکال دی گئی ہے وہ دوڑا ہوا اُس کے پاس آیا تھا - اسکو واقعی افسوس تھا کہ اس کی خاطر اس غریب لڑکی پر اتنا سنگین الزام لگایا گیا - لیکن اب کیا چارہ تھا - اُسکو گل بانو سے محبت تھی اور اس مصیبت میں ہمدردی بھی - یہ بھی اسکو اندازہ ہوگیا تھا کہ گل بانو بھی اس میں کافی دلچسپی رکھتی ہے - اس نے یہ بھی جلد دیکھ لیا کہ میڈیکل کالج کے شوقین مزاج لڑکے اور ہسپتال کے نوجوان ڈاکٹر گل بانو کی بیچارگی سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں - وہ ان میں سے کسی کو مُنہ نہ لگاتی تھی - مگر موتی لال اس صورت حال کو گوارا نہ کرسکتا تھا - اس کے لئے ایک ہی طرزِ عمل ممکن تھا - اس نے شادی کی تجویز پیش کر دی -

مگر گل بانو پر اس تجویز کا اثر اُلٹا ہوا - وہ موتی لال کو بے حد پسند کرتی تھی - شاید چاہتی بھی تھی - لیکن اس کو یقین نہ تھا کہ آیا اس نے شادی کی تجویز محبت کی خاطر کی ہے یا فقط ہمدردی کے لئے - اسکو یہ شُبہ ستاتا تھا کہ شاید اسکی موجودہ مصیبت سے متاثر ہوکر موتی ازدواجی تعلقات پیدا کرکے اُسکی خبرگیری کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے - یہ اس کو منظور نہ تھا -

غرض اُس نے شادی سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس وقت تک وہ موتی کی تجویز نہ منظور کرسکے گی جب تک اسکو یہ یقین نہ ہوجائیگا کہ اس تجویز کی محرک ہمدردی اور فیاضی نہیں بلکہ محبت ہے - موتی نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن گل بانو اپنے فیصلہ پر قائم رہی - دونوں کی دوستی پھر بھی برقرار رہی - ہر روز شام کو دونوں ساتھ ٹہلنے جاتے تھے - لوگ چہ میگوئیاں ضرور کرتے مگر ان کو کسی کے کہنے سُننے کی پرواہ کب تھی -

(۴)

ایک روز شام کو جب موتی حسبِ معمول چار بجے کے قریب گل بانو کے کمرے پر پہنچا تو میز پر ایک پرچہ پڑا پایا -

"موتی - میرے بھائی صاحب کا خط آیا ہے جس سے معلوم ہوا ہے کہ والدہ سخت بیمار ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ اسلئے میں گھر جارہی ہوں۔ اگر اُن کی طبیعت سنبھل گئی تو شام کو واپس آجاؤں گی۔ چھ بجے تک انتظار کرنا۔ گُل"

چھ بجنے میں چند منٹ تھے جب گل بانو واپس آئی۔ کمرے میں خاصہ اندھیرا تھا۔ چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ مگر موتی لال نے اس کے انداز میں ایک عجیب افسردگی پائی۔ کمرے میں خاموشی سے داخل ہوکر گل بانو نے بجلی کا بٹن دبا کر روشنی کی۔ اب موتی نے دیکھا کہ رونے سے اس کی آنکھیں سُرخ ہورہی تھیں۔ بلا کچھ کہے سُنے وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ باوجود ضبط کے ایک آنسو آنکھ سے ٹپک پڑا۔

"کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟ تمہاری والدہ کا مزاج کیسا ہے؟" موتی نے پریشان ہوکر پوچھا۔

"اچھی ہیں۔"

"تو پھر؟ تم کیوں رورہی ہو، گُل؟ کیا مجھے بھی نہ بتاؤگی؟"

گُل بانو نے کوئی جواب نہ دیا۔ فقط ہاتھ کی ایک جُنبش سے ساڑھی کا آنچل سر سے گرادیا۔ موتی کے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ وہ ریشمی سیاہ لمبے بال اب اس کے سر کی زینت نہ تھے۔ ان کے بجائے کٹے ہوئے بالوں کے بے ترتیب اور خون آلود گچھے ایک وحشت ناک منظر پیش کررہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کسی بیدرد نے کُند قینچی سے یہ ظلم کیا ہے۔

"کس نے؟" موتی کی زبان سے یہ سوال بھی مشکل سے نکلا۔

"بھائی نے۔" آنکھیں جُھکا کر گل بانو نے جواب دیا۔ "تم سے دوستی کرنے کا انعام ہے۔"

"تو اب اس کا بدلہ بھی میں لونگا۔" موتی غصّہ سے کانپ رہا تھا۔ "اس جلاّد کو اس ظلم کی سزا بھگتنی پڑیگی۔ مار ہی ڈالوں گا۔"

"میرے بھائی کو؟"

لاجواب ہوکر موتی لال بیٹھ گیا۔ گل بانو کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک عجیب اطمینان پایا گو یا بدترین غم اور تکلیف سے گزر کر وہ ابدی سُکون کا راز پاگئی ہو۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ مُسکرادی۔

اب گل بانو نے پورا واقعہ سُنایا کہ کس طرح اس کے بھائی کو احمد آباد سے واپسی پر تمام واقعات معلوم ہوئے اور یہ سُن کر کہ اس کی بہن نے ایک ہندو کی خاطر گھر چھوڑ دیا تھا وہ غصّہ سے دیوانہ ہوگیا۔ اسی جنون میں اس نے بہن کو دھوکے سے گھر بلا کر اس کے بال کاٹ ڈالے تھے۔ یہ قصّہ سُناتے وقت اس کی آواز میں غصّہ کا شائبہ بھی نہ تھا۔ محبّت کرنے والی بہن نے بھائی کی اس سفاکی کو بھی معاف کردیا تھا۔

کچھ دیر کمرے میں سنّاٹا طاری رہا۔ پھر گل بانو بولی۔ "موتی، تمہیں یاد ہے تم نے اکثر مجھ سے شادی کرنے کو کہا ہے۔ کہو اب بھی تیار ہو؟"

"گل۔ مجھ سے پوچھتی ہو گو یا اس واقعہ سے میرے جذبات بدل سکتے ہیں۔ میرے دل میں اس وقت تمہاری محبّت اور عزّت پہلے بھی ہزار گُنی ہے۔"

"اچھا تو ابھی رجسٹرار کے ہاں چلو۔ ہم سول میرج قانون کے مطابق شادی کریں گے۔"
"گل!" اس خوشی کے لمحہ میں موتی کی زبان سے فقط ایک ہی لفظ نکل سکا۔ دونوں باہر جانے کے لئے کھڑے ہوگئے کسی نے یہ نہ سوچا کہ شام کے چھ بجے کے بعد کوئی سرکاری دفتر نہیں کھلا ہوتا۔
کمرے سے باہر نکلنے لگے تو موتی گل بانو کے سر کی طرف دیکھ کر جھجکا۔ سر بدستور کھلا تھا۔
"گل!" اس نے کہا اور سر کی طرف اشارہ کیا کہ آنچل ڈال لے۔
"اوہ۔ یہ؟" گل بانو نے ہنس کر کہا۔ "اس کو کیسے چھپا سکتی ہوں۔ یہ تو میری آزادی کا اعلان ہے۔"
اُس وقت اس کی آنکھوں میں وہ سرکشی تھی جس نے بڑے بڑے بادشاہوں کے تخت اُلٹ دیتے ہیں۔ اور سنگین ترین رواجوں کو ملیامیٹ کر دیا ہے۔

خواجہ احمد عباس

برسات

اہلِ عالم کو پیامِ زندگی دیتا ہوا
ابرِ گوہر بار اُٹھا کروٹیں لیتا ہوا

چل رہی ہی ہر طرف جاروب کش بنکر ہوا
چھا گئیں پانی کی رکھکر دوش پر اُٹھی گھٹا

کھُلگیا مینہ کا خزانہ دولتیں لٹنے لگیں
ابر کے پردے میں آتشبازیاں چھٹنے لگیں

سُنکے پیغامِ مسرت غنچے غنچے کھِل گئے
ڈالیوں سے ڈالیاں پتوں سے پتے مِل گئے

پھُوٹ نکلیں کونپلیں سوکھے ہوئے اشجار میں
روح جاکر پھر پلٹ آئی تنِ بیمار میں

نیلے نیلے آسماں پر اُودی اُودی دھاریاں
وہ شفق کی چادریں قدرت کی وہ گلکاریاں

بنگیا صحرا چمن غنچہ گُلِ تر بن گیا
مئے بنا پانی کا قطرہ پھول ساغر بنگیا

چل کے دیکھو باغ میں دریا دلی برسات کی
دردیاں تقسیم ہوتی ہیں ہری بانات کی

محسن اعظم گڈھی

دارا کا قتل

یہ واقعہ ہے کہ دارا کا قاتل خود اُس کا بھائی اورنگ زیب تھا۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ دارا کے قتل کا واقعہ جسقدر افسوسناک ہے اُسی قدر اٹل بھی تھا اور خود دارا بھی اپنا خون آپ کرنے سے باز نہ آیا۔ اورنگ زیب کی پوزیشن ایک قاتل کی ہو لیکن وہ کس درجہ مجبور تھا۔ اِس پہلو کو بعض مضمون نگاروں نے روشن نہیں کیا ہو۔ لہذا میں چند سطور رپیش کرتا ہوں۔

قتل دارا کے اسباب کی تہ کو پہونچنے کیلئے شاہجہاں کے دورِ حکومت پر نظر کرنی چاہیئے۔ لڑکپن سے بھائیوں میں چشمک تھی۔ بڑے ہونے پر یہی چشمک تلخیوں کی صورت پکڑ کر دشمنی ہوگئی۔ چند دلچسپ واقعات قابل توجہ ہیں۔

قدرتاً ایک مغل شہزادہ ہونیکی حیثیت سے اورنگ زیب دارا سے سوائے اس کے کیا متوقع ہوسکتا تھا کہ بڑا بھائی ولی عہد ہے۔ لہذا باپ کی سنت کی پیروی کرتے ہوئے جس دن چاہے باپ سے بغاوت کرکے چھوٹے بھائیوں کا خاتمہ کرسکتا ہے۔ شاہجہاں اور جہانگیر دونوں نے اپنے اپنے باپ سے بغاوت کی اور شاہجہاں نے تو تخت نشینی پر مغل شہزادوں کے خون کا دریا بہادیا۔ دارا بھی اُسی کا بیٹا تھا۔ یہ سب کچھ اورنگ زیب کے دماغ میں ہردم موجود رہنا لازمی تہا۔ چنانچہ حسب ذیل واقعہ دلچسپی سے پڑھنے کے قابل ہے۔

دارا کو حلبی آئینوں سے بہت شوق تھا چنانچہ حلب سے اُس نے آئینے منگوائے اور لب دریا ایک تہ خانہ تعمیر کروایا۔ بعد تعمیر ایک دن باپ کو معہ جُملہ بھائیوں کے مدعو کیا۔ وہ بھی اس طرح کہ بے تکلف خود ایک دوسرے کی خاطر کریں۔ شاہجہاں معہ لڑکوں کے آکر بیٹھ گیا اور خود دارا نے مٹھائی وغیرہ کی رکابیاں باہر سے لا لاکر رکھنا شروع کیں اور مدارات میں مشغول ہوا۔ اورنگ زیب اُٹھکر اِدہر اُدہر ٹہلا اور پھر دروازہ میں جاکر بیٹھ گیا۔ دارا نے کہا یہاں کہاں بیٹھے ہو تو دردِ سر کا عذر کرکے شرکت طعام سے معافی چاہی۔ دارا کو ناگوار گذرا۔ دارا نے باپ سے کہا کہ دیکھئے مُلاّجی کہاں بیٹھے ہیں۔ شاہجہاں نے مُتبسم ہوکر اورنگ زیب کو بُلایا لیکن وہ معذرت کرتا رہا۔ حتیٰ کہ پارٹی میں بدمزگی پیدا ہوگئی اور شاہجہاں کو بُرا معلوم ہوا۔ نتیجہ یہ کہ اس کی سزا میں اورنگ زیب کا چھ ماہ کے لئے دربار بند ہوگیا۔ اورنگ زیب نے اس سزا کو خاموشی سے برداشت کیا۔ کچھ عرصہ گذر گیا اور اُمرا کو وجہ خفگی معلوم ہی تھی۔ ایکدن ایک ندیم خاص نے شاہجہاں سے عرض کی کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اورنگ زیب ایسے عقلمند شہزادہ سے ایسا فعل کیوں سرزد ہوا۔ وہ بیوقوف نہیں ہے۔ سب سے عقلمند ہے۔ چنانچہ شاہجہاں نے طلب کرکے نرمی سے اورنگ زیب سے وجہ دریافت کی۔ اورنگ زیب نے اوّل تو تامل کیا۔ پھر امان طلب کرکے کہدیا کہ قبلہ ام آپ نے یہ بھی دیکھا تھا کہ جس کمرے میں تاجدار مُغلیہ معہ جُملہ وارثانِ تخت و تاج کے بیٹھا تھا اُس میں صرف ایک دروازہ تھا اور دارا دوڑ دوڑ کر باہر جاتے اور آتے تھے۔ صرف ایک دفعہ باہر جاکر کنڈی چڑھا دینے کی دیر تھی۔ میں دروازہ پر بیٹھ گیا کہ ایسا نہ ہوسکے۔ شاہجہاں مُنہ پھاڑے رہ گیا۔ اورنگ زیب چلنے لگا تو آہستہ سے کہا کہ خدا دارا کو اُس کے شر سے محفوظ رکھے۔

اورنگ زیب گیارہ سال کی عمر سے میدان کارزار میں جانے لگا۔ بعد میں ہر مہم سرخروئی سے فتح کی۔ سلطنت کا بہترین جنرل شمار ہونے لگا۔ شکست اور ناکامی سے کبھی دوچار نہ ہوا۔ دکن کی مہمات پر تعینات ہوا تو کئی بادشاہیاں لوٹ دیں اور عین موقعہ پر جبکہ بیجاپور وغیرہ فتح کر کے مزید نام پیدا کرنے والا تھا حکم شاہی ایکدم سے آتا ہے کہ اس مہم کو وہیں چھوڑ دو اور ایکدم سے بدخشاں اور قندہار کی مہم سنبھالو۔ بقول مورخ اورنگ زیب کے ہاتھ سے دارا نے دو پکے ہوئے سیب چھین لئے۔ ذرا سوچئے کہ دو سلطنتوں سے برسوں جنگ کر کے جب ہفتہ عشرہ میں اُن کو فتح کر کے شامل سلطنت کرنیکو ہوتا ہے تو سلطنت کا عظیم الشان نقصان برداشت کرتے ہوئے اورنگ زیب کو فتح کی سرخروئی سے محروم کر کے دارا کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے بھی شکست کی سیاہی منہ پر مل دیجائے۔ اُس مہم پر اُسکو بھیجتا ہے جہاں دوسرے بھائی اور جنرل ناکام ہوگئے اور جہاں فتح ناممکن ہے۔ حکم بھی ہوتا ہے تو ایسا کہ قندہار کی برف فتح کو اور بھی مشکل بنادے۔ اورنگ زیب عذر کرتا ہے سنوائی نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ کہ قندہار پر اورنگ زیب ناکام رہتا ہے اور ہار کر کہتا ہے کہ میں ایرانیوں سے لڑسکتا ہوں برف سے نہیں لڑسکتا۔ کیا کوئی مورخ بتاسکتا ہے کہ دارا کا یہ فعل کہاں تک مفاد سلطنت کے لئے تھا۔ اپنی ولی عہدی اور باپ کی محبّت سے اس قدر ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ کیا اورنگ زیب ذرا بھی توقع کرسکتا تھا کہ دارا برسرِ حکومت ہونیکے بعد مجھکو زندہ رہنے دیگا۔

قصہ مختصر اسی قسم کے واقعات چشمک بڑھاتے گئے۔ دشمنی ہوگئی۔ دارا کے ہاتھ میں مہر شاہی تھی جملہ کام دارا کے ہاتھ میں تھا۔

اس موقعہ پر یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس چشمک اور خصومت میں وقتی پالٹیکس نے کیا اضافہ کیا۔ مُغلیہ حکومت میں راجپوت پالیسی ایک خاص چیز تھی۔ شاہجہاں کی ماں راجپوت۔ باپ کی ماں راجپوت۔ اس سے زیادہ راجپوتوں کا کوئی مُغلیہ بادشاہ دوست نہ تھا۔ حد یہ کہ مہارانا اودے پور اُس کا پگڑی بدل بھائی تھا۔ وہ اودے پور جسنے اکبر کی سیادت سے انکار کیا۔ خود شاہجہاں کے لئے میواڑ کے سیسودیا راجپوت پسینہ کی جگہ خون بہانے کو تیار تھے۔ مہاراجہ جے سنگھ مہاراجہ جودھپور اس کے سگے ماموں زاد بھائی تھے۔ اور راجپوتوں کا مغلوں کے معاملات میں وہ زور تھا کہ اکبر کی ولی عہدی کا جب جھگڑا کھڑا ہوا تھا تو راجہ مان سنگھ نے بزورِ قلعہ کے خزانوں پر قبضہ کر کے جہانگیر کی جانشینی پختہ کرالی اور مغل امرا کچھ بھی نہ کرسکے۔ شاہجہاں کا زمانہ راجپوت سرداروں کے عروج کا تھا اور مغل اُمرا ہر جگہ پست تھے۔ دارا بھی مغل اُمرا سے مشکوک رہتا تھا اور راجپوتوں کی طرف جُھکا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ مغل پارٹی لامحالہ اورنگ زیب کی حامی ہوگئی۔ دراصل اس زمانہ میں راجپوتی اور مغلئی کشمکش انتہا پر پہونچ چکی تھی۔

اس کے بعد اب ذاتی قابلیت کا جائزہ لیجئے۔ دارا کی فلسفہ دانی اور علمی قابلیت اور علمی مشاغل تسلیم ہیں مگر یہ طے ہے کہ یہ چیزیں میدانِ جنگ پر کام نہیں آتیں۔ فردوسی کے سپرد محمود کا کام نہیں ہوسکتا۔ دارا کے مشاغل دیکھئے اور اورنگ زیب کے مشاغل۔ اورنگ زیب کی جوانی میدانِ کارزار میں جوہر دکھا رہی تھی اور دوسری طرف دارا محل کی پُرعیش زندگی میں دادِ فلسفہ دے رہا تھا۔ دارا جلد باز تھا۔ ضدی تھا۔ مزاج میں تمکنت اور رعونت تھی۔

حاسد تھا۔ کسی کا مشورہ نہیں مانتا تھا۔ بہادر تھا مگر جنگی قابلیت اورنگ زیب کے مقابلہ میں صفر تھی۔ کبھی کوئی اہم جنگی کام یا سیاسی کام انجام نہیں دیا۔ تخت پر بیٹھنے کے لئے جن قابلیتوں کی ضرورت ہوتی ہے اُن میں سے ایک بھی نہ تھی۔ محض شعرا اور ادیبوں کا دل پھڑکانے اور خوش کرنے کے لئے اُس کا تخت پر آنا ضروری ہو تو امر دیگر۔ لیکن تخت پر بہ حیثیت ایک بادشاہ کے بیٹھنے کی اہلیت دارا میں قطعی نہ تھی۔ اُس سے قابل اور بہتر بھائی یا اور دوسرے منٹوں میں اُتار کر وہی حشر کردیتے جو ہوا۔ خود دیکھ لیجئے کہ مورخوں نے دارا کے مشاغل پر کافی روشنی ڈالی ہے، وہ ضرور ادیب اور فلسفی تھا۔ جب وقت آیا تو دارا کی ناتجربہ کاری اور نالائقی رنگ لائی۔ ذرا غور کیجئے کہ باپ کے بیمار ہوتے ہی اس نے خبریں روکیں کہ افواہوں نے خبروں کی جگہ لی۔ شاہجہاں کی بیماری چھپانے کی ٹھانی۔ شاہی فرمان یہ فرمان جاتے ہیں کہ ہم اچھے نہیں لیکن قلعہ پر پہرہ ہے۔ آگرہ سے باہر خبر یا خط جانے پر سخت بندش ہے۔ نتیجہ یہ کہ دکن میں بھی پتہ نہیں کہ حقیقت کیا ہے۔ بادشاہ زندہ ہے کہ مرگیا۔ خبریں دوسرے ذریعہ سے آتی ہیں کہ بادشاہ قریب المرگ ضرور تھا۔ غالباً مرگیا۔ یا شاید زندہ ہو۔ دراصل دارا کی اس حماقت سے سب کے سب بھائی اُٹھ کھڑے ہوئے اور حد یہ کہ اپنے نام کا خطبہ اور سکّہ چلا دیا۔ گویا طے کرلیا کہ باپ مرگیا۔ سب نے باپ کی زندگی سے انکار کیا۔ یہی کہتے تھے کہ یا تو مرگئے ورنہ قید میں ہیں دارا جھوٹا ہے۔ خود بغاوت دارا کی ناسمجھی نے اُٹھائی۔

بغاوت کے بعد ہی شاہی افواج راجپوتوں پر مشتمل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں اور راجپوتوں میں جنگ ہے۔ مہاراجہ جودھپور اور مہاراجہ رتلام اور سارا راجپوتانہ بادشاہ کی حمایت پر تھا۔ مغل سردار در پردہ اِس راجپوتی عروج سے بدظن اورنگ زیب کے طرفدار از خود ہوگئے۔ گو کہ اورنگ زیب سے پہلے معرکہ میں مہاراجہ رتلام کام آئے اور مہاراجہ جودھپور شکست کھا گئے۔ لیکن ساموگڈھ کے آخری معرکہ میں جس راجپوتی دل سے اورنگ زیب کا مقابلہ ہوا ہے، اُس کی وہ شان تھی جو راجپوتوں کی قومی جنگ کی ہوتی ہے۔ یعنی جس شان سے وہ محمود غزنی اور محمد غوری سے لڑے تھے۔ کیسریا بانا پہنکر مرنے مارنے کی قسم کھاکر آئے تھے

اِس شکست سے دارا کی موت بہت دُور رہی۔ دارا کے لئے موقعہ تھا کہ ایران یا کابل نکل جاتا۔ مگر وہ لاہور گیا اور فوجیں اکٹھا کرکے کئی بار لڑا۔ اِن تمام لڑائیوں کے حالات دیکھئے کہ ایک شاعر اور فلسفی جنرل کے کام کیسے انجام دیتا ہے۔ دارا کی ہر مہم جنگی قابلیت کا بدترین نمونہ ہے۔ ہر بار اُس نے شکست کھائی۔ اورنگ زیب کا اقتدار اِس سرے سے اُس سرے تک پھیل گیا۔ مگر دارا پھر بھی لڑ رہا تھا۔ دو دفعہ وہ ایسے مقامات پر پہونچ گیا کہ قطعی محفوظ تھا لیکن ہوس نے بے چین کیا اور زور آزمائی کی ٹھانی۔ ہر شخص نے اُسکو مشورہ دیا کہ ایسا نہ کرو۔ اتنی قوت نہیں۔ ذرائع نہیں ہیں۔ انتظام ناکافی ہے مگر وہ نہ مانا۔ اس وقت کتاب پیش نظر نہیں ہے۔ راجہ کا نام نہیں یاد رہا۔ غالباً سندھ کی طرف محفوظ علاقہ میں پہنچ گیا۔ راجہ نے لڑکی سے شادی بھی کردی اپنا جانشین بھی بنا دیا۔ چاہیئے تھا کہ بقیہ عمر چین سے فلسفہ اور تصوف کی تحقیقات میں صرف کرتے۔ مگر طبیعت نہ مانی۔ دارا کا قول تھا کہ یا تخت یا تختہ۔ لاکھ اُسے سمجھاؤ مگر نہ مانتا تھا۔ بجائے فوج کے اوندھے سیدھے انبوہ جمع کرکے دوڑ نے لگا

آخرش اس چپقلش کا یہ نتیجہ نکلا کہ گرفتار ہوا۔ اور اپنی موت کے قریب تر پہونچا۔

اب سوال یہ ہے کہ اورنگ زیب کو کیا کرنا چاہیئے تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ جوشِ سعادتمندی میں باپ کو قید سے آزاد کرکے سامنے دست بستہ کھڑا ہوجائے؟ کیا یہ ممکن تھا کہ ساتھ ہی دارا کو بھی چھوڑ دے؟ دارا آزاد اور شاہجہاں برتخت۔ اس سے بدرجہا بہتر ہوتا کہ اورنگ زیب خودکشی کرلیتا۔ دونوں باتیں ناممکن تھیں۔ دارا کو قید کرنا سانپ کو پالنا تھا۔ کوئی توقع نہ تھی کہ دارا کو بالفرض مُلک بدر کرکے نکال بھی دیا جاے تو وہ آئندہ ہندوستان کے امن وچین میں مخل نہ ہوگا۔ ایران اور ہند کی اتنی سخت دشمنی تھی کہ اگر دارا اُدھر نکل جاتا تو شاہِ ایران اس کے ساتھ ہوکر ایسی مداخلت کرتا کہ باید و شاید۔ سوائے دارا کے قتل کے دوسرا اجارہ کار ہی نہ تھا۔ اور وہ بھی اس طریقہ پر جس طرح کہ وہ قتل کیا گیا۔ یعنی دارا کے جُملہ ہمدرد وحمایتی اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ واقعی دارا گرفتار ہوکر قتل ہوگیا۔ پوشیدہ طور پر بغیر تشہیر کے قتل کراتا تو کون باور کرتا۔ ہر چہار طرف سے سلطنت کے دشمن دارا کے حامیوں کو احمق بنانے کے لئے درجنوں دارا پیدا کرکے اعلان کردیتے کہ دارا آتا ہے۔ ہر باغی گورنر اور صوبیدار اپنی بغاوت دارا کے نام سے شروع کرتا۔ ہر بغاوت کے بارے میں یہی کہا جاتا کہ دراصل دارا زندہ ہے اور اب آتا ہے۔ جس طرح اورنگ زیب نے دارا کو قتل کرایا وہی طریقہ حفظ وامن کے لئے مناسب تھا۔

رہ گیا دارا کے قتل کا حادثہ فاجعہ۔ تو اس سے کون منکر ہوسکتا ہے کہ دارا ایک عالم وفاضل بے تعصب اور نیکدل شہزادہ تھا۔ ایسی صفات کا انسان کہ اورنگ زیب اُس کے آگے ایسا تھا جیسے ایک عالم اجل کے سامنے مسجد کا تنگ نظر مُلّا۔ دراصل بادشاہت اور سرداری کے لئے دارا اورنگ زیب کا ہرگز مدمقابل نہ تھا۔ اُسکو تو محض بڑا لڑکا ہونے کے سبب لایا گیا اور وہ آیا۔ یہ نظریہ ہی غلط ہے کہ اگر وہ تخت پر آجاتا تو آج ہندوستان آزاد ہی ہوتا۔ بالکل یہی کہ ٹیگور کو بادشاہ یا جنرل بنا دیا جائے تب کیا ہوتا۔ وہی ہوتا جو ہوا۔ آخر جس وقت اورنگ زیب اُٹھا ہے اُس وقت دارا تخت پر ہی تھا۔ نام کو نہ تھا وہ امر دیگر۔ آخر کیا کرلیا۔ اسی طرح باپ کے قید ہونے کے بجائے مرنے کے بعد اگر دارا تخت پر آتا تو منٹوں میں اسکو تخت چھوڑنا پڑتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ محض شاعرانہ مقاصد کیلئے یہ سوچا جائے کہ اورنگ زیب اور دوسرے بھائیوں کو جبراً فنا کرکے دارا کی حکومت محفوظ کی جاتی۔ ایسا ہوتا تو غالباً کوئی راجپوت سردار اُسکو گدّی سے اُتار پھینکتا۔ بقول کسے اگر دارا اسی قابل یا کسی قابل بھی ہوتا تو کب کا باپ کو خود قید یا قتل کرکے تخت پر بیٹھ چُکا ہوتا۔ شاہجہاں کے ہوتے ساتے اُس سے ملکر جس قوت کو نہ توڑ سکا اُس قوت سے وہ بغیر شاہجہاں کے کیا مقابلہ کرسکتا۔ دارا کا انجام حد درجہ افسوسناک ہی مگر اپنے قتل میں خود دارا کا ہاتھ تھا۔ خواہ مخواہ وہ آگ میں کود پڑا۔ اگر اورنگ زیب اُسکو قتل نہ کراتا اور خود قتل ہوجاتا تو جان کھوئی الگ اور احمق بھی کہلاتا۔ اورنگ زیب میں جتنی بُرائیاں اب گنتے ہیں اُن میں حماقت کا اور اضافہ ہوتا۔ بعض مورخوں نے بھی دارا میں کوئی خوبی ایسی نہیں بتائی ہے جو ایک سپاہی یا بادشاہی کے اُمیدوار

ہیں اُس زمانے میں لازمی تھی۔ یہ اورنگ زیب کی عقلمندی تھی کہ اُس نے دارا کے خون کی ذمہ داری مولویوں کے سر منڈھ دی۔ مولویوں نے بھی سوچا کہ چلو بہتی گنگا ہے ہاتھ دھولو۔ آج کل کا زمانہ ہوتا تو دارا پر قوم اور ملک سے غداری کا الزام لگایا جاتا کہ کس طرح سلطنت کو بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتح سے محض بغض نکالنے کے لئے محروم رکھا اور کس طرح ہزاروں سپاہی اور خزانہ شاہی قندھار کی مہم میں جان بوجھکر ضائع کرائے۔ یہ دونوں الزام بخوبی ثابت ہوجاتے کہ محض اورنگ زیب کو فتح و نصرت کی سرخروئی سے محروم کرنے اور شکست کی سیاہی سے روسیاہ کرنے کے لئے ایسا کیا۔

اس موقعہ پر ایک اور واقعہ یاد آیا۔ اورنگ زیب ہمیشہ سلام میں سبقت کرتا تھا۔ دارا میں بھائیوں کی چغلی کھانے کی بھی عادت تھی۔ دارا نے اورنگ زیب کی شکایت کی کہ انکو اپنی پوزیشن کا خیال نہیں ہے اور اُمراء کو سلام کرتے ہیں۔ دراصل یہ خیال دامنگیر تھا کہ اورنگ زیب ابھی سے جملہ امرائے دولت میں رسوخ پیدا کر رہا ہو تاکہ بوقت بغاوت کام آئے۔ شاہجہاں نے اورنگ زیب سے بازپرس کی اور کہا کہ ایسا کیوں کرتے ہو اس میں بیعزتی ہے۔ اورنگ زیب نے برجستہ قرآن کی آیت پڑھ دی" وتعزمن تشاء .... بیدک الخیر" جس کو خدا چاہے عزت دیتا ہے اور جسکو چاہے ذلت۔ اور یہ واقعہ ہے۔ انسان لاچار ہے۔ شاہجہاں کی مجال نہ ہوئی کہ کلام اللہ کا جواب دیتا۔ چپ کا چپ رہ گیا۔

دارا کے قتل کے سلسلہ میں اورنگ زیب کو الزام دینا بیکار ہے۔ بلکہ دارا کے قتل میں نصیحت ہے کہ کوئی شاعر صاحب یا ایڈیٹر صاحب فوج لے کر نہ نکل پڑیں۔ دوئم یہ کہ لڑکے کو اگر انجنیر بنانا ہے تو طب کا کورس علیحدہ رکھنا چاہیئے۔ دارا کو کلیجہ سے لگا کر رکھا گیا اور وہ شعر و فلسفہ میں پھنس کر رہ گیا۔ جس وقت ضرورت پیش آئی وہ قابلیت میں پورا نہیں اُترا اور اپنی جان اپنے ہاتھوں گنوائی۔

عظیم بیگ چغتائی

شانِ تغزل

کچھ تو وفورِ شوق میں، باعثِ امتیاز ہو
میری نظر کے سامنے، اُن کی حریم ناز ہو

سوزِ دروں و آہِ دل، عشق میں دونوں ایک ہیں
ہم کو تو اِک سرور ہے، سوز ہو یا کہ ساز ہو

واہ دلِ نظارہ کوش، تیرا یہ ذوقِ بیخودی
جلوے کی تاب ہو نہ ہو، اُن کی حریم ناز ہو

ناز ہے شوق آفریں، شوق ہے شورشِ دماغ
حسن ہے آرزو پسند، عشق جنوں نواز ہو

ذوقِ طلب کو عشق نے، طرفہ سبق یہ دیدیا
نالۂ دلخراش بن، آہِ جگر گداز ہو

دل کی تڑپ میں اے خدا، کچھ تو ہو ذوقِ غایت
درد وہ دے جو عشق میں، باعثِ امتیاز ہو

فرحتؔ آرزو پسند، درسِ نیازِ عشق لے
کوچۂ معرفت میں آ، شیفتۂ مجاز ہو

فرحتؔ کانپوری

ممی خانے میں ایک رات

اس شب میں اپنی لیبارٹری میں بہت دیر تک مُردوں کی چیر پھاڑ میں مصروف رہا۔

رات بہت گرم اور بے حد سُنسان تھی۔ دریچوں کے باہر اندھیرا جیسے تکان سے نڈھال ہوکر لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ نہ آسمان پر چاند تھا نہ زمین پر کسی قسم کی آواز۔ دُور دُور تک تاریکی اور ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔

میں اپنے "لاشوں کے کمرے" میں جسے میں اپنا "ممی خانہ" کہا کرتا تھا۔ اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ ایک مُردے کے پوسٹ مارٹم میں مصروف تھا۔ میں ہمیشہ رات کے سُنسان گھنٹے مُردوں کی چیر پھاڑ میں بسر کرنیکا عادی ہوں۔

جس سنہ کا میں ذکر کررہا ہوں۔ اس زمانہ میں گاؤں میں وبا اس شدت کی پھیلی ہوئی تھی کہ ہرایک کا دل مُٹھی میں تھا۔ صبح جو آدمی ہنستا بولتا۔ تندرست اُٹھتا وہ شام تک قبر میں جا لیٹتا۔ صبح سے شام کرنا اور رات سے صبح کرنا جوئے شیر لانا تھا۔

مجھے ہمیشہ سے مُردوں کی چیر پھاڑ میں دلچسپی رہی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہیضے کے مُردے کس بیدردی سے پھینک دئے جاتے ہیں۔ اُس زمانے میں مجھے اپنے تجربات کے لئے لاشیں غیر معمولی کثرت سے دستیاب ہورہی تھیں۔

میں اپنی لیبارٹری میں تھا۔ ممی خانہ بڑے بڑے برقی لیمپوں سے روشن تھا۔ کمرے کے درمیان میں میز پر ایک لاش پڑی تھی۔ میں اس کے چیرنے میں مصروف تھا۔ باغیچے کے رُخ اندھے شیشوں کے دریچے ہوا کے لئے کھول دئے گئے تھے۔ دریچے کے پاس ناشپاتی اور املی کے منحوس اندھیرے درختوں پر شاید گوشت کی بُو سے بیتاب ہوکر گدھ اور اُلّو بیٹھے تھے۔ اور تاریکی میں بار بار اپنے پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ ان کی بے قراری۔ بے تابی میری مصروفیت میں بار بار مُخل ہوکر مجھے ستا رہی تھی۔

میں نے بیزار ہوکر اپنے اسسٹنٹ سے کہا "میرا دریچہ لگا دو۔ ان منحوس مُردار خور پرندوں نے ناک میں دم کررکھا ہے۔"

ابھی میرا جُملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ایک بڑا سا اُلّو اپنے بوجھل پَروں سے جیسے تاریکی میں تیرتا ہوا کمرے میں گھس آیا۔ اور میرے سر کے اُوپر دائرے کی صورت میں گھومنے لگا۔ میں نشتر ہاتھ سے رکھکر اسے باہر نکال دینے کے لئے ایک وحشیانہ انداز میں ہاتھ ہلانے لگا، لیکن اُلّو میرے غصہ اور پریشانی سے بے نیاز اپنے طواف میں مصروف رہا۔ طیش کی ایک لہر سے میری کنپٹیاں گرم ہوگئیں۔ میں نے کہا "نحس چڑیا! یہ اس طرح نہیں مانیگی" یہ کہتے ہوئے میں نے ایک تیز چاقو اُٹھاکر اُس کی طرف پھینکا۔ اتفاق سے وہ سیدھا اُس کی آنکھ میں جا لگا۔ اور اُلّو ایک دلدوز چیخ کے ساتھ پر پھڑپھڑاکر دریچے سے باہر بھاگ گیا۔ اور رات کی خوفناک تاریکی میں جذب ہوگیا۔

میں صبح تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ کوئی چھ بجے کے قریب ممی خانہ سے تھکا ماندہ نکلا اور اپنے کمرے میں گیا۔ بستر پر پڑتے ہی غافل ہوگیا۔

(۲)

میں دن بھر سوتا رہا۔ اور میری نیند ختم نہ ہوئی۔ میری روح ممی خانوں کا گشت لگا رہی تھی۔ ڈراؤنے اور ہیبت ناک خواب دیکھے۔ لاشوں کو چلتے پھرتے دیکھا۔ کبھی کفن میں لپٹے ہوئے مجسموں کو مصروفِ رقص دیکھا۔ شام کے وقت جب بیداری کی سرحد کی مدہم آوازیں خواب کی دُنیا میں رفتہ رفتہ نفوذ کر رہی تھیں۔ تو اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی اس زور سے بجی کہ میں چونک پڑا۔ نیند اور غنودگی یک لخت اُڑ گئی۔ ڈراؤنے خواب میرا مضحکہ اُڑاتے ہوئے غائب ہو گئے اور میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ کھول کر باہر گیا اور ٹیلیفون اُٹھا لیا۔

"ڈاکٹر زہری گھر پر ہیں؟"

"جی میں بول رہا ہوں۔"

"نمبر ۲ اندھی باؤلی پر آج رات گیارہ بجے کے قریب ملئے۔ ایک مریض آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ پتہ اپنی یادداشت کی کتاب میں لکھ لیجئے۔"

میں کچھ سوچ کر بولا "مگر ذرا ٹھہرئیے ——— آج تو میرا ایک اور......"

مگر پھر آواز آئی۔ "آپ کو ملنا ہوگا۔ مریض آپ کا منتظر ہوگا۔ نمبر ۲ اندھی باؤلی۔"

ٹیلیفون بند ہو گیا۔ اور لامحالہ مجھے اپنی یادداشت میں رات کا یہ مقررشدہ وقت لکھنا پڑا۔

گرمی کے دن تھے۔ سات تو بج ہی چکے تھے۔ رات ہونے میں کیا دیر تھی۔ جلد جلد میں نے غسل کیا۔ کھانا کھایا۔ فارغ ہوتے ہی بیگ لے کر ایک کرایہ کی چھوٹی سی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اور نمبر ۲ اندھی باؤلی کیطرف روانہ ہو گیا۔

گاڑیبان حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ "اندھی باؤلی؟ میرا تو خیال ہے۔ کہ وہاں کوئی نہیں ہوتا۔ یہ سڑک شہر سے بہت دُور ندی کے کنارے جو قبرستان ہے۔ اس سے لگی ہوئی ہے۔ پہلے وہاں اینٹوں کا ایک آوا تھا۔ مگر میرا خیال ہے۔ کہ اب وہ بھی اُٹھ چکا ہے۔"

میں ہمیشہ مُلازموں اور کمینہ لوگوں سے ڈانٹ کر بات کرنے کا عادی ہوں۔ طبعاً سخت آدمی ہوں۔ چنانچہ میں نے کہا۔ "احمق۔ تمہیں اس سے کیا! چلو ہم جہاں کہتے ہیں۔"

رفتہ رفتہ گاڑی شہر سے باہر نکل گئی۔ اور ایک اُجاڑ سڑک پر چلنے لگی۔ رات گہری اندھیری ہوتی جاتی تھی۔ ہر طرف ایک ویران سناٹا برس رہا تھا۔ دور سے کتوں کے بھونکنے کی نحیف آوازیں آ رہی تھیں۔ سڑک کی خاموشی پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ایسی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے کسی جنّ کی بارات میں ڈھول بج رہا ہو۔

میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ گیارہ بجنے میں چند ہی منٹ باقی تھے۔ میں نے گاڑیبان سے تیزی سے چلنے کو کہا۔

تھوڑی دیر بعد جب ہماری گاڑی پُل سے نیچے اُتر آئی۔ تو مجھے بڑا تعجب ہوا۔ "کیا یہی اندھی باؤلی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی!" گاڑی بان نے سرد مہری سے جواب دیا۔ وہ مجھ سے چڑا ہوا تھا۔
"یہاں تو زندگی کے آثار ہی نہیں!" میں نے کہا۔
"میں نے تو پہلے ہی عرض کر دیا تھا" اُس نے بے پروائی سے کہا۔
مجھے غصہ آیا "گستاخ! یہیں ٹھیرو۔ میں اُتر کر وہ مکان تلاش کرتا ہوں جہاں میرا مریض میرا انتظار کر رہا ہے!"
یہ کہہ کر میں گاڑی سے کود پڑا اور ہاتھ میں بیگ لے کر سڑک کے کنارے کنارے نمبرے کا مکان ڈھونڈتا ہوا آگے بڑھا۔ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورتا ہوا بہت دُور چلا گیا۔ کچھ دیر بعد مُڑ کر دیکھا تو اب گاڑی کی روشنیاں بھی نظر نہ آتی تھیں۔ چاروں طرف دہشت ناک تاریکی کا سیلاب لہریں مار رہا تھا۔
یک لخت مجھے خوف سا معلوم ہوا۔ چاہتا تھا کہ مڑ کر بھاگ جاؤں کہ اچانک کسی انسان کے درد و کرب سے کراہنے کی مدھم آواز آئی۔ میں تھم گیا۔ ہمت بندھی کہ یہاں کوئی انسان موجود ہے۔ دفعتاً دُور سے ایک روشنی نظر آئی۔ میں نے حوصلے سے کام لینا چاہا۔ اس کی طرف بڑھا۔ مگر میرے قدم پیچھے ہٹ رہے تھے آخر ہمت کر کے آگے گیا۔
ایک اُجڑے مکان کے دروازے میں دیا ٹمٹما رہا تھا۔ میں قریب پہنچا تو دیکھا۔ کہ بوسیدہ لکڑی کے دروازے میں ایک سو سال کی سفید رنگ بڑھیا ہاتھ میں مٹی کا دیا لئے چُپ چاپ کھڑی ہے چہرے پر جھُریاں اور مُنہ میں دانت نہیں۔ ٹھوڑی نکلی ہوئی۔ میرے دل میں ہیبت گہری اُترنے لگی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مکان کوئی شکستہ اور پُرانی قبر ہے۔ جس میں یہ بُوڑھی عورت مُردے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ٹمٹماتے ہوئے دئے کے شعلے کو ٹکٹکی باندھکر گھُور رہی تھی۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ انسانی کھوپری میں دیا ٹمٹما رہا ہے۔ میرے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے ——— میں بھاگنے کا ارادہ کرنے لگا۔
مگر اسی پل بڑھیا نے کہا "ڈاکٹر صاحب آیئے۔ آپ ہی کا انتظار ہے!"
بڑھیا کے حلق سے آواز نکلتی دیکھ کر میں سنبھل گیا۔ ذرا سے توقف کے بعد تردد سے اُس کا چہرہ تکتے ہوئے میں نے قدم اندر رکھا۔ گھر کیا تھا۔ ایک ویرانہ تھا۔ کہیں دیواریں گر رہی تھیں۔ کہیں چھتیں غائب! چوکھٹ پر گھاس اُگ آئی تھی۔
میں نے کہا "معزز خاتون۔ مریض کہاں ہے؟"
بڑھیا نے مجھے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔
زعفرانی رنگ کا لمبا کُرتا پہنے۔ سفید بال گھٹنوں سے نیچے لٹکائے۔ دیا جو انسانی کھوپری میں جل رہا تھا ہاتھ میں اُٹھائے بڑھیا آگے آگے چلی جا رہی تھی اور میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔
آخر وہ حجرہ آیا جہاں مجھے جانا تھا۔ یہاں پہنچکر بڑھیا دروازے پر رک گئی۔ اور مجھے اشارہ کیا کہ "اندر آجاؤ۔"
کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شکستہ چارپائی پر ایک ضعیف بُڈھا پڑا کراہ رہا ہے اور اس کی دائیں آنکھ پر پٹی باندھی ہوئی ہے۔ اس کے کراہنے کی آواز مجھے باہر سڑک پر آ رہی تھی۔ اس کی دوسری آنکھ لہو کی طرح سُرخ ہو رہی

تھی اور غول بیابانی کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ مجھے ٹکٹکی باندھے ایک آنکھ سے گھور رہا تھا۔

"کیا یہی مریض ہے؟" میں لرزاتے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔

"ہاں" بڑھیا نے کہا۔

"ان کی تو آنکھ پر کوئی زخم ہے" یہ کہہ کر میں مریض پر جھکا۔

دفعتاً بڑھیا نے دیا نیچے پٹک دیا۔ اپنا خوفناک لال کرتا سمیٹ کر دونوں ہاتھ اُدپر اٹھائے۔ اور خونخوار انداز میں مجھ پر جھپٹی۔

"ظالم سفاک ڈاکٹر! کیا تجھے یاد نہیں۔ کہ یہ زخم کس طرح یہاں لگا تھا؟ تُونے سمجھا کہ تیرا یہ قصور معاف کر دیا جائیگا۔ لے اب اپنے کئے کی سزا پا"

یہ کہہ کر اُس نے تیز چاقو اُٹھالیا۔ اور میری آنکھ کی طرف اِس طرح جھپٹی جیسے وہ اُسے پھوڑ دینا چاہتی ہے۔

میں بے ہوش ہو گیا۔

دوسرے دن پولیس نے مجھے اندھی باؤلی کے کھنڈروں میں سے اُٹھایا۔

بعض کہتے ہیں مجھے کوئی ذہنی عارضہ ہو گیا۔ بعض کہتے ہیں لاشوں کی دن رات کی صحبت نے میرا دماغ بگاڑ دیا ہے۔

حجاب امتیاز علی

تجلّیات

پست ہوتی ہی کہیں ہمّتِ دشوار پسند — آتش شوق تغافل سے ہوئی اور بلند

دلِ کمبخت پہ کیا بیت گئی کیا کہئے — اُف وہ دُزدیدہ نظر ہائے وہ کوتاہ کمند

عالمِ کشمکشِ شوق بھی کیا عالم ہے — دلِ گرفتارِ محبّت ہیں نہ آزاد نہ بند

نگہِ لطف نے دُنیا ہی بدل دی دل کی — لذّت و کیف سے خالی نہیں اب کوئی گزند

دلِ ناکام میں کچھ اور بڑھا جوشِ طلب — تلخیوں سی ہوئی شیرینیٔ اُمیّد دوچند

اللہ اللہ یہ رعایت یہ نوازش یہ کرم — غرق و سرشارِ ستم ہو دلِ آزار پسند

تُونے چکھی ہی نہیں لذّتِ الفت ناصح

میں تو جنّت میں ہوں لیکن تری جنّت سے بلند

کوکب شاہجہانپوری

معجزاتِ جرّاحی

وہ زمانہ اب دُور نہیں رہا ہے جب مصنوعی اعضا کا رواج اُٹھ جائیگا اور اس صنعت کا خاتمہ ہوجائیگا۔ کیونکہ ماہرینِ طب اب حسبِ ضرورت نیا گوشت اور تازہ خون مہیا کرکے کان، ناک، انگلیاں، دوسرے جاندار کا دل، ہاتھ پاؤں سبھی کچھ یا تو جسم پر اُگاتے یا باہر سے پیوند لگاکر فراہم کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر والٹرسی الوارِیز، میوشفاخانہ کی جمعیۃ اطبا کے ایک رُکن علم الحیات کے ایک سہ ماہی ریویو میں رپورٹ کے دوران میں کہتے ہیں "کسی دن جب ہم کو پیوند لگاتے ہوئے اعضا کو اُکھڑ جانے سے محفوظ رکھنا آجائیگا تو جرّاحوں کی تمامتر توجہ اس تدبیر کی تلاش و جستجو میں صرف ہوگی کہ مفاجاتی موت سے مرنے والے تندرست آدمیوں کی نسوں اور ریشوں کو ان کے جسموں سے نکالکر کس طرح محفوظ اور سالم رکھا جائے۔ روسی اطبا نے خون کے ذرات مُردوں کے جسم سے لیکر تجربے شروع کر دئے ہیں۔ وہ ان ذرات خون کو برف میں محفوظ رکھتے ہیں اور جب کسی مریض کے جسم میں منتقل کرنا ہو آسانی سے کر لیتے ہیں۔"

ڈاکٹر ویلیس آر وِٹنی اشنکٹاڈی نیو یارک کے ڈاکٹر نے ایک برقی کیمیادی مجلس کے سامنے خطبہ دیتے ہوئے پیشگوئی کی کہ وجع الصدر، ضیق النفس، پُرانے وجع المفاصل اور دوسرے اعصابی تشنج کے امراض کا علاج بجلی کے تاروں کی مرمت کرنے والے مستری کے جیسا کام رہ جائیگا۔ اُنھوں نے انسانی نظام عصبی کا مقابلہ برقی نظام سے کرتے ہوئے کہا۔ پاؤں کا ٹھنڈا ہوجانا دورانِ خون کے نقص سے ہوتا ہے مگر یہ اور اسباب سے بھی ہوسکتا ہے مثلاً فکر و تردد سے یہ اعصاب کے مرکز اجتماع کے کاٹ ڈالنے سے دفع ہوجاسکتا ہے۔ اب یہ تفتیش جاری ہے کہ اور کیا کیا اعصابی شکایات اسی طرح دفع کی جاسکتی ہیں۔

تیس برس سے زائد کا عرصہ ہوا ڈاکٹر الیکسس کیرل باشندہ نیو یارک ایک کتے کے خارجی ٹانگ کا پیوند کرنے میں کامیاب ہوئے تھے مگر یہ الحاقی ٹانگ پٹھوں اور اعصاب کے تعلق سے محروم تھی۔ فی الحال ڈاکٹر موصوف اور کرنل چارلس اے لینڈبرگ نے اس نظریہ کی جانچ کے لئے ایک مشین ایجاد کی ہے کہ کس جسم سے خارج کئے ہوئے اعضا میں جان محفوظ رکھی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر کیرل کے خیال کے مطابق مستقبل قریب میں انسان کی زندگی گھڑی کی طرح جس وقت خواہش ہو روک دی جاسکے گی۔ اور پھر جاری کر لی جاسکے گی۔ ان دونوں ڈاکٹروں نے ایک مصنوعی قلب کی مشین بنائی ہے، اس کے عمل سے ایک جانور کے سر سے بھیجا نکال کر اُسے (یعنی بھیجے کو) زندہ رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اس کامیابی سے ان کے نظریہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر کیرل اس مشین کے ذریعہ سے زندہ اعضا مثلاً گلٹیاں لینگے۔ ان کو خشک کرکے بیجان کر دیں گے اور پھر زندہ کر دیں گے۔ ایک غامض ترکیب سے وہ ان اعضا کو ویسا ہی تر و تازہ بنا دے سکیں گے جیسے

جسم سے جدا کرنے کے وقت ہوتے ہیں۔

یہ تو ہوا نظریہ یا اصول۔ طبی جرائد اور روزناموں نے چند تازہ تجربوں کا ذکر کیا ہے جن میں بے جان کی بظاہر دوبارہ زندگی اعضائے ناقص کی دوبارہ تکمیل، مُردہ کے مختلف اعضا کا زندہ مریضوں میں پیوند و الحاق، اور جراحی جدید کے دوسرے عجائبات کی حد سے زیادہ دلچسپ اور عام لوگوں کے لئے ناقابلِ یقین تفصیلات درج ہیں۔

ماسکو میں پروفیسر سرج برجوشینکو (Serge Brjuchenko) نے ایک خودکُش کی لاش پر جسے تین گھنٹے سے مرچکنے کا فیصلہ صادر ہوگیا تھا تجربہ کیا۔ ایک مصنوعی قلب، ایک مصنوعی پھیپھڑے اور دورانِ خون کے ایک مصنوعی نظام کے ذریعہ سے اُس نے مُردہ کو زندہ کردیا۔ تھوڑی دیر کے لئے سہی۔ خودکُش نے سانس لی، ڈاکٹر کو آنکھ کھول کر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں، اُنگلیوں کو حرکت دی۔ گو یہ سب کچھ اُسی لحظہ تک رہا جب تک مصنوعی قلب کا عمل رہا۔ یہ نئی زندگی ڈھائی منٹ تک قائم رہی یہاں تک کہ وہ پھر ٹھنڈا ہوگیا۔

ڈاکٹر موصوف کے مُردوں کو زندہ کرنے کے یہ تجربے گذشتہ پانچ برس سے شروع ہوئے۔ اُنھوں نے دورانِ خون کا ایک مصنوعی نظام اور مصنوعی قلب کی ایک مشین استعمال کی جو بجلی کی طاقت سے کام کرتی ہو جو پمپ کرکے خون کو بعض شریانوں سے اُتارتی ہے اور خون میں آکسیجن پیوست کرنے کا ایک ذریعہ بھی کام میں لاتے ہیں۔

نیویارک کے ایک مشہور سرجن ڈاکٹر البرٹ ایس ہیمن کا دعویٰ ہو کہ اُنھوں نے ساٹھ مُردوں کو زندہ کیا ہے اور وہ سب اب تک تندرست و توانا ہیں۔ اُنھوں نے برقی علاج سے کام لیا ہے جس کے وہی موجد ہیں۔ چھ سال ہوئے اُنھوں نے جانوروں پر اپنے تجربہ کا آغاز کیا تھا اور اتنے مُردہ جانوروں کو زندہ کیا کہ آخر اُنھوں نے انسان پر تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی رپورٹ ہے کہ اب تک اُنھوں نے ساٹھ فیصدی کامیابی حاصل کی ہے۔

دم گھٹ کر مرنے سے استحفاظ کی ایک انجمن نے ایک تدبیر نکالی ہے جسے انسفلیٹر (محرکِ تنفّس) کہتے ہیں۔ اس کے ذریعہ سے بظاہر مردہ کو زندہ کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ مصنوعی تنفس کے لئے ایک دباؤ کا آلہ ہے اور مصنوعی پھیپھڑے سے ایک قدم آگے ایک اقدام ہے۔ اس سے پھیپھڑوں میں قدرتی ہوا پہنچائی جاتی ہے۔ یہ آلہ اب تینس۳۰ ہسپتالوں میں رائج ہے۔ صرف نیویارک سٹی کے ایک ہسپتال کورنل میڈیکل سنٹر میں تین سو مُردہ بچے زندہ کئے گئے ایک اور ہسپتال میں جہاں ایک بچّہ کی موت کا اعلان کیا جاچکا تھا ایک زیرِ تعلیم ڈاکٹر نے مشق کے لئے انسفلیٹر (آلہ تنفس) استعمال کرنے کی اجازت حاصل کی اور چشم زدن میں مُردہ بچہ جیتا جاگتا گود میں کھیل رہا تھا۔

برٹش میڈیکل جرنل (طبّی جریدہ) نے ایک شخص مسمی ارنسٹ ہینلے کا واقعہ درج کیا ہے اس کی عمر ۴۸ سال تھی اور ایک نجی ہسپتال میں ایک عمل جراحی کے دوران میں میز پر ہی مرگیا۔ مرنے کے تین منٹ بعد ڈاکٹر جے۔ دی فیڈین نے جو جرّاحی کررہے تھے۔ مُردہ مریض کے سینے کی دیوار چاک کی، غلاف قلب کی دوہری تہیں کاٹ ڈالیں اور اُن میں ہاتھ ڈال کر قلب کی آہستہ آہستہ یوں مالش کی کہ نرمی سے دباتے اور پھر مٹھی ڈھیلی چھوڑتے۔ دو منٹ تک یہ عمل کیا پھر قلب کے اعصاب میں ایڈرینیلن (Adrenalin) (ایک مشہور تنفس کی دوا) پچکاری

سے داخل کرنے کا حکم دیا۔ نتیجہ فوراً ظاہر ہوا۔ مُردہ کا دل فوراً تیز دھڑکنے لگا۔ چھ دن میں ہنستا کھیلتا اچھا خاصا جیتا جاگتا تندرست ہسپتال سے رُخصت ہو گیا۔

ابھی بروک لین کے کنگس کونٹی ہسپتال میں ایک مُردے کا کان کامیابی کے ساتھ ایک مادر زاد بُوچے کے منتقل کر دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا عمل جرّاحی پہلی بار ہوا ہے۔ اگرچہ انسانی کان پہلے بھی خارج سے لے کر پیوند کئے گئے تھے مگر یہ الحاق قدرتی دکھائی نہ دیتا تھا۔ بروک لین ہسپتال کے عمل جرّاحی میں بُوچے مریض کے سر میں کان کی جگہ پر ایک گھاٹ کھودا گیا۔ دوسرا کان جو ایک مرکّب عرق میں تین ہفتے تک جاندار رکھا گیا تھا اُس گھاٹ میں بٹھا دیا گیا اور ٹانکے لگا دئے گئے۔ جڑ میں جلد کھال پیدا ہو گئی اور دوسرے شخص کا الحاقی کان زندہ عضو بن کر اس بُوچے کا کان بن گیا۔

محمد مُسلم ؔ

ہمارے اعتراض

اخبار پنچ نے ہے لکھی نظم بامزہ ۔۔۔ اور نام "اعتراض" ہے جسکا وہاں رکھا

لکھتے ہیں اس میں اپنا وہ اب حالِ ابتری ۔۔۔ اور یہ کہ کیا ہے وقعتِ برطانیہ رہی

یعنی جو پہلے وزن و اثر دُنیا میں انکا تھا ۔۔۔ اس کا کیا ہی دوسروں نے کیا قلع قمع

ہر مُلک بنگیا ہے خونخوار و تند خو ۔۔۔ پرواہ نہیں ہے کرتا کسی کی بھی جنگجو

ہم ہیں کہ کر رہے ہیں سوالات و اعتراض ۔۔۔ اور دوسرے ہیں جو کہ سمجھتے ہیں اسکو ساز

پہلے تو اعتراض حبش ہم نے بھیجا روم ۔۔۔ ٹائیبر بہا کے لیگیا ہنستی رہی وہ قوم

نامہ جو بھیجا دوسرا ہسپانیہ کے نام ۔۔۔ عربوں نے اسکو لے کے جلایا ہوا یہ کام

اب تیسرا سوال تھا جو چین کا کرخت ۔۔۔ وہ ہم نے بھیجا سوچ کے جاپان سخت سخت

لیکن پکن پہنچ کے یہ اس کا حشر ہوا ۔۔۔ گیشا نے ہنس کے خوشنما پنکھا بنا لیا

کر آپ کی یوں مسٹر ایڈن چلی یہ ٹانگ
پھر دیکھئے کہ رہتا ہے کب تک یہ ہانگ کانگ

صاجزادہ مرزا صلاح الدین احمد خاں

پلنگ

مترو

نیلام میں سے ایک خوبصورت سا مجسمہ خریدا لیکن جب اُسے اُٹھانے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ اسکے نیچے کچھ کاغذات ہیں۔ دیکھا تو خطوط تھے۔ تین میں تو صرف جائے ملاقات کا ذکر تھا، چوتھا یہ ہے :۔

میرے دوست! ــــــــ میں بیمار ہوں، سچ مچ بیمار، اور اتنی کہ پلنگ سے اُٹھ بھی نہیں سکتی۔ بارش کے قطرے دریچوں سے ٹکرا رہے ہیں اور میں شال اوڑھے نرم و گرم بستر پر آرام سے لیٹی ہوئی ہوں۔ میرے پاس ایک کتاب ہے جسے میں بے حد پسند کرتی ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ کچھ میرا ہی تذکرہ ہے۔ تمہیں بتاؤں یہ کیا کتاب ہے؟ نہیں، تم مجھے خواہ مخواہ بُرا بھلا کہوگے!

میرے پیچھے تکیئے لگے ہوئے ہیں جن سے ٹیک کر میں بیٹھ جاتی ہوں، اور اس وقت میں یہ خط اُس ننھی سی میز پر رکھکر لکھنے بیٹھی ہوں جو تم نے مجھے تحفتاً دی تھی۔

لگاتار تین روز سے پلنگ پر پڑے پڑے میں بہت کچھ پلنگ کے ہی متعلق سوچنے لگی ہوں بلکہ نیند میں بھی میرا طائر خیال اسی کے گرد پرواز کرتا رہتا ہے۔ اور میں اب اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ پلنگ ہماری تمام زندگی کو محیط کئے ہوئے ہے کیونکہ ہم پیدا اسی پر ہوتے ہیں، پھر زندگی کی بہار اسی پر لوٹتے ہیں اور آخر کار اسی پر دُنیا سے سدھار جاتے ہیں۔ اگر میرے قلم میں ایک کہنہ مشق انشا پرداز کی سی طاقت ہوتی تو میں پلنگ کی تاریخ تحریر کرتی اور بھلا کونسا ایسا پُرجوش اور دہشت ناک، خوش کُن اور ولولہ انگیز پہلو ہوتا جو اس کتاب میں قلمبند ہونے سے رہ جاتا؟ اور ایسا کون شخص ہوتا جو اس سے اخلاقی درس حاصل نہ کرتا؟

تم میرے پلنگ سے واقف ہو میرے دوست، لیکن تم یہ خیال تک نہیں کر سکتے کہ مجھے ان دنوں میں اس سے متعلق کیا کیا نئی باتیں سُوجھی ہیں اور مجھے اس سے کسقدر محبّت پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ جنہیں میں جانتی تک نہیں اس پلنگ پر رہ چکے ہیں اور پھر اپنے پیچھے بطور یادگار اس پر اپنا مخفی اور پُراسرار اثر چھوڑ گئے ہیں۔

آہ! میں اُن لوگوں کی ذہنیت نہیں سمجھ سکتی جو نئے پلنگ خریدتے ہیں۔ بھلا یہ نئے پلنگ کس کام کے جو نہ کسی کی نشانیاں ہیں اور نہ جن سے کوئی یاد وابستہ ہے؟ میرا (بلکہ ہمارا کہنا چاہیئے) یہ پلنگ جو اسقدر جھلنگا مگر کشادہ ہے بہت سی جانوں کا، پیدائش سے لیکر موت تک حامل رہا ہوگا۔ ذرا اس پر غور تو کرو میرے دوست! اُن زندگیوں پر ایک سرسری تبصرہ تو کر جاؤ جن کا بڑا حصّہ ان جہاندیدہ چارپایوں کے حلقے میں گذرا ہے۔ تمہیں معلوم ہے ان چارپایوں نے اس تین سو سال کے عرصے میں، جب سے انکو اس طرح جوڑ کر پلنگ بنایا گیا ہے، کیا کیا دیکھا ہوگا؟

پہلے ایک نوعمر لڑکی کا تصوّر ذہن میں آتا ہے جو اس پلنگ پر لیٹی ہوئی ہے۔

وہ کراہ رہی ہے اور کبھی کبھی اس کی چیخیں بہت بلند ہو جاتی ہیں۔ اس کی ماں اس کے پاس ہے۔ چند منٹ یونہی گذر کر ایک نئی ہستی جھرّیوں اور سکڑی ہوئی کھال میں ملفوف بلّی کی طرح میاؤں میاؤں کرتی عالمِ وجود میں آ جاتی ہے۔ یہ لڑکا ہے جو اس کے ہاں پیدا ہوا ہے اور یہ نوجوان ماں باوجود سخت اذیت کے خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ بچّے کی پہلی چیخ سُنکر خوشی سے اس کا سانس گھٹنے لگتا ہے اور وہ اپنے ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیتی ہے اور وہ جو اس کے اردگرد ہیں مسرت کے آنسو بہانے لگتے ہیں کیونکہ اس گوشت کے لوتھڑے سے خاندان کا نام چلے گا اور اُن بڑے بوڑھوں کی نسل دُنیا میں باقی رہے گی جو اب تک کسی بات سے خائف، اس گھڑی کے منتظر تھے۔

اور پھر اُن دو محبّ و محبوب کا تصور کرو جو زندگی کے اس معبد میں پہلی مرتبہ یکجا ہوتے ہیں۔ اُن میں کپکپی پیدا ہو گئی ہے اور وہ مسرت میں بے خود ہیں۔ ایک دوسرے سے اسقدر نزدیک ہو کر اُنہیں جو لذّت حاصل ہو رہی ہے اُسے کون بیان کر سکتا ہے؟ اور دیکھو، آہستہ آہستہ اُن کے لب آپس میں ملتے جا رہے ہیں۔ یہ مقدس بوسہ ان دونوں کو ایک جان کر دیتا ہے اور سچ پوچھو تو یہ بوسہ جو ارضی فردوس میں داخل ہونے کا نقیب ہے اور انسانی جذبات و سرمستیوں کا امین، اور جس میں بے شمار عہد و پیمان پنہاں ہیں، اُن کے لئے یہی سب کچھ ہے۔ آخرکار ان کے پلنگ میں طغیانی سے بپھرے ہوئے سمندر کی طرح ہلچل مچ جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اس میں بھی زندگی اور مسرت کی بے پناہ موجیں رہ رہ کر اُٹھ رہی ہیں کیونکہ اس پر محبت کا جنون انگیز رازِ شرمندۂ تکمیل ہو رہا ہے آخر دُنیا میں اس ہم آغوشی سے زیادہ اور کونسی شے مکمل اور قابلِ ترجیح ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ ایک تیسری ہستی میں ظاہر ہو گا اور جو محبّ و محبوب دونوں کے دلوں میں بہ یک وقت ایک ہی خیال پیدا کرتی ہے، ایک ہی توقع، ایک ہی آپے سے باہر کر دینے والی کیفیت اور ایک ایسی سرخوشی جو اُن پر آسمانی اور نگل جانے والے شعلوں کی طرح نازل ہوتی ہے۔

اور پھر میرے دوست، اُن لوگوں کی دل دہلا دینے والی موت کا لرزہ خیز تصور کرو جنہوں نے اس پلنگ پر دم توڑا ہے کیونکہ یہ پامال اور ٹوٹی ہوئی آسوں کا مقبرہ بھی تو ہے اور ایک ایسا دروازہ بھی جو کبھی دُنیا میں داخل ہونے کا راستہ تھا مگر اب کائنات کی ہر شے پر ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا ہے۔ کتنی چیخیں، کتنی کرب و بےچینی، کتنی تکلیفیں اور کتنی آہیں اس پلنگ سے بلند ہو چکی ہیں! ماضی میں کتنی آغوشیں یہاں وا ہوئی ہونگی! کتنی سرخوشی و سرمستی یہاں طاری ہوئی ہوگی جو اب ہمیشہ کے لئے معدوم ہو چکی ہے! عالمِ جانکنی میں پتھرائی ہوئی آنکھوں اور بدشکل ہونٹوں کے علاوہ اور کون کون سی اذیتیں ہونگی جو اس پلنگ پر اس تین سو سال کے عرصہ میں جب سے کہ یہ پلنگ انسانی ہستیوں کے لئے جائے پناہ ہونا شروع ہوا ہے جسدِ خاکی کو نہ پہنچی ہونگی!

یاد رکھنا! پلنگ زندگی کی تشبیہ ہے۔ دُنیا میں کوئی اور شے اس جیسی عمدہ نہیں ہے اور کیا واقعی ہمارے چند بہترین مہینے سوتے میں نہیں گذرتے؟ لیکن پھر ہم دکھ بھی تو پلنگ ہی پر اُٹھاتے ہیں! وہ جو بیمار اور تکلیفوں کا شکار ہیں اسی میں پناہ لیتے ہیں، اور تھکے ماندے جسموں کیلئے اس سے بہتر آرام اور سکون کی جگہ ہو بھی کیا

سکتی ہے!

اِس وقت اور بہت سے خیالات میرے دماغ میں آرہے ہیں مگر کیا یہ ضروری ہے کہ میں ان سب کا اظہار کرہی دوں؟ اور پھر میں تھک اسقدر گئی ہوں کہ میں پاؤں پسار کر تھوڑی دیر سو جانا چاہتی ہوں۔ لیکن کل تین بجے تم مجھ سے ملنے ضرور بالضرور آؤ، شاید میں بہتر ہوں اور تمہیں خوش کرسکوں۔

خدا حافظ، میرے دوست! یہ لو میرے ہاتھ تمہارے پیار کرنے کے لئے حاضر ہیں اور میں تمہیں اپنے لب بھی پیش کرتی ہوں۔

(رگے دی موپساں) مترجمہ۔ صادق الخیری۔

رُخصت ہونیکے بعد!

خلوتِ عیش کا انجام لئے جاتا ہوں
دل میں اک حسرتِ ناکام لئے جاتا ہوں

میں نے اُن مست نگاہوں کا سماں دیکھا ہے
مستیٔ بادۂ گلفام لئے جاتا ہوں

حُسن کی گود میں وہ شعر و ادب کی تخلیق
فطرتِ حافظ و خیام لئے جاتا ہوں

کتنا دلچسپ ہے ناکام تمنّا کا فریب
جیسے میں اک ہوسِ خام لئے جاتا ہوں

خونِ دل، خونِ تمنّا کی بھلا قیمت کیا!
مفت میں عشرتِ بدنام لئے جاتا ہوں

دل پہ اُن شوخ اداؤں کا اثر کیا کہئے
چند ترشے ہوئے اصنام لئے جاتا ہوں

اب نگاہوں کو گھٹاؤں کی ضرورت کیا ہے
پرتوِ زلفِ سیہ فام لئے جاتا ہوں

دل کی آغوش میں اُس "شعرِ مجسم" کی قسم!
ایک دیباچۂ الہام لئے جاتا ہوں

منزلِ ہوش سے گذری نہیں اب تک دُنیا
میں کہاں حُسن کا پیغام لئے جاتا ہوں

زلف کے سایہ میں وہ عارضِ رنگیں کا فروغ
کفر کی بزم سے اسلام لئے جاتا ہوں

دل پہ جو بیت رہی ہے وہ کہوں کس کس سے
شوق و اُمید کا کہرام لئے جاتا ہوں

جس کے سایہ میں نکھرتی ہے کرن سورج کی
روزِ اُمید کی وہ شام لئے جاتا ہوں

لوگ مفہومِ محبت سے کہاں واقف ہیں؟
اپنے سر زُہد کا الزام لئے جاتا ہوں

او مجھے دیکھ کے نظروں کے چرانیوالے
ہر قدم پر میں ترا نام لئے جاتا ہوں

ماہر القادری

وہاں

اُفق کے پار سُنتے ہیں کہ اک رنگین دُنیا ہے
وہاں بادِ صبا مُنہ چومتی ہے کوہساروں کے
شباب انگڑائیاں لیتا ہے دامن میں بہاروں کے

وہاں شعلے لئے پھرتی نہیں برق اپنے دامن میں
سکوں کی نیند سوتے ہیں وہاں طائر نشیمن میں

وہاں مرآتِ حُسن و عشق میں قدرت سنورتی ہے
سُنہری وادیوں میں شاہدِ فطرت نکھرتی ہے

ترنّم رقص کرتا ہے وہاں کے آبشاروں میں
تبسم کھیلتا پھرتا ہے رنگیں مرغزاروں میں

اُفق کے پار سُنتے ہیں کہ اک رنگین دُنیا ہے
وہاں دامانِ گردوں میں فضائیں مُسکراتی ہیں
بکھر کر کوہساروں پر گھٹائیں مُسکراتی ہیں

وہاں شیرازۂ رازِ سکوں برہم نہیں ہوتا
وہاں ناکامیِ تقدیر کا ماتم نہیں ہوتا

وہاں ہوش و خرد پر مستیاں چھائی سی رہتی ہیں
سدا بامِ فلک پر بدلیاں چھائی سی رہتی ہیں

سرور و کیف ہوتا ہے وہاں کی داستانوں میں
وہاں موسیقیاں بستی ہیں اُلفت کے فسانوں میں

اُفق کے پار سُنتے ہیں کہ اک رنگین دُنیا ہے
وہاں بربط کے دامن میں انوکھے گیت سوتے ہیں
ربابِ دل کے تاروں میں سُریلے گیت سوتے ہیں

محبّت کو وہاں رسوائیوں کا ڈر نہیں ہوتا
وہاں دامن سرشکِ چشمِ نم سے تر نہیں ہوتا

خزاں کی بدلیاں گلزار پر چھانے نہیں پاتیں
نشیمن کو جلانے بجلیاں آنے نہیں پاتیں

بہت رنگیں وہاں کی داستانِ زندگانی ہے
وہاں منزل نشیں ہر کاروانِ زندگانی ہے

اُفق کے پار سُنتے ہیں کہ اک رنگین دُنیا ہے
وہاں بہتے ہوئے دریا مسلسل گنگناتے ہیں
وہاں راتوں کی خاموشی میں انجم مسکراتے ہیں

حیا کی گود میں چھپکر وہاں سوتے نہیں جلوے
نظر افروز ہو کر پھر نہاں ہوتے نہیں جلوے

وہاں نغمے نکلنے کیلئے بیتاب رہتے ہیں
نفس کے تار لرزاں صورتِ مضراب رہتے ہیں

وہاں موسیقیوں میں جذب ہو جاتی ہے خاموشی
وہاں نغموں کے ہنگاموں میں کھو جاتی ہے خاموشی

اُفق کے پار سُنتے ہیں کہ اک رنگین دُنیا ہے

علی احمدؔ

اشکِ احمریں

بھابی جان! پچھلے ہی ہفتے تو ہم دعوتوں کی کھکیڑ اٹھا چکے ہیں۔ آج پھر بھائی جان کا نادر شاہی حکم صادر ہوا "مچھلی تمہیں تیار کرنی پڑیگی۔ سلیمہ ہنس کیا رہی ہو سچ کہتی ہوں کوئی منحوس اتوار ایسا ہوتا ہوگا جو باورچی خانہ کو سلام نہ کرنا پڑتا ہو۔

اچھا صبح صبح وہ تمہاری خوابگاہ میں اسی غرض سے گئے تھے کہ پہلے بہن کو رضامند کرلیں۔ خورشید صاحب کو واقعی دعوتوں کی دُھت ہے۔ بغیر احباب کے اتوار اُنہیں کاٹے کھاتی ہے۔ اچھا تو ہے ذرا چہل پہل رہتی ہے۔

خورشید الزماں مُنہ میں سگار سلگائے کمرے میں آئے۔ بیوی بہن کو دعوت کے متعلق بات چیت کرتے دیکھکر پوچھا "تم سب نے پکانے کیلئے ایک ایک چیز بانٹ لی۔ نان پاؤ کے ٹکڑوں کو سوائے سلیمہ کے کوئی ہاتھ نہ لگائے"۔

دیوان خانہ کی اُوپر کی منزل میں فرشی میزوں پر کھانا چُنا گیا۔ میری ہم عمر چچا زاد بہن سلیمہ غریب ہمیشہ دعوتوں میں گھٹا کرتی تھیں۔ ہم سب لڑکیاں زنانخانے کی کھڑکیوں میں سے کبھی کبھی مہمانوں کے کھانے کا تماشہ دیکھتی رہتی تھیں۔ بھابی جان آنکھوں کے ساتھ کانوں کو بھی کھڑکی سے چپکائے لگی کھڑی تھیں۔

"شمع گھی کے چراغ جلاؤ، سامنے کی میز پر جو شخص بیٹھے ہیں اُنہوں نے مچھلی بہت پسند کی"۔

مَیں اپنی کامیابی پر بڑی خوش ہوئی۔ اور لگی جھانکنے "اے سلیمہ دیکھنا کیسا شاندار خوبصورت سجیلا نوجوان آن بان سے بیٹھا ہوا مچھلی اُڑا رہا ہو۔ تمہارے ٹکڑے پڑے ہوئے ابھی رو رہے ہیں"

"گھبراؤ نہیں اُن کی باری آنے دو اگر بسورتی نظر نہ آؤ تو شرط رہی"

"بھابی جان ذرا دیکھئے تو اُن کے نارنگی جیسے چمکیلے بال بیحد خوبصورت ہیں۔ کرزن فیشن مونچھیں بھی سنہری بالوں ہی کی ہیں۔ سر پر بالوں کی گہری گہری سیپیاں کیسی بھلی معلوم ہو رہی ہیں"

اُنہوں نے ہنسی سے ٹھوکا مار کر کہا "لڑکی تو تو ان پر عاشق ہوگئی"

مَیں بگڑ گئی۔ کیا غضب ہے کوئی خوبصورت آدمی ہو تو اُس کی تعریف نہیں کرنی چاہئے۔ خوبصورت عورتوں کو دیکھکر مردوں کی روایت ہے کہ درود پڑھنا چاہئے۔ عورتیں خوبصورت مردوں کو دیکھکر کیا لاحول پڑھیں؟ بھلا اس سے پہلے میں نے ایسا مضبوط اور قدآور بانکا جوان کاہے کو دیکھا تھا۔ انکی صورت ہی میں انتہائی کشش تھی۔

وہاں یہ حال کہ ڈاکٹر مچھلی سب سے زیادہ کھائے جائیں۔ بے تکلف دوستوں کا مجمع تھا۔ لگیں چہ میگوئیاں ہونے۔ دوستوں نے اُنہیں ستانا شروع کیا۔ دارا شکوہ نے کھڑے قورمہ کی قاب اٹھاتے ہوئے پوچھا "خورشید صاحب خدا کے لئے بتائیے مچھلی کس نے دم پخت کی ہے"

ڈاکٹر حامد خود بولے "یہ تو کسی کے نہایت سلیقہ منداور حسین ونازک ہاتھوں کی کاوش کا نتیجہ ہے" اور جھینپ سے گئے۔

دوستوں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا "بجا ہے بجا، باقی تمام چیزیں پیروں کی محتاجِ منت ہیں"

بھائی جان بڑے آزاد خیال تھے۔ وہ ایسی باتوں کو رنگ نہیں دیتے تھے۔
"میری چھوٹی بہن شمسہ نے پکائی ہے۔ وہ مچھلی واقعی اچھی پکاتی ہیں"
ڈاکٹر تڑپ اٹھے "شمسہ، شمسہ نے" حمامی ٹھٹھوں سے کمرہ گونج اٹھا۔
ہم دونوں دوڑی ہوئی کھڑکی پر آئیں" بھابی جان آپ کب تک کن سویاں لے جائیں گی کی اور کو بھی دیکھنے دیں گی؟"
"لیجئے یہ ڈش میں ایک بڑا چکنا دری قتلہ موجود ہے" ڈاکٹر نے بیتابی سے اپنی رکابی آگے کر دی اور سامنے رکھکر ہو بیٹھے۔
"اے بھئی کھاتے کیوں نہیں۔ کیا پرستش کر رہے ہو؟ یا پیٹ بھر گیا اور نیت نہیں بھری والا مضمون ہو"
ڈاکٹر بگڑے "شکوہ صاحب آپ کی فضول باتوں سے مجھے سدا سے نفرت ہے۔ میں آپ کی طرح نہیں کھاتا، تو حلق میں آیا۔
خورشید صاحب آپ کو یاد ہو گا لندن میں کرسمس کے ڈنر پر مسٹر جیمز نے ہم دونوں کو مدعو کیا تھا۔ اور اُن کی لڑکی مس روز مچھلی پکانے میں خاندان بھر میں مشہور تھیں۔ جب سامنے آئی تو تھوک کے مزے کی" پھر جھومے "سبحان اللہ اس مچھلی میں کیا آب و نمک ہے، ہاتھ میں کیا ذائقہ ہے۔ بھائی خورشید باور کیجئے میرا ذہن ایسی بات ماننے کو تیار نہ تھا کہ ایک قابل مضمون نگار خاتون مطبخ سے بھی ایسا تعلق رکھتی ہیں۔ انکی سوز و گداز سے بھری ہوئی تحریریں عرصہ سے میرے مطالعہ میں ہیں۔ اس وقت یاد نہیں آتا کہ کس رسالہ میں ان کا ایک مضمون "مادرِ وطن" پڑھا تھا۔ نہایت پاکیزہ اور موثر"
بھائی جان نے منہ میں لقمہ رکھتے ہوئے کہا "آپ صاحبان کی قدر دانی اور شمسہ کی حوصلہ افزائی ہے"
بھائی جان زنانخانہ میں آئے تو سب گھیر کر بیٹھ گئے۔
سلیمہ نے پوچھا "کہئے کھانا کیسا تھا؟"
"نہایت لذیذ اور عمدہ خصوصاً نان پاؤ کے ٹکڑے بڑے خوش ذائقہ تھے۔ دارا شکوہ تو انگلیاں چاٹتے رہ گئے" سلیمہ نے تمکنت سے میری طرف دیکھکر سر کو جنبش دی۔ میری پیشانی پر خفیف سے شکن ابھرے۔ پھر بولے "مچھلی ڈاکٹر حامد نے انتہا درجہ پسند کی۔ تم سب پاس نکلیں" سلیمہ میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولیں "کیوں بھابی جان میں نہ کہتی تھی کہ خاندانی باورچنیں ضرور کامیاب ہوں گی۔"
میں نے بیتابی سے پوچھا "بھائی جان مچھلی کیا صرف سنہری بالوں والے ڈاکٹر ہی نے پسند کی"
"اے تم سب جھانک رہے تھے۔ بڑے بے انصاف لوگ ہو۔ خود چھپو اور دوسروں کو دیکھو"
بھائی جان پردے کے مخالف بلکہ دشمن تھے۔ ان کا مقولہ تھا، پردہ ہماری مستورات کی ترقی میں سب سے بڑی سدِّراہ ہے۔
جس دن یہ اٹھ گیا بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ عورت کو زبردستی مقفل رکھکر مبتدی بنانا اُن کے نزدیک سب سے بڑا گناہ تھا وہ کہتے تھے "عورتوں کو آزادی دو اور اُن کو خود اپنے ہر فرض کے احساس کا ذمہ دار بناؤ۔ ایک چیز کو سات قفلوں میں بند رکھکر اسکی عزت و عصمت پر نازاں ہونا کون فخر ہے۔ فخر اس پر ہونا چاہیئے کہ عورتیں باوجود بے پردہ رہنے کے خود اپنی عزت کی محافظ اور اپنے فرض کی پابند ہوں۔ بہرحال وہ اپنی بیوی کو پردہ نہ کراتے تھے۔ اور اس قید و بند سے آزاد تھیں۔ یہ بے پردہ بیوی ہمارے خاندان بھر میں سب سے زیادہ قابل عزت اور قابل فخر سمجھی جاتی تھیں۔

بھابی جان نے کہا "سب کو اپنے اپنے کھانے کا فکر تھا۔" میں شروع سے بھائی حامد کی باتیں سن رہی تھی۔ انکی کوئی بات چٹکلوں اور دلچسپی سے خالی نہیں۔ عجب زندہ دل شخصیت ہے۔ بڑے ہی خوش طبع ہیں یہی صاحب زینب کی شادی میں سب سے پہلے جاٹنگے تھے۔ دولہا کے بھائی تکتے کے تکتے رہ گئے۔

اماں بی نے آوازیں دینی شروع کیں۔ رات زیادہ ہو رہی ہے، سو جاؤ گے بھی یا رات جگا مناؤ گے۔ سب لمبی تانی۔ سلیمہ میری خوابگاہ میں آن کر برابر کے پلنگ پر لیٹ گئیں اور دعوت کا ذکر کرتے کرتے غائب۔

کئی دن بعد جب میں کالج سے واپس آئی تو بھائی جان نے ایک پیکٹ دیا "ڈاکٹر حامد تمہارے لئے تحفہ دے گئے ہیں"۔ میں ہاتھ میں لئے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ بھابی جان چیل کی طرح دوڑی ہوئی آئیں "خدا کی قسم جو ہمیں نہ دکھاؤ" میں اس ناگہانی تحفے سے پہلے ہی سراسیمہ ہو رہی تھی۔ ان کے جھپٹ کر آنے سے اور سٹپٹائی اور پیکٹ اُن کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے چیر پھاڑ کر دیکھا۔ انگریزی کی خوبصورت جلد والی کھانا پکانے کی ترکیب کی ایک کتاب تھی۔ کتاب کے سرورق پر خوشنما اور دیدہ زیب حروف میں صرف "شمسہ صاحبہ" لکھا ہوا تھا۔

مجھے دیکھکر کہنے لگیں "پگلی کے صلے میں اچھا تحفہ ملا۔ آئندہ اسی کے درج شدہ کھانے پکا پکا کر کھلایا کرنا"

"آپ جانتی ہیں مجھے بھٹیار خانہ سے دلچسپی نہیں۔ ویسے ہی دو چار چیزیں شوقیہ سیکھ لی ہیں"

"جب ہی تو کہتی ہوں مشق کیا کرو۔ خاتون خانہ کیلئے باورچی خانہ سے جی لگانا فرض اولیں میں سے ہے"

"آپ کی ہی رشتہ داری باورچی خانہ سے ہے"

"اچھا معلوم پڑیگا جب دوسرے گھر جاؤ گی۔ ڈاکٹر حامد کھانے کے بڑے شوقین ہیں اور خود بھی پکانا جانتے ہیں"

میں جلکر بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں آن کر لکھنے کی میز کے سامنے بیٹھ گئی۔ بڑی دیر تک ورق گردانی کرتی رہی۔ اپنا نام لکھا دیکھکر دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ خود بخود دل میں ایک گدگدی تھی جو کسی طرح ختم نہ ہوتی تھی۔ اور ایک نامعلوم ہنگامہ طاری تھا۔ کتاب احتیاط سے شیلف میں رکھدی۔ دن میں معمول تھا کہ ایک دو مرتبہ کتاب کا گہرا مطالعہ کرتی۔ دلی آرزو تھی کہ جس قدر کھانے اس میں لکھے ہیں۔ سب کے پکانے میں ماہر ہو جاؤں۔ میں خود نہیں سمجھ سکی کہ یہ خواہش کیوں پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے اسی مضمون پر ایک کتاب میرے عزیز بہنوئی نے عنایت کی تھی مگر میں نے زیادہ توجہ نہ کی۔

ناشتہ کی میز پر سب جمع تھے۔ بھائی جان نے دریافت کیا "شمسہ تم نے کتاب کا شکریہ بھی نہ لکھا۔ یہ کونسی تمیز و تہذیب ہے، کہ کوئی شخص تحفہ دے اور اُس کا شکریہ بھی ادا نہ کیا جائے"

"میں سمجھی آپ نے ادا کر دیا ہوگا"

"کیا خوب، ملا تم کو ادا میں کروں"

"تو آپ لے لیجئے"

"ہاں تو یہ کہو دو حرف لکھنے تمہیں منظور نہیں"

"جی نہیں، یہ بات تو نہیں"

"تو پھر ناشتہ سے فراغت ہو کر لکھ لاؤ۔ آج میں انہی کے ہاں جارہا ہوں۔"

کمرے میں آن کر کئی کاغذ لکھے اور پھاڑے۔ سمجھ کام نہ کرتی تھی۔ مناسب اور موزوں عبارت سے ذہن چوپٹ تھا۔ اتنی دیر میں بھائی جان کمرے میں کھڑے تھے "کیا مثل لکھ رہی ہو؟" ــــ "جی نہیں لکھ چکی"

مفید اور خوشنما کتاب کا شکریہ ـــــــــ شمسہ

بھائی جان اس مختصر سی تحریر کو دیکھکر مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے۔

حسب معمول دن گذرتے رہے۔ رفتہ رفتہ میں سست رہنے لگی۔ دماغ بھاری اور دل خود بخود بیٹھا جاتا تھا۔ ہر چند غور کرتی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی۔ تنہائی اور خاموشی سے طبیعت کو کچھ سکون حاصل ہوتا۔ تمام کاموں سے دل اچاٹ تھا۔ ہاں اگر کچھ خواہش تھی تو صرف یہ کہ باورچی خانہ میں گھس رہوں۔ اور نئے نئے کھانوں کی مشق کیا کروں۔ اماں بی میرے اس شوق کو دیکھکر بڑی خوش تھیں۔

ڈاکٹر حامد بھابی جان کے رشتہ کے بھائی اور بھائی جان کے عزیز ترین دوستوں میں سے ایک تھے۔ اتوار کے دن آج صبح ہمارے ہاں چائے پر مدعو تھے۔ اور اس دفعہ خیر سے بھابی جان کے کمرے میں براج رہے تھے۔ بھابی جان تو ویسے ہی پردہ نہ کرتی تھیں۔ ڈاکٹر تو بھلا رتی بھر ناتا، گاڑی بھر آشنائی کے مصداق تھے۔ چنانچہ وہ آسن جمائے ایک کرسی پر ڈٹے ہوئے کانسر پر رکھی ہوئی تصویر کو تک رہے تھے۔ آخر نہ رہ سکے اور اٹھا لائے۔

"تہمینہ، بتاؤ تو اس تصویر میں کون کون ہے؟"

"آپ نہیں پہچانتے۔ یہ چھوٹے میاں ہیں۔ یہ خالہ لاڈلی بیگم ہیں۔ ان کے پیچھے کریمن، رضیہ کو لئے کھڑی ہے۔ بیچ میں میں ہوں۔ میرے دائیں ہاتھ پر بڑی نند رفیعہ ہیں اور بائیں پر چھوٹی نند شمسہ" ڈاکٹر نے پھرتی سے تصویر اونچی کر لی۔

"ابھی تو اور باقی ہیں"

"جی ہاں میں سمجھ گیا"

گویا اب کسی کے پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بڑی دیر تک بغور تصویر کو تکتے رہے۔

بھائی جان نے سگار کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا "لو بھئی اٹھو دارا شکوہ انتظار میں ہیں" ڈاکٹر بہ مجبوری تصویر کو رکھکر دیوانخانہ میں گئے۔ دارا شکوہ نے متعجبانہ لہجہ میں کہا "یہ کہیئے نا آج زنانخانہ میں نازل ہوئے تھے۔ ہم یہاں انتظار میں بیٹھے سوکھ رہے ہیں"

آج کی چائے پر بڑی محنت وشوق سے میں نے تاتاری کھانے میں سے ایک چیز مائی آشے بنائی تھی۔ یہ ہلکے کافوری رنگ کے خوشنما بل دار خستہ پاپڑ کے مشابہ تھے۔ رکابیوں میں چنے ہوئے سب کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔

دارا شکوہ نے اٹھا کر کھایا اور تعریف کے پل باندھ دیئے۔ ڈاکٹر خاموش تھے۔ ایسی سنگین خاموشی ان کے حلقۂ احباب کی نظروں سے کبھی نہ گذری تھی۔

دارا شکوہ نے پھر چٹکی لی "ڈاکٹر کیا سکتہ میں ہو۔ گم سم کے لڈو کیسے کھالئے۔ بھلے آدمی منہ سے بولو۔ اس روز مچھلی پر لوٹ پوٹ تھے۔ آج کیوں منہ سل گیا"

بھائی جان نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ کی عطا کردہ کتاب میں سے یہ تاتاری مائی آشے بنائے

گئے ہیں، اور یہ مشق اوّلیں ہے۔" ڈاکٹر جو کھوئے سے بیٹھے تھے خوشی سے جھومنے لگے۔

بھابی جان کی اور ڈاکٹر کی محبت حقیقی بھائیوں کی حد تک پہونچی ہوئی تھی۔ ایک کو ایک کے بغیر کل نہ تھی۔ ایک دوست کا سچا ہمدرد اور ثنا خواں تھا۔ ڈاکٹر نے اب اور بھی زیادتی کی۔ وقتاً فوقتاً گھر کی پیمائش کرنے لگے۔ ذرا ذرا سی باتوں پر انہیں دروازہ پر کھڑا دیکھئے۔

مجھے پیانو سے شوق تھا۔ میرا شوق دیکھکر مسز کیدی جو پیانو کی اتالیق تھیں زیادہ توجّہ دیتی تھیں۔ کالج کی لڑکیوں میں اوّل تھی۔ گھر پر بھی اس میں وقت صرف کرتی تھی۔ اچھی خاصی مشق ہوگئی تھی۔

برکھا کا موسم تھا اُودی اُودی گھٹائیں اُٹھ اُٹھ کر عجیب سماں پیدا کر رہی تھیں۔ ہر چار طرف سبزے نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ہلکے سبز رنگ کے لمبی لمبی ٹانگوں والے ٹڈے پودوں میں روزی تلاش کرنے میں سرگرداں تھے۔ میرے کمرے کے عین سامنے صحن پر ایک پرانا انار کا درخت لدا پھندا کھڑا تھا۔ اس پر کتنے ہی انار پھٹ گئے تھے اور دانت نکوسے اپنی زندگی کا نوحہ کر رہے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار سبز پتّوں پر موتی موتیوں کا منظر پیش کر رہی تھی۔

مجھے اپنے محبوب مشغلہ نے اکسایا اور پیانو کے سُریلے سروں پر غالبؔ کی مشہور غزل — دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت — کا مرتعش نغمہ ہواؤں میں لہرانے لگا۔

کیا خبر تھی کہ ڈاکٹر بھابی کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ اور مرطوب موسم میں بھی گھر میں نہ ٹک سکے۔ پیانو کے ساتھ گانے کی آواز سُنکر ٹہلنے لگے۔ خود بھی اس فن میں اُستادِ کامل تھے۔

بھائی جان تھوڑے روز کے لئے شملہ گئے ہوئے تھے اور اُن کو خاصے دن لگ گئے۔ ڈاکٹر نے دہلیز کی مٹی لے ڈالی۔ جب واپس آئے تو ڈاک میں ڈاکٹر کا ایک خط ملا۔

بھابی جان خط پڑھکر بولیں "ساری تحریر اُسی داستان سے پُر ہے جو پرسوں شب کو اماں جان آپ سے کہہ چکی ہیں۔ آج یہ خط میں شمسہ کو ضرور دکھاؤں گی۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میری رائے اس بارے میں تم سے پہلے ہے۔"

چار بہن بھائیوں میں مَیں ہی کُھر چن تھی۔ اماں بی اچھے رشتہ کی متلاشی تھیں۔ پیغام آنے کو بیسیوں آئے۔ جن میں کنوارے رنڈوے سب ہی شامل تھے۔ بڑے بڑے دولتمند خواہش مند تھے۔ مگر تقدیر کچھ اور ہی سامان کر رہی تھی۔ آخر ایک تیر ٹھکانے پر بیٹھ ہی گیا۔

بھابی جان موتیوں کا ہینڈ بیگ لئے کمرے میں آئیں اور بید کی آرام کُرسی پر دراز ہوگئیں۔

"شمسہ تم تو کتابوں پر ہر وقت اَوندھی پڑی رہتی ہو۔"

"تو کیا کالج کا کام بھی نہ کروں۔"

"میرا یہ مطلب تو نہیں۔ مگر کسی وقت بھی تم فُرصت سے نہیں بیٹھتیں۔"

"توبہ کریئے کل شام ہی کو دو گھنٹے آپکے پاس بیٹھکر آئی ہوں۔"

"دیکھو تو یہ بیگ ختم ہوگیا۔ اس کے مُنہ نے تو مجھے بُلا جُلا دیا۔ کسی طرح ٹھیک نہ بیٹھتا تھا۔ پھر سامنے کی الماری سے چوکولیٹ نکال نکال کر کھانے لگیں۔ "جب چوکولیٹ کو تم شیرہ بنھکر غلق غلق کھاتی ہو وہ دراصل وسکی شراب ہوتی ہے۔"

"سچ کہئے۔"

"نہیں تو کیا جھوٹ ہے۔"

"خیر ہم تو بے قصور ہیں۔ عذاب ثواب بنانے والوں کی جان پر ——— لینا ذرا یہ خط تو پڑھکر سُنانا۔"

"پیارے خورشید صاحب! آج مجھے تم سے زیادہ اپنا ہمدرد کوئی نظر نہیں آتا جس سے مشورہ لوں اور درخواست کروں۔ کچھ روز ہوئے چچی اماں میرا پیام لیکر خورشید منزل گئی تھیں۔ وہ فرماتی تھیں کہ بیرسٹر خورشید الزماں کی واپسی پر تسلی بخش جواب کی اُمید ہے۔ چُنانچہ وہ چشم براہ ہیں اور ان سے زیادہ میں۔ تم خود زمانہ شناس ہو۔ میرے اطوار سے کیا ابھی تک نہیں سمجھ سکے کہ میں کس چیز کا خواہشمند ہوں۔ یقین کرنا میں شمسہ محترمہ کا پرستار ہوں۔ اور بہ منت اپنی دوستی کا واسطہ دیکر درخواست کرتا ہوں کہ میرے سوال کو رد نہ کیا جائے۔ اور مجھے اپنی غلامی میں قبول کر کے عُمر بھر کے لئے مرہونِ منّت کیجئے۔

مشتاقِ جواب ——— حامد"

آخری فقرے نے میرے جسم میں لرزہ پیدا کر دیا۔ اور ایک برقی رو میرے تمام جسم میں دوڑ گئی۔ ہاتھ پیر کنکر ہوگئے۔ اور خط ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پیشانی عرق ریز ہوگئی اور میں دوسری کرسی پر جا بیٹھی۔

"کوئی جلدی نہیں، سوچ سمجھکر جواب دینا" سمندِ ناز پہ ایک اور تازیانہ، چلتے چلتے ایک تصویر بھی میز پر رکھتی گئیں۔

تھوڑی دیر میں خاموش بیٹھی رہی۔ دل و دماغ کی عجب کیفیت تھی۔ میرے امکان میں نہیں کہ اس لمحہ کا نقشہ کھینچ سکوں۔ خیالات کا ایک بے پایاں ہجوم تھا جس میں میں گھری ہوئی تھی۔

رات کی فرصت اور تنہائی میں پلنگ پر پڑنے کے بعد دن کے گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کرکے آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ خط اور تصویر اب میرے قبضہ میں تھی۔ ڈاکٹر عجیب شان سے صوفے پر ایک طرف بیٹھے تھے، دوسری طرف خوشنما پھولوں کا گلدستہ رکھا تھا۔ ان کے چہرے سے بُردباری کے باوجود شوخی تھی۔ اور لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میرا دل اُس کے دیکھنے سے سیر نہ ہوتا تھا۔ متعدد بار دیکھا اور پھر خواہش رہی۔ دل ہی دل سے باتیں کرتی رہی۔ ڈاکٹر کو صرف دو مرتبہ ہی تو اُچٹتا ہوا دیکھا ہے۔ اوّل مرتبہ بھائی جان کے میکے میں جب وہ زینب آپا کے دولہا کی نبض دیکھ رہے تھے۔ دوسری مرتبہ اپنے ہاں دعوت میں، کئی دن مجھے غور و فکر میں کٹ گئے اور کسی نتیجے پر نہ پہونچ سکی۔

ڈاکٹر اب بھائی جان کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے اور ان کی خُوب خاطریں کرتے۔ کسی نہ کسی بہانہ سے کچھ نہ کچھ گاہے گاہے بھیجتے رہتے۔ آج انہوں نے خواہ مخواہ کوئی نیا بہانہ تراش کر سہ پہر کے ناشتہ پر ایک کشتی قسم قسم کی مٹھائیوں اور دال بیجی وغیرہ کی لبالب بھیجی۔ دودھ کی پوریاں قابل ذکر ہیں۔ نہایت نفیس اور لذیذ تھیں جس نے کھائیں کلمہ پڑھنے لگا۔ یہ ڈاکٹر نے خود پکائی تھیں۔

آج بڑی آپا مع بھائی صاحب کے آئی ہوئی تھیں۔ اور سب اس رشتے پر بحث و مباحثہ کر رہے تھے۔ اگر بھائی جان سب سے زیادہ حامی تھے تو چھوٹے بھائی قمر الزماں خلاف۔ دونوں بھائیوں کے مزاج میں اتنا فرق تھا جتنا ارض و سما میں۔

بھابی جان نے پہلو بدلتے ہوئے کہا کہ "واقعات یہ بتاتے ہیں کہ بھائی حامد نے شمسہ سے شادی کرنے کا اٹل فیصلہ کر لیا ہے کیونکہ جو بات اُن کے سامنے پیش کی جاتی ہے سر تسلیم خم ہے۔"

چھوٹے بھائی کے علاوہ گھر کے تمام ممبر تقریباً نیم رضامند تھے۔ تاہم بڑے دن تک سر توڑ کوششیں ہوتی رہیں۔ کسی کو رتی بھر نہ بھیا تا تھا۔ ڈاکٹر اوّل روز سے جہاں کھڑے تھے وہیں جمے رہے اٹل بھر آگے نہ کھسکے۔ وہ مجھے حاصل کرنے کا بیڑا اٹھا چکے تھے۔ اور اُن کے ہر طور سے اچھی طرح ثابت ہو رہا تھا کہ وہ سچے معنوں میں میرے عاشق زار ہیں۔ اور کوئی کوشش وہ ایسی نہیں چھوڑ رہے جس سے میں حاصل نہ ہو سکوں۔ میرے اعزّا نے سخت سے سخت شرائط پیش کیں اور انہوں نے نہایت فراخ دلی سے بخوشی لبیک کہا۔

سب اپنے اپنے دلوں پر ہاتھ رکھیں اور ایمان نہ نگلیں کہ سچی محبت کا اثر فریق ثانی پر کس درجہ ہوتا ہے۔ شب و روز میرے کان اُن کا شوق اور آرزو سُنتے رہتے تھے۔ پتھر کا دل بھی ہوتا تو پگھل جاتا۔ بعض اوقات ایسے قدرداں اور چاہنے والے کا زعم مجھے اپنی قسمت پر نازاں کر دیتا اور میں خوابِ شیریں کے مزے لینے لگتی۔ بات تقریباً طے شدہ تھی۔

اب دن بدن ڈاکٹر کا خیال دل میں جمنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے موسم بہار کے مارچ کی وہ خوش کُن شام جس میں معزز ڈاکٹر نے دعوت کو عزت بخشی تھی میرے نازک اور نرم دل میں سچّی محبت کا بیج چھوڑ گئی۔ اس وقت اور اس کے بعد میرا ننھا منا بھولا بھالا دل کچھ نہ سمجھ سکا کہ یہ کھٹک کیسی ہے۔ مگر جوں جوں گھڑیاں گزرتی گئیں حقیقت آشکارا ہوتی گئی۔ محبت کی بنا پڑ چکی تھی۔ پیغام نے دبی ہوئی چنگاری بھڑکا دی۔ اور میں محبت کے عمیق گڑھے میں گرتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ میرے رگ و پے میں حامد کا خیال سرایت کر گیا۔ ڈاکٹر کی غائبانہ محبت عجب پُر لطف اور کیف آور تھی۔ آہ عورت کا نازک دل۔

بھابی جان بیڈمنٹن کا ریکٹ ہلاتی ہوئی میرے کمرے میں برآمد ہوئیں "شمسہ، آج کھیلنے کا ارادہ نہیں ہے؟"

"آپ چلیئے میں آ رہی ہوں۔"

گیم ختم کر کے میں جانا چاہتی تھی کہ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر سامنے کی بنچ پر ہو بیٹھیں اور ادھر اُدھر کی باتیں کر کے اپنے اصلی مقصد پر اتر آئیں۔

"اتنے روز ہو گئے آخر کچھ جواب بھی دو گی۔"

"بھابی جان میں کیا کہوں، مجھے ان کے متعلق کچھ علم نہیں۔"

"آخر تم نے دیکھا تو ہے؟"

"تو کیا ایک آدھ دفعہ دیکھنے سے انسان کی خُو خصلت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر آپ کے نزدیک صورت شکل اور وجاہت سب چیزوں پر حاوی ہے تو دوسری بات ہے۔ بہرحال مجھے اس معاملہ میں قطعی اندھا سمجھیے۔ اور بزرگوں کی رائے کے ساتھ شریک جانیئے۔" وہ کھل کھلا اُٹھیں۔

اب میری منگنی ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر خوش اور مطمئن تھے۔ انہوں نے رسماً آنے جانے میں کمی کر دی تھی، بھائی جان کہا کرتے تھے۔ اس رشتہ نے اچھی بھلی دوستی میں تکلف کی "بخیہ" اڑا دی۔ بڑی آپا ہونے والے بہنوئی کے ذکر خیر سے شاد شاد ہوتی تھیں۔ اور جب ہی وہ یہاں ہوتیں اور دیوان خانہ میں اُن کی آمد کی خبر سُن پاتیں تو چھپ چھپ کے دیکھتیں اور پھولی نہ سماتیں۔

دونوں طرف بڑے پیمانہ پر شادی کے سامان ہو رہے تھے۔ جوں جوں وقت قریب آ رہا تھا میرا فکر بڑھ رہا تھا۔ رات کے

سنسان وقت میں آنے والے امتحان میں کامیابی کی دُعائیں مانگا کرتی۔

ڈاکٹر کی دل سے نکلی ہوئی سچّی دُعائیں مستجاب ہوئیں۔ اور بیاہ جیت لایا بڑی مسسرال کی گلی۔ میں خانۂ نوشہ کی زینت بنی۔ شادی کے تقریباً تمام پارچہ جات اور زیور ڈاکٹر کی اپنی پسند اور شوق کے تھے۔ جن کا انتخاب مجھے حیرت میں ڈال رہا تھا۔

یاد ہے اور اچھی طرح یاد ہے۔ میری بدنصیب صورت دیکھنے سے قبل ڈاکٹر نے دوگانہ ادا کیا تھا۔ اُن کے وہ شیریں پُرشوق اور محبت بھرے فقرے ہنوز کانوں میں گونج رہے ہیں۔ تم نے دیکھا میں نے کمرہ میں گھستے ہی خالق کا شکریہ ادا کیا۔ تمہیں حاصل کرنے میں جو جو تکالیف اور دقتیں مجھے پیش آئیں اور جو کوفت میں نے اُٹھائی آج اُس کا کیسا نایاب نعم البدل ملا ہے۔ خدا وندا تو مجھے توفیق دے کہ میں شمسہ کو خوش رکھ سکوں۔ کاش دل دکھانے کی چیز ہوتی تو یہ فقرے جو جلی قلم سے دل پر کندہ ہیں پیش کرتی۔

وقت گزرتا چلا گیا اور ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں سرشار رہنے لگے۔ دراصل ہندوستانی جوڑے کی محبّت کا دَور شادی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ان کو ایک لمحہ میرے بغیر چین نہ تھا۔ ہسپتال سے سیدھے گھر آتے اور تمام وقت میرے پاس گزارتے۔ میں اُن کے لیے جنّت کی حُور اور پرستان کی پری تھی۔ جب میں میکے جاتی تو حامد بڑے مایوس نظر آتے اور کہتے بڑی آپا سے کہکر مجھے بھی بلالینا۔ میں بہن بھاوج سے ذکر کرتی اور وہ خوشی خوشی بلوا بھیجتیں۔ پھر تو معمول ہو گیا کہ میرے بلاوے کے ساتھ اُن کا بھی بلاوا جاتا۔ سسرال والوں کو اور خصوصاً نند کو یہ باتیں ناگوار گذریں۔ مگر ڈاکٹر نے پروا نہ کی اور برابر دم چھلا بنے رہے۔

جان دینی ہے اور خالق کو منہ دکھانا ہے۔ ڈاکٹر نے میری ناز برداری میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ سونے میں پیلا اور موتیوں میں سفید کر دیا۔ میری ذرا سی خواہش پر وہ دُنیا کی بڑی سی بڑی قربانی کرنے کو تیار تھے۔ برس دن تک دن عید اور رات شب برات تھی۔ اگر جھوٹوں میرے سر میں درد ہوتا تو وہ رات آنکھوں میں کاٹ دیتے۔ اُن کے خوبصورت اور مضبوط ہاتھ جب میری کنپٹیوں کو چھُوتے تو مجھے وجد آنے لگتا اور رُوحانی سکون حاصل ہوتا۔ میرا پیارا ارمان حسرت بھرا دل ہزار ہزار جان سے اُن پر فدا تھا۔ عارضی مفارقت کے بھیانک خیال سے دل کانپ کانپ اُٹھتا تھا۔

ایک دن ڈاکٹر نے میرے سامنے میز پر ایک خوبصورت چوکھٹا رکھتے ہوئے کہا:-

"شمسہ سال بھر تک متواتر یہ کاغذی پیکر میری توجّہ کا مرکز اور میرے راحتِ قلب کا ماحصل رہا ہے اور یہ آدھا سطرہ نامہ جمیل تسلّیِ قلب کا باعث۔ بلاناغہ تصویر کی زیارت اور خط کا مُطالعہ میرا شغل تھا۔ میری ایک تصویر تہمینہ کے پاس ہے۔ اس میں تمہارا تصوّر کر کے اپنے پہلو میں پھولوں کا گلدستہ رکھا ہوا ہے۔"

میری تصویر بھابی جان نے کمرے سے ڈاکٹر بغیر کہے اُڑا لائے اور اُس کی کاپی کرا کر پھر وہیں رکھ آئے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ کتابِ شکریہ والے خط کو دیکھکر مجھے شرم سی آئی۔ معمولی کاغذ، بے ڈھنگی لکھائی۔

"آپ نے حد کر دی کہ اِس معمولی سے پُرزے کو یوں سینت کر رکھا۔"

"تم کیا جانو۔ اس کی سادگی اور اختصار نے میرے دل کو موہ لیا تھا۔"

خوشی اور غرور نے مجھے مخمور کر دیا۔ دل میں جب یہ خیال آتا، ایسے دلکش خد و خال اور حُسنِ مردانہ کا مالک، ذی اقتدار شخص مجھ پر کس قدر فریفتہ ہے تو دل خوشی میں ڈوب ڈوب جاتا۔ کاش تقدیر عُمر بھر میرا ساتھ دیتی اور میں آخری سانس تک

محبت کے میٹھے سُر الاپا کرتی۔

مرد کی محبت دودھ کا سا اُبال ہے۔ یہ جس قدر جلد محبت سے متاثر ہوکر بے حال ہوتا ہے اسی قدر جلد بے نیاز۔ اسکی محبت کا آغاز جنون کی حد تک مگر انجام سرد۔ ازل سے نئی نئی چیزوں کا دلدادہ اور پرستار ہے۔ اس کا مچلا ہوا دل ہمیشہ نئی نئی دلچسپیاں اور رنگینیاں ڈھونڈتا رہتا ہے۔ ضبط و صبر کی صلاحیت بہ نسبت عورت کے مرد میں کم ہے۔ اس میں اپنے جذبات کا استقبال کرنے کا بڑا حوصلہ اور قابلیت ہے۔

عورت دیر میں محبت کے اثرات قبول کرتی ہے اور آخر تک جمی رہتی ہے۔ عورت کا آغاز محبت پھیکا سیٹھا مگر انجام پختہ۔

رفتہ رفتہ ڈاکٹر کی عادتیں مجھ پر واضح ہو رہی تھیں۔ اُن کے حسنِ سلوک میں دن بدن فرق آرہا تھا۔ نہ پہلی جیسی محبت تھی نہ برتاؤ۔ مجھ سے بچے بچے رہتے تھے۔ اُن کا طرزِ عمل خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ اُن کا وقت اب زیادہ تر باہر گزرتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مَیں اُن پر بار گراں تھی۔ میری غیر حاضری اُن کے لئے خوشی کے سامان مہیا کرتی تھی۔ گھر دیر سے آنے جانے لگے۔ اکثر آدھی آدھی رات تک مَیں بیٹھی گھڑیاں گِنا کرتی۔ کہاں وہ چاؤ چونچلے، کہاں یہ بے پروائی۔ میرا دل اندر ہی اندر برساتی ایندھن کی طرح دُھونی رمانے لگا۔ ڈاکٹر اب پہلے جیسے ڈاکٹر نہ تھے۔ اُن کے اس قدر جلد پلٹ جانے سے میری نایاب دُنیا ویران ہوتی جارہی تھی۔

دیر سے گھر آنے کی پوچھ گچھ کشیدگی کو بڑھارہی تھی۔ مَیں بچہ نہ تھی، نادان نہ تھی، فرشتہ نہ تھی۔ ان کے اس سلوک سے مجھے رُوحی تکلیف پہونچ رہی تھی۔ ان کا جوش ٹھنڈا ہوچکا تھا۔ آہ مرد کا دل کسقدر جلد بھر جاتا ہے۔ مگر میری محبت دن بدن جڑ پکڑ رہی تھی۔ لیکن وہ کبھی کے سیر ہوچکے تھے۔ اُن کے لئے اب مجھ میں کوئی دلچسپی باقی نہ تھی۔

صد ہزار افسوس کہ فلک کج رفتار کو ہمارا یہ دَور بھی گوارا نہ ہوا۔

اچھا ہوتا اگر یہ پردہ یونہی پڑا رہتا۔ اور مَیں بھول میں ان پر اوران کی محبت پر مثل سابق کے بھروسہ رکھتی۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ عیش کی گھڑیاں ختم ہوچکی تھیں۔ اور گردشِ زمانہ انکی سُہاگ کی رات کو میرے علم میں لانا چاہتا تھا۔

اتفاق سے ایک روز اُن کی میز پر وہ دل ہلا دینے والی تحریر دیکھی جس نے جگر کے ٹکڑے کر دئے اور میں غم و غصّہ سے جلکر خاکستر ہوگئی۔ دُنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ خط ہاتھ میں لئے سکتے میں کھڑی تھی۔ ڈاکٹر آن دھمکے۔ مَیں سہم گئی۔ میز کے قریب کھڑا دیکھکر برس پڑے۔ اور جب خط کا پتہ چلا تو غصّہ کی حد نہ رہی۔ میری آنکھیں ساون بھادوں برسا رہی تھیں۔ مگر انہوں نے مطلق پرواہ نہ کی۔

پھُولے پھالے شام کو گھر واپس آئے اور یہ کہکر کہ ایک ہفتہ کیلئے باہر جارہا ہوں سوٹ کیس ہاتھ میں اُٹھا کر روانہ ہوگئے۔

مجھ میں اب ہزاروں کیڑے تھے۔ نہ میری صورت میں کشش تھی نہ سیرت میں اثر تھا۔ ہر ہنر عیب میں بدل گیا تھا۔ خود غرض اور خود پرست کے خوبصورت خطاب کبھی کے عطا ہوچکے تھے۔ آہ میرا حسرت بھرا دل پاش پاش ہوچکا تھا۔

ڈاکٹر ایک ہفتہ بعد واپس آئے تو چہرہ ٹھہرا ہوا تھا۔ پہلی جیسی گھبراہٹ اور اضطراب نہ تھا۔

کوئی راز دُنیا میں ہمیشہ پردے میں نہیں رہا۔ جب میرے کانوں میں یہ منحوس خبر پہونچی کہ ڈاکٹر نے نکاح ثانی کر لیا تو کلیجہ منہ کو

آگیا اور دُنیا ویران نظر آنے لگی۔ آہ عورت کیسی بیکس اور بے بس ہے۔ اس کا وجود محض مرد کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑا گیا۔ ستیاناس ہو اس سوسائٹی کا اور لعنت ہو اس رسم و رواج پر جس نے عورت کیلئے دُنیا کو تنگ کر دیا۔

وہ کسی کے تیرِ نگاہ سے کچھ مُدت سے گھائل ہو چکے تھے۔ یہ کسی بگڑے ہوئے نواب کی صاحبزادی تھیں۔ ڈاکٹر کے دہن طمع میں پانی بھر آیا۔ اور دولت کے لالچ میں یہ رنگین کھیل کھیل کر مجھ بے گناہ کی زندگی کو اُجاڑا۔ وہ شروع سے عاشق مزاج اور رنگین طبع تھے۔ اب نوعروس کی نئی محبت کا نشہ بُری طرح سوار تھا۔ میرے پاس اب جوگی کا سا پھیرا تھا۔ آہ میری آرزو بھری ناؤ بیچ منجدھار میں پڑی غوطے کھا رہی تھی۔

آگ کی طرح یہ خبر میرے تمام کُنبے میں پھیل گئی۔ بھابی جان غریب خواہ مخواہ اپنے کو مُجرم سمجھکر نہایت رنجیدہ اور شرمندہ تھیں۔ بھائی جان اس قدر افسُردہ تھے کہ اُن کے معصوم چہرے کو دیکھکر ہمیشہ میں نے اپنا نہ مٹنے والا اور جان لیوا غم چھپانے کی کوشش کی۔ اس کوہِ الم نے ان کو مبہوت کر دیا تھا۔

مَیں اُن کی دُورُخی چالیں اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اُن کے پیمانہ وفا کی کچھ قدر و قیمت باقی نہ تھی۔ میری زندگی کی خوبصورت وادی کو وہ تقریبًا ملیا میٹ کر چکے تھے۔ مجھ میں اِس صدمے کی برداشت کی قوت نہ رہی تھی۔ میرا غیرت مند دل اب اُنکی خوشامد اور خدمت سے متنفر تھا۔

حامد منزل ویران اور سُنسان پڑی تھی۔ نہ پہلی جیسی چہل پہل تھی نہ رونق۔ اُس کے بیوفا مکین نے دوسرا نشیمن آباد کر لیا تھا اور وہ اب نئے شکار کا شیدائی تھا۔ اس ڈھنڈار حویلی میں مَیں کوئے ہکنی کی طرح کسی کی یاد میں تڑپ تڑپ کر زندگی کے دن تیر کر رہی تھی۔ قولوں کا باندھا ہوا دم اپنے بس میں نہ تھا۔ میری سمجھ کام نہ کرتی تھی کہ کس سزا کی پاداش میں اس ظالم نے میری زندگی کو اجیرن کیا ہے۔

غم و الم اور گلے شکووں کا بخار اُجڑے ہوئے کمرہ میں حامد کی شاندار تصویر کے آگے نکال نکال کر ہلکا کیا کرتی تھی۔

یہ کہاں تھی میری قسمت جو تو نیک کار ہوتا ۔۔۔ نہ کسی کا دِل دُکھاتا نہ ستم شعار ہوتا
نہ کراتنی زر پرستی کہ ہے بے ثبات ہستی ۔۔۔ کہ دو روزہ زندگی پر نہیں اعتبار ہوتا

دنوں سے ہفتے ہفتوں سے مہینے اور مہینوں سے سال ہونے آئے۔ دیکھتے دیکھتے کتنے ہی موسم بہار آئے اور چلے گئے۔ اور خدا معلوم کتنے اور آئیں گے۔ ماہِ مارچ کا ہلکے لحاف اوڑھنے کا پیارا پیارا گلابی جاڑا اب بھی آتا ہے۔ صحنِ باغ میں جُوئی اور موتیا کی کلیاں اب بھی کھلتی ہیں اور اپنی بھینی بھینی خوشبو سے مشامِ جان کو مُعطر کرتی ہیں۔ کگروندے اور مولسری کے گھن دار درختوں پر چڑیاں اب بھی چُوں چُوں کرتی پھُدکتی پھرتی ہیں۔ ایشیا کے چمکیلے اور گرم آفتاب کی تیز و روشن شعاعیں بدستور میرے ویران کمرے میں دریچہ سے سرج لائٹ کی طرح ناچتی ہیں۔ آفتابی شعاعوں میں کوٹرے کرکٹ کے ننھے منّے ذرّات جو کبھی ہماری گفتگو کا موضوع اہم تھے، آج بھی نظر آتے ہیں۔

مگر آہ میرا کیفِ زندگی فنا ہو چکا۔ مدّتیں گزرنے کے باوجود جگر میں سوزش ہے۔ زخمِ دل پر کھُرنڈ آآکر اکھڑتے ہیں۔ بہار کے شروع اور مارچ کے مہینے کی ایک خوشگوار گھڑی آج تک میرے ذہن میں محفوظ رہکر زندگی کو وبالِ جان کر رہی ہے۔

مسز برلاس

ساقی

جہاں پڑ جائے مستی میں، ترا نقشِ قدم ساقی
سمجھ لیں مست اس کو حاصلِ دیر و حرم ساقی

سلامت تیرا میخانہ کہ محفل ہو یہ محشر کی
ترے مستوں کی بیگانوں میں رہ جائے بھرم ساقی

کشیدہ ہر دو عالم دیکھتا ہوں تیرے ساغر میں
مجھے مل جائے سب کچھ، ہو اگر تیرا کرم ساقی

غذائے رُوح میں آب و ہوائے ملکِ امکاں ہے
پیئوں گا جام کھا کر تیرے قدموں کی قسم ساقی

سوا تیرے کوئی اپنا بھی ہو تو وہ نہیں اپنا
ابھی تک خُشک لب ہیں، گو مری آنکھیں ہیں نم ساقی

ابھی تک دیکھتے ہیں اہلِ دُنیا اس میں عالم کو
ترا پھینکا ہوا ساغر، بنا ہے جامِ جم ساقی

کشیدِ مے ہو آنکھوں میں، چھلکتا جام ہو دل میں
لبوں پر آ کے جو اٹکا ہوا ہے میرا دم ساقی

اب اِسکو کوئی سمجھے کُفر یا ایمان کا حاصل
ہو بُتخانہ مرا میخانہ اور میرا صنم ساقی

یہ میخانہ نہیں ہو جلوہ گلزارِ جنّت ہے
نہیں ہو اس میں مستوں کو ترے، دُنیا کا غم ساقی

لگا دے مُنہ سے، ساغر ہو کہ میخانے کا میخانہ
نہیں ہو تشنگی میں کچھ حواسِ بیش و کم ساقی

کسی صورت سے اِس طرزِ عمل کی شرم رکھنی ہو
ہم آئے میکدے میں، چھوڑ کر بابِ حرم ساقی

گُذر جائے گی میخانے میں کیفیؔ! عمر ہستی کی
عنایت مے کا پیمانہ ہے اور دستِ کرم ساقی

کیفی چریاکوٹی

رسم و رواج کی تباہ کاریاں

موجودہ معاشی و اقتصادی پستی کے مدنظر اس وقت ہمیں اپنی معاشرت کی اصلاح اور فضول رسم و رواج و توہمات کے انسداد کی شدید ضرورت ہے۔ دورِ جدید کی نظر فریب اور سحر انگیں طرزِ زندگی اور اس کی دلچسپیوں میں ہم کچھ اس طرح گم ہو گئے ہیں کہ کبھی بھول کر بھی ہم کو اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جو قوم مفلس ہوتی ہے اس میں اظہارِ قابلیت کی صلاحیت عموماً معدوم ہو جاتی ہے اور جس قوم میں کوئی صلاحیت نہ ہو وہ دوسری اقوام کے ساتھ شاہراہ ترقی پر کس طرح گامزن ہو سکتی ہے؟ ہماری قوم کا افلاس حد سے سوا ہو گیا ہے اور ہم پر ہر طرف سے ادبار و نکبت کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں، مگر ہماری آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور ہم کچھ ایسے محوِ خواب ہیں کہ:

"حشر تک جاگنا قسم ہے!"

دنیا میں شاید ہی کوئی قوم اس قدر مفلس ہونے کے باوجود اتنی مسرف ہوگی! افلاس اچھی طرح ہم پر مسلط ہو چکا ہے۔ مگر ہم اپنے فضول رسم و رواج میں بچے کھچے روپے کا خون کرنا عین وضعداری خیال کرتے ہیں، تجارت، زراعت یا صنعت و حرفت کے کسی پیشے کو اختیار کرنا عار اور اپنی شان کے خلاف ہے مگر بیہودہ رسم و رواج کی خاطر قرض خواہوں کی دام دو پٹ ڈگریوں میں اپنے آباؤ اجداد کی جائیدادیں نیلام چڑھوانا شان وضعداری ہے۔

ہم اپنی معاشرت کو اپنے ہاتھوں نئے دن گراں بنا رہے ہیں اور اپنے معیارِ زندگی کو دوسری متمول اقوام کی اندھی تقلید میں بتدریج اونچا کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں ہماری معاشی اور اقتصادی حالت روز بروز بدتر ہوتی جا رہی ہے، ہمارا خرچ ہماری آمدنی سے سوا ہو گیا ہے اور ہم قرض کے شکنجوں یا ساہوکاروں کے پنجوں میں بری طرح پھنستے جا رہے ہیں۔

جن اقوام کی اندھی تقلید میں ہم اپنی معاشرت کو گراں اور اپنے معیارِ زندگی کو بلند کر رہے ہیں وہ قومیں اپنے معیارِ زندگی کو اسلئے اونچا کر رہی ہیں کہ جس رفتار سے ان کی زندگی کی ضرورتوں میں اضافہ ہوتا جائے گا اسی رفتار سے ان میں کسبِ معاش کا خیال خود بخود ترقی کرتا جائیگا اور اس سلسلے میں وہ اپنے بنی نوع کی امداد و اعانت کرنے کے قابل ہو سکیں گی اور بے روزگاری کا بتدریج قلع قمع ہوتا جائیگا۔ مغربی اقوام کا یہ نقطۂ نظر واقعی قابلِ ستایش ہے کیونکہ وہ اپنے اس خیال کو بحسن و خوبی عمل میں لا رہی ہیں مگر باوجود انکی ان تھک کوششوں کے ابتک بے روزگاری کا انسداد نہ ہو سکا۔

ہم مشرقی جو مغرب کی اندھی تقلید کرنا اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں، نئے دن زندگی کے معیار کو تو بڑھاتے جا رہے ہیں لیکن مغربی اقوام کی طرح کسبِ معاش اور صنعت و حرفت کی طرف بالکل متوجہ نہیں جس کی وجہ ہمارے افلاس میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی ہماری آمد و خرچ کے توازن کو بری طرح گرا رہی ہے، اس توازن کو برقرار رکھنے کی ایک ہی تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے ضروری مدات خرچ کا تعین کر لیں اور اس امر کا لحاظ رکھیں کہ آمدنی کا کتنا فی صد کس مد پر صرف کیا جانا چاہیئے۔ اور کتنا غیر مصرفی آنے والی ضرورتوں کیلئے مدِ محفوظ میں رہنا چاہیئے، اس طرح اگر ہم اپنا بجٹ بنا لیں اور اپنی زندگی کے معیار کو اپنی

آمدنی کے لحاظ سے گھٹا دیں تو ہمارا افلاس بڑی حد تک دُور ہو سکتا ہے اور زندگی کی حقیقی مسرتیں ہمیں حاصل ہو سکتی ہیں۔

ہمارا کوئی گھر ایسا نہیں کہ جہاں سال میں دو چار بلکہ دس پانچ فضول تقریبیں نہ ہوتی ہوں اور قرض کے روپے سے پُر تکلف دعوتیں اور رقص و سرود کی رنگین محفلیں برپا نہ کی جاتی ہوں۔ ہماری قوم کا اب یہ مسلک ہو گیا ہے کہ انسان صرف کھانے اور اُڑانے کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ یا لباسِ فاخرہ پہن کر اپنی جھوٹی شان و شوکت کا مظاہرہ کرنیکے لئے عالم وجود میں آیا ہے۔ خواہ اس قسم کی نمائش میں جگ ہنسائی کی نوبت ہی کیوں نہ آئے اور ذلّت و خواری کی حد و انتہا ہی کیوں نہ ہو جائے۔

بچے کی تاریخ پیدائش سے لیکر عمر طبعی کو پہونچکر دوسری دُنیا میں سدھارنے تک بلکہ اس کے بعد بھی کوئی نہ کوئی تقریب ایسی ہوتی رہے جس کی وجہ سے گھر میں خاصی چہل پہل ہو اور صاحب خانہ کی میزبانی، دریا دلی اور خوش سلیقگی کے خُوب چرچے ہوا کریں چاہے اس میزبانی میں میزبان صاحب کی عزّت و آبرو پر ایک دن پانی ہی کیوں نہ پھر جائے اور گھر کا اچھی طرح صفایا ہی کیوں نہ ہو جائے۔

بچے کے عالم وجود میں آتے ہی فضول اور غیر اسلامی رسموں کا طوفان برپا ہو جاتا ہے، چھٹی، چھلہ، بوٹ چٹائی، ناک چھدائی، کان چھدائی غرضکہ ہر رسم کا کرنا واجب اور قرض لیکر پُر تکلف ضیافتیں کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر بچے کے لئے بیش قیمت زریں لباس تیار کیا جاتا ہے، بچے کے ساتھ اُس کے محترم والدین بھی مُرغ زرّیں بن جاتے ہیں۔ اور اعلیٰ پیمانے پر عزیز و اقارب اور دوست احباب کی دعوتیں کی جاتی ہیں۔ بعض گھروں میں چھٹی چھلہ کی تقریبیں کچھ اس طرح منائی جاتی ہیں کہ گویا بچے کی پیدائش کوئی عجیب و غریب بات ہے یا بچہ دُنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے۔ گھر کی یہ فضا بچے کو بسم اللہ کے گنبد میں بٹھا دیتی ہے اور کچھ ایسے ناز و نعم اور بیجا لاڈ پیار میں اسکی پرورش ہوتی اور اُسکی ذہنیت پروان چڑھتی ہے کہ وہ بڑا ہو کر اپنے ناعاقبت اندیش والدین کے نقش قدم پہ چلتا ہے اور آگے چلکر اسی قسم کی لغویات و خرافات کا عادی ہو جاتا ہے۔

چھٹی چھلہ کا بوجھ ابھی ہلکا نہیں ہونے پاتا کہ نامِ خُدا سالگرہ کی تقریب قریب آتی ہے سالگرہ بھی کیسی؟ پہلی سالگرہ!! اس میں تو خُوب جی کھول کے روپیہ خرچ کرنا چاہیئے۔ برس کا یہ ایک دن بھلا بار بار کہاں آتا ہے! نوبت نقارہ کے ذریعے یا ڈنکے کی چوٹ سالگرہ کا اعلان ہوتا ہے اور ایک نہایت شاندار دعوت کے ساتھ کسی چھمی جان کا مجرا بھی کرایا جاتا ہے، غرضکہ ؎

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق!!

مگر اس رونق کے سلسلے میں ایک دن وہ بھی آتا ہے کہ نوبت نقارے کے عوض نیلامی ٹمکی کا "نوحۂ غم" سُننا پڑتا ہے، کیونکہ ہماری اکثر و بیشتر تقریبیں کسی نہ کسی ساہوکار کی شرمندۂ منّت ہوا کرتی ہیں۔ اس جھوٹی شان و شوکت کے مظاہرے نے ہماری قوم کی حالت بد سے بدتر کر دی ہے مگر ہم کو اپنی تقریبوں کی خوش سلیقگی اور تکلّف پر بڑا فخر و ناز ہوتا ہے کہ ایسے اعلیٰ پیمانے پر ہماری تقریبیں ہوا کرتی ہیں کہ ہر مہمان ہمارے سلیقے اور فراخدلی کی جی کھولکر داد دیتا ہے اور ہر طرف ہماری خُوب واہ وا ہوتی ہے اگرچہ کسی دن اس "واہ وا" کے سلسلے میں قرض کی ڈگریاں "ہائے وائے" بھی کرا دیتی ہیں۔

پہلی سالگرہ کے قرض سے ابھی نجات نہیں ملتی کہ لڑکے کی ختنہ یا لڑکی کی ناک اور کان چھدائی کی تقریب آپہونچتی ہے۔ یہ تقریب بھی اُسی روایتی آن بان سے منائی جاتی ہے ورنہ والدین کے ساتھ سارے خاندان کی ناک کٹ جانیکا خطرہ لگا رہتا ہے۔ یہ سب خرافات

اور لغویات واجبات سے سمجھے جاتے ہیں، خواہ ان "واجبات" کی سربراہی اور انجام دہی میں ایک دن سارا اثاث البیت ہی کیوں نہ نیلام کرانا پڑے۔ ان تقاریب کے ساتھ ساتھ ہر سال دُھوم دھام سے سالگرہ کرنا فرض ہوجاتا ہے، اگر یہ رسم کسی سال ناغہ ہوجائے تو بڑی بدشگونی سمجھی جاتی ہے اور بچے کی جان اقسام کے نام نہاد خطروں میں گھر جاتی ہے۔

چوتھا سال آغاز ہوتے ہی والدین کو تسمیہ خوانی یا "بسم اللہ" کی فکر لگ جاتی ہے، اس رسم کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور اب تک جتنی تقریبیں ہوئی تھیں اُن سب سے اعلیٰ پیمانے پر یہ تقریب سعید منائی جاتی ہے۔ بیش قیمت زرّیں لباس، وہی کھانے کھلانے کی پُرتکلّف دعوتیں، رقص وسرود کی رنگین محفلیں، شاندار آتشبازی کا دُھواں دھار مظاہرہ، ان سب پر مستزاد یہ کہ "بسم اللہ" کے نوشہ کی برات گھوڑے یا موٹر پر چکا چوند کرنے والی روشنی، فضا کو گندہ کرنے والی آتشبازی اور کان پھاڑ باجوں کے ساتھ عزیز واقارب، اور دوست احباب کی ہمراہی میں دو چار گھنٹوں کی گشت کے بعد بخیر وخوبی گھر لوٹتی ہے۔

چھٹی، چھلہ، عقیقہ، ختنہ، ناک چھدائی، کان چھدائی، سالگرہ، بسم اللہ وغیرہ میں روپے کا جو دریا بہایا گیا تھا اُس کا اثر والدین کی اقتصادی حالت کو برسوں سنبھلنے نہیں دیتا۔ قرض کی رقم تو رہی ایک طرف اُس کا سُود تک ادا کرنا دُشوار ہوجاتا ہے۔ والدین اپنے اس چشم وچراغ کی مسرت افروز روشنی میں کچھ ایسے کھو جاتے ہیں کہ اُن کو اپنے بُرے بھلے کی کوئی سُدھ نہیں رہتی، اُن کی ناعاقبت اندیشی اور مشیخت مآبی کی وجہ کسی دن یہ "چراغ خانہ" سارے گھر کو پھونک دیتا ہے اور ایک دن وہ بھی آتا ہے کہ:-

"اِس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

کہنا پڑتا ہے۔ بعض حضرات تو قرض کے شعلوں میں بالکل ہی بھسم ہوجاتے ہیں اور بعض جو نیم سوختہ ہوتے ہیں اُنہیں چند سال کے بعد اپنے اس آتش افروز چراغ کی روزہ کشائی کی فکر دامنگیر ہوتی ہے۔ اِس تقریب کو بھی "فرض" سے ہٹکر لغویات کا مظہر بنا دیا جاتا ہے، اس میں بھی وہی جھوٹی شان وشوکت کا مظاہرہ اور اسراف کی نمائش کی جاتی ہے۔ نام ونمود کا شوق ہماری طبیعتوں میں کچھ ایسا راسخ ہوگیا ہے کہ جبتک ہر تقریب میں جی بھر کر فضول خرچی نہ کریں چین ہی نہیں پڑتا۔

جس گھر میں بچے کی پیدائش کے ساتھ اس قسم کی تقاریب کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور اُس کی عُمر کے ساتھ اس سلسلہ کی درازی بھی بڑھتی جاتی ہے، ایسے گھر کے بچے کی ذہنیت اور خیالات کیا ہوسکتے ہیں؟ قیمتی سے قیمتی لباس کی اُس کو ضرورت ہوگی، اقسام کی فضول خرچیاں اُس کی فطرت میں داخل ہوجائیں گی، خود پسندی اور انانیت کے زہریلے جراثیم اُس کے دماغ میں گھر کرلیں گے، کاہلی اور تعیش اُسکی طبیعت ثانیہ بن جائیں گے۔ ایسے ناز ونعم کے گہوارے میں جو بچے پرورش پاتے ہیں وہ دُنیا میں کسی مرض کی دوا نہیں ہوتے، نہ اُن کے ناعاقبت اندیش والدین ہی کو اندھی محبت کی وجہ اُن کی تعلیم وتربیت کا خیال ہوتا ہے اور نہ ایسے بچّوں میں حصول علم وفن کا شوق پیدا ہوسکتا ہے۔ اس قسم کی فضا میں نشو ونما پائے ہوئے بچے اگر کچھ پڑھ لکھ بھی لیں تو اپنی بُری عادتوں کی وجہ بدنام کنندہ نیک نامے چند ہوکر زمین کی پیٹھ کا بوجھ بنجاتے ہیں۔

بچے کے پدر بزرگوار مسلسل تقریبوں کی وجہ قرض کی پریشانیوں میں کچھ ایسے مُبتلا ہوجاتے ہیں کہ اپنے لاڈلے کی تعلیم وتربیت کی طرف اُن کی پوری توجہ نہیں ہوسکتی۔ شب وروز وہ اپنے قرض خواہوں کو بہلانے منانے اور اپنی عزّت بچانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اب رہی ماں! یہ بیچاری تھوڑی بہت تعلیم یافتہ ہوتی ہے، کیونکہ لڑکیوں کو برائے نام تھوڑی سی تعلیم دلانا کافی سمجھا جاتا ہے،

تربیت کی تو قطعاً ضرورت نہیں سمجھی جاتی، جہاں لڑکی اسکول میں داخل ہوئی والدین اپنی ذمہ داریوں سے بالکل سُبکدوش ہوجاتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسکول میں لڑکی کی تعلیم و تربیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ ایک روز وہ صحیح معنوں میں "عورت" بنکر نکلے گی۔ مگر آج کل لڑکیوں کو جس قسم کی تعلیم دی جارہی ہے اُس سے وہ نہ صرف اپنے فرائض سے غافل ہورہی ہیں بلکہ اپنی "نسائیت" کو بھی خیرباد کہہ رہی ہیں۔ اس قسم کی تعلیم اسکو مغربی عورت کی طرح ایک نئی جنس بنارہی ہے، ایسی تعلیم کا پہلا اثر اس میں احساسِ فرائض کا ضعف پیدا کررہا ہے۔ اسکول اور کالج کی فضا میں اُس کو اپنی صنف کے ایسے افراد سے سابقہ پڑتا ہے جن کی تہذیب و شائستگی کا بڑا معیار اُن کے لباس اور سنگار کی اختراعات ہیں۔ ہماری ناسمجھ لڑکیاں اپنی معاشرت میں اُن کی تقلید کرنا چاہتی ہیں۔ اگر وہ متوسط طبقے کی ہیں تو اُن کے والدین اُن کی نت نئی خواہشوں اور فرمائشوں کی تکمیل سے قاصر رہتے ہیں۔ والدین کی اس مجبوری کو یہ کم فہم لڑکیاں "ظُلم" سمجھتی ہیں۔ اس طرح ایک قسم کی بغاوت والدین سے شروع ہوجاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی لڑکی اسکول کی تعلیم ختم کرکے نکلتی ہے تو اُس کے دل میں نہ والدین کی محبّت ہوتی ہے اور نہ اُن کا احترام باقی رہتا ہے، اُس کو اپنی قابلیت کا اس حد تک خبط اور گھمنڈ ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے والدین کو جاہل اور پاگل خیال کرتی ہے۔ اسی قسم کی تعلیم کے متعلق اکبر الہ آبادی فرماتے ہیں ؎

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

غرضکہ اس قسم کی تعلیم یافتہ جاہل ماں کی گود بچے کا پہلا مکتب بنتی ہے۔ جہاں بچے کا معلّم اوّل اس قابلیت کا ہو تو ظاہر ہے کہ اُسکی تعلیم و تربیت کس خوش اسلوبی سے انجام پائیگی اور اُس کے عادات و اطوار کی تعمیر کس پیمانے پر ہوگی۔

بعض ایسی نظیریں بھی موجود ہیں کہ لڑکا اُنیس بیس سال کا بھی نہیں ہونے پاتا کہ ماں کو اپنے لختِ جگر کے بیاہ کا خیال ستانے لگتا ہے، اگر بیاہ ممکن نہ ہو تو کم از کم منگنی کی رسم تو کرنا واجب ہوجاتا ہے، یہ رسم ہوتے ہی نورِ چشم کے سُسرال سے سمدھیانے کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے۔ اور دونوں طرف سے عید بقرعید کے موقعوں پر حصّے بخرے آنے جانے شروع ہوجاتے ہیں، کہنے کو تو یہ عید کے حصّے ہوتے ہیں مگر ان کی تیاری میں کافی اسراف کیا جاتا ہے۔ اور موازنہ میں جو پہلے ہی سے غیر متوازن تھا ایک مستقل خرچ کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس طرح چند سال بھی گزرنے نہیں پاتے کہ والدین کو فکر ہوتی ہے کہ اگر بیاہ جلد نہ کیا جائے تو کہیں برخوردار آوارہ نہ ہوجائیں اور کسی بازاری جنس سے سودا نہ کرلیں۔

ہمارے گھروں میں شادی بیاہ کے موقعوں پر جو فضول خرچی کی جاتی ہے اور بیہودہ رسوم میں جو اسراف ہوتا ہے اس کا صرف تصوّر ہی ایک ذی فہم انسان کیلئے کافی خوفناک اور شرمناک ہے۔ اپنی حیثیت سے بڑھکر اپنی شخصیت کو ظاہر کرنے کی خواہش ایک ایسا مرض ہے جس میں تقریباً ہر شخص مُبتلا نظر آتا ہے۔ تقاریب کے موقعوں پر تو اس مرض میں کافی شدت ہوجاتی ہے، عروس کے والدین خواہ صاحبِ ثروت ہوں یا نہ ہوں مگر اُن پر واجب ہے کہ اپنے برخوردار داماد کے بیش قیمت لباس وغیرہ کیلئے ایک کثیر رقم کسی صورت فراہم کریں۔ اس کے علاوہ دُلہن کے لئے بیش قیمت زرّیں لباس کے کئی جوڑے۔ مرصّع زیور کا سراپا، نئی وضع کا قیمتی فرنیچر، نئے ماڈل کی شاندار موٹر کار، غرضکہ اقسام کی سینکڑوں چیزیں جہیز میں دیں اور یومِ عقد ایک ایسی شاندار پُرتکلف دعوت کریں کہ جس میں ددھیاں کے سارے عزیز و احباب، اُنکے ہمسائے، دُور دُور کے رشتہ دار، اگر کہیں ملازم ہیں تو دفتر کا پورا عملہ اور عہدیداران

متعلق وغیر متعلق سب کے سب بغیر کسی شکایت کے اقسام کے مزیدار کھانے نوش جان کریں اور محفلِ رقص و سرود کا لُطف اُٹھاتے، گیلیں اُڑاتے، تاش کھیلتے شام تک رونق افروز ہیں تاکہ اس تقریب میں ایک "ایٹ ہوم" بھی ہو جائے۔ اس قسم کی شادیاں اکثر خانہ بربادی کا باعث ہوا کرتی ہیں۔

شادی بیاہ اور دوسری تقریبوں کے علاوہ محرم، شب برات اور عیدین کے موقعوں پر بھی ہم اپنی فضول خرچی اور اسراف کا اپنی حیثیت سے بڑھکر خوب مظاہرہ کرتے ہیں، جہاں کہیں کوئی عید آئی دو چار ہفتے پہلے ہی سے دوکانوں پر میلہ لگ جاتا ہے اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لئے سر سے پیر تک نیا لباس بنواتا اور نیا سامان خریدتا ہے، یہانتک کہ محرم کے متبرک دنوں میں بھی شہیدانِ کربلا کی یاد کو تازہ کرنے کے عوض نئے نئے لباس بنائے جاتے ہیں۔ اور شب برات کے مقدس گھنٹوں میں عبادت کو بالائے طاق رکھکر آتشبازی سے جی بہلایا جاتا اور بڑی بیدردی سے روپے کی ہولی جلائی جاتی ہے۔

ہماری فضول خرچیوں اور رسم ورواج کی بربادیوں کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے، مرنیکے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے زیارت، دسواں، بیسواں، مہینے کی فاتحہ، چہلم، سہ ماہی، چھ ماہی، نو ماہی، برسی وغیرہ کے ناموں سے جو تقریبیں کی جاتی ہیں اُن میں بھی جی کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے اور نہایت پُرتکلف اقسام کے کھانوں سے مہمانوں کو شاد کام کیا جاتا ہے، بعض لوگوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ چہلم میں کم از کم چالیس قسم کے کھانے ہونے چاہئیں ورنہ مرحوم یا مرحومہ کی رُوح کی بھوک پیاس تشنہ رہ جاتی ہے اور اپنے پسماندوں کو پریشان کرتی، سرگرداں رہتی ہے۔

خوشی کی تقاریب کی طرح زیارت، دسواں، چہلم وغیرہ کو بھی تقریب کا رنگ دیا جاتا ہے، فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ان تقاریب میں "اربابِ نشاط" کو مدعو نہیں کیا جاتا مگر بعض گھروں میں "قوالی" ہوا کرتی ہے۔ دوست احباب، عزیز و اقارب، شناسائی، پڑوسی، حوالی، موالی سب کے سب جمع ہوتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور ہنس بول کر غم غلط کرتے ہیں۔ اس موقع پر اکبر الہ آبادی نے خوب کہا ہے! ؎

بتائیں ہم تمہیں مرنے کے بعد کیا ہوگا پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

فاتحہ اور نیاز بُری چیزیں نہیں ہیں بشرطیکہ اُن کو صحیح معنوں میں انجام دیا جائے، محتاج، یتیم اور مستحقین کے عوض ایسے لوگ مدعو کئے جاتے ہیں جن کی شرکت قطعًا باعثِ ثواب نہیں ہوسکتی، اس طرح ایصالِ ثواب کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور فاتحہ تقریب بن جاتی ہے۔

سخت ضرورت ہے کہ اپنی معاشرتی خرابیوں، رسم ورواج کی تباہ کاریوں اور فضول خرچیوں کی طرف ہم اپنی پہلی فرصت میں توجہ کریں کہ ہماری مسرت وغم کی یہ تقاریب اپنے اندر کس حد تک تخریب کے سامان رکھتی ہیں اور کہاں تک ہمارے افلاس اور نکبت کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں، ہماری آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور ہم فیشن پرستی، مغرب کی اندھی تقلید، رسم و رواج اور توہمات کے بھول بھلیوں میں کچھ ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ ہمیں کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ خدا ہمیں سمجھ دے کہ ہم فضول رسم و رواج کی پابندی اور مغرب کی اندھی تقلید کرنا چھوڑیں جس کی وجہ آئے دن ہماری دولت دوسری اقوام کی جیبوں میں چلی جا رہی

ہے اور ہم نحبت اور افلاس کے بھنور میں غوطے کھا رہے ہیں۔ خدا وہ دن لائے کہ ہم برائی اور بھلائی میں امتیاز کرنا سیکھیں کفایت شعاری کو اپنا شعار بنائیں اور اپنی آمد و خرچ کے توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔ اپنی جھوٹی شان و شوکت کی نمائش کے عوض ہم میں وہی سادگی، راستبازی اور عجز و انکسار کے جذبات پیدا ہوں جو ہمارے اسلاف میں تھے جنکی بدولت انہوں نے ساری دنیا کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا اور اپنا امتیاز دوسری اقوام سے منوا کر چھوڑا تھا۔

میرزا سیف علیخاں

تاثرات

معصوم ہواؤں میں، معصوم صداؤں میں
خاموش فضاؤں میں
اک کیف سا پاتا ہوں

بھیگی ہوئی راتوں میں بہکی ہوئی باتوں میں
احباب کی گھاتوں میں
اپنے کو مٹاتا ہوں

مخمور فسانوں میں پُرکیف ترانوں میں
مستی بھری تانوں میں
جی بن کے سماتا ہوں

رنگین نظاروں میں ساون کی بہاروں میں
بکھرے ہوئے تاروں میں
دل تھام کے گاتا ہوں

جب یاد وہ آتے ہیں اور دل میں سماتے ہیں
اک آگ لگاتے ہیں
اشکوں سے بجھاتا ہوں

ہاں اور بھی گاؤ کچھ آنکھوں سے بہاؤ کچھ
ماتھے سے بناؤ کچھ
اے حسن! میں آتا ہوں

جاموں کے کھنکنے سے غنچوں کے چٹکنے سے
پھولوں کے مہکنے سے
کچھ بھولتا جاتا ہوں

پھر دیکھا ہے بلانے آنکھیں ہیں کہ میخانے
چھلکے ہوئے پیمانے
پی! اور پلاتا ہوں!

الطاف مشہدی!

اُسکی موت کی وجہ

"تمہارا یہ خیال ایک حد تک دُرست ہے کہ مجھے مالیخولیا ہوگیا ہے" افسانہ نگار عبقری نے ڈبل روٹی کے قتلے پر مکھن کے بعد جیلی لگاتے ہوئے کہا۔

معمولی اسٹیمر کی رفتار سے ساحل اپالو بمبئی سے ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت پر ایلیفنٹا کے قدیم اور مشہور غار واقع ہیں۔ یہ غار ایک چھوٹے سے خوشنما جزیرے پر پہاڑیوں کو تراش کر بنائے گئے ہیں۔ اور غارہائے اجنٹا کی طرح فنِ سنگ تراشی کا معجزہ تصور کئے جاتے ہیں۔ یہ ہمیشہ سے فنونِ لطیفہ کے شائقین اور آرٹ سے دلچسپی رکھنے والوں کی زیارت گاہ رہے ہیں۔ بڑے دن کی چھٹیوں میں یارانِ طریقت ایک بار ضرور یہاں کی سیر کر آتے ہیں۔ کیونکہ بمبئی کے قرب وجوار میں تفریح کے لئے اس سے بہتر اور کوئی مقام نہیں ہے۔

چنانچہ اس مرتبہ بھی ہم ایک ایسی ہی پکنک پر آئے ہوئے تھے۔ ایلیفنٹا کے سب سے بڑے غار میں چادر بچھا دی گئی تھی۔ چائے کا دَور ہو رہا تھا۔ بائیں جانب غار کے کھوہ میں مہا مہیشور کی تین سر والی پندرہ بیس فٹ بلند مورتی اپنے حیرت انگیز تناسب کے ساتھ کندہ تھی۔ پشت پر اردھا نریشور کا نصف زنانہ اور نصف مردانہ دیو قامت بُت دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ لوگ دیوار پر کندہ شدہ مورتیوں کو دیکھتے ہوئے دونوں جانب کھلے دالانوں میں اُتر جاتے تھے جن سے گذر کر روشنی غار میں داخل ہوتی تھی۔ مورتی کے سامنے کالج کے چند لڑکے اور لڑکیاں کھڑی اُس کے حُسن و قبح پر خیال آرائیاں کر رہی تھیں۔ دُور، ایک چٹان پر آرٹ کا ایک طالب علم بیٹھا غاروں کی تصویر بنا رہا تھا۔ ہمارے منچلے دوست مسٹر شیخ نے اپنے سیر و سیاحت کے رفیق پورٹیبل گراموفون پر نیو تھیٹرس کا ایک ریکارڈ لگا رکھا تھا۔ اور سہگل کا دردناک گیت غار کی خاموش فضا میں گونج رہا تھا۔ احباب میں خوش گپیاں ہو رہی تھیں۔ خلافِ معمول عبقری کچھ متفکر سے تھے۔ وجہ صاف ظاہر تھی کہ انہیں کوئی نیا افسانہ سُوجھا ہے۔ لیکن شوخ طبیعت مرزا سے نہ رہا گیا اور آخر اُنہوں نے ٹوک ہی دیا۔

"تمہیں مالیخولیا تو نہیں ہو گیا ہے، عبقری؟ آخر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے؟ بھائی! ان ہندوستانیوں کی کسی قسم کی اصلاح ہم جیسوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ کون جانتا ہے کہ تمہارے قیمتی اصلاحی افسانے اسی توجہ سے جس کے وہ مستحق ہیں پڑھے بھی جاتے ہیں یا نہیں۔ دیکھو یار! جان بوجھکر کوئی پرائی آگ میں نہیں پڑتا! زندگی عدم کے ہیبتناک خواب کے درمیان خفیف سی بیداری کا نام ہے۔ عدم کی تاریکیوں سے انسان شہود کی روشنی میں آنکھیں کھولتا ہے، بہت جلد پھر معدوم ہو جانے کیلئے! تمہیں اس قلیل وقفہ میں سکون کی تلاش کرنی چاہئے۔ تم سے پہلے بھی چند قیمتی زندگیاں اسی طرح تباہ ہو چکی ہیں لیکن نتیجہ معلوم! میری سنو تو میں تمہیں صلاح دوں کہ خدا کیلئے اپنی ذات پر رحم کرتے ہوئے ادبی مشاغل کو بالکل ترک کر دو۔ ملک وقوم کی فلاح و بہبودی کے اور بھی طریقے ہیں۔ اگر تم اسے ایسا ہی ضروری تصور کرتے ہو تو کبھی کبھی مالی امداد کے طور پر یا کسی اور شکل میں اس فرض کو بھی ادا کر لیا کرو۔ ایسی اچھی صبح، جب قدرت انتہائی فراخدلی سے شعریت نثار رہی ہو، احباب کی صحبت میں

بیٹھکر کسی افسانے کے لئے سواد کی فکر کرنا عین حماقت ہے ...." موقع بے موقع اپنے زور تقریر کے اظہار میں مشتاق مرزا نے یہ سب کچھ بلا دم لئے کہہ ڈالا۔

اس کے جواب میں ہم عبقری کی زبان سے ایک ایسے چبھتے ہوئے جملے کے منتظر تھے جو انکی ساری تقریر پر پانی پھیر دے۔ لیکن انہوں نے نہایت اطمینان سے مسکراتے ہوئے اس پُرجوش و مدلل لکچر کو سُنا اور اس انداز میں کچھ کہنے پر آمادہ ہوئے کہ نعمانی کو کہنا ہی پڑا۔ ع

اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

"مذاق نبا شد" عبقری نے کہا "مرزا کا یہ خیال ایک حد تک درست ہے کہ مجھے مالیخولیا ہوگیا ہے"

"اب تو مجھے بھی یقین آگیا" شیخ فوراً بول اُٹھے۔

"ہاتھ لا اُستاد، کیوں کیسی کہی؟" مرزا نے قہقہہ لگا کر داد طلب کی۔

"قدرے سنجیدگی سے سُننے کی بات ہے" اپنے مخصوص انداز میں اتنا کہہ کر عبقری نے ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی اور غور طلب گفتگو کے لئے ماحول پیدا کرلیا۔

"تم تو جانتے ہو مرزا" انہوں نے کہنا شروع کیا کہ "میں ابتدا میں صرف ذوق کی تسکین کے لئے شعر کہا کرتا تھا۔ لیکن بہت جلد اُسے بیکار محض سمجھکر ترک کردیا۔ اس کے بعد میں نے چند مختصر افسانے لکھے جن سے سوسائٹی کے ادنیٰ طبقے کی اخلاقی و معاشرتی اصلاح مقصود تھی۔ ان افسانوں نے لٹریچر میں ایک جدید طرز کی بنا ڈالی اور بہت مقبول ہوئے۔ اس صورت سے میں نہایت قلیل عرصہ میں کافی شہرت کا مالک بن بیٹھا۔ جسے نباہنے کیلئے سال میں دو چار افسانے لکھنا مجھ پر گویا فرض ہوگیا۔ یہ سلسلہ یوں ہی قائم رہتا۔ لیکن کچھ عرصے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کردی کہ سوسائٹی میں سب سے زیادہ اصلاح طلب وہ لوگ ہیں جو اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور شرفا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کا بیشتر حصہ سرمایہ داروں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ میں نے اُن کے خلاف جہاد کی ٹھان لی اور اپنے افسانوں کا یہ رویہ اختیار کیا جو اب میرا جدید طرز بن گیا ہے۔ میں نے ملک و قوم کی اصلاح کا ذریعہ لٹریچر کو بنایا کیونکہ یہ زود اثر ہوتا ہے۔ اور اپنے آپ میں بقا کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلئے اس وقت تک اپنا کام انجام دیتا رہتا ہے جب تک اپنے مقاصد میں پوری پوری کامیابی حاصل نہ کرلے۔

گراموفون اب تک گائے جارہا تھا ؎

او حُسن کے شیدائی، او عشق کے دیوانے ہم بھی تو سُنیں آخر کیا ہیں ترے افسانے

نعمانی نے ریکارڈ روک دیا۔ غار میں خاموشی چھاگئی۔ البتہ عقب والے غار میں کالج کے طلبا نے اُدھم مچا رکھا تھا اور کبھی کبھی انکے کسی طویل قہقہے کی آواز ہم تک پہونچ جاتی تھی۔ عبقری نے جلدی سو چائے کی پیالی ختم کرکے سگرٹ سُلگایا اور پھر کہنا شروع کیا۔

"یہ واقعہ میری ادبی زندگی کے ابتدائی دور کا ہے۔ ہاں پہلے مجھے یہ کہدینا چاہیئے کہ میں آپ لوگوں کی دُعا سے ملک میں افسانہ نویس کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتا ہوں اس لئے اکثر میرے احباب بلکہ بعض اوقات نا احباب بھی اپنے دلچسپ واقعات زندگی مجھے لکھ بھیجتے ہیں اور میں انہیں ذرا افسانوی رنگ دے کر ملک کے سامنے پیش کردیتا ہوں۔ اس سے میرا مقصد یہی ہوتا ہے

جو ہمیشہ سے میرے افسانوں کا نصب العین رہا ہے۔ بھیجنے والے اس سے کیا فائدہ اٹھاتے ہیں' مَیں خود نہیں جانتا۔

گرمیوں کی ایک صبح مجھے ایک اجنبی مزدور کا خط ملا۔ اس میں اُس نے اپنا نام اور حلیہ لکھنے کے بعد مجھ سے استدعا کی تھی کہ مَیں اُس سے بحرِ ہند کے ساحل پر ملاقات کروں اور وجہ یہ بتلائی تھی کہ وہ چند اہم خانگی اُمور میں مجھ سے مشورہ کرنا چاہتا ہے۔ نیز اُس نے ایک عجیب و غریب بات یہ بھی لکھی تھی کہ اُسکی یہ ملاقات میرے بیشمار افسانوں کی تخلیق کا باعث بنے گی۔

اپنے متعلق تو نہیں کہتا لیکن اصولاً ادیب خوش اخلاقی و شرافت بلکہ انسانیت کا نمونہ ہوتا ہے۔ اور لٹریچر کی صورت میں سارے عالم کو اپنا ساتھی بننے کی دعوت دیتا ہے۔ اجنبی مزدور کا یہی خط اگر میرے سوا کسی اور ادیب کو بھیجا گیا ہوتا تو وہ بھی محض خدمتِ خلق کے خیال سے اس کی دعوت کو قبول کر لیتا۔ پھر مجھے تو سبز باغ دکھلائے گئے تھے۔ رہ رہ کر میرے دماغ میں یہ جملہ کھٹکتا تھا "میری یہ ملاقات آپکے بیشمار افسانوں کی تخلیق کا باعث بنے گی"۔

کشاں کشاں میں وقتِ مقررہ پر ساحلِ سمندر تک پہونچ گیا۔ ساحل کے ایک سرے پر عمر پارک کی عالی شان کوٹھیاں اور دوسری جانب راجہ صاحب ونکانیر کا محل دنیاداری کے منتہا کو پیش کر رہا تھا۔ مَیں اُن کے درمیان کم و بیش آدھ گھنٹے تک ٹہلتا رہا۔ لیکن منوہر۔۔۔ اُس نے اپنا نام منوہر ظاہر کیا تھا۔۔۔ کہیں نظر نہیں آیا۔ بالآخر مَیں سمندر کے قریب آ کر ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔

"بجھا ہوا قرمزی آفتاب آہستہ آہستہ سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ اُسکی سُرخ کرنیں اُفقِ مغرب پر اس طرح پھیلی ہوئی تھیں جیسے سمندر سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہو۔ اور روئی کے گالوں کے سے سفید بادل اسکے قطروں کو اپنے میں جذب کر رہے ہوں۔ وسیع سمندر اپنے پورے پھیلاؤ پر لیٹا ہوا کسی دم توڑنے والے مریض کی طرح اُکھڑے اُکھڑے سانس لے رہا تھا۔

میں ساحل پر بیٹھا اُفق پر ٹکٹکی لگائے خیالات میں محو تھا کہ کسی نے پُشت کی جانب سے آ کر مجھے مخاطب کیا:۔

"معاف فرمائیے، آپ عبقری صاحب؟"

"اوہ، منوہر بھائی!" میں نے مُڑ کر دیکھا اور منوہر کو پہچان کر مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"معاف فرمائیے عبقری صاحب، میں نے آپ کو تکلیف دی اور تھوڑی سی اور تکلیف دینا چاہتا ہوں" منوہر نے نہایت سماجت سے یہ کہکر مصافحہ کے لئے اپنا بایاں ہاتھ پیش کیا۔ اس کا دایاں ہاتھ شانے سے کٹا ہوا تھا۔ فطرت کی نیرنگیاں میری نگاہوں میں پھر گئیں۔ مزدور کی بے سروسامانی یوں ہی کب کم ہوتی ہے جو اسے ایک ہاتھ اور وہ بھی دائیں بازو سے محروم رکھا گیا۔ بہرحال میں نے دائیں ہاتھ ہی سے مصافحہ کیا اور کہا:۔

"بلا تکلف کہو، منوہر، مَیں خوش ہونگا اگر مَیں تمہاری کوئی خدمت کر سکا"۔

"میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ میری مختصر سی سرگزشت سُن لیں اسکے بعد مَیں آپ کے سپُرد دو کام کرونگا۔ مجھے احساس ہے کہ مَیں ذرا ادیبے الفاظ میں آپ سے گفتگو کر رہا ہوں۔ لیکن دیکھئے میری استدعا کو نہ ٹھکرائیے گا۔ میری رُوح آپ کو دعائیں دیتی رہے گی"۔

"ہاں بھائی! آخر کہو تو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ حتی الامکان تمہارے کام آنے کی کوشش کرونگا"۔

"جی ہاں شکریہ!! . . . . ان دونوں میں سے ایک کام آپ چند گھنٹوں میں سرانجام دے لیں گے۔ اور دوسرے کیلئے آپ کو اختیار ہوگا۔ جو آپ مناسب سمجھیں۔ ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ آپ نے سیٹھ ہزاری مل کے فرنیچر کے کارخانے کی خوفناک آتشزدگی کا حال ضرور اخباروں میں پڑھا ہوگا اور اس میں ایک مزدور کے پورے خاندان کے جل کر ہلاک ہوجانے کی خبر بھی دیکھی ہوگی"۔

میں حیرت و استعجاب سے اُس کا منہ تکنے لگا۔ اس تشویشناک طریقے پر سیٹھ جی کے کارخانے کی آتشزدگی کو بیان کرنیکا مطلب صاف ظاہر تھا کہ اسکے بعد کوئی نہایت حیرت انگیز خبر سنائی جائے گی۔ چنانچہ میرے اندیشے دُرست نکلے منوہر نے لہجہ بدل کر کہا:۔

"وہ بدنصیب خاندان میرا ہی تھا۔ گھر کے پانچ افراد کو رونے کیلئے میں زندہ بچ گیا ہوں۔ جہاں میں سب کچھ کھو بیٹھا وہاں میرا دایاں ہاتھ بھی آگ کی نذر ہوگیا۔ قصہ طویل ہے۔ واقعات رُوح فرسا ہیں۔ لیکن میں صرف اشارتاً وہ حصے بیان کرونگا جن سے آپ حقائق کو قیاس میں لاسکیں۔

کارخانہ کی عمارت دومنزلہ تھی۔ جس کی دونوں منزلیں گودام کے طور پر بنائی گئی تھیں۔ سیٹھ جی کی تجارت اس قدر چلتی ہوئی تھی کہ کبھی انہوں نے اتنا مال نہیں بنوایا جسے گودام میں رکھنے کی ضرورت پیش آتی۔ البتہ پہلی منزل پر لکڑیاں اور کُندے بھر دئے گئے تھے۔ اور دوسری منزل کا کچھ حصّہ انہوں نے مجھے نہایت معمولی کرایہ پر دے رکھا تھا۔ صرف کرایہ کم ہونے کی وجہ سے میں کارخانے کے شور و غوغا میں مع اہل و عیال پڑا تھا" منوہر ایک لمحہ کیلئے رُکا، اِدھر اُدھر دیکھکر مجھ سے قریب تر ہوگیا اور نیم سرگوشیوں کے لہجہ میں کہا "آپ کو یہ سُنکر حیرت ہوگی کہ بابو جی نے اپنے کارخانے میں خود آگ لگائی تھی۔ ہاں، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں سب حرف بحرف صحیح ہے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کا کارخانہ بیمہ شدہ تھا اور ایسا کر کے انہوں نے بیمہ کمپنی سے اتنی بڑی رقم اینٹھ لی جو ایسے کئی کارخانوں کیلئے کافی ہوسکتی ہے۔

راز کے افشا ہونے کے خوف سے انہوں نے اپنے ناپاک ارادوں سے مجھے مطلع نہیں کیا۔ بلکہ اس بات کو ترجیح دی کہ غریب مزدور خاندان کے چار بے گناہ افراد کو لکڑی کے کارخانے نے موٹے موٹے کندوں کی لپیٹ آگ میں جلا کر راکھ کردیا۔

آہ! کیا آپ کارخانے کی سی بلند دوزخ نما چتا میں بسنے والے کنبے کی حالت کو تصوّر میں لاسکتے ہیں! اسوقت بھی میرے کانوں میں میرے معصوم بچے کی چیخ اور گھروالی کی پکار گونج رہی ہے۔

مجھے اس راز کا شاید کبھی علم نہ ہوتا۔ لیکن قدرت کو یہی منظور تھا، عین اُس وقت جب میں اُس جلتے ہوئے گودام کی ایک کھڑکی سے کُود کر فرار ہو رہا تھا میں نے سیٹھ جی کو خود اپنے ہاتھوں سے آگ مشتعل کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ یک وقت ہوا کے تیز جھونکے سے اُلٹنے والے کتاب کے اوراق کی طرح تمام حقیقتیں مجھ پر واضح ہوگئیں۔ اس کے بعد کافی بلندی سے جست لگانے کی وجہ سے میں ازحد زخمی اور بیہوش ہوگیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں ہسپتال میں تھا۔ اس عرصے میں چونکہ میرا دایاں ہاتھ بُری طرح جل گیا تھا کاٹ کر علیحدہ کردیا گیا تھا۔

چار روز پیشتر جب میں ہسپتال سے لوٹا تو میں نے سیٹھ جی سے اُن کے اس سفاکانہ ظلم کی بازپرس کی۔ وہ سرجوغرور

تجبر سے کبھی نہ جھکا تھا۔ اور وہ آنکھیں جنہوں نے کبھی نیچے نہیں دیکھا تھا، اُس وقت ندامت سے میری طرف نہ اُٹھ سکیں۔ سیٹھ جی یعنی میرے آقا نے جھک کر میرے پیر تھام لئے اور التجا کی کہ میں اس راز کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دوں۔ میں پہلو میں ایک رحم و کرم سے لبریز دل رکھتا ہوں، یہ مجھ میں ایک خدائی صفت ہے۔ بلکہ میرا تو عقیدہ ہے کہ پرماتما رحمت کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے آج میں نے ایسے گناہ کی جرأت کی ہے جسے صرف اُس کی رحمت ہی میں پناہ مل سکتی ہے۔ اور جو ابھی ابھی آپ پر ظاہر ہو جائیگا۔ بہرحال میں نے سیٹھ جی کو معاف کر دیا۔ اُنہوں نے رازداری کے صلے میں مجھے دس ہزار روپے دئے تاکہ میں زندگی بھر بیٹھکر چین سے کھا سکوں۔۔۔ زندگی بھر!! ہاں، زندگی بھر!!!"

اتنا کہکر وہ رکا، دل پر ہاتھ رکھا اور پاگلوں کی طرح ایک وحشت آگیں قہقہہ لگا کر پھر کہنا شروع کیا:-

"میں نے سیٹھ جی کو معاف کر دیا ہے، پرماتما بھی انہیں معاف کرے۔ اور اُن کے روپے، وہ میں نے آپکے نام پر لکھ دئے ہیں۔ میرے لئے اب دُنیا میں کیا رکھا ہے۔ مجھے اسی وقت سے مُردہ سمجھئے اور یہ رقم ایسی جگہ صرف کیجئے جس سے مزدور طبقہ کے زیادہ سے زیادہ افراد ایسی موت مرنے سے بچ جائیں جو۔۔۔۔۔"

اسے ایک ہچکی آئی اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے دل تھام کر سلسلۂ کلام کو جاری رکھنے کی کوشش کی۔ "عبقری صاحب۔۔۔۔ عبقری صاحب" اس کے آگے وہ کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ چکرا کر پیروں پر گھوما اور گر کر ڈھیر ہو گیا۔

اُس نے زہر کھا رکھا تھا۔

(طبعزاد) —————— غلام عباس (مولوی)

تازہ پھول

سرسبز محبت میں ہے گُل داغِ نہاں کا
اس پھول پہ ہوگا نہ اثر بادِ خزاں کا

پوچھا تھا کہ اب تک تمہیں دشمن سے ہے اُلفت
وہ چُپ ہیں کہ موقع یہ نہیں ہے کا نہ ہاں کا

رونے میں جو کی آہ تو رونے لگا لازم
آندھی نے بدل ڈالا ہے رُخ آبِ رواں کا

غیرت کا تقاضا ہے کہ اُف تک نہیں نکلے
درد اُٹھ کے یہ کہتا ہے کہ موقع ہے فغاں کا

پیری میں نظر آیا کہ تھی خواب جوانی
جب آنکھ کھلی اپنی تو موسم تھا خزاں کا

تکلیفِ رفو پھر اُسے دوں، یہ ہو نہیں سکتا
اے دردِ خبردار، کہیں ٹوٹے نہ ٹانکا

ہم چشموں میں ہم بچ گئے ذلت سے سرِ حشر
رحمت کی ردا نے مرے عیبوں کو جو ڈھانکا

مُرجھایا ہوا دل ہے جو بلبل ہے قفس میں
ہر موسمِ گُل میں بھی اثر بادِ خزاں کا

احباب بھی رنجیدہ وہ ظالم بھی خفا ہے
اس عشق نے رکھا نہ یہاں کا نہ وہاں کا

اللہ کے محبوب کا دربار یہیں ہے
ہے کوئے مدینے میں سماں باغِ جناں کا

کُملا گیا کیوں پھول سا رُخ کہئے تو مجھ سے
کہ آہ تجھ میں تھا اثر بادِ خزاں کا

[illegible]

پاک محبّت

جس طرح اُردو شاعری خصوصاً غزل گوئی میں ایک ہی طرح کے مضامین، تشبیہات، استعارات حتٰی کہ الفاظ اور محاورات تک شروع سے اب تک بندھتے چلے آتے ہیں اور اُن میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں آنے پاتا، بالکل یہی حال میں دیکھ رہا ہوں کہ آج کل کے عشقیہ افسانوں کا ہے۔ ہر عشقیہ افسانے کی ابتدا ہیرو اور ہیروئن کے ساتھ کھیلنے کھانے، پڑھنے لکھنے، جھولا جھولنے اور باہم کھیل میں ہیرو ہیروئن کے پارٹ ادا کرنے سے ہوتی ہے، اسی طرح جب ہیروئن بچپن کا زمانہ گزار کر شباب کی محشر بداماں منزل میں داخل ہوتی ہے تو اُسکی ثنا خوانی میں کوئی افسانہ نویس الفاظ کے چند اُلٹ پھیر کے سوا اس سے آگے نہیں بڑھتا کہ اسکی ہیروئن ایک ایسی حسین وجمیل دوشیزہ بن گئی جس کی مخمور وسیاہ ملکوتی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی، اُسکے گلابی رخساروں میں دلربائی اور موتی جیسے دانتوں میں بجلی کی سی چمک دمک تھی، اس کے خوبصورت اور سڈول اعضا میں جنگلی ہرنی کا سا تناسب اور مورنی کی سی نزاکت تھی۔ وہ جس طرف سے گزرتی تھی ساری نظریں اسی کے ساتھ ہولیتی تھیں اور وہ جدھر نظر اُٹھاکر دیکھتی تھیں اُدھر لاشیں پٹ جاتی تھیں۔ حُسن کی ساحرانہ جاذبیت سے مجھے انکار نہیں، مثل مشہور ہے کہ "حُسن" کی ضو اور "سکّے" کی جھنکار ہزاروں انہماک میں بھی انسان کو اپنی طرف کھینچ، اور متوجہ کرلیتی ہے۔ بلکہ اعتراض اس پر ہے کہ یہ وہ چیزیں ہیں جو اُردو کے کم وبیش تمام عشقیہ افسانوں میں پائی جاتی ہیں اور انہیں دیکھکر غیر زبانوں کے افسانہ نویس ہمارے اُردو افسانہ نگاروں کے افلاسِ خیال کا بجا طور پر مضحکہ کرسکتے ہیں۔ مگر ان سب سے زیادہ جو چیز تمسخر انگیز ہے وہ عشقیہ افسانوں کے "افسانۂ محبت" کا ایک "باب" ہے۔

بلاشبہ "افسانہ" اور "محبّت" کا رشتہ بقول حضرت وقار عظیم آج کا نہیں" بلکہ یہ دونوں اُسی دن سے ایک دوسرے کے فریب میں مُبتلا ہیں جب فطرت نے محبت کا سحر آگیں جذبہ انسان کے دل میں بسایا۔ یہی وجہ ہو کہ اُس نے جب فسانہ گوئی شروع کی تو پہلا جادو جس کے اثر میں ڈوب کر اس کے قصّے نکلے۔ یہ ہی محبّت کا جذبہ تھا۔ تہذیب نے ترقی کی، زبان کی جگہ قلم نے لی اور محبّت کی فتنہ پرور داستانیں کاغذی پیراہن میں ہم تک پہونچنے لگیں۔ اُن کی رنگینیوں نے ہر ہر قدم پر ہمیں اپنا دیوانہ بنالیا اور اب تک ہم اور ہمارے افسانے اس سحر سے آزاد نہیں ہوسکے" اور یہ بھی حقیقت ہے کہ فی زمانہ افسانہ نویس نے اس قدر ترقی کرلی ہو کہ ہمیں عشقیہ افسانوں کے علاوہ اخلاقی، معاشری، اصلاحی، تعلیمی، تاریخی، علمی، مذہبی اور جاسوسی ہر قسم کے افسانوں کی ایک کثیر تعداد اُردو زبان میں ملتی ہے مگر ایسے عشقیہ افسانوں کی جن میں محبت، عشق اور رومان کی بھرمار ہو، بڑی بہتات ہو اور اس کی کئی[1] قسمیں ہوگئی ہیں۔

---

[1] تمام اقسامِ محبّت کے تحت اُردو زبان کے افسانے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ مگر میرا مقصود اپنی ہمہ دانی اور ہمہ گیری کا سکّہ بٹھانا نہیں، اسلئے امثال کو نظر انداز کرکے صرف غور طلب امر کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ عطاء اللہ

(۱) "محبت" کی ایک قسم وہ ہے جو کسی انسان کو کسی پالتو جانور، پرندہ یا کسی غیر حساس شے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً کتا، گھوڑا، طوطا، مقام اور کوئی خاص مکان وغیرہ۔

(۲) "محبت" کی ایک قسم وہ ہے جو کسی فن کار کو اپنے فنی شاہکار یا سرمایۂ حیات سے ہو جاتی ہے۔ مثلاً شاعر کو اپنے شعر و دیوان سے، سنگتراش یا مجسمہ ساز کو اپنے بنائے ہوئے مجسمے سے، مصور کو تصویر سے وغیرہ وغیرہ۔

(۳) ایک محبت وہ ہے جو ماں بیٹے میں، بہن بھائی میں، دوست دوست میں، باپ بیٹی میں، آقا نوکر میں ہوا کرتی ہے۔

(۴) محبت کی ایک قسم وہ بھی ہے جو کسی غیر متعلق شخص کو کسی اجنبی غریب، اپاہج، بیمار اور فاقہ کش انسان سے ہو جاتی ہے۔

(۵) ایک خاص محبت وہ ہے جو میاں اور بیوی یا ایک عورت اور مرد میں جنسی کشش یا ازدواجی تعلقات کی وجہ سے ہوتی ہے۔

یہ تمام محبتیں وہ ہیں جو ہمارے افسانوں میں صرف "محبت" یا زیادہ سے زیادہ "عشق" کے لفظ سے تعبیر کی جاتی یا کہی جاتی ہیں اور اکثر افسانہ نگار اس کی نمائش میں زورِ قلم صرف فرماتے رہتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگاروں کے ایک ستم ظریف طبقے نے فی زمانہ محبت کی ایک اور خاص قسم ایجاد کی ہے جو ایک نوجوان مرد و عورت میں نفسانی خواہشات سے بے نیاز اور جنسی کشش سے ماورا تصور کی جاتی ہے۔ اِس محبت کا نام "پاک محبت" رکھا گیا ہے اور ایسے تمام متعینہ حدودِ محبت سے متجاوز ہی نہیں بلکہ روحانی مرتبہ کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اب ایسی محبت کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ غیر متعلق ہی حسینہ سے ہو بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کی محبت کا مرکز چچا زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد بہن بھی ہوا کرتی ہے اور پھر یہی نہیں کہ اس پر اکتفا کیا جائے بلکہ اس "پاک محبت" کی اہمیت بڑھانے کے لئے اس قدر مبالغے سے کام لیا جاتا ہے کہ اُسکو باور کرنے والا محدود نظر، پراگندہ دماغ اور بعض اوقات تمام حدود و انسانیت سے خارج سمجھا جانے لگتا ہے۔

"محبت" یقینی ایک ایسا جذبہ ہے جو فطرت سے ہر ذی رُوح کو عموماً اور ہر انسان کو خصوصاً عطا ہوا ہے اور وہ اسکا بہترین مصرف بھی لیتے ہیں۔ نیز محبت کے اُن کہربائی اثرات کا بھی مجھے اعتراف ہے جنہوں نے عاشقوں اور پرستاروں سے حیرت انگیز اور تعجب خیز مثالی کارنامے سرانجام دلائے ہیں۔ پھر اس سے بھی انکار نہیں کہ جس طرح "عورت" قدرت کا شاہکار اور بہترین عطیہ ہے۔ بالکل اُسی طرح "محبت" بھی فطرت کی عطا کی ہوئی ایک ایسی لازوال نعمت ہے جس کی لذتیں حاصل ہونے پر دُنیا آنکھوں میں جنت بن جاتی ہے لیکن اپنے ہاں کی تہذیب و معاشرت کو دیکھتے ہوئے۔ ایک غیر رشتہ دار تندرست نوجوان مرد و عورت کی محبت کو جس کا تعلق محض جنسی کشش اور حیوانی جذبے سے ہوتا ہے اور جس میں کسی نہ کسی طرح نفسیاتی خواہشات کا دخل ضرور پایا جاتا ہے۔ "پاک محبت" کہنا یا اِس عنوان سے پیش کرنا عجیب و غریب نظریہ محبت پیش کرنا ہے۔

ایک نوجوان مرد و عورت کی محبت کے علاوہ اور محبتیں "پاک محبت" سے تعبیر کی جاسکتی ہیں، یا یہ کہیئے کہ ہر وہ محبت

جو نفسانی خواہشات سے منزّہ اور پاک، یا جسمانی لذّات سے بے نیاز ہو" "پاک" کہی جاسکتی ہے مثلاً ایک فنکار اپنے شاہکار سے جو محبت کرتا ہے وہ اس لئے کہ اس کا محبوب اُس کی دماغی کاوشوں کا ماحصل ہے۔ ایک ماں اپنے بیٹے سے جو محبت کرتی ہے وہ محض اس وجہ سے کہ وہ اس کا لختِ جگر ہے۔ ایک آقا اپنے نوکر سے اس لئے محبت کرتا ہے کہ وہ اُسکی تمام جسمانی آسائشوں کا ضامن ہے۔ اگرچہ اس جگہ یہ بھی بحث کی جاسکتی ہے کہ یہ محبّتیں بھی پاک نہیں ہیں کیونکہ کسی نہ کسی طرح ان میں خود غرضی کا شائبہ ضرور پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک صنّاع اپنے شاہکار سے اس لئے محبّت کرتا ہے کہ اُس کے ذریعے کمالات کی داد ملتی اور تحسین و آفریں کی دل خوش کُن اور مسرّت آگیں صدائیں اُس کے کانوں تک پہونچکر اس کی رُوح کو لذّت بخشتی ہیں۔ ایک ماں اپنے بیٹے سے اسلئے محبت کرتی ہے کہ وہ اُسکی عُمر کے بدترین حصّے میں ممد و معاون ہوگا۔ ایک آقا اپنے ملازم کی محبت کا اس لئے دَم بھرتا ہے کہ وہ اسکی محبّت کو محسوس کرکے اُس کی راحتوں اور آسائشوں میں بکمال انہماک و جفاکشی مصروف رہیگا۔ پھر بھی چونکہ اِن محبتوں کو نفسانی خواہشات سے سروکار نہیں ہوتا اس لئے "پاک" کہہ سکتے ہیں لیکن ایسے عشقیہ افسانوں کے ہیرو و ہیروئن کی "محبت" جو باہم سماجی مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے ازدواجی رشتہ میں منسلک ہوسکتے ہوں نفسانی خواہشات و لذّات سے منزّہ نہیں ہوسکتی اور اس لئے اُسے "پاک محبّت" نہیں کہہ سکتے اور اگر کہا جائے تو یہ حقیقت کے بالکل خلاف اور محض طفل تسلّی، سادہ لوحی اور ستم ظریفی ہے۔

بیشتر افسانے اور اکثر واقعے ایسے دیکھنے میں آتے ہیں کہ ایک نوجوان ایک حسینہ کے عشق و محبت میں مبتلا ہوتا ہے اور کچھ دن مُصیبتیں جھیلنے کے بعد جب دونوں یکجا ہوتے ہیں تو اپنی اپنی پاک محبت کے بلند بانگ دعویدار صرف نباہ کا ہی عہد مستحکم و پیمانِ محکم نہیں کرتے بلکہ باہمدگر یا بعض اوقات علیحدہ ہونے پر فرداً فرداً سماجی اور مذہبی پابندیوں کے ساتھ ازدواجی رشتے میں منسلک ہوکر ابدی عیش و نشاط کی فکر اور کوشش بھی کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اگر واقعی یہ "پاک محبت" "جسمانی تلذّذ" سے ماورا ہے تو اُن میں خواہشِ اتصال کیوں پیدا ہوتی ہے۔ ایک دوسرے "من و تو" کا فرق مٹانے کی کیوں تمنا کرتے ہیں؟۔ نیز ایسے بھی واقعات سُننے اور افسانے دیکھنے میں آئے ہیں کہ "پاک محبت" رکھنے والے عاشق و معشوق رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے ہیں لیکن وابستگی کے کچھ دن بعد ایک دوسرے سے سیر ہوکر منغّض ہوگئے ہیں۔ پھر یہ کس جذبے کے تحت ایسا ہوتا ہے؟ جب "پاک محبت" ایک رفیع و اعلیٰ غیرفانی جذبہ ہے تو اس میں یہ فنائیت کہاں سے آگئی؟ بعض ایسے افسانے بھی میری نظر سے گزُرے جنکے "پاک محبت" کے حامی ہیرو و ہیروئن جب بھی لک چھُپ کر ملے ہیں اُنہوں نے بغلگیر ہوکر اپنی "پاک محبت" کے عہد نامے پر "بوسوں" کی مُہر ثبت کی ہے۔ یہ دو غیر جنس نوجوانوں کا "بوسہ" کیا چیز ہے؟ اگر ایسے جسمانی تلذّذ اور نفسانی تفرح سے غیرمتعلق کہیئے تو یہ بتایئے کہ بیٹا ماں کا اور بھائی بہن کا بوسہ کیوں نہیں لیتا۔ اُن کی محبت سے بڑھکر اور کونسی کس کی محبّت "پاک" ہوسکتی ہے؟ اور اگر ایسے نفسیاتی و جسمانی خواہشات کا پیش خیمہ باور کرتے ہیں تو پھر یہ مانیئے کہ ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت میں جو محبّت ہوتی ہے وہ پاک نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ وہ سخن ہے جو ہمارے افسانہ نگاروں کی صرف جُنبشِ قلم ہی تک محدود ہے ورنہ اگر وہ خود اس ماحول میں ہوں تو اُن کی تحریر اور عمل میں آسمان و زمین کا فرق نظر آئے گا۔ اس جگہ نہایت مُناسب ہوگا اگر میں "چند خطوط" مطبوعہ نگار اگست نمبر ۱۹۳۷ء سے ایک حقیقت نگار ادیب کا وہ قول نقل کروں جس میں اُس نے بتایا ہے کہ

(۱) "محبت" کی ایک قسم وہ ہے جو کسی انسان کو کسی پالتو جانور، پرندہ یا کسی غیر حساس شے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً کتا، گھوڑا، طوطا، مقام اور کوئی خاص مکان وغیرہ۔

(۲) "محبت" کی ایک قسم وہ ہے جو کسی فن کار کو اپنے فنی شاہکار یا سرمایۂ حیات سے ہو جاتی ہے۔ مثلاً شاعر کو اپنے شعر و دیوان سے، سنگتراش یا مجسمہ ساز کو اپنے بنائے ہوئے مجسّمے سے، مصوّر کو تصویر سے وغیرہ وغیرہ۔

(۳) ایک محبت وہ ہے جو ماں بیٹے میں، بہن بھائی میں، دوست دوست میں، باپ بیٹی میں، آقا نوکر میں ہوا کرتی ہے۔

(۴) محبت کی ایک قسم وہ بھی ہے جو کسی غیر متعلق شخص کو کسی اجنبی غریب، اپاہج، بیمار اور فاقہ کش انسان سے ہو جاتی ہے۔

(۵) ایک خاص محبت وہ ہے جو میاں اور بیوی یا ایک عورت اور مرد میں جنسی کشش یا ازدواجی تعلقات کی وجہ سے ہوتی ہے۔

یہ تمام محبّتیں وہ ہیں جو ہمارے افسانوں میں صرف "محبت" یا زیادہ سے زیادہ "عشق" کے لفظ سے تعبیر کی جاتی یا کہی جاتی ہیں اور اکثر افسانہ نگار اس کی نمائش میں زورِ قلم صرف فرماتے رہتے ہیں۔ لیکن افسانہ نگاروں کے ایک ستم ظریف طبقے نے فی زمانہ محبّت کی ایک اور خاص قسم ایجاد کی ہے جو ایک نوجوان مرد و عورت میں نفسانی خواہشات سے بے نیاز اور جنسی کشش سے ماورا تصوّر کی جاتی ہے۔ اِس محبّت کا نام "پاک محبت" رکھا گیا ہے اور ایسے تمام متعیّنہ حدودِ محبّت سے متجاوز ہی نہیں بلکہ روحانی مرتبہ کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اب ایسی محبت کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ غیر متعلق ہی حسینہ سے ہو بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کی محبت کا مرکز چچا زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد بہن بھی ہوا کرتی ہے اور پھر یہی نہیں کہ اس پر اکتفا کیا جائے بلکہ اس "پاک محبت" کی اہمیت بڑھانے کے لئے اس قدر مبالغے سے کام لیا جاتا ہے کہ اُسکو باور کرنے والا محدود نظر، پراگندہ دماغ اور بعض اوقات تمام حدودِ انسانیت سے خارج سمجھا جانے لگتا ہے۔

"محبت" یقینی ایک ایسا جذبہ ہے جو فطرت سے ہر ذی رُوح کو عموماً اور ہر انسان کو خصوصاً عطا ہوا ہے اور وہ اسکا بہترین مصرف بھی لیتے ہیں۔ نیز محبت کے اُن کہربائی اثرات کا بھی مجھے اعتراف ہے جنہوں نے عاشقوں اور پرستاروں سے حیرت انگیز اور تعجب خیز مثالی کارنامے سرانجام دلائے ہیں۔ پھر اس سے بھی انکار نہیں کہ جس طرح "عورت" قدرت کا شاہکار اور بہترین عطیہ ہے۔ بالکل اُسی طرح "محبت" بھی فطرت کی عطا کی ہوئی ایک ایسی لازوال نعمت ہے جس کی لذتیں حاصل ہو کر دُنیا آنکھوں میں جنّت بن جاتی ہے لیکن اپنے ہاں کی تہذیب و معاشرت کو دیکھتے ہوئے۔ ایک غیر رشتہ دار تندرست نوجوان مرد و عورت کی محبت کو جس کا تعلق محض جنسی کشش اور حیوانی جذبے سے ہوتا ہے اور جس میں کسی نہ کسی طرح نفسیا خواہشات کا دخل ضرور پایا جاتا ہے۔ "پاک محبت" کہنا یا اِس عنوان سے پیش کرنا عجیب و غریب نظریۂ محبت پیش کرنا ہے۔

ایک نوجوان مرد و عورت کی محبت کے علاوہ اور محبتیں "پاک محبت" سے تعبیر کی جاسکتی ہیں، یا یہ کہیئے کہ ہر وہ محبت

جو نفسانی خواہشات سے منزّہ اور پاک، یا جسمانی لذّات سے بے نیاز ہو" پاک" کہی جا سکتی ہے مثلاً ایک فنکار اپنے شاہکار سے جو محبت کرتا ہے وہ اس لئے کہ اس کا محبوب اُس کی دماغی کاوشوں کا ماحصل ہے۔ ایک ماں اپنے بیٹے سے جو محبت کرتی ہے وہ محض اس وجہ سے کہ وہ اس کا لختِ جگر ہے۔ ایک آقا اپنے نوکر سے اس لئے محبت کرتا ہے کہ وہ اُسکی تمام جسمانی آسائشوں کا ضامن ہو۔ اگرچہ اس جگہ یہ بھی بحث کی جا سکتی ہے کہ یہ محبّتیں بھی پاک نہیں ہیں کیونکہ کسی نہ کسی طرح ان میں خود غرضی کا شائبہ ضرور پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک صنّاع اپنے شاہکار سے اس لئے محبّت کرتا ہے کہ اُس کے ذریعے کمالات کی داد ملتی اور تحسین و آفریں کی دل خوش کُن اور مسرّت آگیں صدائیں اُس کے کانوں تک پہونچکر اس کی رُوح کو لذّت بخشتی ہیں۔ ایک ماں اپنے بیٹے سے اسلئے محبت کرتی ہے کہ وہ اُسکی عُمر کے بدترین حصّے میں ممد و معاون ہوگا۔ ایک آقا اپنے ملازم کی محبت کا اس لئے دَم بھرتا ہے کہ وہ اسکی محبّت کو محسوس کر کے اُس کی راحتوں اور آسائشوں میں بکمال انہماک و جفاکشی مصروف رہیگا۔ پھر بھی چونکہ اِن محبتوں کو نفسانی خواہشات سے سروکار نہیں ہوتا اس لئے "پاک" کہہ سکتے ہیں لیکن ایسے عشقیہ افسانوں کے ہیرو و ہیروئن کی "محبت" جو باہم سماجی مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے ازدواجی رشتہ میں منسلک ہو سکتے ہوں نفسانی خواہشات و لذّات سے منزّہ نہیں ہو سکتی اور اس لئے اُسے "پاک محبّت" نہیں کہہ سکتے اور اگر کہا جائے تو یہ حقیقت کے بالکل خلاف اور محض طفل تسلّی، سادہ لوحی اور ستم ظریفی ہے۔

بیشتر افسانے اور اکثر واقعے ایسے دیکھنے میں آتے ہیں کہ ایک نوجوان ایک حسینہ کے عشق و محبت میں مبتلا ہوتا ہے اور کچھ دن مُصیبتیں جھیلنے کے بعد جب دونوں یکجا ہوتے ہیں تو اپنی اپنی پاک محبت کے بلند بانگ دعویدار صرف نباہ کا ہی عہد مستحکم و پیمانِ محکم نہیں کرتے بلکہ باہمدگر یا بعض اوقات علیحدہ ہونے پر فرداً فرداً سماجی اور مذہبی پابندیوں کے ساتھ ازدواجی رشتے میں منسلک ہو کر ابدی عیش و نشاط کی فکر اور کوشش بھی کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہو؟ اگر واقعی یہ "پاک محبت" "جسمانی تلذّذ" سے ماورا ہے تو اُن میں خواہشِ اتصال کیوں پیدا ہوتی ہے۔ ایک دوسرے "من و تو" کا فرق مٹانے کی کیوں تمنا کرتے ہیں؟۔ نیز ایسے بھی واقعات سُننے اور افسانے دیکھنے میں آئے ہیں کہ "پاک محبت" رکھنے والے عاشق و معشوق رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے ہیں لیکن وابستگی کے کچھ دن بعد ایک دوسرے سے سیر ہو کر منغّض ہو گئے ہیں۔ پھر یہ کس جذبے کے تحت ایسا ہوتا ہے؟ جب "پاک محبت" ایک رفیع و اعلیٰ غیر فانی جذبہ ہے تو اس میں یہ فنائیت کہاں سے آگئی؟ بعض ایسے افسانے بھی میری نظر سے گزُرے جنکے "پاک محبت" کے حامی ہیرو و ہیروئن جب بھی لُک چھُپ کر ملے ہیں اُنہوں نے بغلگیر ہو کر اپنی "پاک محبت" کے عہد نامے پر "بوسوں" کی مُہر ثبت کی ہے۔ یہ دو غیر جنس نوجوانوں کا "بوسہ" کیا چیز ہے؟ اگر ایسے جسمانی تلذّذ اور نفسانی تفرح سے غیر متعلق کہئیے تو یہ بتائیے کہ بیٹا ماں کا اور بھائی بہن کا بوسہ کیوں نہیں لیتا۔ اُن کی محبت سے بڑھکر اور کونسی کس کی محبّت "پاک" ہو سکتی ہے؟ اور اگر ایسے نفسیاتی و جسمانی خواہشات کا پیش خیمہ باور کرتے ہیں تو پھر یہ مانیئے کہ ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت میں جو محبّت ہوتی ہے وہ پاک نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ وہ سخن ہے جو ہمارے افسانہ نگاروں کی صرف جُنبشِ قلم ہی تک محدود ہے ورنہ اگر وہ خود اس ماحول میں ہوں تو اُن کی تحریر اور عمل میں آسمان و زمین کا فرق نظر آئے گا۔ اس جگہ نہایت مُناسب ہوگا اگر میں "چند خطوط" مطبوعہ نگار اگست نمبر ۱۹۳۶ء سے ایک حقیقت نگار ادیب کا وہ قول نقل کروں جس میں اُس نے بتایا ہے کہ

"پاک محبت" کا دراصل کہیں وجود ہی نہیں ہے اور عوام یا خواص جس محبت کو پاک کہتے ہیں وہ دراصل پاک نہیں بلکہ خود فریبی کا ایک عکس ہے جو اُن کی نظروں اور دلوں پر چھایا ہوا ہے۔ اور اُس جھوٹے عکس میں وہ اُس محبت کو "پاک" سمجھتے ہیں جس میں "بے حیا" عاشق و معشوق نہ ملتے ہوں۔ وہو ہذا:-

"محبت کی دو قسمیں کرنا، پاک محبت اور ناپاک محبت بظاہر دُرست معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت یہ ایک مُغالطہ ہے۔ "پاک محبت" یعنی ایسی محبّت جس میں خواہشاتِ نفسانی کا بالکل تعلق نہ ہو دُنیا میں وجود نہیں رکھتی۔ ایک شخص صرف محبوب کو دیکھ لینے پر اکتفا کرتا ہے اُس سے اور کچھ سروکار نہیں رکھتا۔ اسے وہ پاک محبت کہتا ہے۔ مگر دراصل اُس نے سخت دھوکا کھایا کیونکہ فی الحقیقت آنکھوں کے ذریعے اُس کا نفس لذّت اندوز ہورہا ہے۔ اور جب نفس کو غذا مل گئی تو محبّت خالص کہاں رہی۔ اسی طرح بعض لوگ محبوب کو چُوم لینے اور بعض گلے لگا لینے سے آگے نہیں بڑھتے اور اسے وہ پاک محبت سمجھتے ہیں۔ مگر یہاں بھی مس اور لمس کے ذریعے نفس محظوظ ہورہا ہے۔ مختصر یہ کہ خواہشِ ظاہری میں سے خواہ کسی حس کے ذریعے نفس کی خوراک بہم پہونچائی جائے اصلاً وہ ایک ہے۔ البتہ مراتب کا کچھ فرق ضرور ہے۔ ہاں اگر خواہش باطنی یعنی خیال، وہم، فکر وغیرہ کے واسطے سے کوئی لُطف اندوز ہو تو بیشک محبّت کو خالص کہنا کسی حد تک ٹھیک ہوگا ورنہ صحیح معنوں میں بالکل خالص محبّت اور عورت کے درمیان ہو ہی نہیں سکتی۔"

یہ ایک ایسے شخص کی تحریر ہے جو اُردو زبان کا ایک جادو بیان شاعر، ایک بلند پایہ نقاد، ایک سحر نگار ادیب اور ایک باکمال افسانہ نویس ہے اور جسے حقیقت نگاری میں وہ کمال ہے کہ ہر جُملہ اس ظالم کا آبِ زر سے لکھنے کے لائق ہے۔

یہ تو ہوئی "پاک محبت" کی بحث۔ اب اس طرف آئیے کہ ایسی "پاک محبت" کو جس میں عاشق و معشوق دونوں کے دل میں پاک محبت کا سیلاب موجزن ہو مگر اسکے باوجود اُنہیں ازدواجی تعلقات کی ضرورت محسوس اور خواہش پیدا نہ ہوتی ہو، کیا ہماری معاشرت اور خودداری روا رکھ سکتی ہے؟ کیا ہم حد درجہ سماج کے دُشمن ہوتے ہوئے بھی یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ایک شریف اور باعزّت گھرانے کی لڑکی کسی نوجوان غیر مرد سے اس طرح کی "پاک محبت کا سلسلہ برقرار رکھے؟ کیا ہم اس بات پر ایمان رکھ سکتے ہیں کہ ایک نوجوان نشۂ محبت کا متوالا ایک نوجوان حسینہ سے "پاک محبت" کا رشتہ اس طرح کھ سکتا ہے کہ وہ تنہائی میں ملتے ہیں لیکن ان کا "دامن تر" نہیں ہونے پاتا؟ کم از کم میرا ناپاک دل تو اس کو ہرگز قبول نہیں کرتا اور میرے ساتھ ایک باکمال افسانہ نویس بھی اسے ناقابل اعتبار سمجھتا ہے۔ مُلاحظہ ہو حضرت عظیم بیگ چغتائی نے کتنی سچی بات کہی ہے:-

"اگر کسی غیرت مند نوجوان کو معلوم ہو جائے کہ اُسکی بہن فلاں شخص پر عاشق ہو گئی تو عجب نہیں کہ وہ ان عاشق زار کی ہڈی پسلی توڑ دے اور بہن کا گلا گھونٹ دے۔۔۔۔۔۔۔ ہماری معاشرت میں اجازت نہیں کہ لڑکی کسی نوجوان پر عاشق ہو اور اُس کا بھانڈا پھوٹے۔ ایسی لڑکی ننگِ خاندان ہے۔ اگر لڑکی نے ایسا کیا تو وہ بُری ہے۔ لڑکی خود بھی اپنے کو اس قسم کے عشق سے بچاتی ہے کیونکہ اُس کے اس فعلِ قبیح کا اثر تین پُشت تک نہیں جاتا۔ اب یہاں اس سے

بحث نہیں کہ معاشرت کی یہ سختیاں صحیح ہیں یا غلط مگر حقیقت ضرور ہیں اور افسانہ نگار کو حقیقت ہی سے بحث ہے۔

عشق ناجائز کرنے والی لڑکی حرافہ اور بدمعاش ہے۔ شریفوں میں ایسی لڑکیاں نہیں ہوتیں۔"

بہرحال! میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ آج کل کے عشقیہ افسانوں میں اس طرح کی "پاک محبت" کی جو ترویج ہو رہی ہے وہ حد درجہ فرسودہ، مضحکہ خیز اور سراسر بے حقیقت ہے۔ افسانہ نگاری کی ریل پیل ہوتے ہوئے بھی یہ حقیقت اٹل ہے کہ افسانہ نویسی گپّیں ہانکنے کا نام نہیں افسانہ نگار کو ادب میں بڑا مرتبہ حاصل ہے اب آپ ہی خیال فرمائیے کہ جس زبان کے ادب کے اہم شعبے میں اس قسم کے خرافات رواج پائیں گے اُس کا آئندہ چلکر کیا حال ہوگا؟ میری یہ مجال نہیں کہ افسانہ نگاروں کو عشقیہ افسانوں کی تحریر سے باز رکھوں۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ عشقیہ افسانوں میں "محبت" کی تشریح و ترویج خوب کیجئے۔ عشقیہ افسانوں میں محبتِ صادق کے تمام پہلو پیش کیجئے۔ لیکن خدا کے لئے ایسی بات نہ کہیئے جو عقل اور واقعے کے خلاف ہو۔ اور ایسی محبت نہ دکھائیے جس کا سرے سے وجود ہی نہ ہو۔ کیونکہ یہ چیزیں نہ صرف مضحکہ خیز ہیں بلکہ افسانے کی دلگیر تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہیں۔

عطاء اللہ۔ پایوی

فطرت کی آواز

صُبح کی آغوش میں میرا تنفس سامری
میری حیرت کاریوں سے آسماں نیلم پری
شام کے پردوں میں۔ میرے حُسن کی جلوہ گری
آگ بنکر مَیں اُفق پر ناچنے والی پَری،
رات کے سایہ میں بھی رُکتے نہیں میرے قدم

چشمِ شاعر صرفِ حیرت ہے مرے انداز پر
رقص ہقانوں میں بھر دیتی ہوں ہلکے ساز پر
چاندنی راتوں میں برساتی ہوں ذرّوں پر گہُر
اوس سبزہ کی پلک پر کیا ہے؟ میرا اشکِ تر
مُسکرا کر مَیں چلاتی ہوں کبھی تیرِ شہاب،

پھُول کی پتّا پہ جب پڑتی ہے سُورج کی کرن
اور ہوتی ہے جبینِ گلُ پہ ہلکی سی جبلَن،
آسماں پر بن کے چھا جاتی ہوں برہیل تن
توڑ دیتی ہوں طلسمِ چشمِ مہرِ ضو فگن
باغ میں بنکر ہوا دیتی ہوں کلیوں کا سراغ

جب رُخِ مہ سے ہٹا کر ابر کی سیمیں نقاب
آبشاروں میں اُلٹ دیتی ہوں نوُرانی شراب
لہر بنکر دوڑتی ہیں بجلیاں بالائے آب
شوق بنکر دیکھتی ہے حیرتِ چشمِ عقاب
رات کی تنہائیاں۔ میرا فسُونِ دِلبری

مَیں دلِ انسان میں رہتی ہوں بَنکر آرزُو
دیتی رہتی ہوں زمانہ کو پیامِ رنگ و بُو
میرے افسانوں سے ہے معمور عالم چارسُو
صرفِ گردش ہے رگِ ایّام میں میرا لہُو
عالمِ اِمکاں میں سوزاں ہے مری شمعِ جمال

اجملؔ نجیب آبادی

شاعر

جُنبشِ پیہم سے تھک جاتی ہے نبضِ کائنات
ماند پڑ جاتی ہے روئے جہد کی رخشانِ حیات

جاگنے والوں پہ چھا جاتا ہے اِک خوابِ گراں
دوڑنے والوں کے تھک جاتے ہیں پائے کامراں

شعلۂ روحِ عمل ہوتا ہے آسودہ مزاج
ٹھوکروں میں سطوتِ تقدیسِ انسانی کا تاج

فطرتِ جولاں بھی ہو جاتی ہے نذرِ خفتہ کار
بجلیوں کے ساز میں ہوتا ہے پیدا انتشار

آسماں زادے بھی ہوتے ہیں اسیرِ آب و گِل
برف ہو جاتے ہیں بزمِ عشق کے سرگرم دل

جلوۂ شمعِ نفس را بیں بہ شعرِ دلگداز
لذّتِ بانگ بہ پُرس از شاعرِ نغمہ طراز

کون اس آشوب میں کرتا ہے پیدا انقلاب
کون سُوتوں کو جگا سکتا ہے باصد آب و تاب

کون دَوڑاتا ہے مُردہ نبض میں خُونِ بہار
کون کرتا ہے جلے پودوں کا پانی سے نکھار

کون باطل زار میں کرتا ہے ایماں کی نمود
کون کرتا ہے خزاں رنگ باغ کی پھر ہست و بود

کون چھلکاتا ہے علم و معرفت کے صد گلاب
کون شبنم کو بنا دیتا ہے رشکِ آفتاب

کون بُزدل آدمی کے ہاتھ میں دیتا ہے تیغ
کون عجزِ مرگ آئینی پہ کھاتا ہے دریغ؟

کون دیتا ہے قیامِ امن کا درسِ جمیل
کون واماندوں کا ہوتا ہے مددگار و کفیل

کون سہتا ہے مصائب کے گراں گرزوں کی ضرب
الاماں والحذر! شیطان کے آلاتِ حرب؟

غور کر ان پر حقیقت کی نظر سے اے ندیم
کچھ سمجھ سکتی ہے ان اسرار کو طبعِ سلیم

ہر سبک رفتار طے کرتا ہے کیا پست و بلند
برف کے ٹیلوں کو بھی کچھ پھاند سکتا ہے سمند؟

کیا سمجھ سکتا ہے ہر کس نبضِ عالم کا دماغ ⁂ ارتقائے ذہنِ انسانی کا رُوحانی علاج !
کیا ہر اک معلوم کر سکتا ہے برقِ انفعال ⁂ ماضیٔ رنگیں کا جوہر، نبضِ اشعاعِ جمال !
دیکھ بھی سکتی ہے کیا ایتھر کی موجیں ہر نگاہ ⁂ دائروں کے پیچ و خم میں جلوۂ حسنِ تباہ

کچھ تدبر چاہیئے، کچھ فہم، کچھ صبر و شکیب
وہم ظلمت آفریں کا کھا رہا ہے کیوں فریب

درسِ آزادی بُھلا بیٹھے ہوں جب طبعِ غیور ⁂ جادۂ منزل سے جب واقف نہ ہوں گامِ شعور
ٹھوکریں جب کھا رہا ہو آدمیت کا وقار ⁂ ناتواں جذبوں سے جب اُٹھے صدائے خونفشار
عظمتِ نوعِ بشر کے جھلسلا جائیں کنول ؛ ⁂ قعرِ وحشت میں ہوں قومیں جست ہو تیرِ اجل
جب ضمیرِ حق میں ہو اوہامِ باطل کا نزول ⁂ جب سیہ پڑ جائے دُنیا کی جبیں کا عرض و طول
نغمۂ انسانیت کے ساز میں ہو انتشار ⁂ آسمانی راز ہو بازیچۂ حکمت شعار
وادیٔ تاریک میں کھو جائے جب عقلِ سعید ⁂ جہل کی دانش وری دے، زعمِ باطل پر وعید
عشق کے مفہوم سے واقف نہ ہو جب کائنات ⁂ اِک مُعمّہ بن کے رہ جائے دلِ حسنِ حیات

خلق جب کرتی ہے فطرت ایک ہستیٔ شباب
جسکو دُنیا بولتی ہے شاعرِ صد انقلاب

اس کی ہر آواز ہے عبرت گہِ پست و بلند ⁂ ہوشیار، اے خواب نوشیں! اے حیاتِ ارجمند
اسکی آنکھیں دیکھتی ہیں پُر فشاں زُلفِ جمال ⁂ تولتی ہیں پھول کے کانٹے پہ نورانی خیال

قصرِ استبداد ڈھائے جائیں گے باصد خروش
زندگی کے قہقہے لہرائیں گے باصد خروش

کاوش حیدرآبادی

غربت زدہ

رامو کل کا بچہ آج بوڑھا ہو چلا تھا ——

اس کی جوانی کے بہترین ایام کارخانہ نے کھا کر اب اُسے ایک باسی نوالہ کی طرح اُگل دیا تھا۔ بیکاری میں بھوک پیاس، ایک جونک کی طرح اس کا سڑا ہوا خون چوسنے لگی۔ کارخانہ کے خداؤں کے دلمیں اس لاغر انسان کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ بار بار دھتکار دیئے جانے کے بعد اُس نے محض چند ٹکوں پر اپنی زندگی کے ایام کو کارخانہ داروں کے ہاتھ فروخت کرنا شروع کر دیا —— تقدیر وقت کے ہاتھوں میں ایک چکی ہے جو انسان کو آخری سانس تک برابر پیستی جاتی ہے۔

رامو ناطاقتی کا مریض ہو چکا تھا۔ مگر روٹی! —— یہ خیال اُسے کشاں کشاں کارخانہ تک روزانہ لے جاتا۔

آج کارخانہ میں کام کی کمی کی وجہ سے اُسے دوپہر کو واپس آنا پڑا۔ چھ پیسے —— رامو اپنی زندگی کے آدھے دن کی قیمت مٹھی میں دبائے کارخانہ سے باہر نکل آیا۔

گرمی کی شدت سے بوکھلائے ہوئے مزدور نے اپنے جلتے ہوئے سر کو ٹھنڈک پہنچانے کے لئے ایک نل کے نیچے رکھا۔ نل کے کھلتے ہی پانی کی گرم دھار اُبلتے ہوئے تیل کی طرح اس کے سر پر پھیل گئی۔ ایک مظلوم کی طرح وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹا اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "میں غریب ہوں"۔ یہ اُس کی ضمیر کی آواز تھی۔

حسبِ عادت بیڑی میں راحت تلاش کرنے کے لئے وہ ایک بیڑی والے کی دکان کی طرف بڑھا۔ یکایک اُس کی نگاہیں پاس والے بزاز کی طرف اُٹھیں۔ مختلف رنگ دار پلّہ کی دھوتیوں نے اس کی طبیعت کو مائل کر لیا۔

"اس کی قیمت ——"

"ایک روپیہ ——" بزاز نے بے پرواہی سے جواب دیا۔

ہولی قریب آ رہی ہے۔ پوتر تہوار پر نیا کپڑا ضرور پاس ہونا چاہیئے —— رامو نے دل میں خیال کیا۔

فاقہ کش مزدور نے اپنی خواہش کو پورا کرنے کی ٹھان لی۔ وہ پیٹ کاٹ کر پیسے بچانے لگا۔

—— آج اُس کی مٹھی میں ایک سفید سکّہ تھا۔ کارخانہ سے واپسی پر وہ بزاز کی دکان پر رُک گیا۔

"میری دھوتی دے دو ——"

"کونسی؟ ——"

"یہی —— یہی ——" رامو زور سے ایک ٹنگی ہوئی دھوتی کا رنگین پلّہ ہلا رہا تھا۔

یکایک اُس کی توجہ سامنے دکان کے باہر ٹنگی ہوئی کُدال میں جذب ہو گئی۔

"کُدال — یہ میرا ذریعہ معاش بن سکتی ہے"! کارخانے کی تنگ اور درشت زندگی سے بچ نکلنے کا خیال اس کے ذہن میں فوراً ترقی کر گیا ——

—— رامو بزاز کی دکان سے ہٹ کر کُدال فروش سے اس کی قیمت دریافت کر رہا تھا ——

"دو روپیہ پانچ آنہ —— لے لو یہ بڑی مضبوط ہے ——"

رامو نے کُدال ہاتھ میں لیکر اس کی ساخت اور مضبوطی پر

غور کیا اور بغیر کچھ کہے واپس کر دی۔

وہ اب بجائے دھوتی کے ایک کُدال خریدنا چاہتا تھا۔ فاقہ زدہ انسان بدستور بھوک کو ٹالنے میں مصروف ہو گیا۔ یہی اُس کی کفایت شعاری تھی۔ روزانہ بچت کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں کُدال کا تصور بھی گہرا ہوتا گیا۔ کارخانے آتے جاتے وقت وہ کُدال فروش کی دُکان پر ایک نظر ضرور ڈال لیتا۔

آج وہ دو روپے چار آنہ کا مالک تھا۔ اُسے اب معلوم ہوا کہ وہ کارخانے کی درشت زندگی سے آزاد ہو گیا ہے۔ نہایت اشتیاق سے وہ کُدال فروش کی دکان پر گیا۔

وہ مطلوبہ کُدال کی ساخت پر ایک بار پھر غور کرنے لگا۔ یکایک اُس کے کانوں میں ایک مُسکراتی ہوئی آواز آئی۔ "جوتے مفت ملتے ہیں ——"

"بالکل مفت! ——" اسکا فاقہ زدہ تخیل پریشان ہو گیا۔

کُدال وہیں چھوڑ وہ ایک لمحہ کے لئے وہاں سے مفت جوتا حاصل کرنے کے لئے ایک دُبلے پتلے آدمی کی طرف بڑھا جو گھنٹی بجا بجا کر لوگوں کو بیوقوف بنا رہا تھا۔

"مجھے بھی ایک جوتا دے دو میاں جی ——"

"دکان کے اندر چلے جاؤ ——"

رامو اشتیاق اور حیرانگی سے دکان میں داخل ہوا۔ فرش پر جوتوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔ لوگ جوتے ہاتھ میں لئے دام پوچھ رہے تھے۔

رامو اور حیران ہو گیا ——

"کیا آپ مفت جوتے تقسیم کرتے ہیں ——" رامو نے ایک بڑی پگڑی والے بُوڑھے سے پوچھا جو بظاہر دکاندار معلوم ہوتا تھا۔

"نہایت سستے داموں پر —— مفت کے برابر ——" گاہکوں میں گھرے ہوئے اُس بُوڑھے نے جواب دیا۔

رامو نے ایک آہ بھری۔ اس نے بکھرے ہوئے ڈھیروں پر اپنی گُرسنہ نگاہیں پھیلائیں۔ اسے ایک جوتا بہت پسند آیا۔ اس نے پہن کر دیکھا۔ بالکل فٹ تھا۔

"اس کے دام ——"

"تین روپے بارہ آنے —— دوسری دکان میں چھ روپے سے کم نہیں ملے گا ——"

"اور اس کے دام" —— رامو نے دوسرے جوتے کے متعلق پوچھا۔

"وہی تین روپے بارہ آنہ —— بہت سستا ہے لو"

رامو شکستہ دل ہو کر باہر نکل آیا ——

"یہ امیروں کی دُنیا ہے۔ صرف روپے کی افراط ہی سے تکمیل آرزو ممکن ہے۔ دھوتی! اور اب کُدال —— اور جوتے —— کیا میں بھی امیر نہیں ہو سکتا؟ ——"

رامو اپنی خیالات میں غرق اسی نل کے پاس بیٹھا بھیگی ہوئی زمین پر ان چیزوں کی شکلیں بنا رہا تھا۔

حسن عباس

ایک فرانسیسی افسانہ

جبری بھرتی

کیا آپ اس لڑکی سے واقف ہیں، جو ابھی سڑک پر سے گذری؟ حضرت! ہم لوگ اسے دیوانی میری پکارتے ہیں۔ افسوس غریب لڑکی! زندگی نے اس کا کوئی بھلا نہیں کیا۔ وہ اتنی عمر رسیدہ بھی نہیں، جتنی کہ اُس کے بُشرے سے معلوم ہوتی ہے۔ وہ مجھ سے بھی دو سال چھوٹی ہے ــــــ لیکن آپ باور نہیں کرینگے، کیونکہ آنسوؤں کی لگاتار جھڑیوں نے اس کے چہرے پر جھُریاں ڈال دی ہیں۔

ہم اس سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتے۔ وہ ایک خاموش لڑکی ہے، کبھی چشموں کے پاس گھنٹوں چُپ چاپ کھڑی ہوتی ہے، اور کبھی جنگلوں میں ماری ماری پھرتی ہے اور رنگ برنگ کے جنگلی پھول چُن لاتی ہے۔ لیکن جب وہ کسی سپاہی کو دیکھ پاتی ہے تو آپ کو تعجب ہوگا کہ وہ بھاگ کھڑی ہوتی ہے۔ ذرا توقف کیجئے تو میں اسکی داستان سُناؤں۔

غریب میری! دیوانی ہونے کے قبل، گاؤں میں شاید ہی کوئی لڑکی اس کے حُسن کا مقابلہ کرسکتی۔ جب میں اور وہ نوعمر اور الھڑ تھیں تو ہم دونوں نے گاؤں کے دو نوجوان لڑکوں، مارٹن اور لارنس سے یہ طے کرلیا تھا کہ مارٹن میرا حق دار ہوا اور لارنس میری کو شریک زندگی بنائے۔

لیکن اس زمانے کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ کسی شخص کی اپنی زندگی اپنی نہ رہی۔ حکومت نے جبری بھرتی شروع کی اور گاؤں کے تنومند اور زندہ دل نوجوانوں کو چُن چُن کر فوج میں کھپادیا، اور عورتوں اور بچّوں کو رونے پیٹنے اور قوت لایموت کی خاطر ہاتھ پاؤں مارنے کے لئے زندہ چھوڑ دیا۔ خدا غارت کرے ان جنگوں اور مہموں کو!

ایک دن لارنس اور مارٹن پر بھی ڈورے ڈلے گئے، اور میں اور میری نے وہ شام عجیب کشمکش کے عالم میں گذاری۔ وہ متفکر و مغموم بیٹھی تھی، لیکن میں نے دل کڑا کرکے ــــــ گویا میرے سینے میں دل کے عوض فولاد کا ایک ٹکڑا تھا ــــــ میری سے اس انداز سے گفتگو کا سلسلہ چھیڑا کہ جو کچھ ہوا، اس کی اہمیت تھوڑی ہے "میری!" میں نے کہا "ہر شخص جو جنگ کو جاتا ہے قتل نہیں ہوجاتا، اور اگر یوں ہو جائے بھی تو یہ اس شخص کی خوش نصیبی سمجھی جاتی ہے۔ کیا تو چند دنوں تک ایک ایسے سپاہی کا انتظار نہیں کرسکتی، جو میدانِ جنگ سے فتح مند و کامران ہمارے گاؤں میں واپس آئیگا؟" میری نے چہرہ اوپر کو اُٹھایا اور میری طرف دیکھکر کہا "اوہ! جینٹ، میں موت کے دن تک انتظار کرونگی!"

"بہت خوب!" میں نے ایک مصنوعی قہقہے سے اپنے رقت انگیز جذبات کو دباتے ہوئے کہا "لوگ یونہی کہا کرتے ہیں!" لیکن جب لارنس کی رُخصت کا وقت آیا تو میری کے ساتھ میں بھی اپنے دل پر قابو نہ پاسکی۔ میں اور میری خوب روئے میں خوش نصیب تھی کہ کسی وجہ سے مارٹن کو جنگ میں حصّہ لینے سے معاف کردیا گیا۔ دُنیا کے ڈھنگ ہی نرالے ہیں، اس کی کون سی کل سیدھی چلتی ہے اور کونسی چیز اُلٹ پلٹ نہیں ہوتی؟"

رخصت کے وقت لارنس نے کہا "ہمت بلند رکھو میری! اگر دشمن نے زندہ چھوڑ دیا تو بہت جلد تم سے آملونگا۔ اور کیا تم اپنے وعدے پر قائم رہوگی ــــــ کم از کم اس وقت تک کہ میری خوش قسمتی یا بدقسمتی کا قطعی فیصلہ تمہیں معلوم نہ ہوجائے؟"
اور میری نے اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑدیں اور بولی "ہاں لارنس! میں ضرور انتظار کرونگی!"

غرض لارنس روانہ ہوا اور میری اکیلی رہ گئی۔ اس کے بعد میرا اور مارٹن کا بیاہ ہوگیا۔ کئی دنوں تک ہم نے لارنس کے متعلق کچھ نہ سنا، یہ بھی پتہ نہ چلا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ــــــ کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے گاؤں میں باہر کی بات ایک عرصہ کے بعد پہنچتی ہے اور وہ بھی جھوٹ کا پوٹ۔ لہٰذا میں کسی بات کا یقین نہیں کرتی، جب تک کہ وہ اپنی آنکھوں دیکھی نہ ہو۔

کیا آپ کو وہ چھوٹی سی جھونپڑی نظر آرہی ہے، جس کی چھت گھاس پھوس سے بنائی گئی ہے؟ ہاں وہی!۔ اس کے پیچھے اوٹ (ـــ oats) کے کھیت ہیں، اور دیکھئے! وہ اوٹ کا خرمن بھی صاف نظر آرہا ہے، اور اخروٹ کے درختوں کی قطار کس قدر دیدہ زیب معلوم ہوتی ہے! خیر۔ اسی جھونپڑی میں وہ اپنی چچی کے ہمراہ رہتی تھی، اور ہر موسم میں بلاناغہ صبح و شام کھیتوں میں محنت و مشقت کرتی تھی۔

جب میں دیکھتی کہ وہ کھیتوں میں غلاموں کی طرح کام کررہی ہے تو میرا دل پسیج جاتا۔ مجھے علم تھا کہ وہ مفلس و قلاش نہیں تھی، اور اس کے علاوہ چونکہ اسے ایک اپنے ہی لئے معاش حاصل کرنا کافی تھا، اس قدر محنت و کاوش ضرورت سے زیادہ تھی۔ ایک دن میں نے اس سے دریافت کیا "میری! ایک تنہا عورت کے لئے کیا ضروری ہے کہ وہ صرف اپنی شکم پُری کے لئے اتنی محنت کرے کہ آخر ایک مشتِ استخواں ہوکر رہ جائے؟"

"نہیں جینٹ" اس نے کہا "کیا تم سمجھتی ہو کہ مجھے صرف اپنے لئے اتنا سویرے اُٹھنا اور اس قدر دیر گئے بستر پر جانا پڑتا ہے؟ نہیں، میرے آگے ایک مقصد ہے۔ میں روپیہ جمع کررہی ہوں، جس کی بدولت لارنس فوج سے رہائی حاصل کرے گا" "اور مجھے اس قدر روپے کی ضرورت ہے" اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کہ مجھے صبح شام اتنی محنت کرنی ہی پڑتی ہے" وہ اپنی دُھن کی پکی تھی، اور روپیہ لارنس کو برابر روانہ کرتی تھی۔ لیکن اس نے کبھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ روپے اس نے بھیجے، کیونکہ وہ کہا کرتی تھی "اس کی ضرورت ہی کیا ہے، وہ خود بخود سمجھ جائے گا کہ یہ میری رفیقہ نے روانہ کئے ہیں"

غرض دن یونہی کٹتے جارہے تھے، اور اس دوران میں لارنس کے متعلق کوئی خبر نہیں ملی۔ اور میری جس نے ضروری روپیہ بھیجکر گویا اپنا فرض ادا کردیا تھا، یقین کرتی تھی کہ وہ اب تک فوج سے رہا ہوچکا ہوگا۔ وہ خاموش اور کچھ کھوئی سی نظر آتی تھی اور دن بدن اس کا رنگ زرد ہوتا جارہا تھا۔ ہم لوگ ایسے سنگ دل بھی نہیں تھے کہ میری کے دل سے لارنس کی یاد محو کرانے کی کوشش کرتے۔

آخر ایک دن وہ واپس آیا (اے کاش وہ مرجاتا!) آج بھی وہ منظر میری آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ مئی کا مہینہ تھا، کھیتوں کے کنارے بنفشئی رنگ غنچوں کے فرش بچھے ہوئے تھے اور باڑیں سفید پھولوں سے پٹی پڑی تھیں۔

آسمان پر بادلوں کا نام ونشان نہیں تھا اور سُورج اپنی پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ جنوب کی طرف، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کھیتوں پر سونے کے ورق چڑھا دیتے گئے ہیں۔

گاؤں میں بچے بچے کی زبان پر تھا کہ آج لارنس فوج سے واپس آرہا ہے۔ گاؤں والے خوش تھے کیونکہ لارنس ایک خوش خلق لڑکا تھا اور اب وہ ایک ہیرو کی طرح میدانِ جنگ سے واپس آرہا ہے۔ اور میری؟ ـــــ گاؤں میں وہ ہر دل عزیز تھی، بوڑھے، بچے سب اسکو یکساں چاہتے تھے۔

گھاس کاٹنے والے مزدوروں نے درانتی گھاس ہی میں چھوڑ دی، پسنہار [illegible] پن چکیوں ([illegible]) سے باہر نکل آئے، چرواہوں نے بھیڑ بکریوں کو میدان ہی میں چھوڑ دیا، اور اسی طرح سارا گاؤں لارنس کے استقبال کے لئے کھیتوں کے اس پار ایک میدان میں جمع ہوا، اور میری ایک ملکہ کی طرح ہم لوگوں کے درمیان کھڑی تھی۔

ہم لوگوں نے اُس کی خبر سُنتے ہی گاؤں کے اخیر پُل کے پاس ایک جھنڈا گاڑ دیا اور آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ خوش آمدید کے گیتوں اور بینڈ باجے کے ساتھ اُسے گاؤں میں لے جائیں۔ میں نے میری کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا "میری! خدا کرے، جون کے پہلے ہی ہفتہ میں تمہارا بیاہ ہو جائے"۔

جب دُور سے ہمیں وہ نظر آیا تو ہم سب نے مل کر خوشی کا ایک فلک بوس نعرہ لگایا۔ لیکن اس کے بعد فوراً ہی مجمع پر موت کا سا سکوت طاری ہو گیا، کیونکہ لارنس کے ہمراہ ایک عورت بھی نظر آئی، جس کے ساتھ وہ آزادانہ ہنستا بولتا ہماری طرف بڑھا آرہا تھا۔ اب عورت ہمیں صاف نظر آرہی تھی، اس کی شوخ اور سیاہ بڑی آنکھیں اس کے جنوبی ہونے پر دلالت کرتی تھیں، اور اس کے سر کے بال چاندی کے کانٹوں ([illegible]) سے مزین کئے گئے تھے۔ مجمع میں کانا پھوسی ہونے لگی۔

لیکن جب وہ مجمع کے قریب پہنچا تو شک وشبہ فوراً رفع ہو گیا، کیونکہ اس نے اپنی ہیٹ کو تشکر آمیز تفاخرانہ انداز سے ہوا میں جنبش دیتے ہوئے مجمع کو ان الفاظ میں مخاطب کیا "اس شاندار استقبال کے لئے میں آپ حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں، اُمید ہے کہ آپ میری بیوی کو بھی خوش آمدید کہیں گے"۔ میری نے یہ الفاظ سُنے۔ اے کاش! وہ ان الفاظ کے بدلے اس کے کلیجے میں برچھی گھونپ دیتا!

اب تو حضرت! میں خدا سے یہی دعا کرتی ہوں کہ وہ شکستہ دلی اور رنج وبیکسی کا ایسا دردناک منظر آئندہ کبھی میری نگاہوں کے روبرو پیش نہ کرے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں سخت دل ہوں اور میں جانتی ہوں کہ یہ سچ ہے۔ لیکن یہ منظر اس قدر رقت انگیز تھا کہ اس کی دید سے پتھر کا دل بھی موم ہو جاتا۔

میرا خیال تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائیگی، لیکن اس کی آنکھوں سے ایک آنسو تک نہیں نکلا۔ پہلے تو وہ بھونچکی سی ہو گئی اور پھر خالی نظروں سے ہمارا مُنہ تکنے لگی، گویا اس نے کچھ سمجھا ہی نہیں۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا (کاش وہ اسی وقت مر جاتی!) اور اُسکے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی، پھر وہ ہجوم میں سے بھاگ نکلی۔

اس کے بعد دو مہینوں بستر مرض پر پڑی رہی۔ ان دنوں وہ اکثر زیر لب گنگناتی رہتی۔ "لارنس! میں کس قدر محنت و مشقت سے سرمایہ جمع کر رہی ہوں کہ تمہیں فوج سے آزاد کرا یا جاتے!" زندگی میں کئی دردناک واقعوں سے مجھے سابقہ پڑا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ دردناک واقعہ میں نے کبھی دیکھا نہ سُنا۔ اور بس، یہ ہے غریب میری کی داستان۔ اب آپ جانتے ہیں کہ وہ کیوں ماری ماری پھرتی ہے۔

(ترجمہ) ————— محبوب علی قریشی۔ ویلور

اُردو کی نئی کتابیں جنوری ۱۹۳۸ء

آج کل یہ بات عموماً مان لی گئی ہے، کہ شاعری کے لئے نظم و نثر کی قید نہیں۔ اور شعر کو کلام منظوم کا مترادف خیال کرنا اُس کے میدان کو بہت تنگ بنا دینا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ نظم و نثر کے فرق کو پہچاننا بہت آسان ہے۔ کیونکہ وہ آنکھ اور کان سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مگر شاعری کی کوئی ایسی جامع تعریف جس کو ہر شخص تسلیم کرے میری نظر سے نہیں گذری۔ کوئی شاعری کو جدت خیال پر منحصر کرتا ہے۔ کوئی تصورات کی کثرت کو شاعری کا مدار قرار دیتا ہے۔ بعض کے خیال میں شاعری سے مُراد الفاظ کی رنگینی اور خوش آہنگی ہے۔ بعض جذباتی اثر و تاثر کو شاعری کی رُوح سمجھتے ہیں۔ کچھ عرصے سے اُردو زبان میں بھی نثر کی شاعری کا بہت رواج ہو گیا ہے۔ اور اکثر ادبی رسالوں اور مجموعوں کے اوراق میں مختصر افسانوں کے بعد اس قسم کی نثر سب سے زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے۔ عام طور پر لوگ اس رنگِ تحریر کی مقبولیت کو ٹیگور کی ادبیات کا اثر خیال کرتے ہیں۔ لیکن ٹیگور کی منثور شاعری خیالات کی نُدرت کے باوجود زبان و بیان میں سادگی سے متصف ہوتی ہے۔ اُردو کے نثر نگار شعرا اس کے برعکس خیالات کی بلندی سے زیادہ شکوہ الفاظ کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ بلکہ با اوقات لفظوں کی شان و شوکت خیال کی فرومائگی کے لئے پردہ ہو جاتی ہے۔ کسی اثر کو قبول کرنے کیلئے اہلیت و استعداد درکار ہے۔ ٹیگور کی تصانیف کے مطالعہ کو فوری محرک مان لینے کے بعد بھی اس قیاس کی گنجائش ہے کہ اس سے ماقبل اُردو زبان کا ادبی ارتقا ایک ایسی منزل پر پہونچ گیا تھا۔ جو اس نئی اور دلفریب روش سے بہت قریب تھی۔ جدید اُردو ادب پر انگریزی ادبیات کا بہت گہرا اثر ہوا ہے۔ اور دیگر مغربی زبانوں کی ادبیات کا اثر بھی اُنکے انگریزی ترجموں کے ذریعے سے کم و بیش ہو چلا ہے۔

ان میں سے اکثر زبانیں شاعری کے معاملے میں نظم و نثر کی حدِ فاصل کو محو کرنے پر آمادہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور ہمارے بعض طبعی میلانات ہم کو مغرب کے ان ادیبوں کی جانب زیادہ توجہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ جو اسلوب بیان میں تصنع اور تکلف کے عادی ہیں۔ علاوہ بریں مغرب سے نئے خیالات کی درآمد کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ ہمارے ادیب اور شاعر نظم و نثر کی قدیم تصنع آمیز روش کو ترک کر کے ان نئے خیالات کو سیدھے سادے پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ اُن کی کوشش کی بدولت اُردو میں اس نئی قسم کی شاعری کا آغاز ہوا جس کو بعض لوگ نیچرل شاعری کہتے ہیں۔ مغربی طرز کی مضمون نگاری کا رواج ہوا جس کا مقصد محض زورِ قلم کا اظہار نہیں بلکہ مفید معلومات اور بار آور خیالات کا فراہم کرنا تھا۔ سوانح نگاری اور تاریخ نویسی نے متعصبانہ لفاظی کو ترک کر کے واقعیت اور صداقت کا راستہ اختیار کیا۔ اور افسانہ نویسی نے قوتِ متخیلہ کے کرشموں سے درگذر کر کے روزمرہ کی زندگی اور انسانی فطرت کا مشاہدہ اور مطالعہ شروع کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ ان خارجی تحریکات کا زور ختم ہو گیا۔ اور زبان و ادب میں بھی نئے خیالات کو جذب کرنے کی قوت کم ہو گئی۔ جس طرح جب کسی آدمی کی طبعی اشتہا بے اعتدالی یا مرض کے سبب سے خراب ہو جاتی ہے، تو وہ سادی غذاؤں سے متنفر اور لذیذ کھانوں کی جانب مائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ادیب بھی مغرب کے صاف اور سیدھے اسالیب بیان کو ترک کر کے مغرب کے جن جدید اسالیب بیان کی طرف مائل ہو گئے۔ جن کا مقصد نظم و نثر کے فرق کو مٹانا اور دونوں کو فہم عامہ سے بالاتر بنانا ہے۔ خیر مغرب تو ان نوکھے اسالیب کا موجد ہونے پر فخر کر سکتا ہے کیونکہ ہر ایک ایجاد بجائے خود ایک قیمتی چیز ہے لیکن ہم تو جدت کے شرف سے بھی محروم ہیں پھر معلوم نہیں کہ ہمارے ادیبوں کو ان نئی نئی الجھنوں میں گرفتار ہونے کا کیوں اس قدر شوق پیدا ہوتا جاتا ہے۔ ہماری ادبیات کی تاریخ میں اس سے پہلے بھی ایک اس قسم کا دور آ چکا ہے۔ اُردو شاعری کی ابتدا سب جانتے ہیں کہ فارسی شاعری کے سایہ میں ہوئی۔ اور اُردو کے متقدمین شعرا فارسی شعرا کے مماثل تخیلات کو اُردو زبان میں ظاہر کرنا اپنا مآل کار تصور کرتے تھے۔ لیکن ہر ایک عمل کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ اور جب یہ عمل اپنی حد کو پہونچ گیا۔ تو سوائے اس کے کوئی اور چارہ کار متاخرین کے لئے باقی نہیں رہا کہ وہ خیال آفرینی اور خیال بندی کو چھوڑ کر لفظی صنائع اور بدائع کی جانب متوجہ ہوں۔ جس کا ایک نتیجہ اس قماش کی غزلگوئی تھی۔ جو دہلی کی نسبت لکھنؤ میں زیادہ مقبول ہوئی اور دوسرا وہ نثر نگاری جو نظم کی مانند قافیہ اور ردیف کی پابندی کو حسنِ تحریر کا لازمہ خیال کرتی تھی۔

ان تمہیدی تبصرات سے یہ راز ضرور منکشف ہوگیا ہوگا کہ مجھ میں آج کل کی منثور شاعری کو سمجھنے اور اس کی داد دینے کی بہت کم اہلیت ہے اس لئے محکمہ ریڈیو سے ریویو کے لئے دو کتابیں آئیں تو میں یہ دیکھکر ڈر گیا کہ وہ دونوں ادب لطیف کی اسی صنف سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں سے ایک مسٹر ایل احمد۔ یعنی لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی کی نغمات ہے۔ اور دوسری اختر حسین صاحب رائے پوری کی "محبت اور نفرت"۔ موخر الذکر کا ناشر ساقی بک ڈپو دہلی ہے۔ نغمات کے ناشر کا نام کتاب کے ٹائیٹل پیج (لوح) پر درج نہیں ہے۔ لیکن آخری صفحے پر جو اشتہار ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کنول بک ڈپو۔ ہینگ کی منڈی آگرہ اسے دستیاب ہوسکتی ہے۔ اس ابتدائی خوف کے باوجود جس کا کہ میں ابھی ذکر کرچکا ہوں۔ کتابوں کی ظاہری خوشنمائی نے ان کے مطالعہ کے لئے میری بہت ہمت بندھائی اور چونکہ نغمات حجم میں دوسری کتاب سے کم نظر آئی، میں پہلے اسی کی طرف متوجہ ہوا۔ دیباچے میں چند فقرے ایسے دکھائی دئے جن سے میری جسارت میں اور بھی اضافہ ہوا۔ کیونکہ ان فقروں سے مجھے یہ مفہوم ہوا کہ نثر کی شاعری کی عمومی قدر وقیمت کے بارے میں مسٹر ایل۔ احمد بھی میرے ہم خیال ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ اہل نظر حضرات ضرور محسوس فرما رہے ہوں گے۔ کہ اس وقت اُردو میں اس قسم کا جو ادب پیدا ہو رہا ہے۔ وہ ٹیگور کی غلط تقلید ہے۔ حسین الفاظ کو جمع کر دینا کچھ دشوار نہیں اور انشا میں معانی کا نہ ہونا اور خیال میں بے ربطی نہ آنے پائے۔ اپنے اور مصنف کے درمیان ہم آہنگی سے متاثر ہوکر میں نے کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔ اور ختم کرنے سے پہلے میں اس بات کا قائل ہوگیا کہ اُردو نثر کی شاعری ایسی مہمل شے نہیں جیسی کہ میں اسکو اپنی قدامت پسندی اور جہالت کی بنا پر تصور کرتا رہا تھا۔ مسٹر ایل۔ احمد کے شاعرانہ پارے جن کو شاید شہ پارے کہنا بیجا نہ ہوگا۔ فی الواقع اس کیف اور جذبہ سے خالی نہیں جس کو شعر کی تکمیل کے لئے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اور ان کو الفاظ پر وہی قدرت حاصل ہے جو اچھے شعرا کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ نغمات مختلف قسم کے ادبی پھولوں کا ایک گلدستہ ہے۔ چند کو مختصر افسانہ خیال کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اُن کی تخیلی نزاکت افسانوی ترکیب اور پیچیدگی کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ چند نثر میں تغزل کا نمونہ خیال کئے جاسکتے ہیں۔ اور بعض زندگی کے منتخب اور خوشنما لمحات ہیں جن کو مصنف نے خوشنما الفاظ میں منعکس کرنے کی کوشش کی ہے۔ طبعزاد مضامین کے ساتھ تراجم بھی ہیں۔ جو بیان اور تخیل میں اُن کے ہم رنگ معلوم ہوتے ہیں۔ غرضکہ اس ۱۴۵ صفحہ کے مختصر مجموعے میں تنوع پسند طبائع کی سیری کا خاصہ سامان موجود ہے۔

اختر حسین رائے پوری کی کتاب "محبت اور نفرت" سولہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس کے عنوان کی تشریح دیباچے کے ان فقرات سے ہوسکتی ہے۔ (وہ فرماتے ہیں) زندگی کوئی سیدھی لکیر نہیں ہے۔ اس میں بہت سے پیچ وخم ہوتے ہیں۔ لاتعداد نشیب و فراز۔ اس کے دو رُخ ہیں۔ نفرت اور محبت۔ ان فقرات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختر حسین صاحب کی ادبی کاوش کا مقصد صرف تفریح طبع نہیں بلکہ وہ فلسفہ حیات کی تفسیر کا بھی عزم رکھتے ہیں۔ چنانچہ چند سطریں آگے وہ یہ کہتے ہیں کہ۔ نفرت کے باب میں جو افسانے آئے ہیں وہ کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ اس زمانے کی حقیقت صرف ظالم اور مظلوم کی کشمکش میں پنہاں ہے۔ جان بوجھ کر یا انجان پنے سے دانستہ یا نادانستہ ہر ادیب یا تو ظالم کا طرفدار ہوتا ہے، یا مظلوم کا ہمدم۔ ان اقوال سے صاف ظاہر ہے کہ اختر صاحب دور حاضر کے بعض مغربی مصنفین کی مانند ادب کو سیاسی و اقتصادی جدوجہد کا آئینہ دار بنانا چاہتے ہیں۔ وہ نغمات کے مصنف کی طرح اپنے افسانوں کی فنی حیثیت کیلئے معذرت کا کوئی شائبہ بھی پسند نہیں کرتے بلکہ تحکمانہ لہجہ میں فرماتے ہیں کہ۔ اگر لوگ اس صنف یعنی منثور شاعری کی گہرائیوں تک نہیں پہونچ سکتے تو اس سے اُن کی کم مائگی کا ثبوت ملتا ہے۔ نہ کہ صنف بذات خود بُری ہوجاتی ہے۔ اُن کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ۔ شعر منثور شاعری کی سب سے مشکل صنف ہے صرف تخیل کی رنگینی میں موسیقی کا جادو بھرنا بہت دشوار ہے۔ اُن کے اس دعوے کو کوئی مانے یا نہ مانے لیکن اس میں شک نہیں کہ محبت اور نفرت کے یہ افسانے اختر صاحب کی شاعرانہ طبیعت اور ادبی استعداد کا بیّن ثبوت ہیں۔ ان افسانوں اور نغمات کے مضامین کو مطالعہ کرنے کے بعد میرے خیال میں یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ اُردو نثر میں لطیف جذبات اور دقیق خیالات کے اظہار کی کافی گنجائش ہے۔ لیکن یہ گنجائش بہت کچھ فارسی ترکیبوں اور عربی الفاظ کے استعمال پر منحصر ہے۔ اور اگر ہماری زبان میں سے ان عناصر کو خارج کر دیا جائے تو اس میں اظہار خیال کی قوت کسی قدر محدود ہوجاتی ہے۔

جدید افسانہ نویس کی ایک امتیازی خصوصیت نفسیاتی تجزیہ ہے۔ یعنی اشخاص فسانہ کے کردار کو واضح کرنے کیلئے اُن کے

اقوال و افعال کے علاوہ اُن کی قلبی کیفیات اور اُن کے جذبات و محسوسات کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے دقیق مضامین کیلئے ہماری شاعری کا سرمایہ بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ لیکن بسا اوقات یہ بھی نہیں ہوتا اور نئی نئی لفظی ترکیبیں، تشبیہات اور استعارے گھڑنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دونوں زیر تبصرہ کتابوں میں اس قسم کی لسانی جدتیں موجود ہیں۔ اور بعض وقت مصنف نے نئے لفظ کے مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے لئے ایک فٹ نوٹ کا اضافہ ضروری خیال کیا ہے۔

اس زبان کی بحث پر مجھے ایک اور کتاب یاد آگئی۔ جس کو شائع ہوئے کچھ بہت زیادہ زمانہ نہیں گذرا۔ اس کا نام محاورات نسواں ہے۔ اور اُس کی مصنفہ لاہور کی ایک خاتون وزیر بیگم ضیا نامی ہیں۔ اُردو میں بعض ایسے الفاظ اور محاورات ہیں جو زیادہ تر عورتوں کی زبان سے سُننے میں آتے ہیں۔ وزیر بیگم صاحبہ نے ان الفاظ و محاورات کو جمع کرکے اُن کے معنی و محل استعمال کی تشریح کر دی ہے۔ کتاب دیکھنے میں تو مختصر سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اپنے موضوع کے لحاظ سے خاصی جامع تصور کی جاسکتی ہے۔ اور وزیر بیگم صاحبہ کو اس کی تالیف میں خاص کاوش کرنی پڑی ہوگی۔ کیونکہ اُردو میں ایسی لغت کی کتابیں بہت کمیاب ہیں۔ جن سے انکو اپنی تحقیق و تلاش میں مدد مل سکتی تھی۔ اُمید کہ اُن کی کوشش نہ صرف طبقۂ نسواں میں مقبول ہوگی بلکہ وہ لوگ بھی اس کی داد دیں گے جو اُردو زبان کے علمی مطالعہ کا ذوق رکھتے ہیں۔ کتاب غالباً آوان منزل لاہور سے مل سکتی ہے۔

محمد سعید

پریم سوگ:- محمد حسام الدین خاں صاحب غوری نے یہ ۸۸ صفحے کی چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ اس میں منشی پریم چند مرحوم کی نجی اور ادبی زندگی کے حالات درج ہیں۔ مصنف نے مرحوم کے حالاتِ زندگی، عادات و خصائل، ادبی ذوق و مطالعہ، ادبی زندگی، افسانہ نویسی، ناول نویسی، اور اُن کے اجزائے ترکیبی، منشی جی کی تصنیف، اُن کا تعلق سینما سے، ادب کے متعلق منشی جی کے خیالات وغیرہ بڑی کاوش سے مرتب کئے ہیں اور سلیقے سے ان پر قلم اُٹھایا ہے۔ اُردو میں اور کوئی کتاب "پریم سوگ" سے بہتر اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔ شروع میں منشی پریم چند مرحوم کی تصویر اور ڈاکٹر زور کا دیباچہ شامل ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا۔ قیمت ۸؍ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد۔ دکن سے طلب کیجئے۔ "دش"

یادگارِ محشر:- عبید اللہ محشر ایک نوجوان خوشگو شاعر تھے۔ افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور ۲۳ سال کی عمر میں ۵۲ سال کے باپ اور ۹۸ سال کے ضعیف دادا کو تڑپتا چھوڑ کر راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ مرحوم بی۔ اے۔ کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ صرف پانچ دن کی مختصر علالت کے بعد انتقال کیا۔ شعر بہت اچھا کہتے اور زندہ رہتے تو یقیناً اور بھی اچھا کہتے۔ شاید اسی کمال کی وجہ سے زمانے کی نظر انہیں کھا گئی۔ مرحوم ہی کا شعر ہے ؎

تقاضائے ہستی کی بھی لاج رکھ لوں　　　میں ہونے پہ اپنے مٹا چاہتا ہوں

مرحوم کے دوستِ صادق اشفاق حسین خاں صاحب گورکھپوری نے محشر کا مجموعۂ کلام "یادگارِ محشر" کے نام سے شائع کیا ہے جس سے مرنے والے کا نام رہتی دُنیا تک زندہ رہے گا۔ اس مجموعے میں غزلیں، نظمیں، رباعیات، وغیرہ شامل ہیں۔ کتابت و طباعت اچھی، کاغذ عمدہ۔ جلد مضبوط۔ محشر کی زندگی کی اور ایک مرنے کے بعد کی تصویر دی گئی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً "آسی پریس گورکھپور" سے یادگارِ محشر منگائی جاسکتی ہے۔

"دش"

نورِ مشرق:- جناب مہرلال ضیا۔ ایم۔ اے۔ کا مجموعہ منظومات اس نام سے چھپا ہے۔ ضیا صاحب خوش فکر اور جدت طراز شاعر ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی مشہور شاعر کی پیروی، تقلید یا نقالی نہیں کرتے۔ وہ کسی اور کے "رنگ" میں اپنے آپ کو رنگنا نہیں چاہتے۔ بلکہ خود اپنا ایک ڈھنگ، ایک اسلوب رکھتے ہیں۔ مغربی شاعری کے مطالعہ نے اُن کے خیال کے لئے نئی نئی راہیں کھول دی ہیں اور یہ انہی راہوں پر اُردو شاعری کو بھی لیجانا چاہتے ہیں۔ ترقی اُسی وقت ممکن ہو جب ہم پُرانے ڈھرّوں کو چھوڑ کر نئے راستے نکالیں۔ فرسودہ مفروضوں سے اجتناب ہی نہیں بغاوت کی ضرورت ہے۔ جہاں جمود و سکون ہوتا ہے وہاں ترقی مسدود ہو جاتی ہے۔ خُدا کا شکر ہے کہ اُردو نظم و نثر دونوں میں انقلاب رونما ہو رہا ہے۔ ضیا کے پیشِ نظر مجموعہ "نورِ مشرق" میں بھی ہمیں اسی انقلاب کی روشنی نظر آتی ہے۔ اور اُمید ہے کہ یہی روشنی ایک دن ہمارے بہت سے شاعروں کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دے گی۔ ضیا کے اشعار میں زندگی کے آثار

اور پیامِ بیداری ہے۔ انہیں پڑھکر رونے یا سونے کو جی نہیں چاہتا۔ بس یہی اُن کے کلام کی خصوصیت اور کمال کی دلیل ہے۔ شروع میں جوشؔ ملیح آبادی، آزادؔ انصاری، اور منظر صدیقی کے مختصر تعارف نامے ہیں جن سے شاعر اور اُس کے اشعار کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ کتاب مجلّد ہے۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ بخندلال سونی۔ کٹڑہ کرانہ۔ پھاٹک حبش خاں۔ دہلی
"ش"

مسز کرٹھلے سابق شاہِ انگلستان ایڈورڈ ہشتم کی تاج و تخت سے دست برداری ایک ایسا عظیم الشان واقعہ تھا جس نے ساری دُنیا میں ہلچل ڈال دی تھی۔ بچے بچے کی زبان پر اسی کا ذکر اور جگہ جگہ اسی کا چرچا تھا کہ بادشاہ نے ایک عورت کی خاطر اتنی بڑی سلطنت کو چھوڑ دیا۔ یہ خاتون مسز سمسن تھیں جنہیں شاہ ایڈورڈ اپنی ملکہ بنانا چاہتے تھے۔ لیکن برطانیہ کے شاہی خاندان کے ازدواجی قانون نے اس کی اجازت نہیں دی۔ کنٹربری کے لاٹ پادری اس کو بھول گئے کہ شاہی قوانین سے بھی بڑا ایک اور قانون ہے۔ اور وہ ہے محبت، جس کا قانون یہ ہے کہ اُس کا کوئی قانون نہیں ہے۔ بادشاہ کے لئے اب صرف دو صورتیں تھیں۔ یا تو اپنی محبوب خاتون کو چھوڑ دے یا تاج و تخت کو۔ یہ محبت اور حکومت کی ایک زبردست ٹکر تھی جس میں محبت فتحمند رہی۔ چنانچہ شاہ ایڈورڈ ہشتم نے ڈیوک آف ونڈسر بننا پسند کیا۔ اور ایک نامعلوم مدت کے لئے اپنے وطن کو خیرباد کہکر آسٹریا میں سکونت اختیار کی۔ یہیں انہوں نے سابق مسز سمسن کو اپنی محبوب شریکِ حیات یعنی ڈچز آف ونڈسر بنایا اور یہ سنجوگ دُنیا کی نظروں میں مفتخر ہو کر سمایا۔

مختصر الفاظ میں واقعہ صرف اتنا ہی تھا۔ افسانہ نگار کے لئے اسے طرح طرح سے پیش کرنے کی بہت گنجائش تھی۔ مرزا عظیم بیگ صاحب جیسے افسانہ طراز نے شاہ ایڈورڈ کا عالمگیر واقعہ سنکر اپنے دیس کی سوسائٹی پر نظر ڈالی تو رسم و رواج کی تباہ کاری کی ایک دردناک مثال اُنہیں نظر آئی جسے اُنہوں نے اپنے مخصوص طرزِ انشا میں کہانی کا من بھاتا جوڑا پہنایا۔ کتاب کے آخری ابواب میں اُنہوں نے اپنے اصل مقصد کو بڑی عمدگی سے واضح کیا ہے۔ شاہ ایڈورڈ کی خدمت میں یہ مکتوب اس لئے پیش کیا ہے کہ اُنہوں نے شاہی روایاتِ قدیم کی پابندی کر کے انصاف کا خون اور اپنے دل کا خون نہیں کیا۔ چغتائی صاحب کا ہیرو بھی حق و صداقت کے لئے سماج کے رسمی قوانین سے بغاوت کرتا ہے اور گھربار، عزیز رشتہ دار، ماں باپ، بھائی بہن، دوست احباب، روپیہ پیسہ غرض سب کچھ تج دیتا ہے اور اس عورت کا ہو رہتا ہے جسے اُس کا دل چاہتا ہے۔ مذہب اُس سے شادی کرنے کی اجازت دیتا ہے مگر سماج اور جاہل مولوی اس کو حد درجہ مذموم سمجھکر ناجائز قرار دیتا ہے۔ چغتائی صاحب کے اِس افسانے کا ہیرو اگر اپنا آئیڈیل کسی کو بنا سکتا ہے تو وہ ڈیوک آف ونڈسر (سابق شاہِ انگلستان ایڈورڈ ہشتم) ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ طویل مکتوب غالباً اسی وجہ سے اُن کی خدمت میں پیش کیا گیا ہو۔

یہ کتاب کم و بیش ایک سال پہلے شائع ہونے والی تھی لیکن چغتائی صاحب اس کا مسودہ مکمل کرنے نہیں پائے تھے کہ اُنکی خطرناک علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اُنہیں مجبوراً قلم رکھ دینا پڑا۔ ۱۹۳۶ء کے آخیر میں اُن کی زیست کی اُمید بندھی اور اپنے معالجوں سے خفیہ خفیہ اُنہوں نے کتاب کے آخری ابواب لکھکر مکمل کئے۔ مجھے اُمید ہے کہ جس طرح اُن کی اور تصانیف مقبولِ عام ہیں "مسز کرٹھلے" بھی ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ بلکہ شاید اُن سے بھی زیادہ اس کی قدر کی جائے کیونکہ اس کتاب میں اُن کے فن کی پختگی زیادہ نمایاں ہے۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ساقی بک ڈپو۔ دہلی۔
"ش"

حیدر علی محمود خاں صاحب محمود (مارسٹن) جنہوں نے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا "تاریخ سلطنت خداداد" لکھکر اُردو کے سرمایۂ تاریخ میں ایک عمدہ کتاب کا اضافہ کیا تھا نے "حیدر علی" کے نام سے ایک دلکش مختصر ناول لکھا ہے جس میں حیدر علی بانیِ سلطنتِ خداداد کے عہدِ حکومت کی ایک رومانی کہانی سُنائی ہے۔ یہ کہانی تاریخی شواہد و واقعات سے مرتب کی گئی ہے۔ واقعات یوں ہیں کہ "بدنور کا راجہ مرا تو چن بسویا نامی کم عمر لڑکا جسے راجہ نے متبنیٰ بنا لیا تھا تخت کا وارث ہوا۔ بیوہ رانی نوجوان اور عیاش تھی۔ اُس نے اپنے برہمن آشنا کی مدد سے چن بسویا کو مروا دیا۔ مگر در اصل وہ مرا نہیں اور آگے چلکر حیدر علی کی مدد سے بدنور کا مالک بنا"۔ ناول نویس نے منظر کشی اور کردارنگاری میں کاوش کی ہے۔ اور اس لحاظ سے کہ جنوبی ہند سے بہت کم اُردو ناول شائع ہوا بہت قابلِ قدر ہے۔ ضخامت ۱۴۸ صفحات اور قیمت صرف ۸ جو بہت کم ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ محمد سراج الدین، بک سلر۔ ڈکنسن روڈ۔ بنگلور۔
"ش"

دوائیں جنکا دنیا میں جواب نہیں

جل جلان

خارش خشک وتر۔ داد۔ گنج۔ پھوڑے پھنسی بگڑی دانے جھائیں کیل۔ مہاسے سوزاک۔ آتشک۔ گٹھیا عرق النساء برص۔ اور جذام۔ غرض فساد خون سے پیدا ہونے والی تمام بیماریوں کے لئے نہایت مفید ہے۔ قیمت شیشی ۱۲ قرص پندرہ آنے

نوجیون

عام جسمانی کمزوری اور طاقت مردانہ کیلئے اس قدر مفید ہے کہ اکسیر بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ تمام اعضائے رئیسہ کو طاقت دیتی ہے۔ بے حد مقوی اور ممسک ہے۔ دستہ پیشانی سے بچا لیتی ہے پہلے ایک قرص صبح دو ٹکیاں کھائیں جب عادت ہو جائے تو روزانہ دو قرص استعمال کریں شیشی ۳۰ قرص ...

جمیلان

عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خاں صاحب سرپرست ہندوستانی دواخانہ دہلی کا

وہ نسخہ جس سے دو لاکھ مریضان جریان کو اب تک آرام و فائدہ ہو چکا ہے

جریان کا نتیجہ کیا ہے؟ دل و دماغ و جگر کا کمزور ہو جانا۔ ہاضمہ کا بگاڑ۔ حافظہ کی خرابی۔ ہمت کی پستی۔ طبیعت کی سستی۔ اولاد سے محرومی۔ جوڑوں کا درد اور عام ناتوانی پھر رفتہ رفتہ مالیخولیا یا جنون یا کوئی سخت بیماری مثلاً دق و سل وغیرہ۔ اگر آپ کو جریان کی شکایت ہو تو فوراً توجہ کیجئے۔ آج ہی اس بیش بہا اور کامیاب دوا کا استعمال شروع کر دیجئے۔ جمیلان مرض جریان کی بہترین اور کامیاب ترین دوا ثابت ہو چکی ہے۔ جس سے اب تک دو لاکھ بیماروں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ جریان چاہے پرانا ہو چکا ہو یا نیا ہو ہر حالت میں اس سے فائدہ ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ دل و دماغ کی کمزوری اور اعضاء کا اضمحلال دور ہو کر تندرستی اصلی حالت پر آجاتی ہے۔ قبض پیدا نہیں ہوتا۔ بھوک خوب لگتی ہے۔ غذا اچھی طرح ہضم ہوتی ہے۔ زرد چہرہ پر سرخی جھلکنے لگتی ہے جریان کی دواؤں میں جمیلان سب سے بہتر ثابت ہوئی ہے۔

ترکیب استعمال:- دو قرص صبح دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔

ترشی۔ تیل۔ گڑ۔ اور ثقیل چیزوں سے پرہیز۔

قیمت شیشی بتیس ۳۲ قرص چار روپے آٹھ آنے

طلائے زود اثر

یہ طلا اُن لوگوں کیلئے ہے۔ جن میں سستی اور جوش کی کمی پائی جاتی ہے اس کے استعمال سے پہلی رات میں اثر ظاہر ہوتا ہے مسلسل استعمال سے کمزوری سستی۔ رگ اور پٹھوں کی خرابیاں دور ہو جاتی ہیں۔ نہایت مفید چیز ہے قیمت شیشی ایک ماشہ بارہ آنے۔

طلائے عجیب

اُن لوگوں کیلئے جو اپنے ہاتھوں اپنی مٹی خراب کر چکے ہیں اور غلط کاریوں نے انہیں کسی قابل نہیں رکھا ہے۔ طلائے عجیب نئی زندگی کا حکم رکھتا ہے عضو کی کجی۔ لاغری کمزوری اور کوتاہی دور ہو جاتی ہے۔ اور رگوں سے مادہ فاسد خارج ہو کر از سر نو طاقت حاصل ہوتی ہے قیمت شیشی ۲ ماشہ چار روپے

حب ممسک مشکی

یہ گولیاں وقت پریشانی سے بچا لیتی ہیں۔ سرعت کی شکایت بالکل دور ہو جاتی ہے۔ تمام مضر صحت نشہ کی چیزوں سے پاک ہیں۔ انکی بدولت اُن لوگوں نے جو اپنی کمزوری کی وجہ سے آمادہ خودکشی تھے وقت پر خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے قیمت شیشی ۶ گولی ایک روپیہ

قرص عجیب

آج تک دنیا میں کثرت احتلام کی اس سے بہتر دوا دریافت نہیں ہوئی۔ عرصہ دراز کی شکایت چند خوراکوں میں جاتی رہتی ہے۔ رقت و سرعت بھی رفع کرتی ہے۔ ایسی حکمی دوا ہے کہ سو فی صدی کامیاب ہوتی ہے۔ قیمت شیشی ۱۲ قرص بارہ آنے۔

ملنے کا پتہ
منیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس ۲۲ دہلی

چندہ سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے
قیمت فی پرچہ چھ آنہ

جرعات

ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ
نمونہ کا پرچہ مفت بھیجا جاتا ہے

جلد ۱۷ | ساقی دہلی بابت ماہ مارچ ۱۹۳۸ء | نمبر (۳)

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
(۱)	نگاہ اولیں	شاہد	(۲)
(۲)	تعلیم کے باب میں باپوں کا بیٹوں سے معاملہ ..	شمس العلماء مولانا عبد الرحمن مدظلہ صدر شعبہ السنہ دلی یونیورسٹی	(۳)
(۳)	دلِ غیور کا داغ	جناب امین حزیں	(۷)
(۴)	شانِ تغزل	جناب گنگا دھرناتھ فرحت کانپوری بی اے ایل ایل بی ..	(۸)
(۵)	سیرگاہ	جناب ایم اسلم	(۹)
(۶)	چار فارسی مقولے اردو میں	جناب ولی احمد خانصاحب ایم اے، ایل ایل بی ..	(۱۱)
(۷)	شعلۂ سوزاں	جناب صادق الخیری دہلوی ایم اے	(۱۳)
(۸)	مسز کرٹھلے کے چار باب	مصورِ ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی بی اے ایل ایل بی	(۱۷)
(۹)	اُن کی آمد	جناب الطاف مشہدی	(۲۴)
(۱۰)	اُردو کے عناصر خمسہ اور بہترین انشا پرداز ..	جناب حفیظ نعیمی بی اے	(۲۵)
(۱۱)	دلی کی سیر	جناب اختر انصاری بی اے (آنرز)	(۳۴)
(۱۲)	جاپانی سیاہ خطرہ	پروفیسر محمد مسلم ایم اے	(۳۷)
(۱۳)	شادی	جناب منظر حسن بی اے ایم ای ڈی ..	(۳۹)
(۱۴)	کمی کا احساس	جناب سید علی منظور (حیدر آبادی) ..	(۴۵)
(۱۵)	اُردو رسم الخط کے اختلافات	جناب منظور حسین ماہر القادری	(۴۶)
(۱۶)	خوابوں کا مندر	جناب شانتی سروپ کیف	(۵۰)
(۱۷)	ڈھیٹ	محترمہ عصمت چغتائی بی اے	(۵۱)
(۱۸)	تخیلات	جناب محسن اعظم گڑھی	(۵۵)
(۱۹)	زنج اور قطری زبان	جناب چراغ علی صاحب	(۵۶)
(۲۰)	سجنی	جناب بہزاد لکھنوی	(۶۶)
(۲۱)	زندگی اور اس کی سرگذشت	جناب آغا محسن رضا جعفری	(۶۷)
(۲۲)	حسن	جناب عرش تیموری	(۷۲)
(۲۳)	نوائے فراق	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم اے	(۷۵)
(۲۴)	بمبئی کی مکان	جناب سید ابو طاہر بی ایس سی	(۷۶)
(۲۵)	عظمت	جناب محمد صفات علی خاں	(۷۸)
(۲۶)	نیکی	محترمہ مس قیصر احمد	(۸۰)
(۲۷)	بلوہ	جناب محمد جعفر بجوّد	(۸۸)
(۲۸)	نقد و تبصرہ	"ش"	(۹۰)
(۲۹)	اشتہارات	مشتہرین	(۹۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

منشی پریم چند آنجہانی کی یادگار میں رسالہ زمانہ کانپور کا "پریم چند نمبر" شائع ہوا ہے۔ اِس خاص نمبر کا انتظار کچھ اوپر ایک سال سے کیا جا رہا تھا۔ بمصداق دیر آید دُرست آید "پریم چند نمبر" مضامین کے اعتبار سے مرحوم کے شایانِ شان شائع ہوا۔ اِس خاص نمبر کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں منشی جی کے واقعاتِ زندگی درج ہیں۔ خود نوشت حالات کے بعد اس حصے میں ایڈیٹر زمانہ کا بسیط مضمون بہت قابلِ قدر ہے۔ ایڈیٹر زمانہ کو منشی پریم چند سے تیس سال تک نہایت پُرخلوص سابقہ رہا۔ اِسلئے منشی دیا نرائن نگم سے بہتر منشی پریم چند کو اور کون جان سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں مرحوم کی زندگی کے ہر پہلو پر اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ اِس خاص نمبر میں اگر صرف یہی ایک مضمون ہوتا تب بھی یہ اشاعت کامیاب کہلاتی۔ مسنر پریم چند نے مرحوم کے آخری وقت کی نہایت رقت انگیز تصویر پیش کی ہے۔ پندرہ بیس اور مضمون نگاروں نے بھی اس حصہ میں خامہ فرسائی کی ہے، مگر بیشتر حضرات نے مرحوم سے خواہ مخواہ رشتہ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ وہ عرصے تک میرے پاس آتے رہے اور میری بات بہت مانتے تھے، ایک اور صاحب فرماتے ہیں کہ اُنہوں نے میری فلاں تصنیف کا کچھ حصہ سُنا اور بہت تعریف کی۔ اور بعض بزرگوں کے مضامین سے تو خودستائی کی بساند آتی ہے۔ ان کے مضامین پڑھیئے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ منشی جی مرحوم اِس لئے ایک بڑے آدمی تھے کہ وہ انکے دوست تھے۔ مگر یہ غنیمت ہو کہ یہ لغویت صرف دو ایک ہی مضمونوں میں نظر آتی ہے۔ دوسرے حصے میں منشی جی کے ادبی کارناموں پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ بعض مضامین محنت سے لکھے گئے ہیں۔ حصہ سوم میں ماتمی نظمیں اور قطعاتِ تاریخ وفات وغیرہ شامل ہیں۔ منشی جی کی کئی تصویریں بھی چھاپی گئی ہیں۔ مرنے سے کچھ دن پہلے کی تصویر بہت دردناک ہے۔ پرچے کی مجموعی ضخامت ۲۵۲ صفحات ہے۔ اور قیمت عہ۔ بہتر ہوتا کہ میلے اور سستے کاغذ پر شائع کرنے کی بجائے یہ یادگار نمبر معمولی سفید کاغذ پر شائع کیا جاتا۔ قیمت میں اس کی گنجائش نظر آتی ہے۔

بعض ہندو مضمون نگاروں نے اپنی بے تعصبی کا ثبوت نہیں دیا۔ کسی نے اُردو کی بے بضاعتی پر اصرار کیا ہو اور کسی نے اُردو پبلشرز کی بدمعاملگی کو اُجاگر کیا ہے۔ کسی نے اُردو و ہندی کا مقابلہ کر کے ہندی کو ساتویں آسمان سے اوپر اور اُردو کو تحت الثریٰ سے نیچے دکھایا ہے۔ بھلا اس ہرزہ سرائی کی کیا ضرورت تھی۔ منشی جی مرحوم کے ایک سے زیادہ خطوط گواہ ہیں کہ ہندی سے بھی اُنہیں وہی تکلیفیں پہونچیں جو اُردو سے پہونچیں۔ خود مرحوم نے ہندی رسائل جاری کئے اور ہندی پریس لگایا مگر ہمیشہ ہزاروں سے نقصان اُٹھایا۔ یہاں تک کہ اسی ہندی کی خاطر اُنہیں گھر بار چھوڑ کر سال بھر بمبئی میں فلم کمپنی کی ملازمت کرنی پڑی۔ جب جاکر قرض سے جان چھوٹی۔ اور جان کیا چھوٹی وہیں سے صحت بگڑنی شروع ہوئی اور پھر آخر تک سنبھلی ہی نہیں۔ خود زبانی جب جامعہ ملیہ میں اُن سے ذکر آیا تو مرحوم نے فرمایا تھا کہ ہندی کی حالت اُردو سے اچھی نہیں ہے اور راقم الحروف نے جب اُن سے اُردو سے رُوگردانی کا شکوہ کیا تو مرحوم نے فرمایا تھا کہ میں اب بھی جتنا اُردو میں لکھتا ہوں ہندی میں نہیں لکھتا۔ اور یقیناً (بقیہ بر صفحہ ۹۴)

تعلیم کے باب میں باپوں کا بیٹوں سے معاملہ اور آجکل اُسکا ماحصل

بزرگوں سے سُنا تھا۔ اور تجربہ سے صحیح ثابت ہوا۔ کہ آدمی کبھی دل سے نہیں چاہتا کہ کوئی اُس سے بڑھ جائے۔ لیکن اولاد خاص کر بیٹے کیلئے بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے آدمی کی دلی تمنّا اور آرزو یہی ہوتی ہے۔ کہ بیٹا اُس سے بھی اچھا ہو۔ بڑھے اور اتنا بڑھے کہ دُنیا جہان سے اونچا ہو جائے۔ اور پھر یہ آرزو ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے بوتے بساط کے موافق ہر باپ کم و بیش اس کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اور اُسکو بڑھتا دیکھکر باغ باغ ہوتا ہے۔ اور اس کے بڑھنے کو خود اپنا بڑھنا سمجھتا ہے۔ اسی لئے اُس پر فخر و ناز کرتا ہے۔ کہتے ہیں سبب اس کا یہ ہے کہ وہ اولاد خاص کر بیٹے کو اپنا وجود ثانی تصوّر کرتا ہے۔ بات بالکل سچی ہے۔ لیکن شاید کوئی کہنے لگے کہ حقیقت یہ ہے تو باپوں کا معاملہ بیٹوں سے تجارت کا سا معاملہ نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اور دیکھنے میں اکثر یہی آتا ہے۔ کہ باپ بیٹوں سے اچھا خاصہ تجارت کا سا معاملہ کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ ان کی تربیت میں تعلیم میں بڑے بڑے دُکھ اُٹھاتے اور اکثر بڑی بڑی قربانیاں کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کیا وہ بیٹوں سے مادّی و اخلاقی یا کم از کم اخلاقی بدلے کی توقع نہیں رکھتے یہ توقع تاجرانہ معاملہ نہیں تو کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی صحیح ہے لیکن اس میں بُرائی کیا ہے۔ آخر آدمی جو سعی و قربانی خود اپنے فائدہ کے لئے کرتا ہے اُس سے بھی تو نفع کی توقع رکھتا ہے۔ اور اگر نفع اُٹھاتا ہے اور خاطر خواہ نفع پاتا ہے تو خوش ہوتا ہے۔ ورنہ پژمردہ غمزدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب خود اپنے ساتھ اس کا یہ معاملہ ہے تو اگر وہ اپنی اُس کوشش و قربانی کو بھی جو وہ بیٹوں کی فلاح و بہبود کے لئے کرتا ہے۔ اسی پیمانے سے ناپنے لگے یا ناپتا ہے جس سے کہ اپنی ذاتی بھلائی کی سعی کو ناپتا ہے تو کیا بیجا کرتا ہے۔ اور اس سے کہاں لازم آتا ہے۔ کہ وہ اولاد کو اپنا وجود ثانی تصوّر نہیں کرتا۔ یا اولاد سے مہر و محبت نہیں رکھتا۔ تاہم یہ بات بالکل صحیح ہے کہ باپ کے جذبات اولاد کے ساتھ ایک حد تک تاجرانہ بھی ہوتے ہیں۔ خواہ وہ کبھی کبھی مہر و محبت کے پردے میں چُھپے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں اور جب اولاد کی تعلیم و تربیت کم و بیش ایک قسم کی تجارت ہے تو اس میں نفع نقصان کا ہونا بھی لازمی ہے۔ دُنیا میں وہ کونسی تجارت ہے جس میں ہمیشہ فائدہ ہی فائدہ ہو اور نقصان کبھی اُٹھانا ہی نہ پڑے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا تعلیم بھی وہ جنس ہے جس کی تجارت میں نقصان ہو سکے۔

کہتے ہیں کہ علم یا تعلیم کا اصل ماحصل وہ چیز ہے۔ جسکا ایک ذرّہ بھی سونے کے پہاڑوں سے زیادہ [illegible] ہے۔ یہ بھی صحیح ہے۔ لیکن یہ عالم عقل و روحانیات کی باتیں ہیں۔ اس مادّی عملی دُنیا میں روپیہ پیسہ بھی بڑی چیز ہے۔ سُنا نہیں "کوڑی نہیں

نو کوڑی کے پھر تین تین ہیں"۔ اور آجکل تعلیم کا مدار ہے روپیہ پر اور روپیہ پیسہ وہ چیز ہے جہاں کسی معاملہ میں اسکا قدم آیا اور معاملہ سنگین ہو گیا: یہی وجہ ہے کہ ان دنوں تعلیم کے خرچ اور اس کے ماحصل کا سوال پہلے سے زیادہ اہم ہو گیا ہے اور اصل باقی کا گوشوارہ پیش نظر رکھنا ہی پڑتا ہے۔

سُنا ہے ہندوستان میں ایک زمانہ ست جگ کا ایسا بھی گزُرا ہے۔ کہ باپ اپنے بیٹوں کو تارک الدُنیا دودھوان گردوں کے پاس جا کر چھوڑ آتے اور بے فکر ہو کر اپنے گھر آ بیٹھتے۔ گرد اور چیلے کوئی گائے پال لیتے۔ اُس کے دودھ، جنگل کے پھل پھلار ساگ پات پر زندگی بسر کرتے پڑھتے پڑھاتے، گیان دھیان سے کام ہوتا اور بس پھر وہ زمانہ آیا کہ راجے مہاراجے، دھن دولت والے گردوں اور چیلوں دونوں کی ناگزیر ضروریات زندگی کا سرانجام کرتے۔ ودیارتھی ودھوانوں کے پاس جاتے۔ ان کے مٹھوں اور پاٹشالوں میں رہتے اور اپنی اپنی استعداد کے موافق اُستادوں کی خاک قدم سے علم کے جوہر رولتے کوئی پوٹ باندھتا کوئی دامن بھرتا۔ پھر کر گھر آتے تو اپنے پرائے سب خوشیاں مناتے۔ اور جو دولت علم کے حریص بندے اُستادوں کی خدمت کو چھوڑنا نہیں چاہتے وہ اُستادوں کی گدّیاں پاتے اور ان کے جانشین کہلاتے اور یہی سب سے زیادہ عزّت و احترام کے سزاوار ٹھہرتے اور وہ زمانہ تو ابھی دور نہیں گیا ہے جبکہ امیروں کی صحبت اور ان کی خیرات و صدقات کے طفیل میں غریب بھی وقت کی اعلیٰ تعلیم مفت پایا کرتے تھے۔ اس لئے ان دنوں تعلیم کا ماحصل بھی لین دین کی ترازو میں نہیں تولا جاتا تھا۔

خود میرے ایک اُستاد خُدا غریق رحمت کرے فرماتے تھے "پڑھنے کا شوق تھا اور آئے دن مولانا عبدالحی مرحوم کے درس کی داستانیں سُنتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی طرح لکھنؤ پہنچوں۔ گھر والے نہ مدد کا ذمہ لیتے تھے نہ جانے کی اجازت دیتے تھے۔

شوق نے بہت ستایا تو گھر سے کچھ روپیہ چُرایا۔ اور لکھنؤ پہنچ کر حلقہ درس میں جا بیٹھا۔ لیکن جیب روز بروز ہلکی ہونے لگی۔ لوگوں سے ملے جلے اور چند ہی دنوں میں ایک بزرگ کی سفارش پر ایک نواب صاحب کے ہاں کی تحصیل ہمیں مل گئی ہم نے خدا کا شکر کیا اور بے فکر ہو کر پڑھنے لگے"۔

بہت ممکن ہے آپ تحصیل کے معنی نہ سمجھے ہوں "مَیں خود بھی غلط سمجھ چکا ہوں۔ یہ تقریر تقریباً انہیں الفاظ میں مَیں نے اب سے کوئی اکتالیس برس پہلے حضرت مولانا سے سُنی اور یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ جو کچھ پڑھنا پڑھانا تھا میں تقریباً پڑھ چکا تھا۔ با ایں ہمہ میں لفظ تحصیل سے یہی سمجھا کہ مولوی صاحب کسی نواب صاحب کے ہاں تحصیلدار ہو گئے۔ اس سے دل میں خیال آیا اور بار بار آیا کہ ہمارے مولوی صاحب خدا کے فضل سے اول دن سے خوش قسمت ہیں۔

گھر سے بھاگے تو پڑھنے کو۔ پردیس پہونچے دیر نہیں ہوئی تھی کہ تحصیلدار ہو گئے۔ خیر سے پڑھتے بھی تھے اور تحصیل [illegible] چپڑی اور دو۔ دو، ہم خرما و ہم ثواب، کچھ دن گذرنے کے بعد اتفاق سے پھر لکھنؤ اور تحصیل کا [illegible] لیا۔ اور اس طرح آیا کہ تحصیل کے معنی بھی مولوی صاحب نے بیان کئے مجھے ہنسی آ گئی اور باوجود اپنی عزّت کے کچھ ایسی ہنسی آئی کہ زبان تک کاٹ لی مگر ہنسی کو نہ رُکنا تھا نہ رُکی۔ اٹھنا چاہا کہ مولانا کے

سامنے سے دُور تو ہو جاؤں تو وہ خود بھی ہنس پڑے۔ اس وقت کی حماقت اور اس دن کی ندامت آج تک یاد ہے۔ اور جب خیال آجاتا ہے۔ باوجود اس ندامت کے جو اُٹھا چکا ہوں ہنسی آجاتی ہے۔ کبھی اپنی جہالت پر اور کبھی ایک تحصیل و تحصیلداری پر جو بیش ازیں نہ تھی۔ کہ کبھی بھلے آدمی کی سفارش پر ایک نواب صاحب کے ہاں سے ہمارے مولوی صاحب کا ایک وقتی کھانا مقرر ہو گیا تھا۔ آپ ہی انصاف کیجئے۔ کہاں ایک تحصیل کا پرشکوہ لفظ اور کہاں یہ معنی ایک پڑھا لکھا آدمی اور پھر بایں غرہ کہ...... ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔ تحصیل کے معنی سمجھے کچھ اور وہ نکلیں کچھ اور وہ بھی ایسے رکیک وحقیر، میں اس شاندار تحصیل کا حال معلوم ہونے پر ہنس نہ پڑتا تو کیا کرتا۔

یہ تھا ہماری اعلیٰ تعلیم کی زندگی کا معیار۔ مانا کہ عام نہ تھا۔ اس واقعہ کو تو کوئی ستّر برس ہوئے ہونگے۔ لیکن ہمارے ہاں کے طرز قدیم کے مدارس کا اب بھی یہی حال ہے۔ مدارس اہل خیر کی اعانت پر قائم ہیں۔ امیر غریب سب مفت پڑھتے ہیں۔ کچھ اپنا کھاتے ہیں۔ کچھ وظائف پاتے ہیں۔ بہت سے اسی قسم کی ایک دو تحصیل سے گزارا کرتے ہیں۔ مگر دلّی میں یہ لفظ اب اس معنی میں نہیں بولا جاتا۔ ستّر برس پہلے کی خبر نہیں۔ کبھی یورپ میں بھی مدارس و متعلمین کا یہی حال تھا۔ موجودہ یونیورسٹیوں کے اوقاف جن کے سہارے پر کبھی وہ بنی تھیں۔ اہل خیر ہی کے صدقات کا نتیجہ ہیں۔ فضیلت کی گون کے ساتھ پس پشت گلے میں لٹکا ہوا۔ جو ہُڈ اب تک نظر آتا ہے۔ باخبر لوگ کہتے ہیں ——————
—————— زمانہ قدیم کی اسی قسم کی تحصیل کی جھولی کی یادگار چلا آتا ہے۔ جب تک تعلیمی مصارف کا یہ حال رہا تعلیم کا ماحصل بھی زیادہ تر علم ہی کے معیار سے ناپا گیا۔ زمانے کے ساتھ ساتھ مصارف بدلے تو وہ معیار بھی بدل گیا۔

ان دنوں مروجہ مغربی تعلیم اسکول کی بھی اتنے مہنگے مول ملتی ہے کہ ہمارے ہاں کے غریب کیا اوسط طبقہ کے لوگ بھی چیخ اُٹھتے ہیں۔ یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ یونیورسٹی میں ایک نوجوان کو بھیجنا دروازے پر ایک ہاتھی باندھ لینے کے برابر ہے۔ تکمیل پھر بھی نہیں ہوتی۔ اُس کے لئے ولایت جانا چاہیئے اور ولایت کا نام لیا اور ہزاروں کا خرچ سامنے آکھڑا ہوا پھر بتایئے ہماری موجودہ تعلیم تجارت نہیں تو اور کیا ہے۔ اور کیوں اس کے ماحصل کو چاندی سونے کے سکّوں سے نہ تولا جائے۔

جن باپوں نے محض علم کے لئے اپنی اولاد کو تعلیم دی یا دیتے رہے اگرچہ مجھے شبہ ہے کہ ایسا ہوتا ہے ۔ وہ بہر حال گھاٹے میں نہیں اس لئے کہ علم کے مقابلے میں روپیہ کوئی چیز نہیں یا نہیں ہونا چاہیئے۔ طالب علم کو علم مل گیا سب کچھ مل گیا۔ اگرچہ اہل علم بھی مدّتوں سے کہتے آئے ہیں سے

مرا تجربہ معلوم گشت آخر حال ÷ کہ قدر مرد بعلم است و قدر علم بمال

ہمیں تجربہ سے جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ ہے۔ کہ آدمی کی قدر و منزلت علم سے ہے اور علم کی مال سے لیکن [illegible] تعلیم علم کے نام سے آج کل ہندوستان میں ہو رہی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ وہ واقعی علم [illegible] ہے لیکن یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ مقصود بالذات اس کا علم نہیں۔ اس کا مقصود بالذات جو کچھ رہا [illegible] خاص حد تک پڑھنا اور پھر اسکو مصنوعات کی طرح بازار میں بیچنا رہا ہے۔ نہ کہ علم کی طرح علم میں لانا اور اُس کے نشے میں اپنی کھال میں

مست رہنا۔ شان و مال نہ ہو نہ سہی۔ اسی لئے یہ تعلیم یا پڑھنا لکھنا ایک صنعت و حرفت کا قائم مقام بن گیا ہے۔ اور صنعت و حرفت کا حال معلوم۔ بازار کی ضرورت اور ضرورت کی مقدار اس کی قیمت مقرر کرتی ہے۔ جس قدر فراواں ہوگی۔ اسی قدر ارزاں یا رائیگاں ہوتی چلی جائے گی۔ یہی حال ہمارے ہاں اس تعلیم کا ہوا۔ اور ہوگا۔

یہی جدید تعلیم تھی اور اس وقت سے بھی ناقص تھی جب تک ملک میں اُس کی ضرورت اور مانگ رہی۔ اور زیادہ رہی اس صنعت اور تجارت سے بھی لوگ مالا مال بلکہ نہال ہوتے رہتے۔ کوڑیاں اُٹھائیں اور اشرفیاں رولیں۔ پھر پیسے کے روپے بننے لگے۔ بازار کا یہ حال بھی سالہا سال رہا۔ اب تعلیم کی کثرت ہوگئی ہے۔ اور پیداوار بازار میں ضرورت سے زیادہ آنے لگی ہے۔ اس لئے عام جنس کی قیمت اتنی گر گئی ہے کہ اکثر لاگت بھی نہیں پٹتی......... کبھی سودا نے کہا تھا ؎

بے زری کا نہ کر گلہ غافل :: رکھ تسلی کہ یوں مقدر تھا

اکثر سُنا ہے کہ پہلے لوگ اب سے زیادہ قانع تھے۔ مقدر پر بھی زیادہ ایمان و اعتقاد رکھتے تھے اس زمانے میں بھی اس نصیحت پر عمل کرنے والے کم ہی نکلے ہونگے۔ اب تو نہ قناعت باقی ہے نہ مقدر کا ایمان۔ فیشن اور ترغیبات کی بہتات نے بلند خیالی یا حرص و ہوا کو پہلے سے بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ تعلیم پانے والے اور تعلیم دلوانے والے کیسے تسلی رکھیں اور کیسے کہیں ؎

نوکری کا نہ کر گلہ غافل :: رکھ تسلی کہ یوں مقدر تھا

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں۔ کہ بہت سے باپ اپنی تجارت سے پشیمان ہیں۔ اور بہت سے بیٹے اپنے ہنر کی کساد بازاری سے نالاں اور تعلیم یافتہ طبقہ کو کام نہ ملنے کا سوال مزدوروں کی بیکاری کے مسئلہ سے بھی زیادہ اہم ہو چلا ہے حالانکہ ابھی ان کی اس قدر کساد بازاری نہیں ہے۔ جتنی ان کے شور پُکار سے معلوم ہوتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز نئی نئی بازار میں آتی ہے۔ اور اُس کی ضرورت بھی زیادہ ہوتی ہے تو اچھی بُری سب بازار میں کھپ جاتی ہے۔ مگر جب ضرورت سے زیادہ بازار میں پہونچ جاتی ہے تو باوجود ضرورت کے بھی طرفہ و تحفہ جنس ہی کی نکاسی ہو سکتی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ بھی آجکل اسی دور سے گزر رہا ہے۔ اب بھی جو جنس بازار میں واقعی اچھی آتی ہے بک جاتی ہے۔ اس سے گھٹیا بھی اونے پونے لاگ لپیٹ سے کہیں نہ کہیں لگ جاتی ہے۔ اور ممکن ہے کہ ابھی کچھ دنوں ایسی جنس کم و بیش کھپ جایا کرے۔ لیکن یہ خیال کہ آئندہ ساری پیداوار کھپ جائے گی اور قیمت بھی خاصی باقی رہے گی غلط اور سراسر غلط۔ اس لئے اب باپوں کو بہت سوچ کر اعلیٰ تعلیم کی تجارت کے میدان میں قدم رکھنا چاہیئے اور صرف بہتر سے بہتر جنس بازار میں لانی چاہیئے اور وہ بھی صرف اتنی کہ اِدھر آئے اُدھر نکل جائے کہ مقابلہ روز بروز سخت ہوتا جاتا ہے۔

یہ ہیں ہمارے مشا[illegible] اور ہماری رائے۔ اسی پر ہم نے عمل کیا اگرچہ بادلِ ناشاد۔

عبدالرحمٰن ؔ

"دلِ غیور کا داغ"

شکستِ دل کی صدا آہِ سرد و نالہ نہیں
وفورِ غم کی دوا صحبتِ پیالہ نہیں
دلِ غیور ہے باغِ حیات کا لالہ
یہ داغ فروغِ جمالِ لالہ نہیں

جو آنسوؤں کی ہو دلدادہ آنکھ، آنکھ نہیں
جو لڑنے پہ آمادہ آنکھ، آنکھ نہیں
رہی جو دیکھ کے ماحول جس کے زیرِ نظر
وہی ہے آنکھ جو بند ہو دلِ سادہ آنکھ، آنکھ نہیں

چراغِ بزمِ جہاں ہے دلِ غیور کا داغ
مئے عمل سے بھری جس میں ہو وہ ایاغ
یہ داغِ جرأتِ بے باک کا ہے مہرِ منیر
اسی کے نور سے پُرنور ہے سوادِ دماغ

دلِ غیور کا داغ اک چراغِ روشن ہے
کلیم کا یدِ بیضا ہے طورِ ایمن ہے
یہی وہ داغ ہے جو وادیِ عمل میں ہے
عقابِ ہمتِ مردانہ کا نشیمن ہے

امین حزیںؔ

شانِ تغزّل

ترا جلوہ شام و سحر دیکھتے ہیں ‖ سلیقے سے شمس و قمر دیکھتے ہیں
پہنچنا ہے دل تک نظر دیکھتے ہیں ‖ کدھر دیکھنا تھا کدھر دیکھتے ہیں
محبّت کا اُن پر اثر دیکھتے ہیں ‖ ملا کر نظر سے نظر دیکھتے ہیں
تجھے دیکھنے والے یوں تو بہت ہیں ‖ مگر ہم برنگِ دگر دیکھتے ہیں
یہ ہم اور تمہاری یہ بے التفاتی ‖ نہیں دیکھ سکتے مگر دیکھتے ہیں
جو ہیں نکتہ چیں وہ کریں نکتہ چینی ‖ جو اہلِ ہنر ہیں ہنر دیکھتے ہیں
زمانہ نہیں نازِ معشوقیت کا ‖ کہ اب خورد بیں سے کمر دیکھتے ہیں
ابھی تک تو جی ہم نے کھویا نہیں ہے ‖ ابھی ضبطِ غم کا اثر دیکھتے ہیں

انہیں میری فرحتؔ خبر ہو تو کیونکر
جو اخبار پڑھ کر خبر دیکھتے ہیں

یہ جنوں اور یہ شبابِ خلوص ‖ انتہائی ہے اضطرابِ خلوص
رازِ اُلفت ہے خود حجابِ خلوص ‖ ہائے کیونکر اُٹھے نقابِ خلوص
اُنکی آنکھوں میں ہے شبابِ خلوص ‖ ہر نظر ہے اک آفتابِ خلوص
جان ہے وقفِ اضطرابِ خلوص ‖ میری ہستی ہے ایک بابِ خلوص
کتنے احباب دے چُکے دھوکا ‖ پھر بھی میں دیکھتا ہوں خوابِ خلوص
اب جو جی چاہے وہ سزا دیں آپ ‖ ہے مرا جرم ارتکابِ خلوص
دلِ مجبور کے لئے آخر ‖ ذرّہ ذرّہ ہے آفتابِ خلوص
میرے احباب سے بچا مجھ کو ‖ آہ! اے دورِ انقلابِ خلوص
اور سب زندگی میں ممکن ہے ‖ غیر ممکن ہے اجتنابِ خلوص

یہ زمانہ نہیں ہے تیرے لئے
فرحتِ خانماں خرابِ خلوص

فرحتؔ کانپوری

سیرگاہ

دُنیا ایک سیرگاہ ہی

یہ تو ہم نے بھی کسی حکیم سے سُن رکھا ہی لیکن آپ دیکھینگے کہ یہ سیرگاہیں جہاں عوام الناس بھی اُمرا کی طرح جب چاہیں تشریف شریف لے جا سکتے ہیں اکثر ایسے متلون مزاج لوگوں سے آباد نظر آتی ہیں جو یا تو اپنے نفس کی بداعمالیوں سے پس خوردہِ نہ توبہ! فریب خوردہ محبت ہونگے۔ یا وہ بھلے آدمی ہونگے جنہیں دُنیا جہان میں گھوما گھامی کے سوا اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ یا کچھ اپنی عظمت گذشتہ کے پنشن یافتہ عہدہ دار ہونگے۔ یا وہ شریف لوگ ہونگے جنکے متعلق آج سے کوئی نصف صدی بیشتر ایک حکیم فرما گئے تھے کہ ع

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہی نظر بازوں کی!

اور حقیقت میں ہے بھی کچھ ایسا ہی۔ وہ لوگ جو عیش وعشرت کی داد دے چکے ہوں اور دُنیا کے مزے لُوٹ لُوٹ کر بالکل ہی ناکارہ (حضرت ناکارہ نہیں) ہو چکے ہوں۔ یا وہ تجربہ کار بُزرگ جو حضرتِ عشق کے رموزِ کم وکیف خوب سمجھتے ہوں، یا اللہ میاں کے وہ فرشتہ سیرت بندے جن کی کسی زمانے میں شرافت اور انکسار دیکھ دیکھکر ع

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی

بار بار زبان پر آیا کرتا تھا۔ یا وہ اللہ کے پیارے جو بیوی کی کرامت سے گھر میں قدم رکھتے ہی "یا وحشت" پکار اُٹھیں، یا وہ برخوردار اور نورِ چشم جو ماسٹر جی کی مار کے خوف سے مدرسے سے غائب رہیں، اِنہی سیرگاہوں میں آپ کو سگرٹ پیتے۔ تاش کھیلتے۔ جمائیاں لیتے یا مُنہ کھول کھول کر ہوا پھانکتے نظر آئیں گے۔

رہے ہمارے ادیب اور شاعر لوگ! اِن قسمت کے ماروں کو تو جناب بُوم کی طرح صرف ویرانہ ہی پسند ہوتا ہی جس طرح آج کل ہمارے پیروں کی خانقاہوں سے دن دہاڑے ہُو حق کا شور اُٹھنے لگتا ہی اسی طرح ان لوگوں کے من کا کنول بھی اُجڑے درباروں میں ہی کھلتا ہے۔ جہاں اہل قلم حضرات فکرِ سُخن کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔ اور اگر آپ عقل کے تال صاف کرکے دیکھیں تو یہ نکتہ فوراً ریزش کی طرح آپ کے دماغ میں اُتر آئے گا کہ وہ ادبا جادو بیاں جنہیں شومئی قسمت سے دوسروں کے لئے ایک رومان خیز دُنیا آباد کرنی ہوتی ہے اور شعرا شیریں بیاں جنہیں ہماری اور آپ کی خوش قسمتی سے ایک دُنیا کے لئے رنگ برنگ کے موچھوں والے اور "بن موچھے" معشوق پیدا کرنے ہوں اگر ویرانے آباد نہ کریں تو ان اختراعات اور ایجادات کی داغ بیل کیسے پڑے۔

اکثر لوگوں کو یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ یہ ادیب اور شاعر لوگ عموماً ایسی صحبتوں سے گریز کرتے ہیں جہاں سرمایہ دار بھونرے بھنبھناتے نظر آتے ہوں۔ تو عرض یہ ہے کہ اِس میں حیران ہونے کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ کیونکہ ان بزرگوں کی نگاہ میں یہ آپ کے اہلِ ثروت تو کسی قطار شمار میں ہی نہیں آتے۔ آپ جانیئے! جب اسی کنبے میں سے ایک بزرگ کسی ہندو کے خال پر سمرقند اور بخارا تک بخشدینے پر آمادہ ہوگئے تھے تو کب کسی اور کو خاطر میں لائیں گے۔

یہی حال ہمارے ادیبوں کا ہی۔ دُور کیوں جایئے! یہ تو کل

ہی کی بات ہے کہ دہلی سے جناب شوکت کچھ بڑی ہی شان و شوکت سے ایک تقریر براڈ کاسٹ کر رہے تھے۔ اور ہم بھی کہیں پاس ہی لاہور بیٹھے سُن رہے تھے۔ آپ جوشِ جنوں نہ تو بہ! جوشِ عبودیت سے انسان سے گھوڑا بنے بیٹھے تھے۔ یعنی "اگر ہم گھوڑا ہوتے!" تو سوال یہ ہے کہ جب ایک پڑھا لکھا آدمی اسپِ تازی بننے کے خواب دیکھ رہا ہو خواہ اسپِ بے دُم ہی سہی تو اسے آپ ایسے آدمیوں کی صحبت کب گوارا ہوگی۔ لیکن شوکت صاحب نے گھوڑا بن جانے کے بعد جہاں اپنے "اسپیانہ" کمالات کا ذکرِ خیر کیا تھا کیا اچھا ہوتا جو یہ بھی فرما دیتے کہ اگر ہم گھوڑا ہوتے تو جہاں کہیں ہندی ہندوستانی مادیان کا اجتماع ہوتا مارے دولتیوں کے کُنبے کے کُنبے کا دماغ درست کر دیتے۔ بہرکیف ایک دیرینہ نیازمند ہونے کے باعث ہم خدا سے بشرطیکہ خدا نے توفیق دی تو کسی روز نماز پڑھے بغیر ہی یہ دُعا کرینگے کہ اللہ میاں عرب کے مشہور مشہور گھوڑوں کے صدقے میں ہمارے ایک بھائی کی تمنا جلدی پوری کر دے۔ اور جو ہو سکے تو "ویلر" بنا دے۔

چشم دوستاں روشن دل دوستاں شاد!

ہاں! معاف فرمائیے! بات تو کچھ ہو رہی تھی سیرگاہوں کی اور ذکر لے بیٹھے ہم پڑھے لکھے گھوڑوں کا۔ لیکن سیرگاہوں میں بھی تو اکثر گھوڑے دوڑے گھس ہی آیا کرتے ہیں اسلیئے معذرت کی تو چنداں ضرورت نہ تھی۔ خیر! رسیدہ بود بلائے وے بخیر گذشت!! تو جناب متذکرہ صدر مخلوقات کے علاوہ آپ کو ان سیرگاہوں میں مختلف قوم کی ترقی پسند چھوٹی بڑی عورتیں (یہ تذکرات کے وزن پر ہے) بھی نظر آئینگی۔ ان میں بیاہی ہوئی بھی ہونگی اور بیاہی جانے والی بھی ہونگی۔ کچھ کھسیانی بلی کھمبہ نوچنے "کے ٹائپ کی بھی ہونگی۔ اور کچھ شوخ بالی عمر والیاں بھی ہونگی۔ شکر کیجیئے کہ کہیں بال کٹی نظر نہ آئینگی۔ کیونکہ اگر ان ترقی پسند بیبیوں نے بال کاٹنے بھی شروع کر دئے تو آپ جانیئے ملک کی ناک بھی کٹ جائے تو کچھ تعجب نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ملک کی ناک ہے بھی کہیں۔ ملک کی ناک پر پہلے تو اسی روز سیفٹی ریزر چل گیا تھا جس روز ہندو مسلمان کا بکھیڑا پیدا ہوا تھا اور پھر آج ہندی اُردو کے جھگڑے نے تو رہی سہی بھی کاٹ کر رکھدی ہے۔ لیکن بے حیا کی بلا دُور۔ غم کرے ہماری پیزار! کیونکہ بقول آتش ع۔

بے حیائی سے مگر ناک نہیں کٹتی ہے!

تو آج ۱۹۳۸ء میں ملک کی ترقی کا راز صرف سیر سپاٹے ہی میں نظر آ رہا ہے۔ حالانکہ ملک میں آزادی کی جنگ کا طبل بج رہا ہے، گو ہے پھٹا ہوا ہی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کس قسم کی آزادی چاہتے ہیں۔ جس ملک کی عورتیں آزاد ہوں اور ہو رہی ہوں وہ کبھی "نیم آزاد" نہیں کہلا سکتا۔ اور جناب! یہ اسی سیر سپاٹے اور سیرگاہوں کی کرامت ہے کہ دیویاں دیوں سے بھی دو قدم آگے آزادی کی راہ پر گامزن نظر آتی ہیں۔ ہاں! یہ اور بات ہے کہ ؎

وہ چیز نام ہو جسکا جہاں میں آزادی
سُنی ضرور ہے دیکھی نہیں کہیں میں نے

اور چونکہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ! عموماً بوڑھے بوڑھے ان پڑھے بزرگ فرمایا کرتے ہیں اسلیئے آپ بھی چھوڑئیے اس بحث کو اور چلیئے ذرا نمائش[1] ہی دیکھ آئیں۔ کیونکہ آزادی کے رُوح پرور

---

[1] شاہد صاحب اور نمائش۔ ارے معاذ اللہ!!

چار فارسی مقولے اُردو میں

فارسی اور ہندی کے اختلاط سے جس طرح اُردو مستقلاً ایک زبان بن گئی ہے۔ اکثر فارسی ہندی ترکیبیں۔ محاورے، مقولے جوں کے توں اس میں بولے جاتے ہیں۔ ہر چیز کی شانِ نزول ہوتی ہے۔ محاورے اور مقولے بھی کسی نہ کسی واقعہ پر مبنی وموضوع ہوتے ہیں۔ ہندی کہاوتوں کی کہانیاں تو اکثر سُنائی جاچکی ہیں۔ اب میں وہ چار فارسی مقولے سُناتا ہوں اور وہ داستان بھی جس موقع پر کہ یہ وضع ہوئے ہیں۔ اور اب تک اُردو میں بیساختہ بولے جاتے ہیں۔ جو لوگ فارسی پڑھے ہوئے نہیں ہیں اُن کی زبان پر بھی اکثر یہ مقولے چڑھے ہوئے ہیں۔ جن مقولوں کے متعلق میں کہہ رہا ہوں، یہ اصل میں مصرع ہیں اور اس قدر مقبول ہیں کہ بطور ضرب المثل کے بیساختہ بولے جاتے ہیں۔ حضرت مولانا روم نے اپنی مثنوی کے پہلے دفتر کی پہلی حکایت جو منظوم کی ہے، اُس میں سے میں نے یہ چار مصرعے منتخب کئے ہیں جو ہر خاص وعام کے زبان زد ہیں۔ حکایت میں جس موقع پر وہ مصرع رکھا گیا ہے میں اُسی جگہ مختصر سی تفسیر کے ساتھ اُس کا شانِ نزول بیان کرونگا۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ ایک بادشاہ اپنے شہر سے باہر شام کے وقت تفریح کے لئے گیا۔ بیرون شہر ایک بڑا قافلہ ڈیرہ ڈالے ہوئے پڑا تھا۔ بہت سے لونڈی غلام بھی فروخت کے لئے تھے۔ اُن میں ایک نہایت حسین وطرحدار لونڈی پر بادشاہ کی نظر پڑی۔ چشمِ افتادن ہماں دل دادن ہماں، پہلی نگاہ میں ہی اُس کی محبت میں مُبتلا ہوگیا۔ اور مُنہ مانگے مول اُس کو لے لیا۔ محل میں لاکر سر آنکھوں پر بٹھایا۔ ہر قسم کے عیش وراحت کے سامان مہیّا کردیئے۔ سارا ملک ومال ہی نہیں بلکہ اپنی جسم وجان بھی اُس کی تحویل میں دیدیا۔ اور اُس حُسن کی دیوی کی پرستش کرنے لگا۔ مگر لونڈی کے لئے عیش بھی اندوہ فزا ہوگیا۔ روز بروز گھلتی ہی چلی جاتی تھی، ہڈی سے چمڑا لگ گیا۔ صاحبِ فراش ہوگئی۔ ملک بھر کے اچھے اچھے حاذق طبیب وحکیم معالجہ کے لئے جمع کئے گئے۔ مشورہ سے علاج ہوا کیا۔ لیکن ہر تدبیر اُلٹی پڑتی تھی۔ اور اطبا عاجز آچکے تھے۔ کوئی تدبیر تجویز صحیح نہیں اُترتی تھی۔ اِس موقعہ پر کہا ہے کہ مصرع چوں قضا آید طبیب ابلہ شود۔ جب موت آتی ہے تو حکیموں کی عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ اور ہر چیز کی تاثیر برعکس ہوجاتی ہے۔ جیساکہ اسی کے ساتھ مولانا نے فرمایا کہ مصرع روغن بادام خشکی می نمود۔ حالانکہ روغن بادام کا کام ہے خشکی دفع کرنا۔ مگر مرض الموت میں سرکہ سے صفرا اور بادام روغن سے خشکی بڑھ جاتی ہے۔ معالجوں کی بیچارگی وبے بسی سے بادشاہ کو بے حد فکر وتشویش ہوئی اور بے اختیار دوڑتا ہوا مسجد میں گیا اور نہایت الحاح وزاری سے دست بدعا ہوا۔ فرطِ الم سے روتے روتے وہیں آنکھ لگ گئی۔ خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا۔ وہ کہنے لگے کہ کل صبح سب سے پہلا آدمی جو شہر میں داخل ہوگا وہ ہی اس لونڈی کا علاج کردیگا۔ بادشاہ سحر کے وقت شہر پناہ کے دروازہ پر جا کھڑا ہوا اور سب سے پہلے جو شخص شہر میں داخل ہوا اُسکو نہایت عزت واحترام سے محل میں لے آیا۔ اُس شخص نے لونڈی کی نبض پر ہاتھ رکھکر دیر تک شہروں کے نام لئے۔ اور کیفیت نبض سے محسوس کرتا رہا، بالآخر سمرقند کے نام سے چہرہ اور نبض میں تغیر ہوا۔ اُس شخص نے ایسی دلجوئی اور دانائی کی کہ تفصیل سے سب حال

معلوم کرلیا۔ اور یہ انکشاف ہوا کہ سمرقند کے ایک جوان وجمیل تاجر سے لونڈی کو عشق ہے۔ مولانا عشق کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ عقل اس کی شرح سے عاجز ہے۔ محبّت آپ ہی اپنی تفسیر ہے۔ مصرع آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ بدیہات کے لئے استدلال کی ضرورت نہیں۔ بداہت کا احساس وادراک خود بخود ہوجاتا ہے۔ شدت غمِ ہجراں نے لونڈی کو قریبِ قبر کردیا تھا اور صحت یابی کے لئے کوئی چارہ باقی نہیں تھا سوائے اس کے کہ مطلوب کو پاس لایا جائے۔ اُس مردِ زیرک نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ اُس تاجر کو جس طرح ہوسکے بُلوایا جائے۔ بادشاہ نے بصرف زرِ کثیر قاصد بھیجکر اُسے بُلوالیا۔ اور لونڈی کے پاس پہونچا دیا۔ لونڈی اُس کو دیکھتے ہی اچھی خاصی ہوگئی۔ تاجر لونڈی کے پاس رہنے لگا۔ حُسن کی تجلیاں اور شباب کی مستیاں تھیں ؎

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی ؛ جوانی کا عالم ہی سرشاریاں ہیں

مردِ مصلحت بیں نے اُس جوان وجمیل تاجر کو غذا میں ایسی ادویات کھلائیں کہ رفتہ رفتہ اس کی توانائی و خوبروئی سب رُخصت ہوئی۔ اور وہ کریہہ منظر ہوکر رہ گیا۔ اب جو وہ لونڈی کے پاس جاتا ہے تو لونڈی اُسے مُنہ نہیں لگاتی ؎

خُدا کی شان ہے اللہ اکبر اے تری قدرت ؛ ہمارے نام سے اب ہاتھ وہ کانوں پہ دھرتے ہیں

نتیجہ یہ نکلا کہ لونڈی کو تاجر سے نفرت ہوگئی اور اُس نے قطعاً اُس سے ترک تعلق کرلیا۔ جمال جسمانی اور حُسن ظاہری کے لئے مولانا فرماتے ہیں کہ دُنیا کی ہر شے زوال پذیر ہے۔ ہر لمحہ تغیر و انقلاب ہوتا رہتا ہے، کوئی چیز اپنی حالت پر قائم نہیں رہتی۔ جمال وجوانی عارضی بہار ہوتی ہے۔ جس محبّت کی بنیاد بہارِ مستعار پر ہو وہ دیر تک کیونکر باقی رہ سکتی ہے ؟ عشق تو حسن مطلق اور جمال کامل کے ساتھ ہی شایاں ہے۔ وہ ہی اصل حسن ہے اُسی کا وجود باقی رہنے والا ہے، اُسی کے ساتھ محبّت بھی قائم رہتی ہے۔ اندیشہ غلط ہے کہ حُسنِ مطلق تک رسائی کہاں ؟ مصرع بر کریماں کارہا دشوار نیست۔ اہلِ کرم کے لئے کوئی کام مشکل نہیں ہے۔

ولی محمد خاں

کیا آپ اُداس رہتے ہیں

شعلۂ سوزاں

پروین کے ناسمجھ دل میں عمر کے ساتھ ساتھ یہ آرزو بھی جوان ہو رہی تھی کہ وہ اور مسعود جلد از جلد رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوجائیں۔

وہ اس کا ماموں زاد بھائی تھا، نوجوان اور ہنس مکھ۔ وہ غریب گھرانے کی لڑکی تھی، شوخ اور حسین۔ وہ دونوں بچپن کے ساتھی تھے اور انہوں نے نہر کے کنارے ریت کے چھوٹے چھوٹے گھروندے بنا کر اکثر میاں بیوی کا سوانگ بھرا تھا۔ پروین محبت کے معصوم گہوارے میں پل رہی تھی، ایک ایسے گہوارے میں جس کی طرف عورت فطرتاً مائل ہوتی ہے، اور مسعود کی محبت ایک ایسے خمیر سے تیار ہو رہی تھی جو جوانی کے نشے میں مخمور اکثر مردوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ آغازِ شباب سے پہلے چاندنی راتوں میں اُن دونوں کی ملاقاتیں اس طرح پُراسرار ہوتی تھیں گویا دو پاکباز روحیں کسی فردوسی درخت کے سایہ تلے سرگوشی میں مصروف ہیں اور یہ معصوم سرگوشیاں آہستہ آہستہ ہمیشہ کے لئے لامتناہی محبت میں تبدیل ہوجائیں گی ———— مگر جوں جوں وقت گذر رہا تھا اُن دونوں کے راستے علیحدہ اور دُور ہوتے جا رہے تھے۔

تعلیم و تربیت نے پروین کو بے باک اور خودسر نہیں کیا، پڑھ لکھ کر بھی وہ دبی دبائی الھڑ اور وفا شعار رہی، لیکن کالج کی ہوا نے مسعود کے خیالات میں پُرمعصیت تبدیلی پیدا کردی۔ اور یوں بھی وہ دولتمند والدین کا بیٹا تھا، بھلا امارت اس کا دماغ بھی خراب نہ کرتی تو اور کیا کرتی؟ جب تک اُن کے والدین کی ایک سی حالت رہی وہ دونوں ایک دوسرے سے منسوب رہے مگر جب مسعود کے باپ نے مفلسی کے کھنڈر مسمار کر کے امارت کے کاخِ بلند کھڑے کئے، ان کی نسبت چھوٹ گئی۔ پھر دوستوں کی صحبت نے بچپن کی فریب دریا سے پاک باتیں بھلا دیں اور پروین کی بھولی بھالی صورت مسعود کے دل سے ایک مدھم نقش کی طرح مٹ گئی۔

کچھ اس لئے کہ اُن لوگوں میں جوان بیٹی کا نا کتخدا رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور کچھ اس خیال سے کہ مسعود کی نسبت چھوٹ جانے کا قلق جسقدر جلد ممکن ہو زائل ہوجائے، پروین کی شادی قاسم سے کر دی گئی جو تعلیم یافتہ اور خوبصورت تھا۔ پروین کو اس سے مسرت ہوئی اور نہ رنج، مسرت اسلیئے نہیں کہ وہ ایک دوسرے شخص کے ساتھ تمام عمر رہنا چاہتی تھی اور رنج اسلیئے نہیں کہ خود مسعود وعدہ وفا ٹھکرا کر ایک اونچے گھرانے کی بیٹی بیاہ لایا تھا۔ قاسم سے شادی ہوجانے کے بعد بھی وہ قسمت کی ہیٹی رہی، کیونکہ اُسکے شوہر نے اُسے کبھی اپنی رفیقِ حیات ہی نہ سمجھا، بس وہ آپس میں اس طرح رہتے تھے جیسے کوئی دو مسافر راہ چلتے ایک دوسرے کو پہچان گئے ہوں۔ کبھی کبھی تو قاسم اسکے ساتھ غیروں کا سا سلوک کرتا، لیکن اسپر بھی وہ بیچاری کبھی شاکی نہ ہوئی۔ اور نہ ہوتی بھی کیسے آخر کو تو وہ مسلمان کوک سے پیدا ہوئی تھی۔

اُس شام قاسم خلافِ معمول سویرے سے گھر واپس آگیا۔ اس نے دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ اس کی آنکھوں نے دیکھا ــــــ دیکھا کہ پروین کے پاس ایک نوعمر شخص بیٹھا ہے اور اُس کی آنکھوں میں شباب کی چمک اور بُشرے سے کسی مکروہ عزم کی جھلک ہویدا ہے۔ وہ متحیّر ہوا اور اس کے دل میں طیش کروٹیں لینے لگا۔ یکبارگی اس کی نظر پروین پر پڑی۔ وہ مجسم معصومیت اس طرح سرنگوں تھی کہ بیکسی اور خلوص کا امتزاج اس کے چہرے پر ایک خاموش تلاطم پیدا کر رہا تھا۔ اُس نے سر اُونچا کیا اور بولی ــــــ قاسم پردے کی آڑ میں چھپ گیا۔

"تم مجھے کہاں لے چلوگے؟"

"ہم کسی نامعلوم شہر میں چلے جائیں گے" نوجوان نے کہا "ایک ایسی جگہ جہاں عزیز و اقارب ہمارا کھوج نہ پاسکیں گے اور وہاں ...."

"اُف! ـــــ" وہ بات کاٹ کر اس طرح بولی گویا اُسے کوئی روحانی تکلیف پہونچی ہے۔ "تمہارا مطلب یہ ہے ـــ؟ کہ میں تمہارے ساتھ بھاگ چلوں؟ ...... مسعود! یہ بات تمہاری زبان سے ادا کیسے ہوگئی؟"

"ادا کیسے نہ ہوتی؟" مسعود نے اپنا ہاتھ پروین کے ہاتھ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "سماج نے ہم دونوں کو علیحدہ کردیا حالانکہ ہم بچپن سے آپس میں منسوب تھے۔"

"سماج کو کیوں بُرا کہتے ہو؟" پروین اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولی "جب تم نے دوسری جگہ شادی کرلی تو کیا تمہاری یہ اُمید کہ میرے ماں باپ مجھے بے بیاہی رکھتے؟ ـــــ خیر چھوڑو ان باتوں کو! مجھے افسوس ہے میں تمہاری بات پہلے نہ سمجھ سکی، آہ! تم مجھے میرے شوہر سے چھُڑانا چاہتے ہو؟"

"لیکن تمہیں اپنے شوہر سے محبت تو نہیں ہے" وہ بے باک ہوکر کہنے لگا۔ "اور وہ ـــ وہ وحشی تم سے شوہروں کا سا سلوک کبھی تو نہیں کرتا۔ تم اُسے ـــــ؟"

"مسعود! ـــــ" پروین چیخ کر کہنے لگی گویا کسی نے اس کی سخت توہین کی ہو "تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ اپنے جذبات کو آپے سے باہر نہ ہونے دو۔ میرا شوہر کیسا ہی سہی، یہ ہم دونوں کا معاملہ ہے، کسی اور کو اسپر رائے زنی کی ضرورت نہیں۔"

"کیا وہ رات رات بھر آوارگی کرتا نہیں پھرتا؟ اُس نے کبھی تمہارے پاس بیٹھ کر تمہارے دل کی آواز بھی سُنی؟" مسعود نے تنفر آمیز لہجہ میں کہا۔

"تمہارے سوالات بے معنی ہیں" وہ نیچی نگاہ کئے کہتی رہی "وہ اکثر گھر سے باہر بھی تو نہیں نکلتے۔ اکثر انکی راتیں یہیں بسر ہوتی ہیں۔ رہی میری باتیں، تو دل کی دھڑکن کے لئے گویائی ضروری نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہو کہ ساز نغمہ پیدا کرے اور فضا مرتعش نہ ہو۔ اب نہ سہی، پھر سہی، اُنکا قلب کبھی نہ کبھی متاثر ہوکر رہیگا ـــــ اور پھر میں تو ہر طرح خوش ہوں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں" "کہنے کا کیا ہے، چاہے جو کہہ لو" اُس نے اُس سے بھڑک کر کہا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آہ سرد کھینچی .....

"پروین! .... تم مجھے بچپن سے چاہتی ہو، آخر میرا کہا کیوں نہیں مان لیتیں؟" اُس کے لبوں پر حسرت کھنڈ گئی اور وہ ہونے ہونے کہنے لگی "مسعود! یہ سچ ہے میں تمہیں چاہتی تھی لیکن تم نے اسکی قدر نہیں کی۔ اپنے عہد و پیمان کا تمہیں پاس نہ رہا۔

جوانی اور دولت نے تمہیں محبت کے صحیح معنے جاننے دیئے۔ تمہیں کیا معلوم، تمہاری شادی سے میرے دل پر کیا کچھ گذری۔ جب میں نے تمہیں خوش و خرم دیکھا تو مجھے اپنی ہستی ایک خزاں زدہ پودے کی مانند معلوم ہوئی جسے کسی مالی نے بیکار سمجھ کر اکھاڑ پھینکا ہو۔ میں انسان تھی، میرا بھی دل تھا، بھلا بتاؤ تو، کیا اس ضرب سے وہ پاش پاش نہ ہو جاتا؟ میرے حواس ٹھکانے نہ رہ سکے۔ مجھے ہر طرف ویرانی اور اُداسی نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے جسم میں کوئی دوسری بے قرار روح مقید کر دی گئی ہے۔ تم آج وہ باتیں سُننے آئے ہو جو مجھے چار سال پہلے سُنانی تھیں، مگر تم اپنی دُلہن کی دلچسپیوں میں مصروف تھے، تمہیں میرے دل کی آواز سُننے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ سچ جانو میرے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ تم مجھ سے شادی نہ کرو گے، تم ہی بتاؤ اگر یہ بات تمہارے ساتھ ہوتی تو کیا تم یہ صدمہ برداشت کر لیتے؟ لیکن میں نے کیا! ——— خدا نے، جو رحیم ہے، میرے لئے قاسم کو بھیج دیا۔ وہ میری زندگی کے رفیق ہیں اور میں ان کے ساتھ اب اپنے آپکو ہر طرح مامون سمجھتی ہوں۔ تمہارا خیال ہے ان کا سلوک میرے ساتھ اچھا نہیں۔ ممکن ہے تمہاری نظروں میں ایسا ہی ہو، لیکن میرے لئے ان کا یہی سلوک مناسب ہے۔ اُن کی بے رُخی مجھے اور بھی اُن کی طرف کھینچنے پر مجبور کرتی ہے۔ اب تو میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ شادی ہونے کے کچھ دن بعد تک مجھے جو تمہارا خیال رہا وہ ان کی بیوی ہو جانے پر نہیں رہنا چاہئے تھا۔ لیکن چونکہ میں دل سے مجبور تھی اس لئے اس کا کفارہ اس طرح ادا کر رہی ہوں .... رہے تم، تو مسعود میں اب تمہاری صرف عزت کرتی ہوں ——— مجھے تعجب ہے تمہارے ضمیر نے تمہیں کیونکر اس قدر کمزور اور اخلاق سے گری ہوئی بات کہنے کی اجازت دیدی؟"

"پروین تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں ———" مسعود تیز ہو کر بولا "تم بہت مغرور ہو گئی ہو لیکن یاد رکھنا کہ تم میرے بس میں ہو۔"

"کیا مطلب؟" پروین نے حیرت سے کہا۔

مسعود طنز یہ ہنسا "یہی کہ رات کی تنہائی میں تم مجھ سے اس قدر قریب ہو! تم اگر میرے ساتھ نہیں چلتیں تو میں یہیں بیٹھا ہوں، جب قاسم آئے گا تو میں اُس سے کہدوں گا کہ تم مجھ پر مرتی ہو۔ معلوم ہے پھر کیا ہوگا؟ ظلم و ستم میں اضافہ! شاید اُس وقت تم کو میری مدد کی ضرورت ہو۔"

"میں تم سے مدد کبھی نہیں مانگوں گی مسعود!" پروین اطمینان سے کہنے لگی "تم چاہو تو یہ بھی کر دیکھو۔ میں اسے ترجیح دیتی ہوں۔ وہ میرے شوہر ہیں۔ آخر کب تک بدظن رہیں گے۔ اور یوں بھی دُکھ کی تو میں عادی سی ہو گئی ہوں۔"

پروین، مسعود کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر پیچھے ہٹی "تم اب چلے جاؤ مسعود! رات سرد ہے اور تمہارا راستہ دُور۔"

"نہیں۔ اب دُور نہیں رہا" مسعود نے معنی خیز لہجہ میں کہا اور چاہا کہ اُسے اپنی آغوش میں لے لے کہ سامنے کے پردے کو جُنبش ہوئی اور قاسم دفعتاً آگے بڑھ آیا۔

"نہ رو پروین" قاسم نے اُسے پہلی بار محبت کے اُمڈتے ہوئے طوفان میں سینے سے چمٹا کر کہا "دیکھو ــــ وہ سامنے شیطان مسعود جا رہا ہے۔ اب وہ کبھی آ کر تمہیں تنگ نہ کر سکے گا"

"قاسم!" وہ بمشکل کہہ سکی "میری زندگی اُس شمع کی مانند ہر وقت اپنی لاچاری پر آنسو بہاتی ہے جس کی لَو آندھی کے جھونکوں میں لہرا رہی ہو۔ ہوش سنبھالتے کے ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا کہ میرے دل میں ایک چنگاری روشن ہے لیکن شادی کے بعد میں نے اس چنگاری کو بجھا ہی دینا چاہا۔ لیکن اس کے بعد جس چیز نے میری زندگی اجیرن بنا دی وہ تمہاری محبت سے محرومی تھی۔ میرا خیال تھا کہ تم مجھے حیاتِ نو بخشدو گے مگر مجھے تو جہنم بھر دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹنا تھا........"

"پروین! میری بات تو سُنو!" قاسم نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "تم مجھے معاف کر دو۔ تمہاری پاکیزگی نے میری آنکھوں کے پردے ہٹا دیے ہیں۔ میرے ظلمِ ناروا نے تمہارے دل میں جو شعلہ سوزاں پیدا کر دیا تھا آج اُسی نے میرے غیر شریفانہ جذبات کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے"

قاسم نے اُس کے قدموں پر اپنا سر رکھدیا، لیکن پروین نے اُس کے رخساروں کو ہاتھوں میں لیکر اس کا سر اُوپر اُٹھایا ــــ دونوں کی نظریں ملیں اور اُس لمحہ کتابِ زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

صادق الخیری!

مسٹر کڑھلے کے چار باب

سنگھاڑے کا تال

یور رائل ہائنس یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جبکہ میں طالب علم تھا........ ایک گاؤں کا ذکر ہے....

سامنے ایک مختصر تالاب تھا۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی جس کے پاس ہی ایک ٹوٹی سی چٹائی پر ایک شخص کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔

ایک طرف ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ کوئی پندرہ یا سولہ برس کی عمر ہوگی۔ یہ لڑکی رنگین مگر حد درجہ میلے اور موٹے کپڑے پہنے تھی۔ ہاتھوں اور پیروں میں موٹے موٹے گلٹ کے کڑے تھے۔ زمین سے ایک تنکا اُٹھا کر اُسکو لاپرواہی سے توڑنے کا شغل کر رہی تھی۔ اور اس نوخیز لڑکی نے ہماری طرف دیکھا۔

میں نے لڑکی سے کہا۔ "سنگھاڑے"

اور یہ کہکر میں اُس کے خوبصورت اور تندرست چہرے کو دیکھنے لگا۔ پھر سامنے سنگھاڑے کی بیل کی طرف دیکھا جو سارے تالاب پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ پانی سے باہر زمین پر چاروں طرف پھیلی ہوئی خشک پڑی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ تالاب غیر معمولی طور پر خشک ہو گیا ہے۔ اور کم بخت تالاب تھا ہی کتنا بڑا۔ بمشکل سو گز لانبا اور پچاس کے لگ بھگ چوڑائی۔

میرے سوال کے جواب میں لڑکی نے انتہائی بھولے پن اور سادگی سے تنکا ہاتھ میں لئے نمازی کی طرف اُنگلی اٹھا کر اپنی دیہاتی زبان میں کہا۔ "تو اِج پڑھ لیں......!!" اور اس تنکے کو اپنے شاداب لبوں کے درمیان لیجا کر دانتوں سے دبا لیا۔

میں نے معاً نمازی کی طرف دیکھا اور پھر اس لڑکی کی طرف۔ غروب ہونے والے سُورج کی شعاعیں اُس کے چہرے پر کس طرح کھیل رہی تھیں! یور رائل ہائنس میں نوعمر تھا اور میرے رگ و ریشہ میں شوخی تھی۔ اور یہ لڑکی بھی نوعمر تھی۔ جس وقت کوئی نماز پڑھتا ہو تو اُس کے سامنے سے گُذرنا ممنوع ہے اور میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو چند لمحات اس لڑکی کے ساتھ دلچسپی سے گُذریں گے۔ لہذا سب سے پہلا کام میں نے یہی کیا کہ نمازی کے سامنے سے گُذرا۔ میرے ساتھی غریب رُک گئے اسلیئے کہ وہ نہ صرف اس بات کو جانتے تھے بلکہ ہندو تھے۔

میرا مقصد حل ہو گیا۔ لڑکی نے ایک دم سے غُل مچانا شروع کیا تاکہ میں رُک جاؤں۔ لیکن میں تو گُذر ہی چکا تھا۔ لہذا اُس کے غُل مچانے کا حیلہ جو ملا تو قصداً مصنوعی طور پر گھبرا کر دوبارہ نمازی کے سامنے سے گُذر کر واپس آ گیا۔

میرا مقصد حل ہو گیا۔ نمازی صاحب کا غصّہ چہرے سے عیاں تھا اور لڑکی کا زبان سے۔ اور اب میں اس لڑکی سے لاعلمی کا عذر پیش کر کے اُلجھ رہا تھا کہ نمازی نے اپنی نماز ختم کی اور یہ حضرت بھی مجھ سے لڑنے لگے۔

میں نے تسلیم کیا کہ مسلمان تو ہوں لیکن اس قانون سے ناواقف ہوں کہ نمازی کے سامنے سے نہ گذرنا چاہیئے۔ بلکہ سرے سے اس قانون کو تسلیم ہی کرنے سے منکر ہوگیا۔ اور قائل کرنے کو میں نے کہا کہ اگر تم کو یقین نہ ہو تو لاؤ ہم پڑھتے ہیں نماز اور تم ہمارے سامنے سے گذر جاؤ۔ اور اس اونڈہی بحث کو چھوڑ کر میں نے اب سنگھاڑوں کی بحث شروع کردی۔

معلوم ہوا کہ سنگھاڑے ڈیڑھ آنہ سیر ملیں گے۔ جی چاہے لو جی چاہے نہ لو۔ کوڑی کم نہ ملیں گے۔

ذرا غور فرمایئے کہ شہر میں سنگھاڑوں کا بھاؤ حد چھ پیسے اور یہ بے ایمان یہاں تالاب پر کہتا ہے ڈیڑھ آنے۔ پھر کسی طرح کم نہیں کرتا۔ ویسے نمازی بھی ہے اور چوروں کا شوہر بنا پھرتا ہے۔ بہت کچھ بحث کی جان سُلگائی پر نہ مانا۔ چلکر میں نے کہا۔ "بندۂ خدا۔ ابھی دیر کتنی ہوئی جو تو نمازیں پڑھ رہا تھا کہ لگا اب ساری عبادت کو ملیامیٹ کرنے مجھ سے نہ سہی خدا سے تو ڈر۔"

اس کے جواب میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ سنگھاڑے کی فروختگی اور نرخ کا کسی طرح بھی نماز سے تعلق نہیں ہے اور وہاں اللہ میاں کے یہاں قطعی پرسش نہ ہوگی کہ شہر کے نرخ سے تالاب کا نرخ کیوں بڑھ گیا۔ خواہ سنگھاڑے یہاں ماشہ اور تولہ کے نرخ سے فروخت ہوں۔ میری کچھ نہ چل سکی اور میں نے اُس مُشٹنڈے۔ قوی بازو والے نمازی کو بغور دیکھا۔ کتنا قوی اور تنومند تھا کہ اس سے چھین جھپٹ بھی کرتے ڈر لگے۔ میں نے کہا۔ "بھلے مانس پارسال بھی تو آخر ایک نیک آدمی تھا۔"

دراصل پارسال والا نیک آدمی ایک کہار تھا۔ ہم لوگ آتے تو سنگھاڑے جبر یہ توڑ توڑ کر کھا جاتے۔ جب وہ مارنے دوڑتا تو تالاب کے دو چکر دیتے اور وہ ہار کر بیٹھ جاتا اور جلکر اور بے بس ہوکر طعن میں کہتا "کھا لو خوب" اور ہم خوب ہی تو کھاتے۔ دوسرے کنارے پر بیٹھ کر ساری بیل گھسیٹ کر باہر ڈالدیتے اور وہ بیتاب ہوکر چیختا پیٹتا اور پھر گالیاں دیتا دوڑتا۔ اس آفت سے بچنے کے لئے بیچارہ ہمیشہ مناسب نرخ پر دیتا۔

لیکن یہ نمازی دوسری قسم کا تھا۔ بہت کچھ اس سے بحث کی ساری طالب علمی خرچ کر ڈالی مگر گدّی صاحب نہ مانے۔ جی ہاں یہ قوم کا گدّی تھا۔ کھڑا اپنی گھنی ڈاڑھی پر تاؤ دیتا رہا۔

اب میں نے سوچا کہ اس طرح شکست کون کھائے۔ لہذا میں نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا اور انگریزی میں اُن سے کہا۔ یہ کشمیری برہمن تھے اور مجھ سے بہت محتاط اور سمجھدار لہذا انہوں نے کہا کہ "یا تو جس بھاؤ دے لے لو ورنہ سیدھے واپس چلے چلو۔ یہ آدمی کام کا نہیں ہے۔"

لیکن میں نے اپنے دوست کی صلاح نہ مانی۔ ہم دونوں سیدھے اپنی راہ چلکر تالاب کے پار دوسری طرف پہونچے۔ اور میرے دوست نے بہتیرا منع کیا پر میں نہ مانا۔ جھٹ سے کنارے پر سنگھاڑے کی بیل گھسیٹ کر نکالی اور سنگھاڑے توڑنے بھی نہ پائے تھے کہ لپکا یہ موذی۔ مگر توبہ کیجئے کہیں ہم ہاتھ آسکتے تھے۔

جنگ شروع ہوئی اور سوچے کہ لاؤ اسے بھی تھکا ماریں اور تال کے گرد چکر دے کر اسے چرخ کردیں۔ چنانچہ اچھی رفتار سے اسے تال کے تین چکر دئے مگر بے سود! وہ ہمارے پیچھے بدستور دوڑ رہا تھا! کس رفتار سے؟ ایسے کہ چوتھے چکر کے بعد ہی

یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ خود ہمیں نہ تھکا مارے۔ مجھے اپنے دم خم پر تو پورا بھروسہ تھا لیکن اپنے ساتھی کا خیال تھا کہ کہیں ہار نہ جائیں۔

بہت جلد معلوم ہوگیا کہ میدان میں بھاگ کر نکل جانا ناممکن ہے اور اب شکست کے امکان پر غور کیا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ "اگر ہم پکڑے گئے تو ...."

اور یہ قرار پایا کہ اگر وہ پکڑے گئے تو گدّی کے کاٹ کھائیں گے اور میں ؟ میں نہ معلوم کیا کرونگا اور کس طرح امداد دونگا۔ بہرصورت اس کا تو یقین تھا کہ ہم دو سے ہرگز وہ ایک نہیں جیت سکے گا۔ اوّل تو ہاتھ ہی نہ آئیں گے۔

اور اس دوڑ دھوپ کا تماشا وہ نوجوان لڑکی چُپ چاپ کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اور واقعی خوب تماشا ہوگا۔ میں بار بار گدّی کو چھیڑتا تھا۔ آواز دیتا تھا کہ بھیّا زور سے دوڑو ورنہ ہم جاتے ہیں۔ دراصل اس میں برق رفتاری تو نہ تھی لیکن دوڑنے کی قوت ضرور بے اندازہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک ہاتھ میں اپنی دھوتی کا لنگر اُٹھائے تھا۔ اتنی عقل کہاں کہ ذرا رُک کر دھوتی کس لے اور پھر آزاد ہوکر دوڑے۔

ایک عجیب کُشتی

یور رائل ہائنس خود بہترین "اسپورٹ مین" ہیں دُنیا جانتی ہے۔ لیکن مجھے تحقیق نہیں کہ علاوہ "باکسنگ" کے حضور والا کو کُشتی۔ بالخصوص ہندوستانی کُشتی دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے۔ ہمارے اسکول میں ہیڈ ماسٹر صاحب ایک چوبے جی مہاراج تھے جنکو لڈو اور بھانگ کھانے کے ساتھ کُشتی کا بھی شوق تھا۔ بہت سے لڑکوں نے کُشتی لڑنا سیکھی تھی۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے کُشتی لڑتے تھے۔ میں نے بھی کُشتی سیکھی تھی اور اس کے بعد ایک پولیس کانسٹبل سے کئی داؤں "جوجٹسو" کے بھی سیکھے تھے۔ نتیجہ یہ کہ اپنے ہم وزن سے نہیں بلکہ ڈیوڑھے سے مقابلہ کرسکتا تھا۔ لیکن صحیح عرض کرتا ہوں کہ اس دوڑ جھپٹ میں جس عجیب و غریب کُشتی سے سابقہ پڑا وہ چوبوں اور پنجابیوں کی کُشتی سے بہت مختلف ثابت ہوئی۔

ہم دو چکّروں سے لڑکی کے بالکل ہی قریب سے گذر رہے تھے کہ پانچواں چکّر شروع ہوا۔ اور جیسے ہی موقعہ پر آئے ہیں گدّی نے چیخ کر لڑکی سے کہا کہ ہمیں پکڑے۔ یہاں خیال و گمان تک نہ تھا اور وہ غالباً اس کی منتظر ہی تھی۔ قبل اس کے کہ ہم سُنیں یا سمجھیں آپ یقین فرمائیں کہ وہ بھوکی شیرنی کی طرح جھپٹ پڑی! وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ایک دوشیزہ اس طرح پل پڑے گی۔ اور نہ یہ اندازہ تھا کہ اس میں اتنی طاقت ہوگی۔

قصّہ مختصر وہ بجلی کی طرح جھپٹ کر راستہ کاٹ کر سامنے سے ٹکرائی اور میں بچکر نکلنے کو ہوا کہ وہ بلا کی طرح چمٹ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے مجھے اُس نے جکڑ لیا۔ اور ایک عجیب و غریب کُشتی کا آغاز ہوا۔

میں اِس کُشتی کے لئے قطعی تیار نہ تھا۔ مسلسل دوڑنے سے دم پھُولا ہوا اور اس حالت میں یہ کشمکش شروع ہوئی۔

میں نے پوری قوت کے ساتھ اُس کو ریلا دیکر ایک جھٹکا دیا لیکن وہ نوجان پر کھیلے ہوئے تھی۔ میں گرتے گرتے بچا۔ اور اس کشمکش میں اُس نے نوچ کھسوٹ اور مار پیٹ کو بھی شامل کرلیا۔ اُس کے گلٹ کے کڑوں کی میری پیشانی اور مُنہ

چوٹیں لگیں۔ میں چھوٹ کر دوبارہ گرفت میں آ گیا۔ گرفت کیا یوں سمجھئے کہ ایک بلا ہے جو چمٹ گئی اور وہ موذی گھر پا ہے کہ چڑھا چلا آتا ہے بخار کی طرح!

اب زور جو لگاتا ہوں تو ایک بیل کا بوجھ! بھلا کیونکر کھینچوں! ہاتھوں میں اُس کے بلا کی قوت۔ چھڑا کر نکل جانے کی مزید کوشش کے بے معنی ہوئے کہ مُنہ کے بل گروں۔ "جو جٹسو" اور کُشتی کا ہنر سب بیکار ثابت ہوا۔ کئی پینچ کئے۔ دشمن کو زیر کرنے کے پینچ اور ہیں اور جان چھڑانے کے پینچ اور ہیں۔ قریب تھا کہ ہار جاؤں کہ تین سو چھپنویں داؤں کا خیال آیا۔ لمحہ بھر کی جو دیر ہو تو پکڑا گیا تھا۔ یہ داؤں اُستادوں نے تو پوشیدہ رکھا ہے مگر یہاں بتائے دیتا ہوں کہ پبلک کے کام آئے۔

کوئی نوجوان اور خوبصورت لڑکی اِس طرح پکڑ کر سینے سے چمٹی ہو اور چھڑائے نہ چھوٹے۔ مُنہ نوچ رہی ہو اور کڑٹے مُنہ پر مارے۔ آفت میں جان پھنسی ہو تب کیا کرنا چاہیئے؟

دماغ اور طبیعت دونوں حاضر۔ کوئی مفر کی دوسری صورت ہی نہ تھی کیا کرتا۔ ایک ہاتھ تو اُس کی پُشت کی طرف تھا ہی۔ اُس سے اُس کی گردن پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے پکڑی اُس کی ٹھوڑی۔ اور فتح و شکست کے خیال سے بے نیاز ہو کر جو اُس کا مُنہ چومنا شروع کیا ہے تو ....

گھبرا کر اُس نے مجھے چھوڑ نہیں دیا بلکہ بڑی مُشکل سے اپنے کو چھڑایا۔ گدّی سر پر پہونچا تھا۔ یہ سین دیکھ کر غیظ و غضب میں دیو کی طرح گرجتا ہوا اور میں لڑکی کو چھوڑ کر بھاگا۔ لیکن حماقت تو دیکھیئے میرے ساتھی پنڈت کی۔ وہ سمجھے کہ ہے موقعہ لہذا تالاب چھوڑ کر دوسری طرف کا رُخ کیا کہ نکل جاؤں سیدھا۔ یہ نہ سوچا کہ گدّی میدان میں قطعی لبلیگا۔ گدّی نے جو یہ دیکھا تو وہ مجھے چھوڑ کر اب چلا گرجتا ہوا پنڈت کی طرف۔ میں رُکا اور چشم زدن میں نتیجہ کا خیال کر کے پریشان ہو گیا۔ جس طرح ترجیا پلی کو حملہ سے بچانے کے لئے لارڈ کلایو نے ارکٹ پر حملہ کیا تھا اُسی طرح میں پھر لڑکی پر جھپٹا۔ لڑکی نے ایک لکڑی اُٹھائی۔ مگر توبہ کیجئے کہیں لکڑی سے بھی لوگ رُکا کرتے ہو نگے۔ ایک لکڑی تو اُس نے میری پیشانی پر ایسی دی کہ میں لہولہان ہو گیا، مگر دوسری مارنے کی نوبت نہ آئی۔ لڑکی کو اپنی عجیب و غریب کمزوری کا احساس تھا۔ یہ تین سو چھپنواں داؤں ہی ایسا تھا۔ میں نے لکڑی پکڑ لی اور لپٹ پڑا۔ اُس نے مجھے مارا۔ چیخی چلائی، نوچا مگر میں نے اُسکو بدحواس کر دیا۔ اور یہ کشمکش فوراً ہی ختم ہو گئی اسلئے کہ گدّی صاحب اس چپقلش کو دیکھتے ہی لوٹ پڑے اور اب چلے آ رہے ہیں بھنّائے ہوئے۔ غیظ و غضب کا یہ عالم کہ گویا بھڑکتا ہوا ایک بے پناہ شعلہ!

میں لڑکی کو چھوڑ کر بھاگا اور پھر گدّی کو اُسی چرخی پر دھر لیا۔ لیکن لڑکی سے ذرا ہٹ کر۔ لیکن لڑکی نے اب اور شرارت کی۔ لکڑی لے کر اُس نے ایسے راستہ کاٹا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ سر پھاڑ دیگی۔ اب مجھے مجبوراً تالاب کے کنارے سے اس طرح دُور رہنا پڑا کہ اب دوبارہ جو کنارہ پکڑتا ہوں تو پکڑا جاؤں۔ میں نے اِس خطرے کا احساس کر لیا تھا۔ مگر کیا کرتا۔ گدّی آ گیا اور مجھے بھی کھیت اور میدان لینا پڑا۔ میں ہاکی میں ہاف بیک کھیلنے والا تین چار گھنٹے دوڑ

سکتا تھا اور مجھے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ یہ گدی مجھے پکڑ سکے گا۔ لیکن اس بات کا ضرور احساس ہوا کہ دو تین گھنٹے دوڑ سکنے اور ہانپ نہ آنے میں فرق ہے۔ میرا مقابل بلا کا آدمی تھا۔ تھکنے کا نام نہ جانتا تھا۔ مگر میں نے اپنی قوت پر بھروسہ کرکے میدان لیا۔ گدی نے میرے پیچھے بڑے زور و شور کے ساتھ اپنے ایک دوڑنے کے کارنامے کا حوالہ دیکر مجھے گالیاں دے کر مطلع کیا کہ مجھے قطعی پکڑ لیں گے وہ کارنامہ بھی آپکا سُن لیجئے۔ کوئی مرکھنی بھینس تھی جو اپنے گاؤں بھاگ جاتی تھی۔ اُسے یہ خرید کر لاتے۔ وہ بھاگی تو اُسکی دُم پکڑ لی۔ بھینس جو بھاگی تو نہ دیکھی اُس نے کھائی نہ خندق اور نہ نال نہ تالاب۔ پر اُنہوں نے اُس کی دُم نہ چھوڑنا تھی نہ چھوڑی۔ نتیجہ یہ کہ چار کوس پر جا کر اُسکو قابو میں لے آئے۔

یہ کہانی سُنکر میں نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ "ابے تو نے بھینسیں پکڑی ہونگی۔ مجھے پکڑلے تب جانوں"۔

ہم دونوں کی رفتار ہلکی تھی۔ بھاگتے ہی میں گدی نے اپنی دُھوتی کا لنگر جس طرح بن پڑا کس لیا۔ اور ہم دونوں اسی رفتار سے چلے جا رہے تھے۔

لانگ جمپ

جس طرح مجھکو کُشتی اور "جوجتسو" میں واقفیت حاصل ہے اُسی طرح "لانگ جمپ" کا بھی مجھکو شوق تھا۔ خاص مہارت تو نہیں تھی لیکن سترہ فِٹ تک کو دلیتا تھا۔ لیکن مجھکو یہ نہیں معلوم تھا کہ آج اس دوڑ کا خاتمہ ایک عجیب و غریب لانگ جمپ پر ہونے والا ہے۔

یہ تو مجھے قطعی یقین تھا کہ یہ گدی قیامت تک دوڑے پر مجھے نہیں پکڑ سکے گا اور میں رفتار میں سرعت پیدا کرکے نکل جانے کے امکان پر غور ہی کر رہا تھا کہ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ دراصل آگے بڑھکر جھیل کا ایک بازو دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ ایسے کہ سامنے پانی ہی پانی تھا۔ گویا اب مجھے واپس لوٹنا پڑے گا۔

بہت جلد اس شُبہ کی تصدیق ہو گئی۔ دور و نزدیک کسی طرف سامنے راہ نہ تھی۔ اپنی رفتار کو بدستور قائم رکھتے ہوئے مجھے رُکنا پڑا۔ اس لئے کہ میرے سامنے ایک چوڑا سا نالہ تھا جو ایک طرف تو چوڑا ہوتا دور تک چلا گیا تھا اور دلدل اور کیچڑ کے وسیع میدان میں ختم ہو گیا تھا۔ اور دوسری طرف کوئی تیس قدم جا کر تپلا ہوتا ہوا ایک نوک پر ختم ہو گیا تھا۔ اس نالے کے پار تھوڑی سی خُشک زمین اور پھر کیچڑ اور پانی کا ایک وسیع میدان۔

میں جلدی سے اس نالے کو پھاندنے کے بجائے تیس قدم کا چکر دے کر اُس طرف پہونچا اور میرے پیچھے پیچھے گدی۔ یہ سمجھکر کہ اب کہاں جا سکتا ہوں۔ گھیر لیا ہے۔ آیا جو ہے وہ لپک کر قریب تو میں ایک جست میں نالہ پھاند کر پھر اُس طرف آ گیا۔ یہاں کم و بیش دس گیارہ فِٹ چوڑائی ہو گی۔ گدی جھپٹا ہوا آیا لیکن پانی کے پاس پہنچکر رُک گیا۔

میرے لئے یہ ناممکن تھا کہ بھاگ جاؤں۔ اسلئے کہ گدی گھوم کر سر پر پہونچتا۔ دم لینا بھی چاہتا تھا۔ لہذا میں رُک گیا۔ مگر گدی فوراً ہی واپس دوڑا اور جب قریب آیا میں پھر جست کرکے نالے کے اُس پار پہونچا اور گدی پھر کسمسا کر رہ گیا۔

گدّی نے غور سے نالے کو دیکھا۔ میں سمجھ گیا اور میں نے کہا کہ بچّہ جو اس میں گھس کر اس پار آئے تو کنارہ اونچا ہے تمہیں اندر دھکیل دوں گا۔ وہ جواب میں بولا کہ میں نہیں گرونگا۔ میں نے کہا بہتر ہے کوشش فرمائیں۔ اور ساتھ ہی ایک بڑا بھاری مٹی کا ڈھیلا سنبھالا کہ یہ علاوہ سر پہ مارونگا۔ اس کے بعد میں نے ان کو نالہ پھاندنے کی دعوت دی۔ کیونکہ میں خوب جانتا تھا کہ یہ ان کے لئے ناممکن ہے۔ گدّی نے بعد غور وخوض یہی طے کیا کہ مجھے تھکا مارے اور دانت پیس کر گالیاں دیتا دوڑا۔

قصّہ کو اس طرح مختصر کرتا ہوں کہ مجھے اُس نے تیرہ دفعہ پھاندنے پر مجبور کیا اور آخیر میں تو وہ اتنا تیزی سے جھپٹ کر آتا تھا کہ میں دم نہ لینے پاؤں۔ جلد جلد پھاندنے سے میرے پیروں میں بھی لغزش سی محسوس ہوئی اور میرا خیال ہے کہ زائد سے زائد میں دس بارہ مرتبہ اور کود سکتا، اور یہ واقعہ ہے کہ اس موقعہ پر اگر گدّی کے علاوہ کوئی دوسرا ہوتا تو میں ہار گیا تھا۔ گدّی نے دھوتی کا لنگر بھاگتے میں درست کیا تھا جو پھر ڈھیلا ہو گیا تھا اور دھوتی کی تہمد ہو گئی تھی اور اُس کے واسطے پھر ایک ہاتھ رزرو تھا۔

میں نے اس کی دوڑ جھپٹ کا خوب تو مذاق اُڑایا تھا اور بار بار پھاندنے کی دعوت دیتا تھا۔ اب میں نے اپنے کو ہرن کہا اور اسکو کہا کہ تم بھینس ہو۔ وہ بھی ایسے تمسخر آمیز لہجہ میں کہ اس کی رہی سہی عقل بھی رُخصت ہوئی۔ پھر ایک گدّی کے لئے مجھے گرفتار کرنے کی دوسری صورت ہی نہ تھی۔ اگر پھاند گئے تو مجھے پکڑ لینے میں کیا کلام ہے۔ لہذا دوسری طرف پہنچا جو میں پھاندا ہوں تو یہ میرے پیچھے ہی پیچھے تھے۔ مجھے شُبہ بھی نہ تھا کہ یہ حضرت پھاندیں گے۔ ایک زبردست ہونکا بھر کے بس پھاند ہی تو گئے۔ عقل تو ملاحظہ ہو کہ ایک ہاتھ سے دُھوتی کا لنگر سنبھالے۔ یہ تک نہیں معلوم کہ پھاندنے میں دونوں ہاتھ آزاد ہونا لازمی ہیں۔

ہونکارے کی زبردست آواز کے ساتھ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ پھاندے جو بھی تو کس زور وشور سے کہ میں تو سمجھا کر آلیا۔ مگر توبہ کیجئے۔ دھوتی کا لنگر جو ہاتھ سے چھوٹا تو وہ تہمد ہو گئی۔ ٹانگوں کی کُشادگی میں مانع کیا بلکہ مزاحم۔ نتیجہ ظاہر بیچوں بیچ نالے میں ایک عظیم الشان "پھچاکے" کے ساتھ دراز نظر آئے۔ اور میں جو بھاگا ہوں وہاں سے دھم کے تو ہو کی طرح نہ معلوم کتنی دُور پہنچکر جو مُڑکر دیکھا ہے تو آپ رینگ کر شاید اوپر پہونچے تھے۔ پکڑے جانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

تین چار میل کا فاصلہ طے کرکے گھر پہونچا۔ سیدھا پنڈت کے یہاں پہونچا۔ میری طرف سے سخت حیران و مُتفکر تھا۔ پولیس میں رپورٹ کرنے جاتا تھا کہ میں پہونچ گیا۔ سارا حال سُنایا۔

جب میں نے دن کی کارروائی کا جائزہ لیا تو نتیجہ دلچسپ ہی رہا۔ آج کی جھپٹ خوب رہی۔ لیکن اُس لڑکی کی دست درازیاں تو دیکھیے۔ میری بائیں آنکھ کے نیچے اس کے ناخن کا ایسا کھرونچا لگا تھا کہ معلوم ہوتا تھا قوسے کسی نے زخم پہونچایا ہے۔ پیشانی لہولہان ہو چکی تھی۔

یور رائل ہائنس یقین فرمائیں کہ اس دلچسپ کشمکش کی کامیابی اور اسکی خوشی ایسی چیز نہ تھی جو جلد محو ہو جاتے۔ یہ اندازہ لگاتا رہا کہ یہ طاقتور گدّی لڑکی کا کون تھا۔ لڑکی کا باپ تو قطعی نہ تھا۔ شوہر بھی نہیں تھا۔ لہذا یہ

اندازہ لگایا کہ چچا یا ماموں ہوگا ورنہ وہ سب سے چھوٹی بہن اور وہ سب سے بڑا بھائی۔

ہاٹ

ہندوستانی قصبوں کے ہاٹ قدیمی معاشرت کا نمونہ ہیں۔ ہفتہ وار بازار کا لگنا اُن دیہات کے لئے غنیمت ہے جہاں ہر شے مہیا نہیں ہوتی لیکن پُرانے دستور کے مطابق کم و بیش بڑے قصبوں اور شہروں میں بھی ہاٹ کا دستور عام ابتک جاری ہے۔ جہاں ہفتے کے دن شہر اور دیہات کے تاجر اور خریدار جمع ہوکر لین دین کرتے ہیں۔

اس واقعہ کے دو ڈیڑھ ماہ بعد کا ذکر ہے کہ ہم چھ سات لڑکے ایک فٹ بال میچ میں کامیاب ہوکر گھر آ رہے تھے۔ خیال آیا کہ سامنے ہاٹ ہے اس میں ہوتے چلیں۔

ہاٹ کیا تھا بس یوں سمجھ لیجئے کہ ارزاں قسم کے دکاندار زمین پر دیہاتیوں کے مطلب کی چیزیں لگائے بیٹھے تھے۔ اور سارے ہاٹ میں گنوار ہی گنوار تھے۔

اس ہاٹ میں تھوڑی ہی دُور چلکر گدّیوں (گدّیوں کی عورتوں) کا ایک گروہ کا گروہ ملا جو اپنے حسابوں فیشن ایبل چیزوں کی خریداری کر رہی تھیں۔

یور رائل ہائنس یقین فرمائیں کہ انہی عورتوں میں وہ لڑکی بھی تھی! دیکھتے ہی میں وہیں کا وہیں رُک گیا۔ جلدی جلدی میں نے ساتھیوں کو بتایا کہ یہی وہ لڑکی ہے۔ بہت جلد معلوم ہوگیا کہ اُس کا نام بھوری ہے۔ شاید اُسکے گورے رنگ اور سُنہرے بالوں کے سبب اُسکا نام بھوری رکھا گیا ہو۔

ساتھیوں نے غور سے لڑکی کو دیکھکر آگے بڑھنے کو کہا۔ لیکن میں نے کہا کہ ٹھہرو۔ اور اتنا کہہ کر میں بھی خریدار بن کر اُسی دکان پر جُھک پڑا۔ لڑکی کے قریب آکر اور بظاہر دکاندار کی طرف متوجہ ہوکر میں نے قصداً اس کے پیر پر اپنا پیر رکھ دیا۔ وہ ننگے پیر تھی اور میرا جوتا ربڑ کا تھا۔ اُس نے اپنا پیر بچایا اور مجھے دیکھا۔ مگر میں نے اُس کی طرف قطعاً توجہ نہ کی بلکہ ذرا بڑھکر دکاندار سے ایک چیز کا مول تول کرنے لگا۔

بھوری نے دوسری عورتوں سے کچھ کہا اور اُنہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ لیکن میں نے کچھ توجہ نہ کی بلکہ ذرا جگہ سے ہٹ کر پھر دوبارہ بھوری کا پیر دبا دیا۔ اور دباتے ہی اُس نے بڑے زور سے میرے سینے پر ایک دھمو کا دیا معہ ایک عدد گالی کے۔ اور میں نے ؟ گھوم کے ایک برجستہ اُس کے گال پر چانٹا رسید کیا چٹاخ سے۔ ایسا کہ اُس کا گال سُرخ ہوگیا۔ اور مزید براں بطور گوشمالی بڑے زور سے اُسکا کلا پکڑ کر ہلا دیا۔

بس نہ پُوچھیئے کہ کیا قیامت آئی۔ ہم ہیٹ پہنے تھے غنیمت ہوا۔ ہمارے سروں پر کڑے دار ہاتھوں کی کھٹاکھٹ ہونے لگی۔ سب کی سب چمٹ پڑیں اور ایک ہنگامہ ہوگیا۔

شام کا وقت تھا۔ بھیڑ بھی خوب تھی۔ بھاگتے ہیں تماشائی حائل، اور پھر دو ایک ہیٹ سروں سے گر پڑے وہ رہے جاتے ہیں۔ بھاگنا دوبھر ہوگیا کہ اس چپقلش میں وہی موذی گدّی بھی آ پہونچا معہ دو چار اور

چہ فٹوں کے۔ مگر دکانوں اور خوانچوں کو پھاند پھوند کر ہم سب صفا نکل گئے۔ سارے ہاٹ میں ہلڑ ہو گیا۔ گدیوں کی چیخ پکار، ہر شخص کو معلوم ہو گیا کہ اسکول کے لڑکوں نے کسی لڑکی کو چھیڑا۔ مگر ہم لوگ نکل چکے تھے اور مڑ کر نہ دیکھا۔

اِس واقعہ میں یورر رائل ہائنس کو سوائے ایک ناشائستہ حرکت کے کچھ نہ نظر آیا ہوگا۔ لیکن واضح رہے کہ غیر اہم واقعات بھی مل جل کر کسی اہم واقعہ کو ترتیب دیتے ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی

اُنکی آمد

وہ آج آئیں گے میرے غریب خانے پر

بجائے شمع جلاؤنگا آنسوؤں کے چراغ
شراب ناب کے بدلے جگر کے خونکے ایاغ
روش روش پہ بکھیرونگا خونِ زخمِ دروں
بجائے فرش بچھاؤنگا سجدہ ہائے جنوں
دلوں کا رقص اور آہونکی درد زا تانیں
برائے شغل شکار اہلِ عشق کی جانیں
سُلگتے نالوں سے دیوار و در سجاؤنگا
مچلتی ٹیسوں کے بربط پہ گنگناؤں گا
بجائے پھولونکے زخمونکے ہار گوندھونگا
بطورِ نذر ستم کش جوانیاں دونگا
جگر کے لوتھڑے حاضر کرونگا کھانے کو
برستی آنکھ کی طغیانیاں پلانے کو
گلوں کے بدلے نچھاور کرونگا آہونکو
شبِ فراق کی بپھری ہوئی کراہوں کو
کہ اس سے بڑھ کے نہیں کچھ بھی میرے پاس ندیم!

الطاف مشہدی

اُردو کے عناصر خمسہ

"سرسید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں۔ لیکن آقائے اُردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں۔"

(مہدی الافادی)

کہا جاتا ہے کہ عالمِ فطرت پر کمالِ صنعت کو ترجیح دینے کا اب رواج نہیں ہے۔ لیکن مجھے نہ محض خیال بلکہ یقین ہے کہ جب تک انسان اپنے ذوقِ حسن اور مادۂ تخلیق کے ساتھ زندہ ہے زندگی کے ہر شعبہ میں آرٹ کو یونہی ترقی ہوتی رہیگی۔ ہم لاکھ چیخیں، ہزار شور مچائیں کہ ہمیں فطرت کے مقابلہ میں آرٹ یا صنعت کی ضرورت نہیں لیکن اطمینان رکھیے جبتک وہ فطری مادہ جو انسان کو بندر سے آدم بنا دینے کا باعث ہوا ہے فنا نہیں ہوگا ہمارا یہ شور و شغب محض افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ لغویت سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اگر آپ زندگی کی تاریخ اور فلسفۂ حیات کا بغور مطالعہ کریں، انسانی نفسیات کو بنظرِ تعمق دیکھیں تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ اس نتیجے پر پہونچنے کیلئے مجبور ہوں گے کہ آرٹ خود عین فطرت ہے۔ شاید آپ کو تعجب ہو گا کہ یہ دو متضاد چیزیں کس طرح ایک ہو سکتی ہیں؟ تعجب سے کام نہیں چلے گا، ذرا غور فرمائیے۔ تاریخ حیات کے مُطالعہ سے معلوم ہو جائے گا کہ ذوقِ حسن اور مادۂ تخلیق انسانی فطرت ہے۔ انسانی دماغ مجبور ہے کہ وہ بغیر آرٹ کے چین نہیں پا سکتا۔ ذوقِ حسن اُس مادۂ تخلیق کو اُبھارتا اور تحریک دیتا ہے اور اس کا فطری نتیجہ ہے تخلیقِ صنعت۔ لہٰذا آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ آرٹ جو انسان کی فطرت اور ذوقِ حسن کی تحریک کا فطری نتیجہ ہے خلافِ فطرت ہے؟

انسان جب تک انسان ہے اور انسان رہے گا اُسے آرٹ سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ آرٹ اور زندگی کے درمیان جو ناقابلِ تنسیخ تعلق قدرت نے قائم کر کے انسان اور حیوان میں فرق پیدا کیا ہے وہ کسی طرح منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ عالم فطرت قدرت کا تخلیق کردہ ہے اور آرٹ انسان کی قوتِ تخلیق کا نتیجہ۔ خُدا بننے کی کوشش کرنے والے انسان کو اُس تخلیق سے جو وہ کر سکتا ہے کون روک سکتا ہے؟ ایک صدی پہلے تخلیقِ صنعت کا خاص محرک اگر صرف ذوقِ حُسن تھا تو اب اس میں بہت کچھ خدا بننے کی آرزو بھی شامل ہو گئی ہے۔ اور اسی نسبت سے صنعت و حکمت کی ترقی بھی روز افزوں ہے اور رہے گی۔ یہی مادۂ تخلیق ہے جس کی بنا پر آجکل کا انسان خُدا سے بھی فخریہ کہہ سکتا ہے کہ:-

تو شب آفریدی چراغ آفریدم ٭ سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی ٭ خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اب اگر آپ درحقیقت صنعت سے بے نیاز ہو کر صرف فطرت پر قانع رہ سکتے ہیں تو محض کہہ دینے سے تو کوئی آپ کے دعوے کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ ہاں عملی طریقہ سے ثابت کیجئے۔ "چراغ" کو گل کر کے اندھیری راتوں میں ٹھوکریں کھائیے۔ "خیابان و گلزار و باغ" کو چھوڑ کر "بیابان و کہسار و راغ" کو زینت بخشئے۔ مجنوں بنجائیے اور صحرا کی خاک چھانتے پھرئیے۔ اور اگر آپ یہ نہیں کر سکتے تو عالمِ فطرت پر کمال صنعت کو ترجیح نہ دینے کا دعویٰ کیا؟ نیچر کے مقابلے میں آرٹ کی یہ لفظی تحقیر کیا معنی؟ اگر آپ اپنے دماغ کی تخلیقی قوتوں کو فنا کر کے پھر وہی ابتدائے آفرینش والا صحرائی اور نباتاتی جانور بننا چاہتے ہیں تو بسم اللہ، آپ کو اس "نیک کام" سے کون روک سکتا ہے؟ اور نہ روکنے کی ضرورت ہے۔ اگر سالانہ لاکھوں جانور انسان بن رہے ہیں تو دو چار انسانوں کے پھر جانور بنجانے سے، یقین رکھئے دُنیا کو کوئی نقصان نہیں پہونچے گا۔ شوق سے ہمالیہ کے تیرہ و تار غاروں میں روپوش ہو جائیے، وہاں عالم فطرت ہی فطرت ہے! اگر کچھ اور نہیں ہوگا تو کم از کم آپ کے زہریلے خیالات سے آرٹ غریب تو محفوظ ہو ہی جائیگا۔

اور اگر آپ اپنے دعوے پر خود عمل نہیں فرما سکتے تو پھر کہہ دیجئے کہ یہ دعویٰ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے، اسے حقیقت سے کوئی سروکار نہیں۔ کیوں اب آپ خاموش سے کیسے ہیں؟ کیا واقعی آپ کو اب

اپنا دعویٰ نہایت لغو معلوم ہو رہا ہے؟ اور کیا آرٹ کی اہمیت کا آپ کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا؟

اسی آرٹ کی مختلف قسمیں ہیں اور ان تمام قسموں میں سے اِس وقت ہمیں اس کی صرف ایک قسم یا ایک شاخ "ادب" سے بحث ہے۔ ادب آرٹ کی اُس شاخ کا نام ہے جس میں خیالات و احساسات کے ذریعے اظہار کا کام الفاظ سے لیا جاتا ہے اور صرف ترتیب الفاظ اور طرز ادا سے اُس ذوقِ حُسن کی تسکین کی جاتی ہے جو آرٹ کی تخلیق کا اصل محرک ہے۔

اب آئیے اس روشنی میں ہم مہدی آفادی کے مذکورۂ بالا اقتباس کی صداقت یا عدم صداقت کا مطالعہ کریں۔

سب سے اول سر سید کو لیجئے۔ اس وقت جب انہوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا ہے اُن کی ادبی اہمیت اتنی نہ تھی جتنی اب، اُن کا ایک ہی مقصد تھا، مسلمانوں کی اصلاح و ترقی! اُن کی تمام کوششیں اسی ایک مقصد کے حصول کیلئے تھیں۔ اب وہ خواہ "تہذیب الاخلاق" کی صورت میں ظاہر ہوئی ہو یا "سائنٹفک سوسائٹی" کی صورت میں، "خطاباتِ احمدیہ" اور "تفسیر قرآن" کی شکل میں یا مدرسۃ العلوم اور ایجوکیشنل کانفرنس کی شکل میں۔ مقصد سب کا ایک تھا۔ مولانا حالی نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "سر سید اردو ادب سے مخصوص دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے کارناموں کی تہ میں مذہبی اصلاح کا جذبہ کام کر رہا تھا"! اب اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ ان کا پیغام اور اُن کی آواز وسیع ترین حلقہ تک پہونچ سکے۔ اور یہ بات اس عام فہم اور سلیس طرز ادا سے ممکن تھی جو انہوں نے اختیار کیا۔ اس سے اُن کا مقصد تو در حاصل ہو گیا لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کا یہ طرزِ تحریر ادبیت کا بھی حامل ہے۔ اُن کی نثر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں غضب کی روانی اور بے ساختگی ہے۔ مجھے اسمیں شبہ ہے۔ اُن کے بہت سے جُملے کے جملے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے عربی عبارت کا بے محاورہ لفظی ترجمہ ہوں۔ اور الفاظ کی یہ غیر فطری ترکیب و ترتیب روانی و بے ساختگی کے منافی ہے۔ ان کی نثر فنی نقطۂ نظر سے بھی بہت زیادہ اسقام و اغلاط سے پُر نظر آتی ہے لیکن اُنکے مداح اس عیب پر یہ کہکر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ الفاظ و قواعد کے محکوم نہ تھے۔ ممکن ہے بعضوں کے نزدیک یہ امر قابل ستائش ہو لیکن میرے خیال میں ایک نو آموز بچہ بھی الفاظ و قواعد سے آزاد ہوتا ہے گو اس بچے کی زبان اُسکے اپنے خیالات کا عمدگی سے اظہار کر سکتی ہو اسے سُننے سے خاص لطف آتا ہو لیکن اُسے ادیبوں کے زمرہ میں تو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ نے اُصول قواعد سے بے پروا ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا بالکل اس طرح جس طرح ہندوستان میں بہت زیادہ رہنے والا ایک انگریز کر سکتا ہے تو دُنیا آپ کی تعریف کرے لیکن جہاں تک ادبیت کا تعلق ہے میں آپ کو ہدیۂ تحسین پیش کرنے سے معذور ہوں۔ سر سید کو اور ہر لحاظ سے ایک بڑا انسان کہا جا سکتا ہے لیکن ایک بڑا انشا پرداز نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں تک مذہبی اور قومی اصلاح و ترقی کا تعلق ہے اُن کا ہر کارنامہ، اس میں کسی کافر کو ہی شبہ ہوگا کہ تعمیرانہ ہے لیکن زبان و انشا کے لحاظ سے اُن کے وہی کارنامے تخریبانہ ہو جاتے ہیں۔ غلط محاوروں اور ناموزوں ترکیبوں کا استعمال اُن کے یہاں اس قدر پایا جاتا ہے کہ طبیعت کو ناگوار لگتا ہے۔ سینکڑوں اس قسم کی لغزشوں میں سے ایک جو اُن کے ہر جملے میں آسانی سے مل جائے گی یہ ہے کہ وہ "کر کے" کی جگہ "کر کر" استعمال کرتے ہیں اور یہ "کر کر" اتنی ناگوار ہوتی ہے کہ کتاب بند کر کے علیحدہ رکھ دینے کو طبیعت چاہتی ہے۔

ان کے چند مضامین کے سوا میرے نزدیک باقی تمام ادبیت و انشائیت سے خالی ہیں اور اس لحاظ سے اُنہیں بہترین قومی مصلح تو کہا جا سکتا ہے لیکن بہترین انشا پرداز نہیں۔ اور میں حالی کا ہم آہنگ ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اُن کی تحریریں "وہ متعارفہ خوبیاں نہیں ملتیں جو مشرقی لٹریچر میں کلام کی عمدگی کا معیار سمجھی جاتی ہیں"!

اور اگر اُن کی تحریروں کی تہ میں مذہبی اصلاح کا جذبہ کام نہ کرتا ہوتا، اگر سائنس و مذہب کو ملانے کی آرزو انہیں نہ ہوتی تو وہ تحریریں جو آج ہمیں ملتی ہیں شاید منصۂ شہود پر ہی نہ آئی ہوتیں۔ صرف یہی ایک ذریعہ یا سہارا تھا جس نے انہیں مُصنّف بنا دیا۔ اگر یہ سہارا نہ ہوتا تو آج ہم سر سید کو مصنف کی حیثیت سے بالکل نہ دیکھتے اور مہدی آفادی اپنے اس قول میں بالکل حق بجانب ہیں کہ "سر سید سے اگر معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے"۔

سر سید کے بعد حالی کا نمبر آتا ہے۔ کیونکہ بقول مہدی "انکے قلم کو جو ہاتھ میں لے سکتا ہے وہ بوڑھے حالی ہیں"۔ انہوں نے بیشک نثر لکھی اور ایک عمدہ نثار بن کر لکھی۔ اُن کی نثر کی خاص خصوصیت بھی یہی ہے کہ وہ سلیس اور سادہ ہے، متین اور سنجیدہ ہے، لیکن اُن کی یہی سلاست و سادگی اگر ہمیشہ نہیں تو بعض اوقات بقول سعید انصاری اُن کی نثر کو "روکھا پھیکا" بنا دیتی ہے۔ ادبیت کی چاشنی اور انشا کی رنگینی اس میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے

کہ اُن کی نثر ہر قسم کے مضامین کے اظہار پر قادر ہے۔ اور خصوصاً علمی و تنقیدی مضامین کے ادا ہونے کی اس میں بہت زیادہ گنجائش اور آسانی ہے۔ تسلیم۔ لیکن اگر ایک مصنف آسان طرز تحریر اختیار کرتا ہے تو یہ اُس کا کمال نہیں کہلایا جا سکتا۔ جس طرز میں فطرتاً زیادہ گنجائش اور آسانی ہے اس طرز کو اختیار کرکے اپنے خیالات کا اظہار کر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ ہاں مشکل اور کم گنجائش والے طرز میں زیادہ گنجائش پیدا کرنا ضرور کمال ہو سکتا ہے تو اس سے حالی خالی ہیں۔ حالی کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ "انہوں نے نہ صرف زبان کو سنوارا بلکہ اُس کو وسعت بھی دی۔ اس کی نہ صرف اصلاح کی بلکہ نئی زبان ایجاد کی۔" سنوارنے کا مفہوم جب تک سادگی و سلاست سے ہے تو یہ قول دُرست ہے لیکن اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ تشبیہہ و استعارہ کے حُسن اور رنگینی کی چاشنی سے زبان کو محروم کر دیا تو میں اُسے سنوارنا نہیں کہونگا بلکہ بگاڑنا۔ یہ ضرور ہے کہ غیر موزوں تشبیہہ و استعارات اور بیجا رنگینی بھی زبان کو بگاڑنے ہی کے مترادف ہے لیکن اُس کے یہ معنی تو نہیں کہ اُسے ان چیزوں سے اتنا صاف کیا جائے کہ عبارت پر روکھی پھیکی کا ذوق لگ جائے۔ میرا اس روکھی پھیکی سے یہ مطلب نہیں کہ وہ شروع سے آخر تک یکساں ہی ہے، جا بجا رنگینی اور چاشنی بھی پائی جاتی ہے لیکن زیادہ حصّہ بےکیف ہے۔

دوسری چیز اُن کے متعلق زبان کو وسعت دینا اور ایک نئی زبان ایجاد کرنا ہے۔ مجھے اس میں کلام ہے۔ میرے خیال میں یہ اُن پر بیجا اتہام ہے۔ اگر نئی زبان ایجاد کرنا اور زبان کو وسعت دینا اس کا نام ہے کہ اس میں جا و بیجا انگریزی الفاظ بھر دئے جائیں تو میں کہوں گا کہ آج کل کا ایک ہائی اسکول پاس حالی سے زیادہ انگریزی الفاظ بھر کر نئی زبان کا موجد کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ اُنکی تصنیف حیات جاوید جو اُن کے طرز کا بہترین نمونہ کہی جاتی ہے اُس میں یہ بدشیت بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ ہاں جہاں تک ہندی کے نرم شیریں الفاظ کے استعمال کا تعلق ہے حالی نے انہیں استعمال کرکے دوسروں کے لئے ایک عُمدہ نمونہ پیش کر دیا ہے۔ اور صرف اسی کو اگر ہم زبان کو وسعت دینا کہیں تو وہ ضرور تعریف و تحسین کے مستحق ہیں۔ لیکن اُن کے انگریزی الفاظ کے بیجا استعمال کو یہ کہنا کہ اُنکی دوسری خوبیوں کے مقابلے میں یہ معمولی سی فروگذاشت گراں نہیں گذرتی، بالکل غلط ہے۔ ضرور گراں گذرتی ہے اور کافی حد تک گراں گذرتی ہے۔ اور بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ان الفاظ کا استعمال محض اپنی انگریزی دانی کے اظہار کیلئے کیا ہے حالانکہ یہ دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے اُن کا منشا یہ ہرگز نہیں تھا اور نہ ہو سکتا ہے۔

اُن کی خشک اور بےکیف نثر کے متعلق یہ کہکر انہیں اس الزام سے بچایا جاتا ہے کہ علمی و ادبی مضامین کی ہم قدیم الفاظ کی چاشنی سے سر نہیں ہو سکتی۔ اس پر ہم آگے چلکر بحث کریں گے کہ اس قول میں صداقت کہاں تک ہے۔

الغرض جہاں تک نثر کا تعلق ہے سر سید کی طرح حالی بھی بغیر سہارے کے نہیں چل سکتے۔ حیات سعدی۔ یادگار غالب اور حیات جاوید۔ اُن کی بہترین تصانیف ہیں۔ مگر سب کی سب سوانح حیات۔ اور اسی کا سہارا ہے جس سے آج حالی کا نام بحیثیت نثار کے زندہ ہے۔ ایک چیز مقدمہ شعر و شاعری ضرور ایسی ہے جو باوجود مختصر ہونے کے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اپنی جگہ پر انتہائی قدر و عزت کی مستحق ہے۔ اور اگر انہوں نے سوا اس مقدمے کے اور کوئی کتاب بھی لکھی ہوتی تو محض یہی اُن کا نام زندہ رکھنے کیلئے کافی تھی۔ اس لئے مہدی کا یہ قول کہ "حالی صرف سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں" لفظ بلفظ صحیح نہیں ہو سکتا۔ ہاں بہت کچھ صحیح کہا جا سکتا ہے۔

حالی کے بعد نذیر احمد آتے ہیں۔ مصنف ہونے کی حیثیت سے وہ دو ممتاز خصوصیات کے مالک ہیں۔ ناول نگار۔ دوسرے مذہبی مصنف۔ بحیثیت ناول نگار اُن کی حیثیت بہت بلند ہے۔ اگرچہ اُردو میں قصّے اور ناول ان سے پہلے بھی پائے جاتے تھے لیکن ناول نگاری کے موجودہ اُصول پر کوئی قصّہ نہیں تھا۔ اس لحاظ سے انہیں اُردو کا پہلا ناول نگار کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اُن کے تمام ناول "مقصدی" ہوتے ہیں لیکن اُنکا طرز بیان، اُن کی شوخی و ظرافت قصّہ کو اس قدر حقیقی رنگ دے دیتی ہے کہ تمام نقشہ نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ دوسرے اُن کے ناولوں میں اگرچہ ضرورت سے زیادہ سبق آموزی سے کام لیا گیا ہے لیکن اُن کا قصّہ پن مفقود نہیں ہوا ہے۔ قصّہ پن، سبق آموزی، دلچسپی اور حقیقت نگاری ایک عمدہ ناول کی اہم ترین خصوصیات ہیں۔ اور یہ سب کی سب اُن کی تصانیف میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ ان کا طرز باوجود حالی و سر سید کی طرح صاف و سادہ ہونے کے ایک عجیب رنگینی و چاشنی کا بھی حامل ہے۔ ان کے وہ لکچر جو خشک موضوعات پر بھی ہیں اُن کے پڑھنے سے طبیعت بجائے منغض ہونے کے مسرور ہوتی ہے۔ اور ایک

عجیب قسم کا لطف محسوس ہوتا ہے۔ اور میرے نزدیک وہی طرزِ تحریر تحسین و تعریف کا مستحق ہے جس میں خشک موضوعات کو بھی اس طرح بیان کیا جائے کہ اس سے طبیعت محظوظ ہو نہ یہ کہ اچھے خاصے دلچسپ موضوعات کو بھی خشک و بے کیف بنا دیا جائے۔

نذیر احمد کے اندازِ تحریر پر چند اعتراضات بھی کئے جاتے ہیں پہلا اعتراض تو بقول مرزا فرحت اللہ بیگ کے یہ ہے کہ "وہ چلتے چلتے عربی الفاظ کے روڑے ہی نہیں بچھاتے تھے بلکہ پہاڑ رکھ دیتے تھے"۔ لیکن یہ اعتراض اُن کی عام روانی و بے ساختگی کے مقابلے میں کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ صرف عربی کے بے اندازہ قابلیت اور زورِ بیان کا نتیجہ تھا کہ خود بخود اُن کی زبان پر عربی الفاظ آجاتے تھے۔

دوسرا اعتراض اُن کے طرزِ تحریر پر یہ کیا جاتا ہے کہ وہ بہت زیادہ عامیانہ و سوقیانہ ہے۔ لیکن یہ اعتراض ناول نگاری کی حقیقی خصوصیات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اُنکے محاورات سے گذشتہ صدی میں دہلی کے بعض محلے اور کوچے ہی کے لوگ لطف اٹھا سکتے تھے۔ یہ اعتراض بھی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ناول کے کیریکٹرس کو اپنے ماحول کی زبان استعمال کرنا ہی چاہیئے۔ یہ ناول کی خوبی ہے نہ کہ خرابی۔ اور اُن کے محاورات میں سوائے چند کے جو مخصوص مقامی ہیں باقی تمام عام فہم ہیں۔ اور اُن کی زبان کو عامیانہ و سوقیانہ کہنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ زبان خود ہی عامیانہ و سوقیانہ تھی جو اُس زمانے میں دہلی کے زنان خانوں میں بولی جاتی تھی۔ نذیر احمد کا اس میں کیا قصور ہے؟ ان کا فرض صرف حقیقت نگاری تھا وہ اُنہوں نے عمدگی کے ساتھ ادا کر دیا۔ اب زبان کا اعتراض اُن پر نہیں بلکہ اس زمانے کے بولنے والوں پر عائد کیا جا سکتا ہے۔ اگر بفرضِ محال اس میں کوئی عامیانہ پن ہے۔

نذیر احمد نے اپنے اس طرز کے ذریعے سے حقیقتاً مصوری کی ہے۔ مناظرِ قدرت کی نہیں بلکہ انسانی خصائل کی۔ اور اس عمدگی سے کی ہے کہ اُس کی نقل نہیں کی جا سکتی۔

ناول کے بعد اُن کی بے پناہ قابلیت کا استعمال اُن کی مذہبی تصانیف میں ہوا ہے۔ اور قرآن شریف کا ترجمہ کرکے اُنہوں نے مذہبی خدمت ہی نہیں بلکہ اُردو ادب کی خدمت بھی کی ہے۔ نہ محض یہ کہ اسکے مفہوم کو ہر شخص آسانی سے سمجھ سکے بلکہ عربی کے زور کو قائم رکھنے کی بھی انتہائی کوشش کی گئی ہے۔

باوجود اس کے کہ وہ تشبیہات و استعارات سے کام نہیں لیتے لیکن اس قدر موزوں الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ وہ اپنی جگہ سے ذرہ بھر بھی نہیں ہٹائے جا سکتے۔ اُن کی عبارت میں ایسی بے تکلفی اور بیساختہ پن ہوتا ہے کہ پڑھیئے اور لطف لیجیئے۔ اُن کے طرز کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے طرز کی نقل و تقلید نہیں ہے۔ بلکہ اُن کا طرز اُن کی اپنی ذاتی ایجاد ہے جو اُنہوں نے اپنے لئے ایجاد کیا اور خود ہی ختم کر گئے موجودہ مصنفین میں مرزا فرحت اللہ بیگ اُن کے مقلد معلوم ہوتے ہیں لیکن اس بیساختگی کو نہیں پہونچ سکتے۔ اُن کے طرز کی یہ خصوصیت اُن کی ہر تصنیف میں پائی جاتی ہے۔ خواہ وہ ناول ہو یا کوئی مذہبی کتاب اِس سے اُن کے طرز کمال کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن اس کمال میں ایک خرابی بھی ہے اور وہ یہ کہ عموماً اُن کا طرز مزاحیہ رنگ لئے ہوئے ہوتا ہے جو ناولوں وغیرہ کے لئے تو نہایت موزوں ہے لیکن مذہبی کتابوں میں ذرا گستاخانہ معلوم ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی "اُمہات الاُمہ" پر مولویوں نے اس قدر شور و غل مچایا کہ آخر کتاب نذرِ آتش کرنی ہی پڑی۔

اگر اُن کی مذہبی کتابیں علیحدہ کر لی جائیں تب بھی اُن کی ادبیت فنا نہیں ہو سکتی۔ اُن کے ناول اُن کے نام کو زندہ رکھنے کیلئے بہت کافی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اُن کے ناولوں سے اگر مذہب و اصلاح کا عنصر نکال لیا جائے تو وہ کچھ نہیں رہتے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ "عربی کے اس فاضل پروفیسر کے متعلق جو بہت سخت عجمی تھا" مہدی فرماتے ہیں کہ "نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے"۔

سب سے بعد شبلی آتے ہیں۔ اور چونکہ ان سے اوّل سرسید۔ حالی۔ آزاد اور نذیر احمد بہت کچھ لکھ چکے تھے لہذا اُنہوں نے انکی تحریروں کو سامنے رکھکر اُن سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے: "استدلال اُنہوں نے سرسید سے سیکھا۔ تحقیق آزاد سے لی۔ زورِ بیان نذیر احمد کا لیا اور سادگی و صفائی حالی سے سیکھی۔ اسی وجہ سے اُن کا طرزِ تحریر اُن کے معاصرین کی تمام خوبیوں کا حامل ہے؛ گویا کہہ سکتے ہیں کہ ان کا اندازِ تحریر مختلف طرزوں کا ایک معجون مرکب ہے۔ آزاد کی رنگینی، حالی کی سادگی اور نذیر احمد کے زورِ بیان تینوں کو وہ موقع موقع سے استعمال کرتے ہیں۔ مگر بمقابلہ حالی اور نذیر احمد کے اُن پر آزاد کا زیادہ اثر ہے اور چونکہ آزاد کا رنگین طرزِ بیان کچھ آزاد ہی کا حصہ تھا دوسرے اُسکی نقل سے قاصر تھے اس لئے شبلی صرف آزاد کی رنگینیٔ خیال ہی پر اکتفا کرنے پر مجبور تھے۔ طرز کی رنگینی نہیں لے سکے۔

بہرحال اُنہوں نے اپنے معاصرین کے مختلف طرزوں سے ملا کر

ایک نیا طرز ضرور بنالیا۔ لیکن ایک بالکل نیا طرز ایجاد کرنے اور مختلف طرزوں سے ملاکر ایک طرز گڑھ لینے میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ حقیقتاً نذیر احمد اور آزاد صاحبِ طرز کہے جاسکتے ہیں۔ اور سرسید، حالی اور شبلی نہیں۔ صاحبِ طرز سے میرا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے طرز کا مالک جس میں انفرادیت بہت بڑی حد تک نمایاں ہو۔ صرف ایک ہی جملہ سے یہ اندازہ ہوجائے کہ یہ جملہ فلاں شخص کا ہی۔

خواہ اُس کی وجہ یہی کیوں نہ ہو کہ شبلی نے دوسروں کے طرزوں میں سے صرف خوبیاں لیکر اپنے لئے ایک نیا طرز بنالیا لیکن یہ ضرور ہے کہ اِن کا طرز سرسید اور حالی کے طرز سے زیادہ بلند اور پختہ ہے۔ اور اُن کی زبان ایسی ہے جو تصنیفات میں استعمال ہونی چاہیئے۔ کہیں کہیں اُن کے طرز میں شوخی و رنگینی بھی پائی جاتی ہے اور جہاں کہیں چھوٹے چھوٹے جملوں سے اُنہوں نے بہت زیادہ اثر پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے وہ اُن کی بلاغت اور زورِ بیان کا بہت عمدہ نمونہ ہیں۔ اُن کے طرز کی یہ خصوصیت اُن کے خطوط میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔ اور اُن کے اُن خطوط میں جو عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کو لکھے گئے ہیں ایک دبی ہوئی شوخی اور ایک خاص قسم کی رنگینی بھی پائی جاتی ہی۔

بایں ہمہ اُن کی تمام تحریرات کا موضوع قریب قریب تاریخ ہی ہے جس کا وہ "علم الکلام" کے دیباچے میں خود ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں:۔

"میں نے ابتدائے زمانۂ تصنیف سے اپنی تصنیفات کا موضوع تاریخ قرار دیا ہے۔ چنانچہ اب تک جو چیزیں میرے قلم سے نکلیں اور شائع ہوئیں وہ تاریخی ہی تھیں۔ اِسی بنا پر علم کلام میرے دائرے سے خارج تھا۔ علم کلام کی تاریخ لکھنے سے ایک طرف تو اسلامی لٹریچر کی ایک بڑی کمی پوری ہوتی ہے دوسری طرف یہ تصنیف جو درحقیقت علم کلام کی تاریخ ہے، تاریخ کے دائرے میں آجاتی ہی اور میں اپنی حد سے تجاوز کرنے کا گنہگار نہیں رہتا۔"

اِس کا صاف مطلب ہے کہ اُن کی قریب قریب تمام تصانیف ایک ہی دائرے تک محدود تھیں۔ اُن کی تمام تر توجہ تاریخ کی طرف مبذول رہی۔ اور تقریباً چالیس سال تک مسلسل ایک ہی موضوع کو "پامال" کرتے رہنے کے بعد کمال و شہرت حاصل نہ کرلینا انتہائی حیرت خیز ہوتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ شبلی کی تمام تر شہرت بحیثیت مورخ کے ہے نہ کہ بحیثیت انشا پرداز کے۔ اب اس سلسلہ میں اگر اُنہوں نے اپنے پیش روؤں کے مختلف طرزوں سے ملاکر ایک نیا طرز بھی بنالیا تو وہ ناگزیر تھا۔ اگر آج اُن کی مورخانہ حیثیت اُن سے منفک کرلی جائے تو شبلی دوم درجے کے ایک مصنف رہ جائیں گے۔ اور بس۔ اور یہی وجہ ہے کہ مہدی افادی باوجود اس کے کہ وہ شبلی کے اتنے مدّاح ہیں کہ اُن کی مدّاحی کو ایک منثور قصیدہ کہا جاسکتا ہے، ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ "شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔"

اب آیئے ان سب کے مقابلے میں آزاد کو دیکھیں کہ بحیثیت انشا پرداز اُن کا کیا درجہ ہے۔ اُنہیں ہم بحیثیت مُصنّف نہ تو ناول نویس کہہ سکتے ہیں، نہ سوانح نگار۔ نہ مورخ اور نہ مذہبی مصنف۔ وہ صرف انشا پرداز ہیں، کسی قسم کی حد بندی اور سہارے سے بے نیاز۔ اُنہوں نے ایک خاص طرز تحریر ایجاد کیا اور اپنی تمام تصانیف میں اُسے اس خوبی سے نباہا کہ مرصع کاری اس پر نثار اور شاعری اس پر قربان۔ حقیقت یہ ہے کہ اُنہوں نے نثر میں شاعری کی ہے۔ اور اس خوبصورتی سے کہ اُن کی عبارت پر کسی طرح آورد کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ ایک نہر ہے تیز و شفاف، شفق کی سُرخی اور آفتاب کی زرنگار شعاعوں سے رنگین، جو اٹھلاتی، شوخیاں کرتی، بل کھاتی اور تیزی سے بہتی چلی جاتی ہے۔ وہ ایک آرٹسٹ ہیں مینا کار، صناع ہیں جادو طراز۔ اور اُن کا یہ آرٹ خشک سے خشک موضوعات کو رنگین بنادیتا ہے، دلچسپ داستان کا سا رنگ دیدیتا ہے۔ اور میں اسی کو ایک انشا پرداز کا، ایک صناع کا کمال سمجھتا ہوں کہ وہ ناگوار کو خوشگوار اور غیر دلچسپ کو دلچسپ بنادے۔ یہی آرٹ ہے اور یہی آرٹ کا منشائے حقیقی۔

ایک شعر بمقابلۂ نثر کے کیوں اچھا معلوم ہوتا ہے؟ صرف اس لئے کہ اُس میں اظہارِ خیال کا طرز حسین و جمیل اور پُرکیف ہوتا ہی۔ اقبال کے فلسفہ کو نثر میں تبدیل کردیجئے، میرے خیال میں شاید کوئی اُسے سرسری طریقے سے دیکھنا بھی گوارا نہ کرے۔ لیکن اُسوقت جب وہ ہماری نظروں کے سامنے بانگِ درا۔ بالِ جبریل۔ ضربِ کلیم۔ پیامِ مشرق۔ زبورِ عجم اور جاوید نامہ وغیرہ کی صورت میں آتا ہے تو نہ صرف ہم اسے شوق و دلچسپی سے پڑھتے ہی ہیں بلکہ لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔ ایک مصنف کا صرف یہی فرض نہیں کہ وہ قارئین کو وعظ دے، نصیحتیں کرے بلکہ اس کا فرض یہ ہے کہ اس وعظ و نصیحت کو، اس خشک نصیحت کو ایک ایسے دلکش پیرائے میں سامعین کے سامنے

پیش کرے کہ وہ اگر پہلی مرتبہ اس کا کوئی اثر نہ بھی لیں تو کم از کم شوق اور دلچسپی سے پڑھ تو ضرور لیں۔ اور پھر دلچسپی پیدا ہونے کے بعد کچھ نہ کچھ اثر ہونا لازمی ہے۔ تلخ نوالوں کو شیریں بنا کر حلق سے اتارنا یہ ایک مصنف کا کمال ہی نہیں بلکہ فرض ہے۔

میں نے بہ اندیشۂ طوالت ان چاروں کی طرزِ تحریر کے نمونے نہیں دئے ہیں اور دوسری وجہ نمونے نہ دینے کی یہ بھی ہے کہ چونکہ نمونے کے لئے صرف چند سطریں پیش کی جا سکتی ہیں مگر نذیر احمد کے علاوہ اوروں کے یہاں آزاد کی نقل کی کوشش پائی جاتی ہے حتیٰ کہ سر سید کے مضامین میں سے بھی جنہیں انشا پردازی سے دور کا بھی واسطہ نہیں "اُمید کی خوشی" بطور انشا کے عمدہ نمونے کے پیش کی جا سکتی ہے۔ لہذا یہ عدم یکسانیت مثالیں پیش کرنے میں حائج تھی۔ کیونکہ میں وہی مثالیں پیش کرتا جو ان لوگوں کا عام طرز ہے لیکن انکے مداحین کسی دوسری جگہ سے جہاں بہت کوشش کے بعد وہ دو ایک صفحے رنگین عبارت میں لکھ گئے ہیں چند جملے پیش کر کے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی آزاد جیسے انشا پرداز ہیں۔ اور "بہترین انشا پرداز" ہیں سعید انصاری صاحب نے اپنی ہٹ دھرمی سے ایسا کیا بھی ہے۔ انہوں نے آزاد، حالی اور شبلی کی ایک ہی موضوع کے متعلق عبارتیں نقل کی ہیں اور دعویٰ کیا ہے کہ شبلی کی روانی اور بے ساختگی کو حالی و آزاد دونوں نہیں پہونچتے۔ اوّل تو مجھے یہی تسلیم نہیں۔ اور خود سعید انصاری صاحب اپنے پچھلے جملے بھول گئے ہیں جہاں انہوں نے یہ کہا ہے کہ آزاد کا طرزِ تحریر ایسا ہے کہ اُس کی نقل نہیں کی جا سکتی۔ ایسی صورت میں شبلی کی عبارت کو نہ محض ان کی نقل بلکہ اس سے بہتر بنانا شاید ہٹ دھرمی کے نتیجے کے سوا اور کچھ نہیں۔ دوسرے بفرضِ محال اگر مان بھی لیا جائے کہ وہ چند جملے آزاد کے جملوں سے بہتر بھی ہیں تب بھی یہ نہ آزاد کی تحقیر ہے اور نہ شبلی کی تعریف۔ مسلّم ہے کہ شبلی نے بمقابلہ اپنے اور بزرگوں کے آزاد کا رنگ زیادہ قبول کیا ہے۔ اور آزاد کی رنگینیِ خیال کے ساتھ ساتھ ان کی رنگینیِ عبارت کو بھی لینے کی کوشش کی ہے۔ اور اسی وجہ سے چند جملے انشا پردازی کی مثال میں اُن کی تصانیف میں نظر آتے ہیں۔ مگر انشا پردازی کا کمال اسے تو نہیں کہا جا سکتا کہ بہت کوشش کر کے سو صفحوں میں دو ایک صفحے رنگین لکھ دیئے اور انہیں میں اپنا سارا زور ختم کر کے باقی صفحات پھر ویسے کے ویسے ہی خشک۔ پوری کی پوری تصانیف ایک ہی رنگین و رواں انداز میں لکھ دینا یہ آزاد کے سوا نہ کوئی کر سکا نہ اُمید ہے کہ اب کر سکے۔ لہذا شبلی کو بحیثیت مورخ اور کثیر التصانیف ہونے کے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ غیر فانی ہیں لیکن انہیں بحیثیت انشا پرداز کے آزاد سے ٹکرانا خواہ مخواہ کی سینہ زوری کا ثبوت ہے۔

پھر آگے چلکر سعید انصاری صاحب شبلی کو باقی سب سے بڑھانے کیلئے فرماتے ہیں کہ "حالی نے یادگار غالب اور حیاتِ سعدی لکھی لیکن اُن کے ہیرو پہلے کے مقابلہ میں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی سرکے۔ مگر شبلی نے موازنہ لکھا تو انیس کی دھوم مچ گئی"۔

یہ امر اگرچہ بحث طلب تو کافی ہے لیکن میں اس بحث میں زیادہ اُلجھنا نہیں چاہتا۔ صرف یہ پوچھتا ہوں کہ کیا شبلی نے دبیر کے ساتھ انصاف کیا ہے؟ اور کیا انیس کو بعض جگہ بیجا طریقہ پر ترجیح نہیں دی ہے؟ غالباً اس کا جواب شبلی کے پرستار بھی اثبات ہی میں دیں گے۔ اور اگر ایسا ہے تو کیا شبلی کی ادیبانہ حیثیت تو جو کچھ تھی وہ تھی ہی، مورخانہ حیثیت بھی معرضِ خطر میں نہیں پڑ جاتی؟ پھر لکھتے ہیں "آزاد نے سخندانِ پارس لکھی لیکن شبلی کی شعر العجم سے وہ دب کر رہ گئی"۔ ممکن ہے بحیثیت فنِ تاریخ اور تفصیل کے دب کر رہ گئی ہو لیکن جہاں تک فارسی دانی اور فارسی فہمی کا سوال ہے شبلی بقول اپنے پرستار مہدی کے آزاد سے دوسرے نمبر پر ہیں۔ اسکے علاوہ جہانتک انشا پردازی کا تعلق ہے شبلی کی شعر العجم صرف تاریخ کی غرض سے پڑھی جائیگی۔ اور آزاد کی سخندانِ پارس تاریخ اور انشا پردازی دونوں کیلئے۔ شعر العجم سے اچھی تاریخ شعر العجم کو بھلا دیگی لیکن سخندانِ پارس سے اچھا تبصرہ سخندانِ پارس کی انشا پردازی کو فنا نہیں کر سکتا۔

آزاد کے طرزِ تحریر پر مختلف اعتراضوں میں سے ایک خاص اور اہم اعتراض یہ ہے کہ وہ سنجیدہ موضوعات کیلئے موزوں نہیں لیکن یہ اعتراض خود ہماری نااہلیت کا نتیجہ ہے۔ چونکہ ہم خود اُس کی نقل نہیں کر سکتے اس لئے یہی کہکر اپنے دل کو تسلّی دے لیتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم اس طرز کو بہت زیادہ دلکش اور دلچسپ کہتے ہیں، اسے نہایت عمدہ سمجھتے ہیں لیکن پھر بھی اس پر اعتراض کرتے جاتے ہیں۔ اور یہ کوئی تعجب خیز نہیں۔ بعض اوقات انسان کی مایوسی اس اسٹیج پر پہونچ جاتی ہے کہ وہ اس مایوسی کی روحانی اذیت سے بچنے کیلئے اس چیز ہی کو، دل میں تو نہیں ہاں زبان سے بُرا کہکر اپنے دل کو تسلّی دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ایک مرتبہ ایک لومڑی نے بھی انگوروں کے حصول سے مایوس ہو کر ایسا ہی کیا تھا۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو اس میں اب بھی اعتراض

ہوکہ نہیں یہ "کھٹے انگور ہیں" والا معاملہ نہیں بلکہ واقعی آزاد کا طرز سنجیدہ موضوعات کیلئے موزوں نہیں۔ تو میں یہ پوچھونگا کیا تاریخ، سوانح، ادبی تنقیدات، ادبیات، مکاتیب، سفرنامہ اور فیلالوجی وغیرہ سنجیدہ موضوعات نہیں ہیں؟

شبلی نے بھی تاریخ کو اپنا موضوع بنایا ہے لیکن وہ خود چونکہ آزاد کی طرز کو ہر جگہ نہ نباہ سکے لہذا اُن کے پرستاروں نے یہ کہکر اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ وہ طرز تاریخ کے لئے موزوں نہیں۔ آزاد نے بھی تاریخ لکھی اور شروع سے لیکر آخیر تک اپنے رنگین طرز میں فرق نہ آنے دیا۔ ثبوت کیلئے دربار اکبری اٹھاکر دیکھو، اور زبان کی تاریخ کے لئے آب حیات کا دیباچہ پڑھو۔ ذرا اس اقتباس کو غور سے ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے سلاست و روانی کے ساتھ ساتھ کس قدر زور و اثر ہے کہ بالکل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے:۔

"آج تخمیناً چوبیس سو برس ہوئے اس نورانی موجد نے شعلۂ آتش کے پردے میں توحید کے مسئلہ کو رواج دیا۔ مذہب مذکور نے سلطنت کے بازوؤں سے زور پکڑا اور ایران سے نکل کر دو سو برس کے قریب اطراف و جوانب کو دباتا رہا۔ یہاں تک کہ سکندر یونان سے طوفان کی طرح اٹھا اور ایشیا کے امن وامان کو تہ و بالا کر دیا۔ جو مصیبت بدھ کے ہاتھ سے بیدشاستر پر پڑی تھی وہاں وہی مصیبت ژنداستا پر آئی۔ چنانچہ جس آگ نے زرتشت اور چاماسپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا۔ جس کے آگے گشتاسپ نے تاج اتار کر رکھا، جسکی درگاہ میں اسفندیار نے گرز اور تلوار چڑھائی وہ یونان کے آب شمشیر سے بجھائی گئی اور آتش خانے راکھ ہوکر اڑ گئے۔"

آب حیات میں ایک جگہ زبان کی بناوٹ اور عہد بعہد کی تبدیلیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"بیان ہائے مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو کچھ اس میں ہوا کسی تحریک یا ارادے سے نہیں ہوا بلکہ زبان مذکور کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے مل جل جاتی ہے۔ سنسکرت آئی اس سے مل گئی، عربی فارسی آئی اسے بسم اللہ، خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔"

چند سیدھے سادے مختصر جملوں میں پوری زبان کی تاریخ بیان کر دی۔ کیا یہ "بلاغت کی آخری حد" نہیں ہے؟ اور کیا اس کا موضوع سنجیدہ نہیں؟

شبلی نے شعرالعجم لکھی۔ انیس و دبیر کی شاعری پر تبصرہ کیا۔ آزاد نے آب حیات اور سخندان پارس لکھی اور مختلف شعرا کے سوانح حیات کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعری پر تبصرہ کیا۔ ویسے تو پوری آب حیات مثال میں پیش کی جاسکتی ہے لیکن یہاں صرف دو ایک مثالیں ہماری بحث کے لیے کافی ہونگی۔ ولی دکھنی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"یہ نظم اُردو کی نسل کا آدم جب ملک عدم سے چلا تو اس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا۔ جس میں وقت کے محاورے نے اپنی جواہرات خرچ کئے اور مضامین کی رائج الوقت دستکاری سے میناکاری کی جب کشور وجود میں پہونچا تو ایوان مشاعرہ کے صدر میں اس کا تخت سجایا گیا۔ شہرت عام نے جو اس کے بقائے نام کا ایوان بنایا ہے اس کی مضبوطی اور بلندی کو ذرا دیکھو اور جو کتابیں لکھی ہیں انہیں پڑھو دنیا تین سو برس آگے نکل آئی ہے مگر وہ آج تک سامنے نظر آتے ہیں اور صاف پڑھے جاتے ہیں۔"

کیا اس قسم کی بلند و اعلیٰ انشاپردازی کا نمونہ شبلی کی تمام تصانیف میں کہیں بھی مل سکتا ہے؟ ادبی تنقید ایک خشک و روکھا پھیکا موضوع ہے لیکن ہمارے انشاپرداز کی انشاپردازی اس میں بھی ملاحظہ ہو۔ سودا، میر، درد اور مرزا جانجاناں کے کلام پر مجموعی طور سے تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اس مشاعرہ میں اُن صاحب کمالوں کی آمد آمد ہے جن کے پا انداز میں فصاحت آنکھیں بچھاتی ہے اور بلاغت قدموں میں لوٹتی ہے۔ زبان اردو ابتدا میں کچا سونا تھی ان بزرگوں نے اُسے اکثر کدورتوں سے پاک صاف کیا اور ایسا بنا دیا جس سے ہزاروں ضروری کام اور آرائشوں کے سامان، حسینوں کے زیور بلکہ بادشاہوں کے تاج و افسر تیار ہوتے ہیں۔ .... یہ گرد و پیش کے میدانوں میں بہت دوڑے، سب پھول کام میں آئے ہوئے تھے۔ جب سامنے کچھ نہ پایا تو ناچار اپنی عمارتوں کو اونچا اٹھایا۔ تم دیکھنا وہ بلندی کے مضمون نہ لائینگے آسمان سے تارے اتارینگے .... یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہونگے۔ سودا کا کلام باوجود بلندیِ مضمون اور چستیِ بندش کے تاثیر کا طلسم ہوگا۔ اتنی بات کا افسوس ہے کہ اس ترقی میں طبیعت کی بلند پروازی سے اوپر کی طرف رخ کیا کاش آگے قدم بڑھاتے تاکہ حُسن و عشق کے محدود صحن سے

نکل جاتے اور ان میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے کہ نہ اُن کی وسعت کی انتہا ہو، نہ لطائف و عجائب کا شمار ہے۔"

کسقدر بے لاگ تنقید ہو کہ تحسین طلب باتوں کی تعریف بھی کر دی اور جو عیب یا کمی تھی اسکو بھی صاف صاف بیان کر دیا۔

آزاد نے کسی خاص موضوع کو اپنے قلم کا نشانہ نہیں بنایا ہے اور نہ ہم انہیں کسی مخصوص صنفِ ادب کا خادم کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے صرف اُردو زبان کی خدمت کی۔ اُردو کی تاریخ لکھی۔ شعرا کی سوانح لکھیں۔ اُن کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا۔ غرض اُردو داں پبلک کیلئے آبِ حیات۔ نیرنگ خیال وغیرہ لکھکر اُردو انشا پردازی کا بے مثال نمونہ پیش کیا اور پنجاب کیلئے چھوٹی چھوٹی درسی کتابیں لکھکر پنجابیوں کو اُردو سیکھنے میں مدد دی۔

آج جس شاعری کا جھنڈا لئے ہوئے ہندوستان کے مشہور ترین شعرا آگے بڑھ رہے ہیں سب سے پہلے وہ حالی نے نہیں آزاد نے بلند کیا تھا۔ آج جو وسیع میدان ہمارے شاعروں کے سامنے ہے اُس کا راستہ اُس خادم زبان نے دکھلایا تھا جسے دُنیا آزاد کے نام سے یاد کرتی ہے۔ آزاد ہی وہ شخص تھا جس نے اپنی زبان اور اپنے ادب کی خدمت پر اپنے ہوش و حواس، اپنی صحت اور اپنی زندگی کو قربان کر دیا۔ یہی وہ ہستی تھی جس کا انشا پردازی کے میدان میں اس کا ہر ہمعصر لوہا مانتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اب اس موجودہ دَور میں ہمارے نظریات تبدیل ہو جائیں۔ ہم آرٹ اور حسن کسی دوسری ہی چیز کو سمجھنے لگیں۔ انشا پردازی کو تصنع کا نام دیدیں اور کیا معلوم یہ نظریات جو آج ہم نے انشا پردازی کے متعلق بنائے ہیں کل اگلی نسل آکر انہیں بھی بدل دے۔ آج جس انشا پردازی کو ہم تصنع اور خلاف فطرت کہتے ہیں کل ہماری انشا پردازی پر بھی خشکی اور بے کیفی کا فتویٰ لگ جائے۔ یہ نظریات بدلیں گے اور بدلنا ہی چاہئے۔ لیکن ہم کسی گذشتہ دَور کی بات کو اگر اپنے دَور کی روشنی میں دیکھیں گے۔ اگر کسی گذشتہ عہد کی تصنیف پر اپنے موجودہ نظریات کی روشنی میں تنقید کریں گے تو واضح رہے کہ ہم کبھی بھی صحیح نتیجے پر نہ پہونچ سکیں گے۔ ہمارا یہ طرز عمل اتنا ہی احمقانہ ہوگا جتنا دن کے وقت چاند کو روشن دیکھنے کی خواہش کرنا یا رات کے وقت تمام آسمان پر تاروں کے صحرا میں آفتاب کی تلاش کرنا۔

بہر حال آزاد نے سوا سر سید کے معقولات اور نذیر احمد کے مذہب کے اور کونسے موضوع پر قلم فرسائی نہیں کی۔ تاریخ انہوں نے لکھی۔ سوانح شعرا اور ادبی تنقیدات انہوں نے لکھیں۔ خالص ادب انہوں نے پیش کیا۔ مکاتیب و سفرنامہ اُن کے قلم سے نکلے۔ کیا یہ تمام موضوعات سنجیدہ اور ادبی نہیں؟ کیا ان خشک موضوعات پر آزاد کا قلم کہیں بھی اپنی گلکاریاں دکھلانے سے رُکا ہے؟ کہیں بھی انہیں لغزش ہوئی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے طرز میں کامل تھے۔ وہ اگر انکے علاوہ بھی کوئی اور موضوع اختیار کرتے تو یہ گلفشانیاں جو اُن کے قلم کے لئے بالکل فطرتی تھیں وہاں بھی نظر آتیں۔

لہذا یہ بالکل غلط ہے کہ آزاد کا طرز تحریر سنجیدہ اور تنقیدی موضوعات کے لئے مناسب نہیں۔ ذرا "بقائے دوام کا دربار" پڑھئے۔ وہاں تاریخ بھی ہے، ادب بھی ہے، رنگینی بھی ہے اور رعنائی بھی۔ اب اگر مولانا شبلی اپنی تاریخ دانی کے زعم میں کسی غلط فہمی کی بنا پر اُس کے کسی فقرے پر اعتراض کر بیٹھیں تو اُس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ آزاد غریب کو تاریخ دانی کا دعوےٰ نہیں، ہاں جس چیز کا اُسے دعویٰ ہے اس میں اور تو کوئی کہاں کا خود شبلی باوجود انتہائی کوشش کے اُس کے ہم مثل نہ بن سکے اور نہ اُمید ہے کہ اُردو دُنیا اب اس جیسے انشا پرداز کو پیدا کرسکے گی۔

مہدی الافادی نے (جو بحیثیت انشا پرداز خود شبلی سے بہتر ہیں اور جس کا اعتراف شبلی نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ "کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہوتے"!) اور جو شبلی کے شاگرد رشید مولانا سلیمان ندوی صاحب مدظلہٗ سے بھی زیادہ شبلی کے مدّاح معلوم ہوتے ہیں آزاد کی بے مثل انشا پردازی کی داد اس طرح دی ہے۔

"مہر النساء کا وہ واقعہ کس قدر دلچسپ ہے جب اُس نے باغ کی ایک روش پر جہانگیر کے ہاتھ سے کبوتر لیکر چھوڑ دئے تھے۔ پروفیسر آزاد نے جس خوبصورتی سے اس کو دکھایا ہے انشا پردازی کو آجتک اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکے"!

لیکن خیر بیچارے مہدی تو نہ آزاد کی برابری کا دعویٰ کرتے ہیں نہ انہیں کھینچ تان کر ان کے برابر لایا جاتا ہے لہذا اُن کی اس داد و تحسین سے شاید مدعی اثر پذیر نہ ہونگے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ خود اُن کے وہ معاصرین جنہیں آجکل زبردستی اُن کے برابر لانے بلکہ بحیثیت انشا پرداز ان سے بڑھانے کا فیشن ہو گیا ہے۔ آزاد کی

انشا پردازی کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ مہدی آفادی نے ایک واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لاہور میں پہلی دفعہ جب ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو پروفیسر آزاد زندہ تھے۔ نذیر احمد ملنے گئے، شبلی و حالی بھی ساتھ تھے۔ نذیر احمد کا لکچر ہونے والا تھا جو چھپا ہوا اُن کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے یہ کہکر آگے بڑھا دیا کہ ایک نظر دیکھ لیجئے۔ آزاد فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ گئے اور کانٹ چھانٹ شروع کر دی۔ نذیر احمد آزاد کی اس بے تکلفی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جوشِ محبت سے آنکھیں نم ہو گئیں۔ اُن کو فطرتی طور پر خیال آیا کہ ابھی ان کے دائرے میں ایک شخص ایسا موجود ہے جو "بوڑھے بچے" کی مشق سخن پر نظر ثانی کر سکتا ہے۔

مولانا حالی آزاد کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے یعنی لٹریچر کے رقبے کا طول و عرض بڑھ گیا لیکن اس کا ارتفاع جہاں تھا وہیں رہا یعنی اخلاقی سطح بہت اونچی نہیں ہوئی۔ لیکن آزاد کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی نے یہ کمی پوری کر دی"۔

نیرنگ خیال کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"آزاد کے قلم نے پہلے پہل جذبات انسانی کی تجسیم و تشخیص کی اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں۔ اور خصائل انسانی کے فطری خواص ایسے مؤثر اور دلکش پیرائے میں بیان کئے ہیں جن سے اُردو لٹریچر ابتک خالی تھا"۔

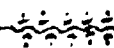
شبلی جو آزاد کی نقل کر کے اپنے ناانصاف پرستاروں کے ہاتھوں بحیثیت انشا پرداز آزاد سے بڑھا دئے گئے ہیں، خود آزاد کا ادب کرتے اور فرمایا کرتے تھے کہ "آزاد اُردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے۔ اُسکو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے"۔ ایک دوسری جگہ انہوں نے آزاد کے مؤثر انداز بیان اور ساحرانہ انشا پردازی کا ایک اور انداز سے اعتراف کیا ہے جو شبلی کے مداحوں کی تمام بیجا ہٹ دھرمیوں کا ایک مسکت جواب ہے۔ مہدی الافادی کو خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"آزاد کی کتاب آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں۔ تاہم اِدھر اُدھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم ہوتی ہے"۔

اور اس سے زیادہ کیا ہوگا آزاد کی انشا پردازی کا ثبوت۔ پھر بھی اگر ہم انہیں اُنکے شاگردوں سے گھٹانے کی بیجا کوشش کریں تو یہ ہماری ناانصافی اور نافہمی کا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن اگر ہمیں "مدعی سست گواہ چست" والی ضرب المثل کو صادق ہی ٹھہرانا ہے تو اس کی اور بھی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اس میں "فرمانروائے سخن" کو گھسیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور یہ کہنا کہ اُن کا طرز سنجیدہ موضوعات کے لئے موزوں نہیں، ہمارے نقادوں کی ستم ظریفی ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ہم اُنکے طرز کی نقل نہیں کر سکتے۔ مگر یہ اس طرز کی خرابی نہیں ہماری ناقابلیت کا ثبوت ہے اور اپنی بیچارگی کا اعتراف۔

اب رہا عالمِ فطرت پر عالمِ صنعت کو ترجیح نہ دینے کا سوال تو یہ اُس وقت ممکن ہے جب انسان کے دل سے آپ اُس کے ذوقِ حُسن کو فنا کر دیں اور جس دن آپ اس میں کامیاب ہو گئے (حالانکہ اس کی کوئی اُمید نہیں) اُس دن آرٹ بھی صفحۂ دُنیا سے مٹ جائیگا۔ آرٹ کے تمام نمونے، تمام شاہکار مٹ جائیں گے اور ایک انسان کی دماغی بے چارگی ایک جانور کی دماغی حالت سے مقابلہ کرنے میں کچھ پست تر ہی ہوگی۔ لیکن جب تک یہ ذوق فنا نہیں ہوتا مجھے اور میرے ساتھ آپ کو بھی مہدی کے الفاظ میں محض یہ کہنا ہی چاہیئے بلکہ کہنا پڑیگا کہ "خوش آب موتیوں کا نشاط انگیز انتشار کے ساتھ فرش رنگین پر بکھر جانا روانیِ آب سے زیادہ دلکش ہے مگر اس سے زیادہ تر دلکش ہے کسی نازک خیال مصنف کی مرصع پیداوار دماغی جو حُسنِ صوری و معنوی کے ساتھ آمد اور بیساختہ پن کی تصویر ہو"۔

مولانا شبلی جن کے متعلق خود اُن کا مداح یہ لکھے کہ "وہ معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں تھے"۔ وہی شبلی جس کے کمالات کا دریا دلی کے ساتھ اعتراف کریں تو اس کے کمال میں کس کا فر کو شبہ ہو سکتا ہے۔ کہنے کو مخالف اور موافق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن جو انصاف پسند طبیعتیں ہیں وہ مہدی افادی کے اِس منصفانہ فیصلہ کی ضرور تائید کریں گی کہ "آزاد کی ادبی فتوحات تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے جس کا فیصلہ خود فلسفۂ ادب کے ہاتھوں ہوگا۔ اور پروفیسر آزاد کا درجہ بحیثیت ادیب جو کچھ ہے اُس کا سمجھنا دوم درجے کی خلقت کے لئے جو فلسفۂ لٹریچر سے قطعاً بیگانہ ہو آسان نہیں ہے"۔



حفیظ نعیمی پیلی بھیتی

دِلّی کی سیر

وہ میرے لئے دہلی جانے کا پہلا موقع تھا۔ اُس سے قبل میں نے اس بڑے شہر کی مہذب زندگی کبھی نہ دیکھی تھی۔
دو تین دن برابر شاہراہوں پر گھومتا رہا۔ وہ عمارتیں جو آسمان سے باتیں کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، وہ سڑکیں جہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہے، وہ بگھیاں، موٹر کاریں اور ٹریمیں جو ایک دوسرے کو مس کرتی ہوئی نکل جاتی ہیں، وہ دکانیں جن میں ہزاروں قسم کا قیمتی سے قیمتی سامان بھرا ہوا ہے، اور وہ عمدہ عمدہ لباس پہننے والے مرد، حسین عورتیں اور خوبصورت بچے جو ان دکانوں پر خرید و فروخت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ـــــــ میں نے یہ سب کچھ دیکھا۔ اور میرا ذہن اُن لاکھوں کروڑوں انسانوں کی طرف منتقل ہو گیا جو ان تجارتی شاہراہوں سے دُور، بھوک، افلاس، بیماری اور بے تعلیمی میں اپنی زندگیاں بسر کر رہے ہیں۔ میں حیرت سے سوچنے لگا کہ کیا یہ لوگ ـــــــ یہ دکاندار جو ہزاروں روپے کماتے ہیں اور یہ گاہک جو ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں ـــــــ کبھی اُن لوگوں کا بھی خیال اپنے دل میں لاتے ہیں جن کی محنت پر اُن کی عیاشیوں کا دار و مدار ہے۔ کبھی نہیں لاتے۔ یہ تو اُن سے بھی بے خبر ہیں جو اِن سے بہت قریب، بالکل ان کے درمیان بھوکے اور ننگے پھرتے ہیں۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ انہی بازاروں میں جہاں عشرت اور فراوانی کا دریا بہتا ہے بہت سے مزدور اپنے سروں پر خالی ٹوکریاں رکھے اِدھر سے اُدھر گھومتے ہیں۔ اُن کی ویران آنکھوں اور سوکھے ہوئے چہروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھوکے ہیں، بے روزگار ہیں اور ستائے ہوئے ہیں۔ لیکن کوئی اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ زندگی کی شراب پینے والے "وردِ نہ جام" سے کتنے بے خبر ہیں! ظاہری شان و شوکت اور اوپری ٹیپ ٹاپ تمدن کی کھوکھلی بنیادوں کو چھپانے میں کس طرح مصروف ہے!!!

غرض کہ میں دو تین روز ان تہذیبی اور تمدنی مظاہر کا مطالعہ کرتا رہا اور پھر ایک دن مجھے اُس زندگی کو بھی دیکھنے کا موقع ملا جو اس شہر کے گلی کوچوں میں بسر کی جاتی ہے۔ جس ہوٹل میں میں ٹھیرا ہوا تھا اُسی میں بہت دنوں سے ایک صاحب علاج کے لئے مقیم تھے۔ اُن سے دو چار روز میں میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ ایک دن صبح کے وقت ہم دونوں چاندنی چوک میں سے گذر رہے تھے کہ اُنھوں نے کہا "آیئے، مجھے اس طرف ذرا سا کام ہے" یہ کہہ کر وہ ایک کوچے میں گھس گئے۔ اب آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے میں۔ ایک گلی سے دوسری میں نکلے، دوسری سے تیسری میں، تیسری سے چوتھی میں، اور اس طرح معلوم نہیں کتنی گلیاں عبور کر گئے۔ میں نے اُن سے کہا "مردِ خدا، کہاں جا رہے ہو؟ اس بھول بھلیاں میں سے کسی طرح نکلو گے بھی یا نہیں؟" مگر وہ چلتے ہی رہے اور تھوڑی سی دیر میں نہیں کے کہیں پہنچ گئے۔ بالآخر وہ جگہ آ گئی جہاں انہیں جانا تھا۔ بولے "آپ یہاں ٹھیریئے۔ میں پانچ منٹ میں واپس آتا ہوں" یہ کہہ کر ایک تپلی سی گلی میں غائب ہو گئے۔

اُس وقت کوئی دس بجے ہونگے۔ گلی میں ایک طرف دھوپ تھی اور ایک طرف سایہ۔ میں نے سائے میں ٹہلنا شروع کر دیا کہ چلتے چلتے جو پسینہ آ گیا ہے وہ ذرا خشک ہو جائے۔ ابھی ٹہلتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ کہیں اُوپر سے آواز آئی۔

"اے بھائی! ذرا ہٹ جانا!" میں نے نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ ایک دومنزلہ مکان کے برآمدے میں ایک میلی کچیلی بڑھیا آدھا جسم باہر نکالے کھڑی ہے اور ہاتھ میں ایک پیالہ لئے ہوئے میرے سر کا نشانہ بنا رہی ہے۔ میں اُس کی زد سے بچا ہی تھا کہ اُس نے اُوپر سے پیالہ اُنڈیل دیا اور بہت سی دال نیچے کوڑے کے ڈھیر پر آ پڑی۔ وہ کوڑے کا ڈھیر یوں ہی کیا کم گھناؤنا تھا کہ اُس میں یہ اور اضافہ کیا گیا۔ اب جو میں نے اپنے اِردگرد دیکھا تو معلوم ہوا کہ تقریباً ہر دروازے کے سامنے ایک کوڑے کا ڈھیر ہے جس میں آم کی گٹھلیاں، گھر کا بچا کھچا کھانا، نالیوں کی کیچڑ اور خدا جانے کیا کیا کچھ شامل ہے۔ مکانوں کے دروازے اور دیواریں باہر سے اتنی گندی اور کالی کالی تھیں کہ مجھے یہ خیال ہوا کہ ان گھروں میں انسان نہیں بستے بلکہ ان کے اندر زمانے بھر کی غلاظت گھولی، چھانی اور پکائی جاتی ہے۔ ہر ڈیوڑھی تاریکی اور نمی کی وجہ سے کسی بدبودار نالی کا دہانہ معلوم ہوتی تھی۔ میں ان خیالات پر دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا کہ سامنے سے ایک صاحب نمودار ہوئے جو ترکی ٹوپی اور شیروانی پہنے تھے اور ایک اندھے اور بالکل ننگے آدمی کو اُنگلی پکڑے ہوئے لا رہے تھے۔ ایک مہذب شہر کے کوچوں میں ایسے شخص کا بے حجابانہ پھرنا جس کے جسم کا کوئی حصّہ بھی ڈھکا ہوا نہ ہو کافی تعجب خیز امر ہے۔ اور پھر جب ایک سفید پوش اور ہوشمند انسان اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر گلیوں میں ٹہلتا ہوا نظر آئے تو کم سے کم میں تو یہ یقین کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دُنیا کے نظام میں کوئی زبردست تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ میں پھٹی ہوئی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا کہ وہ صاحب جو ترکی ٹوپی پہنے تھے "حافظ جی، ذرا ٹھہریئے" کہہ کر الگ ہوئے اور چپاتی کا ایک ٹکڑا جو بیچ گلی میں پڑا تھا اُٹھانے لگے۔ میں سمجھا کہ حافظ جی کو کھلائیں گے لیکن اُنہوں نے اُس کو اُٹھا کر چوما اور کوڑے کے اُسی ڈھیر پر ڈال دیا جس پر ذرا دیر پہلے اُوپر سے دال پھینکی گئی تھی۔ اس کے بعد پھر "حافظ جی" کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گئے۔ میں بہت دیر تک یہی سوچتا رہا کہ ان دو شخصوں کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

میرے دوست نے کہا تھا "پانچ منٹ میں واپس آتا ہوں" اور اب دس منٹ سے بھی زیادہ گزر چکے تھے۔ میں نے بے قرار ہو کر اُس تنگ و تاریک گلی میں جھانکا جس میں وہ غائب ہوئے تھے۔ وہ تو نظر نہیں آئے البتہ ایک صاحب آتے ہوئے دکھائی دیئے جو بہت دُبلے پتلے اور لمبے تھے۔ ڈاڑھی گھنی تھی اور سر کے بال شانوں تک لٹک رہے تھے۔ گھٹنوں تک نیچا کُرتا اور ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں چپل تھی۔ کسی پیر کے بڑے عقیدت مند مُرید معلوم ہوتے تھے۔ یہ حضرت اُس ترکی ٹوپی والے سے بھی زیادہ ستم ظریف ثابت ہوئے۔ پتلی گلی سے نکل کر، آؤ دیکھا نہ تاؤ، پاجامہ کھول نالی کے کنارے بیٹھ گئے۔ یہاں تک بھی خیر معاملہ قابلِ برداشت تھا۔ ارے صاحب اُنہوں نے تو غضب کر دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ہاتھ میں پاجامہ ہے، دوسرا ہاتھ پاجامے کے اندر رہے، اور بڑے اطمینان کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا، واہ! کیا مشرقی تہذیب ہو۔ سُبحان اللہ!

اس کے بعد میں پھر اپنے دوست کے انتظار میں مصروف ہو گیا۔ ٹہلتے ٹہلتے میری طبیعت اُکتا چکی تھی اور میں نے سوچا کہ اب یہاں سے چلنا چاہیئے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ ان پیچیدہ گلیوں سے تو میں واقف ہوں نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں میں گم ہو کر رہ جاؤں۔ اور اپنے مُستقر تک پہنچنا دشوار ہو جائے۔ اس کے علاوہ اپنے دوست کا بھی خیال تھا۔

وہ کہیں گے آپ چند منٹ انتظار نہ کرسکے۔ اور مجھے چھوڑ کر چلے آئے۔ غرض کہ پھر وہی گلی تھی اور وہی میری چہل قدمی!

دو چار منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک نئی دلچسپی پیدا ہوئی۔ جن مکانوں کے آگے میں ٹہل رہا تھا اُن میں سے ایک کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور بند ہوگیا۔ میں نے نگاہ اُٹھائی تو دو حنائی انگلیوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ایک لمحہ کے بعد پھر کواڑوں کو جنبش ہوئی۔ میری نگاہیں دیوانہ وار اُس طرف لپکیں۔ مگر دروازہ اب کے بھی بند پایا۔ میں نے دل میں کہا کہ حضور! اگر آپ کی خواہش یہ ہے کہ آپ مجھے دیکھا کریں اور میں آپ کو نہ دیکھوں تو یہ کبھی نہ ہوگا۔ اور میں نے اپنی نظریں بے حیائی کے ساتھ دروازے پر گاڑدیں۔ بلوری چوڑیوں کی کھنکناہٹ، نرم نرم قہقہے، اور باریک نقرئی آوازیں تو میرے کانوں میں آتی رہیں، لیکن آنکھوں نے دو نسائی چہروں کی ایک خفیف سی جھلک کے سوا کچھ نہ دیکھا۔ ایک مرتبہ میں غور سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ قریب کی ڈیوڑھی سے ایک نوجوان شخص نکلا۔ اُس کے جسم پر بنیان اور تہمد کے سوا کچھ نہ تھا۔ انگریزی وضع کے بال تھے۔ داڑھی مونچھ مُنڈی ہوئی تھی۔ عینک لگائے ہوئے تھا ممکن ہے دہلی یونیورسٹی کا گریجویٹ ہو۔ اُس نے گھور کر پہلے مجھے دیکھا اور پھر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا اور پھر دروازے کی طرف دیکھا۔ اور آخر کار میرے جسم پر سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالتا ہوا چلا گیا۔ اگر وہ مجھ سے ذرا بھی کچھ کہتا تو میں پنجے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑجاتا۔ اور گلیوں کی اِس سڑی ہوئی متعفن تہذیب پر گالیوں کی بوچھاڑ کردیتا۔ مگر خیریت ہی ہوئی۔ وہ چُپ چاپ مجھ سے بولے بغیر چلا گیا۔

اُس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد اُسی دروازے میں سے ایک آواز آئی۔ "ارے بھئی، ذرا مُنہ پھیرلینا"! میں اسکا مطلب نہیں سمجھا اور سر جُھکا کر سوچنے لگا کہ یہ عورتیں مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ پھر ایک عورت نے اپنا چہرہ باہر نکالا اور میری نظروں سے نظریں ملا کر کہا۔ "ارے بھئی، ذرا مُنہ پھیرلو، ہم اُدھر جائیں گے"! میں اِس صورتِ حال سے گھبرا گیا اور لپک کر گلی کے نکڑ کی طرف چلا۔ پیچھے جو نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان عورت دوپٹہ اوڑھے شلوار پہنے، لپکتی ہوئی چلی آرہی ہے "مُنہ پھیرے رہو بھئی!" اُس نے کہا اور پھر معلوم نہیں کس گھر میں گھس گئی۔

مجھے اِس دلچسپ واقعے پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ اُسی وقت میں نے دیکھا کہ میرے دوست دوڑے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ آتے ہی اُنہوں نے کہا۔ "معاف کیجئے گا۔ آپکو بہت تکلیف ہوئی"! میں نے کہا "تکلف تو جو ہوئی سو ہوئی، اب آپ یہاں سے باہر نکلیئے"!

ذرا آگے بڑھ کر میں نے اُن سے پوچھا۔ "معلوم ہوتا ہے اس محلے میں زیادہ تر غریب لوگ رہتے ہیں؟"

"نہیں تو" اُنہوں نے جواب دیا۔ "یہ آپنے کیسے سمجھا۔ اجی صاحب! یہاں تو دہلی کے نہایت مالدار تاجر رہتے ہیں"!

"بالکل ٹھیک ہے"! میں اپنے دل میں سوچنے لگا۔ "یہ گویا تصویر کا دوسرا رُخ ہے۔ اگر میں پُر رونق تجارتی بازاروں کے بعد اِن گلیوں کو نہ دیکھتا تو ایک زوال آمادہ طبقے کی زندگی کا مطالعہ نامکمل رہ جاتا"!

اختر انصاری

جاپانی سیاہ خطرہ

ٹوکیو کی حالیہ خبروں میں سے ایک خبر یوں شائع ہوئی :-

"صدر جمعیۃ سیاہ اژدہا اور ایک شاہزادہ اور امیرالبحر کے دستخطوں سے تمام جاپانی قوم کے نام ایک پیغام سیاسی حلقوں میں بم گولے کی طرح آگرا جس میں موجودہ مجلس (وزارت) کو توڑ کر ایک ملی مجلس کے فوری قیام اور تنظیم کا مطالبہ کیا گیا ہے"

ایسی خبروں کو پڑھکر اہلِ ہند کو حیرت ہوگی کہ یہ سیاہ اژدہا کیا بلا ہے اور اس سبھا کے صدر کا اعلان سیاسی حلقوں میں بم گولا کیوں ہوتا ہے؟ اس راز کو سمجھنے کیلئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ جاپان میں بظاہر جو طرزِ حکومت اور قوانین جاری ہوں، باطن میں یہ ملک ایک اور طاقت کا محکوم ہے۔ حقیقی اختیارِ حکومت اسی کے ہاتھ میں ہے جس کے زور سے جاپان کو ملوکانہ اور جابرانہ کارروائی کرنا پڑتی ہے اور جس کی ایک حسرتناک مثال چین پر ناجائز اور جابرانہ اقدام جنگ ہے۔

کسی ملک کی سیاست کو متاثر یا مغلوب کرنے والی طاقتوں میں سے کوئی طاقت دُنیا میں اتنی زبردست اور قاہر نہ ہوگی جتنی یہ جمعیت سیاہ اژدہا ہے۔ شیخ الاموت کے ماتحت باطنی اسماعیلیوں یا حشیشیوں کی ہلاکت باریاں تاریخ کے مشہور سیاہ ابواب میں سے ہیں، شیخ نے جس ہستی کو اپنے مقصد کے لئے مضر سمجھ لیا یا جس نے اس کی جماعت کے خلاف آواز اٹھائی، دوسری صبح کو وہ اپنے بستر پر فدائی کے خنجر کے زخم سے مردہ پایا گیا۔ فدائی بابیوں کا طریق عمل بھی ایک زمانہ میں اسی طور کا تھا۔ مگر ان فدائیوں کی یہ خونخواری اپنی جماعت کے صوابدید سے عمل میں آتی تھی۔ تشکاران کے اعدا واغیار ہوتے تھے۔ خود ان کی قوم ان کی تخویف وتعذیب کا نشانہ نہ بنتی تھی۔ اسی طرح بنگال کے سیاسی مخوفین کی دہشت خیزی بھی کلیتہً اجنبی ارباب حکومت کے افراد اور استثناءً اپنی جماعت کے بعض خائن اور غدار کارکن کی سزا کے لئے مخصوص تھی۔ ایسے نظائر کی جستجو میں زار روس کے عہد میں راس پوٹین کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مگر سیاہ اژدہا کے مقابلہ میں وہ بھی بالکل بے حقیقت اور خفیف ہے۔

جاپانی اربابِ حکومت وسیاست کے سر پر ہر وقت ایک ایسی جماعت کا سایہ مسلط رہتا ہو جو صحیح معنوں میں قاتلوں کا ایک عدیم المثال جتھا ہو۔ یہی ہی جاپانی جمعیت سیاہ اژدہا۔ اس کا لائحہ عمل دُنیا بھر میں سب سے زیادہ دلیرانہ، جابرانہ اور جارحانہ ہے۔ یہ جمعیت جس سیاسی طریق کار کا فیصلہ کردے اس سے سرتابی کی مجال کسی افسر یا مدبر کو نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی رُکن حکومت نے اس فیصلہ کی تعمیل میں ذرا غفلت اور سستی برتی تو وہ ایسے ذرائع سے راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے جن میں قتل بھی داخل ہو۔ جاپان کی خارجی پالیسی کی وضع ونشوونما میں اس کلب کا بہت بڑا دخل رہا ہے۔ یہ جماعت اپنے آپ کو دُنیا میں جاپانی حقوق کا نگراں ومحافظ سمجھتی ہے۔ اس کے زیر اثر جاپان کی خارجی پالیسی حملہ آوری اور جانبازی کے قدموں سے اُچکتی ہوئی پے در پے فتوحات کی شکل میں جلوہ گر ہے۔ کوئی مدبر یا رکن حکومت اس سے

کمزور یا گھٹیا پالیسی اختیار کرے تو اُس کو فوراً سزا دی جاتی ہے۔

جاپان میں آئے دن ہیبت ناک سیاسی قتل کا ارتکاب ہمیشہ اسی جمعیت سیاہ اژدہا کے اشارہ سے ہوا کیا ہے۔ جاپانی رسم ہراکری (خودکشی) جو اس جمعیت کے فدائی بخوشی کر گذرتے ہیں، عوام میں ان کے اثر اور طاقت کی توسیع میں معاون رہی ہے۔ جاپانی قوم اس جتھا کو کسی نفرت یا ہیبت کے عوض ایک حد تک پسندیدگی اور ستایش کی نظر سے دیکھتی اور اسے وطن کے اندر اور باہر جاپان کی عظمت و حرمت کا لحاظ سمجھتی ہے۔

سنہ۱۹۰۴ء میں روسی جاپانی آویزش کا باعث بھی قاتلوں کی جمعیت تھی۔ واشنگٹن کا بحری معاہدہ اسی کلب نے مسترد کر دیا اور وزیر اعظم ریلو ہرا جس نے یہ معاہدہ کیا تھا اسی جتھے کا شکار ہو گیا۔ اسی طرح سنہ۱۹۳۱ء کے بحری معاہدہ لندن کی بدولت وزیر اعظم ہمگنچی کو جان سے گذرنا پڑا۔ اس جمعیت کے ارکان میں بیشتر تعداد بحریہ کے نوجوان افسروں کی ہے۔ جو کسی قوم کے مقابلہ میں اپنی بحری کی پابستی تسلیم کرنا خلاف شان سمجھتے ہیں۔ لندن میں جاپانی نمایندے برطانیہ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ مساوات کے مطالبہ پر کسی درمیانی سمجھوتے کو قبول کرنے کے عوض مجلس سے نکل جانا (واک آوٹ) بہتر سمجھے۔

سب سے آخری اور زیادہ حسرتناک قتل کی وارداتیں سنہ۱۹۳۶ء میں وقوع پذیر ہوئیں جب کہ امیر البحر سیٹو، جنرل جوتارو وتینبے اور وزیر مال مسٹر کورکیو تکاہشی اس جماعت کے غضب کا نشانہ بن گئے۔ گو امیر البحر اوکاڈا خوش قسمتی سے بچ نکلا۔

چند سال ہوئے ایک جاپانی ذمہ دار افسر نے اعلان کیا تھا کہ جاپان کے پیش نظر روئے زمین کی سلطنت ہے اور چین کو اپنی فوجی سواری بنا کر وہ دنیا کی فتح کی مہم پر روانہ ہوگا۔ ہندوستان صریحاً اس کی دوسری منزل ہوگا۔

یہ وہ اقراری مقاصد ہیں جو صاف طور پر سیاہ اژدہا کلب کے قرارداد ہیں۔ اس کی لگام ایک پیر ہشتاد سالہ تویامہ کے ہاتھ میں ہے۔ خود مختار حکمرانوں، دستوری جباروں مثلاً مسولینی، ہٹلر، مصطفیٰ کمال کے احکام کی خلاف ورزی ممکن ہو تو ہو لیکن جاپان کے اس قابض و متصرف حاکم کے کسی حکم کی خلاف ورزی ناممکن اور غایت درجہ خطرناک ہے۔ اس کی جابرانہ و قاہرانہ طاقت کے زیر اثر جاپان کے حوصلے دنیا کی کمزور قوموں کے لئے مسولینی اور ہٹلر کے حوصلوں سے شاید عظیم تر خطرے ثابت ہونے والے ہیں۔ جاپانی حکام اور مدبرین محض کٹھ پتلے ہیں۔ کابینہ کے پیچھے اصل کارفرما طاقت جمعیت سیاہ اژدہا ہے۔

محمد مسلم

میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں تفریح و رُومانیت کی افادیت کا منکر نہیں ہوں، مگر تفریح کسی چیز کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ ادب کی بنیادیں اگر تفریح کی نازک چٹانوں پر رکھی جائینگی تو بہت دن تک عمارت قائم نہ رہ سکے گی، ادب کو تو ایک ٹھوس اور مضبوط بنیاد کی ضرورت ہے، تفریحی عنصر تو اس عمارت پر بس رنگ و روغن کرتا ہے۔ اور کوئی عمارت رنگ و روغن کی بوقلمونی کے سہارے کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اب وقت آگیا ہے کہ اُردو کے بہی خواہ اُردو ادب کے اہم مسائل پر غور کریں، اور یہ غور صرف جلسوں، تقریروں، اور اشتہار بازی کی حد تک پاؤں پھیلا کر ختم نہ ہو جائے، بلکہ اس کو عملی صورت میں جلوہ گر ہونا چاہیئے۔ میں یہاں ایک ضروری چیز بہی خواہان اُردو کے غور و فکر کیلئے پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ شخصیت پرستی کے جذبہ سے ہٹ کر اس پر غور کیا جائے گا۔

اس حقیقت کو سب جانتے ہیں کہ کوئی ادب اس وقت تک مکمل اور اُستوار نہیں ہو سکتا، جب تک اُس کا رسم الخط مکمل اور یکساں نہ ہو۔ لہذا دوسرے مسائل کی طرف قدم بڑھانے سے قبل ہم کو سب سے پہلے اُردو رسم الخط پر توجہ کرنی چاہیئے۔ میں جو کچھ آگے چل کر کہوں گا اُس کو پڑھکر شاید آپ کہیں گے کہ یہ تو بہت ہی معمولی بات ہے مگر بندہ پرور! آپ فیصلہ کرنے میں عجلت نہ فرمائیں، آپ ادب کے اجزائے ترکیبی اور اُس کے اہم پہلوؤں پر غور کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ بات معمولی نہیں، بلکہ بہت زیادہ اہم بات ہے۔ اتنی اہم کہ آپ کو اولین فرصت میں اس پر غور کرنا چاہیئے۔ میں اُوپر کہہ چکا ہوں کہ رسم الخط کی یکسانی رسم الخط کی جان ہے۔ ہمارے یہاں اُردو رسم الخط میں بعض اختلافات پائے جاتے ہیں یعنی ایک ہی لفظ دو طرح سے لکھا جاتا ہے۔ اس اختلاف کو مٹانے اور یکسانی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اِس قسم کے الفاظ کچھ زیادہ نہیں، گنتی کے چند الفاظ ہیں، جن کی ایک نا تمام فہرست نیچے درج کیجاتی ہے۔ جو حضرات رسم الخط کی خصوصیتوں پر نظر رکھتے ہیں اُن کو باہم مشورہ کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کرنا چاہیئے۔ سب کے مشورے سے جو بات طے ہوگی، وہ ضرور کارآمد اور عمومی افادیت کی حامل ہوگی۔

طوطا ۔ توتا ۔
اُس ۔ اوس ۔
اُن ۔ اون ۔
اُٹھانا ۔ اوٹھانا ۔
پہنچنا ۔ پھونچنا ۔
طیار ۔ تیار ۔
پروا ۔ پرواہ ۔
ہاتھ ۔ ہات ۔
مٹ بھیڑ ۔ مڈبھیڑ ۔

رسم الخط کے اختلافات کی یہ ایک نا تمام فہرست ہے، غور و فکر کے بعد چند اور الفاظ بھی اسی قبیل کے نکل آئیں گے۔ میں نے ان الفاظ پر بہت غور و خوض کیا ہے، لہذا ان الفاظ کے متعلق میں اپنے غور و تفکر کا نتیجہ اہلِ تفکر کے سامنے پیش کرنے کی اگر جرات کروں تو نامناسب نہ ہوگا۔ مجھے اپنی کہی ہوئی باتوں پر اصرار نہیں ہے، کہ میرے خیال کو قبول ہی کر لیا جائے، میں تو صرف مشورے کی حیثیت سے اپنے خیالات پیش کر رہا ہوں، اور مشورے کو رد بھی کر دیا جاتا ہے، اور قبول بھی

کرلیا جاتا ہے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ میرے مشورے کا آپ غور و فکر کی نگاہ سے مطالعہ فرمائیں۔

طوطے یا توتے (parrot) کے متعلق یہ اعتراض اپنے اندر بڑا وزن رکھتا ہے کہ طوطے کی "ط" خالص عربی ہے، اگرچہ "ط" اُردو کا حرف بھی ہے، مگر اپنی خصوصیتوں کے اعتبار سے "ط" کے مقابلے میں "ت" خالص اُردو ہے۔ اس لئے توتا لکھنا زیادہ صحیح ہے۔ اس اعتراض کی اہمیت کے اعتراف کے بعد، ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اس لفظ کو عام طور پر کس طرح لکھا جاتا ہے، میرے خیال میں بچانوے فیصدی اُردو لکھنے والے اس کو "طوطا" لکھتے ہیں، اور نگاہیں اسی رسم الخط سے مانوس ہو چکی ہیں۔ طوطے کو "ت" کے ساتھ لکھنے میں اُردو سیکھنے والے بچوں اور مبتدیوں کے لئے ایک مشکل آ کر پڑے گی، "توتا" کے اگر ٹکڑے کئے جائیں تو اُردو کے دو لفظ "تو" اور "تا" خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح "توتا" لکھے جانے میں بچوں کو خواہ مخواہ التباس ہوگا۔ اور "طوطے" کو وہ جس آسانی اور بغیر ذہن و فکر کی تشویش و انتشار کے پڑھ سکیں گے۔ "توتے" کے پڑھنے میں وہ بات نہ ہوگی۔ بچوں کا ذہن ایک قسم کی اُلجھن محسوس کرتا ہے، جب ایک ہی لفظ بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہو، یا ایک ہی رسم الخط کے ہم معنی ٹکڑے کوئی دوسرا لفظ بنا دیتے ہیں۔ لکھنے میں عموماً نقطے چھوٹ جاتے ہیں، اس چیز کو ذہن میں رکھ کر "توتے" کی مختلف صورتیں اتنی بہت سی ہو سکتی ہیں:-

نوتے۔ نوتے۔ تونے۔ لوتے۔

مگر "طوطے" لکھے جانے میں یہ بات پیدا ہی نہیں ہوتی۔ ان وجوہ کی بنا پر میرا مشورہ "طوطے" لکھے جانے کے حق میں ہے۔

عام اصول ہے اور عام اصول کیا بلکہ رسم الخط کی خوبی اس میں ہے کہ کم سے کم حروف سے الفاظ بنیں، پھر اُردو رسم الخط میں "اعراب" حروف کا کام دیتے ہیں، اس صورت میں ہم کو اعراب سے ضرور کام لینا چاہیئے۔ "اُسکے" مقابلے میں "اوس" لکھے جانے میں ایک تو حرف "واؤ" کا اضافہ ہو جاتا ہے، دوسرے شبنم کے معنی میں "اوس" کا املا بھی یہی ہے۔ اس طرح بغیر کسی ناگزیر ضرورت کے دو مختلف المعنی الفاظ بالکل ایک طرح پر لکھے جاتے ہیں۔ اور اس میں بلا وجہ التباس کی ایک شکل نکل آتی ہے۔ حقیقت میں "اوس" لکھنا رسم الخط کی بہت بڑی غلطی ہے یہاں پیش (ـُ) کی حرکت صرف کافی ہے، اگر آپ نے پیش (ـُ) کا "واؤ" سے کام لینا شروع کیا، تو اس قاعدہ کے تحت "بُھس" کو "بھوس" لکھنا ہوگا۔ میرے خیال میں "اُس" لکھنا درست اور رسم الخط کے اصول کے عین مطابق ہے۔

بالکل یہی حال "اُن" اور "اون" کا ہے "اون" لکھے جانے میں تو "اُون" (wool) کا بھی دھوکا ہو سکتا ہے اور "اُن" میں اس التباس کے لئے کوئی گنجائش ہی موجود نہیں ہے۔ اسی طرح "اُٹھانا" کے مقابل "اوٹھانا" لکھنا نامناسب معلوم ہوتا ہے، اور یہاں بھی "واؤ" کا کام (ـُ) سے بآسانی نکل سکتا ہے۔

میں نے اُوپر کہا تھا کہ "کم سے کم حروف میں الفاظ بننا رسم الخط کی خوبی ہے"۔ مگر مشکلات کے مقابلے میں بعض خوبیوں کو نظر انداز بھی کر دیا جاتا ہے، "پھونچنا" کے مقابل "پہنچنا" لکھے جانے میں ایک حرف کی بچت تو ضرور

ہوتی ہے۔ مگر عام طور پر جب رو میں لکھتے ہیں تو "پہنچنا" اور "بھیجنا" یکساں پڑھے جاتے ہیں، اس لئے کہ تیزی کے ساتھ لکھنے میں شوشوں اور نقطوں کا کوئی خیال نہیں کرتا۔ شوشوں اور نقطوں کی باریکیوں کو ذہن میں رکھکر دیکھو تو بھیجنا، پہنچنا، بھیچنا، کا املا کس قدر ملتا جلتا ہے، ان مشکلات کے مدِنظر "پہنچنا" کو "پہونچنا" لکھنا بہت مناسب ہے۔ اس طرح ایک حرف کا ضرور اضافہ ہوگیا، مگر اس اضافہ نے آپ کی کتنی بڑی مشکل کو گھٹا دیا۔

طوطا اور توتے کے بیان میں "ط" اور "ت" سے بحث کی گئی ہے، طیار اور تیار میں بھی اس اصول سے کام لیا جاسکتا تھا، مگر یہاں یہ مشکل آپڑتی ہے، کہ عربی میں "طیار" بہت زیادہ اُڑنے والے کو کہتے ہیں۔ اس طرح "طیار" لکھے جانے میں عربی لفظ کے معنی کا التباس ہوتا ہے۔ اور ہم اس قسم کے التباسات کو جس حد تک رسم الخط اجازت دیگا، گھٹانا چاہتے ہیں۔ اس لئے "تیار" لکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ زیادہ لوگ اسی طرح لکھتے ہیں۔

"پرواہ" میں تو "ہ" بالکل زاید ہے، بعض قدیم شعرا نے "ہ" کو البتہ ظاہر کیا ہے، مگر عام طور پر بولنے میں "ہ" کا اعلان نہیں کیا جاتا۔ "ہ" کے اعلان سے کوئی معنوی یا صوری فائدہ بھی نہیں ہے، اس لئے بلا کسی فائدے کے حرف کا اضافہ کرنا نادرست ہی، لہذا "پروا" لکھنا زیادہ صحیح ہے۔

ہاتھ اور ہات کا مسئلہ قدرے بحث طلب ہی۔ "ہات" لکھنے والے کہتے ہیں کہ بولنے میں "ہ" کا اعلان نہیں کیا جاتا، اس لئے "ہاتھ" لکھنا درست نہیں۔ رسم الخط اور زبان کے مسئلہ میں عام خیال و رجحان، کثرتِ استعمال کا بھی بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ میرے خیال میں قدیم وجدید کتابوں میں زیادہ تر "ہاتھ" لکھا گیا ہے، "ہات" بہت ہی کم جگہ ملے گا۔ ہاتھ کو اگر ہات لکھیں گے، تو یہ ضرور ہوگا کہ شعرا کو "رات اور بات" کے وزن میں ایک قافیہ مل جائیگا، مگر شعرا کے لئے ایک بڑی دقت یہ ہوجائے گی کہ "ساتھ" کے ہم وزن کوئی شگفتہ قافیہ اُردو میں اُن کو غالبًا نہ مِل سکے گا۔ اس کے ماسوا اُردو میں ایسے الفاظ آپ کو ملیں گے، جن میں "ہ" کا اعلان بولنے میں نہیں ہوتا، مگر رسم الخط میں "ہ" لکھی جاتی ہے، جس طرح بولتے ہیں "ہاتی" اور لکھتے ہیں "ہاتھی" میرے خیال میں "ہاتھ" ہی لکھنا مناسب ہے۔

مٹ بھیڑ اور مڈبھیڑ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں صوبہ داری جھگڑا پیدا نہ ہوجائے، مگر اب اِن باتوں پر جھگڑنے کا وقت نہیں رہا۔ ہم کو وسعتِ قلب کے ساتھ رسم الخط اور قواعد کو ایک مرکز پر لانا ہے۔ اس لفظ "مٹ" یا "مڈ" "دو چیزوں کے باہم ملنے" کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اعراب کے اختلاف کے ساتھ ہی لفظ "گڈ مڈ" میں "ڈ" کے ساتھ ملتا ہے صوتی لحاظ سے بھی اس لفظ میں "ٹ" کا تلفظ زیادہ بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ اسلئے وجدان "مڈبھیڑ" کے جواز کا فتویٰ دیتا ہے۔

ایک لفظ ایسا بھی اُردو میں پایا جاتا ہے جس کے متعلق میں رائے دوں گا، کہ اُس میں رسم الخط کے اختلاف کو باقی رکھا جائے؛ یہ لفظ "ہوشیار" ہے، جسے ہم "ہُشیار" بھی لکھتے ہیں۔ یہاں دیکھئے اُن اور اون" میں جو (واو) اور (ہ) کی نزاع پائی جاتی ہے، اُس کا انطباق یہاں نہیں ہوسکتا۔ اس اختلاف سے سب سے بڑا فائدہ تو شاعری کو پہونچتا ہے۔ کہ وزن کے لحاظ سے دونوں صورتوں سے

فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے، اور یہ فائدہ کوئی معمولی فائدہ نہیں ہے۔ پھر بولتے ہیں "ہوشیار" کے "واؤ" اور "ہشیار" کے "پیش" (ہُ) سے مختلف خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ اسلئے میری رائے ہو کہ ہوشیار اور ہشیار دونوں طرح لکھے جانے چاہئیں۔

میں آخر میں پھر عرض کرتا ہوں، کہ اربابِ فکر رسم الخط کے ان اختلافات پر غور فرمائیں اور مشورے کے بعد فیصلہ صادر کریں، جب اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر اور مضمون نگار اس فیصلہ کی پابندی کریں گے تو چند دن میں اختلافات خود بخود مٹ جائیں گے، یہ اختلافات نہ کوئی مذہبی اختلافات ہیں اور نہ صوبہ واری ہیں، ان کا مٹ جانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ بس اربابِ فکر کے ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت ہے۔

مختلف صوبوں میں جو لسانی اختلافات پائے جاتے ہیں، اُن کے متعلق بھی بعض چیزیں میرے ذہن میں ہیں، جنپر فرصت و اطمینان کیساتھ اظہارِ خیال کروں گا۔"

ماہر القادری

سانیٹ

خوابوں کا مندر

نظر آتا نہیں ہے کوئی ساحل بحرِ ہستی کا۔
لکیریں ڈالتا جاتا ہوں کشتی کھینا جاتا ہوں
تخیّل کے حسیں پردوں پہ نقشے سے بناتا ہوں
اِنہیں نقشوں میں بھر دیتا ہوں پھر میں رنگ مستی کا

سمندر کے بہت اُس پار اک خوابوں کا مندر ہے
فرشتے جس کے درشن کی تمنا لیکے آتے ہیں
جہاں حسن و محبت مست ہو کر گیت گاتے ہیں
جہاں خوابوں کا مندر ہے وہ دنیا کتنی سُندر ہے

اِسی فردوس کی دیوی مرے سپنوں کی رانی ہے
مری حدِّ نظر پر یہ طلسم آب ہے کوئی
یہ مندر ہے کہ دُنیائے حسیں کا خواب ہے کوئی
مری ساری مسافت ایک سپنا اِک کہانی ہے

مگر یہ آرزو ہے میں بھی نقشِ آب ہو جاؤں ؛ اِسی خوابِ حسیں میں جذب ہو کر خواب ہو جاؤں

نیاز حیدر

ڈھیٹ

وہ :- عورت خواہ کتنا ہی بلند مرتبہ پائے۔ بڑے سے بڑا کام انجام دے لیکن پھر وہ عورت ہی۔ ایک کمزور ہستی۔

میں :- تھوڑی دیر کے لئے مانو کہ میں یقین نہیں کرتی۔ تب۔

وہ :- تمہارے ماننے اور نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ دنیا کہتی ہے۔ بڑے بڑے علمائے دین اور فلسفیوں کے قول دیکھ لو۔

میں :- میں تب بھی نہ مانوں تو ؟

وہ :- تو یہ تمہاری زبردستی ہے۔

میں :- تمہیں کامل یقین ہے کہ یہ میری زبردستی ہی ؟

وہ :- اور نہیں تو کیا ؟

میں :- تو تم مان گئے کہ میں زبردست ہوں۔ اب تو یقین ہوا کہ ہماری کمزوری کی ساری افواہیں غلط ہیں۔

وہ :- واہ۔

میں :- کہدو کہ "کٹ حجتی" کرتی ہو۔ کہدو نا۔

وہ :- خواہ مخواہ لڑتی ہو۔ یہ تو تمہاری ہمیشہ سے عادت رہی ہے۔ ہٹاؤ ان جھگڑوں کو۔ مگر تمہیں تو ہمیشہ سے لڑائی دنگا اچھا لگتا ہے۔ یاد ہے (آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوگئی) بچپن کا بھولا بھالا زمانہ ؟ کتنا دلفریب وقت تھا۔ کاش پھر وہی ہنسی خوشی اور بے فکری کے دن لوٹ کر آجائیں۔ یاد ہے تمہیں جب ہم تم املی کے درخت کے نیچے گھروندے بنا بنا کر کھیلا کرتے تھے ؟

میں :- اور تم سے لڑ کر میں گھر نوچ کھسوٹ کر چل دیتی تھی۔ ایں ؟

وہ :- (ہنسکر) ہاں۔ مگر ایکدن تو تم بُری طرح لپٹ گئیں اور میرا مُنہ کھسوٹ ڈالا (اور ہنسکر) اور اُلٹی میری ہی شکایت کردی۔

میں :- تمہارا گُرتا بھی تو نُوچ ڈالا تھا۔ پھر اُلٹی تم نے ہی خوشامد کی۔

وہ :- (اور بھی زیادہ ہنستے ہوئے) ہاں۔ ہاں۔ اور پھر وہ یاد ہے۔ وہ جو ہم نے تم نے آپا کا صابُن چُرا کر بلّی کے بلّوں کو نہلایا تھا۔ جسپر آپا جان نے خوب کان اینٹھے تھے۔

میں :- اور وہ بھی جب ہم تم بیروں پر لڑتے تھے۔

وہ :- (ہنسی سے بیتاب ہوکر) اوہ ..... ہاں۔ اور جب مکھن روٹی بچھونے میں چھپا کر کھایا تھا۔

میں :- تب ابّا جان نے صبح کا ناشتہ کاٹ دیا تھا۔

وہ :- ہاں۔ ہاں۔

میں :- تو تمہیں یہ سب باتیں یاد کرکے ..... کچھ شرمندگی ہوتی ہے۔

وہ :- ایں ..... کیا۔ نہیں تو یہ تو بچپن کی سہاونی شرارتیں تھیں۔ جن کی یاد ....

میں :- بھلا ان شرارتوں میں سہانے پن کی کیا بات تھی۔

وہ :- واہ۔ کیا تمہیں بچپن نہیں یاد آتا۔

میں :- آتا کیوں نہیں۔

وہ :- پھر ؟

میں :- پھر یہی کہ افسوس ہوتا ہے۔ بُرا لگتا ہے کہ ایسے بیوقوف کیوں تھے۔ بھلا اس میں سہاونا پن کیا ہوسکتا ہے۔ املی کے پیڑ کے نیچے گھروندے بنانا ..... نوچ کھسوٹ ..... بیروں پر

مارکٹائی۔ چُپکے چُپکے بستر میں چھپ کر مکھن کھانا۔ اور پھر پٹنا۔ جو کہ بچپن کی سب سے غیر سُہاونی شے ہے..... سب بیہودگیاں تھیں۔ اور شکر ہے کہ وہ نالائق زمانہ گذر گیا اور کبھی نہ آئے گا۔

وہ:۔ واہ بچپن کی ہر بات بھولی ہوتی ہے۔

میں:۔ بھولپن کونسا کمال ہے۔ ہر پاگل اور بیوقوف آدمی ساری عمر بھولا رہتا ہے۔ تمہاری نظروں میں وہ بہت ہی خوش نصیب ہے۔ پھر بن جاؤ نا بھولے۔

وہ:۔ تم تو کج بحثی کرنے لگتی ہو۔ بچپن میں اور پاگل پن میں بہت فرق ہے۔ ہم تم بڑی سمجھ کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ میں ڈپٹی صاحب بنتا تھا اور تم بیگم صاحبہ بنتی تھیں۔

میں:۔ تم نے تو مجھے اور بھی بچپن سے نفرت دلادی۔

وہ:۔ کیوں؟

میں:۔ میں نے تم سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ بھئی اس پاجی لفظ "کیوں" کو اس طرح میرے سر پر نہ پٹخ دیا کرو۔

وہ:۔ یعنی؟

میں:۔ لو۔ یہ تم نے اُس سے بھی بیہودہ اور مُہمل لفظ نکالا۔ اُکھ۔

وہ:۔ تم تو عجیب باتیں کرتی ہو۔ کیا یہ ہماری ذہانت کا ثبوت نہ تھا کہ ہم تم بزرگوں کے طے کئے ہوئے رشتہ کو کس بھولپن اور عقلمندی سے ذہن نشین کر چکے تھے۔

میں:۔ قطعی بھولپن۔ لیکن عقلمندی سے نہیں۔

وہ:۔ ہیں؟ یعنی؟ میرا مطلب ہے کہ کیوں نہیں۔

میں:۔ مطلب یہ کہ ہم تم جب بھولے تھے۔ تب تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن تم تو ویسے ہی "بھولے اور سُہاونے" ہو۔ مگر میں بڑی ہو گئی۔ کچھ بنتی نہیں بات!

وہ:۔ کیا۔ اس سے تمہارا مطلب ہے کہ جو رشتہ ہمارے تمہارے درمیان بچپن سے قائم ہے تکمیل کو نہیں پہونچنا چاہیئے۔

میں:۔ یعنی؟

وہ:۔ یعنی کیا؟

میں:۔ یہ لیجئے۔ آپ تو جب چاہیں "یعنی" "کیوں" کہہ کر مجھ سے لمبے چوڑے جواب وصول کریں۔ اور میں کہوں تو چکرائیں۔

وہ:۔ تم تو.......

میں:۔ کٹ حُجتی کرتی ہو۔ یہی کہنے والے تھے نا تم؟

وہ:۔ مجھے آج تک شُبہ بھی نہ ہوا تھا کہ تم اس رشتے کو ناپسند کرتی ہو۔

میں:۔ اور شُبہ ہونے کی وجہ بھی کیا؟

وہ:۔ تمہیں تو کہہ رہی تھیں کہ.......

میں:۔ کیا؟ کیا؟

وہ:۔ نہ معلوم کیا کہتی تھیں۔

میں:۔ اللہ رے بھولپن! تمہارے ہی دل میں کوئی ایسا ویسا خیال آیا ہوگا میرے سر تھوپ رہے ہو۔ واضح رہے کہ ہم بھی تھوڑی سی عقل رکھتے ہیں۔

وہ:۔ بیوقوف تو میں ہی ہوں جو ابتک اس دھوکے میں تھا۔

میں:۔ یعنی یہ جو ہماری منگنی تھی یہ "دھوکا" تھا۔ تم بزرگوں تک پہنچ رہے ہو۔ پتہ ہے یہ "دھوکا" دادا ابّا کا قائم کیا ہوا ہے۔ میں تو تمہیں ایسا نہ سمجھتی تھی۔ ٹھیکرے کی مانگ بڑی پکّی ہوتی ہے جناب!

وہ:۔ (کھسیا کر) تم مجھے ہر وقت بیوقوف سمجھتی ہو۔

میں:۔ توبہ توبہ۔ لیکن اگر سمجھوں بھی تو کیا ہوا؟ منگنی شادی میں عقلمند اور بیوقوف کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔

یہ تو ایک روحانی رشتہ ہے۔ جس کا فیصلہ خدا نے پہلے ہی آسمان پر کر دیا ہے۔

وہ:۔ یعنی یہ کہ بیوی میاں کو اُلّو سمجھتی رہے؟

میں:۔ اس میں مضائقہ ہی کیا ہے؟

وہ:۔ بھلا ایسے گھر میں نباہ کیسے ہوگا۔

میں:۔ نباہ؟ نباہ ایسے ہوگا۔ تم کما کر لانا اور میں نہایت سلیقے سے خرچ کروں گی۔ تم ڈپٹی صاحب ہو گے اور میں بیگم صاحبہ۔ مزے سے رہیں گے۔

وہ:۔ معاف کرنا تم ذرا بے شرمی پر اُتر آئی ہو آج۔

میں:۔ اس میں بے شرمی کیا ہے؟ تمہیں تو اُس روز کہہ رہے تھے کہ "ہماری زندگی بڑے سکون سے گذریگی۔ تم مندر کی دیوی ہوگی اور میں پجاری۔ یہ ہوگا۔ وہ ہوگا۔" جو آج میں نے کہا تو بُرا مان گئے۔ آج کچھ دل میں ٹھان کر ہی آئے ہو۔

وہ:۔ اگر میں کچھ کہوں تو وہ اور بات ہے۔ میں مرد ہوں۔

میں:۔ مجھے اس بات کا یقین ہے۔

وہ:۔ تم بدتمیز بھی ہو۔ آج تک میں کتنے دھوکے میں تھا۔ شکر ہے کہ جلدی آنکھیں کھل گئیں۔

میں:۔ یعنی؟

وہ:۔ یعنی؟ اب تم کتنی دفعہ "یعنی" کہہ چکی ہو۔

میں:۔ کبھی ناؤ ندی پر کبھی ندی ناؤ پر۔ آگے کہو کیا آنکھیں کھل گئیں۔

وہ:۔ یہی کہ ہماری تمہاری نہیں بن سکتی۔

میں:۔ نہیں کیوں بن سکتی؟ کہیں تمہارا یہ تو مطلب نہیں ہے کہ منگنی ہی ختم۔

وہ:۔ یقیناً۔

میں:۔ تم ٹھیکرے کی منگنی توڑ دو گے؟

وہ:۔ بے شک!

میں:۔ مگر میں تو یہ نہیں چاہتی۔ میں تو تم سے ہی شادی کرنا چاہتی ہوں۔

وہ:۔ مگر میں تو قطعی نہیں چاہتا۔

میں:۔ تم تو دیوانے ہو۔ آخر وجہ کیا؟

وہ:۔ فرض کرو مجھے تم پسند نہیں۔

میں:۔ پھر اور کون بدنصیب پسند آئی۔

وہ:۔ کوئی ہو یا نہ ہو مجھے تم پسند نہیں آسکتیں (حد سے زیادہ چڑ کر)

میں:۔ مگر مجھے تو تم پسند ہو۔

وہ:۔ لاحول ولاقوۃ، کیا بے حیائی ہے۔ کوئی مرد ایک لڑکی کو یوں ٹھکرائے اور وہ ذرا بھی خودداری نہ رکھتے ہوئے مُصر ہو۔

میں:۔ اور تم جو اُس دن کہتے تھے کہ اگر تم مجھ سے خدانخواستہ شادی نہ کرو تو میں دیوانہ ہو جاؤں۔

وہ:۔ میں مرد ہوں۔

میں:۔ دیکھو ایک دفعہ کہہ چکی کہ مجھے پُختہ یقین ہے کہ تم مرد ہو۔ اب جو کچھ کہوں گی تو جل جاؤ گے۔

وہ:۔ مرد چاہیں جو کچھ کریں۔ مگر عورت اگر اظہارِ محبّت یوں دیدہ دلیری سے کرے تو اُسے معیوب سمجھتے ہیں۔ کُجا۔

میں:۔ قطع کلام ہوتا ہے۔ پھر کیسے اظہار کریں؟ اب اظہار کا بھی نیا طریقہ ایجاد کریں؟ اگر تمہیں میرے عشق میں دیوانہ ہونے کا پورا پورا حق حاصل ہے تو کسی کی مجال نہیں کہ مجھے تمہارے لئے اپنا گلا گھوٹنے سے روکے۔ میں جس طرح چاہوں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ کوئی ہوتا کون ہے؟ واہ!

وہ کہیں گے آپ چند منٹ انتظار نہ کرسکے۔ اور مجھے چھوڑ کر چلے آئے۔ غرض کہ پھر وہی گلی تھی اور وہی میری چہل قدمی!

دو چار منٹ گزرے ہونگے کہ ایک نئی دلچسپی پیدا ہوئی۔ جن مکانوں کے آگے میں ٹہل رہا تھا اُن میں سے ایک کا دروازہ آہستہ سے کُھلا اور بند ہوگیا۔ میں نے نگاہ اُٹھائی تو دو حِنائی انگلیوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ایک لمحہ کے بعد پھر کواڑوں کو جُنبش ہوئی۔ میری نگاہیں دیوانہ وار اُس طرف لپکیں۔ مگر دروازہ اب کے بھی بند پایا۔ میں نے دل میں کہا کہ حضور! اگر آپ کی خواہش یہ ہے کہ آپ مجھے دیکھا کریں اور میں آپ کو نہ دیکھوں تو یہ کبھی نہ ہوگا۔ اور میں نے اپنی نظریں بے حیائی کے ساتھ دروازے پر گاڑدیں۔ بلوری چوڑیوں کی کھنکناہٹ، نرم نرم قہقہے، اور باریک نقرئی آوازیں تو میرے کانوں میں آتی رہیں، لیکن آنکھوں نے دو نسائی چہروں کی ایک خفیف سی جھلک کے سوا کچھ نہ دیکھا۔ ایک مرتبہ میں غور سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ قریب کی ڈیوڑھی سے ایک نوجوان شخص نکلا۔ اُس کے جسم پر بنیان اور تہمد کے سوا کچھ نہ تھا۔ انگریزی وضع کے بال تھے۔ داڑھی مونچھ مُنڈی ہوئی تھی۔ عینک لگائے ہوئے تھا ممکن ہے دہلی یونیورسٹی کا گریجویٹ ہو۔ اُس نے گھُور کر پہلے مجھے دیکھا اور پھر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا اور پھر دروازے کی طرف دیکھا۔ اور آخرکار میرے جسم پر سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالتا ہوا چلا گیا۔ اگر وہ مجھ سے ذرا بھی کچھ کہتا تو میں پنجے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑجاتا۔ اور گلیوں کی اِس سڑی ہوئی متعفن تہذیب پر گالیوں کی بوچھاڑ کردیتا۔ مگر خیریت ہی ہوئی۔ وہ چُپ چاپ مجھ سے بولے بغیر چلا گیا۔

اُس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد اُسی دروازے میں سے ایک آواز آئی۔ "ارے بھئی، ذرا مُنہ پھیر لینا"۔ میں اسکا مطلب نہیں سمجھا اور سر جُھکا کر سوچنے لگا کہ یہ عورتیں مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ پھر ایک عورت نے اپنا چہرہ باہر نکالا اور میری نظروں سے نظریں مِلا کر کہا۔ "ارے بھئی، ذرا مُنہ پھیر لو، ہم اُدھر جائیں گے"۔ میں اِس صورتِ حال سے گھبرا گیا اور لپک کر گلی کے نُکڑ کی طرف چلا۔ پیچھے جو نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نوجوان عورت دوپٹہ اوڑھے شلوار پہنے، لپکتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ "منہ پھیرے رہو بھئی!" اُس نے کہا اور پھر معلوم نہیں کس گھر میں گھُس گئی۔

مجھے اِس دلچسپ واقعے پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کیونکہ اُسی وقت میں نے دیکھا کہ میرے دوست دوڑے ہوتے چلے آرہے ہیں۔ آتے ہی اُنہوں نے کہا۔ "معاف کیجئے گا۔ آپکو بہت تکلیف ہوئی"۔ میں نے کہا۔ "تکلیف تو جو ہوئی سو ہوئی، اب آپ یہاں سے باہر نکلیئے"۔

ذرا آگے بڑھ کر میں نے اُن سے پوچھا۔ "معلوم ہوتا ہے اس محلے میں زیادہ تر غریب لوگ رہتے ہیں؟"

"نہیں تو"۔ اُنہوں نے جواب دیا۔ "یہ آپ نے کیسے سمجھا۔ ارے صاحب! یہاں تو دہلی کے نہایت مالدار تاجر رہتے ہیں"۔

"بالکل ٹھیک ہے"۔ میں اپنے دل میں سوچنے لگا۔ "یہ گویا تصویر کا دوسرا رُخ ہے۔ اگر میں پُر رونق تجارتی بازاروں کے بعد اِن گلیوں کو نہ دیکھتا تو ایک زوال آمادہ طبقے کی زندگی کا مطالعہ نامکمل رہ جاتا"۔

اختر انصاری

جاپانی سیاہ خطرہ

ٹوکیو کی حالیہ خبروں میں سے ایک خبر یوں شائع ہوئی :-

"صدر جمعیتہ سیاہ اژدہا اور ایک شاہزادہ اور امیر البحر کے دستخطوں سے تمام جاپانی قوم کے نام ایک پیغام سیاسی حلقوں میں بم گولے کی طرح آگرا جس میں موجودہ مجلس (وزارت) کو توڑ کر ایک نئی مجلس کے فوری قیام اور تنظیم کا مطالبہ کیا گیا ہے"

ایسی خبروں کو پڑھکر اہلِ ہند کو حیرت ہوگی کہ یہ سیاہ اژدہا کیا بلا ہے اور اس سبھا کے صدر کا اعلان سیاسی حلقوں میں بم گولا کیوں ہوتا ہے؟ اس راز کو سمجھنے کیلئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ جاپان میں بظاہر جو طرزِ حکومت اور قوانین جاری ہوں، باطن میں یہ ملک ایک اور طاقت کا محکوم ہے۔ حقیقی اختیارِ حکومت اسی کے ہاتھ میں ہے جس کے زور سے جاپان کو ملوکانہ اور جابرانہ کارروائی کرنا پڑتی ہے اور جس کی ایک حسرتناک مثال چین پر ناجائز اور جابرانہ اقدام جنگ ہی۔

کسی ملک کی سیاست کو متاثر یا مغلوب کرنے والی طاقتوں میں سے کوئی طاقت دُنیا میں اتنی زبردست اور قاہر نہ ہوگی جتنی یہ جمعیت سیاہ اژدہا ہے۔ شیخ الجبل کے ماتحت باطنی اسماعیلیوں یا حشیشیوں کی ہلاکت بار باں تاریخ کے مشہور سیاہ ابواب میں سے ہیں، شیخ نے جس ہستی کو اپنے مقصد کے لئے مضر سمجھ لیا یا جس نے اس کی جماعت کے خلاف آواز اٹھائی، دوسری صبح کو وہ اپنے بستر پر فدائی کے خنجر کے زخم سے مردہ پایا گیا۔ فدائی بابیوں کا طریق عمل بھی ایک زمانہ میں اسی طور کا تھا۔ مگر ان فدائیوں کی یہ خونخواری اپنی جماعت کے صوابدید سے عمل میں آتی تھی۔ ٹھکاران کے اعدا اغیار ہوتے تھے۔ خود ان کی قوم ان کی تخویف و تعذیب کا نشانہ نہ بنتی تھی۔ اسی طرح بنگال کے سیاسی مخوفین کی دہشت خیزی بھی کلیتہً اجنبی اربابِ حکومت کے افراد اور استثنائاً اپنی جماعت کے بعض خائن اور غدار کارکن کی سزا کے لئے مخصوص تھی۔ ایسے نظائر کی جستجو میں زارِ روس کے عہد میں راس پوٹین کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مگر سیاہ اژدہا کے مقابلہ میں وہ بھی بالکل بے حقیقت اور خفیف ہے۔

جاپانی اربابِ حکومت و سیاست کے سر پر ہر وقت ایک ایسی جماعت کا سایہ مسلط رہتا ہی جو صحیح معنوں میں قاتلوں کا یک عدیم المثال جتھا ہی۔ یہی ہی جاپانی جمعیت سیاہ اژدہا۔ اس کا لائحہ عمل دُنیا بھر میں سب سے زیادہ دلیرانہ، جابرانہ اور جارحانہ ہے۔ یہ جمعیت جس سیاسی طریق کار کا فیصلہ کر دے اس سے سرتابی کی مجال کسی افسر یا مدبّر کو نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی رُکن حکومت نے اس فیصلہ کی تعمیل میں ذرا غفلت اور سستی برتی تو وہ ایسے ذرائع سے راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے جن میں قتل بھی داخل ہی۔ جاپان کی خارجی پالیسی کی وضع و نشوونما میں اس کلب کا بہت بڑا دخل رہا ہے۔ یہ جماعت اپنے آپ کو دُنیا میں جاپانی حقوق کا نگراں و محافظ سمجھتی ہے۔ اس کے زیرِ اثر جاپان کی خارجی پالیسی حملہ آوری و جانبازی کے قدموں سے اُچکتی ہوئی پے در پے فتوحات کی شکل میں جلوہ گر ہے۔ کوئی مدبّر یا رکن حکومت اس سے

کمزور یا گھٹیا پالیسی اختیار کرے تو اُس کو فوراً سزا دی جاتی ہے۔

جاپان میں آئے دن بہت ہیبت ناک سیاسی قتل کا ارتکاب ہمیشہ اسی جمعیت سیاہ اژدہا کے اشارہ سے ہوا کیا ہے جاپانی رسم ہراکری (خودکشی) جو اس جمعیت کے فدائی بخوشی کرگذرتے ہیں، عوام میں ان کے اثر اور طاقت کی توسیع میں معاون رہی ہے۔ جاپانی قوم اس جتھا کو کسی نفرت یا ہیبت کے عوض ایک حد تک پسندیدگی اور ستایش کی نظر سے دیکھتی اور اسے وطن کے اندر اور باہر جاپان کی عظمت وحرمت کا لحاظ سمجھتی ہے۔

۱۹۰۴ء میں روسی جاپانی آویزش کا باعث بھی قاتلوں کی جمعیت تھی۔ واشنگٹن کا بحری معاہدہ اسی کلب نے مسترد کر دیا اور وزیر اعظم ریلوہیرا جس نے یہ معاہدہ کیا تھا اسی جتھے کا شکار ہوگیا۔ اسی طرح ۱۹۳۱ء کے بحری معاہدہ لندن کی بدولت وزیر اعظم ہمگنچی کو جان سے گذرنا پڑا۔ اس جمعیت کے ارکان میں بیشتر تعداد بحریہ کے نوجوان افسروں کی ہے۔ جو کسی قوم کے مقابلہ میں اپنی بحری کی پستی تسلیم کرنا خلاف شان سمجھتے ہیں۔ لندن میں جاپانی نمایندے برطانیہ اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ مساوات کے مطالبہ پر کسی درمیانی سمجھوتے کو قبول کرنے کے عوض مجلس سے نکل جانا (واک آوٹ) بہتر سمجھے۔

سب سے آخری اور زیادہ حسرتناک قتل کی وارداتیں ۱۹۳۶ء میں وقوع پذیر ہوئیں جب کہ امیر البحر سیٹو، جنرل جونارو دتینے اور وزیر مال مسٹر کورکیو تکاہشی اس جماعت کے غضب کا نشانہ بن گئے۔ گو امیر البحر اوکاڈا خوش قسمتی سے بچ نکلا۔

چند سال ہوئے ایک جاپانی ذمہ دار افسر نے اعلان کیا تھا کہ جاپان کے پیش نظر روئے زمین کی سلطنت ہے اور چین کو اپنی فوجی سواری بنا کر وہ دُنیا کی فتح کی مہم پر روانہ ہوگا۔ ہندوستان صریحًا اس کی دوسری منزل ہوگا۔

یہ وہ اقراری مقاصد ہیں جو صاف طور پر سیاہ اژدہا کلب کے قرار دادہ ہیں۔ اس کی لگام ایک پیر ہشتاد سالہ تویامہ کے ہاتھ میں ہے۔ خود مختار حکمرانوں، دستوری جباروں مثلاً مسولینی، ہٹلر، مصطفیٰ کمال کے احکام کی خلاف ورزی ممکن ہو تو ہو لیکن جاپان کے اس قابض ومتصرف حاکم کے کسی حکم کی خلاف ورزی ناممکن اور غایت درجہ خطرناک ہے۔ اس کی جابرانہ وقاہرانہ طاقت کے زیر اثر جاپان کے حوصلے دُنیا کی کمزور قوموں کے لئے مسولینی اور ہٹلر کے حوصلوں سے شاید عظیم تر خطرے ثابت ہونے والے ہیں۔ جاپانی حکام اور مدبرین محض کٹھ پتلے ہیں۔ کابینہ کے پیچھے اصل کارفرما طاقت جمعیت سیاہ اژدہا ہے۔

محمد مسلم

میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں تفریح و رومانیت کی افادیت کا منکر نہیں ہوں، مگر تفریح کسی چیز کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ ادب کی بنیادیں اگر تفریح کی نازک چٹانوں پر رکھی جائینگی تو بہت دن تک عمارت قائم نہ رہ سکے گی، ادب کو تو ایک ٹھوس اور مضبوط بنیاد کی ضرورت ہے، تفریحی عنصر تو اس عمارت پر بس رنگ و روغن کرتا ہے۔ اور کوئی عمارت رنگ و روغن کی بوقلمونی کے سہارے کھڑی نہیں رہ سکتی۔ اب وقت آگیا ہے کہ اُردو کے بہی خواہ اُردو ادب کے اہم مسائل پر غور کریں، اور یہ غور صرف جلسوں، تقریروں، اور اشتہار بازی کی حد تک پاؤں پھیلا کر ختم نہ ہو جائے، بلکہ اس کو عملی صورت میں جلوہ گر ہونا چاہیئے۔ میں یہاں ایک ضروری چیز بہی خواہان اُردو کے غور و فکر کیلئے پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ شخصیت پرستی کے جذبہ سے ہٹ کر اس پر غور کیا جائے گا۔

اس حقیقت کو سب جانتے ہیں کہ کوئی ادب اس وقت تک مکمل اور اُستوار نہیں ہوسکتا، جب تک اُس کا رسم الخط مکمل اور یکساں نہ ہو۔ لہذا دوسرے مسائل کی طرف قدم بڑھانے سے قبل ہم کو سب سے پہلے اُردو رسم الخط پر توجہ کرنی چاہیئے۔ میں جو کچھ آگے چل کر کہوں گا اُس کو پڑھکر شاید آپ کہیں گے کہ یہ تو بہت ہی معمولی بات ہے مگر بندہ پرور! آپ فیصلہ کرنے میں عُجلت نہ فرمائیں، آپ ادب کے اجزائے ترکیبی اور اُس کے اہم پہلوؤں پر غور کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ بات معمولی نہیں، بلکہ بہت زیادہ اہم بات ہے۔ اتنی اہم کہ آپ کو اولین فرصت میں اس پر غور کرنا چاہیئے۔ میں اُوپر کہہ چکا ہوں کہ رسم الخط کی یکسانی رسم الخط کی جان ہے۔ ہمارے یہاں اُردو رسم الخط میں بعض اختلافات پائے جاتے ہیں، یعنی ایک ہی لفظ دو طرح سے لکھا جاتا ہے، اس اختلاف کو مٹانے اور یکسانی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اِس قسم کے الفاظ کچھ زیادہ نہیں، گنتی کے چند الفاظ ہیں، جن کی ایک ناتمام فہرست نیچے درج کیجاتی ہے۔ جو حضرات رسم الخط کی خصوصیتوں پر نظر رکھتے ہیں، اُن کو باہم مشورہ کے ساتھ اس مسئلہ کو حل کرنا چاہیئے۔ سب کے مشورے سے جو بات طے ہوگی، وہ ضرور کارآمد اور عمومی افادیت کی حامل ہوگی۔

طوطا۔ توتا۔
اُس۔ اوس۔
اُن۔ اون۔
اُٹھانا۔ اوٹھانا۔
پہنچنا۔ پھونچنا۔
طیار۔ تیار۔
پروا۔ پرواہ۔
ہاتھ۔ ہات۔
مٹ بھیڑ۔ مڈبھیڑ۔

رسم الخط کے اختلافات کی یہ ایک ناتمام فہرست ہے، غور و فکر کے بعد چند اور الفاظ بھی اسی قبیل کے نکل آئیں گے۔ میں نے ان الفاظ پر بہت غور و خوض کیا ہے، لہذا ان الفاظ کے متعلق میں اپنے غور و تفکر کا نتیجہ اہلِ تفکر کے سامنے پیش کرنے کی اگر جرات کروں تو نامناسب نہ ہوگا۔ مجھے اپنی کہی ہوئی باتوں پر اصرار نہیں ہے، کہ میرے خیال کو قبول ہی کر لیا جائے، میں تو صرف مشورے کی حیثیت سے اپنے خیالات پیش کر رہا ہوں، اور مشورے کو رد بھی کر دیا جاتا ہے، اور قبول بھی

کرلیا جاتا ہے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ میرے مشورے کا آپ غور و فکر کی نگاہ سے مطالعہ فرمائیں۔

طوطے یا توتے (parrot) کے متعلق یہ اعتراض اپنے اندر بڑا وزن رکھتا ہے کہ طوطے کی "ط" خالص عربی ہے، اگرچہ "ط" اُردو کا حرف بھی ہو، مگر اپنی خصوصیتوں کے اعتبار سے "ط" کے مقابلے میں "ت" خالص اُردو ہے۔ اس لئے "توتا" لکھنا زیادہ صحیح ہے۔ اس اعتراض کی اہمیت کے اعتراف کے بعد، ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اس لفظ کو عام طور پر کس طرح لکھا جاتا ہے، میرے خیال میں ننانوے فیصدی اُردو لکھنے والے اس کو "طوطا" لکھتے ہیں، اور نگاہیں اسی رسم الخط سے مانوس ہو چکی ہیں۔ طوطے کو "ت" کے ساتھ لکھنے میں اُردو سیکھنے والے بچوں اور مبتدیوں کے لئے ایک مشکل آ کر پڑے گی۔ "توتا" کے اگر ٹکڑے کئے جائیں تو اُردو کے دو لفظ "تو" اور "تا" خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طرح "توتا" لکھے جانے میں بچوں کو خواہ مخواہ التباس ہوگا۔ اور "طوطے" کو وہ جس آسانی اور بغیر ذہن و فکر کی تشویش و انتشار کے پڑھ سکیں گے۔ "توتے" کے پڑھنے میں وہ بات نہ ہوگی۔ بچوں کا ذہن ایک قسم کی اُلجھن محسوس کرتا ہے، جب ایک ہی لفظ بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہو، یا ایک ہی رسم الخط کے ہم معنی ٹکڑے کوئی دوسرا لفظ بنا دیتے ہیں۔ لکھنے میں عموماً نقطے چھوٹ جاتے ہیں، اس چیز کو ذہن میں رکھ کر "توتے" کی مختلف صورتیں اتنی بہت سی ہو سکتی ہیں:۔

نوتے۔ نونے۔ تونے۔ لونے۔

مگر "طوطے" لکھے جانے میں یہ بات پیدا ہی نہیں ہوتی۔ ان وجوہ کی بنا پر میرا مشورہ "طوطے" لکھے جانے کے حق میں ہے۔

عام اصول ہے اور عام اصول کیا بلکہ رسم الخط کی خوبی اس میں ہے کہ کم سے کم حروف سے الفاظ بنیں، پھر اُردو رسم الخط میں "اعراب" حروف کا کام دیتے ہیں، اس صورت میں ہم کو اعراب سے ضرور کام لینا چاہیئے۔ "اُسکے" مقابلے میں "اوس" لکھے جانے میں ایک تو حرف "واؤ" کا اضافہ ہو جاتا ہے، دوسرے شبنم کے معنی میں "اوس" کا املا بھی یہی ہے۔ اس طرح بغیر کسی ناگزیر ضرورت کے دو مختلف المعنی الفاظ بالکل ایک طرح پر لکھے جاتے ہیں۔ اور اس میں بلا وجہ التباس کی ایک شکل نکل آتی ہے۔ حقیقت میں "اوس" لکھنا رسم الخط کی بہت بڑی غلطی ہے، یہاں پیش (ـُ) کی حرکت صرف کافی ہے، اگر آپ نے پیش (ـُ) کا "واؤ" سے کام لینا شروع کیا، تو اس قاعدہ کے تحت "بُھس" کو "بھوس" لکھنا ہوگا۔ میرے خیال میں "اُس" لکھنا درست اور رسم الخط کے اصول کے عین مطابق ہے۔

بالکل یہی حال "اُن" اور "اون" کا ہے "اون" لکھے جانے میں تو "اُون" (wool) کا بھی دھوکا ہو سکتا ہے اور "اُن" میں اس التباس کے لئے کوئی گنجائش ہی موجود نہیں ہے۔ اسی طرح "اُٹھانا" کے مقابل "اوٹھانا" لکھنا نامناسب معلوم ہوتا ہے، اور یہاں بھی "واؤ" کا کام (ـُ) سے بآسانی نکل سکتا ہے۔

میں نے اُوپر کہا تھا کہ "کم سے کم حروف میں الفاظ بننا رسم الخط کی خوبی ہے۔" مگر مشکلات کے مقابلے میں بعض خوبیوں کو نظر انداز بھی کر دیا جاتا ہے، "پھونچنا" کے مقابل "پہنچنا" لکھے جانے میں ایک حرف کی بچت تو ضرور

ہوتی ہے۔ مگر عام طور پر جب رو میں لکھتے ہیں تو "پھیجنا" اور "بھیجنا" یکساں پڑھے جاتے ہیں، اس لئے کہ تیزی کے ساتھ لکھنے میں شوشوں اور نقطوں کا کوئی خیال نہیں کرتا، شوشوں اور نقطوں کی باریکیوں کو ذہن میں رکھکر دیکھو تو بھیجنا، پھینچا، بھیجنا، کا املا کس قدر ملتا جلتا ہے، ان مشکلات کے مدنظر "پھنچنا" کو "پہونچنا" لکھنا بہت مناسب ہے۔ اس طرح ایک حرف کا ضرور اضافہ ہوگیا، مگر اس اضافہ نے آپ کی کتنی بڑی مشکل کو گھٹا دیا۔

طوطا اور توتے کے بیان میں "ط" اور "ت" سے بحث کی گئی ہے، طیار اور تیار میں بھی اس اصول سے کام لیا جاسکتا تھا، مگر یہاں یہ مشکل آپڑتی ہے، کہ عربی میں "طیار" بہت زیادہ اُڑنے والے کو کہتے ہیں۔ اس طرح "طیار" لکھے جانے میں عربی لفظ کے معنی کا التباس ہوتا ہے۔ اور ہم اس قسم کے التباسات کو جس حد تک رسم الخط اجازت دیگا، گھٹانا چاہتے ہیں۔ اس لئے "تیار" لکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ زیادہ لوگ اسی طرح لکھتے ہیں۔

"پرواہ" میں تو "ہ" بالکل زائد ہے، بعض قدیم شعراء نے "ہ" کو البتہ ظاہر کیا ہے، مگر عام طور پر بولنے میں "ہ" کا اعلان نہیں کیا جاتا۔ "ہ" کے اعلان سے کوئی معنوی یا صوری فائدہ بھی نہیں ہے، اس لئے بلا کسی فائدے کے حرف کا اضافہ کرنا نادرست ہے، لہذا "پروا" لکھنا زیادہ صحیح ہے۔

ہاتھ اور ہات کا مسئلہ قدرے بحث طلب ہے۔ "ہات" لکھنے والے کہتے ہیں کہ بولنے میں "ہ" کا اعلان نہیں کیا جاتا، اس لئے "ہاتھ" لکھنا درست نہیں۔ رسم الخط اور زبان کے مسئلہ میں عام خیال و رجحان، کثرت استعمال کا بھی بڑا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ میرے خیال میں قدیم وجدید کتابوں میں زیادہ تر "ہاتھ" لکھا گیا ہے، "ہات" بہت ہی کم جگہ ملے گا۔ ہاتھ کو اگر ہات لکھیں گے، تو یہ ضرور ہوگا کہ شعراء کو "رات اور بات" کے وزن میں ایک قافیہ مل جائیگا، مگر شعراء کے لئے ایک بڑی دقت یہ ہوجائے گی کہ "ساتھ" کے ہم وزن کوئی شگفتہ قافیہ اُردو میں اُن کو غالباً نہ مل سکے گا۔ اس کے ماسوا اُردو میں ایسے الفاظ آپ کو ملیں گے، جن میں "ہ" کا اعلان بولنے میں نہیں ہوتا، مگر رسم الخط میں "ہ" لکھی جاتی ہے، جس طرح بولتے ہیں "ہاتی" اور لکھتے ہیں "ہاتھی" میرے خیال میں "ہاتھ" ہی لکھنا مناسب ہے۔

مٹ بھیڑ اور مڈبھیڑ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں صوبہ داری جھگڑا پیدا نہ ہوجائے، مگر اب اِن باتوں پر جھگڑنے کا وقت نہیں رہا۔ ہم کو وسعتِ قلب کے ساتھ رسم الخط اور قواعد کو ایک مرکز پر لانا ہے۔ اس لفظ "مٹ" یا "مڈ" "دو چیزوں کے باہم ملنے" کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اعراب کے اختلاف کے ساتھ ہی لفظ "گڈ مڈ" میں "ڈ" کے ساتھ ملتا ہے صوتی لحاظ سے بھی اس لفظ میں "ٹ" کا تلفظ زیادہ بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ اسلئے وجدان "مڈبھیڑ" کے جواز کا فتویٰ دیتا ہے۔

ایک لفظ ایسا بھی اُردو میں پایا جاتا ہے جس کے متعلق میں رائے دوں گا، کہ اُس میں رسم الخط کے اختلاف کو باقی رکھا جائے، یہ لفظ "ہوشیار" ہے، جسے "ہُشیار" بھی لکھتے ہیں۔ یہاں دیکھئے "اُن اور اون" میں جو (واو) اور (ہ) کی نزاع پائی جاتی ہے، اُس کا انطباق یہاں نہیں ہوسکتا۔ اس اختلاف سے سب سے بڑا فائدہ تو شاعری کو پہونچتا ہے، کہ وزن کے لحاظ سے دونوں صورتوں سے

فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اور یہ فائدہ کوئی معمولی فائدہ نہیں ہے۔ پھر بولنے میں "ہوشیار" کے "واؤ" اور ہشیار کے "پیش" (ہُ) سے مختلف خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ اسلئے میری رائے ہے کہ ہوشیار اور ہشیار دونوں طرح لکھے جانے چاہئیں۔

میں آخر میں پھر عرض کرتا ہوں، کہ اربابِ فکر رسم الخط کے ان اختلافات پر غور فرمائیں اور مشورے کے بعد فیصلہ صادر کریں، جب اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر اور مضمون نگار اس فیصلہ کی پابندی کریں گے تو چند دن میں اختلافات خود بخود مٹ جائیں گے، یہ اختلافات نہ کوئی مذہبی اختلافات ہیں اور نہ صوبہ واری ہیں، ان کا مٹ جانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ بس اربابِ فکر کے ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت ہے۔

مختلف صوبوں میں جو لسانی اختلافات پائے جاتے ہیں، اُن کے متعلق بھی بعض چیزیں میرے ذہن میں ہیں، جنپر فرصت و اطمینان کیساتھ اظہارِ خیال کروں گا۔"

ماہر القادری

سانیٹ

خوابوں کا مندر

نظر آتا نہیں ہے کوئی ساحل بحرِ ہستی کا۔

لکیریں ڈالتا جاتا ہوں، کشتی کھیتا جاتا ہوں
تخیل کے حسیں پردوں پہ نقشے سے بناتا ہوں

اِنہیں نقشوں میں بھر دیتا ہوں پھر میں رنگ مستی کا

سمندر کے بہت اُس پار اک خوابوں کا مندر ہے

فرشتے جس کے درشن کی تمنا لیکے آتے ہیں
جہاں حُسن و محبت مست ہو کر گیت گاتے ہیں

جہاں خوابوں کا مندر ہے وہ دُنیا کتنی سُندر ہے

اِسی فردوس کی دیوی مرے سپنوں کی رانی ہے

مری حدِ نظر پر یہ طلسم آب ہے کوئی
یہ مندر ہے کہ دُنیائے حسیں کا خواب ہے کوئی

مری ساری مُسافت ایک سپنا اِک کہانی ہے

مگر یہ آرزو ہے میں بھی نقشِ آب ہو جاؤں ؛ اِسی خوابِ حسیں میں جذب ہو کر خواب ہو جاؤں

[illegible]

ڈھیٹ

وہ :- عورت خواہ کتنا ہی بلند مرتبہ پائے۔ بڑے سے بڑا کام انجام دے لیکن پھر وہ عورت ہی۔ ایک کمزور ہستی۔

میں :- تھوڑی دیر کے لئے مانو کہ میں یقین نہیں کرتی۔ تب۔

وہ :- تمہارے ماننے اور نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ دُنیا کہتی ہے۔ بڑے بڑے علمائے دین اور فلسفیوں کے قول دیکھ لو۔

میں :- میں تب بھی نہ مانوں تو؟

وہ :- تو یہ تمہاری زبردستی ہے۔

میں :- تمہیں کامل یقین ہے کہ یہ میری زبردستی ہی ہے؟

وہ :- اور نہیں تو کیا؟

میں :- تو تم مان گئے کہ میں زبردست ہوں۔ اب تو یقین ہوا کہ ہماری کمزوری کی ساری افواہیں غلط ہیں۔

وہ :- واہ۔

میں :- کہدو کہ "کٹ حجتی" کرتی ہو۔ کہدو نا۔

وہ :- خواہ مخواہ لڑتی ہو۔ یہ تو تمہاری ہمیشہ سے عادت رہی ہے۔ ہٹاؤ اِن جھگڑوں کو۔ مگر تمہیں تو ہمیشہ سے لڑائی دنگا اچھا لگتا ہے۔ یاد ہے (آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوگئی) بچپن کا بھولا بھالا زمانہ؟ کتنا دلفریب وقت تھا۔ کاش پھر وہی ہنسی خوشی اور بے فکری کے دن لوٹ کر آجائیں۔ یاد ہے تمہیں جب ہم تم املی کے درخت کے نیچے گھروندے بنا بنا کر کھیلا کرتے تھے؟

میں :- اور تم سے لڑ کر میں گھر نوچ کھسوٹ کر چل دیتی تھی۔ ایں؟

وہ :- (ہنسکر) ہاں۔ مگر ایکدن تو تم بُری طرح لپٹ گئیں اور میرا مُنہ کھسوٹ ڈالا (اور ہنسکر) اور اُلٹی میری ہی شکایت کر دی۔

میں :- تمہارا اگر نا بھی تو نوچ ڈالا تھا۔ پھر اُلٹی تم نے ہی خوشامد کی۔

وہ :- (اور بھی زیادہ ہنستے ہوئے) ہاں۔ ہاں۔ اور پھر وہ یاد ہے۔ وہ جو ہم نے تم نے آپا کا صابُن چُرا کر کتے کے پلّوں کو نہلایا تھا۔ جب پھر آپا جان نے خوب کان اینٹھے تھے۔

میں :- اور وہ بھی جب ہم تم بیروں پر لڑتے تھے۔

وہ :- (ہنسی سے بیتاب ہوکر) اوہ ..... ہاں۔ اور جب مکھن روٹی بچھونے میں چھُپا کر کھایا تھا۔

میں :- تب ابا جان نے صبح کا ناشتہ کاٹ دیا تھا۔

وہ :- ہاں۔ ہاں۔

میں :- تو تمہیں یہ سب باتیں یاد کرکے ..... کچھ شرمندگی ہوتی ہے۔

وہ :- ایں ..... کیا۔ نہیں تو یہ تو بچپن کی سُہاونی شرارتیں تھیں۔ جن کی یاد ....

میں :- بھلا ان شرارتوں میں سُہانے پن کی کیا بات تھی۔

وہ :- واہ۔ کیا تمہیں بچپن نہیں یاد آتا۔

میں :- آتا کیوں نہیں۔

وہ :- پھر؟

میں :- پھر یہی کہ افسوس ہوتا ہے۔ بُرا لگتا ہے کہ ایسے بیوقوف کیوں تھے۔ بھلا اس میں سُہاونا پن کیا ہوسکتا ہے۔ املی کے پیڑ کے نیچے گھروندے بنانا ..... نوچ کھسوٹ ..... بیروں پر

مار کٹائی۔ چپکے چپکے بستر میں چھپ کر کھن کھانا۔ اور پھر پٹنا۔ جو کہ بچپن کی سب سے غیر سُہاونی شے ہے..... سب بیہودگیاں تھیں۔ اور شکر ہے کہ وہ نالائق زمانہ گذر گیا اور کبھی نہ آئے گا۔

وہ :- واہ بچپن کی ہر بات بھولی ہوتی ہے۔

میں :- بھولپن کونسا کمال ہے۔ ہر پاگل اور بیوقوف آدمی ساری عمر بھولا رہتا ہے۔ تمہاری نظروں میں وہ بہت ہی خوش نصیب ہے۔ پھر بن جاؤ نا بھولے۔

وہ :- تم تو کج بحثی کرنے لگتی ہو۔ بچپن میں اور پاگل پن میں بہت فرق ہے۔ ہم تم بڑی سمجھ کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ میں ڈپٹی صاحب بنتا تھا اور تم بیگم صاحبہ بنتی تھیں۔

میں :- تم نے تو مجھے اور بھی بچپن سے نفرت دلادی۔

وہ :- کیوں ؟

میں :- میں نے تم سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ بھئی اس پاجی لفظ "کیوں" کو اس طرح میرے سر پر نہ پٹخ دیا کرو۔

وہ :- یعنی ؟

میں :- لو۔ یہ تم نے اُس سے بھی بیہودہ اور مُہمل لفظ نکالا۔ اُکھ۔

وہ :- تم تو عجیب باتیں کرتی ہو۔ کیا یہ ہماری ذہانت کا ثبوت نہ تھا کہ ہم تم بزرگوں کے طے کئے ہوئے رشتہ کو کس بھولپن اور عقلمندی سے ذہن نشین کر چکے تھے۔

میں :- قطعی بھولپن۔ لیکن عقلمندی سے نہیں۔

وہ :- نہیں ؟ یعنی ؟ میرا مطلب ہے کہ کیوں نہیں۔

میں :- مطلب یہ کہ ہم تم جب بھولے تھے۔ تب تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن تم تو ویسے ہی بھولے اور "سُہاونے" ہو۔ مگر میں بڑی ہو گئی۔ کچھ بنتی نہیں بات !

وہ :- کیا۔ اس سے تمہارا مطلب ہے کہ جو رشتہ ہمارے تمہارے درمیان بچپن سے قائم ہے تکمیل کو نہیں پہونچنا چاہیئے۔

میں :- یعنی ؟

وہ :- یعنی کیا ؟

میں :- یہ لیجئے۔ آپ تو جب چاہیں "یعنی" "کیوں" کہہ کر مجھ سے لمبے چوڑے جواب وصول کریں۔ اور میں کہوں تو چکرائیں۔

وہ :- تم تو.......

میں :- کٹ حجتی کرتی ہو۔ یہی کہنے والے تھے نا تم ؟

وہ :- مجھے آج تک شُبہ بھی نہ ہوا تھا کہ تم اس رشتے کو ناپسند کرتی ہو۔

میں :- اور شُبہ ہونے کی وجہ بھی کیا ؟

وہ :- تمہیں تو کہہ رہی تھیں کہ.......

میں :- کیا ؟ کیا ؟

وہ :- نہ معلوم کیا کہتی تھیں۔

میں :- اللہ رے بھولپن ! تمہارے ہی دل میں کوئی ایسا ویسا خیال آیا ہوگا میرے سر تھوپ رہے ہو۔ واضح رہے کہ ہم بھی تھوڑی سی عقل رکھتے ہیں۔

وہ :- بیوقوف تو میں ہی ہوں جو ابتک اس دھوکے میں تھا۔

میں :- یعنی یہ جو ہماری منگنی تھی یہ "دھوکا" تھا۔ تم بزرگوں تک پہنچ رہے ہو۔ پتہ ہے یہ "دھوکا" دادا ابّا کا قائم کیا ہوا ہے۔ میں تو تمہیں ایسا نہ سمجھتی تھی۔ ٹھیکرے کی مانگ بڑی پکّی ہوتی ہے جناب !

وہ :- (کھسیا کر) تم مجھے ہر وقت بیوقوف سمجھتی ہو۔

میں :- توبہ توبہ۔ لیکن اگر سمجھوں بھی تو کیا ہوا ؟ منگنی شادی میں عقلمند اور بیوقوف کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔

یہ تو ایک روحانی رشتہ ہے۔ جس کا فیصلہ خدا نے پہلے ہی آسمان پر کر دیا ہے۔

وہ:۔ یعنی یہ کہ بیوی میاں کو اُلّو سمجھتی رہے؟

میں:۔ اس میں مضائقہ ہی کیا ہے؟

وہ:۔ بھلا ایسے گھر میں نباہ کیسے ہوگا۔

میں:۔ نباہ؟ نباہ ایسے ہوگا۔ تم کما کر لانا اور میں نہایت سلیقے سے خرچ کروں گی۔ تم ڈپٹی صاحب ہو گے اور میں بیگم صاحبہ۔ مزے سے رہیں گے۔

وہ:۔ معاف کرنا تم ذرا بے شرمی پر اُتر آئی ہو آج۔

میں:۔ اس میں بے شرمی کیا ہے؟ تمہیں تو اُس روز کہہ رہے تھے کہ "ہماری زندگی بڑے سکون سے گذرے گی۔ تم مندر کی دیوی ہو گی اور میں پجاری۔ یہ ہوگا۔ وہ ہوگا" جو آج میں نے کہا تو بُرا مان گئے۔ آج کچھ دل میں ٹھان کر ہی آئے ہو۔

وہ:۔ اگر میں کچھ کہوں تو وہ اور بات ہے۔ میں مرد ہوں۔

میں:۔ مجھے اس بات کا یقین ہے۔

وہ:۔ تم بدتمیز بھی ہو۔ آج تک میں کتنے دہوکے میں تھا۔ شکر ہے کہ جلدی آنکھیں کھُل گئیں۔

میں:۔ یعنی؟

وہ:۔ یعنی؟ اب تم کتنی دفعہ "یعنی" کہہ چکی ہو۔

میں:۔ کبھی ناؤ ندی پر کبھی ندی ناؤ پر۔ آگے کہو کیا آنکھیں کھُل گئیں۔

وہ:۔ یہی کہ ہماری تمہاری نہیں بن سکتی۔

میں:۔ نہیں کیوں بن سکتی؟ کہیں تمہارا یہ تو مطلب نہیں ہے کہ منگنی ہی ختم۔

وہ:۔ یقیناً۔

میں:۔ تم ٹھیکرے کی منگنی توڑ دو گے؟

وہ:۔ بے شک!

میں:۔ مگر میں تو یہ نہیں چاہتی۔ میں تو تم سے ہی شادی کرنا چاہتی ہوں۔

وہ:۔ مگر میں تو قطعی نہیں چاہتا۔

میں:۔ تم تو دیوانے ہو۔ آخر وجہ کیا؟

وہ:۔ فرض کرو مجھے تم پسند نہیں۔

میں:۔ پھر اور کون بدنصیب پسند آئی۔

وہ:۔ کوئی ہو یا نہ ہو مجھے تم پسند نہیں آسکتیں (حد سے زیادہ چڑ کر)

میں:۔ مگر مجھے تو تم پسند ہو۔

وہ:۔ لاحول ولا قوۃ، کیا بے حیائی ہے۔ کوئی مرد ایک لڑکی کو یوں ٹھکرائے اور وہ ذرا بھی خودداری نہ رکھتے ہوئے مُصر ہو۔

میں:۔ اور تم جو اُس دن کہتے تھے کہ اگر تم مجھ سے خدانخواستہ شادی نہ کرو تو میں دیوانہ ہو جاؤں۔

وہ:۔ میں مرد ہوں۔

میں:۔ دیکھو ایک دفعہ کہہ چکی کہ مجھے پختہ یقین ہے کہ تم مرد ہو۔ اب جو کچھ کہوں گی تو جل جاؤ گے۔

وہ:۔ مرد چاہیں جو کچھ کریں۔ مگر عورت اگر اظہار محبّت یوں دیدہ دلیری سے کرے تو اُسے معیوب سمجھتے ہیں۔ کیا۔

میں:۔ قطع کلام ہوتا ہے۔ پھر کیسے اظہار کریں؟ اب اظہار کا بھی نیا طریقہ ایجاد کریں؟ اگر تمہیں میرے عشق میں دیوانہ ہونے کا پورا پورا حق حاصل ہے تو کسی کی مجال نہیں کہ مجھے تمہارے لئے اپنا گلا گھوٹنے سے روکے۔ میں جس طرح چاہوں اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ کوئی ہوتا کون ہے؟ واہ!

وہ :- مرد کے عیب بھی چھپ جاتے ہیں۔ وہ جو کچھ چاہے کرے۔ لیکن عورت......

میں :- چونکہ بھی میری پٹ بھی میری۔ میں پوچھتی ہوں کون کہتا ہے کہ عورت بُری بات کرے تو زیادہ گنہگار ہو گی۔

وہ :- گنہگار کا ذکر نہیں ہے۔ عورتوں کے لئے عام طور پر یہ بات بہت معیوب سمجھی جاتی ہے کہ وہ مرد کے انکار پر بھی اپنے مُنہ سے درخواست کریں۔ لوگ سُنتے ہیں تو تھُتھڑی کرتے ہیں۔

میں :- تمہیں تو اُس دن کہتے تھے کہ "لوگوں کو بکنے دو"۔ دوسرے اب تم لوگوں میں جا کر ڈھنڈورا ہی پیٹ تو نہ دو گے کسی کو کیا معلوم کہ میں نے تم سے کیا کہا۔

وہ :- اوہ۔ تمہاری بحث کبھی نہ ختم ہو گی۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم اور تم دوزخ جیسی زندگی سے بچ گئے۔

میں :- کیسی دوزخ اور کیسی جنت؟ تم مر بھی جاؤ تو بھی ابا جان یہ منگنی نہ توڑنے دیں گے۔ دوسرے جائداد پھر تمہیں کوڑی بھی نہ ملے گی۔

وہ :- مجھے جائداد کی ہوس نہیں۔

میں :- اور یہ ڈپٹی کلکٹری ابا جان تمہیں خاک دلوائیں گے۔

وہ :- چولہے میں ڈالو ڈپٹی کلکٹری کو۔

میں :- لیکن تمہیں میرا کبھی خیال نہیں۔ پرسوں ہی تم نے کہا تھا کہ مجھ خاکسار کے بُت کی بچپن سے پرستش کر رہے ہو۔ اور دل و دماغ پر خاکساری چھائی ہوئی ہے۔ اور وہ کیا شعر تھا۔ معاف کرنا...... وہ... کیا "دل کی کلی"۔ جنے کیا ہوا اور صنم۔ اور گریباں چاک"۔ اور "در کے بھکاری" کا بھی کچھ تھا۔ بتانا ذرا اچھے سے۔

وہ :- لاحول ولا قوۃ۔ تو یہ ہے۔ یہ آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ حد ہے بے شرمی کی!

میں :- کیا کر رہی ہوں۔ وہی جو تم ہمیشہ کرتے ہو۔ آج میں جو کہتی ہوں تو جلے مرتے ہو۔

وہ :- تم اس رشتے کو ناموزوں خیال کرتی ہو۔

میں :- میں؟ ہوش کی لو۔ کہاؤ قسم کہ میں نے کبھی یہ کہا ہو کہ میں تمہیں شادی کیلئے ناموزوں سمجھتی ہوں۔

وہ :- تم مجھے ناپسند نہیں کرتیں؟ (پُرانی روشنی آنکھوں میں کچھ عود کر آئی)

میں :- قطعی نہیں۔ میں...... اب جو میں کبھی پرستش وغیرہ کا کچھ کہوں گی تو تم کہوگے بے شرمی۔ یہ۔ وہ۔

وہ :- تم مجھے بیوقوف کہتی ہو۔ (آنکھوں کی روشنی پھر معدوم ہو جاتی ہے)

میں :- کبھی نہیں۔ دراصل میرا مطلب "بھولے" سے ہوتا ہے۔ یونہیں لاڈ میں کہتی ہوں۔

وہ :- تم کیا کہہ رہی ہو۔ آج میں چکرایا جاتا ہوں۔ ابھی کچھ دن ہوئے تم مجھ سے کھُل کر بات بھی نہ کر سکتی تھیں۔ میرا نام لیتے ہوئے جھجکتی تھیں۔ شرما کر سر جھکا لیتی تھیں۔

میں :- آ دیکھو۔ وہ تو میں بنا کرتی تھی۔ تمہیں وہ باتیں پسند تھیں؟ اچھا اب میں شرمایا کروں گی۔ بس؟

وہ :- اُوہ۔ یہ میں کیا سُن رہا ہوں۔ یا خدا کیا یہ سچ ہے۔ میں کبھی کبھی ایسی لڑکی کے ساتھ زندگی نہ گذار سکتا جو مجھے پسند نہ کرتی ہو۔ اور میرا مذاق اُڑاتی۔

میں :- کیا کہا؟ کیا؟ میں تمہیں پسند نہیں کرتی۔ تم اظہار کو معیوب سمجھتے ہو۔ اور بگڑ جاؤ گے۔ لیکن سچ سچ میں نے تو تمہیں کبھی ناپسند کیا نہیں۔

وہ :- کیا تم ایسے شوہر کے ساتھ زندگی گذار سکتی ہو جو

تمہیں ناپسند ہو۔

میں :- اوّل تو تم مجھے ناپسند ہی نہیں۔ دوسرے شادی بیاہ کے معاملہ میں ان غیر شاعرانہ باتوں کا کیا دخل۔ تم ہی لوگ تو کہتے ہو کہ ہندوستانی دوشیزہ بُرے سے بُرے شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی نباہ کر سکتی ہے' وہ شوہر کو دیوتا سمجھتی ہے۔ ایک دیوتا کے لئے کوئی ضروری نہیں کہ وہ عقلمند ہی ہو' ہندوستانی دوشیزہ تو ایک مرکھنے بیل کے ساتھ بھی سُکھ سے رہ سکتی ہے۔ کُجا تم؟

وہ :- (غصّہ سے مختلف رنگ بدلکر بھنبھناتے ہوئے) تمہاری باتیں تکلیف دہ اور ہتک آمیز ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہے۔

میں :- تمہیں تو آج حیرت ہی ہوئے چلی جا رہی ہے۔

وہ :- میں پاگل جو ٹھیرا۔

میں :- میں نے سب کچھ مانا۔ لیکن ایک دیوتا کے لئے پاگل واگل کا سوال ہی نہیں۔ کہا نا میں نے کہ وہ جیسا بھی ہو پھر مجازی خدا ہے۔ اگر سجدہ سوائے خدا کے جائز ہوتا تو وہ اسی دیوتا کے حضور میں پیش کیا جاتا۔ عورتیں وہی پارسا اور نیک ہیں جو بُرے شوہروں کو نباہ رہی ہیں۔ ہماری بخشش شوہر کی فرمانبرداری میں ہے۔

وہ :- بس بس۔ میں تمہاری باتیں نہیں سُن سکتا۔ (دہن پٹختے تنتناتے ہوئے غائب) کہتے ہیں جو اگر بیاہ شادی کی باتیں لڑکیاں کرتی ہیں تو مُنہ پکّا پکّا ہو جاتا ہے۔ میں دوڑی ہوئی آئینہ کے سامنے گئی۔ واقعی مُنہ پر ٹھیکرے[1] سے ٹوٹ رہے تھے۔

---

[1] ٹھیکرے ٹوٹنا ایک عام محاورہ ہے معنی۔ پھٹکار برسنا۔

عصمت چغتائی

تخیلات

ادھر صبر و سکوں ضبط و تحمل ہیں تماشائی
اُدھر کافر جوانی لے رہی ہے اُٹھ کے انگڑائی

دلیلِ کامرانی ہے رہِ اُلفت میں مر جانا
کمالِ عشق ہے دُنیا جسے سمجھی ہے رسوائی

بنا دے میرے سجدے کو بنا دے حاصلِ کعبہ
عطا کر دے عطا کر دے مجھے ذوقِ جبیں سائی

فلک کانپا زمیں لرزی اٹھے فتنے زمانے میں
ہٹو جاؤ کوئی اسطرح بھی لیتا ہے انگڑائی

فریبِ حُسن میں آ کر متاعِ ہوش کھو بیٹھے
ارے یہ آئینے کے سامنے دعوائے یکتائی

ہم اپنے گھر کو ویراں کر کے قسمت آزماتی ہیں
مبارک ہو مبارک تجھکو مجنوں دشت پیمائی

ادا ہوتی ہے محسن آج رسمِ فاتحہ خوانی
معاذ اللہ یہ گورِ غریباں اور یہ تنہائی

محسن اعظم گڈھی

دل کی بات

سُن لے سجنی دل کی بات
اب نہیں کاٹے کٹتی رات

کالے بادل آئے ہیں
سارے جہاں پر چھائے ہیں
تجھ بن سونی ہے برسات
سُن لے سجنی دل کی بات

جان کو اپنی کھوتا ہوں
تجھ بن میں یوں روتا ہوں
جیسے ہو بھیگی برسات
سُن لے سجنی دل کی بات

تو نے ہنس کر جیت لیا
دل کو یکسر جیت لیا
ہم نے ہنس کر کھائی مات
سُن لے سجنی دل کی بات

ختم یہ بیچینی کر دے
رات میں رنگینی بھر دے
رات کو آ کر کر دے رات
سُن لے سجنی دل کی بات

تو جو نہیں ہے دل کے چاند
ہو گئی ساری دُنیا ماند
تجھ بن ہمکو دن بھی ہے رات
سُن لے سجنی دل کی بات

روتا ہے مر جاتا ہے
نام وفا کر جاتا ہے
یاد رہے گی تیری گھات
سُن لے سجنی دل کی بات

ہاں ہاں تو تڑپائے جا
ہم کو مست بنائے جا
پریم بھری ہے پریم کی گھات
سن لے سجنی دل کی بات

ہمکو مٹا کر خوش کیوں ہے
دل کو جلا کر خوش کیوں ہے
جیت حقیقت میں ہے مات
سُن لے سجنی دل کی بات

تیری آنکھوں پر قربان
میرا دیں میرا ایمان
تیری ہے اب میری ذات
سُن لے سجنی دل کی بات

اب تو ہے بہزاد ترا
یہ مرد ناشاد ترا
لاج ہے اسکی تیرے ہات
سُن لے سجنی دل کی بات

بہزاد

زندہ اور فطری زبان

پہلی کسوٹی ـــ اصولِ ارتقا

زبان کی تعریف و توضیح میں تحقیقات کرنے والوں نے مختلف خیالات پیش کئے ہیں مگر اس کی تعریف بھی شعر کی تعریف کی طرح رنگارنگ ہوتی گئی ہے۔ کسی نے اُسے نمونہ صنعت الٰہی کہا تو کسی نے بلبل ہزار داستاں کسی نے طوطی شکر شکن سے تشبیہ دی اور کسی نے اُسے قدرت کے رازِ سربستہ کی کلید کہا۔ مگر اس کی جو تصریح مولوی عبدالحق صاحب مدظلہٗ نے اپنے قواعد اُردو کے مقدمے میں کی ہے وہ نہایت جامع اور بہتر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ صحیح زندہ اور فطری زبان کی تعریف اس سے زیادہ صاف شاید ہی ہوسکے۔ آپ کے تصریحی الفاظ یہ ہیں:۔

"زبان نہ کسی کی ایجاد ہے اور نہ کوئی اُسے ایجاد کرسکتا ہے۔ جس اُصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی ہے، پتے نکلتے ہیں، شاخیں پھیلتی ہیں، پھل پھول لگتے ہیں اور ایک دن وہی ننھا سا پودا درخت تناور بن جاتا ہے۔ اسی اُصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے..."

زندہ زبانوں کی یہ عام تعریف ہے۔ اور اُس کے زندہ ہونیکی کسوٹی بھی۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ زندہ اور فطری زبان میں حسب ذیل خوبیوں یا خصوصیات کا ہونا لازمی ہے:۔

(۱) زبان کی ابتدا صرف ونحو (گرئمر) سے نہ ہوئی ہو۔

(۲) اس میں قانونِ ارتقا پایا جائے۔ یعنی اپنے جنم سے لیکر آغازِ شباب تک تیز رفتار ترقی۔ اور شباب میں کامل جلوہ نمائی ہو، پھر رفتارِ ترقی مستقل ہو جائے۔ اور درخت تناور کی طرح پھل پھول پیدا کرکے اُسکے فائدے سے دُنیا کو فیض پہونچائے۔

(۳) ماحول کا اثر اس کے نشو و نما میں نمایاں ہو اور اُس کا اثر ماحول پر بھی آگے چلکر ظاہر ہو جائے۔

(۴) جس طرح انسان کی کوشش درخت کے مزاج (پھول کی خوشبو اور پھل کے ذائقے) کو تبدیل نہیں کرسکتی، اسی طرح ایک زندہ زبان بھی مسخ نہیں ہوسکتی۔ غیر فطری رجحانات سے وہ بگڑے گی مگر پھر وہ قدرتی رجحانات کی بدولت سنور جائیگی۔

یہی سبب ہے کہ ہر ملک و قوم کی ایک زندہ زبان ہی جو اُس کی تہذیب اور تمدن کی ترجمان ہے۔

ہندوستان کی زبان بھی ان تمام درجوں سے گذرتی ہوئی موجودہ صورت کو پہونچی ہے۔ فطری اور غیر فطری رجحانوں نے اُسے اکثر بنایا اور بگاڑا۔ مگر آخر میں بازی فطرت اور قدرت ہی کے ہاتھ رہی۔ اور یہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے کہ مصنوعی تحریکیں وقتی ہوتی ہیں۔ اور تھوڑے ہی دن چلکر ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ یا دب جاتی ہیں۔ زبانِ ہند کی تاریخ میں یہ حقیقت بارہا ملتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کہ ہندوستان جنت نشان کی زبان دیوبانی (زبان الٰہی) ویدک تھی۔ لیے ہم زبانِ ہند کا بیج یا چشمۂ زبان کا منبع کہہ سکتے ہیں۔ دانے کا پھوٹنا اور چشمے کا آگے بڑھنا لازمی تھا۔ قانونِ ارتقا کے خلاف پوری طاقت صرف کی گئی کہ زبان الٰہی کی شکل نہ بدلے۔ کونپل نہ پھوٹنے پائے ورنہ بڑا غضب ہوگا۔ زبان مسخ ہوکر ناپاک ہو جائے گی۔ برفستان میں جس طرح تخم اپنے بخت خفتہ پر خشک آنسو روتا ہے وہی حال ویدک زبان کا رہا اور وہ برہمنوں کے سینوں میں مدفون یا محفوظ رہی۔ مگر یہ کب تک۔ آخر شمس ارتقا کی کرنیں پہونچ گئیں۔ دانے پھوٹ نکلے۔ آن کی آن میں اُس کی دوسری شکل تھی۔ گویا زبان ویدک نے جُون بدلی۔ اس جنم میں اُس نے نیا نام پایا۔ ویدک پراکرت اُکے نام سے وہ پکاری گئی۔ اس پراکرت کو اگر مجسم شکل تصور کیا جائے تو پالی کو (جو گوتم بُدھ۔ بُدھ مذہب۔ اور اُس عہد کے حالات کی آئینہ دار ہے) اسکا دست راست سمجھنا چاہیئے۔

اِس زبان کو پراکرت کی اور شاخوں کے مقابلے میں زیادہ فروغ ہوا۔ بُدھ مذہب کے وسیلے سے اُس کے پڑھنے اور جاننے والے کم و بیش شمالی ہندوستان کے اکثر حصّوں میں پائے جانے لگے۔ دوسری پراکرتیں ماگدھی، شورسینی، مراٹھی، پنجابی، اودھی، بندیل کھنڈی، بھوجپوری، مقامی حیثیت رکھتی تھیں۔ نہ تو ان کا تعلق ہندوستان کے ہمہ گیر مذہب بُدھ سے تھا اور نہ اس جیسی سرپرستی نصیب ہوئی۔ مگر باوجود مذہبی توسط اور بُدھ حکمرانوں کے دستگیری و حمایت کے یہ زبان ہندوستان کے لئے زبان عام نہ بن سکی، کیونکہ وہ ایک محدود خطہ کی زبان تھی۔

بدھ مذہب کے زوال کے بعد گپتا خاندان کے عہد حکومت میں برہمنوں کو اپنا قدیم مذہب زندہ کرنے کا اچھا موقع ملا۔ انہوں نے قدامت پسندی کی نظر سے جو زبان کی طرف دیکھا تو چونک پڑے۔ ایں! زبان کہاں سے کہاں جا پہونچی! چنانچہ قواعد کی زنجیروں سے باندھ کر خوب کاٹ چھانٹ تراش خراش کر کے ایک نئی زبان وضع کی۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ زبان کہاں تک فطری ہو سکتی ہے۔ اس کا نام سنسکرت (آراستہ کیا گیا) رکھا گیا کیونکہ ویدک پراکرت کی چھانٹی چھانٹی اور قدیم ویدک کے قالب پر ڈھالی ہوئی زبان تھی۔ اس زبان میں اعلیٰ پائے کی بیبہا تصنیفیں وکرم کے درباری شاعروں کے زورِ قلم سے وجود میں آئیں۔ فصاحت اور بلاغت، صنائع و بدائع غرض جہاں تک انسانی کوشش کو دخل ہو اس سے زبان کو موقر اور قابل قدر بنا دیا گیا۔ شکنتلا، کادمبری، میگھ دوت، دنیا کے ادبی خزانوں کے چمکتے ہوئے رتن ہیں۔ اور نظر انصاف ان کی ادبی شان کو ہمیشہ ہمیشہ سراہتی رہیگی۔ مگر جہاں تک زبان کا معاملہ ہے وہ اس عیب سے پاک نہیں کہ وہ عوام کی تشنگی کو دور نہ کرسکتی تھی۔ عام فہمی سنسکرت میں نہ تھی۔ اس لئے کہ یہ بول چال کی زبان تھی ہی نہیں۔ یہ محض تصنیفی زبان تھی اور عالموں اور درباریوں کیلئے محدود تھی۔ عورتوں اور بچوں کے لئے اور ان پڑھ طبقے میں یہ زبان مروج نہیں ہوئی۔ اسی لئے کالیداس اپنے ناٹکوں میں عورتوں اور بچوں کا کردار جہاں پیش کرتا ہے پراکرت زبان استعمال کرتا ہے۔

ملک کی فطری زبان ایک قدرتی چشمہ کی طرح آگے بڑھ رہی تھی جس میں ادھر ادھر سے نالے ندیاں آکر مل رہی تھیں۔ غرض کنار و ساحل سبزہ و گیاہ کو سیراب کرتا ہوا یہ چشمہ ہر ایک کے اجزا اپنے اندر شامل کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اب چشمے نے دریا کا نام پایا۔ یعنی زبانِ ہند نے تیسری جون بدلی۔ اس جنم میں زبانِ ہند کا نام "اپ بھرنش" تھا۔ بار بار کی تبدیلیوں سے قدامت پسندی کے رجحانات خود بخود ماند اور مدھم پڑنے لگے۔ یہ 'اپ بھرنش' زبان امکان کی تبدیلیوں سے مختلف لباسوں میں نظر آئی۔ ملک کا مرکزی حصہ جس طرح تمدن و آئین و تہذیب و شائستگی میں بڑھا ہوا تھا اسی طرح وہاں کی 'اپ بھرنش' بھی دوسرے 'اپ بھرنشوں' کے مقابلے میں زیادہ صاف تھی۔ (۱) مرکز ملک (میرٹھ اور نواح دہلی)۔ (۲) اس کا ملک (برج کے علاقے میں) زبان کا رنگ وغیرہ دیدہ زیب تھا۔ دیکھنے والوں نے جو انتخابی نظر ڈالی تو یہ بولیاں کچھ دل کو ایسی بھا گئیں کہ اس کی قسمت کا ستارہ گویا طلوع ہو گیا۔ یہ دیکھنے والے مسلمان تھے جنہوں نے فاتحانہ حیثیت سے ملک پر عمل دخل کیا۔ اور اپنا مرکز بھی اسی حلقہ میں رکھا۔

مسلمانوں کا ورود زبان ہند پر ماحول کا سب سے زیادہ اور نمایاں اثر تھا۔ حکومت مرکزی کے اہتمام نے دور و نزدیک کو سمیٹ کر ایک کر دیا۔ دہلی اور آگرہ کی بولیاں گنگا جمنی شان سے مل گئیں۔ جس کے نمونے خسرو کی پہیلیوں اور مکرنیوں میں ملتے ہیں۔ جوہر شناس اور قدرداں مسلم حکمرانوں نے اس جنسِ لطیف کی قدر کی۔ دور بین خسرو کی دوربینی کو انہوں نے اپنی تائید سے دوسروں کے لئے راستہ کھول دیا۔ حکمرانوں کی زبان فارسی تھی۔ اس لئے انہوں نے تمیز کے لئے اس نئی صورت کو پہونچی ہوئی زبان کا نام ہندی رکھا۔ اور وہ موقر بنا کر ہندوستان کی ہر چیز کو ہندی کی صفت نسبتی سے مخصوص کرتے تھے۔ مثلاً تیغ ہندی، نال ہندی، بیم ہندی ... وغیرہ۔ انشا نے بھی اس زبان کو ہندی ہی لکھا ہے۔

مسلمانوں کا عہدِ حکومت بھی بہت وسیع تھا تغیر و تبدل تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں ہی کے عہدِ حکومت میں منجملہ دیگر معاشرتی تبدیلیوں کے زبان کی شان بھی بہت کچھ بدلتی اور بنتی گئی۔ عہدِ اکبر میں ہند کی حدیں وسیع ہوئیں، دکن، دہلی و آگرہ سے وابستہ ہو گیا۔ یہ زبان شاہانِ دکن کے درباروں میں بھی جا پہونچی۔ وہاں ہندی کا نام مقامی نسبت سے دکنی ہو گیا۔ ملک الشعرا نصرتی سے لیکر ولی کے زمانے تک دکن میں رہی۔ اور شمالی ہند تو اس کا جنم بھوم ہی تھا۔ دوسری طرف وہ تمدنی سلسلے سے ہاتھ پیر نکالنے لگی اور گجرات جا پہونچی۔ یہاں کے لوگوں نے اسے گجراتی کہہ کر اپنایا۔ نرسی مہتا گجراتی زبان کا شاعر ہے۔ اس کے کلام کا نمونہ یہاں دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ شمالی ہند میں دکنی اور میرٹھ کے نواح کی زبان کی مثالیں تو ہر خاص و عام کو ولی اور خسرو کے ناموں سے پیش نظر ہو جاتی ہیں۔ مگر اردو کی گجراتی شکل سے ابھی کم لوگ روشناس ہیں۔

ہر دم کرشن کہے تو کرشن کہے تو زباں میری
یہی مطلب خاطر کرتا ہوں خوشامد بہا تیری
وہی اور دودھ شکر روز کھلاتا ہوں تجھے
تو بھی ہر روز نہ ہرِ نام سنائے مجھے
کھوتی زندگانی ساری ہوئی گناہ معاف تیرا
دیا مت بھولے پربھو آخر وقت میرا

(ماخوذ از کبتا کومدی ... بھوسکا۔ مصنفہ پنڈت رام نریش ترپاٹھی)

لفظوں کی ترکیبیں اور خود الفاظ اُردو روزمرہ کے نمونے پر لائے گئے ہیں۔ اسی طرح پنجابی میں اُسی مرکزی زبان کی شان جھلکتی ہے جو مختلف تغیرات کے بعد آج اُردو کہلا رہی ہے۔ غرض اُردو کی اصل صورت، نواحِ دہلی سے اُٹھ کر ہندوستان کے جنوبی حصے (دکن) کی زبان پر اور بہ ہمراہ ولی گجرات پہونچنے سے گجراتی پر اپنا نقش ڈال چکی ہے۔ و نیز خود اس کے اندر دکنی و گجراتی و پنجابی عنصر بھی شامل ہو چکا ہے یہی سبب ہے کہ جب عہدِ محمد شاہ میں شمالی ہند کے نواسیوں نے پھر دہلی کا رُخ کیا اور اِن میں ولی بھی تھے تو اُن کی زبان اور دہلی کی زبان میں بڑا فرق نظر آیا۔ مرکزی زبان جن ایام میں جنوبی ہند اور اورمضافاتِ دہلی کا طواف کر رہی تھی، شمالی ہند کے پائے تخت دہلی میں ٹھہر کی نہ بیٹھی تھی۔ قلعہ شاہجہاں آباد نے اُس کا پُرانا نام ہندی بھلا دیا تھا۔ اور وہ زبان اُردوئے معلّی شاہجہان آباد کہلاتی تھی۔ یہ نام لشکر کے تعلق اور لشکری خلط ملط سے پیدا ہوا تھا۔ اور اب اس میں عام فہمی کی صفت اور بھی ترقی کر چکی تھی۔ چنانچہ ولی نے اپنے دیوان پر نظرِ ثانی کی جن اشعار میں دکنی کے الفاظ تھے اُن کو دیوان سے خارج کر کے ایک دوسرا دیوان ترتیب دیا۔ اس میں دکنی کے اُسی قدر الفاظ تھے جو دہلی کی ترقی یافتہ زبان میں بے جوڑ نہ تھے۔ اس طرح ولی کی خدمت زبان کے سُدھارنے اور سنوارنے میں کس قدر قابل قدر ہے۔ اِس طور پر اب ایک ایسی زبان وجود میں آگئی جس کے سمجھنے والے ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ لوگ تھے اور اس کے مقابل دوسری زبانیں مقامی حیثیت سے بڑھتی اور ترقی کرتی رہیں۔ مسلمان فرمانرواؤں نے اِس وقت کی مقامی زبانوں کے لئے پوری فیاضدلی برتی۔ کیونکہ اُردو نہ تو حکمران قوم کی زبان تھی اور نہ محض مسلمانوں کی۔ اِس کے بولنے، لکھنے اور پڑھنے والے ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ چُنانچہ قدما کے تلامذہ کی فہرست میں دیکھئے کہ کسقدر ہندو ہیں۔

اس وقت غریب اُردو کا دامن علمی جواہرات سے خالی تھا۔ بس لے دیکر اُس کی جھولی میں یا تو غزلوں کے دیوان تھے یا قصہ کہانیاں۔ انیسویں صدی کے آغاز میں جب انگریزوں کی تجارت سارے ہندوستان کا احاطہ کرنے لگی تو اُنہوں نے فورٹ ولیم کالج میں نو وارد انگریز گماشتوں کو تعلیم کی غرض سے اُردو کو نصاب میں داخل کر دیا۔ ایسا کرنے میں اُنہیں یہ سہولت تھی کہ ملک کے ہر ایک حصہ کی مقامی بولی سیکھنے کے بجائے ایک عام ہندوستانی زبان مل گئی۔ اس لئے انہوں نے اسی کو سیکھا۔ اب اُردو کی خوبیوں کو آشکارا ہونے کا یہ اچھا موقع آیا۔ غرض کالج نے باشندگانِ ہند سے ہندوستانی شکل میں اُردو کا تعارف کرایا۔ اور یہ ایسے ہی تسلیم ہوا جیسے ایک مسلّمہ صداقت کی دوبارہ تائید ہو۔ خلاصہ یہ کہ ہندوستان کے باشندوں کی تو یہ زبان ہی ٹھہری غیر ملکیوں نے بھی اسے ہندوستانی سمجھکر سیکھا۔ کالج کے لئے ویسی کتابوں کی جو ہندوستانی زبان (اُردو) میں ہو ضرورت تھی۔ اور تلاش کرنے سے دو ایک سے زیادہ نہ مل سکیں تو کالج کے پرنسپل مسٹر جان گلکرسٹ نے اُردو دانوں کو تلاش کیا۔ مُلک کے ہر حصہ سے اچھے منشی و انشا پرداز کلکتہ میں جمع ہونے لگے۔ میر امن دہلوی، بہادر علی حسینی۔ کاظم علی جوان۔ شیر علی افسوس۔ منشی سداسکھ وسیل مصر، پنڈت للو لال جی نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا۔ ان تمام مصنفین اور مؤلفوں کے لئے ایک عام ہدایت تھی یعنی یہ کہ عبارت صاف ہو۔ اور دِقّت آفرینی اور لفظی شکوہ سے احتراز و پرہیز کیا جائے۔ تکلف پسند مصنفین کو سخت دقتیں پیش آئیں مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ چار و ناچار طبیعتوں کو سادگی پر مجبور کیا اور سادہ نگاری کی مثالیں بہت سی نظر آنے لگیں۔ اس عہد کی بعض کتابیں سادہ نگاری سے کوسوں دُور ہیں۔ مثلاً پنڈت للو جی لال کی تصنیف 'پریم ساگر' اور 'خزینہ دانش' اور اس کے مقابلہ میں منشی سدا سکھ اور میر امن کی تحریروں پر موجودہ عہد کی سادہ نویسی بھی قُربان ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مسٹر جان گلکرسٹ کو صیغہ تصنیف تالیف کے جانچ پڑتال کا زیادہ موقع نہ تھا یا یہ حضرات بالطبع پیچیدہ لکھنے اور سجع نویسی کے عادی ہو چکے تھے اور باوجود کوشش راہ راست یا حد مقررہ تک نہ پہونچ سکے۔

یہاں تک زبان کے تعمیری پہلو کو آپ حضرات نے مُلاحظہ فرمایا۔ مگر تعمیر کے پیچھے پیچھے تخریب کا ڈنڈا بھی چلتا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین اس معاملے میں اور بھی زرخیز ہے۔ یہاں تعمیر کے ساتھ ساتھ تخریب فوراً جلوہ گر ہوتی ہے۔ کانگرس کے جواب میں اینٹی کانگریس، اسکاوٹنگ کے جواب میں اینٹی اسکاوٹنگ نمودار ہوئی تھی۔ چُنانچہ مُلک کی فطری زبان کے مقابلے میں اسی وقت ایک غیر فطری اور مصنوعی زبان بھی ظہور میں آئی۔ جب فورٹ ولیم کالج میں اُردو دانوں کی قدر ہوئی تو تنگ نظری نے حسد کی آگ کو بھڑکایا۔ اور جس ذہنیت نے ہندوستان کو صدیوں غلام رکھا تھا وہ ایک نیا رُوپ بھر کر نُمایاں ہوئی۔ اُردو کے مقابل ایک زبان وضع کی گئی۔ اور چُن چُن کر مروّج فارسی و عربی الفاظ کے بدلے سنسکرت کے غیر مروّج الفاظ رکھے گئے۔ اور ذرا بھی نہ سوچا گیا کہ ایک مشترکہ زبان جو ہندو مسلم کی متفقہ کوششوں کا ثمر، اتحاد و یکجہتی کی جان اور

قومیت و وطنیت کی شان ہے اُس کے گلے پر چھری پھر رہی ہے۔ آزادیٔ ہند کا دشمن درحقیقت اس سے بڑا کوئی نہیں جس نے زبان میں تفریق و تمیز کی۔ ہندی کی پیدائش اس طرح اُردو کے مقابل میں ہوئی۔ یہ زبان پہلے بھاشا کہلائی پھر ناگری اور آخر میں ہندی سے موسوم و معروف کی گئی۔ اس لئے اس جذبۂ رشک اور تنگ نظری کے ساتھ ہندی کی تاریخ پیدائش انیسویں صدی کا آغاز ہے۔ فورٹ ولیم کے مصنفین میں سے اکثر اس جذبہ کے شکار تھے۔ ورنہ زبان میں اس قدر چوڑی خلیج حائل نہ ہوتی۔

اس وقت سے اُردو، ہندی (قدیم ہندی سے میری مُراد نہیں ہے وہ تو اُردو ہی کا ابتدائی نام تھا۔) دونوں پر نظر رکھنا ضروری ہے کیونکہ اب تک غیر فطری رجحانوں کی کوئی سوسائٹی یا انجمن نہ تھی۔ مروّجہ زبان کے خلاف چیخ پکار ہوئی اور پھر اکثریت جب صداقت پر مائل ہوئی تو پُرانی لکیر چھوٹ گئی۔ مگر اب حالات کچھ بدل چکے تھے۔ ملک میں ہندی اور اُردو کی بحث اُس وقت اور زور پکڑ گئی جب انگریز رپورٹروں اور تحقیقاتی کمیشنوں نے فارسی کے بجائے اُردو کو دفتری زبان بنانے اور ذریعہ تعلیم تسلیم کرانے کی سفارشیں کیں۔ اُردو جب عدالتوں میں اور مدرسوں میں رائج ہوگئی تھی۔ تنگ نظروں کو یہ کھٹکنے لگا۔ عاشقِ ناشاد کی طرح اپنے ہی گریبانوں پر رشک کرنے لگے۔

اُردو یا ہندوستانی کی بنیاد زبان عوام پر تھی اس لئے اسکے سمجھنے والے اور بولنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ملک کی فطری رجحان طبع نے تین تحریکیں نُمایاں کیں جن سے اُردو فرش سے عرش پر جا پہونچی۔ اِن تحریکوں میں فرقہ وارانہ بانَد کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ ہر مذہب و ملّت کے لوگ شریک تھے۔ پہلی تحریک جو فورٹ ولیم کالج کے بعد پیدا ہوئی وہ دہلی کالج سے وابستہ تھی۔ یہ کالج دہلی میں وسیع پیمانے پر کھولا گیا تھا۔ اس کا ذریعہ تعلیم اُردو تھا۔ علمی کتابوں کے ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے جاتے تھے۔ اور اس کی تعلیم بھی ترجمے کے ساتھ ساتھ جاری تھی۔ کالج نے بڑا کام کیا۔ اس کے پرنسپل ڈاکٹر بترس اور ماسٹر نگر امداُن کے لائق پروفیسر رام چندر اور پیارے لال، مولوی ذکاءاللہ، مولانا محمد حسین آزاد کی بدولت اُردو علمی زبان بن گئی۔ ہندی کو اس کالج میں روادارانہ جگہ ملی۔ اور ہر فارسی عربی پڑھنے والے طالب علم کا ہندی سیکھنا و نیز سنسکرت لینے والے طالب علم کا اُردو سیکھنا ضروری تھا جس سے ہندی سے کالج کا ایک طالب علم بھی بیگانہ نہ تھا۔ یہ کالج موجودہ تعلیمی مسائل کیلئے ایک عمدہ نمونہ ہوتا افسوس کہ زمانے نے اس کو حرفِ غلط کی طرح مٹانا چاہا مگر عثمانیہ یونیورسٹی نے اس کی یاد تازہ کردی ہے اور انہیں مقبول عام اُصولوں پر سب کے لئے یکساں مفید ثابت ہو رہی ہے۔ اس کالج کی برکتیں ہندوستان کو کیا کیا نصیب ہوئیں، پوری پوری جب معلوم ہوں گی جب مولوی عبدالحق صاحب مدظلہٗ کی پوری تصنیف "مرحوم دہلی کالج" کا مطالعہ کیا جائے۔

اِس سلسلے میں ہندی کے حمایتوں نے کیا کیا، اس کی پوری تفصیل اُس مضمون سے ہوتی ہے جو "ہندی شبد ساگر" کے خاص رکن پنڈت رام چندر شکل نے دیباچے میں ہندی ادب کی تاریخ کے عنوان سے لکھا ہے اور جو اَب علیحدہ کتاب کی صورت میں بھی شائع ہوچکا ہے۔ ہندی گد (نثر) کا بکاس (نشوونما) کے سلسلے میں آپ نے ان تمام کوششوں کو سراہا ہے جن کی بدولت ہندی کو اُردو کے پہلو میں جگہ دی گئی۔ حکومت کے سامنے کتنے وفد کتنے ڈیپوٹیشن ناکام رہے اُس سے واضح ہوتا ہے۔ حکومتِ ہند، ہندی کو زبان کا مرتبہ اس لئے نہ دیتی تھی کہ نہ تو وہ عہدِ حاضر کی زبان تھی اور نہ قرونِ وسطیٰ ہی میں کبھی بولی جاتی تھی۔ سر چارلس ووڈ اور سر چارلس ٹرلویین، جنہوں نے سارے ہندوستان کے دیہات اور قصبوں اور شہروں کا دورہ کیا تھا اپنی سرکاری رپورٹوں میں ہندی کو دیہاتی بولی اور اُردو، دکنی یا ریختہ کو ہندوستانی زبان تسلیم کیا تھا۔ ہندی کے ہنگاموں میں شورش اور جذبات دیکھکر گورنمنٹ نے اُسے اکثر صوبوں میں جگہ دیدی۔ محکمہ تعلیم کے افسروں اور ڈائرکٹروں نے گورنمنٹ کی اس غلطی کو آشکارا کرنے میں کوئی سنکوچ نہ کیا۔ اُنہوں نے اپنی سالانہ رپورٹوں اور پرائیویٹ چٹھیوں میں اس پر تاسف کیا۔ مسٹر ہارول ڈائرکٹر صوبہ مغربی اور شمالی۔ کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر صوبہ پنجاب، مسٹر کمپن نے اُردو کے مقابل ہندی کی ترویج و اشاعت سے نہ صرف یہ کہ اختلاف رائے کا اظہار کیا بلکہ زبان کی اس تفریق سے اُنہیں کافی صدمہ پہونچا۔ اِن مستند شہادتوں کو میں نے ایک دوسری جگہ پر "مستند شہادتیں" کے عنوان سے جمع کیا ہے۔ یہاں صرف مسٹر ہارول کا خط نقل کرتا ہوں جو انہوں نے موسیو گارساں دی تاسی محقق مشرقی زبان کی خدمت میں لکھا تھا:

"آپنے اپنے خطبات میں جو خیال پیش کیا ہے میں
اُس سے بالکل متفق ہوں۔ اُردو کو ہندی پر فوقیت
حاصل ہے۔ بحیثیت اپنے فرائض کے بجا آوری کے

سلسلے میں مَیں نے ہر ممکن موقع پر اُردو کی توسیع و ترقی کے لئے حمایت کی ہے اس لئے کہ مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں قومی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ اس سے میری مُراد وہ زبان ہے جو خاص و عام کی سمجھ میں آتی ہے۔ اس بارے میں مسٹر کسٹن جو صوبہ مغربی و شمالی میں سررشتہ تعلیم میں سب سے اعلیٰ عہدیدار ہیں، بڑی حد تک میرے ہم خیال ہیں لیکن بدقسمتی سے ابتدائی مدارس میں یہ طریقہ رائج ہوگیا ہے کہ اُردو یا ہندی میں سے کسی ایک کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔ چونکہ اکثریت ہندو طلبہ کی ہے اس لئے ہندی کا استعمال بڑھ رہا ہے مسلمان اور بعض ہندو جن کی مادری زبان اُردو ہے، اُردو کو ترجیح دیتے ہیں۔ میرے خیال میں اُردو ہندی کی تفریق قومی نقطۂ نظر سے سخت نقصان رساں ہے۔ یہ زیادہ بہتر ہوتا اگر ہندو بچوں کو اُردو سکھائی جاتی۔ بجائے اس کے کہ انہیں اُس بولی میں اظہارِ خیال کی مشق کرائیں جو بالآخر ایک دن اُردو کے آگے اپنا سرِ تسلیم خم کرے گی۔"

(از خطبات گارساں۔ دی تاسی۔ مطبوعہ انجمن ترقی اُردو۔ اورنگ آباد۔ دکن۔)

ہندی کے حامیوں میں اس وقت ایسی ہستیاں کمیاب تھیں جن کی نگاہ ہندو مسلم آمیز ہندوستانی کلچر پر ہو۔ تنگ نظری نے انکا مقصد زمانہ قدیم کی تہذیب کا احیا رکھا۔ اس لئے مروّجہ زبان ان کی نظروں میں قابلِ قدر نہ تھی۔ انہوں نے اس کا روپ تو عہد فورٹ ولیم ہی میں بدلا تھا اب اس کا ادب بھی ہندوستانی کہکر ہندوانی بنا دیا گیا۔ اور ہندی کا ناتا دھرم سے جوڑ کر علانیہ اس خیال کی اشاعت کرنے لگے۔ اس وقت اس جماعت کا یہ عام مسلک تھا کہ ہندی نہیں جانے اُسے ہندو نہیں مانتے "معقول پسندوں اور معتدل راہ اختیار کرنے والوں کو جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے، اس تحریک سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ خاموش اپنا کام کر رہے تھے۔ رواداری اُن کا مسلک تھا۔ یہ قضیۂ ہندی و اُردو لکھتے لکھتے ہیں اپنے ضمیر کو پراگندہ اور غیر مطمئن پاتا ہوں مگر حیرت اُن لوگوں پر ہے جو اُردو کو ہندی کا (جس کی بنا ہی ہندو نوازی پر پڑی) جواب اور مسلمانی زبان کہکر پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ "ہندی لٹریچر" مصنفہ ایف۔ اے۔ کے۔ سے میرے بیان کی تصدیق ہوتی ہے:-

"جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں شمالی ہند میں ہندی کی بہت سی بولیاں بولی جاتی تھیں مگر اُن لوگوں میں جو فارسی نہیں جانتے تھے شایستہ گفتگو کا ذریعہ اُردو تھا۔ اُردو میں بہت سے الفاظ فارسی عربی سے مستعار لئے گئے تھے جن کا تعلق اسلام سے تھا اس لئے ہندی بولنے والوں کے لئے ایک ادبی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی جو زیادہ تر ہندوؤں کو مرغوب ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو کو لیکر ایک زبان بنائی گئی اور اُس میں سے عربی فارسی کے الفاظ خارج کرکے اُن کی بجائے سنسکرت یا ہندی الاصل الفاظ داخل کئے گئے۔"

راجہ شیو پرشاد صاحب چونکہ محکمہ تعلیم میں ایک عرصے تک رہے۔ اُنہیں ہندی کی تصنع اور بناوٹ کا کچھ تو بذاتِ خود اندازہ ہوا۔ دوسرے چونکہ وہ ڈپٹی انسپکٹر ہونے کی حیثیت سے تعلیمی رپورٹوں اور تجویزوں سے زیادہ باخبر تھے، انہوں نے ہندی میں فارسی عربی لفظوں کو اس قدر جگہ دی کہ سوائے رسم الخط کے اُن کی تحریروں اور اُس عہد کی اُردو اسلوبِ بیان و ترکیبِ الفاظ میں مطلق فرق نہیں معلوم ہوتا۔ اس طرح ہندی اپنی راہ بھول کر اُردو سے جا ملی۔ مگر راجہ لکشمن سنگھ اور ہریشچند نے سخت نکتہ چینی کی اور "بشدھ ہندی" یعنی سنسکرت آمیز ہندی کے نمونے بکثرت دے کر ہندی کو اُردو سے بہت دور کر دیا۔

اس عرصے میں اُردو ایک رفتار سے برابر آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ سائنٹفک سوسائٹی ملکی، تمدنی اور خاص کر اقتصادی اُلجھنوں کو لیکر وجود میں آئی اور بعد کو علم و اخلاق بھی اُس کا اعلیٰ مقصد ہوگیا۔ اس سوسائٹی کے بانی مبانی سرسید مرحوم تھے جنکی اعتدال پسندی، رواداری اور بے لاگ کوششوں سے ہندو، مسلمان، عیسائی اُن کے رفیق کار بنے۔ اس دوسری تحریک نے علم و ادب و سیاست و اخلاق ہر موضوع پر اپنی توجہ صرف کی جسکی بدولت اُردو علمی حیثیت سے آگے نکل کر سیاست کے لئے ایک عمدہ زبان بن گئی۔ ہندوستان کے ادب کا رنگ بدلا۔

وسعت پیدا ہوئی اور ایک خاص ڈھب پر چلنے کی عادت بھی کم ہوئی۔ سوسائٹی کے رسالے تہذیب الاخلاق کا اثر نہ صرف اس سوسائٹی کے ممبروں پر پڑا بلکہ دوسرے اخبارات اور رسالوں نے بھی وہی راستہ اختیار کیا۔ سادگی عام مذاق کی حیثیت سے اس وقت سے ادب میں مسلّم ہوئی۔ اور مغربی علوم سے جو وحشت ہمارے سماج کو تھی وہ بہت کم ہوئی۔ اس طرح سائنٹفک سوسائٹی نے نہ صرف اردو زبان میں بلکہ اس زبان کے بولنے والے ہندو مسلمانوں میں روشن خیالی، آزادیٔ رائے اور دوسروں کی خوبیوں پر نگاہ رکھنے اور اُنہیں قبول کرنے کے رجحانات پیدا کئے۔

تیسری تحریک اورنٹیل کالج لاہور سے متعلق ہے۔ اس کالج کا مقصد محض تعلیم و تعلم نہ تھا۔ اس نے ایک صیغۂ تصنیف و تالیف بھی قائم کیا تھا۔ اس کی ابتدا سائنٹفک سوسائٹی کی طرح ایک ایسی انجمن سے ہوئی تھی جو علمی و تاریخی معلومات کو عام کرنا چاہتی تھی۔ اسی کی کوششوں سے یہ کالج قائم ہوا تھا۔ آگے چلکر انجمن کے مقاصد کالج نے اپنے سر لے لئے۔ سائنٹفک سوسائٹی کی طرح اس کے دائرۂ عمل میں وسعت و ترقی تو نہ ہوئی مگر تصنیف و تالیف کے سلسلے سے عربی و فارسی و انگریزی کے ترجموں سے اُردو کو بڑھایا۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو دُنیا کی ترقی یافتہ زبانوں سے ہمدوش ہوگئی۔ اب وہ موجودہ صورت میں برابر بڑھتی ہوئی بہت آگے نکل چکی ہے۔

اُردو کی ترقی اہلِ مُلک کے لئے اُسی طرح یکساں مُفید تھی جیسے سورج کی روشنی، ہوا اور پانی۔ مگر جو بیج انیسویں صدی کے شروع میں بویا گیا تھا، اُس کی بھی ایک محدود حلقے میں پرورش ہو رہی تھی۔ اُردو کی ترقیاں اس جماعت کو کھٹکتی رہیں۔ ناگری پرچارنی سبھائیں، ناگری پرچار کی منڈلیاں، ناگری پرچار کی سبھائیں قائم ہوئیں۔ زور شور سے ہندی پرچار کے لئے اُردو کی تخریب شروع ہوئی۔ کسی نے کہا کچہریوں میں ہندی کو جگہ دلانے سے اس کی ترقی ہوگی۔ کسی نے کہا اُردو جب تک رہے گی یہ پنپ نہیں سکتی۔ کسی نے کہا بڑا غضب ہے کہ اُردو تو ایسا ریڑھ مار رہی ہے کہ جس کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ ایک صاحب نے تو تقریباً ۰۰ صفحوں کی ایک کتاب لکھی اور رسم الخط پر آ ٹوٹے۔ مثلاً:

ریل، ریل اُردو میں ایک
ایک بات ہے ٹھیک ورٹھیک

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اس عیب جوئی کو بُرا سمجھا۔ اور ہندی کی بڑی خدمت اُنہیں اُردو والوں کی تقلید میں نظر آئی۔ پنڈت مہابیر پرشاد دویدی نے خواجہ الطاف حسین حالی و مولانا نذیر احمد صاحب کی کوششوں کی طرف ہندی کے طرفداروں کو توجہ دلائی۔ اور مقدمۂ شعر و شاعری و آبِ حیات سے استفادہ کرنے کے لئے ہندی کے ادیبوں سے اپیل کی۔ اور اپنی تصنیف "رسگیہ رنجن" میں مقدمۂ شعر و شاعری کے اکثر حصّے ترجمہ کرکے پیش کئے۔ زبان بھی عام فہم بنانے کے خیال سے فارسی و عربی سے فیض حاصل کرنے لگے۔ مگر بُنیادی مقصد جو بھولنا نظر آیا تو پھر "شُدھ ہندی" نویسی پر مائل ہوگئے۔ اور کہیں اوسط راہ اختیار کی۔ اس طرح اس عہد کی ہندی تحریریں تین قسموں میں رکھنی پڑیں۔ ہندی سُدھار کا مجاہدِ اعظم یعنی مہابیر پرشاد دویدی بھی اپنی ہندی تحریر کو اس تقسیم سے نہ بچا سکا۔ یعنی یک رنگی کے بجائے اُنکی ہندی بھی ترنگی نظر آنے لگی۔

پہلا رنگ:- جس میں ہندی الاصل الفاظ ہوں۔ (مطابق پروگرام) اس کا نام شُدھ ہندی رکھا گیا۔

دوسرا رنگ:- وہ ہندی جس پر اُردو کا سایہ ہے۔ اس کا نام ہوا لِشرت ہندی۔

تیسرا رنگ:- وہ ہندی جو باوجود کوشش اور طبیعت پر زور ڈالنے کے بھی صاف نہ ہوئی۔ اور اُردو سے مُشابہ ہو۔

ہندی کو خالص ہندی الاصل بنانے کی کوشش شروع ہی سے ہندی دانوں کے طبقہ ہی میں معرضِ بحث میں پڑگئی تھی۔ فارسی عربی لفظوں کا استعمال بول چال میں ہوتا ہی تھا۔ قلم اُٹھاتے وقت بھی وہ فوراً حاضر آتے تھے۔ اس لئے پنڈت بھیم سین نے اس کی بہت پیشتر یہ تجویز پیش کی کہ ایسے لفظوں کو اب ہم لوگ سنسکرت کے ڈھانچے پر ڈھال سکتے ہیں۔ مروّج فارسی و عربی لفظوں کی ایک لمبی فہرست مع اُس کے بدل الفاظ کے پیش کی۔ یہ جدّت ہندی دانوں کی ذہنیت کا پتہ دیتی ہے کہ وہ اپنی زبان کو اُردو سے کیوں نہیں ملنے دیتے۔

آپ فرماتے ہیں کہ:-

۱۔ چشمہ کو جو آنکھوں پر لگایا جاتا ہے اس آنکھ کی نسبت سے چکچھا (چکھُ ـ آنکھ) کہا جائے۔

۲۔ سفارش کا ترجمہ نہیں قلبِ ماہیت چھپر آشش سے کیا جائے۔

۳۔ انتقال کا بدل انت کال یعنی دمِ آخر ٹھہرایا جائے۔

مگر ہندی کے اس پُرجوش حمایتی کی غیر معمولی اور بنرانی سُوجھ نہ تو قابلِ عمل ہوسکی اور نہ قابلِ قدر متصور ہوئی۔ کیوں؟ اس بارے میں اُس وقت کے زبردست یورپین مستشرق کی رائے نقل کرتا ہوں جو نہایت ضبط و تحمل سے ان تماشوں کو دیکھ رہا تھا وہ اپنے خطبہ ۱۸۶۶ء میں لکھتا ہے:۔

"میرے خیال میں اُردو کے مقابلے میں ہندی
کی جانب توجہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے آج کل کی
جدید یونانی کے بجائے قدیم یونانی کی طرف توجہ
کی جائے۔ تعجب اس پر ہے کہ اُردو کی مخالفت
بھی ہے اور۔ چراغ علی، اُردو کی تصانیف بھی
دیوناگری رسم خط میں چھاپی جا رہی ہیں۔ چنانچہ
ابھی حال میں دیوان نظیر اور میر حسن کی مثنوی
سحر البیان اور دوسری تصانیف جن کی زبان
خالص دہلی کی ٹکسالی زبان ہے دیوناگری کے رسم
خط میں طبع کی جا رہی ہیں . . . .
. . . . مسٹر جے بیمز نے کلکتہ
کی ایشیاٹک میں جو مضمون لکھا ہے اس میں اس
امر کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے . . . . . .
. . . موصوف اپنے سات سال کے تجربے کی بنا
پر کہتے ہیں کہ اُردو ہندوستانی کی مہذب ترین
شکل ہے اس میں اعجاز و فصاحت بدرجہ اتم موجود
ہے۔ موصوف نے اس امر کی طرف بھی اشارہ
کیا ہے کہ دوآب گنگا کے رہنے والوں کی گھٹی
میں یہ زبان شامل ہے۔ اُنہیں اس سے محروم
نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو سے عربی فارسی الفاظ
کو خارج کرنا ایسا ہی ہے جیسے آپ انگریزی زبان سے
لاطینی زبان نکالنے کی کوشش کریں اور چاہیں کہ اس میں صرف
سکسن اصل کے الفاظ باقی رہیں ـــ زبانیں اس
طرح ارادہ کرنے سے نہیں بنائی جاتیں۔ زندگی
کی ضروریات سے ان کی ساخت میں تغیر و تبدل
ہو سکتا ہے۔ سیاسی فتوحات۔ تجارتی تعلقات،
ادبی اور علمی ضرورت سے زبان میں تبدیلی پیدا
ہوتی ہے اور اس میں الفاظ داخل ہوتے ہیں۔
قابل مضمون نگار نے بڑی خوبی سے یہ بات بتائی
ہے کہ جس طرح انگریزی میں المانی اور لاطینی عنصر
موجود ہیں اسی طرح اُردو میں آریا اور سامی یا
اسلامی عنصر موجود ہیں . . . .
ایم۔ بیمز کا خیال ہے کہ اُردو میں عربی فارسی کے
جو الفاظ مستعار لئے گئے ہیں وہ مطالب کو بہ نسبت
دیسی الفاظ کے زیادہ اچھی طرح واضح کرتے ہیں
. . . . اگر دوسری زبانوں کے الفاظ
مستعار لیکر کام نکل سکتا ہے تو نئے نئے غیر مانوس
الفاظ تراشنے سے کیا فائدہ۔ بنگالی میں الفاظ
تراشنے کا کام ہو رہا ہے۔ لیکن اس سے اس
زبان کو کوئی خاص ترقی حاصل نہ ہوئی۔ ہندوستانی
(اُردو) ہر جگہ بنگالی کے مقابلے میں کامیاب
نظر آتی ہے۔"

حقیقت سات پردوں سے آشکار ہو کر رہتی ہے حقیقی اور زندہ زبان کی خوبیوں پر جتنا بھی پردہ ڈالا گیا وہ اور نمایاں ہو اُٹھتی ہے اس پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں وہ اُلٹ کر معترض پر پڑ جاتے ہیں۔ یہ زندہ زبان کا معجزہ ہے۔ یہ ہے حُب کی داد۔

بہاری کا یہ دوہا اس موقع کے حسب حال ہے:۔

ساجے موہن موہ کو موں ہی کرت کچین
کہا کرو دل اُلٹو پڑے ٹونے کونے نین
جھول جھول

اپنی منقاروں سے خود کستے ہیں پھندا جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

زندہ زبان میں ایک کشش ہوتی ہے جو ذوق و نظر کو خود بخود دعوت دیتی ہے۔ اُردو میں وہ کشش موجود ہے جن کی آنکھیں حقیقت کو دیکھکر بند نہیں ہو جاتیں وہ اس کو اپنی پیاری زبان سمجھکر اس کی تخریب نہیں کرتے۔ اور اپنی وسعت کے اندر خدمت بھی کرتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ بھی ہیں جن کی نگاہ محض عیبوں پر پڑتی ہے یا وہ خوبیوں کو پی جاتے ہیں عصبیت نفرت پیدا کر دیتی ہے تب دوسروں کی توسنتا نہیں اپنی ہی تنگ سُناتے جاتا ہے۔ ہمارے ملک کی ہوا کچھ ایسی بگڑ رہی ہے کہ بلا استثنا ہندو مسلمان اس قسم کے مرض میں گرفتار ہیں۔ پھر وہ سچائی کے گھاٹ نہیں لگتے۔ انہیں تصویر کا ایک ہی رُخ دکھائی

دیتا ہے۔ اُردو سے نفرت رکھکر کترانے پھرنے والے بھی اس مرض کے بُری طرح شکار ہیں۔ وہ ایسی عبارت کو جو اُردو رسم خط میں ہو ہاتھ نہیں لگاتے، بھلا حقیقت سے کیونکر آشنا ہو سکتے ہیں۔

جن لوگوں نے اُردو ادب و لٹریچر کو پڑھا۔ دیکھا اور اس پر غور کیا وہ اُس کی سہولت اور سادگی کے مدّاح ہیں۔ اور زندہ زبان کی اُن خُوبیوں سے جس سے وہ زندہ ہے ہندی میں بھی رُوح پھونکنا چاہتے ہیں۔ پنڈت رام نریش ترپاٹھی اپنی "کبتا کومدی کی بھومکا" (دیباچہ) میں لکھتے ہیں:-

ہندی بحروں میں اُردو کی پیروی کرنیکی صلاح

ہندی کب کو ایسا سوبھاگ نہیں پراپت (حاصل) ہے۔ اُس کے سامنے بڑا بندھن ہے جو رو ڑا جیسا ہے اُسے بلا کانٹ چھانٹ کئے ویسا ہی جمانا پڑتا ہے اُسے ذرا بھی کانٹ چھانٹ کرنے کا ادھکار نہیں ہے وہ آنند (اوّل نون مفتوح اور دوسرا ساکن ملفوظ) کو آنند (دوسرا نون غنہ) بھی نہیں کر سکتا اس کے پاس کی زمین بڑی اوبڑ کھابڑ ہے اُسی پر ہوکر اس کا سنکرا راستہ ہے اُردو کویوں نے اس تکلیف کو سمجھا ہے۔ اُنہوں نے کچھ اُدنڈتا (بیجا تصرف) سے کام لیا ہے۔ . . . . (تقطیع میں حروف کے گر جانے پر بلا وجہ ناک بھوں سکیڑنے کے بعد) اب ایسا کرنے کیلئے ہندی کے کچھ کب اُردو والوں ہی کا راستہ پکڑنا چاہتے ہیں۔

(ہندی ساہتیہ کا سنچھپت اتہاس)

ہندی نثر میں اُردو کے اسلوب بیان اختیار کرنیکی سفارش

جب ہندو مسلمانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے تو ایک کو دوسرے کی بیش بھوشا (بھیس بھاؤ وضع قطع) سے نفرت کیوں ہونی چاہیئے۔ پرتیک (ہر ایک) ہندو کو اُردو سیکھنی چاہیئے اور پرتیک (ہر ایک) مسلمان کو ہندی۔ میری تو درڑھ دھارنا (اٹل رائے) ہے کہ کوئی بھی بیکت (شخص) اُردو جانے بنا ہندی کا سیدیکھک (اچھا انشا پرداز) نہیں ہو سکتا۔ اب تک اُردو کی بھاشا شیلی (اسلوب بیان) کی خوبی انشوں میں ہندی سے بڑھکر ہے۔ اُردو میں محاروں کا جیسا سُندر پریوگ (عمدہ استعمال) دیسا وہی لیکھک کر سکتے ہیں جو اُردو جانتے ہوں۔" اس لئے ثابت ہوا کہ ہندی اُردو سے گلے ملنے کو بیکل رہی ہے اور ایک ہی دور میں مختلف قسم کی نگارش کے نمونے ملتے ہیں۔ بیسویں صدی میں کچھ ادیب اس قسم کے ہوتے جن کا تعلق اُردو ہندی دونوں سے رہا و نیز انگریزی ادب کا پرتو دونوں پر یکساں پڑ نیز دوگ اور ایک زبان عام بنانے کی فکر ہوئی۔ چندر شیکھر گولیری اور مرحوم پریم چند، سُدرشن نے ہندی کی قدامت پسندی کی علانیہ عملی مخالفت کی۔ بشن ناتھ آزاد اور بالمکند گپت نے بہت کچھ ہندی کو اُردو سے ہم آہنگ کر دیا مگر کاشی کی ناگری پرچارنی سبھا کے زاویہ نگاہ میں کچھ ایسی تبدیلی ہوئی کہ "شدھ ہندی نویسی" کا جذبۂ طوفانی بن گیا۔ وہ تحریریں نظروں سے گر گئیں جن میں دوست کے بدلے متر، یا کے بدلے اتھوا، اگر کی جگہ یدی۔ لیکن کے بدلے کنتو، گاؤں کے بدلے گرام، شہر کے بدلے نگر۔ کام کے بدلے کاریہ، اور میٹھے کے بدلے مدھر کا استعمال نہ ہو۔ ناگری پرچار کے سلسلے میں قدامت پرستی کی خُوب خُوب اشاعت ہوئی۔ آلو امریکہ سے آکر ہندوستان میں پھیل گیا۔ ہندی نے اقصائے ہند میں اپنی شاخیں پھیلا دیں۔ اپنے سٹور اُس نے ہندی۔ ساہتیہ سمیلن۔ اور ناگری پرچارنی سبھا کے نام سے اسی طرح ان دراوڑی حلقوں میں بھی کھولے ہیں جہاں آریائی عنصر سے زیادہ اسلامی تہذیب کے عناصر نے نقش قائم کر دیا ہے۔ کاش کہ ان مجلسوں کا مقصد زندہ زبان کی اشاعت و رواج ہوتا۔ اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتے کہ اُردو ہی اصل ہندی ہے، ہندی آگے نکل چکی ہے۔ قدامت پسندی عہد طفولیت کو قائم رکھنے کی مضحکہ انگیز کوشش کر رہی ہے۔ قدامت پسندی ہی ہے جو کبھی ہندی سے دھرم کا ناتا جوڑتی ہے۔ قدامت پسندی ہی ہے جو کبھی ہندوستانی کے بدلے بھارت ساہتیہ پرشد میں ہندی۔ ہندوستانی کا بے معنی مرکب لفظ وضع کراتی ہے۔ جو بچہ پنج سالہ سے بڑھکر تیس سالہ جوانوں میں داخل ہو چکا ہو نا ممکن ہے کہ اس کا بچپن واپس لایا جائے۔

نور نامے کی بحر متقارب کی مثنوی کا نام ہندی ہی تھا۔ اُردو رسم الخط اور اُردو بحر میں لکھا گیا تھا۔ اب بھی اُن کی پُرانی اُردو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ خسرو کے تمام کارنامے جو فارسی زبان میں نہ تھے ہندی ہی سے موسوم ہیں جو اُردو کی ابتدائی شکل ہے۔

مصحفی اور انشاء نے بھی ہندوستانی زبان کو اکثر ہندی کہا۔ جب ہندی کی مختلف بولیوں میں اس ہندی کو فروغ ہوا اور وہ ممتاز ہوگئی اُس وقت اس کا نام بدلا۔ پہلا نام بھی ہماری زبان کا صفاتی تھا ذاتی نہ تھا۔ اور دوسرا نام زبان ریختہ۔ زبان اُردوئے معلیٰ شاہجہان آباد تھے۔ جو مختصر ہوتے ہوتے اُردو ہو کر رہ گیا۔ اور آخر میں ہندوستانی کا نام بھی صفاتی ہی ہے۔ ہماری زبان نے ترقی کی منزلیں قدرت کے اٹل قانون کے مطابق طے کی ہیں۔ ہندی نام اگر ایک مخصوص معنی میں مشہور نہ ہو گیا ہوتا تو یہ لفظ ہندی ہندوستانی سے بہتر زبانِ ہند، پر اشارہ کرتا۔ مگر سب سے عمدہ فیصلہ انڈین نیشنل کانگریس کا تھا کہ ہندوستان کی زبان ہندوستانی کے نام سے موسوم ہوگی خواہ ناگری رسم خط میں ہو یا فارسی رسم خط میں؛ "بھارتیہ ساہتیہ پرشد" کا کانگریس کے فیصلہ کو نہ ماننا صاف ظاہر کرتا ہے کہ ہندی، ہندوستانی کی کسوٹی پر صحیح نہیں اُتر سکتی۔ جبھی تو باوجود اس کے جناب مولوی عبدالحق صاحب نے جب پرشد کے اُس ریزولیشن کی ترمیم کی معقول وجہیں پیش کر کے مہاتما گاندھی جی کو ریزولیشن میں زبانِ ہند کے اسم نویسی اور نقص بتا کر لاجواب کر دیا تو انصاف کے بجائے اُنہیں طاقت کو کام میں لانا پڑا۔ اور انہوں نے کہا:۔

(۱) کانگریس کے ریزولیشن میں نے بنائے تھے۔

(۲) میں نے اس کے (ہندی اتھوا ہندوستانی) کے معنی سمجھائے ہیں جو آپ نے ہنس کی تحریروں میں دیکھے۔

(۳) میں ہندی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہندی سمیلن کے ساتھ ساتھ چلنا ہے۔

اور جب اس پر موصوف نے مہاتما جی سے کہا کہ آپ نیشنل کانگریس کے فیصلہ کے ساتھ کیوں نہیں چلتے تو جواب میں فضا کی خاموشی تھی۔ حالانکہ وہاں کانگریس کے سینکڑوں افراد اور تین تین صدر موجود تھے۔ گاندھی جی کی خاموشی سے تو مجھے تعجب نہیں مگر دیش کے مایۂ ناز سپوت جواہرلال کی خاموشی حیران اور ششدر کر دیتی ہے۔ گاندھی جی کی زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ یہ بھی ہے کہ اگر ریزولیوشن میں تنہا، ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اُردو سمجھا جائے گا۔ اس سے ہندی کی کمزوری صاف ظاہر ہو رہی ہے۔ اور یہ بھی روشن ہو جاتا ہے کہ اُردو، ہندوستانی کی کسوٹی پر صحیح اُتر تی ہے۔ اسی خطرے نے ہندی ہندوستانی کا جدید مرکب لفظ وضع کرایا ہے۔

اس طرح ہم دیکھ رہے ہیں ہر دور میں تعمیری اور تخریبی کوششیں ہندی کو ٹیڑھی میڑھی رفتار سے آگے بڑھا رہی ہیں اور اس کشمکش میں بازی قدرت کے ہاتھ رہی ہے اور انسانی کوششیں قدرتی زبان کے آگے جھک رہی ہیں۔ آخر اس ہندی کو ہندی ہندوستانی بنانے میں بھی قدامت پسندی کا زور کچھ نہ کچھ ٹوٹا ہی ہے۔ اخباروں میں "پرارمبھک شکشا" کے بدلے کاکا کالیکر کی وارد ھاشیزی کے ڈھلے ہوئے لفظوں میں سے پارتھمک تعلیم کا بدل سامنے آچکا ہے۔ نئی سوجھ بوجھ کی نرالی ترکیبیں کم سے کم اتنا تو ضرور کرینگی کہ چار چار انگل کے سانسک مرکبات ہندی سے اُڑ جائیں گے۔ اور اگر ہاتھی کے دانتوں کی طرح محض دکھلانے کے لئے ہیں تو پھر ڈھول کی پول کھولنے والے ہندی حلقہ سے نمایاں ہوں گے۔ اور درحقیقت زبان کا سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ وہ آلۂ رازداری بنائی جائے۔ یہ رازداری زبان کو محدود اور خیالات کے میدان کو تنگ کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے ہندی زبان کی سچی خدمت کرنے والوں نے ایسے مصنفین اور انشا پردازوں کی کھری تنقیدیں کیں۔ اور ان کی شان ادبی گنہگار یا مجرم کی ہو گئی ہے۔

(۱) پنڈت رماکانت۔ ایم۔ اے۔ مصنف گدیہ میمانسا نے للوجی لال کے بارے میں صاف صاف لکھ دیا کہ پنڈت جی نے فارسی عربی لفظوں سے تو پرہیز کیا ہی تھا شبہ ہیں ایسے لفظوں کو بھی چھوڑ گئے جو ٹھیٹ ہندی تھے اور اُن کے بدلے یا تو ایک جملہ وضع کیا یا سنسکرت کے آگے ہاتھ جوڑے۔

(۲) بھیم سنگھ کے دماغ کی جدت اُنکے لئے کلنک کا ٹیکا بن گئی۔ آج چشمہ کے بدلے چکچھا اور سفارش کا دپ چھپر اشمش سنکر ہندی ادب کا مبتدی بھی ہنس دیتا ہے۔

(۳) پنڈت چندر شیکھر گولیری نے ہندی نثر و نظم کی بدلی ہوئی صورت کے خلاف اپنی سچی رائے پیش کر دی اور صاف لکھ دیا۔ اُردو نثر و نظم موجودہ ہندی کے گد (نثر) پد (نظم) سے پہلے معرض وجود میں آچکا تھا۔

(۴) پنڈت پریم چند نے پنڈتاؤ بھاشا کے خلاف بنارس (جو ہندی کا مرکز بنایا گیا ہے اور رہے بھی) میں مجمع عام میں کھلے خزانے کہہ دیا کہ ہندی کو اُردو پن سے جس قدر دور لے جائیے گا بھاشا

مردہ ہو جائیگی۔ یہ کلچر غالباً اپنائے وطن کو بھولا نہ ہوگا۔

اُردو سے کوئی ہزار کترائے مگر اس سے پرہیز مشکل ہو۔ ملک کی فطری زبان آب و ہوا و پیداوار سے بالکل مشابہ ہے جس طرح ایک جگہ کے رہنے والوں کے لئے مختلف ہوائیں، مختلف فضائیں نہیں ہو سکتیں اسی طرح دو مختلف زبانیں بھی نہیں ہو سکتیں۔ اُردو کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ اس لئے اس کی تازگی سب کو بھاتی ہے۔ ماحول کی خوشبو اس میں بس گئی ہے۔ اس لئے اُس کی طرف سب بڑھیں گے۔ تہذیب حاضرہ سے وہ برابر مقابل رہی ہے اس لئے اُس میں طاقت اور زور رہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا دم خم ہر دل کو پُر زور بناتا ہے۔ اس کے تیر و نشتر کی لذت کے لئے ہر دل مشتاق نظر آتا ہے۔

اُردو کی شان میں وہ لوگ بھی تر زبان نظر آئیں گے جو آج اس سے کتراتے پھرتے ہیں۔ مگر وہ یہ کہتے ہوئے نظر آئیں گے:۔

بدور گر دی من از غرور می خندد
حریف سخت کمانے کہ در کمیں دارم

چراغ علی

سجنی
دل ہے تیرے بس میں

دل کی تمناؤں کو مٹا دے
بستیِ دل ویران بنا دے
کیوں ہے پیش و پس میں
سجنی
دِل ہے تیرے بس میں

تیری نظر کیوں کر پہچانیں
دل کیا جانے۔ ہم کیا جانیں
پریم نگر کی رسمیں
سجنی
دل ہے تیرے بس میں

یوں تو ہر اک جا نور ہی تیرا
ہر ذرہ اک طور ہے تیرا
تو ہے دلِ بیکس میں

سجنی
دل ہے تیرے بس میں

دل کو ذرا تسکین ہی دیدے
ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھر کے
کھا کے جھوٹی قسمیں
سجنی
دل ہے تیرے بس میں

دیکھ۔ ترا بہزاد پناں ہے
رنگ وفا ملتا ہی کہاں ہے
ہر کس و ناکس میں
سجنی
دل ہے تیرے بس میں

بہزاد لکھنوی

زندگی اور اُسکی سرگذشت

نظام عالم کو معرضِ وجود میں آئے تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا کہ اس تخلیق دہندۂ انس وجان و کون و مکان نے حضرت جبرئیل کو حکم دیا کہ وہ زمین پر جاکر اُسکی مخلوق کا مُلاحظہ کریں. حضرت جبرئیل نے سرِ تسلیم خم کیا اور پردں کو تولتے ہوئے زمین کی طرف روانہ ہوئے.

جب کرۂ ارض کے قریب پہونچے تو دیکھا کہ انسان نشۂ ہستی میں چُور، بادۂ غرور سے مخمور، تمکنت کے ساتھ بیٹھا تمام دُنیا پر حکمرانی کررہا ہے۔ اس کی عقل کا سکہ سب کے دلوں پر جما ہوا ہے۔ نہ کسی کو تاب گفتار نہ مجالِ سرکشی۔ چرندے، پرندے، کیڑے، مکوڑے غرض جتنی بھی مخلوق ہے اس کے نام سے ڈرتی اور حکم سے لرزہ براندام ہوجاتی ہے۔

اس کے بعد حضرت جبرئیل کی نظر ایک بیل پر پڑی جو سر نیچا کئے جگالی کررہا تھا اور اپنی دُم سے مکھیوں کو اڑانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔ لیکن مکھیاں اُسکو چین نہ لینے دیتی تھیں. بادل کی طرح جھوم جھوم کر آتی تھیں اور مینھ کی طرح برسنے لگتیں۔ اسی نظارے کو تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ آقا ہاتھ میں پینا لئے آموجود ہوا اور اُس کی کیل سے پیٹھ گودنی شروع کردی. بیل اپنے مالک کا منشا سمجھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور کھیت کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچکر اُس کی کیا دُرگت ہوئی ناقابل بیان ہے۔ بعض دفعہ تو وہ تنگ آکر خدا سے موت کی دُعا مانگتا مگر جب اپنے آقا کو کہتے سُنتا "یہ بیل بُڈھا ہوگیا اب اسکو قصائی کے ہاتھ بیچدونگا" تو غریب کے رہے سہے ہوش بھی اُڑجاتے، اور پھر محنت سے کام کرنا شروع کردیتا. صبح سے شام تک خُون پسینہ ایک کرکے اُس وقت واپس آجاتا جس وقت دُنیا والے فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں سے محظوظ ہونے گھر سے باہر نکلتے۔ یہ بے بس و بے زبان ان دلفریب خستگی کو دُور کردینے والے مناظر سے بھی دوچار نہ ہوسکتا تھا اور اپنی غلامی پر آنسو بہاتا لوٹ آتا۔

رُوح الامیں جب آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کتا، انسان کے جان و مال کا ضامن، اپنے آقا کے دروازے پر بیٹھا ہوا آتے جاتے کو دیکھکر حفظِ ماتقدم کے اُصول کے لحاظ سے بھونک اُٹھتا ہے. رات کی تاریکی سے موقع جو انسان فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے اور یہ سمجھکر کہ دُنیا والے سو رہے ہیں نقب زنی کے اوزار ساتھ لیکر روانہ ہوتا ہے. چونکہ باحس ہے اس لئے ایسے مکان میں نقب زنی شروع کرتا ہے جہاں سے موقع نازک ہونے پر بھاگ بھی سکے. چور اپنا کام شروع کرتا ہے۔ گھر والے پاؤں پھیلائے دُنیا ومافیہا سے بے خبر، چادر تانے سو رہے ہیں۔ لیکن وفادار شب بیدار کتا کھٹکا پاتے ہی چور کو آدباتا ہے۔ چونکہ وہ پہلے ہی سے اس بات کا انتظام کرچکا تھا، چور بھاگ گیا اور کتا بھونکتا رہ گیا۔ اہل خانہ کی آنکھ اس شور وغل سے کھل گئی۔ اُٹھا اور گھر کا کونا کونا چھان مارا، مگر چور کا نہ پتہ چلنا تھا نہ چلا اور اس محسن کش نے ایک لکڑی اُٹھائی اور کُتے کے اُوپر پل پڑا۔ اتنا مارا کہ نڈھال ہوگیا۔ کتے کو اسبات کا مطلق رنج نہ تھا کہ مالک نے کیوں مارا۔ مگر رہ رہ کر اس کے ان نشتروں کا خیال آتا جو اُس نے مارتے وقت استعمال کئے تھے اور کہا تھا "نمکحرام کہیں کا، کمبخت دن بھر پڑا سوتا ہے، رات کو جاگتا ہے. جب تنہائی سے طبیعت گھبراتی ہے تو دوسروں کو اُٹھاکر ان کی نیند حرام کرتا ہے۔ روز کے روز یہی شغل، یہی مکاری، آج ایسی ہڈیاں نرم کروں گا کہ عمر بھر کسک رہے" کتے کو جب ان باتوں کا خیال آتا تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے۔

اس کے بعد افسرِ قدسیاں کی نظر ایک تالاب پر پڑی، کیا دیکھتے ہیں کہ موجیں تاب مفارقت نہ لاکر ساحل سے التجائے وصال کررہی ہیں۔ لیکن اُس کی رقیب بادِ صرصر، غصّے میں بھر کر، آندھی بنکر آتی اور ناتواں عاشق مہجور کے رُخساروں پر زور سے طمانچہ مارتی گذرجاتی ہے. کنول بھی بعض دفعہ اپنے رفیق کا ہمنوا ہوکر مدد کو اُٹھتا ہے مگر فوراً ہی صرصر اُس کی کمر آدباتی ہے. لہروں کے آبلۂ دل سینہ پر حباب کی شکل میں اُٹھتے ہیں اور پھوٹ جاتے ہیں۔ موجوں کا غصہ کی وجہ سے یہ حال ہے کہ ایک تھرتھراہٹ بدن پر رقصاں نظر آتی ہے۔ موجوں کی رفتار ایسا منظر پیش کررہی ہیں جیسے سپیرے کے پٹارہ سے سانپ نکل بھاگے ہوں۔ کنارے کی طرف جو دیکھا تو ایک سفید پرندہ چھوٹی چھوٹی نقرئی مچھلیوں کا شکار کھیلتا نظر آیا.

یہ بگلا تھا۔ جب کسی مچھلی کو پکڑتا تھا تو اُس کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کرتا، کئی مرتبہ اُچھالتا، ننھی مچھلی کا کلیجہ دھک سے ہوجاتا۔ لیکن اپنے آپ کو زندہ پاکر عارضی ہنسی ہنستی تاکہ بگلے کا دل خوش ہو۔ ممکن ہے کہ بگلہ خوش ہوکر چھوڑ دے۔ لیکن افسوس یہ نہ سمجھی کہ گھوڑا دانے سے دوستی کرکے کیا کھائے گا۔ غرض تھوڑی دیر بعد بگلہ اُسکو نگل گیا۔ اور اس نوزائیدہ کی معصوم دُنیا اُجڑ کر بگلے کے پیٹ میں منتقل ہوگئی۔ جب بگلے کا پیوٹا ان سیمیں پاروں سے بھر گیا تو وہ اُڑکر کنارے پر جا بیٹھا۔ دل میں خیال آیا۔ ممکن ہے کہ مظلوم بچوں کے ماں باپ آئیں اور شکوہ شکایت کریں۔ بگلہ شرمندہ ہوا اور اپنا سر پروں کے اندر چھپاکر کھڑا ہوگیا۔ تھوڑی دیر میں ایک پاؤں بھی پروں کے اندر کرلیا تاکہ مچھلیاں سوتا سمجھکر واپس ہوجائیں۔ اس حالت کو تھوڑی دیر نہ ہوئی تھی کہ دُور سے ایک آواز ہوئی اور کچھ چھرّے بگلے کے پاس سے سنسناتے ہوئے نکل گئے۔ بگلہ اُڑکر دوسرے کنارہ پر جا بیٹھا۔

اِن رُوح فرسا واقعات کا مشاہدہ کرکے جبرئیل امین واپس ہوگئے اور جو کچھ دیکھا تھا من وعن درگاہِ علیم وبصیر میں جاکر عرض کردیا۔ اس عالم الغیب نے فرمایا: "اے جبرائیل جو کچھ تم نے دیکھا ایسا روزانہ روئے زمین پر ہوتا ہے اور عنقریب اُن کا مقدمہ ہمارے حضور میں پیش ہونیوالا ہے"

جیسی کہ عالم الغیب نے پیشینگوئی کی تھی، بگلے، کتّے، اور بیل نے ایک مجلس منعقد کی جس میں انسان کی چیرہ دستیوں اور اپنی مظلومیت کی خونچکاں داستانوں پر تبصرہ کیا گیا اور یہ طے پایا کہ خالقِ ازل کے روبرو اپنی اپنی معروضات پیش کریں۔ وہ سب کچھ جانتا ہے اور صرف وہی ہمارے مصائب کم کرسکتا ہے۔

مقدمہ اس کے دربار والاشان میں گذرانا گیا۔ تاریخ مقررہ پر انسان بھی خلعتِ اشرف المخلوقات پہنے حاضر ہوا۔ فریقین کے وکیلوں نے بڑی مدلل اور پُرلطف بحث کی۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ پھر اجلاس کا باوقار جج کرسیِ عدل پر سے یوں گویا ہوا۔

"اے چرندو، پرندو اور درندو تم نے بحث سُنی، ہر ایک کے دلائل معقول ہیں۔ کس کے حق میں فیصلہ دیا جائے؟ یہ سوال درپیش ہے۔ جانوروں کا یہ کہنا کہ انسان ہمارے اوپر بڑے بڑے مظالم توڑتا ہے، ہر سختی روا رکھتا ہے اور جائز و ناجائز دباؤ ڈالتا ہے محض بے بنیاد ہے۔ اس سوال کا کرنا تمہاری نادانی کا باعث ہے۔ اِن باتوں کو ہم ہی خُوب جانتے اور سمجھتے ہیں۔ آج تم کو بھی آگاہ کیا جاتا ہے کہ انسان کی تخلیق ظلم ہی سے کی گئی ہے۔ اس کا خمیر بغیر جبر کے تیار نہ ہوسکا۔ اسی کے عناصر کے خواص اسکو اِن باتوں کے کرنے کے لئے اُبھارتے رہتے ہیں۔ سُنو، جس وقت ہم تمام کاموں سے فارغ ہوئے تو ہم نے چاہا کہ آدم کو پیدا کریں۔ ہم نے کئی فرشتوں کو زمین پر بھیجا کہ وہ تھوڑی سی مٹی سینۂ زمین پر سے لائیں لیکن وہ سب ناکامیاب رہے۔ پھر عزرائیل ہمارے حضور میں آکر سربسجود ہوا اور زمین پر جانے کی اجازت چاہی۔ ہم نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا اور وہ روانہ جانبِ زمین ہوا۔ جب وہ واپس آیا تو مٹّی اس کے ہاتھ میں تھی۔ ہم نے اُس سے دریافت کیا کہ کیا سبب تھا کہ دیگر فرشتے خالی ہاتھ آئے اور تم اپنے ساتھ مٹی لائے؟۔ اُس نے سجدہ کرکے عرض کیا کہ اے خالقِ ہفت طبقات میں نے یہ کام ظلم کی مدد سے انجام دیا۔ زمین بہت چیخی، چلائی، اے مالک تیری دُہائی دی لیکن میں نے دل پر جبر کیا۔ طبیعت کو سخت کیا وہ روتی ہی رہی مگر میں نے دھیان نہ دیا۔ اور ایک گوندہ اُباڑ ہی لیا۔ اے جانورو تم نے سُنا کہ انسان کی تخلیق ظلم، ستم، جبر اور سختی پر ہوئی۔ ہم نے فرمایا ہے کُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ اس لئے ظلم، ظلم ہی کی طرف رُجوع ہوتا ہے اور چونکہ اس کی سرشت میں مٹی اور آگ کا جُزو زیادہ ہے اس لئے مٹی اپنے انتقام کی آگ میں جل رہی ہے۔ حالانکہ ہم نے اس کے عناصر میں پانی اور ہوا کو بھی دخل دیا ہے لیکن وہ چونکہ باعتبار حصّہ کم ہیں اسلئے مٹی اور آگ ان کو مغلوب کرلیتی ہے۔ ایسا ضرور ہے کہ ہم نے انسان کو عقل دی ہے تاکہ وہ نیک و بد میں تمیز کرسکے لیکن پھر بھی بعض دفعہ وہ جذبات پر قابو نہ پاکر ازخود رفتہ ہوجاتا ہے اور بعض کام بالکل ناعقلوں کے سے کر بیٹھتا ہے۔ اے جانورو!

تم کو اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیئے کہ ہم نے تم کو محض انسان کی خوشنودی و دلبستگی کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ کیونکہ اُس نے وہ بوجھ اُٹھایا ہے جس کی وجہ سے سب کی کمریں جھک گئی تھیں۔ صرف وہ انسان ہی تھا جو اس کا متحمل ہوا۔ تمہارا فرض ہے کہ تم اسکو خوش کرنے کے لئے ہر ممکن و ناممکن ایثار و قربانی کرو۔ ہم اس کا اجر تم کو روزِ جزا میں دینگے۔ اپنا کلام ختم کرنے سے پہلے ہم تمکو اختیار دیتے ہیں کہ تم انسان سے تصفیہ کر لو اور جو کچھ فیصلہ ہوگا ہم اسکو منظور کر لیں گے۔"

وہ لسانِ حقیقی اتنا کہہ کر رُک گیا۔ چاروں طرف سے سبحان اللہ سبحان اللہ کے نعرے بلند ہونے لگے۔ دربار برخاست ہوا اور مجمع مُنتشر ہو گیا۔ اس کے بعد بیل، کتا اور بگلہ انسان کے پاس آئے اور رحم کی التجا کی، انسان، خود غرض انسان!! مغرور انسان!!! عدالت کو پُشت پر دیکھکر اور اینٹھا۔ اُن کی صدائے رحم کا جواب ایک تبسم حقارت آمیز سے دیکر ایک غلط انداز نگاہ ڈالتا ہوا چلا گیا۔ جانور بہت چلائے کہ حضور ذرا ٹھہریں۔ لیکن اُس نے ایک نہ سنی۔ جانوروں نے آپس میں طے کیا کہ سب اپنے اپنے مقام پر بیٹھکر سوچیں اور پرسوں آکر اپنی اپنی رائے کا اظہار کریں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تیسرے روز بیل نے کتے سے کہا کہ چلو بھائی بگلے کے پاس چلیں، ہماری سمجھ میں تو خاک نہ آیا ممکن ہے اُس نے کچھ سوچا ہو۔ غرض یہ دونوں روانہ ہوئے۔ دیکھا کہ بگلہ، بگلہ بھگت بنا سادھو مہاتماؤں کی طرح آنکھیں بند کئے ایک پاؤں پر کھڑا ہوا مدبرانہ شان سے محوِ تخیل ہے۔ کتے نے بھونکنا شروع کیا تاکہ بگلے کو ان کی آمد کا علم ہو جائے۔ بگلہ آواز سُنتے ہی اُن کی طرف متوجہ ہوا۔ بیل اور کتے نے اپنی ناقص العقلی کا رونا رویا۔ بگلے نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا کہ "میں نے ایک تدبیر سوچی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا، کتے اور بیل کے چہروں کے تغیر کو فاتحانہ انداز سے دیکھتا ہوا پھر اس طرح گویا ہوا۔ "سُنو۔ میں نے اس معاملے میں بہت غور و فکر کیا، دُنیا کی روایات کو بڑوں سے سُنا اور آخر اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ انسان بوالہوس ہے، حریص ہے اور لالچی ہے۔ لہٰذا ہم کو چاہیئے کہ اسکو کوئی ایسا لالچ دیں کہ وہ ہمارے [illegible] ہم پھنس جائے۔ میں نے یہ تدبیر نکالی ہے۔

ہم اپنی آدھی آدھی عُمر انسان کے نذر کر دیں۔ طبعی عمر ہماری تیس[۳۰] سال اور انسان کی چالیس[۴۰] سال ہے۔ لہٰذا پندرہ سال ہر ایک انسان کی نذر کرے، وہ عمر بڑھتی دیکھکر ریجھے گا اور ہماری مصیبتوں کی مدت بجائے تیس سال کے پندرہ سال رہ جائیگی۔ انسان دُنیا میں رہنے کا متمنی بھی بہت ہے۔ وہ دُنیا کی مٹنے والی رنگینیوں سے تا قیامت لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس کی عُمر چالیس[۴۰] سے بڑھکر پچاسی[۸۵] سال ہو جائے گی اور وہ بجائے چالیس سال ظلم کرنے کے پچاسی سال ظلم کرے گا تو یہ خیال وہم سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اپنی طبعی عمر پوری کرنے کے بعد اُس کے اعضا میں اتنی قوت نہ رہے گی کہ وہ ہمارے اُوپر زیادہ تشدد کر سکے۔ دوسری بات۔ میرے دوستو، انتقام! ہم انسان سے پورا پورا انتقام لیں گے اور وہ اس طرح کہ انسان درازیٔ عُمر کے خواب آور خیالات میں سرشار ہو کر دُنیا میں پھنسکر اپنے اس خالق کو جس کو انسان پر ناز ہے، بھول جائے گا اور اسکی سزا میں دُنیا و عقبیٰ میں شدید عذاب میں گرفتار رہے گا۔ ہم بیکس اور مظلوم کتنا پیارا انتقام لیں گے۔ یہ بھی صفحۂ تاریخ پر بہترین انتقاموں میں سے ایک ہوگا۔"

کتا اور بیل بگلے کی فلسفیانہ تقریر سُنکر بہت خوش ہوئے اور ذہنیت کی داد دی۔ تینوں انسان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی عرضداشت گذرانی۔ انسان بہت خوش ہوا اور کہنے لگا مجھے منظور ہے۔ کل دربارِ ایزدی میں چلکر اپنے راضی نامہ سے عدالت عالیہ کو مطلع کر دیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور وہاں سے احکامات جاری ہو گئے۔ ملک الموت یعنی حضرت عزرائیل کے دفتر میں بھی عمروں کی تصحیح کیلئے فرمان جاری ہو گئے۔

جانوروں کو تو اُن کے حال پر چھوڑیئے اب ذرا حضرت انسان کی طرف رُخ کیجئے اور دیکھئے کہ اس آدم کے پوتے نے دوسروں کی عمر لینے میں کونسی عقلمندی کا اظہار کیا۔

انسان آغوشِ مادر میں کس قدر معصوم معلوم ہوتا ہے لیکن یہ گندم نما جو فروش جُوں جُوں ہاتھ پاؤں پھیلاتا ہے ویسے ویسے ہی مکر، حیلہ، بہانہ، حجت اور ضد کی عادتیں پرورش پانی شروع ہوتی ہیں۔ بچپن کا معصوم زمانہ بھی بغیر ظلم کے نہ گذرا۔ کبھی فاختہ کے انڈے توڑے، کبھی مُرغی کی گردن دبائی، کبھی بلی پر سوار ہو گئے کبھی چڑیا کے بچے کو اس قدر بے رحمی سے بھینچا کہ غریب ہاتھوں

میں مرگیا۔ کچھ سمجھ آئی شروع ہوئی تو غلیل بنائی اور کبوتروں، قمریوں اور میناؤں کو نشانۂ مشق بنایا۔ اگر ادھر سے کبھی فرصت ملی تو آم کے خودرو پودوں کو اکھاڑ کر پپیئے بنا کر ادھر اُدھر بجاتے پھرے۔ پڑھنے کا زمانہ گیا آیا مولوی صاحب کی شامت آئی۔ مولوی صاحب ذرا اونگھے اور یہ شریر اُن کے کپڑوں پر سیاہی ڈال فوراً رفوچکر ہوئے۔ مار باندھ کر مکتب بھیجا تو کتابیں اِدھر اُدھر چھپا کر کسی باغ کو اُجاڑنے پہونچے یا سنگھاڑے کی بیل پر جا پڑے۔ القصہ جب فارغ التحصیل ہوئے تو روزی پیدا کرنے کا سوال پیش ہوا۔ کچھ روز اِدھر اُدھر مارے پھرے پھر کچھ نہ کچھ کر کے پیٹ پالنے لگے۔ نوکری ملی تو خُوب رشوت لی۔ زمانہ شباب کا تھا۔ ہر بُرا اور بھلا کام بغیر سوچے سمجھے کیا۔ چرندوں، پرندوں جانوروں کو تفریح کا آلہ کار بنایا۔ ان کی ستم رانیاں یہیں پر ختم نہ ہوئیں بلکہ بڑھکر ہمجنسوں پر بھی ہاتھ صاف کیا گیا۔ دولت نے باپ کو زہر دلوایا۔ نابالغ بہن اور بھائیوں کو محروم الارث قرار دیا۔ ماں کو بیوی کی خادمہ بنایا۔ غرض اس پیشینگوئی کو پورا کیا جو فرشتوں نے خُدا سے اس وقت کی تھی جس وقت اس نے فرمایا تھا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہ۔ یعنی مَیں زمین پر ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔ فرشتوں نے عرض کیا تھا کہ اے مالکِ قدسیاں تُو ایسی جنس کو خلیفہ بنانیوالا ہے جو زمین پر ظلم پھیلائے گا اور فساد برپا کریگا۔

اپنی طبعی عمر تو اِن جھمیلوں میں بسر کی۔ اس کے بعد بَیل کی زندگی کا دَور شروع ہوا۔ قویٰ میں اضمحلال پیدا ہوا۔ ہاتھ پاؤں ساتھ دینے سے ایسے جواب دینے لگے جیسے خودغرض دوست دولت ختم ہونے پر ایک ایک کر کے کھسکتے ہیں۔ مزاج کا حال بھی بیل کا سا ہے۔ کسی نے اگر سخت وسُست کہا، ڈانٹا، پھٹکارا بھی تو پی گئے۔ مجبوری کو صبر صبر کہکر چلا اُٹھتے ہیں۔ جس طرح بَیل کو جس طرف مالک چاہے لیجائے، جتنا چاہے کام لے، ویسے ہی اب حضرت انسان ہیں۔ سیر و تفریح سے بھی دلچسپی نہیں رہی۔ کولھو کے بیل کی طرح دن بھر روزی کما کر شام سے ہی گھر میں آ گھُستے ہیں۔ اب ان کا پچپن ۵۵ واں سال شروع ہوتا ہے اور جیسے کہ بُڈھے بیل کو قصائی کے ہاتھ مذبح خانے کے شہیدوں کا نمبر بڑھانے کے لئے بیچ دیتے ہیں اسی طرح ان کی بھی دُنیا اور دُنیا کے کاموں سے پنشن ہو گئی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

اب کتے کی زندگی شروع ہوتی ہے، چونکہ کُتے میں دس صفتیں مومن کی سی پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا وہ صفتیں بھی اب ان میں منتقل ہونے لگیں۔ اوّل شب بیداری۔ انسان کی نیند بھی اب راتوں کو غائب رہنے لگی۔ اکثر رات بیٹھے بیٹھے ہی کٹتی ہے۔ ذرا کھٹکا ہوا اور بولے: "دیکھنا کیا گرا۔ بیٹی سلمیٰ کیا سو رہی ہو؟" بیٹی آواز سنتے ہی فوراً اُٹھ بیٹھی اِدھر اُدھر دیکھا اور کہنے لگی "کچھ نہیں اباجان، بلی نے طباق گرا دیا۔ اس کی آواز ہوئی۔ کیا آپ جاگ رہے ہیں"

"ہاں بیٹی۔ نیند نہیں آتی۔ کیا وقت ہوا ہوگا"

"یہی کوئی دو کا عمل ہوگا"

باپ بولے "ٹھیک ہے سو جاؤ"

اس طرح تو رات گذری۔ دوسری صفت کتے کی مالک سے وفا ہے۔ وہ بھی انسان میں پائی جانے لگی۔ یہ بھی مالک حقیقی کے آستانے پر جبیں سائی کرتا نظر آتا ہے، کچھ خیر خیرات بھی ہو جاتی ہے۔ نیک کاموں میں بھی حصہ لیا جاتا ہے۔ نصیحتیں بھی کی جاتی ہیں۔ جس طرح کُتا اپنے مالک کے مال کا محافظ ہوتا ہے۔ اسی طرح بڈھے میاں بھی بچوں کو پودے اکھاڑنے، جانوروں کو ستانے اور بے زبانوں کو مارنے سے روکتے رہتے ہیں۔

چونکہ معدہ ضعیف ہو گیا ہے اس لئے خوراک کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اور جس قدر بھوک ہے اُس سے ایک آدھ چپاتی کم ہی کھاتے ہیں اور اس طرح کتے کی تیسری صفت نیم گرسنگی بھی پوری ہو جاتی ہے۔

صبر اور قناعت جو چوتھی اور پانچویں صفتیں گنی جاتی ہیں وہ بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ کوئی ظلم، جبر یا ستم کرتا ہو تو "ٹکٹ ٹک دیدم دم نہ کشیدم" کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ ہر حال میں قانع۔ بوالہوسی جوانی کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

انتقام کا جذبہ ناتوانی اور بے بسی نے دبا دیا۔ کینہ پرور انسان عمر کے تقاضے سے آمادہ صلح نظر آ رہا ہے۔

کتے کی ساتویں صفت یہ ہے کہ وہ بے خانماں ہے۔ نہ گھر نہ رہنے کا مقام۔ بڈھا اب جس سے بھی ملتا ہے، کہتا ہے: "دُنیا سرا ہے۔ یہاں کی سب چیزیں آنی جانی ہیں۔ کل من علیہا فان۔ خدا کے سوا سب کچھ فانی ہے۔ یہ دُنیا وہ تماشہ گاہ ہے جہاں انسان جی بھر کے تماشہ کرنے بھی نہیں پاتا کہ اس کے ترکیبی اجزا منتشر ہو جاتے ہیں"

بکا کتے کی آٹھویں صفت ہے جس کو انسان رحیم کے در عفو پر سجدوں میں پڑ کر گڑگڑا کر، رو کر پورا کرتا نظر آتا ہے۔ کیسی

دردمندانہ آواز میں لجاجت کے ساتھ اقرارِ گناہ کر رہا ہے "اے میرے اور ہفت اقلیم کے پیدا کرنے والے! میں بڑا گنہگار ہوں۔ میں نے تیرے بندوں کو بہت ستایا۔ تیری بے زبان مخلوق پر بڑی بڑی ستم ظریفیاں کیں۔ میرے شکم نے ہزاروں بے زبان جانوروں کو ہضم کیا۔ اے میرے مالک میرے گناہوں کو معاف کر دے۔ میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ گوشت صرف اُسی وقت کھایا جاتا ہے جب دوسری چیزیں مُہیا نہ ہوسکیں۔ لیکن اے میرے معبود میں نے یہی نہیں بلکہ سب گناہ جان بوجھ کر کئے۔ میں گنہگار ہوں۔ تو غفور الرحیم ہے"۔

جب نویں صفت پر غور کیا جائے تو انسان اُس کا بھی حال نظر آتا ہے۔ یعنی ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ بچے اُسے ستاتے ہیں، جوان اُسکو چڑاتے ہیں۔ نوجوان آوازے کستے ہیں۔ کوئی کہتا ہے "میاں کی کمر کیسی جُھک گئی ہے جیسے کمان"۔ بیٹوں کو اگر تادیب کی جائے تو وہ کہتے ہیں "آپ تو بُڈھے ہو گئے۔ آپ کی عقل بھی بُڈھی ہو گئی۔ اگر دماغ کا فعل ہی ٹھیک ہوتا تو سرکار پنشن ہی کیوں دیتی۔ دماغ کام کرتا نہیں۔ بولتے سب میں ہیں۔ آئندہ بیجا دخل نہ دیا کیجئے"۔ بُڈھا غریب کھسیانہ ہو کر اپنا سا مُنہ لیکر رہجاتا ہے۔

پچپن سال سے ستر سال تک کا زمانہ اسی طرح گذرا، اور دروازے پر تخت بچھائے بیٹھے رہے۔ آتے جاتے کو دیکھکر کھانس دئے۔ اگر کسی نے رحم کھا کر التفات کیا تو دو ایک باتیں کیں ورنہ خیر۔

بگلہ کی مستعار زندگی اکہتّرویں سال سے شروع ہوتی ہے۔ اور اب دروازے پر سے اُٹھکر اندر ایک پلنگ پر آ پڑتے ہیں۔ نہ اچھی طرح سُجھائی دیتا ہے، نہ سُنائی دیتا ہے۔ نہ چل پھر سکتے ہیں۔ نہ بات چیت کر سکتے ہیں۔ جیسے بگلہ ایک ہی تالاب پر زندگی گذار دیتا ہے اسی طرح یہ بھی آخری دَور کو ایک پلنگ کی نذر کر دیتے ہیں۔ نہ اُٹھتے ہیں نہ بیٹھتے ہیں۔ نہ مُنہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ جیسے بگلہ کیچڑ نگلتا ہے، اسی طرح اس مغرور انسان کے اس مُنہ میں جس سے ہڈیاں مونگ پھلیوں کی طرح توڑی تھیں کوئی چیز ڈال دیتا ہے تو بہ کراہ کراہ کر اُسے نگل جاتا ہے۔ بگلہ کی طرح آنکھیں اکثر بند ہی رہتی ہیں۔ جن آنکھوں سے دُنیا کی پُر کیف و وجد آور نورانی مجسمے دیکھے تھے، وہی آنکھیں آج ندیدی ہو کر دیدارِ فرزند کے لئے ترس رہی ہیں۔ وہ آنکھیں جن کے ذرا سے اشارے پر قیامتِ صغریٰ برپا ہو جاتی تھیں وہی آنکھیں آج رو رو کر سوجھ گئی ہیں۔ جن پاؤں سے سینکڑوں غریبوں کو ٹھکرایا تھا، جن پاؤں سے دوسروں کی آرزوؤں کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا وہی پاؤں آج اس مرتے ہوئے انسان کو اتنی دیر تک بھی نہیں سنبھال سکتے کہ وہ مؤدبانہ کھڑا ہو کر خالق سے گُناہوں کی معافی چاہ لے۔ وہ زبان جس سے سینکڑوں کو گالیاں دی تھیں آج خُدا کا نام لیتے ہوئے لڑکھڑاتی ہے۔ جن ہاتھوں سے سینکڑوں ظلم کئے تھے، جن ہاتھوں سے لاتعداد بے زبانوں کو بغیر پانی پلائے اور دانہ کھلائے ذبح کیا تھا۔ جن ہاتھوں سے تر لقمے اُٹھاتے تھے وہی ہاتھ آج ایک کٹورا پانی اور ایک خُشک نوالہ بھی مُنہ تک نہیں پہونچا سکتے۔

یہ ہے ہوسِ زندگی اور اُس کی سرگذشت جو آپنے سُنی۔

مغرور انسان! دیکھے ظلم کے نتائج!! جانوروں نے کیسا خوبصورت انتقام لیا۔ اگر انسان ہے اور اپنے آپ کو ذی فہم اور زیرک کہلوانا چاہتا ہے تو اَب بھی سمجھنے کی کوشش کر کہ رشوت سے کمایا ہوا روپیہ نہیں پھلتا پھولتا تو بھلا رشوت میں دی ہوئی عُمریں تیرے ساتھ کیا وفا کریں گی۔ لہذا حضرت جو کچھ کرنا ہے جوانی میں کیجئے۔ ورنہ بُڈھے ہو گئے تو سوائے اس شعر پڑھنے کے کچھ نہیں کر سکو گے ؎

حیاتِ رفتہ پر کرنا ہے تبصرہ مجھکو
شباب کاش پلٹ آئے رات بھر کے لئے

آغا محسن رضا جعفری

حُسن

دورِ شباب کا وہ پُربہار زمانہ ہے جبکہ خُونِ صالح کی چنگاریاں رگوں میں دوڑتے دوڑتے گرم ہوکر بہنے لگتی ہیں، دل فطرت کے سامعہ نواز سُریلے نغموں پر سر دُھنتے دُھنتے خود راگ بن جاتا ہے اور نظر کی نورانی پچکاری جہاں پڑتی ہے وہاں صورت کے جوکھٹے میں کوئی نہ کوئی جلوہ فروش، حُسن کا نمونہ دکھاتا اور عشق کا سودا بیچتا ہوا ملتا ہے۔

شباب اور حُسن لازم وملزوم ہیں بلکہ ایک دوسرے پر ایسے فریفتہ کہ یک جان و دو قالب۔ اگر شباب حُسن کے خد وخال کو اُجاگر نہ کرے تو حُسن ایسا تصوّر رہ جاتا ہے جس میں صورت داخل تو ہے مگر آنکھ، ناک، کان سے معرّا، لہذا حُسن بے شباب ایسی حسینی کی مُورت ہے جسکو چُومنے والی کوئی آنکھ نہیں اور جس پر مرنے والا کوئی دل نہیں۔

ہر عطر ایک خُوشبودار تیل یا عرق پر کشید کیا جاتا ہی جسے زمین کہتے ہیں، لہذا حُسن کی زمین شباب ہے، اور جس طرح کہ اچھا عطر اپنی زمین پر غالب رہتا ہے اسی طرح حُسن کامل بھی اپنے آگے شباب کو نمایاں نہیں ہونے دیتا ؎

چھنتا ہے نورِ چہرہ نقاب خیال سے
خود پردہ اشتہار ہوا پردہ دار کا (لبیب)

میکدۂ دہر میں حُسن ہی وہ شراب ہے جس نے ساقی و مے پرست سب کے دل ودماغ پر چھاپہ مار رکھا ہے۔

حُسنِ صورت

ظلم کی دُنیا حُسن کی چیرہ دستیوں سے آباد ہے جہاں چاہنے والوں کو گوسپند قربانی کی طرح ذبح کیا جاتا ہے، حُسن اپنے دالہ و فریفتہ کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتا ہے مگر جب وہ قبضے میں آتا ہے تو اسکو بے نیازی کی ٹھوکروں ہی ٹھوکروں میں تۂ خاک کر دیتا ہے۔ بعض حُسن دیدہ زیب ہوتے ہیں اور بعض سامعہ نواز ——— حُسن دیدہ زیب، ہوش وحواس کے پرخچے اڑا دیتا ہی اسلئے اس کا منکر ناپید ہے، لیکن حُسن سامعہ نواز ایک طویل داستان ہے جس کا آغاز ازل سے ہوا اور انجام ابد پر ہوگا۔ یہی داستاں سوتوں کو گدگدا کر جگاتی اور جاگتوں کو تھپک تھپک کر سُلاتی ہے: یعنی کسی کے حق میں لوری اور کسی کے لئے ہولی کا کام دیتی ہے۔

عالم امکاں میں حُسن سامعہ نواز کے مُنکر بہت ہیں لیکن انکا خود اُس کے ہونے کی دلیل ہی ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد (جامی)

حُسن وہ انمول ہیرا ہے جس کی قدر سے کوئی دیدۂ و دل خالی نہیں۔ لیکن قیمت ہر اندازے سے باہر ہے کیونکہ دریا میں رہنے والی مچھلیاں دریا کی قدر جانتی ہیں مگر قیمت سے واقف نہیں۔ ہستی کی تعریف فلسفی کے پاس کچھ نہیں۔ وہ اسکو حیات، علم اور ارادے کی دلیل سے پہچانتا ہے، درانحالیکہ حیات، علم اور ارادے سے ویسا ہی ناواقف ہے۔

اس طرح فلسفی اور اس کی ذرّیات ایک مجہول سے دوسرے مجہول کا قیاس کر لیتے ہیں۔ لیکن عاشق یا شاعر ہستی کو حُسن سے پہچانتا ہے، وہ صریحًا دیکھتا ہے کہ حُسن فریبندہ نے عقل کے قدم ڈگمگا دئے اور جنوں کا بول بالا کر دیا۔

حُسن ہستی کا سراب اور ہستی حُسن کا گلشن سدا بہار ہی، آدم سے ایندم تک ہزاروں قافلے اسی سراب میں غارت ہو گئے مگر حُسن کے ماتھے پر بل تک نہیں۔

تمام کائنات مسلم ومومن ہے ایک آدم ہی بُت پرست ہی کہ اُس نے انواع واقسام حُسن کی پرستش کی دُھن میں کردرد ل بُت بنا ڈالے، لاکھوں صنم خانے تعمیر کر دئے، پھر بھی جی نہ بھرا تو مسجدوں میں غیر مرئی حُسن کے مظاہر کی پرستش پر کمر بستہ ہوگیا؛ یہاں سے بھی جی اکتا گیا تو خانقاہوں کے تاریک گوشوں میں دل کی گرمی کو پھونک پھونک کر روشن کیا اور اسی کو حُسن کا مظہر بنا کر پوجا پاٹ کرنے لگا۔

سب سے پہلے آدم زاد حُسن ہی کو خُدا جانتے تھے، اس کے بعد مُنکروں یعنی اہل عقل نے حُسن کی خُدائی میں رخنے ڈالدے۔

لیکن جس نے اپنے دل کی گہرائی میں جھانکا تو وہ رکھنے اپنے ہی تن نورانی کے داغ نکلے کیونکہ انسان کا دل حُسن کا آئینہ اور حُسن ہی تمام دلوں کا آئینہ خانہ ہے۔ ؎

دریائے فراواں خود اک آئینہ خانہ ہے
ہر قطرے کو اپنے میں دریا نظر آتا ہے (لبیب)

حُسن صورت کے یہ چند اطوار ہیں مگر پیاز کے چھلکے کی طرح حُسن کی ہر ادا اور ہر طور بجائے خود ایک عالم ہے۔ باوجود اس کے حُسن کا زوال وانقلاب کسی اندرونی حُسن سادہ کا پتہ دیتا ہے اور وہ حُسنِ سیرت ہے جس کو زوال و انقلاب نہیں۔

حُسنِ سیرت

سیرت کی تخلیق صورت کے بہت بعد ہوتی ہے، وہ گوشت کا لوتھڑا جو آدمی کی صورت لیکر دُنیا میں آتا ہے مُدّت دراز تک اعلیٰ انسانی صفات سے محروم اور حجر و شجر و حیوان کے آثار کی تکمیل کرتا رہتا ہے۔ رفتہ رفتہ سیرت کی تخلیق ہوتی ہے اور کوئی چابکدست نقاش اس مرقع کی قلمکاری میں ہمہ تن منہمک رہتا ہے۔

آفات ارضی و سماوی کے علاوہ ذاتی خواہشوں اور ترغیبوں کے نوائے اس مرقع کو تر دامن کرتے رہتے ہیں اور گرد و پیش کے شیاطین الانس و جن اس کے خد و خال کو بگاڑنے کی تاک میں لگے رہتے ہیں، لیکن وہی نقاش، صیاد کی طرح اپنی کمیں گاہ سے مرقع پر ٹکٹکی لگائے سیرت کی بہتر سے بہتر تجویز اور دلکش سے دلکش تشکیل میں مصروف رہتا ہے۔ دُنیا میں بہترین حُسن سیرت کے نمونے وہی لوگ گذرے ہیں جن کو تعلیم و تربیت دینے والا، بُری باتوں سے بچانے والا، اچھی عادتوں کی ترغیب دینے والا کوئی نہ تھا، ان کی سیرت کے مُرقعے اپنے نقاش کے سوا کسی کے زیر بار احسان ہوئے۔

سیرت وہ خوش رنگ ٹھنڈی روشنی ہے جو صورت کے نوس سے پھوٹ پھوٹ کر باہر آتی ہے اور دُور دُور تک فضاؤں کو منور کر دیتی ہے۔

کسی زمانے میں سمجھا جاتا تھا کہ حُسنِ سیرت اُنہی لوگوں کو میسر آتا ہے جنہیں حُسنِ صورت مل چکا ہو۔ ممکن ہے کہ یہ خیال صحیح ہو، لیکن حافظ شیرازیؒ نے اپنی پسند کا نظریہ پیش کرکے حُسنِ صورت و حُسنِ سیرت میں ایک حد تک بے تعلقی کا اشارہ کر دیا ہے۔ ؎

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد
بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

حُسنِ سیرت، بدصورتی کے تمام عیوب کو خوش منظر بنا دیتا ہے، وہی بھدّے ناک نقشے، حُسنِ سیرت کی چمک دمک سے نظارگیوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں اور آخر کار ظاہر کو دیکھنے والے صورت کے صحیح خد و خال کے اندازے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ حُسنِ صورت کی چاہت بالغرض اور حُسنِ سیرت کی چاہت بلاغرض ہوتی ہے؛ چاہت بالغرض لذت کا پیغام دیتی ہے اور چاہت بلاغرض عزّت کا تاج پہناتی ہے۔

دُنیا میں نہ حُسن کا کوئی معیار ہے نہ عشق کا۔ بُلبل گلاب سوسن پر فدا ہے، بھونرا کنول کے صدقے ہوتا ہے۔ کوئل امرتیوں کے بلاگردان ہوتی ہے، لیکن سب میں ایک مابہ الاشتراک ضرور سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ کہ — اعلیٰ معیار حُسن میں دوام اور اعلیٰ معیار عشق میں زندگی حرام ہو جاتی ہے۔ ؎

اے عندلیب عشق ز پروانہ بیاموز
کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد (سعدی)

حُسن و عشق کا موازنہ ہی کیا، حاکم و محکوم کا مقابلہ کیا معنی، مگر ہاں ایک فریق دوسرے کے وجود سے پہچانا جاتا ہے اور اسی لئے حُسن کا بیان ہمیشہ عشق کے گرم گرم خُون سے رنگین رہا کرتا ہے۔

چونکہ حُسنِ سیرت حُسنِ صورت سے اعلیٰ اور لطیف ہے اس لئے حُسنِ سیرت کو دوام ہے۔

اسی کے مقابل عشق صورت (مجازی) اور عشق سیرت (حقیقی) میں اگرچہ زندگی حرام ہو جاتی ہے لیکن عشق صورت ایک دفعہ ڈوبکر پھر نہیں اُبھرتا، لیکن عشق سیرت ڈوب کر پھر اُبھرتا اور پہلے سے زیادہ لطیف زندگی کا بادشاہ ہو جاتا ہے۔ ؎

کُشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است (بختیار کاکی)

آدم زاد دوام زندگی کے لئے ہمیشہ کوشاں ہے، مکان بناتا ہے، شہر بساتا ہے، بڑے بڑے بینک کھولتا ہے، سلطنت قائم کرتا ہے، علوم و فنون مدون کرتا ہے، نئی نئی ایجاد کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان سب میں زندگی و دوام کی خواہش ماہیٔ بے آب کی طرح بے تاب رہتی ہے، لیکن کیا ہر انسان کی کوشش اور خواہش پوری ہوتی ہے؟

نہیں، ہرگز نہیں۔

جن خواہشوں میں لذت کی طلب غالب ہوتی ہے وہ بالکل غارت کر دی جاتی ہیں، غارتگر آدمی ہی ہوتے ہیں۔ لیکن اُنکے ہاتھ خدا کے ہاتھ اور اُن کے دل و دماغ انصاف و عدل کے تقاضوں سے بھرپور ہوتے ہیں۔

جن خواہشوں میں عزت و ادب غالب ہوتا ہے ان کے جسم ڈوبتے ہیں مگر لطیف رُوحیں مُرغابی کی طرح اپنے گرد و پیش کے سمندر سے پر جھاڑ کر خشک نکلتی ہیں اور زندگی دوبارہ کی مالک بنتی ہیں۔

اس درجے پر حُسن و عشق کا مصداق ایک ہو جاتا ہے، یعنی حُسن عینِ عشق اور عشق عینِ حُسن ہوتا ہے اور بات یہ ہے کہ اہلِ ذوق و وجدان سارے عالم کی حقیقت عشق کو اور ماہیت حُسن کو قرار دیتے ہیں۔ حضرت قبلہ گاہ شہزادہ مرزا لبیب تیموری نے اسی نظریے کو بطور جواب مضمون اپنی نظم میں ادا کیا ہو اور بہت ہی فلسفیانہ رنگ میں:۔

حُسن

ہے محیطِ آب و گِل اس طرح سے حُسن و جمال
قال میں اور قال پہ جس طرح سے معنی و حال

یا تو یہ ہے اک جمالیات کی اصل الاصول
جو ثبوت الذات ہے لیکن ہے خارج میں محال
یا یہ ہے اک خوشگوار احساس استعداد کا
یا ہمارے دیدہ و دل پر ہے محویت کا جال
یا تو یہ اک لہر ہے کرنوں میں اپنی خود اسیر
یا دکھاتا ہے تو ہم دور سے شکلِ ہلال
یا تو یہ اک نشۂ پنہاں ہے محوِ خویشتن،
یا ہماری رغبتوں کا ایک تخلیقی خیال
یا یہ ہے نقاشِ فطرت کا وہ نقشِ دلفریب
موجزن جس میں ہے خود نقاش کا فن و کمال
یا یہ شخص بے ہمہ کا ہے وہ عکسِ باہمہ
اتحاد و وصل جس کا اپنی نایابی پہ دال

حُسن آب و تاب ہے اِس گوہرِ نایاب کی
جس کے جوہر کی حقیقت ہے جمالِ ذوالجلال
حُسن وہ فانوسِ رنگیں ہے کہ جس کے جوف میں
ہے فروزاں خیرِ برتر کی شعاعِ پُر جمال

حُسن ہے وہ ربطِ مطلق ہستیِ بے کیف کا
عالمِ صورت میں ہے جس کی کشش سے اتصال
صورتیں باہمدگر محوِ نیاز و ناز ہیں
طالب و مطلوب دونوں مظہرِ شانِ کمال

ہستیِ مطلق کی ماہیت ہے حُسنِ آشکار
اور حقیقت اُس کی عشقِ لازوال و بے مثال
خود پرستار اور خود پروردگارِ حُسن بھی
عشق جانِ حُسن بھی ہے جاں نثارِ حُسن بھی

معاف کیجئے گا! میں آپ کو جوہی اور چنبیلی کے تختوں سے ہمالیہ کے صنوبروں میں لے آیا، ایک کی خوشبو مشامِ جان کو تازہ کرتی ہے مگر دوسری تازہ ہوا مُردے کو زندہ کرتی ہے!!
آمدم برسرِ مطلب، شمع کے آنسو پروانے کے خاکستر میں جذب اور گلاب کی پنکھڑیاں بلبل کے جالدار پروں کے آگے سربسجود ہیں۔

دریا کے کنارے سیپیوں کے ڈھیر میں سے گذریئے اور روندتے ہوئے چلے جایئے۔ آپ کی اس ناقدری کا گلہ کون کرنے والا ہے لیکن جب سیپی میں موتی ہوتا ہے تو وہ یوں روندی نہیں جاتی، مشکل سے ملتی ہے اور قیمت بھی گراں لگائی جاتی ہے۔ یہی حالت عالمِ صورت اور عالمِ سیرت کی ہے کہ موت کا سوداگر صورت کی سیپیاں روندتا ہوا چلا جاتا ہے مگر جو سیپیاں حُسنِ سیرت سے مالامال ہوتی ہیں، اُن کی حفاظت کی جاتی ہے اور پرکھنے والوں کے لئے جواہر خانوں میں سجائی جاتی ہیں۔ لہٰذا حُسنِ سیرت ہی زندگیِ دوام کا پروانہ اور حُسنِ سیرت ہی انسانی جاہ و جلال کا تاج ہے۔

سُنتے آئے ہیں کہ زوال پذیر قوموں میں سیرتیں مسخ ہو جاتی ہیں۔ اور اُن میں حُسنِ سیرت کا مفہوم لفظی گورکھ دھندے سے زیادہ

نہیں رہتا۔ اسی وجہ سے ایسی قوموں میں اگر کوئی حُسنِ سیرت کا مُدعی مرتا بھی ہے تو حیوانوں کی طرح ٹانگ پسار کر مرجاتا ہے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ ہمیں اپنی سیرتوں میں حُسن پیدا کرنے کے لئے کیسی تربیت درکار ہے کیونکہ ہمارا تقاضائے فطری زندگیِ دوام کا طالب ہے۔

مضمون پورا ہو گیا مگر تشنگی ہنوز باقی ہے۔ مجبوراً انجمنِ حُسن کی بنا ملا اپنے اعترافِ نارسائی کے ساتھ اِن دو شعر پر اُٹھتا ہوں۔

آشنا سرا پا سے وصف آشنا مت پوچھ
حُسنِ آشکارا سے حُسن کا پتا مت پوچھ

آپ ہی مسیحا نے زخمِ دل کو چھیڑا ہے
درد کی خدائی میں درد کی دوا مت پوچھ

(لبیب)

عرشؔ تیموری

نوائے فراق

دھیان آنکھ پھیرنے کے جو آئے ہوئے سے ہیں
یہ نقش بھی تو دل میں بٹھائے ہوئے سے ہیں

یادل سے اہلِ دل پہ جو چھائے ہوئے سے ہیں
اگلے زمانے یاد کچھ آئے ہوئے سے ہیں

مرہونِ احتمالِ نظر ہے حیاتِ عشق
روکے ہوئے ستم بھی تو ڈھائے ہوئے سے ہیں

بس جذبِ حسنِ یار کہیں پھر اُبھر نہ آئیں
وہ نقشِ آرزو جو مٹائے ہوئے سے ہیں

تلوار سی جو تابشِ پنہاں ہے حُسن کی
عشاق بھی لہو میں نہائے ہوئے سے ہیں

وہ درد کی طرح سے اُٹھے فتنہ ہائے حشر
یہ بھی کسی کے ناز اُٹھائے ہوئے سے ہیں

جا ہم نے تجھ کو دیکھ لیا اے نگاہِ یار
سرو رو مست دل بھی دکھائے ہوئے سے ہیں

غم ہے کہ انتظار؟ جنوں ہے کہ ہوش ہے؟
آئے ہوئے بھی وقت نہ آئے ہوئے سے ہیں

آگے ترے فقط ہے یہ نذر و نیازِ عشق
خود کو تری نظر سے چھپائے ہوئے سے ہیں

تقریبِ دید میں غمِ ہجراں کی شدتیں
معلوم ہو رہا ہے وہ آئے ہوئے سے ہیں

دیتی ہے وہ نگاہ اگر درسِ نیستی
ہم بھی متاعِ زیست لٹائے ہوئے سے ہیں

کیونکر رہوا احتیاطِ نظر اُن کے سامنے
ہم کھوئیں یا نہ کھوئیں وہ پائے ہوئے سے ہیں

جلوہ نمائیوں میں جھجک کیا، حجاب کیا
انداز تیرے حُسن کے بھائے ہوئے سے ہیں

جانِ نشاط بھی ہیں خزاں دیدگانِ عشق
کچھ شوخیٔ بہار اُڑائے ہوئے سے ہیں

گویا ازل کے دن سے جہاں دیدگانِ عشق
دُنیا کے سرد و گرم اُٹھائے ہوئے سے ہیں

جو حُسن بھی نہ سمجھے۔ حیا والے ناز کو
وہ عشوۂ نہاں بھی سکھائے ہوئے سے ہیں

اکثر شکوتِ ہجر میں گر غور سے سُنیں
آتی ہیں یہ صدائیں "ہم آئے ہوئے سے ہیں"

چونکے ہوئے سے ہیں جو سکوں آشنائے عشق
[illegible] سے اس نگاہ کے کھائے ہوئے سے ہیں

بہلائے ہیں عشق کے احساس کو فراقؔ
دل سے کسی کی یاد بھلائے ہوئے سے ہیں

فراقؔ۔ ایم۔ اے۔

بمبئی کے مکان

ہم ٹرین سے اُترتے ہی سیدھے وہاں پہنچے جہاں ہمارے ایک دوست رہتے تھے۔ بعد تلاش بسیار جب ان کی جائے قیام کا پتہ مل گیا تو ہم اس بلڈنگ میں داخل ہوئے اور زینے پر چڑھنے لگے۔ قطب مینار ہم ایک بار دیکھ آئے تھے۔ اور جوشِ عمل میں سیڑھیوں کو طے کرتے ہوئے اس کے عرش تک بھی پہنچ گئے تھے لیکن اُترتے وقت زمین ہم کو اس سُرعت کے ساتھ کھینچ رہی تھی کہ ہم تیزی رفتار کے لحاظ سے بجھی ہوئی ہوائی معلوم ہوتے تھے — جی ہاں — اس وقت زینہ کی چڑھائی نے ہم کو قطب مینار کی یاد دلائی۔ اور راس گھماؤ اور پھراؤ نے آصف الدولہ کے امام باڑے کی بھول بھلیوں کی۔

رات کا وقت تھا۔ گرد و پیش کے تمام کمروں میں بجلی کی بتیاں روشن تھیں۔ معزز اور شریف عورتیں اپنے اپنے کاموں میں اور بچے اپنے کمروں کے سامنے اپنی معصوم تفریحوں میں مشغول تھے۔ آپ خیال فرما سکتے ہیں اس شخص کی حیرت کی انتہا جو ایسے مقام سے آرہا تھا جہاں کے مکانوں کی دُنیا بالکل علیحدہ ہے۔ جہاں ایک اجنبی کے لئے مکان کے اندر کا سین دیکھ لینا ناممکن ہے بشرطیکہ وہ چور۔ پولیس اور مہمان نہ ہو۔ سڑک پر چلنے والوں کے لئے گرد و پیش کی دیواریں حدِ نظر ہوجاتی ہیں اور مکان کے اندر رہنے والوں کی دنیا صحن اور کمروں میں محدود ہوجاتی ہے۔ البتہ کشادہ صحن، تازہ ہوا، اور سورج کی روشنی پر مکان کی ساخت کے مطابق بلاشرکت غیرے قبضہ رہتا ہے اور فضا میں ہمسایہ کے آنکھ اور کان کو دخل اندازی کرنیکا کوئی حق نہیں دیا جاتا۔

ہمکو کیا معلوم تھا کہ چند منزل کی عمارت جس میں سینکڑوں کمرے ہیں ان میں سینکڑوں خاندان بھی فروکش ہیں اور ان کے اُترنے اور چڑھنے کا زینہ بھی ایک ہی ہے۔ ہم نے اپنے روائتی اصول کے مطابق کہ ہر پردہ دار کو دیکھتے ہی یا تو فوراً گھوم جائیے اور یا اپنی آنکھوں پر رومال۔ ہاتھ ٹوپی وغیرہ کی اوٹ کر لیجئے۔ ہم نے اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ تاکہ ہم سوائے زینہ کی سیڑھیوں کے اور کچھ دیکھ ہی نہ سکیں، مگر اس کے باوجود ہمارے دل میں جھجھک پیدا ہو رہی تھی۔ اور دماغ میں شکوک۔ خیال یہ تھا یہ مخصوص طریقہ سے زنانے مکانات ہیں اور زینہ بھی عورتوں ہی کے لئے مخصوص ہے۔ شاید ہمارے دوست تک پہونچنے کا راستہ دوسرا ہو جس کا ہم کو علم نہ ہو۔ یا ممکن ہے کہ کسی ذات شریف نے اجنبی خیال کرکے مذاق کیا ہو اور یہ غلط راستہ بتا دیا ہو ایسا نہ ہو کہ پردیس میں ذلت ہو اور "اس موئے کو نکالو کہاں گھُسا آتا ہے" کی صداؤں سے پسپا ہونا پڑے۔

بہرحال چونکہ دو منزلیں طے کر آئے تھے اور اس دوران میں کوئی ناگوار واقعہ بھی ظہور پذیر نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ہمت کئے آگے بڑھتے ہی گئے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ (Eyes front) آئیز فرنٹ ہی رہیں۔ مگر تیسری منزل پر پہونچنے کے بعد ہم نے خود کو یکایک ایسی جگہ پایا جہاں قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ عورتوں کی ایک بڑی

مجلس منعقد ہونے والی تھی کیونکہ کمروں کے باہر فرش بچھا ہوا تھا اور اس پر عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی مختلف کیفیتوں کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ دنیا کی تمام چیزیں تماشہ کی جا سکتی ہیں لیکن برات، جنازہ، مار پیٹ، پاگل اور بندر مخصوص طریقہ سے تماشہ ہیں۔ مگر جس قدر ایک اجنبی میں تماشہ بننے کی صلاحیت ہے اتنی کسی اور ہستی میں نہیں۔ دوسرے ملک اور شہر میں جا کر وہ ایک عجیب الخلقت انسان بن جاتا ہے۔ میں خود کو ایسی حالت میں پا کر ارادتاً ایک پنواڑی کی دکان کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ لیا کرتا تھا کہ معلوم کروں کہ میری ناک سونڈ تو نہیں بن رہی ہے۔ چنانچہ میں اس وقت اسی عمارت کی تیسری منزل پر ایک "متحرک تماشہ" تھا جو حاضرین کو بلا ٹکٹ دکھایا جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں فلم کی سی سرعت کے ساتھ زینہ کی سیڑھیوں کو طے کر رہا تھا تاکہ یہ سین طویل نہ ہو جائے۔ اب بدقسمتی کو کیا کیا جائے کہ جس طرح پردہ سینما پر فلم کو یکبارگی حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ اسی طرح مجھکو بھی ایک حادثہ سے دوچار ہونا پڑا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ میری قوت رفتار سلب ہو گئی وجہ یہ تھی کہ چند عورتیں زری کے لباس میں ملبوس چوتھی منزل کے زینے سے تیسری منزل پر آ رہی تھیں اور میں تیسری منزل سے چوتھی منزل پر جا رہا تھا۔ ان کا اور میرا جس وقت مقابلہ ہوا ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میری کیا حالت تھی۔ ایک نوجوان جس کی پرورش و پرداخت حرم کی طرح سب سے علیحدہ ہوئی ہو اس وقت اپنی آنکھوں کا رخ اپنے ہی چہرے کے نقطہ پر جما ہوا دیکھ کر کس طرح نہ گھبرا جاتا خود ہی میرا منہ مڑ گیا۔ پیر تیز ہو گئے اور بجائے چوتھی منزل پر جانے کے میں تیسری منزل سے دوسری منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ میرے کانوں میں سات آٹھ سروں سے ملے ہوئے ایک لطیف قہقہہ کی آواز آ رہی تھی مگر میں اترتا ہی جا رہا تھا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ اسی گھبراہٹ میں میں تیزی سے اتر رہا تھا اور ایک دوسرے صاحب تیزی سے زینے پر چڑھ رہے تھے۔ ریل گاڑیوں کے انجن کی طرح میں اور وہ ٹکرائے اور نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں دھڑام سے گرے اور فٹ بال کی طرح گدّے کھاتے ہوئے پہلی منزل کے زینہ پر بمشکل آ کر رکے۔ جب میرے ہوش و حواس بجا ہوئے تو میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی، جب میں نے انہیں دوست کو اپنے سامنے کھڑا ہوا پایا جن کی تلاش مجھے مقصود تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے ہوئے پھر واپس لئے جا رہے تھے جہاں سے میں ایسی سراسیمگی اور بدحواسی میں بھاگا تھا۔

سید ابو طاہرؔ

عظمت

تمہارے سامنے ایک شخص ہے، عام رائیں اس کے بارے میں بالکل مختلف ہیں، ایک جماعت اُسی کے علم و فضل کا کلمہ پڑھتی ہے اور اُسے ملائک کے مرتبہ سے کم نہیں سمجھتی۔

دوسرا گروہ ہے کہ اُس نے اس کی مذمت و بُرائی اپنا شعار بنا لیا ہے معمولی انسانوں کی صف میں بھی اُسے کھڑا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یقین جانو کہ وہ بڑا آدمی ہے۔

عظمت۔ علم و شعر۔ ثروت و جاہ سے برتر ایک چیز ہے۔ شعراء بہت ہیں۔ عالموں کی تعداد کوئی کم نہیں۔ عظمت ایک وہی قوت ہے جو کہ صاحب عظمت کو عام شخصیتوں سے بلند اور ممتاز کر دیتی ہے۔ ہر مسئلہ میں اُس کی رائے بے لاگ ہوتی ہے۔ کسی انسانی عقل سے مرعوب ہونا شان عظمت کے سراسر خلاف ہے۔ عظیم ترین ہستی کے تمام کارنامے مافوق العادۃ اور ممتاز نظر آئیں گے۔

شاعر کا اسلوب نرالا ہوگا۔ اس کی زمزمہ پیرائیاں بُلبُل نواسنج کو شرماتی ہونگی۔

ایک انشا پرداز اپنے بلیغ اندازِ بیان سے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پبلک اس کے رشحات فکر کو آنکھوں سے لگاتی ہے۔

اگر وزیر ہو تو حکومت کی ایسی جدید تشکیل کرتا ہے کہ ماہرینِ سیاست اُنگشت بدنداں نظر آتے ہیں، بادشاہ ہو تو پھر نہ پوچھئے قیصر و کسریٰ کی حکومتیں اُس کے قدموں پر نثار ہونگی۔ تاریخ کے صفحات میں اسکے درخشاں کارنامے قیامت تک دُہرائے جائیں گے۔

اگر خوش قسمتی سے رہنمائے ملت ہو تو زمین آسمان اُسکی تعریف میں رطب اللسان نظر آئیں گے، اس کی مُعجز نمائیاں قوم کے لئے مسیحا کا کام کریں گی۔

یہ عظمت ہو اور صاحبِ عظمت میں ان خوبیوں کا ہونا ضروری ہے۔

یہ مقصود نہیں کہ ممتاز ہستیوں کی تمام رائیں صائب ہوتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ قائد جو راہ عمل تجویز کرے وہ ہر حال میں صحیح ہو۔ یہ بہت ممکن ہو کہ ایک معمولی انسان کی رائے کسی مسئلہ میں اُس سے زیادہ صائب اور تیر بہدف ہو۔

لیکن ہاں، یہ صرف عظیم ترین ہستیاں ہیں جن کی تعریف و مذمت میں زبان و قلم مصروف عمل ہوں۔ اور معتقدین و مقلدین کی جماعتیں برسر پیکار رہوں۔

حضرت علیؓ کی محبت میں ایک فرقہ کفر کی حد تک پہونچ گیا۔ دوسرے بغض و عداوت میں اسقدر جادہ اعتدال سے ہٹ گئے ہیں کہ بمشکل اُنکے کلمہ گو ہونیکا یقین کیا جا سکتا ہے۔ کسی نے حضرت ابوبکر و عمر کو شیخین کے معزز لقب سے سرفراز کیا تو کوئی اُنکے صدق و اخلاص کا قائل نہیں۔

محی الدین عربی ایک طرف سرتاج الاولیا اور قطب الاولیا کے القاب سے مخاطب کئے جاتے ہیں۔ دوسری جماعت اُنہیں شیخ الملحدین کہکر پکارتی ہے۔

دُنیا نے ابن رشد کے کمالات کا اعتراف کیا۔ اُس نے کرسیٔ قضا کو زینت بخشی فلسفیانہ نکتہ سنجیوں نے اُسے مجدد فلسفہ کے نام سے مشہور کیا۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جامع مسجد میں اُنکے

ساتھ بدترین گستاخیاں کی گئیں۔

زہر کا پیالہ پی کر حسرت و یاس کے ساتھ سقراط نے دُنیار فانی کو الوداع کہا۔ کتنا دردناک سانحہ تھا ہزاروں آنکھیں حزن و الم سے اشک بار تھیں، لیکن اُس وقت ایسے نفوس بھی دیکھے گئے جن کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اور فرطِ مسرت سے اپنے آپے میں نہ تھے۔

ایک طرف انگلستان میں شیکسپیر کے پرستاروں کا زور ہے جو اس کی ادبیت کے نشے میں سرشار ہو کر یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ ہم سے سوائے شیکسپیر کے سب کچھ لے لو۔ دوسری طرف ادبی کافروں کا انبوہ عظیم ہے۔ جو اُسے ایک دروغگو سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ نپولین کے ثناخواں اُسے نبوت کے بامِ رفیع پر پہونچاتے ہیں اور دوسرا گروہ اُسے اوباش اور بازاریوں کے گروہ میں لاکر کھڑا کرتا ہے۔

ٹولسٹائی مغرب کی اور جمال الدین افغانی سعد زاغلول مصطفٰے کمال مشرق کے مشہور عظما ہیں جنہیں زندگی بھر اور موت کے بعد محبت اور عداوت کے جام پینے پڑے۔

غرضیکہ یہ عظماء کی ایک جماعت ہے جنکے بارے میں رائے عامہ اسقدر مختلف ہے کہ مناظرہ و مباحثہ تو کیا کشت و خون تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔ یہ اختلاف رائے خود اُن کی عظمت و بُرائی کی واضح دلیل ہے۔

عظماء کی زندگی جاودانی ہوتی ہے۔ اُن کی مسرتیں ابدی ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی سب سے زیادہ کامیاب ہوتی ہے اگرچہ دُنیا میں اس کے برعکس معلوم ہو۔

عظمت کی خدمت دوست دشمن یکساں کرتے ہیں اور اُسکا مینار تعمیر و تخریب کی انتہائی کشمکش کے بعد آسمان سے باتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

عظمت کی دیوار بغض و محبت کے سہارے پر قائم ہے۔ جب تک یہ دونوں ستون قائم ہیں عمارت بھی تنہائی کروفر کے ساتھ اپنی سطوت و جبروت کا مظاہرہ کرتی رہے گی۔

یہ ناممکن ہے کہ دیوار عظمت کا سارا بار محبت ہی کا ستون اپنے کمزور کاندھوں پر اُٹھائے۔ تمہیں خوش ہونا چاہیئے کہ اگر خلق اللہ تمہارے بارے میں اختلاف رائے رکھتی ہے کہ یہ عظمت کی نشانی ہے۔ اور تم ایسے رہنما بننے کی کوشش کرو جسکے اردگرد معتقدین و معاندین کا اژدہام ہو۔

(منفلوطی) — محمد صفات علیخاں

محبت اور نفرت

تہدیہ محبت ———— نفرت کے نام

اُردو کے سب سے جدت طراز ادیب

اختر حسین رائے پوری

کے سولہ رومانوں اور افسانوں کا مجموعہ

محبت ایک کانٹا ہے چبھنے کیلئے — نفرت ایک پھول ہے سونگھنے کیلئے

قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔ ملنے کا پتہ:- ساقی بکڈپو۔ دہلی۔

نیکی

ہیرلڈ میلش ایک اکسیڈنٹ انشورنس سوسائٹی (Accident Insurance Society) کا کلرک جسے اتفاقیہ ایک موٹر کی ٹکر کے حادثے میں شہادت دینے کے سلسلے میں تھانہ میں حاضر ہونا پڑا تھا، مبہوت کھڑا یہاں کے نرالے قوانین کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

اس کی بچوں جیسی معصوم نیلی نیلی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں، صاف اور کشادہ پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے۔ سنہرے گھونگریالے بال سر پر لہرا رہے تھے۔ اپنی ٹوپی کو اس نے دونوں مٹھیوں سے مضبوط پکڑ رکھا تھا، اور خود ہمہ تن توجہ بنا وہ ان چاروں شہری عورتوں کو دیکھ رہا تھا جن کا تصفیہ اس وقت درپیش تھا ——— تین کو حکم قید اور چوتھی کو سزائے جرمانہ۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ سوچ سمجھ سکے ان کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ یہ چوتھی شاید سب میں خوبصورت اور کم عمر تھی اور بے اختیار رو رہی تھی۔

"تم چونکہ پہلی بار یہاں آئی ہو اس لئے صرف دو پونڈ دس شلنگ ادا کرنے ہونگے" حاکم نے کہا۔

"لیکن میرے پاس تو روپے نہیں ہیں جناب!"

"خیر —— چودہ دن ......"

اس کا دل امنڈ آیا۔ اور غازہ آلود رخساروں میں آنسو اور بھی زیادہ شدت سے بہنے لگے، ساتھ ہی سسکیوں کی عجیب سی درد انگیز آواز ——— ادھر نوجوان میلش کا جذبۂ احساس و ہمدردی بالکل اسی طرح انتہا کو پہونچ گیا جس طرح ایک کیتلی میں پانی کے خوب جوش ہو جانے پر ابال آجاتا ہے سامنے نیلی وردی میں جو سپاہی کھڑا تھا اسے چھوتے ہوئے اس نے کہا۔

"سنو —— میں اس کا جرمانہ ادا کر دونگا"

سپاہی کی تیز نظر کو بچھو کے ڈنک کی طرح اپنے سراپا میں دوڑتے ہوئے اس نے محسوس کیا۔

"غالباً آپ کی کوئی آشنا؟" اس نے سوال کیا۔

"نہیں" جواب تھا۔

"تب تو پھر میں نہیں کہہ سکتا۔ یہ اسی مہینے کے اندر اندر دوبارہ پھر آن موجود ہوگی"

عین اسی وقت لڑکی اس کے قریب سے گذری اور اس کی آنسوؤں کو پینے کی کوشش میں شفاف گلے کی حرکت پر اس کی بے اختیار نظر پڑ گئی۔

"مجھے پرواہ نہیں —— میں ادا کروں گا" وہ اندوہگیں لہجے میں گویا ہوا۔

سپاہی نے ایک بار پھر اسے معنی خیز نظروں سے، جسے اسی نے بری طرح محسوس کیا، دیکھا۔

"خیر، آئیے میرے ساتھ چلئے"

اور نوجوان میلش خاموش اس کے پیچھے ہو لیا۔

"لیجئے یہ صاحب جرمانہ ادا کر رہے ہیں" سپاہی نے حاکم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ادھر میلش کے رخسار اپنے کو کئی مختلف نظروں کا بے طرح نشانہ بنا ہوا پاکر شرم اور جھنجھلاہٹ سے سرخ ہو گئے بہرحال اس نے رقم نکالی۔ کل دو پونڈ پندرہ شلنگ تھے اور اس میں سے دو پونڈ دس شلنگ دیتے ہوئے اس نے سوچا۔

"میرے اللہ! اینس سنے گی تو کیا کہے گی؟"

اچانک لڑکی ایک آہ سرد کے ساتھ اُسنے کہتے سُنا۔

"ارے! آپ کا شکریہ!"

اور ادھر وہی سپاہی بڑبڑایا "آخر برباد کردیئے روپے!

پھر بھی یہ ایک رحمدلانہ اور نیک سُلوک تھا"

وہ باہر سڑک پر نکل آیا ـــــــ اب جبکہ اُس کے جذباتِ نیکی وہمدردی جوش میں آکر دو پونڈ دس شلنگ کا خُون کرا چکے تھے، وہ سرد اور خاموش پڑ گئے۔ جیسے اُس پر نیکی کا شائبہ تک نہ ہو۔ یکایک اُس کے پیچھے سے آواز آئی۔ "بہت بہت شکریہ ـــ یہ آپ کی بڑی نوازش تھی۔ مَیں ہمیشہ ممنون رہونگی"

اپنی ٹوپی کو بلند کرتے ہوئے وہ بےچینی سے اُس کے گذر جانے کا منتظر تھا۔

ایک کارڈ اُس کو گویا زبردستی پکڑاتے ہوئے وہ بولی "کبھی اگر آپ کو ادھر سے گذرنے کا اتفاق ہو تو غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما کر ممنون فرمائیں۔ مَیں آپ کی مرہونِ احسان ہوں اور ہمیشہ شکرگذار رہونگی"

"اس کا خیال مت کیجئے" جبراً مسکراتے ہوئے اُس نے جواب دیا اور سیدھا دفتر کا راستہ لیا۔

تمام دن دفتر کے 'حادثات' کے درمیان وہ کھویا کھویا سا رہا۔ کیا وہ ایک احمقانہ فعل تھا یا شریفانہ؟ کبھی سوچتا وہ بدمعاش اِن بیچاری لڑکیوں کے ساتھ کیسے جنگلی پن کا سُلوک کرتے ہیں۔ پھر خیال آتا اللہ جانے؟ کسے پتہ ہے شاید وہ اسی کی مستحق ہوں۔ اور جب ایلیس دو پونڈ دس شلنگ کا مطالبہ کرے گی تو کیسی بنے گی۔ یہ سوچنے کی اُس نے کوشش نہیں کی۔ اُس کا پاک دل بھی اُس کے بھولے بھالے چہرے کی طرح معصوم تھا۔

وقت مقررہ پر وہ ٹھیک ساڑھے چھ بجے گھر پہونچا۔

اُس کا گھر چھوٹا سا معمولی وضع کا مکان تھا۔

اُس کی بیوی نے ابھی ابھی اپنی بچّی کو پالنے میں لٹایا تھا۔ اور کمرے میں بیٹھی میاں کی جرابوں میں رفو کر رہی تھی۔ آہٹ پاکر اُس نے نگاہ اُٹھائی۔

"ہیرلڈ! تم اپنے موزے ڈھنگ سے پہنا کرو۔ اس جوڑی کی بس مَیں اسی قدر مرمت کرسکتی ہوں"

اِس کی آنکھیں نیلاہٹ لئے ہوئے گول گول سی تھیں، اور آواز میں کچھ عجیب یکسانیت پائی جاتی تھی۔ وہ ایک بینڈ ماسٹر کی لڑکی تھی اور نوجوان ہیلیش کا اور اس کا رشتہ ایک دفعہ چھٹیوں کے موقع پر جب وہ سمرسٹ (Somerset) گیا ہوا تھا قرار پایا تھا ـــ دفتر کے کام اور گرمی کی وجہ سے وہ خود مضمحل اور زرد ہو رہا تھا لیکن اُس نے دیکھا کہ اُس کی بیوی کے چہرے پر اس سے بھی کہیں زیادہ زردی کھنڈ رہی ہے۔

"گرمی ناقابل برداشت ہے، کیوں ہے نا؟" بیوی نے کہا "بعض وقت مَیں سوچتی ہوں اگر ہمارے ہاں یہ بچی نہ ہوئی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس کی وجہ سے تمہیں شام میں اتنی دیر تک بندھے رہنا پڑتا ہے۔ کاش چھٹیاں جلدی سے ہوجائیں مَیں کب سے میکہ جانے کی راہ دیکھ رہی ہوں ـــ"

بلند قامت ہیلیش نے جھک کر اُس کی پیشانی چوم لی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُسے کیونکر بتائے کہ اُس نے اُنکی چھٹیاں باہر گذارنے کے سرمایہ کو کس طرح خاک میں ملایا ہے۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سے ایک ناقابل معافی گناہ سرزد ہوا ہے ـــ لیکن شاید جب ایلیس سُنے تو اُسے یقین آجائے کہ وہ کس طرح خاموشی سے اس غریب لڑکی کو روپیہ نہ ہونے کے کارن قید ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی ہو وہ کم از کم کھانے تک تو اُسے کچھ صاف صاف کھُلم کھلا

نہیں بتائے گا۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔

آخر اُس نے کہا۔ "ایلیس! آج صبح ہی صبح نجانے کس کا مُنہ دیکھا تھا، بڑی پریشانی اُٹھانی پڑی۔ اُس موٹر کی ٹکر کے قضیہ میں جس کی بابت میں نے تم سے تذکرہ کیا تھا، تھانہ جانا پڑا اور وہاں اُس وقت چند ایسی ویسی لڑکیوں کا قضیہ درپیش تھا۔ تھانہ والے اُن کے ساتھ جیسا وحشیانہ سلوک کرتے ہیں، توبہ! دیکھکر میرا تو جی بُرا ہوا۔"

اُس کی بیوی نے اوپر نگاہ اُٹھائی۔ اُس کا چہرہ بالکل بچوں کا سا تھا۔ "کیوں وہ ان کے ساتھ آخر ایسا کیا کرتے ہیں؟"

"راہ چلتوں سے بولنے کے جرم میں انہیں زبردستی جیل میں ٹھونستے ہیں۔"

"تو یہ تو ظاہر ہے کہ وہ کچھ اچھی حرکت نہیں کرتیں۔"

اس کی راست گفتاری سے کچھ دق سا ہو کر وہ پھر گویا ہوا۔ "وہ اُن سے اس طرح پیش آتے ہیں گویا وہ گندی، کمینی اور ذلیل ہوں۔"

"اچھا تو پھر کیا وہ ایسی ہوتی نہیں؟"

"یہ میں کب کہہ رہا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ وہ گرے ہوئے اخلاق کی اور قصوروار ہیں۔ لیکن مردوں پر بھی تو یہی الزام عائد ہوتا ہے۔"

"مردوں کے اخلاق کی تخریب تو وہی کرتی ہیں۔ اگر وہ نہ ہوں تو وہ کبھی ایسی کمینہ حرکتیں نہ کریں۔"

"خیر معلوم ہو گیا کہ تم صرف اُنہیں ہی برائیوں کا آماجگاہ سمجھتی ہو۔ (ذرا وقفہ کے بعد) دو ایک اُن میں سے خوبصورت تھیں۔"

اُس کی بیوی مُسکرائی۔ اُس کی مُسکراہٹ فطری طور پر طنز آمیز تھی۔

"تو میرا خیال ہے اُن کے ساتھ بہتر سلوک کیا گیا ہوگا۔"

یہ سخت طعن اس سے نہ سہا گیا اور وہ بغیر سوچے سمجھے بول اُٹھا۔

"ایک تو بالکل لڑکی سی تھی جو وہاں اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ اور چونکہ اس کے پاس جُرمانہ ادا کرنے کے لئے روپے تھے نہیں اس لئے اُسے چودہ دن کی سزا ہو گئی تھی۔ لیکن مجھ سے یہ دیکھا نہ جا سکا اور — اور میں نے اُس کا جُرمانہ ادا کر دیا۔" اسکی پیشانی پسینہ میں شرابور تھی اور اُسکی بیوی کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔

"ہوں تو تم نے ادا کر دیا — کتنا؟"

وہ کہنا چاہتا تھا کہ صرف دس شلنگ، لیکن اُسکے پاک ضمیر نے اس جھوٹ کے خلاف بغاوت کی اور سچ سچ کہلوا دیا "دو پونڈ دس شلنگ"، لیکن وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس سے کیسی حماقت سرزد ہوئی۔ ایلیس کا مُنہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا تھا اور میلیش کو بُرا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس طرح بے ہنگم پنے سے مُنہ کیوں کھولے ہوئے ہے۔ اُسکی پیشانی پر سینکڑوں بل پڑ گئے تھے۔ لیکن پھر ایک دم چہرہ بالکل سُت گیا۔ ادھر میلیش کا بُرا حال تھا اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا اس نے اُسے مارا یا سخت اذیت پہونچائی ہے۔

"میں سخت شرمندہ ہوں، ایلیس! بخدا میرا ایسا ہرگز ارادہ نہیں تھا لیکن وہ — وہ رو رہی تھی۔"

"بے شک رو رہی تھی! تم بڑے احمق ہو ہیرلڈ!"

وہ انتہائی اضطراب اور بے چینی کی وجہ سے اُٹھکر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "اچھا اور اگر میری جگہ تم ہوتیں تو کیا کرتیں؟"

"کیا کرتی؟ میں اُس کو اُس کے کیے کی سزا بھگتنے دیتی۔ اور نہیں تو کیا۔ بھلا تمہیں دوسروں کے معاملوں کا

کیا واسطہ" یہ کہتے ہوئے وہ بھی کھڑی ہوگئی ـــــ یہ اپنے
گھونگریالے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ لڑکی کا اشک
آلود چہرہ، پریشان، اداس، لیکن خوبصورت، اُس کی
آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اس کا اپنی ملائم باریک اور دلنشیں
آواز میں اظہارِ ممنونیت کرنا کانوں میں گونجنے لگا۔ اِدھر تو
یہ یوں گم سم کھڑا تھا اُدھر دوسری طرف بیٹھے ہوئے اس کی
بیوی سوچ رہی تھی، اب حضرت اپنی حماقت پر پچھتا رہے ہیں۔
اچھا ہے، ہیں ہی اِسی قابل؛

"میں مانتا ہوں میں نے حد سے زیادہ پاگل پن کیا"
وہ آخر کار گویا ہوا "لیکن میں خیال کرتا تھا کہ تم سمجھ جاؤ گی کہ
اس کو اس بیچارگی کی حالت میں روتے ہوئے میں نہیں دیکھ
سکتا تھا۔ بالفرض محال اس کی جگہ تم ہوتیں۔ اُس کے
سر کی جنبش سے ہی وہ سمجھ گیا کہ اُس نے یہ کوئی سخت
خطرناک بات کہدی ہے۔

"خوب! میری آپ کی نظروں میں بس گویا یہی
وقعت ہے!"

اس نے اپنی بیوی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "ہرگز
نہیں ایلس! خدا کے واسطے ایسے فضول خیال دل میں
نہ لاؤ۔"

ایلس نے اُس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے جواب دیا "یہ تو
بتاؤ وہ روپیہ آخر تھا کس کا؟ اب ننھی کو اور مجھے باہر جانا
نصیب نہ ہوگا۔ کیوں؟ محض اس واسطے کہ آپ ایک آوارہ
چھوکری کو آنسو بہاتے نہیں دیکھ سکتے تھے!"

اور قبل اس کے کہ وہ کچھ جواب دے سکے وہ جا چکی
تھی۔ غصہ اور رنج سے میلش کا بُرا حال تھا۔ اس کی چھٹیوں
کو برباد کر دیا۔ ہاں اپنی بیوی کی چھٹیوں کو ایک آوارہ لڑکی
کے بھینٹ چڑھا دیا۔ پھر بھی کیا یہ اُس کی اپنی چھٹیاں نہ
ہوتیں اور علاوہ ازیں روپیہ بھی تو آخر اسی نے کمایا تھا۔
وہ روپیہ کسی لڑکی کو خود سے دینا ہرگز نہیں چاہتا تھا آخر
اُسے اس نیکی اور رحمدلی کا صلہ ہی کیا مل گیا۔ بالفرض اگر
وہ یہی روپیہ کسی خیراتی بکس میں ڈال دیتا تب بھی کیا ایلس
یوں ہی پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑتی۔ چاہے ان کی چھٹیوں کا معاملہ
کیوں نہ ہوتا! اسے تو ان دونوں باتوں میں کچھ ایسا زیادہ
فرق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنے گھٹنوں پر دونوں کہنیاں
ٹیکے بیٹھا تھا۔ اور نظریں نیچے قالین پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ تمام
خیالات جو دو مختلف مذاق کے ایک ساتھ زندگی گذارنے پر
خواہ مخواہ پیدا ہوتے ہیں۔ اُس کے گھونگریالے بالوں کے
نیچے دماغ میں چکر لگا رہے تھے اور اسکی معصوم بچوں جیسی کھلی
سے پریشانی ٹپکی پڑتی تھی۔

آخر وہ بدمعاش ان بدنصیب لڑکیوں کے ساتھ
کیوں ایسا جارحانہ سلوک کرتے ہیں۔ اگر صرف وہ روئی
نہ ہوتی! وہ جان بوجھ کر نہیں رو رہی تھی یہ وہ اسکی سسکیوں
کی آواز سے ہی جان گیا تھا۔ اور مجسٹریٹ کون تھا۔ وہ ایسا
کوئی پہونچا ہوا ولی تو نظر نہیں آتا تھا۔ انہی میں سے ایک تھا
جن کے کارن ان غریبوں کی یہ دُرگت بنتی ہے۔ پھر اسے کیا
حق تھا کہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرے؟ ایلس کو ایسا
ہرگز نہیں کہنا چاہیئے تھا! یکایک عالمِ خیال میں اُس نے
ایلس کو اپنے موزوں پر جھکے ہوئے دیکھا۔ زرد اور گرمی سے
نڈھال، بچی کے لئے یا اس کے لئے ہمیشہ کام میں مصروف۔
اور اُس نے اُس کے آرام اور تفریح کی اُمید کو یوں ملیامیٹ
کیا۔ اس سے وہ کسی صورت انکار نہیں کر سکتا تھا! اسکا
ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ اس کو فوراً اوپر جا کر ایلس کو
ڈھونڈنے اور تالیفِ قلب کی کوشش کرنی چاہیئے۔ وہ اپنی
بائیسکل رہن رکھ دیگا ـــــ اور وہ ضرور چھٹیاں منائیگی۔

ہاں کیوں نہیں ایسا ہو سکتا ہے۔ اُس نے دروازہ کھولا اور سُننے لگا۔ چھوٹے سے گھر میں مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ صرف شام کا معمولی شور و غل، بسوں کی آوازیں جو سڑک پر دوڑتی پھر رہی تھیں اور بچوں کی آوازیں جو گلی میں مختلف گھروں کے دروازوں پر کھیل رہے تھے۔ ایک کیلے والا کیلوں کی کیل لئے آواز لگا رہا تھا۔ میلش نے خیال کیا کہ وہ اُوپر خوابگاہ میں بچی کے پاس ہوگی، اور زینے کا راستہ لیا۔ معاً اُسے خیال آیا زینہ کس قدر بدقطعی ہو رہا ہے علاوہ ازیں سیڑھیوں پر پا انداز کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ خُدا جانے اور کتنی چیزوں کی ایلیس کو ضرورت ہوگی۔ انسان چار پونڈ دس شلنگ فی ہفتہ میں جبکہ لوازماتِ زندگی ایسے گراں ہوں کس طرح ضرورت کی سب چیزیں یکایک دفعہ ہی مہیا کر سکتا ہے۔ لیکن ایلیس کو یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ ایسی بھی بہت سی چیزیں ہیں اچھی یا بُری، جن کی اُسے خود بھی ضرورت رہتی ہے لیکن پھر بھی وہ اُنہیں حاصل کرنے کا خیال نہیں کرتا۔

خوابگاہ کا دروازہ مقفل تھا۔ اُس نے زینہ کے سر پر کھڑے ہو کر دستہ پکڑ کر کھٹکھٹایا۔ اچانک دروازہ کھُلا، اور ایلیس اُس کے مقابل کھڑی تھی۔ "مَیں تمہیں اُوپر نہیں آنے دوں گی۔"

"بات تو سُنو ایلیس! یہ کیا حماقت ہے۔"

اُس نے پیچھے ہاتھ لیجا کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور بولی: "خیر حماقت ہی سہی۔ لیکن آپ نیچے تشریف لے جائیں۔ مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ سوچا ہوگا کہ میں اس رونے کی مَن گھڑت کہانی پر ایمان لے آؤں گی۔ مَیں تمہاری جگہ ہوتی تو شرم سے ڈُوب مرتی۔"

"شرم سے ڈُوب مرتی۔ کیوں؟" بیشک وہ آزردہ ضرور تھا لیکن شرم سے ڈُوب مرنے کی اس میں آخر ایسی کونسی بات تھی؟

"تمہارا خیال ہے کہ مَیں مردوں کی چالوں کو نہیں سمجھتی، نہیں نہیں تم لوگوں کے رگ و ریشہ سے خُوب واقف ہوں۔ جاؤ تم بڑی خوشی سے اُس . . . . لڑکی کے پاس جا سکتے ہو کیونکہ وہ ٹھہری خوبصورت اور پری جمال!" وہ مضبوطی سے دروازے سے لگی کھڑی تھی اور اُس کے دونوں رخسار شدّتِ غیظ سے آتشیں ہو رہے تھے۔ اور اس کا برتاؤ ایسا سخت تھا گویا ایک دُرشت مزاج جج مجرم پر فردِ جُرم ثبت کر رہا ہو۔

"ایلیس! خُدارا یہ کیا ہو گیا ہے۔ کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئیں؟ میں نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی ہے۔"

"لیکن کرنے کو دل تو چاہتا ہے۔ جاؤ نہ پھر کتنی بار کہوں، مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"

اس کی نیلی آنکھوں کا قاتلانہ انداز، غضب آلود وہ آواز اور لب و لہجہ چہرے کی سختی اور دُرشتی اس جیسے سادہ لوح آدمی کو یہ سمجھانے کو کافی تھا کہ وہ نرا کاٹھ کا اُلو ہے، کسی چیز کی بابت کچھ جانتا ہی نہیں۔ اور پھر غضب یہ کہ یہ سب کچھ اسکی اپنی بیوی کی زبان سے ادا ہو رہا تھا۔ وہ سہارا لینے کے لئے دیوار سے لگ گیا اور اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا: "خیر مَیں ہی گدھا تھا۔"

"تو کیا تمہارا یہ مطلب ہو کہ اُس نے تم سے مُطالبہ نہیں کیا تھا؟" ایلیس نے پوچھا۔

لڑکی کے کارڈ کا جو اُسکی جیب میں پڑا ہوا تھا، معاً خیال آ کر اسکی دونوں ہتھیلیاں پسیج گئیں۔

"اب اس خواہ مخواہ کی بدظنی اور بدگمانی کا تو کوئی علاج نہیں۔ آخر تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟"

"اپنی ننھی بچی کا روپیہ ایک آوارہ چھوکری کی نذر کر دینے والا۔ تمہیں اس کے روپے دینے ہی آتے ہونگے ——— ہاں ٹھیک ہے جبھی تو ——— یا نہیں تو اب وصول کیا چاہتے

ہو گئے۔ جاؤ اپنا راستہ لو۔ یہاں کھڑے رہنے سے فائدہ؟"

میتیش کے دل میں خواہ مخواہ خیال پیدا ہوا کہ اتیس کے مُنہ پر ایک تھپڑ رسید کرے ۔۔۔ جو اتنا مکرو ہ نظر آ رہا تھا۔

"اچھا" وہ آہستہ سے بولا۔ "اب میں سمجھ گیا۔"

خبر نہیں وہ کیا سمجھ گیا تھا؟ شاید یہ کہ اُس کی بیوی کی سرشت بھی انہی لوگوں سے ملتی جلتی ہے۔ انہیں تھانے والوں جیسی۔ اس کا لہجہ بھی انہیں کا سا ہے بلکہ ان سے بھی کہیں زیادہ سخت ۔۔۔۔ اُس کی نگاہ میں یہ چیز نظر اندازی کے قابل ہی نہیں۔ بلکہ شاید مجوزہ سزاؤں سے بھی کہیں زیادہ لائق تعزیر ہے۔

"میں نے خیال کیا تھا ۔۔۔۔ میں نے سوچا ہے کہ تم ۔۔۔۔" وہ بڑبڑایا۔

"بس چپ رہو" اتیس نے ڈپٹتے ہوئے اُس کی بات ادھوری کاٹ دی۔

یہ لہجہ قطعی ناقابل برداشت تھا اور وہ فوراً نیچے جانے کے لئے مڑ گیا۔

"واہ وا کیا شان ہے جیسے مُردہ کفن سمیت قبر سے نکل بھاگا ہو"

قبل اس کے کہ وہ اس طنز آمیز ہتک کا جواب دے سکے دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا اور قفل میں کنجی پھرنے کی آواز سُنائی دی۔ بیوقوف محض! اُس کے جذبات میں مارے طیش اور غصّے کے اتنا زبردست تلاطم پیدا ہوا کہ وہ چھجے پر کھڑا نہ رہ سکا۔ اگر درحقیقت اُس نے کوئی ناشایستہ حرکت کی ہوتی تو کیا وہ کبھی اتیس سے اس کا تذکرہ کرتا؟ آخر کیوں؟ اسکی خطا کیا ہے؟ یا محض اس خطا پر مجھے مارا کہ خطاوار نہ تھا؟ کیونکہ فی الحقیقت اُس کے دل میں تو کبھی کسی بیہودگی کا خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ اس حد سے بڑھے ہوئے اہانت آمیز سلوک اور

مایوسی سے اُس کا سر چکرا اُٹھا۔ وہ سیدھا دوڑتا ہوا نیچے آیا اور کھونٹی پر سے اپنی ٹوپی گھسیٹتے ہوئے باہر نکل گیا۔

بازار میں کچھ عجب بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ اوّل تو لندن کی کہُر، اُوپر سے تلی جانے والی مچھلیوں کی بساند، پٹرول، غرض فضا بے حد متعفن تھی۔ اُس کی آنکھوں سے رنج و مایوسی ٹپکی پڑتی تھی اور وہ انتہائی سراسیمگی کے عالم میں سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا ۔۔۔۔ تو یہ ہے اصل فطرت اُس لڑکی کی جس سے اس نے شادی کی۔ یہ ۔۔۔۔ یہ۔ اس سے شادی کرنا تو ایسا ہی ہے جیسے ان بدمعاش تھانہ والوں سے۔ بھلا یہ بھی کوئی انسانیت ہے ۔۔۔۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ معاذ اللہ! اس قدر بدگمانی اور پھر یہ پارسائی کا دعویٰ! اگر سچائی، نیکی اور صاف دلی کا یہی بدلہ ہے تو کس کام کا؟ یہ تو وہی ہوا کہ نیکی برباد گُنہ لازم ۔۔۔۔ کسی نے اُسکے شانے کو چھوا۔

"مسٹر! آپ کی پیٹھ پر تمام سفیدی لگی ہوئی ہے۔ لائیے میں جھاڑ دوں"

وہ حیران اور ساکت کھڑا ہو گیا۔ اور ایک شریف صورت شخص نے اُس کی کمر پر دو تین ہاتھ مار کر اُسے صاف کر دیا۔ "جیسے مُردہ کفن سمیت قبر سے نکل بھاگا ہو" خیال آتے ہی اُس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ بہتر۔ وہ اس کا مزہ چکھا کر رہے گا۔ اُس نے فوراً لڑکی کا کارڈ ٹٹولا ۔۔۔۔ اور اچانک کسی خیال سے وہ اچنبھے میں رہ گیا۔ کارڈ دیکھنے کی ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں کیونکہ بنا دیکھے بھالے اُسے پتہ بخوبی یاد تھا۔ کچھ ایسا دُور نہیں ۔۔۔۔ یوسٹن روڈ کے پرلی طرف ۔۔۔۔ یہ تو عجیب بات ہے! کیا وہ بلا جانے بوجھے اسے دیکھتا رہا تھا؟ کہتے ہیں کہ انسان کے دماغ کا ایک حصّہ آپ ہی آپ غیر ارادی طور پر کام کرتا رہتا ہے۔ غالباً یہ اسی کا کارنامہ ہے؟ نہیں، اب اس کے دماغ کا یہ فعل بلا ارادہ نہیں

کہا جا سکتا۔ وہ ایلیس کو اس کی خواہ مخواہ کی بدگمانی کی قرار واقعی سزا دینا چاہتا ہے! وہ یوسٹن روڈ پر پہونچ گیا۔ لیکن لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اس کے پیر خود بخود لڑکھڑانے لگے گویا اُسے جتا رہے ہوں کہ وہ غلطی کر رہا ہے۔ وہ لڑکی کے ہاں محض اس لئے نہیں جا رہا کہ بیوی کو سزا دے بلکہ ـــــــ یہ یقیناً میرا بہت بُرا فعل ہو۔ اور وہاں جانا تو گویا ایلیس کی بات کو سچ کر دکھانا ہو۔

وہ ایک چھوٹے سے چوک کے قریب ٹھہر گیا ـــ جس میں باغیچہ لگا کر کٹہرے سے حد بندی کر دی گئی تھی ـــ آج تک اُس نے اپنی بیوی کے ساتھ ہمیشہ انتہائی وفادارانہ سلوک برتا تھا ـــ لیکن اب بھی اس بیہودہ خیال کی محرک وہی تو تھی ورنہ اس کی نیک فطرت یہ کبھی روا نہ رکھتی ـــ لیکن اس کے باوجود اُسکے پیروں کی لغزش کچھ عجیب طرح ایلیس کو درگذر کرنے کی سفارش کر رہی تھی۔ ایسی حماقت کرنا تو گویا آگ سے بچکر کنوئیں میں پھاند نے کے مترادف ہوگا۔ اگر خُدا نہ کرے اس سے کوئی زبوں حرکت سرزد ہو جائے تو پھر اس میں اور ان بدمعاشوں میں جن کی بابت وہ تھانہ میں سوچ رہا تھا، فرق کیا رہ جائے گا؟ خیر ایلیس کو جانے دو ـــ تھانہ والوں کو بھی گولی مارو۔ لیکن کیا یہ اُسکو شایانِ شان ہے؟ کیا کوئی شریف آدمی ایسی حرکت کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں یہ سراسر نیکی اور شرافت کے خلاف ہے ـــ باغیچہ میں سے ایک کبوتر کی غٹرغوں نے اس کے سلسلۂ خیالات کی باگ، دوسری طرف موڑ دی۔

"اگر کبھی ادھر سے گذرنے کا خیال ہو تو مجھے آپ سے مل کر بیحد مسرت ہوگی"۔ الفاظ کی ادائیگی کا طریق سراسر دوستی پر مبنی معلوم ہوتا تھا، اور اظہارِ ممنونیت بالکل سچا تھا۔ اسکے علاوہ لڑکی کی نظریں بھی اسی حقیقت کی صحیح ترجمانی کر رہی تھیں۔ اگر صرف ایلیس نے اُس کی ہمدردی اور نیک دلی کو سراہا ہوتا، تو یقیناً وہ آئندہ کبھی اس لڑکی کا بھولے سے بھی ہرگز خیال دل میں نہ لاتا۔ یہ سب کچھ ـــ ـــ خیر، محض تصوّر ہی نے دوبارہ پھر ٹانگوں میں کپکپاہٹ پیدا کر دی۔ وہ ایک شادی شدہ آدمی ہے اور ایسی جرأت اُسے مناسب نہیں۔ لیکن ـــــــ اُس نے مکانوں کے نمبروں پر نظر دوڑائی۔ ستائیس ۲۷! وہ رہا۔

اچانک گل نافرمان کی خوشبو سے اس کا دماغ مہک اُٹھا۔ اور اس کے خیالات اک دم کہاں سے کہاں پہونچے۔ زمانہ ماضی۔ وہ خوشگوار ایام جبکہ وہ چھٹیاں بسر کرنے سمرسٹ گیا ہوا تھا۔ ایلیس سے اوّلین ملاقات، وہ سارے سارے دن کھیتوں اور باغوں میں گھومتے پھرنا ـــ لیکن ایلیس ـــ کونسی ایلیس؟ ـــ وہ خوش مزاج اور ہنسمکھ ایلیس جس پر وہ فریفتہ ہو گیا تھا۔ نہ کہ یہ ایلیس جو ابھی ذرا دیر پہلے زینے پر کھڑی اُسے ہدفِ ملامت بنائے ہوئے تھی ـــ!

اُس نے اس سامنے والے ذلیل سے مکان پر ایک گہری اور پُر معنی نظر ڈالی اور سر سے پیر تک شرم سے کانپ اُٹھا ـــ بالفرض محال اگر وہ اندر داخل ہو گیا ہوتا ـــ تو وہ لڑکی اپنے دل میں کیا سوچتی؟ یہی کہ اُس نے میرا جرمانہ اسی لئے ادا کیا تھا کہ ـــــــ

لیکن معاملہ اس کے قطعی برعکس تھا۔

توبہ الٰہی! پھر آخر یہ اُسے یہاں آنے کی سوجھی ہی کیا تھی؟ اُس نے فوراً ادھر سے رُخ پھیر لیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا وہاں سے روانہ ہو گیا۔

تھیٹروں کے اُوپر نام روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ بازاروں میں بھیڑ بھاڑ بالکل نہ تھی۔ کوئی اِکّا دُکّا آدمی یا گاڑیاں چلتی پھرتی نظر آ جاتی تھیں۔ وہ لیسٹر اسکوائر (Leicester Square) کے قریب پہونچکر

ذرا سستانے کے لئے ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اندھیرا ہوتے ہی رفتہ رفتہ تمام روشنیاں جل گئیں اور بازار جگمگا اُٹھا۔

واقعات کی تلخی سے وہ عجب شکست خوردہ سا ہو رہا تھا۔ دُنیا اس قدر وسیع اور اس کی لذتیں ایسی عام ہوتے ہوئے بھی ایک شخص کی قسمت میں اس قدر محدود حصہ آئے ۔۔۔۔ سارے دن حساب میں مغز پچی کرنا اور شام کو ایلیس کے پاس گھر لوٹ جانا ۔۔۔ بس یہی اس کی زندگی ہے۔

لیکن جب ایلیس اس پر مہربان تھی تو یہ بھی کچھ ناگوار نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اگر دُنیا کی تمام دوسری لذتوں اور نعمتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں ۔۔۔ تو چار پونڈ دس شلنگ فی ہفتہ ایک بیوی اور ایک بچی۔ انسان خاصے آرام سے گذر کر سکتا ہے، بشرطیکہ اُسے سکون اور طمانیت حاصل ہو۔ لیکن ایلیس کے ذرا دیر پہلے کے برتاؤ کا خیال کرتے ہوئے تو اس کی وہی مثل ہو گئی کہ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا' ساری دلچسپیوں سے مُنہ موڑ کر گھر اور صرف گھر کا ہو جانے پر بھی یہ جارحانہ اور ہتک آمیز برتاؤ کسی طرح برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

آہ! بیچاری ایلیس! اُس کی تفریح اور آرام کی یوں بربادی جبکہ وہ ایک مدّت سے میکہ جانے کی آس لگائے بیٹھی ہو، وہ یقیناً اتنی آسانی سے گوارا نہیں کر سکتی! لیکن پھر بھی اسے اس کو کم از کم اتنا کہنے کا موقع اور مُہلت دینی چاہیئے تھی کہ وہ اپنی بائیسکل رہن رکھ دیگا۔

یا اللہ! کہیں یہ سب کچھ ایک پریشان خواب تو نہیں؟ کیا وہ سچ مچ کبھی اس تھانہ میں گیا تھا ۔۔۔ جہاں وہ سفاک ان لڑکیوں کو جیل کی طرف ہانک رہے تھے، جیسے قصاب بھیڑوں کو ذبح کرنے کے لئے کمیلہ کی جانب ہانکتے ہیں ۔۔۔ لڑکیاں جو اتنی ہی قصوروار تھیں جتنے کہ وہ خود ۔۔ کیونکہ . . . . . خیر ۔۔۔ کسے پتہ ہے اُس کی اپنی طرح اُن کا یہ اقدام کن حالات کے تحت ہو۔ آج رات کو وہ مزید شکار پھانس لیں گے۔ کیا وہ روز روز اُن کے جُرمانے چُکاتا پھرے گا؟ پھر وہ رقم ادا کرنی نری حماقت نہیں تو کیا تھی؟۔

"نہیں خُدا کا شکر ہے کہ مَیں اُس کے گھر نہیں گیا۔" وہ اپنے آپ سے گویا ہوا۔ "ورنہ میری کیا عزت رہ جاتی۔"

بس اس تمام معاملے سے متعلق یاد رکھنے کے قابل صرف اس کا وہ دیکھنے کا انداز تھا جب حیرت اور مسرت کے ملے جُلے جذبہ کے تحت اُس نے کہا تھا' ارے ۔۔ آپ کا شکریہ!' اس کا خیال آتے ہی اب بھی اُس کی رگوں میں از سرِ نو خون دوڑ گیا ۔۔۔ لیکن پھر فوراً ہی کسی دوسرے خیال کے تحت سر دپڑ گیا۔ اس سے فائدہ؟ آخر وہ یہاں کیوں بیٹھا ہے؟ اُسے فوراً گھر واپس چلا جانا چاہیئے۔ اگر پہلے ایلیس کو صرف اُسکی نسبت شُبہ ہی ہوا تھا تو اَب اتنی دیر کر لوٹنے پر وہ کیا کہیگی۔ خیر، جو ہو سو ہو اَب تو پانی سر سے گذر چکا۔ پھر بھی وہ یہ خواہش کئے بغیر نہ رہ سکا کہ کاش اُسکی بیوی کا نظریہ نیکی و پارسائی ایسا نہ ہوتا۔ آسمان پر گہرا اندھیرا چھا گیا تھا۔ اور روشنیاں دودھ کے مانند سفید نظر آرہی تھیں باغ میں پھولوں کے تختے بعینہ ایسے ہی غیر حقیقی معلوم ہو رہے تھے جیسے اسٹیج کے مناظر۔ بہرحال اب اُسکو چلدینا چاہیئے۔ بیکار پریشان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں، وہ ایک جُھرجُھری لیکر بنچ سے اُٹھ کھڑا ہوا اُسکی آنکھیں جو سامنے روشنی پر لگی ہوئی تھیں۔ گول، صاف شفاف، روشن اور خُوبصورت بالکل ایسی ہی تھیں جیسے بچّوں کی۔

(گالز ورردی) مس قیصر احمد

بلوہ

سویرا ہو رہا تھا۔ آفتابِ عالمتاب مختلف رنگوں کی جلو میں فلک پر نمودار ہو رہا تھا۔ آخر سورج کی شعاعوں نے مادرِ گیتی کے پیر چومے۔ دن نکل آیا۔ للّو بھی اپنی گدڑی کو سمیٹ کر آنکھیں ملتا ہوا سڑک کے کنارے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جلدی سے انہیں میلے کچیلے کپڑوں سے اپنے منہ کو پونچھا اور بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔ مطلب یہ تھا کہ دُکان کھولتے وقت دکانداروں سے کچھ مل جائیگا۔ وہاں جاکر وہ ایک دُکان کے قریب بیٹھ گیا اور دُکان والوں کا انتظار کرنے لگا۔ چھ بجے، سات بجے، آٹھ بجے۔ کوئی دُکاندار نمودار نہ ہوا۔ للّو سخت حیرت زدہ اور نا اُمید ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک سمت میں گردن جُھکائے ہوئے چلدیا۔ ابھی دو ہی چار قدم چلا ہوگا کہ پیچھے سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سُنائی دی۔ پیچھے مُڑکر دیکھا تو شہر کوتوال صاحب مع نصف درجن سپاہیوں کے چلے آرہے ہیں۔ کوتوال صاحب نزدیک آکر ڈپٹ کر بولے "کیوں بے یہاں کہاں گھوم رہا ہے۔ کچھ چوری دوری کرے گا کیا"۔ للّو کی ڈر کے مارے جان نکل گئی، بیچارے نے گردن جھکالی۔ "اچھا بھاگ اب یہاں سے" کوتوال صاحب نے کہا۔ "جانتا نہیں ہندو مسلمان میں بلوہ ہو گیا ہے۔" للّو غریب ایک سمت کو تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا چلدیا۔ جس وقت وہ ایک تنگ گلی کو پار کر رہا تھا۔ ایک ہندو لاٹھی لے کر اس کی جانب دوڑا "مار مار مسلمان ہے"! ایک نے پیچھے سے للکارا۔ اُس نے لاٹھی اُٹھائی ہی تھی کہ ایک تیسرے آدمی نے پکارا "ارے یہ تو ہندو ہے جانے دو"۔ لاٹھی رُک گئی لالہ جی مہربان ہو گئے۔ قریب آکر کہنے لگے "آج ہم لوگ ناکے پر جمع ہو رہے ہیں، وہیں سے سب مل کر مسلمانوں پر دھاوا بولیں گے، چلو تم بھی چلو"۔ للّو نے غیر تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "لالہ جی بھوک بہت لگی ہے کچھ کھانے کو ملتا تو چلتے"۔ اب تو لالہ جی سٹپٹا کر بولے "ابے یہاں کھانا کہاں دھرا ہے تو بھی عجیب بھک منگا ہے"۔ ایک غلیظ گالی دیکر لالہ جی چلتے ہوئے۔

للّو آگے بڑھا۔ راستے میں ایک لاش ملی جسے کُتے نوچ رہے تھے۔ سارا شہر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ قصائیوں کے محلہ میں کچھ چہل پہل معلوم ہوئی۔ وہاں لاکھوں مجاہدینِ اسلام لاٹھیوں ڈنڈوں اور چھریوں سے مسلح ہوکر ہندوؤں پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ جیسے ہی للّو ان کے نزدیک پہونچا ایک بڑی لانبی سی ڈاڑھی والے مجاہد نے پوچھا۔ "کیوں بے مسلمان ہے نا"۔ "ہاں مولبی صاحب" للّو نے دانت نکال کر کہا۔ "تو چلتا کیوں نہیں ہندوؤں سے لڑنے بہشت ملے گی ابے بہشت"! "مولبی صاحب بھوک بہت لگی ہے کچھ کھانے کو ملتا تو چلتے"۔ للّو نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔ "دھت تیرے بدنصیب کی" مولوی صاحب نے ایک لات ماری "یہاں جیسے کھانا لئے پھر رہے ہیں بدنصیب۔ کم بخت۔ نالائق"! للّو ہائے وائے کرتا رہا لیکن سُنتا کون ہے، مجاہدین اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے دشمنانِ دین سے جہاد کرنے روانہ ہو گئے۔

للّو کے دل میں نہ مذہبی حرارت تھی نہ دینی جذبہ تھا۔ اسے تو یہی تک نہ پتہ تھا کہ اسکا دین و مذہب کیا ہے، رات دن بھیک مانگنا اُسکا کام تھا جس بھلے آدمی سے اِسے ایک پیسہ ملجاتا بس وہی اُسکا دیوتا تھا خواہ اُسکا کوئی مذہب ہو۔

دل ہی دل میں موٹے موٹے در بانِ خصلت دینداروں کو کوستا اور بھوک سے نڈھال وہ ایک طرف کو روانہ ہوگیا۔ وہ نواب فخر الدین صاحب کی کوٹھی کے پھاٹک پر پہونچا۔ رات ہو رہی تھی۔ بیچارہ دن بھر کا بھوکا پیاسا اور تھکا ماندہ تو تھا اس پر لاتیں اسقدر کھائیں کہ چلنا دوبھر ہوگیا تھا۔ گھر گھاٹ تو کہیں تھا نہیں، نواب صاحب کی کوٹھی کے پھاٹک پر سکڑ سمٹ کر اس امید میں بیٹھ گیا کہ کچھ مل جائے گا۔ نواب صاحب مسلمانوں کے قائد اعظم تھے۔ ابھی حال ہی میں تعزیہ والے مقدمے میں آپ نے جج سے ملکر سات ہندوؤں کو سزا دلوائی تھی۔

نو بج گئے تھے شہر سے شور و غل کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہندو مسلم آپس میں خوب کٹ مر رہے تھے۔ للّو نے بیٹھے بیٹھے سوچا آخر یہ لوگ کیوں کٹ مر رہے ہیں۔ اس سے فائدہ کیا ہے۔ میرے دل میں کیوں مذہبی جوش نہیں پیدا ہوتا۔ پھر خود ہی بڑبڑانے لگا۔ بھیّا یہ سب روٹی کے کھیل ہیں، جب پیٹ بھرا رہتا ہے تب مذہب وذہب سب سوجھتا ہے۔ ابھی اس کا سلسلۂ خیال یہیں تک پہونچا تھا کہ کچھ لوگ آتے ہوئے دکھائی دئے۔ یہ مسلمانوں کا گروہ تھا جو اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتا ہوا نواب صاحب کو کلکٹر صاحب کی کوٹھی سے ان کے گھر تک باحفاظت پہونچانے آرہا تھا۔ وہ لوگ پھاٹک کے نزدیک تک آکر چلے آگئے، نواب صاحب ایک شاندار شیروانی زیب تن کئے ہوئے للّو کے نزدیک سے گذرے "حضور بہت بھوک لگی ہے" نواب صاحب نے ایک انتہائی غلیظ گالی دی اور غریب کو ایسی ٹھوکر ماری کہ اُسکا آدھا دم ہی نکل گیا۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ للّو مار کھا کر بھوک پیاس کی شدت سے تنگ آکر نیم بیہوشی کے عالم میں پڑا ہوا بڑبڑا رہا تھا "سنتے ہیں کہ ایک اللہ بھی ہوتا ہے جو سب پر بہت مہربان ہوتا ہے۔ لیکن مجھ سے کیا خطا ہوئی کہ میں پیدائش سے لے کر آج تک پیٹ بھر کھانا نہ کھا سکا" وہ ذرا طیش میں آکر بولا "یہ سب بڑے لوگوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ اللہ بھی روپے والوں کا ساتھی ہے۔ خیر" ...... ایک لالٹین کی روشنی نے اس کے سلسلۂ کلام کو توڑ دیا۔ وہ دُور سے چمک رہی تھی اور اس کی طرف آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اب روشنی قریب آگئی تھی، چار آدمی کوٹھی کی طرف آرہے تھے۔ ان میں ایک حسین وجمیل عورت تھی اور باقی تین آدمی ہارمونیم طبلہ اور سارنگی وغیرہ لئے تھے۔ جب عورت قریب سے گذری للّو نے کہا "بی بی صاحب سویرے کی بھوک لگی ہے کچھ مل جاتا" ان میں سے ایک آدمی کچھ بڑبڑایا۔ عورت چونک پڑی "ارے یہ کون بیچارہ ہے۔ اچھا اے پیسہ" ہتے پیسہ قریب کے پتھر پر چھن سے گرا "بی بی صاحبہ پیسہ کیا ہوگا دکانیں سب بند ہیں" "اچھا بیٹھو ابھی بھیجتی ہوں کھانے کو" عورت نے پھاٹک میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ایک نوکر دو روٹیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں کچھ دال لے کر آیا۔ یہ للّو کے لئے نعمت تھی اسکا پژمردہ چہرہ خوشی کی روشنی سے دمک اٹھا۔ اس گنہگار طوائف کے لئے اس کے روئیں روئیں سے دعا نکل رہی تھی۔ اور مجاہدین اور سورماؤں کے لئے ....

محمد جعفر بجنوری

نقد و تبصرہ

مکاتیبِ غالب۔ اسٹیٹ لائبریری رامپور نے میرزا نوشہ غالب کے (۱۱۵) خطوط کا مجموعہ بڑی آب و تاب سے شائع کیا ہے۔ یہ خطوط وہ ہیں جو غالب نے فرمارواں رامپور نواب فردوس مکان اور نواب خلد آشیاں اور چند اور حضرات کو لکھے تھے۔ جناب امتیاز علی عرشی نے جو اسٹیٹ لائبریری کے لائبریرین ہیں ایک بسیط مقدمہ اور حواشی کے ساتھ ان خطوط کو پیش کیا ہے۔ یہ کتاب سلسلہ مطبوعاتِ کتب خانۂ ریاست رامپور کی پہلی کڑی ہے اور موجودہ فرمانروائے رامپور کے حکم سے شائع کی گئی ہے۔ کتاب مجلّد ہے اور مطبع قیمہ بمبئی کے نہایت خوشنما آہنی ٹائیپ میں چھاپی گئی ہے۔ مرزا غالب کی قلمی تصویر کا عکس، عکسِ تحریر، شبیہِ نواب فردوس مکاں اور شبیہہ نواب خلد آشیاں۔ یہ چار تصویریں شامل ہیں۔ جلد عمدہ اور مضبوط کپڑے کی ہے۔ چار روپے میں یہ کتاب لائبریرین اسٹیٹ لائبریری رامپور سے منگائی جاسکتی ہے۔

مکاتیبِ غالب کی تقریب ریاست کے چیف منسٹر بشیر حسین صاحب زیدی نے تحریر فرمائی ہے۔ اس کے چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

"۱۸۵۵ء میں نواب جنت آرامگاہ نے وفات پائی۔ آپکے بعد نواب سید محمد یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں نے تاجِ ریاست زیب سر فرمایا۔ آپ نواب جنت آرامگاہ کی تخت نشینی سے قبل دہلی میں قیام پذیر ہوئے تھے اور مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور میرزا اسداللہ خاں غالب سے علومِ عربی و فارسی کی تحصیل فرما چکے تھے۔ آپ کی تخت نشینی کے دو سال بعد ہندوستان نے حکومتِ انگلشیہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ نواب فردوس مکاں نے اس موقع پر حکومت کی حمایت و ہمدردی میں بیش بہا خدمات انجام دیں اور غدر فرو ہوجانے پر آفت رسیدہ علما، شعرا، ادبا اور دیگر اہلِ ہنر کے لئے اپنے سایۂ عاطفت و پرورش کو وسیع فرمایا۔"

آگے چلکر فرماتے ہیں:-

"نواب فردوس مکاں نے انہیں (غالب کو) فنِ سخن میں اپنا مشیرِ خاص مقرر فرمایا تھا۔۔۔۔۔۔ ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہوار تنخواہ جاری فرمادی تھی جو آن کے (نواب فردوس مکاں کے) انتقال کے بعد نواب خلد آشیاں کے خزانے سے ملتی رہی۔"

اس طرح ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک رامپور سے مرزا غالب کا سلسلۂ مراسلت جاری رہا جس کا بیشتر حصہ محفوظ رہا اور اب ریاست کی طرف سے "مکاتیبِ غالب" کے نام سے اربابِ ذوق کے لئے شائع کردیا ہے۔ جناب عرشی نے دو سال کی مسلسل کاوش و تحقیق کے بعد اس کا جو مقدمہ لکھا ہے وہ ایک خاصہ کی چیز ہے اور ہمارے خیال میں اُن سے بہتر اس خدمت کو کوئی اور انجام بھی نہیں دے سکتا تھا۔ آپ صرف اس مقدمے کے عنوانات مُلاحظہ فرمالیں۔ اِنہی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کی تفصیل کیا ہوگی:-

(۱) سرگزشت غالب۔ (۲) تصانیف۔ (۳) تلامذہ۔ (۴) لوازماتِ امارت۔ (۵) انگریزی تعلقات۔ (۶) بہادر شاہ ظفر سے تعلقات۔ (۷) تعلقاتِ رامپور۔ (۸) انشائے غالب۔ (۹) متعلقاتِ انشار (۱۰) طباعتِ خطوط۔

دیباچے کے دیکھنے ہی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عرشی نے کم و بیش بیس نہایت مستند اور نایاب کُتب کی امداد سے مندرجہ بالا عنوانات پر خامہ فرسائی کی ہے اور ان سب سے زیادہ انہوں نے ان مکاتیب سے استفادہ کیا ہے جو اب تک چشمۂ حیواں کی طرح تاریکی میں رہے ہے۔

میرزا غالب اپنے زمانے کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے ادبی ماحول سے بغاوت کی، نظم میں بھی اور نثر میں بھی۔ ثبوت میں اُن کا دیوان اور اُن کے خطوط موجود ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے اس فقرے میں کہ "ہندوستان کی دو الہامی کتابیں ہیں۔ وید مقدس اور دیوانِ غالب" گو کتنا ہی مبالغہ کیا گیا ہو لیکن اس میں شبہ کی کم گنجائش ہے کہ فرمودۂ غالب کسی سے دوم درجے پر نہیں ہے۔ مرزا غالب کے زمانے تک خطوط نویسی کا ایک خاص اسلوب تھا جس کی ابتدا رسمی القاب و آداب

ہوتی تھی، ان کے بعد چند مقفیٰ فقرے اور آخیر میں دُعا سلام وغیرہ۔

مرزا غالب نے اِس روش سے یکسر انحراف کیا اور سیدھے سادے انداز میں مزے مزے کی باتیں لکھیں، گویا مکتوب الیہ سے باتیں کیں۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ تحریر کو تقریر بنا دیا۔ مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں :۔

"بھائی مجھ میں تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے، مکالمہ ہے"۔ ایک اور صاحب کو لکھا "یہ خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں"۔ جب تحریر کا یہ پرواز ہو تو تقریر بن جانے میں کیا کسر رہ جاتی ہے۔ "عودِ ہندی" اور "اُردوئے معلّیٰ" میں مرزا غالب کی بات چیت سُنتے رہیئے۔ کبھی جو اس سے جی بھر جائے۔ کیسے کیسے خطاب، کیسے کیسے القاب لکھے ہیں کہ دل پھڑک جاتا ہے۔ "عودِ ہندی" جو میرزا غالب کے ۱۶۲ خطوط کا مجموعہ ہے اُن کی زندگی ہی میں اُن کی اجازت سے شائع ہو گیا تھا۔ "اُردوئے معلّیٰ" (حصّہ اوّل) ۴۷۲ خطوط کا مجموعہ غالب کی وفات کے ۱۹ دن بعد شائع ہو سکا۔ حصّہ دوم اور ضمیمہ وغیرہ بہت بعد میں اضافہ ہوئے ہیں۔

میرزا غالب کی خطوط نویسی کے متعلق اگر بہترین معلومات حاصل کرنی ہو تو ہمارے خیال میں مولانا عرشی مرتب "مکاتیبِ غالب" کے دیباچے سے بہتر اور کہیں یکجا نہیں مل سکتی۔

"مکاتیبِ غالب" کے سلسلے میں مُرتب کا بیان ہے کہ :۔

"مرزا صاحب کی دربارِ رامپور سے مراسلت بارہ سال تک جاری رہی۔ اگر اِس طویل مُدّت کے تمام خطوط محفوظ ہوتے تو اُن کی تعداد چار پانسو تک پہونچ جاتی۔ لیکن سوءِ اتفاق سے ان کا بڑا حصّہ محفوظ نہ رہ سکا...... مجموعہ ہذا کے مکاتیب کی تعداد ۱۱۵ ہے...... نواب فردوس مکاں کے نام کے عرائض میں چار بزبانِ فارسی اور بقیہ (۷۳) اُردو میں ہیں۔ ۶۳ نواب خُلد آشیاں کی خدمت میں ہیں۔ بقیہ اور حضرات کے نام ہیں۔ اِن خطوط میں کیا ہے؟ "مکاتیبِ غالب" ہی کے ایک خط میں اس سوال کا جواب ملتا ہے :۔ "دردِ دل چُناں گزشت کہ دریں بار بداں ساں سخن سرائے تواں گشت کہ سرگزشتِ من از ولیِ نعمت نہاں و حجابے درمیاں نماند"۔

مرزا غالب کے انتقال کے بعد اُن کی بیوی اُمراؤ بیگم (جو نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں، اور ۵۶ سال مرزا غالب کی شریکِ حیات رہیں) کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئیں۔ مولانا عرشی کی عنایت سے ہمیں بیگم غالب کے دو خط دیکھنے کا موقع مل گیا پہلے خط میں ایک جگہ فرماتی ہیں :۔

"...... کمترینہ اوّل بعمرِ ہفتاد سالہ حرکت و نقلِ مکان سے معذور اور سوائے اس کے صدمۂ انتقالِ شوہر اور ہجومِ قرضخواہاں سے اور معیشتِ آئندہ سے مجبور ...... اب نانِ شبینہ کو محتاج ہوں"۔

دو مہینے بعد پھر لکھتی ہیں :۔

"جنابِ عالی جس روز سے مرزا اسد اللہ خاں غالب نے وفات پائی ہے تو یہ عاجزہ بیوہ اس قدر مصائب میں گرفتار ہے کہ تحریر سے باہر ہے۔ اوّل تو یہ مُصیبت ہے کہ مرزا صاحب مرحوم آٹھ سو روپے کے قرضدار مرے۔ دوسری مُصیبت یہ کہ پنشن انگریزی مسدود ہوئی۔ تیسری یہ کہ تنخواہ سو روپے ماہوار، جو آپ از راہ قدر دانی کے مرزا مرحوم کو ارسال فرماتے تھے، وہ بھی یکلخت موقوف ہوئی۔ اب تک قرض لیکر بسر اوقات کی۔ اب قرض بھی نہیں ملتا۔ نوبت فاقہ کشی کی پہونچی۔ ...... اب دُعا گو کی یہ تمنّا ہے کہ ایسی پرورش مجھ ضعیفہ کی ہو جائے کہ مرزا مرحوم حق العباد سے بَری ہو جائیں کہ یہ سخت عذاب ہے ...... یہ تنخواہ شش ماہ کی بحساب فی ماہ صد روپیہ بالفعل مجھ ضعیفہ کو عنایت ہو جائے۔ باقی چھ ماہ اور بحساب مذکورۂ بالا مرحمت فرمائیے، تاکہ مَیں بیوہ قرض مرزا صاحب کا ادا کر دوں۔ اور ظاہرہ یقین ہی ہے کہ زندگی میری بھی اِسی میعاد میں پوری ہو جائے گی ..... اور پنشن میری دسؔ روپے انگریز کرتا ہے، بشرطِ اینکہ کچھری میں حاضر ہوں، اور جانا میرا کچھری میں ہرگز نہ ہو گا۔ گو فاقوں سے مرجاؤں۔ کیا مَیں اپنے باپ اور چچا اور شوہر کا نام روشن کر دوں۔ اور جو عزّت اور ریاست میرے چچا اور حُرمت میرے والد کی اور شوہر کی آگے خاص و عام کے تھی حضور پر سب روشن ہے"۔

مُرتّب کا بیان ہے کہ اس عریضہ پر بھی سرکار نے کوئی حکم نہ دیا۔ ایک مہینے بعد تیسری درخواست پیش کی اور پھر کچھ عرصے بعد چوتھی۔ پھر زندگی نے وفا نہ کی اور اپنی پیشینگوئی کے مطابق وفاتِ غالب کے چھ مہینے کے اندر ہی اندر فوت ہو گئیں۔

اسٹیٹ لائبریری رام پور نے "مکاتیبِ غالب" شائع کر کر اردو کی لائقِ قدر کتابوں میں ایک اور کتاب کا اضافہ کیا ہے ہمیں امید ہے کہ مولانا عرشی کی سعی و کاوش اور فرمانروائے رامپور کی علم پروری سے اردو کے علمی سرمایہ میں اور بھی نوادر کا اضافہ جلد ہو گا۔

"دش"

مرزاجی (حصّۂ اوّل) **اور کارزارِ حیات۔** دسمبر کے ساقی میں جناب ایم۔ اسلم کی کتاب "تفسیرِ حیات" پر ہم اظہارِ خیال کر چکے ہیں کہ ایسی عمدہ ضخیم اور سستی کتابیں اگر شائع ہونے لگیں تو انہیں اردو کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے۔ ہمیں یہ دیکھکر بیحد مسرت ہوئی کہ ایم۔ اسلم صاحب کی دو اور نہایت عمدہ کتابیں گزشتہ مہینے شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک "مرزاجی" (حصّۂ اوّل) ہے جس کی دھوم اب سے چار سال پہلے مچ چکی ہے۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن آراستہ و پیراستہ ہوکر شائع ہوا ہے۔ مرزاجی سے اردو مزاح نگاری میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ ہنسی ہنسی کی باتوں میں مرزاجی پتہ پتہ کی سُناتے چلے جاتے ہیں، گویا گُدگُدیوں کے ساتھ ساتھ چٹکیاں بھی لیتے جاتے ہیں۔ مرزا بندوقچی، مرزا اسکّی، دعوتِ رقعہ، مس ماڈالین، غرض ہر مضمون میں مرزاجی کے مزاح و طنز کی تہ میں ہمیں مصنف کی دلسوزی جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اور ہنسانے والی کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ سنجیدہ ظرافت کے شائقین کے لئے مرزاجی کا مُطالعہ ناگزیر ہے۔ حصّۂ اوّل کی اب مضبوط جلد بھی بندھوا دی گئی ہے لیکن قیمت وہی رکھی گئی ہے۔ یعنی دو روپے چار آنے۔

ایم۔ اسلم صاحب کی دوسری نئی کتاب کا نام "کارزارِ حیات" ہے۔ "تفسیرِ حیات" کی طرح یہ بھی اُن کے چالیس منتخب افسانوں کا ضخیم مجموعہ ہے۔ زندگی کی تصویر کشی ہر افسانہ نگار کی خصوصیت ہوتی ہے۔ لیکن اسلم صاحب اس خصوص میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں۔ انکے افسانے درد و اثر میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ وہ محسوس کرکے لکھتے ہیں اسی لیئے پڑھنے والا بھی اُنکے ساتھ محسوس کرنے لگتا ہے اور مصنف کا ہم خیال بن جاتا ہے۔ کہانی سُنانے کا ایک طریقہ اور سلیقہ ہوتا ہے۔ اسلم صاحب کی مشق اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ پیچیدہ سے پیچیدہ پلاٹ کو دلکش سے دلکش طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ کہیں طبیعت میں اُلجھن پیدا نہیں ہوتی۔ زبان سلیس اور سادہ جیسی زندگی میں بالعموم ہوتی ہے۔ طرزِ تحریر دل آویز، شگفتہ، جو ہر ادیب کا شعار ہونا چاہیئے۔ "کارزارِ حیات" کے سب افسانوں میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔ قیمت بھی واجبی ہی نہیں کم رکھی گئی ہے۔ یعنی دو روپے۔ یہ دونوں کتابیں بھی ملک دین محمد صاحب، تاجرِ کتب، لاہور سے منگائی جاسکتی ہیں۔

"ش"

نیساں (جوبلی)۔ الہ آباد یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی کے موقع پر شعبۂ اُردو کے رسالۂ نیساں کا جوبلی نمبر شائع ہوا ہے۔ نیساں چار سال سے جاری ہے اور ہر تیسرے مہینے شائع ہوتا ہے۔ جوبلی نمبر کی ضخامت ۳۸۰ صفحات ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ کاغذ عمدہ۔ سید محمد ضامن علی صاحب (صدرِ شعبۂ اُردو) اس کے مُدیر اور چھ اور حضرات اس کے نائب مُدیر ہیں۔ مجلسِ انتظامیہ میں پانچ اور حضرات شامل ہیں۔ جوبلی نمبر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء (قدیم و جدید) کے مضامین کے سوا اور کسی کا مضمون شامل نہیں کیا گیا ہے۔ مضامین میں تنوّع کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ابتدا پیغامات سے ہوتی ہے یہ بڑے بڑے آدمیوں کے چھوٹے چھوٹے پیغامات ہیں مگر ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان بزرگوں نے بہت کم کام کی بات کہی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا پیام مُلاحظہ ہو۔ "مجھے بڑی مسرت ہے کہ میں جنابِ صدر کی دلی دُعائیں جو انہوں نے آپکے رسالے کے جوبلی نمبر کے لئے بھیجی ہیں ارسال کر رہا ہوں۔ جنابِ صدر کو افسوس ہے کہ وقت نہ ہونے کی وجہ سے وہ طویل پیام نہ بھیج سکے۔" اس کے ختم پر ڈی نرسنگھ، آفس سکرٹری کے دستخط ہیں اور لکھا ہے کہ یہ انگریزی سے ترجمہ ہے۔ طویل پیام کا تو ذکر ہی کیا مختصر پیام کی بھی حسرت ہی رہ گئی۔ معلوم نہیں کہ گیارہ ارکینِ نیساں نے اسے شائع ہی کیوں کیا۔ پنڈت جی نے تو سرے سے کوئی پیام ہی نہیں دیا۔ اسی طرح مولوی سلیمان ندوی بھی اپنے پیام میں "ابرِ نیساں" سے خدا جانے کیا کہہ گئے۔ خواجہ غلام السیدین صاحب کا پیام بہت معقول رہا اور مولوی عبدالحق صاحب نے بھی کام کی بات کہی۔ الہ آباد یونیورسٹی کی مختصر تاریخ اور شعبۂ اُردو کی تاریخ ضروری اور عمدہ مضامین ہیں۔ جوبلی نمبر میں نظم و نثر کے تقریباً پچاس مضامین ہیں اور ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جسے ہم غیر ضروری کہہ سکیں۔ شاعری اور زندگی، اردو ادب میں تنقیدی نظمیں۔ اردو شاعری میں ظرافت، قصیدہ پر ایک نظر، بچوں کی تعلیم میں مادری زبان کی اہمیت۔ اور نفسیات اور تعلیم۔ ایسے مضامین ہیں جو کسی ایک رسالے میں مشکل سے یکجا ہوسکتے ہیں۔ افسانے نظمیں اور غزلیں دلکش ہیں۔ ڈرامہ اور ڈرامہ کے متعلق ہم الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے بجا طور پر متوقع ہوسکتے ہیں کہ کچھ مفید اور لائقِ قدر مضامین پیش کریگا۔ جوبلی نمبر میں ایک مضمون ہے "ڈرامہ کی تعریف" اور اس کے پڑھنے سے

معلوم ہوا کہ ڈرامہ کی کوئی تعریف متعین نہیں کی جاسکتی۔ ایک طویل تین ایکٹ کا ڈرامہ ہے "اندھیری راتیں" اس کا مکالمہ اچھا ہے مگر فنّی اغلاط نمایاں ہیں۔ مثلاً ڈرامہ شروع ہی ہوتا ہے تو ایک فنی غلطی ہے۔ ڈرامہ نگار نے اس ضروری اصول کو فراموش کر دیا کہ ڈرامہ ایک دیکھنے کی چیز ہے۔ ناول یا افسانے کی طرح پڑھنے یا بیان کرنے کی نہیں۔ پردہ اٹھتا ہے تو ہمارے سامنے اسٹیج پر کوئی منظر ہوتا ہے۔ "اندھیری راتیں" اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

"اندھیری رات۔ شہر کا ٹاؤن ہال بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہا ہے۔ سڑک کے بعد چمن۔ دُور پر ٹاؤن ہال کی عمارت۔ لکچر کی تیاریاں۔ اندر لوگ انتظام میں مشغول ہیں۔ کچھ اگلی کرسیوں پر بیٹھ چکے ہیں۔ بہت سے لوگ دو دو چار چار کر کے چمن میں ٹہل رہے ہیں۔ ہنسی، افسردگی، قہقہے، آہیں، خاموشی اور انتظار سب کچھ ہے۔ بعض اپنی گھڑی دیکھ رہے ہیں۔ ساڑھے سات بجنے کے قریب ہیں۔ موٹریں سڑک کے کنارے کھڑی ہو رہی ہیں۔ سائکلیں عمارت کی دیوار سے لگائی جا رہی ہیں۔ ہال آہستہ آہستہ بھرتا جا رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ"

یہ منظر اسٹیج پر کیسے دکھایا جاسکتا ہے؟ اتنا وسیع اسٹیج تو یورپ بھی شاید ہی پیش کر سکے۔ اسکرین البتہ اس منظر کو پیش کر سکتا ہے۔ اِس ڈرامے میں زیادہ تر منظر اسٹیج کے لئے ناممکن ہیں۔ کہانی بھی معمولی ہے۔ فنّی اعتبار سے عمل سُست، انتظار ندارد، منتہائے عروج معدوم اور انجام ناموزوں ہے۔ ڈرامہ لکھنے میں اِن اُمور کا بطورِ خاص خیال رکھا جاتا ہے۔

نیساں کی ابتدا جس طرح غیر ضروری پیغامات سے ہوئی ہے اسی طرح اس کی انتہا بھی ایک غیر ضروری مضمون پر ہوئی ہے۔ اِس مضمون کا عنوان ہے "اردو غزل" یہ پروفیسر امرناتھ جھا کا لکھا ہوا ایک صفحے کا ناتمام مضمون ہے جس کی اشاعت کا کوئی مقصد ہی نظر نہیں آتا۔ بہرحال نیساں کا جوبلی نمبر اِن فروگذاشتوں کے باوجود نہایت کامیاب ہے۔ اور اس کے اراکینِ ادارہ مستحق مبارکباد۔ جوبلی نمبر کی قیمت ۲ھ/ ہے۔ "ش"

سب رس

"ادارۂ ادبیاتِ اردو" حیدرآباد۔ دکن کا ماہنامہ ہے جو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی نگرانی اور صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کی ادارت میں جنوری سنہ رواں سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ "سب رس" "عروسِ جمیل و لباسِ حریر" کی تفسیر بن کر جلوہ گر ہوا ہے۔ مضامین میں ہر عمر اور ہر مذاق کے لوگوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ زبان بھی جہاں تک ممکن ہو سکا آسان رکھی گئی ہے۔ "سب رس" کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ زبان زیادہ سے زیادہ عام فہم اور سب رس بنائی جائے۔ یہ خیال بہت اچھا ہے اور جتنا اچھا ہے اُتنا ہی مشکل بھی ہے۔ کیونکہ ہوتا یہ ہے کہ سب کو خوش کرنے کی کوشش میں انسان کسی کو بھی خوش نہیں کر سکتا۔ بلکہ اور اُلٹا اپنا نقصان کر لیتا ہے۔ اس لئے ادارۂ سب رس کو بہت ہوشیاری اور احتیاط سے کام کرنا پڑیگا۔ سب رس میں ملکی اور غیر ملکی زبانوں کے تراجم بھی شائع ہوا کرینگے۔ جنوبی ہند کی زبانوں میں یقیناً بہت کچھ ہوگا جسے اگر اُردو میں منتقل کر دیا جائے تو ہماری زبان مالامال ہو جائے۔ اور ہمارے لکھنے والوں کے لئے اُن کے خیالات کی روشنی میں نئے نئے راستے کھل جائیں۔ سب رس میں علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ حصۂ نظم بھی نثر کے مقابلے میں بے جوڑ نہیں ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ سیاسی اور مذہبی مضامین سب رس کی پالیسی سے خارج ہیں۔ تصاویر کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ رنگین اور سادہ تصاویر شائع ہوتی ہیں۔ سالانہ چندہ چار روپے آٹھ آنے اور ششماہی تین روپے ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ حیدرآباد کے لئے آٹھ آنے کی رعایت کیوں رکھی گئی ہے۔ پرچے کی ماہوار ضخامت کم از کم ۴۸ صفحات اور زیادہ سے زیادہ ۹۶ صفحات ہوگی۔ سائز ساقی جتنا۔ قیمت فی پرچہ ۷ر ہے۔ دفتر سب رس۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد۔ دکن سے طلب کیا جاسکتا ہے۔

کاروان

یہ ماہوار رسالہ پٹنہ سے جناب جمیل احمد کندھائے پوری۔ بی۔ اے۔ کے زیرِ ادارت شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس وقت اس کے دو پرچے پیشِ نظر ہیں۔ مجموعی حیثیت سے دونوں پرچے اچھے شائع ہوئے ہیں۔ مضامین میں ترقی پسند عنصر نمایاں ہے۔ افسانوں میں جدتِ خیال نظر آتی ہے۔ خود جمیل احمد صاحب اچھے اہلِ قلم ہیں اور لکھنے والوں میں گمنام نہیں ہیں۔ کاروان سے پہلے اُردو کے مشہور رسائل میں اِنکے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ہر نئے رسالے کی طرح کاروان میں بھی کچھ خامیاں ہیں۔ لیکن ہمیں اُمید ہے کہ جیسے جیسے کاروان اپنی زندگی کی منازل طے کرتا رہیگا یہ خامیاں دُور ہوتی جائینگی۔ اہلِ قلم حضرات سے درخواست ہے کہ کاروان کو منزلِ مقصود پر پہونچانے میں مدد دیں۔ لکھائی چھپائی معقول۔ چندہ سالانہ دو روپے۔ فی پرچہ ۲ر "ش"

حُسن کے دو رُخ

اُردو کے مشہور شاعر جناب حکیم آزاد انصاری نے "حسن غارتگر" کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی جس میں حسن کے تاریک پہلو کو اُجاگر کیا تھا۔ اس کے ۲۲ بند تھے۔ اور ہر بند کا چوتھا مصرعہ "بھاگ بلائے حسن سے بھاگ" تھا۔ اس کچھ عرصہ بعد آپ نے دوسری نظم "حسن دلنواز" لکھی۔ اس میں حسن کا روشن پہلو پیش کیا تھا۔ اس کے ۲۱ بند تھے اور ہر بند کا چوتھا مصرعہ "چاہ ہر اہل حسن کو چاہ" تھا۔ دوسری نظم پہلی نظم کے پانچ سال بعد شائع ہوئی۔ یہ دونوں نظمیں مقبولیت خاص و عام حاصل کر چکی ہیں۔ اب علیحدہ چھوٹی سی کتاب کی صورت میں مع شان نزول کے شائع ہوئی ہیں۔ مقدمہ حضرت جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے۔ مقدمہ میں بعض باتیں ایسی مذکور ہیں جنھیں قبول کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن جب ہم اس کے اختتام پر یکم اپریل ۳۷ء لکھا دیکھتے ہیں تو پھر ہمیں سب کچھ صحیح تسلیم کرنے میں کچھ عذر نہیں رہتا۔ کاشانہ بازار۔ بازار گھانسی حیدر آباد دکن سے طلب کیجئے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ غالباً چار آنے ہوگی۔

"مش"

بنات دہلی

علامہ راشد الخیری مرحوم نے ہندوستانی عورتوں کی ترقی کیلئے عموماً اور مسلمان خواتین کیلئے خصوصاً جو سعی و کاوش کی آج کسی پڑھے لکھے ہندوستانی سے پوشیدہ نہیں ستو کے قریب ان کی بے مثل تصانیف ہیں جو عورتوں کیلئے ہمیشہ شمع ہدایت کا کام دیتی رہیں گی۔ علامہ مرحوم نے تیس سال پہلے عصمت جاری کیا تھا۔ جو اب تک نہایت کامیابی سے ان کی یادگار میں جاری ہے۔ اس کے بعد کئی اور نسوانی رسالے اور اخبار نکالے مگر مالی مشکلات نے جاری نہ رہنے دیا۔ گیارہ سال ہوئے کہ مسلمان بچیوں کیلئے علامہ مرحوم نے "بنات" جاری کیا تھا۔ جو اب تک مقبول و مطبوع ہے۔

یہ رسالہ اپنی طرز کا واحد ماہنامہ ہے۔ بچیوں کیلئے آسان پیرایہ میں عقل کی باتیں، علم و ادب کی تعلیم، خانہ داری اور سلیقہ شعاری کے مضامین اور سب سے زیادہ مذہب اسلام کی خوبیاں پیش کرنا بنات کی خصوصیت ہے۔ مزیدار اخلاقی کہانیاں، سبق آموز نظمیں، دلچسپ تصویریں اور کارآمد خاکے ہر مہینے اس میں شائع ہوتے ہیں۔ لکھائی چھپائی میں بھی خاص اہتمام کیا جاتا ہے

رسالہ عصمت کے اڈیٹر مولانا رازق الخیری ہی کی نگرانی میں یہ پرچہ شائع ہوتا ہے جنوری ۳۶ء سے بنات کی خوبیوں میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ سرورق رنگین اور دلکش ہے۔ ضخامت ۴۰ صفحے چندہ صرف ایک روپیہ آٹھ آنے۔

"مش"

بسلسلہ صفحہ (۲)

منشی جی مرحوم ہندوستانی سبھا میں جھوٹ نہیں بول رہے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد من گھڑت روائتیں اور بے پر کی اڑانا مرحوم کی روح کو صدمہ پہونچانا ہے۔ منشی جی اُردو کے پہلے اور ہندی کے بعد کو اہل قلم تھے۔ اگر اُردو میں انھیں کوئی خاص مالی فائدہ حاصل نہیں ہوا تو ہندی نے بھی انھیں کچھ نواز نہیں دیا۔ یہ سب جانتے ہیں اور اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش بے سود ہے۔ دوسروں کے عیب دیکھنے سے پہلے اپنے عیب دیکھنے کی ضرورت ہے۔

شاہد

نئی

اسٹنڈرڈ انگلش۔ اُردو ڈکشنری

The Standard Urdu English Dictionary

مُرتبہ:۔ انجمن ترقی اُردو (ہند)

جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں ابتک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے۔ اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے۔ چند خصوصیات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) یہ بالکل جدید ترین لغت ہے۔ انگریزی زبان میں اب تک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں۔

(۲) اس کی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی، مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم وفنون کی اصطلاحات سے ہے۔ اسی طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کئے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوئے ہیں۔

(۳) ہر ایک لفظ کے مختلف معانی اور فروق علیحدہ علیحدہ لکھے گئے ہیں۔ اور امتیاز کیلئے ہر ایک کے ساتھ نمبر شمار دیدیا گیا ہے۔

(۴) ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں اور ان کے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا ان کی وضاحت مثالیں دے دے کر کی گئی ہے۔

(۵) اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کے لئے ایسا مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کر سکے اور اس غرض کیلئے تمام اردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہے۔ یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی۔

(۶) ان صورتوں میں جہاں موجودہ اُردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کئے گئے ہیں جو اُردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں۔

(۷) اس لغت کیلئے کاغذ خاص طور سے باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا تھا جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہے۔ طباعت کیلئے اُردو اور انگریزی ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کئے گئے ہیں۔ جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے۔

ڈمائی سائز صفحات ۱۵۱۳+۳۳ قیمت سولہ روپیہ کلدار علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ:۔ دفتر انجمن ترقی اُردو (ہند) اورنگ آباد

(۰)
(۸۱)
(۸۸)
(۹۳)

حکیم نابینا صاحب کے جانشین حکیم محمد عبدالحیٰ صاحب انصاری

ایشیا کے طبیب اعظم حضرت لقمان الملک حکیم حافظ محمد عبدالوہاب صاحب انصاری عرف حکیم نابینا صاحب نے طب یونانی کی جو گرانمایہ خدمات انجام دی ہیں اُسے ہندوستان کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ آپکو یونانی طب میں ایک ایسے جدید طریقہ علاج کا موجد تسلیم کیا جاتا ہے جس نے دیسی طب میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے۔

حکیم نابینا صاحب کی ان گراں مایہ کارناموں کی قدر کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت حضور نظام نے آپکو دہلی سے حیدرآباد (دکن) بلالیا ہے جہاں آپ افسر الاطبا کے عہدہ پر سرفراز ہونیکے بعد دیسی طب کو مزید ترقی دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ برطانوی ہند کے باشندوں کیلئے حکیم نابینا صاحب جیسی نادر ہستی سے محروم ہو جانا اگرچہ بیحد محسوس کیا جا رہا تھا لیکن حکیم نابینا صاحب کے بڑے صاحبزادے حکیم محمد عبدالحیٰ صاحب انصاری نے اپنے کمالات سے اہل ہند کو یہ بتا دیا کہ وہ کسی صورت میں اپنے والد بزرگوار حکیم نابینا صاحب سے ..... کم نہیں ہیں۔ حکیم نابینا صاحب کے چلے جانیکے بعد آپ بدستور حکیم صاحب موصوف کے مطب کو سنبھالے ہوئے ہیں اور آپکے مطب سے ہزارہا بندگانِ خدا اسی طرح فیض حاصل کر رہے ہیں جس طرح حکیم نابینا صاحب کے زمانہ میں حاصل کر سکتے تھے۔ حکیم محمد عبدالحیٰ صاحب انصاری کیونکہ مشرقی فنِ طب کے ساتھ ساتھ مغربی علوم سے بھی اچھی طرح سے واقف ہیں اس لئے توقع کی جا رہی ہے کہ آپ اپنے والد محترم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دیسی طب کیلئے مزید ترقیوں کا باعث ہوں گے۔ ہم کو یہ دیکھکر مسرت ہوتی ہے کہ آج حکیم محمد عبدالحیٰ صاحب انصاری کے مطب سے والیانِ ریاست سے لیکر غربا تک اسی طرح ..... حاصل کر رہے ہیں جس طرح کہ حکیم نابینا صاحب کے مطب سے فیض اٹھاتے تھے۔ آپ کا مطب

کی ضرورت: ٭ منزل متصل نشاط سنیما دہلی واقع ہے۔

ممالک غیر سے بارہ شلنگ
نمونے کا پرچہ مفت بھیجا جاتا ہے

جرعات

چندہ سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے
قیمت فی پرچہ چھ (۶) آنے

نمبر ۴ — ساقی دھلی بابت ماہ اپریل ۱۹۳۸ء — جلد ۱۷

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
(۱)	نگاہِ اولیں	"شاہد"	(۲)
(۲)	قدرت کی ستم ظریفیاں	جناب ریاض الدین احمد۔ ایم۔ اے؛ بی۔ ٹی	(۳)
(۳)	شانِ انساں	جناب امین حزیں (سیالکوٹی)	(۵)
(۴)	تانگہ والا	جناب ایم۔ اسلم	(۶)
(۵)	شانِ تغزل	جناب گنگا دھر ناتھ فرحت کانپوری	(۱۱)
(۶)	جدید مطبوعات	پروفیسر مرزا محمد سعید۔ ایم۔ اے؛ آئی۔ ای۔ ایس	(۱۲)
(۷)	دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی	ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایم۔ اے؛ پی۔ ایچ۔ ڈی؛ (لندن)	(۱۷)
(۸)	نوجوان سے	جناب مجاز۔ بی۔ اے۔ (علیگ)	(۳۶)
(۹)	نوجوان خاتون سے	جناب مجاز۔ بی۔ اے۔ (علیگ)	(۳۷)
(۱۰)	ماں	جناب خواجہ غلام السیدین۔ ایم۔ اے؛ ایم۔ ای۔ ڈی	(۳۹)
(۱۱)	اے دل	"دلفگار"	(۴۳)
(۱۲)	ایک ملاقات	جناب اختر انصاری۔ بی۔ اے۔ (آنرز) بی۔ ٹی	(۴۴)
(۱۳)	کہتے ہیں جسے الفت کیا ہے؟	جناب سید علی شاکر۔ ایم۔ اے	(۴۷)
(۱۴)	سچی کہانی	"پریم پجاری"	(۴۸)
(۱۵)	کافر	محترمہ عصمت چغتائی۔ بی۔ اے	(۵۵)
(۱۶)	بوم بائی	جناب سید ابو طاہر، بی۔ ایس۔ سی؛ بی۔ ٹی	(۶۱)
(۱۷)	کس کے واسطے	جناب جاں نثار حسین اختر۔ بی۔ اے۔ (علیگ)	(۶۴)
(۱۸)	وہ	جناب خواجہ حسن عباس۔ بی۔ اے	(۶۵)
(۱۹)	صدائے غم	محترمہ زکیہ خاتون	(۶۷)
(۲۰)	مژدہ	جناب کاوش حیدرآبادی	(۶۸)
(۲۱)	مقابلہ	جناب قیسی رامپوری	(۶۹)
(۲۲)	نغمات	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق۔ ایم۔ اے	(۷۱)
(۲۳)	صبحِ بنارس	جناب علی احمد (فرزند نواب فصاحت جنگ جلیل مدظلہ)	(۷۲)
(۲۴)	چند مشاہدات	جناب مرزا سیف علی خاں صاحب	(۷۳)
(۲۵)	وعدہ	جناب الطاف مشہدی	(۷۶)
(۲۶)	سمندر کی پریاں	از جبران خلیل جبران۔ مترجمہ جناب محمد رضا انصاری	(۷۷)
(۲۷)	شکست خوردہ بھائی کے نام	جناب عرش گورگانی	(۸۰)
(۲۸)	زندہ اور فطری زبان	جناب چراغ علی صاحب	(۸۱)
(۲۹)	ریل کا سفر	محترمہ بیگم اشرف صبوحی	(۸۸)
(۳۰)	نقد و تبصرہ	ادارۂ ساقی	(۹۳)

قیمت فی پرچہ چھ (۶) آنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اولیں

دورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی کے موضوع پر ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اپنے مضمون کی قسط مارچ کے ساقی کیلئے بھیجی تھی مگر ہمیں افسوس ہو کہ تاخیر ہو جانے کی وجہ سے مارچ کے بجائے اپریل کے ساقی میں اُسے شامل کیا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ ابھی جاری رہیگا۔

ساقی کی توسیعِ اشاعت کے سلسلے میں میاں محمد اسلم صاحب کا نام سرِفہرست نظر آتا ہے۔ آپنے گزشتہ مہینے میں ساقی کے پندرہ ۱۵ نئے خریداروں کا چندہ جمع کر کے یکمشت روانہ فرمایا اور اِس مہینے بھی چند اور خریدار بنائے۔ جو حضرات ساقی کو عزیز رکھتی ہیں وہ اپنی ہمدردی کا ثبوت اسی طرح دے سکتے ہیں کہ ساقی کی مالی مشکلات دُور کرنے کی کوشش فرمائیں۔ اور یہ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ اپنے احباب کو ساقی کی خریداری پر مائل کریں۔ اسلم صاحب ساقی کے سرگرم قلمی معاون بھی ہیں اور خریدار فراہم کرنے میں بھی ساعی رہتے ہیں، گویا دامے، درمے، قدمے مدد فرماتے ہیں۔ اگر ساقی کے قدرداں چاہیں تو اسلم صاحب کی طرح بہت آسانی سے دو دو چار چار خریدار مُہیّا کر سکتے ہیں۔ توسیعِ اشاعت سے ساقی کو نہ صرف اپنی مالی حالت سنبھالنے کا موقع مل جائیگا بلکہ بہتر صورت میں شائع ہو سکے گا۔ ساقی اس وقت ہر مہینے ۹۶ صفحے کے مضامین پیش کرتا ہے لیکن یہ ضخامت بھی ساقی کیلئے ناکافی ہے۔ ع ا۔

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

عُمدہ مضامین کی کثرت اور جگہ کی قلت کی وجہ سے بعض مضامین باریک لکھوانے پڑتے ہیں اور بعض اچھے مضمون بدرجۂ مجبوری واپس کرنے پڑتے ہیں۔ اگر خریداروں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ساقی کی ضخامت میں بھی اضافہ ہو جائیگا۔ خریدار حضرات کا توجہ فرمانا شرط ہے۔

اُردو میں مختصر افسانہ نویسی نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اس ترقی کا سہرا اُردو رسائل کے سر ہے۔ آجکل ضرورت ہے کہ ڈرامے کی طرف توجہ کی جائے۔ مختصر ڈرامے اُردو ادب میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ انگریزی میں ایک ایکٹ کے ڈرامے خاص وقعت رکھتے ہیں۔ اُردو میں اگر اُن کی طرز پر مختصر ڈرامے لکھے جائیں تو مختصر افسانوں کے نعم البدل ثابت ہوں گے۔ خیال اور بیان کے لئے ایک نئی راہ نکل آئے گی اور جو حضرات افسانوں کے مُطالعہ سے تھک گئے ہیں اُن کے لئے ڈرامے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ مضمون نگار حضرات سے استدعا ہے کہ اِس صنفِ ادب کی طرف توجہ فرمائیں۔

جولائی میں ہر سال ساقی کا افسانہ نمبر شائع ہوتا ہے۔ اِس سال ہم چاہتے ہیں کہ جولائی میں ایک ایسا خاص نمبر شائع کریں جو افسانوں اور ڈراموں پر مُشتمل ہو۔ اِس خاص نمبر کی نصف ضخامت افسانوں اور نصف ڈراموں کیلئے وقف ہوگی۔ اُمید ہے کہ یہ تجویز خوش ذوق ناظرینِ ساقی میں پسند کی جائیگی۔

"شاہد"

خریدارانِ ساقی سے گزارش ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ "مینیجر"

"شانِ انساں"

تُو بھی یگانہ میں بھی یگانہ ؛ میں آشکارا تُو غائبانہ

تُو مدعا ہے میں مدعی ہوں ؛ بربط کا مقصود کیا ہے؟ ترانہ

عنقا حقیقت کا تُو ازل سے ؛ تیرا ابد تک میں آشیانہ

مانندِ آئینہ اے حسنِ مطلق ؛ تیری نمائش کا ہوں بہانہ

تُو قلزمِ زیست میں قطرۂ زیست ؛ تُو بیکرانہ میں بیکرانہ

بااین ہمہ آپ آقا میں بندہ ؛ میری جبیں آپکا آستانہ

شانِ خدا ہے یا شانِ انساں

دعویٰ نہیں یہ امیں شاعرانہ

امین حزیںؔ

تانگے والا

شام کا سُہانا وقت تھا بدرو تانگے والا آج سرِشام ہی گھر آ گیا۔ اُس کی بیوی محمدی نے ہنڈیا چڑھا رکھی تھی۔ خاوند کو دیکھ کر بولی۔ "آج تو تم سویرے ہی آ گئے؟"

"ہاں!" بدرو نے گھوڑے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "آج اللہ میاں نے اِس بے زبان کی جلدی ہی سُن لی۔"

"کے پیسے ملے؟" محمدی نے ذرا مُسکرا کر پوچھا۔

"یہ لو!" بدرو نے سب پونجی جیب سے نکال کر بیوی کے آگے ڈال دی۔ "گِن لو۔"

پھر ساز اُتارتے ہوئے "دانہ کہاں ہے؟"

"اندر بالٹی میں بھگو رکھا ہے۔" محمدی بولی۔ "روٹی پکا دُوں؟"

"کیا پکایا ہے؟" بدرو نے گھوڑا اتھان پر باندھتے ہوئے پوچھا۔

"ساگ گوشت چڑھا رکھا ہے۔" محمدی نے ہنڈیا میں کفگیر پھیرتے ہوئے کہا۔ "بس ذرا سی کسر ہے۔"

بدرو نے گھوڑے کے آگے دانہ ڈالا۔ دو ایک ہاتھ پٹھے پر مارے دو ایک بار دمچی کو جھٹکے دیئے۔ پھر بیوی کے پاس آ بیٹھا اور بولا "پیسے گِن لئے؟"

"ہاں!" محمدی بولی۔ "سوا تین روپے ہیں۔"

"تو لا دے یہ اُوپر کی چونی مجھے دیدو۔" بدرو نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں؟" محمدی نے ریزگاری اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "تم کیا کرو گے؟"

"میرے پاس بھی تو کوئی دو چار آنے ہونے چاہئیں۔" بدرو نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اکنی لے لو۔" محمدی نے ایک اکنی اس کی طرف بڑھا کر کہا۔

"رہنے دو تم یہ اکنی بھی!"

یہ کہتے ہوئے بدرو نے جیب سے ایک سیب نکالا اور دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھانے لگا۔

"آدھا مجھے دو۔" محمدی نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"سیب کھانا ہے تو چونی دیدو۔"

یہ کہہ کر جو وہ سیب مُنہ کے پاس لایا تو محمدی نے اُچک کر سیب اُس کے ہاتھ سے چھین لیا اور ہنسکر بولی "اب بولو؟ کون کھائے گا یہ سیب؟"

"میری گھر والی!" بدرو نے ہنسکر کہا۔ "ٹھیک ہے نا۔ تمہارے لئے ہی تو لایا تھا۔ لو اب روٹی پکا دو۔"

محمدی نے ہنڈیا اُتار کر چولھے پر توا چڑھا دیا اور بیلنے پر روٹی بیلتے ہوئے بولی۔ "آج بالشٹر (بیرسٹر) کے ہاں لڑکی ہوئی ہے۔"

"لڑکی؟" بدرو نے تعجب سے کہا "وہ تو بیٹے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔"

کسی کے بس کی بات تھوڑی ہی ہے محمدی نے توے پر روٹی ڈالتے ہوئے کہا۔ "دن بھر موٹریں آتی جاتی رہیں۔"

"ڈاکٹرنیاں آئی ہونگی" بدرو نے پوچھا۔

"ڈاکٹرنیاں بھی اور ڈاکٹر بھی۔" محمدی نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ڈاکڈر (ڈاکٹر) کیوں؟" بدرو نے پوچھا۔
"کچھ پوچھو نہیں"۔ محمدی نے روٹی الٹتے ہوئے کہا۔
"مجھے تو کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے!"
بدرو تعجب سے بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولی
"کبھی ڈاکڈر (ڈاکٹر) نے ہی تو جنائی!"
"پگلی تو نہیں ہوگئیں کہیں!" بدرو نے کہا۔
"میں کیوں پگلی ہونے لگی" محمدی بولی "محلے والوں سے پوچھ لو!"
"تعجب ہے!" بدرو نے ایک شانِ خودداری سے سر ہلا کر کہا "کسی نرس ورس کو بلا لیا ہوتا"
"کہہ تو رہی ہوں" محمدی بولی۔ "ڈاکڈرنیاں بھی آئی تھیں۔ لیکن کام ڈاکڈر نے کیا"
"توبہ ہے!" بدرو نے کان کو ہاتھ لگا کر کہا۔ "یہ سب دولت کے چوچلے ہیں"
"آگ لگے ایسی دولت کو" محمدی روٹی سینکتے ہوئے بولی۔ "اتنی بے شرمی سے تو موت ہی بہتر ہے"
بدرو بولا "یہ شاہی مسجد کے پچھواڑے جو ہسپتال ہے وہاں بھی تو یہی ہوتا ہے"
"کیا؟" محمدی نے پوچھا۔
"یہاں بھی جنائی کا کام مرد ہی کرتے ہیں" بدرو نے جواب دیا "غریب غربا کو ضرورت لے جاتی ہے۔ امیر شوقیہ چلے جاتے ہیں"
"بھاڑ میں جائیں ایسے شوق!" محمدی بولی "جانے ان دولت والوں کی عقل پر پردہ کیوں پڑ گیا ہے۔ اب وہ پہلی بات تو کہیں نظر آتی نہیں"
"کیا بات؟" بدرو نے پوچھا۔
محمدی بولی "یہ بڑے بڑے گھرانوں والیاں اب گھروں میں تو ٹکتی ہی نہیں۔ کہیں چائے پانی (پارٹی) ہے کہیں کھانا ہے کہیں کچھ کہیں کچھ"
"خیر!" بدرو بولا "ہم تو راجو دائی کو بلا لیں گے"
"جب وقت آئے گا تب یا ابھی سے" محمدی نے مسکرا کر کہا۔
"ہاں ہاں!" بدرو کہنے لگا "جب وقت آئے گا لیکن ایک بات تم بھی سن لو"
"کیا؟" محمدی نے پیالے میں سالن ڈالتے ہوئے پوچھا۔
"میں تو بیٹا لوں گا بیٹا!" بدرو بولا۔
"یہ کسی کے بس کی بات تھوڑی ہے!" محمدی نے ہنس کر کہا "بیٹی ہوگی تو گھر کے کام کاج میں میرا ہاتھ بٹائے گی"
اور بدرو سر ہلا کر بولا "بیٹا ہوگا تو گھوڑے کی خبرگیری کیا کرے گا"
"میں تو اسے پڑھواؤں گی" محمدی نے ہنس کر کہا۔ "بابو بنے گا بابو!"
دونوں میں دیر تک اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔

جاڑے کے دن تھے اور رات کا وقت۔ بارش ہو رہی تھی۔ بدرو چولھے کے پاس بیٹھا آگ تاپ رہا تھا اور محمدی لحاف اوڑھے کھاٹ پر لیٹی کراہ رہی تھی۔
"دولت دولت ہی ہے!" بدرو نے ایک آہ بھر کر کہا۔
"پھر کیا ہوتا" محمدی بولی "دکھ تو پھر بھی بھوگنا ہی پڑتا"
"اس وقت کوئی ڈاکڈرنی تو تمہارے پاس ہوتی" بدرو نے جواب دیا "اور نہیں تو یہ کم بخت راجو تو تمہیں

اِس حالت میں چھوڑ کر دوسری جگہ نہ چلی گئی ہوتی۔"

"آ ہی جائے گی۔" محمدی نے جواب دیا۔

"پھر جاؤں۔" بدرو نے پوچھا "شاید آ ہی گئی ہو۔"

"اللہ جانے!" محمدی نے کراہتے ہوئے کہا۔

"بہت تکلیف ہے؟" بدرو نے پوچھا۔

"اللہ آسان کر دیگا۔" محمدی نے جواب دیا۔

"جاڑا تو نہیں لگتا؟" بدرو نے پوچھا۔

"لگ تو رہا ہے!" محمدی بولی۔ "دو چار کوئلے انگیٹھی میں ڈال کر یہاں میرے پاس رکھدو۔"

بدرو نے چولھے میں سے کوئلے نکالے اور مٹی کی ایک انگیٹھی میں ڈال کر بیوی کی چارپائی کے پاس رکھدیئے۔

"بارش ہو رہی ہے؟" محمدی نے پوچھا۔

"ہاں!" بدرو بولا۔ "پانی تو پڑ ہی رہا ہے!"

"راجو آنے کو تو جلدی کہہ گئی تھی۔" محمدی بولی۔ "جانے دیر کیوں لگائی۔"

"جہاں میٹھا ہو وہاں مکھی زیادہ بیٹھتی ہے۔" بدرو نے جواب دیا۔

اِتنے میں کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟" بدرو نے پوچھا۔

"راجو ہوگی۔" محمدی بولی۔

"میں حسن دین ہوں۔" باہر سے آواز آئی۔

بدرو نے دروازہ کھولا۔ حسن دین جس نے بارش سے بچنے کو سر پر ایک بوریا ڈال رکھا تھا اندر آیا۔

"کیسے آئے؟" بدرو نے پوچھا۔

"برکت نے کہا تھا کہ ذرا کھڑے کھڑے محمدی کی خبر لے آؤ۔" حسن دین نے جواب دیا۔

"اللہ رحم کریگا۔" بدرو بولا "تم نے بہت تکلیف کی!"

"تکلیف کیسی؟" حسن دین بولا۔ "برکت کبھی پورے دنوں بیٹھی ہے۔ بُلا لاؤں! راجو نہیں آئی؟"

"ابھی تک تو نہیں آئی۔" بدرو نے کہا۔

"میں برکت کو بھیجتا ہوں" حسن دین نے بوریا پھر سر پر ڈال کر کہا۔ "وہ راجو کو بھی لے آئیگی۔"

"تانگہ لے جاؤ۔" بدرو نے کہا۔

"تانگہ تیار ہونے تک تو میں پہنچ بھی جاؤں گا۔" حسن دین نے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"بڑا احسان ہے تمہارا!" بدرو نے کہا۔

"احسان کو رکھو چھپّر پر" حسن دین نے کواڑ کھولتے ہوئے کہا۔ "تم مٹھائی تیار رکھو!"

"میرے یار!" بدرو بولا۔ "خدا مشکل تو آسان کرے تم مٹھائی بھی کھا لینا۔"

"برکت آ ہی جائے تو اچھا ہے۔" محمدی بولی۔

"تم نے شام ہی سے کیوں نہ بُلا لیا؟" بدرو نے کہا۔

"آخر اس کو بھی تو حسن دین کی روٹی پکانی تھی" محمدی بولی۔ "خیر اب آ ہی جائے گی۔"

"یہ لو!"

محمدی نے ایک چابی خاوند کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

"میرے صندوق میں پانچ دس روپے رکھے ہیں۔ نکال لو۔"

"روپے تو دو تین میرے پاس بھی ہیں" کہتے ہوئے چابی اُٹھالی۔ اور صندوق میں جو پانچ سات روپے رکھے تھے نکال لئے۔

تھوڑی دیر بعد حسن دین کی بیوی برکت راجو دائی کو

بھی لے آئی۔ بدرو بولا۔ "مائی! ہمیں غریب جان کر ٹھالا دیا۔"

"چھاجوں پانی پڑ رہا ہے۔ کیسے آتی؟" دائی نے جواب دیا۔ "تم ہی تانگہ لے کر آ گئے ہوتے!"

"اس غریب کے پاس کون تھا؟" بدرو نے کہا۔ "جو میں بھی چلا آتا۔ تم ہی تانگہ لے کر آ گئیں ہوتی۔ کرایہ ہی تھا۔ ہم دیدیتے۔"

"چلو چھوڑو اس قصّے کو۔" برکت بولی۔ "اب حال کیا ہے؟"

یہ کہہ کر وہ محمدی کے پاس چارپائی پر جا بیٹھی۔

"مر رہی ہوں" محمدی بولی۔

"گھبراؤ نہیں!" برکت نے اُس کے ٹھیکی لے کر کہا۔ "ابھی جلانے والا بھی آ جاتا ہے۔"

اب دائی دیکھنے بھالنے لگی۔

"بیہوش کئے بغیر کام نہ بنے گا۔" راجو نے کہا۔ "کسی ڈاکٹر کو بلوانا چاہیئے۔"

"مجھے مرنا قبول" محمدی نے کہا۔ "پر ڈاکڈار کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔"

"ڈاکٹر کیا کرے گا؟" دائی نے کہا۔ "ذرا ٹیکا ویکا لگا دے گا۔ تکلیف کم ہو جائے گی۔"

"پھر میں جاؤں؟" بدرو بولا۔ "کیا کہوں؟"

"کہدینا!" دائی نے کہا۔ "کہ مریضہ کے بچہ ہونیوالا ہے۔ بیہوش کرنے کی دوا لے چلیں۔"

برکت بولی۔ "بھیّا! تانگہ لے جاؤ۔"

"ہاں!" دائی نے کہا۔ "آنا جلدی۔"

ایک تو جاڑے کی رات۔ پھر بارش۔ بازار سنسان پڑے تھے۔ بدرو نے تو ایک کمبل اوڑھ رکھا تھا لیکن وہ بے زبان جس پر سامنے سے پانی کی بوچھاڑ پڑتی تھی کچھ بدن سُکیڑ سُکیڑ کر چل رہا تھا۔

"چل میرے شیرا چل میرے بیٹا!" بدرو گھوڑے سے کہتا جاتا۔ "اللہ میاں تیرے صدقے ہیں ہماری مصیبت آسان کر دینگے۔ تُو بھی تو غازی مرد ہے۔"

لیکن جب چوک میں پہنچا تو پہرے والے سپاہی نے جو بارش سے بچنے کے لئے کسی دُکان کے چھپرے کے نیچے کھڑا تھا آواز دی۔ "تانگہ روک لے!"

"خالی نہیں ہے!" بدرو نے جواب دیا۔

"خالی کا بچہ!" سپاہی نے ڈانٹ کر کہا۔ "کھڑا ہو جا۔"

"کیا حکم ہے سنتری جی!" بدرو نے سپاہی کو پہچان کر کہا۔

"مجھے ذرا چوکی تک پہنچا دے۔" یہ کہتے ہوئے سپاہی تانگے پر سوار ہو گیا۔

"سنتری جی!" بدرو بولا۔ "میری گھر والی بہت بیمار ہے ڈاکڈار کو لینے جاتا ہوں۔ اس وقت تو معاف ہی کر دیجئے!"

"مجھے کچھ دُور تو جانا نہیں۔" سنتری نے جواب دیا۔ "پہلے مجھے پہنچا دے پھر ایک چھوڑ دس ڈاکٹر لے جائیو۔"

"میں اس وقت نہیں جا سکتا۔" بدرو نے جواب دیا۔

"لے جائیگا تو تیرا باپ بھی!" سنتری نے غصّہ سے کہا۔ "چل سیدھا ہو۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔" اب بدرو نے بھی ذرا اکڑ کر کہا۔

"چلتا ہے یا میں کوئی اور تدبیر کروں؟" سنتری بولا۔

"بابا!" بدرو نے منت سے کہا۔ "رحم کرو۔ میری گھر والی بہت بیمار ہے۔"

"مرنے دے سالی کو۔" سنتری بولا۔ "اور مل جائیگی۔"

یوں ہی بات بڑھ گئی۔ پہلے تُو تُو میں میں۔ پھر ہاتھا پائی

تک نوبت پہنچی۔ اب بدرو کی ڈاڑھی سپاہی کے ہاتھ میں اور سپاہی کے سر کے بال بدرو کی مٹھی میں۔ اتفاق سے دو تین آدمی ادھر سے گذرے۔ انہوں نے دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا۔ لیکن وہ سپاہی ہی کیا جو غلطی کا اعتراف کرے یا اپنی ہٹ سے باز آئے۔ وہ اُچک کر پھر تانگے میں بیٹھ گیا۔ اب بدرو بھی اور یہ آدمی بھی سوار ہو گئے۔ کوتوالی پہنچ کر ان لوگوں کے کہنے سُننے سے بدرو غریب کی دو چار گالیاں کھا کر خلاصی ہوئی۔ لیکن اسی رد و کد میں ۲ بج گئے۔

ڈاکٹر کا مکان ایک گلی میں تھا۔ بدرو نے تانگہ تو بازار میں کھڑا کیا اور خود مکان پر جا کر آوازیں دینے لگا۔

"ڈاکڈر صاحب! ڈاکڈر صاحب جی!"

کوئی بہر بھر آوازیں دینے کے بعد اوپر کی منزل کی ایک کھڑکی کُھلی۔

"کون ہے؟" اوپر سے آواز آئی۔

"ڈاکڈار صاحب ہیں؟" بدرو نے پوچھا۔ "ایک مریض کو دکھانا ہے۔"

"کون بیمار ہے؟" اوپر والے نے پوچھا۔

"میری بیوی بیمار ہے۔" بدرو نے جواب دیا۔ "اُسے بیہوش کرنے کی دوا دینی ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب تو سو رہے ہیں۔" اُوپر سے آواز آئی۔

"تو ذرا جگا دیجئے! میں فیس دوں گا۔" بدرو نے کہا۔

"ٹھہرو ذرا!" یہ کہہ کر اوپر والے نے پھر کھڑکی بند کر دی۔ لیکن جب پانچ دس منٹ گذر گئے اور نہ تو کھڑکی ہی کھلی نہ ڈاکٹر ہی آیا تو بدرو پھر آوازیں دینے لگا۔ کوئی دس، پانچ بار پکارنے کے بعد اوپر والی کھڑکی پھر کھلی۔

"کہاں جانا ہے؟"

"بارود خانہ بازار۔" بدرو نے جواب دیا۔

"موٹر لائے ہو؟"

"تانگہ موجود ہے۔" بدرو نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر صاحب تانگے میں نہیں جا سکتے۔"

"ڈاکڈار جی اپنی موٹر میں چلیں۔ میں تیل کی قیمت دیدوں گا۔" بدرو نے کہا۔

"ٹھہرو!" اوپر والا بولا۔ "میں پوچھکر بتلاتا ہوں۔"

کھڑکی کے پھر ایک بار بند ہونے کی آواز آئی۔ اور بدرو بارش سے بچنے کے لئے مکان کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد پھر کھڑکی کھلی، بدرو نے جلدی سے پوچھا۔ "ڈاکڈار صاحب تیار ہو گئے؟"

"بتیس ۳۲ روپے فیس اور دوا کی قیمت علیحدہ دینی ہوگی۔" اوپر سے آواز آئی۔

"بتیس روپے!" بدرو نے تعجب سے کہا۔

"اور چار روپے میری فیس کے!"

"بھائی!" بدرو بولا۔ "میں غریب آدمی ہوں۔ دس روپے دیدوں گا۔"

کھڑکی بند ہو گئی۔

"مولا! ہم غریب بھی تو تیرے ہی بندے ہیں۔" کہتا ہوا بدرو تانگے پر آ بیٹھا اور گھر کی طرف جلد یا گھوڑا بھی ہانکے جاتا اور اپنے آپ سے کہتا بھی جاتا۔ "توبہ ہے! یہ ڈاکڈار ہے یا ڈاکو! بتیس ۳۲ روپے!! چل میرے بیٹا! سنبھل کر! آج کل کے ڈاکڈار تو مریضوں کی کھال اُتارتے ہیں۔

پیسہ پاس ہو تو سب اپنے، اور جو پیسہ نہ ہو تو پھر اپنے بھی بیگانے ہو جاتے ہیں!"

اسی طرح بڑبڑاتے ہوئے گھر پہنچ گیا۔ پہلے گھوڑے کو تھان پر باندھا۔ اُس کے آگے گھاس ڈالی۔ عورتوں نے آواز سُنکر دروازہ کھولدیا۔ جب اندر آیا تو دائی نے پوچھا "ڈاکٹر کو لے آئے؟"

"نہیں!" کہہ کر بدرو آپ بیتی کہنے لگا۔ لیکن برکت کپڑے میں کوئی چیز لپٹی ہوئی لے کر آئی اور اُسکی طرف بڑھا کر بولی۔ "بھیا! تمہاری کتھا پھر سُن لینگے۔ یہ لو! پہلے اپنا بیٹا تو دیکھ لو!"

"بیٹا!" کہتے ہوئے بدرو نے برکت سے ننھا لیلیا اور سینے سے لگالیا۔ اُس وقت اُسے نہ سپاہی سے شکایت تھی اور نہ ڈاکٹر سے شکوہ۔

ایم اسلم

شانِ تغزل

میں نہ نغمہ ہوں نہ نغمہ ساز ہوں ۔۔۔ درد میں ڈوبی ہوئی آواز ہوں

لفظِ بے معنی ہوں معنی ساز ہوں ۔۔۔ میں کسی کا لہجۂ آواز ہوں

دوستی میں دوستوں کا ناز ہوں ۔۔۔ حلقۂ احباب کا اعزاز ہوں

ہے زباں پر بھی وہی جو دل میں ہے ۔۔۔ میں معمّہ ہوں نہ کوئی راز ہوں

صاف طینت کیلئے ہوں صاف دل ۔۔۔ راز والوں کیلئے میں راز ہوں

میری ہستی اک مسلسل موت ہے ۔۔۔ کوئی مجھکو بھی تو سمجھے راز ہوں

میرے دل کی خاک بھی اکسیر ہے ۔۔۔ میں کسی کا فرشِ پا انداز ہوں

تاڑنے والے مجھے بھی تاڑلیں ۔۔۔ میں تو وقفِ معنیٔ ضبطِ راز ہوں

تم سے ملکر دل ترنّم ریز ہے ۔۔۔ تم مری آواز ہو میں ساز ہوں

میں خود اپنی فطرتِ معصوم سے
آج فرحتؔ مائلِ پرواز ہوں

فرحت کانپوری

جدید مطبوعات

(۱) مقالاتِ حالی (حصہ دوم) (۲) چند ہمعصر (۳) سودا (۴) سراجِ سخن (۵) تصویرِ کشمیر (۶) مطایبات

دہلی اور لکھنؤ اپنی اُردو پر نازاں ہیں۔ لیکن دکن کو بھی اِس زبان کے ساتھ ابتدا سے نیازمندانہ تعلق رہا ہے۔ بلکہ بعض لوگ تو اس سرزمین کو اُردو کی جنم بھومی کہتے ہیں، اور وَلی دکنی کا اُردو شاعری میں وہی مرتبہ سمجھتے ہیں جو چاسر (Chaucer) کا انگریزی شاعری میں ہے۔ اگر اس زمانے میں اُردو زبان اور ادب کی ترقی کی کیفیت و رفتار کو ملاحظہ کیا جائے تو دکن دہلی اور لکھنؤ سے بہت زیادہ آگے نظر آتا ہے۔ کیونکہ اُردو کے پرچار کے دو سب سے بڑے ادارے یعنی جامعہ عثمانیہ اور انجمن ترقی اُردو، دونوں دکن میں ہیں اور اِن اداروں کی بدولت اُردو ادبیات میں ہر روز کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ آج مَیں جن کتابوں کا ذکر کروں گا ان میں سے چار دکن کی پیداوار خیال کی جاسکتی ہیں۔ اگرچہ اُن میں سے دو دلی چھپائی دکن کے باہر ہوئی ہے۔ "مقالاتِ حالی" اور "چند ہمعصر" انجمن ترقی اُردو کے سلسلہ مطبوعات میں منسلک ہیں۔ اور اس سلسلہ میں انکا نمبر علی الترتیب ۱۰۱ اور ۱۰۳ ہے۔ اور اس شمار سے اس خدمت کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ جو انجمن نے ابتک اُردو زبان و ادب کیلئے انجام دی ہے۔ "مقالاتِ حالی" جس کا صرف حصہ دوم میرے پیش نظر ہے۔ ایک مجموعہ ہے۔ جس میں مولانا حالی مرحوم کی تقریریں اور کتابوں کے تبصرے جمع کئے گئے ہیں۔ جدید اُردو ادب کی تعمیر میں حالی کا جو حصہ ہے، اس کی تشریح کا اس وقت کوئی موقع نہیں لیکن مختصر طور پر مَیں اتنا ضرور کہوں گا کہ اس زمانے کی اُردو نظم و نثر یکساں اِن مرحوم کی ادبی جدوجہد کی مرہونِ منت ہیں۔ اور خصوصاً تین سمتوں میں تو ان کو رہنما خیال کرنا چاہیئے۔ اور انکے بعد کے سب مصنفین کو مقلد۔ (۱) قومی اور وطنی جذبات کو سادی مگر مؤثر زبان میں نظم کرنے کا طریقہ انہوں نے سکھایا۔ (۲) حیاتِ سعدی۔ حیاتِ جاوید۔ وغیرہ میں جہاں تک اُردو ادب کا تعلق ہے، سوانح نگاری کا ایک نیا اور پسندیدہ معیار قائم کیا اور (۳) دیوانِ حالی کے دیباچے اور بعض دیگر تصانیف میں ایسی ادبی تنقید کا آغاز کیا جو نہ صرف بیجا تعریف اور ناحق مذمت سے پاک ہے۔ بلکہ جس میں ذوقِ سلیم اور تحقیق کے ساتھ ارتقائی نظر بھی موجود ہے۔ اور جو کسی وجہ سے اپنی ہمعصر مغربی تنقید کی ہم پایہ خیال کی جاسکتی ہے۔ اکثر بڑے مصنفوں کی مانند حالی نے بھی علاوہ اپنی مستقل تصانیف کے جو اُن کی زندگی میں شائع ہوچکی تھیں متفرق مضامین۔ تقریروں، خطوں اور نظموں کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ اگرچہ اس قسم کی ادبیات اکثر عارضی اور ہنگامی موزونیت سے بالاتر کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ اور شاید مصنف خود انکی جمع و ترتیب کو پسند بھی نہ کرتا لیکن اُس کے معتقدین کے حُسنِ اعتقاد کا یہ لازمی تقاضہ ہوتا ہے کہ اُس کی ہر ایک تحریر کو خواہ وہ کتنی ہی غیر وقیع کیوں نہ ہو متبرک سمجھکر محفوظ رکھا جائے۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ "مقالاتِ حالی" حصہ دوم بھی ایسی ہی غیر وقیع تحریرات کا مجموعہ ہے۔ لیکن میرے دل میں یہ خدشہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر حالی اس وقت زندہ ہوتے تو شاید ان سب تقریروں اور تقریظوں کو جمع کرنے کی ضرورت نہ سمجھتے جو اِس کتاب میں درج کی گئی ہیں۔ تاہم یہ تقریریں اور تقریظیں کئی وجوہ سے بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً ایک تقریر بر موقع عطائے خطاب حکیم اجمل خاں ہے۔ آج کل اخباروں میں یہ بحث دیکھنے میں آتی ہے کہ آئندہ ہندستان میں کوئی خطاب نہ دیئے جائیں۔ اس مسئلہ میں اختلافِ خیال کی گنجائش ہے۔ لیکن شاید یہ بات سب کو ماننی پڑے گی کہ ہندوستان اب اس دور سے گذر گیا ہے جب مولوی حالی کے پایہ کے ادیب اپنے دوست کو خطاب ملنے پر اپنی قوتِ تقریر کے اظہار کو برموقع خیال کرتے تھے۔ بعض تقریروں میں اُس زمانے کے مسلمانوں کی قومی اور ملی جدوجہد کی ایک جھلک نظر آتی ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ اِس زمانے اور اُس زمانے کے مسلمانوں کے اجتماعی خیالات میں کتنا تفاوت تھا۔ تقریظات، سے مولانا مرحوم کی طبیعت کا اعتدال اور رائے کا توازن ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ

ماننا پڑیگا کہ ان تقریظوں میں جو ادبی تنقید موجود ہے وہ اس پایہ کی نہیں جس کی توقع دیباچۂ دیوان اور حیاتِ سعدی وغیرہ کے مصنف سے کی جاسکتی تھی۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہو کہ جن کتابوں پر تبصرہ کیا گیا ہے اُن میں سے اکثر ایسے اشخاص کی تصنیف ہیں جو مولانا کے زمرۂ احباب میں شامل تھے اور ادبی دیانت دوستوں کی دل شکنی کیلئے کوئی عذر نہیں ہوسکتی ؎

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر ضرور
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

تقریظات میں شاید سب سے زیادہ دلکش آخری تقریظ ہے۔ جس میں حالی نے میرٹھ کی گنواری زبان کے ایک شاعر منوّر خاں دلگیر کے دیوان پر نہایت دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔

انجمن ترقی اُردو کی دوسری کتاب "چند ہمعصر" اس انجمن کے آنریری سکرٹیری مولوی عبدالحق صاحب کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جن میں مولوی صاحب موصوف نے اپنے بعض معاصرین کے خصائل و کردار کا عکس یا اُن کی زندگی کا کارنامہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ہمعصر دو ایک کے سوا سب مشہور و معروف اشخاص ہیں۔ اور مولوی عبدالحق صاحب نے ان کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں وہ عام طور پر دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کی جائیں گی۔ مشہور و معروف ہونے کے باوجود ان میں اکثر کے سوانح زندگی اب تک قلمبند نہیں ہوئے۔ مثلاً مولوی چراغ علی جو اپنے زمانے میں اسلامیات اور عربی و عبرانی زبانوں کے ایک جیّد عالم خیال کئے جاتے تھے۔ لیکن جن کی شخصیت اور علمی اکتسابات سے اس زمانے کے بہت کم لوگ آگاہ ہیں۔ ہم کو مولوی عبدالحق صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ ان کی کتاب کی بدولت مولوی چراغ علی مرحوم اور اُن جیسے اور مشاہیر کے بصیرت افروز سوانح حیات سے باخبر ہونے کا موقع ملا۔

تیسری کتاب جو اِس وقت میرے پیشِ نظر ہے بعض اعتبار سے سب سے زیادہ وقیع خیال کی جاسکتی ہے۔ یہ اُردو کے مشہور و معروف شاعر مرزا محمد رفیع سوؔدا کی زندگی اور تصانیف پر ایک جامع اور بسیط تبصرہ ہے۔ جو شیخ چاند ایم۔ اے؛ ایل ایل بی؛ کی ادبی اور علمی تحقیق کا نہایت قابل قدر ماحصل ہے۔ سوؔدا کا اُردو شعرا کی صفِ اوّل میں جو پایہ ہے وہ سب جانتے ہیں۔

مرزا غالبؔ کا ایک لطیفہ بیان کیا جاتا ہے کہ اُن کے آگے کسی نے سوؔدا کی تعریف کی تو وہ کہنے لگے کہ میں تو تم کو میری سمجھتا ہوں۔ مگر معلوم ہوا کہ تم سوؔدائی ہو۔ اور اُن کا یہ شعر ؎

غالبؔ اپنا تو عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
خود وہ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

بہت مشہور ہے۔ اگرچہ ناسخؔ اور غالبؔ کی تقلید میں اکثر لوگ میرؔ کو سراہتے ہیں اور ان کے مقابلے میں سوؔدا کے مرتبہ کو گھٹاتے ہیں۔ لیکن میں نے مولانا نذیر احمد مرحوم جیسے مستند ادیب کو یہ کہتے سُنا ہے کہ "میر صاحب صرف ایک میدان کے مرد تھے، یعنی غزل گوئی۔ لیکن سوؔدا کو شاعری کی تمام اصناف پر یکساں قدرت حاصل تھی۔" بہرحال اس میں تو کسی کو کلام نہیں ہوسکتا کہ متقدمین میں میرؔ و سوؔدا جیسی شہرت کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ شیخ چاند نے پہلے مختصر طور پر سوؔدا کے زمانے کے سیاسی اور معاشرتی حالات کو بیان کیا ہے تاکہ اس کی شاعری کی فضا اور ماحول سے آگاہی پیدا ہوجائے۔ اسکے بعد شمالی ہند میں اُردو شاعری کے آغاز و ارتقا کی مجمل کیفیت لکھی ہے۔ یہ کتاب کا پہلا حصّہ ہے۔ دوسرے حصّہ میں سوؔدا کی زندگی اور اُن کی تصانیف و کلام کا مفصّل تذکرہ ہے۔ تیسرے حصّہ میں اُن کے اُردو کلام کی ہر ایک صنف مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، ہجو وغیرہ پر تنقید کرنے کے بعد اُن کے اُردو کلام پر عمومی حیثیت سے نظر ڈالی ہے۔ سوؔدا کے کلام کی قدر و قیمت کے بارے میں شیخ چاند نے مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کی رائے کو بہت کافی اور دُرست قرار دیا ہے جن کے چند فقرے میں آپکو سُناتا ہوں۔ آزاد فرماتے ہیں کہ "اہلِ سخن کا اتفاق ہے کہ مرزا اس فن میں (یعنی شاعری میں) مسلم الثبوت تھے۔ وہ ایسی طبیعت لیکر آئے تھے۔ جو شعر اور فنِ انشاء ہی کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ اُنکا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ۔ جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز۔ نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور کہیں بند نہیں۔ انکے ہمعصر اُستاد خود اقرار کرتے تھے کہ جو باتیں ہم کاوش اور تلاش سے پیدا کرتے ہیں وہ اس شخص کو پیش پا اُفتادہ ہیں۔" آزاد

کے علاوہ شیخ چاند نے انشا۔ رنگین۔ اور قدرت اللہ کی آرا کو نقل کیا ہے اور ان اعتراضات پر نظر ڈالی ہے جو ان لوگوں نے سودا کے کلام پر لسانی اور عروضی اعتبار سے وارد کئے ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے محل اعتراض یہ ہے کہ سودا اپنے شعروں میں بعض ایسے لفظ استعمال کر جاتے ہیں جو یا تو متروک ہو چکے تھے یا انشا وغیرہ کے خیال میں ترک کر دینے کے قابل تھے۔ شیخ چاند نے اس اعتراض کا بہت معقول جواب دیا ہے کہ سودا کی شاعری کا آغاز عہد محمد شاہی میں ہوا تھا اور اگر اس دور کے چند الفاظ اس کے اسی زمانے کے کلام میں مستعمل ہو گئے تو یہ کون اعتراض کی بات ہے۔ میں اُن کے اس جواب پر یہ اضافہ کرونگا کہ بعض جگہ ان پرانے الفاظ کا استعمال سودا کے کلام میں اس قدر موزوں اور بے ساختہ ہے کہ اسکو بجائے عیب کے خوبی تصور کرنا چاہیئے۔ شیخ چاند نے اپنی تنقید کو سودا کے اردو کلام ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اُنکے ہندی اور فارسی کلام پر بھی تبصرہ کیا ہے اور اس کی فارسی اور اُردو نثر کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن ان کے ذوقِ سلیم اور صحیح وجدان نے اُن کو اس امر کی اجازت نہیں دی کہ وہ سودا اور میر کا موازنہ کریں یا اُس کو اور شاعروں کے مقابلے میں بڑھائیں او گھٹائیں۔ ادبیات میں اس قسم کے مقابلے اور موازنے اکثر غیر مفید اور بعض وقت تلخ بحث مباحثہ کا سبب ثابت ہوتے ہیں۔ کتاب کے چوتھے حصے کو اس سب تحقیق و تنقید کا ماحصل سمجھنا چاہیئے۔ اس میں مصنف نے نہایت قوی استدلال اور لطیف ادبی احساس کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ سودا نے اُردو زبان کی تشکیل و اصلاح، ترویج و اشاعت میں کیسا گرانقدر حصہ لیا ہے اور اس کی شاعری کی اُردو ادب میں کیا اہمیت ہے۔ شیخ چاند کی کتاب "سودا" کے آخری فقرات، اس شاعر کے حق میں نہایت شاندار خراج تحسین ہیں۔ اور اُن سے اس کے ادبی شکوہ کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ (یعنی سودا) ہماری زبان کا زبردست بانی ہے جس کو ہم فراموش نہیں کر سکتے۔ اس کا کلام ہماری اوّلین ادبی و لسانی کوشش کا آئینہ ہے جس میں ہمیں اپنی زبان کی نشو و نما کا حال معلوم ہوتا ہے اور اس جد و جہد کا پتہ چلتا ہے جو ہم نے اپنی زبان کے بنانے اور سنوارنے میں کی ہے۔ اس کا کلام اس زمانے کی شاعری کا ایک خاص اور مستقل نمونہ ہے۔ جس کا اثر عرصہ تک بلکہ اب تک موجود ہے۔ اِن حالات میں اُس کا کلام ایک عزیز ارث ہے جس کو ہم چھوڑ نہیں سکتے اس کو نظر انداز کرنا زبان کی ارتقائی کڑی کو کھو دیتا ہے۔ اس لئے جب تک اُردو زبان زندہ ہے سودا کا نام زندہ رہے گا۔ اور اس کا کلام ہمیشہ زندہ رہکر ہماری رہنمائی کرتا رہے گا۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اور اپنی معنوی خوبیوں کے ساتھ اس کی ظاہری شکل بھی خوشنما اور دلکش ہے۔ خاتمہ پر ماخذات کی فہرست ہے جس سے مصنف کی وسعت مطالعہ کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ دو تصویریں بھی ہیں۔ ایک سودا کی جو انڈیا آفس کے قلمی نسخہ کلیاتِ سودا سے اخذ کی گئی ہے۔ لیکن جس کی اصلیت کے متعلق خود مصنف نے شک و شبہ کا اظہار کیا ہے۔ دوسری تصویر شیخ چاند مصنف کتاب کی اپنی شبیہ ہے۔ اس تصویر کے نیچے جو عبارت ہے اس کو اور نیز مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمہ کو دیکھنے سے یہ حسرتناک انکشاف ہوتا ہے کہ کتاب کی اشاعت سے قبل اسکے مصنف کا انتقال ہو گیا۔ ایسے ہونہار ادیب کی بے وقت موت اُردو ادب کیلئے نقصانِ عظیم ہے۔ لیکن اُن کی یہ کتاب ایک ایسی پائدار یادگار رہے جو اُن کے نام اور شہرت کو ادبی حلقوں میں زندہ رکھے گی۔ اُن کے ممدوح سودا کا ایک شعر ہے ؎

فکرِ معاش۔ عشقِ بتاں۔ یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

شیخ چاند مرحوم کی کتاب شاہد ہے کہ اگر آدمی چاہے تو تھوڑی سی زندگی میں بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔

چوتھی کتاب جس کا میں آج ذکر کرنا چاہتا ہوں، جناب عبدالقادر سروری کی "سراجِ سخن" ہے۔ جس میں انہوں نے دکن کے ایک شاعر سید شاہ سراج الدین اورنگ آبادی کے منتخب کلام کو ایک پُر معنی مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ سراج کا شمار دکن کے اُن شعرا میں ہے جن کو اُردو شاعری کی ترتیب میں تقدم کا شرف حاصل ہے۔ سروری صاحب اُن کو "قدیم اور جدید اُردو شاعری کا درمیانی واسطہ" کہتے ہیں اگرچہ اُردو شاعری کے ہر ایک دور کے شعرا کا کلام عموماً اس قدر ہمرنگ ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے کلام کے مخصوص انداز اور اسلوب سخن کے امتیاز کو واضح کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن سروری صاحب نے اپنے حُسنِ انتخاب اور وسعتِ نظر سے سراج

کے کلام کی داد دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے عالمانہ دیباچے نے جس میں انہوں نے دکن کی اردو شاعری پر ایک مجمل مگر نہایت محققانہ تبصرہ کیا ہے کتاب کی خوبی کو دوبالا کر دیا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ادبی ذوق کی تشفی کے علاوہ اردو زبان کی تاریخی اور لسانی تحقیق کیلئے بھی مفید ہو سکتا ہے۔

جناب ابو الاثر حفیظ جالندھری پنجاب کے اردو شعرا میں بہت ممتاز ہیں۔ ان کی ایک نظم "تصویر کشمیر" ابھی کتابی صورت میں شائع ہوئی ہے۔ حفیظ صاحب کا بیان ہے کہ یہ نظم سری نگر کے ایک مشاعرے کے لئے لکھی گئی تھی۔ مصرع طرح تھا۔ ع:-

ذرہ ذرہ جانفزا ہے گلشنِ کشمیر کا

وہ فرماتے ہیں کہ "غزل کہہ کر غالب کا منہ چڑانے کی جرأت نہ تھی۔ مدتوں سے کشمیر کے مختلف اور متضاد مناظر میری روح میں بسے ہوئے تھے، لہذا قافیئے کی رعایت سے کشمیر ہی پر کچھ کہنے کا تہیہ کر لیا"۔ کتاب کے شروع میں ایک تقریب ہے جو سر سید راس مسعود مرحوم (نواب مسعود جنگ بہادر) نے اپنے انتقال سے چند ہفتے قبل تحریر فرمائی تھی۔ یہ تحریر اگرچہ مختصر ہے مگر اس میں مرحوم نے حفیظ کی شاعرانہ خصوصیات کا نہایت لطیف اور معنی خیز پیرایہ میں ذکر کیا ہے اور ان تاثرات کو بھی بہت خوبی سے بیان کیا ہے جو حفیظ کی شاعری کے مطالعہ سے ایک حساس دل اور ایک تربیت یافتہ دماغ میں پیدا ہونے ممکن ہیں۔

کشمیر کی نظر فریب وادی شہنشاہ جہانگیر کے زمانے سے لیکر اس وقت تک شاعرانہ الہام کا سرچشمہ رہی اور نثر و نظم میں اس کی خوبصورتی اور دلکشی کا بہت کچھ ذکر ہو چکا ہے۔ فارسی اور اردو کے علاوہ بعض مغربی زبانوں کے شعرا نے بھی اسکے حسین مناظر کی لفظی تصویر کھینچنے میں اپنے زور طبع اور زور قلم کی آزمائش کی اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے فرسودہ مضمون پر کسی جدید کاوش یا تازہ فکر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی لیکن شاعر اور ایک معمولی قسم کے انسان میں جن باتوں کا فرق ہے ان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ شاعر کی نگاہ اس کی اپنی نگاہ ہوتی ہے اور اس کا مشاہدہ اس کا ذاتی مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ان مضامین کے بیان میں بھی جو بار بار بیان ہو چکے ہیں کوئی ایسی بات کہہ جاتا ہے جو اس سے پیشتر کم از کم اس پیرائے میں کسی اور نے نہیں کہی۔ بلکہ بسا اوقات مضمون کی فرسودگی اس کی جدتِ خیال کو اور بھی اُکسا دیتی ہے اور اس کے اسلوب میں ایک نئی شان پیدا کر دیتی ہے۔ حفیظ کی تصویر کشمیر کی ظاہری ترکیب نظم کی وہ صنف ہے جس کو مسدس کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ نظم کا ہر ایک بند چھ مصرعوں کا ہے۔ اگرچہ مناظر کا بیان اردو نظم میں زیادہ تر مثنوی کی شکل میں ہوا ہے۔ لیکن اقبال اور ان کے متبع شاعروں کی تصانیف نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اس قسم کے طویل بیانات کے لئے مسدس مخمس یا ترکیب بند کی کوئی اور شکل مثنوی سے زیادہ موزوں ہے کیونکہ اس میں ایک طویل مضمون کی تقسیم بھی ہو جاتی ہے اور وہ بے ربطی بھی پیدا نہیں ہوتی جو مثنوی میں (جس میں ہر ایک شعر کے ساتھ قافیہ اور ردیف بدل جاتے ہیں) عموماً پائی جاتی ہے۔ حفیظ کی اس نظم کی معنوی ترکیب یہ ہے کہ ہر ایک بند میں کشمیر کے منظر کا ایک سین دکھایا گیا ہے لیکن جس طرح سینما کی فلم میں مختلف تصویریں ایک دوسرے کے بعد اس طریقے پر آتی ہیں کہ آنکھوں کو ایک مستقل نظارہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح حفیظ کی نظم کے مختلف بندوں میں ایسا تسلسل خیال موجود ہے کہ پوری نظم کشمیر کے منظر کا ایک پورا نقشہ یا تصویر ہمارے تخیل کے روبرو پیش کر دیتی ہے اور ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی حفیظ کے ساتھ اور ان کی راہ نمائی سے اس منظر کی سیر کر رہے ہیں اور ان مسرتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، جو شاعر کے دل میں اس کی مختلف کیفیات کے مشاہدے سے ابھر رہے ہیں۔ ہر ایک بند میں ہر ایک مصرع کی تکرار کہ ع:-

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اس تسلسل خیال کو قائم رکھنے میں مدد دیتی ہے جس طرح کہ ایک گیت میں کسی خاص سر یا بعض سروں کے بار بار آنے سے ایک دلکش ربط اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ تمہیدی بند میں آپکو پڑھ کر سناتا ہوں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ میرے پڑھنے سے آپ کو حفیظ کی شاعری کا پورا حظ نہیں حاصل ہو سکتا کیونکہ اس کی صحیح کیفیت جبھی معلوم ہو سکتی ہے جب اس کے ساتھ ترنم بھی شامل ہو۔

بہرحال "تصویر کشمیر" کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:-

معرکہ درپیش ہے جذبات کی تفسیر کا

ہو رہا ہے تذکرہ کشمیر میں کشمیر کا
کھینچنا تصویر کا لانا ہے جوئے شیر کا
رنگ بھر دے اے قلم الفاظ میں تاثیر کا
لطف جب ہے کہہ اُٹھے ہر نقش اس تحریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اس بند کا تیسرا مصرع غالب کے ایک مصرع (صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا) کی یاد دلاتا ہے لیکن کوئی منصف مزاج شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ حفیظ صاحب نے مرزا غالب کا منہ چڑایا ہے۔ اس سے اگلے چند بندوں میں کشمیر کے قدرتی نظاروں کا ذکر ہے۔ اور اُن تاثرات کا ذکر ہے جو کشمیر کے ماضی اور حال کے متعلق ان نظاروں کے دیکھنے سے شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ نظم کے آخری حصے میں شاعر ان تاثرات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور جب وہ اس سرزمین کی خوش نمائی اور اس کے باشندوں کے فطری حسن کا مقابلہ کشمیر کی موجودہ آبادی کی فلاکت اور پسماندگی سے کرتا ہے تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:۔

وادی و کہسار پر ایسی بہار آئی ہوئی
نخل آدم زاد پر لیکن خزاں چھائی ہوئی
اسقدر خوش رنگ کلیاں اور مرجھائی ہوئی
راکھ میں چنگاریاں جیسے ہوں کجلائی ہوئی
حسرت آلودہ ہے چہرہ ہر جوان و پیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

فطرت اور انسانی زندگی کے اس المناک تقابل کو حفیظ نے کئی مؤثر اشعار میں واضح کیا ہے۔ لیکن آگے چل کر وہ اس افسردہ مضمون سے ایک لطیف پیرائے میں گریز کرتے ہیں اور کشمیر کی دلچسپیوں کی جانب یہ کہکر دوبارہ متوجہ ہو جاتے ہیں کہ:۔

خیر ہم کو کیا غرض اس قوم کے حالات سے
بدگماں ہوتی ہے دنیا اک ذرا سی بات سے
ہم تو لطف اندوز ہونے آئے ہیں باغات سے
ہم کو دلچسپی نہیں ان مالیوں کی ذات سے
لطف کیوں کھوئیں ہم اپنی چشم لذت گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اس کے بعد کشمیر کے دلکش مقامات اور دلفریب سیرگاہوں کا تذکرہ ہے اور شالامار باغ کی سیر کرتے ہوئے حفیظ کو اُن مغل شہنشاہوں اور بیگموں کا خیال آجاتا ہے جو اس باغ کے بانی اور قدر داں تھے اور شاعر کی آنکھوں میں اُن کی دولت و حشمت اُن کے جاہ و جلال کی صورتیں پھر جاتی ہیں۔ لیکن یہ خیال اُسکو افسردہ کرتا ہے کہ شالامار اور اس قسم کی اور عمارتیں اکثر مفلس و نادار مزدوروں کے خون اور پسینے سے تعمیر ہوئی ہیں۔ خیالات کا یہ اتار چڑھاؤ فطرت کے عین مطابق ہے اور شاعر کے تاثرات حقیقت میں وہی ہیں جو اکثر لوگوں کے دلوں میں زمانہ سلف کی یادگاروں اور حسین مقامات کو دیکھکر پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن مؤثر پیرایہ میں بیان کرنے کیلئے ایک شاعر شیریں بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔ حفیظ صاحب ان متضاد تاثرات سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ؎

عشرت ماضی کی ہے خمیازہ کش دنیائے حال
عیش چند افراد کا لایا جماعت پر وبال

پوری نظم کو مطالعہ کرنے کے بعد سر سید راس مسعود مرحوم کی اس رائے کی تائید کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ صاحب محض شاعر ہیں اور "سیاسیات اور پند و نصائح کے دامان گریباں اُن کی دسترس سے دُور ہیں" بلکہ اس کے برعکس ہمارا یہ خیال ہے کہ حفیظ صاحب کی "سیر کشمیر" ایک نہایت سبق آموز نظم ہے اور اس میں انسانی زندگی کا وہی جذبہ پایا جاتا ہے جو موجودہ دور میں ادبیات کا بہترین اور سب سے قوی محرک خیال کیا جاتا ہے۔ اس نظم کے بعد چند تصریحات ہیں جن میں کشمیر کے مشہور مقامات وغیرہ کی ضروری کیفیت ہے تاکہ وہ لوگ جو اس ملک کے جغرافیہ سے آگاہ نہیں نظم کا پورا لطف اٹھا سکیں۔ یہ تصریحات اُن لوگوں کیلئے بھی مفید ہو سکتی ہیں جو کشمیر کی سیاحی کا ارادہ رکھتے ہوں۔ ستر صفحات کی یہ مختصر کتاب دلچسپی کا بہت سا سامان رکھتی ہے اور اس مثل کی صحیح مصداق ہے کہ ہر کہ بقامت کہتر بقیمت بہتر۔

اب میں نظم سے نثر کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور پنجاب کے ایک اور ادیب مولانا چراغ حسن حسرت عرف سندباد جہازی کی ایک کتاب کا کچھ ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کا نام "مطائبات" ہے۔ اس غیر مانوس عربی نام سے آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ کتاب کا مضمون بھی ایسا ہی غیر مانوس ہوگا یا یہ کہ اس کی عبارت میں عربی اور فارسی الفاظ کی وہ کثرت ہوگی جس کے بوجھ سے مضمون بالکل دب جاتا ہے۔ "مطائبات" میں حسرت صاحب نے اپنے اُن مضامین کو جمع کر دیا ہے جو اخبار احسان میں چھپتے رہے ہیں۔ یہ

(بقیہ صفحہ ۵۱ پر)

(نمبر ۵) بسلسلۂ ماسبق

دورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی

فلسفہ و تصوف

لُغات میں، اور فنِ شعر سے بحث کرنے والی کتابوں میں غزل کی جو تعریف بیان کی گئی ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ غزل نام ہے رودادِ محبت کے بیان کا، مگر اُس محبت کی روداد جو ایک مرد کو ایک عورت سے ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے نقّال شعرا نے جن میں دورِ حاضر کے "اساتذہ" بھی شامل ہیں، شعر کی اس جمیل صنف میں بیگانہ عناصر اس کثرت سے داخل کئے کہ وہ بالکل مسخ ہو کر رہ گئی۔ یہاں تک کہ اب اُس کی شکل پہچانی نہیں جاتی۔ غزل اب عشق و محبت کی داستان نہیں بلکہ کباڑی کی دُکان ہے جس میں عشق و محبت کے سوا سب کچھ مل سکتا ہے۔ اِنہیں بیگانہ عناصر میں سے ایک عنصر تصوف اور فلسفہ ہے جس نے ناطورۂ غزل کی تمام رعنائیاں چھین کر اُسے ایک خشک و عبوس فلسفی اور ایک جٹا دھاری جوگی کی وحشت انگیز شکل میں تبدیل کر دیا۔ اوّل تو یوں ہی فلسفہ کے خشک مباحث کو حُسن و محبت کی داستانِ رنگین سے کیا علاقہ اور جذبات کی دنیا میں فلسفہ کا گذر کہاں۔ اُس پر طرہ یہ کہ ہمارے شعرا جو بدقسمتی سے فلسفہ کے مبادیات سے بھی واقف نہیں اپنے آپ کو فارابی و ابن سینا کا جانشین تصوّر کرتے ہیں۔ اس "جہل" و "نادانی" کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی گہری بات کہنے کے بجائے یا تو نہایت عامیانہ اور پیش پا افتادہ خیالات کو موضوعِ سخن بناتے ہیں یا پھر ایسی باتیں کہتے ہیں جو ہزاروں بار دہرائی جا چکی ہیں اور جن میں اب کوئی ندرت و تازگی باقی نہیں رہی۔

یہی حال مسائلِ تصوف کا ہے۔ تصوف جسے یونانی اوہام، ایرانی تخیلات، ہندی مراسم اور بعض اسلامی عناصر کی ایک معجونِ مرکب کہنا چاہیئے ایک نہایت اُلجھی ہوئی چیز ہے۔ اس میں سب سے زیادہ مہتم بالشان دو چیزیں ہیں۔ ایک وحدتِ وجود یا ہمہ اوست کا مسئلہ اور دوسرے ترکِ ماسوا اور رجوع الی اللہ اور فنا فی اللہ کی تعلیم۔ ظاہر ہے کہ ان مسائل کو جب اشعار میں بیان کیا جائیگا تو وہ اشعار کس قسم کے ہونگے اور دنیائے محبت سے اُنہیں کیا سروکار ہوگا۔ یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ محبت سے ہماری مراد وہ محبت ہے جو صحیح معنی میں غزل کا موضوع ہے اور جو اسی عالمِ آب و گل میں گوشت پوست سے بنے ہوئے انسانوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اس کے سوا کسی اور قسم کی محبت سے چند صوفیوں اور نقال شاعروں کے سوا دُنیا کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ ایران کے بعض مشہور شعرا چونکہ صوفی تھے اسلئے ہمارے "اساتذہ" نے یہ سمجھا کہ حصولِ عظمت و شہرت کے لئے تصوف کا سوانگ بھرنا بھی ضروری ہے۔ لہذا ہر شخص بزعم خود سنائی، عطار، اور رومی بن بیٹھا، اور "حقائق و معارف" اور "اسرار و رموز" کے دریا بہا دئے۔ آیئے اب دیکھیں کہ "دورِ حاضر کے چوٹی کے غزلگویوں" نے فلسفہ اور تصوف کے میدان میں کیا کیا موشگافیاں کی ہیں اور ان کے اس قسم کے کلام پر حقیقی عشقیہ شاعری یعنی غزل کا اطلاق کہاں تک صحیح ہے۔

جیسا کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں ہمارے "اساتذہ" کے نزدیک کمال شاعری اس کا نام ہے کہ کہنہ و فرسودہ خیالات کو کسی مخصوص بحر اور کسی خاص ردیف قافیہ میں پھر ایک بار دہرا دیا جائے۔ اور غالباً نقالی کا فرض ادا کرنے کے لئے اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں۔ خواجہ حافظ کا ایک مشہور شعر ہے ؎

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو ؂ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را

ہمارے "بادشاہِ متغزلین" مولانا حسرت نے اسی شعر کا چربہ اُتارا ہے، مگر کس بُری طرح کہ شعر کی ساری رنگینی و رعنائی خاک میں مل گئی۔

حسرت ؎ راز اینک نہ کھلا ہے نہ کھلے لوگ عبث ؂ دعویٔ دانشِ ماہیتِ اشیا نہ کریں

"حدیث از مطرب و مے گو" کا ٹکڑا جو حافظ کے شعر کی جان تھا اور جس نے فلسفہ کے ایک خشک مسئلہ پر شعریت کا رنگین نقاب ڈال دیا تھا، مولانا صاحب کے شعر میں نہ آسکا اور ایک پیکرِ جمیل بوسیدہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا۔ کوئی پوچھے کہ جناب نے اس شعر کے کہنے کی زحمت کس لئے گوارا فرمائی۔ دراصل یہ ایک راز ہے جو حضرات شعرا کے سوا دوسرے لوگوں کو بہت کم معلوم ہے۔ دورِ حاضر کے ایک "غزلگو شاعر" نے ہمیں بتایا کہ اس قسم کے اشعار افلاس تخیل کی پردہ پوشی کیلئے کہے جاتے ہیں۔ روز روز نئے مضامین کوئی کہاں سے لائے ناچار غزل کی تکمیل اسی طرح کی جاتی ہے۔

مولانا جامی نے ترکِ ماسوا کی ترغیب اس طرح دی تھی ؎

اے آنکہ بقبلۂ بتاں روست ترا ؂ بر مغز چرا حجاب شد پوست ترا

دل دربے این و آن نہ نیکوست ترا ؂ یکدل داری بس است یک دوست ترا

"بادشاہِ متغزلین" بھی ترکِ ماسوا کی تلقین فرماتے ہیں۔ مگر کس طرح ؎

حسرت ؎ لائقِ حزبِ اولیا نہ ہوا ؂ وہ جو بے خوفِ ماسوا نہ ہوا

سبحان اللہ، کیا اندازِ غزلخوانی ہے۔ اس محل پر یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غزل کا موضوع چونکہ محبت ہے لہذا اُس کی زبان بھی ایسی ہونی چاہیئے جو امورِ محبت کی نزاکتوں اور لطافتوں کو ایک دلنواز پیرائے میں ادا کرسکے۔ نرم و شیریں الفاظ، بیساختہ ترکیبیں، اور کیف و اثر میں ڈوبے ہوئے فقرے اور جملے اس کے لئے ضروری ہیں۔ ثقیل و درشت لفظوں، پیچیدہ ترکیبوں اور متوالی اضافتوں سے غزل کی اکثر لطافتیں فنا ہو جاتی ہیں۔ "حزبِ اولیا" اور "دعویٔ دانشِ ماہیتِ اشیا" وغیرہ غزل کی زبان میں یکسر خارج از آہنگ ہیں۔

ایک مقام پر ہمارے مولانا صاحب نے ایک نہایت بلند بانگ دعویٰ فرمایا ہے جو بیک وقت دعویٰ بھی ہے اور ایک حیرت انگیز انکشاف بھی۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

حسرت نے بھی مثلِ شمسِ تبریز ؂ اشعار میں کہہ دئے سب اسرار

اِس بیان کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح شمس تبریز نے "اسرار" بیان کئے تھے اسی طرح حسرت صاحب نے بھی اُن کا انکشاف کر دیا۔ دوسرے یہ کہ جس طرح شمس تبریز نے اشعار کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا تھا اُسی طرح ہمارے "بادشاہِ متغزلین"

نے بھی شعروں ہی میں سب کچھ کہدیا۔ بیان کا دوسرا حصہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہے۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسے اشعار ہیں جن میں شمس تبریز نے "اسرار" بیان کئے ہیں؟ اگر شمس تبریز کے اشعار سے وہ دیوانِ غزلیات مراد ہے جو دیوان شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے تو یہ ایک عامیانہ "جہالت" ہے۔ اسلئے کہ ادبیاتِ فارسی کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ وہ دیوان مولانائے روم کی تصنیف ہے اور حسنِ عقیدت کی بنا پر انہوں نے غزلیات کے مقطعوں میں اپنے مرشد شمس تبریز کا نام درج کردیا ہے۔ اگر حسرت صاحب کو اتنا بھی نہیں معلوم تو یہ "رازدانی" اور "راز کُشائی" کا دعویٰ، جو درحقیقت محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے، اُنہیں کچھ زیب نہیں دیتا۔

آیئے اب بیان کے پہلے حصہ پر بھی ایک نظر ڈال لیں اور دیکھیں کہ وہ کونسے "اسرار" ہیں جو شمس تبریز کی طرح آپ نے بھی بیان فرمائے ہیں:۔

حسرت ؎	نہ پاسکتے کبھی پابند رہکر قیدِ ہستی ہیں	سو ہمنے بے نشاں ہوکر تجھے اے بے نشاں پایا
"	اہلِ نظر کو بھی نظر آئے نہ روئے یار	یاں تک حجابِ نور نے مستور کردیا
"	کون ہے، کیا ہے، وہ بتِ بے وفا	کوئی بتاؤ یہ خدا را ہمیں
"	خرمی دوروزہ کو عشرتِ جاوداں جان	فکرِ معاش سے گذر حوصلہ معاد کر
"	کچھ ربطِ جمال و شوق کا حال	معلوم نہ ہوسکا کیا ہے
"	لاؤں کہاں سے حوصلہ آرزو سپاس کا	جبکہ صفاتِ یار میں دخل نہ ہو قیاس کا

یہ اور اسی قسم کے چند اور اشعار دیوانِ حسرت میں آپکو ملیں گے جنہیں کھینچ تان کر "اسرار و رموز" کے تحت میں لایا جاسکتا ہے۔ مگر یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ آپ نے کونسا نیا انکشاف کیا ہے؟ کس مسئلہ پر نئی روشنی ڈالی ہے؟ کونسی نئی بات دُنیا کو بتلائی؟ کچھ بے بنیاد دعوے ہیں جن کا کوئی ثبوت موجود نہیں مثلاً "بے نشان ہوکر اس بے نشان کو پالیا"۔ کچھ اعترافات ہیں جن میں عارف و عامی بھی شریک ہیں آپکی ذات کے لئے مخصوص نہیں مثلاً "یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ بت بیوفا" "کون ہے اور کیا ہے؟" کچھ تلقینات ہیں جنہیں ہر واعظ کی زبان دہراتی رہتی ہے مثلاً "دُنیا کی مسرتیں ناپائیدار ہیں انہیں میں پھنسکر رہجانا مناسب نہیں۔ آخرت کی بھی کچھ فکر کرنی چاہیئے" اور کچھ ایسی باتیں ہیں جو ہزاروں بار دہرائی جاچکی ہیں اور کہیں بہتر پیرائے میں مثلاً یہ کہ "صفاتِ باری میں قیاس کو دخل نہیں"۔ بادشاہِ متغزلین کی پروازِ خیال "قیاس" کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکی حالانکہ کہنے والے اُسے "برتر از گمان و خیال و قیاس و وہم" تک کہہ چکے ہیں۔

حضرتِ اصغر کی "صوفیانہ" شاعری پر اگر تفصیلی بحث کی جائے تو یہ مضمون بہت طویل ہوجائیگا اس کے علاوہ ان کے متصوفانہ اشعار کی طرح یہ تبصرہ بھی قارئین کے لئے بے کیف و بے مزہ ثابت ہوگا۔ اس لئے جہانتک ہوسکیگا ہم اختصار سے کام لیں گے۔ منظوماتِ اصغر کے پہلے مجموعے (نشاطِ روح) کے مقدمہ میں مولانا سہیل صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"حُسن و عشق کے ربطِ باہمی کی نسبت مختلف نظریئے ہیں۔

پہلا نظریہ:۔ بعض کے نزدیک حُسن فی نفسہ کوئی چیز نہیں، خود ہمارا ذوقِ نظر اور بیتابیِ شوق ایک چیز کو ہماری نگاہ میں

محبوب بنا دیتی ہو یعنی بالفاظِ دیگر عشق خالقِ حُسن ہے۔

دوسرا نظریہ:۔ یہ ہے کہ اصل حقیقت حُسن ہو اور حُسن کا تقاضا ہو ظہور و خود نمائی اور یہ تقاضا عشق کا محرک و خالق ہو۔

تیسرا نظریہ: یہ ہو کہ حُسن و عشق دونوں اپنی اپنی جگہ پر مستقل ہستیاں ہیں مگر ہر شخص کا معیارِ حُسن فطری طور پر مختلف ہوتا ہے اور فطرت اپنے معیارِ پسند کی جستجو میں رہتی ہو اور جب اتفاق سے وہی چیز سامنے آجاتی ہے تو دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اُٹھتی ہیں اور اسی انطباقِ حُسن و عشق سے دونوں کا فطری رنگ نکھر آتا ہے۔

چوتھا نظریہ:۔ یہ ہے کہ تمام کائناتِ عالم چونکہ محض ایک حسنِ ازل کا پرتو ہے لہذا حُسن و عشق کی حقیقت ایک ہو۔

حضرت اصغر کے کلام سے ہر نظریہ کے متعلق مثالاً یہاں چند اشعار پیش کر دئے جاتے ہیں جس سے اُن کے کمالِ فن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"

اس کے بعد ہر نظریہ کے ماتحت حضرتِ اصغر کے چند شعر نقل کئے ہیں۔ سطورِ بالا سے اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا تو ثابت ہو گیا کہ حُسن و عشق کے ربطِ باہمی کے متعلق خود حضرتِ اصغر کا اپنا کوئی نظریہ نہیں جس کسی سے جو کچھ سُن لیا آپ نے بھی اُس پر چند شعر فرما دئے اور بس۔ چلئے نقالی کا فرض ادا ہو گیا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھنا چاہیئے کہ آپکی حیثیت ایک ایسے مسلمان کی سی ہے جو ہے تو سُنّی مگر ایک ہی وقت میں چاروں اماموں کا مُقلّد ہے۔ مذہب کی دُنیا میں یہ "وسعتِ مشرب" شاید مستحسن سمجھی جائے لیکن جہاں بحث "حقایق و معارف" کی ہو وہاں اس قسم کے اجتماعِ ضدین کا نتیجہ گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسے شخص کا ہمیشہ تذبذب کے عالم میں رہنا اور یقینی طور پر کچھ نہ جان سکنا لازمی ہو۔ یہ تو خود اس کی اپنی حالت ہوگی اور اگر بدقسمتی سے وہ کسی گروہ کا رہنما بھی ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے مقلدین کو گمراہی کی آخری بلندیوں یا انتہائی پستیوں تک پہونچا کر چھوڑیگا۔

سہیل صاحب نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ جنابِ اصغر صاحبِ وجد و حال" اور "بادۂ عرفان کے ذوق شناس بھی ہیں"۔ ممکن ہے سہیل صاحب کا یہ دعویٰ حقیقت پر مبنی ہو مثل مشہور ہے کہ "ولی را ولی می شناسد"۔ چونکہ ہمیں سہیل صاحب کی "ولایت" کے متعلق کوئی علم نہیں اس لئے اصغر صاحب کی "ولایت" سے بھی انکار نہیں کر سکتے۔ البتہ اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت اصغر کا نہ کوئی پیغام ہے نہ کوئی نظریہ ہے۔ نہ وہ کسی خاص مسلک کے پیرو ہیں نہ ان کا کوئی نصب العین ہے۔ نہ یقینی طور پر انہیں کچھ معلوم ہے۔ نہ وہ آپ بیتی بیان کرتے ہیں۔ تصوف کے چند لکھے ہوئے مسائل کی دلدل میں اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ نجات کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ اس کے سوا جو کچھ ہو وہ نقالی اور محض نقالی۔ اب اسی کو چاہے موسیقی، بُت گری، اور مُصوری سے تعبیر کیجئے یا "اسرار و معارف" کا لقب دیجئے۔ وحدتِ وجود کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

اصغر ؎

کار فرما ہو فقط حُسن کا نیرنگِ کمال :: چاہو وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے

ذرہ ذرہ سے نمایاں ہو تجلّائے قدم :: ہوش گم ہیں وسعتِ صحرائے امکاں دیکھکر

جو شجر باغ میں ہو وہ شجرِ طور ہے آج :: پتے پتے میں جو دیکھا تو وہی نور ہے آج

〃　صاف کہتا ہے کہ میں کیا ہوں فقط دریا ہے　:　کسقدر شوخ ہے ہر قطرۂ منصور مزاج

〃　کس طرح حسنِ دوست ہے بے پردہ آشکار　:　صد ہا حجابِ صورت و معنی لئے ہوئے

〃　ہر شے میں تو ہی تو ہے یہ بُعد یہ حرماں ہے　:　صورت جو نہیں دیکھی یہ قربِ رگِ جاں ہے

〃　حقیقت ایک ہے صد ہا لباس رنگین میں　:　نظر بھی چاہیئے کچھ حُسن رہگذر کیلئے

〃　خیرہ کئے ہے چشمِ حقیقت شناس کو　:　ہر ذرّہ ایک مہرِ منوّر لئے ہوئے

〃　ہستی بھی مری پردہ یہ لفظ و بیاں پردہ　:　وہ پردہ نشیں پھر بھی ہر پردہ میں عُریاں ہے

چلئے تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیا کہ شمع و پروانہ کی حقیقت ایک ہے۔ جو ذرّہ ہے وہی صحرا ہے۔ جو قطرہ ہے وہی دریا ہے۔ ہماری آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ تعینات کے حجاب ہیں، حقیقت صرف ایک ذاتِ مطلق ہے جس کے شیون و مظاہر نے اتنی مختلف شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان مباحث کا عشقیہ شاعری سے کیا تعلق ہے۔ خدارا انصاف کیا اس قِسم کے اشعار کو غزل میں شامل کرنا، غزل کی جانِ نازنین پر انتہائی ظلم نہیں؟

اس قِسم کے بے رُوح و بے مزہ اشعار اصغر صاحب کے یہاں بکثرت موجود ہیں۔ وہی ایک فرسودہ خیال ہے جِسے بار بار مختلف بحروں اور مختلف ردیف قافیہ میں بیان کیا ہے۔ آپکی تمام عرفان بافی کا خلاصہ یہ ایک شعر ہے:۔

اصغرؔ ؎　نہ کھلے عقدہائے ناز و نیاز　:　حسن بھی راز اور عشق بھی راز

اِس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ حسن و عشق کے ربطِ باہمی کے متعلق آپ بالکل تاریکی میں ہیں اور سہیل صاحب کے بیان کئے ہوئے چار نظریوں کے متعلق آپ نے جو اشعار فرمائے ہیں اُن کی حقیقت عامیانہ تقلید کے سوا اور کچھ نہیں۔

حضرتِ فانیؔ بھی چونکہ بقول جناب فراقؔ دورِ حاضر کے چوٹی کے غزلگو ہیں، اسلئے عرفان بافی میں اپنے کسی ہمعصر "اُستاد" سے پیچھے نہیں رہے۔ جو کچھ اوروں نے کہا ہے، آپ نے بھی کہا ہے۔ فرق صرف بحر اور ردیف و قافیہ کا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

فانیؔ ؎　اُس کی ہستی سے جدا میرا وجود اللہ رے ہم　:　بلبلا ہے عینِ دریا پھر بھی دامن چیدہ ہے

تو شمع آئینہ خانہ ہے آئینہ کیا ہے　:　تری خدائی کے قربان ماسوا کیا ہے

ہر چند کچھ اور ہے حقیقت　:　کہنے کو جو میں وہ تو نہیں ہے

رازِ نیرنگیٔ حقیقت ہوں　:　میں ہوں فانیؔ حقیقتِ نیرنگ

آپ ہی اپنی آڑ میں تُو ہے　:　تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز

نشانِ مہر ہے ہر ذرّہ، ظرفِ مہر نہیں　:　خدا کہاں نہ ملا اور خدا کہیں نہ ملا

اٹھا بھی دے نگہ ماسوا نگر کا حجاب ؛ یہ دیکھنے ہی کا پردہ ہو دیکھنا کیا ہو

اور بھی چند حکیمانہ نکتے اپنے فلسفی شاعر کی زبان سے سن لیجئے:۔

فانی ؎ قلب، ادراک، دماغ اور حواس ؛ مجھ سے منسوب ہیں تجھ سے مغلوب

دُنیا جسے کہتا ہے زمانہ فانی ؛ ہے ایک طلسم اجتماعِ اضداد

تعبیر اجل نے دی اس خوابِ پریشاں کی ؛ ہم مر کے تجھے سمجھے اے ہستی انسانی

اس میں کوئی شک و شُبہ کی گنجائش نہیں کہ مرنے کے بعد حقیقتِ ہستی آپ پر منکشف ہو گئی ہو گی۔ تمام "عرفا" کا اس پر اتفاق ہے۔

نقالی کا جہاں تک تعلق ہے یوں تو حسرت، اصغر، فانی، اور جگر سبھی نے تصوف کے رہگزار میں متقدمین کے نقوشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے لیکن جگر اس حیثیت سے یقیناً اپنے معاصرین میں ممتاز ہیں کہ انہوں نے اس بے مزہ راگ کو بہت زیادہ الاپا ہے اور درجنوں اشعار "فلسفہ و تصوف" کے اُن مسائل پر لکھ ڈالے ہیں جن سے ہر نقال شاعر اور ہر جاہل صوفی اچھی طرح واقف ہے۔ سُنیئے:۔

جگر ؎ مجھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر ؛ بہت پاس نکلے بہت دُور ہو کر

وہی نور میں ہو وہی نار میں ہو ؛ کبھی نار ہو کر کبھی نور ہو کر

عالم سے چھپنے والے معلوم تیرا چھپنا ؛ سو بار تجھکو دیکھا سو بار گفتگو کی

پردہ جب اُٹھ گیا ہو دیکھا یہی ہو اکثر ؛ اپنی ہی آرزو میں اپنی ہی جستجو کی

تو نے سو سو رنگ سے پردہ کیا ؛ دیکھنے والا تجھے دیکھا کیا

زہے صورت زہے معنی، زہے جلوہ، زہے پردہ ؛ بیک لحظہ بیک ساعت عیاں ہونا نہاں ہونا

تیری خبر نہیں مگر اتنی خبر تو ہے ؛ تو ابتدا سے پہلے ہو تو انتہا کے بعد

میں وہاں ہوں جہاں نہیں میں بھی ؛ عالم و ماورائے عالم کیا

فلسفیانہ اور متصوفانہ شاعری کے جو نمونے ہم نے پیش کئے وہ آپ ہی اپنی تفسیر ہیں اور انہیں کسی اظہارِ خیال کی ضرورت نہیں۔ معمولی سمجھ کا انسان بھی سمجھ سکتا ہو کہ جن حضرات کا یہ کلام ہو وہ بفضلہ نہ فلسفی ہیں نہ صوفی بلکہ محض نقال ہیں۔ اور غالباً اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ اشعار عشقیہ شاعری کی حدود سے بکسر خارج ہیں۔ یہ ہیں ہمارے "بادشاہِ متغزلین" اور دوسرے "چوٹی کے غزلگویوں" کے زندہ جاوید کارنامے۔ اگر سوءِ اتفاق سے کہیں فراق صاحب نے

اس دور کی روحانی سوانحعمری (Spiritual Biography) اور ذہنی تاریخ مرتب کی تو یقین ہے کہ وہ اسی قسم کے اشعار سے مدد لیں گے جس کے سینکڑوں نمونے ہم اب تک پیش کر چکے ہیں۔

ہوائی محل

ہوائی محلوں سے اس قسم کے اشعار مراد ہیں جو پیاز کی مانند ہیں۔ پیاز کے پرت اُتارتے چلے جایئے یہاں تک کہ وہ ختم ہو جائے لیکن مغز یا تخم کچھ بھی اُس میں سے نہ نکلے گا۔ یہی حال ان اشعار کا ہو کہ جس طرح جی چاہے انکی تحلیل و تجزیہ کیجئے لیکن عنقائے معانی کا ہاتھ آنا محال ہو۔ لفظوں کے انبار میں مطلب گم ہے۔ اور اگر کھینچ تان کر معنی کی تعین کی بھی جائے تو اس کی حیثیت "کوہ کندن وکاہ برآوردن" بلکہ جدید فارسی محاورہ کے مطابق "کوہ کندن و موش درآوردن" سے زیادہ نہ ہوگی۔ "بادشاہِ متغزلین" اور دوسرے اساتذہ کے یہاں اس قسم کے اشعار بکثرت موجود ہیں۔ یہاں صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:-

حسرت ؎ اثرِ عشق سے نکلیں جو تمہارے آنسو ٭ دامنِ جاں میں وہ لے لیجئے سارے آنسو

اوّل تو یہی سمجھنا دشوار ہے کہ مولانا صاحب کا مخاطب کون ہو؟ اور یہ زرّین مشورہ کسے دے رہے ہیں؟ اپنے محبوب کو یا "ہمدم" کو؟ ممکن ہے یہ مطلب ہو کہ اثرِ عشق سے جب محبوب کے آنسو نکلیں تو عاشق صاحب خود اُنہیں اپنی جان کے دامن میں لے لیں۔ لیکن اس صورت میں خطاب۔ (لے لیجئے)۔ خلاف محل ہوگا۔ ان اُلجھنوں سے قطع نظر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ "دامنِ جان" ہے کیا بلا اور آنسو اُس میں کس طرح لئے جاسکتے ہیں۔ کیا وہ کوئی بوتل یا شیشی ہے جسمیں اثرِ عشق سے نکلے ہوئے آنسو جمع کرلئے جائیں؟

حسرت ؎ اللہ رے اُنکے حسنِ درخشاں کی گرمیاں ٭ چھالے سے پڑگئے ہیں زبانِ سپاس میں

سبحان اللہ کتنا حسین مبالغہ ہو اور کتنا پیارا اندازِ بیان ہو۔ عاشق نے جو محبوب کے حسن کی منّت گذاری کی تو حسن کی گرمی سے بیچارے کی زبان جل گئی۔ سپاسِ حسن گویا ایک دہکتا ہوا انگارا تھا جسے بھولے شاعر نے ایک معصوم بچہ کی طرح مُنہ میں رکھ لیا اور اُس سے بیچارے کی زبان میں چھالے پڑگئے۔ وہ تو بڑی خیریت ہوئی کہ اُس وقت وہاں کوئی اور موجود نہ تھا ورنہ یہ آتشیں الفاظ جو سُنتا اس کے کانوں میں چھالے پڑجاتے۔ ضمناً تعشق لکھنوی کا بھی ایک شعر سُن لیجئے۔

تعشق ؎ لکھا تھا خط میں اُنہیں حالِ آہِ سوزاں کا ٭ سُنا ہے راہ میں بجلی گری کبوتر پر

اس آتشیں طوفان کو فرو کرنے کیلئے میر صاحب کا ایک "سیلابی" شعر نقل کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

میر تقی میر ؎ میرے رونے کی حقیقت جسمیں تھی ٭ ایک مدّت تک وہ کاغذ نم رہا

اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ اس قسم کا لغو اغراق و غلو متقدمین و متوسطین سب کے یہاں پایا جاتا ہو۔ پھر بیچارے "بادشاہِ متغزلین" نے بیسویں صدی میں اگر اپنے پیشرووں کی نقالی کی تو کیا بُرا کیا۔

حسرت ؎ نگہ شوق نہ ہو چاہِ زنخداں کے قریب :: کیا یہ اُبھرا ہو ترے خالِ نمایاں کے قریب

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حسرت صاحب کے محبوب کی ٹھوڑی میں مچھّر نے کاٹ کھایا تھا اور اُس سے ددوڑا پڑ گیا تھا۔ اُس کے قریب ہی ایک تل بھی تھا۔ تل کے پاس یہ ددوڑا جو اُبھرا ہوا نظر آیا تو بھولے مولانا صاحب سمجھ نہ سکے کہ یہ کیا چیز ہے۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے کہ ہو نہ ہو یہ ہماری نگاہِ شوق ہے جو تل میں اٹک کر یا چاہِ زنخداں میں پھنسکر رہ گئی ہو۔ نگاہ کو ایک اُبھری ہوئی مادّی چیز سے تشبیہ دینا جس قدر لغو ہے محتاجِ تشریح نہیں اور یہ نکتہ پھر بھی حل نہ ہوا کہ "خالِ نمایاں" کے قریب جو چیز اُبھری ہوئی نظر آ رہی تھی وہ دراصل تھی کیا۔ ممکن ہو ددوڑا نہ ہو کوئی پھڑیا نکل رہی ہو۔

حسرت ؎ کیا کہوں رشک سے کچھ دل کا عجب حال ہوا :: نظر اس رخ پہ جو وہ طرۂ گیسو آیا

رُخِ محبوب پر گیسو پڑے دیکھکر عاشق صاحب کو جیسا کچھ رشک ہوا ہو گا ظاہر ہے۔ مسلّمہ عقیدہ تو یہی ہے کہ زلف اگر رُخ پر بکھری ہوئی ہو تو حسن اور بھی قیامت ہو جاتا ہے[1]۔ اور بعض شاعرانہ طبیعت رکھنے والے حسن پرستوں سے سُنا بھی ہے کہ زلف کو رُخ پر بکھیر کر نظارۂ جمال کے مزے لُوٹے جاتے ہیں۔ لیکن حسرت صاحب نے جو اپنے محبوب کے چہرہ پر زلف پڑی دیکھی تو رشک کے مارے اختلاجِ قلب شروع ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہو کہ حسرت صاحب کی معشوقہ اُن کی مزاجداں نہ تھی ورنہ کورے اُسترے سے سر مُنڈا کر ملنے آتی۔ چوٹی مُنڈ جاتی بلا سے، حسرت صاحب کو رشک کی اذیت تو نہ ہوتی۔

حسرت ؎ ہیں خونِ آرزو جو سیرابِ داغِ یاس :: ہمرنگِ نوبہار ہے حسرت خزانِ دل

بہار میں رنگ برنگ کے پھول کھلتے ہیں اور بکثرت کھلتے ہیں اسلئے بہار کو رنگینیوں سے منسوب کرتے ہیں۔ اب جو شے ہمرنگِ بہار قرار دی جائے اُسے بھی مجموعۂ رنگینی ہونا چاہیئے۔ "خزانِ دل" کے معنی ہیں دل کا عالمِ افسردگی۔ "داغِ یاس" کوئی مادّی وجود نہیں رکھتے۔ ہاں شدّتِ یاس سے جو کیفیت دل پر طاری ہوتی ہو اُسے بطریقِ استعارہ "داغِ یاس" سے تعبیر کر سکتے ہیں مگر اس میں شادابی و رنگینی کا ثابت کرنا سراسر لغو ہے اور پھر وہ شادابی و رنگینی بھی ایسی جو "خونِ آرزو" سے حاصل کی گئی ہے۔ خونِ آرزو بھی کیا کسی انسان یا حیوان کے خون کی طرح ایک سیّال مادّہ ہے جس میں سُرخی اور رنگینی پائی جاتی ہے اور وہ دوسری چیزوں کو شاداب و رنگین بنا دینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جب یاس کے داغ، آرزو کے خون سے شاداب ہو کر پھول بن گئے تو دل کی خزاں کا ہمرنگِ بہار ہو جانا سہل بات ہے۔ اس کا نام ہو موشگافی اور اسے کہتے ہیں نکتہ سنجی کہ استعارہ کی بنیاد پر استعارہ کی دیواریں چنتے چلے گئے اور کئی منزل کی عمارت بنا کر کھڑی کر دی۔ انصاف سے دیکھیے تو اس قسم کا شاعر اور شیخ چلّی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے معلوم ہوتے ہیں۔

اصغر ؎ حقیقت کھولدیتا میں جنوں کے رازِ پنہاں کی :: قسم دیدی ہو لیکن قیس نے چاکِ گریباں کی

اس شعر سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ اصغر صاحب کی قیس سے بڑی گاڑھی چھنتی تھی اور قیس کی طرح چونکہ آپ بھی "مجنون" تھے اسلئے رازِ جنوں سے واقف تھے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ قیس کس بنا پر رازِ جنوں کو چھپانا چاہتا تھا اور حضرت اصغر

---

[1] صبح کے نور سے گویا ہو بہم ظلمتِ شام :: گیسوؤں کا رُخِ جاناں پہ بکھرنا دیکھو۔ حسرت۔

نے جب اس راز کو افشا کرنا چاہا تو کیوں اپنے چاکِ گریباں کی قسم دے کر انہیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ قیس تھا کون؟ قیسِ عامری جسے مجنوں کہتے ہیں اور جو لیلیٰ کا عاشق تھا وہی یا کوئی اور؟ مگر اُس قیس کی وفات کو تو ہزاروں برس سے زیادہ گذرے، پھر حضرتِ اصغر سے بیسویں صدی میں ملاقات اور دوستی ہوئی تو کیونکر؟ ممکن ہو عالمِ خیال یا عالمِ خواب میں آپ نے مجنوں کو دیکھا ہو۔ یا شاید عالمِ ارواح میں ملاقات ہوئی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہو کہ قیس سے آپکی مراد کوئی اور مجہول الحال شخصیت ہو جسے آپکی معاصرت و معاشرت کا فخر حاصل تھا۔ بہرحال یہ "اسرار و رموز" ہیں اور ایک "بادۂ عرفان کا ذوق شناس" ہی انہیں سمجھ سکتا ہے۔

اصغر ؎ نام اُن کا آگیا کہیں ہنگامِ بازپرس ÷ ہم تھے کہ اُڑ گئے صفِ محشر لئے ہوئے

عام عقیدہ تو یہ ہے کہ پرسشِ اعمال قیامت کے دن ہوگی اور قیامت صرف ایک ہی بار آئیگی لیکن اصغر صاحب کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت ایک مرتبہ پہلے بھی آچکی ہے جبکہ آپ نے سُرنگ کی طرح صفِ محشر کو اُڑا دیا تھا۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ضرورتِ شعری کی بنا پر آپ نے مُستقبل کو ماضی میں تبدیل کر دیا ہو تو بقولِ حالی۔ ع

ڈرو اُس سے جو وقت ہے آنے والا

کیونکہ روزِ محشر کی اُس جانگدازی کے علاوہ جس کا حال مذہبی صحیفوں میں مذکور ہے، یہ ایک مزید مصیبت بھی لوگوں پر آئیگی کہ حضرتِ اصغر صفِ محشر کو اُڑا لیجائیں گے اور پھر خدا جانے کہاں جا گریں گے۔

مولانا سہیل نشاطِ روح کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"جنابِ اصغر فطرۃً شدید الاحساس، بلند نظر اور صاحبِ وجد و حال ہیں اسلئے ان کا ایک ایک شعر بلندیٔ خیال، شکوہِ الفاظ، رقصِ ترکیب، جوشِ بیان اور ندرتِ ادا کا ایک دلفریب طلسم ہے۔ اسرار و معارف اُن کی شاعری کا ہیولیٰ وجد و حال اس کی رُوح، ندرتِ ادا اُس کی صورت اور جوشِ بیان اس کا رنگ ہے۔"

اس کے بعد مثال کے طور پر جو اشعار پیش کئے ہیں اُن میں سے ایک شعر یہ بھی ہے ؎

نام اُن کا آگیا کہیں ہنگامِ بازپرس ÷ ہم تھے کہ اُڑ گئے صفِ محشر لئے ہوئے

قارئین خود فیصلہ کرلیں کہ مقدمہ نگار نے اس شعر کو جن خوبیوں کا حامل بتایا ہے ان میں سے کون کون سی اس میں واقعی طور پر موجود ہیں۔ صفِ محشر کو لیکر اُڑ جانا "اسرار و معارف" میں داخل ہے یا "وجد و حال" میں اِسے "ندرتِ ادا" لکھنا چاہیئے یا "جوشِ بیان"؟ "ندرتِ ادا" کے اگر یہی معنی ہیں کہ کوئی مہمل و لایعنی بات کہدی جائے تو یقیناً اصغر صاحب کے اکثر اشعار "ندرتِ ادا" کا ایک لاجواب نمونہ ہیں۔

اصغر ؎ انوار کی ریزش ہو اسرار کی بارش ہو ÷ ساغر کو جو ٹکرا دوں اس گنبدِ مینا سے

انوار کی ریزش اور اسرار کی بارش ہوگی یا نہ ہوگی اس کا فیصلہ تو بعد میں کیا جائے گا۔ پہلے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ آپ ساغر کو اس "گنبدِ مینا" سے ٹکرائیں گے کس طرح؟ ساغر کو اگر آسمان کی طرف اُچھالا جائے تو وہ دس بیس گز سے زیادہ اونچا نہ جاسکے گا اور اگر فلاخن میں رکھکر پھینکا جائے تو شاید چند سو گز چلا جائے اور اگر اصغر صاحب کو کسی طرح ایک ہاؤٹزر

تو پل جائے اور اپنا ساغر اس میں رکھکر اُسے آسمان کی طرف داغ دیں تو ممکن ہے کہ ساغر چند میل کی بلندی تک پرواز کر جائے لیکن آسمان سے ٹکرانا پھر بھی ناممکن ہے۔ الّا یہ کہ بزور کرامت اسے ہوا میں اُڑا دیا جائے اور غالباً یہی صورت حضرت اصغر کے پیشِ نظر ہوگی۔ تجلّی انوار و اسرار کی بارش تو بجائے خود ایک راز ہے کہ بالفرض ساغر آسمان سے ٹکرا بھی جائے تو انوار و اسرار کی بارش کیوں ہوگی؟ شاید اسلئے کہ اللہ میاں حضرت اصغر کی اس خوش فعلی سے مسرور ہو کر انوار و اسرار اُنپر برسانا شروع کر دینگے۔ درحقیقت اس قسم کے اشعار کا مطلب سمجھنا اس دُنیا کے لوگوں کے بس کی بات نہیں۔

فانی ؎ جبینِ درد ہی بیتابِ سجدہ اے فانیؔ ÷ کدھر ہے خاک ترے دل کے آستانہ کی

پہلے جنابِ فانیؔ کے دل کا آستانہ تلاش کیجئے پھر اُس آستانہ کی تھوڑی سی خاک پُڑیا میں باندھکر حضرت "درد" کی خدمت میں لیجائیے تاکہ وہ اس خاک پر اپنی پیشانی ٹیک دیں اور اس کی بیتابی سجدہ کچھ سکون پذیر ہو جائے۔ درد ایک احساس کا نام ہے اس کے پیشانی کہاں اور اگر مان لیا جائے کہ جبینِ درد سے مقصود خود درد ہی تو درد کا سجدوں کے لئے بیتاب ہونا کیا معنی؟ اور پھر وہ سجدے بھی ہوں تو حضرتِ فانیؔ کے دل کے آستانے کی خاک پر ہوں جس کا وجود خود جبینِ درد کی طرح معدوم ہے۔ ماشا اللہ کیا "اندازِ بیان کا تیکھا پن" ہے اور کیا "فلسفیانہ احساس" ہے۔

فانی ؎ لبریزِ تموّج تھا اک خطِ پیمانہ ÷ محفل سے جو وہ اُٹھے لیتے ہوئے انگڑائی

آجکل جن گلاسوں میں شراب پی جاتی ہے ان میں وہ لکیریں نہیں ہوتیں جنہیں خطِ پیمانہ کہتے ہیں لیکن ممکن ہے کہ جس محفل کا حضرتِ فانی نے ذکر کیا ہے وہاں پُرانے زمانے کا کوئی پیالہ موجود ہو اور اُس پیالے میں روایتی خطوط بھی جنکا ذکر شعرائے متقدمین نے بار بار کیا ہے مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُن کے انگڑائی لے کر محفل سے اُٹھنے کا اثر فقط پیالے کی لکیروں ہی پر پڑا۔ حاضرینِ محفل میں سے کوئی اور متاثر نہ ہوا۔ پھر کیفیتِ تاثر کے اظہار کیلئے پیالے کی لکیروں کو لبریزِ تموّج کہنا نہایت لغو تعبیر ہے جسے حقیقت سے کوئی علاقہ ہی نہیں۔ اسی قسم کی یادر ہوا باتیں ہمارے مقدمہ نگاروں کے نزدیک شاعری کا سرمایۂ کمال اور شاعر کی بلندیٔ تخیّل پر دال ہیں۔

فانی ؎ مُنہ ڈھانپ لیا جوشِ ندامت کی اثر سے ÷ خورشیدِ قیامت نے مرے دامنِ تر سے

دعویٰ جتنا بلند بانگ ہو اتنا ہی لغو بھی ہو۔ کہاں خورشیدِ قیامت اور کہاں حضرتِ فانیؔ کا دامنِ تر۔

فانی ؎ منزلِ عشق پہ تنہا پہونچے کوئی تمنّا ساتھ نہ تھی ÷ تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

منزلِ عشق ہو یا کوئی دوسری منزل، جب تک تمنّا ساتھ نہ ہو انسان منزل پر پہونچ ہی نہیں سکتا۔ منزل پر پہونچنا کیسا ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا اسلئے کہ یہ تمنّا ہی تو ہے جو اُسے منزل کی جانب کھینچے لیے جاتی ہے۔ دراصل تکمیلِ تمنّا ہی کا دوسرا نام منزل پر پہونچنا ہے۔ اگر شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ جب منزل پر پہونچ گئے تو تمنا ختم ہوگئی یعنی پوری ہوگئی تو اس صورت میں دوسرا مصرع بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ راستے ہی میں تمنّاؤں کا چھوٹ جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس شعر کو پڑھکر میاں نظیر اکبرآبادی کے ہنس نامہ کا یہ مصرع بے اختیار یاد آ جاتا ہے کہ ؏

آخر سے تنہا ہنس اکیلا ہی سدھارا

فانی ے اے عشق خاکِ دل پہ ذرا مشقِ فتنہ کر : پیدا کر اس زمین سے کوئی آسمانِ داغ

یوں کہنے کو تو شعر میں زمین و آسمان بھی کچھ موجود ہے مگر مفہوم کا صحیح تعین دشوار ہے "خاکِ دل" زمین ہے۔ اُسکے لئے ایک آسمان کی ضرورت ہے۔ وہ آسمان "داغ" ہے اور جس طرح ماما حوا یا وا آدم کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی تھیں اُسی طرح یہ آسمان اسی زمین یعنی خاکِ دل سے پیدا ہوگا۔ عشق اسے وجود میں لائیگا اور وجود میں لانے کی ترکیب "مشقِ فتنہ" ہے۔ کوئی پوچھے کہ اس سب کا حاصل کیا ہوا تو ہم کہیں گے کہ جناب رشید احمد صدیقی سے پوچھئے یا حضرتِ فراق سے رجوع کیجئے۔

فانی ے جو دل کی حسرتیں ہیں سب دل میں ہوں تو بہتر : اس گھر سے کوئی باہر مہمان رہ نہ جائے

دل کی حسرتیں بلا شبہ دل ہی رہیں گی۔ شاعر کی اس تمنا کے کوئی معنی نہیں کہ دل کی حسرتیں دل ہی میں رہیں۔ آخر اُن کے باہر رہجانے کا کونسا امکان ہے حسرتیں کوئی بھیڑوں کا گلّہ نہیں کہ چراگاہ سے لوٹتے وقت کچھ تو باڑہ میں داخل ہوجائیں اور کچھ باہر رہجائیں۔

جگر ے ہیں ہوا جب سے غریق موجِ طوفان خیزِ عشق : ڈوب مرنے کی تمنا سینۂ ساحل میں ہے

ساحل کیلئے پہلے سینہ قایم کیا پھر اُس سینہ میں ڈوب مرنے کی تمنا پیدا کی اور اس تمنا کے پیدا ہونے کا سبب شاعر صاحب کی بحرِ عشق میں غرقابی ہے۔ ممکن ہے جگر صاحب کا یہ بیان صحیح ہو مگر کاش وہ اتنا بتلا دیتے کہ سینۂ ساحل میں جو تمنا موجزن ہے اُسکا علم اُنہیں کیونکر ہوا اور یہ کیسے پتہ چلا کہ اُن کی غرقابی کی وجہ سے ساحل بھی ڈوب مرنا چاہتا ہے!

جگر ے یک بیک سامنے آیا نہ کرو بے پردہ : لے کے اُڑجائے نہ یہ عالمِ امکان کوئی

واقعہ یہ ہے کہ جناب جگر اپنے مرشد کا دامن تقلید بڑی مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ وہ صفِ محشر لیکر اُڑ گئے تھے[1] یہ عالمِ امکان کو لیکر اُڑجانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

جگر ے یہ جو دھندلی سی ضیا خانۂ زنجیر میں ہے : داغ شاید کوئی روشن دلِ دلگیر میں ہے

داغ دل اور پھر اُس کی روشنی اور اتنی کہ زنجیر کے "گھر" میں اُس سے اُجالا ہو گیا۔ ان بلند پروازیوں کی کوئی کہانتک داد دے سکتا ہے۔

جگر ے وہی سب رنگینیِ نقش و نگارِ صفحۂ ہستی : اُڑی تھیں جسقدر چھینٹیں مری خونابۂ دل سے

صفحۂ ہستی کے تمام نقش و نگار اُسوقت بھی موجود تھے جب شاعر صاحب عالمِ نیستی میں تشریف رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ آپکے خونابۂ دل سے اگر واقعی کچھ چھینٹیں اُڑی ہونگی تو آپکے اِس دنیا میں قدم رنجہ فرمانے کے بعد اُڑی ہونگی۔ اس قسم کے بے بنیاد دعوے خدا جانے بے راہیہ روئی تخیل کی بلند پروازی دکھانے کیلئے پیش کئے جاتے ہیں یا اشعارِ غزل کی تعداد اور دیوان کی ضخامت بڑھانے کیلئے!

---

[1] نام اُن کا آگیا کہیں ہنگامِ بازپرس : ہم تھے کہ اُڑ گئے صفِ محشر لئے ہوئے۔ اصغر

دس عنوانوں کے ماتحت اب تک جن فرسودہ مضامین سے بحث کی گئی ہے وہ تقریباً ہر بڑے اور چھوٹے غزلگو کے یہاں پائے جاتے ہیں لیکن ان کے علاوہ بعض فرسودہ مضامین ایسے بھی ہیں جنہیں خصوصیت کے ساتھ ہمارے شعرائے چہارگانہ یعنی حسرت، اصغر، فانی اور جگر نے موضوع سخن بنایا ہے اور اُن کے کلام میں بعض خصوصیتیں ایسی بھی ہیں جو صراحتہً اُن کی رسم پرستی اور نقالی پر دلالت کرتی ہیں۔

تعلّی اور خودستائی

تعلّی اور خودستائی قانونِ اخلاق کی رُو سے کسی زمانہ میں بھی مستحسن نہیں سمجھی گئی لیکن شعرائے متقدمین نے کسی نہ کسی طرح اُسے اپنے لئے جائز کر لیا تھا۔ متاخرین نے اپنے پیشروؤں کی اس مذموم سنّت کو برقرار رکھا اور دورِ حاضر میں "بادشاہِ متغزلین" (حسرت) نے طبل تہی کی طرح خودستائی کا ایسا بے ہنگام شور وغوغا برپا کیا کہ متقدمین کے بلند بانگ دعوے اس کی گونج میں گم ہو گئے۔ جو کچھ آپ نے اپنے متعلق فرمایا ہے اُسے مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کی مصداق آپ ہی کی ذات مستجمع الصفات ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ فارسی غزل میں سعدی وجامی اور نظیری وفغانی کا جو مرتبہ ہے وہی اُردو میں آپ کا ہے ؎

حسرت اُردو میں ہے غزل تیری ؛ پرتوِ نقش سعدی وجامی
اُردو میں کہاں ہے اور حسرت ؛ یہ طرز نظیری وفغانی

شعرائے اُردو میں آپ خود کو میر و مصحفی کا ثانی، قائم کا ہمرنگ اور مومن و نسیم کا ہم پلّہ سمجھتے ہیں ؎

شعر سے تیرے ہوئی مصحفی و میر کے بعد ؛ تازہ حسرت اثر و حسن بیان کی رونق

شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گدازِ میر ؛ حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

قائم ہے ترے دم سے طرزِ سخنِ قائم ؛ کیفر ورنہ کہاں حسرت یہ رنگِ غزلخوانی

کہاں سے آئیگی ہمرنگیاں ترکیب مومن کی ؛ یہ لطفِ خوش بیانی حسرتِ رنگیں بیاں تک ہے

مرحبا حسرت بنایا خوب اندازِ نسیم ؛ لطف ہر ہر شعر میں ہے بندشِ استاد کے

مرزا غالب نے جب بادشاہِ متغزلین کا کلام سنا تو فرطِ حیرت سے مُنہ کھلا کا کھلا رہگیا غزل پڑھنا تو کُجا ایک لفظ زبان سے نہ نکل سکا ؎

ہو کے بیخود کلامِ حسرت سے ؛ آج غالب غزل سرا نہ ہوا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے متعلق رفتہ رفتہ آپ کی رائے تبدیل ہوتی گئی۔ یعنی پہلے میر، مصحفی، قائم، مومن، اور نسیم کا ثانی ہونا کافی سمجھتے تھے لیکن بعد میں بلا استثنا ہر شاعر کو اپنے سے فرو تر سمجھنے لگے ؎

حسرت تری اس پختہ کلامی کی ہے کیا بات ؛ پایا ہے کسی اور سخنور نے یہ کب رنگ

اثر جو نغمۂ حسرت میں ہے وہ اور کہاں ؛ کلام دیکھ لیا سن لیا ہزاروں کا

اپنی عام مدح سرائی اس طرح فرماتے ہیں ؎

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود ؛ تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہوگیا

پسند آیا طریقِ شاعری تیرا ہمیں حسرت ؛ کہ جب کہنا کبھی کچھ نغز کہنا بے بدل کہنا

بخوفِ طوالت ہم نے صرف چند مثالوں پر اکتفا کی ورنہ دیوانِ حسرت میں اس قسم کے اشعار اور بھی کتنے ہی موجود ہیں۔ خدارا انصاف! یہ عشقیہ شاعری ہے یا بے معنی تعلّی۔ کیا قیامت ہے کہ ان اشعار کے مصنف کو غزلگویوں کا بادشاہ کہا جائے۔ حیف بریں ذوقِ سلیم۔ وائے بریں سخن سنجی۔

رعایتِ لفظی

کلامِ حسرت کی دوسری خصوصیت رعایتِ لفظی ہے اور ضلع جگت کے اس مخصوص رنگ میں ہمارے بادشاہِ متغزلین میاں امانت کے چیلے معلوم ہوتے ہیں۔

حسرت ؎

مل رہیگی وصال کی بھی سند ؛ ہو تو لے پہلے امتحانِ وفا

شعر کیا ہے اچھا خاصہ یونیورسٹی کیلنڈر ہے جس میں نصابِ تعلیم کی تفصیل، امتحان دینے اور سند پانے کے شرائط سبھی کچھ مذکور ہے۔

حسرت ؎ شوق کی تاثیر سے گریاں جو ہو وہ سنگ دل ؛ جوئے شیر اک طرفہ پیدا ہو میانِ بیستون

فرہاد و شیریں کی داستان تو پرانی ہوگئی مگر اس کی بدولت ہمارے شعرا کے پاس اتنا مواد جمع ہوگیا ہے کہ برابر نئے نئے "اشعار" اس سے مرتب کرتے رہتے ہیں۔ راقمِ سطور سیاحتِ ایران کے دوران میں "بیستون" کی زیارت کے لئے بھی گیا تھا اور "جوئے شیر" کے آثار دیکھنے کا حد درجہ آرزومند تھا مگر افسوس کہ جوئے شیر تو کجا اب وہاں جوئے آب کا بھی کوئی نشان باقی نہیں۔ لیکن بحمد اللہ جوئے شیر جو کوہِ بیستون میں نہ ملی تھی دیوانِ حسرت میں مل گئی۔ البتہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شعر میں بیستون آپ نے کس چیز کو قرار دیا ہے؟ غالباً اپنے محبوب کے فرازِ سینہ میں آپکو بیستون کی چوٹیاں ابھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں جن پر یہ جوئے شیر یعنی آبشارِ سرشک گر رہا ہے۔ شعر بجائے خود مکمل ہے۔ صرف اتنی کسر ہے کہ لفظِ "شیریں" اس میں نہ آسکا۔

حسرت ؎ ہے نازِ حسن سے جو فروزاں جبینِ یار ؛ لبریز آبِ نور ہے چاہِ ذقن تمام

محبوب کی ٹھوڑی کو شعرا ہمیشہ کنویں سے تشبیہ دیتے آئے ہیں لہذا آپ نے بھی اصولِ تقلید کی بنا پر ایسا ہی کیا۔ مگر کنواں خشک ہو یا اُس میں پانی کی مقدار بہت کم ہو تو وہ ایک گہرے بے مصرف غار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ لہذا آپ نے اُس کے لئے آبِ نور بہم پہونچایا اور وہ بھی دس بیس ڈول یا پانچ دس ہاتھ نہیں بلکہ اُسے لبالب بھر دیا۔ مگر یہ نکتہ سمجھ میں نہیں آتا کہ "آبِ نور" پیشانی سے بہ کر صرف ٹھوڑی کے کنویں ہی میں کیوں اکٹھا ہو گیا۔ چہرہ کے کسی اور حصّہ پر کیوں نہ بہ گیا۔ دوسری بات یہ کہ جبیں کی تابندگی کے لئے "حسن" بالکل کافی ہے بلکہ تابندگی کا باعث تمام و کمال وہی ہے پھر "ناز" کو خواہ مخواہ اس میں کیوں ٹھونس دیا گیا۔ شاید اس لئے کہ ایک خوبصورت لفظ کے اضافہ سے شعر کا حسن زیادہ ہو جائیگا مگر یہ آرائش اس قسم کی ہے جیسے کوئی چھچھورا، نو دولت، محض نمائش کی خاطر اپنی دونوں کلائیوں میں گھڑیاں باندھے اور بلا ضرورت سونے کے فریم کی عینک لگائے۔

کسی بزرگ کا ایک شعر ہے ؎

زلف و رُخ دیکھنے سے مطلب ہے ٭ شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

زلف و رُخ کو شام و سحر سے تشبیہ دینا حد درجہ پامال مضمون ہے اور جزئی تغیر کے ساتھ بہت سے شاعروں نے باندھا ہے۔ ہمارے بادشاہِ متغزلین کی کوشش بھی قابلِ داد ہے۔ ملاحظہ ہو۔

حسرت ؎ گھر سے ہر وقت نکل آتے ہو کھولے ہوئے بال ٭ شام دیکھو نہ مری جان سویرا دیکھو

صبح کے نور سے گویا ہے بہم ظلمتِ شام ٭ گیسوؤں کا رُخِ جاناں پہ بکھرنا دیکھو

عمر کی صرف یادِ گیسو و رُخسارِ یار ٭ یوں بسر ہو جائے لیل و نہارِ انتظار

رسمی غزلگو شعرا چونکہ ہر وقت غزل لکھنے اور دیوان مرتب کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں لہذا تشبیہ و استعارہ کے لئے یہی الفاظ انکی زبان سے نکلتے ہیں۔ حسرت صاحب فرماتے ہیں ؎

بیت الغزلِ حسن کچھ ایسے ہیں وہ ابرو ٭ ہے جنکی ہوس حاصلِ دیوانِ تمنّا

شعر کیا حسرت صاحب کے کلیات کا جامع خلاصہ ہے۔ جہاں ایک طرف اس میں "بیت" اور "غزل" بلکہ پورا "دیوان" موجود ہے۔ وہاں دوسری طرف ابروؤں کی کمانیں کڑک رہی ہیں حسن کا طوفان برپا ہے۔ ہوس گھات لگائے بیٹھی ہے اور تمنّا مچل رہی ہے۔ سچ یہ ہے کہ ع تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا۔

حسرت ؎ خونِ حسرت جو کیا ہے تو وہ نادم ہیں بہت ٭ کچھ نہ مہندی کی خبر ہے نہ انہیں پان کا ہوش

بظاہر صرف اتنا مطلب ہے کہ حسرت صاحب کو قتل کرکے اُن کا معشوق ایسا شرمندہ ہوا کہ اُسے اپنی آرائش کا بھی ہوش نہ رہا لیکن پروفیسر فراق کی سی دقتِ نظر اگر کسی کو حاصل ہے تو اس لطیف نکتہ کو بھی سمجھ لے کہ "خون" "مہندی" اور "پان" کو شاعر نے یوں ہی ایک جگہ جمع نہیں کر دیا ہے بلکہ ان چیزوں میں "سرخی" مشترک ہے اور اسی مناسبت سے اُنہیں اکٹھا کیا گیا ہے۔

حسرت ؎ ہے فروغِ بزمِ یکتائی جو وہ شمعِ جمال ٭ آگئی ہے دل میں بھی بینائیِ پروانہ آج

لفظوں کے ڈھیر میں سے معنی کو علیحدہ کیجئے تو خلاصہ یہ ہوگا کہ "وہ بہت حسین ہیں۔ انہیں دیکھکر دل بُری طرح بیتاب ہو رہا ہے" ظاہر ہے کہ مضمون حد درجہ پامال ہے۔ اس میں کسی قسم کی جدت یا نُدرت موجود نہیں۔ مگر رعایت و مناسبت لفظی داد سے مستغنی ہے۔ پہلے بزم قائم کی پھر اس میں شمع جلائی۔ شمع پر پروانے آتے۔ پروانوں کے دل میں بیتابی جوش زن ہوئی۔ ممکن ہے کوئی یہ اعتراض کرے کہ اس "شمعِ جمال" نے کیا صرف "آج" ہی "بزمِ یکتائی" کو روشن کیا ہے (اور آج سے پہلے بزمِ یکتائی تاریک پڑی تھی) جو فقط "آج" ہی شاعر صاحب کے دل میں "بیتابیِ پروانہ" پیدا ہوگئی۔ تو اسکا جواب ہم یہ دینگے کہ لفظ "آج" تو اس شعر میں ردیف واقع ہوا ہے اسلئے شعر کے مطلب سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ اسے شعر سے خارج کر کے دیکھئے تو مطلب کی چُولیں ٹھیک بیٹھ جائینگی۔

حسرت ؎ مائلِ عشقِ مجازی کیوں نہ ہوں اہلِ نظر :: جلوۂ حق آشکارا صورتِ باطل میں ہے

مولانا نے بالکل صحیح فرمایا۔ "المجاز قنطرۃ الحقیقۃ" کے بھی یہی معنی ہیں۔ مانا کہ مضمون حد درجہ پامال و فرسودہ ہے مگر کیا "حق" اور "باطل" کا مقابلہ بھی تعریف کے قابل نہیں ؟

حسرت ؎ بڑھا تو خوب مگر نارِ عاشقی کا جلال :: حریفِ جلوۂ نورِ جمال ہو نہ سکا

شعر کا کچھ اور مطلب ہو یا نہ ہو مگر نار و نور کا مقابلہ اور جلال و جمال کا موازنہ لطف سے خالی نہیں۔ فنِ بدیع کی اصطلاح میں اِسے صنعتِ "طباق" کہتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار جنکا تعلق زیادہ تر لفظی و معنوی صنائع سے ہے بادشاہِ متغزلین کے دیوان میں بکثرت موجود ہیں۔ درحقیقت نقالی میں آپکو وہ یدِطولیٰ حاصل ہے کہ اگر آپ کو بادشاہِ مقلدین بلکہ خدائے مقلدین کا لقب بھی دیا جائے تو کچھ بیجا نہیں۔

مخصوص نقّالی

کلامِ حسرت کی تیسری خصوصیت مخصوص نقّالی ہے۔ کبھی آپ شاہ نصیر کی تقلید میں لفظوں کے گورکھ دھندے تیار کرتے ہیں مثلاً ؎

فلکِ عیش پہ دم بھر میں گیا شعلۂ دماغ :: کس غضب کا تھا سبک روفرس جامِ شراب
ہم کہ اک قطرۂ مے کو بھی ترستے ہیں مدام :: ہم سے قسمت میں ہے بڑھکر نگسِ جامِ شراب
قیدِ مینا سے نہ چھوٹ کر کبھی آئی مجھ تک :: حائل ایک اور بھی تھی حدِ قفسِ جامِ شراب
مے سے محروم کہاں تک رہے پیمانۂ مے :: تجھ سے فریاد ہے اے دادرسِ جامِ شراب

اور کبھی میاں جرأت کی تقلید میں وقوع گوئی کی سرحدیں ابتذال و سوقیت سے جا ملاتے ہیں مثلاً ؎

کھینچ لینا وہ مرا پردہ کا کونا دفعتہً :: اور دوپٹہ سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے
جان کر سوتا تجھے وہ قصدِ پابوسی ترا :: اور ترا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے
غیر کی نظروں سے بچکر سب کی نظروں کے خلاف :: وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کیلئے ۔۔ وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

اور کبھی شیخ مصحفی کا چربہ اُتارتے ہیں ؎

کیا دل میں آ گئی جو زراہِ کمالِ رحم ۔۔ وعدہ وہ میرے قتل کا فرما کے رہ گئے

پہلے تو میرا خون بہایا خوشی خوشی ۔۔ پھر کیا وہ خود ہی سوچ کے شرما کے رہ گئے

مولانا صاحب نے پوری پوری غزلیں ہزار استادوں کے رنگ میں لکھی ہیں ہم نے بخوفِ طوالت یہاں صرف چند اشعار نقل کر دئے ہیں۔ ان تمام ناقابلِ تردید شہادتوں کے باوجود بھی ممکن ہو کہ فراق صاحب اپنے "بادشاہِ متغزلین" کی نقالی اور رسم پرستی کے قایل نہ ہوں لہذا ہم خود حسرت صاحب کا ایک ایسا قول نقل کرتے ہیں جو ہمارے دعوے کے لئے برہانِ قاطع کا حکم رکھتا ہے۔ حسرت صاحب کو خود بھی احساس ہو کہ اس قسم کی نقالی محض بے کیف و بے مزہ چیز ہے مگر مجبوری یہ ہے کہ رسم و دستور کے خلاف قدم اُٹھانے کی جرأت نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ہے پاسِ ادبِ رسمِ قدیمِ شعرا کا ۔۔ حسرت نہیں اس قسم کے اشعار میں کیا حظ

اے ماہِ رمضاں الوداع

کلامِ حسرت کی چوتھی خصوصیت ایسے مضامین ہیں جنکا عشقیہ شاعری یا غزل سے کوئی دُور کا تعلق بھی نہیں مگر مولانا صاحب کی درجنوں غزلیں ان مباحث کیلئے وقف ہیں۔ نمونے ہم اسلئے پیش نہیں کرتے کہ ان کا مطالعہ قارئین کے ملالتِ خاطر کا باعث ہوگا۔ البتہ اُن مضامین کی ایک مختصر فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے جس سے قارئین کو اندازہ ہو جائیگا کہ "بادشاہِ متغزلین" نے غزل کے لباسِ حریر میں کس خوبصورتی سے ٹاٹ کے پیوند لگائے ہیں۔ وہ مضامین یہ ہیں۔

"حضرتِ انوار کا باغ۔ شیئاً للہ۔ شانِ اولیا۔ غلامانِ رسول۔ درود شریف۔ سلام علیک۔ یا غوث الاعظم۔ زہرا کے دُلارے۔ یا علی مشکل کشائی کیجئے۔ اہلِ سماع۔ اے ماہِ رمضاں الوداع۔ تمنائے مدینہ۔ زمانِ شب برات وغیرہ وغیرہ"

کاش مولانا صاحب نے "اے ماہِ رمضاں الوداع" اور "زمانِ شب برات" کے عوض ہولی اور بسنت کے متعلق کچھ لکھا ہوتا۔

ایک چڑیا کی کہانی

ہمارے شعرائے رسم پرست کا ایک محبوب موضوع "ایک چڑیا کی کہانی" ہے۔ اُردو کے ہزاروں غزلگو شعرا میں سے شاید دو چار بھی ایسے نہ نکلیں گے جنھوں نے اس خیالی داستان کے کسی نہ کسی حصہ پر طبع آزمائی نہ کی ہو۔ ہمارے چوٹی کے غزل گویوں نے تو نہایت تفصیل کے ساتھ تمام "واقعات" کو بیان کیا ہے۔ پہلے اس کہانی کا خلاصہ سُن لیجئے اس کے بعد اپنے "اساتذہ" کی ذہانت اور افسانہ نگاری کی داد دیجئے۔

"ایک چڑیا تھی۔ اُسکا نام بُلبُل تھا۔ چمن میں اس کا گھونسلا تھا۔ بجلی اُس کے گھونسلے کی دشمن تھی اور ہمیشہ اُسے پھونک دینے کے درپے رہتی تھی۔ بلبل کا دوسرا دشمن ایک چڑی مار تھا۔ وہ ہمیشہ اُس کی گھات میں لگا رہتا تھا۔ اُس نے چمن میں جال بچھا رکھا تھا۔ آخر ایک دن اُس بیرحم نے بیچارے بلبل کو پکڑ لیا اور اس کے پَر باندھکر لیچلا۔ گھر پہونچکر پنجرے میں بند کردیا۔ جس زمانے میں یہ غریب پنجرے میں بند تھا ظالم بجلی اس کے گھونسلے پر گری اور اُسے جلاکر خاک کردیا۔ یہ مجبور و بیکس پنجرے میں بیٹھا اپنے گھونسلے کو یاد کیا کرتا تھا۔ تڑپتا تھا۔ پھڑکتا تھا۔ مگر آخر رفتہ رفتہ پنجرے سے مانوس ہوگیا اور پنجرے ہی میں گھونسلا بنانے کیلئے تنکے اکٹھے کرنے لگا۔ چڑیمار بمقتضائے فطرتِ انسانی کبھی تو اُس پر بہت مہربان ہوجاتا تھا اور کبھی اُسے ذبح کرڈالنے کی آمادگی ظاہر کرتا تھا۔ ایک مدت تک پنجرے میں بند رہنے کے باعث بیچارے بلبل کے بازوؤں سے قوتِ پرواز بالکل سلب ہوگئی۔ اُدھر گھونسلا اُجڑ چکا تھا۔ اب اُسے یہ خوف مارے ڈالتا تھا کہ اگر کہیں چڑی مارنے اُسے چھوڑ دیا تو وہ کہاں جائیگا۔ کیونکر جائیگا۔ اور کس جگہ پناہ لے گا۔ بہرحال ایک وقت ایسا آیا کہ چڑی مارنے اُسے آزاد کردیا۔ وہ پھر ایک بار اپنے گھونسلے میں جا بسا۔ مگر اب طبیعت کا کچھ ایسا حال ہوگیا تھا کہ پھر پنجرے میں قید رہنے کو جی چاہتا تھا اور گھونسلے میں وحشت ہوتی تھی۔ چنانچہ ایکبار پھر گرفتار ہوا۔ وغیرہ وغیرہ۔"

اب چڑیا کی یہ کہانی اپنے "اساتذہ" کی زبانی نظم میں سُنیئے۔

"ایک بلبل تھا۔ چمن میں اُسکا گھونسلا تھا"

جگرؔ — اب اس میں جان مری جائے یا رہے صیّاد ؛ بہار میں تو نہ چھوڑونگا آشیانے کو

"وہ بیچارہ جال میں پھنس گیا۔ اور بجلی کڑک کے اس کے گھونسلے کی طرف آئی"

فانیؔ — اس کے سوا نہیں خبرِ آشیاں مجھے ؛ میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی

"چڑیمار نے بُلبُل کو پکڑ لینے کے بعد بڑی بیدردی سے کس کے اُس کے پر باندھ دئے"

فانیؔ — صیّاد یوں پروں میں گرہ باندھتے ہیں کیا ؛ بیدرد بند بند کسی کا جکڑ گیا

"چڑی مار جب بلبل کو پکڑ کر اپنے گھر لیچلا تو بیچارہ بلبل مُڑ مُڑ کر اپنے گھونسلے کی طرف دیکھتا تھا۔ اور راستہ میں ذرا سی جُنبش پر سہم سہم جاتا تھا۔ چیخ چیخ اُٹھتا تھا"

جگرؔ — جب چمن سے لیچلا صیّاد ہم کو کرکے قید ؛ دُور تک مُڑ مُڑ کے سوئے آشیاں دیکھا کئے

ہر اک لرزش پہ چیخ اٹھنا ہر اک جُنبش پہ ڈر جانا ؛ قفس تک ہائے میرا اسطرح بے بال و پر جانا

"اِس کشمکش سے نڈھال ہوکر بیچارہ بلبل بیہوش ہوگیا۔ جب آنکھ کھُلی تو اپنے تئیں پنجرے میں قید پایا"

جگرؔ — اب قفس میں ہوش آیا تو یہ حیرت ہی ہیں ؛ کسطرح آنکھوں سے لُٹتے آشیاں دیکھا کئے

"جس وقت غریب بلبل پنجرے میں قید تھا ظالم بجلی اُس کے گھونسلے پر جا گری۔ گھونسلے میں آگ لگ گئی اور وہ جلکر خاک ہوگیا۔"

جگرؔ — قفس کے سامنے بجلی کچھ اس طرح چمکی ؛ نظر میں پھر گئی تصویر آشیانے کی

فانی ؎ ترا اشارہ ترا ساز برق سے نہ سہی ؛ تجھے خبر ہے کہ جلتا ہے آشیاں صیاد

جگر ؎ مری اس بیخودی کا یاد گل میں کیا ٹھکانا ہے ؛ اٹھی جب آشیاں سے آگ تب سمجھا بہار آئی

"مجبور و بیکس بلبل پنجرے میں بیٹھا اپنے گھونسلے کو یاد کیا کرتا تھا"

جگر ؎ فلک ذرا مری اس بیکسی کی داد تو دے ؛ قفس میں بیٹھ کے روتا ہوں آشیانے کو

اصغر ؎ نہ پوچھو مجھ پہ کیا گذری ہے میری مشق حسرت سے ؛ قفس کے سامنے رکھا رہا ہے آشیاں برسوں

"آزاد ہو جانے کے لئے بیچارہ بلبل قفس میں تڑپتا تھا پھڑکتا تھا"

فانی ؎ بند ہے باب قفس، ہو، مگر تو ٹپکے جایئے ؛ ہم نے دیکھا ہے قفس کی تیلیوں میں در کھلا

"آخر رفتہ رفتہ پنجرے سے مانوس ہو گیا"

اصغر ؎ ہائے وہ دن گذر گئے جوشش اضطراب کے ؛ بند قفس میں آگئی اب غم بال و پر کہاں

"اور پنجرے ہی میں گھونسلا بنانے کے لئے تنکے اکٹھے کرنے لگا"

جگر ؎ اب آگے دیکھیں کری کیا ہوا زمانے کی ؛ قفس میں طرح تو ڈالی ہے آشیانے کی

"چڑیمار بمقتضائے فطرت انسانی کبھی تو اس پر بہت مہربان ہو جاتا تھا"

جگر ؎ باغباں مجھ سے ہے خوش صیاد مجھ پہ مہرباں ؛ اب چمن میرا چمن ہے اب قفس میرا قفس

"اور کبھی ذبح کر ڈالنے کی آمادگی ظاہر کرتا تھا"

فانی ؎ فرصت رنج اسیری دی نہ ان ہاتھوں نے ہائے ؛ اب چھری صیاد نے لی اب قفس کا در کھلا

فانی ؎ کم تو کیا، صیاد، بیتابی سوا ہو جائیگی ؛ تو نے ناحق تیلیوں میں رکھدیا خنجر کھلا

"ایک مدت تک پنجرے میں بند رہنے کے باعث بیچارے بلبل کے بازوؤں سے قوت پرواز بالکل سلب ہو گئی"

اصغر ؎ قید قفس میں طاقت پرواز اب کہاں ؛ رعشہ سا کچھ ضرور ابھی بال و پر میں ہے

"اب اسے یہ خوف مارے ڈالتا تھا کہ اگر کہیں چڑیمار نے اسے چھوڑ دیا تو کہاں جائیگا اور کیونکر جائیگا"

جگر ؎ چمن دور آشیاں برباد یہ ٹوٹے ہوئے بازو ؛ مرا کیا حال ہو صیاد اگر مجھکو رہا کر دے

"ایک وقت ایسا آیا کہ چڑیمار نے اسے آزاد کر دیا۔ مگر بیچارہ اڑنے سے معذور تھا"

فانی ؎ اف اس آزادیٔ بے ہنگام کی مجبوریاں ؛ میں قفس کے پاس یوں بیٹھا ہی رہتا پر کھلا

فانی ؎ ہم ہیں اور عزم آشیاں یعنی ؛ رہگئی دور طاقت پرواز

"بہر حال جس طرح ممکن ہوا پھر ایکبار اپنے گھونسلے میں جا بسا مگر اب طبیعت کا کچھ ایسا حال ہو گیا تھا کہ پھر پنجرے میں قید رہنے کو جی چاہتا تھا اور گھونسلے میں وحشت ہوتی تھی"

اصغر ؎ آشیاں میں اب کی صورت نہیں پڑتا ہے چین ؛ تھی نظر تاثیر میں ڈوبی ہوئی صیاد کی

جگر ؎ قفس کی یاد میں پھر جی یہ چاہتا ہے جگر ؛ لگا کے آگ نکل جاؤں آشیانے کو

اصغر ؎ قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل معاذ اللہ :: کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخ آشیاں رکھدی

اصغر ؎ الٰہی کون سمجھے میری آشفتہ مزاجی کو :: قفس میں چین آتا ہو نہ راحت ہو نشیمن میں

"چنانچہ ایکبار پھر گرفتار ہوا"

فانی ؎ یہ جذبِ ذوقِ اسیری ہی ورنہ اے فانی :: کہاں میں سوختہ دل، مشتِ پر، کہاں صیّاد

اصغر ؎ میں وہ ہرگز نہیں جسکو قفس سے موت آتی ہو :: میں وہ ہوں جس نے خود دیکھا نہ سوئے آشیاں برسوں

یہ ہے ایک چڑیا کی کہانی۔ ہم نے بخوفِ طوالت صرف خاص خاص واقعات نقل کر دئے ہیں تفصیل کے طالب ہمارے "اساتذہ" کے دیوان ملاحظ فرمائیں۔ اس باب کے خاتمہ پر ہم اپنے محترم پروفیسر فراق سے صرف اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہماری عشقیہ شاعری صرف بلبل، چڑیمار، جال، پنجرا، گھونسلا، اور بجلی ہی تک محدود رہنی چاہیئے یا دوسرے پرندوں چرندوں اور شکاریوں کا ذکر بھی اس میں شامل کیا جا سکتا ہے؟

ایک "صوفی" مولٰنا نے اس حکایت کو سنکر فرمایا کہ "میاں یہ اللہ والوں کی باتیں ہیں۔ تم لوگ لڑکوں کو پڑھانے والے لفظی معنی سے آگے تمہاری نظر نہیں جاتی۔ تم ان اسرار و رموز کو کیا جانو۔ یہ پوری کہانی ایک استعارہ ہے بلبل سے مُراد ہے انسان کی رُوح۔ اور صیاد کے معنی ہیں شیطان۔ آشیانہ سے مراد بہشت یا وہ مقام جہاں رُوحیں رہتی ہیں اور قفس استعارہ ہے اس دُنیا سے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ "الدنیا سجن المومن" دام کے معنی ہیں ہوا و ہوس۔ خلاصہ یہ کہ شیطان جسکا کام لوگوں کو گمراہ کرنا ہے ہر وقت اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ نیک روحیں جب دُنیا میں آئیں تو انہیں ہوا و ہوس میں مبتلا کرکے اس دارِ محن میں قید رکھے۔ یہاں تک کہ نیکی کرنے کی ذرّہ بھر صلاحیت اُن میں باقی نہ رہے اور اپنے آشیانے یعنی بہشتِ بریں کو بالکل بھول جائیں"

صوفی صاحب کی یہ تقریر سنکر میں حیران رہگیا کہ یا اللہ یہ چڑیا کی کہانی دراصل ایک "روحانی" چیز ہے مگر عشقیہ شاعری سے اسکا تعلق صوفی صاحب کی تاویل کے بعد بھی موہوم ہی رہا۔

(باقی آئندہ) عندلیب شادانی

نوجوان سے

جلالِ آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اُٹھے وہ شباب پیدا کر

ترے خرام میں ہے زلزلوں کا رازِ نہاں
ہر ایک گام پہ اِک انقلاب پیدا کر

صدائے تیشۂ مزدور ہے ترا نغمہ
تو سنگ و خشت سے چنگ و رباب پیدا کر

بہت لطیف ہے اے دوست تیغ کا بوسہ
یہی ہے جانِ جہاں اس میں آب پیدا کر

ترا شباب امانت ہے ساری دُنیا کی
تو خار زارِ جہاں میں گلاب پیدا کر

سکون خواب ہے بے دست و پا ضعیفی کا
تو اضطراب ہے خود اضطراب پیدا کر

ترے قدم پہ نظر آئے محفلِ انجم
وہ بانکپن وہ اچھوتا شباب پیدا کر

فلک پہ بارہا چمکا ہے آفتابِ جمیل
زمیں کے بطن سے اب آفتاب پیدا کر

شراب کھینچی ہے سب نے غریب کے خوں سے
تو اب امیر کے خوں سے شراب پیدا کر

ترے جلو میں نئی جنّتیں نئے دوزخ
نئی جزائیں انوکھے عذاب پیدا کر

گرا دے قصرِ تمدن کہ اک فریب ہے یہ
اُٹھا دے رسمِ محبت عذاب پیدا کر

جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر

بہے زمیں پہ جو میرا لہو تو غم مت کر
اسی زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

مجاز
بی۔اے (علیگ)

نوجوان خاتون سے

حجابِ فتنہ پرور اب اُٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حُسن کو پردا بنا لیتی تو اچھا تھا

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا

تری چینِ جبیں خود اِک سزا قانونِ فطرت میں
اسی شمشیر سے کارِ سزا لیتی تو اچھا تھا

یہ تیرے خشک لب، یہ زرد رُخ، یہ وہم، یہ وحشت
تو اپنے سر سے یہ بادل ہٹا لیتی تو اچھا تھا

دلِ مجروح کو مجروح تر کرنے سے کیا حاصل
تو آنسو خشک کر کے مسکرا لیتی تو اچھا تھا

ترے زیرِ نگیں گھر ہو محل ہو، قصر ہو کچھ ہو
میں یہ کہتا ہوں تو ارض و سما لیتی تو اچھا تھا

اگر خلوت میں تو نے سر اُٹھایا بھی تو کیا حاصل
بھری محفل میں آ کر سر جُھکا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارا ہے
اگر تو سازِ بیداری اُٹھا لیتی تو اچھا تھا

عیاں ہیں دشمنوں کے خنجروں پر خون کے دھبے
انہیں تو رنگِ عارض سے ملا لیتی تو اچھا تھا

شہیدوں کے لہو کی خاک پر گلکاریاں کب تک
تو ان پھولوں کو دامن میں اُٹھا لیتی تو اچھا تھا

سنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اُٹھا لیتی تو اچھا تھا

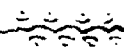
اثر باقی نہیں مفلوج پیروں کی دُعاؤں میں
جوانانِ بلاکش کی دُعا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اِک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مجاز
بی۔ اے (علیگ)

"ماں"

نوٹ :- مندرجہ ذیل مضمون روس کے شہرۂ آفاق مصنف میکسم گورکی کی ایک معرکتہ الآرا تصنیف (Mother) (ماں) کے ایک باب کا ترجمہ ہے جس میں اس نے کتاب کی ہیروئن کی سیرت کشی کی ہے جو ایک بوڑھی عورت ہے لیکن اس کا دل اور دماغ دونوں جوان ہیں یعنی اپنے گرد و پیش کی زندگی اور تحریکوں سے متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسے اپنے بیٹے کی وساطت سے بعض ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جو ایک نئی دُنیا بنانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں اور اس کے لئے ہر قسم کا ایثار کرنے کو تیار ہیں۔ ان کی صحبت اور خود "ماں" کی طبیعت کے اندرونی رجحان کا یہ فیض ہے کہ اس کی خودی وسیع ہو کر ان سب لوگوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے جو ایک بلند نصب العین کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ماں کی محبت جو اب تک صرف بیٹے کی ذات تک محدود تھی اپنے بند دل کو توڑ کر ہر طرف پھیل جاتی ہے اور بیٹے کے سب ساتھیوں کو اپنے دامن میں لے لیتی ہے۔ اس عمر میں پہنچ کر دل و دماغ کا یہ ارتقاء ان لوگوں کے لئے ایک نہایت سبق آموز پیغام ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ جوش اور ہمت اور جدید خیالات سے اثر لینا صرف جوانوں کے لئے ممکن ہے، بوڑھوں کے لئے اس کا امکان نہیں۔ جوانی کا تعلق عمر سے نہیں بلکہ جذبات اور صلاحیت سے ہے!



نلوفنا کی زندگی کا دھارا بہت سکون کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ بعض دفعہ اسے خود اس سکون پر حیرت ہوتی تھی۔ اس کا بیٹا جیل خانے میں قید تھا اور وہ جانتی تھی کہ اس کو سخت سزا ملنے والی ہے لیکن جب کبھی اسے یہ خیال آتا تھا تو اسکا ذہن آندرے، فیدیا اور بہت سے ایسے لوگوں کی طرف بھی متوجہ ہوتا تھا جن سے وہ کبھی نہ ملی تھی، محض ان کا ذکر ہی سُنا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بیٹے کی ذات نے وسیع ہو کر ان سب کو بھی اپنے میں ضم کر لیا ہے۔ اس غور و فکر کے جذبے نے جو خود بخود اور بے اختیار اس میں پیدا ہو گیا تھا اس کی دل کی آنکھوں کو بیٹے کی طرف سے ہٹا کر چاروں طرف دیکھنے کے قابل بنا دیا تھا۔ سورج کی باریک اور ناہموار کرنوں کی طرح وہ سب چیزوں پر پڑتیں اور انہیں روشن کرتی تھیں اور گرد و پیش کے تمام منظر کو ایک تصویر بنا کر پیش کرتی تھیں۔ اب اس کا ذہن کسی ایک ہی چیز پر جم کر نہیں رہ جاتا تھا۔

نکو کے ہمیشہ مصروف رہتا تھا اور ایک بندھی ٹکی باقاعدہ زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ صبح کو آٹھ بجے چائے پیتا، اخبار پڑھتا، اور "ماں" کو خبریں سُنایا کرتا۔ وہ ڈوما (روسی پارلیمنٹ) کے ممبروں کی تقریریں بغیر کسی تلخی یا ناراضگی کے دہراتا اور شہر کی زندگی کا کچا چٹھا اس کو سُنایا کرتا تھا۔

اس کی گفتگو کو سُن کر ماں کو صاف دکھائی دینے لگا کہ زندگی کی مشین کس طرح لوگوں کو بیدردی کے ساتھ

دولت کی چکّی کے پاٹوں کے بیچ پستی رہتی ہے۔ نو بجے وہ دفتر چلا جایا کرتا تھا۔ تب وہ کمروں کو صاف کرتی، کھانا پکاتی، نہاتی دھوتی، کپڑے بدلتی اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر تصویریں اور کتابیں دیکھتی۔ اس نے پڑھنا سیکھ لیا تھا لیکن پڑھنے کی محنت سے وہ بہت جلد تھک جاتی تھی اور لفظوں کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن اس کے لئے تصویریں مستقل طور پر سامانِ حیرت تھیں۔ ان کی بدولت اس کے سامنے نئی اور حیرت انگیز چیزوں کی ایک واضح اور واقعی دنیا کھل گئی تھی۔ اس کی نگاہِ تخیل کے سامنے عظیم الشان شہروں، خوبصورت عمارتوں، مشینوں، جہازوں، پرانی یادگاروں اور انسان کی بے اندازہ دولت کا نقشہ کھنچ جاتا۔ جن کو لوگوں نے بنایا تھا اور جن کی کثرت سے دماغ متحیر ہو جاتا تھا۔ زندگی برابر زیادہ وسیع ہوتی چلی جاتی تھی، ہر روز نئے نئے اور عظیم الشان عجائبات اسکے سامنے آتے تھے۔ اس عورت کی بھوکی روح جو عرصہ دراز تک سونے کے بعد بیدار ہوگئی تھی دنیا کی مختلف نعمتوں اور اس کی بے اندازہ خوبصورتیوں سے نہایت شدت کے ساتھ متاثر ہو رہی تھی۔ اسے خاص طور پر جانوروں کی تصویروں کی کتابوں کو دیکھنے میں دلچسپی تھی اور اگرچہ ان کی تشریح کسی غیر زبان میں لکھی ہوئی تھی لیکن اس کو ان تصویروں کو دیکھ کر زمین کی وسعت اور فراوانی اور خوبصورتی کا نہایت واضح تصور ہو گیا تھا۔

ایک دن اس نے کھانے کے وقت نکولے سے کہا:۔

"یہ دنیا کس قدر وسیع ہے!"

"بے شک ہے۔ مگر باوجود اس کے لوگ جگہ نہ ملنے کی وجہ سے کیسی تنگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں"

ہر قسم کے کیڑے مکوڑوں بالخصوص تتلیوں کو دیکھ کر اسے سب سے زیادہ تعجب ہوتا تھا ایک دفعہ کہنے لگی:۔

"نکولے، یہ کس قدر حسین ہیں اور ہمارے چاروں طرف یہ دلکش حسن ہر چیز میں موجود ہے لیکن ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے، یہ گویا ہمارے اردگرد چھایا ہوا ہے لیکن ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ لوگ ہر وقت تگ و دو کرتے رہتے ہیں مگر وہ کچھ بھی نہیں جانتے کسی چیز سے لطف نہیں حاصل کر سکتے ان میں لطف اندوزی کی صلاحیت ہی نہیں۔ بہتیرے لوگ اپنی زندگی کو خوشی کی چاشنی دے سکتے ہیں اگر انہیں یہ معلوم ہو کہ ہماری یہ زمین کتنی نعمتوں سے مالا مال ہے اور اس میں کیسی کیسی حیرت انگیز چیزیں موجود ہیں"

نکولے اس کی پُرجوش مسرت کے ذکر کو سنتا، مسکراتا اور اس کو تصویروں کی نئی نئی کتابیں لا کر دیتا۔ شام کو بہت سے ملاقاتی گھر میں جمع ہوتے اور آپس میں نہایت جوش اور سرگرمی کے ساتھ مباحثے کرتے۔ وہ ان کے لئے پیالیوں میں چائے بناتی اور دل ہی دل میں تعجب کیا کرتی کہ یہ لوگ کس قدر جوش کے ساتھ زندگی کے مصائب اور مزدوروں کے حالات پر بحث کرتے ہیں اور ان وسائل کو سوچتے ہیں جن کے ذریعہ ان تک جلد سے جلد سچ کی روشنی پہنچ جائے اور ان کی روح میں بلندی پیدا ہو۔ یہ مسائل ہمیشہ ان لوگوں کے دماغ میں گھومتے رہتے تھے اور یہی ان کی زندگی کا مرکز تھے۔ اکثر وہ غصّہ کے لہجہ میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے، ایک دوسرے کو الزام دیتے ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے لیکن پھر اسی سرگرمی سے مباحثہ کرنے لگتے۔ مگر وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ وہ مزدوروں کی

زندگی کو ان لوگوں سے بہتر سمجھتی ہے اور ان لوگوں کی نسبت زیادہ بہتر اندازہ کرسکتی ہے کہ انھوں نے کتنا بڑا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ وہ ان کی تمام حرکات کو ایک خاص رعایت کی نظر سے دیکھتی تھی جس میں ہلکی سی افسردگی بھی ملی ہوتی ہے جس طرح بڑی عمر کے لوگ بچوں کو دیکھا کرتے ہیں جب وہ میاں بیوی کا کھیل کھیلتے ہیں لیکن اس رشتے کی جذباتی کشمکش کو نہیں سمجھتے۔

ایک دفعہ نتاشا آئی اور ماں کو وہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اس کو پیار کیا۔ اس نے منجملہ اور باتوں کے بہ سبیلِ تذکرہ یہ بھی کہا، جیسے اسے اتفاقاً یہ بات یاد آ گئی ہو۔

"میری ماں کا انتقال ہوگیا ہے۔ بے چاری چل بسی۔" اُس نے تیزی سے اپنا ہاتھ آنکھوں پر پھیرا اور کہنے لگی۔ "مجھے اس کا خیال کرکے افسوس ہوتا ہے۔ اس کی عمر ابھی پچاس سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اور ابھی اس کی زندگی کا کافی حصہ باقی تھا۔ لیکن اگر تم اس بات پر دوسرے نقطۂ نظر سے غور کرو تو یہ خیال ہوتا ہے کہ موت ایسی زندگی سے بہتر ہے۔ ہمیشہ تنہا، ہر شخص سے اجنبی، کسی کو اس کی ضرورت نہیں، اور ہمیشہ میرے باپ کی چیخ پکار سے خائف۔ کیا تم اس کو زندگی کہہ سکتی ہو؟ لوگ کسی بھلائی کی اُمید میں زندہ رہتے ہیں، لیکن اس بے چاری کو سوائے ذلتوں کے اور کاہے کی توقع ہو سکتی تھی۔"

ماں نے جواب دیا ایسے لہجہ میں جیسے کسی چیز کو یاد کر رہی ہو۔ "تم سچ کہتی ہو۔ لوگ کسی بھلائی کی اُمید میں زندہ رہتے ہیں اور اگر توقع ہی اُٹھ جائے تو وہ زندگی کیا ہوئی۔" پھر اس نے پیار سے نتاشا کے ہاتھ کو تھپک کر پوچھا۔ "تو اب تم بالکل اکیلی ہو؟"

نتاشا نے بے پروائی کے لہجہ میں جواب دیا۔ "ہاں اکیلی ہوں۔"

ماں چُپ رہی اور پھر دفعتاً مسکرا کر بولی:۔

"کوئی مضائقہ نہیں اچھے آدمی کبھی تنہا نہیں رہتے۔ ان کے ساتھ ہمیشہ لوگ وابستہ ہو جاتے ہیں۔"

نتاشا اب ایک قصبے کے اسکول میں معلمہ ہو گئی تھی جہاں ایک کپڑے کا کارخانہ تھا نلوفنا کبھی کبھی اس کے لئے ممنوعہ کتابیں، اخبار اور اشتہارات مہیا کرتی تھی۔ بلکہ ان کتابوں وغیرہ کی تقسیم ہی اب ماں کا مستقل مشغلہ بن گیا تھا۔ وہ مہینے میں کئی بار مختلف طرح کے بھیس بدل کر، کبھی راہبہ کے لباس میں، کبھی کپڑوں اور لیس بیل وغیرہ کی سوداگرن کر، کبھی جاتری بن کر، کبھی کسی رئیس کی بیوی کا لباس پہن کر، کبھی پیدل، کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر جایا کرتی۔ کبھی کندھے پر تھیلا پڑا ہوتا، کبھی ہاتھ میں بیگ۔ ریل میں، جہاز پر، ہوٹلوں اور سراؤں میں لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ ہمیشہ سادہ اور معقول ہوتا تھا وہ اجنبی لوگوں سے خود گفتگو کا سلسلہ چھیڑتی اور اپنی دھیمی اور دل لگتی باتوں سے بے دھڑک لوگوں کی توجہ اپنی طرف مائل کر لیتی۔ اور اس کے رکھ رکھاؤ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک تجربہ کار عورت ہے جس نے بہت کچھ دیکھا اور سُنا ہے۔ اسے لوگوں سے بات چیت کرنے میں، ان کی رام کہانی سُننے میں، ان کی شکایتوں، پریشانیوں اور گریہ و زاری سُننے میں دلچسپی تھی۔ جب کبھی وہ کسی کو زندگی سے نہایت شدت کے ساتھ

بیزار دیکھتی اس کا دل خوشی سے لبریز ہو جاتا۔ یہی وہ بیزاری ہے جو تقدیر کی ستم آرائیوں کے خلاف اپنی آواز بلند کرتی ہے اور دل لگا کر اس کے مسائل کا حل سوچتی ہے۔ اس کے سامنے انسانی زندگی کا نقشہ زیادہ وسیع زیادہ رنگ برنگی ہوتا جاتا تھا، اُس زندگی کا جو شکم پُری کی پریشانی اور جد و جہد میں گزرتی تھی۔ اسے ہر طرف یہی نظر آتا تھا کہ ناشائستہ، عریاں جد و جہد نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ انسان کو دھوکا دیتی ہے، اس کو لوٹتی ہے، اس کا سارا رس نکال لیتی ہے، اس کا خون تک جس پر زندگی کا مدار ہے چوس لیتی ہے۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ دُنیا میں ہر چیز کی افراط ہے لیکن باوجود اس کے لوگ محروم اور محتاج ہیں۔ اور نیم فاقے کی حالت میں رہتے ہیں حالانکہ ان کے چاروں طرف بے اندازہ دولت ہے۔ شہروں میں گرجا سونے چاندی سے بھرے ہوتے تھے جن کی خدا کو مطلق ضرورت نہ تھی اور گرجوں کے دروازے پر فقیر اس اُمید میں کھڑے ٹھٹھرتے تھے کہ شاید کوئی خدا کا بندہ ان کے ہاتھ پر ایک پیسہ رکھ دے۔ اس نے یہ بات پہلے بھی دیکھی تھی۔ ایک طرف دولت سے لبریز گرجا اور پادریوں کی عبائیں جو سونے کے تاروں سے بنی ہوئی تھیں اور دوسری طرف غریبوں کے جھونپڑے اور ناگفتہ بہ چیتھڑے۔ لیکن اس وقت یہ بات بالکل نظامِ قدرت کے موافق معلوم ہوتی تھی لیکن اب یہ فرق جو غریبوں کے لئے اہانت آمیز تھا کسی طرح اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ گرجا امیروں کی نسبت غریبوں کے زیادہ قریب اور ان کے لئے زیادہ ضروری ہیں۔

مسیح کی تصویروں اور قصّوں سے بھی اسے یہی اندازہ تھا کہ وہ غریبوں کے دوست تھے اور سادہ غریبانہ لباس پہنتے تھے۔ لیکن گرجوں میں جہاں غربت ان کی بارگاہ میں تسکین کی تلاش میں حاضر ہوتی تھی اسے یہ نظر آتا کہ ان کی تصویر کو نمائش کی خاطر سونے کی میخ سے سولی پر نصب کیا گیا ہے اور ریشم اور ساٹن کے کپڑے محتاجی کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ رائی بن کے الفاظ اسے یاد آتے تھے "اُنھوں نے تو ہمارے خدا کو بھی مسخ کر دیا ہے۔ جو کچھ ان کے ہاتھ پڑا ہے اس کو ہمارے خلاف استعمال کیا ہے۔ گرجاؤں میں اُنھوں نے ہمارے ڈرانے کے لئے ایک ڈراؤنی مورت رکھ چھوڑی ہے۔ اُنھوں نے خدا تک کو جھوٹ اور بدزبانی میں ملبوس کر دیا ہے اور ہماری روحوں کو خراب کرنے کے لئے اس کے رُخِ زیبا کو بگاڑ دیا ہے"۔

اس نے بغیر کسی خاص ارادے کے عبادت میں کمی کر دی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ حضرت مسیح کے بارے میں اور ان لوگوں کے بارے میں زیادہ سوچ بچار کرتی رہتی تھی جو بغیر ان کا نام لئے اور گویا بغیر ان کو پہچانے اس کے خیال میں انہیں کے بنائے ہوئے طریقے پر زندگی بسر کرتے تھے اور ان کی طرح زمین کو غریبوں کی ملکیت سمجھتے تھے اور اس کی تمام دولت کو انہیں میں تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ اس کے یہ خیالات اس کی روح کی گہرائیوں میں پرورش پاتے رہے۔ اور انہوں نے بڑھکر اور پھیل کر ان تمام چیزوں کو گھیر لیا جو وہ سُنتی یا دیکھتی تھی۔ اُنھوں نے اور بڑھکر عبادت کی روشن شکل اختیار کر لی اور ان کی روشنی کی چھوٹ ساری تاریک دُنیا اور زندگی اور انسانوں پر محیط ہو گئی۔ اور اسے یہ معلوم ہونے لگا کہ خود حضرت مسیح اب اس سے زیادہ قریب ہو گئے ہیں اور ان کی شکل اس کے گذشتہ تصوّر سے بالکل مختلف ہے، پہلے وہ ان سے ایک عجیب مخلوط قسم کی محبت کرتی تھی جس میں اُمید و بیم اور مسرت و افسردگی ملی

ہوئی تھی۔ اب اسے ان کا درجہ اور بلند معلوم ہوتا تھا اور اسے ان کی سیرت کے نقوش زیادہ واضح طور پر نظر آتے تھے۔ ان کی شکل زیادہ روشن اور خوش و خرم معلوم ہوتی تھی۔ اب ان کی آنکھیں اس کو دیکھ کر زیادہ اعتماد کے ساتھ مسکراتی تھیں اور ان میں ایک زندہ باطنی قوت تھی گو یا وہ درحقیقت ازسرِ نو انسانوں کے لئے دوبارہ پیدا ہوتے ہیں اور ان کے نام پر جو گرم خون بہایا گیا ہے اُس میں نہا کر قوتِ حیات عود کر آئی ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ جن لوگوں کا خون بہا تھا وہ از راہِ انکسار عوام الناس کے اس بدنصیب دوست کا نام لینے سے بھی احتراز کرتے ہیں!

ماں اپنے سفر کے تجربات سے اور راستے میں جو کچھ سُنتی اور دیکھتی تھی اس کے اثر سے ہمیشہ زیادہ تازہ دم ہو کر نکولے کے پاس واپس آتی تھی اور جو کام انجام دیتی تھی اس سے اس کی جرأت اور خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ایک روز شام کو اس نے نکولے سے کہا:۔

"جگہ جگہ جانا اور ہر قسم کی چیزوں کو دیکھنا بڑی اچھی بات ہے۔ اس سے یہ سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ زندگی کا نظم کس طرح قائم ہے۔ سماج نے عوام کو ایک طرف ہٹا دیا ہے بلکہ انہیں کنارے پر پھینک دیا ہے اور یہ بچارے مجروح اور مصیبت زدہ ہونے کے باوجود بلا ارادہ اِدھر اُدھر چلتے پھرتے رہتے ہیں اور یہ سوچتے رہتے ہیں۔ "آخر کیوں؟ ہمیں یہ لوگ کیوں دھتکارتے ہیں۔ ہم بھوکے کیوں رہیں جب ہر چیز اس قدر افراط کے ساتھ موجود ہو۔ دُنیا میں چاروں طرف کس قدر عقل اور علم موجود ہے۔ پھر بھی ہم اس پر مجبور ہیں کہ تاریکی اور جہالت میں زندگی بسر کریں۔ اور وہ خدائے رحمٰن کہاں ہے جس کی نگاہ میں نہ کوئی غریب ہے نہ امیر بلکہ سب اس کے بچے ہیں اور اس کو پیارے ہیں" لوگ آہستہ آہستہ اس زندگی کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو رہے ہیں۔ ان کو یہ احساس ہو چلا ہو کہ اگر وہ خود اپنی فکر نہیں کرینگے تو اس جھوٹ کی دُنیا میں ان کا دم گھُٹ جائے گا"

اپنی فرصت کے اوقات میں وہ کتابوں کو لے بیٹھتی تھی اور بار بار تصویروں کو دیکھتی تھی اور ہر مرتبہ اسے ان میں کوئی نہ کوئی چیز نئی ملتی تھی۔ زندگی کا نقشہ اس کی نظر کے سامنے وسیع ہوتا جاتا تھا اور فطرت کا حُسن اور انسان کی تخلیقی قوتیں بے نقاب ہوتی جاتی تھیں۔ نکولے اکثر اسے کتابوں کا مطالعہ کرتے دیکھتا اور مُسکراتا اور اسکو نئی نئی اور حیرت انگیز باتیں بتاتا تھا۔ انسان کی جرأت اور حوصلے پر حیران ہو کر وہ پوچھتی تھی۔

"کیا یہ واقعی ممکن ہے؟" نکولے اپنی عینک میں سے ماں کے چہرے پر مہربانی کی نظر ڈالتا یہ اپنی پیشین گوئیوں کی صداقت پر پورے اعتماد کے ساتھ اپنی دھیمی آواز میں مستقبل کی کہانیاں سُناتا تھا۔ وہ کہتا تھا۔

"انسان کی خواہشوں کی کوئی حد نہیں اور اس کی قوت بے اندازہ ہے۔ لیکن دُنیا اب تک روحانی دولت کے حاصل کرنے میں بہت سُست رہی ہے۔ کیونکہ آج کل ہر شخص جو محتاجی سے آزاد ہونا چاہتا ہے اور علم جمع کرنے پر نہیں بلکہ دولت جمع کرنے پر مجبور ہے۔ تاہم جب لوگ حرص کا خاتمہ کر دینگے اور غلامی جیسی مزدوری کے جال سے رہا ہو جائیں گے........"

وہ اس کی باتوں کو دماغ پر زور ڈال کر توجہ سے سُنتی تھی۔ اگرچہ وہ اکثر اس کے الفاظ کا مطلب نہ سمجھتی تھی لیکن

ان میں جو ایمانِ کامل کی روح جلوہ فرما تھی اس کا دن بدن زیادہ گہرا اثر اس پر ہوتا جاتا تھا۔ ایکدفعہ اس نے کہا:-
"دنیا کی بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ اس میں واقعتاً آزاد لوگ بہت ہی کم ہیں"
یہ بات ماں کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ بعض ایسے لوگوں کو جانتی تھی جنھوں نے خود کو حرص اور برائی سے آزاد کر لیا تھا۔ اس لئے وہ سمجھتی تھی کہ اگر ایسے لوگ اور ہوں تو زندگی کا تاریک، مجہول اور خوفناک چہرہ زیادہ مہربان، زیادہ سادہ، زیادہ اچھا اور زیادہ روشن ہو جائے!

خواجہ غلام السیّدین

اے دل

جھلس نہ جائے کہیں گردو پیش کا منظر ‖ نہ کھینچ بہرِ خدا، آہِ شعلہ زا، اے دل
رضائے دوست ہے گر مٹ کے خاک ہو جانا ‖ نہ کر خدا کے لئے اس میں چوں چرا، اے دل
ترے مکیں کی پرستش ہی فرض میرے لئے ‖ کہ تجھکو کہتے ہیں سب خانۂ خدا، اے دل
یقین تھا کہ وہ رحم آشنا نہیں، لیکن ‖ وفورِ ضبط نے پاگل بنا دیا، اے دل

وہ اضطراب وہ لرزش، وہ وحشتِ جانکاہ ‖ ہنوز یاد ہے آغاز ابتلا، اے دل
ہوں ایک مسئلہ مقابل ہیں کل جہاں کیلئے ‖ تپش نے پھونکدیا خرمنِ رضا، اے دل
سفینہ جبکہ تلاطم کی زد پہ چھوڑ دیا ‖ تو کیا تلاشِ خدا اور ناخدا، اے دل
غمِ فراق کا سہنا بھی کچھ نہ تھا مشکل ‖ مگر خفا ہے وہ ہی جانِ مدعا، اے دل

ہے گرچہ منزلِ مقصود اک شے موہوم ‖ نہ رہنما ہے کوئی اور نہ ہمنوا، اے دل
نگاہِ شوق میں سب ہیچ ہیں نشیب و فراز ‖ رواں دواں ہو مسلسل یہ قافلہ، اے دل

دلفگار

ایک ملاقات

میں کوئی دلچسپ افسانہ نہیں لکھ رہا ہوں۔ گذشتہ سال لکھنؤ سے کانپور جاتے ہوئے ایک صاحب سے ملاقات ہوگئی تھی۔ اُس ملاقات کی کیفیت بیان کرنی مقصود ہے۔

ہم لوگوں نے کالج اور اربابِ کالج کے خلاف بغاوت کی۔ جوش میں آکر کیا کچھ نہ کیا۔ مگر انجامِ کار والدین کے دباؤ اور بے روزگاری اور بربادی کے خوف سے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ جب ہنگامہ فرو ہوگیا تو فاتحین کے لئے انتقام کا وقت آیا۔ تحقیقات شروع ہوئی۔ تمام آزاد خیال اور انتہا پسند طلباء کو نکال دینے کے مشورے ہوئے۔ میرا نام بھی اسی فہرست میں تھا۔ لکھنؤ سے کانپور بھاگا تاکہ اطمینان سے بیٹھ کر معاملات پر غور کروں اور اپنی تعلیمی زندگی کو تباہی سے بچانے کی کوئی تدبیر سوچوں۔

اسٹیشن پہنچا تو گاڑی تیار تھی۔ ٹکٹ لیکر ایک ڈبہ میں جا بیٹھا۔ میرے سامنے دو آدمی انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ اُنکی باتیں سُننے لگا۔ اُن میں سے ایک ایسی ہی انگریزی بول رہا تھا جیسی عام طور پر ہندوستانی یونیورسٹیوں کے بی۔ اے اور ایم۔ اے بولتے ہیں۔ کتابوں سے سیکھی ہوئی زبان، لمبے لمبے بے ڈھنگے جملے، بناوٹی انداز، خالص ہندوستانی تلفظ۔ صاف بظاہر ہو رہا تھا کہ پہلے دل ہی دل میں اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرتا ہے اور پھر زبان سے ادا کرتا ہے (آپ کسی یونیورسٹی میں اقتصادیات کے پروفیسر تھے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا) دوسرا جو بظاہر ایک ہندوستانی عیسائی معلوم ہوتا تھا بالکل اہلِ زبان کی طرح بات کر رہا تھا وہی اہلِ زبان کا لہجہ، وہی مُنہ بھینچ کر بات کرنے کا انداز، وہی منجھے ہوئے بامحاورہ فقرے، وہی سلاست، وہی بے ساختہ پن، گویا انگریزی اس کی مادری زبان ہے۔ میں بہت آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ یہ دوسرا شخص ایک طویل عرصے تک انگلستان یا امریکہ میں رہا ہے۔ ممکن ہے وہیں پیدا ہوا ہو۔ ممکن ہے تجارت وغیرہ کے سلسلے میں وہاں سکونت اختیار کرلی ہو۔ بہرحال یہ یقینی ہے کہ اُس نے زبان کو اہلِ زبان سے سیکھا ہے، کتابوں سے نہیں۔ اس کے بعد میں اُن دونوں کی باتیں سُنتا رہا اور اپنے دل میں سوچتا رہا کہ اس وقت میرے سامنے ایک ہندوستانی یونیورسٹی کا منتہی عالم بیٹھا ہو۔ وہ شخص جس نے ساری عمر ایک زبان کے غلط سیکھنے میں صرف کردی، اور جو اپنی زبان سے بھی محروم رہا۔ ہائے ہائے کیا تعلیمی نظام ہے۔ زندگیاں برباد ہوگئیں۔ کہیں کے نہ رہے!! میں اِن خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ یہ دونوں ہندوستان کی سیاست پر اظہارِ خیال کرنے لگے۔

اب میرے کان کھڑے ہوئے اور میں نے بہت غور سے سُننا شروع کیا۔ وہ صاحب جو بُشرے سے عیسائی معلوم ہوتے تھے اور انگریزوں کی سی انگریزی بول رہے تھے گاندھی جی کے متعلق فرمانے لگے کہ میں اُن کی قربانیوں کی دل سے قدر کرتا ہوں لیکن ان کی تحریکِ عدمِ تعاون اور قانون شکن اقدامات کے خلاف ہوں۔ کیونکہ ان باتوں سے اُنہی لاکھوں کروڑوں انسانوں کو نقصان پہنچتا ہے جن کی وہ حمایت کرتے ہیں اور جن کی حالت کو سدھارنے کے لئے اُنہوں نے اپنی ساری زندگی وقف کردی ہے۔ ہمارے ہندوستانی پروفیسر نے

اِس سے اختلاف کیا اور گاندھی جی کے طرزِ عمل کو صحیح و مناسب
ثابت کرنے کے لئے اپنی الجھی ہوئی بھدّی انگریزی میں کچھ
فرمایا۔ میں نے اُن کی نفرت انگیز گفتگو کو نہیں سُنا۔ اور
یہ سوچنے لگا کہ یہ شخص جو انگریزی اتنی لاجواب بولتا ہے
سیاسیات کے باب میں بالکل کورا معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً یہ
۱۹۲۱ء کی تحریک کے دوران میں ہندوستان سے گیا
ہوگا اور اب پندرہ سولہ سال کے بعد جو واپس آیا ہے
تو سمجھتا ہے کہ وہی زمانہ ہے۔ وہی سیاسی تحریکیں چل
رہی ہیں اور وہی سیاسی رہنما اُن کو چلا رہے ہیں۔ اتنے
میں اُسنے امریکہ اور امریکہ والوں کا ذکر چھیڑا۔ لیکن چونکہ
گاڑی اب بہت تیزی کے ساتھ جنگل میں سے گزر رہی تھی
میں اُس کی باتوں کو سُن نہ سکا۔ البتہ اتنا مجھے یقین ہوگیا
کہ اس شخص نے اپنی زندگی امریکہ میں گزاری ہے۔ چنانچہ
میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے آپ کو اس سے
متعارف کراؤں، کچھ تو اس لئے کہ اس کی انگریزی کا لطف
اُٹھا سکوں اور کچھ اس لئے کہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی
اور اقتصادی مسائل کے متعلق صحیح نقطۂ نظر پیش کرسکوں۔
میں نے سوچا کہ اب تو میں کالج کے حدود سے باہر ہوں اور
ریل میں سفر کر رہا ہوں۔ کیا حرج ہے کہ اگر ایک اجنبی سے
دل کھول کر باتیں کروں اور اُس کو بتادوں کہ حضرت!
آپ کے گاندھی جی کبھی حقیقی معنوں میں ہندوستان کے
لاکھوں کروروں باشندوں کے نمائندے نہ تھے۔ وہ
صرف اُس قوم پرست اور رجعت پسند جماعت سے تعلق
رکھتے تھے جو زیادہ تر سرمایہ داروں اور زمینداروں پر
مشتمل تھی اور اپنے جماعتی استبداد میں زیادہ استحکام
حاصل کرنے کے لئے انگریزی حکومت سے چند اختیارات
کی بھیک مانگ رہی تھی۔ وہ جماعت شکست کھاچکی اور
میدان چھوڑ کر بھاگ رہی ہے۔ گاندھی جی کا ڈھونگ
بھی ختم ہوگیا۔ اب وہ اپنے آشرم میں بیٹھے اُردو ہندی
اور اسی قسم کے فرقہ وارانہ جھمیلوں سے اپنا دل بہلا
رہے ہیں۔ آپکو شاید ۱۹۲۱ء کا دھوکا ہو رہا ہے، قبلہ
یہ ۱۹۳۶ء ہے۔ عدم تعاون کی تحریک کبھی کی ناکامیاب
ہوچکی۔ اُس کے بعد ۱۹۳۰ء کی تحریک کا بھی یہی حشر
ہوا۔ یہ تحریکیں تھیں ہی ایسی کہ ناکامیاب رہتیں۔ اِن کی
ناکامی کے اسباب خود اِنکے اندر موجود تھے۔ آپ اِن کو گاندھی
جی کے قانون شکن اقدامات خیال کرتے ہیں۔ جنابِ والا!
آپ نہایت زبردست غلطی میں مبتلا ہیں۔ گاندھی جی نے
کبھی قانون شکنی کی جرأت نہیں کی۔ اُن کی سیاسی کارروائیوں
کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ چند معاشی مراعات
حاصل کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً حکومت کے خلاف ایک
نرم اور بُزدلانہ احتجاج کرتے رہے ہیں۔ گویا ایک مکّار
سادھو کسی دولتمند کے دروازے پر اپنا کاسۂ گدائی
لے کر بیٹھ جائے اور کسی طرح اُٹھنے کا نام نہ لے۔ مگر ہاں
جب اُس پر مار پڑنی شروع ہو تو فوراً اُٹھکر بھاگے۔ سمجھے
آپ؟ اور سُنیئے! گاندھی جی نے اپنی تمامتر فراست کے
باوجود کبھی اس بات کو محسوس نہیں کیا کہ ہندوستان
کو ایک زبردست اقتصادی اور معاشری انقلاب کی
ضرورت ہے۔ اور اگر یہ نہیں تو تمام سیاسی انقلابات
ہیچ اور پوچ ہیں۔ وہ ہمیشہ ویدوں کے زمانے کا راگ
الاپتے رہتے اور جاہلیت، وحشت اور افلاس کو سراہتے
رہے۔ ایسے لوگ بیسویں صدی میں کسی ملک کو آزاد
کراسکتے ہیں۔ ناممکن!!

غرض میرے دل میں اُس وقت ایک شدید جذبہ
پیدا ہوا کہ یہ تمام باتیں اس شخص سے کہوں اور اس کو

حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کروں۔ تقریباً اسی وقت پروفیسر صاحب باتیں کرتے کرتے اونگھ گئے اور میں اپنی جگہ سے اٹھکر اُس کے پاس گیا۔

"میں آپ سے چند منٹ گفتگو کر سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"بڑے شوق سے!" اُس نے میرے لئے جگہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

میں بیٹھ گیا۔ "میرا خیال ہے آپ امریکہ میں رہتے ہیں۔"

"جی ہاں!"

"اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک طویل مدت تک رہے ہیں۔"

"جی ہاں! میں تیرہ سال کی عمر سے برابر وہیں رہا ہوں۔"

"خوب!"

میں سوچ ہی رہا تھا کہ کس طرح اپنی بحث کو چھیڑوں کہ اُس نے کہا۔ "اگر آپ امریکہ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیں تو میں بہت خوشی سے بتاؤنگا۔"

"ہاں" میں نے کہا۔ "میں یورپ کی سیاحت تو کر چکا ہوں، لیکن امریکہ سے بالکل ناواقف ہوں۔"

"اچھا! آپ یورپ ہو آئے ہیں۔ غالباً تعلیم کے سلسلے میں؟"

"جی ہاں! لیکن میں اپنی تعلیم کو جاری نہ رکھ سکا اور جلد واپس آگیا۔" میں اس قصّے کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے میں نے کہا۔ "آپنے غالباً انگلستان بھی دیکھا ہوگا؟"

"جی، میں نے دُنیا کے تمام ملک دیکھے ہیں۔"

"خوب! بہت خوب!" میں نے متعجب ہوکر کہا۔ "تو آپ کس سلسلے میں مختلف ممالک کا دورہ کرتے رہے ہیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں؟"

"میں گورنمنٹ سیکرٹ سروس سے تعلق رکھتا ہوں"

اُس نے کہا۔ میرے اوپر جیسے بجلی گر پڑی۔ خیریت ہی ہوئی کہ میں نے ابھی تک وہ ذکر نہیں چھیڑا تھا جسکی خاطر میں اُسکے پاس گیا تھا۔ میرا سارا جوش سرد ہوگیا۔ دو چار باتیں اِدھر اُدھر کی کیں اور اپنی جگہ پر آگیا۔

جب کانپور کا اسٹیشن آیا اور میں گاڑی سے اُترنے لگا تو اُس نے اُٹھکر مجھ سے ہاتھ ملایا اور السلام علیکم کہا۔

"خوب! تو آپ مسلمان ہیں۔ کیوں نہیں!!" میں نے گاڑی سے اُترتے وقت اپنے دل میں کہا۔

اور اب جبکہ میں کالج سے نکالا جاچکا ہوں اور مجھ پر کسی کا دباؤ نہیں ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ ایک دفعہ پھر اُس سے ملاقات ہوجائے تاکہ میں وہ سب کچھ کہہ ڈالوں جو اُس روز کہنا چاہتا تھا۔

اختر انصاری!

"کافر!"

"ہٹ۔ تیرے مہادیو جی جیسے ہوتے کی شکل کے۔ رات کو دیکھ لو تو بخار چڑھ آئے۔" میں نے پشکر کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور تیرے۔ تیرے وہ مستان شاہ جی اور مسٹنڈے پیر جو ہر جمعرات کو تجھے آشیرباد دینے آتے ہیں جیسے ڈاکو چلا آتا ہے۔ میری تو انہیں دیکھ کر ہی گھگی بندھ جاتی ہے۔" پشکر نے انگلیاں نچا کر کہا۔

"تُو تو کافر ہے پشکر۔" میں نے مولویانہ انداز سے کہا۔ "تو جہنم میں جائے گا۔ فرشتے تیرا بدن لوہے کی سلاخوں سے داغیں گے۔ اور آگ کے کوڑے ماریں گے۔ خون اور پیپ کھانے کو ملے گا۔"

"ہے گندی کیسی جی متلانے کی باتیں کرتی ہے۔ میں وہ تیرے فرشتے کے منہ پر الٹا ماروں گا۔ میں کافر ہوں تو تُو کافرنی ہے۔ تُو نے اس دن بابو جی سے کہا تھا کہ مجھ سے شادی کرے گی۔ تیرے بھی جہنم میں کچھ کم جوتیاں نہیں پڑیں گی۔"

"ہٹ۔ میں تو مسلمان ہوں۔ اور تُو ہندو ہے جناب عالی سارے مسلمان تو جنت میں چلے جائیں گے۔ ہم بھی مزے سے جنت میں جائیں گے۔ تُو ہی رہ جائیگا۔ دیکھ لیجو۔"

"بہت رہ گیا! میں تجھ سے بھی اچھی جگہ جاؤں گا۔ تُو مسلمنٹی ہے تو نرک میں پڑی جلا کرے گی۔"

"سور کہیں کا تو مجھے مسلمنٹی کہتا ہے؟ تو ہی ہے بھنگی کافر۔ الّو۔"

"تو تُو بھنگن اور کافرنی ہے۔"

میں نے اس کے ایک زور کا طمانچہ مارا۔ وہ کیوں چوکتا۔ دو دھموکے رکھ دیئے اور ہاتھ الگ مروڑ دیا۔ میں نے بھی اس کی کلائی میں ناخون ایسے گڑو دیئے کہ چربی نکل آئی۔ چاچی جوتی پیزار کی آواز سنکر دوڑی آئی اور بیچ بچاؤ کروا دیا۔

"پشکر کے بچے آنے دے بابو جی کو کیسی گت بنواتی ہوں۔" چاچی نے پشکر کو گھونسا دکھا کر کہا جو دیوار کا کھوڑا بناتے بیٹھا میرا منہ چڑا رہا تھا۔

"چاچی۔ اب اس سور سے میں شادی نہیں کرونگی۔" میں نے رو کر کہا۔

"اور میں تجھ کلوٹی سے کب کروں گا۔ ماں یہ مجھے پیپ خون کھلاتی ہے۔ اُوق۔" پشکر نے ابکائی کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

"ہے رام ملیچھ کہیں کا۔ چپ۔"

"سچی ماں یہ کہتی ہے۔ سب ہندو نرک میں جائیں گے اور یہ بڑی آئی واں سے جنت میں جائے گی۔"

"نہیں چاچی نہیں جائے گی اور کھیا اور بابو جی بھی نہیں جائیں گے۔ پر یہ الّو تو ضرور جائے گا۔" میں نے وثوق سے کہا۔

"میں گیا تو تیری بھی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لے جاؤنگا۔"

"بہت لے گیا۔ وہ زور سے کاٹوں گی کہ مر ہی تو جائیگا۔"

چاچی ہنستے ہنستے لال ہو گئی۔ "ارے یہ نرک میں بھی جوتا چلے گا۔ منی جب تو پشکر کو مار ڈالے گی تو پھر یہ نرک سے کہاں جائے گا۔"

"یہ تب ہی ترک ہی ہیں جاتے گا۔ دیکھ لینا چاچی یہ بڑا کمینہ ہے۔"

"دیکھو ماں پھر میں اسکے ڈھیلا کھینچ کر ماروں گا۔"

"کیا ہو رہا ہے؟" بابوجی نے اپنی چھتری کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"ہندو مسلم فساد" چاچی نے ہنسکر کہا۔ "یہ پشکر منّی کو مار رہا تھا۔"

ڈرپوک پشکر بھاگ بھی گیا۔ چاچی مجھے پیار کرتی لے گئی اور مزے دار دال موٹھ کھلائی۔ چاچی تو جان ہے۔ یہ پشکر ہی کافر ہے۔

دیوالی آئی۔ پشکر کا گھر دیوں سے جگ مگ جگ مگ کرنے لگا۔ میں نے اس سے فوراً ملاپ کر لیا اور دن بھر چراغوں کے لئے بتیاں بٹیں اور کھیلیں اور شکر کے کھلونے کھاتی رہی۔ چاچی بہت چلائی "منّی کی بچی ساری روئی مسل مسل کر گٹھلیاں ڈال رہی ہے۔" مگر میں بھلا کب مانتی تھی۔ شام کو پشکر سجکر نکلا۔ سفید جھاگ سی دھوتی۔ سرخ ململ کا کرتا۔ خوب مانگ پٹی کئے۔ لال لال ٹیکہ لگائے۔ چاچی بھی بنارسی ساڑی پہنے چھاگن جھنکاتی دیوے سنبھالتی پھر رہی تھی۔ پشکر گھر کی ہر چیز کا محافظ بنا ہوا تھا۔ آج وہ کٹر ہندو تھا اور مجھ سے چھوت کر رہا تھا۔ وہی ندیدہ پشکر جو کتنی دفعہ میرے جھوٹے بیر کھا چکا تھا۔ آج مجھے تیوری دور سے پکڑا رہا تھا۔ میرا دل کڑھ رہا تھا۔

"پشکر ہمارے بھی چندن لگا دو۔" میں نے اسے پرانے احسانات یاد دلا کر کہا۔

"نہیں" اس نے غرور سے سر گھما کر کہا۔ "تم بہت دو تھوڑی ہو۔"

"نہیں پشکر اب تو میں ہندو ہوں۔ اماں سے نہ کہنا۔ اچھا۔"

اُسے شاید رحم آ گیا اور اُس نے بڑے اہتمام سے چندن لگا دیا۔

عید پر میں نے بھی ساری کسر نکال لی۔ پشکر کو کافر کہہ کر اُس سے فوراً لڑائی کر لی۔ مگر جب مہندی سے میرے ہاتھ بیر لال ہو گئے۔ تو میں بے چینی سے اُس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ آیا تو میں بے توجہی سے اپنے ہاتھ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔

"آہا منّی کے ہاتھ بڑے لالکتر ہو گئے۔ دیکھیں منّی۔"

میں نے اُس کے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "ہٹو بھئی۔ ہماری تو عید ہے۔ کوئی تمہاری تھوڑی ہے۔ جناب آپ کوئی روزے تھوڑی رکھتے ہیں۔ مسلمان تو روزے رکھتے ہیں تب ہی اُنکی عید آتی ہے۔"

"تو کب روزے رکھتی ہے۔"

"واہ میں ایک ڈاڑھ کا رکھتی ہوں۔"

"اُونھ۔ بڑی رکھنے والی آئی۔ دن بھر تو بکر بکر کھاتی ہے۔ ایسے ایک ڈاڑھ کا میں بھی رکھ لوں۔"

"واہ تم تو ہندو ہو۔" میں نے آخری ترپ لگاتے ہوئے کہا۔

وہ کھسیانہ ہو گیا۔ "تو اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"ہم کل نئے نئے کپڑے پہنیں گے۔" میں نے اترا کر کہا۔

"میں بھی اپنا نیا کوٹ پہنوں گا۔"

"واہ تم تو ہندو ہو۔ تم کیوں پہنو گے۔ ہم تمہیں اپنی سیوئیاں بھی نہیں کھلائیں گے۔"

"اور ہماری دیوالی پر یہ ڈھیر سی کھلیں ٹھونس آئی۔ ہم سے چندن بھی لگوا لیا۔ بابوجی سے کھلونے بھی ٹھگے۔ اور

اب ایسی باتیں کرتی ہے۔ بے ایمان کہیں کی۔"

میں نے فوراً پشکر سے لڑکر اُسے بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ لیکن کپڑے بدلتے ہی مجھے اس پر رعب گانٹھنے جانا پڑا۔

میں گوٹے ٹھپے کے کپڑے پہن کر غبارہ بنی ہوئی جب پشکر کے پاس پہونچی تو اُس کا سارا غصہ رفو چکر ہوگیا۔ اور اُلٹی میری خوشامدیں کرنے لگا۔ مگر میں نے اُسے بار بار سمجھایا کہ وہ ہندو ہے اور اُسے ہماری عید پر خوش ہونے کا کوئی حق نہیں۔

وہ مایوس ہوکر کہنے لگا "اچھا ہم بھی مسلمان ہوئے جاتے ہیں۔ کہنا مت کسی سے۔"

مگر بے ایمان کہیں کا۔ ہولی پر پھر کافر ہوگیا۔ اُسکی بن آئی۔ اور میرے پیچھے لگے رہنے اور خوشامدیں کرنے کے باوجود اُس نے مجھسے رنگ کھیلنے سے صاف انکار کر دیا۔

"تو مسلمنٹی ہے۔" اُس نے کہا۔

"اچھا پشکر۔ عید پر آنا۔ پھر دیکھنا کیسا پیٹونگی کہ یاد کرے گا۔" میں نے سر ہلا کر کہا۔

"تو پھر تو ہندو ہوجانا۔" پنڈت جی نے سر کو بے رُخی سے موڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو مجھے ابرق ملا ہوا گلال تو دو۔"

"تُو تو اُس دن کہتی تھی کہ بدن کے جون جون حصّہ پر رنگ پڑتا ہے وہ دوزخ میں جاتا ہے۔ اب رنگ کیوں مانگتی ہے۔"

"اب میں ہندو جو ہوگئی۔" میں نے قائل ہوکر کہا۔

"ہے۔ بے ایمان ہر دفعہ ہندو ہوتی ہے۔ اور پھر مسلمان ہوجاتی ہے۔ پہلے وعدہ کر کہ ابکے سے مسلمان نہیں ہوگی۔

"اچھا۔"

"اور مجھ سے شادی کرے گی۔ کیوں ہے نا؟"

میں نے یہ آخری شرط بھی مان لی۔ مگر عید تو عید میں محرّم ہی پر مشرف بہ اسلام ہوگئی اور پشکر کو یزید کا بچّہ کہا۔ کیونکہ وہ کافر اور دوزخی تھا۔

یہ پنڈت بھی کیا بھولی ذات ہے اور کشمیری پنڈت خصوصیت سے بس فرشتہ ہوتا ہے۔ ادہر میں پشکر کو مارتی اُدہر وہ ملاپ کر لیتا۔ بُزدل اتنا کہ ذرا سے جو بکرے کٹے تو اُنہیں تڑپتا دیکھ کر رو دیا۔

"ارے تیرے ابّا اتنے بکرے کیوں مار ڈالتے ہیں؟"

اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے پھاڑ کر کہا۔

"ارے بے وقوف یہ تو ثواب ہے۔" میں نے عالمانہ لہجہ میں کہا۔ اور اُس کے رونے کا مذاق اُڑایا۔

"ثواب؟ بکرے کاٹنا ثواب ہے؟"

"ہاں اور کیا۔ جب ہم جنّت میں جائیں گے تو ان بکروں پر سوار ہوکر پل صراط پر سے گذریں گے۔ پشکر ہم تو فٹا فٹ چلے جائیں گے اور تم رہ جاؤ گے۔"

"میں اپنی سائیکل پر چلا جاؤں گا۔"

میں جل گئی۔ "واہ جناب پل صراط بال سے بھی پتلا اور تلوار سے بھی تیز ہے۔ تُو دھڑام سے دوزخ میں گر پڑے گا اور ہم بکروں پر ٹک ٹک کرتے چلے جائینگے۔"

"میں تیرے بکرے پر بیٹھ جاؤنگا۔"

"واہ۔ ہٹ۔ بس میں تجھے ڈھکیل دوں گی۔"

"میں خود تجھے گرا دوں گا۔"

"کیسے گرا دے گا تُو۔" میں نے اُسے تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

ایک چشم زدن میں وہ مجھے چت گرا کر دو جیتیں لگا

چلتا بنا۔

چوڑیاں ٹوٹ جانے سے میرا کلیجہ پھٹ گیا اور ایسی دہاڑی کہ بابوجی اُسی وقت بازار سے چوڑیاں پہنوا کر لائے۔

نہ معلوم کتنی عیدیں اور ہولیاں گذر گئیں۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ خیالات بھی بدل گئے۔ ہم دونوں تو گویا مذہب کی فلاسفی ہی کو سمجھ بیٹھے تھے۔ ہولی پر پشکر آتا اور مجھے رنگ میں شرابور کر دیتا۔ اور ڈھیروں گلال مل دیتا۔ جنم اشٹمی پر اُس نے مجھے کرشن کا ایک مرمریں اسٹیچو دیا جس کے پیروں کے قریب ایک چھوٹے سے فریم میں پشکر کی تصویر تھی۔ تصویر اور مجسمہ دونوں میری میز پر رکھے رہتے اور اکثر میری توجہ کا مرکز بن کر رہ جاتے۔

پشکر بنارس چلا گیا اور میں علیگڈھ۔ ہمارے اسکولوں کی چھٹیاں بھی مختلف زمانوں میں ہوتیں اور اب عید اور ہولی پر بھی ہم دونوں نہ ملتے۔ خدا دسمبر کا بھلا کرے سب کے لئے برابر کے سامان لطف لے آتا ہے۔ میں برآمدے میں لیٹی کچھ پڑھ رہی تھی کہ "مسلنٹی" کی صدا نے مجھے پشکر کے آنے کی خبر دی۔ میں نے "کافر" کہہ کر اس کا استقبال کیا۔ اُس نے میرے منہ پر گلال مل دیا۔

"ارے یہ دسمبر پر ہولی؟" میں نے اسے ڈھکیلتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ یہ گلال میں نے تیرے لئے ہولی پر بچا کر رکھ لیا تھا۔ کیا تو مجھے سیویاں نہیں کھلائے گی؟"

"نہیں۔ تو تو کافر ہے۔"

"اور تو کافرنی۔ تجھے اپنا ہولی والا بچن یاد ہے؟"

"کونسا؟" میں نے چند دھیا کر کہا۔

"اب اتراتی۔ تو نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ مجھ سے شادی کرے گی۔"

"ہٹ۔ بدتمیز۔"

"کیوں بنتی ہے۔"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔

"سنا ہے مسلمنی تم لوگوں پر بڑے ظلم توڑ رہا ہے۔" پشکر میری سانولی (کالی ہی) رنگت پر ہمیشہ ہی چھینٹا کسا کرتا ہے۔

"دلاتی چوہے۔ تو اپنی تو خبر لے۔ سنا ہے فی چوہا ایک آنہ چنگی سے انعام ملتا ہے۔"

میں نے اُسکی گوری رنگت پر حملہ کیا۔

ہندو مسلم فساد کے کچھ ذکر پر میں نے اُس سے کہا۔ "بھاگ یہاں سے بھئی تو ہندو ہے۔ کہیں چاقو واقو نہ مار دے۔"

"تو ہی تو عیبٹی ہے۔ میں تو بیچارا بزدل۔ تو ہی سینکڑوں بکرے ہضم کر گئی۔"

"مگر پشکر تم بکرے نہیں تم تو بیل ہو۔"

اُس نے میرے بازو میں وہ زور سے کاٹا کہ میں تڑپ ہی تو گئی۔

"اگر تو اتنی کلوٹی اُلٹا توا نہ ہوتی تو میں ضرور تجھ سے شادی کر لیتا۔"

"خیر پشکر میں اُلٹا توا تو نہیں ہوں۔"

"تو آپکا مطلب یہ ہے کہ آپ سے شادی کر لوں۔ جی؟" اُس نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

"چپ کافر۔"

"جانتی ہو شعر اپنے کافر کسے کہا ہے؟"

"وہ کافر اور ہوتا ہے۔ تو تو گدھا ہندو ہے۔"

"کیا ہندو اور مسلمان گدھے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔"

اور یہودی گدھے کیسے ہوتے ہیں۔"

ہم مختلف مذاہب کی مناسبت سے گدھوں کی اقسام پر بحث کرکے ہنسنے لگے۔

زمانہ گزرتا گیا۔ پشکر ڈپٹی کلکٹر ہوکر ہمارے قریب کے ضلع میں تعینات ہوگیا۔ اُس کی موٹر اتوار کے دن کھس ڈالی جاتی تھی۔ اُس نے کئی بار مجھے اپنا ہولی کا بچپن یاد دلایا لیکن میں نے اُسے بے تکی بات کہہ کر زبان سے نکالنے کو بھی منع کیا۔

"آخر کیا تو مجھے یونہی ڈراتی رہے گی۔ میں آج ماں سے ذکر کروں گا۔ چاہے پھر غدر ہی کیوں نہ ہوجائے۔ ڈرپوک کہیں کی۔"

"پشکر بڑے جوتے پڑیں گے۔ یاد رکھو ابا پیٹ پھاڑ دیں گے۔"

"اجی ان باتوں سے نہیں ڈرتا۔ لیکن یہ تو سوچو کہ آخر کب تک یہی سوچتے رہیں کہ آسمان سے ہماری مدد کو کوئی آئے۔"

"پشکر یہ تو سوچو ہم اور تم کس قدر معیوب بات کر رہے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک خلیج حائل ہے۔ مذہب!"

"اجی گولی مارو اس مذہب کو۔ مذہب ہمارے فائدہ کے لئے ہے نہ کہ ہم اُس کی قربانی کے لئے۔"

"تم ابا جان اور چاچا کی دیرینہ محبت کو دیکھو۔ کی جو بات شہر میں ہے اُس پر غور کرو۔ ہماری شادی سے اُن کی کیسی ذلت ہوگی۔ اخبار جنہیں کوئی ڈھنگ کا موضوع نہیں میسر ہماری تصویریں۔ ہماری عشق بازی اور موجودہ تعلیم کی وہ درگت بنائیں گے کہ جینا دشوار ہوجائے گا۔ غیر مذہب میں شادی کرنا جرم ہی نہیں بلکہ ایک آفت ہے۔ ہماری قوم کے لڑکوں کو تو اجازت ہے کہ وہ ہندو۔ عیسائی جس سے چاہیں شادی کرلیں لیکن لڑکیوں کو نہیں۔ اور آج تک فخر سے کہا جاتا ہے کہ مسلمان لڑکی کبھی عیسائی سے شادی نہیں کرتی۔ نہ معلوم کہاں تک یہ فخر بیجا ہے۔"

"لیکن میں مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ دوسرے مجھے یہ تمہاری شرط منظور نہیں۔

"چونکہ میرے لئے تمہارے مسلمان ہوجانے سے کوئی فرق نہ ہوگا۔ تم جب بھی اتنے ہی پاجی رہو گے۔ پسند سے اور مذہب سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔"

"تو پھر تو ہندو ہوجا۔"

"ذرا سوچ سمجھ کر بات کر۔ ابھی جو میں کہدوں کہ مجھے مرتد بنا رہا ہے تو محلے کے سارے قصائی تیری بوٹیاں کر ڈالیں۔ دوسرے اگر ہوجاؤں تو پھر ربڑ کی ناک بھی نہ سلامت رہے۔"

"ہم غلام ہیں۔ پشکر ہماری کوئی چیز ہماری کہلائی جانے کی مستحق نہیں۔ ہم سوسائٹی کی ملکیت ہیں۔ وہ جو کچھ چاہے ہمارے ساتھ کرسکتی ہے۔ ہم اگر چاہیں تو بھی کچھ نہیں کرسکتے۔"

"یہ سب واہیات ہے۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہارے بھائی جو ایک بیوی کی موجودگی میں میم لے آئے۔ وہ عیسائی ہے برابر میں نے اُسے گرجا جاتے دیکھا۔ اور تمہارے بھائی صاحب کو بھی۔"

"پشکر وہ میم ہے اور تو پنڈت۔ اور میں بقول تیرے مسلمنٹی۔ بس لگالے حساب۔"

پشکر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ "میں اس سوسائٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا سُنتی ہو۔ ہم آج ہی سول میرج کرلیں گے۔"

"خواہ مخواہ بکنے سے کیا حاصل۔ تم جانتے ہو ابا کو کسقدر صدمہ ہوگا اور تمہاری برادری تمہارا حقہ پانی بند کردے گی"

"پھر کیا کریں۔ سچ بتا کہیں تو اُس با جی حمید سے تو شادی نہیں کر رہی ہے۔ اور مجھے چکمے دے رہی ہو۔ یاد رکھ اسقدر پٹواؤں گا خاں صاحب کو کہ بھول جائیں گے اور علاقہ الگ کورٹ کرالوں گا۔ دیکھ۔ اگر ہم یوں ڈرتے رہے تو بس ہو چکی زندگی"

"تو تو سچ مچ پاگل ہی ہے۔ سوچنے تو دے۔ شاید خدا کوئی راہ بتا دے"

"اب بتا چکا خدا راستہ۔ میں جو بتا رہا ہوں۔ کوتوالی کے قریب سے ہوتے ہوئے داہنے ہاتھ کو نکل چلو۔ وہاں سے بس بڑی سیدھی سڑک ملجاتی ہے"

"اور پھر وہاں سے واپس آکر ابا کا جوتا"

"واپس کیوں وہاں سے سیدھے دور سے پہنچ گئے"

"تو یہ مشہور ہوجائے گا کہ میں بھاگ گئی"

"نہیں بلکہ میں تیرے ساتھ بھاگ گیا۔ اٹھ۔ جلدی ہاں۔ تجھے کچھ مہر وہر کیا ہوتا ہی۔ وہ چاہیئے میں رجسٹری کرا دوں گا"

"مہر میں خود تجھے دوں گی۔ میری تنخواہ تجھ سے ذراسی ہی تو کم ہے"

"اچھا اٹھ تو ہی مہر دے"

"مگر جب جی چاہے گا طلاق دیدیں گے"

"یہ جھول ہے۔ تو تو ہر وقت لڑتی رہتی ہے۔ گھڑی میں سات طلاقیں دے گی۔ چل جلدی سے ساڑی بدل لے"

"اور ربڑ کی ناک؟"

"ٹھیک ہے۔ بڑی ستواں سی دلا دیں گے۔ یہ تو ویسے بھی بالکل چپٹی ہے"

"تو میں نہیں چلتی" میں نے دروازہ کو پکڑ کر کہا۔

"اپنے بس نہیں چلے گی" اُس نے گھسیٹتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم کوتوالی کی سڑک پر سیدھے ہاتھ کو بڑی سیدھی سڑک پر جا رہے تھے۔

"اب بھی لوٹ چلو" میں نے پلٹ کر کے کان میں کہا۔

"سچ مچ" اُس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"میں نے سر ہلا دیا۔ خدا جانے نفی میں یا اثبات میں۔ اور پلٹ کر نے گردن پکڑ کے مجھے جھکول ڈالا۔

"کافر" میں نے اُس کی کلائی میں ناخون گڑو کر کہا۔

"شاعروں والا"

میں نے سر ہلایا۔ لیکن اسدفعہ اثبات میں۔

* * * * * * *

* * * * * * *

عصمت چغتائی

وہ

وہ عرصہ دراز کے بعد اپنے وطن کو لوٹا۔ آوارہ مزاج انسان دُنیا کی رسدگاہوں میں اپنے ستاروں کی گردش دیکھتا پھرا۔ تعلیم یافتہ دل چلا جوان ہنگامی زندگی کے ولولوں میں اُلجھا ہوا لمبا کوٹ اور میلا کُچیلا پاجامہ پہنے آزادانہ طور پر زندگی کی تنگ راتیں گزار رہا تھا۔ اس کی مُنتشر زندگی کا بیشتر وقت شہر کے بڑے قہوہ خانہ میں گزرتا جہاں وہ آنے جانے والوں سے زندگی کی گہرائیوں کے متعلق تبادلہ خیالات کرتا۔ وہ آزاد خیال تھا اور لوگوں کو بھی ذہنی غلامی سے دُور رہنے کی تلقین کرتا۔ یہی اس کا ایک شغل تھا جسے وہ فرض کے برابر سمجھتا ـــــ اکثر لوگ اسے دیوانہ کہہ کر پکارتے تھے۔

شہر میں اس دیوانے کا چرچا ہو گیا۔ بات اُڑتی اُڑتی قانون کے خداؤں کے کانوں تک پہنچی۔ قانون کی تنگ نظر نے اس کی دیوانگی کو مشتبہ قرار دیتے ہوئے بغیر کسی پرسش کے ایک سال کیلئے قید خانہ میں دھکیل دیا۔

ـــــ آج اس کی تنگ زندگی کا پہلا دن۔ قیدیوں کی آہنی زنجیروں کی جھنکار، کولھوں میں جُتتے ہوئے بے گناہ انسانوں کی دردناک صدائیں، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پستی ہوئی چکی کی دلخراش آواز، تیمارداری سے محروم نظربندوں کی بے زبانی ـــــ یہ تھا اس کا ماحول!

اُسے محسوس ہوا کہ راندۂ حیات انسانوں کی آلودہ زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ جھنکار خانہ بہترین درسگاہ ہے۔ اس نے اپنے بھائیوں سے گفتگو کرنا چاہی مگر داروغہ جیل نے اسے زبان بندی کا حکم سُنا کر اس کی زندگی کو قطعاً خاموش بنا دیا۔ اسے بھی مُشقت کے طور پر رسّی بٹنے کو مل گئی ـــــ

شام ہونے پر اس نے تقدیر کے بیٹوں کا ایک نیا گروہ دیکھا۔ یکایک داروغہ جیل کے ہمراہ ایک چپراسی نے بند کوٹھڑیوں کے دروازے کھولنا شروع کئے۔ زرد رُو انسان، گردنیں لٹکائے کھانستے ہوئے باہر نکلے۔ پندرہ منٹ کے بعد ان کی دُھندلی نگاہیں ستاروں بھرے آسمان سے محروم کر دی گئیں اور انہیں گھوڑوں کی طرح علیحدہ علیحدہ تنگ و تار اصطبل میں بند کر دیا گیا۔

"شاید یہ بھی بری طرح بے گناہ ہیں! ـــــ" اس کے خشک لبوں پر ایک دبی ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوئی ـــــ وہ برابر اپنے فرض میں مصروف تھا۔ استبداد کی رسّی دن بدن دراز ہوتی گئی ـــــ

کئی بار کام غیر تسلی بخش ہونے کی وجہ سے ننگی پیٹھ پر کوڑے پڑے۔ حکم زبان بندی کی خلاف ورزی کرنے پر متعدد بار اس کے ہاتھ پاؤں آہنی زنجیروں کی امانت کر دیئے گئے۔ ان آہنی زنجیروں کی جھنکار ایک بے گناہ محبوس انسان کی جذبۂ انصاف کے آگے فریاد تھی ـــــ

کامل ایک سال بعد اُسے انسانوں کے پنجرے سے باہر نکالا گیا ـــــ وہ سراپا بگولا بن چکا تھا۔

وہ سیدھا قہوہ خانہ گیا۔ اس کی لمبی ڈاڑھی، بیمار آنکھوں اور شکستہ جسم کے باعث لوگ اُسے جلد شناخت

کبھی نہ کر سکے۔ ہڈیوں کا یہ رُوح دار ڈھیر سماج کے روندے ہوئے انسانوں کی روداد غم بن کر آیا تھا۔ وہ ایک فلسفی تھا جس نے اپنے پُرسوز دلائل سے بہت سے ہم خیال پیدا کرئے ——— بے زبان، محبوس انسانوں کو ایک آزاد طاقتِ گویائی دلانے کے لئے بھلے انسانوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا۔

جلسے ہوئے تقریریں ہوئیں۔ صحیح حالات معلوم کر کے عوام کا جسم آتشِ انتقام سے جھلسنے لگا۔

قانون نے اپنی بازی کھیلی۔ اس گروہ کے تمام افراد اس کی آہنی گرفت میں تھے۔ مظلوموں کے جذبات کی کھلے بندوں وکالت کرنے والے اب اسی چار دیواری میں مقید کر دیئے گئے ——— پُرخار قانون نے انسانیت کے پاک جسم پر سوزاں آبلے بکھیر دیئے۔

——— اُس پر بغاوت کا جرم عائد کیا گیا۔ عوام کی ظاہرا دلجوئی کرنے والے قانون نے اس کی زندگی کو ریاست کے امن و امان کے لئے خطرناک جراثیم قرار دیا۔

دوسرے ہی دن صبح نور کے تڑکے وہ موت کے سرد ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا ——— یہ قانون کی آخری مسکراہٹ تھی۔

عوام انتقام کی آگ لے کر اُٹھے اور اُنہوں نے قانونِ استبداد کے دیوانوں کو بھڑکتے ہوئے شعلوں میں بدل دیا ———

مظلوم انسانوں کی فاتح نگاہوں نے دیکھا کہ دُور افق پر ایک چمکتا ہوا سُرخ نشان اُنہیں فتح و نصرا اور ابدی راحت کا پیغام دے رہا ہے۔

——— کے حسن عباس

صدائے غم

ہم نندہ بس سروس سے کشمیر جا رہے تھے ــــــ

اباجی ہمیں رخصت کرنے آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ عنقریب ہمیں اس پُرفضا وادی میں آن ملیں گے۔ صرف کشمیر کی دلکشا رنگینیوں کے تخیّل ہی سے راستہ میں ہمارا دل لہرا رہا تھا۔ پتھریلی زمین سے لپٹتا ہوا خوشنما سبزہ، خود رو پودے اور کھل کھلاتے ہوئے چشمے ہماری نگاہوں میں مسرت کی جنتیں آباد کر رہے تھے۔ ان پُرلطف اور دلفریب نظاروں نے ہمیں دُور و دراز سفر کی تکان اور تلخی ذرا بھی محسوس نہ ہونے دی، اور ہم ہنستے کھیلتے فطرت کے اس بڑے مندر میں پُجاریوں کی طرح داخل ہو گئے ــــــ

اس پُرفضا وادی کی عطر بیز رنگینیوں نے ہماری زندگی کے دامن کو مسکراہٹ سے بھر دیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم دُکھ درد کی دُنیا سے بہت دُور نکل آئے ہیں ــــــ ہمیں اپنا ماحول متبسم نظر آتا تھا۔

اب ہونی کی باری آئی۔ بیٹھے بٹھائے ہمیں اباجی کی تشویش ناک علالت کا تار ملا۔ لمحہ بھر ایسا محسوس ہوا کہ زمین نے اپنے محور سے ہٹ کر گھومنا شروع کر دیا ہے۔ ہماری رُوح کانپ گئی اور ہاتھ پاؤں موت سے کہیں زیادہ بھاری ہو گئے۔ کوئی نہ تھا جو ہمیں سنبھلنے کی تلقین کر سکے۔ اسی لرزاں حالت میں ہم نے پل بھر میں واپسی کی تیاری کر لی۔

سفر میں وہی نظارے اب کاٹتے دکھائی دینے لگے۔ چشمے ایک بیوہ سہاگن کے آنسوؤں کی طرح اُبل رہے تھے۔ پودے اور بڑے بڑے جنگلاتی درخت ہمیں سنگ دل زمین کی چھاتی پر گڑے ہوئے کیل کانٹے معلوم ہونے لگے ــــــ زمین جس کی گودی میں ہزاروں لعل اور کئی دُکھی جوانیاں دُنیا والوں سے روٹھ کر سُکھ کی نیند سو رہی ہیں۔ جب یہ زمین ان کچی نیند کے ماتوں کو لوری دیتی ہے تو دھرتی کانپ جاتی ہے ــــــ

میرا دل رو رہا تھا اور بار بار آسمان کی طرف آبدیدہ نگاہوں سے دیکھ کر آسمان والے سے اباجی کی پاسبانی کی التجا کرتی۔ دعائیں میرے دل سے درد کی طرح اُٹھتیں اور آنسوؤں میں بہتی ہوئی جا رہی تھیں۔ وقت کی اُڑان کے ساتھ ساتھ ہمارے چہروں پر غم کی زردی چھاتی گئی۔ اسی طرح لٹکتے، خشک لبوں پر دعائیں لئے ہم اباجی کے پاس پہنچ گئے ــــــ

اباجی ــــــ زندگی کی مُنہ بولتی تصویر بیماری کے چھینٹے سے زرد ہو رہے تھے۔ ان کے جسم میں زہریلا مادہ پیدا ہو گیا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کی بھوری بھوری آنکھیں آنسوؤں سے چھلکنے لگیں۔ اس کیفیت نے ہمارے ٹوٹے ہوئے دلوں کو سراپا درد سے معمور کر دیا۔

وقت کی اُڑان کسی کے قابو میں نہیں ہوتی۔ ہر نئی گھڑی اپنی زندگی کے دروازے سے دُور لئے جا رہی تھی۔

پندرہ دن تک وہ برابر اپنی بیماری سے لڑتے رہے۔ ہمارے ہاتھ بار بار آسمان کی طرف اٹھے لیکن کانپ جاتے، آہیں اوپر اٹھیں لیکن ڈبڈبا کر رہ گئیں۔ ہمیں وقت کی چپّی نے ایک انتہائی جذبہ سے پسینا شروع کر دیا۔

ابّا جی کی جوانی کو بیماری کا گھن لگتے دیکھکر میرا دل غم خانہ بن چکا تھا۔ ان کی نگاہوں کا رنگ بدلتا دیکھ کر دنیا بدلتی جا رہی تھی۔ ان کی آنکھیں زندگی اور موت کی کشمکش سے تھک گئیں تھیں اور زندگی بھی اب ہار کر موت سے پناہ مانگ رہی تھی۔ یکایک ان کی پتلیوں نے حرکت کی —— آخری حرکت شاید وہ موت کے بھیانک سائے سے ڈر گئی تھیں —— ابّا جی کی زندگی کا آخری سانس قضا نے چھین لیا۔

—— ابّا جی چل دیئے۔ ہماری نظراب ہمیشہ کے لئے ان نگاہوں سے محروم کر دی گئی جن میں کبھی ہم محبت کی جنّت تلاش کیا کرتے تھے۔ قدرت کی مسکراہٹ کتنی ستم آمیز ہوتی ہے۔ کھیلتے ہوئے بچّوں سے گودی چھین کر قدرت خوش ہوتی ہے۔ وہ شاید نہیں جانتی کہ اس کے اس ننھّے سے کھیل پر زندگی کی کتنی بہترین آشائیں بھینٹ ہو جاتی ہیں۔

—— ہماری زندگی بادِ غم کے لُو آمیز جھونکوں سے زرد پتیوں کی طرح اِدھر اُدھر لڑکتی پھرتی ہے۔ قدرت کی ایک ہی مسکراہٹ نے ہمیں اپنے دامنِ خزاں میں سمیٹ لیا —— نجانے اب کب بہار آتے!

زکیّہ خاتون!

مژدہ

مژدہ اے دل! کہ وہ خوش رنگ جواں آتا ہے
زلف بردوشِ گلِ عطر فشاں آتا ہے

خوش ہو اے عشق! کہ وہ پیکرِ حسنِ رخشاں
کچھ لجائے متبسّم نگراں آتا ہے

جھوم اے باغ! چہک، بلبلِ نالانِ چمن
اے کلی! پھول ہو، وہ سروِ رواں آتا ہے

اے جنوں! وجد میں آ، ابرِ خراماں ہو جا
موجۂ برقِ نظر، جوہرِ جاں آتا ہے

رقص کر نغمۂ ساکن پہ ادائے رنگین
اے نفس! تیز ہو، طنازِ بتاں آتا ہے

ناچ اے روح! ابل اے مئے دیرینۂ جمال
دور اے زہد! وہ ساقیِ جناں آتا ہے

شکر ہے شکر کہ پھر رنگ کدے میں کاوش
طرۂ کج کلہاں، فخرِ جہاں آتا ہے

[illegible]

مقابلہ

نوعمر و خوبرو اسپراس کا وہ پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرتے پھرنا ایک ہوش رُبا منظر تھا۔ میں نے شرافت کی اوٹ میں اُس کو دیکھنا شروع کیا اور اُس نے بیباک نگاہوں سے اُس کا جواب دیا۔ بہت سے نوجوان اُسکو گھور رہے تھے۔ کسیکو دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کا میں قائل نہیں۔ دیکھنا اس طرح چاہیئے کہ کوئی یہ سمجھے گویا آپ دیکھ ہی نہیں رہے ہیں۔ اور اس نہ دیکھنے میں آپ سب کچھ دیکھ لیں۔

وٹینگ روم میں سے لوگ نکل پڑے اور بہت سے مسافر اپنا سامان قُلی صاحبان کی نیم ایماندارانہ نگرانی میں چھوڑ چھوڑ کر اِدھر آ کر ٹہلنے لگے۔ جب مجمع بڑھنے لگا تو اس نے اپنی شوخیوں میں سنجیدگی پیدا کر لی اور جن فریب خوردہ خوش نصیبوں کی اب تک نگاہی پذیرائی کی جا رہی تھی ان کو مایوس کیا جانے لگا۔ ایک طرف سے احتجاج اور ایک جانب سے تغافل۔ بہت سے بیکار سگریٹ پیئے گئے۔ بہت سی بیسود لیمن کی بوتلیں خالی کی گئیں۔ بیشمار بار بُک اسٹال کے عبث طواف کئے گئے۔ درلاتعداد دفعہ بے نتیجہ پلیٹ فارم پر ٹہلا گیا۔ اتنے میں گاڑی آ گئی اور ایک ویران خطہ کیطرف مسافروں کو لے کر چلدی۔

خاتون انٹر کلاس میں تنہا بیٹھی تھی۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا اور گاڑی درمیانی رفتار سے چل رہی تھی۔ دفعتہً دروازہ کُھلا اور چلتی گاڑی میں ایک شخص اس ڈبّہ میں داخل ہوا۔ اُسکی آنکھوں سے عزائم ذمیمہ کے شرارے نکل رہے تھے۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ حسینہ کی شوخیوں کے پیدا کردہ اشتیاق کو اس کے حضور میں پہنچکر فرو کرنے کا وہ تہیہ کئے ہوئے ہے۔ وہ بغیر کچھ کہے اس کے بہت قریب بیٹھ گیا۔ اور بہیمانہ ملاعبت کے ساتھ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ عورت نے اپنی جگہ سے جست کی اور زنجیر کو کھینچنا چاہا۔ لیکن صیاد نے اسکو پھر جا دبوچا۔ چند سیکنڈ تک آندھی اور پرِکاہ کا مقابلہ ہوتا رہا ———— لیکن یہ آندھی جلد ہی ختم ہو گئی۔ ایک بار اور دروازہ کُھلا اور ایک بلند و بالا قد انسان اس میں داخل ہوا۔ اُس نے آتے ہی اس شیطان کی گردن ناپلی۔ چند منٹ تک دونوں کی کشتی ہوتی رہی آخر مجرم مغلوب ہو گیا۔ لیکن موقع پا کر چلتی گاڑی میں سے کود کر فرار ہو گیا۔

فاتح نوجوان نے چند منٹ تک اپنا سانس درست کیا۔ اس کے بعد مسکرا کر عورت کی جانب دیکھا جس کی نظریں پہلے ہی تشکر و امتنان کے ہدائے اس کو پہنچا چکی تھیں۔

"آپ کے کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟"

"آپکی حسین ہستی کے لئے جان بھی کام آتی تو کم تھا"

یہ کیا؟ عورت نے دل میں سوچا۔ آپ ہماری خاطر جان دینے والے کون۔ خیر وہ چُپ چاپ بیٹھی رہی۔ رستمِ زماں اُس کے اور قریب ہو گئے اور بولے "میں سچ کہتا ہوں تمکو پلیٹ فارم پر دیکھتے ہی میرا دل اپنے قابو میں نہ رہا۔ تم کتنی حسین ہو"

عورت نے اپنے حسن کی تعریف کے الفاظ تو صبر سے سن لئے لیکن اگلے فقرہ سے اس کا دل دھکڑ دھکڑ کرنے لگا۔ یہ نئی بلا معلوم ہوتی ہے۔ اگلے بدمعاش میں اور اس شریف بدمعاش میں فرق ہی کیا تھا۔ اس نے آتے ہی مقصد گوئی شروع کر دی تھی اور یہ صاحب ذرا تمہید سے کام فرما رہے تھے۔

"تم بولتی کیوں نہیں۔ کیا مجھ سے ڈرتی ہو؟"

"میں آپکی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"مطلب تو بالکل صاف ہے۔ میں تم پر مرتا ہوں اور تم کو اپنے پہلو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"یہی مقصد تو اُس غریب کا تھا جسکو ابھی آپ نے مار کر بھگایا ہے۔ آخر اس کے لئے آپ نے اس چیز کو کیوں نہ روا رکھا اور اپنے لئے کیوں واجب گردان لیا؟"

"یہ فضول باتیں ہیں۔ ہم کو دنیا میں اپنے ہر مقصد کے لئے لڑنا پڑتا ہے چنانچہ یہ جنگ بھی اسی قسم کی تھی۔"

"لیکن میں تو مجبور نہیں کہ آپکو چاہوں۔"

"کیوں میرے اس احسانِ عظیم کا تمہارے پاس کیا صلہ ہے؟"

"آپ کا احسان ہی کب رہا جبکہ آپ بھی میرے لئے پہلی جیسی مصیبت بنکر آئے ہیں۔"

"میں مصیبت ہوں کہ رحمت؟"

انسان سے یوں لغزشیں سرزد ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے اغلاط کا محاسبہ کرنے کی عادت ترک کر دیتا ہے۔ گناہ کرتا ہے لیکن اس کے وزن کا خیال نہیں کرتا۔

"لیکن یہ آپکا مطالبۂ محبت تو سراسر ناجائز ہے۔"

"ناجائز؟ یہ تو میرا حق مردانہ ہے۔ ایک مرد ایک عورت سے اور طلب ہی کیا کر سکتا ہے۔"

"یہ عجیب زبردستی ہے۔"

"زبردستی تو ہے ہی۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن میں ہم کو طاقت سے کام لینا پڑتا ہے۔"

"خاص طور پر عورت کے معاملہ میں تو آپ لوگ ہمیشہ اسی اصول پر کار فرما رہتے ہیں۔"

"اچھا اب اس کج بحثی کو چھوڑو۔" یہ کہہ کر اس قوی آدمی نے نازک عورت کو پھول کی طرح اٹھا لیا ——

گاڑی کا دروازہ ایک بار پھر کھلا اور ایک نوجوان قوی ہیکل۔ ٹی۔ ٹی۔ ای۔ ڈبہ میں داخل ہوا۔ یہاں کے منظر نے بہت جلد اسکو اپنے فرض سے سُبکدوش کر کے دوسری جانب مائل کر دیا۔

غدار نے بھی ٹی۔ ٹی۔ کو دیکھا اور عورت کو چھوڑ کر وہ اُس پر پل پڑا۔ برابر کی جوڑ تھی خاصی کشتی رہی۔ کئی منٹ کی ریل پیل کے بعد نوجوان ٹی ٹی مجرم کو کھڑکی کے باہر دھکیل دینے میں کامیاب ہو سکا۔

اس ایک ہی قسم کے دوسرے سین کے بعد حسینہ منتظر تھی کہ یہ رستمِ ثانی اب کتنی دیر بعد اپنا "حقِ مردانہ" جتاتے ہیں۔ نوجوان کے سر میں خفیف سی چوٹ آئی تھی جس سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس نے رومال سے خون صاف کیا اور عورت سے ایک بالکل ہی مختلف لہجہ میں مخاطب ہوا۔ ایسے غیر متعلق لہجہ میں جو اُس نے پچھلے دونوں مردوں کی زبان سے نہیں سُنا تھا۔

"آپ تنہا سفر اس ڈبہ میں کیوں کر رہی ہیں چلئے میں آپکو زنانہ گاڑی میں بٹھا دوں۔"

"بہتر ہے اگلے اسٹیشن پر میں چلی جاؤنگی۔" نوجوان عورت کے پاس سے ہٹ آیا اور آخری سیٹ پر بیٹھ گیا۔

سر کھڑکی سے باہر نکال لیا اور اس مایۂ حُسن کو جس کے لئے ابھی دو مرد لڑ چکے تھے اس طرح نظر انداز کر دیا گویا وہ ڈبہ میں تھی ہی نہیں۔

یہ نئے قسم کا انسان معلوم ہوتا ہے۔ حسینہ نے دل میں کہا۔ ایک مستغنی انسان۔ اس نے اس عورت سے اس چیز کا مطالبہ کیوں نہیں کیا جسکو چند منٹ پیشتر دو مرد طلب کر چکے تھے! کیا تین مردوں میں ایک مرد ابھی اس قسم کا باقی ہے جو عورت کے ساتھ تخلیہ میں خلوت گزیں اثرات کی نفی کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ کیا ۳۳ فیصدی مرد ابھی دُنیا میں ایسے موجود ہیں جو اپنے "حق مردانہ" کو نہیں سمجھتے! اُمید افزا اعداد ہیں، لیکن یہ عورت سے اجتناب تقدس کے سلسلہ میں مرد نیکے اندر ہے یا جنسی کمزوری کے باعث۔ کیا بہیمیت کے علاوہ دنیا میں تزہد کی نورانیت بھی موجود ہے۔ اگر ہے تو ابھی دُنیا کے تباہ ہونے کے امکانات کم ہیں۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

قیسی رامپوری

نغمات

تھی یہ دُنیا کہانیاں تیری	یاد ہیں مہربانیاں تیری
نہ گئیں سر گرانیاں تیری	آج یہ مہربانیاں تیری
اُف یہ ہمدردیٔ خطابِ کلام	کیا ہوئیں بدزبانیاں تیری
اب فضاؤں میں اک کسک سی نہیں	مٹ چلی ہیں نشانیاں تیری
رنگ گرویدگیٔ عشق کھلا	آہ یہ شادمانیاں تیری
موسمِ گل میں یہ اُبھار کہاں	اُف یہ اٹھتی جوانیاں تیری
وقفِ غمہائے روزگار ہے دل	کیا ہوئیں پاسبانیاں تیری
شامِ ہجراں سکوت ہستی کو	یاد ہیں خوش بیانیاں تیری
حیرتیں ہیں خلوصِ عشق کو بھی	نہ گئیں بدگمانیاں تیری
عشق بیگانہ وفا پر بھی	کیوں نہیں مہربانیاں تیری
شامِ ہجراں سُنا گئی اکثر	اہلِ غم کو کہانیاں تیری
عشقِ ناکام کو بھی وجد آیا	مرحبا شادکامیاں تیری
جب زمان و مکاں کو نیند آئی	یاد آئیں کہانیاں تیری
حُسن بیگانۂ تغافل ہے	یہ بھی ہیں خوش گمانیاں تیری

اب وہ بے تابیٔ فراق نہیں
یہ بھی ہیں مہربانیاں تیری

مرزا برق سوکھپوری

صبح بنارس

شب تاریک چلی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی
صبح کے خوف سے ڈرتی ہوئی گھبراتی ہوئی

چور کی طرح دبے پاؤں چلی بادِ صبا
ہر قبائے گل نوخیز کو مسکاتی ہوئی

آئی گردوں سے دھندلکے میں عروسِ شبنم
موتیوں کو سمن و سبزہ پہ بکھراتی ہوئی

جل بجھی شمع ہوئی رات کی محفل خاموش
بزم تاروں کی چلی آنکھوں کو جھپکاتی ہوئی

اڑ چلی نکہتِ گل چھوڑ کے دامن گل کا
بادِ سرشار چلی جھومتی اتراتی ہوئی

جلوہ گر صبح بنارس ہوئی رفتہ رفتہ
شب کا آنچل رخِ پرنور سے سرکاتی ہوئی

دور اندھیرا ہوا تقدیر کھلی گنگا کی
ٹکڑیاں آئیں حسینوں کی ستم ڈھاتی ہوئی

لقرئی شانوں پہ بکھرائے ہوئے بال کوئی
قلزمِ حسن کی ہر لہر میں لہراتی ہوئی

ذرے ذرے کو تبسم سے بناتی رنگین
بجلیاں چشم فسوں ساز سے برساتی ہوئی

کوئی انگڑائیاں لیتی ہوئی بدمستی میں
ساغر عشق سے مئے حسن کی چھلکاتی ہوئی

اپنی گستاخ اداؤں سے الجھتی ہردم
خود بہکتی ہوئی دنیا کو بھی بہکاتی ہوئی

کرنے اشنان کوئی کھول کے جوڑا آئی
کوئی ساحل پہ کھڑی رنگی شرماتی ہوئی

بھیگے کپڑوں میں جو عریاں ہوئے جسم سیمیں
بجلیاں بھرنے لگیں ابر میں گھبراتی ہوئی

کوئی کھولے ہوئے بالوں کو چلی گنگا میں
نکلی پانی سے کوئی زلفوں کو سلجھاتی ہوئی

چلی ہر ایک نہا دھو کے خراماں آخر
موتی ان بھیگے ہوئے بالوں سے برساتی ہوئی

ہو گیا جلد ہی روپوش یہ رنگیں منظر
آنکھوں آنکھوں میں نظر رہ گئی للچاتی ہوئی

علی احمد

چند مشاہدات

ایک ”رومانیت“ بھرے بزرگوار جنہوں نے نامِ خدا زندگی کی صرف ساٹھ بہاریں ہی دیکھی ہیں، اپنی خزاں کو بہار کا سلسلہ دے کر ”ساتویں“ مرتبہ گھر بسانا چاہتے ہیں، ماشاء اللہ سے آپ بالکل ”صحیح سالم“ ہیں، البتہ کسیقدر لرزہ براندام رہتے ہیں، لقوہ سے منہ کچھ ٹیڑھا ہو گیا ہے مگر منہ میں دانت نہ ہونے سے بدنمائی پیدا نہیں ہوئی ہے، بصارت کی کمزوری آپ کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے، مگر عمر کے بڑھنے سے ”بصیرت“ بڑھ گئی ہے، کانوں سے برابر سنائی دیتا ہے صرف چلانا پڑتا ہے۔

آپ کے کئی عدد چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں ہیں، سب سے بڑے لڑکے نے پچھلے مہینہ چالیسویں برس میں قدم رکھا ہے، اور سب سے چھوٹی لڑکی چوبیسویں سال میں کھیل رہی ہے، ان سب کو آپ نے ”اعلیٰ تعلیم“ دلائی ہے بڑا لڑکا انگریزی میں تار کا مضمون اچھی طرح سمجھ لیتا ہے۔ اُردو تو ”پدری“ زبان ٹھیری! اسمیں سبکو مہارت تامہ حاصل ہے البتہ بعض ”پیچیدہ“ الفاظ کے املا میں ایک آدھ حرف کی غلطی ہو جاتی ہے، جیسے آم کو ”ع“ سے، سلام کو ”ص“ سے صبح کو ”س“ سے، اور عقل کو ”الف“ سے بھی لکھا جاتا ہے، انگریزی لکھنے کا کام نہیں پڑتا، اس لئے اس کی املا میں کسی غلطی کا امکان ہی نہیں! بولنے میں عادت نہ ہونیکی وجہ سے ذرا تکلف ہوتا ہے۔ اسلیئے ”یس“ اور ”نو“ پر ہی گفتگو ختم ہو جاتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان لڑکوں کی ”تربیت“ کی طرف بھی پوری پوری توجہ کی گئی ہے اور بڑی کوشش سے ان میں ”اعلیٰ کردار“ اور ”بلند اخلاق“ پیدا کئے گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ آجکل کی ”شریف“ صحبتوں میں دن رات گھنٹوں بیٹھے ”اعلیٰ درجہ کے“ ”مہذب“ کھیل مثلاً برج، پوکر، فلاش وغیرہ میں جی کھول کر حصہ لیا کرتے ہیں، موسمی تفریحات مثلاً گھڑ دوڑ اور بارش کے سٹہ پر کبھی تھوڑی بہت ہار جیت ہوا کرتی ہے، ایسے موقعوں پر ”ایک گونہ بیخودی“ پیدا کرنیکے لئے ”بنت عنب“ کو بھی دعوت دیجاتی ہے، ”ولایتی“ سے زیادہ رغبت ہے، کیونکہ ”دیسی“ صحت کو بگاڑ دیتی ہے، جب ”یہ مس صاحبہ“ جلوہ گر ہوتی ہیں تو سارا گھرانا ان کے عشوہ و ادا کی کافرماجرائی پر مرمٹتا ہے یہاں تک کہ پدر عالی مقام بھی انکے حسنِ جہاں سوز سے اپنی بے نور آنکھیں سینک لیا کرتے ہیں۔

بچوں کی ”سعادت مندی“ کا یہ عالم ہے کہ اباجان کتنا ہی خفا ہوں خاموش رہتے ہیں، کبھی غصہ آتا ہے تو صرف ”ڈیام فُل“ وغیرہ کہہ دیا کرتے ہیں، اس قسم کے انگریزی لفظ جب بچوں کے منہ سے پھول بن کر جھڑتے ہیں تو والد ماجد پھولے نہیں سماتے اور فرماتے ہیں ”بچہ اب اچھی انگریزی بولنے لگا ہے!“

لڑکیوں کی لیاقت لڑکوں سے کچھ ہی کم ہے، مگر سب کی سب ”پڑھی لکھی“ ضرور ہیں، اُن کی تعلیم میں بھی آپ نے کافی روپیہ صرف کیا ہے۔ اسلیئے جب کبھی کسی لڑکے کی جانب سے جہیز وغیرہ کا سوال ہوتا ہے تو آپ بہت برہم ہو کر فرماتے ہیں ”تعلیم یافتہ لڑکی کی ہی خواہش کیجاتی ہے اور پھر جہیز کا بھی سوال کیا جاتا ہے، اگر جہیز جمع کیا جاتا تو ایسی ”اعلیٰ تعلیم“ کیسے

دلائی جاتی ہے۔

مگر اب تک آپ کو ایک بھی ایسا اعلیٰ خیال، علم دوست برخوردار داماد نہیں ملا جو آپکی کسی لڑکی سے محض اُس کی اس "مخصوص" اعلیٰ تعلیم کیوجہ بیاہ کرنا پسند کرتا، حال ہی میں بڑی لڑکی کے لئے پیغام آیا تھا مگر شرط یہ تھی کہ ایک "اشد ضروری" قرض کی ادائی کیلئے فی الحال صرف پندرہ ہزار روپے دئے جائیں، ایک اور "صاحب بہادر" نے یورپ جانیکے لئے بارہ ہزار طلب کئے تھے آج کل کے "یہ تعلیم یافتہ" صاحبزادے بیویوں کے روپے سے اپنی دُنیا سنوارنا چاہتے ہیں، معلوم نہیں اس شرمناک رسم کا کب مُنہ کالا ہونا ہے اور کب آپ کی صاحبزادیوں کے سہرے کے پھُول کھلتے ہیں۔

لڑکوں کا بیاہ کچھ تو اُنکی "کمسنی" اور کچھ پدر بزرگوار کے بیاہ پر بیاہ کی مصروفیت کی وجہ آج تک نہ ہوسکا، آپکے عزیز و احباب کبھی لڑکیوں کے بیاہ کی طرف آپکو متوجہ کرتے ہیں تو مُسکرا کر فرماتے ہیں:-

"ابھی بچے ہیں جلدی کیا ہے؟"

مگر ان "معصوم" بچوں نے چپکے سے اپنے بیاہ کرلئے ہیں، اور بڑی چھان بین کے بعد "بازار" سے اپنے جوڑے خرید لائے ہیں، لبقول والد محترم "جوانی" دیوانی ہوتی ہے اور ایسے کھیل تو سبھی کھیلتے ہیں!

مگر بعض احمق لوگ اپنی لڑکیاں آپکے اعلیٰ تعلیم یافتہ، سعادت مند اور ہونہار لڑکوں کو اسلئے دینا پسند نہیں کرتے کہ وہ "بے روزگار" ہیں، حالانکہ اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے، دوسری "نامعقول" وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بچوں کے بچے ہوگئے ہیں، مثل مشہور ہے کہ "آج کا بچہ کل کا باپ ہوتا ہے" اس میں تعجب کی کیا بات ہے!

ایں سعادت بزورِ بازو نیست!!

خیر کوئی اپنی لڑکی دے یا نہ دے، جو پسلی کا جوڑا ہے ایکدن جوتیاں چٹخاتے آئیگا اور ضرور آئے گا! اس لئے آپ نے لڑکوں کے بیاہ کا خیال ہی ترک کردیا- لڑکے بھی والد کے ہم خیال ہیں اور فی الحال افزائش نسل "دو پایہ" میں مصروف ہیں، ان کی کوششیں خوب پروان چڑھ رہی ہیں اور گھر میں کچھ عجب "میلہ" لگ رہا ہے۔

چندروز سے باپ بیٹوں میں ذرا چشمک ہوئی ہے، بچے چاہتے ہیں کہ ابا جان کسی "امی جان" کو نہ لائیں مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جوانی کی یہ راتیں اور مُرادوں کے یہ دن آخر کس طرح کٹیں! اسلئے کسی ایسی چھوٹی سی "امی جان" کی تلاش ہو رہی ہے جو برس پندرہ یا سولہ کی ہو۔

جب سے لڑکوں نے ابا جان کے بیاہ کی خبر سُنی ہے وہ بھی سوچ رہے ہیں کہ "تقاویم پارینہ" بدل دی جائیں، سب کے سب نئی جنتریاں خریدنے کی فکر میں ہیں، خدا وہ دن لائے کہ ان سب کی فکریں دُور ہوں، باپ بیٹے اپنی اپنی مرادیں پائیں۔

ایں دُعا از من و از جملہ ناظرینِ "ساقی" آمین باد!!

حال ہی میں ہمکو ایک چھوٹا سا خوبصورت کارڈ ہمارے ایک عنایت فرما کی جانب سے وصول ہوا تھا کہ انکی صاحبزادی کے بیاہ کی تقریب سعید میں "عصرانہ" ہونیوالا ہے۔

دعوت کے دن کوئی چھ بجے ہم موصوف کے دولت خانہ پر پہنچے، مکان سے کچھ فاصلے تک راستہ کی دونوں جانب رنگ برنگی جھنڈیاں اور لال سبز، نیلے پیلے بجلی کے قمقمے لگے ہوئے تھے، خانہ باغ کو بڑے سلیقے اور قرینے سے سنوارا گیا تھا، عمارت کی پیشانی پر "خوش آمدید" اور اُس کے اُوپر

"چاند تارا" جگمگا رہا تھا، صحن میں بہت سی تپائیاں رکھی ہوئی تھیں جن پر "اٹ ہوم" کا پُرتکلف سامان سلیقے سے چُنا ہوا تھا، کوئی دوڈھائی سو مہمانوں کی چائے نوشی کا انتظام معلوم ہوتا تھا۔

بیچ میں ایک تخت پر کوئی "چھمی جان" محو ترنم تھیں، ایک طرف زمین میں گڑے ہوئے آتشبازی کے جھاڑ اور اقسام کے چکر آتشبازی کے شاندار ہونیکا ثبوت دے رہے تھے، کوئی چالیس پچاس روشنی کے گولوں کی قطار لگی تھی اور کچھ اصلی و نقلی عرب نوشہ کی موٹر کے سامنے اُچھلنے کودنے کو تیار ہو رہے تھے، برات کا یہ سارا سامان موجود تھا مگر نوشہ میاں سلمہٗ نظر نہیں آ رہے تھے، دریافت کیا گیا تو معلوم ہوا "جلوہ" کی رسم کیلئے اندر سدھارے ہیں۔

مہمان چائے نوشی میں مصروف تھے، ہم بھی ایک طرف بیٹھے آئیسکریم کھا رہے تھے اور اپنے میزبان کی دریا دلی اور سلیقے کی دل ہی دل میں داد دے رہے تھے، مہمان ابھی خورد و نوش میں مصروف ہی تھے کہ برات جمنی شروع ہو گئی۔ اتنے میں میزبان صاحب تشریف لائے اور ہم سے برات کے ساتھ چلنے کی خواہش کی۔

دولہا دلہن اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھ گئے، باجے بجنے شروع ہوئے، آتشبازی اپنی بہار دکھانے لگی، بجلی کے گولے روشن ہو گئے، کوئی روشنی کی تعریف کر رہا تھا، کسی کی آنکھیں آتشبازی کے دُھواں دھار مظاہرے میں گم تھیں، باجوں کی وہ دھما چوکڑی تھی کر کان پڑے آواز سُنائی نہ دیتی تھی، اتنے میں بہت سے مہمان براتی بنکر نوشہ کی موٹر کے پاس آ گئے،

ہم بھی براتیوں میں شامل ہو گئے، برات دو چار میل کے گشت کے بعد بخیر و خوبی پھر دُلہن کے گھر لوٹ آئی۔

ہم نے اب تک نوشہ میاں کی صورت نہیں دیکھی تھی، جب پھولوں سے لدی ہوئی موٹر کار مکان میں داخل ہوئی تو ہم نے لڑیاں ہٹا کر اندر جھانکا، ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں! کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے میزبان کے بڑے صاحبزادے کی گود میں ایک کافوری پُتلا نوشہ بنا ہوا کچھ عجیب شان سے رونق افروز ہے!! سر پر چھوٹی سی تاش کی دستار ہے اور اُسپر مرصع سرپیچ جگمگ جگمگ کر رہا ہے، زربفت کی قبا زیب بدن ہے اور گلے میں پھولوں کے موٹے موٹے ہار پڑے ہیں۔ ہم نے میزبان صاحب سے اس ستم ظریفی کی وجہ پوچھی تو فرمایا:-

"لڑکیوں کے بیاہ میں دیر ہو رہی ہے، پیغام
نہیں جم رہے ہیں، اسلئے بیگم نے گڑیوں
کی شادی رچا کر ٹوٹکا کیا ہے! انشاءاللہ
اب بہت جلد ان کے سہروں کے پھول
کھلیں گے!!"

ایک نہایت بلند پایہ فخر ہندوستان شاعر بے بدل نے حضرت غالب کی ایک مشہور غزل — جسکا ایک مصرعہ ہے۔

"دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں"

کے جواب میں ایک نہایت لاجواب اور مرصع غزل ارشاد فرمائی ہے، جملہ صرف "پچاس" شعر ہیں مگر ہم چند چوٹی کے اشعار ناظرین "ساقی" کے ملاحظہ میں پیش کرتے ہیں۔

ان کے ملاحظہ سے واضح ہو گا کہ ہمارے شاعر بے نظیر کے کلام میں شستگی زبان، سلاست بیان، روانی، نازک خیالی، بلند پروازی، شگفتگی غرضیکہ سب ہی کچھ موجود ہے۔

مطلع عرض ہے ؎

" دل کس کو دیں کہ کوئی خریدار بھی نہیں
اب ہمکو مفت دینے میں کچھ عار بھی نہیں "

غالباً ملک کی موجودہ کساد بازاری اور افلاس کے مدنظر یہ رعایتی اعلان کیا گیا ہے، خریداروں کیلئے زرین موقع ہے! مال بہت ہے اور نرخ سستا ہے!!

پھر ارشاد ہوتا ہے ؎

" فصلِ بہار ہی میں جنوں کی بہار ہے
عریاں ہے جسم جسم پہ اک تار بھی نہیں "

ہمارے شاعر بے بدل کی ہیئت کذائی ظاہر کرتی ہے کہ فصلِ بہار سے پہلے "جنوں کی بہار" شروع ہو گئی ہے!

وہ دن گئے کہ ہم بھی حسینوں میں تھے مگر
اب تو ہمارا کوئی خریدار بھی نہیں

یادِ ایامِ عشرتِ فانی!! ؎

" فرقت میں تیری مرنا بھی جینا بھی ایک ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں "

"گرہ" لاجواب ہے! یقین ہے کہ غالب کی روح پھڑک اٹھی ہوگی!! ؎

" زیلین" میں ہے مقیم وہ سفاک کیا کہنا
چھوڑوں کہاں میں سر کہ در یار بھی نہیں "

اگر وہ "سفاک" "مستقل طور پر" "زیلین" میں رہا کرتا ہے تو کیا کوئی صورت سر چھوڑنے کی ممکن نہیں؟ جب "زیلین" زمین پر اترے تو کیوں "زیلین" سے نہ ٹکرا جائے در یار پر سر پھوڑنے کی آرزو یوں بھی پوری ہو سکتی ہے!!

مرزا سیف علی خاں

وعدہ

شہر کی شورش سے ہٹکر، دُھ بھری راوی کے پار
پھر جنوں انگیز کلیوں میں بصد حرمان و یاس
پھر بچھا کر تیرے رستے پر نگاہیں وقتِ شام
پھر تجھے پُر کیف راگوں میں بسا ڈالونگا میں
پھر میرے شعروں میں بن کر جانِ درآئیگی تو
پھر تری آنکھوں میں کھل جائیگا میخانے کا باب
پھر ترے ہونٹوں میں ہوگی دھیمے نغموں کی مٹھاس
پھر ترے مدہوش کُن ہلکے تبسم کی ضیا
پھر تجھے مغرور کر دونگا شبوں کو جاگ کر

پھر کرونگا چاندنی راتوں میں تیرا انتظار
تھام کر دل کو پھرونگا ہوکے غمگیں و اُداس
آنسوؤں کی سیمگوں مالا پہ لونگا تیرا نام
پھر تجھے قابل پرستش کے بنا ڈالونگا میں
پھر جوانوں کے حسیں خوابوں پہ چھاجائیگی تو
پھر چھیڑیگا تیری رگ رگ میں جوانی کا رباب
پھر تری زلفوں سے آئیگی حسیں پھولوں کی باس
پھر پابوسی شعاعِ مہر کو دے گی صدا
نوجوانی کے حسیں لمحوں کی خواہش تیاگ کر

اب نہیں جاؤنگا تجھ کو چھوڑ کر کچھ غم نہ کر
رحم کر ان مست آنکھوں پر انہیں پُر نم نہ کر

الطاف مشہدی

سمندر کی پریاں

مشرقی جزائر کے گرد، جہاں موتیوں کی کثرت ہے، ایک سمندر کی تھاہ میں، ایک نوجوان کا ڈھانچہ، مٹی ہوئی شکل و صورت میں پڑا ہوا تھا اور اس کے قریب سمندری پریاں اپنے سنہرے بال کھولے ہوئے، موتیوں کے سبزہ زار پر بیٹھی ہوئیں ڈھانچے کو، اپنی خوبصورت نیلگوں آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں اور نغمہ باز آواز میں گفتگو کر رہی تھیں۔ گفتگو کو، سمندر نے اپنی موجوں کے ذریعہ ساحل پر بکھیر دیا، جہاں سے کھربائی ہوائیں مجھ تک اڑا لائیں۔ اُن میں سے ایک نے کہا:۔ یہ آدمی، کل اُس وقت پانی میں اُترا تھا جب سمندر غیظ و غصہ میں تھا۔

دوسری نے کہا:۔ نہ سمندر غصہ میں تھا نہ کچھ، بلکہ انسان ——— جو اپنے متعلق دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خُدا کا بیٹا ہے ——— آج کل ایک شدید جنگ میں مشغول ہے جس میں اتنا خون بہایا گیا ہے کہ سمندر کا پانی تک سُرخ ہے، یہ آدمی اسی جنگ کا مقتول سپاہی معلوم ہوتا ہے۔

تیسری بولی:۔ مجھے جنگ کی کوئی خبر نہیں، لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ انسان نے تمام خشکی پر غلبہ پا لینے کے بعد سمندر پر بھی تسلط کی ہوس کی، عجیب و غریب آلات تیار کئے اور سمندر کو کاٹنے کی کوشش جب نبتون ——— الہ البحار کو یہ معلوم ہوا، تو وہ اس سرکشی پر بہت بگڑا، انسان نے ہمارے بادشاہ کو خوش کرنے کا سوائے ہدیہ اور فدیہ کے کوئی چارہ نہیں دیکھا، وہ اعضاء جنکو ہم لوگوں نے کل سمندر میں دیکھا تھا، آخری پیشکش ہیں نبتون اعظم کی خدمت میں۔

چوتھی نے کہا:۔ نبتون اعظم بہت بلند مرتبہ ہے مگر بہت زیادہ سخت دل ہے، اگر میں سمندر کی ملکہ ہوتی تو ان خونی فدیوں پر کبھی خوش نہ ہوتی۔

اس کے بعد پریوں نے انسانی ڈھانچے کو دیکھنا شروع کیا، اس کی جامہ تلاشی بھی لی، اس کپڑے کے نیچے جو سینے سے چمٹا ہوا تھا، ایک خط ملا، اُن میں سے ایک نے خط اُٹھا کر پڑھنا شروع کیا:۔

میرے پیارے! آدھی رات ہو گئی ہے اور میں جاگ رہی ہوں، میرے آنسوؤں کے سوا مجھے کوئی تسلی دینے والا نہیں ہے، تمہارے جنگ کے جنگل سے زندہ و سلامت واپس آنیکی اُمید ہی ہے جو مجھے تسکین دیتی ہے، میں سونچا کرتی ہوں جو تم نے رخصت ہونے وقت، کہا تھا کہ:۔

"ہر شخص کے پاس آنسوؤں کی ایک امانت ہوتی ہے جسکو واپس کرنا کسی نہ کسی دن ضروری ہے"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیا لکھوں؟ جی تو یہی چاہتا ہے کہ اپنی جان کو کاغذ پر پھیلا کر روانہ کر دوں!

آہ! محبت نے ہمارے دلوں کو ملایا تھا، جب ہم توقع کر رہے تھے کہ ہمارے جسم بھی اس طرح مل جائیں گے جن میں ایک ہی روح دوڑیگی، اس وقت جنگ نے تمکو پکارا اور تم اُس کی آواز کے پیچھے "فرض" اور "وطن" کے خیالات لے کر دوڑ پڑے۔

آہ! کیا "فرض" اسی کو کہتے ہیں کہ دو محبت کرنیوالوں میں جُدائی ہو، عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں؟ کیا وطنیت یہی ہے کہ شہروں کو تباہ و برباد کرنے کیلئے معمولی

معمولی باتوں کی بدولت جنگ چھیڑ دی جائے؟ کیا یہی اہم فرض ہے جو غریب دیہاتی کے لئے تو اہم ہو مگر بڑے گھرانوں اور سرمایہ داروں کے لئے اسکی ادائیگی ضروری نہیں ہے؟

اگر یہ "فرض" قوموں کے درمیان صلح کو روکتا ہے اور اگر "وطنیت" حیاتِ انسانی کے پرسکون شیرازے کو پراگندہ کر دیتی ہے تو سلام ہے ایسے "فرض" پر اور ایسی "وطنیت" پر۔ نہیں! نہیں!! میرے حبیب! ان باتوں کی پروا نہ کر اپنے وطن کے لئے ادر بہادر ہو جا، اور اس لڑکی کی باتوں کو نہ سُن جسے محبت نے اندھا اور جس کی سمجھ کو جُدائی نے ختم کر دیا ہے۔

اگر محبت اس زندگی میں تمکو مجھ سے نہیں ملنے دے گی تو عنقریب ہم دونوں ہمیشہ کیلئے دوسری زندگی میں ملجائیں گے۔

سمندر کی پریوں نے اس خط کو نوجوان کے کپڑوں میں اسی طرح رکھدیا اور غمگین خاموشی کے ساتھ واپس چلی گئیں۔ تھوڑی ہی دُور چلنے کے بعد اُنمیں سے ایک نے کہا: "انسان تو بتونِ اعظم سے بھی زیادہ

مُجرم

از

سڑک کے کنارے ایک نوجوان بیٹھا ہوا بھیک مانگ رہا تھا، اُس کے مضبوط جسم کو بھوک کی شدّت نے کمزور کر دیا تھا۔ وہ گلی کے نکڑ پر، ہاتھ پھیلائے، اپنی مفلسی اور بھوک کی داستان کہہ کہہ کر راہگیروں سے سوال کر رہا تھا،

رات ہو گئی ہے، اور اس کے ہونٹ سوال کرتے کرتے خشک ہوگئے اور زبان تھک چکی ہے، مگر اُس کا ہاتھ اسکے پیٹ کی طرح بالکل خالی ہے۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھکر آبادی سے باہر چلا گیا۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھکر بُری طرح رونے لگا، اُس نے آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھائیں اور کہنے لگا، بھوک کی تکلیف اُسے بولنے نہیں دیتی تھی:۔

"اے پروردگار! نہ معلوم کتنی مرتبہ میں نوکری کی تلاش میں مالداروں کے پاس گیا مگر اپنے میلے کچیلے کپڑوں کی وجہ سے دھتکار دیا گیا۔

میں نے مدرسے کا دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن مفلسی کے سبب انکار کر دیا گیا۔

میں نے مزدوری کی کوشش کی، صرف پیٹ بھر روٹی کے لئے، مگر اپنی بدقسمتی سے محروم رہا، مجبوراً بھیک مانگنا شروع کی تو اب تیرے بندے کہتے ہیں کہ یہ "ہٹا کٹا جوان ہے۔ سُست اور کاہل آدمی کو بھیک نہ دینا چاہیئے۔"

میری ماں نے مجھے تیرے ہی حکم سے جنا ہے اے رب!

اور اب میں تیرے ہی اشارے پر زندہ ہوں، تو پھر کس لئے لوگ مجھے ایک روٹی دینے سے انکار کرتے ہیں حالانکہ میں تیرا ہی نام لے کر اُن سے مانگتا ہوں!"

اُس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا، وہ اُٹھ کھڑا ہوا، اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے، ایک درخت سے لمبی سی شاخ توڑ کر آبادی کی طرف اشارہ کر کے چلّانے لگا:۔

میں نے اپنی محنت سے زندگی چاہی مگر نہیں ملی، اب میں اپنے بازو کی قوت سے حاصل کرونگا۔

میں نے عاجزی اور خوشامد سے روزی طلب کی مگر انسان نے اسکو نہیں سُنا۔ اب میں شرارت سے طلب کرونگا اور اس سے زیادہ لونگا۔

۲

برسوں اس طرح پر گذر گئے کہ وہ معمولی معمولی چیزوں

کے لئے قتل و غارت پر آمادہ ہو جانا، بڑے بڑے مالدار دل کی روح اس کے نام سے کانپتی تھی تو نوبت یہاں تک پہونچی کہ حکام کو بغاوت فرو کرنے کیلئے اس سے مدد مانگنا پڑتی تھی، "اسی طرح مظلوم انسان؛ سفاک بنائے جاتے ہیں"

موت کی بستی میں

میں کل، شہر کے ہنگاموں سے اُکتا کر، آبادی سے بہت دُور، ساکن و خاموش کھیتوں میں ہوتا ہوا ایک بلند ٹیلے تک پہونچا، وہاں میں ٹھہر گیا،

شہر اپنے بڑے بڑے محلوں اور عالیشان عمارتوں کے ساتھ، کارخانوں کے ایک سیاہ بادل میں چھپ گیا تھا۔

دُور سے، بیٹھا ہوا حیاتِ انسانی کا جائزہ لے رہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ زندگی کا اکثر حصّہ "مشقت" ہے۔

میں نے طے کر لیا کہ اب ان مسائل پر غور نہیں کرونگا جو انسانوں کے اپنے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی نظر کھیتوں ——— خلاقِ کائنات کی عظیم ترین نعمت ——— کی طرف ڈالی، کھیتوں کے درمیان ایک قبرستان ——— پتھر کی مضبوط قبروں کو سرو کے لمبے لمبے درخت گھیرے ہوئے تھے ———

وہاں ——— زندگی اور موت کی بستیوں کے درمیان ——— بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔

مسلسل کشمکش اور دائمی حرکت ——— یہاں ہے۔

کامل سکون اور مستقل خاموشی ——— وہاں۔

اُمید اور نا اُمیدی، محبت اور عداوت، دولت اور مفلسی، اعتقاد اور الحاد ——— ایک طرف ہے۔

دوسری طرف ——— مٹی، مٹی میں پوشیدہ ہے۔

انہیں خیالات میں کھویا ہوا تھا، کہ میری توجہ کو دفعتاً ایک بڑے مجمع نے ——— جو آہستہ آہستہ جا رہا تھا، آگے آگے باجے، فضا میں غمگین نغمے پھیلا رہے تھے ——— اپنی طرف منعطف کر لیا۔

معزز سرمایہ دار کا جنازہ تھا! بیجان و بوسیدہ ہڈیاں!! جن کے پیچھے پیچھے ہوش اور سمجھ رکھنے والے لوگ چیختے چلاتے جا رہے تھے۔

یہ مجمع ایک مقبرہ تک پہونچکر رُک گیا،

پادریوں کا گروہ آگے بڑھا، پہلے دُعائیں پڑھیں، پھر اگر سُلگایا، ماتم کرنے والے آئے، اپنے باجوں کو بجا کر ماتم کا فرض ادا کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خطیب آئے، اپنے بلند پایہ کلام سے مرنیوالے کی تعریفیں کیں۔ پھر شعرا کے گروہ نے اپنے لاجواب اشعار سے مرثیہ پڑھا۔ یہ سب مراسم بڑے بڑے وقفوں میں ختم ہوئے۔ اسکے بعد مجمع اُس خوبصورت مقبرہ سے لوٹ گیا جس کی زینت میں کاریگروں اور انجینیروں نے بہت مہارت صرف کی تھی۔

مجمع شہر کی طرف لوٹ گیا، میں دیکھ رہا تھا اور تعجب کر رہا تھا۔

آفتاب مغرب کی طرف جھک چکا تھا، درختوں اور پتھروں کے سائے دراز ہو چکے تھے، ساری کائنات نورانی لباس اُتارنے میں مصروف تھی۔

اُسی وقت میں نے دو آدمیوں کو دیکھا، ایک لکڑی کا تابوت اُٹھائے ہوئے اُن کے پیچھے پیچھے، پھٹے پُرانے کپڑے پہنے، ایک عورت اپنے کندھوں پر شیر خوار بچے کو بٹھائے

چلی آرہی تھی اُس کی ایک جانب کُتا بھی تھا، جو کبھی عورت کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی تابوت کو۔

یہ ایک مسکین فقیر کا جنازہ تھا، پیچھے اُس کی بیوی غم کے آنسو بہا رہی ہے اور بچہ اپنی ماں کو روتا دیکھکر رو رہا ہے، اُس کا وفادار کُتا، رنج و تکلیف کی چال سے، ساتھ چل رہا ہے،

یہ لوگ ایک حد تک پہونچے، اور تابوت کو، مضبوط پکّی قبروں سے بہت دور، ایک گڑھے میں ڈال کر انتہائی خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے، کُتا اپنے آقا کی "نئی آرامگاہ" کو دیکھتا رہا۔

درختوں کی آڑ میں، میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

اُس وقت ——— میں نے "زندوں کی بستی" کی طرف دیکھا اور اپنے دل میں کہا "یہ دولت اور اقتدار والوں کے لئے ہے"

پھر "مُردوں کی بستی" کی جانب مڑا اور کہا "یہ بھی دولت اور اقتدار والوں کے لئے ہے، پھر غریبوں کا ٹھکانا کہاں ہے؟ اے رب!"

میں نے یہ سوچکر، آسمان کی طرف دیکھا، میں نے اپنے اندر سے ایک آواز سُنی:۔

"وہاں ———"

* * * * * * * * *

(جبران خلیل جبران)

ترجمہ محمد رضا انصاری

شکست خوردہ بھائی کے نام

سطور ہیں مٹی مٹی صحیفۂ حیات کی
کہ روندتی ہوئی گئی ہے فوج کائنات کی

اگرچہ زندگی بہت کشادہ و فراز ہے
مگر یہاں کا اک گدا بھی محوِ خوابِ ناز ہے

زمانہ فروغِ رنگ و بوئے مشکبار ہے
پسینہ بھی شباب کا لہو کا آبشار ہے

تو زندگی کی ٹھوکروں پہ قہقہے لگائے جا
پھنسے کسی بھنور میں بھی تو یونہی مسکرائے جا

نہ ظلمتوں کی سمت جا جہاں ہے آبِ زندگی
تری نگاہ جستجو ہے آفتابِ زندگی

عمل ہو مستقیم اگر نہ خوف کر مآل کا
کہ موت آدمی کی خود فریب ہے خیال کا

سکون و امن کی طلب ہے موت نوجوان کی
اسی میں غرق کشتیاں ہوئی ہیں اک جہان کی

فقیر ہو کے جینے میں تری شکست فاش ہے
کہ ہمتِ جواں تری ابھی سے پاش پاش ہے

عرش

زندہ اور فطری زبان

(۲)

دوسری کسوٹی ——— بول چال کی زبان

ہماری زبان اپنے منازل ارتقا سے صاف پہچانی جا سکتی ہے۔ اور یہ رفتار اسے اردو ہندی کے قضیہ سے آزاد کر دیتی ہے۔ اس لئے اُس کو صحیح طور سے پرکھنے کے لئے اس مضمون کا پہلا حصہ کافی ہے۔ ثابت ہو چکا کہ زبان ہندستانی اور حمایت، دوٹ شماری اور پروپگنڈوں کی محتاج نہیں ہے۔ وہ اپنے اوپر کئے گئے اعتراضوں کو خود رفع دفع کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ معترض کا دامن خود الجھ پڑتا ہے۔ ردوکد، بحث و تکرار کی جو دلیلیں آج گھڑی جاتی ہیں کل انہیں کی زبان سے صاف ہو جاتی ہیں۔ وہ تعجب کرتے ہیں کہ راشٹر بھاشا کی ہم نے جتنی کسوٹیاں ایجاد کیں اُس پر اردو صحیح اُترتی جاتی ہے۔ (مثلاً گاندھی جی کا فرمانا کہ اگر ریزولیشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اردو سمجھا جائیگا۔) اب وہ بھاگ رہے ہیں حقیقت کو جان کر اور سمجھ کر۔ اب تو اپنی بات کی پچ ہے۔ یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ اکثر ان باتوں کو چھوڑتے ہوئے ہچکچاتا ہے جس کو وہ غلط سمجھ چکا ہے۔ اپنی غلطی سچائی کے ساتھ تسلیم کرنا آسان بات نہیں۔ یہ ایک جہاد ہے جس میں کبھی نفس کامیاب ہوتا اور کبھی صداقت اُسے ہرا دیتی ہے۔ نفس دھوکے دیتا ہے کہ اگر تم نے اسے تسلیم کر لیا تو بڑی ندامت اور شرمندگی ہوگی خبردار حرفِ راست زبان تک نہ لانا، یہ دل میں رہنا کافی ہے۔ اردو کو ہندوستانی تسلیم کرنے میں یہی دشواری ہمارے بھائیوں کے سامنے موجود ہے۔ وہ اردو بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ مگر جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو "لیکن" کا لفظ قلم سے نکل جانے کے بعد اسے "پرنتو" سے تبدیل کرتے ہیں۔ "یا" کے بجائے قصداً دماغ پر زور دے کر "اتھوا" لاتے ہیں۔ اگر وہ غریب ایسا نہ کریں تو ان کا دعویٰ غلط ہو جاتا ہے۔ ہندی میں لکھی ہوئی تحریر اردو ہو ہی جاتی ہے۔ اب اردو سے دامن چھڑا کر بھاگ رہے ہیں۔ پہلے نام سے گھبراہٹ تھی۔ ہندوستانی نام قرار پایا اردو کا اطلاق اس پر بھی ہوا۔ پھر ہندی کی طرف لوٹے۔ ہندستے نسبتی تعلق رکھنے سے ہندی، اردو کی صفت بن گئی اور اردو اُس پر بھی صادق آئی۔ (مسلمانوں نے صفاتی طور پر اُس کا یہ نام رکھا بھی تھا۔) پھر نئے نام کی ضرورت ہوئی۔ پھر ہندی اتھوا ہندوستانی کا شاخسانہ کھڑا ہوا۔

دُور بینوں کی نظر بڑی دور رس ہوتی ہے۔ وہ حال کی روش سے استقبال کو دیکھ لیتے ہیں۔ زبانِ ہند کے ماہر اور لسانیات کے محقق پر زبان کی صورت آئندہ اسی طرح روشن ہے جس طرح موجودہ دَور میں وہ گفتگو کرتے اور بولتے چالتے ہیں۔ ایسے لوگ شور و شغب کو بیکار بتاتے ہیں۔ اس لئے حقیقت کی پرستش خاموشی سے ہوا کرتی ہے۔

سارے ہنگامے ختم ہو جائیں گے جب کہ حقیقت کی بجلی کوندیگی۔ جو کچھ در پردہ ہے آشکارا ہو جائے گا، اور آشکارا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ موجِ مضطر کی طرح فضا میں برقِ حقیقت کی لہریں بدگمانی کے پردوں میں بیتاب ہیں وہ اِس ابر کو چیر کر حقیقت کا کرشمہ دکھائیں گی۔ اپنی مختلف تاویلیں دیکھ کر زبانِ ہند خود کپکپانے لگی ہے۔ اُسی کا بیان آخری فیصلہ ہوگا۔

لسانیات کے علمی مطالعہ سے ہمیں زبان کا بیان جو ہلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھنے، نظر جمانے اور کان دھر کے سننے سے سمجھ میں آتا ہے اور بتاتا ہے کہ زبانِ ہند (ہندوستانی زبردستی رائج کرنے سے، پروپیگنڈے سے نئی شکل نہیں اختیار کرے گی۔) ہندوستانی کی یک شکل ہے وہ تشکیل کیلئے محتاج نہیں ہے۔ زبانِ خلق اور زبردستی!! یہ راہ دیر تک چلنے والی نہیں۔ ہر عامی اور عاقل، گنوار و شہری کی زبان پر یہ مثل چڑھی ہوئی ہے بندھوے بنیوں سے مینا بازار نہیں لگتا۔ کوئل کی کوٹھی میں بند کرنے سے گورا، کالا نہیں ہوتا۔ یہ کہنا کہ ہندوستانی کا ابھی ادب نہیں بنا ایک حد تک صحیح نہیں ہے۔ جن ہندو مسلمانوں نے ہندوستانی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی ان کی تحریریں اور ذہنی کاوشیں ہندوستانی ادب کی بہترین شکلیں ہیں۔ میر امن، سرسید، حالی

رتن ناتھ، اکبر، پنڈت برج نرائن چکبست۔ ایسی بہت سی ہستیاں تھیں جو ادب برائے ادب پر یقین نہ رکھکر ادب برائے زندگی پر عمل پیرا تھیں۔ ان کی زبان اَن پڑھ اور جاہل بھی سمجھ سکتا ہے۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ بول چال کی زبان تھی۔ اس کی شکل وہ بنا چکے ہیں مرصع نگاری کا زور انہوں نے توڑا ہے اور انہیں کی پاک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ہماری زبان وہ ہے جس میں ہم ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں، اس کی شکل وہ ہے جس میں اُستاد شاگرد کی دقتیں دور کرتا ہے۔ اس کی شکل وہ ہے جس میں گاؤں سدھارک، صفائی کا انسپکٹر، اسکاوٹ آرگنائزر، وکیل، موکل اپنے اپنے خیال کی اشاعت کرتے ہیں جن کو کام سے کام ہے جو کہتے اس لئے ہیں کہ جو کچھ کہا جائے بلا دقت سمجھ لیا جائے نہ اس لئے کہ لوگ اس کو لفظی بندش کا دیوان سمجھیں۔ دوکانداروں، بزازوں کی زبان، سیٹھ ساہوکاروں سے لیکر خوانچہ والوں کی زبان۔ پیشہ ور قوموں کی زبان۔ موچی، دھوبی، درزی، نائی، کی زبان جنہیں عوام سے برابر سابقہ رہتا ہے ہمیں بتلاتی ہے کہ موجودہ ہندوستان کی زبان کیا ہے؟ اُن کی زبان گو ادبی نزاکتوں سے بھرپور نہیں ہے یہ تو نقص زبان کا نہیں۔ خیال کی سادگی کاروباری زندگی میں کام آتی ہے اور رنگینی کا موقع ہی نہیں ہوتا۔ ورنہ یہی لوگ جس وقت کاروبار سے چھٹی پا کر مل بیٹھتے ہیں تو تخیل کی کارفرمائیاں یہ نفس مسادی ہے۔ اس لئے ادبی زبان اور زبان عام کے ڈھانچے (قواعد صرف نحو اور مزاج الفظوں کی کرختگی، لوچ دوسری زبان سے الفاظ لیکر اس کی کمیت کی نسبت) میں فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ ادبی زبان میں سادہ لفظوں کے بدلے مجازی زیادہ ہوتے ہیں استعاروں، تمثیلوں، تشبیہوں اور اشاروں اور کنایوں سے ہی وہ تمیز پاتی ہے۔ لہٰذا ادبی زبان کو بول چال کی زبان سے دُور سمجھنا محض غلطی ہے اسلئے ہمیں ہندوستان کی ملکی اور زندہ زبان کی تلاش میں باشندگان ہند کے مختلف طبقوں کی زبانوں کو عملی اور اصلی مطالعہ کرنا لازمی ہے۔

اوّل اوّل فطرت کی گود میں کھیلنے والے اُن بچوں کی گفتگو پر غور کریں جن کے لئے ایک طرف تو ہندوستانی بننے والی ہندی کی[1] پیدا ہو رہی ہے اور دوسری طرف فطرت نہ صرف زبان کی تیاری میں مشغول ہے بلکہ زندگی کے ہر ایک کل پرزے کو ڈھال رہی ہے۔ یہ معصوم ہیں، طرفداری اور تعصب کا لفظ انہوں نے نہیں سُنا۔ اخبارات کی زہریلی ہوا جن کو نہیں لگی ہے، تاریخی انتقام سے ان کے سینے پاک ہیں۔ اس معاملے میں میں اپنا ذاتی تجربہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

مَیں عرصہ دس سال سے ورنیکولر اسکول کا ٹیچر ہوں۔ دیہات کے طلبہ اور دیہاتی زبان سے مجھے چھ سات سال واسطہ رہا اور اب چار سال سے شہر کے طلبہ اور شہری زبان کو دیکھ رہا ہوں۔ مگر حسنِ اتفاق سے یہ اسکول دیہات اور شہر کا ایک سنگم ہے۔ گورنمنٹ نورمل اسکول میں طریقہ تعلیم سیکھنے والے طلبہ کی مشق (طریقہ تعلیم کے لئے) اس کے ساتھ مڈل درجات تک تعلیم دی جاتی ہے۔ جو لوگ نارمل اسکول میں منتخب ہو کر فنِ تعلیم سیکھتے ہیں وہ تو ۹۰ فیصدی دیہاتی زندگی اور دیہاتی زبان سے متعلق اور ملحق ہیں۔ اس کے پریکٹسنگ موڈل اسکول کے چھوٹے طلبا بھی ۵۰ فیصدی دیہاتی رہتے ہیں۔ پرائمری کلاسوں (ابتدائی جماعتوں) سے لیکر مڈل کے ساتویں درجے کے لڑکوں سے مجھے کام پڑتا رہتا ہے۔ زبان (اُردو ہندی) حساب، جغرافیہ، تاریخ، مشاہدہ قدرت وغیرہ مختلف مضامین کی تعلیم دیتے وقت ہمیشہ ہمیں ہندوستانی زبان اختیار کرنی پڑی تاکہ دونوں طرح کے طلبا ایک ساتھ سمجھ سکیں۔ طلبا سنسکرت کے ثقیل اور تتسم (ہندی الاصل) لفظوں کے استعمال سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ اپنی گفتگو میں گاؤں کو گرام، شہر کو نگر، پانی کو جلم یا جل نہیں کہتے۔ "نالش" کے بدلے ابھیوگ تھنا، کا لفظ تو سننے میں نہیں آیا۔ مولوی صاحب طبیعت خراب ہے، سر میں درد ہے۔ یہی سننے میں آیا۔ ہندی کے ایڈوانسڈ اور وشارد وں سے لیکر نچلی جماعتوں کے طلبا تک یہی کہتے ہیں "ہم ملین ہے" "شہر میں پیدا ہے" آج تک کسی بچے نے نہیں کہا۔ دیہاتی حلقے کے لڑکے "مات دکھات با" کہکر اس مطلب کو ادا کرتے ہیں۔ اس موقع پر چھوٹی جماعتوں کے بچوں کی گفتگو ٹھیک ٹھیک انہیں کے انداز میں نقل کرتا ہوں۔ اس درجے تک اُردو، ہندی کی عام زبان کی ریڈیں ایک مضمون اور ایک ہی پیرایہ بیان کی تقریباً ایک ہی زبان میں ہیں۔

[1] جب بھارتیہ ساہتیہ پرشد منعقدہ ۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء بمقام ناگپور میں مولوی عبدالحق صاحب نے مہاتما گاندھی جی سے پوچھا کہ آپ نے جو ریزولیوشن میں ہندی اتھوا ہندوستانی کا لفظ رکھا ہے اس کے معنی کیا ہیں؟ گاندھی جی نے اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد یہ کہا اس سے مُراد ایسی ہندی ہے جو آئندہ چلکر ہندوستانی بننے والی ہے۔

چند لڑکوں کی گفتگو جو تیسرے درجے میں پڑھتے ہیں:۔

رام پیارے:۔ نبی محمد راستے میں گالی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر نالش کروگے تو راستے میں خوب پیٹوں گا۔

"نبی محمد یہاں چلو" میں نے پکارا، اور وہ آتے ہی اپنی صفائی دینے لگا۔

"مولوی صاحب سن لیجئے۔ یہ حضرت ایک روز گھر سے پڑھنے چلے مگر اسکول سے غائب تھے۔ میں نے آپ کو اس کی خبر کردی جبر سے مجھے کمینہ چغلخور کہتے ہیں اور ہیر سادھ کر آپ سے جھوٹ موٹ ہی نالش کرتے ہیں۔"

جگنناتھ:۔ مولوی صاحب! قصور نبی محمد کا ہے۔ رام پیارے صحیح کہتے ہیں۔ ان کو (نبی محمد کی طرف اشارہ کرکے) جھوٹ بولنے کی عادت ہے۔ (اسی درجے کا ایک لڑکا آپ ہی آپ بول پڑتا ہے۔)

(ہنسراج اور دکھی، کلاس کے سچے اور سنجیدہ لڑکوں میں ہردلعزیز ہیں۔ میں نے تصفیہ کیلئے ان کو بلایا۔)

ہنسراج۔ مولوی صاحب، نبی محمد سے ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ انکے چھل کے آگے ہم لوگ پنپ نہیں پاتے۔

دکھی:۔ یہ دیکھئے کل واقعہ ہم نے کاغذ پر لکھا ہے۔ آپ اسے پڑھ لیجئے۔ ٹفن کے وقت ایک نہ ایک بکھیڑا روز مچاتے ہیں۔

ہنسراج، دکھی، جگنناتھ ہندی پڑھنے والے طلباء ہیں۔ انکی زبان سے عادت، صحیح، نالش کے الفاظ بے تکلف ادا ہوئے ہیں۔ ایسے صدہا الفاظ ہیں جن کو فارسی و عربی سمجھکر انہیں ہندی پڑھنے والوں کے لئے مشکل اور اجنبی بتاکر ہندی کی کامن لینگویج ریڈروں سے الگ کیا جارہا ہے۔ حالانکہ یہ الفاظ نہ تو ہندی پڑھنے والے بچوں کیلئے مشکل ہیں اور نہ اجنبی، وہ انہیں برابر بولتے ہیں۔

اردو، ہندی کامن ریڈروں یعنی بول چال کی زبان کا معیار ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی ایم۔ اے کی تصنیف "اونکار ریڈر" سے بخوبی واضح ہوتا ہے:

اردو ایڈیشن

اونکار تعلیمی سلسلہ

اونکار ریڈر۔ تیسری کتاب

مصنفہ ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی۔ ایم۔ اے، ڈی۔ ایس۔ لندن سوسائٹی

(اردو عبارت)

زبان نے سوچا اس طرح دب کر رہنے سے مرنا ہی اچھا ہے۔ مجھکو کمزور دیکھکر دانت ہمیشہ ستایا کریں گے۔ وہ بھی بدلہ لینے کی گھات میں رہی ایک دن ایک پہلوان کہیں سے آگیا، اسکو دیکھکر زبان بہت خوش ہوئی اور سوچنے لگی کہ بدلہ لینا چاہیئے اس لئے پہلوان کو گالیاں دینا شروع کیں، پہلوان کو غصہ آگیا اس نے منہ پر ایک ایسا گھونسہ مارا کہ چار دانت ٹوٹ گئے اور کئی ہل گئے۔ زبان نے دانتوں سے کہا اپنی کرتوت کا نتیجہ دیکھا! شیخی مارنے اور دوسروں کے ستانے کی یہی سزا ہے۔ ہم تم ساتھ کے رہنے والے ہیں، اسلئے ملکر رہنا ہی اچھا ہے۔ جھگڑا کرنے میں میرا اور تمہارا دونوں کا نقصان ہے۔

ہندی ایڈیشن

اونکار شکشا مالا

اونکار ریڈر

تیسری کتاب

(ہندی عبارت)

جیبھ نے سوچا اس طرح دب کر رہنے سے مرنا ہی اچھا ہے۔ مجھکو نربل دیکھکر دانت ہمیشہ ستایا کریں گے۔ وہ بھی بدلہ لینے کی گھات میں رہی۔ ایک دن ایک پہلوان کہیں سے آگیا۔ اسکو دیکھکر جیبھ بہت پرسن ہوئی اور سوچنے لگی کہ بدلہ لینا چاہیئے۔ اس نے پہلوان کو گالیاں دینا شروع کیں۔ پہلوان کو کرودھ آگیا۔ اسنے ایسا گھونسا مارا کہ چار دانت ٹوٹ گئے اور کئی ہل گئے۔ جیبھ نے دانتوں سے کہا اپنی کرتوت دیکھا۔ شیخی مارنے اور دوسروں کو ستانے کا یہی پھل ہے۔ ہم تم ساتھ کے رہنے والے ہیں اس سے ملکر رہنا ہی اچھا ہے۔ جھگڑا کرنے سے میری اور تمہاری دونوں کی ہان ہے۔

آپ ملاحظہ فرمائیے۔ ایک ہی مطلب کو دونوں عبارتوں سے ایک سو اٹھارہ لفظوں سے ظاہر کیا گیا ہے جس میں ایک سو تیرہ الفاظ دونوں جانب مشترک ہیں صرف پانچ لفظوں کا فرق ہے جس سے زبان کی شکل تو کیا بدلے گی سننے والا جب تک اسے دکھایا نہ جائے تمیز بھی نہیں کرسکتا کہ دونوں میں کچھ فرق بھی ہے۔ ہندی عبارت میں زبان کے بدلے جیبھ ہے اس کی چنداں ضرورت نہ تھی، کیونکہ زبان، ناک، کان، منہ سب ہی لڑکے سمجھتے ہیں چاہے وہ اردو پڑھنے والے ہوں یا ہندی کے پڑھنے والے یا بالکل ان پڑھ۔ اسی طرح نربل بجائے کمزور کے لکھنا بیکار ہے، کمزور ہندی والے طالب علم کے لئے اسی طرح سہل ہے جس طرح اردو کے طالب علم کو۔ کرودھ، پرسن کو ہندی پڑھنے

والا اثر کا غصہ اور خوشی سے مشکل سمجھتا ہے۔ اگر کسی بچے سے آپ پوچھئے کرودھ کیا؟ وہ فوراً کہے گا غصہ۔ اور پرسن کا بھی یہی حال ہے۔ اسکے مقابلے کا لفظ جو اُردو ریڈر میں آیا ہے یعنی خوش اسے بچے شاید اسی وقت سمجھنے لگتے ہیں جب وہ بولنے اور باتیں کرنے لگتے ہیں۔ بس صاف ظاہر ہے کہ خوش، کمزور، ہندوستانی کیلئے عام حیثیت رکھتے ہیں یعنی بول چال کی زبان سے باہر نہیں ہیں اور کامن ریڈروں سے جو بول چال کا معیار ہیں خارج کرنے کے قابل قطعی نہیں ہیں۔ اب صرف دو لفظ رہجاتے ہیں یعنی پھل، اور ہانِ، اس کو ہندی سے مخصوص کرنا تحسالی اُردو سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اُردو میں ہزاروں موقعوں پر ہان، الابھ، پھل پھلاری بولا جاتا ہے۔ پھل نتیجے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ سہ:- آج جو بوئے گا تو کاٹے گا کل

تیرے کاموں کے ملیں گے تجھکو پھل

بیج جو بوئے گا تو کاٹے گا کل تیرے کاموں کے ملیں گے تجھکو پھل

اسی طرح نتیجہ اور نقصان سے گنوار و شہری سبھی واقف ہیں۔

پس ماننا پڑتا ہے کہ ہماری بول چال کی زبان میں اُردو ہندی کی کوئی تمیز نہیں ہے اور اگر کوئی فرق ہے تو وہ رسم خط کا فرق ہے اور رسم خط کے فرق سے نہ تو زبانیں بدلتی ہیں اور نہ وہ دو مختلف زبانیں کہلا سکتی ہیں۔ زبان اپنے ذخیرہ الفاظ (لغت)، صرف ونحو کی بنا پر مختلف قرار پاتی ہے۔ اُردو، ہندی کی بول چال کی صورت میں جب الفاظ ایک، حروف عامل ایک، حروف مخاطبہ ایک، حروف علامت نشان ایک تو کیونکر ممکن ہے زبان دو ہو۔ اسی لئے ہندوستان کے حق پسند ہندو مسلمان انہیں دو الگ زبانیں تسلیم نہیں کرتے۔ پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے صاف صاف اقرار کیا ہے کہ:-

بہت سے عربی فارسی کے شبدوں کا پریوگ اتنا بڑھتا جارہا ہے کہ اب اُن کے استھان سنسکرت یا پراکت کے پریایواچی شبد (مرادف الفاظ) ڈھونڈھ ڈھونڈھ رکھے جائیں تو یا تو کچھ ارتھ (مطلب) ہی نہ نکلے گا یا بھاشا اتنی کٹھن ہوجائے گی کہ سرب سادھارن (عام لوگ) تو کیا شکھشت ہندو (تعلیم یافتہ ہندو) بھی کٹھنتا سے (مشکل سے) سمجھ سکیں گے۔ جیسے مزدور، وکیل، قلم، دوات، سیاہی، مسخرہ، نصیحت، چادر، صورت، طوطا، پرہ، جلاب، گلاب، تنگ، زین، رکاب، نعل،

تہبند، مستول، پردہ، دالان، تنخواہ، صحیح، غلط، ہوا، تازہ، کاریگر۔

اُوپر کے شبدوں (لفظوں) کے پریایواچی (مرادف الفاظ) سنسکرت میں اوشیہ (ضرور) ہیں پر ہندی میں ان کا پریوگ (استعمال) بند ہوگیا ہے۔ اب پاٹھل کے استھان پر گلاب نے ادھکار جمالیا ہے۔

(کبتا کومدی، بھومکا۔ ہندی کا سنچھپت اتہاس صفحہ ۵۰)

پنڈت جی کی رائیں شخصی خیال کرکے ٹالی نہیں جاسکتیں۔ اُردو اور ہندی ہر ایک کے حامی اس حقیقت کے خلاف ایک لفظ بھی بول نہیں سکتے اس بنا پر یہ مسئلہ بالکل صاف ہوجاتا ہے کہ اُردو سے الگ رہ کر ہندی کے لئے کوئی راستہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ پنڈت جی موصوف نے مندرجہ ذیل سطروں میں دونوں کی حدیں باندھنے کی کوشش کی ہے مگر یہ حد بول چال کی زبان کے لئے نہیں ہے البتہ کتابی اور تصنیفی ہندی کی مختصر لفظوں میں تعریف ہے۔ آپ کتاب مذکورہ بالا میں فرماتے ہیں:-

اُردو ہندی میں صرف اتنا ہی انتر ہے کہ ہندی ناگری لپی (رسم خط) میں لکھی جاتی ہے اور اس میں سنسکرت شبدوں کی بہلتا (بہتات) رہتی ہے اُردو فارسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے اور اس میں فارسی و عربی شبدوں کی ادھکتا رہتی ہے

(صفحہ ۷۴۔ (بحث) ہندی۔ اُردو)

اُردو میں فارسی و عربی لفظوں کی کثرت تو پنڈت جی نے لکھدی ہے مگر انہیں یہ بھی تسلیم ہے کہ ہندی بھی اس مرض سے بچ نہ سکی اور پھر اُس کی اردو سے تمیز مشکل ہوگئی۔ وہ مسلمانوں کے اثر سے فارسی و عربی لفظوں کے میل جول کو غیر فطری تسلیم نہیں کرتے۔ اور نہ وہ یہ مانتے ہیں کہ مسلمان حکمرانوں نے لاتعداد الفاظ فارسی عربی کے ہندی میں ملا دئے بلکہ وہ یہ بھی اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے فارسی و عربی لفظوں اور ہندی الاصل الفاظ کا میل ملاپ شروع ہوچکا تھا۔

مسلمانوں کے آنے کے پہلے یہاں کی بھاشا عربی، فارسی، ترکی شبد پرچلت تھے۔ یہ بات چندر برائی

کی کبتا سے اسپشٹ (صاف) معلوم ہوتی ہے۔
جب مسلمانوں کا سنسرگ (تعلق) اس دیش میں بڑھا تو اُن کی بھاشا کے بہت سے شبد ہماری بول چال میں بڑھ گئے۔ بول چال کے سمجھنے کیلئے ہندو مسلمان دونوں نے ہندی میں عربی و فارسی کے شبدوں کو ملنے دیا۔ شاہجہاں کے وقت میں اس مشرت (مرکب و مخلوط) بھاشا کا نام اُردو پڑ گیا۔ اس کا پُرانا نام ریختہ بھی ہے۔
(کبتا کومدی۔ ہندی کا سنچھپت اتہاس صفحہ ۶۵)
مُصنّف پنڈت رام نریش ترپاٹھی

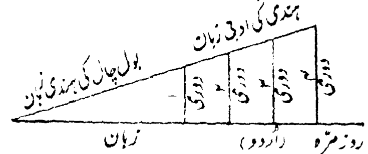
یہ حوالے میں نے مدرسوں کی بول چال کی ریڈروں کو اُردو، ہندی کے تفریق اور تمیز سے آزاد کرنے کے سلسلے میں دئے ہیں۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ بات اور عرض کر دوں۔ میرے درجے کے ہندی طلبا نے ہندی الاصل (تت سم) لفظوں کے سمجھنے کا ایک عجیب طریقہ نکالا ہے۔ وہ مطالعہ کے وقت میری توضیح کا انتظار نہیں کرتے۔ موقع استعمال سے سمجھنے کے بجائے اُردو عبارت میں آئے ہوئے ہندی نئے الفاظ کے بدل کو اُردو طالب علموں سے پوچھ لینے میں آسانی سمجھتے ہیں۔ مثلاً اس مضمون میں اونکار ریڈر کی دی ہوئی ہندی عبارت کے پڑھنے والے لڑکے کو اگر کرودھ کا مطلب سمجھنا ہے تو وہ جھٹ ایک اُردو پڑھنے والے ساتھی کو پکارتا ہے۔ "بھائی موتی لال اپنی کتاب اُس جگہ سے پڑھو جہاں سے میں پڑھ رہا ہوں"۔ وہ اپنی ہندی ریڈر کی عبارت کے ایک ایک لفظ کو منطبق کرتا چلا جاتا ہے جب اُردو طالب علم لفظ "غصہ" پر پہونچتا ہے تو وہ کہتا ہے بس رہنے دو معلوم ہو گیا۔ اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ کرودھ۔ غصہ، ایک معنی رکھتے ہیں۔ اسی طرح ہندی طلبا اپنی ہندی ریڈر میں آئے ہوئے ایک، دو، اسلئے، گنے لفظوں کو سمجھ لیا کرتے ہیں۔ اُردو کے طالب علم اس زحمت سے ایک حد تک آزاد رہتے ہیں، کیونکہ اُن کی ریڈر میں آئے ہوئے الفاظ فارسی و عربی ہوتے ہوئے معروف و مشہور ہوتے ہیں اور روزمرّہ زندگی میں سامنے آتے رہتے ہیں۔ مگر ہندی ریڈروں میں یوگی بجائے جوگی اور منتر بجائے منتر کے آتا ہے اس لئے قرامت کے پردے سے پہچانے نہیں جاتے۔ نیچے ایسے لفظوں کو چھانٹ کر لکھتا ہوں۔ اس کے مقابل اُردو ریڈر کے ہم معنی الفاظ ہیں۔ مقابلے سے صاف ظاہر ہو جائیگا کہ بول چال کی کسوٹی پر ان دونوں میں سے کون صحیح اترتے ہیں:-

ہندی	اُردو	دیہاتی
رچی	ذوق، شوق	جوک سوک
پرشنشا	تعریف	تاریفی
شترو	دُشمن	دُسمن
کر	محصول	ماصول
سادھارن	معمولی	ماسولی
اہو بھاگیہ	خوش قسمت	بڑی بھاگ
آگیا	حُکم	حُکم
سواستھیہ	تندرستی	تندرُہتی

اس طرح اُردو کامن ریڈر پڑھنے والا طالب علم اپنے ہندی خواں دوست کی مشکل نہایت آسانی سے حل کرتا ہے۔ شاید یہ غلط فہمی ہو کہ میں اُردو سے ہندی کے لفظوں کو خارج کرنے کی رائے دے رہا ہوں۔ مگر میرا منشا یہ ہرگز نہیں ہے۔ میری گذارش کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہماری بول چال کی زبان صرف ایک ہے اور فارسی و عربی کے الفاظ اس میں اس قدر گھل مل چکے ہیں کہ اُن کی جگہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سنسکرت لفظ رکھنے سے زبان قطعی نہ رہ کر گنجلک بھاشا ہو جاتی ہے جو سامعین کے لئے آسان نہیں ہوتی۔ چلن کے الفاظ کے استعمال سے زبان سہل بھی ہوتی ہے اور مزیدار بھی۔ اس کے خلاف بھاشا روکھی پھیکی اور مُردہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر اس لفظی تبادلے میں ہم لفظوں کے چلن کو ضروری نہ قرار دیں تو نہ صرف یہ کہ ایک ہندوستانی زبان کا خیال خواب ہو کر رہ جائے بلکہ ایک ایسی زبان پیدا ہوگی جو اپنے ماحول کے مطابق نہ ہو کر عہد وسطیٰ کی زبان کا نمونہ ہوگی، اور ہماری اس قسم کی کوششیں پیچھے چلنے کی دُنیا میں نئی مثال بن جائیں گی۔

اس تصویر کو جو حال میں مستقبل کیلئے تیار کی جائے آگے بڑھکر دیکھنا لازمی ہے اور کم از کم کچھ نہیں تو حال سے آنکھیں ہرگز نہ بند کرنا چاہیئے۔ کٹھن کو کاٹھنیہ اور بھلے مانس کے بدلے سجن، سجن سجّن کہنا عقل اور ترقی کے خیال کے بالکل خلاف ہے۔ اس لئے بول چال کی صورت کو بدلنا جس کی ابتدا اسکولی کامن ریڈروں سے ہو رہی ہے بہت مضر ثابت ہوگا۔ اس کا ایک نتیجہ تو ہمارے سامنے آچکا کہ دونوں زبانوں کے ادب میں ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی ہے۔ یہی چند الفاظ جو اُردو، ہندی کامن ریڈروں میں ذریعۂ تمیز بنے ہوئے

میں آگے چلکر وہی نتیجہ پیدا کریں گے جو ایک لفظ پر ملنے والے فریل کے دو خطوط کرتے ہیں۔ یہ خطوط جیوں جیوں آگے بڑھتے جاتے ہیں ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ اسی طرح کی تفریق اردو ہندی میں ہوتی جا رہی ہے۔



بول چال کی زبان جو مدرسوں میں ہے اور جو کچھ اس کی رفتار میں دور اندیشی کے خلاف تبدیلی پیدا کی گئی ہے وہ اچھی طرح دکھاتی چاہئی ثابت ہو چکی کہ اگر ہم ہندی کو اردو سے الگ رکھنے کا خاص ارادہ نہ کریں تو جس طرح بولتے وقت اس کی صورت ایک ہے، اسی طرح تحریری صورت میں بھی کوئی تمیز نہیں ہو سکتی۔ کوئی وجہ نہیں کہ زبان سے نکلنے والے الفاظ کو قلم کی زبان کچھ کا کچھ کر دے۔ اگر ارادہ ہی کچھ اور ہے تو ساری بحث اور ساری دلیلیں بیکار رہیں گی۔ سوتے کو جگانا اور بہکے کو راہ لگانا آسان ہے مگر جو جاگتے ہوئے سوتا ہوا اور جان بوجھ کر انجان بنا ہوا ہے اسکو ہزار جھنجھوڑیئے ہزار سر کھپایئے وہ آنکھیں بند رکھیگا۔

اب بول چال کے دوسرے حلقوں پر بھی نظر ڈالئے اُن لوگوں کی گفتگو اور زبان پر غور کیجئے جن کو اپنے کسی خاص مقصد کی غرض سے بولنا پڑتا ہے بحث تیں لکچرر کی طرح جنہیں تفنن طبع یا زور کلام ہی سے غرض نہیں جن کو شان ادبیت یا زور قلم دکھانے سے سروکار نہیں مثلاً اُصول صحت سمجھانے والا ڈاکٹر، سینیٹری انسپکٹر گاؤں سدھارک، اسکاوٹ آرگنائزر، بیرسٹر، وکیل، مختار، تجار، تجارتی پروپیگنڈسٹ، عام پبلک سے ملنے جلنے والے مثلاً پان سگریٹ خوانچہ فروش، اسٹیشن کے قلی، مزدور۔ ظاہر ہے کہ ان کی زبان پر وہی الفاظ آئیں گے جو شہر اور دیہات دونوں کے لئے عام ہونگے زبان کا محقق ان کی بول چال کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا، اور ہندستانی زبان کی شکل ان کی گفتگو میں نظر رکھنے پر ہی نمایاں ہوتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی زبان میں فارسی وعربی کا کوئی پرہیز نہیں ہے۔ نہ تو فارسیت وعربیت کا غلبہ ہے اور نہ سنسکرت شبدوں کی بھرمار، نہ ٹھیٹ ہندی یا ٹھیٹ اردو کا ٹھاٹ۔

حفظان صحت کے متعلق ڈاکٹر جو کچھ کہتا ہے اس میں بیمار کے بدلے اسوستھ، دوا، یا علاج کے بدلے اوشدھ، استعمال کے بجائے سیون۔ ترکیب کی جگہ بدھی کہیں سننے میں نہیں آتا۔ پورے لکچر میں آپ مشکل سے دو ایک لفظ اصل سنسکرت کے نکال سکیں گے۔

اسکاوٹ آرگنائزر کو بھی اپنے کام سے کام ہے۔ وہ کام کی باتیں کرتا ہے۔ ہوا میں لفظوں کی پھلجھڑی اڑانا اس کا مقصد ہرگز نہیں ہے۔ اُس کے مخاطب ہر قسم کے لوگ اور مختلف قسم کے لڑکے ہیں۔ آرگنائزر کی زبان میں جہاں تک ہندوستانی ہوتی ہو وہ اپنی بات کو ذہن نشین کرانے یا خیال کی اشاعت میں اتنا ہی کامیاب ہوتا ہے اور اس کے خلاف عمل میں جو دشواریاں ہوتی ہیں اُن سے ہندوستانی اسکاوٹ آرگنائزر صاحبان بخوبی واقف ہونگے۔ ہندوستان کے چیف اسکاوٹ آرگنائزر پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کی زبان اور اس کا جو غیر معمولی اثر اسکاوٹنگ کی اشاعت میں جادو گر ہے اُسے میں مثال میں پیش کرتا ہوں۔

تاجروں اور دوکانداروں کی گفتگو سرتاسر کتابی ہندی سے مختلف ہے ہیں اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں کہ وہ کس زبان میں گفتگو کرتے ہیں مگر یہ تو صاف ظاہر ہے کہ اُن کی گفتگو جو کہ زبان عوام کا درجہ رکھتی ہے ہندی اور وہ ہندی ہرگز نہیں ہے جس کا بھارتیہ ساہتیہ پرشد نے ہندی کے ذریعے اعلان کیا اور جسے اب وردھا کی مشین میں ڈھال کر ٹکسالی بتایا جا رہا ہے۔ نیچے ایک مارواڑی بزاز کی گفتگو ایک گاہک سے ہو بہو نقل کی جاتی ہے۔ اس گفتگو کو میں نے خود لکھا تھا کیونکہ مجھ اس وقت ہندوستانی زبان کے زندہ مثالوں کی دھن تھی۔

مارواڑی:- بابو لیجیے۔ کون سا کپڑا دوں؟

بابو صاحب:- دام ٹھیک بتایئے تو پھر بیٹھوں ورنہ فضول وقت میرے پاس نہیں ہے۔

مارواڑی بزاز:- (نوکر سے) بابو کے لئے کرسی لانا۔ بابو جی کھڑے ہوا نہیں ہوتا۔ ذرا بیٹھ جایئے۔ نفع کا کیا سوال ہے۔ پہلے آپ یہ تو فرمایئے کہ کونسا کپڑا آپ کو دکھاؤں۔

بابو:- تن زیب کا ایک تھان۔ زری کور کی ساڑیاں دو۔ کوئی اچھی وضع کی چھینٹ زمپر کے لائق۔

بزاز:- چھینٹ کے تھان یہ سب لگے ہیں۔ زمین قسم قسم کی وضع بھی ایک بڑھکر ایک جو پسند آئے دیدوں۔ (نوکر کو آواز دیتے ہوئے)

للو۔ زری کور کی ساڑیاں کنی مبل کی اور تن زیب کا تھان اندر سے لاؤ۔

بابوجی۔ اس کی قیمت کیا؟ اور یہ کیا حساب ہے؟ اور یہ پورا تھان کتنے کا ہے؟ اس میں (ساری میں) محض کورہی کور ہے۔

بزاز۔ خیر اسکو چھوڑ دیجئے۔ چھینٹ اور تن زیب کو بندھوا دوں؟

بابوجی تقریباً دوکان پر پہنچ گئے تھے۔ دوکاندار کا خاصہ ہوتا ہے کہ ادھر کسی نے دوکان کی طرف دیکھا کہ اُدھر سے "آئیے بابوجی" سے خیر مقدم کیا۔ اپنی صاحبی کی لاج رکھنے کے لئے بابو صاحب نے ادھر اُدھر اُلٹ پلٹ کے جب پنڈ چھڑانا چاہا تو بزاز بولا:۔

"کچھ لینا دانا ہے یا نہیں۔ پھجول پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔ ابھی تو عید بہت دن ہے۔ اتنی جلدی کیا ہے؟"

خدارا انصاف کیجئے۔ کیا زبردستی رائج کی جانے والی ہندی یہی ہے۔ موجودہ ہندی میں مہاجن کے آخری جملوں کا ترجمہ یہ ہوگا۔

آپ کے اِچھّا نوسار بستر دوں گا۔ لابھ کا کیا پرشن ہے۔ اپنی رُچی تو بتلائیے۔ لیناوانا ہے یا نہیں۔ بیرتھ بیگر کرنے سے کیا لابھ؟ ابھی تو عید نکٹ نہیں ہے۔ اتنی شیگھتا کیوں؟

پھیری لگانے والے جو اپنے کو خوانچہ فروش کہتے ہیں اُنکا بھی یہی حال ہے۔ پوربی ضلعے جو اِس مصنوعی ہندی کے لئے مرکز بنائے جاتے ہیں وہاں بھی مونگ پھلی چاٹ کی بہار، چنے مزیدار مسالے دار کی آواز کانوں کو بھاتی ہے۔ حلوائی بھی شواد کے بدلے سواد کہتا ہے اور لذّت کے لفظ سے اپنی مٹھائی کو زیادہ لذیذ بناتا ہے۔ تمباکو فروش، لڈو دل بہار، خمیرہ خوشبودار کے اشتہار سے حقّے بازوں کو بیچین کرتا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ خود دیکھ لیجئے کہ زبان کا رخ کدھر ہے۔ آخر بات کیا ہے؟ جو الفاظ ہم ایک زمانے میں خوشی خوشی لیتے تھے آج کیوں ہماری زبانوں پر نہیں چڑھتے۔ آج ہم دُگدھ اور گُھرت کو دودھ اور گھی کے مقابل کیوں نظرانداز کرتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ ہماری طبیعت کو میلان حسن کی جانب ہے راہ میں چلتے چلتے سڑک پر پڑے ہوئے کنکروں میں سے خوشوضع اور چکنے پتھر اپنے بچپن میں ہم اٹھا لیا کرتے تھے اور کھردرے بدوضع پتھروں کو پھوٹی آنکھ سے بھی نہیں دیکھتے تھے۔ یہی میلان بڑے ہونے پر بھی قائم رہتا ہے۔ ہم میں سے جو جاہل اور غیر مہذب ہیں وہ کندۂ ناتراش کہلاتے ہیں۔ وحشیانہ حرکتیں دیکھکر ہر مہذب ہنس دیا کرتا ہے۔ جس طرح پتھر کی چکنی ڈلی کے مقابل ان گڈھ اور کڈھب کنکر پتھر ہمیں کھٹکتے تھے غیر مہذب انسان کی غیر مہذب حرکتیں بھی ہمیں کھٹکتی ہیں۔ ادب اور زبان میں بھی یہی انسانی فطرت کارفرما ہے جو لفظوں کی قدیم شکلوں کو دیکھنا اور سننا پسند نہیں کرتی۔ "دُگدھ"، "دودھ"، کے مقابل اَن گڑھ ہے، ناتراش ہے اور اُس میں وہ لوچ اور روانی نہیں ہے۔ اسی فطرت اور میلان نے "کاریہ" کو "کاج" کا اور "سوریہ" کو "سورج" کا شگفتہ رُوپ دیا۔ اس لئے فطرت کی پیروی کو ہی زبان کی سچی خدمت کہہ سکتے ہیں۔ لفظوں کی یہ شکلیں مرورِ ایّام کی بدولت ایسی ہوئیں۔ جو لوگ زبان کی چلتی ہوئی روش کو روکنا چاہتے ہیں وہ قدرت سے پہلے جنگ کرکے دیکھ لیں۔ جب گلیشیر برف کی چادروں پتھر کی سلوں کو محفوظ نہ رکھ سکا تو بھلا زبان کا بہتا ہوا دریا ساحل پر کیا رحم کرے گا۔ اس لئے میں ان کو حق بجانب سمجھتا ہوں جن کی کوششیں قدرتی رو کے موافق ہیں۔ اور اُن انجنیروں کی کوشش میں ہمیشہ مضحکہ انگیز سمجھوں گا جو ایک طرف دریا کی گھٹ بندی کر رہے ہیں اور دوسری طرف اُس کا رُخ اُلٹا پھیرنا چاہتے ہیں گرچہ وہ اپنے زعمِ باطل میں کامیابی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

چراغ علی

Chiragh Ali

ریل کا سفر

میں تو عورت ذات پردے کی بیٹھنے والی ٹھہری میرا تو ذکر کیا۔ تقدیر سے جس کے پلّے بندھی وہ بھی ایسے گھر گھسنے ہیں کہ باہر جانے کے نام سے دشمنوں کا بُرا حال ہو جاتا ہے۔ دس ۱۰ برس سے خاصے تیس ۳۰ روپے کے نوکر تھے۔ صاحب نے کہیں باہر کی بدلی کر دی۔ بس پھر کیا تھا دفتر سے جو آئے تو بخار چڑھ آیا۔ دست چھوٹ گئے۔ اماں جان نے جو سُنا تو سارا گھر سر پہ اُٹھا لیا۔ "جھُلسا لگے ایسی نوکری کو، صدقے کئے تھے یہ تیس روپلی۔ بڑا جوانا مرگ پردیس بھیجنے والا آیا۔ اس بندی کا ایک تو پھونسڑا ہے۔ نا بابا مجھے اپنے بچّے کی جان پیاری ہے۔ روزگار پیارا نہیں"۔ آخر صاحب کو کیں ضد ہو گئی۔ یا وہ باہر جائیں یا نوکری سے ہاتھ دھوئیں۔ میں کیا سمجھاتی۔ میری رُوح سفر سے خود کانپتی تھی۔ وہ جاتے تو مجھ کو بھی جانا پڑتا۔ مدعا یہ کہ نوکری چھوٹ گئی۔ وہ تو خدا بخشے ابّا جان پانچ سات مکان چھوڑ مرے تھے جو گزارہ چل رہا ہے۔ اور اب ہم دو میاں بیوی اور ایک چھ برس کا بچّہ تین دم ہیں۔ خدا دال روٹی دے دیتا ہے۔ آرام سے کھا لیتے ہیں۔

تیس سال کی ان کی عمر ہے اور میں بھی بچّے والی ہو گئی ہوں مگر بہن چار پیسے کو دلّی پر بھی جانے کا ہیاؤ نہیں پڑتا۔ ایک دو دفعہ ہمت کر کے ان سے کہا بھی کہ دیکھنا بڑے خواجہ کے عرس میں جانے کیلئے دل بھر بھر آتا ہے۔ حج تو ہمارے نصیب میں کہاں جیتے جی ان پیروں کی زیارت تو کر لیں لیکن بوا وہاں جانے کیلئے ریل میں بیٹھنا پڑتا ہے۔ اتنا دل گردہ نہ ان کا ہے نہ میرا کہ وہ مجھ کو ساتھ لیجائیں اور میں مردوں کی بھیڑ میں اُنکے ساتھ جاؤں۔ جب لوگوں سے ریل کے تماشے اور دوسرے شہروں کی بہار سنتے ہیں ان کے مُنہ میں بھی پانی بھر آتا ہے اور میں بھی چاہتی ہوں کہ ایک دفعہ تو ضرور ریل میں بیٹھیں۔ اوّل مرنا آخر مرنا پھر مرنے سے کیا ڈرنا۔ ساری دُنیا ریل میں بیٹھتی ہے۔ بوڑھے بالے بُڑھیاں، جوانیں سبھی روز چلی جاتی ہیں۔ بلی آتی میں کیا ایک ہمیں کو ریل کھا جائیگی۔

بہن اتفاق دیکھو، گئے جمعہ کو وہ جو باہر سے آئے تو انکے ہاتھ میں ایک گلابی رنگ کا کاغذ تھا۔ مجھے دکھا کر کہنے لگے: "لو بی تمہاری دُعا اللہ میاں نے سُن لی۔ خالو ابّا کا دلّی سے تار آیا ہے۔ حمید کو گھوڑی چڑھائیں گے۔ ہم دونوں کو بُلایا ہے"۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بھونچکّا ہو کر بولی "یہ دُعا قبول ہوئی ہے یا بد دعا۔ مجھ بندی کو تو معاف رکھو۔ تم برسوں سے ریل کیلئے تڑپ رہے تھے۔ خدا نے یہ دن دکھایا۔ جم جم جاؤ۔

وہ:۔ اور تم نہیں چلو گی؟

میں:۔ دم خشک کرنے سے کیا فائدہ۔ جی بھر گیا ہے تو ایک دفعہ ہی گلا گھونٹ دو۔

وہ:۔ ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ یا اللہ ریل کیسی ہوتی ہے جو اتنی مخلوق کو دن رات لئے پھرتی ہے۔ اب جو خدا نے یہ موقع دیا ہے تو انکار کرتی ہو۔ عجب قسم کی عورت ہے۔ ڈر کاہے کا۔ ایک ذرا ہچکچاہٹ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تمہارے سبب سے میں بھی ریل میں بیٹھ لونگا۔

میں:۔ تم ماشاء اللہ مرد کی ذات ہو۔ پھر جب سے نوکری چھوڑی ہے اور مردوں میں زیادہ اُٹھک بیٹھک رہتی ہے تمہارا دیدہ موٹا ہو گیا ہے۔ جاؤ شوق سے جاؤ۔ میں منع کرتی ہوں۔ چاہے یوسف کو بھی ساتھ لے لو۔ مگر مجھے نہ ستاؤ اور مجھ سے جی بھر گیا ہے تو ویسی کہو۔ مجھ میں تو یہ بوتا نہیں ہے کہ اس نگوڑی کالی دیونی کے چنگل میں پھنسوں سُنا ہے موئی آندھی کے بوکے کی طرح چلتی ہے۔ درخت نہیں سوجھتے۔ زمین چکراتی ہوئی نظر آتی ہے۔ میری تو جان فنا ہو جائیگی۔ آگ لگاؤں ایسی سیر کو جھلسا دوں ایسے سفر کو۔

وہ:۔ اور میری جان کو تم نے جان ہی نہیں سمجھا ہے۔ اری نیک بخت مریں گے تو دونوں ساتھ مرینگے۔

میں:۔ لیکن کس برتے پر ہاں کروں۔ آخر تم کو ایسی کیا پخ آپڑی ہے تم نہ جاؤ گے تو کیا خالہ جان کی ہیٹی ہو جائیگی۔

وہ:۔ ہمارے جانے نہ جانے سے ہوتا بھی کیا ہے۔ لیکن سمجھو تو سہی ہمیں بھی اس دُنیا میں رہنا سہنا ہے۔ ہمارے آگے بھی خدا رکھے لڑکا ہے۔ اس کی شادی تم کو کرنی ہے یا نہیں۔ اگر ہم کسی کے مرنے جینے، شادی غمی میں شریک نہ ہوں گے تو ہمارے ہاں آکر کون تھوکے گا۔ بھائی بندوں کے دم سے ایسے موقعوں کی رونقیں ہوتی ہیں۔

ساقی کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے
جس میں اسکے تمام خاص نمبروں کی
قیمت بھی شامل ہے

جُرعات

ساقی میں اردو کے بہترین انشا پردازوں
کے مضامین شائع ہوتے ہیں اسکا معمولی
پرچہ بھی تقریباً سو صفحے کا ہوتا ہے

جلد ۱۷ | ساقی دھلی۔ بابت ماہ مئی ۱۹۳۸ء | نمبر ۵

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
(۱)	ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ	شاہد	(۲)
(۲)	دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی	ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایم۔ اے؛ پی۔ ایچ۔ ڈی؛ (لندن)	(۳)
(۳)	پیامِ دلفگار بنامِ دلفگار	ایک دلفگار	(۱۷)
(۴)	صیدِ ہوس	جناب صادق الخیری دہلوی۔ ایم۔ اے	(۱۸)
(۵)	قطعات	جناب اختر انصاری۔ بی۔ اے (آنرز) بی۔ ٹی	(۲۳)
(۶)	بوسہ	جناب گنگا دھر ناتھ فرحت کانپوری۔ بی۔ اے؛ ایل ایل۔ بی	(۲۴)
(۷)	سچی کہانی	"پریم پجاری"	(۲۵)
(۸)	سوزِ ناتمام	جناب ماہر القادری	(۳۲)
(۹)	ہماری مغرب پرستیاں	جناب مرزا سیف علی خاں	(۳۳)
(۱۰)	گاؤں اور شہر	جناب بہزاد لکھنوی	(۳۸)
(۱۱)	نکات	جناب امین حزیں (سیالکوٹی)	(۴۰)
(۱۲)	بچپن	محترمہ عصمت چغتائی۔ بی۔ اے	(۴۱)
(۱۳)	کیفِ جمال	جناب کاوش حیدر آبادی	(۴۴)
(۱۴)	زندہ اور فطری زبان	جناب چراغ علی صاحب	(۴۵)
(۱۵)	نغمات	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق۔ ایم۔ اے	(۴۹)
(۱۶)	عورت	جناب اثر۔ بی۔ اے (علیگ)	(۵۰)
(۱۷)	افسانہ نویسی	جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ بی۔ اے؛ ایل ایل۔ بی	(۵۷)
(۱۸)	ڈاکٹر کا استعمال	جناب ممتاز مفتی۔ بی۔ اے	(۶۱)
(۱۹)	ایک وادی سے گزرتے ہوئے	جناب جاں نثار اختر۔ بی۔ اے (علیگ)	(۶۶)
(۲۰)	بربادِ تمنا	جناب تسنیم جہانگیر نگری	(۶۷)
(۲۱)	پردیس	محترمہ اختر اشفاق علی	(۷۱)
(۲۲)	آرٹ اور اخلاق	جناب حفیظ نعیمی۔ بی۔ اے	(۷۶)
(۲۳)	پنہاری	جناب الطاف مشہدی	(۸۷)
(۲۴)	آئس کریم	جناب ریاض الدین احمد۔ ایم۔ اے؛ بی۔ ٹی	(۸۸)
(۲۵)	کتاب پر مقدمہ	جناب سید علی شاکر۔ ایم۔ اے	(۹۰)
(۲۶)	علامہ سر محمد اقبال	جناب یوسف رضا بدایونی	(۹۲)

قیمت فی پرچہ ۶/

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ

Sir Mohammad Iqbal

۲۱ اپریل کی منحوس صبح نے یہ غمناک خبر سنائی کہ علامہ اقبال ہم سے چھین لئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی بے وقت موت پر جتنے بھی آنسو بہائے جائیں کم ہیں۔ انکی جدائی کا صدمہ ہمیں اس لئے اور بھی زیادہ ہے کہ ہمیں اس وقت اُن کی سب سے زیادہ ضرورت تھی ع۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اقبال جیسا فلسفی، اقبال جیسا شاعر، اقبال جیسا قوم پرست، اقبال جیسا مسلمان صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ایسے عالمِ باعمل کی موت پر ع۔

شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھکو

لیکن جو موت کے چنگل میں پھنس کر بھی یہ کہے کہ "مجھے موت کا ڈر نہیں ہے کیونکہ میں مسلمان ہوں" اُس کی موت بھی حیاتِ تازہ ہے۔ کیسی لائقِ رشک موت جس پر ہزاروں زندگیاں قربان۔ اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔

"شاھد"

اقبال کی سُنانی سنکر

کیا پوچھتے ہو حال مسلمانونکا　　دل ہو گیا پامال مسلمانوں کا

اسلام غریب ہائے اسلام غریب　　رخصت ہوا اقبال مسلمانوں کا

میرزا یگانہ لکھنوی

(بسلسلۂ ماسبق۔ نمبر ۵)

دورِ حاضر اور اُردو غزلگوئی

غزل کی "تنگ دامانی"

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل — کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے — غالبؔ

آج جو ہر ہیں دل کے قاش فروش — کاش کچھ اور قافیے ہوتے — مولانا محمد علی جوہر مرحوم

رگھوپتی سہائے صاحب، فراق، ایم۔ اے۔ گورکھپوری کے اس دعوے کے باوجود کہ "تنگنائے غزل میں لامحدود وسعتیں ہیں" غزل کی "تنگ دامانی" سے انکار ممکن نہیں۔ فراق صاحب کو چونکہ غزل بہت محبوب ہے لہذا اُسکے مُسلّمہ عیوب بھی انہیں محاسن ہی نظر آتے ہیں، اور یہ کوئی نئی بات نہیں، نہ اس پر کسی کو اعتراض کی ضرورت ہے۔ رہ گیا نقاد! تو ظاہر ہے کہ وہ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ لیلیٰ اگر واقعی کالی ہے تو نقاد یہ کہنے پر مجبور ہے کہ لیلیٰ کالی ہے۔

غزل کی اس "تنگدامانی" کی ذمہ دار خصوصیت کے ساتھ دو چیزیں ہیں:۔

(۱) ہر مضمون کے لئے صرف دو مصرعوں کا قالب۔

(۲) قافیہ و ردیف۔

ان قیود کے ہوتے ہوئے غزل میں وسعتوں کا وجود اس وقت تک قابلِ تسلیم نہیں جب تک اُسے عمروعیار کی کراماتی زنبیل نہ مان لیا جائے۔ فراق صاحب نے یہ ثابت کرنے کی بہت کوشش کی ہے کہ غزل کا ایک شعر، بشرطیکہ وہ کامیاب شعر ہو، سُننے والوں پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتا ہے ہمیں بھی فراق صاحب کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ظرفِ غزل میں اتنی وسعتیں موجود ہیں جتنی ایک بلند پرواز شاعر کے تخیل کے لئے درکار ہیں۔ غالبؔ اور جوہرؔ نے مندرجہ صدر اشعار میں غزل کی اسی کوتاہی کا شکوہ کیا ہے۔

غزل گو شاعر اس بات پر مجبور ہے کہ اُسے جو کچھ کہنا ہے دو مصرعوں میں کہدے۔ ظاہر ہے کہ بعض مضامین مختصر ہونے کے باوجود بھی کسی طرح دو مصرعوں میں نہیں سما سکتے لیکن شاعر بیچارے کے پاس جو سانچا ہے اس میں دو ہی مصرعوں کی گنجائش ہے۔ ناچار وہ ہر مضمون کو کھینچ تان کر، توڑ مروڑ کر، کاٹ چھانٹ کر، جس طرح بھی ممکن ہوتا ہے انہیں دو مصرعوں میں ٹھونس دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مضمون کے بعض حصے بیان ہو جاتے ہیں، بعض رہ جاتے ہیں۔ اگر چھوٹ جانے والے حصے مقتضائے حال اور قرینے سے سمجھ میں آ گئے تو خیر، ورنہ شعر مہمل ہو گیا اور بالفرض مہمل نہ بھی ہو تو پورے طور پر بیان نہ ہو سکنے کی وجہ سے مضمون کا سارا لطف خاک میں مل جاتا ہے۔ مرزا غالبؔ کا ایک مشہور شعر ہے:۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم — میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے

علامہ نظم طباطبائی مرحوم نے اس شعر کی شرح اس طرح کی ہے :-

"تجھ سے تو مجھے کچھ شکایت نہیں، لیکن نامہ بر کو میرا سلام شکایت آمیز پہونچا دینا"

اور مولانا حسرت موہانی اپنی شرح میں لکھتے ہیں کہ :-

"نامہ بر سے میرا سلام کہیو، یعنی بطور طعن کے، کہ واہ کیا خوب ہمارا کام کیا"

ان دونوں بزرگوں نے شعر کا وہی مطلب بیان کیا ہے جو الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن مرزا غالب اگر شارحین کی زبان سے اپنے اس معرکتہ الآرا شعر کا یہ مختصر مطلب سنتے تو یقیناً اپنا سر پیٹ لیتے اور اپنے کلام کی ایسی ناقص شرحوں کو سوختنی قرار دیتے۔ اب سنیئے کہ وہ خود کیا کہتے ہیں :-

"یہ مضمون کچھ آغاز چاہتا ہے۔ یعنی شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی لیکن کھٹکا یہ کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص کو لایا اور اسے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد علیہ ہے۔ میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کریگا۔ خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا۔ قضارا عاشق کا گمان سچ ہوا۔ قاصد مکتوب الیہ کو دیکھکر والہ و شیفتہ ہو گیا۔ کیسا خط، کیسا جواب، دیوانہ بن، کپڑے پھاڑ جنگل کو چل دیا۔ اب عاشق اس واقعہ کے وقوع کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب داں تو خدا ہے، کسی کے باطن کی کسی کو کیا خبر۔ اے ندیم تجھ سے کچھ کلام نہیں، لیکن اگر نامہ بر کہیں ملے تو اس کو میرا سلام کہیو کہ کیوں صاحب تم کیا کیا دعوے عاشق نہونے کے کر گئے تھے اور انجام کار کیا ہوا"[1]

فراق صاحب ہوں یا کوئی دوسرے صاحب، اگر الفاظ کی مدد سے غالب کے اس شعر کا مطلب بیان کرنا چاہیں گے تو قریب قریب وہی کہیں گے جو نظم اور حسرت نے کہا۔ لیکن غالب کی اپنی تشریح سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا بیان کیا ہوا مطلب بالکل ناقص ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نقص کا ذمہ دار کون ہے؟ شارحین کا قصور فہم یا مرزا غالب کا انداز بیان؟ ہمارے نزدیک شارحین کا قصور ہے نہ مرزا غالب کا بلکہ اس ساری خرابی کا سبب خود غزل کی وضع اور اس کے ظرف کی تنگی ہے۔ آخر اتنا بڑا مضمون دو مصرعوں میں کیسے سماتا۔

دوستوں کی ایک مخصوص صحبت میں دور حاضر کے ایک نامور غزل گو شاعر نے اپنی ایک معرکہ کی غزل سنائی۔ جب وہ اس شعر پر پہونچے :-

غم سے دل خون ہوا اور آنکھ میں صہبائے نشاط — یہ کہیں میرے ہی تخییل کی پرواز نہ ہو

تو بعض سامعین پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اور تحسین و آفریں کے شور سے فضا گونج اٹھی۔ میں حیرت سے سب کا منہ تک رہا تھا۔ اور اپنی کوتاہ فہمی پر بیحد متاسف تھا کیونکہ اس شعر کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ شاعر صاحب جو کسی وجہ سے مجھے سخن فہم سمجھتے تھے، میرے سکوت سے آزردہ ہو کر فرمانے لگے کہ شاید آپ کو یہ شعر پسند نہیں آیا۔ میں نے عرض کیا کہ کوئی شعر کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو جب تک اس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آئے مجھے پسند نہیں آتا۔ میں تو ابھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اس کا مطلب کیا ہے خصوصاً دوسرے

[1] ۱۹۱۱ء میں نظامی پریس بدایوں سے جو دیوان غالب شائع ہوا تھا اس میں مرزا غالب کے ایک خط کا فوٹو بھی شامل ہے۔ یہ عبارت اسی خط سے نقل کی گئی ہے۔ شاد انی

مصرع ہیں "یہ" سے کیا مراد ہے! شکر ہے کہ انہوں نے میرے قول کو باور کیا اور فرمایا کہ ہاں اس شعر میں ذرا سی گنجلک ضرور ہے۔ چونکہ اس کا تعلق ایک واقعہ سے ہے اسلئے اس کا جاننا لازمی ہے ورنہ پورا لطف نہیں آسکتا۔

واقعہ یوں ہے کہ کسی وجہ سے شاعر کو یقین ہوگیا ہے کہ اس کی محبوبہ زلیخا وار اس کی پرستار ہے لیکن درمیان میں مشکلات کے سربفلک پہاڑ حائل ہیں۔ ملاقات ممکن نہیں۔ اندوہ جدائی نے اس کے نازک دل کا خون کردیا ہے۔ ایک دفعہ شاعر نے اسے دیکھا اور قریب سے دیکھا۔ محبوبہ کی آنکھیں جوش نشاط سے چمک رہی تھیں۔ تبسم پیہم مسرتِ قلبی کا آئینہ دار تھا، چہرہ پر شادمانی کے ہرگونہ آثار موجود تھے۔ یہ عالم دیکھکر شاعر کا دل دھک سے ہوگیا۔ اس کا خیال تھا کہ کاہشِ فراق نے اس کی محبوبہ کو غم کا پتلا بنا دیا ہوگا۔ آنکھوں سے اندوہ و ملال ٹپکتا ہوگا۔ چہرے سے یاس برستی ہوگی۔ مگر معاملہ بالکل برعکس تھا۔ اب اسے خیال آیا کہ شاید میں خود فریبی میں مبتلا ہوں۔ شاید یہ محض میرے تخیّل کی کارفرمائی ہے کہ میں اپنی محبوبہ کو اپنا والہ و شیدا تصور کرتا ہوں اور یہ فرض کرلیا ہے کہ جس طرح اندوہ فراق نے میری جان پر بنا دی ہے اسی طرح اسے بھی خون درجگر کر رکھا ہے۔ اگر یہ واقعہ ہوتا یعنی غم الفت نے اسے اس درجہ ستایا ہوتا جتنا میں سمجھ رہا ہوں تو چہرہ پر اس قدر خوشی کے آثار کا پایا جانا ناممکن تھا۔ دوسرے مصرع میں "یہ" سے شاعر کا یہ مفروضہ مراد ہے کہ "میری محبوبہ بھی مجھے بے طرح چاہتی ہے اور غم الفت سے اس کا بھی دل خون ہوگیا ہے"۔

ظاہر ہے کہ اگر کوئی ان تمام واقعات سے آگاہ نہ ہو تو اس کے لئے محض شعر کے الفاظ سے اس مفہوم کا سمجھنا قطعاً ناممکن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شاعر نے بڑی محنت سے شعر کو مرتب کیا ہے لیکن دو مصرعوں میں آخر اتنا ہی مضمون تو سما سکتا ہے جتنی ان میں گنجائش ہے۔ مضمون کے بعض حصے چھوٹ جانے کی بنا پر شعر ایک چیستاں بنکر رہ گیا لیکن یہ شاعر کا قصور نہیں۔ ایک اسی پر کیا منحصر ہے "بادشاہِ متغزلین" یا خود جنابِ فراق بھی چاہیں تو دو مصرعوں کے دو دو پیمانے میں اس سے زیادہ مضمون کسی طرح ادا نہیں کرسکتے۔ بخوفِ طوالت صرف ان دونوں مثالوں پر اکتفا کی گئی ورنہ ہر "استاد" اور "چوٹی کے غزلگو" کے یہاں ایسے اشعار کافی تعداد میں موجود ہیں جو یا تو سرے سے مہمل ہیں یا مضمون پورے طور پر ادا نہیں ہوسکا جس کی وجہ سے اس کا سارا حسن اور لطف خاک میں مل گیا۔

تعجّب ہے کہ اتنی موٹی بات حامیانِ غزل کی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب سب کچھ انہیں دو ہی مصرعوں میں کہنا ہے تو غزل میں ہر چھوٹے بڑے خیال کو وہ کس طرح پیش کرسکتے ہیں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک نہایت لطیف مضمون غزلگو شاعر کے ذہن میں آتا ہے لیکن جب وہ غزل کے ایک شعر میں اسے نظم کرنا چاہتا ہے تو ممکن نہیں ہوتا۔ دو مصرعوں کا لباس کوتاہ مضمون کے قامت بلند پر ٹھیک نہیں آتا۔ ناچار وہ اس سے صرفِ نظر کرتا ہے۔ اس طرح غزل اپنی وضع اور ساخت کی بنا پر بہت سے خوبصورت مضامین سے محروم رہ جاتی ہے۔ ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ غزل کا یہ عیب اتنا بڑا ہے کہ اس کے تمام محاسن سے چشم پوشی کرکے اسے مردود قرار دیا جائے۔ غزل بلاشبہ ایک جمیل صنفِ سخن ہے مگر اس کے ظرف کی تنگی سے انکار ممکن نہیں۔ اس کی مثال ٹھیک ایک خوبصورت عورت کی سی ہے جس کے بال بہت چھوٹے ہوں۔ یہ تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ خوبصورت نہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑیگا کہ اس کے بال بہت چھوٹے ہیں۔

الغرض غزل کی وضع نے جو تنگیاں اس میں پیدا کردی ہیں اس کا اثر تین شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

(۱) بعض مضامین کا لطف اور حسن فنا ہو جاتا ہے۔
(۲) بعض اشعار مہمل ہو کر رہ جاتے ہیں۔
(۳) بعض خوبصورت مضامین ترک کر دئے جاتے ہیں۔

غزل کی تنگ دامانی کا دوسرا سبب قافیہ اور ردیف ہے۔ اس سلسلہ میں بھی فراق صاحب نے بہت سی غیر متعلق اور مغالطہ انگیز باتیں کہی ہیں۔ مثلاً وہ نقادوں پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"غزل کیلئے قافیہ و ردیف کو غلط اور غیر فطری بتانا اور خاقانی کے قصائد اور فردوسی کی مثنوی، عمر خیام کی رباعیوں اور نظم گو شعراء کے مسدس، قطعات اور منظومات میں ردیف و قافیہ کو صحیح سمجھنا عجیب بات ہے۔"

قافیہ و ردیف سے بحث کرتے ہوئے غزل اور مثنوی کا مقابلہ کرنا اور دونوں میں قافیہ و ردیف کی قیود کی اہمیت اور دشواریوں کو مساوی قرار دینا بہت ہی عامیانہ بات ہے۔ اول تو مثنوی کے ہر شعر میں ردیف کا ہونا لازمی نہیں۔ صرف قافیہ ہی سے کام چل جاتا ہے اس کے علاوہ مثنوی کے قافیہ میں بھی غزل کی سی پابندی نہیں۔ ہر شعر کا قافیہ علیحدہ ہوتا ہے۔ شاعر کو اختیار ہے کہ مضمون کی مناسبت سے جو قافیہ چاہے اختیار کرے۔ اس بنا پر اس کے قافیوں کا ذخیرہ غیر محدود ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غزل گو شاعر جس زمین میں غزل لکھ رہا ہے اسی زمین کے مقررہ، اور مخصوص و محدود قافیوں میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے پر مجبور ہے۔ مثلاً اگر غزل کے لئے یہ مصرع طرح تجویز کیا جائے کہ:۔

کیا خوب ہے کلام جناب فراق کا

اور لفظ فراق کو قافیہ قرار دیں تو غزل گو مجبور ہے کہ فراق، ایاق، بلاق، طلاق، چماق، مراق وغیرہ قوافی اختیار کرے۔ اب جو مضامین ان الفاظ میں بیان کئے جا سکتے ہیں وہ بیان ہو جائیں گے۔ باقی رہ جائیں گے۔ اس طرح گویا غزل گو شاعر قافیہ کا غلام ہے۔

رباعی میں بھی شاعر کو اختیار ہے کہ اپنا مفہوم ادا کرنے کیلئے تین یا چار قافیے اپنی پسند، ضرورت اور سہولت کے مطابق انتخاب کرلے۔ مسدس میں بھی ہر بند کے لئے صرف چار ہم قافیہ لفظوں کی ضرورت ہوتی ہے یہاں بھی شاعر کو انتخاب کا اختیار حاصل ہے۔ مضمون جس قافیہ کو چاہتا ہے وہی قافیہ شاعر اختیار کرتا ہے۔ لیکن غزل میں اس کا امکان نہیں۔ ضرورت ہے "وصال" کی مگر درپیش ہے "فراق"، شاعر بیچارہ کرے تو کیا کرے۔ یا تو "وصال" سے درگذرے یا پھر وصال کو فراق میں تبدیل کر دے۔

غزل کے اشعار قافیہ و ردیف کی قیود سے دو طرح متاثر ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ مثلاً آپ نے کسی خاص زمین میں غزل لکھنا شروع کی اور چند شعر لکھنے کے بعد کوئی نہایت خوبصورت مضمون آپ کو سوجھا مگر موجودہ قافیوں میں اس کا ادا ہونا ممکن نہیں تو آپ چار و ناچار اس خیال کو چھوڑ دیتے ہیں اور نظم نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ اس خیال کو بالکل ترک نہیں کر دیتے تو قطع و برید کرکے اپنے موجودہ سانچے میں اسے ڈھال دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس کا اصلی حسن ایک بڑی حد تک تباہ ہو جاتا ہے۔ ہر "استاد" اور "چوٹی کے غزل گو" کے یہاں اس قسم کی مثالیں مل جائیں گی جہاں قافیہ اور ردیف کی مجبوری نے

شعر کو خراب کر دیا۔ ہم صرف "بادشاہِ متغزلین" کے کلام سے بعض نمونے پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے موجودہ بحث کے لئے فراقؔ صاحب کی خاطر اُنہیں کو معیار قرار دیا ہے:۔

حسرتؔ
ہم نے کسدن تیرے کوچے میں گذارا نہ کیا ۔۔۔ تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

"گذارا کرنا" اُردو کا ایک خاص محاورہ ہے جس کے معنی ہیں تنگی تُرشی سے زندگی بسر کرنا وغیرہ۔ مگر مولنٰا صاحب نے اس شعر میں "گذارا نہ کیا" بمعنی "نہیں گذرے" استعمال کیا ہے جو یقیناً غلط ہے اس کے بجائے "گذر نہ کیا" چاہئے تھا لیکن مولنٰا صاحب بیچارے کا کیا قصور جب قافیہ "ہمارا" "دوبارہ" اور "نظارہ" وغیرہ ٹھہرا تو ناچار "گذر" کو "گذارا" بنانا پڑا۔

حسرتؔ
جان کیا چیز ہو رکھیں گے جسے تم سے عزیز ۔۔۔ ہو نہ باور تو کسی دن ہمیں فرما دیکھو

"فرما دیکھو" کی ترکیب جس قدر لغو ہے محتاجِ بیان نہیں۔ ایک طرف معشوق کا یہ احترام کہ اس کے لئے "فرمانا" استعمال کیا گیا اور دوسری طرف "تم" سے خطاب۔ پھر "فرما" کے ساتھ "دیکھو" کا جوڑ اور بھی پُر لطف ہے۔ اسے "شتر گربہ" کے بجائے "موش و گربہ" کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اس غزل کے قافیے ہیں تماشا، جلوہ، دوپٹا وغیرہ۔ لہٰذا بیچارے شاعر کو قافیہ کی خاطر "فرما" کا بیجوڑ پیوند لگانا پڑا۔

حسرتؔ
واں سے ناکام پھرے ہم تو دریاس تلک ۔۔۔ خونِ حرماں دلِ مجروح سے جاری آیا

"جاری آنا" اُردو روزمرہ کے بالکل خلاف ہے۔ یہاں "جاری" بمعنی مسلسل، متواتر، پیہم، برابر، استعمال ہوا ہے جو یقیناً غلط ہے۔ مگر یہ اس قسم کی غلطی ہے جو ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ مجبوری کی گئی ہے۔ اس لئے کہ "ہماری" اور "یاری" کا قافیہ "جاری" ہی ہوسکتا ہے "مسلسل" یا "متواتر" سے یہ کام نہیں چل سکتا۔

حسرتؔ
اثرِ عشق سے نکلیں جو تمہارے آنسو ۔۔۔ دامنِ جاں میں وہ لے لیجئے سارے آنسو

مصرع ثانی میں لفظ "سارے" بجائے "سب" استعمال ہوا ہے اور محض قافیہ کی مجبوری سے ایسا کیا گیا ہے ورنہ "سب" اور "سارے" کے معنی میں جو فرق ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ عوام الناس میں بعض اوقات "سب" کی جگہ "سارے" استعمال کرتے ہیں مگر اس کا سبب انکی ناواقفیت ہے۔ "سب" کا اطلاق مجموعۂ افراد پر ہوتا ہے۔ مثلاً:۔

سب لوگ، جدھر وہ ہیں، اُدھر دیکھ رہے ہیں ۔۔۔ ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

اور سارے کا اطلاق فردِ واحد کے کُل پر ہوتا ہے۔ جیسے:۔

مُسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا۔ یا۔ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ممکن ہے کوئی صاحب بادشاہِ متغزلین کی تائید میں کسی دوسرے "اُستاد" کا شعر تلاش کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں مگر یہ زحمت بالکل غیر ضروری ہے اس لئے کہ جس اُستاد نے بھی "سارا" بمعنی "سب" استعمال کیا ہے بضرورتِ قافیہ ہی کیا ہے ورنہ کسی مستند ادیب کے یہاں نثر میں "سارا" بمعنی "سب" آپ کو نہ ملیگا۔ اور اگر اتفاق سے مل بھی جائے تو اُسے لکھنے والے کی غفلت یا سہو القلم پر محمول کرنا

---

[1] گذری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش ؛ کرنا تھا جواں مرد گذارا کوئی دن اور ۔ غالبؔ
مصحفی نے البتہ گذارہ ہونا بمعنی گذرنا باندھا ہو لیکن وہ مصحفی کے زمانہ کی زبان ہو بیسویں صدی کی زبان نہیں۔ گذارہ کرنا بمعنی گذرنا مصحفی سے ہاں بھی نہ ملیگا۔

چاہئیے" اُسے صحیح سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے "مشکور" کو بمعنی "ممنون" صحیح سمجھنا محض اس بنا پر کہ مولنا شبلی نے اس معنی میں استعمال کیا ہے۔

حسرت:۔ نوجوانی تھی کوئی شیدا نہ تھا میرے سوا ایک حسن یار کا ان بھی زمانہ ہوگیا

"وہ بھی زمانہ ہوگیا" ماشاء اللہ کیا زبان ہے۔ کیوں نہ ہو آخر بادشاہ متغزلین" ہیں۔ شاید اپنی اسی زبان کی شان میں آپنے فرمایا ہے کہ:۔

ہے زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہوگیا

حسرت صاحب کی بدولت شاعری کا نام روشن ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر زبان کے گلے پر کند چھری ضرور چل گئی۔ "ہوگیا" کا یہاں کوئی محل نہیں۔ اس کے بجائے (ایک حسن یار کا ان بھی زمانہ) "تھا" یا "رہ چکا ہے" چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اس غلطی کا ارتکاب بھی ردیف کی مجبوری نے کرایا ہے۔

حسرت:۔ وہ ایک بار جو سونگھی تھی زلف یار کی بو سو روح آج تلک تر دماغ باقی ہے

مصرع ثانی میں "باقی" بالکل غیر ضروری ہو مگر اسے کہاں پھینکا جائے اسلئے کہ یہ تو ردیف کا ایک حصہ ہے۔

حسرت:۔ اب رونے سے کیا ہوگا پروانہ ہے بے پروا برباد ہے سب محنت اے شمع لگن تیری

"لگن" کی مطلق کوئی ضرورت نہ تھی مگر مجبوری یہ ہے کہ دہن و سخن کا ہم قافیہ بنانے کے لئے فقط "شمع" سے کام نہیں چلتا لہذا "لگن" کا دُم چھلا اس میں لگا دیا۔

حسرت:۔ زندگی اپنی ہو کے اُن سے جُدا سخت گذرے گی اب اگر گذرے

اس قسم کے شرطیہ جملوں میں پہلا فعل یا تو ماضی ہونا چاہیئے یا مستقبل۔ مضارع صحیح نہیں۔ یعنی نثر میں یوں کہنا چاہیئے کہ "اب اگر گذری تو سخت گذرے گی" یا "اب اگر گذرے گی تو سخت گذرے گی" مگر کیا کیا جائے کہ اس غزل کی ردیف "گذرے" ہے لہذا "گذرے" ہی باندھنا پڑا۔ قواعد زبان کی خلاف ورزی ہوگئی بلا سے۔

حسرت:۔ پوچھو جو کرو گے تم ہمیں قتل کہتے ہیں نہ کس ادا سے ہاں ہم

اس شعر میں ردیف "ہم" نے جو مزہ دیا ہے اس کا حال فراق صاحب سے کوئی پوچھے۔

دیوان حسرت میں آپ کو اس قسم کے اشعار بکثرت ملیں گے جن میں قافیہ، یا ردیف، یا دونوں کی مجبوری سے شعر میں کسی نہ کسی قسم کی خامی پیدا ہوگئی ہے۔ لگے ہاتھوں ہم دوسرے "اساتذہ" کے کلام سے بھی چند مثالیں اس قسم کی پیش کئے دیتے ہیں تا کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ رہے۔

فانی:۔ ترا اسیر ہوں چاہے تو ذبح کر صیاد نہ توڑ دل کہ امانت ہے آشیانے کی

"بلبل" کا دل اگر امانت ہو سکتا ہے تو "گل" کی۔ دل کا آشیانے کی امانت ہونا کیا معنی۔ شاعر بھی اس حقیقت سے ناآشنا نہیں مگر بیچارہ کیا کرے کہ قافیہ فسانہ اور زمانہ ہے۔ ناچار "امانت ہے گل کی" کہنے کے بجائے "امانت ہے آشیانہ کی" کہنا پڑا۔

اصغر شایستہ صحبت کوئی اُن میں نہیں اصغر کافر نہیں دیکھے کہ مسلمان نہیں دیکھا

سیاق کلام اس کا مقتضی ہے کہ جب "کافر نہیں دیکھے" بصیغہ جمع استعمال کیا گیا ہے تو اس کے مقابل کا ٹکڑا "مسلمان نہیں

دیکھیے : ہونا چاہیئے۔ مگر یہاں بھی وہی مشکل درپیش ہے کہ ردیف بصیغہ واحد (دیکھا) واقع ہوتی ہے لہذا "آدھا تیتر آدھا بٹیر" والا معاملہ کرنا پڑا۔

جگر۔ طلبِ خُلد نہیں آرزوِ حُور نہیں — تم جو ملجاؤ تو پھر کچھ مجھے منظور نہیں

سُننے والا حیران رہ جاتا ہے کہ "منظور نہیں" کہنے کا یہاں کیا محل ہے۔ اس کی جگہ "درکار نہیں" ہونا چاہیئے۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ اس محل پر "منظور" غلط اور "درکار" صحیح ہے مگر "درکار" "تو" "حور" کا ہمقافیہ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس لئے مجبوراً شاعر نے منظور لکھدیا۔ آخر تُک ملانا بھی تو شاعر کا ایک اہم فرض ہے۔ فقط مطلب پر نظر رکھنے سے غزل نہیں کہی جا سکتی۔

قافیہ ور ردیف کی بحث کے سلسلہ میں ہم قارئین کو یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ فراق صاحب کے "بادشاہِ متغزلین" نے جہاں نقالی کی اور تمام شرائط پوری کی ہیں وہاں الف سے لیکر "ی" تک ہر ردیف میں غزل کہکر اپنی "اُستادی" یا نقالی کا پورا پورا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ بعض ردیفوں کے نمونے ملاحظہ ہوں :۔

"(اقرار) صالح۔ (آشنائے) تیغ۔ (اسباب) کا نرخ۔ (اطاعت) کے لذائذ۔ (نمونہ) کاغذ۔ (خطر) فرودش۔ (الہام) کی حرص۔ (اطاعت) نہیں ہے فرض۔ (اوتاد) سے فیض۔ (آسان) کی احتیاط۔ (اختصار) کی شرط۔ (بخدا) حظ۔ (اہلِ عصیاں) الوداع۔ (آثار) پہ موقوف۔ (اشتیاق) میں فرق۔ وغیرہ۔

اس قسم کی بے تکی ردیفوں میں جس پایہ کے شعر کہے جاسکتے ہیں ظاہر ہے۔ "بادشاہِ متغزلین" نے قافیہ پیمائی کی جو داد دی ہے اور اس قسم کی ردیفوں میں اشعار لکھکر کمالِ فن کا جو اظہار کیا ہے اُس کا مختصر سا نمونہ بھی پیش نہ کرنا بڑی بے انصافی ہے اس لئے ہم قارئین کے لُطف خاطر کیلئے چند شعر پیش کرتے ہیں :۔

حسرت :۔ فرقت میں تیری ہیچ ہے شانِ شبِ برات — اک آگ سی لگی ہے بجانِ شبِ برات

" قبولِ ستم سے ہے انکار صالح — کروں کیوں نہ میں آج اقرار صالح

کچھ نہ ابدال سے پہونچا ہے نہ اوتاد سے فیض — جس کو پہونچا ہے سو پہونچا ہے تری یاد سے فیض

کیوں نہ ہو اپنے اشتیاق میں فرق — آگیا آپ کے مذاق میں فرق

حسن بیتاب ہے محدود انہیں دو چار کے بیچ — مری گفتار کے اندر تری رفتار کے بیچ

اب کہے کوئی کہ ہم اہلِ نظر جائیں کہاں — ہر طرف مسئلہ غضِّ بصر ہے درپیش

فتنہ جور نہ کرنا مجھے ان کا یارب — جنکو گمراہ کیا تُونے کہ مغضوب کیا

(غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔)

اس قسم کے سینکڑوں اشعار دیوانِ حسرت میں آپ کو ملیں گے جو صرف غزل پوری کرنے کے لئے کہے گئے ہیں اور ہر ردیف میں طبع آزمائی، ظاہر ہے کہ دیوان کی رواجی تکمیل کی خواہش کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتی۔

"قافیہ پیمائی" کا جیسا مکمل نمونہ "بادشاہِ متغزلین" کے یہاں ملتا ہے دوسری جگہ ناممکن ہے۔ دوسرے درجے پر "مستہ فراق صاحب کو رکھ سکتے ہیں۔ حسرت صاحب نے اگر بہت سی زمینوں میں اکیس سے لیکر پینتالیس شعر تک

کہے ہیں[۱]۔ تو فراق صاحب کی غزلیں بھی عموماً ڈیڑھ درجن سے کم اشعار نہیں ہوتے۔ اس محل پر یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غزل کی کسی زمین میں بھی دو تین یا انتہا چار پانچ سے زیادہ، بہت اچھے شعر نہیں نکل سکتے۔ اس سے زیادہ اشعار عام طور پر بھرتی کے ہوتے ہیں۔ مستثنیات سے بحث نہیں، یہی وجہ ہے کہ متقدمین میں سے بعض نے پانچ شعر سے زیادہ کسی غزل میں لکھے ہی نہیں اور عام طور پر سات سے لیکر گیارہ اشعار تک غزل کے لئے بالکل کافی سمجھے گئے ہیں۔ بعض "قافیہ پیمائی" کے دلدادہ دوغزلہ اور سہ غزلہ لکھتے ہیں۔ مگر در اصل وہ ایک ہی غزل ہوتی ہے۔ اصولی اعتراض سے بچنے کے لئے اُس کے دو یا تین ٹکڑے کر دئے جاتے ہیں اور ہر ٹکڑے کے ساتھ ایک مطلع اور ایک مقطع لگا دیا جاتا ہے تاکہ ہر ٹکڑا ایک معینہ مقدار (مثلاً گیارہ شعر) سے نہ بڑھنے پائے۔

"بادشاہِ متغزلین" نے اپنی والا پایگی کے اظہار کے لئے خود کو ایران کے بہترین غزل گویوں کا ہم مرتبہ قرار دیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

حسرت اُردو میں ہے غزل تیری ۔۔۔ پرتوِ نقش سعدی و جامی

ایک اور غزل میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اُردو میں ہے کہاں ہے اور حسرت ۔۔۔ یہ طرز نظیری و فغانی

قارئین کو حیرت ہوگی کہ ہمارے مولٰنا صاحب نے سعدی و جامی اور نظیری و فغانی کا تو ذکر کیا مگر بلبل شیراز (حافظ) اور طوطی ہند (خسرو) جیسی عظیم المرتبہ ہستیوں کا نام تک نہ لیا۔ سعدی کو اوّلیت کا فخر ضرور حاصل ہے مگر غزل میں خواجہ حافظ کا جو پایہ ہے وہ کسی کو نصیب نہیں۔ نظیری تو خود خواجہ حافظ کا مقلد ہونے پر فخر کرتا ہے:۔

نظیری ۔۔۔ تا اقتدا بحافظِ شیراز کردہ ایم ۔۔۔ گشتہ است مقتدائے دو عالم کلام ما

اور غزل میں امیر خسرو علیہ الرحمہ کا جو مرتبہ ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حافظ و خسرو کو چھوڑ کر ہمارے مولٰنا صاحب نے جامی و فغانی کا ہمرنگ ہونا اپنے لئے سرمایۂ کمال سمجھا۔ در اصل یہ ایک راز ہے اور بصیغۂ راز ہی ہم قارئین کو بتلا دینا چاہتے ہیں کہ پہلے شعر میں جامی اور دوسرے میں فغانی ہی کو قافیہ بنانا ممکن تھا کیونکہ پہلی غزل کے قافیے ہیں ناکامی و بدنامی وغیرہ اور دوسری کے جاودانی، مہربانی، ناتوانی، وغیرہ۔ اس میں حافظ اور خسرو کی گنجائش کہاں۔ ناچار جامی و فغانی کو حافظ اور خسرو پر ترجیح دینا پڑی۔ اسے مولانا کی بدذوقی سے تعبیر کرنا صریح ظلم ہے۔ یہ تو قافیہ کی مجبوری ہے۔

متقدمین کی تقلید میں "بادشاہِ متغزلین" نے بعض غزلوں میں بہت لمبی لمبی ردیفیں اختیار کی ہیں۔ جب تقریباً ایک مصرع ردیف کے صرف میں آگیا تو شعر میں باقی کیا رہا اور کونسا خوبصورت مضمون اس میں ادا ہو سکتا ہے۔ ہاں اس قسم کی لمبی ردیفوں

---

[۱] یہاں حسرت کی بعض غزلوں کے پہلے مصرعے لکھے جاتے ہیں اور اُنکے ساتھ غزل کے اشعار کی تعداد بھی جس سے قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ "قافیہ پیمائی" حقیقتاً بادشاہِ متغزلین کا حصہ ہے۔ بعض زمینوں میں کئی کئی غزلیں بھی ہیں۔ ہم نے اُن سب کے اشعار کو ایک جگہ شمار کیا ہے کیونکہ مقصود "قافیہ پیمائی" کا دکھانا ہے۔

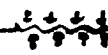
خلوص اب ہم وہ لائیں گے کہاں سے۔ ۱۲ شعر۔ ہم نے اس بات کا شکوہ نہ کیا تھا نہ کریں۔ ۲۲ شعر۔ شرف حاصل ہے اس جانِ جہاں سے مجھکو نسبت کا۔ ۴۴ شعر۔ نہ وہ راتوں کا آنا ہے نہ وہ دن کا بلانا ہے۔ ۲۵ شعر۔ جفا کو وفا ہمیں کبتک بھلا ہم۔ ۲۷ شعر۔ سرگرمِ ناز آپ کی شانِ جفا ہے کیا۔ ۳۰ شعر۔ اس محوِ تغافل کی جفا میرے لئے ہے۔ ۳۱ شعر۔ پھر بھی ہے تم کو مسیحائی کا دعویٰ دیکھو۔ ۳۶ شعر۔ تجھ کو پاسِ وفا ذرا نہ ہوا۔ ۴۵ شعر۔

میں غزلیں کہنا سہل ضرور ہے۔ مثلاً حسرت کی ایک غزل ہے:۔

کامرانی تجھے مُبارک ہو   جاودانی تجھے مبارک ہو
لے ترانغم دلوں کو دجو سرور   شادمانی تجھے مبارک ہو
مرقدِ عاشقاں پہ آخر کار   گلفشانی تجھے مبارک ہو   وغیرہ وغیرہ

"تجھے مبارک ہو" کے پہلے ایک ایک لفظ رکھدیجئے۔ لیجئے مطلع تیار ہوگیا۔ باقی اشعار بھی زحمت طلب نہیں۔ قلم اُٹھایا اور غزل تیار مثلاً:۔

کامرانی تجھے مُبارک ہو   جامدانی تجھے مبارک ہو
کھیر کھانی تجھے مبارک ہو   سرد پانی تجھے مبارک ہو
تجھ پہ قربان کوٹ اور پتلون   شیروانی تجھے مبارک ہو
ہوگیا تو تو اور بھی نازک   ناتوانی تجھے مبارک ہو
تجھکو بھیجا ہے یار نے تحفہ   ناسدانی تجھے مبارک ہو
ہیں یہ راز و نیاز کی باتیں   لن ترانی تجھے مُبارک ہو
مجھکو اردو سے عشق ہے پیارے   دیوبانی تجھے مبارک ہو



فراقؔ صاحب کی اس رائے سے ہمیں بھی اتفاق ہے کہ "قافیہ اور ردیف شاعر کی سوئی ہوئی شخصیت کو جگا دیتے ہیں!" بھولے ہوئے واقعات یاد آجاتے ہیں اور چند ساعتوں کیلئے شاعر اُسی دور میں پہونچ جاتا ہے جو گذر چکا ہے۔ اس طرح ماضی حال بن جاتا ہے اور غائب نظر کے سامنے آجاتا ہے مگر ظاہر ہے کہ قافیہ کی مدد سے واقعات یاد بھی تو جبھی آئیں گے جبکہ وہ فی الحقیقت شاعر کی زندگی میں کبھی پیش آئے ہوں۔ جس بدبخت کو کبھی عشق و عاشقی سے سروکار نہیں رہا اُسے کیا یاد آئیگا اور بالفرض اگر اس نے کوئی اچٹتی ہوئی چوٹ کبھی کھائی بھی ہو تو آج ایک زمانہ کے بعد اس میں وہ شدّتِ احساس کہاں جو ایک طوفان انگیز شعر کہلوا سکے۔ اِن تمام باتوں سے قطع نظر اسکا کیا علاج کہ اس نے آپ بیتی بیان کرنے کی قسم کھائی ہے۔ اور صرف نقالی اور جگالی کو لینے لئے کافی سمجھتا ہے۔ واقعات یاد دلانے کی ضرورت تو اُس کے لئے ہے جو واقعات نظم کرنا چاہتا ہو۔ مگر جو صرف "ایک چڑیا کی کہانی" لکھنا چاہے اُسے یادِ ماضی سے کیا فائدہ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ "محمل" کا قافیہ سامنے آتے ہی شاعر جھٹ لیلیٰ مجنوں اور نجد و صحرا کا راگ الاپنا شروع کر دیتا ہے اور "بسمل" فوراً اُسے "مقتل" کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ اِن واقعات کی روشنی میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "قافیہ" رسمی شاعری کا بے کیف ذخیرہ بڑھانے میں بہت کچھ مدد دیتا ہے۔ اور قافیہ جب تک اجازت نہ دے شاعر اپنے دل کا حال غزل میں نہیں کہہ سکتا۔

ردیف و قافیہ کے متعلق مَیں ایک خاص بات قارئین کی خدمت میں عام طور پر اور جناب فراقؔ کی خدمت میں خاص طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں اور ملتمس ہوں کہ ٹھنڈے دل سے اور پوری توجہ کے ساتھ اس پر غور فرمائیں۔ غالباً اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر خیال اور ہر مضمون کیلئے بہترین پیرایۂ ادا صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ہر مضمون کمالِ حُسن کے ساتھ ادا ہونے

کیلئے مخصوص الفاظ کو چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی صاحب اپنا ایک بہترین شعر لے لیں اور چاہیں کہ اس مضمون کو کسی دوسری بحر میں، دوسرے ردیف قافیہ میں اسی خوبصورتی کے ساتھ بیان کر دیں تو کیا یہ ممکن ہوگا؟ جس کا جی چاہے عملی تجربہ کر دیکھے۔ اس کا امکان ہی نہیں کہ ایک مضمون جو کسی خاص شعر میں نہایت خوبصورتی کے ساتھ بندھ گیا ہے اتنی ہی خوبصورتی کے ساتھ کسی دوسری زمین میں ادا ہو سکے۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ پہلا شعر ناقص تھا۔ کامل اب ہوا۔ حاصل اس گفتگو کا یہ ہے کہ غزل کہتے وقت جو خیالات آپ کے دماغ میں آرہے ہیں اور جو یقیناً بجائے خود نہایت خوبصورت ہیں اگر اُن کے اظہار کیلئے وہی مخصوص الفاظ اختیار نہ کئے گئے جنہیں وہ چاہتے ہیں تو کیا اُن کا حُسن تمام و کمال باقی رہیگا؟

اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو مضمون کے حُسن کا خُون کر کے اُسے اپنی معینہ زمین کے سانچے میں بھر دیجئے یا پھر اس زمین اور اس ردیف و قافیہ سے صرف نظر کر کے، اُس بحر اور اُس ردیف و قافیہ میں اُسے ادا کیجئے جس کا وہ متقاضی ہے۔ اس آخری صورت میں غزل کا مکمل ہونا بہت دشوار ہے مگر ساتھ ہی اعلیٰ درجے کے اشعار کا مرتب ہونا نسبتاً سہل ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اسکا تجربہ ہوا ہے کہ غزل لکھنے بیٹھا ہوں اور غزل کے بجائے مختلف زمینوں میں کئی اشعار کہہ کے اُٹھا ہوں۔ کیونکہ میرے نزدیک غزل کی تکمیل کے مقابلہ میں مضمون کے حُسن کو باقی رکھنا زیادہ اہم ہے چاہے کسی خاص زمین میں صرف ایک ہی شعر کیوں نہ کہہ سکوں۔ اسلئے میری صلاح تو یہ ہے کہ شعر کہتے وقت صرف اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ مضمون کن الفاظ کو چاہتا ہے، وہی الفاظ، وہی ردیف، وہی قافیہ، جو اس کے اظہار کیلئے آپ کے نزدیک بہترین ہے استعمال کیجئے اور اس کی ہرگز پرواہ نہ کیجئے کہ کسی خاص زمین میں صرف ایک ہی شعر ہوا اور غزل مکمل نہ ہو سکی۔

مطلع اور مقطع کی اہمیت پر بھی فراقؔ صاحب نے بہت زور دیا ہے۔ مطلع کہتے وقت شاعر کو غزل کے دوسرے اشعار کی بہ نسبت دوگونہ قیود کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کیونکہ مطلع کے دونوں مصرعوں میں قافیہ و ردیف کا استعمال ضروری ہے۔ اس قید کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غزل کا مطلع اکثر غزل کا بہترین شعر نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر کسی زمین میں بے ساختہ مطلع ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ ایک "اصولی" پابندی یعنی محض مطلع کی خاطر ایک پھسپھسے شعر کا غزل میں اضافہ کرنا بالکل غیر ضروری ہے۔ رہ گیا مقطع، تو فراقؔ صاحب مانیں یا نہ مانیں مقطع عموماً غزل کا سب سے کمزور شعر ہوتا ہے۔ کبھی خصوصیت سے کوئی مقطع اچھا ہو جائے تو وہ قابلِ لحاظ نہیں۔ کیونکہ وہ الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے۔ مقطع کے بارے میں ہماری اس رائے سے اگر فراقؔ صاحب کو اتفاق نہ ہو تو وہ مولانا نیاز فتحپوری سے مشورہ کر لیں۔ اس کے بعد تو پھر کسی قیل و قال کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ فراقؔ صاحب کا دعویٰ ہے کہ "مقطع سو فی صدی داخلی چیز ہے۔" آئیے "بادشاہ متغزلین" کے چند مقطعے آپ کو سنائیں تا کہ فراقؔ صاحب کے اس قول کی حقیقت آپ پر روشن ہو جائے۔

ہم عرصۂ حشر میں بھی حسرتؔ — پہچان گئے اُنہیں رہے ہوش

گذرے بہت اُستاد مگر رنگِ اثر میں — بے مثل ہے حسرتؔ سخنِ میر ابھی تک

یہ ظاہر میں سب زہد و تقویٰ ہے حسرتؔ — حقیقت میں یاروں کا ہے یار واعظ

جس سے حسرتؔ ہو گئی زیر و زبر بزمِ سماع — کس قیامت کی غزل مطرب نے گائی آپ کی

مجھ گنہگار پہ ہے شبۂ گمانِ واعظ ۔۔۔ لے گیا ہے کوئی پگڑی جو اڑا کر حسرت

خوار پھرتے تھے پریشان بیابانوں میں ۔۔۔ یادِ ایام کہ ہم جوشِ جنوں میں حسرت

جھوٹ، بالکل جھوٹ، سونی صدی جھوٹ، کبھی بھی آپ بیابانوں میں خوار و پریشان نہیں پھرا کرتے تھے۔ کیا فراق صاحب "بادشاہِ متغزلین" کے اس بے سرو پا بیان کی تصدیق کیلئے تیار ہیں؟

یہی ہیں وہ مقطعے جن میں بقولِ فراق "نفسیاتی اور وجدانی ارتعاشات آخری جلوہ نما" ہوئے ہیں۔

اشعارِ غزل کی باہمی بے ربطی

غزل کے اشعار کی باہمی بے ربطی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے مگر فراق صاحب اس کے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اگر وہ یہ کہتے کہ غزل کے اشعار میں ہم آہنگی کو لازمۂ غزل گوئی قرار دینا چاہیئے تو غالباً کوئی صاحب ذوق اُن کی اِس تجویز سے اختلاف نہ کرتا۔ بلکہ سچ پوچھیئے تو فراق صاحب سے بہت پہلے ایک مستشرق غزل کی "پریشان خیالی" سے متاثر ہو کر یہ خیال ظاہر کر بھی چکا ہے:۔

"*Though there may be no definable connection between the individual couplets these ought never to be out of harmony with one another and a single tone of mind should run through the whole poem. Such indeed is what ought to be but in practice we find that in a vast number of Ghazals. . . . there is no more unity of thought or feeling between several couplets than there is between the paragraphs of a news paper.*" (*The poetry of the Ottomans. by Gibb. Vol. 1, Page 83.*)

اشعارِ غزل کا، از روئے خیال و احساس، باہم مربوط ہونا کبھی بھی لازمۂ غزل گوئی نہیں سمجھا گیا۔ نہ اربابِ فن نے اُسے اصول قرار دیا نہ شُعرا نے اپنے عمل سے اس کا ثبوت پیش کیا۔ اب ہم "بادشاہِ متغزلین" کے کلام سے چند نمونے پیش کرتے ہیں جن کے مُطالعہ کے بعد فراق صاحب بھی چاہے زبان سے اقرار نہ کریں مگر کم از کم دل میں اس بات کے ضرور قائل ہو جائیں گے کہ غزل، خواہ وُہ کسی دَور کی ہو، خیال و احساس کی ہم آہنگی سے عموماً محروم ہوتی ہے۔

حسرت:۔ پاسِ ناموس کہاں عاشقِ بدنام کہاں ۔۔۔ پندِ ناصح وُہ سُنے خوفِ ملامت ہو جسے

اس شعر میں آپ ایک عاشقِ بدنام کے لباس میں ظاہر ہوئے ہیں، ملامتِ خلق سے بے پروا، پندِ ناصح سے یکسر بے نیاز۔ مگر دوسرے ہی شعر میں آپ چولا بدل لیتے ہیں اور منبر پہ کھڑے ہو کر اس طرح وعظ فرماتے ہیں:۔

کشورِ ہند کہ مغلوب رہا ہے اس میں　　نام ہی نام ہے اسلام کا اسلام کہاں

ماشاء اللہ دونوں شعروں میں کس قدر لطیف ربط ہے۔

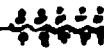


حسرت۔　انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار　　ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہیگی

ساقی سے ناز و نیاز ہو رہے ہیں۔ ادھر اصرار ہے، اُدھر انکار ہے۔ یہاں تشنگی سے بُرا حال ہے۔ وہ ظالم شراب کا ایک گھونٹ بھی دینا نہیں چاہتا۔ حقیقت اور واقعیت سے بحث نہیں، صحبت بہرحال مزہ دار ہے۔ لیکن یکایک مولنا صاحب ایک ندبلانوش سے ایک اُونچے درجہ کے فلسفی بنجاتے ہیں اور فرماتے ہیں:۔

نسبت جزو کل کی ہے یہ دُنیائے عمل میں　　اقوام کو محتاجیِ افراد رہیگی

اسے کہتے ہیں خیال کی ہم آہنگی!

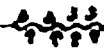


حسرت۔　تسکینِ مدعا کیلئے اک دوا ہے تلخ　　ظاہر میں گرچہ وہ سخن آشنا ہے تلخ

شعر بہت بے کیف ہے پھر بھی دُنیائے محبت سے بالکل بے تعلق نہیں لیکن جب ہم مقطع پر پہونچتے ہیں:۔

حسرت گراں ہے خلق پہ گو سہل ہے نماز　　بدلا ہے اِن کے مُنہ کا مزہ یوں دوا ہے تلخ

تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اِسے "راہِ نجات" یا "مالابدمنہ" کی ایک سطر قرار دیں یا "طبِ اکبر" کا متن سمجھیں شاید اسی کا نام ہے توافقِ احساس؟۔



حسرت۔　ہاں اسی کا تو سحرِ حُسن ہے نام　　وہ جو چشمِ سیاہِ یار میں تھا

محبوب کی جادو نگاہی کا ذکر کرتے کرتے یکایک مولنا صاحب اشہب خامہ کی باگ "دشتِ یثرب" کی طرف موڑ دیتے ہیں:۔

سرمۂ طور میں کہاں یہ اثر　　دشتِ یثرب کے جو غبار میں تھا

غالباً یہ وہ رابطہ ہے جو مجاز کو حقیقت سے ملا دیتا ہے؟



حسرت۔　اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود　　رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس شعر کا مضمون خود مولنا کا زادۂ طبیعت ہے یا غالب کے اس مشہور شعر کا چربہ ہے:۔

از زلفِ پُرخمِ مشکیں نقابے　　وز تابشِ تن زریں ردائے

شعر بہرحال عاشقانہ ہے اور خُوب ہے لیکن اس کی بدبختی دیکھئے کہ مولنا نے اِسے کیسے ناجنس کا رفیق بنایا ہے:۔

سمجھے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریبِ مرگ　　مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام

کہاں جسمِ یار کی خوبی سے پیرہن رنگین ہو رہا تھا کہاں مغرب کے چیل کوّے مشرق کی لاش کو نوچ نوچ کر کھانے کیلئے جمع ہوگئے۔

خدارا انصاف! کیا اسی کا نام ہے "اتحادِ داخلی"؟

حسرت:- بھولی نہیں دل کو تری دُزدیدہ نگاہی پہلو میں ہے کچھ کچھ خلشِ تیر ابھی تک

اس حسین شعر کے لطف و اثر کو برباد کرنے کی بہترین صورت یہی ہوسکتی ہے کہ اس کے بعد والا شعر پڑھا جائے۔ یعنی:-

تھے حق پہ ولے بیکِ کہ نہتے تو نہ ہوتا دُنیا میں بپا ماتمِ شبیر ابھی تک

ماتمِ شبیر سے زیادہ اس کور ذوقی کا ماتم کرنے کی ضرورت ہے کہ اس قسم کے دو شعروں کو ایک غزل میں جمع کیا جائے۔ اور اس سے بھی زیادہ اندوہناک یہ حادثہ ہے کہ اس قسم کے اشعار میں لوگوں کو ایک ربطِ معنوی، ایک اتحادِ داخلی اور ایک افقِ احساس نظر آئے۔

حسرت:- وصل کی رات، خرمی کا رواج شوق کا آج عرش پر ہے دماغ

دو مصرعوں کے پڑھنے میں جتنا وقت صرف ہوتا ہے اس شبِ وصل کی مدت بھی بس اتنی ہی مختصر تھی کیونکہ دوسرے ہی شعر میں دستبردِ فراق کا ماتم کیا جارہا ہے:-

دستبردِ غمِ فراق سے آہ ہوگئی کشتِ آرزو تاراج

وصال کے بعد تو فراق لازمی چیز ہے۔ خیر۔ اس کا بھی مضائقہ نہیں لیکن مولٰنا صاحب جلد ہی اس وصل و ہجر کے جھنجھٹ سے آزاد ہوکر حق و باطل کی معرکہ آرائیوں میں مصروف ہوجاتے ہیں:-

غلبۂ کذب متحد معلوم حق ہے بخوفِ کثرتِ افواج

اور اس کے بعد فوراً ہی میلاد خوانی شروع کردیتے ہیں:-

چھپ گئے سب ستارگانِ کمال کہ عرب سے ہوا طلوعِ سراج

مومنین! اُٹھئے، کھڑے ہوجایئے، پیغمبر آخر الزماں کی آمد آمد ہے، سلام پڑھیئے:-

یا نبی سلام علیک۔ یا رسول سلام علیک۔ یا حبیب سلام علیک صلوٰۃ اللہ علیک

سُبحان اللہ غزل کیا ہے کباڑی کی دوکان ہے۔ بھان متی کا پٹارا ہے۔ عمرو عیار کی زنبیل ہے۔ کونسی چیز ہے جو اس میں موجود نہیں۔

اس قسم کی غزلیں جن کے اشعار میں باہمی ربط ایسا ہی ہوتا ہے جیسا مندرجہ بالا مثالوں میں پیش کیا گیا ہے ہر "اُستاد" کے یہاں عام ہیں۔ حامیانِ غزل کو غزل کی اس مضحکہ خیز بلکہ اسف انگیز حالت کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا ازبس ضروری ہے۔

فراق صاحب نے اپنے مضمون میں بعض ایسے دعوے بھی کئے ہیں جنہیں پڑھکر موصوف کی بے بسی پر بے اختیار ہنسی آتی ہے، آپ فرماتے ہیں:-

"مسلسل غزل ایک تناقضی اصطلاح (Contradiction in terms) ہے۔ غزل کی مسلسل اور واحد العنوان بنانے کی کوشش بالکل ایسی ہے جیسے کسی زندہ جمیل پیکرِ انسانی سے ایک سڈول لکڑی ہوجانے کا احمقانہ مطالبہ کیا جائے"

غالباً "مسلسل غزل" کا کوئی ایسا مفہوم فراق صاحب کے ذہن میں ہے جسے واقعیت سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ بات نہ ہوتی تو وہ ایک

حُسن کو عیب کی شکل میں پیش نہ کرتے۔ مسلسل غزل کا مفہوم سمجھانے کے لئے سب سے بہتر صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ایک مسلسل غزل پیش کر دی جائے اس کے مطالعہ کے بعد فراق صاحب خود ہی فیصلہ کرلیں گے کہ مسلسل غزل ایک زندہ اور جمیل پیکرِ انسانی کہلانے کی مستحق ہے یا ایک سڈول لکڑی کہے جانے کی۔ نمونے کے طور پر دورِ حاضر کے کسی خوش گوار اُردو شاعر کی مسلسل غزل بھی پیش کی جاسکتی تھی مگر معاصرانہ چشمک شاید فراق صاحب کو اس کے حُسن کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت نہ دے اس لئے ہم نظیری نیشاپوری کی ایک پُر لطف مسلسل غزل نقل کرتے ہیں۔ اس غزل میں شاعر نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ اس کا معشوق خود کسی خوبرو کے دامِ محبت میں گرفتار ہوگیا ہے اب ایسی حالت میں جو جو واقعات پیش آسکتے ہیں اُن کی ایک دلکش تصویر کھینچی ہے۔ غزل کیا ہے محبت کی ایک دل فریب داستان ہے۔ سُنیئے :- (نظیری نیشاپوری)

چشمش براہے، میرود، مژگانِ نمناکش نگر درسینہ دارد آتشے، پیراہنِ چاکش نگر

ذرا دیکھنا! (صیاد خود گرفتار ہونے کے بعد کس حال میں ہے) نظر راستہ پر ہے۔ پلکیں آنسوؤں سے تر ہیں۔ سینہ میں محبت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ پیرہن چاک ہے۔ اس طرح چلا جا رہا ہے۔

دامے کہ زُلف انداختہ، در گردنِ سیمینش بیں خونے کہ مژگاں ریختہ، بر دامنِ پاکش نگر

اُس کی زُلف نے جو جال پھینکا تھا اب خود اُس کی سیمیں گردن میں ہے۔ اور اس کی پلکوں نے جو اشکِ خونیں گرائے ہیں اُن سے اس کا دامن رنگین ہوگیا ہے۔

شرم از میاں برخاستہ، مُہر از دہاں برداشتہ گفتارِ بے ترسش ببیں، رفتارِ بے باکش نگر

اب نہ وہ شرم ہے نہ وہ حجاب۔ لب خاموش اب گرمِ گفتگو ہیں۔ گفتار میں اب وہ ہچکچاہٹ نہیں رہی۔ رفتار میں بیباکی آگئی ہے۔

قصدِ فریبے میکند، سوئے غزالے میچمد آں چشمِ آہوگیر را بازلفِ پیچاکش نگر

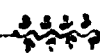
فریب دینے کا ارادہ کر رہا ہے اور ایک غزال کی جانب مصروفِ خرام ہے۔ ذرا اس کی چشمِ آہوگیر اور زُلفِ شکن در شکن کو تو دیکھو۔

از کوئے معشوق آمدہ، شوریدگاں در حلقہ اش از صید آہوی رسد، شیراں بفتراکش نگر

ذرا دیکھنا وہ اپنے معشوق کے کوچہ سے آیا ہے عشاقِ شوریدہ سر اُسے گھیرے ہوئے ہیں۔ آہو کا شکار کرکے پلٹا ہے اور شیر اُسکے فتراک میں ہیں۔

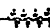
دل بُردہ در دل باختن، معشوقِ عاشق پیشہ بیں بگرفتہ در انداختن بازوئے چالاکش نگر

معشوق ہے مگر عاشق پیشہ، اور ایسا اُستاد کہ اپنا دل دیتے دیتے دوسروں کا دل چھین لیا۔ کُشتی کے دوران میں حریف کو کس طرح پھانس لیا، ذرا اس کے بازوؤں کی چُستی تو دیکھو۔



ہمیں اُمید ہے کہ اس غزل کے مُطالعہ کے بعد "مسلسل غزل" کا مفہوم فراق صاحب کی سمجھ میں آگیا ہوگا اور یہ بھی کہ "مسلسل غزل" واقعی ایک حسین چیز ہے۔

—عندلیب شادانی



پیامِ دلفگار
بنامِ دلفگار

میری تمنّا، تیری جوانی،　　آ! اک بنالیں رنگیں کہانی
محشر بداماں میری تمنّا　　آشوبِ عالم تیری جوانی

آ! اک بسالیں خوابوں کی دُنیا　　جس کی بہاریں ہوں جاودانی
پھولوں کی دُنیا، نغموں کی دُنیا　　تاروں کی دُنیا، ٹھنڈی، سُہانی

ہے نیشتر زن میرے جگر پر　　اشکوں کی تیرے یہ خونچکانی
بے طرح پھونکے دیتی ہے مجھکو　　آہوں کی تیری شعلہ فشانی

آ! آرزو کا اِک کھیل کھیلیں　　تسکین پائے دردِ نہانی
ویراں دِلوں کو آباد کرلیں　　باہم ملاکر عشق و جوانی

آ بھول جائیں غمہائے ماضی　　سینوں میں بھرلیں پھر شادمانی
مٹ جائے یکسر، جوشِ طرب میں　　ناکامیوں کی یہ جاں ستانی

مَیں مانگتا ہوں تجھکو خُدا سے　　اور تُجھ سے تیری کافر جوانی
بن جائے تیری رعنائیوں سے　　ہر شعر میرا ارژنگِ مانی

تیری تڑپ ہمرنگِ زلیخا　　میں حسرتوں کی سچی کہانی
جلووں کا تیرے دریوزہ گر ہوں　　زیبا ہے مجھ سے کب "لن ترانی"

[illegible] دلفگار

صیدِ ہوس

یہ غریبوں کی بستی ہے۔ یہاں یہ ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ سامنے اُس خاک سے اَٹے ہوئے طاق میں جسکی کمر بڑھاپے سے دُہری ہوگئی ہے، ایک شمع چُپکے چُپکے رو رہی ہے۔ اس کے آنسو اس کا جسم لاغر کئے دے رہے ہیں۔ شاید اس لئے کہ چند پروانوں کو اس کے شعلۂ حُسن نے جلا کر خاکستر کر دیا ہے اور اُن کی لاشیں اس مجبور محض شمع کے قدموں میں بے حس و حرکت پڑی ہوتی ہیں۔ لیکن مَیں نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کاش میں نے کبھی محبت کی ہوتی۔ کبھی کسی نے مجھے بھی اپنی آتشِ عشق میں جلایا ہوتا۔ پھر اس وقت میں اُس لذت کو سمجھ سکتا جو پروانے کو جل مرنے میں محسوس ہوتی ہے! دیکھو شمع پروانے سے سرگوشی میں کچھ کہہ رہی ہے۔
"پیارے! مَیں تجھ سے ہمکنار نہیں ہو سکتی تھی۔ تُو نے ناحق جان گنوائی۔ لیکن دیکھ میرے محبوب! تیری یاد مجھے بھی تو جیتا نہ چھوڑیگی"

میرا تخیل مجھے ایک شہر میں لے جاتا ہے۔ یہاں امیر لوگ رہتے ہیں۔ عالیشان مکانات ہیں، بجلی کے قمقمے ہیں۔ پروانے یہاں بھی آتے ہیں۔ اُن کے گرد طواف کرتے ہیں مگر اُن کے پر نہیں جلتے۔ ان میں سوزش نام کو نہیں ہوتی اور ہو بھی کیسے؟ یہ شمع تھوڑی ہے! یہ تو بڑے آدمیوں کے ہاں خوبصورتی سے آراستہ کئے ہوئے بجلی کے قمقمے ہیں جن کے سروں میں غرور اور تکبر کا سودا سمایا ہوا ہے۔ ایک پروانہ دیوانہ وار آیا اور اس سے پیہم اپنا سر ٹکرانے لگا۔ قمقمے کا مزاج برہم ہوگیا۔ اُس نے خشمناک ہو کر کہا
"اے دیوانے! کیوں میرا اُجلا بدن مَیلا کرتا ہے؟ ایسا ہی مرنا ہے تو وہ سامنے دیکھ۔ آتشدان میں اپنا جسم جُھلس لے"
اللہ رے تفاوت! عاشق کی جان جانے پر شمع روئے اور قُمقمہ برہم ہو۔

———— ۱ ————

میں اس قصبہ میں ایک ہفتے سے مہمان ہوں۔ سرِ شام لوگ اِدھر اُدھر سے آکر میرے پاس جمع ہو جاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں اُنہوں نے مجھے ایک دیہاتی لڑکی کے واقعات بتائے جن سے میں نے ایک کہانی مرتب کی۔ آج کی صحبت میں مَیں آپ کو اُسی الھڑ معصوم کی داستان سُناتا ہوں۔

اس کا نام کلثوم تھا۔ وہ اور اُس کی ماں، دونوں اس بوسیدہ مکان میں رہتے تھے۔ ایک چکّی اُن کی ملکیت تھی۔ آس پاس کے لوگ اُس کی ماں سے گیہوں پسواتے تھے جس کی مزدوری اُس کو سیر سوا سیر میں ایک مُٹھی مل جاتی تھی۔ اسی پر اُن کا گذارہ تھا۔ تھوڑے فاصلے پر شہر والوں کا سا ایک پختہ مکان بنا ہوا تھا۔ اس میں یہاں کا زمیندار اور اس کے گھر والے رہتے تھے۔ بچپن میں سب کو ساتھیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے زمیندار کا بیٹا غریب کسانوں ہی کے بچّوں میں کھیلتا تھا۔ کلثوم سے اُس کا اُنس آہستہ آہستہ اس قدر بڑھ گیا کہ اُس نے اُسی کو اپنا ہجولی مُنتخب کیا۔ کھیل کا وقت نہ بھی ہو تب بھی وہ دونوں دھان کے کھیتوں یا پست مُنڈیروں کے پیچھے کھیلتے ہی نظر آتے تھے۔

پھر اُنہوں نے بچپن کی حدود سے نکل کر لڑکپن میں قدم رکھا لیکن اب بھی وہ دونوں غیریتِ جنسی سے ناواقف کسی گوشۂ تنہائی میں گھنٹوں گذار دیتے تھے۔ ایک دفعہ شام ہونے کو تھی۔ سُورج تھکے ہارے مزدور کی طرح سستانے کیلئے پہاڑیوں کے پیچھے

چھپ رہا تھا۔ چرواہے گلّوں کو ہنکاتے اور پرانی بانسریوں پر ٹوٹی ہوئی لَے میں گیت گاتے چلے جا رہے تھے۔ ذرا دُور ایک ندی اس طرح بے چینی سے بہہ رہی تھی گویا اُس کا سانس کوئی دم میں رکا ہی چاہتا ہے۔ عابد، کلثوم کے بالکل قریب سرک آیا اور وہ بھی اپنی حیثیت سے بے خبر اس کے پہلو سے چمٹی ہوئی سُرور سا محسوس کرنے لگی۔

عابد بولا "ایک بات کہیں ــــــ ؟"

"ہاں" کلثوم نے اُس کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ھمم ــــــ ہم جا رہے ہیں"

"کہاں ؟"

"ابا کہتے ہیں پڑھنے لکھنے سے آدمی ہیرا ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ مجھے پالم پور بھیج رہے ہیں"

"پالم پور!" وہ ہولے سے بولی "وہ تو بہت دُور ہے"

"ہاں ــــ ابا نے کہا ہے وہاں اسکول اور کالج ہیں۔ جب ہم پڑھ لکھ جائیں گے تو سرکار ہماری بات مانا کرے گی اور . . . ."

"کے دن میں آجاؤ گے ؟"

"دن ؟" اُس نے ذرا شوق سے کہا "اری کئی سال لگ جائیں گے . . . تم ہمیں بہت یاد آؤ گی"

"جانا کب ہے ؟"

"کل مُنہ اندھیرے"

۲

کئی سال بیت گئے پر دیہات کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سوائے اس کے کہ کلثوم اپنی ماں کے انتقال کے بعد سے کچھ بدلی بدلی نظر آتی تھی۔ اس کی ہستی کا آبگینہ دُکھ کی چٹان سے پہلی بار ٹکرایا تھا۔ اس لئے وہ سمجھنے لگی تھی کہ زندگی گریۂ مسلسل ہی کا نام ہے۔ اس کا دُنیا میں اب کوئی نہیں تھا جس کے سہارے وہ اطمینان سے بیٹھی رہتی۔ وقت موت کا سب سے بڑا مرہم ہے۔ چنانچہ جب اُس کے آنسو خشک ہونے لگے تو اُس نے ایک روز بیکسی سے اپنی چکی کی طرف دیکھا۔ وہ بیچاری خود اُسے حسرت سے تک رہی تھی۔ کلثوم اُس سے لپٹ گئی۔ کچھ دنوں پہلے کا منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا کہ ماں تُور کے تڑکے گیہوں کے دانے پاٹ میں ڈالتی اور دھیمے سروں میں گاتی جارہی ہے۔ اُس نے جھک کر کھُردرے پتھر کو بوسہ دیا اور قدرے اطمینان سے غمناک آواز میں کہنے لگی "میری جان۔ جب تک تو موجود ہے مجھے دو روٹیوں کی کمی نہیں" پھر یکبارگی کسی خوف اور مایوسی نے اُسے بوجھل دُھند کی طرح ملفوف کر لیا۔ اس کا چہرہ اُتر گیا۔ اور وہ بھٹکتے ہوئے مسافر کی طرح خالی الذہن ہوگئی ــــــ کہ یکایک اُس نے دیکھا کہ دھند لکے کے اس پار کوئی چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ اُس کی آس بندھ گئی۔

چند ماہ بعد عابد بھی اپنے باپ کی جگہ زمیندار بنکر آگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا مکان آج خالی نظر آرہا ہے گویا یہاں کبھی کوئی بسا ہی نہیں۔ باپ کی جُدائی کا اُسے بڑا رنج تھا مگر اتنا نہیں جتنا کلثوم کو۔ کیونکہ شہر کی دلچسپیوں نے اُس کے خیالات ایک مرکز پر مجتمع نہیں رہنے دئے تھے۔ دو چار روز میں ہجومِ کار سے فرصت ملی تو اُسے کلثوم یاد آئی۔ سوچا اب تو وہ شباب سے بھرپور، دوشیزہ بہار کی مانند ہوگی۔ شام

ہوتے وہ اس سے ملنے اسکے گھر پہونچا۔

کلثوم کی جوانی انگڑائی لیکر بیدار ہوئی۔ جب سے اُس نے عابد کے آنے کا حال سُنا اُس کے دل میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ اُسنے کئی بار سوچا "چلی چلوں، مجھے دیکھکر بچپن کی تمام باتیں انہیں یاد آجائیں گی اور وہ میری ٹھوڑی اُٹھاکر کہیں گے کلثوم! تیری شب بیداریاں اور یہ لمبے لمبے کٹھن دن اب ختم ہوگئے" لیکن خود ہی کہتی "مجھ میں اور ان میں بڑا فرق ہے۔ وہ تو بچپن کا زمانہ تھا جب انسان خواب کی طرح اصلیت سے کوسوں دُور ہوتا ہے۔ کہاں وہ زمیندار اور بستی بھر کے مالک اور کہاں میں بچاری؟" آج تمام دن اسی اُلجھن میں گذرا کبھی دل کہتا "اتنے سال اس کی یاد میں گذارے ہیں اب اس کے پاس جانے میں شرم کیسی؟ اور پھر اُس نے خود بھی تو کہا تھا کہ تم ہمیں بہت یاد آؤگی" لیکن جب قدم اُٹھتے تو خودداری زنجیر بنکر پاؤں میں پڑجاتی۔ "آخر انہیں اب تک کیوں نہ خیال آیا ——— وہ خود ہی چلے آئیں گے"

چوکھٹ کے اُوپر بستے میں ایک دیا جل رہا تھا۔ کبھی کبھی ہوا کے تند جھونکوں سے اس کی لَو لہرا جاتی تو اس کا ہاتھ خود بخود اسکے دل پر چلا جاتا۔ اللہ جانے آج یہ کیوں بےچین ہوا جاتا تھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ رات گئے تک اگر وہ نہ آئے تو میں خود ہی چلی جاؤنگی، اور انہیں سوتے سے جگا دوں گی۔ بس اسی خیال سے وہ ذرا نہائی دھوئی تھی۔ اُجلا رنگ تو یوں ہی تھا، صاف ستھرے کپڑے پہن کر تو اور بھی اچھی نکل آئی۔ بال بھی سنورے تھے مگر جس پلنگ پر وہ بیٹھی تھی وہ کچھ اچھا نہیں تھا اور پُرانا لحاف تو اور بھی بُری حالت میں تھا۔ اِس غضب کی سردی میں وہ خدا جانے کیسے گذارا کرتی تھی۔ لیکن یہ سوال تو امیروں کیلئے ہے، غریبوں کے ذہن کی یہاں تک رسائی ہی نہیں ہوتی۔

اُسے سردی لگنے لگی تو اُس نے لحاف گھسیٹ کر اپنی ٹانگوں پر ڈال لیا۔ اتنے میں آواز آئی "کلثو!" وہ آواز پہچان گئی۔ عابد کی آواز کہیں تطویل زمانہ بُھلا سکتا تھا؟ خوشی کے مارے وہ دیوانی ہوگئی مگر پلنگ سے اُٹھ نہ سکی اور نہ اُس کے مُنہ سے یہ نکل سکا "ہاں، میں اندر ہوں، آؤنا!" عابد نے جھانکا اور خود ہی اندر آگیا۔ وہ بُت بنی بیٹھی رہی۔ عابد نے دیکھا کہ اُسکی مُسکراہٹ چہرے پر سے سمٹ سمٹ کر معدوم ہوئی جارہی ہے جیسے کوئی حسین کمھلاتا خاک دفن ہورہا ہو۔ وہ اس کے پاس جلدی سے بیٹھ گیا "کلثو!"

کلثوم رو پڑی۔ نہ جانے اس کا دل کیوں بھر آیا۔ اُس نے آہستہ سے کہا "میں آپ کا کئی دن سے انتظار کررہی تھی۔ میں سمجھی شاید آپ نہ آئیں — مگر میرے دل نے . . . . . میرے دل نے کہا آپ ضرور آئیں گے"

"کیوں نہ آتا کلثو۔ میں نے تو تمہیں کئی بار یاد کیا۔ بھلا تم نے تو کیوں کیا ہوگا؟"

"آپ کو کیا معلوم ———" وہ اپنی بڑی بڑی پُرنم آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "اماں کے مرنے کے بعد بس آپ کو یاد کرکر کے جیتی رہی ورنہ میں تو اب تک ———"

"تو ہم اکیلے رہ جاتے۔ کیا تم ہمیں اکیلا چھوڑ جاتیں؟" عابد کی طرح کلثوم نے بھی اس کے گلے میں باہیں ڈالدیں مگر دفعتاً وہ جھجک کر پیچھے ہٹی۔ آج اُسے شرم آرہی تھی۔ جوانی کا بوجھ اُسے بےتکلف نہیں ہونے دیتا تھا۔ اور جب عابد نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا تو اس کا تنفس تیز ہوگیا اور اُس کے ہاتھ پاؤں باوجود کوشش کے حرکت نہ کرسکے۔ اُسنے اُسکے رخسار پر اپنے لب رکھ دئے اور شکستہ آواز میں کہنے لگا: "تم کتنی خوبصورت ہو کلثو!"

کلثوم کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا اور وہ اُس کی آغوش سے بچ نکلنے کی سعی کرتے ہوئے بولی "آپ ــــــ آپ یہ کیا کر رہے ہیں . . . . "

عابد انجان بنکر کہنے لگا "اور تم مجھ سے شادی کب کروگی ؟"

"شادی ؟" کلثوم کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا "آپ مجھ سے شادی کرلیں گے ؟ مَیں تو غریب ہوں" اُسکی آنکھوں میں خوشی اور بے بسی کے آنسو جھلک آئے "آپ . . . . سچ کہہ رہے ہیں ؟"

"ہاں ــــــ بہت جلد !" وہ آگے ہی بڑھتا ہوا بولا "پھر ہم دونوں اس سامنے والے مکان میں آرام سے رہا کریں گے۔ مجھے تم سے بیحد محبت ہے کلثو"

اس دفعہ اُس نے مدافعت نہیں کی۔

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

(۳)

دو تین ماہ تک وہ اپنی جوانی کے پیاسے جذبات کو تسکین دیتا رہا لیکن جب کلثوم کی طبیعت گری گری سی رہنے لگی تو اسکو ہوش آیا۔ کلثوم میں چُستی اور پھر اضمحلال دیکھکر بعض عورتیں کچھ تاڑ گئیں۔ عورتوں کے ذریعے یہ بات مردوں کے کانوں تک پہونچی اور آہستہ آہستہ اُس کی طرف لوگوں کی انگلیاں اُٹھنے لگیں۔ قدرت بھی تو سماج کی طرح عورت کی لغزشیں طشت ازبام کردیتی ہے! جوں جوں دن گذرتے رہے اُسکے ماں بننے کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ایک رات اُسے اذیت محسوس ہوئی مگر وہ کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ آپ ہی آپ اُسے سہا کی۔ اسی حالت میں گذشتہ واقعات سطح ذہن پر اُبھر آئے اور اُسے وہ وقت یاد آیا جب عابد نے پہلی بار اس کے دل و دماغ پر ایک کیفیت نامعلوم طاری کردی تھی . . . . اس خیالی تلذذ سے تھوڑی دیر کیلئے وہ جسمانی تکلیف کو بھول گئی اور سوچنے لگی اے کاش میں اُس دن کے بعد زندہ ہی نہیں رہتی اور یا وہ کیفیت ایک سلسلہ لامتناہی ہو جاتا۔

ــــــــ

"بس اب ایک یہی صورت ہے" عابد نے التجا کرتے ہوئے کہا "باہر گاڑی کھڑی ہے۔ تم اس میں سوار ہو جاؤ۔ مَیں اُس دن میں گھر دیکھ آیا ہوں۔ وہاں کوئی پوچھے تو کہدینا میرے خاوند شہر میں کام کرتے ہیں۔ کوئی ڈرنے کی بات نہیں۔ یہ بوڑھا گاڑیبان اپنا آدمی ہے اور مکان بھی جانتا ہے۔ آرام سے لے جائیگا۔"

کلثوم مُنہ بند کئے اُسے چُپ چاپ دیکھتی رہی مگر اُس کی خاموش آنکھیں کہہ رہی تھیں "آپ تو کہتے تھے ہماری بہت جلد شادی

ہو جائیگی۔ اب وعدہ پورا کیوں نہیں کرتے؟" عابد اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا "بڑا خراب زمانہ ہے کلثو! لوگ خواہ مخواہ بُرا بھلا کہتے ہیں۔ ذرا میں گھر والوں کو راضی کرلوں، پھر میں تم کو جلد یہیں لے آؤں گا۔ اور وہ گاؤں یہاں سے ہے کتنی دور، میں بھی وہاں تم سے ملنے آؤں گا .... ہاں تم کسی قسم کا فکر نہ کرنا، ہر مہینے تمہیں خرچ چلانے کیلئے روپے بھیجتا رہا کروں گا۔ آؤ اُٹھو، اُٹھو......"

اس کا دل صاف تھا۔ عابد کی باتوں پر یقین نہ کرنے کی اُس کے خیال میں کوئی وجہ نہیں تھی۔ شام کی تاریکی اور تنہائی میں گاڑی میں بیٹھ گئی اور بیل ڈگمگ ڈگمگ چلنے لگے۔ عابد کچھ دیر درختوں کی آڑ میں کھڑا اُسے دیکھتا رہا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہوئی تو کلثوم کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔ ہر طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ آس پاس کے گھنے درخت اُس کے دل کی کہانی سُن سُن کر آہِ سرد بھر رہے تھے۔ کبھی کبھی گاڑیبان کے چکارنے یا کسی فاقہ زدہ کتّے کے بھونکنے کی آواز سُنائی دے جاتی تھی جو آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر اپنے پیدا کرنے والے سے جو سمیع بھی ہے اور بصیر بھی، اپنی بیچارگی کی شکایت کر رہا تھا۔

(۴)

چار پانچ مہینے تک دس دس روپے آتے رہے جس سے اُسکی تن پروری ہوجاتی تھی مگر من کا روگ اُسے ایسا لگا تھا کہ اُس کی جان گھلی ہی چلی گئی۔ اِدھر پچھلے مہینے روپے نہیں آئے اور عابد نے تو کبھی شکل ہی نہیں دکھائی۔ اس لئے اس کا ماتھا ٹھنکنا تعجب خیز نہیں تھا۔ پڑوس میں ایک رحمدل بوڑھی عورت رہتی تھی۔ اُس سے اُسے بہت کچھ سہارا تھا۔ ایک دن کلثوم سے اُسنے کہا "بیٹی! میری تو کوئی اولاد ہوئی نہیں، تیرے ہاں بچّہ ہوگا تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

بچّے کا خیال آتے ہی کلثوم کانپ اُٹھی "اماں! میں کہیں مر نہ جاؤں! — مجھے اس وقت بڑی تکلیف ہو رہی ہے" پھر اُسنے ہاتھ جوڑ کر کہا "اچھی! مجھے اپنی گاڑی میں جلدی آسوں پہونچوا دو ——— وہ میرا گاؤں ہے۔"

بُڈھا گاڑی ہانک رہا تھا اور کلثوم بے حال پڑی ہوئی تھی۔ خیالات اُسکے دماغ میں گردش کرنے لگے "کہیں وہ مجھے بھول تو نہ گئے؟ ..... نہیں، نہیں ..... اور اگر بھول بھی گئے ہیں تو مجھے دیکھکر انہیں رحم آجائے گا، پھر وہ اکیلا کبھی نہیں چھوڑینگے۔"

گاڑی جب زمیندار کے مکان سے ذرا ہی فاصلے پر رہ گئی تو شور و غل کی آوازوں نے اُسے چونکا دیا۔ لوگ ایلے گیلے بہ رہے تھے۔ گاڑی کو راستہ بھی تو نہیں ملتا تھا۔ گاڑی بان کے پوچھنے پر کسی نے کہا "کیوں رے بڈھے! تیری عقل تو نہیں سٹھیا گئی؟" وہ بولا "ارے ناچو! تجھے نہیں معلوم کہ زمیندار جی شادی کرکے آرہے ہیں۔"

کلثوم تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ اُسنے دیکھا کہ عابد کا مکان دُلہن کی طرح سج رہا ہے۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا اور وہ بوڑھے کے سنبھالتے سنبھالتے چکرا کر گر پڑی۔

اُمید کے آسمان پر ایک ستارہ جھلملا رہا تھا۔ آہ! آج وہ بھی غروب ہوگیا۔

صادق الخیری

قطعات

چاندنی راتیں

غمزۂ حسن ہے کیا، عشق کی گھاتیں کیا ہیں ۔۔۔ چاند تاروں میں جو ہوتی ہیں وہ باتیں کیا ہیں
چاندنی ہے مری ہمدرد، میں اُس کا ہمراز ۔۔۔ میرے دل سے کوئی پوچھے کہ یہ راتیں کیا ہیں

حقیقت سے گریز

غمِ حیات کو غرقِ شراب کرنے دے ۔۔۔ سکوں سے جینے دے دو دن، سکوں سے مرنے دے
عذابِ جاں ہے حقیقت سے آگہی اے دل! ۔۔۔ برنگِ خواب مری زندگی گزرنے دے

نغمہ و شاعر

کوئی گاتا ہے ہم روتے ہیں اختر! ۔۔۔ ہوا کرتا ہے ایسا شب کو اکثر
اندھیرا، خامشی، نغمہ، یہ تینوں ۔۔۔ قیامت بن کے پھٹ پڑتے ہیں دل پر

رات

بزمِ ہستی کی یہ غفلت کوشیاں ۔۔۔ یہ فضائے دہر کی مدہوشیاں
کیا کہوں اِس وقت کس عالم میں ہوں ۔۔۔ ہو رہی ہیں رات سے سرگوشیاں

چاندنی رات

خلوتِ کامل ہے اختر، چرخ نے ۔۔۔ ڈال دی ہیں ماہتابی چلمنیں،
رات سے اِس طرح ہم آغوش ہوں ۔۔۔ سُن رہا ہوں اُس کے دل کی دھڑکنیں

بیخواب راتیں

ردٹھیں ہیں، کروٹوں میں دکھ بھی ہے ۔۔۔ غم نے لوٹی نیند، لوٹا چین بھی
ہاں اختر اِک زمانہ وہ بھی تھا، ۔۔۔ جب خوشی کے مارے نیند آتی نہ تھی

اختر انصاری

بوسہ

اے عشقِ شیریں کار کی رُوحِ صد اُمید آفریں
اے میرے جذبِ شوق کی تصویرِ زرّین و حسیں

اے راز دارِ شانِ عشق، اے غمگسار و جانِ من
اے نقشبندِ خوبیٔ حُسن و جمالِ صد چمن

اے انبساطِ حُزنِ دل، اے نوبہارِ نازِ حُسن
اے نغمۂ رُوحِ طرب، اے زمزمہ پردازِ حُسن

اے راحتِ جانِ حزیں، اے خوابِ شیریں مزے
پنہاں تجھی میں راز ہیں، دلبستگیٔ شوق کے

اے جانِ تصویرِ طرب، اے رُوحِ تخئیلِ وصال
اے شانِ حُسنِ عارضی، اے نازشِ نورِ جمال

اے نوبہارِ گلشنِ حُسن و کمالِ عاشقی
اے خندۂ گلہائے اُمید نہالِ عاشقی

تُو نوبہارِ ناز ہے، اے نغمۂ سازِ عاشقی
تُو جانِ خوابِ شوق ہے، اے جاں نوازِ عاشقی

اے نغمۂ جذباتِ دل، اے امتنانِ آرزو
اے غنچۂ باغِ طرب، اے جانِ جانِ آرزو

اے حُسنِ دل آویز کی، زیبائشِ رنگیں ہے تُو
اے سازِ عشقِ آہنگ کا، اک نغمۂ شیریں ہے تُو

اے مرکزِ جذباتِ دل، اے مخزنِ اسرارِ عشق
اے دولتِ جذبِ نہاں، اے جلوۂ اظہارِ عشق

اے جانِ جانِ زندگی، تصویرِ فرطِ عاشقی
تُو جانِ صد اُمید ہے، اے جذبِ شوقِ باہمی

آئینۂ جذباتِ دل، اے خاتمِ رُخ کے نگیں
فرمانروائے عشق ہے، تُو اے شہِ بالا نشیں

اے خالِ رُخسارِ حسیں، ہاں اے شہابِ مہ نشیر
سو داغ دل پر کھائیگا، اب گلشنِ چرخِ بریر

ہر ہر ادا خود بن گئی، تصویرِ جانِ عاشقی
ہر ہر نفس میں پھونکدی، تُو نے دمِ رُوحِ تازگی

دل سے اُمنگیں جب اُٹھیں، ہونٹوں پہ آکر رہ گئیں
کچھ رُک گئیں، کچھ تھم گئیں، کچھ ہو گئیں اندوہگیں

پھر ہونٹ سمٹے یا سمٹ کر اک کلی سی رہ گئی
پھر گُل کھلے کچھ اور ہی اور کھل گئی دل کی کلی

فرحت کانپوری

ہماری مغرب پرستیاں

دورِ جدید کی تہذیب و تمدن کی ترقیاں اور ہماری فیشن پرستیاں زندگی کے ہر شعبہ میں گرانی اور افلاس کے اسباب آئے دن پیدا کر رہی ہیں۔ ایک طرف ہماری مغرب پرستی اور مغربی طرز معاشرت کی اندھی تقلید ہماری زندگی کے معیار کو سرعت سے بڑھا رہی ہے۔ اور دوسری طرف ہماری معاشی و اقتصادی پستی بدستور قائم بلکہ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، آمدنی کی کمی اور خرچ کی زیادتی ہماری آمد و خرچ کے توازن کو بگاڑ رہی ہے اور ہماری زندگی میں نت نئی مشکلیں اور مصائب پیدا کر رہی ہے۔

گراں قیمت طرزِ زندگی کے ہم اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ سادہ اور سُودمند معاشرت ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتی، ہم اپنی اقتصادی حالت پر کبھی غور کرتے ہی نہیں کہ موجودہ معاشرت ہمارے لئے کس حد تک مضرت رساں ہے۔ مغرب کی نظر فریب طرز معاشرت اور اُسکی رنگینیوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتے ہیں، مغربی معاشرت کی دلفریب ادائیں ہمیں کچھ ایسی بھا گئی ہیں کہ ہر قیمت پر ہم انہیں خریدنے کو بیتاب نظر آتے ہیں۔

مغربی معاشرت کے نقصانات پر غور کرنے کا خیال نہ کبھی ہمارے دماغ میں آتا ہے اور نہ ہماری سماج اس اہم مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت سمجھتی ہے، مغرب زدہ سوسائٹی میں شریک ہونا آجکل زندگی کا لازمہ اور تہذیب کا خاصہ بن گیا ہے، سوسائٹی کی ہر ادا پر آمین کہنا اور اُس کی ہر حرکت کو نقل کرنا ہماری تہذیب و تمدن کی معراج ہے، اگر کوئی اُس کی کسی حرکت پر اعتراض کرے تو بدتمیز اور وحشی کا لقب دیا جاتا ہے اور اس کا سوسائٹی میں بار پانا دشوار ہو جاتا ہے۔ سوسائٹی سے علیحدگی اختیار کرنا ممکن نہیں، کیونکہ اس کی دلچسپیاں اور رنگینیاں اس قدر جاذب نظر و جادو اثر ہیں اور اپنے اندر اتنے سحر آگیں کرشمے رکھتی ہیں کہ دامنِ دل از خود اُنکی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنے معیار زندگی کو جو خواہ مخواہ مغرب کی اندھی تقلید کی وجہ بڑھتا جا رہا ہے، جادۂ اعتدال پر لے آئیں؛ تاکہ سوسائٹی کے تعاون و اشتراک باہمی کا بوجھ ہماری اقتصادی پستی اور موجودہ معاشی حالت کے مدنظر اسقدر گراں نہ ہو کہ ہم اُسکو برداشت نہ کر سکیں اور سوسائٹی کی شرکت کی خاطر قرض کے شکنجوں میں پھنستے نہ جائیں! یہ مسئلہ نہایت اہم اور ہم سب کے غور و فکر کا محتاج ہے۔

مغربی تہذیب اور معاشرت کی ایک حد تک تقلید کی جا سکتی ہے، ہمارے موجودہ تمدن میں اس کا بڑا عنصر داخل ہو گیا ہے۔ ہماری عادات و اخلاق اور ہماری اقتصادی حالت کو مغرب کی تقلید سے متاثر نہ ہونے دینا چاہیئے، مغربی تہذیب کی حسین اور دلکش صورتوں کو تنقیدی نظروں سے دیکھیں کہ کون ہماری صحبت کے قابل ہے اور کس سے کنارہ واجب ہے۔

مغربی تمدن کی صحیح تقلید کا سب سے پہلا اثر ہم میں یہ ہونا چاہیئے کہ صنعت و حرفت، زراعت و تجارت، تحقیقات و ایجاد، محنت و مشقت اور کسب معاش کے وہ طریقے سیکھیں اور ذرائع اختیار کریں جن کی وجہ آج مغرب کو مشرق پر فوقیت حاصل ہے؛

اپنی آمدنیوں کو جائز طریقوں سے بڑھا کر اگر ہم اپنی زندگی کے معیار کو بھی بلند کریں اور اپنی معاشرت کو گراں بنائیں تو ہمارا شمار مغرب کی صحیح تقلید کرنے والوں میں ہو سکتا ہے، وقت کی قدر و قیمت کرنا سیکھیں، وعدہ کے ایفا کا خیال رکھیں، قول و قرار کے پابند رہیں، جھوٹ نہ بولیں، اپنی آمد و خرچ کے توازن کو بگڑنے نہ دیں، معاشرت میں صفائی اور سادگی پیدا کریں، گھر کی ہر چیز کو سلیقے اور قرینے سے ترتیب دیں، غیر ضروری چیزیں خرید کر روپیہ برباد کرنے کے علاوہ گھر کو کباڑی کی دوکان نہ بنا دیں، فرنیچر میں نہ اس قدر قلت ہو کہ کرسیاں بھی صحیح سالم نہ نکلیں اور نہ اس قدر بہتات کہ سارا مکان نیلام گھر نظر آئے۔

مغربیوں کا ہر گھر فردوسِ نظر معلوم ہوتا ہے، اس کا سبب یہ نہیں کہ اُن کی آمدنی ہم سے بہت زیادہ ہے اس لئے وہ ایسی صاف ستھری معاشرت کے پابند ہو سکتے ہیں، اگر ہم غریب اور متوسط درجے کے یورپینوں کا مقابلہ ہمارے متمول حضرات کی معاشرت سے کریں تو بھی یہی فرق نظر آئے گا، سلیقہ اور صفائی، نفاست اور پاکیزگی کیلئے زیادہ روپے کی نہیں بلکہ تمیز اور احساس کی ضرورت ہے، اور یہی ہم میں نہیں ہے۔

ہم کیا سے کیا ہو گئے ہیں! اگر اپنی اس حالت پر ہم غور کریں تو معلوم ہو گا کہ ہماری معاشی اور اقتصادی حالت سرعت کے ساتھ گرتی جا رہی ہے، اگر ہم میں کچھ انقلاب ہوا ہے تو وہ ہماری معاشرت میں مغربیت ہے، علم و عمل سے تو کوسوں دُور ہیں مگر مغرب زدگی ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی ہے، نئے نئے فضول مصارف نے ہماری سادہ زندگی کے مطلع کو بھی غبار آلود کر رکھا ہے۔ ہمارے خیالات میں مغرب پرستی نے ایک طوفانِ عظیم برپا کر رکھا ہے، ہم اپنے سادہ طرزِ زندگی کو خیرباد کہکر نئے دورِ حیات میں داخل ہو رہے ہیں، اسوقت نہایت ضروری ہے کہ ہم ذرا عاقبت اندیشی سے کام لیں، اچھائی اور بُرائی میں امتیاز پیدا کریں، اپنی بربادیوں اور تباہکاریوں کو اپنے ہاتھوں دعوت نہ دیں کہ کسی دن بالکل ہی ملیامیٹ نہ ہو جائیں اور حرفِ مکرر کی طرح لوحِ جہاں سے مٹ نہ جائیں۔

آجکل مغرب پرستی کی وبا ہمارے ہاں اس حد تک پھوٹ پڑی ہے کہ ہمارے بعض ہندوستانی "صاحب بہادر" جب اپنے ملازمین سے گفتگو کرتے ہیں تو اپنی مادری زبان اس لئے غلط بولتے ہیں کہ یورپین ہندوستانی زبان صحیح نہیں بول سکتے، یہ مغرب زدہ حضرات اپنے بزرگوں، عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کے موقعوں پر بھی مغربی طریقے اختیار کرتے ہیں، تحریر و تقریر میں اپنی مادری زبان کو اس قدر مغرب زدہ بنا دیا جاتا ہے کہ وہ ایک نئی زبان بن جاتی ہے۔ غرض کہ ہر وقت اور ہر موقع پر مغرب کی اندھی تقلید کرنا روشن خیالی اور اعلیٰ تہذیب کا معیار سمجھا جاتا ہے۔

مغرب پرستی کی ایک مثال آج ہم ناظرین ساقی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس مثال سے واضح ہو گا کہ جو لوگ اپنے کمسن اور ناسمجھ لڑکوں کو تعلیم کی غرض سے یورپ بھیجتے ہیں اُن پر مغرب کی فضا کا کیا اثر ہوتا ہے اور وہ کس حد تک مغرب کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔

ایک بزرگوار نے اپنے صاحبزادے کو انٹرنس پاس کرتے ہی بیرسٹری کی ڈگری لانے یورپ بھیجا، دس بارہ سال کے بعد صاحبزادے بیرسٹر ہو کر وطن لوٹے، بمبئی سے پدرِ بزرگوار کو تار دیا کہ فلاں ٹرین سے گھر پہونچیں گے، وقت پر والد ماجد اسٹیشن پہونچے۔ ٹرین آئی مگر بیرسٹر صاحب کا پتہ نہیں، ہر روز بیچارے بیٹے کو لینے اسٹیشن جاتے مگر بے نیل و مرام لوٹتے۔

اس طرح کوئی دو ہفتے گزر گئے۔ ایک روز آپ کے ایک دوست نے بیرسٹر صاحب کو مُنہ میں چرٹ دبائے، کتا بغل میں لئے، ایک میم صاحبہ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کسی تفریح گاہ میں چہل قدمی کرتے دیکھا اور آپ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ بڑے میاں ابھی یہ گتھی سلجھا ہی رہے تھے کہ ایک اور صاحب تشریف لائے، انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ آپ کے صاحبزادے کو وطن پہونچکر کوئی دو ہفتے ہوتے ہیں اور وہ فلاں ہوٹل میں مقیم ہیں، اُن کو یہ شکایت ہے کہ تار بھیجنے کے باوجود نہ آپ اسٹیشن آئے نہ انہیں لینے کسی کو بھیجا۔

واقعہ یہ ہوا کہ بیرسٹر صاحب نے اپنے ورود کی جو تاریخ تار میں بتائی تھی اسی دن وہ تشریف لائے۔ ٹرین سے نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا کوئی آپ کی پیشوائی کو آتا نظر نہ آیا، ٹیکسی لی اور ایک ہوٹل میں اتر پڑے اب جو بڑے میاں نے یہ خبر سُنی تو یہ بیچارے اگلے وقتوں کے بھولے بھالے آدمی پریشان ہوئے کہ آخر یہ کون سی خفگی کی بات تھی کہ پندرہ روز ہوگئے ماں باپ کی صورت تک دیکھنا پسند نہیں کیا۔ اولاد کی محبت بُری ہوتی ہے، فوراً ہوٹل پہونچے، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس نام کے ایک صاحب فلاں کمرے میں مقیم ہیں۔ کمرے کے اندر جانا چاہا تو خانساماں نے کارڈ مانگا۔ یہ پُرانی وضع کے آدمی کارڈ کیا جانیں، پریشان ہوکر پوچھا "بھائی تم کیا مانگتے ہو؟" خانساماں سمجھ گیا کہ بڑے میاں آجکل کی تہذیب سے بالکل کورے ہیں، وہ خود ہی ایک سادہ کارڈ اُٹھا لایا اور اس پر نام لکھنے کو کہا اور عرض کی کہ یہ کارڈ ہم صاحب کو دیں گے اگر وہ آپ کو طلب کریں تو آپ کمرے میں جاسکتے ہیں۔ انہوں نے کہا "بھائی میں کسی صاحب بہادر سے ملنے نہیں آیا، میں تو اپنے لڑکے ..... سے ملنے آیا ہوں جو ولایت سے بیرسٹر ہوکر آیا ہے۔" خانساماں نے کہا "جی ہاں! اس نام کے ایک صاحب اس کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں، خواہ وہ آپ کے بیٹے ہوں یا کوئی اور یہاں کا یہی قاعدہ ہے۔"

بڑے میاں نے لرزتے ہاتھوں سے کارڈ پر اپنا نام لکھ کر خانساماں کو دیا، وہ لیکر کمرے کے اندر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آکر کہا "اس وقت صاحب تاش کھیل رہے ہیں آپ تھوڑی دیر انتظار کریں۔" کوئی آدھے گھنٹے کے بعد گھنٹی بجی اور آپ کی طلبی ہوئی، پدر بزرگوار کو دیکھکر صاحبزادے اُٹھ کھڑے ہوئے اور "گڈ مارننگ" کہکر مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ بڑے میاں مصافحہ کرکے بیٹھ تو گئے مگر لگے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صاحبزادے کو دیکھنے کہ یہ اُن کا پیارا ..... ہی ہے یا کوئی صاحب بہادر ہیں۔

اس پریشانی میں سامنے تپائی پر جو نظر پڑی تو ایک شیشہ ارغوانی رنگ کے شربت سے آدھا بھرا رکھا دیکھا، شیشہ کے آس پاس کانچ کے دو چار خوبصورت جام دھرے تھے۔ ایک میز پر تاش کے پتّے بکھرے پڑے تھے اور وہیں کچھ ریزگاری بھی موجود تھی۔ بڑے میاں اِن چیزوں کو غور سے دیکھ رہے تھے اور بیرسٹر صاحب تین پتّوں کے کھیل میں مشغول تھے۔ بڑے میاں نے آخر تنگ آکر کہا "بیٹا ..... گھر کیوں نہیں آئے! یہاں ٹھہرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

بیرسٹر صاحب کے ایک دوست نے آپ کی طرف بغور دیکھکر پوچھا "آپ کی تعریف؟" برخوردار صاحبزادے نے انگریزی میں جواب دیا "یہ ہمارے پڑوسی اور والد کے دوست ہیں!" اتنے میں بڑے میاں نے ان ہی صاحب سے کہا کہ "دیکھئے جناب! یہ میرا لڑکا ..... ہے، تعلیم کیلئے یورپ گیا تھا خدا جانے کیا ہوگیا کہ ہم سب کو بھول بھال کر یہاں ہوٹل میں آبیٹھا ہے،

ماں اُدھر انتظار انتظار میں مری جا رہی ہے، خدارا آپ ہی کچھ سمجھائیے "۔ یہ سنکر انہوں نے بیرسٹر صاحب کو خوب لتاڑا آخر خدا خدا کرکے ماں سے ملنے آپ گھر آئے۔

ماں بیچاری ممتا کی ماری بیٹے کے دیدار کو ترس رہی تھی، جب آپ اندر آئے ماں کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے اندھی ہو رہی تھیں اُس نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر بلائیں لینی چاہیں، ماں کے دونوں ہاتھ اپنے منہ کی طرف آتے دیکھکر آپ گھبرائے کہ بڑی بی منہ نوچنا چاہتی ہیں، جھٹ اپنے دونوں ہاتھ بڑھا کر روکنا چاہا۔ جب ماں بیٹے کے ہاتھ چار ہوئے تو بڑی بی کا توازن قائم نہ رہ سکا اور وہ غریب چاروں خانے چت ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اُس کو اٹھا کر پلنگ پر لٹایا گیا تو آپ قریب آئے اور پوچھا " مما! تم کیسا ہے؟ "۔ ماں مزاج پُرسی کے یہ مہذب بول سُنکر بہت پریشان ہوئی، آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو ایک صاحب بہادر کھڑے ہیں، سر پر تنکوں کی اُلٹی ٹوکری رکھی ہوئی ہے، ایک بے ڈھنگا شلوکہ زیب بدن ہے جس میں نیچے اُوپر کئی تھیلیاں لگی ہیں، منہ میں موٹی سی اگربتی سُلگ رہی ہے، پچھے دار دُھواں نکل رہا ہے مگر اگر کی سی خوشبو نہیں، ایک سُرخ دھجی نیچی اُونچی گرہ دی ہوئی بل کھائی ہوئی گلے میں لپٹی ہے اور ایک سفید سفید پٹہ سا گلے کے اطراف میں پڑا ہے۔ جلدی سے بڑی بی نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور کہا " اے یہ موا کہاں سے گھُس آیا، لے صاحب کیا میں ایسی بیمار ہو گئی تھی کہ بڑے ڈاکٹر کو بلوایا اور مجھکو بے پردہ کر دیا؟ میرا بچہ کہاں ہے؟ " بڑے میاں نے کہا " یہی تو تمہارا لڑکا ہے۔ ولایت جا کر بڑا صاحب بنگیا! " ماں کی محبت کو جوش ہوا، بیٹے کو گلے سے لگا لیا، ماں پوچھتی کچھ ہے اور یہ جواب کچھ دیتے ہیں۔ چند ہی سال میں اپنی زبان بھول گئے، آپکے رگ و ریشہ میں مغربیت کچھ ایسی سرایت کر گئی کہ اپنے وطن کی ہر چیز سے نفرت ہو گئی۔ خوراک، لباس، مکان، غرضکہ ہر چیز میں مغربیت رچ گئی۔ مغربی ماحول نے کچھ ایسا جادو کر دیا کہ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے مغرب ہی مغرب نظر آنے لگا۔ دماغ میں کچھ ایسی فرعونیت سما گئی کہ ہندوستان سے سیدھے منہ بات کرنا کسرِ شان سمجھنے لگے۔ بیرسٹری دھری کی دھری رہ گئی۔ باپ کی جائیداد پر گزر بسر ہو رہی ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ یہ ایک مثال مغرب پرستی کی پیش کی گئی ہے۔

آجکل ہماری خواتین میں بھی مغرب پرستی کی وبا خوب پھوٹ پڑی ہے، مغربی عورتوں کی طرح اُن کے لباس اور سنگار کی اختراعات میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ ضرورت سے زیادہ فیشن اور سنگار کی مصروفیتیں عورت کو اُسکے فرائض سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ مغرب کی تہذیب اور اُس کی طرز معاشرت پر اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ مغربی عورت اپنے اصلی اور جنسی فرائض سے کس قدر دُور جا پڑی ہے، گھر کی مسرتیں تو رہیں ایک طرف مغرب کا کوئی گھر ہی نہیں رہا اس لئے ایسی تقلید کا خیال جو گھر کی مسرت کو فنا کر دے اور عورت کو اُس کے فرائض سے غافل کر دے قطعاً قابل ستایش نہیں ہو سکتا۔

ہماری معزز بہنیں غالباً مغربی خواتین کی گھریلو زندگی سے واقف نہیں ہیں، آج یورپ کے اکثر مرد اپنی عورتوں کی آزادی اور فیشن پرستی کی وجہ سے بیزار ہیں عورت کی اسی نام نہاد آزادی نے مغرب کی زندگی کے توازن کو اس قدر خراب کر دیا ہے کہ ایک لمحہ کا بھی حقیقی آرام اور چین نہ مرد کو نصیب ہے نہ عورت کو۔ مغرب کی یہ عورت جو آزادی کا انتہائی نمونہ ہے، عورت

تو نہیں رہی اور نہ اُسکو مرد ہی کہہ سکتے ہیں اس لئے وہ ایک تیسری جنس بن گئی ہے جس کو مغرب کی فضا نے پیدا کیا ہے۔ ہندوستان میں بھی اب وہی اسباب پیدا ہو رہے ہیں جنہوں نے مغرب کی عورت کو ایک نئی جنس بنا دیا ہے اور اُسکی نسائیت اور اُسکی گھریلو زندگی کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔

ہماری بہنوں کو مغرب کی تقلید اس طرح کرنی چاہیئے کہ سب سے پہلے اپنے گھروں کو پاک صاف رکھیں، سامان کو سلیقے اور قرینے سے سنواریں، گھر کے گوشہ گوشہ کی صفائی کا خیال رکھیں، صحن کو گملوں اور خوشنما پودوں سے آراستہ کریں کہ درخت ہر آنے والے کو دعوت نظارہ دیتے ہیں اور خراب گیاس کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں، اپنی معاشرت کو حتی الامکان سادہ بنائیں، فضول خرچی سے احتراز کریں، خرچ کو آمدنی سے بڑھنے نہ دیں، قرض لیکر غیر ضروری سامان خریدنے اور قیمتی لباس بنانے کے عوض ہزار درجہ بہتر ہے کہ کم قیمت سادہ مگر صاف ستھرا لباس اختیار کریں۔

ہماری معاشی اور اقتصادی حالت روز بروز بدتر ہوتی جا رہی ہے، اس کی ذمہ داری مردوں کے علاوہ خواتین پر بھی عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ اکثر ملازمت اور تجارت پیشہ اشخاص اقسام کی مصروفیات کی وجہ سے گھر کے کاروبار میں دلچسپی لینے سے قاصر رہتے ہیں۔ ملازمت پیشہ حضرات تو اپنی کامل آمدنی اپنی گھروالی کے سپرد کر کے ہر قسم کی ذمہ داری سے سُبکدوش ہو جاتے ہیں، گھر کے خرچ کو آمدنی سے بڑھنے نہ دینا بیوی کا اہم فرض ہے اور جہاں اسراف کی عادت پڑ جاتی ہو وہاں باوجود اقسام کی جائز اور ناجائز معقول آمدنیوں کے قرض کی مقدار میں آئے دن اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

ہماری خواتین کو چاہیئے کہ اپنی مغربی بہنوں سے وقت کی قدر و قیمت کرنا سیکھیں۔ بیکاری، دوسروں کی عیب جوئی، ببت، فضول گپ شپ اور ضرورت سے زیادہ فیشن اور سنگار کی مصروفیات میں اپنا عزیز وقت برباد نہ کریں۔ اپنی زندگی کا ل نظام العمل بنائیں۔ کام کرنے کے اوقات کا تعین کریں، گھریلو صنعتیں حاصل کریں، بچوں کی صحت اور تربیت کا خیال رکھیں، ور خانہ داری میں تہذیب و ترتیب پیدا کریں اور اوقات فرصت میں کبھی مطالعہ کتب و اخبار بینی سے جی بہلائیں، کبھی سنیما لب چلی جائیں اور کبھی سیر و تفریح کیلئے کھلی فضا میں نکل کر قدرتی مناظر کا لطف اُٹھائیں۔ اس قسم کی سیر و تفریح کیلئے ایسے مامات کا انتخاب کریں جہاں تازہ ہوا ملے اور اچھے منظر دیکھنے میں آئیں مگر غیروں سے مڈبھیڑ ہونے کا زیادہ اندیشہ نہ ہو۔ اگر اپنے قات کی اس طرح تنظیم کر لیں تو اُن کا ایک لمحہ بھی رائیگاں نہیں جا سکتا۔

آخر میں ہم اپنی معزز بہنوں سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ خواہ وہ گھر کے اندر رہیں یا ہوٹلوں اور پارٹیوں میں ڈانس ب، موٹر چلائیں یا ہوا میں اُڑیں، کشتی رانی کریں یا گھوڑے دوڑائیں، چراغ خانہ ہونا پسند کریں یا شمع انجمن بنیں، اسٹیج پر ن افروز ہوں یا پردۂ فلم پر جلوہ گر!

مگر ذرا سا خیال رکھنا کہ پیاری بہنو وطن تمہارا
نہیں ہے بدقسمتی کہ یورپ غریب بدبخت ایشیا ہے

مرزا سیف علیخاں

گاؤں اور شہر

شہباز نگر سے دو میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں تھا جس کو موہن پور کہتے تھے۔ موہن پور دو زمینداروں کا تھا۔ ایک تو ذات کے ٹھاکر تھے دوسرے برہمن۔ ان دونوں خاندانوں میں بڑا میل ملاپ تھا۔ ٹھاکر جی کا نام پرتاب سنگھ اور پنڈت جی کا نام وشنو دت۔ ٹھاکر جی اور پنڈت جی دونوں نوجوان تھے۔ بیس کے کچھ ہی اوپر عمریں ہوں گی۔ دونوں کے پاس ایشور کی کرپا سے دھن کی کمی نہ تھی۔ یہ دونوں زمیندار بڑے نیک اور سیدھے تھے۔ ان کے پتاؤں نے انہیں اب تک شہر کی صورت بھی دیکھنے نہ دی تھی حالانکہ شہباز نگر کا فاصلہ ہی کیا تھا۔ یہ لوگ اپنی کھیتی کسانی میں مست خاموش زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان دونوں کے پتا سرگباش ہو چکے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ پنڈت جی کے ایک رشتہ دار شہر سے آئے اور بولے:۔

رشتہ دار:۔ وشنو دت، آجکل کیا ہو رہا ہے؟

وشنو دت:۔ کیا ہو رہا ہے! کل سے کٹائی شروع ہو گئی ہے۔

رشتہ دار:۔ کیا حال ہے؟

وشنو دت:۔ حال کیا ہے۔ فصل اب کی اچھی نہیں ہو سکی۔ پندرہ دن ہوتے جو اولے پڑے تھے انہوں نے لٹیا ڈبو دی۔

رشتہ دار:۔ یار تم تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھیتی کسانی کے ہاتھوں بک گئے ہو۔ کچھ بسنت کی بھی خبر ہے؟

وشنو دت:۔ کیا کہا بھائی میں تو سمجھا نہیں۔

رشتہ دار:۔ ارے بھائی۔ ذرا شہر میں رہو تو یہ سب کتھا بھول جاؤ۔

وشنو دت:۔ کیسی کتھا آپ کیا کہہ رہے ہیں!

رشتہ دار:۔ ارے یہی فصل کی رام کہانی۔ کبھی شہر بھی دیکھو۔

پنڈت:۔ شہر میں کیا دھرا ہے۔

رشتہ دار:۔ کیا دھرا ہے۔ ذرا چلو تو پتہ چلے آج کل ایک تھیٹر کمپنی آئی ہوئی ہے۔ اس میں ایسی ایسی خوبصورت عورتیں ہیں کہ سارا شہر بس لٹو ہو رہا ہے۔

پنڈت:۔ یہ تھیٹر کسے کہتے ہیں آپ، اور یہ عورتیں اس میں کیا کرتی ہیں۔

رشتہ دار:۔ (قہقہہ) واہ رے مورکھ۔ ارے تھیٹر میں سوانگ ہوتا ہے اور اس میں یہ عورتیں کام کرتی ہیں۔

پنڈت:۔ اور دیکھنے میں کیا لگتا ہے؟

رشتہ دار:۔ کیا لگتا ہے! کوئی دس بیس ہزار۔ ارے پانچ روپیہ تین روپیہ، دو روپیہ ایک روپیہ آٹھ آنے ٹکٹ ہے۔ چلو نا۔

پنڈت:۔ اچھا لیکن ٹھاکر کو بھی بلا لیں۔

رشتہ دار:۔ شوق سے، ایک سے دو بھلے۔

چنانچہ اسی دن سورج بیٹھے یہ تینوں آدمی موہن پور سے چلے۔ گھنٹہ بھر سے کم میں شہر پہونچ گئے۔ اور آٹھ بجتے بجتے یہ لوگ تھیٹر کے سامنے آ دھمکے۔

یہاں شور و غل برپا تھا۔

آوازیں:۔ بابو جی۔ مجھے ٹکٹ۔ دو روپے والا۔

دوسری آواز:۔ مجھے تین روپے والے تین ٹکٹ دیجیے، بابو جی ـــ!

تیسری آواز:۔ ارے مرا ہاتھ پسا۔ ہٹ ادھر۔ بابو جی آٹھ آنے والے چار۔

پنڈت:۔ یہ کیا ہے بھائی؟

رشتہ دار:۔ ہے کیا۔ اسی کھڑکی میں ٹکٹ ملتا ہے۔

ٹھاکر:۔ تو جا کے مہراج تین ٹکٹ لے آئیے۔ پنڈت جی، یہاں تو مارے روشنی کے دن معلوم ہو رہا ہے۔

پنڈت جی:۔ ہاں بھئی، میں تو حیران ہوا جاتا ہوں۔

رشتہ دار:۔ پانچ روپیہ والے تین ٹکٹ دیجیے بابو!

بابو:۔ لیجیے صاحب۔ یہ پانچ روپیہ واپس۔ دس کے دو نوٹ آپ نے دئے تھے۔ روپیہ پرکھ لیجیے۔

تینوں آدمی ٹکٹ خریدنے کے بعد آکر تماشہ گاہ میں بیٹھے۔

دشنودت:۔ تماشہ شروع ہونے میں کیا دیر ہے؟

رشتہ دار:۔ بس کوئی منٹوں کی کسر ہے۔

گھنٹی کا بجنا۔ پردے کا اُٹھنا۔

سہیلیوں کا گانا۔

سکھی آؤ ہل مل ناچیں گائیں۔

پہلا آدمی:۔ خبردار۔ گانا موقوف کرو۔ میرے کچھ دوست آرہے ہیں۔

پیروں کی آواز۔

پہلا آدمی:۔ آئیے آئیے، صاحبان، بوائے شراب۔ جلدی لاؤ۔۔۔ ا۔

گلاس اور بوتل آتی ہے۔ قہقہے، باتیں۔ ایک شخص داخل ہوتا ہے۔

پہلا آدمی:۔ آئیں۔ تم کیسے آئے۔ نکل جاؤ یہاں سے فوراً۔

نووارد:۔ میں نکل جاؤں۔ اچھا نکلا جاتا ہوں۔ لیکن جانے سے پہلے ان بھولی چڑیوں کو جن کو آج تو اپنے دام میں اسیر کرنا چاہتا ہے۔ تیرا حال ضرور سنا کر جاؤں گا۔

اُو فریبی انسان، تو میرے ہی دئے ہوئے مکان سے مجھے نکال رہا ہے۔ حضرات یہ شخص جس کے آپ حضرات مہمان ہیں۔ انتہائی بے ایمان اور فریبی ہے۔ یہ بھولے بھالے دیہاتی زمینداروں کو شہر لاتا ہے اور اُنہیں بائیسکوپ، تھیٹر، شراب اور گانے کے جال میں پھنسا کر خوب لوٹتا ہے۔ میں بھی ایک زمیندار تھا۔ آہ میری کُل دولت اس نے دو سال میں تباہ کردی اور آج میں پیسہ پیسہ کو محتاج ہوں۔ خدا کیلئے اس انسان کے پھندے سے بچئے۔

دشنودت:۔ بھیا ٹھاکر۔ اٹھو گھر چلیں۔

ٹھاکر:۔ ہاں بھیا۔ میرا بھی جی یہی چاہتا ہے۔

رشتہ دار:۔ ارے کہاں، کہاں۔ واہ بھائی۔ ابھی تو تماشہ ذرا ہی سا ہوا ہے پورا دیکھ تو لو۔

دشنودت:۔ نہیں بھائی بس دیکھ لیا اور اتنا دیکھ لیا کہ تمام جیون بھولنا مشکل ہے۔

رشتہ دار:۔ ہا ہا ہا۔ ارے تم پر تماشہ نے اثر کرلیا۔ واہ وا۔

ٹھاکر:۔ ہاں بھائی صاحب۔ بھلے گھوڑے کو ایک چابک اور بھلے آدمی کو ایک بات بہت ہوا کرتی ہے۔

پنڈت اور ٹھاکر دونوں اُسی وقت تھیٹر سے باہر نکل آئے اور موہن پور کو روانہ ہوگئے۔ راستے بھر اُن کے سامنے اس مغموم ایکٹر کی صورت رہی جو رو رو کر اپنی فرضی تباہی کی داستان سنا رہا تھا۔

وہ گھڑی ہے اور آج کی گھڑی۔ پنڈت اور ٹھاکر دونوں نے شہر کا منہ نہیں دیکھا۔ دونوں اپنا جیون آرام سے گذار رہے ہیں۔

بہزاد لکھنوی

نکات

خفتہ ہے خودی جس کی ناقص ہے شعور اسکا
بے نطق کلیم اس کا بے شعلہ ہے طور اسکا
آئی ہی نہیں جسکے لب تک یہ مئے باقی
بے کیف حیات اسکی بے لطف سرور اسکا

دریا کے تموج میں دریا کی خودی پنہاں
گوہر کے تجمل پہ قطرے کی خودی نازاں
ہر چیز خودی سے ہے ارضی کہ سماوی ہو
مہر و مہ و انجم میں ہے ان کی خودی تاباں

احساسِ خودی ہی سے بلبل کا ترانہ ہے
پھولوں کی دل آویزی خوش رنگ بہانہ ہے
احساسِ خودی سے ہے احساس حقیقت کا
یہ ضبط نہیں جس میں بے ربط فسانہ ہے

بادل کی گرج میں ہے بادل کی خودی مضمر
بجلی کی تڑپ میں ہے بجلی کی خودی مضطر
کہتے ہیں خودی جس کو آئینہ ہے جوہر کا
ہیں اس کے امیں جوہر رستا ہی نہیں جوہر

امینِ حزیں (سیالکوٹی)

زندہ اور فطری زبان

تیسری کسوٹی۔ دیہات کی زبان میں اُردو کا رنگ جھلکتا ہے

دیہات اور شہر کی زبان میں ہمیشہ قدرے اختلاف رہا ہے۔ مگر یہ اختلاف بُنیادی نہیں ہوتا۔ شہری دیہاتی زبان کا ڈھانچہ اور اس کا مزاج تقریباً ایک ہوتا ہے۔ ظاہری ہیئت میں وہاں وہ آراستگی اور نکھار نہیں جو شہر کی زبان میں ہے اس لئے تمیز ہوجاتی ہے، مگر اس بنا پر دیہاتی زبان اور شہری زبان دو زبانیں نہیں ہیں اور نہ دُنیا کے کسی حصہ میں ان دو کو الگ الگ بُنیاد قرار دیکر دو آزاد زبانیں وجود میں آئی ہیں۔ دُنیا کے سب ملکوں میں دیہات کی زبان شہر کے لوگ اور شہر کی زبان دیہات کے باشندے سمجھتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے کہ دیہات میں رہنے والے شہریوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ اُن کی زبان کو معیاری زبان نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ شہر کی زبان کی پیروی حتی الوسع کرتی ہے اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے وہ شہری زبان کے سانچے میں بڑھتی رہتی ہے باوجود اس کے کہ شہر کی زبان دیہاتی زبان ہی کی باقاعدہ شکل ہے، دُنیا کا کوئی مُلک یہ نہیں کرتا، شہری زبان کے افعال و اشتقاق کو دیہاتی زبان کے متبع کر دے۔ اس لئے جو لوگ اُردو کو شہری اور ہندی کو دیہاتی زبان کہتے ہیں وہ صریح غلطی پر ہیں۔ حقیقت تو بس اسی قدر ہے کہ دیہات کی زبان اَن پڑھ گنواروں کی زبان ہے۔ اُس کے بولنے والے اُس درجہ متمدّن، شائستہ اور تعلیم یافتہ نہیں جتنا کہ شہری لوگ ہیں۔ تمدّن کا فرق نتیجے کی صورت میں زبان سے بھی ظاہر ہے ورنہ اور کوئی فرق نہیں ہے۔

شہر اور دیہات دونوں جگہ ذخیرۂ الفاظ ایک قسم کا ہے۔ فارسی عربی کا استعمال جس کو غلطی سے اُردوپن سمجھا جاتا ہے، دیہات میں شہر سے کم نہیں۔ سنسکرت کی اصل صورتوں کے بجائے اسکی بدلی ہوئی اور مرورِ ایام سے ڈھلی ڈھلائی شکلیں دونوں جگہ رائج ہیں۔ تت سم (ہندی الاصل سنسکرت) کا تو کہیں نام تک نہیں ہے۔ محاورے اور ضرب الامثال بھی ایک حد تک دونوں کے مشترک سرمائے قرار دئے جاسکتے ہیں۔ ان تینوں باتوں پر مَیں نیچے مثالیں پیش کر کے اپنے دعوے کا ثبوت دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ فارسی و عربی کا برمحل استعمال۔ فارسی و عربی لفظوں کی کثرت اور ہندی لفظوں سے اُن کی ترکیب کو دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ آخر کس بنیاد پر ہندی کو دیہات کا سہارا دیا جاتا ہے۔ خوشی، ناخوشی، آب، تاب، زور، ظلم (جلم)، شان (سان)، گمان، قہر، غضب گرانی، حیرانی و پریشانی، احمق (اَحمق)، نادان (ندان)، سلام، بندگی، حجت، حکایت، شکوہ شکایت، عذر معذور، آرام تکلیف، حیلہ حوالہ، سوال جواب، ناز نخرہ، قلت (کِلت)، کثرت غرض فارسی عربی کے بے شمار اسمائے ذات و کیفیت دیہاتی زبان کا دامن بھرے ہوئے ہیں۔

تعریف و توصیف کیلئے، اعلیٰ لمبر (اعلیٰ نمبر)، اعلیٰ درجے، (اعلیٰ درجہ) خاب صورت (خوبصورت) بصُورت (بدصورت) کلاں راس، اوّل لمبر، توفہ مال (تحفہ کے لائق مال)، مزیدار، بہاردا صلی، نقلی، جعلی، داغی، نیک ماش (نیک معاش)، بدماش (بدمعاش) سفید، سُرخ۔ غرض وہ تمام صفات جن کو شہری استعمال کرتے اور بولتے دیہاتیوں کیلئے نہ صرف یہ کہ عام فہم ہیں بلکہ وہ انہیں بے تکلّف استعمال کرتے اور بولتے ہیں۔

مخاطب کرنے کیلئے جہاں "ہے مہراج! ہے بابو!" آتا ہے وہاں اس کے ساتھ ہی حضور، سرکار، مالک، کا سکہ اور زیادہ چلتا ہے۔

معاشرت کے ہر ہر پہلو پر فارسی عربی الفاظ چھائے ہوئے ہیں۔

زیوروں کے نام: بازوبند، حمائل، بندی، پوں جیب (پازیب) توکھ (طوق) تعویز وغیرہ۔

لباس: کرتہ، قمیص، شلوکہ، مرزئی، چوبندی، جامہ، کلہی (کلاہ)، جھلم بکتر (زرہ بکتر)، صدری، نیم آستین، صافہ،

غذا :- دانا (دانہ) نرم چارہ، کلیہ کھچری (قلیہ کھچڑی) شرتی ملیدہ (شیرتی مالیدہ) وغیرہ۔

پالتو اور دیگر جانور :- طوطا، خصّی (بکرا) خر (گدھا) گدھا، خرگوش، شاہیں۔ باز، شیر۔ لطف یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگ تو چوہا بولتے ہیں مگر دیہات میں موس (موش۔ فارسی) زیادہ عام ہے۔

اوزار :- چرخہ، تار، کمانی، پیچ، پیچ کش، انگستانہ (انگشتانہ) سوزن سے سوزنی۔

تقریبوں کے نام :- سادی (شادی) بدا (وداع) بدائی (وداعی)، غمی۔

پیشوں کے نام :- بیلدار، معمار، درزی، بازی گر، جادوگر، قلعی گر، سکلی گر (صیقل گر) موسہر (موش پکڑنیوالا)۔

اب ذرا اِن دیہات کے رہنے والوں کی رسمی زبان (آفیشل لینگویج) پر نگاہ ڈالئے۔ برسے کے برسے الفاظ ہیں جو اس قدر عام ہیں کہ زبانوں پر چڑھ گئے ہیں اور بالکل ہندوستانی ہوچکے ہیں۔

رسید، رسید فارخطی (فارغ خطی) رقم، پیشگی رقم، ادائگی، بقایا، حال، سابق، مالگذاری، قرقی، ہرجہ، خرچہ، دعویٰ، حاکم، اجرار، نالش، فریاد، ثبوت، گواہ، بحث، تجبیر (تعظیر) پیشی، ملتوی، معاف، رہا، قید، قید سخت، سزا، جرمانہ، اطلاع، بیان، بیان تحریری، حلف، دروغ حلفی، قتل، خون، مقدمہ، جرم، الجام (الزام)۔ اب وہ حضرات جو بلا دلیل یہ کہہ بیٹھتے ہیں کہ کچہریوں میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ دیہات کے لوگ نہیں سمجھتے سوائے اس کے کیا کہا جائے، وہ آفتاب پر خاک ڈال کر اُسے تیرہ و تاریک ثابت کرنے کی فکر میں ہیں جو ہتی دُنیا تک ناممکن ہے۔

آخر وہ دیہاتیوں کے عام فہمی کے لئے مروّج فارسی لفظوں کے بدلے کون سا لفظ رکھنا چاہتے ہیں۔ جائداد کے بدلے "سمپت" ہو جانے تو اُن کو زیادہ سمجھ میں آئیگا؟ موروثی کے بدلے کیا وہ "پیترک" کو سمجھ سکیں گے؟ کیا وہ "ثبوت" کو نہیں سمجھتے کہ اُس کے لئے سنسکرت لغت کی طرف ہاتھ بڑھایا جائے۔ اور کیا اس کا بدل جو سنسکرت سے آئیگا وہ اِن مروّج فارسی لفظوں کے مقابل اور دشوار نہ ہوگا۔

آپنے دیکھا کہ دیہاتی زبان میں فارسی و عربی لفظوں کی کس قدر کافی مقدار ہے اور وہ گھل مل کر جزوِ زبان اور جزوِ تمدن ہوچکے ہیں تو پھر کوئی شخص مروّج لفظوں کے ترک کرنے کی اور دوسری دلیل کیا پیش کرسکتا ہے جب وہ بول چال کی حیثیت سے دیہات میں بھی عام ہیں۔

اب فارسی اور ہندی کے لفظوں کے میل جول کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔ موہ کے پہلو میں محبت بھی جلوہ افگن ہے۔ شُبھ ساعت، راہ باٹ، بحرِ سمندر، لاؤ لشکر، غریب دکھیا "راجا، ایک فقیر" "لڑکا، ٹھاکر، بوڑھ، جوان" اور ایسی ہزاروں ترکیبیں لفظوں کی خاندانی تمیز مٹا چکی ہیں۔ اور گوشت سے ناخن کی طرح یہ الفاظ ایک دوسرے سے جُڑے ہیں، اب جو شخص گوشت سے ناخن کو جدا کرنے کی رائے دے اُسے تفرقہ انداز کیوں نہ کہا جائے۔

محاورات اور ضرب الامثال۔ دیہاتی اور شہری زبان کی مثلیں اور کہاوتیں بھی مشترک ہیں۔ جس طرح بہت سی فارسی و عربی ضرب المثلیں شہری زبان میں موجود ہیں دیہاتی زبان میں بھی وہ بجنسہٖ مستعمل ہیں۔

جامے سے باہر ہونا۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا، مزاج کا گرم ہونا، ٹھنڈی سانس لینا، مردِ میداں ہونا، باغ باغ ہونا، بڑا شیر مارنا، اپنے عہد کا رستم ہونا، رستم بننا، نمک حرامی کرنا، نمک حلالی کرنا۔ اور اسی قسم کے صدہا محاورات جو فارسی محاورات کے ترجمے ہیں شہری اور دیہاتی زبان میں یکساں طور پر یکساں موقعوں پر استعمال ہوتے ہیں۔ نو نقد نہ تیرہ اُدھار۔ خالہ جی کا گھر۔ (کالعمار موسیاں ہے کہ سمد ھیان) سچی بات کڑوی ہوتی ہے، مطلب کا سارا زمانہ۔ بڑے گویا، آستین کا سانپ۔ ابھی دلّی دور ہے۔ کھانے کے لئے منہ چاہیئے۔ نقارخانہ میں طوطی کی آواز، غریب کی پکار کون سُنے۔ اونٹ کے گلے میں بلّی۔ اور اسی قسم کے کتنے ضرب الامثال ہیں جو فارسی کے توسط سے ہندوستانی زبان میں ترجمہ ہوکر منتقل ہوگئے اور بید ھڑک اور شہر اور دیہات کے لوگ حسب موقع اُنہیں کھپاتے ہیں۔

تارید و تہنید۔ اُردو زبان فارسی و عربی کی طرفدار کبھی نہیں رہی وہ عربی و فارسی کے ثقیل لفظوں کو ہندوستانی زبان کے پیمانہ پر ڈھالتی رہی۔ اسی بنا پر تارید، تہنید اور تخفیف کے قاعدے اُردو میں جاری کئے گئے تھے۔ اسی قاعدے پر (ع :- شاباش جسکو کہتے ہیں وہ شاد باش تھا) شاد باش کا شاباش بنا۔ اسی قاعدے پر پادشا کو بادشاہ کی صورت میں ہم دیکھتے ہیں۔ اس طرح اُردو

میں فارسی عربی لفظ ہضم ہوتے رہے۔ ہمارے دیہاتی بھائیوں نے بھی تہنید و تارید کے وہ نمونے پیش کئے ہیں کہ شاید حاتم، مبارک مصحفی، میر کے خیال میں بھی یہ بات نہ رہی ہو۔ مثلاً:۔

۱۔ نرہانا۔ (نعرہ کرنے کی مختصر صورت ہے۔)

۲۔ غرّانا۔ (غرور میں گلا پھلا کر بولنا)

۳۔ دِقدقانا۔ (دق کرنا۔)

تلاش کیجئے تو ایسی مثالوں کا ایک دفتر مہیا ہو سکتا ہے۔

ہندوستانی زبان کی تعمیر میں انگریزی عہد میں بھی انگریزی لفظوں کا بدل دیسی اور جوڑ کا توڑ لفظ پیش کرنا لسانیات کے ماہروں سے زیادہ اَن پڑھ مزدوروں اور قلیوں کا کام ہے جو دیہات کے بھی رہنے والے ہیں اُن کے ذریعے سے مشین اور اُسکے پُرزوں کے بیسیوں نام انگریزی کے بدل بن کر مروّج ہو گئے۔ ہینڈل۔ ہتھا، سلینڈر۔ بیلن۔ پریشر۔ داب وغیرہ اسی قسم کی کوششوں کے نتیجے ہیں۔ خُلاصہ یہ کہ اُردو زبان کی فطری ساخت کے عین مطابق دیہات کی زبان ہے۔ یہی سبب ہے کہ شمالی ہند کے دیہاتی رقبے کا باشندہ اپنے اظہار خیال میں موجودہ ہندی آہنی لائن پر چلنے سے معذور ہے۔ شہری رقبہ کا وہ شخص جسے برابر ہندی سے واسطہ رہا وہ کچھ دیر کے لئے اپنی ہندی دانی کا ثبوت دے سکتا ہے مگر اس عرصے میں اُسے بہت چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ باوجود روک تھام، اُس کی پانچ منٹ کی گفتگو میں زبان کے دو رنگ صاف جھلکنے لگتے ہیں، ایک تو وہ حصّہ ابتدائی جس میں فارسی عربی لفظوں کا استعمال ہے اور دوسرا حصّہ آخری گفتگو کا جس میں ارادے کی لگام کچھ ڈھیلی پڑ گئی۔ جس میں لفظوں کا استعمال برمحل ہوتا ہے۔ اب دیہات میں بھی یہ وہی عمل جاری ہے پھر بھی یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے اُردو یا ہندوستانی کے پڑے ہوئے ڈھرے کے بجائے لوگ دوسری لائن اختیار کریں۔

ہندی کی اشاعت دیہات اور شہر میں آج تقریباً ۶۰۔ ۷۰ سال سے ہو رہی ہے مگر فارسی و عربی لفظوں سے پرہیز کرتے ہوئے زبان کا جو نمونہ پنڈت للوجی لال، بھارتیندبابو ہریشچندر اور راجہ لکشمن سنگھ نے پیش کیا تھا، دیہات میں بھی مقبول نہ ہوا۔ ہریشچندر کی چندراولی ناٹک اور ستیہ ہریشچندر ناٹک کی زبان اُردو کے قالب میں ڈالی جا چکی ہے اور اسی وجہ سے یہ ناٹک دیہات و شہر میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہوئے۔ تلسی داس جی کے رام چرت مانس کو پنڈت رادھے شیام نے اُردو طرز پر رام لیلا ناٹک کمپنیوں کے لئے تیار کیا۔ رامائن کا چربہ اُردو طرز پر جب سے ناٹک منڈلوں نے اُتروایا اُس وقت سے انہیں زیادہ کامیابی ہے۔ ناظرین پر اب یہ بات اچھی طرح روشن ہو چکی کہ دیہاتی زبان کا رُخ کس طرف ہے؟

سنسکرت کے تدبھو (مرور ایام سے بدلے ہوئے) الفاظ بھی دیہاتی زبان میں مستعمل ہیں۔

اب دیہات کی زبان کے اُن لفظوں کی صورتوں کو دیکھنا ہے جن کے بنا پر اپنی زبان کو آریائی تسلیم کرتے ہوئے ہم سنسکرت سے مختلف سمجھتے ہیں۔ مثلاً صرف پٹھ (پڑھنا) کی چند اشتقاقی صورتیں مُلاحظہ ہوں۔

پَٹھتِ (وہ پڑھتا ہے) پَٹھتہ (وہ دونوں پڑھتے ہیں) پَٹھنتِ (وہ سب پڑھتے ہیں)

ہندی اُردو میں اوّلاً تو ضمیر فاعلی سنسکرت کی طرح فعل سے متصل نہیں آتی ہے دوسرے سنسکرت کے رُوپوں اور اُردو ہندی فعلوں میں کتنا فرق ہے۔ اس لئے اُردو ہندی میں قول کا سنسکرت کی بدلی ہوئی صورتوں میں آنا مسلم ہے اور اسے ہندی کے حامی تسلیم بھی کرتے ہیں۔ اب رہ گیا اسما صفات اور تمیز کی بحث۔ اس بارے میں بھی ہماری گذارش ہے کہ وہ مجبوری ہمیں سنسکرت اسما و صفات اور تمیزوں کو بھی ہندی الاصل استعمال کرنے سے منع کرتی ہے اور دیہاتی زبان اپنے نمونوں سے ہماری تائید کرتی ہے۔ آپ دیہات اور شہر ہر جگہ سنسکرت تت سم (اصل) لفظوں کا فقدان پائیں گے۔ کہیں بھی پانی کو پانیہ، جَل کو جلم، جلو، جلہ، کہتا ہوا کوئی نہ ملیگا۔ سولہ کی گنتی کھوڑس اور چھتّا وش کی صورت میں کہیں نہ سُنے گا۔ دُگدھ، گھرت کے بجائے دودھ، گھی ہی سنائی دے گا۔ مہینوں کے نام سنسکرت پترے ہی میں پھالگن ہے ورنہ ہر دیہاتی پھاگن ہی کہتا ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ آج کونسی "تھتی" ہے بلکہ یہاں بھی تاریخ، سمجھی جاتی ہے نہ یہاں "یکشنبہ" عام ہے اور ربی وار مگر جمعہ، سنیچر، اتوار۔ سیدھا سیدھا سب لوگ سمجھتے ہیں۔ آدمیوں گاؤں کے نام بھی مُلاحظہ ہوں:۔

پورن مل (بجائے پورن مل۔) گنیش پرشاد، رام جتن بجائے رام یتن۔ رامپور بجائے رام پُرے ۔۔۔ اسلام پور، غرض

لہ رامائن۔

یہ کہ سنسکرت کی قدیم (تت سم) شکل کے بجائے اس کا تدبھو (بدلا ہوا) جیتا جاگتا روپ بولا جاتا ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ تھتی بنانے والے پنڈت بھی اسی طرح بولتے ہیں اور اپنے جمانوں سے لفظوں کی جدید شکلوں کے اچارن سے اُن کا بھی جی خوش ہوتا ہے ایک لطیفہ اس موقع پر مجھے یاد آتا ہے جو میرے اُستاد مکرم موقع بہ موقع فرمایا کرتے تھے۔

کہتے ہیں کسی ہندو رئیس کے یہاں بڑی منتوں سے لڑکا پیدا ہوا۔ از راہ شکر گزاری اُنہوں نے اس تقریب میں دوست احباب کو مدعو کرنا چاہا۔ شُبھ ساعت پنڈت جی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ چیتی سُدی چیت اس کے لئے بہت مبارک ہے اور اس دن چندرما بالک کے سن مُکھ ہونگے، یوگ بَلی ہے۔ پنڈت جی کے جانے کے بعد بابو صاحب کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوئے۔ وہم نے ایک شوشہ پیدا کیا کہ گھڑی، مہورت، جوگ بل، سب کچھ تو پوچھا مگر دن نہیں پوچھا کہیں مانَ کا دن نہ پڑ جائے دربار کا حجام بڑا ہوشیار تھا اُس نے کہا سرکار اگر حکم ہو تو مہاراج جی سے ابھی جا کے پوچھ آویں کہ دن کون سا پڑتا ہے۔ اجازت مل گئی۔ نائی نے پہونچتے ہی پنڈت جی کے چرن چھونے کے بعد ہاتھ جوڑ کر کہا مہاراج "کھشٹی" کے تھتی کو کونسا دن ہے۔ ذرا لمبا دن ہے ٹھیک ٹھیک پترا دیکھکر بتا دیجئے۔ پنڈت جی کو "کھشٹھی" کا صحیح تلفظ سُن کر بڑا تعجب ہوا اُنہوں نے سوچا کہ کمبخت نائی، حجام، کہار جب ایسا شدھ اچارن کرنے لگے تو اب تو بُرے دن آنے کو بلمب (دیر) نہیں۔ پھر ذرا سوچکر سنبھل گئے اور کہا ابھی یہ فتنہ عام نہیں اس کو نہیں سے دبا دینا چاہئیے۔ یہ سوچکر گھرک کر بولے۔ تو کون بڑا ڈھیٹ معلوم ہوتا ہے، چلو بابو صاحب ہی سے اب ہم بتا دیں گے کہ چھٹی کو کون سا دن ہے اور تم کو تمہاری کرتوت کا پھل بھی بھوگنا پڑے گا۔ حجام پنڈت کے پیروں پر گر پڑا۔ اور بولا "مہراج سیوک ہوں۔ خطا معاف کیجئے نہیں ہماری روزی آج ہی چلی جائیگی، ابھوں ہی بابو صاحب کو معلوم ہوگا کہ ہم سے کچھ گڑبڑ کام ہوا ہے ایک نہ مانیں گے، اور نکال دیںگے۔

پنڈت جی نے اپنی آن کی حفاظت کرتے ہوئے فرمایا۔

"مورکھ، سُن۔ پہلے یہ بات بتا کہ تو بابو صاحب کا پونی[1] ہے کہ پروہت[2]؟"

حجام:- سرکار۔ راو دے پیر کا جوتا اور اُن کے بھی پیر کا جوتا۔

پنڈت جی:- تب کا ہے پروہت بننے لگا، پوچھتا ہے کھشٹی کی تھتی دن سا دن ہے۔

حجام:- مہراج جیسے آپ کا آگیان ہو ویسے ہی پوچھونگا۔

پنڈت جی:- تمہیں پوچھنا چاہیئے تھا کہ چھٹھی کون دن پڑیگی۔

حجام:- ہاں مہراج (ہاتھ جوڑتے ہوئے) بتا دیا جائے، چھٹی کون دن ہے۔

پنڈت جی نے پترا کھولا اور دن بتلایا۔

اس لطیفے کے بیان کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ سنسکرت کے ہندی الاصل الفاظ عام استعمال کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اور جب یہ اختلاف جاتا رہے تو اُردو و ہندی میں کوئی فرق ہی نہ رہا۔ پھر بعض بزرگوں کا یہ فرمانا کہ ہندی دیہات کی زبان اور اردو صرف شہروں کی زبان ہے کہانتک صحیح ہے؟ اور یہ بھی روشن ہوجاتا ہے کہ اب 'سرب'، کا استعمال ہماری موجودہ زبان میں جائز ہے یا 'سب'، 'سبھی'، کا؟ ناظرین خود فیصلہ کرلیں۔

دیہات کی زبان کو اُس ہندی کے قریب تر ضرور کہہ سکتے ہیں جس کی مختلف شاخوں میں اُنیسویں صدی کے پیشتر بہت سی کام کی باتیں نظم کی گئیں۔ مثلاً کبیر کے دوہرے اور سنتوں کے بھجن اور اُپدیش۔ مگر بقول سر جارنس دد وہ ہندی تو دہقانی بولی ہے موصوف نے اپنی رپورٹ میں صاف صاف لکھا ہے۔

"ہندی سے مُراد دراصل وہ دہقانی بولیاں ہیں جو شمالی ہند میں بولی جاتی ہے۔"

پس اس ہندی کے حق میں جو اُردو کے قالب پر ڈھال گئی اور جسے وہ اُن دہقانی بولیوں (بھوجپوری، اودھی، قنوجی، بندیلی وغیرہ) سے تمیز دینے کے لئے کسی خاص مصلحت سے اُردو طرز نہ کہکر کھڑی بولی کہتے ہیں۔ دیہاتی زبان کی تائید کچھ بھی مُفید نہیں بلکہ اس سے تو وہ کلاسک حیثیت سے بھی گری ہوئی مانی جائے گی۔ اور اُسے .... اپنے دعوے سے بہت نیچے اُترنا پڑیگا۔

پس اسی صورت میں جبکہ دیہات کی زبان میں افعال کی شکلیں اُردو، ہندی سے یکساں طور پر مختلف ہیں جبکہ فارسی و عربی کے اسما و صفات، غیر ہیں' اس میں اردو جس کو غلطی سے شہری

---

[1] نوکر، خدمتگار۔ [2] گرو۔ برہمن۔ ہندو خاندان کا پیر۔

ڈاکٹر کا استعمال

"ہاں یقین کیجئے" حامد نے سگار کا ایک کش لیکر بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا "ہماری نظروں میں حقیقت، خدا، مذہب کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ ہم ان سب کو تصرف میں لاتے ہیں۔ حقیقت کے ذریعے ہم قتل کر سکتے ہیں، انتقام لے سکتے ہیں۔ خدا کو لیجئے "خدا" کو بھی حسب ضرورت موڑ توڑ لیا جاتا ہے۔ یا مختلف سانچوں میں ڈھال لیا جاتا ہے۔ مذہب کی مختلف تعبیریں تراش لی جاتی ہیں محض کسی وہم کیلئے یا اپنے یقینوں اور ایمانوں کی دنیا کو برقرار رکھنے کیلئے، یا کسی ایسی ہی ذہنی الجھن کیلئے۔"

"مگر ڈاکٹر صاحب" طارق نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا "کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ یہ تمام دکھ بیماریاں بھی سب محض "ذریعے" ہیں اور حقیقت میں کوئی وقعت نہیں رکھتے"

حامد نے سگار کی راکھ طشتری میں جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں، زیادہ تر بیماریاں خود ساختہ ہوتی ہیں اور تقریباً ہر بیماری میں مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ مریض کو مرض کی وجہ سے بہت فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً عورتوں کو لیجئے انکی بیماریاں عموماً کسی نہ کسی مقصد کیلئے ہوتی ہیں۔ خاوند کو خوش رکھنے، نچانے، مٹھی میں لینے یا ٹالنے کیلئے، یا ساس کی خفگی سے نجات پانے کیلئے یا پڑوسیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے۔ اور تقریباً یہی حال بچوں اور بوڑھوں کا ہے۔ ہاں بالکل یہی" اس نے شانے ہلاتے ہوئے کہا "اور پھر ایسے مریض ڈاکٹر سے علاج نہیں کراتے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق ڈاکٹر کا استعمال کرتے ہیں۔ جیسے دانتوں کا برش۔ بیچ یا پرانی روایات استعمال کی جاتی ہیں۔"

اس بات پر تینوں اصحاب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"اچھا تو ڈاکٹر" طارق نے طعنے کے طور پر کہا "کیا کبھی کسی مریض نے آپ کو بھی استعمال کیا ہے"

"ہاں" ڈاکٹر نے مسکرا کر میز پوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیوں نہیں۔ اس کے متعلق مجھے ایک واقعہ یاد آیا" ڈاکٹر حامد نے سگار کا ایک کش لیا اور اسکے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آ گئی مگر پھر وہ کسی نامعلوم گہرے خیال سے کانپ اٹھا۔

حاضرین کے اصرار پر حامد نے وہ قصہ یوں بیان کیا۔

"ایک روز میں اپنے مطب میں بیٹھا تھا۔ کوئی نو بجے کا وقت ہوگا۔ کہ ایک دبلا پتلا آدمی آیا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں شاید وہ جوہری تھا۔ یا شاید ویسے ہی کوئی سوداگر تھا۔ بہرحال وہ کوئی امیر دوکاندار تھا۔ اس کی دوکان مال روڈ پر تھی۔ تینتیس پینتیس برس کا سن ہوگا۔ سیدھی سادی شکل و صورت سمجھ لیجئے۔ مگر اس کی آنکھیں تخیلی آنکھیں تھیں اور ان میں کچھ ایسی جھلک تھی جسے دیکھکر یوں محسوس ہوتا جیسے اس نے زندگی میں بہت دکھ سہا ہو۔ اور اس کے انداز میں ایک ایسی جھینپ اور "**کھویاپن**" تھا جس سے ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کسی تخیلی دنیا میں رہنے کا عادی ہو۔ اور دنیا کے حقائق کی کھوریوں سے گھبراتا ہو۔ بیٹھتے ہی اس نے ایک اضطراری انداز سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب مجھے آپکے مشورے کی سخت ضرورت ہے۔ میں سخت دکھی ہوں اور میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے میں وحشت سے دیوانہ ہو جاؤنگا۔ یا خدا جانے کیا کر بیٹھوں۔ میں اتفاقاً آپ کا بورڈ دیکھکر اندر چلا آیا ہوں۔ آپ فرمائیے کہ میں کس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہوں"

"میں آپ کو صبح نو بجے سے بارہ بجے تک ہر وقت مل سکتا ہوں۔ ہاں اگر کوئی مریض آیا ہوا ہو تو آپ کو انتظار کرنا پڑیگا۔۔۔ ابھی فرمائیے میں اس وقت فارغ ہوں۔۔۔ یا جب بھی آپ کو فرصت ہو" میں نے اس کے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھکر کہا۔

اس نے دو ایک بار گھڑی کو گھور کر دیکھا اور یوں کہنے لگا۔ جیسے وہ اپنے آپ سے کہہ رہا ہو "خیر کوئی بات نہیں! کوئی بات نہیں! ابھی سہی" اس کے الفاظ سے سسکیوں کی بو آ رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھ سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کسی نامعلوم دبی ہوئی مسرت سے چمکنا چاہتی ہو۔

"ایک منٹ ٹھہریئے" میں نے نوٹ بک تلاش کرنے

کیلئے معذرت کی۔

"کیا میں یہ تصاویر دیکھ سکتا ہوں" اُس نے یکلخت اُٹھتے ہوئے کہا۔ جیسے کرسی میں اُس کا دم گھُٹ رہا ہو۔

"شوق سے" میں نے دراز سے نوٹ بُک تلاش کرتے ہوئے جواب دیا۔ . . .

"اخاہ!!" انگیٹھی سے پتھر کا کُتا اُٹھاتے ہوئے کہا "بہت اچھا ہے!! نہایت خوب! ڈاکٹر صاحب" اُس نے مجھے مخاطب کرکے کہا "میں آپکے چُناؤ کی داد دیتا ہوں"

اُن دنوں میں نے اپنے کمرے کو مختلف تصاویر اور نادرات سے سجایا ہوا تھا۔ تاکہ مریض کی بھٹکتی ہوئی نگاہوں میں اُس کے دل کی اَن کہی یا ناگفتنی بات کا اظہار ہو سکے۔ وہ کُتا میں نے ڈبی بازار سے خریدا تھا وہاں ایک میلی کچیلی دُکان میں متفرقات کے ڈھیر تلے پڑا تھا۔ ایک کباڑی کی دوکان میں۔ اور چونکہ بہت سستا مل گیا اس لئے میں نے خرید لیا۔ گو میں یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ تحلیل نفسی کے عمل میں کیا کام دے سکتا ہے"

وہ کُتا پتھر کا تھا۔ کوئی پانچ چھ اِنچ اُونچا ہوگا۔ مگر اُس کی صورت بے بسی کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھی۔ یعنی یوں سمجھ لیجئے۔ یعنی. . . . . . ہاں اُس نے کچھ سوچ کر کہا۔ اُس کی صورت اُس کتے کی تھی جو عام طور پر سڑک کے درمیان میں پڑا ہوا پایا جاتا ہے۔ اور ہر راہگیر کو مظلوم اور ملتجی نگاہوں سے اس اُمید سے دیکھتا ہے کہ وہ اُسکی دُم کو پاؤں تلے روند جائے اور پھر وہ چیختا ہوا اپنا آپ گھسیٹتا ہوا ایک طرف سرک جائے۔

ہاں تو مریض نے کُرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میرے دُکھ کا باعث میری بیوی ہے" اُس کی آواز یکدم کسی اندرونی ٹھیس سے بدل گئی۔ اُس نے ایک گرم آہ بھری۔

"ہاں ہماری شادی کو چھ برس ہو چکے ہیں اور مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے بلکہ عشق۔ مگر اُس نے کبھی حقیقی معنوں میں میری پرواہ نہیں کی۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھ میں وہ چمک نہیں رہتی۔ بلکہ ایک غبار سا آجاتا ہے۔ اور اُس کے ہونٹوں میں ایک ایسی شکن پڑ جاتی ہے کہ میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے وہ مجھے تمسخر سے بنا رہی ہو۔ . . . . . . چھ سال پہلے" اُس نے ایک آہ بھر کر کہا "اُسے واقعی مجھ سے محبت تھی۔ یا خدا جانے وہ میری نظر کا دھوکا تھا۔ خیر، شاید ایسا ہی ہو۔ مگر میرا خیال تھا کہ اُسے مجھ سے محبت ہے۔ مگر شادی کے بعد اُسکی نگاہوں میں وہ بات نہ رہی۔

مثلاً میرے دوستوں کی موجودگی میں جب کبھی وہ کسی سے بات کرے تو اُسکی نگاہوں میں ایک لہر سی ہوتی ہے۔ اور کچھ ایسا خُمار سا تڑپ سی یا روشنی سی یا خُدا جانے کیا ہوتا ہے" اُس نے ایک جُھرجُھری لیکر کہا "اُس کی ہر حرکت اور چال ڈھال میں کچھ ایسی بات ہوتی ہے جس سے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میرے دوستوں کو مسحور کر رہی ہو۔ یا اُبھار رہی ہو. . . مائل کر رہی ہو یعنی جیسے وہ آنکھ سے کوئی وعدہ کر رہی ہو. . . مگر. . . جب وہ میری طرف دیکھے تو اُس کی نگاہوں میں وہ چمک بُجھ جاتی ہے۔ اور وہ یوں پھیکی نظروں سے دیکھتی ہے جیسے وہ دُنیا بھر کی چیزوں سے اُکتا چکی ہو. . . .

مثلاً میرے دوست" خدا جانے اُس نے کیا نام بتایا تھا ڈاکٹر حامد نے اپنی اُنگلی سے میز بجاتے اور سوچتے ہوئے کہا۔ شاید جمیل تھا یا جمشید. . . کچھ ایسا ہی نام تھا۔ خیر تو جمشید ہی سہی۔ ہاں تو وہ کہنے لگا۔

"جمشید کے ساتھ تو اُس کا برتاؤ بالکل رازدارانہ تھا۔ میرا مطلب ہے، جیسے اُن کے درمیان کوئی راز ہو۔ جمشید میرا پُرانا دوست ہے۔ وہ ریلوے میں اے۔ ٹی۔ او تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نہایت خوبصورت جوان تھا اور بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔ اب تو خیر عرصہ سے ہمارے تعلقات ٹوٹ چکے ہیں" اُس نے ایک موہوم سی آہ بھر کر کہا "اور اس کا باعث میری بیوی تھی. . . خیر. . . خیر. . . " اُس نے کُرسی کے بازوؤں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "ہاں جس روز جمشید کو آنا ہوتا میری بیوی خاص طور پر چُن کر لباس پہنتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ بڑی بے صبری سے اُس کا انتظار کر رہی ہو۔ اُسکی عموماً اکتائی ہوئی آواز میں لوچ پیدا ہو جاتی اور باتوں ہی باتوں میں وہ ایسے لفظوں پر زور دے جاتی یا ہاتھ، ہونٹ اور سر کی ہلکی سی جنبش سے اُس سے ایسی باتیں کہہ جاتی جن سے جمشید کی آنکھ میں سُرخ ڈورے دوڑ جاتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ پی کے آیا ہو۔ مگر میرے لئے اُس کی وہ ایک ایک حرکت برچھی بنکر کلیجے سے نکل جاتی حتیٰ کہ میں رقابت کی جلن سے بے حال ہو کر ادھر اُدھر ہو جاتا۔"

"اور پھر دُکان میں بیٹھے بٹھائے اُن کی وہی ایک ایک حرکت میری آنکھوں تلے پھرتی حتیٰ کہ اُن حرکات کا مطلب مل جل کر میرے سامنے پیش کر دیتا۔ ایک نازیبا اور ذبح کرنے والی تصویر۔ اور

مَیں سوچتا۔ ہاں اُس نے دو مرتبہ ہاتھ دکھایا تھا یعنی دس بجے۔ ملاقات کا وقت... یعنی وہ اس وقت مل رہے ہیں... اکٹھے بیٹھے ہیں... خدا جانے کیا کر رہے ہیں... پھر میرے سامنے اُن کی ملاقات کی تصوّر آکھڑی ہوتی اور میں درد سے بیقرار ہو جاتا... ڈاکٹر صاحب یقین کیجئے اِس سے بڑھکر اور کوئی جلن نہیں ہو سکتی... مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں دہکتے ہوئے کوئلوں پر پڑا تڑپ رہا ہوں... اور پھر وہ تصویر میرا پیچھا کرتی... میرے دل کے کونے سے آوازیں آتیں "چلو چل کر دیکھ لو۔ چلو چل کر دیکھ لو"... حتیٰ کہ مَیں دیوانہ وار دوکان سے اُٹھ بھاگتا۔ مگر ڈاکٹر صاحب وہ بہت چالاک ہے۔ اس لئے مجھے کبھی موقع نہ ملا کہ مَیں اُس کو جھٹلا نہ سکا۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ وہ حقیقت تھی... میرا وہم نہ تھا... ہاں... وہ کیسے وہم ہو سکتا ہے۔" اُسنے شاید اپنے آپکو یقین دلانے کیلئے دہرایا۔

"اُسکی چالاکی کی یہ انتہا ہے کہ جب کبھی میں اپنے شکوک کا اظہار کروں تو وہ اُلٹا بگڑتی ہے اور ایسے مظلوم انداز سے اور بھرّائی ہوئی آواز میں اپنی محبت اور ناقدری کا قصّہ کہتی ہے کہ اکثر میں اُسکو مظلوم اور اپنے آپ کو مجرم سمجھنا شروع کر دیتا ہوں... کئی دفعہ میں نے اُسکی بات پر اعتبار کر کے اُسے موقع دیا ہے۔ مگر اُس کے انداز میں فرق نہیں آیا... ڈاکٹر صاحب یقین کیجئے میری طبیعت میں کبھی کمینے شکوک پیدا ہی نہیں ہوئے۔ اور میں نے کبھی اپنی بیوی کو پردے یا چکوں کی قید میں نہیں ڈالا۔ اس کے برعکس میں نے اُسے ہر قسم کی آزادی دے رکھی ہے۔ مگر وہ میری طبیعت کا ناجائز فائدہ حاصل کرنے سے ذرا نہیں شرماتی۔ بس میں یہ چاہتا ہوں کہ مجھے حقیقت معلوم ہو جائے، اور مجھے دھوکے میں نہ رکھا جائے... ہاں... آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مَیں اُسے کسقدر چاہتا ہوں۔ ورنہ میں ایک دن کیلئے بھی اُسے پاس نہ رکھتا۔ وہ بہت پیاری ہے ڈاکٹر صاحب بہت پیاری، مگر آہ کاش کہ وہ پیار کرنے کے لئے یوں غیروں کو نہ چنتی۔ جمشید کے بعد نوشیرواں اور اب۔" اُس نے ایک تمسخر بھری ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "اب اُس کی آنکھیں میرے دوست مسٹر منیر سے کھیلتی ہیں۔ مگر میں ضرور کھوج نکالنے میں کامیاب ہونگا۔ مَیں اُسے عین موقع پر ثابت کر دونگا کہ مَیں کمینہ نہیں ہوں اور خواہ مخواہ الزام نہیں تھوپتا۔ وہ لاکھ چالاک سہی۔ مگر ڈاکٹر صاحب وہ بہت چالاک ہے، وہ بہت چالاک ہے۔" اُس نے بےبسی سے بالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

پھر وہ ایک تڑپ سے کرسی سے اُٹھ بیٹھا۔ "ہاں ڈاکٹر صاحب مجھے جانا ہے۔ آج ہم نے مسٹر منیر کو چائے پر بلایا تھا۔ مجھے نو بجے وہاں پہونچ جانا چاہیئے تھا۔ اب پونے دس ہو چکے ہیں۔" اُس نے گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے نا۔ میں بھی کسقدر بھروسا کرتا ہوں۔" اُسنے اپنے آپ سے کہا۔

حامد نے ایک نیا سگار لگایا اور دیا سلائی بجھا کر چاروں طرف دیکھا، تینوں دوست خاموش بیٹھے تھے۔ ہاں طارق کے ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ تھی اور وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"اچھا تو ڈاکٹر کیا تم نے اُس کی بیوی سے ملاقات کی۔" حمید نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ اور اپنے ہونٹوں کو یوں بھینچ لیا۔ جیسے بچے انگریزی مٹھائی چوستے ہیں۔

"ہاں" ڈاکٹر نے کہا۔ "میرا یہ الو کھا مریض اس بات پر مصر تھا کہ مَیں اُس کی بیوی سے ملوں اور تحلیل نفسی کے ذریعے یہ معلوم کروں کہ آیا واقعی وہ ایسی ہی پُراسرار اور بیوفا بیوی تھی جیساکہ اُس کا خیال تھا یا نہیں۔ پہلے تو میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی مگر آخر مجھے اُس کی بات ماننی ہی پڑی اور حقیقت یہ ہے کہ چونکہ اُن دنوں میرے پاس مریضوں کی بہت قلت تھی۔ چونکہ میں نے ابھی پریکٹس شروع ہی کی تھی اور لوگ ابھی تحلیل نفسی کے طریقہ علاج سے واقف نہ تھے بلکہ اس کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں اور بغض اُن کے دلوں میں بھرے ہوئے تھے۔ خیر" ڈاکٹر نے سگار کا ایک کش لگایا۔

القصہ اُس نے کسی بہانے اپنی بیوی کو میرے مطب میں بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور پھر جانے سے پہلے نہایت منت اور عاجزی سے کہنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب اپنی بیوی کو یہاں بھیجنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ اُس کا بیان میں اپنے کانوں سے سنوں۔ آپ کا اس میں کچھ نہیں بگڑیگا مگر مجھے حقیقت سے آگاہی ہو جائیگی۔ میرے لئے یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں صرف جاننا چاہتا ہوں۔ صرف جاننا۔ یقین جانیئے مَیں کوئی جھگڑا پیدا نہیں کرونگا۔ مَیں خاموشی سے اُس پردے کے پیچھے بیٹھا رہونگا۔" اُس نے پردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر غالباً میری ہچکچاہٹ دیکھکر وہ چلایا۔ "میری بات سُن لیجئے، خدارا میری بات سُن لیجئے۔ مَیں جانتا ہوں۔ ہاں... ہاں مَیں جانتا ہوں کہ یوں چھپنے کی اجازت دینا آپکے اصول کے

خلاف ہی۔ مگر خدا کیلئے مجھ پر رحم کیجئے۔" اُس کا چہرہ خوف سے یا خدا جانے کسی نامعلوم لذّت یا ڈر سے بھیانک ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی بچہ جسے باپ نے استرے کو ہاتھ لگانے سے منع کیا ہو۔ موقع پاکر چوری چوری باپ کی صندوقچی سے استرا نکال خوف بھرا نی اور ایک اضطراب بھری لذت سے اُسکی دھار محسوس کرتا ہے۔

اگلے روز شام کے چار بجے میرا مریض آیا۔ اس کے چہرے پر ایک پُرکیف خُمار سا چھایا ہوا تھا۔ اور اس کی آنکھیں یوں سُرخ ہو رہی تھیں اور چست نظر آتی تھیں جیسے وہ اپنی تخیّلی دُنیا سے اُبھر کر پہلی مرتبہ اس حقیقی دُنیا سے آشنا ہونے کیلئے مشتاق ہوں۔

"ڈاکٹر صاحب وہ ابھی آ رہی ہے۔" اُس نے آتے ہی اضطراب سے کہا۔ "اس کا کوئی بچہ نہیں۔ اور اُسے ایک بچے کی بہت آرزو ہے۔ میں نے اُسے آپ کا کارڈ دے کر کہا تھا کہ آپ تحلیل نفسی کے ذریعے عورتوں کا علاج کرنے کے ماہر ہیں۔ وہ ضرور آئے گی۔ وہ آ ہی رہی ہوگی۔ خُدا کیلئے آپ اُسے اِس موضوع پر ضرور پوچھئے۔ وہ ضرور سچ سچ کہدیگی۔ اُس کی آنکھ میں عجیب سی چمک تھی۔

میں نے پردے کے پیچھے اُس کیلئے ایک آرام کرسی رکھوا دی اور خود اُس کی بیوی کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ اور سچ پوچھئے تو میں خود اس پُراسرار عورت کو دیکھنے کیلئے بیقرار سا ہو رہا تھا۔ گو بظاہر میں اپنے آپ سے یہ شوقِ ملاقات چھُپا رہا تھا۔" ڈاکٹر نے سگار کا ایک کش لیکر کہا۔

ساڑھے چار بجے وہ آئی۔ اور میں اُسے دیکھکر بھوچکا سا رہ گیا۔ کیونکہ وہ ایک نہایت حسین اور وجیہہ عورت تھی۔ ڈاکٹر چند ساعت کیلئے خاموش ہوگیا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سگار کے دھوئیں میں کچھ دیکھ رہا تھا۔ حمید نے اپنی نکٹائی کی گرہ درست کی ہونٹوں کو چبایا اور پھر بُت سا بنکر بیٹھ گیا۔ طارق کے چہرے سے وہ مسکراہٹ گم ہوچکی تھی اور وہ غور سے سُننے کیلئے آگے کی طرف جُھکا ہوا تھا تیسرا دوست نسیم جو کسی کالج میں پروفیسر تھا، اپنے بدن کو یوں بھینچ رہا تھا جیسے وہ کسی ضدی انگڑائی سے لڑ رہا ہو۔

اُس کی آنکھیں بہت جاذب نظر تھیں۔ ڈاکٹر نے اُسی کھوئے ہوئے انداز سے بیان کرنا شروع کیا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ پانی میں تیر رہی ہوں۔ اور اُس کی نگاہیں یوں بھیگی بھیگی سی تھیں جیسے وہ ابھی رو کر آئی ہو۔ ہلکی ہلکی سی سُرخی تھی جس میں غم کی جھلک تھی۔ جیسے وہ آنکھیں پی جانے کی عادی ہوں۔

اور اُس کے ہلکے سُرخ سے پتلے پتلے ہونٹ جن کے درمیان ایک ایسا خلا سا تھا جیسے کوئی کلی جو ابھی کھلنے لگی ہو۔ انہیں دیکھکر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہہ رہی ہو یا کہنا چاہتی ہو۔ اس کے علاوہ اُس کے ناک اور گالوں پر ایک ایسی سُرخی سے تھی جیسے وہ مسلسل جھینپ رہی یا شرما رہی ہو۔ اور اُسکی ہر حرکت رسیلی تھی۔

وہ بیٹھ گئی۔

"فرمائیے۔" میں نے اپنے ضمیر پر بوجھ سا محسوس کرتے ہوئے اور پردے کی طرف نہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خاوند نے مجھے آپ کا پتہ دیا تھا۔" اُس نے شرم سے لال گلال ہوکر کہا اور آنکھیں جُھکا لیں۔ "چھ سال شادی کو ہوئے ہیں مگر ہمارا کوئی بچہ نہیں۔"

ڈاکٹر نے سگار کی راکھ جھاڑ کر ایک گہرا سانس لیا۔

"ہاں تو کوئی بیس منٹ میں اس سے اِدھر اُدھر کی بے معنی باتیں کرتا رہا۔ ایسے سوال کرتا رہا جو عام ڈاکٹر کیا کرتے ہیں۔ آخر میں جرأت کرکے اُسے مطلوبہ موضوع پر لے آیا۔

"ہاں بیگم اگر آپ بُرا نہ مانیں تو کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے اور آپ کے خاوند کے تعلقات کیسے ہیں؟" میں نے ہمت کرکے پوچھا۔

جواب میں کچھ دیر کیلئے اُس کی آنکھوں کو کچھ ایسی جنبش ہوئی جیسے وہ ڈوب رہی ہوں۔ اور میں نے محسوس کیا جیسے ان آنکھوں میں بلا کی گہرائیاں تھیں۔ اور اُس نے ایک موہوم سی آہ بھری۔

"ہمارے تعلقات نہایت خوشگوار ہیں۔" اُسنے میز کو حسرت بھری نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"آپ گھبرائیے نہیں بیگم۔" میں نے اُسے یقین دلانے کی غرض سے کہا۔ "آپ جب تک پوری آزادی سے دل کی بات نہیں کہیں گی جب تک ہم ملکر اس بات کا کھوج نہیں لگا سکیں گے۔ یعنی میرا مطلب ہے کہ آپ کی آرزو پوری نہ ہو سکے گی۔ آپ بالکل بے فکر رہیئے۔" میں نے پردے کی طرف نہ دیکھنے کی شدید کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا راز ہمیشہ راز رہے گا۔ آپ بالکل نہ گھبرائیے۔"

"کوئی خاص بات تو نہیں۔ البتہ اُن کا مزاج شکی ہے۔ اور وہ کسی نہ کسی طرح شک کی صورت پیدا کر لیتے ہیں۔" اُسنے

اپنی انگلیوں سے "پیپر ویٹ" گھماتے ہوئے جواب دیا: "وہ اپنے خیالی شک کی وجہ سے ہی دیوانوں کی طرح پریشان رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں بہت دُکھی سی رہتی ہوں۔

اور میری حیرانی کی بات یہ ہے کہ اول تو وہ مجھے اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اگر مَیں اُن سے خندہ پیشانی نہ ملوں تو اُلٹا مجھ سے بگڑتے ہیں اور اگر ملوں تو بعد میں میری چھوٹی چھوٹی حرکتوں اور باتوں کو موڑ توڑ کر کیا سے کیا سمجھ لیتے ہیں اور مجھ پر الزام دیتے ہیں۔

مثلاً کل کی ہی بات ہے کہ انہوں نے میرے پُرزور انکار کے باوجود اپنے ایک دوست مسٹر منیر کو چائے پر بُلایا اور خود نو بجے کے بجائے دس بجے آئے۔ اسی طرح وہ مجھے اکثر پریشان کرتے ہیں۔ یا جب کبھی اُن کا کوئی دوست آجائے تو عین اسی وقت انہیں کوئی بھولا بسرا کام یاد آجاتا ہے اور وہ ہمیں چھوڑ کر اِدھر اُدھر چلے جاتے ہیں۔" اور پھر اُس نے شرم سے یا خدا جانے غصہ سے لال ہو کر کہا۔ . . "پھر وہ پردوں کے پیچھے چھُپ چھُپ کر ہمیں دیکھتے ہیں۔"

"جب میں نے یہ سُنا" حامد نے ایک جھُرجھُری لیکر کہا "تو میری نگاہ بے اختیار پردے کی طرف اُٹھ گئی۔ اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے پہلی مرتبہ میں نے زندگی کے بھید کو عریاں دیکھا ہو۔ جیسے خوشی اور غم کا راز میں نے پالیا ہو۔ جیسے زندگی تو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ . . . اور خدا جانے کتنی دیر میں یوں بھونچکا سا بیٹھا رہا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ وہ بیگم میری طرف حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

مجھے مخاطب دیکھ کر اُس نے مُسکرانے کی کوشش کی۔ "اور تو کوئی بات نہیں؟" اُس نے گھبراتے ہوئے کہا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میں کیا تھا اور کہاں کا اور وہ بیگم کون تھی۔

"ہاں معاف کرنا" میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا "میں سب بات سمجھ گیا ہوں میں آپ کو اپنی تشخیص کل لکھ کر بھیج دوں گا۔"

"ایک منٹ کی اجازت دیجئے" یہ کہکر مَیں اُٹھ بیٹھا اور کسی بہانے پردے کے پیچھے چلا گیا۔ اور صاحبان میں نے کیا دیکھا . . .

ڈاکٹر خاموش ہوگیا۔

آرام کرسی میں پڑا میرا مریض گہری نیند سو رہا تھا۔ اُسکے کوٹ کے بٹن کھُلے تھے اور قمیص کا گلا ڈھیلا تھا۔ اور انتہائی خوشی یا کرب کے بعد جو تھکن سی ہو جاتی ہے وہ اُس کے چہرے پر عیاں تھی۔ یعنی یوں سمجھ لیجئے جیسے کوئی بچّہ جو کسی کھلونے کیلئے رو رو کر اپنا آپ بے حال کرلے۔ اور پھر جب اُسے کھلونا مِل جائے تو وہ سسکیاں بھرتا ہوا اطمینان سے سو جاتا ہے۔ مگر نیند میں بھی اُس کے ہونٹوں پر ایک سسکی قائم رہتی ہے۔ کرب بھری یا انتہائے خوشی بھری سسکی۔ اور اُس کے ہاتھ میں جو کرسی سے نیچے لٹک رہا تھا وہی پتھر کا کتا تھا۔ جو شاید اُس نے وہاں انگیٹھی سے اُٹھالیا ہوگا۔

"مگر ڈاکٹر صاحب" حمید نے خاموشی کو توڑتے ہوئے اور کالر ڈھیلا کرتے ہوئے بے اختیارانہ پوچھا: "تو کیا وہ بیگم پھر کبھی آپکے مطب میں نہ آئی۔"

مگر ڈاکٹر خاموش تھا جیسے وہ لیمپ کے شُعلے میں کسی اور دُنیا کو دیکھ رہا ہو اور اُس کے ہونٹ یوں ہل رہے تھے جیسے وہ کہہ رہا ہو۔ زندگی کا بھید۔

"ممتاز مُفتی"

ایک وادی سے گذرتے ہوئے

یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں
یہاں کی خاک تھی اے دوست رنگیں سبزہ زاروں میں
یہاں چاندی کھنکتی تھی پگھلتے آبشاروں میں
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

وہ خود رو پھول، وہ رنگیں زمیں کے خوشنما تارے
وہ سبزے کی لہکتی موج پر خوشبو کے گہوارے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

وہ پہلی تتلیاں مصروف تھیں رنگین کھیلوں میں
نظر سے کوئی اوجھل جھولتا رہتا تھا بیلوں میں
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

افق کے نیل میں وہ سرخ اودی ابر کے ٹکڑے
سجے تھے دیویوں نے ہر کنول کی ناند میں مکھڑے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

ہوا گنجان جھاڑی میں انوکھے گیت گاتی تھی
یہاں شاداب کنجوں میں محبت مسکراتی تھی
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

ترانے پھوٹتی کرنوں پہ جھرنے گنگناتے تھے
کہ کچی سنے پہ چرواہے پہاڑی گیت گاتے تھے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

وہ جھرنے کے کنارے اک طرف اتری ہوئی قازیں
بطوں کا شور، سارس کی صدا، موروں کی آوازیں
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

جھلکتے تال میں تیرے ہوئے چاندی کے پتھر سے
وہ کاہی پر مچلتی اوس کے رنگین گوہر سے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

وہ پانی کے کنارے دوب کے ریشوں کا ہلکا نم
کسی نے دور تک قینچی سے کترا تھا ہرا ریشم
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

ہواؤں میں ٹھٹھرے تال پر بنسی بجاتے تھے
ہرے پودے اشارے سے کنارے پر بلاتے تھے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

یہاں بڑھ بڑھ کے گھٹتی تھی دھڑکتے دل کی بیتابی
یہاں پیاسی نظر کو سیر کر دیتی تھی شادابی
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

بہت سے جانے والے اس گھنے جنگل میں کھو جاتے
تھکے ماندے مسافر آ کے اس وادی میں سو جاتے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

یہیں ہم نے محبت کے حسیں جادو جگائے تھے
انہیں شادابیوں میں دل کے غنچے مسکرائے تھے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

ہم اکثر گھاس پر سائے میں لیٹے گیت گاتے تھے
کبھی کچھ گنگناتے تھے، کبھی کچھ گنگناتے تھے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

شرارت سے کبھی "وہ" جھاڑیوں میں جا کے چھپ جاتی
کہیں کوئل کی لے گاتی، کہیں شاما کی دھن گاتی
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

کبھی ہم گھومتے پھرتے تھے اونچے سبز ٹیلوں پر
زمرد سا بہا کرتا تھا میدانوں میں جھیلوں پر
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

کبھی ہم تال کے پانی میں کنکر پھینکتے رہتے
چمکتے آئینہ میں دائرے پر دائرے بہتے
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

وہ قصہ اس کے منہ سے ہیلن کی سچی محبت کا
وہ لہروں میں مسرت سی، وہ موجوں میں تبسم سا
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

محبت ہلکی ہلکی آنچ دونوں کو پلاتی تھی
کوئی دیوی شفق میں منہ چھپائے مسکراتی تھی
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

نہ اب نغمے ہیں ڈالوں پر، نہ اب خوشبو ہی خاروں میں
بس اک دکھتے ہوئے دل کی صدا ہی آبشاروں میں
یہ وادی کس قدر سرسبز تھی اگلی بہاروں میں

جان نثار اختر (علیگ)

بربادِ تمنّا

شکار کے موسم کا آغاز تھا۔ اس کی خوشی میں مارکوئس دو برتراں کے ہاں پُرتکلف دعوت تھی۔ گیارہ شکاری آٹھ لیڈیاں اور مقامی ڈاکٹر شرکت کر رہے تھے۔ کھانے کا کمرہ دُلہن بنا ہوا تھا۔ میز پر انواع و اقسام کے کھانے اور پھل چُنے ہوئے تھے اور اس کے گرد خوش فعل لوگ بیٹھے خوش گپیاں کرتے ہوئے مصروفِ طعام تھے۔ کھانا قریب الاختتام تھا کہ گفتگو کا موضوع محبت سے بدل گیا اور اس ابدی مسئلہ پر زور شور سے بحث ہونے لگی کہ آیا کوئی شخص زندگی میں سچی محبت صرف ایک ہی دفعہ کر سکتا ہے یا بار بار۔ ایسے لوگوں کی مثالیں پیش کی گئیں جنہوں نے زندگی میں صرف ایک ہی مرتبہ محبت کی ہے اور ایسے لوگوں کی مثالیں بھی پیش کی گئیں جو بار بار عاشق ہوئے اور ہر بار سچے جوش اور حقیقی خروش کا ثبوت دیا۔ بہرحال مرد ثابت کرنا چاہتے تھے کہ عشق ایک مرض کی طرح ایک ہی شخص کو بار بار اپنا شکار بنا سکتا ہے اور اس کے راستہ میں روڑہ اٹکانے پر خطرناک صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔

اس کا جواب عورتوں کے پاس کچھ نہ تھا۔ ان کے نظریہ کی بنا تخیل پر تھی تجربہ پر نہیں۔ ان کو اصرار تھا کہ محبت، حقیقی اور بہشتی محبت صرف ایک ہی دفعہ ابن آدم کے قلبوں کو مسخر کرتی ہے۔ یہ ایک بجلی کی طرح انسان کے خرمنِ دل پر گرتی ہے اور اُس کی ہستی کو مٹا دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے جس کی گرفت میں آ کر انسان دوبارہ محبت تو درکنار اس کا خیال تک کرنے سے معذور رہتا ہے۔ مارکوئس دو برتراں میدانِ محبت کا جانباز شہسوار تھا۔ اس نے اس کی پُرزور تردید کی۔

"یقین کیجئے ایک شخص دل وجان سے متعدد بار محبت کر سکتا ہے۔ آپ اپنے اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے کہ انسان زندگی میں ایک ہی مرتبہ محبت، حقیقی محبت سے آشنا ہوتا ہے ایسے لوگوں کی مثالیں پیش کر رہی ہیں جنہوں نے کوچۂ عشق میں اپنے کو فنا کر دیا۔ قُربانگاہِ عشق پر اپنے کو بھینٹ چڑھایا۔ مگر میں کہتا ہوں یہ اُن کی حماقت تھی۔ وہ بُزدل تھے اور موت ہی کے قابل تھے۔ مرکر انہوں نے اپنے کو عشق کے مکرر حملے سے بچالیا۔ اگر وہ اس سفلہ پن سے اپنی زندگی کا خاتمہ نہ کرتے تو زمانہ کی رفتار کے ساتھ وہ پھر محبت کرنے کے قابل ہو جاتے، محبت کرتے اور محبت ہی میں مر مٹتے۔ عاشق شرابی کی طرح ہے، ایک دفعہ جس نے پی ہے وہ دوبارہ ضرور پیئے گا۔ ایک دفعہ جس نے محبت کی ہے وہ دوبارہ ضرور کرے گا۔ محبت ایک طبیعی مسئلہ ہے"۔

آخر کار سب نے اس کا فیصلہ ڈاکٹر پر چھوڑا۔ ڈاکٹر پیرس میں پریکٹس کرتا تھا مگر اب وہاں کی پریکٹس چھوڑ کر دیہات میں مقیم ہو گیا تھا۔ سب نے التماس کی کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرے مگر وہ کوئی رائے قائم کرنے سے قاصر تھا۔

"جیسا کہ مارکوئس نے فرمایا ہے یہ ایک طبیعی مسئلہ ہے۔ میں ایک محبت کرنے والی ہستی کو جانتا ہوں جو پچپن سال تک بغیر کسی تغیر کے محبت کرتی رہی اور جس کا انجام موت پر ہوا"۔

لیڈی برتراں خوشی سے اُچھل پڑیں۔

"آہا کس قدر دلکش، کس درجہ کیف انگیز خواب ہے ایسی محبت کی زندگی۔ پچپن سال کسی کی سچی، پُرخلوص، جنوں انگیز محبت کا مرکز بنے رہنا۔ کیسی بہشتی اس کی زندگی تھی اور کتنا خوش نصیب تھا وہ شخص"۔

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔

"محترمہ آپ کا خیال ایک حد تک درست ہے۔ اس لاثانی محبت کا مالک ایک مرد ہی تھا اور آپ اس کو اچھی طرح جانتی ہیں، وہ "شاکی" ہمارے یہاں کا دواساز ہے۔ اور اس محبت کی ماری عورت سے بھی آپ واقف ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا ہر سال ایک بُڑھیا آپ کے یہاں آیا کرتی تھی۔ وہ ٹوٹی ہوئی کرسیوں کی مرمت کیا کرتی تھی۔ خیر مفصل قصہ سُن لیجئے"۔

یکایک عورتوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ اُن کے خوبصورت بیضاوی چہروں پر نفرت اور حقارت کے آثار نمایاں ہوئے۔ بھلا محبت کو سوسائٹی کی ایسی ذلیل ہستیوں سے کیا سروکار۔

"تین مہینے پہلے کا ذکر ہے"۔ ڈاکٹر کہنے لگا۔ "وہ بُڑھیا دمِ

تو نوکر ہی تھی اور میں پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پہلے ہی روز وہ اس گاؤں میں آئی تھی۔ وہ اپنی گاڑی میں آئی تھی۔ آپ لوگوں کو معلوم ہے یہی گاڑی اس کے گھر تھی۔ اور ایک بڈھا گھوڑا اسکو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا تھا۔ اس کے ساتھ دو بڑے بڑے سیاہ کتے تھے جو اس کے دوست اور محافظ تھے۔ میں جب پہونچا تو پادری آچکا تھا اور مرنے والی کو روحانی تسلّی دے رہا تھا۔ میں اس لئے بلایا گیا تھا کہ مرحومہ کا وصی بنایا جاؤں۔ اپنی وصیت کو اچھی طرح میرے ذہن نشین کرانے کی خاطر غریب نے اپنی داستانِ زندگی سنائی۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ اتنی دردناک اور حیرت انگیز کہانی مجھے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ سُننے کا اتفاق ہوا۔

"اس کے ماں باپ ٹوٹی ہوئی کرسیوں کی مرمت کیا کرتے تھے۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا، اچھی جگہ پر سونا اُسے کبھی نصیب نہیں ہوا۔ چھٹپنے میں وہ چاروں طرف ماری ماری پھرتی تھی، نہایت ہی غلیظ اور بوسیدہ حالت میں رہتی تھی۔ اس کا خاندان گاؤں کے باہر آکر ڈیرا ڈالتا تھا۔ گاڑی سے گھوڑا کھول لیا جاتا تھا اور چرنے کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ کتا سکڑ کر بیٹھ جاتا تھا اور پنجوں پر سر کو رکھکر سونے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ بچی گھاس پر کھیلتی تھی اور درختوں کے سایہ میں بیٹھکر اس کے والدین گاؤں کی پرانی ٹوٹی ہوئی کرسیاں درست کرنے میں لگ جاتے تھے۔ اس پہیوں والے مکان میں فضول باتوں کی گنجائش نہ تھی۔ مختصر طور پر بحث کرکے وہ فیصلہ کر لیتے تھے کہ اس رہ گزر ان میں سے کون گاؤں میں گھر گھر 'کرسیاں بنوا لو' کا نعرہ لگاتا پھرے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے کام میں مشغول ہوجاتے تھے۔ اگر وہ بچی کھیلتے کھیلتے دور نکل جاتی یا گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ دوستی کرنا چاہتی تو اُس کے باپ کی غصیلی آواز اس سے باز پُرس کرتی:

"جلد یہاں آ چڑیل"

اور یہی وہ پیار کے الفاظ تھے جسے اُس نے اپنی زندگی میں سُنے۔ جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو اُسے بھی گاؤں میں مرمت طلب کرسیاں لانے کیلئے بھیجا جانے لگا۔ اب وہ آزاد تھی کہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ دوستی پیدا کر سکے۔ لیکن شومئ قسمت سے دوسرے لڑکوں کے والدین اس کے روادار نہ تھے۔ وہ نہایت ہی بیدردی سے اپنے لڑکوں کو دھمکا کر بلا لیتے:

"آنا نہیں بدمعاش، خبردار جو کبھی پھر آوارہ گردوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا"

چھوٹے لڑکے کبھی کبھی اسکو پتھر مارتے تھے۔ عورتیں کبھی کبھی اُسے ایک آدھ پیسہ دے دیا کرتی تھیں جسے وہ نہایت احتیاط سے جمع کرتی تھی۔

جب وہ گیارہ سال کی تھی اُس کے خاندان نے اس گاؤں کے کنارے پر ڈیرا ڈالا۔ ایک روز قبرستان کے پیچھے اُسنے "شاکی" کو روتے پایا۔ وہ اس لئے رو رہا تھا کہ اس کے کسی ساتھی نے اُس کے دو پیسے چھین لئے تھے۔ اس چھوٹے شہری کے آنسوؤں نے اس ننھی خانہ بدوش کو بیقرار کر دیا۔ اس کا معصوم، ننھا دل یہی جانتا تھا کہ شہر کے بچے ہر وقت خوشی اور شادمانی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ اس کے پاس گئی اور اس کی مصیبت کا راز معلوم کرکے اپنا اندوختہ سب اس کے حوالہ کر دیا۔ یہ کل سات "سُو" تھے۔ شاکی نے اُسے بغیر چون و چرا کے لے لیا اور آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ خوشی سے بیتاب ہوگئی۔ یہانتک کہ اُس نے "شاکی" کا منہ چوم لیا۔ یہ دیکھکر کہ اُس نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور نہ ناراض ہوا اُس نے اُسکے گلے میں بانہیں ڈالدیں اور اُسکو دیوانہ وار پیار کرنے لگی۔ پھر یکایک چھوڑ کر بھاگ گئی۔

کیا خیال اس غریب کے دماغ میں آگیا تھا؟ وہ کونسی کشش تھی جس نے اُسے لڑکے کی طرف کھینچا؟ کیا یہ اس لئے تھا کہ اُسنے اپنی ننھی سی عمر کی کمائی اس کے حوالہ کردی تھی یا اس لئے کہ یہ اسکی محبت کا پہلا بوسہ تھا؟ یہ ایک معمہ ہے سب کیلئے، بچوں کیلئے بھی اور جوانوں کیلئے بھی۔

دوبارہ جب وہ آئی تو اس کے پاس دو فرانک تھے۔ مگر وہ "شاکی" کی صرف ایک جھلک دیکھنے پائی۔ وہ اپنے باپ کی دوا کی دوکان پر بیٹھا ہوا تھا اور بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ دوکان پر طرح طرح کی چھوٹی بڑی رنگین شیشیاں اور بوتلیں قرینے سے چنی تھیں۔ اس کی آنکھیں چُندھیا گئیں اور اس لئے وہ اُسے اور زیادہ چاہنے لگی۔ اس کی یاد اس کے دل سے کبھی محو نہیں ہوتی تھی۔ دوسرے سال وہ اس کے سکول میں "شاکی" سے ملی۔ وہ لٹو کھیل رہا تھا۔ وہ اس پر جھپٹی، اسے سینہ سے چمٹا لیا اور بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگی۔ شاکی ہیبت سے چیخنے لگا۔ اس کو تسلی دینے کیلئے اُس نے اُسے اپنی پوری دولت دیدی جو تین فرانک

چار سُو تھے۔ شاکی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُس نے اِس ہدیۂ اُلفت کو قبول کیا اور اس کے عوض میں اجازت دیدی کہ وہ جی بھر کے اُسے پیار کرلے۔

اس واقعہ کے بعد چار برس تک وہ برابر اپنا سرمایہ شاکی کی نذر کرجاتی تھی اور وہ بھی نہایت دریا دلی کے ساتھ اُسے پیار کرنے دیتا تھا۔ مزہ کا لین دین تھا۔ کبھی بازار مندہ ہونے کی وجہ سے دس بارہ سُو ہوتے تھے تو وہ شرم سے رونے لگتی تھی اور کبھی چار پانچ فرانک ہوتے تھے تو وہ خوشی سے قہقہہ لگانے لگتا تھا۔

وہ اس کا تخیل بنا ہوا تھا۔ وہ خود بھی اب اس کی آمد کا بیچینی سے انتظار کیا کرتا تھا اور اسکو دیکھتے ہی دوڑا دوڑا آتا تھا جس سے وہ عجیب مسرت سی محسوس کرتی تھی، اس کا دل بلّیوں اُچھلنے لگتا تھا۔

اس کے بعد اچانک وہ ایک روز غائب ہوگیا۔ غریب لڑکی کی دُنیا گویا تاریک ہوگئی۔ بڑی جانفشانی سے اُس نے پتہ لگایا کہ وہ اسکول بھیجدیا گیا ہے۔ بڑی کدو کاوش کے بعد اُسنے اپنے والدین کو راضی کیا کہ وہ ہر تعطیل میں یہاں پر آیا کریں۔ اسی طرح ایک زمانہ گزر گیا اور وہ اُس کے دیدار سے محروم رہی۔ دو برس بعد اُس نے پھر اُسے دیکھا۔ وہ بمشکل اُسے پہچان سکی۔ نام خُدا اب وہ جوان تھا اور سونے کے بٹنوں والی جاکٹ میں نہایت شاندار معلوم ہورہا تھا۔ وہ اس غریب کے سامنے سے تنکر گذر گیا گویا کبھی کی جان پہچان ہی نہ تھی۔ دو روز تک وہ روتی رہی۔ اور یہ آغاز تھا اسکی نہ ختم ہونے والی مصیبت کا۔

ہر سال وہ لوٹ آتی تھی۔ وہ راستہ میں اُس کے سامنے سے گذر جاتی تھی۔ اُسے ہمت نہ پڑتی تھی کہ اُس سے ہمکلام ہو۔ اسکی محبت دیوانگی کی حد تک پہونچ چکی تھی۔

"ڈاکٹر!" اُس نے مجھ سے کہا تھا "دُنیا میں وہی ایک آدمی ہے جس کی طرف میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا ہے۔ مجھے اتنی خبر بھی مشکل سے ہے کہ اسکے علاوہ بھی دُنیا میں مرد ہیں۔"

اس کے والدین کے مرنے کے بعد بھی اُس نے اُنکے پیشہ کو جاری رکھا۔ اب اُس نے بجائے ایک کے دو کتے پال رکھے تھے۔ یہ بڑے خونخوار تھے اور کسی کو پاس پھٹکنے نہ دیتے تھے۔ ایک روز جبکہ وہ اس چھوٹے سے قصبہ میں جہاں اس کا دل پھنسا ہوا تھا آئی اُس نے دیکھا کہ ایک نوجوان عورت "شاکی" کا ہاتھ پکڑے دواساز کی دوکان سے نکلی۔ وہ اُس کی بیوی تھی "شاکی" کی شادی ہوچکی تھی۔

اسی شام کو ٹاؤن ہال کے تالاب میں وہ کُود پڑی۔ ایک مسافر اتفاقاً آنکلا۔ اُسے تالاب سے نکالا اور دواساز کی دُکان پر لے گیا۔ شاکی شب خوابی کے لباس میں نیچے اتر آیا۔ اُس نے تجاہل عارفانہ کے ساتھ اس کا علاج کرتے ہوئے نہایت ہی کرخت لہجے میں کہا:۔

"کیا سٹرن ہوگئی ہے۔ یہ کیا واہیات ہے؟"

اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ خیر اُس نے بات تو کی۔ اس تصوّر ہی نے اُسے بہت دنوں تک خوش رکھا۔ اُس نے بہت کچھ کہا سُنا مگر "شاکی" نے معاوضہ لینے سے قطعی انکار کردیا۔

غرض اسی طرح اُس کی زندگی گذرتی گئی۔ اُس کے ہاتھ کرسیاں دُرست کرتے تھے اور اس کا دل تصوّرِ جانانہ میں کھو جاتا تھا۔ اس کی دوکان کی کھڑکیوں سے وہ ہر سال اسکو دیکھتی تھی۔ اس نے اس سے معمولی دوائیں خریدنی شروع کیں۔ اسی طرح وہ اس کے نزدیک ہوتی تھی، اس سے بات چیت کرتی تھی اور پہلے کی طرح اُسے پیسے دیتی تھی۔

جیسا کہ میں بیان کرچکا ہوں وہ اسی بہار میں مری ہے۔ اس المناک قصہ بیان کرنے کے بعد اُس نے مجھ سے التجا کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی عمر بھر کی کمائی میں اُس شخص کے حوالے کردوں جس سے وہ کمال وفاشعاری کے ساتھ محبت کرتی رہی ہے۔ صرف اسی کیلئے وہ محنت کرتی تھی، اُس نے کہا تھا خود فاقہ تک کئے مگر اپنے جیب کے لئے روپیہ جمع کرتی رہی۔ صرف اس اُمید پر کہ مرنے کے بعد تو کم از کم ایک دفعہ وہ اس حرماں نصیب کو یاد کرے گا۔ اس کے بعد اُس نے مجھے دو ہزار تین سو ستائیس فرانک دئے۔ ستائیس فرانک تو میں نے اُس کے کفن دفن کیلئے رکھ چھوڑا اور باقی رقم اس کے مرتے ہی لیکر چلا آیا۔

دوسرے روز میں "شاکی" سے ملنے گیا۔ میاں بیوی ناشتہ پر تھے۔ گول مول موٹا تازہ جوڑا تھا اور اپنی رفتارِ زندگی سے خوش۔ اُنہوں نے مجھ سے بھی ناشتہ میں شریک ہونے کی خواہش کی میں بھی شامل ہوگیا۔ ناشتہ کے بعد میں نے نہایت ہی دردناک لہجہ میں اپنی کہانی شروع کی۔ میں اُمید کررہا تھا کہ وہ رو پڑینگے۔

مگر جیسے ہی اُسے معلوم ہوا کہ ایک ذلیل ٹوٹی کرسیاں دُرست کرنے والی عورت اس سے محبت کرتی تھی، انتہائی غیظ و غضب سے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس غریب کی محبت نے "شاکی" کی عزت پر بٹا لگا دیا ہے، عزت جو اسے اپنی زندگی سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ اُس کی بیوی بھی غصہ سے سُرخ ہوگئی۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی،

"وہی فقیرنی، وہی بڑھیا قطامہ"

شاکی غصہ سے بیتاب ہو رہا تھا۔ اس کی ٹوپی سر سے گر چکی تھی۔

"ڈاکٹر، ایسی بات بھی تم نے کبھی سُنی، غضب خُدا کا مجھے اس سے کیا سروکار۔ اگر میں اس کے جیتے جی اس حال سے آگاہ ہوتا تو ضرور اُسے جیل خانہ بھجواتا جہاں اُس کی زندگی کے دن پورے ہوتے۔ قسم خُدا کی"

میں احمق بنا کھڑا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ مگر مجھکو اپنا فرض ادا کرنا تھا۔ میں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"مرحومہ وصیت کر گئی ہے کہ میں اس کا جمع کردہ دو ہزار تین سو فرانک آپکے حوالے کروں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ اس کی کہانی نے آپ لوگوں کو بیحد رنج و صدمہ پہونچایا ہے، اس لئے میرے خیال میں اس رقم کو خیرات کر دینا ہی بہتر ہوگا"

حیرت سے اُن کی زبان گنگ ہوگئی۔ اور وہ بیوقوں کی طرح مجھے تکنے لگے۔ میں نے جیب سے روپیہ نکال کر پوچھا۔

"اب آپ کی کیا رائے ہے"

شاکی کی بیوی نے سکوت کو توڑا۔

"خیر، ایک مرنے والی کی وصیت ہے۔ کیا کیا جائے"

اس کے شوہر نے خفت کے ساتھ کہا:۔

"ہم یہ روپیہ بچوں کی بھلائی کیلئے خرچ کرینگے"

"جیسی آپ کی مرضی" میں نے روکھے پن سے کہا۔

"بہت خوب۔ مناسب یہی ہے کہ مرحومہ کی وصیت کے مطابق آپ وہ روپیہ ہمیں دیدیں۔ کسی کارِ خیر میں خرچ کرنے کا موقعہ ہم نکال لیں گے"

میں نے روپیہ اُنکے حوالے کیا اور رخصت ہو کر چلا آیا۔

دوسرے روز شاکی پھر میرے پاس آیا اور بغیر کسی تمہید کے کہنے لگا:۔ "مرحومہ کی گاڑی بھی تو ہے۔ آپ اُس کا کیا کرنا چاہتے ہیں"

"کچھ نہیں، آپ کا جی چاہے تو لے جائیے"

"خوب، اس سے مرغیوں کیلئے ڈربہ بن جائیگا"

جب وہ جا رہا تھا میں نے اُسے آواز دی۔

"مرحومہ ایک بڈھا گھوڑا اور دو کتے بھی چھوڑ گئی ہے"

حیرت سے وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

پناہ بخدا، وہ میرے کس کام کے، آپ انہیں اپنے تصرف میں لائیں"

وہ ہنسا پھر ہم لوگوں نے ہاتھ ملایا۔ آخر دیہات میں ڈاکٹر اور دوا ساز کی دوستی ایک ضروری شئے ہے نا۔

کتے میرے پاس ہیں، گھوڑا پادری کے پاس۔ گاڑی مرغیوں کا ڈربہ اور روپے سے "شاکی" نے ریلوے کمپنی کا حصہ خریدا ہے۔

"سچی محبت کی یہی ایک نظیر میرے پاس ہے"

ڈاکٹر خاموش ہوگیا۔ لیڈی برتران نے ایک لمبی سانس لی۔ پھر پُرنم آنکھوں سے کہا۔

"اِس سے یہی ثابت ہوتا ہے نا کہ محبت کرنا عورت ہی جانتی ہے"

(موپاساں)

پروین

موسم سرما کی ایک رات جبکہ کائنات پر سناٹا طاری تھا، ہوا تیزی سے چل رہی تھی، پروین ڈرائنگ روم میں آتشدان کے قریب پاؤں رکھے ایک صوفہ پر نیم دراز تھی۔ کمرے کے دروازے بند تھے۔ باہر سے ہوا کی سائیں سائیں کی آواز آرہی تھی۔ دیوار پر لگے ہوئے گھنٹے کی ٹک ٹک اور آتشدان کی جلتی ہوئی لکڑیوں کی چر چراہٹ کی آواز ایک عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔

یکایک پروین نے ہاتھ بڑھا کر سامنے کارنس پر سے ایک نیلے رنگ کا لفافہ اٹھا لیا اور خود بخود کہنے لگی: "جب سے یہ خط آیا ہے نہ معلوم میرا دل کیوں اس قدر بے چین ہے۔ افسوس غریب کامنی کو شادی کا بڑا تلخ تجربہ ہوا۔ کیسی تعجب کی بات ہے کہ شادی سے پہلے تو شیام اس سے اتنی محبت کرتا تھا لیکن یہ محبت چھ مہینے تک بھی قائم نہ رہی! افسوس اب وہ کامنی کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا بلکہ کئی کئی دن تک گھر بھی نہیں آتا۔ مجھے کامنی سے دلی ہمدردی ہے!!! کامنی لکھتی ہے کہ شادی ایک عذاب ہے... ممکن ہے اس کے لئے ایسی ہو۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں تو اس معاملہ میں بڑی ہی خوش قسمت ہوں۔ میری شادی شدہ زندگی کس قدر خوشگوار ہے۔ رضا میرا پرستار ہے... مجھ پر جان قربان کرنے کو تیار ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے... بہت ہی سخت محبت ــــ یہ میں اس کی آنکھوں میں پڑھ سکتی ہوں ــــ اس کے چہرے پر مرتسم دیکھتی ہوں۔ اور میں !!! میری تمام خواب، میری تمام امیدیں اس میں مجسم ہیں۔ وہی میری تمام دنیا ہے۔ میری زندگی کا ہر نفس رضا ہی کے نام سے شروع اور رضا ہی کے نام پر ختم ہوتا ہے۔ میرا رواں رواں اس سے محبت کرتا ہے۔ کامنی کے لئے شادی عذاب ثابت ہوئی مگر میرے لئے تو خوشیوں کی جنت ہے۔ اگر میری شادی نہ ہوتی تو مجھے میرا رضا اور رضا کی پیاری محبت کہاں نصیب ہوتی۔ ہم ایک دوسرے کی محبت میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہر آنے والا دن ہمارے لئے محبت کی ایک کڑی بن کر آتا ہے اور ہمیں ایک دوسرے کے قریب تر کر دیتا ہے۔ ہمارا گھر خوشیوں کا گہوارہ ہے۔ ایک چھوٹی سی پریم نگری ہے۔ لیکن اگر کبھی شیام کی طرح رضا نے بھی میرے ساتھ بیوفائی کی؟" ــــ اس خیال ہی سے پروین کو پھریری آگئی ــــ "نہیں!! مجھے ایسے وہم کو دل میں بھی جگہ نہ دینی چاہیئے... یہ ناممکن ہے۔ رضا کی محبت سچی ہے۔ اس کی ہر بات صداقت اور خلوص سے بھری ہوتی ہے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہوا؟ اُف رضا کی بے اعتنائی ــــ بس میرے لئے موت کا پیغام ہوگی۔ رضا کی محبت کے بغیر زندگی بے معنی اور بیکار ہوگی ــــ توبہ توبہ میں بھی کیسی باتیں سوچنے لگتی ہوں مجھے شرم آنی چاہیئے کہ میں اپنے رضا کے متعلق ایسے وہم دل میں لا رہی ہوں۔ سنگدل شیام کی بیوفائی نے میری پیاری سہیلی کامنی کا دل توڑ دیا۔ اس کی زندگی برباد کر دی۔ محبت کا رشتہ قائم کر کے بے اعتنائی کرنا کتنا سخت جرم ہے، کتنا بڑا گناہ ہے۔ افسوس بیچاری کامنی کو کیا خبر تھی کہ شیام کی محبت محض جھوٹی محبت ہے جو شادی کے ساتھ ختم ہو جائیگی۔"

گھنٹے نے ٹن ٹن گیارہ بجائے۔ پروین کے خیالات کا طلسم ٹوٹا۔ وہ ایک دم چونک پڑی۔ "اُفوہ گیارہ بج گئے اب تک رضا واپس نہیں آئے۔ کرنیل قریشی کے یہاں کا ڈنر بھی ایک مصیبت ہوتا ہے۔ بارہ بجے سے پہلے کبھی ختم نہیں ہوتا۔ کرنیل عجیب باتونی انسان واقع ہوا ہے۔ کوئی اس کے گھر چلا جائے بس پھر واپس ہی نہیں آنے دیتا۔ ڈنر کے بعد برج شروع ہو گیا ہوگا۔ دین دنیا کی خبر کسے ہوگی، کھیل میں وقت کا اندازہ تو ہوتا ہی نہیں۔"

پروین یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور رضا اندر داخل ہوا۔

"ارے پروین اب تک جاگ رہی ہو؟" رضا نے حیرت سے دریافت کیا۔

پروین: جی ہاں، آپ کا بھی ڈنر ختم ہوا یا نہیں، گیارہ بجے ہیں اسوقت کچھ معلوم ہے؟"

رضا: پروین یہ کرنیل عجیب ضدی اور بکواسی شخص ہے۔ ڈنر کے بعد زبردستی ٹھیرا لیا کہ ایک بازی برج کی کھیل لو۔ میں نے کہا بھی کہ نہیں مجھے نیند آرہی ہے تو کہنے لگا کہ نہیں کل اتوار ہے صبح اُٹھنے کی ضرورت

نہیں ہے صبح دس بجے تک سو کر اس وقت کی کمی کو پورا کر لینا آج تو گولڈن نائٹ ہے برج ضرور کھیلنا پڑے گا۔ اس لئے مجبوراً ٹھہرنا پڑا۔ تم نے فضول انتظار کی تکلیف اٹھائی تم سو گئی ہوتیں"

"میں کیوں سو گئی ہوتی، ایسا ہی خیال تھا تو آپ ہی ذرا پہلے کیوں نہ آ گئے" پروین نے ایک انداز سے گردن اٹھا کر کہا۔

"دیکھو نا پروین" رضا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا "کبھی کبھی دیر ہو جاتی ہے تم تو اتنی اتنی سی باتوں پر خفا ہو جاتی ہو"

پروین:۔ خفا کون ہو رہا ہے"

رضا:۔ تم اور کون۔

پروین:۔ میں تو خفا نہیں ہوں۔

رضا:۔ اچھا اگر خفا نہیں تو مسکرا دو"

پروین شرما کر ہنسنے لگی وہ دل ہی دل میں اپنی فتح محسوس کر رہی تھی اور اس پر نازاں تھی۔ پروین صوفہ سے اٹھ کھڑی ہوئی وہ دونوں چلتے چلتے ڈرائنگ روم کی کھڑکی تک چلے گئے۔ "رضا! دیکھو چاند کتنا خوبصورت معلوم ہو رہا ہے" پروین نے ایک انداز دلربائی سے کہا۔

"لیکن میرا چاند تو اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہے" رضا نے محبت بھری نظروں سے پروین کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ پروین شرما گئی۔

پروین:۔ رضا کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟۔

رضا:۔ خوب، کیا میری محبت کا ابتک یقین نہیں؟ کیا ڈنر سے دیر میں آنے سے میری محبت کے متعلق شبہات پیدا ہو گئے؟۔

پروین:۔ (ہنس کر) نہیں رضا یہ بات بالکل نہیں میں تو ویسے ہی معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ میرا رضا مجھے کتنا چاہتا ہے۔

رضا:۔ اچھا اگر یہ بات ہے تو سنو کہ تمہارا رضا صرف تم سے محبت ہی نہیں کرتا بلکہ اسے تو تم سے عشق ہے!! وہ تمہارا پجاری ہے۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے تم اس کے دل میں ہر وقت بسی رہتی ہو، اس کی روح میں سمائی ہوئی ہو اور تمہیں اس کی تمناؤں اور امیدوں کا مرکز ہو۔

پروین:۔ اچھا رضا! ایک بات اور بتا دو۔ کیا تم مجھے ہمیشہ ہی اتنا چاہتے رہو گے؟۔

رضا:۔ کبھی نہیں پروین میں ہمیشہ تم کو اتنا ہی نہیں چاہتا رہونگا کیونکہ مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر روز تمہاری محبت دوگنی بڑھتی جا رہی ہے۔

یہ سنکر پروین کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں "اگر ایسا ہے تو میں بڑی خوش قسمت ہوں" اس نے خوش ہوتے ہوئے جواب دیا۔

رضا:۔ پروین، تمہارے دو سوالوں کا جواب میں نے دیا اب میں بھی تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔

پروین:۔ وہ کیا؟۔

رضا:۔ وہ یہ کہ آج تم نے اس قسم کے سوال کیوں پوچھے؟۔

پروین:۔ (مسکرا کر) وجہ یہ ہے رضا کہ میری سہیلی کامنی کا شوہر شیام شادی سے پہلے اس کو بہت چاہتا تھا لیکن چھ مہینے ہی میں اس کی تمام محبت ختم ہو گئی۔ آج کامنی کا ایک درد بھرا خط میرے پاس آیا ہے۔ مجھے بھی اپنے متعلق وہم آنے لگا اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ یہ سوالات پوچھ کر اپنی دلجمعی کر لوں"

"اب آپ کی دلجمعی ہو گئی؟" رضا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

پروین:۔ ہاں ہو گئی! تم جانتے ہو رضا میں تمہاری ہر بات کا یقین کر لیتی ہوں۔ کیونکہ تم مجھ سے ہمیشہ سچ بولتے ہو لیکن اگر خدا نہ کرے کبھی تم نے بے اعتنائی کی تو وہ میری موت کا پیغام ہو گی۔

رضا نے پروین کا منہ اپنے ہاتھ سے بند کر دیا "ایسی اول فول باتیں مت کرو پروین"

پروین:۔ رضا یہ آج اتوار کو صبح ہی صبح کہاں جانے کی تیاری ہو رہی ہے؟۔

رضا:۔ پروین، میں رات کرنیل قریشی اور مسٹر مکرجی سے شکار کو جانے کا وعدہ کر آیا ہوں۔ مسز مکرجی اور مسز قریشی بھی ساتھ جائینگی تم بھی چلو"

پروین:۔ نہیں رضا میری طبیعت اچھی نہیں ہے ورنہ ضرور چلتی"

رضا:۔ (پریشان ہوتے ہوئے) ہائیں، کیا تمہاری طبیعت خراب ہے؟ کیا حرارت ہے؟ دیکھوں نبض!!! بخار تو معلوم ہوتا ہے!!! پھر؟ ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر دوں؟ میں بھی اب شکار کو نہیں جاتا۔

پروین:۔ اتنے پریشان مت ہو میرے رضا۔ میرے سر میں خفیف سا درد ہے۔ ڈاکٹر کو فون کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے تم شکار کو چلے جاؤ۔

رضا: پروین تمہاری تو طبیعت ٹھیک نہیں اور میں شکار کو چلا جاؤں؟ چلو چل کر لیٹ جاؤ۔

پروین: رضا میں بالکل ٹھیک ہوں گھبراؤ نہیں صرف سر میں ذرا درد ہے تم شکار سے کیوں رکتے ہو جب وعدہ کر آئے ہو تو چلے جاؤ میں تمہیں اجازت دیتی ہوں۔

رضا: اچھا تم کہتی ہو تو خیر۔

رات کے آٹھ بج گئے۔ رضا اب تک شکار سے نہ لوٹا تھا۔ پروین محو انتظار تھی۔ وقت کاٹنے کو ایک کتاب لیکر بیٹھی لیکن دل نہ لگا "میرا دل نہ جانے آج کیوں گھبرا رہا ہے خدا رضا کو خیریت سے واپس لائے" پروین نے اپنے دل میں کہا۔

باہر کسی کے چلنے کی آواز آئی "خدا کا شکر رضا آگئے" کہتی ہوئی وہ خوشی سے دوڑتی برآمدہ میں گئی لیکن آنے والا نوجوان رضا نہ تھا بلکہ پروین کا ماموں زاد بھائی ارشد تھا جو کئی سال سے افریقہ گیا ہوا تھا اور اب یہ سُنکر کہ پروین کی شادی ہو گئی ہے اس سے ملنے آیا تھا۔

"ارے بھائی ارشد تم یہاں کہاں؟" پروین نے حیرت انگیز خوشی سے کہا۔

ارشد: بیشک تمہیں مجھے یہاں دیکھکر حیرانی ہوئی ہوگی، میں کوئی پندرہ بیس دن گزرے افریقہ سے واپس آگیا ہوں یہاں آکر میں نے سُنا کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے میں نے کہا لاؤ تم سے بھی ملتا چلوں لیکن اگر تم خفا ہوتی ہو تو میں چلا جاتا ہوں۔

پروین: توبہ ارشد کیسی باتیں کرتے ہو۔ تمہاری شرارتیں کبھی نہیں جائیں گی۔ بھلا خفا ہونے کا کیا ذکر! میں تو انتظار ہی کر رہی تھی۔

اسی وقت رضا کوٹھی میں داخل ہوا۔ پروین کے کمرے میں روشنی دیکھکر اُس کے دل کو ایک گونہ مسرت حاصل ہوئی "میری پروین اب تک جاگ رہی ہے" رضا نے اپنے دل میں کہا "میں پیچھے سے چپکے سے اُس کی آنکھیں بند کر لونگا" یہ سوچکر وہ دبے پاؤں برآمدہ میں گیا۔ کمرے میں سے بولنے چالنے کی آواز آئی۔ رضا سخت حیران ہوا کہ خدایا اس وقت کون ہے جو پروین سے باتیں کر رہا ہے۔ دبے پاؤں دروازے تک گیا۔ صوفہ پر پروین بیٹھی تھی اور اُس کے برابر ایک خوشرو نوجوان!!! رضا خاموشی کے دروازہ سے کان لگا کر سُننے لگا۔ آواز آتی ہے!!!

ارشد: اچھا آپ انتظار کر رہی تھیں؟ کس کا؟ میرا یا رضا کا؟

پروین: (ہنسکر) رضا کا نہیں آپ کا۔

ارشد: بہت بہت شکریہ۔

پروین: رضا شکار کو گئے ہیں میں اس وقت تنہا تھی۔ بڑا اچھا ہوا آپ آگئے۔

رضا یہ جملے سنتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ دماغ میں کسی نے سیسہ پگھلا کر ڈال دیا۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر دروازے سے ہٹ جاتا ہے اور دیوانہ وار برآمدہ میں چلتا ہے دل ہی دل میں بڑبڑاتا ہے:

"اُف خدا میں نے یہ کیا سنا۔ پروین! بے وفا پروین! اگر یہ نوجوان تیری اُمیدوں کا مرکز تھا تو پھر مجھ سے اعترافِ محبت کی کیا ضرورت تھی۔ غیرت کا تقاضہ ہے کہ ابھی بندوق سے تیرا اور اس نوجوان کا خاتمہ کر دوں لیکن محبت کا تقاضہ ہے کہ میں خود جو تمہاری خوشی میں حائل ہوں نکل جاؤں۔ اُف خدا میری زندگی برباد ہو گئی اور اب اس جگہ ایک لمحہ ٹھہرنا بے وقوفی ہے۔ انسان کسی کو مجبور کر کے محبت نہیں پا سکتا۔ خدا حافظ پروین، خدا تمہیں اور اس نوجوان کو خوش رکھے۔"

اپنی جیب میں سے قلم نکالتا ہے اور جلدی سے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر لکھتا ہے:

"پروین — گو کہ تم نے میرے ساتھ بیوفائی کی لیکن میں اب بھی تمہارا ہوں۔ میرا اب انتظار فضول ہے۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟ مجھے خود نہیں معلوم۔ شاید میں اس زندگی سے عاجز آکر اپنی زندگی ختم کر دوں لیکن کہہ نہیں سکتا۔ میری تلاش مت کرنا کیونکہ بے سود ثابت ہوگی۔ تم سے دُور رہکر بھی تمہارا رضا۔"

جلدی سے کاغذ کو تہ کر کے نوکر کو دیدیتا ہے کہ "یہ خط اپنی بیگم صاحبہ کو دیدینا۔ اور میں جا رہا ہوں" یہ کہکر جلدی سے سوٹ کیس اُٹھا کر ایک طرف کو چلدیا۔ نوکر نے خط لے لیا لیکن یہ متر اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ابھی تو آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں پھر بھی۔۔۔ حکم کی تعمیل میں پروین کے کمرے کی طرف جاتا ہے۔

جمن: بیگم صاحب۔

پروین: (ارشد سے مخاطب ہو کر) ارشد آپ تشریف رکھئے، جمن کیا صاحب آگئے؟

جمّن:- جی ہاں صاحب آئے تھے اور چلے بھی گئے۔ یہ پرچہ آپ کو دے گئے ہیں۔"

پروین:- کیسا پرچہ؟ کچھ دماغ خراب ہے یا زیادہ پی گئے ہو۔

جمّن:- حضور گستاخی معاف بالکل صحیح عرض کر رہا ہوں۔

پروین حیران اور کچھ پریشان ہوکر دروازے پر جاتی ہے۔

"کہاں ہے وہ پرچہ ادھر لاؤ۔"

جمّن:- لیجئے حضور۔

پروین نے پرچہ لے لیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ خط بالکل مختصر تھا۔ صرف تین سطریں تھیں۔ لیکن اُف! یہ تین سطریں اُس کے لئے تین ہزار برچھیوں سے کم نہ تھیں بجلی کی طرح اس کی آنکھوں سے گزر گئیں مگر پہلی مرتبہ کچھ نہ سمجھی کہ کیا لکھا ہے دوبارہ پڑھا تو اُس کی خوفناک حقیقت سے خبردار ہوئی پڑھکر آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ دل کی حرکت بند ہونے لگی۔ چہرہ زرد پڑ گیا ایک دردناک چیخ کے ساتھ وہ چکرا کر صوفہ پر گری۔

"ارے! ارے!! یہ تمہیں کیا ہو گیا پروین" ارشد نے اُس کو سنبھالتے ہوئے کہا "اس خط میں کیا لکھا ہے؟" جلدی سے خط پڑھتا ہے۔ "اُف یہ کیا ہو گیا! غضب!! رضا کو کیسی سخت غلط فہمی ہوئی!!! پروین، پروین ہوش میں آؤ میں ابھی رضا کو تلاش کرکے لاتا ہوں، گھبراؤ مت، پروین، پروین"۔ خوشبو سنگھاتا ہے۔

جب پروین کو ہوش آیا تو اُس نے دیوانوں کی طرح چاروں طرف آنکھیں پھیلا کر دیکھا اور نہایت کرب کی حالت میں کہنے لگی "رضا، رضا، میرے رضا، واپس آجاؤ، میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"پروین بے وقوفی کی باتیں نہ کرو رضا ابھی آجائیں گے۔" ارشد نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

پروین:- ہائے اللہ یہ کیا ہو گیا؟ میں تباہ ہو گئی! میرا بنا بنایا گھر ایک لمحہ میں اُجڑ گیا۔ رضا بے وفا نکلا! آہ رضا تم سے یہ اُمید نہ تھی آپنے دیکھا ارشد بھائی میں کتنی بدنصیب ہوں؟۔

پروین اس سے زیادہ نہ بول سکی بلکہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے منہ چھپا کر اُس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد نحیف آواز سے کہا "رضا میرے اُوپر ایک بے سرو پا اتہام لگا کر چلا گیا۔۔۔ بغیر تحقیق کئے ہوئے!!! مگر وہ بے قصور ہے اُسکو غلط فہمی ہوئی!! اُف رضا! نادان رضا!"

ارشد:- پروین میں ابھی ابھی رضا کی تلاش میں جاتا ہوں مگر میں نے تو اُس کو کبھی دیکھا بھی نہیں۔ خیر میں کسی نوکر کو ساتھ لئے جاتا ہوں۔

رات کے گیارہ بجے ارشد، رضا کی تلاش سے ناکام واپس آتا ہے۔ پروین کو روتا دیکھکر کہتا ہے:-

"پروین اس قدر رو رو کر حال تباہ نہ کرو، تم تو بالکل بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ رضا اس وقت نہیں ملے تو کیا ہوا صبح کو ضرور مل جائیں گے۔ اطمینان رکھو۔ میں تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

پروین:- خدا آپ کو اس نیکی کا بدلہ دیگا بھائی۔

جمّن:- بیگم صاحب آج تین دن ہو گئے کہ آپنے بالکل کچھ نہیں کھایا آج تو تھوڑا سا کھا لیجئے۔

پروین:- نہیں جمّن میں کچھ نہیں کھاؤں گی کیا تم کو معلوم نہیں کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔

جمّن:- بیگم صاحب سب کچھ معلوم ہے۔ آپ کی حالت دیکھکر اسقدر رنج ہوتا ہے کہ کیا بتاؤں لیکن حضور جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے پورا ہو کر رہتا ہے۔ خدا کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے آپ اسقدر پریشان کیوں ہوتی ہیں سرکار آجائیں گے۔"

پروین:- میرا دل بیٹھا جاتا ہے، جمّن میرے دل پر جو گزر رہی ہے وہ کوئی نہیں جانتا!!"

جمّن:- اچھا حضور چل کر کچھ تو کھا لیجئے۔ اتنا رنج نہ کیجئے۔

پروین:- نہیں جمّن، میں نے کہہ دیا کہ میں کچھ نہ کھاؤں گی، ارشد صاحب کہاں ہیں؟"

جمّن:- حضور وہ خانساماں کو ساتھ لیکر سرکار کو ڈھونڈنے گئے ہیں ــــ!

پروین منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہے "میرے رضا کو ڈھونڈنے گئے ہیں" یہ کہکر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی ہے۔ جمّن کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا خاموشی سے کمرے سے نکل جاتا ہے۔

رضا جس وقت گھر سے نکلا اس کا دماغ پریشان، دل مضطرب اور نظر تاریک تھی، تاہم وہ اس خوف سے کہ کہیں کوئی اس کا پیچھا کرکے

اُسے گھر واپس نہ لے جائے، وہ جلدی جلدی قدم اُٹھاتا ہوا آبادی سے دُور دریا کے کنارے پہونچ گیا۔ اور ایک پتھر پر سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیٹھ گیا۔ رات تاریک تھی ہوا تیزی سے چل رہی تھی۔ دریا نہایت تاریک نظر آرہا تھا۔ وہ خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ ایک آتشیر آہ اور گہری سانس کے بعد اُس کے ہونٹوں سے ایک نام نکلا پروین! ہوا دریا کی موجوں کو اُٹھا رہی تھی جن میں ایک شور برپا تھا۔ رضا کو معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک موج کہہ رہی ہے "پروین، پروین"!

رضا نے تمام رات اسی پتھر پر بیٹھے بیٹھے گزار دی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اُس کی آنکھ نہ جھپکی۔ صبح ہوتے ہی وہ گھنی جھاڑیوں میں چھُپ کر بیٹھ گیا۔ دوسرا دن بھی اسی بے قراری میں گزر جاتا ہے۔ تیسرے دن آفتاب غروب ہونے کے بعد رضا لوگوں کی نظروں سے بچتا ہوا پھر دریا کے کنارے پر جاتا ہے اور خود بخود کہتا ہے: "میرے لئے اب دُنیا میں کوئی دلچسپی کا سامان باقی نہیں۔ پروین، بیوفا پروین! آہ تُو نے میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ مجھے تباہ کر دیا۔ غارت کر دیا۔ پھر بھی مَیں تیری صورت دیکھنے کے لئے بیچین ہوں، بیقرار ہوں۔ یہ بہتا ہوا دریا مجھے میری مُصیبتوں سے نجات دے گا۔ یہ زندگی موت سے بدتر ہے۔ اِس ذلّت کی زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہوگی۔ کاش میں مرنے سے پہلے تیری صورت دیکھ سکتا۔ لیکن آہ۔ یہ میری آخری آرزو پوری نہیں ہوسکتی۔ یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی اے خوبصورت جھاڑیوں اور اے اِس جنگل کے خوبصورت پھولوں اور درختوں تم اِس بات کے گواہ رہنا کہ مَیں اپنی پروین کے نام پر جان دیتا ہوں۔"

پروین، پروین کہتا ہوا رضا پانی میں کُود پڑا اور موجیں اپنی آغوش پھیلا کر اُس کی طرف بڑھیں۔

ارشد:۔ خانساماں دیکھو سُورج بھی چھُپ گیا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ٹانگیں تھک گئیں مَیں تو اب گھر واپس جاتا ہوں۔ مگر آؤ ذرا دریا کے کنارے اور دیکھتے چلیں۔

خانساماں:۔ بہت اچھا حضور۔

دونوں دریا کے کنارے چلتے ہیں۔ ایک دھماکہ ہوا۔ پانی میں کوئی چیز گری۔ ارشد نے فوراً اس طرف دیکھا۔ ایک انسان کو جو تیرنے سے تقریباً ناواقف معلوم ہوتا تھا، لہریں ہمیشہ کیلئے اپنے آغوش میں لینے والی تھیں۔ ارشد جیسا مشہور تیراک بھلا ایسے موقع پر کب چوک سکتا تھا۔ فوراً پانی میں گھُس گیا اور چشم زدن میں اُس شخص کو کھینچتا ہوا کنارے پر لے آیا۔

"ارے یہ تو ہمارے سرکار ہیں" خانساماں نے خوشی سے چیختے ہوئے کہا۔

"ہائیں کیا رضا؟" ارشد نے حیرت سے دریافت کیا۔

خانساماں:۔ جی ہاں حضور۔

ذرا سی دیر میں رضا کو ہوش آگیا۔ اُس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا "میں مرنا چاہتا تھا! افسوس میری قسمت میں موت بھی نہ تھی۔ مُصیبت کے وقت موت نے بھی میرا ساتھ نہ دیا۔ اے نیک بخت انسان تجھے میرے بچانے سے کیا فائدہ ملا۔ میری زندگی ایک مُصیبت اور جہنم ہے میں ان مصیبتوں کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا لیکن۔ اے انسان تُو نے مجھے دوبارہ اس دُکھ بھری دُنیا میں واپس بُلا لیا۔

ارشد:۔ رضا! تم نے ایک ذراسی غلط فہمی سے اپنی خوشگوار زندگی کو خود جہنم بنا لیا۔

رضا:۔ تم کون ہو؟ اور میرا نام کیونکر جانتے ہو؟ میں نے تو تمہیں کبھی پہلے نہیں دیکھا۔

ارشد:۔ مَیں پروین کا ماموں زاد بھائی ارشد ہوں۔ پندرہ سال سے افریقہ گیا ہوا تھا اس لئے تم نے مجھے نہیں دیکھا ہوگا۔ میں اُس سے ملنے آیا تھا اور تم نہ معلوم کیا سمجھ کر گھر سے چل دیے۔ بندۂ خدا کسی سے کچھ پوچھا تو ہوتا! پروین روتے روتے اپنا حال تباہ کر رہی ہے اُسکی حالت دیوانوں کی سی ہے۔

رضا:۔ تم پروین کے ماموں زاد بھائی ہو؟ تو کیا تم وہی ہو جو اُس رات پروین کے پاس بیٹھے تھے؟

ارشد:۔ جی ہاں مَیں ہی وہ قصوروار ہوں۔

رضا:۔ اُف! مَیں کس قدر ظالم ہوں، پروین کے ساتھ میں نے کتنا بڑا ظلم کیا۔ بیچاری معصوم پروین میرا ننھا سا فرشتہ۔ چلو جلدی گھر چلو تاکہ مَیں اپنی پروین کے پاؤں پر گر کر اپنا قصور معاف کراؤں میں نے اُس کے ننھے نازک دل کو صدمہ پہونچایا ہے اُف خدا میں کتنا گنہگار ہوں۔

تینوں گھر کی سمت چلتے ہیں۔

پروین ڈرائنگ روم میں ایک صوفہ پر بیٹھی ہے تین دن سے

اضطراب نے اُس کی صورت بدل دی ہے اس کے رخسار جو ہمیشہ گلاب کی مانند تروتازہ رہتے تھے زرد اور مرجھائے ہوئے نظر آرہے ہیں ہونٹوں پر ایک مضطربانہ تبسم ہے۔ آنکھیں جو رونے کی شدت سے سُرخ ہیں ان سے حسرت ٹپک رہی ہے، وہ خود بخود کہتی ہے "آہ آج رضا کی صورت دیکھے ہوئے پورے تین دن گزر گئے۔ اب زندگی بے سود ہے۔ رضا کی محبت سے محروم رہ کر زندہ رہنا مرنے سے بدتر ہے۔ موت میری مصیبتوں کا خاتمہ کر سکتی ہے جس پھول کو کوئی دیکھنے والا نہ ہو وہ کھلکر کیا کرے۔ اب مجھ میں صبر کی طاقت نہیں" دوسرے کمرے میں جاکر الماری میں سے ایک ننھی سی شیشی نکالتی ہے جس پر لال سیاہی کے جلی حروف میں "زہر" لکھا ہے۔ "اُف یہ لال لال حرف زہر مجھے پہلے کس قدر خوفناک معلوم ہوتا تھا لیکن آج کتنا پیارا معلوم ہو رہا ہے — یہی تو مجھے دنیا کے جھگڑوں سے نجات دیگا...... یہ زہر نہیں۔ یہ میرا نجات دہندہ ہے.... یہ امرت ہے" ایک پیالی میں پانی ڈال کر زہر کے چار پانچ قطرے ڈالتی ہے — "بس یہ ایک گھونٹ پانی مجھے چند منٹ کے اندر ہی اندر مصیبت سے آزاد کر دے گا" پیالی کو میز پر رکھکر خود کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ میز پر کہنیاں ٹکا کر کچھ دیر تک سوچتی ہے۔ "مگر شاید رضا کو دیکھے بغیر میرا دم نہ نکل سکیگا۔ آہ، میں مرتے وقت بھی اس بیوفا کی صورت دیکھنا چاہتی ہوں" کارنس کے قریب جاکر رضا کی تصویر کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور تصویر کو مخاطب کرتی ہے — "رضا تم میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہو لیکن اب تم مجھ سے نفرت کرتے ہو...... تمہاری بے اعتنائی سوہان روح ہے۔ اس لئے میں اس دنیا ہی کو چھوڑ کر جارہی ہوں! مرنے کے بعد کیا تم کبھی مجھے یاد کروگے؟... کروگے ....ضرور.... میرا دل کہتا ہے.... تمہیں مجھ سے محبت ہے.... جب تمہاری غلط فہمی دور ہوگی تب تم پشیمان ضرور ہوگے... لیکن میں اس وقت تک نہ ہوں گی" تصویر کو ہاتھ میں لیکر پھر میز کے پاس کرسی پر بیٹھتی ہے اور کہتی ہے۔ "اچھا خدا حافظ رضا، خدا تمہیں خوش رکھے" تصویر کو بار بار چومتی ہے اور زہر کی پیالی اٹھاکر پی جاتی ہے — "اُف کس قدر بدمزہ.... میرے گلے میں آگ سی لگنے لگی.... آہ میرا کلیجہ کٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے میرا دل دھڑک رہا ہے اب میں مر رہی ہوں" چیخکر کہتی ہے، "رضا رضا! تمہاری پروین ہمیشہ کے لئے تم سے رخصت ہو رہی ہے۔ رضا تمہیں دیکھے بغیر میرا دم نہیں نکل سکے گا۔ اُف میرے تن بدن میں آگ لگ رہی ہے"

کمرے کا دروازہ کھول کر رضا داخل ہوتا ہے اور دیوانہ وار پروین کی طرف دوڑتا ہے۔

"پروین، پروین، مجھے معاف کر دو، مجھے غلط فہمی ہوئی۔ .... ارے تمہیں یہ کیا ہو رہا ہے پروین ...." زہر کی شیشی کی طرف نظر پڑتی ہے..."اُف، تم نے زہر پی لیا!... یہ کیا کیا؟ ...... یہ کیا کیا؟...."

پروین:۔ (نحیف آواز سے) "آہ، میرے رضا تم آگئے یا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟.... نہیں یہ اصلیت ہے"۔ رضا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیتی ہے — "میں نے تمہیں دیکھ لیا رضا، اور اب میرا دم آسانی سے نکل جائیگا"

رضا فرش پر گھٹنے ٹیک کر کھڑا ہو جاتا ہے "میری پروین مجھے معاف کر دو، کہدو کہ میں نے معاف کیا"

پروین:۔ (ٹھہر ٹھہر کر) "میں نے.... معاف.... کیا... ...خدا حافظ، رخصت"

زہر اُس پر سرایت کرتا ہے وہ گرنے لگتی ہے۔

رضا دیوانوں کی طرح "آہ پروین تم جارہی ہو مگر تمہارا رضا تمہارے ساتھ آرہا ہے ہماری روحیں ایک ساتھ عالم بالا کی طرف اُڑتی ہوئی جائیں گی"

زہر کی شیشی اٹھاکر باقی زہر جلدی سے منہ میں انڈیل لیتا ہے۔ پروین اپنا نحیف ہاتھ اُسکو روکنے کے لئے بڑھاتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے اور ہاتھ بے قابو ہو کر لٹک جاتا ہے۔

تیز زہر ایک دم رضا پر سرایت کر جاتا ہے اور وہ دھڑام سے فرش پر گر جاتا ہے۔

محبت کے دو دیوانے ایک عارضی جدائی کے بعد ہمیشہ کیلئے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔

اختر اشفاق علی

ان کا اساسہ ختم ہوگیا اور انہوں نے اپنے گھر کی راہ لی اس کے بعد جو کچھ ان کے گاہکوں پر گذری اُس کا ذکر کوئی شہید آئس کریم ہی کرتا تو خوب ہوتا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے میری حیثیت تماشہ بینوں سے زیادہ نہیں۔ اس لئے جگ بیتی کو ہنس ہنس کر بیان کر رہا ہوں۔

شام ہوئی تو ایک دوسرا ہی نظارہ تھا۔ جوق در جوق طلباء ہسپتال کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ کوئی تانگے پر لٹکا ہوا کراہتا جا رہا ہے کوئی یکے پر پیر پھیلائے لیٹا ہے۔ کسی کی حالت اتنی نازک ہے کہ لوگ اسٹریچر پر لاد کر لے جا رہے ہیں۔ چھ بجے شام سے لیکر بارہ بجے رات تک مریضانِ آئس کریم کا تانتا بندھا رہا۔ ہوسٹل خالی ہوتے رہے اور ہسپتال کی آبادی بڑھتی رہی۔ مرض کی یہ حالت کہ قے اور دست کا سلسلہ بند ہونے میں نہ آتا تھا۔ جس نے بیس پچیس کے بعد نجات حاصل کر لی اُسے گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا مریض تو صرف وہی تھے جن کا اوسط ساٹھ اور ستر کا تھا۔

اب آئیے ایک چکر وارڈ کا بھی رہے۔ ہسپتال کا قاعدہ ہے کہ مرض کے لحاظ سے وارڈ کی تقسیم کی جاتی ہے۔ بخار کا وارڈ۔ پیچش کا وارڈ۔ چیچک کا وارڈ وغیرہ۔ غرض تمام امراض کے لئے جُدا جُدا وارڈ موجود ہیں۔ مگر آئس کریم کا وارڈ کہیں نہیں۔ برآمدوں میں قطار سے چارپائیاں بچھادی گئی ہیں۔ پچاس کے قریب مریض پڑے ہیں۔ گرم و سرد آہیں جاری ہیں۔ ابھی زندہ ہیں مگر کل کی خبر نہیں۔ کمپاؤنڈروں اور نرسوں کے بھی حواس باختہ ہیں۔ یہ لیجئے ڈاکٹر صاحب دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ آئس کریم نمبر ۱۴ کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے ہیں۔ بچنے کی اُمید نہیں معلوم ہوتی۔ گرم بوتلیں لگائی جا رہی ہیں۔ دوائیں دی جا رہی ہیں۔ نبضیں گنی جا رہی ہیں۔ ادھر کچھ جان میں جان آئی تو دوسری طرف سے شور اُٹھا۔ آئس کریم نمبر ۵ کی حالت خراب ہوگئی ہے۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ اب مریض رُو بہ صحت ہیں، ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر ہنستے ہیں اور قہقہے لگاتے ہیں۔ شہیدانِ آئس کریم اب غازیوں کے زمرے میں شامل ہو گئے ہیں۔

مگر آئس کریم اب یہاں مشین سے تیار کی ہوئی دودھ بالائی یا کیلے کے برف کا نام نہیں رہا بلکہ ایک مرض کا نام ہے، جو "ٹن پائزن" (   ) سے پیدا ہوتا ہے۔ ماہرین طب کو اپنی لغت میں اضافہ کر لینا چاہیئے۔

ریاض الدین احمد

دوشیزۂ چمن

کل گیا تفریح کو میں باغ میں وقتِ سحر ۔۔۔ پھول تاروں کی طرح چھٹکے ہوئے آئے نظر
ایک رشکِ گل کو دیکھا گل سے ہم آغوش ہے ۔۔۔ گاہ بر دوشِ چمن ہے گہ چمن بر دوش ہے
کھیلتی ہے ہر قدم پر اُس کی ٹھوکر سے بہار ۔۔۔ ہو رہے ہیں پھول اُسکی مسکراہٹ پر نثار
شوخیٔ رفتار سے اِک حشر برپا ہو گیا ۔۔۔ ڈھونڈتا تھا میں سکونِ قلب، دل بھی کھو گیا
ہائے وہ رنگین ادا شوخی سے بل کھاتی ہوئی ۔۔۔ چاند سے رُخ پر سیہ زلفوں کو لہراتی ہوئی
گل کو پیروں سے مسل کر دلرُبا انداز سے ۔۔۔ لیکے انگڑائی چلی ہنستی خرامِ ناز سے
عشق سے ناآشنا اٹکھیلیاں کرتی ہوئی ۔۔۔ پیکرِ گل میں نظر سے رنگ و بو بھرتی ہوئی

پھول چُن کر باغ سے رخصت ہوئی جانِ بہار
خود گئی ہنستی ہوئی محسن کو چھوڑا اشکبار

محسن اعظم گڑھی

کتاب پر مقدمہ

اس کتاب کے فاضل مصنف نے مجھ ہیچمداں و ہیچمیرز سے خواہش کی ہے کہ آپ کی اس قابل قدر تصنیف پر مقدمہ لکھدوں۔ اگرچہ میں اپنی بے بضاعتی کے سبب اس قابل نہیں تھا کہ اتنے بڑے کام کو اپنے سر لوں۔ پھر بھی بہ تقاضائے دوستی قبول کر لیا۔ سچ ہے کہ دروازے کے بغیر مکان، باتوں کے بغیر عورت اور مقدمہ کے بغیر کوئی کتاب نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ فن جتنا عام ہے، اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ پھر، من خراب کجا و صلاح کار کجا۔ یہ فاضل مصنف کی ذرہ نوازی ہے کہ مجھی کو اس قابل سمجھا۔ اس سے پہلے بھی کئی حضرات نے خاکسار کو اس قسم کی فرمائشوں سے مفتخر فرمایا ہے۔ چونکہ اتنی فرمائشوں یا خطوط کا انفرادی طور پر جواب دینا میرے لئے دشوار ہے، میں نے ان کی قدر افزائی یا مزاج پرسی کا شکریہ کرتے ہوئے ایک ایسے مقدمہ کا اعلان کر دیا ہے جو ذرا سی ترمیم کے بعد ہر شخص کے کام آسکے۔

زیر نظر کتاب ملک کے ایک مایۂ ناز اور قابل فخر شاعر و نثر نگار و ڈراما نویس و ایکٹر و پروفیسر و حکیم کی وہ معرکہ آرا تصنیف ہے جس کا مقابلہ کرنے کی دنیا کے بہت کم لوگوں میں ہمت ہے، اور جس کی گلی گلی دھوم ہے اور کوچہ کوچہ ترانے گائے جاتے ہیں۔

قابل مصنف کی ہستی محتاج تعارف نہیں۔ آپ ایک نہایت ہوشیار و چالاک، جوشیلے نوجوان ہیں۔ والدین کا سایہ بچپن سے اٹھ گیا تھا۔ اس لئے آپنے محلے کی ایک میراثن کی گود میں پرورش پائی ہے۔ والد محترم مشائخ پیشہ تھے لیکن چونکہ آپ کو بچپن سے ادبیاتِ عالیہ کا ذوق تھا۔ اب بڑے پروفیسر ہوگئے ہیں۔

جامعہ علمیہ ہی کے ایک ہونہار سپوت ہیں، اور اپنی فطری قابلیت کے سبب کافی ڈگریاں بھی حاصل کر چکے ہیں۔ خوبصورت بھی ہیں۔ جنہیں شوق ہو ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ غرض قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے تو سارے دکن بلکہ ساری دنیا کے لئے غنیمت ہستی ہیں، ورنہ (افسوس ہے کہ) کچھ بھی نہیں۔

آپ نہایت خوش اخلاق، وسیع مشرب اور سادہ آدمی ہیں اور ہر چیز میں تناسب و اعتدال کو پسند کرتے ہیں، چنانچہ جب کبھی جلد جانا ہوتا ہے تو تیز چلتے ہیں، نہیں تو معمولی رفتار سے ہی۔ ابتدائً داڑھی، مونچھ دونوں کترواتے تھے، اور اب دونوں منڈواتے ہیں۔ پہلے شیروانی کی رعایت سے پاجامہ پہنتے تھے اور اب کوٹ کے تناسب سے پتلون زیب تن فرماتے ہیں۔

حال ہی میں آپ لندن بھی ہو آئے ہیں۔ علمی قابلیت کے متعلق تو ابھی کئی مستشرقین تحقیقات کر رہے ہیں، لیکن مشرق و مغرب کے اتصال سے آپ نے جو خاص خیالات، اور خاص تمدن پیدا کر لیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ آپ کی آزادی اور صلح کلی میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ اور آپ اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ سارے ابنائے وطن کو اسی مشرب پر لے آئیں۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت باوجود عزیزوں کی مخالفت کے آپنے ایسی لڑکی سے شادی کی ہے جس کے باپ مسلمان ہیں اور ماں انگریزنی۔ امید ہے کہ اس امتزاج سے بھی آپ کو کافی مدد ملے گی۔

ملک و قوم کی خدمت کے لئے اِس ہونہار نوجوان نے اپنی ساری عمر وقف کر دی تھی، مگر اب نزلہ و زکام کے سبب مجبور ہو گئے ہیں۔ خصوصًا ادبیات کی جو گراں قدر خدمات آپنے انجام دی ہیں، وہ، اگر کوئی پڑھنا چاہے تو دکن کی سیاسی تاریخ میں زریں حروف سے لکھی جائیں گی۔

آپ کا "حب الوطن" خاص خاکِ پاکِ دکن ہے، مگر چونکہ ابھی "ملکی صداقت نامہ" نہیں ملا، اس کی تصدیق نہیں کی جا سکتی، فی الحال کوئی کام بھی نہیں ملا، اسلئے سردست ملازمت کی فکر شروع کر دی ہے۔

مختصر یہ کہ آپ بہت مشہور ہیں اور ہر جگہ مل سکتے ہیں۔

زیر نظر کتاب آپ ہی کا نتیجۂ قلم ہے۔ ایک شہرۂ آفاق اور اعلیٰ درجے کی علمی و فنی و اصلاحی و مذہبی و معاشری و سیاسی و

فلسفی وادبی وڈاکٹری وطبی کوشش ہے۔ جو مصنّف کی غیر معمولی یا خلافِ وضعِ فطری قابلیت پر دلالت کرتی ہے۔ اگرچہ مصنّف نے نہایت قلم برداشتہ لکھی ہے مگر جگہ جگہ سے دماغی کاوشوں کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ خاص مادری زبان میں لکھی گئی ہے، اور طویل سے طویل جملوں میں مختصر سے معنے اس خوبی سے پہنائے گئے ہیں کہ گویا دریا میں کوزہ بند کر دیا ہے۔

ٹائیٹل پیج کی صفائی، کتاب کی روانی، جملوں کی سلاست، الفاظ کا میل ملاپ اور حروف کا توڑ جوڑ، ایک نمایاں و نادر حیثیت رکھتا ہے، اس پر مستزاد آپ کا وہ خاص اندازِ بیان ہے جو عوام کی ملک ہوتا ہوا بھی خاص آپ ہی کا طرز ہے۔ مضامین کی بلندی، مطالب کی عام فہمی، اور مسائل کا انحصار اس میں چار چاند لگا رہے ہیں اور کئی جملے اور الفاظ ضرب المثل کا کام دے سکتے ہیں۔

اتنی وسیع النظری سے کام لیا گیا ہے کہ بے ساختہ فاضل مصنف کی داد دینی پڑتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ کتاب کائنات کے سارے موضوع اور مسائلِ حاضرہ و غائبہ و مستقبلہ پر یکساں حاوی نظر آتی ہے۔ ایک طرف سیاسی مسائل پر اس خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ ہر شخص اس کو پڑھکر مسولینی و ہٹلر بن سکتا ہے، تو دوسری طرف عاشقانہ مضامین میں وہ سوز و گداز بھرا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں سے خون کی ندیاں بہہ جائیں۔ فلسفیانہ مسائل کو تو اس خوبی سے حل کیا گیا ہے کہ جس جملے یا بات پر سے گذریئے، اس کا نقشہ نظروں کے سامنے آتا جاتا ہے۔ اور جہاں طبی مسئلوں پر تحقیق کی گئی ہے، وہاں اتنی مفید معلومات فراہم کردی ہیں کہ کتاب ختم ہونے سے پہلے بوڑھی سے بوڑھی عورت و مرد کا شباب عود کر آئے۔

غرض کہاں تک لکھیں۔ اس سے زیادہ تعریف کرنا ہم خلافِ تہذیب سمجھتے ہیں۔ جب آپ خود ایک نسخہ منگا کر آزمالیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ کتاب کتنی مجرب و آزمودہ ہے۔ صرف ایک بار آزمائش شرط ہے۔ فائدہ نہ ہو تو دام واپس۔ نمونہ مفت طلب کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان بلکہ سارے جہان کے اخبارات و رسائل نے بہترین ریویو کیا ہے۔ اپنے موضوع پر اپنی زبان میں پہلی کتاب ہے، کتاب کی اہمیت اسی سے واضح ہوجائے گی کہ لکھنے سے پہلے ہی کئی آرڈر مختلف قیمتوں پر رجسٹرڈ ہو چکے تھے۔ پھر یہانتک تقاضے بڑھے کہ مجبوراً قانونی چارۂ کار اختیار کرنا پڑا۔ تب کہیں جاکر یہ سیلاب تھما۔ کئی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل چکے ہیں، اور اب تو یہ حال ہے کہ اس کی شہرت سنکر دُور دُور سے لوگ اس کتاب کو دیکھنے آرہے ہیں۔

چونکہ آپ نے کتاب خالص علمی خدمت کی غرض سے لکھی ہے، نہ کہ پیسے بٹورنے کیلئے، کوئی قیمت مقرر نہیں کی گئی۔ جو صاحب جو قیمت ہدیۃً پیش کرینگے قبول کرلی جائے گی۔

دیکھا جارہا ہے کہ آج کل بہت سی نقلی کتابیں بھی اصلی نام سے چھپنے لگی ہیں۔ اس لئے ناظرین کو اطلاع دیدی جاتی ہے کہ اصلی ٹریڈ مارک دیکھے بغیر کوئی صاحب اس کتاب کو نہ خریدیں۔ ورنہ نقصان کی ذمہ داری کسی پر نہ ہوگی۔ ع ؎

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی

کاغذ چکنا ہے، حروف چمکدار ہیں، اور کتابت نہایت دیدہ زیب ہے۔ تقطیع چھوٹی ہے اور لکھائی بڑی۔ حروف بغیر عینک کے بھی صاف دکھائی دیتے ہیں۔ اور عینک سے تو گویا پڑھے بھی جا سکتے ہیں۔

مصنّف اور کتاب کا نام زیرِ طبع ہے۔ عنقریب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوکر "جلوہ پاشِ عالمتاب" ہوگا۔ فقط باقی خیریت بالمشافہ۔

سید علی شاکر۔ ایم۔ اے

علامہ سر محمد اقبالؒ

جمیعِ ہند کی آشفتہ حالی ۔۔۔ غدر کے بعد سے ناگفتہ بہ تھی
مسلمانوں کی حالت نحس تر تھی ۔۔۔ ابھی برہم ہوئی تھی بزم اُن کی
دماغوں میں گذشتہ شان و عظمت ۔۔۔ نظر میں نقشۂ دورِ حکومت
وہی اطوار تھے، عادت وہی تھی ۔۔۔ عنانِ سلطنت، پر چھن گئی تھی!
مخالف تھا ہر اک اپنا پرایا ۔۔۔ سروں پر نکبت و ذلّت کا سایہ
مکدّر نیّت ابنائے زمن کی ۔۔۔ عنادانہ روِش اہلِ وطن کی

اگر یہ کیفیت پیشِ نظر ہو
نہ کیونکر چشمِ شاعر نوحہ گر ہو!

یہ باعث تھا جو حالی نوحہ خواں تھا ۔۔۔ انہیں جذبات کا وہ ترجماں تھا
مسلمانوں کے غم کا مرثیہ تھا ۔۔۔ زوالِ قوم پر صرفِ بکا تھا!

پھر اس کے بعد آیا وہ زمانہ ۔۔۔ تھی جس میں کیفیت اُمید افزا
ہوئی تب فکر یہ اربابِ دل کو ۔۔۔ بُھلا دیں ہنس کے رنجِ جانگسل کو
کریں کچھ طنز کی باتیں دلوں کی ۔۔۔ نکالیں کام شیریں نشتروں سے
جو دل پژمردہ ہوں برمائیں انکو ۔۔۔ مزاحاً چھیڑ کر چونکائیں ان کو

روش یہ اکبرِ مرحوم کی تھی
مزاح و طنز میں تھی نکتہ چینی

مگر قدرت نے جب یہ حال دیکھا ۔۔۔ کہ مسلم خوابِ غفلت سے نہ چونکا
دعا خالی گئی ہر اہلِ دل کی ۔۔۔ نہ کارآمد ہوئی تدبیر کوئی
صدا یہ عالمِ بالا میں گونجی ۔۔۔ کہ "مرضی ہے یہ ربّ العالمیں کی
کہ ہو تخلیق ایک انقلابی ۔۔۔ عدیم المثل در آتش نوائی
مسلمانوں کو جو ہوشیار کر دے ۔۔۔ دلوں کو جذبۂ قومی سے بھر دے
اثر ہو یہ زبانِ سحر فن میں ۔۔۔ حرارت پھونک دے مردہ تن میں
بھرا ہو زور یہ اُس کے قلم میں ۔۔۔ کہ برپا کر دے محشر ایک دم میں
نکالے کام نشتر کا زباں سے ۔۔۔ رگِ خوابیدہ کو بیدار کر دے"

"ہیولیٰ اس کا یوں تیار ہوئے ۔۔۔ مُرکب زبدۂ اربابِ فن سے
حکیمانہ روش ہو نیٹشے کی ۔۔۔ ہو گیٹے کے تخیل کی بلندی
قلم میں حق نگاری شیکسپیر کی ۔۔۔ بیاں میں کیٹس کی رنگیں طرازی

مجسّم شعریت ہو مثلِ شیلے — حسک آہ و فغاں میں بائرن کی
اثر سعدی کا، فردوسی کا انداز — فغانِ دل نشیں میں میر کا ساز
محاکاتِ انیس و سوزِ حالی — اسداللہ خاں کا فکرِ عالی"

مُرتّب جب ہوئے یہ سب عناصر — ہوئی ترکیب جسم و رُوحِ شاعر
ملائک بہرِ نظارہ جو آئے — معافق ہوگئے حیرت سے پھرے
کیا یہ عرض ربّ العالمیں سے — کہ یہ تشویش ہے دلکو ہمارے
بلا کا سحر ہے اس کی زباں میں — وُفورِ انقلابیت بیاں میں

کہیں یہ مُنقلب عالم نہ کردے
جہاں کو درہم و برہم نہ کردے"

جواب آیا کہ "تم واقف نہیں ہو — یہ بھیجا جائیگا ہندوستاں کو
وہاں مُسلم ہے محوِ خوابِ غفلت — تن آسانی میں ننگِ آدمیت
غریقِ نکبت و افلاس ہے وہ — خُدا کے فضل سے بے آس ہے وہ
یہ بھیجا جا رہا ہے اس غرض سے — کہ اُسکو خواب سے بیدار کردے!"

یہ ہے اقبال کی خلقت کی غایت
کلام اُس کا ہے پیغامِ حقیقت!!

یوسف رضا بدایونی

حکیم نابینا صاحب کے جانشین حکیم محمد عبدالحئی صاحب انصاری

ایشیا کے طبیب اعظم حضرت لقمان الملک حکیم حافظ محمد عبدالوہاب صاحب انصاری عرف حکیم نابینا صاحب نے طب یونانی کی جو گرانمایہ خدمات انجام دی ہیں اُسے ہندوستان کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ آپکو یونانی طب میں ایک ایسے جدید طریقۂ علاج کا موجد تسلیم کیا جاتا ہے جس نے دیسی طب میں ایک نئے باب کا اضافہ کردیا ہے۔

حکیم نابینا صاحب کی ان گرانمایہ کارناموں کی قدر کرتے ہوئے اعلیحضرت حضور نظام نے آپکو دہلی سے حیدرآباد (دکن) بلالیا ہے جہاں آپ افسر الاطبّا کے عہدہ پر سرفراز ہونیکے بعد دیسی طب کو مزید ترقی دینے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ برطانوی ہند کے باشندوں کیلئے حکیم نابینا صاحب جیسی نادر ہستی سے محروم ہوجانا اگرچہ بیحد محسوس کیا جارہا تھا لیکن حکیم نابینا صاحب کے بڑے صاحبزادے حکیم محمد عبدالحئی صاحب انصاری نے اپنے کمالات سے اہل ہند کو یہ بتادیا کہ وہ کسی صورت میں اپنے والد بزرگوار حکیم نابینا صاحب سے کم نہیں ہیں۔ حکیم صاحب کے چلے جانیکے بعد آپ بدستور حکیم صاحب موصوف کے مطب کو سنبھالے ہوئے ہیں اور آپکے مطب سے ہزارہا بندگان خدا اسی طرح فیض حاصل کررہے ہیں جس طرح حکیم نابینا صاحب کے زمانہ میں حاصل کرسکتے تھے۔ حکیم محمد عبدالحئی صاحب انصاری کیونکہ مشرقی فن طب کے ساتھ ساتھ مغربی علوم سے بھی اچھی طرح سے واقف ہیں اس لئے توقع کی جارہی ہے کہ آپ اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دیسی طب کیلئے مزید ترقیوں کا باعث ہوں گے۔ ہم کو یہ دیکھکر مسرت ہوتی ہے کہ آج حکیم محمد عبدالحئی صاحب انصاری کے مطب سے والیانِ ریاست سے لیکر غربا تک اسی طرح فیض حاصل کررہے ہیں جس طرح کہ حکیم نابینا صاحب کے مطب سے فیض اُٹھاتے تھے۔ آپ کا مطب

اُردو منزل متصل نشاط سنیما دہلی واقع ہے۔

میرا فرض!

یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو میں مسلمانوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ مسجدوں، مدرسوں اور یتیم خانوں کیلئے آئے دِن چندہ اور امداد طلب کی جاتی ہے جس میں صاحبِ استطاعت حضرات دل کھولکر اپنی فیاضی کا ثبوت بھی دیتے ہیں لیکن زیادہ تر اس معاملہ میں شکایت اور شک کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ اہلِ کرم اس معاملہ میں زیادہ حُسنِ ظن رکھتے ہیں پھر بھی شکایات کہیں کہیں بجاطور پر ثابت ہوتی ہیں۔

میری آبائی بستی موضع "صالح پور نیچہ" میں ہے۔ جہاں کے لوگ جاہل اور مذہبِ اسلام سے محض ناآشنا ہیں۔ ایک مدت سے مُفلسی اور تنگدستی کے شکار ہیں۔ بے علمی اور مسائل اسلامی سے ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ وہاں کے باشندے پڑھنے لکھنے کو بڑی بدشگونی تصور کرتے ہیں یہاں "جو پڑھتا ہے وہ سرسبز نہیں ہوتا"۔ یہ جاہلانہ خیال ابھی تک وہاں کے اکثر لوگوں میں باقی ہے۔ اس بنا پر میں جبکہ کسبِ معاش کی غرض سے اپنے وطن سے دُور، رنگون (برہما) میں پڑا ہوں۔ اپنے ہمسایوں اور اہلِ وطن کیلئے علمی خدمت کیسے کرسکتا ہوں۔ پھر میری اتنی حیثیت نہیں کہ میں وطن والوں کی تعلیم کا ذاتی طور سے بندوبست کرسکوں۔ اِس لئے "میرا فرض" تھا کہ میں برادرانِ اسلام سے درخواست کروں کہ اُنہیں اس موقع پر جہالت اور خام خیالی کے گڑھے سے نکالیں۔

چونکہ میرے موضع میں ایک شریف اور تعلیم یافتہ بیوہ رہتی ہیں۔ اُن کے علمی ذوق اور مسلمان بچوں کو تعلیم دینے کا جذبہ ایسا ہے کہ وہ موضع کے بچوں اور بچیوں کو ایک جگہ جمع کر کے جن کی موجودہ تعداد چوبیس ۲۴ ہے، پڑھاتی ہیں۔ اس بات کو میں نے پہلے پہل جناب سید کشفی شاہ صاحب نظامی سے اُن کے متعلق کہا اور اُنہوں نے ازراہِ غریب نوازی اُن بیوہ معلّمہ کو پانچ روپے ماہوار دینے کا وعدہ فرمایا اور پانچ روپے اُنہوں نے مسماۃ عائشہ خانم بیوہ ولی محمد خاں مرحوم کے نام محض علمی کفالت کیلئے روانہ بھی کر دیئے۔ اگر اسی طرح اہلِ خیر حضرات بھی توجہ فرمائیں تو معلّمہ صاحبہ جو لاوارث اور بیکس مگر شریفہ اور پردہ نشین ہیں اُن کے گزارے کی صورت بھی ہوجائے گی اور ایک اسلامی اسکول جس کا نام "مدرسہ کشفیہ نظامیہ" میں نے تجویز کیا ہے وہ چلتا رہے گا۔ جس میں مسلمانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ہوتی رہے گی۔ جو صاحب زرِ نقد سے امداد کرنا چاہیں وہ اُنہیں معلّمہ کے نام حسبِ ذیل پتہ پر روانہ کر کے عنداللہ ماجور ہوں۔

پتہ:۔ عائشہ خانم بیوہ ولی محمد خاں مرحوم۔ موضع صالح پور نیچہ۔ ڈاکخانہ روناہی ضلع فیض آباد

الملتمس

عبدالرزاق خاں نظامی فیض آبادی ایجنٹ اخبارات۔ رنگون (برہما)

منجن تسکین آور:- آجکل دانتوں کا مرض عام ہوگیا ہے جوان سے بوڑھے تک سب پریشان ہیں۔ دن رات اشتہاری منجن بڑے دعووں کے ساتھ بک رہے ہیں۔ یہ ایک انوکھا مجرب المجرب ہے جو کسی مذہب کے خلاف نہیں ہے۔ جملہ امراض دنداں کا واحد کفیل ہے۔ جو اصحاب پائریا میں مبتلا ہوں۔ منہ سے بدبو آتی ہو، یا پیپ پڑگئی ہو۔ ڈاکٹروں کی طرف رجوع کرکے قدرتی عطیہ سے محروم نہ ہوں۔ بلکہ ایکدفعہ اس منجن کو شرف آزمائش عطا فرماویں۔ انشاء اللہ جملہ امراضِ دنداں سے نجات پاوینگے اور ہمیشہ کو اسی کے طلبگار ہونگے۔ برسوں کا مرض پائریا صرف چند روزہ استعمال سے جاتا رہا ہے۔ قیمت فی شیشی ۸؍ علاوہ محصولڈاک ۔ نوٹ: منجن کیمیاوی طریق پر تیار ہوتا ہے اسلئے ہوا کے اثر سے محفوظ رکھنا چاہئے۔

قادرین:- یہ گولیاں جملہ اعضائے انسانی کی اصلاح کرتی ہیں کیسی نساد خون کی شکایت ہو، لاغری ہو۔ فاسد خون کی اصلاح کرکے چہرے کو بارونق بناتی ہیں اور جسم میں تازہ خون کا دَور شروع کرتی ہیں۔ چالیس روز کے استعمال سے انسان کی کھوئی ہوئی طاقت پھر سے عود کر آتی ہے۔ چہرہ خوش رنگ ہوجاتا ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ اُمرا کے واسطے جن کو بڑے بڑے قدحے پینے سے عار ہو اور جلاب بھی برداشت نہ ہو اس کا ضرور استعمال کریں۔ دو گولی صبح و شام ہمراہ دودھ جس میں شہد خالص بطور مٹھاس ڈالا جاوے، استعمال کی جاتی ہیں۔ قیمت پوری خوراک (۸۰) گولی کی ڈبیہ صرف پانچروپے (ﷲ) علاوہ محصولڈاک۔

مشیران:- یہ نہایت ہی قیمتی اجزا کا مجموعہ ہے۔ جو خاص طور پر اُمرا رؤسا اور دوسری شادی شدہ صاحبان کے واسطے فارمیسی نے نہایت محنت سے تیار کیا ہے۔ جو منشی اشیا اور سمیت سے بالکل پاک ہے۔ ہر مذہب و ملت کے واسطے جائز، صحت کو مفید، بدن کو سُرخ اور فربہ بنانا اس کا عام شیوہ ہے۔ یہ وہ بازاری گولیاں نہیں ہیں کہ چند منٹ کی نفسانی خواہش کو پورا کرکے صحت کو بالکل ملیامیٹ کردیں۔ اور آئندہ قدرتی قوت بھی برباد ہوجائے۔ بلکہ ان کا عامل کبھی لینے میں ضعف کی شکایت نہ پاویگا اور نہ کبھی وظیفہ زوجیت سے خوف زدہ ہوکر شرمندہ ہوگا بلکہ ہر وقت مستعد اور توانا رہیگا۔ عورت کے زیر ہونیکا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ دودھ، گھی، مکھن، فواکہات جتنا بھی استعمال ہوگا سب ہضم کرکے خون صالح پیدا ہوگا۔ قیمت فی ڈبیہ چالیس گولی پانچروپے علاوہ محصولڈاک ۔

رفیمیل لائف:- یہ فارمیسی کی مشہور اور مجرب چیز رئیسِ و شریف زادیوں کی جان ہے۔ جو دوبارہ جوانی کی بہار عطا کرتی ہے۔ جو اپنی جان میں کمزوری پاتی ہوں، چاہے بوجہ مرض یا بہ تقاضائے عمر ہو یا عالم زچگی میں یا بوجہ بچہ کشی کمزور ہوگئی ہوں صحت میں فرق ہو لاغر ہوں چہرہ پژمردہ ہو بھوک عنقا ہو اور اسی غم میں پریشان اور صاحبِ فراش ہوں۔ مایوس نہ ہوں۔ اس کا استعمال از سرِ نو نظامِ نسوانی کی اصلاح کرکے چست توانا بنادیگا اور گری ہوئی صحت کی اصلاح کرکے جوان اور خوش رُو کردیگا۔ یہ مجرب ہر گھر گھر ستنوں کے واسطے ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ ہر قسم کی نشیلی و زہریلی اجزا سے پاک۔ ہر موسم میں استعمال کے قابل قیمتی ادویات کا مرکب خوراک ۳ ماشہ سے ۹ ماشہ تک۔ قیمت فی ڈبیہ وزن ۵ تولہ۔ چار روپیہ۔ علاوہ محصولڈاک۔

طلا فیض عام:- یہ سب طلاؤں کا سرتاج۔ زیادہ تعریف مانع تہذیب۔ ہر قسم کی زہریلی، گندی، ناپاک اشیاء سے پاک، بالکل بے ضرر کسی قسم کی بندش سے مبرا محض نازک مزاج اُمرا کے واسطے خالص کیمیاوی طریق پر تیار کیا ہے۔ کسی قسم کی کسی وجہ سے شکایت ہو چند یوم میں وہ سن رسیدہ بھی اپنی کمزوری دُور فرماکر نوجوان ہوسکتے ہیں۔ سوزش آبلہ کچھ نہیں ڈالتا۔ چند بوند کا مالش کردینا کافی ہے۔ قیمت فی شیشی ﷲ۔

(نوٹ) جلق زدہ یا خلافِ فطرت کے عامل صاحبان طلا فیض عام خاص طلب کریں جو پانچروپے میں ملیگا۔ اور ساتھ میں اپنی کُل ہسٹری مع تائب ہونیکا عہدنامہ آنا لازمی ہوگا۔ انشاء اللہ فارمیسی انکو بامراد ہونے میں حتی المقدور کوشش کریگی۔ کیونکہ اس ذریعہ سے پیشہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ خدمت خلق ضروری ہے۔

المشتہر:- مینیجر فیض عام فارمیسی۔ شکوہ آباد۔ یو۔ پی۔

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
قیمت فی پرچہ چھ آنے

جُرعات

ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ
نمونہ کا پرچہ مفت
بھیجا جاتا ہے۔

جلد ۱۸ | ساقی دھلی۔ بابت ماہ اگست ۱۹۳۸ء | نمبر ۲

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
(۱)	نگاہِ اولیں	انصار ناصری	(۲)
(۲)	ہندوستان کے تعلیمی مسائل	پروفیسر مرزا محمد سعید ایم۔ اے، آئی۔ ای۔ ایس	(۳)
(۳)	خسران المبین	جناب امین حزیں (سیالکوٹی)	(۷)
(۴)	غزل	جناب بہزاد لکھنوی	(۸)
(۵)	منکہ ایک بیمہ ایجنٹ	جناب انصار ناصری۔ بی۔ اے ایل ایل۔ بی	(۹)
(۶)	سچی کہانی	پریم پجاری	(۱۷)
(۷)	کلامِ فرحت	جناب گنگا ناتھ دھر فرحت بی۔ اے، ایل ایل۔ بی	(۲۴)
(۸)	سانپ کا شکار	جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ بی۔ اے، ایل ایل۔ بی	(۲۵)
(۹)	شعر بازی	"آوارہ"	(۲۸)
(۱۰)	پیامِ گل	جناب اجمل نجیب آبادی۔ بی۔ اے (علیگ)	(۳۲)
(۱۱)	پہلا پتھر	جناب خواجہ احمد عباس	(۳۳)
(۱۲)	جذبِ عشق	جناب سید علی شاکر۔ ایم۔ اے	(۳۸)
(۱۳)	نوائے فراق	پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے	(۴۰)
(۱۴)	سوچنے کی علت	پروفیسر محمد مسلم۔ ایم۔ اے	(۴۱)
(۱۵)	باپ	جناب ممتاز مفتی	(۴۳)
(۱۶)	دو روسی دیہاتی بچے	جناب مسعود حسن علوی	(۴۹)
(۱۷)	ساقی	جناب اسرار الحق مجاز۔ بی۔ اے۔ (علیگ)	(۵۶)
(۱۸)	سزا	جناب بلونت سنگھ	(۵۷)
(۱۹)	دو غزلیں	جناب کوکب شاہجہان پوری	(۶۵)
(۲۰)	فنِ تجمیل	جناب اشرف صبوحی دہلوی	(۶۶)
(۲۱)	الارم	جناب عرش تیموری	(۶۸)
(۲۲)	بدگمان	محترمہ آمنہ مسز ناظر	(۶۹)
(۲۳)	اُمید	جناب سید رفیق حسین	(۷۲)
(۲۴)	بے زبان	جناب صادق الخیری۔ ایم۔ اے دھلوی	(۷۴)
(۲۵)	آج پھر	جناب جعفر شیرازی	(۷۶)
(۲۶)	مکالمۂ ساقی و ساغر	جناب ساغر نظامی	(۷۷)
(۲۷)	مُعمّہ	جناب ایم۔ ملک	(۷۹)
(۲۸)	ابن طفیل الاندلسی	جناب محمد مختار زمن	(۸۱)
(۲۹)	تجدید محبت	جناب ساغر جعفری۔ بی۔ اے ایل ال۔ بی	(۸۸)
(۳۰)	اشتہارات	مشتہرین	(۹۵)

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کیجئے۔ مینیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

الحمدللہ ساقی کا "خاص نمبر" توقع سے زیادہ مقبول ہوا جس کا ثبوت یہ کہ دفتر میں ایک بھی کاپی باقی نہیں اور سینکڑوں فرمائشی خطوط موصول ہو چکے ہیں۔ اُن بیشمار "نوازشناموں" کا ذکر نہیں جن میں ساقی کے "خاص نمبر" کی مبالغہ آمیز تعریفیں کی گئی ہیں۔ خود ستائی ساقی کا شعار نہیں لیکن تسلیم شدہ امر ہے کہ ساقی کے خاص نمبر تو جُدا رہے معمولی نمبر بھی اکثر مقتدر رسائل کے خاص الخاص نمبروں کے مقابلہ میں بھی نمایاں فوقیت رکھتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ ساقی میں شُستہ و پاکیزہ مذاق کی دلبستگی کا التزام جس ادائے خاص سے کیا جاتا ہے وہ اوروں کیلئے مثالی ہے۔ قدر دانی شرط ہے آپ دیکھیں گے کہ ساقی دن دونی اور رات چوگنی ترقی کریگا۔

پیشِ نظر پرچہ میں پروفیسر مرزا محمد سعید صاحب کا مضمون "ہندوستان کے تعلیمی مسائل" غور و فکر کا مقتضی ہے۔ خواجہ احمد عباس صاحب اور ممتاز مفتی صاحب نے افسانہ نگاری میں دلنشیں پیرایۂ بیان کے ساتھ اچھوتا اسلوب تفکر پیدا کیا ہے۔ "پہلا پتھر" اور "باپ" دونوں افسانے اپنے اپنے رنگ میں بے مثل اور خاصے کی چیزیں ہیں۔ پروفیسر محمد مسلم صاحب سلیس و شگفتہ انداز میں فلسفے کے دقیق مسائل پیش کرتے ہیں۔ "سوچنے کی علت" قیمتی مضمون ہے۔ "سوچ" کر لکھا گیا ہے اور موضوع کی اہمیت سفارشی ہے کہ "سمجھ" سمجھکر پڑھا جائے۔

حضرت آوارہ کہنہ مشق ادیب ہیں گو بزمِ ساقی میں تازہ وارد سہی۔ "شعربازی" موجودہ مشاعرہ نوازی پر نہایت لطیف طنز ہے۔ اُمید ہے کہ موصوف کے بیش بہا افکار سے ساقی کے صفحات ہمیشہ مزیّن ہوتے رہیں گے۔ حضراتِ شعرا میں بہزاد صاحب اور ساغر صاحب ہمارے شکریہ کے بطور خاص مستحق ہیں۔ موخرالذکر کی پاکیزہ نظم "مکالمۂ ساقی و ساغر" (درباب رحلتِ علامہ اقبال) توصیف سے مستغنی ہے۔

بھائی شاھد احمد صاحب مُدیر ساقی اُس غم کو بُھلانے کی جُستجو میں، جو کبھی نہیں بھلایا جاسکتا، اپنے عزیزوں کے اصرار پر برائے چندے حیدرآباد دکن تشریف لے گئے ہیں۔ (حق تعالیٰ اُنہیں اس جانگداز غم کو برداشت کرنے کی قوت اور صبر کی توفیق عطا کرے!) اُن کے ارشاد کی تعمیل میں مجھے دوبارہ ادارتی فرائض انجام دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ممکن ہے بعض منچلی طبیعتوں کے نزدیک میری بخت آوری لائقِ رشک ہو لیکن تجربہ کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ادارت ایک بیش قیمت عذاب ہے ——————

من نہ کردم شما حذر بکنید!!

انصار ناصری

خسرانُ المبین

خودی کو بیچ کے صدق و صفا کو بیچ دیا
متاعِ خانۂ شرم و حیا کو بیچ دیا
حرام اس پہ ہے جینے کی آرزو جس نے
بلا سے جینے ہی کے مدعا کو بیچ دیا

خودی کو بیچ کے شانِ خدا کو بیچ دیا
نظر کی وسعتِ لا انتہا کو بیچ دیا
یمِ حیات ترا کیوں نہ خشک ہو جائے
کہ تو نے اس کے دُرِ بے بہا کو بیچ دیا

خودی کو بیچ کے اپنی بقا کو بیچ دیا
چمک تھی جس سے تری اس ضیا کو بیچ دیا
اُمیدِ لالہ و گل اب فضول ہے نادان
کہ تو نے باغ کی بادِ صبا کو بیچ دیا

خودی کو بیچ کے فقر و حیا کو بیچ دیا
حریفِ ارض و سما کی بلا کو بیچ دیا
تری نگاہ کو وسعت سے واسطہ کیا
جب ابتدا ہی میں اس انتہا کو بیچ دیا

امینِ حزیں

غزل

صنمخانوں میں جا کر نورِ یزداں دیکھ لیتا ہوں
مَیں اپنی کفر سامانی میں ایماں دیکھ لیتا ہوں

مری دانائیِ وحشت پہ حیراں ہیں جہاں والے
مَیں فصلِ گُل میں ہر تارِ گریباں دیکھ لیتا ہوں

گئے وُہ دن کہ جب خوابِ سُبک تھے میری دُنیا میں
ترے صدقے میں اب خوابِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں

خُدا شاہد ہے میری رُوح تک بے چین ہوتی ہے
مَیں جب ان نرگسی آنکھوں کو گریاں دیکھ لیتا ہوں

مجھے آواز دے لے ناخُدا کیوں ہے پریشانی
کہ مَیں ٹھہری ہوئی موجوں میں طوفاں دیکھ لیتا ہوں

جُنوں کا جوش جب بڑھتا ہے بہزادِ جُنوں پرور
تو میں دامن کو تا حدِّ گریباں دیکھ لیتا ہوں

بہزاد لکھنوی

(ریڈیائی ڈرامہ)

منکہ ایک بیمہ ایجنٹ

افراد

میاں .. .. بھاری آواز والے تنومند ڈرپوک
بیوی .. .. مہین آواز والی چڑچڑی حسینہ؛
چھوٹے (ملازم) .. .. پھٹے ہوئے بانس کی آواز والا خونخوار نمک حلال
مجرم .. .. گڑگڑاتی ہوئی آواز والا ناز ک اندام

(خاموشی، سہانی رات، دن بھر کے تھکے ہارے میاں، پاؤں پسارے، خواب میں جنّت الفردوس کے مزے لے رہے ہیں ——— ان کے نرم وگرم خرّاٹے خاص التزام کے ساتھ چھوٹے (ملازم) کے خرّاٹوں کی آواز سے جو نسبتاً دُور سے آرہی ہے، دست وگریباں ہیں ———

بیوی کی نیند ان ہوشرُبا خرّاٹوں نے کھو رکھی ہے۔ بیچاری کروٹوں پر کروٹیں، وجمائیوں پر جمائیاں لے رہی ہے۔ اور سخت کرب میں مبتلا ہے۔

دو قسم کے ہلکے بھاری خرّاٹے سوالاً جواباً کار فرما ہیں، بیچ بیچ میں نازک سی جمائیوں کی آواز۔

ان منظم اور مبسوط خرّاٹوں اور بے ربط جمائیوں کی تشیلی موسیقی سے کمرہ گونج رہا ہے۔ کبھی کبھی ہوا کا شریر جھونکا "شوووں ں ں" پکارتا ہوا گذر جاتا ہے ———

ذرا دیر بعد دُور سے چٹخنی کھولنے کی سی آواز آتی ہے۔ اور پھر کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ سے مشابہ ہلکی آوازیں سُنائی دیتی ہیں ——— بیوی کی جمائیاں بند ہوجاتی ہیں۔ خاموشی ———

پھر یہی آوازیں کافی بلند ہوجاتی ہیں۔ ساتھ ہی قدموں کی ہلکی چاپ سُنائی دیتی ہے۔ بیوی کُنمناتی ہے ———

مکمل خاموشی، سوائے خرّاٹوں کے اور کوئی آواز نہیں آتی۔

یکایک برتنوں کے کھڑکنے کی آواز دُور سے لیکن کافی بلند سُنائی دیتی ہے۔ جس کے ساتھ ہی ہوا کا تیز جھونکا "شوووں ں" کرتا ہوا گذرتا ہے۔)

بیوی:- (نہایت آہستگی سے) دیکھنا ——— ذرا اُٹھو تو ——— (کُھنکارتی ہے)

(میاں کے خرّاٹوں کا باجا خُمار آگیں انداز میں بدستور بجتا رہتا ہے۔ کافی فاصلے سے ایک پیتل کی تھالی "جھن ن ن ن" سے گرتی ہے۔)

بیوی:- (ہلکی سی خوفزدہ چیخ کے ساتھ، دھیمی آواز میں) اے، اُٹھو، اُٹھو ——— دیکھو تو سہی گھر میں کوئی ہے۔ اُٹھو، اُٹھو تو . . . . . .

(میاں کے خرّاٹوں کا تار ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹتا ہے، ایک لمبی "اوں ں نہ" آہ سرد کی شکل میں نکالتے ہیں۔ اور مُنہ سے "چپ چپ چپ" کرتے ہوئے دوسری کروٹ لے لیتے ہیں۔)

(پھر آہستہ آہستہ خراٹوں کی موسیقی اُبھرنی شروع ہوتی ہے فوراً ہی بہت سے چینی کے برتنوں کے گرنے کی آواز آتی ہے۔)

بیوی:۔ (غصہ میں لیکن دھیمی آواز سے) شاباش ہے کیسے گھوڑے بیچ کر سوتے ہو ــــ میں کہتی ہوں گھر میں کوئی گھس آیا ہے، ذرا دیکھو تو سہی۔ . . . .

میاں:۔ (خراٹے بند کرکے) او ــ ہا ــ ہو ــ گھو ــ ڑے، ہاں ــ گھوڑے ہی گھو ــ ڑے۔

بیوی:۔ توبہ!! ذرا اُٹھ کے سُنو تو سہی۔ گھر میں کوئی چور ہے۔

میاں:۔ (ترش ہو کر) کیا ہے خواہ مخواہ غُل مچا رکھا ہے ــــ کون ہے، ــــ فو ــ ضو ــ ل نیند خراب کرتی ہو، کوئی بات بھی ہو ــــ

بیوی:۔ اُوپر کے کمرے میں کوئی چور ہے۔ برابر کھٹکا ہو رہا ہے۔ کبھی برتنوں کے گرنے کی آواز آتی ہے اور کبھی . . . . . .

میاں (مقابلتاً بلند لہجے میں) تمہارے تو کان بجا کرتے ہیں۔ اس وہم کا کیا علاج ــ رکھا کیا ہے گھر میں جو ڈاکے پڑینگے ــ سو جاؤ سو جاؤ ــ چور وور نہیں ــ بھوت ہوگا ــــ

بیوی:۔ (خوفزدہ) بھوت!! کیا اس مکان میں بھوت رہتے ہیں۔

میاں:۔ (وثوق کے لہجے میں) سبھی مکانوں میں رہتے ہیں ــــ اور ــــ اس مکان میں تو ضرور ہی رہتے ہیں۔ جبھی تو اس کا آدھا کرایہ ہے۔

(ہوا کا تیز جھونکا زور سے "شوووں" کرتا ہے جس سے کھڑکیوں کی چٹخنیاں آہستہ سے کھڑ کھڑ بولتی ہیں ــ)

بیوی:۔ (خوف کی چیخ کے ساتھ بے اختیار) بھو وو ــــ ت!! ہو ہو ہو ــــ بھو وو!!!

میاں:۔ (تسلی آمیز لہجے میں) ڈرو نہیں ــ ڈرو نہیں ــ یہ تو ہوا کی آواز ہے ــــ اور بھوت ــــ بھوت تو کبھی کسی کو نہیں ستاتے ــــ مجھے عمل یاد ہے، تم گھبراؤ نہیں۔

(قدرے خاموشی کے بعد "دھب" سے کسی بھاری چیز کے گرنے کی آواز ــ)

بیوی:۔ دیکھا، سنا تم نے۔ یہ ہرگز بھوت کی آواز نہیں ہو سکتی ضرور کوئی نہ کوئی چور ہے۔ تم اُٹھکر دیکھو تو۔

میاں:۔ کیا فضول باتیں کرتی ہو۔ چور کا بھلا ہمارے ہاں کیا کام۔ بلی کودی ہوگی۔

بیوی:۔ (جلکر) تم یونہی بھیگی بلیاں بتاتے رہنا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ذرا اُٹھکر دیکھ لیں۔

(دوبارہ دُور سے "دھب" کی آواز اور کسی کے بھاگ کر چلنے کی آواز۔)

بیوی:۔ لو سُن لو ــــ میں کہتی ہوں تم چوڑیاں کیوں نہیں پہن لیتے ــــ عجیب حالت ہے، گھر میں چور گھسا ہوا ہے، اور گھر کے مالک کا دم فنا ہو رہا ہے۔ تمہیں بھی قسم ہے یونہی پڑے اینڈتے رہنا، چاہے وہ گھر میں جھاڑو پھیر کر چلتا بنے ــــ اور ــــ اور ہم نے بیمہ بھی نہیں کروایا ہے۔

میاں:۔ بیمہ! کیسا بیمہ؟

بیوی:۔ چوری کا بیمہ اور کیسا۔

(ہوا کا جھونکا)

میاں:۔ (دلچسپی سے) چوری کا بیمہ ــــ ہاں واقعی، یہ کی بہت عُمدہ چیز ــــ پھر تو کسی قسم کا ڈر ہی نہیں رہے گا ــ چاہے ہم اپنی سونے کی اینٹیں یونہی طاقوں میں پڑی رہنے دیں۔ سچ مچ بہت آرام ہو جائے گا ــ ناحق راتوں کو مجھے چوکسی کرنی پڑتی ہے۔ ضرور بیمہ کروالو ــــ آدھا پریمیم۔ تم دینا اور آدھا خیر ہم ہی دیدیں گے۔

بیوی:۔ (تنک کر) میں کہاں سے دونگی۔

میاں:۔ تم نہیں دوگی تو اور کون دیگا ــــ زیور تمہارا ہے یا میرا۔

بیوی:۔ خوب!۔۔۔ کیا اچھا وقت نکالا ہے آپ نے ان باتوں پر لڑنے کا۔۔۔!!

("چھن ن ن" سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ پاؤں کی چاپ نسبتاً قریب سے۔)

بیوی:۔ لے یہ لیجئے۔ اب وہ آتا ہے اس کمرے میں۔ (تیزی سے) بولئے، آپ جاتے ہیں یا میں ہمسائی کے میاں کو آواز دوں!!

میاں:۔ (آہستگی سے) شے ش ش! آواز مت نکالنا۔ ممکن ہے۔۔۔

بیوی:۔ (بلند آواز سے) جائیے۔ جلدی کیجئے۔۔۔ اُٹھیے اٹھیے۔۔۔ نہیں تو میں دیتی ہوں ہمسائی کے میاں کو آواز!

میاں:۔ (بادلِ ناخواستہ اُٹھتے ہوئے) اچھا بھئی! تم نہیں مانو گی۔۔۔ آج میرے ہاتھ سے ضرور کسی نہ کسی کا خون کروا کر رہو گی۔۔۔ دیکھو چُپکے سے جا کر ذرا چھوٹے کو تو جگا دو۔

بیوی:۔ یہ بھی میں ہی کروں۔

میاں:۔ کیا ہرج ہے برابر کے کمرے میں بھی جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ کوئی کھا تھوڑی جائیگا۔۔۔ اتنے میں چلتا ہوں۔

(کپڑوں کے سٹر پٹر کی آواز)

بیوی:۔ (دُور سے) چھوٹے، او چھوٹے۔۔۔ ائے چھوٹے!!۔۔۔ اُٹھ۔ اُٹھ تو۔ جلدی کر۔

چھوٹے:۔ (ہڑبڑا کر دُور سے) کیا ہے، کون ہے؟؟

بیوی:۔ (آہستگی سے) ائے چور ہے!!

چھوٹے:۔ کہاں؟؟

بیوی:۔ اُوپر۔۔۔!

چھوٹے:۔ ائے ہے۔۔۔ اچھا کہاں گیا اس کا۔ اس کا کیا نام میرا ڈنڈا۔

بیوی:۔ یہ رہا۔۔۔ لے، دیکھ ہوشیاری سے۔ میاں کے ساتھ جائیو۔ لے یہ ٹارچ بھی لے لے خبردار رہو ہوشیاری سے۔

(ڈنڈا زمین پر "کھٹ" سے مارنے کی آواز دُور سے۔)

چھوٹے:۔ آپ کچھ خیال نہ کریں بیوی جی۔ میں سالے کا دم نکالدونگا۔ اس کا نام میاں کہاں گئے۔ کیا اکیلے ہی اُوپر۔۔۔۔

بیوی:۔ وہ رہے۔

میاں:۔ (دبی زبان سے) ائے چھوٹے، دیکھ ہوشیاری سے، لا، وہ دوسری لکڑی مجھے دیدے آج حرامزادے کا سر توڑیں گے۔۔۔ دیکھو خبردار جانے نہ پائے۔۔۔ اہم م م!!! (کھنکارتے ہیں)

(دھب دھب دھب بھاگنے کی آوازیں تیزی سے آتی ہیں۔ کرسیوں وغیرہ کے ٹکرانے کی آوازیں کھڑ کھڑ۔۔۔)

میاں:۔ جلدی جلدی ڈراؤنی آوازیں، لیجو چھوٹے جانے نہ پائے۔ کدھر گیا بدمعاش، دیکھ وہ کون ہے پردے کے پاس، ٹرنک کے پیچھے، وہی ہے، ہا ہاں ں ں، ہا، ہو و و و۔ وہ نکلا۔ قراں ق۔ چو چور چور۔ وہ۔ وہ۔ وہ بھاگا۔ لیجو۔ نکلنے نہ پائے۔ چ چ چا چچا چور۔۔۔ بغ۔ غاف۔ پکڑ۔ پکڑ۔ مار۔ شڑانق۔ تفتنگ۔ یہ ی ی یہ۔ ادھر۔ اس طرف ہاں ہاں مار۔۔۔ م م م۔۔۔۔

(میاں کے وحشت زدہ دہنِ مبارک سے طرح طرح کی بے ہنگم آوازیں نکل رہی ہیں۔ وہ اِدھر سے اُدھر کود پھاند رہے ہیں۔ کثرتِ جوش سے کبھی کبھی مستقل طور پر دھاڑنے لگتے ہیں۔ چھوٹے صاحب بھی بہر کیف کچھ نہ کچھ فرما رہے ہیں۔۔۔)

(ایک تڑخے کے ساتھ چھوٹے صاحب پوری طاقت سے اپنا ڈنڈا مجرم کے سر پر رسید کرتے ہیں، جو اتفاق سے میز پر لگتا ہے۔۔۔ پھر مجرم کی ملتجیانہ "ہی ہی ہی" کے درمیان "پکڑ لیا۔ پکڑ لیا" پکارتے ہوئے تھپڑ، لات، گھونسے سے تواضع کرتے ہیں۔)

مُجرم:۔ ہی ہی ہی۔۔۔ میں۔ م م م۔۔۔ مَیں چور۔ نہیں۔۔۔۔

میاں:۔ (ہانپتے ہوئے) شاباش! چھوٹے خُوب پکڑا۔۔۔ لا ادھر لا اس بدمعاش کو۔ میں اسے ابھی مزا چکھاتا ہوں۔ کیوں رے حرامزادے! اب آیا چوری کرنیکا مزا۔

چھوٹے۔ اجی میرے حوالے کیجئے میاں اس کو۔ ابھی، اس کا، اسکا کیا نام اچار نکال دوں سسر کا۔

مجرم۔ خدا کے واسطے شور نہ کیجئے میں چور نہیں ہوں۔

چھوٹے۔ چور نہیں ہوں! سسر۔ بڑے ساہوکار۔

("دھڑاک" چھوٹے صاحب کا غضبناک چانٹا)

مجرم۔ اُف، ہا۔ ارے۔ ذرا سنیئے تو میں عرض کرتا ہوں۔

میاں۔ عرض کرتا ہے، خوب، شاعری کرتا ہے کمبخت ـــــ کیا عرض کریگا۔ جلدی عرض کر، مطلع عرض کر، مقطع عرض کر ـــــ میرا سارا اسباب تتر بتر کر دیا۔ نقب زن، ڈاکو ـــــ میں تجھے ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں ـــــ چھوٹے! کہاں جاتا ہے۔ (دبی آواز میں) یہیں رہ بھائی، معلوم نہیں کیا آفت!

چھوٹے۔ اجی میاں، اسکا کیا نام مجال ہے۔

مجرم۔ میں نے آپ کی پھوٹی کوڑی بھی نہیں لی۔ آپ اپنا اسباب سنبھال لیں ـــــ

چھوٹے۔ لیتا کیسے، اس کا کیا نام ہم جو آگئے اس ڈنڈے سے تیرا سر توڑنے۔

("کھٹ" سے ڈنڈا زمین پر بجاتا ہے۔)

مجرم۔ میں کبھی اتنی جرأت نہیں کر سکتا۔

میاں۔ دوسروں کے گھروں میں گھسنے کی جرأت کر سکتا ہے اور اسباب چرانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اچکے تو زبان دراز بھی ہیں ـــــ بیوی، بیوی، کدھر گئیں۔ ذرا سنو تو اس موذی چور کی باتیں۔

مجرم۔ آپ صبر سے تشریف تو رکھیں۔ میں سارا حال عرض کئے دیتا ہوں۔ اس مرتبہ میری کچھ شامت ہی آگئی ورنہ اس سے پہلے آپ کے پڑوسی ایس۔ ڈی۔ او صاحب کے ہاں اس طرح داخل ہوا تھا تو . . . .

میاں۔ داخل ہوا تھا ـــــ! یوں کیوں نہیں کہتا کہ ڈاکہ ڈالا تھا۔ بدمعاش، اب معلوم ہوا کہ تو دھاڑی چور ہے ـــــ جبھی یہ لوگ بیچارے اتنے پریشان تھے۔

مجرم۔ میں نے چوری کبھی نہیں کی جناب! آپ یقین کیجئے ـــــ زیادہ سے زیادہ اسے مداخلت بیجا بغیر نیت مجرمانہ کہہ سکتے ہیں۔

میاں۔ خوب، خوب، قانون بھی چھانٹنے لگے، کیوں نہ ہو ـــــ تجربہ کار ہو ـــــ اور ـــــ اور کچھ پڑھے لکھے بھی معلوم ہوتے ہو ـــــ!

مجرم۔ جناب! میں گریجویٹ ہوں ـــــ!

میاں۔ (رعب گانٹھتے ہوئے) صاحبزادے، تم کچھ احمق تو نہیں ہو ـــــ بہت شان نہ جتاؤ۔ کیوں گریجویٹ کا نام بدنام کرتے ہو ـــــ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا کہ تم میرے گھر میں چوری کی نیت سے داخل ہوئے اور میں نے تمہیں پکڑ لیا۔ بس باقی اپنی دلچسپ کہانی مجسٹریٹ کو سنانا ـــــ سمجھے؟

مجرم۔ میں جناب کو نہایت ادب سے یقین دلاتا ہوں کہ میں چور نہیں ہوں ـــــ میں ایک بیمہ ایجنٹ ہوں۔

چھوٹے۔ اس کا کیا نام آجنٹ ٹ ٹ ہو!!! (ڈراؤنی ہنسی)

میاں۔ بیمہ ایجنٹ! خوب، ہو چالاک، کبھی گریجویٹ بنتے ہو اور کبھی بیمہ ایجنٹ!!!

مجرم۔ تو جناب بے ادبی معاف، کیا گریجویٹ بیمہ ایجنٹ نہیں بن سکتے ـــــ!

میاں۔ ہرگز نہیں۔ گریجویٹ کیلئے بیمہ ایجنٹ بننا زندہ درگور ہو جانے کے برابر ہے۔

مجرم۔ اسکی صادق اور مکمل مثال میں آپکے سامنے موجود ہوں۔

میاں۔ بکو مت!! تم چور ہو ـــــ ڈاکو ہو۔

مجرم۔ حضرت میں بڑی سے بڑی قسم کھاتا ہوں کہ میں چور نہیں ہوں۔

میاں۔ (برافروختہ) پھر وہی بکواس! چور نہیں ہو تو کیا کہیں کے

ساہو کار ہو تے تھے!! عجیب قماش کا جانور ہے۔ چوری اور سینہ زوری
—— اور آپکی جیبیں میرے روپے اور نوٹوں سے نہیں بھری ہوئیں تو کیا
آپکے باواجان کی حویلیوں کے قبالے ہیں۔

مجرم :۔ آپ اس بن مانس سے ذرا مجھے نجات دلوائیں تو میں ابھی سارے
کاغذات پیش کر دوں۔

چھوٹے :۔ دیکھ لو میاں، ہم کو اس کا کیا نام بن مانس کہتا ہے۔

(گلا دباتا ہے)

مجرم :۔ کاخ کاخ۔ کق۔ قیں۔ ذ ذ ذ ذرا۔ اُف۔ چھڑوایئے، غش حضرت
م م م میں مرا —— میرا دم —— مقیں —— !!!

میاں :۔ (دبی زبان سے) ارے چھوڑ —— چھوٹے۔

چھوٹے :۔ سسُر —— !!! یاد رکھیو دم نکال دونگا۔ سیدھا بیٹھ۔ ہم اسکا
کیا نام خود تیری تلاشی لیں گے۔

(کاغذوں کی کھڑبڑ)

چھوٹے :۔ سسُرے نے مار ردی ہی ردی بھر رکھی ہے پاکٹوں میں۔

مجرم :۔ ملاحظہ کیجئے یہ میری کمپنی کے پراسپکٹس وغیرہ ہیں۔

میاں :۔ (پڑھتے ہوئے) دی گریٹ انڈین برگلری انشورنس کمپنی لمٹیڈ۔

مجرم :۔ اور —— اور —— یہ دیکھئے میرا نام!

میاں :۔ (پڑھتے ہوئے) مسٹر ایس کے پوری، بی۔ اے، چیف ایجنٹ
دی گریٹ انڈین برگلری انشورنش کمپنی لمٹیڈ۔

میاں :۔ (قدرے تامل کے بعد) ہوؤں —— !! مگر مجھے کیسے یقین
آئے کہ آپ ہی مسٹر پوری ہیں۔

مجرم :۔ آپ ڈاکٹر صاحب سے دریافت کر سکتے ہیں۔ انہوں نے
مجھ سے ہی بیمہ کروایا ہے۔

میاں :۔ خوب، چوتی کُتیا اور جلیبیوں کی رکھوالی —— کیا آپ کی
کمپنی کا کام چوریاں کروانا ہے۔

مجرم :۔ نہیں ہم تو اور اُلٹا۔ . . . .

میاں :۔ تو پھر آپ میرے گھر میں کیوں داخل ہوئے اور میرا اسباب
کیوں الٹ پلٹ کیا —— اس کا کیا جواب ہے آپکے پاس ——
کیا بیمہ ایجنٹ کا یہی کام ہے —— نا نا نا نا —— میں کسی طرح
یقین نہیں کر سکتا۔ تم قطعی خاندانی چور ہو —— اچھوٹے ——
لا رسّی —— !!

مجرم :۔ ذرا ٹھہریئے تو —— آپ مہربانی کر کے ذرا سُن تو لیجئے۔
صرف ایک منٹ۔ نہایت سیدھی سی بات ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ
میں اس کمپنی کا بیمہ ایجنٹ ہوں۔ (درد بھرے لہجے میں) صرف اتنا
کہدینا ہی مجھے ہر شریف آدمی کی ہمدردی کا مستحق بنا دیگا۔ لیکن میری
کہانی —— میری کہانی اس سے زیادہ دُکھ بھری ہے . . . . .

میاں :۔ دُکھ بھری —— !! ہاں کیوں نہ ہو۔ ضرور —— آج کے
سے دُکھ تو آپ کو کئی مرتبہ نصیب ہوئے ہوں گے۔ ہا ہا ہا ——
یہ کیا کاغذ ہے جسے آپ اتنی بے چینی سے چُھپا رہے ہیں۔

مجرم :۔ یہ کچھ نہیں۔

میاں :۔ کیا ہے، ادھر لاؤ —— دکھاؤ فوراً۔

مجرم :۔ جی، یہ کچھ نہیں، معمولی کاغذ ہے —— ارار لفافہ ہے۔
خط ہے۔

میاں :۔ دکھاؤ۔ ممکن ہو اس میں نوٹ ہوں —— نکالو جیب سے۔

مجرم :۔ (قدرے ترشی سے) میں یہ خط آپ کو نہیں دکھا سکتا۔

میاں :۔ کیسے نہیں دکھا سکتا۔ دکھانا پڑیگا —— نکالو، نکالو،
جلدی —— !!

مجرم :۔ (بمجبوری) یہ میری بوڑھی ماں کا خط ہے —— یہ لیجئے۔
(ہلکی سی سُسکی کی آواز)

(لفافہ میں سے خط کھولنے کی آواز)

میاں :۔ ہم سے تو پڑھا بھی نہیں جاتا۔ عجیب جناتی خط لکھا ہے۔

مجرم :۔ جی ہاں میری ماں خود لکھنا نہیں جانتی، کسو کسی سے
لکھوا کر بھیجتی ہے۔

میاں :۔ تو تم پڑھکر سُناؤ —— چھوٹے، تم جاؤ، اب ضرورت

نہیں۔ !

چھوٹے:۔ اجی میاں، اس کا کیا نام۔ آپ ان سنسکرت کی باتوں پر نہ جائیے۔ یہ پنڈت جی تو اس کا کیا نام پوری کتھا سنا ڈالیں گے۔ آپ میرے حوالے کیجئے۔ میں سسرے کو اس کا کیا نام گودام میں بند کر کے رکھونگا

میاں:۔ (تحکمانہ) جاؤ۔

(چھوٹا بڑبڑاتا ہوا جاتا ہے۔ پاؤں کی چاپ اور ڈنڈے کی کھٹ کھٹ۔)

میاں:۔ ہاں اب پڑھئے۔

مجرم:۔ اسے آپ نہ سنتے تو بہتر تھا۔

میاں:۔ (قدرے نرمی سے) نہیں نہیں، سناؤ کیا ہرج ہے۔

مجرم:۔ (رک رک کر موثر لہجے میں پڑھتا ہے۔)

میرے پیارے بیٹے کو ہزاروں دعائیں۔ (سسکی کی آواز)

بیٹا تمہارے بھیجے ہوئے بیس روپے بہت ہی اڑے وقت پہونچے۔ ظالم مکاندار دھکے دے کر نکلوانے کو کھڑا تھا۔ اگر تمہارے روپے نہ پہونچتے تو آج اس سفید چونڈے کو در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتیں۔ جیسے ہی ڈاکئے نے تمہارے روپے دئے میں نے اس کی ناک پر مارے۔ وہ پوچھنے بھی لگا کہ یہ کہاں سے آگئے۔ میں نے بڑے چاؤ سے کہا "میرے بیٹے نے بھیجے ہیں۔ کیا تو سمجھتا تھا کہ میرا کوئی رہا ہی نہیں۔ بھگوان کی دیا سے میرا ایک جوان کماؤ پوت ہے"

(رکھی ہچکی کی آواز)

—— پر بیٹا یہ تو نے سارے روپے مجھے کیوں بھیج دیے۔ اپنے خرچ کو کچھ بھی نہیں رکھا۔ میری طرف سے تو زیادہ چنتا نہ کیا کر۔ میرے دن اب تھوڑے ہی رہ گئے ہیں۔ اور اچھے کٹ رہے ہیں۔ (سسکی کی آواز) مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ اب تیرا کام چل نکلا ہے بھگوان تجھے بہت سا دے، اور سدا سکھی رکھے۔ مجھ بڑھیا کی آشیرباد تیرے ساتھ ہے۔ و دھوا بہن سلام کہتی ہے۔ سب تیرے آنے کی راہ تک رہے ہیں۔ اب کے تو تو نے بہت دیر لگائی۔ مانو عمر بہت گئی۔ سال چھ مہینے پیچھے تو ہو جایا کر۔ کون جانے کب میرا وقت آن پہونچے۔

(مجرم کی ہلکی سسکیاں۔)

میاں:۔ (ترحمانہ) صاحبزادے مجھے تمہاری حالت پر رحم آتا ہے —— کیا تمہاری ماں یہ سنکر زندہ رہ سکے گی، کہ اس کا بیٹا چوری میں پکڑا گیا۔

مجرم (نحیف آواز میں رک رک کر) میں نے آپ سے عرض کیا کہ میں چوری نہیں کرتا —— مجھے اس کام میں بہت تھوڑی کمیشن ملتی ہے۔ آج کل کا زمانہ آپ جانتے ہیں۔ ہر قسم کا کاروبار سرد ہے۔ اور پھر بیمہ تو کوئی کرواتا بھی نہیں —— کیا آپ یقین کرینگے کہ مجھے کئی کئی وقت کے فاقے جھیلنے پڑتے ہیں۔ (قدرے خاموشی)

مجرم:۔ چوری کا بیمہ نئی چیز ہے جس کے پاس جاتا ہوں، انکار کر دیتا ہے۔ لاچار میں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ آسامی کے گھر چار پانچ پھیرے کرنے کے بعد میں اسکے گھر میں رات کو داخل ہوتا ہوں اور سامان اِدھر اُدھر بکھیر کر اور ایک آدھ شیشہ وغیرہ توڑ کر چلا جاتا ہوں۔ لیکن کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ دوبارہ جب جاتا ہوں تو وہ فوراً بیمہ کروالیتا ہے۔

میاں:۔ (متبسم) ہے خطرناک، لیکن نسخہ تیر بہدف ہے۔

مجرم:۔ محض پالیسی حاصل کرنے کی غرض سے مجھے چور بننا پڑتا ہے۔ مجبوری اور فاقہ کشی سب کچھ کروا دیتی ہے جناب !!! —— مجھے خود شرم آتی ہے لیکن کیا کروں۔ غل و شور

(پیچھے کے کمرے میں سے کی مدھم آوازیں۔
"کہاں گیا"۔ چور کدھر گیا۔ کہاں ہے۔ ٹارچ لاؤ۔ یہ کون ہے، کدھر، ہاں —— وہ، اس طرف، ارے کوئی اُوپر تو جاؤ۔ وغیرہ وغیرہ۔)

میاں:۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے مسٹر توپری —— سخت افسوس ہے کہ ہم نے تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیا لیکن، لیکن —— یار ——

تمہائے کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ۔۔ معاف کرنا۔

مجسم: آپ کی مہربانی (خفیف ہنسی کے ساتھ) آپکے اس بن مانس نے سر میں ایک بڑا سا گومڑا ڈال دیا ہے ۔۔۔ (گھبراکر) کیا پولیس آگئی ج جناب ج ج ج ناب۔ پرماتما کے لئے مجھے بچائیے۔ میری عزت آپ کے ....

بیوی کی آواز:۔ اوپر چلو۔ اوپر۔ اوپر۔

میاں:۔ (محبت سے) تم بالکل فکر نہ کرو ۔۔۔ اطمینان سے اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔

قدموں کی آوازیں۔ شور و غل

(چور کو پاتال میں سے بھی ڈھونڈھ نکالنے والے سرفروشوں کا غول کا غول جنگی بینڈ کی سی آوازیں نکالتا، ہوا میں ناچتے بلاتا۔ بیوی اور چھوٹے کی قیادت میں تیزی سے اوپر آتا ہے ۔۔۔)

میاں:۔ (جلدی سے) بیوی ۔۔ شش شش ۔۔!!!

بیوی:۔ آخر یہ معاملہ ۔۔۔

میاں:۔ فکر نہ کرو۔ تم جلدی سے میرے دوست کے لئے پینے کو لاؤ ۔۔ کافی وغیرہ ۔۔ اور، دیکھنا۔ چھوٹے کو اپنے ساتھ لیتی جانا ۔۔۔ جلدی!

(مہم سر کرنے والے جانباز داخل ہوتے ہیں مختلف آوازیں)

میاں:۔ اوہ! آپ لوگ تو بڑی دیر میں آئے ۔ وہ تو بھاگ بھی گیا۔ نکل بھاگا۔ بڑا ہی پھرتیلا تھا۔ لیکن میں نے ایسا ڈنڈا کھوپڑی پر رسید کیا ہے کہ کچھ دن تک تو یاد کریگا۔

لوگ:۔ کدھر گیا۔ کچھ لے تو نہیں گیا۔ کہاں گیا ۔۔ مارا کیوں نہیں ۔۔ زیور ۔۔ سامان ۔۔ پکڑا کیوں نہیں ۔۔ کب، کیسے۔ سامان ۔۔ برتن۔ پکڑتے کیسے، روپے۔ زیادہ نقصان تو نہیں ہوا۔ ۔کدھر ۔۔ بہت تیز ہوتے ہیں۔

میاں:۔ میں نے اور میرے دوست نے ایسا مارا۔ ایسا مارا، حرامزادے کو کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ بس ایک ذرا چوک ہوئی تھی کہ بھاگ نکلا۔

ایک آواز:۔ اور چھوٹا تو کہہ رہا ہے کہ یہی بابو جی چور ہیں۔

میاں:۔ (تادیبا دھیمی آواز میں) منشی جی آپ کو کیا ہوگیا ہے۔ یہ میرے دوست ہیں مسٹر نوری۔ بیمہ ایجنٹ۔ کہیں ایسا ہو سکتا ہے اور آپ انہیں کے سامنے ۔۔۔ (بلند آواز سے) اخاہ! ڈاکٹر صاحب آپ بھی آگئے۔ بڑی تکلیف ہوئی۔ مہربانی، عنایت، ارے رے، پنڈت جی۔ آپ بھی ہیں۔ بڑی کرپا کی ۔۔ اور ذرا پنڈت جی کا ڈنڈا تو دیکھو ۔۔ اخوہ!!!

(مختلف سائز کے قہقہے۔)

ڈاکٹر صاحب:۔ معلوم نہیں آجکل کے یہ چور کیسے ہیں۔ میرے ہاں بھی آیا تھا اور ایس ڈی او صاحب کے ہاں بھی مگر کچھ لے کر نہیں گیا۔ چاہتا تو لے جا سکتا تھا۔ کیونکہ دونوں جگہ کے آدمی مُردوں سے شرط باندھ کر سو رہے تھے ۔۔۔ میں نے تو دوسرے ہی دن آپکے دوست مسٹر نوری سے بیمہ کروالیا۔ اب کچھ گیا تو ان سے دُگنا وصول کرونگا۔

(ہلکے قہقہے)

میاں:۔ کیوں نہیں، کیوں نہیں، آپ سب لوگوں کی بڑی مہربانی۔ بہت تکلیف ہوئی، عنایت ....

لوگ:۔ چلو چلو بھئی، کوئی بات نہیں۔ یہ تو ہمارا فرض تھا۔ آداب عرض۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ بڑی عنایت۔ چلو بھئی۔ آگے دیکھ کر چلئے۔ آئیے پنڈت جی۔ دیکھ کے۔ شکریہ، آداب عرض، آداب عرض، آداب عرض۔ بھاگ کیسے گیا۔ چلو اچھا ہوا۔ بہت چوریاں۔ کوئی بندوبست ....

(بیوی کے قدموں کی چاپ)

بیوی:۔ یہ لیجئے۔ اوولٹین ہے۔

میاں:۔ لیجئے مسٹر نوری۔ تھینکیو۔ تھینکیو۔ لیجئے۔ یہ لیجئے۔

مجرم:۔ آپنے ناحق تکلیف کی ــــ مہربانی ــــ آداب عرض بیگم صاحبہ۔

میاں:۔ اے تم انہیں کیسے جانتی ہو۔

بیوی:۔ کہیں دیکھا تو ہے۔

مجرم:۔ میں چوری کا بیمہ کرنیوالی کمپنی کا ایجنٹ ہوں!

بیوی:۔ (سوچکر) اوہ۔ ہو۔ ہاں۔ آپ میرے پاس دو ایک دفعہ آئے تھے۔ مگر یہ قصہ کیا ہے۔

میاں:۔ قصہ وصہ کچھ نہیں۔ ہمارے دوست نے تمکو ذرا ڈرایا تھا۔ کہ تم جلدی سے بیمہ کرالو۔

بیوی:۔ میں نے تو تم سے ہزار دفعہ کہا کہ بیمہ کروالو۔ مگر تم سُنتے کب ہو ــــ!

میاں:۔ میں نے انکار کب کیا۔ مگر شرط یہی ہے کہ آدھا پریمیم تم کو دینا ہوگا۔

بیوی:۔ (ٹھنک کر) میں کہاں سے دوں، دیں نہ دیں آپ دیں"۔

میاں:۔ کیوں زیور تو تمہارا ہے۔ دو نہ دو تم کیوں نہ دو۔

چھوٹے:۔ (بلائے بے درماں کی طرح نازل ہوتے ہیں) اجی میاں، اس کا کیا نام۔ آپ اِس چور کو دودھ پلا پلا کر اور اُلٹا ہلا رہے ہیں۔ سسُر کو مارتے کیوں نہیں۔

میاں:۔ (ڈانٹ کر) چھوٹے ــــ!!! (ملامت سے) مسٹر نوری، آپ کی اِس ڈرامٹیک تشریف آوری کا شکریہ۔ کل صبح یعنی میرا مطلب ہے آج صبح ہم آپسے بیمہ کروا لینگے۔ لیکن خدا کیلئے آئندہ ایسی حرکت نہ کیجئےگا، ورنہ آپکی جان کی خیر نہیں۔ سمجھے آپ۔ !!! اب آپ تشریف لیجائیں۔

چھوٹے! آپ کو راستہ بتاؤ ــــ آؤ بیوی ــــ آداب عرض۔

(پاؤں کی چاپ)

مجرم:۔ ہیں ہیں ہیں۔ آداب عرض۔ آدا......

ــــــ انصار ناصری، دہلوی،

(یہ ڈرامہ ۴ ۱پریل ۳۸ء کو دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوا۔ اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب کی خاص اجازت سے شائع کیا جاتا ہے۔)

سانپ کا شکار

(۱)

سامنے میدان میں اینٹوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر تھا۔ لوگوں نے کہا کہ "سانپ اسی میں گھس گیا ہے۔" ہم نے کہا کہ "ہم اس موذی سانپ کو ہرگز نہ جانے دیں گے اور سب کی سب اینٹیں ہٹا کر اُسے ماریں گے۔" میں تھا اور میرے ایک کلاس فیلو۔ ہم دونوں ہاکی کھیلنے جا رہے تھے اور اس شکار کیلئے آج کا کھیل ملتوی کیا۔

تماشائیوں سے ہم نے کہا کہ یا تو یہاں سے بھاگ جاؤ اور یا ہمارا ہاتھ بٹاؤ ورنہ کیا عجب کہ ہم تمہیں اسی سانپ سے کٹا دیں۔" کام صرف اتنا تھا کہ اینٹیں ایک ایک کر کے اُٹھا کر پرے پھینکتے جاؤ۔

بہت جلد اینٹوں کو اُٹھا کر پھینک دیا مگر سانپ نہ نکلا۔ ایک سوراخ نظر پڑا۔ سانپ اِسی میں گھس گیا۔ ہم نے کہا کہ "ہم اس موذی کو کھود کر نکالیں گے۔" ایک پُرجوش آدمی دوڑ کر پھاوڑا لے آیا اور سوراخ کھودنا شروع کیا۔ تھوڑی دُور جا کر سوراخ میں دو راستے ملے۔ لاٹری ڈال کر اُن میں سے ایک کو کھودا اور پورا کھود مارا۔ لاٹری غلط رہی لہذا دوسرے کو کھودا۔ کھودتے چلے گئے حتیٰ کہ . . . .

اس موذی سانپ کو اتنی محنت سے کھود کر نکالا مگر بجلی تھی کہ ایک دم سے آنکھوں کے سامنے سے کوند گئی اور میں نعرہ مار کر اس موذی کے پیچھے! اب اسٹک پر اسٹک مارتا ہوں پر سب وار خالی! کمبخت حملہ کرنے لوٹ لوٹ پڑتا ہے۔ ہاتھ ہاتھ بھر اُچھل کر جست سی لگاتا ہے!

بالآخر ایک املی کے درخت کی جڑ کی طرف چلا اور میرے دیکھتے دیکھتے جڑ میں گھس گیا۔ یہاں ہاکی اسٹک کا وار جڑ پر پڑتا تھا اور سانپ تھا کہ گھسا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جاتا ہے لہذا جھٹ سے اسٹک پھینک کے اُس کی دُم پکڑ لی۔ اب آدھا سانپ باہر اور آدھا اندر اور ہو رہا ہے زور۔ اب سانپ ہے کہ پھسلا جا رہا ہے۔ آدمی بھی جمع ہو گئے۔ ایک نے کہا "ہاتھوں کو مٹی میں رگڑ کر پکڑو۔" ایسا ہی کیا۔ اب سانپ ہے کہ زور مار رہا ہے اور کھنچا جاتا ہے پر نہ وہ نکلتا ہے اور نہ میں اُسے چھوڑتا ہوں۔

میرے دوست نے کہا کہ "تم اس کو کھینچو اور میں ہاکی اسٹک سے اِسے کچلتا ہوں۔" چنانچہ یہ عمل جو کیا تو سانپ انچ دو انچ سرکا۔ میں نے دیکھا کہ یہ نکل پڑا تو کیا کروں گا۔ اور لوگ کہہ رہے کہ "اس کو کچل دو تاکہ مر جائے۔" میں نے کہا کہ "اب تو یہ ہرگز نہ ہوگا۔"

ہاکی اسٹکوں پر مضبوط ڈوری کسی ہوئی تھی۔ اس ڈوری کو کھولا اور جلدی جلدی اس کو دُہرا کر کے بٹ لیا۔ اب سانپ کو بیچوں بیچ میں اِس ڈوری سے اِس زور سے کس کر باندھا کہ اُس مقام کا جسم اُس کا کس کر چوتھائی رہ گیا۔ ایسا کہ یہ اندیشہ ہی نہ رہا کہ ڈوری سرک جائے گی۔ اس ڈوری کو ہاکی اسٹک میں باندھ کر میرے دوست نے کھینچا اور میں نے پرے ہٹ کر اپنی اسٹک سے سانپ کا جسم آہستہ آہستہ ٹھونکنا شروع کیا۔ سانپ کو نکلنا پڑا۔ ایک عظیم الشان پھنکار کے ساتھ بلبلاتا ہوا نکلا اور لگا ادھ

اُدھر اس خطرناک طریقے پر دوڑنے کہ اُس کو میدان میں لاکر ہاکی اسٹک کو اینٹ سے دباکر پرے ہٹ گئے۔ تھوڑی دیر تک تماشہ رہا۔ پھر ہم نے ایک گھڑا منگایا، اُس کا مُنہ قریب کر دیا تو اس میں گھُس گیا۔ گھڑے کے مُنہ پر رومال کس کر باندھ دیا اور اس شکار کو گھر لے آئے۔

گھر لاکر زمین میں ایک کھونٹا گاڑ دیا اُس میں یہ سانپ بندھا رہتا۔ اُوپر سے ٹوکری ڈھک دیتے۔ اسقدر زبردست سانپ تھا کہ ٹوکری کھولتے ہی جوش وخروش سے حملہ کیلئے دوڑتا تھا۔ عرصہ تک اسی طرح رہا۔

ایک روز لکڑی سے اُسے دباکر قابو میں کر کے اُس کا پھن پکڑ لیا اور اُس کا مُنہ کھول کر پرکار کی نوک سے اُس کے خوفناک دانت توڑ دئے۔ وہ دانت جن کے ذریعے سے سانپ اپنے زہر کا انجکشن دیتا ہے۔ اب یہی سانپ ایک بے ضرر کھلونا ہوگیا۔

لیکن یہ سانپ جوان تھا اور اس قدر پُرجوش کہ ہاتھ بھر اُونچا کھڑا ہو کر جھلے پہ حملہ کرتا اور ایسی خوفناک پھنکاریں مارتا کہ آدمی کے ہوش اُڑا دے۔

اس سانپ کو پکڑے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ تقدیر نے چکی کا ڈنڈا اُلٹا پھیرا۔ گھر سے تار آیا کہ ہماری شادی طے ہوچکی اور فوراً فلاں تاریخ کو پہونچو۔ اوہو! ہم نے کہا کہ بھئی یہ زوردار بات رہی۔ سانپ تو موجود ہی ہے اب عورت بھی ملے گی تو پتہ چل جائے گا کہ زیادہ خوبصورت کون ہے؟ سانپ یا عورت! تاریخ قریب آئی تو اسکول سے چھٹی لیکر چلے ہم گھر کو۔ یعنی شادی کی فکر میں۔

(۲)

جب ہم گھر پہونچے تو بھابی جان نے لپک کر خبر سُنائی کہ جس سے ہماری شادی طے ہوئی ہے وہ بڑی شرمیلی لڑکی ہے۔ میں نے مُنہ پھاڑ کر کہا "تو پھر، یہ تو کوئی تعریف کی بات نہیں۔۔۔۔" وہ بولیں "شرمیلی بہت ہے صورت اُس نے دیکھنے نہ دی"۔

اب آپ خود سوچئے کہ یہ بھی کوئی تعریف کی بات ہے کہ شرمیلی ہے! لاحول ولاقوۃ! ارے ہمیں تو ایسی عورت چاہیئے جیسے یہ سانپ! اور یہ کہکر میں نے سانپ کو بھابی جان کے مُنہ کے سامنے کر دیا اور وہ پھنکار مار کر ہاتھ بھر اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔

بھابی جان نے ایک قلابازی کھائی اور "اُوئی" کر کے لگیں چارپائیاں پھاندنے۔

جب ہماری برات چڑھکر دُلہن کے گھر پہونچی اور نکاح بھی ہوگیا تو ہم اندر بُلائے گئے۔ رسم یہ ہے کہ دولھا دُلہن کا مُنہ دیکھے اور دُلہن آرسی میں دولھا کا مُنہ دیکھے۔ ایک تخت پر ہماری بیوی بیٹھی ہوئی تھی کہ گوٹے کا ڈھیر! بڑی محنت کی گئی تب بھی اُس نے مُنہ نہیں دکھایا۔ کچھ دیکھنے میں نہ آیا۔ رسم پوری کر کے باہر جو لوٹے تو لوگوں نے ناطقہ بند کر دیا۔ سب یار دوست، اَیرے غیرے پل پڑے پوچھنے "دُلہن کیسی ہے؟" کوئی پوچھتا ہے "گوری ہے؟" کوئی پوچھتا ہے "ناک نقشہ کیسا ہے؟ رنگ کیسا ہے؟" ایک بڑے میاں نے مُسکرا کر پوچھا کہ "دُلہن کیسی ہے؟" بھلا غور کیجئے کیا بتاتا۔ کہدیا میں نے جلکر کہ "آپ جیسی ہے" یہ بڑے میاں بہت بگڑے۔ اوروں سے بھی یہی کہا کہ معلوم ہوتا ہے دُلہن بدصورت ہے۔ غرض میں حیران ہوگیا۔ جب میں نے دیکھی ہی نہیں تو بتاتا کیا خاک۔

قصہ مختصر دُلہن کو بدا کر کے گھر لائے تو بھابی جان نے کہا کہ "چلو ہم تمہیں تمہاری دُلہن اچھی طرح دکھائیں"۔
کمرے میں پہونچکر اُنہوں نے مُنہ کھولنے کی ہر طرح کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی یہاں تک کہ ساتھ والی عورت نے بُرا مان کر کہا کہ "تم دُلہن کو رُلا دوگی"۔ دُلہن نے اپنا مُنہ دونوں ہاتھوں سے کپڑے میں چھپا کر سر تخت پر رکھدیا تھا۔ بھابی جان ہنسکر بولیں کہ "شرمیلی بہت ہے۔ تم اسے فرصت سے دیکھ لینا"۔ ہم نے بھی سوچا کہ ٹھیک ہے فرصت ہی سے دیکھیں گے اسے۔

(۴)

میں نے چپکے سے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بجلی کی تیز روشنی میں کمرہ جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ سفید فرش ہے کہ چاندنی کھلی ہوئی ہے! چاندی کی سجی سجائی چھپر کھٹ پر سونے اور روپے کی گٹھڑی سی رکھی ہے۔ سارا کمرہ خود دُلہن کی طرح سجا ہوا مہک رہا تھا۔ آ ہا ہا! سانپ! عورت! سانپ عورت! عورت! سانپ!
میں نے اب ذرا گردن بڑھا کر جھانک کر دیکھا۔ کھٹکا پاتے ہی بیوی بیر بہوٹی کی طرح اور سکڑ گئیں۔ میں دیکھ رہا تھا! ایک نگینہ کی طرح دُلہن صاحبہ کمرے میں چمک رہی تھیں۔
میں آہستہ سے کمرے میں داخل ہوا" جے شری رتی[1] جی کی"! میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ جواب ندارد۔ میں ایک کرسی کھینچکر بیٹھ گیا۔ باتیں کیں جواب ندارد۔ ہمت کر کے اُٹھا۔ پاس جا کر کان میں ایک ضروری اور کام کی بات کہی جو آپ کو نہیں بتائی جا سکتی مگر جواب ندارد۔ پھر مُنہ کھولنے کی کوشش کی۔ آپ خود سوچئے کہ کیسے نہ کھولوں آخر دیکھوں تو کیا معاملہ ہے۔ کہیں کوئی موذی یا مہاراج تو براجمان نہیں!
دونوں ہاتھوں سے پوری کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ بلکہ دُلہن بہادر نے دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ چھپا لیا۔ اور مُنہ کو پلنگ پر سجدے میں رکھدیا۔
جب میں سب طرح سے تنگ آ گیا تو میں نے جیب میں سے نکال چپکے سے دُلہن پر سانپ چھوڑ دیا۔ ترکیب سے رومال میں ایسا پیٹا کہ رومال چھوڑتے ہی بن پڑے اور زور سے چیخا "ارے سانپ!!"
اب دُلہن صاحبہ نے جو گھبرا کر سانپ دیکھا اور وہ بھنّا کر جو اُن کو پیار کرنے لپکا تو دُلہن صاحبہ اپنا گھونگٹ اور رومال چھوڑ کر ایک نعرہ مار کر وہیں سے "ہائی جیپ" کر گئیں۔ اور ادھر میں نے اچھل کر ہاتھ بڑھا کر کہا "ارے لکڑی لکڑی..... ارے جلدی......"
آپ یقین مانیں کہ ننگے سر، عطر میں مہکتی ہوئی سونے اور روپے کی تصویر، ہُنستی سی آنکھیں اور چاند سا مکھڑا کھولے لکڑی لینے دوڑتی ہیں! اور جھپٹ کر پردہ کی لکڑی گھسیٹ کر مجھے دیدی۔
میں نے لکڑی لینے کو تو لے لی مگر خود سوچئے کہ سانپ مارتا کہ دیکھتا اُن کا چاند سا مکھڑا! میں نے بجائے سانپ مارنے کے سر سے پیر تک اُن کو ایک نظر بھر دیکھا پھر سانپ کو پھر انہیں! ایک طرف کھڑا سانپ جھوم رہا تھا اور دوسری طرف...؟...؟

عظیم بیگ چغتائی

[1] رتی کام دیو کی دُلہن کا نام تھا۔

شعر بازی

کیا خیال ہے؟ یہ جو حکیم لوگ موتی مونگے کے نام سو کنکر پتھر کھلا کر ایک ہنگامہ برپا کرتے رہتے ہیں کہ دل کو یوں تفریح ہوتی ہے، دماغ میں ووں جولانی آتی ہے۔ سچ پوچھیے تو ہم برملا کہہ دیں کہ قبلہ یہ ہیں سب رئیسوں کے چونچلے اور ان حکیم جیوں کے ڈھکوسلے۔ اپنے مزے سے کھائیے تر تراتا قورمہ اور گیہوں کی روٹی چپاتیاں۔ پھر کلی غرارہ کر، کلے میں گلوری دبا، بچھونے پر دراز ہو، آنکھیں موند، عظیم اللہ خانی گڑگڑائیے، دو دو کش خمیرے کے چار چھ کش لیجیے پھر دیکھئے عقل شریف کیا کیا قلانچیں مارتی ہے اور ذہن مبارک کیسی کیسی چوکڑیاں بھرتا ہے۔

چنانچہ اسی عالم میں یہ شگوفہ کھلا۔ دل نے کہا کہ اماں بہت دن سے شعر بازی نہیں ہوئی۔ کیا ابکی چاندنیاں یوں ہی کوری کٹ جائیں گی؟ فوراً دعوت نامے کا مضمون گانٹھا اور یارانِ طریقت کے نام چلتا کیا۔ اب آپ کی دعا سے شعر بازی ہے جس کی روداد تو بعد کو سنئے گا پہلے دعوت کا یہ بے تکلف رقعہ قبول فرمائیے۔

طرح ندارد، ردیف القط، قافیہ سوخت، دو تین شعر سنائیے اور مسند خالی کی، سرقے کی اجازت عام، بشرطیکہ توارد کے نام سے ہو اور سرقہ نیو الا آشنا پابندِ وضع، کہ روایت، درایت، سماعت، بصارت سب بالائے طاق۔ آنکھوں میں آنکھیں لڑائے توارد کئے جائیے خاکسار اپنی مالی کمزوری کے اعتبار سے اس بار واردینِ کرام کے خورد و نوش، زادِ راہ، یا دیگر حوائج ضروری کا انتظام نہ کرسکے گا۔ البتہ جوتیوں کا تا بہ حد امکان ذمہ دار رہوگا۔

گھر کے مختصر صحن میں چھڑکاؤ، دری چاندنی کا فرش، صدر میں مسند اُس پر ایک تکیے صاحب قبلہ، خاصدانوں میں بسی ہوئی گلوریاں ہمراہ اگالدان، کوری صراحیاں، ٹھنڈا پانی، یہ تھا ہماری "شعر بازی" کا اہتمام، ادھر آٹھ کا گجر بجا ادھر خوش فکرے ٹپکنے لگے۔

بساط بچھ چکی تھی، مُہرے اپنے اپنے خانوں میں ڈٹے ہوئے تھے، فکر یہ تھی کہ شعر بازی شروع کہاں سے ہو۔ دفعتاً کھٹ پٹ کی صدا اور کسی کی آمد نے بزم کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

جل تو جلال تو، یاجوج ماجوج تو دو ہی عدد سنے تھے، یہ ثالث بالخیر کون نازل ہوئے؟

ماشاء اللہ سے چاروں ضلع برابر پورے چھ فٹ کے دیو ہیکل بزرگ، سر پر شملہ بقدار علم، نین سکھ کا سفید نیچا کرتہ، خدا جھوٹ نہ بلائے تو کوئی دس بارہ گز گاڑھے کا پٹکا کمر سے لپٹا ہوا۔ ہاتھ میں ایک "القربہ تنبیہ الغافلین"، جسے دیکھ کر کٹر سے کٹر مولوی کو بھی تپ چڑھے، یہ بڑی اور نہایت بے تحاشا داڑھی، آنکھوں پہ کمانی ٹوٹی بینی ٹیڑھی عینک، ایک شیشہ بھوں پر چڑھا ہوا، دوسرا کھسک کر رخسار کی ہڈی پر ٹکا ہوا، موٹے دھاگے کی پچھاڑی سے کانوں میں اٹکی ہوئی۔ پان کی مسلسل جگالی کرتے جس سے کوئی ایک چوتھائی محاسن شریف حنا آلود۔

گرج کر کہا "سلام علیکم۔ یہ شعروں کی بازی کدھر ہے، کب شروع ہوگی، شعر باز کون ہے؟ ایں!"

یہ "ایں" کچھ اس جھٹکے سے صادر ہوا کہ چلتے چلتے ہماری نظر نے ایک سکندری کھائی، اور زندگی کے آثار جب دوبارہ نمودار ہوئے ہیں تو دکھائی دیا کہ مسند پر حضرت ہی حضرت رکھے ہوئے ہیں، ڈرتے ڈرتے عرض کیا "شعر بازی یہیں ہے۔ قبلہ ہی اس کے بادی

ہونگے اور شعر بانی بھی ہیچمدان ہے۔ حضرت کا اسم گرامی؟"

"حاجی عبدالقدوس، تخلص حاجی، گا ہے حاجی جی، بہر حال حسب ضرورت اور وزن شعر کا لحاظ کرتے ہوئے۔ جی۔ اور ہاں ساکن عظیم آباد۔"

یہ "جی" اور "ایں" گویا تکیہ کلام کا دونالا پستول تھا جو بار بار غریب مخاطب پر فیر ہوتا رہتا، ساری بزم ابھی چہ کنم میں تھی کہ حاجی جی نے نہایت بولشویک انداز سے فرمایا "شمع لاؤ ہم شعر پڑھیں گے اور دیکھو ہم شمس العلما بھی ہیں۔ خاص گورنمنٹ شمس العلما۔ جی۔"

"قبلہ یہ سو سو بتّی کے چار برقی قمقمے آپ کے ملاحظہ سے شاید نہیں گزرے؟"

بگڑ گئے اور فرمایا "بغیر شمع کے شاعری حرام ابن حرام ہے۔ ایں!—"

ان کے تیور اور تفقہہ سے مرعوب ہو کر پڑوسی بنئے کی دوکان سے کاٹ کا ڈیوٹ منگوایا۔ اور میٹھے تیل کا دیا جلا کر حاجی جی کے آگے رکھ دیا گیا۔

حاجی جی سنبھلے، کھنکارے، اور ریش بیضا کے ٹھوس اور دو نُسخے گردے میں پنجے سے زیر و بالا خلال کر کے عینک کے اوپر سے چاروں طرف بزم کو دیکھا اور غزل شروع ہوگئی۔

"پڑھوں؟ دیکھو پہلے پہلا شعر پڑھتا ہوں۔ سنو۔

"تم۔ تم یعنی معشوق۔ جی۔ خفا ہو مجھ سے تو میں بھی علی ہذا القیاس" گردن ہلا کر "آپ کی خو ہے وہی، میری علی ہذا القیاس"۔ سلاما لیکم، سلاما لیکم۔"

قافیہ پر بزم میں ایک ہڑبونگ مچ گئی۔ حاجی صاحب نے دوسرا شعر سر کیا۔

"تم جو کہتے ہو۔ کیا کہتے ہو؟ کہ تجھ سے کچھ غرض ہم کو نہیں" "تو حاجی جی کہتے ہیں۔

"ہم کو کب پروا ہے اب تیری علی ہذا القیاس"— جی یہ "کون تو مے۔ فاعلاتن، رائیں تیرا۔ فاعلاتن، کون جو تم فاعلاتن" کہتے ہو۔ فاعلن" دیکھو میں شمس العلما بھی ہوں۔ اور کیا جواب دیتا ہوں"

"کچھ مرے بھی دل میں اب سُوجھی علیٰ ہذا القیاس" دیکھا؟ سلاما لیکم! کیوں بھائیوں میعاد باقی ہو تو ایک شعر معاملے کا اور ہے"

سب نے یکزبان ہو کر کہا کہ "قبلہ آپ کو تو معافی دوام بہ عبور دریائے شعر ہے۔ ارشاد"

"بیٹھتے ہیں جس طرح نزدیک تیرے آکے غیر" اب یہاں سے معاملہ شروع ہوتا ہے"

"ہوگا" آنکھ مار کے "میرے پاس بھی کوئی علیٰ ہذا القیاس" ہے کہ نہیں؟ ایں!"

"مقطع لکھا ہے۔ پوچھتے کیا ہو۔ اسے۔ پوچھتے کیا ہو میاں حاجی نے دلکو جسطرح" اس میں حاجی جی نہیں کہا تو وجہ کیا کہ وزن سے گرتا ہے" پھر سے سنو۔ پوچھتے کیا ہو میاں حاجی نے دل کو جس طرح" "کھو دیا تھا جان بھی کھو دی علیٰ ہذا القیاس"

غزل ختم ہوئی، محفل تہ و بالا تھی، حاجی جی نے ناس کی ایک موٹی چٹکی سے بینی پاک کو ہلکا مسہل دیا۔ اور مسند چھوڑ کر نہایت شمس العلمایانہ بُردباری سے گویا کہ شعر، مشاعرہ اور خود میر مشاعرہ سب پر اُن کی یکساں حکومت تھی، بزم کا فرداً فرداً نظری جائزہ لینا شروع کر دیا۔

اب ایک اور صاحب رونق مسند ہوئے۔ ورزش کا کمایا ہوا بدن، اُس پر نیچی چولی کا پھنسا پھنسا جامدانی کا انگرکھا، تنگ مُہری کا شرعی پیجامہ، سر پر عرق چیں کی قدر کھیا ٹوپی، دولت خانہ بقول میر ع: ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے۔ دلی۔ گاؤ تکیہ کھینچ کر پہلو میں لے لیا۔ اُس پر کہنی ٹیک کر بہ صد تمکنت اہل بزم

کی طرف دیکھا۔

"تبرکاً حضرت اُستاد کا ایک شعر سُناؤں گا۔ فرماتے ہیں اور ایمان کی تو یہ ہے کہ اُنہیں کا حصّہ ہے۔

میں جھوٹا اور بات مری، تم سچے اور قاصد سچّا

بزم نے مصرع اُٹھایا۔

میں جھوٹا اور بات مری، تم سچے اور قاصد سچّا

"طنز ملاحظہ ہو اور ثبوت کتنا لاجواب کہ سُبحان اللہ۔

میں جھوٹا اور بات مری، تم سچے اور قاصد سچّا
پر یہ لفافے حاضر ہیں خط جن جن کو ملفوف ہوئے"

محفل میں کہرام مچ گیا، سُبحان اللہ واہ وا، کے دونگڑے برس گئے ـــــ،

"اس جواہر پارے کے بعد میرے شعر خذف ریزے معلوم ہونگے۔ فقط تعمیل ارشاد ہے"

پھر نہایت رس بھرے گلے سے مزے لیکر ؎

نہ رکھ پیرہن میں پنجۂ وحشت نے کچھ باقی
بس اک دامن کہ ہے آزردۂ مشقِ جنوں وہ بھی

دوسری زمین کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔ سادگی اور بلندی کی داد لئے بغیر نہ رہونگا ؎

ہر ایک جلوہ نظر فریب ہے، وہ اگر دلنشیں نہیں ہیں۔ اور حضور
کہیں نہیں جو یہاں نہیں وہ، یہاں نہیں تو کہیں نہیں ہیں

اس پر لوگوں نے کہا کہ "حضرت خدا کے لئے اور۔ آپ نے تو دلوں میں آگ لگا دی" حاجی صاحب نے داد دی" شاعر ہیں کہ ارگن باجا۔ طبلے سارنگی کی سنگت ہو جائے تو بی اللہ باندی کے مجرے کا لطف آجائے۔ جی! اور پڑھو میاں دلّی وال اور پڑھو"

"ذرہ نوازی ہے آپ کی۔ عرض کرتا ہوں" دھن بدلکر ؎

"کچھ اس قدر ہے مزاجِ دلِ حزیں نازک
کہ عشرتِ غمِ اُلفت بھی ناگوار ہوئی

مُلاحظہ ہو۔ عرض کیا ہے ؎

متاعِ زیست ہے شاید دلِ حزیں کے لئے
وہ ایک خلش جو ہوئی اور بار بار ہوئی"

اب تخفیف تصدیعہ کرتا ہوں، نواب مجّن صاحب کو بھی سُننا ہے، دُور سے تشریف لائے ہیں"

ایک مہین سُریلی آواز آئی "آپ شوق سے فرمائیے، نحیف کا وقت آپ پر سے صدقے"

اس پر تھوڑی دیر قبلہ قبلہ' ہونے کے بعد نواب مجّن صاحب مسند پر تشریف لائے۔ دُبلے پتلے تولوں ماشوں کی جان، شربتی ململ کا سنجافدار انگرکھا، نیچے کیجلی جالی کا ہلکا پستئی کُرتا، بنارسی مشروع کا ٹھسا ہوا پیجامہ، تیچپی کی نکے دار ٹوپی گھونگر والے پٹوں پر جمی ہوئی، ہاتوں میں مہندی اور فیروزے کی انگوٹھیاں، شرمیلی نگاہوں سے اگالدان پر بائیں ہاتھ سے پردہ کرکے پان تھوکا۔ باریک رومال سے ہونٹ اور باچھیں پاک کیں اور مسند پر ذری کسمساکر غزل کا کاغذ رکھا۔

"کیا عرض کروں، ژولیدہ زبانی سے محجوب ہوں ـــ ملاحظہ ہو ؎

جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں
ملگجے پھول ترے بستر کے"

واہ وا کا شور بلند ہوا، نواب مجّن صاحب تسلیمیں کرتے کرتے دُہرے ہو ہو گئے۔

"دوسرا شعر ملاحظہ ہو،

خار کو گل کے قریب دیکھ کے میں یہ سمجھا
چیختے چیختے بلبل کی زباں سوکھ گئی

بزم "سُبحان اللہ نواب صاحب پھر ارشاد ہو" مجّن صاحب نے مکرّر شعر سُنایا۔

"یہ آخری ہے۔ عرض کرتا ہوں،

نازکی ختم ہے ان پر جو یہ فرماتے ہیں ٭ فرشِ مخمل پہ مرے پاؤں چھلے جاتے ہیں"

پھر تسلیمیں بجاتے ہوئے پسینہ پونچھتے خس کی پنکھیا جھلتے مسند سے اپنی نشست پر آ گئے۔

کیا حاجی صاحب خاموش تھے؟ استغفراللہ! کہنے لگے "آپ شعر کیا پڑھتے تھے معلوم ہوتا تھا او وائن پہ طوطا اُتو کرتا جا رہا ہے، جی ــــ"

مجن صاحب کا کلام ابھی کانوں میں گونج ہی رہا تھا کہ ایک گوشے سے صدا آئی۔

"صاحبو اب ہم کیا نہ سُنانے پائیں گے؟ دو تین تو کلہم اشعار ہیں وُہو باسی ہوتے جا رہے ہیں"

سب نے کہا "آیئے آیئے بسم اللہ ضرور ضرور!" دیکھا تو چکن کے کُرتے اور باریک دھوتی میں ایک لالہ صاحب۔ بندگی عرض کو نشر کرتے ہوئے مسند پر آئے۔

دریافت کیا گیا "اسم گرامی!"

"صاحب۔ اسم گرامی تو دیکھئے..... ہے لالہ ہزاری لال، قوم کایستھ سری باستو دوسرے۔ فرزند نرینہ منشی بہاری لال صاحب آنجہانی مدظلہٗ العالی، ساکن و زمیندار قصبہ پالی پرگنہ و تحصیل شاہ آباد ضلع ہردوئی، شاگرد خاص اُستاد خود مدفوظہ"

"آپ کا نام ہزیا چورن والے کی بانی؟ اور یہ آنجہانی اُسپہ مدظلہٗ العالی! جی! ایں!"

حاجی صاحب کا ڈبل بیرل جو چلا تو لالہ صاحب ذری بوکھلائے، مگر ہم نے یہ کہکر معاملہ مختصر کر دیا کہ "ہاں منشی جی ارشاد"

"بس صاحب ہم گھر سے جلدی کے مارے ایک ہی مطلع لانے پائے، مگر یہ ہے کہ ہے مطلع آفتاب، برسبیل استعجال قلم سو نکل پڑا۔ کہا ہے ؎

مقراض موج دامن دریا کتر گئی
کشتی کا بادبان مُشریا کتر گئی" اور صاحب۔

دوسرے قافیہ پر قہقہہ پڑا۔

"منشی جی مطلع تو درحقیقت نایاب ہے مگر یہ مُشریا کیا بلا ہے ــــ؟"

"لے اب کیا بتاویں، ارے صاحب چوہے کو فارسی میں موش کہت ہیں کہ نہیں، پھر اُس کی مادہ مُشریا ہوئی کہ اور کوئی۔ اب تازہ فکر اور سماعت ہوتے جاتے۔ شعر قابل شنیدن ہے۔

ستلا کے داغ ہیں رُخ تاباں پہ اس طرح
مانو کہ کہکشاں ہے کُھلی آسمان پر"

بزم تھی کہ ہنستے ہنستے لوٹی جا رہی تھی، لالہ صاحب نے فرمایا کہ "آپ تو ہم کو خارن میں کشید رہے ہیں۔ مُلاحظہ ہوتے۔ ؎

سُن کے لیلیٰ آ رہا ہے دشت میں
ناقہ مجنوں دِوانہ ہوئے گیا"

"منشی جی واہ، مضمون تو خیر سُبحان اللہ مگر لیلیٰ کا ناقہ تو سُنا تھا، یہ مجنوں کا ناقہ آج تاریخ میں اضافہ ہوا"

"لے اب ہم تو شعر کہت ہیں تاریخ تو لکھت نا ہیں ہیں"

"اور منشی صاحب یہ لیلیٰ کو آپ نے مذکر باندھ دیا، قبلہ یہ تو سماعی اور قیاسی دونوں طرح پر مؤنث ہے"

"پھر اس میں ہم کیا غلطی کہا، آج تک اُردو میں کوئی معشوق عورت بندھا ہو تو سند لایئے، اب رہ گئی یہ عورت مرد کی لڑائی تو بھیّا یہ تو دلّی لکھنؤ والوں ہی کو مبارک ہوتے۔ عورت ہوئے کہ مرد ہم کا اچھا معلوم دیا اُٹھاتے کے شعر میں باندھ دیا"

اس مرتبہ تو حاجی صاحب بالیقین تنبیہ الغافلین ہی سنبھالتے اور لالہ صاحب کا کچومر نکال دیتے۔ جو ہم نے کہا کہ "حضرات تفریح ہو چکی، دو تین شعر ہیں میٹھے بیٹھے ہو گئے ہیں قافیہ حسب حال ہے ملاحظہ ہوں۔

دست جاناں سے اُڑا جاتا ہے۔ غالباً رنگ حنا پاگل ہے
درد مند تپ غم ہے خبطی۔ جو کرے اُس کی دوا پاگل ہے

قطعہ بند ہے۔

میں نے کل مادرِ لیلیٰ سے کہا۔ تیرا داماد سنا پاگل ہے
رو کے بولی کہ حسینوں کے نصیب۔ انکی قسمت میں لکھا پاگل ہے"

حاجی صاحب بولے:" اماں تم تو کوئی اسم بامسمیٰ معلوم ہوتے ہو، مگر یاد رکھو کہ ہم بھی شمس العلما ہیں"

فائدے کی بات۔ اِس مضمون میں کسی شعر کے متعلق اگر شبہ ہو کہ آپ کا ہے تو براہ کرم اپنا بیان حلفی اور صرف پانچ روپے چہرے شاہی "ساقی" کو بھیجکر راقم الحروف کا باز دعویٰ منگوا لیجئے۔ ورنہ خطا معاف، آپ جانتے ہیں۔ ع۔

ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند

"آوارہ"

پیامِ گل

صبحِ رنگیں کو رہینِ شامِ رعنا دیکھکر — ہنس رہا ہوں باغِ ہستی کا تماشہ دیکھکر
عینِ ہستی میں ہر اک غنچہ گریباں چاک ہے — بوئے گل کیا ہے؟ چمن کا نالۂ بیباک ہے
جانتا ہوں مَیں بھی ارمانِ تبسم کا مآل — مجھپہ روشن ہیں رموزِ صبح و شام و حال و قال
ایک تبسم ہو جہاں میں کائناتِ زندگی؟ — ہر کلی کی آنکھ میں ہوں کیفیاتِ زندگی؟
عرصۂ لمحات میں مضمر نہیں عمرِ حیات — زندگی کی گود میں پلتے ہیں ایامِ ممات
چشمِ بینا کیلئے ہر دم جواں ہے زندگی — موت کی آغوش میں خندہ کناں ہے زندگی
زندگی روحِ خزاں و رقصِ ایامِ بہار — زندگی تمہیدِ غنچہ۔ زندگی گل کا مزار
زندگی جوئندگی، تابندگی، رخشندگی — زندگی دریا و موجِ مردئی و فرزانگی
دانۂ گل مر کے بھی رکھتا ہے شانِ زندگی — خاک کے تودوں میں مضمر ہے دکانِ زندگی
ہمتِ پیکار ہے درسِ کمالِ زندگی، — قوتِ تکرار ہے رسمِ مآلِ زندگی

موت کی آواز سے یہ ساز دب سکتا نہیں
زندہ رہ کر کوئی اِس دنیا میں مر سکتا نہیں

جمیل نجیب آبادی

پہلا پتھر

"اِس گنہگار عورت پر پہلا پتھر وہ چلائے جس نے خود کبھی گناہ نہ کیا ہو" (حضرت عیسیٰؑ)

(۱)

رام گڈھ کلب میں ٹینس ہو چکی تھی اور ممبر جن میں شہر کے معزز خواتین اور حضرات شامل تھے برقی روشنی سے منوّر ڈرائنگ روم میں ایک ایک دو دو کی ٹولیوں میں آ رہے تھے۔ چند نے تاش سے شوق کرنا شروع کیا، ایک گنجے پروفیسر نے اپنی توجہ ریڈیو کی طرف مبذول کی اور باقی سب آرام سے صوفوں پر لیٹ کر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں دروازہ زور سے کھلا اور مسز سمتھ، شہر کی لیڈی ڈاکٹر، داخل ہوئیں۔

"ہلو ڈاکٹر صاحبہ" مسز سنگھ نے پوچھا" کہاں رہیں؟ ٹینس پر تو آپ کا انتظار ہی رہا"

مسز سمتھ اب تک ہانپ رہی تھیں۔ کچھ تو اپنے قدرتی موٹاپے کی وجہ سے، وہ تھوڑا سا چل کر بھی تھک جاتی تھیں' اور کچھ اُن کے بُشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک نہایت اہم خبر کی حامل ہیں۔ جس کے گراں بوجھ نے انکی تکان میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ مسز سمتھ اس فیاض طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں جو ہمیشہ اپنے رازمیں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ اپنے پیشہ کی اہمیت جتانے میں بھی اُن کو خاص خوشی حاصل ہوتی تھی۔

"کیا بتاؤں۔ یہ پیشہ ہی ایسا ہے۔ گھڑی بھر کی فُرصت نہیں ملتی۔ بڑی مشکل سے فراغت پا کر آئی ہوں" اور پھر اپنے قریب بیٹھی ہوئی خاتون کی طرف مخاطب ہو کر "تم نے کچھ اور بھی سُنا؟"

یہ سوال انہوں نے ایسی آواز میں کیا کہ سب نے سُن لیا۔ مسز سمتھ اپنی دشنام طرازی کے لئے مشہور تھیں اور اپنے کام کے سلسلہ میں اکثر لوگوں کے متعلق "دلچسپ واقعات" ان کے علم میں آتے تھے جن کو کلب میں بیان کرنا وہ اپنا فرض اوّلین تصوّر کرتی تھیں۔

گنجے پروفیسر نے ریڈیو بند کر دیا۔ تاش کھیلنے والوں نے بازی فی الحال ملتوی کر دی۔ مردوں نے اپنی اپنی ٹائیوں کو درست کیا اور عورتوں نے اپنی ساڑھیوں پر سے شکنوں کو دُور کیا اور سب ہمہ تن گوش ہو کر مسز سمتھ کی جانب متوجّہ ہو گئے۔

"اپنے پیشے کے اُصول کے مطابق مجھے یہ بیان تو کرنا نہیں چاہیئے مگر کلب کے ممبر کی حیثیت سے مجھے لازم ہے کہ آپ کو اس واقعہ سے مطلع کروں۔ کیونکہ ایسے واقعات سے کلب کی بدنامی ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مسز ٹامس کو کلب سے نکال دیا جائے۔"

مسز سمتھ دلچسپی میں اضافہ کرنے اور اپنا گلا صاف کرنے کیلئے ٹھہر گئیں۔ ایولن ٹامس میونسپل سکول میں ایک نوجوان معلّمہ تھی اور ایک مہینہ ہوا کلب میں بعض ممبران کی سفارش پر داخل کی گئی تھی۔ اسکے داخلہ ہی پر کافی چہ میگوئیاں ہوئی تھیں۔ کیونکہ وہ ایک کم تنخواہ معلّمہ تھی۔ اُسکے خاوند کو جو کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اکثر خواتین کا خیال تھا کہ اس کا کلب میں ممبر کی حیثیت سے داخلہ اُن کی ہتک تھی۔ بھلا کہاں فوق البھڑک ساڑھیاں پہننے اور موٹر میں پھرنے والیاں، کہاں وہ ساٹھ روپے کی اُستانی۔ مگر اُن کی خفگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ باوجود ان کے شاندار کپڑوں اور رغازہ اور سُرخی کے استعمال کے ایولن ٹامس سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔

"ہاں تو کیا ہوا مسز سمتھ؟ مَیں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ اس کمبخت کو داخل نہ کیا جائے" ایک خاتون نے کہا۔ یہ بوڑھے اور گنجے پروفیسر اندرسین کی نوجوان بیوی موہنا تھیں۔ تعلیم تو معمولی ہوئی تھی، مگر رام گڈھ کی سوسائٹی کی تتلیوں سے بڑھیا ساڑھیاں پہننا اور فرانسیسی

سامانِ زیبائش کا استعمال سیکھ لیا تھا۔ انگریزی ٹوٹی پھوٹی بولتی تھیں مگر بالکل فرانسیسی انداز میں جیسے کہ کوئی خاص پیرس کی حسینہ انگریزی بولنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔

مسز سمتھ نے آرام لیکر پھر سلسلہ بیان شروع کیا "کیا بتاؤں مجھے تو سناتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ مگر کلب کی بہبودی کے خیال سے آپ کو اطلاع بھی دینی ضروری ہے۔ جیساکہ آپ کو شاید یاد ہوگا ایولن کی شادی چھ مہینے ہوئے ہوئی تھی۔ اور آج اُس کے بچہ پیدا ہوا ہے"

"کیا؟"

"ہاں؟"

"واقعی؟"

"لاحول ولاقوۃ"

"توبہ۔ توبہ"

یکدم چاروں طرف سے یہ آوازیں بلند ہوئیں اور مسز سمتھ آرام سے صوفے پر لیٹ کر لوگوں کے چہروں کا مطالعہ کرنے لگیں۔

"میں تجویز کرتی ہوں کہ ایولن ٹامس کو فوراً نکال دیا جائے۔ ایسی عورت کا ممبر رہنا کلب کی ذلت ہے"

تجویز پیش کی مسز اندرسین نے، موافقت ایک نوجوان انجنیر رام لال نے کی اور بالاتفاق فوراً پاس ہوگئی۔

الگ الگ صوفوں پر اسی واقعہ کے متعلق آہستہ آہستہ گفتگو شروع ہوگئی۔ مگر یہ ظاہر تھا کہ مسز سمتھ کی خبر نے کلب کی فضا میں ایک بے لطفی پیدا کر دی تھی۔ پروفیسر فلسفیانہ انداز میں ریڈیو کے ساتھ کھیل رہا تھا، کچھ لوگ اخباروں کی تصویروں پر نظریں جمائے ہوئے تھے

رام لال انجنیر نے مسز اندرسین کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا جس کا جواب ایک خفیف سی مسکراہٹ سے پاکر وہ اٹھ کھڑا ہوا ــــ!

"اچھا اب میں تو اجازت چاہتا ہوں" اُس نے اوورکوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ اور پھر پروفیسر کی طرف مخاطب ہوکر "پروفیسر صاحب چلئے آپ کو کار میں پہونچا تا جاؤں"

"ہیں؟ نہیں۔ شکریہ۔ میں تو دس بجے ریڈیو پر خبریں سُنکر جاؤنگا" پروفیسر نے بیدار ہوکر کہا "مگر ہاں مہربانی فرماکر موہنا کو پہونچاتے جایئے۔ وہ جانا چاہتی ہوگی"

جانے سے قبل موہنا نے پھر ایولن ٹامس کے متعلق کلب کے سکریٹری مسٹر اختر حسین سے کہا "اچھا تو اختر صاحب آپ آج ہی ایولن ٹامس کو اطلاع دیدیجئے کہ اسکو کلب کی ممبری سے خارج کر دیا گیا ہے۔ ہم ایسی آوارہ عورتوں کو نہیں رکھ سکتے"

"کیوں موہنا" رام لال نے ایک ہاتھ سے موٹر چلاتے ہوئے اور دوسرے کو موہنا کے گردن میں حمائل کرتے ہوئے کہا "اگر پروفیسر کو معلوم ہو جاتے تو کیا ہو"

موہنا نے اس کا جواب ایک پیار بھرے چپت سے دینا مناسب سمجھا۔

(۲)

"آج منشی برق اب تک نہیں آئے" رات کا ایک بجا تو لچھمی طوائف نے اپنے استادجی سے پوچھا۔

پوپلے استادجی نے جواب دیا "تعجب ہے۔ ایسی دیر تو اُن کو ہوتی نہیں ہے کبھی۔ وہ تو بارہ کے بعد ہی آجاتے ہیں۔ اچھا تو اب میں تو چلا۔ آئیں گے بھی تو اب گانا کیا سنیں گے" یہ کہکر وہ تو چلتے بنے۔

"میں بھی اب جاکر سوتی ہوں" لچھمی نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا "اب کبتک انکا انتظار کروں"

"جہاں اتنا انتظار کیا ہے وہاں چند منٹ اور ٹھہر جاؤ" بوڑھی جہاندیدہ نائکہ بولی۔

وقت کاٹنے کیلئے لچھمی نے ہارمونیم بجانا شروع کر دیا۔ لچھمی

خوبصورت نہ تھی۔ عمر بھی ۵۰ سے کم نہ تھی۔ گناہ کی زندگی سے چہرے پر ایک پھٹکار سی برسنے لگی تھی۔ مگر پاؤڈر و غازہ کی مدد سے بجلی کی سُرخ روشنی میں جب بیٹھتی تو کوئی نہ کوئی گاہگ پھنس ہی جاتا تھا۔ گانا اچھا جانتی تھی اس لئے ناچ مجرے سے بھی معقول آمدنی ہو جاتی تھی منشی برقؔ اس کے پُرانے چاہنے والوں میں تھے اور اپنی عاشقی کو پندرہ برس سے نباہے جا رہے تھے۔ وہ شہر کے ایک ہفتہ وار اخبار "خنّاس" کے اڈیٹر تھے، جس کی پالیسی "سرکار کی وفاداری، اسلام کی اخلاقی و مذہبی روایات کو قائم رکھنا اور نئی روشنی کی تباہی سے قوم کو بچانا" تھی۔ شہر کے پُرانے خیال کے طبقے میں اُن کی کافی عزّت کی جاتی تھی، ضلع کے دربار میں اُن کو کرسی ملتی تھی۔ اکثر اوقاف کے متولیوں میں تھے۔ اس لئے کم از کم ظاہر داری کا تقاضہ تھا کہ دن دہاڑے طوائف کے مکان پر چڑھتے نظر نہ آئیں۔ اُنکے آنے کا مقررہ وقت بارہ بجے تھا۔

اب ڈیڑھ بج گیا تھا۔ نائکہ نے بھی اب چھمی سے کہا "بس اب جا کر سو رہو، منشی جی کو کوئی کام ہو گیا ہوگا" چھمی ہارمونیم بند کر کے اُٹھنے ہی والی تھی کہ زینے پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی اور منشی برقؔ ہانپتے کانپتے داخل ہوئے۔

پچاس سے اُوپر عمر، پنشاخہ ڈاڑھی، اس میں گھٹیا خضاب سے قوس و قزح کے رنگ۔ سر پر پٹھے۔ ان میں سیروں تیل پڑا ہوا۔ سر پر چوگوشہ مخمل کی ٹوپی۔ ریشمی شیروانی۔ سلیم شاہی جوتا۔ منشی برق اچھے خاصے چڑیا کے غلام معلوم ہوتے تھے۔

سانس قابو میں آیا تو بولے "ارے چھمی بیٹھو۔ کھڑی کیوں ہو" نائکہ سے پان کی فرمائش کی اور پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ارے بھئی معاف کرنا۔ مجھے آج ذرا ضروری کام ہو گیا تھا۔ اس لئے دیر ہو گئی"

چھمی تجربہ کار طوائف تھی۔ اِس موقع سے فائدہ اُٹھا کر بولی۔ "جی ہاں۔ آپ کو ہمیشہ کام ہی ہوتا ہے۔ یہاں تو انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔ اتنی رات گئے بھلا کیا کام تھا۔ کسی اور کو ٹھے پر گئے ہونگے"

منشی برقؔ نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔ "ارے ہاں! اس عمر میں ضرور کہیں اور جاؤنگا! بھلا پندرہ برس سے جب سے ہماری تمہاری مُلاقات ہے کبھی سُنا ہے کہ میں کہیں اور گیا"

"اچھا تو پھر بتاؤ کہاں گئے تھے؟" چھمی نے اصرار کیا۔

منشی جی نے پہلو بدلا۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا، ٹوپی اتار کر رکھی اور جواب دیا "ارے لو تمہیں نہیں تو کسے بتاؤں گا۔ بڑا دلچسپ قصّہ ہے۔ پہلے ایک پان اپنے ہاتھ سے کھلاؤ تو شروع کروں"

چھمی نے پان دیا اور منشی صاحب نے اپنے زرد پا سیریا زدہ دانتوں میں دبایا۔

"بات یہ ہوئی" انہوں نے کہنا شروع کیا "کہ آج اپنے اخبار کے لئے بہت بڑھیا مواد ہاتھ آیا ہے۔ کلب کے خانساماں سے معلوم ہوا۔ وہاں بھی اسی کی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ وہ عیسائی چھوکری مسز ٹامس ہے نا، سکول میں پڑھاتی ہے۔ اسکے متعلق۔ ایک ہفتہ ہوا اُس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔ اور" منشی جی نے آنکھ مار کے کہا "شہر کے گرجا کے پادری کا رجسٹر کہتا ہے کہ شادی صرف پانچ مہینے ہوئے ہوئی تھی۔ کیوں کیسی رہی؟ تو مَیں اُسی کے متعلق تحققات کر رہا تھا۔ پادری سے ملا، اُس کا رجسٹر دیکھا۔ سکول کے مُلازمین سے پوچھا، لیڈی ڈاکٹر سے ملا۔ تب جا کر یہ مواد دستیاب ہوا ہے۔ پرسوں پرچہ نکلنے کا دن ہے۔ سوچا کہ مضمون بھی لکھ لوں۔ سُنو گی؟ جیب ہی میں ہے۔۔۔۔۔"

چھمی اور اُس کی نائکہ دونوں نے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور اَور قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ منشی جی نے جیب سے کچھ کاغذ نکالے، اپنی قیانوسی عینک ناک پر رکھی اور پڑھنا شروع کیا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اخبار "خنّاس" کی پالیسی کے مطابق ہم ہمیشہ بے پردگی، فیشن، اور عورتوں کی تعلیم کے مضر اثرات کو عوام

پر ظاہر کرتے آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم نے اکثر بے پردہ طبقہ کی بدمعاشیوں اور بداعمالیوں کی مثالیں بھی ناظرین کے سامنے پیش کی ہیں تاکہ مسلمانوں پر بے پردگی اور تعلیم نسواں کے خطرات عیاں ہوجائیں۔ چند ماہ کا عرصہ ہوا ہم نے مخلوط کلب کی رنگ رلیوں کا ذکر کیا تھا۔ مگر آج ہمارے علم میں اس سے بھی زیادہ سنگین واقعہ آیا ہے جو صاف ظاہر کرتا ہے کہ عورتوں کو بے پردہ رکھنے اور اُن کو آزادی دینے سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ شہر کے گرلز اسکول میں ایک نوخیز عیسائی اُستانی ہیں۔ مسز ٹامس، جن کی خانہ آبادی شہر کے گرجا میں پانچ ماہ ہوئے ہوئی تھی۔ اور آج تہذیب جدید کی برکت سے اُنکے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے!......"

چھمی اور اُس کی نائکہ نے ایک قہقہہ مارا اور منشی جی نے فاتحانہ انداز سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا مضمون جاری رکھا۔

"کیا اس واقعہ کے بعد بھی شہر کے شریف مسلمان اپنی لڑکیوں کو گرلز سکول میں پڑھنے کے لئے بھیجیں گے۔ جہاں اُستانیاں ایسی ہونگی وہاں کی لڑکیوں کا کیا حال ہوگا؟ ہم گرلز سکول کی مینجنگ کمیٹی اور خصوصاً اُس کے صدر رائے بہادر موہن لال سے سوال کرتے ہیں کہ کیا اُن کو اس واقعہ کا علم ہے........"

(۳)

رائے بہادر موہن لال نے تیسری بار "خناس" کے مضمون کو پڑھا اور میز پر رکھدیا۔

رائے بہادر موہن لال دس لاکھ روپیہ نقد تین کوٹھیوں، چار باغات اور ایک توند کے مالک تھے۔ عزت اور شہرت دولت کی لونڈیاں ہیں۔ رائے بہادر موہن لال نے اپنی دولت اپنے دو بھتیجوں کی جائداد غصب کرکے اور سٹہ کے ذریعے حاصل کی تھی۔ لیکن اب تو اُن کا شمار شہر کی معزز ہستیوں میں ہوتا تھا۔ آنریری مجسٹریٹ میونسپلٹی کے صدر۔ "ہندو دھرم سیوک سنگھ" کے سکریٹری اور پچھلے سال سے جب انہوں نے دس ہزار نقد چندہ دیا تھا، رام گڈھ گرلز سکول کی مینجنگ کمیٹی کے بھی صدر۔

رائے بہادر صاحب نے اپنی چکنی توند پر ہاتھ پھیرا۔ جو چکن کے کُرتے میں سے چمک رہی تھی۔ ایک ڈکار لی۔ اور چوتھی بار پڑھنے کیلئے "خناس" اُٹھایا ہی تھا کہ ان کے لنگوٹیا یار خان بہادر چھٹن میاں صاحب داخل ہوئے۔ اُن کے ہاتھ میں بھی ایک "خناس" کا پرچہ تھا۔

خان بہادر چھٹن خاں ایک خاندانی رئیس تھے۔ انکے دادا کے ہاں چھ ہاتھی اور چھ طوائفیں تھیں۔ ان کے والد کے پاس ایک گھوڑا اور فقط ایک ہی خانہ زادی تھی۔ چھٹن خاں کو ہمیشہ افسوس رہا کہ اجناس کی گرانی کے سبب وہ کبھی ایک طوائف گھر پر نہ رکھ سکے۔

"ارے یار یہ کیا لکھا ہے؟" خان بہادر صاحب نے بیٹھتے ہی فرمایا۔

"میں نے خود ہی ابھی پڑھا ہے۔ سخت بدنامی کی بات ہے۔ سکول کی ناک کٹ گئی" رائے بہادر نے جواب دیا۔

"ارے جناب تمام شہر میں یہی چرچا ہے۔ لوگ کہتے ہیں ہم اپنی لڑکیوں کو ایسے سکول میں نہیں بھیجیں گے" خان بہادر صاحب بولے "اب آپکا کیا ارادہ ہے؟"

"ارادہ کیا بھئی۔ اب مینجنگ کمیٹی کے سامنے معاملہ رکھنا پڑیگا" رائے بہادر صاحب نے فرمایا۔

"مگر ایسی عورت کو تو آپ کو ایک منٹ سکول میں نہ رکھنا چاہیئے" خان بہادر نے کہا "ورنہ اپنا اسکول خالی ہوا سمجھئے۔ آخر آپ کو بھی تو بحیثیت صدر مینجنگ کمیٹی کچھ اختیارات ہیں"

"تو کیا فوراً نکالدوں"

"اور کیا۔ اگر اپنے سکول کی خیریت چاہتے ہو۔"

"مگر اس سے پوچھ تو لیا جائے"

"ارے میاں، اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟ نکال باہر کرو سالی کو"

رائے بہادر صاحب کو بھی اپنے اسکول کی نیک نامی کی بہت فکر رہتی تھی کیونکہ اس کی بدنامی سے اُن کی بھی بدنامی ہوتی تھی اسلئے اُنہوں نے وہیں کاغذ قلم منگا کر مسز ٹامس کی برخواستگی کا حکم لکھ اُس کے گھر بھجوا دیا۔

جب نوکر خط لیکر روانہ ہوگیا تو رائے صاحب نے افسوس بھرے انداز میں کہا "کمبخت اگر اس قماش کی تھی تو آخر ہم لوگوں نے کیا قصور کیا تھا کہ محروم رہے۔"

(۴)

"ارے بس ہنسی بند کرو۔"

اَیولن کو غصہ آرہا تھا اور اُس کے خاوند کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔

"میری نوکری چلی گئی اور تم ہو کہ ہنسے جارہے ہو۔" اُس نے ٹامس کے بال کھینچتے ہوئے کہا۔

"یہ شہر کمبخت اس قابل نہیں ہے کہ تم یہاں رہو۔" ٹامس نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ "اب میں اپنی اَیولن کو یہاں چھوڑونگا ہی نہیں۔"

"تو تمہارے پچاس روپے پر کیسے دونوں گزارہ کریں گے۔ اور ان لوگوں کو دیکھو کہ مجھے بلا کر پوچھا بھی نہیں۔ اس ذلیل چیتھڑے "خناس" کے لکھنے پر مجھے نکال دیا۔ میں کل ہی اپنی پہلی شادی کا سرٹیفکیٹ لے جاکر رائے بہادر کو دکھاؤنگی۔"

"وہ اس قابل نہیں ہے کہ تم اُس سے ملنے جاؤ۔ تمہاری پاکبازی کا انحصار رائے بہادر موہن لال کی رائے پر نہیں ہے۔ نہ رام گڈھ کلب کی ممبری پر۔ میں کہتا ہوں کہ تم اس جگہ کی فکر ہی نہ کرو۔ اور کل صبح ہی میرے ساتھ دہلی چلو۔ بھلا رام گڈھ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ رہی ہماری شادی تو وہ ہمارا فعل ہے۔ ہم خواہ دس دفعہ شادی کریں۔ کہو تو دہلی میں تیسری دفعہ گرجا میں جاکر نکاح پڑھالیں۔ ... مگر اَیولن، یاد ہے، جو مزہ اس خفیہ شادی میں آیا تھا۔ کس طرح تم گھر سے چھپ کر آئی تھیں، اور گرجا میں جب پادری بائبل پڑھ رہا تھا تو تم کانپ رہی تھیں......"

"یہ سب تو ہے۔ لیکن میں کہتی ہوں دہلی جیسے شہر میں ہم کیسے تمہاری تنخواہ پر گزارہ کرینگے۔"

ٹامس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ "ارے میری منّی، میں نے تجھے ابھی یہ تو بتایا ہی نہیں۔ مجھے اپنے دفتر کی ہیڈ کلرکی مل گئی ہے۔ اب ستّر روپے تنخواہ ملے گی، ستّر روپے......"

"اوہو۔ سچ بتاؤ۔" اَیولن نے خوشی سے ٹامس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اور نہیں تو۔ اور ابھی پوری بات تو سنو۔ کوئین الزبتھ ہائی سکول کی ہیڈ مسٹرس سے میں ملا تھا۔ اُسنے کہا ہے کہ اُسکے ہاں ایک استانی کی جگہ خالی ہے۔ یقین ہے تمہیں وہ لے لیگی۔"

"ارے سچ!" اَیولن خوشی کے مارے سُرخ ہوگئی۔ "اب تو کل ہی اس منحوس شہر سے بھاگ چلو۔"

"ہاں" ٹامس نے جوابدیا "مگر کچھ اور بھی یاد ہے۔ آج ہماری پہلی شادی کی سالگرہ ہے۔ اس کا تو جشن منانا چاہیئے۔"

اسی رات محلہ والوں کا سونا حرام ہوگیا۔ گراموفون پر گانے کے رکارڈ، ٹامس اور اَیولن کے قہقہے اور اُن کے بچے کے رونے نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔

خواجہ احمد عباس

جذبِ عشق

خوشا وہ دور! کہ مغرورِ حسن ہم بھی تھے
ہزاروں دل تھے جنہیں روندتے تھے قدموں سے

خیالِ دوش، نہ فردا، نہ فکرِ نیک و بدے
چمن تھے نار بھی معصومیت سے گھر دیتے

اچانک اک نگہِ سحر نے، وفا دم نے
اس عرشِ دل کے بھی، ہاں، کنگرے ہلا ڈالے

نیا شباب، دلِ پاک، بولِ الفت کے
نسیمِ خلد کے آتے تھے جیسے جھونکے سے

قسم وفا کی، محبت کی، جور کے شکوے
دلِ گزیدہ پہ چرکے یہ، اور نشتر کے

وفا نے کھولیں جو باہیں، تو عشق جا لپٹے
تھے لب پہ لب کہ محبت کے چار حرف ملے

یہ زندگی تھی نئی، آن اور شان نئی؛
دلِ فسردہ میں ڈالی کسی نے جان نئی

تجملات کا جلوہ دکھا دیا کس نے؟
تعشقات کا جادو چلا دیا کس نے؟

تقیدات کا پردہ اٹھا دیا کس نے؟
دوئی کو میٹ کے یکتا بنا دیا کس نے؟

سکونیات کا خاکہ اڑا دیا کس نے؟
تحیرات کا نقشہ جما دیا کس نے؟

شکست و فتح کو یکسر مٹا دیا کس نے؟
جبینِ ناز سے سجدہ کرا دیا کس نے؟

تصورات میں خود کو بسا دیا کس نے؟
بگاڑ کر مرا سب کچھ بنا دیا کس نے؟

بنا کے، خاک میں پھر سے ملا دیا کس نے؟
مٹا کے، خاک کو سرمہ بنا دیا کس نے؟

اسی کرم نے، عنایت نے، دوستداری نے!
اسی نگہ نے، محبت نے، جاں نثاری نے!

کبھی وہ چپکے سے آنا، وہ گدگدا دینا
نظر نظر سے ملا کر وہ مسکرا دینا

تڑپ کے، جھوٹی تڑپ سے، کبھی رلا دینا
مژہ پہ دیکھ کے اشکوں کو، کھلکھلا دینا

جو وقت کام کا بتلایا، بڑبڑا دینا
چھپے سے کانٹا گھڑی کا کبھی گھٹا دینا

کبھی جو غم بھی ہوا بات میں اُڑا دینا | ہنر بڑھانا سدا عیب کو چھپا دینا
مٹانا ہجر سے، اور وصل سے جلا دینا | فنا بتا کے، حیاتِ ابد بقا دینا
وہ اپنا دل سے فدا ہونا، جاں گنوا دینا | ستم ہو، مہر ہو، دل تھا یہ، اور دُعا دینا

وہ طفلی تھی، کہ جوانی تھی، راز داں، نہ چھیڑ!
نہ چھیڑ، بہر خدا، غم کی داستان نہ چھیڑ!

وہ دن کہ جس میں وفاؤں کی تھی گھٹا چھائی | وہ رات، جس میں محبت کے نور کی تھی جھڑی
وہ عہد، نام ستم کا بھی جب کہ تھا شوخی | وہ دور، جس میں مسرت تھی، عیش تھا مستی
زمانہ وہ، کہ پرستش تھی زندگی اپنی | وہ دن کہ ہم بھی کسی کے تھے قبلہ گاہِ دلی
وہ حسن و عشق کہ نازاں تھا جس پہ ربِ جلی | بلائیں حور جو لیتی تھی، جھومتی تھی پری
جفا وہ، جس میں کرم کی ہزار رنگینی، | وفا وہ، جس سے محبت بھی تھرتھراتی تھی
وہ حال، جس میں مسرت تھی یادِ ماضی کی | وہ آنے والا، خوشی جس کی حال سے تھی بڑھی

گیا تو جائے، وفا کی جو شان باقی ہے
جو غم ہے، یہ، کہ مرے پر بھی جان باقی ہے

جو تابِ درد ہے، اے دل، فگار ہوتا جا! | جو داغ نقش بنیں، تو نگار ہوتا جا!
جو ضبطِ سوز نہیں، بے قرار ہوتا جا! | بجھے نہ سوز، تو ہو اشکبار، ہوتا جا!
کسی کے جلوے کا آئینہ دار ہوتا جا! | خزاں میں بھی چمنِ نو بہار ہوتا جا!
جو شوقِ دید ہے، اُمیدوار ہوتا جا! | کسی کے راہگذر کا غبار ہوتا جا!
قدم قدم پہ رہِ انتظار ہوتا جا! | پلک پلک سے صفا کا رِخار ہوتا جا!
فنا سے درسِ فنا بار بار ہوتا جا! | ستانے والے پہ اپنے نثار ہوتا جا!

جو جذبِ عشق ہے، معشوق پھر سے پالیں گے!
کبھی تو پوج کے بُت کو خدا بنالیں گے!

سید علی شاہ کرنا، بی، اے

نوائے فراق

ہر نظر رنگینیوں میں یادگار ہر ادا میں مستیٔ صبحِ بہار

یار کے بس میں نہیں اب نازِ یار کیا کیا یہ اے دلِ ناکردہ کار

بزمِ ہستی ہے سراپا انتشار حسن کے دل میں بھی تھا کتنا غبار

اضطرابِ عاشقی تجھ پر نثار کس کا غم ہے اے نگاہِ نازِ یار

اب کہاں وہ دردِ وصل و ہجرِ یار بھول بیٹھا تجھکو عشقِ بیقرار

ہوش و مستی سے گذر جا عشق میں سن پیامِ نرگسِ رعنائے یار

بھول جاتے ہیں جہاں کے سانحے یاد آتے ہیں ترے قول و قرار

لرزشِ پنہاں سی ہے افلاک میں چال پر تیری ستارے بھی نثار

اور ہی انداز کے ہیں درسِ ضبط اور ہی عنوان سے گریہ ہے زار

حسن کی انگڑائیاں یاد آ گئیں جیسے ٹوٹے بادۂ غم کا خمار

سب کرشمے ہیں سکوتِ حسن کے نظمِ ہستی حشر کا ہنگامہ زار

کس قدر بیکس ہے عشقِ بدگماں آنکھ پُر نم، ہاتھ میں دامانِ یار

ایک عالم ہے سکونِ شامِ ہجر آ گیا چلتی ہواؤں کو قرار

طول کھینچا انتظارِ یار نے اب نہیں اتنی فضائیں بیقرار

شرطِ الفت کیا ہے بس اک شرطِ سکوت جان جاتی ہے تو جائے دم نہ مار

بے نیازِ نیستی بھی کر دیا ان حیا پرور نگاہوں کے نثار

ایک ہی نا کامیاں خوش کامیاں اک فسانہ ہی ہے جبر و اختیار

کھلتے جاتے ہیں رموزِ صبح و شام تجھکو دیکھا اے نگاہِ لطفِ یار

یہ اداسی اے سبکسارانِ عشق بارِ خاطر ہو گیا احسانِ یار

ماورائے مشکل و آساں ہے عشق کچھ نہیں ہونیکا ناداں سر نہ مار

سست کتنی ہے بنائے عشق بھی اک تغافل پر ہے کُل دار و مدار

اُف خلوصِ حسن کی نیرنگیاں سچ بتاؤ کس کو تم کرتے ہو پیار

اپنے مرکز پر ہیں اب ذراتِ دل دور پہونچا عاشقی کا انتشار

اضطرابِ شوق رسوا ہو چلا اٹھتی چل اب اے نگاہِ شرمسار

بن سراپا نشترِ پنہاں فراق کر علاجِ دردِ وصل و ہجرِ یار

فراق گورکھپوری

سوچنے کی علّت

ہمارے دوست "بھڑ بھڑتے شاہ" کے افکار و ارشادات معقول ہوتے ہیں یا مہمل اس کا فیصلہ آسان نہیں مگر انکے سب سامعین اِس رائے پر متفق ہیں کہ وہ انوکھے اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ اور خاکسار راوی اُن کی زیادہ قدر اسی لئے کرتا ہے۔ اسے بھی معقولیت اور پند و نصیحت کی خشکی سخت ناپسند ہے۔ بات حق ہو یا ناحق طرزِ ادا میں کوئی ندرت ہونا چاہئے۔ ایسی ہی باتیں دل نشیں ہوتی ہیں۔ اِسی نقطۂ نظر سے مَیں حضرت بھڑ بھڑتے شاہ کے کچھ دماغی پکوڑے ناظرینِ ساقی کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ یہ ہوتے ہیں ذرا دیر ہضم، اس لئے بیک وقت تھوڑی تھوڑی مقدار سے ضیافت ہوگی۔ اگر ناظرینِ ساقی کو موافق آئے تو دَور جاری رہیگا ورنہ موقوف۔

مُسلم،

بھڑ بھڑتے شاہ معمولاً کم سخن بلکہ بے سخن ہیں۔ مگر کبھی ذرا سی چھیڑ سے ان پر بکواس کا دَورہ پڑ جاتا ہے اور ایک صحبت میں دنوں کی تلافی ہو جاتی ہے۔ ایک سوال پر میں نے کہہ دیا "ذرا سوچ لوں تو عرض کروں گا"۔ پھر کیا تھا جیسے تالاب کا بند ٹوٹ گیا۔ میری مانگی مُراد بر آئی اُن کی تقریر حرف بحرف پی لی۔ اور انکے اٹھتے ہی قلمبند کرلی۔

تم نے آج تک اپنے ہر اُستاد اور ناصح سے یہی تعلیم پائی ہے کہ کوئی کام بے سوچے سمجھے نہ کیا کرو۔ ہر بات کو پہلے اچھی طرح سوچ لیا کرو پھر عمل کرو۔ مَیں آج تم کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ سوچنا اخلاقی مرض ہے، دماغی روگ ہے، عملی گھن ہے۔ دُنیا میں ایسے معاملات بہت تھوڑے ہیں جو کھرے سچے حق بھی ہیں اور سوچنے کے محتاج بھی۔

حق و باطل، خطا و صواب، جائز و ناجائز، نیک و بد میں اتنا نُمایاں امتیاز ہوا کرتا ہے کہ اُن میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں ہوا کرتی۔ ایک مسئلہ حق ہے تو پھر سوچنا کیسا؟ سوچنا دلیل ہے بدنیتی کی، بدباطنی کی، مکاری کی، سازش کی، سوچنا کام ہے شاطر کا شطرنج کی چال میں، چور شاہد باز اور مجرم کا گرفت سے بچنے کیلئے، مدبرانِ سیاسی کا غنیم کو دھوکا دینے یا پروپگنڈا کرنے کیلئے سرمایہ داروں کا دولت کے غیر معتدل استحصال کیلئے۔ بھلا ایک شریف صلح جُو پاکباز آدمی کو سوچنے کا کیا کام؟۔

ہاں اور سوچنا پیشہ ہے ضعیف الارادہ زن مُرید کا جو ہر بات پر کہتا ہے کہ "سوچ کے جواب دونگا"۔ جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ذرا گھر والی سے پوچھ لوں۔ ادر گھر والی بھی اکثر سوچ لینے کی مہلت لیتی ہے یعنی اپنی ماں سے سرگوشی کرلیتی ہے اور کبھی یہ بڑی بی پڑوسنوں سے مشورہ کر چکتی ہیں جب جا کر کہیں فیصلہ ہوتا ہے اور فیصلہ کیا ہوتا ہے زیادہ معاملہ بگڑ ہی جاتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ سوچنے والے کی مٹی پلید ہے۔

اکثر نسبت ناطہ کی بات بہت سوچنے کے لائق سمجھی جاتی ہے۔ اس کی حقیقت بھی سُن لو۔ جہاں تک دلہن منتخب کرنے کا تعلق ہے یہ سوچنا بھی زیادہ تر مجرمانہ ہوتا ہے، موٹی سی بات ہوتی ہے۔ عورت ہو جوان ہو مضبوط ہو مگر میاں سے کم۔ اتنی ضرور ہو کہ چالیس پچاس بالٹی بے تکان کوئیں سے کھینچ لے، ہانڈی برتن صفائی سے مانجھ لے۔ چکّی پیس لے، ڈھیکی چلا لے۔ کبھی میاں کے ہاتھ پاؤں میں تیل مالش کرے اور بدن دبائے تو معلوم ہو کہ ہے کوئی مرد نہ کہ چوہیا۔ گھر میں کم سخن اور صلح پسند ہو مگر پڑوسن سے معاملہ پڑے تو ایک

کی سوئیں ناسے اور گالی کو سنے کا جواب چونڈا کھینچکر گھٹنوں کے نیچے دَبا لینے سے دے سکے۔ ایسی کارآمد بیوی نادرالوجود نہیں۔ اب سوچنا کیا ہے؟ سوچنے کی بات یہ ہوتی ہے کہ مجھے اس سے مالی منفعت کیا ہوگی۔ آپ سونے کی چڑیوں کے انتخاب اور منافع کے شمار حساب کے لئے سوچتے ہیں۔ آپ کو بیوی کے ذاتی اوصاف سے غرض نہیں صحتِ جسمانی، تعلیم تربیت بلکہ حسب نسب کی پوچھ گچھ کرنا بھی مقصود بالذات نہیں، صرف آمدنی جوڑنا ہی۔ تو کہیئے یہ سوچنا بھی مجرمانہ ہے یا کچھ اور؟۔

رہا معاش اور روزگار کا سوچ۔ سو اب اس کی ضرورت نہیں۔ بے روزگاری نے یہ سوچ بچار بھی ختم کر دیا۔ جو کام مل جائے اختیار کرلو، سوچنے کی گنجائش نہیں۔

شاہ صاحب ابھی خدا جانے اور کتنی طرح کے سوچ کا تجزیہ کرتے کہ خدا سمجھے بے تُکے خاں سے۔ "زن مُرید" والی بات میں اُن پر شَہ پڑ چکی تھی، جھلائے ہوئے تھے یا کیا، دفعتاً انہوں نے شاہ صاحب کے سامنے مٹھائیوں کی طشتری پر ہاتھ مارا۔ چاٹ کی پیالی اُلٹ گئی، بسکٹ دور لڑھک گئے، جھپٹ کر دو بسکٹ ہاتھ میں اور دو لڈو مُنہ میں رکھ لئے اور چباتے ہوئے بولے:-

"شاہ صاحب میرا یہ کام بھی بے سوچے سمجھے تھا، کہیئے کیسا رہا؟ آپ کو خفا ہونے کی کوئی وجہ تو نہیں معلوم ہوتی۔ میں ٹھہرا مضبوط اور قوتِ ہاضمہ زبردست، آپ نحیف الجثہ ضعیف المعدہ۔ یہ انصاف نہ تھا کہ ہم دونوں کے حصے برابر ہوتے۔ مجھے بھوک باقی تھی آپ کے سامنے یہ بسکٹ مٹھائیاں ختم ہونے پر نہ آتی تھیں، میں نے کھا دیا۔ اب آپ کیا فرماتے ہیں؟"

شاہ صاحب مُسکرائے "آپ نے خوب کیا۔ ناحق معذرت کرکے اس حرکت کو اہمیت دیتے ہیں، اور اس کے جواز کو مشتبہ کرکے سوچ کے جُرم کا اظہار کر رہے ہیں۔ آپ کا یہ اُلجھنا بھی غیر ضروری تھا۔ مٹھائیوں سے میری بے رغبتی دیکھکر آپ اُن کو انسان کی طرح بھی حاصل کر سکتے تھے۔ رہا اس حرکت کا ردِ عمل یا جواب۔ بے سوچے سمجھے ایمانداری سے اس کے دو ہی جواب ہیں۔ انتقام یا درگذر۔ اور سوچ والا جواب ایک درمیانی چیز ہے، کینہ۔ مَیں بھوکا نہ تھا اس لئے آپ کی دست درازی پر غصہ نہ آیا لہٰذا انتقام کا سوال ہی پیدا نہ ہوا، دوسرے آپ مجھ سے مضبوط بھی ہیں نتیجۂ انتقام معلوم تھا۔ میں نے معاً درگذر کا فیصلہ کرلیا اور سوچتا تو کینہ کے انڈوں سے فساد کے بچے نکلتے۔"

دراصل بے تُکے خاں نے اپنی حرکت سے شاہ صاحب کے فلسفہ کو باطل ثابت کرنا چاہا تھا مگر نتیجہ اُلٹا ہوا۔

محمد مُسلم۔ ایم۔ اے؛

ناکامی جرم ہے

(از ملفوظات حضرت بھڑ بھڑتے شاہ)

صرف کھُل جانے پہ بنجاتا ہے ہر عیب گُناہ   جُرم چوری نہیں چوری کا پکڑا جانا ہے
پاس زر ہے تو زنا زندہ دلی ہے۔ ورنہ   بوسہ بیوی کا بھی اِک فعل بہیمانہ ہے
قتل و غارت میں جو ہو جائے تجھے فتح نصیب   پھر تو ہیرو، تو حق آگاہ، تو ہی دانا ہے
تیری قسمت سے ہو ناکام اگر سعیِ دفاع   تو کمینہ ہے، جفا پیشہ ہے، دیوانہ ہے

باپ

کسی شخص پر عظمت تھوپ دیجئے اور اُسے ممنوع قرار دیکر علیحدہ کسی بلند جگہ پر بٹھا دیجئے تو اُس میں باپ کی سی جھلک پیدا ہو جائے گی۔ یعنی باپ ایک نفسی کیفیت ہے۔ جسے بچے پیدا کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر کسی مرد کے گھر بچہ پیدا ہو جائے تو وہ یقینی طور پر باپ نہیں بن جاتا۔ ہاں اگر یہ مصنوعی عظمت علیحدگی اور "خبردار" کا سا انداز مٹ جائے تو کسی باپ کیلئے وقت کاٹنا از حد مشکل ہو جائے اور دنیا بھر کے باپ زندگی سے بیزار ہو جائیں۔ جس طرح لوہے کی الماری اور ساہوکار کے درمیان ایک ابھری ہوئی توند نہ ہو جس پر ہاتھ پھیرا جا سکے تو "ساہوکار کی نفسیت"[1] قائم نہ رہ سکے۔

کسی بچے کے دل میں جھانک کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ باپ ایک قوی ہیکل مرد ہے جو دور بیٹھا رہتا ہو۔ اور اس کے باوجود سب کچھ جانتا ہو جس سے اماں ہر وقت ڈراتی رہے۔ جس کے پاس بہت سے پیسے ہوں جس کے متعلق یقین سے نہ کہا جا سکے کہ وہ کب مسکرائیگا یا کب گھوریگا۔ جسے زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے قطعی دلچسپی نہ ہو جس کی طبیعت ناساز ہو تو بچوں پر یہ لازم ہو جائے کہ کھیلنا کودنا چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہیں۔ اور یہ سوچتے رہیں کہ آپا کے بازو پر چٹکی بھری جائے یا بلی کی دم کھینچ لی جائے یا ننھے کا کھلونا چرا لیا جائے تو بڑا مزہ رہے۔ اور جس کی طبیعت اکثر ناساز رہے۔

ہم نے اپنے دل میں خدا کے متعلق جو تخیل قائم کر رکھا ہے وہ کسی بڑی فیکٹری کے منیجر کا سا نہیں جو ادھر اُدھر گھومتا ہے۔ ملازمین سے ملتا ہے۔ اور حالات کا مطالعہ کرتا ہے۔ بلکہ ایک بڑے خزانچی کا سا ہے جو لوہے کی سلاخوں کے پیچھے ایک لوہے کے بہت بڑے صندوق کے سامنے مسند پر بیٹھا رہتا ہے۔ بچوں کے دل میں بھی باپ کا تخیل ایسا ہی ہے یعنی جسے گھر کا انتظام چلانے کے لئے اِدھر اُدھر چلنا پھرنا نہیں پڑتا۔ بلکہ جو دُور بیٹھکر "کُن" کہدے اور گھر کا انتظام خود بخود چلتا رہے۔ البتہ کبھی کبھی جبکہ گھر میں جھگڑے یا فساد کا احتمال ہو تو امن قائم کرنے کے لئے اُسے ایک خاص آواز اور لَے میں کھنکھارنا یا بچوں میں سے کسی ایک کا نام لینا پڑتا ہے ——"حمید!"—— اور حالات فوراً سنور جاتے ہیں۔

باپ بننے کے لئے یہ لازم ہے کہ ایک اپنی بیوی ہو۔ ایک ایسی بیوی جس کے بچے بھی ہوں اور جسے سب کے سامنے اپنایا جا سکے۔ اِس امر کا تولید سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ غالباً دنیا میں ایسے مرد بھی ہونگے جن کو کبھی شُبہ بھی نہیں ہوا کہ وہ باپ ہیں۔ اور اِس غلط فہمی میں وہ اعلانیہ ہنسنے کھیلنے اور اپنے آپ کو عوام میں سے سمجھنے سے گریز نہیں کرتے۔ اور شاید ایسے بھی ہوں۔ جو ایسی لطیف اور انسانیت بھری حرکات کو اپنے آپ پر اس خیال پر حرام کر چکے ہیں کہ وہ باپ ہیں۔ چونکہ اُن کی بیویاں اُن کو "حمید کا ابا" یا "سعید کا میاں" کہتی ہیں اور لوگ انہیں حمید یا سعید کا ابا سمجھتے ہیں۔

بہر صورت کسی مرد کو باپ بننے کیلئے یہ لازمی ہے کہ اُس کی بیوی اُسے "حمید کا ابا" کہکر بلائے۔ لوگ اُسے "حمید کا ابا" سمجھیں اور آخر کار

---

[1] Psychology of a capitalist.

بذاتِ خود وہ اپنے آپ کو "ابا" تسلیم کرلے یعنی اپنی بیوی کا کہنا لوگوں کا سمجھنا اور اپنا ایمان ان تینوں باتوں کے قائم ہوجانے کے بعد "نفسیتِ پدری"[1] کی تکمیل ہونی شروع ہوجاتی ہے۔

تو ظاہر ہے کہ "باپ" "بحیثیت رشتہ" یا "تعلق"[2] یا "بحیثیت برتاؤ" فطری امر نہیں بلکہ اعتباری ہے۔ یعنی باپ بننے کیلئے بچے پیدا کرنے لازم نہیں اور باپ بن کر ہم بچوں سے یا ان کے روبرو کسی مخصوص برتاؤ پر پابند نہیں ہوجاتے۔ جیسے بلی چوہے کو دیکھکر اسے مارنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ تو باپ بحیثیت رشتہ کسی سوشل نظام کا ایک جزو ہے جیسے "ذات پات کی تمیز"[3] "میں برہمن یا" "جمہوری طرز حکومت" "میں پریزیڈنٹ" جو ہمارے بزرگوں نے ایجاد کیا تھا۔ اور جسے "خاندانِ پدر سپری"[4] کہتے ہیں۔

سنا ہے "باپ" کی ایجاد سے پہلے، باپ گھر میں کبھی کبھار ہی آیا کرتا تھا۔ اور اکثر مرتبہ جب وہ متواتر دو تین سال کی غیر حاضری کے بعد گھر میں آتا اور لوگ اُسے نئے بیٹے کی پیدائش پر مبارک بادیں کرتے تو وہ پھولے نہ سماتا۔ اور اس کرم پر دیوتاؤں کو مناتا۔ چونکہ اس زمانے میں باپ کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس کا بیٹا اس کی اپنی تخلیق ہونی چاہیئے۔ اس زمانے میں بیٹا یا بیٹی دیوتاؤں کی عنایت سمجھے جاتے تھے۔ پھر شاید کسی عورت نے کسی غلط یا خوش فہمی کے زیر اثر "دیوتاؤں کی عنایت" کا راز کھولدیا۔ اور مردوں نے وقت کی نزاکت کو سمجھکر خاندانِ پدر سپری کی بنیاد ڈال دی۔ اور یہ اعلان کردیا کہ آئندہ سے کوئی مرد گھر کی ذمہ داری برداشت نہیں کریگا جب تک اس کے بیٹے اس کے بیٹے نہ ہوں یعنی مردنے بیویوں پر وفا عائد کردی۔ شاید اسی دن بیویوں کو یہ سوجھی کہ خاوند کا نام لینا یا اس کا نام لیکر بلانا اس کے شایانِ شان نہیں۔ اس بنا پر انہوں نے ان کو "حمید کا ابا" یا "سعید کا میاں" کہنا شروع کردیا اور اسے بار بار دہراکر، خاوندوں کو اپنی وفا کا ثبوت دینے لگیں۔

برتاؤ کے لحاظ سے باپ کیلئے یہ لازم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں یہ ایمان پختہ ہو کہ وہ "حمید کا ابا" یا "حمید کا میاں" ہے۔ یعنی حمید یا سعید کا خالق ہے۔ اور یہی ایمان پدری نفسیت کا جزوِ اعظم ہے۔ مگر جزوِ اعظم ہونے کے باوجود یہ برتاؤ کی وہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات (جن سے ہم خوب واقف ہیں،) قائم کرسکتا۔ تو پھر باپ کو کیسے معلوم ہوجاتا ہے کہ گھر میں داخل ہوتے وقت اسے یوں کھنکارنا چاہیئے۔ یا امن قائم کرنے کیلئے اس آواز اور لہجے میں "حمید" کہنا چاہیے۔ یہ یوں دو رہیٹے لفظ آنا چاہیے۔ اور بچوں کے دل میں باپ کے متعلق جو تصویر بنجاتی ہے اس میں رنگ کون بھر دیتا ہے کہ "ابا" جیسا سادہ لفظ ان کے لئے مفہوم سے لدجاتا ہے۔

بچوں اور باپ کے درمیان جو تعلق یا رشتہ قائم ہوجاتا ہے وہ ماں کی وجہ سے ہی ہے۔ وہ براہ راست خاوند کی بیوی اور بچوں کی ماں ہوتی ہے۔ اس لئے باپ کا بچوں سے برتاؤ اور بچوں کا باپ کے متعلق تخیل وہی پیدا کرتی ہے۔ وہی باپ کو یہ یقین دلاتی ہے کہ وہ اسکے بچوں کا خالق ہے یعنی نفسیت پدری کا جزوِ اعظم بھی ماں ہی پیدا کرتی ہے اور برتاؤ کی تفصیلات بھی ماں ہی قائم کرتی ہے۔

نفسیتِ پدری کی جو شکل ماں نے قائم کر رکھی ہے وہ ایسی کیوں ہے جیسے کہ صدیوں سے رائج ہے۔ ماں نے اس مروجہ برتاؤ سے مختلف برتاؤ کیوں قائم نہیں کیا۔ اور ایسا برتاؤ قائم کرنے سے اس کا کیا مقصد ہے؟ اس کے متعلق ماں کے صرف دو مقصد ہوسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ باپ اس کے بچوں میں اس قدر دلچسپی لے کہ ان کو ضروریاتِ زندگی بہم پہونچائے۔ اور ان کی ذات کیلئے قربانیاں کرنے کے لئے تیار ہو۔ اور

1. Psychology of a father. 2. Father as a relation or as an attitude. 3. Caste System. 4. Patriarchal Family.

دوسرے چونکہ اُسے اپنے بچّوں سے انتہائی محبت ہوتی ہے وہ یہ نہیں چاہتی کہ بچّے اُس کی اپنی نسبت باپ سے زیادہ محبت کریں۔ اس لئے وہ چاہتی ہے کہ بچّے باپ سے ڈر کر دُور ہی رہیں۔ یعنی بچّے جس قدر باپ سے ڈریں گے یا دُور رہیں گے اُسی قدر وہ ماں کے قریب تر رہیں گے۔ تو اس مخصوص برتاؤ سے ماں کے یہ دونوں مقصد حاصل ہوتے ہیں۔

مرد میں خُدا جانے یہ عادت کہاں سے پیدا ہوئی تھی کہ وہ خود اپنے متعلق قطعی طور پر کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا۔ اپنے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے وہ اپنے متعلق لوگوں کی رائے سننے کا محتاج ہے۔ یعنی اگر "حمید کا ابّا" لوگوں سے یہ سُن پاتے کہ وہ نہایت معقول خود دار اور بات کا پکّا آدمی ہے تو وہ بیچارہ اپنے آپ پر یہ لازم کرلیتا ہے کہ وہ بظاہر ایسا ہی رہے جیسا کہ لوگ اُسے سمجھتے ہیں۔ چاہے اِن اَوصاف کو پیدا کرنے یا قائم رکھنے یا اُن کی جھلک ہی پیدا کرنے میں اُسے زندگی کی لطافتوں کو اپنے آپ پر حرام ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اکثر خاوند اپنی ازدواجی زندگی میں اسلئے خوش ہیں کہ لوگ اُنہیں خوش سمجھتے ہیں۔ بیوی خاوند کی اس عادت سے خُوب واقف ہے۔

شاید ٹامس ہیر یا کسی اور صاحب نے کیا خُوب لکھا ہے کہ "ہر بیوی اس بھید سے واقف ہے کہ خاوند اپنی "زبردستی" تیوریوں اور عظمت کے باوجود حقیقت میں ایک بچّہ ہے۔ اور ہر بیوی کو اس راز سے واقف ہونے کی ضرورت ہے کہ وہ خاوند پر یہ ظاہر کرے کہ وہ اُسے ایک معزز بڑا اور سمجھدار شریف آدمی سمجھتی ہے۔ عورت کی فطری مگر خارجی اور ظاہری خصوصیت "زیردستی"[1] ہی اُسے خاوند پر یہ ظاہر کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اس لئے باپ جو اپنے متعلق رائے قائم کرتا ہے۔ یا باپ کو کیسے رہنا سہنا چاہیئے کے متعلق جو تخیّل اُس کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ بیوی کی رائے سُن سُن کر قائم ہوتا ہے۔

یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ شادی ہونے کے بعد ہی ہمیں مرد سمجھا جاتا ہے۔ شادی سے پہلے ہمیں سوسائٹی میں وہ وقعت حاصل نہیں ہوتی جو ایک فرد کا حق ہے۔ اور ہمیں "مشکوک مرد" سمجھا جاتا ہے۔ غیر شادی شُدہ لوگوں کے متعلق کئی ایک شُبہات ہوتے ہیں۔ (یعنی اُن کے متعلق یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا) جو شادی کے بعد فوراً ہی معدوم ہوجاتے ہیں۔ اور مشکوک مرد فوراً ہی ایک یقینی اور معقول مرد بن جاتا ہے۔ پھر بچّے ہوجائیں تو وہ معزز فرد ہوجاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس رائے عامّہ کی موجد بیوی ہے۔ مگر آپ جانتے ہی ہوں گے کہ لوگ عام طور پر اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہیں۔ اور اُن کی بھی بیویاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی رائے کو رائج کرنے میں مفاد صرف بیوی کا ہی ہوسکتا ہے۔ اگر مرد کا معقول اور معزز ہونا گھر میں ایک بیوی لانے پر ہی موقوف ہو تو عظمت اور عزّت کس کی ہوئی۔ بیوی کی۔ براہِ راست خاوند کی نہیں۔ اس کے بعد جب مرد اپنے متعلق لوگوں سے ایسی رائے سُن پاتا ہے تو وہ اِس رائے کے مطابق نظر آنے کی کوشش کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اوّل تو وہ معقول مرد اور بعد میں خالص باپ بن جاتا ہے۔

کسی مرد کو جتنا ہی لوگ معقول سمجھیں گے وہ لوگوں کے سامنے اُتنا ہی معقول ظاہر ہونے کی کوشش کریگا۔ تو اُس کی خواہشات کا وہ حصّہ جو لوگوں کے خیال کے مطابق "معقول" سے خارج ہے۔ اُس کا اظہار لوگوں میں نہ ہوسکے گا۔ اس لئے ایسے اظہار کے لئے باپ کو تخلیہ کی ضرورت ہوگی جو بیوی کے سوا ممکن نہیں۔ یعنی جوں جوں لوگوں اور بچّوں کے نزدیک وہ خالص اور مکمل باپ بنتا جائیگا۔ جوں جوں بیوی کیلئے وہ زیادہ غیر معقول (یعنی بچّہ) بنتا جائیگا۔

---

1. Passivity.

بچپن کی عمر میں ہم میں جو بچپن ہوتا ہے وہ شاید محض سطحی ہوتا ہے۔ پھر اس عمر میں جب ہم کو معتبر اور معقول سمجھا جاتا ہے ہم وہ تمام بچپن سمٹ کر باطن میں سلب کر لیتے ہیں۔ اور اس کا اظہار تخلیے میں کرتے ہیں۔ اس اظہار بچپن پر بندشیں ڈالنے کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے باطن میں وہ بچپن اکٹھا ہو ہو کر اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ بڑھاپے میں ہم اندر با ہر سے بچے بن جاتے ہیں۔ مسٹر مائتھر لینٹ کا خیال ہے کہ انسان میں بچپن نہ ہو تو وہ محض ایک خوفناک درندہ رہ جائے۔

نفسیتِ پدری قائم کرتے وقت ماں چھوٹی چھوٹی حرکات اور معمولی معمولی باتوں کا زیادہ خیال رکھتی ہے۔

ماں :۔ (باآواز بلند) "حمید۔ تم ایسی گندی گندی باتیں کرتے ہو نہ۔ تمہارے ابا اندر بیٹھے ہیں۔ اگر انہوں نے سن لیا تو"۔ حالانکہ اُسے اچھی طرح معلوم ہے کہ ابا حمید کی بات سُن چکے ہیں اور اُس کی ہر بات سُن رہے ہیں۔ مگر وہ اس انداز میں حمید سے یہ بات کہتی ہے۔ جیسے وہ حمید کو ایک پرائیویٹ مشورہ دے رہی ہو۔ حمید یہ سمجھتا ہے کہ گندی باتیں کرنا بُرا نہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ابا نہ سنیں۔ اُدھر ابا یہ سمجھتے ہیں کہ چلو گھورنے اور جھڑکنے کی تکلیف کے بغیر ہی بچے سُدھر رہے ہیں۔ اور گھر میں باپ کی فوقیت قائم ہو رہی ہے۔ اور اُن کے دل میں ایک خاموش سا اصول قائم ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ اگر باپ گھر میں ہو تو بچوں کو ایسی ویسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

ماں :۔ حمید یہ کیا شور مچا رکھا ہے۔ دیکھتے نہیں کہ وہ اندر بیٹھے کام کر رہے ہیں۔

ہاں ہاں یہ ٹھیک ہے۔ باپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ جب باپ کام کر رہا ہو تو بچوں کو یہ چاہئیے کہ چپ چاپ بیٹھے رہیں۔ پھر اُسے خیال آتا ہے کہ وہ تو اُس وقت تفریحاً ایک ناول پڑھ رہا تھا ــــــ حتیٰ کہ اُسے یہ معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ وہ کیسا ہی معمولی کام کیوں نہ کر رہا ہو۔ اُس کا ہر معمولی کام بھی نہایت اہم اور ضروری ہے۔

بچے سوچتے ہیں ابا عجیب انسان ہے جس کی موجودگی میں ہنسنا کھیلنا شور بن جاتا ہے اور سیدھی سادی باتیں گندی سمجھی جاتی ہیں۔ اور اماں کیسی اچھی ہیں جو نہ ہنسی کھیل سے گھبراتی ہیں اور نہ کسی بات سے۔ اور دل میں وہ یہ سمجھنے ہیں کہ گندی باتیں یا شور وغل بذاتِ خود بُرے نہیں صرف ابا کی موجودگی ہی انہیں بُرا بنا دیتی ہے۔ یعنی ابا کا وجود ہی اُنکے نزدیک ایک رکاوٹ ہو جاتی ہے۔

ماں :۔ (باآواز بلند) "حمید۔ تم پھر ضد کر رہے ہو نہ۔ کہوں میں تمہارے ابا سے۔ اُن سے پٹے بغیر تمہیں بھی چین نہیں آتا"۔

باپ سنتا ہے۔ اچھا۔ بچہ ضد کرے تو مجھے پیٹنا چاہئیے۔ یعنی میری موجودگی میں ضد کرے تو میری توہین ہے۔ اُدھر بچہ سنتا ہے کیسی پیاری اماں ہیں کہ باپ کے پیٹنے کو بُرا مانتی ہیں۔

ماں :۔ لڑاکا کہیں کا۔ آپا کو مارتا رہتا ہے۔ اچھا تمہارے ابا آئیں تو انہیں بتاؤں گی کہ ہر وقت فریدہ سے دنگا کرتا رہتا ہے۔ شیطان کہیں کا۔ (اندر باپ سنتا ہے اور اپنی موجودگی کا اظہار کرنے کیلئے کھانستا ہے۔) فریدہ ماں سے کہتی ہے "اماں ابا تو اندر بیٹھے کام کر رہے ہیں" حمید کا دم خشک ہو جاتا ہے۔ فریدہ ماں کو خاموش دیکھکر کہتی ہے "پھر مجھے مارو گے۔ کہوں ابا سے۔ (اور دبی آواز میں کہتی ہے) ا۔۔۔ با۔۔۔ جی۔۔۔۔ اور فریدہ تمہارے طور پر آنکھوں ہی آنکھوں میں مُسکراتی ہے۔ اتنے میں ماں بول اٹھتی ہے "فریدہ شور نہ مچاؤ۔ آخر بچہ ہے۔ تم بھی تو ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑ جاتی ہو"

حمید کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ "جب تک اماں ہیں۔ ابا ہوں بھی تو کیا ہے۔ پڑے ہوا کریں" اور وہ اماں کے قریب جا بیٹھتا ہے۔ (باپ کے کھانسنے کی آواز پھر آتی ہے) اس مرتبہ وہ اپنی کھنکار میں رعونت پیدا کر لیتے ہیں۔ چونکہ انہیں معلوم ہے کہ باورچی خانہ میں حالات

بگڑ رہے ہیں۔ مگر حمید اُس رعونت بھری کھنکار کی پرواہ نہیں کرتا۔ "اماں جو ہیں۔ ابا ہیں ہوا کریں"۔

جب تک ماں اس آواز کو مفہوم نہ بخشے، باپ کی کھنکار ایک بے معنی آواز ہے۔ یہ ماں کی اپنی مرضی ہے کہ اُسے جیسا جی چاہے مفہوم بخشدے۔ نہ تو بچوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ماں ہی "باپ" کے لفظ میں رنگ بھر رہی ہے اور نہ باپ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ماں اُس کو باپ بننا سکھا رہی ہے۔ اور بچوں پر زندگی حرام کر رہی ہے۔ مگر باپ روز بروز بچوں کیلئے ایک ناقابل برداشت رکاوٹ بنتا جاتا ہے۔ اور اپنے متعلق رائے سُن سُن کر اپنے آپ کو اُس کے مطابق وضع کرتا رہتا ہے۔ البتہ اُسے یہ احساس ضرور ہو جاتا ہے کہ بچوں کے سامنے اُسے معزز اور بارعب ہستی نظر آنا چاہیئے۔ مگر وہ نہیں جانتا کہ یہ رعب جو ماں اُسے دے رہی ہے اُسی کے ذریعے وہ اُس پر عظمت علیحدگی اور بلندی تھوپ رہی ہے۔ اور بچے دل ہی دل میں اس سے نفرت کر رہے ہیں۔

تو ماں کی دبی دبی آوازیں جو باورچی خانے سے اُٹھتی ہیں، وہ باپ کے دل میں اتر کر اُس کے ماتھے پر گھوریاں، خط و خال میں جمود۔ کھنکار میں رعونیت اور طبیعت میں عظمت اور "برتری" ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اُسے دیکھکر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی اور دُنیا کا فرد ہو۔ جہاں لوگ لوہے سے بنے ہوتے ہیں۔ گھر میں وہ قدم نہیں رکھتا جب تک وہ ان خصوصیات کو چہرے اور انداز میں پھیلا نہ لے۔ حتیٰ کہ یہ گھر کا بہروپ اس پر اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ وہ باہر دوکان پر یا دفتر میں بھی باپ ہی بنا رہتا ہے۔

ایسی چھوٹی چھوٹی دو دھاری باتوں سے ادھر تو میاں پر معقول برتاؤ واضح کر کے اور بچوں کے دل میں یہ تخیل پیدا کر کے کہ باپ کس بلا کا نام ہے۔ اور باپ اور ماں میں کیا فرق ہے۔ ماں اپنے دونوں مقصد حاصل کر رہی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ جب کبھی باپ بچوں کو سرزنش کرے۔ جس پر باپ کو اُس نے بذاتِ خود مائل کیا تھا۔ تو ماں جھپٹ کر کہتی ہے: "آپ جانے بھی دیں۔ ابھی بچہ ہے بڑا ہو کر خود ہی سمجھ جائیگا۔" بچہ یہ سمجھتا ہے کہ دیکھا ماں کتنی سمجھدار ہے اور باپ ــــــــــ۔ بیچارے کو یہ بھی پتہ نہیں کہ ہم بچے ہیں۔ اور پھر دل ہی دل میں اُسے معلوم ہو جاتا ہے کہ بچہ رہنے میں بہت فائدہ ہے۔ اس لئے وہ بچہ ہی رہنے کی کوشش کرتا ہے۔

اگر کبھی خاوند بچوں کے سامنے ہی اُن کی ماں سے کوئی پیار محبت کی بات کہدے تو بیوی مسکرا کر کہہ اُٹھتی ہے "یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ لڑکی اب جوان ہے۔ بچے اب کوئی بچے نہیں جوان ہو چکے ہیں۔ وہ کیا کہیں گے؟" یعنی چاہے اُسے پیار سے محروم ہی کیوں نہ رہنا پڑے، وہ یہ گوارا نہیں کرتی کہ باپ کے متعلق جو تخیل اُس نے بچوں کے دل میں اتنی محنت سے پیدا کر رکھا ہے برباد ہو جائے۔ بچے یہ نہ سمجھ لیں کہ باپ میں بھی انسانیت کا عنصر ہوتا ہے۔

ماں کی ان چھوٹی چھوٹی مگر ہمہ گیر باتوں کا یہ اثر ہوتا ہے کہ باپ تو خالص باپ بن جاتا ہے اور بچے، بچے ہی رہتے ہیں اور اُسکے دونوں مقصد حل ہو جاتے ہیں۔

بچہ جب تک بچہ رہیگا اور اُسے اپنے انفرادی وجود کا احساس نہ ہو گا وہ اپنے آپ کو ماں کا ایک جزو سمجھے گا۔ اور اپنی حفاظت کے لئے بیل کی طرح ماں کا سہارا لے گا۔ یعنی ماں سے محبت کریگا۔ تو ماں بچے کی محبت حاصل کرنے کی غرض سے اُس میں بےبسی پیدا کرنے اور اُسے برقرار رکھنے سے بھی گریز نہیں کرتی۔

ادھر باپ بیٹے کو بچہ سمجھکر خوش ہو گا۔ چونکہ اُس کے خیال کے مطابق بیٹا اُسکی اپنی تخلیق ہے۔ اُس کے جسم کا ایک حصہ ہے۔ اور حصہ "تمام" سے کمتر چیز ہوئی۔ کیسا خوش کن خیال ہے۔ اس لئے باپ اپنے آپ کو ہمیشہ افضل اور برتر سمجھتا ہے۔

ہر باپ کے دل میں یہ پرائیویٹ ایمان قائم ہے کہ سب سے نااہل شخص اس کا اپنا بیٹا ہے۔ چاہے وہ عمر میں کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ حقہ آخر حقہ ہے اور خالق خالق۔ ویسے دنیا والوں کے سامنے اپنی مخلوق پر ناز کرنا تو قدرتی بات ہوئی۔
اس لئے کہ باپ اپنے بیٹے کو اپنا نہ مال کہتی ہے "آخر باپ کا بیٹا جو ہوا۔ باپ ہی کا نام ہوگا" اور باپ اس خیال پر کہ اس کا نام ہوگا بیٹے کیلئے محنت کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔

بیٹا جب بڑا ہوجاتا ہے تو اُسے معلوم ہوجاتا ہے کہ "باپ" ایسا نہیں جیسا کہ وہ اُسے سمجھتا رہا ہے۔ مگر وہ یہ نہیں سوچتا کہ باپ نے تو کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ میں ایسا ہوں۔ اور باپ کا تخیل جو اس کے دل میں تھا وہ تو ماں کی شوخیٔ تحریر تھی۔ مگر اس احساس پر کہ وہ دھوکے میں رکھا گیا۔ وہ باپ سے بگڑ جاتا ہے اور باپ بیٹے کے اختلافات شروع ہوجاتے ہیں۔ اور بیچارے باپ کی عمر کا آخری حصہ بیٹوں کی بغاوت سے زہرآلود ہوجاتا ہے۔

پھر بہت دیر کے بعد باپ کو یہ پتہ چلتا ہے، کہ اس کے باپ کا پارٹ ادا کرنے سے اس کا اپنا نقصان تھا۔ فائدہ تو ماں کا تھا۔ اس دلسوز انکشاف کے بعد وہ باپ کا بہروپ اتار پھینکنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر کامیاب ہوجائے تو "دادا" بنتا ہے۔
باپ کو نہ تو بیٹا سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ایسا شخص جو خود باپ ہو۔ بلکہ ایک ایسا آزاد فرد جو بیٹا نہ ہو اور اس عالم سے نکلکر مکمل انفرادیت قائم کرچکا ہو۔ یا "باپ" سے نکلکر "دادا" بن چکا ہو۔

آج کل کے باپ مروجہ "باپ" سے مختلف ہو رہے ہیں۔ غالباً اس کی یہ وجہ ہے کہ ماں اور عورت کی نفسیت میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ خدا جانے کس مقصد سے ماں یہ نیا تجربہ کر رہی ہے۔ اور خدا جانے اسکے نتائج کب تک واضح ہونگے۔
بظاہر یہ تبدیلی مغربی تہذیب کا نتیجہ نظر آتی ہے۔ اور نئی تہذیب کے زیر اثر ماں دن بدن معدوم ہو رہی ہے۔ اور مغربی عورتیں ماں بننے سے "عورت" رہنے کو ترجیح دے چکی ہیں۔ اُن کے خیال کے مطابق ماں کی زندگی سے عورت کی زندگی میں زیادہ دلچسپیاں پنہاں ہیں۔ مگر یہ بات کبتک قائم رہے گی اس کے متعلق اندازہ لگانا مشکل ہے۔

"ممتاز مفتی"

دو روسی دیہاتی بچے

آدھی رات کا وقت ہے، ایک وسیع بے رونق کمرے میں صرف ایک موم کی شمع جھلملا رہی ہے۔ گیارہ اور آٹھ سال کی عمر کے دو چھوٹے لڑکے ایک مستطیل میز کا سہارا لئے فرش پر بیٹھے ہیں۔ کمرہ میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی ہے، انسان و حیوان سب پڑے سو رہے ہیں، لیکن ان دو بچوں کو پلک جھپکانے کی ہمت نہیں پڑتی جب تک کہ اُن کی مالکہ نہ آجائے جو اپنے دوستوں سے ملنے گئی ہوئی ہے اور دیر میں واپس آئیگی۔

نصف شب! بھوتوں کے نکلنے کا وقت، اور اتنا لمبا چوڑا کمرہ! اتنے تاریک گوشے! بچے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، بڑا خود کو باہمت ظاہر کرنے کی انتہائی کوشش کر رہا ہے اور آٹھ سال کا معصوم اپنی نیلگوں اور نمناک آنکھوں کو اپنی پھٹی ہوئی آستین سے خشک کرتا ہے، دھندلی شمع تیزی کے ساتھ پگھل رہی ہے، گاہے گاہے بے رنگ سائے کھڑکی کے دھندلے شیشوں سے گذرتے دکھائی دیتے ہیں، دروازوں کی چولوں سے ایک درد آمیز آواز نکل کر اداسی پیدا کر رہی ہے برف کے گالے ہوا کے تند جھونکوں کی وجہ سے تیزی سے گذر رہے ہیں۔

خوفزدہ بچے ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں، اُن کو اس سفید موہوم جھلک میں کسی غمزدہ رُوح کا عکس دکھائی دیتا ہے اور برفانی ہوا کی "سائیں سائیں" میں نادیدہ سرزمین سے آئی ہوئی ندائیں سُنائی دیتی ہیں۔

بڑے لڑکے کا نام وانیا اور چھوٹے کا مشا ہے۔ مشا دُبلا پتلا زرد رُو بچہ ہے۔ اس کے بال سُنہرے اور بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں جو سہم سہم کر کمرے کا جائزہ لے رہی ہیں اور جب وہ تاریک گوشوں پر جا کر ٹھہرتی ہیں تو بچے کا رنگ اور زیادہ پیلا پڑ جاتا ہے۔

وانیا ایک تندرست لڑکا ہے جس کی آنکھیں کالی ہیں اور مسکرا کر مشا کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ خائف نہیں ہے ـــ مطلقاً نہیں۔ وہ کہتا ہے "میں نے ایک دن بھوت کو دیکھا ـــ ایک اصلی بھوت کو، اور نہ تو میں ڈرا نہ چلایا، مشا سچ میں ڈرتا نہیں ہوں" تاہم اُس نے بہت دھیمی آواز میں کہا "میں صرف کم ہمت ہوں، لیکن جب تم میرے پاس ہوتے ہو تو مجھے ڈر کا بالکل احساس بھی نہیں ہوتا"

"بیچارے چھوٹے مشا نے چپکے سے کہا" اور اگر ہم جلادئے گئے؟"

"جلا دئے گئے! اونہہ، یہ ناممکن ہے!" اتنے اطمینان بخش لہجے میں جس سے مشا پورے طور پر بہل جاتا ہے۔

مشا نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا "وانیا یہ تو بتاؤ کہ ایک تیز اور سرد چاقو کی دھار کیا بہت تکلیف دیتی ہے؟"

وانیا نے مشا کے سُنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے اور مزید یقین دلاتے ہوئے متانت سے جواب دیا "پہلے بالکل خفیف سی تکلیف ہوتی ہے اُسکے بعد تو تمہیں کچھ محسوس بھی نہ ہوگا"

"مگر آہ! کیا تمہیں یاد نہیں کہ جب باورچی نے اپنا گلا کاٹا تھا؟ پہلے چلایا 'میں اپنا گلا کاٹنے جا رہا ہوں' اور جب گلے پر چاقو پھیرا ـــ افوہ کتنا خُون بہا!"

"ارے بھی ـــ اس کا تو خیال بھی نہ کرو ـــ وہ ایک کمزور حوصلہ والا انسان تھا اس لئے کہ وہ مرا نہیں، وہ ڈاکٹروں کے علاج سے اچھا ہوگیا اور یہ بھی خُوب ہوا اس لئے کہ حسب دستور وہ پھر مارا جانے لگا، مگر ہم اس کام کو زیادہ ہشیاری سے کرینگے ـــ اس طرح کہ ڈاکٹر ہم کو اچھا نہ کرسکیں کہ ہم پھر مار کھانے کے لئے

زندہ رہ جائیں۔"

"اور چاقو وغیرہ ـــــ کیا وہ سب ٹھیک ہیں ناوآنیا؟"

"ٹھیک؟ میں نے اُن کو تین روز تک خوب تیز کیا اور چمکایا ہے، لیکن چھوٹے بزدل کیا اب عین وقت پر قدم پیچھے ہٹانے کا ارادہ ہے؟"

مشا نے کوئی جواب نہ دیا لیکن سسکی بھرتے ہوئے ایک لمبی سانس لی اور اپنی سہمی ہوئی نیلی آنکھیں بجھتی ہوئی شمع پر جما دیں اُس نے بھرائی ہوئی آواز سے پوچھا "وآنیا کیا میں اسے گُل کر دوں ـــــ آخری بار؟"

"فائدہ کیا؟ اسے چھوڑو اور جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں اُسے گوش دل سے سنو، اگر ہم ویسا ہی کریں جس کو انجام دینے کی ہم نے ابھی قسم کھائی ہے تو ہم سیدھے جنت میں جائیں گے اس لئے کہ ہم معصوم بچے ہیں اور یہاں زیادہ عرصہ تک گناہ کرنے کیلئے زندہ نہیں رہے، مگر کٹیرنا افانسویا کو ہمیں اس حال تک پہونچانے کی ضرور سزا ملے گی اور وہ دوزخ میں جائیگی۔"

"اور آئی ون ویسلیچ ـــــ کیا وہ بھی دوزخ میں جائیگا؟"

"شاید خدائے رحیم اُسے معاف کر دے اس لئے کہ وہ اتنا ظالم نہ ہوتا اگر وہ اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا۔"

"تب کٹیرنا اپنے گناہوں کا بدلہ ضرور پائیگی۔"

وآنیا نے مسرور ہو کر کہا "میرے ننھے دوست وہ ضرور سزا پائیگی، فرشتے اس کو لوہے کے بڑے قلابے میں لٹکا کر اتنے کوڑے ماریں گے کہ خون بہنے لگے، وہ اُس کو ننگے پیر سرخ دہکتی ہوئی اینٹوں پر چلائیں گے اور بہت ممکن ہے کہ وہ اس سے ان اینٹوں کو چٹوائیں بھی جیسا کہ اُس نے چند روز پہلے سنکا کے ساتھ کیا تھا، وہ اس قدر ماری جائیگی اور اُسکو اتنی تکلیفیں پہونچائی جائیں گی کہ انسان کا خون اُسکے خیال سے سرد پڑ جاتے۔"

نرم دل چھوٹے مشا نے مرعوب ہو کر رحم کے لہجے میں آہستہ سے کہا "لیکن وہ یہ سب کیسے برداشت کر سکے گی؟"

"وہ اُس کو برداشت کرنے کے لئے مجبور کریں گے، وہاں منّت وسماجت اور فریاد کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا، کوئی برداشت کر سکے یا نہ کر سکے، اُسے بہرصورت تمام مصیبتوں کو جھیلنا ہی پڑتا ہے۔"

کُتّے نے باہر کے صحن میں ایک درد بھری بلند چیخ نکالی۔

مشا پیلا پڑ گیا اور اُس نے کہا "اوہو! ٹریزر نے شاید کسی بھوت کی آہٹ پالی ہے۔"

"کیا مہمل بکتے ہو! اور فرض کرو کہ ایسا ہے بھی تو کیا تم کو اپنی بزدلی پر شرم نہیں آتی؟"

"نہیں وآنیا میں بزدل نہیں، لیکن ہمارے کُتّے کو بھوت کا ہمیشہ کیسے احساس ہو جاتا ہے۔"

"ارے یہ اس لئے کہ کتّا انسان کا دوست ہے، گھوڑے کو ایسی باتوں کے متعلق کوئی واقفیت نہیں ہوتی لیکن کتّا سب کچھ سمجھ جاتا ہے ـــــ یہی سبب ہے کہ جب کوئی بھوت قریب ہوتا ہے تو وہ بھونکتا ہے۔"

مشا نے وآنیا کی بات کاٹتے ہوئے کہا "اور اگر فرض کرو کہ ہم اپنے کو ڈبو دیں؟"

"تم بھی کتنے نادان ہو! یہ بھی کوئی گرمی کا زمانہ ہے؟"

"یہ سمجھو کہ پانی ٹھنڈا ہے ـــــ اتنا ٹھنڈا کہ شاید اگر ہم اس میں غوطہ لگائیں تو برداشت نہیں کر سکتے۔"

"اگر ہم حقیقتاً اپنے کو ڈبونا چاہیں تو پہلے ہم کو برف توڑنا پڑے گی اور اُس کے بعد بلاشبہ ہم باہر آنے کی کوشش کرینگے اور وہ بھی کتنی مصیبتوں کے ساتھ! اور چاقو کی بات اور ہے، ذرا تیزی سے گلے پر چلایا اور قصہ ختم، صرف ہاتھ نہ کانپنا چاہیئے۔"

معصوم ننھے مشا نے سوال کیا "تو کیا پھر ہم کبھی نہ مارے جائیں گے؟"

"نہیں، ہرگز نہیں! پھر ہم کو کوئی بھی نہ ماریگا، فرشتے ہماری رُوحوں کو سیدھے آسمانی باپ کے پاس لیجائیں گے۔"

مشانے پوچھا "تب ہمارا آسمانی باپ کیا کہیگا؟"

"ہمارا باپ کہے گا، میرے معصوم مظلوموں تم نے مستقل مزاجی سے اپنے خاتمہ کا انتظار کیوں نہ کیا؟ تم نے اپنی زندگیاں کیوں ختم کر ڈالیں؟ ہم جواب دینگے پیارے معبود ہمارے لئے اب زندہ رہنا بالکل ناممکن تھا اور ہم اس سے سب کچھ کہہ دینگے ــــ کٹیرینا ہم کو اس طرح مارتی تھی کہ خون نکل آتا تھا ــــ ہم کو بیحد مارتی اور تکلیفیں پہونچاتی تھی۔"

مشانے سب غور سے سُنا اور مصیبت کے احساس نے اُسکے معصوم دل کو اتنا دُکھایا کہ اُس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔ وانیا نے اُس کی دلجوئی اس طرح شروع کی "سنو ہو مشا، ہم کل اُس کے ساتھ ایک آخری چال چلیں گے۔ کٹیرینا کو اُمید ہے کہ دعوت میں معزز مہمانوں کی ایک معقول تعداد شریک ہوگی۔ میں نے سب چاقو چھپا دئے ہیں اس لئے اُسے اپنے مہمانوں کیلئے ایک چاقو بھی نہ ملے گا۔"

مگر مشا برابر روتا رہا۔ وانیا نے شمع گل کر دی اور کھڑکی سے منہ نکال کر باہر دیکھنا شروع کیا۔ "یہ کس قسم کی ہوا ہے! یہ کیسی ہوا چل رہی ہے!" اس نے کہا اور اس کے بعد یہ گیت گنگنانا شروع کیا۔

"کیسی ہے اندھیاری رین"

مشانے جب گوش آشنا نغمہ سُنا تو اور زور سے سسکیاں بھرنے لگا۔ وانیا نے گھبرا کر کہا "تم بھی کیسے رونے لڑکے ہو!"

گھڑی کی ٹن ٹن نے خاموشی کو توڑا۔ مشانے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے سہم کر کہا "پل بھر میں مالکہ یہاں آن پہونچے گی۔"

"ہاں اس میں کیا شک ہے، مگر کیا اچھا ہو اگر اب بھی ہمیں سونا مل جائے!"

"نہیں نہیں! مسیح کی محبت کا واسطہ وانیا، میں تم سے منت کرتا ہوں کہ سونے کا ارادہ نہ کرو۔"

"کیا تم ڈر رہے ہو؟"

"پیارے ننھے مشانے ہکلاتے ہوئے کہا "ہاں ــ و ــ وا ــ نیا ــ میں بہت ڈر رہا ہوں۔"

"احمق کہیں کے! میں تم سے کتنے بار کہوں کہ اس کمرہ میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے؟ اگر تم کہو تو میں اِدھر اُدھر دیکھ بھال لوں۔"

مگر وانیا نے اپنے دل میں یہ پہلے ہی ٹھان لی تھی کہ وہ جنبش تک نہ کریگا۔ کمرے میں گہری خاموشی تھی ــــ ایک ایسا خاموش وقفہ جس میں رُوح غم کی لہروں میں غرق معلوم ہوتی ہے۔ بچوں نے پگھلتی ہوئی شمع کے بجھتے ہوئے شعلہ کی طرف خاموشی سے نگاہیں جما دیں۔ کُتا پھر بھونکا۔

"کیا منحوس کتا ہے!" مشانے کہا

"اور آنیا کہاں ہے؟" وانیا نے یکایک پوچھا۔

آنیا، مشا کی بہن تھی۔ ایک اٹھارہ سال کی لڑکی جو چھ مہینو سے غائب تھی اور کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں چلی گئی۔ خاندان میں مختلف قسم کی افواہیں اور قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں، کچھ لوگ کہتے تھے کہ آنیا زندگی کے عذاب سے نجات پانے کے لئے بھاگ گئی ہے اور کچھ لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ وہ اپنی ذلت و رسوائی پر پردہ ڈالنے کیلئے روپوش ہوگئی ہے۔ اسکے متعلق بس اس قدر معلوم ہو سکا کہ ایک دن دریا پر وہ کچھ کپڑے دھونے گئی تھی مگر اس کے بعد وہ نہیں دیکھی گئی، کپڑے دریا کے کنارے پائے گئے، غائب ہونے سے دو دن پہلے جیسے کہ یہاں کا دستور ہے کہ جب کوئی لڑکی آوارہ ہوجاتی ہے تو اُس کے سر کے بال کاٹ دئے جاتے ہیں۔ لوگوں نے آنیا کے بھی سر کے بال بالکل جڑ سے کاٹ ڈالے، بال کاٹتے وقت اُسنے اُن لوگوں سے دیوانہ وار مقابلہ بھی کیا تھا لیکن بے سُود، مالکہ نے بھی نہایت وثوق سے کہا کہ بدکردار آنیا میرے

خراب طرزِ عمل سے چھٹکارا پانے کے لئے نہیں بلکہ اپنے بُرے رویہ کو چھپانے کے لئے خود ہی ڈوب گئی ہے، لیکن پھر بھی اُس کا حشر اک راز ہی رہا۔ اس ناگہانی موت کی جب تحقیق شروع ہوئی تو خاندان کے ایک بہت منہ پھٹ گواہ نے صاف صاف کہدیا کہ آلیا کی روزانہ کی زندگی بہت دُکھ بھری تھی لیکن حاکم عدالت نے گواہوں کے ایک لفظ پر بھی اعتبار نہ کیا بلکہ اُن کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ تم یہاں دروغگوئی کیلئے نہیں بلکہ سچ بولنے کیلئے بُلائے گئے ہو، اس کے بعد اس نے مالکہ کا بیان قلمبند کیا۔

کٹرینا نے کہا کہ غلاموں کے ساتھ نہ صرف اُس کا طرزِ عمل ہی اچھا تھا بلکہ وہ اُن کو کھانے کے لئے گوشت بھی دیتی تھی۔ کٹرینا نے اپنی موافقت میں کئی گواہ پیش کئے جنہوں نے اُس کے بیان کی حرف بہ حرف تصدیق کی۔ جج نے قدرے تامل کیا، اور غور کرنے کے بعد حسب ذیل فیصلہ سنا دیا۔

"ضلع ج ـــــ کے رؤسا اپنے غلاموں کے ساتھ نہ صرف اچھا طرزِ عمل ہی کرتے ہیں بلکہ اُن کو کھانے کے لئے گوشت بھی دیتے ہیں"

اس کے بعد جج نے گواہوں کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا "کیوں جی تم ایسے کھلے ہوئے جھوٹ کیوں بولے" گواہ پیلے پڑ گئے۔ اور دم بخود اپنے ہونٹوں کو چباتے رہے، یہاں تک کہ خون نکل آیا۔ کٹرینا نے یہ سب دیکھا اور گواہوں کی اتنی بیباکی اور دیدہ دلیری سے متاثر ہو کر موقع پر بیہوش ہو جانا مناسب خیال کیا۔

عدالت نے یہ حکم سُنایا۔

"یاسیانک ریاست کی رہنے والی ایک لڑکی مسیٰ آلگا سندرا جو فوجی رسالے کے ایک پنشن یافتہ کپتان کی لونڈی تھی چوبیس جون کی صبح کو غائب ہو گئی۔ مذکورہ لڑکی کا حلیہ یہ ہے:۔

دراز قد، گورا رنگ، بھورے بال چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے، کھلی ہوئی رنگت، نیلی آنکھیں، سڈول ناک نقشہ، بائیں گال پر ایک ننھا سا کالا تل ..... اس ضلع کے محکمہ پولیس کو جس سے کہ یہ لڑکی تعلق رکھتی ہے حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اس لڑکی کو ضلع ج ـــــ کی عدالت کے حوالے کر دیں، عدالت مالکہ کی درخواست پر منعقد کی جائے گی"

پس یہ معاملہ اس قانونی کارروائی پر ختم ہو گیا، کٹرینا نے کچھ عرصے تک تو بہت ہشیاری سے کام لیا مگر مہینہ دو مہینہ ہی میں وہ اپنی پُرانی عادتوں پر لوٹ آئی، کیا کوئی شخص اُسے ظالم اور سنگدل خیال کر سکتا تھا؟ ہرگز نہیں، ہر شخص اُس سے ملنے آنے لگا اور اُس کے کمرے میں حسب دستور ملنے والوں کا مجمع رہنے لگا، ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر یہ جانتا تھا کہ وہ اپنے غلاموں کو طرح طرح کے انوکھے اور نرالے طریقوں سے اذیت دیکر اپنا دل بہلاتی ہے لیکن کبھی کسی نے سنجیدگی سے اُس کے افعال پر نکتہ چینی کا خیال تک نہ کیا، وہ صحیح معنوں میں اپنی خوش خرامی، جاذب توجہ اور فیاضانہ طرز عمل کیلئے اپنے دائرہ احباب میں بہت ہر دلعزیز تھی جن کی وہ اکثر انداز میں خاطر و تواضع بھی کیا کرتی تھی۔

ایک دن کٹرینا کے شوربے میں ایک چھوٹی سی مکھی نکل آئی، اُس نے اپنے باورچی کو بُلایا اور نہایت بے جگری سے مکھی نگلنے کا حکم دیا اور طرفہ یہ کہ حاضرین میں سے کسی پر یہ بات ذرا سی بھی شاق نہ تھی۔

ایک دوسرے موقع پر اُس نے سنکا سے کہا کہ جاؤ اور آہنی گرم چولھے کو زبان سے چاٹو۔ غریب سنکا کو عدول حکمی کی جرأت بھی نہ ہوئی، جب وہ واپس آئی تو اُس کی زبان پر چھالے پڑ گئے تھے۔ اُس کا چہرہ درد کی شدت سے تمتا رہا تھا۔ بال جھلس گئے تھے اور اُسکے گالوں پر موٹے موٹے آنسو ڈھلک رہے تھے۔

ایک شخص بولا "احمق! کتنا فیل مچاتی ہے" دوسرے نے کہا "کیسی گھامڑ لڑکی ہے!" اور پھر سب ایک ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ یہ اس زمانے میں مہمانوں کی تواضع کا ایک نہایت پسندیدہ طریقہ

خیال کیا جاتا تھا۔

مشا کے ننھے سے دل پر اپنی بہن آپا کی یاد کا بڑا گہرا نقش تھا، اُس کا جسم قدرے خم ہوگیا اور گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے اور جب دانیا بولا "آپا واپس آگئی ہے۔ وہ کل اپنی مالکہ کے سامنے بھی آئی تھی" تو مشا کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو جھلکنے لگے۔

مشا نے چلا کر کہا "یہ جھوٹ ہے"

"یہ سچ ہے ـــــ وہ یقینی واپس آگئی ہے۔ میٹرنا نے خود ہم سے کہا کہ مالکہ نے جب آپا کو دیکھا تو اُس کے چہرے کا رنگ دُھلے ہوئے کپڑے سے زیادہ سفید پڑگیا تھا اور وہ اپنے کمرے سے بھاگ گئی تھی۔"

مشا نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا "یہ سب جھوٹ ہے کہ آپا نے اپنے کو ڈُبو یا نہیں اور ابتک زندہ ہے۔"

"مشا، جہانتک اس کا تعلق ہے اُس نے اپنے کو ضرور ڈُبو یا، اُس کا ڈوبنا اتنا صحیح ہے جیسے دو اور دو ملکر چار ہوتے ہیں۔"

مشا نے آہ بھرتے ہوئے کہا "سب جھوٹ، سب غلط!"

دانیا نے کہا "معصوم بچے! اس کے متعلق تم اتنا شور کیوں کرتے ہو، کیا ہم دونوں چند ہی گھنٹوں میں مرنے نہیں جارہے ہیں"

مشا خاموش ہوگیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے نہ جانے کتنے واقعات کی تصویریں پھرنے لگیں، اُس نے اپنے تخیل میں آپا کو بالکل اسی طرح دیکھا جیسے کہ وہ اُس کے پاس آتی، اُسکے گال تھپ تھپاتی، شیریں اور محبت آمیز لہجے میں کہا کرتی تھی "میرے پیارے ننھے بھیا" ـــــ یا جبکہ وہ کوئی نئی بلاؤز تیار کرکے لاتی اور مُسکرا کر کہتی تھی "میرے چھوٹے بھائی خُدا کرے تم اسے پہنکر سدا ہنستے کھیلتے رہو" ـــــ مشا کو وہ دن بھی یاد آئے جبکہ اسکا چہرہ روتے روتے بگڑ گیا تھا، اُس کے خوبصورت بال کاٹ کر بالکل خراب کردئے گئے تھے اور جب وہ ایک ایسی دُکھ بھری آواز کے ساتھ جو رحم کی خواستگار تھی مالکہ کے کمرے سے باہر بھاگی تھی، آپا کی وہ التجائیں جن میں سسکیوں کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوجاتی تھی" آہ مجھے معاف کردو، مجھے معاف کردو، مَیں آئندہ کبھی ایسا نہ کرونگی۔ مسیح کے لئے میرے بال نہ کاٹو" ـــــ درد اور حیا سے لبریز اس کی دل پاش کن فریاد جبکہ اس کی لانبی، گھنی، خوبصورت اور سنہری لٹیں قینچی کی نذر کی جارہی تھیں ـــــ مشا کے کانوں میں ایک ایک کرکے سب آرہی تھیں اور اس دکھ بھرے لہجے میں مشا کے تصوّر کے سامنے یہ تمام نظارہ ایسی دردناک اصلیت کے رُوپ میں اُبھر آیا تھا کہ جیسے وہ سچ مچ آپا کو دیکھ رہا ہے اور گویا کہ واقعی آپا کی رُوح اپنی مالکہ سے انتقام لینے کیلئے آن موجود ہوئی ہے ـــــ اور جیسے وہ ٹھیک اُسی جگہ اُس کے پہلو بہ پہلو موجود ہے۔ یہانتک کہ مشا کو اُس کی آواز سرگوشی کرتی ہوئی سُنائی دی "میرے پیارے چھوٹے بھیا"

وہ دہشت زدہ ہوکر چیخ اُٹھا "اُف! آپا آگئی! دانیا کیا تم اُسے نہیں دیکھتے ـــــ تم کو اُس کی آواز نہیں سُنائی دیتی؟"

دانیا نے ڈری ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھکر کہا "اب تم جھوٹ بول رہے ہو" مشا نے اصرار کیسا تھ کہا "مَیں تم سے قسم کھاکر کہتا ہوں کہ آپا یہاں موجود ہے" "میں کہتا ہوں کہ وہ یہاں نہیں ہے، بھلا آپا ہمکو تکلیف دینے کیوں آنے لگی، صرف گندی رُوحیں لوگوں کو ستانے کیلئے آتی ہیں، وہ ہمیوں نقصان پہونچائیگی؟ آپا تو بیحد نیک اور بہت اچھی لڑکی تھی۔" مشا نے غیرارادی طور پر دُہرایا "ہاں ہاں میری آپا بہت اچھی تھی"

مشا کو مزید یقین دلانیکے خیال سے اور خود یقین نہ کرنے پر کسی قسم کا افسوس کئے بغیر دانیا نے کہا "اچھا ٹھہرو ہم تمام کونوں میں ڈھونڈھے لیتے ہیں" اُسنے میز کے نیچے دیکھا کونوں میں جھانکا، گلی والے دروازے کو نصف کھولا مگر اُسے کچھ بھی نظر نہ آیا اُسنے مشا سے کہا "دیکھو مشا یہاں کوئی بھی نہیں ہے"......

دانیا نے جواب دیا "یقینی، اور اسی وجہ سے تو ہم اُس سے بیحد محبت کرتے تھے، تم تو یہ بھی جانتے ہو کہ اسٹیپکا آپا کو دل سے پیار کرتا تھا اور اُس سے شادی بھی کرنا چاہتا تھا، اسی وجہ سے

لوگوں نے اُسے قید میں بھی ڈال دیا۔ جب آنیا نے خود کو ڈبو دیا تو اسٹیپکا نے مالکہ سے کہا مجھے فوج میں بھرتی کرا دو۔ میں تمہاری خدمت کرنے سے سپاہی بن کر اپنی زندگی گذارنا بہتر خیال کرتا ہوں۔ اس پر مالکہ نے کہا کہ نہیں اسٹیپکا تمہیں فوج میں جانا نہیں ملے گا ہاں اگر چاہو تو تمہیں بھیڑوں کا چرواہا بننے کی اجازت دی جا سکتی ہے، اور اُس بیچارے کو ویسا ہی کرنا پڑا۔"

"وآنیا ذرا یہ تو بتاؤ کہ کیا سپاہی بنکر انسان کو اور زیادہ مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں؟"

"کیا معلوم۔ بہرحال اس زندگی سے تو زیادہ مصیبت نہ اُٹھانا پڑتی ہوگی۔ افسوس مشا ہماری بھی کیا زندگی ہے!"

اپنی مصیبت کے خیال سے اُس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"اچھا مشا آؤ ایکبار تمام کمروں میں پھر چکر لگائیں۔"

مشا نے چپکے سے کہا "اچھا چلو آخری بار اور سہی"

وآنیا آگے آگے چلا۔ اُس نے کہا "یہ بڑا کمرہ ہے۔"

مشا نے دُہرایا "یہ بڑا کمرہ ہے۔"

"میرے ننھے بھائی آؤ کمرے کے گوشے گوشے کو رخصتی سلام کرلیں۔"

مشا نے چار مرتبہ سلام کیا، وآنیا نے بھی ویسا ہی کیا۔ اُسکے بعد ہر ایک کمرہ سے گزرتے ہوئے اور چاروں کونوں کی طرف تعظیماً جھکتے ہوئے وہ بالآخر اپنی خوابگاہ میں پہونچے یہاں وآنیا نے فرش پر تھوکا، مشا نے بھی ویسا ہی کیا۔

"مشا فرض کرو کہ ہم یہاں روشنی کردیں، ہاں آؤ یہاں روشنی کردیں۔" مشا کی نیلی آنکھیں ایک لمحہ کیلئے روشن ہو گئیں اور کسی کی مسکراہٹ نے ننھے غلام کے چہرے کو چمکا دیا، انہوں نے تمام شمعیں روشن کیں۔ اس کے بعد مشا میزبان بنا اور وآنیا مہمان۔ مگر اُن کو مخملی دیوان پر بیٹھنے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ بہت زور سے

گھنٹی بجی۔ میزبان اور مہمان کے چہرے خوف کی وجہ سے سفید پڑ گئے۔ وہ بسرعت دیوان پر سے کود پڑے اور شمعیں گل کی جا چکی تھیں۔ بچے ڈیوڑھی کے دروازہ سے بھاگے لیکن دروازے کے باہر مالکہ کی قہر آمیز آواز سنائی دی۔

"کمبختو! نکمو! تم کیا کر رہے ہو؟ شیطان کے بچو مجھے کمرے کے باہر کھڑا رکھنے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟"

اسی وقت اُس کے شوہر کی آواز آئی "میری پیاری اپنے تئیں پریشان نہ کرو کہیں ہمارا بھائی نکانر نہ آیا ہو"

اسی لمحہ وآنیا نے دروازہ کھولا۔ مالکہ نے غضبناک لہجہ میں پوچھا "کیا ہمارا بھائی نکانر یہاں آیا ہے؟"

وآنیا نے جواب دیا "نہیں بیگم صاحبہ کوئی نہیں آیا"

"پھر تمام شمعیں جلانے کی کس کو جرأت ہوئی؟"

"کسی کو نہیں بیگم صاحبہ"

اس جواب پر ایک ایسا زوردار گھونسہ وآنیا پر پڑا کہ وہ لڑھک کر فرش پر جا گرا، مالکہ نے ننھے مشا کو گھسیٹتے ہوئے دوبارہ پوچھا "کس نے شمعیں جلائی ہیں؟"

وآنیا نے مالکہ پر جھپٹ کر اُس کے چہرے کو اپنے ناخنوں سے نوچتے ہوئے ایک مجنونانہ چیخ نکالی کہ ایک لمحہ کیلئے وہ خود اپنا تمام خوف بھول گیا، اُس نے دیوانگی میں کہا "اب تم ہم کو زیادہ عرصہ تک تکلیفیں نہیں پہونچا سکتیں"

مالکہ بیہوش ہو گئی، وآنیا اتنے غضبناک جوش و خروش سے لڑا کہ اُس کو قابو میں لانا دشوار ہو گیا، غم و غصہ سے وہ پاگل ہو رہا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح لوگ اُسے گھسیٹتے ہوئے باورچی خانہ میں لے گئے جہاں وہ ایک زخمی جانور کی طرح جو چاروں طرف سے گھر گیا ہو دردناک چیخیں بلند کرتا رہا۔ اُس کی آنکھ میں اس وقت ایک آنسو بھی نہ تھا۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ مالکہ نے اِن چھوٹے بچوں کو اس رات کو سزا دینے کا کوئی حکم نہیں دیا۔

جب یہ معاملہ ختم ہو گیا تو وآنیا تکان سے چور ہو کر سو گیا۔ بیچارہ مشا بھی وآنیا کے پاس دبک گیا مگر اس کی پلک تک نہ جھپکی۔ وہ یہ خیال کر کے کانپ اٹھا کہ دوسرے دن اُن کے لئے خدا معلوم کیا سزا تجویز ہوتی ہے، اُس نے اپنے تصور میں پھر آلیا کا چہرہ دیکھا اور اُس کی آواز سُنی لیکن وہ اِس وقت اُونی پوشاک میں ملبوس نہ تھی بلکہ ایک جھرجھری سفید عبا میں اُس کا جسم لپٹا ہوا تھا اور اُس کے بھورے بالوں پر ایک چمکدار تاج رکھا ہوا تھا۔

تین بجے کے قریب اُس کی آنکھ لگی مگر چار بجے وآنیا نے اُسے جگا کر چپکے سے کان میں کہا "اب وقت آگیا ہے۔" مشا اٹھ بیٹھا اور غیر ارادی طور پر اُس نے کپڑے پہن لئے، اُسے اس کا کچھ احساس نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے، دونوں کمرہ سے گذرے اور باہر نکل کر صبح کی سرد ہوا میں کھڑے ہو گئے، وآنیا اپنے ساتھ ایک قینچی بھی لیتا آیا تھا۔ اس نے اُس سے اپنے بلاوزر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اس کے بعد اُس نے جوتے کے پرزے پرزے کئے اور ننگے پیر کھڑا ہو کر بڑبڑایا "یہ سب مالکہ کے کسی کام نہ آئیں گے۔" مشا نے اُسے بغور دیکھا، اُس کی ننھی روح پر یہ روشن ہو گیا کہ اب وہ حقیقتاً زندگی کو خیرباد کہہ رہا ہے۔ وہ بے تحاشا سسکیاں بھرنے لگا۔ وآنیا نے دانت پیس کر کہا "روئے بچے اپنے بستر پر واپس چلا جا۔"

"نہیں نہیں وآنیا میں تم کو کبھی نہ چھوڑونگا۔"

"آہ تب تم کیوں روتے ہو؟ کیا تم رات کا واقعہ بھول گئے؟" اس کے بعد وہ صحن سے ہو کر گذرنے لگے، کتے نے مسرت آمیز استقبال کرتے ہوئے اُن کی طرف جست کی، وآنیا نے اسکو ہنٹر دکھایا جس سے وہ "کوں کوں" کرتا ہوا تاریخانہ میں چلا گیا۔

صبح نمناک اور خنک تھی۔ وآنیا اپنی قمیص میں کانپ رہا تھا، دونوں مکان کی چہار دیواری سے پھاندے، سامنے لق و دق اُجڑے ہوئے میدان تھے، ایک گہری خاموشی اُن کو گھیرے ہوئے تھی، تھوڑے فاصلہ پر ایک گہری خندق منہ پھیلائے ہوئے تھی، اسی جگہ اُنہیں اپنا کام انجام دینا تھا۔ پہلے وآنیا نے جست لگائی، مشا نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ وہ بالکل ساکت تھا، مگر زندگی کی خاموش اور فطری محبت ہر قدم کے ساتھ اُس کے دل میں بڑھتی جا رہی تھی لیکن اُسے کچھ کہنے سننے کی ہمت نہ تھی اُسے وآنیا سے ڈر لگتا تھا مگر شاید اس لمحے وآنیا کو بھی اپنی عزیز جان لینے پر افسوس معلوم ہو رہا ہو، شاید اُس کی روح میں وہی ناقابل مدافعت جذبہ کام کر رہا ہو، وہ سردی سے کانپ رہا تھا مگر پھر بھی اُس کے دماغ میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وآنیا ایک چاقو سے دوسرا چاقو تیز کرتا ہوا آگے بڑھا، چاقوؤں کی اس مرعوب کُن آواز نے مشا کے دل کو بے حرکت بنا دیا مگر وہ چُپ چاپ دم بخود اندھوں کی اطاعت کے انداز میں وآنیا کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔

. . . .

. . . .

صبح ہوتے دو روسی دیہاتی بچوں نے ایک چرواہے کو جو گہری نیند میں پڑا سو رہا تھا جگا کر کہا کہ انہوں نے خندق سے امداد کیلئے کسی کی دردناک چیخیں بلند ہوتی ہوئی سنی ہیں۔ اجڑے ہوئے میدان میں یہ آوازیں گونج رہی تھیں "کوئی مدد کرو! کوئی مدد کرو!" وہ سب لوگ خندق کی طرف دوڑے، وہاں انہوں نے دو بچوں کو پایا، ایک نیم برہنہ اور دونوں خون میں لتھڑے ہوئے تھے، وآنیا بے حرکت پڑا تھا، اس کا جسم سرد اور مُردہ ہو چکا تھا۔ اس کے ہاتھ نے ذرا سی لغزش تک نہ کی تھی۔ بلکہ نہایت مستحکم اور بھرپور وار کیا تھا مشا ابھی دم توڑ رہا تھا، اُس کا ننھا اور کپکپاتا ہاتھ کاری ضرب نہ لگا سکا تھا۔

مسعود حسن

ساقی

مری مستی میں بھی اب ہوش ہی کا طور ہے ساقی
ترے ساغر میں یہ صہبا نہیں کچھ اور ہے ساقی

بھڑکتی جا رہی ہے دم بہ دم اِک آگ سی دل میں
یہ کیسے جام ہیں ساقی یہ کیسا دَور ہے ساقی

کہیں اِک رند اور واماندۂ افکارِ پنہانی
کہیں محفل کی محفل طور سے بے طور ہے ساقی

وہ شے دے جس سے نیند آجائے عقلِ فتنہ پرور کو
کہ دل آزردۂ تمیزِ لطف و جور ہے ساقی

مجھے پینے دے۔ پینے دے! کہ تیرے جامِ رنگیں میں
ابھی کچھ اور ہے ــ کچھ اور ہے ــ کچھ اور ہے ساقی

چھلکتی ہے جو تیرے جام سے اُس مے کا کیا کہنا
ترے شاداب ہونٹوں کی مگر کچھ اور ہے ساقی

مرے ایماں سے مت ڈر مرے اسلام پر مت جا
وہ انساں ہوں کہ مذہب ہی مرا کچھ اور ہے ساقی

علی گڈھ میرا فاراں اور دلّی طور ہے میرا
مدینہ لکھنؤ کعبہ مرا لاہور ہے ساقی

مجازؔ
بی۔ اے۔ (علیگ)

سزا

یہ کہانی پنجاب کے ایک گاؤں سے وابستہ ہے۔

چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دو ایک حویلیوں کو چھوڑ کر باقی تمام مکانات گارے کے بنے ہوئے تھے۔ وہی جوہڑ، وہی ببول، شرینہہ اور بیریوں کے درخت، وہی گھنے پیپل کے تلے رُوں رُوں کرتے ہوئے رہٹ، وہی صبح کے وقت کنوؤں پر کنواریوں کے جمگھٹ، دوپہر کو بڑے بوڑھوں کی شطرنج اور چوپٹ، شام کو نوجوانوں کی کبڈی اور پُرسکوت راتوں میں وارث علی شاہ کی ہیر، ہیر اور قاضی کے سوال وجواب، وہی مضبوط، نٹ کھٹ اور چنچل چھوکریاں اور وہی سیدھے سادے بلند قامت اور وجیہہ نوجوان ——

شام ہو چکی تھی۔

گھر میں پکانے کے کیلئے کوئی چیز نہ تھی۔ اس لئے جیت کور پیسہ آنچل میں باندھ کر دال لینے کیلئے گھر سے باہر نکلی۔ لیکن چار قدم چل کر رُک گئی۔ سامنے پیپل کے نیچے مگدر کے قریب لچھمن سنگھ چارپائی پر بیٹھا مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔

جیت کور جانتی تھی کہ جب وہ اُس کے پاس سے گذریگی تو وہ اُسے بغیر چھیڑے ہرگز نہ رہیگا۔ لہٰذا اُس نے سوچا کہ بجائے دال کے کسی کھیت سے ساگ لے آتی ہوں۔ اس طرح سے وہ پیسہ چھوٹا بھائی چلنّن خرچ کرے گا۔ آج دوپہر بھر وہ کھانڈ کی رنگدار گولیوں کے لئے روتا رہا تھا۔ یہ سوچ کر وہ کھیتوں کی طرف چل دی۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ ببول اور کِکروں کے سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ جیت کور چھوٹی چھوٹی کانٹے دار جھاڑیوں سے شلوار بچاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ جامن کے قریب بیروں کی جھاڑیاں تھیں۔ اُس نے تھوڑے سے بیر چلنّن کیلئے توڑ لئے، پھر آگے بڑھی۔ اُس کے چہرے سے افسردگی اور غصہ کے آثار ہویدا تھے۔

اس وقت وہ لچھمن سنگھ کی بابت سوچ رہی تھی۔ آخر لچھمن سنگھ اُسے کیوں دِق کرتا ہے۔ اگر اور نہیں تو سمتری اُس سے کم حسین تو نہ تھی۔ وہ اُسے کیوں نہیں چھیڑتا؟ لیکن سمتری کے تین جوان بھائی تھے۔ اگر کوئی اُس کی طرف انگلی بھی اُٹھائے تو وہ اُس کا خون پی جائیں۔ یہ خیال آتے ہی اُسے اپنا بھائی یاد آگیا۔ تین سال پہلے جبکہ اُسکی عمر پندرہ برس کی تھی اُس کا بھائی گھر سے کھانا کھا کر کنوئیں پر گیا جہاں اُس نے تربوز کھالیا۔ اور شام تک ہیضہ سے مر گیا۔ اُس کا بھائی گاؤں بھر میں سب سے زیادہ دراز قد تھا۔ اس کا سینہ ایسا تھا جیسے کسی بڑی چکی کا پاٹ۔ ایک بالشت اونچی اور موٹی گردن۔ چوڑے چکلے مضبوط ہاتھ۔ کلائی پکڑنے اور کبڈی کھیلنے میں دور دور تک کوئی اُس کی برابری کا دعویدار نہ تھا۔ ایکدفعہ کبڈی میں اُس نے تھپڑ مار کر اپنے حریف نوجوان کی ہنسلی کی ہڈی توڑ دی تھی۔ یہ باتیں یاد کر کر کے جیت کور کی آنکھوں میں آنسو آگئے، بھلا آج اُس کا بھائی زندہ ہوتا تو کیا لچھمن سنگھ کی ہمت پڑ سکتی تھی کہ اس سے چھیڑ خانی کرے۔ کل ہی کی بات تو ہے کہ اس بدمعاش نے اُس کا آنچل کھینچکر اُس کا سر ننگا کر دیا تھا۔ یہ سب اسی لئے تو تھا کہ وہ نمبردار کا لڑکا تھا اور دوسرے یہ اُن کے قرضدار تھے۔ ماں کی موت کے بعد اِن پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ماں کے بعد باپ مرا۔ باپ کے بعد اس کا بھائی مرا اور اب بوڑھا دادا رہ گیا تھا جسے وہ بابو کہا کرتی تھی۔ یا چلنّن تھا۔ چھ سال کا بچہ۔ ماں باپ کی آخری نشانی۔ کئی دفعہ فصلیں خراب ہوئیں۔ نمبردار کا ڈیڑھ سو روپے کا قرضہ سر پر ہو گیا۔ زمین علیحدہ رہن تھی۔ بابو بوڑھا تھا۔ اِن تمام مصیبتوں پر طرّہ یہ کہ بے شرم لچھمن سنگھ اُسے دَم نہ لینے دیتا تھا۔

اب جیت کور کا پھر سے خون کھولنے لگا۔ اُس کے دل میں تمام مردوں کیلئے نفرت پیدا ہو رہی تھی۔ دل ہی دل میں کہنے لگی اب تارا سنگھ کو ہی دیکھو۔ اُس کا نہ آگا نہ پیچھا۔ بس لے دیکے اُس کی ماں ہے تھوڑے دن کی مہمان۔ اُسے بھلا کاہے کی فکر؟ زمین ہے۔ ایک کچا مکان۔ تین بیل۔ ایک بھینس اور ایک گائے بھی ہے۔ اُسے اپنی اکیلی جان کیلئے یہ کافی سے زیادہ ہے۔ مارے بے فکری کے رانڈ کا سانڈ ہو رہا ہے۔ جب دیکھو مونچھ پہ ہاتھ۔ اتنا لمبا چوڑا جوان ہو کر بچاری کمزور لڑکیوں پر آوازے کستے شرم نہیں آتی۔ میں تو کہونگی کہ سبھی مرد پرلے درجے کے مغرور، غنڈے اور پاجی ہوتے ہیں۔ جب کبھی پانی کا گھڑا کنوئیں سے اُٹھا کر لاتی ہوں تو کیسی بھدی آواز سے گاتا ہے،۔۔

نِکا گھڑا چک لچھیئے! تیرے لک نوں جرب نہ آ وے۔[۱]

نِکا گھڑا چک لچھیئے!۔

باپو کا خیال ہے کہ میں اُس سے شادی کر لوں، مگر میں ایسے لفنگے کے ساتھ شادی کروں کیوں؟ مانا کہ بھمن سنگھ کی طرح اُس نے دست درازی کبھی نہیں کی مگر اِس قسم کے گانے نوجوان لڑکیوں کو سُنا سُنا کر گانا بھی تو بھلے آدمیوں کا کام نہیں۔

اِس وقت جیت کور کو رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کاش واہگورو اکال پرکھ اُسے طاقت دیتا تو وہ اِن دل پھینک عاشقوں کو اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی۔

چلتے چلتے وہ رُک گئی۔ سامنے گنّے کے کھیتوں کے پاس ہی ہرا بھرا ساگ کا کھیت تھا۔ لیکن وہ کھیت تھا تارا سنگھ کا۔ اِسنے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مویشی باندھنے کا مکان خالی معلوم پڑتا تھا۔ رہٹ چل رہا تھا۔ اور پاس ہی بیل بندھا ہوا تھا۔

اُس نے جب اچھی طرح سے دیکھ لیا کہ نزدیک کوئی نہیں ہے تو وہ چپکے سے کھیت میں سمٹ سمٹا کر بیٹھ گئی۔ اور جلدی جلدی ساگ توڑنے لگی۔ مگر ایک آواز سُنکر اُس نے سہم کر سر اُوپر اُٹھایا۔ دیکھا کہ دُور گنّے کے کھیتوں سے تارو ہاتھ میں پھاوڑا لئے بلند آواز سے گالیاں دیتا چلا آتا ہے۔ اس کے جسم میں سنسنی سی پیدا ہوئی اور وہ ساگ وہیں پھینک کر جلدی جلدی دوسری طرف کو چلدی۔ اتنے میں تارو وہاں پہونچا۔ اُس نے توڑا ہوا ساگ ہاتھ میں اُٹھا کر دیکھا اور پھر اُس کی طرف لپکا۔ اِدھر اس کے چھوٹے چھوٹے پھٹے ہوئے سلیپر ہری گھاس پر بار بار رپٹتے تھے۔ یہ دیکھکر کہ تارو اُس کو پکڑنا ہی چاہتا ہے وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ تارو بھی دوڑا۔ مختصر سی دوڑ کے بعد تارو نے اُسے جا دبوچا۔ اور اُس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ کر بولا "کیوں ری جیتو! ہم سے یہ چالاکیاں؟ ہر روز تو ہی ساگ چرا کر لے جاتی تھی نا؟ آج میں بھی اِسی تاک میں بیٹھا تھا"

جیتو روتے ہوئے اور اُس کی آہنی گرفت سے بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "میں تو تیرے کھیت میں پہلے کبھی نہیں آئی.... چھوڑ مجھے"

"کبھی نہیں آئی تھی...." تارو دانت پیستے ہوئے بولا۔

"چل آج میں تجھے چکھاتا ہوں مزا"

تب تارو اُسے گھسیٹتا ہوا کچے مکان کی طرف لے گیا اور دروازہ کھولکر اُسے زور سے اندر دھکیل دیا۔ وہ بھینس کے اُوپر گرنے سے بال بال بچی۔ اُس کی ایک چوڑی بھی ٹوٹ گئی۔ چوڑی کو ٹوٹتے دیکھکر دامنِ صبر اُس کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ چیخکر بولی۔

"تُو نے میری چوڑی توڑ دی۔ میں نے اتنے شوق سے میلے سے لی تھیں...." اُس کی آواز بھرا گئی اور وہ شکستہ چوڑی کے ٹکڑوں کو دیکھ دیکھ کر آنسو بہانے لگی۔

اب تارو نرم پڑ گیا۔ دل میں افسوس بھی پیدا ہوا۔ یکایک اُس نے دیکھا کہ چوڑی کا ٹکڑا چبھ جانے سے جیتو کی کلائی سے خون

[۱] اے دوشیزہ تو چھوٹا گھڑا اُٹھایا کر۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں تیری نازک کمر میں بل نہ آجائے۔

بہہ رہا ہے۔ وہ ایک دم آگے بڑھا " اوہو! جیتو تمہاری کلائی سے خون بہہ رہا ہے۔ لاؤ۔۔۔۔۔۔"

"ہٹ" جیتو نے دو قدم پیچھے ہٹ کر کہا " بدمعاش۔۔۔ کلموہا۔۔ مسٹنڈا۔۔۔"

تارو گالیاں کھا کر خاموش ہوگیا۔ اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ وہ تو دو گھڑی کیلئے جیتو کو پریشان کرنا چاہتا تھا کیونکہ اُسے دق کرنے میں اُسے مزہ آتا تھا۔ لیکن اس کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ جیتو کا کوئی نقصان ہو یا وہ اُسے کوئی جسمانی ایذا پہونچے۔

جیتو دیوار کے پاس کھڑی چپکے چپکے رو رہی تھی۔ اور تارو اپنی گردن کھجا رہا تھا۔ اُس کے دل میں رحم کے جذبات پیدا ہو چکے تھے مگر وہ ہمدردی کا اظہار نہ کر سکتا تھا۔ دو گھڑی بعد وہ باہر نکل آیا اور دروازہ بند کر کے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد تارو سرسوں کا عمدہ ساگ لئے صحن میں داخل ہوا۔ جیتو نے نظر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اسکی بھیگی بھیگی لانبی پلکوں کو دیکھکر تارو کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اس کو اپنی حرکت پر بہت افسوس ہو رہا تھا۔ وہ جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور ساگ کا گٹھا آگے بڑھاتے ہوئے بولا " جیتو! اب تم گھر جاؤ۔ لو یہ ساگ "

جیتو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ اُس نے جھپٹ کر ساگ لیا اور اُلٹا اُس کے منہ پر دے مارا۔ تمام ساگ بکھر کر زمین پر گر پڑا۔ اور دو چار پتے تارو کی چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی میں پھنس کر رہ گئے۔ تارو منہ سے کچھ نہ بولا اور جھک کر پھر ساگ کو چننا شروع کر دیا۔

جیتو جلدی سے باہر نکل آئی۔ تارو بھی ساگ لئے پیچھے پیچھے لپکا۔ جیتو پانی کی نالی پھاندنے لگی۔ اس کا ایک پاؤں زمین میں دھنس گیا۔ کیونکہ زمین نمی کی وجہ سے نرم ہو رہی تھی۔ اس نے پاؤں باہر کھینچ لیا لیکن سلیپر پھنسا رہ گیا۔ تارو نے بڑھکر جلدی سے سلیپر باہر کھینچ لیا اور کہنے لگا " تم ٹھہرو میں ابھی دھوئے دیتا ہوں۔۔۔"

نالی کے کنارے کپڑے دھونے کی سل پڑی تھی۔ جیتو اس پر منہ پھلا کر بیٹھ گئی اور تارو پانی کی دھار میں پہلے ساگ دھونے لگا۔ وہ اب کوئی صلح کی گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ دھیمی آواز اور اپنی دانست میں بہت نرم لہجہ میں کہنا شروع کیا۔

" جیتو! یہ بھینس تو اب دو کوڑی کی نہیں رہی۔ تین سیر صرف تین سیر دودھ دیتی ہے۔ بھلا ایسی بھینس رکھنے سے فائدہ! ۔۔۔ ایک بھوری بھینس میری نظر میں ہے۔ کم سے کم سولہ سیر دودھ دینے والی۔ دام زیادہ ہیں مگر کچھ ہرج نہیں مجھے بھینس رکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے ایک سو پچپن روپے جمع کئے ہیں۔ بڑی مشکل سے، بہت ہی مشکل سے۔ اُس بھینس کو ضرور خریدونگا۔ ایسی مریل بھینس رکھنے سے کیا فائدہ؟ ایسی بھینس۔۔۔۔۔"

تارو کو اپنی باتیں بالکل مہمل سی معلوم دے رہی تھیں۔ اُسے اتنا بھی حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ نظر اُٹھا کر جیتو کی طرف دیکھ لے۔ اُسنے ساگ دھو کر ایک طرف رکھ دیا اور اب ٹوٹا ہوا سلیپر دھونے لگا۔ ایک بات اور سوجھی۔ بولا " اور ہاں تم وریامو کو تو جانتی ہی ہو۔ بہت ہی کھوٹا آدمی ہے۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ چنن کے کان اینٹھ رہا ہے۔ میں نے سبب پوچھا تو کچھ ڈر گیا۔ کہنے لگا کہ اس نے کھیت سے ایک خربوزہ چرایا تھا۔ میں نے چنن کو اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔ بچارا چڑیا کی طرح سہما ہوا تھا۔ اور پھر میں نے دو دھپ وریامو کی گردن پر دئے اور کہا کہ " تو اتنی سی بات پر لونڈے کو مارے ڈالتا ہے۔ خبردار! جو اسے کبھی ہاتھ بھی لگایا تو۔۔۔۔۔ جانتا نہیں چنن کس کا بھائی ہے؟ "

یہ کہکر تارو خاموش ہوگیا۔ اور اُس نے چپکے سے کنکھیوں سے جیتو کی طرف دیکھا۔ مگر وہ ابھی تک منہ پھلائے خاموشی سے اپنے کبوتروں کے سے سفید سفید پاؤں کو ٹھیکری سے رگڑ رگڑ کر دھو رہی تھی۔ تارو اٹھا اور سلیپر اُس کے پاؤں کے پاس رکھ دیئے۔

اور ساگ بھی جھولی میں ڈال دیا۔ وہ بے نیازی سے اٹھی اور اٹھلاتی ہوئی چل دی۔ وہ نزدیکی رستہ سے جلد از جلد پہونچنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اب اندھیرا ہو چلا تھا مگر رستہ خراب تھا۔ کھیتوں میں پانی بھرا تھا۔ اور مینڈ بہت کم چوڑی تھی۔ جیتو نے سلیپر ہاتھ میں لیکر بجائے مینڈھ کے پانی میں سے ہوکر جانے کی ٹھانی۔ تارو جلدی سے آگے بڑھا اور اُس کا بازو تھام کر بولا "تم سلیپر پہن کر مینڈھ پر سے چلی چلو۔ کیونکہ پانی کے اندر کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تمہیں سہارا دیئے رہونگا۔ ۔"

جیتو نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ اور کہنے لگی "تم لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ تم لوگ ہر کام بُری نیت سے کرتے ہو۔ مگر میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب تم لوگوں کی اس قسم کی حرکات چپکے سے برداشت نہ کرونگی۔"

یہ "خراب نیت" کے الفاظ سُنکر تارو نے اپنی صفائی کرنا چاہی مگر جیتو چمک کر بولی "اور آج میں تمہیں خبردار کئے دیتی ہوں کہ آئندہ مجھے ہاتھ لگانے کی جُرات ہرگز نہ کرنا ورنہ ہاتھ توڑ دونگی۔"

تارو نے پہلے اُسکے نرم و نازک ننھے مُنے ہاتھوں کو دیکھا پھر اپنے بھاری بھرکم، میلے کچیلے اور کھُردرے ہاتھوں پر نظر ڈالی اور تب اُسکے لبوں پر تبسم پیدا ہوا۔

جیتو کو اُس کی یہ حرکت دیکھ کر زہر سا چڑھ گیا اور اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ تڑاق سے سلیپر اُسکے منہ پر دے مارا۔

"جیتو!" تارو مغاشیر کی طرح غصہ میں گرجا لیکن پھر نہ معلوم کیا سوچکر خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کیلئے دونوں طرف سکوت سا رہا۔ پھر جیتو بے پروائی سے شلوار اٹھا کر پانی میں چلدی۔ سلیپر کی ایک کیل تھوڑی باہر نکلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے تارو کی پیشانی پر خراش آگئی اور خون بہنے لگا۔ مگر وہ خون سے بے پروا جیتو کے آگے آگے چل رہا تھا۔ راستے میں جو کانٹے دار جھاڑی ہوتی اُسے اپنے پھاوڑے کے ایک وار سے اُکھاڑ کر جیتو کو راستہ صاف کر دیتا۔ جب یہ پانی کا راستہ ختم ہوگیا تو تارو نے بڑھکر کانٹے دار جھاڑی میں سے راستہ بنا دیا اور خود ٹھہر گیا۔ جیتو نے ایک لمحہ کے لئے اس کے خون سے تر چہرے کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

تاریکی میں اُس نے گھر کا دروازہ کھولا۔

ایک طرف چراغ جل رہا تھا۔ بابو گنڈاسے سے جوار کاٹنے میں مشغول تھا۔ چنن قینچی سے کاغذ کے پھول بنانے میں مصروف تھا ۔۔۔ !

جیتو اندر داخل ہوئی تو بابو نے ایک دفعہ سر اُٹھایا اور پھر جھک گیا۔ چنن نے ایک مرتبہ کہا "بہن آگئی" اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

اُس نے کونے میں سے کپاس کی سوکھی چھڑیاں اٹھائیں اور انہیں توڑ کر چولھے میں رکھا اور اُوپر اُپلے رکھکر آگ جلائی تب مٹی کی ہنڈیا میں ساگ پکنے کیلئے رکھدیا۔

بابو آہستہ سے بولا "آج نمبردار اور سپاہی پھر آئے تھے"

وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ اُس کے ہاتھ رُک گئے۔ وہ عالمِ خیال میں تاریکی کی طرف دیکھنے لگی۔ اُن کی بربادی اور تباہی ناچتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ جگ ہنسائی اس کے علاوہ تھی۔ اُس نے سرد آہ بھر کر سر جھکا لیا اور کچھ بیچینی سے اُٹھی اور آٹا لیکر تنور پر روٹی پکانے چلی گئی۔

روٹی کھاتے وقت بابو نے بتایا کہ سپاہی کہتا تھا کہ اگر پرسوں تک روپے کا انتظام نہ ہوسکا تو گھر کی قُرقی کرا دی جائے گی۔

انسان پر مصیبت آتی ہے تو ایک نہیں بلکہ سینکڑوں مصائب پے در پے حملہ آور ہوکر انسان کو بے بس و لاچار بنا دیتی ہیں۔

آج گویا آخری دن تھا۔ باپو صبح سے باہر گیا ہوا دوپہر کو گھر واپس آیا، اُس کے اُداس جھرّیوں دار چہرے سے صاف عیاں تھا کہ روپے کا بندوبست نہ ہو سکا۔ جیتو کی ماں کا ایک سونے کا زیور بیچا تھا کُل بائیس روپے جمع ہوئے تھے۔ باقی ایک سو تیس کہاں سے آئیں گے۔ گھر کے مویشی بیچنے سے کچھ روپیہ مل سکتا تھا مگر انہیں سے تو روزی تھی اگر وہ بک گئے تو گویا دال روٹی سے بھی گئے جیتو دوپہر کا کام ختم کر کے گھر سے باہر تھوڑی دیر تک وہ کھلی ہوا میں کھڑی رہی۔ نمبردار ابھی تک نہ آیا تھا لیکن اُسے آنا ضرور تھا۔ اور کل؟ کل تمام دُنیا اُن کا تماشہ دیکھے گی۔

سامنے سے کالی گھٹا جھوم کر اُٹھی اور آسمان پر چھا گئی۔

جیتو گوردوارے کی طرف چل دی۔ یہ چھوٹا سا گوردوارہ گاؤں سے کم و بیش تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ عمارت پُرانی تھی۔ دو تین کوٹھریاں مسافروں کے واسطے بنی ہوئی تھیں۔ اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا باغ تھا۔

گوردوارے کا کام ایک پرہیزگار اور پاکباز بزرگ کے سپرد تھا جیتو کے باپو کی اُن سے گاڑھی چھنتی تھی۔ یہ بزرگ جیتو کو سکھ گوروؤں کی پاک زندگی کے واقعات اُن کی قربانی اور ایثار کی کہانیاں سُنایا کرتے تھے۔ جس سے جیتو کے دل کو گونہ تسلی ہوتی تھی۔ جب وہ وہاں پہونچی تو معلوم ہوا کہ وہ بزرگ دوسرے گاؤں میں کسی کام کی وجہ سے گئے ہیں۔ اُس نے کنوئیں پر اشنان کیا۔ کتاب پاک کے آگے سر جھکایا اور بابا نانک کی درگاہ سے رو رو کر اِس مصیبت کے ٹل جانے کی دُعا کرتی رہی۔ پھر اُس نے چنبیلی کے پھول چنے اور جیتن کیلئے ہار گوندھنے لگی۔ کیونکہ آج صبح اُس نے اُس سے ہار کا پکا وعدہ کیا تھا۔ اتنے میں بارش شروع ہو گئی۔ خوب موسلا دھار ہوئی۔ آخر جب بارش بند ہو گئی اور وہ بزرگ نہ آئے تو جیتو نے ہار اپنے بالوں کے جوڑے سے لپیٹا اور گاؤں کی طرف چل دی۔

بادل ابھی تک چھائے ہوئے تھے۔ روشنی آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی۔ وہ ہنوز گھر سے کافی دُور تھی کہ اُس نے دیکھا کہ ایک سپاہی اور گاؤں کا نمبردار اُن کے گھر سے باہر آرہے ہیں۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اُس کے پاؤں شل ہو گئے۔ آخر کیا ہوا ہوگا؟ کل .... ہاں کل ڈھول پٹ جائیگا ..... وہ آگے کچھ نہ سوچ سکی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے گھر کی طرف جانے کے بجائے اور ہی کسی طرف چل دی۔ وہ جانتی تھی کہ اِس وقت اُس کے بوڑھے دادا کی کیا حالت ہو رہی ہوگی۔ مگر اُس کا حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ گھر جائے۔ وہ عجب پریشانی میں چلتی گئی نہ معلوم کتنی دُور تک ــــــ آخر اُس کی ٹانگوں نے جواب دیدیا اور وہ وہیں کھیت کے کنارے بیٹھ گئی۔

ہم دُکھ سے اتنا نہیں گھبراتے جتنا کہ دُکھ کے تصوّر سے وہ جانتی تھی کہ اِس تکلیف کا سامنا اُسے کرنا ہی پڑیگا۔ مگر وہ چاہتی تھی کہ تاریکی چھا جائے اور وہ اندھیرے میں سب کی نظروں سے بچکر چپکے سے اپنے گھر میں چلی جائے۔ اُسکی آنکھوں کے سامنے اپنے گھر کی تصویر آگئی۔ جہاں اُسنے بچپن سے ابتک اپنی زندگی کے دن گزارے تھے۔ اور اب وہ گھر غیروں کا ہونے والا تھا۔

تاریکیاں چھانے لگیں۔ آسمان پر اِکّا دُکّا تارا جھلملانے لگا۔ مویشی واپس گاؤں کو جا رہے تھے۔ جوہڑ کے کنارے پیلے پیلے مینڈک ٹرّا رہے تھے۔ جھاڑیوں میں ٹڈے اپنی تیز آواز سے بول رہے تھے۔ اور گِدھ بیریوں پر بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔

جیتو نے سر اُٹھایا۔ سامنے دھندلکے میں تارو کا کچا مکان اور رہٹ نظر آرہا تھا۔ آج تارو کا کنواں دیکھکر جیتو پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی۔ پچھلا واقعہ اُس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ جبکہ وہ ساگ لینے کے لئے گئی تھی۔ تارو کی بدمزاجی، اس کی چوڑی کا ٹوٹنا، تارو کا پچھتانا اور اُسے ساگ لا کر دینا، اس کا سلیپر چھونا پھر ہاتھ لگا دینا، تب سلیپر کھا کر بھی ضبط کرنا، اس کے راستے سے

کانٹے صاف کرنا اور اُس کی پیشانی سے لہو کا بہنا سب اس کی نظروں کے سامنے پھر گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ تارو میں ہزار عیب سہی مگر دل کا بُرا نہیں اور آج جبکہ اُس کا دل اُمڈا آتا تھا وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُس کی داستانِ غم سُنے۔ اگر سُننے والا ہمدردی کے کلمات بھی کہدے تو اُس کے دل کو تسلّی ہو جائے۔ مگر ایسا ہمدرد تھا کون ــــ؟۔

تارو کے کنوئیں پر اس وقت کیسا امن و سکون تھا۔ اس وقت رہٹ کی روں روں اور مویشیوں کی گھنٹیوں کی ٹن ٹن نے کیا عجب سماں باندھ رکھا تھا۔ شرینہہ کے بلند درخت ہوا میں جھوم رہے تھے۔ ہرے بھرے کھیت میں سفید گھوڑی گھاس چر رہی تھی گنّوں کے کھیت کے پاس کتّے کھیل رہے تھے کبھی دُم ہوا میں اُٹھا کر عجب انداز سے چلتے، کبھی غرّا کر ایک دوسرے پر لپکتے، اور پھر اکٹھے ہو کر نئے کھیل کھیلنے کی تجویزیں سوچنے لگتے۔

جیتو کو خواہ مخواہ یقین ہونے لگا کہ تارو اُس کا دُکھڑا ضرور ہمدردی سے سُنے گا۔ یہ سوچکر کہ اس طرح سے وقت بھی کٹ جائیگا اور اُس کے دل کا بار بھی ہلکا ہو جائے گا وہ کنوئیں کی طرف چلدی۔ مدار کے پیڑوں اور کانٹے دار جھاڑیوں میں سے ہوتی ہوئی وہ کنوئیں پر پہونچ گئی۔ ہری ہری گھاس کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی۔ جیتو نے اِدھر اُدھر تارو کو دیکھا مگر وہ نظر نہ آیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ اور کچھ ٹھٹکی۔ ٹھٹک کر بڑھی! اور آہستہ سے دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے تارو نے کرخت اور تحکمانہ آواز میں پوچھا۔

جیتو خاموش رہی۔

"ارے بھئی کون ہے؟ چلے آؤ دروازہ کُھلا ہوا ہے"

جیتو نے آہستہ سے دروازہ کھولدیا۔

تارو اُسے دیکھتے ہی اُچھل پڑا "آؤ جیتو! تم کیسے رستہ بھول پڑیں؟"

اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ اُس نے تارو کی طرف جو کہ پیڑھی پر بیٹھا گنّا چُوس رہا تھا دبی نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے بولی "یونہی اِدھر آئی تھی۔ سوچا کہ ماں سے ملتی جاؤں"

"ماں؟ ماں تو کنوئیں پر بہت کم آتی ہے۔ آتی بھی ہے تو دن کو۔ اس وقت گھر پر ہی رہتی ہے"

وہ جانتی تھی کہ تارو کی ماں کنوئیں پر نہیں رہتی، گاؤں میں رہتی ہے۔ بظاہر وہ واپس جانے کے لئے لوٹی تو تارو نے ڈرتے ڈرتے پیڑھی اپنے تلے سے نکال کر اُس کی طرف دھکیل دی اور جھجکتے ہوئے بولا "جیتو! اب آئی ہو تو بیٹھو۔۔۔۔۔ اگر تمہیں جلدی نہ ہو تو بیٹھو۔ ساگ لے جاؤ۔ چنّن کے لئے گنّے لیتی جانا۔ گنّے بہت میٹھے ہیں"

جیتو پیڑھی لیکر تاریک کونے میں بیٹھ گئی۔ تارو شاید دل میں سمجھا ہو گا کہ ساگ اور گنّوں کا داؤ چل گیا۔

تارو نے ٹاٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "آج تو بارش اچھی ہو گئی۔ ہوا مزے کی چل رہی ہے۔۔۔۔۔ کیا تم شربت پیوگی؟ بہت عُمدہ گُڑ رکھا ہے"

"نہیں، پیاس نہیں اس وقت"

"اچھا کچھ ہرج نہیں تم گُڑ گھر لے جانا اور کل کو شربت بنا کر دیکھنا"

"اچھا"

"میں نے چنّن سے کہا تھا کہ گنّے لے جائے، مگر وہ آج تو آیا نہیں۔ اُسے یہاں بھیجدیا کرو۔ رستہ جانتا ہی ہے۔ رس (گنّوں کا) پی جایا کرے گا۔ اور یہ ہمارے پچھواڑے بیر لگے ہوتے ہیں، لال لال بہت میٹھے۔ مَیں تو اِدھر اُدھر کے چھوکروں کو توڑنے نہیں دیتا۔ میں کہتا ہوں کہ چنّن آئے تو کھائے۔ آخر بچہ ہے نا" اُسے بیر بہت بھاتے ہیں۔ جب ہم تم چھوٹے تھے، یاد ہے نا ہم بھی

تو بیر کھانے جایا کرتے تھے۔"

"کیوں تارو! تمہارے گنّے تو خوب ہوئے ہیں اب کے" جیتو نے بات کا رُخ بدل کر کہا۔

"ہاں سب واہگورو اکال پرکھ کی کرپا ہے۔"

وہ خاموش رہی۔

"کہو تو باہر سے گنّا لا دوں۔"

"نہیں تارو میرا جی نہیں چاہتا۔"

اب پھر کچھ دیر کیلئے خاموشی رہی۔ تارو اس کی خاموشی کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ پھر بہت احتیاط سے کہنے لگا۔ "جیتو! .... مجھے دراصل ڈر لگتا ہے کچھ کہتے ہوئے، کہیں تم خفا نہ ہو جاؤ..... آخر بتاؤ نا تم آج اس قدر خاموش کیوں ہو؟ کیا کوئی خاص بات ہے ——؟"

یہ ہمدردی کا کلمہ سن کر جیتو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر تاریکی کی وجہ سے تارو انہیں دیکھ نہ سکا لیکن وہ اپنی بھرائی آواز کو چھپا نہ سکی۔ "نہیں تارو... تمہیں کیا بتاؤں....."

تارو کے چہرے پر سختی کے آثار پیدا ہو گئے۔ آنکھیں غصہ میں چمکنے لگیں۔ وہ کرخت آواز میں کڑک کر بولا۔ "چھمن سنگھ نے کوئی حرکت تو نہیں کی؟ بتا دو جیتو! وہ دیکھ سامنے کرپان لٹکی ہوئی ہے۔ میں نے آج ہی تیز کی ہے۔ میں چھمن کی بابت تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ مگر اب اسکی موت دور نہیں۔ یہ کرپان اسی کا خون پینے کیلئے رکھی ہے....."

"نہیں تارو" جیتو ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "یہ بات نہیں۔ یہ بات بالکل نہیں... میں بتاتی ہوں۔ تم سے کچھ چھپا نہیں..... اصل بات یہ ہے کہ....."

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ تارو چیتے کی طرح چوکنا ہو گیا اور اس کا ہاتھ فوراً پاس پڑی ہوئی کلہاڑی پر جا پڑا۔ جیتو نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"کیا میری بہن یہاں ہے؟" چنن نے آہستہ سے دروازے میں سے سر نکال کر تارو سے پوچھا۔

تارو نے اطمینان کا سانس لیا اور کلہاڑی پیچھے کی طرف سرکا دی۔

"چاند! آجاؤ۔ میں یہاں ہوں۔"

چنن دوڑ کر آیا اور اپنی بہن کی گود میں چڑھ بیٹھا۔

"ڈھونڈ لیا نا تمہیں؟ میں تمہیں بہت دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ پھر میں نے سوچا کہ بہن ضرور ہمارے لئے بیر لینے کیلئے تارو کے کنوئیں پر گئی ہوگی۔"

جیتو اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے بولی۔ "کیوں رے! تجھے ڈر نہیں لگا اندھیرے میں؟"

"نہیں۔"

تارو بولا۔ "واہ! بھلا شیروں کے بچوں کو بھی کبھی ڈر لگا ہے؟"

چنن نے تارو کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ "اچھا تم نے کہا تھا کہ گنّے دیں گے لاؤ اب؟ .... میں تو بہت سے لونگا۔"

"آؤ جتنے چاہو لو۔"

"اچھا، لاؤ دو۔" یہ کہکر وہ گودی سے اترنے لگا۔ مگر پھر رک گیا۔ "ذرا ٹھہرو، ایک بات ہے تمہیں نہیں بتائیں گے۔" پھر بہن کے کان میں کہنے لگا۔ "بہن ہمیں ایک پیسہ دو۔ تم نے کہا تھا...."

"گھر پر لینا۔"

چنن شانوں کو ہلا کر ضد سے کہنے لگا۔ "نہیں ابھی دو۔"

"تم بہت اچھے ہو چنن۔" جیتو نے چمکارتے ہوئے کہا "اس وقت ہے نہیں۔"

"تو تارو سے لے دو۔"

"اس کے پاس بھی نہیں ہے۔"

"ہے کیوں نہیں..... آج جب تم باہر چلی گئی تھیں

تارو ہمارے گھر آیا اور بابو کو اُس نے چھن چھن کر کے بہت سے روپے گن دیے ..... "

"چنن!!" جیتو حیرت سے بولی

لیکن چنن اپنی ہی دُھن میں تھا "مگر میں تو کہتا ہوں کہ بابو نے بہت بُرا کیا۔ اُس نے شام کو سب روپیہ نمبردار کو دیدیا ... "

جیتو کی حیرانی کی حد نہ رہی "مگر یہ تم سے کس نے کہا ؟"

"کس نے کہا ؟" چنن چیخ کر بولا "میں نے خود دیکھا۔ اچھا بتاؤ اب میں تارو سے پیسے لے لوں ؟"

"تم نے خود دیکھا" یہ کہکر وہ خاموشی سے ہوا میں تاکنے لگی۔ ایک بڑے طوفان اور آندھی کے بعد گویا یکایک بادل پھٹ گئے، ہوا خاموش ہوگئی۔ اور ہر طرف بالکل امن وسکون ہوگیا۔ اُس کے دماغ کی پریشانیاں دُور ہوگئیں اسکے دل پر سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔ اس محویت کے عالم میں اُسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب چنن نے تارو سے پیسہ لیا، اور کب وہ کنوئیں پر سے گنے لینے کے لئے باہر دوڑ گیا۔ اور کب تارو اپنی جگہ سے اُٹھ کر بھینس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اس راحت آمیز محویت میں جیتو کو تارو کا خیال آیا وہی دنیا میں اُس کا سچا ہمدرد تھا کس قدر نیک۔ اتنی دیر باتیں کرنے کے باوجود اُس نے اُن روپوں کا اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا۔ وہ روپے اس نے کسقدر مصیبتوں سے جمع کئے تھے۔ مگر اُس نے اپنی ذاتی خواہش پر اسکی ضرورت کو ترجیح دی۔

تارو کا خیال آتے ہی اُس کی صورت اُس کی آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ جب اِس نے اُس سے کہا تھا کہ وہ ہر کام خراب نیت سے کرتا ہے۔ یہ کیسے بے معنی اور خود غرضانہ الفاظ تھے۔ وہ اُس کی زخمی پیشانی، وہ بہتا ہوا خون۔ وہ اُس کا ضبط و تحمل۔ جیتو چونکی اور اُسکی آنکھیں تارو کو ڈھونڈنے لگیں جو کہ اُس کی طرف پُشت کئے بھینس کے پاس کھڑا تھا جیتو اُس کے پاس جاکر آہستہ سے بولی "تارو !"

وہ خاموش رہا۔

"میری طرف دیکھو تارو"

تارو نے دیکھا کہ جیتو کی بڑی بڑی سُرمگیں آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔

وہ اپنی بھاری آواز میں بولا "روتی کیوں ہو جیتو۔ مَیں تو ہر وقت اِسی کوشش میں رہتا ہوں کہ تمہارے کسی کام آسکوں مجھے اُس دن کا اپنی حرکت پر بہت افسوس ہے"

جیتو نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اُس کی پیشانی پر رکھدیا جس جگہ کہ اُس کے کمبخت ہاتھوں نے سلیپر مارا تھا۔ پھر دھیرے سے کہنے لگی۔

"تارو اب میں جاتی ہوں۔ مَیں پھر آؤں گی، اب تم آرام کرو، ہاں۔ مَیں پھر آؤں گی"

یہ کہکر وہ واپس پیڑھی کے پاس آئی اور سلیپر پہن کر لوٹی تو دیکھا کہ تارو راستہ روکے دروازے کے آگے کھڑا ہے۔ وہ مُسکراکر اپنے کرخت لہجہ میں بولا "جیتو آج پھر میری نیت خراب ہورہی ہے آج پھر سزا دیدو"

جیتو نے جھینپ کر ایک اُٹھتی ہوئی نگاہ تارو پر ڈالی پھر جسم چُراتی ہوئی اُس کی طرف بڑھی، اپنے جُوڑے سے چنبیلی کا ہار کھولا اور کچھ مُسکراکر اور کچھ لجاکر وہ ہار اُس کے گلے میں ڈال دیا۔

تارو نے راستے سے ہٹ کر دروازہ کھول دیا۔

آگے چنن گنے لئے بھاگا آرہا تھا۔ جیتو نے گنے تھام لئے اور اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ گوبر اور کیچڑ سے پاؤں بچاتی ہوئی چلدی۔ چنن اُس کے گلے کے گرد باہیں حمائل کرکے کہنے لگا "بہن تارو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ تمہیں کیسا لگتا ہے"

جیتو دل ہی دل میں شرما گئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھکر کہ کوئی سُن تو نہیں رہا، جواب دیا "ہاں چنن! تارو مجھے بھی ..."

تارو بہت اچھا آدمی ہے۔"

جیتو کو اب بھی تارو کے گانے کی بھاری اور بے سُری آواز سنائی دے رہی تھی۔

نکا گھڑا چک پھیئے! تیرے لک توں جرب نہ آوے
نکا گھڑا چک پھیئے!

بلونت سنگھ

دو غزلیں

مجسّم رنگ و نکہت کو، زسرتا پا گلستان کو
ترستا ہے دل اک مدت سے لطفِ تیغ و پیکاں کو
گزشتہ صحبتوں سے لطف اٹھاتا ہوں تصور میں
نظر آتی ہے پھر کچھ ہلکی ہلکی روشنی دل میں
کلی دل کی کھِلی جاتی ہے، اُن کی آمد آمد ہے
نگاہیں تو ملاتا ہوں کسی کی شوخ نظروں سے
قیامت سی قیامت تھی وہ شرمائی ہوئی چتون
چھپانا سیکھئے پہلے، کہیں یوں بھی چھپاتے ہیں

نگاہیں ڈھونڈتی ہیں ایک فردوسِ خراماں کو
شباب انگیز نظروں کو تمنّا خیز مژگاں کو
بڑی کاوش سے روشن کر رہا ہوں شامِ حرماں کو
منوّر کر رہے ہیں اُن کے جلوے پھر شبستاں کو
بہارِ شام نے شرما دیا ہے صبحِ خنداں کو
کہیں رسوا نہ کردوں بے خودی میں ذوقِ ارماں کو
بہت نادم ہوئے ہم چھیڑ کر اُس سست پیماں کو
تجاہل اور افشا کر رہا ہے ربطِ پنہاں کو

کوئی عالم ہو، جی بھرتا نہیں جینے سے لے کوکب
سمویا ہے کسی نے اس طرح آزار و درماں کو

بصد منت کیا ہے ملتفت اُس راحتِ جاں کو
ہوا دینی تھی کم کم آتشِ شوقِ فراواں کو
گرائی جا رہی ہیں بجلیوں پر بجلیاں پیہم
کسی دم بھی خیال اُن کا جُدا ہوتا نہیں دل سے
چمن میں مسکراتے، کہکشاں میں گنگناتے ہیں،
ہجومِ آرزو سے دم گھُٹا جاتا ہے او کافر،
پشیماں ہوگئے خود ہم، گلہ شکوہ تو کیا کرتے
دلِ بیتاب کو سمجھا ہے خوب اوبے خبر تو نے

خدارا کوئی ٹھہرانا ذرا عمرِ گُریزاں کو
ابھی اور آزمانا تھا دلِ شعلہ بداماں کو
دُعائیں دے رہا ہے دل نگاہِ برق ساماں کو
وہ رکھتے ہیں فروزاں رات دن اِس شمعِ سوزاں کو
پریشاں کر رہے ہیں اور وہ "اک "خود پریشاں" کو
کوئی قابو میں رکھے تا کُجا شوقِ فراواں کو
بڑی مشکل سے راضی کر سکے حُسنِ پشیماں کو
جزاک اللہ مسلماں کر دیا اِک نامسلماں کو

یہی لے دیکھئے ہے اک یادگارِ دوست لے کوکب
سمجھتے ہیں نشانِ زندگی ہم سوزِ پنہاں کو

کوکب شاہجہاں پوری

فنِ تجمیل

آج سے جتنے پیچھے ہٹتے جاؤ حُسن مختلف پردوں کی اوٹ میں ہوتا چلا جائیگا۔ جتنا یہ پوشیدہ ہوتا تھا تعریف کی جاتی تھی۔ اسکو نظر بد سے بچانے کے لئے سینکڑوں بگاڑ پیدا کئے جاتے تھے۔ لیکن اب حُسن کی تعریف عریانیوں میں ہے۔ جس قدر بے نقابی ہو پسندیدہ ہے اور جتنا آگے بڑھتے جائیں گے اُمید ہے کہ اسی قدر برہنگی حسن میں داخل ہوتی جائیگی۔ حسین بننے کا شوق ایسا بڑھتا جارہا ہے کہ یورپ میں تو تجمیل ایک مستقل فن ہوتا جاتا ہے۔ بیسیوں ماہرانِ تجمیل اپنی دستکاریوں سے لاکھوں روپیہ پیدا کر رہے ہیں۔

پہلے حُسن و جمال کی جستجو صرف بازاروں، تماشہ گاہوں اور تھیٹروں میں ہوا کرتی تھی۔ عصمت فروشی یا پیاسی نگاہوں کیلئے حسین بننا۔ جمال دکھانا اور صنعت سے حُسن کو دوبالا کرنا ضروری تھا تاکہ دلوں کو لُبھایا اور آنکھوں کو تسخیر کیا جائے۔ مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ حالات کچھ سے کچھ ہوگئے ہیں۔ حُسن و جمال کی طلب اس قدر بڑھ گئی ہے اور خوش نظری یا بدنظری کا ایسا لپکا پڑ گیا ہے کہ عملی زندگی کا ہر شعبہ حُسن کا گاہک ہے۔ معاشرت ہو یا تجارت، گھر ہو یا بازار ہر جگہ حسن ہی حُسن تلاش کیا جاتا ہے۔ جب تک ظاہری حُسن و جمال نہ ہو کامیابی نہیں۔ خانگی خدمت کیلئے چاہیئے تو حسین لڑکا یا لڑکی تاکہ حُسن آنکھوں کے سامنے رہے اور آنکھیں سِنکتی رہیں۔ دفاتر میں کلرکی کیلئے جمیل عورتوں کی جستجو کی جاتی ہے تاکہ قلموں کے ساتھ دل بھی قلابازیاں بھریں اور دماغی کام کرنے والوں کی قوتِ عمل میں ہیجان پیدا ہوتا رہے۔ دوکانوں میں خوبصورت عورتوں کی مانگ ہے کہ وہاں بھی جنسِ جمیل کی ضرورت ہے۔ خریداروں کی جیبیں نازک ہاتھوں سے خُوب ٹٹولی جاتی ہیں۔ ہوٹلوں کی خدمت کے واسطے بھی صاحب جمال لڑکیاں یا طرحدار لڑکے ڈھونڈے جاتے ہیں تاکہ مہمانوں کی دعوت کا پورا حق ادا ہو۔ ہر جذبہ کی تسکین ہوسکے۔ ریلوے والوں نے بھی مسافروں کی دلچسپی کا سامان مہیا کرنا شروع کر دیا ہے۔ بڑے بڑے اسٹیشنوں پر سُرخ و سفید تیتریاں چھوڑ دی ہیں تاکہ سفر جو بصورتِ سقر تھا آسان ہوجائے۔ اور بے کیف مناظر دیکھتے دیکھتے جو نظریں اُکتا گئی ہوں وہ مسرور ہوتی رہیں۔ ہسپتالوں میں بیماروں کی دیکھ بھال بھی بغیر نوجوان اور حسین نرسوں کے نہیں ہوسکتی کیونکہ حُسن میں جس طرح بیمار ڈالنے کی خاصیت ہے اُسی طرح اچھا کرنے کی بھی طاقت ہے۔

گزشتہ جنگ عظیم نے عالم میں جہاں غیر معمولی تباہیاں پھیلائی ہیں اور ہزاروں چیزوں میں انقلاب پیدا کیا ہے وہاں کچھ برکتیں بھی ہیں جن سے ہم رفتہ رفتہ روشناس ہو رہے ہیں۔ فنِ تجمیل کی بُنیاد اسی جنگ کا صدقہ ہے۔ جو لوگ اس لڑائی میں اپنا حُسن کھو بیٹھے تھے۔ کسی کا ہاتھ بیکار ہوگیا تھا۔ کسی کی ٹانگ اُڑ گئی تھی، کوئی ناک کو رو رہا تھا۔ کوئی کان کو۔ کسی کی آنکھ پھوٹ گئی تھی تو کسی کا کوئی نمائشی عضو بدنما ہوگیا تھا۔ حُسن و جمال پر جنگ کے اِن ہولناک نتائج نے یورپ کے ڈاکٹروں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے فن کا کمال دکھائیں اور مجروحین کے ناقص اعضا کو دُرست کریں تاکہ اپاہجوں کے لئے حکومت کو کسی جدید انتظام کی ضرورت نہ پڑے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد حُسن کی دیوی سے ان ڈاکٹروں نے سازش شروع کردی! اور رفتہ رفتہ دُنیا کی بدصورتی اور بدقوارگی کو دل کو لُبھانے والی صورت اور سڈول جسم میں بدل دینے کا ٹھیکہ لے لیا۔

فنِ تجمیل کی اس ترقی نے یورپ کے جمالیاتی ذوق پر اپنا زبردست اثر ڈالا۔ اور نمائشی شوق نے اس قدر مستعدی دکھائی کہ نفسیات سے

کوئی سروکار ہی نہیں رہا۔ بُری عادتیں، بُرے اطوار، بُری تقدیر اور بُرے اخلاق کو تو وہ نظر انداز بھی کر سکتے ہیں لیکن بری صورت اور بھدّے اعضا کی اُن کے ہاں کوئی جگہ نہیں۔ سوسائٹی محض نمائش حُسن کا نام ہے۔ مرد ہو یا عورت، امیر ہو یا غریب، شریف ہو یا رذیل اگر حسین نہیں ہے تو سوسائٹی میں اُس کی کہیں پرسش نہیں۔ حال کا واقعہ ہے کہ امریکہ میں ایک شخص اپنی بدصورتی کے سبب بیکار تھا۔ نہ کوئی امیر اس سے کام لینے پر راضی تھا نہ کسی کارخانہ میں اُس کی کھپت ہوتی تھی۔ بے روزگاری سے تنگ آکر آخر اُس نے خودکشی کا ارادہ کیا۔ لوگوں کو پتہ چل گیا۔ صلاح دی کہ فنِ تجمیل کے کسی ہسپتال میں داخل ہو جائے۔ چنانچہ اُس کی بدصورتی دُور کر دی گئی اور وہ بآسانی مُلازم بھی ہو گیا۔

اِبتداءً تو صرف ناک، کان، آنکھ وغیرہ کی بدنمائی کو جراحی سے دُور کر دیا کرتے تھے۔ ہندوستان کے کئی شوقینوں سے مجھے بذاتِ خود ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جن میں سے ایک بھینگا تھا جو امریکہ گیا اور جب وہاں سے واپس آیا تو اُس کی دونوں آنکھیں دُرست تھیں۔ دوسرے کی ناک بالکل پیّا پھری ہوئی تھی۔ اُس نے جرمنی والوں سے اپنی ناک ٹھیک کرالی۔ تیسرے صاحب کا ایک کان بچّا اور دوسرا خرگوش تھا۔ وہ انگلستان تشریف لے گئے۔ سول سروس میں تو ناکام رہے لیکن کانوں کا حُلیہ بدلوا آئے۔ اور اب اُن کے سارے چہرے پر اگر کوئی حسین کہنے کے قابل چیز ہے تو وہ کان ہی ہیں۔ یہ باتیں بھی پُرانی ہیں۔ اب تو چہرہ اور جسم کے ہر حصّہ کی بدنمائی خوشنمائی سے بدل دی جاتی ہے اور اس لئے اُس ذوق میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ حوادث کا شکار اور امراض سے بگڑی ہوئی نوجوان عورتیں ہی صرف اس شوق میں مُبتلا نہیں ہیں بلکہ ساٹھ ساٹھ برس کی نیم مُردہ خواتین بھی عملِ جراحی کی اذیتوں کو گوارا کرتی ہیں اور یہ اس لئے کہ جب وہ آئینہ دیکھیں تو خود انکو اپنی صورت بُری نہ معلوم ہو۔ غرضکہ حُسن و جمال جو کبھی صرف فطرت کا عطیہ تھا بازار کا سودا ہو گیا ہے جو قیمتاً بھی ملتا ہے اور گورنمنٹ کی طرف سے خیرات بھی ہوتا ہے۔

لیکن عورتیں تو خیر حسین بننے پر ایک حد تک مجبور ہیں۔ صنفِ نازک کہلاتی ہیں۔ اُن کو زندگی بسر کرنے کے لئے اکثر صورتوں میں اس کی ضرورت بھی ہے۔ گھرستنوں کو شوہر کی محبت حاصل کرنے کی آرزو ہوتی ہے۔ عصمت فروش اپنی دُکان کی رونق چاہتی ہیں۔ تھیٹر کی ایکٹرسیں اپنے مالکوں کی منظورِ نظر بننا یا عاشق مزاج نوجوانوں کے دل و دماغ پر قبضہ کرنے کی خواہشمند ہوتی ہیں اور ان مہموں میں فتح پانا حُسن کے بغیر ممکن نہیں۔ عورت غریب کے پاس ایک یہی ہتیار ایسا ہوتا ہے جس سے مردوں پر فتح پاتی ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ مرد بھی فنِ تجمیل سے مستفید ہونے میں عورتوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ اگرچہ ابھی تک مَردوں کا ذوق دیوانگی تک نہیں پہونچا ہے۔ عورتیں تو بلا ضرورت بھی محض اپنے حُسن کو زیادہ بے پناہ اور آلاتِ حرب کو زیادہ آبدار بنانے کی غرض سے کان چھوٹے، ناک سُبک، آنکھیں بڑی، اور دہانہ تنگ کرا لیتی ہیں، مگر مرد کوئی نہ کوئی معقول وجہ لیکر آتے ہیں۔ یہ شاید اس لئے بھی ہے کہ جب عملِ تجمیل کی طرف پبلک کا زیادہ رُجحان دیکھا تو قانون ساز جماعت نے اسکے متعلق بھی قانون بنا ڈالا یعنی کوئی شخص اپنے چہرے کی شباہت بدلوانا چاہتا ہے تو ڈاکٹر کا فرض ہے کہ اپنی دستکاری سے پہلے پولیس کو اطلاع دے اور جب وہاں سے تصدیق ہو جائے کہ عملِ تجمیل کا یہ شوقین کسی جرم میں مطلوب نہیں ہے اور اپنی شکل میں تبدیلی پیدا کر کے قانون کی گرفت سے بچنا نہیں چاہتا ہے تو پھر عملِ جراحی کیا جاتا ہے۔ کچھ ایسے مرد بھی ہیں جو اپنی بیویوں کی خاطر ایسا کرتے ہیں تاکہ وہ شوہر پرست بنجائے اور اسکی حُسن پرست آنکھ اور ڈانواڈول

عورت مرد کے لئے اپنی صورت کو خراد اُتروائے۔ مرد عورت کی خاطر اپنا چیشتا بدلوائے اور گو اس ذوق و شوق میں مرد اور عورت کی دوڑ شروع ہو جائے۔ اور ایک دوسرے پر حُسن و جمال میں بازی لے جانے کی کوشش میں عصمت و عفّت کا چراغ بالکل

ہی گل کر کے دُنیا کو ایک نئے اور زیادہ خطرناک انقلاب کی دعوت دے۔ لیکن ہم تو جانتے ہیں اور جان کر خوش بھی ہیں کہ اگر حسین بننے کی طرف لوگوں کا یہی شغف رہا۔ ڈاکٹر اپنے فن کا کمال دکھاتے اور گورنمنٹ اس صنعت کی حمایت میں اسی طرح مصروف رہی تو موجودہ نسل چہرہ اور جسم کے تمام نقائص سے پاک ہو جائے گی اور آئندہ دوچار پلٹیوں کے بعد جو بچے پیدا ہونگے وہ خود ہی اتنے حسین اس قدر جمیل اور ایسے خوش اندام پیدا ہونے لگیں گے کہ پھر اس فن کی ضرورت نہ رہے گی۔

اشرف صبوحی دہلوی (منشی فاضل)

الارم

اُٹھ کہ اپنے عزم سے دُنیا تہ و بالا کریں
محشرِ فردا سے پہلے حشر اِک برپا کریں

اُٹھ کہ اپنے خون سے چشمے بہا دیں ریت کے
کوہ حائل ہوں تو اُن کو پیس کر سرما کریں

اُٹھ کہ خس خانوں کو بھڑکائیں گرا کر بجلیاں
ایک اک تنکے کو ہم رنگِ یدِ بیضا کریں

دیں سنان و تیغ کا پانی لبِ اغیار کو
ہند میں پھر بابر و تیمور کو پیدا کریں

نرگسِ شہلا سہی آنکھیں غلامِ ہند کی
اُٹھ کہ ہم ان نرگسوں کو دیدۂ بینا کریں

اُٹھ کہ اس دیرِ کہن کے رسم و آئیں توڑ کر
ماہ کو ساغر بنائیں مہر کو مینا کریں

اُٹھ کہ قوت کو بہا لے جائیں روحِ عرش تک
قطرہائے ثابت و سیار سے دریا کریں

ناخنِ ہمت سے سلجھائیں ہر اک ابرو کے بل
اُٹھ کہ اب رازِ جنوں اغیار پر افشا کریں

اس غلامی کو کریں ہم ٹھوکروں میں پاش پاش
اپنی آزادی کریں تخلیق اور سجدہ کریں

وقفِ سجدہ آستانوں پر ہیں جو پیشانیاں
اُٹھ کہ ان پیشانیوں کو آسماں سیما کریں

اُٹھ کہ پھونکیں روح اپنی تاب و تب کی خاک میں
ہند میں بھی اک صلاح الدین کو زندا کریں

اُٹھ کہ توڑیں یہ تعطل اور جمود و بے حسی
ہند کے ان سنگریزوں کو ابھی گویا کریں

کرتے ہیں ایجاد آئینِ شہنشاہی ہمیں
اُٹھ کہ اہلِ ہند کو پھر آسماں پیما کریں

ابر کی مانند چھا جاتے ہیں ہمت کے دھنی
عرشؔ اُٹھ پھر زندہ ہندوستان اِک پیدا کریں

عرشؔ تیموری

بدگمان

(۱)

ساجد نے نوعروس شگفتہ کا زریں گھونگھٹ کھولا تو آنکھیں چوندھیا گئیں چاندسا گول مٹول چہرہ، سرمگیں شرمیلی آنکھیں، جگمگاتے ہوئے زیورات، گویا محبت کی سنہری زنجیروں میں جکڑی ہوئی دلہن۔ . . . ساجد کا دماغ نکہت عروس سے معطر ہوگیا اور دل نشۂ سرور سے مسکر۔ اُس نے دلہن سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے اور محبت کے عہد و پیمان میں صبح کر دی، وہ سمجھ رہا تھا کہ ساجد سے زیادہ کوئی خوش نصیب نہیں۔ . . . ساجد جیسا خوبرو خوش نصیب۔ خوش مزاج۔ محبت نواز دولھا پاکر شگفتہ مگن اور مسرور تھی وہ اپنی زندگی کے زریں خواب دیکھ رہی تھی اس کی ہر صبح دلچسپ اور ہر شام لطیف تھی۔

(۲)

شگفتہ سسرال والوں کی آنکھوں کا تارا اور شوہر کے دل کا چاند تھی۔ دو سال بعد اُس کے آغوش میں ایک پھول سا بچہ پرورش پا رہا تھا جس کی ایک "آغوں" پر ماں باپ کے دل کی دنیا نثار تھی، اس گھر کی مسرتوں میں غم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ساجد کے والد نے رحلت کی۔ کل جائداد کے انتظام کا بار ناتجربہ کار ساجد کی گردن پر آ پڑا۔ اوّل اوّل غم بھی رہا مشکلات بھی پیش آئیں مگر رفتہ رفتہ یار باشوں کی صحبت نے سب غم غلط کر دیا۔ حتیٰ کہ بیوی اور بچے کی تڑپ پر دوستوں کی رنگین محفلیں حاوی ہوگئیں لیکن اب بھی ساجد کے معصوم دل پر شگفتہ کے سوائے اور کوئی حکمران نہ تھا۔

(۳)

روزانہ ناچ رنگ کے جلسے، تھیٹر، سینما، بھانت بھانت کی حسن فروش تیتریوں کے دلفریب نظارے اپنا رنگ لا رہے تھے مگر ساجد کا ڈانواں ڈول دل ابھی کسی زلفِ گرہ گیر میں نہ الجھا تھا۔ ساجد کے گندم نما جو فروش دوست اُسے کسی طرف کشاں کشاں لے جا رہے تھے لیکن ابھی تک دامنِ حرص پاک و صاف تھا . . . . پائیں باغ میں ساجد آرام کرسی پر دراز تھا۔ ہاتھ میں آج کا پرچہ تھا۔ یکایک کسی نے شانہ پر ہاتھ رکھا ساجد کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ پشت پر شگفتہ ایک کھلے ہوئے پھول کے مانند ہلکی دھانی ساری میں ملبوس کھڑی مسکرا رہی تھی۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار، گلابی شام، ننھا آصف ہاتھ گاڑی میں جنت نگاہ . . . . . ساجد سرشار ہوگیا۔ مرزا نے آواز دی، ساجد بغیر کچھ کہے سُنے چلا گیا . . . . شگفتہ نے کرب او بےچینی میں کئی گھنٹے گزار دئے لیکن ساجد نصف شب سے پیشتر واپس نہ آیا۔

(۴)

مرزا نے ساجد کا ہاتھ پکڑ کر نہ چھوڑا۔ سیدھا نواب باقر کی بارہ دری میں جا ڈٹا، یہاں محفل رقص و سرود گرم تھی۔ ایک پرکالہ آفت اپنے دلرُبا رقص سے بگڑے دلوں کو برما رہی تھی۔ ساجد نے گاؤ تکیہ سے لگ کر رقاصہ کے بے پناہ حُسن پر ایک غائر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں کی چمک میں ہزاروں عشوے جلوہ گر تھے۔ ایک ایک نگاہِ غلط انداز میں سینکڑوں رمز پنہاں تھے۔ کاکل خمدار میں لاکھوں پھندے تھے۔ کمر کی ہر لچک کے ساتھ ساجد کا دل مچل رہا تھا . . . . . اُف! . . . . حُسن اس کو کہتے ہیں، ہَیں غلطی پر تھا، دھوکے میں تھا آنکھوں

پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ساجد کے حواس جواب دے رہے تھے، رقاصہ کے پاؤں کی ہر ٹھوکر اور پازیب کی ہر جھنکار اس کا کلیجہ مسلے دیتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر رات گئے محفل برہم ہوئی۔ ساجد افتاں و خیزاں گھر پہونچا۔ شگفتہ کا حسن پھیکا نظر آرہا تھا۔ انداز و ادا میں ایک جہالت اور بے تکا گنوارپن نہ کوئی لگاوٹ نہ کوئی نزاکت، صرف ایک اطاعت بے محل ایک محبت بے نمک۔ ۔ ۔ ۔

(۵)

گھنٹے، گھنٹوں سے دن۔ دنوں سے ہفتے۔ غرض ساجد ہفتوں گھر ہی نہ آتا۔ غریب شگفتہ کے جسم کو اب ایک کملاتے ہوئے پودے سے نسبت تھی۔ اگر ساجد کی شکل نظر آجاتی تو گویا سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جاتا۔ یا ننھے آصف کے گلابی ہونٹوں سے لفظ "ممی" نکلتا تو دل کی مرجھائی ہوئی کلی ایک دفعہ مسکرا دیتی۔ محبت کی جلی شگفتہ اپنی روٹھی ہوئی قسمت کو منانے کیلئے ہر ایک جتن کر رہی تھی۔ لیکن ہر صبح سورج کی گرم کرنیں پیامِ غم سناجاتیں۔ ہر شام یاس کا دھندلکا لیکر آتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۶)

اب تو ساجد کے لئے دوست احباب نت نئی رنگینیاں پیش کرنے کی کوشش کرتے۔ اور اس کا مرغ دل ہر روز نئے دام میں پھنستا۔ روپیہ پانی کی طرح چلا جارہا تھا اور ناعاقبت اندیش ساجد مدہوش۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ساجد نے کسی محبوبۂ فرنگ کی تعریف سن کر بمبئی کا رخ کیا وہ بمبئی کے عالیشان حسین بالاخانوں پر اپنا ایمان، اپنا سکون قلب، اپنی دولت دُنیاء، اپنی صحت و توانائی نچھاور کر رہا تھا اور بدقسمت شگفتہ اپنے ویران عزلت کدہ میں اپنے معصوم بچے کے ساتھ سوگوار دن کاٹ رہی تھی۔

(۷)

مرزا کے کیف آور جملے ساجد کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ سگار کا دھواں اپنی ناگوار بدبو سے مخملیں تکیوں کو معطر کر رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ چند جلے ہوئے ٹکڑے غالیچے پر ستم نظر تھے۔ "پارسی مہ پارہ اور خود دار۔ لاپرواہ۔ اونہہ۔ عجیب بات ہے۔ کیا کبھی ہم بھی اس قتالۂ عالم کے دیدار سے بہرہ اندوز ہوسکیں گے۔ آنے دو مرزا کو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

"حکم" مرزا کی خوشامدانہ آواز نے ساجد کو چونکا دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مرزا کھلے ہوئے بٹن کی اچکن لٹکائے چلے آرہے تھے۔

ساجد نے مرزا کی جیب گرم کی اور بن سنور کر کوئے جاناں کا راستہ لیا۔ مرزا نے رہبری کی اور ایک شاندار کنڈنی عمارت کے در پر لا کھڑا کیا۔ اُس کے زینے پر سے جو خادمہ اتری گویا وہ ایک شہزادی سے کم وضعدار نہ تھی۔ اُس نے ساجد اور مرزا کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اپنی مالکہ کو اطلاع کرنے چلی گئی۔

سامنے کے ریشمین پردے پر ساجد کی حریص نگاہیں جمی ہوئی تھیں کہ حنائی انگلیوں نے پردہ سرکایا اور ایک شعلۂ جوالہ نمودار ہوئی ـــــ کٹے ہوئے بالوں کے دلفریب لچھے ہلالی پیشانی پر لہرا رہے تھے بڑی بڑی آنکھوں پر سنہرا چشمہ رعب حسن میں اضافہ کر رہا تھا۔ پوڈر اور سرخی کی فراوانی اصلی رنگ و روپ کو چندے نمایاں کر رہی تھی۔ انداز نشست جاذب نظر، انداز تکلم دل فریب۔ ساجد کی پُرشوق نظروں اور لچھے دار تقریروں نے حسین نازنین کو عرق آلود کر دیا۔ اس نے نیچی نگاہوں سے جواب دیا "جی ہاں میں بھی آپ کی زیارت کی عرصے سے مشتاق تھی، کیا آپ ہر شام کو اس کنیز کو شرف ملاقات بخشا کریں گے؟" ساجد اس قدردانی

سے جُھوم گیا۔ وعدے وعید ہوئے، خاطر و مدارات ہوئیں۔ تحفے تحائف پیش ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غرض یہ کہ رفتہ رفتہ کافی بے تکلفی ہوتی چلی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۸)

ساجد حیران تھا کہ یہ بُتِ طناز معصوم شگفتہ سے کیوں مشابہ ہے۔ اس وقت ساجد کے دل میں شگفتہ کے خیال نے ایک چٹکی لی۔ آصف کا پیارا چہرہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ آج ساجد نے اس پُراسرار محبوبہ سے دو دو باتیں کرنے کا پختہ فیصلہ کیا ــــــ یہ شام آخری تھی ــــــ ساجد نے ایک آہِ دلخراش کے ساتھ نازنین کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنا دردِ دل بیان کیا ــــ

"اے حسین ملکہ۔ اے پُراسرار خزینۂ علم۔ اے درخشاں چاند۔ اے مہربان۔ نامہربان سچ بتا تو کون ہے۔ کیا تجھکو میری کھوئی ہوئی آرزو سے کچھ نسبت ہے۔ کیا تو ہی منبعِ ایمان ہے۔ بس اب پردۂ فراق کو ہٹا دے ــــ للہ مجھے حقیقت سے آشنا ہونے دے ــــ"

محبوبہ مسکرائی۔ اُس کے ہونٹ ہلے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر زبان بند ہوگئی۔ اُس نے چشمہ اتارا، رومال سے چہرہ صاف کیا اور آنکھوں سے دو آبدار موتی ٹپکا دئے۔ ساجد کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔ استعجاب میں زبان سے نکلا: "اور شگفتہ کی عصمت محفوظ رہی" اُس بے رحم انسان پر شگفتہ نے ایک خشمگیں نگاہ ڈالی اور مجنونانہ زینے سے اُتر گئی۔ ہرچند ساجد نے پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس پر جن سوار تھا۔ وہ بھاگ رہی تھی، وہ چیخ رہی تھی: "بدگمان! بدگمان! بدگمان! آصف۔ آصف بیٹے مجھکو بچانا۔ اس بدگمان صیاد سے پناہ دینا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

ساجد پیچھے دوڑ رہا تھا لیکن شگفتہ اس کے ظالم چنگل سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ ساحل کی پرشور لہریں اس کو آوازیں دے رہی تھیں۔ شگفتہ نے بدگمان۔ بدگمان کی دلخراش چیخوں میں خود کو خوفناک سمندر کے سپرد کر دیا۔ اور ساجد کے پشیمان آنسوؤں کی حقدار رہی ــــ

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

آمنہ

اُمید

اُمید اُمید! خدا کی مار اِس اُمید پر۔ میرے ہاتھ آجائے تو مٹّی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دوں۔ مصیبت! وبالِ جان! چَین ہی نہیں لینے دیتی۔ کچھ نااُمیدی ہوتی ہے۔ چَین سے بیٹھتا ہوں کہ پھر آکر چپکے سے سوئی چُبھونک جاتی ہے۔ قرار ہی نہیں لینے دیتی۔ بس بس اب مجھ پر اِس کے داؤں نہیں چل سکتے۔ میں خُوب جان گیا۔ متھرا تیلی کے بیل کو بھی جھانسہ دے۔ لڑکپن اور بچپنے کو جانے دیجیے صاحب، جب سے دُنیا میں قدم رکھا ہے، پینتالیس[45] برس ہوگئے ہیں یہ مجھکو جھانسے دے رہی ہے۔ اور مَیں کمبخت احمق، بیچاری بھولی بھالی منّی کی اماں کو ہوائی لقمے دیتا چلا آرہا ہوں۔

اُمید مجھ سے کہتی ہے: "اَب دولت ملتی ہے"؛ اور مَیں اُن سے (منّی کی اماں سے) کہتا ہوں: "گھبراؤ نہیں جڑاؤ کنگن اور جڑاؤ کڑے بنوا دونگا ذرا صبر سے کام لو" صبر کرتے کرتے دونوں بڈھے ہوگئے۔ وہ صبر سے بیٹھی پن کٹّی سے کھیل رہی ہیں اور میں صبر سے بیٹھا یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔

بس آج آپ لوگوں کے سامنے عہد کرتا ہوں (گواہ رہیں) کہ اب اس حرامزادی کو پاس نہ پھٹکنے دونگا۔ (منّی کی اماں کو نہیں، اُمید کو) ناصاحب ہم کو تو اب نااُمیدی ہی اچھی۔ صبر سے بیٹھیں۔ اطمینان سے باقی زندگی بسر کریں۔ بس ہو چکا، بہت بے بھاؤ کے ناچے اب آپ ہی لوگوں کو یہ ناچ مُبارک۔ اللہ رکھے آپ لوگ جوان ہیں آپ کو سب کچھ زیب دیتا ہے۔ ہم دونوں بڈھے ہوگئے تھک گئے۔ چار دن کی اور باقی ہے، سکون سے بسر کرینگے کچھ نہ ہوگا اطمینان سے ٹھنڈے پانی کے گھونٹ پئیں گے۔

لیکن کیسے کچھ نہ ہوگا۔ آپ لوگ قدر دان ہیں مجھ ایسے گھٹنا پرداز کو (یہ انشا پرداز کی ایک قسم خاص ہے۔ خیر آپ کو کیا یہ ٹکنیکل معاملات ہیں) بھول تھوڑی جائیں گے۔ دو چار دس پانچ نذرانے کے منی آرڈر جو آجایا کریں گے اس ہی پر ہم دونوں بڑھیا بڈھے گذر کریں گے۔ چھوڑی انجینیری، ماری اس پر لات اب تو مضمون نگاری ہی ہوا کرے گی۔ اور صاحب اگر آپ میری مانیں تو واللہ آپ بھی یہی کریں (گھٹنا پردازی سے مطلب نہیں ہے، نانا) اُمید کو پاس نہ پھٹکنے دیں۔

سراسر مُصیبت ہے وبالِ جان ہے۔ اُمید لگی ہے کہ ایکی ویکلی کا معمہ ٹھیک نکل آتا ہے۔ اچھا ایکی؛ اچھا ایکی۔ ایکی! ایکی! اُمید جب پیچھا پکڑتی ہے جونک ہو کر چمٹ جاتی ہے۔ گھوڑ دوڑ کے شوقینوں کو تو بھیک منگوا دیتی ہے۔ اُمید ہی کی بنا پر آپ اپنے افسر کی خوشامد پر خوشامد کرتے ہیں اور اُن کا مُنہ ٹیڑھا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اُمید ہی کی بنا پر آپ صاحب بہادر کے بنگلے پر جاتے ہیں۔ اور وہ موجود نہیں ہوتے۔ اُمید ہی کی بنا پر آپ بچھونا کندھے پر سوٹ کیس بغل میں دبا کر دوڑتے ہیں۔ اور ہانپتے ہوئے خالی پلیٹ فارم پر پہونچتے ہیں۔ ورنہ آپ کی گھڑی نے صاف بتا دیا تھا کہ گاڑی چھوٹنے میں صرف ایک منٹ ہے۔ بس کچھ نہیں۔۔۔ معلوم ہوا کہ ہر کام نااُمید ہو کر کرنا چاہیئے۔ آپ میرے کہنے پر چل کر دیکھئے تو سہی۔ سب اچھے رہیئے گا۔ انشاءاللہ آپ کو کامیابی ہی کامیابی ہوگی۔ ناکامیابی تو ہو ہی نہیں سکتی۔

بھائی جان! بات یہ ہے کہ اُمید تو دراصل ہم لوگوں کے واسطے بنائی ہی نہیں گئی۔ اُمید بنی ہے شاعروں کے واسطے

اور مچھلی کے شکاریوں کے واسطے۔ اپنے بنسی ہاتھ میں ہے، ڈور پانی میں پڑی ہے، اُمید کی جھکی لگائے گومتی ندی کے کنارے بیٹھے ہیں۔ شام کو انگل بھر کی ایک مچھلی لٹکائے گھر آگئے۔ رات بھر مچھلیاں ہی مچھلیاں خواب میں دیکھیں، صبحدم اور زیادہ جوش و خروش سے پھر بنسیاں کندھے پر لاد چلدئے: آج ضرور ڈھائی سیر کا مہاشیر پھنسے گا، یہ حال تو ان کا ہے۔ لیکن شاعروں کی تو بس بیان سے باہر ہے۔ اب میں کیا بیان کروں آپ خود مُلاحظہ کرلیں۔ ایک صاحب مُٹھی کی دُوربین بنائے اکڑوں بیٹھے ہیں، اور یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔

خاطرِ مایوس میں نقشِ اُمیدِ وصلِ یار
نورِ صحرا میں ہے گویا اک چراغ دُور کا

سیّد رفیق حسین

ساقی کے چند خاص نمبر رعایتی قیمت پر

نمبر	سنہ	قیمت	نمبر	سنہ	قیمت
سالنامہ	۱۹۳۴ء	قیمت ۸ر	افسانہ نمبر	۳۵ء	قیمت ۶ر
〃	۳۵ء	۱۰ر	〃	۳۶ء	۶ر
〃	۳۶ء (جاپان نمبر)	۱۰ر	〃	۳۷ء	۸ر
ظریف نمبر	۳۳ء	۵ر	سالنامہ	۳۷ء	۱۰ر
〃	۳۴ء	۵ر	〃	۳۸ء	۱۲ر
〃	۳۵ء	۵ر	چغتائی نمبر		۸ر
〃	۳۶ء	۵ر	دانتے کا جہنم		۶ر
افسانہ نمبر	۳۱ء	۶ر	مکمل فائل	۳۵ء	۳سے
〃	۳۳ء	۶ر	〃 〃	۳۷ء	للعہ ر

محصولڈاک بذمہ خریدار۔

بے زبان

جیسے کم ظرفوں میں گھر داماد کا بڑا بُرا ہو ویسے ہی اُس بے چارے کی مٹّی پلید تھی۔ جب تک ہاتھ پیر چلتے رہے اُس وقت بھی اُس کی کچھ قدر نہ ہوئی، معذور ہوئے پیچھے تو کون پوچھتا کہ تم کس باغ کے بتھوے ہو؟ دن بھر وہ غریب محنت مشقت کرتا پھر بھی مار پیٹ اور گالیاں کھانا اُس کی قسمت میں لکھا تھا۔ بساط سے زیادہ بوجھ ڈھوکر وہ خون پسینہ ایک کر لیتا تب جاکر کہیں دھڑیں ڈالنے کیلئے کچھ ملتا، وہ بھی اس لئے نہیں کہ یہ اُس کا حق تھا بلکہ محض اِس لئے کہ اُس کی زندگی منظور تھی تاکہ کمائی کا ذریعہ قائم رہے۔

اپنی حق تلفی اور یہ مظلومی اُسے عرصہ سے محسوس ہو رہی تھی مگر وہ بے زبان، اشرف المخلوقات کے آگے بالکل بے بس تھا۔ بھلا اس میں اتنی ہمت کہاں سے آتی کہ وہ خدا کے خلیفہ سے اپنے حقوق زبردستی طلب کرتا اور کہتا "میں اپنی جان تمہارے لئے ہلاک کئے دیتا ہوں، خدارا میرے ساتھ وہ سلوک تو نہ کرو جو انسانیت سوز ہے"۔ نہیں، نہیں، یہ گستاخی، یہ بے ادبی، یہ سرکشی بارگاہِ انسانیت میں ہرگز برداشت نہیں کی جاسکتی۔ پروردگار کے نائب کا تو کام ہی یہ ہے کہ اپنے سے کمزور کو پیس ڈالے اور اُس کے خون سے کاخ بلند کھڑے کرے۔

اُس کا ایک ساتھی تھا، روبی۔ دونوں بچپن سے اکٹھے بڑھے پلے تھے۔ جب انہوں نے ہوش سنبھالا اور ایک نے دوسرے کو اپنا ہمدم پایا۔ ماں باپ اور دوسرے عزیز و اقارب یا تھے نہیں یا لاپتہ تھے۔ نتیجہ معلوم! ہر متنفّس سے بے نیاز ہو کر اُن دونوں کے پاک جذبات (یہ کیا کہا؟ اتنی جرأت؟ یہ بیباکی؟ خبردار! "پاک" کا لفظ تو صرف اولادِ آدم کیلئے مخصوص ہو چکا ہے۔ حیوانی جذبات کہو!) ایک دوسرے کیلئے وقف تھے۔ ایک کو دُکھ ہوتا تو دوسرا اِشاروں سے، کنایوں سے کہتا "بھائی غم نہ کرو، تمہارے دُکھ درد میں میں شریک ہوں"۔ اور پھر دونوں ٹکٹکی باندھ کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے، یہاں تک کہ حکم نازل ہو جاتا کہ "کام کا وقت آگیا، چلو اپنا فرض ادا کرو!" پھر وہی زندگی کی چکی شروع ہو جاتی جس کے ہر چکّر سے صرف ایک صدا "کام! کام!" کی نکلتی رہتی۔

جوانی بھر اُس کو اپنی محنت اور سخت کوشی کا خیال نہ آیا۔ ہاں جب زیادہ سے زیادہ بوجھ ڈھونے پر بھی مالک کے یہ الفاظ سُنتا "ارے یار! یہ کمبخت گدھا بڑا ہی بدجانور ہے، ہمیشہ مگراپن کرتا ہے"، تو اُس کے دل پر چوٹ سی لگتی اور وہ چُپ چاپ گردن لٹکائے منزلِ مقصود کی طرف چلنے لگتا لیکن کہیں روبی مل جاتا اور وہ اُس کے قدموں میں لوٹنے لگتا تو اُس کے دل پر سے رنج کی سِل اُتر جاتی اور وہ دونوں چند لمحات کیلئے سنگدل انسان کی سہما دینے والی ہیبت سے غافل ہو کر اخلاص و محبت سے محظوظ ہونے لگتے۔ کبھی کبھی راستے میں لمبی لمبی ستھری گھاس اور رئیسی گھوڑوں کا مزیدار چارہ دیکھ کر اُس کے منہ میں پانی بھر آتا لیکن یہ چیزیں اُسے بھلا کہاں نصیب ہوسکتی تھیں۔ ایک رات اُس نے خواب دیکھا کہ وہ کسی بڑے رئیس کے اصطبل میں رہتا ہے اور صرف کبھی کبھار، گھنٹے آدھ گھنٹے کیلئے اس کی ہلکی پھلکی رنگ برنگی فٹن میں جُت جاتا ہے۔ دیکھو نا وہ ایک آدمی آیا، کیسی محبت سے اُس کی گردن پر پیار کرتا ہے، کمر پر ہاتھ پھیرتا ہے اور پٹھے پر تھپکی دیتا ہے۔ پھر اُس نے اُسے خوبصورت ساز پہنایا اور بڑی ملائمت سے گاڑی

میں جوت دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں میلے کچیلے اور تعفن آمیز کپڑوں میں نہیں بلکہ نہایت شاندار لباس میں رئیس صاحب آ گئے اور انہوں نے چمکار کر چلنے کا اشارہ کیا: "ہاں بیٹا!" اب نہ وہ روز روز کی کل کل ہے اور نہ پٹ پٹ، نہ وہ پوچھوں مرنا ہے اور نہ وہ حقارت آمیز سلوک۔ تھوڑی دیر کی ہوا خوری کے بعد نیلو واپس آ گیا۔ بڑی شاباشی دی گئی، خود رئیس بہادر نے بھی پیار کر کے ہمت بڑھائی۔ پھر طرح طرح کا چارہ آگے رکھا گیا، گڑ اور چنے کی سانی دی گئی اور سونے کے لئے نرم نرم گھاس کا بچھونا بچھوا دیا گیا مگر...... صبح ہونے لگی تھی۔ روبی اپنے دوست کے چہرے پر مسکراہٹ (جو انسان کے لئے غیر مرئی ہے) دیکھکر حیرت سے بھونکنے لگا اور نیلو ایکا ایکی کمر پر ایک موٹا سا ڈنڈا پڑ جانے سے گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی اس کی نیند نہیں بھری تھی اور مار کی تکلیف کو بھول کر وہ خواب کی باتیں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دفعتاً کپڑوں کے بڑے بڑے گٹھڑ اس پر لاد دیئے گئے اور ساتھ ہی گالیاں اور جھینکنا سنائی دیا: "لے یہ ڈنڈا لے، ذرا زور سے مار لیو، یہ بد ذات بغیر ارے چلتا ہی نہیں۔"

ایک بات روبی کی سمجھ میں کبھی نہ آ سکی۔ اس نے برسات اور خزاں کی دسیوں صبح و شام دیکھی تھیں لیکن چاہے چاروں طرف ہریاول ہی ہریاول ہو، چاہے تا حدِ نظر تمازتِ آفتاب سے جھلسا ہوا چٹیل میدان، نیلو بدنصیب ہمیشہ بھوکا رہتا۔ وجہ یہ تھی کہ اسے کبھی اتنی مہلت ہی نہیں ملی کہ وہ ہری ہری برسات میں کچھ بھی متمتع ہوتا۔ گویا برشگال کے موسم میں بھی جبکہ کائنات کا ذرہ ذرہ حیاتِ تازہ حاصل کرتا ہے اس بیچارے کی قسمت قدرت کی تقسیم سے محروم ہی رہتی۔ ایک روز شیشم کے سائے تلے روبی سرنگوں بیٹھا ہوا اپنے رفیقِ دیرینہ کی ازلی بدنصیبی پر غور کر رہا تھا کہ اس نے کسی کی آہٹ سنی۔ روبی کی بینائی جاتی رہی تھی۔ اس لئے اسے دور کی چیز اچھی طرح نہ سجھائی دی۔ جب وہ آواز اور بھی قریب آ گئی تب اس کی دھندلی نظر نے دیکھا کہ بوڑھا نیلو ہولے ہولے ڈگمگ ڈگمگ چلا آتا ہے۔ روبی اٹھ کھڑا ہوا لیکن ابکے اسے دیکھکر وہ انگڑائی نہ لے سکا۔ دونوں بوڑھے ہو چکے تھے! اور ان میں اب جان باقی نہ رہی تھی۔ نیلو نے جب بصد مشکل اس کی کمر پر آہستہ آہستہ اپنا کھر پھیرا تو روبی یہ دیکھکر گم سم سا ہو گیا کہ نیلو کی ایک آنکھ پھوٹ گئی ہے اور اس کی کمر سے جیتا جیتا خون بہہ رہا ہے۔ مگر وہ فوراً ہی سمجھ گیا کہ اس کی طرح اسے بھی اس کے مالک نے چلتے چلتے تمام عمر کی خدمت اور وفاداری کا یہ صلہ دے کر رخصت کیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اسے خود اپنی زدہ حالت بھی یاد آ گئی۔ وہ اب گھر کا تھا اور نہ گھاٹ کا۔ کئی دنوں سے وہ ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ نہ اسے روٹی کا ٹکڑا میسر تھا نہ پانی کا قطرہ۔ پھر بھی اپنی رفتار کو بھول کر (اور وہ کوئی انسان تو تھا نہیں جو اپنا دکھڑا لے بیٹھتا۔) وہ نیلو کو دکھ بھری نظروں سے تکنے لگا اور جب اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں تو نیلو، روبی کے دیکھتے ہی دیکھتے زمین پر گر پڑا۔ اس کی کمزور ٹانگیں اس کا جسم سہار نہ سکیں، بس اس میں اتنی سی سکت باقی رہ گئی تھی کہ اسکے منہ سے ایک فلک شگاف آہ نکلی اور پھر بدن کی کھال پارۂ سیماب کی طرح لگاتار تھر تھر کانپنے لگی۔

روبی یہ کیفیت دیکھکر اس کے بالکل پاس سرک آیا اور اس کی زخمی آنکھ کو اپنی زبان سے چاٹنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی جسمانی اور روحانی تکلیف کا اسے اچھی طرح احساس ہے۔ اسی لئے اس کا دکھ ذرا ہلکا کرنے کو اس نے اپنی رام کہانی کہہ سنائی۔

"نیلو بھیا! تمہاری طرح میں نے بھی اپنے مالک کی بڑی خدمت کی تھی۔ دن دن بھر پاسبانی کی، راتوں کو جاگ

جاگ کر اُس کے گھر میں چوروں کو پکڑوایا — ایک دفعہ تو اس کے لڑکے کی جان بھی بچائی مگر اس سب کا عوض مجھے یہ ملا کہ اب جبکہ مجھ میں ہلنے کی بھی طاقت نہیں رہی، اُس نے مجھے لکڑیاں مار مار کر گھر سے باہر نکال دیا۔ میں رویا، قدموں میں لوٹا، تلووں کو چاٹا مگر اُس نے ایک نہ مانی ———— خیر، چلو اچھا ہوا، ہم دونوں کو اُسکی بیدردی اور بے رحمی سے نجات مل گئی۔ اب ہم انسانوں کی بستی میں زیادہ ظلم اور بے انصافی نہیں سہیں گے۔"

روبی کی کتھا کا آخری باب سُنکر نیلو نے ذرا گردن کو جنبش دی اور اُسکے منہ سے اپنا منہ ملا دیا۔ روبی بھی اُس سے بھڑ گیا اور اپنے پُرانے اور سچے دوست کی آغوش میں بیٹھکر فرطِ محبت سے دُم ہلانے لگا۔

———— صادق الخیری۔ ایم۔ اے دہلوی

آج پھر

گر رہا ہے آسماں سے مستیوں کا آبشار
فرصتوں سے کھیلتے تھے زیست کے لیل و نہار

بزمِ فطرت کے لبِ گلگوں تبسم کار ہیں
شادمانی کے حسیں بازو گلے کا ہار ہیں

سایہ افگن ہے در و دیوار پر رنگِ نشاط
کروٹیں لیتا ہے رگ رگ میں سرورِ انبساط

ذرّے ذرّے سے نُمایاں ہے جوانی کا نکھار
آگئی ہے گلستانِ دہر میں رنگیں بہار

کھُل رہے ہیں عنبریں نافے فضا کی گود میں
کھیلتے ہیں کیف زا نغمے ہوا کی گود میں

مُسکراتا ہے نگاہوں میں سرورِ جانفزا
چھا گئی ہے بزمِ ہستی پر مسرّت کی گھٹا

اس لئے کہ آج پھر چشمِ فسوں گر باز ہے
جس پہ میری شاعرانہ زندگی کو ناز ہے

دم زدن میں جو بُڑھاپے کو جوانی کر گئے
زندگانی میں منظر سے مستیاں سی بھر گئے

جو بیاباں کو چمن کی گلفشانی دے گئے
دل کی مٹھی میں سرورِ جاودانی دے گئے

جو خزاں کو دے گئے رنگِ بہارِ جاوداں
جو نگاہوں سے دلوں میں بو گئے موسیقیاں

جو ہواؤں میں گلوں کی نکہتیں بکھرا گئے
جو خُمارِ سرمدی کی بارشیں برسا گئے

آرہے ہیں بے خودی کی ڈال کر رُخ پر نقاب
آج پھر مینا بہ ہنگامے میں حل کر کے شباب

جعفر شیرازی

مکالمہ ساقی و ساغر

(درباب رحلتِ علامہ اقبال)

ساغر۔

کیا ہوا رندِ بلا نوش تمام اے ساقی ۔ کیوں کھنکتے نہیں اب ساغر و جام اے ساقی

عرق آگیں ہے یہ کیوں وقتِ سحر کا مکھڑا ۔ خاک آلودہ ہیں کیوں گیسوئے شام اے ساقی

نہ ہے پیمانے میں پرتو نہ مرے ساغر میں ۔ کیا ہوا آج ترا ماہِ تمام اے ساقی

جیسے رہرو کسی کھوئی ہوئی شئ کو ڈھونڈے ۔ ہے کچھ ایسا ترا اندازِ خرام اے ساقی

خُمِ مشرق میں ابھی بادۂ رنگیں باقی ۔ مئے اقبال تھی پھر حاصلِ جام اے ساقی

روحِ اقبال تھی سرشارِ مئے کیفِ ازل ۔ مجھ سے کافر کو نہیں اس میں کلام اے ساقی

مدفنِ شب ہے سحر، مقبرۂ روز ہے شام ۔ کیا یہی ہے تری دُنیا کا نظام اے ساقی

یہی انجام ہے گر میکشی و مستی کا ۔ تیرے میخانے کو میرا بھی سلام اے ساقی

صبحِ محشر سے ادھر کھل نہ سکے گا گویا ۔ اس طرح بند ہے دروازۂ عام اے ساقی

رہ گیا تھا یہی اک رندِ سبوکش باقی ۔ نامۂ مرگ نہ آیا ترے نام اے ساقی؟

کیا ہے عالم کی تباہی میں کلام اے ساقی
کر دے خم زار کو غرقِ مئے و جام اے ساقی

خام ہے خام ہی قدرت کا نظام اے ساقی

جوابِ ساقی۔

جوشِ غم میں یہ ترا طرزِ کلام اے ساغر ۔ مرحبا، لے یہ چھلکتا ہوا جام اے ساغر

مہرِ تخلیق ہو یا مرحلۂ مرگ و حیات
مجھ سے پوشیدہ نہیں کوئی مقام اے ساغر

چشمِ مردِ میں حیاتِ ابدی نیستی ہے
مرگِ میخانہ تو ہے عمرِ دوام اے ساغر

نغمۂ قلقلِ مینا ہے فضا میں محفوظ
کہیں مرتے ہیں کلیم اور کلام اے ساغر

جس کی پروازِ تخیّل تھی فضا بوسِ فلک
اب وہی عرش پہ ہے محو خرام اے ساغر

خاکِ اقبال کا ہر ذرّہ ہی میخانہ بدوش
خم بہ خم، بادہ چکاں، جام بہ جام اے ساغر

شعر اس کا ہے زمانے کو پیامِ اَبدی
اُس نے قائم کیا شاعر کا مقامِ اَبدی

جاوداں ہے، مرے مستوں کا امام اے ساغر

جواب الجواب

جسے کہتے ہیں "ابد" تیرے عوام اے ساقی
ہے وہ اقبال کی دُردِ تہِ جام اے ساقی

لاصراحی و سبو و مے و جام اے ساقی
آج ڈھاتا ہے مشیّت کا نظام اے ساقی

قاتل ترموت سے بھی ہاں کوئی جام اے ساقی
موت بھی اصل میں ہے بادۂ خام اے ساقی

گر پڑی آج کلیدِ درِ میخانہ کہیں
تیز تر ہے ترا اندازِ خرام اے ساقی

ڈھالتا جا مگر اتنا تو بتا دے مجھکو
کن عناصر سے ہے ہستی کا قوام اے ساقی

سقفِ میخانہ سے عالم میں منادی کردے
غمِ اقبال میں پینا ہے حرام اے ساقی

تجھے معلوم نہیں اس کا مقام اے ساقی
دو جہاں کیف میں تھے اسکے غلام اے ساقی

طائرِ قدس تھا مُرغِ تہِ دام اے ساقی

ساغر نظامی

مُعمّہ

لِسے وحشت کہیئے یا عادت، میں رات گئے تک ٹہلنے کا عادی ہوں۔ کبھی کبھی اس مشغلۂ بے شغلی میں عجیب وغریب واقعات پیش آئے، لیکن فطرت کا تقاضہ ہے کہ میں اِس خُو سے باز نہ آؤں۔ ابھی چند دنوں کا ذکر ہے کہ میں جوں ہی کمرے سے باہر آیا تو رات کے سراپا حُسن پر منظر پڑی اور جم کر رہ گئی۔ بدرِ کامل نہایت خاموشی سے ذرّے ذرّے کو نقرئی سانچہ میں ڈھال کر مجسمۂ نُور بنا رہا تھا۔ ارض مرمریں پر جدھر بھی نگاہ اُٹھتی 'نبیک' کی خاموش آواز کانوں کو محوِ حیرت بنا ڈالتی۔ ایسے خوشگوار ساعت میں کس کا جی نہیں چاہتا کہ ایسی رات پہ سوراتیں بھینٹ چڑھا دوں یا نہیں تو یہ لیلۃ القمر خود مجھ پہ قربان ہوجائے۔

غرض کہ بادِ مشک آگیں کا ایک ایک جھونکا رگ رگ میں سرایت کر گیا۔ پیکرِ جمال کی ایک ایک ادا جسم وجان پر غالب آگئی۔ میں مغلوب عادت (طبیعت ہی رہنے دیجئے) سے مجبور سامنے والے باغ میں جا اترا۔

شبنمی موتیوں سے آراستہ کلیوں کو چُومتا، مست غنچوں سے سرگوشیاں کرتا، جُھومتے پُھولوں سے چند اوراق چھینتا، لہرائی شاخوں سے نغمہ سرائی کرتا ع،

گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

اور پھر اپنی صدائے بازگشت سے محظوظ ہوتا ہوا میں ممی خانہ کی طرف نکل آیا۔ لاشوں کے جُھرمٹ میں ایسے سناٹے کے وقت میں دِیئے کا ٹمٹمانا معًا اچھے اچھوں کے ہوش وحواس گُم کر دیتا ہے۔

سُنا کرتا تھا اور اب بھی سُنتا ہوں کہ بہت سی ناپاک رُوحیں مرنے کے بعد راکھشش (جس کو بہار میں راکس کہتے ہیں۔) ہوجاتی ہیں اور اُنکے مُنہ میں آگ سُلگتی رہتی ہے۔ یہ رُوحیں پاک انسانوں سے دُور دُور رہا کرتی ہیں لیکن مُردوں کے گوشت پر اِن کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ میں نے اب تک راکس نہیں دیکھا تھا کیونکہ میں اس کے وجود کا منکر تھا (اور اب بھی ہوں) اس لئے بیک وقت دیکھنے کا شوق بھی سمایا اور مرنے کا خوف بھی۔ میں نے کہا بلا سے۔ اور ممی خانے کے دروازے تک پہونچ گیا۔

ممی خانے کا دروازہ آج خلاف معمول کُھلا تھا۔ اندر پندرہ بیس لاشیں رکھی تھیں اُن میں سے ایک لاش کے قریب جس کو میں تین چار روز سے چیر رہا تھا، ایک سفید پوش نظر آیا۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں ایک چراغ اور دوسرے میں چمکتی ہوئی کوئی چیز تھی۔ مجھکو دیکھتے ہی اُس نے آواز دی "اندر چلے آؤ" آواز بہت نحیف تھی اس لئے میں نے قیاس کیا بلکہ ایک گونہ یقین ہوگیا کہ یہ عورت ہے۔ خوف سے لرز گیا۔ چاہتا تھا کہ بھاگ جاؤں لیکن پاؤں جیسے جم گئے تھے کہ اُٹھتے ہی نہیں۔

پھر آواز آئی "آتے کیوں نہیں؟" اس دفعہ آواز میں ذرا کرختگی اور کچھ کچھ متانت ملی جلی مگر تحکمانہ تھی۔ میں اپنی جگہ سے نہیں ہٹا خیال آیا کہ زور زور سے چلاؤں، شاید کوئی مدد کو آجائے لیکن اُس بیاباں میں اور وہ بھی ایسے ڈراونے وقت میں کون سُنتا ہے۔ جانے کیا شامت آئی کہ ادھر کھٹک آیا۔

"تُم نہیں آتے؟ اچھا میں ہی آکر تمہیں پکڑ لاتی ہوں" یہ کہتی ہوئی وہ بڑھی۔ اس کی آواز میں غصہ اور غضب بھرا تھا۔ میری نیم وا آنکھوں نے اُس کو قدم قدم پہ رعشہ براندام بھی دیکھا۔

اس دفعہ میں نے مدافعت نہیں کی۔

یہ ایک عورت تھی سفید ساری میں ملفوف پینتیس چالیس کا سن ہوگا۔ بُوٹا سا قد، نکھرا بدن، پریشان بال، سفید بیضاوی چہرے پر سیاہ سیاہ بے جھینپ آنکھیں اور اُن نرگسِ غزال سے حسد ورنج، ملال وتمنا، حجاب وغرور، شوخی وسنجیدگی کے بیش بہا چشموں کا اُبل اُبل کر فنا ہوجانا مجھ پر عجیب کیفیت طاری کر رہا تھا۔ اُس کا بے تکا انداز، اُس کی بیباک نگاہیں، بے تکلفانہ گفتگو اور پھر اُس کے ہاتھ میں نشتر۔ یہ سب چیزیں مجھکو مرتعش کئے دیتی تھیں۔ دماغ میں ہیجان سا پیدا ہوگیا۔ تمام جسم لرز گیا۔ بولنے کی کوشش کی لیکن زبان بے قابو تھی۔ اِس عالمِ بے خبری میں نہ جانے کتنی دیر تک کھڑا رہا کہ اُس نے یک بیک مُہرِ سکوت توڑی "تمہارا نام؟"

میں نے اپنا نام غلط بتا دیا اور وہ مُطمئن ہوگئی۔

"اس لاش کے درندے تم ہو؟ اور شاید اس کا دل بھی تم نے ہی نکالا ہوگا؟"

"ہاں"! اِس دفعہ جُھوٹ بولنے کی جُرأت نہ ہوئی۔

"خوب! مجھکو تمہاری ہی تلاش تھی تاکہ اس کی بوٹیاں الگ کرنے سے قبل تم اس کی سوانح عمری معلوم کرلو۔ یہ میرا باپ، بھائی، شوہر اور بیٹا ہے۔ تم محوِ حیرت توضرور ہوگئے لیکن اب جان لو کہ تمدّن اور جدّت پسند سماج نے سب کو جائز قرار دیا ہے۔" اُس نے اپنی کہانی یوں شروع کی۔ "اِس (لاش) کا باپ جو میرا باپ بھی ہوا ایک دولتمند تاجر تھا۔ بیوی کا اکلوتا شوہر اور اکلوتے بچّے کا باپ، اور سیم وزر اتنا کہ پینتیس کروڑ کی آبادی ایک ماہ تک پرورش پا سکتی تھی۔ روپیہ بلا شرکتِ غیرے خرچ ہو نہیں سکتا اس لئے اُس نے شہر کے عرشِ بام کو زیادہ سمجھا اور اُسکی تہ تک پہونچ گیا۔ لیکن ابھی خونِ تعیش کے دوچار قطرے اور باقی تھے۔ اُس کی بیوی نے جو میری ماں ہوئی۔ ساس اور سوت بھی، اپنے لئے اپنے اِس اکلوتے بچّے کو جو کہ شباب کی رنگینیوں سے مغلوب ہو کر ماں اور بیوی کا امتیاز اُٹھا چکا تھا، منتخب کیا۔ اُس کے لغزشِ افعال سے میں وجود میں آئی۔ اب میرا حقیقی بھائی میرا باپ تھا۔

عورت کی بار ڈھ! میں بھی چودہ پندرہ برس کے بعد نوجوانوں کی بربادی (یا عشرت کہو) کا باعث بن گئی۔ میرے دادا (جو سماج کی نگاہوں میں میرا باپ تھا) کی عیاش آنکھیں مجھ پر پڑیں اور عشقِ مجازی نے اُس کے داغدار سینے میں گھر کرلیا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ دامِ فریب میں پھنسانے کیلئے لاکھوں وسیلے ڈھونڈ نکالے۔ آخر ایک روز اپنے انوکھے جذبات کے ماتحت اُس نے ناممکن کو ممکن ثابت کر دکھایا۔ یہ میری عصمت پر پہلا داغ تھا۔ شرم و حیا کو ذراسی ٹھیس لگی لیکن لذّت و عشرت کے خیال میں رنج و غم کو مندمل کر بیٹھی۔

اب میں اپنے بھائی اور حقیقی باپ کی ماں بن چکی تھی۔ لیکن دُنیا ابھی تک حقیقت سے ناآشنا و بے خبر تھی۔ میری رنگین مزاجی اور جوشِ عشق و جنون نے پہلو بدلا اور میرا شیوۂ حُسن و جمال میرے باپ میں شوہر کی اہمیت پانے لگا۔ قُدرت نے اُس کی حریص و وحشی نگاہوں سے متاثر ہو کر اُس کو اپنے پیاسے جذبات کو تشفی دینے کیلئے میرا شکاری بنا دیا۔ وہ کامیاب ہوگیا اور میں بھی ...... اگر کامیاب نہیں تو ناکامیاب بھی نہ رہی۔ اُس روز سے وہ میرا شوہر تھا۔ یہ رشتۂ ازدواج (صرف گھر تک محدود) مدّتوں قائم رہا یہاں تک کہ اِسوقت میری عمر پینتیس ۳۵ سے بالا ہے۔

ذرا غور تو کرو۔ یہ عشووں کی عُریانی۔ فطرت کی شیطانی۔ جذبات و جوانی کی بربادی۔ عشق و محبت کا نرالا ڈھنگ کب تک ایک رُوپ میں رہتا! سوسائٹی سے کسی رمز کا پوشیدہ رکھنا غیر ممکن ہے۔ سماج کا دھارا بہیم رُخ بدلتا ہے۔ زمانہ نے کروٹ بدلی۔ تہذیب و تمدّن کے رضاکاروں نے سارا راز طشت از بام کر ڈالا۔ اب رُسوائی اور ذلّت کے سوا تھا ہی کیا۔ میرا دادا (یعنی باپ اور شوہر بھی) شہر بدر کردیا گیا۔ میرا شوہر ایک رات ایسا غائب ہوا کہ دوسرے روز اس کے خط سے اُسکے جائے سکونت کی خبر ملی۔ خط یہ ہے:۔

اُس نے ساری کے پلو کی گرہ کھول کر ایک خط نکالا اور پڑھنا شُروع کیا:۔

"۲۱ رماہ رواں ۳۹ء

..... ہر آغاز کا دامن انتہا سے وابستہ ہے۔ مظلوم کی آہ شعلہ بنکر ظالم کو ستاتی ہے۔ جوانی و شباب کا وقت نہایت سُرعت سے گذر کر ضعیفی کی شکل میں کباب کی طرح بُھننے لگتا ہے۔ عیش و طرب ختم اب رسوائی اور ذلّت کا سامنا ہے۔ ہاں میں نے اب سمجھا کہ دُنیا کا وجود خیالی اور محبت کا مقصد عارضی ہے۔ دولت و ثروت، جاہ و حشمت، اقبال و کامرانی عشرت و مرتبہ بس حُسنِ فریب کار ہیں عقل کو معدوم کر دیتے اور چشمِ بینا پر پٹیاں ڈال دیتے ہیں۔ گنہگار کے لئے لذّت اگر ہے تو عالمِ فانی سے کوچ کرنے اور اپنے کو دریائے مغفرت کے متلاطم امواج پر چھوڑ دینے میں ہے۔ یاد رکھو میں آج خودکشی کرلوں گا۔ تم بھی اگر اِس زندگی سے بیزار ہو تو دشت نوردی کے لئے نہ صحرا و وادی کی کمی ہے اور نہ سرکوبی کے لئے پتھروں کا فُقدان ...... مر تو رہا ہوں لیکن ایک ارمان کے ساتھ کہ اپنے گُناہوں کا کفارہ ادا نہیں کر سکا۔ یہ بشکل عذاب مجھکو ہمیشہ ستائیگا۔ اگر رحم آئے تو معاف کر دینا کیونکہ میں ظالم ہوں اور تم مظلوم ..... اچھا خُدا حافظ"

"میں بھی اپنا گُناہ اس سے بخشوانے آئی تھی لیکن ..... اے ظالم تُونے تو اس کا دل ہی نکال ڈالا ہے" آخری لفظ بمشکل ادا ہوا ہوگا کہ وہ چاقو لئے مجھ پر جھپٹی ....

میری آنکھ جو کھُلی تو صبح ہو چکی تھی۔ میں ایک لاش کے قریب فرش پر پڑا تھا لیکن میرے جسم پر کہیں بھی چاقو کا نشان نہیں ملا۔ کچھ ہٹ کر میز پر ایک عورت کی لاش تھی۔ غور سے دیکھکر میں نے پہچان لیا کہ یہ تو وہی عورت ہے۔ اُس کا سینہ چاک اور دل غائب تھا۔ عجیب کرشمہ ہے! کل تو یہ لاش تھی بھی نہیں۔ ممی خانے کے بھنگی سے یہ خبر ملی کہ یہ عورت کل جیلخانے کے قریب پائی گئی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک معمّہ ہے کہ دل کیسے اور کہاں نکل پڑا۔

ایم۔ ملک

غروب ہونے کو تھا۔ پرکاش کے آنے کا وقت قریب تھا لہٰذا میں خود کو سنبھالتے ہوئے کرسی سے اٹھی اور کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔

(۳)

روہیش کے چلے جانے کے بعد میری زندگی پھر خادماؤں کی طرح بسر ہونے لگی۔ وہی محنت مشقت اور وہی کام کاج۔ یہاں تک کہ ایک سال گذر گیا۔ اگرچہ اس عرصے میں مجھے روہیش کی نسبت کوئی اطلاع نہ مل سکی اور نہ ہی اسکی طرف سے کوئی خبر آنے کی امید تھی تاہم اس کی یاد برابر میرے دل میں مستور تھی۔ اس کا متبسم چہرہ، خمار آلود آنکھیں اور محبت بھری باتیں ایک ایسا سحر تھا جو ہر وقت میرے دل و دماغ پر مستولی رہتا۔ ستمبر کا مبارک مہینہ شروع ہوتے ہی پرماتما نے میری گود ہری کر دی اور ہمارے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ میں نے اس کا نام موہنی رکھا۔ ایک لڑکی کا باپ بنجانے پر پرکاش کے طرز سلوک میں کافی تغیر رونما ہو گیا۔ گھر میں کام کاج کے لئے اس نے ایک خادمہ کو ملازم رکھ لیا۔ شاید اب اُسے میری تکالیف کا احساس ہونے لگا تھا یا وہ یہ سمجھتا ہو کہ مجھے کام کاج کی نسبت اپنی معصوم بچی کا زیادہ خیال کرنا چاہیئے۔ اگرچہ ہم میاں بیوی میں اب رابطۂ اتحاد زیادہ مستحکم ہو رہا تھا تاہم میں پرکاش سے محبت نہ کر سکتی تھی۔ جس شخص کو میں دل دے چکی تھی وہ مجھ سے کوسوں دور تھا۔ معلوم نہیں کہاں؟

موہنی کوئی ڈیڑھ برس کی ہوئی ہو گی کہ ایک نئی مصیبت کا آغاز ہوا۔ سردیوں کے دن تھے اور غالباً نو بجے کا وقت۔ میں اپنی خورد سال بچی کو گود میں لئے دھوپ میں بیٹھی تھی کہ کارخانہ کا ایک ملازم ہانپتا ہوا آیا اور پرکاش کی موت کی وحشتناک خبر سنائی۔ آج صبح سے ہی اس کی طبیعت خراب تھی اور اب اچانک دل کی حرکت بند ہو جانے سے وہ سرگباش ہو اتھا۔ میں زندگی سے آگے ہی بیزار تھی اب شوہر کی موت نے بیوگی کا کاری زخم دل پر لگا دیا۔ سب سے بڑھکر مصیبت یہ تھی کہ اب دنیا میں میرا کوئی ایسا عزیز یا رشتہ دار نہ تھا جو میری زندگی کا سہارا بن سکتا۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا میرے رشتہ داروں میں صرف والدہ ہی باقی تھیں جو میری شادی کے چند ماہ بعد فوت ہو چکی تھیں۔ ادھر پرکاش کا بھی کوئی قریبی رشتہ دار اس وقت موجود نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز بعد کارخانہ بھی بند ہو گیا اور میں تنہا زمانہ کی صعوبتیں اٹھانے کیلئے باقی رہ گئی۔

پرکاش کو سرگباش ہوئے کوئی دو مہینے ہوئے ہونگے کہ اچانک روہیش واپس آ گیا۔ اُسے دیکھتے ہی میرے مغموم دل میں شعاعِ مسرت چمک اٹھی۔ آتے ہی اس نے مجھے آغوشِ محبت میں لے لیا اور تسلی آمیز لہجہ میں کہنے لگا "جان سے عزیز نرملا! مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارا دل توڑ کر چلا گیا تھا مگر اس وقت میں مجبور تھا۔ اب میں نے پرکاش کے مرنے کی خبر ایک دوست کی زبانی سنی تھی اس لئے فوراً تمہارے پاس چلا آیا۔"

ایک ماہ بعد میں نے روہیش سے شادی کر لی۔ گلشنِ زندگی جو باغبان کی عدم موجودگی میں تاراج ہونے لگا تھا اب نئے باغبان کی نگرانی میں از سرِ نو پر بہار ہونے لگا۔ چونکہ قانوناً روہیش ہی اپنے سوتیلے بھائی کی جائداد کا وارث تھا اس لئے کارخانہ کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس نے نہایت تندہی سے کاروبار کو فروغ دینا شروع کیا۔ پرماتما کی کرپا سے اب میرے دن پھرے تھے۔ میری خوابیدہ قسمت انگڑائی لیکر بیدار ہوئی تھی۔ اور زندگی کی مسرتوں سے مجھے پہلی بار لطف اندوز ہونے کا موقع ملا تھا۔ گھر کا کام کرنا تو کجا خود میری خدمت کے لئے دو خادمائیں موجود تھیں۔ روہیش ننھی موہنی کو اپنی حقیقی لڑکی کی طرح پیار کرتا تھا اور وہ بھی توتلی زبان میں اُسے پتاجی کہکر پکارتی تھی۔ روہیش اپنی سیاحت کی عجیب و غریب داستانیں اکثر مجھے سناتا۔ جنہیں سن کر میرے دل میں بھی مختلف شہروں کی سیاحت کا جنون پیدا ہونے لگا۔

(۴)

دو سال نہایت خوشی و خرمی میں بسر ہوئے۔ اس عرصے میں روہیش نے اپنی خداداد ذہانت و قابلیت کے باعث کاروبار میں حیرت انگیز ترقی کر لی اور منافع کی ایک کثیر رقم اس کے پاس جمع ہو گئی۔ میرے نام کا بھی کافی روپیہ بنک میں جمع تھا۔ لہٰذا گرمیوں کا موسم شروع ہوتے ہی میں نے روہیش سے کسی صحت افزا پہاڑی مقام پر چلنے کو کہا۔ روہیش کو چونکہ میری خوشنودی مقدم تھی اس لئے اُسے کب انکار ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اگلے روز کارخانے کے منیجر کو کاروبار کے متعلق ضروری ہدایات دے کر ہم دونوں اپنی خورد سال بچی اور ایک خادمہ کو ساتھ لیکر شملہ روانہ ہو گئے۔ دس پندرہ روز شملہ ٹھہرنے کے بعد ہم نے طے کیا کہ شور و غل سے بھرے ہوئے شملہ میں ٹھہرنے کی بجائے کسی پہاڑی گاؤں میں جا کر قیام کیا جائے، جہاں کی پُرسکون معصوم سادگیاں۔ سرد و شفاف پانی کے چشمے اور خوشگوار ہوائیں ہمارے لئے حیات بخش ثابت ہوں۔ اگرچہ روہیش کو تین چار گاؤں کے نام یاد تھے مگر اس کے خیال میں کسی کے محل وقوع میں اس قدر جاذبیت اور کشش نہ تھی جو ہمیں کچھ عرصے کے لئے اپنا پیوند بنا سکے۔ آخرکار تین چار روز کی لگاتار دریافت کے بعد ہمیں ایک ایسے گاؤں کا پتہ لگا جو شملہ سے دس میل کے فاصلہ پر تھا اور جس کی فضا ہماری مرضی کے عین مطابق بتلائی گئی تھی۔ دوسرے دن صبح کا ناشتہ کر کے ہم نے اپنا اسباب دو ٹٹوؤں پر لدوایا اور خود بھی ٹٹوؤں پر سوار ہو کر اس گاؤں کی طرف روانہ ہوئے اکثر مقامات پر راستہ

سخت دشوار گذرا تھا لیکن ہمارے رہوار پتھریلی چٹانوں پر چلتے اور ندی نالوں کو آسانی عبور کرتے ہم کو شام کے وقت منزلِ مقصود پر لے آتے۔ گاؤں کی آبادی نہایت مختصر تھی اور صرف چار پانچ مکان کرایہ کے لئے خالی تھے۔ میں نے اردگرد کی فضا پر نظر ڈالی تو بیحد مسرور ہوئی۔ کیونکہ مشرق کی طرف شفاف پانی کے دو چشمے تھے۔ جنوبی اور مغرب کی پہاڑیاں کوہستانی پھلدار درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ شمال کی جانب گاؤں بالکل خالی تھا جہاں سے کیلاش پربت کی منجمد چوٹیوں پر سے پھاندتی ہوئی سرد ہوائیں آتی تھیں۔ نزدیک ہی ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی جہاں مچھلی کا شکار کیا جا سکتا تھا۔ اس مقام کو اپنی مرضی کے مطابق پاکر ہم بہت خوش ہوئے اور معمولی تجسس کے بعد شمال کی جانب ہمیں دو رویہ پہاڑ پر ناتراشیدہ پتھروں کی بے ڈھب سی دیواروں والا ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر مل گیا۔ مالک مکان رتن نامی ایک معمر دیہاتی تھا، نہایت سادہ مزاج اور خوش طبیعت۔ بظاہر وہ بوڑھا معلوم ہوتا تھا مگر اس کے بدن میں خاصی قوت اور توانائی تھی۔ گاؤں کے لوگ اُسے صوفی منش خیال کرتے تھے۔ وہ آبادی سے دور کوئی تین میل کے فاصلہ پر اپنی اٹھارہ سالہ لڑکی کے ساتھ ایک جھونپڑی میں رہتا تھا اور ماہی گیری اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ گاؤں میں تیسرے چوتھے روز وہ یا اس کی لڑکی آیا کرتی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی ہم رتن کے حسنِ سلوک اور خوش خلقی سے نہایت متاثر ہوئے۔ اور گرمیوں کے چھ ماہ کے لئے مکان کا کرایہ طے کر کے ہم اس پہاڑی خطہ میں رہنے لگے۔

زندگی کے وہ چند ایام ایک نغمۂ مسرت کی طرح جو نکہت آلود فضا میں رقص کرتا ہو۔ اس کوہستانی علاقہ میں شادابی و مسرت کی حسین دیوی اپنے پُر بہار جلووں کی ضیا پاشیوں سے فضا کو منور کرتی اور اپنے حیات آفریں سانسوں سے مُردہ اجسام میں زندگی کی روح پھونکتی تھی۔ اپریل کا نصف مہینہ گذر چکا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب پنجاب میں اس قدر گرمی ہوتی ہے کہ تمام دن برف پیتے اور پنکھے کی ہوا کھاتے گذر جاتا ہے مگر یہاں پہاڑی خودرو پھولوں کی خوشبو میں بسے ہوئے سرد ہوا کے جھونکے اس طرح آتے تھے جیسے کسی شاعر کی خیالی جنت کی کھڑکیاں کھول دی گئی ہوں۔ ہمارا وقت عیش و عشرت کے رنگین خواب میں بسر ہونے لگا۔ سیر کوہسار اور مچھلی کا شکار ہمارا مرغوب ترین مشغلہ تھا۔ اکثر شام کے وقت ہم دروازہ کے باہر کرسیاں بچھوا کر بیٹھ جاتے اور کتب بینی سے دل بہلاتے۔ ہمارے اردگرد سماں نہایت نشاط انگیز ہوتا۔ برف پوش پہاڑیوں پر سے سرد اور خوشگوار ہوا کے جھونکے مستانہ وار آتے۔ سیاہ بادلوں سے ڈھکے ہوئے آسمان پر سفید سفید بگلوں کی قطاریں، قریب کے جنگل سے مست طاؤس کی پکاریں، ایک سحر ہوتا جس سے مُردے زندہ ہو سکتے تھے۔

(۵)

ایک دن صبح کے وقت موہنی کو خادمہ کے سپرد کر کے میں اور رومیش سیرِ کوہستان کے لئے نکل پڑے۔ ظلمت پوش مشرقی آسمان کی جبین پر صبح کی روشنی یوں لرز رہی تھی گویا ماضی کی تاریکی کے کثیف پردوں میں کوئی گذشتہ سُہانی یاد لوحِ حافظہ پر مرتسم ہے۔ شمال کی جانب کوئی دو ڈھائی سو فٹ بلند ایک عظیم الشان پہاڑی تھی جس کی چوٹی پر پہونچنے کی میری کئی دنوں سے خواہش تھی۔ ہم نے دوپہر کا کھانا ساتھ لے لیا اور پہاڑ کی بلندی پر چڑھنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم کئی میلوں کی مسافت طے کر رہے ہوں۔ سفر کی تکان سے میرا سانس پھولنے لگا اور میرے قویٰ مضمحل ہونے لگے۔ مگر اوپر پہونچ کر منظر کی نشاط انگیزی سے میرے جسم میں ازسرِ نو توانائی عود کر آئی۔ پہاڑ کی چوٹی پر سماں نہایت کیف آور تھا۔ سورج کی سُنہری شعاعیں چٹانوں اور بلند درختوں کی پیشانی پر بوسہ زن تھیں۔ اُفق پر چند ابرپارے چیلوں کی طرح ہواؤں میں اُڑ رہے تھے۔ نیچے وادی میں بکھرے ہوئے مکانات ان مسافروں کی مانند معلوم ہوتے تھے جو سفر کی تکان کے باعث ستانے کے لئے بیٹھ گئے ہوں۔ پہاڑی ندی نالے یوں دکھائی دیتے تھے گویا سطحِ زمین پر یدِ قدرت نے سیمیں لکیریں کھینچ دی تھیں۔ اس قسم کے پہاڑی خطہ کی عظمت و شوکت اور یہیں کی خوبصورتی کا اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے جسے ایسی بلندی پر پہونچنے کا اتفاق ہوا ہو۔ مگر ہر شخص کو میری طرح کوہستانی سیر کا جنون نہیں ہے۔

شام کے قریب میں اور رومیش پہاڑی سے واپس اُتر رہے تھے کہ ایک مقام پر کسی انسان کی دردناک مگر کمزور آواز فضا میں گونجتی سنائی دی۔ ہم ٹھٹک کر وہیں رُک گئے۔ ایک لمحہ بعد پھر وہی درد انگیز سسکتی ہوئی آواز ہمارے کانوں میں پہونچی۔ دائیں طرف چند قدم چلنے پر میری آنکھوں نے ایک حسرتناک منظر دیکھا۔ ہمارا نیک دل مالک مکان رتن بے ہوشی کی حالت میں پڑا کراہ رہا تھا۔ اُس کی دائیں ٹانگ ایک وزنی پتھر سے دبی ہوئی تھی۔ رومیش نے جلدی سے پتھر اٹھا کر ایک طرف کیا تو ہمیں یہ معلوم کر کے ازحد رنج ہوا کہ گھٹنے کے نیچے سے اُس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ غالباً وہ بدنصیب انسان، چٹان سے پھسل کر گرا تھا۔ بہت دقت سے رومیش نے اُسے دوش پر اٹھایا۔ اور ہم مکان کی جانب روانہ ہوئے۔ جب ہم مکان پر پہونچے تو سورج غروب ہو چکا تھا اور رات کی تاریکی اپنا سیاہ دامن پھیلا رہی تھی۔ بوڑھے رتن کو ایک نرم و گداز بستر پر لٹا کر رومیش ڈاکٹر کو بلانے کے لئے فوراً قریب کے گاؤں کی طرف دوڑا۔ میں نے

برانڈی کے چند قطرے رتن کے حلق میں اُتارنے اور سرد پانی سے اُسکی پیشانی کو دھویا مگر کسی طرح بھی اُسکی نحیفت کم نہ کرسکی۔

قریباً دو گھنٹے بعد رومیش ڈاکٹر کو ساتھ لیکر واپس لوٹا۔ راستے میں وہ رتن کی نوجوان لڑکی مایا کو بھی ہمراہ لے آیا۔ ڈاکٹر نے آتے ہی کوئی خواب آور دوائی رتن کو پلائی اور شکستہ ہڈی کو اصلی مقام پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ چونکہ ٹانگ ٹوٹے چار پانچ گھنٹے گذر چکے تھے اس لئے یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ تاہم ڈاکٹر نے نہایت محنت و احتیاط سے کام کرتے ہوئے ٹانگ پر پٹی وغیرہ باندھ دی۔ ڈاکٹر کے جانے کے پندرہ منٹ بعد رتن نے آنکھیں کھولیں تو اُس کی اکلوتی بیٹی چارپائی کے قریب بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔ میں اور رمیش دونوں باپ بیٹی کو تسلی دیکر ان کا غم غلط کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ مایا کو آج میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ایسی حسین و جمیل لڑکی قبل ازیں میری نظروں سے نہیں گزری تھی۔ بلاشبہ اُسکی ہستی ایک مجسمۂ شعر و شباب، ایک ہیکل حُسن و جمال اور ایک مجموعۂ زُہرہ و نور تھی۔ جس نے اس کوہستانی خطہ کی طرب انگیز فضاؤں کو اپنے یاسمین جلووں کی ضیا پاشیوں سے منور کر رکھا تھا۔ گلاب کے سفید پھول کی مانند شگفتہ چہرہ، پُرکیف و خُمار آگیں آنکھیں، آفتاب کی طرح درخشاں پیشانی۔ اس پہ طرّہ یہ کہ وہ شباب کی مخمور منزلوں میں گامزن تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس خطۂ جنت نظیر میں فردوسِ بریں سے کوئی حور اُتر آئی ہو۔

ڈاکٹر نے ہدایت کی تھی کہ مریض کو کم از کم تین ماہ تک چارپائی سے نہیں اُٹھنا چاہیئے۔ ہلنے جُلنے کی اُسے قطعی ممانعت تھی۔ کیونکہ ذرا سی غفلت اور بے احتیاطی سے جوڑ کے ہل جانے کا احتمال تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر رتن اور مایا دونوں ہمارے ہاں رہنے لگے۔ مایا جلد ہی ہم سے گھُل مل گئی اور ہم دونوں نہایت ہوشیاری اور محنت سے بوڑھے رتن کی تیمارداری کرنے لگے۔ مایا اور رتن سے ہمارا رابطۂ اتحاد روز بروز ترقی پذیر ہوتا گیا اور ہم سب ایک ہی گھر کے افراد معلوم ہونے لگے۔ مایا سے مجھے بہت ہمدردی پیدا ہو چکی تھی۔ گھر کا معمولی کام کاج خادمہ کے سپرد تھا اس لئے میں سارا دن موہنی کی نگہداشت اور رتن کی تیمارداری میں صرف کر دیتی۔ مایا کو میں زیادہ دیر تک اپنے بوڑھے باپ کے پاس بیٹھنے نہیں دیتی تھی تاکہ اس کے مجروح دل کو رنج و غم سے زیادہ آشنا نہ ہونا پڑے۔ رومیش کی طرح مایا بھی مچھلی کے شکار کی دلدادہ تھی۔ اور یوں بھی وہ ایک دوسرے سے بہت مانوس ہو چکے تھے اس لئے وہ دونوں سیر و شکار کے لئے متواتر کئی کئی گھنٹوں تک مکان سے باہر رہتے۔ میں اُن کے اس طرزِ عمل سے مطلق خائف نہ تھی بلکہ خود مایا کو سیر و تفریح میں وقت گذارنے کی ہدایت کیا کرتی تھی تاکہ گھر میں زیادہ وقت رہنے سے باپ کی تکلیف کا خیال اُس کی صحت کی خرابی کا باعث نہ بن جائے۔ لیکن اس وقت میرا یوں بے فکر ہونا نادانی پر مبنی تھا۔ ایک جوان عورت کا میرے خاوند سے ہر وقت کا میل جول ہوسناکیوں کا مرکز بننا لازمی تھا۔ کاش! مجھے اس وقت اس حقیقت کا احساس ہوتا۔ گو میں شباب کی جنوں خیزی سے بخوبی آشنا تھی اور مایا کی دلفریب شکل کا بھی مجھے اچھی طرح خیال تھا تاہم رومیش کی لغزش کا خیال ایک لمحہ کے لئے بھی میرے دل میں جاگزیں نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ دُنیا کی کوئی طاقت ہماری محبت میں حائل نہیں ہو سکتی۔

بوڑھے رتن کی حالت دن بدن اچھی ہو رہی تھی اور اُسکی صحتیابی کا ہمیں یقین ہو گیا تھا۔ مگر تقدیر کا لکھا کسی طور نہیں مٹ سکتا۔ متواتر دو ماہ تک چارپائی پر پڑا رہنے سے رتن کا جی اُکتا گیا تھا اس لئے ڈاکٹر کی ہدایت سے قطع نظر کرتے ہوئے اُس نے ٹانگ کو جنبش دینی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جوڑ کچا ہونے کے باعث اپنی جگہ سے کھسک گیا، اور ٹانگ میں سُوج پیدا ہو گئی۔ دو دن شدتِ تکلیف سے وہ نیکدل بوڑھا تڑپتا رہا۔ بالآخر تیسرے روز اسی تکلیف کے باعث اُس نے جان دیدی۔ پتا کی موت نے مایا کے نازک دل کو سخت صدمہ پہونچایا۔ اُس کی یتیمی کا دُکھ دیکھکر میرا دل ہمدردانہ غم کی لہروں میں تیرنے لگا۔ میں نے بہت چاہا کہ جتنا عرصہ ہم اِس پہاڑی مقام پر مقیم ہیں وہ ہمارے پاس رہے مگر اُس کی شمعِ دل بُجھ چکی تھی اور وہ دُنیا سے اُکتائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لہذا وہ اپنی جھونپڑی میں واپس چلی گئی۔ اب وہ ہفتہ میں صرف ایک آدھ مرتبہ مجھ سے ملنے کے لئے آتی اور وہ بھی کوئی گھنٹہ آدھ گھنٹہ کے لئے۔

——— (۶) ———

اکتوبر کا مہینہ شروع ہوتے ہی میں نے رومیش سے وطن چلنے کو کہا تو مجھے یہ سُنکر قدرے تعجب ہوا کہ وہ ابھی اس کوہستانی علاقے کو چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ سردیوں میں برف باری کا منظر نہایت دلفریب ہوتا ہے لہذا سردی کا موسم بھی اسی جگہ گذارنا چاہیئے۔

نومبر میں برف باری شروع ہوئی۔ آسمان سے برف کے ٹکڑے روئی کے گالوں کی طرح گر کر ایک عجیب کیف آور سماں پیش کرتے۔ درخت، مکانوں کی چھتیں، پہاڑوں کی چوٹیاں، سب کے سب سفید پوش نظر آتے۔ سارا سارا دن آسمان پر سیاہ بادل محیط رہتے۔ اکثر اوقات بارش بھی نہایت زور شور سے ہوا کرتی۔ میں سارا دن مکان میں آتشدان کے قریب بیٹھی

رہتی اور ناول یا افسانے پڑھا کرتی، مگر سیر و سیاحت کا زیادہ دلدادہ رومیش
عموماً مکان سے غیر حاضر رہتا۔ چونکہ دن گذرتے گئے موسم کی سختی زیادہ
ہوتی رہی۔ پہاڑوں کی منجمد چوٹیوں پر سے سرد ہوا کے جسم خراش جھونکے
سردی کی تندی میں اضافہ کرنے لگے۔ دسمبر کے آخیر میں تو اس بلا کی سردی
پڑنے لگی کہ ندی نالوں کا پانی بھی منجمد ہو گیا۔

جنوری کے غالباً پہلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی۔ کئی دنوں کے بعد
آج آسمان پر بادل نہیں تھے۔ صبح کا وقت تھا اور مشرقی آسمان پر اُفق کی
تاریخی تنویریں بکھر رہی تھیں۔ متواتر کئی روز تک مکان کی چار دیواری میں
مقید رہنے سے میرا دل اُکتا گیا تھا۔ موہنی ابھی تک محوِ خواب تھی۔ رومیش
حسب معمول علی الصبح ہی سیر کیلئے نکل گیا تھا۔ میں خادمہ کو موہنی کی نگہداشت
کی ہدایت کر کے سیر کے لئے مکان سے باہر نکل پڑی۔ کوئی سو گز چلنے کے
بعد میں ندی کے کنارے پہونچی اور خاموش و ساکن پانی کا نظارہ کرنے لگی۔
بہت دنوں کے بعد آج آسمان پر سورج جلوہ گر ہوا تھا جس کی پُرنور شعاعوں
میں نہایا ہوا پہاڑی منظر نہایت دلفریب معلوم ہوتا تھا۔ میں دھوپ میں
اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی کہ دفعتاً دو انسانی آوازیں مصروفِ گفتگو سُنائی
دیں۔ ساتھ ہی کسی کے قدموں کی چاپ آنے لگی۔ میں دوڑ کر ایک چٹان
کی آڑ میں ہو گئی اور آنے والوں کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ ایک
لمحہ بعد میں نے پتھروں کے درمیان سے جھانک کر دیکھا تو رومیش اور
مایا ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہنسی خوشی چلے آ رہے تھے۔ جس چٹان کے عقب
میں میں پوشیدہ تھی اس کے قریب پہونچکر وہ رُک گئے اور میرے
دیکھتے ہی رومیش نے مایا کو اپنی آغوش میں لیکر اُس کے لبوں پر
محبت کا بوسہ دیا۔ مایا نے بھی اپنے نرم و نازک بازو رومیش کی گردن
میں حمائل کر دیے اور اُس کے سینے سے چمٹ گئی۔ اس منظر کو میرے
دل پر بجلی سی گری اور میں بے اختیار اُن کی جانب دوڑی۔ "رومیش!
رومیش!!" میں نے چلا کر کہا "تم نے کس طرح . . . . . . " میں
غش کھا کر گر پڑی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں مکان میں چارپائی پر پڑی تھی اور رومیش
میرے اوپر جھکا ہوا میری پیشانی کو پانی سے دھو رہا تھا۔

"نرملا! مجھے سخت افسوس ہے کہ میں نے تمہارا دل دکھایا"
اُس نے کہا "میں اپنے فعل پر سخت نادم ہوں ـــ شاید کسی دن میں
تمہاری نظروں میں پھر اس قابل ہو جاؤں کہ تم میری خطا معاف
کر سکو"

"رومیش! کیا تم اس کوہستانی چھوکری کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتے ہو؟"
میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جانِ من! مجھ پر بھروسہ رکھو" رومیش نے جواب دیا "میں
ہر وقت تمہارے لئے جان دینے کو تیار رہوں۔ ابھی برف باری سے
تمام راستے مسدود ہیں۔ موسم کھلنے پر ہم فوراً وطن روانہ ہو جائینگے"

اس واقعہ کے بعد میں اور رومیش آپس میں بہت کم گفتگو کرتے۔ ہمارا
وقت مکان کی چار دیواری میں نہایت خاموشی سے بسر ہونے لگا۔ مایا کو
پھر میں نے نہیں دیکھا تھا۔ رومیش کی طبیعت میں بہت تغیر رونما ہو چکا تھا
وہ ہر وقت کسی گہری سوچ میں کھویا سا رہتا تھا۔ مایا سے مجھے سخت نفرت
ہو چکی تھی۔ اس کوہستانی چھوکری نے جسے میں نیکدل خیال کرتی تھی میرا
بنا بنایا گھر برباد کر دیا تھا اور اپنے محشر بدامن حسن اور قیامت خیز جوانی کے
سحر سے میرے عزیز شوہر کے دل پر جادو کر رکھا تھا۔

سردی بدستور اپنے عروج پر تھی۔ آسمان پر ہر وقت گہرے سیاہ
بادل چھائے رہتے۔ برف باری تھمنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ پہاڑوں کی
منجمد چوٹیوں سے سرد ہوا کے مہیب تھپیڑے شور مچاتے ہوئے خوفناک
آندھی کی طرح آتے۔ اکثر اوقات بارش کی بلاخیزی منظر کو اور زیادہ
ہیبت ناک بنا دیتی۔ میرا دل موسم کی اس قیامت خیزی سے سخت بیزار
ہو چکا تھا مگر جب تک راستہ صاف نہ ہوتا ہمارا سفر کرنا ناممکن تھا۔

وسط فروری میں موسم قدرے اعتدال پر آ گیا۔ میں نے رومیش
کو وطن لوٹنے کے لئے مجبور کیا۔ اس عرصے میں کارخانہ کے منیجر کی طرف
سے متعدد خطوط کاروبار کے نقصان کی بابت آ چکے تھے اور بنک کے منیجر
سے بھی سرمایہ کے دن بدن کم ہونے کی اطلاع مل چکی تھی۔ لیکن بایں ہمہ
رومیش چلنے پر رضامند نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب تک راستہ پورے
طور پر صاف نہ ہو جائے سفر کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ مجھ پر اس حقیقت
کا انکشاف بعد میں ہوا کہ وہ کیوں ٹال مٹول کرتا رہا۔

ماہ فروری کی آخری تاریخ تھی۔ رات کا وقت تھا اور بارش
پورے زور سے ہو رہی تھی۔ آہ! وہ رات مجھے تمام عمر نہیں بھولے گی۔
ہوا کے تیز و تند جھونکے خوفناک آندھی کی صورت اختیار کئے ہوئے
درختوں اور چٹانوں سے دیوانہ وار ٹکرا رہے تھے۔ ہم کمرہ میں آتشدان
کے قریب بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتاً دروازہ پر زور سے دستک ہوئی۔
میں نے دوڑ کر کواڑ کھولے تو مایا پانی میں شرابور ایک سیاہ لبادہ اوڑھے
ہانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ہوا کے ایک دلخراش جھونکے نے اس کے
پیچھے کمرے میں داخل ہو کر میرے جسم کو لرزا دیا۔ میں نے فوراً دروازہ

بند کیا اور مایا کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ عجیب پریشانی کی حالت میں تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو رہا تھا اور وہ بمشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔ میں نے اُسے سہارا دیتے ہوئے پانی میں بھیگا ہوا لبادہ اُس کے جسم پر سے ہٹایا۔ اور آتشدان کے قریب ایک چارپائی پر اُسے لٹا دیا۔ یہ دیکھ کر مجھے سخت تعجب ہوا کہ وہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی اور اس کے وضع حمل کا وقت قریب تھا۔ اس راز سے واقف ہو کر میری رُوح لرز اُٹھی۔ رومیش اس معاملے سے سخت متفکر ہوا اور چُپ چاپ اُٹھکر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اگرچہ مجھے مایا سے نفرت ہو چکی تھی تاہم میری غیرت نے مجھے مجبور کیا کہ میں اِس مُصیبت کے وقت میں اس کی امداد کروں۔ مجھے متذبذب دیکھکر اُس نے ملتجیانہ انداز میں کہا "نرملا بہن! پرماتما کے لئے میری خطاؤں کو بہ نظر عفو دیکھنے کی کوشش کرو۔ دُنیا میں اسوقت میرا کوئی ایسا عزیز نہ تھا جس کے ہاں اس مصیبت کے وقت میں پناہ مل سکتی۔ میں اپنی سیاہ کاری سے سخت نادم ہوں۔

چونکہ مجھے رومیش سے بیحد محبت ہو چکی تھی اس لئے ہمارے معاشقہ کی ابتدا میری طرف سے ہوئی اور ہم خُفیہ طور پر اپنی جوانی کے پیاسے جذبات کو تسکین دیتے رہے۔"

جس طور پر وہ بہکی بہکی باتیں کرتی تھی اس سے واضح تھا کہ وہ وضع حمل کی اذیت سے جانبر نہ ہو سکے گی۔ اس وقت کسی لیڈی ڈاکٹر کا اُس کے پاس ہونا نہایت ضروری تھا مگر رات کی تاریکی اور بارش کے طوفان میں پانچ چھ میل سے لیڈی ڈاکٹر کو بُلا کر لانا سخت دُشوار تھا۔ راستے میں تین چار ندی نالے پڑتے تھے جن میں طُغیانی زوروں پر تھی۔ میں نے خادمہ کو پانی گرم کرنے کے لئے کہا اور ایشور کا نام لیکر خود ہی مایا کو اُس کی مشکل سے نجات دلانیکی کوشش کرنے لگی۔

آخر کار نصف شب گزُرے بچہ پیدا ہوا۔ نہایت مضبوط و توانا اور بے حد خوبصورت۔ میں نے اُسے ماں کے پہلو میں لٹا دیا۔ مایا کی حالت اس وقت سخت تشویشناک تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو چکا تھا اور وہ سخت لاغر معلوم ہوتی تھی۔ مجھے آثار اچھے نظر نہ آتے تھے لہذا میں نے رومیش کو بھی پاس بُلا لیا۔ اس وقت ایک عجیب عبرتناک سماں میرے پیشِ منظر تھا۔ باہر بادل کی گرج اور بارش کا بے پناہ طوفان ایک خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔ اور اندر ہمارے سامنے ایک بیکس ہستی عین عنفوانِ شباب میں دَم توڑ رہی تھی۔ میں اور رومیش مایا کی چارپائی کے دائیں بائیں بیٹھے تھے اور ہماری نگاہیں اس کے مغموم و افسُردہ چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

چند ساعتوں کی خاموشی کے بعد مایا نے اپنی گہری خوبصورت آنکھیں جن میں آنسوؤں کے شفاف قطرے لرز رہے تھے، میری طرف اُٹھائیں اور ایک دُکھی ہوئی مضمحل آواز میں کہنے لگی "نرملا بہن! میں تمہاری عنایت کا کس مُنہ سے شکریہ ادا کروں۔ میں جانتی ہوں کہ میں صرف چند ساعتوں کی مہمان ہوں۔ ایشور کو یہی منظور تھا کہ مجھ جیسی گنہگار ہستی زندگی کی مسرتوں سے لُطف اندوز ہونے کی آرزو دل میں لئے ہوئے ناشاد و ناکام دُنیا سے سدھارے۔ میری آخری التجا ہے کہ رومیش اور تم دونوں ملکر میرے بچے کو اپنی حقیقی اولاد کی طرح پرورش کرنا۔ میں اپنے جگر کی یہ نشانی بطور یادگار تمہارے درمیان چھوڑے جاتی ہوں۔ اچھا الوداع! ......"

اتنا کہکر اُس نے محبت بھری نظروں سے اپنے معصوم بچے کو آخری مرتبہ دیکھا اور ایک لمبی سانس کے ساتھ اُس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور رومیش بھی زار و قطار رونے لگا۔

(۸)

مایا کی حسرتناک موت کے بعد قریباً دو ہفتے مزید ہمیں اس کوہستانی علاقہ میں قیام کرنا پڑا۔ اس عرصے میں مجھے سوائے بچوں کی نگہداشت کے اور کسی کام سے سروکار نہ تھا۔ رومیش کا دل بھی اب مناظر فطرت کی دل فریبیوں سے بے وفا ہو چکا تھا۔ اُس کی حیاتِ معاشقہ کی المناک پہلو نے ایک ایسا خوفناک احساس اُس کے دل و دماغ پر طاری کر دیا تھا کہ اُس کے بدن سے اب پہلی سی طاقت و توانائی مفقود ہو چکی تھی۔

مارچ کی پندرہ تاریخ تھی جب ہم وطن لوٹنے کی تیاری کرنے لگے۔ سامان ٹٹوؤں پر لدوا کر میں نے الوداعی نظروں سے اس مقام کو دیکھا جہاں میرے خاوند کی حیاتِ معاشقہ کا حسرتناک ڈرامہ ایک حزنیہ سین کے ساتھ اختتام پذیر ہوا تھا۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ سورج کی ابتدائی کرنیں بلند چٹانوں کی پیشانی پر بوسہ زن تھیں۔ رومیش میرے قریب کھڑا حسرت سے ارد گرد نظر دوڑا رہا تھا۔ دفعتاً اُس نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں میں میرا ہاتھ لیتے ہوئے کہا "پیاری نرملا! جس حسرتناک واقعہ سے ہمیں اس جگہ دوچار ہونا پڑا میں سمجھتا ہوں کہ اُس کی یاد تمام عمر ہمارے

دلوں سے محو نہیں ہو سکتی۔ میں سخت نادم ہوں کہ میرے یہاں آنے کے باعث ایک نیک دل ہستی کی زندگی برباد ہوتی۔ لیکن اب اس تلخ احساس کو فروغ دینا لاحاصل ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم پھر سے اپنے دورِ محبت کو زندہ کریں اور مرحومہ کے بچے کو اپنی حقیقی اولاد تصوّر کرتے ہوئے اپنی ازدواجی زندگی کو ازسرِ نو پُرمسرت بنانے کی کوشش کریں"۔

اِن الفاظ کے ساتھ اُس نے مجھے پیار سے اپنی آغوش میں لے لیا اور میں نے بھی بے اختیار اُسکی خوبصورت گردن میں اپنے بازو حمائل کر دئے۔ اُس کے نرم و نازک ہونٹ خودبخود میرے لبوں سے پیوست ہو گئے۔ گویا یہ عہد تھا ہماری تجدیدِ محبت کا.....

رونیش اب اپنا کاروبار نہایت محنت سے چلا رہا ہے۔ ہم دونوں اپنی ازدواجی زندگی کو دن بدن پُرمسرت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہمارا رشتۂ محبت روز بروز مستحکم ہو رہا ہے۔ لیکن مایا کی یاد زندگی کے آخری سانس تک ہمارے درمیان قائم رہیگی۔ اس کا لڑکا جسے ہم کمار کے نام سے پکارتے ہیں اب دو برس کا ہو چکا ہے۔ اور جس طرح رونیش موہنی کو اپنی حقیقی اولاد تصوّر کرتا ہے اسی طرح میں بھی کمار کو اپنے لختِ جگر کی طرح عزیز رکھتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ کبھی بھی اِس حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکے گا کہ میں اُسکی حقیقی ماں نہیں ہوں۔

(پلاٹ جزوًا ماخوذ)

ساغر جعفری۔ بی۔ اے، ایل ایل۔ بی

ہندوستان کے سب سے بڑے مترجم مولٰنا عنایت اللہ دہلوی کے دلکش تراجم

شہرۂ آفاق فرانسیسی انشاپرداز گستیو فلابیئر کا شہپارہ

سلامبو ۔ جس میں قرطاجنہ قدیم کی مٹی ہوئی تہذیب اس طرح از سرِ نو الفاظ میں تعمیر کی گئی ہے کہ اب سے دو ہزار سال پہلے کی تصویر آنکھوں کے آگے آجاتی ہے۔ سلامبو اور ماتو کی محبت کی کہانی اس قدر حسرتناک ہے کہ پڑھنے والوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رہتے ہیں۔ وحشیوں کی لڑائی کا بیان جب آپ پڑھیں گے تو سانس بھی روک لیں گے۔ غرض شروع سے آخیر تک یہ کتاب عجیب و غریب چیز ہے۔ ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ قیمت تین روپے (سے ر)

نجم السحر ۔ پانچ ہزار سال پہلے جب مصر کی تہذیب اپنے معراج کمال پر تھی تو ربّ عمون کی بیٹی ملکہ نجم السحر نے سر بفلک محلوں میں آنکھیں کھولیں پروان چڑھی۔ جوان ہوئی اور پھر اُس کی داستان عشق شروع ہوئی جو حد درجہ المناک ہے۔ ساحرہ آشتی کا جادو۔ ثوران کے مظالم۔ کیفر کی پُر اسرار ہستی۔ اشمعون نجومی کی سحر آفرینی۔ غرض اُس زمانہ کے تمدّن و معاشرت کا کوئی پہلو مصنّف کی نظر سے نہیں بچا ہے۔ اسکے دورانِ مطالعہ میں آپ کو معلوم ہوگا کہ ماضی کا دلکش فلم آپ حال کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات قیمت ۲؎ ۔

ہیرودیاس ۔ سلومی کا حسن بدی کا بے پناہ حسن تھا، اس کا ناچ رقصِ گناہ تھا۔ اُس کا جذبہ کوہِ آتش فشاں کی طرح تُند اور اُس کی محبت لاوے کی طرح جھلس دینے والی تھی۔ اُس کے سانس میں زہر تھا اور بوسے میں موت۔ وہ یوحنان کے لبوں کو چومنا چاہتی تھی۔ مگر یہ خدا رسیدہ بزرگ اسے اور اُسکی ماں کو بُرا بھلا کہا کرتا تھا۔ حاکم رُبع الخلیفس کے حکم سے سلومی ایک عظیم الشان دعوت میں ناچی۔ انعام میں اُس نے یوحنان کا سر مانگا۔ اس خون آلود سر کو طشت میں سے اٹھا کر سلومی نے اس کے ہونٹ کو دیوانہ وار چوما۔ اور گناہ، خون اور موت کی اس رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانی کو پڑھیئے۔ قیمت ۲؎

شہرۂ آفاق شکسپیر کا سب سے مشہور ڈرامہ ہیملٹ شہزادۂ

ہیملٹ ۔ ڈنمارک، کا ترجمہ مولانا عنایت اللہ دہلوی نے ایسی قادر الکلامی سے کیا ہے کہ اُردو میں ایک غیر فانی کتاب کا اضافہ ہوگیا۔ اُردو میں لفظی پابندی کے ساتھ آجتک شکسپیر کے کسی ڈراموں کا ترجمہ کسی سے نہیں ہو سکا۔ مولانا عنایت اللہ صاحب کا یہ احسان ہے کہ اُنہوں نے اس عظیم الشان ڈرامہ کو اُردو میں نہایت عمدگی سے منتقل کر دیا۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ ٹائیٹل رنگین۔ قیمت عہ؎

جملہ کتابیں ملنے کا پتہ:-

ساقی بکڈپو۔ دہلی

اسٹنڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
(دی)

مُرتّبہ

انجمن ترقی اُردو (ہند)

جس قدر انگلش اُردو ڈکشنریاں اب تک شائع ہوئی ہیں ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل ڈکشنری ہے۔ اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے۔ چند خصوصیات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) یہ بالکل جدید ترین لغت ہے۔ انگریزی زبان میں اب تک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں۔

(۲) اس کی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی، مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کے معنی بھی شامل ہیں جن کا تعلق علوم وفنون کی اصلاحات سے ہے۔ اسی طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کئے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں شامل ہوئے ہیں۔

(۳) ہر ایک لفظ کے مختلف معانی اور فروق علیحدہ علیحدہ لکھے گئے ہیں۔ اور امتیاز کیلئے ہر ایک کے ساتھ نمبر شمار دیدیا گیا ہے۔

(۴) ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں اور اُن کے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا اُن کی وضاحت مثالیں دے دیکر کی گئی ہے۔

(۵) اس امر کی احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کیلئے ایسا مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کر سکے اور اس غرض کیلئے تمام اُردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہے۔ یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی۔

(۶) ان صورتوں میں جہاں موجودہ اُردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کئے گئے ہیں جو اُردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں۔

(۷) اس لغت کیلئے کاغذ خاص طور سے باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا تھا جو بائیبل پیپر کے نام سے موسوم ہے۔ طباعت کیلئے اُردو اور انگریزی ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کئے گئے ہیں۔ جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے۔

ڈمائی سائز۔ صفحات ۱۵۱۳ + ۳۳ قیمت سولہ روپے کلدار علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ:۔ دفتر انجمن ترقی اُردو (ہند) اورنگ آباد۔ دکن

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
قیمت فی پرچہ چھ آنے

جُرعات

ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ
نمونے کا پرچہ مفت بھیجا جاتا ہے

جلد ۱۸ | ساقی دھلی۔ بابت ماہِ ستمبر ۱۹۳۹ء | نمبر ۳

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
(۱)	نگاہِ اوّلیں	"شاہد"	(۲)
(۲)	ہندوستان کے تعلیمی مسائل	جناب مرزا محمد سعید۔ ایم۔ اے؛ آئی۔ ای۔ ایس۔ (ریٹائرڈ)	(۳)
(۳)	تخیلات	جناب مظہر عزیز ایم۔ اے؛ ایل ایل۔ بی	(۶)
(۴)	حقائق	جناب امین حزیں (سیالکوٹی)	(۷)
(۵)	آجا سجنی میرے پاس	جناب بہزاد لکھنوی	(۸)
(۶)	اوشیمہ	پروفیسر نورالحسن برلاس۔ (از جاپان)	(۹)
(۷)	کلامِ احسن	جناب احسن بگرامی۔ بی۔ اے؛ ایل ایل۔ بی	(۱۳)
(۸)	باغی	جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ بی۔ اے؛ ایل ایل۔ بی (علیگ)	(۱۴)
(۹)	ناشاد	جناب سید وزیر حسن دہلوی	(۲۳)
(۱۰)	ہم لوگ	جناب نہال سیوہاروی	(۲۷)
(۱۱)	مصنف کا وارث	پروفیسر محمد اسلم۔ ایم۔ اے؛	(۲۸)
(۱۲)	اے ساقی	جناب سکندر علی وجد۔ بی۔ اے (عثمانیہ)	(۳۲)
(۱۳)	اُس کوچے میں	جناب "ممتاز مفتی"	(۳۳)
(۱۴)	ہدایت	جناب گنگا دھر ناتھ فرحت۔ بی۔ اے؛ ایل ایل۔ بی	(۴۱)
(۱۵)	بے پرکی	"آوارہ"	(۴۲)
(۱۶)	ایک مندر جانے والی	جناب شاد عارفی	(۵۲)
(۱۷)	تجرد کی ناکام خود رائیاں	"ماضی"	(۵۳)
(۱۸)	غلغلۂ ہندوستانی	جناب سید علی اختر	(۵۷)
(۱۹)	ایک تابناک ستارہ	ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایم۔ اے؛ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (لندن)	(۶۵)
(۲۰)	یادِ رفتگاں	جناب سید علی منظور	(۷۴)
(۲۱)	اک ندی آکاش سے آئی	جناب صلاح الدین خاں	(۷۵)
(۲۲)	آتشِ غم	جناب اسد انوری۔ بی۔ ایس۔ سی۔ (علیگ)	(۷۸)
(۲۳)	گریۂ طفل	از آنسمی۔ مترجمہ صلاح الدین احمد قریشی۔ دہلوی	(۸۰)
(۲۴)	شاعر کی موت اُس کی زندگی ہے	از خلیل جبران۔ مترجمہ محمد رضا انصاری	(۸۲)
(۲۵)	منظومات	کاوش۔ جاں نثار اختر۔ اجمل۔ میکش۔ علی احمد۔ شاد عارفی	(۸۳)
(۲۶)	غزلیات	شاکر میرٹھی۔ کوکب۔ فراق۔ ماہر القادری۔ تابش دہلوی	(۸۹)
(۲۷)	منقد و تبصرہ	"ش"	(۹۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

دو مہینے کی پُر آشوب علیحدگی کے بعد آج پھر ساقی سے وابستگی کی تجدید کرتا ہوں۔ ع:۔ دِگر از سرگرفتم قصّہ زلف پریشاں را۔
ایک پریشانی کا انجام دوسری پریشانی کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی انجام و آغاز سے حیاتِ انسانی عبارت ہے۔ ع:۔
زندگی کاہے کو اک خواب ہے دیوانے کا

سب سے پہلے مجھے اُن سب حضرات و خواتین کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے میری خانہ ویرانی پر میرے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا۔
ان کے بعد عزیزم انصار ناصری کا شکریہ واجب ہے کہ باوصف گوناگوں مصروفیات کے اُنہوں نے ساقی کے ادارتی فرائض بحُسن وخوبی انجام دیئے۔ مضمون نگار حضرات کی عنایت و مہربانی سے ساقی وقت کی پابندی سے شائع ہو سکا۔ اس لئے میں اِن حضرات کا بھی شکر گزار ہوں۔

اُردو کی مقبولیت کا ثبوت اُس کے مضمون نگاروں کی تعداد سے بھی ہوتا ہے۔ اُردو رسائل کو اب قلّتِ مضامین کا شکوہ نہیں ہوتا۔ ساقی کے لئے جو مضامین موصول ہوتے ہیں اُن میں کثرت اچھے مضامین کی ہوتی ہے۔ ساقی بالعموم (۹۶) صفحات کے مضامین پیش کرتا ہے۔ یہ ضخامت جملہ پسندیدہ مضامین کی اشاعت کیلئے ناکافی ہے۔ تقریباً نصف رسالہ باریک لکھوانا پڑتا ہے۔ اس پر بھی بعض اچھے مضمون چھپنے سے رہ جاتے ہیں اور مضمون نگار حضرات کی برہمیِ مزاج کا سبب بنتے ہیں۔ مُدیر کی مجبوریوں کا اُنہیں احساس نہیں ہوتا اور ہو بھی نہیں سکتا۔ ع:۔

کجا دانند حالِ ما سُبکسارانِ ساحلہا

گزشتہ دو مہینے میں اُردو کی چند بہت اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ساقی کی اِسی اشاعت میں ان پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے چند کتابوں کے ریویو ابکے شائع نہیں ہو سکے۔ آئندہ پرچے میں یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔ اُمید کہ ناشرین اس تاخیر کو معاف فرمائیں گے۔

سالنامہ ساقی کے شائع ہونے میں ابھی چار مہینے کا وقفہ ہے لیکن اس کے لئے مضامین کی فراہمی کا کام شروع ہو گیا ہے۔ اکتوبر سے لکھائی شروع ہو جائے گی۔ مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضامین بھیجنے میں تاخیر نہ فرمائیں تاکہ انتخابِ مضامین اور ترتیبِ مضامین میں مجھے آسانی رہے۔

شاہد

ہندوستان کے تعلیمی مسائل

وار دھا کی تعلیمی اسکیم

میں نے اپنے گذشتہ مضمون میں وار دھا کی مجوزہ تعلیمی اسکیم کا کچھ ذکر کیا تھا۔ لیکن ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت یعنی کانگریس تعلیم کی بنیاد قرار دینا چاہتی ہے۔ روس کے بعد غالباً ہندوستان ہی ایک ملک ہے جہاں ایک ایسا تعلیمی نظام تمام ملک کے لئے تجویز کرنے کا خیال پیدا ہوا ہے جو اس ملک کی اقتصادی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو بنانے کی تحریک مسٹر گاندھی کی جانب سے ہوئی تھی اور اس کو بنانے میں کئی صوبوں کے مدبروں کے علاوہ بہت سے تعلیم ماہروں نے حصّہ لیا ہے۔ کہ اس کو تمام صوبوں میں رائج کر دے جہاں اس کی حکومت ہے اس کو پورے ملک کے آئندہ تعلیمی نظام کی بنیاد خیال کرنا کچھ بیجا نہ ہوگا۔ مسٹر گاندھی کا اس تحریک سے جو مقصد تھا وہ جہاں تک اُن کے مضامین وغیرہ سے پتہ چلتا ہے یہ ہے کہ صحیح تعلیم کے لئے کسی دستکاری کا سکھانا ضروری ہو جس سے کچھ کمایا جا سکے۔ اور سب مضمون اس دستکاری کے ذریعے سکھائے جا سکتے ہیں۔ گویا دستکاری تعلیم کی جڑ ہوگی اور دوسرے مضامین اُسکی شاخیں اور پتّے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر دستکاری کو ٹھیک طور پر سکھایا جائے تو اس سے تعلیم کا بہت سا خرچ نکل آئے گا۔ اور صوبہ جاتی حکومتوں کے لئے مفت اور جبری تعلیم کو رائج کرنے میں بہت آسانی ہو جائیگی۔ مسٹر گاندھی کے مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو نصاب تعلیم تیار ہوا ہے اُس کی تفصیل یہ ہے کہ سات سال کا کورس ہوگا جو ہر ایک بچے کے لئے سات سال کی عمر سے شروع ہوگا اور چودھا برس کی عمر تک ختم ہو جائے گا۔ جو مضمون پڑھائے جائیں گے اُن میں سب سے اول کوئی بنیادی دستکاری ہے۔ وار دھا تعلیمی کمیٹی نے جن دستکاریوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اُن میں کتائی اور بنائی، بڑھئی کا کام، کھیتی، پھل اور ترکاریاں پیدا کرنا اور چمڑے کا کام شامل ہے۔ اِن کے علاوہ اور کوئی دستکاری بھی جو مقامی حالات کے مناسب ہو، تعلیم کی بنیاد ہو سکتی ہے۔ اگرچہ کمیٹی کا یہ خیال ہے کہ جن مدرسوں میں کتائی، بنائی یا کھیتی باڑی کے سوا کوئی اور دستکاری سکھائی جائے اُن میں بھی طلبا کو روئی دھننا، تکلی کاتنا اور کھیتی باڑی کا معمولی کام جاننا چاہیئے۔ کمیٹی اِن چیزوں کو جاننا غالباً اس لئے ضروری سمجھتی ہے کہ ان کا تعلق انسان کی دو سب سے بڑی ضروریات، خوراک اور لباس سے ہے۔ یا شاید اُن کو یہ خیال ہو کہ ہندوستان کی موجودہ اقتصادی فلاح بہت کچھ زراعت اور کپڑے بُننے کی ترویج اور اصلاح پر منحصر ہے۔ دستکاری کی تعلیم کا یہ مقصد نہیں ہوگا کہ ایسے ایسے کاریگر پیدا کئے جائیں جو صرف ہاتھ سے کام کر سکیں بلکہ اس کو بچے کی دماغی تربیت کا ذریعہ بنایا جائے گا اور دوسرے سب مضمونوں کی تعلیم کو دستکاری کی تعلیم کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا جائے گا کہ بچہ جو کام کریگا اس کے بارے میں یہ بھی جان سکے گا کہ یہ کام کیوں اور کس لئے کیا جاتا ہے۔ اِن دوسرے مضمونوں میں سب سے زیادہ ضروری مادری زبان ہے۔ جن علاقوں میں ہندوستانی بولی جاتی ہے اُن میں یہ مادری زبان ہوگی۔ معلوم نہیں کہ ہندوستانی سے وار دھا کمیٹی کا کیا مطلب ہے کیونکہ فی الحال اس قسم کی کوئی زبان موجود نہیں جو اُردو اور ہندی

دونوں سے الگ سمجھی جا سکے، گمان یہ ہوتا ہے کہ ہندوستانی سے مطلب ہندی ہے۔ لیکن کمیٹی نے یہ بات صاف کر دی ہے کہ اُن کی اسکیم کی رو سے بچوں اور اُستادوں دونوں کے لئے ناگری اور فارسی دونوں خطوں کا جاننا ضروری ہوگا۔ جن علاقوں میں کوئی اور زبان بولی جاتی ہے وہاں وہ مادری زبان ہوگی۔ لیکن ان علاقوں میں بھی پانچویں اور چھٹے درجے کے طلبا کے لئے ہندوستانی تعلیم لازمی ہوگی۔ البتہ ناگری اور فارسی دونوں میں سے صرف ایک خط چننے کا ان کو اختیار رہوگا۔ مادری زبان کی تعلیم کا جو معیار کمیٹی نے اپنے ذہن میں رکھا ہے وہ خاصہ بلند معلوم ہوتا ہے۔ اس میں معمولی نج کی خط وکتابت سے لیکر گاؤں کے عام جلسوں کی رپورٹ تک لکھنے کی قابلیت شامل ہے۔ اور سات سال کی تعلیم کے بعد بچے میں نہ صرف یہ اہلیت پیدا ہو جانی چاہیئے کہ وہ ہر چیز کے بارے میں جس سے اس کو روزمرّہ کام پڑتا ہے صاف صاف اور ٹھیک ٹھیک بات چیت کر سکے بلکہ اُس میں اسکی بھی استعداد ہونی چاہیئے کہ وہ اچھے اچھے لکھنے والوں کی کتابوں کو سمجھ سکے اور اُن کو دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکے۔ شاید یہ جتانے کی ضرورت نہیں کہ مادری زبان کی تعلیم کے اس معیار تک دُنیا کے کسی ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمیوں سے بھی کم پہونچ سکتے ہیں۔

تیسرا مضمون ریاضی ہے اور یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ جہاں تک اس مضمون کی تعلیم کا تعلق ہے طلبا کا بوجھ بہت ہلکا ہو جائے گا۔ معمولی ضرب تقسیم کے علاوہ، معمولی کسر اور کسر اعشاریہ، سود، اربعہ، پیمائش اور عملی ہندسہ کافی سمجھا جائیگا۔ لیکن ساتھ ہی بہی کھاتے کا ابتدائی کام جاننا بھی ضروری ہوگا۔ چوتھا مضمون سماج کا علم ہے۔ جس کا دائرہ بہت وسیع معلوم ہوتا ہے، اس میں تاریخ اور جغرافیہ کی عام معلومات کے علاوہ ملک کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات سے آگاہی بھی شامل ہے۔ اور اس کا سب سے ضروری مقصد یہ ہوگا کہ بچے میں قومیت کا جذبہ، وطن کی محبت اور اپنے ہموطنوں کی خدمت کا شوق پیدا ہو۔ پانچواں مضمون عام سائنس ہے جس میں آس پاس کی قدرتی چیزوں یعنی پودوں جانوروں وغیرہ کے علم کے علاوہ انسانی جسم کی ساخت اور اُس کے رکھ رکھاؤ کی تعلیم شامل ہے۔ نیز کہانیوں کے پیرائے میں بڑے بڑے سائنسدانوں اور موجدوں وغیرہ کے حالات بھی بچوں کو بتائے جائیں گے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سائنس اور سماج کا علم، دونوں کی تعلیم اس طریقے سے ہوگی کہ بُنیادی دستکاری سے اور معلومات کا تعلق بچے کے ذہن نشین ہو جائے اور علمی اور عملی تعلیم کا رابطہ ٹوٹنے نہ پائے۔ ان پانچ مضمونوں کے ساتھ ساتھ دو اور مضمون گانا اور ڈرائنگ بھی سکھائے جائیں گے اور جن بچوں کی مادری زبان ہندوستانی نہ ہوگی انکے لئے ہندوستانی آٹھواں مضمون ہو جائے گی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اُن مضامین میں جو آج کل کے مروجہ نصاب اور وار دھا کمیٹی کے مجوزہ نصاب میں مشترک ہیں معیار تعلیم وہی ہوگا جو اس وقت میٹریکیولیشن کا ہے۔ لیکن اس وقت جو تعلیم اسکولوں میں رائج ہے وہ محض کتابی اور نظری ہے۔ اور وار دھا کمیٹی نے جو نصاب تجویز کیا ہے وہ سراسر عملی ہوگا۔ ممکن ہے کہ کسی شخص کو یہ شبہ گذرے کہ سات سال کی مدت میں ان سب مضامین کی کافی تعلیم حاصل ہو جانا ایک دشوار امر ہے۔ اور چونکہ دستکاری کو تعلیم کی بُنیاد بنایا گیا ہے اس لئے بہت ممکن ہے کہ بعض اُستاد اپنی سب توجہ دستکاری پر صرف کر دیں اور دوسرے مضمون ادھورے رہ جائیں۔ اس خطرے کا کمیٹی کو بھی احساس معلوم ہوتا ہے۔ اور انہوں نے اس کے خلاف اپنی رپورٹ میں تنبیہہ کی ہے کہ طالب علموں کے لئے وار دھا اسکیم کا سب سے دلکش پہلو وہ ہے جن کا تعلق امتحانوں سے ہے۔ امتحانوں کے متعلق اکثر ماہرین تعلیم کا جو خیال ہے کہ وہ بُری چیز ہیں، مگر ان کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لیکن وار دھا اسکیم کے بنانیوالے

ان کو اٹل ضرورت سے انکار کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ امتحانوں کے مقصد کو اور طریقوں سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے مثلاً ہر حلقہ میں تعلیمی انسپکٹر کچھ چنے ہوئے بچوں کے کام کا نمونہ دیکھ کر اسکول کے کام کا اندازہ کر لیا کریں۔ (معلوم نہیں کہ ان بچوں کو کون چنے گا۔ اسکول یا خود انسپکٹر) بنیادی دستکاری میں بچوں کی قابلیت سے بھی اسکول کے کام کا اندازہ ہو سکتا ہے اور اگر ہر سال ہر ضلع کے اسکولوں کے کام کی نمائش کی جائے تو اس سے کام کا ایک اچھا معیار قائم رکھنے میں بہت مدد ملے گی وارد ھا کمیٹی نے اس نئے نظام تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے مسائل پر غور کیا ہے اور اس سلسلے میں ایک مرکزی تعلیمی بورڈ اور حسب ضرورت صوبجاتی تعلیمی بورڈوں کے قیام کی سفارش کی ہے۔ ان بورڈوں کا یہ کام ہوگا کہ ملک کے تعلیمی معاملات پر غور و فکر کرنیکے بعد مفید مشورہ دیں تعلیم کے متعلق دوسرے ملکوں سے معلومات فراہم کریں اور درسی کتابوں کی تیاری میں مدد دیں۔

یہ ہیں وارد ھا اسکیم کی زیادہ اہم خصوصیات جن کو میں نے آپ سے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ضروری سمجھا ہے، رہا یہ سوال کہ اس اسکیم کے ملک میں رائج اور کامیاب ہونے کی کہاں تک توقع ہے؟ تو ایک بات صاف ظاہر ہے کہ چونکہ کانگریس نے اسکو رواج دینے کا تہیہ کیا ہے۔ اور اس وقت ہندوستان کے کئی بڑے صوبوں میں کانگریسی حکومتیں ہیں اس لئے جہاں تک کوئی تعلیمی اسکیم حکومت کی امداد سے کامیاب ہوسکتی ہے اس کو کامیاب بنانے کیلئے ہر ایک ممکن کوششیں کی جائیں گی۔ لیکن اصلی اور آخری کامیابی کا انحصار اس کی اپنی خوبیوں پر ہے اور ان خوبیوں کا صحیح اندازہ تجربہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ میرے خیال میں اکثر لوگوں کا اس رائے پر اتفاق ہے کہ موجودہ نظام تعلیم بہت ناقص ہے اگرچہ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اس نظام تعلیم کے نکتہ چیں بھی خود اسی کے پروردہ ہیں اور جس تعلیم کی بدولت ہم اس قابل ہوئے کہ اپنے بھلے برے کو خود سوچ سمجھ سکیں وہ بالکل ناقص نہیں ہو سکتی۔ اس میں وارد ھا اسکیم کے بانی ایک بہت بڑا نقص یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ بچوں کی قوت عمل کو کمزور کرتی ہے اور بیکاری کو بڑھاتی ہے۔ جہاں تک بیکاری کا سوال ہے کسی خاص طریقۂ تعلیم کو اس کا تنہا ذمہ دار ٹھہرانا صحیح نہیں معلوم ہوتا اس کے بہت سے سیاسی اور اقتصادی اسباب ہیں جو طریقۂ تعلیم کے بدل جانے سے محو نہیں ہو سکتے اور اگر پڑھے لکھے نوجوان دستکاریوں کو عار سمجھتے ہیں تو اس میں ہماری ملکی روایات کو بھی کچھ دخل ہے جہاں ہاتھ سے کام کرنے والوں کو بعض اور جماعتوں کے مقابلہ میں ہمیشہ ادنیٰ خیال کیا گیا ہے۔ بہرحال وارد ھا اسکیم کوئی نئی چیز نہیں کیونکہ دنیا کے اور بہت سے ملکوں میں تعلیم کو عملی بنانے کا خیال پہلے سے موجود ہے۔ اگر اس میں کوئی جدت ہے تو یہ ہے کہ مسٹر گاندھی کے خیال میں اس قسم کی تعلیم اپنا خرچ خود نکال سکتی ہے۔ لیکن ان کے ماہرین تعلیم اس خیال سے متفق نہیں معلوم ہوتے وہ زیادہ سے زیادہ یہ امید دلاتے ہیں کہ خرچ کا کچھ حصہ آمدنی سے پورا ہو جائے گا لیکن وہ بھی اس صورت میں کہ اسکولوں کی دستکاری کی پیداوار کو گورنمنٹ خود خریدنے پر تیار ہو تعلیمی پہلو سے مجوزہ نصاب کے خلاف اور بھی بعض اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ پڑھائی کے اوقات میں ۵½ گھنٹے میں سے ۳ گھنٹے ۲۰ منٹ دستکاری کے لئے ہونگے۔ اور صرف ۲ گھنٹے دس منٹ، باقی چھ سات مضامین کے لئے اس وقت ابتدائی تعلیم کی مدت عموماً چار پانچ سال ہوتی ہے اور روزانہ پانچ گھنٹے معمولی لکھنا پڑھنا اور حساب وغیرہ کو دئے جاتے ہیں تو بھی بچے اپنا کورس ختم کرنے کے بعد ان مضمونوں کو اچھی طرح نہیں جانتے اس لئے کیونکر یقین ہو سکتا ہے کہ سات سال کی تعلیم کے بعد اور وقت کا زیادہ حصہ دستکاری میں صرف کرنے کے باوجود بچوں کو ان سب مضمونوں سے بقدر ضرورت واقفیت حاصل ہو جائیگی۔

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ اسکیم میں سات سال سے کم عمر کے بچوں کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا۔ ان سب اعتراضوں کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ صحیح رائے قائم کرنے کا موقع تجربہ کے بعد ہو سکتا ہے اور کانگرسی حکومتوں کا یہ ارادہ ہے کہ فی الحال اس نظامِ تعلیم کی آزمائش چند منتخب دیہاتی حلقوں میں کی جائے اور دیکھا جائے کہ اُس کے کیا نتائج ہوتے ہیں۔ کسی تعلیمی نظام کی کامیابی کا مدار بہت کچھ معلموں کی قابلیت پر بھی ہے اور اس لئے نئے قسم کے اُستادوں کی ضرورت ہے۔ کمیٹی نے اِن اُستادوں کے لئے بھی ایک کورس تجویز کیا ہے، جس کی مُدّت تین سال رکھی ہے لیکن چونکہ جدید طریقۂ تعلیم کو جلدی رواج دینا منظور ہے اس لئے بعض صوبجاتی حکومتوں کا شاید یہ خیال ہے کہ ابتدا میں صرف چند مہینے کی ٹریننگ مُعلّموں کے لئے کافی ہوگی۔ اگرچہ محض تعلیم کی اصلاح کے خیال سے ایسے کاموں کو جلدی کی وجہ سے ادھورا چھوڑ دینا شاید بُرا سمجھا جائے لیکن سیاسی مصلحت غالباً یہی ہے کہ جو کام شروع کرنا ہے اُسے جلدی شروع کر دیا جائے۔

مرزا محمد سعید

تخیّلات

اب تلک جو کچھ بھی سمجھا تھا۔ اگر سمجھا تھا میں!
دل کی دُنیا کو بہ آئینِ دگر سمجھا تھا میں

لذتِ فرقت ہی سرمایہ ہے سوز و ساز کا
وصل کو غلطی سے اُلفت کا ثمر سمجھا تھا میں

یہ تو ہر قطرے سے خونِ دل کے تھا میری عیاں
حُسن کے جلوے کو جادوئے نظر سمجھا تھا میں

دل اسیرِ رنگ و بُو تھا۔ وائے نادانی مری!
عشق کی دولت سے خود کو بہرہ ور سمجھا تھا میں

کھُل گئی ساری حقیقت ادّعائے دید کی
کم نگاہی کو ہی نیروئے نظر سمجھا تھا میں

طول کھینچا اُس نے فردائے قیامت سے نہ کم
زندگی کو تو بس اک رقصِ شرر سمجھا تھا میں

مختلف عشوے ہیں دونوں حُسنِ مطلق کے، مگر
اب تلک کچھ بھی نہ ربطِ خیر و شر سمجھا تھا میں

یہ تو ہے پھیلا ہوا روزِ ازل سے تا ابد،
اپنے افسانے کو کتنا مختصر سمجھا تھا میں

زندگی کی راہ تو ہے اس کے آگے تک کہیں
موت ہی کو آخری حدِّ سفر سمجھا تھا میں

عشق کو ہمراہ لیکر جادہ پیمائی عشق
راہزن کو ہائے کیونکر راہبر سمجھا تھا میں؟

اُس کا دل تھا سربسر اک لالہ زارِ آرزو،
مظہرِ بدنام کو خونیں جگر سمجھا تھا میں!

مظہر غزنوی اسیر

حقائق

غم سے آزاد بھی تو رہ نہ سکا!
وقفِ فریاد بھی تو رہ نہ سکا!
دھوپ چھاؤں تھی اک تحیر ایسے
اور کچھ یاد بھی تو رہ نہ سکا!

راحتیں سازگار رہ نہ سکیں!
کلفتیں غمگسار رہ نہ سکیں!
کیا خزاں کیا بہار دونوں ہی
باغ میں استوار رہ نہ سکیں!

رنج و راحت کا سلسلہ ہے حیات
رات میں دن ہے اور دن میں ہے رات
منہ سے کڑوا کبھی، کبھی میٹھا
کھاتے جاتے ہیں حنظل اور نبات

رنج اٹھائے ہیں راحتوں کے لئے
راحتیں ہیں قباحتوں کے لئے
حالتِ رنج ہو کہ راحت ہو
جان آئیں ہے جراحتوں کے لیے

امینِ حزیں

آجا سجنی میرے پاس
تجھ بن ہے کُل دہر اُداس

دل کی تمنّا تو تُو ہے
میرا سہارا تو تُو ہے
تجھ بن ہے کُل دہر اُداس
آجا سجنی میرے پاس

توڑ نہ میرے دل کی آس
آجا سجنی میرے پاس
دل کو تو مٹ جانا ہے
تجھ کو کہاں اب پانا ہے

تُجھ بن ہے آرام کہاں
میری دُنیا ہے گریاں
دل کی کیا نکلے گی بھڑاس
آجا سجنی میرے پاس

رہتا ہوں دن رات اُداس
آجا سجنی میرے پاس
پریم نے تن من لُوٹ لیا
پریم نے جیون لُوٹ لیا

یوں ہیں جہاں میں لاکھ حسیں
لیکن تجھ سا ایک نہیں
پریم نہ اب تک آیا راس
آجا سجنی میرے پاس

تیری سی کب ہے بُو باس ؟
آجا سجنی میرے پاس
کیا کہوں اے بہزاد حزیں
غم نے کیا مجھکو غمگیں

رات میں وُہ انداز نہیں
دن میں وُہ سوز و ساز نہیں
غم نے کیا ہے جیون ناس
آجا سجنی میرے پاس

بہزاد لکھنوی

اوشیمہ

پانچ چھ سال پہلے اوشیمہ ایک چھوٹے سے جزیرے کی حیثیت رکھتا تھا جس میں کوہِ مہارا کا جیتا جاگتا آتش فشاں جلتا رہتا تھا کچھ زیادہ مشہور نہ تھا۔ لوگ دوسری سیر گاہوں کی طرح وہاں کا رُخ کم کرتے تھے۔ سنہ ۳۳ء میں ٹوکیو کے ایک ثانوی مدرسے کی طالبہ نے جوالا مکھی میں کُود کر اُس کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔ اخبارات نے خُوب رنگ آمیزی سے اُس کی داستانِ خودکشی بیان کی۔ پھر کیا تھا خلقت ٹوٹ پڑی۔ مہارا یامہ خودکشی کرنے والوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اور اوشیمہ نے ایک مشہور سیرگاہ کی حیثیت اختیار کرلی۔ پہلے سال بھر میں کوئی تیس چالیس آدمی جوالا مکھی میں کُود کر جان دیتے تھے۔ مگر پچھلے سال میں ایک ہزار آدمی اِس راستے سے سفرِ آخرت پر روانہ ہو چکے ہیں۔ اس سے اوشیمہ کی شُہرت بہت بڑھ گئی ہے۔ لوگ بارہ مہینے سیر کو جاتے ہیں۔ موسمِ بہار و خزاں میں سیّاحوں کا اژدہام ہوتا ہے۔

کوہِ مہارا دیکھنے کا ہمیں عرصے سے اشتیاق تھا۔ آخر عزمِ سفر مصمم کر کے گرمی میں روانہ ہو گئے۔ اوشیمہ کافی دُور ہے۔ ٹوکیو سے آٹھ گھنٹے کا راستہ ہے۔ ایک چھوٹا سا دو ہزار ٹن کا جہاز روزانہ ٹوکیو سے روانہ ہوتا ہے۔ ہم نے دن کو جاپان ٹورسٹ بیورو سے ٹکٹ لے لئے تھے۔ رات کو پونے دس بجے جہاز پر پہونچ گئے۔ بندرگاہ پر جمِ غفیر تھا۔ لوگ صرف چوبیس گھنٹے کے سفر پر جا رہے تھے، مگر پہونچانے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ روانگی کا منظر بڑا پُر لطف تھا۔ بندرگاہ برقی قمقموں سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ جہاز پر مُسافر اور بندرگاہ پر اُن کے احباب کاغذ کی پٹیاں تھامے کھڑے تھے۔ رنگین کاغذ کی پٹیوں کی چکتیاں وہیں دکانوں پر بہت ملتی ہیں۔ پٹی کا ایک سرا ایک آدمی پکڑ لیتا ہے اور چکتی دوسرے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جہاز چلتا ہے تو چکتی کُھلتی جاتی ہے۔ جہاز اور بندرگاہ کے درمیان رنگین جھالر کی چادر تن جاتی ہے جو جہاز کے چلتے وقت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ہمارے ایک جاپانی دوست بھی چکتی خرید لائے تھے اور اس کا سِرا ہمیں دیدیا۔ ٹھیک دس بجے جہاز نے لنگر اُٹھایا اور چکتیاں پھرنی شروع ہوئیں۔ جب تک جہاز مُڑا ہماری پٹی سلامت رہی۔ بعض کی پٹیاں پہلے ہی ٹوٹ گئیں یا ہاتھ سے چھوٹ گئی تھیں، جو بُرا شگون مانا جاتا ہے۔

جہاز کے دو ڈک مُسافروں کے لئے مخصوص ہیں۔ ان کے نیچے رسٹارنٹ ہے جہاں سب لڑکیاں کام کرتی ہیں۔ مسافروں کے آرام کی نگہداشت پر بھی لڑکیاں مامور ہیں۔ اُوپر کے ڈک پر چند کیبنیں بھی ہیں مگر زیادہ تر ڈک کے مُسافر ہوتے ہیں۔ ڈک پر تتامیوں کا فرش ہے۔ وہیں لیٹ جاتے ہیں۔ جو پچاس سین زیادہ دیں انہیں کوچ پر سونے کو جگہ مل جاتی ہے۔ کمبل اور تکیے بھی کرایہ پر مل جاتے ہیں۔ ڈک کا کرایہ دو این ہے اور کیبن کا پانچ این۔ کیبن میں تخلیہ تو مل جاتا ہے مگر سونا مشکل ہے جس کا ہمیں ذاتی تجربہ حاصل ہوا۔ مسافر عمومًا رت جگا کرتے ہیں۔ گانا بجانا تو ہوتا نہیں لوگ آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہتے ہیں یا کچھ کھیل خاموشی سے کھیلتے ہیں۔ مگر چلنے پھرنے کی آواز نیند اُڑانے کیلئے کافی ہوتی ہے۔

رات کو مطلع صاف تھا مگر اندھیری رات تھی۔ کوئی گھنٹہ بھر تک ٹوکیو اور یوکوہامہ کی روشنی کا نظارہ دیکھتے رہے۔ جب چار پوں

طرف بھیانک تاریکی چھاگئی تو کیبن کا رُخ کیا۔ صبح کے چار بجے جہاز نے موتومرا کی بندرگاہ میں لنگر ڈالا۔ چھوٹی سی بندرگاہ ہے۔ جہاز کنارے تک نہیں پہونچ سکتا۔ بیچ سمندر میں کھڑا تھا۔ یہاں سے موٹر لانچ میں بیٹھکر کنارے پہونچے۔ جہاز ہمیں اُتار کر آگے روانہ ہوا۔ یہی جہاز تین بجے سہپر کو واپس آتا ہے اور توکیو کے مُسافروں کو سوار کرکے لے جاتا ہے۔ رات کو نو بجے وہاں پہونچا دیتا ہے۔

بندرگاہ کے باہر نکلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام قصبے والے جاگ اُٹھے ہیں۔ سراؤں کے ایجنٹ قطار باندھے کھڑے تھے۔ ہم نے ایک سرائے کا انتخاب کیا جو سمندر کے رُخ پر واقع تھی۔ یہاں پہونچتے ہی ہم نے دو گھوڑوں کی فرمائش کی۔ ہمیں علم تھا کہ اس میں دیر کی تو سب گھوڑے رُک جائیں گے اور سواری کے لئے صرف گدھے ملیں گے۔ کچھ دیر آرام کرکے ناشتہ کیا۔ اتنے میں گھوڑے آگئے اور ہم مہارایامہ کی جانب روانہ ہوئے۔ مسز بر لاس کو اس سواری میں کافی دقت ہوئی۔ راستہ ہموار ہوتا تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ وہاں تو چڑھائی ہی چڑھائی تھی۔

اوشیمہ میں ہریاول بہت ہے، ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ دُور سے سمندر میں نگینہ جڑا ہوا معلوم ہوتا ہی۔ اینوشیمہ کا جزیرہ بھی اس لحاظ سے بہت خوبصورت ہی۔ وہ گول نگینہ ہے تو اوشیمہ لمبوترا۔ پرندے ہر طرف چہچہاتے ہیں۔ توکیو میں آمدورفت کا شور و غل بہت ہوتا ہے اور پرندے نام کو نہیں نظر آتے۔ یہاں جنگل کا سناٹا ہے۔ طرح طرح کے پرندوں کی بولیاں بہت بھلی لگتی ہیں۔

اوشیمہ تین باتوں کیلئے مشہور ہے۔ اوّل مہارا کا آتش فشاں پہاڑ۔ اس میں سے ہمیشہ گندھک کا دُھواں نکلتا رہتا ہے۔ اس قدر کثیف ہوتا ہے کہ اندر کی آگ نظر نہیں آتی۔ البتہ رات کو دہکتے ہوئے پتھروں کی سُرخی جھلک دکھا دیتی ہے۔ یہیں لوگ زندگی کی نااُمیدیوں سے تنگ آکر آخرت کے سُکون کی طرف رُجوع کرتے ہیں؛ دوئم حسینانِ اوشیمہ کا بانکپن اور اُن کے لمبے لمبے بال۔ جاپانی عورت کے بال قدرتاً سیاہ اور لمبے ہوتے ہیں۔ کولھے تک کے بال بالکل عام ہیں۔ بہت سی عورتوں کے بال رانوں تک پہونچتے ہیں۔ مگر اوشیمہ کی عورت تمام جاپان کو مات کرتی ہی۔ اُسکے بال ٹخنوں تک پہونچتے ہیں۔ بعض اوقات اُس کے قد سے گزر جاتے ہیں۔ پھر یہ بالوں کا سنگھار اس انداز سے کرتی ہی کہ بائیں کان پر ایک گُچھا نکل آتا ہی اور عجیب بانکی ادا پیدا ہو جاتی ہے۔ اِن بالوں پر رومال کی نرالی بندش بانکپن میں بے انتہا اضافہ کردیتی ہے۔ حسینانِ توکیو اسکی بانکی ادا پر رشک کرتی ہیں مگر بانکا رومال باندھنا اُنکے بس کی بات نہیں۔

سوئم سُباکی کا تیل ہے۔ سُباکی کا درخت نارنگی سے کچھ بڑا ہوتا ہے اور اُس میں گلاب جیسا پھول آتا ہے۔ پھول کے بعد اُس میں بیر کے برابر پھل لگتا ہے جو تمامتر گری پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس گری کا تیل نکالتے ہیں۔ اوشیمہ میں سُباکی کی کاشت بہت ہوتی ہی۔ تیل نکالنے کے کارخانے بھی بہت ہیں۔ اس تیل سے بال بڑھتے ہیں۔ عورتیں ہمیشہ اوشیمہ کے تیل کی فرمائش کرتی ہیں۔ یہاں سب سے زیادہ بکری اِسی کی ہے۔ جگہ جگہ دُکانیں ہیں۔ سربند شیشیوں میں تیل بکتا ہے۔ اینوشیمہ اور اوشیمہ کے دُکانداروں میں ایک بات کا بڑا فرق ہے۔ اینوشیمہ کی دکاندار لڑکیاں سیاحوں کے سر ہو جاتی ہیں کہ کچھ سوغات خریدئے۔ اس اصرار سے سیر بھی کرکری ہو جاتی ہے۔ یہاں اوشیمہ میں یہ بات نہیں۔ چاہے خریدئے چاہے نہ خریدئیے لڑکیاں بالکل نہیں ستاتیں۔

کوہ مہارا پر چڑھنے کے دو راستے ہیں۔ ایک موتومرا سے جو ہم نے اختیار کیا۔ دوسرا پہاڑ کے دوسری جانب ہے۔ سیاح

موٹو مرا سے بسوں میں بیٹھکر اُدھر جاتے ہیں۔ وہ راستہ سنسان ہے، پہاڑ پر چڑھنے والوں کے لئے راستے میں کوئی تفریح گاہ نہیں۔ البتہ اُترتے وقت ایک سنسنی خیز پھسلنے کا طریقہ ہے۔ ڈھال پر لوہے کی پٹڑیاں ڈال کر اُن پر ٹھیلے چلاتے جاتے ہیں۔ پھسلنے ٹھیلے اپنے آپ ڈھال پر پھسلتے چلے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پھسلنی دُنیا بھر میں سب سے طویل ہے۔

ہم نے پہلا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس راستے میں جگہ جگہ چائے خانے ہیں جہاں تھوڑی دیر آرام کر سکتے ہیں۔ ہر چائے خانے میں مُہریں موجود ہیں۔ سیّاح اپنی کتابوں میں مُہریں لگواتے ہیں۔ جاپانی مُہریں جمع کرنے کے بڑے شوقین ہیں۔ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے ہر مندر، ہر درگاہ، ہر سیرگاہ کا رسٹارنٹ، ہر ہوٹل، حتیٰ کہ ہر ریلوے اسٹیشن مُہریں رکھتا ہے۔ جاتری کچھ پیسے دے کر جگہ جگہ کی مُہریں جمع کرتے پھرتے ہیں۔ جہاں اور کوئی مقام موجود نہ ہو وہاں ڈاکخانہ مُہر لگا دیتا ہے۔ جاتریوں کے پاس کئی کئی کتابیں بھر جاتی ہیں۔ یہ سیر و سیاحت کی یادگار رہے۔ لوگ اس شغل سے مالی فائدہ بھی اُٹھاتے ہیں۔ مُہروں کا مجموعہ معقول رقم لے کر فروخت کر دیتے ہیں۔ مُہروں کے علاوہ ہر سیرگاہ میں وہاں کے مناظر و عمارات کے مصوّر کارڈ بھی فروخت ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان چائے خانوں میں دونوں اشیا موجود ہیں۔ ہم نے پانچویں چائے خانے میں قیام کیا۔ یہ وسط میں واقع ہے اور سب سے بڑا ہے۔ بانکی حسینانِ اوشیمہ چائے اور فواکہات پیش کرتی ہیں۔ یہ سیّاحوں کی تفریح کیلئے اوشیمہ کے گیت بھی سُناتی ہیں مگر کوئی معاوضہ نہیں لیتیں۔ ایک گیت بہت مشہور ہے جو زبان زدِ عام ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:-

میں اوشیمہ ہوں،
میں وہی دیوتائی آگ کا جزیرہ ہوں،
میرے دل میں آگ سُلگ رہی ہے۔
یہ کیا بجھنے والی ہے؟

یہاں سے چل کر پہاڑ کی چوٹی پر پہونچے۔ ہمیں خیال تھا کہ منزلِ مقصود آپہونچی۔ مگر ہمارا یامہ کے تین پیالے ہیں اور یہ سب سے بیرونی پیالے کا کنارہ ہے۔ اس کا قطر کوئی چار میل ہوگا۔ کسی زمانے میں یہ بڑا وسیع آتش فشاں تھا۔ اب سُکڑتے سُکڑتے بہت چھوٹا رہ گیا ہے۔ تیسرے اور دوسرے پیالے کے درمیان لاوے کا ریگستان ہے جو ڈیڑھ میل چوڑا ہوگا۔ پیدل چلنے والوں کے لئے یہی سب سے کٹھن منزل ہے۔ اس منزل کو طے کرنے کے لئے منچوکو کے دو کوہان والے اُونٹ مُہیا ہیں۔ کجاوے میں چار آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ اُونٹوں کو جلد باز انسان کی نفسیات کا کچھ تجربہ ہو گیا ہے جبھی اس قدر سُست چلتے ہیں کہ آدمی اُکتا کر پیدل چلنا گوارا کرتا ہے۔ ہم نے یہ منزل گھوڑوں پر طے کی۔ آخر اُنہوں نے دوسرے پیالے کے کنارے آتار دیا۔ تیسرے پیالے کا اندرونی علاقہ بالکل بنجر ہے۔ کہیں سبزے کا نام نہیں۔ اُونٹوں کا چارہ بھی نیچے سے آتا ہے۔ دوسرے پیالے کا کنارہ سنگلاخ ہے۔ لاوے کے کُھکیلے اور تیز دھار پتھر ہیں جن پر چلنا بڑا دشوار ہے۔ کنارے کے اُوپر چڑھنے پر دسویں چائے خانے میں پہونچے جو آخری ہے۔ یہاں سے آتش فشاں کا اندرونی پیالہ صاف دکھائی دیتا ہے جو کچھ نشیب میں واقع ہے۔ بڑا بھیانک منظر ہے۔ چاروں طرف سیاہ اور بھُورے پتھر، بیچ میں دھوئیں کا غبار۔

یہاں سے اُتر کر مرکزی پیالے پر پہونچے۔ اسی کے کنارے سے بیزارگانِ دنیا ایک چھلانگ مار کر دُنیا سے رخصت

ہوتے ہیں۔ یہاں پولیس نے خاردار تاروں کا کٹہرا لگا رکھا ہے۔ گندھک کے دھوئیں میں ایسی تیزی ہے کہ لوہا تھوڑے ہی عرصہ میں گل کر بھر بھرا ہوجاتا ہے اور ذرا سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتا ہے۔ عاشقانِ موت اس کٹہرے کی پروا نہیں کرتے۔ بعض تو اتنے دلیر ہوتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے کود پڑتے ہیں۔ اور وہ چلّاتے رہ جاتے ہیں۔ پیالہ دھوئیں سے اس قدر لبریز رہتا ہے کہ اندر سے کچھ دکھائی نہیں دیتا اور اس کی گہرائی کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے کوہِ آسامہ کا پیالہ بھی دیکھا ہے۔ وہ اس سے کچھ چھوٹا ہی ہے۔ مگر دھواں اتنا کثیف نہیں۔ وہاں ہوا کے جھکڑ سے دھواں اڑ جاتا ہے تو اندر کا فوٹو لیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ ممکن نہیں۔ پھر بھی کوہِ آسامہ اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہاں آئے دن آتش باری ہوتی رہتی ہے۔ کوہِ آسامہ پر چڑھنے والوں کو کبھی کبھی زلزلے کے جھٹکے بھی محسوس ہوتے ہیں اور گرج کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی چوٹی پر زیادہ دیر نہیں ٹھہرتے کہ کیا معلوم کب آتش فشانی ہونے لگے۔ یہارا یامہ پر یہ خطرات نہیں۔ یہ زیادہ بلند نہیں۔ اس کی چڑھائی پر اتنی تکان بھی نہیں ہوتی اور یہاں گھوڑے، گدھے، اونٹ سب دستیاب ہوجاتے ہیں۔ وہاں خطرات کی وجہ سے جانور اوپر نہیں لے جاتے۔ یہاں ہم نے اپنی کتاب پر آخری مُہر لگوائی۔ دکان سے یہارا کی سوغات یعنی لاوے کے چند پتھر لئے اور واپس ہوئے۔

پرستارانِ اجل کے ساتھ کبھی کبھی عجیب واقعات پیش آتے ہیں اور وہ موت کے منہ میں کود کر باہر نکل آتے ہیں۔ کوئی شخص پیالے میں کودا اور اس کی تہ میں پہونچنے سے پہلے کسی چٹان پر اٹک کر رہ گیا۔ یہاں اس کی عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ بدن کی چوٹ اور گندھک کے دھوئیں میں تنفس کی تکلیف اس کے ارادے میں تزلزل پیدا کر دیتی ہے اور وہ موت کے خیال سے ڈر کر چلّا اٹھتا ہے۔ وہیں سے دہائی دیتا ہے۔ باہر کے لوگ فریاد سُنکر مدد کو آپہونچتے ہیں۔ رسّیاں ڈال کر اسے باہر نکال لیتے ہیں۔ پھر یہ آدمی مرنے سے توبہ کرلیتا ہے۔ بعض لوگوں کی ہمّت پیالے کے کنارے پہونچکر جواب دے دیتی ہے اور وہ بادل ناخواستہ واپس آجاتے ہیں۔ پچھلے سال ایک لڑکی خودکشی کرنے نکلی۔ اس کی ایک ہجولی ساتھ تھی جو اس کی ہمراہی میں دنیا سے رخصت ہونا چاہتی تھی۔ پیالے پر پہونچکر ہجولی تو کود پڑی۔ مگر اس کی ہمت نہ ہوئی۔ گھر واپس گئی، اپنی کمزوری پر بہت پچھتائی۔ پھر ہمت کی۔ دوسری ہجولی کو ساتھ مرنے پر آمادہ کیا۔ دونوں خوشی خوشی روانہ ہوئیں۔ پیالے کے کنارے پر پھر خوف غالب آگیا۔ مگر ہجولی صادق نکلی اور جاں بحق ہوئی۔ اس مرتبہ اخباروں میں اس کا بہت چرچا ہوا۔ تیسری بار پھر ایک موت کی خواہاں ہجولی مل گئی۔ اس مرتبہ زندگی کی مایوسیوں سے کچھ ایسی تنگ آگئی تھی کہ کوئی خوف اُسے نہ روک سکا۔

جاپان میں چشموں کی کثرت ہے اور ندیاں لہراتی بل کھاتی ہر جگہ بہتی نظر آتی ہیں۔ مگر اوشیما ان نعمتوں سے محروم ہے۔ آگ کا دیوتا پانی کے دیوتا کو قدم نہیں جمانے دیتا۔ بارش صرف سبزے کی پیاس بجھانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ لوگ کھپریلوں کا پانی جمع کرلیتے ہیں۔ تمام موضع موتومرا میں صرف ایک چشمہ ہے جہاں سے لوگ پانی بھرتے ہیں۔ یہاں کی عورتیں عام جاپانی عورتوں کے دستور کے خلاف سر پر بوجھ اٹھاتی ہیں۔ کنوئیں پر ہر وقت مجمع رہتا ہے۔ چوبی بالٹیوں میں پانی بھر بھر کر سر پر رکھ کر لے جاتی ہیں۔

عام دستور کے خلاف اوشیمہ کی عورتیں اپنی اوبی آگے باندھتی ہیں۔ سامنے کی اوبی خوبصورتی اور بندش میں پیٹھ کی اوبی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ مگر ان کے سنگھار میں سب سے زیادہ دل لبھانے والی بات ان کے آڑے بال اور رومال کی بانکی بندش ہے جو سیاحوں کا دل مسخر کئے بغیر نہیں رہتی۔

کوئی گیارہ بجے ہم واپس سرائے میں پہونچ گئے۔ کھانا کھایا اور جہاز کی تیاری کی۔ ہم نے جزیرہ نما ایذو میں شہر اتیتو میں چند روز قیام کرنے کا پروگرام پہلے سے تیار کرلیا تھا جہاں کے گرم چشموں سے ہم مستفید ہونا چاہتے تھے۔ اس لئے ہمیں بارہ بجے جہاز سے روانہ ہونا پڑا۔ اوشیمہ آنے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ یہ بڑا خوشگوار مقام ہے۔ کم از کم ایک دن رات یہاں بسر کرکے مزید لطف اٹھانا چاہیئے تھا۔

نور الحسن برلاس (جاپان)

کلامِ احسن

کہاں یہ ہوش جو کچھ دیکھتے بیاباں میں
روان دواں رہے ہم منزلِ گریباں میں

جنوں زدوں کو ملا آکے کیا بیاباں میں
پھنسے ہیں مرحلہ دامن و گریباں میں

ترے خیال نے پہونچا دیا گلستاں میں
بہار خود چمن آرا ہے میرے داماں میں،

یہ کیا ارادہ کیا ناوکِ نگہ نے ترے
قیامتیں جو بپا ہوگئیں رگِ جاں میں

کرم کو چارہ گروزحمتیں نہ دو اپنے
پھنساتے ہو مجھے کیوں فتنہ ہائے درماں میں

کریں وہ منع محبت سے ہم نہ مانیں گے
یہ کفر وہ ہے ترقی ہو جس سے ایماں میں

دوانہ نغمۂ زنجیر پر ہے رقص کناں
بہار آئی ہے اب کے بہارِ زنداں میں

ہمارے زخموں کو دو اذنِ لطف اندوزی
وہ کیا مزے جو مقید رہیں نمکداں میں

وہ جن سے روح پر اک وجد ہوگیا طاری
نہ جانے دل میں یہ اسرار تھے کہ پیکاں میں

احسن بلگرامی

باغی

پلونہ کی خونیں جنگ

یہ جنگ روس و روم ۱۸۷۷ء کا ذکر ہے۔

روسیوں نے یکایک محض ذرا سے بہانے پر ٹرکی پر فوج کشی کر دی۔ نہ صرف یورپ بلکہ ایشیا میں کوہ قاف کی طرف سے بھی حملہ کر دیا۔ اِس فوج کشی کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ زار روس نے کم و بیش گیارہ لاکھ فوج میدانِ جنگ میں پہونچا دی تھی۔

یورپ میں رُوسی دریائے ڈینیوب کو عبور کر آئے اور جو کچھ بھی افواج ڈبروجا اور رومانیہ کے اطراف سے مہیا ہو سکیں ترکی جنرل ان افواج کو لیکر جھپٹتا ہوا آگے بڑھا۔ اتنے میں کچھ افواج رومیلیا وغیرہ کی طرف سے اور آگئیں اور ترکی جنرل نے اپنی فوج رُوسیوں سے ملا دی۔

کئی شبانہ روز مسلسل جنگ رہی۔ جنگ بھی ایسی خونخوار کہ الامان۔ مگر ترکی جنرل نے پورے محاذ پر روسیوں کو زبردست شکست دی۔ ایسی کہ اُن کا لشکر کا لشکر دھر کے دریا میں لوٹ دیا۔ رُوسیوں کیلئے یہ شکست اِس وجہ سے اور بھی ذلت آمیز تھی کہ ترکی فوجیں تعداد میں آدھی بھی نہ تھیں۔ اور رُوسی افواج کی آمد کا سلسلہ چونکہ برابر جاری تھا لہذا ترکی جنرل افواج کی قلّت کے سبب ہزیمت خوردہ رُوسیوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور اُس نے صدر مقام کو امدادی افواج کیلئے لکھا اور اس کا منتظر ہی تھا کہ امدادی فوج آجائے تو رُوسیوں کا تعاقب کر کے اُن کے علاقے میں گھسکر اُن کو مارے۔

(۲)

بخارسٹ دار الخلافہ رومانیہ سلطانی فتح پر خوشیاں منا رہا تھا۔ ہز ہائنس شاہ رومانیہ[1] سلطان ٹرکی کی ادنیٰ اور وفادار رعایا ہونے کے سبب ضرورت سے زیادہ خوش تھے۔

شاہ کے محل پر شام کو عجیب سین تھا۔ سبزہ پر ایک طرف شاہی بینڈ "بادشاہم چوق یشا"[2] (God save the King) کی گت بجا رہا تھا تو دوسری طرف البانی اپنے قومی باجوں سے نغز نوائی کر رہے تھے۔ سامنے کردستان کے پہاڑی جنگجو اپنے پہاڑی لباس میں جنگی ناچ ناچ رہے تھے اور معزز مہمانوں کے وسط میں نوعمر خواتین کا رقص قابل دید تھا۔ ہر قسم کے فواکہات شرابیں اور مٹھائیاں تقسیم ہو رہی تھیں۔ غرض عجیب دلفریب سماں تھا۔

ہز ہائنس شاہ رومانیہ نے جلسہ کے اختتام پر سلطان المعظم کا جامِ صحت تجویز کیا اور ایک مختصر تقریر کی جس میں اپنی وفاداری اور جاں نثاری کا یقین دلاتے ہوئے سلطان المعظم کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش کیا اور موجودہ فتح پر خداوند تعالیٰ کا شکریہ ادا

---

* مورخ اسلام علامہ شبلی۔ سفرنامہ۔ [1] رومانیہ، بلغاریہ، سرویا وغیرہ سب ترکی کے زیر نگیں تھے۔
* [2] خدا ہمارے بادشاہ کو سلامت رکھے۔ ترکوں کا قومی گیت۔

کرتے ہوئے سلطانی سفیر سے درخواست کی کہ میرا یہ پیغام حضور تلطیبریؔ کی خدمت میں پہونچا دیا جائے اور ہز امپیریل میجسٹی کو میری وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے عرض کر دیا جائے کہ میں اور میری رعایا اور میری فوج بلکہ پوری رومانوی قوم ایک ادنیٰ خادم کی طرح ہر وقت خدمت کیلئے تیار ہیں۔ یہ جلسہ بادشاہم چوقِ یشاہ کے فلک شگاف نعروں پر ختم ہوا۔

رات کا منظر بھی عجیب تھا۔ شہر میں چراغاں ہو رہا تھا۔ مسجدوں اور گرجاؤں میں نمازِ شکرانہ ادا کی جارہی تھی اور ہز امپیریل میجسٹی کی فتح کے لئے دعا کی جارہی تھی۔

(۳)

زارِ روس نے جب سنا کہ روسی افواج نہایت ہی ذلت آمیز شکست کھا گئیں تو مارے غصہ کے آگ ہوگیا اور دوگنی افواج بطور کمک ارسال کیں۔ روسی جنرل بھی افواج قاہرہ لیکر بدلا لینے اور کلنک کا ٹیکہ مٹانے ہمت کر کے آگے بڑھا۔ اور شاہِ رومانیہ بھی سلطان سے بغاوت کر کے روسیوں سے جاملا۔ ترکی جنرل امداد کیلئے پیغام پر پیغام بھیج رہا تھا مگر فوجیں آج آتی ہیں نہ کل۔ دراصل ٹرکش گورنمنٹ جنگ کیلئے قطعی تیار نہ تھی۔ دیر لگی اور بہت دیر۔ بمشکل تھوڑی سی فوج آئی لیکن روسیوں نے بڑے وسیع پیمانے پر اور طویل محاذ پر جنگ کا آغاز کیا کہ ترکی جنرل کو اپنی فوج کو دو ٹکڑے کرنا پڑا۔ روسیوں اور رومانیوں کا ٹڈی دل سا امنڈ آیا۔ ایسا کہ جنگ ناممکن اور محاذ جنگ اس قدر طویل کہ ساری ترکی فوج ایک صف میں کھڑی کی جائے تب بھی کافی نہ ہو۔ اس عظیم الشان سیلاب سے بچنا ہی کمال تھا۔ لہذا ترکی جنرل نے بادلِ ناخواستہ اپنی پوزیشن چھوڑی اور جنگ کرنے کے بجائے جنگ سے گریز کرتا سنبھلتا پیچھے ہٹا۔ مگر تو بہ کیجئے۔ وہ تو ایک سیلاب تھا۔ ترکی فوج کو ایک طرف چھوڑ کر اس روسی سیلاب نے سلطنت عثمانیہ میں بے تحاشہ بڑھنا شروع کیا۔

ترکی جنرل اب بھی سر پیٹ رہا تھا کہ امدادی فوج نہیں آتی۔ اور نہیں آئی۔

اب سامنے اہم ترین مقام پلونہ کا قلعہ تھا جو خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اگر ذرا بھی توقف ہو تو روسی آگے بڑھکر اس اہم مقام کو لیتے تھے۔ ترکی جنرل کیا کرتا۔ مقابلہ ناممکن۔ آخری صورت یہی تھی کہ پلونہ کے قلعہ میں گھس کر قلعہ بند ہو جائے۔ چنانچہ یہی کیا۔ قبل اس کے کہ روسی پہونچ سکیں ترکی جنرل غازی عثمان بادشاہ اپنی مٹھی بھر فوج (صرف بتیس ہزار) لیکر پلونہ کی گڑھی میں قلعہ بند ہوگئے اور روسیوں نے چشم زدن میں پلونہ کی گڑھی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

(۴)

روسی فوج کم و بیش سوا لاکھ ہوگی اور یہاں عثمان پاشا کے پاس صرف بتیس ہزار! پلونہ کی معمولی سی گڑھی! دفاعی توپخانہ کی قلت کیا بلکہ ندارد! ادھر روسیوں کا زبردست توپخانہ۔ روسی جنرل نے سوچا کہ اگر پلونہ چھوڑ کر آگے بڑھتا ہوں تو ممکن ہے ترکی جنرل پلونہ سے نکل کر پیچھے سے حملہ کرے یا افواج کی آمد و رفت میں مخل ہو لہذا بہتر ہے کہ پلونہ فتح کر لیا جائے۔ اور اس نے توپخانہ آگے بڑھا کر پلونہ کے قلعہ پر خوفناک گولہ باری کی کہ واقعی کوئی عمارت اور مقام تک ثابت نہ چھوڑا۔ اور پھر ایک زبردست حملہ کیا۔

لہ سلطان کا لقب جس کو ہر موقع پر استعمال کرتے تھے۔ ۲ لین پول۔

(۵)

حملہ آور فوج کا حملہ منظم اور زبردست تھا جس کی تندی سرعت کے ساتھ بڑھتی گئی۔ ہر چہار طرف سے لاتعداد افواج نے ہلہ بول دیا۔

عثمان پاشا اپنے مٹھی بھر سور ماؤں کو لئے ایک تواریخی جنگ کر رہا تھا۔ جنگ ہولناک سے ہولناک تر ہو گئی اور مسلسل! تازہ دم افواج کا سیلاب تھا جو اُمنڈا چلا آرہا تھا۔ مگر عثمان پاشا نے جم کر مقابلہ کیا۔ ایسا کہ آج تک دنیا کا کوئی محاصرہ اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتا۔ روسی افواج سرپٹک پٹک کر شل ہو گئیں اور پلونہ کی گڑھی نہ لے سکیں۔ غازی کو جوش آیا۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ عثمان پاشا اپنے جانبازوں کو لیکر روسیوں اور رومانیوں پر ٹوٹ پڑا۔ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ شیروں کے حملے بھی کسی سے رُکے ہیں۔ عثمان پاشاہ نے اس ٹڈی دل روسی اور رومانوی دونوں فوجوں کو نہ صرف شکست بلکہ شکست فاش دی۔ اور خوفناک قتل عام کے ساتھ روسیوں اور رومانیوں کی متحدہ افواج کو ایسا مارا کہ آج تک اس شکست کا دھبہ روسیوں سے نہ مٹا اور نہ مٹ سکے۔

سارا یورپ انگشت بدنداں رہ گیا۔ زارِ روس نے مارے غصہ کے رانیں پیٹ لیں۔ روسی جنرل کو برطرف کر کے اپنے بھائی آرچ ڈیوک میکائیل رومانات کو جنرل مقرر کر کے تازہ دم افواج روانہ کیں اور تاکید کر کے کہا کہ روس کا وقار جا رہا ہے۔ پلونا پہلے حملے میں لیلو۔ ساری دنیا تعجب کر رہی تھی کہ یہ کیا غضب ہے۔ مہینوں ہو گئے اور پلونہ فتح نہیں ہوتا۔

(۶)

آرک ڈیوک میکائیل رومانات اٹھاسی ہزار کا مزید لشکر لیکر جوش و خروش کے ساتھ پلونہ پر بڑھا۔ شاہِ رومانیہ نے کھلم کھلا بغاوت کر ہی دی تھی۔ رومانوی اور روسی شکست خوردہ افواج پھر مرتب ہو گئیں اور اس خوفناک جمعیت کے ساتھ میکائیل رومانات نے پلونہ کو پھر محاصرہ کے شکنجہ میں کسا۔

عثمان پاشا کی فوج کی حالت ابتر تھی۔ وردیاں پھٹ کر ٹکڑے ہو گئی تھیں اور پیوند کے عوض سپاہی کا غذ رکھکر رسی اوپر سے باندھتے تھے۔ قلعہ میں رسد قریب الختم تھی اور پیٹ بھر سوکھی روٹی تک میسر نہ تھی۔ روسی توپوں اور گولیوں سے کوئی گھوڑا مرتا وہ فوراً ذبح کر لیا جاتا۔

توپخانہ کی گرج کا یہ حال کہ ایک عمارت اور ایک مورچہ ثابت نہ رہا تھی کہ ترکوں نے اپنے شہیدوں کی لاشوں کی دیوار پر بناکر مورچہ کا کام لیا۔ مگر پلونہ نہ دیا!

اور افسوس کہ کمک اب بھی نہیں آئی تھی۔ ایک اُمید موہوم تھی کہ سلیمان پاشا فوج لیکر امداد کو آتا ہے مگر بھلا کیسے ممکن تھا کہ روسی افواج پلونہ سے آگے بڑھکر جنرل گورکو کے ماتحت رومیلیا کی طرف جا رہی تھیں۔ اور پلونہ روسی سمندر میں جزیرے کی طرح تھا۔

میکائیل رومانات نے روسی اور رومانوی لشکر ٹڈی دل کی طرح آگے بڑھایا۔ اور ادھر عثمان پاشا نے جھنجلا کر قسم کھائی کہ

لہ سلیمان پاشا کو یا تو گورکو نے اور یا رشوت نے روکدیا۔ دراصل رشوت نے پلونہ کو امداد نہ پہونچنے دی۔

پلونہ ہرگز نہ دونگا۔ غازیو کٹ مرو۔ معرکہ پھر شروع ہوگیا۔

یہ حملہ اس سے بھی زبردست تھا مسلسل اور خوفناک جنگ !! ترکی فوج سردی میں اکڑ رہی تھی، فاقہ کشی کر رہی تھی اور لڑ رہی تھی۔ غازیوں کی زبان پر تھا کہ پلونہ نہیں دینگے !!۔

اور جوں جوں گھمسان کی لڑائی ہوتی گئی غازیوں کا جوش بڑھتا گیا۔ رومانات کا زبردست سے زبردست حملہ بڑے جوش و خروش کیساتھ اٹھا اور اُبال کی طرح بیٹھ گیا۔ حملہ پہ حملہ اور حملہ پہ حملہ، غازی عثمان پاشا کو پھر جوش آیا۔ اللہ اکبر! اللہ اکبر! تکبیر کے نعروں کے ساتھ یہ بچی کچی مٹھی بھر فوج جوش و خروش میں قلعہ چھوڑ کر باہر نکل پڑی اور اس عظیم الشان روسی اور رومانوی لشکر کو پھر اسی طرح دھر کے لوٹ دیا۔ میکایل رومانات کی ساری فوج انتہائی ذلت کے ساتھ اپنا بوریا بستر چھوڑ کر سراسیمگی کی حالت میں بھاگی۔ کہاں کے شاہ رومانیہ اور کہاں کے رومانات۔ عثمان پاشا نے بچ بچ روئی کی طرح دھنک کر پھینک دیا۔ حیف صد حیف کہ تئیس ہزار سپاہیوں میں سے اب کتنے رہ گئے تھے جو میکائل رومانات کا تعاقب کرتے۔ غازی عثمان پاشا کیا کرتے۔ لاچار و مجبور ہو کر پھر پلونہ کے پلونہ ہی میں رہے۔

اس شکست سے زار روس کا کیا حال کیا ہوگا۔ بہ نفس نفیس زار روس تازہ دم افواج لیکر خود بڑھا اور اب از سر نو پھر پلونہ کے محاصرے کو سخت کیا۔

دنیا حیرت میں تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اودھر سارا ترکی فتح ہوا جاتا ہے پر پلونہ نہیں ملتا۔

اور غازی عثمان پاشا نے پھر کہا کہ میں پلونہ نہیں دونگا۔ ہرگز ہتیار نہ ڈالوں گا۔ کٹ مرونگا۔

اور بہت جلد ترکی فوج اور پلونہ کے قلعہ کی حالت قابل رحم ہوگئی۔ روسیوں نے پانی پر بھی قبضہ کرلیا اور ترکی فوج پیاس کے مارے بیحال ہوگئی۔ مگر تو بہ کیجئے۔ حسینؑ کے نانا کے امتی! کہیں پیاسا مرنے سے ڈرتے۔ تلاش آب میں باہر نکلے کہ ظالم روسیوں نے آلیا۔ زور کی جنگ ہوئی۔ اور اسی دوران میں بارش آگئی۔ روسیوں کو تو مار بھگایا اور پیاسے سپاہی اس خونیں میدان جنگ پر زمین میں جگہ بہ جگہ بھرا ہوا پانی پینے لگے۔ اس پانی میں زخمیوں کے خون کی آمیزش ہوگئی جس سے متلی اور قے شروع ہوگئی۔ خدا کی پناہ! کس قدر سخت محاصرہ تھا۔ مگر واہ رے عثمان پاشا پھر گرج کر یہی کہا کہ میں پلونہ نہیں دونگا۔

بہت جلد نوبت یہ پہونچی کہ فاقہ ایسا شروع ہوا کہ ایک نوالہ تک نہ رہا۔ اور اب سوال تھا کہ کیا کریں۔

عثمان پاشا نے کہا بخدا میں پلونہ نہیں دونگا۔ پلونہ تھا کہ کھنڈر!

اوہم پاشا نے کہا "پھر کیا حکم ہے"؟

عثمان پاشا نے کہا کہ حکم کیا ہے۔ میگزین اڑا دو اور روسی فوج کو کاٹ کر نکل چلو"

سوال تھا کہ کہاں؟ ہر چہار طرف سینکڑوں میل تک روسی قبضہ تھا۔ ہوا کرے!

عثمان پاشا نے کہا کہ "کچھ پروا نہیں ہم روسیوں کو کاٹ کر نکل چلیں گے"

Twice the Russians and Rumanians were totally defeated in the field. (Lane Pool.)

(۸)

صبح اندھیرے ایک دھماکے کے ساتھ قلعہ کا میگزین اُڑا۔ عثمان پاشا نے اپنی فوج کو ایک لانبی صف میں مرتب کیا تھا۔ ریرگارڈ ایکشن (پلٹ کر لڑنے) کے فرائض ادہم پاشا کے سپرد کئے۔

رُوسی فوج کے قریب پہونچ گئے ہیں جب میگزین اُڑا اور میگزین کے اُڑتے ہی اُدھر روسی فوج بیدار ہوئی کہ یہ کیا آفت، کہ عثمان پاشا نے اپنے چارجر کو مہمیز کر کے للکارا اور اپنی تلوار نیام سے کھینچکر نعرہ مارا "بترجم" (چارج کرو)

اور جنگی بینڈ گویا چیخ پڑا۔ "بترجم" ــــ بترجم!!" پاشا کے باڈی گارڈ نے نعرہ مارا "بترجم، بترجم" چاؤش للکارے "بترجم بترجم" حتیٰ کہ ہر سپاہی نے نعرہ مارا "بترجم"۔ گھوڑے تک چارج کا نعرہ سُنکر ہنہنانے لگے۔ ایک دم سے عثمانی صف کے بیچوں بیچ میں ایک نوک پیدا ہوئی اور سرعت کے ساتھ عثمانی فوج جو صف کی صورت میں تھی تیر کی سی نوک بن گئی کہ ایک بازو ادھر اور ایک اُدھر! اس طرح۔

اور یہ نوک ایک سناٹے کے ساتھ رُوسی فوج میں ترازو ہو گئی!!

(۹)

"بترجم" غازی پاشا کے باڈی گارڈ للکارے۔ "بترجم" ادہم پاشا نے عقب سے نعرہ مارا۔

اور یہ ترکی فوج کا چارج تھا کہ الاماں۔ شیرِ پلونہ غازی عثمان پاشا صورت جلال خود حملہ آور!!

رُوسیوں نے پلونہ کے گرد ہفت مورچہ محاصرہ کر رکھا تھا۔ پہلا اور دوسرا مورچہ تو غازی اس طرح پھاند گئے جیسے گندی نالی۔ تیسرے مورچہ پر رُوسی ہوش میں آئے کہ وہ بھی پار ہوا اور چوتھے مورچہ پر روسیوں نے دیوار کی دیوار سامنے کر دی۔ کیا کوئی آگے بڑھتا۔ زارِ رُوس خود فوجوں کو مارشل کر رہا تھا اور اُس نے بیمین و یسار کو نرغہ کے لئے اور بڑھا دیا۔

پاشا کا باڈی گارڈ اس ناقابلِ عبور فوج کے سمندر کو دیکھکر کچھ ہچکچایا کہ کیا حکم ملتا ہے۔ رفتار ہلکی کی تھی کہ پاشا نے جھنجلا کر نعرہ مارا "بترجم" اور تیر کی طرح اپنا رہوار توپ کی گرج اور گولیوں کی بارش میں بڑھا دیا!!

باڈی گارڈ اور ساری ترکی فوج نے پھر اسی جوش کے ساتھ نعرہ مارا "بترجم" اور سنگینیں چڑھا کر جو ترکی فوج نے رُوسی صفوں کو چیرنا شروع کیا۔ ہے تو ایک ہولناک کشمکش کے ساتھ غازی پاشا مع اپنے باڈی گارڈ کے للکارتے ہوئے مورچہ توڑ کر نکل گئے!! "بترجم" سنگینوں سے رُوسیوں کو چیر کر نعرہ مارتی ترکی فوج نکل چلی آئی! فوجوں کا نرغہ اور بھی بڑھ گیا۔ زار نے دیکھا کہ ترکی جنرل زبردستی نکلا جاتا ہے غضب ہے۔ جوشاں اور خروشاں رُوسی ہر چہار طرف سے اُمنڈ آئے۔ توپوں کی گرج سے میدان دہل گیا۔ گولیوں کی بوچھار نے بارش کو مات کر دیا۔ مگر واہ رے غازی۔ یہ شدّ و مد کی مخالفت اور یہ نرغہ۔ مگر ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ غازی کی زبان پر وہی حکم تھا کہ چارج کرو! "بترجم، بترجم" اور پھر گویا پتھر کو کاٹتا ہوا تھکا ہارا ترکی سپاہی آگے بڑھا۔ بترجم غازی پاشا کے باڈی گارڈ نے پھر للکارا اور ادہم پاشا نے ہولناک ترین "ریرگارڈ ایکشن" لڑتے ہوئے عقب سے للکارا "بترجم"! اور پھر اُس جوش و خروش سے بڑھکر عثمانی اس مورچہ کو بھی توڑ کر نکل گئے! (زندہ باد آلِ عثمان)

لے Rearguard Action ــــــ ۔ ۲ چالیس آدمیوں پر ایک سردار چاؤش ہوتا ہے۔

(۱۰)

جنگ ہولناک سے ہولناک تر ہوگئی۔ یمین و یسار کے دباؤ نے ترکی فوج کو پیپا شروع کیا۔ جیسے سمندر میں تنکا بہا جاتا ہو۔ ہر قدم یہی خیال کہ پاشا ہتیار ڈالنے کا حکم دیتے ہیں کہ پاشا اور اُن کے باڈی گارڈ زور سے للکارتے: "بتر جم"!
آخری کشمکش ہولناک ترین لڑائی تھی۔ دست بدست کا گھمسان۔ مٹھی بھر آدمی رہ گئے۔ اسلامی جوش تھا کہ لڑ رہا تھا۔
غازیوں نے ہتیار نہیں ڈالے۔ گاجر مولی کی طرح کٹ مرے اور آخری مورچہ پر تو گویا فولادی دیوار کو توڑ کر عثمان پاشا مع فوج "بتر جم" کا نعرہ مارتے نکل گئے۔ اللہ اکبر کا فلک شگاف نعرہ بلند ہوا۔
دُنیا میں جنگی کمال ہوگیا کہ شیر پلونہ سب کے سب مورچے توڑ کر پار نکل گیا! مگر افسوس صد افسوس کہ آدہم پاشا نرغہ میں رہ گئے۔ آخری مورچہ پر اُن کے مٹھی بھر سپاہی سر توڑ کوشش کر رہے تھے اور عثمان پاشا نے دیکھا کہ آدہم پاشا رہے جاتے ہیں۔ ترکی قوت دو حصہ ہوگئی۔ روسیوں کا سمندر بیچ میں۔ عثمان پاشا کو توقف کرنا پڑا۔ کیا کرتے۔ واپس لوٹ پڑے۔ کہ روسیوں نے اب دوسری چال چلی۔ دیکھا کہ واپس حملہ ہوتا ہے تو سپاہیوں کو ذرا روک کر توپخانہ کا رُخ اُدھر کر دیا۔ اور پھر جو توپیں گرجنا شروع ہوئی ہیں تو خود عثمان پاشا کے سر پر گولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ مگر کہیں غازی رُکتے ہیں! انہوں نے واپس چارج کیا ہی تھا کہ روسیوں نے نشانہ باندھ کر غازی کو توپ سے اُڑا دیا۔

(۱۱)

عثمان پاشا توپ کے گولے سے اُڑ کر دور گرے۔ باڈی گارڈ کے پرخچے اُڑ گئے۔ پاشا کا گرنا تھا کہ ٹڈی دل روسی ٹوٹ پڑے۔ ایسی کہ پاشا کی جان بچانا دوبھر ہوگئی اور اس چپقلش میں توپ کے گولے کے علاوہ پاشا کے سر میں ایک سنگین کا زخم بھی لگا۔ وہ تو باڈی گارڈ کے سپاہی کٹ مرے ورنہ غازی پاشا شہید ہو جاتے۔ باڈی گارڈ کے سپاہیوں نے غازی کو اسی حالت میں اُٹھا کر ایک ٹیلہ پر پہونچایا۔ غازی پاشا بے حال تھے۔ چاروں طرف دیکھا تو روسی سیلاب ترکی فوج کو ڈبو چکا تھا۔ ایک ایک سپاہی کے گرد دس دس روسی۔ سپاہی کٹ رہے تھے۔ ایک روسی افسر سفید رومال ہلاتا قریب آیا۔ اجازت دی گئی۔ اس نے پاشا سے کہا "اب کیا دیکھتے ہیں۔ سپاہیوں کو موت سے بچائیے"! سچ بھی تھا۔ عثمان پاشا نے زخموں سے چُور ایک آہ کھینچی۔ حکم دیا کہ ہتیار ڈالدو، اور اپنی تلوار بطور اعترافِ شکست روسی افسر کو دیدی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
"میرے بھوکے سپاہی"! ایک دلدوز آہ کے ساتھ عثمان پاشا کی زبان سے نکلا۔
معاً امن کا سفید جھنڈا ٹیلہ سے بلند ہوگیا اور وہی باڈی گارڈ جو بتر جم للکار رہے تھے اب اعلان کر رہے تھے کہ ہتیار ڈالدو۔ اور غازیوں نے ایک آہ بھری، آسمان کی طرف دیکھا اور خون آشام سنگین یا خونی تلوار جو بھی ہاتھ میں تھی وہیں کی وہیں صبر و شکر کر کے ڈالدی۔ ساری فوج مع افسر اور سپاہی جنگ کے قیدی تھے۔
پورے چھ ماہ کے طویل محاصرے کے بعد دو تین لاکھ فوجوں کی امداد سے زار روس نے پلونہ کا قلعہ لے لیا۔ ساری دُنیا میں تعریف کا غلغلہ بلند ہوگیا۔ زار کی فتح کا نہیں بلکہ عثمان پاشا کی شاندار مدافعت کا۔
اور لوگوں نے کہنا شروع کیا: "اگر عثمان پاشا زخمی نہ ہوتے تو گورکو کو پیچھے سے جا دباتے!" بھلا غور تو کیجئے سپاہی اکیلے

پاس کتنے تھے جو گورکو کو بچا دیتے۔

(۱۲)

زارِ روس نے عثمان پاشا کو طلب کیا۔

دو گھوڑوں کی گاڑی میں سوار۔ ایک طرف پاشا کا ایڈی کانگ اور دوسری طرف اُن کا ڈاکٹر تھا۔ روسی فوج دو رویہ کھڑی مع عوام کے غازی کو دیکھتی تھی۔ یہ کون تھا؟ وہی جس نے پلونہ نہیں دیا! جو روسیوں کے تمام مورچوں کو توڑ کر نکل گیا! جس نے میکائیل رومانانف اور رومانیوں کو ذلت آمیز شکست دی! جس نے پلونہ کے محاصرہ میں ساٹھ ہزار روسی قتل کر ڈالے اور نہیں ہارا۔ اور اگر چھوٹ جاتا یا امداد آجاتی تو کیا غضب ڈھاتا! ذرا دُہرے بدن کا مضبوط الاعضا۔ پستہ قد انسان، فراک کوٹ پہنے، ترکی ٹوپی مختصر خوبصورت ڈاڑھی۔ صرف کچھ بال سفید۔ سُرخ و سفید رنگ۔ چہرہ انتہا سے زیادہ متین اور خاموش۔ صورت سے عثمانی جلال کی تصویر، آنکھوں میں بلا کی قوت۔ جنگ میں شیر غرّاں اور باہر بھولا بھالا اور سچا سیدھا مسلمان۔ مذہب کا سختی سے پابند۔ یہ تھا عثمان پاشا جو زارِ روس سے ملنے پہونچا۔ اپنے فاتح دشمن سے!

زخموں سے چُور تھا جگہ جگہ پٹیاں بندھی تھیں۔ توپ کے گولے نے ران کو سخت زخمی کیا تھا اور سر کا سنگین کا زخم بہت تکلیف دہ تھا۔

ایڈی سی اور ڈاکٹر نے سہارا دے کر کمرے میں پہونچایا۔ وہاں ایک کرسی پر بٹھا دیا اور زارِ روس کا انتظار ہونے لگا۔

(۱۳)

زارِ روس مع اپنے سرداروں، نوابوں اور جنرلوں اور فوجی اسٹاف کے اپنے پورے شاہی دبدبہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اُسکے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ پلونہ کا فاتح اپنے مدمقابل سے ملنے آیا۔ ملاقات کسقدر دلچسپ ہوگی۔

غازی پاشا فوراً تعظیم دینے کھڑے ہوئے اور فوجی سلام کیا۔ زارِ روس انکو اُٹھتا دیکھکر آگے بڑھا۔ "ہیں! ہیں! تم مت اُٹھو، زخمی ہو۔" زار نے اخلاق سے سلام کرتے ہوئے کہا۔

عثمان پاشا نے سپاہیانہ سادگی سے کہا۔ "سپاہیوں پر بادشاہوں کی تعظیم لازمی ہے۔ آپ شہنشاہ ہیں۔"

مسکرا کر زار نے کہا۔ "تمہارا دشمن۔"

عثمان پاشا کو ایک طرف سے اُن کا ایڈی سی اور دوسری طرف سے ڈاکٹر سہارا دئے پکڑے کھڑے تھے۔ زار نے بٹھانے کا حکم دیا اور پھر کہا:-

"عثمان پاشا میں تم کو تمہاری حیرت انگیز مدافعانہ جنگ پر مبارکباد دیتا ہوں۔"

عثمان پاشا نے سپاہیانہ انداز سے شکریہ ادا کیا اور زارِ روس نے پھر اُن کو مبارکباد دی اور آگے بڑھکر عثمان پاشا کی گرفتہ تلوار خود اپنے ہاتھ سے اُن کی کمر میں باندھ دی۔ اس سے بڑھکر اور کون صلہ مل سکتا تھا۔ زار نے کہا۔ "تمہاری تلوار واپس اور تم قیدی نہیں بلکہ آج سے میرے مہمان ہو۔"

لہ جنرل گورکو جس نے کوہ بلقان پار کر کے ترکوں کو آخری شکست دی۔

زارِ روس نے بہادری اور بہادر کی قدر کی اور دُنیا کو دکھا دیا کہ میں بھی بہادر ہوں۔ سکندر اور پورس کا معاملہ تاریخ نے دُہرا دیا۔ عثمان پاشا کے لئے اپنے دشمن اور وہ بھی شہنشاہ دشمن سے اس طرح خراج تحسین لینا معمولی بات نہیں اور شکریہ کے سبب اُن کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ مگر واہ رے غازی، اپنے سپاہیوں کو نہ بھولا۔

"اور میرے سپاہی؟"

زار نے کہا: "وہ بھی آزاد اور میرے مہمان"۔

اور زارِ روس کے جنرلوں اور اسٹاف نے عثمان پاشا کو مبارکباد دی۔ عثمان پاشا اب زار کے معزز مہمان تھے اور زار کا فرض تھا کہ اپنے اسٹاف سے مہمان کا رسمی تعارف کرائے۔

"یہ میرے پیارے بھائی آرک ڈیوک میکائل رومانوف تمہارے خاص دشمن اور میری افواج قاہرہ کے جنرل اعظم ہیں" زارِ روس نے بھائی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

یہ وہ تھے جن کی فوج کو عثمان پاشا نے قلابازیاں کھلادی تھیں!! اور میکائل رومانوف نے بڑے اخلاق سے مسکراتے ہوئے آگے بڑھکر عثمان پاشا سے ہاتھ ملایا۔

مصافحہ طویل اور دلچسپ تھا اس لئے کہ عثمان پاشا بھی مسکرا رہے تھے اور زارِ روس اور سب لوگ بھی مسکرا رہے تھے۔

"میرے عزیز ترین اور قابل قدر شاندار دشمن" عثمان پاشا نے مسکراتے ہوئے کہا اور مصافحہ ختم ہوا۔

"یہ میرے دوست ہز ہائی نس شاہ رومانیہ ہیں" زار نے کہا اور شاہ رومانیہ نے آگے بڑھکر مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

خُدا کی پناہ! غازی عثمان پاشا ایک دم سے صورت جلال ہوگئے۔ "ہرگز نہیں" یہ کہکر اپنا مصافحہ والا ہاتھ کھینچکر اپنی پُشت کی طرف لے گئے۔ جیسے ہاتھ کو کسی گندگی سے بچانا ہو۔ "ہرگز نہیں۔ میں اس سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا۔ یہ اس قابل نہیں کہ میں اس سے ہاتھ ملاؤں۔ یہ تو "باغی" ہے۔ دشمن سے ہاتھ ملا سکتا ہوں مگر "باغی" سے ہاتھ نہیں ملا سکتا"۔

سامعین پر بجلی سی گری۔ سب کے سب اس عجیب وغریب اظہارِ خودداری پر ششدر رہ گئے۔ شاہ رومانیہ خفیف ہوکر رہ گیا۔ بھرے دربار میں کیسی توہین ہوئی ہے! مگر واقعہ ہے کہ وہ سلطان کی ادنیٰ رعایا تھا اور بغاوت کرکے روسیوں سے مل گیا۔ بقیہ تعارف ہی پھر نہ ہوا۔ مگر باغی کو سزا مل گئی!!

نوٹ

غازی عثمان پاشا ترکی کا وہ آخری سپاہی تھا کہ جس کا جنگی کارنامہ اب بھی یورپ کے قرون وسطیٰ کے کارناموں میں سب میں زیادہ شاندار مانا جاتا ہے۔ پلونہ پر جنگ کیا بلکہ جنگی معجزہ کر گیا۔ چھ ماہ بعد جب قریب دس ہزار سپاہی روس کی قید یا مہمانی سے قسطنطنیہ واپس آئے تو سارا شہر غازی کو دیکھکر رو رہا تھا۔ غازی موصوف نہایت ہی سخت شاہ پرست تھے اور جس زمانے میں ینگ ٹرکش پارٹی کا زور ہوا اور انہوں نے شاہ پرستوں کو چُن چُن کر قتل کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ جوشیلے سے جوشیلا نوجوان ترک بھی اس سب سے بڑے شاہ پرست کو قتل کرنے پر تیار نہیں ہے۔ یہ طے ہوا کہ ان کو زندہ گرفتار کرکے کہیں قید کرو اور یہ ممکن نہ ہوا۔ سلطان عبدالحمید جانتے تھے کہ ان کے دشمن عثمان پاشا سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ لہذا سلطان نے یہ ترکیب کی کہ جب باہر نکلتے

تو اپنے پاس عثمان پاشا کو اس طرح بٹھاتے کہ کوئی ان کو قتل کرے تو عثمان پاشا بھی قتل۔ نتیجہ یہ کہ عثمان پاشا سلطان کی ڈھال بنے رہے۔ پلونہ کے معرکہ میں عثمان پاشا کی تیس ہزار فوج میں سے بیس ہزار کٹ مرے، مگر عثمان پاشا نے پچاس ساٹھ ہزار روسی قتل کئے۔ پلونہ کے غازیوں کی یورپ میں ایسی قدر و منزلت ہوتی تھی کہ جنگ عظیم کے دوران میں ایک بڈھا ترک سپاہی گلی پولی کے معرکہ میں گرفتار ہوا۔ یہ عثمان پاشا کے ساتھ پلونہ کے معرکہ میں شریک تھا۔ اس کی درجنوں تصویریں لی گئیں اور بڑے بڑے اتحادی جرنیل اس سے ملے اور پلونہ کی باتیں پوچھیں۔

عثمان پاشا کے ماتحتوں میں ادہم پاشا تھے جنہوں نے ۱۸۹۷ء میں یونان کو شکست دیکر بائیس دن میں پہلی فتح کی۔ اسی جنگ میں جنگ کی پہلی گولی چلنے سے پہلے ترکی فوج کا صرف معائنہ کرنے غازی کمال پاشا بھی گئے۔ یونانی لشکر میں ہلڑ ہو گیا کہ عثمان پاشا حملہ کر رہے ہیں۔ لہذا یونانی پہلا مورچہ محض شیر پلونہ کے نام پر چھوڑ بھاگے اور جنگ کی پہلی لڑائی صرف تعاقب ہی پر رہی۔

پلونہ کی جنگ کے دو بہادر افسروں میں حافظ حفیظ پاشا بھی تھے جو ۱۸۹۷ء کی جنگ یونان میں شہید ہو گئے۔ ہیورڈ پاشا ایک انگریز افسر بھی ماتحتوں میں خوب لڑے تھے۔ یہ ترکی فوج میں شروع سے نوکر تھے اور عثمان پاشا کے بڑے مداحوں میں تھے۔ انہوں نے ایک کتاب بھی لکھی۔

لکھتے وقت کوئی کتاب پیش نظر نہیں تھی ممکن ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو۔

ایک صاحب نے مجھے لطیفہ سنایا تھا، وہ یہ کہ مسٹر گلیڈسٹن وزیر اعظم برطانیہ جو ترکوں سے بیحد نفرت رکھتے تھے، بیمار پڑے اور اخبار روز سنتے۔ پلونہ کے فتح ہونے کی خبر کے روز منتظر رہتے مگر رنجیدہ خبر ملتی۔ نتیجہ یہ کہ رنج کے سبب بیماری بڑھ گئی اور ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اخبار نہ پڑھیں مگر باز نہ آئے نتیجہ یہ کہ عثمان پاشا نے روماناف کو جو شکست دی ہے تو اس کے صدمہ سے مرض بالکل بگڑ گیا اور بالآخر مر گئے۔ عثمان پاشا نے موذی کو بڑی دور سے مارا۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی

ناشاد

صبح کا وقت تھا۔ ایک بیمار ڈاکٹر کے ہاں گیا۔ گھنٹی بجائی۔ ڈاکٹر ملاقاتی کمرے میں آیا۔ دیکھا کہ مریض ٹہل رہا ہے۔ جوان۔ اونچا پورا۔ گلے میں ریشمی دستی۔ اس میں سیدھے ہاتھ کو سہارا دیا ہے۔ جیسے دکھتا ہو۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، سخت تکلیف ہے۔ جسے ضبط کر رہا ہے۔ مگر ضبط نہیں ہوسکتی۔

ڈاکٹر:۔ تشریف رکھیے۔ . . .

مریض:۔ تین روز سے نہیں سویا۔ ہاتھ میں بڑی کھولن ہے۔ آپ آپریشن کر دیں۔ . . . .

ڈاکٹر نے سر سے پیر تک مریض کو دیکھا۔ پھر ہاتھ کو دیکھا۔ پوچھا: "کہاں تکلیف ہے؟"

مریض نے ہاتھ کے بالائی حصّے کو اشارے سے بتا دیا۔ شدّتِ تکلیف سے بول نہ سکا۔

ڈاکٹر نے پورے ہاتھ کا معائنہ کیا۔ مریض کا بخار دیکھا۔ حیران تھا کہ نہ کہیں ورم، نہ نشان، نہ بخار، پھر کیسی تکلیف ہے؟!

مریض کی عجب حالت تھی۔ تکلیف سے بے حواس تھا۔ ہاتھ کو بچائے لیتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

ڈاکٹر کو خیال ہوا۔ ہاتھ میں تو کوئی روگ نہیں۔ مریض کے دماغ میں روگ معلوم ہوتا ہے۔ کہا: "آپ میرے شفاخانہ میں کچھ روز ٹھہریں تو علاج ہوسکتا ہے۔"

اس پر مریض بے چین ہوگیا۔ کہنے لگا: "مجھے ایک ایک منٹ دوبھر ہے۔" پھر ڈاکٹر کی مشتبہ نظروں کو دیکھ کے کہا: "مانا کہ میرا زخم دکھائی نہیں دیتا۔ مگر میں دیوانہ بھی نہیں ہوں۔ کچھ ایسی ہی تکلیف ہے۔ جو آپریشن چاہتا ہوں۔"

ڈاکٹر:۔ مگر مشفق! میں کیسے آپریشن کر دوں۔

مریض:۔ کیوں؟!

ڈاکٹر:۔ آپ کا ہاتھ بالکل اچھا ہے۔

مریض نے جیب سے سو کا نوٹ نکالا۔ اور ڈاکٹر کو دیتے ہوئے کہا: "آپریشن کی فیس۔"

ڈاکٹر:۔ معاف کیجئے۔ سَو کیا آپ ہزار بھی دیں تو میں آپریشن نہیں کر سکتا۔

مریض گھبرا کے ڈاکٹر کو دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر:۔ ہاں! . . . . آپ کے ہاتھ میں کوئی خرابی نہیں . . . . دیکھئے نا، میں آپ کے اچھے بھلے ہاتھ کو کیسے کاٹ چھانٹ کے رکھ دوں؟

مریض:۔ اچھا، آپ آپریشن نہ کریں۔ میں خود بدگوشت نکالے دیتا ہوں۔ آپ زخم کی دیکھ بھال کر لیں۔

مریض نے یہ جملے کچھ ایسی مایوسی سے کہے کہ ڈاکٹر کا بھی دل ہل گیا۔ اور خیال ہوا کہ اس شخص کو کچھ ایسی ہی تکلیف ہے جو اتنا بے چین ہے۔ اتنے میں مریض نے یہ غضب کیا کہ ڈاکٹر کی آنکھ بچا کر الماری سے نشتر نکالا۔ اور دیکھتے دیکھتے ہاتھ میں بھونک لیا۔

ڈاکٹر:۔ ہائیں!! کیا کرتے ہو؟؟

ڈاکٹر نے جلدی سے مریض کے ہاتھ سے نشتر چھینا۔ مجبوراً زخم کی دیکھ بھال شروع کی۔ مریض ڈاکٹر سے کہتا جاتا تھا "یہ، یہ بدگوشت ہے۔ اسی میں کھولن ہے۔ اسے نکال دیجئے۔"

ڈاکٹر نے ہاتھ کے جس حصّے کا آپریشن کیا۔ وہ روپے سے کچھ بڑا تھا۔ جب اتنا گوشت نکل گیا۔ خاصا لہو بہہ گیا تو مریض نے آرام کا سانس

لیا معلوم ہوا کہ اسکی رُوح پر ایک بوجھ تھا جو اُتر گیا۔

ڈاکٹر:۔ اب تو وہ تکلیف نہیں۔

مریض:۔ بالکل نہیں۔ شکریہ! اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے تپتی دھوپ میں تپتا ہوا انسان ٹھنڈی چھاؤں آجائے۔

ڈاکٹر نے زخم پر پٹی باندھی۔ اب مریض پہلا سا آدمی ہی نہ تھا۔ بڑا بھلا مانس بن گیا۔ ہنس مکھ، خلیق، ملنسار، باتوں باتوں میں مریض نے پھر فیس دینی چاہی۔ مگر ڈاکٹر نے نہ لی۔

کئی روز تک ڈاکٹر اس شخص کے پاس ہوٹل میں جاتا رہا، کیونکہ وہ شخص کہیں اور سے علاج کے لئے آیا تھا۔ مریض پڑھا لکھا اور اچھے گھرانے کا فرد تھا۔

کچھ دن میں زخم بھر گیا۔ وہ شخص اپنے گھر واپس ہو گیا۔ مشکل سے تین چار ہفتے گزرے ہوں گے کہ ایک روز وہی شخص پھر ڈاکٹر کے ہاں چلا آتا ہے۔ گلے میں دستی، اس میں ہاتھ کو سہارا دے رکھا ہے۔ کیونکہ اسی ہاتھ میں اُسی جگہ دُکھ کی وہی شدت ہے۔ چہرے پر زردی۔ آنکھوں میں آنسو، ابرو پر پسینہ۔ آیا اور آتے ہی آرام کرسی میں بے حال ہو کر گر گیا۔ تکلیف کا یہ عالم تھا کہ منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ اس لئے بلا کچھ کہے سنے اُس نے ڈاکٹر کے سامنے اپنا دُکھتا ہوا ہاتھ پھیلا دیا۔ اور بڑی تکلیف سے کہا۔ "ڈاکٹر! میں نے آپ سے کہا تھا کہ زخم اور گہرا کیجئے۔ دیکھئے، مرض پھر عود کر آیا۔"

ڈاکٹر نے ہاتھ کا معائنہ کیا۔ زخم اچھا ہو گیا تھا۔ نئی کھال بھی آگئی تھی۔ اس دفعہ بھی نہ سُوجن تھی، نہ بُخار تھا۔ مگر مریض کو پہلے سے بھی زیادہ بےچینی معلوم ہوتی تھی۔

اب بھی سوائے آپریشن کے گزر نہ تھا۔ آپریشن ہوا۔ اِدھر آپریشن ہوا اُدھر درد کافور ہو گیا۔ مگر قرینہ کہتا تھا، مریض کو ویسا سکون نہیں ہوا جیسے پہلے ہوا تھا۔

مریض:۔ آپ کو زحمت ہوئی۔

ڈاکٹر:۔ کیا ہرج ہے۔ میرا تو کام ہی یہ ہے۔ . . . . اب تکلیف نہ ہوگی۔ میں نے گہرا نشتر دیا ہے۔

کچھ روز بعد مریض پھر چلا گیا۔ ڈاکٹر کو بڑی اُلجھن تھی کہ آخر یہ مرض کیا ہو سکتا ہے۔ کئی اور ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کیا۔ مگر کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ خیر ایک ہفتہ گزرا۔ دوسرا گزرا۔ مگر مریض نہیں آیا۔ تیسرا ہفتہ بھی گزر گیا۔ اب بھی مریض تو نہ آیا، ایک خط آیا۔ ڈاکٹر نے خیال کیا، ہو نہ ہو یہ مریض کا ہی خط ہے۔ چلو اچھا ہوا۔ اُسے صحت ہو گئی۔ جو وہ نہیں آیا۔ خط خیریت کا بھیجا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے خط کھولا اور پڑھنے لگا۔

"—— جب سے آپ کے پاس سے آیا ہوں مرض کے دو سخت دَورے پڑ چکے ہیں۔ ہر دفعہ گوشت نکال دیا۔ لہو بہہ گیا تو سکون ہو ہو گیا۔ دَورے بتاتے ہیں کہ یہ اب جان کے ساتھ ہی جائیں گے۔ آپ کو میری طرف سے تشویش ہو گی۔ اس لئے یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ ان میں میری ماندگی کی سرگزشت ہے۔ جو میری زندگی کا ایک راز ہے۔ جی نہیں چاہتا کہ اسے ساتھ لیجاؤں، آج آپ پر افشا کرتا ہوں۔

—— چار پانچ مہینے ہوئے، میں بھی دُنیا کے خوش نصیبوں میں تھا۔ یعنی تیس بتیس برس کے انسانوں کو مسرت کی جو جو باتیں بھا سکتی ہیں وہ مجھے بھی بھاتی تھیں۔ اور ایک کھاتا پیتا، پڑھا لکھا شخص اُنہیں جس سلیقے سے برت سکتا ہے، میں بھی برتتا تھا۔ برس بھر میرے بیاہ کو ہو چکا تھا۔ جو میں نے اپنی پسند سے کیا تھا۔ ماں باپ کی پسند کا نہ تھا۔ جیسے ہمارے گھرانے کا دستور ہے ——،

—— ڈاکٹر! آپ کو کیونکر بتاؤں کہ میری شریکِ زندگی کیسی تھی۔ خوبصورت، خوب سیرت، ہنستی پیشانی۔ پڑھی لکھی، تندرست۔ ہائے! ایک افسوں ہو تو نام لوں۔ میری زندگی کا کونسا سانس ہے جس پر اس کا جادو نہ تھا۔ بس اُس نے مجھے اپنا

کر لیا تھا اور وہ خود میری ہو کر رہ گئی تھی۔

—— تو ہاں سنگار میز کے ایک خانے کو وہ مقفّل رکھتی۔ اُس کی کُنجی بھی اپنے پاس سے جُدا نہ ہونے دیتی۔ ایک دن اسی بات پر مجھے شُبہات پیدا ہوئے۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ میری بیوی کی محبت صرف دکھاوے کی ہے۔ اس میں اصلاً کوئی جان نہیں۔ اُف! انسان کیسا ناداں ہے کہ محبّت کو نفرت اور راحت کو کلفت سے بھی بدل لیتا ہے۔

اس احساس کے ساتھ ہی میرا دل خالی خالی ہو گیا۔ اور بیوی کی ہر بات کھٹکنے لگی۔ اب روئی کی آگ کی طرح اندر ہی اندر کوئی شے میری رُوح کو پھونکے دیتی تھی۔ بار بار دل میں آتا کہ میز کے خانے میں نہ جانے کس کے کیا تحفے ہیں۔ جنہیں مجھ سے یوں چُھپایا جا رہا ہے۔

—— شبہات بڑھتے رہے چاہت کم ہوتی رہی۔ دم بدم مجھے یقین ہوتا گیا کہ اس کی آنکھوں میں عصمت نہیں۔ مکر ہے۔ اس کے پیار میں خُلوص نہیں۔ لوٹ ہے۔ اس کی باتوں میں مٹھاس نہیں، زہر ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ اُس کی سہیلی آئی۔ کم و بیش یہ روز اُس کے پاس آیا جایا کرتی تھی۔ کہا "پردہ باغ میں جلسہ ہے، تم بھی چلو" بھلا میری بیوی کو میرے دل کی کیا خبر تھی۔ جس کی جُوالامکھی باتوں پر میں نے ریا کی اندھیری ڈال رکھی تھی۔ وہ میرے پاس آئی۔ ہنستے ہوئے مجھ سے جانے کیلئے پوچھا۔ میں نے بخوشی اجازت دیدی۔ کیونکہ میں ایسے موقع کا منتظر ہی تھا۔ جونہی وہ دونو گئیں میں نے دوسری کنجیاں لگا لگا کر میز کا خانہ کھول لیا۔ اِدھر دیکھا، اُدھر دیکھا۔ تو عطر دان میں نیچے کی طرف کاغذات کا ایک چھوٹا سا پلندہ نظر پڑا۔ جو سُرخ ریشمی ربن سے بندھا ہوا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی کے مکتوب محبّت ہیں۔ جن کی اس شد و مد سے حفاظت ہو رہی تھی۔ دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں میں نے پلندا کھولا۔ اور بمشکل ان خطوں کو پڑھ سکا۔ نہیں کہہ سکتا ان کے الفاظ میری نظروں قلب و قلم کے نکلے ہوئے بول تھے، یا دہکتے انگارے تھے۔ اب زندگی میرے لئے جہنّم بن گئی تھی۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ جس وجود کو میں نے اپنا کہا۔ اُس نے میرے لئے یہ ہلاہل تیار کیا ہے۔ جس کو بوند بوند کر کے آج مجھے پینا پڑ رہا ہے۔ ان خطوط میں وہ سب کچھ تھا جو مرد حالتِ اضطرار میں عورت کو لکھتا۔ اور اُس کو محبت کے نام سے یاد کرتا ہے! خیر، خط میں نے پڑھ لئے اور پھر اسی طرح رکھدئے اور میز کے خانے کو مقفّل کر دیا۔ اور ایک عجیب قلبی موت میں گرفتار ہو گیا۔

شام ہوتی۔ میری بیوی پردہ باغ سے واپس آئی۔ سہیلی ساتھ نہ تھی۔ موٹر سے اُترتے ہی وہ ہنستی ہنساتی میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔ لیکن میرے دل میں کچھ تھا، منہ پر کچھ تھا۔ اُسے ذرا نہ معلوم ہونے دیا کہ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہے۔ جس کا مجھے ملال ہو۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ روز کی طرح رات کا کھانا بھی ساتھ کھایا۔ کھانا کھا کر میں نے کہا "مجھے ذرا کی ذرا ایک دوست کے پاس جانا ہے۔ ضروری کام ہے" اور یہ کہتے ہوئے میں نے باہر جانے کی تیاری شروع کی۔ بیوی نے مجھے جاتے دیکھا تو بہت روکا۔ کہا "اب رات ہو گئی۔ نہ جاؤ۔ تنہائی میں میرا جی گھبرائے گا۔ صبح چلے جانا" مگر میں نے اس کی ایک نہ سنی باہر چلا آیا۔ کیونکہ مجھے آج رات اپنا سوچا ہوا کام کرنا تھا۔ وہ نہ کرتا تو پاگل ہو جاتا۔

کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد کمپاؤنڈ کی دیوار کُود کر مَیں واپس ہوا۔ دبے پاؤں کمرے میں گیا۔ دیکھا خوابی بلب روشن ہے۔ جس کی دھیمی مگر رنگین روشنی میں میری بیوی کا نندا سا حُسن جھمک رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر اپنے آپ میرا دل مڑ گیا۔ اس وقت گھنٹے نے گیارہ بجائے۔ گجر میں بڑا لے دار نغمہ بجتا تھا۔ اُسے سُنکر نہ جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میں کتنی دیر تک روتا رہا —— میری بیوی سو رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس طرح

کروٹ لیتی، جیسے کوئی تپ چین ہو"۔

— آہ! جس زہر نے میرا دل و دماغ بسا دیا تھا، اُسنے پھر مجھ میں ایک داخلی تشنج پیدا کیا۔ اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اگر کچھ دیر اور مَیں یونہی کھڑا رہا تو میرے روئیں روئیں سے خُون پھُوٹ بہے گا۔ اسی عالم میں آگے بڑھا۔ آہستہ سے اپنا سیدھا ہاتھ اُس کے گلے پر رکھا۔ اور پوری قوت سے دبایا۔ جس سے اُس کے جسم میں دفعتاً تڑپ پیدا ہوئی۔ اُس نے گھبرا کے آنکھیں کھولیں۔ مجھے دیکھا تو نگاہوں میں وحشت کی جگہ حسرت آگئی۔ گویا مرنے والی مجھ سے اپنی خطا پوچھتی۔ مگر پھر آنکھیں بند کرلیں۔ جو سدا کے لئے مُند گئیں۔

—— اس کا مزا اب تک میری نظروں میں ہے۔ جیسے کسی بچے کو نیند کا غلبہ ہو اور وہ میٹھی نیند سو جائے۔ ہائے! اس نے میرے ہاتھوں اپنی جان دیدی۔ مگر اُف تک نہ کی۔ ہاں اسی وقت اُس کے مُنہ سے نہ معلوم کس طرح خُون کی کچھ بوندیں اُڑی تھیں۔ جو میری قمیص پر گریں۔ اُن کی ایک بُوند میرے ہاتھ پر بھی گری تھی۔ جسے میں نے صبح دیکھا۔ اس وقت بالکل خشک ہوگئی تھی۔ اور یہ وہی جگہ ہے جہاں یہ کھولن ہے۔

صبح ہوئی۔ میں نے اپنے چند دوستوں کو بلایا اور چپ چپاتے اُسے دفن کر دیا۔ اب جو پوچھتا، کہدیتا "کیا بتاؤں، رات کو اچھی خاصی سوئی تھیں۔ صبح کو مُردہ پائی گئیں۔ دل کی حرکت بند ہوگئی"۔ یہ باتیں کچھ ایسی شکل اور بسورتی آواز میں کہتا کہ لوگوں کو کسی طرح کا کوئی شبہ تک نہ ہوتا۔ اُلٹے سب مجھ سے ہی ہمدردی فرماتے تھے۔

میں نے یہ سب کچھ کہا۔ مگر میرا ضمیر مجھ سے راضی تھا۔ اس میں کوئی ٹیس نہ تھی۔ مَیں سمجھتا تھا کہ میں نے مرنے والی پر ظلم بہت کیا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اسی کی سزاوار تھی۔ جو میں نے اُسے مار ڈالا۔ اور اس طرح مار ڈالا کہ شاید ہی کوئی قاتل، ظالم، ڈاکو اس اطمینان سے کسی کو مار سکتا ہے۔

دوسرے ہی دن میری بیوی کی سہیلی آئی۔ اور مرنے والی کو یاد کرکے بہت روئی۔ اس کے رونے سے میرے دل پر اس لئے تو اثر ہوا کہ ایک عورت رو رہی تھی۔ مگر کیوں رو رہی تھی اس کی کوئی پروا نہ تھی۔ جب وہ خُوب رو چکی، دل کی بھڑاس نکال چکی تو میرے پاس آئی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ آخر کہنے لگی "آپ جانتے ہیں۔ مجھ میں اور مرنے والی میں کیسی یک دلی تھی"۔ اتنا کہا اور یکایک خاموش ہوگئی۔ اس کی اس خاموشی میں کچھ حیرانی بھی تھی۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کہنے سے اس کا کیا مطلب ہے۔ پھر وہ مجھے میز کے پاس لے گئی۔ اور مجھ سے کہکر عطر دان سے کاغذوں کا وہی پلندا نکلوایا جس کے خطوط میں نے پڑھے تھے۔ اور بڑے اضطراب میں کہا: "یہ میرے ہیں"۔

یہ ایک بیوہ لڑکی تھی۔ جس نے تھوڑا پڑھا تھا۔ مگر خود کو علاّ مہ سمجھتی تھی۔ مشرق میں جیتی، مغرب کی ریس کرتی۔ بس یوں سمجھئے کہ آدھا تیتر آدھا بٹیر تھی۔ بیوہ ہو کر دیس کی خدمت کرنے کا پرچار سُوجھا۔ اور اس چیز کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ کہتی تھی "دُنیا میں سارے رشتے جُھوٹے ہیں۔ اگر کوئی رشتہ سچا ہے تو وہ یہ کہ انسان دیس کی خدمت کیا کرے"۔ اِسیُ دھن میں اُس نے دوسرا بیاہ نہ کرنے کا بھی عہد کر لیا تھا۔ مگر پیار و محبت کے خطوط اس کے ہاں ہُن کی طرح برسا کرتے تھے۔ جنہیں دُنیا کی نگاہوں سے بچانے کے لئے وہ اس طرح چھپاتے چھپاتے پھرتی تھی جس طرح بلی اپنی ذیلی پیداوار کو چھپاتی ہے۔

یہ معلوم کرکے کہ وہ خطوط کس کے تھے، اور کیا ہوگیا۔ مجھ پر بجلی گری۔ اور آنکھیں زمین میں ایسی گڑیں کہ پھر نہ اُٹھیں۔ کیونکہ آنکھیں چار کرتے مجھے خوف ہوتا تھا کہ کہیں آنکھوں آنکھوں میں کوئی میرے دلِ خانہ خراب کی سرگزشت نہ پڑھ لے۔ وہ دن اور

آج کا دن کہ میرے ہاتھ میں وہاں یکا یک ٹیس ہونے لگی۔ جہاں میری بیوی کا لہو گرا تھا۔ اور مجھے محسوس ہوا۔ جیسے ہاتھ کے اتنے سے حصے میں میری ساری رُوح بند ہے۔ جس پر ہزاروں زہریلے بچھو ڈنک مار رہے ہیں۔

ڈاکٹر! جب تک میں اس نیک بخت کے پاس نہ چلا جاؤں۔ اُس سے معافی نہ مانگ لوں۔ اس سوزش سے چھٹکارا نہیں ہو گا۔ اُس نے کبھی میری خوشی کو نہ ٹالا۔ اب بھی نہ ٹالے گی۔ ضرور معاف کر دے گی!!"

سیّد وزیر حسن

ہم لوگ

ادائے خاص سے گرمِ کلام ہیں ہم لوگ ۔۔۔ جہانِ شعر و ادب کے امام ہیں ہم لوگ

جہاں نصیب نہیں منطقِ جبرئیل کو بار ۔۔۔ براہِ راست وہاں ہمکلام ہیں ہم لوگ

نگاہِ پستیِ عالم کی سمت کیا جائے ۔۔۔ یہ جانتے ہیں کہ عالی مقام ہیں ہم لوگ

ہماری گرد کو بھی موجِ برق پا نہ سکی ۔۔۔ رہِ حیات میں وہ تیز گام ہیں ہم لوگ

شریکِ حال ہے ہر چند فیض ساقی کا ۔۔۔ خدا گواہ وہی تشنہ کام ہیں ہم لوگ

نہ دیکھ چشمِ زمانہ ہمیں حقارت سے ۔۔۔ ادب کہ درخورِ صد احترام ہیں ہم لوگ

ہجومِ یاس میں ہر اپنے دم سے نورِ اُمید ۔۔۔ جہانِ شب کو سحر کا پیام ہیں ہم لوگ

ہزار مورد بیدادِ چرخ ہیں پھر بھی ۔۔۔ ترانہ سنجِ بقائے دوام ہیں ہم لوگ

بہار سے جو بدل دیں خزاں کی بے کیفی ۔۔۔ صفت جہان پہ وہ رنگیں کلام ہیں ہم لوگ

ہماری قید بھی کتنی حسیں ہے نامِ خدا ۔۔۔ اسیرِ سلسلۂ مشکفام ہیں ہم لوگ

ہے دیدنی یہ فروغ اپنے داغِ اُلفت کا ۔۔۔ سپہرِ عشق پہ ماہِ تمام ہیں ہم لوگ

گناہِ عشق میں ہیں از گروہِ خاص الخاص ۔۔۔ منظر میں خلق کی ہر چند عام ہیں ہم لوگ

کبھی جھجکتے نہیں فرِّ شہریاری سے ۔۔۔ وہ بندگانِ خدا کے غلام ہیں ہم لوگ

ڈرا نہ واعظِ ناداں ہمیں جہنم سے ۔۔۔ شرابِ تیز سے آتش بجام ہیں ہم لوگ

طرب فروز بنی تیرگی ہمارے لئے ۔۔۔ شبستانِ خانے کی رنگین شام ہیں ہم لوگ

نصیبِ عزِّ حضوری بھی ہو ہی جائے گا ۔۔۔ ازل سے گرمِ پیام و سلام ہیں ہم لوگ

قدح پرست ہیں واعظ بُرا کہے تو کہے ۔۔۔ کہ بے نیازِ غمِ ننگ و نام ہیں ہم لوگ

ہماری طرزِ سخن گستری الگ ہے نہال
خلافِ پیرویِ رنگِ عام ہیں ہم لوگ

نہال سیوہاروی

مُصنّف کا وارث

"میرے ماموں لکھ پتی تھے اور اپنی ساری دولت مجھے لکھ گئے" ہمارے خاموش رفیق سفر نے زبان کھولی۔ حیرت سے ہم نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ میل سے چیکٹے کنارے کی ترکی ٹوپی، شیروانی کی گھسی ہوئی آستینیں، میلا پاجامہ، پُرانے شوز اور انٹر کلاس کا سفر وہ ہماری حیرت کو سمجھ گیا:- "جی ہاں اپنی جائداد کا پیسہ پیسہ مگر (ٹھنڈے سانس کے ساتھ) ورثہ بھی ہمیشہ رحمت ہی نہیں ہوتا"

"بجا ہے"

"وہ اہل قلم تھے اور درجنوں کتابوں کے مُصنّف"

"خُوب! اُن کا اسم گرامی کیا تھا؟ شاید ہم ناآشنا نہ ہوں؟"

"استغفراللہ! کوئی آشنا نہیں ہوسکتا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں اُنکی کوئی کتاب پبلک کے ہاتھوں تک پہونچی؟ آپ ذرا سُنتے جائیں۔ یہ تصنیف ہی تو ہماری مصیبتوں کی جڑ ہے۔ یہ انکی کمزوری کیا جنون کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا۔

"دولت ان کو بھی ایک ماموں ہی سے غیر متوقع طور پر مل گئی تھی۔ اس سے پہلے وہ برسوں کتب خانہ عام کے کتاب دار تھے اور کتابیں اُن کے دل و دماغ میں رچ گئی تھیں۔ میری اور شاید آپ حضرات کی سمجھ سے بھی باہر ہے کہ ایک ۲۷ برس کا جوان یک بیک اتنی بڑی دولت چھپر پھاڑ کر اُس کے سر پر جا پڑے اور کبھی اس سے لُطف اندوز نہ ہو۔ کبھی قرینہ کا ایک جوڑا نہ پہنے۔ آپ کو شاید یقین نہ ہو وہ مرے ہیں تو اثاثہ میں ایک چاندی کی گھڑی تک نہ پائی گئی۔ اس دولت سے جو کچھ مصرف اُنہوں نے لیا صرف یہ تھا کہ شہر سے شہر اور محلہ سے محلہ کرایہ کا گھر بدلتے رہے۔ پندرہ بیس من کتابیں ایک مٹکا روشنائی ایک مربع میل بھر کاغذ، دو صندوق قلم اور جاذب اکھٹے کر لئے اور کتابیں لکھنا شروع کر دیں۔ دن رات خواہ کوئی موسم ہو اس کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ قریب ترین قرابتمندوں میں صرف ایک بہن تھی، میری ماں، اور میں اپنی ماں کا اکلوتا۔ سلسلۂ ذکور میں چچیرے بھائیوں کی اولاد سے صرف ایک لڑکا تھا۔ مگر وہ ماموں جان کے پاس لایا گیا تو خبر نہیں کیوں 'دُور دُور، دفع کرو، لے جاؤ میرے سامنے سے!' کا غُل مچا دیا۔ پھر بیچارے کو کبھی سامنا کرنے کی ہمت پڑی نہ ماموں نے کبھی اُسے یاد کیا۔ اب میدان میں صرف مَیں رہ گیا تھا۔ میری والدہ نہایت ہوشیار اور موقع شناس عورت تھیں۔ بھائی کے دل میں میرے لئے جگہ بناتی رہیں اور مجھے بھی اسی قسم کی تعلیم و تربیت ملتی رہی۔

ماموں جان کچھ عجب ہیئت و فطرت کے بُزرگ تھے۔ اب میں سوچتا ہوں تو اُس لونڈے کے متوحش اور خوفزدہ ہو جانے پر حیرت نہیں ہوتی۔ اُن کے سر کے بال جُدا جُدا کھڑے صرف کن پٹیوں پر۔ گدی اور چندیا خالی، ہو بہو چکڑے کی جاپانی گڑیا، گال پچکے، ناک ننھی سی، اُوپر کا لب بڑا اور موٹا، چہرہ زردی مائل، کرنجی آنکھیں عینک کے پیچھے، ہر وقت شب خوابی کے انگریزی طرز کے کپڑے، ڈھیلا پاجامہ، ڈھیلا کوٹ، منکی کیپ۔ باہر اگر نکلتے تو بند گلے کا گھٹنوں سے چھ انچ نیچا لمبا کوٹ، ایڑیوں تک لٹکی ہوئی ڈھیلی ڈھالی پتلون، سر پر ایک بڑی سی اور سیر ہیٹ۔

وہ ہمیشہ کسی مشہور مصنّف یا شاعر کے مولد یا مدفن پر یا اس کے آس پاس بود و باش اختیار کرتے۔ آخر میں وہ آگرہ کے

اُس مکان میں سکونت پذیر تھے جس کی زمین پر لوگوں نے بتا دیا تھا مرزا غالب مرحوم پیدا ہوتے تھے۔ ان کی تمام تصانیف مطبوعہ اور قلمی جن میں سے اکثر اُن کے عقیدے میں مرزا کے دستِ خاص کی تحریریں تھیں، اُن کے کتب خانہ کی زینت تھیں۔ قرآن مجید سے لیکر کریما اور قواعد بغدادی تک معروف وغیر معروف عربی و فارسی نظم و نثر کے قلمی تبرکات پر انہیں ناز تھا۔ اور ان پر مُنہ مانگی قیمت دیدیا کرتے۔ ایسے سوداگروں اور عیاروں کے پیٹ خوب بھرے۔

اس طرح قدیم مصنفوں کی ایک رُوحانی فضا تیار کرکے وہ خود لکھنے بیٹھے۔ وہ عرصہ تک سر سید اور حالی کے عاشق رہے۔ ان کا مقصود بھی قوم کی اصلاح تھا مگر اتنے بڑے پیمانے پر جو سر سید اور حالی کو خواب میں بھی خیال نہ گذرا ہوگا۔ دینِ حق، راہ راست، درسِ تاریخ، رُوحِ حیات، منزلِ آخر، اور درجنوں کتابیں نثر میں "تازیانہ، دیو تعصب، صورِ اسرافیل، ندائے غیب، اور بیسیوں مجموعے نظم میں اپنے صرفِ خاص سے چھپوائے"

میں نے ابھی اس کو گھورا ہی تھا اور کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ میرا مطلب سمجھ گیا۔

"ان میں سے کوئی کتاب آپ کی نظر سے نہیں گذری نہ اشتہار دیکھا ہوگا کسی نے نہیں دیکھا نہ کوئی کتاب پڑھی۔ یہاں تک کہ اخبارات اور جرائد نے رسید کے سوا کسی پر تنقید کی بھی پروا نہ کی۔ بھاڑے پر تقریظ لکھنے والوں نے بھی جواب دیدیا۔ اپنے حسابوں وہ نصف صدی قبل از وقت پیدا ہوئے تھے۔ وہ صبر سے وقت کے منتظر تھے۔ اکثر مجھ سے کہا کرتے "عزیزم وقت آئے گا جب ان خیالات کی قدر ہوگی۔ آج اقوام بے گڈریے کی منتشر بھیڑیں ہیں۔ مذہب، خون، رنگ، وطن کے راکشوں نے دُنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ اشتراکیت جمہوریت قیصریت، وطنیت، اور سرمایہ داری کی شکلوں میں فرعونیت، جبری بھرتی، جبری مزدوری، جبری قانون، جبری محصولات کی شکلوں میں چنگیزیت، بغاوت، جنگ، قحط، وبا، طلاق کے عذابوں سے دُنیا کبھی تو تنگ آئے گی، اُس وقت میرے معروضات سمجھ میں آئیں گے...

... میں صاف دیکھ رہا ہوں (آنکھیں بند کرکے) سیاہ بادل افق پر جمع ہو رہے ہیں، ٹھنڈی سانس کھینچکر چپ ہو جاتے ہیں گویا۔ ع

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

"کبھی وہ "مزدور سے خطاب" یا "مذبوحِ انسانیت" اپنی نظمیں خوش الحانی سے سُنانے کا مجھے حکم دیتے اور عطف و اضافت میں نشتر گربگی کے سبب سے میں اٹکتا یا ناموزوں پڑھتا تو وہ مطبوعہ بیاض مجھ سے لیکر خود گھر گھراتی آواز سے یوں پڑھتے جیسے کوئی تخت گھسیٹ رہا ہو۔

اکثر وہ آنکھیں بند کئے یوں تقریر فرمانے لگتے:۔

"بیٹا سعدن (سعدالدین) میں دیکھ رہا ہوں حملہ آوروں کو، اُن کی کمینگاہوں کو، خون آشامیوں کو، مظلوم مدافعوں کو، انکی بے دست و پائی، پھر انقلاب کو۔ یہ فتنہ برسات کے پتنگوں اور ٹڈیوں کی طرح دُنیا کے ایک گوشے سے اُٹھ رہا ہے جس کا کسی کو وہم نہیں اور دیکھتے دیکھتے رُوئے زمین پر چھائے جاتا ہے۔ تاریخ عالم بدلی جاتی ہے، نہیں، مٹی جاتی ہے۔ نیست و نابود ہوئی جاتی ہے اور نئی تاریخ اور جغرافیہ کی بسم اللہ ہو رہی ہے۔

مجھے دیکھو، میں کیا چاہتا ہوں۔ قوم کو نہیں، قوموں کو راہِ راست پر لانا۔ سعدن میں انہیں راستہ بتا سکتا ہوں۔ نہیں۔ بتاؤنگا اور امن و صلاح کی اُس بہشت میں پہونچا کر چھوڑونگا جہاں دودھ اور شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں"

"غرض وہ مجھے پاس بٹھا کر گھنٹوں اقوام، امن، صلاح و فلاح کی بکواس کیا کرتے۔ اماں کے حکم سے ہر اتوار کے اتوار تفریح و دلچسپی سے مُنہ موڑ کر بہترین لباس میں صاف ستھرا آراستہ ہو کر اپنے سگے ماموں کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا اور تمام دن اُن کا بزاخفش بنا رہتا۔

رفتہ رفتہ مَیں اُن کی بکواس کا خوگر ہو گیا۔ اکثر خوش مدے سے ہفتہ کے اور دن بھی اُن کے پاس جا نکلتا۔ یا بھیجا جاتا تو زیادہ خوش ہوتے۔ وہ سمجھنے لگے تھے یا یقین دلایا گیا تھا کہ دُنیا میں اُن کو کوئی سمجھا ہے تو مَیں۔ میرے سوا دُنیا میں اور کوئی ایسا بدنصیب تھا ہی کون جو اُن کے پاس پھٹکتا۔

دُنیا میں کہیں کسی شخص میں کوئی حرکت دیکھ پائی، اخبار میں کسی موجد، مصلح، مصنّف، شاعر، مدبّر، مفکّر، جانباز کا ذکر پڑھا اور اپنی تصانیف کی چند جلدیں اُس کے پاس بھیجدیں اور اصلاح اقوام و ملل پر تبادلۂ خیالات کے لئے گھر پر دعوت دی۔ ان میں سے نصف سے تو کوئی جواب ہی موصول نہ ہوتا اور کسی نے رسید دی تو آیا نہیں۔ آپ کو شامتِ اعمال سے کبھی اُن کے کمرے میں داخل ہونے کا اتفاق ہوتا تو دیکھتے کو چوں اور کرسیوں پر، سر ـــــ، راجہ ـــــ، نواب ـــــ، دیش بندھو ـــــ، رئیس الاحرار ـــــ، ڈکٹیٹر ـــــ، صدر جمہوریہ ـــــ، وزیر الممالک ـــــ، کے نام لکھی ہوئی چٹھیوں کا پشتارہ، فرش پر پُرزوں، اخبارات، رسائل کا ڈھیر، آتشدان پر چائے کی طشتری پیالی، میز پر آدھے کھائے توس کے ریزے، داہنے بائیں کرسیوں کے اُوپر نیچے کتابیں، اور اُن کے درمیان بیٹھے یہ قلم گھسے جا رہے ہیں اور کاغذ رنگے جاتے ہیں۔

اس درمیان میں کبھی مجھے دیکھکر کاغذ پر نظر جمائے بڑبڑاتے: خیال جیسا ٹھوس ہو ویسا ہی طرزِ بیان چاہیے۔ کیوں؟" اور خیریت یوں پوچھتے: کہو عصر جدید کا کیا حال ہے؟" یعنی مَیں کیسا ہوں۔ مجھے وہ عصر جدید کا نمونہ بنا رہے تھے۔

ماموں جان اپنے خیالات کا اظہار مجھی سے کیا کرتے۔ دوسرا کوئی اُن کے پاس پھٹکتا ہی نہ تھا اور کوئی مل بھی جاتا تو اُس سے کُھلکر باتیں نہ کرتے یا کر نہ سکتے۔ مجھے اپنی کُل تصانیف عنایت فرمائیں۔ چار چار سو صفحوں کی ایک ایک جلد، نہایت خوبصورت بندھی ہوئی اور بہترین چھپی ہوئی۔

آخری سے پہلی بار جو مَیں اُن سے ملا ہوں تو وہ کمزور اور کچھ بیمار تھے۔ ایسی علامتیں میں زیادہ غور سے دیکھا کرتا۔ کم سے کم اُن کی کتابوں سے زیادہ توجہ اُن پر صرف کرتا تھا۔ فرمانے لگے:۔

"سعدن خوب آئے ـــ بیٹے یہ ہے میری آخری تصنیف۔ اندھی اور بہری اقوامِ عالم سے میرا آخری خطاب" ساتھ ہی اُنکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ قوم کی بے حسی اور اپنی آواز کی ناشنوائی پر اکثر رو دیا کرتے۔ "سعدن میں اب سوچنے لگا ہوں کہ موجودہ نسل کی بے حسی پر مَیں اعتدال سے زیادہ سخت رہا ہوں۔ ضرورت ذرا ہمدردانہ لہجے، پیار، چمکار اور کچھ مدّھم روشنی کی معلوم ہوتی ہے۔ میری زبردست برقی شعاعیں ان کی آنکھوں کو چکا چوند کرتی ہیں"

اس کے بعد عمر میں پہلی بار اپنی ناکامی کا اقرار کیا۔ مَیں سمجھ گیا اب کوئی چیز اُن کو زندہ رکھنے والی باقی نہیں۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد رُک رُک کر بولے:۔

"سعدن مَیں احمق تھا۔ تمام عمر بیکار بکواس میں گذار دی۔ خدا جانتا ہے اب تک خود فریبی میں مبتلا رہا۔ کبھی کبر نفس اور غرور پر باطن کی

بری نہیں رہا۔ یہی جملے دہراتے دہراتے رُکے اور کانپتے ہاتھ سے آخری خطاب، میری طرف بڑھائی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے تعظیم کیساتھ لیلی۔ یہ ساری جزئیات ذرا ذرا مجھے اس لئے یاد ہیں کہ میں نے گھر پہونچکر اماں کے سامنے ان سب کو دُہرایا بلکہ ایکٹ کیا تھا۔ خیر ماموں نے کہا: "اب یہ کتاب (' یہ ' پر زور دیکر) لے جاؤ اور پڑھو۔ یہ میرے آخری الفاظ ہیں۔ مَیں اپنی تمام جائداد تمہارے لئے چھوڑے جاتا ہوں۔ خدا کرے میری کامیابی 'تم' دیکھو" وہ کھانسنے لگے۔

آخری بار جو آخری زیارت کو مَیں بلایا گیا ہوں، مجھے خوب یاد ہے، باہر اُن کی ماما کی چھوکری سے حسب معمول مذاق کرتا، ہنستا بولتا اندر گیا۔ اُن کی نبض تیزی سے ڈوبی جاتی تھی مگر فریبِ نفس نے آخر دم تک پیچھا نہ چھوڑا۔

انتہائی نقاہت سے "اُسے ــــ پڑھا؟"

"جی، مَیں تمام رات بیٹھا پڑھتا رہا اور ختم کرکے اُٹھا" میں نے بلند آواز سے کان میں کہا۔

ماموں جان بولے "گو یہ آخری ہے مگر بہترین اور قوی ترین، شیریں ترین" اُن کے لبوں پر تبسم نمودار ہوا جو اُن کے لئے انوکھی چیز تھی۔ میرا ہاتھ دبانے کی کوشش کی اور چپکے ہوگئے۔ جن الفاظ سے وہ خوش ہوگئے تھے میں نے پھر دُہرائے "سب سے عمدہ، دلیرانہ، زبردست تصنیف" مگر انہوں نے جواب نہ دیا۔ دروازے کے پاس سے چھوکری کی صرف کھی کھلکھل کھی کھلکھل ہنسی میں سُن رہا تھا۔ اکثر وہ اُن کی عجیب حرکات کا میرے سامنے مذاق اُڑایا کرتی تھی۔ کمبخت نے اس وقت بھی یہ جرأت کی۔ سچ ہے دولت سب کچھ خرید سکتی ہے مگر سچی محبت اور عزت نہیں خرید سکتی۔

ماموں کے چہرے پر جو پھر نظر کی تو آنکھیں پتھرا چکی تھیں، منکا ڈھل چکا تھا مگر لب پر وہ آخری تبسم موجود تھا۔ مرے تو ناکام، نامراد، محرومِ تمنا، مگر یہی آخری تبسم اُن کی عمر بھر کی کشمکش، محنت ومشقت اور خیالی قربانیوں کی قیمت تھی۔

آپ دل میں سوچتے ہونگے کلمہ، تلقین، یٰسین؟ مگر آپ اُن کی کتابیں پڑھتے تو سمجھ لیتے کہ وہ اصلاحِ عالم کی تعلیم کے ساتھ ایک خاص مجموعۂ مذاہب کے مبلغ بھی تھے۔ ایک معجونِ مرکب سی چیز تھی اور اپنے طور پر اُس کا استعمال کرلیا کرتے تھے سو کر چکے ہونگے۔

میرے اور زیادہ تر اماں کے جوش وخروش سے بڑی دھوم سے جنازہ اُٹھا۔ پختہ قبر بنی۔ فاتحہ، چہارم سے فرصت ملی تو وصیت نامہ کی تلاش ہوئی۔ میزوں کی درازیں، الماریاں، کتابیں، صندوق سب اُلٹ ڈالے، گبھے پھاڑ ڈالے، دلے توڑ ڈالے، دیواروں کا پلاسٹر اور فرش ٹھونک ٹھونک کر خلا کا اندازہ لگایا اور اُکھاڑ ڈالا۔ باغ کا چپہ چپہ کھود ڈالا، وصیت نامہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ نوکر، ماما، چھوکری سب نے شہادت دی کہ سرکار نے دستاویز کی قسم کی کوئی چیز لکھی تھی ضرور مگر کہاں رکھی، کسی کو علم نہیں۔

پانچویں روز ایک وکیل صاحب تشریف لائے اور ایک پرانا وصیت نامہ نکالا، جو مرحوم نے اماں سے ذرا سی ناراضگی کے موقع پر تحریر کیا تھا اور اُسی چچیرے درچچیرے بھائی کے بیٹے کے حق میں تھا، جسے وہ کبھی دور دفان کر چکے تھے، جو ایک منٹ ماموں جان کی گفتگو سننے کی مجال رکھتا تھا نہ تحمل۔ مَیں اُن کی صبر آزما بکواس کی کوفت اُٹھانے پر مفلوک الحال پڑا پھرتا ہوں اور وہ سانڈ بنا بلا درد سر گلچھرے اُڑاتا رہا۔ شراب، جوئے، عورت میں سنِ بلوغ سے لیکر ۱۳ سال کی عمر کے اندر دس سال میں ساری دولت پھونک دی۔ اب تین سال سے پاگل خانے میں ہے۔

میں فلاکت میں مبتلا ہوگیا۔ ورثہ کے خواب کے سوا میں نے کوئی صلاحیت حاصل نہیں کی۔ میری زندگی کے سارے نقشے موقوف تھے

ماموں کی موت پر، جب میں واقعی زندگی شروع کرنے کو تھا۔ جب سے میں کسی طرح دن کاٹتا رہا۔ اب جو عام مالی تنگی اور کساد بازاری کے دن آگئے اور پریشانیوں میں اضافہ ہوگیا، میں نے ضروری حاجتوں کے لئے غیر ضروری اثاثہ فروخت کرنے کا ارادہ کیا۔ ان میں سب سے نمایاں ماموں کی تصانیف کی خوبصورت جلدوں کی قطاریں تھیں جنکو کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا، پڑیاں باندھنے کو بھی نہیں۔ ماموں سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ عمر بھر ان کو جدا نہ کروں گا۔ مگر ہوا کیا؟ وہ آخری کتاب فرش پر ہی پڑی رہی۔ جلکر لگائی جو میں نے ٹھوکر تو ہوا میں اچھلتی ہوئی دور جا گری اور ساتھ ہی ایک کاغذ نکلکر اڑا۔ پوچھئے وہ کاغذ کیا تھا؟ وہی گمشدہ وصیت نامہ!"

ہمارا رفیق سفر تھوڑی دیر گاڑی سے باہر میدان میں گھورتا رہا اور پھر آہستہ بولا" واقعہ یہ ہے کہ وہ کتاب میں نے کھولی ہی نہ تھی، ورق تک نہ کاٹے تھے"، جیب ٹٹول کر ایک کاغذ نکالا" یہ بے کٹے ورق کی تہ میں پڑا تھا۔ سچ پوچھئے تو ماموں جان کا بھی قصور نہ تھا۔ ان کو یقین تھا کہ میں گھر پہونچتے ہی کتاب کو پڑھنے بیٹھ جاؤں گا اور یہی اُن سے کہہ بھی دیا تھا"

پھر وہ میدان میں نظر گاڑے ہوئے بولا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک دوسرے کو سمجھنے میں کتنی غلطی کر سکتا ہے۔ خود فریبی میں وہ بھی مبتلا تھے اور میں بھی۔

(ماخوذ، مقلوب، مضموم، حق اخذ و قلب و ضم محفوظ)

محمد مسلم

اے ساقی!

ماہِ تاباں ہے ابھی مست خرام اے ساقی! ۔۔۔ اور کچھ دیر رہے گردش جام اے ساقی

عہدِ بیتاب میں یہ سست مقالی کبتک؟ ۔۔۔ اپنے رندوں کو بنا شعلہ کلام اے ساقی

بس گئی ہو رگ و پے میں تری صہبائے نظر ۔۔۔ حاصل عمر ہے یہ شرب مدام اے ساقی

میں اسی واسطے اس سمت چلا آتا ہوں ۔۔۔ تری محفل میں نہیں قید ستام اے ساقی

ہوشمندوں کو پلانا ہے فقط کام ترا ۔۔۔ پی کے گرنے جو لگیں انکو نہ تھام اے ساقی

کیف و مستی کیلئے مے کی ضرورت کیا ہے ۔۔۔ ترے مستوں کو ہے کافی ترا نام اے ساقی

میکدہ دیر و حرم بن کے نہ رہ جائے کہیں ۔۔۔ لطف مے خاص ہے کر اسکو نہ عام اے ساقی

فخر کی بات نہیں، تیری عنایت کی قسم
لوح ہستی پہ ہوں اک نقشِ دوام اے ساقی

سکندر علی وجد

اُس کوچے میں

بازار میں مظفر کی دُکان اُس کوچے کے عین مقابل میں تھی جہاں شام کو مزدور لوگ کھانے کمانے اور کمانے کھانے کے چکر سے اُکتا کر تھوڑی سی دل لگی خریدنے جاتے ہیں۔ دُکان پر ایک بورڈ پر "ڈاکٹر ایم مظفر دندان ساز" لکھا ہوا تھا۔ دروازوں اور دیواروں پر مختلف سائز کی تصاویر لٹک رہی تھیں۔ جن میں دانت ہونٹ اور مسوڑوں کے ڈراؤنے منظر تھے۔ اندر دو چار الماریوں میں دانتوں کے متعلق سامان چُنا ہوا تھا۔ بائیں طرف چند ایک خوفناک مشینیں کھڑی تھیں۔ جن کو دیکھکر سلسلاتے ہوئے دانت فوراً دُکھنا بند کر دیتے۔

مظفر شیشے کی الماری کے پاس کھڑا زنبور صاف کر رہا تھا۔ حمید کُرسی پر بیٹھا بازار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بازار میں دُھندلی سی غبار آلودہ چاندنی میں بجلی کی بتیاں ٹمٹا رہی تھیں۔

سامنے گھر سے ایک مدھم سی چیخ سُنائی دی۔

مظفر کے ہاتھ سے زنبور گر گیا۔ ایک دھماکے سے الماری کا شیشہ چُور چُور ہو کر بکھر گیا۔

حمید چونک پڑا "کیوں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں" مظفر نے گھبرا کر کہا "ویسے ہی ہاتھ سے زنبور پھسل گیا" اُس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور دل دھڑک رہا تھا۔

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔

"تم یہ آواز سُن رہے ہو؟" مظفر نے رُکتے ہوئے کہا۔

"شاید کوئی چیخ رہا ہے"

"ہوں۔ یہ سامنے والے مکان میں"

"وہی دُبلی پتلی سی لڑکی جو اِس نکڑ پر بیٹھتی ہے؟"

"ہاں۔ وہی"

"بیمار ہے؟"

"نہیں ——— کوئی پیٹ رہا ہے"

"پیٹ رہا ہے؟"

"ہاں"

"کیوں؟"

"خُدا جانے کیوں؟"

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔

دُور ہوا درختوں کی ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ فضا غبار سے بھری ہوئی تھی۔ اس گدلی سی چاندنی میں بجلی کی بتیاں ٹمٹانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ سامنے پنواڑی کی دُکان پر دو ایک لوگ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سُنائی دیتی اور ان مدھم چیخوں کو اور بھی مدھم کر دیتی۔ حمید بیٹھا غور سے سُن رہا تھا۔

مظفر۔ (جیسے وہ اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔) "یہ انسان کی انتہائی ذلت ہے۔ پیٹ بھرنے کی خاطر لوگوں سے پٹنا۔ کس قدر ذلت ہے" اُسکا مُنہ نفرت اور غصے سے دھمک رہا تھا ——— "جو کوئی آتا ہے وہ اس کو پیٹتا ہے۔ مجھے تو اس عورت پر ترس آتا ہے"

"ترس! اگر تم یوں لوگوں پر ترس کھانے لگے تو تمہارا کوئی علاج نہیں! ترس کھانا خودکشی سے کم نہیں"

"تم نے اُسے دیکھا بھی ہے؟"

"کسے اس لڑکی کو؟"

"ہاں"

"بے بس نیم جان سی ہے"

"ہوں"

مقابل کے مکان کا دروازہ کھلا۔ ایک دُبلا پتلا سا مرد باہر نکلا۔ اور لاپرواہی سے دُکان کے سامنے سے گذر گیا۔ اُس کی بھویں تنی ہوئی تھیں چھاتی بھنچی ہوئی تھی۔

"دیکھا تم نے؟"

"یہی اُسے پیٹ رہا تھا؟"

"ہاں۔ کس قدر بدصورت شکل ہے" مظفر نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا۔

"شاید اسی نے اُسے یہاں بٹھا رکھا ہے۔ کیا نام ہے اُس کا؟"

"چاند!"

مظفر کو اُس کوچے سے سخت نفرت تھی۔ جب اُس نے وہاں دُکان بنوائی تھی تو اُس کوچے کا وہاں وجود نہ تھا۔ پھر خدا جانے وہ کہاں کہاں سے آ گئیں۔ حتیٰ کہ وہ جگہ اُن کے لئے مخصوص ہو گئی۔

شروع شروع میں تو جب کبھی اُس کی نظر اُدھر پڑ جاتی تو وہ "لاحول" پڑھ کر الماری میں اپنے اوزاروں کا جائزہ لینا شروع کر دیتا۔ اور حمید اُسے اس قرب پر چھیڑتا تو وہ غصے سے لال ہو جاتا۔ پھر اُسے یہ سُوجھی کہ اُسے تو اُس صراطِ مستقیم سے گری ہوئی مخلوق کو دیکھ کر عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ مگر اس کے باوجود اُس نے کبھی آنکھ بھر کر اُس کوچے کی طرف نہ دیکھا۔ شاید وہ ڈرتا تھا کہ کہیں عبرت حاصل کرتے کرتے وہ یہ نہ بھول جائے کہ وہ محض عبرت حاصل کرنے کے لئے دیکھ رہا ہے۔ یا جو نفرت اُس کوچے کے متعلق اُس نے دل میں پال رکھی تھی وہ فوت نہ ہو جائے۔

بہرصورت اُسے اُس کوچے والیوں سے سخت نفرت تھی جو شام کو بھولے بھالے مزدوروں کو دام میں پھنساتی ہیں۔ یا صبح کی روٹی کیلئے مزدوروں کا کھلونا بننا گوارہ کرتی ہیں۔ یا دُکھے ہوئے دلوں کیلئے ہمدردی بیچتی ہیں۔ یا مظلوم مزدوروں کی تشنہ کرنے کی آرزو کو پورا کرتی ہیں۔

شام کو اُس صراطِ مستقیم سے گری ہوئی مخلوق کے کوچے میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے اور جاذبیت پیدا کرنے کی اُمید پر وہ لٹی ہوئی شکلیں اپنے ڈھانچوں میں رنگ بھرنا شروع کر دیتیں۔ اور پھر جب سُورج چُھپ جاتا۔ جسے بلا امتیاز ہر چہرے پر تنقید کرنے کی بے درد عادت ہے۔ تو وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی چوکیوں پر لالٹین کی دُھندلی مگر ہمدرد روشنی میں جو بوسیدہ کپڑوں میں بھی ایک دُھندلی سی دمک پیدا کر دیتی ہے مزدوروں کے انتظار میں آ بیٹھتیں۔

مزدور دن بھر کی مشقت کے بعد وہاں آ جاتے۔ اور یوں ہنستے بولتے اور آنکھیں چمکاتے ہوئے وہاں سے گذرتے جیسے وہ کسی برات کے ساتھ جا رہے ہوں۔ جیسے وہ غم و فکر سے واقف ہی نہ ہوں۔ اُنہیں یہ قطعی فراموش ہو جاتا کہ زندگی اُن کے لئے مسلسل مشقت ہے۔ یا شاید اسی مشقت اور بے بسی کے احساس کو بھولنے کیلئے وہ وہاں آتے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اللہ میاں کی دُنیا میں وہ بھی کچھ حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن سے گری ہوئی مخلوق بھی ہے۔ جسے وہ حقارت کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں، خرید سکتے ہیں۔ اپنی خواہشات کے پاؤں تلے روند سکتے ہیں۔ جن کے وہ رزّاق بن سکتے ہیں۔

اکثر مظفر کو یہ احساس ہوتا کہ وہ اُدھر دیکھ رہا ہے۔ اُس وقت اُس کا چہرہ نفرت سے سُرخ ہو جاتا۔ اور اُس کا ماتھا سمٹ کر گتھیاں بنا لیتا۔ اور وہ "لاحول" پڑھ کر کسی زنبور کو صاف کرنے یا کسی تصویر کو سیدھا کرنے میں شدت سے مصروف ہو جاتا۔

یا وہ آپ ہی آپ بولنے لگتا۔ "اب مجھے کیا کرنا ہے۔ ہاں۔ ٹھیک ہے۔ توبہ کس قدر گرمی ہے" اُس وقت اُس کا جی چاہتا کہ وہ دُکان بند کر کے دُور بھاگ جائے۔ اور اس گدلی چاندنی میں کسی باغ میں کسی گلاب کی جھاڑی تلے بیٹھ کر رو پڑے۔ پھر وہ دکان میں چاروں طرف گھومتا۔ الماریاں کھولتا اور بند کر دیتا۔ قلم کو یہاں سے

اٹھاکر وہاں رکھ دیتا۔ اور آخر پھر کرسی پر آبیٹھتا اور بیسیوں دفعہ سامنے دیوار پر سینما کا اشتہار غور سے پڑھتا —— حتیٰ کہ اُسے پھر احساس ہوتا کہ وہ اُدھر دیکھ رہا ہے۔

چاند پھر اپنی چوکی پر آبیٹھی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک گیند سی تھی جسے وہ اُچھال رہی تھی۔ وہ دبی آواز میں کچھ گنگنا رہی تھی، جیسے وہ اُس گیند اور گیت کی مدد سے کچھ بھولنے کی کوشش کررہی ہو۔ اُس کے چہرے پر انتہائی بےبسی چھائی ہوئی تھی جب کبھی کوئی اُسے دیکھتا تو وہ اور بھی سہم جاتی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو سہم کر اور بھی حسین ہوجاتی ہیں۔

اُسے دیکھکر ایک معمولی سے تھکے ہارے مرد کے دل میں بھی یہ احساس بیدار ہوجاتا کہ میں ایک زبردست مرد ہوں اسکا سینہ تن جاتا اور اُس کے ماتھے پر "مردمی وقار" اُبھر آتا۔

مظفر ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے اکھٹے کرنے میں شدت سے مصروف تھا۔ وہ ایسا محسوس کررہا تھا جیسے حمید کی موجودگی تمام کمرے میں چھائی ہوئی ہو۔ وہ اُس کا بوجھ اپنی گردن پر محسوس کررہا تھا۔ اُس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ اور وہ اِدھر اُدھر مڑ نہ سکتی تھی۔

حمید بیٹھا غور سے چاند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ خود بخود تبسم سے کھل رہے تھے۔ جیسے وہ کوئی لطیفہ سُن رہا ہو، اور اُس کی آنکھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چاندنی میں کوئی گا رہا ہو۔

"ابھی جوان ہی ہے" حمید نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"کون؟"

"یہی لنگڑ والی لڑکی۔ کیا نام ہے اسکا —— چاند"

"جوان" یہ بات اُسے کبھی نہ سوجھی تھی۔ "بیچاری" اُسنے حقارت سے کہا اور چپ ہوگیا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اسکے متعلق کیا کہے۔

"تم نے کبھی اُس سے بات بھی کی ہے؟"

"مَیں نے؟" اُس نے حیرانی سے کہا۔

"کیوں اس میں کوئی بُری بات"

"بُری بات!" وہ سخت پریشان ہورہا تھا۔

"تمہاری بھی اچھی ہمدردی ہے" حمید نے چھیڑ کر کہا۔

"جو الماریوں کے شیشے پھوڑنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی"

مظفر نے پریشانی سے ٹوٹے ہوئے شیشے کی طرف دیکھا۔

"چلو چلکر اُس سے پوچھیں تو سہی۔ چلو گے؟"

مظفر نے بیساختہ سامنے پنواڑی کی دوکان کی طرف دیکھا۔ جہاں دو ایک آدمی بیٹھے باتیں کررہے تھے "یہ کیا دیوانگی ہے؟" اُسنے حمید کی طرف کی طرف ملامت بھری نگاہ ڈالی۔

"تم اُس سے ڈرتے تو نہیں؟"

"مَیں۔ مَیں کیوں ڈرنے لگا!" اُس نے ایک جُھرجُھری لی۔

"چلو تو" حمید نے اُٹھکر اُس کا بازو پکڑ لیا اور اُسے گھسیٹ کر باہر لے گیا۔

"تم بیمار تو نہیں ہو" حمید نے چاند سے پوچھا۔

چاند کی دعوتی مُسکراہٹ گھورنے میں بدل گئی۔ مگر وہ گھور نہیں سکتی تھی۔

مظفر نے حمید کو ملامت اور غصّے سے دیکھا۔

"نہیں، نہیں" حمید نے مُسکراتے ہوئے کہا "تم ابھی ابھی چیخ رہی تھیں نا۔ میرا مطلب ہے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں۔ اگر ہم تمہاری مدد کرسکتے ہوں تو"

"آپ کی مہربانی ہے۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں"

اُس نے مُسکرانے کی کوشش کی مگر اُس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں "آئیے بیٹھیے"

مظفر کی نگاہیں اُس کمرے میں آوارہ تھیں، جیسے اُسے معلوم نہ ہو کہ اُسے کس طرف دیکھنا ہے۔

"یہ کون آدمی تھا جو ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے؟"

حمید نے آنکھوں میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ تمہیں اس بیدردی سے کیوں پیٹتا ہے؟"

"آپ اس بات کو پوچھ کر کیا لیں گے۔ جانے دیجئے۔"

"پھر بھی بتاؤ تو سہی۔"

"میں اُسکی باندی ہوں۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔"

"مگر وہ تمہیں پیٹتا کیوں ہے؟"

"اُس کا خیال ہے کہ میں پیسے چراتی ہوں۔"

مظفر نے بےچینی سے کروٹ لی۔

"تم اپنی کمائی اُسے دیتی ہو؟"

چاند نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مگر تم ایسی زندگی کس طرح گوارہ کرتی ہو؟" حمید نے بھری ہوئی آواز میں کہا۔

چاند نے ایک بے بس سی مسکراہٹ کی کوشش کی۔ "ہاں۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ہمیں اِس زندگی سے دلچسپی ہے ـــــ مگر ـــــ" اُس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ڈھلک آئے۔

"ہمیں آپ سے بہت ہمدردی ہے۔"

اور وہ خاموش ہو گئے۔ مظفر کا دل دھڑک دھڑک کر اُس مختصر سے کمرے میں گونج رہا تھا۔ اس کی نگاہیں چاند کے چہرے کی بے بسی پر جمی ہوئی تھیں۔

چاند نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہے ـــــ"

حمید نے مظفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم انہیں جانتی ہی ہوگی۔ یہ میرے دوست ڈاکٹر صاحب ہیں۔" چاند نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ان کو تم سے بہت ہی ہمدردی ہے۔"

مظفر ٹھٹک سا گیا۔ اُس نے حمید کو ملامت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"تمہیں چلاتے ہوئے سُنکر یہ ہمدردی کے مارے دکان کے شیشے پھوڑتے رہتے ہیں۔"

چاند مسکرا دی۔ وہ چُپ چاپ مظفر کو دیکھ رہی تھی۔ اور اُس کی آنکھوں میں بے بسی چپکے چپکے اُسے کسی بات کی دعوت دے رہی تھی۔ مظفر سخت پریشان تھا اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ "آپ چُپ کیوں ہیں ڈاکٹر صاحب۔" چاند نے مظفر سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میں۔ میں۔ نہیں۔ میرا مطلب ہے۔"

"آپکی بڑی مہربانی ہے۔" وہ زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔

حمید نے مظفر کی گھبراہٹ محسوس کر کے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ "تو میرا مطلب ہے۔ تم واقعی اس زندگی کو چھوڑنے کیلئے تیار ہو۔ اگر ـــــ"

"اگر ـــــ" چاند نے ایک زہر خند کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں اگر ـــــ" اور اُس نے مظفر کی طرف ایک مظلوم نگاہ ڈالی۔ اُس نگاہ کو دیکھکر مظفر نے یوں محسوس کیا جیسے وہ دُنیا کی بڑی سے بڑی مشکل کو بھی برداشت کر سکتا ہو۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ "چلو چلیں دیر ہو چکی ہے۔" وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"اگر تم کو ہماری مدد کی ضرورت ہو۔" حمید نے اپنی لکڑی سنبھالتے ہوئے کہا۔

"آپ کی مہربانی ہے۔"

چاند نے اُنہیں راستہ دکھانے کیلئے روشنی اُٹھانے کو ہاتھ بڑھایا۔ اُس کے بازو پر بیت کا ایک بڑا سا نشان تھا جس سے خون رس رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" حمید نے گھبرا کر پوچھا۔

"ویسے ہی چوٹ لگ گئی تھی۔"

مظفر کی نگاہوں میں وہ کمرہ گھوم رہا تھا — "میں۔ جاتا ہوں۔ آپ ٹھہریئے۔ میں ابھی ٹنچر لے آتا ہوں — میرا مطلب ہے، دوائی — یہاں — دکان سے۔"

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔" حمید نے مظفر سے مصافحہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

مگر مظفر کو اُس وقت یہ احساس نہیں تھا کہ حمید جا رہا ہے یا پنواڑی کی دکان پر بیٹھے ہوئے لوگ اُسے یوں بھاگتے ہوئے دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ یا وہ اُس صراط مستقیم سے گری ہوئی مخلوق سے عبرت حاصل کر رہا ہے۔ اس کا دماغ شل ہو چکا تھا۔ اور اسکا دل دھڑک دھڑک کر اُس سے کچھ کہہ رہا تھا۔

مظفر روئی سے اُس کے بازو پر دوائی لگا رہا تھا، اسکی اُنگلیاں اُس دُبلے سے بازو کی گرمی محسوس کر رہی تھیں۔ اُس کی نگاہیں بازو سے پھسل اس کے جسم پر جا پڑتیں جہاں قمیص کی سلوٹیں اُبھر اُبھر کر کسی چھپے ہوئے مدوجزر کا اظہار کر رہی تھیں۔ اور وہ چوری چوری اُسے دیکھ رہا تھا۔

چاند اُس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی جیسے اس چہرے کے اُتار چڑھاؤ میں وہ اپنا مستقبل دیکھ رہی ہو۔

"آپ کو کس قدر تکلیف ہے۔"

"نہیں تکلیف تو نہیں ویسے ہی خراشیں سی ہیں۔"

"مگر تم اس زندگی کو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟"

"چھوڑ کیسے سکتی ہوں؟"

"کیوں تم اُس کی زر خرید ہو؟"

"ہاں میں دو سو روپے پر بک چکی ہوں۔"

"دو سو روپے!" وہ کسی سوچ میں پڑ گیا — "اچھا اگر تمہیں دو سو روپے مل جائیں تو؟ پھر تم آزاد ہو جاؤ گی؟"

"ہاں۔ مگر میں کوئی کام نہیں جانتی۔"

"تم اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں چلی جانا۔"

"رشتہ دار! میرا تو کوئی بھی نہیں۔ بس یہی ایک جان ہے جسے میں اپنا کہہ سکتی ہوں۔" اُس نے اپنے پاؤں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

مظفر نے اُس کے پاؤں کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک سیاہ بلی بیٹھی اُسے گھور رہی تھی۔

وہ خاموش ہو گیا — "تم آزاد ہو جاؤ گی تو تم کسی سے شادی کر لینا۔"

"شادی!" وہ ہنس پڑی۔ "مجھ سے کون شادی کرے گا؟"

مظفر کا دل خواہ مخواہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ جیسے کسی نے اُسے چڑا دیا ہو۔ "تم ایسی ذلیل زندگی کیسے بسر کر سکتی ہو — تمہارے دل میں احساس نہیں۔ تم خود اپنے دل سے واقف نہیں یہ ذلت کی انتہا ہے۔"

چاند اُسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ خوف سے یا خدا جانے خوشی سے۔ مظفر کو غصہ چڑھ رہا تھا۔ خدا جانے کیوں۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اُسکے منہ پر ایک تھپڑ مار دے یا خود کھڑکی سے کود پڑے۔

"میں جاتا ہوں۔ بتی کی ضرورت نہیں میں چلا جاؤنگا۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے۔" چاند نے چونک کر کہا۔ جیسے وہ کوئی رنگین خواب دیکھ کر جاگ اُٹھی ہو۔ مگر مظفر جا چکا تھا۔

شام کو مظفر سخت پریشان تھا۔ بن دیکھے وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ نکڑ پر چاند بیٹھی اُس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے تیسری دفعہ تصویروں کو ٹھیک کیا۔ زنبور کو صاف کیا اور الماریوں کو خدا جانے کس لئے کھولا اور بند کیا۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کوئی اہم بات بھول چکا ہو۔ جسے یاد کرنا

اشد ضروری ہو۔ اُس نے اپنی کُرسی کو موڑ لیا اور ایک کتاب پڑھنے بیٹھ گیا ——— اُس نے دیکھا کہ وہ سامنے دیوار پر سینما کے اشتہار کو گھُور رہا ہے۔

سامنے وہی دُبلا پتلا مرد چاند کی طرف جا رہا تھا۔

مظفر اُٹھ بیٹھا "ہاں ہاں مجھے تو حمید کے ساتھ سینما جانا ہے۔ دوسرا شو، بہت تھوڑا وقت باقی ہے" اُس نے دُکان بند کر دی۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک سہمی ہوئی سی شکل آکھڑی ہوئی۔ اُس کی آنکھیں اُسے بُلا رہی تھیں "لاحول ولاقوت۔ ذلیل ہے تو ہوا کرے۔ مجھے کیا" وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا جا رہا تھا۔ جیسے وہ خاموشی سے ڈرتا ہو ——— "توبہ کس قدر گرمی ہے ——— یہ کُتے خدا جانے کیوں بھونکتے ہیں؟ ——— اِس شہر میں کتنے کتے ہیں!!"

"حامد تو کہتا ہے کہ میں نے اپنی آنکھ سے اُسے وہاں سے نکلتے دیکھا ہے" مظفر کے باپ نے کہا۔

"مگر اباجی میں کب کہتا ہوں کہ میں وہاں نہیں گیا اُس بیچاری کو تکلیف تھی۔ میں اُسے دوائی دینے گیا تھا۔ اس میں کیا بُری بات ہے"

"مگر بیٹا لوگوں کو تو یہ معلوم نہیں کہ تم وہاں دوائی دینے گئے تھے۔ وہ تو یہ سمجھتے ہیں کہ تم وہاں گئے تھے" مظفر کے والد نے الماری میں سامان کو گھُورتے ہوئے کہا۔ اُن کی نگاہیں فرش پر اِدھر اُدھر آوارہ تھیں جیسے اپنی تسکین کیلئے یا سہارا لینے کیلئے کسی چیز کو تلاش کر رہی ہوں۔

"لوگ!" مظفر نے دانت پیستے ہوئے کہا "لوگ تو اندھے ہیں۔ کمینے۔ آپ حمید سے پوچھ لیجئے"

"نہیں بیٹا" اُس کے باپ نے کھانستے ہوئے کہا۔ جیسے وہ مظفر کے الفاظ اپنی کھانسی سے ناپید کر دینا چاہتے ہوں۔ جیسے وہ لوگوں کے متعلق ایسے کلمات سُننا نہ چاہتے ہوں۔ شاید

اس لئے کہ اُنہیں لوگوں سے اتفاق تھا۔ "حمید کی اور بات ہے۔ تم ہمشیرہ کے سُسرال والوں کو تو جانتے ہی ہو۔ وہ تو صرف بہانا ہی چاہتے ہیں۔ میں نے تو سُنا ہے کہ تم اُس عورت سے ——— میرا مطلب ہے۔ یعنی ایسی عورتوں سے ہمدردی کرنا بھی گُناہ ہے"

"آپ لوگوں کی باتوں پر یقین کرتے ہیں۔ اس دُنیا میں لوگ کیا کہیں گے، کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ میں کوئی بچہ نہیں ——— اگر مجھے اُس لڑکی سے کچھ ہے تو میں اُس سے نکاح کر سکتا ہوں۔ میری مرضی بھی کوئی چیز ہے۔ مجھے لوگوں کی پروا نہیں۔ میں دیکھونگا لوگ کیا کہیں گے"

اُس شام کو وہ سکون سا محسوس کر رہا تھا۔ سامنے چاند یوں بیٹھی تھی جیسے وہ مظفر کو قطعی طور پر نہ دیکھ رہی ہو۔ اتنی دُور ہونے کے باوجود اُس کا انداز ایسی بے بسی سے بھرا تھا کہ مظفر اپنے دل ہی دل میں اُس پر ترس کھا رہا تھا۔

ایک چھوٹا سا لڑکا اُس کے پاس آیا "چاند دوائی مانگتی ہے۔ کہتی ہے تمہاری بڑی مہربانی ہوگی"

"دوائی۔ کیوں اُسے تکلیف ہے۔ اچھا۔ تم جاؤ۔ میں دوائی لیکر آتا ہوں"

وہ اُٹھ بیٹھا۔ اُسکی طبیعت پریشان سی ہو رہی تھی۔

پنواڑی کی دُکان پر لوگ اُس کی طرف گھُور رہے تھے۔

"پھر کیا ہے" اُس نے دل میں کہا "دیکھتے ہیں تو دیکھا کریں" مگر اُس نے ٹنچر کی شیشی یوں پکڑ رکھی تھی کہ دُکان سے لوگ اُس دوائی والی شیشی کو واضح طور پر دیکھ سکیں۔

"دوائی لگانے کا کیا فائدہ ہے" اُس نے دوائی لگاتے ہوئے کہا "یہ زخم تو پھر کھُل جائیں گے"

"یہ میرا نصیب" چاند نے مزید بے بسی پیدا کر کے کہا۔

"نصیب ——— جھوٹی ——— تم خود آزاد ہونا نہیں چاہتیں"

"مگر ڈاکٹر صاحب میں اپنے لئے آپ کی بدنامی کیوں کروں"

لوگ کیا کہیں گے؟"

"لوگ! مجھے لوگوں کی پرواہ نہیں۔ میں تمہیں اپنا بنانے کیلئے تیار ہوں۔ تم میرے ساتھ چلوگی؟"

"مگر مجھ جیسی بدبخت کو ساتھ لے جاکر آپ کیا کریں گے" چاند نے آہ بھرکر کہا۔ جیسے وہ مظفر سے کچھ کہلوانا چاہتی تھی۔

"یہ میری مرضی ہے۔ تم تیار ہو۔ مجھے جواب دو۔"

"ہاں۔ میں جاؤں گی" اُس کا بدن ڈھیلا پڑگیا۔ اُس کی آنکھیں اثبات سے جھک گئیں۔ اس کا جسم خدا جانے کس بات کا منتظر تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اس اثبات پر کوئی اُسے کھینچ لے۔

"تم تیار رہنا۔ میں کل اسی وقت آؤں گا" مظفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مظفر کو جاتے دیکھکر چاند جاگ پڑی۔ اُس کا وہ سنہری خواب بکھر گیا۔ اُس کا بدن اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑنے پر خود ہی چڑ گیا۔ وہ شرم سی محسوس کر رہی تھی یا شاید غصہ۔

"ہم جا رہے ہیں ماں لو" چاند اپنی بلی سے کہہ رہی تھی۔ "یہ دیکھو۔ یہ دو سو روپے ہیں۔ یہ انہوں نے بھیجے ہیں۔ اُن کی بڑی مہربانی ہے"

"تم جا رہی ہو چاند" اُسکی پڑوسن نے آکر کہا۔

"ہاں بانو۔ میں جا رہی ہوں ـــــ تم مجھے یاد کیا کرو گی؟"

"پگلی ـــــ تمہارے سوا میرا یہاں تھا ہی کون" بانو کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ "مگر تم خوش ہو نہ"

"ہاں۔ بہت۔ اس روز روز کے جھگڑے سے تو چھوٹ جاؤں گی"

"چاند ایک بات کہوں"

"ہاں کہو"

"تمہیں اُس پر بھروسہ بھی ہے؟ تم ان کی عادتیں جانتی ہی ہو۔ اِن کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ اس بات کو کبھی نہیں بھول سکتے کہ وہ ہم کو یہاں سے لے کر گئے ہیں۔ ان کے دل میں ہماری قدر نہیں رہتی۔ یہاں ہمارے پاس آتے ہیں تو انہیں یاد نہیں ہوتا کہ کس کے پاس آئے ہیں۔ اور ہم کیا ہیں۔ مگر ایک دفعہ گھر لے جائیں تو اُن کے لئے یہ بات بھولنی مشکل ہو جاتی ہے۔ شمو بھی گئی تھی۔ چھ مہینے پٹ پٹ کر واپس لوٹ آئی"

"ہاں۔ خدا جانے قسمت میں کیا کیا لکھا ہے۔ کہتی ہوں چلو یہ بھی کر دیکھوں"

"نہیں نہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ وہ ڈاکدر بُرا ہے۔ وہ تو شریف دکھائی دیتے ہے، ویسے تم خود سوچ لو۔ بس میں یہ کہتی ہوں ـــــ"

سارا دن وہ چیزیں اکٹھی کرتی رہی۔ اور اس کا دل کسی نامعلوم توقع سے دھڑکتا رہا۔ جیسے اُسے کوئی نیا کھلونا ملنے والا تھا اور وہ ایک بچہ تھی۔ اُس کا دل اب "خدا جانے کیا ہوگا" کی دلچسپی سے دھڑک رہا تھا۔

"تم جا رہی ہو چاند؟" بالو کہتی ہے "تم جا رہی ہو؟" اُسنے ایک کرخت آواز سنی۔ اور اُس کے بدن میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔

"ہاں میں جا رہی ہوں" اُس نے ایک مصنوعی لاپروائی سے کہا ـــــ

وہ دُبلا پتلا مرد کھل کھلا کر ہنس پڑا "کون جا رہا ہے۔ تم۔ تم کہیں نہیں جا سکتیں"

"کیوں نہیں جا سکتی۔ میں تمہاری 'باندی' نہیں ہوں"

اُس نے لپک کر چاند کے بال پکڑ کر گھسیٹ لیا "باندی نہیں تو اور کیا ہے"

"یہ لو اپنا دو سو روپیہ" چاند نے ٹرنک سے نوٹ نکالکر اُس کے پاؤں میں پھینک دئے "میں اب آزاد ہوں"

"روپیہ۔ یہ تم نے کہاں سے لیا ہے ـــــ ہاں میں جانتا تھا کہ تم پیسے چُرا رہی ہو۔ یہ روپیہ میرا ہے۔ تمہارا نہیں۔ خدا کی قسم

مَیں تمہیں اس جھوٹ کی سزا دونگا" اُسنے کونے سے رسّہ اٹھالیا۔ اور بیدردی سے اُسے پیٹنے لگا۔

چاند دُور سے چیخ رہی تھی " اور مارلو۔ اور مارلو۔ مگر تم۔ مجھے جانے سے روک نہیں سکتے "

وہ بستر پر گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ سامنے چوکی پر وہ بیٹھا اُسے گھور رہا تھا۔

"مَیں ابھی جاتی ہوں۔ مَیں دیکھوں گی تم مجھے کیسے روک لوگے" وہ اُٹھ بیٹھی۔

"مَیں کہتا ہوں چاند تم نہ جاؤ"

"کیوں نہ جاؤں۔ مجھے روکنے والے تم کون" چاند نے روتے ہوئے کہا۔

"تم پچھتاؤ گی"

"تمہیں کیا" وہ اُٹھکر ٹرنک کو تالا لگانے بیٹھ گئی۔ کمرے میں چاند کی ہچکیوں کے علاوہ بالکل خاموشی تھی۔ چاند کے چہرے پر غم کی ایک تصویر کھنچی تھی۔ جو اُسے اور بھی جاذب بنا رہی تھی۔ سامنے وہ بیٹھا تھا۔ اُس کے ماتھے پر بل تھے۔ کونے میں بلی بیٹھی غرّا رہی تھی۔

وہ اُٹھ کر چاند کے قریب جا بیٹھا "چاند" اُس نے اپنا سر چاند کے گھٹنوں پر ٹیک دیا" تم جارہی ہو۔ خدا کے لئے نہ جاؤ" وہ رو پڑا" تم چلی جاؤ گی تو مَیں کس سے لڑا کرونگا۔ مجھے تم سے محبت ہے" اُس نے ہچکیوں میں کہا۔

چاند کا ہاتھ اُٹھا اور اُس کے سر کو تھپکنے لگا۔

"مگر کیوں" مظفر نے تڑپ کر پوچھا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب مَیں نہیں چاہتی کہ میری خاطر آپ کی بدنامی ہو"

"بدنامی" مظفر پریشان تھا "مگر کیوں؟"

"میں اپنے لئے آپکی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتی"

"نہیں نہیں۔ تم کو یہ ذلیل زندگی چھوڑ دینی چاہیئے۔ مَیں اِسے برداشت نہیں کرسکتا"

"مگر کیوں۔ میری خاطر اِتنا کیوں"

"کیوں؟" اُس نے ایک وحشت سی محسوس کرتے ہوئے کہا "کمینی عورت۔ فاحشہ" اُس کا ہاتھ اُٹھا اور اُس نے زور سے چاند کے مُنہ پر تھپڑ مار دیا" رذیل کسبی"

ایک ساعت کے لئے چاند کے چہرے پر خدا جانے کیسی چمک سی پیدا ہوئی۔ پھر وہ بے بسی میں بدل گئی۔ دو آنسو اُس کی آنکھوں سے ٹپک پڑے۔

"مگر آپ ٹھہرئیے تو سہی۔ ذرا ٹھہرئیے ڈاکٹر صاحب" اُسنے منت اور اضطراب سے کہا۔

مگر مظفر سیڑھیاں اُتر چکا تھا۔

* * *

"ممتاز مفتی"

ہدایت

(۱)

اے عالمِ خُفتہ کے محافظ!
اس بسترِ راحت کی خبر ٹھیک سے رکھنا
جس جا ہے مرا دوست نظر ٹھیک سے رکھنا
اِس خوابگہِ ناز سے غفلت نہیں اچھی
سوتی ہے جہاں پر مری محبوبۂ ہستی
اے عالمِ خُفتہ کے محافظ!
اُس بسترِ راحت کی خبر ٹھیک سے رکھنا

(۲)

وہ خواب میں رنگین محبت کے ہے مشغول
خود میرا تصوّر غمِ ہستی کا ہے معمول
گو سوتی ہے ظاہر میں، مگر جاگ رہی ہے
نیند اُس سے تو وہ نیند سے خود بھاگ رہی ہے
اے عالمِ خُفتہ کے محافظ!
اُس بسترِ راحت کی خبر ٹھیک سے رکھنا

(۳)

ہر سانس میں میرا ہی تصوّر ہے مچلتا
ہر لمحہ مری یاد میں ہے اشک نکلتا
جھپکی ہوئی آنکھوں میں ہے اک عالمِ تصویر
اُلجھی ہوئی ہر لمحہ ہے تقدیر سے تدبیر
اے عالمِ خُفتہ کے محافظ!
اُس بسترِ راحت کی خبر ٹھیک سے رکھنا

(۴)

اُن ہونٹوں سے جن پر ہے رواں چشمۂ حیواں
اُن آنکھوں سے جن میں ہے نہاں سحرِ غزالاں
امرت نہ اڑا لے کوئی دزدیدہ نظر سے
مستی نہ چرا لے کوئی خود ساغرِ زر سے
اے عالمِ خُفتہ کے محافظ!
اُس بسترِ راحت کی خبر ٹھیک سے رکھنا

(۵)

بل زُلفِ معنبر کے صبا کھول نہ پائے
گلُ رخ کی لطافت کو کبھی تول نہ پائے
ہاں! اس کو سلا دیدۂ عالم سے چھپا کر
عالم ہی نہیں اپنی بھی آنکھوں سے چُرا کر
اے عالمِ خفتہ کے محافظ!
اُس بسترِ راحت کی خبر ٹھیک سے رکھنا
ہاں! اُس پہ نظر دُور سے پر ٹھیک سے رکھنا
اے عالمِ خُفتہ کے محافظ!

نورحسن کانپوری

بے پر کی

سنہ ۲۰ء میں پہلے پہل علی گڈھ کالج میں اڑی تھی، اور ابھی جی بھر کے نہ اڑنے پائی تھی کہ ضبطِ تکلم کے سلسلہ میں "قوم" نے یکم اپریل سنہ ۲۱ء کو "دی آل انڈیا جھانپلزم ایکٹ" نافذ کر دیا، ناچار ہمیں بھی مردن موقوف مقبرہ مسمار کرنا پڑا، اور یہ سمجھکر کہ "آل انڈیا" نوعیت کے جتنے معرکے ظہور میں آتے یا لائے جاتے ہیں اکثر سر نہیں ہوا کرتے کر بیٹھ گئے۔ ہونے والی بات کہ حال ہی میں کسی آثارِ قدیمہ کی تلاش کرتے ہوئے اپنے اسباب جہالت میں ایک کرم خوردہ مسودہ ہاتھ آیا۔ دیکھا تو "بے پر کی" جو کبھی اڑان تھی، جو آج اٹھارہ برس بعد "ساقی" میں اڑ رہی ہے، اور اس بل پر اڑ رہی ہے کہ اگر نصیب اعدا "جھانپلزم ایکٹ" اب بھی بر سر کار ہے تو یہ فدوی اُس کی زد سے دور یعنی "بارہ پتھر" باہر ہے۔

"ادارہ"

(کھٹیا پر پڑے پڑے) "پناہ بہ خدا۔۔۔۔۔۔ وہ کہیئے کہ خیر گزری اور جاگ ہوگئی۔ ورنہ کام ہی کر چکا تھا مردک!۔۔۔۔۔ خیر اُس وقت تو ذری حواس برجا نہ تھے مگر توبہ توبہ کر کے کہتا ہوں کہ بچا جو کہیں لمحے بھر پہلے آنکھ کھل جائے نا تو غضب ہی تو ڈھا دوں قسم پروردگار کی وہ تُلا دا جینیو کا ہاتھ دیا ہو شقی کے کہ معاذ اللہ! ۔۔۔۔۔ آنتیں ڈھیر ہو جائیں آنتیں، بھاگتے راہ نہ ملے کافر کے تئیں، جی اور کیا۔ تا دمِ زیست یاد کرے ملاعون! ہونھ! دل لگی بازی ہے۔ سپاہی کے پوت ہیں، عمر بھر کمیدانیاں، رسلداریاں کی ہیں کہ باتیں۔۔۔۔۔ مگر واللہ مانتا ہوں قسم قرآن کی، شوہرے پشت جلیا! کیا چکمہ دیا ہے کہ اوہ! یعنی دیکھتے دیکھتے پنجرہ سمیت غائب، "خالی حقہ گڑ گڑا کے"۔ اور اس گپوا حرامخور کو تو ذری سویرا ہونے دیجیئے کھود کے دفن نہ کر دیا ہو تو مغل سے نہیں چمار سے کہیئے گا قسم قرآن کی ہکشتنی گردن زدنی!

اس گھر میں کیا کچھ حشر برپا رہا اور اس مادر بخطا کے کان پر جوں نہ رینگی، خبر تک نہ ہوئی اصلا، کام چور نٹھلا خدائی کا" منہ پر سے دلائی ہٹا کر "گپوا، گپوا، ابے او گپوا کے بچے۔ اٹھتا ہے نابکار، یا ہے شرط کہ بگڑ چلوں اور دوں آن کے گدی پہ ایک چکت، جی کھیر کی قلفیاں اور شیرمال چٹ کر کے جو مردک لمبی تانی ہے تو منکنے کا نام نہیں"۔

گپوا۔ نیند کے عالم میں جھنجھلا کر "لے کچھ کہیئے گا بھی یا نحق بن نحق کو ٹیں ٹیں ہی مچائے جائے گا، کھٹملوں نے الگ ناک میں دم کر رکھا ہے، آپ الگ خفکان کر رہے ہیں"۔

پہلا۔ "گنتا جا نمکحرام تو اپنی گستاخیوں کو گنتا جا، ذری سویرا ہونے دے تب مزا چکھاؤں گا اس کا، کلّے چیر کے نہ دھر دوں تو سہی، بولنے کو ترس جائے جب کی سند، اور سنیئے باجی کی، ہم ٹیں ٹیں مچاتے ہیں، خفقانی ہیں؟"

گپوا۔ "لیجیئے یہاں جاڑے کے مارے اچور ہوئے جا رہے ہیں؟ میاں ہیں کہ ہوا سے لڑ رہے ہیں، اور اول فول بک رہے ہیں، آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر، وقت دیکھیں نہ بے وقت، کوئی سنے تو الو کی پھبتی کہے، جی اور کیا، نالت ہے واللہ اس نوکری پر اور کرنے والے "گالی دیکر" کو تو کیا کہوں"۔

پہلا۔ برافروختہ ہوکر "ابے کیا کہوں کے چچا، اُٹھ کے چراغ

جلاتا ہے کہ نہیں؟ وہ گھسیٹن قطامہ کا پلا طوطے کو پنجرے سمیت اُڑا لے گیا ہے ہے قسم قرآن کی وہ تو ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے میں نے نہیں تو مجھ پہ چوٹ کی تھی۔"

گپوا۔ لیٹے سے بیٹھ کر "تو یہ کہیئے پچ پچ! ہائیں غضب ہوگیا میاں یہ کب؟ پچ پچ! خیر طوطے کا تو غم نہیں، ایک نہیں" گالی دے کر "آپ کی جان کو دس، مل یہ بُرا دانوں مارا کہ دھیلی دس گنڈے کا پنجرہ گانٹھ دیا۔"

پہلا۔ متاسف ہوکر "ہائے واللہ تھا تو مشت پر، مگر قسم قرآن کی بلبل ہزار داستان، جہاندیدہ مزاج داں، اور جب سے چُپکی پر لگ گیا تھا تب سے تو جانہار کے اور بھی جوہر کھلے تھے، قسم ہے جناب امیر کی جھوٹ بولنے والے" گالی دے کر "کو بھی، کچھ کہتا ہوں، کہ رات رات بھر میں تو اکثر میٹھی نیند سویا ہوں اور وہ شخص داستانیں کی داستانیں منہ زبانی سُنا یا کیا ہے منہ زبانی، اللہ بخشے فردوس مکانی کو، انہیں نے ایک روز اپنے چڑیا خانے کی سیر کرائی، چڑیا خانہ کاہے کو تھا ایک طلسمات تھا، اور اس طوطے کو دکھا کر کہنے لگے کہ مرزا اُستاد کبھی یہ جنور بھی دیکھا تم نے؟ میں نے منہ بنا کر عرض کی "جی ہاں پیر و مرشد، مگر غلام کے نزدیک کوئی انوکھی بات تو پیدا ہے نہیں اس میں" ہنسے اور فرمایا کہ "مرزا تم بانک پٹے کے اُستاد ضرور ہو، اُستاد کیا معنی اس وقت اکے ہو شہر میں، مگر یہ علم بھی ہمارے گھر کا ہے، اسے ہم خوب جانتے ہیں" یہ کہہ اور گنگا جمنی پنجرے سے طوطے کو نکال کر آنکھ جو مارتے ہیں تو مٹھو میاں کیا فرماتے ہیں کہ ع۔ قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔ پھڑک گیا، ششدر رہ گیا، قسم قرآن کی، ایسا طوطا اور یہ برجستہ جواب! ہائے واللہ کیا تیکھا شہزادہ تھا، بات کا دھنی، اور کلیجہ تو رستم کا لیکر آیا تھا اللہ کا بندہ، بس چتونوں سے تاڑ لیا کہ مرزا کا دل اس پر آگیا، حکم دیا کہ "مرزا اُستاد یہ طوطا تو آپ پالئے، مگر دیکھنا مرزا کبھی تمہیں کبریا کا واسطہ میرے طوطے کو ایذا نہ پہونچے، نہیں تو حشر میں دامن پکڑونگا"

ڈھاکے بنگالے کا ایک سوداگر نذر کر گیا ہے، کہتا تھا کہ جاٹوں نے مالوے پر جب یزن بولا ہے تو وہاں کی رانی راج پاٹ، دھن دولت چھوڑ چھاڑ صرف اس طوطے کو لیکر مردانے بھیس میں جنگل بیابان کو نکل گئی تھی، مگر رستے میں کسی شقی لعین نے شیر بچہ جو اٹھا کے جھونک دیا تو جل بھن کر خاک ہوگئی، اور یہ ماشہ بھر کی ننھی جان دشمن کے پلے پڑی، مرزا، دیکھتے نہیں ہو بائیں آنکھ ندارد ہے، چھرّے چھیلتے پڑے جو ایک آنکھ ہی کام آئی ورنہ سر قلم ہوجاتا۔"

ہائے واللہ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ صاحب عالم کی رُوح کو میں نے جو ایذا پہونچائی ہو تو لعین ہی کا کام ہو واللہ، خیر، مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ یہ خونِ ناحق بالا بالا نہ جائے گا۔ اے بے ایمان خود فجر ہوئی اور ہم نے تھانے کی کُنڈی کھٹ کھٹائی اور رپٹ داغی، ٹھہرو تو سہی بی صاحب کا مع تلے چالان نہ کرایا اور یہاں سے لیکر بڑے صاحب تک اور وہاں سے تا بہ لاٹ صاحب نہ کھچوایا تو "مرزا الٰہی خیر" نام پلٹ دینا، بلا پالا ہے مالزادی نے یا خونی باندھا ہے، بس کہہ تو دیا کہ گھر بھر کی ٹنڈیاں نہ کسوا دوں تو دہنے ہاتھ کا کھانا حرام ہے قسم قرآن کی۔"

گپوا۔ بات کاٹ کر "منہ کا ہے کو بُرے کا پیٹ ہے کر اب چلا تو چلا۔ اے میاں تھانہ عدالت پیچھو کیجئے گا، پہلے تکیہ تلے سے ماچس کی ڈبیہ نکالئے، دیکھوں تو سہی کہ آخر کے تئیں گیا کدھر؟"

اندھیرے میں ٹٹول ٹٹال مرزا صاحب نے ڈبیہ دی، گپوا نے دیا سلائی کھینچی اور کپّی جل گئی۔

گپوا۔ دیکھ بھال کے "جی میں آتا ہے کہ سر پیٹ لوں اپنا واللہ، سنکھیا کھا کے سو رہوں ان باتوں پر، توبہ توبہ! اسی سے تو کتابوں میں لکھا ہے کہ نشہ حرام ہوتا ہے، اور اس مُردار افیم کا تو سب سے کمین، ادھم جوت دیا مار کے، لگے واہی تباہی بکنے لام کاف کرنے" پنجرہ دکھا کر "یہ کیا ٹنگا ہے پنجرہ کھونٹی میں۔"

مرزا۔ دولائی پھینک نیم خیز ہو کر "ایں کیا کہا؟ ماں تمہیں واللہ قسم

قرآن کی، مگر یار گپتو ذری دیکھنا تو جھانک کے وہ بھی ہیں؟"

گپوا۔ طنزاً۔ "جی نہیں تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لے یہ کیا ٹیاں سے بیٹھے پٹ پٹ آنکھیں مار رہے ہیں، مار بو کھلا دیا لے کے آپ نے، سچ ہے آدمی میں حواس ہی حواس ہیں۔"

مرزا۔ لیٹ کر "لاحول ولا قوۃ، بھئی مار ڈالا، بڑا دھوکا ہوا اس وقت قسم قرآن کی۔"

گپوا۔ "جی اور کب نہیں ہوتا، پینک میں، کوئی آج آپ ہمیش مچھر کا ہاتی بناتے ہیں۔ مل کہے کون، لاکھ بار سمجھایا کہ مہنگے مہنگے تو ذری چسکی میں کمی کر دیجئے مل نہیں، غضبِ خدا سونے کے بھاؤ توافیم مل رہی ہے، یہ تو کال پڑ رہا ہے کہ روپے کے پان سیر گیہوں ہیں۔ آپ ہیں کہ آٹھ نو گنڈے سے کم کی پیتے نہیں، اور یار دوستوں کے جلسے میں دو ایک دو رچل گئے وہ گھاتے ہیں۔"

مرزا۔ خفیف ہو کر۔ "خیر بھئی کھائی تو کھائی اب کھائیں تو رام دُہائی معاف کرو،" اور "جماہی لیکر" حقہ تازہ کر کے ذری ایک توا تو بھر دو۔"

گپوا۔ "جی ماف واف کے بھر دسے نہ رہیئے گا، کہیں آج تار دی بھری رات میں بے خطا بے قصور لاکھوں صلواتیں سنائی ہیں آپ نے یاد رکھئے گا، اور ہاں یہ جب دیکھئے تب گپوا گپوا کیا کہا کرتے ہیں آپ، نوکری کی ہے یا ذات بیچی ہے کوئی ہم نے، اور سنئے گپوا گپوا، واہ کیا خوب کوئی دھنا جلاہا مقرر کیا ہے آپ نے۔ ہم بھی کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں اصل پٹھان ہیں، ککرزئی، سنا آپ نے، ہو تھا بینے چھیو دھیلی کے پیسے دیئے اور سمجھیں گے مول لیکے چھوڑ دیا، حاتم کی گور پہ لات مار دی، خبردار جو آج سے ٹھیک نام نہ لیا آپ نے، عبدالغفور خاں اور نہیں تو کیا۔"

مرزا۔ "بہت اچھا عغفور خاں صاحب بہت اچھا، اب تو خوش ہوتے۔"

گپوا۔ "کیوں نہیں، سلامت رہیئے، یہ ہیں دیکھئے اشرافوں کی سی باتیں، یہ نہیں کہ اس کا سا منہ اٹھالیا اور گپوا گپوا! بڑی عمر کی منظر ہوئی تو گپتو! لے وہ تو کہیئے ان پڑھ جاہل رہ گئے ہم، نہیں تو آج چلیں بھرتے ہوتے آپ کی، راس نہیں آیا یہ علم" گالی دیکر "ہم کو اور آتا تو کیونکر سے، مولوی صاحب تھے کل بجتے، ہم نے دیئے جمال گوٹے، بس بد دعا لگ گئی ہم کو، مل میاں ایک بات ہے کہ آپ کی سلامتی میں جگہ نوابوں رئیسوں ہی کے برابر ملتی ہے۔"

مرزا۔ "اماں ہاں عغفور خاں بھئی خوب یاد آیا" ہنس کر "طوطے کیلئے ٹیں ٹیں کی بھی تم نے خوب کہی، قسم قرآن کی برجستہ کہتے ہو، تھی تو ہم پر مگر جاؤ کیا یاد کرو گے ہم نے معاف کیا ہمارے خدا نے معاف کیا۔"

گپوا۔ سلام کر کے۔ "حضور کی بدولت ہم بھی دو گال ہنس لیتے ہیں ملاحظہ کیجئے گا حقہ بھی وہ پلاتا ہوں اسوخت کہ آنکھیں نکل پڑیں حضور کی کلیجہ تک سلگ جائے۔"

مرزا الٰہی خیر صاحب پلنگ پر دراز ہو گئے اور گپوا حقہ بھرنے چلدیا۔

گپوا۔ چلم بھرتے میں "نرے بودم بے وال ہیں میاں ہمارے، پورے چونگا، کن گھامڑوں سے پالا پڑا ہے آن کے کہ توبہ توبہ! پڑے پڑے اچھی السیٹھ لگائی جاڑے میں کہ بلا طوطا لے گیا۔ ان کا سر! اور مزہ یہ کہ اوپر سے سورما بنتے ہیں آپ، اپنے حساب بڑے بہادر ہیں۔ اسی دن بھٹیاری والا جو ذری کے ذری سیدھا ہو گیا تو ہنکارتے ہی رہے، نکلا ہی کیا تمنچہ اور کٹاری، اور وہ آنکھوں تلے سے کنکوا اور ڈور کا گولا لے گیا، اور مٹھی بھر بھر کے دھول جھونکی وہ نفے میں، جی اور کیا" نیچہ بہگک کے "کیا موسم ہے واللہ" گالی دیکر "مار ہات گل گئے، تالت میں تھوک ایسی طلب پر، جی، کلیجے میں دم نہیں، اور فرمائش کریں گے نوے کی، اب کہیئے دو گھنٹے ان کے لئے سدگائے کون بیٹھ کے، وہی ایک گپتو نا! سوچا ہے اوڑھو

چاہے بچھاؤ" سٹ سٹ دو چار کش لے کر" ابے سُلگ بھی چُک کہیں، نیند کے مارے حواس نہیں ٹھکانے، سر کھپا پڑتا ہے، حُقّہ ہے کہ نخرے کر رہا ہے"

مرزا۔ اندر سے "ماں غفور خاں کیا بجا ہے؟"

گپوا۔ جل کے "بجا کیا حقّہ بجا ہے"

مرزا۔ "بڑا عیبی ہے بے، لگا ئیں تو نے پھر وہی باتیں"

گپوا۔ جھنکر "میاں سُنا حقہ پینا ہے تو سیدھی طرح پی لیجئے، اور جو بے ستے، کیجئے گا تا؟ تو اس وخت بن نخت کی ٹھائیں ٹھائیں ہو جائیگی ہمارے آپکے، اور نہیں تو، ایک تو نیند خراب کی بھلے مانس کی، ویسے ہی سوخت ہو رہے ہیں، اوپر سے 'بے ستے' کا پہاڑا پڑھتے ہیں آپ، اور جو ہم بھی کہدیں

اَلِب بے ہوّا، ماں چیل باپ کوّا

تو دیکھئے کتنے چرھیند سے ہوتے ہیں اپنی دفے کو" اندر جا کر "لیجئے اُٹھیئے۔"

مرزا۔ دھیمے پڑ کر "لاؤ لاؤ بھئی جیتے رہو، کیا کام کیا ہے واللہ، اماں خانصاحب تم تو اک ذری سی بات میں بگڑ گئے"

گپوا۔ "لے حضور مجال ہے میری، آپ مالک میں غلام، آپ آقا ہم نوکر، مل میاں کوئیں کی آواز ہے جیسے کہیگا ویسی سُنے گا" لیٹ کر "لے اب ہم تو سوتے ہیں میاں، آپ چاہیں رات بھر مکان رکھائیں یا ہماری جان کچھ کریں، مل اَبکی بلا دلا نہ کہیں لگا دیے گا۔ اب تو جنگل کا شیر بھی ایک دفے کو آئے گا تو بندۂ درگاہ اپنی جگہ سے نہیں ٹلنے کے، ہاں"

مرزا۔ گھنٹے کی آواز سنکر "ایک دو تین، ایجئے اس گلخپ میں دھیان ہی نہ رہا اور تڑکا ہو گیا۔ میاں غفور خاں بھئی یہ سونے کا وقت نہیں، میں نہ مانوں گا قسم قرآن کی، اماں اٹھ کے مولا کی یاد کرو۔ چار رتیں اُڑاؤ سویرا ہو جائے، اور اب ہماری جھپکی کا وقت بھی آیا ہی سمجھو"

گپوا۔ رزائی ورائی پھینک کر "جی ہم تو مولا کی یاد کریں اور آپ افیم کی؟ کیوں! ہاق تھوا پھٹے سے منہ! بات یہ ہے کہ آپ کے دماغ میں تو آ گئی ہے خشکی اور یہاں تڑکے تڑکے اُٹھکر الغاروں کام کرنا ہے، چاہ بنانا، برتن مانجنا، سودے سلف کو جانا، پھر چولہا جھونکنا، ہنڈیا ڈوئی کرنا، کہیئے ہاں، آپ ہل کے پانی پینا نہیں جانتے، اتنا کام کون کریگا میں یا شیطان؟"

مرزا۔ "بھئی کام کی جو کہتے ہو تو لو قسم قرآن کی وہ تدبیر بتاتے ہیں کہ پھڑک اُٹھوگے، اور ترکیب بھی سبحان اللہ وہ مختصر کہ ہزا لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے، میاں ہم سے سیانا وہ دوانا"

گپوا۔ "اب منہ سے کچھ پھوٹیئے گا بھی؟"

مرزا۔ فقرہ ہضم کر کے "سُنیئے آپ کی ایسی تیسی، اب تو بیٹھ کے کوئی قصہ کہانی چھیڑئیے جس میں رات کٹے، پھر جھپکی وکی سے فارغ ہو کر سو رہیں ہم آپ دولوں، کہیئے بہت خوب، آنکھ کھلے دن چڑھے، جھٹ ہات منہ دھو، آپ جائیں بازار اور چار آنے کی آبیاں، اور چھ پیسے حد دو آنے کی لائیں نہاری، اور اک دو شیرمال، اور ہاں چار ڈبل کی برفی، یا نہ ہو تو قلاقند مگر ہو تازی، بس کھا پی کے فرصت ہوئی تو ہم چلیں جانی مرزا کے ہاں، دو دو بازی گنجفہ ہو، ورق بدے ہیں اُن سے دو دو روپے ورق، اور آپ شام کے لئے مسالا پیسیں، نہ کہیئے گا کیسی کہی؟"

گپوا۔ سوکھے منہ سے "سُبحان اللہ، یہ حضور کا حصّہ ہے، علم کا زور ہے، ہم سے جاہل کو دن کی عقل اتنے لمبے پہ تھوڑی جا سکتی ہے، کیا ممکن ہے، مل میاں" سر کھجا کر "غلام کو یہ اور معلوم ہو جاتا کہ یہ دس بارہ آنے کے پیسے آئیں گے کہاں سے؟"

مرزا۔ کنوّں پر سے جاتے رہے "کیا کہا بے تو نے؟ پھر تو کہنا۔ یہ ہماری بات میں چوں چرا کیسی؟ ایں، اس کے کیا معنی؟ اُدھیڑ کے ڈالدونگا قسم قرآن کی، کہاں سے آئینگے، کہاں سے آئیں گے؟" زور دیکر "ابے وہاں سے آئیں گے جہاں سے اور سب آتا ہے؟"

گپوا: "سب تو حضور پروردگار کے حکم سے بنیہ دیتا ہے"۔

مرزا: "تو یہ بھی بنیہ دیگا"۔

گپوا: (سنجیدہ بن کر) "جی بجا ہے، دیگا اور بے شک کر کے دیگا، مل سویرے سویرے بن داموں کھوپڑی کی کھپڑیل بھی بنا دیگا، چندیا کی استری بھی خوب ہو جائیگی"۔

مرزا: (آئیں تو جائیں کہاں) "چپ مردود، بدزبان، نفرے، ٹکے کے پیادے، بڑے آئے وہاں سے بنیہ کی وکالت کرنے والے، زبان ہیں پاجی کی موچ ہی نہیں گویا طرح دیتا ہوں مگر جی میں آتا ہے اُٹھ کے جوتی سے کھوپڑی کی اصلاح کر دوں، بچا اُٹھتے ہی گڑگڑی اور لوٹا رکھ کے نہاری نہ لایا تو مار ہی ڈالونگا قسم قرآن کی، اور تو اور بنیہ سے بھی ہم دبیں گے، لے گولی سے تو ہم بات کرتے ہیں، اور خیر چلئے اُس کے دن نہیں تو اب گالی سے بھی گئے گزرے کیا"۔

گپوا: "یہ مانا حضور، یہاں پر ہم بھی قائل ہیں، پہلے ہی حضور کا منشا معلوم ہو جاتا تو یہ تُو تُو مَیں مَیں کاہے کو ہوتی۔ ابتک گڑگڑی لوٹا کیا مال ہے، حکم پائیں تو ہم تو حضور کے کوڑے کر لیں، لوکر ہیں کہ دل لگی، ہم نے تو خدا واسطے کو ایک چلتی بات کہہ اٹھائی تھی کہ حضور بنئیے کے ہاں سے آٹا دال تو خیر اُدھار مل بھی جاتا ہے مل نقد پیسے تھوڑی ملیں گے، آپ تو چار جامے تو بہ پاجامے سے باہر ہو گئے، اب حکم شد ہو گیا ہے تو ہم بھی منہ اندھیرے آفتابہ اور گڑگڑی میکے سے سسرال پہونچا دیں گے، جی اور کیا، چلمچی اور دیگچیاں جہاں سدھاریں وہاں بھائی بہن کی یہ جوڑی اور سہی" مل ایک بات ہے جو آپ کڑوے نہ ہوں، حضور ہیں بڑے سخی کے بچے، لنگوٹی تک کو چاہیں محتاج ہو جائیں، مل بے شیرمال کے حلق تلے نوالہ نہ اترے گا، کچھ خلاف ہے اس میں؟ سچ کہیئے گا"۔

مرزا: (باچھیں کھل گئیں) "سچ کہتے ہو واللہ قابل انعام، خوش کر دیا اس وقت تم نے میاں غفور خاں! کبھی آج سے افیم پیا کرو تم بھی"۔

گپوا: "مجھے تو بخشیں حضور، ان کالی مائی کو دُور ہی سے ڈنڈوت ہے ہماری، اچھی داد دی" (کچھ سوچ کر) "ہمیں تو آپ ہی کے لالے پڑے ہیں، دیکھنا ہے کہ آپ ہی کی کے دن چلنے پاتی ہے"۔

مرزا: "کیا افیم؟ افیم تو بھی مرتے دم تک ساتھ ہے انشاءاللہ تعالےٰ"۔

گپوا: "جی اور کیا۔ سچ بھی ہے، کلمہ درود تو ساتھ جانے سے رہا آپکے، اے آپ سمجھے ہی نہیں ہم نے کیا کہا، اور سمجھ میں تو تب آئے کہ گرہ میں تولہ ماشہ ہو بھی"۔

مرزا: "چلئے وہ ہم بیوقوف گوکھے سہی، آپ کی بلا سے، اپنا مطلب کہیئے"۔

گپوا: (آواز بلند کر کے) "مطلب یہ کہ جھگڑا ہی پاک ہوا جاتا ہے دس پانچ دن میں اس کا، نہ شہر میں افیم ملے گی نہ آپ پینگو"۔

مرزا: "واہ بے" (ہنسکر) "بڑا زیٹیا ہے، کیوں حضت کیوں نہ ملے گی؟ اور نہ ملے گی تو پاپوش سے، اپنے بھر کی ہم گھر بولینگے، اور رکھوالی کو تمہاری نوکری بولدیں گے، اپنے بیٹھے ہوئے کوتے ہنکارے ہیں مزے سے، چلئے چھٹی ہوئی، اب کہتے"۔

گپوا: (منہ دھو رکھئے) "حکم آگیا، بلکن کل ڈگی بھی پٹ گئی کہ افیم سب لام پہ لدے گی، حکم بڑے صاحب کا، گُرم دُھم! گُرم دُھم!"

مرزا: (رنگ پریدہ ہو کر) "اماں نہیں، لگے بے تکی اڑانے"۔

گپوا: "جوانی قسم میاں، مَیں کوئی جھوٹ بول سکتا ہوں آپکے آگو، یقیں نہ آئے تو اس کی اور بات ہے، اچھا وہ جو ناٹے سے گورے سے ہیں نا؟ بھلا سا نام ہے اُن کا" (ٹھہر کر) "وہی وہی جن سے حضور نے اُس اتوار کو کنکوّے کا میدان بدا تھا اور انہیں نے ایک کل پتے سے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو حضور کے دس بارہ جمدھر اور کوئی کوڑی بھر بھیڑیئے کاٹے تھے اور خود چراغ جلے اچھوتے اتر گئے تھے، اُن سے پوچھ لیجیئے گا"۔

مرزا: "کون؟ بلاقی کو کہتے ہو گے، وہ سفلہ مسخرہ پیچ لڑانا کیا جانے،

کل کا لونڈا ہمارے سامنے کا، چرخی تھامنے کی تمیز نہیں جس کو، وہ کیا کھا کے میدان لے گا ہم سے، ہم کنکوا لڑاتے ہیں؟ اے ہوا پر دیو لڑاتے ہیں قسم قرآن کی، اور مانجھا تو اتنا بڑا شہر ماشاء اللہ سے پڑا ہے آج، ہمارا سا کوئی نکال کر دکھا دے، اور تو نہیں ناک ناک تو ہم بدتے ہیں واللہ کیا مجال، ماں غفور خاں سو گئے بولتے نہیں، یاد ہوگا کہ پرسوں ذری کے ذری جیل کے چھو گیا تھا۔ دوپر کالے ہوکر گری واللہ!"

گپوا:- "یاد تو نہیں مل میاں ہوگا بیشک کر کے سچ، تو وجہ کیا کہ ہمیں تو ہینے پیچھو اپنی اٹھنی سے کام، اینچ پینچ سے کیا واسطہ، اپنے حساب جیل گرے کہ گدھا، دونوں ایک اور حضور۔ ۔ ۔

مرزا:- لال پیلے ہوکر "ہاں اور حضور، کیا کہا اور حضور، سوچ کے کہنا۔"

گپوا:- "مطلب یہ کہ حضور تو کہاں کی بات کہاں لا ڈالتے ہیں۔"

مرزا:- "خیر چلیے بات بنالی اس وقت آپنے، ورنہ بے بھاؤ کے پڑتے۔"

گپوا:- "ہاں میاں تو بلاقی صاحب ہی یہ قرآن دھر کے پوچھ لیجئے کہ اگلے جمعے سے افیم لام پہ لدے گی کہ نہیں، وہ اپنی آنکھ سے دیکھ آئے ہیں ریل پر پٹارے کے پٹارے لدے چلے جا رہے ہیں، کھانچیاں کی کھانچیاں جا رہی ہیں، مارے بدبو کے ناک نہیر دی جاتی، اور قلیوں کی تو کچھ پوچھئے نہیں، ماذاللہ کی پناہ! لادتے لادتے حضور نشے جم جاتے ہیں، دس ادھر غین پڑے ہیں، پانچ اُدھر انٹا غفیل ہو رہے ہیں، مکھیاں الگ بھنک رہی ہیں، کتا موت جائے تو اُن کو خبر نہیں، بابو لوگوں کے ہاں البتہ راوی چین لکھتا ہے، شہر کے دس پانچ افیمی پہونچ گئے ہیں، جلسے ہو رہے ہیں، شہر میں ایک پونڈا جو دیکھنے میں آتا ہو، پھاندیاں کی پھاندیاں ریل پر جا رہی ہیں، بڑے ٹھاٹ ہیں، اور تو اور، وہ دیکھئے شام کی ٹیم سے وہ فیضو فیضو ہیں نا؟ سیتلا منہ داغ، کالے سے، سرمہ مستی بیچتے ہیں، اناؤ سے آئے تھے، آنکھوں میں لال لال ڈورے دیکھے میں نے پوچھا "ماں تم تو بڑے مولوی مولانا بنتے تھے آج یہ کیا" قسمیں کھا کھا کے بیچارے کہتے تھے کہ بھئی غفور خاں صاحب کراچی بھری افیم کھڑی تھی، پاس سے ہوکر نکلنے بھر کا گنہ گار ہوں، نشہ دبا بیٹھا۔"

مرزا:- مسرور ہوکر "سچ ہے واللہ سچ ہے، اور میاں، لوگوں نے بدنام کر رکھا ہے مفت میں ان نیک بخت کو، ورنہ چنیا بیگم اور آب حیات کا خواص یکساں ہے، اور جو کہیں ذری نشہ نہ کرتی ہوتی تو قسم ہے قرآن کی حرام بھی نہ ہوتی، بس کہنے کو ایک ذری سا عیب رکھ دیا ہے پروردگار نے اس میں، مگر یار گپو اگر جو یہ خبر نصیب اعدا صحیح نکلی تو ستم ہی تو ہو گیا قسم قرآن کی، بھئی چل کے ریل پہ دیکھنا چاہیے اس کو ضرور، مگر اس کی لِم نہ معلوم ہوئی آخرش، کہ یہ لام پہ کیا ہوگا لاکھوں کروڑوں من افیم کا؟ اور ہاں بھئی یہ تو بتاؤ کہ یہ لام بندھا کس ملک پر ہے، سراندیپ کے جزیرے پر تو کہیں نہیں بندھا، یعنی جس کو لنکا کہتے ہیں اور جہاں راون کا محل تھا۔ یہ بھی اپنے وقت کے بڑے طبیعت دار رئیس گزرے ہیں، ایک ڈال سونے اور مرصع کا محل تھا، اور بانک پٹا تو اس بلا کی کرتے تھے کہ ایک ایک گھائی میں لاکھ لاکھ جوڑ بند باندھتے کھولتے تھے، ہمارے ہاں اسی گھرانے سے یہ فن آیا ہے، خدا بخشے اُستاد بڑی تعریفیں کیا کرتے تھے۔"

گپوا:- "حضور تو ایک سانس میں خدا جانے کیا کیا بک گئے، مل ایک بات ہے میاں، ریل پر میں آپکے ساتھ نہ جاؤنگا۔"

مرزا:- "کیوں آخر وجہ، سبب؟"

گپوا:- "اجہ وجہ میں نہیں جانتا، روٹی ہانڈی کر کے یار لوگ بستر پر وندنائیں گے، آپ اپنے شہر بھر کے قربان صدقے ہوتے پھریئے گا۔"

مرزا:- "نہیں تم کو چلنا ہوگا، اور نہ چلوگے تو قسم قرآن کی زیر بند

بھی اتنے مارے ہونگے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا، آیئے وہاں سے آقا تو چلیں افیم کی زیارت کو اور نوکر پڑے پڑے نحوست پھیلائیں کھٹیا کے بان توڑیں، میاں چل کے دیکھنا ہے کہ پٹاروں کے کیا ٹھاٹھ ہیں؟ نشوں کے کیا عالم ہیں؟ لام کدھر بندھا ہے؟ لڑائی کس ملک پر ہے؟ اور یہ پٹاسے بھر بھر افیم کہاں جارہی ہے؟ کیوں جارہی ہے؟ ابے جاہل گاؤدی اس کے معنی تحقیقات ہیں، یہ نہیں کہ پلنگ پر پڑے پڑے ۔ ۔ ۔ ۔ اُڑایا کئے، یہاں جب تک ہر شے کی لِم نہ دریافت ہوئے اسوقت تک آرام کیا۔"

گپوا (مسکراکے): "تو یہ کہیئے کہ سرکار تھانے دار کوتوال ہوگئے جو لگے تحقیقات کرنے، اے حضور عقل کے ناخن لیجئے، اچھا اور جو سب باتیں یہیں بیٹھے بتادیں تو کیسی رہے۔"

مرزا (جوش میں آکر): "غلام ہوجاؤں تمہارا عمر بھر کے لئے اور تو کیا کہوں۔"

گپوا: "ہے؟ دیکھیئے مکر نہ جائیے گا، اچھا قسم کھائیے۔"

مرزا (بگڑ کر): "لگے دون کی لینے، کیوں بے اٹھ کے گدی سے زبان کھینچ لوں۔"

گپوا: "جی لیٹے رہیئے، کاہے کو تکلیف کیجئے۔ یہاں تو مالک کے آرام کا ہر وقت خیال لگا رہتا ہے۔"

مرزا: "بھئی بڑے نمک حلال ہو واللہ، باغ باغ ہوگئی طبیعت تم سے غفور خاں، ہاں تو یہ لام کدھر بندھا ہے بھئی، اسی سے شروع کر چلو۔"

گپوا: "اے حضور آپ کی طرح کتے کا بھیجا تو ہے نہیں ہمارا، سننا ہو تو ایک ساتھ سب سن لیجئے ادر نہیں تو کیا۔"

مرزا (بہ نرمی): "بہت اچھا حضور فرمائیے۔"

گپوا: "اب آئے راہ پہ، سنئے ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، سُنی کہتے ہیں، دیکھی کہتے نہیں، سچ ہو تو ہمارے آگو آئے، جھوٹ ہو تو آپ کی گردن پہ سوار ہو۔"

مرزا: "دیکھو بھئی جو ذری بھی چھپایا تو جو چور کی سزا وہ تمہاری سزا۔"

گپوا: "آپ تو بیچ میں بول اٹھتے ہیں، ہم رتیوں بناتے ہیں آپ تولوں اُڑاتے ہیں، آخر آپ آدمی ہیں یا گھن چکر۔"

مرزا: "اچھا صاحب چلئے۔"

گپوا: "دیکھئے اونگھ نہ جائیے گا پھر نہ کہوں گا چاہے رٹ رٹ کر آپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مرزا (جھلاکر): "بس آگے نہ نکلے کچھ منہ سے، کمبخت منہ پہ کوستا ہے۔"

گپوا: "بہت خوب، ایک ملک ہے کوئی جہاں کے آدمی گھڑ مونہے ہوتے ہیں کیا مرد کیا عورت ۔ ۔ ۔"

مرزا (بات کاٹ کر): "کیا کہا؟ گھڑ مونہے! تمہیں قسم قرآن کی، اماں فردوس مکانی کے چڑیا خانے میں بھی ایسا ہی ایک آدمی آیا تھا، یہ یاد نہیں اس وقت کہ مرد تھا یا عورت، معاذاللہ! دانت بھیچے مردک کے کہ الٰہی توبہ! دیکھے سے ڈر لگے، خدا بھلا کرے چسکی پہ تو لوٹ تھا، پیالی دور سے دیکھی اور لگا دم ایال پھلا کر ہنہنانے، صاحب عالم فرمایا کرتے تھے کہ کہیں ولندیز کے اس پار کوئی جزیرہ ہے وہاں کے آدمی سب ایسے ہی ہوتے ہیں، میاں غفور خاں، ہزار ہزار کے اسی توڑے کلکتے والے سوداگر نے لئے اور سرکار سے خلعت اور شمشیر عطا ہوئی وہ الگ، تب کہیں ہات آیا تھا۔ چلتے چلتے سوداگر جتا گیا تھا کہ حضور اسے تو یہ گھڑ مونہے کو افیم سے نہ توڑیئے گا پھر سال بھر بعد دیکھیئے گا سات زبانوں میں تو بات کریگا، اور سپہگری کا فن تو گویا ان کے ملک سے نکلا ہے، غلہ وہ بے مثل لگاتے ہیں گھڑ مونہے لوگ کہ واہ وا! ہاں بھئی غفور خاں پھر کیا ہوا؟"

گپوا: "ہوا کیا آپ کا سر، اے حضور میں آپکو اتنا نہ جانتا تھا، یہ بتا دیجئے کہ آپ کو کبھی بخار آیا ہے تو آگے چلوں۔"

مرزا: "ایک دفعہ پوچھتے ہو، میاں کوئی سو کروڑ دفعہ آیا ہوگا۔"

گپوا: "بس میاں آپ کے برابر ہم نے تو دوسرا دیکھا نہ سنا، لیجئے آج خبر ہوئی کہ آپ گھڑ مونہے آدمی برت چکے ہیں، پھر بھی پوچھے جاتے

ہیں کہ لام کہاں بندھا لڑائی کس سے ہو رہی ہے؟"

مرزا:۔ تو یہ کہئے بندہ پرور آجکل گھڑموہوں سے چھڑی ہے سمندر پار۔ اہا جبھی تو میں کہتا ہوں یہ افیم یہ افیم کس طرف لدی چلی جا رہی ہے، ٹھیک اب سمجھ گئے ہم، اہیں اوہ! گپو دیکھا جہالت کا مزہ آج چکھا کہ نہیں؟ دیکھئے ہم کو وہ علم بغیر پوچھے معلوم ہو گئی اور تم سُنی سُنائی اُڑا رہے تھے، کیوں سچا، تو وجہ کیا کہ بادشاہوں شہزادوں کی صحبت اُٹھائی ہے، رئیسوں نوابوں کی آنکھیں دیکھی ہیں ہم نے، یا آپکی طرح گھس کھُدوں کی"

گپوا:۔ اتنی دیر میں حضور کی مجھ پر ایک ہوئی، خیر کہہ لیجئے مالک ہیں جان مال کے آپ"

مرزا:۔ جی وہ اب ایک ہو یا دو، سُننا پڑیگی قبلہ" راوی این قبلہ! "میاں علم اور تجربہ بڑی شے ہے، ابھی اس کے زور پہ کہہ لو، ضلع جگت پھکڑ اس کے بل پہ اُڑا لو، جی اور کیا، ہل تک چلا لو، اور تو اور علم کے زور سے افیم وہ گھلتی ہے کہ باید و شاید، ہاں بھئی گھڑموہوں کا حال تم ہم سے سُنو، ان کا کھانا پینا سب افیم ہے، بس معلوم ہوتا ہے اور معلوم کیا ہوتا ہے یہ بھی علم کی بدولت ہے جو ہم بتا رہے ہیں، ورنہ کوئی بڑے مولوی مولانا تو بتا نہیں سکتے ان باتوں کو بتانا تو درکنار بڑی شے ہے، توبہ توبہ کرکے کہتا ہوں منہ نہیں کھول سکتے ہمارے سامنے، ہاں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک اُدھر برسات نہیں ہوئی اور قحط پڑ گیا بس بولا کے گھڑموہوں نے چڑھائی کر دی، ہندوستان ہوا، مالوہ ہوا، چلین ماچین ہوا، یہ تو آپ جانیں کانیں ہیں افیم کی کانیں، یہاں سے بڑھ کے ہوتی ہی نہیں کسی ولایت میں، ہفت اقلیم میں یہیں سے مال جاتا ہے، تو اب دیکھئے کہ جب یہاں جواہرات کے مول ہو گئی تو وہاں کا کیا ٹھکانا، معاذ اللہ، بس جھلا کے اُنہیں نے چڑھائی کر دی، یہ ملک ٹھہرا ہمیشہ کا دَتو، لگے کھانچی پہ کھانچی پٹارے پہ پٹارا بھیجنے، لاحول ولاقوۃ الا باللہ، لعنت ہے قسم قرآن کی اس بزدلے پن پہ، زد ف ہے

واللہ! اب آئے تو دیا ہوتا ذری سرحد تک، پھر دیکھتے کہ کیا گنی کا ناچ ناچتے ہیں یہ گھڑموہے، اور سُنئے یہ پردیسی چوٹٹے آکر ملک سے افیم لے جائیں، اور ہم کنگال ہو کر دربدر مارے پھریں، ایک ایک کا منہ تکیں"

گپوا:۔ لیجئے آپ کی بکواس میں یہ کہنا تو بھول ہی گیا کہ گھڑموہوں سے لڑنے کے لئے آدمی بھرتی ہو رہے ہیں، لال کرتی میں ایک صاحب آیا ہے وہ بھرتی کرتا ہے، بڑا بھلا مانس ہے، حکم دیا کہ جو چاہے لام پر چلا جائے، آدھی چھٹانک افیم، اور پاؤ بھر جواہر کے ہاں کی بالوشاہیاں اور سیر بھر دودھ اور شکر چاہے چینی لیجئے چاہے شجہانپور کی، اور بالائی پیڑے، گرما گرم چاہ کی پیالی سبو شام ملیگی، ایندھن مفت، برتن کپڑے اپنے اپنے، مل میاں ۔۔۔۔۔"

مرزا۔ بات کاٹ کر "بھئی غفور خاں، جو یہ سب سچ نکلے تا تو قسم قرآن کی کل ہی سے تم برطرف اور ہم رسالے میں، مالک ہزار ہزار شکر ہے تیرا پروردگار، وہ جو کہتے ہیں گھورے کے بھی بارہ برس بعد دن پھرتے ہیں، وہ مثل سچ ہو گئی، بس غفور خاں کل سب کا حساب کرا دو، اور بھائی" آبدیدہ ہو کر "خدا کے لئے تم کو پنجتن کا واسطہ ہمارا کہا سنا معاف کرنا، ہم تو چلے، بس قسم قرآن کی ایک ایک دم اب شاق ہے واللہ ہم پر، اور میاں سپاہی کی موت مرنا تو خدا ہر مسلمان کو نصیب کرے، لڑینگے اور یا تو مر ہی جائینگے یا" گالی دیکر "ان گھڑموہوں کا قصہ ہمیشہ کیلئے پاک کر دیں گے"

گپوا:۔ مل میاں آپ میں ایک بڑا عیب ہے کہ کسی کی اپنے آگو سُنتے نہیں، اے حضور یہ سب کچھ ہوا۔ ایک بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، وہ بھی تو سُن لیجئے، وہاں تیس برس تک کے آدمی لئے جائیں گے، باقی ندارد"

مرزا:۔ ہا کمبخت پھانس مار، تو ہر جگہ کانٹا مارتا ہے مردود، جا دُور ہو سامنے سے، ورنہ اس وقت طیش ہے قسم قرآن کی، ہات مُنہ چل گیا تو ۔۔۔۔۔"

گپوا۔ قطع کلام کرکے "ہاں ہاں میاں ہات کا جواب تو خیرات ہے،

منہ نہ چلے نہیں تو میرے کون آدھی رات کو کپڑے ونپڑے دھوتا پھرے گا، جاڑے کے مارے آپ ہی کچومر نکلا جا رہا ہے۔"

مرزا (ہنسکر) "بڑا مسخرا ہے۔ ہر وقت دل لگی، ہر وقت دل لگی، مگر یار گپو تم بھی ہمارے ساتھ چلے چلو، دیکھو تو قسم قرآن کی کیا جشن رہتے ہیں۔"

گپو - "پہلے اُس بات کا تو ٹھیک کر لیجئے۔"

مرزا - "واہ بے، ہم نے تیرے کہتے ہی وہ ترکیب دماغ سے اُتاری ہے کہ بقراط کو بھی سُنکر چکر آئے۔" (کان میں) "بے خضاب لگالیں گے کسی سے کہنا نہیں، بھیڑ میں دیکھتا کون ہے، نکل چلینگے، کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔"

گپو - "نہیں حضور، میں کہیں آپ کی آبرو کے پیچھے تھوڑی پڑا ہوں، ہنسی دل لگی میں اور بات ہے، آپ مالک ہی جو ٹھیرے۔"

مرزا - "تو بھی غفور خاں چلنا پڑیگا، اس کان سُنو یا اُس کان۔ میدانِ جنگ میں تمہارے آقا کے کیا کیا جوہر کھلتے ہیں، قسم قرآن کی ایک ایک گھڑمونہے کو جو رنگ نہ بنایا تو نام نہیں، بانک، بنوٹ، پٹا، تلوار، نیزہ۔ آخر ہم بند کس کام میں ہیں، ہاں ایک ذری گھوڑے کی سواری کا برسوں سے اتفاق نہیں ہوا ہے، اور کبھی اصل تو یوں ہے کہ گھوڑا اور پانی، دو ہی چیزوں سے مرزا ذری جھجکتا بھی ہے۔"

گپو - "حضور اس کی ترکیب غلام بتائے گا، یہ جو مٹھوا دھوبی نہیں رہتا ہے، اس کا گدھا حضور کے لئے مانگ دیں گے، دانا چارہ ہمارا اور لڑائی کے بعد گدھا صحیح سلامت واپس۔"

مرزا - "کیوں صاحب اب ہم گدھے پر چڑھیں گے، ٹھونک چلوں اسی پر، ہوا بد لگام تو؟"

گپو - "واہ میاں وا، سچ ہے نیکی کر دریا میں ڈال، بھر پایا ہم نے، جائیے اب ہم بولیں گے ہی نہیں، اور نہیں تو۔"

مرزا - (تلملاکر) "لاحول ولاقوۃ، کتنے پاجی نوکر سے سابقہ پڑا ہے قسم قرآن کی، اچھا صاحب مانا کہ گدھا منظور بھی کرلیں تو مٹھوا کیوں منظور کرنے لگا، وہ ایک ٹرا اوچھا آدمی ہے، روزگار کی بات ہے، کہ دل لگی، اب کہو۔"

گپو - "یہ کہی ٹھکانے کی اتّی دیر بعد، یہ بے شک کرکے مانے کی بات ہے، اجی ہم کچھ دے دلاکر راضی کرلیں گے اُس کو، آپ گدھے کو لیکر لام پہ چلے جائیے گا پھر کیا کر لیگا ہے کہ نہیں؟ لائیے پلاؤ والا ہاتھ کیسی کہی!"

مرزا - (ہاتھ ملاکر) "بھئی واللہ خُوب سوچی، آخر کس کے صحبت یافتہ ہو ــــ"

گپو - "وہی گُھس کُھدے کے، کہیئے ہوئی اب تو؟"

مرزا - "ہوئی اور بیچ کھیت ہوئی، مرتے وقت بھی خُدا کو جان دینا ہے، ذری سی بات کیلئے ایمان نہ بیچیں گے۔"

گپو - "تو سویرے اُٹھکر پکی کر لیجئے گا۔ ورنہ دس بجے مٹھوا گھاٹ پہ چلا جائیگا۔"

مرزا - "یہ بھی کوئی بات ہے، اور ہاں عرضی پرزہ تو نہیں لکھنا ہوگا، اجی خود ہی لکھ لیں گے کوئی دبتے ہیں اس میں ہم کسی سے۔"

گپو - "دیکھیئے ہم بتائیں، جیسے اُٹھے، کہیئے ہاں، کھا پی کے گدھا ٹھہرایا، پھر چلے ریل پہ، مل میاں اِکہ کرنا پڑے گا۔ پیدل نہیں چلا جائیگا، کالے کوسوں ریل گھر ہے، وہاں سے لوٹے تو چلے صاحب کے ہاں، چھٹی ہوتی، آئے گھر، اور دوسرے تیسرے روز ہم اپنے گھر اور آپ جہندم واصل، لیجئے فرصت ہوئی۔"

مرزا - (برافروختہ ہوکر) "ہاں فُرصت ہوئی، مگر یہ جہندم کیا معنی، ایں یہ جہندم کس چڑیا کا نام ہے؟" (گالی دیکر) "نالائق بارہ برس دلّی میں رہے بھاڑ جھونکنا نہ آیا۔ ابے جہندم نہیں، جہنّم جہنّم! کہہ جہنّم، ایک دفعہ نہیں دس دفعہ، تب یاد ہوگا کمبخت کُند ذہن۔"

گپو - جہنّم جہنّم ... دس بار کہکر "کہہ تو دیا کہ الف بے تک پڑھا ہی نا ہم نے، بس اُس میں تو جہندم ملے تو یہ جہنم جہنم کہیں آیا نہیں، یہ تو آپ پڑھے لکھے لوگوں کیلئے ہے میاں۔"

مرزا: پھول کر: "اور کیا تم سے کندۂ ناتراش کے لئے، ایسے ہم شعر کہتے ہیں ــــ"

گپوا: "کہتے ہونگے، مُل میاں ابھی بلا دیکھا تھا تو کچھ نہ بنا سکے۔"

مرزا: "تم گدھے ہو۔"

گپوا: "مُل آپکے لئے میاں مٹھوا والا ہی آئیگا۔"

مرزا: "اماں ہاں۔ سُنا بھئی۔ ذری تڑکے اُٹھنا۔ خضاب بھی لگانا ہے۔"

گپوا: "تو اس میں جلدی کی کیا ضرورت، توے کی سیاہی میں ذری سا کڑوا تیل ملا دینگے، بہت بڑھے، اور حضور کے مزاج میں ذری تکلف بھی ہے تو دھوئی تل کا سہی، چلئے خضاب بن گیا، مُنہ کالا ہوگیا۔ دیکھئے گا کیا کاک ریزی ڈاڑھی نکھر کے آتی ہے، اب دو گنڈے کیوں بے فضول کو خراب کیجئے۔"

مرزا: مسکرا کر: "مذاق کرتا ہے بے۔ اچھا ایک حقّہ اور بھر لو اور سونے کی ٹھیرے۔"

گپوا: "ایں ایں یہ بد بہریزی۔ ابھی رات پڑی ہے۔ اور یہاں نیند اپنے حساب کسی مردود کو آتی ہوگی، جبسے یہ سُن لیا ہے کہ حضور کا وقت آگیا واللہ نیند بھوک کوسوں بھاگ گئی۔"

مرزا: "ہاں بھئی یہ دُنیا سرائے فانی ہے، اوّل مرنا آخر مرنا۔"

گپوا: "آغا تقی کے باغ میں کوآ اصلال ہے۔"

مرزا: "یہ کیا ہے؟"

گپوا: "آپنے ابھی کہا نہ تھا کہ ہم شعر کہتے ہیں، آپ تو کہتے ہی رہے، ہمنے پڑے پڑے ایک جوڑ بھی دی۔ کیوں خداوند کیسی ہے؟"

مرزا: "پاگل! کیسی؟ نہیں کیسا، کہہ۔"

گپوا: "ہم نہیں ملتے آپ اپنے ویسے کہئے، ہم اپنے یوں کہتے ہیں، پھر اس میں آپ کا اجارہ، چلئے جھنجھٹ گیا۔"

مرزا: "اب تجھ سے کون جھک جھک کرے، حقہ تو اُٹھ کے لا۔"

گپوا: "میاں کیسے، اس وخت تو آپ ہی بھر لیجئے، ذری دیر کو آپ ہی نوکر بن جائیے، ہم کہیں "مرزا" آپ کہیں "جی"۔ کبھی ناؤ گاڑی پر کبھی گاڑی ناؤ پر۔ ہے کہ نہیں۔"

مرزا: "اب آ ہی گئی شامت تمہاری بچّا۔ بالکل نہیں رہے حواس میں تم ــــ"

گپوا: بسور کر: "حضور حواس کیونکر سے ٹھکانے رہیں آپ تو لڑنے مرنے جائیں اور میں بغلیں بجاؤں، مجھ سے تو یہ نمکحرامی نہ ہوگی۔"

مرزا: "شاباش جیتے رہو، اسی بات پر وہاں سے لوٹ کر ہم تم کو کچھ دینگے، اچھا دیکھو کہیں یاد کرکے وہ ہمارا سبز گوٹ کا اتو کیا ہوا انگرکھا ہے نا؟ وہ۔ اور شہزادے صاحب والی مندیل، اور ہاں کمر کا پٹکا صندوق میں سے نکال رکھنا، اور ہاں خوب یاد آیا قلم دوات کاغذ بھی کہیں سو مانگ لانا، کنکوے کا کاغذ ذری باریک ہوتا ہے نہیں تو مزے سے اُسی پہ عرضی تان دیتے۔"

گپوا: "جی بہت خوب، مُل میاں ․ ․ ․ ․"

مرزا: "مُل کیا؟ صاف صاف کہو جی۔"

گپوا: سر کھجا کر: "حضور یہ ہے کہ بنیہ تو کل سے گنگا نہانے کان پُر گیا ہے، دس بجے کی ٹیم سے آلیگا، تو کہیں نہا دھو، روٹی دوٹی کھا کر بارہ بجتے بجتے دکان کھولیگا، یوں جو حکم ہو۔"

مرزا: "پھر باشد! بنیہ سے انگرکھے پجامے کا کیا تعلق؟"

گپوا: "حضور کی جامدانی تو وہیں ہے نا!"

مرزا: "خدا کی مار تجھ پر۔ ملاعون کے بچّے، ابے کیا میرے کپڑے بھی گروی رکھ دئے؟"

گپوا: "تو خداوند یہ چار پانچ سے چکوتھیاں کہاں سے ہو رہی ہیں۔"

مرزا: "پھر اب؟"

گپوا: "اب یہ کہ اس وخت تو ٹھنڈے ٹھنڈے سو رہیے، سویرے کوئی فکر کرونگا۔"

مرزا اپنی اُمیدوں کا یوں خون ہوتے دیکھکر دم بخود رہ

گئے۔ کیسا حقہ اور کس کا حقہ! افیمی آدمی، دو چار ہی کروٹیں بدلنے پاتے تھے کہ نیند آ گئی۔ گویا اپنا مطلب حاصل کر، رزائی سمیٹ گٹھڑی بن، مُسٹ مار کر جو لیٹا تو مُردوں کے کان کاٹنے لگا۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ہے ہے اُکتا گئے ہو گے۔ چلو ایک انگڑائی لو، اور "مرزا" اور "گپّو" دونوں کو بھول جاؤ، پچھلا پہر ہے، ہم بھی تھک گئے اور اب سوتے ہیں، زندگی شرط ہے، یاد آیا اور جی لہرایا تو اب کے "مرزا" کے ساتھ "اسٹیشن" اور "بھرتی والے" کے ہاں چلیں گے۔

"آوارہ"

ایک مندر جانے والی

چلی ہے گھر سے وہ ہمجولیوں کو ساتھ لئے　　نمودِ صبح میں تاروں کو جھلملائے ہوئے
ضیائے شرق سے کٹتے ہوئے دھندلکے میں　　سپیدۂ سحری کے دِیے جلائے ہوئے
شفق کے تختۂ رنگیں میں تتلیوں کے پرے　　فضا میں تیر رہے ہیں پرے جمائے ہوئے
ہجومِ حُسن میں چھپتی نہیں مری تتلی　　وہی جو دیکھ رہی ہے نظر جمائے ہوئے
مرا "تعاقبِ محمود" طے شدہ ہی سہی　　مری نگاہ کی جُرات سی ہچکچائے ہوئے
رُخِ صبیح پہ گلگونۂ حیا کی قسم　　تجلّیوں کو چُرائے ہوئے۔ لجائے ہوئے
شرارتوں کو سکھائے ہوئے شکیبائی　　متانتوں کی تامل سے لَو لگائے ہوئے
ٹھہر ٹھہر کے دوپٹہ کو ہاتھ سے تھامے　　چھٹک چھٹک کے "دوملے" پہ خار کھائے ہوئے
"سنہری بال" "طلائی بروچ" سے روکے　　جبینِ ناز پہ ریشم سی لٹ گرائے ہوئے
لبوں کو ضبطِ تبسّم کا واسطہ دے کر　　کلی کلی پہ حقارت سے مُسکرائے ہوئے
سوادِ خال کو سمجھے ہوئے "محلِ نظر"　　سیاہ سرمے سے ٹھوڑی پہ تل بنائے ہوئے
حریمِ دل میں بٹھائے خیالِ بتخانہ　　قدم اُٹھائے سرِ بندگی جھکائے ہوئے
بس ازادائے رسوم و سجودِ اہلِ کنشت　　پلٹ رہی ہے وہ مندر سے جل چڑھائے ہوئے
اُٹھائے ہاتھ پہ ہلکی سی پیتلی تھالی　　کمر دباؤ سے تھوڑا سا لوچ کھائے ہوئے

تلک سے "برہمنِ ہردوار" پیشانی
غلط ہے شاؔد مرا ادعائے ایمانی

شاؔد عارفی

تجرّد کی ناکام خودرائیاں

(ایک ناتمام ڈرامہ جسے جو شخص چاہے تکمیل کو پہونچا سکتا ہے۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے)

کلکتہ ـــــ لوئر سرکلر روڈ پر ایک "فلیٹ" ـــــ شام کا وقت ـــــ بیسویں صدی عیسوی

لب سڑک ایک کمرے میں دو آدمی آپس میں بے تکلفانہ گفتگو کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کافی موٹا تازہ ہے، توندکی وجہ سے کسی بینک کا منیجر معلوم ہوتا ہے۔ عمر پینتیس چھتیس سال کے قریب ہے مگر چہرے سے بچپن نمایاں ہے۔ شرارت آمیز تبسم کی ایک جھلک کبھی کبھی سفید سفید دانتوں کی قطار کو ظاہر کر دیتی ہے جو روزانہ نیم کی مسواک سے صاف کئے جاتے ہیں۔ اُس کا ساتھی اُسے "مُرشد" کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ دوسرا پتلا دُبلا سا نوجوان ہے جس کی عمر چھبیس سال سے متجاوز نہ ہوگی۔ اُس کے بُشرے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ دُنیا کی ہر چیز سے تنگ آ گیا ہے مگر کسی خاص چیز سے نہیں۔ ہر حرکت سے بیقراری اور اضطرار ٹپکتا ہے۔ "شکیل" کے نام پر بولتا ہے۔

اس وقت شکیل کھڑکی کے قریب کھڑا ہوا سگرٹ پی رہا ہے۔ اُس کا موٹا دوست ایک آرام کرسی کی گہرائیوں میں چھپا ہوا ہے۔ ٹانگیں ہوا میں اُٹھی ہوئی ہیں اور کرسی کے ڈنڈوں کے ساتھ عجیب عجیب زاوئے بنا رہی ہیں۔

مُرشد:۔ یار، تم پر ترس آتا ہے (خاموشی ..... وہ پھر کہتا ہے) سنتے ہو، شکیل، مجھے تم پر ترس آتا ہے!

شکیل:۔ کیا کہنا! بہت بہت شکریہ!

مُرشد:۔ مجھے معلوم ہے تمہیں کیا مرض ہے ..... تمہیں اور تمہارے ہی جیسے بہتوں کو! کیا تم جانتے ہو کہ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے؟

شکیل:۔ بھئی واہ، شاید تم بتا سکو۔ مگر خُدا کے لئے اپنا ہومیوپیتھی والا علاج شروع نہ کر دینا۔ میں اس سے باز آیا۔ اِن دواؤں کے تجربہ کیلئے تمہیں دُنیا میں بہتیرے تندرست مریض مل سکتے ہیں۔

مُرشد:۔ (ہنس کر) تم تو خواہ مخواہ ہومیوپیتھی پر خار کھائے بیٹھے ہو مگر واقعہ یہی ہے کہ ہومیوپیتھی ایلوپیتھی سے کہیں زیادہ سودمند ہے۔ خیر! اس بحث کو طول دینے سے کچھ فائدہ نہیں۔ میں کچھ اور کہہ رہا تھا۔ سُنو۔ ـــ تمہیں ایک بیوی کی ضرورت ہے، بیوی! تم اب شادی کر ڈالو، سمجھے۔ کر ڈالو، کر ڈالو، کیا ہرج ہے! کیا ہرج ہے!

شکیل:۔ بھئی واللہ، مُرشد، خوب سمجھے۔ ـــ ماشاء اللہ کیا انکشاف ہے! مانتا ہوں ..... مگر ذرا دیر میں چونکے۔ کیوں؟

مُرشد:۔ بیوی کے لئے دیر سویر کا کیا سوال! (کچھ رُک کر) مجھے دیکھو۔ جب سے میں نے طبی اُصول پر عمل کرتے ہوئے گوشت کھانا چھوڑا ـــ اور یہ تم جانتے ہو کیونکہ اُن دنوں تم میرے ہی ساتھ رہتے تھے ـــ اُس وقت سے مجھے اپنی دو ضرورتوں کا احساس رہا ہے ـــ روپیہ اور بیوی! اور دیکھو میں نے دونوں کو حاصل کر کے چھوڑا۔

شکیل:۔ واہ رے میرے شیر! مگر یار مُرشد، تم نے تو اُن دنوں ترکاری کھلا کھلا کر ناک میں دم کر دیا تھا!

مُرشد:۔ (اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے مگر موٹاپے کی وجہ سے کرسی ہی میں مقید رہتا ہے) تو تم گوشت کھانے لگے! بہت تمہاری کی! تم اور تمہارے جیسے لفنگے کبھی ایک اُصول پر قائم نہیں رہتے۔ اپنی مونچھ ہی پر غور کرو۔ پہلے تو تم اسے چنے کے برابر تراش لیتے ہو اور پھر اس پر تاؤ دینے کی کوشش کیا کرتے ہو۔ یہ کبھی نہیں بڑھتی بلکہ اکثر موہوم ہی رہا کرتی ہے۔ مجھے دیکھو۔ میں نے ایک سرے سے یہ جھگڑا ہی نہیں پالا ـــ بالکل صفائی بولدی ـــ اور اب اسی ایک وضع پر قائم ہوں!

شکیل:۔ شاید تم اس کشتی نما ٹوپی کو نظر انداز کر رہے ہو جو آٹھ پہر تمہارے سر سے نہ اُترتی تھی!

مُرشد:۔ ہا ہا ہا، خوب یاد دلایا، مگر اُن دنوں میں انگریزی وضع کے بال بھی تو نہ کٹتا تھا۔ اب تم سے کیا پردہ! سُنو، نیلوفر کا اصرار تھا۔

شکیل:۔ اور تم دب گئے!

مُرشد:۔ شکیل، تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جب ایک عورت اصرار کرتی ہے تو اُس میں بھی ایک رمز پنہاں ہوتا ہے۔ ایک مقصد ہوتا ہے۔

شکیل:۔ (قریب آ جاتا ہے اور "مُرشد" کی پیٹھ ٹھونکتا ہے) عورت! مقصد! مُرشد، کیا کہہ رہے ہو؟ معلوم ہوتا ہے ابھی تمہیں بہت کچھ

سیکھنا ہے۔

مرشد:۔ ہر انسان کے کان میں شیطان نے پھونک دیا ہے کہ اس سے زیادہ قابل اور ذی فہم کوئی نہیں۔ جب تم ایک بھولے بھولے گالوں والے بچے تھے تو اُس وقت بھی تو تمہارا یہی خیال تھا کہ تم چاند کو سمجھ سکتے ہو۔ عورت! ارے وہ تمہارے ادراک سے بالاتر ہے۔ تم اس کا تعین نہیں کر سکتے!

شکیل:۔ عورت کی صرف ایک تعریف ہو سکتی ہے، صرف ایک۔ وہ حزن و ملال کا دوسرا نام ہے۔

مرشد:۔ تم گدھے ہو، کابل کے ——— جو کلکتہ میں بھٹک آتے ہیں۔ ارے عورت تو جمالیات کا اصل اصول ہے۔ میں کسی زبردست شخصیت رکھنے والے مرد کا تصور بغیر کیریکٹر کے اور کسی زبردست شخصیت والی عورت کا تصور بغیر خوبصورتی کے نہیں کر سکتا۔ کیا تم نے میرا "فلسفۂ جمال" نہیں پڑھا؟

شکیل:۔ تم اپنے فلسفہ کو اپنے سفید بالوں والے سر ہی میں رہنے دو۔ میں اس سے باز آیا۔ میرے نزدیک حسن و جمال بہت سی ایسی چیزوں کا بدل ہوتا ہے جن کی بنیاد 'نیکی اور بھلائی' پر ہوتی ہے! (مضطرب ہو کر کمرے میں ادھر اُدھر چکر لگاتا ہے۔ اس کا دوست اُسے دیکھتا رہتا ہے۔ اچانک وہ رک جاتا ہے) مرشد، کسی شے کو حاصل کر لینے، اپنا بنا لینے کا جذبہ ہر فرد کی زندگی میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ میرے لئے خوبصورت عورتوں کا وجود باعثِ تسکین و مسرت ہے۔ ایک حد تک وہ مجھے مسحور بھی کرتی ہیں مگر ان پر قبضہ کر لینے کا خیال مجھے ایسا ہی عجیب معلوم ہوتا ہے جیسا "تاج محل" یا کسی اور خوبصورت شے کو اپنا تصور کر لینے کا!

مرشد:۔ ہیر ہیر! شاباش!

شکیل:۔ لوگ کہتے ہیں کہ حسن میں کچھ غیر مادی عنصر بھی ہوتا ہے، جو دوری اور نارسائی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی عنصر لوگوں کی نجات کا باعث ہے (اچانک سوال کرتا ہے) تمہاری شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟

مرشد:۔ پانچ سال!

شکیل:۔ (آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا ہے) اور ابھی تک تم "فلسفۂ جمال، فلسفۂ جمال" چلا رہے ہو!

مرشد:۔ میاں تم کیا جانو۔ یہی تو وہ تجربہ ہے جس سے تم ناآشنا ہو۔ میں کہتا ہوں۔ پہلے بھی کہتا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ "وہ "خدا کی بہترین اور جمیل ترین مخلوق ہے!

شکیل:۔ ہو گی ——— (کچھ دیر سوچ میں رہ کر) تم تو سامی النسل ہو نہ؟ چھپاؤ مت تمہاری آنکھیں، تمہاری قومیت کی غمازی کر رہی ہیں۔ تم لوگوں کے پرانے عقیدے کے مطابق خدا نے کائنات کو پیدا کرنے کے بعد "روزِ سبت" منایا تھا ——— مرشد، کیا خدا کا تصور اس کھنڈرے جیسا نہیں جو کام سے بھاگ جانے کا متمنی ہو؟ (خیالات کی دنیا میں کھویا سا جاتا ہے) اُس کے ذمہ بہت سی چیزوں کو مکمل کرنا تھا . . . . . اور شام ہو چلی تھی . . . . . ہو سکتا ہے کہ اُس کی دوست "کارخانۂ قدرت" کے دروازے پر اس کا انتظار کر رہی ہو، یا اُس کے دماغ میں ہفتہ کے اختتام پر "پکنک" کا خیال سمایا ہو . . . . . صبح صبح اس نے تیندوے کی کھال پر خوبصورت خوبصورت نقش بنائے تھے اور عندلیب کے نغمہ کا تال سُر ٹھیک کیا تھا ——— مگر اب تو اُسے جلدی تھی اور اُس نے اس بات کا التزام نہ کیا کہ عورت کے جسم میں "دل" بھی رکھ دے!

مرشد:۔ کاش نیلوفر یہ خیال آرائیاں سن سکتی!

شکیل:۔ وہ تم سے پہلے یہ جانتی ہے۔ مرشد، مرد کے لئے کچھ مباحث لازوال اہمیت رکھتے ہیں ——— محبت۔ فطرت (جو زندگی ہی کا دوسرا نام ہے) اور مذہب . . . .

عورت کی دنیا ہی دوسری ہے۔ محبت کا اظہار کرو گے تو اُسے کنگھی چوٹی کا خیال آئے گا۔ فطرت کا نام آتے ہی وہ پھولوں کے زیور کا تذکرہ کرنے لگے گی اور مذہب ——— ارے مذہب تو ایک بڑا بھاری تہوار ہے۔ ایک اسٹیج ہے جس پر وہ اپنے بہترین ملبوسات اور رعنائیوں کی نمائش کر سکتی ہے! ایک مذہب ہی پر کیا موقوف ہے۔ اس کے لئے تو ہر جگہ اور ہر موقع اپنی نمائش کے لئے مناسب اور موزوں ہوتا ہے۔ کبھی تم کسی کالج کے توسیعی لکچروں میں شریک ہوئے ہو؟ یہ پوچھنا ہی فضول ہے، ضرور ہوئے ہو گے۔ وہاں کبھی اپنی ان سماوی پیکروں کے اوچھے پن پر غور کیا ہے؟ کیا ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ سامعین کی توجہ اور نظروں کا مرکز بجائے لکچر دینے والے کے وہ خود بن جاتے ——— اور کیا اس خواہش کے پورا کرنے کے لئے ہر قسم کی آرائش اور ملبوس پر بے دریغ روپیہ خرچ نہیں کیا جاتا، وہ روپیہ جس کے حاصل کرنے میں اُس کا ذرا سا بھی ہاتھ نہیں ہوتا!

مرشد:۔ (مسکراتے ہوئے اور بلا کسی قسم کا اثر لیتے ہوئے) پناہ بخدا! تم تو پکے بُت شکن نکلے۔ تمام نصب العین مسمار کر ڈالے! حسن بھی تم سے

پناہ مانگتا ہے۔

شکیل:۔ ہر سچا مذہب یہی تعلیم دیتا ہے۔

مرشد:۔ مجھے تم سے اختلاف ہے۔ میں ان چیزوں کو لوازماتِ زندگی سمجھتا ہوں۔

شکیل:۔ انسان کو مذہب کی ضرورت زندگی کے لئے نہیں بلکہ موت اور اسکی بعد کی حالت کے واسطے ہوتی ہے!

مرشد:۔ تو پھر زندگی کے بارے میں حضور کا کیا حکم ہے؟

شکیل:۔ سنو، خیالات کے گڈمڈ ہوجانے کا سب سے بڑا باعث یہی موت وحیات کے متعلق غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ ہمارے نزدیک زندگی عبارت ہے ایک سلسلۂ دوام سے۔ اور موت صرف ایک منزل ہے، ایک پتھر ہے جو وقت کی شاہراہ کی پیمائش کے لئے نصب کیا گیا ہے۔ بس اور کچھ نہیں! یہ بڑی بھاری غلطی ہے! مرشد، انسان کو عرصۂ دراز تک اُسی طرح "مرتے رہنا" پڑتا ہے جس طرح وہ جیا کرتا ہے۔ موت کی بھی ایک مدت ہے۔ موت بھی زندگی کی طرح ایک "سلسلہ" ہے۔ مجھے دیکھو میرے لئے زندگی اور موت دونوں ہمکنار ہیں ــــ اسے چاہے "زندگی میں موت" کہو یا "موت کی حالت میں زندگی"!

مرشد:۔ تمہارا دماغ پھر گیا ہے۔ تم کو فنی اور ادبی بدہضمی ہوگئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تم نے عرصہ تک کتابوں سے سر مارا ہے مگر تم میں اور اس کتب فروش میں کوئی فرق نہیں جو نئی کتابوں کے متعلق اخبارات میں تبصرے پڑھ پڑھ کر اپنے خریداروں کے سامنے اپنی ہمہ دانی کی ڈینگ مارا کرتا ہے اور اس طرح اپنی جہالت کے اس تکلیف دہ احساس کو دور کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے جو ہر لمحہ اس کی روح کے اندر نیش زنی کرتا رہتا ہے۔ تم نے مطالعہ سے کوئی فائدہ اخذ نہیں کیا۔ زندگی سے ناواقفِ محض رہ گئے۔ تمہیں زندگی کا تجربہ ہی نہیں ہوا! اپنے علم اور زندگی میں تم کوئی ہم آہنگی پیدا کرنے سے معذور ہو۔ تخیل کی فضا میں قلابازیاں کھایا کرو۔

شکیل:۔ زندگی! تجربہ! مرشد، ان خام خیالیوں کو چھوڑو۔ تمہاری عمر مجھ سے دس بارہ سال ہی تو زیادہ ہوگی۔ ذرا بتاؤ تو تم زندگی کے بارے میں کیا جانتے ہو جو میں نہیں جانتا؟ تم خود زندگی سے واقف نہیں ہو۔ تمہارے والدین نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ تم کو زندگی سے بیگانہ رکھیں جسے وہ "پاکدامنی" کہتے تھے وہ دراصل "جہالت" کا سبق پڑھانا تھا۔ اور تم سمجھتے ہو کہ تم کو آدابِ معاشرت سکھائے گئے ہیں، حالانکہ جو سوسائٹی اور تمہارے ماحول اور طبقہ کے تعصبات اور اپنے ہم جنسوں سے نفرت کے درس کے علاوہ اور کچھ نہیں!

اور تمہاری بیوی ــــ کیا وہ حد سے زیادہ اس بات کی کوشش نہیں کرتی کہ تمہیں اپنی صنف سے بیگانہ رکھے؟ (سامنے آجاتا ہے) کبھی تمہیں ایسا اتفاق ہوا ہے کہ چراغ جلے گھر لوٹو، اس حالت میں کہ پیٹ اور جیب دونوں خالی ہوں اور کوئی بات تک کرنے کو نہ ہو؟ گرے اسٹریٹ کے کونے پر کبھی تم اُن لڑکیوں کے پاس سے گذرے ہو جو چند چاندی کے سکوں کے عوض تم کو جیتے جی جہنم میں جانے کی دعوت دیتی ہیں ــــ اور کیا اُس وقت بھی اپنے نصب العین کے لئے تم کو "خود اپنے آپ سے جنگ کرنے کی خواہش" پیدا ہوتی ہے؟ تجربہ! تجربہ! کیا کہنا ــــ!

مرشد:۔ شکیل، شکیل، تمہیں صرف زندگی کے خراب حصہ سے واسطہ پڑا ہے۔ "نصف بہتر" کو کیوں چھوڑے دیتے ہو؟

شکیل:۔ بہتر! نصف بہتر! (سگرٹ کا سرا پھینکتے ہوئے) مرشد، عمر بھر میں مجھے صرف ایک ہستی ایسی ملی تھی جس نے مجھ کو خوش آئند خواب دیکھنے پر مجبور کیا۔ میں اُس کی پرستش کرتا تھا ــــ پرستش! اور میں نے اُس کے قدموں میں رکھدی تھی ہر وہ چیز جو مجھ میں نیک اور خوبصورت کہی جاسکتی ہے۔ اُف کتنا شیریں تجربہ تھا! مگر اچانک میرے تمام خواب تلخ حقیقت میں تبدیل ہوگئے . . . . میں یہ نہیں کہتا کہ میں بالکل بے قصور ہوں۔ ذرا سی بات تھی . . . . مگر اس کے تعصبات اور تنگ نظری کے خیالات ظاہر ہوگئے! یہ ممکن ہے کہ وہ حالات اور واقعات کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔ ممکن ہے اس کا یہ خیال ہو کہ میں اُس کی اس حرکت کی پرواہ نہ کرونگا۔ شاید وہ یہ سمجھتی ہو کہ میں اُسے بھلانے میں کبھی نہ کبھی کامیاب ہوسکونگا . . . . . شاید . . . . . . شاید . . . . . خیر اُس کے خیالات کچھ ہی ہوں مجھے اس سے بحث نہیں۔ مجھے صرف اپنی روحانی موت اور جانکندنی کی اذیت کا احساس ہے۔ "اُسے معلوم تھا کہ مجھے سخت تکلیف ہوگی مگر وہ اپنی ایذا رسانی سے باز نہ آئی . . . . ہونہہ، اُسے میرے وجود سے شرم آنے لگی تھی۔ کس لئے؟ میرے چال چلن کی وجہ سے نہیں بلکہ میری ظاہری مالی ــــ حالت کی وجہ سے۔

کم نظر بیتابیٔ جانم نہ دید
آشکارم دید و پنہانم نہ دید!

مرشد:۔ میں نے آجتک کسی عورت میں سچی ذہنی رواداری نہیں

دیکھی۔ ایک بھی عورت ایسی نہیں ملی جو اپنی بلند نظری سے مجھے متاثر کر سکے اور مجھے اپنی عزّت کرنے پر مجبور کر دے۔ بھلا تمہیں بتاؤ، میں محبت کیا خاک کرونگا!

مرشد:۔ تب تو، یار، مجھے تم سے ہمدردی ہے۔

شکیل:۔ (سکون کے لہجہ میں) شکریہ۔ مگر تمہیں ہمدردی کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم کیا ہمدردی کر سکتے ہو؟ کس طریقے سے کر سکتے ہو؟ میں برسرِ روزگار ہوں، اپنی تمام ضروریات پوری کر سکتا ہوں۔ شاید میں جذباتی کشاکش کے ردّ عمل سے زندہ سلامت نکل آیا ہوں ——

(وہ دوسرا سگرٹ سلگاتا ہے اور خود فراموشی کی حالت میں ماضی کی یاد تازہ کرتا ہے) اپنے جسم میں شباب کا پہلا احساس مجھے یاد ہے۔ اُس وقت زندگی نام تھا ارمانوں اور آرزوؤں کا۔ دل میں بہت سی ایسی خلشیں محسوس ہوا کرتی تھیں جو درحقیقت نشاط انگیز تھیں، اور ایک ہستی، صرف ایک ہستی اُن سب سے متعلق ہوا کرتی تھی۔ میرے تمام خوش آیند خوابوں کی آخری حد رہی تھی۔ جیسے تمام آوازیں سکوت پر ختم ہو جاتی ہیں اُسی طرح میرا تخیلِ بے پایاں بھی اُسی پر جا کر ختم ہو جاتا تھا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ وہ میرے لئے کیا تھی۔ زمانے کے ساتھ ساتھ وہ بھی بڑھتی رہی —— بدلتی رہی —— آہ، اُس کے سینے کا وہ اُبھار، جو بیک وقت اذیت اور مسرّت دونوں کا سرچشمہ تھا —— رُوحانیت اور مادّیت کا وہ بیخود بنا دینے والا امتزاج!..

..... دبی ہوئی ظالم آرزوئیں! رغبتِ جنسی ایک بلائے بے درماں بن گئی تھی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ "زندگی کی اصلی مشکلات" کیا ہوتی ہیں —— اُمیدیں ہوتی ہیں اور خطرات ہوتے ہیں —— اور تب وہ گھڑی بھی آ پہونچتی ہے جب آخرکار حقیقت کھل جاتی ہے، اور تمہارے سارے خواب خاک میں مل جاتے ہیں، اور اُن کے ساتھ ہی تمہارے اندر کی ہر وہ چیز جسے تم جوان کہہ سکتے ہو! ——

(وہ ٹھہر جاتا ہے، سگرٹ کا ایک لمبا کش کھینچتا ہے اور سلسلۂ کلام جاری رکھتا ہے:۔)

اور ایک وہ وقت آتا ہے جب تمہیں عجیب عجیب خیالات آتے ہیں۔ تم گویا اپنے بستر پر خاموش لیٹے ہوتے ہو۔ تمہیں ایسا احساس ہوتا ہے کہ تم ہر چیز سے علیحدہ کر دئے گئے ہو۔ تمہارا تھکا ہوا جسم بستر کی گرمی میں آرام محسوس کرتا ہے۔ اور اُس وقت تمہیں شاید ایک ویران سے باغ کی یاد آتی ہے اور تم تصوّر کرنے لگتے ہو کہ گویا دوپہر کا وقت ہے، آہستہ آہستہ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے، بادلوں کی وجہ سے ہلکا ہلکا اندھیرا سا چھایا ہوا ہوتا ہے..

.... اور پھر تمہارا خیال ایک ایسے نیلکنٹھ کی طرف جاتا ہے جو تنہا ساکت و صامت ایک شاخ پر بیٹھا ہوتا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے ایک عجیب کیفیت ٹپکتی ہے جو تمہیں عجیب عجیب باتیں یاد دلاتی ہے۔ بارش کے قطرے اور فضا کا سکوت تک تم سے سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں۔ اور شاید تم میں ایک نیا جذبہ، ایک نیا ایمان پیدا ہونے لگتا ہے!

(نیچے سڑک پر سے موٹر کے ہارن کی کرخت آواز آتی ہے۔ مرشد اُچھل پڑتا ہے اور کسی نہ کسی طرح کرسی کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرتا ہے۔)

مرشد:۔ معاف کرنا، یار، مجھے سات بجے ایک جگہ جانا ہے۔

(گھڑی دیکھتا ہے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوتے ہیں۔)

(موٹر میں سے ایک سیمیں آواز سنائی دیتی ہے "کیوں جی، کس مشغلہ میں اتنے محو تھے کہ دُنیا و مافیہا کو بھول بیٹھے؟" معلوم نہیں مرشد کیا جواب دیتا ہے۔ جھٹ سے پٹ کھول کر موٹر میں غائب ہو جاتا ہے، جو فوراً ہی سڑک کے کونے پر پہونچکر نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔)

سڑک پر آمد و رفت کی کثرت ہے۔ موٹروں کے ہارن کی مسلسل آواز اور بڑی بڑی "بسوں" کی گھڑگھڑاہٹ کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتی ہے، ٹریموے کی گھنٹیاں اُن پر متزاد ہیں۔

شکیل کونے میں رکھی ہوئی میز کی طرف بڑھتا ہے۔ ایک فوٹو اُٹھا لیتا ہے اور اُسکی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا ہے....

(پردہ)

نوٹ

اس ڈرامے کے تمام افراد فرضی ہیں۔ کوئی صاحب ان میں اپنی شخصیت ڈھونڈنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔

"ماض"

غلغلۂ ہندوستانی

بجواب مقالۂ پنڈت امرناتھ جھا وائس چانسلر الٰہ آباد یونیورسٹی

پروفیسر امرناتھ جھا صاحب نے روزنامہ لیڈر میں ایک بصیرت افروز مقالہ بعنوان "ببل آف ہندوستانی" شائع کرکے علمبرداران ہندوستانی کو عبرت آموز سبق دیا ہے۔

پروفیسر صاحب موصوف انگریزی علم و ادب کے مسلم الثبوت اُستاد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ مزید براں ہندی و سنسکرت زبانوں پر قدرت تامہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو زبان پر بھی آپ کو عبور حاصل ہے۔

مجھ ہیچمداں کا ایک ادیب فاضل کے مقابلہ میں اپنے ناقص خیالات سپردِ قلم کرنا گستاخی میں داخل ہوگا۔ مگر نفسِ مضمون کا تعلق چونکہ "ہندوستانی" زبان سے ہے اس لئے اپنے خیالات اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں پیش کرنے کی جرأت کرونگا۔

سب سے پہلے پروفیسر صاحب کے مضمون کا اقتباس قارئین کرام کے ہدیۂ نظر کرتا ہوں۔

اوّل پروفیسر صاحب اُردو ہندی ناموں کو برطرف کرکے زبان کو ہندوستانی سمجھنا سعی لاحاصل سمجھتے ہیں اور اس ضمن میں ہندوستانی اکاڈمی الٰہ آباد کی تمام مساعی جمیلہ کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ان تمام جماعتوں کی خدمات عالیہ کو بہ نظرِ اشتباہ دیکھتے ہیں جو اُردو ہندی کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر ہندوستانی کے عام پسند دیدہ زیب لباس میں ملبوس دیکھنا چاہتی ہیں۔

آپکے خیال میں اُردو ہندی کو مشترک کرنیکی اسکیم اپنے اندر خود غرضانہ مقاصد مضمر رکھتی ہے۔ دوم، آپ کی رائے میں دونوں زبانیں اپنی اپنی روایات اور اُصول علیحدہ رکھتی ہیں۔ دونوں کے پاس ادبی خزانے موجود ہیں۔ دونوں کے وجود سے ایسے تاریخی اور مذہبی واقعات وابستہ ہیں جو ملّی و قومی تہذیب کا حصّہ بن چکے ہیں۔

آپ کا ارشاد ہے کہ اُردو کا ماخذ زیادہ تر فارسی و عربی ہے اور ہندی ماخوذ ہے سنسکرت سے یعنی اُردو، خیالات، جذبات، الفاظ اور رسم الخط میں فارسی کا اتباع کرتی ہے اور سلطنت مُغلیہ کے زیر نگیں شہروں ہی تک محدود رہی اور اُردو نے ہندوستانی اثر کو کبھی قبول کیا نہ اُردو کا تعلق دیہات سے رہا۔ برخلاف اسکے تلسی داس و سور داس کی ہندی نظمیں دیہات میں پڑھی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ہندی میں کہاوتوں اور قومی گیتوں کے خزانے موجود ہیں جو ہر دیہاتی کی زبان پر ہیں۔

اس لئے آپ کی رائے میں دونوں زبانوں کی ادبی خصوصیات و تاریخی روایات کو نظرانداز کرکے نیا نام 'ہندوستانی' رکھنے میں بے شمار دقتوں کا سامنا کرنا ہوگا۔

سوم۔ آپکے نزدیک اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی ہندوؤں کی۔ تو کیا وجہ ہے کہ اُردو ہندی کو مشترک کرکے 'ہندوستانی' ٹریڈ مارک لگایا جائے۔ اگر اُردو ہندی الفاظ کو مٹایا جارہا ہے تو گجراتی، بنگالی، پنجابی الفاظ کو بھی مسترد کردیا جائے۔

اسی سلسلے میں کسی بنگالی مسلم مُدبّر کے مضحکہ خیز قول کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس نے اُردو کو رسول عربی کی زبان سے منسوب کیا ہے۔

آپ دریافت فرماتے ہیں کہ کیا حیدرآباد کے پچھتر فی صدی باشندوں کی زبان اُردو ہے اور کیا حیدرآباد اور بنگال میں اُردو ان لوگوں پر جبراً مسلط نہیں کی جارہی ہے جن کے آبا و اجداد اُردو سے ناواقف محض تھے؟

چہارم۔ آپ مسلم طلبا کی ہندی کے ساتھ ناروا داری پر نکتہ چینی کرتے ہوئے دریافت فرماتے ہیں کہ یونیورسٹی میں کتنے مسلمان ہندی و سنسکرت پڑھتے ہیں اُن کے مقابلہ میں کتنے ہندو لڑکے اُردو، فارسی پڑھتے ہیں۔ چنانچہ مسلم ہوسٹلوں میں کوئی ہندی رسالہ نہ ملے گا۔ برخلاف اس کے ہندو ہوسٹلوں میں متعدد اُردو رسائل پائے جائیں گے۔

آپ کا فیصلہ ہے کہ اگر کوئی قدم اُردو ہندی کو متحد کرنے کے لئے اُٹھایا جاتے تو مسلموں کی رواداری کا ثبوت اس طرح ہونا چاہیئے کہ جس تعداد میں مسلمان ہندی و سنسکرت پڑھیں اُسی تعداد میں ہندو اُردو فارسی پڑھیں۔

پنجم، آخر میں پروفیسر صاحب نے چند اقتباسات رشید احمد صاحب صدیقی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے خطبۂ صدارت سے اخذ کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ خطبہ کے ہر پیراگراف میں چوتھائی الفاظ فارسی عربی ہیں۔ اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کی مشہور تقریر "ہماری زبان" سے اقتباس کر کے بہتر الفاظ میں چوبیس[۲۴] الفاظ فارسی بتلاتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایسی زبان کو جس کو صرف فارسی داں اصحاب سمجھ سکیں ہندوستانی کہنا کہاں تک حق بجانب ہوگا۔

آپ کی رائے میں ہر شخص کو اُردو ہندی جاننا چاہیئے۔ اسکولوں میں سختی کے ساتھ اُردو ہندی کو لازمی قرار دیا جائے۔ اور اُردو ہندی دونوں زبانوں کا حق ہے کہ وہ اپنا وجود علیحدہ علیحدہ قائم رکھیں۔

مندرجہ بالا خیالات ایک ایسے عالم متبحر کے زور قلم کا نتیجہ ہیں جس کی ہستی فرقہ پرستانہ جذبات سے بلند و بالا سمجھی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی رائے فداکارانِ ہندی کے لئے وقیع اور ہمت افزا ہو مگر وابستگانِ "ہندوستان" کے لئے نہایت ہمت شکن ثابت ہوگی۔ میری ناچیز رائے میں اُردو ہندی اس قدر مختلف و اجنبی زبانیں نہیں ہیں جن کا اشتراک کسی طرح ممکن نہ ہو سکے۔ مَیں وثوق کے ساتھ کہونگا کہ انصاف پسند ماہرین السنہ اُردو و ہندی کو ایک ماں کی دو بیٹیاں سمجھتے ہیں۔ دونوں حُسنِ صورت و حُسنِ سیرت میں یکتائے روزگار ہیں، اگر اُردو پر بانکپن اور کرشمۂ و ناز قربان ہیں تو ہندی پر سادگی لوٹ ہے، دونوں زبانوں کے پرستاروں نے وفورِ شوق میں دونوں نازنینوں کو ایسے بیش بہا زیورات سے آراستہ کرنا شروع کر دیا کہ بیچاریاں گرانباری تصنع سے دبکر رہ گئیں۔ اور تمام ذاتی حُسن و جمال ملمع کاری کی نذر ہو گیا۔ اس افراط و تفریط نے زبانوں کی شکل کو اب بگاڑا کہ اصلی صورت پہچانی ہی نہیں جاتی، شاید اسی سے اعتدال پسند حلقہ بگوشوں نے ایک درمیانی روش پسند کی اور چاہا کہ اُردو سے عربی فارسی کے ثقیل الفاظ، اور ہندی سے سنسکرت کی لغات نکال کر دونوں زبانوں کو اس قدر عام فہم بنا دیا جائے کہ دونوں بہنیں ایک دوسرے کو پہچان کر گلے مل جائیں۔ اور دونوں زبانوں کے جانباز ایک دوسرے سے شیر و شکر ہو کر ہندو مسلم اتحاد کے قلعۂ معلیٰ کا سنگِ بنیاد رکھدیں جس کا نام ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی کہلایا جائے۔

ہندی، اُردو کو متحد کرنے کی مساعی بارآور نہ ہونے کے معنی ہونگے کہ مسلمان عربی و فارسی آمیز اُردو بولیں گے اور ہندو سنسکرت سے مخلوط ہندی۔ بالفاظ دیگر باہم تبادلۂ خیالات اور میل ملاپ کا حقیقی ذریعہ بھی باہمی نفاق کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔ اس طرح ہندوستان کی کوئی زبان لنگوا فرنکا (Lingua Franca —) ہونیکا حق ادا نہیں کر سکتی۔

میری رائے میں ہندوستانی اکاڈمی اور دیگر جماعتوں کا اقدام بدنیتی اور تعصب سے پاک ہونے کے ساتھ نہایت مستحسن اور مخلصانہ ہے۔

علاوہ ازیں اگر دامانِ انصاف کو نہ چھوڑا جائے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ اُردو نے برج بھاشا سے خوشہ چینی کی۔ ہندوستان میں جنم لیا اور ہندو مسلمانوں کے گود میں پلی، دیسی زبانوں کی خو بو لیکر بڑھی، پروان چڑھی اور بالآخر اپنی فرسودہ ضعیف ماں کی جانشین ہوگئی۔ اس نویلی ہونہار بچی کو ہندو مسلمانوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گلے لگایا اور آخر کار مادری زبان بنا کر شہر بہ شہر قریہ بہ قریہ پھرایا۔

تاریخ اُردو شہادت دیتی ہے کہ اُردو لشکری زبان ہے جو بازار میں مختلف زبانوں کے تبادلہ اور آمیزش سے عالم وجود میں آئی۔ اُردو میں سب سے زیادہ اس پراکرات زبان کے الفاظ شامل ہیں جو دہلی اور نواح دہلی میں بولی جاتی تھی۔ اُردو زبان کے تمام افعال مثلاً لانا، کھانا، پینا، بھاشا سے لئے گئے ہیں۔

اس موقع پر مسٹر رام بابو سکسینہ۔ ایم۔ اے کی ہسٹری آف اُردو لٹریچر کا اقتباس درج کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"زبان اُردو اس ہندی بھاشا کی ایک شاخ ہے جو صدیوں تک دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی جس کا تعلق شورسینی پراکرت سے بلا واسطہ تھا۔ یہ بھاشا جس کو مغربی ہندی کہنا بجا ہے۔ زبان اُردو کی اصلی ماں سمجھی جا سکتی ہے۔"

"اُردو کا اصلی ماخذ وہ زبان ہے جو دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی جس کو مغربی ہندی کی ایک شاخ ہونا چاہیئے۔ اور مغربی ہندی اپنی جگہ پر شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی۔ مگر زبانِ حال کی اعلیٰ اُردو ہندی سے پیدا ہوئی اس طرح کہ فارسی الفاظ نکالکر انکی جگہ سنسکرت الفاظ رکھدئے گئے۔ مگر سچ پوچھئے تو اُردو ہندی اپنی ماخذ اور نیز اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی زبان ہیں اور ان دونوں میں کچھ فرق نہیں ہے، اگر کچھ ہے بھی تو نشو و نما اور ترقی کے طریقے میں۔"

فوجی بازار کا نام اُردو تھا جہاں مختلف اقوام کے لوگوں کے میل ملاپ سے ایک نئی زبان "اُردو" نے جنم لیا۔ شاہی دربار کی زبان فارسی تھی لیکن اُمرائے سلطنت و راجگانِ ہند کی زبانیں باہم مختلف

تھیں اس لئے اُن کی باہمی گفتگو نے بھی ایک نئی زبان کا کالبد تیار کیا۔
شہنشاہ اکبر نے قلعہ میں ایک زنانہ بازار قائم کیا جس میں عجمی، عربی، ترکی، ہندی عورتیں اپنی دُکانیں لاکر سجاتی تھیں۔ اور اُمراء کی بیویاں اور محل کی عورتیں آکر خریدتی تھیں۔ اس تقریب سے باہم گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا۔ حتیٰ کہ مختلف قوموں کے اختلاط سے ایک مختلف زبان شہروں میں پھیل چکی تھی۔

پراکرت سنسکرت کی بگڑی ہوئی زبان کا نام ہے۔ متھرا اور مغربی علاقوں کی پراکرت کا نام برج بھاشا ہے۔ مشرقی علاقوں (اودھ) کی زبانوں کا نام پوربی بھاکا پڑا۔ ہندی اُردو میں دراصل وہی لوگ فرق سمجھتے ہیں جو اِن دونوں زبانوں کی باہمی مناسبت اور اُن کی خوبیوں سے ناواقف ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں، دونوں زبانوں میں بہت کچھ مماثلت ہے۔ بول چال میں بھی دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ چنانچہ اگر اُردو میں عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ کی بھرمار نہ کی جائے تو وہ شخص جس کی زبان بھاشا ہے اس سے وہی لطف حاصل کرے گا جو ہم خالص بھاشا میں پاتے ہیں اسی طرح بھاشا میں بھی ناگ بھاشا اور سنسکرت الفاظ شامل ہوکر زبان کو سخت ناقابل فہم بنا دیتے ہیں۔

اُردو زبان چونکہ برج بھاشا و سنسکرت سے نکلی ہے اسلئے اُردو زبان کی حفاظت؛ دراصل ایک لحاظ سے ہندی برج بھاشا کی ترقی وحفاظت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلم سلاطین نے محض رعایا کی سہولت کے لئے اپنی مادری زبان فارسی کو چھوڑکر ایسی زبان کو رواج دیا جو دیسی زبانوں سے ملکر بنی اور خاص وعام میں بولی اور سمجھی جانے لگی۔ اور اس طرح مسلمان بادشاہوں نے ہندو نوازی ورعایا پروری کا جو زبردست ثبوت دیا ہے اسکی نظیر دُنیا کی حکومتوں میں نایاب ہے۔

صدیوں سے فارسی اور عربی الفاظ روزمرہ کی بولی میں مستعمل ہونے کے بعد زبان زد خاص وعام ہو گئے اور اجنبی اور غیر مانوس نہ رہے۔ حتیٰ کہ اُردو عوام کی زبان کی حیثیت سے سینکڑوں برس سے ملک و عدالت کی زبان قائم ہے۔ اس موقع پر بعض مستند اہلِ قلم کے کلام کے چند اقتباسات پیش کرونگا۔

مُسلم بادشاہوں کی اِس بے نظیر رواداری ہندوستان کے رسم ورواج اختیار کرنے اور مُلک کی ہر چیز کو سراہنے اور اپنا کرنیکا یہ نتیجہ ہوا کہ بھاشا نہ صرف تباہی اور پامالی سے بچی بلکہ اُس نے فارسی اور دیگر زبانوں سے اتنا کچھ حاصل کرلیا اور اپنے دائرے کو اس قدر وسیع کرلیا کہ ایک مستقل نئی زبان اُردو بن گئی۔ جس کو پہلے زمانہ میں ہندی کہتے تھے، یہ امر واقعہ ہے کہ فارسی عربی الفاظ کے میل نے زبان کو مالامال کر دیا۔

ہندی میں فارسی عربی کے خلط ملط کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی باہر والا کسی کے ہاں ٹھہرا ہو، گھر والوں کی آؤ بھگت اور آنکھیں بچھانے سے وہ اس میں رہ پڑے اور آپس کے میل ملاپ بڑھنے سے وہ اور گھر والے مل ملاکر ایک ہوجائیں تو وہ پھر باہر والا نہیں رہتا، گھر ہی کا کہلاتا ہے۔ عربی فارسی کو بھی ایسا ہی سمجھئے۔ اب تو یہ کہنا ہی ٹھیک نہیں ہے کہ یہ عربی ہے یہ فارسی ہے۔ عربی فارسی الفاظ اب کہاں رہے۔ ہندی، فارسی، عربی، ترکی الفاظ سب ایک ہو گئے اور اپنے ہوگئے، پھر اپنوں کو پرایا کیوں کہا جا رہا ہے؟۔

البتہ مسلمانوں کے زیر اثر اُردو زبان فارسی رسم الخط کے اتباع کرنے کی گنہگار ضرور ہے۔ کیا مسلمانوں کے ایک ہزار برس کے عہدِ حکومت کی کوئی یادگار بھی باقی نہ رہنا چاہیئے؟ ان عام فہم فارسی الفاظ کو نکال کر اُس کے بجائے سنسکرت الفاظ چسپاں کرنا گویا گوشت سے ناخن کو جُدا کرنا ہے۔

ہر زبان اپنے اندر دوسری زبانوں کے الفاظ شامل کرکے اپنی ہمہ گیری اور جامعیت کو قوی اور وسیع تر کرتی ہے جس طرح انگریزی میں لاطینی و یونانی الفاظ کی کثرت نے انگریزی زبان کو بحرِ ذخار کردیا۔ اسی طرح اُردو میں بھی فطرتاً اس درجہ ہمہ گیری ہے کہ زبان کے الفاظ کو اپنا کرلیتی ہے۔ چنانچہ اس وقت ہندی الفاظ کے علاوہ بہتیرے انگریزی الفاظ اُردو کی ملکیت میں آگئے ہیں۔ کوئی زبان دوسری زبانوں سے خوشہ چینی کئے بغیر وسیع اور جامع نہیں ہوسکتی۔

میرا دعویٰ ہے کہ جو زبان یو۔ پی۔ کے ہندو گھروں میں بولی جاتی ہے اور جو ہندو حضرات آپس میں بولتے ہیں وہ اُردو ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُردو نے شہروں میں ترقی کی، مگر اس زبان کی عالمگیری کا اثر دیہات پر بھی پڑا۔ اس لئے کہ دیہات میں ہندی نہیں بولی جاتی، بلکہ بگڑی ہوئی اُردو بولی جاتی ہے۔ جس میں فارسی عربی کا عنصر شامل ہے۔ اب رہا یہ کہ شہری اور دیہاتی زبانوں کی متانت اور درنیت میں فرق نظر آتا ہے تو ایسا کس زبان اور کس ملک میں نہیں؟

اُردو کی عالمگیری کا اِس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے

کہ اُردو ہندوستان کے ہر گوشے اور ہر خطے میں سمجھی جاتی ہے خواہ پشاور ہو یا بنگال و بمبئی۔ باوجود مخالفت کے اُردو صدہا برس سے عدالت کی زبان ہے اور کامیابی کے ساتھ کچہری میں دیہاتی عدالت کی اور وکلا کی گفتگو خوب سمجھتے ہیں اور عدالتی الفاظ انکی زبان پر ہیں۔

ہندی بھاشا نہایت سادی اور محدود تھی جہاں نازک خیالی اور بلند پروازی کا دخل نہ تھا۔ برخلاف اس کے فارسی ادب میں بلند پروازی اور نازک خیالی کے چشمے بہہ رہے تھے۔ چنانچہ اُردو کو ترقی یافتہ فارسی کے خزانۂ ادب سے خیالات مستعار لینا پڑے۔

اگر ہندی میں سنسکرت الفاظ شامل کرلئے جائیں تو وہ زبان ہندی نہ رہیگی بلکہ ایک ایسی اجنبی زبان بن جائے گی جو دیہات کیا شہروں میں بھی سمجھی نہیں جاسکتی۔

جو زبان کہ تحریر و تقریر میں ہندو حضرات ارادتاً و قصداً استعمال کرتے ہیں وہ نہ اُردو ہے نہ ہندی۔ تلسی داس و سور داس کی ہندی نظمیں دیہات کے جہلا کیا سمجھیں گے بلکہ یوں کہیئے کہ ہندو پنڈت ان نظموں کو پڑھکر سمجھانے کے لئے مطلب بیان کرنے پر مجبور رہتے ہیں اور وہ مطلب غریب اُردو ہی میں سمجھایا جاتا ہے۔

ہر زبان کا ادب روزمرہ کی زبان سے بلند ہوا کرتا ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ اُردو کی تحریر میں فارسی عربی کے مغلق الفاظ شامل کردئے جائیں یا ہندی میں سنسکرت الفاظ کی ریل پیل ہو نہیں تو وہ اُردو اُردو رہیگی نہ ہندی۔ ہندی۔

اگر اُردو ہندی دونوں زبانوں میں عام فہم الفاظ مستعمل ہوں تو دونوں زبانیں اپنی اپنی خصوصیات و روایات قائم رکھتے ہوئے باہم متحد ہوکر ایک پلیٹ فارم پر آسکتی ہیں اور ہندوستانی کہلائی جانیکی مستحق ہوسکتی ہیں۔

اُردو متحدہ قومیت کے تخیل اور ہندو مسلمانوں کے باہمی اختلاط سے عالمِ ظہور میں آئی اور اس طرح صدیوں سے ہندوستان کی مشترکہ زبان چلی آتی ہے۔ ابتک ہندو مسلمان فارسی اُردو یکساں پڑھتے رہے۔ شادی میں نوید بھی فارسی میں لکھتے تھے بلکہ کایستوں کے گھروں میں فارسی عربی الفاظ کا استعمال اور فارسی اُردو کا چرچا مسلمانوں سے کم نہ تھا۔ اور اَب تک مہذب ہندو اور خصوصاً کشمیری پنڈت اُردو فارسی زبان دانی اور مسلم کلچر و تہذیب شایستگی کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہیں۔

یہ سراسر غلط خیال ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی ہندوؤں کی۔ بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ اُردو ہندو مسلمانوں کی سعی کی پیداوار ہے۔ اِس موقع پر اپنے دعوے کے ثبوت میں پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کے مشہور مضمون "دنیائے ادب اور ہماری زبان" کے مندرجہ ذیل اقتباسات کی طرف قارئین کرام کی توجہ مبذول کراؤنگا۔

"مسلمان اور ہندو مصنف بھی اب سے ایک صدی پہلے اور اُسکے بعد تک بھی اُردو کو ہندی کہا کرتے تھے . . . . . . اور کیونکر بنی؟ اور کون لوگ اس کے بنانے کے زیادہ تر ذمہ دار ہیں؟ ہندوستان میں اسلامی حملوں اور فتوحات سے پیشتر اُردو کی داغ بیل پڑجانا قرینِ قیاس ہے . . . . البرونی نے جو ہندوستان میں پنڈتوں سے سانسکرت پڑھی تو درس و تدریس کی زبان کیا تھی؟ کوئی مشترک زبان ضرور ہوگی۔ ورنہ اُستاد شاگرد کو درس کے معنی اور کس طرح سمجھاسکتا . . . . ہندوستان کے راویوں اور راجوں کے دربار سے جو فارسی مراسلے اور خریطے اسلامی ممالک کو جاتے تھے وہ ضرور ہندو پرشین سکریٹریوں کے لکھے ہونگے . . . . یہ اہم ذمہ داری وہ ہندو دربار غیر ممالک کے سپرد نہیں کرسکتے تھے۔ لابُد ہے کہ وہ پرشین سکریٹری ہندو ہی ہونگے . . . . تِلک جو محمود غزنوی کے زمانے میں ہوا ہے فارسی بہت اچھی جانتا تھا۔ . . . .

ثابت یہ ہوا کہ ہندوستان میں اسلامی تسلط سے پیشتر فارسی کا علم کم و بیش موجود تھا جب ہی تو چند کوی کی نظموں میں فارسی الفاظ اور کہیں کہیں فارسی مرکبات ملتے ہیں۔ جو بعض محققوں کو چونکا دیتے ہیں . . . . . ہماری اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک مساعی اور اتحاد کا نتیجہ ہے —— اس کی تنظیم و تدوین میں ان دونوں فرقوں کی شرکت ہے۔ یہ تنظیم سلطان اور رعایا، حاکمی اور محکومی، افسری و ماتحتی کے لم سے مبرا ہے۔ وہ ایک مبارک ثمر تھا اس ادبی کل بر کش اور رطوبی کے پیوند کا جو قدرت نے ہندوستان کی سرزمین پر بھیجے۔ یہاں معاشرت نے انہیں پیوند کیا۔ رواداری نے اُسے تہذیب و تمدن کے امرت سے سینچا اور شایستگی نے اُس کی ضروری شاخ تراشی کی، حسن سلیقے اور شعورِ نفسیاتی نے موافق ہوا مُہیا کی۔ تب یہ قلمی پودا پھولا پھلا اور پروان چڑھا۔ اب انہیں باغبانوں کی نسلیں اگر اس سرسبز نونہال کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ کیا بات ہے۔ اس سے آگے میں کچھ نہ کہوں گا . . . . . یہ امرِ واقعہ پایۂ ثبوت کو پہونچایا گیا ہے کہ اسلامی تسلط کے قریب بلکہ اس سے پہلے ہندو فارسی سے واقفیت

رکھتے تھے. میں کہتا ہوں وہ ہندو ہی تھے جنہوں نے مسلمانوں سے ملکر اُردو کی تدوین کی. . . . . . . گوشائن تلسی داس جی کی رامائن میں نشان، فوج، نفیری، اور شہنائی، وغیرہ الفاظ موجود ہیں. ان سے پہلے کبیر داس اور گرونانک کے کلام میں اختراعی و اجتہادی ترکیبیں اور الفاظ کثرت سے ملتے ہیں. ابتدائی اُردو والوں نے پراکرت اور اب بھرنش بھاشاؤں سے سُودھے یا بنائے. . . . . . ۱۹۱۹ء میں شریمد بھاگوت کا دسواں اسکند یعنی باب اُردو کی ایک ضخیم مثنوی مسمیٰ بہ "آئینہ مستور" کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے. . . . .

"یہ مذہبی و اعتقادی کتاب ایک ہندو اپنے ہندو بھائیوں کے لئے اچھی اُردو نظم میں تصنیف کرتا ہے. اس سے بدیہی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں اُردو کہاں تک جاری و ساری تھی. مختصر یہ کہ سنسکرت اور ہندی بھاشاؤں کے ہوتے ساتے ہندوؤں نے اُردو کو اُوراد و وظائف سے یا زیادہ احتیاط سے یہ کہیئے کہ مذہبی اور ملّی تقریبوں سے خارج نہیں کیا. شکت چالیسی ایک اُردو کی کتاب استوتر یعنی وظیفے کی ہے. جس کو میں نے پوجن کے سلسلہ میں وظیفہ یا مناجات کی طرح پڑھتے ہوئے دیکھا ہے. اور یہ دھیان میں رکھنے کی بات ہے، کہ تلسی داس رامائن لکھ چکے تھے. اس کی کتھا برابر ہو رہی تھی. مہابھارت اور بہت پران اور دوسری مذہبی کتابیں اُردو میں منتقل ہو چکی تھیں. لیکن اپنے اہالی ملت میں دھرم پرچار کی کمی محسوس ہوئی جبتک کہ اُردو سے کام نہ لیا گیا. . . . .

"اِس ضمن میں شنکر دیال فرحت، منشی رام سہائے تمنّا اور خوشتر وغیرہ حضرات نہ صرف ہندوؤں بلکہ تمام اُردو دُنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے مہابھارت، رامائن، گیتا، مہاتم شو پران، گینشی پران، اور جانکی بجے وغیرہ دھرم پستکیں اُردو میں تصنیف و ترجمہ کیں.

"یہ سوال بہت برمحل ہوگا کہ اگر اُردو کا ہندو دینیات یا ملیات پر کچھ اثر ہے تو اُردو کے معترضین بتائیں اور ثابت کریں کہ اِن کتابوں سے ہندو دھرم اور جاتی کی کیا ہانی ہوئی؟. . . . سرور جہاں آبادی کی نعت اِس وقت مولود شریف کے جلسوں میں نہایت خلوص سے پڑھی جاتی ہے. . . . . . یہ سب جانتے ہیں کہ سرور جہاں آبادی ہندو ہی رہے اور ہندو ہی مرے. جب نعت اور اتنی مقبول عام نعت اُردو میں لکھکر ایک ہندو ہندو دھرم پر قائم رہ سکتا ہے تو پھر یہ خوف کہ اگر ہندو اُردو سے دل لگائیں گے تو اُن کے دھرم اور مذہبی روایات کو صدمہ پہونچے گا' ایک مریضانہ واہمہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا جس کا علاج نہ چرک کے پاس ہے نہ لُقمان کے. . . .

. . . . آپ نے دیکھا کہ اُردو کی تعمیر و تدوین اور ترویج میں کتنا مقتدر حصّہ ہے. آپنے دیکھا کہ ہندوؤں کی مذہبی اور ملّی کتابیں کس کثرت سے اُردو میں لکھی گئیں؟ اور آپ دیکھتے ہیں کہ بھگوت گیتا کے ایک سے زیادہ نئے ترجمے اور تفسیریں اُردو نظم و نثر میں ہر سال بلاناغہ شائع ہوتے رہتے ہیں؟ آپنے یہ دیکھا کہ نعتیہ کلام بھی ہندوؤں کو ہندو مت سے برگشتہ نہ کر سکا. یہ واقعہ بھی ذہن میں رکھنا ہے کہ ہندوؤں کے اُردو اخباروں کے خصوصی نمبر یا بجے دشمی نمبر وغیرہ میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی چیزیں کتنی ہوتی ہیں؟ اگر کوئی ہندی والا (میرا مطلب ہے اُردو ہندی جھگڑے کا علم بردار) اس وقت یہاں موجود ہے تو سامنے آکر بتائے جو واقعات ابھی پیش کئے گئے ہیں اُن میں سے کونسا صداقت سے محروم ہے.

مسلمانوں نے ہندی کی جو خدمت و اعانت کی وہ ہندی ساہتیہ کی تاریخ میں عظیم الشان جگہ رکھتی ہے. یہی نہیں کہ جان جاناں رحیم اور ملک محمد جائسی اور رس خاں جیسے مستند شاعر اور صاحب تصنیف اُنہوں نے پیدا کئے بلکہ مسلمان بادشاہوں نے ہندی کی سرپرستی میں تنگ دلی کا اظہار کبھی نہیں کیا. مہابلی اکبر کے عہد کو جانے دیجئے پکّے مسلمان اورنگ زیب کے عہد و دربار کا حال سُنیئے:.

مشہور رزمیہ شاعر یعنی بیر اس کا بادشاہ بھوشن کوی کا بھائی چنتامنی کوی اورنگ زیب کے دامنِ دولت سے وابستہ تھا. اُسی کے توسل سے بھوشن کوی دربار دہلی پہونچے اور وہیں رہے. . .

مسٹر وہ ہر ہر جی بجز ایم. اے. اپنے 'ہسٹری آف ہندی لٹریچر' میں لکھتے ہیں:.

"سخت گیر اورنگ زیب ہندوؤں کے آرٹ اور علوم کا دلدادہ نہ تھا لیکن ہندی کے (ہندو) شعرا دربار کی اعانت اور سرپرستی سے قطعاً محروم نہیں رہے اور بہت سے شاعر اورنگ زیب اور اسکے بیٹے بہادر شاہ ۱۷۰۷ء سے ۱۷۱۲ء تک دربار سے وابستہ تھے."

"اُردو کیا ہے؟ دو مختلف معاشرتوں، دو مختلف مذہبوں، دو مختلف کلچروں کے شیر و شکر ہونے اور ارتباط کی یادگار ہے. وہ ہے عرب کے مذہب اور ایران کے کلچر کا دُنیا کے سب سے قدیم کلچر یعنی آرین تہذیب سے تصادم نہیں اختلاط. یہ سب کچھ اپنے آپ ہوا. جس وقت ہندوؤں نے فارسی پڑھنا اور اُردو کی نیو رکھنا شروع کیا تھا لیکن جو کچھ ہوا بالطبع ہوا. نتیجہ یہ کہ فریقین اپنے اپنے اعتقاد پر قائم

رہ کر فروعی اختلافوں اور رسمی نقیضوں کو بھلا بیٹھے۔ تعصب اور عصبیت کی جگہ رواداری اور موالات نے لے لی۔ رہنا سہنا، خوشی اور غمی کی تقریبوں میں شرکت، یہ باتیں معاشرت کا روزمرہ ہوگئیں۔ یہ اُردو اور اُس کے کلاسیکل اسکول کی برکت ہے۔ لٹریچر میں دیر و حرم پر وہ سخت دھاوے ہوئے کہ الاماں۔ سبحہ و زنار ہوا میں اُڑ گئے۔ اور زُہد و تقویٰ کا قُل ہوگیا۔ غرضکہ کیا کچھ نہ ہوا۔ اس میں ہندو اور مسلمان شُعراء کا پلہ برابر تھا۔ اور ہم یعنی اُردو والے خواہ کسی قوم اور مذہب کے ہوں اب تک اِسی رستے پر چلے جا رہے ہیں۔ شعر سے اخلاق، اخلاق سے کردار متاثر ہوا اور معاشرت نے وہ رنگ پکڑا اور ایسی کلچر پیدا ہوگئی جس کی مثال روما و یونان کا میل بھی پیش نہیں کرسکتا۔ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، ہندی والے ہوں یا اُردو والے، جو اِس ہند سماں رواداری اور ہند پُرانی کلچر کو فنا کرنے کی فکر میں ہیں یقین جانیئے وطن کے بدخواہ اور خود اپنے دُشمن ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

فرق کیا واعظ و عاشق میں بتائیں تم کو
اُس کی حجت نہ گئی اُس کی محبت نہ گئی

جو لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں اور اس تیقن کے ساتھ کھڑے ہوئے ہیں کہ ہندو دھرم قائم نہیں رہ سکتا اگر ہندی لنگوا فرنکا نہ بنے۔ یا جن کا عقیدہ یہ ہے کہ دینِ اسلام کو صدمہ پہونچے گا اگر اُردو کو ہندی پست کردے، تو میں کھُلے خزانے کہتا ہوں کہ دونوں غلطی پر ہیں۔ میں ہندی اور ہندی والوں کو دیکھتا اور سُنتا ہوں مگر اُردو والوں کو سمجھتا ہوں اور بلاخوف اختلاف کہتا ہوں کہ اگر یہ ساٹھ برس میں نے اُردو کے پیچھے اور اُردو والوں میں بے فائدہ ضائع نہیں کئے تو میں جانتا ہوں اُردو والے جو واقعی اُردو کے کھنیل و وکیل ہیں اُن کو یہ ساسا نہیں کہ اُردو کے ساتھ دینِ اسلام و ملت بیضا پست ہو جائینگے اُن کو اور مجھ کو رونا ہے تو یہ کہ اُردو کی مخالفت جس جوش و خروش کے ساتھ اب شُروع ہوئی ہے اور جو منافقانہ پروپگنڈا کیا جا رہا ہے، اُس کا زہریلا اثر وطنیت اور صدیوں کی بنائی ہوئی کلچر کو ملیا میٹ کردیگا۔ اور ہمارے ہندوستانی تمدن اور معاشرت کی وجاہت کا خُون اپنی گردن پر لے گا۔

ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

حضرات! اُردو کچھ حلوائے بے دود نہیں جسے کوئی چپکے سے نگل جائے۔ اُردو کہیئے یا ہندوستانی اس کی جڑیں دُور تک پہونچی ہوئی ہیں۔ اس میں اصلاح اور ترمیم کی ضرورت ہے جو ہر زندہ زبان

میں ہوا کرتی ہے۔ یہ کام ہے ہمارا۔ ہندی کی ترقی سے اُردو والوں کو ضد نہیں۔ لیکن وہ ہندی ہندی تو ہو۔ کانگریس کی مجلس عاملہ نے بہت دانائی کی جو مہاسبھائیوں کے مطالبہ کو رد کردیا۔ اس سلسلے میں مجھے سخت افسوس ہے کہ مہاتما گاندھی کا نام زبان پر آئے بغیر نہیں رہتا۔ بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس میں جو کچھ موصوف کی ذات سے ظہور پذیر ہوا سخت مایوس کرنیوالا ہے۔

ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

جو حالت ہندی نثر و نظم کی اس وقت ہے یہ زبان کیونکر ملکی زبان ہونے کا دعویٰ کرسکتی ہے اور مذاق سلیم اور ادب میں شعور رکھنے والا اُردو کو چھوڑ کر اسے کس طرح اختیار کرسکتا ہے۔

ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

اب یہ کہنا ہے کہ یہ دیکھکر کہ ہندی والے جو ہندی میں سنسکرت کی اندھا دُھند بھر مار کر رہے ہیں تو ہم بھی کیوں نہ اُردو میں فارسی اور عربی کی بھرتی کرتے جائیں، میں آپ سے اور اُن سے دونوں سے کہتا ہوں کہ ایسا کرنا کسی طرح بھی مستحسن نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ لسانیاتی خودکشی کی حد تک پہونچتا ہے .... ؎

بند ہے میری خموشی میں ہجومِ فریاد
ہر نفس چاہتا ہے ایک صدا ہو جانا"

(پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی)

پنڈت جی کے مضمون کے مندرجہ بالا اقتباس سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ اُردو عوام کی زبان کی حیثیت سے صدیوں سے قائم ہے جہاں ہندو مُسلم کی تخصیص نہیں۔ نہایت افسوس ہے کہ جب فرقہ پرستی کا طوفان برپا ہوا تو ہندو حضرات نے من حیث القوم اُردو کے خلاف جہاد شُروع کر دیا اور اُردو کو یک قلم چھوڑ کر ہندی کی طرف اپنی تمامتر توجہ مبذول کر دی اور ہندی اُردو کو مذہبی رنگ دیکر اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیکر چھوڑ دیا اور ہندی کو اپنی زبان سمجھکر اختیار کیا۔

حالانکہ اُردو مسلمانوں کی زبان اسی طرح سے ہے جس طرح دلی، لاہور، شملہ، گنگا، جمنا، اندس مسلمانوں کی ہے۔ کیونکہ مسلمان اُردو کو اپنے ساتھ نہیں لائے، اُردو نے ہندوستان میں جنم لیا۔ ہر طریقے سے ہندوستانی ہوئی۔ میں حیران ہوں کہ ایک زندۂ جاوید اور شگفتہ و رائج زبان کو محض فرقہ پرستانہ جذبات کے زیر اثر مٹایا جا رہا ہے۔ اور ایک مُردہ سنسکرت زبان کو زندہ کیا جا رہا ہے۔ سنسکرت صدیوں

اِک ندّی آکاش سے آئی!

ہزاروں سال گذرے، اجودھیا میں ساگر نامی ایک مہاراجہ حکومت کرتا تھا۔ وہ ایک بڑی وسیع راجدھانی کا فرمانروا تھا۔ لیکن اپنی تمام دولت و قوت کے باوجود اُسے خوشی نصیب نہ تھی۔ کیونکہ وہ اولاد سے محروم تھا۔ کئی سال کے انتظار کے بعد جب اُس کے ہاں کوئی اولاد پیدا نہ ہوئی تو اُس نے ایک دوسری رانی سے شادی کرلی۔ لیکن قسمت کا کرنا دیکھیے کہ وہ بھی بانجھ ثابت ہوئی۔ مہاراج نے ارادہ کیا کہ وہ ہمالیہ پربت کے غاروں میں بھیرگو سادھو کی کُٹیا پر جائیں گے۔ چنانچہ وہ اپنی دونوں رانیوں کو ہمراہ لیکر سادھو کے آستانے پر حاضر ہوئے، دُنیوی جاہ وجلال نے فقر کے حضور میں سر جُھکا دیا۔ کفّارے ادا کئے گئے۔ پرائشچت کی رسمیں پوری ہوئیں اور سالہا سال کی ریاضت کے بعد سادھو جی مہاراج کا دل پسیجا۔ راجہ کے عجز ونیاز سے متاثر ہوکر فقیر نے اُس کی دعا قبول فرمائی اور اُسے ایک بیٹا عطا کرنے کا وعدہ فرمایا۔

بڑی رانی کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اور چھوٹی کو تربوز نُما سا ایک پھل عطا کیا گیا۔ شہزادے کا نام اَنشومانیہ رکھا گیا۔ اور پھل پُختہ ہوتے ہوتے سُورج بن گیا۔ سُورج بن کر یہ خود بخود پھٹ گیا اور اس میں سے پورے ساٹھ ہزار بچّے نکل آئے جو سب کے سب بیٹے تھے، مہاراج فرطِ مسرت سے جامے میں پھولے نہ سماتے تھے۔ سارے اجودھیا میں جشن منائے گئے۔

راجہ ساگر کو یہ آرزو ہمیشہ بیتاب رکھتی تھی کہ اُس کے خاندان سے حکومت کبھی ختم نہ ہو۔ بقائے نسل کے خیال سے اُس نے شہزادہ اَنشومانیہ کی شادی بیس برس کی عمر سے بھی پہلے ہی کردی۔ شہزادے کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو مہاراج نے اُس کا نام اَنشومت رکھا۔ یہ وقت ایسا تھا کہ مہاراج کامل طور پر مطمئن ہو جاتے۔ لیکن اَنشومانیہ میں گُستاخی اور نافرمانی کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائیوں سے نفرت کرتا تھا اور اُن کے ساتھ اُس کی آئے دن کی بدسلوکی مہاراج کو شاق گذرتی تھی۔ ایک روز اُس نے ان میں سے کچھ بھائیوں کو دریا میں دھکیل دیا اور وہ ڈوبتے ڈوبتے بچے۔ اِن باتوں سے تنگ آکر مہاراج نے اَنشومانیہ کو اپنی راجدھانی سے دیس نکالا دیدیا۔ مغرور شاہزادے نے معافی مانگنا گوارا نہ کیا۔ باپ کا حکم سُنتے ہی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوا اور اجودھیا سے رخصت ہو گیا۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا، مہاراج کے ساٹھ ہزار بیٹے اور ایک پوتا، اتنے اتنے قوی ہیکل اور وجیہہ جوان بنے کہ ہندوستان بھر میں کوئی بھی اور شخص قوت وصورت میں اُن سے ٹکر نہ کھاتا تھا۔ مہاراج نے اَشومیدھ یگیہ (گھوڑے کی قُربانی) ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس رسم کی ادائگی اتنی مشکل ہے کہ مُلک کا سب سے طاقتور راجہ ہی اُسے پورا کرسکتا ہے۔ کسی اور کو اسکی جُرات نہیں ہو سکتی۔ اسے پورا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ قُربانی کے گھوڑے کو سال بھر کے لئے کُھلا چھوڑ دیا جائے۔ گھوڑا جس طرف بھی اُس کے جی میں آئے چلتا جائے۔ فوج اُسکے ساتھ ہو۔ جس جس علاقے سے بھی گذر ہو فوج کا یہ کام ہے کہ اُسکے فرمانروا سے خراج وصول کرے۔ جہاں خراج سے انکار ہو وہاں جنگ کی جائے۔ یگیہ کی یہ رسم اُسی وقت مکمل سمجھی جائے گی جبکہ گھوڑا زرِ خراج لیکر محفوظ ومصئون گھر واپس پہونچ جائے۔ اس رسم کے کامیاب اختتام پر راجہ اُن تمام فرمانرواؤں کا شہنشاہ ہوگا جن سے خراج وصول کیا جا چکا ہے۔

مہاراج نے شاہی اصطبل کا بہترین گھوڑا اس مقصد کیلئے انتخاب کیا۔ سادھوؤں نے چندن اور سیندور اُس کے ماتھے پر ملا۔ اَنشومت کو اس کا محافظ مقرر کیا گیا اور اُس کے گلے میں یاسمین کے ہار ڈالے گئے۔ گھوڑا اپنے خطرناک سفر پر روانہ ہوا۔ اَنشومت فوج سمیت اُس کے ساتھ ساتھ تھا۔ چند روز مسافت طے کرنے کے بعد وہ ایک جنگل میں پہونچے۔ تھکے ہارے مُسافر شب بسری کے ارادے سے یہاں ٹھہر گئے۔ شفقِ شام کے رُخصت ہوتے ہی ایک ضعیف بُڑھیا اَنشومت کے پاس آئی۔ اُس نے رات بھر کے قیام اور طعام کی بھیک مانگی۔ اَنشومت نے اُسے کھانا کھلایا اور گھوڑے کے قریب خشک گھاس کے ایک گٹھے پر آرام کرنے کی اجازت بخشی۔

رات کے سناٹے میں یہ کون ہے جو دبے پاؤں مقدس گھوڑے کے تھان کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے؟ رسّہ کھول دیا گیا۔ کوئی شخص اُچھل کر اُس کی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔ اب گھوڑا سرپٹ بھاگا چلا جا رہا ہے۔

گھوڑے کے سُموں کی آواز سے سونے والے جاگ اُٹھے۔ سارے لشکر میں خبر کردی گئی۔ تاریکیاں آگ کے شعلوں سے روشن ہوگئیں۔ لیکن گھوڑا جا چکا تھا اور اُس کے ساتھ ہی بوڑھی بھکارن بھی! انشومت احسان فراموشی کے اس مظاہرے پر مارے غصّے کے دیوانہ ہو رہا ہے۔ وہ فوراً اپنے ہمراہیوں کو ساتھ لیکر ایک لاحاصل تعاقب پر چل کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن مایوس و نامراد واپس لوٹتا ہے۔ مہاراج کو یہ واقعہ سُنکر تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن وہ فرماتے ہیں کہ "جوانوں کیلئے بوڑھوں پر رحم کھانا ہمیشہ اچھا ہوتا ہے"۔ یہ کہکر وہ اپنے ساٹھ ہزار بیٹوں کو بلاتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ اگر ضرورت پڑے تو زمین کے بعید ترین گوشوں تک پہونچ جاؤ اور گھوڑے کے چور کو گرفتار کرکے واپس لاؤ۔

اشارہ پاتے ہی ساٹھ ہزار جوان اپنے گھوڑوں کے زین کستے ہیں اور گمشدہ جانور اور اس کے چور کی تلاش میں چل کھڑے ہوتے ہیں۔ اِدھر اُدھر، یہاں وہاں، وہ تلاش کرتے ہیں مگر کہیں بھی گھوڑ یا بوڑھی عورت کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی آوارگی میں انہیں برسوں گزر جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ سمندر کے کنارے پہونچتے ہیں۔ یہاں پر وہ رک جاتے ہیں کیونکہ اُن کے پاس کوئی بادبانی کشتی نہیں۔ وہ حیران ہوکر سوچتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ گھوڑا سات سمندر پار لے جایا گیا ہو؟

اب انہیں کیا کرنا چاہیئے؟ اچانک ایک تجویز اُن کے ذہن میں آتی ہے۔ سمندر کے نیچے سے ایک سرنگ لگانی چاہیئے جس کے ذریعے سے زمین کے دوسرے کناروں تک پہونچ جاسکے۔ زمین کھودنا شروع کردی گئی۔ یہاں تک کہ وہ اُس کے مرکز تک پہونچ گئے جہاں سانپ رہتے تھے "کیا تم نے یہاں ایک گھوڑا اور ایک بوڑھی عورت بھی دیکھی ہے؟" شہزادوں نے پوچھا۔

سانپوں کی قوم اس سوال کے جواب میں صرف لہرا کے رہ گئی۔ اب شہزادوں نے دھرتی کو اُس کے پورب کی طرف سے کھودنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ایک کشادہ اور پُرفضا میدان میں جا پہونچے، جہاں انہوں نے ایک غیرمعمولی قد و قامت کے ہاتھی کو اپنے کان اور دُم ہلاتے ہوئے دیکھا۔ یہ ہاتھی زمین کے شرقی حصّے کا محافظ ویروپکش تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ویروپکش بھی انہیں گھوڑے کے متعلق کوئی خبر نہ دے سکا۔ چنانچہ وہ زمین کے مرکز کی طرف لوٹ پڑے۔ جہاں سے اُنہوں نے جنوب کی طرف ایک سُرنگ لگانا شروع کی۔ یہاں بھی انہیں ایک ہاتھی ملا جو نسیم خوشگوار کے نرم و لطیف اور خواب آور جھونکوں سے غنودگی کی سی حالت میں جھوم رہا تھا۔ یہ مہاپدم تھا، جنوب کا محافظ! اُس نے بھی کوئی گھوڑا یا بڑھیا نہیں دیکھی۔ اب انہوں نے شمالی جانب ایک سُرنگ لگائی جہاں برف کے بڑے بڑے تودوں کے درمیان بھدر نامی ایک عظیم الجثہ ہاتھی استادہ تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اُن کے جسموں پر تیر برسا رہے تھے اور برف کے ٹکڑے ان کے پس و پیش اڑ رہے تھے۔ لیکن گھوڑا کہاں ہے؟ جب وہ زمین کے رُبع چہارم ——— مغرب ——— میں پہونچے تو انہوں نے سَومنس نامی ایک سیاہی مائل بھورے رنگ کا ہاتھی شفق شام کے مقابل بےحس و حرکت کھڑا دیکھا۔ لیکن وہ بھی اُن کی رہنمائی نہ کرسکا۔

چار اطراف کے علاوہ دھرتی کے چار کونے بھی ہیں۔ راجہ ساگر کے ساٹھ ہزار بیٹوں نے چاروں کونٹ اپنی تلاش کو جاری رکھا۔ وہ تھک کر چُور ہوگئے مگر مایوس نہ ہوئے۔ بالآخر وہ شمالی مشرقی کنارے پر پہونچے۔ کیا دیکھتے ہیں ایک جانور ایک وسیع و شاداب مرغزار میں گھاس چر رہا ہے۔ وہ حیران ہوکر آنکھیں ملتے ہیں اور مقدس گھوڑا اور چور دونوں اُن کو نظر آجاتے ہیں۔ بوڑھی ساحرہ وہاں موجود تھی، بالکل مطمئن اور بےپروا۔ اُس پر کسی طرح کی گھبراہٹ طاری نہ ہوئی۔ یکلخت ساٹھ ہزار شمشیریں تڑپ کر میانوں سے باہر نکل آئیں اور وہ بڑھیا پر جھپٹ پڑے، اس سے پہلے کہ وہ اُس پر حملہ کرتے، ساحرہ ایک غیرمعمولی طور پر روشن اور پُراسرار آسمانی صورت اختیار کرچکی تھی۔ اب بڑھیا کی جگہ وشنو دیوتا سامنے کھڑا تھا۔ اس عظیم المرتبت دیوتا نے ایک ہی آتشناک نگاہ میں ساٹھ ہزار انسانی صورتوں کو خاک سیاہ کرکے رکھدیا اور وہ جھلسی ہوئی ہڈیوں اور راکھ کا ڈھیر بن کے رہ گئے۔

اجودھیا میں انتظار کرتے کرتے راجہ ساگر کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اُن پر کوئی آفت نازل نہ ہوئی ہو۔ اس نے انشومت کو بلایا۔ اور فرمان دیا کہ اپنے گمشدہ چچاؤں کی تلاش میں زمین کا گوشہ گوشہ چھان مارو اور واپس آکر اُن کی خبر سے مطلع کرو۔ فاصلہ طے کرتے کرتے انشومت کو زمان و مکان کا اندازہ

نہ رہا۔ صرف اُفق کے کنارے باقی رہ گئے۔ وہ سُرنگ کے شمال مشرقی کنارے کی جانب نکل کھڑا ہوا۔ انجام کار کیا دیکھتا ہے کہ مقدس گھوڑا ایک سبزہ زار میں گھاس چر رہا ہے اور راکھ اور ہڈیوں کے ساٹھ ہزار چھوٹے چھوٹے ڈھیروں پر ہری ہری گھاس اُگ رہی ہے۔ یہی اسکے ساٹھ ہزار چچاؤں کا مرگھٹ تھا۔ رنج والم کا پہاڑ اُس پر ٹوٹ پڑا۔ اب اُسے کیا کرنا چاہیئے! گھوڑا انشومت کو دیکھکر اُس کے پاس آگیا اور فرطِ مسرّت سے ہنہنانے لگا۔ ایک جانور کی یہ محبت دیکھکر اُس نے اُسے تھپکی دی اور دفعتاً اُسے اپنے بوڑھے دادا کا خیال آیا، جو اپنے بیٹوں کی خبر کے انتظار میں بیٹھا ہوگا۔ بے اختیار ہو کر اُس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔ اے وشنو تو نے یہ کیا غضب کیا؟

انشومت شمال مشرقی راستے سے گھوڑے کو زمین کے مرکز کی طرف واپس لایا۔ اور مرکز سے اُوپر سمندر کے کنارے نکل آیا، جہاں اُس نے اُفقِ زرد کو فانی حقیقت کے سایوں میں غروب ہوتے دیکھا۔

انشومت ایک ہی دُھن میں چلتا رہا۔ اس وقت ایک ہی خیال اُس کے دل و دماغ پر چھا رہا تھا۔ اُس کے ساٹھ ہزار چچاؤں کا کریا کرم کرنا ابھی باقی تھا۔ کیا اجودھیا میں اس قدر پانی موجود ہے جس سے مرنے والی رُوحوں کی پیاس بُجھائی جا سکے؟ نہیں اتنی بڑی ضرورت کیلئے اجودھیا کا پانی ناکافی تھا۔ کیا وشنو دیوتا کے قہر و غضب کو ہی کسی صورت ملائمت سے بدلا جا سکتا ہے؟ کیا یہ جلیل القدر دیوتا اس کی پرارتھنا قبول کرے گا؟ انشومت کے ذہن میں ایک تجویز آئی۔ اُسے وشنو سے صرف ایک دُعا مانگنی چاہیئے اور وہ یہ کہ وہ دریائے گنگا کو جو اُس کے پاؤں کے ساتھ بہتا ہے زمین پر بھیجدے۔ کیونکہ صرف یہی ایک دریا راجہ ساگر کے ساٹھ ہزار بیٹوں کی رُوحوں کو پاکیزگی بخش سکتا ہے۔

راجہ ساگر نے اس بلائے عظیم کی خبر سُنکر پران تیاگ دئے۔ کئی سال گذر گئے۔ انشومت ایک ہی دُعا کرتا رہا مگر وشنو کو رحم نہ آیا۔ انشومت نے مرتے وقت اپنے بیٹے کو وصیّت کی کہ وہ اُسوقت تک چین نہ لے جبتک کہ وشنو کا غصّہ فرو ہو جائے اور وہ گنگا کو دھرتی پر بھیجکر اُس کے بزرگوں کی رُوحوں کو اس سراپ سے نجات نہ دلائے۔ آخر کار وشنو دیوتا نے بھگیرتھ کی التجاؤں کو سُن لیا۔ یہ بھگیرتھ کی تپسیا کا اثر تھا۔ لیکن گنگا فرطِ غضب سے بل کھا رہی تھی۔ کیا آسمان کی بلندیوں پر بہنے والی ندی زمین کی پستیوں پر فرد نہیں جائیگی؟ اچھا! وہ دھرتی کے باسیوں کو اس گستاخی کا مزا چکھا کے رہیگی۔ وہ پھیلنا شروع ہوئی اور خوفناک طغیانی کے ساتھ موجیں مارنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فانی ہستیوں کی ساری بستی کو ایک ہی ریلے میں تباہ کر کے رکھدے گی۔

عالمِ بالا کی غیر فانی قوم لرزہ براندام ہوگئی۔ بیم و رجا کے عالم میں بھگیرتھ زمین پر کھڑا تھا اور اس پر رعشہ طاری تھا۔ برہما فوراً شِو کے پاس گیا۔ گنگا طوفان کی رفتار کے ساتھ بہ نکلی۔ آسمان کے لافانی جانتے تھے اور بھگیرتھ بھی جانتا تھا کہ ساری آسمانی مملکت میں صرف شِو ہی ایک ایسا دیوتا ہے جو تباہی کے اس سیلاب کو رُوک سکتا ہے۔ چنانچہ شب و روز وہ اُس کے حضور میں دُعائیں کرتے رہے۔ حتیٰ کہ دیوتا کی صفتِ رحم کو حرکت ہوئی۔ اُس کے گندھے ہوئے بال کھُل گئے اور اس طرح بکھرے کہ تمام کائنات کو انہوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ شِو دیوتا آسمان و زمین کے درمیان خلا میں کھڑا تھا۔ جس قدر تیزی کے ساتھ دریا بہتا تھا، اُسی قدر سختی سے وہ دیوتا کی لٹوں میں گرفتار ہوتا چلا جاتا تھا۔ وہ چکر کاٹتا تھا اور جھاگ اُڑاتا تھا۔ جھاگ اُڑاتا تھا اور گھومتا تھا۔ مگر اس جال سے باہر نکلنے کا کوئی رستہ نہ پا سکا۔ اُسنے اپنے آپ کو پابزنجیر پایا۔

شکست خوردہ ہو کر آسمانی دریا نے خُدائے خُدایاں کے حضور میں آزادی کی بھیک مانگی۔ آزاد ہونے پر وہ ایک پاکیزہ اور سبک رفتار ندی بن گئی۔ لیکن بھگیرتھ کی مُصیبتیں ابھی ختم نہ ہوئی تھیں۔ جنہو نامی ایک بہت بڑا رشی دریا کی گذرگاہ میں بیٹھا گیان دھیان میں مصروف تھا۔ جونہی کہ گنگا کا پانی رشی کے قدموں سے مس ہوا، اُس نے غضبناک ہو کر دیکھا۔ گنگا خشک ہوگئی۔ غریب بھگیرتھ کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ پھر ایک مرتبہ دُعا کرنے کو بیٹھ گیا۔ اُس پر رحم کھا کر دیوتاؤں نے جنہو کے پاس اس کی سفارش کی۔

کیا وہ اس دریا کو اپنی بیٹی بنانے پر رضامند ہو جائیں گے اور اُسے جنہوی نام سے موسوم ہونے دیں گے؟

ہاں ہر وہ خواہش قبول کی جائیگی جو ایک رشی کی شانِ جلال کو مطمئن کر سکے — ایک لافانی نام کے شانِ جلال کو! ہر وہ آرزو مان لی جائیگی جو بھگیرتھ کے بزرگوں کی رُوحوں کو فانی زمین کی قید سے آزاد کرا سکے۔ جنہوی کو ایکدفعہ پھر آزادی نصیب ہوئی۔ اسکے بعد کبھی کوئی رکاوٹ اسکی راہ میں حائل نہ ہوئی اور بالآخر وہ سمندر کے ساتھ جا کر ہم آغوش ہوگئی۔ (نیلم دیوی) مترجمہ صلاح الدین خاں۔

آتشِ غم

سو برس پہلے کی، دِلّی آج کل کی دلّی نہ تھی۔ اب تو انگریز بہادر نے اس کو "فردوس بر روئے زمین" بنا رکھا ہے۔ فصیلیں صاف کر کے کشادگی پیدا کر دی۔ سڑکیں، روشنی، بدررو، صفائی، ستھرائی، ایک چھوڑ دس دس ہسپتال، غرضیکہ پرانی دلّی کو نئی دلّی بنا دیا۔ نہر سعادت خاں، شاہ جی کا تالاب، اور قاضی کا حوض بھر دئے گئے۔ اور اب تو پہلوانوں کی جان موتیا کھان بھی پاٹ ڈالی گئی، تاکہ نمرود مچھر کی نسل ہی ختم ہو جائے۔

۱۸۳۰ء میں لوگ بیچارے فصیلوں کی قید ہی میں رہتے تھے۔ گھمس اور حبس، روشنی کی کمی، گندگی، پانی کیچڑ، پھر مچھر اور ملیریا کیوں نہ ہوتے ہوں گے، پر جیسی اب دلوں میں پژمردگی اور چہروں پر زردی ہے ایسی کبھی پہلے تو نہ تھی۔ حکومت نکل چکی تھی لیکن ابھی بل باقی تھا۔ لوگوں میں زندہ دلی یعنی زندگی باقی تھی۔ فلکِ کجرفتار نے اگرچہ اس بستی کو بیس کر برباد کر دیا تھا لیکن پھر بھی اس اجڑے دیار میں بڑے بڑے منتخب روزگار رہتے تھے۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز، مفتی صدرالدین آزردہ، اور مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مولوی سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید جیسی ہستیاں ابھی باقی تھیں پر جو رنگ شاہ نصیر اور ذوق، غالب، اور مومن، شیفتہ اور صہبائی کا جما وہ ایسا پکا تھا کہ اس کے آگے حدیث و فقہ منطق و فلسفہ، جہاد و ہجرت سب ماند پڑ گئے۔ گھر گھر مشاعرے ہوتے تھے۔ کوچے کوچے میں محفلیں سجتی تھیں۔ شاہ اور گدا امیر اور فقیر، بڑے اور چھوٹے سب میں شاعری سمائی ہوئی تھی۔ دلوں میں جوش تھا امنگ تھی۔ چاٹ اور لاگ تھی۔ جذب اور اثر تھا۔ بڑے بڑے بانکے، جوبن والے سجیلے جوان دل کے آبلوں کو شعر و شاعری کے نشتروں سے شگاف دیتے تھے۔

انہی میں ایک جوان گلاب سنگھ بھی تھا۔ کھتری کا جایا، سرخ و سفید، ہونٹ جیسے واقعی گلاب کی پتی۔ چوڑا سینہ، سڈول بدن، مدھ بھری آنکھیں، تیکھی نظریں۔ کپڑے ایسے صاف کہ ہاتھ لگائے میلے ہوں۔ سرِ شام جب نکلتا ہے تو راہگیروں کی نظریں قدم قدم پر پھرتی تھیں۔ جوانی کی عمر، معاش سے بےفکری۔ مرادوں کے دن اور پھر یوں بھی گلاب سنگھ بڑا محبت بھرا دل رکھتا تھا۔ آشفتہ تخلص کرتا تھا۔ اشعار میں سوز تھا اور دل بے اختیار کسی پر نثار ہو جانے کو بیچین۔ بقول حسرت ؎

کسی پر مٹ کے رہ جانا ہے حسرت
ہمیں کیا کام عمرِ جاوداں سے

اسی زمانے میں بنّو جان کا بڑا شہرہ تھا۔ ڈیرے دار طوائف تھی، بڑی آن بان والی۔ حُسن میں بےمثل، طبیعت میں لاثانی۔ بنّو تخلص کرتی تھی پر سینکڑوں ہزاروں کو بگاڑ چکی تھی۔ لیکن گلاب سنگھ آشفتہ سینکڑوں ہزاروں سے جدا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے۔ صید اور صیاد میں تمیز نہ رہی ؎

زلفوں سے بھی زیادہ کیا دل پہ رخ نے جور
کافر جو تھے سو تھے پہ مسلماں کو کیا کروں
(آشفتہ)

آشنائی سے محبت، محبت سے دوستی، دوستی سے عشق، ساری منزلیں طے ہو گئیں۔ ایک دوسرے کا پروانہ تھا اور ایک لمحہ کی جدائی بھی گوارا نہ تھی۔ لیکن اس صورت کو قیام کہاں! حسبِ معمول غلط فہمیاں پیدا ہونی شروع ہوئیں ؎

ہائے یہ غیروں سے کہنا اُس کا رُک رُک کر کہ اب
مجھکو مت چھیڑو کہیں آشفتہ یاں آ جائے گا
آشفتہ

اِس غلط فہمی نے طول پکڑا۔ عشق ہمہ گیری پر مُصر تھا۔ اور ہر ہر حرکت پر مشکوک۔ حُسن اس بدگمانی سے دل گرفتہ تھا اور مجروح خودداری اس کا اظہار بہ شکل بے پروائی کرنا چاہتی تھی۔ نہ عشق نے اس کھسیانی بے پروائی کو سمجھا نہ حُسن نے عشق کی کورچشمی کو جانا۔ کھنچاؤ اور کشاکش زیادہ ہوتی گئی ملاقات میں فرق آنے لگا۔ دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے بیتنے لگے۔ لیکن عشق کی آگ پہلے سے بھی زیادہ بھڑکتی رہی ؎

اک نہ آنے سے ترے اے ظالم
شکوے سو سو زباں پہ آتے ہیں
آشفتہ

اُدھر بی بنّو بھی ماہیِ بےآب کی طرح تڑپتی تھیں لیکن وہی بدنصیب خودداری حائل تھی۔ یہ اس طنطنے میں تھیں ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو — غالبؔ

اور وہ اس مشکل میں تھا کہ ؎

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائیں کیوں — غالبؔ

غرض اس وضعداری نے دونوں کی زندگی اجیرن کر دی۔ فرقت میں آتشِ عشق اور تیز ہوئی۔ اس جانسوز اور جانگداز زمانے کے آشفتہ کے اشعار سنئے ؎

پوچھتے کیا ہو کہ شب آشفتہ کیوں کر مر گیا
اس میں کیا باقی رہا تھا، بندہ پرور، مر گیا
جان دی عاشق نے تیرے شکوہ اک نالے کے ساتھ
آدمی تھا آخرش، صدمہ اُٹھا کر مر گیا
ہو جُدائی میں زبس آشفتہ جینے سے بہ تنگ
سُن ہی لو گے اک نہ اک دن پھوڑ کر سر مر گیا

اور ہوا بھی آخر یہی۔ سوزِ ہجر ضبط اور قابو سے بڑھ نکلا۔ نحیف آواز میں ایک آخری آہ اور بھری ؎

دم کا مہماں ہے اور آشفتہ
بے خبر تجھ کو کچھ خبر بھی ہے

اور خنجرِ آبدار سے گلا کاٹ کر جان بحق ہوا۔

بی ہنّو کو اب تک عشق کے امکانات کا یقین نہ تھا ورنہ خودداری اور وضعداری پر یوں نہ اَڑی رہتی۔ عاشقِ صادق کی قربانی نے زندگی حرام کر دی۔ دُنیا سے مُنہ موڑ کر رات دن آشفتہ کی یاد میں آنسو بہانے کا مشغلہ ہوا۔ آخر کار تپِ دق میں مُبتلا ہو کر چھ ماہ بعد خود بھی اپنے شیدا سے جا ملی۔

ہنّو جان کے شروع کے اشعار نہیں ملتے۔ انہی چھ مہینوں میں جو آہیں اسکی شعر بن کر نکلیں اُن میں سے چند ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

چھوڑ کر مجھ کو کہاں اے بُتِ گُمراہ چلا
تو چلا کیا کہ یہ دل بھی ترے ہمراہ چلا
چُھٹ گیا غم سے مرا کُشتہ آبرو مر کر
اِک چُھری میرے گلے پر بھی مری آہ چلا

نہ تو موت آتی ہے نہ زیست کا یارا مجھکو
ہائے آشفتہ ترے مرنے نے مارا مجھکو
موت پر بس نہیں چلتا ہے کروں کیا۔ ورنہ
تو نہیں ہے تو نہیں زیست دوبارا مجھ کو
اب کسے چین، کہاں عیش، کہاں بسترِ خواب
نہیں مخمل بھی کم از بسترِ خارا مجھکو
ہے غضب وہ تو مَرے اور جیوں میں ہنّو
موت آجائے تو ہو عُمر دوبارا مجھکو

نعشِ آشفتہ کو بے رحموں نے پھونکا آگ سے
آتشِ غم بھی جوانا مرگ کی کچھ کم نہ تھی

اسد انوری۔ بی۔ ایس سی (علیگ)

گریۂ طفل

مندرجہ ذیل مضمون مشرق کی مشہور سحر طراز ادیبہ "آنسہ می" کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس ادیبہ کے بے مثل ادبی مضامین جو ادبیاتِ عالم میں خاص وقعت رکھتے ہیں عنقریب "نور و ظلمات" کے نام سے مجموعی صورت میں شائع کئے جائیں گے۔

مَیں نے جب بچّے کی ہنسی کی آواز سُنی تو میری نُورانی رُوح جسمِ خاکی میں فرطِ مسرت سے کروٹیں لینے لگی۔

طفلِ شیر خوار کی آواز فرشتوں کی آوازوں کی صدائے بازگشت ہے اور اس کا خوشگوار اور معصوم تبسّم ایک متفکر کو ازلی اور گم گشتہ اسرار و رموز کی حقیقت شناسی کیلئے اکساتا ہے۔

پھر میں نے اس بچّے کے رونے کی آواز سُنی تو میرا دل بیچین ہوگیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس میں کوئی عظیم الشان چیز پگھل رہی ہے۔ آہ! گریۂ اطفال لوگوں کے رونے سے زیادہ تکلیف دہ اور مضطرب کُن ہے!

میں نے بچّے کے گریے کی آواز سُنی اور آنسوؤں کو اسکے گلابی رُخساروں پر معصومانہ انداز میں بہتے ہوئے دیکھا۔ میرے لئے وہ آہستہ آہستہ پگھلنے والے موتی، آگ کی چنگاریاں تھیں جو میری رُوح پر چرکے لگا رہی تھیں۔

بچہ رونے لگا اور بے کسی و ناامیدی کی علامتیں اس کے حسین چہرے پر ظاہر ہونے لگیں۔ وہ اس انسان کی طرح رو رہا تھا جسے اکیلا چھوڑ دیا گیا ہو اور دُنیا میں اس سے کوئی محبت کرنے والا نہ ہو۔ پیارا بچّہ رو رہا ہے اب اُس کی آنکھوں میں پہلی جیسی چمک پھر کیسے پیدا ہوگی؟ اب اس کے معصومانہ قہقہوں میں فرشتوں کی آوازوں کی صدائے بازگشت میں پھر کس طرح سُن سکوں گی۔

مَیں والہانہ اُس کے قریب پہونچ گئی۔

اس کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اُس آغوش میں لے لیا جسے آج تک کسی ننھّے سے بھائی یا بہن نے مُیّر نہیں کیا تھا، اور میں نے اس کو اپنے گھٹنے پر بٹھالیا جہاں غریبوں کے بچّے ہی بیٹھتے ہیں اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے، گویا میں کسی مقدس چیز کو چھُو رہی ہوں، اُس کے بکھرے ہوئے بالوں کو پاکیزہ پیشانی سے ہٹانے لگی۔

.... پھر میں نے اس پیشانی پر اپنے لب رکھدئے اور ایک طویل بوسے میں اپنے دل کی تمام محبّت اور وارفتگی کی بارش کردی۔ آپ کے خیال میں کوئی چیز بھی جذباتِ اُلفت و محبّت کو رونے والے بچّے سے زیادہ بیدار کرسکتی ہے؟

بچّہ حیرت زدہ ہوکر خاموش ہوگیا چونکہ اس نے محسوس کیا کہ کوئی رُوح اُس کی رُوح سے سرگوشیاں کررہی ہے۔ وہ دفعتاً خاموش ہوگیا اور اپنی ان آنکھوں سے جو حزن و ملال سے پُر تھیں مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ کیا آپ جانتے ہیں بچّوں کی آنکھیں کس طرح غمگین ہوتی ہیں! کیا آپ کو معلوم ہے اس ننھی مخلوق کی حزن آمیز نظریں کیسی نظر آتی ہیں؟ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے نہایت معصومی کے ساتھ دُنیا کی عزیز ترین ہستی کو دریافت کیا اور فلسفیوں کی سی سنجیدہ آواز میں کہنے لگا: "امّی! امّی!"

تیرا بچّہ تجھے پکار رہا ہے، تو کیوں اُسے جواب نہیں دیتی اے بچّے کی ماں؟

تو بیمار نہیں ہے چونکہ میں نے تجھے ابھی شام کی تفریح کرتے ہوئے دیکھا ہے جبکہ تیری گردن میں جواہرات کا ہار پڑا ہوا تھا۔ تیری جسمانی حالت بہت اچھی ہے تو اُس کے پاس دوڑتی ہوئی کیوں نہیں آتی؟ کیا تجھے اس بچّے کے آنسو اپنی حرارت سے بیچین نہیں کرتے جو آنکھوں سے اوجھل ہے؟ کیا تیرے دل میں اس ہستی کا گریۂ و نالہ کوئی درد پیدا نہیں کرتا جس کی آواز تو نہیں سُن رہی؟

آ! اور اپنی طول طویل تفریحوں، متعدد ملاقاتوں اور غیر سنجیدہ گفتگوؤں کو خیرباد کہدے۔ آ! اور اس ننھی مخلوق کے

سامنے جھک کر معافی طلب کر۔

تو خوبصورت ہونے سے پہلے "عورت" پیدا کی گئی ہے اور فطرت نے اس سے پہلے کہ معاشرہ تجھے سیر و تفریح کا عادی بنائے تجھے "ماں" بنا کر اس دنیا میں بھیجا ہے۔

آ! اور مسند کے سامنے سجدہ ریز ہو جا، اس ننھی مخلوق کی مسند کے سامنے!

اس گہوارہ کے سامنے سجدہ کر جس کے پردوں میں تو عالم طفلی میں کھیلتی رہی ہے۔ اور جوانی میں تجھے جسکے خواب نظر آتے ہیں۔ ازدواجی زندگی میں تو جس کیلئے چشم براہ تھی۔ اور اب ماں ہو کر تجھے اس قدر بے اعتنائی کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اس گہوارے کے سامنے سجدہ کر کیونکہ یہ تیری آرزو کی انتہا ہے۔

اس مسند کے سامنے سجدہ کر اور صاحب مسند کو رونے نہ دے، کہیں تنہائی کی تلخیاں اُس کے دل میں جگہ نہ کر جائیں یہاں تک کہ جب وہ بڑھاپے سے دوچار ہو تو یہ تلخیاں نفرت و سخت دلی میں تبدیل ہو جائیں۔

اس مسند کے سامنے سجدہ کر اور اس ننھی مخلوق کو لوریاں دے! کہ بچوں کے آنسو بڑوں سے زیادہ رنج و الم کا باعث ہیں۔

"آنرمی"

صلاح الدین احمد قریشی

شاعر کی موت اُسکی زندگی ہے

رات شامیانہ کی طرح سارے شہر پر چھائی ہوئی تھی، برف باری نے ساری کائنات کو سفید لباس میں ملبوس کر دیا تھا، انسان جاڑے سے ہارا ہوا بازاروں سے بھاگ کر اپنے نشیمن میں چھپ چکا تھا، نصف شب کی ہوا مکانوں کے گرد اس طرح آہ وزاری کر رہی تھی جیسے پتھر کی قبروں کے درمیان کوئی بیوہ اپنے شوہر کا ماتم کرتی ہے۔

شہر کے کنارے، محلوں اور منزلوں سے علیحدہ، ایک شکستہ چھوٹا سا مکان تھا جس کے کھنبے جھکے ہوئے تھے، برف کے بوجھ سے چھت بیٹھی جا رہی تھی۔ اس مکان کے کونے میں پھٹے پرانے بستر پر ایک شخص نزاعی کیفیت میں پڑا ہوا ایک مدھم چراغ کو دیکھ رہا تھا جو تاریکی پر غالب آنا چاہتا ہے مگر ہمیشہ مغلوب ہو جاتا ہے یہ ایک نوجوان ہے جس کو عنفوانِ شباب میں ہی یہ معلوم ہو گیا ہے کہ اب زندگی کے بکھیڑوں سے آزاد ہونیکا وقت آ گیا ہے، وہ موت کا انتظار کر رہا ہے اور اس کے زرد چہرے پر امید کی جھلک اور ہونٹوں پر غمگین تبسم ہے۔

یہ بیکس شاعر، جو اپنے لطیف اقوال سے انسانی دلوں کو خوش کرنے آیا تھا، سرمایہ داروں کے شہر میں بھوکا مر رہا ہے۔ ایک شریف، جو قدرتی نعمتوں کے ساتھ زندگی کو شیریں بنانے آیا تھا، ہماری دنیا سے رخصت ہو رہا ہے، قبل اس کے کہ انسانیت اس کیلئے مسکرائے، دم توڑنے والا اپنی آخری سانسیں پھینک رہا ہے اور اس کے پاس کوئی نہیں ہے سوائے ایک چراغ کے جو اس کا رفیقِ تنہائی ہے اور چند اوراق جن پر اُس کی پاک روح کے خیالات ہیں۔

اس جاں بلب نوجوان نے اپنی باقی قوت کو، جو ختم ہونیوالی تھی جمع کیا، اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر اپنی خشک آنکھوں کو اس طرح حرکت دی گویا وہ اپنی آخری نگاہوں سے بوسیدہ جھونپڑی کی چھت کو چیر کر بادلوں کے پیچھے چھپے ہوئے تاروں کو دیکھنا چاہتا ہے۔

وہ کہنے لگا: "آ، دلنواز موت! آ، میں تیرا بہت مشتاق ہوں! میرے پاس آ، اور مادیت کے بند کھول دے۔ جس کے بوجھ سے میں تھک گیا ہوں۔ آ، آ، مجھ سے قریب ہو جا، اے شیریں موت! اور مجھ ان انسانوں کے جنگل سے نکال لے جو مجھے اپنے درمیان اجنبی سمجھتے ہیں محض اس لئے کہ میں ملائکہ سے سُنے ہوئے آسمانی الہامات کو اُن کی زبان میں بیان کر دیتا ہوں۔

جلدی آ، پیاری موت! لوگ مجھ سے بے پرواہ ہیں، اُنہوں نے مجھے "گوشۂ نسیاں" میں ڈال دیا ہے صرف اس لئے کہ میں اُنکی طرح سرمایہ کا حریص نہیں ہوں اور اپنے سے کمزور پر حکومت کرنا نہیں چاہتا ہوں۔

آ، میرے پاس آ، اے راحت بخش موت! مجھے اپنے محبت بھرے سینے سے چمٹا لے، اور میرے ہونٹوں کو پیار کر جنہوں نے کبھی ماں کے پیار کا مزہ نہیں چکھا۔ جو اپنی بہن کے رخساروں سے نہیں ملے، اور جنہوں نے کبھی اپنی محبوبہ کا بوسہ نہیں لیا۔"

اس وقت دم توڑنے والے کے پاس ایک خوبصورت غیر انسانی عورت کا خیال کھڑا تھا جو برف کی طرح سفید و شفّاف کپڑے پہنے تھی اور اپنے ہاتھ میں کلیوں کا ایک خوبصورت تاج لیئے ہوئے تھی جو فردوسی باغوں سے چُنی گئی تھیں۔

وہ نوجوان سے قریب ہوئی اور گلے سے لگا لیا، اس کی آنکھیں بند کر دیں تاکہ دل کی آنکھوں سے دیکھے، اُس کے ہونٹوں کا محبت بھرا بوسہ لیا، وہ بوسہ جس نے اس ہونٹوں پر تسکین بخش مُسکراہٹ چھوڑ دی۔

اب اس گھر میں کچھ نہیں تھا سوائے مٹی کے ڈھیر اور چند مُنتشر اوراق کے جو تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔ صدیاں گزر گئیں، اور اہلِ وطن انکار و غفلت کی نیند میں غافل رہے۔ بارے وہ جاگے اور اُن کی آنکھوں نے انکار کی تاریک رات کے بعد اعتراف کی روشن صبح دیکھی، ایک پبلک پارک میں مرحوم شاعر کا عظیم الشان اسٹیچو نصب کیا اور سال میں ایک روز اس کی برسی اور دن (ڈے) منانے کیلئے مقرر کر دیا۔

آہ! "انسان کتنا بھولا ہے"

از خلیل جبران، ——— مُترجمہ:۔ محمد رضا انصاری

منظومات

عارف

ترکِ دُنیا میں ہے مضمر زندگیٔ تابناک
ترکِ دُنیا سے جھلک اُٹھتی ہے رُوحِ قصرِ خاک

ترکِ دُنیا ہی میں جولاں ہیں مقاماتِ بلند
صید کرتی ہے خُدا کو ترکِ دُنیا کی کمند

ترکِ دُنیا سے خودی کے نقش ہوتے ہیں جمیل
ترکِ دُنیا سے ہے نُورانی حیاتِ جبرئیل

ترکِ دُنیا سے مجاہد کی نظر ہوتی ہے تیز
ترکِ دُنیا میں ہیں آزادی کے جوہر حُسن بیز

خواب ہے دُنیا۔ متاعِ خواب ہے آسودگی
لا الہ کی ضرب سے ہوتی ہے روشن زندگی

دہری

تُو بھی تو واقف نہیں کیا ہے ترا حُسنِ وجود
چند تاویلاتِ بے انوار تیری ہست و بُود

جادۂ راہِ یقیں سے تو بھی ہے بھٹکا ہوا
جلوۂ اوہام کی زُلفوں میں ہے لٹکا ہوا

غیب کا تُو ہے پُجاری اور وہ بھی بے دلیل
عقل کے آگے ٹھہرتا ہے جُنونِ سلسبیل ؟!

آسمانی جہل کے سایہ میں ہے تیرا دماغ !
رُوح میں تیری فروزاں کب ہے عرفاں کا چراغ

جاگ اے سوتے ہوئے دل اے حقیقت ناشناس
ٹُوٹ جائے گا تری تخییل کا ہر التباس

فلسفی

آج تک کاوشؔ نہ میری فہم میں آئی یہ بات
کیوں بنی کیونکر بنی کیسے بنی یہ کائنات

معرفت کے مدعی بھی ہیں یہاں بے آب رنگ
ان کے دل میں بھی وہی جو میرے دل میں ہے ترنگ

ہاں! مگر مَیں دیکھتا ہوں رقصِ انوارِ وجود
ایک روشن زندگانی ایک رخشاں ہست و بود

خیر و شر میرے جہاں میں دخل پا سکتے نہیں
سرحدِ ادراک تک بے دین آ سکتے نہیں

نیاز

دوستوں کو دوستی کا واسطہ دیتا ہوں میں
دُشمنوں کو دُشمنی کا واسطہ دیتا ہوں میں

رزم گہ میں آؤ گر کچھ ہے تمنائے حیات
کشمکش ہی میں ہے سازِ جلوہ آرائے حیات

ذوقِ جد و جہد سے ہوتی ہے رخشاں کائنات
چھین لو اِک جست میں خورشید کی تاباں حیات

آسماں سے چاند تارے توڑ لاؤ بے درنگ
اپنی ہمت سے بدل ڈالو رخِ سیلابِ جنگ

رقص لاہوتی ہے ایمانی تکلم کا فریب
اعتبارِ حُسن کے رنگیں تبسم کا فریب

کاوشؔ حیدرآبادی

بیزاری

رات اور یہ چاند تاروں کے نشاں　　برص میں لتھڑا ہوا ہے آسماں
ہے بھیانک زندگی کی داستاں!
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

موت کا مضبوط لیکن سرد ہات　　چھو رہا ہے دیکھ نبضِ کائنات
آہ مت دُہرا گذشتہ واقعات
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

ہو سکی دُنیا نہ مجھ سے مستفید　　آج ہر احساس ہے کوسوں بعید
مجھ سے وابستہ تھی کس کس کی اُمید
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

غیر کا انصاف، اپنوں کا فساد　　دوست کا شک، دُشمنوں کا اعتماد
تلخ ہے گذری ہوئی گھڑیوں کی یاد
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

دل تو دل ہستی مٹا بیٹھا ہوں میں　　گھر تو گھر، دُنیا لُٹا بیٹھا ہوں میں
اب تو "اُن" کو بھی بُھلا بیٹھا ہوں میں
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

صبر، صحت، عقل سب کچھ کھو چُکا　　چھوڑ، اب جو ہو چکا سو ہو چُکا
جس قدر رونا تھا مجھکو رو چُکا
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

مدتوں جھوٹی مسرت کے لئے　　میں نے دل کو سینکڑوں دھوکے دیے
جی ٹھہر سکتا نہیں اب بے پیے
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

قابلِ نفرت ہے دُنیا کی زمین　　اس سے بڑھکر ہر ستارہ ہے حسین
میرے ہاتھوں سے بھرا ساغر نہ چھین
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

دیکھ تاروں کی نظر پتھرا گئی　　رات کی چوٹی کمر تک آ گئی
رُوح پچھلی یاد سے گھبرا گئی
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

یہ ستارے یہ کفن کے سرد پھول　　آسماں جیسے جلی لاشوں کی دھول
چاند گویا ایک بے اُمت رسول!
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

رات کی چادر میں مجرم ہر طرف　　تیرگی میں خودکشی خنجر بکف

زندگی ہے یاں گُناہوں میں تلف
دوست سب کچھ بُھول جانے دے مجھے

زندگی ہے یاں غریبوں پر حرام آہ یہ دُنیا ہے دولت کی غلام
لے نہ میرے سامنے دُنیا کا نام
دوست سب کچھ بُھول جانے دے مجھے

قید ہے یاں فلسفہ میں عشق بھی رسم میں جکڑی ہوئی ہے زندگی
اس جگہ جینا ہے گویا خودکشی!
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

حسن کیا ہے جاگتی آنکھوں کا خواب عشق کیا ہے؟ ایک ذہنی اضطراب
علم کیا ہے؟ اک سوالِ بے جواب
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

مُفلسی اک جُرم، محنت اک سزا سلطنت اِک ظلم، مذہب اک بلا
ہے یہاں چنگیز کا حامی، خُدا
دوست سب کچھ بُھول جانے دے مجھے

کھا چکی انصاف کی میزان زنگ ہر طرف بغض و عداوت، قتل و جنگ
لُٹ چکا انسانیت کا نام و ننگ
دوست سب کچھ بُھول جانے دے مجھے

ہے گراں یہ حلقۂ وقت و مقام یہ زمین و آسماں یہ صُبح و شام
چھوڑ بھرنے دے مجھے اک اور جام
دوست سب کچھ بُھول جانے دے مجھے

وہ علی گڑھ وہ علی گڑھ کا چمن اب کہاں وہ ہمنوایانِ سخن
مت دلا اب یاد بُھولی انجمن
دوست سب کچھ بُھول جانے دے مجھے

عافیت کی فکر، عزت کا سوال شاعری کا خبط، شُہرت کا خیال
اُن کا غم، بے روزگاری کا ملال
دوست سب کچھ بُھول جانے دے مجھے

صبح ہوتی ہے بُجھا جاتا ہے دل چاند کا چہرہ ہے بے حد مضمحل
لا پلا اِک اور جامِ مشتعل
دوست سب کچھ بُھول جانے دے مجھے

جاں نثار اختر (علیگ)

طفولیت کی جولانگاہ کو دیکھکر

اے فضا کی سُرخیو! اے شام کی رعنائیو! اے سماں کی شوخیو! اے وقت کی برنائیو!

اے ہجومِ سبزہ و گُل دامنِ کہسار میں! اے خرامِ ورودِ دریا تختۂ گلزار میں!
اے ہوائے صاف باطن! اے زمینِ دلفریب جانے کیوں دلکو تری قربت سے ملتا ہی شکیب!
کھیلتا تھا ذرہ ذرہ مجھ سے اِس ماحول کا میری گردن پر نہ تھا جب عمر کا بھاری جُوا
جانے کیوں اک پیاس سی رہتی تھی تیری دید کی تیری ہجولی میں دل پاتا تھا لذت عید کی
دوڑتا پھرتا رہا ہوں مَیں گیاہِ سبز پر چہچہاتے تھے پرندے میری ہر آواز پر
ٹہنیوں میں جھول کر جھولا گرا ہوں مَیں کبھی مُسکراتا شرمگیں ہو کر اُٹھا ہوں مَیں کبھی
گیت جب برسات میں کوئل سناتی تھی مجھے ڈھونڈتا پھرتا تھا میں ہر پیڑ کے نیچے کسے؟
کھیتیوں میں قہقہا کرتا اُچھلتا کودتا جھومتا پھرتا رہا ہوں بالیوں کو توڑتا
بے خبر تھا میں محبت کی نوازش سے ابھی نیند میں بھی تیری آنگن میں پڑا رہتا تھا جی
گر کہیں جانا ہوا کرتا تھا دو دن کے لئے تیری فرقت ایک مصیبت تھی مرے دل کیلئے
اِس فضا کا عشق تھا دل کو مگر روپوش تھا سچ تو یہ ہے کس کو اتنا سوچنے کا ہوش تھا
جھاڑیوں کو چھیڑ کر بھاگا ہوں پھولوں کی طرف توڑ کر اک پھول کو دوڑا ہوں کھیتوں کی طرف
لیٹ کر سبزہ پہ گہ تکتا رہا روئے شفق ہر کلی مانوس تھی مجھ سے چمن کا ہر طبق

دیکھتا ہوں آج یوں مَیں اِس فضا میں چار سو
جیسے کوئی چیز کھو کر ڈھونڈتا ہو راہ رو

اے زمینِ دل نشیں یہ پوچھنے آیا ہوں میں کیا فضائے علم[1] میں ہیئت بدل آیا ہوں مَیں
آج مَیں دل میں نہیں پاتا اُمنگوں کا وجود سُن رہے ہیں کان اک مدّت سے سازِ ہست و بود
پیس ڈالا ہے مرا دل گردشِ ایام نے کاٹ ڈالا ہے جگر کو خنجرِ آلام نے
اَب لبوں پر آہ آتی ہے ہنسی کے نام پر خونِ دل کا شک مجھے ہوتا ہے رنگِ شام پر
زندگی شاداں نظر آتی ہے سینے میں ترے زندگی ترساں و لرزاں ہی سفینے میں مرے
وقت کے ہاتھوں سے کٹتا تھا جو حلقِ آرزو تو نے کیوں بخشا تھا میرے دلکو عشقِ رنگ و بو
تجھ کو کیا معلوم ہے ظالم لہو رویا ہوں میں دل کے بدلے اب لہو کے لوتھڑے رکھتا ہوں میں
وقت کی بھٹی میں جب قسمت جلاتی تھی مجھے تیری صورت یاد آ آ کر رُلاتی تھی مجھے

اب مجھے بخشا گیا ہے اور ہی سوزِ نظر
کر رہا ہوں دشت و در پر آج میں نظرِ دِگر

ہیں اگرچہ اب تلک تیرے مناظر دل فریب پا رہا ہوں آج مَیں تجھ میں بھی کچھ آثارِ شیب
تیرے ظاہر میں نہیں وہ لذتِ دیدار کیوں؟ تیرے باطن پر نظر جمتی ہی اے دلدار کیوں؟
جھاڑیوں کے چھیڑنے سے ہاتھ رکتا ہی مرا شاخِ گُل کے توڑنے سے قلب دُکھتا ہی مرا

گردشِ ایام میں بجتا ہے سازِ زندگی
جل رہا ہے ذرّہ ذرّہ میں چراغِ زندگی

موجۂ دریا میں رقصاں ہی روانِ زندگی ساحلوں کی خامشی کیا ہی؟ فغانِ زندگی
بھیس میں جھینگر کے ہی سازندگانِ زندگی دے رہی ہیں کوئلیں پیڑوں سے تانِ زندگی
برگِ گُل پر قطرۂ شبنم صبوحیِ حیات زندگی کی دھار میں لوٹی ہوئی ہی کائنات

[1] یونیورسٹی

نیم جاں میرا نفس ہے مضمحل میرے قدم ۔۔ روحِ غمگیں چھیڑنا چاہتی ہے پھر سازِ عدم
دیکھتا ہوں جب نگاہِ غور سے تیرا ضمیر ۔۔ تو بھی آتی ہے نظر میری طرح برنا و پیر

سوختہ ساماں ہیں بزمِ آرزو میں ہم ابھی
اور پہناتے عدم میں نوجواں ہیں ہم ابھی

دیکھتا ہوں اک لہر سی میں درونِ کائنات ۔۔ پا رہا ہوں جس کا زیر و بم ورائے شش جہات
ہر تنفس اس سے ملحق ہے نفس کی ڈور سے ۔۔ اس کا رشتہ آسمانوں تک ہے ماہ و ہور سے
پاسباں اس کے تموج کی ہے فطرت کی نگاہ ۔۔ ایک ہی جنبش ہے اصلِ گردشِ شام و پگاہ
سینۂ ذرات میں مخفی ہے سوزِ آرزو ۔۔ دل کی آنکھیں دیکھتی ہیں آج اصلِ رنگ و بو

عالمِ طفلی سے اب تک میں ترا ممنون ہوں
جب ترا شیدا رہا ہوں اب ترا مجنون ہوں

احمل نجیب آبادی

احساسِ محبت

آج تم کو دیکھ کر کیوں بے خودی سی چھا گئی ۔۔ خون کے بدلے رگوں میں برق سی لہرا گئی
کیوں لبوں پر خوفِ رسوائی سے آہیں رک گئیں ۔۔ بڑھ کے گردن تک تمہاری آج بانہیں رک گئیں
کیوں ہی سجدوں میں تڑپ، قدموں پہ گرنے کیلئے ۔۔ آج کیوں ڈر ہو رہا ہے بات کرنے کے لئے
"سامنے ہو تم مرے" بس ہوش اتنا کہہ سکا ۔۔ آج تم کو دیکھ کر کیوں دیکھتا ہی رہ گیا
مجھ کو ہے تم سے محبت، یہ بھی کہہ سکتا نہیں ۔۔ آج کیوں آنسو مری آنکھوں میں رہ سکتا نہیں
اس سے پہلے تم کو تڑپانے کی عادت تو نہ تھی ۔۔ دیکھنے والوں سے شرمانے کی عادت تو نہ تھی
دور، احساسِ محبت سے رہا کرتے تھے ہم ۔۔ درد کو اکثر فریبِ دل کہا کرتے تھے ہم
یہ تو کہہ سکتا نہیں، دل میں خلش اتنی نہ تھی ۔۔ ہاں مگر اتنا تو ہے، تم میں کشش اتنی نہ تھی

آج کچھ بدلے ہوئے مجھ کو نظر آتے ہو تم
جانے کیوں میری نگاہوں میں سما جاتے ہو تم

(صاحبزادہ) میکش حیدرآبادی

سہانی رات

تمہیں بھی یاد ہے وہ شامِ رنگیں ۔۔ ہم اپنے دل کو جب بہلا رہے تھے
شفق کے رنگ میں ڈوبے نظارے ۔۔ حسیں رنگینیاں پھیلا رہے تھے
سرِ گردوں کہیں دو چار بادل ۔۔ افق کی گود میں منڈلا رہے تھے
شبِ تاریک کے بیباک گیسو! ۔۔ رخِ ہستی پہ پھیلے جا رہے تھے
لبِ فطرت ربابِ زندگی پر ۔۔ مسرت کے ترانے گا رہے تھے
کنارِ آبجو بیٹھے تھے ہم تم ۔۔ گذشتہ عہد کو دہرا رہے تھے
شبابِ تند کے ساغر تمہارے ۔۔ مئے دوشیزگی چھلکا رہے تھے

صبا بالوں کو برہم کر رہی تھی ::: اُلجھ کر تم اُنہیں سلجھا رہے تھے
مری رگ رگ میں تم پیوست ہوکر ::: خوشی کی لہر اک دوڑا رہے تھے
گلِ عارض جو میں نے چھو لیے تھے ::: تبسم لب پہ تھا شرما رہے تھے
فضا میں مستیاں حل ہوگئی تھیں ::: بہک کر تم مجھے بہکا رہے تھے
بکھر کر بال دوشِ مرمریں پر ::: گھٹائیں بجلیاں چمکا رہے تھے
ہمارے بے وفائی کے گلہ پر ::: "محبت" کی قسم تم کھا رہے تھے
تمہاری دید کو گردوں سے تارے ::: شعاعیں نور کی پھیلا رہے تھے

فلک پر بیخودی سی چھا رہی تھی
مگر اب ہوش میں ہم آرہے تھے

علی احمد

ایک رومان

مشاطۂ مسرت آئی پیام لیکر ::: جامِ نوید لیکر سحرِ دوام لیکر
کشمیر جا رہی ہیں۔ چلئے بلا رہی ہیں

یہ کاسنی لفافہ خوشبو میں بس رہا تھا ::: الفاظ کی روش پر گلشن برس رہا تھا
سطریں دہک رہی تھیں کلیاں چٹک رہی تھیں

فوراً جواب لکھکر، بالوں میں کرکے شانہ ::: اُس پیکرِ وفا کی جانب ہوا روانہ
مخمور تھیں گھٹائیں، رنجور تھیں فضائیں

چلمن کے پاس جاکر دیکھا عجب نظارہ ::: سادہ تھیں ساری باندھے بیٹھے ہے...
کچھ گنگنا رہی ہے، زلفیں بنا رہی ہے

مُنہ اُس طرف کو پھیرے مصروف آئینہ ہے ::: "بالعکس" میری صورت زیرِ معائنہ ہے
میں اُس کی شوخیوں کا مطلب سمجھ رہا تھا

کرسی کے پاس جاکر خاموش ہوگیا میں ::: آنکھوں پہ ہاتھ رکھکر مدہوش ہوگیا میں
مدہوش ہوگیا میں، جلووں میں کھوگیا میں

انسان شاد اکثر وہ خواب دیکھتا ہے ::: تعبیر جس کی شاید اک وہم نارواہے
اب اُس سے میں جدا ہوں اور مجھ سے وہ جدا ہے

شاد عارفی

غزلیات

کلیسا کیا، حرم کیا، بُت کدا کیا
تجھے ڈھونڈا کئے ہر سمت کیا کیا

یہ غم کیا، یہ غمِ حسرت فزا کیا
ہمیں بیٹھے بٹھائے ہو گیا کیا

نہ جانے جو، وفا کیا ہے، جفا کیا
کریں اُس بے خبر سے ہم گِلہ کیا

بتائیں تجھ کو ہم اے دلرُبا کیا
بھری ہیں آرزوئیں دل میں کیا کیا

کیا میری شکایت کا گِلہ کیا
ذرا پھر تو کہو تم نے کہا کیا

نگاہِ شوق سے کیا بچ سکو گے
کیا بھی تم نے تو پردا کیا کیا

تجھی کو دیکھ کر مانگا ازل میں
خُدا سے اس سے بڑھکر مانگتا کیا

کسی پر پہلے ہی سے مر چکا ہوں
یہاں آ کر کرے گی اب قضا کیا

بُتوں کو دیکھتے ہی ہو گیا بُت
مرے اللہ مجھکو ہو گیا کیا

محبت میں دفورِ بےخودی ہے
میں خود واقف نہیں مجھکو ہوا کیا

اُڑایا چٹکیوں میں دل کو کس نے
خدا معلوم گزرا ماجرا کیا

مجھے تو اپنی قسمت کا ہے رونا
تمہاری بے وفائی کا گِلہ کیا

دل و جاں، دین و ایماں دے چکے ہم
ہمارے پاس اب باقی رہا کیا

غم و اندوہ و یاس و درد و حسرت
ملے ہیں ہمکو بھی احباب کیا کیا

جو مرضی ہو تری راضی ہیں اُس میں
ہماری آرزو کیا، مدعا کیا

سُنائے جائیں گے ہم حالِ اپنا
کہے جائیں گے کب تک آپ کیا کیا

تبختر نے بھرے ہیں کان اُن کے
سُنیں گے وہ کسی کا مدّعا کیا

گرہ تقدیر کی کھلنے نہ پائی
رہی فکرِ کشودِ کار کیا کیا

مجھی کو گھور کر محفل میں دیکھا
بجز میرے وہاں کوئی نہ تھا کیا

اُلجھتا ہے عبث رندوں سے زاہد
وہ کیا جانے کہ ہے مے کا مزا کیا

یہ کیوں رہ رہ کے ہچکی آ رہی ہے
کوئی یاد آ گئی پھر اُن کو جفا کیا

بنے ہیں خاک سے، پھر خاک ہونگے
ہماری ابتدا کیا، انتہا کیا

گزرتی ہے جو میرے دل پہ شاکر
کہیں کہنے سے اُس کے فائدا کیا

پیارے لال شاکر میرٹھی

ایک شعرِ مجسّم سے

یہ عنفوانِ شباب اور یہ سحرِ شباب ترا
جہانِ حسن میں دیکھا نہیں جواب ترا

نہ پھوٹتی ہوئی کونپل، نہ مسکراتی کلی
کچھ اور چیز ہے یہ حسنِ نیم خواب ترا

یہ تیری اٹھتی جوانی یہ چھاؤں تاروں کی — یہ بھینی بھینی مہک یہ نیا شباب ترا
ترے حضور میں، میری ہر آرزو ناکام — مری نظر میں ہر انداز کامیاب ترا
تری نظر میں، مری ہر نگاہ گستاخی — مرے خیال میں اک کیف ہر عتاب ترا
یہ نرم نرم تبسم، یہ گرم گرم نگاہ — مٹا نہ دے کہیں سائل کو یہ جواب ترا

تجھے خبر بھی ہے او شوخ، کیا قیامت ہے
شراب و شعر میں ڈوبا ہوا شباب ترا

کوکب شاہجہانپوری

آج تک

کچھ مضطرب سی عشق کی دنیا ہے آجتک — جیسے کہ حسن کو نہیں دیکھا ہے آج تک
مدت ہوئی کسی کو مٹے کوئے یار میں — اک ناتواں غبار سا اٹھتا ہے آج تک
ساری رگوں میں ہیں غم پنہاں کے نیشتر — جاری کشاکش غم دنیا ہے آج تک
تو نے کبھی کیا تھا جو ذکر غم فراق — دل کو لگا ہوا وہی کھٹکا ہے آج تک
پورا ابھی کر کے ہم جسے پورا نہ کر سکے — دل سے وہی نظر کا تقاضا ہے آج تک
تو نے جھلک دکھا کے جسے منہ چھپا لیا — وہ چشم شوق محو تماشا ہے آج تک
اس ایک دور جام کو مدت گذر گئی — دل پر تری نگاہ کا دھوکا ہے آج تک
تصدیق تو نہیں مگر افواہ سی ہے کچھ — تیری کسی سے رنجش بیجا ہے آج تک
پرچھائیاں نشاط و الم کی ہیں درمیاں — باہم وصال و ہجر کا پردا ہے آج تک
یوں تو اداس غمکدۂ عشق ہے مگر — اس گھر میں اک چراغ سا جلتا ہے آجتک
ہم بیخودان عشق تو کچھ شادماں سے ہیں — سنتے ہیں دل میں درد سا اٹھتا ہے آجتک
ویرانیاں جہان کی آباد ہو چکیں — جز اک دیار عشق کہ سونا ہے آج تک
چھیڑا ہے غم نے پھر وہی دل کا معاملہ — اس آنکھ نے اٹھا جسے رکھا ہے آج تک
افلاک سے ملی ہے کب افتادگی عشق — پستی حریف اوج ثریا ہے آج تک
مدت ہوئی کہ حسن سے مانوس ہو چکے — دل بیقرار عرض تمنا ہے آج تک

یہ عمر بھر فراق بجا دل گرفتگی
سینے میں کیا وہ درد بھی رکھا ہے آجتک

رگھوپتی سہائے فراق

دو آتشہ

۱

یہ کس کے دل کی کہانی سنائی جاتی ہے — وہ کہہ رہے ہیں مجھے نیند آئی جاتی ہے
نگاہ شوق پہ حسرت سی چھائی جاتی ہے — اس احتیاط سے چلمن اٹھائی جاتی ہے
شراب ناب میں دیکھی نہ برق و انجم میں — وہ چیز جو تری آنکھوں میں پائی جاتی ہے

یہ شوخیاں، یہ جوانی، ارے خدا کی پناہ! — قدم قدم پہ قیامت اٹھائی جاتی ہے
جو ناگوار ہے اہلِ جفا کی فطرت کو — مری زباں پہ وہی بات آئی جاتی ہے

مجھے بھی بار ہے اُس بزمِ ناز میں ماہر
جہاں نظر سے جوانی لٹائی جاتی ہے

۲

مانا مقامِ عشرتِ ہستی بلند ہے — میں دل کو کیا کروں کہ اُسے ناپسند ہے
تم کو حجاب، مجھ کو تماشہ پسند ہے — میری نظر، تمہاری نظر سے بلند ہے
اللہ رے! دل کی عشق میں دیوانہ واریاں — اندیشۂ زیاں ہے نہ خوفِ گزند ہے
آنکھوں میں آ چکی ہے محبت کی واردات — طوفانِ بے پناہ پیالوں میں بند ہے
اب اُن کا انتخاب کرے گا یہ فیصلہ — اُلفت بلند ہے کہ تمنا بلند ہے

ماہر ازل میں دل نے کیا غم کا انتخاب
اُن کی خطا نہیں ہے یہ دل کی پسند ہے

ماہر القادری

تجلیات

نہ خردمند نہ دیوانہ بنایا ہوتا — مجھکو دُنیا سے جُداگانہ بنایا ہوتا
دیر و کعبہ میں تجھے تفرقہ گر ڈالنا تھا — کفر و دیں سے مجھے بیگانہ بنایا ہوتا
وحشتِ دل کے لئے وسعتِ صحرا کم ہے — کوئی ویرانہ سا ویرانہ بنایا ہوتا
حُسن بھی جانتا کچھ سوزشِ اُلفت کے مزے — شعلۂ شمع سے پروانہ بنایا ہوتا
حرم و دیر کی کھل جاتی حقیقت ساقی — میرے ہر جام کو میخانہ بنایا ہوتا
لذتِ درد باندازۂ دل دے ورنہ — درد کو دل جو بنایا نہ بنایا ہوتا
عجز کے ساتھ مزے ناز کے ہم بھی لیتے — سر کو سنگِ درِ جانانہ بنایا ہوتا
منکشف دہر پہ ہوتے نہ جنوں کے اسرار — کاش دیوانہ کو دیوانہ بنایا ہوتا
کرمِ خاص سے دینا تھا غمِ عشق اگر — دل غمِ دہر سے بیگانہ بنایا ہوتا
کاش بدمستِ ازل کے لئے تو نے یارب — سارے کونین کو پیمانہ بنایا ہوتا

تھا غمِ دہر گوارا مجھے تابش لیکن
دل کو محرومِ تمنا نہ بنایا ہوتا

تابش دہلوی

نقد و تبصرہ

ریاضِ رضواں۔ حضرت ریاض خیرآبادی کا مجموعہ کلام خدا خدا کر کے شائع ہو گیا اور بڑی آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ کم و بیش چالیس سال سے ریاض مرحوم کے قدر دانوں کو اس کا انتظار تھا۔ افسوس ہے کہ آج ہم میں نہ خان بہادر میر ناصر علی دہلوی ہیں اور نہ دلگیر اکبرآبادی جو ریاض کے قدردان اور کلامِ ریاض کے عاشق تھے۔ اگر یہ حضرات زندہ ہوتے تو "ریاضِ رضواں" کی سچی داد دیتے۔ افسوس کہ خود ریاض بھی نہ رہے۔ ریاض سا شاعر، ناصر علی سا سخن فہم اور دلگیر سا نقاد زمانہ صدیوں میں پیدا کرتا ہے۔

حاجی سید سبحان اللہ صاحب رئیسِ گورکھپور ان بزرگوں کی یادگار اور اپنے رفیقوں کے تنہا ماتم گسار ہیں۔ سید صاحب کو ریاض سے تقریباً نصف صدی تک دماغی سابقے رہے۔ اور شعر و سخن کے ان پرکھنے والوں میں سے ہیں جن کی اصابت رائے مسلّم ہے۔ ریاض کی امداد دامے درمے قدمے ساری عمر کرتے رہے۔ بقولِ ریاض ؎

جوہری جوہرِ سخن کے ریاض
منہ مرا موتیوں سے بھرتے ہیں

ریاض کے بعض بعض اشعار پر دنوں نہیں ہفتوں سید صاحب خود رفتہ رہے ہیں اور جب تک ریاض کو انکی مکمل تشریح نہیں سنادی انہیں سکونِ قلب میسر نہیں آیا۔

ریاض کے ایک اور بہت بڑے قدر دان قاضی تلمذ حسین صاحب ایم۔ اے۔ ہیں جن کا علمی کارنامہ "مراۃ المثنوی" مشہورِ زمانہ ہو چکا ہے۔ قاضی صاحب دیوانِ ریاض کی اشاعت کے لئے چالیس سال ساعی رہے اور اب انہی کی نگرانی میں "ریاضِ رضواں" شائع ہوا ہے۔ سید سبحان اللہ صاحب کے صاحبزادے سید رضوان اللہ صاحب۔ ایم۔ ایل۔ اے کی کوششوں سے حضرتِ ریاض نے اپنا دیوان مرتب کیا اور انہیں اشاعت کے لئے دیا۔ اپنے ایک خط میں رضوان اللہ صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"میں نے اپنے دیوان کا نام "ریاضِ رضواں" رکھ دیا۔۔۔۔ کسی نے میکدہ، کسی نے میخانہ، کسی نے کچھ کسی نے کچھ، کسی نے صرف ریاض تجویز کیا تھا۔ ریاضِ رضواں میں سب آ گئے۔ نہ صرف آپکے خاندان بلکہ تمام خاندان کیلئے رضواں کا نام انتہائی مسرت کا سبب ہوگا۔۔۔۔۔ رضواں نے ریاض میں جان ڈال دی۔"

ان حضرات کا اردو لٹریچر پر ہمیشہ احسان رہیگا کہ برسوں کی جد و جہد اور انتھک کوششوں کے بعد ایک ایسی نادر کتاب کا ہماری زبان میں اضافہ کیا۔

ریاض کی شاعری کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔ انہوں نے امیر اور داغ سے کم شہرت نہیں پائی۔ ان کے دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ جملہ اصنافِ سخن پر حاوی تھے لیکن انکا خاص رنگ رندانہ ہے۔ شراب کا مضمون ریاض سے بہتر اور ریاض سے زیادہ کسی اردو شاعر نے پیش نہیں کیا۔ مولوی سبحان اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ "ریاض نے غزلوں کے دیوان میں (۱۳۶۶) شعر شراب کے لکھے ہیں جن میں (۱۳۶۶) پہلو شراب کے دکھلاتے ہیں۔" قاضی تلمذ حسین صاحب عربی شاعر ابونواس اور فارسی شاعر حافظ کے مقابلے میں ریاض کو پیش کرتے ہیں اور ان تینوں شاعروں کے خمریات پر ایک کتاب علحدہ مرتب کر رہے ہیں۔ ریاض کے مرتبے کا اندازہ اسی سے لگا لیجئے۔ رند کا حال ملاحظہ ہو ؎

یہ اپنی وضع اور یہ دشنامِ مے فروش
سن کر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

اب رند کا جلال بھی دیکھئے ؎

بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم خشتِ خم رکھدیں
جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

شراب و شباب ایک ہو گئے ؎

خمِ قد ہے خمِ مینا سوئے جام
موج ہے ہاتھ ہے انگڑائی کا

شوخی تو ریاض کے اشعار سے ٹپکی پڑتی ہے۔ ان کا بہت مشہور شعر ہے۔ ؎

چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

جب ذرا اور کھل جاتے ہیں تو کہتے ہیں ؎

کوئی منہ چوم لے گا اس نہیں پر
شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر

ثقہ طبیعتیں غالباً اس کے تیور پسند نہیں کریں گی۔ وہ یہ شعر سن لیں ؎

گلا بیٹھا ہوا خدمت اذاں کی اور کعبے میں
بھلے سے ہم دبالاتے تھے ناقوسِ برہمن کو

دعا مانگنے کا کیسا اچھوتا طریقہ نکالا ہے ؎

کیا تجھ سے ترے مست نے مانگا مرے اللہ
ہر موجِ شراب اٹھ کے بنی ہاتھ دعا کا

جی چاہتا ہے کہ ریاض کے شعر آپ کو سناتا ہی چلا جاؤں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میری طرح آپ بھی کلامِ ریاض سے کبھی نہ اکتائیں گے مگر ڈرتا ہوں کہ مجھے اُن کا آٹھ سو صفحے کا پورا دیوان یہاں نقل کرنا پڑ جائے گا۔ کوئی غزل ایسی نہیں جس میں ایک شعر بھی ناقص یا بھرتی کا ہو۔ دو باتیں اور سن لیجئے۔ ایک شاعر کے کردار کے متعلق ہے اور دوسری شاعر کے کلام کے متعلق۔ ریاض کی ساری عمر پارسائی اور نیکو کاری میں گذری۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے کبھی شراب نہیں پی۔ مولوی سبحان اللہ صاحب کا بیان بھی یہی ہے اور میں نے میر ناصر علی مرحوم اور دلگیر اکبرآبادی مرحوم کی زبانی بھی یہی سنا تھا کہ ریاض نے دخترِ رز کو کبھی منہ نہیں لگایا۔

ہے ریاض اک جواں مست خرام
نہ پیے اور جھومتا جائے

دوسری بات کلامِ ریاض کے متعلق یہ ہے کہ انکا سارا کلام بے عیب ہے۔ زبان و بیان میں تو وہ اکثر اپنے استاد امیر مینائی سے بھی اکثر آگے دکھائی دیتے ہیں۔ فن کے لحاظ سے بھی اُن کا پورا دیوان اغلاط سے پاک ہے۔

یہ دیوان راجہ صاحب محمود آباد کے نام معنون کیا گیا ہے۔ غالباً اس وجہ سے کہ ریاض اسی ریاست کے متوسلین میں سے تھے۔ شروع میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے از راہِ قدر افزائی ریاض اور دیوانِ ریاض کیلئے گوہر افشانی فرمائی ہے۔ اس کے بعد حضرت جلیل کی تقریظ اور حضرت اختر مینائی کا پیش لفظ ہے۔ تقریب قاضی تلمذ حسین صاحب نے لکھی ہے اور مقدمہ سید سبحان اللہ صاحب نے۔ مولانا نیاز فتحپوری نے اعترافات کے عنوان سے ریاض کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ دیوان کے آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں ریاض مرحوم کے صاحبزادے اشیم نے کیفیتِ ترتیب حصہ دوم اور قاضی تلمذ حسین صاحب نے داستانِ دیوانِ ریاض لکھی ہے۔ مولوی رضوان اللہ صاحب نے آخری مرحلۂ طبع دیوان لکھکر اس ضمیمہ کو ختم کیا ہے۔ دیوان میں ریاض کی تصویر کی کمی بہت کھٹکتی ہے۔

"ریاضِ رضوان" مجلد ہے۔ بہت خوشنما چھپا ہے۔ ضخامت (۸۷۲) قیمت (للعہ) ملنے کا پتہ:۔ دائرۃ الادب۔ حیدر گوڑہ۔ حیدرآباد۔ دکن۔ (و) دفتر شاہکار۔ گورکھپور۔ یو۔ پی۔ "ش"

مضامینِ اسلم:۔ میاں محمد اسلم صاحب عرصہ صحافت کے مشہور شہسوار ہیں۔ مضمون نگاری ان کا دلچسپ شغلہ ہے۔ افسانہ نگاری میں خاص شہرت کے مالک ہیں اور سب سے جدا اپنا ایک دلکش اسلوبِ بیان رکھتے ہیں۔ افسانوں کے کئی ضخیم مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ لئے گئے ہیں۔ اب ایک اور مجموعہ "مضامینِ اسلم" کے نام سے چھپا ہے۔ جس کے خوشنما سرورق پر ناشر نے سہواً (۲۱) افسانوں کا مجموعہ لکھدیا ہے۔ یہ کتاب محض افسانوں کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں چند نہایت قابلِ قدر ادبی و علمی مضامین بھی شامل ہیں مثلاً اردو ہندی جھگڑے کے متعلق اسلم صاحب نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اُن کا مطالعہ اردو کے ہر بہی خواہ کے لئے ضروری ہے۔ بعض مضامین میں سوشل اور نیشنل مسائل پر ایسے سلیقے سے قلم اٹھایا ہے کہ اُن کی نبض شناسی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ مزاح نگاری میں ایم۔ اسلم صاحب قبولیتِ عام حاصل کر چکے ہیں پیشِ نظر مجموعے میں اکثر و بیشتر مضامین ظرافت کے پھولوں میں بسائے گئے ہیں۔ ہنسی ہنسی میں ہی پتہ پتہ کی کہہ گئے ہیں بلکہ مذاق ہی مذاق میں کھری کھری سنا گئے ہیں۔ ہر مضمون کا مقصد کوئی اہم اصلاح ہے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ نہایت قیمتی ہے اور امید ہے کہ اردو داں حضرات اسے وقعت کی نظر سے دیکھیں گے۔ کتاب مجلد ہے اور سرورق مطلا ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں ہے۔ غالباً عہ میں ملک دین محمد۔ لاہور سے منگائی جاسکتی ہے۔ "ش"

بیوہ:۔ منشی پریم چند آنجہانی کی تصنیف ہے جو مکتبۂ جامعہ کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس میں ایک بیوہ کی دردناک حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ موضوع نیا نہیں بلکہ کسی حد تک پامال ہو چکا ہے لیکن فطرت نگار پریم چند نے اسے ایسے ڈھب سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا یہ کہیں محسوس نہیں کرتا کہ

نئی سنی سنائی کہانی پھر سُن رہا ہے۔ ہندو سوسائٹی میں بیوہ کی حالت بہت زبوں ہے، خصوصاً نوجوان بیوہ کی۔ اس کہانی کی ہیروئن بھی ایک ایسی ہی بیوہ ہے۔ عزیز رشتہ دار مالدار ہیں مگر شوہر کے انتقال کے بعد اُسے چین سے رکھنے کا کوئی روادار نہیں۔ مصیبت پہ مصیبت جھیلنے کے بعد اُس کا آخری ٹھکانہ ایک آشرم بنتا ہے جہاں وہ اپنی دُکھ بھری زندگی کے آخری دن اَوروں کی سیوا میں گزارتی ہے۔ کہانی نہایت عبرتناک اور درد انگیز ہے۔ منشی جی نے سوسائٹی کی ردّی حالت کا جائزہ سختی سے لیا ہے اور اُن تمام عیوب کو بے نقاب کر دیا ہے جو ظاہرداری کے پردے میں پوشیدہ رہتے ہیں۔ کتاب مجلّد ہے اور ۱۲ میں مکتبہ جامعہ دہلی سے طلب کی جاسکتی ہے۔ "ش"

ضرب الامثال۔ خواجہ محمد عبدالمجید صاحب دہلوی اُن چند وضع دار ہستیوں میں سے ہیں جن سے دلّی کی تہذیب و شائستگی عبارت ہے۔ دلّی کی ٹکسالی زبان بولتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ اردو میں جتنی ضرب الامثال شامل ہیں شاید ہی کسی اور زبان میں ہوں۔ قیاس کہتا ہے کہ یہ مثلیں کسی نہ کسی واقعہ کے زیر اثر بنی ہونگی۔ اور رفتہ رفتہ سکۂ رائج الوقت کی طرح فصحا کی تقریر و تحریر میں انہوں نے جگہ پائی ہوگی۔ بعض امثال فصحا سے سندِ قبول حاصل نہ کرسکیں چنانچہ ٹکسال باہر کہلائیں۔ جو مثلیں آج کل اردو میں بولی اور لکھی جاتی ہیں اُن کی تعداد کا شمار مشکل ہے۔ بعض امثال کم مستعمل ہیں اور بعض زیادہ۔ خواجہ صاحب نے چند مشہور مثلیں ایسی جمع کی ہیں جن کا مفہوم صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اُن کی شانِ نزول سے واقف ہونا ضروری ہے۔ گویا یہ کتاب مجموعہ ہے قصص ضرب الامثال کا۔ اس میں (۷۸) قصے اور کہانیاں بیان کی گئی ہیں جن سے ہماری زبان کی مشہور مثلیں بنی ہیں۔ کتاب نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ خواجہ صاحب اگر اس سلسلۂ تحقیق کو جاری رکھیں تو ایک بڑی علمی خدمت اُن کے ہاتھوں انجام پائیگی۔ قیمت ۸ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔ "ش"

دلّی کی دو سو برس کی تاریخ۔ تیمور کے حملے سے پہلے کے واقعات کو تاریخِ ہند کے گمشدہ اوراق سمجھنا چاہیے۔ مولانا سید حسن برنی صاحب۔ ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی، نے تحقیق و تفتیش کی مشعل سے اس زمانے کی تاریکی کو دُور کیا ہے۔ بیس سال کی جانفشانی کے بعد برنی صاحب نے اپنے نتائج تحقیق مختصراً ایک مقالہ میں پیش کئے ہیں۔ یہ مقالہ اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی میں پڑھا گیا تھا اور اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ قابلِ قدر کتاب ہے۔ قیمت درج نہیں۔ غالباً ۶ میں مکتبہ جامعہ دہلی سے منگائی جاسکتی ہے۔ "ش"

ذکرِ غالب۔ مالک رام صاحب ایم۔ اے کی تصنیف ہے جس میں میرزا غالب کے متعلق اب تک جو کچھ معلوم ہوا ہے سب کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اس کتاب کے متعلق دیباچہ میں فرماتے ہیں:۔ "اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں واقعات بحساب سنین ترتیب دئے گئے ہیں۔ . . . اسکے علاوہ مالک رام صاحب نے بڑی محنت اور کاوش سے بہت سی نئی معلومات بھی حاصل کی ہیں، مثلاً غالب کے بزرگوں کے متعلق بعض تفصیلات، اُن کی ہمشیرہ کا حال، عارف اور ان کے دونوں بیٹوں کے حالات، غدر کے سلسلے میں سکّے کا اصلی واقعہ، میرزا صاحب کو ملک الشعراء بنانے کی تجویز، وغیرہ وغیرہ"

میرزا صاحب کی ایک نئی تصویر اور اُن کے آگرہ والے مکان کا فوٹو بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ غالب کے متعلق اتنی وافر معلومات کسی ایک کتاب میں دستیاب نہیں ہوسکتی۔ قیمت صرف ۸ر اور مکتبہ جامعہ دہلی سے ملتی ہے۔ "ش"

چنبیلی۔ محمد حسین صاحب حسّان ایڈیٹر "پیامِ تعلیم" نے چھوٹے بچوں کے لئے یہ چھوٹی سی کتاب لکھی ہے جس میں ایک بلی اور ایک لڑکی کی دلچسپ کہانی سُنائی ہے۔ زبان آسان اور دلکش ہے۔ چند تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ قیمت ۲ر مکتبہ پنجاب لاہور سے منگائیے۔ "ش"

عقاب۔ رقیہ ریحانہ صاحبہ کی چند کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کہانیاں بھی بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں لیکن ذرا بڑی عمر کے بچوں کے لئے۔ اس میں چار کہانیاں ہیں:۔ (۱) عقاب۔ (۲) ابو خاں کی بکری۔ (۳) سعیدہ کی اماں۔ (۴) جولاہا اور بنیا۔ کہانیاں سب دلچسپ ہیں اور بچوں کے لئے بہت مفید ہیں۔ قیمت ۴ر مکتبہ جامعہ۔ دہلی سے منگائیے۔ "ش"

سبدِ چیں۔ میرزا غالب اپنے اُردو کلام کو اپنے رنگ کی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ اُنہیں اپنے فارسی کلام پر ناز تھا۔ چنانچہ فرمایا ہے: ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

کلیاتِ فارسی کی اشاعت کے بعد میرزا غالب کا جو کلام شریکِ اشاعت

نہ ہو سکا یا بعد میں جمع ہوا اُسے "سبد چیں" کے نام سے علیحدہ شائع کر دیا تھا۔ یہ چھوٹا سا مجموعہ ایک دفعہ چھپ کر نایاب ہو گیا تھا۔ اب مکتبہ جامعہ کے اہتمام سے شائع ہوا ہے اور اس میں وہ کلام بھی شریک کر لیا گیا ہے جو اُن کے کلیات میں شامل نہیں ہے۔ "سبد چیں" میں قصائد، ترکیب بند، ترجیع بند، مثنوی، قطعات، نظم، غزلیات، متفرق اشعار اور رُباعیات سبھی کچھ ہے۔ شروع میں میرزا غالب کی ایک نایاب قلمی تصویر کا عکس بھی دیا گیا ہے۔ کتابت، طباعت وغیرہ نہایت عُمدہ۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔ "ش"

قطراتِ شبنم:۔ مسٹر گوردھن داس۔ بی۔ اے کی تصنیف ہے۔ جس میں چھوٹے چھوٹے شاعرانہ نثر پارے ہیں۔ عنوانات کی تعداد ستتر ہے۔ تخیلات میں فراوانی اور طرزِ تحریر میں روانی ہے۔ عبارت آرائی پر زیادہ زور نہیں دیا گیا ہے۔ سیدھے سادے الفاظ میں اپنے لطیف احساسات کو قلمبند کر دیا ہے۔ اس مجموعے کی خوبی یہ ہے کہ اسکے پڑھنے میں جی لگتا ہے۔

اس مجموعے میں دوؔ مقدمے، تینؔ دیباچے، ایک قطراتِ شبنم (دیباچہ منجانب مصنف) اور ایک اظہارِ تشکر بھی ابتدا میں شامل ہے۔ کتاب مجلّد ہے اور ایک روپے میں تیج رام اینڈ سنز لاہور سے منگائی جا سکتی ہے۔ "ش"

اقبال کی شاعری:۔ جناب عبدالمالک صاحب آروی نے "یومِ اقبال" کی تقریب میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو شاہ آباد اُردو لائبریری کے جلسے میں ایک طویل علمی مقالہ پڑھا تھا جسے اب کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ یہ مقالہ ایک سخن فہم کا لکھا ہوا ہے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت کاوش و محنت سے مرتب کیا ہے۔ مصنف نے اُردو شاعری کی مختصر تاریخ سے ابتدا کی ہے اور اس کے بعد مختلف عنوانات قائم کیے ہیں جن کے تحت اقبال کی شاعری کے مختلف رُخ پیش کیے ہیں عنوانات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اقبال اور اُس کی شاعری۔ (۲) اقبال کی شاعری پر فارسی شُعرا کا اثر۔ (۳) اقبال کی صوفیانہ شاعری۔ (۴) اقبال اور اسلامیات۔ (۵) اقبال کے بین الاقوامی تاثرات۔ (۶) اقبال کی فلسفیانہ شاعری۔ (۷) اقبال و سیاسیات، تضاد فکر و عمل۔ (۸) اقبال کا ادبی انداز۔ ان سب عنوانات پر بہت قابلیت سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ جس شان کا یہ مقالہ ہے اُس شان کی کتابت و طباعت اُسے میسّر نہ آئی۔ کاغذ میلا اور بہت گھٹیا لگایا گیا ہے۔ ان کوتاہیوں نے اِس مقالے کو کافی حد تک ناقابلِ مطالعہ بنا دیا۔ عروسِ جمیل کیلئے لباسِ حریر اگر میسّر نہ آئے تو گاندھی جی کا ہندی ہندستانی گاڑھا بھی نہ ہو کہ اُسکا اگلا روپ بھی کھو دے۔ یہ کتاب ۸ر میں طاقِ بُستاں آرہ سے منگائی جا سکتی ہے۔ "ش"

جوئبار:۔ مسٹر بیم سین ظفر اُردو کے نوجوان شاعر ہیں۔ انکی نظمیں اکثر ممتاز رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حال ہی میں اُنکا مجموعۂ کلام "جوئبار" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں (۳۴) نظمیں، (۷) ہندی پارے اور (۲۷) غزلیں شامل ہیں۔ جدید شاعری کے رُجحانات سے ہر صاحبِ ذوق واقف ہے۔ مختصر یہ کہ آجکل کی شاعری زندگی کی عکاسی کی طرف مائل ہے۔ فطرت سے زیادہ سماج اور انسان کی سچی تصویریں جدید منظومات میں دکھائی دیتی ہیں۔ "جوئبار" میں بھی اِنہی خصوصیات کا ہلکا ہلکا عکس نظر آتا ہے۔ ظفر صاحب کی شاعری آجکل کے فیشن کے مطابق یکسر مزدوروں اور کسانوں اور سماج کے شکاروں کے لئے وقف نہیں ہے۔ وہ خیالات اور جذبات کے شاعر ہیں، محسوسات کے شاعر ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں لکچر نہیں دیتے۔ اور نہ اپنے پڑھنے والوں کو ڈانٹتے ہیں۔ وہ دھیمے سروں میں اپنا نغمہ الاپتے ہیں اُن کے میٹھے بول سُننے والے کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ ہندی پارے یا گیتوں میں بڑے سچے اور سادے جذبات پیش کئے ہیں، اور اس انداز میں پیش کئے ہیں کہ جذبہ یا کیفیت کی تصویر کھنچ گئی ہے۔ جناب ن۔م راشد نے اپنے قابلانہ مقدمہ میں شاعر اور اسکی شاعری پر نہایت جامع تبصرہ کیا ہے۔ جناب احسان بن دانش کا تعارف نامہ اس مجموعے میں غیر ضروری سا نظر آتا ہے۔ اُمید ہے کہ اِس "جوئبار نغمہ" کو مقبولیت خاص و عام حاصل ہوگی۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ بانگِ درا سائز۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ قصرِ اُردو۔ ملتان چھاؤنی۔ "شمس"

بنی اسرائیل کا چاند:۔ رائڈر ہیگرڈ پُرانی سے پُرانی تہذیب کو اپنے ناولوں میں اس طرح سے زندہ کرتا ہے کہ ہم حال کی آنکھوں سے ماضی کی تصویر دیکھنے لگتے ہیں مصرِ قدیم کے متعلق اُس نے کئی ناول لکھے ہیں۔ انہی میں سے ایک کا ترجمہ عبدالمجید صاحب حیرت شملوی نے "بنی اسرائیل کا چاند" کے نام سے کیا ہے۔ ترجمہ صاف شُستہ اور اچھی زبان میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ نگار سر محمد یعقوب ترجمہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ "ترجمے میں صحتِ الفاظ کے ساتھ محاورے کی خُوبی پورے طور سے پائی جاتی ہے" کہانی کی دلچسپی سے ترجمہ کی دلکشی ہم آہنگ ہے، اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ کتاب مجلّد ہے۔ خاکپوش بھی خوشنما ہے ضخامت (۴۵۰)

صفحات۔ قیمت ۱۲؍۔ مکتبۂ پنجاب لاہور سے مل سکتی ہے۔ "ش"

ہمدردِ صحت — دق و سل

دہلی کے مشہور طبی رسالے "ہمدردِ صحت" نے اب تک ہر سال ایک نہایت قیمتی خاص نمبر شائع کیا ہے۔ ہمدردِ صحت نے "اعادۂ شباب" "الاطفال" اور "عورت" جیسے خاص نمبر شائع کرکے طب کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کی مثال آج تک صحافتِ ہند میں نہیں ملتی۔ اس سال ایک نہایت اہم موضوع کیلئے ہمدردِ صحت نے اپنی اشاعتِ خاص وقف کی ہے۔ یہ موضوع ہے "دق و سل"۔ ان موذی امراض کی تباہ کاری سے کون واقف نہیں۔ ہندوستان پر تو بلائے بے درماں کی طرح یہ مرض چھائے ہوئے ہیں اور لاکھوں سے بھینٹ لے رہے ہیں۔ آج کل فلاکت و ہلاکت، دونوں کی گرم بازاری ہے۔ ہمدردِ صحت کا ایسے نازک موقع پر ایک نادر نمبر شائع کرنا لائقِ صد ستائش ہے۔ دق و سل کے متعلق مکمل معلومات اور جدید ترین معالجات اگر کہیں یکجا مل سکتے ہیں تو صرف اس اشاعتِ خاص میں۔ ہندوستان کے مشہور حکیموں اور ڈاکٹروں نے اپنے اپنے تجربات کی بنا پر بیش قیمت مضامین لکھے ہیں۔ ان موذی امراض سے بچنے کی تدابیر اور جو ان میں مبتلا ہیں ان کی جان بچانے کے لئے معالجات، سینکڑوں طبیبوں کے مجربات، ڈاکٹری، یونانی اور ایورویدک طریقہائے علاج اور نایاب نسخے اس دق و سل کی انسائیکلوپیڈیا میں وضاحت سے درج کئے گئے ہیں۔ ایسے بیماروں کی تیمارداری کس طرح کرنی چاہیئے اور اس میں کیا کیا احتیاطیں برتنی چاہئیں، ان کے متعلق قیمتی ہدایات درج ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا کے مشہور ڈاکٹروں کے مضامین بھی حاصل کرکے شریکِ اشاعت کئے گئے ہیں۔ عکسی تصاویر اور نقشے کثرت سے دئے گئے ہیں۔ دق و سل کی اشاعتِ خاص صرف طبیبوں ہی کیلئے مفید نہیں ہے بلکہ معمولی قابلیت کے عوام بھی اس سے پوری طرح مستفیض ہوسکتے ہیں کیونکہ جتنے مضامین لکھے گئے ہیں عام فہم اور سلیس زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ایسے قابلِ قدر اور کامیاب خاص نمبر کی اشاعت پر ہم ادارۂ ہمدردِ صحت کو مبارکباد دیتے ہیں۔ ہمیں امید ہے وہ عنداللہ ماجور اور عندالناس مشکور ہونگے۔ لکھائی چھپائی اعلیٰ درجے کی ضخامت (۲۶۰) صفحے معمولی ایڈیشن کی قیمت صرف ۸؍ اور اعلیٰ ایڈیشن کی قیمت ۱۲؍ ہے جو بالکل بے حقیقت ہے۔ جو حضرات اس اشاعتِ خاص کو مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ایک روپیہ بھیجکر ہمدردِ صحت کے مستقل خریدار بن جائیں تاکہ سال بھر تک انہیں ماہوار پرچے ملتے رہیں اور یہ خاص نمبر بھی مفت مل جائے۔ "ش"

سبدِ گل۔ اردو کی ہمہ گیری دیکھئے کہ افریقہ جیسی بنجر سرزمین میں بھی پھل پھول رہی ہے۔ نیروبی۔ مشرقی افریقہ میں چند ہندوستانی حضرات نے ایک بزمِ ادبِ اردو قائم کی ہے جس میں ہندو مسلمان سکھ وغیرہ سب ہی شریک ہیں اور اس تپتے ہوئے ریگستان میں اپنی محبوب زبان کی آبیاری کررہے ہیں۔ اس انجمن کے جلسے ہوتے ہیں جن میں علمی مقالے پڑھے جاتے ہیں۔ مشاعرے ہوتے ہیں اور علم و ادب کے چرچے رہتے ہیں۔ اردو ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ کی نشانی ہے اور ان دونوں کے اتحاد کا سب سے بڑا ذریعہ اردو ہی ہے، جسے ہندوستانی مشکل اور ناممکن بنانے کی کوشش کررہے ہیں اسے افریقہ والوں نے سہل و ممکن بنادیا۔ اس بزمِ ادب کے جلسوں میں جو کچھ پڑھا گیا ہے اس کا ایک مجموعہ پہلے شائع ہوچکا ہے اور دوسرا مجموعہ اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ جسے محمد شریف اور سجاد حسین صاحبان نے مرتب و شائع کیا ہے۔ ناظمِ عمومی نے اس مجموعے کا دیباچہ اور حاجی اسلم چشتی نے جو اس انجمن کے صدر ہیں، مقدمہ لکھا ہے۔ اس کے بعد مسٹر جائن سنگھ شفق بی اے نے علامہ اقبال مرحوم پر ایک قابلِ ستائش مضمون لکھا ہے۔ دوسرا مضمون مرزا غالب کے متعلق ہے جس میں اکثر حضرات نے غالب کے لطائف و ظرائف پر گفتگو کی ہے۔ اور چند حضرات نے اس جلسے میں غالب پر نظمیں بھی پڑھی ہیں۔ یہ مضمون بحیثیت مجموعی اچھا ہے۔ "تہذیبِ نو پر تبصرہ" دلچسپ اور عالمانہ مضمون ہے۔ اسکے بعد بزمِ ادب کے تین مشاعروں کا سرمایہ پیش کیا گیا ہے جسے ہم بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس مجموعہ مضامینِ نظم و نثر کی قیمت ڈیڑھ شلنگ ہے۔ بہی خواہانِ اردو کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس لالۂ صحرائی سے اپنے کتب خانہ کی زینت بڑھائیں۔ اور اس کی ایک کاپی خرید کر بزمِ ادب کے اراکین کی حوصلہ افزائی فرمائیں۔

ملنے کا پتہ:۔

محمد شریف قریشی۔ ناظمِ عمومی۔ بزمِ ادب۔ معرفت پوسٹ بکس ۱۰۱۲
نیروبی۔ (مشرقی افریقہ)

"ش"

چندہ سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے مع محصول ڈاک
قیمت فی پرچہ ۶/

جُرعات

ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ
نمونے کا پرچہ مفت طلب کیجیے۔

جلد ۱۸ — ساقی دہلی بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۸ء — نمبر ۴

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
(۱)	نگاہِ اوّلیں	"شاہد"	(۲)
(۲)	ہندوستانی ناٹک اور آغا حشر	پروفیسر مرزا محمد سعید۔ ایم۔ اے؛ آئی۔ ای۔ ایس۔ (ریٹائرڈ)	(۳)
(۳)	تجلّیات	جناب تابش دہلوی	(۶)
(۴)	نکات	جناب امین حزیں (سیالکوٹی)	(۷)
(۵)	قسم	جناب بہزاد لکھنوی	(۸)
(۶)	دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی	ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ ایم۔ اے؛ پی۔ ایچ۔ ڈی؛ (لندن)	(۹)
(۷)	اُردو شاعری کے استعارے اور تشبیہات	جناب آغا محمد اشرف ایم۔ اے	(۲۱)
(۸)	اجمیری مل	مصوّرِ ظرافت مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ بی۔ اے؛ ایل ایل۔ بی؛	(۲۵)
(۹)	بے پرکی	"آوارہ"	(۳۳)
(۱۰)	کیا ہوا	جناب گنگا دھر ناتھ فرحت کانپوری۔ بی۔ اے؛ ایل ایل۔ بی؛	(۴۸)
(۱۱)	خواب کا معمار	جناب عبدالقیوم باقی۔ ایم۔ اے؛ (عثمانیہ)	(۴۹)
(۱۲)	خدمتگار	محترمہ عصمت چغتائی۔ بی۔ اے؛	(۶۰)
(۱۳)	مقصدِ حیات	جناب علی منظور حیدر آبادی	(۷۲)
(۱۴)	ایک انوکھی انجمن	"جہاں نورد"	(۷۳)
(۱۵)	انتقام	جناب ایس احمد۔ بی۔ اے؛ بی۔ ٹی۔	(۷۷)
(۱۶)	اے حسنِ سراپا	جناب شاد عارفی	(۸۴)
(۱۷)	شکریۂ کشمیر	جناب الطاف مشہدی	(۸۴)
(۱۸)	ناظمِ نشرگاہِ صوت دہلی کی تقریر الخ	شاہد احمد	(۸۵)
(۱۹)	افسانۂ محبت و عورت	جناب عطاء اللہ پالوی	(۸۹)
(۲۰)	حیاتِ دوام	از شدرشن۔ مترجمہ جناب رفیع الزماں خاں؛	(۹۳)
(۲۱)	اشتہارات	مشتہرین	(۹۶)

قیمت فی پرچہ چھ آنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

اکثر حضرات دریافت فرماتے ہیں کہ ساقی میں کس قسم کے مضامین شائع ہوتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ساقی کا کوئی پرچہ مُلاحظہ فرمالیں۔ اس سے کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہوجائیگا۔ مضمون نگاروں کی تعداد ماشاء اللہ بڑھتی جاتی ہے اور ہمیں اپنی بے بسی کا احساس اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی اچھا مضمون جگہ نہ ہونے کی وجہ سے واپس کرنا پڑتا ہے۔ ساقی کا معمولی پرچہ (۹۶) صفحات کا ہوتا ہے۔ اور اس میں بھی تقریبًا نصف صفحات باریک لکھوانے پڑتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ اچھے مضامین شامل ہوجائیں۔ اس پر بھی اکثر حضرات کو شکوہ ہے کہ اُن کے مضامین ساقی میں شائع تو کئے گئے مگر باریک لکھوائے گئے۔ افسوس ہے کہ محدود صفحات میں غیر محدود مضامین سمانے کا کوئی طریقہ ابھی تک دریافت نہیں کیا گیا۔ اُمید کہ آپ ہمیں مجبور سمجھکر معاف فرمائیں گے اور اس کا فیصلہ ہم پر چھوڑ دیں گے کہ آپ کا مضمون کس طرح شائع کیا جائے۔ بعض حضرات اپنے احباب کے اصرار پر ساقی کیلئے کوئی غزل یا ادبِ لطیف کا کوئی شذرہ بھیجتے ہیں۔ انکی خدمت میں عرض ہے کہ وہ کسی کے اصرار پر ساقی کو مرہونِ منت نہ فرمائیں۔ ساقی ویسے ہی بہت زیر بار احسان ہے۔ آپ اپنی طبیعت سے اگر کچھ بھیجنا چاہیں تو بھیجدیں۔ اگر ہم مناسب سمجھیں گے اور گنجائش دیکھیں گے تو شکریہ کے ساتھ شائع کر دینگے۔

سالنامہ ساقی کے لئے ادبیاتِ عالم کے دو زبردست شاہکار موصول ہوئے ہیں۔ ایک شہرۂ آفاق ڈرامہ نگار شیکسپیر کا ڈرامہ "کنگ لیئر" ہے جسے مولانا عنایت اللہ دہلوی نے اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور دوسرا کرسٹوفر مارلو کا فاؤسٹ ہے جسے محترمہ فرخندہ اختر بیگم صاحبہ نے اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ پنجاب کے مشہور انشا پرداز حضرت ایم۔ اسلم کا ایک طویل و دلکش افسانہ، چغتائی صاحب کا مزاحیہ افسانہ، اور محترمہ عصمت چغتائی کا طنزیہ ڈرامہ سالنامہ کے لئے موصول ہوچکا ہے۔ مضامین اور مضمون نگاروں کی مفصل فہرست آئندہ اشاعت میں پیش ہوگی۔

نغمۂ نور۔ اُردو کے ہر دلعزیز شاعر حضرت بہزاد لکھنوی کا دیوان ساقی بک ڈپو کے اہتمام سے تیار ہو رہا ہے۔ اس دیوان کا نام "نغمۂ نور" تجویز کیا گیا ہے اور اُمید ہے کہ نومبر کے پہلے ہفتے تک "نغمۂ نور" آپ تک پہونچ سکے گا۔ کوشش کی جارہی ہے کہ دیوان نہایت خوشنما شائع ہو اور اُس کی قیمت بھی کم سے کم رکھی جائے تاکہ شائقین آسانی سے حاصل کرسکیں۔

دلی ریڈیو اسٹیشن کے بارے میں ایک مضمون اس اشاعت میں شامل ہے۔ ریڈیو کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ گھر گھر اس کا چرچا ہوتا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ریڈیو اسٹاف کی بدعنوانیوں پر نکتہ چینی کی جائے تاکہ ان کا انسداد ہوجائے۔ آئندہ مضمون میں ہم نئی بدعنوانیوں کے اسباب پیش کریں گے اور بتائیں گے کہ پبلک کا لاکھوں روپیہ کس طرح برباد کیا جارہا ہے۔

شاہد

ہندوستانی ناٹک
اور
آغا حشر مرحوم

ہمارے ملک میں ناٹک بہت پرانا فن ہے اور آج سے تقریباً دو ہزار سال پہلے اس فن نے اس قدر فروغ حاصل کیا تھا کہ سوائے یونان کے اُس قدیم زمانہ میں اس کی نظیر کسی اور ملک میں نہیں ملتی تھی آج کل کے ہندوستانی ناٹک کو اُس قدیم سنسکرت ناٹک سے بہت کم واسطہ ہے۔ اس کو شروع ہوئے سو سال سے زیادہ نہیں ہوئے اور سنیما کی روز افزوں مقبولیت کی وجہ سے اُس کی آئندہ ترقی کی اُمید بہت موہوم معلوم ہوتی ہے۔ عام خیال ہے کہ ہندوستانی ناٹک کے اس نئے دور کا آغاز امانت لکھنوی کی اندر سبھا سے ہوا۔ شاہانِ اودھ کے دربار میں یوروپین اثر بہت غالب تھا۔ انکی عمارت وغیرہ میں بھی یوروپین صناعی کا رنگ بہت نمایاں ہے قیاس کیا جاتا ہے کہ کسی یوروپین نے اُن کو مغربی ڈراما کا شوق دلایا اور اُس شوق کو پورا کرنے کے لئے اندر سبھا قائم ہوئی جس میں رنگیلے پیا جانِ عالم خود راجہ اندر بنتے تھے اور دربار کے اربابِ نشاط دیو اور پریوں کا سوانگ بھرتے تھے، یہ قیاس کہ جدید ہندوستانی ناٹک دیسی ادبیات کے طبعی ارتقا کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ایک فرمانروا کے حکم سے اور اُس کے سامانِ عیش وطرب میں اضافہ کرنے کیلئے وجود میں آیا تھا اس واقعہ کی وجہ سے بہت قوی ہو جاتا ہے کہ اندر سبھا کے بعد کچھ عرصہ تک کسی اور ناٹک کا پتہ نہیں چلتا۔ بعد ازاں بمبئی کے پارسیوں کو کسی خیراتی کام کے لئے روپے کی ضرورت پیش آئی اور چونکہ اُنہوں نے مغربی اثرات کو اور ہندوستانیوں کے مقابلہ میں زیادہ جلدی قبول کیا تھا اس روپے کی فراہمی کی یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ تعلیم یافتہ اور اچھے گھرانوں کے پارسی نوجوانوں نے ایک ناٹک قائم کیا جس نے رفتہ رفتہ ایک باقاعدہ تھیٹریکل کمپنی کی صورت اختیار کر لی۔ اس تھیٹریکل کمپنی نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کے علاوہ انگلستان کا بھی دورہ کیا جو مالی پہلو سے اس کے لئے تباہ کن ثابت ہوا۔ لیکن اب ناٹک کا مذاق عام طور پر ہندوستان میں پیدا ہو گیا تھا اور ایک تھیٹریکل کمپنی کی جگہ کئی اور کمپنیاں پیدا ہو گئیں جو ملک کے مختلف حصّوں میں دورہ کرتی پھرتی تھیں۔ اگرچہ پارسیوں کی عام زبان گجراتی تھی لیکن ناٹک کے معاملے میں اُنہوں نے اُردو کو ترجیح دی اُنہوں نے اپنی مسلمہ تجارتی ذہانت سے اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ اُردو ہی ایک زبان ہے جس کو ہندوستان کے ہر گوشے کے لوگ کم وبیش سمجھ سکتے ہیں لیکن چونکہ اُردو ادبیات سے چنداں واقفیت نہ تھی اس لئے شروع میں جو ناٹک لکھے گئے اُن کی زبان عموماً غیر فصیح اور ناقص تھی۔ یہ ناٹک زیادہ تر اندر سبھا کے نمونے پر تھے۔ یعنی ان میں نثر سے زیادہ نظم کا حصہ تھا، اور گفتگو سے زیادہ گانے کی کثرت تھی ان کا مضمون بھی اندر سبھا کی مانند واقعیت سے دور اور عجیب وغریب باتوں سے بھرپور تھا۔ اُن کے پلاٹ عموماً الف لیلہ یا اور مشرقی داستانوں سے اخذ کئے گئے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ناٹک کے بانیوں کے پیشِ نظر نمونے کے طور پر ڈراما کی وہ صنف تھی جو یورپ میں زیادہ تر بچوں کی تفریح کے لئے مخصوص رہی ہے اور جسکو (Pantomime) کہتے ہیں۔ شاید اُس زمانے کے ناٹک کے تماشائی ذہنیت اور تخیّل کے اعتبار سے یورپ کے بچوں سے بہت بالاتر نہ تھے۔ اس ناٹک کا ایک

اور وصف جو عین مشرقی طبائع کے موافق تھا اس کا مذہبی اور اخلاقی میلان تھا مشرقی افسانوں کا مقصد عموماً تفریح کے ساتھ مذہب اور اخلاق کی تعلیم بھی ہوتا ہے اور یہ مقصد ابتدا سے ہمارے ناٹکوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ بلکہ جب اس جدید ناٹک نے ذرا اور ترقی کی تو یہ اخلاقی رنگ زیادہ گہرا ہو گیا۔ ہریش چندر، گوپی چند، وغیرہ ناٹک جو وسطی دور میں لکھے گئے دھرم کے پرچار کے لئے بالکل وقف معلوم ہوتے ہیں یہ مذاق معلوم ہوتا ہے کہ اب تک قائم ہے، صرف فرق اتنا ہے کہ پرانی قسم کی اخلاقی اور مذہبی تعلیم کی جگہ اب سماج سدھار اور حب وطن کے جذبات نے لے لی۔

آغا حشر نے جب ناٹک کے میدان میں قدم رکھا اس وقت اندر سبھا، ہوائی مجلس، علاء الدین کا عجیب و غریب چراغ، علی بابا اور چالیس چور وغیرہ کی قسم کے تماشوں سے لوگ اکتا گئے تھے اور مغربی تعلیم کے اثر سے مشرقی غلط گوئی کا ذوق کسی قدر کم ہو گیا تھا۔ جس طرح شاعری اور افسانہ نگاری میں مغربی اثرات نے ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا اسی طرح ناٹک کے دلدادہ اس فن میں بھی کسی نئے نمونہ کے منتظر تھے اور جس طرح نئی افسانہ نویسی کا آغاز انگریزی ناولوں کے ترجمے یا تقلید سے ہوا اسی طرح نئے ناٹک کی ابتدا بھی انگریزی ڈراما کی نقل سے ہوئی۔ انگلستان کے ڈرامہ نویسوں میں شیکسپیر کا جو مرتبہ ہے اس کو سب جانتے ہیں۔ اس لئے ہمارے ناٹک بنانے والوں کی توجہ سب سے پہلے اسی کی جانب ہوئی اور اس کے بعض مشہور ڈرامے مثلاً ہیملٹ اور رومیو اینڈ جولٹ وغیرہ ایشیائی لباس سے مزین ہو کر ہمارے اسٹیج پر جلوہ گر ہوئے۔ شیکسپیر کے علاوہ بعض اور مغربی ڈرامہ نگاروں کا بھی ہمارے ناٹک پر احسان ہے۔ مثلاً جس ناٹک سے آغا حشر کی شہرت کا آغاز ہوا وہ شیریڈن کے ڈرامے (Pizarro) کا ترجمہ اسیر حرص تھا جس کی پہلی نمائش غالباً ۱۹۰۱ء میں ہوئی تھی مجھکو وہ زمانہ بخوبی یاد ہے۔ لارڈ کرزن نے شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی کے اعلان کے لئے دہلی میں دربار منعقد کیا تھا اور ہندوستان کی ہر ایک سمت سے لاکھوں آدمی اس تقریب سے جمع ہو گئے تھے۔ جیسا کہ ایسے موقعوں پر عموماً ہوتا ہے مختلف قسم کے کھیل تماشے بھی موجود تھے لیکن سب سے زیادہ دھوم الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کی تھی جس کو مسٹر کاؤس جی کھٹاؤ نے کچھ دنوں پہلے قائم کیا تھا۔ کھٹاؤ خود بہت اچھا ایکٹر تھا۔ خصوصاً ٹریجک پارٹ (یعنی غم و الم کے جذبات کو ادا کرنے میں) اس کی خاص شہرت تھی۔ اس کے ساتھ چند اور بھی اچھے اچھے ایکٹر (یعنی اداکار) شریک تھے ہر شب کو پنڈال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہوتا تھا۔ آگے کے درجوں کی نشستیں کئی دن پہلے سے رک جاتی تھیں اور ایک ہی تماشہ تھا جو کئی ہفتوں تک برابر ہوتا رہا یعنی آغا حشر کا اسیر حرص جس کو لوگ بار بار دیکھنے آتے تھے اور جس کی ہر دلعزیزی اب تک قائم ہے۔ اگر ہم شیریڈن کے ڈرامہ کا "اسیر حرص" سے مقابلہ کریں تو ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے ناٹک نویس مغربی ڈرامے کو مشرقی قالب میں ڈھالنے کیلئے کیا ترکیبیں کرتے تھے۔ اس خاص معاملے میں آغا حشر کو موجد قرار دینا انصاف کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ ان سے پہلے سید مہدی حسن احسن لکھنوی بھی وہی ترکیبیں اپنے شیکسپیر سے ماخوذ ناٹکوں میں استعمال کر چکے تھے۔ صرف سوال یہ ہے کہ کون زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ ان کو نباہتا ہے۔ میں اس سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا کیونکہ مجھ کو فی الحال حشر سے سروکار ہے۔ شریڈن کا "پیزارو" تاریخی ڈرامہ ہے، جس کی بنیاد امریکہ میں ہسپانوی فتوحات کے بعض واقعات ہیں۔ حشر کے "اسیر حرص" میں اس تاریخی اور جغرافیائی عنصر کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے ناٹک کے واقعات اور اشخاص کسی خاص زمانہ اور وقت سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس خیالی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں جو شاعروں اور نو عمر بچوں کی مشترکہ ملک خیال کی جا سکتی ہے۔ شیریڈن کا ڈرامہ اول سے آخر تک ایک حزنیہ داستان (ٹریجیڈی) ہے جس میں مزاح و ظرافت کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔

حالانکہ مزاح و ظرافت میں شیریڈن کو بہت دستگاہ حاصل تھا۔ حشر کے ناٹک میں نہ صرف مزاح و ظرافت کا ایک بہت بڑا حصہ ہے بلکہ اس کے انجام میں بھی اس طرح تصرف کر دیا گیا ہے کہ بجائے افسردگی اور غم کے ساتھ ختم ہونے کے ہنسی خوشی ختم ہوتا ہے۔ حشر کے ناٹک کی جان حماقت بیگ اور اُن کی بوالہوسی کی داستان ہے۔ جس کو حشر نے یقیناً شیکسپیئر کے (Merry Wives of Windsor) سے بہت حد تک اخذ کیا ہے۔ لیکن اُنھوں نے جس کو کچھ شیکسپیئر سے لیا ہے اس کو اس طرح تبدیل کیا ہے کہ مشکل سے پہچانا جاتا ہے۔ ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حشر کو کم از کم "اسیر حرص" کی تالیف کے زمانے میں انگریزی ادب اور شاعری سے بہت کم واقفیت تھی۔ اُن کے متعلق اُس وقت عام طور پر یہ مشہور تھا کہ وہ خود شیکسپیئر یا شیریڈن کے ڈراموں کو پڑھنے یا سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ کسی اپنے دوست سے ترجمہ کروا لیتے ہیں اور پھر اس کو اپنی زبان میں لکھ ڈالتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس سے حشر کے کمال فن پر کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ شیکسپیئر کو بھی لاطینی اور یونانی زبان و ادب سے بہت کم آگاہی تھی، تاہم اُس نے یونان اور روما کی تاریخ و معاشرت سے متعلق ڈرامے لکھے ہیں جن کا سامان اُس نے غالباً اسی طرح کے ناقص تراجم سے فراہم کیا تھا۔ بہرحال "اسیر حرص" نے آغا حشر کو اپنے سب ہم عصر اور پیشرو ناٹک نویسوں سے آگے بڑھا دیا۔ "مرید شک"، "صید ہوس" اور "مار آستین" وغیرہ نے جو مختلف شیکسپیئر کے ڈراموں پر مبنی ہیں ان کے اقتدار شہرت کو بالکل مستحکم کر دیا۔ اگر ان ناٹکوں کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حشر نے اس زمانے کے مروجہ ناٹک کو کئی پہلو سے بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ تعلیم یافتہ اور صاحب ذوق تماشائی اس ناٹک میں کئی نقائص محسوس کرتے تھے۔ اندر سبھا کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک ہندوستانی ڈراما ..... اوپرا (Opera) یا میوزیکل کامیڈی سے مشابہ تھا یعنی سوائے ہلکی مذاق کے جو عموماً نثر میں ہوتا تھا، ناٹک کی سب کارروائی گانے کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اگر ہیرو کو ہیروئن سے اپنی اُلفت کا اظہار مقصود ہوتا تھا تو کوئی غزل چھیڑ دیتا تھا اور ہیروئن اس کا جواب ٹھمری میں دیتی تھی۔ اگر کسی جنرل کو اپنی مردانگی اور شجاعت کی دھاک بٹھانی منظور ہوتی تھی تو گانا شروع کر دیتا اور اُس کی فوج اُس کے ساتھ سُر ملاتی تھی۔ اگر کوئی ماں اپنے جوانمرگ بیٹے کا ماتم کرتی تو تان سُر کے ساتھ اور انتہا یہ ہے کہ اگر اسٹیج پر کسی کی موت کا منظر دکھایا جاتا تھا تو مرنے والا دم توڑتے ہوئے بھی لے کو نہیں چھوڑتا تھا۔ اگرچہ اکثر تماشائی گانے کی اس فراوانی کو پسند کرتے تھے اور تھیٹریکل کمپنی کی کامیابی اچھے ایکٹروں سے زیادہ اچھے گانے والوں پر منحصر ہوتی تھی۔ لیکن جو لوگ عامیانہ مذاق سے بالاتر ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے اُسے ناپسند کرتے تھے۔ علاوہ بریں ان ناٹکوں میں جو نثر ہوتی تھی وہ بھی حد درجہ کی تصنع آمیز اور مقفیٰ۔ قافیہ کی رعایت شاید ایکٹروں کے حافظ کی امداد کے خیال سے اختیار کی گئی ہو۔ یا ممکن ہے کہ اس زمانے کے بعض مقبول عام قصوں مثلاً فسانۂ عجائب وغیرہ کی عبارت آرائی کا عکس ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ قافیہ پیمائی بعض دفعہ بہت ناگوار گذرتی تھی۔ حشر کیلئے تو ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے ناٹک میں سے گانے اور مقفیٰ گفتگو کو بالکل خارج کر دیں تاہم انہوں نے حتی الامکان گانے کے بیجا استعمال کو روکنے کی کوشش کی اور اس کے مقابلہ میں محض الفاظ کو اظہار جذبات کا ذریعہ بنایا۔ نثر کو قافیہ کی قید سے آزاد کیا اور اگر مقفیٰ عبارت لکھی بھی تو سلیقہ کے ساتھ۔ نفسِ مضمون یعنی پلاٹ وغیرہ کے لحاظ سے بھی جیسا کہ میں ابھی ذکر کر چکا ہوں اُن کے ناٹک کے ماخذ زیادہ اعلیٰ تھے۔ یعنی اُنھوں نے شیکسپیئر اور مغربی ڈراما کے خرمن سے خوشہ چینی کی تھی۔ تعلیم یافتہ جماعت نے پرانے ناٹکوں کے مقابلہ میں اس نئے ناٹک کو زیادہ پسند کیا اور رفتہ رفتہ اُنکی ہر دلعزیزی عوام تک بھی سرایت کر گئی۔ لیکن اس ہر دلعزیزی کا سب سے بڑا سبب غالباً ان کی ظرافت تھی جو عموماً ہر عمر اور ہر قماش کے انسانوں کو خوش کر سکتی ہے۔ مزاحیہ مواقع کی ایجاد اور ظریفانہ گفتگو لکھنے میں حشر کو

خاص ملکہ تھا۔ پرانے سنسکرت ناٹک کے بعض نقاد کہتے ہیں کہ ہندوستان کے ناٹک نویس ٹریجیڈی میں اپنے کمال کا اظہار نہیں کرسکے۔ یعنی جب وہ غم والم یا افسردہ جذبات کا اظہار کرتے ہیں تو ان کا پیرایہ بیان مصنوعی اور غیر موثر ہوجاتا ہے۔ یہ کمی حشر میں بھی موجود ہے لیکن ان میں ایک اور چیز کی بھی کمی ہے۔ جو سنسکرت ناٹک میں بدرجہ غایت موجود ہے۔ اور وہ شاعری ہے۔ حشر مرحوم نے کثرت سے اشعار اور نظمیں لکھی ہیں لیکن اُن کی شاعری تکلف آمیز شاعری تھی اور اس میں وہ جذباتی کیفیت موجود نہیں جو بڑے شعرا کا حصہ ہوتا ہے۔ حشر دنیا کے اور کامیاب ناٹک نویسوں کی مانند اپنی پبلک کو خوب پہچانتے تھے اور ذوقِ عامہ کے اتار چڑھاؤ کو خوب جانتے تھے۔ جب ہندوستان میں قومی تحریک شروع ہوئی اور اس کے ضمن میں ہند کی قدیم روایات کے احیا اور ہندوستانی معاشرت کی اصلاح کا ذوق پیدا ہوا تو حشر نے شیکسپیر اور شیریڈن کو خیرباد کہی اور رامائن اور مہابھارت کی ورق گردانی شروع کی۔ اُردوئے معلیٰ کو ترک کرکے اس قسم کی مخلوط زبان اختیار کی جس کو ہندی ہندوستانی کہتے ہیں۔ معاشرت کی خرابیوں کا خاکہ اڑانے اور اصلاحی مقاصد کو فروغ دینے کے لئے دھارمک اور سماجک ناٹک لکھے اور آخیر کار سینما کی روز افزوں ہردلعزیزی کو دیکھتے ہوئے ناٹک کو چھوڑ کر (Talkie) فلم کی جانب توجہ کی۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اُن کے ان آخری ناٹکوں کو اُن کے ابتدائی ناٹکوں پر ترجیح دیتے ہوں لیکن میں اور میرے ساتھ کے اور بہت سے لوگ جو حشر مرحوم کے سب سے پہلے معترضین تھے اُن کو انہیں (romantic) ناٹکوں کی وجہ سے یاد رکھیں گے جن کی بدولت اُن کی شہرت کا آغاز ہوا۔ سینما نے دُنیا کے تقریباً سب ملکوں میں اسٹیج کا کساد بازاری کردیا ہے اور اس ملک میں تو ناٹک کا شوق تقریباً معدوم ہوگیا۔ ان حالات میں اُمید نہیں کہ مدت دراز تک کوئی اُردو زبان میں ناٹک لکھنے والا حشر پیدا ہو، جو عام شہرت اور مقبولیت حاصل کرسکے۔

محمد سعید

تجلیات

زیرِ لب رہا نالہ درد کی دوا ہوکر ⁂ آہ نے سکوں بخشا آہ نارسا ہوکر
کردیا تعین سے ذوقِ عجز کو آزاد ⁂ نقش سجدہ نے میری تیرا نقشِ پا ہوکر
سانس بن گیا گھٹ کر سینہ میں یہ اک نالہ ⁂ ہم نے زندگی پائی درد آشنا ہوکر
فرطِ غم سے بےحس ہوں غم ہے غم نہ ہونیکا ⁂ درد کردیا پیدا درد نے دوا ہوکر
گرمیٔ نوا سے خود پھونکدیں نشیمن ہم ⁂ کیوں رہیں گلستاں میں مورد بلا ہوکر
ہوچکے ہیں شل بازو، ہے نہ ہمت پرواز ⁂ ہم رہا نہ ہوپائے قید سے رہا ہوکر
حسرتیں نکلتی ہیں، میری جان جاتی ہے ⁂ دم لبوں پہ آتا ہے حرفِ مدعا ہوکر
غم پہ غم مجھے دیکر غم سے کردیا محروم ⁂ کیا ملا زمانے کو صبر آزما ہوکر

رنج عیش ہے باقی اب نہ عیشِ غم تابش
کچھ خبر نہیں مجھ کو رہ گیا ہوں کیا ہوکر

تابش دہلوی

(مسلسل ۴)

دورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی

طومارِ اغلاط

(اکیسویں صدی کی ایک ادبی صحبت)

۲۰۳۵ء۔ اُردو اکاڈمی الہ آباد کا سالانہ جلسہ۔ اہلِ علم کا مجمع ہے۔ ہال کچا کھچ بھرا ہے۔ ڈاکٹر شانتی سروپ نگم، رسالہ "اکیسویں صدی" کے فاضل ایڈیٹر، لالہ مکھن لال تحقیق مرحوم کے متعلق ایک تحقیقی مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ تحقیق اپنے زمانہ کے ایک بلند پایہ مصنف اور ایک زبردست شاعر تھے۔ علمی تحقیقات کا آپ کو بے انتہا شوق تھا۔ اسی مناسبت سے تحقیق تخلص اختیار کیا تھا۔ آپ مدت تک بنارس ہندو یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کے پروفیسر رہے۔ ۲۰۲۰ء میں بسن ہفتاد سالگی وفات پائی۔

ڈاکٹر شانتی سروپ نگم اپنا مقالہ پڑھتے پڑھتے ایک منٹ کیلئے ٹھہر جاتے ہیں۔ رومال سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہیں اور تھوڑا سا پانی پی کر پھر اس طرح گویا ہوتے ہیں:۔

"حضرات! ابتک میں نے تصویر کا ایک رُخ آپ کے سامنے پیش کیا ہے یعنی تحقیق مرحوم کے صرف محسنات کلام سے بحث کی ہے۔ اب ذرا تصویر کے دوسرے رُخ پر بھی نظر ڈال لیجئے۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ بھول چوک انسان کی فطرت ہے۔ لیکن یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ مکھن لال تحقیق جیسا فاضل اجل اور اس قسم کی فاحش غلطیاں کرے۔ حضرات! آپ باور کیجئے کہ میرے دل میں مرحوم کی بڑی عزت ہے۔ ان کے اغلاط پیش کرنے سے میرا مقصود ان کی عالمگیر شہرت کو داغ لگانا ہرگز نہیں بلکہ اس ناخوشگوار فرض کو ادا کرنا ہے جو آئینِ انتقاد کی رو سے مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ تحقیق مرحوم کے اکثر تلامذہ اس جلسہ میں موجود ہیں۔ اُن کے جذبات کا احترام بھی لازمی ہے اور اس امر کا لحاظ بھی کہ دیگر حضرات بھی بے لطف نہ ہوں اس لئے میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کرونگا۔

تحقیق کا ایک مشہور شعر ہے اور حق یہ ہے کہ اس لغزش سے قطع نظر جس کی طرف میں اشارہ کرنے والا ہوں یہ شعر نہیں بلکہ کلیجہ میں اتر جانے والا ایک نشترِ الماس ہے۔ سنئے:۔

غنچہ ہائے متبسم دیکھکر بھر آیا دل، آہ اُن کی عادت تھی یوں ہی مسکرانے کی

"متبسم" "متحرک" کا ہموزن ہے لیکن تحقیق نے "مت۔ بس۔ سم" باندھا ہے۔ یعنی "ت" جو متحرک تھی اُسے ساکن کر دیا۔ یہ تصرف سراسر بیجا ہے۔ مستند اساتذہ کے یہاں اسکی مثال نہیں مل سکتی۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:۔

غمزۂ دلستاں ترا، دشنۂ جاں شکر سہی میری بھی آہِ نیم شب نشترِ دلفگار ہے

حقیقت یہ ہے کہ لاجواب شعر کہا ہے مگر "دلفگار" کی ترکیب محلِ نظر ہے۔ تحقیق نے "دل فگار" کے معنی "دل کو زخمی کرنے والا" سمجھے ہیں مگر ایسا سمجھنا فاحش غلطی ہے۔ "دل فگار" کے معنی ہیں "ایسا شخص جس کا دل زخمی ہو"۔ دلفگار اسم فاعل اُس وقت ہو سکتا تھا جبکہ

"دلفگار" صیغہ امر ہوتا کیونکہ اسم فاعل قیاسی، اسم اور امر کی ترکیب سے بنتا ہے جیسے اسی شعر میں "دل ستاں" اور "جان شکر"۔ لیکن "فگاریدن" نہ کوئی مصدر ہے نہ "فگار" اس کا امر۔ پھر "دلفگار" کے معنی "دل کو زخمی کرنے والا" کیونکر ہو سکتے ہیں؟

ایک اور رنگین شعر سنیئے :-

طوفانِ رنگ و بُو ہے وہ غیرتِ بہاراں — گل بھی ہے یاسمن بھی، نسریں بھی نسترن بھی

شعر کیا ہے ایک گلدستہ بلکہ "دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے" لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنابِ تحقیق نے بلا تحقیق نسرین و نسترن کو لفظی اختلاف کی بنا پر دو مختلف پھول سمجھ لیا حالانکہ ان دونوں اسموں کا مسمیٰ ایک ہی ہے۔ عربی میں جسے نسرین کہتے ہیں فارسی میں اسی کا نام نسترن ہے۔

اس قسم کی لغزشوں کے علاوہ تحقیق کے یہاں زبان و قواعد کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً :-

برابر سے بیگانہ وش کیوں نہ گذریں — وہ تحقیق کو جانتے ہی نہیں ہیں

اُردو زبان کا یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ فعل حال کو جب مثبت سے منفی بنایا جاتا ہے تو اس کے آخر سے "ہے"، "ہوں" اور "ہیں" کو گرا دیتے ہیں اور اس کے پہلے علامت نفی لگا دیتے ہیں۔ مثلاً :-

فعل حال مثبت :- وہ مجھے جانتا ہے۔
فعل حال منفی :- وہ مجھے نہیں جانتا۔
فعل حال مثبت :- میں اسے جانتا ہوں۔
فعل حال منفی :- میں اسے نہیں جانتا۔
فعل حال مثبت :- ہم تمہیں جانتے ہیں۔
فعل حال منفی :- ہم تمہیں نہیں جانتے۔

لیکن تحقیق مرحوم نے شعر مذکور کے مصرع ثانی "وہ تحقیق کو جانتے ہی نہیں ہیں" میں زبان کے اس مسلمہ قاعدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ "وہ تحقیق کو جانتے ہی نہیں" کے بعد "ہیں" بالکل زائد اور محض بیکار ہے۔"

نگم صاحب کا مضمون ختم ہوتے ہی تالیوں کے شور سے ہال گونج اٹھا۔ ذرا سے وقفہ کے بعد صدر جلسہ مولوی مفضل حق صاحب دولت آبادی نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ حضرات! نگم صاحب کے مقالہ کے متعلق اگر کوئی صاحب اظہار خیال کرنا چاہیں تو اسٹیج پر تشریف لے آئیں۔ جلسہ کی آخری صف میں سے ایک دبلے پتلے مولانا آگے بڑھے۔ تحقیق کے ارشد تلامذہ میں آپ کا شمار ہے۔ حقایقی آپکا تخلص اور ابوالخیرات عبداللہ ون آپ کا نام ہے۔ اسٹیج پر پہونچکر آپ نے اپنا ڈنڈا میز پر رکھدیا۔ کھنکار کر آواز صاف کی اور بولے :-

"حضرات! میں نہ عالم ہوں نہ فاضل۔ نہ محقق نہ دانشمند۔ اور نہ بقول چچا سعدی کے "چارپائے برو کتابے چند"۔ البتہ استاذ مرحوم کے فیض صحبت سے طبیعت کو شعر و سخن سے ایک لگاؤ ضرور پیدا ہو گیا ہے۔ اسی بنا پر میں نے اس وقت آپ حضرات کے سامنے اظہار خیال کی جرأت کی ہے۔ فاضل مقرر نے حضرت تحقیق کے کلام پر جو اعتراضات کئے ہیں مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ محض ان کی ناواقفیت کا نتیجہ ہیں۔ استاد مرحوم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میاں حقایقی! ہم نے اپنے پندرہ ہزار اشعار کے دیوان

میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا جس کی سند اساتذۂ متقدمین و متاخرین کے یہاں نہ دیکھ لی ہو۔ فاضل مقرر نے "متبسم" پر اعتراض کیا ہے اور اس دعوے کے ساتھ کہ مستند اساتذہ کے یہاں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ میں عرض کرتا ہوں کہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ بیسویں صدی کے مسلم الثبوت اُستاد علامہ اصغر گونڈوی کا یہ شعر سند میں پیش کر دینا کافی ہے۔

عشق متبسم کہ یہ راز جہاں کی کائنات　　　عقل سرگرداں کہ ہر ذرہ جہانِ راز ہے

جن لوگوں نے اصغر کی زندۂ جاوید تصنیف "نشاطِ رُوح" کے مقدمے پڑھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ یگانۂ روزگار بیسویں صدی کا رومی اور سنائی تھا۔ پھر جب اُس نے متبسم کو "مت بس سم" بروزنِ نادانی باندھا ہے تو کس کی مجال ہے کہ اس تلفظ کو غلط قرار دیکر حضرت تحقیق پر ایراد کر سکے۔

فاضل مقالہ نگار کے نزدیک اُستادِ مرحوم کا یہ شعر۔

غمزہ دلستاں ترا دشنۂ جاں شکر سہی　　　میری بھی آہِ نیم شب نشترِ دلفگار ہے

ہے تو لاجواب مگر اس میں "دلفگار" کی ترکیب محلِ نظر ہے۔ اور اس ترکیب کو غلط ثابت کرنے کے لئے موصوف نے فارسی زبان کا ایک قاعدۂ کلیہ بیان کیا ہے کہ اسمِ فاعل، اسم اور امر کی ترکیب سے بنتا ہے۔ میں یہ عرض کرونگا کہ زبان پہلے بنتی ہے اور قواعد بعد میں۔ قواعد کا استنباط زبان ہی سے کیا جاتا ہے اس لئے کوئی قاعدۂ کلیہ نہیں ہو سکتا اور قدم قدم پر ہمیں مستثنیات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ دراصل اساتذۂ قدیم نے جس لفظ کو جس طرح باندھ دیا ہے وہی صحیح ہو چاہے وہ از روئے قواعدِ زبان غلط ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا اگر "دلفگار" کی سند کسی اُستاد کے یہاں مل جائے تو "دلفگار" کی ترکیب بمعنی اسمِ فاعل درست ہے ورنہ غلط۔

حضرات! جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں اُستادِ مرحوم زبان کے معاملہ میں حد درجہ محتاط تھے اور ہمیشہ اساتذہ کا تتبع کیا کرتے تھے چنانچہ "دلفگار" کی ترکیب بھی انکی ایجاد نہیں بلکہ آج سے سو برس پہلے بیسویں صدی کا وہ شاعر یگانہ جو اپنے دیوان کے مستند مقدمہ نگار کے بقول رشکِ غالب اور فخرِ میر تھا جس کا تخلص فانی اور جس کی شہرت باقی ہے، اس ترکیب کو مکرر استعمال کر چکا ہے۔ سنیئے۔

نہیں کہ آہ میں تاثیر ہی نہیں لیکن　　　یہ دلفگار، کبھی آسماں فگار ہوئی

فانی اس پایہ کا اُستاد تھا کہ جو کچھ اُسکی زبان سے نکلتا تھا سند قرار پاتا تھا اور لوگ قواعدِ زبان کی پابندی سے یکسر بے نیاز ہوکر اس کی ایجاد کی ہوئی ترکیبوں کا استعمال باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہی "دلفگار" کی ترکیب جسے ہمارے فاضل مقالہ نگار نے غلط قرار دیا ہے۔ فانی کے تتبع میں بیسویں صدی کے ایک اور زبردست محقق اور فاضل ادیب یعنی رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے بھی استعمال کی ہے۔ فراق کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ اسی الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی ادبیات کا پروفیسر تھا اور اُردو تو اُس کے گھر کی لونڈی تھی، جاننے والے جانتے ہیں کہ غزل کی حمایت میں اُس کے تحقیقی مقالات نے سارے ہندوستان کو ہلا دیا تھا۔ خیر یہ بحث میرے موضوع سے خارج ہے۔ اب آپ فراق آنجہانی کا وہ شعر سنیئے۔

چلے ازل سے تو رُکنے کا نام تک نہ لیا　　　وہ نشترِ دل ہستی فگار ہیں ہم لوگ

کہیئے کیا اب بھی آپ کو دلفگار کی ترکیب کے صحیح ہونے میں کچھ شک ہے؟ کیا اب بھی آپ تحقیق مرحوم کو غلط گو قرار دیتے ہیں؟

بگم صاحب کا تیسرا اعتراض اُستادِ مرحوم کے اس شعر پر ہے۔

طوفانِ رنگ و بو ہے وہ غیرتِ بہاراں — گل بھی ہے یاسمن بھی نسرین بھی نسترن بھی

آپ کا دعویٰ ہے کہ نسرین و نسترن ایک ہی پھول کے دو نام ہیں۔ شاید فی الواقع ایسا ہی ہو۔ مگر شاعر لازمی طور سے حقائق سے بحث نہیں کرتا۔ اس کے لئے مفروضات کافی ہیں۔ اگر ہماری شاعری میں یہ امر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ نسرین و نسترن دو مختلف پھول ہیں تو اب چاہے وہ ایک ہی سہی مگر شاعر کیلئے جائز ہے کہ وہ انہیں دو ہی سمجھے اور دو ہی لکھے۔ مثالیں تو بہت مل جائیں گی مگر میں ایک ایسے اُستاد کا کلام سند میں پیش کرنا چاہتا ہوں جو صحت زبان کا بادشاہ تسلیم کیا جاتا ہے اور خود اس کے معاصرین نے بھی اس کی اس ممتاز خصوصیت کا اعتراف کیا ہے چنانچہ بیسویں صدی میں مولانا تسلیم ناطقی ایک بزرگ گذرے ہیں جو کانپور میں کسی اسکول کے ہیڈ مولوی تھے۔ موصوف نرے مولوی ہی نہ تھے بلکہ ایک بلند پایہ شاعر اور ایک زبردست نقاد بھی تھے۔ انہوں نے آج سے ٹھیک سو برس پہلے یعنی جولائی ۱۹۳۰ء میں رسالہ شاہکار گورکھپور میں حضرت جگر مرادآبادی کو صحتِ زبان کا سرٹیفکٹ عطا فرمایا تھا۔ اب سُنئے جگر کا وہ معرکۃ الآرا گُل افشاں شعر:۔

گل و بنفشہ و نسرین و نسترن کیا خوب — بہار و سایۂ ابر بہار کیا کہنا

اس سند کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ تحقیق مرحوم نے نسرین و نسترن کو بلا تحقیق دو جدا گانہ پھول سمجھ کر غلطی کا ارتکاب کیا۔

فاضل مقالہ نگار کا آخری اعتراض یہ ہے کہ فعل حال جب منفی ہو تو اس کے آخر میں "ہے" یا "ہیں" بالکل زائد اور بیکار رہے۔ لہذا تحقیق کے اس مصرع میں:۔ "وہ تحقیق کو جانتے ہی نہیں ہیں"

"ہیں" زائد محض اور غلط ہے۔ کسی اُستاد کا کوئی شعر اس وقت مجھے یاد نہیں آتا جو سند کے طور پر پیش کر سکوں مگر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر تلاش کی جائے تو اس کی بہت سی مثالیں مل جائینگی۔

حاضرین میں سے ایک صاحب کھڑے ہو کر "جناب صدر! اگر اجازت ہو تو تحقیق مرحوم کی تائید میں یہ خاکسار ایک شعر پیش کرے"

صدر:۔ "فرمائیے!"

وہ شخص:۔ سُنئے حضرات:۔

یوں شکر جور کرتے ہیں تیرے ادا شناس — گویا وہ جانتے ہی نہیں ہیں گلا ہے کیا

مولٰنا حقائقی۔ (بآواز بلند) سُبحان اللہ کیا شعر پڑھا ہے۔ یقیناً یہ کسی اُستاد کا کلام ہے۔

وہ شخص:۔ جی ہاں یہ شعر بیسویں صدی کے بادشاہ متغزلین حسرت موہانی کا ہے۔

حقائقی:۔ ہاں، وہ تو شعر کے تیور ہی بتا رہے ہیں۔ خدا اس مرحوم کی تربت پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔ حضرات! کیا اس برہانِ قاطع کے بعد حضرت تحقیق پر قواعدِ زبان کی خلاف ورزی کا اعتراض باقی رہتا ہے؟

آپ کو معلوم ہے کہ مقدمہ نگار دیوانِ حسرت کے بقول، حسرت اپنے زمانہ کا نظیری و فغانی تھا اور بقول خود رشکِ سعدیؔ جامیؔ۔ میں پوچھتا ہوں کیا حسرت جیسے کامل الفن اُستاد سے قواعد زبان کی غلطی ہو سکتی ہے؟ اور اگر کسی کو اس پر اصرار ہو کہ نہیں یہ غلطی ہی ہے تو ہم کہیں گے کہ ایسی غلطی پر ہزار صحتیں قرباں ہیں جسے حسرت جیسے مسلم الثبوت اُستاد نے روا رکھا ہو۔

یہ کہکر مولانا حقائقی اسٹیج سے نیچے اتر آئے اور پھر ایکبار تالیوں کے شور سے ہال گونج اٹھا۔ نگم صاحب کے چہرے پر شرمندگی کے آثار طاری تھے۔ پیشانی سے عرقِ انفعال ٹپک رہا تھا۔ آج اُن کی ساری ہمہ دانی خاک میں مل گئی تھی۔ ان کی تحقیق کا پول کُھل گیا تھا اور ہر شخص اُنہیں اس طرح دیکھ رہا تھا گویا وہ انتہا درجہ کے احمق واقع ہوئے ہیں۔

ستّارِ عیوب ہونا بلاشبہ ایک اچھی صفت ہے لیکن جہاں افراط و تفریط کا قدم درمیان میں آیا اور اعتدال سے تجاوز ہوا، فضائل اپنے بلند مرتبے سے گر کر رذائل کی پست سطح پر آ جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک نقاد کیلئے اس سے زیادہ شرمناک جرم اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ جان بوجھ کر کلامِ زیرِ نظر کے عیوب و اسقام پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرے۔ ہاں کسی نو آموز کی ہمّت افزائی مقصود ہو تو تعریف میں تھوڑا سا مبالغہ اور عیوب سے چشم پوشی چنداں قابلِ اعتراض نہیں لیکن جب کلامِ "اساتذہ" کو معیارِ نقد پر کسا جائے تو صرف جوشِ عقیدت کا مظاہرہ ایک شدید قسم کی گمراہی کے پھیلنے کا باعث ہوتا ہے۔ معاصرین میں تو صرف وہی لوگ دھوکا کھا سکتے ہیں جو اتنی استعداد نہیں رکھتے کہ بذاتِ خود کھوٹے کھرے کو پرکھ سکیں اور ناچار انہیں کسی "مستند" مقدمہ نگار کی رائے پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ لیکن آنے والی نسلوں کیلئے مقدمہ نگاروں کی یہ "یار فروشی" ازبس خطرناک ہے۔ نثر کے اِن مدحیہ قصائد یعنی دیوانوں کے مقدمات کو پڑھ پڑھکر اور اُن سے متاثر ہو کر آج عوام جن بزرگوں کو دورِ حاضر کے اساتذہ میں شمار کرتے ہیں، یہی بزرگ شہرتِ عام کی بنا پر اکیسویں صدی میں مسلم الثبوت اُستاد مانے جائیں گے اور اُس زمانے کے شُعرا اپنے کلام کی صحت کے ثبوت میں انہیں "اساتذہ" کے اغلاط کو بطور سند پیش کیا کرینگے۔

گذشتہ صفحات میں اکیسویں صدی کی ایک ادبی صحبت کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے اُسے محض ایک خیالی چیز نہ سمجھنا چاہیئے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ اغلاط کے اس بڑھتے ہوئے طوفانِ بے تمیزی کو اگر روکنے کی کوشش نہ کی گئی تو اگلی صدی میں یہ واقعہ رونما ہو کر رہیگا اور غریب اُردو کیلئے وہ بہت نازک وقت ہوگا جبکہ صحتِ زبان کا معیار اغلاطِ گذشتگاں کو ٹھہرایا جائے گا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ آج جن لوگوں کا شمار اساتذہ میں ہے خواہ اُنکی شہرت کمالِ فن کی بُنیاد پر قائم ہو یا محض ایک حادثہ کی حیثیت رکھتی ہو اُن کی غلطیوں پر آزادی کے ساتھ نکتہ چینی کی جائے تاکہ لوگ اُن کی عظمت و بزرگی سے مرعوب ہو کر اُن کے ہر لفظ کو وحی و الہام نہ سمجھنے لگیں بلکہ صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط جانیں۔ اس بے لاگ انتقاد سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ حضراتِ شعرا خود بھی اپنی شہرت سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے ڈرینگے یعنی جو کچھ کہیں گے سوچ سمجھکر کہیں گے۔ اس طرح بھی اُردو ایک بڑی حد تک اغلاط سے محفوظ رہیگی۔

آیئے اب "اساتذہ" دورِ حاضر کے کلام پر ایک نظر ڈال لیں اور دیکھیں کہ ان بزرگوں نے کس حد تک صحتِ زبان کا خیال رکھا ہے۔ آپنے فارسی کی یہ مثل ضرور سُنی ہوگی کہ "ہر عیب کہ سلطاں بپسند د ہنر است"۔ اسی اُصول کے ماتحت دورِ حاضر کے "بادشاہ متغزلین" یعنی مولانا حسرت موہانی کی ادبی لغزشیں آج بمنزلہ "ہُنر" سمجھی جاتی ہیں اور اُن کے متعلق لب کُشائی گویا پسندِ عام کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کرنا ہے۔ لیکن راقم الحروف کے نزدیک یہ "بغاوت" اسی قسم کی ہے جیسے ہندوستان کے وطن پرست قائدین آزادیِ ہند کے لئے موجودہ حکومت کے خلاف کر رہے ہیں۔ ذاتیات سے مجھے بحث نہیں۔ میرا مقصود زبان کو اغلاط سے محفوظ رکھنا ہے اور بس۔ اس لئے میں نے حضرات "اساتذہ" کے ارادتمندوں اور دوسرے ناواقفوں کی برہمی اور سبّ وشتم سے

بے نیاز ہو کر اظہارِ خیال کی جرأت کی ہے۔

علم البیان کا یہ ایک مسلّمہ قاعدہ ہے کہ جب حرفِ "یا" بطور ادات تشبیہ استعمال ہوتا ہے تو فقرہ یا جملہ کو اس طرح مرتب کرتے ہیں کہ پہلے مشبّہ۔ اس کے بعد "یا" اس کے بعد مشبہ بہ۔ مثلاً۔

سیارے ہیں فضائے مصفا میں ہیں رواں　　یا رود بارِ نیل میں چاندی کی کشتیاں

بن گیا ہے آسماں نتھرے ہوئے پانی کی جھیل　　یا کسی ساحر نے ساکن کر دیا دریائے نیل

کھلے ہیں چاندنی کے پھول یا تارے چمکتے ہیں　　ہجومِ لالہ و گل ہے کہ انگارے دہکتے ہیں

توضیح مطالب کیلئے آخری شعر کے مصراع اولیٰ کو لے لیجئے اس میں شاعر نے چاندنی کے پھولوں کو ستاروں سے تشبیہہ دی ہے یعنی پھول مشبّہ ہیں اور ستارے مشبّہ بہ۔ اسی لئے پھول "یا" سے پہلے اور تارے "یا" کے بعد مذکور ہوئے لیکن اگر شاعر کو ستاروں کا بیان مقصود ہوتا اور وہ انہیں پھولوں سے تشبیہہ دیتا تو جملوں کی ترتیب اس طرح ہوتی کہ "یہ ستارے ہیں یا چاندنی کے پھول کھلے ہوئے ہیں"

لیکن ہمارے "بادشاہِ متغزلین" نے الٹی گنگا بہائی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

عالمِ حسن میں ہیں نور کی نہریں جاری　　یا رواں عارضِ جاناں کے کنارے آنسو

غالباً آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ عارضِ محبوب پر جو آنسو رواں ہیں وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا عالمِ حسن میں نور کی نہریں جاری ہیں مگر شعر کی موجودہ ترتیب سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ آپ اتفاق سے ایک ایسی دنیا میں پہونچ گئے تھے۔ جسے "عالمِ حسن" کہہ سکتے ہیں۔ ہماری دنیا کی طرح وہاں بھی سب چیزیں تھیں چنانچہ نہریں بھی تھیں مگر وہ نہریں پانی کی نہیں بلکہ نور کی تھیں انہیں جاری دیکھکر فی البدیہہ آپ کو یہ تشبیہہ سوجھی کہ یہ نہریں کیا ہیں گویا عارضِ محبوب پر آنسو ڈھلک رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ایسی ہی بات ہے جیسی ایک دفعہ سر فضل حسین مرحوم نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں کہی تھی۔ آپ کہنا یہ چاہتے تھے کہ "حضرات! آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے" مگر کہہ گئے یہ کہ "حضرات! آپ کا بجانا بالکل فرما ہے"

مولٰنا صاحب کا مفہوم صحیح طور پر اس وقت ادا ہوتا جبکہ شعر کی ترتیب اس طرح ہوتی۔

ہیں رواں عارضِ جاناں کے کنارے آنسو　　عالمِ حسن میں یا نور کی نہریں جاری

بعض علما کا خیال ہے کہ ایک شاعر بشرطیکہ وہ صحیح معنی میں شاعر ہو علم النفس کا زبردست ماہر ہوتا ہے اس دعوے کی تائید میں ہم مولٰنا حسرت کا یہ شعر پیش کر سکتے ہیں۔

حسرتیں وقفِ طرب ہیں آرزو مسرور　　بخت نے کھولا ہے روئے شوق پر بابِ نشاط

نکتہ سنجانِ سخن اس شعر پر یہ اعتراض کریں گے کہ اس محل پر "حسرتیں" بصورت جمع اور "آرزو" بشکل واحد ایک بے جوڑ بات ہے، اور مقتضائے حال کے خلاف۔ دونوں لفظ یا جمع ہوتے یا واحد۔ یعنی یا تو اس طرح کہتے کہ "حسرتیں وقفِ طرب ہیں آرزوئیں مسرور"

یا پھر اس طرح کہ "حسرت وقف طرب ہے آرزو محو سرور" یہ آدھا تیتر آدھا بٹیر کیا معنی؟ مگر یہ اعتراض کھلی ہوئی دلیل ہے اس امر کی کہ معترض "نفسیات" میں بالکل کورا ہے۔ اس نادان کو کون سمجھائے کہ جس وقت انسان کے دل میں گوناگوں حسرتوں کا ہجوم ہوتا ہے اُس وقت "آرزو" ایک سے زیادہ نہیں ہوتی۔ دراصل یہ وہ نکتہ ہے جو "بادشاہ متغزلین" جیسے فطرت انسانی کے نبض شناس ہی کو سوجھ سکتا تھا۔ اعتراض کا دوسرا جواب شاعرانہ انداز میں یہ ہو سکتا ہے کہ مصراع میں اتنی گنجائش ہی نہ تھی کہ آرزو کی جگہ آرزوئیں لایا جاتا۔ چلو قصہ ختم ہوا۔

اظہار مطلب کے لئے ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق ایک جداگانہ پیرایۂ بیان اختیار کر سکتا ہے لیکن محاورات اور روزمرہ میں تصرف کا حق کسی کو نہیں حتیٰ کہ "بادشاہ متغزلین" کو بھی نہیں۔ یہاں اُن کے لئے بھی شاہِ برطانیہ کی طرح دستور و آئین کی پابندی لازمی ہے۔ اس شعر میں :-

سب گئے پر اک تُو نہ آیا نہ آیا — ترا دیر دیکھا کئے راستہ ہم

مصراع ثانی محل نظر ہے۔ اگر اس کی نثر کی جائے تو یہ ہوگی "ہم دیر ترا راستا دیکھا کئے" مگر اردو میں اس طرح نہیں بولتے۔ "دیر تک راستا دیکھا کئے" یا "بہت دیر راستا دیکھا کئے" کہنا چاہیئے۔ تنہا "دیر" صحیح نہیں۔

حال مرا تھا جب بتر تب تو ہوئے نہ تم خبر — بعد مرے ہوا اثر اب میں اثر کو کیا کروں

"بتر" دراصل "بدتر" کا مخفف ہے۔ مگر بتر یا بدتر کا یہاں کوئی موقع نہیں۔ جب دو چیزوں یا حالتوں کا مقابلہ مقصود ہو تو ایک کو دوسری سے بدتر کہہ سکتے ہیں۔ اس محل پر "ابتر" (بمعنی خراب) چاہیئے۔ مثلاً "جب میری حالت ابتر تھی" غالباً مولٰنا صاحب نے بتر کو ابتر کا مترادف یا مخفف سمجھ لیا ہے۔

حسرت صاحب "سب" اور "سارا" میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ "سب" کی جگہ "سارا" اور "سارا" کی جگہ "سب" بلاتکلف استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ دونوں لفظوں کا محل استعمال بالکل جدا جدا ہے جیسا کہ تفصیل کے ساتھ اس مضمون کی پہلی قسط میں بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر صرف دو شعر نقل کئے جاتے ہیں :-

مایوس دل کو پھر سے وہ شوریدہ کر چلے — بیدار سارے فتنۂ خوابیدہ کر چلے

مصراع ثانی میں "سارے" کی بجائے "سب" چاہیئے۔

ترا ناز بھول بیٹھا مری سب نیازمندی — بغرور دلربائی بیقینِ دل پسندی

مصراع اولیٰ میں "سب" کی بجائے "ساری" چاہیئے۔

شام ہو یا کہ سحر یاد اُنہیں کی رکھنی — دن ہو یا رات ہمیں ذکر اُنہیں کا کرنا

مصراع اولیٰ میں "یا" اور "کہ" کا یکجائی استعمال صحیح نہیں کیونکہ یہاں دونوں ہم معنی ہیں لہذا کوئی ایک زائد محض ہے۔ شام ہو کہ سحر۔ یا۔ شام ہو یا سحر۔ کہنا چاہیئے۔ خود اسی شعر کا مصراع ثانی مثال کیلئے کافی ہے۔

محبت نے کی دل میں وہ آگ روشن　　کہ جسم ہو گئے جسم خاکی سے نوری

مصراع ثانی میں لفظ "جسم" محض بیکار اور مخل فصاحت ہے۔ اگر اسے باقی رکھا جائے تو مصراع کے یہ معنی ہونگے کہ دل میں محبت کی آگ روشن ہونے سے پہلے آپ صرف "جسم خاکی" تھے۔ حالانکہ کسی زندہ انسان پر مطلق جسم کا اطلاق صحیح نہیں۔

آگئی کس کے جمال عرق آلود کی یاد　　رات بھر تجھ میں گنتے رہے تارے عاشق

"جمال عرق آلود" کی ترکیب معنوی اعتبار سے محض مہمل ہے۔ پسینہ چہرے پر آتا ہے۔ جمال پر نہیں آتا۔ یہاں "جمال" سے شخص جمیل" مراد لینا بھی ممکن نہیں کیونکہ "کس" اس کے منافی ہے۔ "جمال" کی جگہ چہرہ، عارض، رخ، کوئی لفظ ہونا چاہیئے۔ اسی قبیل کا یہ شعر۔

چہرہ حسن یار پر ندرت خال دلبری　　دل کماں کی نقطہ موشنا ہے دیکھا

"چہرہ حسن یار" یعنی چہرہ پر تل ہوتا ہے "حسن" پر نہیں ہوتا۔ اگر حسن کی جگہ جمیل یا زیبا یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ ہو تو یہ سقم نہ رہے۔

شوق لقائے یار میں مرتے تو ہو مگر　　حسرت جو نقد جان نہ ٹھہرے بہائے ناز

مصراع ثانی میں "جان" کے نون کا اعلان صحیح نہیں۔

اک طرفہ جنون کا ہے عالم کہ عشق میں　　تکلیف آج کل ہے نہ راحت ہے آجکل

مصراع ثانی میں ردیف (ہے آجکل) محض بیکار ہے۔ "آجکل نہ تکلیف ہے نہ راحت" یہ کہنا بالکل کافی ہے۔

مجھکو معلوم ہے پیمانۂ مے میں ساقی　　تو نے جو کچھ کہ مری آنکھ بچا کر چھوڑا

مصراع ثانی میں "کہ" زائد محض ہے۔ صرف جگہ پر کرنے کے لئے ٹھونسا گیا ہے۔

اور تو کچھ بھی نہ ہم سے اس کے آگے بن پڑا　　حسن خلق یار کی مدح و ثنا کرنے لگے

پہلے مصراع میں "اس" اور دوسرے میں "یار" ایک ہی شخص کے لئے لائے گئے ہیں اور شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ "ہم سے یار کے آگے اور تو کچھ بھی نہ بن پڑا۔ اس کے حسن خلق کی مدح و ثنا کرنے لگے" لیکن اس مفہوم کو ادا کرنے کیلئے اسم (یار) پہلے مصراع اور ضمیر (اس) دوسرے مصراع میں لانا چاہیئے۔ مثلاً:-

اور تو کچھ بھی نہ پیش یار ہم سے بن پڑا　　اس کے حسن خلق کی مدح و ثنا کرنے لگے

ورنہ "اس" اور "یار" سے دو جداگانہ شخص سمجھے جائیں گے۔

محبت ہوگئی ہے جھکتے جھکتے — جبینِ شوق کو اس آستاں سے

عام عقیدہ تو یہی ہے کہ عاشق بربنائے محبت، آستانِ یار پر سجدے کیا کرتا ہے لیکن مولانا صاحب نے ایک بالکل انوکھی بات کہی ہے۔ آپنے محبت کے علاوہ کسی ایسی وجہ سے جو آپ کسی کو بتلانا نہیں چاہتے آستانِ یار پر جھکنا شروع کیا تھا مگر جب مدت تک یہ شغل جاری رہا تو بربنائے عادت آپ کو آستانِ یار سے محبت ہوگئی اور یہ بالکل قدرتی بات ہے جس طرح برسوں جیل میں رہنے کی وجہ سے قیدی اپنی کوٹھری سے مانوس ہوجاتا ہے اور طوطا اپنے پنجرے سے۔ مگر یہ پتا نہیں چلتا کہ مولنا صاحب نے ابتدائے کار میں آستانِ یار پر جھکنے کی مشق کس لئے شروع فرمائی تھی۔

سیکھا ہی کہاں سے لے لبِ یار — یہ شیوۂ دلکشِ شکر قند

شکر قند سے ہر شخص واقف ہے۔ اصل میں شکر کند تھا (کند بمعنی جڑ) یہ ایک قسم کی میٹھی ترکاری ہوتی ہے جو مولی کی مانند زمین کے اندر پیدا ہوتی ہے اور اُسے اُبال کر یا بالو میں بھون کر کھاتے ہیں۔ اس کے اندر سے سُوت نکلتا ہے۔ معلوم نہیں شکر قند کا کونسا "شیوۂ دلکش" مولنا کو پسند آیا جو اُسے لبِ یار سے جا ملایا۔

عرضِ کرم پہ ترکِ جفا بھی نہ کیجئے — ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجئے

"عرضِ کرم" کے معنی ہوئے "اظہارِ کرم" جس کا یہاں کوئی موقع نہیں۔ غالباً آپنے "عرض" کو "درخواست" کا مترادف سمجھا ہے۔

دل غم سے جو کہتا ہے محبت کا بُرا ہو — ایسے میں تری یاد بھی آجائے تو کیا ہو

کیا ابلہ فریبی ہے ماشاء اللہ۔ محبوب سے غائبانہ خطاب ہو رہا ہے مگر اس کی یاد ہنوز نہیں آئی۔ ظاہر ہے کہ جس شخص سے ہم تصور میں باتیں کر رہے ہوں اسکی یاد کیونکر آسکتی ہے۔

عربی اور فارسی کے ایسے بہت سے الفاظ اُردو میں رائج ہیں جن کے معنی عربی اور فارسی کی لغت کی رُو سے کچھ اور رہیں اور اُردو میں کچھ اور۔ ایسے الفاظ کو اب اُردو کے الفاظ سمجھنا چاہیئے اور مرکبات میں خصوصاً اضافت کے ساتھ اُن کا استعمال جائز نہیں۔ بادشاہِ متغزلین نے غالباً اپنی بادشاہی کے زور پر اس قسم کی غلط ترکیبیں بارہا استعمال کی ہیں۔ چند مثالیں مُلاحظہ ہوں :-

(۱) شاید وہ یاد کرتے ہیں مجھ کو کہ اور بھی — تکلیفِ اضطراب کی شدت ہے آجکل

رُوح نے پائی ہے تکلیفِ جُدائی سے نجات — آپ کی یاد کو سرمایۂ راحت کر کے

"تکلیف" عربی لفظ ہے اور اُس کے لغوی معنی ہیں "طاقت سے زیادہ کام لینا" اور فارسی میں مطلق "کام لینا" کے معنی میں آتا ہے لیکن اُردو میں اس کے معنی ہیں، دُکھ، رنج، ایذا، درد، مصیبت، بپتا، دشواری۔ ان معنوں میں اگر استعمال ہو تو "تکلیف" اُردو کا لفظ ہے۔ مذکورہ بالا اشعار میں بمعنی "ایذا" استعمال ہوا ہے۔ لہذا "تکلیفِ اضطراب" اور "تکلیفِ جدائی" کی ترکیب غلط۔

اِک جو لے دیکھے ہیں شیوۂ یاری آیا — وہ بھی کچھ کام نہ خدمت میں تمہاری آیا

"یاری" فارسی لفظ ہے اور فارسی میں بمعنی "مدد و نصرت" مستعمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شعر میں "یاری" بمعنی "مدد و نصرت" استعمال

نہیں ہوا لہذا "شیوۂ یاری" کی ترکیب نادرست۔

(۳) میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے

عربی اور فارسی میں "شرارت" کے معنی ہیں "بدی" لیکن اُردو میں "شرارت" شوخی کو بھی کہتے ہیں اور اسی معنی میں یہاں استعمال ہوا ہے۔ اس لئے "آغازِ شرارت" کی ترکیب صحیح نہیں۔

(۴) تجھکو جب تنہا کبھی پاناتو ازراہِ لحاظ حالِ دل باتوں ہی باتوں میں سُنانا یاد ہے

"لحاظ" کے معنی ہیں چشمِ نیم باز یا کنکھیوں سے دیکھنا۔ کسی چیز کا آنکھ میں خیال رکھنا۔ لیکن اُردو میں پاس خاطر، مروّت، اور احتیاط کے معنی میں آتا ہے۔ اس شعر میں اُردو معنوں میں استعمال ہوا ہے بنا بریں "ازراہِ لحاظ" کی ترکیب جائز نہیں۔

(۵) نازبردارِ الم لکھا ہے نامہ میں مرے اس سراپا ناز کی مضمون نگاری دیکھئے

"نازبردار" فارسی میں مستعمل نہیں۔ فارسی کا محاورہ نازکشیدن ہے۔ اس لئے "نازبردارِ الم" کی ترکیب بھی معیوب ہے۔ ہاں "نازبردارِ الم" کو محبوب کا قول مان لیا جائے تو پھر مولف پر یہ اعتراض باقی نہیں رہتا۔ رہ گیا محبوب تو اُس بیچارے کو اگر اتنی فارسی آتی تھی کہ "نازبردارِ الم" خط میں لکھدیا تو یہ بھی کچھ کم تعریف کی بات نہیں۔ کیونکہ آجکل کے مضمون نگار محبوب تو عموماً "لپ سٹک" کی قسم کی اُردو لکھتے اور بولتے ہیں۔

اُردو زبان کا یہ ایک مُسلّمہ قاعدہ ہے کہ جب کسی کا نام لیکر خطاب کرتے ہیں تو پھر اُس کے لئے "آپ" کا استعمال نہیں کرتے۔ حسب اقتضائے سن و مرتبہ "تو" یا "تم" کہتے ہیں۔ مثلاً:۔

"اصغر! تم کلکتے کب جاؤ گے؟" یا "اصغر! تو کلکتہ کب جائیگا؟"

حسرت! جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا آئینِ اشتیاق میں یہ بھی روا ہے کیا

تم سے گدا کو اس شہِ خوباں کی آرزو حسرت! یہ اور کیا ہے جو دیوانگی نہیں

یہ کوئی نہ کہے گا کہ "اصغر! آپ کلکتے کب جائیں گے؟" اگر اظہارِ احترام مقصود ہو تو پہلے نام کے ساتھ ایک لفظ اور بڑھا دیتے ہیں تب "آپ" کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً:۔ "اصغر صاحب! آپ کلکتے کب جائیں گے۔"

لیکن "بادشاہِ متغزلین" مشرق کے مطلق العنان بادشاہوں کی طرح کسی آئین کے پابند نہیں، اُن کی زبان قانون ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

کچھ کچھ اس راز کی ہم کو بھی خبر ہے حسرت آپ جاتے ہیں جو روزانہ سرِ شام کہیں

حال کُھل جائیگا بیتابیٔ دل کا حسرت! بار بار آپ انہیں شوق سے دیکھا نہ کریں

حسرت! اس کوچہ کا پھیرا روز روز اچھا نہیں رنگ لائے گی کسی دن یہ گدائی آپ کی

نہاں نہ ہو کرمِ یار میں ستم حسرت بہت نہ کیجئے اظہار شادمانی کا

مجہول نام کے ساتھ، جب خطاب ہے تو "کیجئے" کی جگہ "کرو" یا "کر" چاہیئے۔

یہ اور اسی قسم کی دوسری غلطیاں حضرت صاحب کے دیوان میں بکثرت موجود ہیں۔ کسی نو آموز سے اگر اس قسم کی لغزشیں ہوتیں تو چنداں قابل لحاظ نہیں لیکن قیامت تو یہ ہے کہ آپ "بادشاہِ متغزلین" ہیں۔ قافیہ و ردیف سے بحث کرتے ہوئے اِس مضمون کی پہلی قسط میں حضرت صاحب کی جن غلطیوں کا مفصل ذکر کر چکا ہوں اُن کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ اب مولنا کے ایک مخصوص انداز نگارش پر روشنی ڈالنا ہے۔ فارسی محاورات کے لفظی ترجمہ کا آپ کو بہت شوق ہے مگر یہ انیسویں اور خصوصاً اٹھارویں صدی کی باتیں ہیں اور اسی وقت کیلئے موزوں تھیں کیونکہ اس وقت اُردو کا مجموعہ الفاظ و محاورات اتنا وسیع نہ تھا کہ ہر خیال آسانی کے ساتھ ادا ہوسکے اس لئے ناچار لفظی ترجمہ سے کام لیا جاتا تھا۔ اب بیسویں صدی میں جبکہ یہ چیزیں یکسر متروک ہیں، اسی پُرانی لکیر کے فقیر بنے بیٹھے رہنا بزرگانہ وضعداری ہیں داخل ہو تو ہو ترقی زبان کے حق میں یقیناً مضر ہے۔ نمونہ کیلئے چند شعر کافی ہونگے :-

(۱) بند کر دیگا لب یار کو بوسوں کا ہجوم — آج بھی ہم سے جو وہ برسر انکار آیا

"برسر انکار آنا" برسر انکار آمدن کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں اسی جگہ "انکار کرنا" بولتے ہیں۔

(۲) عمر کچھ صرف یادِ گیسوءِ رخسار یار — یوں بسر لیجا سکے لیل و نہارِ انتظار

"بسر لیجانا" بسر بردن کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں "بسر کرنا" بولتے ہیں۔

(۳) پھر کہیئے کس اُمید پہ ہم زندگی کریں — جب آپ التفات ذرا بھی نہ کیجئے

"زندگی کرنا" زندگی کردن کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں "جینا" بولتے ہیں۔

(۴) کامیابی جلد ہوگی آ کے پابوسِ اُمید — کھینچ ڈالیں اور رنج انتظار اک برس

"رنج کھینچنا" رنج کشیدن کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں اس کی جگہ "رنج اٹھانا" یا "رنج سہنا" بولتے ہیں بلکہ "رنج بھی اس محل پر صحیح نہیں اسی جگہ "تکلیف" چاہیئے یعنی تکلیف اُٹھانا یا سہنا۔ مولنا نے یہاں کمال جدت سے کام لیا ہے صرف لفظی ترجمہ ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ کچھ اضافہ بھی کر دیا۔ رنج کھینچنا تو خیر جو کچھ تھا سو تھا۔ رنج کھینچ ڈالنا اور بھی مزہ دیگیا۔

(۵) تری خوشبو کے بعد رُوح مری — گلِ جنت بھی ہو تو بو نہ کرے

"بُو کرنا" بُو کردن کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں "سونگھنا" بولتے ہیں۔

(۶) کب بر آئیگی سکونِ جانِ مضطر کی اُمید — کب بسر آیگا یا رب یہ زمانِ اضطراب

"بسر آنا" بسر آمدن کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں "ختم ہونا" بولتے ہیں۔

(۷) ہجر ساقی میں بھلا کس کو خوش آئیگی شراب — ہمنشینو! طلبِ ساغر و مینا ہے عبث

"خوش آنا" خوش آمدن کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں "اچھا لگنا، اچھا معلوم ہوتا، پسند آنا" بولتے ہیں۔

(۸) بادۂ عیش سے مینائے تمنا رنگیں — ساغرِ شوق مے ذوق سے گلنار آیا

"آیا" آمد کا ترجمہ ہے اُردو میں اُس کی جگہ "ہوگیا" چاہیئے۔

(۹) کچھ نہیں شوقِ جبّہ و دستار — دل سر ساغر و سبو نہ کرے

فارسی کا محاورہ ہے سر چیزے داشتن۔ کسی چیز کا خیال یا خواہش کرنا۔

(۱۰) مَیں ہوں سابت بدخو کی اس آن پہ مرتا ہوں　　　کھینچا نہ کبھی جس نے اندوہ پشیمانی

"اندوہ کھینچنا" اندوہ کشیدن کا ترجمہ ہے۔ اردو میں غم سہنا بولتے ہیں۔

(۱۱) لگتی ہی نہیں روضۂ رضواں میں طبیعت　　　ان کی جو سرِ کوچۂ جاناں میں لگے ہیں

سلے سُبحان اللہ! کیا بات کہی ہے "سرِ کوچۂ جاناں میں لگے ہیں" کایستھوں کی فارسی کے دلچسپ نمونے" بادشاہِ متغزلین" کی اس مُرصّع اُردو کے سامنے گرد ہیں۔ انصاف سے کہیئے کہ "مُلّا! من لُٹیا اینجا نہادہ بودم، تَیں سنے تو نائیں دیکھی" زیادہ مزہ دار ہے یا مولٰنا صاحب کا یہ مصراع :- "انکی جو سرِ کوچۂ جاناں میں لگے ہیں"

(۱۲) بچھی ہیں راہِ تمنا میں سینکڑوں آنکھیں　　　کہ ناز جلوہ کرے تیری خوش خرامی کا

"جلوہ کرنا" جلوہ کردن کا ترجمہ ہے۔ اُردو میں "جلوہ دکھانا" بولتے ہیں۔

ان مثالوں میں صرف تین شعر اور شامل کر لیجئے :-

(۱) مجھے شکوۂ جفا کی نہیں آنے پاتی نوبت　　　وہ ستم بھی گر کرے ہے تو بلطفِ ہوشمندی

(۲) ہو کے آگاہ غمِ عشق مری حالت پر　　　اب تو بھر لائے ہے وہ شوخ بھی بائے آنسو

(۳) حسنِ بیتاب ہے محدود انہیں دو چار کے بیچ　　　مری گفتار کے اندر تری رفتار کے بیچ

اب ذرا ٹھنڈے دل سے سطورِ ذیل کا مطالعہ کر لیجئے۔

"آہ! یہ لیل و نہارِ انتظار کیونکر بسر لے جاؤں۔ آخر کس اُمید پر زندگی کروں۔ روتے روتے میری آنکھیں گلنار آگئیں۔ اب تو میرا دل سرِ ساغر و سبو بھی نہیں کرتا۔ ساغر و سبو کس کا آب و دانہ تک خوش نہیں آتا۔ پھولوں کو بُو کرنے سے جی اُلجھتا ہے۔ آہ جو بدنصیب ہر وقت سرِ کوچۂ جاناں میں لگا ہو اُسے ان چیزوں سے کیا واسطہ۔ میں تو ایک برس رنجِ انتظار اور بھی کھینچ ڈالتا مگر ڈر یہ ہے کہ اگر اس کے بعد بھی وہ ظالم برسرِ انکار آیا تو میں اندوہِ پشیمانی کھینچنے کے سوا کیا کروں گا۔ اُسکی رفتار کے بیچ جو حسنِ بیتاب محدود ہے جس وقت عالمِ تصور میں وہ میرے دل کے سامنے جلوہ کرے ہے تو بے اختیار میرا دل آنکھوں میں آنسو بھر لائے ہے"

سچ کہیئے۔ یہ عبارت بیسویں صدی کے بادشاہِ متغزلین کی گلابی اُردو کا صحیح نمونہ ہے یا نہیں! واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں زبان کے ایسے دلنواز نمونے کسی اُستاد کے یہاں آپ کو نہ ملیں گے۔

عندلیب شادانی[۶]

اجمیری مَل

نذرِ عقیدت

چل ری سکی اجمیر گلی جہاں خواجہ پیارا سانولیا! جھما جھم، جھما جھم
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خواجہ بانکا سانولیا! چھما چھم
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنجر والا سانولیا! چھما چھم، چھما چھم

..... شب کا آخیر حصہ تھا۔ گرمیوں کا موسم ریگستان کی خنکی نے عجیب پر سرور کیفیت پیدا کر دی تھی۔

چاند کی روشنی خاموش رنگ کے سمندر پہ دُور تک پھیل چلی گئی تھی۔ جس پر چنگ کی آواز کے ساتھ پازیبوں اور کڑوں اور چھڑوں کی جھما جھم ہو رہی تھی اور یہ دلکش گیت ریگستان کی ہوا میں تیرتا ہوا دُور تک چلا جاتا تھا حتیٰ کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی صدائے بازگشت ریگستان کے نرم ونازک سینے پر ہوتی ہوئی کوہِ اراولی کی بلند قامت اور دیوہیکل پہاڑیوں سے ٹکرا کر واپس آ رہی ہو۔

عورتیں گیت گا رہی تھیں اور باری باری سے ڈھولک اور چنگ کی آواز پر ناچ رہی تھیں۔

اوہو! میں نے بھی قصہ کہاں سے شروع کر دیا۔ یہ ایک ایسا قصہ ہے کہ جب خواجہ کا نام آتا ہے تو لامحالہ یاد آجاتا ہے۔

---

(۱)

لالہ جھومر مل کے یہاں پہلوٹی کی لڑکی پیدا ہوئی تو کسی نے کہا کہ لکشمی ہے۔ کسی نے دیبی بتایا، کسی نے مجسم برکت بتایا۔ پھر اس کے بعد بیوپار کے نفع، پیرو سے لڑائی میں فتح، سناروں سے پرنالے کے مقدمہ میں کامیابی اور سیٹھ جی کے ایجاد کردہ سر کے تیل کی فروخت میں کامیابی وغیرہ سب اسی لکشمی کی آمد کا صدقہ قرار دی گئیں۔ اور اس حقیقی حادثہ فاجعہ کو خوش بختی کا رنگ دینے والوں میں خاص حصہ سیٹھ جی کی ساس وغیرہ کا تھا ورنہ سیٹھ جی کی والدہ تو پیدائش کے وقت ہی مُنہ بگاڑ کر فرما چکی تھیں کہ "رانڈ مر جائے تو اچھا ہے" خفیہ طور پر روئی بھی تھیں۔

اور بعد اس کے اُس کو باضابطہ رانڈ کا لقب عطا کر دیا گیا تھا اور بہو سے بڑی خفگی کا سبب اسی کو قرار دے رکھا تھا۔

سیٹھ جی نے اس حادثہ پر خاص توجہ نہ کی اس لئے کہ سیٹھانی بہت ہی نوعمر اور خوبصورت بھی تھیں۔

جب سیٹھ جی کے یہاں دوسرا بچہ پیدا ہونے کی اُمید ہوئی تو تصوّر کر لیا گیا کہ لڑکا ہوگا۔ ساس نے بہو کو نوٹس دیدیا تھا کہ اگر لڑکی ہوئی تو بہو پر آجائیگی۔ مندروں وغیرہ میں علاوہ کوشش ہوئی۔

لیکن خُدا کو پھر لڑکی منظور تھی۔ سیٹھ جی نہ صرف گھبرا گئے بلکہ حیران ہو گئے۔ اولاد کا معاملہ حد سے سوا خطرناک صورت اختیار

کر گیا۔ سٹھانی غریب کی جیسی آفت آئی ظاہر ہے۔
اس کے بعد پانڈے جی نے سٹھانی کو اپنے ڈول پر گانٹھا اور واقعہ تھا کہ بھیروں جی کے ہوتے ساتھ معاملہ اُن کی طرف رجوع نہیں کیا گیا ورنہ یہ دیوتا لڑکا دینے میں حد سے سوا سخی ہیں۔
غلطی محسوس کر کے پانڈے جی کی وساطت سے بھیرون جی کی چبوتری پر لڈو وغیرہ چڑھا کر باضابطہ منت مانی گئی۔
برہمنوں اور جوتشیوں نے ہاتھ دیکھ کر بھی بیٹا بتایا۔ عاقلوں نے لڑکیوں کے سر کی بہونری دیکھ کر لڑکے کی پیشگوئی کی۔
خدا خدا کر کے عرصے بعد دن آئے کہ پھر بچے کی اُمید بندھی۔ سیٹھ جی نے خود خواب میں دیکھا کہ لڑکا ہوا ہے۔ نام تک قبل سے سوچا جانے لگا۔ کپڑے بھی لڑکے کے سلنے لگے۔ بھیرون جی کی پوجا کا پروگرام مرتب ہونے لگا۔
سٹھانی جی خود متفکر تھیں اور اُنہوں نے نہ صرف ہر مقامی مندر دیوتا دیبی سے معاملہ رجوع کر رکھا تھا بلکہ اس سلسلہ میں اپنے میکہ تک کے مندروں تک میں سلسلہ جنبانی ہو چکی تھی۔ اور ہر جگہ کے پجاریوں کے زرّیں وعدے حاصل ہو چکے تھے۔
بچہ پیدا ہونے کے دن قریب لگتے ہیں تو مختلف پنڈتوں اور پجاریوں نے سٹھانی کو رسّی کشی پہ دھر لیا تھا اور ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ آنے والی کامیابی اُسی کی سفارشات و پوجا کا ثمر ثابت ہو۔
سیٹھ جی کو خود سولہ آنے یقین تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اب لڑکی پیدا ہونے کا خیال تک نہ تھا۔

(۲)

رات کے دو بجے تھے۔ گرمیوں کا زمانہ، سیٹھ جی کی بیٹھک پر پڑوسیوں کا ہجوم سا تھا۔ بیٹا پیدا ہونے والا تھا اور سب کے کان لگے ہوئے ہیں کہ کب خوشخبری آئے۔
ایکدم سے ہلڑ مچا۔ لڑکا! لڑکا! لڑکا! سیٹھ جی کا مارے خوشی کے بُرا حال ہو گیا۔ مگر وہ سوتے بن گئے۔ ایک گرگے کو پیشتر سے کہہ رکھا تھا کہ آتشبازی کہاں ہے اور اُس نے چپکے سے نکال آتشبازی چھوڑنی جو شروع کی ہے تو گولوں کی دھوا دھوں نے گاؤں سر پر اُٹھا لیا اور پھر دوسری آتشبازی کی روشنی!
سیٹھ جی گویا گولوں کی آواز سے اُٹھے اور اس "بے ضرورت" غل غپاڑے پر ایک رسمی خفگی کا اظہار کیا۔
ابھی یہ ہنگامہ شباب ہی پر تھا کہ موت سے بھی زیادہ خوفناک خبر آئی۔ یہ واقعہ تھا کہ لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ جان بچانے کی خاطر کسی نے خاموشی اختیار کی تو اور کسی نے لڑکا کہہ دیا۔ نتیجہ ظاہر۔ قیامت یہ کہ اڑوس پڑوس کے لوگ مبارکباد دے رہے تھے، حقیقت سے بے خبر!
کوئی صاحب کسی محفل میں گئے مگر حصہ نہ ملا۔ ایک اور تھے اُن کو حصہ بھی نہیں ملا اور پٹے بھی۔ ہمارے سیٹھ جی پٹنے والے تھے۔ دُنیا کی محفل میں ایک تو بیٹے کا حصہ نہیں ملا اور اُس پہ لڑکیوں کی مار! سر دست دُنیا اندھیر معلوم دینے لگی۔ سمجھ میں نہ آیا کیا کریں۔ سامنے آتشبازی کی پھلجھڑیاں چٹخ چٹخ کر اُن کا مذاق اُڑا رہی تھیں۔ یہ تحقیق نہ تھا کہ کس قطامہ نے غلط افواہ اُڑا دی تھی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ سوچے کہ لاؤ بیوی بچوں کو قتل کر دیں۔ تیر کی طرح باوجود عورتوں کی ہیں! ہیں! کے زچہ خانے میں گھس پڑے۔ بیوی کی چوٹی پکڑ کر مارے جوتوں کے قتل کم کیا مارا بہت۔ عورتیں بیچ میں کود پڑیں۔ نوزائیدہ بچی پر سخت حملہ کیا مگر ایک عورت نے چھاتی سے چپٹا کر بچا لیا۔ اور

اس ہڑبونگ میں "تلوار! تلوار!" کا غل مچایا۔ یعنی مطلب یہ کہ تلوار لاؤ تاکہ قتل کریں۔ لیکن عورتیں چل پڑیں اور انہوں نے دھکے دیکر نکال دیا۔ خودکشی کا مسئلہ زیر غور رہا اور سچ مچ روتے ہوئے اپنی بیٹھک میں پڑ رہے اور ہر کس و ناکس کو نکال کر اندر سے دروازہ بند کر لیا اور صبح تک اکیلے پڑے روتے رہے۔ اسی قیامت خیز صبح کو آٹھ بجے کی گاڑی سے میں پہونچا اور ٹریجڈی کا علم ہوا۔ حسب دستور فوراً کا فوراً سیٹھ جی کو میں نے شطرنج کھیلنے نہیں بلوایا۔ اطمینان سے خود پہونچا۔ تعزیت کو سمجھئے۔

(۳)

سیٹھ جی بیٹھک کے باہر دیوار کے سایہ میں ایک ہموار مقام پر بیٹھے تھے اور خاصہ مجمع تھا۔ دو چار پائیاں پڑی تھیں مگر لوگ زمین ہی پر بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ زیر بحث معاملہ یہ تھا کہ یہ دیبی دیوتاؤں نے جو اپنی ساکھ بٹھا رکھی ہے تو اس کا مدار محض اتفاق اور حادثہ پر ہے ورنہ سچ پوچھو تو کسی میں کوئی گُن نہیں اور محض تقدیر سے پُج رہے ہیں۔ سیٹھ جی ایک سرے سے منکر ہو گئے تھے اور رجنوں کا ذکر کیا آدھا خدا بھی ماننے کو تیار نہ تھے۔ طنز سے بولے "سب کو دیکھ لیا۔ کوئی پیر پیغمبر دیبی دیوتا کچھ نہیں"

میں پہونچا تو یہ معاملہ فیصلہ کے لئے فوراً میرے سپرد کیا گیا۔ سیٹھ جی نے بڑی گرمجوشی سے پوری تفصیل بتائی کہ کس کس طرح ہر دیوتا دیبی نے اندھیر مچا رکھا ہے اور زبردستی پُج رہا ہے۔ غضب ہے خدا کا کہ سیٹھ جی نے اپنا معاملہ پیپل تلے کے پتھروں سے لیکر خود دیبی کے عظیم الشان مندر تک کس قدر خشوع و خضوع کے ساتھ رجوع کیا لیکن بیکار۔ مولا فقیرا اپنی لمبی ٹوپی ہاتھ میں لاٹھی بجائے سلام کے "اللہ بھلا کرے" کے جملے کے ساتھ پہونچے اور سیٹھ جی نے اسی سلسلہ گفتگو میں مولا فقیر کے مقامی پیر جی کو بھی سمیٹ لیا۔ کیونکہ ایک ناریل اُن کے مزار پر چڑھایا تھا۔ مولا فقیر بگڑ کھڑے ہوئے اور سختی سے انکار کیا اور سیٹھ جی کو تسلیم کرنا پڑا کہ معاملہ باضابطہ رجوع تو نہیں ہوا تھا لیکن بہرحال صاحب قبر ضرورت مند سیٹھانی کی صعوبت سے باخبر ہونے کے باوجود اگر یہ سمجھکر توجہ نہ کریں کہ ہم سے ایک شے مانگی نہیں گئی تو کم از کم ایک پیر کے لئے یہ تجاہل عارفانہ قابل گرفت۔

مولا فقیر نے اس پر کیسی کیسی لے دے کی کہ دیکھا کیجئے اور جو لوگ بیٹھے تھے اُن کے انصاف پر معاملہ کو چھوڑ کر مقدمہ کو جیت لیا۔ سیٹھ جی فوراً ہی بھیروں جی پر پل پڑے پچیس روپے سے بھی زیادہ وقتاً فوقتاً بھیروں جی کی چبوتری کے نذر ہو چکے تھے اور اصل پوچھئے تو یہ معاملہ اس دفعہ کلیتہً انہی کی عدالت خداوندی میں مرجوعہ تھا اور تمام تر مصیبت کی ذمہ داری انہی پر تھی۔

سیٹھ جی نے چند ضرورت سے زیادہ ناشائستہ کلمات بھیروں جی کی شان میں کہے۔

معاً بجلی کی طرح چمک کر ایک نوجوان راجپوت اٹھ کھڑا ہوا۔ اور خوں فشاں آنکھوں سے اُس نے سیٹھ کو دیکھا۔ کڑک کر چھاتی پر ہاتھ مار کر بولا "ابے او بنیے۔ بھیروں جی کو ایک بات بھی کہی تو زبان کاٹ لونگا تیری"

"تم کون بھیروں جی کے؟" کڑک کر سیٹھ جی بولے۔

"ہم بھیروں سنگھ کے لڑکے" راجپوت نے کہا "ہمارے دادا کے کوئی بیٹا نہیں ہوتا تھا تب بھیروں جی نے ہمارے پتا کو دیا"

"تم ہو بھیروں سنگھ کے لڑکے" لالہ جی نے تُند ہو کر کہا "ہم تو نہیں"

راجپوت نے کہا "ہاں ہم تو ہیں جب ہی تو ہم جھگڑیں گے تم سے کیوں تم بھیروں جی کو بدنام کرتے ہو"

"بدنام کیا کرتے ہیں"
"دیکھنا صاحب" راجپوت بولا "ذرا سیٹھ جی کو دیکھنا۔ بولو سیٹھ جی میری بات کا جواب دے جاؤ"
"پوچھو"
"تم نے بھیرون جی پر اب تک کیا چڑھایا؟ لڈو مٹھائیاں وغیرہ"
"اور نہیں کیا بکرا چڑھاتے؟"
"کس سے چڑھوایا اور کس سے اُنکی سیوا کروائی۔ اُسی چور برہمن سے نا"
"کون چور برہمن؟"
"ارے وہی گوپال مہاراج"
"ہاں"
اب راجپوت نے مجھے مخاطب کر کے کہا "اب ذرا انصاف کرنا۔ کہیں بھی آپ نے سنا ہے کہ بھیرون جی کا پُجاری برہمن ہو۔ ان سیٹھ جی کی عقل دیکھو۔ راجپوت اور پٹھان کی دعوت کریں گے اور کھلائیں گے دال بھاجی! نتیجہ کیا ہوگا! کھانے والا تھالی لوٹ کر مُنہ پر ماریگا۔ آئے وہاں سے بھیرون جی کو مٹھائی کھلانے والے"
"اور کیا بکرا چڑھاتے؟"
"بھینسا یا بکرا۔ اس کے علاوہ جو بھیرون جی کو مٹھائی کھلائے اُس سے زیادہ احمق نہیں۔ ذرا سوچو تو آپ کہ بکرے کا کھاجرو (قربانی) کر کے کلیجی اور خون تھال میں لگا کر بھیرون جی کو چڑھاؤ تب کام بنے گا کہ بنیوں کا کھاجا لڈو مٹھائی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ہم تو یہ پوچھتے ہیں صاحب کہ ایک دفعہ تم نے ہمارے ساتھ بے ایمانی کی تو پھر ہم تم سے بیوپار کرینگے کہ نہیں؟"
میں نے کہا "ہرگز نہیں"
"پھر ان سیٹھ جی مورکھ سے پوچھئے کہ یہ ذات کے بنئے اور بھیروں جی سے بیٹا مانگنے کیوں گئے"
"کیوں! کیا منع ہے؟"
"جب تم کو یہی نہیں معلوم کہ بھیرون جی بنیوں کے معاملہ میں نہیں سُنتے، تم بغیر کسی راجپوت کو بیچ میں ڈالے، گئے کیوں؟"
سیٹھ جی بولے "ہم نے تو کہیں نہیں سُنا کہ بھیرون جی بنیوں کو بیٹا نہیں دیتے"
"تم نے نہیں سُنا تو لو آج سُن لو۔ سُنو صاحب ان بنیوں کی حیرانی۔ ایک تھے سیٹھ جی وہ بھیرون جی کے یہاں پہونچے اور بولے ہے بھیرون جی مجھے بیٹا دو تو میں ایک بھینسا چڑھاؤ نگا! بیٹا مانگ کر سٹھانی کو گھر چھوڑ کر پردیس چلدے اور دو سال بعد لوٹے۔ سٹھانی سے پوچھا کہ لڑکا ہوا تو وہ خفا ہوئی۔ آپ بھیرون جی کے پاس پہونچے اور شکایت کی۔ بھیرون جی نے کہا کہ مُورکھ تو تو سٹھانی کو چھوڑ کر چلا گیا تھا بیٹا کیسے ہوتا! سیٹھ جی بگڑ کر بولے: واہ بھیرون جی واہ! ارے ہم کو جو بیوی سے ملنے کی فرصت ہوتی تو ہم تمہارے آگے ہی ہاتھ کیوں پھیلاتے۔ ارے تم دیوتا ہو کر اتنا بھی نہ کرو۔ واہ وا واہ! آپ تو دیوتا ہو کسی آدمی سے کہہ جاتے تو آج ایک چھوڑ دو لڑکے ملتے: ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

لوگوں نے زبردست قہقہہ لگایا۔

"... بھیرون جی دل میں بہت جلے کہ کیسا نالائق بنیا ہے۔ اُدھر سیٹھ جی بگڑ کر چلے گئے اور انہوں نے معاملہ اپنے پڑوسی رگھو جی کو سپرد کر کے پردیس کی راہ لی ......"

"پھر کیا ہوا؟" لوگوں نے پوچھا۔

"پھر ہمیں نہیں معلوم کیا ہوا اب دوسرے بنئے کا قصہ سنو۔ اس کے بعد بھیرون جی کے پاس ایک اور بنیا آیا اس نے بھی بیٹا مانگا اور وعدہ کیا کہ بھینسا چڑھاؤنگا۔ جب بیٹا پیدا ہوا تو مع بیوی اور بیٹے کے بنیا آیا۔ بھیرون جی نے پوچھا کہ بھینسا لائے ہو، تو ہاتھ جوڑ کر بولا کہ "ہے بھیرون جی لایا تو ہوں پر ایک میری عرض ہے"

بھیرون جی بولے "وہ کیا"

بنیے نے کہا "بھینسا تو ہے مگر اس کے دم نہیں ہے"

بھیرون جی نے کہا "مضائقہ نہیں وہی پیش کرو" بنیے نے پگڑی اتار کر اس میں سے ایک موٹی سی جوں نکال کر پیش کر دی اور ہاتھ جوڑ کر عرض کر دی کہ "ہے بھیرون جی اپنا بھینسا سنبھال لو۔ رنگ کالا ہے۔ دو سینگ گن لو اور چار پیر۔ رہ گئی دم تو آپ دیوتا ہیں اس کی معافی مل چکی ......"

لوگوں نے یہ سنکر خوب قہقہہ لگایا اور بولے "پھر کیا ہوا؟"

راجپوت نے کہا "پھر ہوا یہ کہ بھیرون جی قائل تو ہو گئے مگر بہت جان جلی اور جب ڈنڈوت کیلئے سیٹھ اور سٹھانی جھکے تو انہوں نے سٹھانی کا چہرہ زمین کے اندر ہی اندر سے پکڑ لیا اس طرح کہ وہ سجدے میں پڑی رہ گئی۔ بنیے نے بہت زور لگایا پر وہ نہ چھوٹی تو بنیے نے کہا کہ لاؤ جورو میں آگ دیدو۔ لہذا وہ آگ لینے گیا کہ اتنے میں بنیے کے بھانجے نے جو آگیا تھا ایک ایسی حرکت کی جس سے بھیرون جی کو ہنسی آگئی اور چونکہ وہ دانت سے سٹھانی جی کو پکڑے تھے لہذا وہ چھوٹ گئی۔ بنیا بھیرون جی کو دھوکا دیکر چلتا بنا۔ لیکن یہ بیٹا ماتا جی نے لے لیا، یعنی مر گیا، تو بنیا پھر روتا ہوا بھیرون جی کے پاس آیا اور وعدہ کیا کہ ابکے سچ مچ پورا بھینسا چڑھاؤنگا۔ فرق نہ کرونگا۔ بھیرون جی نے رحم کھا کر بنئے کو پھر بیٹا دیا۔ بنیا بھینسا لیکر آیا۔ مگر اس کو کاٹا نہیں۔ بلکہ بھینسا رسی میں بندھا ہوا تھا اس کی رسی بھیرون جی کی مورتی سے باندھکر ہاتھ جوڑ کر بھیرون جی سے کہدیا کہ ہے مہاراج میں بنیا ہوں بھینسا کاٹ نہیں سکتا۔ آپکے جسم سے باندھے دیتا ہوں جیسے جی چاہے اب اس کو کھانا پینا۔ یہ کہکر بنیا چلا گیا۔ بھینسا تھوڑی دیر تو مورتی سے بندھا رہا پھر بھوک پیاس جو لگی تو اس نے مارا زور ایک دو چار جھٹکوں میں مورتی جگہ سے اکھڑ گئی اور اب بھینسا بھاگا! بھیرون جی کی مورتی بہزار خرابی افتاں و خیزاں گلے کی رسی میں بندھی! بھینسا دیبی جی کے مندر کے سامنے سے بھاگا۔ دیبی جی نے گھبرا کر کہا "ارے بھیرون یہ کیا؟" بھیرون جی نے جلکر کہا "ماتا جی تم نے مندر کے اندر بیٹھ کر مزے سے بھوجن اڑاتے ہیں۔ کسی بنیے کو بیٹا نہیں دیا ہے۔ جو دیا ہوتا تو خبر پڑتی"

بمشکل دیبی جی نے اپنے پجاریوں سے بھیرون جی کو چھڑایا۔ بھینسا بھاگ کر اپنے گھر پہونچا جہاں سے بنیا قرض لایا تھا۔ بنیے نے کہدیا کہ اپنا بھینسا باندھ لو بدمعاش ہے چھوٹ گیا اور اب نہیں چاہیے۔ غرض بنیے کو بیٹا مفت پڑا ...... یہ قصہ سن لیا آپنے۔

[1] بھیرون جی کا مندر نہیں ہوتا بلکہ مورتی ہمیشہ کھلی جگہ ہوتی ہے۔ یہ دیبی جی کے لڑکے ہیں۔

اب آپ ان سیٹھ جی کی عقل کو دیکھو کہ چلے ہیں پنڈے پجاریوں کو بیچ میں ڈال کر بیٹا لینے! یہ تو ان کی عقل کا حال ہے، انہوں نے نہ معلوم سوچا کیا ہے۔"

سیٹھ جی بولے "ہمیں تو یہ قصہ نہیں معلوم تھا۔"

میں نے کہا "سیٹھ جی اس قصہ کو سُنکر تو کہنا پڑتا ہے کہ خیر مناؤ کہ ہر دفعہ دو لڑکیاں نہیں ہوئیں۔"

"گلا گھونٹ دیتا رانڈوں کا" سیٹھ جی بولے۔

راجپوت بولا "اب آپ خود سوچئے کہ اس میں بھیرون جی کی خطا ہے کہ ان کی۔ آگے جا کے پھر دیوتا ہیں۔ ایک دفعہ دھوکہ کھا گئے دو دفعہ کھا گئے نہ کہ ہر دفعہ۔ اور پھر نہ بھینسا نہ بکرا یہ سیٹھ جی چلے ہیں دال بھاجی سے بھیرون جی سے بیٹا لینے۔ اب سیٹھ جی اگر تم کو بیٹا لینا ہے تو لے ہمارے ساتھ آؤ ہم کیا۔ کسی راجپوت کے ساتھ بکرا الیکر جاؤ۔ کھا جرو کر کے کلیجی چڑھاؤ تازہ تازہ اور ایک بوتل شراب اور پھر دیکھو جو بیٹا نہ ملے تو پچاس جوتے میرے مارنا۔"

مولا فقیر بیٹھے سب سُن رہے تھے۔ ذرا کھنکار کر بولے "واہ موتی سنگھ جی واہ۔ خوب دیوتاؤں کو بدنام کرتے ہو۔ دیوتا نہ ہوئے تھانیدار ہو گئے کہ بن رشوت بات نہ کریں۔ کوئی بکرا نہ دے تو بیٹا نہ دیں۔"

"ہاں تو مُفت لے لو گے؟"

"مُفت! ارے لڑکر لے لیں گے۔ لڑ بھڑ کر جھگڑ کر۔"

"لے لیا، لے لیا، کہاں سے لے لو گے۔"

"ارے خواجہ سے لے لیں گے اپنے۔۔۔۔۔ دیکھو سیٹھ جی۔ جتنے دیبی دیوتا ہیں خواجہ صاحب سب کے اُوپر تعینات ہیں اور بغیر اُن کے حکم کے کچھ نہیں ہوتا۔"

"بالکل جھوٹ" موتی سنگھ نے کہا "خواجہ صاحب کا کسی دیبی دیوتا سے تعلق نہیں۔"

"ہرگز نہیں" مولا بولے "ہرگز نہیں۔ سب میں بڑا دربار وہی ہے۔ سیٹھ جی جو بیٹا لینا ہے تو وہاں سے لو۔ ہم کھڑے ہیں دیکھو وہیں کے دئے۔ اور بیٹی بتادیں۔ پھر وہ تو اُونچا دربار ہے وہاں کچھ رشوت نہیں چلتی۔ مفت ملتا ہے۔"

"پاگل ہوا ہے ڈوکرا" موتی سنگھ نے کہا "سنی نہیں چڑھتی وہاں۔ دیگ نہیں بھرتی۔ آیا وہاں سے۔"

مولا بولے "سب کچھ ہوتا ہے۔ پر لینا دینا مفت۔ اپنے خواجہ سے مانگ کر لو۔ نہ دے لڑ کر لو۔ اور نہ دے جھگڑ کر لو۔ ارے گالی دے کر لو۔ وہ ہر طرح دیتا ہے۔ آئیں سیٹھ جی اور بھریں خواجہ کا طاق اور مانگیں بیٹا۔ اگر نہ ملے تو اور کچھ نہیں کہتا یہ سفید ڈاڑھی مونڈ کے گدھے پر سوار کر کے گاؤں سے نکالدینا۔"

"ارے بڈھے، کیوں اپنی دُرگت بنوانے پھرتا ہے" موتی سنگھ بولا "چل اپنی راہ لے۔ آیا وہاں سے خواجہ والا۔ کیوں صاحب آپ کیا کہتے ہو؟ مفت مل جائے گا بیٹا؟"

میں نے کہا "بھئی میری دانست میں تو سوائے خُدا کے کسی سے بھی کچھ نہ مانگنا چاہئے۔ اگر بیٹا مانگو تو خُدا سے مانگو۔"

"اور خواجہ صاحب سے کیا مانگیں؟" مولا بگڑ کر بولے۔

میں نے کہا "خواجہ صاحب سے کچھ بھی نہ مانگو"
"پھر کس سے ؟"
"خدا سے" میں نے کہا۔
"ہر چیز ؟"
"ہاں"

مولا بولے "یہ لو صاحب نئی سنو۔ آم کا اچار بھی خدا سے مانگو! ... سن لو صاحب۔ گرم روٹی اور دال ہم تو گھر والی سے مانگیں گے ہاں آپ اپنے خدا سے مانگئے گا ..... واہ وا واہ! دین ایمان خدا سے مانگیں گے کہ بیٹا"

مولا نے جو حاضرین سے اپیل کی تو فوراً لوگ انکے طرفدار ہو گئے کہ ٹھیک ہے۔ خدا سے ہر شے مانگنا تمسخر ہوگا۔ ایک صاحب مجھ سے بولے "کیوں صاحب جنگل جانے کو میں روزانہ لوٹا مانگتا ہوں گھر والی سے توکل سے چلاؤں کہ ہے بھگوان لوٹا لائیو" اس پر ایک قہقہہ لگا۔

میں باوجود بحث کے ہار گیا۔ میں نے جلکر کہا "خواجہ صاحب دے ہی نہیں سکتے"
"یہ بات کہی آپنے" مولا بولے۔ اور آگے بڑھکر ہاتھ پھیلا کر بولے "دس دس روپیہ شرط"
میں نے کہا "اب تین لڑکیاں ہوگئیں اسکے ازخود لڑکا ہوگا"

مولا فقیر ذرا مٹک انداز سے سر کو جنبش دیکر بیٹھ گئے۔ یہ کہتے ہوئے "اب آپ کی جیت ہے۔ کیوں سیٹھ جی ٹھیک ہے نا۔ چلنے دو ناؤ جدھر بھی جائے"

موتی سنگھ بولا "ارے بھیرون جی سے اٹکے ہیں یہ ان کے سترہ چھوکریاں ایک سانس میں ہونگی۔ ورنہ بکرا چڑھائیں کسی اچھوت کو ساتھ لیکر"

بڑی دیر تک یہی گفتگو رہی اور میں دیکھ رہا تھا کہ مولا فقیر کا رنگ جم رہا ہے۔ میں تو اسی روز چلا آیا۔

(۴)

عرصہ بعد جب وقت اور موقع آیا تو مولا فقیر نے خواجہ صاحب کا طاق لیپ پوت کر تیار کیا۔ ایک طاق میں لیپ پوت کر پھول اور کلاوے ٹانگے اور لوبان اور اگر سلگایا گیا۔ یہاں رت جگا ہوا۔ خوب گانا ہوا۔ صبح گاتی بجاتی عورتیں گھر واپس آئیں۔ کیسے ؟

سنجر والے سے نینا لگاتے آئی رے!

اور ادھر مولا فقیر وجد میں "بڑے سے نینا لگائی ہے تو نے ..... ارے لے لے اپنے پیا سے جو تیرا جی چاہے۔ بڑے سے آنکھ لگائی ہے"

اجمیر کے میلے کے دن قریب تھے اور جلدی مولا فقیر سٹھانی جی کو میلہ لے گئے اور وہاں سیٹھ اور سٹھانی نے خواجہ سے بیٹا مانگا۔ سٹھانی نے پوچھا "کیسے مانگوں ؟"

مولانا نے کہا "بیٹی۔ میں کیا جانوں۔ تو جان تیرا خواجہ! ایک عورت اپنے خاوند سے زیور کیسے مانگتی ہے ؟ ہاتھ جوڑ کر۔

خوشامد کر کے، راضی کر کے، لڑکر، رُوٹھ کر، جھگڑ کر، بگڑ کر، اور گالی وغیرہ غرض سب طرح مانگتی ہے۔ اب تو جان اور تیرا خواجہ۔ مانگ جیسے جی چاہے، چاہے خوشامد سے چاہے گالی دیکر۔ . . . . دیکھ بیٹی میرے باپ نے مجھے مانگا تھا تو خواجہ سے لڑ کر اور یہ کہکر کہ گنبد توڑ ڈالونگا ورنہ بیٹا دے۔"

"پھر کیا ہوا؟" سیٹھ جی بولے۔

"کھڑے تو ہیں ہم تمہارے سامنے ساٹھ برس کے۔ دیا۔ ہزار دفعہ غرض پڑی دیا۔ لہذا جیسا تمہارا دل بولے اور جیسی تمہارے دل میں خواجہ کی لگن ہو اور جیسا بھی پریم ہو تم جانو اور اُسی طرح مانگو اور پاؤ۔"

سیٹھ اور سیٹھانی نے جیسے اُن کا جی چاہا بیٹا مانگا۔

(۵)

چار سال بعد میرا پھر اُس گاؤں میں جانا ہوا۔ مَیں رات کے دسؔ بجے کی گاڑی سے پہونچا۔ تھکا ہارا کھانا کھاکر سو رہا۔ شب کا اخیر حصہ حد درجہ خنک اور خوشگوار تھا۔ میں نے ایک کروٹ لی اور سوتے اور جاگتے کے عالم میں ریگستان کی میٹھی میٹھی ہوا کے ساتھ آواز آئی:۔

چل ری سکھی اجمیر گلی جہاں سنجر والا سانولیا

جھاجھم۔ چھما چھم،

اور یہ آواز آہستہ آہستہ دُور ہوتی چلی گئی۔ ڈوبتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ڈھول کی خفیف سی آواز کا شائبہ رہ گیا اور ہوا کے ہلکوروں کے ساتھ معلوم ہوتا تھا کہ ریگستان کی طرف سے آواز آرہی ہے:۔

چل ری سکھی اجمیر گلی جہاں سنجر والا سانولیا

صبح اُٹھکر سیٹھ جی سے ملا۔ معلوم ہوا کہ اجمیری مل کو لیکر عورتیں چار بجے کی گاڑی سے اجمیر کے میلہ کو گئیں! اور جب کبھی خواجہ کا ذکر آتا ہے میرے کانوں میں وہی میٹھے سُروں میں آواز گونجتی ہے:۔

چل ری سکھی . . . .

عظیم بیگ چغتائی

بے پرکی

"چاگریم! چاگریم! کیا گرما گرم ہے! چاگریم! چاگریم"

صبح ہی صبح کھرج کے سُروں میں کسی کے بلغم آلود بھونڈے گلے سے یہ صدا نکل کر فضا میں تھرّائی اور ایک خس پوش مکان کے اندر سُننے لے تو یہ سونے والے کے دماغ میں جھنجناتی ہوئی سارے جسم میں برقی رَو کی طرح لہرا گئی۔ رگ پٹھے کھنچے۔ ہات پاؤں ہلے۔ حواس میں دھینگا مُشتی۔ بیداری و خواب میں جوتی پیزار ہونے لگی۔

اتنے میں دیوار کے اُدھر سے ایک موٹے تازے الست جغادری نے لال لال چقندر سا مُنہ نکال کر نیچے جھانکا تو خالی میدان۔ آدمی نہ آدم زاد، ہو کا عالم، ناشتے کی فکر، کچھ سیمابیت کا تقاضا، نہ رہ گیا، بدن کو تول، کنگنی کو تھام، لٹکا ہی تھا جو تڑسی ایک بڑا سا پپڑ اُکھڑا! گرفت چھوٹ گئی اور مَنو میاں بوکھلا کر گرتے ہیں تو گھڑونچی پر اڑرڑڑ دھم!

گرہستی کا یہ کار آمد جزو، کہنگی میں اپنا آپ ہی جواب، عالی ظرفی کہیے یا وضع کا پاس، کہ آج تک بھرے مٹکے کا ساتھ نباہ رہی تھی، اب وزن ہوا المضاعف، لنگر نہ جھیل سکی، چولیں ڈھیلی، انجر پنجر الگ، چرچرا کے بیٹھ گئی، مٹکا ڈھیکلی کھاتا، اپنے محور پہ آپ گردش کرتا، ہبّق ہبّق کہتا ہوا وہ گیا۔

چکنا گھڑا، غیرت کا پتلا، بنا بنولے کے صدقے جائیے، پھوٹا تو نہیں ہاں صحن بھر نینی تال ہو گیا،

ساتھ ہی بس کھٹیا کے جوف سے کسی نے آدھے دھڑ سے اُٹھ کر پٹی تلے کچھ ٹٹولا۔ ہوا میں سنّاٹا ہوا، اور کھنا نا نا کی آواز آتے ہی بگاہ جو اُٹھتی ہے تو آئیں! سُبحان اللہ! انگنئی میں بینا بازار لگا ہوا ہے! گرم مسلے کی پڑیا۔ افیون کی ڈبیا۔ پیتل کی سرمہ دانی جست کی سلائی۔ زنگ خوردہ سوئیاں۔ ہاتھی مار پیچک۔ کاٹھ کا کنگھا۔ ٹین کا آئینہ۔ بالوں کی صافی۔ کتھے چونے کی کلھیاں چھالیہ کا چورا۔ تماکو کا قوام۔ چورن کی گولیاں۔ ان سب میں سر برآوردہ خود پانوں کی پٹاری اور اس بے ترتیبی کے ذمّہ دار گودڑ میں لپٹے ہوئے میاں گپّو!

گپوا۔ "ابے لے! میں کہتا ہوں شامتوں نے تو نہیں گھیرا ہے پاجی کی"۔ ڈانٹ کر۔ "پھینک آئینہ، بڑے شوقین کی دُم بنے ہیں بیٹا، کسی دن باندھ کے مشکیں حوالے کر دونگا مداری کے، ساری فیلسوفی نکل جائیگی"۔

جغادری پھبکی دے کے جست جو کرتا ہے تو چھپّر پہ، اور دہاں سے ایک زقند میں آئینہ سمیت نو اور دو گیارہ، چلنے فیصلہ ہوا۔

گپوا۔ "لیجیے یہ تو پیمبری وَخت پڑا ہے گھر میں رونے کو آنسو تک نہیں، دہاں مفلسی میں آٹا گیلا، اور ٹھگ گئی بارہ ڈبل کی۔ یہ نہ لے گئے افیم کی ڈبیا۔ سُونگھتے ہی ڈھیر ہو جاتے چڈا"! بآواز بلند۔ "مرزا صاحب۔ لے حضرت مرزا صاحب"! جواب نہ پاکر "اچھا ہی ہوا واللہ جو آنکھ نہیں کُھلی، ہے ہے اگر جو کہیں پٹاری کی یہ گت دیکھ پاتے۔ توبہ ہے۔ پنجے جھاڑ کے پیچھے ہی تو پڑ جاتے۔ مرزا جی ہیں کہ معاذ اللہ کی پناہ!"

یہ کہکر میاں گپّو نے جلدی جلدی بکھری ہوئی دکان سمیٹی اور رزائی سے جھاڑ پونچھ کر پٹاری کو آراستہ کر دیا۔ اس سے فارغ ہو کر آگ سُلگائی۔ توا جمایا۔ حقہ پیا اور گھر سے نکلے تو سیدھے مٹھو کے ہاں گلی کے نکڑ پہ تو گھر ہی تھا جاتے ہی کُنڈی کھٹ کھٹائی۔

اندر سے "کون ہے بخت؟"

گپوا: "ہم ہیں بھائی اور کون ہے"

مٹھو۔ دروازہ کھول کر "بندگی ارج ہے سرکار کہئے حکم"

گپوا: "حکم وکم نہیں۔ یہ لو اپنی دھلائی کے پیسے خبردار"

مٹھو۔ پیسے لیکے "سلامت رہیئے جلدی کیا تھی پھر آجاتے۔ چھ ڈبل کی بھی کوئی آبرو ہے"

گپوا: "نہیں ماں یہ کہنے کو نہ ہو کر بے مار تھے۔ لے کے مزدوری چلدے"

مٹھو: "خیریت! یہ آج کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ طبیعت تو نہیں ماندی کچھ؟ ایکے تو وہ جوڑی بکھار کی ہوا چلی ہے کہ ماج اللہ تین دن سے بسنتی کی اماں پڑی ہیں تو ہوس نہیں نا"

گپوا: "اماں جوڑی بخار جس" بہن کی گالی دیکر "کو آتا ہوگا اسکے تیر آتا ہوگا۔ یہاں اور ہی آزار لگا ہے"

مٹھو۔ مونڈھیا دیکے "آیئے تو بیٹھ جایئے تسریجہ رکھیئے، کھڑے کب تک رہیئے گا۔ حقہ منگواؤں، بھر رہا ہے، بسنتی بسنتی بیٹا اٹھو، دن نکل آیا، جری گفور میاں کو حقہ تو بھر دو"

گپوا۔ بیٹھ کر "نالت ہو ماں حقے پر، یوں ہی پنڈا سلگ رہا ہے حقہ کیا ہوگا"

مٹھو: "اسے وہ مرجاجی آپکے نہیں دکھائی پڑے کئی دن سے۔ کیا کہیں باہر گئے ہیں"

گپوا۔ بڑے تیوروں سے "ہٹاؤ تم بھی کس نسوڑے کا نام لیتے ہو سویرے سویرے، روٹی بھی نہ ملے گی، ہمیں ان سے اب واسطہ کیا، جس کے دوائے نہ جانیے اس کے کوس گننے سے مطلب"

مٹھو: "یہ کیا، میں سمجھا نہیں"

گپوا: "ہیں [illegible] تو سب ہوگیا نا"

مٹھو: "نہیں یہ کیوں، کسم لے لیجئے جو ہم نے سنا بھی ہو، دیکھنے میں تو مرزا بڑے میاں آدمی معلوم دیتے ہیں ہاں اک جری جھلے بے سک [illegible]"

گپوا: "جھلے سے جھلے! اور آدمی کی بھی ایک ہی کہی تم نے۔ ماں سنا نیت کے جامے میں ہوتے تو نخلے بھر میں آج یہ حاشرات بھی برپا ہوتی"

مٹھو: "کیا مارکا ہوا کچھ کہئے تو؟"

گپوا: "مارکا دار کا کچھ بھی نہیں، شیطان نے انگلی دکھا دی ہے۔ پچھلے پہر سے شیخ سدو کھیل رہے ہیں سر پہ، جی اور کیا"

مٹھو: "ایسی تو ہیں ہی، لنے بانج آدمی"

گپوا: "نشہ وشہ کچھ نہیں، مراق ہے، سودا ہوگیا ہے، کھا پکیے اچھے خاصے سوئے، تین پونے تین بجے کا عمل ہوگا آنکھ کھلی، حقہ مانگا۔ اب یہ تو سردی دیکھئے تو ڑکا دخت، اور ہمارا اٹھنا دیکھئے، مل بھیا نابیداری تو بری شے ہے تم جانو، اٹھے بھائی، حقہ بھر کے دیا تو لگے بکواس کرنے کان کھانے، پڑے پڑے ہوک جو اٹھی تو کیا کہتے ہیں تمہیں واللہ ہے مٹھو ذرا سننے کی بات ہے کہ میاں غفور خاں سویرے تو چاند کی تیرہ تاریخ ہوگی، میں نے کہا کہ بہر باشد، تو فرماتے کیا ہیں ماں تم بڑے واہی ہو بھول گئے ہماری سالگرہ کا دن ہے، اس پر میں نے کہا کہ حضور تو بے وخت کی شہنائی بجاتے ہیں یہاں نیند میں اپنے حساب کس" بہن کی گالی دے کر "کو کچھ یاد ہے۔ دن بھر کام کاج میں جتے رہے۔ ماریلیتھن نکل گیا، آپ آدھی رات کو سالگرہ لے کے بیٹھے ہیں، کیوں بھئی کچھ جھوٹ کہا میں نے؟"

مٹھو: "لے اب ہم سے کوئی بات چھپی ہے"

گپوا: "لے تم جو، بس میاں کہنے لگے جلسہ ہوگا۔ کاشمیری ناچیں گی، یار دوستوں کے جمگھٹ رہیں گے، یہ ہوگا وہ ہوگا، اور ہاں بھئی غفور خاں شگن کی فکر تو ہوئی نہیں اب تک، اسی سوچ میں ہوں، بھئی تمہیں کو کرنا پڑے گی۔ کاشی دیش کے ایک پنڈت جی مہاراج دھرم شالے میں آن کے ٹکے تھے وہ نجوم دیکھ کے بتا گئے ہیں کہ خبردار منگل کے دن سالگرہ پڑے تو دکھن رخ کھڑے ہو کر منہ پر گلشن لیٹ کا رومال ڈال کے پہلے ایک گدھے کے درشن کر لینا تب گرہ لگانا، سال بھر تو سکھ چین سے کٹے گی، دوست آباد، دشمن بیری پامال، میں بھک تو رہا ہی تھا پڑا پڑا۔ یہ سنتے ہی اور آگ لگ گئی تن بدن میں، اور شامت جو آوے بھائی مٹھو نا؟ تو چھوٹتے ہی بھوٹے منہ سے نکل گیا کہ اس میں فکر کاہے کی، آپ منہ پر رومال ڈال کے دکھن رخ کھڑے ہو جایئے گا، میں آئینا دکھا دونگا، گدھے کی شکل نہ نظر آجاتے تو چور کا حال سو ہمارا حال، لے حضت اتنا سننا تھا کہ مرزا آئیں تو جائیں کہاں، بپھر ہی تو پڑے، لاکھوں مادیدر کی سنائیں، بالوں کی پٹاری رکھی تھی جھانجھ میں وہ اٹھا کے کھینچ ماری زن دینے، امام حسین قسم خالی نہ دوں تو بھیجا ہی نکل پڑے، جی اور کیا، غرضیکہ کہاں تک کہوں وہ تو تو میں میں ہوئی کہ بناہ بخدا۔ بکتے بکتے اب تھکے ہیں تو پست ہو کے پڑے ہیں"

مٹھو: "تو یہ کہیئے بڑا جھنجٹ ہوگیا، پھر اب؟"

گپوا: ایں اب کیا، نہ وہ مالک نہ ہم نوکر، بھاری پتھر تھا چوم کے چھوڑ دیا، ہات پاؤں سلامت ہیں ہزار نوکری، رزق کیا ایک انہیں پر موقوف ہے، پر دیکھ لینا مٹھو اپنی آنکھوں سے، ہم تو نہ ہونگے جو یہ مرزا کوڑی کوڑی کان نہ مانگتا پھرے۔"

مٹھو: "سچ ہے گریب کی آتما کا ستانا نہیں اچھا، وہ دیکھئے بھلا سا نام ہے ان کا مصاحب گنج میں رہتے ہیں، بڑے بانکے بنتے ہیں، کپڑے لے کے جو ان کے یاں آج تیسرا دن ہے جاتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں ایک اودھم ایک اودھم، عالم ہوا کہ ماما کی کندی ہو رہی ہے اور ماما ہے کہ کلپ کلپ کے کوسنے دے رہی ہے، پانی بھری ڈیگچی لے کے چلی، جھلا تھا، رپٹ پڑی، یہ بھی ساری کتھا، بس حجت میں تو کانپ گیا، اور کان دبا کے چلا آیا، مجوری گئی اپنی ایسی تیسی میں، اب دیکھئے مالک کی سان، وہی بانکے جوتے میں دھرے گئے، ٹنڈیاں کسی گئیں، منہ ڈھانپے تلنگے ساتھ کل چوک میں جا رہے تھے۔ میں کیا کہوں"

گپوا: "پھر بیجا کیا ہی، سزا ہے بدت کی۔"

مٹھو: "کل ایک بات ہے حجت، مرجاجی نے اسرا بہیت نہیں برتی وہ جانیں، آپ ان کی برتری کیوں کریں، ہے کہ نہیں؟ کتے نے کاٹا اب کتے کا کون ٹھور کاٹے"

گپوا: "اور سنو بھائی کی باتیں، ناصاحب اب تو مرزا کی ہفتاد پشت بھی قبر سے اٹھ آئے تب بھی غفور خاں ان پر پیشاب نہیں کرنے کے، نا بابا یہ پی ہزار لعنت کھائی، وہ آدمی ٹھیرے جھنجھٹی، ہمارے کون گدھا ڈھونڈتا گھومے گا انکے لئے"

مٹھو: "اے گدھا بھی کوئی انول چیج ہے، منہ ہی تو دیکھنا ہے جری کے جری، سو بھیا گفور مرجا تو کیا مل تمہارے لئے مجود ہے، آگے تم جانو۔"

گپوا۔ دل میں خوش ہوکر: "خوش رہو تم، تمہارے بال بچے جئیں، اتی بات تو کہی تم نے، میاں اس کلجگ میں کون کسی کا یار ہوتا ہے"

مٹھو: "وہی تو میں نے کہا کہ کیوں برس برس کے دن مرجاجی کا سگن بگڑے اور تم بھی رجگار سے کیوں جاؤ، بن تنک کو، نوکری آج کل بھیا ڈل پاس کو تو ملتی نہیں ہماری تمہاری کون حکیکت"

گپوا: "اب بھی تم کہتے ہو تو اتنی مجال نہیں میری کہ تمہاری بات ٹال دوں، اور تم بھی ہمارے ہی بھلے کی خاطر کہہ رہے ہو بیچارے مگر تمام عمر کیلئے تمہارا احسان ہوا ہماری گردن پہ"

مٹھو: "واہ میاں کوئی بات ہے یہ بھی، دئے سے دیا جلتا ہے۔ بن تنک کانٹوں میں گھسیٹتے ہو گفور خاں" حقہ پی کر "لے حجت میں تو جاتا ہوں گھاٹ پہ آج باتوں میں دیر ہو گئی۔ تم آپ آکے لے جانا، نہیں بسنتی پہونچا دیگی"

گپوا: "واہ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ لا دو دے لدا دے لادن ہارا ساتھ دے، میں آپ لئے جاتا ہوں پھر فرصت کسے ہوگی۔ الغا دن کام کرنا ہے، فرش فروش کرنا، دعوت کا سرانجام، پھر لوگوں کو بلانے چلانے بھی جانا ہے"

مٹھو: "اے ہاں گفنو رکھاں کون کون سے تائفے آئیں گے، جو ہر یوں میں آج چار دن سے رس ہو رہا ہے، متھرا والے گئے ہیں ان کو جرور کر کے بلوائیے گا۔ ان میں ایک لونڈا ہے تو کالا سا مل آج وہ پائی ہے اپنے حساب کو ملیا کو کتی ہے میں کیا کہوں"

گپوا: "دو زنانے طائفے ہیں، حسنا کو بھی کھڑکی گئی ہے مل وہ آتی نہیں دکھائی دیتیں۔ کاشمیریوں سے مرزاجی خود کہہ آئے ہیں اور ہمیں معلوم نہیں"

مٹھو: "اور ڈومنیاں نہ آئیں گی کیا؟ مبارکباد کون گائے گا حجت، یہ تو بھول ہی گئے"

گپوا: "خوب یاد دلایا تم نے اس وخت مٹھو، دیکھو ابھی جا کے انکو اٹھاتا ہوں، اور ہاں تم انام لینے نہ آؤ گے کیا، جلد بھی دیکھنا اور اپنا حق بھی لینا"

مٹھو: "ہمارا تو دہرا حک ہوا نا؟ سلامت رہیئے"

گپوا: "گلے گلے پانی"

گھر آکے دیکھا تو مرزا صاحب اکڑوں بیٹھے پینک کے مزے اڑا رہے ہیں، حقہ منہ سے لگا ہوا ہوا کے جھوکے کھا رہا ہے:

گپوا: "مرزا صاحب مرزا صاحب"

مرزا: "ہوں ہوں"

گپوا: "اے اٹھئے قبلہ، سوا پہر دن چڑھنے آیا"

مرزا پینک میں: "تو جب ملکہ شمسہ تاجدار نے امیر با توقیر کے.. ..کے...... کے"

گپوا: "اے ماشاء اللہ داستان اڑ رہی ہے، اہو ہو ہو" شانہ ہلا کر "مرزا صاحب مرزا صاحب"

مرزا گھبرا کے چونکے، حقے میں ٹھیس لگ گئی اور نہال دو انگل ناک میں اتر گئی، چلم گرتی ہے تو رزائی پر آگ ہی آگ

مرزا: اماں جانی مرزا صاحب کہاں گئے؟"

گپوا: "جانی مرزا وانی مرزا گئے بھاڑ میں، نئی رزائی جل کے بھسمت ہو گئی"

مرزا۔ (ادھر اُدھر دیکھ کر) لاحول ولاقوۃ یہ کب؟ اور مردود تو کھڑا باتیں بنا رہا ہے، یہ نہیں ہوتا کہ آکے بجھا دے"

گپوا: "حقہ کا پانی رزائی پر چھڑک کر" یاد نہیں رہا میاں چوک ہو گئی، خطا ہوئی"

مرزا: اور یہ تھے کہاں اتنی دیر سے آپ آوازیں دیتے دیتے گلا بیٹھ گیا قسم قرآن کی۔ خود حقہ بھرنا پڑا"

گپوا: "سودے سلف کو گیا تھا اور کہاں تھا"

مرزا: پھر لایا؟"

گپوا: لایا نہیں لاتے کہیے، سُبوں سُبوں بدکلامی نہیں اچھی"

مرزا: ہاتے سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ پھر بھی نہ کہا کہ سودا آیا کہ نہیں"

گپوا: "جی نہیں"

مرزا۔ (بگڑ کر) اور رات کو ہم نے جو حکم دیا تھا وہ کچھ نہیں، ناپوں گردن اُڑا کے"

گپوا: آپ تو حق بے نحق کو تیز ہوتے چلے جاتے ہیں، سودا لاتا کہاں سے؟ بازار بھر سونا پڑا ہے، کانی چڑیا تک تو ہے نہیں، نانبائی کی دکان بند، حلوائی کی دکان بند، بنیہ کی دکان بند"

مرزا: آخر یہ سب کہاں مرگئے ہیضہ لے گیا یا طاعون کھا گیا؟"

گپوا: دنیا جہان کی آپ کو خبر تک تو ہے نہیں، وہاں چار بجے رات سے مخلوق ریل پہ ڈھلی چلی جا رہی ہے۔ روپے سواری کو تو اکے والے دھتا بتاتے ہیں، پانچ پانچ روپے کھیپ لد رہی ہے"

مرزا: افوہ غفور خانصاحب اب یاد آیا آج تو وہاں افیم کا میلہ ہے نا؟ ہات تمہارے ندیدوں کی ایسی کی تیسی، پانچ روپے سواری کر دی"

گپوا: یہ بھی ہے اور لاٹ صاحب کی سواری بھی آ رہی ہے"

مرزا۔ (متعجب ہو کر) ہائیں! کون؟ منور الدولہ بہادر کا جلوس نکلیگا۔ تو یہ کہیے بعد مدت کے آج آنکھیں سکیں گی!"

گپوا: کیا مشکل ہے، ہم کہیں کھیت کی وہ سنیں کھریان کی، اے حضور منور الدولہ مرستان پہونچے۔ لاٹ صاحب! لاٹ صاحب"

مرزا: کلکتے والے کو کہتے ہو نا؟"

گپوا: اب کلکتہ بمبئی تو آپ جانیں، ہم نے تو سب سے یہی سنا کہ لاٹ صاحب کی سواری نکلے گی"

مرزا: ہاں ہاں جی ہم کس کو نہیں جانتے تمہاری طرح جاہل نہیں ہیں بے پڑھے ہم"

گپوا: تو اُٹھیے گا بھی یا کھٹیا پہ پڑے پڑے بڑیں ہانکیے گا۔ ریل چلنا ہے کہ نہیں، لال کرتی الگ جانا ہے، آج تو مار کام ہی کام ہے"

مرزا: (اُٹھ کر) مگر یار یہ تم نے بری سنائی کہ سواری نہ ملے گی، ہال اور لام کیسے گدھا؟"

گپوا: آپ کا ہل وجود میں تو دنیا تھوڑی اُٹھی ہے، یہاں تڑکے اُٹھے جھاڑو بہارو کی، گھر سے نکلے، بنیہ ملا نہیں، سٹھائی کے بات پاؤں جوڑ کے حضور کی جامدانی نکلوائی۔ بازدواں مٹھوا کے گھر گیا، بامشکل اس کو راضی کیا تب کہیں آٹھ آنے مہینے پر گدھا ملا، اتنی تو محنت کی ہم نے اور انام ملا یہ کہ فضول بے فضول کو آپنے اتنی صلواتیں سنائیں، اور کہہ لیجیے دو چار دن ہے ہم کہاں اور آپ کہاں"

مرزا: سچ ہے ع جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے، مگر بھئی گدھا لات وات تو نہیں مارتا"

گپوا: اے حضور وہ ٹھمک ٹھمک چلتا ہے کہ لوگ تماشا دیکھتے ہیں۔ گدھے پر نہ بیٹھے اپنے حساب اُڑن کھٹولے پر بیٹھے، جی اور کیا"

مرزا: "مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اتنی ہی جگہ ٹھیری انگنی میں۔ یہ بندھیں گے کہاں اور کھائیں گے کیا"

گپوا: پھر تو آپ برا مانتے ہیں جو آپ کی کوئی گستاخی کرتا ہے، مگر ہے یہ کہ حضور ہیں نرے بودم۔ ہم سے سنئے وہ ترکیب بتائیں جو آپکے دادا جان کو بھی نہ سوجھی ہو گی"

مرزا: کیوں بے یہ نانا دادا کیا؟ ایں یہ نانا دادا کے کیا معنی؟ آ گیا رذیل اپنی ذات پر، کہیے توبہ اسی میں خیر ہے کہ آئندہ یہ حرکت نہ ہوگی"

گپوا: واہ ری دنیا! کیا قدر دانی کی ہے، اے حضور پہلے تو سن لیجیے پھر توبہ تلا کرائیے گا، سنئیے حضور نے پوچھا، بندھے گا کہاں، غلام عرض کرتا ہے کانجی ہوز میں، کھائیگا کیا کہیے سرکار کے سر"

مرزا۔ (اچھل کر) بھئی سچ کہتے ہو قسم قرآن کی سچ کہتے ہو، واللہ نانا دادا کیا معنے ہماری چھتیس پشت کو بھی یہ ترکیب نہ سوجھی ہوگی پھر خانصاحب پہونچا دیا ہوتا انکو وہیں"

گپوا: "نہ میاں غلام سے یہ نہ ہوگا، رات سے گھومتے گھومتے یہ وقت
آیا ہے، حضور خود تکلیف کریں، چار قدم پر تو کانجی ہوز ہے۔" اپنی
رزائی دے کر یہ اوڑھ لیجئے اور رسی پکڑ کے نالے نالے چلے جایئے
لوگ سمجھیں گے کوڑا او وڑا ڈالنے جا رہا ہوگا، یا نالی صاف کرتا
ہوگا۔"

مرزا ۔ گردن ہلا کر۔ "کیوں حضرت نواب ہم حلال خور ٹھیرے؟ اصل
یہ ہے کہ غفور خاں تم اس قابل ہو کہ توپ دم کرا دئے جاؤ قسم
قرآن کی۔"

گپوا: "حلال خور نہ سہی حرام خور سہی، اب خوش؟"

مرزا: "کیوں صاحب حرام خور کس طرح، غفور خاں ثابت کرنا پڑیگا
تم کو، جو نہ ہوا تو یاد رکھنا کہ گولی مار دونگا ابھی واللہ۔"

گپوا: "اچھا بھلا بتایئے حضور زہر کھانا کیسا؟"

مرزا: "حرام قطعی حرام۔"

گپوا: "اور افیم؟"

مرزا: "زہر قاتل، سنکھیا، ہلاہل۔"

گپوا: "اور آپ؟"

مرزا: "کھاتے ہیں اور بیچ کھیت کھاتے ہیں۔"

گپوا: "اب بتایئے آپکے دشمن کیا ہوئے؟ نہ کہیئے کا کیسا نچا کھایا۔"

مرزا ۔ جھینپ کر۔ "ایں استغفراللہ، میاں خانصاحب تم جیتے
ہم ہارے۔"

گپوا: "کہہ دیا سمجھا دیا کہ یاروں سے نہ بل کی لیا کیجئے، وہ ہیں کہ
نہیں سنتے نہیں مانتے۔"

مرزا: "اچھا تو بھئی لاؤ پہونچا دوں، ابھی تڑکا ہے۔"

گپوا: "اور غلام اتنی دیر سے کیا جھک مار رہا تھا، مگر سنتے جایئے
منشی پوچھے تو کہیں اپنا نام نہ لکھا بیٹھئے گا، ہاں، آپ تو ٹھنڈے
ٹھنڈے نام یہ سدھاریں یہاں ہم دھر سے جائیں، خواہ مخواں کی الیسٹھ
ہو، مٹھو کا نام لے دیجئے گا۔"

مرزا ہنسکر۔ "بڑا حرفتی ہے، بڑا حرفتی ہے۔"

گپوا: "تسلیم۔"

مرزا نے گپتو کی رزائی لی، گدھے کو چمکارا اور نالے نالے
چلے تو کانجی ہوز، گدھا داخل دفتر، اور تھوڑی دیر میں خوشی خوشی
مرزا واپس ہوئے تو پھر وہی گپتو۔

مرزا ۔ حمام پہنچتے پہنچتے: "ارماں غفور خاں خضاب تیار ہے۔"

گپوا: "حضور بڑی دیر سے آپ چار پی کے کوٹھڑی میں چلئے میاں یا۔"

مرزا: "عجب نامعقول ہے قسم قرآن کی، ابے دھوپ یہاں ہے یا
کوٹھری میں۔"

گپوا: "حضور تو جب دیکھئے گھوڑے گدھے پہ اتراتے ہیں، ابھی قابل
ماتول ہو چکے ہیں، لے صاحب روشنی میں رنگ شرمائے گا کہ نہیں،
اب آپ سے کون کہے۔"

مرزا: "کہتے تو ٹھیک ہو بھئی۔"

کوٹھری میں چلے گئے اور بیٹھے ہی تھے کہ گپتو مٹی کے تیل
کی کپی لئے آپہونچا۔

مرزا: "یہ کیا؟ خضاب کی پیالی اور چمچی کہاں ہے؟"

گپوا ۔ کپی جلا کے: "پیالی ویالی کیا ہوگی، آپ اک ذری پاؤں لٹکا کے
آرام سے بیٹھ جایئے، میں نیچے سے لو دکھا دوں، لمحے بھر میں تو ڈاڑھی
کجراتی ہے، اوپر سے ذری سا مغز کدو کا تیل مل دیں گے، چمک
اٹھے گی۔"

مرزا ۔ گپتو کا کان پکڑ کے: "کیوں بے الو کے پٹھے جان لینے کی فکر
کی تھی، اور سنئے بد ذات نابکار کی، اور جو ذری بالوں کو لپک چھو
جاتی تو؟"

گپوا: "مہینوں کو فرصت ہو جاتی۔"

مرزا ۔ کان چھوڑ کر: "دور ہو کمبخت سامنے سے۔"

گپوا: "میں نے کیا بے جا کیا، انصاف تو چھو نہیں گیا آپکے، دس
بج چکے ہیں دو کوس زمین ناپنے کو پڑی ہے، خضاب لگاتے دھوتے
بارہ بجتے کہ نہیں۔"

مرزا: "بخشیں آپ، ہم درگذرے ایسے خضاب سے قسم قرآن کی، اچھا
ہماری جامدانی لاؤ۔"

کپڑوں کی بقچی آئی اور گپتو گیا۔

مرزا: "ارماں غفور خاں یہاں تو آنا ذری۔"

گپوا: "کہیئے حاضر۔"

مرزا: "یہ دوشالا بھی دیکھا تم نے؟"

گپوا: "لے حضور کی بھی کیا باتیں ہیں، غریبوں کی نگہ سے ایسی نادرات
چیزیں گزر سکتی ہیں بھلا، مل حضور ہاتھ چوم لے کاریگر کے، کیا جھنجھریاں
رکھی ہیں موقع سے واہ وا، جاڑے گرمی دونوں کے کام کی۔"

مرزا: "جی جناب آپ کیا سمجھتے ہیں، یہ خاص حضرت سلطان عالم
محمد امجد علی شاہ بادشاہ غازی کے اوڑھنے کا ہے۔"

گپوا: "بجا ہے۔ عاقبتی جوڑے پر کا ہوگا"
مرزا: شال پھینک کر "ہائے نہیں ملتی نہیں ملتی جو ایک ہی وار میں اس مردک کا قصہ پاک کر دوں۔ کیوں جناب یہ ہم مُردوں کا مال پہنتے ہیں، ایں گستاخ بے ادب"
گپوا: "حضور بھی پورے زانغلول ہیں۔ میں نے یہ کہا کہ حضور پہنتے ہیں، یہ تو بڑے مرزا صاحب مرحوم کو ملا ہوگا"
مرزا: "اور نہیں کیا ہم کو۔ پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا تھا"
گپوا: "بندہ بشر ہی تو ہو گئی بھول"

مرزا صاحب نے پوشاک بدلی۔ کھلی نہری کا زرد شروع کا پیجامہ۔ سیاہ دبیز کا اونچی چولی کا انگرکھا۔ سر پہ سُرخ مندیل۔

مرزا: "گپو ذری لانا تو آئینہ"
گپوا: "آئینا دیکھ کے کیا کیجیئے گا، ہمیں تو حضور عین مین . . . ."
مرزا۔ گرم ہو کر "ہاں کیا عین مین، گدی سے زبان کھینچ لونگا جو ذرا بھی اس وقت گستاخی کی تو نے!"
گپوا: "جی سُن تو لیجیئے۔ میں کہتا تھا کہ حضور عین مین اپنے والد معلوم ہوتے ہیں اس وقت، وہی سج دھج، وہی ٹھاٹ ہیں بالکل، بس ایک اُس کی کسر ہے"
مرزا: تیکھے چتون سے "جی، کا ہے کی۔ منہ کو ذرا لگام دے تجنے کہہ دیا ہے"
گپوا: "ولائتی کی"
مرزا: "میں سمجھا دُم کی"
گپوا: "سچ سچ! ایسا نہ کہیئے والد تھے آپکے"
مرزا۔ پیچ تاب کھا کے "کیوں بے یہ تو نے انکو کب دیکھا تھا ہمیں تو نصیب ہوئی نہیں انکی زیارت خیر سے"
گپوا: مسکرا کے "حضور دیکھا تو بے شک کرکے نہیں مُل سُنا ضرور ہے لوگوں کی زبانی کہ ایک آپکے والد تھے، اور کیا حضور انکے سامنے پیدا نہیں ہوئے تھے؟"
مرزا۔ ٹھنڈی سانس لیکر "نہیں میاں ہم انکی وفات شریف کے بعد تولد ہوئے تھے"
گپوا۔ سوکھے منہ سے "یہ حضور کتنے دن بعد؟"
مرزا۔ جھنجلا کر "ابے یاد کس کو ہے۔ کوئی آج کی بات ہے احمق، اچھا باتیں نہ بناؤ۔ پٹاری میں سے آئینہ نکال کے لاؤ"
گپوا۔ کنپٹی کھجا کر "حضور . . . وہ . . . وہ . . ."

مرزا: "ایں ایں، ابے حضور وہ کیا یہ "حضور وہ حضور وہ" کس جانور کا نام ہے؟"
گپوا۔ ڈرتے ڈرتے "حضور وہ تو میں نے خدا کی راہ پہ دیدیا"
مرزا۔ گرج کر "کون! آئینہ؟ خبیث، ملاعون، پاجی کے بچے کسے دیدیا"
گپوا: زیر لب "گھسیٹن بھٹیاری کو"
مرزا: "کیوں؟"
گپوا: "حضور منہ دیکھنے کو ترستی تھی غریب، کہنے لگی بھیا ٹوٹا پھوٹا اپنا پڑا ہو تو ہمیں دیدو۔ میں نے کہا ثواب کا کام ہے اور حضور کا نام بھی ہوگا پٹاری سے نکال کر دیدیا، خطا ہوئی"
مرزا: "خطا کے بچے۔ خیر اسی میں ہے کہ جاکے آئینہ لاؤ، نہیں تو یاد رکھنا قسم قرآن کی۔ لاش نکلے گی تمہاری اس ڈیوڑھی سے آج کے دن، بوٹیاں بو دونگا واللہ بوٹیاں۔ اور سنئے متقنی کی گھسیٹن اماں کو آئینہ پکڑا دیا۔ والدہ شریفہ تھیں نا وہ ان کی، منہ دیکھنے کو ترستی تھیں، ہونہہ بصورت چڑیل کی مزاج پریوں کا، اور تو نے تو گپوا لاکھ کا گھر خاک کر دیا ہمارا، بس کہہ تو دیا خیر سلا اسی میں ہے کہ آئینہ لاکے دیجئے چپکے سے"

گپو گھسیٹن کے ہاں پہونچے، بی بھٹیاری موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگائے بیٹھی ہوئی چھینٹ کے لہنگے میں گوٹ لگا رہی تھیں۔
گھسیٹن: "اللہ غفور خاں آج کہاں بھول پڑے، مجاز تو اچھے ہیں، تم تو عید کا چاند ہو گئے"
گپوا: "کیا پوچھتی ہو بُوا، ایسے بد کے پالے پڑے ہیں کہ سر کھجانے کی مہلت نہیں ملتی، سر کھجانے کی"
گھسیٹن: "چل بے مروت بہانے خور، وہ دنیا سے اوپرا ایسا کیا کام ہے تمہاری سرکار میں ہم بھی سنیں، جو تجھے بھر کو چھٹی نہیں ملتی"
گپوا: "سچ پوچھئے تو کام اتنا نہیں جتنی لیتھن ہے، اور جس روز سے مرزا صاحب نے پردیس کی ٹھانی ہے تب سے تو اور بھی ناک میں دم ہے"
گھسیٹن: "ہے ہے یہ کب، یہ کہو کہ پڑوس ویران ہوتا ہے۔ کبتک اصل خیر سے لوٹوگے"
گپوا: "میں تھوڑی جاتا ہوں وہی اپنے سدھارتے ہیں، اور دیکھئے لوٹنے کا خدا ہی حافظ ہے"
گھسیٹن: "کیا کربلا جاتے ہیں زیارت کو، خدا وہ دن لائے جو گھسیٹن

لونڈی کو بھی آقا یاد کریں، روضے کی زیارت نصیب ہو اور وہیں مٹی عزیز ہو جائے"

گپوا: "اے کچھ خواب تو نہیں دیکھ رہی ہو، بھلا حج زیارت کو جائینگے۔ وہ لام پہ جا رہے ہیں"

گھسیٹن: "اوئی لام پہ، جہاں تروار چلتی ہے؟ چل مردوئے دلگی کرتا ہے بڑھیا سے، خدا نہ کرے جوان کے دشمن مدعی لام پہ جائیں"

گپوا: "جوانی قسم وہ لام پہ جا رہے ہیں، اسباب وسباب بھی بندھ گیا، ایک تو تھا ہی کیا خاک، گھڑی بھر بعد سوار ہوا چاہتے ہیں، یہاں سے کراچی بندر تک ریل پہ، باز داں آگبوٹ پہ سرحد کوئی ایسے ہی ہیں اللہ جانے کون لوگ ہیں انہیں نے دھاوا بول دیا ہے بڑا رن پڑنے والا ہے، میں نے تو حضرت لپنے چلتے بہت سمجھایا مگر تم جانو اس عمر میں آدمی تو الو کی جون میں آجاتا ہے، کون سنتا ہے"

گھسیٹن: "یا میرے اللہ، اے میں کہتی ہوں بھیا لگوڑے سٹران ہی ہیں مرزا تمہارے جو مٹی پلید کرانے جا رہے ہیں وہاں، یہ دن اللہ اللہ کرنے کے ہیں یا خدائی خوار گھومنے کے، نا بھیا گھسیٹن بندی کو تو سونے کے سوا لاکھ ٹکے بھی کوئی دے تب بھی اس ملک کا نام نہ لے" آہستہ سے "کسی نے جادو وادو تو نہیں کرا دیا ہے اللہ مارے پہ؟ ہاں میں جانوں کسی اگھوری وگھوری کا پھیر ہے"

گپوا: "جی نشاں خاطر رہیئے وہ آپ دنیا بھر کے اگھوری ہیں، اور ہوگا جی، اپنے تئیں کیا"

گھسیٹن: "دیکھو بھیا جوانی پہ رحسم کھانا۔ تم نہ کہیں ان کے ساتھ ہو لینا"

گپوا: "توبہ کرو۔ میری کوئی مت کٹ گئی ہے جو ملک ملک اپنا دیس چھوڑ کر ویران پھروں، یہاں پہلے ہی اپنا حساب کرالیا، کہتے تھے جیتا پھرا تو پھر بلا لونگا، اچھا بوا جاتے ہیں بندگی"

گھسیٹن: "اے گلوری تو کھاتے جاؤ، بگوڑا کتنے دن باد تو آئے تھے۔ مگر تمہیں سوگند ایسا نہ کیجو غفور کہ پھر ادھر کا نام نہ لو، ہاں تم جانو پڑوس کا بڑا سہارا تھا، اور ہاں ایک پیسہ کپڑے میں لپیٹ کر "بھیا کیسے یہ لئے جاؤ، میری طرف سے امام ضامن باندھ دینا" اور بندگی کے بعد کہہ دینا کیا کروں مرزا جی گھر اکیلا ہے، وہ بخشو مردہ بھی نہیں نا، نہیں تو میں خود آتی، اچھا بھیا یاد کرکے جاؤ وہی پچھل کا شگن"

گپوا: "بندگی"

مرزا: "لایا بے؟"

گپوا: "کیا خاک لاتا، وہ نکلی ہی نہیں ٹاپے سے، بڑی مشکل سے اتنا قبولی ہیں کہ شام کو آکے لیجانا"

مرزا: "کیا کہا، پرایا مال ہضم کرکے قطامہ اب حیلے حوالے کرتی ہے بالے بتے بتاتی ہے، لانا تو میرا ڈنڈا ذری"

گپوا: "اے نہیں حضور رحم کیجئے، درجن بھر انڈے پھوٹ جائینگے"

مرزا: "یہ کیا، اسکے کیا معنی؟"

گپوا: "حضور وہ تو آج دس بارہ روز سے کڑک ہیں نا، انڈے لئے ٹاپے میں دکھیا بیٹھی ہے"

مرزا: "کڑک! کیا بکتا ہے بے، جو سن لے گی تو بچا مارے گا لیوں کے فشار کر دیگی تمہارا، یہ کیا بد تہذیبی ہے، جو بات ہے لغو"

گپوا: "اب ہماری بڑی مشکل ہے، حضور کو یقین نہیں آتا۔ اس کا میاں کسریٹ والے صاحب کے ہاں ہانڈی روٹی پہ ہے کہ نہیں، وہ لایا ہے یہ ترکیب اڑا کے کمسٹریٹ سے، جی چاہے لوٹ کے دیکھ لیجئے گا، کوئی ڈھکی چھپی بات ہے، محلے بھر میں تو ماشور ہے"

مرزا۔ کمال حیرت زدہ ہو کر: "ایں واللہ تمہیں قسم قرآن کی بھئی غفور حیرت ہو گئی حیرت، بھٹیاری ہو کے کھا گھس مرغی کا کام دے، کیا ترکیب نکالی ہے قسم قرآن کی، اچھا ایک بات بتادو تو ہم قائل ہو جائیں اسکے، بھلا چوزے ہوتے تو مرغ ہی کے شکل کے ہیں یا کچھ اور؟"

گپوا: "حضور تو بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں، اے قبلہ مرغ کے نہیں تو کیا میری آپ کی شکل ہوتے ہیں، اصل کڑک نا تھہ، مگر آپ بے فضول باتوں میں دیر کر رہے ہیں، گیارہ بج چکے ہیں پھر مجھے نہ الہنا دیجئے گا"

مرزا: "ہاں بھئی چلنے میں اب منت کیا ہے، تم لتنے میں گلوریاں بناؤ، میں استخارہ دیکھ لوں"

گپوا: "استخارہ؟ کون؟ میں حضور استخارہ قیامت تک نہ دیکھنے دونگا تو وجہ کیا، اس دن خط بنواتے وخت استخارہ دیکھا تھا پھر کیا نتیجہ ہوا۔ استرا کھپ دینے گلے میں اتر گیا، خونا خون ہو گئے مار آپ، جیسے کوئی بکرا حلال کرکے ڈال دے، آگو آپ مالک ہیں، ہم نے کہنا تھا کہہ دیا"

مرزا: "غفور خاں صاحب، بھئی تمہاری نمک حلالی میں اب شک کرنے والے بہن کی گالی دے کر، کے تئیں کافر کہتا ہوں، قسم قرآن کی۔ اچھا گلوری تو کھلا دو، اور ہاں بھئی ڈنڈا یاد کر کے لے لینا۔ برا وقت کہہ کے نہیں آتا۔"

الغرض مرزا الٰہی خیر صاحب بصد خرابی دولت کدے سے برآمد ہوئے، گپّو نے ڈیوڑھی معمور کی قفل لگایا اور اسٹیشن کی راہ لی۔

مرزا: "ایک بات ہے۔"

گپوا: "یا اللہ! وہ بھی کہہ ڈالئے۔"

مرزا: "رستے میں جو کوئی پوچھ بیٹھا کہ یہ کون صاحب ہیں تو کیا کہو گے؟"

گپوا: "کہدونگا لال بیگیوں کے گرو ہیں۔"

مرزا۔ لال پیلے ہو کر: "کیوں پاجی نہیں چوکتا بدمعاشی سے۔ ابے یہ نہیں، یوں کہنا کہ رسلدار صاحب ہیں، وہ کہے کہاں جاتے ہیں؟ کہنا لاٹ صاحب نے بلایا ہے ملاقات کو، خبردار۔"

گپوا: "لے ہم سے کہئے ہم کنڈیل صاحب جنڈیل صاحب کہدیں، رسلدار صاحب۔" گانی دیکر: "کیا مال ہیں، مل ایک بات ہے رستے ہیں چھلے پن کی نہ لیجیے گا آج: نہیں تو بنے گی نہیں ہماری آپ کی۔"

مرزا: "کیوں حضرت ہم چھلے ہیں؟ مگر خوب یاد آیا، اسے گھامڑ اتنا نہیں سمجھتا کہ سپاہی کے پوت اتنے کڑوے بھی نہ ہوتے تو کس کام کے۔"

گپوا: "برا ماننے کی بات نہیں حضور، ہم نے تو ایسوں کو پٹتے ہی سنا، سنا کیا معنی آنکھوں سے دیکھا، پرسوں دوپہر ہی کو سبزی منڈی میں اس بہارٹی کو شرفوا نے وہ بے بیونت، ماردی ہے کہ ماذ اللہ کی پناہ، مانتا ہی نہ تھا مانتا ہی نہ تھا کسو طرح، کہیئے گیا وہ ڈبل کا بمبئ تجھکو تین ڈبل میں کس طرح دیدے، اسی پہ اکڑ بیٹھے، اور شرفو کے ٹھوکر جڑ دی بونٹ جوتے کی، بس حضرت پھر تو شرفو نے وہ کلے ہی کلے چانٹے رسید کئے ہیں کہ خون تھکوا دیا بیٹا کو، دھرا ہی رہا سورماپن، جی اور کیا!"

اتنے میں دور سے اسٹیشن کا چوراہا دکھائی دیا، مرزا صاحب رک گئے۔

مرزا: "لو بھئی گپّو تیار ہو جاؤ، منزل آگئی، بولو اب تم آگے بڑھو گے یا ہم چلیں، سوچ لو۔"

گپوا: "حضور بھی کمال کرتے ہیں، غلام کی مجال ہے آگے چلنے کی، کوئی آپ کو مخلوق میں ذلیل کرانا ہے، اول تو میں ان پڑھ جاہل ٹھیرا، پھر اکھ میں اللہ ہیں آپ آقا ہیں میں نوکر ہوں تابیدار۔"

مرزا: "کہتے تو سچ ہو، لاٹ صاحب کی نظر ادھر پڑ گئی اور وہ کچھ پوچھ بیٹھے تو بھی غفور خاں تم تو سٹ پٹا جاؤ گے۔"

گپوا: "حاکم کا رعاب بھی کوئی شے ہے آخر، اور ہم اللہ بڑھ جائیں سینے دہی ٹکے کے پیادے۔"

مرزا صاحب نے کمر سے چادر کھول کر ہات پاؤں کی گرد جھاڑی، موچھوں کو تاؤ دیا، اور نادعلیاً مظہر العجائب، کہہ کر چند قدم ہی بڑھے ہونگے جو کسی نے ڈانٹ کر آواز دی: "ہلٹ! ہکم سدر۔"

مرزا صاحب اچھل پڑے، دیکھا تو سامنے وردی ڈانٹے بندوق لئے پولس کا سپاہی، پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو گپوا غائب۔

سپاہی: "ٹھار رہیو، آگے نہ بڑھیو، مریہو ں گولی ٹھائیں دے، تو ن کیرجا کے پار سے نکسیے، پہر لٹن سُتھنا چل دیہے سالا سڑ سڑ کر کے۔"

آپ جانیں پولیس کا جوان، اُس پہ جاٹ کی ذات، جاہل گنوار کالٹھ، کڑوا کریلا دوسرے نیم چڑھا، مرزا ٹھٹکے، ڈانٹ پڑی تو سر سے پا تک پسینے میں غرق، اوپر کی سانس اوپر نیچے کی سانس نیچے۔

مرزا۔ دبی زبان سے: "کیا وقت پہ داغ دیا ہے نمک حرام نے اسی لئے پھڑ پہ ہم کو رکھ دیا تھا، ابے او نمک حرام کے بچے گپوا کہاں مرگیا۔ ہائے کیا ضیق میں جان ہے اس پاجی کے مارے، قسم قرآن کی۔"

گپوا: "کہیئے کہیئے کیا آفت ٹوٹ پڑی، بڑھتے ناٹھٹک کیوں گئے، ذری پیشاب کرنے بیٹھ گیا تھا آپ سے نہ لے کے گالیوں کا دونگڑا برسا دیا۔"

مرزا۔ دانت پیس کر: "ابے حرامزادے، دیکھ وہ سامنے باپ کھڑا ہے تیرا۔"

گپوا: "پھر باشد، مخلوق آتی جاتی ہے، ایک آپ ہی کیلئے ہوا ہے، چلئے تو سہی۔"

مرزا۔ ہمت کر کے دور سے: "آداب بجالاتا ہوں جمعدار صاحب۔"

سپاہی: "کابخت ہے رہے؟ تم دیہو ہمکا، کے؟ دیہوں سنگین، پیٹ پھاٹ جائی، دھرلین گیا کھپڑی پہ، بوکے لاگی پھاتی سارا مانو بڑے منسی لالہ ہیں، کاکہی۔"

مرزا: "لبے بولتا نہیں گپوا بے ایمان!"
گپوا: "اماں بھائی جوان گالیاں نہ دو، رسلدار صاحب ہیں!"
سپاہی: "ہٹ گاری! ہم برو بر گر یاب، پولس بن کر دنگی یاجی، یو سار رسلدار ہے؟ ہمار جان بہتر پیاہس۔"
مرزا: "کیا کہتے ہیں؟"
گپوا: "کہتا ہے یہ رسلدار نہیں بہروپئے ہیں۔"
مرزا: "ہم تو غریب پرور ریل پہ جا رہے ہیں، افیم کی کھانیاں دیکھیں حضور بیٹے کبھی تو سنا ہو گا لام پہ افیم اندر رہتی ہے۔"
سپاہی: "کا ابھین اپھین کے رہا ہے، ہونہہ چاند و باج سار نسا کرے ٹیسن پر آوے لاگے انگریزی ہوسے جیسے کوتوں، چلان ہوتے جالی، چلو رستہ لیو۔ لاٹ صاحب او یا ہیں، بڑے بڑے افسرن کا جانے کا حکم نا ہیں سار لہر و بہنا کا کو کہے۔"
مرزا: "غریب پرور، ہمارے لئے آپ ہی لاٹ صاحب ہیں" چپکے سے مٹھی میں پیسے دے کے "حکم ہو تو وہاں پیڑ تلے ہم بھی ٹک جائیں ذرا سے ذری کو، خداوند بڑا حرج ہو جائے گا ہمارا۔ دو کوس پیدل ناپ کے آئے ہیں اس خاطر آپ کی بدولت لاٹ صاحب کی سواری ہم بھی دیکھ لیں گے۔"
سپاہی۔ پیسے لے کر "لے اب کس کس کا او کری ہو آگے جائیکا حکم نا ہیں، گورن کا پہرا ہے، ساہب لوگ، نیم لوگ جاتے پاوت ہیں، ہیں دو چار رہیں نیا بو، ندا اور سے کا جاجت نا ہیں ہے، بوریو چاد لیو نا۔ چپائیں بیٹھے رہو۔ بت کھاؤ نہ ہو تے پاوے۔"
مرزا کی جان میں جان آئی۔ چپکے سے ایک درخت تلے چادر بچھا کے بیٹھ گئے۔
گپوا: "آج تو بچ گئے حضور پٹتے پٹتے!"
مرزا: "کیا مجال کسی کی جو ٹیڑھی نگاہ سے دیکھ سکے، تم تو تھے نہیں" آہستہ سے "اس مردک زندیق نے بندوق جو چھتیائی نا، بس قسم ہے قرآن کی، یہ پینترا بدل کے کھڑا ہو گیا۔ ادھر میں نے کہا صلی جاٹ کا ہے تو مار گولی، آ میدان میں، دیکھ تو واللہ کیسی کاٹتا ہوں، دیکھا نہیں تھا اس وقت میرے کیا تیور تھے؟"
گپوا: "جی ہاں خوب، دیکھا تھا مرنے کے تیور تھے!!"

گپوا: "لے حضور صاحب لوگ ہیں اور میمیں ہیں، ہوں کی دو انسانی سئے۔"
مرزا: "لے لیجئے واللہ ہم نے پہچانا نہیں اتنی دیر سے، اور دو ڈھائی سے کہتے ہوان کو، ڈھائی ہزار نہیں کہتے۔ لیجئے وہ ایک بگھی اور آ گئی، کیا سرنگ جوڑی ہے کہ واہ وا۔ لے تو وہ اتری، سیا ہے سیا۔ اور دیکھئے گورنمنٹ کا چھاتا لگاتے ہے، مگر ہٹاؤ بھی غفور ... حسن ان لوگوں میں نہیں ہوتا، حسن ہے اور کچھ ... قرآن کی، لے اب اتنی بیٹھی ہیں چربی کی تیلیاں، کوئی ... پلک کی درست ہے۔ پھیکا سٹھ قسم قرآن کی، کچھ دیکھ کر ... دیکھنا وہ سیٹ ٹیکے شہزادہ کیوان جاہ بہادر تو ... رہی ہیں، کوئی دو سو روپے گز کی ہمیں شہر بھی کا ... اس وقت، اور دیکھنا میں افوہ! تاج کلاہ کے موتی کیا دمک رہے ہیں، آنکھ نہیں ٹھہرتی۔"
گپوا: "لے ماشاء اللہ میں کی آنکھ کا کیا کہنا، موتی مونگے بڑے ... دیتے ہیں، کل وہ ادھر کنگر والا کھڑا ہے، اور اس سے آگے ... صاحب کا خانساماں لگتا ہے ہم کو تو۔"
مرزا: انگلی سے اشارہ کر کے "لبے وہ نہیں، وہ تنبو کے نیچے دیکھ۔"
اتنے میں توپ چلی دن سے، ایک اور، دنانانا۔ دوسری اور دنانانا!!
مرزا: "یا علی یا علی، خداوندا خیر، یہ اذ غیبی گولہ کہاں سے آیا، جمعدار صاحب جمعدار صاحب۔ لے حضرت یہ آسمان کہاں پھٹا یہ دنانانا کیسی؟"
سپاہی: "ہلا نہ کرو، توپیں دگ رہا ہیں، لاٹ صاحب جان پہ ہے آتے گئے۔"
مرزا: "ایں آ گئے اور ہم کو خبر بھی نہ ہوئی، کیوں بھئی ... مجھی بھول رہا چل رہا ہو نگی!"
گپوا: "توبہ ہے بس آپ سے، آنکھ کے نیچے ... دیکھتے وہ گورے چلا رہے ہیں۔"
مرزا: "اخاہ، بھئی دیکھنا کلن خاں تو کچھ بھی ... بڑھتے پار ہیں، کیا گولا اتار تا ہے بھی قسم قرآن کی ... کہ بے عمل کئے شست نہیں بیٹھتی انکی، ادھر ... اڑایا۔ بھی دکھائی پڑیں تو ذری پکار کے کہہ دینا کہ حضور ..."

* * *

مرزا: "اماں خانصاحب ذری نظر بچا کے تم دیکھنا وہ کرسیوں پہ جو بیٹھے ہیں کون لوگ ڈسٹے ہوتے ہیں؟"

دھرڈٹے ہوئے ہیں، مگر گپو توپ کا منہ کدھر ہے! "

گپوا: "دکھائی تو کچھ ادھر ہی دیتا ہے"

مرزا۔ گھبرا کے: "اور مردود تو اطمینان سے دیکھ رہا ہے اور کہتا بھی نہیں۔ نصیب اعدا جو ایک آدھ گولہ ادھر آپڑے تو؟"

گپوا: "نشاخاطر رہیے میں آڑ میں ہوں زد میں آپ ہی ہیں"

مرزا۔ متوحش ہوکر: "کیوں جمعدار صاحب یہ توپیں بھری چل رہی ہیں؟"

سپاہی: "ناہیں ہو کھالی داگت ہیں بارودت بھر بھر کے، بہر پیاسار کا جانے سلامی ہوئے رہی ہے"

مرزا: "شکر ہے اس معبود کردگار کا، میرے تو حواس ہی گئے تھے قسم قرآن کی"

گپوا: "اس پہ تو لام پر جانے کے واسطے ہیں، وہاں تو آٹھ پہر ہی آتشباری چلے گی"

مرزا: "اماں نشے میں سنتا کون ہے توپ کدھر چلی، آسمان کدھر پھٹا"

گپوا: "جی بجا ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو"

مرزا: "غفور خاں، سنا تم نے جیسے انگریزی باجہ کہیں بجتا ہو"

گپوا: "ہم تو عاری آ گئے بتاتے بتاتے، پیرومرشد وہ دیکھئے میری آنکھوں سے گورے بجا رہے ہیں، کتابیں سامنے لگی ہیں، بیچ میں ایک گورا کھڑا بتا رہا ہے"

مرزا: "اوہو ہو ہو اب دیکھا۔ بھئی کیا مست باجہ ہے، مانتا ہوں قسم قرآن کی فرنگیوں نے کیا شے نکالی ہے واہ وا!"

گپوا: "اس میں انوکھی کیا بات ہے، شہر میں سینکڑوں کنگی ہی جو بجاتے ہیں"

مرزا: "آپ گدھے ہیں، یہ اور شے ہے، یہ ولندیزی میں بجاتے ہیں، وہ شہدے ٹھمری دادرا اڑاتے ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں یہ سوا نہیں ہوئے لاٹ صاحب ابتک۔

گپوا: "لے اسباب وسباب اتروا رہے ہونگے"

مرزا: "بیشک یہی وجہ ہے، خوب پہونچے غفور تم، شہر میں آج کہار تھوڑا ہی بچا ہوگا کوئی، ہزاروں بہنگی اسباب ترا ہوگا، ہزاروں، مگر یہ شہدے کہاں رہ گئے، روپے پیسے کون لوٹے گا"

گپوا: "حضور ان میں بھی شہدے ہوتے ہونگے؟"

مرزا: "کیوں، نہ ہونے کی وجہ؟ آپ بھی واللہ عجیب بے تکے ہیں قسم قرآن کی، میاں ساتوں ذاتیں ان کے ملک میں ہوتی ہیں، اتنا ہے کہ حقہ پانی سب کا ایک ہے چھوت چھات نہیں نا، اور ایک بات ہے کہ ہمارے ہاں طبلے سارنگی پر کاشمیہ ہی گاتے بجاتے ہیں انکے ہاں وہ ایک ہوتا ہے بھلا سا نام ہے اس پر ناچتے گاتے ہیں"

گپوا: "ہرمنیا"

مرزا: "جیتے رہو خوب یاد رکھا بھئی قسم قرآن کی، ہرمنیا ہرمنیا، ایک فردوس مکانی کی سرکار میں بھی تھا، ہمیں تو سچ پوچھئے کچھ جچا نہیں، غزل وزل بجا لیجئے پر راگ کیا، یہ کمال تو میاں کچھ اس کاٹھ کے باجے ہی میں دیکھا"

گپوا: "کاٹھ کا باجہ کیا؟ غلام نہ سمجھا"

مرزا: "تم کیا جانو عطائی، اماں سارنگی سورنگی کا نام نہیں سنا؟"

گپوا: "دیکھئے حضور اب مجھے بگڑنے دیجئے کیوں میاں ڈوم ڈھاڑی سمجھا ہے آپنے ہم کو، یہ نائکی آپ ہی کو مبارک"

مرزا: "چپ مردود بدزبان، کان اینٹھو نگا بچا کے"

گپوا: "دیکھا جائیگا، لیجئے سنبھلئے، وہ صاحب لوگوں میں غدر مچا، سواری نکلنے کو ہے معلوم دیتا ہے"

مرزا: "سنو غفور خاں، لاٹ صاحب کا واسطہ ہے، کبھی ایسا نہو کہ شکوے شکایت کا موقع ملے اور وہ کہیں کہ بڑے گو کھے تھے، تم تو خیر، مگر ہم نے شاہی دربار برتے ہیں، دیکھو جب شاہی سواری برابر سے نکلے نا، تب تو قدم گن کے پیچھے ہٹنا اور پھر کھڑے ہو کے سات دفعہ مجرا بجا لانا، اور فوراً ہات باندھ کے پیچھے آنا، تب میں بڑھونگا اور ہاں آنکھ سے آنکھ نہ لڑے خبردار، اور ہاں چھینک بھی نہ آنے پائے"

گپوا: "حضور یہ قواعد تو ہمارے باپ سے بھی نہیں ہونے کی، اور وہ ادھر سے نکلیں گے ہی نہیں، آپکے پیٹ میں بن نحق کو درد ہو رہا ہے، وہ ادھر سے جائینگے جدھر گوروں کا پہرہ ہے"

مرزا: "ہشت رئیس کے مزاج کا کیا ٹھیک، گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ، اور جو انہیں نے حکم دے دیا کہ ادھر سے نہیں ادھر سے چلو تو آپ روکیں گے جا کے ان کو، ایں؟ وہی بے ڈھنگی جاہلوں کی باتیں، میاں ان آنکھوں نے لاکھوں ہزاروں جلوس دیکھ ڈالے، ہم سے پوچھے کوئی ــــــ سواری کے ٹھاٹھ اسپ پہلے سقے ہونگے، کم سن کمسن، برس سولہ سولہ اٹھارہ اٹھارہ کے، شالباف کی لنگیاں، تاش بادلے کے شلوکے، کاندھے پہ چھوٹے

چھوٹے مشکیزے، چاندی کے فوارے ہزارے دہانے پر چڑھے ہوئے، گلاب کیوڑے کا چھڑکاؤ ہوتا ہوا، پھر نشان کا ہاتی ہو گا، ایک دستامست، جھومتا ہوا، مستک پر طلا کار جھومر، گھونڈے پہ سیندور کے گل بوٹے، مغرق کارچوبی جھول، پاؤں میں چوڑے کڑے چھڑے جھانجن، ٹن ٹن کی صدا کوسوں جائے، فیل بان ڈاڑھی چڑھائے، موچھوں کو تاؤ دئے، سرخ رومی بانات کی چپکن، سر پہ ترچھی بتی باندھے، ہاتھ میں فولاد کا آنکس، میل، بری بری، دھت، دھت، کہتا ہوا، ہاتی پر نشاں بردار، نشان کا پرچم کھلا ہوا' اب سانڈنی سوار آئے، کوئی سو سوا سو سانڈنیاں، دو دو ہزار کوس کے دم کی، مور کی طرح گردن اٹھائے ہوئے، زنگولے بجتے ہوئے کجاوے کسے ہوئے، زرد لال سپچرنگی پوششیں پڑی ہوئی، ان پر ایک ایک سوار، ایک ہات میں ریشم کی مہار، دوسرے میں ننگی تلوار چھم چھم کرتی ہوئی، پھر کوتل گھوڑے، مشکی، سبزے، نقرے، سمند سیہ زانو، شرغے، کمیت، ہرکھیت کے، کاٹھیاواڑ، خوب ترکی ویلے، ہر گھوڑا دلہن بنا ہوا، زر زیور سے آراستہ، مخمل کے زین زربفت کے زین پوش، پھر علم بردار، عصا بردار، چوبدار، گنگا جمنی عصے، وردیاں پہنے، تغمے لگائے، پھر ماہی مراتب، سونے کی مچھلی روپے کے چاند سورج، پھر نقیب کا کڑکا، پیش ملاحظہ نگہ رو برو با ادب، سواری باد بہاری خاقانِ کجکلاہ، خسرو گیتی پناہ اعلحضرت سلطانِ عالم، میرزا محمد واجد علی شاہ بہادر بادشاہ غازی . . . "

گپوا۔ بات کاٹ کر "خدا جانے آپ کیا بے تکی ہانک رہے ہیں' وہ نکلی سواری لاٹ صاحب کی، وہ جا رہے ہیں، آگو ننگی تروایں لئے گھوڑوں پہ گورے ہیں، پیچھو چھو چار گھوڑوں کی بگھی پہ خود بادولت ہیں، دونوں ہاتھوں سے دعا سلام کرتے جاتے ہیں"

مرزا۔ کھڑے ہوکر "ایں لاحول ولا قوۃ، استغفراللہ، گئے گزرے تھے" پیچھے ہٹ کر اور سات تسلیمیں بجا کر "غفور غفور دیکھنا خواصی میں صاحب عالم شہزادے برجیس قدر بہادر ولی عہد مورچھل کر رہے ہیں!"

گپوا۔ حضور کی بھی کیا باتیں ہیں، اواصی خواصی میں کوئی نہیں، ہاں سامنے ایک بڑا صاحب بیٹھا ہے، لال بنات کی کرتی پہنے ہو اور مار تغمے ہی تغمے لٹکائے، بڑا ڈبلو"

مرزا "پہچانا یہ کون ہیں؟ ارے نادان یہ حضور عالم وزیر السلطان نواب علی نقی خاں بہادر ہیں، مبارک محل جو جہاں پناہ کی ملکہ ہیں نا، وہ انہی کے بطن سے ہیں، آج تو دیکھ لیا جلوس تم نے بھی غفور خاں!"

گپوا: ایں یہ جلوس تھا؟ مشکل سے دس بارہ گھوڑے اور بگھی میں کالے کپڑے پہنے لاٹ صاحب!"

مرزا۔ غصہ ہوکر "چپ مردک گستاخ بھوڑے، بادشاہوں کی جناب میں بے ادبی، کوئی محرم ہے جو ماتمی ملبوس پہنے ہیں، لبے اندھے سولہ سے روپیہ گز کی جامدانی ہوگی جس کی پوشاک پہنے لب معشوق سے شغل فرماتے ہوئے بیٹھے ہونگے"

گپوا: جی بٹو کو جامدانی حضور ہی کے منہ سنا"

مرزا: ایں پھوٹی تقدیر کے، اونگھ گیا نامردک، یہ نشان کا دیو پیکر ہاتی، یہ چھم چھم کرتی سانڈنیاں، یہ ترچھے رسالے کے جوانوں کا پرا۔ اور جلو میں انیس الدولہ جلیس الدولہ اہتمام کرتے ہوئے تو نے نہیں دیکھے؟ کیوں بے؟"

اتنے میں صاحب لوگوں اور میموں نے تالیاں بجائیں۔

مرزا: "اب کہدینا کہ ولایتی شہدے کبھی میں نے نہیں دیکھے، وہ دیکھ کیسے تالیاں بجا بجا کر تصدق مانگ رہے ہیں' اور برق الدولہ دوانیاں چونیاں نچھاور کر رہے ہیں"

سواری نکل گئی۔

سپاہی "چانڈو باج۔ ارے او چانڈو باج، اب جیہو کہ ناہیں ـ؟ چور ہے پہ گدر مچائے کھاتر پوڑھے ہو، دیکھ لیو لاٹ صاحب کا، اب جات ہو کہ ناہیں، پھر ہم گدیاب، ہکا نہ تماکھو سرو چپائے رہے ہیں بلا ڈارے ہیں"

مرزا: "بہت اچھا خداوند، سلامت رہیئے، آپ کی بدولت مجرا ہو گیا لاٹ صاحب کو"

سپاہی "کا سروہٹر بولائے رہو سنگ ماں؟"

گپوا: "لیجئے مبارک حضور بہروپے سے میر شکار بنے"

مرزا "چپ رہو یار، نکل چلو آدمی ذرا بینڈا ہے" دور پہونچکر "ہاں خواہ مخواہ دو ایک ڈنڈے چکھا دوں گا ساری شیخی کرکری ہو جائے گی، پولس کے سپاہی نہ ہوئے اپنے حساب فرعون ہو گئے، میاں غفور خاں تم لپک کر بٹاروں کی خبر لے آؤ، ہم یہاں کھڑے ہیں، موقع ہو تو ہم بھی چل کے دیکھ لیں، پھر چلیں لال کرتی، اور ہاں یہ لو دو آنے کی امرتیاں میلے سے لیتے آنا، آج خدا جانے کیا بات ہے جو ابھی تک عمل نہیں ہوا ہے، مارہات پاؤں ٹوٹ رہے ہیں"

گیپوا نے پیسے لے کر اپنے ڈب میں رکھے، اور دس منٹ کے بعد ادھر ادھر گھوم کے لوٹے خالی ہات، منہ لٹکائے ہوئے پژمردہ ۔

مرزا: "کیوں بھئی چلیں ؟"

گیپوا: "نہیں نام بھی نہ لیجیے گا، وہاں گزر نہیں ہے افیمی سا افیمی آیا ہے حضور جھگڑے سے جھنجھٹ ہے کہ باذ اللہ کی پناہ! پھاٹک پہ چپراسی کی خوشامد درآمد کی، آٹھ ڈبل بھینٹ چڑھائے وہ کھاتے ہیں تب کہیں بمشکل جھانکنے بھر کی اجازت ملی"

مرزا: "باچھیں کھل گئیں" "مالک بے نیاز شکر ہے تیرا معبود بھئی قسم سے قرآن کی روح تازہ کر دی تم نے غفور خاں، یہ مژدہ سنا کے۔ شکر کرو شکر کہ ابھی تمہارے شہر میں ماشاء اللہ سے افیمی کا توڑا نہیں ہے۔ ہائے واللہ نہ پوچھو اس دن کا عالم۔ ہم تو رو ہی بیٹھے تھے اس دن جب سنا کہ پچاس روپے سیر کا بھاؤ ہو گیا۔ بارے ہزار ہزار احسان ہے اس پالن ہار کا۔ کیوں ماں ہو گا کوئی دو ہزار افیمی؟"

گیپوا: "گو ستے ہیں آپ لے قبلہ دو لاکھ کہیئے تو کم ہے"

مرزا: "بات بل کر رہ با القدیر! یار غفور خاں بڑی علت ہو گئی اماں کسی بابو وابو کو دو چار آنے دینے کہے ہوتے ہمیں بھی زیارت ہو جاتی پیاروں کی"

گیپوا: "یہ! جیسے بابو لوگ اپنے ہوش میں ہی تو تھے۔ اے حضور بابو لوگ نہیں ہیں وہاں ناچ رہا ہے۔ چاروں طرف پڑے ہوئے ہیں۔ پہرہ لگا ہے، بابو لوگ پینک کے مزے اڑا ئیں یا آپ کے چار چھ کنڈے پیسے لیں"

مرزا۔ بادل سرد "خیر۔ یا قسمت یا نصیب، آج نہیں دس دن بعد سہی۔ سرحد پہ تو افیم ہی افیم ہو گی۔ ہم اپنے گھوڑموہوں کے ڈیروں پر جا کے دیکھ لیں گے"

(لال کرتی کی تیاریاں)

مرزا یکہ والے سے "اماں چلو گے بھئی"

یکہ والا: "مالک اس لئے تو چار پہر سے جتے کھڑے ہیں، کہاں چلئے گا، چوک نخاس؟"

مرزا: "نہیں لال کرتی، صاحب کے ہاں"

یکہ والا: "یکہ اچھی ہو گی خداوند دونوں سواریوں کی کم نہ ہو۔ میرا یکہ بھی آندھی کی مثال جاتا ہے۔ طبیعت خوش ہو جانے تب دام دیجئے گا۔ اور کیا"

چلے اور دس منٹ میں لال کرتی۔ یکہ والے کو پیسے دئے اور اب حیران کہ کہاں جائیں۔

مرزا: "اے آخر کہاں رہتا ہے وہ بھرتی والا؟" ایک راہگیر سے "کیوں حضرت بھرتی والے کا مکان کہاں ہے؟"

راہ گیر: "وہ کیا ہے سامنے۔ مگر اس وقت تازی نہ ملیں گی آپکو"

مرزا: "کیا اوندھی کھوپڑی کا ہے واللہ۔ ہم کہتے ہیں بھرتی والا وہ سنتے ہیں برفی والا"

اتنے میں ایک صاحب نے کہا کہ سڑک سڑک چلے جائیے، آگے صاحب لوگ رہتے ہیں، تختہ لگا ہے، پڑھ لیجیے گا۔ مرزا صاحب چلے۔ ایک بنگلہ آیا پھاٹک پر چپراسی بیٹھا تھا۔

مرزا: "کیوں بھئی، صاحب کا یہی بنگلہ ہے؟"

چپراسی: "ہاں جائیے"

مرزا اندر پہنچے۔ سامنے برآمدے میں ایک شحیم شحیم بنگالی۔ کالی رنگت، کوٹ پتلون پہنے ٹہل رہا تھا۔

مرزا۔ ٹھٹک کر غفور سے "کیوں بے تو نے تو کہا تھا کہ بھرتی والا صاحب ہے"

گیپوا: "پھر میں نے کیا جھوٹ کہا۔ صاحب لوگ دونوں رنگ کے ہوتے ہیں، جو کالے ہیں وہ کالٹین صاحب، جو گورے ہیں وہ گڈامیر صاحب سمجھے حضور"

مرزا۔ بڑھکے "آداب عرض ہے جناب، کالٹین صاحب قبلہ"

بنگالی "کیا منگتا!"

مرزا: "حضور ہم منگتے نہیں اشراف ہیں"

بنگالی: "اومی بنگلہ دیس کا مانس، ہندوستانی کا جبان نہیں بولنا منگتا"

مرزا: "سبحان اللہ کیا بنگالی روزمرہ ہے۔ اے صاحب ہم بھرتی ہونا چاہتے ہیں، گھڑموہوں سے لڑائی پڑی ہے نا سرحد پہ، وہاں جائیں گے لام پہ"

بنگالی: "او ڈمرا! مانیشس جانے منگتا؟"

مرزا غفور سے "قسم قرآن کی کیا منگتا ہے" بنگالی سے "جی ہاں وہ جو سرحد ہے نا پہاڑوں کے اس پار۔ میں اس کو کہتا ہوں جہاں افیم کے پٹارے جا رہے ہیں"

بنگالی: "اوہیم اوہیم! کیا گول مال۔ ہمرا کا سانج میں نہیں آنے منگتا۔ اب تم جانے منگتا"

گیپوا: "چلئے بھی یہ تو ہمیں کوئی جب جھالیا سا لگتا ہے"

مرزا رخصت ہوئے۔

مرزا: "کیا خوب منگتا۔ جو بات ہے سو منگتا"

گپوا: "چلے چلئے کہیں نہ کہیں تو تختہ ملیگا"

مرزا: "تو کیا یہاں تختہ نہ تھا؟"

گپوا: "حضور یہی تو چوک ہو گئی۔ بن تحقیق کو بڑا اٹھائی۔ تختہ ہی تو نہ تھا۔"

الغرض آگے بڑھے، ایک اور بنگلہ آیا۔

مرزا: "میاں دیکھو اس پر تختہ لگا ہے، یہ ہوگا" بہشتی سے: "کیوں بھئی گنڈا امیر صاحب یہیں رہتے ہیں؟"

بہشتی۔ دور سے: "جی ہاں۔ وہ کیا سبزے پہ میز کرسی لگائے پڑھ رہے ہیں"

مرزا نے جھانکا اور غفور کو آواز دی:-

مرزا: "ارماں تقدیر میں اتنا چکر ہی بدا تھا۔ دیکھو وہ یہاں نکلے"

گپوا۔ گویا پہچان کر: "اخاہ یہی تو ہیں۔ شکر ہے حضور سے شرمندگی نہیں ہوئی"

مرزا ڈرتے ڈرتے بنگلے میں گئے۔ اب سنیئے کہ یہاں پارسی ناٹک کمپنی کے لوگ ٹکے ہوئے تھے اور یہ گورا چٹا شخص اس کا مالک تھا۔

پارسی۔ مرزا کو دیکھکر: "شوں چھے؟"

مرزا۔ غفور سے زیر لب: "یہ شوں شاں کیسی؟ اسکے کیا معنی؟"

پارسی سے: "حضور ہم بھرتی ہونا چاہتے ہیں آپکے بیڑے میں"

پارسی نے اپنے منشی کو بلا کر کہا ان سے دریافت کرو کیا کہتے ہیں، منشی نے مرزا سے پوچھکر کہا کہ حضور نوکری کو آئے ہیں۔ پارسی نے انکی وضع سے سمجھا کہ طبلہ بجاتے ہیں۔

پارسی منشی سے اپنی زبان میں: "پوچھو تنخواہ کیا لوگے؟"

منشی۔ بمبئی کی طرف کے۔ واجبی ہی واجبی اردو بولنے والے: "تمکو بگھار کیا ہونا؟"

مرزا: "ہمارے ہاں تو لہسن پیاز دونوں کا بگھار دیتے ہیں، اب چاہے قورمہ ہو چاہے بریانی یا مونگ کی بھنی کھچڑی"

منشی: "تمکو مہینے پیچھے تم کو کیا ہونا؟"

مرزا: "تنخواہ کہیئے تنخواہ۔ جو آپ کے ہاں شرح ہو وہی دیجئے گا، مگر افیم دینا پڑیگی ضرور"

منشی۔ پارسی سے کہہ کر: "سیٹھ بولتے تم طبلہ کہاں سیکا؟"

مرزا: "ایں طبلہ؟ یہ طبلہ کیسا، ہم رسلداریاں کمیدانیاں جانتے ہیں یا طبلہ بجانا"

پارسی نے منشی سے کچھ کہا۔

منشی: "سیٹھ بولتے تم چھاکٹا ہے۔ نکل جانے کمپونڈ سے ہم ہتکڑی ڈلوا دیگا"

مرزا صاحب یہاں سے بھی رخصت ہوئے۔

گپوا: "میں تو دور کھڑا تھا کہیئے کیا باتیں ہوئیں"

مرزا: "اماں یہ تو تماشے والے ہیں"

گپوا: "ایں تماشے والے۔ گلابو شتابو کا تماشا! مگر بڑی حیرت ہے کہ یہ لوگ اب بنگلے میں رہنے لگے"

مرزا: "ابے گلابو شتابو نہیں۔ ناٹک ناٹک۔ راجہ ہوں میں قوم کا اندر میرا نام سنا ہے کہ نہیں؟ جس میں سبز پری شہزادے گلفام پہ عاشق ہوتی ہے۔ وہ ہے یہ"

گپوا: "آخر پھر انہیں نے کیا کہا۔ ہماری جان تو آپ لام وام پہ نالت بھیجئے۔ مزے سے یہیں ناٹک میں دندناتے لال دیو کا پاٹ آپ پہ خوب کھلیگا"

مرزا: "نہیں بھئی یہاں پہلے سہیلیوں میں نکلنا پڑیگا لال دیو کا پاٹ پہلے پہل نہیں مل سکتا" ایک کوٹھی کی طرف انگلی سے بتا کے: "وہ لال لال کیا؟"

گپوا: "تختہ ہے"

مرزا: "لاؤ بھئی اسے بھی دیکھتے چلیں۔ بے ایمان نے استخارہ اسوقت نہ کرنے دیا۔ مفت کی تھکن ہوئی"

گپوا: "ٹھیریئے پہلے مجھے دیکھ لینے دیجئے، آپ جہاں جاتے ہیں قدموں کی برکت ساتھ لے جاتے ہیں" پھاٹک میں جاکے اور مرزا صاحب کو اشارہ کرکے: "لے یہاں آئیے، ہیں آپ قسمت کے بڑے دھنی۔ دیکھئے وہ کیا ہو رہا ہے"

مرزا: "ایں اوہ! اب نگی محنت ٹھکانے۔ جب مرینگے ہم تم دونوں۔ یہ بھرتی والے کا بنگلہ ہے اور ہزار میں ہے۔ قواعد جو ہو رہی ہے۔ وہ صاحب کھڑا بولی بول رہا ہے۔ کمانیر ہی معلوم ہوتا ہے"

گپوا: "جی ہاں۔ بل دیکھئے رنگروٹ پینک کی ترنگ میں کیا بھونڈے پینترے ڈال رہے ہیں"

مرزا: "تو ہے صلاح جاؤں"

گپوا: "بسم اللہ کیجئے۔ شام ہونے آئی"

مرزا صاحب بڑھے۔ دلگی سنئے کہ یہ مشن اسکول تھا، پادری صاحب لکڑی کے سہارے ٹکے ہوئے قواعد کرا رہے تھے، انکی نظر جو

مرزا صاحب پر پڑی ایسے کوئی شہ کار میں ہے۔ اشارہ جو کرتے ہیں تو لونڈے تتر بتر، اُدھر سے پادری صاحب بڑھے اِدھر سے مرزا صاحب چلے۔

مرزا: "زمین دوز ہو کر" کورنش عرض کرتا ہوں پیر و مرشد"

پادری: "او گڈ ایوننگ۔ ہو ڈو یو ڈو؟"

مرزا: "غلام عیسائی نہیں ہے"

پادری: "آئی سی۔ آپ کا مزاج اچھا ہے"

مرزا: "حضور کے اقبال سے اچھا ہوں"

پادری: "بیرا۔ بیرا"

بیرا: "حاضر حضور"

پادری نے کرسیاں منگوائیں۔

پادری: "او آپ بیٹھیے"

مرزا: "حضور تشریف رکھیں غلام کی مجال ہے آقا کے سامنے بے ادبی کی"

پادری۔ مرزا کو بٹھا کے: "موسم بہت اچھا ہے آجکل"

مرزا: "جی ہاں حضور جاڑوں کی کیا بات ہے، اچھے سے اچھا پہنیے اچھے سے اچھا کھائیے۔ حضور میں دیکھتا ہوں بہت نقیہہ ہو رہے ہیں، مارالّلحم نوش فرمایا کریں، پانچ تولے صبح پانچ تولے شام ہمراہ شربت بزوری معتدل"

پادری۔ مرزا کی بات نہ سمجھ کر: "ویل ہم آپ کا کوئی کام کرنے کی اُمید کرتا ہے"

مرزا: "یہ بھی حضور کے فرمانے کی بات ہے۔ خدا حضور کو کمانیر سے لاٹ صاحب کرے، میں اس وقت ایک ضرورت سے حاضر ہوا ہوں وہ یہ کہ غلام کو اپنے بیڑے میں بھرتی کر لیجیے مہربانی ہوگی"

پادری۔ دل میں خوش ہو کر کہ اچھا پھانسا: "کھداوند کے نام کا تکدیر ہو۔ ہمارا مکدّس باپ آپکا مدد کریگا"

مرزا: "انہیں تکلیف کیوں دیجیے اس ضعیفی میں ذری سے بات کیلیے"

پادری: "نہیں۔ مبارک ہیں وے لوگ جو اُس کے گلّے میں آئے، مبارک ہیں وے لوگ جن کے ڈلوں میں رُوح الکدس کا روشنی چمکا۔۔۔"

مرزا: "جی ہاں کیا عرض کروں بیٹھے بیٹھے دل میں ترنگ آئی کہ چل کے بھرتی ہو جاؤ۔ سر بھی ان شیطانوں نے بہت اُٹھایا ہے"

پادری۔ جھرجھری لیکر: "سیٹن او سیٹن! وہ انسان کا ڈشمن ہے، وہ کھداوندم کا ڈشمن ہے، وہ تاریکی کا باڈشاہ ہے، جہنم میں اُس کا حکومت ہے"

مرزا: "دیکھئے گا حضور میدان میں کشتوں کے پُشتے نہ لگا دیتے ہوں، غلام کے والد شاہی میں رسالدار تھے"

پادری: "پھر کیا وہ مر گیا؟"

مرزا: "جی ہاں"

پادری: "وہ نیک بیٹے کا باپ تھا اسکو نجات اَبدی ملا"

مرزا: "جی نہیں حضور کسی چغل خور نے آپ سے جڑا ہوگا قسم قرآن کی، اُن کے پاس آبادی وابادی کوئی نہیں تھی، وہ اس رنگ کے آدمی ہی نہ تھے"

پادری: "او جس بیٹے کے ڈل میں رُوح الکدس اُترا اُسکا باپ آدمی نہیں ہو سکتا وہ فرشتا تھا"

مرزا: "جوان تو برابر بھرتی ہو رہے ہونگے حضور، میں نے گِنا نہیں اُس وقت کوئی دو ڈھائی سے"

پادری: "نجات کا ڈروازہ کُھلا ہے، کھداوند کا مکدس کام جاری ہے"

مرزا: "اِدھر ہمارا رسالہ مورچے پر پہونچا اور گھوڑمو ہواں سے نجات ملی"

پادری: "وہ آپکو برکت دیگا"

مرزا: "جی اور افیم بھی قبلۂ عالم۔ کیوں خداوند آپ بھی عمل کرتے ہیں"

پادری: "بیگ یور پارڈن"

مرزا: "حضور یہ نہیں بلکہ تریاق تریاق۔ اگر وقت آگیا ہو تو حاضر کروں، جمائیاں آیا ہی چاہتی ہیں مجھے تو معلوم ہوتا ہے" یہ کہکر ڈبیہ نکالی اور ایک گولی ہتیلی پر رکھ کر دُور سے دکھائی۔

پادری: "او لیکسیٹو پلیز"

مرزا: "جی ہاں ولندیزی میں ان کا یہی نام ہے۔ بڑی نایاب شے ہے خداوند"

پادری: "اویس"

مرزا: "تو اب فدوی کس دن حاضر ہو"

پادری۔ سوچکر: "آپ کل آٹھ بجے آئیگا"

مرزا: "تو اب تخفیف تصدیعہ کرتا ہوں، تسلیمات عرض ہے"

مرزا صاحب بنگلہ سے نکلے گیتو سے مُلاقات ہوئی۔

گیتوا: "اوہ بڑی دیر لگا دی آپنے۔ میں تو سمجھا کہ لیا صاحب نے پیٹوا اور برسایا ہنٹر"

مرزا: "گیتو۔ تم برطرف۔ ابھی برطرف۔ سوا کلے درازی کے اور کچھ ہے ہی نہیں نمک حرام کے پاس"

گپوا:۔ ایں ایں، ذری حواس میں، میں نے یہ کہا کہ بیچ مچ پٹ گئے آپ، میں نے تو شاید کرکے کہا۔"

مرزا:۔ ہاں تو یوں کہو نا قسم قرآن کی جو میں نے سُنا ہو۔ اماں صاحب تو بڑے رنگیلے نکلے غفور خاں، عمل کرتے ہیں، اور کہنے کو ہیں ولایتی مگر بڑے اشراف۔"

گپوا:۔ اجی گڈ امسٹر ہے پورا۔ کہیں اُس کے بھروسے نہ رہیئے گا کہیں بہلا پھسلا کے وہ اپنے مَہذب پر نہ لے آئے آپ کو، جی اور کیا، پادڑی ہے۔"

مرزا:۔ چل بے اُلو کی دُم فاختہ۔ اب کل آکر ہم بھرتی ہوتے جاتے ہیں، راوی چین لکھتا ہے غفور نماں، دیکھو سر میں خاک ڈال کے روؤگے چلے چلو لام پہ۔"

گپوا:۔ ہٹائیے ہم نالت بھیجتے ہیں۔ آپ کو تو کچے گھڑے کی چڑھی ہے، اب گھ بھی چلیے گا یا رات کو یہیں پیڑوں پہ بسیرا کیجئے گا۔"

مرزا:۔ گپو۔ دیکھو بھئی اس میں گالی کا پہلو نکلتا ہے۔ ہم ٹھونک پیٹ چلینگے۔"

الغرض آقا اور نوکر کو تو گھر کا راستہ لینے دیجئے اور یہ سُنئے کہ مرزا صاحب کے جاتے ہی گھسیٹن نے محلے بھر میں پھونک دیا کہ مرزا لام پہ چلے گئے۔ یہ خبر شدہ شدہ بی اُجلی کے کان میں پڑی، اور وہ "ہائے میرا بیس روپے کا گدھا" کہہ کر پیٹنے لگی۔ بسنتی فوراً گھاٹ پر دوڑائی گئی۔ مٹھو گالیاں دیتا ہوا آیا، پتہ چلا کہ مرزا اسٹیشن گئے ہیں، غرض صلاح مشورہ ہوا اور ایک بجتے بجتے مٹھوا نے بڑے صاحب کے اجلاس پر عرضی تان دی۔

. . . .

مرزا اور گپو باتیں کرتے چوک میں چلے آرہے ہیں۔

مرزا:۔ ہاں بھئی تو پھر نان بائی کی ٹھیری ؟"

گپوا:۔ جی اور کیا۔ اب آدھی رات کو میرے کون چولھا جھونکتا پھریگا۔ یہ لیجئے دکان بھی آگئی، آپ چل کے کھانا نکلوا ئیے میں ایک بالائی لے لوں۔"

گپوا چلدیا۔

مرزا صاحب دُکان کی طرف بڑھے ہی تھے کہ کسی نے چپکے سے کہا "دیکھو وہ ہیں وہ ہیں جانے نہ پائیں" اور ساتھ ہی آواز آئی "رُک جاؤ۔"

مرزا۔ ٹھٹک کر:۔ الٰہی خیر۔"

چپراسی:۔ ہاں الٰہی خیر کے نام کا سمن ہے۔"

مرزا۔ سراسیمہ ہوکر:۔ ایں سمن !"

یہ کہا اور تیورا کے گرے تو دھڑسے نالی میں !!

زندگی شرط۔ اگلے کچہری میں اُڑے گی۔

"آوارہ"

کیا ہوا

جو دین تھا محرکِ دیدار کیا ہوا ۔۔۔ کفرِ شباب و طنطنۂ یار کیا ہوا

یوسف کہاں ہے مصر کا بازار کیا ہوا ۔۔۔ اے حسن! تیرا فتنۂ بیدار کیا ہوا

رخ سے وہ پیچ طرۂ طرار کیا ہوا ۔۔۔ وہ زعمِ زہد و طاعتِ دیندار کیا ہوا

تیرِ نگاہِ ناز میں اب وہ خلش نہیں، ۔۔۔ وہ غمزۂ شباب کماندار کیا ہوا

شبنم سے جس کا سلسلۂ تازگی رہا ۔۔۔ وہ نو بہارِ حسن، ترا ہار کیا ہوا

پژمردہ کیوں ہیں عشقِ زلیخا کی سازشیں ۔۔۔ یوسف بھٹک رہا ہے خریدار کیا ہوا

اب گونجتی نہیں ہیں انا الحق کی شورشیں ۔۔۔ وہ جذبِ شوق و ولولۂ دار کیا ہوا

وہ خد و خال جن پہ نچھاور بہارِ عمر ۔۔۔ رشکِ گل و گہر تھا جو رخسار کیا ہوا

وہ کیف اور وہ عارضِ گلرنگ اب کہاں ۔۔۔ وہ پیچ و تاب کاکلِ خمدار کیا ہوا

اب لعلِ لب کی شوخیِ شکرفشاں کہاں ۔۔۔ وہ التزامِ نطقِ گہربار کیا ہوا

وہ حسن، وہ جمال، وہ اندازِ باکمال ۔۔۔ وہ عشوۂ لطیف و طرحدار کیا ہوا

عشووں میں وہ لطافتِ پیہم نہ وہ خلش ۔۔۔ غمزوں میں جو تھا جذبۂ پیکار کیا ہوا

جس نے جہانِ شوق کو درسِ فنا دیا ۔۔۔ وہ کیف و رنگِ جلوۂ بیدار کیا ہوا

جس جبہ صاف پر کبھی آئیں نہ سلوٹیں ۔۔۔ اس جبہ کا وہ جلوۂ زردار کیا ہوا

جس نے جہانِ ہوش کو مجنوں بنا دیا ۔۔۔ وہ کیف و رنگِ نرگسِ بیمار کیا ہوا

جس میں سکونِ شوق کی بھی تھیں گھلاوٹیں ۔۔۔ وہ قند و شہد و شربتِ گفتار کیا ہوا

ہر دل پہ تھی نگاہ، یہ اندازۂ خلش ۔۔۔ اب وہ نظامِ اندکِ بسیار کیا ہوا

ناکردہ جرم، جس نے کہ تسلیم کر لئے ۔۔۔ وہ ناروا سزا کا سزاوار کیا ہوا

جو تھا جمالِ یوسفِ ثانی کا قدرداں ۔۔۔ وہ قافلہ وہ قافلہ سالار کیا ہوا

سونی پڑی ہے محفلِ جمشید آجکل ۔۔۔ اے دخترِ رز، وہ رندِ قدح خوار کیا ہوا

واماندگیِ دل کی جہاں پر ہیں تربتیں ۔۔۔ اے ہمسفر! وہ سایۂ دیوار کیا ہوا

اب تم کہاں! کہاں وہ نگاہِ سکوں گداز ۔۔۔ وہ طور و طرزِ پرسشِ بیمار کیا ہوا

فرحت بھٹک کے راہِ حقیقت پہ آگیا
آخر جنونِ شوق کا آزار کیا ہوا

فرحت کانپوری

خواب کا معمار

نوٹ: یہ مختصر سا ڈرامہ خالص تخیلی ہے۔ ایک ایسا تماشہ دکھانے کا خیال جو ہم کو اس دُنیا سے باہر لے جاکر کسی اور ہونیوالی دُنیا کا منظر دکھائے ہمیشہ سے ڈرامہ نویسوں کو بیتاب کرتا رہا ہے۔ مسٹر سر جے ایم باری مرحوم کی تصانیف سے یہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک عمدہ تخیلی ڈرامے میں شاعری کی چاشنی ضرور ہونی چاہیئے۔ اس کا قصہ اتنا یقینی ہو کہ وہ ہماری توجہ کو تھامے رہے، پھر بھی شروع سے آخر تک ایسا ہلکا اور لطیف ہو جیسے ہوا۔ غالباً ڈرامے کی کوئی صنف بظاہر اتنی آسان اور درحقیقت اتنی مشکل نہیں جتنی یہ ہے۔ اس قسم کے تخیل تمثیل کو ایک اوا کر وہ پریوں کی کہانی ہونا چاہیئے۔ بوجھ اور آورد کے ساتھ جو تمثیل لکھی جاتی ہے وہ دل کو پست کر دیتی ہے۔ مسٹر آئنیڈ ڈون کا یہ مختصر ڈرامہ ایک بھونڈا تخیلی افسانہ نہیں ہے۔ مختصر سہی، مگر اسکے کردار انگوٹھوں کے بل چلتے معلوم ہوتے ہیں۔　(باقی)

(شام۔ ایک پرانے چھوٹے مکان کا کمرہ جس کی دیواریں لکڑی کی بنی ہوئی ہیں۔ اس میں پیچھے کھلی ہوئی کھڑکی سے [illegible] ہے، آگے آتشدان کی سُرخ چمک ہے جو دیکھنے والوں کی بائیں جانب نظر آرہی ہے۔ یہی دو روشنیاں ہیں جو [illegible] کمرے میں پائی جاتی ہیں۔ ایک معروف گلی باہر نظر آتی ہے اور کھڑکی کی سیدھی طرف والا دروازہ ٹھیک اس [illegible] ہے۔ آتشدان کے مقابل باورچی خانہ ہے جس میں پیالیاں اور رکابیاں آگ کی روشنی میں جگمگا رہی ہیں۔ اونچی پشت کی ایک ساگوانی کرسی نے سرد چاندنی کے خوف سے اپنی پشت کھڑکی کی طرف کر کے اگلا رُخ آتشدان کی طرف پھیر لیا ہے، تاکہ آگ کی گرمی میں اپنے اعضا تاپ سکے۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک میز ہے جس پر سُرخ کپڑا ہے۔ دونوں جانب کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک طرف چائے دان اپنے آپ کو گرمی پہونچا رہا ہے، اور اوپر کی جانب جہاں دُھواں نکلتا ہے ایک دھیما چراغ جل رہا ہے۔

کھڑکی سے ایک لڑکی گذرتی ہے، دروازے میں ایک کھٹک سی ہوتی ہے اور پائرٹی داخل ہوتی ہے۔ دروازے پر اپنا لبادہ آویزاں کر کے، بدن سمیٹتی اور ایک لمحے کیلئے آگ تاپنے چلی جاتی ہے۔ چراغ بڑھا کے چائے دان آگ پر رکھتی ہے۔ کمرے کے اُس طرف تابدان سے دسترخوان نکالتی اور میز پر بچھا کے دو پیالیاں رکھتی اور چائے کی فکر کرتی ہے۔ ایک دفعہ کھڑکی کے قریب جاتی اور معمولی سُرخ پردہ ہٹا کے باہر نظر ڈالتی ہے اور کسی قدر مایوسی سے کام پر واپس آجاتی ہے۔ ایک دو تین چمچے چائے ڈالتی ہے۔ باہر کسی وجہ سے اس کی توجہ باہر کی طرف ہو جاتی ہے [illegible] ہے اور اس کا چہرہ کھل جاتا ہے۔ گانے کی آواز آتی ہے۔

"لڑکی، چاند کا انتظار نہ کر۔
وہ ڈالیوں کے جال میں پھنس گیا۔
اور شاداب اور شرمیلا موسم بہار
مولشیوں کو رات کا سلام" کہہ رہا ہے۔

(آواز قریب آتی ہے اور ایک کھونی سفید ٹوپی کھڑکی کے

شیشوں سے گذرتی ہے۔ پاٹرٹ داخل ہوتا ہے۔)

پاٹرٹ۔ (اپنی ٹوپی پاٹرٹی کی طرف پھینک کے) اُف کس بلا کی سردی

ہے۔ میرے پاؤں شل ہو گئے۔

پاٹرٹی۔ یہ رہے تمہارے سلیپر پہن لو۔ میں نے گرمی کے لئے وہاں

رکھدئے تھے۔

(وہ آگ کے قریب بیٹھتا ہے۔ لڑکی زمین پر گھٹنے ٹیک کے

اُس کے جوتے نکالتی ہے۔)

پاٹرٹ۔ (گاتے ہوئے) لڑکی چاند کا انتظار نہ کر

وہ اپنی زبان نکال کر منہ چڑائیگا

دیکھ کہ شرمیلا اور شاداب موسم،

ستاروں کو اپنی اپنی جگہ ٹانک رہا ہے۔

چائے ابھی تیار نہیں ہوئی؟

پاٹرٹی۔ ہو چکی ہے۔ صرف چائے دان ابلنا باقی ہے۔

پاٹرٹ۔ آج بازار میں بھی وہ سردی تھی کہ خدا کی پناہ۔

شاید میں اچھا نہ گا سکا ہونگا، سردیوں میں مجھ سے الاپا نہیں

جاتا۔

پاٹرٹی۔ آہا، آپ تو چائے دان معلوم ہوتے ہیں۔ جب سردی ہوتی

ہے تو وہ بھی نہیں گا سکتا۔ اے حضرت چائے دان۔ جلدی کیجئے۔

پاٹرٹ۔ کاش چائے دان اپنی آواز پر آپ عاشق ہوتا!

پاٹرٹی۔ میں سمجھتی ہوں واقعہ بھی یہی ہے۔ دیکھئے نا ایک پرندے کی طرح

چہچہانے لگا۔ آؤ آج بلبل کی زبان سے چائے کے چمچے کا کام لیں۔

(وہ جوش کھاتا ہوا پانی چائے دان میں ڈالتی ہے) چلئے۔

پاٹرٹ۔ (آگ کی طرف دیکھ کے) خدا نے آگ کو حسن دیا ہے۔ شکل و

صورت عطا کی ہے مگر اُس کے سینے میں دل نہیں۔

پاٹرٹی۔ (روٹی کاٹ کر مسکہ لگاتی ہے) چلئے، کھا پی کر لطف اٹھائیے

ایک کونے میں بیٹھے کیا بڑ بڑا رہے ہیں؟

پاٹرٹ۔ میں سوچ رہا تھا۔

پاٹرٹی۔ چلو، چائے پی لو۔ جب کوئی آگ تاپنے بیٹھتا ہے تو اونچے

خیال آتشدان کی راہ سے باہر نکل جاتے ہیں۔

پاٹرٹ۔ ساری دنیا ایک آتشدان ہی تو ہے۔ لوگوں کو ردی کاغذ

کی طرح کوئی چیز دیدو، وہ فوراً اُن کے دل میں بھڑک اٹھتی ہے۔ ٹھوس

خیالات دھواں بنکر اُڑجاتے ہیں۔

پاٹرٹی۔ پاٹرٹ، چھوڑو بھی یہ قصہ، دیکھو میں نے مسکہ کتنا گہرا

چڑھا دیا ہے۔

پاٹرٹ۔ تم تو ہمیشہ مسرور رہتی ہو۔ پاٹرٹی۔

پاٹرٹی۔ جی ہاں، خوش رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔

پاٹرٹ۔ اُف۔

(میز کے پاس آکے بیٹھ گیا۔ تھوڑا سا وقفہ جس میں

پاٹرٹ چائے کے گھونٹ لینا شروع کرتا ہے۔)

پاٹرٹی۔ چائے اچھی ہے؟

پاٹرٹ۔ ہاں! خاصی ہے!!

پاٹرٹی۔ خاصی ہے؟ کہو تو تھوڑی سی اور ڈالدوں۔

پاٹرٹ۔ بس کافی ہے۔

پاٹرٹی۔ ارے ہاں۔ اس سیاہ کتے کو باندھ دوں کیا؟

پاٹرٹ۔ سنو تو سہی۔ کیا تم نے آج اس لڑکی کو دیکھا؟

پاٹرٹی۔ کہاں، کس جگہ؟

پاٹرٹ۔ وہ جو گھوڑوں کے حوض کے قریب کھڑی ہوئی تھی۔ بانکی

ترچھی، گلے میں منکوں کا ہار!

پاٹرٹی۔ میں نے اُسے نہیں دیکھا۔

پاٹرٹ۔ میں نے تو دیکھا، اور اُس نے بھی مجھے دیکھا۔ میں گا رہا تھا

اور وہ مجھے دیکھ دیکھ کر تالیاں بجا رہی تھی۔ کیا عورت کے سینے میں

ایسا دل اور پھر ایسا روپ بھی ہو سکتا ہے؟

پاٹرٹی۔ سارا دکھاوا تھا۔

پائرٹ۔ ہرگز نہیں، تمہیں کیسے معلوم؟ تم نے تو اُسے دیکھا ہی نہیں؟

پائرولٹ۔ شاید دیکھا بھی ہو!

پائرٹ۔ سُنو، پائرٹی، اس طرح رشک کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔
جب ہم دونوں نے یہ تماشہ دکھانے کا کاروبار شروع کیا تو طے یہ
ہوا تھا کہ ہم صرف ایک دوسرے کے کام میں شریک رہیں گے اور بس۔
اگر میں کسی کو دیکھ کر اپنی شادی کے قابل پاؤں تو شادی کر سکتا ہوں،
اگر کوئی تمہیں دیکھ کر شادی کرنا چاہے تو تم بھی شوق سے کر سکتی ہو،
ہاں تم بھی۔

پائرولٹ۔ کیا بکتے ہو؟ مجھے رشک کیوں ہونے لگا؟۔

پائرٹ۔ (انجان گاتا ہے) لڑکی، چاند کا انتظار نہ کر،

اُس نے اپنی ٹھوڑی زخمی کرلی ہے،

اور شاداب، سُریلا موسم بہار

کومل کا دل دُکھا رہا ہے۔"

پائرٹی۔ کیا تم نے کھیل ہونے کے بعد اُسے دیکھا؟

پائرٹ۔ نہیں، اس وقت تو وہ مجمع میں گم ہو کر نکل گئی۔ بس میں اور
چائے نہیں پیوں گا" باہر جا کے ذرا اُسے ڈھونڈ لوں۔

پائرولٹ۔ آگ کے قریب آرام سے بیٹھو نا۔ شاید پاتابے سینے میں
تم میری مدد کرسکو۔

پائرٹ۔ مجھے روکنے کی کوشش نہ کرو۔ پاتابے سینا ہے ۔۔۔
کیا دُنیا میں سوائے اسکے کوئی اور کام نہیں؟۔

پائرولٹ۔ شاید ایسا ہی ہو۔ اور ساری دُنیا کا یہی دستور ہو۔ پہلے ہم
پاتابوں میں سوراخ ڈالتے ہیں اور پھر اُنہیں سیتے ہیں۔ عقلمند وہی ہیں
جو اُن سے زیادہ کام لیں اور جہاں تک ممکن ہو سیتے رہیں۔

پائرٹ۔ ائے واہ، اس سے تو مجھے ایک گیت یاد آیا۔

پائرولٹ۔ تو پھر گا دو بھی اُسے۔

پائرٹ۔ نہیں، ابھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ باتیں کرتے کرتے مجھے
سوجھی سُنو،

(میز کو اسٹیج بنا کے کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے،)

زندگی ایک دھاگہ ہے،

ممکن ہو تو اُسے سُلجھاؤ

وہ جو شیخیاں کرتے ہیں

(ایک لمحے کیلئے رک کر، مصرعہ پورا کرنے کیلئے)

کہ ہم مرد ہیں۔

صرف خاکہ ہے یہ۔

پائرٹی۔ کیا تماشے میں اسے گاؤ گے!

پائرٹ۔ تم تو بس بھونڈی کی بھونڈی رہو گی۔ جانتی نہیں ایک شاعرانہ
خیال والا انسان اس قدر حساس ہوتا ہے جیسے بچے کا جسم۔

پائرولٹ۔ پائرٹ، خدا کیلئے ٹھہر جاؤ دیکھو باہر کتنی سردی ہے۔

پائرٹ۔ مطلب یہ کہ میں بیٹھے ہوئے تمہاری بڑبڑاہٹ سُنتا رہوں۔

پائرولٹ۔ ابھی ابھی تم نے کہا کہ میں بہت خوش رہتی ہوں۔

پائرٹ۔ لے تو پھر گرفت شروع ہوئی۔

پائرولٹ۔ معاف کرنا پائرٹ۔ مگر بازار میں آج کیچڑ بہت ہے اور
تمہاری جوتیاں بہت پتلی ہیں۔

پائرٹ۔ میں نے ایک دفعہ کہدیا کہ میں نہیں ٹھہرونگا۔ میں اُس
لڑکی کا ضرور پتہ چلاؤں گا کیا خبر کہ وہی میرے خوابوں کی دُنیا ہو!

پائرولٹ۔ تم ہمیشہ ایک تصوّری عورت کی فکر میں کیوں رہتے ہو؟"

پائرٹ۔ کیا تم کسی تصوّری مرد کا خیال نہیں کرتیں؟

پائرولٹ۔ نہیں، میں تصوّری نہیں عملی بننا چاہتی ہوں۔

پائرٹ۔ عورتوں میں تصوّر کا جوہر ہے کہاں۔ ان کو تو فقط رحم و
ترس کھانا، مامتا دکھانا آتا ہے اور جب وہ ضرورت سے زیادہ نرم
ہو جاتی ہیں تو کہتی ہیں "میں محبت کرتی ہوں"۔ یہ سب کچھ نہیں۔ میں
ایک ایسی عورت چاہتا ہوں جسے سامنے کھڑا کروں اُسے دیکھا کروں
اور محبت کرتا رہوں۔

پائرولٹ۔ (جوش میں آکر) پائرٹ، چاند کا انتظار نہ کر،

اس کی شعاعوں میں ایک دن بجھ رہا ہے
اور شاداب سنہرا موسم بہار
صرف بیس دن رہیگا"

پائرٹ۔ آہ، میں تمہیں کبھی سمجھا ہی نہیں سکتا۔ خیر، میں چلا۔
(باہر جاتے ہوئے، منہ ادھر کرکے، کسی قدر طعن
کے ساتھ گاتا ہے۔)
"لڑکی، چاند کا انتظار نہ کر"

(پائرٹی دور تک اس کی آواز سنتی ہے۔ پھر آگ کے
قریب آکے لکڑیاں ہلاتی ہے۔ آگ پر جھکتے ہوئے
اسے ایک پرانا گیت یاد آتا ہے جسے وہ ہنستے اور
جھجکتے ہوئے شعلوں کی مخمل اور فکر کرتے ہوئے
کندوں کو سناتی ہے۔)

اتنی بڑی اور مصروف دنیا میں،
شہروں اور بازاروں کے قریب
ایک دوشیزہ رہتی ہے۔
لوگ اُسے دیکھکر آہیں بھرتے ہیں اور کہتے ہیں
"غریب ہجراں نصیب"
یہ کیوں؟ اس لئے کہ نرم گلابی ہونٹوں پر
وہ چیز رقص کرتی ہے جسے زبان ادا نہیں کرسکتی
اس کی آنکھیں غمگین اور اداس ہیں پرسکون خوبصورت
دن میں اسے کوئی خوشی نصیب نہیں۔
تصور کے صاف شفاف پانیوں کی گہرائی میں
اس کا معشوق خیالی رہتا ہے،
سوتے ہوئے رات اسی کی روشنی سے کھلتی ہے
اور اس کی نیند اسی کی آنکھوں پر بوسوں کی بارش ہوتی ہے۔
وقت کی گہرائیوں سے، گو ایک شخص اٹھا
جو اس کے دل میں آگ لگا سکتا تھا،
مگر اس کی زندگی مایوسی سے پُر ہے، وہ کبھی
اپنے شاہد دلنواز کو نہیں پاسکتی
اگر اس مایوس الفت سے ملو
تو کہیں چھیڑ چھاڑ نہ کرنا۔
خاموشی اچھی ہے۔ اُسے اپنے ہجراں نصیب دل میں
اپنے تصورِ حیات کو چھپا رکھنے دو؛

(اشک بھر آتے ہیں، وہ اپنے ہاتھوں میں منہ
چھپا لیتی ہے۔ دروازے پر تین مرتبہ آہستہ کھٹکا
ہوتا ہے۔ پائرٹی حیرت سے سنتی ہے۔ پھر کھٹکا
ہوتا ہے۔)

پائرٹی۔ اندر آؤ۔

(دروازہ آہستہ سے کھلتا ہے۔ گویا خودبخود کھل گیا
دہلیز پر پوری چاندنی میں ایک صنعت گر کھڑا ہوا
ہے۔ یہ ایک عجیب مگر نرم مزاج انسان معلوم
ہوتا ہے، عمر زیادہ ہے مگر چہرے پر کوئی کرختگی
نہیں۔ اس کی صورت ایسی ہے جس سے بچے
فوراً کھیلنے لگتے ہیں۔ اس کا لباس اس کی وضع
قطع کسی قدر انوکھی ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں
فڈل ہو تو وہ کسی گاؤں کا سازندہ معلوم ہو۔ بغیر
کچھ کہے وہ کمرے میں داخل ہوتا ہے اور اس کے
پیچھے پھر دروازہ خودبخود بند ہو جاتا ہے۔)

پائرٹی۔ (اچھلکر اس کی طرف بڑھتے ہوئے) معاف کرنا، کھٹکا دیتے
ہی مجھے دروازہ کھولنا چاہیئے تھا۔

صنعت گر۔ مضائقہ نہیں۔ میں دروازے کھولنے کا عادی ہوں۔
تمہارے گھر کا دروازہ تو بہت آسانی سے کھل گیا۔ شاید تم کو یقین آئے
کہ بعض لوگ دروازوں کو کیل کانٹوں سے جڑ دیتے ہیں کہ کھلنے ہی
نہ پائے۔ تم اس وقت مجھے دیکھکر حیران سی ہو نا؟

پائرٹی:۔ میں سوچ رہی تھی شاید آپ کو بھوک لگ رہی ہو۔

صنعت گر:۔ بالکل نسوانی خیال۔ مگر خیر، شکریہ۔ میں بہت کم کھاتا ہوں بہت ہی کم۔ گرمجوشی سے ہاتھ ملانا، یا ایک تبسم میری غذا ہے اور میرے لئے کافی ہے۔

پائرٹی:۔ کم از کم بیٹھ تو جایئے، یہ مکان آپ کا ہے۔

صنعت گر:۔ (بنچ پر بیٹھتے ہوئے) میں جس مکان میں جاتا ہوں اُسی اپنا گھر سمجھتا ہوں۔ لبعض لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ میرے بغیر گھر، گھر ہی نہیں ہوتا۔ کیا اپنے پاؤں اس کٹہرے پر رکھوں؟ یہ میری پرانی عادت ہے، میں ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہوں۔

پائرٹی:۔ ہاں، لوگ کہتے بھی تو ہیں۔

"بغیر کٹہرے پر پاؤں رکھے
زندگی میں فراغت کہاں"

صنعت گر:۔ بالکل ٹھیک۔ گھر اور آتشدان کی راحت کا سارا راز اسی میں ہے۔ ہائیں، تم رو رہی تھیں؟

پائرٹی:۔ ہاں، دل کچھ بھر آیا تھا۔

صنعت گر:۔ مجھے سارا حال معلوم ہے۔ یہ پائرٹ کا قصہ ہے۔ ٹھیک ہے' تو گویا تم اُس کی محبت میں دیوانی ہو اور وہ تمہاری ذرہ برابر پرواہ نہیں کرتا۔ سچ ہے نا؟ کیا دُنیا ہے؟ اور تم آنکھوں سے فریاد کئے جاتی ہو؟

پائرٹی:۔ میں ہمیشہ تو نہیں روتی۔ آج اُس نے ضرورت سے زیادہ کھائی پڑی۔ اور میں نے اسکے دل بہلانے کی بہت کوشش کی۔

صنعت گر:۔ مُرکھائی، کیا یہ اسکی عادت ہے؟

پائرٹی:۔ نہیں اس کا منشا یہ نہ تھا۔ کچھ موسم کی خرابی، ادھر تماشے کی آمدنی میں کمی۔ پائرٹ کا ارادہ ہمارے متعلق ایک مضمون لکھکر بطور اشتہار کے کسی مقامی اخبار میں شائع کروانے کا ہے۔ اس کا خیال ہے اگر مُدیر اور اُس کے خاندان کو تماشے کے فری پاس دے جائیں تو وہ خوشی سے شائع کر دیگا۔

صنعت گر:۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ پائرٹ ان قیمتی آنسوؤں کے قابل ہے؟

پائرٹی:۔ بیشک۔

صنعت گر:۔ تم جانتی ہو، آنسو گنوا دینے کے لئے نہیں ہیں۔ دل تھام رکھنے کے لئے ہم کو اُن کی بہت ہی کم مقدار ملتی ہے۔ اگر ہم انہیں بہت جلد خرچ کر دیں اور اپنے پاس کچھ نہ رکھیں تو پھر دل کا خدا حافظ ہے۔

پائرٹی:۔ پائرٹ نہایت عُمدہ شخص ہے۔ تم اُسے اتنا نہیں جانتے جتنا میں جانتی ہوں، ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہتا ہے، اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ اُس نے ابھی کسی کو دل نہیں دیا ہے۔ تم جانتے ہو، محبت آدمی میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیتی ہے۔

صنعت گر:۔ بالکل صحیح ہے۔ مگر کیا اُس نے تم میں بھی کچھ تغیر کیا ہے؟

پائرٹی:۔ ہاں ہاں ۔ ۔ ۔ میں روزانہ پائرٹ کے جوتے صاف کرتی، اس کے لئے چائے بناتی ہوں اور ہر وقت خوش رہتی ہوں کہ مجھ سے اس کی کچھ خدمت ہو جاتی ہے۔ اگر محبت نہ ہوتی تو مجھے یہ سار کام دردِ سر نہ معلوم ہوتا؟

صنعت گر:۔ کیا واقعی تمہاری محبت سچی ہے؟

پائرٹی:۔ کیوں نہیں۔

صنعت گر:۔ سنو، جب کبھی تم کو پائرٹ کا خیال آتا ہے تو کیا تم کو ننھے ننھے پاؤں کی چاپ سُنائی دیتی ہے؟ جب کبھی وہ تم سے بولتا ہے تو کیا ننھے ننھے نرم ہاتھ تمہارے چہرے اور سینے پر مچلتے دکھائی دیتے ہیں؟

پائرٹی:۔ (جوش کے ساتھ) جی ہاں۔ بالکل ٹھیک، ایسا ہی ہوتا ہے!

صنعت گر:۔ تو پھر ٹھیک ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ پائرٹ تمہارے اندر یہ جنبشیں کیوں پیدا کرتا ہے؟

پائرٹی:۔ اس لئے ـــــ ہاں اس لئے کہ پائرٹ آخر پائرٹ ہے۔

صنعت گر:۔ "آخر پائرٹ ہے" یہ تو پرانی بات ہے۔

پائرٹی:۔ یہ ضرور ہے کہ وہ کسی قدر خیالی آدمی ہے۔ مگر یہ اس کی رُوح کی ترنگ ہے۔ مجھے یقین ہے اگر وہ کوشش کرے تو بہت بڑے بڑے کام کر سکتا ہے۔ اور تم نے کبھی اس کو مسکراتے ہوئے دیکھا ہے؟ کتنا دلکش تبسم ہے! بعض وقت، جب وہ میری طرف نہیں

دیکھتا تو میں ہمیشہ یہ دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں کہ میں اُس کی نگاہوں میں کیا ہوں؟ (غور سے) مگر میری دلی خواہش تو یہ ہے کہ بجائے دوسروں کے وہ مجھے ہی دیکھ کر مسکرایا کرے۔

صنعت گر:- اچھا تو وہ اوروں کو دیکھکر بھی مُسکراتا ہے؟

پائرٹی:- کوئی دن ناغہ نہیں ہوتا کہ اس کے تماشے میں کوئی حسین عورت نہ آتی ہو۔ آج ہی ایک خاتون آئی تھیں، سرو قد، گلابی رخسار۔ یہ حضرت آج اُسے ہی ڈھونڈنے چلے گئے ہیں۔ مگر یہ ان کا قصور نہیں۔ بیچاریاں اس سے محبت کئے بغیر رہ کب سکتی ہیں! (فخر سے) میرا خیال ہے کہ ہر شخص کو پائرٹ سے محبت ہے۔

صنعت گر:- مگر فرض کرو ان میں سے کوئی اُس سے شادی کرلے؟

پائرٹی:- جی نہیں کوئی ایسا نہیں کرسکتی۔ ایک عمدہ عورت کسی غریب گویّے سے کیوں شادی کرنے چلی؟ اگر پائرٹ شادی کرلے تو میرا خیال ہے مجھے . . . . . اس جہان سے گذر جانا چاہیئے مگر توبہ۔ میں یہ سب تم سے کیوں کہہ رہی ہوں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے میں برسوں سے تم کو جانتی ہوں۔

(صنعت گر نشست گاہ سے اُٹھتا اور پائرٹی کی طرف آتا ہے۔ پائرٹی میز کا دسترخوان اُٹھا رہی ہے۔)

صنعت گر:- شاید ایسا ہی ہو پائرٹی، تم مجھے برسوں سے جانتی ہو۔

(اس کا لہجہ اتنا نرم اور موثر ہے کہ پائرٹی دسترخوان چھوڑکر صنعت گر کا منہ دیکھنے لگتی ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے صنعت گر بھی اُسے دیکھکر مسکراتا ہے پھر حلق میں ایک گھونٹ اتارتے ہوئے جو اسکی ہمیشہ کی عادت ہے وہ آگ کی طرف پلٹ جاتا ہے)

پائرٹی:- (اس کی جیب سے ایک چھوٹی سی کمان نکالتی ہے) آہا، دیکھو تو اسے!

صنعت گر:- (شرمندگی سے جھجک کر) اسے تو بہ، میں نے اُسے نہیں دکھانے کے لئے نہیں رکھا۔ میں بھول ہی گیا تھا کہ یہ جیب سے باہر نظر آرہی ہے۔ میں پہلے بہت تیر چلایا کرتا تھا، اب کچھ زیادہ موقع نہیں ملتا۔

(کمان لیکر پھر جیب میں رکھ لیتا ہے۔)

پائرٹ:- (دور سے گاتا ہوا)

لڑکی، چاند کا انتظار نہ کر،
وہ سمندر کو اپنے جال میں پھنسا رہا ہے،
اور شاداب اور سُریلا موسم بہار
گُلاب کو "پھول جانا" سکھا رہا ہے۔

صنعت گر:- (آہستہ سے آواز سنتے ہوئے) کون ہے وہ؟

پائرٹی:- پائرٹ۔

(پھر کوئی سفید ٹوپی شیشوں سے گذرتی دکھائی دیتی ہے، پائرٹ داخل ہوتا ہے۔)

پائرٹ:- کہیں اس کا پتہ نہیں چلا۔ (صنعت گر کو دیکھکر) آپ کون؟

صنعت گر:- میں آپ کے لئے اجنبی ہوں، مگر پائرٹی نے مجھے ایک لمحے ہی میں پہچان لیا۔

پائرٹ:- شاید کوئی پرانی آگ ہو؟

صنعت گر:- سچ ہے "میں پرانی آگ ہوں" میں نے دُنیا کو مدتوں روشن رکھا ہے۔ مگر جب تم "پرانی" کہتے ہو، تو دوسری طرف ایسے بھی لوگ ہیں جو مجھے اچھی کاٹھی کا کہتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو، میں نے دُنیا کا کتنا سفر کیا ہے؟"

پائرٹ:- (آزمائشی طور پر ایک گز بھر ناپتے ہوئے) شاید اتنا۔

صنعت گر:- میرا خیال ہے تمام دن مذاق کرتے ہوئے آپ کچھ بیزار سے ہو جاتے ہونگے۔

پائرٹی:- اتنے روکھے نہ بنو پائرٹ۔

صنعت گر:- (پائرٹ کے ساتھ تنہا رہنے کی خواہش سے) پائرٹی کیا تم نے رات کا کھانا تیار کرلیا۔

پائرٹی:۔ ارے ہاں، مجھے جلد بازار جانا چاہیئے۔ دکانیں بند ہو جائینگی۔ میرے واپس آنے تک کیا تم یہاں رہو گے؟

صنعت گر:۔ (پائرٹی کو باہر چھوڑتے ہوئے) میں کوشش کرونگا میں کوشش کرونگا۔

(پائرٹی باہر چلی جاتی ہے۔ ایک لمحہ خاموشی رہتی ہے جس میں صنعت گر پائرٹ کو کسی قدر دلخوش کُن انداز سے دیکھتا ہے)

صنعت گر:۔ اچھا تو میرے دوست، آج کل کاروبار ٹھیک نہیں۔

پائرٹ:۔ تیز ضرور ہیں۔ اگر مذاق کے معنی کاروبار کے ہیں تو یہ ضرور تیز ہے، مگر پیسہ نہیں ملتا۔ تاہم آج میں نے کچھ اچھا کام کر لیا ہے۔ مدیر سے وعدہ لیا ہے کہ میرا مضمون شائع کرے۔ اس کی وجہ سے لوگ آجائیں گے۔ (گاتا ہے)

"براہ کرم ایک دن غریب خانے آئیے جو اُن درختوں میں واقع ہے،
مگر چار بجے نہ آئیے، ہم اس وقت بہت مصروف ہیں،
ہم شہد کی مکھیوں کو دیکھتے، مینڈکوں اور مچھلیوں کو غسل دیتے ہیں ـــ
جو ابر کے عکس میں سونا ملاتے ہیں"

یہ گیت ہے جو میں لکھ رہا ہوں۔

صنعت گر:۔ اگر تم کو دُنیا کی ساری دولت مل جائے تب بھی تم خوش نہ ہو گے۔

پائرٹ:۔ واقعی؟ مجھے دُنیا کی ساری دولت دیدو اور میں اُسے کام میں لگا دونگا۔ سب سے پہلے میں مدرسے بناؤں گا تاکہ لوگ اعلیٰ چیزوں کو سمجھ سکیں۔

صنعت گر:۔ تم شہرت، دولت اور بہت خالی خولی باتوں کے خواب دیکھتے ہو، اس لئے بہت سی عمدہ چیزیں رہ جاتی ہیں۔ تم غیر مطمئن ہو! کیوں؟ اس لئے کہ تم کو خوش رہنا نہیں آتا۔

پائرٹ:۔ (گاتا ہے:۔)

زندگی ایک بہتا ہوا چشمہ ہے:
اُس کی مچھلیاں پکڑ لو۔
اے وہ لوگو، جنہوں نے معشوق کی زلفوں پر
عُمدہ گیت لکھے ہیں؛

یہ ایک اور گیت ہے جو میں لکھ رہا ہوں۔ یہ دوسری نظم ہے۔ مجھے باتیں یکایک ایسی ہی سوجھتی ہیں۔ اُسے پورا کرنے کے لئے مجھے ایک تیسری نظم بھی لکھنی چاہیئے۔

صنعت گر:۔ ایسی نظم کیوں نہیں لکھتے جس کا کوئی انجام ہی نہ ہو، اور ہمیشہ جاری رہے؟۔

پائرٹ:۔ بھئی یہ تو کچھ حماقت سی معلوم ہوگی۔

صنعت گر:۔ یہ سب منحصر ہے کسی ـــ مگر اس قسم کے گیت کیلئے گانے والے کو ہمیشہ خوش رہنا چاہیئے۔

پائرٹ:۔ ہاں، اور میرے انداز میں تھوڑی سی مشق بھی۔

صنعت گر:۔ کیا ہم تم دونوں ملکر ایک سودا کریں؟

پائرٹ:۔ ضرور ـــ آپ کو کونسی نشستیں چاہئیں؟ صف اوّل کی نشستیں مخمل کی ہیں، ایک روپیہ، لکڑی کے بنچ آٹھ آنے۔ سب سے پیچھے کی نشستیں چار آنے۔ شاید آپ کو روپے والی نشستیں چاہئیں مگر کتنی؟۔

صنعت گر:۔ تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں۔

پائرٹ:۔ اس سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ہمارے پاس سب برابر ہیں۔ البتہ آپکے لطف و کرم اور توجّہ کا شکریہ۔

صنعت گر:۔ پائرٹ، میں خوابوں کا معمار ہوں!

پائرٹ:۔ کیا کہا؟

صنعت گر:۔ میں اُن تمام خوابوں کا معمار ہوں جو اس دُنیائے پرشور پر چھائے ہوئے رہتے ہیں۔

پائرٹ:۔ دوست، تھوڑی دیر آرام لیجئے، آپ بہت تھکے ہوئے

معصوم ہوتے ہیں۔

صنعت گر:۔ پائرٹ، پائرٹ، تمہارا بلند تر دماغ میری سطح پر اتر نہیں سکتا۔ ایک بچہ یا "عام مخلوقِ خدا" ایک لمحے میں یہاں اتر سکتی ہے۔ میں خوابوں کی تعمیر کرتا ہوں۔ ان نا چیز ٹکڑوں کی جو لوگوں کے دلوں میں بس جاتیں اور انہیں مسرور کر تی ہیں۔ تم نے کبھی غور کیا ہے کہ موسم خزاں میں ابابیلیں کہاں چلی جاتی ہیں؟ وہ میری دکان پہ آتی ہیں اور اُن کا پتہ نشان دیتی ہیں جن کو خوابوں کی ضرورت ہے۔ پھر یہ بھی بتاتی ہیں کہ وہ خواب کیا ہوئے جو لوگوں نے موسم بہار میں حاصل کئے تھے؟

پائرٹ:۔ آپ کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ان باتوں پر یقین کر لوں؟

صنعت گر:۔ جب پھول مرجھا جاتے ہیں تو کبھی تم نے سوچا ان سب کے رنگ کہاں جمع ہوتے ہیں اور یہ تیتریاں سرما میں کدھر غائب ہو جاتی ہیں؟ میری دوکان میں سرما کا گذر نہیں ہوتا۔

پائرٹ:۔ میں نے ان چیزوں کا کبھی خیال نہیں کیا۔

صنعت گر:۔ میری دوکان کھوئی ہوئی چیزوں کا ایک خزانہ ہے جہاں دنیا کی تمام گمشدہ خوبصورت چیزیں سما جاتی ہیں۔ میں یہیں بیٹھ کر اپنا ہر دلعزیز خواب" تیار کرتا ہوں۔ وہ خواب جسے "عشق" کہتے ہیں۔

پائرٹ:۔ او ہو! اب سمجھ میں آیا۔

صنعت گر:۔ مگر یقین نہیں آتا؟

پائرٹ:۔ آتا تو ہے مگر قائم نہیں رہتا۔ ہاں قائم نہیں رہتا۔ دنیا میں جب جسم ہوتا ہے تو روح نہیں رہتی، اور جب روح رہتی ہے تو جسم نہیں رہتا۔ میں نے کئی مرتبہ یقین کرنے کی کوشش کی، مگر پہلے ہی شوب میں رنگ غائب!

صنعت گر:۔ تم ہمیشہ ایک نعم البدل کا خیال رکھتے ہو۔ نہیں اصل اور ماہیت کا انتظار کرو۔

پائرٹ:۔ مگر اسے سمجھائے گا کون؟ اور بیان کریگا کون؟

صنعت گر:۔ اس کی سینکڑوں علامتیں ہیں۔ جونہی تم کو روح اور ماہیت حاصل ہوئی تو تمہارے بازوؤں میں گدگدی سی پیدا ہونیگی۔ یہ سمجھو محبت پر تول رہی ہے۔ پھر تم چڑھتے چڑھتے ستاروں تک پہنچنا چاہتے اور آسمان کی چھت پر چڑھ کے چاند کو راگ سنانا چاہتے ہو۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ میں اپنے خواب میں چاند کا بہت کچھ حصہ شامل کر دیتا ہوں۔ اس کو سخت محنت کرتا ہوں کہ وہ غائب ہو جاتا ہے، پھر میں اُسے ترقی عطا کرتا ہوں۔ وہ بہت جلد بڑھتا ہے، شاید تم نے بھی دیکھا ہوگا اور دو ہفتوں میں وہ پھر کام کا ہو رہتا ہے۔

پائرٹ:۔ یہ ایک بڑی دلکش، فسوں انگیز چیز ہے! ہاں تو کیا ابابیلیں سارے خواب جمع کرتی ہیں؟

صنعت گر:۔ ہمیشہ نہیں۔ میرے پاس اور بھی قاصد ہیں۔ ہر رات کو جب بارہ بجتے ہیں اور بڈھے گھڑیال نصف شب کی منادی کرتے ہیں تو دن تقویم سے نکل کر میری دکان میں داخل ہو جاتا ہے جو عہد گذشتہ کی سرزمین میں واقع ہے۔ میں اس پر شفقت کا ایک چھینٹا دیتا اور اُسے سونے کی ایک جھلک عطا کر کے کہتا ہوں "اے ننھے ماضی واپس جا اور دنیا میں یادگار رہ" مگر میں اپنے بہترین خواب امروز کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ میں معصوم بچوں کو حاصل کرتا اور انہیں خوابوں سے سنوارتا اور انہیں مکمل کر کے روانہ کرتا ہوں . . . . . یہ میری ہمیشہ کی عادت ہے!

پائرٹ:۔ میں نے عمر بھر خواب دیکھا کئے مگر وہ میرے ہی خواب بنے رہے۔ میرا خیال ہے شاید میں اُن کی اچھی طرح آمیزش نہیں کرتا ۔۔۔!

صنعت گر:۔ تم وہی چیز چھوڑ دیتے ہو جو اس کا نچوڑ، اس کی جان ہے۔ تم کو اس میں تھوڑی سی غم کی چاشنی لگانی چاہیئے تاکہ ضرورت سے زیادہ مٹھاس کم ہو جائے۔ مجھے یہ راز بہت جلد معلوم ہو گیا اس لئے میں نے تھوڑی سی شبنم لی جس سے صبح کے موتی بنتے ہیں اور میں اپنے خوابوں پر اسے آنسوؤں کا تحفہ بنا کر چھڑک دیا۔

پائرٹ:۔ (عالم جوش اور مستی میں) آنسوؤں کا تحفہ! بہت خوب! تم جانتے ہو مجھے واقعی ایسے تحفے کی ضرورت ہے، وہ نہیں جو میں خود بنا لیتا ہوں۔

صنعت گر:۔ اگر تم تلاش کرو تو لی تحفے مل سکتے ہیں۔ جو بندہ، یا بندہ۔

پائرٹ:۔ یہ ٹھیک ہے، مگر بکھرے ہوئے خوابوں کو کون اِدھر اُدھر دیکھتا پھریگا؟

صنعت گر:۔ میرے پاس اپنا بنایا ہوا ایک خواب ہے، جو تمہارے کام آسکتا ہے۔ میں نے ایک معصوم کے اندر اُسے ڈال دیا۔ یہ بیس سال پہلے کی بات ہو، اب یہ معصوم ایک نوجوان حسینہ بن گئی ہے جس کی آنکھیں نیلی اور بال سنہری ہیں۔

پائرٹ:۔ ہاں اس کے متعلق "گفتار" ہی سے میرے بڑے کام نکلتے ہیں۔

صنعت گر:۔ ابھی مجھے اور بہت کچھ کرنا ہے۔ جب میں نے اُسے دنیا میں روانہ کیا تو اس کے ساتھ ایک پروانہ تھا۔ وہ یہ ہے، تم اسے لے سکتے ہو۔

پائرٹ:۔ شکریہ، مگر اس سے فائدہ؟

صنعت گر:۔ کیوں، یہ پروانہ جس کا، مال بھی اُس کا۔ غور سے دیکھو اس میں ساری تفصیل درج ہے، بڑے خوش قسمت ہو دوست۔

پائرٹ:۔ کیا اس کے رُخسار سُرخ اور اس کے گلے میں منکوں کی مالا ہے؟

صنعت گر:۔ نہیں تو!

پائرٹ:۔ تو پھر وہ میری لڑکی تھی۔ ۔ ۔ ۔ آہ میں اُسے کہاں ڈھونڈوں۔ ۔ ۔ ۔؟

صنعت گر:۔ اس کا پتہ تم خود چلا سکتے ہو۔ صرف جستجو چاہیئے۔

پائرٹ:۔ تو پھر میں چلا۔

(چلنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔)

صنعت گر:۔ میں ہوتا تو آج کی رات نہ جاتا۔

پائرٹ:۔ مگر مجھے اُسے ڈھونڈ نکالنا ہے۔ کوئی اُسے مجھ سے پہلے نہ حاصل کر لے۔

صنعت گر:۔ پچھلے دنوں ایک شخص تھا جو موتیا کے پھول جمع کرنا چاہتا تھا۔

پائرٹ:۔ (ایک عام بات سُن کے) موتیا کے پھول!

صنعت گر:۔ لوگوں کے توڑے جانے کے خوف سے اُس نے رات ہی کے وقت ارادہ کیا۔ صبح ہوگئی، مگر پھول نہ ملے اس لئے وہ مایوس ہو کر گھر لوٹ آیا۔ جب باغ پہونچا تو دیکھا کہ رات کو پھول خود اس کی چوکھٹ کے قریب اُگ آئے ہیں۔ بھائی صبر کرو اور کہا مانو۔ ع: کہ سالک بیخبر نبود زراہ و رسم منزلہا۔

پائرٹ:۔ ہاں اگر یہی تمہاری نصیحت ہو تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر یہ تو بتاؤ، کیا میں اُسے ڈھونڈ سکونگا؟

صنعت گر:۔ میں یقیناً تو نہیں کہہ سکتا، مگر کیا تم اپنے آپ کو احمق سمجھو گے!

پائرٹ:۔ ہاں کیوں نہیں۔ ۔ ۔ جب تم مجھ سے براہ راست یہ سوال کرو۔ ۔ ۔ کبھی تم مجھے کسی قدر الجھن میں ڈال رہے ہو۔ مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ آدمی سے آدمی۔ ۔ ۔ (تامل کرتا ہے)

صنعت گر:۔ (ہاتھ سے تیقن کا اشارہ کرکے) ہاں ہاں۔

پائرٹ:۔ تو پھر میں کسی قدر فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ

صنعت گر:۔ بالکل ٹھیک۔ یہی تمہارا اصل خطرہ ہے۔ جب تم ستاروں کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھو گے تو ممکن ہے تمہارا پاؤں ایک جگنو پر پڑ جائے۔ مگر ہاں۔ تمہارے تیسرے گیت کے لئے ایک مضمون ہاتھ آیا۔

زندگی ایک عورت کی پکار ہے
اپنے کان بند نہ کرو
ایسا نہ ہو کہ جب رات بڑھ جائے

تو تم کو آنسو بہانا پڑے۔

(صنعت گر کی یہ نرم اور مؤثر آواز سنکر پائرٹ بھی
ایسا ہی حیران ہوجاتا ہے جیسے پائرٹی ہوتی ہے۔
دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اتنے
میں شیشوں کے قریب ایک سرخ ٹوپی رقص کرتی
ہے۔ پائرٹی سامان لیکر اندر آتی ہے۔)

پائرٹی۔ آہ، میں بہت خوش ہوں کہ آپ ابھی ہیں۔

صنعت گر۔ مگر اب مجھے جانا چاہیئے۔ میں ایک سیاح تو ٹھہرا۔

پائرٹی:۔ (دروازے میں راستہ روکتے ہوئے) اوہ، آپ ابھی نہیں جا سکتے۔

صنعت گر۔ مجھے کھڑکی سے نکل بھاگنے کی تکلیف نہ دو۔ میں بہت ناخوشگوار صورتوں میں ایسا کرتا ہوں۔

پائرٹ (خوشی اور کسی قدر طعن کے ساتھ) پائرٹی، اپنے مہمان کا خیال رکھو۔ تم جانتی ہی نہیں کہ تم کس کی خاطر مدارات کر رہی ہو۔ تم اس وقت خوابوں کے ایک معمار کے سامنے کھڑی ہو جو دنیا میں اس طرح مہکتا ہے جیسے مچھلی کسی چشمے کی گھاس میں۔ مجھے اس نے اپنے ایک شاہکار کا پروانہ دیا ہے اب میرا کام ہے کہ اس کا پتہ چلاؤں (پھر عامیانہ گفتگو شروع کر کے) میری آرزو ہے کہ میں اسے پا سکوں۔

صنعت گر۔ اپنے جانے سے قبل میں یہ چھوٹا سا نغمہ دے جاتا ہوں۔

"ہر عورت کو ایک درسگاہ کھولنی چاہیئے۔
کیونکہ ہر مرد احمق پیدا ہوتا ہے"

(وہ تعظیم کے ساتھ جھک کے تیزی اور خاموشی
سے چلا جاتا ہے۔)

پائرٹی (دروازے کی طرف بھاگتی ہوئی اور باہر دیکھتی ہوئی) ارے وہ کتنی تیزی سے چلا گیا۔ نظر سے بالکل غائب!

پائرٹ۔ آخر مجھے اپنا بڑا مقصد حاصل ہونے والا ہے۔ اب بڑی شادی رچائی جائیگی، میں اپنا سفید کوٹ پہنوں گا، چاندی کا نشان لگاؤں گا اور ہاتھ میں سونے کی موٹھ کی چھڑی رکھونگا۔

(کچھ گاتا ہے۔ پھر کہتا ہے)

پائرٹی، ایسا معلوم ہوتا ہے میں اس دنیا میں داخل ہونے والا ہوں جو ہر آدمی کا پیدائشی ورثہ ہے۔۔۔ اور وہ ہے "عورت کی محبت"۔

پائرٹی۔ خدا تمہیں کامیاب کرے اور خوش رکھے۔

پائرٹ۔ (ستانے کے خیال سے گاتا ہے)

"یہ ایک سمجھی ہوئی اور چھپی ہوئی بات ہے کہ
ہم تو خواب کی دنیا میں ملا کرینگے۔
تم دریا کا خواب دیکھو، میں جنگل کا
اگر دریا رہے تو میں تم سے ملونگا
اور اگر ہم جنگل میں ملیں تو وہ تم ہی ہوگی"

پائرٹی۔ تم کو خوب روپیہ کمانا چاہیئے تاکہ تم اسے اس کی منہ مانگی دولت دے سکو۔ میں رقص کرونگی اور اتنا ناچوں گی کہ لوگ بول اٹھینگے "ارے یہ تو ناچتے ناچتے مرگئی!"

پائرٹ۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہم دونوں ملکر تماشہ کا کاروبار چلائیں۔ میں اخبار کا مضمون ابھی تیار کئے دیتا ہوں۔

(وہ میز سے کاغذ، قلم نکال کے لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔)

"حال ہی میں اس شہر میں سیاح اداکاروں کی ایک جماعت وارد ہوئی ہے، اس کا ایک تماشہ ہوا جو نہایت رنگین، موسیقانہ اور دلچسپ تھا۔ مجمع پائرٹی کے شاندار رقص اور نغموں سے بہت محظوظ ہوا۔۔۔۔ اور پائرٹ کے ناچ سے بھی۔ پائرٹ بیس سالہ نوجوان اور ایک دل خوش کن ظریف ہے، اداکار ہے"۔۔۔۔ اسکے بال۔۔۔ کس رنگ کے ہیں؟

پائرٹی۔ نہایت خوبصورت۔

پائرٹ ۔ عجیب بات ہے، ہم روز ایک شخص کو دیکھتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ اُس کے بالوں کا رنگ کیسا ہے، خوبصورت بال اور آنکھیں؟

پائرٹی ۔ نیلی۔

پائرٹ ۔ خوبصورت بال اور نیلی آنکھیں۔ خوبصورت اور نیلی یہ دو لفظ مہمل معلوم ہوتے ہیں۔

پائرٹی ۔ کیا مہمل ہے؟

پائرٹ ۔ وہ چیز جو میں سوچ رہا تھا۔ اکثر لڑکیوں کے خوبصورت بال اور نیلی آنکھیں ہوتی ہیں۔

پائرٹی ۔ ہاں پائرٹ، ہم لوگ آخر انسان ہی تو ہیں، خیالی فانوس نہیں۔

پائرٹ ۔ تمہاری آواز کتنی سُریلی معلوم ہوتی ہے! مگر میں نہیں سمجھ سکتا۔ بیشک، مگر یہ سب مہمل ہے۔

(پروانہ جیب سے نکال کے پڑھتا ہے)

پائرٹی ۔ کیا چیز مہمل ہے پائرٹ؟ تم مجھ سے نہ کہوگے؟

پائرٹ ۔ پائرٹی، ادھر اُجالے میں کھڑی رہو۔

پائرٹی ۔ کیا کوئی خاص بات ہے؟

پائرٹ ۔ میرا تو یقین ہے کہ دُنیا میں کوئی خاص بات نہیں۔

(پروانہ پڑھتے ہوئے اور اُسے دیکھتے ہوئے)

"آنکھیں کہتی ہیں" مجھے تم سے محبت ہے" بازو کہتے ہیں" مجھے تمہاری ضرورت ہے"! ہونٹ کہتے ہیں" تم کیوں جرأت نہیں کرتے"

پائرٹی، یہ ناممکن ہے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی غور نہیں کیا کہ تم کتنی حسین ہو، اُسے، تم تو پہلے جیسی رہی ہی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں تم نے اپنا پہلا چہرہ مٹا دیا ہے اور گلاب کے پھول سے ایک نیا چہرہ بنا لیا ہے!

پائرٹی ۔ یہ کیا تماشہ ہے؟

پائرٹ ۔ محبت، آہ میں نے اُسے پالیا۔ کیا تم نہیں سمجھتیں؟

"میں بیوقوف ہوں، جس نے
تمہارے مدرسے میں درس ہوش حاصل کیا ہے"
آہ، تمہیں روز دیکھنا اور پھر ایک خواب کے عالم میں گم ہونا!
بہت افسوس ہے۔ بیشک یہ اس کے رنگین خوابوں میں سے ایک ہے۔
یہی سبب ہے کہ میرا دل ایک نئی صبح سے بھرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

پائرٹی ۔ آہ پائرٹ!

پائرٹ ۔ آہ، میرے بازو کتنے کُھل رہے ہیں کہ اُڑوں۔ کیا تم بھی آسمان پر اُڑ کر ستاروں کی انجمن میں گانا نہیں چاہتیں؟

پائرٹی ۔ میں تو ابتک چاند پر بیٹھی ہوئی اپنے محبوب کا انتظار کرتی رہی۔

پائرٹ، ایک مسکراہٹ، ایک تبسم سے مشکور کرو۔ ایک بوسے کے ذریعے یہ مجھے عطا کرو۔

(ہاتھ پیچھے کھول کے ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں حتیٰ کہ اُن کے ہونٹ ایک طویل بوسے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔)

پائرٹی ۔ (اپنا سر خوشی کی آہ لیکر پیچھے ہٹاتی ہے) آہ، میں کتنی خوش ہوں اب سارے غم والم کا خاتمہ ہو جائیگا۔

پائرٹ ۔ پائرٹی، چلو آتشدان کے قریب بیٹھیں، اپنے پاؤں کٹہرے پر رکھیں اور اب ایک خوشی کی زندگی بسر کریں۔

(دونوں نشستگاہ کے قریب آگئے۔ بیٹھتے ہوئے پائرٹ نرمی سے گاتا ہے۔)

لڑکی، چاند کا انتظار نہ کر،
آسمان کی سیڑھیاں بہت بلند ہیں۔
سریلا اور شاداب موسم بہار
بوسہ لیکر تم کو نیند کی آغوش میں پہونچا رہا ہے۔

(چراغ جل کر خاموش ہو رہا ہے۔ صرف آتشدان کی آگ اُنکے چہروں پر پڑتی ہے اور پردہ گر جاتا ہے۔)

(باڈون)

مترجمہ: باقی

خدمتگار

"کتنی مرتبہ تم سے کہا کہ بھئی جلدی لایا کرو مگر سُنتے ہی نہیں!"
میں نے پچھلی سیٹ پر کتابیں پٹخ کر کہا۔ "ڈیڑھ گھنٹے سے پاگلوں کی طرح ٹہل رہی ہوں۔ غضب خدا کا ڈھائی بج رہے ہیں۔ خدا کی قسم آج ابا سے ضرور کہونگی کہ بہادر سے وقت پر موٹر نہیں لائی جاتی تو میرے لئے دوسرا انتظام کریں" اور میں کتابیں سرکا کر بیٹھ گئی۔

"تو سرکار ناراض کیوں ہوتی ہیں؟ کل ذرا جلدی لایا تو فرمایا اتنی جلدی لے آتا ہے۔ میں لائبریری میں پڑھ بھی نہیں پاتی۔"
بہادر نے بدتمیزی سے میری نقل کرتے ہوئے کہا۔

"چپ رہو، ایک تو غلطی کرتے ہو اور اوپر سے ٹرّاتے ہو!" میں نے جھڑک کر کہا۔

"اتنا غصہ کریں گی تو سوکھ کر کانٹا ہو جائیں گی" بہادر نے تنبیہاً انگلی ہلا کر کہا۔

"دیکھو بہادر بک بک مت کرو" میں نے غصہ کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔

"تو پھر آپ بھی .... تو پھر آپ غصہ کیوں ہوتی ہیں۔ ایسا بُرا مُنہ لگنے لگتا ہے"

"تمہاری بلا سے"

"تمہاری بلا سے" اُس نے اترا کر نقل کی۔

مجھے ہنسی آنے لگی۔

"آج تو مارے غصے کے پیچھے جا بیٹھیں۔ آگے آئیے نا!"
اُس نے کھڑکی کھول کر "حکم" دیا۔

"نہیں۔ چلو بک بک نہ کرو۔ جہاں میرا دل چاہیگا بیٹھونگی"

"اچھا تو پھر چلا لیجئے خود! ہم سے نہیں چلتی" اُس نے نہایت لاپرواہی سے کھڑکی سے سہارا لیکر کہا۔

"بہادر شاید تم بھول رہے ہو کہ تم نوکر ہو" میں آج لڑنے پر تُلی ہوئی تھی۔

"تو لیجئے میں استعفا دیتا ہوں" "بس" وہ موٹر سے ہٹ کر زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور لاپرواہی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"بہادر! بد مذاقی مت کرو۔ مجھے واقعی غصہ آرہا ہے" میں نے جھلا کر کہا۔

"واقعی" اُس نے ہنسکر مذاق اُڑایا۔

"بہادر سیدھی طرح موٹر چلاتے ہو کہ ......"

"تو پھر آگے آئیے نا۔ اچھا قصور ہوا لیجئے پیر چھوتا ہوں۔ آپکا پھولا ہوا مُنہ دیکھکر سچ مچ میرے ہاتھ پیر بھول جاتے ہیں اور موٹر اُلٹ جاتی ہے۔ اور ......"

"نہیں میں آج پیچھے ہی بیٹھوں گی" میں نے صلح پر رضامند ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں آج آپ آگے ہی بیٹھیں گی۔ اب معافی جو مانگ لی ہے" اُس نے خوشامد سے کہا۔

میں اُتر کر آگے بیٹھ گئی۔

"اگر آپ آگے نہ بیٹھتیں تو میں موٹر تھوڑی چلاتا" وہ شرارت سے مُسکرایا۔

"بہت بیحیا ہو" میں نے کہا۔

"کون؟" اُس نے ایسے کہا گویا وہ خود مجھے بیحیا سمجھتا ہے۔

"بدتمیز! میں آج ضرور ابا سے کہوں گی کہ تم کبھی وقت پر نہیں آتے" میں نے اپنی ہنسی کو روکنے اور بات ٹالنے کیلئے کہا۔

"تو پھر خود ہی موٹر چلانا سیکھ لیجئے نا۔ یوں! آتی ہے یوں!"
اُس نے چٹکی بجا کر بتایا۔

"سیکھوں ہی گی" میں نے بے توجہی سے فیصلہ کیا۔

"تو پھر سیکھئے نا۔ آج ہی سے شروع کیجئے۔ چلو جُبلی پارک ؟"

اُس نے موٹر موڑ کر کہا۔

"کیا واقعی دو روز میں سکھا دو گے ؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"اور کیا۔ دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ مگر یوں تھوڑی ...... اونہنک .... پہلے سیر بھر مٹھائی" اُس نے ہونٹ بھینچ کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مٹھائی وٹھائی کا جھول ہے یونہی سکھاؤ"

"خوب! بھئی واہ! تو پھر سکھانا بھی جھول ہے۔ اچھا سودا ہے! ایسی مُفت کی موٹر کسی اور سے سیکھئے" اُس نے اکڑ کر کہا۔

"اچھا اب اتراؤ نہیں۔ ورنہ ابّا سے کہہ دوں گی۔ وہ جوتے لگیں گے کہ یاد ہی کرو گے" میں نے دھمکی دی۔

"اچھا یہ ہے تو پھر یہی سہی، جائیے کر دیجئے سو دفعہ شکایت، نہیں سکھاتے"

"تو اتنا اکڑتا کیوں ہے۔ اچھا چل مل جائے گی مٹھائی سکھاؤ تو" میں نے وہیل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تو پھر ... خیر ... مگر سُنیئے تو ... نِرا واعدہ تو کچھ ویسا ہے" اُس نے بے اعتباری سے کہا۔

"بدتمیز تجھے میرا اعتبار نہیں"

"اور جو نہیں پھر ؟"

"دیکھو کدھر گھماؤں" میں نے بات ٹالنے کے لئے وہیل پکڑ کر کہا۔

"سیدھی طرف"

"ارے رے رے" میرے مُنہ سے نکلا اور موٹر بال بال تار کے کھمبے سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"سیدھی سڑک پر جا رہی ہیں اور موڑنے کی کیسی جلدی ہے" اُس نے مذاق اُڑایا۔

"اچھا لیجئے۔ سنبھالئے" اُس نے الگ ہو کر کہا میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ موٹر کی اسپیڈ بڑھی اور ہوا سائیں سائیں کر کے میرے دل میں اُترنے لگی۔

"بہادر۔ اَرے" میں نے تکلّف سے کہا "ارے پکڑو"

"آپ ہی پکڑئے .... ہاں زور سے ... ارے بھاگی"

اور وہ زور سے ہنسا۔

موٹر کی اسپیڈ بڑھی اور میری گھبراہٹ۔ میں چلّانے پر مجبور ہوئی اور ایک زور کا جھٹکا لگا۔ موٹر اُلٹتے اُلٹتے بچی۔ بہادر نے ایک دم بریک دبا دیا تھا۔ میں نے ہاتھ ہٹا لئے اور واقعی غصہ ہو کر بیٹھ گئی۔ مجھے پسینہ آ گیا تھا۔

"اچھا لیجئے ... لیجئے اچھے نہیں" اُس نے خوشامد سے کہا۔

"چلو گھر سیدھے" میں نے غصہ سے حکم دیا۔

"آپ چلائیے نا! اس میں ڈرنے کی کیا بات تھی۔ ہونہہ ... اسی بر تے پر موٹر چلائیں گی" اُس نے موٹر گھر کی طرف موڑ کر کہا۔

"اور چلائیں کیسے ؟ جیسے لوٹ ہی تو گئی نا! بہت چلی آپ سے موٹر!"

بہادر ہنستا رہا اور میں اُتر کر کھسیانی اندر چلی گئی۔

"اَے بندو" بہادر نے مالی کو پُکار کر کہا "بیوی کو موٹر چلانی آ گئی" اور وہ طویل قہقہہ لگا کر موٹر گیرج میں لے گیا۔

ذرا سوچئے ایک ذلیل نوکر جو چھوٹی سی عمر سے ہمارے یہاں رہا۔ دن بھر بیٹّا۔ برتن مانجھنا۔ جوتے صاف کرنا۔ ذرا بڑے ہو کر چھوٹے موٹے کاموں کے لئے ڈرائیور کی خدمات انجام دینا۔ اور یہ دماغ ؟ وجہ یہ ہے کہ مجھے اور بھیّا کو سوائے بہادر کے کبھی کوئی دوست نصیب نہ ہوا۔ چنانچہ ہم نے ہمیشہ اس کے لاڈ برداشت کئے۔ بھیّا تو جلد ہی اسکول میں بورڈر ہو گئے اور بہادر نے مجھ پر رعب جمانا شروع کیا۔ ہر بات میں اُس کی ہی در رہتی۔ رُوٹھ جاتا تو ایک بات کرنے والا ہی ہاتھ سے جاتا۔ ابّا دوسرے ابّاؤں کی طرح

ہم سے کبھی لاڈ پیار نہ کرتے تھے۔ ویسے بہادر کو خود انہوں نے سر چڑھا رکھا تھا۔ کبھی میں نے اگر اُس کی شکایت بھی کی تو ہنس کر ٹال دیا۔ چھٹپن میں تو اگر کبھی میں بھولے سے بہادر کو مار دیتی تو وہ تڑاق سے چانٹا مارتا کہ منہ پھر جاتا۔ ابا کو فخر تھا کہ وہ اُلٹا مجھے ہی ڈانٹتے کہ "تو پہلے کیوں مارتی ہے" ویسے جب بہادر کا جی چاہتا مجھے چھپ چھپ کر خوب ٹھونکتا۔ بھیا سے بھی وہ برابر ہی کا برتاؤ کرتا۔ اب تک جب وہ کالج سے آتے ہیں تو وہ دونوں میں گھل مل کر باتیں ہوتی ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ آقا اور نوکر ہیں۔

موٹر سیکھے، دنوں کے بجائے ہفتے ہو گئے۔ سوائے لڑنے اور صبر کرنے کے اور موٹر سیکھتے وقت کچھ نہ ہوتا۔ کبھی سوچتی "بھاڑ میں جائے، تانگہ میں کالج چلی جایا کروں گی۔ موٹر نہ ہوئی مصیبت ہو گئی" مگر پھر بہادر سبز باغ دکھاتا اور میں چکر میں آ کر سیکھنے کو تیار ہو جاتی۔

بہادر کو ہر بات میں دخل دینے کا حق ہے۔ پڑھے نہ لکھے ٹوٹی پھوٹی اُردو آتی ہے۔ اس پر یہ زور کہ اُردو کا اخبار گھر میں آنا لازمی۔ جہاں میں اور ابا اپنی سنجیدہ بحث شروع کرتے بہادر اپنی بدتمیز رائیں پاس کرنا شروع کر دیتا۔ میری ہی بات کو کاٹتا۔ اور میں جل جاتی۔ مگر ابا کہتے "یہ خوب سیاسیات کو سمجھتا ہے، اِسے اُلو نہ سمجھو"

بڑی ہنسی آتی جب بہادر صاحب، مولا بہشتی، ننھا دھوبی اور ننو اچار کے لڑکے اور مسجد کے مولوی صاحب کے بیچ میں ٹوٹی ہوئی اینٹ پہ بیٹھکر چین اور جاپان، جرمنی اور آسٹریا کے موجودہ تعلقات پر رائے زنی فرماتے۔ اُوٹ پٹانگ جھوٹ سچ واقعات پر روشنی ڈالی جاتی۔ ننو کا نوجوان لڑکا خودکشی اور فراری کے واقعات جو اُسے ازبر ہوتے تھے نہایت جوشیلی آواز سے سُناتا۔ مولا کو ہمیشہ ہندو مسلمانوں کی باہمی جنگوں کا ذکر سننے میں مزہ آتا۔ اُس کا بس نہ تھا کہ ہندوؤں کو پیس ڈالے۔ ننھا گو ہندو تھا مگر اُسے فسادوں سے دلچسپی نہ تھی، دوسرے وہ مولا کے بگڑے بگڑے بازو دیکھکر ذرا خوش مزاج ہی رہنا پسند کرتا تھا۔

ایک دن میں اخبار پڑھ رہی تھی کہ بہادر کمرہ صاف کرنے آئے۔ اخبار کو جھانک جھانک کر دیکھنا اُن کی عادت ہے۔ ان کے پھٹے ہوئے اخبار میں تصویریں نہیں ہوتیں اور اس وجہ سے انہیں میرے اخبار میں جھانکنے کیلئے ذرا نرم ہونا پڑتا ہے۔

"یہ کون ہے؟" وہ ایک تصویر کو دیکھکر بولے۔

"یہ ایک لیڈر ہیں" مَیں نیکی کے دم میں تھی۔

"لیڈر؟" یہ لفظ اُنکے اخبار میں کم آتا تھا "لیڈر؟"

"ہاں" میں نے مختصر طور پر کہا۔

بہادر کی غرض اٹکی تھی مجھے معلوم ہو گیا۔

"تو یہ لیڈر کون ہوتے ہیں۔ یہ تو جانور لگتا ہے"

"چُپ بدتمیز یہ بہت بڑا آدمی ہے"

"کوئی پان چھ گز کا؟"

"بیوقوف ہو تم"

"ویسے ہی تو نہیں جیسے لیڈر صاحب یہاں بھی آئے ہیں"

"کون؟"

"وہی جو پرسوں بھی آئے تھے"

"وہ پلیڈر تھے۔ بیوقوف یہ لیڈر ہے"

"اچھا!" اُس نے بالکل نہ سمجھکر کہا۔

"رہنما ہے"

"یہ... اچھا... رہنما... قطب نما" وہ اترانے لگا۔

"تو تم اسے نہیں جانتے؟"

"نہیں"

"تمہارے اخبار میں کچھ نہیں لکھا"

"اس میں ایسے بیہودہ لوگوں کا کہاں ذکر؟ وُہ تو ورتے ہوتے ہیں سارے اخبار میں زیادہ تر تو بس غزلیں ہی ہوتی ہیں۔

اور آنا بھی تو بہت دِنوں میں ہے۔"

"کیسے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ملک کے جہلا اپنے لیڈر کو نہیں جانتے" میں نے تاسّف سے کہا۔

"تو اس میں میرا کیا قصور؟ مجھے تو فرصت نہیں ملتی جو اِن "نا" صاحب کے پاس جاؤں۔ چور ہے تک تو جانے کی مہلت نہیں ہوتی۔"

"تم جیسے اِس کے پاس جا بھی کہاں سکتے ہو" میں نے ہنس کر کہا۔

"کیوں؟ کیا وہ سات تالوں میں رہتا ہے۔ یا کیا؟"

"جی وہ تم جیسے ٹرپونجیے سے ضرور ملے گا؟"

"ہم ٹرپونجیے کاہے سے ہیں؟ یہ دیکھئے" بہادر نے ذرا سیدھے کھڑے ہو کر کہا۔

"وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ دُور سے دیکھ لینا ہی اُسے غنیمت ہے۔ تمہاری تو وہاں تک رسائی بھی نہ ہو گی۔"

"ایسے اس میں کون سے لڈو لگے ہیں جو ہم اُسے کھائینگے، دماغ کیوں دکھاتے ہیں کیا بہت روپیہ پیسہ ہے؟"

"بہت! دو دِکے اُنہیں روپے کی پروا نہیں۔ کھدّر پہنتے ہیں ـــ"

"تو اس میں کیا ہوا۔ ننوا چار ہمیشہ سے کھادی پہنتا ہے، مولا بھی ایک تہبند میں چھ مہینے گذار دیتا ہے۔ ہم بھی تو سرکار اور بھیا کی اُترن پہنتے ہیں۔"

"تم، ننوا اور مولا تینوں گدھے ہو۔ یہ تو قوم کی خدمت کرتے ہیں۔ غریبوں کا انہیں بڑا درد ہے۔"

"ارے! اور ہم کون خدمت نہیں کرتے؟ صبح سے جو جُت جاتے ہیں تو شام کہیں دس بجے چھٹی ملتی ہے۔ مولا کی کمر پانی بھرتے بھرتے ٹیڑھی پڑ گئی۔ ننوا کے ہاتھ چمڑا چھیلتے چھیلتے گھِنا گئے۔ اب اور کونسی خدمت . . . . یہ لیڈر کرتے ہیں۔"

"جی! تو جناب کا خیال ہے کہ ننوا، مولا اور آپ تینوں لیڈر ہیں۔ ضرور را" میں نے ہنس کر مذاق اُڑایا۔ "تم لوگ گائے بیل کی طرح کام کرتے ہو گدّی میں سے تو کچھ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ لوگ قوم کی خاطر قید میں جاتے ہیں لوگوں کو سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔ انکی بھلائی کے لئے کوئی اگر جان مانگے تو جان تک دیدیں۔"

"تو کوئی مولوی ہیں، رشی ہیں۔ کیا ہیں؟"

"ہٹ۔ رشی اور مولوی سب ڈھونگ مچاتے ہیں، یہ تو رہنما ہیں۔"

"ارے کچھ بتائیے تو یہ کون ہوتے ہیں؟ جیسے؟"

"جیسے . . . . وہ . . . . جو . . . . تجھے یاد ہے؟ لکھنؤ میں جلوس نکلا تھا۔"

"وہ لاٹ صاحب کا"

"اُرے ہٹ . . . . وہ جو امینہ آباد . . . ."

"وہ جو بیّپا شاہ جی نے پنکھا چڑھایا تھا درگاہ پر؟"

"میں تمہیں مار دونگی جو ٹیں ٹیں کرے جائے گا۔ جا نہیں بتاتے۔"

"تو پھر بتاتی نہیں ہیں ڈانٹے جاتی ہیں۔"

"ارے بھئی وہ جب قومی جھنڈیاں لگی تھیں . . . ."

"وہی تو لاٹ صاحب والا تھا۔ سارے میں روشنی ہی روشنی تھی۔ ایسی رونق لگی تھی کہ کیا کہنا۔ منوں پھول لوگوں نے ڈالے تھے۔"

"نہیں۔ اِن کمبخت انگریزوں نے تو ہمارے ملک کو لوٹ لوٹ کر ناس کر دیا۔ غریبوں کا پیٹ کاٹ کر استقبال کے لئے روپیہ جمع ہوتا ہے اور دو چار عمدہ عمدہ سڑکیں صاف کر کے اور سجا کے اُس میں سے اُنہیں گذروا دیا جاتا ہے۔ بڑے ہمارے ملک پر حکومت کرتے ہیں! کمبخت کہیں کے،" میں نے جوش سے کہا۔

"اور یہ لیڈر کیا کرتے ہیں۔ یہ بھی تو جھنڈیاں لگا کر سڑکیں چھڑوا کر اور ہار پھول پہن کر جلوس نکال دیتے ہیں۔ بہت ہوا تو کچھ

بول دیے۔ دے تالیاں! دے تالیاں پڑی پٹ رہی ہیں۔ سمجھ میں خاک نہیں آتا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"تم بیوقوفوں کی سمجھ میں کیا آئیگا!"

"تو پھر آپ جیسے...." وہ ہنسا "تو پھر یہ بیوقوفوں کے لیڈر نہیں!"

"نہیں اور نہ بدتہذیب لوگوں کے" میں نے جلکر کہا۔

"تو پھر ہمیں کیا ضرورت جو ہم انہیں کوڑی بھر بھی دیا ریں۔ کبھی ہمارا بھی کوئی لیڈر ہوتا۔"

"تم تو سمجھتے ہی نہیں۔"

"تو پھر سمجھائیے نا؟" اُس نے عاجز ہوکر کہا۔

"یہ لیڈر غریبوں کے ہمدرد ہیں۔ تمہارے پیپا شاہ اور مداری شاہ تو ٹھگ ہیں۔ لوٹ لوٹ کر اپنا گھر بھرتے ہیں۔ اور یہ تو غریبوں کی روزی کی کوشش کرتے ہیں۔ انکے حقوق دلاتے ہیں۔"

"پیپا شاہ کے یہاں بھی تو آئے دن لنگر بٹتا ہے" بہادر نے دلیل پیش کی۔

"لنگر بٹتا ہے! پیٹ بھرے پہونچ جاتے ہیں اور کچھ نہیں ـــــ"

"لو! پیٹ بھرے کیوں پہونچ جاتے۔ اب میں نہ پہونچ جاؤں آپ نہ چلی جائیں" بہادر بولا۔

"تم سمجھ ہی نہیں سکتے" میں نے عاجز آکر کہا۔

"اور جو کہتا ہوں سمجھائیے تو سنتی ہی نہیں۔"

"کیا سمجھاؤں کوڑھ مغز! ابھی یہ ہمارے حقوق دلوائے ہیں۔ ہمیں گورنمنٹ کی نوکریاں دلوائیں گے۔ ہمارے لئے سیٹیں رزرو کروائیں گے" میں نے سمجھا ہی دیا۔

"سیٹیں کیسی؟ ریل کی؟" کندۂ ناتراش بولا۔

"اونھ! گھسل۔ بھئی ہٹ میں تجھے نہیں سمجھا سکتی۔ ارے بھئی سیٹیں! اونھ کیسے بتاؤں اسمبلی میں سیٹیں۔"

"اچھا اب میں سمجھا" بہادر نے سمجھنے کی کوشش چھوڑ کر کہا "اچھا تو سب کو اب ڈپٹی کلکٹریاں ملا کریں گی۔"

"اور کیا۔"

"تب تو مزہ ہے! میں بھی ڈپٹی کلکٹری میں نام ڈلواؤنگا۔"

"جوتے لگیں گے" میں نے ہنسکر کہا۔

"جی۔ ای۔ بہت لگے جوتے۔ اور ہاں ننوا کا لڑکا نویں درجے میں پڑھتا ہے۔ وہ تو ضرور ہی ڈپٹی بنجائیگا۔"

"تم تمہارے ننوا اور مولی ہی تو ڈپٹی بننے کے لائق ہیں۔ ذرا سی گرہ میں بھی رکھتے ہو، ڈپٹی بنو گے۔"

"کیوں اس میں کیا ہے؟ تھانہ داری تو میں ایسی کروں کہ کیا بتائیے۔"

"بھلا تم، جو نہ جانے دُھنے ہو کہ جُلاہے اور ننوا چمار مجسٹریٹ بنیں گے" میں ہنسی۔

"اچھا تو پھر ہم لوگوں کا ذکر نہیں۔ اور یہ گاندھی جی جو ہمارے ہیں وہ؟"

"وہ کیا کر سکتے ہیں؟ وہ مجبور ہیں۔ بھلا کیسے ایک رذیل آدمی کو اونچے عہدے دیدئے جائیں۔ تم ہی سوچو بہادر۔"

"تو پھر کیا! پھر یہ نوکریاں بھی صرف بڑے لوگوں کیلئے ہی لے رہے ہیں۔ لو بھئی ابھی روٹی کپڑے کا ٹھکانہ نہیں ہوا اور نوکریاں بھی نہ ملیں تو یہ کیسے لیڈر۔ ان سے اچھے تو مداری شاہ ہیں جو کھانا کپڑا دیں اور پھر اُن کا کہنا کرو تو جنّت میں الگ جاؤ" بہادر نے جلی ہوئی آواز میں کہا۔

"بس کھانا کپڑا ہی تو ضروریات نہیں۔ ان ذلیل خواہشات سے بلند اعلیٰ اور بھی تو خواہشیں ہیں۔ یہ ضرورتیں تو صرف حیوانات کو ہیں کہ پیٹ بھر لیا اور بیٹھے میں سو گئے۔"

"واہ آپ بھی کیا کہہ رہی ہیں۔ لے جب پیٹ بھر کے کھانا نہ ملے گا تو کوئی جیے گا کیونکر جانوروں کو چرنے کے لئے گھاس

تو ہے اور سونے کو بچھٹے تو ہیں۔ بہت سے غریبوں کو تو یہ بھی میسر نہیں۔ جانوروں کو ایک ایک کے در بھیک مانگنا تو نہیں پڑتی۔"

میں کھسیانی ہوتی جا رہی تھی۔ یہ بہادر بڑا حجتی ہے۔ ایک بات کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔

"غریبوں کی زندگی بہت اچھی ہوتی ہے۔" میں نے فلاسفی چھانٹی۔" نہ کسی بات کا غم نہ فکر۔ مزے سے کھلی ہوا میں جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ روکھی سوکھی ملتی ہے، مگر چین سے کپڑے کی فکر بھی نہیں ستاتی۔"

"بڑی اچھی ہے غریبوں کی زندگی! آپ کو کیا معلوم ان کو یہ روکھی سوکھی بھی کن مصیبتوں اور فکروں کے بعد ملتی ہے۔ زمیندار کا جوتا سر پر رہتا ہے۔ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ بھئی خوب کھلی ہوا میں مزے سے رہے، ذرا آپ تو دو روز یہ مزے اٹھا کر دیکھیں۔ یہ آنکھیں کھل جائیں۔ آپ سمجھتی ہونگی جھونپڑی بھی کوئی سرکار کا دورے والا ڈیرہ ہے کہ اندر مزے سے میز کرسی جمی ہوئی ہے اور نوکر لگے ہوئے ہیں۔ جھونپڑی میں بھلا بھل تو پانی بھرتا ہے۔ اور دنیا بھر کے کیڑے مکوڑے کا ڈر، اس پر نہ بستر نہ تکیہ۔ خوب!" بہادر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

میری عادت ہے کہ بہادر کی دلیلوں سے خواہ کتنی قائل ہو جاؤں مگر کہتی اپنی ہی رہتی ہوں۔ میں نے بات ٹالنے کیلئے کہا: "تم تو ہو جاہل لٹھ، تم سے کون مغز مارے، پڑھو لکھو تو دنیا میں قدر بڑھے۔"

"تو پھر آپ پڑھا تی کیوں نہیں۔" اس نے ضد کی۔" دیکھئے پھر میری بھی قدر بڑھ جائیگی۔"

اس دن کی بحث اس بات پر ختم ہوئی کہ اگر بہادر ایمانداری سے مجھے موٹر سکھائے گا تو میں اس کو پڑھاؤنگی۔

ابھی چند روز ہی پڑھتے شروع ہوئے تھے کہ بہادر کو اپنی قدر بڑھ جانے کا گمان ہو گیا۔ بجائے نیچے بیٹھنے کے کھانے کے کمرے سے کرسی لا کر اس پر بیٹھ گئے۔ اور کتاب کے ورق نہایت انہماک سے اُلٹنے لگے۔

"اٹھو یہاں سے" میں نے اُن کے کان پکڑ کر کہا۔

"کیوں۔ کیا کرسی پر بیٹھنا برا ہے؟" اس نے آنکھیں پھاڑ کر کان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں" اور میں کرسی پر دراز ہو گئی۔

"اُٹھیے یہاں سے" بہادر نے آہستہ سے میرے کان چھو کر کہا۔

میں نے اُسکے ایک تھپڑ لگایا: "بدتمیز۔"

"آپ ہی نے تو کہا تھا کہ کرسی پر بیٹھنا بری بات ہے۔ لیکے ایسے زور سے میرے کان" مروڑے۔"

"تم نوکر ہو اور پھر کرسی پر چڑھ کر بیٹھے ہو۔"

"تو کیوں کیا نوکروں کے کان چمڑے کے ہوتے ہیں؟ بڑی آپ تو گاندھی جی کی چیلی بنتی ہیں۔ اللہ قسم ابتک درد ہو رہا ہے"

"تو کیوں گدھا پن کرتے ہو تم۔"

"کیا کیا میں نے؟"

"تم پھر اتنے گندے کیوں رہتے ہو۔ ذرا اپنے ہاتھ تو دیکھو، جیسے بیل کے کھر۔" میں نے بات پلٹی۔

"کیا کروں؟ ساری عمر برتن مانجھتے، جوتوں پر پالش کرتے گذری۔ یہ دیکھئے کیسے گٹے پڑ گئے ہیں۔ اب موٹر کا کام کچھ کم گندہ ہے؟"

"تمہاری روح ہی گندی ہے!" میں نے فیصلہ کیا۔" کپڑے دیکھو جیسے صافی!"

"اتنے سے روپے اماں بہن اور اس کے پانچ بچے۔ اتنے کپڑے کہاں سے بناؤں۔"

"اور یہ جو بال جھبرے کتوں کی طرح آنکھوں پر پڑے ہیں، یہ؟" میں نے اُس کے سرخی مائل سنہرے بالوں کو پکڑ کر ہلایا۔

"اور جو مانگ پٹی کردں تو سرکار جوتے مار کے نکالدیں۔ جو سر منڈاؤں تو بھیا وہ ٹیپیں لگائیں کہ بھیجا نکل پڑے۔ دوسرے ایسی فکریں لگی رہتی ہیں کہ جی نہیں چاہتا۔" اُس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"تم پڑھوگے بھی یا میرا سر ہی کھائے جاؤگے۔" وہ خاموشی سے پڑھنے بیٹھ گیا۔

رشید ابا کے بے تکلف ہمعصر دوستوں میں سے تھے۔ مجھ سے اُنہیں بچپن سے بیحد لگاؤ تھا۔ میں اُنہیں رشید چچا کہا کرتی تھی۔ وہ مجھے بہت چھیڑا کرتے تھے۔ نہ جانے کیسے انہیں مجھ سے شادی کرنے کا خیال آگیا۔ اور میں اُنہیں رشید کہا کرتی تھی۔ کتنے خوش مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔ گو مجھے دق بھی کرتے تھے لیکن میری ذرا سی بات بھی وہ بڑی مسرت اور غرور سے مانتے تھے۔ اُنکی زندگی ہمیشہ ایک مجرد ہی جیسی گذری۔ والدین نے بچپن میں زبردستی شادی کردی۔ دو تین بچے ہوئے اور پھر جو بیوی سے علیحدگی ہوئی تو ملاپ ناممکن ہوگیا۔ رشتہ داروں سے دور ہم لوگوں کے سوائے کوئی ہمدرد دغویب کا نہ تھا۔ بھیا کو اور مجھے بہت ہی چاہتے تھے۔ مجھے بھی وہ بہت ہی اچھے لگتے تھے۔ ابا تو کبھی لاڈ پیار کرتے نہیں۔ رشید کی محبت ایک نعمت معلوم ہوتی تھی۔ وہ چندروز کیلئے آجایا کرتے تھے جب جانے لگتے تھے تو اُن کے آنسو آجاتے تھے۔ انہیں آئے ہوئے کئی روز ہوگئے تھے۔ انہیں مجھ سے بہت سی باتیں کرنا تھیں اور بجائے گھر میں بیٹھنے کے کہیں باہر کار میں جائیں۔ صبح ہی صبح جو بہادر میرے کمرے میں آیا تو میں نے پوچھا۔ "رشید کہاں ہیں؟"

بہادر نے شرارت سے اپنی جیب میں جھانکا پھر دوسری میں ہاتھ ڈالا۔ پھر حسرت سے منہ بناکر ہاتھ اور سر ہلایا۔ گویا کہتا ہے "نہیں ملتے، کھو گئے۔"

"بتاؤ کہاں گئے ہیں؟" میں نے ہنسی کو روکنے کے لئے کہا۔

"پہلے یہ تو بتلایئے کہ آپ ہمیں آجکل پڑھاتی کیوں نہیں ہیں؟" بہادر نے کمر پر ہاتھ رکھکر پوچھا۔

"نہیں پڑھاتی، پہلے بتاؤ۔"

"نہیں بتاتے پہلے پڑھاؤ" اُس نے فوراً کہا۔

اُسکی کمینی عادت سے واقف ہوں۔ اس لئے نرمی سے کہا۔

"پڑھادونگی بھئی۔ آج میرا دل نہیں چاہتا۔"

"تو پھر میں بھی بتادونگا۔ آج میرا دل نہیں چاہتا۔" اُس نے 'میرا' پر زور دیتے ہوئے کہا اور جانے لگا۔

"ٹھہرو بہادر۔" وہ مڑ گیا۔

"بات یہ ہے... بھئی مجھے... میرے سر میں درد ہے۔ اسلئے آج تو نہیں ہاں کل پڑھادونگی۔"

"بات یہ ہے... بھئی مجھے... میرے سر میں درد ہے۔ اسلئے آج تو نہیں ہاں کل بتادونگا۔"

وہ بالکل جانے والا تھا۔

"اچھا بیٹھو" میں نے کہا۔ اور وہ میرے سامنے پالتی مارکر بیٹھ گیا۔

"اور کتاب؟" میں نے پوچھا۔

"اور یہ آپکے رشید چچا" اُس نے لفظ چچا کو بنکر بگاڑکر بالکل بے تکے پن سے کہا۔ "ذرا موٹر تیز کرو بس گھگی بندھ جاتی ہے ارے رے رے رہے۔ اتنی تیز کیوں ہانکتا ہے۔" بہادر نے مسخری صورت بناکر رشید کی نقل کی۔

"نہیں پڑھنا نہیں تو نکلو میرے کمرے سے۔ چلو میں نہیں پڑھاتی۔"

"آیلو۔ لو۔ بگڑ گئیں۔ بُزدل نہیں ہیں تمہارے رشید چچا" اُسنے پھر لفظ 'چچا' کو واضح طور پر کہا۔

میرا جی جل گیا، مگر کچھ کہتے نہ بن پڑا۔

"بہادر، بھاگو یہاں سے۔ اب میرا دماغ نہ چاٹو" میں نے عاجز آکر کہا۔

"آج وہ ۔ ۔ ۔ ۔" اس نے پروا نہ کرتے ہوئے کہا مگر پھر رُک گیا۔

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ آپ کے تو سر میں درد ہے" وہ جانے کیلئے اُٹھا۔

"تم رشید کیلئے کیا کہہ رہے تھے" میں نے اپنے شوق کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"ہاں اب "اُن" کا جو ذکر ہے تو جلدی جلدی پوچھ رہی ہیں۔ نہیں بتاتے جائیے" وہ دروازے کی طرف چلا۔ پھر بولا "آج جب وہ یہاں برآمدے میں کھڑے تھے تو میں نے غور سے انہیں دیکھا۔ کیسے بے ہنگم لگ رہے تھے۔ بڈھے ہوگئے۔ مگر سنا ہے شادی کے بڑے شوقین ہیں"

مَیں کھسیانی ہوگئی۔ رشید چھ سال سے مجھ سے شادی کرنے میں کوشاں تھے۔

"میں نے سوچا" وہ دروازے کے پاس جاکر بولا "میں نے سوچا بھئی کیسی بدقسمت وہ لڑکی ہوگی جو ۔ ۔ ۔ جس سے ان کی شادی ہوگی"

پیمانہ چھلک گیا۔ میں نے میز پر سے رُولر اُٹھاکر حکم دیا "نکلو ۔ ۔ ۔ ۔ بہادر میرے کمرے سے"

وہ چلا گیا لیکن فوراً پھر آکر کہا "اور ہاں وہ پھاٹک پاس کھڑے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، انہوں نے مجھے آپ کو بلانے کے لئے بھیجا تھا۔ چلتی ہیں آپ یا جاکے کہدوں نہیں آتیں سر میں درد ہے"

وہ پھر چلا۔

کیا بتاؤں میرا کس قدر جی جلا۔ رشید نے مجھے بلانے کو بھیجا اور یہ یہاں باتیں بنانے لگا۔

"میں آرہی ہوں" میں نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

"میں تو کہے دیتا ہوں طبیعت ٹھیک نہیں۔ بخار ہے" وہ مُسکراتا ہوا تیزی سے چلا۔

"نہیں" میں نے ڈانٹا اور جلدی سے مفلر لپیٹتی ہوئی اُسکے پیچھے چلی۔

"تیز آئیے ورنہ پھر نہیں لے جائیں گے" اُس نے میری جلدی دیکھکر طعنہ دیا۔

رشید جلدی سے ٹوپی گھُماتے آگے بڑھے۔

"لیجئے سرکار آگئیں" اُس نے فتحمندانہ بلند آواز سے کہا۔

"کہتی تھیں نہیں جاؤں گی سر میں درد ہے۔ میں نے کہا چلئے بھی۔ سیر کو چلئے تو سب ٹھیک ہوجائیگا" اُس نے مکاری کی وَرکرکے کہا۔

رشید کا چہرہ چمک اُٹھا اور وہ حسب عادت میری نبض ٹٹولنے لگے۔

"اونہہ!" میں نے جلکر کہا اور کار میں بیٹھ گئی۔ بہادر ڈرائیو کرنے لگا۔

اتنی تیزی سے موٹر اسٹارٹ کی کہ معلوم ہو بھونچال آگیا۔ اور کھمبے سے موٹر ذرا ہی بچکر نکلی۔

"ارے" رشید نے آنکھیں پھاڑکر کہا "ٹھیک سے نہیں ہانکتا"

سامنے لگے ہوئے شیشے میں میں نے بہادر کی ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کا مُطالعہ کیا اور میں جل گئی۔ رشید سے کتنی دفعہ کہا کہ بھئی یہ "ہانکنا" کہاں کا لفظ ہے۔ کوئی موٹر نہ ہوئی تانگہ یا چھکڑا ہوگئی جو ہانکی جائے۔ وہ فوراً خوش مزاجی سے کہتے ہیں کہ "میرا مطلب چلانے سے ہے" مجھے اُن کی بعض باتوں سے نفرت ہی ہے۔

باتوں میں خیال بھی نہ رہا اور بہادر نے موٹر کھنڈوں اور نالیوں والی سڑک پر ڈال دی ایسے کہ بات کرنا دشوار ہوگیا۔

توازن بگڑ گیا جوڑ جوڑ ہل گیا۔

"ابے اِدھر کہاں لے آیا" رشید غرائے۔

"ابے۔ تو آپ نے روکا بھی نہیں" اُس نے اُلٹا الزام دیا "خیر آگے سیدھی سڑک ہے"

موٹر پھر لڑھکنے لگی۔ چار میل چلے گئے مگر سیدھی سڑک کا خاک پتہ نہیں۔

رشید کے مُنہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔ مجھے بھی صرف ہنسی آ رہی تھی۔

"ار۔ بھئی تیری سیدھی سڑک کدھر ہے" رشید نے پوچھا۔

"ہوں۔۔۔۔ بھول گیا۔ یہ سڑک تو اٹھارہ میل تک کھڑکھڑیا ہی چلی گئی ہے۔ کیا موڑ دوں"

"اور نہیں تو کیا مار ڈالے گا" رشید بھنائے "یار تم تو بس وہی ہو۔ یکے جوڑ جوڑ ہلا ڈالا ہونہہ" رشید نے اپنا سر میرے سر سے ٹکرانے سے بچا کر کہا۔

سیر کیا خاک ہوتی۔ سارے راستہ طوطوں کی طرح اڈّے پر پنجے جمائے بیٹھے رہے۔ سر پھوٹ جانے کا الگ ڈر۔ گدیوں پر اُچکتے اُچکتے تھک گئے۔ معلوم ہوا سیر نہیں بلکہ کشتی لڑ کر آ رہے ہیں۔ بہادر نے فتحمندانہ مُسکراہٹ سے مجھے دیکھا گویا کہتا ہو کہ "دیکھا! کیسی سیر کرائی؟"

"شام کو کہاں چلیے گا۔ پانچ بجے موٹر نکال لوں" اُس نے تڑاخ سے کھڑکی بند کر کے کہا۔

"ابے ہٹ۔ ہم کیا مرنے کے لئے تیری موٹر میں جائینگے" رشید نے ڈانٹا۔

رشید ہمیشہ بہادر سے بدتمیزی سے بولتے ہیں۔ انہیں بڑی شکایت ہے کہ یہ نوکر ہو کر ذرا بھی مہذب نہیں۔ ابا نے سر چڑھا لیا ہے۔ بیہودہ ہے۔ کسی دن ٹھیک کر دیا جائے گا۔ مگر بہادر خاک نہ سنتا۔ بلکہ صرف شرارت سے مُسکرا کر اور بھی مذاق اڑانے پر تُل جاتا۔

ہم اُتر کر باہر ہی بیٹھ گئے۔ رشید کو میرا اتنا خیال رہتا تھا کہ اگر ذرا سی چیز خریدتے تو سو مرتبہ میری رائے لیتے۔ اُنکی کوٹھی اور فرنیچر میری خاص پسند کا تھا۔ موٹر ہم نے خود جا کر دہلی سے خریدی جس پر خوبصورت حلقے میں میرا مونوگرام بنوایا تھا۔ ہر چیز پر میرا مونوگرام تھا۔ سارے نوکر میری پسند سے رکھے اور نکالے جاتے تھے۔ رشید کے کپڑے اور مختلف چیزیں عموماً میرے پسندیدہ رنگ کے ہوتے۔ اُنہوں نے کبھی میری مخالفت نہ کی۔ جب میں چھوٹی سی تھی جب ہی سے وہ مجھ سے ڈرتے تھے۔ مجھے چھیڑتے اور جب میں خفا ہو جاتی تو وہ بےچین ہو جاتے۔ انہیں اس میں ہی مزا آتا تھا۔ مجھے اب تک اُن سے روٹھ جانے کی عادت ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے مذاق ہی مذاق میں میری چاندی کی جوڑی مچھلیوں والے حوض میں پھینک دی تو میں دس بارہ کی ڈھونگ وہیں مچل گئی۔ بچارے فوراً کوٹ اتار کر پانی میں اُتر گئے۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ وہ کتنے اچھے معلوم ہو رہے تھے۔ سبز کائی اُنکی ٹائی اور بالوں میں بے طرح اُلجھ گئی تھی اور سارے جسم پر سڑی گلی پتیاں چپکی ہوئی تھیں۔ انہیں تکلیف پہونچا کر میرے دل میں گدگدی سی ہوتی تھی۔ مجھے بڑا فخر تھا کہ ایسا بارعب اور طاقتور انسان میرے سامنے بھیگی بلّی بن جاتا تھا۔ بھیا کا تو دم نکلتا تھا۔ مگر میں بہت دلیر تھی۔ ذرا سی بات پر انہیں باتیں سُنا کر رکھ دیتی۔ وہ اُلٹے خوش ہوتے۔ جیسے مجھے ٹائیفائڈ ہوا تھا رشید نے اپنے پیشے کی ساری ترکیبیں مجھے موٹا کرنے کیلئے صرف کر دیں۔ اتنے ٹونک پلائے کہ میں پھول کر کپّا ہو گئی۔ اور بہادر اور بھیا مجھے چڑا چڑا کر کھا گئے۔ ڈاکٹر بھیا کو بہت چاہتے تھے مگر بھیا بیوقوف اُن سے کھنچے کھنچے رہتے تھے۔ رشید اور رشید کی ساری چیزیں میرے آنے کی منتظر تھیں۔ لیکن کتنے ہی نئے سٹ خریدے کتنے ہی نئے موٹر میرے مونوگرام سے سجائے گئے۔ مگر مجھے کبھی وہاں پہونچنا نصیب نہ ہوا۔ ابا سے جب رشید تقاضہ کرتے تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔ رشید مجھے ایک نئے آتشدان کا نقشہ زمین پر کھینچ کر بتاتے

تھے کہ سامنے سے ایک مرکھنی سی گائے دُم اُٹھائے دوڑتی ہوئی سیدھی ہماری طرف لپکی۔ ہندو پیچھے ڈنڈا لیکر دوڑا۔ غُل سُنکر بہادر بھی اپنی کوٹھری سے جھانکا۔ نہ جانے کیا سوچ کر ایک چھوٹی سی لکڑی لیکر ایسے گائے کو ہماری طرف ہنکا کر لایا کہ وہ پھاٹک چھوڑ کے ہماری طرف آ گئی۔

گائے، بیل اور بچھو تین چیزوں سے میرا دم نکلتا ہے۔

"ائے، ادھر مت ہانک بہادر،" رشید ڈر کر ڈانٹنے لگے۔

لفظ "ہانک" پر بہادر ہنسی سے لوٹ گیا۔ اگر ہم منڈیروں پر نہ چڑھ جاتے تو یقیناً گائے ہمارا آٹا کر دیتی۔ بہادر مجھے نظر غلط انداز سے چھیڑتا ہوا گائے کے پیچھے بھاگا چلا گیا۔ اگر رشید کو بہادر کی مکاریوں کا ذرا بھی پتہ چل جاتا تو وہ غدر مچا دیتے۔ وہ اُسے صرف ایک بیوقوف گدھا سمجھتے تھے۔

اس دفعہ رشید کچھ ایسے پیچھے پڑے کہ اباّ شادی پر راضی ہو گئے۔ میں اور رشید دن بھر سامان خریدتے پھرتے۔ خالہ جان بھی انتظام میں مدد دینے آ گئیں، اماّں کے بعد وہی تھیں جو ہماری قریبی رشتہ دار تھیں۔

بہادر خاموش دن بھر ہمیں موٹر میں لادے پھرتا تھا۔ رشید چھٹی لیکر آ گئے تھے اور مجھے ہفتوں بہادر سے بات کرنیکا بھی وقت نہ ملتا۔ بہادر کی بدمزاجی بڑھتی جاتی تھی۔ وہ مجھ سے بالکل بات نہ کرتا اور اگر کرتا تو ترشی سے، بات بات پر ہر ایک سے اُلجھ پڑتا، یہانتک کہ اباّ نے جو اُسے کچھ کہا تو غرّا کر انہیں گھورنے لگا۔ اباّ میں غضب کا تحمل ہے۔ دوسرے وہ اُسے چاہتے بھی بہت ہیں۔ بالکل چُپ رہ گئے۔ مجھے بہادر کو دیکھکر بڑا رنج ہوتا۔ بھیا کے چلے جانے کے بعد سہیلی کہو بھائی کہو یا نوکر سب کچھ یہ بہادر ہی تھا۔ رشید بیشک میرا لاڈ کرتے تھے بہادر اور ہی تھا۔ میرا بچپن کا ساتھی اور اب وہ مجھ سے بات تک کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ زرد اور دُبلا ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بہادر مجھ سے خفا ہے۔ یہ رشید تو نہ تھے کہ اگر کبھی خفا ہو جائیں تو اُن کا بہترین علاج یہ ہے کہ خود خفا ہو جاؤں۔ بس وہ فوراً اُلٹی خوشامد شروع کر دیتے تھے۔ یہاں بہادر کا سوال تھا جو صرف خوشامد کرانے کا عادی تھا۔

رشید ایک دُکان پر سوٹ کا آرڈر دینے اترے۔ میں نے بہادر سے پوچھا "یہ تمہاری تھوتنی کیوں سوجی ہوئی ہے؟"

کوئی اور وقت ہوتا تو بہادر ایسا مُنہ توڑ جواب دیتا کہ میں اپنا سا مُنہ لیکر رہ جاتی لیکن وہ صرف کھسیانی سی ہنسی زبردستی ہنسنے لگا۔

"کبھی دماغ درست ہی نہیں ہوتا۔ جب دیکھو جب مُنہ ڈبل روٹی ہو رہا ہے۔ آخر کوئی وجہ بھی ہو۔" میں نے نرمی سے ملامت کی۔

"میں کس پہ غصہ کروں گا۔ بھلا میں ایک پھٹا ہوا نوکر اور کسی سے غصہ ہو جاؤں تو پھر روٹی کہاں ملے۔" وہ افسردہ ہو کر مجھ سے دُور دیکھنے لگا۔

"نہیں تم کچھ بدل ہی گئے ہو۔" رشید آ گئے اور ہم واپس چلے آئے۔

میرا دل بہادر سے کھلکر باتیں کرنے کو چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے اُسے بلایا۔

"بہادر ذرا میری ساڑھیوں پر استری کر دو۔"

"لیجئے یہ کوئی میرا کام ہے۔ ننھا کو بھیجے دیتا ہوں۔" وہ مُڑا۔

"نہیں وہ ٹھیک نہیں کرتا۔ دوسرے وہ میری استری توڑ دے گا۔"

"اچھا، لائیے، مجھے ساڑھیاں اور استری دیدیجئے۔ میں کر لاؤں گا۔"

"میرے کمرے ہی میں بڑی میز پر کر لو۔ بس تمہیں اپنی بجلی کی استری توڑنے کیلئے نہ دونگی۔"

"تو پھر کروا لیجئے کسی اور سے۔" اُس نے سوکھا مُنہ بنا کر کہا۔

"اِدھر آؤ۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

وہ قریب آیا۔

"چلو۔" میں نے اُس کا کان پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف لیجا کر کہا۔ "ساڑھیاں نکالو اور سیدھی طرح استری کرو۔"

وہ مُسکرانے لگا۔ اُس کا پتلا سا زرد چہرہ خُون کی گرمی سے بادامی ہو گیا اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ خوش تھا۔ صندوق میں سے ساڑھیاں نکال کر وہ استری کرنے لگا۔ میں کھڑکی کے قریب سٹول پر بیٹھ گئی۔

اُس کے کھُردرے بڑے بڑے بالوں دار ہاتھ چمکتی ہوئی استری اور رنگ برنگی ساڑھیاں میرے لئے ایک کھیل بن گئیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک نئی جان پیدا ہو گئی تھی۔ استری کے ساتھ ساتھ اُس کی چنچل آنکھیں آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ اُس نے اپنے گداز زیریں لب کو دانتوں سے دبا رکھا تھا جیسے کہ سخت مصروفیت اور کام کے وقت دبا لیتے ہیں۔ کف بے ٹکے پن سے اُس کی آستینوں میں جھول رہے تھے۔ آبا کی چوڑے چکلے دامن کی قمیص اور بھیّا کے ڈھیلے ڈھالے پتلون میں وہ ایک تنکا معلوم ہو رہا تھا۔ گریبان کے تمام بٹن ٹوٹ گئے تھے اور اس کا کافوری سینہ بہت سا کھُلا ہوا تھا جس پر پسلیوں کا جال بخوبی نظر آتا تھا۔ اُس کے بے رونق کھچڑی بال بے ترتیب گچھوں کی صورت میں اُس کی پژمردہ مگر بلند اور ذہین پیشانی پر بکھرے ہوئے۔

میں اُسے متواتر غور سے دیکھ رہی تھی۔ میرا دل دُکھ گیا۔ آہ بے رحم زمانہ نے اُسے ایک ذلیل وخوار خدمتگار بنا دیا تھا۔ ورنہ وہ ذہانت اور عقلمندی کا مجسمہ معلوم ہو رہا تھا۔ نہ جانے کتنے بلند دماغ صرف غربت کے ہاتھوں کچل کر خاک راہ سے بدتر بن جاتے ہیں۔ اگر اُسے اعلیٰ تعلیم دی جاتی اور اُس کے پاس روپیہ ہوتا تو وہ کتنی شاندار ہستی ہو جاتا۔ وہ ایک ذلیل نوکر تھا جس نے بچپنے سے اپنی ہی جنس کی دل وجان سے خدمت کی تھی۔ لیکن پھر بھی کوئی بات تھی کہ وہ ایک نمایاں ہستی معلوم ہوتا تھا۔ زندگی کے ہر معمولی سے معمولی اور بڑے سے بڑے کام میں وہ ایک قابل تعریف عقلمندی کا ثبوت دیتا تھا۔ مَیں اُسے محویت کے عالم میں تک رہی تھی۔ اُس نے کئی دفعہ اچٹتی ہوئی نظر میری طرف ڈالی اور مجھے اپنی طرف گھورتے دیکھ کر وہ بے اختیار ایک مظلوم مُسکراہٹ میں ڈُوب گیا۔

اُس نے سیاہ باریک ساری کی چار تہیں کر کے میز پر پھیلا دیا اور استری سیاہ بادلوں میں بجلی کی طرح تیزی سے کوندنے لگی۔

ایک سحر تھا کہ جس نے مجھے بیخود کر دیا۔ کوئی سخت سی چیز میرے گلے میں بار بار اٹکتی ہوئی معلوم ہوئی اور آنکھیں دُھندلی سی ہو گئیں۔ میں کھڑی ہو گئی۔ بہادر کا ہاتھ رُک گیا اور اُس نے مجھے ایک لمحے تک بے معنی نظروں سے دیکھا۔ لیکن یکایک جذبات کے ہجوم اور خیالات کی خاموش گھٹائیں اُس کی آنکھوں میں چھا گئیں۔ میں آہستہ سے اُس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ چہرہ کسی ناقابل بیان تکلیف سے تمتا اُٹھا۔ اُس کے ہونٹ خُون کی زیادتی کی وجہ سے انگارہ ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پھُوٹ جائیں گے۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک لرزش تھی جسے وہ جھنجلا جھنجلا کر چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم نہ بتاؤ گے؟" میں نے اُس کے استری والے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

وہ مضبوطی سے استری کو پکڑے رہا اور میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ کو جو کانپ رہا تھا۔ اُس نے آہستہ سے ڈرتے ڈرتے میری طرف دیکھا۔ اور اس مرتبہ ایسے کہ دوبارہ کسی سوال کی ضرورت نہ رہی۔ میں نے استری لیکر اُس کے ہاتھ سے رکھدی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گریبان بند کرنے لگا۔ پریشانی کے علاوہ اور کچھ بھی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی پلکیں بوجھل ہو کر لرز رہی تھیں۔ اور اُسکے ہونٹ ایک سسکی میں مچل جانے کو تیار تھے۔

"بولتے کیوں نہیں؟" میں نے نرمی سے قریب ہو کر کہا۔

"میں... میں... کیا بولوں؟" وہ لفظ چبانے لگا۔

"تم رنجیدہ نہیں رہتے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

وہ چُپ رہا۔

"کیوں رنجیدہ رہتے ہو؟" میں نے پھر کہا۔

"مجھے نہیں معلوم" اُس نے پریشانی سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم... جھوٹے!" میں نے لفظ جما کر کہا۔

"سچ" اُس نے سر ہلا کر اپنے جھوٹ کا اور بھی پختہ ثبوت دیا۔

"میں دھوکے میں تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ تم مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو" میں نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بنکر کہا۔ اور کُرسی پر بیٹھ گئی۔

اُسکی آنکھیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ "بنو مت تم خوب سمجھتی ہو" مگر وہ چُپ تھا۔

وہ تھوڑی دیر کھڑا غیر مطمئن نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ اُس نے چاہا کہ باہر چلا آئے لیکن پھر ایک دم اُس کا وہی غصہ اور جنون عُود کر آیا۔ وہ تیزی سے میری طرف جھپٹا اور میرے اتنے قریب آکر رُکا کہ میں سمجھی وہ ضرور میرے اُوپر گر پڑیگا۔

"آپ سمجھتی ہیں... آپ کھیل رہی ہیں۔ مجھ غریب سے... آپ کھیل رہی ہیں۔ آپ... جانتی ہیں" اور وہ جھنجلا کر اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ آنسو بے اختیار بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔

میں نے اُس کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔ وہ خاموش میری طرف تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ خاموش فسانوں کی ضخیم جلدیں میرے سامنے کھُل گئیں۔

"بہادر" میں نے کہا۔

اور وہ میرے قریب گر پڑا اور اپنا سر میری گود میں رکھدیا۔ بڑی دیر تک وہ گہری گہری سسکیاں لیتا رہا۔

"تمہیں رنجیدہ دیکھکر میرا دل دُکھتا ہے۔ بہادر!" میں نے اُس کے سر کو سہارا دے کر کہا۔

"تو نہ دیکھا کیجئے میری طرف!" اُسنے غرور سے کہا۔

"نہ دیکھا کروں تمہاری طرف!" میں نے گویا خود سے کہا

"ہاں! کیا فائدہ؟"

"کیا ہر کام انسان فائدہ کے خیال سے ہی کرتا ہے؟"

"ہاں اور جو نہیں کرتا وہ دُکھ اُٹھاتا ہے"

"کیا دُکھ بڑے کٹھن ہوتے ہیں؟"

"ہاں ایک بھوکے ننگے خدمتگار کے لئے" اُس نے انگلیاں چٹخا کر کہا۔

"اور جو بھوکے، ننگے خدمتگار نہیں ہوتے انہیں کیا دُکھ ہی نہیں ہوتا؟"

"کیا اُن کو بھی دُکھ ہوتا ہے" وہ اُمید بھری آواز میں بولا اور سیدھا ہو بیٹھا۔

"ہاں"

"کیا وہ بھی اپنی ٹوٹی ہوئی کوٹھری... نہیں..... میرا مطلب ہے صاف سُتھرے کمرے میں چھُپ چھُپ کر رویا کرتے ہیں" اُسکی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"ہاں"

"اور کیا وہ بھی۔ اُن... وہ بھی ایک امیر اور طاقتور انسان کو دیکھکر کہ وہ... کہ جب وہ..... اس کو دیکھتے ہیں تو گھنٹوں جلا کرتے ہیں" اُس نے چبا چبا کر بے ترتیبی سے کہا۔

"کون سے طاقتور امیر انسان کو؟ رشید کو؟" میں نے شرارت سے کہا۔

"ہاں" اور وہ شرمندہ ہو کر زور سے ہنسا۔

"تم.... طاقتور انسان کی یہ ہی تو پہچان نہیں کہ وہ موٹا ہو اور بہت سا روپیہ رکھتا ہو۔ بلکہ.... بعض... بلکہ...." میں الفاظ ڈھونڈنے لگی۔

فراہم کرنے کی ضرورت کیوں نہ لاحق ہو"

(۳) "ہماری بہنوں کی ذہنیت ابھی اس قابل نہیں کہ اچھائی اور بُرائی میں امتیاز پیدا کریں، اپنی بُرائیوں پر نظر ڈالیں، شوہر کے متعلق گندے اور فاسد خیالات کو اپنے دل میں نہ آنے دیں، اُس پر پورا بھروسہ رکھیں، اگر بیوی شوہر پر اور شوہر بیوی پر اعتماد نہ کرے تو متاہلانہ زندگی کا سارا لطف غارت ہو جاتا ہے"

(۴) "دُنیا میں عورت کی بہت سی ذمہ داریاں ہیں مگر وہ اپنی ذمہ داریوں کو بالکل محسوس نہیں کرتی، وہ یہ سمجھتی ہے کہ ساری ذمہ داری مرد کے سر ہے، اس کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ مرد کی کمائی کو فضول خرچی میں اُڑائے، اپنے غازے اور پوڈر پر بیدردی سے روپیہ صرف کرے، آئے دن نئے نئے قیمتی لباس بنائے جائیں، عمدہ عمدہ زیور کی فرمائشیں کی جائیں اور یہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی مرد کے متعلق اقسام کی بدگمانیاں کی جائیں، بُہتان باندھے جائیں اور اس کو گھر گھر بدنام کیا جائے، اس قسم کی بدگمانیوں سے پہلے پہل آپس میں شکر رنجی ہوتی ہے اور بعد میں اقسام کے جھگڑے اور خانہ جنگیاں ہونے لگتی ہیں جس کی وجہ سے محبت میں کمی اور نفرت میں زیادتی ہوتی ہے اور زندگی عذابِ جان بن جاتی ہے"

(۵) "جس گھر میں عورت حد سے زیادہ تجاوز کر جاتی ہو وہاں سے اطمینانِ قلب اور سچّی محبت رفوچکر ہو جاتے ہیں"

(۶) مرد عورت کے لڑنے جھگڑنے، رونے پیٹنے، بیجا دباؤ ڈالنے، حکومت کرنے، گھر سے چلے جانے اور خودکشی کی دھمکی دینے سے محبت نہیں کرتا، مرد کے دل میں محبّت پیدا کرانے کے اور ہی طریقے ہیں۔ پُرخلوص خدمت، فرمانبرداری، وفاشعاری، سچی ہمدردی، شیریں زبان، اچھے برتاؤ اور نیک خیالات سے محبت موہ لی جاسکتی ہے، بچپن میں ماں باپ کی اطاعت، بیاہ کے بعد شوہر کی فرمانبرداری اور اُسکے جذبات کا احترام کرنا بیوی کا فرض اوّلیں ہے"

(۷) "اگر دین و دُنیا میں سُرخ روئی حاصل کرنا ہے تو آج کل کی نام نہاد تہذیب کو خیرباد کہنا چاہیئے یعنی یورپ کی اندھی تقلید ہرگز نہ کرنی چاہیئے۔ ہماری زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم شوہر کی ذات کو ذاتِ خدا کا مظہر سمجھیں، اس کی اطاعت خُدا کی اطاعت ہے"

اِس انجمن کا جلسہ پچھلی نوچندی جمعرات کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہوا، اراکین کی کثیر تعداد شریک تھی، چند خواتین بھی پسِ پردہ رونق افروز تھیں، انہیں انجمن کی "واحد" خاتون ممبر نے مدعو کیا تھا تاکہ "رکن" ہونے سے پہلے قواعد وضوابط سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ سکریٹری صاحب نے اُوپر لکھے ہوئے اغراض و مقاصد پڑھکر سُنائے جو بغیر کسی اعتراض کے بغلبہ آرا منظور ہوئے۔ اس کے بعد ایک ظالم امریکن بیوی کے مظالم کے واقعات پڑھکر سُنائے گئے، بیوی پر "لعنت" اور شوہر کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کی قرارداد پاس ہوئی یہ "داستانِ عبرت" ناظرینِ ساقی کی خدمت میں اختصار کے ساتھ پیش کی جاتی ہے

ایک "بدگمان" بیوی کو اپنے ۷۰ سالہ شوہر پر شبہ ہوا کہ وہ کسی پر فریفتہ ہوگیا ہے اور اپنی ساری دولت اُسکے پیچھے برباد کر رہا ہے، بڑی سوچ بچار کے بعد بیوی کے "ذہنِ رسا" نے ایک "معقول" تدبیر نکالی، ایک رات جبکہ شوہر گہری نیند میں تھا بیوی نے پوری قوت سے اُس کے سر پر پستول کے دستہ سے مارا۔ بیچارہ شوہر بیہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو دیکھا کہ ہاتھ پیر جکڑے ہوئے ہیں، اتنے میں بیگم صاحبہ

تشریف لائیں، میاں کو ہوشیار دیکھکر مسکراتے ہوئے پوچھا "کیوں! اب بھی "اس کا" نام بتاؤ گے کہ نہیں؟" مصیبت کا مارا شوہر حیران کہ کس کا نام بتائے! غریب نے ہزاروں قسمیں کھائیں مگر بیگم صاحبہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں!! برابر نام پوچھتی گئیں اور کوڑے لگاتی گئیں!!! میاں نے شور مچانا شروع کیا تو پھر پستول کا دستہ سر پر مار کر بیہوش کر دیا! شوہر کا بیان ہے کہ یہ "عمل" مسلسل کئی روز تک جاری رہا اس کے علاوہ کبھی شوہر کے پیروں کو آگ سے داغا جاتا تھا، کبھی لوہا گرم کر کے رخساروں پر رکھا جاتا تھا۔ کبھی جسم میں چاقو بھونکے جاتے تھے اور کبھی شوہر کے گوشت کی بوٹیاں کاٹی جاتی تھیں۔

مثل مشہور ہے "سو سنار کی ایک لوہار کی"! اتفاق سے ایک دن بیگم صاحبہ نے میاں کو بیہوش کرنے کے بعد پستول وہیں کھدیا شوہر کو جب ہوش آیا تو پستول کو ہاتھ کے قریب پاکر پکڑ لیا۔ اتنے میں بیوی کمرے میں داخل ہوئی۔ پستول کو شوہر کے ہاتھ میں دیکھکر بہت پریشان ہوئی مگر شوہر نے بیوی کو سوچنے کا موقع نہیں دیا فوراً فیر کر دیا۔ نشانہ ٹھیک بیٹھا اور بیگم صاحبہ زمین پر تشریف لائیں، میاں نے بڑی مشکل سے خود کو رسیوں سے نجات دلائی مگر دماغی توازن جاتا رہا! آپ پستول پکڑے نیم برہنہ سڑک پر دوڑنے!! پولیس نے آپکو جو اس ہیئت کذائی میں دیکھا تو دھاوا بول دیا۔ آپنے بغیر کسی مزاحمت کے خود کو پولیس کے حوالہ کر دیا اور واقعہ صحیح صحیح بیان کر دیا۔ مگر پولیس کو آپکے بیان پر یقین نہ آیا، پاگل سمجھکر گرفتار کر لیا اور کشاں کشاں گھر لائی۔ "سخت جان" بیوی ابھی تک زندہ تھی، موت کو سر پر کھڑی دیکھکر شوہر کے بیان کی پوری پوری تصدیق کر دی، جب بیوی کو قتل کرنے کے جرم میں آپ کا چالان ہوا تو عدالت نے آپکو بری کر دیا اور آپکے صبر و ضبط کی بہت تعریف کی! مظلوم شوہر کی جے!!

بفضلہ تعالیٰ انجمن کے دفتر میں جہاں سینکڑوں شرکت کی درخواستیں وصول ہو رہی ہیں وہاں بعض حضرات نے ممبر ہونے کی خواہش کے ساتھ اپنی بیویوں کی "بیرحمی" کے واقعات لکھکر اُن کے "انسداد" کی تدبیریں پوچھی ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے آج صرف دو خطوں کے اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔

ایک ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ یوں تو آئے دن اُنکے گھر میں "شکر رنجیاں" ہوا کرتی ہیں مگر پچھلے سنیچر کی "شکر رنجی" سے کچھ ایسا "رنج" ہوا کہ اب تک "کوفت" باقی ہے۔

واقعہ یہ ہوا کہ بیگم صاحبہ نے ایک بیش قیمت ہیرے کا سٹ جو کلپس، بندے، بروچ اور انگشتری پر مشتمل تھا، کسی جوہری کی دُکان پر دیکھکر میاں کو خریدنے کا "حکم" دیا، چونکہ اس وقت میاں کی آمدنی کچھ گھٹی ہوئی تھی اس لئے اتنا قیمتی زیور خرید نہ سکے، جب بیوی کو میاں کی اس "ناشایستہ" حرکت کا علم ہوا تو اُن کے غم و غصہ کی کوئی حد و انتہا نہ تھی، میاں پر کچھ اس طرح برس پڑیں کہ ساون اور بھادوں کا مینہ بھی مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا، گرجنے اور کڑکنے کے بعد "موت بہتر ہے ایسے جینے سے" کہتی ہوئی کمرے میں گھس کر کنڈی لگالی، میاں کو بڑی پریشانی ہوئی کہ کہیں بیگم سچ مچ خودکشی کا ارادہ نہ کرلیں! بڑی ہمت کر کے میاں نے دروازہ کھولنے کی التجا کی مگر صدائے برنخاست!! اب تو آپ بہت پریشان ہوئے! لگے زور زور سے دروازے پر "گھونسے" لگانے!! اندر سے آواز آئی "کچھ شامت تو نہیں آئی ہے؟" اور ایک دھماکے کے ساتھ دروازہ کھل گیا! بیوی نے میاں پر کچھ اس طرح حملہ کیا کہ میاں کو اپنی "سلامتی" فرار میں نظر آئی۔ ایک جست میں آپ برہنہ سر اور برہنہ

پیر سڑک پر تشریف لائے اور اپنے چچا کے مکان کا رُخ کیا جو کوئی "دو سو قدم" پر تھا، جب گھر میں داخل ہوئے تو آپکی پریشانی اور حیرت کی انتہا نہ تھی کیونکہ آں محترمہ نے بھی ...... آپکی پیروی کی تھی اور "دوڑ" میں آپ سے دوسرے نمبر پر تھیں! اتفاق سے یہاں آپکے والد بزرگوار رونق افروز تھے۔ صاحبزادے اور بہو بیگم کو آگے پیچھے اس طرح داخل ہوتے دیکھکر بڑے میاں کو بہت غصہ آیا دونوں کو جی بھر کر صلواتیں سنانا شروع کیں، بیٹا باپ کا غصہ برداشت کر سکتا ہے مگر بہو بیگم کے "ولایتی شوز" کو کیا غرض کہ خسر کی بُری بھلی سُنے! لہذا بہو بیگم کا سارا غصہ خسر علیہ السلام پر اُبل پڑا اور آں جنابہ نے بڑے میاں کو کچھ اس طرح جھنجوڑا کہ بس چھٹی کا دودھ یاد آگیا!! لگے چیخنے "ارے میں مرا! مرا!! کوئی مجھکو اس ڈائن سے بچاؤ!!!" سارے گھر والے جمع ہو گئے اور بڑی مشکل سے خسر صاحب کو بہو صاحبہ کے چنگل سے چھڑایا۔ یہ سارے واقعات لکھکر محترم شوہر نے جنہیں بیوی کی اِس "شکر رنجی" پر ابھی تک کوفت ہے انجمن کے سکریٹری صاحب سے بیوی کی "اصلاح" پوچھی ہے، انہیں مشورہ دیا گیا کہ انگریزی ناول "ٹیمنگ آف دی شرو" (The Taming of the Shrew) شروع سے آخر تک نہایت غور سے پڑھیں بلکہ حفظ کر لیں اور لفظ بہ لفظ عمل کریں۔

ایک وکیل صاحب لکھتے ہیں کہ بیگم کی بدگمانیوں سے ناک میں دم آگیا ہے، کسی کے پاس جانا مشکل! کسی عزیز سے ملنا دشوار!! گھر میں آتے ہی اصرار ہوتا ہے کہ "قسم" کھائیے آج کہاں کہاں گئے تھے؟" وکیل صاحب کی ایک "ضعیف" سالی صاحبہ ہیں یعنی مرحوم بیوی کی بہن! انکے گھر جب کبھی جاتے ہیں بس "قیامت" آجاتی ہے!! کہیں ناظرین یہ نہ سمجھیں کہ بیگم صاحبہ "بوڑھی" سالی سے بدگمان ہیں! سالی کی ایک نوجوان تعلیم یافتہ "بہو" ہیں، انکے کارن یہ ساری بدگمانیاں اور پریشانیاں ہیں!! بیگم صاحبہ کی بارگاہِ عالی سے کئی مرتبہ حکم "امتناعی" اجرا ہوا کہ سالی کی "بہو" سے نہ ملیں، مگر یہ کیسے ممکن؟ سالی سے ملیں اور انکی "بہو" کی طرف سے مُنہ پھیر لیں! آخر "بہو" نے کیا خطا کی؟

ایک روز بیگم صاحبہ نے آپکو سخت "تاکید" کی کہ سالی کے گھر نہ جائیں، مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اُسی دن آپکو سالی سے ملنے کی سوجھی! اور اُدھر بیگم صاحبہ کے "ذہن رسا" میں جاسوسی کا خیال آیا۔ خیال آنا ہی تھا کہ فوراً "عمل" کی سوجھی، ٹیکسی لیکر سالی کے گھر پہونچیں، یہاں جو "سین" دیکھا آں محترمہ کا قول ہے کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے! شوہر صاحب مزے سے سالی کے گھر براجے ہیں اور سالی کے ساتھ سالی کی "بہو" سے بھی گھل ملکر میٹھی میٹھی باتیں کر رہے ہیں!! یہ "روح فرسا" نظارہ دیکھکر بیگم صاحبہ کا دل جلکر "کباب" ہو گیا اور آنکھوں سے ایک ایسی "جوئے خون" بہنے لگی کہ بس دونوں آنکھیں "شمع فروزاں" ہو گئیں! اس طرح آنسو بہاتے، آہیں بھرتے گھر لوٹیں، جب "بیوفا" شوہر تشریف لائے تو بیگم کی "گریہ وزاری" کو "مبدل بہ دم سرد" پایا۔ پلنگ پر بیٹھکر آپ نے چپکے سے "سائنٹفک" انداز میں فرمایا "بیگم! بھئی آج تاور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا" یہ سُننا ہی تھا کہ بیگم صاحبہ کے غصہ کو ایسا اُبال آیا کہ مُنہ سے "پھلجھڑیاں" جھڑنے لگیں۔ کچھ بیگم کے اصرار نے اور کچھ چند روز اُن سے چھٹکارا پانیکے خیال نے میاں کو مجبور کیا کہ تبدیل آب و ہوا کیلئے بیگم کو کسی ٹھنڈے مقام پر انکے بھائی کے ساتھ بھیجدیں، دو مہینے نیلگری کی ٹھنڈی "برف زدہ" ہوا کھا کر حال ہی میں گھر آئی ہیں مگر حیرت ہے کہ باوجود اسقدر ٹھنڈک پانیکے "دماغی توازن" ٹھیک نہیں ہوا! وہی "رٹ" اور وہی "ہٹ" ہے کہ سالی کی "بہو" سے نہ ملیں!!

وکیل صاحب کے اس عنایت نامہ کے جواب میں انکی خدمت میں عرض کیا گیا کہ اگر وہ "گربہ کشتن روز اول" پر عمل کرتے تو آج یہ "دن" نصیب نہ ہوتا! خیر اب بھی کچھ نہیں گیا!! بیگم صاحبہ کی "ضد" ہرگز نہ چلنے دیں۔ شوق سے "روزانہ" سالی صاحبہ کے پاس جائیں اور اُنکی "بہو" سے بھی ضرور ملیں۔ ممکن ہو تو دو چار ہفتوں کیلئے سالی صاحبہ کے گھر اُٹھ آئیں اور اس اثنا میں بھولکر بھی اپنے گھر نہ جائیں۔ چند روز میں بیگم صاحبہ کا دماغ بالکل ٹھیک ہو جائیگا۔ ضد اور ہٹ سب کچھ بھول جائیں گی ورنہ ہر سال "نیلگری" بھیجنا ہوگا۔

"جہاں نورد"

انتقام

موسمِ بہار کا بدرِ کامل اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ درخشاں تھا۔ جنوبی نسیم کے جھونکے آم کے بوروں کی بھینی بھینی خوشبو ہر طرف پھیلا رہے تھے۔ ایک پرانے لیچی کے درخت کے گھنے پتوں کی آڑ میں ایک کوئل بیٹھی ہوئی تھی جو رات کو چین نہ پڑنے کی وجہ سے سُریلی آواز سے کُو کُو کی صدا بلند کر رہی تھی۔ یہ آواز ہمنت کی کھلی ہوئی کھڑکی سے اُس کی خوابگاہ میں بہت صاف سُنائی دیتی تھی۔

موسمِ بہار کی اضطراری کیفیت ہمنت پر بھی طاری تھی۔ اُس نے اپنے دلرُبا کی چوٹیوں میں سے کچھ بال کھول کر اپنی انگلیوں کے چاروں طرف لپیٹ لئے۔ کبھی اُس کی چوڑیوں کو بجاتا تھا کبھی چنبیلی کے ہار کو کھینچ لیتا تھا جسے وہ اپنے سر میں باندھے ہوئے تھی۔ یہاں تک کہ وہ اُس کے ابروؤں کے درمیان سہرے کی طرح لٹکنے لگے۔ وہ اپنے کمرے کے اندر وہی کام انجام دے رہا تھا جو پُر وجد نسیم باہر کر رہی تھی۔ ہوا پھولوں کو جنبش دیکر بار بار کسُم کو متنبہ کر رہی تھی کہ وہ اُنکے اصلی حُسن سے آگاہ ہوجائے۔

لیکن اُس کی بیوی کسُم بےحس و حرکت کھڑکی کے قریب بستر کے کنارے بیٹھی ہوئی اپنی نظریں چاندنی پر جمائے ہوئے کچھ اور ہی خیالات میں مستغرق تھی۔ اور اپنے شوہر کی چھیڑ چھاڑ اور خوش فعلیوں سے مطلق متوجہ نہ ہوئی۔

بالآخر جب ہمنت میں ضبط کی طاقت نہ باقی رہی تو اُسنے اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر آہستہ سے دبایا اور پوچھا "کسُم! تمہارا دماغ کہاں ہے۔ تم تو ایسی کھوئی ہوئی ہو کہ معلوم ہوتا ہے تمہارا یہاں وجود ہی نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ آج تم میرے قریب رہو۔ دیکھو۔ آج کیسی جانفزا اور مسرت خیز شب ہے۔"

کسُم نے اپنی آنکھیں آسمان سے پھیر کر اپنے شوہر کی طرف کرلیں۔ اور بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایک ایسا سحر معلوم ہے جس سے میں آنِ واحد میں اس بہار کی مسرت۔ چاندنی کے لُطف اور تمام نیرنگیوں کو نیست و نابود کر دوں۔"

ہمنت نے کہا۔ "اگر یہ سچ ہے تو خُدا کیلئے تم اس وقت ہرگز اس کا استعمال نہ کرو۔ ہاں اگر تم کو کوئی ایسا منتر معلوم ہو کہ ایک ہفتہ میں تین اتوار مجتمع ہوجائیں یا اس رات کو کل شام تک روک سکو تو اسے ضرور کام میں لاؤ۔"

کسُم نے اُس کے آغوش سے احتراز کرتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے آج کچھ باتیں کہنا چاہتی ہوں جن کو میں نے سوچا تھا کہ تم سے صرف نزاع کے وقت بتاؤنگی۔ لیکن اب میں محسوس کرتی ہوں کہ سزا برداشت کرسکتی ہوں۔ اس لئے سوچتی ہوں کہ اب بتا ہی دوں۔"

اس کا شوہر اس کے شش و پنج کی حالت پر سزا کے متعلق جے دیو کا ایک شعر پڑھکر مضحکہ اُڑانا چاہتا تھا کہ کمرے کی طرف سے کسی کے کھڑاوں کی آہٹ سُنائی دی۔

ہمنت اپنے سن رسیدہ والد ہری ہر مکرجی کو اس غیظ و غضب میں زور زور کھٹ کھٹ کرتے ہوئے آتے سُنکر چونک گیا اور سوچنے لگا کہ آج خیریت نہیں ہے۔

ہری ہر نے اُسکے دروازے پر پہونچتے ہی کڑک کر کہا۔ "ہمنت! اپنی بیوی کو فوراً گھر سے نکالدو۔"

ہمنت سکتہ کے عالم میں کسُم کی طرف دیکھنے لگا۔ لیکن کسُم کے چہرے سے حیرت یا پریشانی مطلق نہ عیاں تھی۔ بلکہ اُسنے اپنے وجود کو

باعثِ ننگ و عار سمجھ کر اپنے چہرے کو ہاتھوں سے چھپا لیا۔ کومل کی بہیم آواز آرہی تھی گو کہ اس کی طرف کوئی متوجہ نہ تھا۔

"دنیا کیسی خوبصورت اور دلچسپ جگہ ہے لیکن کس آسانی سے اسکا حُسن و جمال ایک آن میں رخصت ہو جاتا ہے۔"

(۲)

اپنے والد کی واپسی کے بعد ہمنت نے بیوی سے پوچھا "کیا یہ سچ ہے؟"

کسم نے کہا "بالکل سچ ہے۔"

"تم نے ابتک اس راز کو مجھ سے کیوں مخفیہ رکھا؟"

"میں نے اکثر کوشش کی لیکن اتنی جسارت نہ کر سکی کہ تم کو بتاتی۔ میں واقعی بہت گنہگار ہوں۔"

"خیر، اب تو سب کہہ سناؤ۔"

کسم نے نہایت مجتمع ہو کر پورا قصہ اس طرح سنایا جیسے آگ پر چلنے والا دہکتے ہوئے انگاروں پر بے تامل چلتا ہے۔ اور اسکے بشرے سے یہ مطلق نہیں عیاں ہوتا کہ وہ کیسے یا کہاں جھلسا جا رہا ہے۔

ہمنت نے سارا قصہ شروع سے آخر تک سنا اور منہ سے بغیر ایک لفظ بھی نکالے ہوئے باہر چلا آیا۔

کسم نے سمجھا کہ اب دائمی مفارقت کا وقت آگیا ہے اور پھر اب شوہر کا دیدار نصیب نہ ہوگا۔ لیکن یہ سب باتیں کچھ عجیب نہ معلوم ہوئیں۔ اس نے سوچا کہ روزمرہ کے ہزارہا واقعات میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اس کے تمام جسم میں سنسنی پیدا ہوگئی۔ کیونکہ اب دنیا میں کوئی اس کا ہمدرد و مونس نہ ملیگا۔

ہمنت کے محبت کی داستان از سر نو تازہ ہوگئی۔ اس کی یاد سے اس کے دل پر ایسا زخم کاری ہوا جو ایک تیز چاقو کے چلنے سے ہو جاتا ہے۔ یہ وہ محبت تھی جس کا عمق بے پایاں تھا۔ جس کی فراوانی غیر محدود تھی جس کی شکستگی کا خیال اس کے لئے سوہانِ روح تھا۔

(۳)

ہمنت کو تمام رات نیند نہ آئی۔ صبح ہوتے ہی وہ ضعیف العمر پیارے گھوشال کے مکان پر پہونچا۔

پیارے نے نہایت نرم لہجے میں دریافت کیا "کیا خبر ہے؟"

ہمنت کی کانپتی ہوئی زبان سے یہ الفاظ نکلے "آپ نے تو آگ لگا کر خاکستر کر دیا۔ آپنے ہماری ذات خراب کی۔ ہمارا گھر تباہ و برباد کر دیا۔ آپ کو اس کا زبردست تاوان دینا ہوگا۔" بہت غیظ و غضب کے لہجے میں کہتے کہتے اسکی آواز بند ہوگئی اور وہ خاموش ہوگیا۔

پیارے مسکرایا۔ اس نے کہا "اور تم لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ ہماری ذات کا خوب تحفظ کیا۔ مجھے اپنے سماج میں رکھا۔ ہم سے خوب ہمدردی کی۔ واقعی تم لوگوں نے ہمارا خوب ساتھ دیا اور ہماری اچھی خیر خواہی کی۔"

اگر ہمنت کے غصہ میں وہی تاثیر ہوتی جیسی قدیم برہمنوں کی بددعا میں ہوتی تھی تو پیارے جلکر خاکستر ہو جاتا۔ چونکہ معاملہ اسکے برعکس تھا اس لئے آتشِ غیظ و غضب نے خود اسی کے سینے کو جلایا اور بوڑھا پیارے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

ہمنت نے کسی طرح لکنت کے ساتھ کہا "ہم نے آپ کا کیا بگاڑا؟"

پیارے نے کہا "اچھا پہلے تم یہ بتاؤ کہ میری اکلوتی بیٹی جو میری مسرت کا واحد ذریعہ تھی اس غریب بیکس نے تمہارے باپ کو کیا نقصان پہونچایا تھا۔ غالباً تم پورے واقعات سے بے خبر ہو۔ بہتر ہے کہ تم بیٹھ جاؤ اور جو کچھ میں کہوں اسے بغور اطمینان سے سنو۔ قصہ تو ضرور طویل ہے لیکن اس میں بہت سی دلچسپ باتیں ہیں۔

"جب میرا داماد اپنی بیوی کے زیورات لیکر انگلینڈ چلا گیا تو تم ناسمجھ سے بچے تھے۔ شاید تم کو یاد نہ ہوگا کہ جب وہ پانچ برس کے بعد بیرسٹر ہو کر واپس آیا تو گاؤں میں کس قدر شور و غل برپا ہوا۔ شاید

تم اس وقت کلکتہ کے اسکول میں تعلیم پا رہے تھے۔ تمہارے باپ نے اپنی ذات کے سب آدمیوں کو جمع کیا اور خود سب کے سرغنہ بنکر مجھ سے کہا "اگر تم یہ فیصلہ کرتے ہو کہ تمہاری لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ رہے تو اپنی لڑکی سے کسی قسم کے مراسم و تعلقات نہ قائم رکھو"

میں نے بہت منت سماجت کی کہ اس مرتبہ مجھے معاف کر دیا جائے، میں نے نہایت لجاجت سے یہ بھی کہا کہ اگر سب لوگ میرے داماد کو اپنی ذات میں واپس لے لیں تو میں اُسے راضی کر لونگا کہ وہ اُس کے بدلے میں کچھ تاوان ادا کرے۔ لیکن تمہارے باپ اپنی رائے پر نہایت سختی سے قائم رہے۔ چونکہ میں اپنی لڑکی سے دائمی مفارقت نہ برداشت کر سکتا تھا۔ اس لئے میں ذات پات کو خیرباد کہکر یہاں چلا آیا اور کلکتہ میں بود و باش اختیار کر لی۔

لیکن مجھے یہاں بھی سماجی تشدد سے نجات نہ ملی۔ جب میرے بھتیجے کی نسبت ہونے لگی تو تمہارے باپ نے لڑکی والوں سے جاکر کہدیا اور نسبت منقطع ہو گئی۔ اس وقت دامنِ صبر و تحمل میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں نے قسم کھائی کہ "اگر میں نے انتقام نہ لیا تو برہمن کا بچہ نہیں ہوں"

"اب تو تم تمام واقعات سے بہت کچھ واقف ہو گئے۔ لیکن ذرا اور صبر کرو تو بقیہ قصہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ معلوم ہوگا۔

جب تم کالج میں داخل ہوئے تو بیپرداس بیچارے جو اب اس دنیا سے رخصت ہو گئے تمہاری قیام گاہ کے قریب ایک مکان میں رہتے تھے۔ انہوں نے ایک کایستھ کی جوان لڑکی کسم کو پناہ دی۔ جو بچپن ہی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ کسم حسن میں یکتائے روزگار تھی۔ اس لئے کالج کے لڑکوں سے محفوظ رکھنے کیلئے بیپرداس کو اسکی سخت نگرانی کرنی پڑتی تھی۔

لیکن ایک دوشیزہ کیلئے کسی بوڑھے شخص کو دھوکا دینا کچھ مشکل نہیں۔ اُسے اکثر کپڑے پھیلانے کیلئے یا دوسرے کاموں کو بالاخانے کی چھت پر جانا پڑتا تھا۔ دوسرے تمہارا بھی یہ حال تھا کہ طبیعت پڑھنے لکھنے میں نہ لگتی تھی۔ اس لئے ہر وقت سامنے والے بالاخانے پر موجود رہتے تھے"

تم دونوں کے درمیان جو اشارے کنائے ہوئے اُس کا علم سوائے تمہارے اور کسی کو نہیں لیکن لڑکی کے طرزِ عمل سے بیپرداس کو شبہ ہوا۔ وہ اب امورِ خانہ داری سے بہت کم دلچسپی لینے لگی۔ ایک دن بیپرداس نے کسم کو روتے ہوئے دیکھا اور بالآخر تم دونوں کے باہمی تعلقات و مراسم کا حال معلوم ہوا۔ تم کالج سے غیر حاضر رہنے لگے اور ایک گوشہ میں تنہا رہکر پڑھنے کے شائق نظر آنے لگے۔

جب کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی تو بیپرداس میرے پاس مشورے کیلئے آئے۔ میں نے رائے دی کہ "چچا! آپ تو مدت سے اپنی زندگی کے آخری ایام بنارس میں گزارنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ بہتر ہے کہ اب اس ارادہ کی تکمیل کیجئے۔ لڑکی کی نگرانی میں کر لونگا" وہ میرے بہت احسان مند ہوئے اور جاترا کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں نے کسم کو اپنے ایک پرانے دوست سری پت بنرجی کے حوالے کیا اور کہا "اسے اپنی ہی لڑکی سمجھو"

اس کے بعد جو واقعات ہوئے اس کا علم تم کو مجھ سے زیادہ ہے۔ بہرحال میں نے بہت مسرت آمیز پیرایہ میں تم سے ساری داستان بیان کر دی۔ یہ تو ایک رومان معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ باتیں تحریر کی جائیں تو بہت پُر لطف قصہ تیار ہو جائے لیکن مجھے اس میں دستگاہ نہیں۔ میرا بھتیجا اس میں بہت ماہر ہے۔ میں اس سے کہونگا کہ اس پر اپنے قلم کی جولانی دکھائے۔ بہرحال ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس میں پوری کامیابی نہیں حاصل کر سکتا۔ کیونکہ انجام کا تو کچھ حال ہی نہیں معلوم"

ہمنت، پیارے کے آخر جملوں کو بغور نہیں سن رہا تھا۔ وہ کچھ اور ہی خیالات میں مستغرق تھا۔ اس نے اسی حالت میں دریافت کیا "کیا کسم نے اس قسم کی شادی پر کوئی اعتراض تو نہیں کیا؟"

پیارے نے جواب دیا "یہ سوال تو آسان نہیں ہے۔

میرے بچے، تم نے خود تجربہ کیا ہوگا کہ عورتیں کس فطرت کی ہوتی ہیں۔ جب ان کا مطلب "ہاں" ہوتا ہے تو وہ "نہیں" کہتی ہیں۔ جب کسم پہلے پہل اپنی جدید قیام گاہ میں آئی تو تمہارے روزانہ دیدار سے محروم رہنے کی وجہ سے بہت بیقرار و بیخود رہنے لگی۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ تم نے کسی طرح اس کا پتہ لگا لیا۔ تم کالج کے راستے سے بھٹکنے لگے اور اپنے ہاتھوں میں کتابیں لئے ہوئے سرتی پت کے مکان کے سامنے اس طرح کھڑے ہو جاتے کہ تم کسی گمشدہ چیز کو تلاش کر رہے ہو۔ مجھے یہ تو غلط فہمی ہو نہیں سکتی تھی کہ تم کسی گمشدہ چیز کو تلاش کر رہے ہو۔ مجھے یہ تو غلط فہمی ہو نہیں سکتی تھی کہ تم کالج جانے کا راستہ تلاش کر رہے ہو کیونکہ کسی شریف آدمی کے مکان کی کھڑکی سے سوائے طیور اور عشق کے مریضوں کے کسی دوسرے کا گذرنا تو ناممکن ہے۔"

"بہرحال لڑکی کی حالت اور تمہاری پڑھائی کی طرف سے عدم توجہی دیکھکر مجھے ضرور افسوس ہوتا تھا۔"

ایک دن میں نے کسم کو علیحدہ بلا کر کہا "میری بچی! تم کو اپنے بوڑھے چچا سے اپنی خواہش کے اظہار کرنے میں ذرا بھی تکلف نہ کرنا چاہیے۔ مجھے تمہارے دلی جذبات کا حال بخوبی معلوم ہے۔ تمہاری وجہ سے اس نوجوان کی بھی بہت بُری حالت ہو رہی ہے۔ میں تم دونوں کی خواہش پوری کرنے میں بخوشی امداد دونگا۔"

کسم نے بجائے جواب دینے کے رونا شروع کر دیا۔ میں اس کے بعد اس کے پاس متعدد بار گیا اور برابر تمہارا تذکرہ کرتا رہا۔ اور آخر کار اس کے حجاب کو دور کرنے میں کامیاب ہوا۔ میں نے رفتہ رفتہ اس کے دل میں یہ اعتقاد راسخ کر دیا کہ سوائے شادی کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس نے ایک دن بضد ہو کر کہا "بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔"

جب معاملہ کے ہر پہلو پر گفتگو ہو چکی تو اس نے مجھ سے کہا کہ "اچھا ہمنت کا بھی عندیہ معلوم کر لیجیے۔"

میں نے جواب دیا "وہ بیچارہ تو خود ہی تمہاری محبت میں بہت سرگرداں ہے۔ ان فروعات سے اُسے پریشان کرنے کی ضرورت نہیں تو اس کی زندگی تلخ کرنے سے کیا نتیجہ۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس نے میری باتوں کو سمجھا یا نہیں لیکن وہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے خاموش کھڑی تھی۔ جب میں نے اس سے کہا "پھر یہی بات ہو جائیگی" تو اس نے زار و قطار رونا شروع کیا۔

عین شادی کے ایک دن پہلے اس نے مجھ سے التجا کی کہ کسی طرح روک دیجئے۔ میں نے چیخکر کہا "یہ کیسی نامعقول بات ہے جب سب معاملات طے ہو چکے تو میں اب سب لوگوں کو کیا جواب دونگا۔" اس نے چلا کر کہا "مجھے کہیں اور مشتہر کر دو کہ میں مرگئی۔" میں نے اس پر اعتراض کیا "پھر اس نوجوان کا کیا حشر ہوگا۔ جو اس دن کا بہت بے صبری سے انتظار کر رہا ہے اور تمہارے لئے جان تک فدا کرنے کیلئے تیار ہے۔ کیا یہ مناسب ہے کہ میں کہدوں کہ تم مرگئیں۔ تمہاری موت کی خبر پہونچانے کے بعد مجھے تم کو یہ بھی خبر دینی ہوگی کہ وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ اس بڑھاپے میں میں ایک برہمن اور ایک عورت کے قتل کے عذاب کا بار گراں اٹھاؤں۔"

القصہ وہ مبارک دن بھی آیا کہ بہت اچھے ساعت سے تمہاری شادی ہو گئی اور میں اپنے عہد و پیمان سے سبکدوش ہو گیا۔"

ہمنت نے آزردہ خاطر ہو کر کہا "آخر اب کیا وجہ ہوئی کہ آپنے اس راز کو افشا کیا؟"

"ایک دن جب مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری بہن کی شادی طے ہو گئی ہے تو میرے ضمیر نے مجھے لعنت ملامت کرنا شروع کیا کہ ایک برہمن کی ذات کو میں نے محض اس لئے خراب کر دیا کہ میں اُس کے لئے عہد کر چکا تھا۔ اب میں نے اپنا اولین فرض یہ سمجھا کہ ایک دوسرے بے گناہ برہمن کے جسم کو ملوث ہونے سے محفوظ رکھوں اس لئے میں نے دوسرے فریق کو یہ اطلاع دیدی کہ میں

ناظمِ نشرگاہِ صوت دہلی کی تقریر

اور

اُس پر ہمارے خیالات

٦

یکم ستمبر کو دلّی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر مسٹر لکشمانن نے ایک تقریر نشر کی تھی جس میں اُنہوں نے براڈکاسٹنگ کے چند اہم مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ اُن کی پوری تقریر کا ترجمہ ہمارے لئے چنداں ضروری نہیں اس لئے اُس کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ ڈائریکٹر صاحب اپنی تقریر میں فرماتے ہیں:۔ "سننے والوں کے خطوط سے ہمیں معلوم ہوتا رہتا ہے کہ پروگرام کے متعلق اُن کی کیا رائے ہے اور اُن سے ہمیں کام چلانے میں مدد ملتی ہے۔ ہمیں آپ کی مسلسل امداد کی ضرورت ہے۔ جب کبھی بھی آپ یہ سچے دل سے محسوس کریں کہ آپ کوئی تعمیری اظہارِ خیال کر سکتے ہیں تو ہمیں لکھنے میں مطلق پس و پیش نہ فرمائیں۔" ریڈیو کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے ہم نے مناسب سمجھا کہ اِس تین سال کے عرصے میں جیسے پروگرام ہم نے سنے ہیں اُن پر ایک سرسری سا تبصرہ کر دیا جائے تاکہ اکثر سننے والوں کی ترجمانی ہو جائے۔

دلّی کے اکثر اخبارات ریڈیو کے متعلق لکھ چکے ہیں اور اب بھی لکھتے رہتے ہیں مگر اِس محکمے کی خاصیت چکنے گھڑے کی سی ہو گئی ہے۔ پیختے پیختے اخبارات کا گلا بیٹھ گیا مگر کنٹرولر صاحب کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ریڈیو رفارم سوسائٹی بنی اور اس کے مطالبات رد کر دیے گئے۔ لسنرز ایسوسی ایشن بنی اور اُسکی طرف سے کان بہرے کر لئے گئے۔ مگر اِن حرکتوں سے سننے والے مایوس نہیں ہوتے ہیں بلکہ اُنہیں اس کا احساس ہو گیا ہے کہ اُن کی آواز کمزور اور کوشش مضمحل تھی اس لئے اب ذرا سنبھل کر صدائے احتجاج بلند کرینگے اور کوشش بھی منظم کرینگے تاکہ دوبارہ ناکامی کا مُنہ نہ دیکھنا پڑے۔

مسٹر لکشمانن اپنی تقریر میں موسیقی کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"حد بندی سے یہ فائدہ ہوا کہ دلّی کے پروگرام میں مقامی رنگ بڑھ گیا۔ شوقیہ گانے والے بہتر اور زیادہ ہو گئے۔ نئے نئے جوہر تلاش کر کے پیش کئے جا رہے ہیں۔

سازوں پر بہت زور دیا گیا ہے خصوصًا آرکسٹرا پر۔ کچھ عرصے سے ہم ایک نئی قسم کے آرکسٹرا کے تجربے کر رہے ہیں۔ اس میں صرف ہندوستانی ساز بجائے جاتے ہیں لیکن اس میں جو غیر معمولی بات ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی آرکسٹرا پہلی مرتبہ لکھی ہوئی طرزوں کو دیکھ کر ساز بجاتا ہے۔ کئی سازوں کا ایک ساتھ بجنا اور اس طرح کہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہوں بالعموم پسند کیا جا رہا ہے اس کا مقصد ہندوستانی موسیقی کی اُن خصوصیات کو حیاتِ تازہ دینا ہے جو قریب المرگ ہیں اور اس ہم آہنگی کو اجاگر کرنا ہے جو ہندوستانی موسیقی میں پوشیدہ ہے۔ ہندوستان میں جب سے نشرگاہیں قائم ہوئی ہیں اثر آفرینی اور اثر پذیری کا عمل جاری ہے ایک طرف تو ہندوستانی موسیقی کے نازک اور سُریلے اتار چڑھاؤ ہیں اور دوسری طرف چار براعظموں کی زبردست متحدہ اور مخصوص موسیقی ہے۔ اس ربط ضبط کا اثر ہم پر ہو کر رہے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ اثر و تاثر کا سلسلہ یونہی اندھا دُھند چلتا رہے یا ہم اِسے اپنے ذمہ لیں اور اسکی رہنمائی کریں؟"

حد بندی سے سب سے بڑا نقصان تو یہ ہوا کہ باہر کے اچھے آرٹسٹ دلّی سے اپنا پروگرام پیش نہیں کر سکیں گے۔ دوسرا نقصان یہ کہ دلّی والوں کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا۔ چراغ تلے اندھیرا گویا اس روشن زمانے میں بھی ہوتا ہے۔ پروگرام اُٹھا کر دیکھئے دلّی کے مشہور خاندانی گویئے کتنے گا رہے ہیں؟ باہر والوں کی بھرتی ہو رہی ہے خصوصًا بنگالیوں کی۔ کیا مقامی رنگ کے معنی یہ ہیں کہ دلّی سے بنگالی گانے اور مرہٹی پد نشر کئے جائیں؟ جتنے نئے جوہر پیش کئے جا رہے ہیں سب بنگالی! دہلی یا مضافاتِ دہلی کا ایک جوہر بھی ڈائرکٹر صاحب کو نہیں ملا۔ مقامی رنگ کی ایسی نادر مثال ملنی مشکل ہے۔

ہندوستانی موسیقی ساری دُنیا کی موسیقی سے نرالی ہے اور سب سے قدیم ہے۔ تین ہزار سال سے راگ راگنیاں اُسی طرح مروج ہیں جس طرح آجکل اُن میں تبدیلی کسی قسم کی نہیں ہوئی، اضافہ ضرور ہوتا رہا ہے اور نئی راگنیاں وجود میں آتی رہیں لیکن یہ نئی راگنیاں بھی کسی نہ کسی قاعدے اور اصول کے ماتحت وضع کی گئی ہیں اور اُنکی مقبولیت کا ثبوت یہ کیا کم ہے کہ رائج ہو گئیں اور مستند سمجھی جانے لگیں۔ راگ راگنیوں کا علم بہت وسیع ہے۔ صرف بارہ سُروں کی اُلٹ پلٹ سے تقریبًا پانچ ہزار راگنیاں بنتی ہیں۔ بائیس سُرتیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ آج کل دو ڈھائی سو راگنیاں مستعمل ہیں اور انہی سے پکا گانا عبارت ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ ہندوستان جہاں کی ایک زبان نہیں، ایک مذہب نہیں، ایک قوم نہیں، اس کی ایک ہی موسیقی ہے۔ بنگال سے بمبئی تک اور کشمیر سے مدراس تک سینکڑوں زبانیں بدلتی ہیں مگر راگ راگنیوں میں ایک سُر کا بھی فرق نہیں۔ بول مقامی زبان کے ہوتے ہیں لیکن راگنی وہی مستند ہندوستانی۔ غرض کل ہندوستان کا ایک مخصوص نظامِ موسیقی ہے جو بے قدری کے ہاتھوں بہت کچھ فنا ہو چکا۔ دلّی میں جب گورنمنٹ کی طرف سے ایک باقاعدہ ریڈیو اسٹیشن کھلا تو آس بندھی کہ ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی پنپ جائے گی۔ چنانچہ ہندوستان کے مشہور فن کار بلائے گئے اور اُن کے گانے نشر ہونے لگے۔ دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح موسیقی بھی ایک شکل فن ہے خصوصاً ہندوستان کی کلاسیکی موسیقی جسے عرفِ عام میں پکا گانا کہا جاتا ہے۔ عوام کو فنونِ لطیفہ سے یوں بھی کم تعلق ہوتا ہے اور موسیقی سے تو بالخصوص بہت کم طبیعتوں کو لگاؤ ہوتا ہے۔ پبلک نے ریڈیو کے پکے گانوں پر اعتراض کیا اس لئے اُن کی تعداد کچھ کم کر دی گئی اور اُن کی جگہ غزلوں اور گیتوں کو ملی۔ ان کی نسبت ۸۰ اور ۲۰ فی صدی کی تھی۔ اس پر بھی پبلک راضی نہیں ہوتی لیکن مسٹر زید۔ اے۔ بخاری (جو اُس وقت اسٹیشن ڈائریکٹر تھے) وقتی ہنگامے سے متاثر نہیں ہوئے۔ اُن کی نظروں کے سامنے غالباً دس سال بعد کا ہندوستان تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ سننے والے پہلے کلاسیکل موسیقی سننے کے خوگر بنیں، پھر رفتہ رفتہ وہ اُس کے سمجھنے والے اور عادی بھی ہو جائیں گے اور اس طرح ہمارا یہ قدیم علم نہ صرف از سرِ نو زندہ ہو جائے گا بلکہ عام ہندوستانیوں کا مذاقِ موسیقی بھی بلند ہو جائیگا۔ بخاری صاحب کی یہ اسکیم بہت قابلِ قدر تھی اور آہستہ آہستہ کامیاب ہو رہی تھی۔ دو سال کے عرصے میں سننے والوں کا مذاق کافی سنور گیا تھا۔ عوام میں موسیقی کا شعور نشو و نما پا رہا تھا کہ کنٹرولر صاحب کی موجی طبیعت (moody nature) میں جوش آیا اور بخاری صاحب کا تبادلہ دلّی سے بمبئی کر دیا گیا۔ ع۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

بخاری صاحب کے جانشین مسٹر کشمانن نہایت ذہین اور قابل افسر ہیں لیکن اُن کی عمر کا بیشتر حصہ یورپ میں گزرا ہے۔ ہندوستان کی ضروریات سے ناواقف، دلّی جیسی مرکزی نشرگاہ پر انہیں متعین کر دیا گیا۔ اُردو ہندی سے وہ ناواقف، ہندوستانی سنگیت سے وہ نا آشنا۔ یہاں کے مرد کیا چاہتے ہیں، عورتیں کیا چاہتی ہیں، بچے کیا چاہتے ہیں؟ انہیں معلوم نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سننے والوں کے خطوط پر سارے پروگرام کا دارومدار ہو گیا۔ سننے والوں نے کہا "ہمیں پکے گانے پسند نہیں ہیں۔" اور ڈائریکٹر صاحب نے کہا "اچھا، تم ۸۰ فی صدی غزلیں، گیت اور بھجن سنو۔ فن کے گلے پر چھری چلتی ہے، چل جائے۔ میں تم سب کو خوش کروں گا۔ چاہے تم میں سے ایک بھی خوش نہ ہو۔ اور ہاں میں نئے نئے شوقیہ گانے والے تمہارے لئے مہیا کروں گا جنہیں راگ راگنیوں کا تو ذکر ہی کیا تال سُر سے بھی کوئی واسطہ نہ ہو گا۔ گانے والے نہیں گانے والیاں! عورتیں!! بنگالی عورتیں!!! یہ تمہیں بنگالی گیت سنائیں گی تاکہ تم اُن کے بول بھی نہ سمجھ سکو۔ سمجھے! میں تمہیں ایسا گانا سنواؤں گا جو تم نے پہلے کبھی نہیں سنا ہو گا۔ ۱۸ ستمبر کو یاد رکھنا۔ اس دن "نئے نئے "جوہروں" کو گمنامی کی تاریکی سے نکلنے اور نمایاں ہونے کا موقع ملے گا۔"

اور ۱۸ ستمبر کا دن ریڈیائی موسیقی کی سیاہ کتاب میں آب و تاب سے لکھا گیا۔

انڈو یورپین آرکسٹرا پر روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ سننے والوں کو دنوں پہلے سے اس کا اشتیاق دلایا گیا۔ اعلان کیا گیا تھا کہ مسٹر جان فولڈز نے تین سال کی لگاتار محنت کے بعد ہندوستانی موسیقی میں ایک بات ایسی پیدا کی ہے جو اُسے چاروں بلکہ پانچوں براعظموں کی موسیقی سے وابستہ کر دیگی! اور جب خدا خدا کر کے انڈو یورپین آرکسٹرا نے اپنے نغمے نشر کئے تو۔۔۔ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔ مشرق و مغرب کا ملنا معلوم۔ مجتہد نے ان دونوں کو ملانا چاہا ہے۔ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر۔ عجیب معجونِ مرکب تیار کی ہے۔ لیکن ان نغموں میں ایک کمال ہے کہ ہندوستانی موسیقی کا جاننے والا انہیں سُنکر بے اختیار ہنس پڑتا ہے۔ مسٹر فولڈز کا یہ اعجاز کیا کم ہے کہ انہوں نے روتوں کو ہنسا دیا۔ موجودہ ڈائریکٹر صاحب کی اگر یہی پالیسی رہی تو ہندوستان کی قدیم موسیقی کا جنازہ دیر سویر نکل کر رہیگا۔ شائقین منتظر رہیں۔

ریڈیو میں جو ڈرامے ہوتے ہیں اُن کے بارے میں ڈائریکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

"دلّی سے جو ریڈیائی ڈرامے نشر کئے جاتے ہیں گزشتہ دو سال میں سب سے زیادہ مقبولیت انہی کو حاصل ہوئی۔ یہ ڈرامے بڑی حد تک غیر زبانوں کے ڈراموں یا کہانیوں سے اخذ کئے گئے ہیں یا کم از کم اُن کے چربے ہیں۔ طبعزاد شاذ و نادر ہیں۔ ہندوستان کے بڑے ڈرامہ نویسوں نے ابھی ریڈیو ڈراموں کی طرف توجہ نہیں کی۔ ریڈیو کی اِس صنف کا مستقبل میری رائے میں نئی پود سے وابستہ ہے جس میں ریڈیائی احساس و آگاہی از خود پیدا ہو گئی ہے اور ہوتی جا رہی ہے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں ہمارے پاس ۴۳۳ ڈرامے آئے جن میں سے صرف ۸۳ نشر کرنے کے لئے منتخب کئے جا سکے اور ان میں سے بھی اکثر ایسے تھے جنہیں از سرِ نو لکھنا پڑا۔"

" تین سال کے عرصے میں دلّی ریڈیو اسٹیشن سے بہت اچھے ڈرامے

بھی نشر ہوتے اور بہت بُرے بھی۔ اُن میں ترجمے بھی تھے اور طبعزاد بھی۔ ڈائرکٹر صاحب نے اگر یہ ڈرامے خود پڑھے ہوتے یا کم از کم سُن کر سمجھے ہوتے تو انہیں یہ کہنے کی جسارت نہ ہوتی کہ ہندوستان کے اچھے لکھنے والوں نے ریڈیو کی طرف توجہ نہیں کی۔ اُردو کے جتنے مشہور ڈرامہ نگار ہیں اُن سب کے ڈرامے دلّی اور لاہور سے نشر کئے جا چکے ہیں۔ اب اچھے لکھنے والوں نے اسلئے کنارہ کر لیا کہ اُن کے بڑے سے بڑے ڈرامے کی قیمت بیس پچیس روپے مقرر کر دی گئی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ابتدا میں سمجھدار ڈائرکٹروں نے پچھتر اور اسّی روپے تک فی ڈرامہ فی نشر دئے ہیں۔ موجودہ ڈائرکٹر صاحب کم قیمت کے ناقص ڈرامے نشر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ریڈیو ڈرامہ موجودہ نسل کو لکھنا نہیں آتا۔ ڈرامے چونکہ پسند کئے جا رہے ہیں اس لئے دس بارہ ڈرامے ہر مہینے پیش کئے جا رہے ہیں۔ چاہے اُن میں سے ایک بھی کام کا نہ ہو۔ ہر ہفتے اگر صرف ایک اعلیٰ درجے کا ڈرامہ پیش کیا جاتے تو وہ موجودہ طرزِ عمل سے کہیں بہتر ہوگا اور دو تین ناقص ڈراموں کی رائلٹی ایک اچھے ڈرامے کی قیمت میں دیدی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ کتنے اچھے اچھے ڈرامے آپ کو آسانی سے مل سکتے ہیں۔ آپ اس پر فخر کر رہے ہیں کہ لوگوں کو لکھنا نہیں آتا اور ہم نے تین سو ڈرامے واپس کر دئے۔ اچھے لکھنے والوں کو زیادہ نہ دیجئے مگر اُن کے ڈراموں کی پوری قیمت تو دیجئے۔ پندرہ منٹ کی تقریر کے بھی بیس روپے! اور پینتالیس منٹ کے ڈرامے کے بھی بیس روپے! اچھے گانے والوں اور گانے والیوں کی ڈیڑھ سو اور دو سو روپے سوا یا ڈیڑھ گھنٹے کا دیں اور اچھے ڈرامے لکھنے والوں کو پچیس روپے فی گھنٹہ! ع۔

اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

یہ ساری خرابی نہ جاننے کی ہے۔ ایسا ڈائرکٹر کیا کر سکتا ہے جو ہنر کی صحیح قدر و قیمت بھی نہ جانتا ہو۔

ریڈیو کے اداکار غلط تلفظ، غلط ادائیگی، ترمیم و تنسیخ کے اُستاد ہیں۔ جس طرح چاہتے ہیں مکالمے کی مٹی پلید کرتے ہیں۔ اور کیوں نہ کریں؟ ڈائرکٹر صاحب خود اِن باتوں سے ناواقف ہیں۔ وہ سرے سے ہندوستانی کا لب و لہجہ ہی نہیں سمجھتے۔ خوش فہم اداکار مرد کے مکالمہ میں اُوئی اور نگوڑی کا اضافہ اپنی طرف سے کرتا چلا جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اُس نے مُستند ڈرامہ نگار پر بڑا احسان کیا۔ اور جب ڈرامہ نگار اِس حماقت کی شکایت کرتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ اِس سے تو ڈرامہ کا اثر بہت بڑھ گیا۔ (چاہے سُننے والے حیران رہ جائیں کہ یہ مستند انشاپرداز اتنی بڑی ٹھوکر کیسے کھا گیا۔) دلّی اسٹیشن کے ڈائرکٹر کے لئے یہ شرمناک بات ہے کہ وہ اُردو کی نزاکت سے ناواقف ہو اور اتنا بھی نہ جانے کہ عورتوں کی زبان بھی ایک علیحدہ چیز ہے۔ کنٹرولر صاحب بھی ان بدعنوانیوں کو نہیں سمجھتے اور نہیں سمجھ سکتے۔ ع۔

وزیرے چنیں شہریارے چناں

ریڈیو ڈرامہ کا ذکر آیا ہے تو ایک لطیفہ بھی سُن لیجئے۔ ابھی تھوڑے دن کی بات ہے کہ کنٹرولر صاحب نے بہترین ریڈیو ڈرامہ کے لئے ڈھائی سو روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا تھا۔ تاریخ مقررہ تک سینکڑوں ہی ڈرامے اُنکے پاس پہونچ گئے اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان کے مشہور قلمکار اِس مقابلے میں شریک ہوئے تھے۔ کنٹرولر صاحب خود تو اِن ڈراموں کو پڑھنے کی اہلیت رکھتے نہیں تھے اِس لئے خُدا جانے کس طرح یہ فیصلہ کر دیا کہ موصولہ ڈراموں میں سے ایک بھی انعام کا مستحق نہیں ہے اس لئے انعام اپنے حق میں ضبط کیا جاتا ہے۔ ع۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

مسئلہ زبان کے بارے میں ڈائرکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

"نشر کی زبان کیا ہو۔ یہ ایک سوال ہے جو ہر مُلک میں پیدا ہوا اور اُس کے حل کرنے میں کافی وقت لگا۔ انگلینڈ میں ایسا ہی ہوا۔ جرمنی اور روس میں بھی۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ غور طلب ہے۔ . . . . قومی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو زبان ایسی ہونی چاہیئے جو زیادہ سے زیادہ سمجھ میں آنے والی ہو۔ اگر ایسی نہیں ہے تو بیکار ہے۔ اس باب میں دو مختلف خیال کے لوگ ہیں۔ ایک وہ ہیں جو اپنی مخصوص طرزِ نگارش کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور یہ اسلوبِ بیان نتیجہ ہے تمدنوں کے امتزاج کا اور شاندار ماضی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو زیادہ سے زیادہ سمجھی جانے والی زبان پیش کرنے کے قائل ہیں اور نقوش بر دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس خیال کے لوگ عملی اور بہت اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ بدلنے والی دُنیا کی حقیقت کو وہ سمجھتے ہیں۔ دونوں سے میں کہتا ہوں کہ زبان کا سوال حل کرنے کے لئے ہم اپنی بہترین کوششیں کر رہے ہیں۔ کوئی معیاری چیز ایک دن میں پیدا نہیں ہوتی۔ اسکے وجود میں آنے کیلئے وقت درکار ہے۔ تجربہ اور بصارت کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں براڈکاسٹنگ کی ابھی عُمر ہی کیا ہے؟ مشکل سے تین سال۔"

ہندوستان کے لئے ایک عام زبان کا مسئلہ سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے توقع تھی کہ اِس گتھی کو سُلجھانے میں سب سے پیش پیش رہیگا۔ چنانچہ اب سے تین سال پہلے جب دلّی ریڈیو اسٹیشن کُھلا تو یہ توقع کسی حد تک پوری ہوتی دکھائی دی۔ روزانہ دو یا تین تقریریں نشر کی جاتی تھیں۔ انکی زبان سلیس اور عام فہم ہوتی تھی، بالکل ویسی جیسی آجکل بالعموم

بولی جاتی ہے یعنی عربی اور سنسکرت کے مشکل الفاظ سے پاک۔ یہ زبان بلیغ نہیں تھی لیکن فصیح ضرور تھی۔ اسے ہم "آسان اُردو" یا "آسان ہندی" یا پھر صرف "ہندوستانی" کہہ سکتے ہیں۔ مضمون نگار حضرات سے بطورِ خاص درخواست کی جاتی تھی کہ زبان میں سادگی کو مدِ نظر رکھیں۔ چُنانچہ جن حضرات نے ڈھائی تین سال پہلے کی تقریریں سُنی ہیں جانتے ہیں کہ دلّی ریڈیو اسٹیشن نے صحیح معنوں میں ہندوستانی زبان پیش کی جس پر نہ تو مسلمانوں کو اعتراض ہوا اور نہ ہندوؤں کو۔ مقررین میں شمس العلماء بھی تھے اور مہا مہو پادھیا بھی لیکن نہ عربی زدہ ہندوستانی تھی اور نہ سنسکرت زدہ۔ وہی سیدھی سادی زبان تھی جس میں سب کچھ آسانی سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ خُداوندانِ ریڈیو کی نادانی کی وجہ سے یہ دَور زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا۔ مسئلہ زبان کو سمجھنے بوجھنے والے حضرات میں آغا محمد اشرف صاحب ایم۔ اے۔ (نبیرہ آزاد مرحوم) اور مسٹر زیڈ۔ اے بخاری کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ اوّل الذکر پروگرام ڈائریکٹر تھے اور ثانی الذکر اسٹیشن ڈائریکٹر۔ آغا صاحب کو استعفیٰ دینا پڑا اور بخاری صاحب کا تبادلہ بمبئی کر دیا گیا۔ انکی جگہ اُن حضرات کو متعین کیا گیا جنہیں اُردو یا ہندی سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ دلّی سے جو زبان کا گھر ہے اب ایسی تقریریں نشر کی جاتی ہیں جو کسی قواعدِ زبان کی پابند نہیں ہوتیں۔ مسلمان بولنے والے تو پھر بھی کچھ ایثار سے کام لیتے ہیں لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہندو حضرات جان جان کر کھڑی بولی میں سنسکرت کے الفاظ ملاتے ہیں اور یہ ناقابلِ فہم تقریریں نشر کی جاتی ہیں۔ اِس بدعنوانی کی تمامتر ذمہ داری اسٹیشن ڈائریکٹر پر عائد ہوتی ہے جنکے متعلق خواجہ حسن نظامی صاحب نے لکھا ہے کہ ایک لفظ بھی اُردو کا نہیں بول سکتے۔ اس پر طرّہ یہ کہ مستند انشا پردازوں سے جو مضامین لکھوائے جاتے ہیں اُن میں یہ ڈائریکٹر صاحب اپنے ماتحتوں سے اصلاح و ترمیم کراتے ہیں اور یہ ماتحت حضرات وہ ہیں جو اپنے آقا سے کچھ کم اُردو نہیں جانتے۔ چنانچہ خواجہ عبدالمجید صاحب، پروفیسر مرزا محمد سعید اور خواجہ حسن نظامی صاحب کی اکثر تقریریں مسخ کی جا چکی ہیں۔ اور اِس حد تک کہ ان میں سے بعض حضرات نے نشر کرنے سے انکار کر دیا۔ جب تک ایسے قابل اسٹیشن ڈائریکٹر دلّی پر مسلّط رہیں گے زبان کے گلے پر چُھری چلتی رہے گی۔ کنٹرولر صاحب خود ہندوستان اور ہندوستان کی ضروریات، دلّی اور دلّی سے سُننے والوں کی توقعات سے قطعی ناواقف ہیں۔ مردم شناسی کا مادّہ بھی اُن میں نہیں معلوم ہوتا۔ اُکھاڑ پچھاڑ البتہ انہیں خُوب آتی ہے اور وہ بھی بے سمجھے بوجھے۔ دلّی اسٹیشن کو بخاری صاحب جیسے اسٹیشن ڈائریکٹر کی ضرورت تھی اس لئے بخاری صاحب کو بمبئی بھیجدیا گیا۔ بمبئی کو مسٹر لکشمانند کی ضرورت تھی اس لئے انہیں بمبئی سے دلّی بُلا لیا گیا۔ ع۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

ایسا اندھیر گورنمنٹ کے کسی اور محکمے میں نہ دیکھا نہ سُنا۔ دلّی ریڈیو اسٹیشن اُردو کا مرکزی اسٹیشن ہے اور یہاں کا ڈائریکٹر ایک ایسا تعلیم یافتہ فوجی ہے جسے اُردو اور اُردو کی شائستگی سے مطلق کوئی تعلق نہیں۔ اگر چندے یہی حال رہا تو دلّی کا ریڈیو اسٹیشن اپنی دیرینہ ہر دلعزیزی کھو دیگا۔ ضرورت ہے کہ ریڈیو اسٹاف کا جائزہ سختی سے لیا جائے اور نا اہلوں کو علیحدہ کیا جائے۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا
کارِ طفلاں تمام خواہد شُد

شاہد احمد

افسانۂ "محبت"[1] و "عورت"

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب گو دُنیا ظُلمت خانۂ امکاں سے اُبھر چکی تھی لیکن عروسِ شب کی زلفیں ناآشنائے خم تھیں۔ چاند گردش کے آئینِ مسلّم سے ہنوز ناواقف اور اپنے نئے لباس میں بیگانہ سا نظر آتا تھا۔ سیارگانِ فلک محرومِ لذتِ رم تھے۔ ساری کائنات پر ایک غبار سا چھایا ہوا تھا اور فضا کسی قدر تاریک سی نظر آتی تھی۔ کہ عالمِ بالا کے اس کیمیاگر کو جس کا قلب صفائے باطن سے جامِ جم بنا ہوا تھا، یہ پتہ لگا کہ "اکسیر" کا ایک نایاب نسخہ عرش بریں کے پائے پر لکھا ہوا ہے اور فرشتے اُسے اپنے نورانی پروں میں رُوحِ آدم سے چھپائے رکھتے ہیں۔ کیمیاگر کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ اس کی ٹوہ میں ہو گیا۔ آخر موقع پاکر ایک روز تسبیح کے بہانے عرشِ اعظم کی جانب بڑھا اور فرشتوں کی آنکھ بچا کر وہ نسخہ اُڑا لایا۔ مگر اس کے اجزا سے ترکیبی کچھ ایسے عجیب و غریب تھے کہ انہوں نے مدتوں اس ہوس کو سرگرداں رکھا۔ آخر ایک دن اُس نے اِس نسخہ کو اس طرح ترتیب دیا کہ:

چمک تارے سے مانگی۔ چاند سے داغِ جگر مانگا

اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے

تڑپ بجلی سے لی اور حور سے پاکیزگی مانگی

حرارت لی نفسہائے مسیح ابنِ مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیّت سے شانِ بے نیازی لی

ملک سے عاجزی، اُفتادگی تقدیرِ شبنم سے

پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں

"مرکب" نے "محبت" نام پایا عرشِ اعظم سے

جب یہ "مرکب" تیار ہو گیا تو اُس کے رکھنے کیلئے ایک اسی طرح کے صبیح و ملیح اور ایک ایسے ہی حسین و جمیل "ظرف" کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ایک دن عالمِ بالا میں کیمیاگر کی رُوح نے اعلان کیا کہ:

"میں نے پایۂ عرش سے ایک ایسی کیمیا کا نسخہ حاصل کیا اور کنگرۂ آسمان سے ایک ایسی قیمتی شے چُرائی ہے جو اپنی رعنائی و لطافت اور خوش ذائقی و نفاست میں اپنی نظیر نہیں رکھتی مگر اس کی رہائش و زیبائش کے لئے مجھے کوئی ایسا مکان نہیں ملتا جو اس مکین کی عظمت و لطافت کا متحمل ہو سکے۔ ہے کوئی ایسا جو اِس نعمتِ گرانمایہ کے ہم پلہ یا اس افضل ظرف کا مجھے پتہ دے!"

اِس آواز سے ساری کائنات گونج اٹھی۔ اور جب سارے جن و ملک اور حور و قصور اظہارِ عجز و نادانی میں خاموش اور سرنگوں نظر آنے لگے تو کیمیاگر کی رُوح انسانی عالمِ ارواح کی جانب بڑھی اور اس نے بڑی لجاجت سے اپنا سوال دُہرایا۔ بھلا انسان ایسے موقع پر کب چُوک سکتے تھے! چند ہی لمحوں میں انسانی جماعت کی جنس کثیف کے چند لطیف افراد (شعرا) کی روحیں آگے بڑھیں اور انہوں نے اپنے ایک نمائندہ کے ذریعے ایک حسین و نازک نورانی شے اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھکر پیش کرتے ہوئے عرض کیا:

"لیجئے! یہ ہے وہ حسین گلدان جس میں آپ کا حاصل کیا ہوا خوبصورت پودا نشو و نما پا سکتا ہے۔ یہ ہے وہ شیشہ جس میں آپ کا سجایا ہوا گلدستہ سرسبز و شاداب رہ کر خوشنما ہو سکتا ہے اور یہ ہے وہ طلسمی خزانہ جس میں آپکا قیمتی جوہر محفوظ اور باقدر رہ سکتا ہے۔"

کیمیاگر کی رُوح حصولِ مقصد کے جذبہ سے اُچھل پڑی۔ آگے بڑھکر بڑے غور اور کسی قدر نظرِ استعجاب سے اُس نے اسے دیکھا اور پھر بولی:

"اس میں شُبہ نہیں کہ بظاہر یہ چیز نہایت حسین معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی اصلیت سے واقف ہونے سے پہلے مجھے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اسے کہتے کیا ہیں؟"

ارواحِ شعرا کو کیمیاگر کی رُوح کی بے خبری اور بدمذاقی پر بیحد افسوس ہوا۔ پھر بھی ایک رُوح آگے بڑھی اور اُس نے عرض کیا:

"یہ "عورت" کا "دل" ہے!"

کیمیاگر کی رُوح نے پھر سوال کیا:

"یہ "عورت" کیا شے ہے؟ اس کا خالق کون ہے؟ اور اس کی تخلیق میں کن کن لطیف عناصر اور کیسے کیسے حسین اجزا کا استعمال ہوا ہے جس کی بنا پر تم اسے اس لائق سمجھتے ہو؟"

ارواحِ شعرا کی درخشاں پیشانیاں چمکنے لگیں، اُن کے کیف آگیں

[1] حضرت اقبال علیہ الرحمۃ کی ضوفشانیوں میں۔ عطاء اللہ

لبوں پر مسکراہٹیں کھیلنے لگیں اور اس مسرت آگیں خیال سے کہ انہیں کائنات کی سب سے زیادہ حسین و جمیل شے پر زورِ بیان دکھانے کا موقع ملا ہے، وجد کرنے لگیں۔

یکایک کیمیاگر نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

فوراً ہی ارواحِ شعراء کی صف سے ایک رُوح (امینِ حزیں) آگے بڑھی اور اس نے عرض کیا۔

"عورت" شاہکارِ قدرت "عورت" کونین کی زیب و زینت،
"عورت" وہ شے ہے جس سے زیادہ حسین و لطیف کوئی دوسری شے ابتک وجود میں نہیں آئی۔ مجملاً یہ سمجھئے کہ۔

عروس دہر کی چشمِ سرور بار ہے یہ
نہیں نہیں رُخِ زیبائے نور بار ہے یہ
فضائے وادیٔ ایمن پہ طور بار ہے یہ

گلِ گلاب کہوں اس کو باغِ عالم کا
کہ میں شباب کہوں اس کو باغِ عالم کا

جہاں میں حُور و جناں کی مثیل کون ہے! یہ
سکونِ قلبِ حزیں کی کفیل کون ہے! یہ
امیں کے دعوے کی روشن دلیل کون ہے! یہ

جمال اس کا مداوا ہے کثرتِ غم کا
جگر کا زخم دعا گو ہے اس کے مرہم کا

کیمیاگر کی رُوح نے چیخ کر کہا۔

"کچھ نہیں کچھ نہیں۔ صرف اِن خوبصورت الفاظ اور مجمل تعریفوں سے میرا اطمینان نہیں ہو سکتا۔ تمہیں یہ بتانا ہوگا کہ اس میں کون کون سی ایسی خوبیاں ہیں جو دوسری جگہ نہیں پائی جاتیں اور اس وجہ سے تم کائنات کی افضل ترین چیز سمجھتے ہو"

کیمیاگر کی رُوح نے جب غیر اطمینانی ظاہر کی تو صف سے دوسری رُوح (جمیل مظہری) آگے بڑھی اور اُس نے بڑی متانت سے کہا۔

"عورت" بلاشبہ ساری بہترین چیزوں اور ساری لطیف اشیا سے افضل و برتر ہے، فطرت کا کوئی کرشمہ اور مناظرِ قدرت کا کوئی ذرّہ ایسا نہیں جس کی زیبائی و رعنائی "عورت" کا مقابلہ کر سکے کیونکہ۔

اپنے ہاتھوں سے خُدا نے ہے بنایا اُسکو
ہم کہیں گے دلِ فطرت کی تمنّا اُس کو

ماہِ کامل سے تڑپ برق سے غیرت مانگی
سینۂ مہر سے تھوڑی سی حرارت مانگی

مُدح پھولوں کی بنی جس سے، وہ خوشبو لیکر
دلِ شاعر کی امانت تھے جو آنسو، لیکر
گوندھا قدرت نے ہے اس شوخ طبیعت کا خمیر
فطرتِ حُسن میں کیوں ہو نہ محبت کا خمیر!

دہر میں مقصدِ تخلیق کی حامل ہوگی
جس کی آغوش میں قلزم ہو وہ ساحل ہوگی

معنیٔ لفظِ وفا عقدۂ فطرت ہے یہ
اس کی مجمل ہے یہ تعریف کہ "عورت" ہے یہ

کیمیاگر کی رُوح اگرچہ اس حُسنِ بیان سے پھڑک گئی لیکن اُس نے اعتراض کیا۔

"اگر لطیف عناصر ہی کا شمار کیا جائے تو "عورت" کے مقابلے میں "محبت" کے لطیف اجزا دو گنے نظر آتے ہیں پھر اسکی بہتری و سرفرازی کیونکر تسلیم کی جا سکتی ہے؟"

فوراً ہی صفِ ارواح سے تیسری رُوح (لامعلوم) جلوہ گر ہوئی اور اُس نے اعتراض کیا۔

"عورت" میں "محبت" کے بہ نسبت لطیف عناصر کی کمی کہاں ہے!"

پھر رُوح نے ایک خاص دُھن میں کہنا شروع کیا "دیکھئے! عورت کی تخلیق میں کتنے اجزا مشتمل ہوئے ہیں۔

چاند کی گولائی لیکر، سانپ کا ساپیچ و خم
گھاس کی پتّی کی ہلکی تھرتھراہٹ بیش و کم
بید مجنوں کی نزاکت، بیل کے بل کی کجی
بانکپن طاؤس کا، نرمیٔ گُلِ کہسار کی
ابر سے آنسو، صبا سے بیوفائی لے اُڑا
سہم خرگوش، اور چیتے سے لیا جور و جفا
سرد مہری برف نے دی، سختی ملی الماس سے
تابِ تابانِ آہنی دل کا، دل سنگیں سے
طوطیٔ گلزار نے رنگینیٔ منقار دی
قمریٔ ناشاد نے شیرینیٔ گفتار دی
روزِ اوّل سے ودیعت نور کا جوبن ہوا
شورِ بلبل کا اضافہ اُس کا ہلکا پن ہوا
گُندھ گُندھا کر یہ مسالہ جب اکٹھا ہو گیا
دستِ قدرت نے بنایا ایک سانچا نُور کا
آگ کا تن بن گیا اور نُور کی مُورت بنی * شکل عورت کی بنی کیا موہنی صورت بنی

کیمیاگر کی رُوح، رُوحِ شاعر کی سحر بیانی سے بیحد متاثر ہوئی لیکن ہنوز اُس کی اپنی چیز "عورت" سے افضل نظر آ رہی تھی لہذا اُس نے سر ہلا کر کہا۔

"یہ درست ہے کہ "محبت" میں جتنے لطیف عناصر استعمال ہوتے ہیں بہ نسبت اُن کے چند اجزا کی عورت میں زیادتی نظر آتی ہے ۔۔۔"

کیمیاگر کی رُوح ابھی اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ صفِ شعرا سے چوتھی رُوح (ضیا فتح آبادی) آگے بڑھی اور اُس نے بات کاٹ کر کہا۔

"اپنی اپنی محدود دالعلمی کا اعتراف نہ کیا جائے یہ دوسری بات ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ "عورت" اتنے حسین اجزا اور اس قدر جمیل عناصر سے مرکب ہوئی ہے کہ اس کی تفصیل بیان کرنا انسانی عقلوں اور رشک آفریں سخن سنجیوں کی دسترس سے قطعی باہر ہے۔ سنیئے "عورت" کی تخلیق فطرت نے کس طرح کی ہے۔

آب کوثر سے جوانی مانگ لی　　　باغِ جنّت سے جوانی مانگ لی
لی گلوں سے نکہتِ جاں آفریں　　　بُلبلوں سے نغمہائے دل نشیں
مانگ لی نرگس سے چشمِ نیم باز　　　شاخِ طوبیٰ سے ادائے دل نواز
موجِ بادِ صبح سے رفتار لی　　　سوسنِ خاموش سے گفتار لی
زُلفِ سُنبل سے درازی مانگ لی　　　سرو سے پھر سرفرازی مانگ لی
غُنچہ ہائے نو سے لی معصومیت　　　لی فضائے جاں فزا سے عطریت
لالۂ صحرا سے سُرخی مانگ لی　　　بادۂ کوثر سے مستی مانگ لی
انجمِ تاباں سے لیں تابانیاں　　　ماہ کے آئینہ سے حیرانیاں
مہرِ روشن سے شعاعوں کو لیا　　　اقتباسِ جلوۂ الوز کیا
لی کشش کی تاب مقناطیس سے　　　اور تھوڑی سرکشی ابلیس سے
لیں فرشتوں سے سکوں آمیزیاں　　　موجِ غم سے اضطراب انگیزیاں

سب کو فطرت نے بہم یک جا کیا
پیکرِ نو ان سے اک پیدا کیا

اور یہ ہی حسین پیکرِ نو "عورت" ہے "

کیمیاگر کی رُوح جھومنے لگی اور اُس نے باوجود اس کے کہ "عورت" کے حسین عناصر کا دل میں اعتراف کر لیا لیکن پھر بھی یہ اعتراض کر ہی دیا۔

"لطیف عناصر کے اعتبار سے اب بلاشبہ "عورت" کی افضلیت و برتریت کا مجھے اعتراف ہے لیکن ان لطیف عناصر کے استعمال سے "عورت" کیا چیز بن گئی یہ ابتک نہیں معلوم ہوا "

کیمیاگر کی رُوح نے جیسے ہی اپنا اعتراض ختم کیا۔ صفِ مخالف سے ایک رُوح (رابعہ پنہاں) بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھی اور اُس نے بڑے پُروقار انداز میں کہنا شروع کیا۔

"دیکھو! میں خود یہاں موجود ہوں۔ مجھے دیکھ لو کہ میں کیا ہوں اور اگر میرے متعلق کچھ اور سُننا چاہتے ہو تو میں اُس کے لئے بھی حاضر ہوں ۔"

کیمیاگر کی رُوح نے اگرچہ اسکی خواہش نہیں ظاہر کی لیکن رُوح نے اپنا سازِ ثناخوانی چھیڑ ہی دیا۔

مَیں جلوۂ رفعت ہوں　　　تنویرِ حقیقت ہوں
تمکینِ صباحت ہوں　　　تخلیقِ لطافت ہوں
"عورت" ہے مرا عُنواں
میں شمعِ مجلّیٰ ہوں،　　　تنویرِ سراپا ہوں
اسرار کا پردہ ہوں　　　تخلیق کا منشا ہوں
"عورت" ہے مرا عُنواں
تصویرِ وفاداری　　　تنویرِ حیا داری
وارفتۂ غم خواری　　　دل دادۂ دلداری
"عورت" ہے مرا عُنواں
افسانۂ غم ہوں میں　　　آلامِ نشیم ہوں میں
محبوسِ الم ہوں میں　　　پابندِ ستم ہوں میں
"عورت" ہے مرا عُنواں
تسلیم مرا شیوہ　　　ہے ضبط مرا نغمہ
دل میرا وفا پیما　　　آنکھیں ہیں خلوص آرا
"عورت" ہے مرا عُنواں

غزل خواں رُوح اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ کیمیاگر کی رُوح نے بگڑ کر کہا۔

"اگرچہ تمہاری آواز بڑی رسیلی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں تمہارے ان محاسن سے قطعی واقف نہیں اور اس صورت میں اگر تم میں تمہاری بیان کردہ صفتیں موجود ہوں تو بھی خود تمہاری زبان سے تمہاری یہ اپنی ثناخوانی مجھے ذرا اچھی نہیں معلوم دیتی "

کیمیاگر کی رُوح کا یہ رنگ دیکھکر فوراً ہی صفِ ارواح سے ایک اور رُوح (پریم پجاری) آگے آئی اور اُس نے بڑے دل نواز انداز سے عرض کیا۔

"اس میں خفگی کی کوئی بات نہیں۔ بلاشبہ "عورت" کا درجہ بہت زیادہ اور بہت ہی بلند ہے۔ درحقیقت قدرت نے "عورت" کو بمنزلہ بہا پیدا کیا ہے۔ یہ ایک معیاری عورت کی تعریف ہے۔ اس سے کم درجے

کی عورت ہو تو اُسے گلستان سے تعبیر کر سکتے ہیں، اور نیچے اتر آیئے تو پھولوں کی کیاری کہیے۔ اس سے بھی ادنیٰ درجہ ہو تو سبدِ گل نام رکھیے۔ یہ بھی زیادہ تو گلدستہ سہی۔ اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو ایک "پھول" ہے یا "خوشبو" اس کے بعد کسی کمی کی گنجائش نہیں۔ یہ ہے عورت کا درجہ!"

کہتے ہیں کہ خوشبو کو ہم دیکھ نہیں سکتے اور نُور کو چھونا ممکن نہیں۔ مگر یہ اُن لوگوں کا خیال ہے جو "عورت" کے بارے میں کچھ نہیں جانتے خوشبو کو دیکھنے کا آرزومند "عورت" کو دیکھے اور نُور کو چھونے کا تمنائی "عورت" کے لمس سے لذت گیر ہو اُس وقت معلوم ہو کہ "عورت" کیا چیز ہے۔ اور تب سمجھ میں آئے کہ فطرت کا یہ کیسا بے نظیر معجزہ ہے"

اِس مشورہ ثنا خوانی کے بعد رُوح نے منظوم مدح سرائی کا ایک کیف بار نغمہ یوں چھیڑ دیا۔

فطرت نے جبکہ چاہا۔ اک معجزہ دکھانا
اچھی طرح ٹٹولا، اپنا ہر اک خزانا
انوارِ صبح لیکر، کچھ بجلیاں ملائیں
پھر نکہتوں میں یکسر رنگینیاں بسائیں
موسیقیِ حسن میں، شامل کیا تبسم
شعریتِ حسیں میں، داخل کیا ترنم
جب یہ تمام اجزا، باجسم ہو کے مرکب
تب یہ حسین فتنہ، اِن سے ہوا مرتب
کس کی مجال دیکھے، اس کو نگاہ بھر کے
گر بے خیال دیکھے، رہ جائے آہ بھر کے"

کیمیاگر کی رُوح ہر مصرع پر لوٹ لوٹ جاتی تھی۔ اور شاعر کی رُوح ایک ایک حرف سے شرابور تھی۔ یہاں پہونچکر یکایک رُوحِ شاعر کی آواز نے کہا۔

"جب اِس طرح یہ پیکر تیار ہو گیا تو پوری تصویر یوں نظر آنے لگی۔

یہ ماتھا صاف و روشن، یہ جلوہ گہِ نظر ہے
سادہ بیاض گردن، اک خندۂ سحر ہے
ماتھے پہ سرخ بندی، گردن میں سبز مالا
ان زہرۂ فلک ہی، گردِ قمر یہ ہالا
ملتے ہیں، جھومتے ہیں، اس طرح گوشوارے
جس طرح جھلملائیں وقتِ سحر ستارے"

رُوح نے نغمہ روک کر بطور تمہید پھر کہنا شروع کیا۔

"نداقِ سلیم اور ذوقِ جمالیات رکھنے والوں کے لئے یوں تو عموماً "عورت" کا ہر حصۂ جسم حسن و جمال کی ایک دنیا ہے مگر خصوصاً کشش فسادگی کے مرکز دو ہیں "آنکھیں" اور "مقیاس الشباب" چنانچہ آپ خود دیکھ لیجئے کہ۔

یہ انکھڑیاں خدایا، کس قدر کی حسیں ہیں،
کاجل نہیں لگایا، ویسے ہی سُرمگیں ہیں
آفاق کی نظر میں، تسخیر ہیں یہ آنکھیں
عشاق کی نظر میں، تقدیر ہیں یہ آنکھیں
بس کبریائیت کی تفسیر ہیں یہ آنکھیں
رُوحِ نسائیت کی تصویر ہیں یہ آنکھیں
جادو ہے نام ان کا کہتے ہیں موہنی بھی
شغلِ مدام اِن کا، افسوں بھی رہزنی بھی

بیتابِ ولولوں کے طوفاں سے بھر گیا ہے
شاید اسی سبب سے، سینہ ابھر گیا ہے
یا یہ فرازِ سینہ، نازِ شباب سمجھو
نازِ شباب کیسا۔ رازِ شباب سمجھو
یا حُسنِ شرمگیں تھا۔ خواہانِ خود نمائی
بس یہ اٹھان گویا۔ ہے شانِ خود نمائی
الفاظ و حرف سینہ، سنگ است و آبگینہ
این است علم سینہ۔ گنجد نہ در سفینہ"

کیمیاگر کی رُوح خیالات و جمالیات کی دنیا میں کھوئی ہوئی سی وجد کر رہی تھی اور یہ بلبلِ شیریں نوا ہمہ رنگینی و رعنائی ریاضِ ارواح میں چہک رہا تھا۔ جب شاعر اس جگہ پہونچا تو کیمیاگر کی رُوح چلائی۔

"بس بس، اب مجھ میں زیادہ سننے کی تاب نہیں۔ میں دیوانہ ہو جاؤں گا میں فنا ہو جاؤں گا۔ میں فنا ہو جاؤں گا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے اِس حاصل کئے ہوئے انمول موتی کیلئے بیشک تمہارا یہ پیش کردہ خزانہ بہرصورت مناسب ہے۔ اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ لاریب ایسی ہی نایاب شے کی مجھے تلاش تھی"

یہ کہتے کہتے کیمیاگر کی رُوح نے اپنی حاصل کی ہوئی بیش بہا اکسیر بطور امانت ایک والہانہ انداز سے "عورت" کے "دل" تک سپرد کر دی۔ معاً ایک ہلکے ترنم کے ساتھ "عورت" کے "دل" نے درمیان سے شق ہو کر "اکسیرِ محبت" کو اپنی آغوشِ شوق میں لے لیا دفعتاً ساری فضا آلود اور تاریک فضا منور ہو گئی جیسے تمام عالمِ ارواح دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ تمام کائنات اس چھوٹے سے پارۂ جسم کی اس عظیم الشان عظمت و رفعت اور اس جلیل القدر جسارت و ہمت پر انگشت بدنداں تھی۔

عطاء اللہ پالوی

حیاتِ دوام

بابو اندر ناتھ کے قلم میں جادو تھا جب لکھنے بیٹھتے تو اُن کے قلم سے امرت کی دھاریں بہہ نکلتیں۔ اُس وقت ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے کسی پہاڑی پر امرت کی گنگا بہہ رہی ہو۔ اُن کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ پچیس ۲۶ سال ہوگی۔ مگر اُن کی نظمیں اور طرزِ بیان دیکھکر جی باغ باغ ہو جاتا تھا۔ وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے اُس میں جان ڈال دیتے۔ اُن کے مضامین اور نظمیں پڑھکر لوگ عش عش کر اُٹھتے اور کہتے: "واہ وا! کیا دلکش اشعار ہیں، تشبیہہ و استعارے کیسے نادر ہیں۔ الفاظ کتنے شیریں ہیں، انہیں پڑھکر تو آدمی کسی اور ہی دُنیا میں پہونچ جاتا ہے۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ پڑھتے ہی رہیں اور کبھی ختم نہ کریں۔" اُن کے کلام میں شیرینی بھی تھی اور خوشنمائی بھی۔ مگر ان کے علاوہ اس میں سادگی تھی وہ مشکل الفاظ سے اپنے قارئین پر بے جا رُعب نہ ڈالتے تھے۔ یہ طریقہ اُنہیں پسند نہ تھا۔ اُنہیں جو کچھ کہنا ہوتا سیدھے سادے الفاظ میں ادا کر دیتے اور یہی اُن کا سب سے بڑا وصف تھا۔ ایک سال پہلے لوگ اُن کے نام سے بھی واقف نہ تھے مگر آج ہندی ادب میں انہی کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں بھی ایسا نہ ہوگا جس میں "گلشنِ خیال" اور "سوم ساگر" کی ایک دو کاپیاں موجود نہ ہوں، اُنہیں جو پڑھتا وہ اُنہیں کے گُن گانے لگتا۔

مگر بابو اندر ناتھ کی اقتصادی حالت کچھ زیادہ تسلی بخش نہ تھی۔ اتنا مغز مارنے پر بھی اُنہیں اتنی آمدنی نہ ہوتی کہ جس سے وہ اپنی زندگی بے فکری سے کاٹ سکتے۔ وہ اکثر غمگین رہتے اور اپنے وطن کی قابلِ رحم حالت پر آنسو بہایا کرتے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ اُن کے صوبے کا سب سے بڑا ادیب اور نامور شاعر پیسے پیسے کا محتاج ہے۔ اُن کا ناشر روپوؤں میں کھیلتا اور وہ بھوکے مرتے تھے۔ لوگوں کے اس رویّہ کو دیکھکر اُنہیں بہت دُکھ ہوتا۔ اور بعض اوقات تو وہ اتنے جوش میں آجاتے کہ اپنے مضامین پھاڑ ڈالتے اور قلم توڑ دیتے اور کہتے: "آئندہ کبھی لکھنے کا نام بھی نہ لونگا۔"

۲

صبح کا وقت تھا اور اندر ناتھ دھوپ میں بیٹھے ایک ماہوار رسالہ کے ورق اُلٹ رہے اور ساتھ ہی ساتھ مُسکراتے جا رہے۔ اُنکی بیوی منورما نے پوچھا "کیوں کیا بات ہے! اتنے خوش کیوں ہو؟"

اندر ناتھ نے منورما کی جانب محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا: "کسی نے "گلشنِ خیال" پر تنقید کی ہے۔ نقّاد نے بہت تعریف کی ہے"

منورما کے دل میں خیالات کا ایک ہجوم تھا۔ ذرا آگے سرک کر بولی: "تعریف تو کرتے ہیں مگر سمجھتے خاک نہیں۔"

اندر ناتھ۔ ہیں؟

منورما۔ ہاں میں جھوٹ نہیں کہتی اس مُلک کے لوگ سخت نادان ہیں۔ بھلا یہ تمہاری قدر کیا جانیں تم تو بھینس کے آگے بین بجا رہے ہو۔

اندر ناتھ۔ دراصل میری تحریر کے عیب و ہُنر کو سمجھنے والے یہاں صرف چند اشخاص ہیں۔ اس شہر میں مجھے سمجھنے والا اور میری باریکیوں کا علم رکھنے والا صرف ایک شخص ہے۔

منورما۔ وہ کون؟

اندر ناتھ۔ اگر ناراض نہ ہو جاؤ تو بتا دوں کہ وہ ایک عورت ہے۔ اس جیسی ذہانت میں نے کسی آدمی میں بھی نہیں دیکھی۔

منورما کو کچھ شُبہ ہوا اور وہ آہستہ سے بولی: "وہ کون ہے؟"

اندر ناتھ۔ شری متی منورما دیوی رانی۔ نام تو شاید تم نے بھی سُنا ہوگا۔

منورما نے ہنس کر مُنہ پھیر لیا اور بولی: "جاؤ تم تو ہر وقت مذاق ہی کرتے رہتے ہو۔"

اندر ناتھ۔ نہیں منورما میری ذاتی رائے یہی ہے۔

منورما۔ جی ہاں، دوسروں کا مذاق اُڑانا کوئی تم سے سیکھ لے۔

اندر ناتھ۔ منورما اگر تم میری ہمت نہ بڑھاتیں تو میں اتنی ترقی کبھی نہ کر سکتا۔

منورما۔ ہاں میں بڑی عالم ہوں نا!

اندر ناتھ۔ یہ تو تم مجھ سے پوچھو۔ سونا اپنی قیمت نہیں جان سکتا۔

منورما۔ خوشامد کرنا تو تمہیں خوب آتا ہے۔

اندر ناتھ۔ اچھا تو نقّاد کی رائے سُنو گی۔

منورما۔ سُناؤ۔

اندر ناتھ نے پڑھنا شروع کیا۔

"... "گلشنِ خیال" ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے اسے شروع سے

آخر تک پڑھا۔ بہت عرصے تک ہم پہ ایک حالت سی طاری رہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی نئی دُنیا میں پہونچ گئے ہیں۔ اس میں خوبصورتی بھی ہے اور سادگی بھی۔ اس میں تصنع نام کو نہیں۔ طرز بیان بھی دلکش ہے۔ اس میں شیرینی ہے اور حکمت۔ اور کیا کہیں ـــــــ غرضیکہ اس میں سب کچھ ہے۔"

اچانک نیچے سے آواز آئی "بابو اندرناتھ"

اندرناتھ اور منورما دونوں چونک پڑے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نہایت شیریں موسیقی سے لطف اندوز ہوتے وقت کوئی بلند آواز سے رونے لگ جائے۔ اُس وقت مغنی کے دل پر جو کچھ گذرتا ہے اُسے وہی جانتا ہے۔ وہ جھنجلا اٹھتا ہے اور مرنے مارنے پر تیار ہوجاتا ہے۔

بابو اندرناتھ نے رسالہ چارپائی پر رکھدیا اور نیچے چلے گئے۔ واپس آئے تو چہرہ اُداس تھا اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

منورما نے پوچھا "کون تھا؟"

اندرناتھ:۔ مالک مکان۔

منورما کا چہرہ اُتر گیا اور اُس نے نہایت غمگین لہجے میں کہا۔ "کیا کہتا تھا؟ یہ تو بُری طرح پیچھے پڑا ہے۔ چار دن بھی صبر نہیں کر سکتا۔

اندرناتھ:۔ کہتا تھا کہ اب تو نالش ہی کرونگا۔

منورما:۔ کتنا کرایہ ہے؟ تین مہینے کا؟

"جب ہمارے پاس روپیہ نہیں ہوتا تو ہم حساب نہیں کرتے۔ اُس وقت حساب کرتے ہوئے ہمیں ڈر لگتا ہے" اندرناتھ نے منورما کی بات کو دھیان میں نہ لاکر کہا۔ "جی چاہتا ہے کہیں ملازمت کرلوں۔ یہ روز روز کی بے عزتی اب برداشت نہیں کی جاسکتی۔ سراہنے کو تو سبھی ہیں مگر عملی طور پر امداد کرنے کیلئے کوئی بھی تیار نہیں۔ اس خالی تعریف سے کسی کا پیٹ تو بھرنے سے رہا"

منورما نے اپنے پتی کی جانب دیکھکر کہا: ہاں یہ بھی کر دیکھو۔ مگر آپ کی یہ ادبی خدمت کی لت نہیں ہٹ سکتی۔ یہ بھی دوسری شراب ہے"

اندرناتھ:۔ ہوا کرے۔ بس اب میں سب کچھ ترک کر دوں گا۔ تم ابھی تک مجھے سمجھی ہی نہیں۔

منورما:۔ خوب سمجھتی ہوں۔ دفتر میں کام کروگے تو جانونگی۔

اندرناتھ:۔ پیسے ملیں گے تو سب کچھ کرلونگا۔

منورما:۔ افسروں کی جھڑکیاں گھُڑکیاں سب سہنی پڑینگی۔

اندرناتھ:۔ خیر مالک مکان کے تقاضوں سے تو بچ جاؤں گا۔

منورما:۔ اگر کسی نے کہہ دیا ـــــ ارے یہ تو وہی شاعر ہیں جو ادبی دُنیا میں اتنا نام پا چکے ہیں۔ ہم نے تو سمجھا تھا کہ کوئی بڑا آدمی ہوگا مگر یہ تو ایک معمولی کلرک نکلا ـــ تو پھر؟

اندرناتھ:۔ میں سمجھوں گا مجھے نہیں کسی دوسرے کو کہہ رہے ہیں۔ اور کیا کروں! میرے ناشروں نے تو مجھے لوٹنے کا عہد کر رکھا ہے۔ کہتے ہیں جب کوئی اور نہ ملے گا تو ہماری شرطیں ہی منظور کرنی پڑیں گی۔ وہ امیر ہیں۔ روپے کی قیمت جانتے ہیں۔ ادب کی قدر نہیں پہچانتے۔ ایسے خود غرض لوگ مجھے کیا دے سکتے ہیں! یورپ میں ہوتا تو سونے میں کھیلتا۔ یہاں پڑا اپنی قسمت کو رو رہا ہوں۔

منورما:۔ تم ایسی باتوں کو جی میں نہ لاؤ۔ سب کچھ درست ہوجائیگا۔

اندرناتھ:۔ اچھا تو آج جاکر لالہ رنگی لال سے ملتا ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کام ضرور بنجائے گا۔ وہ بڑے شریف انسان ہیں۔

منورما:۔ ذرا تعریف کر دینا۔ بڑے آدمی بس اسی چیز کے بھوکے ہوتے ہیں اور دو باتوں سے خوش ہوجایا کرتے ہیں۔

اندرناتھ:۔ مجھے اس طرح پڑھانے کی ضرورت نہیں۔

منورما:۔ یہ کام بن گیا تو میں سمجھونگی گنگا اشنان کرلیا۔

اندرناتھ:۔ ان کا کافی رسوخ ہے وہ اگر چاہیں تو آج ہی کوئی نوکری دلادیں۔ اُٹھو ذرا کپڑے بدلوا دو۔

منورما نے اُٹھکر صندوق کھولا اور کپڑے تلاش کرنے لگی مگر دھوبی لے ابھی تک کپڑے واپس نہیں کئے تھے۔ منورما کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ اس روحانی ایذا سے اُس کا چہرہ اتر گیا۔ یہ وہی ہنس مکھ اور خوش دل منورما تھی جس کے قہقہوں سے سارا محلہ گونج اُٹھتا۔ اس وقت وہ کتنی مضطر اور اُداس تھی۔ پنچھی کبھی پھول کی ٹہنی پر بیٹھ کر چہچہاتا ہے اور کبھی پر سمیٹ کر چُپ چاپ آشیانے میں بیٹھ جاتا ہے۔

اندرناتھ نے سرد آہ بھری اور کہا "منورما اب میں ہرگز برداشت نہیں کرسکتا"

یہ تھا حال اُس مشہور شاعر کا جس کی نظمیں ملک میں اس قدر عزت اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ جس کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ پتھر جیسے سخت دل کو بھی موم کر دیتے ہیں۔ جس کی تحریر کو لوگ ترستے ہیں۔ جس کا نام سُنکر لوگوں کے سر جھک جاتے ہیں۔ جس کی کتابیں گرنتھوں کے لئے دھرم اپدیش سے کم نہیں۔ وہی شاعر آج پچاس روپے کی ملازمت کی تلاش میں نکلا ہے۔ ادب کی نگری کا راجا بھیک مانگنے چلا ہے۔

منورما نے اپنے پتی کی یہ حالت دیکھی تو آہ بھرکر زمین پر بیٹھ گئی۔ اُس وقت اُس کے دل میں صرف یہی خیال بنا ہوا تھا کہ ـــــ یہ سر

کسی کے آگے جھکے گا؟...

(۲)

ایک گھنٹے بعد اندر ناتھ بے آفس کے سپرنٹنڈنٹ لالہ رنگی لال کے دفتر میں تھے۔ لالہ رنگی لال اُس وقت کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اُٹھکر اندر ناتھ سے ہاتھ ملایا اور معذرت کرتے ہوئے کہا صرف پانچ منٹ کی مہلت دیجئے۔ یہ کہکر لالہ رنگی لال نے ایک کُرسی کی طرف اشارہ کیا اور کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔

اندر ناتھ کو یہ رویہ سخت توہین آمیز معلوم ہوا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُن کی کھلم کھلا بے عزتی کر دی ہو۔ اُن کا چہرہ تمتما اُٹھا اور خیال آیا کہ یہ کیسا بدتمیز ہے۔ اِسے اپنے وقت کا تو خیال ہے لیکن میرے وقت کی قدر نہیں۔ ابھی سے یہ حالت ہے تو نوکری مل جانے پر تو شاید دروازے پر ہی منتظر رہنا پڑے گا۔

اندر ناتھ نے چلنے کا ارادہ کیا تو یکایک مالک مکان کی آتشیں صورت اُن کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ کیا پھر اُس کا سامنا کرنا پڑیگا؟ کیا پھر وہی تقاضا سنوں گا؟ اندر ناتھ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہوا میں اُڑتے ہوئے کاغذ پر لوہے کا ٹکڑا رکھ دیا جائے۔ اس لوہے کے ٹکڑے کے مقابل اس کاغذ کا کیا مقدور ہے۔ رُوح پر انسانی فطرت غالب آ چکی تھی۔ یہ آزمائش کا وقت اندر ناتھ کیلئے سخت روحانی کشمکش کا وقت تھا۔

جب لالہ رنگی لال نے کتاب ختم کی تو اندر ناتھ کو ایسا معلوم ہوا کہ کمرہ ہوا سے بالکل خالی ہے اور وہاں انہیں اپنا دم گھٹتا ہوا معلوم ہوا۔ لالہ رنگی لال اپنی کتاب کی ادبیت کے تصور میں تھے۔ کچھ عرصہ تک وہ آنکھیں بند کئے جوگیوں کی مانند بیٹھے رہے۔ پھر بڑبڑانے لگے۔

"واہ وا! کیا کہنے! کتنا بلند تخیل ہے! کیسے پاکیزہ خیالات ہیں!"

اندر ناتھ حیران ہو کر سوچ رہے تھے کہ آخر یہ کہتے کیا ہیں۔

لالہ رنگی لال نے میز پر جُھک کر کہا: فرمائیے جناب کیا کام ہے؟

اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور بڑے صاحب ہاتھ میں ہیٹ لئے اندر داخل ہوئے۔ لالہ رنگی لال کھڑے ہو گئے۔

"گڈ مارننگ!"

"گڈ مارننگ! یہ کتاب کیسا؟"

رنگی لال:- نہایت عمدہ۔

صاحب نے دوسرے ہاتھ میں کتاب لیکر اُس کے ورق اُلٹتے ہوئے کہا: ہاں تو آپ کو بہت اچھا لگتا ہے۔

رنگی لال:- ابھی یا بُری کا سوال ہی نہیں۔ میں نے تو ہندی ادب میں آجتک ایسی کتاب نہیں دیکھی۔

صاحب:- تو اتنا اچھا ہے؟

رنگی لال:- بس پڑھکر جی خوش ہو گیا۔

صاحب:- انگلش میں کس کتاب کے مافک ہے؟

رنگی لال:- یہ تو میں جانتا نہیں لیکن کتاب بہت اچھی ہے۔

صاحب:- کیا کوئی ڈرامہ ہے؟

رنگی لال:- نہیں صاحب پوئٹری (نظم) ہے۔

صاحب:- ہندی کا پوئٹری کیا ہوگا۔ اِلِش (

رنگی لال:- اگر آپ اس کا مطالعہ کر سکتے تو کبھی ایسا نہ کہتے۔

اچانک اندر ناتھ کی نظر کتاب کے سرورق پر پڑی تو وہ چونک پڑے۔ یہ کتاب تو "گلشنِ خیال" تھی۔ اُن کا دل گلاب کے پھول کی مانند کھل گیا۔ اب وہ اس دنیا میں نہ تھے۔ وہ کسی دوسرے جہان میں پہونچ چکے تھے۔ انہیں اب اس ذلیل اور ناکارہ دنیا کے مال و دولت کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ وہ سوچتے تھے دولت کیا ہے؟ آتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ یہ تو اُڑتی پھرتی چڑیا ہے جسے پنجرے میں بند رکھنا سخت مشکل ہے۔ میرے پاس دولت نہیں ہے مگر دولت والے تو میرے ہیں۔ اس شخص کے دل میں میری کتنی قدر و منزلت ہے! یہ میرا کیسا معتقد ہے۔ کتاب کی جانب اس طرح دیکھتا ہے جیسے کوئی بھگت اپنے سوامی یا دیوتا کی جانب دیکھتا ہو۔ کتاب کے مطالعہ کے وقت اُس کی آنکھوں سے ایک عجیب چمک ہویدا تھی۔ مجھے اس حالت میں دیکھے گا تو کیا خیال کرے گا؟ چونک اُٹھے گا حیران رہ جائے گا۔ اُسے کبھی توقع نہ ہوگی کہ میں بھکاری بن کر اُس کے سامنے ہاتھ پھیلانے آؤں گا۔ اور میں ـــ میں اُسکے سامنے آنکھیں نہ اُٹھا سکوں گا۔ شرم سے زمین میں گڑ جاؤں گا۔ ملازمت تو بیشک مل جائے گی مگر خودداری جیسی بے بہا شے جاتی رہے گی۔ یہ سودا مہنگا ہے۔ لوگ اس کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ کیا میں چاندی کے چند ٹکڑوں کی خاطر ایسی انمول شے لُٹا سکتا ہوں نہیں۔ مجھ کو ایسی غلطی کبھی سرزد نہ ہوگی۔ میں ایسا کبھی نہ کروں گا۔

یہ سوچ کر اندر ناتھ آہستہ سے اُٹھے اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ اب اُن کے چہرے پر ایک ایسی رُوحانیت چھائی ہوئی تھی جو اس جہانِ رنگ و بُو میں کم ہی نظر آتی ہے۔ اُن کی آنکھوں میں خودداری کی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اُن کے دل میں ایک سرمدی دریائے لطافت ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ پہلے اُن کی آتما پر انسانی فطرت

غالب آگئی تھی۔ اب اُن کی فطرت پر اُن کی آتما نے مکمل فتح حاصل کرلی تھی اب اندرناتھ کے پاس وہی اطمینانِ قلب، وہی تیاگ اور وہی فقر کی دولت تھی جس کے چند برگزیدہ اشخاص ہی اہل ہو سکتے ہیں اور جس کی تلاش میں جوگی جنگلوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ گھر پہونچکر وہ ایسے خوش تھے کہ معلوم ہوتا تھا انہیں کہیں سے بیش بہا دولت ہاتھ آگئی ہے۔

منورما بولی: "معلوم ہوتا ہے کام بن گیا"

اندرناتھ۔ توقع سے بھی زیادہ۔

منورما۔ پرماتما کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے ہماری سُنی۔ کیا مشاہرہ ملے گا؟

اندرناتھ۔ کچھ نہ پوچھو، اس وقت میرا دل قابو میں نہیں۔

منورما۔ تو کیا مجھے بھی نہ بتاؤ گے؟

اندرناتھ نے منورما کو اپنی سرگزشت سُنائی اور آخر میں کہنے لگے "منورما! مجھے نوکری نہیں ملی۔ مگر مجھے اپنے نفس کا علم ضرور مل گیا ہے۔ میں اب نفس شناس ہوگیا ہوں۔ میری گیان کی آنکھیں روشن ہوگئی ہیں۔ میں خود فراموش تھا مگر آج میرے دل سے ایک پردہ اُٹھ گیا ہے اور مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ شاعر کا درجہ کس قدر بلند ہے وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے، وہ خوابیدہ مُلک کو جگاتا ہے اور مُردہ قوم میں زندگی کا رُوح پھونکتا ہے۔ دُنیا صرف اپنے لئے جیتی اور اپنے لئے ہی مرتی ہے مگر شاعر کی زندگی دوسروں کیلئے وقف ہوتی ہے۔ وہ گری ہوئی قوم کو سنبھالتا ہے۔ رونے والوں کی آنکھوں سے آنسو پونچھتا ہے۔ نااُمیدوں کو پیغامِ اُمید پہونچاتا ہے۔ دُنیا میں لوگ پیدا ہوتے ہیں اور مرجاتے ہیں لیکن ایسے قوم پرست ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور اُنہیں کبھی موت نہیں آتی میں نے ملازمت کے بدلے حیاتِ دوام خریدلی ہے۔ منورما میرا ہاتھ تھامو۔ میری مدد کرو۔ بلاشبہ تمہیں اس سے رنج پہونچے گا مگر اس کے بدلے جو روحانی خوشی اور حقیقی مسرت حاصل ہوگی وہ بہت انمول ہوگی۔

منورما محبت بھری نظروں سے اپنے پتی کی جانب دیکھکر مسکرانے لگی۔۔۔۔۔۔!

(شدرشن) ——— مُترجمہ۔ رفیع الزماں خاں؛

چندہ سالانہ پانچ روپے ششماہی تین روپے۔ مع محصولڈاک
قیمت فی پرچہ ۸؍

جُرعات

ممالک غیر سے بارہ شلنگ
نمونے کا پرچہ مفت طلب کیجئے

جلد ۱۸ | ساقی دہلی۔ بابت ماہ نومبر ۱۹۳۸ء | نمبر ۵

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
(۱)	نگاہِ اوّلیں	شاہد	(۲)
(۲)	خاتون اکرم	جناب صادق الخیری۔ ایم۔ اے	(۳)
(۳)	احوال و مقامات	جناب امین حزیں (سیالکوٹی)	(۱۴)
(۴)	نکات	جناب امین حزیں (سیالکوٹی)	(۱۵)
(۵)	انکی شکل سے	جناب جاں نثار اختر۔ بی۔ اے، (آنرز)	(۱۶)
(۶)	شمّو	جناب شاہد لطیف	(۱۷)
(۷)	خیاباں	جناب نہال سیوہاردی	(۲۱)
(۸)	پرستم میری رُوح کے مالک	"رضیہ"	(۲۲)
(۹)	فریبِ تخیّل	جناب علی احمد	(۲۴)
(۱۰)	نمک پارے	"جہاں نورد"	(۲۵)
(۱۱)	نہ قصہ نہ کہانی	جناب سید رفیق احمد	(۲۹)
(۱۲)	قطعات	جناب اختر انصاری۔ بی۔ اے۔ (آنرز) بی۔ ٹی	(۳۱)
(۱۳)	دیوالی	جناب شاد عارفی	(۳۲)
(۱۴)	چلم گزٹ	جناب سید علی شاکر۔ ایم۔ اے	(۳۳)
(۱۵)	ریاضِ رضواں	جناب رئیس احمد جعفری	(۴۱)
(۱۶)	اوقات	جناب سید احسن ایم۔ اے	(۵۲)
(۱۷)	زندہ اور فطری زبان	جناب چراغ علی	(۵۷)
(۱۸)	سنِ بلوغ	جناب سید عبدالجلیل حسنی۔ بی۔ اے، بی۔ ٹی	(۶۴)
(۱۹)	ہمساتی	جناب ایس۔ احمد بی۔ اے، بی۔ ٹی	(۶۷)
(۲۰)	خواجہ الطاف حسین حالی	جناب محمد عیسیٰ خواجہ۔ ایم۔ اے	(۶۹)
(۲۱)	اہتمامِ بہار	جناب محمود جالندھری	(۷۴)
(۲۲)	ڈاکٹر کی کہانی ڈاکٹر کی زبانی	ڈاکٹر ایس۔ اے۔ ہاشمی۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس	(۷۵)
(۲۳)	غزلیات	شاکر میرٹھی۔ بہزاد لکھنوی۔ کوکب شاہجہانپوری۔ فراق۔ علی منظور۔ فرحت کانپوری وغیرہ	(۷۸)
(۲۴)	کھلی چٹھی بنام ایڈیٹر ساقی	"ہم سخن فہم ہیں ساقی کے طرفدار نہیں"	(۸۲)

قیمت فی پرچہ چھ آنے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

ناظرینِ ساقی میں یہ خبر مسرت سے سنی جائیگی کہ ساقی کے شفیق قلمی معاون حضرت ایم۔ اسلم کو اُن کی کتاب "تفسیرِ حیات" پر پنجاب نے ادبیات کا پہلا انعام (ساڑھے سات سو روپے) دیا ہے۔ "تفسیرِ حیات" پر ساقی میں مجمل تبصرہ کیا جاچکا ہے۔ ایسی عمدہ کتابیں اُردو میں کم شائع ہوتی ہیں۔ اگر ایسی کتاب کی قدر نہ کی جاتی تو تعجب ہوتا۔ اس قدر دانی پر اسلم صاحب کی خدمت میں ہم ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

عورتوں کی حق تلفی مردوں نے ہمیشہ کی ہے چنانچہ ادبیات میں بھی یہ فریضہ نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا گیا ہے۔ اُردو کی جتنی تاریخیں یا تذکرے ملتے ہیں اُن میں عورتوں کی خدمات دانستہ نظرانداز کی گئی ہیں۔ اسے ہم چاہیں تو مرد کی خود غرضی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں ورنہ شاید ہی کوئی زمانہ ہو جس میں عورتوں نے مردوں کے ساتھ کسی نہ کسی حد تک ادبیات میں حصہ نہ لیا ہو۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ صنفِ نازک کے کتنے جوہر مردوں کی ہٹ دھرمی سے گمنامی کی تاریکی میں پڑے رہ گئے ہیں۔ عورتوں کو کچھ عرصے سے اپنے حقوق کا احساس ہوچلا ہے۔ جہاں اور بہت سے کام انہیں کرنے ہیں وہاں یہ کام بھی اُن کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اپنی ہمجنس قلمکاروں کا ایک مستند تذکرہ مرتب کریں اور اُنکے کارناموں سے دنیا کو روشناس کرائیں۔ ساقی کی اس اشاعت میں ایک ایسی ہی باکمال خاتون کا آپ سے تعارف کرایا جارہا ہے۔ برادرم صادق الخیری کا میں شکرگزار ہوں کہ انہوں نے خاتون اکرم مرحومہ کی ادبی خدمات اور اُنکے کارناموں سے ہمیں متعارف ہونے کا موقع دیا۔

سالنامۂ ساقی کے لئے اُردو کے مشہور اہلِ قلم حضرات اور خواتین سے مضامین لکھوائے گئے ہیں۔ ساقی کا مقابلہ کسی پرچے سے نہ تو پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ ساقی اپنی انفرادی حیثیت قائم رکھنا چاہتا ہے اس لئے ہمیشہ ایسے مضامین پیش کرتا ہے جو آپ کو کسی اور رسالے میں نظر نہیں آسکتے۔ جدید اُردو ادب بڑی حد تک رسائل کا مرہونِ منت ہے اور اس سلسلہ میں ساقی کی خدمات سب سے پیش پیش ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں کا دائرہ ساقی ہی نے قائم کیا ہے اور "ادب برائے زندگی" کا عملی ثبوت بھی ساقی ہی پیش کرتا ہے۔ سالنامۂ ساقی میں اس جدید تحریک کے چند نہایت عمدہ نمونے جمع کئے گئے ہیں۔ ادبیاتِ عالم کے دو مشہور شاہکار "کنگ لیئر" اور "فاوسٹ" سالنامہ میں شائع ہورہے ہیں۔ ہندوستان کے سب سے بڑے مترجم مولانا عنایت اللہ دہلوی نے اول الذکر کا ترجمہ کیا ہے اور مشہور انشاپرداز خاتون محترمہ فرخندہ اختر بیگم نے کرسٹوفر مارلو کے فاوسٹ کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ رومانی اور مزاحیہ مضامین میں ایم۔ اسلم؛ ل۔ احمد؛ حجاب امتیاز علی؛ پریم پجاری؛ صادق الخیری؛ عظیم بیگ چغتائی؛ قیس رامپوری؛ آوارہ؛ ناکارہ حیدرآبادی؛ ابوطاہر داؤد کے مضامین شامل ہیں۔ سالنامہ کے مضامین اور مضمون نگار حضرات کی نامکمل فہرست اسی اشاعت میں کسی اور جگہ شائع ہورہی ہے۔ اس پر ایک نظر آپ ضرور ڈال لیں۔

شاہد

خاتون اکرم

اُردو کی پہلی فسانہ نگار اور ترقی پسند مُصنّفہ

خوبیٔ خیالات کے علاوہ خاتونِ اکرم مرحومہ کا کلام باعتبار شستگیٔ زبان بھی ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے اور شروع سے آخر تک کوئی لفظ ایسا نہیں جو کھٹک جائے۔

اُن کی سعادت مندی اور فرض شناسی کے متعلق بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے "شامِ زندگی" "شب زندگی" میں جو نیمہ لکھی خدا نے مجھ کو وہ اپنی آنکھ سے دکھادی...... خدا کرے وہ مبارک وقت جلد آئے جب مسلمانوں میں سینکڑوں خاتون اکرم جیسی بچیاں پیدا ہوں۔

(مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری مغفور)

پیش لفظ:- ذرا اُردو زبان کی وسعت اور عروج و ترقی پر نظر ڈالئے اور پھر اسکی تاریخوں کو دیکھئے۔ کس قدر افسوس ناک امر ہے کہ اوّل تو سرے سے اُنکا فقدان ہی ہے اور جو دو چار تاریخیں ملتی بھی ہیں وہ اکثر اعتبار سے ناقص و نامکمل۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں نقاد اور ادبی مورّخ عنقا ہیں، پھر اُردو ادب کی تاریخ ڈھنگ سے مرتّب کون کرے؟ اس وقت تک جو چند تاریخیں چھپ چکی ہیں اُن کے پڑھنے کے بعد یہ رائے قائم ہوتی ہے کہ اُنکے اکثر مؤلف و مرتّب نہ مصنف کو سمجھے ہیں اور نہ اُنہوں نے اس کے لٹریچر کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ حالانکہ تاریخ ادب لکھنے سے پیشتر، مورّخ کا اوّلین فرض ہے کہ وہ زبان کی تدریجی نشو و نما سے واقف ہو اور مصنّفین اور انکی تصانیف کو اچھی طرح کھنگال لے۔ لیکن ہمارے مورخین نے یہ کیا کہ جو دوسروں نے لکھا کم و بیش وہی خود بھی نقل کرلیا۔ اُنہوں نے تنقیدی مطالعہ کی ضرورت سمجھی نہ محنت کرنی اور وقت صرف کرنا لازمی جانا۔ اس سلسلے میں چند "مورخینِ ادب" کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں مگر اس عرض کے ساتھ کہ میری نیت بُری نہیں ہے۔ محمد یحییٰ صاحب تنہا اور آغا محمد باقر صاحب کی "سیر المصنفین" اور "تاریخ نظم و نثر اُردو" اُٹھائیے۔ بڑے سے بڑا مصنف بھی انکی ہرزہ سرائی سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ کسی مصنف سے خوش ہیں تو اس کی تعریف میں انتہائی غلو سے کام لیا ہے ورنہ اپنی برہمی کا ثبوت نہایت نامناسب الفاظ میں دیا ہے۔ نتیجہ ہے کہ ان کتابوں کا مطالعہ کم سے کم انجان طلبہ کے لئے نہایت گمراہ کُن ہے۔ ڈاکٹر زور، ڈاکٹر عبد اللطیف، اور عبد القادر سروری کی تاریخوں سے یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ اُنہوں نے غیر جانبداری سے کام لیا ہے لیکن اُنہوں نے بھی مصنّفین اور اُنکے ادب کا گہرا مطالعہ نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مصنّفین کی صرف چند مشہور کتابوں کو سرسری طور پر پڑھ گئے ہیں۔ حالانکہ کسی مصنف پر تنقید کرنے سے پہلے یہ لازمی ہے کہ نقاد اس کے تمام لٹریچر پر ہر طرح حاوی ہو اور اسکے آرٹ کی تمام باریکیوں سے کماحقہٗ واقفیت رکھتا ہو۔ افسوس ہے اس ضروری پہلو کو اُردو کے یہ محققین بھی نظر انداز کر گئے۔ اس لئے اُنکا حوالے اور رائیں دینے میں جابجا غلطی کرنا کچھ زیادہ تعجب انگیز نہیں۔ سکینہ کی ہسٹری آف اردو لٹریچر غنیمت ہو لیکن اکثر مصنفین کے لٹریچر پر خاطر خواہ تبصرہ وہ بھی نہیں کرسکے۔ وقار عظیم صاحب ایک اور محقق طالب علم ہیں۔ اُن کی کتابیں "افسانہ نگاری" اور "ہمارے افسانے" فن کے جدید اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ مگر انگریزیت کی رو میں وہ اُردو کی وسعت اور ارتقائی منزلوں کو بالکل بھول گئے۔ ان کا مطالعہ صرف چند رسائل اور اُردو

کی دیگر تاریخوں تک محدود ہے۔ ہر اچھے رسالے کا ایڈیٹر اُن کے نزدیک فسانہ نگار ہے مثلاً منصور احمد مرحوم، مولوی شاہد احمد اور حامد علیخاں صاحب کو اُنہوں نے افسانہ نگاروں میں شمار کیا ہے۔ حالانکہ یہ بجائے اعلیٰ درجے کے مترجم ہیں، افسانہ نگار نہیں۔ شاہد احمد کو ہماری زبان کے اچھے ترجمہ کرنے والوں میں جگہ دینی چاہیئے لیکن ان کے ایک ایک افسانوں کو دیکھ کر افسانہ نگار ان کو بھی نہیں کہا جا سکتا۔ وقار صاحب کا کسی نامعلوم وجہ سے چند نوجوانوں کو باکمال اور بوڑھے فسانہ نگاروں کے برابر سمجھنا یا اُن پر ترجیح دینا بھی خاصہ مضحکہ خیز ہے لیکن فی الحال آپ ان خامیوں کو نظرانداز کر کے نفس مضمون کو لیجئے۔ اردو کی جو چند تاریخیں موجود ہیں۔ ان میں متذکرہ بالا غلطیوں کے علاوہ سب سے بڑا نقص یہ رہ گیا کہ مورخوں نے خواتین کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا (سوائے وقار صاحب کے جن کا انتخاب بے حد تشنہ ہے)، حالانکہ ہماری بہت سی خواتین مثلاً خاتون اکرم، رفعیہ کرانیہ، حجاب اسمٰعیل، خورشید آرا وغیرہ کے نام ان تاریخوں میں آجانے چاہیئے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ کوئی خاتون غالب یا اقبال، نذیر احمد یا راشد الخیری کا سا درجہ حاصل نہ کر سکی لیکن آپ اتنی توقع ہی کیوں کریں۔ عورتوں کو ہر معاملے میں مردوں نے دبانے کی کوشش کی ہے اس لئے ان کا تھوڑا بہت اُبھرنا بھی بہت زیادہ وقیع ہے۔ اور اُنہوں نے تو ادب میں ہماری بہت کچھ مدد کی ہے اور اُردو کی ترویج و توسیع میں خاصا حصّہ لیا ہے۔ آپ زنانہ لٹریچر کا بہ غور اور غیر متعصبانہ مطالعہ کر لیجئے۔ بہت سی خواتین ایسی نظر آئیں گی جنکی نظم و نثر اکثر ادبا و شعراء کے ہم پلّے ہیں۔ میں مولوی شاہد احمد مدیر ساقی کا ممنون ہوں کہ اُنہوں نے مجھے اس طرف متوجہ کیا اور اُردو کی مشہور انشا پرداز خاتون اکرم مرحومہ پر مضمون لکھنے کی دعوت دی۔ چنانچہ آج کی صحبت میں میں آپ کو ایک ایسی خاتون کی ادبی داستان سناتا ہوں جن کا لٹریچر اپنی خصوصیات کی وجہ سے یقیناً یہ حق رکھتا ہے کہ تاریخ اُردو میں ان کا نام نمایاں طور پر شریک کیا جائے۔ یہ خاتون اُفقِ ادب پر ایک روشن ستارہ بن کر چمکیں لیکن شہاب ثاقب کی طرح زندگی کے آسمان سے جلد ہی ٹوٹ کر موت کے گہرے نیلے سمندر سے ہم آغوش ہوگئیں۔

ابتدائیہ:۔ خاتون اکرم مرحومہ علامہ راشد الخیریؒ کی بہو اور مولانا رازق الخیری ایڈیٹر عصمت کی شریک حیات تھیں۔ ان کے سوانح مختصر مگر اہم ہیں۔ کیونکہ انکی ادبیت اور شخصیت میں گہرا تعلق تھا۔ وہ ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئیں، ۱۹۱۷ء میں مضمون نگاری شروع کی، ۱۹۲۳ء میں بیاہی گئیں۔ اور ۱۹۲۴ء میں رخصت ہوگئیں۔ بس انکی زندگی کی اتنی سی کہانی ہے۔ مگر اس کہانی کا پلاٹ ایسے اجزا سے مرتب ہوا تھا کہ ہم انکے کردار کو خواتین کے لئے مثالی نمونہ (Ideal) قرار دے سکتے ہیں۔ بقول لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی مرحوم:۔

بہت گردشیں جب کرے گا زمانہ تو پیدا کہیں ہوں گی ایسی یگانہ

اُنکی کتاب زندگی کی چند سطریں منشی پریم چند آنجہانی کی زبانی سنیئے:۔

> محترمہ خاتون اکرم مرحومہ کی کتابیں پڑھ کر مجھ پر انکی ادبیت سے زیادہ انکی شخصیت کا اثر ہوا۔ اچھی کہانیاں لکھنے والی تو اور دیویاں بھی ہیں لیکن ایسی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں جن کے قول اور عمل میں مناسبت ہو، جو کچھ دوسروں کو سکھاتی ہوں خود بھی اسپر چلتی ہوں ...... خاتون اکرم صاحبہ کی زندگی قدیم اور جدید معیار حیات کا نہایت متناسب اتحاد تھی۔ ان میں خدمت کی لگن ہے۔ قربانی کی تمنّا ہے۔ وہ تحمل اور سعی کی دیوی ہیں مسلم خواتین کی ساری خوبیاں اُن میں مجتمع ہوگئیں ہیں۔ (سسرال کے) پونے دو سال میں جس ہستی نے حضرت علامہ راشد الخیری کے قلم سے یہ خراج تحسین حاصل کیا "جسکی ہر ادا نے میرا دل مسخر کر لیا۔ میرے گھر میں چار دن کی چاندنی تھی۔ میں دیکھتا تھا اور دنگ رہ جاتا تھا کہ وہ ایک طرف مغرب کے مشاہیر پر رائے زنی کر رہی ہے

تو دوسری طرف جامی، سعدی اور خسرو بیے باکانہ گفتگو"۔ وہ غیر معمولی دل و دماغ کی خاتون تھی"۔

خود حضرت "مصوّر غم" کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے :۔

خاتون اکرم کے نام سے دنیائے نسواں اچھی طرح آشنا ہے۔ یہ جاہنار لڑکی ۲۶ فروری ۱۹۲۳ء کو دلہن کی حیثیت سے دہلی آئی اور بہو بن کر میرے گھر میں داخل ہوئی۔ وہ کسی متموّل باپ کی لڑکی نہ تھی اور شکل وصورت کے اعتبار سے بھی اوسط درجے کی تھی۔ مجھے جس چیز نے مائل کیا وہ اس کے مضامین اور خیالات کی شستگی، معاملہ فہمی اور عاقبت اندیشی تھی۔ اس کا مطالعہ اس قدر وسیع تھا کہ اکثر متقدمین کا کلام حفظ تھا۔ شادی کے بعد اسکی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ سسرال کے ہر متنفس کا دل فتح کرے۔ چنانچہ وہ اس میں ہر اعتبار سے کامیاب ہوئی۔ اسکی موت نے میری بہت سی خواہشوں کا خاتمہ کردیا۔ مگر وہ اپنی قابلیت اور فرمانبرداری کے ایسے سدا بہار پھول میرے دل پر کھلا گئی کہ میں جب تک زندہ ہوں اس کو فراموش نہیں کرسکتا۔ مرنے والی خاتون دلی والوں کو دکھا اور کُنبے والوں کو بتا گئی کہ بیوی کیا ہوتی ہے اور بہو کس کو کہتے ہیں .... قوم درماندہ میں اگر چند لڑکیاں ایسی پیدا ہو جائیں تو لاریب چند روز میں بیڑا پار ہے۔

سطور بالا سے آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ مرحومہ کی ادبیت اور شخصیت میں کس قدر تطابق و تعلق ہے اور آگے کے بیان سے آپ پر واضح ہو جائے گا کہ اُنہوں نے مثالی عورتوں کی جو خوبیاں دکھائی ہیں وہ قیاسی نہیں حقیقی ہیں، اور خود اُن میں موجود تھیں۔ وہ جھانسی کے ایک مقتدر گھرانے کی چشم و چراغ تھیں۔ اُن کے والد ڈاکٹر عبدالغفور، میر ناصر علی صاحب کے رسالہ "صلائے عام" کے خاص مضمون نگار تھے۔ اس لحاظ سے انشا پردازی کا ذوق اُنہوں نے ورثہ میں پایا تھا۔ اُنہوں نے سترہ سال کی عمر میں مضمون نگاری شروع کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عورتوں کا نام دوسروں کی زبان پر آنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ کُجا کہ چھپنا؟ چنانچہ شروع شروع میں وہ فرضی اور پھر کبھی ہمشیرہ احسن الغفور اور کبھی مس مطیر کے نام سے لکھتی تھیں۔ پھر بعد میں وہ اپنا اصلی نام لکھنے لگیں اور اُنکے قلم سے بعض ایسے مضامین نکلے جو تعلیم نسواں کے مخالفین کے نزدیک باغیانہ اور بے باک سمجھے گئے۔ کیونکہ عورتوں کے ساتھ مردوں کے بے جا مظالم کو طشت از بام کرنے میں انہیں بالکل جھجک نہ ہوتی تھی۔ انکی کامیابی کی یہ دلیل کیا کچھ کم ہے کہ اُس وقت کے قریب قریب تمام مشاہیر اور مستند ادبا و شعرا مثلاً علّامہ راشد الخیری، مولانا محمد علیؒ، اکبر الہ آبادی، تلوک چند محروم، عزیز لکھنوی، منشی پریم چند، مولوی عبدالحق وغیرہ وغیرہ نے انکی قابلیت اور انشا کی داد دی تھی۔

خاتون اکرم کے لٹریچر کی خصوصیات :۔ اُنیسویں صدی کا اختتام وہ زمانہ تھا جب "ادب برائے تفریح" کی صدائیں کانوں میں گونجتی تھیں اور قصے کہانیاں، نظم مثنویاں وغیرہ اس لئے مرتّب کی جاتی تھیں کہ رؤسا کی خوشنودی اور عوام کی دلبستگی کا سامان منظور تھا۔ اردو زبان کی مختلف شقین ابھی فن کے لحاظ سے بڑی حد تک خام تھیں اور فن کا کوئی ایسا نصب العین قائم کئے بغیر جو جذبات انسانی کا سچا عکس ہو، دریا کے دھارے کی طرح تقلید یا آزاد تخیل کی رو میں بہے چلے جارہے تھے۔ اس وقت زیر بحث "افسانہ" ہے جس کے صحیح مفہوم اور فنی حیثیت سے اُردو داں اس وقت تک ناآشنا تھے۔ البتہ ڈاکٹر نذیر احمد نے "ناول" نگاری کی ابتدا کرکے "ادب برائے زندگی" کا نغمہ ہم تک پہنچا دیا

تھا۔ بیسویں صدی نے اُردو ادب میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ جب اُس کے اوائل میں علامہ راشد الخیری[1] نے مختصر افسانہ نگاری کی داغ بیل ڈالی اور اُردو کو افسانے کی فنّی ضروریات وخصوصیات سے روشناس کرایا۔ کوئی آٹھ دس سال بعد منشی پریم چند بھی اس محفل میں شریک ہوگئے، اور ان دونوں بزرگوں نے ربع صدی گذرنے کے بعد اپنے غیرفانی کارناموں سے افسانہ نگاری کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔ لیکن ذکر اب کا نہیں ہمیں بائیس سال پہلے کا ہے جب افسانہ نگاری کی کم عمری تھی اور اردو ادب میں زندگی کی وہ تڑپ پیدا نہ ہوئی تھی جو آجکل سچے فن کار کے لئے محرک ہوتی ہے۔ اس وقت کے زنانہ لٹریچر کا مطالعہ کیجئے جو بالکل ابتدائی منازل سے گذر رہا تھا اور پھر خاتون اکرم کی تصانیف پڑھیے۔ پہلی ہی نظر میں ان کی وہ تمام خصوصیات ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہیں جن کی وجہ سے انہیں اپنے ہمعصروں میں ایک ممتاز درجہ حاصل ہے۔ سب سے پہلے ہم اُنکے ادب کے متعلق نقطۂ نظر کو لیتے ہیں۔ وہ ادب کو محض دل بہلانے کا ذریعہ نہیں سمجھتیں۔ بلکہ ان کے نزدیک ادب اور زندگی دو دل ہیں ایک کی دھڑکن دوسرے میں سُنائی دیتی ہے۔ انہوں نے دوسری خواتین اور اکثر مردوں کی طرح کسی خیالی دُنیا کی بے سروپا حکایتیں نہیں سُنائیں۔ بلکہ حیاتِ انسانی کے ایسے افسانے سُنائے ہیں جن میں تلخی ہے، حقیقت ہے، جدوجہد کا پیغام ہے اور عورتوں کی مظلومی کا نوحہ ہے۔ اس لحاظ سے آجکل کی ادبی اصطلاح میں وہ ایک "ترقی پسند مصنفہ" ہیں۔ ان کے افسانے اور مضامین تھپک تھپک کر سُلانے والی لوریاں نہیں بلکہ وہ ایسے اہم مسئلے ہیں جو قاری کو احساس اور تفکر پر آمادہ کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی زبردست خصوصیت ہے جو انہیں اُردو کے اچھے مصنفین میں جگہ دلاتی ہے۔ انکی ادبیت سے متاثر ہو کر افسرالشعراء حضرت آغا شاعر قزلباش فرماتے ہیں :-

علم کی تصویریں کے ہیں جو کردگار ... جن کے لفظوں سے ہیں دل سینے نگار
دفعتاً اُن کی بہو کی ایک کتاب ... سامنے آئی مرے - پروردگار!
عورتیں بھی اس طرح لکھ سکتی ہیں!! ... تیری قدرت کا نہیں کوئی شمار!

اب ہم انکی افسانہ نگاری کو لیتے ہیں جو اُنکے ادب کا اہم ترین عنصر ہے۔ اُنکی ہمعصر خواتین میں محترمہ نذر سجاد حیدر (مصنفہ جاں باز۔ آہِ مظلوماں وغیرہ) اور محترمہ صغرا ہمایوں مرزا (مُصنّفہ زہرہ، موہنی وغیرہ) کے نام پیش پیش ہیں۔ بے شک انہوں نے اپنی تصانیف سے زنانہ لٹریچر میں قابلِ قدر اضافہ کیاہے۔ لیکن اُنکی تصانیف مختصر افسانے نہیں کہے جا سکتے۔ کیونکہ وہ طوالت، تفصیلات اور پلاٹ کی وسعت کی وجہ سے افسانہ نگاری کے معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔ ان سب پر ناولی رنگ چھایا ہوا ہے۔ اسلئے ہم ان کو ناولوں میں تو جگہ دے سکتے ہیں لیکن افسانوں میں شمار نہیں کرسکتے۔ ان سے پہلے کی ایک آدھ کہانی اور نظر آتی ہے مثلاً "انوری بیگم" (مُصنّفہ بیگم نواب خدیو جنگ مرحوم) اُس کو بھی ہم ناول ہی کہہ سکتے ہیں افسانے کی خصوصیات اس میں بھی مفقود ہیں۔ غرض ۱۹۱۶ء سے پہلے کی کہانیوں کو افسانہ نگاری کے نمونوں سے جانچا جائے تو وہ فنّی حیثیت سے اس دائرے میں شامل نہیں کی جاسکتیں۔ وہ سب کہانیوں، قصوں، داستانوں، حکایتوں کے زُمرے میں آتی ہیں۔ البتہ بعض تصانیف جن کا میں ابھی ذکر کیا ہے ناول کی حدود میں ضرور داخل ہوگئی ہیں۔ یہ شروع صدی کا مختصر سا بیان ہے۔ اسکے بعد ہمارے سامنے خاتون اکرم کے افسانے آتے ہیں جو ۱۹۱۶ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان لکھے گئے انہیں میں پہلی بار "مختصر افسانے" کی زیادہ تر خصوصیات اور ضروریات ملتی ہیں۔ جو اس سے پیشتر کسی عورت کے قصّے کہانیوں میں نہیں تھیں۔ لہٰذا عورتوں میں سب سے پہلے افسانہ لکھنے کا سہرا خاتون اکرم کے سر ہے۔ اب ہم ان کے افسانوں کی خصوصیات اور جزئیات پر ذرا تفصیل سے بحث کرینگے۔

---

[1] مصّورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری مرحوم

خاتون اکرم کے قریب قریب تمام افسانے اصلاحی و معاشرتی ہیں اور کسی نہ کسی مقصد کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ اسلئے جیسا کہ لازمی تھا کہ وہ بعض مقامات پر افسانے کی حدود سے آگے نکل گئی ہیں۔ لیکن یہ چیز زیادہ گرفت میں نہیں آتی۔ کیونکہ اُن کے نزدیک آرٹ برائے آرٹ نہیں۔ بلکہ برائے اخلاق ہے، مزید برآں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں فن کی اتنی ساری خوبیاں سمو دی ہیں کہ چند خامیوں کا احساس ناگوار نہیں گذرتا۔ سب سے پہلے تو انہوں نے ایسا اسلوب بیان اختیار کیا ہے کہ ہم چند لمحات کے لئے براہ راست افسانہ نگار کے خیالات میں محو ہو جاتے ہیں اور چونکہ وہ اردو و انگریزی کے علاوہ فارسی و ہندی سے بھی واقف تھیں اس لئے اُن کے بیان میں مختلف النوع خوبصورت لفظوں، مختصر جملوں، حسین استعاروں اور شاعرانہ تشبیہوں کا سنجوگ ہو گیا ہے۔ دوسرے ان میں افسانہ گوئی کی فطری صلاحیت معلوم ہوتی ہے۔ اسلئے اُن کے افسانوں میں نہ صرف سادگی اور روانی ہے۔ بلکہ شروع سے آخر تک دلچسپی اور دلکشی برقرار رہتی ہے۔ پھر اُنکے افسانوں میں اوریجنیلیٹی ہے، ندرت ہے، تنوع ہے جو ہماری توجہ کو بھٹکنے کی مہلت نہیں دیتی۔ غرض:-

جو بھی سخن تھا نقش نگیں تھا   ہر قول محکم حصن حصیں تھا   (تلوک چند محروم)

وہ اپنے افسانوں کے لئے سادہ پلاٹ انتخاب کرتی ہیں جو مختصر بھی ہو اور تصویرزا بھی۔ اور چونکہ ان کا دل نہایت حساس ہے۔ اس لئے انکے پلاٹ کا محرک (Motive) اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ان کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ انکے افسانوں میں ہمیں نفسیاتی مطالعہ اور مشاہدے کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ جابجا تحیر، استعجاب، رنج، خوشی، غصہ، نفرت، رشک، رقابت وغیرہ جذبات کا اظہار کر کے اُنہوں نے کرداروں کو بعض مقامات پر انتہائی ارتقاء پر پہونچا دیا ہے۔ عورت کو بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنا کردار خصوصی بنا کر اس کے متعلق مختلف نظریے پیش کئے ہیں لیکن یہاں ہمیں عورت ایک عورت کی نظر سے دکھائی دیتی ہے۔ انکے افسانوں کا مرکز عورت ہی ہے جسکے ارد گرد ان کا بے پناہ تخیل گھومتا رہتا ہے اور وہ ہمیں اسکی مختلف کیفیات و احساسات کے پُرسوز افسانے سُناتی ہیں۔

پلاٹ:- افسانے کا سب سے اہم جزو پلاٹ ہے اور پلاٹ نام ہے حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں کا یا اُن واقعات کا جو افرادِ افسانہ کو پیش آتے ہیں۔ اچھا افسانہ نگار وہ ہے جو ان واقعات کو فنی اعتبار سے ترتیب دے سکے۔ چونکہ اختصار افسانے کا خاص جوہر ہے اسلئے ضروری ہے کہ وہ غیر اہم واقعات سے اجتناب کر کے صرف ان واقعات کو لے جو پلاٹ کو زیادہ سے زیادہ دلکش اور موثر بنا سکیں۔ خاتون اکرم کے افسانوں میں ہمیں یہ بات نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ اُنکے افسانوں کے پلاٹ پیچیدہ یا ضرورت سے زیادہ وسیع نہیں ہیں۔ بلکہ ہر افسانے کے لئے اُنہوں نے صرف ایک ہی واقعہ یا ایک ہی نقطۂ نظر یا ایک ہی نفسیاتی پہلو منتخب کیا ہے۔ جو شروع سے آخر تک اس پر چھایا ہوا ہے۔ خواہ مخواہ کی تفصیلات میں جانے کے بجائے وہ تصور آفرینی سے کام لیتی ہیں۔ تاکہ قاری خود اپنے تخیل سے لذت یاب ہو سکے۔ اور یہ افسانے کا جمالیاتی عروج ہے۔ انہوں نے بعض افسانوں میں پس منظر اور بیانی تفصیل سے بھی ترتیب پلاٹ میں ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ اسکے علاوہ مختلف حصص کے تناسب نے افسانوں کے حُسن میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ ایک چیز جو سب سے زیادہ قابل تعریف ہے وہ یہ ہے کہ انکے افسانے ایک ہولے ہولے بہنے والی ندی کی طرح رواں نہیں ہیں۔ بلکہ انکے پلاٹ ہمیں چین سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ ہم پر ایک تذبذب کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور پلاٹ کا زیر و بم، مدّ و جزر، اُتار چڑھاؤ ہمیں دم بدم ہلکورے دیتا رہتا ہے۔ اور بعض مقامات پر پلاٹ کے جوڑ توڑ سے ہم حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ انکے پلاٹ بتدریج نشو و نما پاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کا اختتام مُنتہا (Climax) پر ہوتا ہے اور بعض مُنتہا پر پہونچنے کے بعد آہستہ آہستہ پُرسکون طریقے سے ختم ہوتے ہیں۔ انکے پلاٹوں میں سے ایک دو کا ذکر کرتا ہوں "پیکر وفا" میرے نزدیک ان کے بہترین افسانوں میں سے ہے اس کے

متعلق ایک دلچسپ بات سُن لیجئے منشی پریم چند مرحوم اس کی تعریف کرتے ہوئے دبی زبان سے لکھتے ہیں کہ پلاٹ نیا نہیں ہے اور صورت یہ ہے کہ اس افسانے سے پہلے اُردو میں کوئی افسانہ اس پلاٹ کا موجود نہیں تھا۔ بعد میں یہ افسانہ اس قدر مقبول ہوا کہ کئی نامور افسانہ نگاروں نے اس پلاٹ پر افسانے لکھے لیکن میرے علم میں کوئی افسانہ "پیکرِ وفا" کو نہیں پہونچتا۔ ہاں ان افسانہ نگاروں کی وجہ سے اس کا پلاٹ عام ضرور ہوگیا۔ ممکن ہے اسی لیے منشی جی نے یہ رائے قائم کی ہو۔ اب آپ مختصر الفاظ میں "پیکرِ وفا" کا پلاٹ سُنیئے :-

ایک نکھٹو صاحب بہادر لڑکا ــــ اسکی وفا شعار بیوی ــــ صاحب بہادر بیوی کا زیور چُرا کر ولایت چلے جاتے ہیں ــــ بیوی جُدائی کے صدمے سے بے جان ہو جاتی ہے لیکن ہمت و استقلال سے کام لے کر مرحوم باپ کا کاروبار سنبھالتی ہے ــــ صاحب بہادر ولایت سے مختلف بہانوں سے روپیہ منگاتے ہیں ــــ بچاری سعیدہ مصیبت سے بسر کرتی ہے مگر جس طرح بھی ہوتا ہے روپیہ بھیجتی ہے ــــ صاحب سول سرجن ہو کر آتے ہیں مگر الگ کوٹھی میں رہتے ہیں ــــ بیوی متعجب مگر شوق میں اپنے ایک وفادار ملازم کے ساتھ اسکے گھر جاتی ہے ــــ ایک میم صاحبہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے نظر آتی ہیں ــــ سعیدہ کی تشویشناک بیماری بھی ظفر پر کوئی اثر نہیں کرتی ــــ میم صاحبہ ہزار ہا روپیہ کا مقروض کرنیکے بعد شوہر کو علیل چھوڑ کر چلی جاتی ہیں ــــ عین اس وقت جب شوہر کی عزت خاک میں ملنے والی ہوتی ہے، بدنصیب بیوی پھر وفا کا جوہر دکھاتی ہے لیکن خاتون اکرم اس افسانے کو یونہی ختم نہیں کر دیتیں۔ اُنہوں نے اس کا انجام بے حد ڈرامائی دکھایا ہے جو قاری کے دل پر ٹریجڈی کا سا اثر پیدا کرتا ہے۔ ظفر اس مصیبت سے چھٹکارا پاکر دوسرے شہر میں چلا جاتا ہے وہاں اسکی پریکٹس خوب چلتی ہے۔ ایک روز بیمار ہو جاتا ہے اور تیز بخار کی حالت میں رات گئے :-

> "ظفر کے کمرے کا دروازہ کُھلا ہے نوکر اپنی اپنی جگہ سو رہے ہیں۔ مکان بالکل سنسان ہو رہے ہیں ظفر اکیلا کمرے میں کمبل اوڑھے لیٹا ہے۔ میز پر لیمپ جل رہا ہے۔ کمرہ خوب سجا ہوا ہے۔ بڑے بڑے اور مشہور لوگوں کے مجسّمے رکھے ہوئے ہیں۔ ظفر کو ہوش آیا اس نے کروٹ لی اور پسینے کی شدت سے گھبرا کر کمبل پھینک دیا۔ آدھے گھنٹے تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر یکایک پلنگ پر سے اتر کر کانپتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر کہنے لگا ــــ
>
> "اے مالک کائنات! میری حالت پر رحم کر! میں نے تیرے بندے کی حق تلفی کی، اسکی جو میرا ساتھی بنایا گیا تھا۔ سعیدہ! آ۔ مجھ کو جو تیرا جی چاہے سزا دے ...... اے سعیدہ آ!"
>
> مغموم و مایوس ظفر رنج و ندامت کی حالت میں سرنگوں ہوگیا کہ :-
>
> "دفعتاً سرسید کے مجسّمے میں حرکت ہوئی اور اس کے پیچھے سے کوئی نکلا ــــ آہٹ سُن کر ظفر نے نگاہ اونچی کی اور چیخ کر کہا ــــ
>
> سعیدہ! میرا قصور معاف کر!"

ایک اور چھوٹا سا پلاٹ سُناتا ہوں۔ خاتون اکرم پلاٹ کی جستجو میں اپنے گرد و نواح سے دور نہیں جاتیں۔ بلکہ وہ انہیں روزمرّہ کے واقعات سے اخذ کرتی ہیں اور بسا اوقات ایک معمولی سا واقعہ جو ہماری نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتا انکے قلم سے ایک مؤثر فسانے کی صورت میں نکلتا ہے۔ آپنے سُنا ہوگا کہ کسی چہیتی ماں نے اپنے بچے کو پہلا روزہ رکھوانے کے شوق میں یہ خیال نہیں کیا کہ وہ روزہ رکھنے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ کمزور بچوں کے ساتھ اس کا نتیجہ شدید علالت یا موت ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک واقعہ کو خاتون اکرم نے افسانے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ پلاٹ یہ ہے

سخت گیری کا زمانہ ——— ایک جاہل مگر دولت مند عورت پہلا روزہ رکھوانے کے شوق میں اپنی پانچ برس کی بچی پر یہ آفت نازل کرتی ہے ——— دن بڑی مصیبت سے کٹتا ہو ——— ماں تقریب میں مگن، مہمانوں کے استقبال اور افطاری کے انتظام میں مشغول ہے۔ شام کو بچی غائب ہو جاتی ہے، ڈھنڈیا مچتی ہے۔ افطار ہو جاتا ہے ——— بڑی تلاش کے بعد بچی ملتی ہے۔ مگر اس طرح کہ:۔

"آخر رقیہ ملی۔ ایک چھوٹی کوٹھری میں، جہاں ماما اپنے لئے پانی کا ایک گھڑا رکھا کرتی تھی۔ وہ بچاری اس گھڑے پر منہ کے بل پڑی ہوئی تھی۔"

کیونکہ:۔

"معصوم بچی پانی پینے کے لئے گھڑے کے پاس گئی تھی مگر ماں کا حکم تھا کہ پانی نہ پینا۔ آخر پیاس کی تاب نہ لاکر اُسی پر گر پڑی۔"

اس پلاٹ میں کوئی جدت تو نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے ہیں مگر اُنہوں نے انجام دے کر ایک نئے طریقے سے پیش کیا ہے جو حسرت ناک بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ خاتون اکرم کے پلاٹ ہماری معاشرت کی تصویریں ہیں اور اس قدر سچی کہ کہیں غیریت یا اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔

کردار نگاری:۔ افسانے کا دوسرا اہم جزو کردار نگاری ہے اور کردار نگاری میں وہی افسانہ نگار کامیاب ہو سکتا ہے جس کا مطالعہ وسیع ہو اور نفسیات سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔ خاتون اکرم نے انسانی زندگی کا مطالعہ اچھی طرح کیا تھا اس لئے اُنکے ہاں کردار نگاری کے نمونے بھی عُمدہ ملتے ہیں۔ ان کے کردار نہ تو محلوں کے رہنے والے ہیں اور نہ جھونپڑوں کے، بلکہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں خوشی بھی میسر ہوتی ہے اور رنج بھی۔ وہ عورتوں کی نفسیات سے زیادہ واقف ہیں۔ اسی لئے اُنہوں نے عورت کی مختلف کیفیات اور احساسات کو طرح طرح سے بیان کیا ہے۔

"بچھڑی بیٹی" میں ایک پُرانے زمانے کی ساس کا کیرکٹر ملاحظہ فرمائیے جس کو پوتی کے کھو جانے کا غم اور اس بات کا زیادہ رنج ہے کہ بہو کے ہاں اور کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ اس کے متعلق ایک جگہ لکھتی ہیں:۔

"بڑی بی کی گھبراہٹ قابل دید ہے۔ یوں تو پہلے بھی وہ کہا کرتی تھیں مگر جب سے شکیلہ کھوگئی تب سے وہ اور بھی بے قرار ہیں۔ دن رات اسی پیچ و تاب میں گذرتا۔ یہ نہیں کہ اُنہوں نے کچھ تدبیر نہ کی ہو۔ تعویذ اُنہوں نے پہنائے، دوائیں اُنہوں نے کھلائیں، منتیں اُنہوں نے مانیں۔ مزاروں پر وہ لے گئیں، چادریں اُنہوں نے چڑھائیں۔ فقیروں کے آگے اُنہوں نے ہاتھ جوڑے۔ اولیاؤں سے لڑکے اُنہوں نے مانگے .... مگر حاصل حصول کچھ بھی نہ ہوا۔ ان کو سوائے اس ذکر کے اور کوئی بات تھی ہی نہیں۔ بیٹے سے، بہو سے، آئے گئے سے، یہی دُکھڑا رویا کرتی تھیں۔"

ان کے بعض اور زنانہ کرداروں نے اُنکی کردار نگاری کو نہایت بلند درجے پر پہونچا دیا ہے۔ وہ ایک حقیقت پرست (Realist) ادیبہ ہیں۔ اس لئے ان کے کردار ہم ہی جیسے انسان ہیں۔ یہانتک کہ مثالی کرداروں کے پیش کرنے میں بھی اُنہوں نے Realism کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ اچھی عورت میں ایثار، محبت، اطاعت اور خدمت کے

جذبات دکھائی ہیں اور یہ وہ خوبیاں ہیں جو مبالغہ آمیز نہیں ہیں۔ وہ اگر "سچ کی فتح" یا "پیکر وفا" میں عورتوں کے ایسے کردار پیش کرتی ہیں جنہوں نے شوہر کی خاطر اپنا عیش و آرام قربان کر دیا اور باوجود اذیتوں کے وفا اور سچی محبت کا ثبوت دیا تو یہ خلاف عقل نہیں۔ یہ جذبات تو عورت کی فطرت میں عبادت کی حد تک داخل ہیں۔ وہ اپنے اچھے سے اچھے کردار کی برائیاں بھی ہم پر ظاہر کر دیتی ہیں۔ اور برے سے برے کیریکٹر کی بھلائیاں بھی ہم سے نہیں چھپاتیں۔ "جدت پرست" میں ایک فیشن زدہ، خانہ داری سے غافل اور شوہر کی طرف سے لاپروا مغرور عورت کا کیریکٹر ملاحظہ فرمایئے۔ نسوانی فطرت کے حسن و قبح کی عکاسی کتنی کامیابی سے کی ہے:-

"اُس میں بھلائیاں بھی موجود تھیں۔ اس میں بعض اوقات رحم و کرم کا ایک فوری جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔ اسکی متاہلانہ زندگی میں ایسے ایام اکثر آئے جب وہ اپنے شوہر سے خوش اخلاقی و خندہ پیشانی سے پیش آئی ہے۔ جس دن وہ کوئی زیور لاتا تو اظہار ممنونیت و مسرت ضرور کرتی جس طرح کوئی بچہ کھلونا پاکر خوش ہوتا ہے وہ زیور پاکر پھولی نہ سماتی تھی۔ ایک ہفتے تک وہ جسم سے کبھی الگ نہیں ہوتا، ہر وقت اُس کا ذکر رہتا خوش مزاجی کی بھی انتہا نہ ہوتی۔ میاں پر عنایتیں دن دونی رات چوگنی بڑھتی رہتیں مگر جوں جوں زیور دل سے اُترتا جاتا، میاں کی چاہت بھی کم ہوتی جاتی"

وہ جو کچھ کرداروں کے متعلق تعارفاً خود کہتی ہیں وہی کردار اپنے افعال سے ثابت کرتے ہیں لیکن یہ افعال کرداروں سے زبردستی نہیں کرائے جاتے بلکہ وہ خود بخود اُن سے سرزد ہوتے ہیں۔ عقیلہ کا کردار پیش کرتے ہوئے وہ اتنا تعارف کراتی ہیں "اس نے خدمت سے عظمت حاصل کی تھی"۔ پھر اس کے پے در پے افعال ہمکو مصنفہ کی رائے سے متفق ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ:-

"ساس سخت بیمار پڑ گئیں۔ عقیلہ نے دن کا آرام اور رات کی نیند حرام کر لی۔ اور ساس کی تیمارداری میں اپنی جان لڑا دی۔ خدا خدا کر کے وہ اچھی ہوئیں تو جٹھانی کے ہاں مردہ بچہ پیدا ہوا۔ ساس اول تو بیماری سے اُٹھی تھیں۔ پھر ضعیفی کا عالم۔ لے دیکر عقیلہ ہی عقیلہ تھی۔ مگر اُس نے پھر دل توڑ کر محنت کی۔ ننھا مسعود جو ساڑھے چار برس کا تھا اسکو بھی سنبھالتی۔ جٹھانی کو بھی دیکھتی۔ رات رات بھر مریضہ کے سرہانے بیٹھ کر گذار دیتی۔ دوا پلاتی، سر دباتی۔ غذا کا اہتمام کرتی۔...."

اُنکی کردار نگاری کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ جوں جوں انکے کردار ارتقائی منزلیں طے کرتے جاتے ہیں ہمیں انکے ساتھ تعلق اور ہمدردی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ ہمیں انکی مسرت سے اطمینان اور دکھوں سے تکلیف ہوتی ہے۔ اور چونکہ پلاٹ کی سادگی کے باوجود ان کے کردار کشمکش و پیچ (Crisis) میں رہتے ہیں اسلئے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ دو کھلی ہوئی راہوں میں سے کونسی اختیار کرتے ہیں۔ دراصل وہ انسانی فطرت خاص کر فطرت نسوانی کی اس قدر ماہر ہیں کہ انکی کردار نگاری میں کہیں جھول نہیں آیا۔ چند الفاظ ہیروئن کے متعلق اور کہنے چاہتا ہوں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ خاتون اکرم اپنی ہیروئن میں وہی خصوصیات دکھاتی ہیں جن پر مشرق کو ناز ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ **خذ ما صفا ودع ما کدر** کی قائل ہیں۔ نیز انکی ہیروئن خالی وقت میں ولولہ انگیز رومان نہیں پڑھتی بلکہ خانہ داری کے کسی کام میں مشغول نظر آتی ہے۔

مکالمہ:- افسانے کا ایک اہم جزو مکالمہ ہے اور خاتون اکرم اس میں بھی ناکامیاب نہیں۔ انکے افراد جو گفتگو کرتے ہیں اس میں تصنع نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی بات خلاف فطرت ہوتی ہے بلکہ برجستگی اور بانکپن نے ان کے مکالموں کو اور اُبھار دیا ہے۔ ایک جگہ سے مکالمہ پیش کرتا ہوں۔

بیٹے کی پسند کے خلاف شادی ہوتی ہے۔صاحبزادے دلہن اور گھر والوں کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ساس بہو سے بے حد برہم ہیں۔ایک دن ایک کنجڑن پھرتی پھراتی آنکلی:-

پوچھنے لگی "بیوی ترکاری لوگی؟"

ساس نے کہا "لے آ"

(سودا بیچنے کے بعد) کنجڑن بولی "بیوی! ایک پان کھلاؤ۔ تمہارا کو کھائے دیر ہوئی، جمائیاں آرہی ہیں"

ساس نے بہو کی طرف دیکھ کر کہا "اس کو ایک پان دے دو"

(بہو پان لینے اٹھی) کنجڑن سب کو پوچھنے لگی "بیوی آپ کی یہ کون ہیں؟ وہ کون ہیں؟"

ساس نے بتایا "یہ میری بیٹی ہیں۔ وہ جو پان لینے گئی ہیں، بہو ہیں"

کنجڑن بولی "بہو تو آپ کو بہت اچھی ملی ہے۔خدا سلامت رکھے"

ساس فوراً ترخ کر بولیں "اے ایسی خوبصورتی کو لے کر کیا چاٹنا ہے جسکی بدولت میرے بچے نے گھر چھوڑ دیا۔اس سے بہتر ہوتا کہ بہو کانی بدصورت ہوتی۔مگر میرا بچہ میرے ساتھ رہتا"

کنجڑن نے جلدی سے پوچھا "بیوی! تو آپ کے لڑکے آپ کے پاس نہیں ہیں؟"

ساس نے "اے کہاں؟ انہیں کی بدولت گھر چھوڑ دیا۔کہتا ہے جب تک یہ ہیں نہ آؤنگا"

آپ نے ساس اور کنجڑن کی گفتگو سن لی کس قدر عین فطرت ہے؟ اب حسنا کی سوتیلی ماں کی باتیں سنیئے:-

باپ نے کپڑوں پر نظر ڈال کر کہا "تمہارے کپڑے کتنے چکٹ ہو رہے ہیں۔تم بدل کیوں نہیں ڈالتیں؟"

حسنا نے شرم سے نیچی نظریں کرلیں اور بولی "میرے پاس دو پٹے نہیں ہیں"

باپ قیصر (دوسری بیوی) سے مخاطب ہوئے "تم نے اس مہینے سب کے لئے حساب کرکے کپڑا منگوایا تھا۔اس کے کپڑے اس کو دے کیوں نہیں دیئے؟"

قیصر کی تیوری پر بل پڑگئے۔ذرا تیز آواز سے بولی "ابھی کبھی کے کپڑے نہیں بنے تو ان کے کس طرح بنجاتے ——— ابھی اس دن دوپٹہ بنا تھا، آج سن رہی ہوں کہ پھٹ گیا" حسنا کی طرف دیکھ کر "کیا مجھ سے نہیں کہہ سکتی تھیں جو باوا جان سے کہا جا رہا ہے؟" (اور شوہر کی عدم موجودگی میں) "تم جوان ہوگئی ہو، باپ کے سامنے جاتے شرم نہیں آتی؟"

منظر کشی: منظر نگاری میں بھی انہوں نے ایسا زورِ قلم دکھایا ہے کہ سارا سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور باقی جزئیات سے بھی انہوں نے افسانوں کو زیادہ سے زیادہ مکمل اور دلکش بنانے کی کوشش کی ہے۔پس منظر کے متعلق ایک چیز نمایاں ہے اور وہ مذہب ہے۔انکے زیادہ تر افسانے مسلمان سوسائٹی کے ہیں۔لیکن انہوں نے مذہب کو پس منظر لاکر سمجھدار اور قادر افسانہ نگار ہونے کا ثبوت دیا ہے کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہاں افسانے سے علیحدہ تبلیغ کی گئی ہے۔

طرزِ نگارش:- خاتون اکرم کا طرزِ نگارش اتنا ممتاز نہیں ہے کہ وہ دوسرے مصنفین کی تحریر سے الگ پہچانا جا سکے۔پھر بھی جو اسلوب انہوں نے اختیار کیا ہے وہ قابل داد ہے۔وہ طویل فقرے اور بے معنی رنگین عبارت نہیں لکھتیں۔اختصار اور حسن انکی طرزِ نگارش کا خاصہ ہے۔انکی تحریر میں

روانی ہے۔ زور ہے، اثر ہے، سوز ہے کہیں سے بھی پڑھنا شروع کر دیجئے۔ طبیعت کہیں نہیں اُکتاتی۔ وہ مشکل خیال کو بھی دلچسپ اور شگفتہ عبارت میں ادا کر دیتی ہیں۔ خیالات کی پختگی کے علاوہ انکی زبان بھی صحیح اور دلاویز ہے۔ اسلئے کوئی فقرہ کانوں یا ذہن کو ناگوار نہیں گزرتا۔ جذبات نگاری نے انکے اسلوب بیان کو اور بھی صیقل کر دیا ہے۔ جہاں وہ قلبی جذبات اور ذہنی احساسات کی عکاسی کرتی ہیں وہاں ان کا اسلوب بیان اور بھی نکھرا ہوا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے [illegible] استعارے۔ شاعرانہ تشبیہیں اور گنگاجمنی ترکیبیں اُن کے افسانوں اور مضامین میں اس طرح [illegible] ہیں جیسے نیلے وسیع آسمان پر روشن ستارے۔ غرض ان کے ہاں سادگی و پرکاری، برجستگی و رنگینی، لطافت و شیرینی بیک وقت [illegible] کہیں کہیں سے چند جملے نقل کرتا ہوں۔

"وہ تھی اور دن رات کا رونا۔ وہ تھی اور شمع کا جلنا"

"مکان مقفل دیکھا تو اسکی امیدوں کا چراغ گل ہو گیا .... شام کو پھر آیا مگر دروازہ اب بھی کسی حرماں نصیب کی امیدوں کی طرح بند تھا۔ لیکن امید نے پھر دُھندلی جھلک دکھائی اور ......"

"سعیدہ کے دل میں اسوقت پنکھے لگے ہوئے تھے اور اس کی حالت اس ملزم کی سی تھی جس کا فیصلہ جج سنانے والا ہو"

"بڑے بھائی کی بیوی شیاما کو اس بات کا بڑا گھمنڈ تھا کہ میرے شوہر ہی کی بدولت سب کو روٹی مل رہی ہے۔ اس لئے وہ گھر کے کاموں میں ہاتھ نہ لگاتی تھی۔ جو سب کو کما کر کھلائے اسکی پیاری بیوی ماماگیری کیوں کرے؟"

"بھائی نے بہن کی قبر دیکھی جس پر حسرت و بیکسی برس رہی تھی۔ جیو ہا نوحہ پڑھ رہے تھے۔ شمع اسکے غم میں آنسو بہا رہی تھی۔ بھائی نے ہاتھ [illegible] کر بدنصیب بہن کو فاتحہ کا تحفہ بھیجا اور بادل گریاں و چشم بریاں واپس آیا"

افسانوں کا مقصد اور نظریہ حیات :- خاتون اکرم کے افسانے ایک مقصد کے حامل ہیں اور یہ مقصد حمایت نسواں ہے۔ انہیں اپنی صنف کی زبوں حالی کا پورا پورا احساس ہے۔ اس لئے وہ افسانوں اور مضامین کے ذریعے انکی پستی کا اظہار اور مردوں کے بیجا ظلم و ستم کا شکوہ کرتی ہیں۔ اُن کا [illegible] عورت کو [illegible] نہیں دیکھ سکتا۔ اسی لئے ان کے ہاں کہیں گلا ہے کہیں التجا کہیں غصہ ہے کہیں جھنجھلاہٹ کہیں بے چارگی ہے کہیں حسرت کہیں طعن ہے کہیں طنز۔ چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

"وہ کوئی ہندوستانی بیوی تھوڑی تھی [illegible] پکاتی۔ برتن بھی مانجھتی۔ جھاڑو بھی دیتی۔ کپڑے بھی سیتی۔ اور ہر طرح گذارہ کر لیتی۔ وہ ٹھیریں ولایت کی میم صاحب [illegible] کی ہر بات انوکھی اور ہر ادا نرالی تھی"

میم دیکھو کر۔ "ہمارا یہ کام ہے کہ خانساماں کی خوشی ہم کریں! تم ابھی کیا کیا نہ کہے گا؟ کہے گا کہ خدمت گار اور بھنگی کی خوشی بھی ہم ہی کریں [illegible] ہم کوئی یہاں کا کالا عورت بنا ہے کہ جو چاہے گا کروالے گا؟"

"ہمارے مذہب وفا کا داغ لگنا اچھا نہیں۔ وہ جو چاہیں کریں اور جس قدر چاہیں ظلم توڑیں۔ مگر ہمیں اُن سے بے وفائی اختیار کرنی اچھی نہیں"

[illegible] نبی صلعم کی اجازت سے شرعی طور پر جائز ہے۔ آپ کے عہد مبارک میں ہوا ہے۔ جو بدنصیب و بدقسمت عورتیں جل جل کر گھل گھل کر زندگی کے دن پورے کرتی ہیں وہ خلع کیوں نہ حاصل کریں اور رنج و غم سے نجات کریں؟"

خاتون اکرم کا مقصد [illegible] خواتین کی اصلاح اور بہبودی تھی اسلئے ان کے افسانوں سے وہ لوگ لطف اندوز نہیں ہونگے جو افسانے کا مقصد

صرف حسن وعشق کے جذبات کو برانگیختہ کرنے والی داستان سمجھتے ہیں۔ بیشک انکے افسانوں میں عشق کی شوریدہ سری اور حسن کی ہنگامہ پروری نہیں ہے لیکن انکے افسانوں میں ہمکو وہ محبت جابجا ملتی ہے جو ایک باوفا بیوی کے دلمیں اپنے شوہر کے لئے ہوتی ہے۔ انکے رومان میں محشر سامانی اور فتنہ گری نہیں ہے گرمیاں بیوی کی پُرسکون اور خاموش الفت کا مظاہرہ ہے جس میں صرف اسی وقت ہلچل مچتی ہے جب شوہر بیوی کی محبت کا جواب بیوفائی سے دیتا ہے۔

خاتون اکرم بالطبع مُتشائم ہیں اس لئے وہ دُنیا اور زندگی کی طرف سے مایوس ہیں، وہ مسرت کے ترانے گانے گانے موت کے نوحے سنانے لگتی ہیں۔ "جمال ہمنشیں" انکے زیادہ تر ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں انکے نظریۂ حیات کی وضاحت ہوتی ہے۔ چند مضامین کے عنوانات ملاحظہ فرمایئے:۔ فانی زندگی، نیرنگیٔ زمانہ، اجل، عالمِ نزع، عبرت گاہِ دُنیا، غم، تعزیت نامہ۔ ایک مضمون میں عید کی مسرتوں کا ذکر کرتی ہیں مگر ساتھ ہی محرم کی یاد تازہ کراتی ہیں۔ غرض انسان کشتۂ آلام ہے، اسکی خوشیاں اور وہ خود فانی ہے۔ تاہم وہ یہ پیغام دیتی ہیں کہ انسان جب تک جیئے اچھے عمل کرے:۔

اس طرح جی کے بعد مرنے کے   گاہے گاہے تو کوئی یاد کرے

اور مردوں کو اس طرف متوجہ کرتی ہیں:۔

"ہندوستانی شریف عورت سے بڑھکر مرد کے لئے اور کوئی بیش بہا نعمت نہیں ہو سکتی۔ وہ ایک بیش قیمت ہیرا ہے جسکی قدر و قیمت سے مرد واقف نہیں"

اور عورتوں کو یہ درس دیتی ہیں:۔

"نیک بیٹی، نمکسار بیوی، فرمانبردار بہو اور دوسرے رشتے داروں کے حقوق ادا کرنے میں کسر نہ رہنے دو"

اعتراضات:۔ میں یہ نہیں کہتا کہ خاتون اکرم کے لٹریچر میں خوبیاں ہی خوبیاں ہیں اور عیب بالکل نہیں ہو سکتا ہے کہ کسی کو بعض اوقات ان کے افسانوں کی تمہید یا انجام کو ذرا تفصیل سے بیان کرنا، ماضی کے افسانے میں کہیں حال کا انداز اختیار کر لینا یا اسی قسم کی کوئی اور چیز قابلِ اعتراض معلوم ہو۔ لیکن یہ رائے آپ آج قائم کر رہے ہیں۔ جب کہ افسانہ نگاری اس قدر ترقی کر چکی ہے۔ نیز عیوب کے متلاشی حضرات کو Earl of oxford and Asquith کے مقالے "تنقید" کیطرف متوجہ کرتا ہوں خصوصاً ان کے اس اصول کیطرف کہ نقاد کا اولین فرض یہ ہے کہ تنقید کرنے سے پہلے وہ ان حالات، فضا اور وقت کو مدنظر رکھے جن میں زیر تنقید کتاب تصنیف کی گئی ہے۔

خاتون اکرم کا انتقال عین عالمِ شباب میں ہوا۔ چوبیس سال کی عمر ایسی نہیں ہوتی کہ ہم اُن سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کریں، پھر بھی زندگی و موت، مسرت والم، کنوارپنے اور ازدواجی زندگی وغیرہ پر اُنہوں نے ایسی قادر الکلامی سے اظہارِ خیال کیا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے اور دلمیں یہ آرزو پیدا ہوتی ہے "کاش خاتون اکرم اور جیتیں!"

آج تک کرتے ہیں تجھکو یاد اربابِ نظر   فخر تھا ہندوستاں کو تیری ذاتِ پاک پر
باغِ اُردو میں ہے تازہ رات دن تیری بہا   تو نہیں ہے لیکن افسانے ہیں تیرے یادگار

(عزیز لکھنوی مرحوم)

صادق الخیری

"احوال و مقامات"

ہو عزقِ مئے نور دل کا سفینہ ۔ کبھی آئینہ اور کبھی چشمِ بینا ۔ کبھی دستِ بیضا کبھی طورِ سینا

"یہی ہے مقامِ حریمِ حضوری"

خودی کی بلندی وہ معراج دل کی ۔ غنی ہے نظر جس سے محتاج دل کی ۔ غرض ہاتھ میں جس کے ہے لاج دل کی

"حقیقت میں ہے جادۂ ناصبوری"

وفورِ محبت سے مجبور ہونا ۔ مئے شوق سے مست و مسرور ہونا ۔ انا الحق سرا مثلِ منصور ہونا

"ہے عشاق کی منزلِ ناصبوری"

سنبھلنا ہے دل اپنی بپتا سنا کر ۔ کلی دل کی کھلتی ہے جب مسکرا کر ۔ نگاہیں جب اٹھتی ہیں آنسو بہا کر

"مقامِ قبول و اجابت یہی ہے"

کفِ خاک بیباک ہو دیدہ ور ہو ۔ خود آگاہ ہو خود گر و خود نگر ہو ۔ زمیں پر قدم آسماں پر نظر ہو

"کہ لاریب منشارِ فطرت یہی ہے"

یہی خاکیوں کی ہے معراجِ عرفاں ۔ اسی سے حقیقت میں ہے شانِ انساں ۔ ابھی خدمتِ خلق ہے اصلِ ایماں

"قسم ہے خدا کی شریعت یہی ہے"

امینِ حزیں سیالکوٹی

"نکات"

ہے تو یقیں ہی تری ہے ترا جسم اے پہلو
عمل سے کیف ہی تو ہے جبھی تو بیگانہ
شہید لذت سوز دروں نہ ہو جب تک
کسی کو مل نہیں سکتی نگاہ پروانہ

کلیم کا ید بیضا، کلیم کی لاٹھی
یقین پختہ کی محسوس صورتیں ہی تو ہیں
نہ رعب و داب شہی اور نہ جبر کام آیا
یقین وہم و گماں سے کبھی دبا ہی نہیں

حوادثات زمانہ کے تیز دانتوں میں
گھرا ہوا ہے زباں کی طرح دل انساں
یقین پختہ اگر اس کو اپنی ذات پہ ہو
اسے پہنچ نہیں سکتا کوئی گزند و زیاں

شکستہ بال فلک سیر باز بھی ہو اگر
رہے گا خاک نشیں مور ناتواں کی طرح
یقیں نہیں ہے تو اپنے ہی پیرہن میں یہ کف خاک
بھٹکیں اُڑ کر آئیں گرد کارواں کی طرح

امین حزیں سیالکوٹی

اُن کی ہمشکل سے

(کماری جمنا کے نام)

حال پہ پردہ گرا اک یاد تازہ ہو گئی
ایک دُنیا جاگ اٹھی ایک دُنیا سو گئی

وقت کے پردہ میں تھا ماضی کا کھنڈر ماند سا
پھر اندھیرے سے نکل آیا چمکتا چاند سا

دل کا ٹوٹا تار پھر آواز سی دینے لگا
کوئی سوتی رُوح میں انگڑائیاں لینے لگا

پھر لہو امید کی نبضوں میں لہرانے لگا
زندگی کے زرد رُخ پر رنگ سا آنے لگا

میری سوکھے جام میں پھر سے اُبل آئی شراب
پھر اُبھر آیا گذشتہ زندگی کا آفتاب

قید سے نکلیں مری گذری ہوئی آزادیاں
جگمگائیں پھر سے ماضی کی سُنہری وادیاں

دل کے پردوں میں محبت کی ہوا پھر چل اٹھی
پھر وہی قندیل سی بتکدے میں جل اٹھی

اے کہ تجھ سے اس اندھیرے بتکدے کی روشنی
آ ادھر آ اے مری دیوی کی زندہ مورتی

تیرا پیکر تو میرے ٹوٹے آسماں کا آفتاب
تیری دُنیا مجھ کو اپنی گمشدہ جنت کا خواب

تیرا نقش پا مرا کھویا ہوا سا آستاں
تیری آنکھوں میں مرے مسمار کعبہ کا نشاں

ہر ادا تیری مرے سنسان بتخانہ کا ساز
تیری نظروں میں مری کھوئی ہوئی دنیا کا راز

تیری خوشبو میں مرا بھٹکا ہوا سا کارواں
تیرے لہجہ میں مری بھولی ہوئی سی داستاں

ہر تبسم میں ترے میری گذشتہ زندگی
[illegible] تیرے حسن کی تابندگی

چل خدا کیواسطے شاعر کے بتخانہ میں چل
اپنے قدموں میں جلانے دے محبت کا کنول

رُوح کا سونا شوالا اپنے چرنوں سے بسا
میری زندہ مورتی، آ میری دیوی بن کے آ

تیری پوجا کیلئے موزوں ہے شاعر کا دماغ
چاند کا صندل، فلک کا عود، تاروں کے چراغ

بے ترے قدموں کے شاعر کی عبادت ہے فضول
آ تری چرنوں میں پھر تازہ کروں پوجا کے پھول

آ ان قدموں پہ چشم تر جھکانے دے مجھے
آنسوؤں کی اک حسیں گنگا بہانے دے مجھے

پھول بنکر چھپ رہے ہیں جیسے دل کے شرار
آ تری گردن میں ڈالوں گوندھ کر اک سُرخ ہار

کاش تیرے واسطے رنگین نغمہ گا سکوں
تیری پُوجا کے مقدس گیت پھر دہرا سکوں

تیرے آگے کاش سجدہ محبت کر سکوں
تیری خاطر جی سکوں تیرے لئے میں مر سکوں

جاں نثار اختر (علیگ)

شمّو

یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے جب ہم ٹولی بنا کر بھیک مانگتے پھرا کرتے تھے۔

ابتدا میں ہماری ٹولی میں صرف تین آدمی تھے۔ میں، بندو اور فدا۔ ہم لوگوں کی زندگی دوسرے بھکاریوں سے کسی حد تک مختلف تھی۔ ہم نے یہ پیشہ، پیشہ کے خاطر اختیار نہیں کیا تھا۔ بلکہ ہم مجبور تھے کہ دوسروں کی زندگی کے سہارے اپنی زندگی چلائیں۔ میں کانپور میں کپڑے کے ایک کارخانے میں ملازم تھا۔ ایک دن یکایک میرا سیدھا پاؤں مشین میں آگیا جس نے میرا پاؤں بُری طرح چبا ڈالا۔ زخم اتنے کاری لگے تھے کہ مجبوراً ڈاکٹروں کو میرا پاؤں کاٹنا پڑا۔ اس کے بعد اس دُنیا میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میری خدمات کسی نے قبول نہ کیں۔ ہر شخص مجھے تاش کی گڈّی کے جوکر کی طرح ناکارہ سمجھ کر مجھ سے غافل ہو گیا۔ چند دن فاقوں مرنے کے بعد میں مجبور تھا کہ دوسروں کے سامنے گڑگڑاؤں کہ وہ کسی طرح میرے پیٹ کے بڑھتے ہوئے شعلوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کریں۔

بندو ایک مرتبہ چوری کے شبہ میں گرفتار ہو چکا تھا۔ جیل سے چھٹنے کے بعد اُسنے اپنے آپ کو اس دُنیا میں تنہا پایا۔ ایک چور اچکّے کو کوئی اپنے یہاں ملازم رکھنے کو تیار نہ تھا۔

فدا ابتدا ہی سے اس قسم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔ ایک آنکھ سے کانا ہونے کے علاوہ وہ کوڑھ کے مرض میں بھی مبتلا تھا۔ اُس کی حالت اُس پیڑ کے مانند تھی جس کے پتّوں کو کیڑوں نے چاٹنا شروع کر دیا ہو۔ اُس کے جسم کی کھال میں ایک عجب قسم کی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ ہاتھ پیر کی انگلیاں سڑ گل کر جھڑ چکی تھیں۔ ناک سوجھ کر پھلی ہوئی پیاز کی مانند ہو گئی تھی۔ اور ہونٹ ورم کی وجہ سے نیچے کو لٹک گئے تھے۔ اس کی اس ہیئت کذائی کو دیکھنے کا کوئی بھی روادار نہ تھا۔

اس طرح ہم لوگ زندگی کی ٹوٹی پھوٹی ناؤ کو سماج کے خوفناک سمندر میں کھے رہے تھے۔

ہم لوگوں نے کچھ غزلیں اور دو چار نعتیں یاد کر لی تھیں۔ سُورج نکلنے سے پہلے پہلے ہم لوگ اپنے پڑاؤ سے چل دیتے تھے۔ اور اپنے سینوں کا پورا پورا زور لگا کر کوئی نعت شروع کر دیتے۔ مُنہ اندھیرے کا وقت ہوتا۔ کچھ لوگ جاگ چکے ہوتے۔ کچھ کروٹیں بدل رہے ہوتے اور جاگنے کی تیاری کرتے ہوتے۔ ہم لوگوں کے گانے کی آوازیں صبح کے وقت لوگوں پر خاص اثر کرتیں اور کوئی دن ایسا نہ جاتا کہ ہماری جھولی اور جنگل خالی رہتے ہوں۔ اسی طرح بُرے بھلے ہماری زندگی کے دن بیت رہے تھے۔ ہم عموماً حمد اور نعتیں ہی گاتے کیونکہ ہمیں اس بات کا اچھی طرح تجربہ ہو گیا تھا کہ نچلے طبقے کے لوگوں پر جن پر ہماری روزی کا دارومدار تھا، اس قسم کی چیزوں کا خاص اثر ہوتا تھا۔

دن بھر ہم لوگ گلی گلی کوچے کوچے مارے مارے پھرتے۔ بیساکھی کے سہارے دن بھر اس طرح مارے مارے پھرنے سے میرا کندھا شل ہو جاتا۔ رات کو ہم لوگ باسی روٹی کے ٹکڑوں کو بوسیدہ سالن کی مدد سے اپنے حلقوم کے نیچے اتارنے کی کوشش کرتے۔

لیکن یہ حالت بھی زیادہ عرصے تک نہ رہی۔ جلد ہی لوگوں کو ہماری صورتوں سے نفرت سی ہو گئی۔ اب کسی کو بھی ہم لوگوں کی حالت پر ترس نہ آتا تھا۔ غالباً وہ ہم لوگوں کو ہر وقت دیکھتے دیکھتے عاجز آگئے تھے۔ عورتیں ہم لوگوں کو آتا دیکھکر کواڑ بند کر لیتیں۔ لیکن ہم لوگ ان چیزوں کی مطلق پرواہ نہ کرتے اور بدستور چیختے رہتے۔

"مائی خدا تیرا بھلا کرے" "سائیں کا چنبل بھر دے" "اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے"

بعض گھروں سے چیخنے کی آوازیں آتیں:

"کیا روز روز کا ٹھیکہ لیا ہے۔ ابھی کل ہی تو روٹی دی تھی۔ ایسے مہنگے میں اپنے ہی پیٹ کو نہیں ملتی تو پھر ان کو کہاں سے دیں"

لیکن اس قسم کے جملوں سے ہماری ہمتیں نہ ٹوٹتیں۔ اور ہم یہ کہتے ہوئے "جو دے اُس کا بھی بھلا جو نہ دے اُس کا بھی بھلا" آگے بڑھ جاتے۔ اور ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں کی طرف سے بڑے بڑے اونچے اونچے مکانوں کا رُخ کرتے۔ لیکن وہاں عموماً ہم لوگوں کے چیخنے کی آوازیں ان مکانوں کے رہنے والوں کے کانوں تک نہ پہونچتیں۔ اور جب چیختے چیختے ہمارا گلا سوکھ جاتا۔ اور ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے گلے میں کسی نے سوئیاں بھر دی ہیں۔ تو ہم حیرت کے عالم میں ایک دوسرے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بازار کا رُخ کر دیتے۔ اور بازار ہم لوگوں کی اُمیدوں کی آخری آماجگاہ ہوتی۔ شام تک ہمیں بے شمار گھڑکیوں اور گالیوں کے ساتھ چند پیسے مل جاتے۔

رات کے وقت پڑاؤ پر ہم لوگ روٹی کے چند ٹکڑوں کے لئے آپس میں لڑتے ہوتے اور اس طرح دن بھر کا غصہ غیر محسوس طریقہ پر اُسوقت ایک دوسرے پر نکالتے۔ ہماری زندگی، گالیوں، گھڑکیوں، روٹی کے چند ٹکڑوں اور چند پیسوں پر مشتمل تھی۔

جاڑوں کی ایک بہت ٹھنڈی شام تھی۔ سرد ہوا کے تیز و تند جھونکے ہم لوگوں کے جسموں پر نشتر زنی کر رہے تھے۔ ہم لوگ حسب عادت روٹی کے چند ٹکڑوں کے لئے آپس میں لڑ رہے تھے، سامنے الاؤ میں آگ جل رہی تھی۔ جس کے شعلے ہم لوگوں کے جسموں کے قریب آآ کر واپس لوٹ جاتے تھے۔ گویا وہ ہمارا تمسخر اُڑا رہے ہوں۔

یکایک فدا کی بھرائی ہوئی آواز میرے کان میں آئی:

"بھوکی ہے۔ روٹی کھائیگی"

میں نے دفعتاً چہرہ اُٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک تیرہ چودہ برس کی چھوکری ہم لوگوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے کچھ اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کتیا اُن کتوں کی طرف دیکھتی ہے۔ جو چند ہڈیوں کیلئے آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہوں۔

دفعتاً لڑکی کھانے پر کچھ اس طرح جھپٹ گئی، جس طرح چیل گوشت پر گرتی ہے۔

فدا نے میرا پاؤں دبایا اور اپنا مُنہ میرے کان کے قریب لاکر کہا: "ہیرا ہے ہیرا۔ اگر راضی ہو گئی تو بہت کام آئیگی"

کھانے کے بعد فدا اُس چھوکری سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ اور پھر اصل مطلب پر آیا۔ اور آخر کار اُسے اپنے ساتھ رہنے پر راضی کر لیا۔ ہماری ٹولی میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔ ہم لوگوں نے جلد جلد اُسے وہ تمام غزلیں اور نعتیں یاد کرا دیں جو ہمیں رٹی ہوئی تھیں۔

اس چھوکری کے آتے ہی ہماری قسمت پھر سدھرنا شروع ہو گئی۔ صبح سویرے سے رات گئے تک آگے آگے شمّو اور پیچھے پیچھے ہم لوگ مانگتے گاتے پھرتے۔ شمّو کی آواز جس میں اُس کی زندگی کی داستان کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اس قدر دردناک تھی کہ لوگوں پر خواہ مخواہ اثر ہوتا۔ اور وہ ہمیں بُلا بُلا کر بھیک دیتے۔ اب وہ بڑے بڑے مکانوں میں رہنے والے چھوکرے جو ہم لوگوں کی صورتیں دیکھنے تک کے روادار نہ تھے، ہم لوگوں کو آوازیں دے دے کر بلاتے اور گھنٹوں "شمّو" سے غزلیں سُنتے۔ اور اس طرح شمّو کو گھورتے رہتے کہ اُن کی آنکھوں میں حیوانیت کی جھلک صاف ناچتی ہوئی دکھائی دیتی۔

ایک رئیس کے یہاں شادی تھی، ہم لوگ ایسے موقعوں کے

خاص طور پر تلاش میں رہتے تھے کیونکہ اس طرح ہمیں ذائقہ بدلنے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا تھا۔ شمو اندر زنانخانہ میں چلی گئی تھی۔ شام کو جب ہم واپس ہوئے تو ہم لوگوں کی جھولیاں بھری ہوئی تھیں۔ اور ہم لوگ بہت خوش تھے۔ اس رات ہم لوگوں نے خوب ڈٹ کر جھوٹے چاول، چوڑی ہوئی ہڈیاں اور بھیگی ہوئی تندوری روٹیاں کھائیں۔

کھانے کے بعد ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں شمو بولی "بیاہ میں کتنی بہت سی عورتیں تھیں۔ ایسے اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھیں کہ کیا کہوں، جی چاہتا ہے کہ میں بھی اُن جیسے کپڑے پہنتی۔"

بندو نے سنکر ایک طویل قہقہہ لگایا۔

"تو پھر کسی رانی کے پیٹ سے کیوں پیدا نہ ہوئیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اری پگلی، تیرے ایسے نصیب کہاں! یہ ہی بہت ہے کہ اُلٹا سیدھا کھانے کو مل جاتا ہے" فدا بولا۔

شمو ہم لوگوں کی باتیں سنکر کچھ افسردہ سی ہو گئی۔ ہم لوگ دیر تک کھانے کے ذائقہ کی تعریف کرتے رہے۔ صبح کو جب ہم اٹھے تو ہم نے دیکھا کہ شمو کی آنکھیں کچھ سوجی ہوئی ہیں اور اُس کی آواز بھاری ہو رہی تھی۔ شاید رات میں غم کے مارے اُسے نیند نہ آئی۔

اُس دن ٹھیک سے وہ گا بھی نہ سکی۔ اُس کی آواز ہی نہ نکلتی تھی۔ جیسے اُس کے حلق میں کوئی چیز پھنس کر رہ گئی ہو۔ شام کو جب ہم اپنے پڑاؤ پر آئے اور کھانے کے بعد لیٹے تو شمو کراہ رہی تھی۔ اسکو بخار ہو گیا تھا۔ اُس رات میں تو بالکل نہ سو سکا۔ جوانی کی وہ رگ جسے بھوک اور افلاس نے بالکل مردہ کر دیا تھا۔ شمو کی موجودگی میں از سر نو بیدار ہو رہی تھی۔ شمو کی بیماری کی وجہ سے میں نے بھی بھیک مانگنے جانا بند کر دیا تھا۔ اور دن و رات اُسکی تیمارداری میں لگا رہتا تھا۔ بندو اور فدا تنہا جا کر مانگ لاتے تھے۔ جس سے پیٹ چلتا تھا۔

خدا خدا کر کے کئی دن بعد شمو ٹھیک ہوئی اور ہم لوگوں نے پھر ایک بار پوری تندہی سے بھیک مانگنی شروع کی۔ لیکن شمو اب ہر وقت مغموم سی رہنے لگی۔ ہم میں سے ہر شخص اُس کو خوش کرنے کی کوشش کرتا لیکن اُس کی پہلی سی زندہ دلی واپس نہ آئی۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔

کتنے ہی دن اس طرح گذر گئے۔ اب اکثر ایسا بھی ہوتا کہ شمو گھروں میں جاکر تنہا ہی مانگ لاتی۔ ایک دن جو وہ آئی تو بہت خوش تھی۔ اُس نے اپنی دونوں کلائیاں ہمارے سامنے کر دیں۔

"دیکھو کیسی اچھی چوڑیاں ہیں۔ اب میرے پاس بھی ان عورتوں جیسی چیزیں ہو جائیں گی۔" اُس کا چہرہ خوشی سے تمتا رہا تھا۔

"اری کہاں سے لائی؟" فدا نے پوچھا۔

"پُل پار ایک بابو رہتے ہیں۔ اُنہوں نے دی ہیں، وہ مجھے اور چیزیں بھی دینگے۔"

میں نے ایسا محسوس کیا گویا کسی نے اچانک میرے دل کے اُوپر زور سے گھونسا مار دیا ہے۔

میں نے فدا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"دیکھو، اب اُسکے پاس نہ جانا۔ نہیں تو ٹھیک نہیں ہوگا" فدا نے قدرے سخت آواز میں کہا۔

رات کو جب وہ سو گئی تو فدا نے ہم لوگوں کو رائے دی کہ اُس کو اکیلا کہیں نہ جانے دیا جائے، ورنہ چھوکری ہمارے ہاتھوں سے نکل جائیگی۔

اس کے بعد ہم لوگ یہی کوشش کرتے تھے کہ شمو ہم سے ذرا دیر کے لئے علیٰحدہ نہ ہو۔ اور ہم اُسے ہر طرح خوش کرنے کی کوشش کرتے۔

ایک دن شام کو وہ چپکے سے غائب ہو گئی۔ اور رات گئے واپس آئی۔ وہ ایک رنگین دوپٹے میں لپٹی ہوئی تھی۔ اور اُس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

اسکو دیکھتے ہی فدا چیخ کر بولا "تو پھر گئی تھی، اسی بابو کے پاس، بول ؟"

"ہاں گئی تو تھی۔ تو کیا ہوا ہے" یکایک اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہوگیا۔

"یہ ٹھیک نہیں، تم ہمارے ساتھ رہتی ہو، ہمارے بغیر پوچھے گچھے تم کہیں نہیں جا سکتیں" میں نے کہا۔

"وہ دن نہ بھولو، جب بھوکی ماری ماری پھرتی تھیں۔ اب اپنے نئے نئے چاہنے والے پیدا کئے ہیں" بندو نے اُس کے قریب جاتے ہوئے کہا۔

بپھری ہوئی شیرنی کی طرح شمّو نے چیخنا شروع کیا۔

"تم منع کرنے والے ہوتے کون ہو، میرا جہاں دل چاہے گا جاؤں گی۔ آخر دھونس کس کو دکھاتے ہو۔ تمہارے پاس ہے کیا جس پر اتنا اِتراتے ہو۔ نہ پیٹ بھرکر روٹی دیتے ہو اور نہ تن کو کپڑا۔ آخر میں چیتھڑے لٹکائے کیوں پھروں؟"

"ہم بھی دیکھیں گے تو کیسے جاتی ہے" ہم تینوں نے ایک زبان ہوکر کہا۔

"یہ حکومت کی دھونس کسی اور کو دکھانا۔ میں اس بابو کے پاس جاؤنگی اور ضرور جاؤں گی۔ وہ مجھے اچھے اچھے کپڑے دیتا ہے۔ کھانے کو دیتا ہے۔ اور تم لوگ لنگڑے لولے، کوڑھی، میرے ہی سہارے جی رہے ہو اور مجھی پر دھونس جماتے ہو"

یہ کہکر وہ ہماری نظروں کے سامنے واپس لوٹ گئی۔ ہم اپنی جگہ سے ہل تک نہ سکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے ہمارے پاؤں سی دئے ہیں۔

اُس دن رات بھر ہم میں سے کسی کو نیند نہ آئی۔ صبح ہوئی اور ہم اُس کا اِس اُمید میں انتظار کرتے رہے کہ ممکن ہے وہ آجائے شام ہوئی اور رات بھی آگئی لیکن وہ نہ آئی۔

تیسرے دن مجبوراً ہمیں اڈا بھیک مانگنے کے لئے چھوڑنا پڑا۔ میں نے شمّو کو بہت تلاش کیا لیکن اُس کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ شمّو کے چلے جانے سے میں اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس کرتا تھا۔ بہرحال زندگی کسی نہ کسی طرح بھلے یا بُرے بیتے گئی۔ اسکے بعد ہماری زندگیوں نے کروٹوں پر کروٹیں لینا شروع کیں۔ فدا کا تمام جسم تیزی سے سڑتا چلا جاتا تھا۔ ایک رات جو وہ سویا تو پھر کبھی نہ اُٹھا۔ کچھ دنوں بعد جب بُندو نے دیکھا کہ فاقوں کی نوبت آگئی ہے تو اُس نے بھی کنارہ کشی کرلی۔ اور وہ کسی اور ٹولی میں جاملا۔ مجھے بھی اپنی گذر اوقات کا انتظام کرنا تھا اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس شہر کو ہی چھوڑ دیا جائے اور کسی دوسرے شہر میں قسمت آزمائی کی جائے۔

عید کا دن تھا۔ دلّی کی جامع مسجد کے آس پاس میلا سا لگا تھا۔ نمازی نماز پڑھ کر نکل رہے تھے۔ فقیروں کا ایک ہجوم تھا اور وہ ان خوش قسمتوں سے گڑگڑا کر بھیک مانگ رہے تھے۔ ایسے مُبارک موقع پر دو چار پیسے خیرات کرنا کسی پر بھی بار نہ تھا۔ اس لئے خُوب بھیک مل رہی تھی۔ تیسرے پہر تک میں نے کوئی ایک روپے سے کچھ اُوپر پیدا کرلیا۔ بیساکھی نے میرے دونوں کندھے شل کردئے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ پڑاؤ کو واپس لوٹ جاؤں۔ جاتے جاتے مجھے ایک پنواڑی کی دکان کے سامنے ایک عورت دکھائی دی جو گڑگڑا کر کچھ دل چلے نوجوانوں سے بھیک مانگ رہی تھی۔ مجھے کچھ شُبہ سا ہوا۔ میں اور آگے بڑھا اُس کی گود میں کوئی پانچ چھ مہینے کا لاغر سا بچّہ تھا۔ اب اُس کی صورت صاف نظر آرہی تھی۔ میں اُس کے بالکل پاس پہونچ گیا۔

"تم، تم یہاں کہاں شمّو۔ اور اس حالت میں"

وہ سر سے لیکر پیر تک کانپنے لگی اور اُس نے بچّے کو اپنے سینے سے زور سے چمٹالیا۔

منچلے نوجوانوں نے یہ دیکھکر قہقہہ لگایا۔

"آؤ۔ اِدھر آؤ، مجھے تم سے ذرا باتیں کرنا ہیں۔" میں نے اُسکے بالکل قریب ہوتے ہوئے کہا۔

وہ خاموشی سے میرے ساتھ ہولی۔ پڑاؤ پر آکر میں نے اُس کو کھانا کھلایا۔ اور اُسکے بچے کیلئے دودھ لاکر دیا۔ رات گئے تک وہ میرے سامنے بیٹھی رہی۔ لیکن نہ تو اُس کی اور نہ میری ہمت ہوئی کہ پچھلے واقعات کو دُہراؤں، کئی بار سوچا کہ پوچھوں کہ آخر وہ اس حالت پر کیونکر پہونچی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے میری زبان سی دی ہے۔

بہت رات گئے تک ہم لوگ اسی طرح بیٹھے رہے کہ مجھے ہوش آیا اور میں اپنے خیالات سے چونکا۔ اپنے ٹاٹ پر اُس کو لٹا دیا اور خود یہ خیال کرکے کہ صبح کو سب حالات پوچھونگا، درخت کی جڑ کا تکیہ بناکر زمین کے فرش پر سوگیا۔ صبح کو جب میری آنکھ کھلی تو ٹاٹ خالی پڑا تھا اور اُس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔

⁂ ⁂ ⁂

شاہد لطیف

خیاباں

دریا میں نہنگ وجوشِ طوفاں سے نہ ڈر | افزائشِ ابتلائے دوراں سے نہ ڈر
جز خوابِ پریشاں نہیں اصلِ ہستی | ڈرتا ہے عبث خوابِ پریشاں سے نہ ڈر

ہر چند مقابل غمِ دوراں آئے | شکوہ نہ ترے لب پہ کوئی ہاں آئے
انساں ہے تو ہمت کے فرائض کو نہ بھول | آئے تو ہزار بار طوفاں آئے

ہمت کا دھنی ہر راہِ دُشوار سے کھیل | تکلیف وعناد و رنج و آزار سے کھیل
مطلق رہِ پُرخار کو خاطر میں نہ لا | اے مردِ مجاہد سرِ ہر خار سے کھیل

تخلیق تری جہاں پناہی کے لئے | ہے فرقِ بلند کج کلاہی کے لئے
دریوزہ گری کہاں سے سیکھی تُو نے | آیا تھا جہاں میں بادشاہی کیلئے

نہال سیوہاروی

پریتم! میری رُوح کی مالک!

آہ! تم مجھ سے بدگمان ہو گئے۔ صرف اس قصور پر کہ جو ملتا ہے میں اپنی کہانی اُسے سُنا دیتی ہوں اور اس طرح تمھیں بدنام کرتی ہوں۔ تمھارا خیال ہے کہ میں لوگوں کی دلچسپی کیلئے ایسا کرتی ہوں۔ نہیں پریتم کسی کی دلچسپی سے مجھے کیا غرض میری مجبوریاں تمھیں معلوم ہیں۔ آہ! یہ دوری نا مہجوری۔ اس پر یہ بے دستی و پائی۔ دل جب درد سے بیتاب ہو جاتا ہے تو بے اختیار مُنہ سے آہ نکل جاتی ہے۔ سینہ میں جو آگ سُلگ رہی ہے اور جلا جلا کر مجھے راکھ کا ڈھیر کئے دیتی ہے آنسوؤں کے سوا اُسے اور کس چیز سے بُجھاؤں۔ تمھاری ہی فنا نہ ہونے والی محبت کی قسم! میں اپنا افسانہ محبت لوگوں کے سامنے صرف اس لئے دُہراتی ہوں کہ تمھارے ذکر میں مزا ملتا ہے۔ لے دے کر ایک یہی چیز تو میرے پاس باقی رہ گئی ہے جس کے سہارے پر میں زندہ ہوں۔ تمھاری باتیں کوئی مجھ سے پوچھے جائے اور میں بتائے جاؤں۔ اس سے زیادہ محبوب اور دل نواز مشغلہ میرے لئے کوئی نہیں۔

پھر یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ میری داستانِ درد کا کوئی حصہ شاید کبھی کوئی تم تک پہنچا دے۔ اور تم پھر ایک بار اپنی گنہگار کو محبت کے ساتھ یاد کر لو۔ خدا شاھد ہے بس اسی امید پر جیتی ہوں۔ اسی امید موہوم پر گذرے ہوئے قصے لوگوں کو سُنا دیتی ہوں۔ خدا کرے میری زندگی کا وہ آخری لمحہ ہو جبکہ تمھیں رسوا کرنے کا خیال میرے دماغ میں آئے۔ پریتم! میرا "پیمانِ وفا" اتنا بودا نہیں کہ فراموش ہو جائے یا ٹوٹ جائے۔ دل میں جب تک دھڑکنے کی قوت باقی ہے تمھاری پرستاری کا جذبہ اس سے نہیں نکل سکتا۔ ہاں جذبات کے طوفان میں اس بات کا خیال مجھے کبھی نہیں آیا کہ میرے اس طرزِ عمل سے لوگ تمھیں شک کی نظروں سے دیکھنے لگیں گے۔ بیشک یہ میری غلطی تھی۔ نادانستہ ہی سہی، جوشِ اضطراب کا نتیجہ ہی سہی، مگر مجھ سے قصور ہوا بھاری قصور ہوا۔ سخت شرمندہ ہوں مگر اب کیا کروں۔ معاف کر دو، میرے اچھے شمیم! اپنی معصوم محبت کے صدقہ میں مجھے معاف کر دو، اب ایسی خطا کبھی نہ ہوگی۔ اب میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی چاہے ضبطِ غم سے میرا دم ہی کیوں نہ نکل جائے۔

کیا کروں دُور ہوں، بے بس ہوں۔ ورنہ مجھے وہ طریقہ معلوم ہے کہ تم میری خطا کو معاف کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ جس وقت میں تمھارے سامنے دو زانو ہو کر، اپنا سر تمھارے قدموں پر جھکا دیتی۔ اپنے آنسوؤں سے تمھارے پاؤں بھگو دیتی مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ کہتی اور میرا پا التجا بن کر حسرت کے ساتھ تمھاری طرف دیکھتی، تو مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کرتے۔ تم تڑپ اٹھتے۔ بیتاب ہو جاتے۔ بے اختیار میرے بازو پکڑ کر مجھے اٹھاتے اور سینہ سے لگا لیتے۔ پھر میری ہچکی بندھ جاتی تم کہتے بس۔ بس، بس، رضیہ۔ للہ بس۔ اچھا معاف کیا۔ یہ کہہ کر میرے آنسو پونچھتے اور تسکینِ اضطراب کیلئے اپنے آبِ حیات کے چشمے میرے ہونٹوں سے لگا دیتے۔ مگر آہ کیا کروں۔ میں خود تو کیا میرے الفاظ بھی تم تک نہیں پہونچ سکتے۔ معاف کر دو، میرے اچھے شمیم! اپنی پرستار کے معصوم گناہ کو معاف کر دو۔

ہاں پریتم۔ ایک قصور مجھ سے ضرور ہوا ہے۔ اگر میں خود ہی تمھیں نہ بتاؤں تو تمھیں کبھی اس کا پتہ بھی نہ چلے۔ مگر میں نے

آج تک تم سے اپنی کونسی بات چھپائی ہے جو اپنے اس قصور کو پوشیدہ رکھوں۔ ادھر کچھ دنوں سے مجھے یہ خیال ہو چلا تھا کہ غالباً تم مجھے بھول گئے۔ زندگی کے گوناگوں انقلابات نے شاید تمہیں اس پر مجبور کر دیا کہ ایک "پریشان خواب" کو ہمیشہ کیلئے بھول جاؤ۔ مگر میں شرمندہ ہوں اور بیحد مسرور بھی کہ میرا یہ گمان غلط نکلا۔ شمیم! میرے پیارے! میرے خوابوں کے دیوتا للہ میرے اس قصور کو معاف کر دو۔ بدگمانی لازمۂ محبّت سہی مگر تمہاری محبّت پر شک کرنا یقیناً گناہ ہے۔

موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ امید کرنا کہ میں کبھی تمہیں دیکھ سکوں، کبھی تمہیں پاسکوں گی اور اپنا بنا سکوں گی۔ دیوانگی سے کم نہیں۔ مگر پھر بھی خدا جانے کیا سبب ہے کہ مسلسل ناکامیوں کے باوجود امید کی ایک دُھندلی سی شعاع میری دل میں جگمگاتی رہتی ہے۔ میں نے تمہارے آخری محبّت نامہ کا جواب نہیں دیا۔ پریتم! میں مجبور تھی۔ بالکل مجبور۔ ہائے تم نے یہ سمجھ لیا کہ میں نے "تغافل" برتا۔ کیا میرے لئے تمہارے خط کا جواب لکھنے سے زیادہ محبوب مشغلہ بھی دنیا میں کوئی اور ہوسکتا ہے۔ مگر کیا کرتی، بےبس تھی، بالکل بےبس۔ کیونکر تمہیں سمجھاؤں کہ تمہارے پیارے خط کا جواب دینے کیلئے میں کیسا کیسا تڑپی ہوں، کیسا کیسا انگاروں پر لوٹی ہوں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ دشواریاں اور مجبوریاں کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی گئیں اور میں بدنصیب اپنے مستقبل کو قسمت کے حوالے کر کے خاموش ہو رہی۔ اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتی تھی۔ سفر میں، حضر میں، ہر جگہ اس خط کو ساتھ رکھتی ہوں۔ اور جب دل بہت بیتاب ہوتا ہے تو نکال کر اُسے پڑھ لیتی ہوں۔ بس اس سے زیادہ میرے اختیار میں کیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میرا کوئی خط تم تک نہ پہونچ سکے گا۔ میں نے سوچا ہے کہ چاند کو اپنا پیامبر بناؤں۔ اُسے تو کوئی نہ روک سکے گا۔ وہ ضرور تم تک پہونچ جائیگا۔ مگر کیا تم اس کی زبان سمجھ سکو گے۔ اچھا کچھ دنوں انتظار کرو۔ میں اس کے ہاتھ اپنا پیام بھیجوں گی۔

ہاں پریتم! ایک دلچسپ بات تمہیں سُناؤں۔ شاید تمہیں یقین بھی نہ آئے۔ مگر ہے یہ واقعہ۔ میں شعر کہنے لگی ہوں۔ رات چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ میں بالکل تنہا اپنے کوٹھے پر پڑی ہوئی چاند سے باتیں کر رہی تھی۔ تمہاری یاد بری طرح ستا رہی تھی۔ کئی بار آنسو امنڈ امنڈ کر آئے۔ کئی بار انھوں نے میرے رخساروں کو بھگویا۔ کئی بار میں نے انھیں اپنے آنچل سے خشک کیا۔ پچھلے پہر آنکھ لگ گئی۔ جاگی ہوں تو یہ شعر زبان پر تھا۔

آنکھوں سے رات پیہم ٹوٹا کئے ستارے ∴ تم دُور تھے نظر سے اور چاندنی کھلی تھی

صبح ہی رقعہ بھیجکر میں نے رشیدہ کو بلایا۔ وہ آئی تو میں نے اسے یہ شعر سنایا۔ اس نے کہا "رضیہ! تجھے شعر کہنا کس نے سکھایا؟" میں نے کہا اسی نے جس نے محبّت کرنا سکھایا۔ پھر میں نے اُسے رات کی کل روداد سُنائی۔ وہ بہت متاثر ہوئی۔ اس کے دل پر چوٹ لگی۔ اس نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ میرے منہ پر منہ رکھدیا اور کہا کہ دیوانی تو کب تک اپنی جان کو اس طرح ہلکان کرتی رہے گی۔ پھر ایکبار میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

پریتم! خط بہت طویل ہو گیا۔ پھر خدا جانے یہ تم تک پہونچے گا بھی یا نہیں۔ جواب کی امید رکھنا تو فضول ہی ہے۔ میری ایسی قسمت کہاں کہ تمہاری نورانی تحریر سے اپنی اندھی آنکھوں کو منور کرسکوں۔ لو ایک بات یاد آگئی۔ تم نے ایک وعدہ کیا تھا۔ مدّت ہوئی۔ بہت مدّت ہوئی۔ اب تو شاید تمہیں یاد بھی نہ ہو۔ میں یاد دلا دوں۔ ایک دفعہ میں نے ایک گیت تمہیں سُنایا تھا

اسے سن کر تم جوشِ مسرت سے بیتاب ہو گئے تھے۔ تم نے کہا "رضیہ! میں نے ایسا روح پرور نغمہ کبھی نہیں سنا تھا۔ یہ گیت تمہارا شاہکار ہے۔ میں تمھیں انعام دوں گا۔ بتاؤ کیا انعام لوگی۔ جو کہو" میں نے کہا "میرے دیوتا! میرا انعام تم خود ہی ہو۔ مگر تم نے اصرار کیا۔ میں نے کہا "اچھا تمھاری ایسی ہی خوشی ہے تو جو تمھارا جی چاہے دیدو" تم نے کہا۔ اچھی بات ہے۔ وہ وقت گذر گیا۔ حالات بدل گئے۔ دن، ہفتے، مہینے گذرتے چلے گئے۔ برس ہو گئے۔ مجبوریوں نے تمھیں اتنا موقع نہیں دیا کہ اپنا وعدہ پورا کرتے۔ مگر میرے دل سے اس انعام کی تمنا کبھی نہیں گئی۔ کیوں پریتم! کیا تم میرا وہ انعام اب بھی مجھے دینے کیلئے تیار ہو۔ تو پھر دیتے کیوں نہیں۔ میں اُسے حرزِ جان بنا کر رکھوں گی۔ اسے سامنے رکھکر تمھاری غائبانہ پرستش کیا کرونگی۔ اچھا رخصت، میرے محبوب، میری روح کے مالک، ایک نامعلوم مدت کیلئے رخصت۔ خدا تمھیں شاد و بامُراد رکھے۔ ممکن ہو تو اپنی اس بدنصیب کنیز کو یاد کر لینا۔

ہمیشہ کیلئے تمھاری

"رضیہ"

فریبِ تخیل

آج تکمیل مرے خواب حسیں کی ہوگی — ہوگا مہمان مرا مست شباب آج کی رات
آج لرزیگی محبت کی مقدس دنیا — چہرۂ حسن سے اُٹھیگی نقاب آج کی رات
حسن کی آج ہر اک ذرہ پہ بارش ہوگی — پھٹ پڑیگا مرے دامن میں شباب آج کی رات
آج نغمے نئے انداز سے رقصاں ہونگے — مرتعش ہوگا محبت کا رباب آج کی رات
آج تقسیم ہر اک ذرہ کو مستی ہوگی — ہوگا افلاک سے بارانِ شراب آج کی رات

آج سلجھائینگے وہ زلف مری قسمت کی — لبِ فطرت پہ ہنسی ہوگی رواں آج کی رات
محفلِ ناز و نیاز آج سجے گی اپنی — ہم پہ ہوگی نگہِ کاہکشاں آج کی رات
تذکرے آج ستاروں میں زمیں کے ہونگے — رشکِ جنت نظر آئیگا جہاں آج کی رات
آج گل ہونگے شگفتہ مری امیدوں کے — سوئیگی میری بہاروں میں خزاں آج کی رات

کتنا رنگیں ہے مری زیست کا آج افسانہ
رُک گئے ہیں قدمِ عمرِ رواں آجکی رات

علی احمد

نمک پارے

ہمارے ایک دوست کو کرایے کے مکان کی ضرورت تھی، ایک روز ہمیں انکی ہمرکابی کی عزّت حاصل ہوئی اور علی الصباح مکان کی تلاش میں نکل پڑے، کئی مکان دیکھ ڈالے مگر ایک بھی حسب دلخواہ نہ نکلا، چوک کی شاندار گھڑی ٹن ٹن بارہ بجا رہی تھی کہ ایک مکان پر "کرایہ پر دیا جاتا ہے" دیکھکر موٹر سے اتر پڑے اور صحن خانہ میں داخل ہوگئے، پہلی نظر ایک بھینس پر پڑی جو وراندے کے کھمبے سے بندھی ہوئی تھی، دوسرا کھمبا ایک عدد بکری کی حفاظت کر رہا تھا، وراندے کے قریب جاکر ہم نے آواز دی "کوئی ہے؟" دروازے کا ایک پٹ کسی قدر کھلتا نظر آیا اور اندر کسی نے جھانکا اور نہایت فصاحت سے فرمایا۔

"اُوئی ماں مٹی پڑو، دو دو مردوے کھڑین، اری مُردار گل بہار! جا دیکھ!! باہر تیرے کون باوایاں آہیں؟"

ایک چھوٹی سی آٹھ برس کی "گُل بہار" باہر نکلی اور ہم سے پوچھا: "کون ہے کیا ہونا؟"

ہم نے کہا "کسی مرد کو بھیجو مکان دیکھنے آئے ہیں، کرایہ پر لینا چاہتے ہیں!"

اندر سے آواز آئی "بس یہی کام ہے! تو آتا میں آتا، مکان میں کیا ہیرے موتی جڑین!! مکان سرکار کا مکان ہے، جا بول دوار تیرے سرکار کو!!!"

اس اثنا میں ہمیں وراندے کی آرائش پر غور کرنے کا جو موقع ملا تو ہم نے صاحب خانہ کے سلیقہ کی دل ہی دل میں خوب داد دی! ایک تخت پر دسترخوان بچھا ہوا تھا جس پر چند پلیٹ اور چمچے بکھرے پڑے تھے، ایک صراحی جو صفائی سے بے نیاز تھی ایک طرف رکھی ہوئی تھی، صراحی سے لگا ہوا ایک الیومنیم کا گلاس تھا جو ایک عرصہ سے شرمندۂ صفائی نہ ہوا تھا۔ تخت سے ذرا ہٹ کر ایک "کموڈ" فوری امداد کیلئے تیار کھڑا تھا۔ تخت کے نیچے چونی، بھونسے اور ربنولے کے دو چار تھیلے پڑے تھے، ایک کونہ میں ہری گھانس اور کچھ "برگ سبز" اپنے اندر "معرفت کردگار" کا ایک دفتر لئے ڈھیر ہو رہے تھے۔ دیوار پر دو چار شیروانیاں کچھ قمیص اور پاجامے لٹکے ہوئے تھے، الگنی پر ایک ساڑی ہوا کھا رہی تھی، وراندے کی اس آرائش و زیبائش کو ہم ابھی بنظر غور دیکھ ہی رہے تھے کہ "گل بہار" کے "مولوی نما" سرکار برآمد ہوئے، سر پر نہایت شاندار عمامہ اور اُس کے نیچے آدھے گز کی گھنی کھچڑی ڈاڑھی، ہاتھ میں سُرخ سبز منکوں کی لانبی تسبیح، جسم پر ڈھیلا ڈھالا کرتا، ٹانگوں میں ٹخنوں سے اونچا "شرعی" پاجامہ، کاندھے پر تیلیا رومال۔

ہمیں دیکھکر مولویانہ "انداز" سے "سلام علیکم" کہا۔ سلام کا جواب دے کر ہم نے اپنے آنے کی وجہ بتائی اور مولانا کے حسب الحکم ہم اُن کے پیچھے وراندے سے لگے ہوئے ایک کمرے یا مولانا کے "ڈرائنگ روم" میں داخل ہوئے، صوفوں اور کرسیوں کے عوض اس کمرے میں ہم نے چند نادر چیزیں دیکھیں۔ مثلاً اناج کے تھیلے، مرچ اور املی کے بورے، غلہ رکھنے کے ڈبے، گھی کے پیپے، تمباکو کے گٹھے، آم کے انڈکے، اچار کے مٹکے اور مربے کے کئی روغنی گھڑے، غرضکہ کمرہ کیا تھا "نانک رام" کی دوکان تھا، اس کمرے کے دونوں جانب دو کمرے تھے۔ ایک مولانا کی "عبادت گاہ" معلوم ہوتا تھا، اس میں ایک طرف مصلّے بچھا ہوا تھا اور ایک کونہ میں چند کتابیں منوں گرد و غبار کے نیچے دبی پڑی تھیں، دوسرے کمرے میں "گل بہار" کی بیگم صاحبہ "گل بہار" سے یوں مخاطب تھیں۔

"اری حرام زادی، ایسے پیاز کاٹتی! چھلٹہ (چھلکا) تک بروبر (برابر) نیں (نہیں) نکلا۔ کیری کے ٹکڑے دیکھو کاٹی سو!! اری خام پارہ، کام چور نوالے حاضر! دیکھتے دیکھتے بڈّی (بوڑھی) ہوگئی پن تیرے کو ابی (ابھی) تک پیاز کاٹنا آیا نہ کیری کترنا آیا۔ اب تو مکان میں لوگاں (لوگ) ہے بول کو چپ بیٹھیوں۔ ماری نیں، پھر کو ایسے کتری تو مارتے مارتے فرش کر دیونگی۔ لِتے (اتنے) جوتیاں مارونگی سر میں ایک بال بی نیں ہونگا سمجھ کو رہو!!!"

اس پُرلطف گفتگو میں ہم کچھ ایسے محو ہوگئے کہ گھر دیکھنے کے عوض جی چاہ رہا تھا کہ بس ان "ارشادات عالیہ" کے انمول موتیوں سے اپنے دامن بھرتے جائیں۔ مولانا کی بے چینی سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی صورت ہم کو جلد دفع کرنا چاہتے ہیں مگر ہم وقت کی "نزاکت" کا خیال کر کے ہر کمرے کو نہایت اطمینان سے دیکھ رہے تھے۔ مولانا کے "تیور" کہہ رہے تھے کہ دو غیر محرموں" کا انکی ایک عدد "محرم" کی "پرائیویٹ" گفتگو سننا مولانا پر بڑا شاق گزر رہا تھا۔ مکان کا معائنہ ہم نے ختم ہی کیا تھا کہ اندر سے ارشاد ہوا۔

"اری مردار جا دیکھ! وہ مونڈی کٹے گئے نیں؟ اندر بیٹھے بیٹھے خفکان (خفقان) ہوگیا!! سرکار سے پوچ کو آج کھانا کھاتیں یا بھکے (بھوکے) رہتیں؟ ہنڈیاں چلّے (چولھے) پر پڑیں ہور (اور) آپ ٹھمک ٹھمک کو مکان بتاریں!!"

ایک شاعروں کے "قدرداں" بزرگ کسی جگہ رونقِ بزم تھے، طوائف صفی لکھنوی کی مشہور غزل گا رہی تھی جس کا مطلع ہے۔

یہ دردِ عشق نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا اس دل سے کہ موت آئیگی آسانی سے دم نکلیگا مشکل سے

آپ جھوم جھوم کر "دادِ کلام" دے رہے تھے، جب اس نے مقطع گایا۔

پلٹ کر عمر رفتہ کو صفی آواز دیتا ہوں
نکل آیا ہوں اپنی رو میں اتنی دور منزل سے

آپکے کچھ سمجھ میں نہ آیا، آپ نے ایک دوست سے جو آپ کے بازو میں بیٹھے تھے فرمایا "بھئی عجب "مہمل" شعر ہے! کچھ مطلب ہی نہیں نکلتا!!"

دوست نے کہا "بھائی صاحب شاعر نے بڑی نازک بات کہی ہے کہ کس طرح تغافل شعار انسان دُنیا کی بھول بھلیوں میں پھنسکر زندگی کی منزل سے دُور نکل جاتا ہے اور آخر عمر میں پچھتاتا ہے . . . . جبکہ اُس کے بس میں کچھ نہیں ہوتا"

شاعری کی یہ "موٹی موٹی باتیں" آپ کے نازک دماغ میں بھلا کیسے آسکتی تھیں! مگر آپنے اس انداز سے سرِ اقدس کو جنبش دی گویا سب کچھ سمجھ گئے ہیں!!

دوسرے روز صبح میں آپ کے بیدار ہوتے ہی آپ کی محترم بیگم کو یہ دیکھکر بڑی حیرت ہوئی کہ آپ اُلٹے پاؤں چل رہے ہیں! پوچھا تو ارشاد ہوا۔

"رات کو دعوت میں ایک شعر سُنا تھا معلوم ہوا کہ گزری ہوئی عمر اُس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے! چنانچہ شاعر آخر عمر میں اپنی "عمر رفتہ" کو پلٹ پلٹ کر پکارتا ہے۔ میں نے کل کی رات ہی سے یہ عمل شروع کر دیا ہے۔ ابتک تو "وہ" کمبخت نظر نہیں آئی۔ پلٹ پلٹ کر بار بار دیکھنے کی زحمت سے بچنے کیلئے میں نے اُلٹے پاؤں چلنا شروع کر دیا ہے تاکہ "وہ" نظر آتے ہی پکڑ لوں! کیوں؟ کیسا آسان طریقہ

میں نے "اعادۂ شباب" بلکہ "اعادۂ طفلی" کا سوچا ہے۔"

ایک دن ہمارے ایک پڑوسی کچھ عجب صورت بنائے، منہ لٹکائے، آنکھوں میں آنسو بھرے، وحشت زدہ، اِدھر اُدھر دیکھتے

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں　　مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

گنگناتے ہوئے ہمارے گھر قدم رنجہ ہوئے اور ہم سے اپنی "پریشانیِ خاطر" کہکر مشورہ مانگنے لگے۔ واقعات یہ ہیں کہ موصوف کا بیاہ ہو کر پونے نو سال ہوتے ہیں، اس مدت میں آپکے صرف پون درجن بچے ہوئے جو دو لڑکے اور سات لڑکیوں پر مشتمل ہیں۔ یہ سب کے سب بفضلہ تعالیٰ بقیدِ حیات ہیں۔ آپ کی آمدنی کی تفصیل یہ ہے کہ تنخواہ تو دو ڈھائی سو روپے سے زیادہ نہیں ہے مگر "بالائی آمدنی" معقول ہوا کرتی ہے" افسوس ہے کہ اس آمدنی میں کچھ عرصے سے غیر معمولی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ یہ غالباً ملک کی معاشی اور اقتصادی پستی کا سبب ہے، جہاں کسی معاملہ میں ہزاروں ملا کرتے تھے اب سینکڑوں پر نوبت آگئی ہے۔ اس کمی کا آپ کے بجٹ پر خاص اثر پڑا اور آمد و خرچ کا توازن بگڑ گیا۔ اس سلسلہ میں آپ کی اہلیہ محترمہ کے مزاج کا توازن بھی بگڑتا جا رہا ہے اور وہ بےحد تلوّن مزاج ہوتی جا رہی ہیں، اُن کے غصہ کا پارہ ایک سو دس ڈگری تک پہونچ گیا ہے۔ کبھی آپ کو دفتر میں دیر ہو جائے یا راستے میں کسی دوست کے پاس ٹھہر کر دیر سے گھر آئیں تو ایسی موسلا دھار برس پڑتی ہیں کہ ساون بھادوں کا مینہ بھی مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہے۔ گرجنے کڑکنے اور برسنے کے علاوہ آپ کے گریبان و آستین کی بھی خیر نہیں! اس تقریب میں آپکے دو ایک قمیص ہر ہفتہ شوز صاف کرنے اور برتن پونچھنے کے کام آتے ہیں۔ آپ کے جسم پر بعض جگہ زخموں کو دیکھکر بیساختہ زبان پر آتا ہے؛۔ ع

نظر لگے نہ کہیں "اُنکے" دست و بازو کو!

خیر آپ کی "تواضع" تو اسی طرح ہوتی رہیگی کیونکہ آں محترمہ کی عادت تو چھوٹنے سے رہی! مگر اب سوال موصوف کے آمد و خرچ کے توازن کو برابر کرنے کا ہے!! خرچ جو ابتک ہوتا رہا ہے وہ تو کم ہونے سے رہا!! اور "وضعداری" بھی یہی ہے کہ خرچ کو گھٹا کر اپنے ہم چشموں میں ذلیل نہ ہوں۔ اس کے علاوہ جیسے جیسے بچے بڑے ہونگے خرچ بھی اللہ رکھے بڑھتا جائے گا اس لئے بڑی سوچ بچار کے بعد ہم نے موصوف کی خدمت میں یہ رائے پیش کی ہے کہ آپ کسی ایسے دفتر میں اپنا تبادلہ کرالیں جہاں "بالائی آمدنی" آپکے بڑھتے ہوئے اخراجات کی کفیل ہو سکے۔ تاکہ آپ کی آمد و خرچ کے توازن کے ساتھ آپ کی بیگم صاحبہ کے مزاج کا توازن بھی برقرار رہے۔ تبادلہ کی کارروائی میں دو چار ہزار صرف کرنے پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ برس چھ مہینے میں اتنی رقم آپ مع سُود حاصل کر سکتے ہیں۔

موصوف قسم کھا کر کہتے ہیں کہ آں محترمہ کے گلے پڑنے سے پہلے "بالائی آمدنی" کو آپ "حرام کی کمائی" سمجھتے تھے اور اب بیگم کی نت نئی خواہشوں اور آپ کی فرمانبرداریوں نے حرام و حلال میں امتیاز باقی نہیں رکھا، اس کے ساتھ ساتھ آپ کا یہ بھی خیال ہے کہ گھر کی "برکت" اور دل کا "چین" دونوں رفوچکر ہو گئے ہیں۔

آں محترمہ سے بیاہ کے بعد دو چار مہینے تک آپ کا بیان ہے کہ آپ کا "غریب خانہ" اُنکے دم قدم سے "رشکِ ارم" بنا رہا اور آپ کے گھر میں واقعی "بہار" آئی ہوئی تھی مگر بےتکلفی شروع ہوتے ہی آپ کی "شامت" آگئی اور وہ اپنے اصلی "روپ" میں جلوہ گر ہو گئیں! جس طرح "لال مرچ" دیکھنے میں نہایت حسین ہوتی ہے مگر ذرا مُنہ لگائیے تو بس خدا یاد آجاتا ہے!! بالکل اسی طرح "وہ" بھی نکلیں۔

دیکھنے میں نہایت بھولی بھالی، صورت دیکھکر فرشتے یاد آتے تھے اور جی چاہتا تھا۔

"اُسکو بٹھا کے سامنے یادِ خدا کروں !!"

مگر ضد اور ہٹ کی اس قدر پکی کہ خدا کی پناہ! موصوف کو اپنا "عبدِ طفلی" جب یاد آتا ہے تو فرماتے ہیں کہ سینہ پر لاکھوں سانپ لوٹ جاتے ہیں، اُس وقت وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کسی دن آپ کا بھی بیاہ ہوگا اور الٰہی "لال مرچ" صفت بیوی سے پالا پڑیگا!

جب آپ کو اُس عہدِ میمنت مہد کا خیال آتا ہے تو زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے۔

وہ بھی کیا دن تھے کہ بیوی گھر میں جب آئی نہ تھی رنج سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی

ایک بزرگوار کو آپ کی بیگم نے دو روپے دئے کہ ایک روپے کے آم اور ایک روپے کے سنگترے خرید لائیں۔ جب آپ میوے کی دُکان پر پہونچے تو بڑی احتیاط سے آم اور سنگترے چُنے کہ کہیں دُکاندار جیسا کہ اکثر خریداروں کی غفلت کی وجہ سے سڑے گلے پھل دیدیتے ہیں آپ کے ساتھ بھی یہی طرزِ عمل نہ کرے۔ پھل چننے کے بعد آپنے اپنے سامنے وزن بھی کرائے، کیونکہ اس موقع پر بھی گاہکوں کو چکمہ دیا جاسکتا ہے ــــ یہ سب کچھ کرنیکے بعد آپنے جیب سے دو روپے نکالے، دکاندار کو یہ دیکھکر بڑی حیرت ہوئی کہ روپے اُسکو دینے کے عوض ہاتھ پر رکھے آپ اُن کو بہت غور سے دیکھ رہے ہیں!

تھوڑی دیر کے بعد آپنے آم اور سنگترے واپس کردئے اور شوفر سے گھر چلنے کو کہا، جب گھر پہونچے تو بیگم نے آم اور سنگترے کا سوال کیا، ارشاد ہوا۔

"تم بڑی احمق ہو! آج دکاندار سے بڑی ندامت ہوئی، نہایت عمدہ آم اور سنگترے ایک ایک کرکے چُنے اور اپنے رُوبرو تُلوائے مگر جب روپے دینے کی نوبت آئی تو تم پر بہت غصہ آیا ــــ کیونکہ روپے دیتے وقت تم مجھ کو یہ بتانا ہی بھول گئیں کہ کس روپے کے آم خریدوں اور کس روپے کے سنگترے!!"

"جہاں نورد"

نہ قصہ نہ کہانی

جنگل کے کنارے چار چھ جھونپڑیوں کا ایک گاؤں تھا۔ اُس میں ایک بڑھیا رہتی تھی۔ بڑھیا کا کوئی نہ تھا۔ خود ہی اپنا پیٹ پالتی تھی۔ بجھڑے کی دو روٹیاں کھانے کو، گاڑھے کی ایک دھوتی پہننے کو، بس یہی زندگی کی ضرورتیں تھیں۔ ایسی حالت میں کیا حسرتیں اور کیا تمنائیں ہو سکتی ہیں۔ مگر نہیں! یہ گھر بھوتوں سے خالی نہیں رہتا۔ بڑھیا کے دل میں بھی ایک حسرت تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھی "اگر میرے پاس ایک بھینس ہوتی تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

بڑھیا کی ان باتوں پر ایک روز اُن کو ہنسی آ گئی۔ حکم دیدیا۔ ایک فرشتہ آدمی کا بھیس بدل کر آیا اور ایک موٹی گول بھینس بڑھیا کو دیکر چلا گیا۔ اب تو بڑھیا باغ باغ ہو گئی۔ بھینس کے واسطے اُس نے ناند بنائی، کھونٹا گاڑا، ایک رسّی بٹی، اور ایک چھپّر بھی ڈالا۔ ہر وقت وہ بھینس ہی کی فکر میں لگی رہتی۔ چرانے کو لے جاتے، دونوں وقت ندی میں نہلائے، راتوں کو دھنواں کرے کہ مچھر نہ ستائیں۔ جس دن بھینس بیاہی تو اُس نے نظر گذر کے ٹیکے اُسکے ماتھے پر لگائے۔ کالی مائی کا پوجا کیا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھینس نے دونوں وقت ملاکر آٹھ سیر دودھ دینا شروع کر دیا۔ اب تو بڑھیا کے گھر میں رکھنے کا ٹھکانا نہ رہا۔ کہیں دودھ اونٹ رہا ہے کہیں مٹھا رکھا ہے کہیں دہی جمایا ہوا ہے، مٹکیاں گھی کی بھری رکھی ہیں۔ بیٹے پیچھے جب اس گاؤں کے لوگ، ہاٹ میں جائیں تو اس کا گھی لے جاکر اس کے بدلے میں چمکتے ہوئے روپے لاکر اسے دیدیں۔ یہ ان کو گن گن کر زمین میں دبائے۔ اور بھینس کے کان میں جاکر کہے "بہنیا پورے ڈیڑھ بیسی کر دے تا جانوں"۔ بھینس جگالی روک کر سُنے اور پھر جگالی کرنے لگ جائے اور من ہی من میں کہے "بڑھیا اچھی ہے مجھے چاہتی ہے"۔ اس طرح دونوں میں محبت بڑھتی گئی۔ لیکن پڈا (بھینس کا بچہ) دُبلا ہی ہوتا چلا گیا۔ بھینس کی عقل تو موٹی ہوتی ہے۔ بہت دنوں میں جاکر اُس کی سمجھ میں آیا کہ کیا بات ہے۔ اب اُس نے دودھ چرانا شروع کر دیا۔ بڑھیا کو یہ بات ناگوار گذری۔ مگر کر ہی کیا سکتی تھی۔ البتہ اُس نے بھینس کی نگہداشت میں اور زیادہ جانکشی سے کام لیا۔ جتنی دیر بھینس چرتی بڑھیا اُس کے رات کے واسطے چارہ جمع کرتی۔ صبح سانی دیتی، دن بھر چراتی، رات کو ناند بھر کر گھانس رکھدیتی۔ کبھی کبھی بجھڑے کی روٹی بھی اسے کھلایا کرتی۔

ایک دن کلکٹر صاحب شیر کے شکار کو نکلے۔ شیر کے واسطے پڈوں کی ضرورت تھی۔ ایک چپراسی نے آکر بڑھیا کے پڈے پر قبضہ جمالیا۔ اور بارہ آنے پیسے جن میں ایک چونی کھوٹی تھی، بڑھیا کو دیکر پڈا چھین لے گیا۔ شام کو جب بھینس اپنے چھپّر میں آئی اور پڈے کو نہ پایا بہت گھبرائی۔ رات بھر پکارا کی نہ جگالی کی نہ دودھ اُترا۔ بڑھیا بھی بہت پریشان تھی۔ دم دلاسے کی باتیں بھی کرتی تھی، گردن بھی سہلاتی تھی، چمکارتی بھی تھی۔ روٹی لاکر کھلائی، مگر بھینس کے دل پر زخم تازہ تھا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ تین دن بڑھیا نے سب جتن کر ڈالے، دنیا بھر کی ترکیبیں کیں۔ ٹوٹکے، ٹونے، گنڈے، تعویز، سب کئے۔ تیسرے دن ڈیڑھ کوس چلکر کلندر پھکیر سے چار آنے کا تاویج لائی۔ (قلندر فقیر سے چار آنے کا تعویذ لائی) وہ بھینس کے سینگ میں باندھا جب جاکر بھینس نے دودھ دیا۔ دیا کیا بلکہ دینا شروع کیا۔ آٹھ دس دن بعد دودھ تو دینے لگی لیکن کبھی تین سیر کبھی چار سیر۔ بڑھیا نے چری کی کٹی، گیہوں کا بھوسا، ہری گھاس، سب ہی کچھ دیا۔ زمین میں سے کھود کھود کر چار روپے بھی خرچ کر ڈالے مگر دودھ نہ بڑھا۔ بھینس دل ہی دل میں کہے "بہنیا اب تو دودھ مور بس کا ناہیں"۔ دہن تو

دودھ میرے بس کا نہیں" بڑھیا ساتی دیکر گھٹنوں بھینس کی گردن سہلاتی اور اُس سے باتیں کیا کرتی۔ اور بھینس بھی محبت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھا کرتی۔ اسی طرح کچھ دن اور گذر گئے۔

ایک دن شام کو جنگل کے کنارے کنارے یہ دونوں آرہے تھے کہ پاس ہی سال بنی میں نالے کے کنارے شیر دہاڑ نکلا۔ دونوں بھاگے، بڑھیا بھی بھاگی اور بھینس بھی۔ نہ اس سے بھاگا گیا نہ اُس سے، جوں توں گھر آئے۔ رات بھر بڑھیا کو نیند نہ آئی، اور بھینس سے جگالی نہ ہوتی۔ صبح کو اس کا پیٹ پھولا ہوا تھا اور اُس کو بخار تھا۔ دو ایک دن بعد جب دونوں لوٹ پوٹ کر تندرست ہوئے تو بھینس کا دودھ اور سوکھ گیا تھا اب دو ہی سیر رہ گیا تھا۔ کچھ دن بڑھیا نے کوشش کی جب دودھ نہ بڑھا تو کوشش چھوڑ دی۔ جب کوشش چھوڑ دی تو دودھ اور کم ہوگیا۔ اور جب دودھ اور کم ہوگیا تو ساتی چارہ سب موقوف ہوگیا۔ ادھر بڑھیا کو رنج تھا اُدھر بھینس کو۔ دن بھر گاؤں کے کنارے یہ اُلٹی سیدھی گھاس چر کر آتی اور سیر آدھ سیر دودھ اُترتا۔ کچھ دن بعد یہ بھی نہ رہا۔ یہاں تک کہ بڑھیا نے دوہنا بھی چھوڑ دیا۔

اب بھینس اکثر بھوکی ہی رہا کرتی۔ کچھ دن بعد جاڑا آگیا، گھاس کا پتہ نہ رہا۔ بھینس کو فاقہ پر فاقہ گذرنے لگا۔ بڑھیا نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ برسات کا گرا گرایا چھپّر تھا اسی کے نیچے اپنے آپ بھینس آکر بیٹھ جایا کرتی تھی۔ ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ راستہ چلنا دشوار تھا۔ پیٹ ظالم ہے ایک دن گھاس کی تلاش میں ندی کے کنارے کنارے بہت دُور نکل گئی۔ ایک جگہ چاروں طرف کیچڑ اور پانی سے گھری ہوئی کچھ گھاس نظر آئی۔ تیرتی کیچڑ میں پھنستی یہ بیچاری اُس تک پہونچی۔ اب جو سونگھا تو کھانے کی نہ تھی۔ بمشکل تمام واپس آئی۔ اور ساتھ ہی ایک بھینسیا جونک بھی اپنی بغل میں لٹکا لائی۔ سیدھی گھر کی طرف چلی کہ بڑھیا دیکھکر چھڑا دیگی۔ لیکن اب بڑھیا نے اُس کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہی ہوا کہ جب جونک نے پورا ڈھائی سیر بچا خون پی لیا اور پونے دو فٹ لمبی ہوگئی جب جا کر پیچھا چھوڑا۔ خیر جونک تو چھٹ گئی لیکن جونک کا زخم رہ گیا۔ اوّل تو بڑھیا اب اُس کی طرف سے بے خبر ہی تھی۔ پھر زخم تھا بغل میں۔ اندر ہی اندر ناسور ہوگیا۔ کیڑے پڑ گئے۔ بھینس کا وقت آگیا۔ ایک دن جو مرتی کھپتی چرنے گئی تو پھر واپس نہ آئی۔ ندی کے قریب پیپل کے درخت کے نیچے اس کے پیر لڑکھڑا گئے، چاروں پیروں پر بیٹھ گئی۔ خود اُٹھنے کی سکت نہ تھی، سر اونچا کئے بیٹھی تھی۔ گزشتہ زندگی کے واقعات نظروں کے آگے تھے۔ دل کا انجن آخری جدّو جہد میں مصروف تھا، کہ ایک پُرانا دوست نظر آیا۔ بھائی کالے نے کائیں کائیں کی آوازیں لگائیں اور پیٹھ پر آ اُترے۔ پھر پُھدک کر سر پر آ گئے۔ پھر کان کے پاس۔ بھینس سوچنے کی کوشش کرنے لگی کہ یہ سچّا دوست ہے۔

کوّے نے کہا "کیوں کالی اماں ہم نہ کہتے تھے آدمیوں کو بھینس کی محبت نہیں ہوتی۔ دودھ کی محبت ہوتی ہے" بھینس نے بڑی کوشش سے لمبا سانس لیا اور کوّے کی طرف احسان مندانہ آنکھ اُٹھائی۔ کوّا بولا "کالی اماں سچ تو یہ ہے کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے بلکہ تمہارے کان کی کلیوں سے محبت ہے، لاؤ دو چار کھالوں"

بھینس کا دل ضرور بہت بڑا ہوتا ہے۔ لیکن وہ بھی بیٹھ گیا۔

سید رفیق احمد

قطعات

محبّت کی راتیں

گوشۂ باغ کی ملاقاتیں! | اور راز و نیاز کی باتیں
اے دل! ارماں رہ نہ جائے کوئی | پھر نہ ہونگی نصیب یہ راتیں

مُلاقات

یہ مُلاقات لُوٹے لیتی ہے | عشق کی گھات لُوٹے لیتی ہے
کرلو اختر گواہ تاروں کو | آج کی رات لُوٹے لیتی ہے

گزشتہ رات

چاند کے پاس اک ستارہ تھا | میں نے دیکھا تو اشک بہنے لگے
کوئی مجھ سا نہ ہو تمنائی | ایسی حسرت خُدا کسی کو نہ دے

یاد

کبتک آنسو بہاؤں اور نہ سوؤں | کبتک اس طرح اپنی نیندیں کھوؤں
حوصلے، ولولے، تمنّائیں | ہائے کس کسکو یاد کر کے روؤں

محبّت

دُو دِلوں کی محبّت اے اختر! | ہے اک ایسی مئے نشاط انگیز
جس کی مستی میں کائنات تمام | منظر آتی ہے حُسن سے لبریز

اختر انصاری

دیوالی

ہو رہے ہیں رات کے دیوؤں کے ہر سو اہتمام — صبح سے جلوہ نما ہے آج دیوالی کی شام
ہو چکی گھر گھر سپیدی ڈھل رہی ہیں نالیاں — پھرتی ہیں کوچوں میں مٹی کی کھلونے والیاں
بھولی بھالی بچیاں چنڈول پا پا کر مگن — اپنی گڑیوں کے گھروندوں میں سجی ہے انجمن
رسم کی ان حکمتوں کو کون کہہ دے گا فضول — ٹھیکروں میں رکھ دئیے ہیں خانہ داری کے اصول

شادماں ہو فرد۔ وہ نوخیز ہو یا پختہ کار — "تیوہاری" کیفیت بشاش چہروں پر نثار
سر د موسم کا لڑکپن۔ گرم چولھوں پر شباب — "برف میں ساقی لگا لایا ہے مینائے شراب"
اجڑے بن کر کڑھائی پر ہوا لہکی ہوئی — ہر گلی پکوان کی بوباس سے مہکی ہوئی
گھی تڑق کر پاس والوں کی خبر لیتا ہوا — "جھر" سے شعلوں پر ٹپک کر جل کے گودیتا ہوا
نیک دل پتنی کا حصہ ہے مصیبت جھیلنا — پوریاں تلنا حقیقت میں ہے "پاپڑ بیلنا"
ادھ جلے ایندھن کا آنکھوں میں دھواں بھرتا ہوا — نرگسِ شہلا میں تیزابِ خزاں بھرتا ہوا

جاتے ہیں حصوں پہ حصے خانداں در خانداں — آتی ہیں تھالی پہ تھالی۔ لا رہی ہیں مہریاں
کچھ اگر سالم تو کچھ ٹوٹے کھلونے کھانڈ کے — مور کی گردن ندارد۔ پاؤں غائب سانڈ کے
صحن میں کھیلیں بتاسے ابر سے برسے ہوئے — برتنوں کے پاس پتّل رات کے پڑے ہوئے

منہمک ہیں کام میں نوخیز۔ چنچل لڑکیاں — ساتھ وہ ہمجولیں بھی آئیں جو ہیں مہماں
ایک نازک انگلیوں سے دیولے دھوتی ہوئی — دوسری دھوئے ہوؤں کو چھن کے خوش ہوتی ہوئی
بتیاں بٹتی ہے کوئی روئی کا گالا لئے — تیل کا "کڑوا" کوئی آفت کا پرکالا لئے
کوئی طاقوں میں دیئے ترتیب سے رکھتی ہوئی — مشورے سے۔ رائے سے۔ ترغیب سے رکھتی ہوئی
جب دیوں سے کر چکی آراستہ دیوار و در — صحن سے زینہ پہ دوڑیں اور پہونچیں بام پر
رکھ چکے اونچی منڈیروں پر دیئے جب فرق سے — اوڑھ کر کملی سوادِ شام نکلا شرق سے
بجھ گئی شمعِ شفق ہر سمت کہرا چھا گیا — غازۂ روئے فلک اُڑ کر زمیں پر آ گیا
رات۔ اپنی زلف کا سایہ لگی جب ڈالنے — ماچسیں "گھس کر لگیں یہ سب دیوں کو" بالنے"
آنکھ جھپکی تھی کہ منظر ایک پلٹا کھا گیا — طور کا جلوہ چراغوں پر سمٹ کر آ گیا
روشنی میں ساریوں کے رنگ لہرانے لگے — مختلف آنچل ہوا کے رُخ پہ بل کھانے لگے

یہ "دوالی" کے مناظر۔ یہ نگاہیں کامیاب
"یا الٰہی تا قیامت بر نہ آید آفتاب"

تاجور سامری

چلم گزٹ (انسان نمبر)

الحمدللہ کہ ہمارا رسالہ اپنی عمر کے کئی دور ختم کر کے اس سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ ماشاء اللہ ابتدائے آفرینش سے آج تک ہمارا رسالہ جس آب و تاب سے چلا گیا، اس کا علم کس کو نہیں، اس لئے مزید تعارف کو ہم غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ پھر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ نہ اس کا کوئی دفتر ہے نہ ایڈیٹر۔ اسکے باوجود اسقدر ہر دلعزیز ہوا کہ ہر شخص کی زبان پر یہ یا اس کے کچھ حصے ہمیشہ چڑھے رہتے ہیں۔

رسالہ کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھکر ہم نے ضروری سمجھا کہ اس سال اس کا ایک خاص نمبر بہ طور سالنامہ نکالا جائے۔ عموماً عادت ہوتی ہے کہ خاص نمبروں یا تصنیفوں کو بڑے بڑے لوگوں یا چیزوں سے منسوب یا مخصوص کرتے ہیں، لیکن ہماری نظر ہمیشہ لطفِ عام پر رہی ہے۔ اس لئے ہم نے اس کا نام 'انسان نمبر' رکھا ہے۔ اور عام لوگوں کی سہولت بھی پیش نظر ہے اس لئے بالاقساط یہ سالنامہ شائع کیا جائے گا، تاکہ دیکھنے والوں کو وقت بھی ملے اور آسانی سے دیکھ بھی سکیں۔ چنانچہ بطور نکاہات' یہ پہلی قسط پیش ہے، جو صاحب چاہیں بہ طور 'قیلولہ' دیکھ لیں۔ 'اندیشہ' ہے کہ یہ ایک مستقل کتاب بھی ہو جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو نہایت آب و تاب کے ساتھ ایک مجموعی شکل میں بھی پیش کیا جائے گا۔ فقط

(خاص نامہ نگار خصوصی کے قلم سے)

اشتہارات

کیا آپ کو شادی کرنی منظور رہے؟ تو پھر فوراً پتہ ذیل پر درخواست بھیجکر اس زرّیں موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیجے۔ اب تک کئی درخواستیں آ چکی ہیں۔ اس لئے دیری کرنی مناسب نہیں۔

لڑکی نہایت حسین۔ شریف اور اعلیٰ تعلیمیافتہ ہے۔ ماں، البتہ موجود ہے، باپ کا پتہ نہیں۔ بولتی خوب ہے۔ ماشاء اللہ نہایت شوقین اور سلیقہ مند ہے۔ بال جمانے، کریم لگانے اور پوڈر لگانے میں تو گویا کمال حاصل ہے۔ قیمتی لباس کی آرزو ہے۔ مزاج بھی کافی تیز ہے جس سے یقین ہے کہ شوہر کی ترقی میں بڑی مدد ملے گی۔

مختلف فنون میں بھی مہارت حاصل ہے۔ چنانچہ ریڈیو اور گراموفون لگانے پر تو اس قدر عبور حاصل کر لیا ہے کہ دن کا اکثر حصہ اسی شوق وغیرہ میں گذر جاتا ہے۔ اب صرف ہارمونیم، پیانو، ستار اور طبلہ بجانا باقی ہے۔

خواتین کانفرنس کی ایک سرگرم رکن رہی ہے، اور کئی عورتوں کو ترقی دلا کر مردوں کی قید سے کاملاً آزاد کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل عورتیں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نہ صرف مردوں کو مات دے رہی ہیں بلکہ گئے دن کی خانہ جنگیوں اور گھریلو جھگڑوں کا صفایا کر کے تزئین و نمائش میں معتد بہ حصہ لے رہی ہیں۔ اور خود یہ لڑکی بھی اس قدر روشن خیال ہے کہ مردوں کے 'دوش بدوش' چلنے کے شوق میں گھریلو کام کاج کے لئے جھکنا کبھی گوارا نہیں کرتی۔ لہذا پکانے کا انتظام خود شوہر کو کر لینا پڑیگا۔ البتہ اگر اپنی مصروفیتوں سے وقت بچے تو یہ بعض ضروری مشورے دیدیا کرے گی۔ اس لئے مرد کا محنتی، خوش اخلاق، سلیقہ شعار، منتظم، اطاعت گزار، اور فرمانبردار ہونا

ضروری ہے۔

صرف وہ حضرات درخواست دیں جو نوجوان اور طاقتور ہوں۔ طاقتور نہ بھی ہوں تو "اوکاسا" کا استعمال فوراً شروع کردیں۔ یہ رگ پٹھوں کو چست کرکے آدمی میں نئی توانائی اور طاقت پیدا کر دیتا ہے۔

ماں، باپ نہ ہوں، یا ہوں تو انہیں مار ڈالیں یا چھوڑ دیں۔ ماہوار جو کچھ بھی ہو مگر موٹر رکھ سکیں، صرف جیب خرچ، سینما اور سہیلیوں کی پارٹیوں سے بڑھکر اور کچھ نہیں چاہیئے۔ البتہ مکان اور لباس وغیرہ بھی اعلیٰ پیمانہ پر ہونا لازمی ہے۔

لڑکی کا خیال ہے کہ اعلیٰ تعلیم بھی جاری رکھے، اس لئے ولایت کو بھیجکر اخراجات بھی برداشت کرنے ہونگے۔ البتہ ہفتہ میں ایک خط وہ مسلسل لکھکر سائنس، لندن اور مضافاتِ لندن کی کیفیت سے بھی برابر مطلع کرتی رہے گی۔ جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے، ورنہ جواب کی ذمہ داری نہیں۔

جدید اصولِ خانہ داری کی رُو سے یہ ضروری ہے کہ میاں بیوی الگ رہیں، جہاں ساس، نند، جٹھانی، مامائیں وغیرہ نہ ہوں۔ ان لوگوں کے قدیم خیالات کی وجہ سے گھر کی حفظانِ صحت پر اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اسلئے ان سب سے گھر کو پاک صاف رکھنا افضل ہے۔ البتہ باہر کے کام کاج یا گھر کی سنبھال کیلئے ایک آدھ بٹلر یا دیور وغیرہ ہوں تو مضائقہ نہیں۔

ویسے لڑکی، ماشاء اللہ، خود بہت سلیقہ شعار ہے۔ اور تجربہ کاری نے تو اس میں اور بھی چار چاند لگا دئے ہیں۔

عموماً ہمارے ہاں نوعمر اور جاہل کنواری لڑکیاں کرنے کا رواج ہے جو نہایت مہمل اور آفت انگیز ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے ہمارے گھروں سے امن وچین مفقود ہو گیا ہے۔ کیونکہ میاں ٹھہرے تعلیم یافتہ اور عمر والے اور بیوی ٹھہری ایک ناسمجھ اور بالکل کنواری لڑکی۔ پھر وہ میاں کی فطرت کو کیونکر سمجھ سکتی ہے۔ جب کہ آنکھ ملاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اسی خامی کو دُور کرنے کیلئے اس لڑکی نے پکی عُمر میں شادی کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اور عینک بھی لگاتی ہے تاکہ مرد کی فطرت کا مطالعہ اچھی طرح کر سکے۔ اس پر اسے سابق دو شوہروں سے جو تجربات ہوئے ہیں انہوں نے اس کی مزاج شناسی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اس لئے صنفی محبت کے ساتھ ساتھ ایک مادرانہ شفقت کا رنگ بھی نظر آجائیگا۔ اور ماں تو آپ جانتے ہی ہیں جسکے پاؤں کے نیچے بہشت ہے۔

غرض جب آپ شادی کریں تو خود بخود واضح ہو جائے گا، ہم کیا عرض کریں — یہ اشتہار تو صرف یوں ہی ہے، ورنہ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔

درخواست کے ساتھ فوٹو اور صرف ایک سو روپیہ بطور داخلہ فیس ماہ حال کی مناسب تاریخ تک فوراً آجانی چاہیئے، ورنہ شرکت کا موقع نہ ملے گا۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ فقط

نوٹ

مخفی مباد کہ عمر کا زیادہ تر حصہ بہ سلسلہ ملازمتِ شوہرانِ سابق مدراس اور ملیبار کے علاقوں میں گذر رہا ہے، اس لئے صرف تلنگی اور تامل زبانیں آتی ہیں۔ اُردو البتہ سکھالینی پڑیگی۔

رشتہ داروں اور جائداد کا زیادہ تر حصہ غدر ۱۹۵۷ء اور مال و زیور سب موسیٰ ندی کی طغیانی میں غارت ہو گیا، اس لئے اب صرف "قناعت بہ از توانگری" کے انمول موتی کے سوا جس کی قیمت داناؤں نے کوہِ نور کے مشہور ہیرے سے بڑھکر لگائی ہے، اور

کچھ نہیں رہا۔ خریداروں کے لئے زرّیں موقع ہے۔

ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی شادی ہوچکی ہے۔ اب صرف دو لڑکیاں اور ایک لڑکا شادی طلب ہیں۔ ان کی ذمہ داری لے لینی بھی مناسب ہوگی۔ ثواب کا کام ہے۔

فلک ناہنجار کی کجرفتاری کی وجہ سے بینائی میں کچھ فرق آگیا ہے۔ اس لئے درخواستیں خوشخط یا ٹائپ ہونی ضروری ہیں تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔ فقط

تیری یاد

انجمن ترقی ڈراما کے

معتمد ترقی ڈراما کی انجمن صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ پروفیسر بی کافر کا مشہور و معروف و معرکتہ الآرا ڈراما بتاریخ ۲۰ ماہ رواں و سنہ جاری، روز چہارشنبہ، بمقام باغ عام، بنظرِ سہولت پبلک ہونے والا ہے۔ اُمید کہ دنیا کے سب افراد حاضر ہوکر خود کو ماجور اور بندے کو ممنون فرمائیں گے۔

ڈرامے کی آمدنی کا کثیر حصہ رفاہ عام کے کام مثلاً محکمہ بدیہ، انجمن ارتقاءِ گداگراں، ریڈیو سٹیشن کی گانے والیاں، امدادِ ہوٹلان، امدادِ بیوگان، اور ہلاکتِ یتیماں اور ٹی پارٹیاں وغیرہ میں صرف ہونے والا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ ہر شخص اپنی آمدنی کا کثیر سے کثیر حصہ صرف کرکے اپنی وطن پرستی کا ثبوت دیگا۔

عالی جناب نواب صاحب موصوف دام اقبالہٗ نے بہ کمالِ عنایت سرپرستی قبول فرماکر نہ صرف ڈرامے پر احسان کیا ہے بلکہ اسٹیج، اشتہارات، تھیٹر وغیرہ سب کو بھی سرفراز فرمایا ہے۔ اور عالی جناب کی سرپرستی سے کون واقف نہیں، چنانچہ آپ بڑے سرپرست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ایک کی سرپرستی فرماتے ہیں، اور سرپرستی ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعے ڈرامے اور قومیں ترقی کرتی ہیں۔ نہ صرف آپ سرپرستی فرماتے ہیں بلکہ بڑے ڈراما نویس، اور ایکٹر بھی بننے کا شوق رکھتے ہیں۔ انشاء اللہ اگر پروفیسر کافر صاحب ڈرامہ نہ لکھ سکے تو آپ ہی کا ڈرامہ اسٹیج کیا جائیگا۔ سنا ہے کہ آپ بھی لکھنے کا ارادہ کررہے ہیں۔

ادبیاتِ عالیہ میں ڈراما ہی ایک ایسی چیز ہے جس کو صحیح معنی میں ادب اور اسٹیج کا ایک جزو کہا جاسکتا ہے مگر افسوس ہے کہ ہماری زبان اسی میں سب سے پیچھے ہے۔ ڈرامے میں کردار کا پتہ، واقعات کا خاکہ، اور ایکٹروں کا مکالمہ ہوتا ہے جس سے سب کے سامنے مختلف لوگوں کا کام اور نفسیاتی پہلو آجاتا ہے۔

ماشاء اللہ جتنی عورتیں کام کررہی ہیں وہ سب اعلیٰ تعلیمیافتہ، فیشن ایبل اور حسین ہیں اور مرد بھی چنے ہوئے۔

چونکہ کثرت و اژدہام کا اندیشہ ہے اسلئے کرسیوں وغیرہ کے جھگڑوں سے لوگوں کو بچایا گیا ہے۔ باغ عام کا سبزہ کیا ہے، گویا مخملی فرش ہے۔ یہی انتظام ہم نے مناسب سمجھا۔ اُمید ہے کہ لوگ اس ڈرامے میں کھو جائیں گے۔ یہی سبب ہے کہ ڈرامے کا نام "تیری یاد" رکھا گیا ہے۔ اور دنیا میں کون ایسا شخص ہے جس کو "تیری یاد" سے واسطہ نہ پڑا ہو۔ خصوصاً نوجوان حضرات کیلئے تو یہ بیک وقت تریاق اور زہر دونوں کا کام دیگا۔

اور پھر لکھنے والے کی شخصیت پر غور کیجئے! ——کون؟ —— کافر! —— کافر کے کئی معنی ہوتے ہیں، ازاں جملہ خود معشوق

کو بھی کافر کہا جاتا ہے ۔۔۔۔ اب آپ خود اندازہ فرمالیں ۔۔۔ بہرحال یہ ڈرامہ اپنے اندر جو شاندار خصوصیات رکھتا ہے وہ عنقریب منصہ شہود پر آجائیں گی۔

اُمید ہے کہ تمام ایکٹر اور ایکٹرسیں اس ڈرامے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گی، انشاءاللہ ڈراما کامیاب ہوتے ہی انہیں تنخواہیں دیدی جائیں گی۔خیر یہ سب تو ہوتا رہیگا۔ مگر اب صرف ڈرامے کے لکھے جانے کا انتظار ہے۔ آپ بھی تاریخ کا انتظار کیجئے۔ فقط

انکشافات

آئے دن جو حیرت انگیز انکشافات ہوتے رہتے ہیں وہ سائنس اور انسانی عقل وتحقیق کا ایک شاندار کرشمہ ہیں آج ہم اسی قسم کے ایک جدید انکشاف کا ذکر کریں گے۔

قصبہ افریقہ میں ایک بڑا شہر ہے جس کی بیچ زمین میں ایک درخت پایا جاتا ہے۔ اس کی کوئی جڑ نہیں، مگر ایک ڈالی ہے اور اتنی اونچی گئی ہے کہ سورج کی شعاعیں بالکل اسی میں سے ہوکر گذرتی ہیں۔ یہ درخت ہزار سال میں ایک دفعہ نظر آتا ہے۔ مشہور ہے کہ جو کوئی اس کو دیکھ لے ساری دُنیا کا بادشاہ بن جاتا ہے۔ اس کو سُن کر کئی بادشاہ، شہزادے حتیٰ کہ عام لوگ بھی اس کے زیر سایہ جاکر بیٹھے کہ کسی دن نظر آجائے۔ اِسی طرح تانتا بن گیا۔ جب لوگوں کا بہت ہجوم ہوگیا تو درخت کو گرمی ہونے لگی۔ ابتداءً تو نرمی سے چلے جانے کو کہا لیکن کثرتِ اشتیاق میں کسی نے نہ مانا تو اُس نے زور زور سے تقریر شروع کر دی، جس کے ہر لفظ سے ایک ایک درخت ٹپکنے لگا، اور انہوں نے بھی بولنا شروع کیا۔ اس پر اس قدر شور مچا کہ وہ لوگ تو فنا ہوتے ہی، ساری دُنیا میں بھی زلزلے کے جھٹکے شروع ہوگئے۔ چنانچہ کوئٹہ، پٹنہ، بہار، بلغرستان، جاپ جک آباد، اور براعظم مُوروی لینڈ، کے جھٹکوں سے تو کون واقف نہیں، بلکہ یہاں دو چار حال کے جھٹکوں کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا، مثلاً پنجاب کا جھٹکا، حیدرآباد کا جھٹکا، جالنہ کا جھٹکا، قلم کا جھٹکا، بات کا جھٹکا سواری کا جھٹکا وغیرہ۔ یہ سب جھٹکے اسی درخت کے غصہ کا نتیجہ ہیں۔ اِن جھٹکوں میں بعض آرام دہ ہیں اور بعض تکلیف دہ۔

اگرچہ اس واقعہ کو ہزاروں برس گذر چکے ہیں، مگر اب بھی اس کا اثر ہر جگہ باقی ہے۔ چنانچہ جب کبھی موسلا دھار بارش ہو آپ کانوں میں انگلیاں رکھکر خوب دبائیے، اسی جھٹکے کی سنسناتی ہوئی آواز آپکے کانوں میں آئیگی۔

آواز کی نوعیت سے اگرچہ آپ خود اندازہ لگا سکیں گے کہ کتنی دُور اور کتنے قبل تاریخی زمانے کی یہ بات اور درخت ہے، مگر حال میں محکمۂ آثار قدیمہ نے اس خصوص میں جو تحقیق کی ہے وہ ایک نہ مٹنے والی یادگار ہے:

کہتے ہیں کہ اس محکمے کے ایک رکن ایک شام تفریحاً جا رہے تھے کہ ایک خاص مقام میں اُن کے پاؤں سے ایک ٹکڑا لگا۔ انہوں نے فوراً اٹھالیا، اس پر کچھ لکھا ہوا تھا مگر پڑھا نہیں جاتا تھا۔ دھندلکا دُور کرنے کے لئے انہوں نے جیب میں سے عینک صاف کرنیکا کپڑا نکالا، اور صاف کیا تو معلوم ہوا کہ "خطِ تقدیر" میں اس پہ کچھ لکھا ہوا ہے۔ اُن سے پڑھا تو نہیں جا سکا۔ پھر بھی جوڑ لئے انہوں نے اپنی تحقیق کی بنا پر ظاہر کی، جو اس کا اقتباس ہی درج ذیل کیا جاتا ہے۔

میں آج ایک حیرت انگیز ٹکڑے کا انکشاف کرنے والا ہوں تحقیق سے نہیں بتا سکتا پھر بھی اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ضرور کسی درخت کا ہی جزو رہا ہوگا۔ حروف کا پتہ نشان کچھ بھی نہیں پایا جاتا جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بہت قدیم زمانے کا ٹکڑا ہے۔

اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ یہ شیشم کی لکڑی سے تعلق رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غار ہائے ایلورہ، اجنٹا کی تعمیر میں جتنی لکڑی صرف ہوئی وہ اسی درخت سے لی گئی ہوگی، تب ہی تو ان غاروں میں اتنی مضبوطی اور تاریکی پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ قدیم سے قدیم انگریزی زمانہ کا تمدن بھی سامنے آجاتا ہے۔

ان غاروں کی تعمیر میں ایسے ایسے معماروں نے کام کیا ہے کہ دنیا کے سارے دیکھنے والے روزانہ جوق درجوق آتے ہیں اور دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ البتہ بعض صاحبِ ذوق اور شاعر قسم کے لوگ کچھ تعریف بھی کر دیتے ہیں یا ایک آدھ نظم لکھ لیتے ہیں۔ غرض یہ ایسی قابلِ فخر چیز ہے کہ ہمارے محکمہ اور ساری دنیا کو اس پر جتنا ناز ہو کم ہے۔ اور یہ خوش نصیبی کی بات ہے کہ اس ٹکڑے کا سہرا خاکسار کے سر رہا ہے، جس سے اس درخت کی قدامت، استقامت، حقیقت، قیمت وغیرہ سب کچھ کا پتہ چل جاتا ہے:

ہم قابل کارکن کے اس انکشاف و تحقیق پر انہیں مبارک باد دیتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس ٹکڑے کو بیچ ڈالیں، چنانچہ انہوں نے ابتداءً اعلان کیا تھا، اور کئی آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں نے قیمت بھی لگائی تھی، حتیٰ کہ وہ ہزاروں لاکھوں تک پہونچی۔ مگر اُن کی خواہش تھی کہ اس ٹکڑے کے عوض انہیں جرمنی کی ڈکٹیٹری دیدی جائے۔ مگر ہٹلر نے صاف انکار کر دیا، اس لئے انہیں مایوسی ہوئی۔ پھر انہوں نے ہراج میں ڈالدیا، لیکن چونکہ وقت گذر گیا تھا کسی خریدار کو اطلاع نہ دی جاسکی۔ مجبوراً وہ وہاں سے بھی گھر لائے، اور ایک کانچ کی الماری پر رکھا تھا کہ ایک دن گھر کی بلّی انہیں بہت ستانے لگی، غصہ میں آکر انہوں نے اس ٹکڑے سے اسکو مار دیا۔ اور وہ زخمی ہوگئی۔ اتفاقاً بلّی بیوی کو بہت عزیز تھی، بہرحال جو دیکھا تو غصہ میں آگئیں، اور شوہر کے اس لختِ جگر کو لے جاکر چولھے میں جھونک دیا۔ شوہر صاحب بہت تلملائے، مگر آج کل بیوی کے مقابلہ میں کس کی چلتی ہے جو اُن کی پیش جاتی۔ دل پر سِل رکھ کے یہ صدمہ برداشت کیا۔

البتہ سنا ہے کہ اب راکھ اٹھا کر رکھی ہے کہ بہ صدرنج والم کاشی کو لے جاکر دفنا آئیں۔ چونکہ اس غرض کیلئے پیسے درکار ہیں، فی الحال چندہ جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ موصوف کو اپنے مقدس مقصد میں جلد کامیابی ہو۔

اختراعات

فوٹوگرافی۔ فوٹوگرافی کے فن نے حال میں جو ترقی حاصل کرلی ہے وہ ماضی میں کبھی نہیں کی تھی، اور مستقبل میں جو ترقی کرے گی اس کا اندازہ ہم ابھی سے کیونکر بتا سکتے ہیں۔ آئے دن اس فن میں جو ایجادات و اختراعات ہو رہی ہیں اُن کو سُن کر عقل دنگ رہ جائے گی۔

ابتداءً لوگ سمجھتے تھے کہ فوٹو میں صرف صورتیں لی جاسکتی ہیں مگر معلوم ہوا ہے کہ اب عمارتیں، تجارتیں، سین سینریاں وغیرہ بھی لی جاسکتی ہیں۔

فوٹوگرافی کی تاریخ پر ایک سرسری آنکھ مارنے سے ظاہر ہوجائیگا کہ اس کا موجد ایک مزدور اور اُس کا پسینہ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک مزدور جب دن بھر کام کرتے کرتے پسینہ پسینہ ہوگیا تو تالاب کے کنارے گیا کہ منہ ہاتھ دھوئے۔ جیسے منہ دھونے جھکا پانی میں صورت نظر آئی۔ پہلے تو اس نے خیال کیا کہ شاید کوئی مگرمچھ پانی پینے اُوپر آرہا ہے۔ پھر اپنے ہاتھ پاؤں کی حرکات سے اُسے وہم ہوگیا کہ ہو نہ ہو اس میں کوئی جن ہے۔ دوڑا ہوا مالک کے پاس آیا اور حال بیان کیا کہ پانی میں کوئی صورت

نظر آتی ہے۔ انہوں نے ہنس کر ٹال دیا کہ "بیوقوف! پانی بھی کوئی کاغذ ہے کہ جس میں صورت نظر آئے ـــــ پانی تو پینے کے لئے ہے دیکھنے کے لئے تھوڑی ہے!" لیکن اس کے اصرار سے جب انہوں نے خود جاکر دیکھ لیا تو بڑا تعجب کیا، اور سارے شہر میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ فوراً قاضی صاحب کو اطلاع دی گئی۔ موقعہ واردات پر پہونچے اور معائنہ فرمایا۔ دیکھا تو بات ٹھیک معلوم ہوئی، گھبراتے ہوئے فرمایا۔ "ہو نہ ہو، ابلیسِ لعین اس تالاب پر چھا گیا ہے ـــــ دیکھو دیکھو، کتنی بڑی ڈاڑھی ہے ـــــ لو باتیں بھی کرتا ہے!" پھر جو اپنے رعب کا خیال آیا تو ذرا سنبھلکر کہا۔ "لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم"۔

رفتہ رفتہ یہ خبر بہت پھیل گئی تو گورنمنٹ نے ایک کمیشن اس کی تحقیقات کیلئے مقرر کی۔ کمیشن نے بعد تحقیقات ثابت کر دیا کہ "بعض دفعہ پانی میں جھانکنے سے صورت نظر آسکتی ہے"۔

پھر ایک زمانہ کے بعد ایک سائنسداں نے اسی تحقیقات سے فائدہ اٹھاکر پانی کو ایک کٹوری میں ڈالا، اس میں تھوڑا سا رنگ ملا دیا اور ایک تنکے سے پہلے کپڑے رنگنا، پھر کاغذ پر لکیریں کھینچنا، پھر تصویریں بنانا شروع کیا، اور اس طرح سے اس فنِ صورت گری یا فوٹو گرافی کا وجود عمل میں آیا۔

اور اب تو اس فن نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اس سے مختلف کام لئے جانے لگے ہیں۔ مثلاً ڈنروں میں دعوتیوں کے فوٹو لینا، میلے ٹھیلے مجمعوں کے تعداد جماعت کا اندازہ لگانا، چوروں کے نقشِ قدم سے ان کو گرفتار کرنا، ناولوں میں عاشق معشوق کی تصویریں لگانا، کوکشاستروں میں آسن بتانا، انسانی جسم کو لباس کی کلفتوں سے بچانا وغیرہ۔

اس آخری فن کو اصطلاح میں "نوڈی زم" کہا جاتا ہے، جس کا سیدھا سادا ترجمہ "ننگاپن" ہو سکتا ہے، مگر ہندوستانیوں میں ابھی تک صلاحیت نہیں پیدا ہوئی کہ اپنی مادری زبان میں اس فن کی خوبی اور اہمیت کو سمجھ سکیں، اسلئے بالفعل انگریزی زبان میں ہی اسکی اشاعت جاری ہے۔

بہت سے ماہر فن اس میں پیدا ہو گئے ہیں اور جگہ جگہ، مثلاً پان کی دکانوں، حجامت خانوں، عید کارڈوں، اور سوشل کلبوں میں اس کا عکسی یا جسمی مظاہرہ ہوا کرتا ہے۔ اس فن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انسانوں اور خصوصاً عورتوں کی تصویریں جس قدر لباس کی آلائش سے پاک ہوں اتنا ہی کمال سمجھا جاتا ہے، جسکو آرٹ کہا جاتا ہے۔

پہلے پہلے تو یہ فن تصویروں تک ہی رہا لیکن اب راست عورتوں پر بھی اثر کر گیا۔ اس کا اثر رفتہ رفتہ ہوتا ہے چنانچہ پہلے پہل ہاتھوں سے شروع ہوا کہ آستینیں اٹھتے اٹھتے کاندھے تک پہونچیں، پھر گردن پر اس کا اثر پڑا، اور وہاں سے نیچے کو کھسکتے کھسکتے یہ اب صرف سینہ کے نیچے تک آکر رہ گیا ہے۔ یہاں سے جانے اس کی ٹرین کب مارچ ہو، فی الحال تو اسی کو جنکشن سمجھ کر ٹھہر گئی ہے۔

جب لباس کی اوپری تنگی جو کھسکی یہاں تک ظاہر ہوئی تو اس نے پاؤں میں سے سمٹنا شروع کیا: پہلے ٹخنا، پھر پنڈلی، پھر گھٹنا، اور اب تو ماشاءاللہ زانو پر بھی کھیلنے لگا ہے۔ امید ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو ملنے کے شوق میں بالکل ختم ہو جائیں گے۔ پھر آرٹ کا منتہائے کمال اور ماڈل آرٹ سامنے ہوگا۔

فوٹو گرافی کا کمال صرف آرٹ کی حد تک محدود نہیں، بلکہ اس سے اور بہت سے حیرت انگیز کام لئے جاتے ہیں، مثلاً جرائم کی تفتیش، جغرافی تحقیق وغیرہ۔

ذیل میں ہم ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جس سے اِس حقیقت پر کافی روشنی پڑتی ہے :-

حال میں ایک گاؤں کے زمیندار نے ایک نوجوان کسان کو گولی سے مار ڈالا۔ پولیس کی تحقیقات میں، فوٹو لینے سے صاف معلوم ہوگیا کہ گولی مقتول کے پیٹ کی جلد کو چیرتی ہوئی، انتڑیوں میں سے گذر کر، راست پیٹھ کے باہر نکل گئی ہے۔ اور کسان زمین پر سرد وقت تڑپتا پڑا ہے۔

زمیندار کو قاتل ہونے سے انکار تھا۔ پولیس امین اور فوٹو گرافی نے اس خصوص میں جو مدد دی وہ ایک زبردست کارنامہ ہے۔ امین صاحب اُس مقام پر گئے جہاں مقتول کا خون پڑا تھا۔ خون کو غور سے دیکھا اور بڑی احتیاط سے خون پر زمیندار کے نام کی سی لکیریں چپکے سے کھینچ کر دکھیں، صاف نہ معلوم ہوسکا، لیکن فوٹو لینے سے پتہ چل گیا کہ زمیندار ہی قاتل ہے۔ لہٰذا کارروائی کی گئی لیکن زمیندار اور پولیس کے سمجھوتہ سے معاملہ رفع دفع ہوگیا اور حکومت نے فیصلہ کیا کہ "نوجوان کسان کے افسوس پر حکومت کو بڑا انتقال ہے، اور اس کے پسماندوں سے دلی ہمدردی ہے۔ چونکہ غریب کسان تھا، لہٰذا اس کے اہل و عیال کی پرورش کے لئے کسان کی زمینات سے زمیندار کو وظیفہ تاحین حیات جاری کرنے کا حکم صادر کیا ہے۔ زیادہ چہ!"

اس سے واضح ہوجائے گا کہ فوٹو گرافی سے انسانی ضرورتوں کی کہاں تک تکمیل ہوسکتی ہے اور اس نے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اب ہم اس بابِ اختراع کی ایک اور کرشمہ سازایجاد کا ذکر کرکے اس باب کو ختم کر دیتے ہیں :-

امریکہ میں ایک مچھر مارنے کی مشین ایجاد ہوئی ہے، جس سے ایک گھنٹہ میں کئی لاکھ ہزار سو مچھر مارے جاسکتے ہیں۔ مچھر سی مردم آزار مخلوق شاید ہی کائنات میں کوئی ہو، اسی نے نمرود سے خدائی اور جان چھینی، اسی نے ملکوں میں ملیریا پھیلا کے لوگوں کی جانوں پر بنا دی، اسی نے لوگوں کی نیندیں حرام کر دیں۔۔ مگر شکر ہے کہ اب انتقام کا وقت آگیا اور امریکہ نے اس کا بیڑا اُٹھایا۔

مشنری کے نصب کرنے کے لئے اقطاعِ عالم سے بڑے بڑے انجنیر بلائے گئے ہیں۔ اور کئی مزدور دن تمام اس دھن میں لگے رہتے ہیں کہ مچھروں کا قلع قمع کیا جائے۔ مگر مچھر اکثر رات میں نکلتے ہیں اور پھر مشنری کے قریب جانے سے بھی گھبرانے لگے ہیں، اس لئے کمپنیوں نے ایک عام فہم اُصول ایجاد کرکے جگہ جگہ اعلانات تقسیم کرا دئے ہیں، تاکہ اُن کی مدد سے لوگوں کو بغیر مشن کے بھی مچھر مارنے میں آسانی ہو۔

اُصول کا خُلاصہ یہ بتایا گیا ہے کہ مچھر کے آواز کرنے تک تو صبر سے کام لیا جائے لیکن جب وہ کان کے پاس یا زیادہ تر گال پر بیٹھ جائے تو نشانہ کا ٹھیک اندازہ کرکے زور سے ایک ہاتھ مارا جائے ۔۔۔ یقین ہے کہ اگر مچھر پر یہ ہاتھ پڑ جائے تو وہ کبھی بچ نہیں سکتا۔ اور اگر غلطی سے وار خالی جائے بھی تو فائدے سے خالی نہیں۔ کیونکہ صحیح معنی میں احساس ہوتا ہے کہ "اندازِ بے رحمی بر جانوراں" کتنی ضروری چیز ہے۔ اس کے علاوہ خون چوسنے کے لئے مچھر جو مسامات کو اپنے ڈنک سے کھول دیتا ہے، وہ اس طمانچہ سے فوراً بند ہوکر پھر سے مسامات مل جاتے ہیں اور خون بہنے کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔

صنعت و حرفت اور ایجادات کے معاملہ میں امریکہ نے جس قدر ترقی کرلی ہے کسی سے پوشیدہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ کہا جاتا ہے امریکہ کے رقبہ میں کہیں مچھر نہیں مل سکتا، البتہ مکھیاں جگہ جگہ نظر آجاتی ہیں۔

امریکہ میں قافیہ تنگ ہونے کے سبب اکثر مچھر ملک، ہذا میں آگئے ہیں اور یہ نوآبادیات کچھ ایسے زوروں پر ہے کہ یہاں بھی اسکا

سیلاب کافی نظر آتا ہے، چونکہ جب تک کوئی شخص ولایت کا طواف نہ کرلے ماہر نہیں سمجھا جاسکتا۔ بہتر ہے کہ چند قابل نوجوانوں کو "مچھر کشی" کی اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیجکر ملک کی کارکردگی میں اضافہ کیا جائے، اور ایسی چند مشینیں بطور فائر بریگیڈ منگالی جائیں تو بہت کچھ فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

اگرچہ ملک ہذا میں ہر شخص کو اس فن میں کچھ نہ کچھ مہارت حاصل ہے، لیکن ابھی تعلیم اس قدر عام نہیں ہوئی کہ ہر شخص اس طرف توجہ کرے۔ اس لئے یہ بھی قابل ترجیح ہے کہ جبری تعلیم کو رواج دیا جائے، تاکہ ملک ہیضہ اور مکھیوں سے بالکل محفوظ ہوجائے۔

مگر اس سلسلہ میں ایک دشواری یہ ہے کہ بعض مذاہب میں اسکے خلاف سخت احتجاج کیا جارہا ہے، کیونکہ مچھروں سے شب بیداری اور عبادت میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

بہرحال کافی غور وخوض کے بعد گورنمنٹ نے ایک بورڈ قائم کردیا ہے۔ اُمید ہے کہ اسی سلسلہ میں وہ اپنی اعلیٰ قابلیتوں کا مظاہرہ کرکے ملک کو کثیر سے کثیر فائدہ پہونچائیگا۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس سلسلہ میں کثیر سے کثیر مچھروں کو رغبت دلانے اور تحقیقات کرنے کے لئے کئی ڈنر، رات اور دن کے مختلف اوقات میں ترتیب دئے جانے والے ہیں۔ اور ایک بیرونی وفد کی بھی توقع کی جارہی ہے۔

سالانہ رپورٹ شائع ہوتے ہی ہم نتیجہ سے فوراً آگاہ کردیں گے۔ فقط

سید علی شاکر

ساقی بک ڈپو۔ دہلی کی دلکش کتابیں؛

ریاض رضواں

ہندوستان کے شعرا میں مرحوم ریاض کا نام شہرتِ عام اور بقائے دوام کی نعمت سے مالامال ہے۔ گل و بلبل، زلف و عارض، چشم فتاں اور ابروئے خمدار، تبسم جاں بخش اور قہر جاں سوز، بیماریٔ دل اور رنجوریٔ جگر کی داستانیں بیان کرنے والے شعرا کی نہ کبھی کمی تھی، نہ ہے، اور نہ شاید ہوگی۔ لیکن اسی ہجوم عام میں کبھی کبھی کوئی ایسا شاعر بھی نمودار ہو جاتا ہے جو فن کا امام، زبان کا ماہر، وارداتِ دل کا ترجمان، حسیات قلب کا پیامبر اور حقائق و معارف کا منادو مبلغ ہوتا ہے۔ ریاض کا شمار اسی آخری قسم سے ہے۔

شاعری کی تمام اصناف میں، میرا خیال ہے کہ غزل کی شاعری بہت زیادہ کٹھن ہے۔ یہ موضوع جتنا زیادہ پیش پا افتادہ ہے اسی قدر "سہل ممتنع" بھی ہے، غزل عبارت ہے دل کی ترجمانی سے، عشق و محبت کے صحیح واردات کی تصویر کشی سے، حسیات و محاکات سے، جو لوگ عشق کی نعمت سے محروم ہیں اور شاعری میں بے بہرہ ہیں، لیکن اشعار میں حسرت و نامرادی کا نقشہ کھینچتے ہیں، جو شوق مضطرب اور حرماں سکوں آمیز کی لذت سے ناآشنا ہیں لیکن اپنے اشعار میں شوق و حرماں کے نقش و نگار بناتے ہیں، وہ بحیثیت پیشہ ور شاعر کے یقیناً کامیاب ہیں لیکن بقائے دوام کا خلعت ان کی قامت پر راس نہیں آتا۔ ہر دور میں چند شعرا ایسے ہوتے ہیں جو اپنے واردات و تاثرات کو شاعری کا جامہ پہنا کر منظر عام پر پیش کرتے ہیں، ریاض کی زندگی سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ریاض کی زندگی، عشق و محبت، کامیاب عشق اور کامیاب محبت، ساتھ ہی ساتھ ناکامی و نامرادی، جانستاں ناکامی اور عبرت انگیز نامرادی، اور پھر ساتھ ہی ساتھ شگفتہ دلی، خندہ جبینی اور شوخیٔ طبع کا کیسا متضاد نمونہ اور کیسا عجیب و غریب مجموعہ تھی، اشعار میں اپنی زندگی کے ہر دور کی بہترین تشریح و تفسیر پیش کرتے ہیں۔

حال میں ریاض مرحوم کے عزیز دوست اور مداح جناب قاضی تلمذ حسین صاحب، ایم۔ اے نے حیدرآباد سے حضرت مرحوم کا مجموعۂ کلام شائع کیا ہے۔ جو کتابت و طباعت کے اعتبار سے نمونہ ہے، کاغذ بھی بہترین استعمال کیا گیا ہے۔ ضخامت تقریباً ۹۰۰ صفحے۔ قیمت چھ روپے۔ ملنے کا پتہ:-

دائرۃ الادب۔ حیدر گوڑہ۔ حیدرآباد۔ دکن

آج کی مجلس میں، میں چاہتا ہوں کہ ریاض کی شاعری پر تبصرہ کروں، کہ یہ ایک ادبی خدمت بھی ہے اور ایک بزرگ کی فنی و ادبی خدمتوں کی یادگار بھی!

شوخی

ریاض کی شاعری کا ایک اہم عنصر اُن کی "شوخی و شرارت" ہے، اس برجستگی، بے ساختگی، بیباکی، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور بے تکلفی سے وہ اپنی شوخیٔ طبع کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ بس، ع
وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

شیخ و واعظ، ناصح اور مرشد، عرصے سے شعرا کے تختۂ مشق بنے ہوتے ہیں، ریاض کی زندہ دلی اور چلبلی طبیعت ان غریبوں کو کیوں چھوڑتی فرماتے ہیں اور کس خوبی سے فرماتے ہیں:-

کیا تڑاقے کی صدا تھی سرِ ناصح کی قسم — کسی میکش نے سبو کوئی اچھالا ہوگا
ساغر میں یہ افشردۂ انگور ہے اے شیخ — اس چیز سے حضرت کو بھی انکار نہ ہوگا
اس واسطے کہ آؤ بھگت میکدہ میں ہو — پوچھا جو گھر کسی نے تو کعبہ بتا دیا
بوتل جب اُسکے حجرے میں بھولے بھری ملی — زاہد بھی آدمی ہے بڑے اعتبار کا
چوری گیا ہے رات کوئی میکدہ سے خم — نکلا ہے نام زاہدِ شب زندہ دار کا
حشر کے دن بھی وہی ہیں شیخ خیال — آج بھی تو دعائے فردا کی
یہ کم نہیں ہے بڑھاپے میں ہم نے توبہ کی — تمام عمر میں ہم نے یہ ایک کام کیا
چُن چُن کے آج شیخ نے انگور کھا لئے — اب کیا کھنچے گی تاک کا حاصل نکل گیا

کیا جانے کیوں رقیب بنا تھا گلے کا ہار … صورت میں وہ ریاض سے اچھا تو کچھ نہ تھا
ہم رند سمجھتے ہیں اُسے انجمنِ وعظ … جس بزم میں ذکر مے و مینا نہیں ہوتا
مسجد میں آج ہم بھی گئے تھے پئے نماز … دیکھا سلام پھیر کے تو شیخ جی نہیں
جنابِ شیخ نے جب پی تو مُنہ بنا کے کہا … مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں
شیخ یہ کہتا گیا پیتا گیا … ہے بہت ہی بدمزہ، اچھی نہیں
نکلی ہیں حشر میں دُنیا کی پُرانی باتیں … میں تو کیا میرے فرشتوں کو بھی اب یاد نہیں
یہ کیا مذاق فرشتوں کو آج سُوجھا ہے … ہجومِ حشر میں لے آئے ہیں پلا کے مجھے
وہ آرہا ہے عصا ٹیکتا ادھر ناصح … بہا دے اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھاہ رہے
فرشتے عرصہ گاہِ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں … ہمیں بھی آج لطفِ لغزشِ مستانہ آتا ہے
وہ بھی بخشے گئے ہم بادہ کشوں کے ہمراہ … آج جنت میں ہمیں ناصحِ مغفور ملے

خود فریبی

مصائب کا ہجوم، ناکامیوں کا وفور، اور محرومیوں کا تواتر ریاض کی طبیعت میں ایک انوکھا اور نرالا جذبہ خود فریبی پیدا کر دیتا ہے، وہ مُصیبت سہتے ہیں لیکن رو رو کر نہیں ہنستے ہوئے اور مسکراتے ہوئے۔ وہ توجیہ و تاویل سے اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تصویر کا ایک نیا رُخ پیدا کر کے اپنا دل بہلانے کی سعی کرتے ہیں چاہتے ہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ واقعہ ہے، جو ایک ناقابل تردید حقیقت ہے، اُسے اپنی ہٹ دھرمی، سخن سازی اور قوت استدلال سے باور نہ کریں!

اسلام کا مفتی فتویٰ دیتا ہے کہ شراب حرام ہے، اس فتوے کو ریاض تسلیم کرتے ہیں، لیکن احترام شراب کا پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے فرماتے ہیں:-

جس دن سے حرام ہو گئی ہے … مے خلد مقام ہو گئی ہے

صیاد کو بددعا دیکے اپنے مغموم دل کو تسلی دیتے ہیں:-

صیاد کو جو مجھ پر یا رب ترس نہ آئے … باغوں میں موسم گل لاکھوں برس نہ آئے

در توبہ بند ہونے کے بعد عرض والتجا، توبہ و انابت، استغفار و طلب عفو کا کوئی موقع نہیں رہتا، ریاض درِ توبہ بند ہونے کی خبر سُنتے ہیں تو کس طمینان و استقامت سے ارشاد فرماتے ہیں:-

بند ہوتا ہے اب درِ توبہ … درِ میخانہ وا کرے کوئی

گنہگاروں کی صف میں جب ثواب کا بھی جواب لایا گیا تو اپنی صفائی اس طرح دیتا ہے:-

اہل عصیاں کی کمی حشر میں دیکھی نہ گئی … ایک ہم اور ملے آ کے گنہگاروں میں

اسی سلسلہ میں چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:-

ریاض آنے میں انکے ہے ابھی دیر … چلو ہو آئیں مرگ ناگہاں تک
دونوں سے رات دن ہے تعلق جہاں ہوں … مجھ پہ قفس کو ناز مرے آشیاں کو ناز
تم نے ملائے خاک میں لاکھوں تو کچھ نہیں … مجھ کو ملا کے خاک میں ہے آسماں کو ناز
ہنس ہنس کے عبث آپ مجھے کوس رہے ہیں … رو رو کے مرے واسطے مانگیں گے دعا آپ
کمزور ہوئے اشکوں سے گھر کے در و دیوار … رونے کیلئے لیں گے کرایہ کا مکاں اب
خدا کے ہاتھ ہے بکنا نہ بکنا مے کا اے ساقی … برابر مسجد جامع کے ہم نے بھی دکاں رکھدی

توبہ کرتے ہوئے رہ رہ کے یہ آتا ہے خیال | مُنہ مرا دیکھ کے رہ جائیگا ساغر میرا

یادِ ایام

ریاض کا عہدِ شباب عیش و نشاط فراغِ خاطر اور اطمینان و آسودگی کا عہد تھا، انہوں نے جی کھول کر دادِ عیش دی، لیکن اس دور کے اختتام کے بعد اُنہوں نے محتاط زندگی بسر کی۔ پاکی اور پاکبازی اُن کا طرۂ امتیاز رہا۔ گوشہ نشینی اور اعتکاف کے اس عالم میں بھی کبھی کبھی انہیں گُزرا ہوا زمانہ یاد آجاتا ہے تو مزے لے لیکر درد و حسرت کے ساتھ اس عہدِ زریں کو یاد کرتے ہیں:۔

اب نہ وہ شاہد پرستی ہے نہ ذوقِ میکشی | مٹ گئیں وہ صحبتیں وہ مشغلہ جاتا رہا

وہ راتیں یاد آتی ہیں وہ باتیں یاد آتی ہیں | مرا کھل کھیلنا ظالم ترا مجبور ہو جانا

پیری میں وہ شباب کی سیج دھج کہاں گئی | وہ بانکپن وہ طرۂ دستار کیا ہوا؟

رنگیں وہ بادۂ مئے گُلرنگ کیا ہوئے؟ | پیشِ نظر جو تھا وہ چمن زار کیا ہوا؟

سن اور تھا، دل اور تھا، کچھ اور تھا عالم | اب ہم کو کسی بات کا ارماں نہیں ہوتا

وقت کے ساتھ گئیں وقت کی باتیں بھی ریاض | نہ وہ ہم ہیں نہ وہ دل ہے، نہ زمانہ دل کا

وہ نخل، نہ وہ باغ، نہ وہ شاخِ نشیمن | اے اہلِ قفس چھوٹ کے ہم جائیں کہاں اب

وہ مزے وصل کے وہ مینہہ کا برسنا رم جھم | اُف ری برسات کی رُت ہائے ری برسات کی رات

وہ دن گئے، گئیں غمِ اُلفت کی لذتیں | اب تو ہے مُبتلائے غمِ روزگار دل

دن گئے وہ سِن گیا، راتیں گئیں باتیں گئیں | وہ زمانہ اور تھا اب یہ زمانہ اور ہے

چُٹکیاں!

زندہ دلی اور خوش طبعی ریاض کا حصہ تھی۔ شیخ و زاہد اور واعظ و ناصح پر جب وہ چوٹ کرتے ہیں تو صرف بناتے ہی نہیں ہیں بلکہ ایسی ایسی چٹکیاں لیتے ہیں، ایسی پتہ کی بات کہتے ہیں، اس طرح شہ رگ پر حملہ کرتے ہیں کہ کچھ کہتے سُنتے نہ بن پڑے۔ ملاحظہ ہو:۔

نہ رہے جبہ و دستار امامت باقی | غم غلط کرنے کا افسوس یہ ساماں نہ رہا

دھوکے سے پلا دی تھی اُسے بھی کوئی دو گھونٹ | پہلے سے بہت نرم ہے واعظ کی زباں اب کا

لگا کے دھوکے سے منہ شیخ پھر نہ چھوڑ سکا | پکارتا ہی رہا میں اسے شراب، شراب! ۱ ہ

گئے ہیں جو میخانے میں واعظ بہت اچھا | بنکر وہ یہاں آئے ہیں ہشیار، بہت خوب!

جام چھلکانے لگے بھر کر سُئے کوثر کے آپ | حضرتِ واعظ بہت اُونچے گئے منبر سے آپ!

تھی ظرفِ وضو میں کوئی شئے، پی گئے کیا آپ؟ | اے شیخ یہاں کون ہے؟ میں چور ہوں یا آپ!

میخانہ ہمارا کوئی مسجد تو نہیں ہے | تسبیح لئے کون بزرگ آئے ادھر آج

مجھے یہ آپکے سرکی قسم نہ تھا معلوم | کہ آپ بھی رہ و رسمِ وفا سمجھتے ہیں

ابھی تھوڑی سی اسکو اپنی بوتل سے پلائی ہے | ذرا رند و شباب شیخ فانی دیکھتے جاؤ

ایک واعظ ہے کہ جس کی دعوتوں کی دھوم ہے | ایک ہم ہیں جس کے گھر کل مے اُدھار آئے کو تھی

کبھی کبھی اپنے اوپر بھی چوٹ کر جاتے ہیں سہ دنیا کی کوئی بات نہیں جانتے ریاض | اک شخص ہیں ریاض بہت ہی غریب سے

اب پھر اپنے موضوع پر آتے ہیں۔

جناب شیخ کو ہلکی سی اپنے جام سے دے / مرے سبو کی تو ساقی بڑی کڑی ہوگی

سامنے جام مے ہوش ربا رکھا ہے / بگڑ لے شیخ مصلے سے جدا رکھا ہے

نزاکتِ خیال

شاعر کی فکر بلند، نزاکت خیال کے بڑے دل فریب مرقعے پیش کرتی ہے، زبان کا لطف، خیال کی ندرت، فکر کا انوکھا پن سب ہی کچھ شاعر نگینہ کی طرح جڑ دیتا ہے، کہتا ہے۔

وہ جانا مرا روٹھ کر میکدہ سے / صراحی کا مجھ کو وہ آواز دینا

اے وسعتِ دل تھوڑی جگہ دے کہ بنا لوں / بتخانہ کوئی بتکدۂ چین سے بھی اچھا

آئینہ دیکھتے ہی وہ حیران ہو گیا / دیکھا کسے کہ شمع سے پروانہ ہو گیا

ہے نور کا عالم رخِ روشن کی ضیا سے / وہ خوش ہیں شبِ وصل کی ہوتی ہے سحر اب

وحشت نہ گئی، سیر سے بہلی نہ طبیعت / پتوں نے بجائی بھی دف و چنگ چمن میں

چھلکائیں لا دو بھر کے گلابی شراب کی / تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

کمبخت نے شراب کا ذکر اس قدر کیا / واعظ کے منہ سے آنے لگی بو شراب کی

وہ کیا شے ہے بتا دے تو مرے ساقی ترے صدقے / کہ جس کے نام سے منہ پر ہمارے نور آتا ہے

کبھی آسماں سے کبھی لامکاں سے / مرے گھر وہ آتی ہے اونچی دکاں سے

میرے ساقی ترے تبسم سے / جام چھلکے، چھلک پڑے خم سے

تمہارے بام سے ہم نالے جو کرتے تو یہ ہوتا / کبھی وہ تارے بن جاتے کبھی وہ کہکشاں ہوتے

آب زیادہ کس میں ہے، باہم چشمک ہوتی ہے / میری آنکھ میں آنسو ہے تیرے کان میں موتی ہے

مقطعے

اردو شعرا میں مومن کے مقطعے مشہور ہیں، اس باب میں ریاض بھی ایک جداگانہ اور منفرد شان رکھتے ہیں، چند مقطعے ملاحظہ ہوں۔

ریاض خاکِ درِ میکدہ تھا جیتے جی / فنا کے بعد اسے خلد آشیاں دیکھا

وہی شباب کی باتیں وہی شباب کا رنگ / تجھے ریاض بڑھاپے میں بھی جواں دیکھا

جس انجمن میں بیٹھ گیا رونق آ گئی / کچھ آدمی ریاض عجب دل لگی کا تھا

پھرتا تھا اس گلی میں عجب وضع سے ریاض / اک پشت خار ہاتھ میں اور سر منڈا ہوا

بنائی کیا یہی گت میکدہ میں بادہ نوشوں نے / ریاض آئے تھے کل جامہ پہن کر پارسائی کا

توبہ کر کے آج پھر پی لی ریاض / کیا کیا کمبخت تو نے کیا کیا

نہ یاری کعبہ والوں سے نہ کاوش دیر والوں سے / ریاض اللہ والا تھا بڑا مردِ مسلماں تھا

نمازِ عید ہوئی میکدہ میں دھوم سے آج / ریاض بادہ کشوں نے ہمیں امام کیا

اک زمانہ جسے کہتا تھا کہ کافر ہے ریاض / وہی بدکیش بڑا صاحبِ ایماں نکلا

ہوتی ہیں وہاں کوہکن و قیس کی باتیں
مدت سے ریاض آپ کا چرچا نہیں ہوتا

یہی ہیں وہ ریاض سلے شیخ جو جیبیں کترتے ہیں
جنہیں تو نے ہمیشہ جبہ و دستار میں دیکھا

میں جو آیا غیر سے ہنس کر کہا اس نے ریاض
ختم ہے جس پر شرافت وہ کمینہ آگیا

ریاض اٹھ کر وہاں سے یوں نگہ نیچی کئے آئے
کہ جو دیکھے یہ جانے ہیں بڑے پرہیزگاروں میں

جنہیں لوگ کہتے ہیں رند دمی وہ خدا پرست ریاض ہیں
یہ سنا ہے کل کہ جناب بھی پس خم تھے محو نماز میں

پیا کے تم کو وعظ کہتے ہم نے دیکھا ہے ریاض
ہم بلانوشوں میں تم بھی کتنے عالی ظرف ہو

ہم نے دیکھا طرف میکدہ جاتے تھے ریاض
اک عبا پہنے، عصا تھامے، عمامہ باندھے

موقع کے اشعار

ریاض کے دیوان میں ایسے اشعار بھی بہت کافی تعداد میں ملتے ہیں جو موقع کے اشعار کہے جا سکتے ہیں، مضامین میں، خطوط میں، تقریر میں ان کا برمحل استعمال بڑی کیفیت پیدا کر سکتا ہے چند اشعار سنیے:۔

تری نوکِ قلم نے دل میں گہرے زخم ڈالے ہیں
ہزاروں دشنہ و نشتر لئے خط کا جواب آیا

اسی کی جان پر ٹوٹا فلک اتنی بلندی سے
جسے بیٹھا تمہارے سایۂ دیوار میں دیکھا

دونوں جہاں دادۂ مذہب ہیں مگر وقت کی ہے
کوئی ہندو نہ رہا کوئی مسلماں نہ رہا

فریاد میں کم ہے اثرِ دردِ نہاں اب
ہم آپ بدلنے کو ہیں اندازِ فغاں اب

فریادِ جنوں اور ہے بلبل کی فغاں اور
صحرا کی زباں اور ہے گلشن کی زباں اور

بات کیا چاہیئے بگڑنے کو
روٹھ جانے کے ہیں ہزار طریق

زمانہ بنا دے جنہیں اب وہی ہیں
زمانہ کے لائق زمانہ کے قابل

تو نے توبہ کی تو ہے لیکن ریاض
بات کا تیری ٹھکانا کچھ نہیں

خدا جانے کہتا ہوں مستی میں کیا
خدا جانے بکتا ہوں کیا جوش میں

جب دیکھئے تو ہے مے و معشوق پر نگاہ
با ایں ہمہ ریاض بڑے پارسا بھی ہیں

نظر بچائے، بغل میں دبائے شیشۂ مے
کہیں ریاض بھی پینے پلانے جاتے ہیں

جا کے در پر جب سنا تو یہ سنا
شب کے جاگے ہیں ابھی آرام میں

یہ گر جاتی ہے پہلو سے چھلک پڑتی ہے ساغر سے
کوئی کیونکر بچائے داغِ مے سے اپنے دامن کو

خانقاہوں سے ہے پوشیدہ تعلق جن کا
راستے ایسے گئے ہیں کئی میخانے کو

ہم تمہیں جان گئے جان گئے جان گئے
تم نہ جانو ہمیں ہم تو تمہیں پہچان گئے

کیا ٹھکانا ہے بات کا ان کی
دل میں کچھ ہے زبان پر کچھ ہے

منبر نہیں ہے تختِ شہی ہے یہ وقتِ وعظ
واعظ نہیں ہے جھوٹوں کا یہ بادشاہ ہے

تری خوش بیانی کا کیا ذکر واعظ
خموشی تری خوش بیانی سے اچھی

سجادہ خانقہ سے پسِ خم جو آ رہا
یہ کیا ہوا ریاض یہ کیا جی میں آ گئی

مے ریاض آپ بھی پیتے ہیں بایں ریش سفید
ہائے یہ نور کی شکل اور گنہگاروں میں

بیساختگی

ریاض کا کلام، بیساختگی اور روانی کے اعتبار سے بھی "خاصہ" کی چیز ہے، نمونہ ملاحظہ ہو۔

منہ میں میکدہ والو جو خدا سے چاہا
یہی جلسہ ہی، ساغر یہی مینا ہوگا

دھوکے میں پڑے کوئی نہ امید وفا پر
ہوگا نہ ہو رہے وہ وفا باز کسی کا

خانقہ میں جو کبھی طاق سے مینا اترا
ہم یہ سمجھے کوئی رحمت کا فرشتہ اترا

یہ دو گھڑی اب یہ جاتے ہیں خم کے خم کہاں تک
بتا دے آج شور قلقل مینا کہاں ہوگا؟

وہیں رہتے وہیں پیتے، وہیں سجدے کرتے
ایک گوشے میں اگر خم کہیں بستہ ہوتا

نہ تجھ سے واعظا مجھے تکلف، نہ مجھ سے واعظ تجھے تکلف
ہر ایک دعوت میں بے تکلف شراب میری کباب تیرا

کس مزے کی ہوا میں مستی ہے
کہیں برسی ہے آسماں سے آج

پینے کا مزا جب ہے کہ خم منہ سے لگا ہو
مجھ رند سے ساقی یہ کہے جائے کہ ہاں اور

مجھے ہے خون کا دعویٰ مجھے پر
انہیں پر دار محشر انہیں پر

بہار آئی کہ آئی وصل کی شام
کھلے غنچے، کھلیں کلیاں، کھلا دل

لاکھ مزے ہیں میکشی کی
لیکن یہ خطا کبھی کبھی کی

دور سے دیکھ کے پھرنا وہ مرا الٹے پاؤں
اف وہ بدلے ہوئے تیور ترے دربانوں کے!

یہ چھلکتا ہوا کیا جام شراب آتا ہے
لے میں قربان مرا عہد شباب آتا ہے

آئے مینا سے جام میں جب تک
ہم نے پی لی کھڑے کھڑے خم سے

دوڑے گی خون بنکے اترتے ہی حلق سے
جو کالی کالی بوتلوں میں لال لال ہے

دن پھرے عہد شباب آیا ملی تعبیر خواب
جام نکلا ڈوب کر خم سے کہ یوسف چاہ سے

جب سن چکے وہ حال تو یہ کہہ کے رہ گئے
او جھوٹے ہے بیان ترا کسقدر غلط!

مذہبیت

اگرچہ ریاض کی شاعری رندی و سرمستی، عیش و نشاط، "در ... خوش باش دمے کہ زندگانی اینست" کی شاعری ہے، لیکن وہ اگر رند بھی تو رند پاکباز، مذہبیت انکی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی، کون مانتا... شراب ناب اور دختر رز انگور کی حکایت رنگیں بیان کرنے والا حقیقتاً ایک مرد صالح، ایک تہجد گزار اور ایک متقی آدمی تھا؟ لیکن واقعہ یہی تھا!

ریاض کی مذہبی ذہنیت، اشعار کی صورت میں بھی نمودار ہوتی ہے۔

مجھے کیا ڈر ہے کہ ہونگے مرے ... شفیع
مجھے کیا ڈر ہے کہ تو بخشنے والا ہوگا

کام تو ہیں کافروں کے، نام ہے اسلام کا
اب مسلماں رہ گیا کوئی نہ ایماں رہ گیا

کیا زمانہ ہے کہ دشوار نظر آتا ہے
لاکھ دو لاکھ سے بھی صاحب ایماں ہونا

آ گیا تقدیر سے میرے مدینہ آ گیا
جس سے بام عرش پر پہونچوں وہ زینہ آ گیا

ہے عرش بریں اور مدینہ کی زمیں اور
اللہ یہاں کے ہیں مکاں اور مکیں اور

آنکھ اٹھا کے چلے ساتھ کئی طور نشیں اور
جو کعبہ کو جاتے ہیں وہ جائینگے کہیں اور

ہے عرش بریں فرش رہ گنبد خضرا
ہے میری جبیں اور فرشتوں کی جبیں اور

دونوں ہیں مقام ایک مکاں ایک مکیں ایک
کعبہ سے کوئی جا کے مدینہ میں نہیں اور

او کمبخت یہ آنکھیں شرف سجدہ دے تو
ہیں اپنی نگاہوں میں ریاض آج جبیں اور

ہم سے سیاہ کاروں کو لے حشر خوت کیا　　اُمت میں ہیں جناب رسالت مآب کی
لعنت کا کوئی طوق ہے یا سار دا لیلی ہے　　ہم مذہب و ناموس کو رُسوا نہ کریں گے

رعایتِ لفظی

اگلے شعرا رعایت لفظی کو بڑا ہنر سمجھتے تھے۔ مذاق جدید میں یہ ایک غیر پسندیدہ فن ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے رعایت لفظی کا جو معیار قائم کیا ہے اور جو نمونہ پیش کیا ہے، من حیث الاکثر وہ کچھ زیادہ دلچسپ اور مرغوب بھی نہیں۔

اس صنف کو نباہنا بہت مشکل ہے۔ بڑے بڑے اساتذہ نے اس میدان میں ٹھوکر کھائی ہے، اس صنعت کا ایسا استعمال کہ حامیانِ فن کا ذوق بھی پورا ہو۔ اور سننے والا بجائے گرانی محسوس کرنے کے لطف لے، بہت کم دیکھنے میں آتا ہے، خواہ نثر میں شاعری کرنے والوں کے مقالات و مقامات ہوں یا میدانِ نظم میں جولانی دکھانے والے شعرائے نامدار، اگر کسی شاعر نے، سو دو سو شعر اس صنعت میں کہے ہیں تو مشکل سے چار پانچ شعر ایسے دستیاب ہو سکیں گے جو معیاری ہوں اور جنہیں سُنکر سُننے والا مزا لے۔

ریاض بھی اس میدان میں دوسرے شعرا سے کچھ آگے نہیں ہیں۔ زیادہ تر اشعار ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ آمد نہیں آورد ہے۔ صرف محاورہ، زبان اور صنعت کو نباہنے کے لئے کہا گیا ہے۔ مثلاً:-

کوئی جو یار ہوتی، لب جو شکار ہوتا　　بط مے بھی ساتھ اُڑتی جو اُڑتے کلنگ تر
شریک شکارِ لب جو تھا　ناصح　　مجھے تاز اُسے روغن تاز دینا
نزع تک قلقل سے رکھی یاد واللہ اس لے　　پڑھ کے قل بخشے گی ہم کو قلقلِ مینا ثواب
مرا پانی بھریں یہ بجلیاں کالی گھٹا والی　　جو دیں کالوں کی اپنے زُلفوں والی بجلیاں مجھکو

جذبات و محاکات

پیشہ ور شاعر اور حقیقی شاعر میں ما بہ الامتیاز یہی ہے کہ جذبات کی تصویر کشی، وارداتِ دل اور حسیات قلب کا بیان کن الفاظ میں، کس لب و لہجہ میں کر اسلوب اور کس نوعیت سے کرتا ہے؟ جس کے الفاظ بے رُوح ہوں، درد و اثر سے خالی ہوں، کیف اور تاثر سے بیگانہ ہوں، وہ پیشہ ور شاعر ہے۔ اور جو الفاظ کے ذریعے، خیالات کی تصویر کھینچ دیتا ہو، جو حسیات کو جیتا جاگتا مجسمہ بنا کر پیش کرتا ہو، جو وارداتِ دل کو زندہ اور مرئی صورت میں دکھا سکتا ہو، جس کے الفاظ بولتے ہوئے ہوں، وہ حقیقی شاعر ہے، طبعی شاعر ہے، ملہم بالغیب ہے۔

آئیے اس معیار پر ریاض کے اشعار پرکھیں ——— عالمِ نزع طاری ہے، محبوب ——— جانِ تمنا اور جانانِ تمنا ——— سامنے بیٹھا ہے، مرنے والا گریۂ حسرت سے دل کی لگی بجھانا چاہتا ہے، لیکن پاس وضع اور وفورِ محبت کے سبب یہ بھی نہیں کر سکتا۔

دیکھو تو پاس نزع میں کتنا کسی کا تھا!　　دُکھ جائے گا دل اسلئے جاری ہوئے نہ اشک

محبت کرنے والا اپنے محبوب کو غیر کے گھر سے آتا ہوا دیکھتا ہے، وہ کس طرح اس منظر کو بیان کرتا ہے؟ ایک مشہور اور زبان زد عام شعر ہے:

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے　　پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے!

کوئی شبہ نہیں شعر خوب ہے، لطیف طنز، ——— ع : پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے! ——— شعر کی جان ہے۔ ریاض اسی منظر کو بیان کرتے ہیں اور تصویر کھینچ دیتے ہیں:-

نکلے تھے منہ چھپاتے ہوئے گھر سے غیر کے　　تصویر بن گئے جو مرا سامنا ہوا

اسی مفہوم کو دوسرے شعر میں اس طرح ادا کیا ہے:-

غیر کے گھر سے جھجکتے ہوئے تم نکلے تھے　　رُکتے دیکھا تمہیں پھر چھپ کے نکلتے دیکھا

اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

شوخی سے ہر شگوفے کے ٹکڑے اُڑا دیے　　جس غنچہ پر نگاہ پڑی دل بنا دیا
وہ خود چاہتے ہیں کوئی اب ستائے　　ستانا مزا دے گیا ہے کسی کا
بتا دو تم ہمیں بیداد کرنا　　سکھا دیں ہم تمہیں فریاد کرنا
قفس کی تیلیاں توڑیں تڑپ کر　　نہیں آتا اُنہیں آزاد کرنا
کہتے ہیں خوب ہی، ہم نہ ستائیں تم کو　　تم جو پا جاؤ ستاؤ ہمیں کیسا کیسا
کیوں اس قدر ہجوم تھا گرد اس غریب کے　　دم توڑتا تھا کوئی تماشہ تو کچھ نہ تھا
درد دل آج سنایا جو اُنہیں رو رو کر　　ہنس کے بولے کہ یہ قصہ ہے پُرانا دل کا
سر چڑھا کوئی مُنہ چڑھا کوئی　　شانہ گستاخ آئینہ گستاخ
چھیڑیں دو نو کی ہلکے آنچل سے　　شوخ کچھ آپ، کچھ صبا گستاخ
وہ ستائیں تو ستانے کا ہو شکوہ دن رات　　نہ ستائیں تو گلہ ہے کہ ستاتے بھی نہیں
آیا تھا روز حشر مرے ہونٹ پر گلہ　　گردن میں اُس نے ڈال دیے مسکرا کے ہاتھ
میں اُس نگاہ کے صدقے یہ ہو اثر جس میں　　کہ دل میں درد اٹھے بھی تو گدگدی ہو جائے
چلے آتے ہیں خوش خوش کس کے گھر سے　　وہ ہنستے کھیلتے باد سحر سے
لیا بڑھ کے محشر میں دامن تو بولے　　انہیں کیا ہوا ہے یہ کیا ہو رہا ہے!
بے طرح ٹوکتے ہیں دیکھتے ہی دور سے وہ　　تم نے اچھا سگ دربان کو لگا رکھا ہے

نئی ترکیبیں

پیچیدہ اور مغلق الفاظ، نئی ترکیبیں اور نئے الفاظ، ریاضؔ کے ہاں بہت کم ملیں گے۔ وہ اپنی شاعری میں روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں، صاف، شفاف، رواں، اور سُبک الفاظ! الفاظ کی نشست اور ترکیبوں کے استعمال سے وہ بڑے بڑے کام نکالتے ہیں حسب موقع شعر میں لطف و مسرت یا درد و حسرت کے تاثرات پیدا کر دیتے ہیں اس لئے اُن کے کلام میں نئی ترکیبوں کا ذخیرہ بہت محدود ہے، محدود ہونے کے باوجود وہ ایسا نہیں ہے کہ اُسے نظر انداز کر دیا جائے یا اہمیت نہ دی جائے۔ اس سلسلہ میں بھی دو چار اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

مجھے بال دیر مایۂ ناز دینا　　خدایا پر عرش پرواز دینا
شوخی سے اضطراب کی کچھ چھیڑ چھاڑ ہے　　اُن کی نگاہ ناز سے دل ہے دغا طلب
روز ازل تھے ڈھیر ہزاروں لگے ہوئے　　چُپکے سے چھانٹ لائے دل آرزو پسند
حشر آشوب وہ ہنگامے زمانے میں نہیں　　سوتے فتنے ترے کوچے کے جگائیں کیونکر
چیخ اٹھیں گے مری آواز سے سب اے صیاد　　دور رکھنا قفس افتادہ عنادل سے مجھے
بینا نہ رہا کوئی اس صاعقہ تابی میں　　ہر آنکھ ہوئی خیرہ کیا تیرہ زمانہ ہے

ابتذال

شوخی اور ابتذال کے ڈانڈے ملے ہوتے ہیں، ذرا حدود سے تجاوز ہوا، اور شعر اپنی تمام خوبیوں کے باوجود متانت کی بزم اور سنجیدگی کی

محفل سے "خارج البلد" ہوا۔

ریاض کے جو اشعار ابتذال کے ماتحت آتے ہیں وہ اپنی جگہ پر بہترین نفسیاتی تحلیل، واردات اور حسن و عشق کی عامۃ الورود باتوں کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں، لیکن چونکہ شوخی حد سے بڑھ گئی ہے اس لئے سنجیدہ حضرات کا ان پر چونکنا اور ثقہ اصحاب کا ناک بھوں چڑھانا بالکل قدرتی ہے۔

تمثیلاً ذیل میں دو تین اشعار اس قسم کے دئے جاتے ہیں۔

بتائیں کیا تمہیں کیونکر گلے لگائیں گے بتائیں کیا تمہیں روزِ وصال کیا ہوگا؟
چھپتا نہیں چھپانے سے عالم ابھار کا آنچل کی تہ سے دیکھو نمودار کیا ہوا؟
کیا وصل کی شب ہائے بگڑتی ہے بنی بات کہتا ہوں کچھ اُن سے تو وہ کہتے ہیں بُری بات

اے کاش

طلب و تقاضہ ریاض کی شاعری میں ایک مخصوص چیز ہے، وہ کھل کے نہیں کہتے، لیکن کہتے اس طرح ہیں کہ مخاطب یا سننے والا یہ سمجھ لے کہ انکی دلی آرزو یہ ہے کہ کاش ایسا ہو۔

جو زمین کو دیا تادم مرا مزار ہوتا جو فلک کو زیر کرتا وہ مرا غبار ہوتا
ہمارے گھر وہ ہنستے کھیلتے آئیں عدو کے گھر وہ روتے پیٹتے جائیں
جوانی تو گزری بڑھاپے سے بدتر گزر جائے پیری جوانی سے اچھی

اس شعر کا جوش طلب، مبہم اور خودداری لئے ہوئے طرز دعا ساتھ ہی ساتھ التجا کا رنگ دیکھئے۔

تو اگر چاہے تو مری کشتی کرے اٹھکھیلیاں تلاطم سے
درماں کی طرح تڑپ مزا دے یارب مجھے دردِ لا دوا دے

اسلوب بیان

اشعار کی اثر آفرینی بہت کچھ اسلوب بیان کی رہینِ منت ہے، بہتر سے بہتر مفہوم نامناسب الفاظ اور غیر پسندیدہ اسلوب بیان اختیار کرنے سے بے اثر ہو جا سکتا ہے اور معمولی سے معمولی بات اگر اچھے اسلوب، دلنشیں الفاظ اور اثر آفریں انداز میں کہی جائے تو وہ ایک خاص کیفیت اور خاص اثر پیدا کر سکتی ہے، ریاض اسلوبِ بیان کے بادشاہ ہیں۔ وہ پیش پا افتادہ باتیں بھی کہتے ہیں تو اپنے اسلوب بیان سے چار چاند لگا دیتے ہیں، چند اشعار سنیئے۔

یہ جانتے ہیں کہ دل خاک ہو گیا مٹ کر نہ آگ دیکھی نہ اٹھتے ہوئے دھواں دیکھا
چھپتا ہے مرے ساتھ مرا داغ زمیں میں اب ڈوب کے یہ چاند نمودار نہ ہوگا
آپ آئے تو خیال دلِ ناشاد آیا آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا
آج شب میں کوئی سو بار تو بجلی چمکی آج دن میں کوئی سو بار تو صیاد آیا
ننھے سے دل کی چھوٹی سی تربت بنائی تھی نقش قدم نہ تھا جسے تم نے مٹا دیا
جو کھلا پھول بنا زخم مرے دل کا ریاض جو کلی رہ گئی کھلنے سے بنی دل میرا
پہلو سے یوں کوئی سرِ محفل نکل گیا معلوم یہ ہوا کہ مرا دل نکل گیا
آنا تھا اس کو چاند سی صورت کو سامنے بادل میں چھپ کے کیوں مہ کامل نکل گیا

آتے آتے سرِ مژگاں جو کبھی خشک ہوا
گرتے گرتے وہی آنسو کبھی طوفاں نکلا

شمع کعبہ رہے محفوظ الٰہی تا حشر
نام روشن ہے اک اُجڑے ہوئے بتخانہ کا

کچھ رنگ تماشہ ہیں ہے حد سے سوا زرد
کچھ حد سے سوا آج ہے خونِ شہدا سُرخ

نزع میں یار سے پیمانِ وفا کرتے ہیں
اُس دغا باز سے ہم آج دغا کرتے ہیں

عنادل میں صبا میں چل گئی تھی
اڑا دی بات پھولوں نے ہنسی میں

ہنس کے پوچھا کہ کیا مصیبت ہے
سُن کے بولے کہ کیا کرے کوئی

یہ میکدہ کی بھیڑ، یہ انبوہ، یہ ہجوم
ہم تو نکل کے کھونے گئے خانقاہ سے

تعلّی

مشرق کے شعرا تعلّی کے موجد اور خودستائی کے امام ہیں، اگرچہ ان کی تعلّی میں بظاہر ادّعا ہوتا ہے لیکن حقیقتاً لطفِ محفل کے لئے وہ ایک سخن گسترانہ دعوے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

اس موضوع سے متعلق بھی ریاضؔ کے ہاں اچھے اشعار ملتے ہیں جو اپنی معنویت اور اندازِ بیان کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ اُن سے لطف لیا جائے۔

ہم نے بھی ریاضؔ آپ کے اشعار سُنے ہیں
یہ لطف بیاں لطفِ زباں ہو نہیں سکتا

یہ رنگ، یہ شوخی، یہ نفاست، یہ سلاست
کہتے ہیں ریاضؔ آپ تو اشعار بہت خوب

خدمتِ شمع فروزی مرے دم تک تھی ریاضؔ
کیسی تاریک ہے بزمِ شُعرا میرے بعد

میرے بیاں پہ آج ہے طرزِ بیاں کو ناز
میری زباں پہ آج ہے اردو زباں کو ناز

بہت ہے تم کو اپنے جام پر ناز
ذرا لانا مرا ٹوٹا ہوا دل

پروازِ فکر

علوِ خیال اور پروازِ فکر کے اعتبار سے بھی ریاضؔ پورے شاعر تھے اُنھوں نے اپنی بلند خیالی اور فکر کی رسائی کے ایسے اچھے نمونے پیش کئے ہیں کہ پڑھئے اور سر دُھنیے۔

شفق سُرخ کی یہ دھج یہ کہے دیتی ہے
کہ جوانی میں حسین کچھ فلک پیر بھی تھا

نہ سلسبیل ہوتی، نہ شراب حوضِ کوثر
جو ریاضؔ سا مسلماں نہ شراب خوار ہوتا

دیکھکر ترشے ہوئے پاؤں کے ناخن اُنکے
وہ اُبھر نا مہِ نو کا وہ پشیماں ہونا

یہ کہہ رہا ہے ترنم ہوا کی موجوں کا
خموش پھولوں کا حُسن بیاں نہیں ملتا

ہو جیسے ٹوٹنے میں صدائے شکستِ دل
ایسا بھی کوئی کام اسے شیشہ گر بنا

نہ رہ کے طور تو ہم جائیں عرش سے اونچے
ہماری راہ سے پتھر ذرا ہٹا دینا

ترے نازک سے چہرے پر جہاں رنگِ عتاب آیا
صباحت رُخ کی بول اُٹھی کہ رُخ زیرِ نقاب آیا

خیال شبِ غم سے گھبرا رہے ہیں
ہمیں دن کو تارے نظر آرہے ہیں

یہ سربمہر بوتلیں جو ہیں شراب کی
راتیں ہیں ان میں بند ہمارے شباب کی

نسخۂ بیاض ساقیِ کوثر سے مل گیا
گھر بیٹھے اب تو بادۂ کوثر بنائیں گے

شعر تو یہ ہے۔

غروب حسن کا اب آفتاب ہوتا ہے
نقاب اٹھتی ہے وہ بے نقاب ہوتا ہے

درد و حسرت

اگرچہ ریاضؔ کی شاعری نے لکھنؤ کی سرزمین میں نشو و نما کے مدارج طے کئے، جہاں نالہ، نغمہ بن جایا کرتا ہے۔ سوزِ غم، سازِ مسرت کی خوش آہنگیوں میں گم ہو جایا کرتا ہے، قرب و وصل کی لذت، ہجر و فراق کی نعمت چھین لیا کرتی ہے، لیکن ریاضؔ اس باب میں ذرا "غیر مقلد" واقع ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ چونکہ واقعات، واردات، اور مشاہدات کی شاعری پر مشتمل ہے، اس لئے یہ بالکل اور قدرتی ہے کہ اگر خوشی کے موقع پر اُن کے لب تبسم سے آشنا ہوتے ہیں تو یاس و محرومی گریۂ بے اختیار کی دعوت بھی دیتی ہیں، قرب کی لذت اگر خوش نوائی اور حکایاتِ رنگین بیان کرنے پر مجبور کرتی ہے تو ہجر و فراق کی صعوبتیں رونے اور رُلانے پر بھی آمادہ کرتی ہیں۔

ریاضؔ کے اشعار میں ایک چیز خاص طور پر قابلِ غور ہے، وہ جس تاثر کا اظہار کرتے ہیں اس کی کیفیت اُن پر اس درجہ مستولی ہوتی ہے کہ وہ اُسی میں ڈوب جاتے ہیں، اس طرح کے اشعار، عام اس سے کہ مسرت انگیز ہوں یا غم آفریں اپنا پورا پورا اثر کرتے ہیں۔ اور پڑھنے والے پر بھی وہی کیفیت طاری کراتے ہیں۔

قفس میں رہ کے ستم تیرے دیکھ لیں صیاد　　چمن میں رہ کے بہت لطفِ باغباں دیکھا

ہنگامِ نزع گریہ یہاں بے کسی کا تھا،　　تم ہنس پڑے یہ کون سا موقع ہنسی کا تھا

حسرت سے کوئی سوئے فلک دیکھتا تھا آج　　لب پر گلہ کسی کا نہ شکوہ کسی کا تھا

کہتے ہیں کہ ہم ہاتھ اُٹھاتے ہیں ستم سے　　کیا چرخ بھی اب درپئے آزار نہ ہوگا؟

ایسے بھی ہیں دُنیا میں جنھیں غم نہیں ہوتا　　اک غم ہے ہمارا جو کبھی کم نہیں ہوتا

پوچھا کسی نے حال کہ آنسو ٹپک پڑے　　رونا مجھے ہے گریۂ بے اختیار کا

ہنستی ہے تقدیر ہنس لئے اُنکے ساتھ　　دل مجھے میں اپنے دل کو رو چکا

کہیں بھی جائیں کہاں آسماں نہیں ملتا　　لحد ہی ایک جگہ ہے جہاں نہیں ملتا

یہ کس کے سایۂ دیوار نے مجھے پیسا　　یہ کون لوٹ پڑا مجھ پہ آسماں کی طرح

شریکِ درد تو کیا باعثِ اذیت ہیں　　وہ لوگ جن سے روابط تھے جسم و جاں کی طرح

ریاضؔ موت ہے اس شرط سے ہمیں منظور　　زمیں ستائے نہ مرنے پہ آسماں کی طرح

نہ وہ عشوہ نہ کرشمہ نہ وہ غمزہ نہ وہ ناز　　نہ وہ قاتل ہے نہ قاتل کی ادا میرے بعد

کھلے غنچے، نہ بو پھوٹی، نہ شاخِ گل پھلی پھولی　　قفس میں جب سے ہم آئے بہار آئی خزاں ہوکر

ہم بھی گئے تھے آج مزارِ ریاضؔ پر　　پژمردہ چند پھول تھے اِک اشکبار شمع

بہار نام کی ہے کام کی بہار نہیں،　　یہ دستِ شوق کسی کے گلے کا ہار نہیں

سحر بھی ہوتی ہے چلتے ہیں اے اجل ہم بھی　　اب اُن کے آنے کا ہم کو بھی انتظار نہیں

مجھ سا دُنیا میں ناشکیبا کون؟　　مجھ سا دُنیا میں ناصبور کہاں؟

اب ہم ہیں اور محویتِ عشق اے جُنوں　　ہمدم کہاں، ندیم کہاں، ہم نشیں کہاں؟

کون دل ہے مرے اللہ جو ناشاد نہیں　　کون گھر ہے مرے اللہ جو برباد نہیں

لے نسیمِ سحری اس کو لئے جا سوئے بام　　نفس سرد ہے نالہ نہیں فریاد نہیں،

فسردہ دل ہوں مجھے کیا ہو کوئی موسم ہو　　بھری بہار میں کیا تھا جو اب خزاں میں نہیں

کل ہم گئے تھے دیکھ کے آنسو ٹپک پڑے　　بے شمع و گل ریاضؔ کی تربت چمن میں تھی

(باقی آئندہ)

رئیس احمد جعفری

ریڈیائی ڈرامہ:

اَوقات

افراد

۱۔ شیخ سریرالدین
۲۔ مرزا قلمدار بیگ
۳۔ پنڈت چھدامی لال
۴۔ شیخانی۔ (شیخ سریرالدین کی بیوی)
۵۔ حفظا (ملازم)

مقام دہلی ———— زمانہ وسط اگست

سین پہلا

(شیخ سریرالدین بیٹھے ہوئے حقہ گڑگڑا رہے ہیں)

مرزا قلمدار بیگ ۔ (داخل ہوتے ہیں) جناب شیخ صاحب آداب عرض ہے۔

شیخ سریرالدین ۔ آداب عرض ہے مرزا صاحب۔ کہئے مزاج تو بخیر ہیں۔

مرزا ۔ بندہ پروری ہے جناب کی۔ ورنہ ہمارے مزاج کون پوچھتا ہے۔

شیخ جی ۔ اجی حضرت آپ کے مزاج پوچھے کیسے جائیں۔ آپ کے مزاج ملتے بھی ہیں۔

پنڈت جی ۔ (کھنکار کر) ان کے مزاجوں کے کیا کہنے۔ جتنے چاہے لے لو۔ بڑا سستا بھاؤ ہے ان کا۔

مرزا جی ۔ اخاہ آپ بھی آگئے۔ پنڈت جی نمستے۔ پنڈت جی نمستے۔

شیخ جی ۔ بھئی کیا کہنے پنڈت جی۔ ان کے مزاج نہ ہوئے بارش کے بعد کے خربوزے ہو گئے کہ جس کا جی چاہے لے لو آنہ کے ڈھائی سیر۔

پنڈت جی ۔ مگر کھلاوٹ ان میں کتنی ہوتی ہے۔

مرزا جی ۔ ان باتوں کو تو چھوڑیئے۔ شیخ صاحب۔ آپ یہ فرمایئے کہ پچھلے کئی دن سے آپ کس سوچ میں بیٹھے تھے۔ حقہ میں بھی کچھ دم نہیں۔ یہ بھی مرثیہ خوانی کر رہا ہے۔

شیخ جی ۔ حقہ کا دم لگا کر ہی بھرونا ہوں۔ ارے کوئی ہے حفظا... او حفظا۔ ابے حفظا۔ او حفظا کے بچے... ابے... نالائق حفظا۔ ار حفظا کے بچے۔

آواز : ۔ جی آیا سرکار۔

شیخ جی ۔ ابے سرکار کے بچے۔ آواز دیتے دیتے گلا پڑ گیا۔ ورنہ تیرا کہیں پتہ نہیں۔ جلدی چلم بھر کر لا۔ اور دیکھ یہ خاصدان لیتا جا۔ ڈیوڑھی پر سے پان لگوا کے جلدی دے جا۔

مرزا جی ۔ پان وان تو آتے رہیں گے۔ اب یہ بتایئے کہ ارادہ کیا ہے؟

شیخ جی :۔ ارادہ کیا ہے۔ میں خود سوچ رہا تھا کہ وقت کیسے گذارا جائے۔

مرزا جی :۔ بس صرف اتنا ہی سوچا؟

شیخ جی :۔ ہاں بھئی۔ اسی سوچ میں وقت گذر رہا ہے۔

مرزا جی :۔ اچھا تو میں بتاؤں۔ آپ جامع مسجد چلے جایا کیجئے۔ وہاں کی سیڑھیاں گن ڈالئے۔

شیخ جی :۔ اس سے کیا ہوگا۔

مرزا جی :۔ آپ کا وقت گذر جائیگا۔

شیخ جی :۔ اور جو میں چڑھتے اترتے تھک گیا۔

مرزا جی ۔ اور آپ کا وقت جو گزر گیا۔

شیخ جی :۔ اچھا فرض کیجئے میں نے جامع مسجد کی سیڑھیاں گن ڈالیں

مرزا جی :۔ ان کو ایک جگہ نوٹ فرمایئے۔

پنڈت جی :۔ اس نوٹ کرنے سے ایک فائدہ اور بھی ہوگا۔

شیخ جی ۔ وہ کیا؟

پنڈت جی :۔ دیکھئے میں بتاؤں آپ کو شیخ جی۔ بس آپ ایسا کیجئے کہ پہلے "جما مسجد" کو لیجئے۔ اس کی سب سیڑھیاں گن ڈالئے۔ یعنی یہ کہ صدر دروازہ میں اتنی ہیں۔ اتر میں اتنی اور دکن کے دروازہ میں اتنی۔ یہ کرنے کے بعد پھر آپ اس کے میناروں پر چڑھئے۔ اور ان کی بھی

سیڑھیاں گن ڈالئے۔

شیخ جی:۔ واہ بھئی پنڈت جی۔ تم تو مرزا جی سے بھی بڑھ گئے۔

پنڈت جی:۔ سنئے تو آپ 'جامع مسجد' سے سیدھے چلے جائیے۔ سیدھے قطب۔ اور وہاں کی سیڑھیاں گن ڈالئے اور راستے میں پڑ جائیگا 'جنتر منتر'، اس کی بھی گن ڈالئے۔

مرزا جی:۔ پھر دیکھئے وقت کیسے گذرتا ہے۔

پنڈت جی۔ اجی خالی وقت ہی نہ گذریگا بلکہ روپیہ بھی ہاتھ لگیگا۔

مرزا جی:۔ پنڈت جی۔ وہ کیسے۔

پنڈت جی۔ دلی کی تمام قابل دید عمارتوں کی سیڑھیاں گننے کے بعد شیخ جی آپ ان کو ایک کتابی شکل میں چھپوا ڈالئے اور ایک ایک آنہ میں چھپوا ائیے۔ جو لوگ بوڑھے یا بیمار ہوں گے یا جو مستورات کے ساتھ ان مقامات کی سیر کو جائیں گے ان کو پہلے سے پتہ چل جائیگا کہ فلاں عمارت میں اتنی سیڑھیاں ہیں۔ اسی حساب سے وہ سیر کو جایا کریں گے۔ یہ نہیں کہ گئے تو قطب مینار دیکھنے لیکن نیچے کھڑے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ بھئی اوپر کیسے جائیں یہ تو بہت اونچا ہے

شیخ جی:۔ کہی تو زوروں کی۔ پر بات یہ ہے کہ مجھے روپیہ کمانا تو ہے نہیں۔ میں تو روپیہ اور وقت دونوں کا مصرف سوچ رہا ہوں۔

مرزا جی:۔ تو پھر کنویں کھدوائیے۔

شیخ جی:۔ ہاں یہ تو میں بھی سوچ رہا تھا کیونکہ والد مرحوم ...

مرزا جی:۔ (بات کاٹ کر) جی ہاں اس میں روپیہ اور وقت دونوں ٹھکانے لگ جائیں گے۔ اور نام ہوگا وہ الگ۔

شیخ جی۔ ٹھیک کہتے ہیں مرزا جی آپ۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ ابا جان کہہ گذرے تھے کہ بھئی روپیہ ایسی جگہ لگانا جہاں نام چلے۔

پنڈت جی:۔ جی ہاں وہ آنجہانی انہی خوبیوں کے آدمی تھے۔

شیخ جی۔ پر مجبوری یہ ہے کہ دلی میں کنووں کا رواج ہی اٹھ گیا۔ بس یہاں تو نل چل پڑے ہیں۔

پنڈت جی:۔ تو پھر لاریاں چلوائیے اس میں روپیہ اور نام دونوں چلے گا۔

شیخ جی:۔ ارے یار پنڈت۔ تم بھی ایسی ہی لاتے ہو۔ دیکھتے نہیں ہزاروں لاریاں اسٹیشن اور اجمیری گیٹ پر کھڑی رہتی ہیں۔ میں لاریاں چلوا کر کیا دھیلے سواری ڈھو کر قطب لے جایا کروں۔

مرزا جی:۔ (ایک دم سے) بس شیخ جی میں نے سوچ لیا۔

بتاؤں گا... نہیں... اوہنہ... کبھی بھی نہیں بتاؤں گا۔

شیخ جی:۔ اچھا تو یہ پان آ گئے۔ ان کو تو لیجئے۔ ابے حفیظا پنڈت جی کو الائچی دے۔ اور ان کے لئے سگریٹ منگوا۔

پنڈت جی:۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو سگریٹ پیتا ہی نہیں آپ تو جانتے ہی ہیں۔ اچھا مرزا صاحب۔ آپ اپنی ترکیب بتائیے کہ کیا سوچی ہے۔

مرزا جی:۔ اتنی آسانی سے تو میں بتانے سے رہا۔ شیخ جی کچھ کھلائیں تو میں بتاؤں۔

شیخ جی:۔ مرد خدا کھا لینا۔ پہلے بتاؤ تو...

مرزا جی:۔ اچھا پنڈت جی آپ کے کان میں کہے دیتا ہوں۔

شیخ جی:۔ نہیں بھئی۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں کانا پھوسی نہ چلے گی۔

مرزا جی:۔ اچھا تو سنئے (حقہ کا دم لگا کر) آپ 'مربعے' خریدئیے 'مربعے'۔

شیخ جی:۔ یہ 'مربعے' کیا؟

مرزا جی:۔ لیجئے۔ آپ کو یہ بھی نہیں معلوم۔ آجکل تو بڑا زور رہے ان کا۔

شیخ جی:۔ ہاں ہے تو آم کی فصل مگر ہمارا 'مربے' بنانے والا تو مر گیا۔ بڑا لاجواب مربہ تیار کرتا تھا۔

مرزا جی:۔ ہا... ہا... ہا... ارے واہ بھئی کیا کہنے..... کیا کہنے... بھئی... شیخ جی۔

شیخ جی:۔ (گھبرا کر) کچھ کہو گے بھی۔ یا یوں ہی ہنستے چلے جاؤ گے۔

مرزا جی:۔ شیخ جی... ہا... ہا... آم کا مربہ نہیں بلکہ زمین کا 'مربعے'۔

شیخ جی:۔ اماں لاحول ولاقوۃ... یہ پہلے سے کیوں نہ کہا۔

پنڈت جی:۔ جبھی تو میں بھی پریشان تھا کہ مربّہ سے بھلا کیا کام چلنے والا تھا۔ آپ تو شیخ جی کو بالکل عطار بنائے دیتے تھے۔

مرزا جی:۔ جناب والا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ زمین مربعوں کے حساب سے خریدئیے اور اس پر بنوائیے مکان۔ آج کل امپرومنٹ ٹرسٹ کی اسکیم کی وجہ سے اس کاروبار میں بڑی گنجائش ہے۔

شیخ جی:۔ ہے تو بات ٹھیک۔ پر بڑے جھنجٹ کا کام ہے۔ کوئی اور ترکیب بتائیے۔

مرزا جی:۔ اچھا اگر یہ بھی نہیں مانتے تو پھر آخری ترکیب بتاتا ہوں۔

شیخ جی :۔ وہ کیا؟

مرزا جی :۔ آپ نکالئے اخبار۔ اس میں روپیہ اور رونق دونوں لگنے لگا اور نام بھی چمکے گا۔

شیخ جی :۔ بات تو کچھ لگتی ہوئی سی کہہ رہے ہو یار۔ کہو پنڈت جی۔ تمہاری کیا رائے ہے؟

مرزا جی :۔ پنڈت جی سے کیا پوچھنا۔ بس وہ تو منیجر ہو جائیں گے۔

پنڈت جی :۔ (کھانستے ہوئے) جی ... میں ... آپ کی خدمت سے کب باہر ہوں .. مگر بات یہ ہے ....

شیخ جی :۔ بس بات وات کچھ نہیں۔ آپ منیجر ہوں گے ... منیجر۔ لانا بھئی قلم دوات بھی کارروائی مرتب ہو۔ کدھر گیا۔ ذرا حفظا.. ارے کوئی ہے ... او حفظا کے ....

آواز :۔ جی حضور۔

شیخ جی :۔ دیکھ وہ ہمارا لال قلم کالے کوٹ کی جیب میں سے نکال لا۔ اور خط لکھنے کا پیڈ بھی لیتا آ۔

حفظا۔ جی بہت اچھا۔

شیخ جی :۔ ابے سن بھاگا کہاں چلا جا رہا ہے۔ بلاٹنگ بھی لیتا آئیو۔

حفظا۔ بہت اچھا حضور۔

شیخ جی :۔ اور ہاں ... ابے چلا کہاں .... سن تو سہی ... روشنائی کی شیشی بھی لانا ... قلم میں سیاہی ختم ہو گئی ہے۔

حفظا :۔ تھی بات ہے حضور۔

شیخ جی :۔ ابے پھر چلا جا رہا ہے .... میں کہتا ہوں یہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے .... وہ چھوٹی میز بھی لائیگا یا نہیں لکھوں گا کاہے پر۔ تیرے سر پر ....

حفظا :۔ میں سمجھا حضور اپنی ٹانگوں پر رکھکر لکھ لیں گے۔

شیخ جی :۔ اچھا جاؤ۔ فوراً یہ چیزیں لیکر آؤ۔

حفظا :۔ میں ابھی آیا۔

شیخ جی :۔ ابے سن .... او حفظ ... حفظا ... اس نوکر نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ بات پوری نہیں سنتا۔ ابے دیکھ۔ اندر کہلو دیجیو کہ مرزا جی آ گئے ہیں۔ وہ کھانا نہیں کھائیں گے اور پنڈت جی کیلئے بازار سے خستہ کچوری منگوا۔

مرزا جی :۔ کھانے دانے کی کیا ضرورت ہے۔

پنڈت جی :۔ اور میں تو کھا کر آیا ہوں۔

شیخ جی :۔ واہ پنڈت جی۔ آپ تو منیجر ہیں۔ آپ کا کھانا پینا سب یہیں رہا کریگا۔

مرزا جی :۔ تو اخبار سب سے بڑھیا ترکیب روپیہ کے خرچ کی اور وقت گزاری کی ہوگی۔

شیخ جی :۔ ہاں بات تو معقول ہے۔

پنڈت جی :۔ ہاں معقول اور سوا لاکھ ٹکے کی معقول۔

مرزا جی :۔ اس میں بڑے بڑے فائدے ہیں۔ روپیہ کا بہترین مصرف یعنی روپیہ خرچ کرنے سے عزت کتنی بڑھے گی۔ تمام دنیا جان جائیگی وہ الگ۔ نام بھی خوب ہوگا۔

شیخ جی :۔ آپ لوگوں کی دعا چاہئے۔ ہاں مرزا صاحب فی الحال کتنے روپیہ کی ضرورت پڑے گی؟

مرزا جی :۔ اس کا حساب تو پنڈت جی آپ کو بتائیں گے۔

پنڈت جی :۔ دیکھئے صاحب میں بازار جا کر چیزوں کا بھاؤ دریافت کروں گا۔ پھر تخمینہ بناؤں گا۔

مرزا جی :۔ چیزیں تو بعد میں بھی آ جائیں گی۔ پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ اخبار کس قسم کا ہو۔ (حقہ کا دم لگاتا ہے) لیجئے۔ شیخ جی۔ حقہ پیجئے۔

شیخ جی :۔ (حقہ لیتے ہوئے) تسلیم۔ جی ہاں یہ سوچنا ضروری ہے۔

مرزا صاحب :۔ آپ ہی رائے دے سکیں گے۔

مرزا جی :۔ یعنی سیاسی ہو یا تفریحی؟

شیخ جی :۔ خالی تفریحی سے تو کام نہ چلے گا۔

مرزا جی :۔ کام تو جناب تفریحی سے چلے گا۔ سیاست کی شطرنج میں کون پھنسے۔

پنڈت جی :۔ اور کاغذ کے بھاؤ کا بھی اندازہ کرنا ہوگا۔

مرزا جی :۔ خیر یہ باتیں تو بعد کی ہیں۔

شیخ جی :۔ تو پھر تفریحی میں یہی کھیل کود۔ گھوڑ دوڑ۔ ہاکی۔ فٹ بال وغیرہ کا ذکر ہوا کریگا۔

مرزا جی :۔ ہاں یہ بھی ... اور بہت سی باتیں ہیں۔

شیخ جی :۔ وہ کیا؟

مرزا جی :۔ یعنی سب سے زیادہ سینما اور ریڈیو کا ذکر ہوا کرے۔ انگریزی اخباروں کو دیکھئے صفحہ کے صفحہ ان باتوں میں رنگے ہوتے ہیں۔

پنڈت جی :۔ اور جی ہاں۔ اشتہار جو چھپیں گے ان سے بڑی معقول آمدنی ہوگی۔

مرزا جی :۔ کاروباری معاملات میں پنڈت جی کی رائے خوب ہوتی ہے

شیخ جی: ۔ اچھا مرزا صاحب۔ آپ اور پنڈت جی مل کر تمام معاملات طے کر لیجئے۔ میں ذرا اکھانے کی خبر لوں۔ (شیخ جی جاتے ہیں)

مرزا جی: ۔ پنڈت جی ہاتھ ملاؤ۔ کیسا شکار پھنسا ہے۔

پنڈت جی: ۔ مگر بڑی سوچ سمجھ کا کام ہے۔ بڑا شکار ہی ذرا ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ ہاتھ سے نکل جائے۔

مرزا جی: ۔ ہاتھ سے نکل جانیکی ایک ہی رہی۔ مگر شرط یہ ہی پنڈت جی کہ پچاس پچاس کا حساب رہے گا تو کام چلے گا ورنہ میں ہاتھ اٹھاتا ہوں۔

پنڈت جی: ۔ مرزا جی آپ کی بھی باتیں ہیں۔ آپ پچاس کہتے ہیں میں سو کے سوا سو آپ کے ہاتھ میں نہ رکھدوں تو پنڈت چھدامی لال نام نہیں۔

مرزا جی: ۔ جی ہاں پنڈت جی میں نے آپ کو پہلے سے بتادیا۔ کیونکہ مجھے اس کا تجربہ ہے۔ ابھی بمبئی سے سیٹھ عادل جی کے اخبار کا حساب کر کے چلا آرہا ہوں۔

پنڈت جی: ۔ تو یہ کہئے آپ سمندر کے پرانے تیراک معلوم ہوتے ہیں۔

مرزا جی: ۔ جی ہاں۔ اس میدان کے میں چپہ چپہ سے واقف ہوں۔

پنڈت جی: ۔ اچھا۔ دیکھئے وہ شیخ جی آرہے ہیں۔ پھر باتیں ہوں گی (شیخ جی کے آنیکی آواز)

دُوسرا سین

(ایک اخبار کا دفتر مکمل طریقہ پر آراستہ۔ ایک میز پر شیخ سریر الدین مینجنگ پروپرائٹر اور دوسری پر مرزا قلمدار بیگ اڈیٹر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کٹہرے سی لگی ہوئی ایک چوکی پر پنڈت چھدامی لال جی مینجر و خزانچی تشریف فرما ہیں۔ کارروائی بہت ضابطہ کی ہو رہی ہے)

شیخ جی: ۔ اڈیٹر صاحب پرچہ لکھکر تیار ہو گیا لیکن ابھی تک کوئی نام تجویز نہیں ہوا۔

مرزا جی: ۔ جی ہاں۔ میں خود اسی فکر میں ہوں کہ کیا نام رکھا جائے کئی نام خیال میں آتے ہیں لیکن کسی نہ کسی وجہ سے چھوڑ دینا پڑتے ہیں۔ کسی نام کا اخبار نکل رہا ہے۔ کوئی نام اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

شیخ جی: ۔ وہ نام معلوم بھی تو ہوں

مرزا جی: ۔ بس یہی نام۔ گل چین۔ پروین۔۔۔

پنڈت جی: ۔ مگر یہ تو عورتوں کے سے نام ہیں۔

مرزا جی: ۔ پنڈت جی آپ تو صرف فرد حساب بنائیے۔ اڈیٹوریل بورڈ کے معاملہ میں نہ بولئے۔

شیخ جی: ۔ مگر بحیثیت مینجر پنڈت جی رائے دے سکتے ہیں۔

پنڈت جی: ۔ میری رائے میں کوئی ایسا نام رکھئے جس کا تعلق سینما سے ہو۔ جیسے پردہ۔ ریڈیو والوں نے اپنے پرچہ کا نام 'آواز' رکھا ہے۔ بس آپ کا 'پردہ' رہے گا۔

مرزا جی: ۔ واہ۔۔۔۔ پنڈت جی۔۔۔ خوب نام نکالا۔۔۔ پردہ۔۔۔ بھئی واہ۔۔۔ پردہ۔ اب اس کے بعد کہیئے گا کہ کرسی، کمرہ، چائے، بسکٹ مونگ پھلی، لیمن، سوڈا۔ کیونکہ ان سب چیزوں کا تعلق بھی تو سینما سے ہی۔

پنڈت جی: ۔ دیکھئے جناب مرزا صاحب۔ چونکہ اخبار کے نام پر اس کے کاروبار کا دارومدار ہے اس لئے میں رائے دیتا ہوں کہ اس کا نام پردہ ہو۔

مرزا جی: ۔ میں صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔ بہ حیثیت اڈیٹر کے اخبار کے نام رکھنے کا حق مجھے ہے۔

شیخ جی: ۔ تو پھر مرزا صاحب آپ ہی کوئی نام بتائیے۔ نام تو آپ رکھتے نہیں۔ دوسروں کے نام رکھنے پر آپ خواہ مخواہ اعتراض کرتے ہیں۔

مرزا جی: ۔ دیکھئے میں نے ایسا نام سوچا ہے کہ آپ کا بھی نام ہو جائے۔ ولایت کے سب سے بڑے اخبار کے نام پر میں نے نام رکھا ہے۔

شیخ جی: ۔ تو جلدی بتلائیے۔ ڈاک کا وقت نکلا جا رہا ہے اس کو جلد چھپوا کر روانہ کرنا چاہئے۔

پنڈت جی: ۔ اچھا مجھے تو بتائیے ٹکٹ کتنے درکار ہوں گے۔

شیخ جی: ۔ ٹکٹوں کی جلدی کیا ہے۔ مرزا صاحب آپ پہلے نام بتائیے۔

مرزا جی: ۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ 'ٹائمز' انگریزی کا بہترین اخبار ہے اسی کے نام پر دنیا بھر کے اخباروں نے نام رکھے ہیں۔ جیسے ٹائمز آف انڈیا، نیویارک ٹائمز، ایسٹرن ٹائمز، یہ ٹائمز وہ ٹائمز غرض دُنیا بھر نے ٹائمز کا دُم چھلا اپنے ساتھ لگا رکھا ہے۔ بس میں نے بھی آپ کے اخبار کا وہی رتبہ کر دیا ہے۔

شیخ جی: ۔ وہ کیا؟

مرزا جی: ۔ یعنی 'اوقات'!

شیخ جی: ۔ کیا۔ اوقات۔ واہ بھئی مرزا جی نام تو خوب چبھتا ہوا سا رکھا ہے کہیئے پنڈت جی آپ کی کیا رائے ہے؟

پنڈت جی :۔ نام تو اچھا معلوم ہوتا ہے پر سینما سے اس کو کیا علاقہ۔

مرزا جی :۔ پنڈت جی ذرا سوچیے تو کہ سینما میں روپیہ کے بعد کس چیز کی بربادی ہوتی ہے۔ وقت کی ہوتی ہے یا نہیں۔

پنڈت جی :۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔

مرزا جی :۔ بس اسی نسبت سے میں نے نام رکھدیا 'اوقات' کیسا اچھا تو نام ہے۔

پنڈت جی :۔ جی ہاں۔ لوگ ہر وقت اب ہماری 'اوقات' پوچھیں گے

مرزا جی :۔ جی نہیں۔ بلکہ آپ کے اوقات کو دیکھیں گے اور ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

پنڈت جی :۔ اور پھر ہماری اوقات بڑھے گی۔

مرزا جی :۔ ہوں اوقات ۔۔۔

شیخ جی :۔ اچھا تو اڈیٹر صاحب۔ کاتب کو فوراً حکم دیجیے کہ یہ نام سرورق پر لکھ کر کاپی تیار کر دے میں پریس مین کو بلاتا ہوں۔

(گھنٹی بجتی ہے)

تیسرا سین

(اخبار اوقات نکلنے کے تین مہینے بعد شیخ جی اپنے گھر میں بیٹھے ہیں)

شیخانی :۔ میں پوچھتی ہوں یہ تم کو ہو کیا گیا ہے۔ اس کم بخت اخبار کے پیچھے کچھ گھر بار کی بھی خبر ہے۔ لڑکا بیمار پڑا ہے وہ الگ ۔۔۔ بٹیا کے سر میں پھنسیاں نکل آئی ہیں۔

شیخ جی :۔ لڑکا بیمار پڑا ہے تو کیا میں دوا بن جاؤں ۔۔۔ ڈاکٹر کو بلا کر دکھا دیا۔ ۔۔۔ دوا آرہی ہے میعادی بخار ہے۔ اترتے اترتے اتریگا۔ بٹیا کے سر میں پھنسیاں نکل آئی ہیں تو اسکی ذمہ دار تم ہو۔ کیوں اتنے زیادہ آم کھلا دیئے۔

شیخانی :۔ آم کھلانے سے کیا ہوتا ہے۔ کیا دنیا کے آم کھانے پر پھنسیاں نکل آتی ہیں۔

شیخ جی :۔ تو پھنسیاں نکلنے سے بھی قیامت بھی برپا نہیں ہوتی۔

شیخانی :۔ اور یہ چھت جو ٹپک رہی ہے اس کا کیا انتظام ہوگا؟

شیخ جی :۔ بھئی بیشک، یہ ایک دم تم پھنسیوں سے چھت پر پہنچ گئیں!

شیخانی :۔ جس کے سر پر پڑتی ہے وہی جانتا ہے۔ تم کوٹھی میں بیٹھے تو بیٹھے چلیے۔ تم تو ہر وقت دیوانخانہ میں مزے اڑاتے رہتے ہو۔ ایک موا اخبار رہے۔ ہر وقت اخبار ۔۔۔ جب دیکھو اخبار۔ نام بھی تو کم بخت کا کچھ ایسا ہی ہے۔

شیخ جی :۔ اوقات۔

شیخانی :۔ اسی موئے کے پیچھے اپنی اوقات بھی خراب کی ہے

شیخ جی :۔ تم بیچاری اندرون خانہ بیٹھنے والی تم کو کیا معلوم کہ باہر اور خصوصاً اخباری دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کئی مہینے کے بل ادا نہیں ہوئے ہیں ۔۔۔ ملازمین کی تنخواہ نہیں دی گئی ہے۔ کاتب صاحب پرسوں سے تشریف نہیں لائے ہیں۔ اخبار بھی نہیں لکھا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا اتوار کو پرچہ کیسے نکلے گا۔ پریس مین کے گھر بچہ ہونیوالا ہے وہ الگ بیٹھ رہا۔

شیخانی :۔ اور تم کو میری تو کچھ خبر ہی نہیں۔ کریمن کا میاں بچہ پر سے گر پڑا تھا۔ پرسوں سے وہ نہیں آرہی۔ روٹی مجھ کو اپنے ہاتھ سے پکانا پڑتی ہے۔ آج صبح رمضانی آیا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ کل تک اگر اس کے لونڈے کی تنخواہ نہیں ملی تو وہ اس کو روک لیگا۔ دودھ والے کا الگ تقاضا ہے۔ قصائی کل سے آئیگا ہی نہیں۔

شیخ جی :۔ مگر یہ باتیں تو گھر میں طے ہو سکتی ہیں۔ یہاں تو آبرو پر پانی پھر رہا ہے۔ اڈیٹر صاحب دو ہفتہ کی چھٹی پر کلکتہ تشریف لے گئے تھے وہاں سے ان کا خط آیا ہے کہ ٹرام پر چڑھتے وقت پاؤں پھسل گیا۔ اس لئے موٹر سے ٹکر ہو گئی۔ بڑی سخت چوٹ آئی ہے۔ ہسپتال میں داخل کر دیئے گئے ہیں۔ پندرہ روز کی چھٹی اور روپیہ منگایا ہے۔

شیخانی :۔ کون وہی مرزا جی؟

شیخ جی :۔ ہاں وہی مرزا قلمدار بیگ۔

شیخانی :۔ ان کے لچھن ہی بتاتے تھے کہ وقت پر دھوکہ دیں گے۔ ٹرام سے گرنیکا تو بہانہ ہی بہانہ ہے۔ کل ان کی بیوی بھی آئی تھیں جھوٹے آنسو بہا رہی تھیں۔

شیخ جی :۔ اور پنڈت جی کا بہی کھاتہ کا بستہ کھو گیا۔ کہہ رہے تھے کہ دو تین روز ہوئے حساب ملانے کیلئے گھر لیے جا رہے تھے۔ بغل میں دبائے چلے جا رہے تھے کہ راستہ میں نکل پڑا۔ نہ معلوم کس نشہ میں تھے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوئی۔ مگر خدا نے یہاں آکر دیکھا۔ ساری آمدنی اور خرچ کا حساب تھا۔ کئی تاجروں سے اشتہار کے روپیے وصول کرنا تھے۔ وہ سب کاغذات اسی بستہ میں تھے۔

شیخانی :۔ تو اب کیا ہوگا؟

شیخ جی :۔ ہوگا کیا۔ اب جو آن پڑی ہے وہ بھرنا ہی پڑیگی۔ میں نے

زندہ اور فطری زبان

پانچویں کسوٹی ۔ ادبی زبان میں یک رنگی اور ہم آہنگی کا ہونا لازمی ہے

کسی ملک کی زندہ زبان کی فطری صورت کا مطالعہ کرنے والا اس کی صوتی ارتقاء، بول چال، ہمہ گیری یعنے دیہاتی اور رسمی زبان کے نمونوں کو دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے ۔ جب وہ اس زبان کے ادبی سرمایے پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے اس زبان کے ادب سے لطف اندوز ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوتی اس لئے کہ ادیب یا شاعر کوئی نئی زبان ادب کے لئے وضع نہیں کرتا ۔ جس کی ہیئت ترکیبی و لغوی مختلف ہو، زبان پر بحث کرنے کے لئے ہم چاہے جتنے ذیلی عنوانات قائم کرلیں ۔ مگر ان حدود (یعنے بول چال دیہاتی، دفتری و سرکاری کاروبار) میں زبان اس طرح مقید نہیں رہتی کہ ایک احاطے سے نکل کر دوسرے احاطے میں پہنچ نہ جاسکے ۔ ہزاروں الفاظ بول چال کے ہیں کہ دفتری ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں ۔ اسی طرح سرکاری یا دفتری زبان کا بیشتر حصہ زبان عوام پر ہے ۔ پھر ادبی زبان کی حیثیت (بقول حامیان ہندی) الگ اور مختلف کیوں کر مانی جاسکتی ہے ۔ اس نہج پر اگر آپ اردو و ہندی کا تقابلی مطالعہ کریں تو اردو (ہندوستانی) اسی متذکرہ بالا اصولوں کے ماتحت ملے گی، روزمرہ کی پیروی اور پابندی ابتدا ہی سے اس کو مدنظر رہی ہے ۔ چند تکلف پسند مصنفوں کو چھوڑ کر جو ہر دور میں اُلٹی گنگا بہاتے رہے ہیں جتنے ادیب و شاعر گذرے ہیں ۔ اُنکے ادبی کارناموں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے چلے جایئے کہیں بھی ادبی زبان کی نوعیت زبانِ عام سے جُداگانہ نہیں ملتی ۔ اردو کی داغ بیل ڈالنے والے شعراء میر امنؔ دہلوی سے بیشتر اور بعد کے نثار سب غیر مروج لفظوں کے استعمال کو نہ صرف عیب سمجھتے ہیں بلکہ "غرابت" کو ایک معمولی غلطی کی حیثیت دے کر قواعد کی فہرست میں شامل کر چکے تھے ۔ نظم یا نثر کا ایک ایسا انتخاب اُٹھا لیجئے جس میں انتخاب با ترتیب زمانہ ہوں، اور عہد بعہد پڑتال کرتے چلے جایئے اسی مسلمہ اصول کا جس ادیب شاعر یا انشا پرداز کو پابند نہ پایئں گے تذکروں میں ان کا نام ادبی گنہگار کی حیثیت سے درج ہوگا ۔

اب ذرا "ہندی" کے ادب پر بھی نظر ماریئے ۔ اُردو کے نمونے پر ہندی نثر کا وجود عہدِ فورٹ ولیم (۱۸۰۱ء) سے پہلے نہیں ملتا ۔ اس سے بیشتر کا سرمایہ جو کچھ تحقیقات و تلاش کے بعد ملا ہے وہ "کوہ کندن و کاہ برآوردن" (پہاڑ کھود کر چوہیا نکالنا) کے عین مصداق ہے ۔ "مشربندھو ونود" میں جو ہندی زبان و ادب کا پہلا باقاعدہ تذکرہ ہے کتابی ہندی کی اُردو پر تقدیم ثابت کرنے کے لئے ساتویں صدی تک کھوج لگائے گئے ہیں ۔ مگر جو کچھ ہاتھ آیا وہ اس ہندی (کتابی ہندی) کے ساتھ بے جوڑ ہونے سے اس کو ایک ہار میں نہ گوندھ سکا ۔ "ہندی گدیہ میمانسا" میں پنڈت رمانت ترپاٹھی نے سولہویں صدی عیسوی کے نمونوں اور کہانیوں کی اقتباسات کہانیوں کو محض ناگری رسم خط ہونے کی بنا پر ہندی نثر کی ارتقاء دکھلاتے ہوئے تمہیدی طور پر انکے اقتباسات شامل کئے ہیں ۔ مگر اسے ہندی نثر کی ابتدائی کڑیاں صرف رسم الخط کی یکسانی سے کہنا غلطی ہے ۔ البتہ اس کتابی ہندی نثر کی ابتدا کے بارے میں ایف ۔ اے کیکی کا بیان مضبوط دلائل اور ناقابل انکار صداقتوں پر مبنی ہونے سے زیادہ مستند معلوم ہوتا ہے ۔ موصوف نے بھی وہی کہا ہے جو دوسرے حامیان ہندی کہتے ہیں یعنے یہ کہ ماڈرن ہندی ادبی ضرورتوں سے وجود میں آئی ۔ مگر وہ ادبی ضرورتیں کیا تھیں وہ اُنکے بیان سے آپ خود اخذ کیجئے :۔

> "جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں شمالی ہندوستان میں ہندی کی بہت ساری بولیاں بولی جاتی تھیں ۔ مگر ان لوگوں میں جن کی زبان فارسی نہ تھی شائستہ گفتگو کا ذریعہ اردو زبان کی یا اتنی تھی ۔ اردو میں بہت سے الفاظ فارسی و عربی سے مستعار لئے گئے تھے جن کا تعلق اسلام سے تھا ۔ اس لئے ہندی بولنے والوں کے لئے ایک ایسی ادبی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی جو زیادہ تر ہندوؤں کو مرغوب ہو ۔ اس لئے اردو کو لے کر ایک زبان بدلی گئی اور اس میں سے یعنے اردو میں سے چن چن کر فارسی عربی کے الفاظ نکال دیئے گئے اور ان کی جگہ خالص ہندی اور اصل (سنسکرت) لفظ رکھے گئے ۔"

مصنف ہندی لٹریچر کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اگر ہم اس سے حسب ذیل نتائج استنباط کریں تو غالباً کسی معقول پسند اعتراض نہ ہوگا

(الف) عہد فورٹ ولیم سے بیشتر کہ تمام تحریروں کو جو ناگری رسم الخط میں ہیں صرف رسم الخط کی یکسانیت سے ایک زبان قرار دینا غلطی ہے ۔ اودھی، بندیلکھنڈی، ماگدھی، پوربی الگ الگ زبانیں ہیں ۔ ان کو "ہندی" کی شاخ تک کہنا تو ایک حد تک صحیح ہے ۔ مگر ان کے ادب کو موجودہ ہندی زبان کا ادب سمجھنا درست نہیں ۔

(ب) اُنیسویں صدی کے اوائل مسلمانوں و کشمیریوں اور تعلیم یافتہ طبقے کی زبان فارسی تھی اور ہندوؤں کی اُردو تھی ۔ وہ شائستہ گفتگو کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی اس لئے انیسویں صدی کے آغاز تک ماڈرن ہندی کا نام و نشان نہ تھا

اور نہ اس کا ادب تھا۔

(س) ہندی ادبی زبان کا وجود ادبی ضرورت پر نہیں بلکہ قومی نفرت یا پسندیدگی کے جذبے سے ہوا۔ اور اس سے پیشتر اہل ہند فارسی و عربی کے الفاظ سے برابر ادبی ضرورتوں کو پورا کرتے رہے۔

(د) جدید ہندی کی اشاعت صرف ہندوؤں میں منظور تھی اُسے ہندوؤں کی بین الاقوامی زبان بنانے کا خیال تھا۔ مصنف ہندی لٹریچر کے یہ الفاظ کہ "ایک ایسی ادبی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی جو زیادہ تر ہندوؤں کو مرغوب ہو" کسی تشریح و توضیح کے محتاج نہیں ہیں۔

(ی) اس لئے اگر پھر ہندی کو ہندو مسلمانوں کی قومی زبان بنانا ہے تو یہ نظریہ بدلنا پڑے گا۔ مذہب سے اس کا ناتا رشتہ مخصوص نہ کرکے حدبندیوں سے آزاد کرنا پڑے گا۔ اس طرح جو زبان پیدا ہوگی وہ نہ اسلامی ہوگی اور نہ ہندوانی وہی زبان ہوگی جو بقول ایف۔ اے کیٹی انیسویں صدی کے اوائل میں شائستہ گفتگو کا ذریعہ خیال کی جاتی تھی۔

اگر ہندی کا وجود اس نفس نظریئے کے تحت نہ ہوا ہوتا تو وہ فارسی عربی الفاظ سے یک بیک معترانہ ہو جاتی اور منشی للولال جی کو ایک فارسی عربی لفظ کے بدلے ایک پورا فقرہ مرتب کرنے کی زحمت نہ گوارا کرنی پڑتی اور یہی نظریہ اگر اب تک قائم نہ ہوتا تو اُردو سے مشابہ ہوتے ہوئے ہندی زبان اس قدر مختلف نہ ہو جاتی اور دن دن اس کا اختلاف یوں نہ بڑھتا جاتا۔ چونکہ ہندی کسی ادبی ضرورت پر اردو سے متمائز نہیں ہوئی ہے اور اس کے وجود کا سبب خاص مذہبی عصبیت ہے اس لئے اس جذبے کے ختم ہوتے ہوئے اُردو سے مل جانا چاہیئے۔ جب تک دونوں زبانوں کا اختلاف باقی ہے یقیناً یہ سمجھا جائیگا کہ وہی جذبات ادبی ضرورت کی تہ میں کام کر رہے ہیں۔

اظہار حقیقت کے اس صاف اور کھلے انداز کو ممکن ہے کہ نازک طبائع کو کدر بھی ہو۔ میں اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ اردو ہندی کا اختلاف لسانی و ادبی ضرورت پر نہیں ہے جس کا اعلان بہت گھما پھرا کر کیا جاتا ہے۔ عام طور پر اردو سے جو چشم پوشی اور بے اعتنائی برتی جا رہی ہے وہ اسی نفرت کے اثرات ہیں جس کی تخم ریزی انیسویں صدی کے شروع کی گئی تھی۔ جب تک اس ذہنیت کو جڑ سے اکھاڑ نہ پھینکا جائے گا ہندوستان کی قدرتی زبان کو فروغ پانے میں بیش از بیش دشواریاں ہیں۔ زبان کے بہت سے نادم آج ملک میں کمیاب ہیں۔ جو ہیں بھی ان کی آواز پُر اثر ہونے کے باوجود نہ اتنا اثر دکھا کر اور زبان سے کہلا کر بے اثر رہ جاتی ہے کہ "بھائی بات تو ٹھیک ہے لیکن ......" بس یہ "لیکن" ساری حقیقت پسندی کو نگل جاتا ہے۔ کیا یہ حقیقت اب بھی ہماری نظروں سے چھپی ہوئی ہے کہ "ہندی زبان میں وہ تبدیلی جو اُسے اردو سے متمائز کراتی ہے دھیرے دھیرے نہیں بلکہ یک بیک ہوئی ہے اس لئے ہم اس کی مثال دریا کی شاخ سے نہیں بلکہ ریل کی شاخ لائن سے دینا مناسب سمجھتے ہیں جس کی

ٹرینیں لڑیں اپنے بل پر، پانی کی طرح قدرتی راستہ پر آزادانہ گھوم پھر کر نہیں چلتیں بلکہ انجن کے جھٹکے، ڈرائیور کے ہینڈل کی گردش اور انجینیر کی تعمیر کردہ آہنی لائن پر جدھر لیجائی گئی ہوتی ہے اُدھر ہی کو جاتی ہیں یہی سبب ہے کہ ہندوستان کی زبان اور اُس کے مقابل وضعی زبان میں اس قدر فرق ہے۔

(ن۔پ) اور پھر قابل غور امر یہ ہے کہ ہم جب بول چال کی زبان کو اردو ہندی کی تقسیم سے بالاتر بلا ایک لفظ یا ایک شوشہ کے فرق کے زبان واحد مانتے ہیں اور مقام مسرت ہے کہ بول چال کے معیار پر حال میں جو ریڈریں محکمہ تعلیم یو۔پی نے گذشتہ سنہ میں منظور کیں وہ بدستور قدیم چند لفظوں کے اختلاف سے جو درمیان میں رونما ہوئے تھے بالکل پاک ہیں۔ پھر ادبی زبان ہندی اور اُردو کی خلیجوں کی چوڑائی بھی کم ہونی چاہیئے۔ اس لئے اردو اور ہندی دونوں میں سے ہر ایک کا فطری ہونا اس وقت مسلّم ہوگا جب ادبی زبان اور زبان عام کی وہ مغائرت جائز خیال کی جائے جو ہندی کی ادبی زبان ———— اور عام زبان میں نظر آتی ہے۔ مگر میں اس مضمون کے کسی اگلے حصے میں عرض کر چکا ہوں کہ بول چال اور ادبی زبان کے ڈھانچے میں (قواعد صرف و نحو میں) اور مزاج (یعنے لفظوں کی ترکیبیں، اُن کا باہم اتصال یا جوڑ، دوسری زبان کے الفاظ کا داخلہ، لب ولہجہ، حرکت و سکون) بھی یکساں ہوتا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ زبان میں زیادہ تر لفظوں کے لغوی اور حقیقی معانی مطالب کی تشریح کرتے ہیں۔ ادبی زبان میں لفظوں کے لغوی معنوں سے گذر کر اسکے مجازی معنی کارفرما ہوتے ہیں۔ ادبی زبان چونکہ تشبیہوں، کنایوں اور استعارں سے لبریز ہوتی ہے اس لئے اس میں ایک حسن کشش اور دلربائی پیدا ہو جاتی ہے ادائے بیان میں بھی زبان عام کے مقابلہ میں زیادہ ندرت، زیادہ رنگینی اور زیادہ زور ہوتا ہے۔ ادب کے موضوعات، بول چال کے موضوعات کے حدود کو پار کرکے اس زمین اور آسمان کے ذرّے ذرّے تارے تارے کو ہی سمیٹنے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ادبی تخیل کتنے نئے عالم، کتنی نئی دنیا، کتنے نئے آسمان و زمین کی تخلیق کرکے موضوعات ادب کی فراہمی کرتا ہے، پھر بھی عالم ادب کو وسعت ہی کی تمنا رہتی ہے۔ مگر ان معنوی تمیزوں سے زبان کی ہیئت ظاہری نہیں تبدیل ہوتی۔ بلکہ اسلوب بیان بدلتا ہے اور ظاہر ہے کہ اسالیب بیان کی رنگینی سے زبان کی یک رنگی ہرگز مفقود نہیں ہو سکتی۔

اب یہ واضح کرنے کے بعد ادبی زبان کو ادبی ضرورت کی بنا پر زبان عام سے مختلف قرار دینا اصلیت اور واقعیت کے برعکس ہے ہم اُردو یا ہندوستانی اور ہندوستانی کی جدید دعویدار ہندی۔ ہندوستانی ادب کا جائزہ لینا چاہتے اور دیکھنا چاہتے ہیں۔ زبان کی یک رنگی اور ہم آہنگی کس میں ہے اور کس میں نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ہم اُس عام غلطی کو بھی جو ہندی کے حامیوں کی جانب سے پھیلائی جا رہی ہے ہم دور کرنا چاہتے ہیں...... وہ عام غلطی جس پر اس قدر اصرار ہے

وہ ہے یہ غلط پروپیگنڈہ کہ ادب کے لئے چلن کے الفاظ کافی نہ ہونے سے ہندی ادبی زبان کا عام زبان سے متاثر اور مختلف ہونا لازمی ہے۔ نازک جذبات، لطیف احساسات کومل بھاؤں کے بیوہار میں لانے کی سکت چلن کے الفاظ میں نہیں ہے۔ مگر تجربات اسکے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔

زبان کے نمونوں کو لے کر بحث کرنے سے پہلے محض عقلی طور پر بھی نہایت آسانی سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ الفاظ کی یہ کمی صرف سنسکرت کے آگے ہاتھ جوڑ کر کیوں پوری کیجائے۔ تجربات اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک مقام خاص پر فارسی اور سنسکرت دو مرادف الفاظ میں اکثر فارسی لفظ ہی زیادہ زیب دیتا ہے۔ "مزدور" اور "شرم جیوی" میں آپ کسے پسند کرینگے، صلاح و مشورہ اور گوشٹھی ہم معنے ہیں۔ ہندی کا ادیب ان میں سے کس کو نظر انداز کرے گا، اگر یہ عام زبان میں شامل کر دیئے جائیں تو آیئے "گلاب اور دل" کو لیجئے جو گوناگوں ادبی تخیلات کا جاذب اور مرکز ہے اس کے مقابل سنسکرت میں "پاٹل" اور "ہردے" کے الفاظ ہیں۔ کیا ہندی کے ادیبوں نے گلاب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اور "پاٹل" کو ہردے سے ایک لمحہ کے لئے الگ نہیں کیا۔ کیا ان کے "دل کی کلی" "گلاب" کی شگفتگی و تر و تازگی سے نہیں کھلی۔ لہذا معلوم یہ ہوا کہ ادبی ضرورت کے لئے بول چال کے دائرے سے ایک قدم آگے بڑھ کر جب اور الفاظ کی ضرورت ہوگی تو جو الفاظ مزید لئے جائیں گے وہ فارسی، عربی سنسکرت سب ہی کچھ ہو سکتے ہیں۔ اس لئے جس طرح ہماری زبان عام کا لفظی سرمایہ عربی، فارسی، سنسکرت سے مخلوط ہے اسی طرح ادبی زبان کا سرمایہ بھی مخلوط ہی ہوگا۔ اقلیدس کا یہ عام علوم متعارفہ زبان پر بھی صادق آتا ہے کہ برابر چیزوں میں اگر برابر جمع کیا جائے تو مجموعہ برابر ہوگا۔ نابرابر چیزوں میں اگر برابر جمع یا تفریق کیا جائے تو نتیجہ نابرابر ہی ہوگا۔ اس لئے ادبی ضرورت پر نئے لفظوں کی بھرتی سے زبان کے تبدیل ہونے کی منطق محض خیالی ہے یا ایسے وکیل کی بحث ہے جو کمزور مقدمات کی پیروی کو اپنی ذاتی اغراض کی بنا پر زوردار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے ساہتیک (ساہتک) بھاشا کی پناہ بیکار ہے۔ اور اب ہمیں ہندی کے ادبی زبان کے مختلف نمونوں کو دیکھنا ہے۔ سب سے اول یہ امر غور طلب ہے کہ جیسا کچھ ہندی کی تخلیق کے وقت سوچا گیا تھا۔ دیئے یہ کہ ہندی والوں کو ایک ایسی ادبی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی جو زیادہ تر ہندوؤں کو مرغوب ہو سکے،، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں سے چن چن کر عربی فارسی الفاظ خارج کئے گئے اور انکی جگہ ہندی الاصل یا سنسکرت الفاظ رکھے گئے، اس منصوبے میں کلی طور پر عملاً کامیابی ہوئی یا نہیں؟ ہندی کا متبدی ہی جان سکتا ہے کہ زبان کے فطری رجحانات کی بدولت فارسی و عربی لفظوں کا قطعی بائیکاٹ ہندی کے اہل قلم سے نہ ہو سکا۔ للو جی لال کے بعد سدل مصر نے ہی مروج فارسی، عربی لفظوں، محاوروں سے ایک خاص تناسب کے ساتھ فائدہ اٹھایا۔ اسی طرح ہندی ادبی زبان کا کوئی مستقل معیار نہیں ملتا۔ (۱) ٹھیٹ ہندی، (سنسکرت آمیز ہندی) (۲) مشرت ہندی یعنی ایکے، دو کے فارسی و عربی لفظوں سے ملی ہوئی ہندی کی دو شاخیں شروع ہی میں ہو جاتی ہیں اور لطف یہ کہ دونوں اردو سے مختلف آگے چل کر ان دو خانوں میں بھی ہندی زبان مقید نہ رہ سکی، افسانہ نگاروں نے مشرت ہندی سے ایک قدم آگے بڑھایا اور اردو سے جا ملے۔ ٹھیٹ ہندی ایک قدم نیچے اتری اُس میں فارسی و عربی لفظ گھسنے لگے۔ اب تینوں قسم کی زبانوں کے نمونے ملاحظہ فرمایئے۔

(ہندی کسما نجلی صفحہ ۹۰ برائے درجہ ہفتم)	(ترجمہ اردو روزمرہ)
جس سمے ہر کرات اپنے دھنش کا ٹنکار کرتا ہے اُس سمے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آکاش پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔ اس کے کاریہ تو اس کے بیش کے انوکول نہیں ہیں بیش اس کا کراتوں کے سدرش ہے پر کاریہ اس کا سرو تھا الوکک ہے۔ آت ایو مجھے سندیہ ہوتا ہے کہ یہ وستو تہ کرات نہیں یہ تو کوئی اور ہی کیونکہ چھپانے پر بھی منشیہ کا اصلی روپ اُس کی چیشٹاؤں سے پرکٹ ہو جاتا ہے۔	جس وقت یہ کرات اپنے دھنش سے تیر پھینک رہا تھا اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا گویا آسمان پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا ہو اس کے کام تو اس کے بھیس یا شکل ظاہر کے مطابق نہیں بھیس تو اس کا کرانوں (جنگلی قوم کی طرح ہے۔ مگر کام سراپا دیکھ، غیر انسانی (ملکوتی) ہے۔ اس لئے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت کرات نہیں ہے یہ تو کوئی اور ہی ہے۔ کیونکہ چھپانے پر بھی انسان کی اصلی صورت اس کی حرکتوں اور خواہشوں سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔

دونوں عبارتوں کو مقابل رکھ کر پڑھئے یہ ادبی زبان اور ادبی پیرایہ بیان ہے اس کو ادب کے منتخب کورس میں چن کر رکھا گیا ہے۔ اب جو لوگ ہندی کو اردو سے سہل بتاتے ہیں وہ ذرا ہمیں یہ سمجھا دیں کہ بھیس کو ویش کر دینے میں کیا سہولت ہوگی؟ یا کونسا ادبی نکتہ پیدا ہو جائیگا کار اور کام کی معروف صورت کو "کاریہ" کی قدیم اور نامانوس، غیر معروف صورت سے کیونکر کمتر سمجھا گیا ہے۔ اور تمام مادی عبارت کو چھوڑ کر عربی اور سنسکرت کا ایک ہی لفظ مقابلہ میں رکھتا ہوں۔ "در اصل" اور "وستو تہ" ان دونوں لفظوں میں کونسا زیادہ عام فہم ہے نیز ثقالت اور بھدا پن کس میں ہے۔ ہندوستان کا کونسا ایسا گوشہ ہے جہاں کے لئے در اصل اور در حقیقت سمجھنا مشکل ہوگا۔ اور کون سی سرزمین پاک ہے جہاں بلا معنے بتلائے وستو تہ کوئی سمجھیں گے کیا یہ ساری کوشش کسی ادبی و لسانی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے کی گئی ہے؟ پھر یہ بھی دیکھ لیجئے کہ سدرش[1] کے آگے کس جذبے کے تحت نظر انداز کیا گیا ہے اس لئے کہ ہندوستانی مرکب لفظ کے بدلے "آت ایو" کو جگہ دینا جس کی غرابت مسلمہ ہے، کیا معنی رکھتا ہے۔ باوجود کامل احتیاط اور چوکسی کے نہ معلوم کس راستے سے "معلوم" اور "اصلی" مصنف کے دماغ میں آئے اور زبان قلم سے بے ساختہ کاغذ پر ٹپک پڑے۔ اب دوسری قسم کی ہندی (مشرت ہندی) کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ یہ پیرے گراف ادبی ریڈر سے لیا گیا ہے جس سے پہلا ٹکڑا لیا گیا ہے۔

---

[1] سچا رس، اصلی اور قدیم تلفظ پر خوش عقیدگی رکھنا۔

ہندی کسما نجلی حصہ بڑے درجہ ختم
(ہندی خواں طلبہ۔ دلی دربار صفحہ ۱۳۵)
جگت پربھو پرماتما کی الکپ انوگرہ سے
دلی دربار اتینت سماروہ سے سمپن
ہو سانند سماپت ہوگیا۔ دہی دربار جس
کی بے نظیر تیاریاں مہینوں سے ہو رہی
تھیں جسکے انتظار میں ایک ایک گھڑی
برسوں برابر بیت رہی تھی جسے دیکھنے
اور شریک ہونے کے لئے سارا بھارت
درش بیاکل ہو رہا تھا۔ ۷ دسمبر ۱۹۱۲ء
کو سمراٹ جارج پنجم کے دلی میں پدھارنے
سے آرمبھ ہوکر ۱۶ دسمبر ۱۹۱۲ء کو انکے
پرستھان کرنیکے ساتھ سماپت ہوگیا۔

ترجمہ

خدائے جہاں کی بے حد مہربانی سے
دلی کا دربار بہت ہی شان و شوکت کے
ساتھ بخیر و خوبی ختم ہوگیا جسکی بے نظیر
تیاریاں مہینوں سے ہو رہی تھیں جس کے
انتظار میں ایک ایک گھڑی برسوں برابر
بیت رہی تھی۔ جسے دیکھنے اور جس میں شریک
ہونے کے لئے سارا ہندوستان بے تاب
بے چین ہو رہا تھا۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۲ء کو
شہنشاہ جارج پنجم کے دلی تشریف فرما ہونے
سے شروع ہوکر ۱۶ دسمبر ۱۹۱۲ء کو تشریف
لے جانیکے بعد ختم ہوگیا۔

یہ طرز نگارش کسی معمولی ادیب کا نہیں ہے بلکہ پنڈت پدم سنگھ شرما جیسے عالم سنسکرت اور ایک فاضل نقاد نگار کا ہے آپ دیکھتے ہیں کہ سنسکرت کے بھاری بھرکم مشکل لفظوں کے پہلو بہ پہلو فارسی و عربی کے مروج و موزوں و بر محل الفاظ بھی جا بجا چمک رہے ہیں۔ بے نظیر تیاریاں۔ شریک ہونے۔ دربار وغیرہ الفاظ و ترکیبیں ٹھیک اسی طرح مستعمل ہیں جس طرح اردو میں آتے ہیں۔ کیا فاضل ادیب شرما جی اس کی جگہ سنسکرت الفاظ نہ رکھ سکتے تھے؟ وہ سنسکرت اور ہندی کے جید عالم تھے! پس ناچار یہ ماننا پڑے گا کہ برمحل لفظ اگر کسی بھی زبان کا مل جائے تو اپنی زبان میں گھل مل جاتا ہے اس کو کام میں لانا۔ لکھنا اور بولنا ہندی ادیبوں کی نظر میں نہ صرف جائز ہے۔ بلکہ قدیم اور غیر مانوس لفظوں کے مقابل اسے فضیلت دی گئی ہے۔ یہاں اس بحث کو نظر انداز کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا پیرے گراف میں ہندی اور اردو عبارتیں ایک دوسرے سے حرف بحرف مشابہ کیوں نہیں ہیں اور پنڈت جی نے تھوڑی نہیں بلکہ کافی سے زیادہ حد تک ایسی عبارت کیوں لکھی ہے کہ وہ اردو اور روزمرہ کی زبان سے تمیز ہو سکے؟

اب اس ہندی کو اردو کے بالمقابل رکھئے جو بہ تغیر چند الفاظ بالکل اردو معلوم ہوتی ہے۔

(الف) بہاری کے ایک دوہے پر تنقید کے سلسلے میں پنڈت پدم سنگھ شرما لکھتے ہیں جنکی سنسکرت الفاظ سے گرانبار ہندی اور خال خال فارسی و عربی کے زندہ الفاظ اور روزمرہ کے برجستہ فقروں سے ملی جلی زبان کا نمونہ اوپر دیا جا چکا ہے۔

"دوہے کی بانکپن (لوہے کا بے جان قلم) اس کی کیا داد دے گی بڑے بڑے شہروں کے بڑے صاحب ذوق حضرات سے دل ہی کچھ اسکی داد دیں کے جو اسکی چوٹ سے پڑے تڑپتے ہونگے"

"اس پرکار (اس طرح) بہاری جی اس میدان میں گاتھا کار اور کیشوداس دونوں سے آگے نکل گئے ہیں کیا اچھا سنسکار (اصلاح) کیا ہے۔ مضمون چھین لیا ہے"

پدم سنگھ شرما۔ (از سنجیون بھاشیہ)
(اصلاح کے طور پر)
پدم سنگھ شرما (سنجیون بھاشیہ سے)

چوٹ سے تڑپنا۔ داد دینا۔ مضمون چھین لینا۔ خالص اردو روزمرے اور محاورے ہیں۔ جب فارسی و عربی کے مروج الفاظ سے گذر کر اردو محاورات و روزمرہ ہندی ادب میں لایا جا سکتا ہے تو پھر ساہتیہ کا نام لے کر نرالی ہندی کی ایجاد کرنا فضول سا ہے۔

(ب) اب ذرا موجودہ دور کی افسانے والی زبان بھی دیکھئے۔

پنجاب میل کا اول درجہ سورگ (بہشت) کا نمونہ ہے۔ جیسے گنگا کا مان چترد نقشہ کتابوں میں دیسے ہی پنجاب میل کے اول درجہ میں بہشت کا نقشہ موجود ہے۔ اسے الکاپری یا امراوتی کا نمونہ کہنا کوئی بے جا بات نہیں۔ ہیرالال بابو کو اول درجہ میں چڑھا کر ہم نے انجن سے گارڈ کے ڈبے تک دو۔ دو بار چکر لگایا" شیو پوجن سہائے بحوالہ ہندی گدیہ شیلی کا وکاس صفحہ ۱۳۸۔

"اول درجہ"، "بہشت کا نمونہ" "بہشت کا نقشہ" "امراوتی کا نمونہ" "کوئی بے جا بات نہیں" وغیرہ الفاظ و مرکبات اور انکی محاکاتی طاقت کا اندازہ میں ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔ یہاں صرف میں یہ دکھلانا چاہتا ہوں "اردو پن" نے یہاں کونسا ادبی شوشہ تھا جسے بگاڑ دیا۔ اور جس کا پتہ خود لکھنے والے کے بڑھ کر بات بنانے والے کو ہے اگر آپ نظر انصاف ڈالیں تو دیکھیں گے متذکرہ بالا الفاظ نے جو خالص ہندوستانی ہو چکے ہیں، اس عبارت میں جان ڈال دی ہے۔ ہندی والوں کی مخصوص ذہنیت اگر دماغ سے اترنے والے الفاظ کا راستہ نہ روکے تو اردو ہندی نثر میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہندی کے اہل قلم میں کثرت ان لوگوں کی ہے جو اردو سے نفرت رکھتے ہیں اور اس نفرت سے متاثر ہوکر ہندی کا چہرہ بگاڑ کر غیر فطری کر دیتے ہیں۔ آزاد قلم ہندی کے انشا پرداز بھی اس سے متاثر ہوکر اکثر نیچرل ہندی کے کشادہ شاہ راہ سے ہٹ جاتے ہیں۔ مگر جب ادائے بیان کا جذبہ اس احتیاطی جذبے پر غالب آجاتا ہے تو زبان کی نیچرل صورت ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ آپ ہندی کے مضمون یا ادیبوں کے ادبی شاہ کاروں میں یک رنگی اور ہم آہنگی نہیں پا سکتے۔

سب سے اول جو نمونہ دیا گیا ہے وہ بھی ہندی ہے۔ اور ساہتیک بھاشا کا نمونہ ہے پھر دوسرا نمونہ جو پنڈت پدم سنگھ شرما کے مضمون دلی دربار سے لیا گیا ہے وہ بھی ہندی کے ادب العالیہ میں گنا جاتا ہے۔ پھر تیسرے قسم کی ہندی کے نمونے جو (الف) (ب) پیرے گراف میں ہیں وہ بھی ہندی ہیں: تو پھر ہندی ادبی زبان کی خصوصیت کیا مانی جائے؟

پہلے اور دوسرے گروپ کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا تھا کہ شاید ہندی ادبی زبان سے مراد وہ زبان ہے جو اُردو سے اسما صفات میں مختلف ہو، مگر تیسرے گروپ میں آنیوالی زبان تو اس حد سے بھی باہر جاتی ہے۔ اب اس کے اسباب پر غور فرمائیں۔ ہندی زبان کا مستقل معیار کیوں نہیں قائم ہوتا۔ اس کی یکرنگی اور ہم آہنگی، نیرنگی اور رنگا رنگی سے کیوں بدل جاتی ہے؟

اس بارے میں پنڈت رام نریش ترپاٹھی کے خیالات یہ ہیں:-

بہت سے عربی و فارسی شبدوں کا پریوگ (استعمال) اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب ان کے استھان (جگہ) پر سنسکرت یا پراکرت کے پرایا یہ باچی شبد (مرادف الفاظ) ڈھونڈ کر نکالے جائیں تو یا تو کچھ ارکھ (مطلب) نہ نکلیگا۔ یا بھاشا اتنی کٹھن ہو جائے گی کہ سرب سادھن (عوام) تو کیا شکچھت ہندو (تعلیم یافتہ ہندو) بھی کٹھنتا سے سمجھ سکیں گے۔"

پس صاف ظاہر ہے کہ "شدھ ہندی" کا سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے قدیم زبانوں کا سیکھنا یا آثار شکستہ سے تہذیب و حالاتِ قدیم کا پتہ لگانا۔ میں نہیں کہتا کہ اسکی ضرورت نہیں ہے۔ مگر جدید اور قدیم کی اس خلط ملط سے کیا فائدہ۔ اس کیلئے ہمیں سنسکرت زبان سیکھنی چاہیئے بھلا یہ کونسی تک ہے کہ آدھی سنسکرت اور آدھی ہندی۔ جب ہی تو اس قسم کی زبان کے مہمل اور مشکل ہونے کا اعتراف پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے اوپر کے اقتباس میں کیا ہے اور بہت سے دوسرے معقول پسند ہندی داں اُن کے ہمخیال ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ ہندی زبان کی مختلف تحریریں اپنے مختلف قسم کے ذخیرہ الفاظ کی بدولت ایک دوسرے سے مختلف ہوگئیں ہیں۔ جنہیں یہ منظور رہا کہ ایسا لکھو کہ سمجھنے میں دقت نہ ہو اُنہوں نے مستعمل لفظوں کی آمد نیچرل انداز میں لکھا۔ مقصدِ اوّل پر جن کی نظر گڑی اُنہوں نے اُس کو پیش نظر رکھتے ہوئے گردو پیش (ماحول) کی مطلق پروا نہ کی شدھ ہندی وجود میں آگئی۔ کچھ لوگ بیچ بین بین رہے۔ انکی کوششوں سے ایک بے جوڑ زبان وجود میں آئی جسے وہ خود بھی مشرت ہندی کہتے ہیں۔

اس وقت بھی جب کہ مدرسوں میں ہندو طلبا کو ہندی تقریباً لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جارہی ہے۔ ہندی پرچار کے نے ناگری ہندی پرچار کی، اور ہندی ساہتیہ سملین سبھائیں۔ ہندی پرچارک منڈلیاں۔ ہندی کے بکثرت اخبارات اور رسالے مدّت سے اپنے مقصد کی تکمیل میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں شدھ ہندی نویس انشا پرداز کمیاب ہی نہیں معدوم ہیں۔ بلکہ بعض بعض شبد کے خلاف اس زبان کی اشاعت کو ثواب عظیم سمجھ کر میدان میں علم جہاد لے کر اُتر آئے ہیں جس میں نہ تو فارسی و عربی لفظوں کا بائیکاٹ ہے اور نہ غیر مروج شبدوں کی بھرمار۔ کاکا کالیکر صاحب اسی جہادی لشکر کے سالار اعظم ہیں۔ آپ کا ایک مضمون رسالہ اردو اپریل نمبر ۱۹۳۷ء میں کسی ہندی رسالے سے لیا گیا ہے جس میں آپ فرماتے ہیں:-

"دیش کی صوبہ جاتی زبانوں میں اردو فارسی اور عربی کے الفاظ کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ جہاں جہاں "بھاشا کی شدھی" کے خیال سے ان الفاظ کو نکالنے کی کوشش کی جارہی ہے وہاں ہم سختی سے اس تحریک کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان صوبہ جاتی زبانوں میں بہت سے ہندی کے الفاظ موجود ہیں، اگر ہم ان مضامین میں ان الفاظ کا استعمال کریں جو ان زبانوں میں مشترک اور ہم معنی ہیں تو اس زبان کو سب لوگ آسانی سے سمجھ سکیں گے۔"

اُردو کی ہمہ گیری کا اس سے بڑھ کر اقرار اور کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر بفرض محال یہ سب باتیں کہنے سننے کی اور عملاً وہی ہٹ دھرمی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ اپنی ہٹ پر قائم ہیں وہ اپنے ماضی کے عشق میں گرفتار ہیں عشق اور خرد میں اتفاق ناممکن ہے۔ ورنہ جوانی کا شعور عہدِ طفلی کے واپس لانے میں ضرور کوشاں ہوتا یہی سبب ہے کہ اکبر مرحوم نے صاف صاف کہدیا تھا۔

اُردو میں خوب شریک ہونیکے نہیں	اس ملک کے کام ٹھیک ہونیکے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرالقیس بنیں	پنڈت جی بالمیک ہونے کے نہیں

ایک دھوکا۔ زبان کے بارے میں اعتدال سے دُور جا پڑنے کا سبب وہ مغالطہ ہے جو ہندی خوانوں اور اُردو خوانوں کے اعداد و شمار سے پیدا ہوگیا ہے لوگوں نے اس بات کو ذرا دیر سے سمجھا کہ زبان کے مسئلہ میں اکثریت اور اقلیت بے اثر چیزیں ہیں اور اوٹ شماری سے اگر ایک جانب ۹۹ اور دوسری جانب ایک کی نسبت ہو جب بھی ننانوے زبان کی قدرتی شکل کو مسخ نہیں کر سکتے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے صوبے کے ۶۰ فیصدی مصنف اپنی تحریروں میں فارسی و عربی لفظوں سے پرہیز کر رہے ہیں مگر جب وہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو کہیں قلم سے "تاکہ" نکل جاتا ہے کہیں "تاہم" "مگر" "اگر" کا شمار نہیں، بیچارہ کاٹتا چھانٹتا ہے۔ پرانے دفینے سے پرنتو، کنتو، اتھوا نکالا جاتا ہے۔ لفظوں کی جیتی جاگتی زندہ دل سپاہ کے ساتھ ڈیڑھ ہزار برس کے گڑے ہوئے مُردے لاکھڑے کئے جاتے ہیں۔ اس طرح شدھ ہندی کی صورت وجود میں آتی ہے پھر بھی ہندی کے والنٹیروں کو حکم ہوتا ہے کہ ایک ساتھ مل کر پکارا آؤ کہ "ہندی جیوت بھاشا ہے" مگر سامنے انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہو کر ان بلند بانگ دعووں کی پول کھول دیتے ہیں۔

لطیفہ۔ اس موقع پر میں اپنے ایک شدھ ہندی نویس دوست کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ آدمی ملنسار ہیں اور وطنی جذبات سے پُر، ایک روز میں ان سے ملنے گیا۔ ازراہِ محبت فرمانے لگے۔ میں نے اپنے چچا کو ایک پتر لکھا ہے آپ کو سناؤں۔ اس خط میں شدھ ہندی کو نہایت مستعدی سے نبا ہا گیا

تھا۔ مجھ کو خط پڑھ کر سناتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ مولوی صاحب! آپ ہندی جانتے ہیں۔ سمالوچنا کی درشٹ (تنقیدی نظر) سے دیکھیئےگا ایک بگ غریب سے لغزش ہوگئی تھی "لیکن" لکھ گیا تھا، اس جگہ پر پہونچتے ہوئے بولے ارے رام رے "لیکن"، نہیں کنتو ہونا چاہیئے۔ میں ہنس پڑا اور کہا لیکن سے حرج کیا ہے میرے دوست نے فرمایا کہ شُدھ ہندی کے مریادا (خالص ہندی کے منصب عزت) سے یہ لیکھ گر جائیگا۔

ہمارے ہندی کے وِدوانوں کا یہ مت ہو کہ جو شبد ہماری سنسکرت بھاشا میں ہیں اُنکے بدلے آنیہ بھاشا (غیر زبان) کے شبدوں کا پریوگ اُچت (مناسب) نہیں۔ یہ خیالات شخصی نہیں عام ہو چکے ہیں، انہیں خیالات نے ہندی کی اصلی صورت کو مسخ کیا ہے۔ اُردو سے جو دُوری برتی جارہی ہے وہ کسی لسانی ضرورت پر نہیں ہے۔

اس قدر ہوشیاری اور مستعدی کے باوجود بھی بسا اوقات اصلی زبان سے گریز مشکل ہو جاتی ہے جس طرح ہندوستان میں رہ کر انگلینڈ کی ہوا میں سانس لینا ناممکن ہے۔ اُسی طرح دورِ موجودہ میں زبانِ قدیم کا ملکی اور قومی بننا غیر ممکن ہے۔ اب وہ دن قریب ہیں کہ دماغوں سے یہ غلط فہمی دور ہو جائے بدیسی چیزوں کی طرح فارسی عربی کے وہ الفاظ بھی جو مدت سے تحریر و تقریر میں آتے رہنے سے ہندوستانی زبان و ادب کا زیور بن چکے ہیں غیر ہندوستانی قرار پاکر خارج کرنے کے قابل نہیں۔ ان حضرات کو سمجھنا چاہیئے، بدیشی اشیا کا بائیکاٹ ہماری ملکی تجارت کے فروغ کا باعث اور بدیسی الفاظ کا اخراج اس کے برعکس زبان کے سرمائے کو گھٹا کر اس کا گلا گھونٹنے والی اسکیم ہے۔ ان حضرات کی خدمت میں مسٹر لبمبھر لال کی مندرجہ ذیل روشن رائے پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

"ہماری غلطیاں یا باہر والوں کی خود غرضانہ دست اندازیوں سے ترقی کی یہ باڑھ ماری گئی لیکن اس تحریک کے اثرات ہماری زندگی میں اتنی گہرائی تک پیوست ہو چکے ہیں کہ انہیں باہر نکالنے کی کوشش خودکشی کے مصداق ہے کون سمجھدار ہندو گلاب کو باغ سے اس لئے نکال پھینکے گا کہ وہ ایران سے آیا ہے یا روٹی کھانا بند کر دیگا کیونکہ اُس کی زبان میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے؟ ہماری پوشاک کا نصف بہتر حصّہ مسلمانوں کی دین ہے شمالی ہند میں ہر ہندو شادی کے وقت نوشہ بنتا ہے اور اُسکی شادی سہرے اور جامے کے بغیر پوری نہیں ہوتی، ہماری بہنوں کے بہت سے زیور، ہمارے کل پرزے یہاں تک کہ چارپائی اور بستر اور رشتہ داروں کے القاب، رنگ و روغن، بہتیوں کے کاغذات، میوے اور مٹھائیاں غرض ہر کہیں اسلامی تہذیب کا نقش موجود ہے، کاغذ، قلم، دوات، سیاہی اور عینک کے بغیر ہمارے مصنفوں کا کام ایک دن بھی نہیں چل سکتا"

اُردو ہندی کا قضیہ از لبمبھر ناتھ بحوالہ اردو اپریل نمبر ۱۹۳۶ء

پس برادرانِ وطن! فارسی، عربی کے الفاظ ہندوستانی کے لئے غیر ملکی نہیں اور نہ باعثِ ننگ ہیں۔ وہ ہماری زبان کے لئے سرمایۂ ناز ہیں۔ ان انمول رتنوں سے زبان کے خزانے کو پُر کرنے کی بجائے ادب ہندی کے تاج میں جڑ کر اسے جگمگانے کی بجائے تم اسے نکال کر پھینک رہے ہو، یقیناً یہ تنگ نظری نہیں بے ہوشی ہے۔ وطنیت کے علمبرداروں سے ہرگز یہ توقع نہیں کیجا سکتی تعصب تصویر کا ایک ہی رُخ دکھلاتا ہے۔ فارسی عربی لفظوں کا محض بدیسی ہونا یاد رہ گیا باقی خوبیاں (چلن، رواج، لوچ، گھلاوٹ، شیرینی، بانکپن، تیکھاپن وغیرہ) سب بھول گئیں۔ یا نظرانداز کر دی گئیں۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ ادبی زبان کی اس شق کے متعلق تھا کہ اردو ہندی کا ذخیرہ الفاظ کس قسم کا ہے اور ذخیرۂ الفاظ کی بنا پر دونوں میں فرق کیا ہے۔ ہم نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ہندی ادبی زبان میں سوائے اسکے اور کوئی معیار نہیں کہ ایسی زبان لکھی جائے جو اُردو سے تمیز پاسکے۔ کہیں کہیں پورے پیرے گراف میں سنسکرت آمیز چھٹا (بہار) ہے تو کہیں "سادہ"، شستہ اور دل نشین پیرایہ بیان، کہیں دونوں کی گنگا جمنی شان سے مشترت ہندی وجود میں آجاتی ہے۔ اگر ہماری ذہنیت تفریق اور تمیز کی طلبگار نہ ہو تو سہ رنگی کی جگہ یک رنگی نظر آئے۔ نیچے ایک پیراگراف رسالہ مادھوری سے نقل کرکے اس ذہنیت کو میں اور صاف کرنا چاہتا ہوں:-

زمین کی چھوٹی چھوٹی ملکیت کے سمبندھ میں کمیشن کا کہنا ہے کہ اس سے پیداوار کو نقصان پہونچتا ہے۔ ہندوا و مسلمان دونوں میں پیترک سمپت سبھی پتروں کو برابر ملتی ہے۔ پر اس رنئے میں ہو ہی کیا سکتا ہو بیکاری منڈل دوارا کھیتی کرنے سے اس ترٹ کو دور کیا جا سکتا ہے پنجاب کے کا۔ی منڈل نے آشا تیت اُنت کی ہے پر مدھیہ دیس میں قانون دوارا یہ ترٹ دور کی گئی ہے۔
(مادھوری کھنڈ ۱ از سکھما دارگ ترشن ۱۳)

زمین کی چھوٹی ملکیت کے بارے میں کمیشن کا بیان ہے کہ اس سے پیداوار کو نقصان پہونچتا ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں میں موروثی جائداد سب ہی بیٹوں کو برابر ملتی ہے۔ پر اس بارے میں ہو ہی کیا سکتا ہے۔ البتہ کوآپریٹیو سوسائٹی کے ذریعہ کھیتی کرنے سے نقص کو دور کیا جا سکتا ہے۔ پنجاب کو اپریٹو سوسائٹی نے امید سے بڑھکر ترقی کی ہے لیکن مدھ دیس میں قانون کے ذریعہ اس نقص کو دور کیا گیا ہے۔

زبان کے نیچرل، انداز میں ہر لفظ برمحل آتا ہے یہ الفاظ اپنی جگہوں میں اس طریقے سے جمے ہوئے ہیں کہ ان کو نکال کر دوسرا لفظ رکھا جائے تو وہ بدلا ہوا لفظ ان فٹ ہونے کے سبب فوراً چغلی کھاتا ہے۔ اوپر کے دونوں نمونے اس حقیقت کی توضیح کرتے ہیں۔ کالم ۱ میں زبان کا سیدھا سادھا غیر مصنوعی انداز ہے جس میں ملکیت، زمین، کمیشن، بارے، بیان، نقص، البتہ، کوآپریٹیو سوسائٹی، ذریعہ، امید، قانون کے عام فہم اور برمحل الفاظ آئے ہیں۔ کالم ۲ میں زمین، قانون، اور پیداوار، کمیشن کو صحیح سلامت چھوڑ کر تمام الفاظ کے بدلے سنسکرت الفاظ سے پُر زور کیا گیا ہے "ملکت" کو "مالکیت" کی صورت میں مسخ کیا گیا ہے۔ اردو سے تمیز دلانے والی ذہنیت کے سوا اس "شدبی" کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔ ملزم کا بیان، سرکاری وکیل کا بیان، خفیہ پولیس کا بیان، کلکٹر کا بیان، رام کا بیان، رحیم کا بیان کون نہیں جانتا۔ مگر لشد ھ ہندی تو زبان قدس ہے مشرت ہندی میں بھی اس کو جگہ نہ ملی ہے۔ " بیان ہے" کے بدلے رکھا گیا "کہنا ہے" میں بھی کہوں گا آپ کے اس تبادلے کو کیا کہنا ہے۔ قربان جائیے۔ پھر "بارے میں" کے بدلے سمبندھ میں، د　　　　،" ذریعے" کے بدلے دورا، موروثی جائداد کے بدلے پیترک سمپت، لانے سے ہندی پبلک کو کونسی سہولت اور کون سی ادبی لذت حاصل ہوگی۔ اس حقیقت کو چھپانے کی کسے جرات ہو سکتی ہے کہ "　　　　میں"، "سمبندھ میں" سے کہیں زیادہ "بارے میں" کے ٹکسالی لفظ کا سکہ رواں ہے۔ اسی طرح موروثی جائداد کی عام فہمی اور "پیترک سمپت" کی غرابت بھی مسلم ہے غرض ان تمام سنسکرت کے وضعی الفاظ کو جو مروج فارسی عربی لفظوں کے بدلے گھڑے گئے ہیں مقبولیت اور معقولیت اور سلاست کا درجہ اب تک نہ ملا اور نہ مل سکتا ہے۔ یہ جان کر اور سمجھ کر اگر اب بھی ہم اپنی روش نہ بدلیں تو ہر انصاف پسند یہ کہہ سکتا ہے کہ ہندی اُس زبان کا نام ہے جو کسی قدر خناقت ہو اور اہلیان ہندی کو صاف صاف اس کا اعلان کر دینا چاہیئے۔ ورنہ یہ یہ کیسے ممکن ہے۔ زبان کے وہی اصول آپ بھی بتائیں جو ہم اب تک مانتے رہے ہیں، جن پر ہم اب تک کاربند رہے ہیں۔ چلن کے الفاظ کو ہم بھی سراہیں اور آپ بھی، یہ تھا اور یہ پالی (سنت جاریہ) کی شرن ہیں۔ باہری الفاظ جو جزو زبان و تمدن بن چکے ہیں ان کا استعمال ہم بھی جائز قرار دیں اور آپ بھی کہیں کہ ہاں ہم بھی اسے مانتے ہیں۔ پھر وہ اردو ہندی کی بیخ کیوں باقی رہ جاتی ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے اوپر صد ہا مثالوں سے دکھایا جہاں تک زبانی دعوے کا تعلق ہے ہندی کے اہل قلم نہایت ہی دل خوش کن پیرایہ میں ان مسلمہ اصول کا ببانگ دہل اعلان فرمائیں گے۔ مگر عمل کی دنیا میں اُنکے اعلانات قدم نہیں نکالتے۔ لسانیات میں ابھی تک نفض للّٰہی کو دخل نہ تھا۔ مگر بعض نا سمجھ لوگ شہری کو شہرانی اور کارروائی کو کاریہ واہی اور مخالفت کو "خلافت" سے بدل کر اپنی ذہنیت کا پتہ دے رہے ہیں۔ ہم اس ذہنیت کے خلاف اس وقت تک جہاد کرینگے تا وقتیکہ وہ خود اس کا اقرار نہ کرلیں کہ ہم کسی اصول کے پابند نہیں۔ ہم اپنی طبیعت اور مذاق کے موافق جیسا چاہیں گے لکھیں گے یا بولیں گے" مگر جب تک اصولی گفتگو جاری ہے ایک خادمِ زبان کی حیثیت سے مجھے حق ہے کہ غلط روی سے باز رہنے کے لئے اپنے دوستوں سے ہر ممکن طریقے پر التجا کروں۔

الفاظ کی شکلوں پر زمانے کا اثر، اُن کی ہمہ گیری (بول چال کی سند اور دفتری رکارڈ) کے واضح کرنے کی ضرورت اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک ہمیں ادبی نکات گنائے جائیں گے۔ ادبی ضرورت یا ادبی نقطہ نظر سے زبان کی بحث میں ایک نیا شوشہ اور ہے۔ اب ہم اسکے تحت میں آواز، تلفظ، ترکیب الفاظ، قواعد صرف و نحو سب پر نظر ڈالنے کے لئے مجبور ہیں۔ ذخیرہ الفاظ کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا لکھنے والے کو اختیار ہے کہ وہ اگر "نقص" میں کوئی نقص پائے تو ترٹ ——— لکھ کر اپنی تسکین کرے۔ اگر کوئی نقصان وزیان نہیں تو اندھی تقلید سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔　　(باقی آئندہ)

چراغ علی

سنِ بلوغ

ہماری روزانہ کی زندگی کے تجربات و مشاہدات بتلاتے ہیں کہ جس شے کا ہمارے پردۂ تخیل پر ایک مبہم سا خاکہ بھی نہ ہو اُسے ایک مرئی شکل دینا بشتر انسانی کمالات سے بعید ثابت ہوتا ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ ایک مشین کسی کے سامنے رکھ کر اس کو فوراً چلانے کا حکم دیدیا جائے۔ درآنحالیکہ وہ اس کے پرزوں سے عدم واقفیت کا اظہار کر رہا ہو۔ اسی طرح تاوقتیکہ بچوں کی فطرت کا ہم نے باقاعدہ مطالعہ نہ کیا ہو ہمیں مناسب نہیں کہ انکے ظاہری عادات واطوار کو دیکھ کر کوئی خاص حکم لگادیں۔ یہ واقعہ ہے کہ بچہ اپنے ماحول سے بہت کچھ اثر قبول کرتا ہے لیکن کچھ اسکی طبیعت کی افتادبھی ہوتی ہے جو مل ملاکر اسکے مستقبل کو بناتی یا بگاڑتی ہے۔ افتاد طبع فی نفسہٖ ایک مستقل شے ہے پھر بھی ماحول کے ذریعہ اسمیں سلامت روی پیدا کی جا سکتی ہے۔ بچے کے والدین ابتدا میں اس کے بہترین اتالیق ہوتے ہیں۔ لیکن وہ وقت آنے پر جسے ہوش سنبھالنا یا "سن شعور" کہتے ہیں اس وقت بچے کی تربیت میں ایک حد تک ایک دوسری ہستی بھی مد ہوتی ہے جسے عرف عام میں "استاد" کہتے ہیں۔ اگرچہ یہ امر مسلم ہے کہ استاد کو اتنا موقع نہیں ملتا کہ وہ اس ہستی کو اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکے (اور میں تو یہ کہونگا کہ یہی غنیمت ہے ورنہ آجکل عموماً استاد کو بھی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے) اسے دن رات کے صرف چند گھنٹے ملتے ہیں جس میں والدین کے خیالات کے مطابق زیادہ سے زیادہ تعلیم ہونی چاہیئے۔ پھر بھی یہ وقت اس لحاظ سے غنیمت ہے کہ بچہ عموماً کسی ہستی کی نقل کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے جسے وہ غیر محسوس طریقہ پر وسیع نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اسلئے اگر ایک استاد اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر بچہ کے سامنے اخلاقی نمونہ کا مظاہرہ کرے تو اسے وہ جلد جلد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔

انفرادی حیثیت سے دورِ حاضر کے ماہرین نفسیات نے تفتیش و تحقیق کے بعد وہ حیرت انگیز نتائج مرتب کئے ہیں جو ایک بچے کو عالم طفولیت سے لیکر سن بلوغت تک پیش آتے رہتے ہیں۔ خاص کر وہ حصہ عمر جسے سن شعور کہتے ہیں انسان کی زندگی میں نہایت اہم ہوتا ہے۔ سن شعور و بلوغت میں بہت بڑا فرق ہے۔ اول وہ زمانہ ہے جب بچہ اپنے ماحول سے متاثر ہوکر اشیا میں امتیاز پیدا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب تعمیری اور تخریبی دونوں پہلو بچہ کے سامنے ہوتے ہیں۔ یہ کام استاد کا ہے کہ اس کی کشتی حیات کو منزل مقصود تک پہونچنے میں معاون ہو ورنہ ممکن ہے کہ وہ بے راہ ہو جائے۔ موخر الذکر وہ زمانہ ہے جب انسان میں متضاد جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ان جذبات میں اعتدال پیدا ہو سکتا ہے لیکن اسی وقت جب سن شعور میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی گئی ہو۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک بچہ جسکی ابتدائی تربیت وتعلیم بہت غور و خوض سے کی گئی ہو آئندہ چل کر وہ اس کے نتائج کے موافق نہیں ثابت ہوتا۔ اس کا تعلق تو زیادہ تربیت کی خرابی سے ہے اور کچھ اس کی ذہنیت سے بھی۔ بچہ سن شعور کو پہونچتا ہے تو اس کا زاویۂ نظر وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ ایسی حیثیت میں وہ اچھی بُری ہر چیز کو سمجھنے اور حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سن شعور تقریباً بارہ برس کی عمر سے لے کر ۲۰ برس تک ہوتا ہے۔ یہ زمانہ تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اول شعوریت کا ابتدائی دور۔ دوم درمیانی۔ سوم انتہائی یا آخری۔ اس تقسیم سے پہلے کا زمانہ طفولیت کہلاتا ہے۔ اور بعد کا بلوغیت۔ کچھ ماہرین کا یہ بھی خیال ہے نیز ہمارے تجربے بھی اسکے شاہد ہیں کہ لڑکوں میں بالغ ہونے کا احساس اسی ابتدائی دور میں پیدا ہو جاتا ہے اور لڑکیوں میں اس عمر سے پیشتر لیکن ان احساسات کا لمحہ ۱۱ اور ۱۴ سال تک علی الترتیب ہو جاتا ہے۔ یہ عمر بھی کلیۃً نہیں بتائی جا سکتی۔ جذبات کا اس سے قبل بھی پیدا ہو جانا ممکن ہے۔ زیادہ تر یہ باتیں آب وہوا پر منحصر ہوتی ہیں۔ اس لئے استاد کا فرض ہے کہ جب لڑکا ان منازل سے گذر رہا ہو تو انتہائی تدبیر و ہوشیاری سے کام لے۔ اگر تمام لڑکے ایک ہی سی خصوصیات اور خُو بُو کے حامل ہوتے تو اُستاد کا کام قدرے آسان ہوتا لیکن قدرت اتنی مہربان نہیں واقع ہوئی۔ لامحالہ اُسے موجودہ واقعات میں نباہنا پڑیگا۔ سوال ہو سکتا ہے کہ وہ کون سے واقعات ہیں اور کونسی مشکلات ہیں جو ایک استاد کو پیش آتی ہیں۔ لڑکا اس وقت جسمانی ذہنی جذباتی لحاظ سے تیزی کے ساتھ بڑھتا ہوتا ہے۔ اس لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ نشوونما کی ہر حیثیت کو پہلے سمجھ لیا جائے۔

طبعی یا جسمانی ارتقاء سن شعور میں پہونچنے کے بعد جسمانی لحاظ سے قویٰ میں سختی آتی اور اعضا میں بڑھاؤ ہونا شروع ہو جاتا ہے یہ ترقی کچھ اتنی سرعت کے ساتھ ہوتی ہے کہ بعض اوقات قوت اس کا ساتھ دینے سے عاری رہتی ہے، نیز جسم کے مختلف اعضا راضائی حیثیت سے مختلف بنتے ہیں جن سے ایک عجیب ہیولیٰ بن جاتا ہے آواز میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس لڑکے کے تنفس اور نشست کے بارے میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ ورنہ خوف ہے کہ کہیں شدید امراض میں مبتلا ہو جائے ایسی تبدیلیاں معدہ اور خون کی روانی میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور نبض زیادہ تیزی سے چلنے لگتی ہے جس وقت یہ جسمانی تغیر پیدا ہونا شروع ہو جائے تو استاد کا کام ہے کہ اس سے کما حقہٗ فائدہ اُٹھائے۔ اس عمر میں اضافی قوت کی بنا پر لڑکا ہر قسم کی ورزش جسمانی کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ اگر اس کے سامنے جسمانی فلاح کی مثالیں پیش کی جائیں تو وہ اُسے آسانی سے نقل کر سکتا ہے۔

اسکول کے کھیلوں میں، تعلیم میں اور خیالات اعلیٰ کے حامل ہونے میں اساتذہ مدد کر سکتے ہیں۔ اس وقت آزادیٔ خیال کے بجائے لڑکا ایسی راہ پر لگایا جائے جہاں اُسے حرکات و سکنات میں بڑی حد تک آزادی حاصل ہو۔ ضرورت ہے کہ انفرادی تعلیم ایسے موقعوں پر زیادہ اہمیت دی جائے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ لڑکے اس حصہ کے بعد لڑکوں میں عموماً افسردگی پیدا ہونے لگتی ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اضافی قوت کی وجہ سے جو حرکت پیدا ہو گئی تھی اس سے قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اساتذہ اس وقتی جمود کو زیادہ اہمیت نہ دیں۔ ہاں اگر یہ جمود مستقل کاہلی، انکاری یا جمود کا پیش خیمہ ہو تو اس مرض کا علاج بہت ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ اس لااعتدالی سے اگر چشم پوشی اختیار کر لی گئی تو آئندہ اسکول کے ضابطہ میں فرق پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ دور لڑکے کے عادات و خصائل بننے کے لئے مخصوص ہے لیکن سن شعور اگر بے توجہی سے چھوڑ دیا گیا تو یہ خیال کہ لڑکے میں خود بخود اچھی عادتیں پیدا ہو جائیں گی، دماغی وہم ہے۔ اس موقعہ پر کبھی رحم و تسلی سے کام لینا چاہئیے اور کبھی سختی سے۔ مگر یہ تسلی اور سختی دونوں اعتدال سے آگے نہ بڑھیں۔ انفرادی بھلائی اتنا کا معیار ہے گو سوسائٹی میں اجتماعی حیثیت سے انفرادی مفاد کی قربانی جو ایک جماعت کے لئے ہو جائز ہے۔

قویٰ کے بڑھنے کے ساتھ ہی ساتھ لڑکے میں ذاتی شخصیت کا تخیل بھی پرورش پانے لگتا ہے۔ عموماً ضد اور سرکشی کا مادہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یا پھر سادہ لوحی کی علامتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ ایک دانا اُستاد یہ دونوں خطرناک صورتیں نہ پیدا ہونے دیگا۔ اس وقت اس کی دلچسپیاں خاص طور پر نگاہ میں رکھی جائیں اور کوشش کی جائے کہ ذاتی اثر سے ایسی خطرناک صورتیں مٹا دی جائیں۔

اس عمر میں سب سے زیادہ خطرناک جذبہ وہ ہے جو قلبی ہیجان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لڑکا اُنس و کشش کے غیر مرئی اثر سے بہت کچھ متاثر ہوتا ہے۔ اس وقت اسے خیالی دنیا میں زیادہ لطف آنے لگتا ہے۔ کم و بیش یہ حالت ۹۹ فیصدی لڑکوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اُستاد اس راہ میں اگر کسی قسم کے روڑے اٹکاتا ہے تو نتیجہ ضد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ لڑکوں کو ہمیشہ "کرنا چاہئیے" کا حکم دینا چاہئیے "نہ کرنا چاہئیے" کا نہیں۔ لیکن اس مشکل مہم سے کیسے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے۔ اسکی صورت یہ ہے کہ ایسے لڑکے کے خلقی تصورات کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے لیکن ان پر نگاہ رکھی جائے مبادا اس آزادی سے ناجائز فائدہ اُٹھانے لگے۔ انجام میں صرف دو ہی صورتیں ہونگی یعنے یہ جذبہ یا تو مستقل پائدار دوستی پر منتج ہوگا ورنہ خود بخود ہی ختم ہو جائیگا۔

ذہنی ارتقاء: سن شعور کے ساتھ ہی ساتھ ذہنی ارتقاء بھی شروع ہو جاتا ہے۔ لڑکے میں اس وقت ہر شے کی علت و غایت کا بھی احساس ہونے لگتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ چیز کی ماہیت اور اُسکے اسباب کی واقفیت حاصل کرے۔

ایسی حالت میں اگر بے جا خوف و ہراس سے کام لیا گیا تو اس قوت میں ایک دھکا لگتا ہے جس سے اسکی قوت غور و فکر میں کمی پیدا ہو جاتی ہے اور اپنی نارسائی عقل کا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ خیال مستقبل کی ترقیات کو کسی حد تک مسدود بھی کر دیتا ہے اور مانع خیالات ارفع ہے۔ قابل غور طلب امر یہ ہے کہ لڑکے میں آیا یہ قوت یک بیک فوری طریقہ پر پیدا ہوتی ہے یا آہستہ آہستہ۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے چونکہ طبی لحاظ سے دماغ اس وقت نشو و نما پاتا ہے۔ اس لئے اسباب و علل کے دریافت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن زیادہ تر صحیح معلوم یہ ہوتا ہے۔ جوں جوں بچہ کا تجربہ بڑھتا جاتا ہے ویسے ہی اس کے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ نظر کے وسعت پذیر ہونے سے تجسس و تلاش کا مادہ بھی بڑھتا جاتا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ کسی وقت یہ قوت تیزی کے ساتھ عود کر آئی ہو اور بعض اوقات زوال پذیر ہو لیکن یہ قوت کبھی بالکل مفقود نہیں ہو جاتی جنہوں نے جسمانی ساخت کا معائنہ کیا ہے ان کے بیان کے مطابق دماغی قوتوں میں اصلاح عمر کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ اپنے بیان کے ثبوت میں وہ پیش کرتے ہیں کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ تجربہ بھی بڑھتا جاتا ہے اور اسی لحاظ سے اشیاء کی افہام و تفہیم۔ دماغ کے سامنے بالکل مختلف اور متضاد خیالات ہوتے ہیں جن پر اُسے غور کرنا ہوتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ کوئی مسئلہ جس کا تعلق اسکی طبعی ذہانت سے ہو بہت آسانی سے سمجھ میں آجائے بعض میں باوجود کوشش بسیار اس کا ناخن تدبیر نہ حل کر سکے۔ اس سے یہ بات صریحی طور پر حل ہو جاتی ہے کہ لڑکے میں سن شعور پر پہونچنے کے بعد قوت تمیز و تلاش تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس وقت فطری اُکاؤ بھی اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ اس عمر میں چونکہ بچہ عالم طفولیت سے نکل کر عالم شعوریت میں داخل ہوتا ہے۔ اس لئے اسکی دماغی کیفیت میں کسی حد تک پختگی ہو جاتی ہے اس کا تخیل زود فہمی و ادراک تجزیہ اشیاء اور انکی امتزاجی کیفیت کے احساس کا حامل ہوتا ہے۔ واقعات کے علم کی تشنگی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ خود زیادہ ذکی الحس ہو جاتا ہے۔ اسی وقت ساتھ ہی ساتھ شرم بے جا کا مادہ بھی پیدا ہو جاتا ہے جسے ہم "جھینپ" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت اس کے زیر نظر زیادہ تر ایسی کتابیں ہوتی ہیں جن میں حسن و محبت کے افسانے ہوں یا پھر قصص و حکایات جن سے اسکی طبیعت کے جوش کو تسکین ہو سکے۔ اس وقت اس میں اپنے بڑوں کے نقل کا مادہ تیزی کے ساتھ بڑھ جاتا ہے۔ تنہائی پسند خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یا اگر انجمن آرائی کا خیال پیدا ہو تو وہ بھی شوق حجاب سے بے پروا نہیں ہوتا۔ اُستاد کو ایسے وقت میں زاویۂ نگاہ کی وسعت میں مدد کرنی چاہئیے۔ اس ولولۂ بے اختیاری کو مصروف عمل کیا جا سکتا ہے جس سے نیک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ ہاں اگر تدبیر و نصیحت کی کچھ مخالفت ہی ہو تو یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ ایک بالا قوت ارادی سے پالا پڑا ہے۔ ایسی صورتوں میں اُستاد بجائے احکام جاری کرنے کے نمونہ بن کر پیش ہوں۔ لڑکے ایسے اثر کو جلد قبول کر لیتے ہیں۔

جذباتی ارتقاء:۔ جذبات انسانی کا تعلق بہت کچھ جسمانی ارتقاء سے ہوتا ہے۔ اور کسی قدر ماحول سے۔ خون کی روانی میں تیزی پیدا ہوتے ہی جذبات اُبھر آتے ہیں۔ لڑکے کے اعضا اس عمر میں عموماً تیزی سے بڑھتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے احساسات میں بھی تموّج پیدا ہوتا ہے شعور کے ابتدائی زمانہ میں جیسے ہی اعضاء بڑھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جذبات میں قوت و شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ لڑکا اس وقت مختلف کیفیات اور ولولوں کا حامل ہوتا ہے۔ اسکی طبیعت کبھی بشاشت طبع کا احساس کرتی ہے۔ تو کبھی افسردگی کا دورہ پڑتا ہے کبھی خندہ پیشانی سے پیش آتا ہے۔ کبھی بدمزاجی کا مظاہرہ کرتا ہے کبھی رحم وکرم کے جذبات سے مملو نظر آتا ہے کبھی نفرت و فساد سے پیش آتا ہے کبھی یقین و ایمان کے ساتھ کام کرتا ہے اور گاہ مایوسی کا اظہار کرتا ہے کبھی ہمت و جرات دکھلاتا ہے۔ اور کبھی خوف وہراس اس کے دامن میں پناہ لیتا ہوا دکھائی پڑتا ہے۔ اسی طرح مختلف قوی جذبات سے کھیلتا نظر آتا ہے یہی ولولے سن بلوغت پر پہونچکر سکون حاصل کر لیتے ہیں ضرورت ہے کہ اُستاد بچہ کی ان متضاد کیفیات سے جو بالکل نفسیاتی ہیں اچھی طرح واقف ہو ورنہ ہو سکتا ہے کہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے اسکی تربیت ہی کی طرف سے وہ مایوس ہو جائے۔

کام نہ لیا گیا تو لڑکے کی طبیعت میں بغاوت کا مادہ پیدا ہو جائے گا جس سے اُستاد کے کام میں سخت دشواریوں کا پیدا ہو جانا قرین قیاس ہے۔ جذبات کے اس تلاطم ہیجان کے اندر سکون بھی پوشیدہ ہے۔ اس لئے اس شورش کو نظر انداز کر کے سکون کے لطیف تاروں سے کھیلا جائے تو ایسا پُرترنم نغمہ پیدا ہو سکتا ہے جو لڑکے کی روح کو بھی گرویدہ کر سکتا ہے۔ البتہ ایسے موقع پر سختی۔ غیر محتاط طریقہ طنز اور حکم سے کام لیا گیا تو نفرت کا پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ لڑکا اس عمر میں اپنی شخصیت کا کسی حد تک احساس کرنے لگتا ہے اور خود کو مستقبل کی پُرآشوب زندگی کے لئے تیار کرتا ہوتا ہے۔ اس لئے کسی قسم کی رکاوٹ برداشت نہیں کر سکتا اس کا دل سطحی دل چسپیوں کا جویا ہوگا۔ موسیقی سے اُسے رغبت ہوگی۔ شہرت کا دلدادہ نظر آئیگا۔ عزت کی اُسے فکر ہوگی۔ اور بعض میں مذہبی جوش بھی پایا جائیگا۔ غرض یہ زمانہ حیات انسانی کا ایک موج انگیز اور طوفانی دور ہوتا ہے۔ جہاں اکثر مایوسی اور جودت طبع کی وجہ سے انسانی جذبات میں توازن قائم نہیں رہتا۔ صاحب شعور لڑکے کے جذبات سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے جنسی احساسات کا خیال رکھا جائے۔ ناجائز افعال۔ گھناؤنے قصے۔ بُری صحبت اگر ان امور سے لڑکے کو لاعلمی کی صورت میں علیحدہ رکھا گیا تو ان کا مستقبل شاندار ہو سکتا ہے لیکن افسوس تعلیم و تربیت کے موجودہ دور میں جہاں اور بہت سی باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ گو سب سے اہم شئے ہے نظر انداز کر دی جاتی ہے نتیجۃً ہے کہ ہمارے اسکولوں کے ۹۰ فیصدی بچے جذبات کے لحاظ سے غیر تربیت یافتہ نکلتے ہیں۔

قوت ارادی وضبط کا ارتقاء:۔ اصل میں یہ قوت عمل و کردار سے تعلق رکھتی ہے، اگر اپنی خواہشات اور احتیاجات میں قوت ارادی سے کام لیں تو بہت سے عیوب مٹ سکتے ہیں اور بہت سے غیر ضروری امور سے ہم اپنے کو علیحدہ رکھ سکتے ہیں۔ جب طفلانہ ولولے سکون اختیار کرنے لگتے ہیں احساس خودداری پیدا ہو جاتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ یہ جذبہ بھی عود کرنا شروع ہو جاتا ہے۔ عہد طفلی کی ہماری تمام خواہشیں وقتی ولولوں سے متاثر رہتی ہیں لیکن شعور حاصل کرنے پر یہی عزم خاص کے ماتحت ہو جاتی ہیں۔ ہمارا کردار کیا ہے، جذبات وخواہشات میں اعتدال۔ یہ اعتدال زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ مستقبل میں مستقل عادتیں بن جاتی ہیں۔ زمانہ طفلی سے لیکر بالغ ہونے تک قوت ارادی طاقت پکڑتی رہتی ہے لیکن زمانہ شعور میں یہ قوت بلا ارادہ پائداری اختیار کر لیتی ہے۔ اس دور میں طبیعت پر جو رنگ غالب ہو جاتا ہے وہ تادیر اور بعض اوقات ہمیشہ رہتا ہے ذہانت اور قوت ضبط و ارادہ میں خاص تعلق ہے جس سے بعد میں رہنمائی قابلیت اور صفات کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس لئے خاص طور پر ایسے لڑکوں میں جن کے مزاج ایسی تربیت کو قبول کرنے کی قابلیت وصلاحیت رکھتے ہوں ایسے خیالات پیدا کرنے اور بڑھانے چاہئیں۔ لڑکا اس وقت قدرے اجتماعی زندگی پسند کرتا ہے۔ اس لئے اسے کافی موقع بہم پہونچایا جائے کہ وہ رہنمائی یقین اور اپنی برتری کا اظہار کر سکے، ورنہ ایسی تمام خوبیاں ظاہر نہ کی جاسکیں اور صرف گوشہ ہائے قلب و دماغ کے طواف میں مصروف رہیں۔ گھٹ گھٹ کر ختم ہو جاتی ہیں۔

سن شعور نہایت خطرناک، غیر مستقل شوریدگیٔ مزاج کا زمانہ ہے جہاں قدم قدم پر متضاد اور متخالف جذبات سے واسطہ پڑتا ہے، اگر اسکے اصلاح کی کوشش نہ کی گئی تو زندگی اکثر مثالوں میں ایک بھیانک خواب بن کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے اسکول اکثر تو قابل اساتذہ سے خالی ہیں۔ لیکن اگر ہیں بھی تو تعلیم و تعلم کا مروجہ طریقہ انکی زندگی میں شاید ہی کبھی ایسے لمحات پیش کرتا ہوں جن میں طالب علم کو اس نظریہ کے ماتحت تعلیم دیرہے ہوں۔ ایسی حالت میں مستقبل میں جو قوم بننے والی ہے اس سے امید و فلاح اور کامیابی کی توقع رکھنا جو بو کر گیہوں کی فصل کاٹنے کے مرادف ہوگا۔

سید عبد الجلیل حسنی
بی، اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

نوٹ:۔ جواب طلب امور کے لئے محصول ڈاک آنا ضروری ہے۔ پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت کرتے وقت اپنا نمبر خریداری لکھا کیجئے۔ "مینجر"

ہمسائی

میری ہمسائی بچپن ہی میں بیوہ ہوگئی تھی۔ وہ شبنم کے قطرات اشک سے نم اور پژمردہ کلی کی طرح ڈالی سے علیحدہ ہوگئی تھی۔ وہ شب عروس کے لئے نہیں بلکہ کسی دیوتا کے پوجا کے لئے منتخب کی گئی تھی۔

میں دل سے اس کا پرستار تھا اسکی محبت میں میرے دل کی جو کیفیت تھی اس کے اظہار کے لئے سوائے پرستش کے اور کوئی مناسب لفظ نہیں ملتا۔

میری اس دلی کیفیت کی میرے دوست نوین کو بھی خبر نہ تھی۔ میں نے اپنے دلی جذبات کو اس طرح چھپا کر بے لوث بنا رکھا تھا اور اس پر مجھے غرور بھی تھا۔

لیکن دل کے جذبات کوہستانی دریا کی طرح اپنے مخرج ہی تک محدود نہیں رہتے وہ کسی نہ کسی طور سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر اس جد وجہد میں ان کو کامیابی نہیں حاصل ہوتی تو سینے کے اندر ہی ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں خیال کرتا تھا کہ اپنے قلبی تاثرات کا نظم میں اظہار کردوں لیکن قلم اس جولان گاہ میں آنے کے لئے آمادہ نہ ہوا۔

عین اسی وقت ایک تعجب انگیز بات یہ ہوئی کہ میرے دوست نوین مادھو کی طبیعت میں زلزلہ کی طرح یکایک ایسی لرزش ہوئی کہ وہ دفعتہً شعر گوئی میں ہمہ تن محو ہو گیا۔

اس کے قبل یہ غریب کبھی ایسی ارضی یا سماوی مصیبت میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس کے مقابلہ کے لئے پورے ساز وسامان سے تیار نہ تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ وہ ہنوز نہ تو وزن وقافیہ سے واقف تھا اور نہ تک بندی ہی کر سکتا تھا۔ تاہم اس نے مطلق پس وپیش نہ کیا۔ شاعری کا خبط اسکے سر پر ایسا سوار ہوگیا جیسے ضعیفی کی دوسری بیوی کسی کے سر پر مسلط ہو جاتی ہے۔ آخرکار ترمیم واصلاح کے لئے میری خدمت میں حاضر ہوا۔

اسکی نظم کا موضوع نیا نہ تھا لیکن نہ اُسے بہت قدیم کہہ سکتے تھے نہ بالکل جدید۔ جب میں نے دیکھا کہ ایک محبوبہ کے عشق میں کچھ اشعار لکھے ہیں تو اسے دھکا دے کر مسکراتے ہوئے میں نے دریافت کیا: "بتاؤ تو وہ ہے کون؟" نوین نے ہنس کر جواب دیا "ابتک تو مجھے اس کے متعلق کچھ واقفیت نہیں ہے"

نوین کو اس کام میں امداد دینے میں مجھے بیحد لطف آیا۔ اسکی مجازی محبوبہ کے حیلہ سے میں نے اپنے دبے ہوئے جذبات کو برانگیختہ کیا جس طرح بغیر بچے والی مرغی بطخ کے انڈوں کو پاکر سینے کے لئے پر پھیلا دیتی ہے۔ اسی طرح میں نے بھی نوین کے ذریعہ سے اپنے درد وسوز کا اظہار کرنا شروع کیا۔

نوین نے متحیر ہو کر کہا: "بالکل یہی باتیں تو میں بھی کہنا چاہتا تھا لیکن میں اس سے قاصر رہا۔ تم کیسے اس خوبی سے میرے خیالات کی ترجمانی کر لیتے ہو؟"

میں نے ایک شاعر کی حیثیت سے جواب دیا "تخیل سے"۔ وجہ یہ ہے کہ حقیقت ایک سرچشمہ ہے اور تخیل اس کا محرک ہے۔ حقیقت ہمارے تاثرات کیلئے سدِ راہ رہتی ہے۔ لیکن تخیل ان کو رواں کر دیتا ہے۔

نوین نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کچھ سوچتے ہوئے کہا: "یہی تو معلوم ہوتا ہے ٹھیک ہے" اس کے بعد پھر کچھ دیر تک سوچ کر کہا۔ "ٹھیک! ٹھیک!"

میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میری محبت میں تذبذب تھا۔ اسی وجہ سے میں خود کچھ تحریر نہ کر سکا لیکن جب نوین کو پس پردہ بٹھا لیا تو میرے قلم نے زور دکھایا۔ میری انشا پردازی کا پیمانہ جذبات محبت کی داستان سے لبریز ہو کر چھلکنے لگا۔

نوین نے کہا: "یہ تمہارے اشعار ہیں۔ انہیں میں تمہارے نام سے شائع کراؤں گا" میں نے کہا: "لیکن لکھے ہوئے تو تمہارے ہی ہیں۔ میں نے تو محض معمولی ترمیم کی ہے"۔ رفتہ رفتہ نوین بھی میری رائے سے متفق ہو گیا۔

میں اس امر سے انکار نہیں کرسکتا کہ جس طرح ایک منجم کی نگاہ ستاروں کے طلوع کے انتظار میں آسمان کی طرف رہا کرتی ہے ویسے ہی میری متجسس نظر بھی اکثر اپنی ہمسائی کی کھڑکی کی طرف اٹھتی تھی بعض اوقات اس دیوی کے پرعقیدت نظارہ میں میری خودغرضی بھی مضمر رہتی تھی۔ اس عفت مآب کے رُخ درخشاں کی پُرسکون وروح پرور ضیا پاشی سے چند لمحوں کے لئے ہمارے آلام وافکار محو ہو جاتے تھے۔

لیکن میں نے ایک دن یہ محسوس کیا کہ ہمارے ماہتاب کی حرارت ابھی زائل نہیں ہوئی ہے۔ کیا وہاں کے سربسجود کوہوں اور وادیوں میں ابھی گرمی موجود ہے؟

اُس دن تیسرے پہر کو شمال ومشرق کے گوشے سے بارش ہو رہی تھی۔ طوفان کے بھی علامات ہویدا تھے۔ درمیان میں بجلی بھی چمک جاتی تھی۔ میری ہمسائی کھڑکی کے پاس تنہا کھڑی تھی۔ اس دن اس کی آسمان کی طرف متوجہ نگاہوں سے درد وسوز مترشح تھا جس سے ساری فضا متاثر تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر یقین ہوگیا کہ اس وقت میرے قمر میں تپش موجود ہے۔ آتش نے وہاں بھی اپنا تسلط جمایا ہے۔ دیوتا کے لئے انسان نہیں بلکہ انسان کے لئے دیوتا ہے۔ اس کی دونوں آنکھوں کی بے قراری اس دن کے طوفان سے گھبرائے طائر کی طرح پرواز کر رہی تھی۔ کدھر؟ فردوس بریں کی طرف نہیں۔ بلکہ کسی انسانی قلب کی طرف جسے وہ اپنا نشیمن بنا سکے۔

اس پُرحسرت ودل افروز جلوہ سے لطف اندوز ہونے کے بعد مجھ پر ایسی سراسیمگی طاری ہوئی کہ میرا دل بے قابو ہوگیا۔ اس وقت دور کی بے بنیاد شاعری سے سیری نہ ہوتی تھی بلکہ بے اختیار یہی جی چاہا کہ اپنے تخیلات کو عملی جامہ پہنانے

میں ہمہ تن محو ہو جاؤں۔

میں نے تہیہ کیا کہ ملک میں عقدِ بیوگان کو رائج کرنے کی حتی الامکان کوشش کرونگا۔ صرف تحریر و تقریر کو آلہ کار نہ بناؤں گا بلکہ مالی امداد بھی کروں گا۔

ایک دن نوین مجھ سے حجت تکرار کرنے لگا۔ اس نے کہا "بیوگی پُرسکون ہوتی ہے۔ اس میں ماہِ نو کے قبل تیسری شب کی چاندنی کی طرح جاذب نظر اور لفریب لطافت و نزاکت پائی جاتی ہے۔ شادی کی زنجیر اس سکون کا قلع قمع کردیگی"۔

اس قسم کے شاعرانہ تخیل سے میری طبیعت منغض ہوگئی۔ جو لوگ بھوکوں مر رہے ہوں ان سے کوئی شخص شکم سیر ہو کر کھانے سے نفرت کا اظہار کرے اور پھولوں کی خوشبو اور طائران خوش الحان کے نغموں سے محظوظ کرنے کی کوشش کرے تو اسکے دل کی کیا کیفیت ہوگی۔

میں نے کہا "دیکھو نوین! ایک مصور کے نقطۂ نظر سے ایک آتش زدہ مکان کا نظارہ بھی نہایت دل فریب ہوتا ہے۔ لیکن مکان کو صرف مصور کے زاویۂ نگاہ سے نہ دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں قیام بھی کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے آرٹسٹ خواہ اُسے جو کچھ بھی سمجھے اسکی مرمت ضروری ہے۔ تم دُور سے ایک بیوہ پر شعر بازی کرنا جانتے ہو لیکن تم کو یہ خبر نہیں کہ اسکے اندر ایک پُرحسرت دل ہزاروں تمناؤں کے ساتھ جلوہ گر ہے"۔

میں نے سمجھا کہ نوین کسی طرح میرا ہمخیال نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے میں نے اس سے خشونت آمیز لہجہ میں گفتگو کی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ میری تقریر سے متاثر ہو کر اس نے اپنی شکست تسلیم کرلی۔ اس کے علاوہ میرے دماغ میں اور بہت سے خیالات مجتمع تھے لیکن انکے اظہار کا موقع ہی نہ مل سکا۔

تقریباً ایک ہفتہ کے بعد میں نے نوین کو گلے لگا کر کہا "اس نیک کام میں جو کچھ صرفہ ہوگا میں اس کا متحمل ہونگا"۔ اس پر نوین نے اپنی ساری داستان بیان کردی۔

معلوم ہوا کہ اس کی محبوبہ مجازی نہیں ہے۔ کچھ دنوں سے وہ ایک بیوہ پر فریفتہ ہوگیا ہے۔ اس نے اب تک اس راز کا کسی پر انکشاف نہیں کیا ہے جس رسالے میں نوین کی یعنے میری نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ ان کو جہاں جانا چاہیئے تھا وہاں پہونچ جاتی تھیں۔ وہ نظمیں بے سود نہیں ثابت ہوئیں۔ بغیر ربط و ضبط ملاقات کے نوین نے دل کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ایک جدید طریقہ اختراع کیا تھا۔

نوین کہتا تھا کہ میرا یہ فعل کسی خاص مقصد پر مبنی نہ تھا۔ بلکہ میں تو اس بیوہ کو بالکل جاہل سمجھتا تھا۔ محض اپنے دل کی تسلی کے لئے اس پرچے کو باقیمت اسکے بھائی کے پاس بھیج دیتا تھا۔ بھلا اسے سوائے ایک مجنونانہ حرکت کے اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ میں نے ان کو بھیجتے وقت محض یہ سمجھا تھا کہ ایک دیوتا کے روبرو ایک گلدستہ ہدیتاً پیش کرتا ہوں۔ ع گر قبول اُفتد زہے عز و شرف۔

کسی طرح بیوہ کے بھائی سے نوین کی ملاقات ہوگئی۔ اس میں بھی نوین کا بیان ہے کہ کوئی خاص مقصد ملحوظ نہ تھا۔ یہ کون نہیں جانتا کہ جس سے کسی کو الفت ہوتی ہو اس کے اعزا و اقربا کی صحبت بھی نہایت خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔

بالآخر بھائی کی سخت بیماری کے سلسلے میں نوین کی ملاقات بیوہ سے بھی ہوگئی۔ اس قصّے کو تشریح کے ساتھ بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

شاعر کے ساتھ اصلی موضوع کا بھی تعارف ہوگیا۔ نظموں پر تنقید ہوئی لیکن یہ تبصرہ محض مطبوعہ نظموں تک محدود نہ رہا۔

مجھ سے مباحثہ میں شکست خوردہ ہو کر نوین نے بیوہ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ پہلے تو وہ کسی طرح راضی نہ ہوتی تھی جب نوین میری مجوزہ تدابیر کو عمل میں لایا تو اسکی آنکھوں سے قطرات اشک رواں ہوگئے۔ اس پر رقت طاری ہوگئی اور اس نے مجبوراً سرِ تسلیم خم کردیا۔

اب بیوہ کے سرپرست کچھ روپے کے طالب ہوئے۔ میں نے کہا "روپیوں کی کیا فکر ہے؟ ابھی لے جاؤ"۔

نوین نے کہا "میرے والد جو مجھے ماہوار خرچ دیتے رہے ہیں۔ اسے وہ شادی کے بعد چار چھ مہینوں کیلئے یقیناً بند کردینگے۔ اس لئے اس مدت کے لئے ہم دونوں کے اخراجات کا بھی انتظام ہونا چاہیئے"۔ میں نے بلا تامل چک کاٹ کر دے دیا۔

اور کہا "اس کا نام بھی تو بتا دو۔ جب مجھے تم سے کوئی رقابت نہیں ہے تو اس کے نام پوشیدہ رکھنے سے فائدہ ہی کیا ہے؟ میں تمہارے سر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کے نام سے کبھی اشعار نہ لکھوں گا۔ اور اگر بفرضِ محال ایسا کیا بھی تو اس کے بھائی کے پاس بھیجنے کی بجائے تمہارے ہی پاس بھیجوں گا"۔

نوین نے کہا "مجھے ان باتوں کا خوف نہیں ہے۔ عقد ثانی کے نام سے اسے کچھ حجاب ہوتا ہے۔ اس لئے اس نے مجھ سے تاکید کردی تھی تم سے اس کا تذکرہ نہ کروں لیکن اب اس کا خفیہ رکھنا فضول ہے۔ وہ تمہاری ہمسائی ہے اور نمبر ۹ کے مکان میں رہتی ہے"۔

مجھے ان الفاظ سے سخت صدمہ ہوا میرا کلیجہ پاش پاش ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد مجتمع خاطر ہو کر میں نے دریافت کیا "کیا بیوہ شادی کو پسند کرتی ہے؟"

نوین نے مسکرا کر کہا "اس وقت تو ضرور کرتی ہے"۔

میں نے کہا "تو کیا تمہارے اشعار پڑھتے ہی وہ تم پر فریفتہ ہوگئی؟"

"کیوں؟ کیا میری نظمیں کچھ کم مؤثر تھیں؟"

میں نے دل میں کہا لعنت ہو۔ لیکن وہ لعنت کسے؟ — اسے یا مجھ یا پروردگارِ عالم کو۔

(ترجمہ از ٹیگور)

ایس۔ احمد۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی



خواجہ الطاف حسین حالی

اُردو کی جو خدمت مولانا حالی نے اپنی نظم و نثر سے اُس میں وسعت پیدا کر کے کی ہے اس کا ثبوت خود اُن کے ادبی کارنامے ہیں۔ نثر میں حالی کے قلم نے یوں تو موضوعات کے تمام میدان پامال کر دیئے ہیں۔ اور ہر شعبہ میں نئے نئے راستے پیدا کئے ہیں اور ہماری نثر کو غیر معمولی طور پر وسعت بخشی ہے لیکن جس مخصوص شعبہ علم کی ترقی مولانا کی ذات سے ہوئی ہے وہ فن سوانح نگاری ہے۔

حالات زندگی اس سے پیشتر بھی اردو زبان میں قلمبند کئے گئے ہیں لیکن حالی نے اس فن میں واقعات کی ترتیب کا ڈھنگ اور انداز بیان کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ اردو میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ سوانح نگاری کا طریقہ جو اس وقت تھا اسمیں تصویر کا ایک رُخ دکھایا جاتا تھا یعنی مصنف ہیرو کے محاسن اور اوصافِ حمیدہ ہی قلمبند کرتے تھے اور صرف انکی خوبیوں ہی پر روشنی ڈالتے تھے۔ ہیرو کی کمزوریاں تاریکی ہی میں رہتی تھیں اور اس طریقہ سے مصنف اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ سوانح نگاری کا اصل مقصد ہیرو کے محاسن اور اوصاف کے درج کرنے کے ساتھ ساتھ اسکی لغزشوں اور کمزوریوں کو دکھانا بھی ہے۔ اور اسی طریقہ سے کسی کے حالات زندگی پر صحیح معنیٰ میں تنقید ہو سکتی ہے۔ اسکے برعکس یورپ کی سوانح نگاری کا یہی طریقہ ہے کہ ہیرو کے اوصاف حمیدہ اور اُسکے کارنامے گنتے تو ہیں لیکن اس کیساتھ کہیں کہیں اس کی لغزشوں اور کمزوریوں کی طرف بھی دبی زبان سے اشارہ کر دیتے ہیں لیکن سوانح نگاری کا صحیح معیار یہ ہے کہ حالات زندگی میں ہیرو کے ہر کارنامے تفصیل کے ساتھ بیان کئے جائیں اور اُس کے ماحول پر پُوری طرح روشنی ڈالی جائے۔ تاکہ پڑھنے والا ہیرو کے ذہنی نشو و نما اور ارتقا کا پُوری طرح مطالعہ کر سکے۔ اور اس پر یہ واضح ہو سکے کہ کن کن واقعات کا ہیرو کے خیالات اور جذبات پر اثر پڑا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ دوسری طرف ہیرو کی کمزوریوں اور لغزشوں پر بھی تفصیل سے بحث کی جائے اور اُن کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی جائے تاکہ پڑھنے والے اس سوانح حیات سے اپنی زندگی میں ہر ہر موقع پر رہبری حاصل کر سکیں۔

حالی نے تین سوانح عمریاں لکھیں۔ حیات سعدی۔ یادگار غالب اور حیات جاوید۔ ہم ان تینوں سوانح عمریوں پر علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے۔ اور دیکھیں گے کہ حالی ان تینوں کارناموں میں کس کس حد تک عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔

حیات سعدی لکھ کر حالی نے اردو زبان میں فن سوانح نگاری کا سنگِ بُنیاد رکھا۔ اس سے پیشتر اُردو میں کوئی سوانح عمری اس طریقہ پر نہیں لکھی گئی تھی۔ تذکرہ اور ترجمہ اور فن رجال کے اعتبار سے بہت سی کتابیں ہیں' اسلامی ادبیات میں قدیم سے موجود ہیں لیکن جو علمی انداز حیات سعدی کے لئے اختیار کیا گیا۔ وہ بالکل جدید اور ممتاز ہے۔ یہ کتاب اس قسم کی سوانح عمریوں میں شامل ہے جن میں سوانح نگار کو کوئی زیادہ دقت و دشواری پیش نہیں آتی۔ ان مشاہیر کی سوانح عمریاں جنکی عظمت و شخصیت مدت سے نافذ ہو کسی خاص محنت کی محتاج نہیں کیونکہ وہ مختلف کتابوں اور تذکروں وغیرہ سے واقعات جمع کر کے اخذ و مستنبط کی جا سکتی ہیں اور سوانح نگار کے سلیقہ سے کتاب کی ترتیب و تدوین نمایاں حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ جو سوانح نگار کے لئے بھی باعث شہرت ہو سکتی ہے۔ حیات سعدی کی بھی یہی نوعیت ہو لیکن اس میں صرف واقع نگاری اور حالات کی ترتیب ہی نہیں ہے۔ بلکہ حالی نے اسکے ترتیب دینے میں تحقیق اور تنقید دونوں سے جدید اصولوں پر کام لیا ہے۔ اور اسی طرح یہ کتاب اردو زبان کے لئے خاص کر اور دیگر اسلامی زبانوں کے لئے بڑی حد تک اہمیت رکھتی ہے اسی وجہ سے حیات سعدی اردو زبان کی پہلی حقیقی سوانح عمری ہے۔

شیخ سعدی کی ہستی کسی شہرت شہدت کی محتاج نہیں تھی ہر شخص جس نے انکی تصنیفات دیکھی ہیں۔ ان کی قابلیت اور علمیت کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔ کون ایسا شخص ہے جو فارسی جانتا ہو اور شیخ سعدی سے واقف نہ ہو۔ شیخ سعدی کی تصانیف کی نوعیت اور اُن کا اسلوب بیان ہی کچھ ایسا ہے کہ ہر پڑھنے والا اس سے متاثر ہوتا ہے اور زندگی میں ہر ہر قدم پر اس سے رہبری حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والوں کے لئے شیخ سعدی کی تصانیف صرف مفید اور دلچسپ ہی نہیں بلکہ ان کے دلوں میں شیخ سعدی کے حالات زندگی معلوم کرنے کا اشتیاق بھی پیدا کر دیتی ہے۔ لہذا حالی نے حیات سعدی لکھ کر شیخ سعدی کے پرستاروں پر بہت بڑا احسان کیا ہے اور ان کو صرف شیخ کے حالات زندگی سے ہی واقف نہیں بنایا۔ بلکہ ان کو علمی تصانیف کا مطالعہ کرنے اور اُنکے سمجھنے کا صحیح طریقہ بھی سکھایا ہے۔ ہر وہ شخص جس نے شیخ سعدی کی تصانیف کو پڑھا ہے وہ اُنکے مطالعہ میں ہر مرتبہ نئی خوبیاں پاتا ہے۔ اور ہر بار یہ سمجھتا ہے کہ وہ حقیقتاً مضامین کے نکات کو پہلے اتنی اچھی طرح نہیں سمجھا تھا جتنا اب سمجھا ہے۔ اسی طرح وہ جتنی مرتبہ ان مضامین کو پڑھتا ہے۔ یہی صورت ہر دفعہ اسکو پیش آتی ہے۔ لہذا ایسے جامع مضامین کے سمجھنے کے لئے ضرور تھا کہ کوئی صحیح معیار اُنکے مطالعہ کا قائم کیا جائے۔ حالی نے جہاں اپنے ادبی ذوق کی تشنگی کے زیر اثر حیات سعدی لکھنے پر قلم اُٹھایا۔ وہاں کا ان کا مقصد یہ بھی ہوگا کہ شیخ سعدی کے مضامین کے مطالعہ کا صحیح معیار قائم کیا جائے۔

حالی کے بعد ان کے معاصرین اور خصوصاً شبلی نے اس قسم کی کئی سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ لیکن تقدم و فضیلت حالی ہی کو حاصل ہے۔ حیات سعدی جہاں اپنی

نوعیت کی پہلی سوانح عمری ہے وہاں اس میں یہ کمزوری بھی ہے کہ حالی نے اس میں بعض بعض جگہ صحیح اور غلط خیالات کو بھر دیا ہے۔ اگر حیات سعدی کو یادگار غالب اور حیات جاوید کے مقابلہ میں دیکھا جائے تو یہ بات صاف طور پر نظر آتی ہے کہ یادگار غالب میں حالی نے اس عزت و احترام کو پیش نظر رکھا ہے جو ہر شاگرد کو اپنے اُستاد سے ہونا چاہئیے۔ حیات جاوید میں وہ ایسے شخص کے حالات قلمبند کرتے ہیں جس نے حالی کو اپنا بنا لیا تھا لیکن جب شیخ سعدی رح کی باری آتی ہے تو اُنکو ایسے الفاظ سے گویا کسی بہت معمولی آدمی کا ذکر کر رہے ہیں اُصول تصنیف اور قوانین انشا پردازی میں حالی تینوں کتابوں میں ایک شخص نہیں معلوم ہوتے تاہم حیات سعدی میں وہ اپنے مقصد سے کسی حد تک عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

حیات سعدی کے علاوہ بقیہ دو سوانح عمریاں ایک خاص قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اُنکی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معاصرین کی سوانح عمریاں ہیں جن کے مدون اور مرتب کرنے میں خاص محنت و لیاقت درکار ہے۔ معاصرین کے متعلق موافق و مخالف رائے رکھنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں ان سب کو اپنے بیان سے قائل کرنا اور ان کو اپنا ہمخیال بنانا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسکے سوا معاصرین کے حالات کبھی ایک جگہ نہیں ملتے۔ بلکہ منتشر اور پراگندہ رہتے ہیں اور قرب زمانی کی وجہ سے بکثرت ہوتے ہیں۔ اسلئے ان سب کو یکجا جمع کرنا اور ان کو خاص تبویب و ترتیب کا جامہ پہنانا اور خاص اُصول و ضوابط کے تحت میں لانا بڑی مہارت اور اُستادی کا محتاج ہے۔ معاصرین کی سوانح عمریاں ابتک ہماری زبان میں بہت کم لکھی گئی ہیں یہ تقدم صرف حالی کو حاصل ہے کہ اس نے اس قسم کی دو مبند پایہ سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ یادگار غالب میں حالی نے غالب کے سوانح حیات جیسی ترتیب و تبویب کے ساتھ قلمبند کئے ہیں اور واقعات کے انبار سے مطلب اور کام کی ضروری باتیں چن کر جس سلیقہ سے یکجا جمع کر دی ہیں وہ اُنکی اُستادی اور دماغی و عقلی سنجیدگی کی دلیل ہے وہ واقعات کے ہجوم میں گھبراتے نہیں۔ بلکہ نہایت استقلال اور خاطر جمعی سے ان گوناگوں مختلف اور متضاد نوعیتوں کے حالات و واقعات کو قابو میں لاکر قلمبند کرتے ہیں۔ اس قسم کی دقتیں ہمارے سوانح نگاروں کو شاذ و نادر ہی پیش آتی ہیں آجکل حالی کے سوا شبلی بھی سوانح نگاری کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن اُنکو ہیرو وہ اشخاص تھے جنکے حالات و واقعات مختلف کتابوں میں درج تھے اور جنکی عظمت و عزت مسلم و نافذ تھی۔ اسلئے شبلی کو واقعات کی ترتیب میں کوئی مشکل درپیش نہیں ہوئی۔ وہ تلاش و محنت سے ایسی چیزیں جمع کر لیتے تھے جو عام مسلمانوں کے جذبات و خیالات سے مطابقت رکھنے والی تھیں۔ اسی وجہ سے اُنکی تحریریں بہت جلد مقبول ہو گئیں۔ مگر حالی کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کا تجربہ ہمارے کسی سوانح نگار کو آجتک نہیں ہوا حالی کے ہیرو دو ایسے شخص تھے جو اُن کے معاصرین تھے اور اپنے زمانہ کی سطح سے بہت بلند۔ غالب اور سر سید دونوں کے افکال و افعال اور خیال و اعتقادات مسلمہ طور پر اپنے زمانہ اور ماحول سے بالکل مختلف اور جداگانہ تھے۔ مرزا غالب کی شخصیت ظاہر اور مشہور ہے اور عام شخصیت سے کس قدر بلند تھی۔ اُنکی موافقت اور مخالفت میں کیا کچھ نہ ہوا۔

لائف لکھنے میں یہ ضروری ہے کہ مصنف ہیرو کے انتخاب کرنے اور سوانح زندگی لکھنے میں کوئی نہ کوئی متعین مقصد پیش نظر رکھتا ہے۔ اگر تذکیہ نفس مقصود ہے تو کسی پیغمبر یا ہادی کی سوانح عمری لکھے گا۔ اگر قومی اصلاح مقصود ہے تو کسی ایسے بڑے شخص کے حالات زندگی بیان کریگا جسنے اپنی زندگی قومی اصلاح اور قومی ترقی کی جستجو میں صرف کی ہو۔ اور اگر علمی تحقیق و تفتیش کا شوق پیدا کرنا منظور ہے تو کسی مشہور مصنف یا شاعر کے سوانح حیات قلمبند کریگا۔ یادگار غالب میں ہمیں حالی کی سب سے بڑی کمزوری جو نظر آتی ہے وہ اُنکے مقصد سوانح نگاری کا فقدان ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مرزا غالب کی زندگی ہند کے نوجوانوں کے لئے کوئی سبق رکھتی ہے۔ یا مرزا کے خانگی حالات اور اسباب سے تعلقات کا ذکر حیات انسانی میں کسی نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔ بلکہ جس چیز نے غالب کو غالب کیا ہے وہ اُنکی بے مثل فلسفیانہ شاعری ہے۔ ایسی صورت میں یادگار غالب کے مصنف کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ مرزا کی شاعری کے مختلف دور اُنکے معاصرین میں اُن کا درجہ، شاعری کے مختلف اصناف میں اُنکے کمالات پیش کئے جاتے۔ مرزا کی زندگی کے حالات و واقعات اور اسباب کے تعلقات کا ذکر صرف اسی حد تک ضروری تھا۔ جہانتک کہ ان چیزوں کا اثر انکی نظم و نثر پر پڑتا ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر کر کے مرزا کے حالات زندگی اخلاق و عادات لطائف و امثال پر تصنیف کا بیشتر حصہ وقف کیا گیا ہے۔ البتہ آخر میں کسی قدر اردو فارسی کے نظم و نثر کے نمونے دکھائے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری چند صفحوں میں مرزا کی فارسی نثر کا مقابلہ ظہوری، علی حزین اور ابوالفضل کی نثر سے کیا گیا ہے۔ اس مسئلہ پر حالی یادگار غالب کے دیباچہ میں خود روشنی ڈالتے ہیں۔ کہتے ہیں: "اگرچہ مرزا غالب کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام اُنکی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا مگر صرف اسی ایک کام نے اُنکی لائف کو دار الخلافہ کے آخر دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اسی ملک میں مرزا پر فارسی نظم و نثر کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اردو نظم و نثر پر بھی ان کا کچھ کم احسان نہیں ہے۔ اس لئے کبھی کبھی مجھ کو اس بات کا خیال آتا تھا کہ مرزا کی زندگی کے عام حالات جس قدر کہ معتبر ذریعوں سے معلوم ہو سکیں، اور انکی شاعری اور انشا پردازی کے متعلق جو اُمور کہ احاطہ بیان میں آسکیں اور ابنائے زماں کی فہم سے بالاتر نہ ہوں۔ اُنکو اپنے سلیقہ کے موافق قلمبند کروں۔" اس عبارت میں حالی نے غالب کی انشا پردازی اور شاعری کی اہمیت کو خود ہی واضح کیا ہے۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ غالب کی سوانح حیات اس ملک کے نوجوانوں کے لئے کوئی

مفید چیز نہیں ہوسکتی۔ البتہ اُنکی شعروشاعری اور انشاپردازی ہی ان کے لئے باعث شہرت ہے۔ یادگارِ غالب کے دیباچہ میں حالی دوسری جگہ کہتے ہیں "مرزا کو بحیثیت شاعری پبلک سے روشناس کرنے اور اُنکی شاعری کا پایہ لوگوں کی نظر میں جلوہ گر کرنے کا عمدہ طریقہ یہ تھا کہ ان کے اصناف کلام میں سے ایک متعدبہ حصہ نقل کیا جاتا۔ ہر صنف میں جو باتیں مرزا کی خصوصیات سے ہیں وہ بیان کی جاتیں۔ جو کلام نقل کیا جاتا اس کی لفظی و معنوی خوبیاں نزاکتیں اور باریکیاں ظاہر کی جاتیں۔ شعراء کے جس طبقہ میں مرزا کو جگہ دینی تھی اُسی طبقہ کے شاعروں کے کلام سے مرزا کے کلام کا موازنہ کیا جاتا۔ اُنکی غزل کو مرزا کی غزل سے، قصیدہ سے قصیدہ کو اور اسی طرح ہر صنف سے اُنکی صنف کو ٹکرایا جاتا۔ اور اس طرح مرزا کے پایۂ شاعری اور اُنکے کلام کی حقیقت سے اہل وطن کو خبردار کیا جاتا۔ مگر یہ طریقہ جس قدر مصنف کے حق میں دُشوار گذار تھا اسیقدر پبلک کے لئے خاصکر اس زمانے میں غیر مفید بھی تھا اگر ہم اس دشوار گذار منزل کے طے کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو ہماری وہی مثال ہوتی کہ مرغی اپنی جان سے گئی اور کھانے والوں کو مزہ نہ آیا۔ ناچار ہم نے طریقہ مذکور کے حالت موجودہ میں باوجود دُشوار ہونے کے غیر مفید بھی ہے اس موقع پر ایک ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جو ہمارے لئے سہل تر اور پبلک کے لئے مفید تر معلوم ہوتا ہے" مولانا حالی نے مرزا کے واقعات زندگی پر زیادہ زور دیا ہے اور پہلے حصہ میں اُنکے چھوٹے بڑے واقعات درج کئے ہیں جو پبلک کے لئے حقیقتاً کچھ مفید نہیں۔ البتہ دوسرے حصہ میں مرزا کے کلام کو چار حصوں میں درج کرکے کچھ مختصر رائے زنی کی ہے۔ ایسا کرنے کی وجہ وہ یہی درج کرتے ہیں جس کا حوالہ ہم ابھی اُنہی کے الفاظ میں دے چکے ہیں لیکن وجہ معقول نہیں۔ اُنہوں نے جس چیز کو پبلک کے لئے غیر مفید سمجھا ہے وہی چیز حقیقتاً زیادہ مفید تھی۔ حالی کی معذرت ایک عذر لنگ ہے وہ ان وجوہ کی بنا پر جو اُنہوں نے درج کی ہیں اپنے فرائض سے سبکدوش نہیں ہوسکتے۔

حالی نے جہاں مرزا کے حالاتِ زندگی اور اُنکی انشاپردازی اور شعروشاعری کی تعریف کی ہے وہاں اُنکی لغزشوں پر بھی کچھ روشنی ڈالی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اُن کمزوریوں پر پردہ بھی ڈالا ہے۔ مثلاً کتاب کے آخری حصہ میں یوں تو ایک جگہ لکھتے ہیں "باپ اور چچا کا سایہ تربیت بچپن میں سر سے اُٹھ گیا۔ ننھیال مرفع الحالی نانا نانی کی ناز برداری اور خود مرزا کا ذکی الحس ہونا یہ تمام اسباب ایسے تھے کہ عنفوانِ شباب میں ان کا جادۂ مستقیم سے تجاوز نہ کرنا نہایت دشوار تھا مرزا کی ابتدا بگڑی اور ایسی بگڑی کہ جب تک ننھیال کی تمام املاک اور دیہات کی صفائی نہ ہوئی نشے ہرن نہ ہوئے۔ اگرچہ مرزا بہت دیر میں سنبھلے مگر وہ جو مشہور ہے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو بھولا نہ جانو۔ اُنہوں نے اپنے فضل و کمال حسن معاشرت شریفانہ خصائل اور کریمانہ اخلاق سے جو کہ اُن کے ذاتی جوہر تھے وہ عارضی دھبے اس طرح دھو ڈالے کہ گویا کبھی ان سے دامن آلودہ نہ ہوا تھا جس فن پر اُنہوں نے لڑکپن میں ہاتھ ڈالا تھا اسکو آخر عمر تک نبھا دیا۔ غفلت اور بدمستی کے زمانے میں بھی اس کا خیال نہ چھوڑا۔ اور باوجودیکہ زمانہ قدر دانوں سے خالی تھا اس کو اس درجہ تک پہنچا کر چھوڑا جو اس کا منتہائے کمال تھا" حالی ایک زبردست شاعر کی سوانح عمری لکھ رہے تھے اور وہ خود بھی مرزا کے شاگرد تھے۔ لہذا ان کا فرض تھا کہ سوانح عمری کی بنیاد اور اس کا اصل مقصد شعروشاعری اور انشاپردازی کی تنقید کو قرار دیتے۔ لہذا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یادگار غالب کے لکھنے میں حالی اپنے مقصد سے عہدہ برآ نہ ہوسکے۔

حالی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ حیاتِ جاوید ہے۔ اسکی وسعت، حجم جامعیت اور متنوع مضامین کی ترتیب و تبویب ایسی چیزیں ہیں کہ خود حالی اس کو اپنی دیگر تصانیف کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ بلکہ بہتر قرار دیتے ہیں۔ حیات جاوید کے دیباچہ میں فرماتے ہیں "ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اس سے پہلے لکھا ہے۔ اس میں جہانتک ہم کو معلوم ہوسکیں اُنکی اور اُن کے کلام کی خوبیاں ظاہر کیں اور اُن کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی لیکن اول تو ایسی بائیگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اس کے سوا وہ ایسے لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنہوں نے اس موج خیز اور پرآشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ صحیح و سلامت جا اُترے، ان کو سب بھلا جانا۔ کیونکہ ان کو کسی کی بھلائی یا بُرائی سے کچھ سروکار نہ تھا۔ وہ کہیں راستہ نہیں بھولے۔ کیونکہ اُنہوں نے اگلی بھیڑوں کی لیکھ سے کہیں اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے۔ بڑے بڑے علماء و مفسرین کو ٹوکا ہے۔ اماموں مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے۔ قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے۔ اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں جسکو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق لکھا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے اور جس کو پولیٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راست باز لبرل جانا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیسے لکھی جاسکتی ہے ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھونک بجا کر دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسکی لائف سے اسکی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے" حالی نے جن اصولوں کا ذکر کیا ہے ان کو نہایت دیانت اور استقلال سے نبھایا ہے، اُنہوں نے سرسید کی زندگی کے ہر واقعہ اور شعبہ کا ذکر کیا ہے۔ اُنہوں نے صرف واقعات ہی نہیں جمع کئے ہیں۔ بلکہ اُن کو کسوٹی پر کس کر

دیکھا بھی ہے۔ مولانا حالی کی رائے ہر مسئلے اور ہر موضوع پر قطعی اور مستقل ہوتی تھی۔ جس کا اظہار وہ نہایت صفائی سے کر دیتے تھے۔ ان کے معاصرین اور خصوصاً مولانا شبلی نے ان کے طرز استدلال کو دیکھ کر کہا کہ "حیاتِ جاوید کو میں مدلل مداحی سمجھتا ہوں"۔ اس کے علاوہ اکثر موقعوں پر حیات جاوید کی تنقیص میں عموماً تین لفظ کہے جاتے ہیں ایک رنگی تصویر، مدلل مداحی اور کتاب المناقب اور تینوں الفاظ مولانا شبلی کے ہیں۔ حالی پر یہ الزام ہے کہ انہوں نے حیات جاوید میں بیجا مدح سرائی کی ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب شروع سے آخیر تک ایک اعتذار کا پہلو لئے ہوئے ہے

مولانا شبلی کے اعتراضات کے جواب میں ان کے خلاف خود ان کے پرجوش حامی عبدالماجدی نے صدائے احتجاج بلند کی ہے اور اس کی توجیہہ یہ پیش کی ہے کہ شبلی کی حد سے بڑھی ہوئی خودداری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں زیادہ فیاض نہیں تھی۔ اسکے علاوہ مولانا شبلی کا اعتراض بے سبب ہے۔ اگر مولانا شبلی کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں دیکھی جائیں تو وہ خود اس عیب سے خالی نہیں۔ اور اگر بالفرض حیاتِ جاوید کو مدلل مداحی مان بھی لیا جائے تو اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ حالی نے اندھا دھند واقعات کا انبار نہیں لگایا ہے۔ بلکہ خاص اصول و ضوابط کے تحت ان کو مرتب کر کے اپنی ذاتی رائے کی روشنی میں تنقید کی اور نتائج اخذ کئے ہیں۔ یہ وہی شخص کر سکتا ہے جو خود بھی تمام مسائل پر عبور اور تبحر رکھتا ہو۔ حالی میں یہ جامعیت اور قوت استدلال موجود تھی۔ اول تو کہیں حالی نے سرسید کی بے جا اور بے سبب مدح سرائی نہیں کی اور جہاں کہیں کی بھی ہے تو اس کی دلیلیں بھی پیش کی ہیں۔ تاکہ پڑھنے والا خود اس کا فیصلہ کر سکے اور سمجھ سکے کہ حالی کس حد تک سرسید کی تعریف کرنے میں حق بجانب تھے۔ حالی تو کیا سرسید کے واقعات زندگی پر ان کے کارناموں پر اور ان کی ان جان توڑ کوششوں پر جو انہوں نے قومی فلاح کے لئے اپنی عمر کے آخری حصہ تک کیں۔ جو کوئی شخص بھی غور کریگا وہ انکی عالی حوصلہ اور غیر معمولی قابلیت اور محنت پر صدائے آفرین بلند کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حالی نے سرسید کی زندگی کے تمام واقعات بے کم و کاست قلمبند کر دیئے ہیں اور ان پر اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ لہذا وہ اس مدلل مداحی میں بالکل حق بجانب ہیں۔ مصنف کو اول تو اپنی رائے ظاہر کرنے کا بالکل اختیار ہے اسکے سوا سرسید کی ذات اور انکے صفات تھے بھی ہی قابل کہ انکی جہانتک تعریف ہوسکے کم ہے۔ لیکن حالی نے تو صرف مدلل مداحی پر اکتفا کیا ہے جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ حیات جاوید شروع سے آخر تک ایک اعتذار کا پہلو لئے ہوئے ہے اس کا جواب یہ ہے کہ سرسید مرحوم اپنے وقت کے ایک غیر معمولی شخص تھے۔ انہوں نے قوم کی زبوں حالت کو دیکھیں اور دیکھ کر تڑپ گئے۔ آنسو بہائے اور جب ضبط نہ ہو سکا تو اسکی فلاح کا بیڑا اٹھایا۔ یہ قاعدہ ہے کہ تباہی میں انسان جب اپنی برائیوں کو سمجھنے کی قوت کھو بیٹھتا ہے تو اس وقت اس کو ہر پند و نصیحت تلخ معلوم ہوتی ہے۔ یہی حالت اس وقت قوم کی بھی تھی۔ جب سرسید نے اسکو اس خواب گراں سے جگانا چاہا اور اس کو اسکی غفلت سے آگاہ کیا تو لوگوں کو انکی وہ آواز بری معلوم ہوئی۔ اسکے علاوہ سرسید نے اپنی کوششوں میں جو غلطی کی وہ یہ تھی کہ انہوں نے مذہب کو ہاتھ لگایا مذہب مسلمانوں کو جان و مال سے زیادہ عزیز تھا اور مذہب کا یہ وہ دور تھا جب ہر شخص اپنے عقائد اور رسم و رواج کے لئے کوئی دلیل نہیں سننا چاہتا تھا۔ سرسید کی اسی مداخلت سے لوگ چراغ پا ہوگئے اور ہر طرف سے سرسید پر تکفیر کے فتوے لگائے جانے لگے ایسی حالت میں لوگ سرسید کے اس قدر خلاف ہوگئے کہ ان کے ہر کارنامے کو وہ کسی نہ کسی برائی پر محمول کرتے تھے اور اس طرح اس ایک گناہ نے سرسید کے تمام کارناموں پر پانی پھیر دیا۔ حالی نے اس کا اندازہ کرلیا۔ اور دوسری طرف انہوں نے سرسید کی ذات میں ان کے کمالات کا نور بھی دیکھا جسکی چمک تمام قوم کو روشن کرنے کے لئے کافی تھی۔ لہذا انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر سے پردہ ہٹانا چاہا۔ اور سرسید کے مقاصد اور انکی کوششوں سے آگاہ کرنا چاہا۔ چنانچہ حیاتِ جاوید میں انہوں نے سرسید کی زندگی کی مکمل تصویر پیش کی ہے تاکہ لوگ سرسید کو پہچانیں اور اپنے دماغوں کو تعصب کے اثرات سے بچا کر سرسید کی کوششوں کی تکمیل کو پہونچائیں یہ ہے حقیقت اس بات کی کہ حیات جاوید اعتذار پر مبنی ہے۔ حیاتِ جاوید کا مقابلہ اس لحاظ سے انگریزی مشہور تصنیف "ڈاکٹر جانسن کی سوانحعمری مصنفہ جیمس بوزول ——————" سے کیا جا سکتا ہے۔ بوزول کی کتاب کی شہرت کا دارومدار تمامتر اس قلمی تصویر پر ہے جو جانسن کے عین مطابق ہے جس میں بوزول نے ڈاکٹر جانسن کی سوانح عمری انہی وجوہات کے تحت میں لکھی ہے جن کے تحت میں حالی نے حیات جاوید لکھی ہے۔ ڈاکٹر جانسن انگلستان کا ایک بہت ہی لائق اور عالی دماغ شخص گذرا ہے۔ اسکے انتقال پر اسکے دوست بوزول نے اسکی لائف عقیدت و خلوص کے ساتھ تحسین آمیز لہجہ میں نہایت مفصل اور مؤثر طریقہ سے لکھی ہے حیات جاوید کی تنقیص میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسکی ضخامت اس قدر زیادہ ہے کہ ہر شخص کو اُسکے مطالعہ کی ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ اعتراض فوراً دفع ہو جاتا ہے اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ حالی کو حیات جاوید لکھنے میں لوگوں کے سامنے سرسید کی زندگی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات پیش کرنے تھے۔ تاکہ سرسید کے اوپر جو طرح طرح کے بے بنیاد الزامات لگائے گئے تھے اُن سے لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے اور اُن کے دلوں سے سرسید کے متعلق تمام شکوک رفع کر دیئے جائیں۔ لہذا یہ غیر ممکن تھا کہ حالی کا یہ مقصد بھی پورا ہو جاتا اور انکی تصنیف مختصر بھی ہو جاتی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حیات جاوید میں سرسید کی زندگی کا ایک رُخ دکھایا گیا ہے۔ اسکے متعلق بھی چند ضروری باتیں بیان کرنا ہے۔ حالی حیاتِ جاوید میں ایک جگہ لکھتے ہیں "سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعوےٰ ہے اور نہ اسکے ثابت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں"۔ یہ اصول ان کا کتاب کے آخیر تک رہا اور کتاب کی خوبی خود اس کی شاہد ہے کہ وہ اس پر کاربند ہوئے ہیں۔ تفسیر القرآن کے متعلق فرماتے ہیں:- "سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا

ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض مقامات پر اُن سے نہایت رکیک لغزشیں سرزد ہوئی ہیں"۔ ٹرسٹی بل کے ہنگامے کے متعلق حالی کی رائے ہے کہ "سرسید بالکل ڈیسپاٹک آدمی تھے، اور کالج کے اندرونی انتظامات میں وہ بہت سی باتیں موجود ہیں جن کو سرسید کی خودداری، ضد اور ہٹ کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے"۔ ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں کہ آخیر عمر میں سرسید کو اپنی رائے پر ضرورت سے زیادہ وثوق ہو گیا تھا اور بعض وقت وہ ایسی باتیں کہہ جاتے تھے جن کو سن کر ہر شخص کو تعجب ہوتا تھا خصوصاً جب وہ قرآن شریف کی بعض آیتوں کے ایسے معنے بیان کرتے تھے جنہیں کوئی تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ مثلاً ذوالقرنین کو سرسید نے فغفور چین ٹھیرایا ہے۔ مگر اسکو ماننے کے لئے ہمارے پاس دلائل بہت کمزور ہیں۔ ان مثالوں سے واضح ہو گیا ہو گا کہ حیات جاوید کتاب مطلقاً نہیں کہی جا سکتی۔ کیونکہ اس میں تصویر کے دونوں رُخ دکھائے گئے ہیں۔ کتاب کا پہلا حصہ جس میں سرسید کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اتنا اہم نہیں ہے لیکن دوسرا حصہ جسمیں سرسید کی ترقی کے اسباب انکی خدمات اور عام عادات و خصائل پر نظر ڈالی گئی ہے خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ حالی نے سرسید کی ترقی کے اسباب بہت خوبی سے بیان کئے ہیں اور بالکل صحیح فرمایا ہے کہ ان کے تمام کارناموں کا محرک مذہب ہے یہ قول اگرچہ بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن ہے بالکل درست اور حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے خود کئی جگہ اسی کا اعتراف کیا ہے۔ یوں سیاسی، ملکی اور تعلیمی اور ادبی خدمات سب کا ذکر اچھی طرح کیا گیا ہے لیکن مذہبی خدمات کا ذکر کتاب کی جان ہے، مولانا نے اس میں کافی تفصیل برتی ہے اور اپنی غیر معمولی قوت استدلال سے کام لے کر سرسید کے تمام مذہبی کارناموں پر خصوصاً خطبات احمدیہ و تفسیر القرآن پر سیر حاصل بحث کی ہے جس میں جگہ جگہ ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے۔ یہ کتاب جن اصولوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے ان کے لحاظ سے بےنظیر کتاب ہے یہ مسلمانوں کے لئے سبق آموز ہے۔ اس میں تمام واقعات و حالات خاص ترتیب سے پیش کئے گئے ہیں اور ہیرو کی زندگی کے تمام عناصر اور کامیابی و ترقی کے اسباب پر اس تفصیل سے بحث کی گئی ہے کہ کتاب صرف ایک شخص کی تصویر نہیں رہی بلکہ تمام قوم اور ماحول کی تصویر ہو گئی ہے۔ اس میں نہ ہیرو کی بے جا پاسداری ہے اور نہ اس کی بے بنیاد مداحی۔ اس میں اُنہوں نے جو کچھ لکھا ہے بقول وحیدالدین سلیم "واقعات کی بنیاد پر لکھا ہے، بے جا طرفداری اور مبالغہ کا اسمیں نام و نشان نہیں۔ اگر واقعات سے اگر تعریف نکلتی ہے تو وہ تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے اور نکتہ چینی کا موقع ہاتھ آیا ہے تو اسکو بھی کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا"۔ "بحیثیت مجموعی شبلی کا یہ قول تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ" ایک شریف انسان نے ایک شریف تر انسان کی سرگذشت لکھی اور آشنائے فن ہو کر لکھی"۔

سرسید ایک بلند مرتبہ مصلح اور قوم پرست تھے۔ لیکن انکی زندگی گذشتہ مشاہیر کے حالات اور ماحول سے ہر طرح مختلف تھی" یہ حالی کا کارنامہ ہے کہ اُنہوں نے سرسید کی سوانح عمری کو خاص اصول و ضوابط کے تحت میں علمی طریقہ سے مرتب کیا۔ اور اُن مسائل کو اس اُستادی سے سب سے اول قلمبند کیا ہے کہ یہ کتاب اسلامی ادبیات میں پہلی سائنٹفک سوانح عمری کہلائی اور زبان، بیان، انداز اور اصول فن کے اعتبار سے مکمل نمونہ بن گئی"۔ اچھے اچھے ادیب اور انشا پرداز اس سے رہبری اور ہدایت حاصل کرنے لگے چنانچہ مرحوم سید علی بلگرامی کے متعلق مشہور ہے کہ جس زمانہ میں تمدن ہند کا ترجمہ کر رہے تھے تو وہ صبح اُٹھ کر اوّل چند ورق حیات جاوید کے پڑھ لیتے تھے اس کے بعد ترجمہ شروع کرتے تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے اور جو اکثر نئے تعلیم یافتہ حضرات کر بیٹھتے ہیں کہ حیات جاوید کو وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو اُسکے ہیرو اور مصنف دونوں کو شایاں ہے۔ بات یہ ہے کہ سرسید کو ہم نے قرب زمانی کی وجہ سے نہایت بیدردی سے بھلا دیا ہے اور نہایت ناشکری کے ساتھ انکے انقلاب انگیز احسانات پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ اب رہا مصنف کے کارنامہ کی طرف سے تغافل تو اسمیں ایک حد تک خود مصنف کا بھی قصور ہے۔ یہ اس قدر ضخیم کتاب ہے کہ کسی کو اسکے مطالعہ کی ہمت نہیں ہوتی۔ ایک اور سبب اسکی طرف سے بدگمانی کا ہے۔ اس کی نسبت یہ مشہور ہے کہ اسمیں سرسید کی تصویر کا ایک رُخ دکھایا گیا ہے۔ لیکن ان دونوں باتوں کی حقیقت وہی ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔

حیات جاوید حالی کی تحریر کا سب سے بہترین نمونہ ہے لیکن اسمیں حالی کی ایک کمزوری بھی ہے وہ انگریزی الفاظ کا بعض بعض جگہ بے ضرورت استعمال کرتے ہیں درآں حالیکہ ان الفاظ کے مترادف اردو الفاظ بھی موجود ہیں لیکن اس امر سے اس کمزوری پر پردہ پڑ جاتا ہے کہ حالی نے ہندی کے بہت سے نرم اور شیریں الفاظ اُردو میں اس طرح جذب کر دیئے ہیں کہ آج وہ اردو کے ہی ہو گئے ہیں اور اس طرح اُردو کو وسعت دی۔ اس کے علاوہ بہت سے متروک الفاظ کو برمحل استعمال کر کے ان کے صحیح استعمال کا طریقہ نافذ کر دیا اور "ان متروک و مردود الفاظ کو دربار فصاحت میں جگہ دی"۔

جس طرح حالی کا دل پاک اور دماغ سُلجھا ہوا ہے اسی طرح انکی تحریریں پاک صاف سنجیدہ اور متین ہیں، وہ پیچیدہ سے پیچیدہ اور طویل سے طویل مسائل عام فہم اور پاکیزہ انداز میں صحت اور رواتی کے ساتھ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ مضمون کے اعتبار سے پیرایہ اختیار کرتے ہیں اور نہایت فصیح و بلیغ الفاظ میں اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔ وہ واقعات کی تفصیل اور مسائل کی نزاکت سے گھبراتے نہیں بلکہ اُن پر قابو پا کر ضبط تحریر میں لاتے ہیں۔ "سید انصاری صاحب نے بہترین انشاپردازی میں حالی کی تحریر کو روکھا پھیکا اور بے مزہ کہا ہے لیکن وہ اس بات کو فراموش کر بیٹھے کہ حالی نے" وہ پیرایہ اختیار کیا جس سے بہتر کوئی دوسرا پیرایہ علمی و ادبی مسائل کے لئے موزوں و مناسب نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ نہایت خوبصورت و دلچسپ اور

دل فریب تحریریں لکھتے ہیں اگر اُنہیں کوئی علمی و ادبی موضوع دیدیا جائے تو اُن کی جوگت بنتی ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ اُن کی لفظی آرائش علمی خیالات ادا نہیں کرسکتی اور وہ صداقت و دیانت کے ساتھ اُنکی ترجمانی کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ زبان کی خوب صورتی کے لئے لازم ہے کہ مبالغہ اور شاعرانہ لفظ طرازیوں سے کام لیا جائے۔ یہ شاعرانہ تحریروں میں کام دے سکتا ہے لیکن علمی و ادبی خیالات کی صحت و باریکی شاعرانہ صناعی کو قبول نہیں کرتی۔ اس کا قدم آیا۔ اور علمی مسائل کی نزاکت فنا ہوگئی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حالی کی طرز تحریر "ادیبانہ اور انشا پردازانہ ہی نہیں بلکہ علمی اور خالص تنقیدی بھی ہے"۔ اس کے علاوہ جس تحریر کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سادہ اور بے مزہ ہے وہ اُردو میں سلیس و سادہ مگر پُرزور نثر لکھنے کی پہلی کوشش تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ حالی نے اُردو میں سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی اور ایسے وہ اعلیٰ نمونے ہماری رہبری کے لئے چھوڑ گئے ہیں کہ ہم آج تک ان سے بصیرت و ہدایت حاصل کرتے ہیں۔" حالی نے جہاں سوانح عمری کی اُردو زبان میں داغ بیل ڈالی وہاں اپنے ہاتھوں سے اسکو پروان چڑھایا اور اس میں اس قدر وسعت۔ جامعیت اور استحکام پیدا کیا کہ اُنکی تصانیف ہمارے لئے کامل نمونہ بن گئیں۔

محمد عیسٰے خواجہ ایم۔ اے
مُرسلہ:۔ نواب ذکیہ سلطانہ ذکی۔ مُرادآبادی

اہتمامِ بہار

اُداسی اور ویرانی ہے یکسر بزمِ انساں میں　　بہاروں کا حصول آساں نہیں دنیائے امکاں میں
عروسِ رنگ و بُو کی جاں فزا یہ رنگ سامانی　　طلب کرتی ہے خواہش مندِ رنگ و بُو سے قربانی

بہارِ کیف در داماں کا جلوہ اتنا رنگیں ہے
طلب گارِ نوا و رنگ جو ہے محوِ تزئیں ہے

چمن پیراہنِ بوسیدہ کو جب پھینک دیتا ہے　　خزاں کی سلطنت سے جب خراجِ رنگ لیتا ہے
سحاب اندازِ گریہ سیکھتا ہے جب محبت سے　　بہا دیتا ہے دریا جب فلک کی نیلگوں چھت سے
یہ کلیاں آشنا ہوتی ہیں جب جوشِ جوانی سے　　یہ سینے اُٹھتے جب ہوتے ہیں شق سوزِ نہانی سے
فراقِ گُل میں جب بلبل بکا و نالہ کرتا ہے　　غمِ جاں سوز سے جب سازِ دل میں سوز بھرتا ہے
اُڑاتی ہیں ہوائیں نکہتیں جب زُلفِ جاناں سے　　مہک بن بن کے جب اُڑتی ہیں صحنِ گلستاں میں
لبِ لعلینِ جاناں جب گلوں سے رنگ بھرتا ہے　　شعاعِ مہر سے جب باغ کا چہرہ نکھرتا ہے
جب آنسو بن کے چشمِ چرخ سے شبنم ٹپکتی ہے　　ہم آغوشی کو جب اِک شاخ سوئے گُل لپکتی ہے
فلک سے بجلیاں جب ٹوٹتی ہیں آشیانوں پر　　بکھر جاتے ہیں ٹکڑے ابر کے جب آسمانوں پر
جگر میں جب کسی دوشیزہ کے اک ہوک اُٹھتی ہے　　جب اندوہِ حقیقی سے یہ کوئل کوک اُٹھتی ہے
غضب کی ایک رنگینی جب آجاتی ہے ذرّوں میں　　پڑا کرتے ہیں جب جھولے چمن کی سبز شاخوں میں
کوئی دوشیزہ جب باریک لَے میں گیت گاتی ہے　　فضائے کائنات اِک شعر سے جب جھوم جاتی ہے
زبانِ شاعرِ رنگیں پہ جب پیغام ہوتا ہے　　جب اسکے ذہن و لب پر عرس کا الہام ہوتا ہے
تو پھر فطرت کے اس کیف و نشاطِ روح پرور میں　　چمن کے پیکرِ رنگیں میں اور پھولوں کے ساغر میں

بہارِ لطف ساماں کی ادائیں رقص کرتی ہیں
جو ہیں بے رنگ گوشے اُن کو رنگینی سے بھرتی ہیں

محمود جالندھری

ڈاکٹر کی کہانی ڈاکٹر کی زبانی

انسان کی زندگی بھی خوب طرفہ معجون ہے۔ پیدا ہوتے ہی کوئی نہ کوئی روگ بلائے جان لگ ہی جاتا ہے۔ ابھی چھوٹے ہی سے ہوتے ہیں کہ ڈرانے کو اللہ کا فضل۔ مائی بیبی کا دردورہ ہوتا ہے۔ ذرا بڑے ہوئے مولوی صاحب بلائے جان آدھمکے۔ مدرسہ بیٹھے ماسٹر جی بلائے جان سر پر سوار ہوئے۔ پڑھ لکھ گئے نوکری بلائے جان دامنگیر ہوئی۔ شادی خانہ آبادی رچائی تو اونچی ایڑی والی بیوی بلائے جان ثابت ہوئی۔ نت نئے گل کھلے۔ پھر کیا تھا۔ بچے وہ بھی چھوٹے چھوٹے۔ دُبلے پتلے۔ موٹے بھونڈے۔ لنگڑے لولے بلائے جان ہوئے۔ ایک کندھے پر بسولا۔ دوسرے پر بسولی۔ ایک ٹانگوں میں چیاؤں میاؤں تو چوتھا جھوجھو جھولے میں ٹیں ٹیں۔ مذہب کا شوق چرایا تو ملّاجی بلائے جان نصیب ہوئے۔ جمعرات کی شیرینی۔ جمعہ کا ثواب۔ دوزخ کا عذاب جنّت کی بہار غرضیکہ ہر رنگ میں ملّاجی کی جیت ہی رہی۔ تہذیب کا بھوت سوار ہوا تو فیشن بلائے جان رنگ لایا۔ درزی کا بل۔ کالر ٹائی۔ رومال کا قرضہ چکانا ہی دشوار ہوگیا۔ شاعرانہ مذاق پایا تو عشق بلائے جان جلانے کو آن دھمکا۔ خونِ دل پیا لختِ جگر کھایا۔ ٹھنڈی آہیں بھریں۔ شکوے کئے آہ وزاری اور مزید براں گالیاں۔ پوری بپتا سہنی پڑی۔ غرضیکہ زندگی کی ہزاروں سکندریاں۔ کیا کیا گنیں۔ بیماری۔ قرضہ۔ آگ۔ چوری۔ زلزلہ آیا گیا مہمان۔ جن۔ بھوت۔ سید صاحب۔ ہزاروں بلائے جان موجود ہیں یوں سمجھئے کہ انسان کی زندگی بلائے جان آفتوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ ہے۔

ان بلائے جان شدتیوں میں ہم نے ڈاکٹر کو کبھی شامل نہ کیا تھا۔ بلکہ ہم تو ان حضرت کو فرشتۂ رحمت سمجھتے ہیں۔ ہم دل لگی بات کہیں گے اور خدا سے ڈر کے۔ ان ڈاکٹروں میں ہیرے لوگ بھی موجود ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں۔ کوئی پانچوں انگلیاں برابر تو ہوتی نہیں۔ پھر ایک ہی لاٹھی سے سب کو کیوں ہانکیں۔ بھانت بھانت کے آدمی ہوتے ہیں۔ کوئی ایک جیسی مخلوق تھوڑی ہے۔ ہماری زبان کے آگے آئے اگر ہم جھوٹ بولیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمیں پہلا احساس ڈاکٹر بلائے جان کا اس وقت ہوا جبکہ ماشاراللہ ابھی ہمارا بچپن ہی تھا۔ سبزہ آغاز ہو رہا تھا مسیں کچھ کچھ بھیگ چلی تھیں۔ نئے نئے کالج میں گئے تھے دیدہ ہوائی تھا۔ یہاں کے میچ۔ وہاں کا کھیل۔ اِدھر کی محفل۔ اُدھر کا جلسہ۔ کتابوں کو پڑھتا کون۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ کتابوں پر نیم کے پتّے ڈال رکھے تھے جو کیڑے بھی نہ چٹ کر سکتے۔ سر پر امتحان کا وبال آن کھڑا ہوا۔ دل ہی دل میں کوسا کئے۔ کس کمبخت نے امتحان نکالے۔ کوئی بدطینت آدمی ہوگا۔ یکایک خیال آیا کہ ڈاکٹر یاتی رام اور آکا بھائی کی دوستی کس دن کام آئیگی۔ ان سے مدد لیں۔ ڈاکٹر صاحب بیچارے بزرگوں کی طرح شفقت کرتے تھے۔ ہمیشہ کہتے تھے۔ کہ میاں تم بچے ہو۔ بڑا شہر ہے۔ کوئی تکلیف ہو تو ہمیں کہنا۔ اپنا ہی گھر سمجھو ورنہ دیکھو تمھارے آکا بھائی ہمیں زندہ نہ رہنے دیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ ہماری امیدیں بن گئیں۔ صبح سے ہی منہ ہاتھ دھونا بند کر دیا۔ خوب سوئے۔ سوسو کر آنکھیں کپا کریں۔ موٹا سا سینہ بند پہنا۔ جیسے سردی لگ رہی ہو۔ میلا پاجامہ نکالا۔ ٹوپی پر دیوار کی سفیدی رگڑی۔ جیسے کسی بات کی ہوش نہیں۔ منہ بسورا ہوا ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچے۔ اِدھر سے ہم پہنچے اُدھر سے وہ برآمد ہوئے۔ ہاتھ میں چھڑی تھی۔ کہیں باہر جا رہے تھے۔ ہم نے دل میں سوچا کہ بھائی خوب پکڑا۔ مجھے دیکھتے ہی ڈاکٹر صاحب کچھ پریشان سے ہوگئے۔ شاید سوچتے ہوں کہ کہیں قرضہ مانگنے تو نہیں آدھمکا۔ لیکن تھے جہاندیدہ غور سے میری طرف دیکھا۔ اور فرمانے لگے خیر تو ہے۔ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے۔ اور مجھے اطلاع بھی نہ دی۔ اندر آؤ۔ ہاتھ پکڑ سہارا دیتے ہوئے کمرے میں لیگئے۔ ایک بید کی کرسی پر لٹا دیا۔ ہم نے بھی تیتا مرچ ہلاس بنا رکھا تھا۔ آنکھ بچا ذرا سا سونگھا۔ اب ہمارا چہیتا ملاحظہ ہو۔ ناک ہے کہ بہہ رہی ہے۔ آنکھوں سے پانی رواں ہے۔ منہ پر چودہ طبق روشن ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پریشان ہیں۔ ہم سوں سوں کر رہے ہیں۔ کھانس بھی لیتے ہیں اور کہتے جا رہے ہیں۔ جی نہیں پریشانی کی تو بات نہیں ذرا کھانسی نزلہ، زکام اور بخار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کچھ جلال میں آگئے۔ ہم تمھارے آکا بھائی کو ابھی چٹھی لکھتے ہیں زبان دکھاؤ۔ (ہم نے زبان نکالی) اوہو۔ اس قدر گندی۔ آنتوں میں زہر بھرا ہوا ہے۔ منہ کھولو۔ اُف پکے بیر۔ ہم نے متانت سے کہا جی نہیں پیوندی بیر تو نہیں کھائے۔ بیوقوف، بیر کا کیا ذکر ہے، تمھارے غدود ٹانسل کا ذکر ہے۔ جھٹ سے آنکھ کا پپوٹا پلٹا۔ خون کا نشان

غزلیات

پھر ہوا چرخ مرے درپئے ایذا کیسا
پھر ہوا ہجر مری جان کا لیوا کیسا

پیری آئی تو جوانی نے بدل لیں آنکھیں
چھٹ گیا ساتھ یہ برسوں کا خدایا کیسا

واہ کیا خوب یہ ضد ہے کہ چھپے بیٹھے ہیں
دل میں گھر کر لیا پھر آنکھ سے پردا کیسا

ڈوری ڈالے وہ بتوں نے کہ نہ بچنے پائے
نہیں معلوم کہ یہ پڑ گیا پھندا کیسا

دیر کی سمت بڑھوں اب کہ حرم کی جانب
راہ میں آن پڑا ہے یہ دوراہا کیسا

نہ سنی پر نہ سنی میری دلِ ناداں نے
اسکو سمجھا تیکو سمجھایا نہ کیسا کیسا

اپنے جلووں کی تو تعریف بہت فرمائی
داد مجھ کو بھی تو دی ہوتی کہ سنبھلا کیسا

خواہشِ ظلم و ستم بھی جو کبھی کرتا ہوں
وہ بگڑتے ہیں کہ آخر یہ تقاضا کیسا

سالہا سال میں مر مر کے کہیں ختم ہوا
زندگانی کا تھا ہنگامہ خدایا کیسا

چپ جو رہتا ہوں تو کہتے ہیں خموشی کیسی
جب تڑپتا ہوں تو کہتے ہیں تڑپنا کیسا

داستاں صاف بتاتی ہے مہ کنعاں کی
اپنے اپنے نہ ہوئے، غیر کا شکوا کیسا

تو نے دیکھا ہے مرے بُتِ شہ رباکو ناصح
وضع کیسی ہے اور اس کا ہے سراپا کیسا

تم وہی ہو کہ مجھے قتل کیا تھا تم نے
اب مری قبر پہ بیکار یہ رونا کیسا

عام جلوہ ہے، کوئی دیکھنے والا تو ہو
سب قصور اپنی ہی آنکھوں کا ہے پردا کیسا

دل کو بیکار جلایا کئے اوروں کیلئے
آہ گھر پھونک کے دیکھا ہے تماشا کیسا

دوست جو کوئی نہ ہے وہ جلتی رقم ہے گویا
میں بھی دنیا میں ہوں تقدیر کا کھوٹا کیسا

ناتوانی کا بھلا ہو کہ دبا سا تھا اس نے
ڈوبتے کو ہوا تنکے کا سہارا کیسا

اب جو پیری ہے تو یاد آتا ہے کمبخت شباب
ایک دن ہم کو جوانی کا تھا شکوا کیسا

کبھی تقدیر نے گتھی کو سلجھنے نہ دیا
پڑ گیا رشتۂ تدبیر میں پھندا کیسا

شوق سے آپ چلائیں مری گردن پہ چھری
اُف بھی کر جاؤں تو کہئے گا تڑپنا کیسا

سرِ ممبر ہیں کہ کوثر پہ کھڑے ہیں واعظ
جام مے کا نہ ئیے جاتی ہیں یہ چھینٹا کیسا

نامۂ شوق کی حسرت میں زمانہ گذرا
پیش آیا مری تقدیر کا لکھا کیسا

بات کیا تھی کہ اڑے حضرتِ موسیٰ کے حواس
وہ شرارہ تھا سرِ طور خدایا کیسا

لڑ گئیں آنکھیں کسی بُت سے، خدا خیر کرے
دیکھئے اب یہ دکھائیں کی تماشا کیسا

دم بھی ٹوٹا مرا تو یادِ مے دمینا ہے
میں نے توبہ شکنی کو بھی نباہا کیسا

حسنِ بُت دیکھ کے سب نقش بدیوار ہوئے
تو نے کھینچا مرے اللہ یہ نقشا کیسا

شادی و غم کو تو ہم کیسے نہ سمجھیں شاکر
ہنستے ہنستے مجھے آجاتا ہے رونا کیسا

شاکر میرٹھی

تمھارے حسن کی تسخیر عام ہوتی ہے ۔۔۔ کہ اک نگاہ میں دنیا غلام ہوتی ہے
جہاں یہ جلوۂ جاناں ہے انجمن آرا ۔۔۔ وہاں نگاہ کی منزل تمام ہوتی ہے
نمازِ عشق کا ہے انحصار اشکوں تک ۔۔۔ یہ بے نیاز سجود و قیام ہوتی ہے
زہے نصیب میں قربان اپنی قسمت کے ۔۔۔ ترے لئے مری دنیا تمام ہوتی ہے
نگاہِ حسن مبارک تجھے دراندازی ۔۔۔ کبھی کبھی مری محفل بھی عام ہوتی ہے
تری نگاہ کے قرباں تری نگاہ کی ٹیس ۔۔۔ یہ ناتمام ہی رہ کر تمام ہوتی ہے

کسی کے ذکر سے بہزاد مبتلا اب تک
جگر میں اک خلشِ ناتمام ہوتی ہے

بہزاد لکھنوی

گزرے گی کیا جمالِ رخ یار دیکھکر ۔۔۔ حیرت ہے حسن حسرتِ دیدار دیکھکر
ہر تارِ آستیں میں ہے اک شہر آرزو ۔۔۔ ہنستا ہوں رنگ دیدۂ خونبار دیکھکر
ناسازئی جہاں کی تو پروا کبھی نہ تھی ۔۔۔ جی بجھ گیا ہے تم کو دل آزار دیکھکر
اس دل فگارِ شوق کی حسرت نہ پوچھئے ۔۔۔ مجروح ہو گیا ہو جو تلوار دیکھکر
مجھ کو سنبھل تو لینے دے ای عمر تیز گام ۔۔۔ ہے پابگِل صبا تری رفتار دیکھکر
وہ رنگِ التفات وہ انداز برہمی ۔۔۔ لطف آگیا تر اک ستم آزار دیکھکر
آنکھیں ہوئی تھیں چار کہ پہلو میں کچھ نہ تھا ۔۔۔ دل کھو گیا نگاہِ خریدار دیکھکر
کوئی کھلا ہوا ہی تو کوئی چھپا ہوا ۔۔۔ واعظ نہ چھیڑ مجھ کو گنہگار دیکھکر
ہر رنگ میں مسرّت و غم ساتھ ساتھ ہیں ۔۔۔ حیرت زدہ ہوں ربطِ گل و خار دیکھکر
آنکھوں کے سامنے ہی متاعِ دل و جگر ۔۔۔ خوش ہو رہا ہوں دامنِ گلزار دیکھکر
بیتاب کر دیا نگہِ التفات نے ۔۔۔ آنسو نکل پڑے انھیں غمخوار دیکھکر

کوکب دیارِ عشق کچھ ایسا اُداس ہے
روتی ہے بیکسی در و دیوار دیکھ کر

کوکب شاہجہانپوری

کیا زندگی و موت بھی۔ کیا کون و مکاں بھی ۔۔۔ اک خوابِ پریشاں ہی نظامِ دو جہاں بھی
امید نہ رکھتے تھے بہت عشق میں لیکن ۔۔۔ ان باتوں کا تجھ سے تو نہ ہوتا تھا گماں بھی
اک شامِ غریباں میں فسانہ ہے فسانہ ۔۔۔ یہ حسن و محبّت بھی، جہانِ گزراں بھی
کچھ پوچھ نہ اس وقفۂ ہستی کی کشاکش ۔۔۔ کچھ موت ہے ٹھہری ہوئی کچھ عمر رواں بھی
اللہ ری نیرنگئی تقدیرِ محبّت ۔۔۔ بیداری جاوید بھی ہے، خوابِ گراں بھی
کر عہدِ گذشتہ کو شریکِ غمِ امروز ۔۔۔ خاکسترِ ماضی سے کچھ اٹھتا ہے دھواں بھی
ہے صلح کل اس انجمنِ ناز میں ہر سمت ۔۔۔ رہ رہ کے کچھ ابرو کی لچکتی ہے کماں بھی
بیگانہ عالم ہے بہت عشق بھی لیکن ۔۔۔ کیوں بند ہے مدّت سے زمانہ کی زباں بھی

مانوس ذرا جان کے خطروں سے بھی ہو لے
سنتے ہیں فراق ایسوں کو ملتی ہے اماں بھی

فراق گورکھپوری

جانستاں کو دل دیگر کیا بتائیں کیا پایا
لذتِ فنا چکھی، زیست کا مزا پایا

منزلوں کی سختی کا غم نہیں، خوشی یہ ہے
کس ہجوم حسرت میں ہم نے راستا پایا

قدر اس کی پہچانیں آپ یا نہ پہچانیں
اپنے دل کو ہم نے تو حسب مدعا پایا

بیخودی کی حسرت کیا بے سبب میں کرتا تھا
آ کے ہوش میں سمجھا بیخودی میں کیا پایا

شیخ یہ بھی ساغر میں ہاں اسی کو ساقی نے
میرے کام کا پایا، تیرے کام کا پایا

حسرتیں سراسیمہ ہر طرف نظر آئیں
کاروانِ دل میں نے پھر لٹا ہوا پایا

میری مستیاں سمجھیں تیری شوخیاں جانیں
تو نے کیا لیا مجھ سے میں نے تجھ سے کیا پایا

سب یہ رنگ آمیزی ہے فقط تخیل کی
کیا بتائیں کیا کھویا کیا جتائیں کیا پایا

پاس بیٹھکر میرے دیکھتے نہیں مجھ کو
ان کی شرم کو میں نے صبر آزما پایا

سعی پیہم اے منظور اس قدر نشاط افزا
ناامید کس سے تھے کس سے یہ صلا پایا

علی منظور

اک خلش سی ہے مجھے تقدیر سے
الاماں اس خارِ دامنگیر سے

عقل عاجز آ گئی تدبیر سے
وہ بھی شاید مل گئی تقدیر سے

حسرتِ نظارہ کی تاثیر سے
پردہ اٹھا یار کی تصویر سے

شامِ غم کے رونے والے صبر کر
صبح بھی ہوگی تری تقدیر سے

ادعائے ضبطِ غم کرنا پڑا
تنگ آکر آہ بے تاثیر سے

مجھکو دیوانہ سمجھ لیں اہلِ ہوش
کیوں الجھتے ہیں مری زنجیر سے

دل نہیں اک آبلہ سینے میں ہے
اس نگاہِ گرم کی تاثیر سے

ہائے رے تدبیر کی ناکامیاں
اور کیا امید ہو تقدیر سے

ہوتی ہے تسکین فرحت کچھ نہ کچھ
خوش ہوں اپنی آہ بے تاثیر سے

فرحت کانپوری

رہی اگرچہ نہ مجھکو کبھی رلائے بغیر
قرار دل کو نہیں تیری یاد آئے بغیر

کوئی یہ حسن کی دیکھے نوشانِ بیتابی
رہا گیا نہ مرے دل میں ان سے آئے بغیر

ہنسا ہنسا کے مجھے اور خود بھی ہنس ہنسکر
رہے نہ خاک میں میرا وہ دل ملائے بغیر

اگرچہ شرم سے کہتے بنا نہ کچھ اُن سے
رہے نہ آہ پہ میرے وہ سر اٹھائے بغیر

تری نگاہ سے محروم رہ کے کیا حاصل
بنے گی آگ نہ اس گھر کو اب لگائے بغیر

کمالِ جذبِ محبت سے داستاں میری
تری زباں پہ ہے میری زباں پہ آئے بغیر

گداز قلب وہ نعمت ہے جو نہیں ملتی
بشر کو آنکھ سے خونِ جگر بہائے بغیر

جلا کے آتشِ غم سے اسے بنا اکسیر
کہ سنگ و خشت سے بدتر ہے دل جلائے بغیر

یہ راز وہ ہے جسے میں ہی جانتا ہوں جلیل
کہ دل میں وہ اتر آئے نظر میں آئے بغیر

جلیل قدوائی ایم اے

ہر نفس اک مستقل فریاد ہے　　کتنی پُر غم عشق کی روداد ہے
گھٹ رہی ہیں میرے دل کی قوتیں　　اب یہ شاید آخری فریاد ہے
ہو گئی شاید کہ اب تکمیلِ عشق　　ورنہ مجنوں شعور مبارک باد ہے
جسم پابندِ تعین ہو تو ہو　　روح تو ہر قید سے آزاد ہے
پھر کہاں گلشن میں وہ آسودگی　　آشیاں جب وقفِ برقِ یاد ہے
دیکھئے انجام کار کائنات　　دل ہر اک پر مائلِ حشر یاد ہے

جس میں ثاقب تھا وہ مجھ سے ہمکنار
مجھکو وہ منظر ابھی تک یاد ہے

ثاقب کانپوری

شکستِ دل کی ہر اک آہ میں آواز آتی ہے　　مرے لب پر فغاں شاید مری ہمراز آتی ہے
فروغِ گل مبارک ہم چمن سے بے تعلق ہیں　　نہ اب ہے شوقِ آزادی نہ اب پرواز آتی ہے
مجھے دھوکا ہے بختِ نارسا پر بختِ دشمن کا　　کہ تیری ہر نظر مجھ تک غلط انداز آتی ہے
نیازِ عشق کر نقشِ جبیں میں وسعتیں پیدا　　کوئی دم میں کسی کی جلوہ گاہِ ناز آتی ہے
تماشاگاہِ عالم بھی مرقع ہے مرے دل کا　　کہ ہر آواز میں مجھکو تری آواز آتی ہے
ضیائے حسن نے کھولی حقیقت حسن کی ورنہ　　تجلی تک نظر خود پردہ دارِ راز آتی ہے
کترتا ہے بہارِ گل میں کیوں صیاد پر میری　　گلستاں میں نشیمن تک مجھے پرواز آتی ہے
کئے جا جلوہ سوزی تو فروغِ حسن سے لیکن　　کہیں دیدار سے چشمِ تماشا باز آتی ہے

جہاں میں صرف دردِ دل مرا ہمدرد ہے تابش
لبِ فریاد پر فریاد ہی دم ساز آتی ہے

تابش دہلوی

اشتہار دے دیا ہے کہ جو کوئی اس بستہ کو ڈھونڈھ لائیگا اس کو سو روپئے انعام دوں گا۔

شخاتی :۔ یہ پنڈت جی بھی بڑے حضرت ہیں۔ میں تو اسی دن کیلئے کہتی تھی کہ ان دونوں کا یہاں آنا جانا ٹھیک نہیں۔ پر میری بات سنتا کون۔ تمھارے پیچھے ان دونوں میں خوب سکوٹ ہوتی تھی۔ حفظا کی زبانی مجھے سب پتہ چلتا رہتا تھا۔

شیخ جی :۔ تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔

شخاتی :۔ بتاتی کیسے ؟ مرزا جی اور پنڈت جی کیخلاف جو لفظ میرے منہ سے نکلتا تھا تو تم آگ بگولا ہو جاتے تھے۔ میں اس آگ میں جلنے کو کہاں جاتی۔

شیخ جی :۔ اور اب جو میں جلا جا رہا ہوں تو ؟

شخاتی :۔ اس آگ کو تو تمھارے مرزا جی اور پنڈت جی ہی بجھائیں گے۔

شیخ جی :۔ وہ دونوں کہیں ہوں بھی۔ ایک کلکتہ میں ہیں دوسرے اپنے گھر پر بیٹھے دو اور دو چار کر رہے ہیں۔

شخاتی :۔ تو پھر ان آدمیوں کو جواب کیوں نہیں دیتے۔

شیخ جی :۔ جواب تو دینا ہی پڑے گا۔ پر ایک بڑی مصیبت کا انتظار ہے کاغذ والے کے بل کی ادائیگی۔

(باہر سے آواز آتی ہے)

بڑی بی : ذرا میاں کو باہر بھیج دینا۔ کچہری کے سپاہی سمن لیکر آئے ہیں۔

شیخ جی :۔ ہاں یہ تو میں خود ہی کہہ رہا تھا ...... جاتا ہوں۔ خدا حافظ۔ خدا آبرو رکھے گا تو پھر آؤں گا۔ واہ ری میری اوقات، اور ہائے رے میرے اوقات۔

---

۱۶ اکتوبر کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے براڈکاسٹ ہوا

سید احسن مارہروی ایم اے

سالنامہ ساقی (جنوری ۱۹۳۹ء) کی ایک جھلک

سالنامہ ساقی کو اگر مختلف ابواب میں تقسیم کیا جائے تو اس کی نامکمل فہرست یہ ہوگی۔ اس اشاعت میں صرف مضمون نگار حضرات کے نام درج کئے جارہے ہیں۔ دسمبر کے ساقی میں مکمل فہرست پیش کی جائے گی۔

ڈرامہ

(۱) مولانا عنایت اللہ دہلوی۔ (۲) مسٹر سید انصار ناصری دہلوی۔ (۳) محترمہ فرخندہ اختر بیگم۔ (۴) محترمہ عصمت چغتائی (۵) محترمہ صالحہ عابد حسین۔

افسانہ (سماجی اور رومانی)

(۱) حضرت ایم اسلم۔ (۲) جناب ل۔ احمد اکبر آبادی۔ (۳) محترمہ حجاب امتیاز علی۔ (۴) مسٹر صادق الخیری۔ (۵) پریم پجاری۔ (۶) ڈاکٹر ایس۔ اے۔ ہاشمی۔ (۷) اشرف صبوحی (۸) غلام عباس سولوی۔

ترقی پسند

(۱) پروفیسر محمد مسلم۔ (۲) مسٹر اختر انصاری۔ (۳) جناب ممتاز مفتی۔ (۴) جناب شاہد لطیف۔

مزاح و طنز

(۱) جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ (۲) جناب تقی رامپوری۔ (۳) جناب ابوطاہر داؤد۔ (۴) جناب آوارہ۔ (۵) جناب ناکارہ حیدرآبادی (۶) جناب سید علی شاکر۔

تنقید و تحقیق

(۱) ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ (۲) جناب سید بادشاہ حسین حیدرآبادی۔ (۳) جناب مرزا سیف علیخاں۔ (۴) جناب عبدالقیوم باقی۔ (۵) پروفیسر مرزا محمد سعید۔

منظومات

امین حزیں۔ جوش ملیح آبادی۔ فراق۔ فرحت۔ ثاقب۔ بہزاد۔ مجاز۔ اختر۔ علی منظور۔ تابش۔ شاد عارفی۔ کوکب شاہجہانپوری۔ علی احمد۔ الطاف مشہدی۔

مندرجہ بالا حضرات کے علاوہ چند اور حضرات نے بھی مضامین بھیجنے کے وعدے کئے ہیں مثلاً قاضی عبدالغفار صاحب۔ خواجہ غلام السیدین صاحب۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور سید وزیر حسن صاحب۔ سالنامہ کی ضخامت ۱۷۵ صفحات ہوگی۔ قیمت ۸/

مستقل خریداروں سے سالنامہ کی قیمت علیحدہ نہیں لی جائیگی۔

ایڈیٹر ساقی کے نام کھلی چٹھی

مکرمی تسلیمات

ساقی بابت اکتوبر [illegible] میں دہلی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر صاحب کی تقریر پر آپ کے خیالات دیکھکر ازحد خوشی ہوئی۔ سخت ضرورت تھی کہ اس محکمہ کی حد سے بڑھتی ہوئی افراتفری پر سختی سے روک ٹوک کی جائے۔ اس کے پہلے بھی بعض اخبارات نے اس محکمہ کی بدعنوانیوں اور ریشہ دوانیوں پر دارو گیر کی لیکن قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ ریڈیو کے ارباب بسط وکشاد اپنی ازلی بے غیرتی اور بے حسی کے باعث ان تنقیدوں سے کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتے۔ شاید اس کا بڑا سبب یہ بھی ہو کہ اس قسم کی تنقیدیں قطعی بے لوث جذبات کا نتیجہ نہ سمجھی گئی ہوں اور ممکن ہے کہ حکام بالا کی باز پرس پر زیر دست حکام نے کسی طرح یہ ثابت کر دکھایا ہو کہ تنقید نگار صاحبان کسی حیثیت سے مایوس غرض مند واقع ہوئے تھے۔ بہرحال! راقم الحروف کے نزدیک اس کا سبب سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ گذشتہ تمام تنقیدیں کمزور تھیں اور اُن میں سوائے سطحی اعتراضات کے اور کچھ نہ تھا۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کا مقالہ قوی دلائل پر مبنی ہے۔ علاوہ ازیں آپ کی ذات بابرکات پر کسی ذاتی غرض وغیرہ کا شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔ آپ نے اپنے اسلوبِ خاص سے جس سنجیدگی اور ہنروری کے ساتھ اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے وہ داد سے مستغنی ہے۔ ہر ہر اعتراض پر میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" واالامعاطہ ہوا یقین جانیئے آپ نے ملک کے سنجیدہ ترطبقے کی بڑی حد تک نمائندگی کی۔ وہ حضرات جو ریڈیو سے صرف سُن لینے تک کا تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس مفید ایجاد کو ملک کے خاص مسائل کیلئے زیادہ سے زیادہ سُودمند بنانے کے حامی ہیں اور اس کی ترقی و بہبودی کے خواہاں ہیں اور اسی لئے مختلف النوع پروگرام کو غیر معمولی دلچسپی اور غور سے سُنتے ہیں۔ عرصہ سے دلی ریڈیو اسٹیشن کے بے ڈھنگے اور بونگے پن سے تنگ آچکے تھے۔ اُن کی بیزاری نفرت کی حد تک پہونچ چکی تھی۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تھی۔ ارباب حل وعقد کو ایک دو نہیں سینکڑوں خطوط کے ذریعے آگاہ کیجیے۔ اُن سے زبانی شکایت کیجئے۔ اخبارات میں مضامین لکھیئے —— سب بے سود۔ سب بیکار۔ وہاں تو ہر شخص طلبِ منفعت میں گرفتار ہے۔ پروگرام اسسٹنٹ صبح وشام اسی بے چینی میں گرفتار رہتا ہے کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ خوشامد کرکے پروگرام ڈائریکٹر بن جاؤں۔ پروگرام ڈائریکٹر غریب اس فکر میں دُبلا ہوا جارہا ہے کہ کس منتر سے اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر بنوں۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر کو یہ غم ہے کہ وہ تو اسٹیشن ڈائریکٹر بننے کا حقدار تھا۔ اسٹیشن ڈائریکٹر اس لگن میں مگن ہے کہ دیر سویر وہ کنٹرولر بنکر رہے گا۔ پھر تو تمام ہندوستان کی بے تار کی باگ ڈور اُسی کے ہاتھ میں ہوگی۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس میں کلام نہیں کہ ان حضرات کے بہت سے خواب سچّے ثابت ہوتے ہیں۔ اور کس قدر جلد!! حیرت سی حیرت ہے!! ابھی کل کی بات ہے کہ تین صاحب دہلی اسٹیشن میں معمولی پروگرام اسسٹنٹ تھے۔ اب (یعنی دو سال کے قلیل عرصے میں) وہ کلکتہ جیسے بڑے اسٹیشن کے اسٹیشن ڈائریکٹر ہیں۔ گویا Kingdom of given to a school boy's care. اسی طرح نیازی صاحب اسٹیشن ڈائریکٹر لاہور، جگل کشور صاحب اسٹیشن ڈائریکٹر لکھنؤ چٹکی بجاتے میں کہاں سے کہاں پہونچ گئے۔ جس قدر جلد اس ناز پرور محکمہ میں ترقیاں ملتی ہیں گورنمنٹ آف انڈیا کا کوئی محکمہ اس کی نظیر نہیں پیش کرسکتا —— اس ترقی کا راز کیا ہے؟ جی چاہتا ہے وہ بھی ظاہر کردوں، لیکن ابھی نہیں۔ ذرا ان نازک دل والوں کو کھری کھری سُننے کا عادی بن جانے دیجیے پھر سہی —— لیکن ازالۂ غلط فہمی کے طور پر اتنا ضرور کہونگا کہ سوائے خوشنودیٔ افسرانِ بالا ان صاحبزادگان کی ترقی کا بھید اور کچھ نہیں —— میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ان لوگوں نے کونسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دئے جن کے صلے میں اُن کو بامِ اوج پر جگہ دی۔ کیا یہ "بچّے" (آپ کا جی چاہے بزرگ کہہ لیجئے) غیر معمولی قابلیت کے مالک ہیں ——!؟ راقم الحروف بدقسمتی سے ان سب حضرات سے ذاتی طور پر متعارف ہے۔ یقین جانیئے ان میں سے ایک بھی اس لائق نہیں کہ سنجیدگی سے کسی مسئلہ پر گفتگو کرسکے۔ گفتگو تو بڑی چیز ہے اتنی بھی اہلیت نہیں کہ شریف آدمیوں کے اخلاق وآداب سے واقف ہو۔

جناب محترم! ان پوست کندہ حالات کے انکشاف سے راقم الحروف کا مدعا یہ ہے کہ پروگرام کی غیر دلچسپی اور ذلالت کا شکوہ بے سُود ہے۔ پروگرام تو آپ سے آپ خراب ہونگے کیونکہ ذمہ دار لوگ ہی نالائق ہیں۔ جان جان کے اور چھانٹ چھانٹ کے اس محکمہ میں ایک سے ایک "عقل کل" بھرتی کیا جاتا ہے۔ تاکہ افسرانِ بالا کے ارزل مقاصد کی تکمیل ہوسکے۔ یا، یہ کہ اپنے آدمی اندھا دُھند کھپائے جائیں —— مثال کے طور پر دیکھ لیجیے کہ "بخاری کُنبے" کے چار افراد علانیہ وظیفے ہستے ہیں۔ اُصولاً اس محکمہ کے پروگرام والے

شعبے میں کوئی شخص بھرتی نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس کو عدہ تعلیم کے علاوہ ان چند صفات میں سے ایک یا ایک سے زیادہ صفت میں کچھ نہ کچھ درک حاصل نہ ہو۔

(۱) انگریزی یا ہندوستانی موسیقی۔ (۲) صحافت۔ (۳) ادبی یا ڈراماتی کارگزاری ــــ علاوہ ازیں، ایک نہ ایک ورنیکلر یعنی دیسی زبان میں مہارت حاصل ہونی بھی ضروری ہے ــــ معیار نہایت مناسب ہے کیونکہ فی الواقع ایسے محکمے کے لئے جس میں ادبیت، موسیقی اور ڈرامہ کا چرچا رہتا ہو اس سے بہتر معیار نہیں ہو سکتا۔ لیکن ذرا ملاحظہ کیجئے کہ باستثنائے چند جتنے ارباب نشاط اس محکمہ کے کارگزار ہیں کوئی بھی اس معیار پر پورا اُترتا ہے؟ دُور کیوں جائیے دہلی اسٹیشن کے احباب پر ہی ایک نظر ڈال جائیے۔ آپ کی اجازت اور ان کرمفرما احباب سے معافی کے ساتھ میں پبلک مفاد کی خاطر ذکر جمیل کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

اسٹیشن ڈائریکٹر صاحب جن کی عجیب و غریب شخصیت عبارت ہے چوڑے چکلے سینے، شاندار ڈبل مونچھوں، ایسے طرز تحریر سے جسے کوئی بھلا آدمی پڑھ بھی نہیں سکتا اور بے ڈھنگے سے فوجی لباس سے (تازہ ترین اطلاعات مظہر ہیں کہ کسی حادثہ سے متاثر ہو کر نادرِ روزگار مونچھیں حجام کے سپرد کر دی گئیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون) ان قبلہ و کعبہ کی تعریف یہ ہے کہ آئی۔ سی۔ ایس۔ کے امتحان میں شاندار پسپائی کے بعد حضور عالی نے فوج کی طرف رُخ کیا اور وہاں اپنے جبلی کمزور سے پن کی بدولت آپکو اعزازی لفٹنٹ بنا دیا گیا۔ ادب سے دُور کا بھی لگاؤ نہیں۔ موسیقی سے ڈر لگتا ہے۔ ڈراما سے ازلی نفرت ہے لیکن نہ معلوم کیوں مادر ریڈیو نے انہیں اپنے آغوش میں لے لیا۔ پہلے بمبئی میں تھے اب دلی جیسے مرکزی اسٹیشن کے ڈائریکٹر ہیں۔ اُردو کے نام تک بھی نہیں جانتے پھر بھی زباندانی کا دعویٰ ہے۔ پروگرام کیوں خراب ہوتے ہیں یہ اُن کی بلا جانے۔ انہیں اپنے حلوے مانڈے سے کام۔

سب سے بڑی کرسی سے ذرا چھوٹی کرسی پر بیٹھنے والے ہمارے پیارے اقتدار صاحب!! زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا ــــ عجیب پُراسرار شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اس محکمہ میں سب سے زیادہ پُرانے افسر آپ ہی ہیں اور محض اسی لئے آپ اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر بننے کے اہل ہیں۔ کوئی اور بزرگ سے پوچھے کہ آپ کی تجربہ کاری اور بدرالی دیرینی مسلّم لیکن خدارا یہ تو بتلایئے اس محکمے میں آنے سے پہلے آپ کیا تھے۔ کوئی ادبی خدمت؟؟ ڈراما کے معاملے میں اس فن سے معمولی لگاؤ بھی ظاہر کرنے کا کوئی استحقاق!؟ اور سب سے بڑی بات یہ کہ حضرت کی تعلیم!! ــــ افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ ہمارا یہ پیارا دوست صرف میٹرک پاس ہے۔ یعنی اگر ستارہ سامنے نہ ہوتا تو زیادہ سے زیادہ کہیں چالیس روپے کے کلرک ہوتے لیکن اب اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر ہیں۔ اس لئے کہ ہیں۔

تیسری کرسی پر بیٹھنے والے، بلکہ گھومنے والے، حضرت شمس تبریزی۔ میں بھولا، شمس عارف صاحب ڈائریکٹر آف پروگرام۔ آپ کی شانِ نزول یہ ہے کہ چھوٹے بخاری صاحب کے سالے ہیں اور بس۔ دانتوں کو بھینچ کر عجیب نخرے سے گفتگو کرتے ہیں۔ ہر ادا مکلوف یعنی کلف زدہ۔ نری اکڑ اور کھاما پن۔ پروگرام کے ذمہ دار آپ ہیں۔ ادبیات سے، موسیقی، اور ڈراما سے آپ کو دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر بغیر کسی سے پوچھے یہ اتنا بتا دیں کہ بھیرویں میں کتنے کومل سر لگتے ہیں اور کتنے تیور تو جو چور کی سزا وہ میری۔ بھلا بتایئے یہ شخص حق رکھتا ہے اس بات کا کہ اپنے بائیں ہاتھ کے کرتب سے ہندوستانی موسیقی، ہندوستانی ادبیات میں جیسی چاہے ترمیم کر دے جس کو چاہے ذلت دے اور جس کو چاہے عزت۔ پس بچائے خدا اس خدائی فوجدار سے ــــ!!

ایک اور صاحب ہیں جن کے نام پر دہلی کی مشہور و معروف مینار ہے۔ یہ حضرت پہلے صرف ریکارڈ بجانے پر مامور تھے۔ پھر موسیقی کے انچارج ہوئے۔ پھر ڈراما کے اور اب تعلیمی براڈکاسٹ کے انچارج ہیں۔ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا۔ تعریف ان قبلہ کی یہ ہے کہ سائنس کے طالب علم ہیں۔ والدین نے چاہا تھا کہ انجینئر بنیں اسی مقصد سے گلاسگو سے فارغ التحصیل کرایا۔ لیکن پبلک کی انتہائی بدنصیبی کہ آپ اس محکمہ میں ہیں۔ پھٹے ہوئے بانس کی سی خوفناک آواز رکھتے ہیں پھر بھی آپ سے بارہا اناؤنسنگ کرایا جاتا ہے۔ اُردو ادب سے خاندان بھر کو کوئی واسطہ نہیں۔ ہندوستانی کہلانا اپنی توہین سمجھتے ہیں ٹھیک طرح ہندوستانی میں گفتگو بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن مدعی ہیں ہندوستان میں ریڈیو کے ذریعے تعلیم دینے کے۔ پھوٹی قسمت پبلک کی!!

ایک اور بیچارے مرنجان مرنج معصوم صفت انسان ہندوستانی تقریروں کے انچارج ہیں۔ جو یہ بھی نہیں جانتے کہ کون شخص کس موضوع پر بہتر تقریر کر سکتا ہے۔ ہندوستانی ادبیات میں جو انقلابی رجحانات ہو رہے ہیں ان کا انہیں خواب میں بھی احساس نہیں ہوتا۔ جو ڈھرا پیش رووں نے بنا دیا اُسی لکیر کے فقیر ہیں۔ اگر یہ ثابت کر سکیں کہ اپنے دورانِ قیام میں ایک بھی نیا مقرر پیدا کیا تو میں ہار ماننے کو تیار ہوں۔ فضول موضوعات پر دو مٹرنے سے تقریریں کراتے ہیں اور کسے مجال ہے کہ انہیں روک سکے۔ یہ بابی ہیں اسی لئے اکثر اناؤنسنگ کی خدمت انجام دیکر اعلیٰ تلفظ کی مثال ذہن نشین کراتے ہیں۔

ایک اور بیچارے طویل القامت حسین ہیں جن کے لب و لہجہ میں لطیف

سی لکنت ہے۔ یہ ڈراما کے انچارج ہیں۔ اور حال یہ ہے کہ ڈراما آرٹسٹوں کی معمولی وقار اور رُعب نہیں رکھ سکتے۔ انھوں نے اپنے اداکاروں کو اختیار کلی دے رکھا ہے کہ جس طرح چاہے ڈرامے میں ترمیم کرو۔ حذف و اضافہ گویا انہی کا حق ہے۔ مہینے میں روپیٹ کر آٹھ آٹھ ڈرامے کرنے پڑتے ہیں انکی مجبوریوں پر رحم آتا ہے۔ زبردستی انہیں سرکار دولتمدار اس محکمے میں رکھے تو ان کا قصور؟؟

بھگوان کے تیسرے روپ (برہما۔ وشنو!) موسیقی کے انچارج ہیں۔ طرفہ معجون ہیں۔ موسیقی کا کام اس لئے ان کے سپرد ہے کہ ان سے زیادہ موسیقی سے بے بہرہ کوئی ہے بھی تو نہیں؟! ان سے پوچھئے تو معلوم ہوگا کہ کوئی معمولی سے معمولی شخص بھی یہی فرائض انجام دے سکتا ہے۔ اسے بھی مشکل کیا ہے۔ گانے والوں کے نام معلوم ہی ہیں۔ اٹھایا کو شریک کر دالیا۔ بہت خانہ پُری کی ضرورت ہوئی تو دو ایک دفعہ آڈیشن لے لی۔ کوئی شخص اچھا گاتا ہے یا بُرا یہ انہیں راوت چغتائی۔ صبری۔ فضل۔ منگ خاں۔ حامد صاحبان بتا ہی دیتے ہیں اور اصل پوچھئے تو یہی لوگ آڈیشن لیتے بھی ہیں۔ حکام کو ہر طرح سے خوش رکھنے کے عجیب عجیب نسخے انہیں ازبر ہیں اس لئے کیا مجال جو کوئی ان کے کام پر نکتہ چینی کر سکے۔ عورتوں کے پروگرام کے بھی یہی انچارج ہیں۔ کیوں؟؟ یہ اسٹیشن ڈائریکٹر ہی نہیں جانتے۔

یہ خط طویل ہوا جاتا ہے ورنہ اناؤنسر صاحبان مثلاً حضرت خضر کے ساتھی اور محمود غزنوی کے تاریخی محبوب کا بھی ذکر کرتا۔ انشاء اللہ آئندہ عریضہ میں سہی۔ علاوہ ازیں اسٹیشن کے نظم و نسق اور دیگر انتظامی اُمور کے متعلق بھی کچھ عرض کر دونگا۔

فی الحال یہ التماس ہے کہ خدارا اس سلسلہ کو بند نہ کیجئے گا۔ یہ اہم ترین خدمت ہے جو آپ کے ہاتھوں انجام پا سکے گی۔ ضرورت تھی کہ اس پول کے کارخانے کی جانچ پڑتال کی جائے۔ ذمہ دار افسران تو کانوں میں تیل ڈالے ہوتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ بیچارے کر بھی کیا سکتے ہیں۔ خود بھی تو کچھ نہیں جانتے ـــ وہ۔

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

لیکن آخر کب تک پبلک کے لاکھوں روپیے اس اندھیر کھاتے کی خاطر برباد ہوں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سُننے والوں کا تعلیم یافتہ اور سمجھدار طبقہ تمام تر آپ کے ساتھ ہے اور اگر آپ نے اس سلسلہ کو جاری رکھا تو انشاء اللہ جلد یا بدیر کچھ نہ کچھ ہو کر رہیگا۔ فقط

"ہم سخن فہم ہیں ساقی کے طرفدار نہیں"

ساقی بک ڈپو۔ دہلی کی دلکش کتابیں

		قیمت
خانم۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کی پُر لطف نوک جھونک۔ چغتائی صاحب کے پچیس دلکش مضامین۔ مجلد سنہری ٹھپہ		للعہ
کولتار۔ تھی تو بچاری سانولی مگر شریر لڑکوں نے نام "کولتار صاحب" رکھدیا۔ پھر کیسے کیسے واقعات رُونما ہوتے ہیں کہ	〃	۱۲ر
ویمپائر۔ زانی مرد ایک خونخوار درندے کی طرح ایک بیکس مظلوم عصمت مآب خاتون پر جھپٹتا ہے اُسکی زندگی برباد کرتا ہے۔ مگر	〃	۱۲ر
شریر بیوی۔ اس قدر شریر بیوی تھی کہ بڑے بڑوں کے کان کاٹتی تھی۔ کیسا کیسا ناک میں دم کیا ہے اس شریر بیوی نے!	〃	عمر
رُوح لطافت۔ "جہارانی کا خواب" اس کا پہلا افسانہ ہے۔ ایسا عبرتناک افسانہ آپنے آج تک نہیں پڑھا ہوگا۔ بھیانک مگر دلکش	〃	عمر
کمزوری۔ عورت کی کمزور فطرت سے شہزور مرد نے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور اُس کی زندگی برباد کر دی۔	〃	۱۲ر
رُوح ظرافت۔ انگوٹھی کی مصیبت اس کتاب کے آٹھ افسانوں میں سے ایک ہے جس نے یہ افسانہ نہیں پڑھا اُس نے اپنے اوپر ظلم کیا	〃	عمر
جنت کا بھوت۔ بی جنت بھی شرارت کی پتلی تھیں۔ بھوت صاحب کا ناک میں دم کر دیا۔ پھر کچھ ایسی صورت پیدا ہوئی کہ	〃	۱۲ر
دیکھا جائیگا۔ ایک لڑکی پر تین مرد دے عاشق ہوگئے تو "دیکھا جائیگا صاحب" کچھ فیصلہ نہ کر سکے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ	〃	عہ
ملفوظات ملیحی۔ کتے۔ مرغے مرغیاں اور گھریلو جانور انسانی زبان بولنے لگے۔ کیسی عجیب عجیب باتیں کی ہیں انہوں نے!	〃	۱۲ر
تفویض۔ بی۔ اے پاس لڑکی کی شادی مسجد کے ملاسے ہوگئی۔ بس یہ سمجھئے کہ زمین آسمان ایک ہوگئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ	〃	۵ر
قرض۔ محبت کو کاٹنے والی قینچی کا نام قرض ہے۔ آپ نے بہت کہانیاں پڑھی ہونگی مگر ذرا اس کو بھی پڑھکر دیکھئے	〃	۵ر
فرزند سرحد۔ سرحد کے باشندے عزت کی خاطر موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں۔ انہی غیرت مند لوگوں میں سے چند کا ذکر ہے کہ	〃	۵ر
قدرداں۔ سرزمین ریت کے ایک بہنوئی اور اُس کے سات خطرناک سالوں نے وہ وہ حرکتیں کی ہیں کہ بس حیرت ہے	〃	۵ر
خطوط کی ستم ظریفی۔ یہ خط بھی کیسا ستم ڈھاتے ہیں۔ خصوصاً جب خط وکتابت ایک شریر لڑکی اور جوان مرد کی ہو۔	〃	۱۲ر
مرزا جنگی۔ لکھنؤ کے بانکے مرزا بھی واللہ عجیب چیز تھے۔ بٹیر لیکر انگریزوں سے لڑنے چلے۔ واللہ	〃	۲ر
چمکی۔ عورت کی فطرت اجان جائے پر آن نہ جائے۔ غیرت وشرافت کی مُنہ بولتی تصویر "چمکی" میں دیکھئے۔	〃	عمر
نجم السحر۔ پانچہزار سال پہلے مصر کی ایک شہزادی تھی "نجم السحر" اس کی داستان عشق بے پناہ چیز ہے۔	〃	عہ
سلامبو۔ وحشیوں سے جان بچانے کی صرف ایک صورت تھی اور وہ یہ کہ حسین سلامبو وحشیوں کے سردار کی ہو جائے۔	〃	۳ے
تائیس۔ سرزمین مصر کی عروس بازاری نظر بھر کے دیکھنے سے جس کا حُسن میلا ہوتا تھا اس کی عبرتناک داستان	〃	علم
ہیرودیاس۔ سلومی کا ناچ موت کا ناچ تھا۔ اُس نے پیغمبر یوحنا کا سر انعام میں مانگا اور اس کے مُردہ لبوں کو چُوما۔	〃	۱۲ر
فاؤسٹ۔ شاعری مصوری اور مصوری کی شاعری کی شہرۂ آفاق کہانی۔ اُردو میں پہلی مرتبہ عام فہم پیرائے میں پیش کی گئی ہے	〃	عہ
پروین وثریا۔ ایک مرد پر دو عورتوں کا عاشق ہونا اور دونوں کا عشق صادق تھا۔ مرد بھی دونوں سے برابر کی محبت کرتا تھا۔ مگر	〃	عہ
نرگس جمال۔ موریس ماترلنک کی ایک رنگین تمثیل جس میں عشق ومحبت پر بحث کی گئی ہے۔ مترجمہ شاہد احمد۔ مجلد	〃	عہ
سحر بنگال۔ طاہرہ دیوی شیرازی کے دلکش نثر اور اچھوتے پلاٹ کے افسانوں کا مجموعہ	〃	عہ
تعلیم زوج بیوی۔ فضل حق قریشی دہلوی کا لکھا ہوا ڈرامہ جس کو پڑھکر آپ ہنستے ہنستے لوٹ جائیں گے	〃	۸ر
سرگذشت عروس۔ دلہن کا روزنامچہ جس میں اُس نے اپنے دل کے تمام زخم کھول کر پڑھنے والے کو دکھا دیے ہیں	〃	عہ
عروس ادب۔ دل میں کھب جانے والے مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ۔ تین سو صفحے۔ زبان نہایت صاف	〃	عہ
گناہ کی راتیں۔ عورت گناہ کرنے پر کس طرح مجبور ہو جاتی ہے؟ فطرت انسانی کے چند عبرتناک مرقعے۔ مجلد	〃	عہ

چندہ سالانہ پانچ روپے
ششماہی تین روپے
قیمت فی پرچہ چھ آنے

جُرعات

چندہ سالانہ ممالک غیر سے
۱۲ شلنگ - نمونے کا پرچہ
مفت بھیجا جاتا ہے۔

جلد ۱۸ | ساقی دہلی - بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۸ء | نمبر ۶

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
(۱)	نگاہِ اولیں	شاہد	(۲)
(۲)	دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی	ڈاکٹر عندلیب شادانی - ایم - اے؛ پی - ایچ - ڈی؛ (لندن)	(۳)
(۳)	لال مُہر	جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی - بی - اے؛ ایل ایل - بی	(۱۷)
(۴)	شبِ جُدائی	جناب ایم - اسلم	(۲۹)
(۵)	نظریۂ حیات	جناب امینِ حزیں (سیالکوٹی)	(۳۱)
(۶)	بہار میں ایک تشویش	جناب علی منظور حیدرآبادی	(۳۲)
(۷)	چیلم گزٹ	جناب سید علی شاکر - ایم - اے	(۳۳)
(۸)	رپورتاژ	جناب شاہد لطیف	(۴۲)
(۹)	وہی انوکھی انجمن	"جہاں نورد"	(۴۶)
(۱۰)	جاسوس	جناب ایس - احمد - بی - اے؛ بی - ٹی	(۵۰)
(۱۱)	سازِ انا	"دلفگار"	(۵۴)
(۱۲)	ناہید	جناب کاوش حیدرآبادی	(۵۶)
(۱۳)	ریاضِ رضواں	جناب رئیس احمد جعفری	(۵۷)
(۱۴)	پکھیرو کے دُو پر	جناب رفیق حسین انجنیئر	(۶۵)
(۱۵)	ثمرات	جناب نہال سیوہاروی	(۶۷)
(۱۶)	رقیبِ وطن	محترمہ محمودہ بیگم	(۶۸)
(۱۷)	اعلانِ آزادی	جناب محمد حسین اعجازی	(۷۰)
(۱۸)	میری مملکت	جناب سید رفیق حسین	(۷۶)
(۱۹)	نوابِ چمن	جناب ڈاکٹر ایس اے ہاشمی - ایم - بی - بی - ایس	(۷۷)
(۲۰)	شکستِ ساز	جناب مجاز - بی - اے؛ (علیگ)	(۷۹)
(۲۱)	مُسلم اور کافر	از افکار بھڑ بھڑلے شاہ - مُرسلہ محمد مُسلم	(۸۰)
(۲۲)	زندہ اور فطری زبان	جناب چراغ علی	(۸۱)
(۲۳)	غازی کمال پاشا کی یاد	جناب سید محمد اسمٰعیل رسا ہمدانی ٹربیل ایم - اے (گولڈ میڈلسٹ)	(۸۶)
(۲۴)	یہ دلّی ہے	شاہد	(۸۷)
(۲۵)	ریڈیو کی کہانی	ایک واقف حال کے قلم سے	(۹۳)
(۲۶)	نقد و تبصرہ	ساقی الخیری - ایم - اے؛ "شس"	(۹۷)

نوٹ:- خریداران ساقی کو چاہیئے خط و کتابت کرتے وقت اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں تاکہ تعمیل میں تاخیر نہ ہو۔ — مینیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلین

محمد ﷲ کہ اس اشاعت کے ساتھ ساقی اپنی زندگی کے نوسال پورے کر رہا ہے۔ اس مختصر سی حیاتِ ادبی میں ساقی نے اُردو لٹریچر میں کچھ نئی چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔ مثلاً افسانہ نگاری میں ایک نئی روش قائم کی ہے۔ یہ نئی روش اُردو کے افسانوں کو مغربی زبانوں کے افسانوں سے ہمدوش کرنے میں سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ افسانے کو اعلیٰ معیار پر پہونچانے میں ساقی کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ افسانہ نگاری میں نقیب ہونے کے علاوہ ساقی نے ترقی پسند مُصنّفین کا حلقہ بھی قائم کرکے اُردو دُنیا کے ادب میں معتدبہ اضافہ کیا ہے۔ اس جدید تحریک کا مقصد مختصر الفاظ میں زندگی کی آئینہ داری ہے۔ عشق و محبت کے بے معنی مضامین۔ رُلانے اور سُلانے والی شاعری کو اس تحریک میں کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ انسانیت کے بے شمار مسائل زندگی ہماری توجہ کے محتاج ہیں۔ افلاس، بھوک، سماج، حکومت، غلامی اور اسی نوع کے موضوعات سے چشم پوشی کسی مُردہ قوم ہی کے لٹریچر کی خصوصیت ہوسکتی ہے۔ چنانچہ ہندوستانی ادبیات بھی اِن غور طلب مسائل سے اجتناب کرتی رہیں۔ لیکن قومی بیداری کے ساتھ اب کچھ عرصے سے اہلِ قلم کا بھی ایک گروہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جو لٹریچر کے ذریعے ان اہم مسائل کو پیش کر رہا ہے اور اس طرح ادب کو زندہ اور پائیدار بنا رہا ہے۔ ترقی پسند مصنّف "ادب برائے ادب" کو بیکار سمجھتا ہے۔ وہ "ادب برائے زندگی" کا قائل ہوتا ہے۔ زندگی اور سماج کے اُن تمام پہلوؤں کو دیکھتا ہے جو انسانیت کے جسم پر گندے پھوڑوں سے زیادہ مکروہ نظر آتے ہیں، اور اپنے قلم سے نشتر کا کام لیکر ان میں شگاف دیتا ہے تاکہ انسانیت اس گندگی سے پاک ہوجائے۔ ساقی نے ترقی پسند مصنفین کا ادب بیش از بیش پیش کیا ہے اور یہ ساقی کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں وہ قطعاً منفرد ہے۔

ادبیاتِ عالم کے بہترین نمونوں کو اُردو میں پیش کرنے کا فخر بھی ساقی کو حاصل ہے۔ زندہ قوموں کے زندہ جاوید لٹریچر کو اُردو کے قالب میں ڈھالنا گویا اُردو کو مالامال کرنا ہے۔ اس باب میں بھی ساقی پیش پیش ہے۔

ساقی کی جو کچھ بھی کامیابی وہ دلعزیزی ہے اس کا سہرا مضمون نگار حضرات کے سر ہے جو ستائش و صلہ سے بے نیاز ہوکر ساقی کی قلمی اعانت کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارے ساتھ ناظرین ساقی کو بھی انہی کا منّت گزار ہونا چاہیے۔ صحیح معنوں میں یہی حضرات خادمانِ ادب ہیں کہ اپنے ذوقِ کشمکش میں بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ اُردو کی خوش نصیبی سے ایسے ہمدردوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور زبان کا مستقبل روشن ہوتا جارہا ہے۔ اُمید ہے کہ وہ دن جلد آئیگا جب اُردو کے مخالفین بھی اُردو ہی کو ہندوستان کی مشترک زبان تسلیم کر لینے پر اپنے کو مجبور پائیں گے۔

شاہد

نغمۂ نَو بہار: حضرت بہزاد لکھنوی کا مجموعۂ کلام ساقی بکڈپو کے اہتمام سے زیرِ طبع ہے۔ افسوس ہے کہ چند ناگزیر وجوہ سے ابتک شائع نہ ہوسکا۔ اُمید ہے کہ اس مہینے میں طباعت کے مراحل طے ہوجائیں گے۔ اور ہم آپکی خدمت میں نئے سال کے موقع پر یہ تحفہ پیش کرسکیں گے۔ قیمت بہت کم تجویز کی گئی ہے تاکہ شائقین کو زیر بار نہ ہونا پڑے۔

مینیجر ساقی بکڈپو۔ دہلی

نمبر ۹

دَورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی

طُومارِ اغلاط

"اکثر غلطیوں کا مجھے احساس ہے۔ بعض غلطیاں ایسی بھی ہیں جنہیں میں نے دانستہ اختیار کیا ہے۔ بعض ایسی ہیں کہ وہ خود اپنی جگہ محاسن ہیں۔ اکثر ایسی بھی ہونگی جن کا مجھے علم نہیں یا جن کو ناقدانہ نظر سے نہیں دیکھ سکتا"

(دیباچہ شعلۂ طور۔ نوشتۂ حضرت جگر مرادآبادی)

سطورِ بالا میں جگر صاحب نے جس مشرقی انکسار سے کام لیا ہے وہ ہماری "روایاتِ شاعرانہ" کے عین مطابق ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جہانتک اغلاط کا تعلق ہے دورِ حاضر کے "اساتذہ" میں جگر صاحب کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ یوں تو "بادشاہِ متغزلین" (حسرت موہانی) بھی بے پئے ہی لڑکھڑائے ہیں۔ "سلطان العرفا" (اصغر گونڈوی) کبھی بار بار گرے ہیں۔ "رئیس الفلاسفہ" (فانی بدایونی) نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں مگر حضرتِ جگر کی "مستانہ وار" لغزشیں آپ اپنا جواب ہیں۔

جن غلطیوں کا آپ کو احساس ہے اور جنہیں آپ نے دانستہ اختیار کیا ہے انکی تعداد صرف دو ہے۔ ایک اس مصرع میں (بال بکھرائے کوئی مستانہ وار آہی گیا) "مستانہ وار" کی ترکیب۔ اور دوسرا اس مصراع میں (فخرِ ہندوستان ہے پیارے) ہندوستان کے نون کا اعلان۔ اس کے علاوہ اس شعر میں:۔

جدھر سے حُسن کا اک گوشۂ نقاب اُٹھا　　تمام ذرّے پکار رہے وہ آفتاب اُٹھا

"آفتاب اُٹھا" (جو بظاہر The sun rose کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتا ہے اور) بمجبوری استعمال کیا گیا ہے خود آپکے بقول "ذوقِ سلیم کا ایک اجتہاد ہے" جسے رائج ہونا چاہیئے۔

ایسی غلطیاں "کہ وہ خود اپنی جگہ محاسن ہیں" تلاش کے باوجود جگر صاحب کے دیوان میں نہ مل سکیں آپکی تقسیم کے مطابق اب صرف ایک ہی قسم کی غلطیاں باقی رہ جاتی ہیں یعنی وہ جن کا غالباً آپ کو علم نہیں۔ چونکہ آپ ایسی غلطیوں کو جاننا چاہتے ہیں لہذا سطورِ ذیل کا مطالعہ آپ کیلئے ازبس مفید ہوگا۔

میں نہیں بسمِل خیام جگر　　حافظِ خوش کلام نے مارا

یہ شعر اگرچہ کُل دس لفظوں کا مجموعہ ہے لیکن قادر الکلام شاعر نے اس میں ایک پوری داستان بیان کر دی ہے اور اس خوبصورتی کیساتھ کہ جو باتیں اس میں مذکور نہیں وہ خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں اور واقعہ کی مکمّل تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

ایک بادشاہ سیر و شکار یا جنگ کے ارادے سے اپنی فوجیں لیکر نکلا ہے۔ بحیثیتِ ملک الشعراء سلطانی جگر صاحب بھی لشکر کے ہمراہ ہیں۔ چلتے چلتے لشکر ایک مقام پر ٹھہر جاتا ہے۔ پڑاؤ ہوتا ہے۔ خیمے لگائے جاتے ہیں۔ ایک خیمہ جگر صاحب کیلئے مخصوص ہے۔ رات کو آپکے خیمہ پر پہرا

دینے کیلئے ایک حافظ یعنی محافظ بھی آپ کو ملا۔ اس کا نام "خوش کلام" ہے۔ یہ شخص اگرچہ سپاہی ہے مگر شاعر ہے اور اچھا شاعر ہے۔ اسی بنا پر لوگ اسے "خوش کلام" کہتے ہیں ورنہ درحقیقت اس کا اصلی نام کچھ اور ہے جو آپ کسی کو یاد نہیں۔ خوش کلام کا خیال ہے کہ وہ جگر صاحب سے کہیں بہتر شعر کہتا ہے مگر بدذوق دنیا اس کی قدر نہیں کرتی۔ اسی بنا پر وہ جگر صاحب کا جانی دشمن ہے اور رات دن ان کے دشمنوں کی ہلاکت کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اس موقع کو اس نے غنیمت جانا۔ طوفانی رات تھی، آندھی چل رہی تھی۔ پچھلے پہر وہ ظالم جگر صاحب کے خیمے میں گھس گیا اور تلوار سے آپ کا سر بری طرح زخمی کر دیا۔ بلکہ اپنے نزدیک آپ کو مار ہی ڈالا۔ اپنے جرم کو چھپانے کی اس نے یہ تدبیر کی کہ جگر صاحب کے خیمے کی اور آس پاس کے اور دو تین خیموں کی طنابیں کاٹ دیں تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ طوفانی ہوا سے خیمے گر پڑے اور لوگوں کی ہلاکت کا باعث ہوئے۔

خیموں کے گرتے ہی ایک شور مچ گیا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ اٹھائے گئے۔ اور تو سب صحیح و سلامت تھے لیکن جگر صاحب خون میں شرابور بیہوش پڑے تھے۔ لوگوں نے سمجھا کہ چوبِ خیمہ جو آپ کے سر پر لگی ہے تو اس سے سر شق ہو گیا ہے۔ بہرحال آپ کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کی گئیں۔ آپ نے آنکھیں کھولیں۔ اور لوگوں کو بتایا کہ میں چوبِ خیمہ سے زخمی نہیں ہوا ہوں بلکہ میرے محافظ خوش کلام نے مجھے مارا ہے۔

اگر کسی شعر کا مطلب اس کے الفاظ ہی کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے تو یقیناً اس شعر کا یہی مطلب ہے جو ہم نے بیان کیا لیکن جگر صاحب کے مخالفین جو ان کی قادر الکلامی کے قائل نہیں اس مطلب کو غلط ٹھہراتے ہیں اور دور از کار تاویلیں کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ "خیام" (بروزن صیام) سے شاعر کی مراد ایران کا مشہور شاعر عمر خیام نیشاپوری ہے۔ اور حافظ کا مطلب محافظ نہیں بلکہ حافظِ شیراز کی طرف اشارہ ہے۔ مگر یہ مخالفین کی زبردستی ہے۔ ورنہ "خیام" (بروزن صیام) خیمہ کی جمع ہے۔ مکتوبی مشابہت کی بنا پر اسے خیام (بروزنِ ایام) کیونکر سمجھ سکتے ہیں اور بلا وجہ کیوں ان پر یہ الزام لگایا جائے کہ اُس نے مشدد (خیّام) کو مخفف (خیام) کر دیا ہے۔ اس لئے کہ بقولِ مولانا روم:

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

بہار اپنی جگہ پر سدا بہار رہے — یہ چاہتا ہے تو تجزیۂ بہار نہ کر

اس شعر کا مصرعِ ثانی پڑھکر بے اختیار یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

چہ خوش گفت فائق شاعر ما — تشدید در شعر چرا نباشد

تجزیہ بروزنِ تفعلہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کی "ی" کو مشدد بنایا جائے اِلّا بضرورتِ شعری۔ مگر پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسی ہی ضرورتِ شعری ہے تو "شعر گفتن چہ ضرور" یا پھر یہ بات ہے کہ خیّام کی تشدید پھسل کر "تجزیہ" پر آ گری ہے۔ وہ "خیام" رہ گیا اور یہ "تجزیّہ" بن گیا۔

درد دل غیرت تری کیا ہو گئی — ان لبوں پر اور ہائے دردِ دل

یہ مانا کہ دوسرے مصرع میں "ہائے" کو بروزن "ہائے" یا "ہاے" نظم کیا گیا ہے جو یقیناً غلط ہے کیونکہ اس کا تلفظ "ہائے" بروزن "کام" ہے۔ لیکن معترضین اس پر غور نہیں کرتے کہ ایسا کیوں کیا گیا۔ درحقیقت یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ شدتِ درد سے جب انسان آہ کرتا ہے

اور "ہائے" کہتا ہے تو وزن اور تلفظ کی رعایت اسکے لئے ناممکن ہوجاتی ہے اور کبھی وہ "ہاتے" کو اتنا کھینچتا ہے کہ "ہا اے" بنجاتا ہے۔ شاعر نے یہی لطیف نکتہ اس شعر میں پیدا کرنا چاہا ہے۔ مگر وہی مثل ہے کہ "آنکھوں والا ترے جوبن کا تماشہ دیکھے" ۔طرز بیان کی ان نزاکتوں کا سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اگر یہ غلطی ہے تو اسی قسم کی غلطی ہے جسے محاسن میں شمار کرنا چاہیئے۔

ہاں اس طرف بھی اک نگہِ نیشتر نواز کب سے پھڑک رہی ہو رگِ جانِ آرزو

"نیشتر نواز" نگہ کی صفت ہے "نگہِ نیشتر نواز" کے معنی ہوئے "نشتر پر نوازش کرنے والی نگاہ"۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نگاہ، نشتر پر نوازش کس طرح کرسکتی ہے۔ بظاہر اس کی ایک ہی صورت سمجھ میں آتی ہے۔ وہ یہ کہ نگاہ، نشتر سے کہے کہ تم بہت تھک گئے ہو۔ لاؤ تمہارا کام میں کردوں۔ یعنی تمہاری بجائے میں عاشق کی فصد کھولدوں۔ مگر دشواری یہ ہے کہ اس شعر میں :-

ہٹا نہ سینۂ عاشق سے رُخ کسی جانب نگاہِ ناز کو نشتہ نواز رہنے دے

"نشتر نواز" کے کچھ اور معنی معلوم ہوتے ہیں۔ محبوب کا سر سینۂ عاشق پہ رکھا ہوا ہے۔ عاشق کہتا ہے کہ اپنا سر اسی طرح رکھا رہنے دے۔ نگاہِ ناز کو اسی طرح میرے سینہ پر لوٹنے دے۔ تو گویا یہاں نشتر کے معنی ہوئے سینہ۔ کیونکہ نگاہِ ناز سینہ پر نوازش کررہی ہے نہ کہ نشتر پر۔ نشتر بمعنی سینہ شاید "اساتذہ" نے کہیں لکھا ہو مگر ہمیں اسکی مثال کہیں نہ مل سکی۔

دل کی ہر چیز جگمگا اٹھی آج شاید وہ بے نقاب ہوا

کوئی معمولی شاعر اگر اسی خیال کو نظم کرتا تو یوں کہتا کہ "دل کا ہر ذرہ جگمگا اٹھا" لیکن جگر نے "ہر چیز" کہکر شعر کو زمین سے آسمان پر پہونچا دیا۔ ایک عامی اس پر یہ اعتراض کرسکتا ہے کہ عاشق کا دل کوئی بنئے کی دکان ہے کہ اس میں نون، تیل، ادرک "ہر چیز" موجود ہے۔ اور بقول مرزا سودا "یہ بھی ہے الو بھی ہے"۔ درحقیقت جگر صاحب نے "دل کی ہر چیز" کہکر اس عامیانہ خیال کی تردید کی ہے کہ "دل فقط ایک لہو کی بوند ہے" علم التشریح اور نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ دل فقط خون کی ایک بوند یا چند قطروں کے مجموعہ کا نام نہیں۔ وہ گوشت کا بنا ہوا ہے۔ اس میں رگیں بھی ہیں اور خون بھی۔ اور اسکے علاوہ اور بھی کتنی چیزیں شامل ہیں اور جذبات و احساسات کا مرکز بھی ہے۔

طلبِ خلد نہیں، آرزوِ حور نہیں، تم جو مل جاؤ تو پھر کچھ مجھے منظور نہیں

کلام جگر کی اس خصوصیت پر بہت کم لوگوں کی نظر پہونچی ہے کہ اس میں بعض الفاظ ایسے نئے معنی میں استعمال ہوتے ہیں جو آج تک کسی کو معلوم نہیں۔ "منظور" کے ایک معنی تو وہی ہیں جو مشہور ہیں۔ مثلاً آپ فرمائیں کہ کہیئے آپ کو یہ شرط منظور ہے اور میں کہوں کہ جی ہاں منظور ہے۔ اور دوسرے وہ لغوی معنی جو عام طور پر اردو میں مروج نہیں مگر مرزا غالب کے یہاں اسکی ایک مثال ملتی ہے :-

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

یہاں منظور بمعنی مشہود استعمال ہوا ہے۔ نظر کا اسم مفعول ہے۔ "ہمیں منظور نہیں" کے معنی ہوتے "ہمیں دکھائی نہیں دیتا"۔ لیکن جگر صاحب نے مذکورہ بالا شعر میں "منظور" بمعنی "درکار" استعمال کیا ہے۔ فنِ لغت سے دلچسپی رکھنے والوں کا فرض ہے کہ حضرت جگر کے اس شعر کو

محفوظ رکھیں تاکہ آئندہ اُردو کے جو لُغات مُرتب ہوں اُن میں اس شعر کے حوالہ سے "منظور" کے یہ نئے معنی بھی درج کر دیں۔ اس قسم کی جدتیں جگر صاحب کے یہاں بہت ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

رشک آتا ہے شہیدانِ وفا پر مجھ کو اُن کی قسمت میں تھا کیا جلد شفا ہو جانا

مطلب یہ کہ شہیدانِ وفا بہت جلد "شفا" ہو گئے۔ یعنی تندرست ہو گئے۔ تو اس طرح "شفا" کے معنی ہوئے "تندرست"۔ یہ معنی بھی نئے ہیں۔ اُردو میں شفا پانا۔ یا۔ شفایاب ہونا بولتے ہیں۔

دے چکا جب دل تو کیسا خوف شہرت ہو تو ہو اب یہ سر جائے تو جائے اور قیامت ہو تو ہو

اُردو میں "شہرت" اچھے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی لئے لوگ شہرت کے آرزو مند رہتے ہیں اور اُسے حاصل کرنے کیلئے ہر قسم کے جائز و ناجائز وسائل سے کام لیتے ہیں۔ شہرت سے خوف کھاتے کسی کو نہیں سُنا۔ مگر اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ شہرت بدنامی اور رُسوائی کا مترادف ہے۔

دیکھا نہ مُڑ کے تو نے ستمگر بُرا کیا بیمارِ ہجر منتظرِ بازدید تھا

"بازدید" کے معنی ہیں Return visit یعنی کوئی آپ کی ملاقات کو آئے اور پھر آپ اس سے ملنے جائیں تو یہ جوابی ملاقات "بازدید" ہوئی۔ لیکن جگر صاحب کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ "بازدید" کے معنی ہیں "جاتے جاتے مُڑ کے دیکھنا"۔ یہ معنی بھی جگر صاحب کی جدتِ طبع کا نتیجہ ہیں۔

عدم کی راہ میں رکھا ہے پہلا ہی قدم میں نے مگر احباب اسکو آخری منزل سمجھتے ہیں

موت، سفرِ آخرت، اور قبر کو مجازاً منزلِ اول یا پہلی منزل کہتے ہیں۔ [illegible] زکی۔

اب بحد تنگ ہوئی منزلِ اول دیکھوں آگے لیجائے مجھے گردشِ ایام کہاں

موت ہے گویا قدم رکھنا ہی راہِ عشق میں ہمسفر ہوئے الگ پہلی ہی منزل سے الگ

جگر صاحب نے اسی پہلی منزل کو آخری منزل بنا دیا۔ آپکے ایک طرفدار کا قول ہے کہ یہ غلطی جگر صاحب کی نہیں بلکہ ان کے احباب کی ہے جنہوں نے پہلی منزل کو آخری منزل سمجھا۔

کیا دن تھے جگر وہ دن جب صحبتِ اصغر میں مسرور طبیعت تھی محرور مرا دل تھا

گرمی، سردی، خشکی اور تری، مزاج کے خواص میں داخل ہیں جس شخص کے مزاج میں گرمی زیادہ ہو اُسے محرور المزاج کہتے ہیں۔ دل کا محرور ہونا بھی اسی قبیل سے ہے۔ مگر یہ ایک مرض ہے اور بہت بُرا مرض ہے خدا سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ مگر جہاں تک سُنا ہے یہ مرض اُڑ کر نہیں لگتا۔ اس لئے کسی کی صحبت کے اثر سے اس کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ شاید جگر صاحب نے محرور بمعنی مسرور استعمال کیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہ بھی ایک مجتہدانہ جدت ہے۔

نگاہِ اہلِ دل بھی رہ گئی زیر و زبر ہو کر کہاں پہونچے مرے اجزائے ہستی منتشر ہو کر

جگر صاحب کی جدتوں سے فقط اہلِ ہند ہی نہیں بلکہ عرب والے بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ منتشر بروزنِ مختصر اُن کے یہاں موجود نہیں جگر صاحب نے مفعول کا یہ نیا صیغہ ایجاد کیا۔ حالانکہ از روئے قواعدِ عربی منتشِر (بکسرِ شین) ہونا چاہئے۔ منتشَر (بفتح شین) غلط ہے۔ مگر اس

غلطی سے زبان میں وسعت اور شعرا کیلئے سہولت پیدا ہوگئی۔ مختصر کا قافیہ منتشر تو پہلے سے موجود ہے۔ اب معتبر کے لئے منتشر کا قافیہ بھی نکل آیا۔ اس قسم کی غلطیاں وسعت زبان کیلئے نہایت ضروری ہیں۔

۱۴ سفاک چتونیں بھی ہیں قاتل نظر بھی ہے ‏ کیا چیز ہوگئے ہو تمہیں کچھ خبر بھی ہے

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ چتون کیا چیز ہے مگر یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ بعض معشوقوں کے کئی کئی چتونیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ جگر صاحب کا محبوب بھی کئی چتونوں کا مالک تھا (یا ہے۔) ورنہ "چتونیں" (بصیغہ جمع) کہنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ اور اگر چتون کو چتونیں اس بنا پر کہا گیا کہ اس میں ایک سے زیادہ شکنیں بھی ہوسکتی ہیں تو یہ ایسی ہی بات ہے جیسے دو نتھنے ہونے کی بنا پر کسی کی ناک کو ناکیں کہنا۔

۱۵ وہ دل کو توڑ کے بیٹھے تھے مطمئن کہ انہیں ‏ شکستِ شیشۂ دل کی صدا نے لوٹ لیا

عام قاعدہ تو یہی ہے کہ جب کوئی شے ٹوٹتی ہے تو فوراً ہی اس میں سے آواز بھی نکلتی ہے۔ مگر یہ عاشق کا دل بھی عجب چیز ہے کہ ٹوٹنے کے گھنٹہ بھر بعد صدا دیتا ہے۔ جگر صاحب کے محبوب نے جگر صاحب کا دل توڑ ڈالا اس کام سے فارغ ہونے کے بعد منہ دھویا۔ کنگھی کی۔ بال سنوارے، سرمہ لگایا، پان کی گلوری بنا کر منہ میں رکھی اور گاؤ تکیہ کے سہارے آرام و اطمینان کے ساتھ تخت پر بیٹھ گیا۔ پیک تھوکنے کے لئے فرش پر سے اگالدان اٹھانا چاہتا تھا کہ یکایک ایک دھماکے کی آواز ہوئی۔ غریب کا جی دہل گیا، اگالدان ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور فرش کی چاندنی پیک کی چھینٹوں سے جامہ وار میں تبدیل ہوگئی۔ خواصیں دوڑ پڑیں کہ ہے ہے کیا ہوا؟ بی صاحبہ کو سنبھالا۔ تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ یہ جگر صاحب کا دل تھا جسے توڑنے کے بعد بی صاحبہ اطمینان سے بیٹھ گئی تھیں اور جس نے ٹوٹنے کے پورے ۲۷ منٹ ۱۱ سکنڈ بعد آواز دی۔

۱۶ بیٹھا ہوں مست و بیخود خاموش ہیں فضائیں ‏ کانوں میں آرہی ہیں بھولی ہوئی صدائیں

مست و بیخود کو کیا خبر کہ فضا خاموش ہے یا شور سے گونج رہی ہے۔ خیر فرض کر لیا کہ فضا خاموش تھی۔ اور فضا جب خاموش تھی تو کانوں میں صدائیں یقیناً آرہی ہونگی۔ یہ بات تو سمجھ میں آگئی لیکن یہ معمہ پھر بھی حل نہ ہوا کہ جہاں آپ مست و بیخود بیٹھے ہوئے تھے وہاں کتنی فضائیں تھیں۔ غالباً فضا تو ایک ہی ہوگی لیکن مست و بیخود ہونے کی وجہ سے آپ کو کئی نظر آتی ہونگی۔ یا پھر یہ کوئی ایسا راز ہے جسے صرف "حقائق و معارف والے" ہی سمجھ سکتے ہیں۔

وزن و قافیہ کی ضرورت سے فضا کو بصیغۂ جمع استعمال کرنے کی وبا عام ہوتی جارہی ہے اور دورِ حاضر کے اکثر شعرا اس سے "ناجائز فائدہ" اٹھا رہے ہیں۔ خود جگر صاحب نے کئی بار اس لفظ کی جان پر ستم کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۷ رنگین ہیں فضائیں، جاری ہیں اشکِ خونیں ‏ افسانہ حسن کا ہے اور عشق کی زبان ہے

بھری ہوئی ہیں فضائیں جمالِ غم سے تمام ‏ گناہگارِ نظر لذت عذاب اٹھا

پردہ میں سازِ غم کے کس کی ہیں یہ ادائیں ‏ نغمے تڑپ رہے ہیں مسحور ہیں فضائیں

مولینا بلغ العلیٰ عرف حاجی بغلول سے کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ جانتے ہیں انگور کیا چیز ہے۔ فرمایا یہ تو ہم نہیں جانتے کہ انگور کیا چیز ہے مگر جب ہم حج کیلئے گئے تھے تو مکہ شریف میں روز انگور کھایا کرتے تھے، ہم سمجھتے تھے کہ یہ حکایت محض ایک لطیفہ ہے لیکن جگر صاحب نے

بھی اسی قسم کا ایک ذاتی تجربہ بیان کیا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ لطیفہ محض بے بنیاد نہیں جگر صاحب فرماتے ہیں۔

نہ جانے محبت ہے کیا چیز لیکن — بڑی ہی محبت سے ہم دیکھتے ہیں

جب آپ کو معلوم ہی نہیں کہ محبت کیا چیز ہے تو پھر جس انداز سے آپ دیکھتے ہیں اُسے محبت سے تعبیر کرنا کیا معنی؟ شاید یہی ہیں وہ "اسرارِ رموز" جو دورِ حاضر کی غزل گوئی کا طرۂ امتیاز ہیں۔

یہ راز سُن رہے ہیں اک موجِ تہ نشیں سے — ڈوبیں گے ہم جہاں پر اُچھلیں گے پھر وہیں سے

ایک چھوٹی سی ریاست کے دیوان صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ اُن کے نواب صاحب نے موٹر خریدی۔ اس کے سلسلہ میں ہارس پاور (Horse Power) کا لفظ بار بار سُننے میں آیا۔ اور جس وقت آپ گدی پر بیٹھے تھے تو یہ بھی سُنا تھا کہ گورنمنٹ برطانیہ نے حکومت کے پورے اختیارات (Full Powers) آپ کو عطا کئے ہیں۔ جنگِ عظیم کے دوران میں آپ نے سرکار کی بہت کچھ خدمات انجام دیں جس کے صلہ میں گورنر صاحب نے بادشاہ کی طرف سے سرِ دربار آپ کو چار حرف کا خطاب عطا کیا۔ آپ نے گورنر صاحب سے کہا کہ حضور ہمیں ایک مشین گن (Machine Gun) بھی عنایت ہو۔ گورنر صاحب نے کچھ عذر پیش کیا تو نواب صاحب چیں بجبیں ہو کر بولے کہ حضور آخر ہم کس رئیس سے کم ہیں۔ حضور کی دعا سے ہم بھی (Full Horse Power) "فل ہارس پاور" ہیں۔ گورنر صاحب ہنسی سے بیتاب ہو گئے۔ کسی لفظ کے صحیح مفہوم سے ناواقف ہونے کے باوجود اُسے استعمال کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ غالباً جگر صاحب نے انگریزی کا لفظ "انڈر کرنٹ" (under current) کہیں سُن لیا ہے اور اُسی کا ترجمہ "موجِ تہ نشیں" فرمایا ہے۔ حالانکہ موج کا تہ میں بیٹھ جانا قطعاً ناممکن ہے۔ ہاں شعر میں لفظ "راز" کی موجودگی کے باعث اسے بھی کوئی راز کی بات فرض کر لیا جائے تو پھر کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔

پُرانے زمانہ میں دیوانے گریبان پھاڑا کرتے تھے۔ دامن کی دھجیاں اُڑایا کرتے تھے۔ لیکن دورِ حاضر کے بعض اساتذہ پر جب جنون کا دورہ پڑتا ہے تو جیبیں پھاڑتے ہیں کہ یہ بھی ایک جدت ہے۔ گریبان اور دامن پھاڑنے کی علت تو ظاہر ہے کہ اس میں سہولت ہے لیکن جیب کے پھاڑنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جگر صاحب فرماتے ہیں۔

بچ رہا ہو جو کوئی جوشِ جنوں کے ہاتھوں — تار ایسا کوئی اب جیب و گریباں میں نہیں

جنوں کی خیر ہو یارب کہ ضعف کے ہاتھوں — رہا نہ جیب و گریباں پہ اعتبار مجھے

حال وحشت میں ہوا یہ ترے دیوانوں کا — جیب چھوٹی تو گریبان لئے بیٹھے ہیں

بات دراصل یہ ہے کہ جگر صاحب نے دوسرے شعرائے کلام میں جیب و دامن کی دھجیاں اُڑتے دیکھیں اور غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ دامن کی طرح "جیب" بھی پھاڑی جاتی ہے۔ مگر آپ کو یہ معلوم نہیں کہ جیب بھی گریبان ہی کو کہتے ہیں۔ ناواقفیت کی بنا پر آپ نے جیب کو پاکٹ (Pocket) سمجھ لیا۔ (جس میں فاونٹن پن، گھڑی، روپیہ پیسہ، اور رومال وغیرہ رکھتے ہیں) اور گریبان کے ساتھ اس کو بھی پھاڑنا شروع کر دیا۔ ایک اور "استاد" نے اسی قسم کا ایک شعر کہا ہے۔

تمہاری نذر کو لایا ہوں تحفے — یہ دل ہے یہ کلیجہ یہ جگر ہے

اللہ ری معصومیت، بیچارے کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ جگر اور کلیجہ دو چیزیں نہیں۔ مگر اس کا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ جہاں تک ہو سکے تحفوں کی فہرست لمبی ہو۔ اس سے کیا بحث کہ جو کلیجہ ہے وہی جگر ہے۔ چیز ایک سہی نام تو دو ہیں۔ یہی حال ہمارے جگر صاحب کا ہے کہ

جنون کے جوش میں گریبان کے ساتھ جیب بھی پھاڑ ڈالی۔ مگر جب ہوش آئے گا تو معلوم ہوگا کہ اپنے جسے ہم جیب سمجھے تھے دل تو گریبان ہی ہے۔

اُٹھتے ہی پائے یار کے باغ کا باغ اُجڑ گیا   پھول بھی ہیں تباہ سے سبزہ بھی پائمال سا

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر صاحب کے یار کے پاؤں میں ہل بندھا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ دو قدم چلا تمام باغ کھد گیا۔ اور اگر "پائے یار کے اُٹھتے ہی" سے "یار کے جاتے ہی" مراد ہے تو الفاظ سے یہ مفہوم ادا نہیں ہوتا اور اگر "پاؤں اُٹھنا" سے مراد شکست کھا کر بھاگنا ہو تو اس کا بھی یہاں کوئی محل نہیں۔ ممکن ہے پورا شعر "عشقِ حقیقی" کے بیان میں ہو۔ تو اُسے کوئی "عارف باللہ" ہی سمجھ سکتا ہے۔

اس عشق کے ہاتھوں سے ہرگز نہ مفر دیکھا   اُتنی ہی بڑھی حسرت جتنا ہی اُدھر دیکھا

عشق کے ہاتھوں سے مفر ہو یا نہ ہو لیکن "جتنا" کے بعد "ہی" سے ضرور مفر حاصل کرنا چاہیئے ورنہ اس بےتکی بولی سے بہت سی خرابیوں کا اندیشہ ہے۔

دورِ حاضر کے اکثر اساتذہ "سب" اور "سارے" میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ "سب" کی جگہ "سارا" اور "سارا" کی جگہ "سب" بلا امتیاز استعمال کرتے ہیں حالانکہ جیسا ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں "سب" کا اطلاق مجموعۂ افراد پر ہوتا ہے۔ مثلاً:۔

سب لوگ جدھر وہ ہیں اُدھر دیکھ رہے ہیں   ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں

اور "سارے" کا اطلاق فردِ واحد کے کل پر ہوتا ہے۔ مثلاً:۔

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا — یا — سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

جگر صاحب بھی اس بلوئے عام میں شریک ہیں۔

آج کن آنکھوں سے یہ جورِ خزاں دیکھا کئے   سب چمن لٹتا رہا اور باغباں دیکھا کئے

اوّل تو مصراعِ ثانی میں "سب" زائد محض ہے اور اگر فرض کر لیا جائے کہ اس کے بغیر شاعر کا مفہوم ادا نہیں ہوتا تو "سارا چمن" کہنا چاہیئے۔ مگر شاعر بیچارے کا کیا قصور، مصراع میں "سارے" کی گنجائش ہی نہ تھی لہٰذا "سب" سے کام لیا۔ البتہ جہاں جگہ زیادہ ہوتی ہے وہاں "سب" کی جگہ بھی "سارا" ہی استعمال کیا جاتا ہے جیسے اس شعر میں۔

تیری ہی نعت میں ہیں مشغول یا محمد   سارے زمین والے کُل آسمان والے

جیسا کہ ہم پیشتر کہہ چکے ہیں اساتذہ دورِ حاضر کی تائید میں کسی "پرانے اُستاد" کا شعر تلاش کرنا بے سُود ہے اس لئے کہ جس اُستاد نے بھی "سب" کی جگہ "سارا" اور "سارا" کی جگہ "سب" استعمال کیا ہے بضرورتِ شعری ہی کیا ہے ورنہ کسی مستند ادیب کے یہاں نثر میں اس کی مثال نہ ملیگی اور اگر اتفاق سے مل بھی جائے تو اُسے لکھنے والے کی غفلت یا سہو القلم پر محمول کرنا چاہیئے۔ اُسے صحیح سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے "مشکور" کو بمعنی "ممنون" صحیح سمجھنا، محض اس بنا پر کہ مولانا شبلی نے اس معنی میں استعمال کیا ہے۔

مری موت سُن کر کیا اُسنے ضبط   مگر رنگ چہرہ کا فق ہوگیا

جس طرح اُردو کا رسم الخط ایک طرح کا شارٹ ہینڈ ہے اسی طرح جگر صاحب کی زبان بھی شارٹ ہینڈ کے لئے بخوبی استعمال کی جا سکتی ہے کہیں ایک لفظ اور اس سے کام نکلے تین لفظوں کا۔ مثلاً اس شعر کے پہلے مصراع میں "موت" بجائے "موت کی خبر" استعمال ہوا ہے۔ ہر چند کہ اُردو میں لفظ موت اس معنی میں کبھی نہیں آتا اور اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ غلط ہے لیکن اگر اس کی جامعیت کو مدِ نظر رکھا جائے تو جگر صاحب

کی یہ جدت اس قابل ہے کہ اسے رواج دیا جائے۔ اس قسم کے اختصار کی مثالیں آپ کے کلام میں اور بھی ملتی ہیں۔ مثلاً۔

یہ جنون بھی کیا جنوں، یہ حال بھی کیا حال ہو ہم کہے جاتے ہیں کوئی سن رہا ہو یا نہ ہو

دوسرا مصرع اس طرح ہونا چاہیئے کہ "ہم کہے جاتے ہیں کوئی سن رہا ہو یا نہ سن رہا ہو" لیکن اس طرح کہنے میں "سن رہا" مکرر ہو جاتا لہذا بنظرِ اختصار آپ نے ایک "سن رہا" کو حذف کر دیا۔ یہ ضرور ہے کہ اس سے عبارت بے ربط بلکہ ایک حد تک مہمل ہو گئی مگر جو لوگ آپ کے اندازِ کلام سے واقف ہیں انہیں آپ کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو گی۔

شکستِ حسن کا جلوہ دکھا کے لوٹ لیا نگاہ نیچی کئے سر جھکا کے لوٹ لیا

از روئے قواعد "جلوہ دکھا کے"، "نگاہ نیچی کر کے" اور "سر جھکا کے"۔ ان تینوں فعلوں کو ایک ہی وضع پر ہونا ضروری ہے۔ یعنی "نگاہ نیچی کئے" کے بجائے "نگاہ نیچی کر کے" چاہیئے۔ مگر "نگاہ نیچی کر کے" مصرع میں نہیں سما سکتا لہذا "شارٹ ہینڈ" کے اصول کے مطابق "کر کے" کو "کئے" بنا دیا۔

حیات درد ہی پھر بھی آہ کیا کرتے فنا کی چیز جو ہوتی تو ہم فنا کرتے

"فنا کی چیز" مخفف ہے "فنا کرنے کی چیز" کا۔ یہ مانا کہ "فنا کی چیز" خلافِ محاورہ ہے لیکن اگر محاورہ کی پابندی کی جائے تو پھر "مختصر نویسی" نہ ہو سکے گی۔

میں دور ہوں تو روئے سخن مجھ سے کس لئے تم پاس ہو تو کیوں نہیں آتے نظر مجھے

"روئے سخن" کسی کی طرف[1] ہوتا ہے "کسی سے" نہیں ہوتا۔ لہذا "میں دور ہوں تو روئے سخن میری طرف کس لئے" کہنا چاہیئے۔ مگر وہی شارٹ ہینڈ والا اصول یہاں بھی کام کر رہا ہے۔

بیان ہوں کیا یہاں کی مشکلیں بس مختصر یہ ہے وہی اچھے ہیں کچھ جو جس قدر ہیں دور منزل سے

دوسرے مصرع کی عبارت یا تو اس طرح ہوتی کہ "وہی کچھ اچھے ہیں جو منزل سے دور ہیں" اس صورت میں "جس قدر" بے محل ہے یا پھر اس طرح کہتے کہ "جو منزل سے جس قدر دور ہیں وہ اتنے ہی اچھے ہیں"۔ موجودہ صورت میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ مصرعِ ثانی صنعتِ "اختصار" میں ہے یا صنعتِ "اطناب" میں۔ کیونکہ پہلی صورت میں "جس قدر" زائد اور دوسری صورت میں "اتنے ہی" کم ہے۔

جس طرح ضرورتِ شعری کی بنا پر آپ لفظوں، فقروں، جملوں اور محاوروں کی قطع و برید کر کے انہیں مختصر کر دیتے ہیں اسی طرح جہاں گنجائش زیادہ ہوتی ہے وہاں خلا پُر کرنے کیلئے آپ الفاظ کو کھینچ تان کر پھیلا بھی دیتے ہیں مثلاً اس شعر کے پہلے مصرع میں۔

عالم جب ایک حال پہ قائم نہیں رہے کیا خاک اعتبارِ نگاہ و یقین رہے

"نہ" کی جگہ "نہیں" استعمال ہوا ہے۔ اور چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

زخم کو مرہمِ دل، درد کو درماں سمجھا چارہ گر خوب علاجِ غمِ پنہاں سمجھا

مصرع اولی میں مرہم کے ساتھ دل کی قید بالکل بیکار ہے۔ "زخم کو مرہم۔ درد کو درماں سمجھا" کہنا کافی ہے۔ "دل" اس میں خواہ مخواہ ٹھونس دیا گیا ہے۔

[1] روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ۔ غالب

دل ہر اک حال میں ہے حضرتِ احساں کے قریب — میں جگر لاکھ ہوں آوارہ و سرگشتہ مگر

مصراعِ ثانی میں "ہر" کے بعد "اک" زائدِ محض اور مخلِ فصاحت ہے۔

دیکھی تری آنکھوں کی کیفیتِ رعنائی — اب کس سے سنبھلتا ہے جامِ مے مینائی

دوسرے مصراع میں "مینائی" محض بضرورتِ قافیہ لایا گیا ہے ورنہ شعر کا مطلب اسکے بغیر پورا ہو جاتا ہے۔

ہم اہل تھے خزاں کے نہ رنگِ بہار کے — آکر قفس میں اب یہ کھُلا ہے معاملہ

جب خزاں کی کوئی خاص صفت مذکور نہیں تو بہار کے "رنگ" کا ذکر کس لئے۔ "ہم اہل تھے خزاں کے نہ بہار کے" کہنا بالکل کافی ہے۔

سنبھل سنبھل کے طبیعت مری نڈھال ہوئی — کسی کے سامنے مشکل سے عرضِ حال ہوئی

اُردو میں "عرض" جب درخواست کے معنی میں آئے تو مؤنث ہے۔ مثلاً "میری عرض یہ ہے"۔ لیکن "عرضِ حال" کے معنی ہیں "اظہارِ حال"۔ اس صورت میں مُرکب مصدر ہے۔ لہٰذا "عرض" کے قیاس پر اُسے بھی مؤنث سمجھنا غلط ہے۔

نظر ملی کہ ہو گیا تبادلہ خیال میں — بیانِ اہلِ دل ہے کب اسیرِ قیل و قال میں

"تبادلہ" بمعنی تبادل (exchange) نہ عربی ہے نہ فارسی نہ اُردو۔ "ایجادِ بندہ" البتہ کہہ سکتے ہیں۔ اُردو میں "تبادلہ" کے معنی ہیں ٹرانسفر (transfer) یعنی بدلی سو اس کا یہاں کوئی محل نہیں۔

ہم جہاں شیشہ پٹک دیں وہی میخانہ بنے — تم دکھا دو جسے آنکھیں وہی مخمور رہے

آنکھیں دکھانا اُردو کا ایک خاص محاورہ ہے جس کے معنی ہیں خفگی کی نظر سے دیکھنا۔ گھورنا۔ دھمکانا۔ بے مروّتی کرنا۔ مگر یہاں شاعر کا یہ مقصود نہیں۔ لہٰذا اپنے مفہوم کو کسی دوسرے طریقہ سے ادا کرنا چاہیئے تھا مثلاً یوں کہتے کہ "جو تمہاری آنکھ دیکھ لے"۔

وہ ایک شے بھی اگر شاملِ نگاہ نہیں — ہزار چشمِ عنایت ہو پھر بھی کیا حاصل

"وہ ایک شے" سے آپ کی مُراد کیا ہے آپ خود ہی سمجھتے ہونگے۔ اشارہ "اس بات" کی طرف خیال جاتا ہے مگر اُس کا یہ موقع نہیں۔ شاید یہ شعر آپنے تصوف میں کہا ہے۔

سُناتا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے — کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی

دوسرے مصراع کی ترتیب بالکل ابتر ہے۔ یا تو "سُناتا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہے" ہونا چاہیئے۔ یا "سُناتا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے"۔

شاق گزرا مجھے بلبل کا غزلخواں ہونا — سن کے افسانۂ غم باغ میں کُملا گئے پھول

غزلخوانی میں سرور و شادمانی کا مفہوم شامل ہے۔ اسے افسانۂ غم سے تعبیر کرنا مقتضائے حال کے مطابق نہیں۔ غزلخوانی کے بجائے اگر نوحہ خوانی کہتے تو البتہ افسانۂ غم کے مناسب ہوتا۔

کہ ذرہ ذرہ تو تصویرِ حُسنِ یار ہوا — اب اس سے بڑھ کے طلسمِ خیال کیا ہوگا

مصراعِ ثانی میں "کہ" اور "تو" کا اجتماع صحیح نہیں۔ دونوں میں سے کسی ایک کو حذف کر دینا چاہیئے۔ اگر "کہ" کو باقی رکھا جائے تو باعتبارِ

---

[1] جگر کی تائید میں کوئی صاحب غالب کا یہ مصراع پیش نہ کریں۔ "ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے"۔ کیونکہ وہی اعتراض اس پر بھی عائد ہوتا ہے۔

[2] امیرؔ۔ وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے — آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب

تقدیم و تاخیر مصرعوں کی ترتیب یوں ہی رہیگی اور اگر "کہ" کو حذف کیا جائے تو مصراع ثانی کو پہلے پڑھنا چاہیئے۔

وہ صبح شامِ وصال میرا لپٹ لپٹ کر بلائیں لینا حیا سے وہ نیچی نیچی نظریں وہ شرم سے آب آب عارض

"شامِ وصال" کے بجائے "شبِ وصال" چاہیئے۔

سحر تک شمع محفل میں سے جل بجھنے کی ٹھانی ہو ہمیں یہ دیکھنا ہے خاک ہوجاتے ہیں ہم کبتک

پہلے مصراع میں "میں" اور دوسرے میں "ہم" اگر بطورِ صنعتِ "ایجاد" استعمال ہوا ہے تو خیر، ورنہ "شتر گربہ" ہے۔ کم ازکم "اساتذہ" کو اس سے احتراز لازم ہے۔

ہر وقت اک خمار تھا ہر دم سُرور تھا بوتل بغل میں تھی کہ دلِ ناصبور تھا

خُمار اور سُرور دو مختلف کیفیتوں کے نام ہیں جب دلِ ناصبور شراب کی بوتل کا کام کر رہا تھا تو اُس سے بیک وقت خُمار اور سُرور دونوں کا پیدا ہونا کیا معنی؟۔

اللہ ری وارفتگی شوق کا عالم میرا ابھی پتہ اب سرِ منزل نہیں ملتا

وارفتگی مونث ہے اور عالم مذکر۔ "اللہ ری" کا تعلق "عالم" سے ہے "وارفتگی" سے نہیں۔ لہذا "اللہ رے" چاہیئے۔ اگر وارفتگی کا بیان مقصود ہوتا تو البتہ "اللہ ری" صحیح ہوتا۔

چین اسیرانِ قفس کو یادِ گلشن میں نہیں دوڑتی ہیں بجلیاں سیلابِ خوں تن میں نہیں۔

جسم میں خُون کی گردش کو "سیلان" کہتے ہیں سیلاب نہیں۔

جگر بتائیے کچھ حالِ زار خیر تو ہے یہ کیوں برستی ہیں مایوسیاں نگاہوں سے

منادی اگر واحد ہو تو اسکے لئے فعل بصیغۂ جمع اُس وقت استعمال کیا جاتا ہے جبکہ اُسکے ساتھ کوئی کلمۂ تعظیم بھی موجود ہو۔ ورنہ فعل بھی واحد ہی ہونا چاہیئے۔ لہذا "جگر بتائیے" کہنا صحیح نہیں "جگر بتا" یا "جگر صاحب، بتائیے" کہنا چاہیئے۔

تم اس دلِ وحشی کی وفاؤں پہ نہ جانا اپنا نہ رہا جو وہ کسی کا نہ رہے گا

دوسرا مصراع خلاف محاورہ ہے۔ اس طرح ہو تو صحیح ہو جائے۔ "اپنا نہ ہوا جو وہ کسی کا بھی نہ ہوگا۔"

کرے نہ کام جو بلبل کا نالۂ خونیں نہ مجھے نیند سے چونکیں نہ رنگ و بو آئے

بُو اردو میں "بدبو" کے معنی میں مستعمل ہے اور "بُو آنا" سڑاند آنے کے مترادف ہے۔ لفظِ بو اگرچہ یہاں رنگ کا معطوف علیہ ہے پھر بھی "بو آئے" علیحدہ پڑھا جاتا ہے اور سامع کا ذہن "بدبو" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

تعقیدِ لفظی بہرحال بُری ہوتی ہے لیکن اُس صورت میں اور بھی بُری ہو جاتی ہے جبکہ دو متعلق لفظوں کے درمیان زیادہ فاصلہ ہو جائے۔ مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صرف ایک لفظ کے درمیان میں آجانے سے تعقید کی بدترین شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات مفہوم کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ مثلاً۔ جگر۔

زمانہ آج ہی غرقِ شراب تھا ناہد کچھ اور دیر جو وہ چشمِ نیم باز رہے

"کچھ اور دیر" کی ترکیب جس قدر نامطبوع ہے محتاجِ بیان نہیں لفظ "اور" جسے "دیر" کے بعد آنا چاہیئے تھا (یعنی "کچھ دیر اور")۔

"دیر" کے پہلے آ کر اس ابتری کا باعث ہوا۔ اسی طرح اس شعر میں :-

نسیمِ شوق یہ لائی جوابِ نامۂ درد   کچھ اور دن ابھی تکلیفِ اضطراب اُٹھا

"کچھ دن اور" کی جگہ "کچھ اور دن" کہا ہے اور دونوں فقروں کے مفہوم کا فرق ظاہر ہے۔

چاہیئے عشق میں مجھے آپ ہی کا جمال سا   داغ ہر ایک بدر سا زخم ہر اک ہلال سا

پہلے مصراع کے "سا" کو دراصل "جمال" سے پہلے آنا چاہیئے تھا۔ شاعر کو "آپ ہی کا سا جمال" کہنا مقصود ہے۔ مگر سا کی جگہ بدل جانے سے مصراع کا مفہوم ہی بدل گیا۔

جیسا کہ ہم پیشتر کہہ چکے ہیں "عربی اور فارسی کے ایسے بہت سے الفاظ اُردو میں رائج ہیں جن کے معنی عربی اور فارسی لغت کی رُو سے کچھ اور ہیں اور اُردو میں کچھ اور۔ ایسے الفاظ کو اب اُردو کے الفاظ سمجھنا چاہیئے اور مرکبات میں خصوصاً اضافت کے ساتھ ان کا استعمال جائز نہیں" لیکن اس غلطی سے بچنا اُسی وقت ممکن ہے جبکہ شاعر صاحب کو یہ معلوم بھی ہو کہ جن الفاظ کو وہ استعمال کر رہے ہوں وہ تغیرِ معنی کی بنا پر اُردو کے الفاظ بن چکے ہیں اور اس خاص معنی کے ساتھ انہیں عربی یا فارسی سمجھنا غلط ہے۔ دورِ حاضر کے اکثر "اساتذہ" کے یہاں اس قسم کی لغزشیں پائی جاتی ہیں۔ فعلاً ہم جناب جگر کے کلام سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں :-

ستم زیست آفریں کی قسم   خطرۂ التفات نے مارا

یہاں خطرہ بمعنی خطر استعمال ہوا ہے مگر اس معنی میں نہ عربی ہے نہ فارسی۔ لہٰذا "خطرۂ التفات" کی ترکیب غلط۔

نسیمِ شوق یہ لائی جوابِ نامۂ درد   کچھ اور دن ابھی تکلیفِ اضطراب اُٹھا

تکلیف بمعنی دُکھ، درد، رنج، نہ عربی ہے نہ فارسی اس لئے "تکلیفِ اضطراب" کی ترکیب ناجائز۔

اک جامِ آخری تو پہنا ہے اور ساقی   اب دستِ شوق کانپے یا پاؤں لڑکھڑائیں

یہ حدِّ آخری ہے عاشق کی جستجو کی   بن بن کے مٹ رہی ہے ہر شکل آرزو کی

جامِ آخری اور حدِّ آخری دونوں ترکیبیں غلط ہیں۔

پہلے جو ختم ہو گئی یہ داستانِ غم   تو میں کہونگا عرصۂ محشر دراز تھا

عرصہ کے معنی ہیں میدان۔ اُردو میں یہ لفظ بمعنی مدّت مستعمل ہے اور اس شعر میں بھی اسی معنی میں آیا ہے اسلئے "عرصۂ محشر" کی ترکیب صحیح نہیں۔

کوئی تو دردمندِ دلِ ناصبور تھا   مانا کہ تم نہ تھے کوئی تم سا ضرور تھا

"دردمند" فارسی میں مصیبت زدہ کے معنی میں آتا ہے۔ اُردو میں اس کے معنی ہیں غمخوار و ہمدرد۔ اور اسی معنی میں یہاں استعمال ہوا ہے اس لئے "دردمندِ دلِ ناصبور" کی ترکیب غلط ہے۔

کیا بلا عشقِ تماشہ ساز ہے   اس کا ہر انجام اک آغاز ہے

اُردو میں تماشہ (تماشا) کے جو معنی مشہور ہیں وہ فارسی یا عربی میں موجود نہیں۔ اس لئے "تماشا" اس خاص معنی کے ساتھ اُردو کا لفظ سمجھنا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں "تماشہ ساز" کی ترکیب صحیح نہیں ہو سکتی۔

خود اپنے نشہ میں جھومتے ہیں وہ اپنا منہ آپ چومتے ہیں   خرابِ مستی بنے ہوئے ہیں ہلاکِ مستی بنا رہے ہیں

ظنِ غالب ہے کہ جگرؔ صاحب نے یہ شعر "تصوّف" میں کہا ہے۔ اس لئے کہ انسان کی یہ قدرت نہیں کہ اپنا منہ آپ چوم لے (الّا آئینہ میں۔ مگر وہ عکس ہے اصل نہیں) ہاں خدا کو سب قدرت ہے۔ ان اللہ علیٰ کل شیٍٔ قدیر۔ مگر اس صورت میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ باتفاق جمہور خدا کبھی نشہ میں جھومتا نہیں۔ اور اگر محبوبِ مجازی مراد ہے تو وہ اپنا منہ آپ کیونکر چوم سکتا ہے۔

۱۲۔ ہم ہیں تیرے ودیعتیں تیری شکرِ راحت، شکایتِ غم کیا

اگر یہ کہنا مقصود ہے کہ "ہم تیری ودیعتیں ہیں" تو "تیرے" بیکار ہے۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ ہم تیرے ہیں اور تُو نے ہمیں جو کچھ دیا ہے وہ تیری ودیعتیں ہیں تو یہ مفہوم اسوقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک مصراع میں "تو نے ہمیں جو کچھ دیا ہے وہ" کا اضافہ نہ کیا جائے۔ موجودہ صورت میں مصراع مہمل ہے۔

۱۳۔ قسم ہے تیری پشیمان نگاہیوں کی قسم مجھی کو خود مری شرمِ وفا نے لُوٹ لیا

یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات کسی لفظ کی تکرار سے بیان میں زور پیدا ہو جاتا ہے لیکن اس شعر میں "قسم" کی تکرار بالکل بے محل ہے اور "قسم ہے" کا ٹکڑا محض بیکار۔ بلکہ اس سے مصراع پھسپھسا ہو گیا۔

۱۴۔ پھر جنوں سامانیوں میں کچھ کمی سی آ چلی آج پھر برہم مزاجِ حُسنِ جاناں کیجئے

"مزاجِ حُسن" کو بھی برہم کیا جا سکتا ہے اور "مزاجِ جاناں" کو بھی (بلکہ دراصل مزاجِ حُسن اور مزاجِ جاناں کے ایک ہی معنی ہیں۔) لیکن جگرؔ صاحب کو یہ بالکل نئی سوجھی کہ "مزاجِ حسنِ جاناں" کو برہم کرنا چاہتے ہیں۔ بظاہر تو یہ ایک مہمل سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اس میں کوئی عارفانہ نکتہ ہو تو ہم نہایت ادب کے ساتھ اپنا اعتراض واپس لیتے ہیں۔

۱۵۔ مجھ سا کوئی دیوانہ تجھے کون ملے گا آ، اے اجل آ، تو بھی مرے ساتھ ہی مر جا

پہلے مصراع میں "کوئی" اور "کون" کا اجتماع بالکل غلط ہے۔ یا تو "کون" کی جگہ "کہاں" لائیں۔ یعنی "مجھ سا کوئی دیوانہ تجھے کہاں ملیگا" یا "کوئی" کو حذف کر دیں اور "مجھ سا دیوانہ تجھے کون ملیگا" کہیں۔ اسکے بغیر عبارت صحیح نہیں ہو سکتی۔

۱۶۔ عطا کر اے جمالِ حُسن وہ داغِ محبت بھی زبانِ عشق میں جس کو گُلِ شاداب کہتے ہیں

جمالِ حُسن کی ہلکی سی لہر دوڑا کر نفس نفس کو مرے جگمگا دیا تُو نے

جس طرح کمزور عقیدے کے لوگ ایک پاگل کو "عارف باللہ" سمجھنے لگتے ہیں اُسی طرح وہ لوگ جو نقد و نظر کی صلاحیت اور جرأت نہیں رکھتے، مشہور ہو جانے والے شعرا کے مہملات کو بھی طرح طرح کے معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حضرات شعرا لوگوں کی اس ذہنیت سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھاتے ہیں اور بیخوف ہو کر جو جی چاہتا ہے کہتے ہیں۔ مندرجہ بالا دونوں شعروں میں "جمالِ حُسن" کی ترکیب یکسر مہمل ہے۔ کیونکہ جمال اور حُسن یہ دونوں لفظ فارسی میں مترادف المعنی ہو گئے ہیں۔ لیکن جگرؔ صاحب کے معتقدین سے پوچھئے تو وہ اس ترکیب کو "تخیل کی انتہائی پرواز" سے تعبیر کرینگے۔

۱۷۔ پھنکا جاتا ہو دل جس سوزِ غم سے جہنم میں یہ چنگاری کہاں ہے

پہلے مصراع میں چونکہ "جس" آیا ہے لہذا دوسرے مصراع میں "یہ" کی جگہ "وہ" چاہیئے۔ یعنی "جہنم میں وہ چنگاری کہاں ہے"۔ اردو زبان کا قاعدہ ہے کہ اسم موصول یعنی "جو" اور "جس" کی ضمیر ہمیشہ "وہ" ہوتی ہے۔

۶۸ اس تبسم کے تصدق اس تجاہل کے نثار — خود مجھی سے پوچھتے ہیں کون یہ دیوانہ ہے"

تجاہلِ تسلیم، مگر جب کسی شخص سے خطاب کیا جاتا ہے تو وہ الفاظ استعمال نہیں کئے جاتے جو غائب کیلئے مخصوص ہیں! "کون یہ دیوانہ ہے" سے معلوم ہوتا ہے کہ جگر صاحب کا محبوب کسی تیسرے شخص کی طرف اشارہ کرکے جگر صاحب سے دریافت کر رہا ہے کہ "بتاؤ! یہ دیوانہ کون ہے" اگر اُسے خود جگر صاحب کے متعلق دریافت کرنا ہوتا تو اس طرح کہتا کہ "اے دیوانے تو کون ہے"۔ اس قسم کے بے تکے خطاب جگر صاحب کے ہاں بہت ہیں۔

۶۹ یوں ہیں مری نگہ میں نقشِ نگارِ کائنات — عالمِ خواب جس طرح دیدۂ نیم باز میں

"عالمِ خواب" کیلئے "دیدۂ نیم باز" کی قید بالکل بیکار ہے۔ کیا انسان صرف اُسی وقت خواب دیکھتا ہے جبکہ اس کی آنکھیں آدھی بند اور آدھی کھلی ہوں۔ دیدۂ نیم باز کی جگہ دیدۂ خوابیدہ یا دیدۂ خُفتہ کہنا چاہیئے تھا۔

۷۰ اسی صورت سُنا دیتے ہیں انکو واردات اپنی — کہ جیسے ہم کسی کی داستانِ خواب کہتے ہیں

اُردو میں واردات کے معنی ہیں کوئی ہنگامہ یا حادثہ جیسے قتل، خون، ڈاکہ، چوری وغیرہ۔ مگر ظاہر ہے کہ شاعر اپنے متعلق اس قسم کا کوئی واقعہ محبوب کو نہیں سُنا رہا ہے۔ اس کی مُراد تو "وارداتِ قلب" سے ہے۔ مگر صرف "واردات" سے یہ مفہوم ادا نہیں ہوتا اور سامع کا ذہن فوراً کسی ہنگامہ یا حادثہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

۷۱ ان آنکھوں کا نہ پوچھو ضبط جن آنکھوں نے دیکھا ہے — سحر ہونے سے پہلے شمع کا بے نور ہو جانا

اس شعر کی نثر اس طرح ہوگی۔ "جن آنکھوں نے سحر ہونے سے پہلے شمع کا بے نور ہو جانا دیکھا ہے اُن کا ضبط نہ پوچھو"۔ یا۔ "اُن آنکھوں کا ضبط نہ پوچھو جنہوں نے سحر ہونے سے پہلے شمع کا بے نور ہو جانا دیکھا ہے"۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں آنکھوں کی تکرار صحیح نہیں یا تو "اُن آنکھوں کا" کی بجائے صرف "اُن کا" کہنا چاہیئے۔ یا "جن آنکھوں" کے بجائے "جنہوں نے"۔

۷۲ نقوشِ پرتوِ رنگینیٔ دل دیکھنے والے — کبھی خود کو بھی دیکھ او خود سے غافل دیکھنے والے

اس شعر میں مخاطب کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں ایک "خود سے غافل"، اور دوسری "نقوشِ پرتوِ رنگینیٔ دل دیکھنے والے" نثر کی جائے تو اس طرح ہوگی۔ "او خود سے غافل! (او) نقوشِ پرتوِ رنگینیٔ دل دیکھنے والے! کبھی خود کو بھی دیکھ"۔

اس صورت میں دوسرے مصراع کی ردیف (دیکھنے والے) برائے بیت ہے۔

شمع چُپ پروانے ششدر، اہلِ دل سب دم بخود — ہائے کیا تصویر کا عالم تری محفل میں ہے

جگر صاحب کے محبوب کی محفل میں شمع "چُپ" ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شمع کبھی بولتی بھی ہے۔ اور اگر بولتی نہیں تو یہاں چُپ کہنے کا کیا حاصل؟ اور اگر یہ چُپ "خاموش" کا ترجمہ ہے تو ایک نئی مشکل کا سامنا ہے۔ کیونکہ فارسی میں شمع کا خاموش ہو جانا شمع کے بُجھ جانے کو کہتے ہیں۔ اگر چُپ سے مُراد "بُجھی ہوئی" شمع ہے تو پھر وہاں بیچارے پروانوں کا کیا کام؟

ہاں ترے عہد میں جگر کے سوا — ہر کوئی شادمان ہے پیارے

جگر صاحب نے اس مصراع میں "فخرِ ہندوستان ہے پیارے" ہندوستان کے نون کا اعلان جائز بتایا ہے لیکن مذکورِ بالا شعر میں "شادمان" کے نون کے اعلان کے متعلق اپنی رائے کا اظہار نہیں فرمایا لہٰذا قارئین خود فیصلہ کرلیں۔

چیخی ہے کس انداز سے کس کرب و بلا سے — دل ٹوٹ گیا نالۂ بلبل کی صدا سے

"کرب سے چیخنا" تو سمجھ میں آتا ہے لیکن "بلا سے چیخنا" کیا معنی؟

سمجھ میں جو نہ آئے اور بے سمجھے نہ رہنے دے — اسی کا نام شاید عشق میں نامِ تمنّا ہے

جو سمجھ میں نہ آئے اور بے سمجھے نہ رہنے دے، شاید عشق میں اسی کا نام، نامِ تمنّا ہے۔ بہت خوب۔ اگر یوں کہتے کہ "اسی کا نام تمنّا ہے" تو ہر شخص سمجھ سکتا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ لیکن "اسی کا نام، نامِ تمنّا ہے" ایک خاصی پہیلی ہے جس کو "یا بجھیں میاں آزاد یا منشی ذکاء اللہ"۔ جگر صاحب کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

عاشقی یاس کی محکوم ہوئی جاتی ہے — بیکسی اب مرا مفہوم ہوئی جاتی ہے

اسی غزل کا دوسرا شعر ہے۔ — دل ہوا خاک تپِ غم سے مگر دل کی جگہ — اک خلش سی مجھے معلوم ہوئے جاتی ہے

اس شعر میں جبتک "ہوئی" کو "ہوئے" نہ پڑھیں صحیح مفہوم ادا نہیں ہوسکتا اور اگر "ہوئے" پڑھیں تو ردیف غلط ہوئی جاتی ہے۔ یہی حال اس شعر کا ہے۔

دل دھڑکنا بھی غنیمت ہے تری فرقت میں کہ خبر تو مجھے معلوم ہوئے جاتی ہے

یہاں بھی "ہوئے جاتی ہے" پڑھنا پڑیگا۔ ورنہ مطلب خبط ہوجائے گا۔

شوق کی انتہا کہو یا کہ فریبِ عاشقی شورِ انا الحبیب کا خاصۂ مقام ہے

پہلے مصراع میں "کہ" زائد محض ہے لیکن جگہ پُر کرنے کیلئے اس کا لانا ضروری تھا۔

۸ محبت عین مجبوری سہی لیکن یہ کیا باعث مجھے باور نہیں آتا مرا مجبور ہوجانا

"یہ کیا باعث" کہنا صحیح نہیں۔ "اس کا کیا باعث" چاہیئے۔ "باور آنا" بھی محل نظر ہے۔ "مرا" کی جگہ "اپنا" چاہیئے۔

مرے لیا کام جو لینا تھا غمِ ہستی نے گرچہ ثابت نہ ہوئی میری ضرورت مجھکو

"میری ضرورت" کی جگہ "اپنی ضرورت" چاہیئے۔

گل ویرانہ کو کیا اہلِ ہوس سے مطلب ننگ ہے میری پریشانی نکہت مجھکو

یہاں بھی "میری پریشانی" کی جگہ "اپنی پریشانی" چاہیئے۔

ابرِ رحمت گھر کے جسدن قطرہ زن ہوجائیگا قطرہ قطرہ غیرتِ دُرِ عدن ہوجائیگا

"قطرہ زن" کے معنی ہیں "ہرزہ گرد" اور صلۂ "بر" کے بغیر مجرد قطرہ زدن کے معنی باریدن کے نہیں آتے لہذا اس شعر میں قطرہ زن بالکل غلط ہے۔

ٹھونس ٹھانس (جسے اصطلاح میں حشو کہتے ہیں) دورِ حاضر کے اساتذہ کے یہاں بھی اسی کثرت سے موجود ہے جیسی انکے پیش رووں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ جب دیکھتے ہیں کہ کسی جملہ یا فقرہ سے مطلب تو پورا ادا ہوگیا لیکن مصراع پورا نہیں ہوا تو خواہ مخواہ کسی لفظ کا مترادف اس میں ٹھونس دیتے ہیں۔ یہ نامطبوع رسم اسدرجہ عام ہوگئی ہے کہ اب لوگوں کو اسکی ناخوشگواری کا احساس تک نہیں ہوتا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جگر۔ ۸ مل گئیں نظروں سے نظریں اور ملکر رہ گئیں چشمِ ساقی دیکھکر کیا جام و ساغر دیکھتے

زاہد مسجد نشیں ہیں اور اک ٹوٹا ساظرف میکدہ میں اہتمامِ جام و ساغر دیکھتے

اردو میں جام اور ساغر کے ایک ہی معنی ہیں اس لئے جام یا ساغر ایک لفظ محض بیکار ہے۔ اسی طرح اس شعر میں۔

۸ یہی صہبا یہی ساغر یہی پیمانہ ہے چشمِ ساقی ہے کہ میخانہ کا میخانہ ہے

ساغر و پیمانہ چونکہ مترادف ہیں اسلئے دونوں میں سے ایک بیکار ہے۔ نہ صرف اسقدر بلکہ اس ٹھونس ٹھانس کی وجہ سے شعر پست ہوگیا۔ دوسرے مصراع میں چشمِ ساقی کو میخانہ سے تشبیہ دی گئی ہے لہذا پہلے مصراع میں میخانہ کے زیادہ سے زیادہ جتنے لوازم بیان ہوسکتے تھے بیان کرنے چاہیئے تھے مثلاً اگر پہلا مصراع اس طرح ہوتا تو کہیں بہتر تھا۔ ع۔ یہی صہبا، یہی مینا، یہی پیمانہ ہے۔

سرداد گانِ عشق و محبت کی کیا کمی قاتل کی تیغ تیز خدا کی زمیں رہے

فراق بھی ہے وصال بھی ہے ہر ایک لحظہ ہر ایک ساعت فراق کیا ہے وصال کیا ہے جو کوئی پوچھے خبر نہیں ہے

جگر کا ہاتھ ہوگا حشر میں اور دامنِ حضرت شکایت ہو کہ شکوہ جو بھی ہوگا برملا ہوگا

یہ حسن و جمال اُن کا یہ عشق و شباب اپنا جینے کی تمنّا ہے مرنے کا زمانہ ہے

بیتاب و مضطرب تھے یہ دردِ نہاں سے ہم کچھ دُور آگے بڑھ گئے عمرِ رواں سے ہم

اسی تلاش و تجسس میں کھو گیا ہوں میں اگر نہیں ہوں تو کیونکر جو ہوں تو کیا ہوں میں

دُور ہٹنا نہ منزلِ دل سے وصل بھی ہے یہیں وصال بھی ہے

عشق اور محبت، لحظہ اور ساعت، شکوہ اور شکایت، حسن اور جمال، بیتاب اور مضطرب، تلاش اور تجسس، وصل اور وصال، اردو میں مترادف ہیں البتہ وصل اور وصال میں یہ فرق ضرور ہے کہ بقولِ شاعر "لوگ مرنے کو بھی کہتے ہیں وصال" لیکن جگر صاحب نے وصال بظاہر اس معنی میں استعمال نہیں کیا۔

اس مضمون میں ہم نے زیادہ تر اغلاطِ زبان سے بحث کی ہے اگر جگر صاحب کے اُن تمام اشعار پر بھی تبصرہ کیا جاتے جن میں علم بیان و بلاغت کی رُو سے خامیاں پائی جاتی

لال مُہر

زیرِ تصنیف ناول "شراب" کا ایک باب

(۱)

یکہ کی سواری۔ کچی سڑک اور اُس کا غُبار، دوپہر کا وقت! اور بھوک اور اُس کے ساتھ شراب کی پیاس۔ یہ سب کچھ! ۔ ۔ ۔ ۔ یکہ والے نے سڑک کی بائیں طرف یکہ روکا۔ دیکھتا ہوں تو سامنے کٹوراسی جھیل! پانی ہے کہ پڑا پارہ کی طرح چمک رہا ہے۔

میں یکہ سے اُترا۔ سامنے کا منظر کس قدر دلکش تھا۔ ہر طرف اور بالخصوص جھیل کے کنارے درختوں کے جھرمٹ کے جھرمٹ۔ ایسے گنجان کہ دیکھنے سے جی خوش ہو جائے۔ داہنے ہاتھ کو عین جھیل کے کنارے ایک دلکش بلندی اور بلندی پر ایک عظیم الشان بڑ کا درخت، ایسا کہ دُور سے تھکے ہارے کو اپنی طرف کھینچ لے۔ بخدا اس سے بہتر دوپہر کا کھانا کھانے اور آرام کرنے کی اور کون جگہ تھی اور وہ بھی ایک کچی سڑک پر تیز یکہ دوڑاتے کے بعد۔

میں نے یکہ والے کو اشارہ کیا اور اس نے سوزنی اور ناشتہ دان لیا اور میں نے گلاس اور لوٹا اور بوتل اور چلے بڑ کے درخت کی طرف۔

اس بلندی کے خوشگوار ڈھال کے اختتام پر عین جھیل کے کنارے میں نے سوزنی بچھائی، ناشتہ دان رکھا اور بوتل رکھی اور ٹوپی اور اچکن اتاری۔ یکہ والا جھیل سے پانی بھرنے لگا کہ پشت سے ایکدم سے آواز آئی "ذرا آگے بڑھ کر پانی لو۔ یہ پانی میلا ہے"۔

میں نے مڑکر بلندی پر سے ایک صاحب کو اپنی طرف اُترتے دیکھا علیک سلیک ہوئی اور انہوں نے میری شراب کی بوتل پر ناقدانہ نظر ڈالی، قدرے مُسکراہٹ کے ساتھ۔

ایک دو باتوں میں معلوم ہو گیا کہ یہ حضرت بھی ہماری طرح آرام کر رہے ہیں۔ دراصل میں نے یکہ ان کا نہیں دیکھا۔ جہاں ہمارا یکہ رُکا اس سے ذرا آگے بڑھ کر اُن کا یکہ بھی تھا۔ مگر اس کا بم ٹوٹ گیا تھا اور یکہ والا کسی قریب کے گاؤں سے بڑھئی یا اوزار لینے گیا تھا۔ یہ حضرت بلندی کے نشیب کے دوسری طرف بیٹھے تھے اور معلوم ہوا کہ اُن کی ماں بھی اُنکے ساتھ ہیں۔

اُنہوں نے میری بوتل پر پھر ناقدانہ نظر ڈالی اور میں نے ایک نظر انکو گھور کر دیکھا۔ اُن کے چہرے پر مُسکراہٹ تھی۔

میں نے پوچھا "کہیئے کچھ آپ کو بھی اس پری سے لگاؤ ہے؟"

"جی نہیں" انہوں نے کہا "مجھے کوئی خاص شوق نہیں"

"خاص نہیں! تو پھر آئیے بیٹھیے" اور یہ کہکر میں نے انکو اصرار کے ساتھ ہاتھ پکڑ کر بٹھانا چاہا۔

ایک تھوڑے سے تکلف کے بعد کہنے لگے "میرا اپنا کھانا بھی آیا لے اور کھانے کو بیٹھا ہی تھا کہ آپ آگئے۔"

"اجی ابھی تو کھانا دیر میں ہوگا"

"کچھ لوازمہ سہی"

یہ کہکر وہ تیزی سے چلے۔ بڑ کا درخت اس بلندی کے وسط میں تھا اور ذرا آگے بڑھ کر دوسرے حصّہ کی جانب ڈھال تھا جس کے پُشت میں اُن کی والدہ بیٹھی تھیں۔ یہ حضرت طالب علم معلوم ہوتے تھے۔ یا یہ بیکار رئیس زادے۔ بہت جلد یہ اپنا کھانا لیکر آگئے۔ اور ہم دونوں نے شراب سے شغل شروع کیا۔ میرے پاس تلے ہوئے نمکین پستوں کی تھیلی تھی اور اس وقت یہ گزک عجیب لُطف دے رہی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی گلاس سے پی رہے تھے۔ گلاس بیچ میں رکھا تھا۔ سوڈا وغیرہ تو تھا نہیں شراب میں پانی ملایا تھا۔ پانی ایسی شے ہے کہ شراب کی تلخی کو اس سے حسب ذائقہ توڑ سکتے ہیں اور میرے ہم پیالہ نے مُنہ بنانا شروع کئے۔ دراصل وہ بھی نئے شرابی تھے، اور بہت جلد اُن کو اقبال کرنا پڑا۔ گفتگو کا سلسلہ اس طرف پہونچا کہ ہم دونوں کے روبرو یہ دلچسپ سوال پیش ہو گیا کہ کب! اور کیسے سیکھی؟۔

نہ پوچھیے! اس سوال نے اس وقت میرا کیا حال کر دیا۔ شراب کا چڑھتا ہوا نشہ! یہ منظر! اور یہ سوال! اور یہی حال اُن کا ہوا۔ ایسا کہ ہم دونوں جھومنے لگے۔ معاً میرے دل میں یہ سوال گذرا کہ کیا ان کو بھی میری طرح رنگین واقعات نے شرابی بنا دیا۔ اور یہ واقعہ تھا کہ میری طرح انہیں بھی شراب پینا ایک نوخیز حسینہ نے سکھائی۔ شراب کا نشہ

چڑھ رہا تھا اور اُنہوں نے اور میں نے دونوں نے کسی کے حُسن کی تعریف کی۔ میرا خیال تھا کہ لاڈو رانی سے زیادہ خوبصورت وہ حسینہ ہرگز نہیں ہو سکتی جس نے ان کو شراب پلائی۔ اور میں نے ایک نشہ میں جھومتے ہوئے شرابی کی پوری پوری سنجیدگی کے ساتھ ان سے کہہ دیا۔ اُنہوں نے تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ میں نے اصرار۔ نتیجہ یہ کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے معشوق کو گالی دی۔ میں نے جواب میں اُن کے جبڑے پر ایک مکا رسید کیا۔ ایسا کہ وہ چرخ کھا کر گرے۔ اور اُٹھتے اُٹھتے ہم دونوں گتھم گتھا۔ کہاں مجھ سا دیو ہیکل اور کہاں وہ۔ پُھرتی سے وہ نکل گئے اور انہوں نے مجھے ڈھیلے مارنے شروع کئے اور میں نے اُن کو۔ اور گالیاں علاوہ۔ بہت جلد میں نے ہاتھ روک لیا کیونکہ یہ واقعہ تھا کہ درخت کی آڑ سے ایک نوعمر خاتون کا گلنار سا چہرہ چمک کر رہ گیا۔ میں نے فوراً آپے میں آنے کی کوشش کی یہ سوچا کہ علاوہ والدہ کے شاید ہمشیرہ بھی ساتھ ہیں۔ چہرہ تھا کہ ایکدم سے آئینہ سا چمک کر رہ گیا تھا! ایسا کہ شراب کے نشہ میں خیالات لڑائی کی طرف سے یکسر جمالیات کی طرف منتقل ہو گئے۔ معاً دوسرا خیال یہ آیا کہ وہ معشوقہ کون اور کہاں ہے۔ ذرا معلوم تو کریں۔ شاید کہ۔۔۔۔۔

لہٰذا میں نے کہا "دیکھئے جناب یہ کوئی شرافت نہیں ہے۔ کیا آپ جھگڑے کو ختم نہ کریں گے" میں نے چپکے سے اُن کو قریب آنے کا اشارہ کیا تاکہ اُن کی بہن نہ سُن لے۔ وہ قریب آئے تو میں نے کہا "۔۔۔ میرے پیارے دوست میں زیادہ سے زیادہ یہ مان سکتا ہوں کہ تمہاری حسینہ بھی حُسن و خوبصورتی میں لاڈو رانی کے برابر ہے۔ مگر زیادہ ہرگز نہیں"

"تو کم بھی نہیں"

"بیشک۔ بیشک" میں نے کہا اور مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا۔ اور ہم دونوں پھر اسی محبت کے ساتھ مشغول ہو گئے اور اب لگے اپنے اپنے قصے سُنانے!

اس سلسلہ میں پھر لڑائی ہو گئی ہوتی۔ میں نے کہا کہ میں اپنا قصہ پہلے سُناؤں اور اُنہوں نے کہا میں۔ لیکن وہ دب گئے اور میں نے مزہ لے لے کر لاڈو رانی کا قصہ سُنایا۔

ہم دونوں کا نشہ زوروں پر تھا اور ان باتوں میں وہ لطف آ رہا تھا کہ بیان سے باہر جھیل کا پانی جھوم رہا تھا! درخت رقصاں تھے! عجیب ہی سرور کا عالم تھا!۔

کہنے لگے "اب میں اپنا قصہ سُناؤں"

میں نے کہا "ضرور"

بولے "پہلے ایک وعدہ کرو"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ وعدہ کرو کہ اگر میرا قصہ تمہارے قصہ سے اچھا ہوا تو قائل ہو جاؤ گے"

"تیری ایسی تیسی" میں نے گھونسہ تولتے ہوئے کہا "پھر وہی لگائی رَٹ! تیرا قصہ اور میرے قصہ سے اچھا!" میں نے پھر نشہ کے زور میں بکتے ہوئے کہا۔

گھونسے والی مٹھی دیکھکر اُنہوں نے سنبھلکر کہا "اگر آپ کو خود پسند آ گیا تو۔۔۔۔"

"ہاں، پسند آ جائے گا۔۔۔۔ پسند البتہ آ سکتا ہے۔۔۔ مگر یاد رکھو، جھوٹ بولے تو قسم قرآن کی۔۔۔۔"

اور میں نے نشہ میں آنکھیں مچکاتے ہوئے جھیل کی طرف دیکھا۔ آہا! جھیل تھی کہ چاندی کا ڈلا! میرے مُنہ سے نکلا "پیارے تم اپنا قصہ سُناؤ قسم خُدا کی اُسے بہت پسند کرونگا۔ بہت، بہت، بہت"

یہ کہتے ہوئے میں نے اُنکے گلے میں ہاتھ ڈالدیا۔

وہ بولے "آہا!۔۔۔ بہک کے ہاتھ نہ گردن میں ڈالئے صاحب۔۔۔"

میں نے کہا "دیکھو اُسکے ہم تمہیں جھیل میں پھینک دیں گے۔۔۔۔ ہاں نہیں تو۔ قصہ شروع ہی نہیں ہوتا۔ اسے سُناؤ جلدی"

اور اُنہوں نے اپنے شانوں کو زور سے جُنبش دیکر زور سے ڈکار لی اور قصہ شروع کیا۔ اب اس جگہ بیکار نشہ کی بدتمیزیوں کو چھوڑ کر میں اُن کا قصہ کو دُہراتا ہوں۔

اُنہوں نے ڈکار لی اور کہنے لگے "لو سُنو۔۔۔۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ پھول باغ شام کو پہونچے۔ بائیں پھاٹک سے جو داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی عورت مع نوکرنی ایک پردہ دار تانگہ میں بیٹھکر روانہ ہو رہی ہے۔ پردہ ذرا سا ہٹا تو برقعہ کا نقاب سر پر۔ ایک انار کا سا دانہ! یا دہکتا ہوا سا انگارہ۔ سُرخ و سفید کہوں کہ گلنار! وہ سُبک نقشہ!۔۔۔۔ ایکدم سے پردہ گرا اور تانگہ یہ جا وہ جا! میں تانگہ کو جاتا دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

اب چلتا جو ہوں آگے تو بائیں طرف سبزہ پر سے مُسکراتے ہوئے میرے ایک یار غار نے بڑھکر سلام کئے جُھک جُھک کر۔ وہ آن کیفیت کا مطالعہ کر رہے تھے۔ فوراً بولے "کہو کیسی چیز ہے۔ کب آئے؟"

میں نے کہا "اللہ کی شان ہے۔۔۔ آج ہی آیا ہوں"

کہنے لگے "اللہ کی شان تو ہے مگر ذرا اِدھر آؤ"

اب میں لاکھ پوچھتا ہوں پر وہ نہیں بولتے۔ قصہ مختصر ہم دونوں

سبزہ پر سے ہوتے ہوتے باغ کے اُس مقام پر پہونچے جہاں کوئی نہ تھا بیچوں بیچ سبزہ پر گملوں کی قطار تھی اور اُن میں سے ایک گملہ کے نیچے سے اُنہوں نے ایک کاغذ نکالا۔

"جلدی سے بھاگو یہاں سے"۔ اُنہوں نے کہا۔ اور ہم جھپٹ کر ایک مناسب مقام پر کھڑے اس خط کو پڑھ رہے تھے۔ جی ہاں یہ خط تھا جو ان تانگہ پر جانے والی خاتون کو چپکے سے رکھتے ہوئے میرے دوست نے دیکھ لیا تھا۔ خط حسب ذیل تھا۔

"آپ کی شکایت سر آنکھوں پر مگر انصاف شرط ہے۔ میں آپ سے کبھی ملی نہیں۔ دیکھا نہیں۔ بھلا کیونکر پہچانتی اور وہ بھی اتنی دور سے محض تصویر دیکھے سے کیا ہوتا ہے۔ کم از کم میرے لئے مشکل ہے۔ بلکہ اب بھی مشکل ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ دھوکہ دیتی ہو اور میں آپ کے لئے تڑپتی ہوں۔ کوئی وجہ ہو جاتی ہے۔ خیر۔ اب دھوکہ ہرگز نہ ہوگا۔ آپ اُسی مکان پر آجائیے۔ وقت نہ بھولئے۔ رات کے گیارہ بجے۔ آٹھ بجے آکر سن گن لے جائیے گا۔ کمرہ میں اندھیرا ہوگا۔ دروازہ بھی بند ہوگا مگر کھڑکی کھلی ہوگی آپ چپکے سے کھڑکی میں رکھدیجئے گا۔ دوبارہ جب آپ آئیں گے تو خواہ روشنی ہو یا نہ ہو دروازہ کھلا ہوگا اور یہ آپ کی کنیز چشم براہ۔ مگر دس منٹ سے زائد نہ دے سکوں گی۔ اب وقت نہیں ہے۔ میں یہاں سے گھر جاتی ہوں اور فوراً ہی گھر سے وہاں جاتی ہوں۔

والسلام

مکرر۔ جہاں تین گئیں وہاں اس چوتھی کا غم نہ کیجئے گا۔ اور تو کیا کہوں سوائے اس کے کہ قول زناں ...... اور ہاں دیکھیں کیسی شے آپ لاتے ہیں......"

یہ خط پنسل سے لکھا ہوا ایک کاپی کے ردی سے کاغذ پر تھا۔ نہ آداب نہ القاب اور نہ نام۔ اس معمہ کو دیکھکر ہم دونوں بہت اُلجھے سلجھے۔ یہ کون قطامہ ہے؟ کون حرافہ ہے؟ کھڑکی میں کیا چیز رکھنا مانگتی ہے۔ اور گھر کون سا؟ یہ سوالات تھے۔

یہ باتیں کرتے کرتے اب ہم اس مقام پر پہونچے جہاں بینڈ بج رہا تھا اور آس پاس ہر عمر کے لوگوں کا خوب مجمع تھا اور میرے دوست اس پر اسرار عورت کا قصہ سنا رہے تھے۔

"...... میں اس جگہ بیٹھا بینڈ سُن رہا تھا" انہوں نے سبزہ پر بٹھاتے ہوئے کہا "کہ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ سامنے بُرقعہ پہنے اور اپنی نقاب میں انکھیوں سے ایک مختصر کھڑکی قائم کئے چلی جارہی ہے۔ بُرقعہ پُرانے ناپ کا اور وہ بھی ذرا میلا۔

مجھے خیال بھی نہ رہا کہ ایک تھوڑی ہی دیر بعد ایک عالم بیخبری میں جھومتی جھامتی ادھر پہونچیں اور بینڈ کی طرف دیکھنے میں ایسی مشغول کہ ساتھ کی ملازمہ بہت کچھ کہتی ہے "ہیں، ہیں" مگر توبہ کیجئے۔ مجھے پامال کر دیا۔ یعنی واقعی میرے اوپر ہی ٹکرا کر گریں۔ اور سنبھلنے میں اُنکو نقاب چھوڑ کر میرے اوپر گرنے سے بچنا پڑا۔ اس طرح کہ میں خود نیم دراز ہوا اور وہ رکوع توڑ کر سجدہ میں! عین میرے اوپر۔ اُن کا چاند سا چہرہ میرے چہرہ کے نہ صرف قریب بلکہ اس قدر قریب کہ آنکھوں میں آنکھیں گھُس جائیں!

گھبرا کر وہ سنبھلیں اور پھر گری ہوئیں کہ ملازمہ کی امداد سے سنبھلیں اور انتہائی گھبراہٹ میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح تیزی سے چلی گئیں۔ مڑ مڑ کر اُسی طرح نقاب کے کونے سے دیکھتی ہوئی!۔

میں بھی دیکھتا رہا۔ مجھے وہ عطر میں بسا گئیں۔ سر سے پیر تک معنبر و معطر ہو رہی تھیں۔

ایک کشش تھی کہ میں دیکھتا رہا کہ ایکدم سے اٹھا اور سوچا کہ اسے پھر دیکھنا چاہیئے لہذا اندازہ لگایا کہ وہ کدھر نکلیں گی اور یہ اندازہ لگا کر دوسری طرف سے نکل کر اُسی مقام پر جا کر بیٹھ گیا جہاں وہ پہونچنے والی تھیں اور سبزہ پر بیٹھکر لگا ایک کاغذ کو دیکھنے۔ مگر اس طرح کہ اصل میں نظر اُسی طرف۔

"یہاں کوئی نہ تھا اور روش خالی...." (باتیں کرتے اب ہم دونوں اُسی جگہ آ گئے تھے)..... لہذا مجھکو یہ معلوم ہوا کہ ایکدم سے چودھویں رات کا چاند طلوع ہو گیا۔ نقاب سر پر۔ چہرہ اس طرح سرخ وسفید کہ معلوم ہو آگ بھڑک رہی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اطمینان سے نقاب ڈال لی۔ لیکن اس احتیاط کے ساتھ غالباً کہ میں انکو اچھی طرح دیکھ لوں۔ برقعہ سے کوئی ڈیڑھ بالشت ایک ریشمی کپڑا ایک انداز سے زمین پر گھسٹتا جا رہا تھا۔

وہ نکل چلی گئیں لیکن وہاں جا کر ایک دم سے سبزہ پر حوض کے پاس بیٹھ گئیں اور طبیعت خراب ہونے لگی......"

"طبیعت خراب!...." میں نے چونک کر کہا۔ اور ہم دونوں اس حوض پر پہونچے۔ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں نے جھک کر دیکھا، شراب کی تعفن اُڑ رہی تھی۔ یہ واقعہ تھا کہ اُنہوں نے شراب پی کر قے کی تھی اور کلی کر کے پان کھا کر جھٹ سے بھاگ گئی!!

مجھے شراب سے بے انتہا نفرت تھی اور ایک مسلمان عورت کا شراب پینا ظاہر ہے میرے لئے کس قدر معیوب ہو سکتا تھا۔ مگر یہ تو عجیب و غریب پُر اسرار عورت تھی۔ ایسی کہ الف لیلہ کے قصے مرتب کر لو۔ مگر ہم کر ہی کیا سکتے تھے۔ وہ جا چکی تھی۔ کاش کہ ہم اس کا گھر معلوم کر سکتے۔ معاً بجلی کی طرح خیال میرے دل میں کوند گیا۔ جب میرے دوست نے محلہ کا

نام بتایا جو ملازمہ نے تانگہ والے کی ہدایت کے لئے بتایا تھا۔ میرے پاس موٹر سائیکل تھی۔ سوال یہ تھا کہ کیوں نہ میں جھپٹوں۔ آدھ گھنٹہ ہو چکا تھا لیکن فاصلہ کو دیکھتے ہوئے ایک گنجان سڑک پر معمولی رفتار کا تانگہ ابھی منزل مقصود پر نہیں پہونچا ہوگا۔ اور یہ سوچتے ہی دیوانہ وار میں موٹر سائیکل کی طرف جھپٹا۔ اپنے دوست کو پیچھے بٹھایا اور ہم دونوں چشم زدن میں روانہ!

شہر کی بھیڑ بھاڑ، راستہ کی اُلجھنیں، اور یہ ضروری کام۔ کچھ بھی ہو۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی تھی جب ہم نے اس تانگہ کو پالیا۔ اور میں قریب پہونچ گیا کہ اللہ کی شان۔ موٹر سائیکل کا انجن ایکدم سے رک گیا۔ نتیجہ یہ کہ موٹر سائیکل کے اسٹارٹر پر دولتیاں جھاڑ رہے تھے اور تانگہ تھا کہ نکلا جاتا تھا۔ پر ہر دم یہ خیال کہ اب روانہ ہوتے ہیں۔ ایک دوست کی موٹر سائیکل تھی جس کے عیوب سے میں قطعی واقف نہ تھا۔ نتیجہ ظاہر۔ تانگہ آنکھوں سے اُوجھل ہوگیا۔ اب میں اپنے دوست کو دوڑاتا ہوں تو بیچ میں کانسٹبل مخل۔ بات کاٹ کر کہتا ہے کہ موٹر سائیکل ایک کنارہ کرو۔ کی۔ اور دوست احمق کو پیدل ہی دوڑایا کہ جس طرح بھی بن پڑے تانگہ کا پیچھا کریں۔

موٹر سائیکل نے کافی وقت لے لیا جب چلی۔ مگر بیکار۔ تانگہ نکل چکا تھا اور دوست بھی لاپتہ۔ تھوڑی دُور آگے بڑھکر دُور راستہ آگئے اور میں نا اُمید ہوگیا۔ دوست بھی لاپتہ۔

مگر موٹر سائیکل پھر موٹر سائیکل ہے اور میں نے یہ سوچا کہ ہر سڑک انتہا تک پوری دیکھ لی جائے اور اس کوشش میں اور بھی اُلجھ کر رہ گیا۔ سڑک اور سڑک میں گلی اور موڑ۔ ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ نتیجہ یہ کہ مغرب کا وقت آپہونچا اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اب میں کہاں تھا اور مقصد سے کتنی دور۔ کہ ایک طرف ہوکر میں نے لیمپ روشن کیا۔ ایک سگرٹ پیا اور ٹہلنے کی طرف مڑا ہی تھا کہ بخدا کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے کو وہی تانگہ چلا آرہا ہے۔

میں نے فاصلہ سے تانگہ کا پیچھا کیا۔ اور ایک آدھ گھنٹہ میں تانگہ منزل مقصود پر پہونچا۔ نسبتاً ایک غیر معروف سی سڑک کے کنارہ ایک اچھے خاصے مکان کے دروازہ کے سامنے تانگہ رکا۔ میں نے دور ہی سے دیکھا کہ مکان کا پھاٹک کھلا اور وہ اُتر گئیں۔ مگر اس وقت تنہا تھیں۔ صاحب خانہ کی ملازمہ البتہ اُتر کر آئی تھی۔ اب میں لاکھ اس کمرے کو تلاش کرتا ہوں کہ جس کی کھڑکی اور دروازہ کا ذکر اس خط میں تھا لیکن بیکار۔ وہاں تو کوئی ایسا کمرہ ہی نہ تھا۔ جب میں بیحد حیران ہوا تو خیال آیا کہ ممکن ہے اس مکان کی پُشت پر ایسا کمرہ ہو۔ اس مقصد کیلئے مجھکو سڑک کی پوری مسافت طے کرکے دوسری سڑک پکڑنا پڑی جو گلی کے طور پر تھی لیکر بہت جلد معلوم ہوگیا کہ مکان کا پُشت کی طرف سے شناخت کرنا دشوار ہے۔ قصہ کو اس طرح مختصر کرتا ہوں کہ دو دفعہ اسی سڑک پر جاکر واپس آنا پڑا تب جاکر کوئی اندازہ لگا سکا۔ ایک سیاہ رنگ کا ٹوٹا پھاٹک تھا۔ ایک پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا۔ اندر جھانک کر دیکھا تو ایک مختصر سا احاطہ جس میں شکستہ گاڑی سے لیکر ٹوٹے ہوئے صندوق تک ہزاروں قسم کا کوڑا ڈھیر تھا۔ اور داہنی طرف ایک پتلا سا دروازہ بتارہا تھا کہ یہ زینہ ہے۔ اس زینہ کے اُوپر ایک بالاخانہ البتہ ایسا تھا جو کسی طرح خط کی تفصیل سے منطبق ہوسکتا تھا۔ کھڑکی ایک چھوڑ دو اور ایک۔ دروازہ بھی۔ جو اس وقت بند تھا۔ گلی اور مقام قطعی سنسان میں بہت جلد یہاں سے نکلا چلا گیا اور سیدھا اپنے دوست کے گھر پہونچا۔ اپنی دانست میں ہمارا یہ رومانس بھی خوب رہا اور ختم ہوگیا۔ زندہ باد! میں نے کہا پہلے مانس ختم ہوا کہ شروع! اس میں کچھ شک نہ تھا کہ خط میں جو شے مانگی تھی وہ شراب تھی اور عورت قطعی بدچلن۔

وہ بولے "تو کیا بوتل لیکر جانے کا ارادہ ہے؟"

میں نے کہا "بھئی چاہیئے تو یہی، سوچ رہا ہوں"

"اور جو دھوکا ہوا کچھ"

"باشد! اور دھوکہ کا احتمال نہ ہوا تو پھر رومانس ہی کیا"

"بسم اللہ" وہ بولے "جائیے۔ بندہ ہر خدمت کو حاضر ہے"

میں نے کہا "مجھے ذرا بھی ڈر نہیں۔ ہاں صبح اگر نہ ملوں تو چلو مکان دیکھ لو۔ پولیس کو لیکر پہونچنا۔ مردہ یا زندہ۔ ڈھونڈ نکالنا"

اور واقعی میں نے اُن کو فاصلہ سے مکان دکھایا اور وہ ہر طرح ڈراوے دیکر مجھے روکتے رہے۔

۲

شراب سے مجھکو روایتی نفرت تھی اور وہ بھی بیحد۔ مگر سر دست تو وہسکی کی ایک بوتل خریدی اور چپکے سے در بغل وہاں پہونچا۔ رات کا اوّل وقت تھا اور میں وقت مقررہ پر پہونچا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ اِدھر اُدھر چوروں کی طرح دیکھکر میں جھٹ سے احاطہ میں گھس گیا اور چوروں ہی کی طرح اس تنگ و تاریک زینے پر چڑھ گیا۔ زینہ ایک مختصر اور تاریک سی گیلری پر ختم ہوا اور اسی گیلری میں ایک دروازہ اور دو کھڑکیاں تھیں۔ دروازہ اندر سے بند تھا مگر کھڑکی کا ذرا سا پٹ کھلا تھا اور میں نے آہستہ سے ذرا اور کھول کر لوہے کی سلاخوں میں سے ہاتھ اندر ڈالکر بوتل دی۔ معاً میں چونک پڑا۔ اس لئے کہ کسی نرم و نازک ہاتھ نے ایک

ہاتھ سے بوتل لیتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میری کلائی پکڑ کر ایک زور سے شکریہ کی چٹکی لی اور غائب۔ اب میں گھور گھور کر اندر اندھیرے میں دیکھ رہا تھا لیکن وہاں تو قبر کی سی خاموش تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ تاریکی انتہا سے زیادہ خاموش اور پُرمس معلوم دی اور ایک دم سے بدن میں ٹھنڈک سی محسوس ہوئی۔ کہیں یہ رومانس اسی جگہ تو ختم نہیں ہو گیا! اور سوئی صدی دل نے کہا کہ ایسا ہی ہوا۔

جس طرح گیا تھا اُسی طرح واپس آیا اور سوچتا ہوا چلا گیا۔ سیدھا چاٹے والے کی دکان پر۔

اِدھر اُدھر گھومتا رہا حتیٰ کہ وقت مقررہ آیا۔ طرح طرح کے شکوک آرہے تھے لیکن اب تو بوتل جا چکی تھی۔ بنظرِ احتیاط ایک خوفناک چاقو خریدا کہ اگر خطرہ سے سابقہ پڑے تو کام آئے۔

رات خنک اور خاموش تھی۔ ہوا میں سکون تھا اور سڑک پر سناٹا۔ سوائے اکا دکا راہگیر کے۔ فاصلہ سے گراموفون بجانے کی صدائیں البتہ آرہی تھیں۔ دھیمی دھیمی روشنی دُور کی لالٹینوں سے دھوئیں میں چھن چھن کر آرہی تھی۔ یا پھر دو منزلہ عمارتوں کے بلند بالاخانوں کی کھڑکیوں سے جگہ جگہ روشنی کی سلاخیں فضا میں پھیلے ہوئے دھوئیں میں جھگڑ رہی تھیں۔

احتیاط اور تیزی سے میں احاطہ میں داخل ہوا۔ کھڑکی سے کمرہ کی روشنی کا پتہ چلتا تھا۔ زینہ پر کان لگائے آہستہ آہستہ چڑھا۔ خوف بھی غالب تھا۔ گیلری میں پہونچ کر انتہائی خاموشی سے دروازہ پر ہاتھ رکھا۔ کُھلا پایا۔ قدرے ٹھٹکا۔ پھر آہستہ سے دروازہ کا پٹ کھول کر اندر سر ڈال کر پردے کی آڑ سے دیکھا۔

چھوٹا سا کمرہ تھا۔ چاندی کا پاکیزہ فرش ہو رہا تھا۔ بیچ میں مخملی قالین۔ دو چار چھوٹے بڑے تکیے اِدھر اُدھر بے ترتیبی سے بکھرے تھے اور قالین پر وہی شراب کی بوتل کچھ سامان خورد و نوش اور دو گلاس ایک میں شراب بھری تھی اور دوسرا خالی۔ دو بوتلیں سوڈے کی قریب رکھی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ابھی ابھی کوئی اُٹھ کر گیا ہے۔

کمرے کے اندرونی دروازے دو اور تھے اور دونوں بند۔ ایک کونے میں ایک نیچی سی مسہری تھی اور کمرہ خالی۔ کمرہ بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اندر داخل ہوا۔ داخل ہونا تھا کہ دو نرم اور نازک ہاتھوں نے ایک دلربا مگر خفیف ہنسی کے ساتھ پیچھے سے میری آنکھیں میچ لیں!!۔

میں نے رسانیت سے نازک ہاتھوں کو اپنی آنکھوں پر سے ہٹایا اور مڑا جو ہوں......

چشم زدن میں ایک انتہا سے زیادہ معطّر اور چنکتی ہوئی نوعمر خاتون میری گود میں تھی۔ میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ ایک پھول تھا مسکراتا ہوا، آنکھیں مخمور، چہرہ سراپا نور خود نشہ میں چُور کھڑی جھوم رہی تھی!

میں نے آہستہ سے اپنی گرفت ڈھیلی کی اور چھوڑتے ہوئے سر سے پیر تک دیکھا۔ چہرہ اس قدر سُرخ و سفید کہ معلوم ہوئے رنگ بھرا ہے! ہونٹ جیسے دہکتا ہوا انگارہ، چہرہ پر حُسن کی وہ گرمی کہ معلوم ہوئے کوئی شئے ہے کہ بھڑک رہی ہے۔

انہوں نے دروازہ بند کیا اور کہا "آرام سے بیٹھیے"

میں نے جوتہ اُتارا۔ کوٹ اور ٹوپی اتاری اور ہم دونوں بیٹھ گئے

اور میں نے گفتگو شروع کی۔

"اب تو آپ نے مجھے پہچان لیا؟"

"قطعی" چہکر پر بے پناہ مُسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "میری تصویر میں اور مجھ میں کچھ فرق ہے؟..... کچھ زیادہ فرق؟"

جواب میں غور سے مجھے دیکھا۔ آنکھوں میں پریاں ناچ رہی تھیں! چہرہ پر عجیب لرزش تھی۔ سُرخ انگارہ سے ہونٹ ذرا کھلے ہوئے جو ایک برق پاش تبسم میں جنبش میں آگئے "اب تصویر سامنے ہوتی تو بتاتی"

اور یہ کہتے ہوئے گلاس میری طرف بڑھایا۔ اور میں نے کہا۔

"ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی!

مجھے تو اس سے معاف رکھیں"

"معاف!"

"جی ہاں مجھے اس سے شوق نہیں ہے"

اور یہ آغاز تھا ایک حد سے زیادہ تقویٰ شکن ضد اور بحث کا جو شراب کے نشہ میں بہت جلد ایک انتہا سے زیادہ بیحیا اور بدمست کشمکش میں تبدیل ہو گئی۔ شراب اور شراب کے تاثرات کے ساتھ یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ میں نے عورت کو اس قدر بیحیا، بیباک اور بدمست کبھی نہ دیکھا تھا۔ بلکہ عورت میں اس درجہ بے حیائی میں نے سنی بھی نہ تھی۔ مگر بخدا۔ مذہب بھی کیا شئے ہے! اس آگ پر ستے میں کہاں پہونچا ہوں! مجھے اس وقت احساس ہوا! یہ احساس کہ مذہب نے اس شئے کو کیوں حرام کیا ہے۔ جو چیز عورت سے اس کی نسوانیت لیکر بہیمیت پیدا کر دے

اس سے بدتر اور حرام تر بھی کوئی شے ہے ......"

اُن کی بات کاٹ کر میں خود چیخ اُٹھا "حرام! حرام! قطعی حرام ... خدا ہمیں معاف کرے ... معاف کرے ...."

وہ بھی چلائی "معاف کرے ... معاف کرے ...."

اور ہم دونوں نے گفتگو روک کر کس کس کر ایک دو چسکیاں ایسی لیں کہ "گن گنا" اُٹھے۔ اور انہوں نے اپنا قصہ جاری کیا۔

"ہاں جناب ... کیا عرض کروں ... مگر آپ خود سوچئے کہ یہ مذہبی احساس کر ہی کیا سکتا تھا!۔

ع:- توبہ کر زاہد! کردں توبہ میں ایسے حال میں!

لہذا توبہ کا تو سوال نہیں ہاں شراب سے انکار میں نے ضرور کیا اور وہ بھی بیحد۔

"نہیں مانوگے" اُس نے بے پناہ شوخی سے اپنی آنکھوں کو عجیب انداز سے جھپکاتے ہوئے کہا "... جو بچہ دوا نہ پیئے تو کیسے پلاتے ہیں ......"

میں نے اس "رنگ فطرت" کی طرف دیکھکر مسکرا کر پوچھا "کیسے؟"

"بتاؤں پھر ...."

"بتاؤ"

"ایسے .... دیکھو ایسے ہاتھ پکڑتے .... اور ایسے .... ایسے بچھاڑ کر ... دبا کر ... ایسے ...."

جیسے کوئی ڈرامہ کا ایکٹنگ ہوتا ہے! مجھے سچ مچ بچے کی طرح پچھاڑ کر زبردستی دوا پلائی جانے لگی! میں فرش پر چت پڑا!! اور وہ میرے سینہ پر سوار، مجھے ایک بچہ کی طرح گھٹنے اور کہنی سے دبائے!

اپنے بائیں ہاتھ سے اُس نے میرے رخساروں میں انگوٹھا اور انگلی اس زور سے گڑائی کہ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا! اور آتشِ سیال میری حلق میں ڈالنا شروع کی!

کبھی پی نہ تھی لہذا اتنی بدمزہ کہ بیان سے باہر مگر جس طرح پلائی جارہی تھی شاید زہر بھی مزیدار ہوتا۔

تھوڑی تھوڑی کر کے۔ ایک ایک گھونٹ۔ ایک سو ایک بڑا۔ جتنا جی چاہا اُس نے پلائی اور میں اسی طرح پڑا تھا۔

میں اُس کے مشتعل چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔ ایک چشم زدن میں دیکھتے ہی دیکھتے مجھے دوآتشہ لے اُڑا!

ایک دم سے ہر شے ایک دلچسپ جنبش کے ساتھ رقصاں نظر آئی۔ اس کا چہرہ سرخ سے سرخ تر معلوم ہونے لگا کہ جیسے آگ سی جل رہی ہو۔ اُس کے چہرے کی ہر لرزش اور مسکراہٹ سے آنکھوں میں عجیب طرح کی جھپکیاں سی لگتی معلوم ہوئیں۔ ایک متزلزل اور متحرک عالم خواب سا طاری ہونے لگا اور ایک عجیب سرور اور بیخودی کا سا عالم ہو گیا۔ اُس نے مجھے غور سے دیکھا۔ بہت غور سے۔ ایک عجیب اندازِ فاتحانہ سے مسکراتے ہوئے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ آہستہ سے میرے رخسار پر ایک طمانچہ مار کر ایک نرم قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "کھل گئی"!

میں مسکراتا ہوا اٹھا۔ اُس کے ہنسنے کا ترنم عجیب دلربا معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے پلیٹ میں سے ایک کباب اُٹھا کر دیا۔ میں کھاتا جاتا تھا مسکراتا جاتا تھا اور اُس کے سنہری بالوں کو ہر جنبش کے ساتھ دیکھتا کہ کس طرح وہ بجلی کی تیز روشنی میں باریک سے باریک تر ہوتے جارہے ہیں۔ اور اُن کی چمک سورج کی شعاعوں کی طرح سفید ہو کر چہرے کی سرخی کے ساتھ عجیب کیفیت پیدا کر رہی ہے! اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اور پی اور دیر تک یہی شغل جاری رہا۔

صبح کے چار بجے ہونگے جب میری آنکھ کھلی۔ سوتے وقت بجلی گل کر دی تھی۔ آنکھ اس طرح کھلی کہ گرمی سی اور سخت پیاس معلوم دی۔ میں آہستہ سے اُٹھا اور بستر سے نکل کر بجلی روشن کی تاکہ صراحی دیکھ سکوں کہ کدھر ہے۔

بجلی جلنا تھی کہ میں ششدر رہ گیا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ آپ یقین کریں کہ وہ سرخ و سفید آتش کا پرکالہ غائب! وہاں تو کوئی اور نوعمر لڑکی محوِ خواب تھی۔

پانی پینا چھوڑ چھاڑ میں قریب آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حد درجہ معصوم اور مظلوم سا چہرہ۔ چہرے سے بھولا پن اور بچپن ٹپک رہا تھا۔ اچھا گورا رنگ اور نہایت ہی سبک نقشہ۔

ابھی میں دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ کلبلا کر جاگ اٹھی اور روشنی کے سبب اُس نے آنکھیں مچکائیں اور مجھے دیکھا ہے کہ ایک دم سے وہ اُچھل پڑی۔ ایک دبی ہوئی چیخ اُس کے منہ سے نکلی اور انتہائی بدحواسی کے ساتھ اُٹھ کر بھاگی۔ اور دروازہ کھول کر اندر غائب! میں حیرت زدہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے اور آہستہ سے دروازے کی طرف بڑھا ....."

میرے دلچسپ دوست نے اپنے قصہ کو اس نوبت تک پہونچایا تھا کہ عجیب ہی آفت آئی۔ دراصل ہم دونوں تو شراب اور باتوں میں محو تھے اور ہم نے دیکھا بھی نہیں کہ ایک نوجوان شخص انکی والدہ صاحبہ کو نے اڑا۔ اور دونوں نکل کر سڑک پر پہونچے تھے کہ میرے

دوست نے دیکھا۔

"ارے . . . . لے . . . لینا۔ پکڑنا . . جانے نہ پائے . . . "چیختے بدحواس دوڑے اور میں اُنکے ساتھ ! مگر قبل اس کے کہ ہم اُٹھیں میرے دوست کی والدہ معظمہ مع اُس اجنبی کے میرے یکہ پر بیٹھ کر ہوا ہوگئیں۔

سڑک جھیل کے کنارے بائیں طرف کو گھومتی چلی گئی تھی اور بہت جلد ہمیں معلوم ہوگیا کہ یکہ پکڑنے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ درختوں کی آڑ سے جھپٹ کر یکہ کو آگے سے لیں۔ اس لئے کہ یکہ کو کافی چکر کھا کر اس جگہ آنا تھا اور ہم سیدھے دوڑ کر پہونچ سکتے تھے۔ لہذا ہم دونوں سیدھے سڑک والے راستہ اور تعاقب کے خیال کو چھوڑ کر بائیں ہاتھ کے ایک ٹیلہ کی آڑ میں ہوکر بھاگے۔ چشم زدن میں بانسوں اور درختوں کی گنجان قطار کو پار کرکے یکہ سے بہت پہلے ایک مناسب مقام پر پہونچ گئے اور ایک جھاڑی میں چھپنے بھی نہ پائے تھے کہ یکہ آگیا اور پوری رفتار سے ہمارے سامنے سے گذرا۔ ایک صاحب صورت جنٹلمین۔ نوجوان، کالا کوٹ اور سفید پتلون۔ سر پر ترکی ٹوپی، دونوں پیر پائیدان پر رکھے اور دونوں ہاتھوں سے یکہ کے ڈنڈے پکڑے فاصلہ پر پیچھے دیکھ رہے تھے۔ یکہ کے بیچ میں میرے دوست کی خوبصورت والدہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک انتہا سے زیادہ گوری چٹی اور خوبصورت نوجوان عورت۔ سر پر نقاب اور حیرت سے وہ بھی اُدھر ہی دیکھ رہی تھیں۔

جیسے ہی یکہ آیا ہے بجلی کی طرح تڑپ کر ہم دونوں نکلے۔ میں نے لپک کر اُس شخص کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر زور سے گھسیٹا مگر وہ یکہ کے ڈنڈے اس مضبوطی سے پکڑے تھا کہ ممکن ہے میری کوشش رائیگاں جاتی کہ میرے حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ میرے دوست کی والدہ نے میری اس طرح مدد کی کہ اپنے ساتھی کے ہاتھ ڈنڈے سے چھڑا دئے اور وہ دھم سے گرے زمین پر۔ دونوں پیر میرے ہاتھ میں ! ابھی میں نے شاید پیر چھوڑے بھی نہ ہونگے کہ میرے ساتھی چشم زدن میں اُچھل کر یکہ پر پہونچے اور بڑا جو گھوڑے پر ہنٹر تو دوڑ تو رہا ہی تھا اور بھی تیزی سے لے اُڑا ! ایسے کہ چشم زدن میں سوائے دھول کے یکہ کا پتہ بھی نہ تھا۔

میں ہکا بکا کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ عجیب سوچ میں کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہوا۔ میرا یکہ والا خود مجھے دغا دے گیا !

اب میں نے اِن نئے ساتھی کی طرف دیکھا جنکی لطیف صحبت حاصل کرنے کے لئے سردست بالکل ہی نیا طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ یہ حضرت ایک ذرا دیر تو اپنا کولھا پکڑے چوٹ کے سبب بیٹھے رہے۔ غنیمت ہوا کہ سڑک کچی تھی ورنہ اور بھی سخت چوٹ آتی۔ اب یہ حضرت دھول جھاڑتے کولھا پکڑے لنگڑاتے اُٹھے اور ادھر میں اب یہ دیکھ رہا تھا کہ ساتھی کے تبدل کو اب میں کس نظر سے دیکھوں۔

ان کی نظروں کا یہ حال کہ معلوم دے مجھے کھا ہی تو جائیں گے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اگر کہیں میں ان حضرت سے طاقت میں دوگنا نہ ہوتا تو شاید یہ مجھے مار ہی ڈالتے۔

اور مجھے اس کا افسوس علیحدہ کہ ایک دلچسپ ترین قصہ ہی اُدھورا رہ گیا ! نہ معلوم پھر کیا ہوا ؟ اور وہ دوسری لڑکی کون تھی ؟۔

اب میں نے ایک بامعنی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا "فرمایئے۔ یہ قصہ کیا ہے ؟"

وہ بھنا کر گردن کو جنبش دیکر جل کر بولے "چہ خوش" اور مارے غصہ کے گردن ٹیڑھی کرکے رہ گئے۔

میں نے ایک دو لفظوں میں ان کو بتایا کہ میں ان کو کس حد تک جان سکتا تھا۔ ایک وقتی ملاقات تھی حد یہ کہ نام تک نہ جانتا تھا۔ بلکہ یہ سمجھے تھا کہ یہ خاتون بہن ہیں اور ماں بھی ہیں یعنی دو عورتیں۔ چنانچہ میں نے اتمام حجت اس طرح کیا "میں بھلا آپکے سوالات کا کیا جواب دے سکتا ہوں جبکہ میں انکو اتنا ہی جانتا ہوں جتنا کہ آپکو"

وہ کچھ بگڑ کر بولے "تو پھر آپنے مجھے یکہ پر سے کیوں گھسیٹ لیا . . . ؟"

میں نے کہا "اور آپ میرا یکہ لئے بھاگے جاتے ہیں۔ مع میرے دوست کی والدہ کے !"

"کیسی والدہ ! کیا فرماتے ہیں جناب ؟ وہ قطامہ میری مفرورہ بیوی ہے !"

"آپکی بیوی ؟"

"جی ہاں۔ اور میں کہاں کہاں سے اس کا سراغ لیتا پہونچا ہوں۔ ذرا غور کیجئے کہ یہ مسافت بائیسکل پر طے کی جو دوسرے یکہ کے پاس پڑی ہے۔ کس مصیبت سے آپکے یکہ والے کو دس روپے نقد دیکر راضی کیا۔ اور آپ دونوں کو مشغول دیکھکر کس طرح اس قطامہ کو چاقو کی نوک دکھاتا، قتل کی دھمکی دیتا نکال لایا تھا کہ آپ نے سارا کھیل بگاڑ دیا"

"لاحول ولاقوۃ" میں نے کہا "اگر آپ سیدھے میرے پاس چلے آتے تو میں کیا کر سکتا تھا۔ مارے گھونسوں کے اُس کا بُرا حال کر دیتا اور آپکی بیوی آپکے حوالہ کرتا"

"مگر مجھ کمبخت کو کیا معلوم۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ کمبخت ہے کون اور اس قطامہ کو اپنی ماں کیوں کہتا ہے۔ میں اب کیا کروں اور کہاں جاؤں؟"

میں نے کہا "بندہ پرور سر دست تو میرے ساتھ چلئے اور غم غلط کیجئے۔ میں بھی رنجور ہوں کہ اکیلا رہ گیا۔ چلئے اُٹھئے، اور یہ کہکر میں نے ان نئے ساتھی کو محبت سے ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لیا اور واپس جھیل کے کنارہ پہونچا۔

(۳)

اپنے نئے ساتھی کے ساتھ باتیں کرتا میں اب جھیل کی طرف چلا۔ کہنے لگے کہ "اور کیا باتیں ہوئیں"

میں نے مفصل بتایا کہ کیا باتیں ہوئیں اور کس طرح ہم ایک دوسرے کے شراب پینا سیکھنے کے قصہ کو سُن رہے تھے۔

وہ مسکرا کر بولے "آپ کچھ زیادہ پیتے معلوم ہوتے ہیں"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ میں اس انداز سے پیتا ہوں کہ نشہ کا چڑھاؤ یکساں قائم رہے اور کم نہ ہو۔ آپ بھی شاید پیتے ہیں؟"

"شاید!" کہکر انہوں نے قہقہہ لگایا "اس قطامہ سے جس کو سروکار ہو وہ اس سے بچ بھی سکتا ہے"

"اچھا!" میں نے کہا "اس نے سکھائی ہے!... آپکو!"

"جی"

"شراب پیتی ہے؟"

"خوب۔ اور اس قطامہ سے جس کو سروکار ہو وہ اس سے بچ بھی سکتا ہے!"

میں نے ہنسکر کہا "یہ بھی خوب رہا کہ ہم تینوں نے عورتوں ہی سے شراب پینا سیکھی"

"انہوں نے بھی اسی قطامہ سے سیکھی ہوگی"

میں نے کہا "نہیں انہوں نے تو کسی اور سے سیکھی۔ دراصل کا قصہ بیحد دلچسپ تھا جو ادھورا رہ گیا"

اب ہم جھیل کے کنارے پہونچ گئے۔ میں نے نئے دوست کو بٹھاتے ہوئے انکا نام پوچھا۔ معلوم ہوا رفیق احمد ہے۔ اور پھر ہم دونوں نے شغل شروع کر دیا۔ میں نے تو جلدی کھانا شروع کر دیا اسلئے کہ کافی پی چکا تھا اور وہ شراب کا شغل کرنے لگے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ "یہ عورت ہے کون؟ آپکی منکوحہ ہے تو بھاگ کیسے گئی؟"

انہوں نے اس عورت کا عجیب و غریب قصہ سُنایا۔ کہنے لگے "اگر آپ میری مدد کا وعدہ کریں تو میں آپکو اس عورت کا سارا حال بتادوں دراصل اس کی صورت شکل اور حسن ظاہری نے مجھے دیوانہ کر رکھا ہے اور اب بھی اسکے سابقہ گناہوں سے درگذر کر سکتا ہوں۔ لیکن اسکے جو اُسنے دھوکہ دیا تو کیا کرونگا..."

"ناک کاٹ لینا..."

وہ بولے "یہ ناک کاٹنا آسان نہیں ہے"

"ہم کاٹ دیں گے" میں نے کہا اور اشارۃً اپنے کو پردہ میں رکھتے ہوئے بتایا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کام کو کر دیں گے اور خود میں نے اس کو گرفتار کرنے میں امداد دینے کا وعدہ کیا۔

کہنے لگے "اس عورت کا قصہ بھی عجیب و غریب ہے... بلکہ میری دور قریب کی یہ عزیز ہے"

"عزیز ہے! تب تو آپ کو اس کے پوست کندہ حالات معلوم ہوں گے......"

"جی ہاں.... یہ دراصل ایک ترک سپاہی کی لڑکی ہے۔ میرے والد کی رشتہ کی خالہ تھیں۔ اُن کی ایک بیوہ لڑکی تھی اور کوئی نہ تھا۔ اس لڑکی کی عمر کوئی بیس سال کی ہوگی۔ اور وہ بہت خوبصورت تھی۔ اس بیوہ کا عقد ثانی ایک ترک سپاہی نشاط بے سے ہوگیا۔ نشاط بے عجیب غریب قد و قامت اور وجاہت کے آدمی تھے۔ ۱۸۹۷ء کی جنگ یونان و روم میں اُنہوں نے حصہ لیا تھا اور ادہم پاشا فاتح تھسلی کے سپاہیوں میں تھے۔ اپنے کو غازی اور فاتح تھسلی و یونان کہتے تھے۔ اور تھے بھی واقعی فاتح یونان۔ تین گولیاں کھائے ہوئے تھے اور ایک سنگین کا زخم داہنے بازو پر تھا۔ یہ حضرت ہم لوگوں میں آکر ایسے عزیز ہوئے کہ ان کا عقد ثانی ان خوبصورت بیوہ سے ہوگیا۔ ان کی گذر اوقات کیلئے پندرہ بیس روپے کی دوکانات تھیں۔ علاوہ اس کے یہ ترک ایسے تھے کہ جہاں جاتے رؤسا ان کو مہمان رکھتے اور نقد روپیہ دیتے جو یہ خوب خرچ کرتے تھے۔

ان ترک کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو آپ کے سابق ہم پیالہ کی مفروضہ "اماں" اور میری منکوحہ بیوی ہے۔ یعنی یہ قطامہ!

جس روز یہ لڑکی پیدا ہوئی اُسی روز کسی مہاجن نے نشاط بے کو ایک مُہر نذر کی تھی۔ اس مُہر پر گلال چڑھا ہوا تھا اور سُرخ تھی۔ اسی روز یہ پیدا ہوئی تو نشاط بے نے لڑکی کا نام "لال مُہر" رکھا اس لئے کہ لڑکی کا رنگ بہت زیادہ سُرخ تھا۔ اور وہ سونے کی سُرخ مہر کی طرح پیاری تھی۔ یہ نام پیار کا تھا۔ ورنہ اصل نام اس کا دلکش خانم ہے۔

نشاط بے کو شراب کی عادت ہوگئی۔ وہ بھی اس طرح کہ انکو

ڈاکٹروں نے شراب کو انڈے کی زردی میں پھینٹ کر پینا بتایا۔ نشاط بے بڑے کٹر مسلمان تھے اور اُنہوں نے وہ لے دے کی کہ خدا کی پناہ۔ درجنوں مولویوں سے امداد لی گئی تب جاکر جائز قرار پائی۔ غرض اس دوا کو انہوں نے ایسا شروع کیا کہ تھوڑے عرصہ میں اچھے خاصے شرابی ہوگئے۔ شراب خواری کی انتہا کر دی۔ لال مہر بڑی چہیتی لڑکی تھی اور باپ کی شراب کی الماری کی کنجی اُسی کے سپرد تھی۔ اکثر باپ لڑکی کو بھی تماشہ دیکھنے کو دو گھونٹ ہی پلا دیتے۔ بڑی ہوئی تو خود چپکے چپکے پینے لگی۔ نشاط بے مرے ہیں تو لڑکی شراب کے مزے سے بخوبی واقف ہو چکی تھی۔

نشاط بے مرے ہیں تو میری عمر گیارہ یا بارہ برس کی تھی۔ لال مہر کی عمر ہوگی کوئی چودہ برس کی۔"

"آپ سے بڑی ہیں!"

"جی ہاں — یہ جب کا ذکر ہے کہ ایک عرصہ دراز کے بعد میں نے اُن کو اپنے چچا کے مکان میں دوپہر کو سوتا ہوا دیکھا۔ نشاط بے پانچ چھ سال سے بمبئی میں رہتے تھے اور وہیں مرے اور اُن کے مرنے کے بعد ہی کا واقعہ ہے جو میں بیان کرتا ہوں۔

یہ گھر میرے چچا یعنی میرے والد کے چچازاد بھائی کا تھا۔ انکا چھوٹا لڑکا احمد میرے ساتھ اسکول میں پڑھتا تھا۔ ہم دونوں کو ڈرائنگ ماسٹر نے نقشے دیے تھے جن میں رنگ بھرنا تھا۔ اپنے گھر بیٹھکر ہم دونوں نے رنگ بھرا۔ احمد چلا گیا۔ اب میں نے رنگ کا بکس جو سنبھالا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سُرخ رنگ کی ٹکیا غائب۔ میں نے بہت ڈھونڈی اور نہ ملی تو میں سمجھا کہ احمد چُرا لے گیا اور میں سیدھا اُنکے گھر پہونچا۔

مکان اس طرح کا تھا کہ بڑا وسیع صحن تھا اور اصل مکان دو حصوں میں تقسیم تھا۔ میں نے گھر میں پہونچکر احمد کو پکارا۔ یہ سوچکر کہ صحن کے دوسری طرف کھپریل کے دالان میں ہوگا۔ عورتیں علیحدہ کمرے میں سینے پرونے میں مشغول تھیں۔

احمد نے تو کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس کے بدلے کیا دیکھتا ہوں کہ سید بھائی دالان کے داہنے سرے کی کوٹھری میں کھڑے میری طرف اشارہ کرکے بلاتے ہیں۔ میں سیدھا پہونچا تو اُنہوں نے وجہ دریافت کی۔ میرے بتانے پر اُنہوں نے چہرہ کو بیحد سنجیدہ بنا کر کہا "تمہاری رنگ کی ٹکیا چوری گئی اور اب نہیں مل سکتی"

"کیوں؟"

وہ بولے "ہم بتا تو دیں" خاموشی کا اشارہ کرتے ہوئے۔

میں نے کہا "بتلایئے"

دروازے سے چُپکے سے سر نکال کر اُنہوں نے برآمدہ کے دوسرے سرے کے انتہائی حصہ کی طرف ایک چارپائی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"اُنہوں نے لے لی ہے"

اور میں نے دیکھا کہ لال مہر بڑی غافل گھری چارپائی پر سوتی ہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جایئے بھی . . . . ." اور اتنا کہکر میں چلنے لگا۔

"ارے" اُنہوں نے کہا "میں جو کہتا ہوں"

"اُنکے کس کام کی" میں نے کہا۔

"ارے اُنہوں نے ابھی ابھی تو پانی میں گھول کر اپنے مُنہ پر رنگ ملا ہے۔ مُنہ پر اور ہونٹوں پر"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "جایئے بھی۔ وہ تو گوری ہیں"

"ابے گدھے" سید بھائی نے ہنستے ہوئے کہا "گوری تو ہیں مگر تجھے نہیں معلوم کہ آفندی صاحب ان کے رنگ ملا کرتے تھے۔ ارے یہ رنگ ملتی ہیں۔ نہ یقین ہو جاکر دیکھ لو۔ دیکھ لو جاکر"

میں ایسا گدھا نہ تھا مگر باتوں میں آگیا۔ اور آہستہ آہستہ وہاں پہونچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ واقعی رخساروں اور ہونٹوں پر وہ رنگ آمیزی کہ معلوم دے سچ مچ رنگ مل لیا۔

اب حقیقت یہ تھی کہ سید بھائی جو کچھ بھی مجھ سے کہہ رہے تھے وہ لال مہر سب کچھ سُن رہی تھی۔ بنی ہوئی سو رہی تھیں۔ میں قریب پہونچا تو میں نے سید بھائی کی طرف مڑکر دیکھا۔ اُن کے بیان کو، سمجھ میں نہ آیا کہ صحیح سمجھوں کہ غلط، کہ اُنہوں نے وہیں سے مجھے اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا اور میں نے نہایت آہستہ سے ذرا آگے بڑھ کر داہنے ہاتھ کی انگلی اپنی زبان سے تر کرکے لال مہر کے رخسار پر نہایت ہی آہستہ سے گھسی کہ رنگ ہو تو انگلی میں لگ آئے۔ اور میرا گھسنا تھا کہ اٹھی لال مہر بڑبڑاتی صورتِ جلال اور ایک چانٹا کس کر میرے گال پر دیا۔ چانٹا تو میں نے ہاتھ پر لیا مگر گھبرا کر بھاگا۔ مگر میں نے ایک عجیب وغریب بات دیکھی۔ وہ یہ کہ کس طرح لال مہر سید بھائی کی طرف دیکھکر بڑبڑانے کے دوران میں مسکرائی ہے۔ اس کا بار بار مُسکرا کر اِدھر دیکھنا، ایک عجیب انداز سے۔ اور پہلا کام جو لال مہر نے کیا وہ یہ کہ جھٹ سے لوٹا اور صابون لیکر سامنے ہی اس طرح کہ سید بھائی بخوبی دیکھ لیں، اپنا مُنہ رگڑ رگڑ کر دھویا اور تولیہ سے جو رگڑ کر پوچھا ہے تو میں کیا عرض کروں کہ چہرے پر سُرخی آگ کی طرح مشتعل تھی۔ چہرے کی سُرخی اور سفیدی ایسی کہ عمر بھر میں نے نہ دیکھی تھی۔ ثابت ہوگیا کہ میرے رنگ کی ٹکیا انکے چہرے پر نہیں ہے۔

میں چلا آیا۔ یقین یہ دیکھتا ہوا کہ کس طرح سید بھائی لال مہر کو اور وہ ان کو چھپ چھپ کر دیکھ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ سید بھائی نکلے ہوئے چلے آئے اور لال مہر کے پاس سے ہوتے ہوتے وہاں پہونچے جہاں لال مہر کی والدہ انکی ماں اور بہنوں سے باتیں کر رہی تھیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور میں نے بھی اس موقع پر دیکھا کہ لال مہر کن نظروں سے بار بار سید بھائی کو دیکھ رہی ہیں اور کس طرح کبھی اپنے ہاتھ کی کلائی دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے جو دبا کر چھوڑتی ہیں تو کلائی سفید ہوجاتی ہے اور چھوڑتے ہی سرخ سرخ خون پھر دوڑ کر اسی جگہ آجاتا ہے۔ اسی طرح اپنی ٹھوڑی جو ہاتھ پر ٹکا کر ہاتھ ہٹاتی ہیں تو سرخ و سفید رنگ کی چہرے پر آنکھ مچولی سی ہوجاتی ہے۔

اس کے بعد کا۔ شاید سال بھر بعد کا ذکر ہے کہ ہمارے گھر میں کئی رشتہ دار جمع تھے۔ میں سو رہا تھا۔ رات کے کوئی ڈیڑھ بجے ہونگے سب اسی طرح جمے تھے اور کچھ باتیں ہو رہی تھیں۔ سید بھائی کے والد بھی تھے، کوئی اہم واقعہ ایسا ہوا تھا کہ لال مہر کی شادی کا سوال درپیش تھا۔ سید بھائی کے والد نے سید بھائی سے شادی سے انکار کیا تھا اور ایک دوسرے صاحب کا نام تجویز تھا۔ اس کے دو چار ماہ بعد ہی کا ذکر ہے کہ لال مہر کی شادی ایک صاحب سے ہوگئی۔ یہ حضرت محکمہ بندوبست میں اہلکار تھے۔ خوب کھاتے پیتے تھے۔ کوئی چالیس برس کی عمر ہوگی۔ مولوی صورت مقطع ڈاڑھی۔ پابند صوم وصلوٰۃ۔ بہت خوشحال اور کھاتے پیتے۔ مگر میری دانست میں ایک ایسے شخص جو کسی طرح بھی لال مہر کے لئے موزوں نہ تھے۔ یہ اودھ کے ایک ضلع میں نوکر تھے اور شادی کے بعد کا ذکر ہے کہ میرا ایک کلاس فیلو تھا اور وہ لال مہر کے شوہر کے عزیزوں میں تھا۔ برسبیل تذکرہ میں نے اس سے کہدیا کہ لال مہر اچھے چلن کی لڑکی نہیں اور یہ کہ سید بھائی سے وہ انتہا سے زیادہ قابل اعتراض طریقے پر ہنستی بولتی تھیں۔ اور یہی بات میں نے تعطیلوں کے زمانہ میں انکے دوبارہ دریافت کرنے پر بے دھڑک خط میں لکھدی۔

یہ کہنا میں بھولا ہی جاتا ہوں کہ شادی سے کچھ پہلے ہی لال مہر کا سب سے پردہ ہوگیا تھا۔ نہ صرف سید بھائی سے بلکہ مجھ سے بھی۔

لال مہر کی یہ شادی بھی خوب رہی۔ قسمت کی خوبی کہ شوہر نے سال بھر سے قبل ہی ہیضہ کیا اور مر گیا۔ نہ صرف لال مہر کے ہاتھ نقد و زیور آیا بلکہ حق زوجیت میں کافی جائداد بھی ملی۔ اور لال مہر بیوہ ہوکر وطن آگئیں اور لگیں اپنی اماں کے ساتھ رہنے۔ دس پندرہ روپے کی جائداد پہلے ہی تھی۔

سید بھائی کی شادی نئی نئی ہوئی تھی اور ان کی نئی نویلی دلہن کو لال مہر کے سابقہ قصوں کے سبب للّٰہی بغض تھا۔ ایسا کہ سید بھائی کیلئے لال مہر کی طرف دیکھنا بھی غالباً ناممکن ہوگا۔

اور میں ان جملہ مکروہات سے اس طرح بے نیاز تھا کہ میں نے لال مہر کی بیوگی اور آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ دراصل مجھے اپنے تعلیمی مشاغل اور ہاکی فٹ بال ہی سے فرصت نہ تھی کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

میرے ایک پھوپی زاد بھائی ہیں ان سے مجھ سے عید کے ایک روز قبل یہ طے ہوا کہ عید گاہ جانے کے لئے میں ان کے یہاں پہونچ جاؤں گا اور وہاں سے ہم دونوں مل کر ایک اور دوست کے یہاں چلیں گے۔

نہانے دھونے میں لگا تو مجھے دیر ہوگئی اور ایسی دیر کہ سب لوگ عیدگاہ چلدئے۔ میں کپڑے بدل کر سیدھا پھوپی کے یہاں پہونچا۔ وہاں سناٹا۔ سب لوگ عیدگاہ جاچکے تھے۔ مگر میں نے آواز دی۔ میرے بھائی کا کمرہ ایک زینہ چڑھکر ہے۔ میں باہر ہی صحن میں داخل ہوا۔ یہاں کوئی نہ تھا اور یہاں سے زینہ کے نیچے ہی سے آواز دی اور لگا اوپر چڑھنے۔ آدھا زینہ بھی نہ چڑھا تھا کہ عجیب معاملہ پیش آیا۔ تین چار عورتیں آپس میں چہل کرتی ہنستی شوخیاں کرتی اوپر معلوم ہوئیں۔ جو دوڑتی ہوئی آتی معلوم ہوتی تھیں اور قبل اس کے کہ میں سوچ سکوں وہ دوڑتی زینہ کے اوپری دروازے میں ہنستی ہوئی پہونچیں اور وہ بھی اس زور سے کہ مجھے دیکھتے ہی جو جلدی میں رکی یا مڑی ہیں تو ان میں سے ایک کا پیر پھسل گیا اور وہ لڑھک کر ایک چیخ کے ساتھ گری۔ سیدھی میرے اوپر! میں نے بہت سنبھالا لیکن انہوں نے بچنے کیلئے مجھے پکڑ لیا اور ہم دونوں نے بقیہ زینہ اس طرح لڑھک کر طے کیا کہ گرا جو ہوں تو انکا پورا بوجھ میرے اوپر تھا۔ میں چت پڑا تھا اور وہ میرے اوپر!

یہ لال مہر تھیں۔ اپنے بیوگی کے لباس میں سفید دوپٹہ لیکن عطر میں بسی ہوئی۔

وہ فوراً اٹھکر زینہ پر چڑھ گئیں۔ لیکن دو چار ہی سیڑھیاں چڑھ کر انہوں نے مجھے دیکھا۔ میرے بہت سخت چوٹ آئی تھی۔ سر چکرا گیا اور ایسا کہ میں تھوڑی دیر اسی طرح پڑا رہا۔ اٹھا جو ہوں تو چلنا دشوار۔ بائیں پیر میں سخت درد تھا ایسا کہ میں وہیں کا وہیں بیٹھ گیا۔ اوپر سے بھی عورتوں نے جھانک کر دیکھا۔ جیسے بھی بن پڑا میں اٹھا اور اٹھکر بمشکل سڑک تک پہونچا جہاں سے یکہ پر بیٹھکر میں گھر پہونچا۔ میرا پیر اتر گیا تھا۔ یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے کچھ نہیں لیکن نتائج کے لحاظ سے میری زندگی میں اس واقعہ

ایسا انقلاب پیدا کیا کہ یکسر میری دنیا بدل گئی۔

میں پندرہ بیس دن تک صاحبِ فراش رہا اور اس دوران میں لال پَری کی ہمدردی اور عیادت کا مرکز بنا رہا۔ یہ واقعہ تھا کہ یہ ضرب شدید انہوں نے میرے اوپر گرکر پہونچائی تھی اور اس کی ذمہ دار وہی تھیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اپنی اس ذمہ داری کا اُن کو ہر طرح احساس تھا۔ انکی ملازمہ میری والدہ صاحبہ کے پاس روزانہ میری خیریت پوچھنے آتی۔ لال پَری خود مع اپنی والدہ کے دو دفعہ میری عیادت کو آئیں اور دونوں دفعہ اس طرح کہ میں نے اُن کو نہ صرف دیکھ لیا بلکہ ہم دونوں ایک دوسرے کو چند لمحات آنکھیں چار کرکے بھی دیکھتے رہے۔

میں سمجھتا تھا کہ بیوگی کے صدمات نے لال پَری کو کچھ دُبلا کر دیا ہوگا لیکن درحقیقت وہ نسبتاً زیادہ موٹی تھیں اور تندرستی ایسی کہ شاید ہزار عورتوں میں ایک جس کے سبب چہرہ اس قدر زیادہ خوبصورت اور حسین تھا کہ جو شخص دیکھتا ان غیر معمولی سرخی و شادابی کو دیکھتا رہ جاتا۔ لال پَری نسوانی حُسن کا ایک ایسا نمونہ تھی جسکو ہر طرح مکمل کہہ سکتے ہیں۔

جب میں اچھا ہوکر چلنے پھرنے لگا تو اپنے دل میں ایک تھوڑی سی دلچسپی لال پَری کی طرف سے پائی۔ میں اُن کو بُرا سمجھتا تھا۔ مجھکو اُن سے محبت بھی نہیں ہوسکتی تھی بلکہ نفرت تھی لیکن یہ واقعہ ہے کہ اُن کے ظاہری حُسن نے مجھکو مرعوب کر دیا تھا۔ اور میں قائل ہوگیا تھا کہ غضب کی خوبصورت عورت ہے۔

یہ خیال بھی شاید پندرہ بیس روز میں نکلا تو نہیں لیکن ایسا پڑ گیا جیسے کوئی کسی بات کو بھول جاتے۔ دراصل میں خوب جانتا تھا کہ لال پَری کا چلن اچھا نہیں ہے اور مجھے ایسی بات سے ایک تنفر سا ہوتا تھا۔ قصہ مختصر جو بھی دلچسپی لال پَری سے اس واقعہ نے پیدا کر دی تھی وہ فنا ہوچکی تھی یا ہونے والی تھی کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔۔۔"

میں نے کہا: "عجیب واقعہ تو آپ کو پیش آیا لیکن حضرت وہ دیکھئے یکہ والا کیا خبر لاتا ہے۔ آخر یہاں سے کسی نہ کسی جگہ پہونچنا بھی تو ضروری ہے۔"

یہ کہکر میں نے حواس باختہ یکہ والے کو مختصر طور پر جو کچھ گذرا تھا سُنایا اور بات چیت جو کی تو معلوم ہوا کہ آگے جانا ناممکن ہے' اوزاروں میں سے صرف ایک بسولہ ملا ہے وہ بھی پانچ روپے جمع کرکے۔ لہذا یکہ بمشکل ایسا ہو سکے گا کہ گرتا پڑتا گھر واپس پہونچ جائے اور یہ کہ بعد درستی بسولہ واپس کرنے جانا ہے لہذا شام سے پیشتر روانگی ناممکن۔ ہم دونوں نے اپنا اور بائیسکل کا کرایہ طے کیا۔ میرا کام کس قدر ضروری تھا مگر مجبوری ہے کہ اتنو گھر واپس پہونچنا تھا۔ چنانچہ اس بڑے مرحلہ کو طے کرکے میں نے فرمائش کی کہ اب اپنا عجیب واقعہ سُنایئے۔

———— [illegible] ————

شراب ختم ہوچکی تھی اور میں کھانا کھا چکا تھا۔ انہوں نے کھانا نہیں کھایا لہذا ہم نے اپنا مشغلہ ختم کیا۔ انہوں نے اپنے قصے کو اس طرح جاری کیا:

"۔۔۔۔۔۔ اس واقعہ کے بعد ہی ایک اور واقعہ پیش آیا۔ میرے مکان سے کچھ ہی فاصلہ پر میرے ایک کلاس فیلو رہتے تھے۔ میں اُن کے مکان پر اکثر پڑھنے جاتا تھا۔ ہم دونوں ملکر پڑھتے تھے۔ لال پَری نے جب زینہ سے گرایا تھا کبھی کبھی میرے سر میں درد ہونے لگتا تھا اور مجھے بڑی فکر ہوئی کہ کہیں اس سے کوئی مستقل نقصان نہ پیدا ہو۔ ڈاکٹروں نے اسکو واہمہ بتایا۔ لیکن واقعہ ہے کہ واہمہ نہیں تھا بلکہ ضرب سے ضرور کمزوری واقع ہوگئی تھی۔ ان دوست کے مکان سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک ویدجی رہتے تھے جو بہت ہوشیار تھے۔ اور میرے ان دوست نے یہ سفارش کی کہ ویدجی کا علاج کرو۔ چنانچہ ہم دونوں ویدجی کے یہاں گئے اور اُن سے دوا لی۔ انہوں نے ہفتہ بھر کی دوا دیکر کہا کہ بعد استعمال دوا حال کہنا۔ یہ ویدجی قابل ذکر آدمی تھے۔ ویدجی نہیں بلکہ "جتی جی" کہلاتے تھے۔ اچھا کھلتا ہوا گورا رنگ، مضبوط الاعضا اور گٹھا ہوا بدن۔ کانوں میں سچے موتیوں اور سونے کا لچھا سا پہنے رہتے تھے۔ ماتھے پر ایک شاندار قشقہ۔ سر پر بانکی ٹوپی کشتی دار۔ سر میں بہترین تیل ڈالے اور بڑے انتظام سے بال بنائے۔ نہایت وجیہہ آدمی تھے۔ عمر کوئی چھبیس برس کی ہوگی۔ مونچھیں ایک انتظام سے ذرا سی چڑھی ہوئی۔ آنکھوں میں غضب کی چمک۔ مزاج سے حد درجہ نفاست عیاں تھی۔ سفید ململ کا جھاگ سا کُرتا اور دھوتی اور چپل۔ ان کا مطب نہایت ہی کامیاب تھا۔ خود میز کرسی لگائے جمے ہوئے اور دوسری طرف ایک کہار کی قسم کا آدمی مریضوں کی خدمت اور دواؤں کی بوتلیں اُٹھانے بٹھانے میں مشغول۔ اُن کا مطب ایک گلی میں تھا جو دُور تک اندر چلی گئی تھی۔ اور وہیں کی وہیں ختم ہوگئی تھی۔ لہذا زیادہ تر مریض اس گلی کے باہر ہی سے آتے تھے۔

دوسری دفعہ جو میں گیا تو جتی جی کسی مریض کو دیکھنے گئے تھے اور میں انتظار کرنے لگا۔ دیر نہ گذری تھی کہ ڈاکیہ ڈاک لایا۔ اور ایک خط مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے اُس نے مجھے دکھا کر پوچھا کہ یہ خط کس کا ہے۔ یہ ایک لفافہ تھا جس پر کچے خط میں اُردو میں جتی جی کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ میرے بتانے پر ڈاکیہ مع دو اور خطوں کے یہ خط بھی دیکر چلا گیا اور جتی جی کے ملازم نے میز پر خط رکھدئے۔

جتی جی کے آنے میں دیر معلوم ہوئی تو میں اُٹھکر ایک کام سے بازار چلا گیا اور وہاں سے واپسی میں پھر آیا۔ جتی جی آ گئے ہی تھے اور حد درجہ مشغول۔ مریضوں کی بھیڑ کی بھیڑ تھی۔ مجھ سے بیٹھنے کو کہا اور میں نے بھی سوچا کہ بہتر ہے مریض نکل جائیں تو آرام سے کہونگا۔ میں میز پر دونوں کہنیاں رکھے بیچ پر بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے ہاتھ جو اُٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سفید کاغذ میز کے نیچے پڑا ہے۔ یہ خط تھا۔ ایک کاپی کے کاغذ پر جو اُودے رنگ کی سیاہی سے لکھا تھا۔ اور وہ بھی نب سے نہیں بلکہ دیسی کلک کے قلم سے۔ اس خط کی عبارت ایک معمہ تھی۔ خط یہ تھا۔

۷۸۶

کل اوّل وقت آپ کے پاس سیاہ دوپٹہ زرد بوٹی کا
اوڑھکر جو مریض آوے اُسے آپ بجائے دوا کے شراب
دیدیں اور کہدیں کہ رات کے کھانے سے آدھ گھنٹہ
پہلے پی لینا۔ شراب میں کوئی چیز ایسی ملا دیں کہ معلوم
ہو دوا ہے۔ شراب اتنی ہو کہ نشہ ہو جائے۔ پھر جو
آپ چاہتے ہیں وہ ہو جائیگا۔ فقط

یہ بتانا میں بھول گیا کہ جتی جی کے منہ سے شراب کے بھبکے آتے رہتے تھے اور وہ شراب پی کر مطب میں بیٹھتے تھے۔

یہ خط دیکھکر میں ششدر رہ گیا۔ میرے پیر کے پاس ہی پڑا تھا جو میز پر سے اُڑکر گر پڑا تھا۔ یہ وہی خط تھا جس کا پتہ ڈاکیہ نے مجھ سے پڑھوایا تھا۔

میں دوا لیکر چلا آیا لیکن عجیب سوچ میں۔ سب سے پہلے یہ سوال تھا کہ لکھنے والا کون ہے۔ مرد ہے کہ عورت۔ دوسرا سوال یہ کہ جتی جی کیا بات چاہتے ہیں جو ہو جائے گی۔ غرض میں اسی طرح دن بھر اُلجھا سُلجھا کیا حتیٰ کہ میں نے طے کیا کہ خواہ کچھ ہو کل اوّل وقت جتی جی کے یہاں جاکر زرد بوٹی کا سیاہ دوپٹہ اوڑھکر آنیوالے مریض کو دیکھنا چاہیے۔

میں نے سوچا کہ شاید دیر تک بیٹھنا پڑے لہذا ایک دوسری ترکیب ہے۔ دو روپے کے پھل خرید کر جتی جی کو نذر کروں۔ چنانچہ دوسرے دن میں مع پھلوں کے پہونچا۔ وجہ آمد، پیٹ میں رات کو غیر معمولی قراقر اور سخت تکلیف وہ درد سر اور بیخوابی بتلایا اور پھل پیش کئے۔

جتی جی مطب میں اس طرح فیس لینے کے عادی نہیں تھے۔ یعنی کوئی دیتا ہی نہ تھا۔ لہذا میرا یہ تحفہ ضرورت سے زیادہ بھاری پڑا۔ نتیجہ یہ کہ جب امتحاناً میں نے روانگی کی تمہید اُٹھائی تو اوّل وقت تھا۔ ویسے بھی جتی جی تنہا تھے۔ اُنہوں نے مجھے ذرا اور بیٹھنے کو کہا اور مزید یہ کہ اپنے نوکر کو پان لینے سامنے کی دوکان پر دوڑایا۔ درحالیکہ میں منع کرتا رہا۔ اور وہ گیا ہے کہ زرد بوٹی کا سیاہ دوپٹہ اوڑھے مریض آ گیا!! ایک جھجک کے ساتھ ایک نوجوان عورت داخل ہوئی۔ کوئی انیس برس حد بیس برس کی عمر۔ گورا رنگ۔ سرمئی آنکھیں، بڑی بڑی اور چمکیلی جن سے افسردگی سی عیاں۔ چہرہ خاموش اور حد درجہ سنجیدہ۔ اس جھجک سے آئی ہے کہ لوٹ گئی ہوتی اگر کہیں جتی جی نے خود توجہ کر کے آنے کا اشارہ نہ کیا ہوتا۔ جیسا کہ ایک حکیم آتے ہوئے مریض کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اُنہوں نے ہاتھ لاپرواہی سے اُٹھا کر کہا: "ادھر بیٹھو ابھی دیکھتا ہوں"

جتی جی کی حالت قابل دید تھی۔ ویسے بھی ذرا بیکار ہوں تو دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں آپس میں پھنسائے مزے میں باتیں کرتے کرتے سامنے سڑک پر ہر عورت کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ خواہ کوئی ہو۔ عورت شرط ہے۔ کسی عمر کی ہو۔ اور اس طرح متوجہ ہوتے تھے کہ سلسلۂ گفتگو تک ٹوٹ جاتا تھا۔

جتی جی نے عورت ہونے کے سبب اپنی جگہ چھوڑ کر مریضہ کو دیکھا۔ نبض دیکھی۔ پھر مریضہ سے کہا کہ "جیب دکھاؤ" اور یہ واقعہ ہے کہ اس مریضہ کی زبان دیکھے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ مریضہ نے جو حالات اپنے بیان کئے وہ مختصراً "ماتھا دُکھتا ہے اور کھانا نہیں بھاتا"

جتی جی نے ایک بڑی سی شیشی میں دوا دیدی۔ الماری سے اس طرح نکالی جیسے تیار ہی رکھی تھی اور ہدایت کی: "رات کے کھانے سے آدھ گھنٹہ پہلے"

لڑکی نے قیمت پوچھی تو ہاتھ اُٹھا کر کہا: "آجائیں گے۔ جلدی نہیں۔۔۔۔" وہ چلی گئی۔

یہ لڑکی بیوہ تھی اور ذات کی مہاجن۔ اور بیواؤں ہی کے سے کپڑے اور بال تھے۔ میں جلد ہی اُٹھ آیا

عظیم بیگ چغتائی

نظریۂ حیات

کہتا ہے کوئی خونِ تمنّا ہے زندگی
اور قول ہے کسی کا "تماشہ ہے زندگی"

سُکھ جس نے بھُول کر بھی نہ دیکھا ہو عمر بھر
کہتا ہے وہ تو صاف کہ بپتا ہے زندگی

دہری کے ذہن میں بجز "امروز" کچھ نہیں
فتویٰ ہے مجتہد "غمِ فردا ہے زندگی"

مُوتو[1] کا شور حلقۂ صوفی میں ہے بلند
کہتے ہیں رند "صحبتِ مینا ہے زندگی"

خواب و خیال کہہ کے کوئی ہو رہا ہے چُپ
اور کوئی کہہ رہا ہے "معمّا ہے زندگی"

بوجھی نہ فلسفی نے پہیلی حیات کی
شاعر کے ہاں خیال کی دُنیا ہے زندگی

لیکن اِک اہلِ دل کی نگاہوں میں ہے آئیں
تکمیلِ آرزو کا تقاضا ہے زندگی

[1] مُوتو قبل ان تموتو۔ مرنے سے پیشتر مر جاؤ۔

امینِ حزیں

بہار میں ایک تشویش

میں لطفِ سیر کیوں نہ لوں طرب فزا اُمنگ ہے　　میں دادِ عیش کیوں نہ دوں الم رُبا ترنگ ہے

بہار کا ہے عام اثر لٹا رہے ہیں پھول زر　　خزاں کا دل ہے منتشر کہ ہاتھ اُس کا تنگ ہے

نہیں وہ اگلے جور اب بدل گئے وہ طور اب　　بہار کا ہے دور اب غضب کا یہ بھی رنگ ہے

گلاب یہ وہ یاسمن یہ نارون وہ نسترن　　چمن انہیں سے ہی چمن وگرنہ کشت بنگ ہے

یہ پھول جاذبِ نگہ ہے ان پہ چشمِ مہر و مہ　　کسی کا رنگ ہے شفق کسی کا شوخ و شنگ ہے

رُخ ان کا ہے شگفتہ تر لطیف ان سے ہر نظر　　صباحت اُن کی دیکھ کر ہر اہلِ ذوق دنگ ہے

ہے آتشِ گل اب عیاں نظر فروز ہے سماں　　دہک رہا ہے گلستاں، بہار کا یہ رنگ ہے

نگاہ اس پہ جب پڑی خوشی کی دل میں لہر اُٹھی　　صدائے آبشار بھی مجھے صدائے چنگ ہے

خوشا عنادلِ چمن یہ سب کے سب ہیں سحرِ فن　　ہر اہلِ دل ہے خندہ زن کہ دُور دل کا زنگ ہے

جو گوش زد ہوں چہچہے ملول کون اب رہے　　لگاؤ تم بھی قہقہے کہ دل کُشا یہ ڈھنگ ہے

نہ پا کے لطفِ مے کشی بڑھے گی اور تشنگی　　خجل بہار سے ابھی مری دلی اُمنگ ہے

بتاؤ اب میں کیا کروں یہ رُت یونہی گزار دوں
پیوں تو کس طرح جیوں مضرِ مئے فرنگ ہے

علی منظور

چلم گزٹ (انسان نمبر)

(۲)

گذشتہ اشاعت میں ہم نے اپنے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے رسالے چلم گزٹ کی چھپائی شروع کی تھی، جس کی پہلی قسط ہم کو سمجھنا چاہیے۔ اتنی مقبول ہوئی، اتنی مقبول ہوئی جتنے ایران میں امرد۔۔۔ ہنر اپنی قیمت آپ بڑھاتا ہے، ہمارے کہنے کی ضرورت نہیں۔ مختلف مقامات سے جو مبارکباد کے تار اور ستائشی خطوط آ رہے ہیں، اُن کو دیکھکر تو ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں رسالہ کا بچہ کو ہوا ہے۔ گویا "مکان میں" لڑکا تولد ہوا ہے۔ اس سے بڑھکر ہندوستان کی ناسازگار ادبی فضا میں کسی رسالے کی کامیابی کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ خود جارج دہم نے، قیاس چاہتا ہے، پیدائش سے قبل ہمیں طلائی تمغہ عطا کرنے، اور ستائشی الفاظ کہنے کے لئے خاص اپنے باڈی گارڈ کو بھیجا ہے۔۔۔ ہمارے خیال میں اُمید کی جاسکتی ہے کہ اور بھی کئی تار آئیں گے۔ تاروں تک تو خیر، ہمیں تو اندیشہ ہے کہ کہیں خود پڑھنے والے حضرات ہمارے گھر نہ آجائیں۔ اور ان خطوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں جو اس سلسلہ میں شاید آئیں۔ ہمیں تو یہ بھی اندیشہ ہے کہ اگر ان خطوط کو گننے بیٹھیں تو دوسری کے سبب مضامین لکھنا بھول جائیں۔ اور یوں بھی ہم اپنی ستائش آپ کرنا نہیں چاہیے۔ یہ جملے بھی صرف اس لئے لکھدئے ہیں کہ یہ ایڈیٹروں کی ایک "تجارتی سنت" ہے، جس کے بغیر "ایڈیٹری" کا "فرض" پورا نہیں ہو سکتا۔ اس کی اہمیت تو بہت کچھ ہے، لیکن آپ ہم اسے سمجھ نہیں سکتے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ اس کے بغیر نہ اُن کی ایڈیٹری کا رعب جم سکتا ہے، نہ رسالہ چل سکتا ہے، کیونکہ دُنیا بہ ابلہ فریبی و تجارت بہ تشہیر قائم۔۔۔ اور ایڈیٹروں پر کیا موقوف، یہ تو ہر اہل غرض یا اہل حرفہ کا اصول ہے کہ اپنے متعلق چند جملے عرض کر دیا کرے۔

آپ کسی انجمن کو لے لیجئے، کسی جلسہ کو لے لیجئے، آپ ضرور سنیں گے کہ شاندار طریقہ پر منایا گیا۔ اور نہایت "کامیاب" رہا۔ خواہ شریک ہونے والے، پانچ مکھیاں ہی کیوں نہ ہوں، اور بولنے والا کوئی بدھو ہی کیوں نہ ہو۔ کہنا تو یہی پڑتا ہے کہ جلسہ نہایت "کامیاب" رہا۔ (ہاں اگر "فیل" رہے تو صرف جلسہ منانے والے) ورنہ اخبار میں ذکر کیسے آئے اور نام کیونکر چھپے۔ تو بہرحال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا سالنامہ بھی نہایت "کامیاب" رہا۔ اس لئے اب ہم اس کی دوسری قسط نہایت "آب و تاب" کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ "آب و تاب" تو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ بھی کتنا بامعنی اور "کامیاب" لفظ ہے۔

لہٰذا اُمید ہے کہ یہ قسط بھی انشاءاللہ پہلے سے زیادہ "کامیاب" رہیگی، کیونکہ اس پر پہلے سے زیادہ بہتر طریقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، یعنی اگر پہلے مشعل سے ڈالی گئی تھی تو اب بیٹری سے ڈالی گئی ہے۔ اور مشعل اور بیٹری میں یہ فرق ہے کہ مشعل سے دھواں نکلتا ہے اور بیٹری سے نہیں نکلتا۔ جس سے دماغ خراب ہونے کا اندیشہ نہیں۔ یوں بھی اس کو "کامیاب" ہونا ہی چاہیئے اس لئے کہ ایک شاعر صاحب نے کبھی کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول"۔۔۔ اور شاعر تو آپ جانتے ہی ہیں کہ "تلامیذ الرحمٰن" ہوتے ہیں، پھر اُن کا فیصلہ غلط کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ اس پر بھی "کامیاب" نہ ہو تو نہ "سند" کی آرزو ہے نہ "نوکری" کی خواہش۔ ہمیں اس کی زیادہ پرواہ بھی نہیں۔

ہم تو سمجھتے ہیں کہ جس طرح آپ نے سُنا ہوگا کہ مجنوں گورکھپوری نے اپنے افسانے، غالباً "سمن پوش" کے متعلق لکھا ہو گا انہوں نے سُنا ہے کہ علی گڑھ کے ایک طالب علم نے اسکو بار بار پڑھا اور شدت غم سے انتقال کر گیا۔

اب ہمیں یہ توقع ہے کہ اس سالنامہ کو پڑھکر اکثر حضرات براہ کرم شادی مرگ ہو جائیں گے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو لوگوں کو کہیں یہ گمان نہ ہو جائے کہ ملک میں طاعون آگیا ہے، اس لئے ہم حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ گھر گھر فوراً "چوہے دان" تقسیم کرا دے، کیونکہ چوہے ہی طاعون کا اصل باعث ہیں ـــ لیکن اس سلسلہ میں ایک ضروری بات یہ کہدینے کی ہے کہ آجکل چوہے زہر کی گولیاں نہیں کھا رہے ہیں، اس لئے چند "پیپرمنٹ" اور میوہ وغیرہ کا انتظام بطور "رفرشمنٹ" کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں بہت مناسب ہوگا۔ کیونکہ یہ ایک قسم کا "ایٹ ہوم" ہوگا۔ اور "ایٹ ہوم" کے نام سے تو بڑے بڑے لوگ دعوتیں اور گھر کی نعمتیں چھوڑ کر بھاگتے ہیں تو یہ تو پھر معمولی چوہے ٹھہرے ـــ

ہم کہاں سے کہاں پہونچ گئے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سالنامہ کی دوسری قسط ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ بعض حضرات تو ضرور اس کو پڑھیں گے اور اگر پسند آئے تو خاموش ہو جائیں گے اور ناپسند ہو تو گالیاں عنایت فرمائیں گے۔

"بے دفتر ادارہ"

موسمیات

سال میں تین موسم ہوتے ہیں، اور ایران میں چار۔ البتہ یورپ اور آفریقہ میں صرف ایک ایک موسم ہوتا ہے۔ یعنی یورپ میں صرف سردی ہی سردی، اور آفریقہ میں صرف گرمی ہی گرمی، کیونکہ آفریقہ خط استوا پر واقع ہوا ہے۔ اور لفظ "استوا" انگریزی لفظ "اسٹو" (stove) سے نکلا ہے، جس کے معنی ایک قسم کے انگریزی چولھے کے ہیں جو بہت گرم ہوتا ہے۔ پہلے یہ لفظ "اسٹو" تھا، پھر عربوں نے اس کو "استو" بنایا۔ اور ایرانیوں کے کثرتِ استعمال سے یہ "استوا" ہو گیا۔ اور ایران سے تو ہندوستانیوں نے سب ہی کچھ لیا ہے!

چونکہ یہ لفظ تین مقامات سے گذر کر آیا ہے، یہاں صرف تین موسم پائے جاتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اُوپر کے سب موسم غیر ملکی یا بدیشی ہیں، اور یہ نیچے کے تین موسم ملکی یا دیسی ـــ اب ہم اُنہیں کا ذکر کرینگے۔

ہندوستان کے تین موسم علی الحساب سال میں چار چار مہینے کے ہوتے ہیں۔ کبھی دھوپ کالا اور برسات مل کے آتے ہیں اور کبھی جاڑا کالا اور دھوپ کالا۔ ان تینوں موسموں میں بہ غلبہ آرا طے پایا کہ بارش کا موسم سب سے اچھا ہوتا ہے، کیونکہ اسی سے کسانوں کی معیشت اور امیروں کے پیٹ وابستہ ہیں۔ اور ہندوستان میں چونکہ کسانوں وغیرہ کی تعداد زیادہ ہے، یہ غلبہ آرا بھی انہیں کی بدولت رہا ـــ

یوں بھی بارش کو ایک نعمت تصور کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں ہر قسم کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ یوں تو بارش میں ہر چیز اچھی ہوتی ہے مگر پروانوں کا ہجوم، سڑکوں کی کیچڑ، موٹر والوں کی شرافت، مچھروں کی موسیقی اور مینڈکوں کا شور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

بارش ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ابر آئے۔ ابر ایک کالا سا ٹکڑا ہوتا ہے جو مختلف سمندروں سے پانی پی کر سیر کو نکلتا ہے لیکن چونکہ اسکے آنکھیں نہیں ہوتیں، اونچی اونچی پہاڑیوں سے ٹکرا کر گر جاتا ہے۔

اونچی اونچی پہاڑیوں میں دو تین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شمال میں کوہ ہمالیہ کا سربفلک پہاڑی سلسلہ، وسط میں وندھیاچل، اور جنوب میں سانپ کا سا مشرقی گھاٹ اور مغربی گھاٹ۔ جو ہندوستان کے جنوبی مثلث کے خطوط اضلاع کا کام دیتے ہیں۔

زیادہ تر مانسون ہوائیں انہیں پہاڑیوں سے ٹکراتی ہیں، اس لئے بارش بھی صرف ان ہی مقامات میں ہونی چاہیئے تھی، مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے مقامات پر بھی بارش ہوتی ہے جہاں نہ پہاڑ ہیں، نہ جھاڑ۔ اس کا ثبوت جغرافیہ دانوں نے یہ دیا ہے کہ ابروں میں بھی بعض ابر قوی ہوتے ہیں اور بعض کمزور، یعنی یوں سمجھ لیجئے کہ بعض مذکر اور بعض مونث۔ کمزور ابر تو جہاں ٹکر کھاتا ہے وہیں گرجتا ہے، البتہ زور دار ابر بہت دُور جا کر گرتا ہے جس کی توجیہہ یوں کی جاتی ہے کہ بعض دفعہ شیر یا خرگوش کو گولی مارنے کے بعد دیکھا گیا ہے کہ وہ دو دو میل کے فاصلہ پر جا کر گرے ہیں۔

یہ سُنکر ایک طالب علم نے اعتراض کیا کہ بعض دفعہ تو یہ دیکھا گیا ہے کہ کڑک دھوپ کالے میں بھی بارش ہوئی ہے اور اچھی خاصی ہوئی ہے۔ یہ سُنکر جغرافیہ ماسٹر نے کہا کہ بعض دفعہ گرمی سے آسمان کو پسینہ آجاتا ہے اور ٹپک پڑتا ہے، جس طرح تمہارے اعتراضوں سے اب مجھے پسینہ آرہا ہے ــــ پھر طالب علم یوں گویا ہوا کہ ابر کے بغیر اور دھوپ کے ہوتے بارش کیونکہ ہوسکتی ہے، تو ماسٹر صاحب نے جغرافیہ دیکھکر بتایا کہ اس وقت لومڑا، لومڑی کی شادی ہوتی ہے۔ اسلئے آسمان دُولھا کو نہلانے کی تیاری کرتا ہے۔

خیر اب ہم کو اس سے زیادہ تحقیق کی ضرورت بھی نہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ بارش اکثر ایسے مقامات پر زیادہ ہوتی ہے جہاں پہاڑ ہوں اس لئے جب سے فرہاد نے کوہ بے ستوں کو ڈھا دیا ہے، ایران میں آج تک بارش نہیں ہوئی، پھر بھی شکر ہے کہ اُس کی جُوئے شیر سے بہت کچھ کام نکل جاتا ہے، اور اکثر مائیں بچّوں کو دودھ پلانے سے بے نیاز ہوگئی ہیں، صرف اناؤں سے کام چل جاتا ہے۔ اس سے ماؤں کی طاقت بھی گھٹنے نہیں پاتی اور افزائش نسل میں بڑی مدد ملتی ہے۔

ہندوستان کی بارش کے اثرات مختلف ہیں، اسی لئے مختلف مقامات پر مختلف پیداواریں ہوتی ہیں۔ مثلاً پنجاب میں گیہوں اور رسالے۔ پنجاب کا گیہوں بہت موٹا اور قوی ہوتا ہے، اس لئے وہاں کے لوگ بھی اچھے خاصے ہوتے ہیں۔ اور رسالوں کی تو یہ کثرت ہے کہ فوجی رسالے اور ادبی رسالے میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ لکھنؤ اور دہلی میں عطر اور نزاکت، صنعتی کام اور زبان دانی کا دعویٰ۔ کلکتہ میں چانول اور رنڈیاں ــــ آگرہ میں تحصیلدار، بوٹ اور تاج محل ــــ وارِدھا میں کانگریس اور ہندی زبان۔ بمبئی میں تجارت اور فلم کمپنیاں، اور حیدرآباد میں فیشن پرستی اور غیر ملکی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

اب ہم مختصراً کچھ دھوپ کالے اور جڑ کالے کے متعلق بھی تحقیق کریں گے، دھوپ کالا بھی ایک بڑی نعمت ہے، اس میں پسینہ آتا ہے، کپڑوں میں بدبو ہوتی ہے، زبان 'یا ہو، یا ہو' کے نعرے لگاتی ہے، جو خاص صوفیانہ نعرہ ہے۔ شربت زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ ندی نالے آباد ہوتے ہیں، کچھ لڑکوں سے، کچھ بھینسوں سے۔ اور سب سے بڑی خصوصیت یہ سُنی ہے کہ اس میں بچھو بہت نکلتے ہیں۔

بچھو بھی خدا کی ایک مخلوق ہے۔ اس کے متعلق بعض بزرگوں سے روایت آئی ہے۔

جب خالق نے تمام زہریلے جانوروں کو زہر دینا چاہا تو ایک بڑی سل پر بہت سارے زہر کو خوب پسوایا، اور تمام جانوروں میں تقسیم کرا دیا۔ بچھو کو جانے میں ذرا دیر ہوگئی، اس وقت تک سب زہر ختم ہوچکا تھا۔ بچھو نے مانگا تو خدا نے کہا کہ "سب زہر ختم ہوچکا، تو نے اتنی دیر کیوں لگائی۔ اب تجھے نہیں مل سکے گا"۔ بچھو کو مایوسی بھی ہوتی اور غصّہ بھی آگیا۔ ضد کا پکّا تھا اس لئے اُس نے سل پر ہی اپنی

ڈنک پیدا نا شروع کر دیا۔ جو کچھ زہر آسکتا تھا اُس کے ڈنک میں آگیا یہی وجہ ہے کہ بہ مقابل سانپ کے بچھو کے ڈنک میں زہر کم ہوتا ہی۔ لیکن اس غصہ کے سبب جو بل کھا گیا تھا وہ آج تک نہیں نکل سکا۔ اسلئے اسکا ڈنک ہمیشہ ٹیڑھا رہتا ہی۔ ۔ ۔ ۔"

ممکن ہے بعض معقول پسند یا سائنس دانوں کو اس روایت سے اختلاف ہو، مگر ہم نے اس لئے لکھدی کہ اس کی راوی ایک خاتون ہیں۔ اور خاتون کی عزت کرنا تو آجکل کے آداب کا رکن رکین ہے۔ پھر ان کی باتوں کو غلط سمجھنا تو یقیناً "ایٹی کیٹ" (Etiquette) کے خلاف ہوگا۔ اب اگر کوئی صاحب چاہیں تو اس کی تحقیقات کریں۔ ہمارا موضوع تو صرف دُھوپ کالا ہے۔ اس لئے ہم تو گریز کرتے ہیں ـــــ!

دھوپ کالے میں اکثر اُمرا شملہ، اوٹی، مسوری، نیلگری، میسور اور مینی تال وغیرہ جاتے ہیں تاکہ گرما گزاریں۔ لیکن یہ بات آجتک سمجھ میں نہیں آئی کہ جن مقامات میں گرما آئے ہی نہیں اُن میں گذر کیسے سکتا ہے!۔ خیر، بہرحال یہ بڑوں کی باتیں ہیں جنکے پاس وافر دولت ہو وہی اس کے صحیح مصرف کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔

بعض عامیوں کا اعتراض ہے کہ جو اُمرا دُور دُور کے مقامات کو جاکر گرما گذارتے ہیں کیا وہ تھوڑے سے صرفہ سے یہاں رہ کر اسکا انتظام نہیں کرسکتے؟ اور کیا بقیہ دولت کو جو وہ غیروں میں صرف کرتے ہیں، اپنے غریب بھائیوں پر صرف نہیں کرسکتے؟۔ تو اسکا جواب یہ ہے کہ وہ کر تو سکتے ہیں مگر مجبوری یہ ہے کہ اس طرح سے اخباروں میں اُن کا نام آسکتا ہے نہ امارت ظاہر ہوسکتی۔ رہا غریب بھائیوں کا تو غریب امیر کا بھائی ہو ہی کیونکر سکتا ہے، ان میں تو صریح تضاد اور دُشمنی ہے، پھر دُشمنوں کی مدد کرنا کون عقلمندی ہی، چنانچہ قرآن پاک میں بھی اسکی ممانعت آگئی ہی کہ دُشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

جڑکالے میں اگرچہ ناقابل برداشت سردی ہوتی ہے، لیکن یہ لوگ گرما گذارنے کے لئے آفریقہ وغیرہ نہیں جاتے ـــ آخر یہ کیوں؟ ـــ وجہ یہ ہے کہ اکثر اُمرا مغربی ملکوں کو نظراً یا عملاً دیکھ چکے ہیں۔ اور مغربی ممالک کی دوامی سردی تو اظہر من الشمس ہی۔ اسلئے ان کے جسم و دل، کچھ تو ان ملکوں کے اثر سے اور زیادہ تر اپنی طبعی خنکی سے اس قدر سرد ہوگئے ہیں کہ اب کسی حال میں بھی انہیں سردی محسوس ہونا ناممکن ہے۔

جڑکالے اور دھوپ کالے کے متعلق اب ہم ایک اور معتبر روایت بیان کرکے اپنی تحقیقات کو ختم کرتے ہیں۔

جڑکالے اور دھوپ کالے کے معنی دراصل سردی اور گرمی کے ہیں۔ اور سردی گرمی پیدا ہوتی ہی دراصل چاند سورج سے۔ تو سوال یہ ہوا کہ چاند سورج میں دراصل یہ سردی گرمی کیونکر پیدا ہوتی۔ اسکے متعلق بھی ایک روایت مشہور ہی۔

بیان کیا اس کو اُم بصرہ نے، کہ سنا اُنہوں نے اس کو بی حجانی سے، کہ روایت کی اُنہوں نے ماماحوا کے حوالے سے، کہ اتری ہی وہ سینہ بسینہ چند پرانی بوڑھیوں سے، یاد کیا جس کو میری نانی نے، اور پہونچی مجھ تک میری اماں سے کہ چاند سورج دراصل ایک ہی والدین کے بیٹے ہیں۔ بچپنے میں یہ نہ ٹھنڈے تھے نہ گرم، بلکہ معتدل تھے۔ ماں نے انکو بڑی محنتوں اور لاڈ چاؤ سے پالا تھا۔ اور بڑی بڑی اُمیدیں باندھی تھیں اور ان ہی اُمیدوں سے سرسید نے "اُمید کی خوشی" پر ایک مضمون لکھا تھا۔

غرض جب یہ ذرا بڑے، سیانے ہوتے تو محلہ میں ایک شادی کی تقریب ہوئی، اور بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ پرانی وضع کی اس ماں نے بڑے گھر اور کام کاج نہ دیکھے تھے۔ بریانی کا حال سُنا تو مُنہ میں پانی بھر آیا، اور خصوصاً بیٹوں کی دعوت سُنکر تو ٹپک

ہی پڑا ہے۔!

بیٹوں کو حسب حیثیت بنا سنوار کے دعوت میں بھیجا اور اتنی نصیحت کر دی کہ آتے وقت چپکے سے تھوڑی بریانی لے کے آنا۔

سورج بچپن سے ذرا تیز مزاج اور اصول کا بہت پابند تھا، اس لئے سب سماج والے اسکو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اور چاند نہایت نرم دل، خوش اخلاق، اور رسم و رواج کا پابند تھا۔

دونوں دعوت میں گئے۔ سورج کو یہ بات خودداری کے خلاف معلوم ہوئی کہ وہ اس طرح چوری چھپے ماں کی خواہش پوری کرے۔ بلکہ اُس کو ماں کی اس بے تکی خواہش پر غصہ آیا۔ اس لئے اس نے بجائے بریانی چُرانے کے ایک دو ہڈیاں علانیہ اُٹھالیں۔

اس کے برعکس چاند کو ماں کی خواہش اور ظاہرداری کا خاص لحاظ تھا اس لئے سُنا ہے، اس صفائی سے کھایا (غالباً کسی فلم کمپنی یا اسٹیج کا ایکٹر بھی رہا ہو) کہ آدھا نوالہ شیروانی کی آستین میں اور آدھا منہ میں۔ اس طرح بہت سی بریانی جمع کر کے ماں کے پاس لایا۔ ماں نے کھالی اور خوش ہو کر دعا دی کہ بیٹا تیرا کلیجہ ہمیشہ ٹھنڈا رہے اور تو چاند کی طرح چمکے۔

پھر سورج کی باری آئی۔ ماں نے بڑی "اُمید کی خوشی" سے پوچھا کہ "میرا بیٹا کیا لایا؟" بیٹے نے چپکے سے منہ میں ہڈیاں ڈال دیں۔ چونکہ رات کا وقت تھا، اور ماں بھی بھولی بھالی تھی، سمجھ نہ سکی، اور کھائیں، ہڈیاں حلق میں اٹک گئیں۔ ماں نے جل کے بددعا دی کہ "موئے، ظالم، تیرا ستیاناس! تُو نے جس طرح مجھے جلایا ہے، تو بھی ہمیشہ آگ کی طرح جلتا رہے۔۔۔۔۔!"

ان ہی دُعاؤں کا اثر ہے کہ چاند میں نور و خنکی ہے اور سورج میں نار و گرمی۔ لیکن چاند نے چونکہ خیانت کی تھی، شرم کے مارے ہمیشہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، اور سورج نے دیانت، اس لئے گھٹتا تو نہیں لیکن "مذہبی تقشقہ" ساتھ ساتھ ہے۔ اور چاند کے بغیر تو کام چل سکتا ہے، لیکن سورج کے بغیر ایک دن بھی گذر ہونا مشکل ہے، جس طرح اُصول سے ہٹ کر انسان ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا ہی۔

تازہ مطبوعات

مشکل کُشا۔ زیر نظر کتاب جس پایہ کی تصنیف ہے، وہ ہماری کسی قسم کی تنقید سے بے نیاز ہے۔ اس لئے ذیل میں ہم خود مصنف کے مقدمہ سے چند اقتباسات پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ اب یہ ناظرین پر موقوف ہے کہ ذاتی تجربات سے ان خصوصیات کی تصدیق یا تکذیب کرلیں، چنانچہ قابل مصنف نے لکھا ہی:-

"سُنیئے، عالی جناب پرنس ڈیوک رائٹ آنریبل لارڈ سر نواب صاحب کیا فرماتے ہیں اس کتاب کے بارے میں:-

'مصنف کے دست نقاش نے موئے قلم کو زمین قرطاس پر کچھ اس طرح جنبش دیا ہی کہ ہر ہر لفظ سے مانی و بہزاد ٹپک پڑتے ہیں اور اس کا ایک ایک جملہ مثل گلچین گل ریحان سُنبل سرسبز و سرسبد ہے۔

میری اہلیہ کو ایک عرصہ تک خلاف توقع خاموشی کا عارضہ رہا۔ مکان میں سخت جمود و سکون تھا۔ ایک عرصہ تک گویا پریشانی رہی۔ اس اثنا میں مَیں نے دیکھا کہ بیگم کو صرف عشقیہ ناول اور "مشکل کُشا" پڑھنے کی عادت ہی۔ عشقیہ ناول تو خیر نوجوان لڑکیوں کیلئے ضروری ہیں ہی۔ مگر اس "مشکل کُشا" کا اتنا شوق میری سمجھ میں نہ آیا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ اس میں دُلہنوں کے برتاؤ، ماں باپ کی تعلیم، اور میاں کو بھنے کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں کہ کس طرح ابتدائے عورتوں کو اپنا دُلہن پن، اور شرم و حیا اور خاموشی بتانی چاہیئے تاکہ شوہر کو اُنکی خوش

خلاقی کا یقین ہوتا جائے، اور رفتہ رفتہ دلہنیں دولہوں کے دل میں اتر تی جائیں پھر بھولے میاں کے دل پر قابو پالینے کے بعد کلیجے کا ناسور بن جانا کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ صرف ذرا صبر اور ہوشیاری سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

واقعی مجھے بھی کتاب کی خوبیوں کا قائل ہونا پڑا۔ چنانچہ اب غریب خانہ میں اس کتاب کے سبب اور زیادہ تر بیگم صاحب کی بے تکلفی کے سبب ایک انقلاب عظیم بپا ہوگیا ہے اور ان کے عارضہ میں دن بہ دن افاقہ و ترقی ہوتی جارہی ہے، اور ماشاء اللہ دلہن کو لائے تو ابھی کچھ زیادہ عرصہ بھی نہیں گذرا ہے کہ گھر میں اس قدر چہل پہل معلوم ہوتی ہے جیسے گھر کسی ریلوے جنکشن کے قریب بنایا گیا ہو، بعض لوگ اس کو بیگم کی سلیم الفطرتی کا نتیجہ کہتے ہیں اور بعض "مشکل کشا" کی تاثیر۔ پھر یہ عجیب بات ہے کہ اسکے نسخوں پر کچھ لاگت بھی نہیں آتی۔ غرض یہ ایسا کرشمہ ہے کہ ہر شخص کو اس سے مستفید ہونا چاہیئے۔

اور اب سنیئے خود مصنف صاحب کیا فرماتے ہیں اس کتاب کے بارے میں۔

"اگر آپ کو بے روزگاری نے پریشان کر رکھا ہو، رات میں کھٹمل ستاتے ہوں، دن میں دھوپ زیادہ لگتی ہو، چہرے پر چھائیاں یا مسے آگئے ہوں، اگر بھوت، پریت یا کسی قسم کا آسیب ہو، یا شادی کرنے کی وجہ سے آپ کا ناک میں دم آگیا ہو، یا کام کرتے وقت سستی محسوس ہوتی ہو، یا جسم میں کسی وجہ سے خشکی یا سختی پیدا ہوگئی ہو آپ کا قد چھوٹا ہو، یا آپ بہت دبلے ہوں تو سرعت، رقت، درازی، بطری، اور ہر قسم کی بہتری کے ساتھ ساتھ آپ کا مزاج بحال کر دے گی، اور از سر نو آپ کی بیٹھی ہوئی طبیعت میں ایک قسم کا جوش وانتشار پیدا کر دے گی۔

اور جو آپ کو بھوک زیادہ لگتی ہو، کسی محبوبہ پہ دل آگیا ہو، یا دماغ خراب ہوگیا ہو، کہیں آپ لکچر دینا چاہتے ہوں، ہندو مسلم اتحاد نے آپ کو بیچین کر رکھا ہو، اگر آپ کو کہیں سے قرضہ لینا ہو، بیوی کا مہر یا زیور بتانا ہو، اپنی عزت وجائداد کو نیلام کرانا ہو تو اس کتاب کے مطالعہ سے آپ کو بڑی مدد ملے گی۔

اسکے علاوہ برسوں کے مایوس العلاج مریض، بانجھ پن، ضعف دماغ، کثرتِ اولاد، شاعری، مصوری، ڈرامہ نگاری، ایکٹنگ، خوابِ پریشاں، دشمن پر فتح، امتحان میں کامیابی، ملازمت میں ترقی، تلاشِ روزگار میں عروج، تجارت، آنکھوں کی بیماری، دل کی کمزوری، شوہر پر قابو، زباں درازی، خونی بواسیر، دمہ، زنانہ و مردانہ حسن میں جنگجوئی و نزاکت، مساوات مرد و زن، وفاق، سیاسیات حاضرہ، لیگ اور کانگریس کی کارگزاری، بچے کے بال اتارنے ہوں تو سیفٹی ریزر کا استعمال، اگر آپ کسی کو دیکھنا چاہتے ہوں، اور کوئی آپ کو نہ دیکھے۔ زائد بال اڑانے ہوں، ڈنروں میں جانے اور لیڈیوں کے بازو بیٹھنے کے طریقہ سیکھنے ہوں، سائنس کی ترقی، چکروتی اور الجبرا کا حل، ہندوستان کے مستقبل کی مستند تاریخ وغیرہ پر معلومات حاصل کرنی ہو، غرض ہر مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہوں تو ضرور اس کتاب کو اپنے پاس رکھیئے۔ یقیناً مفید ثابت ہوگی۔

کہنے کو تو کتاب ہے مگر دراصل جام جہاں نما ہے جو جمشید کے انتقال کی وجہ سے ورق ورق ہوگیا تھا، اسلئے ہم نے از سر نو شیرازہ بندی کر کے اس کو ایک ضخیم کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔

چونکہ ہر شخص کا فائدہ پیشِ نظر ہے، کوئی قیمت نہیں رکھی گئی۔ بلکہ مفت ہدیۃً تقسیم کی جاتی ہے۔ جو صاحب چاہیں ہمارے پتہ پر صرف دو روپے کے ٹکٹ اور ایک روپیہ پارسل خرچ بھیجکر منگا سکتے ہیں۔ انشاء اللہ ضرور فائدہ پہونچے گا۔ البتہ فائدہ نہ ہونے کی صورت میں حلفیہ

بیان دے کر ثابت کرنے پر (اوّل تو ثابت ہی کون باپ کا بیٹا کر سکتا ہے) ہدیہ کے دو روپے اور پارسل خرچ بذریعہ وی، پی، روانہ کر دیئے جائیں گے، جس کو وصول کرنا ہر شریف آدمی کا اخلاقی فرض ہوگا۔

نمونہ اقرار نامہ

میں اپنے باپ دادا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے آپ کے اشتہار میں پڑھا، بیوقوفی سے اس کو سمجھا نہیں تھا، اور کتاب منگوالی تھی، لیکن مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا، اس لئے اب آپ سے ایک فقیر کی التجا ہے کہ براہ کرم میری رقم واپس فرما دیجئے۔ مدت العمر فقیر اور اس کے بال بچے آپ کے حق میں دُعا گو رہیں گے۔
صاف نام .... صاف پتہ ....

اقرار نامہ پر بادشاہِ وقت کے دستخط ہونے لازم ہیں۔ ورنہ مسروقہ و مسترد سمجھا جائیگا"

کتاب کی لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے، غرض ہر لحاظ سے دیکھنے کے قابل ہے۔ ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔ شاید سہواً چھوٹ گیا ہو۔ غالباً ذیل کے پتہ پر مل سکتی ہے:-

"زبدۃ العارفین، مسکتۃ الخادعین، گنج العرفان، خزینۃ الدھوکاں، حضرت مولانا، مولوی، سیدنا وشیخنا، عالِم و عالَم، رمال جفار، منجم و مفسر، پیران پیر، حضرت پیر غیب صاحب ساکن خبطی گوڑہ، و ہر جگہ در اٹلس دُنیا، دام اقبالہٗ مدظلہٗ العالی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج عالی۔ دیگر کیفیت یہ ہے کہ"

برتھ کنٹرول:- برتھ کنٹرول کا مسئلہ آج کل نوجوان عورتوں اور مردوں کیلئے جس قدر اہم ہوگیا ہے کسی سے مخفی نہیں۔ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ حصول معاش و ترقی کا ذریعہ زیادہ تر حُسن کی نمائش ہوگئی ہے، اس طرح سال بہ سال نئے نئے مسافروں کا تشریف لانا حُسن و جوانی کو غارت کرنا ہے تو ملک کی ترقی معلوم۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی معاشی حالت دن بدن ابتر ہوتی جارہی ہے اور دردمندانِ قوم "انسدادِ تولیدِ برخورداراں" کی طرف متوجہ ہوگئے ہیں۔

یہ کتاب بھی ایک ایسی ہی دردمند قوم خاتون کی لکھی ہوئی ہے، جو اپنے حُسنِ خداداد قابلیت کی وجہ سے سارے ہندوستان میں شُہرتِ عام حاصل کر چکی ہیں۔

اس کتاب میں جیسا کہ ابھی اشارہ کیا گیا، ملک کی معاشی حالت پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ملک کی موجودہ اقتصادی پستی اور مالی تباہ حالی کو بڑی خوبی سے ماں باپ کی غلط کاریوں کا نتیجہ بتایا گیا ہے، اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ اس کتاب نے گذشتہ بیس صدیوں سے ملکوں کی آب وہوا اور خیالات پر کیا کیا اثرات ڈالے۔

عورتوں اور مردوں کے مختلف امراض مخصوصہ وغیر مخصوصہ پر نہایت مفید اور جذبات انگیز طریقے سے نسخے فراہم کردئے گئے ہیں۔ ہر اندرونی مرض کا علاج اندرونی طور پر، اور بیرونی مرض کا علاج بیرونی طور پر بغیر دوا کے کیا جاتا ہے۔ دواؤں اور نشتروں کی ترکیب استعمال بھی ساتھ ہی درج ہے۔

غرض ایسا سواد فراہم کر دیا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ آپکو سارے ملکی اور غیر ملکی اخباروں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیگا۔

البتہ ممکن ہے بعض جگہ کچھ مغلطات بھی آگئے ہوں، اس لئے کاتب صاحب نے اپنے فن کا وہ جوہر دکھایا ہے کہ کتاب کے نام سے ہی لوگ پورے مفہوم اور خیالات سے واقف ہوجائیں اور دیکھنے میں ایک حرف بھی نظر نہ آئے۔

لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب ہے اور ایک عجیب خوبی اس میں یہ ہے کہ چونکہ اس مسئلہ کا تعلق انسانوں سے ہے، اس کتاب کی تقطیع بھی انسانی قد پر رکھی گئی ہے، یعنی طول چھ فٹ اور عرض ڈیڑھ فٹ۔ اسلئے کتاب کھڑی رکھ کے بھی پڑھ سکتے ہیں۔

جلد "مثلاً" یعنی چمڑے کی بنی ہوئی۔ شروع میں "میری اسٹوپس" (Mary Stopes) کے نام ایک "انتساب" بھی درج ہے۔ ملنے کا پتہ اور قیمت حسب حیثیتِ خریدار۔

سیاسیات

ہندو مسلمانیات:۔ ہندو مسلم فساد تحقیقات کے بعد معلوم ہوا ہے کہ دراصل معدہ کا فساد ہے، کیونکہ جو لوگ غریب ہیں وہ خلوئے معدہ کے سبب لڑتے ہیں۔ اور جو پیٹ بھرے ہیں بدہضمی انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ نتیجۃً وہ بطور اسہال جگہ جگہ لکچر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جن سے آئے دن فسادات پھوٹ پڑتے ہیں۔

فساد دراصل چار خلطوں سے ہوتے ہیں، سودا، صفرا، بلغم، خون۔ ان چار خلطوں میں سے جو بھی بڑھ جائے، لازمی طور پر نظام عصبی خراب ہوجائیگا۔ ایسا ہی کچھ حال ہمارے ملک کا ہے۔ جہاں چار خلطوں میں اتفاق کا یہ حال ہو، وہاں ایک لاکھ اکیس ہزار سے کچھ اوپر قوموں کے ملاپ کا کیا کچھ حال نہ ہوگا۔ ان میں سے اگر ہم ہر قوم کو ایک ایک خلط فرض کرلیں تو اس کے نظام عصبی، اور صحت جسمی و دماغی کا اندازہ کر لیجئے۔ پھر ایسی صورت میں اتحاد و اتفاق کی کوشش کرنا، توقع رکھنا، یا ڈینگیں مارنا حماقت بلکہ الو پن نہیں تو اور کیا ہے۔

چنانچہ حکیموں مثلاً ہمدرد دواخانہ، حکیم اجمل خاں، لقمان الملک حکیم نابینا جیسے کئی حکیموں نے اپنی اپنی محبت کی گولیاں استعمال کرا کے دیکھ لیں، لیکن:۔ ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی
مریض "پھوٹ" پر لعنت خدا کی

جب یہ انفرادی حکیم عاجز آ گئے تو باضابطہ ہاسپٹل کھولے گئے جن میں سے دو نہایت اہم اور مرکزی ہیں، ایک کا نام مسلم لیگ ہے اور دوسرے کا نام کانگریس۔

ان دواخانوں نے ارادہ کیا تھا کہ ملک کے اس بڑھتے ہوئے روگ کو دور کر دیں اور اس کو تندرست و ترقی یافتہ موقف پر لے آئیں مگر جس طرح چیونٹیوں کو پر راس نہیں آتے ان پرانے ویدکوں کو یہ نئی ڈاکٹری کچھ راس نہیں آئی۔ اور یوں بھی ملک بے اعتدالی کی علت کا کچھ ایسا خوگر ہے کہ پہلے خواب غفلت میں تھا تو اب بیداری کے نشہ میں ہے۔ اگر سونے کے زمانہ میں سونے کے سبب پستی میں تھا تو اب زیادہ جاگنے کی وجہ سے آنکھیں جلنے لگی ہیں اور آنکھ کی جلن تو ظاہر ہے کہ دل تک پہونچتی ہے، جس طرح معشوق کی صورت آنکھ سے دل میں اتر کر رہتی ہے۔ اور جلن کا لازمی نتیجہ ہے بے چینی، اور بے چینی کا لازمی نتیجہ ہے بے اعتدالی، اور بے اعتدالی کا دوسرا نام ہے ناانصافی۔ اور ناانصافی منتج ہوتی ہے تنگ نظری پر۔ اور تنگ نظری پیش خیمہ ہے اندھا دھند جھگڑوں کا، لہذا

ثابت ہوا کہ دواخانے بہرحال اپنا اپنا کام اچھی طرح انجام دے رہے ہیں! اور ایک دن ہوگا کہ ان مریضوں کو مرکر بھی شکایت نہ ہوگی۔ کیوں کہ ہر دواخانہ اس قدر احتیاط سے کام لے رہا ہے کہ اپنے، اپنے مسلک سے، جسے جُہلا داؤں سے بھی تعبیر کرتے ہیں، ہنٹ کر نہ کسی کا نشتر استعمال کرے نہ دوا۔ کیونکہ لیگ کے دواخانے کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں کانگریس کی دواؤں میں صرف دال بھاجی ہی نہ ملائی گئی ہو کہ اس سے گوشت خوار مریض کی قوت میں کیونکر اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور کانگریس کے دواخانے کو یہ ڈر ہے کہ کہیں لیگ کی دوا میں گائے کا گوشت نہ شامل کیا گیا ہو کہ اس سے اُن کی "گئو ماتا" ناراض ہو جائیگی تو پھر یہ دودھ کس کا پی کر پلے بڑھیں گے۔ رہا عورتوں کا ۔۔ سو انہیں اب ترقیِ جدید اور کانگریس کے کام ہی سے کہاں فرصت ہے کہ بچوں کو دودھ پلاتی بیٹھیں۔ اور انکی مصروفیات اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ وہ چاہتی ہیں کہ جننے کے کام کو بھی بعض مردوں کے سپرد کر دیا جائے، لیکن چونکہ یہ اُن کے بس کی بات نہیں، ابھی یہ مسئلہ زیرِ غور ہے۔ جب ذرا سیاسی کاموں سے نمٹ لیں گی تو اس طرف توجہ کریں گی۔

تو بہرحال، یہ معمولی سا اختلاف آرا ہے، جس کا نام سہولتِ فہم کیلئے مذہب رکھ لیا گیا ہے۔ اور آپسے کا کام ہے صرف کاٹنا، لہذا مذہب کا کام بھی جہاں تک ہو سکے کاٹنا ہی ٹھہرا، تو پھر ملاپ کی ایک ہی کہی۔

وہ تو پھر بھی بھلا ہوا کہ ان دواخانوں کی کوششوں، اور دماغ کے صفائے سے اتنا بھی ملاپ ہو سکا جتنا کہ ہتوڑی اور اہرن میں ہوتا ہے، ورنہ ان دواخانوں سے پہلے ہندو مسلمان اپنی اپنی جگہ ایسے بکھرے ہوئے تھے جیسے آسمان پر تارے۔

لیکن دشواری یہ تھی کہ اپنی اپنی جگہ رہ کر کوئی ہفت اقلیم کا بادشاہ بھی ہو تو لوگوں پر کیونکر ظاہر ہو سکتا ہے یہ زندگی نام ہے کشمکش کا" اور کشمکش پیدا ہوتی ہے اجتماعیت سے، اور اجتماعیت ظاہر ہوتی ہے آپس کی مڈبھیڑ، جوتی دھینگے سے تقریروں سے، لیڈروں سے، لیڈرنیوں سے، اخباروں سے، ایڈیٹروں سے۔ ورنہ یوں ہونے کو تو دڑبے میں پچاسوں مُرغیاں ہوتی ہیں، رہتی ہیں، بستی ہیں، آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں مگر کسی کو نہیں معلوم ہوتا، البتہ صرف دو ہی مُرغے ہوں، اور آپس میں چلتی رہے تو ماشاءاللہ سارا دڑبہ جگمگا اُٹھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض لیڈروں نے جگہ جگہ جنگ کو عام کر دیا ہے۔ پھر بھی ہندوستانی اس قدر جاہل اور کٹھ مغز ہیں کہ اس میں دلچسپی لینے سے پیچھے ہٹتے ہیں اور صرف مذہبی تہوار مثلاً دسہرہ، دیوالی، عید، بکرید، محرم اور عرس وغیرہ میں اس کا کچھ مظاہرہ کر کے خاموش بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں بچارے لیڈر کہاں تک سر پھوڑیں اور زیادہ سے زیادہ زندگی، اجتماعیت اور اتحاد کا نمونہ کیونکر پیش کریں، اس لئے وہ بھی صرف لیڈر بن کر رہ جاتے ہیں ۔۔۔ اور اس سے بڑھکر انہیں اور چاہیئے بھی کیا ۔۔۔ رہی قوم کی حالت، سو اس کے متعلق ایک شاعر صاحب نے کبھی کا فیصلہ کر دیا ہے:-

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

سید علی شاکر

رپورٹر

میں ایک خبر رساں ایجنسی کا نمائندہ ہوں، میرا کام خبریں جمع کرنا ہے۔ میں دُنیا اور دُنیا کے رہنے والوں کو ہر وقت متحرک دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مقصدِ حیات کو جتنے بہتر طریقے پر مَیں سمجھا ہوں، بہت کم لوگ سمجھے ہونگے۔ میں زندگی کو اُس کی اصلی صورت میں دیکھنے کا عادی ہوں۔ اس لئے غم و مسرت میرے لئے یکساں جاذبیت رکھتے ہیں۔ اس فلسفہ کے تحت میں دُنیا والوں کی شادی و غم میں شریک ہوں۔ کسی کی شادی ہو، کوئی مر گیا ہو، کہیں قتل ہو گیا ہو، کسی کے یہاں چوری ہو گئی ہو۔ کوئی بڑا آدمی کہیں تقریر کر رہا ہو۔ کوئی کھیل ہو رہا ہو۔ بازار میں فروخت ہونے والی اشیاء کے نرخ میں اُتار یا چڑھاؤ پیدا ہو جائے۔ کہیں دو ریل گاڑیاں ٹکرا گئیں ہوں۔ کوئی لُولی لنگڑی عورت موٹر کی جھپٹ میں آجائے۔ کہیں کوئی عظیم الشان دعوت ہو۔ کہیں رقص کی محفل جمی ہو۔ یا کوئی عسرت سے تنگ آ کر خودکشی کرے، آپ مجھے وہاں پائینگے۔ صبح سے شام تک اور شام سے رات گئے تک مجھے قرار نہیں۔ کبھی عدالت میں ہوں تو کبھی کوئی تقریر سُن رہا ہوں۔ غرضکہ میں ہر اُس جگہ موجود رہتا ہوں جہاں زندگی کے تھوڑے بہت آثار بھی ہوں۔

کل صبح میں ناشتہ سے ذرا دیر میں فارغ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ خانسامہ صاحب تشریف نہیں لائے تھے۔ کپڑے پہن کر میں باہر جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ خانسامہ بھی آپہونچا۔ مَیں اُسے دیکھتے ہی چیخا۔

"مردود! یہ کیا ہے! اگر تم آٹھ آٹھ بجے آؤ گے تو مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ تم سے تین سو چھتّر مارے مارے پھرتے ہیں، مَیں کسی اور کو رکھ لونگا۔"

وہ کچھ مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑایا اور میز پر رکھے ہوئے چائے کے برتنوں کو ٹھیک کرنے لگا۔

"بڑبڑاتا ہے! جاؤ، مجھے تمہاری ضرورت نہیں۔ میں کوئی اور انتظام کر لونگا" میں نے سر پر ہیٹ رکھتے ہوئے کہا۔

"صاحب، آپ تو بیکار ہی ناراض ہو رہے ہیں۔ میں نے کوئی جان بوجھ کر دیر تھوڑی کر دی؟"

"بک بک مت کرو، میں زیادہ بکواس سُننے کا عادی نہیں، سمجھے! ہونہہ ———— !" میں نے کوئی جان بوجھ کر دیر تھوڑی کر دی" گویا آپکے یکایک قولنج کا درد اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یا آپکے یہاں کوئی موت ہو گئی تھی کہ جب تک لاش اُٹھکر گھر سے نہ چلی جائے آپ دُنیا کا کوئی کام ہی نہیں کر سکتے۔ میں خوب........"

"ہاں صاحب، یہی تو بات تھی.........."

"یہی تو بات تھی کہ آپکے درد اُٹھ کھڑا ہوا تھا ————"

"نہیں صاحب، یہ نہیں، آپ سُنیں تو بتاؤں، رات میرے ایک ساتھی نے اپنے کو پھانسی دے لی"

"کیا کہا، پھانسی دے لی! کیوں، آخر بات کیا تھی؟"

"صاحب، بات وات کیا تھی، نصیب کا چکر ہے اور بس، بڑی لمبی بات ہے، بتاؤں گا، پھر کسی وقت، آپکو دفتر کو دیر ہو رہی ہو گی"

"ہاں، ——— نہیں دفتر کو دیر نہیں ہو گی۔ کوئی ایسی جلدی نہیں ہے۔ ہاں ——— تو یہ تو بتاؤ کہ اُس نے خودکشی کیوں کر لی؟ اس

وقت اُس کی لاش کہاں ہے؟ کیا پولیس کو اس کی خبر ہو گئی؟"

"ہاں، صاحب، پولیس کو تو اُسی وقت خبر ہو گئی تھی اور اُنہوں نے لاش بھی اپنے قبضہ میں کر لی ہے"

"تمہارا تو وہ ساتھی تھا نا، تمہیں کچھ نہیں معلوم کہ اُس نے خودکشی کیوں کر لی؟"

"دل کا حال تو بس خدا کو معلوم صاحب، میری تو سمجھ کچھ کام نہیں کرتی، نا جانے کیا ہو گا، کس کس پر مصیبت آتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اسے گھبرانے کی بات نہیں، تم اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو، کوئی تم نے اُسے پھانسی تھوڑی دیدی ہے، جو اس قدر ڈر رہے ہو، خیر چھوڑو ان باتوں کو اور مجھے یہ بتاؤ کہ جب تم رات کو مجھے کھانا کھلا کر گئے ہو اُس وقت سے ابتک کیا کیا ہوا۔ دیکھو، سب باتیں ٹھیک ٹھیک بتانا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم سے جو کچھ تم لوگوں کے لئے ہو سکے گا، کرینگے۔ ہاں، اب بتاؤ" "صاحب آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارے محلے میں زیادہ تر غریب لوگ رہتے ہیں، جنکا کام محنت مزدوری کرنا ہے، دن میں قریب قریب سب مزدوری پہ چلے جاتے ہیں، شام کو لوگ اپنی اپنی کوٹھڑیوں کے سامنے ٹولیاں بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ رات بھی یہی ہوا ہے کہ جب میں یہاں سے آپ کو کھانا کھلا کے گیا ہوں، تو روٹی کھانے کے بعد میں اپنے کچھ ساتھیوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر سونے کے ارادے سے میں اپنی کوٹھڑی میں آ گیا۔ اتنے میں کریم آیا۔ کہنے لگا کہ چلو نوٹنکی دیکھ آئیں۔ بنارس والے کی نوٹنکی آئی ہے۔ بنارس والے کی نوٹنکی صاحب بہت مشہور ہے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ چلو دیکھ ہی آئیں۔ خیر صاحب تو میں بھی اُس کے ساتھ ہو لیا۔ راستہ میں کریم کہنے لگا: اسے یار گھر میں جوان بہن بیٹھی ہے۔ اس کا کچھ انتظام کرنا ہے اور مزدوری کا یہ حال ہے کہ دو وقت کی دال روٹی مشکل سے چلتی ہے۔ شادی کر کے تو میں اور مصیبت میں پڑ گیا۔ ورنہ اس سے پہلے تو میں چین کرتا تھا۔ ماں جو کچھ کماتی تھی اس سے گھر کا کام چل جاتا تھا۔ اور مجھے جو کچھ ملتا تھا اُس سے اپنا خرچ چلاتا تھا۔ کوئی فکر نہ تھی۔ لیکن اب ماں بوڑھی ہو گئی ہے، اُسکے ہاتھ پاؤں نہیں چلتے، اس لئے سب کچھ مجھے ہی کرنا ہوتا ہے" اس کے بعد تھوڑی دیر تک وہ خاموش رہا، پھر کہنے لگا: ایک بات کہوں اگر کسی سے کہو نا" میں نے کہا: ہاں ہاں ضرور کہو، میں کسی سے نہ کہونگا" کہنے لگا: میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ حمید جو ہے، اچھا ہو جائے اور کچھ کمانے لگے تو اس کے ساتھ اپنی بہن کی بات چیت پکی کر دوں، آدمی اچھا ہے اور بیچارہ ہماری طرح غریب ہے، اور پھر میرا بار ہلکا ہو جائیگا اور اُسکی دُسرات ہو جائیگی" میں نے کہا: ہاں، ہاں، بات تو ٹھیک ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا یہ حمید کون ہے؟"

"اسے صاحب اُسی نے تو رات اپنے کو پھانسی دے لی ہے"

"اچھا تو اس کا نام حمید ہے، کچھ بیمار تھا؟"

"ہاں صاحب، شروع میں تو کالی کھانسی ہوئی تھی، بڑے دنوں میں جا کے ٹھیک ہوئی۔ پھر اُسے بخار رہنے لگا، پہلے تو وہ تھوڑی بہت مزدوری بھی کر لیتا تھا۔ لیکن اس بخار نے اس کی بالکل ہی کمر توڑ دی۔ اور بیچارہ بہت پریشان رہنے لگا۔ تو ہم لوگوں نے اُسے سمجھایا کہ بھئی اپنے گھر لوٹ جا لیکن وہ راضی نہ ہوا۔ کہنے لگا" بوڑھے باپ کو جا کے کیا مُنہ دکھاؤنگا۔ اور پھر وہ اس قابل بھی نہیں کہ مجھے بٹھا کے کھلائیں۔ اُنہیں اپنی روٹیوں کا ٹوٹا ہے"

"تو حمید دھلی کا رہنے والا نہ تھا۔ کسی اور جگہ سے آیا تھا"

"اس کا مکان امروہہ میں تھا۔ بیچارے کے ماں باپ نے نہ جانے کن کن مشکلوں سے تو اُسے انگریزی کے دسویں درجہ تک پڑھایا

تھا کہ بیٹا پڑھ لکھ کر کما کر کھلائے گا۔ نوکری کی تلاش میں ہی بیچارہ دلی آیا تھا۔ لیکن صاحب کہیں بھی نوکری نہ ملی۔ سارے شہر میں مارا مارا پھرا۔ گھر سے جو کچھ لیکر آیا تھا وہ بھی ختم ہوگیا۔ بڑے دنوں میں جاکر ایک دوکان پر نوکری ملی لیکن نہ معلوم کیوں کسی بات پر ایک دن سیٹھ سے تو تو میں میں ہوگئی اور اُس نے اُسے نکال دیا۔ اس کے بعد اُس نے نوکری کی بہتیری ہی کوشش کی لیکن کہیں بھی نہ ملی۔ دو چار وقت کے فاقوں کے بعد ہی ہماری طرح مزدوری کرنے پر مجبور ہوگیا اور ہمارے محلے میں کریم کی برابر والی کوٹھڑی میں آن بسا۔ اس کے بعد کریم سے اُس کی دوستی ہوگئی۔ وہ حمید کا بہت خیال رکھنے لگا۔ اور جب وہ بیمار ہوا تو کریم اور اُس کی بیوی دوا دارو اور کھانے کا برابر انتظام کرتے رہے ۔۔۔۔"

"تو یہ کہو کہ وہ اپنی اس زندگی سے عاجز آگیا تھا۔ بچارا پڑھا لکھا لڑکا اور اس طرح کی مزدوریاں کرنی پڑتی تھیں۔"

"ہاں صاحب، وہ بیچارہ بھلا ڈھلیا ڈھونے کا کہاں عادی، بیچارے پر پڑی تھی تو سہہ رہا تھا۔"

"ٹھیک ہے، واقعی وہ بیچارہ ایسے کاموں کا کہاں عادی ہوگا ۔۔۔ اچھا تو تمہیں اُسکے مرنے کی کب خبر ہوئی؟"

"میں نے کہا نا صاحب کہ ہم لوگ نوٹنکی دیکھنے گئے تھے، صبح تک ہم نوٹنکی دیکھتے رہے۔ صاحب ایسا اچھا سوانگ بھرا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ بس دیکھتے ہی رہو۔ کوئی چار ساڑھے چار بجے کے قریب ہم لوگ لوٹے۔ میں نے سوچا کہ دن میں کام کرنا ہے اس لئے تھوڑا سا سو لوں، اس لئے میں تو جاتے ہی سو گیا۔ ابھی مشکل سے کوئی ایک گھنٹہ سویا ہونگا کہ کریم بھاگا بھاگا آیا۔ بیچارہ کا سانس پھولا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ "غضب ہوگیا۔ حمید نے اپنے کو پھانسی دے لی۔ اُس کی لاش کڑمی میں لٹکی ہوئی ہے۔" صاحب میرا تو پسینہ چھوٹ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، تھوڑی دیر میں سارے محلے کو خبر ہوگئی اور خلقت ٹوٹ پڑی۔ سورج نکلتے نکلتے پولیس بھی آگئی۔ کریم چونکہ حمید کی برابر والی کوٹھڑی میں رہتا ہے اس لئے اُسے تو اُسی دم پکڑ لیا۔ اور اُس وقت سے اُس کی کئی بار پٹائی بھی ہو چکی ہے۔ کہتے ہیں کہ قبولو، پھانسی ہمیں نے ہی دی ہے۔ صاحب، کریم تو بالکل ہی بے قصور ہے۔ رات بھر تو وہ میرے ساتھ رہا۔ اُسکے گھر والے تو روتے روتے بُرا حال کئے لے رہے ہیں۔ اسی مصیبت میں پھنسا ہوا تھا جو اتنی دیر ہوگئی ورنہ میں تو آپکے ناشتہ کے وقت ضرور آجاتا۔"

"ہوں ۔۔۔ پولیس نے کوٹھڑی کی تلاشی ولاشی بھی لی؟"

"کہاں صاحب۔ کچھ نہیں۔ بس آتے ہی اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں پوچھیں اور پکڑ دھکڑ شروع کردی۔"

"اچھا تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہم چلتے ہیں تمہارے ساتھ دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"ہاں صاحب، آپ چلے چلیں تو بڑا کام بن جائے۔ کسی طرح بچارے کریم کو چھڑا لیجئے۔"

مرنے والے کی کوٹھڑی کے سامنے ابھی تک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میں ٹیکسی سے اُترا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا اندر پہونچا۔ ایک داروغہ صاحب کچھ لوگوں کے بیانات تحریر کر رہے تھے۔ کچھ دیر میں خاموش کھڑا رہا اور جب اُنہیں کچھ فرصت ہوئی تو میں نے اُن سے کہا: "داروغہ جی، میں آپ سے ذرا دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اُنہیں بتایا کہ میں خبر رساں ایجنسی کا نمائندہ ہوں۔ اور اس خودکشی کے متعلق مفصل حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

داروغہ جی نے مجھے سر سے پیر تک دیکھا اور پھر کسی قدر مُنہ بناتے ہوئے کہا: "آپ تو جانتے ہی ہیں، یہ حرامزادے چند روپوں کیلئے کسی

کی جان لے لینا بڑی بات نہیں سمجھتے۔ بس یہی ہوا ہے کہ اسکے پاس کچھ روپے ہونگے۔ دو چار آدمیوں نے ملکر اس کا روپیہ چھین لیا ہوگا اور جب اُس نے کچھ شور مچانے کی کوشش کی ہوگی تو اُس کی گردن میں پھندہ ڈال کر اُسے مار ڈالا۔ اور اب سب کے سب بالکل انجان بن رہے ہیں۔ گویا کچھ جانتے ہی نہیں "

"جی ہاں، یہ تو سب درست ہے، لیکن آپنے اس کی کوٹھڑی کی تلاشی بھی لی، میں نے سُنا ہے کہ مرنے والا پڑھا لکھا آدمی تھا"

"جناب کی باتیں، اسے صاحب یہ تو صاف کیس ہے، انہیں بدمعاشوں میں سے کسی کا کام ہے"

"لیکن سُنیئے تو، میں آپسے یہی درخواست کرونگا کہ آپ ایک بار کوٹھڑی کی تلاشی ضرور لے لیں۔ شاید اُس نے کسی وجہ سے خود ہی اپنے کو ہلاک کر لیا ہو۔ اور ممکن ہے وہ کوئی ایسی چیز چھوڑ گیا ہو، جس سے حالات پر مزید روشنی پڑ سکے"

بہت دیر تک جھک جھک کرنے کے بعد داروغہ جی نے کوٹھڑی کھلوائی۔ پیال پر ایک طرف لاش پڑی ہوئی تھی دوسری طرف کونے میں ایک پھٹی ہوئی دری پڑی تھی۔ ہم لوگ دیر تک پیال اور دری اور کوٹھڑی کی دوسری اشیاء کو دیکھتے رہے۔ لیکن کوئی چیز ایسی نظر نہ پڑی جس سے کچھ سراغ ملتا۔ دفعتاً میری نظر سامنے والے طاق پر پڑی جس میں ایک تہ شدہ کاغذ رکھا ہوا تھا۔ یہ اسپتال کا نسخہ تھا۔ اُس کی پُشت پر پنسل سے لکھا ہوا تھا۔

"میرے پیارے دوست کریم، مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں بہت تکلیف دی اور اب مرتے مرتے بھی تکلیف دے رہا ہوں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ بہت سوچ سمجھکر کر رہا ہوں۔ اسکے علاوہ کچھ چارہ ہی نہیں ہے۔ دیکھو میرے مرنے کی میرے گھر خبر نہ کرنا۔ گھر والوں کو ایک مدت سے میری کوئی خبر نہیں۔ اس لئے شاید وہ مجھے اس سے پہلے ہی مُردہ تصور کر چکے ہونگے۔ اس لئے اُنکو دوبارہ غم دینے سے کیا فائدہ۔ بھابی کی دیکھ بھال اچھی طرح کرنا۔ اُس بیچاری نے میری بہت خدمت کی ہے۔ تمہارا حمید"

خط سے تمام واقعات روشنی میں آگئے تھے۔ میں نے خط داروغہ جی کے حوالے کیا اور فوراً ہی وہاں سے چل دیا کیونکہ مجھے جلد از جلد یہ خبر اپنے آفس پہونچانی تھی۔ میں اپنی اس کامیابی پر بہت مسرور تھا اور ذہن میں اس حادثہ کے متعلق تمام واقعات کو ترتیب دے رہا تھا تاکہ اس خبر کو اخباروں میں بہترین صورت میں پیش کر سکوں اتنے میں باجوں کی آواز اور آتشبازی کے شور نے میرے خیالات کا تانتا توڑ دیا۔ چورا ہے پر تماشائیوں کا ایک ہجوم تھا۔ سامنے سڑک پر ایک لمبی چوڑی برات چلی جارہی تھی۔ آگے آگے آتشباز تھے جو اپنی اپنی آتشبازی کی نمائش کر رہے تھے۔ انکے پیچھے آٹھ دس قسم کے باجے۔ انکے پیچھے زرّیں جھولیں پہنے ہوئے گھوڑے اور ہاتھی جھومتے چلے جارہے تھے۔ انکے پیچھے پیچھے چھولداریاں لئے ہوئے سینکڑوں آدمی تھے۔ پھر ہزاروں کی تعداد میں مٹکیاں تھیں جو میووں اور مٹھائیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ برات شہر کے سب سے بڑے رئیس ———— کے بیٹے کی ہے۔ ایک صاحب نے یہ بھی بتایا کہ سیٹھ صاحب اس مبارک موقع پر ایک لاکھ روپیہ ایک مندر کی تعمیر کیلئے دے رہے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں عائدین شہر کی تقریریں بھی ہونگی۔

میں نے آفس میں خودکشی کی خبر داخل کی اور سیٹھ صاحب کی کوٹھی کا ارادہ کرکے جہاں مجھے عائدین شہر کی تقریریں سُننا تھیں روانہ ہوگیا۔ کیونکہ جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ مجھے تو زندگی کا ہر رُخ یکساں طور پر عزیز ہے۔

شاہد لطیف

وہی انوکھی انجمن

ناظرین کو غالباً یاد ہوگا کہ کوئی دو مہینے پہلے دکھی اور زخمی شوہروں کے آنسو پونچھنے اور انکی مرہم پٹی کی غرض سے ایک سبھا کے قیام کا اعلان کیا گیا تھا، یہ سبھا "انجمن انسدادِ بے رحمی بر شوہراں" کے نام سے چالو ہے اور خوب کام کر رہی ہے۔ اپنے مقاصد اور اغراض میں آہستہ آہستہ کامیابی ہو رہی ہے، اس کامیابی کا سہرا زیادہ تر اس کے سکریٹری، مشیر قانونی اور پبلیسٹی افسر کے سر ہے۔

پچھلے مہینے ایک بپتا یہ آن پڑی تھی کہ ہماری بعض ناسمجھ بہنیں پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں، پانی پی پی کر ہمیں کوس رہی تھیں اور یہ ارادہ کر رہی تھیں کہ ہماری توڑ پر ایک اپنی بھی انجمن بنائیں۔ کئی جلسے ہوئے۔ سنگتیں جمیں۔ چاء پانی کی دعوتیں ہوئیں۔ مگر ہوا وہی جو ہوتا تھا! یعنی۔ ج م۔

نشستند، گفتند، لڑیدند اور برخاستند

اب وہ ہمارے پاس روتی چلاتی، کان پکڑے ناک گھستی ہوئی آئی ہیں اور یہ چاہتی ہیں کہ انصاف کرنا ہو تو دونوں کے ساتھ کیا جائے یعنی ہر دو صنف کی بے رحمیوں کا انسداد کیا جائے۔ بات معقول تھی اس لئے اس درخواست پر سوچ بچار کرنے کے لئے ایک مخلوط جلسہ طلب کیا گیا، حاضرین کی خاصی تعداد تھی مگر وہ سب شوہر غائب تھے جنہوں نے انجمن کی بنیاد ڈالی تھی اس وجہ سے کہ انکی بیویاں اپنی پوری قوت میں جمع ہو گئی تھیں۔ بانیان انجمن میں سے صرف سکریٹری صاحب، مشیر قانونی اور پبلیسٹی افسر حاضر تھے۔ خوب بحث و مباحثے ہوئے، پُرجوش تقریریں ہوئیں اور بڑے غور و فکر کے بعد یہ طے پایا کہ ایک مخلوط عدالت ثالثی ([illegible]) قائم کی جائے اور اس میں دونوں کے جھگڑے چکائے جائیں اور جلسہ عام میں ثالث منتخب کئے جائیں، انکے فیصلے قطعی ہوں، ایک مدت تک "راز" میں ہیں اور ان کی تعمیل نہ ہونے کی صورت میں "پبلیسٹی افسر" کی خدمت میں بھیجدئے جائیں تاکہ وہ سارے واقعات کو ثالثی کے فیصلہ کے ساتھ "منظرِ عام" پر لے آئیں۔ مظلوم شوہروں کی طرح اُن بیویوں کو بھی اپنے واقعات لکھنے کی اجازت دی گئی جو اپنے بے رحم شوہروں کے مظالم کی آماجگاہ بنی ہوئی ہیں۔ یہ بھی طے ہوا کہ انجمن کے نام کے آخر میں "و زوجگاں" کا اضافہ کیا جائے، پس آئندہ سے انجمن کا نام ہوگا، "انجمن انسدادِ بے رحمی بر شوہراں و زوجگاں"۔ یقین ہے کہ اس اضافہ کے بعد ہماری لائق بہنوں کو انجمن کی رکنیت کے قبول کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہوگا۔ ملک کی اقتصادی پستی کے مدنظر فیس رکنیت صرف ایک روپیہ سالانہ رکھی گئی ہے۔

صلائے عام ہے مظلوم شوہران و زوجگاں کیلئے

گذشتہ جلسہ کی قرارداد کی تعمیل میں ایک جلسہ عام شب برات کی "رات" کو ٹھیک آٹھ بجے ہونا قرار پایا۔ چونکہ اس جلسہ کی اطلاع ایک مہینہ پہلے سے بڑے بڑے پوسٹروں، سینما سلائیڈوں، دستی اشتہاروں، ریل گاڑیوں کے تشہیری بورڈوں کے ذریعے ملک کے طول و عرض میں کافی سے زیادہ کی گئی تھی اس لئے حاضرین کی تعداد چیونٹیوں کو مات کر رہی تھی۔ ہر دو صنف کے افراد نے جی کھول کر اس میں حصّہ لیا تھا۔ پردہ کا معقول انتظام تھا مگر خواتین کی بڑی تعداد نے، اس خیال سے کہ دن کچھ نکٹی چپٹی یا ان پڑھ تو نہیں کہ مردوں کے سامنے آنے سے "شرم" کریں، مردوں کے دوش بدوش بیٹھکر جلسہ میں حصّہ لیا اور ایسی "زوردار" تقریریں کیں کہ جلسہ گاہ دس بیس مچھلی مارکیٹوں سے بھی زیادہ "رونق دار" بن گئی۔ خواتین کے رنگ برنگی "آستین چٹ"

مجرموں کو گرفتار کرتے وقت میں نے کہا ہے "کیا گورنمنٹ کے پھانسی کا تختہ تم جیسے بے شرم لوگوں کیلئے بنایا گیا ہے۔ نہ تو تم میں بلند حوصلگی ہے اور نہ تم کو اپنے نفس پر قابو حاصل ہے۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ تم نے اتنے بڑے جرم کے ارتکاب کی کیونکر ہمت کی؟"

جب میں پیرس اور لندن کی سڑکوں کے دونوں طرف فلک بوس عمارتوں اور محلات کا تصوّر کرتا ہوں تو میرے سارے جسم میں ایک سنسنی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس طرح وہاں کے لوگ بہت سے مشاغل، پیشے اور مصروفیات میں ہمہ تن محو نظر آتے ہیں ویسے ہی اُن کے درمیان جرائم کا بھی ایک چشمہ بہتا رہتا ہے۔ اسی کے وجود کے سبب سے اہل یورپ کے اطوار، کردار، اخلاق اور مذاق نے عظیم الشان جاذبیت حاصل کی ہے۔ لیکن کلکتہ کی سڑکوں کی کھلی ہوئی دریچیوں سے مکانوں میں کھانا پکانا، امور خانہ داری کی انجام دہی، سبق یاد کرنا، مقدمہ بازی کے متعلق گفتگو کے علاوہ کوئی دوسری بات ہی نہیں نظر آتی۔ یہاں کسی مکان کو دیکھکر یہ خیال ہی نہیں ہو سکتا کہ کسی گوشہ میں شیطان بیٹھا ہوا طرح طرح کے فسادات برپا کرنے کی تدابیر سوچ رہا ہے۔

میں اکثر سڑکوں کے راہگیروں کے اطوار اور نقل و حرکت کو بہت غائر نظر سے دیکھتا تھا۔ اگر کسی شخص کے متعلق ذرا شبہ ہوتا تو مَیں اس کا تعاقب کرتا۔ اُس کے نام و سکونت اور پورے حالات سے بغیر واقفیت حاصل کئے چین نہ لیتا۔ آخر کار اس نتیجہ پر پہونچکر آزردہ خاطر ہو جاتا کہ وہ نہایت شریف النفس اور بے قصور اشخاص ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کے رشتہ داروں اور اعزّا کو بھی اُن سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ راہگیروں میں سے جو مجھے سب سے زیادہ فسادی معلوم ہوا۔ حتیٰ کہ اسے دیکھکر مجھے پورا یقین ہو گیا کہ یہ ابھی کوئی بہت بڑا جرم کر کے چلا آرہا ہے۔ اس کے متعلق بھی تحقیقات کرنے سے یہی انکشاف ہوا کہ وہ نہایت سیدھا سادا کسی اسکول کا امن پسند مدرس ہے اور لڑکوں کو چھٹی دیکر گھر جا رہا ہے۔ اگر یہ لوگ کسی اور ملک میں ہوتے تو نہایت کامیاب چور اور ڈاکو بن سکتے تھے۔ اولو العزمی اور عالی ہمتی کے جوہر سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے اس بدبخت ملک میں پیدا ہو کر وہ محض مدرّسی پر اکتفا کرتے ہیں اور پنشن لیکر مر جائیں گے۔ میں نے اس مدرّس کے استغنا اور بے حسی پر سخت نفریں کیا۔ غالباً ایسی نفرت ذلیل تریں حرکت مثلاً ایک لوٹا یا کٹورا اُچرلنے پر بھی نہ ہوتی۔

میں نے ایک دن شام کو اپنے مکان کے نیچے گیس کے ستون کے قریب ایک آدمی کو دیکھا جو متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر ذرا بھی شک کی گنجائش نہ رہی کہ وہ کسی جُرم کی تیاری کر رہا ہے۔ میں نے تاریکی میں چھُپ کر اُسے بخوبی شناخت کر لیا۔ وہ ایک جوان اور خوشرو شخص تھا۔ میں نے دل میں خیال کر لیا کہ جرائم کرنے کیلئے ایسے ہی چہرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے چہرے خود اُن کے خلاف شہادت دیتے ہوں اُن کو تو ہر قسم کے فسادات سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیئے۔ ایسے لوگ شاید نیک کاموں میں سرخ روئی حاصل کر لیں لیکن بُرے کاموں میں انکے لئے کامیابی بالکل ناممکن ہے۔ میں نے غور کیا کہ اس لڑکے کا چہرہ اس کیلئے سب سے زبردست آلۂ کار ہے۔ میں نے دل میں اس کی خوب تعریف کی اور کہا خدا نے جو صفات و خصوصیات تم کو ودیعت کی ہیں تم کو ان سے کماحقہٗ مستفید ہونا چاہیئے۔ فی الحقیقت تم قابل ستائش ہو"

میں اندھیرے سے نکل کر اس کے سامنے آگیا اور اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا "کہو اچھے تو ہو" وہ یکایک میری آواز سُنکر چونک گیا اور اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ میں نے کہا "معاف کیجئے۔ مجھے کچھ غلط فہمی ہو گئی" لیکن اپنے دل میں کہا۔ غلط فہمی ذرا بھی نہیں ہوئی۔ تم کو میں نے جو کچھ سمجھا تھا تم بالکل وہی نکلے۔ لیکن اسقدر گھبرا جانا اسکے لئے نامناسب تھا۔ بلکہ اُسے اپنے دل پر قابو رکھنا چاہیئے تھا۔

وہاں سے ہٹ کر میں نے آڑ میں سے دیکھا کہ وہ خائف ہو کر اس جگہ سے چلدیا۔ میں نے بھی اس کا تعاقب کیا۔ دیکھا کہ ایک تالاب کے

کنارے چٹائی پر جا کر لیٹ گیا۔ میں نے خیال کیا کہ کسی امر پر غور و فکر کرنے کے لئے یہ بہت مناسب مقام ہے۔ گیس کے ستون کے نیچے سے تو یہ جگہ بدرجہا بہتر ہے۔ یہاں لوگ شبہ کر کے زیادہ سے زیادہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ اپنی مہ جبیں محبوبہ کی یاد میں محو ہے۔ اس طرح اس نوجوان نے میری توجہ کو اپنی طرف اور زیادہ مرکوز کر لیا۔

میں نے اُس کی قیامگاہ کا بھی پتہ معلوم کر لیا اور یہ بھی دریافت کر لیا کہ اس کا نام مُنّھَہ ہے اور وہ کسی کالج میں تعلیم پا رہا ہے۔ امسال امتحان میں ناکامیاب ہونے کی وجہ سے وہ موسم سرما کی تعطیل میں اپنے گھر نہیں گیا۔ حالانکہ اُس کے تمام ہم جماعت طلبہ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ میں نے اس امر کی تحقیقات کا مصمم ارادہ کر لیا کہ جب سب طلبہ اس طویل تعطیل میں کلکتہ چھوڑ کر اپنے اپنے وطن کو رخصت ہو گئے تو کون سی وجہ مانع ہوئی کہ وہ ابتک نہیں گیا؟۔

بالآخر میں بھی ایک طالب علم بن گیا اور اس کے کمرے کے ایک حصّہ میں اقامت پذیر ہو گیا۔ جب اُس نے مجھے پہلے دن دیکھا تو وہ میرے چہرے کو اس طرح غائر نظر سے دیکھ رہا تھا کہ میں اس کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت متعجب ہوا اور میرے مقصد کو سمجھ گیا ہے۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ ایک اچھے شکاری کیلئے یہ بہترین شکار ہے۔ اس پر کوئی شخص بہ آسانی قابو نہیں حاصل کر سکتا۔

لیکن جب میں نے اُسے اپنا دوست بنانے کی خواہش ظاہر کی تو وہ بہت سہولت سے میرے قابو میں آگیا۔ اور ذرا بھی پس و پیش نہ کیا۔ مجھے یہ ضرور معلوم ہوا کہ وہ مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے اور مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ استادوں کی یہی خصوصیت ہونی چاہیئے کہ اُن کی نظر ہر وقت فطرتِ انسانی پر رہے۔ اس قدر کم عمر میں اُس کی ایسی چالاکی اور چستی دیکھکر مجھے بہت مسرت ہوئی۔

میں نے سوچا کہ جب تک ایک نازنین کو آلۂ کار نہ بناؤنگا اُس وقت تک اس شریر لڑکے کے متعلق رازہائے سربستہ کا انکشاف ہونا ناممکن ہے۔

ایک دن میں نے مسرت آمیز لہجہ میں کہا: "بھائی مُنّھہ! میں ایک مہ جبیں پر دل سے شیدا ہوں لیکن وہ میری طرف ذرا بھی ملتفت نہیں ہوتی۔"

پہلے تو اُس نے متحیر ہو کر مجھے دیکھا پھر ہنس کر کہا: "یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے۔ خُدا نے ایسے ہی کرشمے دکھانے کے لئے مرد اور عورت پیدا کئے ہیں۔"

میں نے کہا: "میں اس معاملہ میں تمہارے مشورے اور امداد کا طالب ہوں۔"

وہ فوراً دونوں باتوں کے لئے تیار ہو گیا۔

تب میں نے ایک طویل داستان اختراع کر کے بیان کرنا شروع کیا۔ گو کہ اُس نے میری داستان کو ابتدا سے لیکر انتہا تک نہایت دلچسپی اور محویت کے ساتھ سُنا لیکن خود بالکل خاموش رہا۔ میں نے سوچا کہ جب کسی سے عشق و محبت کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو اس سے بے تکلفی ہو جاتی ہے لیکن موجودہ صورت میں ایسے کچھ آثار نمایاں نہ ہوئے۔ لڑکے نے شروع سے سکوت اختیار کر لیا تھا اور سب باتیں سُنکر اپنے لوحِ قلب پر منقوش کر لیں۔ اس سے اسکی عظمت و منزلت میرے دل میں اور زیادہ ہو گئی۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ وہ روزانہ دروازہ بند کر کے کیا کیا کرتا ہے اور اُسنے اپنے فن میں کس حد تک مہارت حاصل کی ہے۔ لیکن

س کے متعلق مجھے ذرا بھی شک نہ تھا کہ وہ بہت آگے قدم بڑھا چکا ہے۔ اس کے بُشرے سے یہ عیاں تھا کہ وہ کسی اہم کام میں منہمک ہے جو اب پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا ہے۔ میں نے موقع پاکر ایک دوسری کُنجی سے اس کے ڈسک کو کھول کر دیکھا کہ اس میں ایک نظم کی کتاب۔ کچھ کالج کے لکچروں کے نوٹ اور کچھ اُس کے اعزا کے خطوط تھے۔ ان کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ ان خطوط کے پڑھنے سے یہی منکشف ہوتا تھا کہ وہ باوجود اصرار اور تاکید کے تعطیل میں بھی اپنے گھر نہیں گیا۔ میں نے سوچا کہ یقیناً کوئی خاص کشش ہے جو اُسے یہاں روک رہی ہے۔

ابتک اُس کے بھیدوں کے مخفی رہنے کی وجہ سے میری بے قراری اور بے چینی میں اور بھی اضافہ ہوا۔ میں نے اس کے متعلق اب قطعی طور پر رائے قائم کرلی کہ وہ ایک معمولی طالب علم نہیں ہے بلکہ اہلِ دنیا کو ہلاکت اور تباہی کی طرف کھینچنے والا بہت بڑا فسادی ہے۔

بالآخر مجھے ایک خوشرو نازنین سے استمداد کرنا پڑا۔ پولیس کی وظیفہ خوار ہرمیتی نے بہت اعانت کی۔ میں نے کہا: میں ہرمیتی پر فریفتہ ہوں۔ در اس کی محبت کا تشنہ کام ہوں۔ میں اکثر اُسے دیکھ کر عاشقانہ نظمیں پڑھتا تھا اور ہرمیتی بھی کبھی درد انگیز لہجہ میں اور کبھی تفنناً غزلیں پڑھا رتی تھی اور یہ اظہار کرتی کہ میں منمتھ پر وارفتہ اور دلدادہ ہوں لیکن ان تدابیر سے کوئی اُمید افزا صورت نہ پیدا ہوئی۔

اسی طرح ایک دن دوپہر کو منمتھ کی میز پر مجھے ایک خط کے کچھ ٹکڑے نظر آئے۔ میں نے سب کو اٹھا لیا۔ ٹکڑوں کو جوڑ کر اس میں سے یک نامکمل جملہ پڑھا: "آج شام کو سات بجے چھپکر میں تمہارے گھر پر۔ . . . " باوجود سخت کوشش کے کوئی اور بات نہ معلوم ہوسکی۔ بہرحال جملے کے یک جزو سے بھی مجھے بہت خوشی ہوئی۔

میں جانتا تھا کہ آج رات کو دس بجے ہرمیتی میرے گھر پر آئیگی۔ پھر ایسی صورت میں سات بجے شب میں کونسا واقعہ پیش آنیوالا ہے۔ فی الحقیقت یہ نوجوان جس قدر عالی ہمت ہے، ویسے ہی دُور اندیش بھی معلوم ہوتا ہے۔ اگر پوشیدہ طور پر کوئی جرم کرنا ہو تو جس دن گھر کے لوگ دوسرے کاموں میں منہمک ہوں تو اسوقت موقع پاکر اُسے کرڈالنا چاہیئے۔ کیونکہ ایسے موقع پر اوّل تو سب کی نظر اصل کام کی طرف ہوتی ہے اور دوسرے تو یہ یقین ہی نہیں ہوسکتا کہ جہاں پر لوگ کسی خاص تقریب میں محو ہیں وہاں اُس دن قصداً کوئی خفیہ جرم بھی ہوسکتا ہے۔

مجھے دفعتاً شبہ ہوا کہ ہماری دوستی اور ہرمیتی کی محبّت کو منمتھ نے اپنی مقصد براری کا وسیلہ تو نہیں بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو وہ خود گرفتار ہوتا ہے اور نہ ہم سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔ وہ اس شک کو بھی رفع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کہ ہم لوگ اُس کی کارروائیوں میں کسی طرح مانع ہیں۔ اور سب لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ہم لوگوں کی وجہ سے کسقدر حیران و پریشان رہتا ہے۔

ان سب باتوں پر ایک مرتبہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جو طالب علم تعطیل کے زمانے میں اپنے اعزا و قربا کی منت سماجت، لعنت ملامت کی بالکل پروا نہ کرکے ایک کمرے میں تنہا پڑا رہتا ہے اس کے لئے اُسے خلوت کی سخت ضرورت ہے۔ ہم لوگ اس کے کمرے کے ایک حصّہ پر قابض ہوکر اس کے سکوت و خلوت میں رخنہ انداز ہوئے۔ اس کے علاوہ مہ جبیں کا ورود ایک نئے فساد کا باعث ہوا۔ باوجود ان سب باتوں کے اس نے کبھی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ نہ تو وہ کمرہ چھوڑتا ہے اور نہ ہماری صحبت سے اجتناب کرتا ہے۔ اس کے سوائے یہ امر بھی یقینی ہے کہ وہ ہرمیتی یا مجھ سے ذرا بھی اُنس نہیں رکھتا۔ کیونکہ میں نے کبھی کبھی اُسے غافل پاکر یہ غور کیا ہے کہ اُسے ہم لوگوں سے سخت نفرت ہے۔ یہ سب واقعات کن اُمور پر دلالت کرتے ہیں؟

اس کا صرف یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ کئی آدمیوں کی موجودگی کی صفائی پیش کرکے خلوت کی سہولتوں سے مستفید ہونا چاہیئے۔ اس میں کامیابی کی بہترین ترکیب یہی ہے کہ مجھ جیسے نووارد شخص کو اپنی مصاحبت میں رکھا جائے۔ پھر کسی کام میں ہمہ تن مصروف ہوکر فتحیابی حاصل

کرنے کا اس نازنین سے بہتر کوئی دوسرا وسیلہ نہیں ہوسکتا ہے۔ منتہ کے اخلاق و اطوار اب تک جس قدر بے معنی اور مشتبہ تھے اب ہم لوگوں کے وارد ہونے کے بعد ویسے نہ رہے۔ لیکن یہ خیال کرکے میرے سارے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور مجھے اور زیادہ جسارت ہوئی کہ ہمارے ملک میں بھی ایسے تیز فہم اور دُور اندیش شخص پیدا ہوسکتے ہیں جو آئندہ کی باتوں کو چشم زدن میں سوچ لیتے ہیں۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ معلوم نہیں منتہ میرے متعلق کیا رائے قائم کریگا تو میں اُسے بغیر گلے لگائے نہ رہتا۔

اس دن مُلاقات ہوتے ہی میں نے منتہ سے کہا "میں نے سوچا ہے کہ آج ہم لوگ ہوٹل میں چلکر کھانا کھائیں" یہ سُنتے ہی وہ کچھ چونک گیا۔ کچھ لمحہ کے بعد سوچکر بولا "بھائی معاف کرو۔ آج میرے معدے کی حالت اچھی نہیں ہے"

اس سے قبل میں نے کبھی منتہ کو ہوٹل جانے سے انکار کرتے نہ دیکھا تھا۔

اُس دن یہ بات طے ہوچکی تھی کہ میں شام کو گھر پر نہ رہونگا۔ لیکن اس کے پاس بیٹھ کر باتوں کا کچھ ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ شام تک جاری رہا۔ وقت گذرنے لگا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں وہاں سے ہٹنے کے لئے ذرا بھی آمادہ نظر نہیں آتا تو اُس کی بیقراری بڑھنے لگی۔ میری سب باتوں پر حامی بھرنا شروع کیا اور مجھ سے ذرا بھی اختلاف نہ کرتا تھا۔ آخر کار جب اس کی بے چینی ناقابل برداشت ہوگئی تو اُس نے گھڑی کی طرف مضطربانہ انداز سے دیکھکر کہا "کیا آج آپ ہرمتی کو بُلانے نہ جائیں گے؟"

میں نے فوراً چونک کر کہا "ہاں ہاں۔ یہ تو میں بُھول ہی گیا تھا۔ اچھا تو میں جاتا ہوں۔ تم کھانا وغیرہ تیار رکھنا۔ میں اسے لیکر ٹھیک دس بجے آؤنگا" یہ کہکر میں وہاں سے روانہ ہوگیا۔

میں فرطِ مسرت سے وجد میں آگیا۔ سات بجے منتہ کو جو بیقراری تھی میں اس سے بھی زیادہ مضطرب تھا۔ میں اپنے گھر کے قریب ایک جگہ چُھپ گیا اور نہایت بے صبری سے گھڑی کو بار بار دیکھتا تھا۔ جب اندھیرا ہوگیا اور سڑکوں کے کنارے کے لیمپ روشن ہوگئے تو ایک پردہ پڑی ہوئی پالکی ہمارے گھر میں داخل ہوئی۔ یہ سوچ کر میرے جسم میں ایک سنسنی پیدا ہوئی کہ اس پالکی کے اندر کونسی آفت کی پرکالہ رونق افروز ہے جو اس کالج کے طالب علم کی قیامگاہ میں کہاروں کے کندھوں پر سوار ہوکر ہاہو ہاہو کرتی بغیر کسی مقصد کے داخل ہورہی ہے۔

جب مجھ میں صبر کی طاقت باقی نہ رہی تو میں نے آہستہ آہستہ زینے سے چڑھنا شروع کیا اور اُوپر کی منزل پر پہونچ گیا۔ دلی تمنا تو یہی تھی کہ خاموش رہ کر سب باتیں سُنوں۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ کیونکہ زینے کے سامنے کے کمرے میں منتہ زینے کی طرف رُخ کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ اور ایک عورت شیریں لہجہ میں گفتگو کررہی ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ منتہ نے مجھے دیکھ لیا تو جلدی سے کمرے میں داخل ہوکر کہا "بھائی۔ میں کمرے میں اپنی گھڑی چھوڑ گیا تھا اُسے لینے آیا ہوں"

منتہ اب بدحواس ہوکر زمین پر گرنا چاہتا تھا۔ میں نے اشتیاق و مسرت سے بے چین ہوکر کہا "بھئی! تم کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے" لیکن وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ تب میں نے اس خاموش و ساکت گھونگھٹ والی عورت کی طرف پھر کر کہا "آپ منتہ کی کون ہیں؟" گو کہ اُس نے کچھ جواب نہ دیا لیکن میں نے دیکھا کہ منتہ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ بلکہ وہ میری بیوی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کا تذکرہ فضول ہے۔

ناظرین! دیکھئے میری جاسوسی کی بسم اللہ اس شاندار کامیابی کے ساتھ ہوئی۔

کچھ دنوں کے بعد میں نے ڈیٹیکٹیو انسپکٹر بابو فہم چندر سے کہا "یہ ممکن ہے کہ منتہ کے ساتھ تمہاری بیوی کے تعلقات شاید سماج

سے خلاف نہ ہوں ۔۔۔"

فہم چند رنے کہا" نہ ہونے کا ہی زیادہ امکان ہے۔ کیونکہ میری بیوی کے صندوق سے متمتہ کا خط برآمد ہوا ہے" یہ کہکر اُس نے وہ خط میرے ہاتھ میں رکھدیا۔ اس کا مضمون یہ تھا۔

محترمہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

معلوم ہوتا ہے کہ اتنا عرصہ گذرنے کی وجہ سے تم مجھے بھول گئی ہوگی۔ بچپن میں جب میں اپنے ماموں کے گھر جاتا تھا تو ہمیشہ تمہارے ہاں جاکر تمہارے ساتھ کھیلا کودا کرتا تھا۔ ہم لوگوں کے وہ کھیل اور کھیلنے کودنے کے وہ تعلقات اب نہ باقی رہے۔ معلوم نہیں تم کو یہ خبر ہے یا نہیں کہ ایک مرتبہ میں نے نہایت بے صبر ہوکر اور شرم کو بالائے طاق رکھ کر تمہارے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی بجید کوشش کی۔ لیکن بڑی دشواری یہ ہوئی کہ ہم دونوں قریب قریب ہم عمر تھے۔ اسلئے دونوں طرف کے لوگوں نے اس رشتہ کو نامناسب قرار دیا۔

اس کے بعد تمہاری شادی ہوگئی۔ چار پانچ برس تک میں تمہاری خیر و عافیت سے بالکل بیخبر تھا۔ اور پانچ چھ ماہ ہوئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ اب تمہارے خاوند تبدیل ہوکر کلکتہ میں آتے ہیں۔ تب میں نے تمہارے گھر کا پتہ دریافت کیا۔

مجھے تم سے ملاقات کی کوئی اُمید تو نہیں ہے اور نہ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے خانگی سکون و اطمینان میں کسی طرح کا انتشار پیدا کروں۔ شام کو تمہارے گھر کے سامنے ایک گیس کے ستون کے نیچے میں ایک آفتاب پرست کی طرح کھڑا رہتا ہوں تم روزانہ ساڑھے سات بجے بالاخانہ کے داہنے جانب کے کمرے کی شیشے والی کھڑکی کے سامنے ایک لیمپ روشن کرکے رکھدیتی ہو۔ اور اس وقت تھوڑی دیر کیلئے تمہاری شبیہہ کا جلوہ دیکھ لیتا ہوں۔ اگر میں نے کوئی جرم کیا ہے تو بس یہی ایک۔

اس عرصہ میں تمہارے خاوند سے میرا تعارف ہوا اور رفتہ رفتہ دوستی کے تعلقات قائم ہوگئے۔ ان کے اطوار و کردار سے مجھے ابتک جو کچھ واقفیت ہوئی ہو اُس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ تم کو قلبی سکون و اطمینان نہیں حاصل ہو۔ تم پر میرا کوئی سماجی اختیار تو نہیں ہو۔ جس خدا نے میرے دل میں تمہاری تکالیف کا احساس پیدا کیا ہے۔ اُسی نے تمہارے مصائب کو رفع کرنے کی ذمہ داری میرے اُوپر عائد کی ہو۔

لیکن میری گستاخی معاف کرو۔ اگر تم جمعہ کی شام کو ٹھیک سات بجے نہایت خاموشی سے پالکی میں بیٹھکر صرف بیس منٹ کے لئے میرے گھر پر آجاؤ تو بہت سے مخفی اُمور کا اظہار کرونگا۔ تم کو ان باتوں کا یقین نہ ہو اور گوارہ کرو تو میں اس کا مجسم ثبوت بھی دے سکتا ہوں۔ اور کچھ مشورہ بھی دونگا۔ میں خدا کو شاہد و ناظر سمجھکر کہتا ہوں کہ اگر تم میری نصیحتوں پر عمل کروگی تو تمہاری زندگی ضرور مسرت آگیں اور پُرسکون ہوجائے گی۔

میری یہ التجا کسی قسم کی خود غرضی یا نفسانیت پر مبنی نہیں ہے۔ تھوڑی دیر تم کو روبرو دیکھ لونگا، تمہاری باتیں سُنوں گا اور تمہارے قدوم میمنت لزوم سے میں مفتخر بنوں گا۔ اگر تم کو مجھ پر اعتماد نہ ہو اور اس برکت سے مجھے محروم رکھنا چاہتی ہو تو اس کی بھی اطلاع مجھے دیدینا۔ تو مجبوراً خط کے ذریعے سے تم کو سب باتوں سے آگاہ کرونگا۔ اگر تحریر کا بھی اعتبار نہ ہو تو یہ خط تم اپنے خاوند کو بھی دکھا سکتی ہو۔ پھر مجھے جو کچھ کہنا ہے میں اُنہیں سے کہدونگا۔

(ٹیگور) ایس۔ احمد۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔

سازِ انا

اب عطاہائے فراواں سے گرانبار ہوں میں ۔۔۔ کچھ نہ تھا پاس تو رونا تھا کہ نادار ہوں میں
ہیں فغاں کوشیاں ہی مقصدِ ہستی شاید! ۔۔۔ ورنہ کس واسطے یارب ہمہ تن زار ہوں میں

اپنی ہستی کے مد و جزر سے لاعلم ہی ہوں! ۔۔۔ گو ازل ہی سے سراپردۂ افکار ہوں میں
حُسنِ ظن فطرتِ شوریدہ سے نکلا بے سود ۔۔۔ بے نقابی سے حقیقت کی دل افگار ہوں میں

فرض پر بھینٹ چڑھا ڈالی محبت جس نے! ۔۔۔ اُف، وہ مجرم، وہ کم اندیشِ زیاں کار ہوں میں
ہوں گنہگار میں، اُسکی بھی خدا کی بھی، مگر! ۔۔۔ شرحِ "کُن" کی بھی خُدا ہی سے طلبگار ہوں میں

گُم فراوانیِ احساس میں ہیں ہوش و حواس ۔۔۔ نہ گرانبار ہوں ہمدم نہ سُبکسار ہوں میں
یاسِ پُرشوق کی اللہ رے ہمت زائی! ۔۔۔ کہ جہنم میں بھی آسودۂ گلزار ہوں میں

لفظِ غمخوار تو شرمندۂ معنی ہی نہیں! ۔۔۔ خود ہی ہوں سوگ نشیں، خود ہی عزادار ہوں میں
آہ، مَیں کیا ہوں! یہ ابتک مجھے معلوم نہیں ۔۔۔ خود ہی اپنے لئے اک عقدۂ دشوار ہوں میں

"دلفگار"

ناہید

گھٹائیں جھوم رہی ہیں فضاؤں میں ناہید! ۔۔۔ ہجومِ کیف ہے ٹھنڈی ہواؤں میں ناہید!
وہ جوشِ لالہ و گل ہے وہ ہے بہار کا رنگ ۔۔۔ ڈھلی ہے آگ کے سانچوں میں خاکداں کی اُمنگ
نگارِ جلوۂ فطرت کھڑی ہے زُلف بدوش ۔۔۔ فضائے دہر ہے یا کارگاہِ بادہ فروش
برس رہی ہے سرِ خاک کچھ عجیب بہار! ۔۔۔ ربابِ و نغمۂ دلکش، شراب و حُسنِ نگار

مگر بایں ہمہ! میں ہوں رہینِ رنج و ملال
ترے جمیل تصور میں منہمک ہے خیال!

کاوش حیدرآبادی

(بسلسلۂ گذشتہ)

ریاضِ رضوان

خمریات

جن لوگوں نے ریاضؔ کے کلام کا مطالعہ کیا ہے، عام طور ان کی یہی رائے ہے کہ ریاضؔ ایک رندِ مے آشام شاعر تھے۔ جام و بادہ ان کا مشرب، ساغر و مینا ان کا مذہب، اور پیمانہ و صہبا ان کا مقصدِ حیات تھا، اس لئے کہ شراب کا ذکر جس تنوع، لُطف، اور کیف سے اُنہوں نے کیا ہے کسی نے نہیں کیا، عربی زبان میں خمریات کا امام ابونواس تھا، اور لاریب کہ عربی زبان اُس کا کوئی حریف نہ پیدا کر سکی۔ فارسی زبان میں حافظ کی شراب معرفت اور شرابِ حقیقی لٹریچر میں ایک گراں بہا اضافہ ہے اور بلاشبہ فارسی زبان میں حافظ کا کوئی مدمقابل نہیں پیدا ہو سکا۔ اُردو زبان میں ریاضؔ نے خمریات کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت دی، اور بلا اندیشۂ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان کا کوئی شاعر عام اس سے کہ وہ دہلی سے متعلق ہو یا لکھنؤ سے، میرؔ و سوداؔ کے زمانہ کا ہو یا آتشؔ و ناسخؔ کے، "لہرا کے پی گیا کے شراب پیتا ہو، یا" بر سبیلِ تذکرہ" یہ شاعرانہ کیفیت اپنے اوپر طاری کر لیتا ہو، ریاضؔ سے بازی نہ لے جا سکا۔ حالانکہ ریاضؔ کا دامن بادہ گلگوں کے داغ سے بالکل صاف ہے، اُنہوں نے ممکن ہے دوسرے گناہ کئے ہوں لیکن شراب پینے کا گناہ اُن سے کبھی سرزد نہیں ہوا۔

شراب کا ذکر وہ برجستگی، بے ساختگی، اور روانی سے کرتے ہیں، نئے خیالات، نئے مصطلحات، نیا اندازِ بیان، نیا اسلوبِ ذکر، انکے خمریات کا مابہ الامتیاز ہے۔ وہ کبھی اُسے "میکدہ والی" کہتے ہیں، کبھی "کالی کالی بوتلوں میں لال لال" "چیز" کی تنبیہ سے کام نکالتے ہیں، کبھی اُس کا مقام ظرفِ وضو میں ہوتا ہے، کبھی زمزمی میں، کبھی شیخ کے حجرے میں کبھی طاقِ مسجد میں۔

جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، ریاضؔ جس کیفیت کا اظہار کرتے ہیں پہلے اُسے اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔ خمریات میں اُن کی غیر معمولی کامیابی کا راز یہی ہے۔

میں کہیں جاؤں وہ محشر ہو کہ ہو محفلِ وعظ — دوش پر میرے سبو ہاتھ میں مینا ہوگا

ہوگا جنہیں توبہ کا بھروسہ مرے مالک — وہ اور ہی ہونگے یہ گنہگار نہ ہوگا

ہم گرے جب لڑکھڑا کر بزم میں — سر سبو پر ہاتھ ساغر پر پڑا

دیکھ واعظ مجھکو، میں کیا ہوگیا — آدمی تھا، پی! فرشتہ ہوگیا!

مے خرابے میں ہمیں پیدا طولیٰ کیسا — ہم اُڑا لائے سبو آج اچھوتا کیسا

چلو ہی بھر سہی ہمیں تسکین اس سے تھی — جب تک سبو میں تھی غمِ فردا تو کچھ نہ تھا

کبھی ممکن نہیں میخانہ کا ویراں ہونا — کبھی ممکن نہیں جنّت کا بیاباں ہونا

چلے نہ کام بھرے خم اگر نہ ساتھ چلیں — حرم کی راہ میں کوسوں کنواں نہیں ملتا

ہم پیے نوش جو لب کھولتے واعظ کی طرح — صحنِ مسجد میں رواں چشمۂ کوثر ہوتا

اُتری ہو آسمان سے جو کل اُٹھا تو لا — طاقِ حرم سے شیخ وہ بوتل اُٹھا تو لا

دھونا ہے داغ جامۂ احرام صبح صبح — حجرے سے شیخ پانی کی چھاگل اُٹھا تو لا

مجھکو بھی انتظار تھا ابر آئے تو پیوں — ساقی اگر یہ سچ ہے کہ بادل اُٹھا تو لا

میں کام لونگا ابر کا اے رند تان کر — تو مجھ فقیرِ مست کا کمل اُٹھا تو لا

مُنہ پونچھ کے کہنا وہ مرا شیخ حرم سے — ہاں نام سے زمزم کے ذرا قبلہ دیں اور

ریاضؔ ہائے ستے تیرا وہ خراب کا انداز — سبو تو ہے تہِ دستِ شوق، ساغر پہ

پہونچے کعبہ میں ہم شراب فروش
بیچکے مشکیزہ بن کے آب فروش

یہ سُرخ سُرخ سی شئے اک سیاہ بوتل میں
بقیۂ ابر بھی ہے سبزہ زار کے قابل

کیا کیا خوشامدیں ہیں کہ پی لوں بہار میں
سر پر یہ ٹکڑے ابر کے کیوں چھائے جاتے ہیں

وہ شے آج واعظ کو ہم نے پلاکر
مٹائے خیالات باطل ہزاروں

اُٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانہ کو ہو آئے
پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں

شورِ قلقل میں مگر آوازِ اذاں ہے اے شیخ
یہ بہت خوب کہی میکدہ آباد نہیں

جی نہ مانا حضرت ناصح کو آتے دیکھ کر
کچھ یونہی تھوڑی سی پی لی دل لگی کے واسطے

نام توبہ لیتے ہی مجھ پر برس پڑتا ہے یہ
توبہ شکستہ ہے رگِ ابرِ کرم کے واسطے

آئے میخانہ میں جب مسجدِ جامع سے ریاض
ساتھ ہی آپ کے قبلہ سے گھٹا بھی آئی

یہ عالم ہے ریاض اک ایک قطرے کو ترستا ہوں
حرم میں اب خدا جانے بھری بوتل کہاں رکھدی

جامِ مے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے!

اتنی پی ہے کہ بعد توبہ بھی
بے پیئے بےخودی سی رہتی ہے

اچھی پی لی خراب پی لی
جیسی پائی شراب پی لی

عادت سی ہے نشہ ہے اب نہ کیف
ملا نہ پیا شراب پی لی

ڈاڑھی کی نہیں ریاض اب شرم
جب پا گئے بے حساب پی لی

تیسرے فاقہ ہمیں دانۂ انگور ملے
ہم یہ سمجھے کہ بھرے ساغرِ بلور ملے

ندرتِ تشبیہ

رسائیِ فکر، بلندیِ خیال، اور تیزیِ طبع؛ یہ عناصر ہیں جو شاعر کے کلام کو نادر تشبیہوں سے مزین کرتے ہیں، اس صنعت کلام کو وہی شاعر نباہ سکتا ہے جو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت رکھتا ہو، بات میں بات پیدا کر سکتا ہو۔

حضرت مرحوم کے کلام میں ایسے اشعار بھی بڑی تعداد میں ملتے ہیں جن میں انہوں نے زبان و بیان پہ ماہرانہ دسترس کا ثبوت نادر اور انوکھی تشبیہوں کو استعمال کر کے دیا ہے، مثال کے لئے چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

کیا تجھ سے ترے مست نے مانگا ہے الٰہ
ہر موج شراب اٹھ کے بنی ہاتھ دعا کا

اُچھلا جو یہ بوتل سے تو بن آئے گی لے شیخ
اس کاگ سے اچھا کُلَہِ دستار نہ ہوگا

میں تو سمجھا پنکھڑی ہے پھول کی
کس قدر بانکا ترا خنجر پڑا

نشہ میں گر کے ہاتھ سے ساغر ہوا جو چور
ہر ریزہ جا کے سبزۂ لبِ آبجو ہوا

زندگی آٹھ پہر لطف سے کٹتی قاتل
سانس کی طرح رواں سینہ میں خنجر ہوتا

رات سے بن گئی دن رخ سے الٹ دی جو نقاب
کھول دی زلف جہاں ہو گئی بے رات کی رات

وہ تابشِ دُرِ دنداں وہ جنبشِ لبِ تر
رواں ہے کشتیِ مے کیسی آبِ گوہر پہ

نہیں ہے آنکھ ڈیوڑھی ہے یہ کاشانۂ دل کی
اسی پردے میں وہ آکر سواری سے اترتے ہیں

کتنی نازک ہیں چوڑیاں اُن کی
ایسی تو چینِ آستیں بھی نہیں

کچھ بھی چلے نہ کام بڑھاپے میں اے ریاض
اٹھ کر یہ سوچئے جو ہمارا عصا نہ ہو

نازک کلائیوں میں حنا بستہ مٹھیاں
شاخوں میں جیسے منہ بند ہی کلیاں گلاب کی

میں رکھ لوں ریزۂ مینا کو دل میں
اسے کس پھول کی یہ پنکھڑی ہے

اڑتے ہوئے میخانہ چلے آتے ہیں رندو
اٹھتی ہوئی ساون کی گھٹا اور ہی کچھ ہے

زمینِ میکدہ عرشِ بریں معلوم ہوتی ہے
یہ خشت خم فرشتہ کی جبیں معلوم ہوتی ہے

سنوارے جائیں گے گیسو الٰہی بات بنجائے
دل صد چاک میرا ہے جو بنکر شانہ آتا ہے

قسمت مری! کس نور سے روشن ہے مری آنکھ
پتلی نہیں یہ نقش کف پائے علیؑ ہے

کہکشاں کو ہے ناز میں بھی ہوں
کسی مہوش کی خندہ پیشانی

طنزیات

طنز — لطیف طنز — ادب کی جان ہے، ریاضؔ کی شاعری کا یہ بھی ایک اہم عنوان ہے، اُن کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر اُسے نظر انداز کر دیا جائے! —

ارمان عدو کا تجھے ہوتے ہوئے مرے
ہوتے ہوئے ترے مجھے ارمان قضا کا

وہ کیوں ٹہرتے نزع میں بالین غیر پر
کوئی معاملہ یہ گھڑی دو گھڑی کا تھا؟

مری خوشی کی نہیں کس لئے خوشی ہوگی
مرے ملال کا اُن کو ملال کیا ہوگا؟

دیکھیے گا سنبھل کے آئینہ
سامنا آج ہے مقابل کا

مجھ سے بڑھا ہوا مرے قاصد کا شوق
نامہ ملا اور ہوا ہوگیا

بزم ساقی میں مرے واسطے تو تھی اے شیخ
کیا ترے واسطے افسردۂ انگور نہ تھا؟

کچھ حشر لحد پر ابھی برپا نہیں ہوتا
آئے ہو تو ٹھہرو کوئی زندہ نہیں ہوتا

میخانے میں کیوں یاد خدا ہوتی ہے اکثر
مسجد میں تو ذکر مے و مینا نہیں ہوتا

عدو کی قبر ہوگی بال بکھرائے جہاں پہونچے
بچے سایہ سے جس کے آپ، وہ میرا مکاں ہوگا

آنکھ کوثر پر دکھائی شیخ نے کچھ اس طرح
واسطہ رکھتے ہیں گویا ساقیِ کوثر سے آپ

حضرت واعظ پسینہ میں ہیں تر اس رنگ سے
ڈوب کر نکلے ہیں گویا چشمۂ کوثر سے آپ

یہ حال ہے ریاضؔ کا روتے ہیں آج غیر
پھر بھی تو پھر رہے ہیں بہت شادماں سے آپ

جو اُٹھ نہیں سکتے تھے عشق اُٹھ کے لحد میں
بیٹھے رہیں اب گھر میں لئے عذر حنا آپ

کہیں ایسا نہ ہو آجائے ترس آپ کو کچھ
آپ سنیئے نہ کسی مور د آفات کی بات

دم وعظ کیسے مزے میں ہیں واعظ
بھرے جام کوثر سے چھلکا رہے ہیں

میرے گھر سے اے شب غم تو کہاں
لے کے صورت کالی کالی جائے گی؟

کیوں معتبر ریاضؔ کو سمجھیں نہ مے فروش
ریش دراز و جبۂ و دستار دیکھیے

مر کے ہم دادِ وفا دیں تو بھی کچھ پرسش نہیں
یونہی سی ہے حسن کی سرکار کچھ یونہی سی ہے

حقائق و معارف

حکیمانہ رنگ میں فلسفہ و حکمت اور حقائق و معارف کی گتھیاں بھی ریاضؔ نے سلجھائی ہیں، انداز اتنا دل نشیں کہ ہر لفظ اثر بن کر دل میں اُترے، اسلوب

اتنی دلکش کہ حقائق عامۃ الورود واقعات معلوم ہوں، حقیقت اتنی صاف اور واضح کہ ریب و شک کی گنجائش ہی نہ باقی رہنے پاتے۔

یہی گلشن کی ہوا ہے یہی گلشن کی بہار — کبھی صیاد کبھی ناوکِ صیاد آیا

وہ کون ہے دنیا میں جسے غم نہیں ہوتا — کس گھر میں خوشی ہوتی ہے ماتم نہیں ہوتا

آزارِ محبت نہیں جاتا نہیں جاتا — بیمارِ محبت کبھی اچھا نہیں ہوتا

اللہ دکھائے نہ برا وقت کسی کو — کوئی بھی زمانے میں کسی کا نہیں ہوتا

جو کبھی ہے خوشی کے بعد ملال — تو کبھی ہے خوشی ملال کے بعد

عجز سے بڑھ کر نہیں ہے کوئی چیز — کیسی نخوت، کبر کیسا، کیا گھمنڈ؟

صبح پیری آنکھ اپنی جب کھلی تو یوں کھلی — جیسے کوئی چونک اٹھے خواب پریشاں دیکھ کر

اتنے جھگڑے زندگانی کے لئے — زندگانی کا ٹھکانا کچھ نہیں

ہجر کی کٹتی نہیں ہے ایک رات — دن گزر جاتے ہیں ستوا آرام کے

ناپائدار زندگی مستعار ہے — آئے نہ آئے سانس کا کیا اعتبار ہے

جو نہ چھوٹے ہاتھ سے دامن وہ ہو — جو نہ ٹوٹے وہ سہارا چاہیئے

حق یہ ہے کہ زندگی ہو یا موت — ہر چیز بری ہے مفلسی کی

موت سے بدتر بڑھاپا آئے گا — جان سے اچھی جوانی جائے گی

جس سے ملیے ظاہر و باطن میں فرق — اس زمانے میں کوئی کس سے ملے؟

بگڑ کر کوئی بنتا ہے کوئی بن کر بگڑتا ہے — یہی دنیا کا نقشہ ہے اسی کا نام دنیا ہے

زمانے میں بہت اللہ کے بندے ہیں ایسے بھی — کہ جن کے پاؤں پر تاجِ سرِ فغفور رہتا ہے

تھے ریاض اس فکر میں یہ بت انہیں کے ہو رہیں — مرد حق آگاہ بھی کس سعیِ باطل میں رہے

دل پر نقش مہر و وفا دو دن کی تو بات نہیں — کوئی بھی ہو دل میں جگہ ہوتے ہوتے ہوتی ہے

زبان زد عام

ریاض کے دیوان میں ایسے اشعار بھی اچھی تعداد میں موجود ہیں جو قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں؛ اور عام طور پر زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں مثلاً۔

میرے گھر مثلِ تبرک کے یہ ساماں نکلا — آستیں قیس کی فرہاد کا داماں نکلا

دیکھ کر ہنستے ہو کیا تم صورتِ پاکِ ریاض — یہ بڑے پہونچے ہوئے اللہ والے لوگ ہیں

بڑے نیک طینت بڑے صاف باطن — ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

کمر سیدھی کرنے ذرا میکدہ میں — عصا ٹیکتے کیا ریاض آ رہے ہیں؟

لکھا کس حسن سے خط امیر کہ ہم تجھ سے کشیدہ ہیں — کشش حرفوں کی ایسی ہے کہ ہم بھی صاد کرتے ہیں

گلا بیٹھا ہوا خدمت اذاں کی دو بھی کعبہ میں — بھلے کو ہم دبالاتے تھے ناقوسِ برہمن کو

مری شراب کی کیا قدر جانے تو واعظ — جسے میں پی کے دعا دوں وہ جنتی ہو جائے

چھپا تھا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی — پسلی پھڑک اٹھی نگہ انتخاب کی

جہاں ہم خشتِ خم رکھدیں بنائے کعبہ پڑتی ہے — جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم ابلتا ہے

حسینوں کا عالم نیا ہو رہا ہے — کہ جس بت کو دیکھو خدا ہو رہا ہے

دل ہیا رکا سنبھلنا کیا   دیکھو لو پیار کی نگاہوں سے

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور   نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

روزمرّہ

وہی اشعار قبول عام اور بقائے دوام کا خلعت حاصل کرتے ہیں جو عام فہم ہوں، صاف اور رواں ہوں، سادہ ترکیب، آسان الفاظ، اور نشست الفاظ، اس فن کا معیار ہے، گنجلک ترکیبیں، پیچیدہ اسلوبِ بیان، بڑے بڑے اور ناقابل فہم الفاظ، خواہ غیر معمولی قابلیت کا ثبوت ہوں، مفہوم و معنی کے اعتبار سے خواہ وہ کتنے ہی بلند ہوں لیکن قبول عام اور بقائے دوام کے دربار میں اُن کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، غالب کے وہ اشعار جن میں روزمرّہ کی زبان استعمال کی گئی ہے بزم و انجمن کی ٹکسال کے کھرے سکے ہیں، لیکن جہاں انہوں نے اپنی "قابلیت" صرف کی ہے اور بڑے بڑے لغات کا عطر استعمال کیا ہے، وہاں وہ ناکام ہیں، متعدد شرحیں اُن کے کلام کی لکھی جا چکی ہیں، لیکن مشرح اشعار میں کتنے ہیں جو عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں یا اس قابل ہیں؟

گھر کی زبان ــــ دہلی اور لکھنؤ کے شریف گھرانوں کی زبان ــــ استعمال کرنے میں ریاض کو خاص ملکہ حاصل ہے، معلوم ہوتا ہے زبان انکی کنیز، بیان ان کا بندہ ہے۔ دوام سادگی اور بے تکلفی انکا شعار خاص ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

رونق تھا آزار تھا، اچھا ہوا جاتا رہا   ایسے دل کا رنج کیا جاتا رہا جاتا رہا

نہ آیا ہمیں عشق کرنا نہ آیا   مرے عمر بھر اور مرنا نہ آیا

نمکداں کئے تم نے گولا کے خالی   نمک تم کو زخموں میں بھرنا نہ آیا

تری تیغ کیا کیا نہاتی لہو میں   تری طرح لیکن نکھرنا نہ آیا

کچھ عجب لطف سے مل جل کے رہا ایک سے ایک   غم ترا جان مری، رنج ترا دل میرا

کہتے ہیں میری راہ میں کوئی ہو پامال   جاتی ہے پوچھنے مری پیزار کیا ہوا؟

اُٹھنے کا اب تو نام بھی لیتا نہیں ہے درد   پہلو میں ہم نے آج یہ کس کو بٹھا لیا

اتری وہ چینِ جبیں موجِ تبسّم بنکر   دیکھو دیکھو وہ ہنسی آئی وہ غصّہ اترا

کھلتا نہیں ہے کچھ مرے دشمن نے کیا کہا   دشمن کی سن کے اُس بتِ پُرفن نے کیا کہا

سنبل نے لیں بلائیں جو دیکھی تمہاری زلف   دیکھی مسی جو لب کی تو سوسن نے کیا کہا؟

کیا دی دعا؟ "تجھے آنا ہو پھر نصیب!"   غربت میں مجھکو لوٹ کے رہزن نے کیا کہا؟

وہ کشمکش، وہ بھیڑ، وہ آفت کی دار و گیر   ملنے کا اُن سے حشر میں موقع کہاں ملا؟

اتاروں حلق سے دو چار شہد و شیر کے گھونٹ   کہے جو شیخ یہ کیا ہے؟ کہوں جناب شراب!

آگے کچھ بڑھ کر ملے گی مسجد جامع ریاض   اک ذرا مڑ جایئے گا میکدہ کے در سے آپ

میں نے چھیڑا تو کس ادا سے کہا   کچھ سنو گے مری زباں سے آج؟

کوئی منہ چوم لیگا اس نہیں پر   شکن رہ جائے گی یونہی جبیں پر

یوں بھی ہو شغلِ مے کہ پئیں ہم پلاؤ تم   یوں بھی ہو شغلِ مے کہ پیو تم پلائیں ہم

صورت ایسی کہ دیکھتا ہی رہے   باتیں ایسی سنا کرے کوئی

مر گیا غیر؟ مرے سر کی قسم سچ کہیئے؟   ہاں مرے سر کی قسم آپ تو کھاتے بھی نہیں

شیخ صاحب کیا چرا کر لے چلے رومال میں   کچھ نہ کچھ حصّہ رہے یاروں کا بھی اِس مال میں

آپ کی شکل بھلی آپ کی صورت اچھی   آپکے طور بُرے آپ سے نفرت اچھی

چل ہے تیغ تو کس ناز سے رُک رُک کے تھم تھم کے   یہ کچھ اُن سے زیادہ نازنیں معلوم ہوتی ہے

موقع ہو تو مزے کی ہے رندانہ یہ ادا   اے بادہ نوش بادہ کے چلو کبھی کبھی

آپ بیتی

ذاتی تاثرات و واقعات کی جھلک بھی نمایاں طور پر ریاض کی شاعری میں نظر آتی ہے، اور کوئی شبہ نہیں، بیانِ واقعہ اور اظہارِ حقیقت کے اعتبار سے وہ اہم چیز ہے، ضرورت ہے کہ اس کا بھی ایک ہلکا سا خاکہ پیشِ نظر رہے۔

اپنی پہلی اہلیہ کے حادثۂ وفات پر کہتے ہیں:-

دیکھتے جاتے ہیں کبتک گور کے دامن میں ہم   آنکھ کی پتلی رکھ آئے دیدۂ مدفن میں ہم

حُسنِ صورت حُسنِ سیرت کو ملا کر خاک میں   بہرِ تسکیں خاکِ تُربت لائے ہیں دامن میں ہم

نرم و نازک خندۂ گُل سے تری آواز تھی   ڈھونڈھتے ہیں نغمہائے بلبلِ گلشن میں ہم

سایۂ خاتونِ جنت میں ہے اُن کی کنیز   جان دیکر جائیں گے اب خُلد کے گلشن میں ہم

نُور بنکر چشمِ تُربت میں ہے وہ اے ریاض   داغ بن کر اب رہینگے لالۂ گلشن میں ہم

اہلیۂ ثانی کی وفات ریاض کے لئے پہلے سے بھی زیادہ اندوہناک سانحہ تھا، کہتے ہیں:-

ملی مٹی میں اور اک چاند سی صورت   بڑا پہلے سے بھی یہ دوسرا داغ

یہ کس کی موت مجھ سے کہہ رہی ہے   نہ دے ایسا کسی کو بھی خدا داغ

بظاہر کچھ نہیں واقع میں یہ ہے   مٹے ہم، مٹ گیا دل، مٹ گیا داغ

انہیں غم نے انہیں کھایا اجل نے   ریاض اب ہیں نہ اب ہیں میرزا داغ

متعدد اشعار میں حضرت ریاض نے اپنی زندگی کی خود تصویر کھینچی ہے:-

ہو ریاض اک جواں مست خرام   نہ پئے اور جھومتا جائے

یہ بھی واقعہ ہے:- وہی ریاض جو تھے بُت پرست و بادہ پرست   خُدا کی یاد میں بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے

یہ بھی ایک حقیقت ہے:- دُنیا کی پڑ رہی ہیں نگاہیں ریاض پر   کس نوک کا جواں ہے کس آن بان کا

اِسے بھی تعلّی نہ سمجھئے بیانِ واقعہ ہے:-

رہا نہ کوئی بھی یارانِ رند مشرب میں   بس اک ریاض تہجد گزار باقی ہے

واردات

کلامِ ریاض کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جسے واردات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اسے بھی "آپ بیتی" ہی کا ضمیمہ سمجھئے:-

عشق میں خُوب دن گزرتے ہیں   روز مرتے ہیں روز جیتے ہیں

چین مر کر تہِ زمیں بھی نہیں   اب ٹھکانا مرا کہیں بھی نہیں

کل تو روتے تھے اپنے دامن کو   اے جنوں آج آستیں بھی نہیں

مجھکو دیکھا تو ہنس کے کہتے ہیں   اشک اب بے سبب بھی بہتے ہیں

حسیں دل کو تاراج کرتے رہے ہمیشہ اُجڑتی یہ بستی رہی
تھی جوانی عیش دُنیا کے لئے ہے بڑھاپا فکر عقبیٰ کے لئے
حضرتِ ناصح جوانی میں مجھے رکھئے معاف پیر و مرشد توبہ کرنے کا زمانہ اور ہے
جوانی سے ارغوانی سے اچھی نئے ارغوانی جوانی سے اچھی
ہم جہاں اُنکو ملے رُوٹھتے ملے وہ جہاں ہم کو ملے ہنستے ملے
یہ کہہ کے کس نے گلے سے لگا لیا مجھکو ارے ریاض مرا مجھ سے سرگراں کچھ ہے

رُباعیات

اس صنفِ کلام کی طرف ریاض نے بہت کم توجہ کی، لیکن جب ادھر متوجہ ہوئے تو خُوب خُوب گلکاریاں کیں جو تاریخ ادب میں نقشِ دوام بن کر باقی رہیں گی، چند رُباعیاں سُنیئے۔ سر سید کے متعلق کہتے ہیں:۔

قدموں سے لگا ہوا ہے زرسید کے
سرخاب کا کیا لگا ہے پر سید کے
کیونکر نہ بڑھے دماغ سرسید کا
اک اور لگا ہوا ہے سر سید کے

شباب کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:۔

دینے کے لئے داغ شباب آتا ہے
ساتھ اپنے لئے یہ آفتاب آتا ہے
گھوڑے سے ہوا کے یہ اُترتا ہی نہیں
جانے کیلئے پا بہ رکاب آتا ہے

روداد پیری سُنیئے:۔

طفلی بھی شباب بھی تھا اک دم کے لئے
پھل پھول تھے سب خزاں کے عالم کے لئے
پیری میں نہیں ریاض یہ رعشہ دست
ملتے ہیں ہاتھ اپنے ماتم کے لئے

ضعف پیری اور صوم کا تذکرہ:۔

ان ہاتھوں سے روز جام صہبا ٹوٹا
ان ہاتھوں سے بار بار مینا ٹوٹا
شرمائے خدا مرے بڑھاپے کو ریاض
یہ ضعف ہے ایک بھی نہ روزہ ٹوٹا

تشنگی صوم کا بیان:۔

روزہ رکھکر بلا کے دن کاٹے ہیں
مے سے دامن بچا کے دن کاٹے ہیں
میخانہ میں ہم تشنہ لبوں نے ساقی
سینے سے سبو لگا کے دن کاٹے ہیں

یہ وقت وہ ہے خم سبو پر پی لیں
پا جائیں تو جھک کے حوض کوثر پی لیں
خم کی ترے خیر، کہدے اے پیرِ مغاں
روزہ رکھا ہے سانس بھر کر پی لیں

رند ناکام کو کچھ نشہ سا ہو جاتا ہے
ہاں یونہی نام کو کچھ نشہ سا ہو جاتا ہے
صدقے اے لذتِ افطار پس توبہ بھی
بے پئے شام کو کچھ نشہ سا ہو جاتا ہے

قطعات تاریخ و قصائد!

رباعی کے لئے شرط ہے کہ مصرعۂ آخر، جانِ معنی ہو، قصائد کے لئے شرط ہے کہ مفہوم بلند اور الفاظ پُر زور ہوں قطعات تاریخ کے لئے شرط ہے کہ

مصرعۂ تاریخ برجستہ اور بے تکلف ہو۔ رباعیات کا نمونہ آپ ملاحظہ فرما چکے کہ مصرعۂ آخر کتنا پُر معنی اور مطلب خیز ہوتا ہے، اب ایک بالکل سرسری نظر ریاض کے قطعات تاریخ اور قصائد پر ڈال لیجئے، آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ قصائد اپنے شکوہِ معنی اور شکوہ الفاظ کے اعتبار سے کس درجہ پر زور، اور قطعات تاریخ میں برجستگی اور بے تکلفی کس درجہ عیاں ہے — موجودہ نواب صاحب بھوپال کی مدح میں گویا ہوتے ہیں:۔

بزم میں موجِ تبسّم جامِ مے کی موج ہے — رزم میں بہرِ عدو چینِ جبیں نوکِ سناں
بزم میں مے کا چھلکتا جام اُس کی چشمِ مست — رزم میں بہرِ عدو ابرو کے بل تیر و کماں
بزم میں تیغِ کمر گویا ادائے حسنِ وضع — رزم میں تیغِ کمر پر برقِ خاطف کا گماں
ہاں ہزیمت خوردہ جنگاہ سے — پیلِ گردوں کا شکستہ دانت ہے یہ کہکشاں
سالِ نو آیا ہے لیکر جی۔ ایس۔ آئی کا خطاب — ہو مبارک آپ کو حاجی حمید اللہ خاں

اپنے استاد امیر مینائی مرحوم پر ایک طویل قطعۂ تاریخ ریاض نے کہا۔ چند اشعار یہ ہیں:۔

یہ آج ٹوٹ پڑا مجھ پہ آسماں کیسا — کہ دیکھنے میں پرانا نہ تھا یہ چرخِ کہن
نہ میں نے نالہ کیا تھا کوئی فلک فرسا — نہ آہ نکلی تھی منہ سے کوئی سپہر شکن
مری فغاں سے پڑا تھا کبھی نہ اس میں شگاف — نہ میں نے کھولے تھے اپنے لب و زبان و دہن
بہت ہی خون بہایا ہے پھوٹی آنکھوں سے — شفق سے ہے یا ہے لہو سے رنگا ہوا دامن
شکستِ چرخ کی آواز ہے کہ رعد کا شور — چمک ہے درد کی یا صاعقہ ہے شعلہ فگن
ہے یہ سالِ سرِ قبرِ بے دیارِ امیر — فقیر کوچۂ محبوب، امیرِ ملکِ سخن!

مرحوم مہاراجہ صاحب محمود آباد کی وفات پر کہتے ہیں:۔

قبرِ پُر نور کا وفور ہے آج — ذرّہ ذرّہ ہے نیّرِ تاباں
سایہ گستر ہے دامنِ زہراؑ — کہہ رہی ہے یہ پاکیِ داماں
بعدِ رحلت بھی زندۂ جاوید — چھپ کے زیرِ زمیں بھی جلوہ عیاں
نسبتِ خلد کربلا کی زمیں — نسبتِ گورِ چشمِ حورِ جناں
لکھنؤ ہائے لکھنؤ نہ رہا — اب وہ صحبت کہاں وہ لطف کہاں
دھوم ہے دھوم خلد میں آئے — سر محمد علی محمد خاں

قاضی خلیل الدین احمد صاحب وزیر اعظم ریاست پنّا کی اہلیہ محترمہ کی تاریخ وفات نکالی ہے:۔

اس سے بہتر اور ہو سکتا نہیں سالِ وفات — گل ہوئی بادِ اجل سے شمعِ ایوانِ خلیل

حضرت ریاض نے اپنی اہلیہ کی تاریخِ وفات کہی ہے:۔ زوجۂ مرحومۂ ریاض

اپنے ایک عزیز دوست کی وفات سے متاثر ہو کر حضرت مرحوم نے تاریخ وفات کہی ہے:۔

ارمان ہے نیند آئے اسی طرح ہمیں بھی — یوں چین سے سوتے ہیں وہ جنّت کی ہوا میں

سر سلیمان کے والد مولوی محمد عثمان صاحب کی تاریخ وفات:۔

بولی بلبل یہ نکل کر پئے سال — گئے جنّت میں محمد عثمان

اپنی دوسری بیوی کی تاریخ وفات کہی ہے:۔ جانِ ریاض مُرد

ایک دوست کا دیوان شائع ہوا، تاریخ کہی۔ چبھتا ہوا پیکاں ہے چبھتا ہوا نشتر بھی

ریاض کا دیوان گلہائے رنگ رنگ کا مجموعہ ہے، بحرِ ناپیدا کنار کے چند قطرے اگر سمندر کی وسعت کے ترجمان ہو سکتے ہیں تو یہ چند اشعار جو تبصرہ نگار نے درج کئے ہیں کلامِ ریاض کے تعارف کیلئے کافی ہیں، انتخاب کرنے بیٹھئے تو ــ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست ــ کی مجبوری عناں گیر، سطور

پکھیرو[1] کے ڈوپہر

(باب اوّل ـــــ قافلہ کی پہلی منزلیں)

نیم کی نمکولی پکی ـــــــ ساون کب آوے گا
جیوے میرا بیرن بھیا ـــــــ ڈولی بھیج بلاوے گا

دوپہر کا وقت ہے۔ انگنائی کے ایک کونے میں دو بلیوں پر ایک جھولا پڑا ہے۔ کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔

منجھلی لڑکی حسن آرا ساٹن لیٹ کے پاجامہ کے پائنچے زمین پر لٹکائے ناف سے ایک انگل اونچا شلوکہ پہنے دوپٹہ گردن میں الجھائے اور پیچھے اس کو اڑاتی ہوئی۔ دونوں پیر پھیلائے ہلکے ہلکے پینگ لے رہی ہے۔ پاجامہ کے پائنچے زمین کو جھاڑو دے رہے ہیں۔ اور خود آہستہ آہستہ گا رہی ہے۔

نیم کی نمکولی پکی ـــــــ ساون کب آوے گا

اتنے میں اس سے چھوٹی رفعت آرا بھی چپکے سے آجاتی ہے۔ کچھ دیر کھڑی ہو کر بہن کو دیکھتی ہے۔ پھر اسکے منہ پر ہلکی سی مسکراہٹ آتی ہے۔ اور وہ اسکو برداشت سے چھپا کر آہستہ آہستہ قریب جاتی ہے۔ جیسے ہی بہن پینگ لیتی ہوئی پاس سے نکلتی ہے منہ بڑھا کر کان میں کہتی ہے "آپا ابھی سے پہلے چلی تو جاؤ"

اتنا کہہ کر بھاگنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر آپا جھولے سے کود جھپٹا مارتی ہیں اور ہاتھ لمبا کر کے شانہ پکڑ کر گھسیٹ کچ کچ ـــــ کچ کچ۔ دو چٹکیاں شانہ پر اور دو گورے گورے گالوں پر لیتی ہیں۔ رفعت دو نعرہ "اوئی۔ اوئی" کے لگا کر بھوں بھوں رونے لگتی ہے۔

سامنے شوکت آنکھیں جھاڑو کا تنکا لئے۔ گڑیا کی ایک آنکھ میں سرمہ لگا کر رہ جاتی ہے۔ اور چلاتی ہے "دیکھئے اماں دیکھئے" برآمدے کے دوسرے سرے سے خالہ کہتی ہیں "میں سب دیکھ رہی ہوں اچھا حسن آرا اچھا" حسن آرا بھن بھن کرتی پھر جھولے کی طرف لوٹتی ہے۔ مگر گرے ہوئے پائنچوں میں الجھ کر دھم سے گرتی ہے آنسو بھرا چہرہ گھما کر رفعت کہتی ہے "اچھا ہوا" حسن آرا کھڑی ہو کر دونوں سیب کی طرح سرخ گال پھلا کر کہتی ہے "منہ سڑ جائے" خالہ نے کہا "میں سب حرکتیں دیکھ رہی ہوں باجی کو سو کر اٹھنے دو کیا انداز ہے! واہ خدا نہ کرے۔ نہ معلوم آج کل کی لڑکیوں کے کیسے ہوائی دیدے ہیں۔ ہوش میں آؤ دوپٹہ سنبھالو" حسن آرا کھس کھس روتی ہوئی ایک چارپائی پر جا بیٹھتی ہے۔ اور رفعت دوسری پر۔ پان دھوتے سے اٹھ کر پھوپھی ہنستی ہوئی پاس آئیں۔ اور باری باری دونوں سے بہتیرا پوچھا کیا ہوا کیوں لڑائی ہوئی؟ مگر نہ اس نے جواب دیا نہ اس نے۔ کنواری بالی لڑکیاں بھلا کیسے بولتیں۔ نہ معلوم کیوں کر سیڑھی در سیڑھی چلکر نصیبن سے اللہ رکھی للہ رکھی سے کریمن۔ کریمن سے ان لوگوں تک خبر پہونچی تھی۔ جہاں آرا اور حسن آرا کی بات ٹھہر رہی تھی۔ کچھ آنے والی زندگی کی امیدیں۔ کچھ میکہ کے چھٹنے کا غم۔ ان سب پر حاوی بھائی میاں۔ بھائی کی محبت اس گھنگھور گھٹا میں معصوم دل کو ہیجان میں ڈالے تھی۔ کعبہ کی دہلیز کی طرح پاک لبوں سے یہ گیت نکل رہا تھا جو ایک لڑکی اپنے میکہ جانے کے انتظار میں کہتی ہے۔ ساون میں مجھے بلانے کا دعوے تھا برسات بھی آگئی، نیم کی نمکولیاں بھی پک گئیں۔ مجھے لینے کوئی نہیں آیا۔ پھر آب حیات زندگی یعنے امید ڈھارس دیتی ہے۔ بھائی پیارا بھائی! نہیں سب بھول جائیں۔ مگر وہ نہ بھولیگا۔ ضرور آکر مجھے لیجائیگا۔ پھر اماں۔ گھر۔ اپنا گھر۔ یہ خیال تھا ان لفظوں میں۔

نیم کی نمکولی پکی ـــــــ ساون کب آوے گا
جیوے میرا بیرن بھیا ـــــــ ڈولی بھیج بلاوے گا

لیکن یہاں کچھ سے کچھ ہو گیا۔ ایک ادھر بیٹھی بسور رہی ہیں۔ دوسری ادھر ـــ

باب دوم ـــــ ایک مسافر کی آخری منزلیں

حضرت گنج کے پاس لال باغ کی طرف چھوٹا سا چمکتے ہوئے پیتل کا دی نسٹ ([illegible]) کا سائن بورڈ ملیگا جسکی کہ دراصل کوئی ضرورت نہیں ہو اگر کسی کو بھی محلہ یا روڈ بتا دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ کوٹھی کا نام دی نسٹ، ہے تو وہ سوائے اس کوٹھی کے کسی اور میں نہیں جا سکتا ہے۔

احاطہ کی دیوار کے ساتھ ساتھ گھنی نیل کانٹے کی ٹٹی ہے۔ جو کہ دونوں طرف سے چل کر دو سمر ہاؤسوں میں آملتی ہے۔ اور دونوں سمر ہاؤسوں کے بیچ میں کوٹھی کا پھاٹک ہے۔ یہاں سے سیدھی سڑک جا کر کوٹھی کے چاروں طرف گھوم جاتی ہے۔ اس سیدھی سڑک کے دونوں طرف سرخ اور سفید گلاب کی بیلوں کی ٹٹیاں تھوڑی تھوڑی دور پر کھڑی ہیں۔ ایک طرف لان اور دوسری طرف ٹینس کورٹ ہے اگر کوئی ادھر بیٹھا ہو اور اس سڑک پر سے موٹر آئے تو دیکھنے والے کو یہ معلوم ہوگا کہ موٹر

---

[1] مندرجہ بالا مضمون۔ نئے پکھیرو۔ ناول کے دو مختلف باب ہیں۔ یہ ناول ابھی نامکمل ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی کتاب کی صورت میں شائع ہوگا۔

رشید حسین

ان گلاب کی پتیوں میں آنکھ مچولی کھیل رہا ہے کبھی چھپ جاتا - اور کبھی نکل آتا ہے۔ کوٹھی بالکل نئے انگلش اسٹائل کی ہے جس میں کہ ہر حصہ بذاتِ خود ہے۔ کوئی کسی کا ہم وزن جواب نہیں ہے۔ ایک کونے پر مکان کا سب سے اونچا حصہ ہے۔ ایک پر سرخ پھولوں کی بیل (جسے ہندوستانی مُنیا بیل کہتے ہیں) پھیلتی ہوئی اوپر تک پہونچکر پھر نیچے کوٹھی پر سہرے کی طرح لہرا رہی ہے۔ اس ہی کے برابر ایک ڈبل پور رچ ہے جو کہ مختلف بیلوں اور لٹکے ہوئے گملوں سے دُلہن بنا ہوا ہے۔ اس کے اندر کتھئی رنگ کا ایک موٹر کچھوے کی طرح خاموش کھڑا ہوا آنے جانے والوں کو اپنی تکونی اور چوکونی شیشہ کی آنکھوں سے حقارت کی نظر سے دیکھتا رہتا ہے۔ کوٹھی کے باقی دو طرف مولسری اور گولڈ مہر کی شاداب سبز شاخوں نے گہرا سایہ کر رکھا ہے۔ باہر سے یہ کوٹھی ایک بنی سنوری روٹھی ہوئی مغرور حسینہ معلوم ہوتی ہے۔

یہاں کبھی غل شور تو کیا! کوئی آواز تک نہیں سنائی دیتی۔ اگر کوئی آدمی ایک ہفتہ دن رات اس کے پھاٹک کے باہر سڑک پر کھڑا رہے تب بھی وہ حلف اُٹھا سکتا ہے کہ اُس نے ان تین آوازوں کے علاوہ کوئی آواز نہ سُنی ہوگی۔ موٹر کی ہلکی سرسراہٹ۔ پیانو کی مدھم پن پُن پوُن پین۔ یا پکڑی (جھبیا کتا) کی بُوبُو بُو ــــ باقی تمام باہر والے کے واسطے۔ سحر ہے۔ جادو ہے۔ افسانہ ہے۔ سکوت ہے۔ غم ہے۔ حسرت ہے۔ ناز ہے۔ غرور ہے۔ یا جو بھی سمجھ میں آجائے۔ اور ہاں حسن ہے۔ اس مکان کے پشت پر شاگرد پیشہ ہے۔ وہاں سے خاموش ملازم۔ بغیر پیروں کی آہٹ کے آتے ہیں۔ اپنا اپنا کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ حسن آرا کا اپنا کمرہ اور غسل خانہ باہر کے چھوٹے برآمدے سے ملا ہوا ہے۔ یہیں اسکی دونوں وقت کی چاء اور رات کا کھانا آجاتا ہے۔ صبح کو میز پر بیٹے اور بہو کے ساتھ کھانے کے کمرہ میں کھانا کھاتی۔ اور کبھی کبھی رات کے کھانے پر جب دو ایک مہمان ہی اس قسم کے ہوتے ہیں کہ اس کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ تو اسے اطلاع ملتی کہ آج رات کو میز پر جانا ہوگا۔

چھ اور سات کے درمیان بہو آکر دو چار منٹ ساس سے باتیں کرتی ہیں اور اس طرح ساس کے لباس پر نظر پڑ ہی جاتی ہے۔ نہایت محبت کے لہجہ میں کہتی ہیں "اماں جان۔ سلک کے پاجامہ کے واسطے ابھی موسم اتنا تو ٹھنڈا نہیں ہے۔ کیوں نہ آپ ہلکا پیازی ریشمی گون کا پاجامہ پہن لیں۔ اس پر سفید دوپٹہ ٹھیک رہیگا۔" اماں جان کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے جو کہو وہ پہن لیں۔ صرف ایکدفعہ اماں جان نے ضد ضرور کی تھی۔ جب اُن سے ساڑی پہننے کو اصرار کیا گیا تھا۔ اس وقت میاں اور بیوی دونوں سر تھے۔ مگر حسن آرا نے نہ بہو کی مانی نہ مسعود ابن جلال کی پرواہ کی، صاف کہدیا "سنو میاں اب میرا بڑھاپا ہے۔ میرا کیا ہے۔ کونے میں پڑی اللہ اللہ کرتی ہوں ماشاء اللہ بہو کو جو جی چاہے پہناؤ۔ میں بھی دیکھ دیکھ کر خوش ہوں۔ دعائیں دوں۔ نہ مجھے اب کسی سے ملنا جلنا ہے نہ کہیں آنا جانا ہے تم کو پھولتے پھلتے دیکھتی ہوئی ایسے ہی مرجاؤں، تم پہ سے صدقے ہو جاؤں۔ ارے میرا کیا ہے۔ بچپنے سے جوانی تک بڑے پائنچے پہنے۔ نواب اور ہر کل کی بات جب سے تم پیدا ہوئے گھٹنے پہننے لگی ــــ میرے لئے تو یہی بڑا فیشن (فیشن) ہے۔" آخر جب ماں کسی طرح ساڑی پر راضی نہ ہوئیں تو اُن کو واپسی کا حکم ملا تنگ بڑے پائچوں کے پاجاموں کا۔ "اماں گھٹنوں کا بھی کوئی تُک ہے بھی اگر پرانی ہی وضع رکھنا ہے تو پھر بڑے پائچوں کا پاجامہ پہنئے۔"

"ہاں بیٹا یہ مجھے منظور ہے۔" اور اسی وقت سے حسن آرا نے اپنے کو بالکل اس طرح بہو اور بیٹے کی خوشی پر چھوڑ دیا تھا۔ جیسے کہ ڈرائنگ روم کا کوئی گلدان۔ اُن میں پھول اور ان پر کپڑے سب وقت اور موسم کے لحاظ سے آرائش کئے جاتے تھے۔ شروع شروع میں جب کوٹھی سجائی گئی ہے تو حسن آرا کو یاد ہے کہ ایک دن میاں بیوی دونوں گول کمرہ میں ایک مسئلہ طے کر رہے تھے وہ یہ تھا کہ ایک بے ڈول لمبا مرادآبادی گلدان بیوی کو شادی کے موقعہ پر کسی سہیلی نے دیا تھا اسکے بارے میں یہ بات چیت تھی "بیگم اسے کیا کریں؟" بیوی بولیں "پھینک دو کسی کو دیدو۔ بیکار ہے" میاں نے کہا "نہیں جب ہے تو اسکی بھی کوئی جگہ نکالنا چاہیئے" پھر وہ گلدان جگہ جگہ رکھا گیا طرح طرح سے اُسے دیکھا گیا۔ آخر باہر برآمدے میں ہیٹ ریک کے برابر مور کے پر لگا کر اسکی نشست سمجھ میں آگئی۔ حسن آرا پڑھی لکھی نہ تھی۔ ان سب باتوں کا اثر اس پر تھا! وہ لفظوں میں اپنی حالت نہ بیان کر سکتی تھی لیکن بغیر لفظ دلمیں دُہرائے وہ جانتی تھی کہ وہ بھی ایک چیز ہے سامانِ آرائش میں اسے بھی ایک جگہ دینا پڑتی ہے۔ اس سے زیادہ اس کی ہستی اس مکان میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ تین برس کے پوتے کے واسطے وہ قطعی بیکار تھی۔ بچے کے لئے نرس تھی! کھلانا۔ پلانا۔ منہ دُھلانا، دُکھ، درد۔ دوا۔ کسی مصرف کی وہ نہ تھی۔ متروک سکہ کی طرح زمانہ اسے میلوں پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ پوتے کے پیار کو دل چاہے تو دُور سے چٹکی بجالے۔ اس سے آگے بڑھنا مشکل تھا۔ اب رہا گھر! اس سے اسکو کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ ملازم اپنے کاموں پر مستعد ان کے کام اسکی سمجھ سے باہر تھے۔ چار برس سے باورچی خانہ کا نام ہی نام سُنا تھا۔ دیکھا نہ تھا۔ ایک دفعہ ڈرتے ڈرتے اس طرف گئی بھی تھی۔ نوکروں نے بتایا بھی تھا لیکن اُس بیچاری کو باورچی خانہ نہ نظر پڑا۔ کھانے کے بارے میں بھی اس کا دخل یا اسکی رائے کچھ نہ تھی اور ہوتی بھی کیسے۔ جہاں کھانے والے بدل گئے وہاں کھانے بھی بدل چکے تھے۔ اسکی زندگی صرف اس قدر رہ گئی تھی کہ چاء پی لی۔ کھانا کھا لیا اور چوکی پر نمازیں پڑھتی رہے۔

جب شاندار یادگار سلطنت کا نمونہ دکھانا ہو تو۔ ماں کو بھی کھانے پر یا گول کمرہ میں بلالو۔ غیر مردوں کے سامنے یہ کبھی نہ گئی۔ نوکروں کے سامنے جانے پر مجبور ہو گئی تھی ایک دن تین عورتیں (جن کو حسن آرا زنانے ہی سمجھتی رہی) آئی ہوئی تھیں۔ ان میں اسے ایک گھنٹہ بیٹھنا پڑا۔ سوائے خاموش بیٹھے رہنے کے کیا کرتی۔ آخیر میں ان تین سے ایک نے مسز نہدو کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "آپ

ان کو جانتی ہیں" حسن آرا نے بغیر مسکرائے ہوئے کہا " ہاں! یہ میری بہن ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ یہ چوکھٹے میں ہیں اور میں باہر ہوں" سب کی سب بڑی دیر تک ہنستی رہیں۔ اور حسن آرا انکے ہنسنے پر ہنستی رہی حسن آرا ماں تھی! ماں کی ممتا ابھی اسیطرح تھی۔ مسعود ابن جلال کی ہر خوشی سر آنکھوں پر تھی۔ اسکی ہر برائی ایک بڑائی تھی۔ اسکی بڑائی اسکے لئے ایک غرور تھا۔ مگر۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں　　(غالب)

بیٹے سے گلا نہ تھا وہ پھلے پھولے۔ مگر زمانہ تو بڑی جلدی ختم ہوگیا۔ میاں بھائی پر جان فدا تھی جئیں وہ ہزار برس۔ لیکن اب وہ میاں بھائی ہی نہیں۔ اُن کی شادی کا ہونا۔ ایک کے بعد ایک بچہ ہونا اپنا بیوہ ہونا۔ آفتاب بھی سگے بھائی کو برابر تھا۔ جب سے اسکے بھی بال بچے ہوئے اس نے بھی رفتہ رفتہ چھوڑ دیا۔ ہاں آخری وقت ہے کیا کیا جائے ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ مسعود تو پھلے پھولے آباد رہے ...

.... حسن آرا کے خیالات بے ترتیب تھے۔ وہ جاہل تھی اظہار نہ کرسکتی تھی مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پیارے بیٹے نے پیار سے ماں کے پاس بیٹھ کر پورے اہتمام سے عمدہ کفن سلوا کر دیدیا۔ صاف ستھری پکی قبر بنوادی۔ دم دلاسہ دیدیا "لو اماں سب سامان تیار ہے۔ تم یہیں بیٹھو۔ جب آخری نیند آنے لگے پکار لینا میں آجاؤں گا۔ اگر تم کو آرام سے لٹا دوں گا۔ گول کمرے میں ہوں! ریڈیو پر بڑے مزے کا گانا آرہا ہے۔ لو میں جاتا ہوں اچھی اماں۔ پیاری اماں سب سامان ٹھیک ہے گھبراؤ نہیں" لیکن یہ ماں تھی اسکی یہی خوشی تھی کہ آئے جلد ہی نیند آئے۔ اس چھوٹے برآمدے میں جا۔ نماز پڑھتی اس آخری کوچ کا انتظار کیا کرتی تھی۔ لیکن سردی سے گرمی، گرمی سے برساتیں آتی تھیں اور نہیں آتی تھی تو وہ نیند۔ کہ جو سب دردوں کا ایک علاج ہے۔ اور جب نیند نہ آتی تھی تو وہ مٹھی بھر کا گوشت کا ننھا ٹکڑا جس کو دل کہتے ہیں تڑپتا تھا۔ اور خیالات محدود دماغ کو چکرا دیتے تھے آج برسات کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے کبھی کبھی گڑگڑاہٹ ہوتی ہے۔ ظہر کی نماز میں خیالات خلل ڈالے دے رہے ہیں۔ دفعتاً کان میں آواز آتی ہے۔ معصوم سُریلے سُر ہیں — نیم کی نمکولی پکی ——— ساون کب آوے گا

جیوے میرا بیرن بھیا ——— ڈولی بھیج بُلا دے گا

تیسری رکعت کے دوسرے سجدہ میں ہچکیوں سے سسکیاں ہوگئیں۔ نماز جاتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد جب آنسو پونچھنے کے قابل ہوگئے۔ تو لیہ اور پانی کے چھینٹوں کی مدد کے بعد برآمدے میں جا کر کوٹھی کے قاعدے کے موافق دبی آواز میں کہا " جاؤ دِلّو یہاں سے جا " دھوبی کی لڑکی مولسری کے نیچے سے بھاگ گئی۔ پھر وضو کیا۔ پھر نماز ہونے لگی۔

سید رفیق حسین

ثمرات

جنوں تعلیم کچھ فرما رہا ہے
خرد کا ہاتھ چھوٹا جا رہا ہے

معاذ اللہ نازِ حُسن اُس کا
دماغ آسماں چکرا رہا ہے

بڑھی جاتی ہے شمعِ بزم کی لَو
کوئی پروانہ شاید آرہا ہے

فنا کا پیش رَو اُس کو سمجھیے
جو لمحہ زندگی کا جا رہا ہے

فضائے نیم شب اتنی دل آویز
نقاب اُلٹے ہوئے کون آرہا ہے

نگہ نے شکل یکسر دیکھی نہیں ہے
پسِ پردہ کوئی تڑپا رہا ہے

کمالِ آدمِ خاکی تو دیکھو
زمیں سے آسماں تک چھا رہا ہے

جوانی اور جامِ مے سے توبہ
یہ کیا پیرِ خرد سمجھا رہا ہے

تری روشن جبیں کا ہے وہ عالم
چراغِ ماہ بھی شرما رہا ہے

نہالؔ آنکھیں اُٹھا بہرِ نظارہ
کوئی سوئے گلستاں آرہا ہے

نہالؔ سیوہاروی

رقیب وطن

(۱)

جتنا چین اور امریکہ میں فرق ہے اس سے کہیں زیادہ چین اور امریکہ کی نوجوان لڑکیوں میں فرق ہے۔ لائے ایک نوجوان چینی لڑکی تھی۔ اور گو وہ امریکہ میں تعلیم پا رہی تھی لیکن اس کے خیالوں کی بستیوں میں اپنا پیارا ملک چین۔ والدین اور وطن کی معاشرت بسی ہوئی تھی۔ امریکہ میں اس کی زندگی ایک حد تک بے کیف سی تھی۔ کالج کا جانا، پڑھنا، اور چلا آنا، یا اپنے محدود حلقۂ احباب میں جن میں چند سنجیدہ شریف زادیاں شامل تھیں علمی گفتگو کرنا اور کبھی کبھار تفریح گاہوں میں خاموشی سے ہو آنا۔

اس کی اس بے کیف زندگی میں ایک وجہ سے انقلاب عظیم رُونما ہوا۔ نکومہ ایک نوجوان جاپانی انجنیئر تھا جس نے پرواز کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور بغرض سیر و سیاحت امریکہ آیا ہوا تھا۔ لائے کے محدود حلقۂ احباب میں نکومہ کا گذر ہوا۔ دونوں مشرقی تھے قدرتاً ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے پھر ملتے جلتے رہے۔ نکومہ میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو ایک ہونہار اور نوعمر مشرقی جوان میں ہو سکتی ہے۔ لائے کا بھولا پن اور چینی حسن بھی نکومہ پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکا، اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہ دوستی مبدل بہ محبت اور محبت سے تجاوز کر کے عشق کے درجہ تک پہونچ گئی۔ دونوں نے عہد و پیمان کیا کہ ایک دوسرے کے ہو کر رہیں گے۔

(۲)

لائے چونکہ اب فارغ التحصیل ہو چکی تھی اور نکومہ کو بھی امریکہ آئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ اسلئے یہ دونوں اپنے اپنے وطن کی جانب روانہ ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب چین و جاپان پر جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جاپانی چین کو برباد کر کے اپنا تسلط جمانا چاہتے تھے۔ ان کی تمام تر توجہ چین کو اپنے قبضہ میں کر لینے کی طرف تھی اور مخالفت کی آگ برابر بھڑک رہی تھی۔ یہ سب کچھ تھا لیکن نکومہ اور لائے کے تعلقات ویسے ہی رہے۔ امریکہ سے واپس آنیکے بعد کئی مرتبہ وہ آپس میں مل چکے تھے۔ ان دونوں میں اکثر لڑائی کے امکانات پر گفتگو ہوئی۔ نکومہ کو یقین تھا کہ چین اور جاپان کے درمیان لڑائی ضرور ہوگی۔ مگر وہ لائے کو اس کا بھی اطمینان دلاتا تھا کہ اس سے ہم لوگوں کی محبت پر کوئی ناخوشگوار اثر نہیں پڑیگا۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا جب ہزاروں جانیں موت کے گھاٹ اُترنے لگیں۔

(۳)

جنگ زوروں پر جاری تھی۔ ٹڈی دل کی طرح ہوائی جہاز آتے اور بلا تفریق فوج یا پُرامن آبادی بم بارش کی طرح برسا کر واپس ہو جاتے۔ ہزاروں بوڑھے۔ جوان اور بچے بم باری کے سبب عمارتوں کے نیچے دفن ہو چکے تھے۔ میدان جنگ میں لاکھوں ہستیاں مشین گنوں اور زہریلی گیسوں کی نذر ہو گئیں تھیں۔ باغ اُجاڑ اور شہر ویران پڑے ہوئے تھے۔ چینی فوج متواتر شکست کھا رہی تھی۔ شہر شنگھائی اور کئی علاقوں پر جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ لائے کے لئے یہ وقت نہایت نازک تھا۔ اگر ایک طرف وطن کی تباہی اسکے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی تو دوسری طرف نکومہ کی الفت اس کو نکومہ کی حفاظت کے لئے ہر وقت مضطرب رکھتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ تمام تمام رات وہ اسکی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہوئے گذار دیتی۔

کیونکہ نکومہ بھی اب ایک ہوائی بیڑہ کا کمانڈر مقرر ہو کر شنگھائی کے شمالی حصہ میں جہاں جاپانیوں کا عمل دخل تھا تعینات ہو چکا تھا۔ ان دنوں اسکے زیر کمان جو ہوائی جہاز تھے وہ بذریعہ مشین گن اور بم دور افتادہ چینی علاقوں کو مسمار کرنے میں مصروف تھے۔ لائے اس خیال سے اور بھی رنجیدہ تھی کہ اس کے محبوب کے ہاتھوں اسکے وطن کو کافی ایذا پہنچ رہی تھی۔

(۴)

جنگ کی خبریں آئے دن شائع ہوتی رہتی تھیں جنکو دیکھکر لائے بیحد غمگین ہو جاتی۔ ایک دن جب کہ وہ ان باتوں سے سخت ملول تھی نکومہ بھی آ گیا وہ اکثر چینی علاقوں کی بم باری کی مہم سے لوٹتے ہوئے ہوائی جہاز میں سے جھولے کے ذریعہ اسکے مکان کے قریب اُتر جایا کرتا تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ اسی طریقہ سے پہونچ گیا تھا۔

لائے کو متفکر دیکھ کر اس سے نہ رہا گیا اور اُس نے بڑے اصرار سے اسکی وجہ دریافت کرنی شروع کی۔ لائے نے اخبار میں سے پرامن رعایا کی بم باری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مجھے ان خبروں سے بڑی تکلیف ہوتی ہے نکومہ! مگر تم سے کہنا فضول ہے۔ تم بھی تو اس میں شریک ہوتے ہو۔ تم نے بھی تو بم پھینکے ہیں یہ نکومہ۔" "ہیں لائے میں نے خود تو کوئی بم پُرامن باشندوں پر نہیں پھینکا" پھر ذرا رک کر "یہ سب بیکار ہے قصور تو چند چینی سرداروں اور فوجی افسروں کا ہے۔ اور اگر ہمیں چیانگ کائی شیک مل جائے تو سب قصہ ہی ختم ہو جائے" ——— لائے نے حسرت سے دُہرایا "ہاں سب قصہ ختم ہو جائے گا" ———

اور حقیقت بھی یہی تھی جسپین کا روح رواں، چین کا ہٹلر، چین کا مسولینی، چین کا آماترک جو کچھ بھی سمجھئے مارشل چیان کائے شیک ہی تھا جس نے چین کو سوتے سے جگایا۔ اور تمام چین جس کے اشارہ پر بھوکے شیر کی مانند گرج اٹھا۔ جس کی رہبری میں چینی قوم زخمی ناگن کی طرح قاتل کی تلاش میں بے دل و بے جگر ہو کر لڑ رہی ہے۔ جو خطرے سے بے خبر اور موت سے نڈر شمع وطن پر پروانہ کی طرح فدا ہو رہی ہے۔ وہ چیان کائے شیک جس نے تمام چھوٹے چھوٹے خود مختار سرداروں کو ملا کر چین کو ایک کر لیا ہے جس نے یہ قسم کھائی ہے کہ وہ چینیوں کو ایک قوم بنا کر غلامی سے آزاد کرا کے رہیگا ——

——(۵)——

اس ملاقات کے کچھ ہی دن بعد کا ذکر ہے ایک قہوہ خانہ میں نکومہ اپنے سادہ لباس میں لائے کے ساتھ قہوہ پی رہا تھا۔ دوران گفتگو میں حسب معمول وہ چند اہم باتیں بھی کہہ گیا۔ اُس نے بتلایا کہ مخبروں نے یہ اطلاع دی ہے کہ شنگھائے کی چینی فوج میں بوجہ شکست پسپا ہونے کے آثار نمودار ہو رہے ہیں اور کمانڈر چیان کائے شیک سے حکم لینے کی غرض سے روانہ ہوا ہے۔ خیال ہے کہ کل "وار کونسل" مع چیان کائے شیک موقع دیکھنے آئینگے۔

یہ خبر بہت ہی تشویشناک تھی جسنے لائے کو بے چین کر دیا۔ تاہم اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا "پھر کیا ہوگا؟"

نکومہ "مجھے اُنکے تعاقب میں کل صبح ہی روانہ ہونا پڑے گا۔ اچھا اب اجازت دو لائے۔ چند ضروری کام کرنے ہیں۔ اسلئے آج تم سے مجبوراً جلد رخصت ہونا پڑ رہا ہے"

"بہتر ہے!" لائے نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ اس خبر نے اس کو تنا متوحش کر دیا تھا کہ وہ نکومہ کو زیادہ ٹھہرنے کے لئے نہ کہہ سکی۔

——(۶)——

قہوہ خانے سے نکلکر لائے نے نکومہ کو اپنی موٹر پر ہوائی جہازوں کے قیام گاہ تک پہونچایا اور خدا حافظ کہکر وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

اب لائے سخت پریشان تھی۔ تمام خطرات یکے بعد دیگرے اس کے سامنے آرہے تھے۔ اُس نے سوچنا شروع کیا۔ ٹیلیفون کا استعمال تو ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ جاپانیوں کی ماتحتی میں آچکا ہے۔ وقت کی کمی اس کی بھی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ خبر رساں کا انتظار کرے اور اسکے ذریعہ چیان کائے شیک اور وار کونسل کو ہوائی تعاقب کے خطرہ سے آگاہ کرے۔ آخر دل ہی دل میں اس نے کچھ فیصلہ کیا۔ اور ہمت کر کے جو کرنا تھا کر گذری۔

——(۷)——

دوسری صبح نکومہ اپنے طیارہ میں بم اور بم باز کو لیکر روانہ ہوا۔ اونچائی پر پہونچنے کے لئے اس نے پہلے مشرق کی طرف پرواز کی اور پھر مغرب کی سمت واپس ہوا۔ قریب نو بجے نکومہ اپنا ہوائی جہاز لے کر نانکنگ سے شنگھائے کی طرف جاتی ہوئی چینی موٹروں کی تلاش میں نیچا ہوا۔ پائیلٹ [illegible] جہاز کو نیچا اس لئے کرتا ہے کہ بم پھینکنے والا صحیح نشانہ پر بم پھینک سکے جونہی بم باز جہاز کے نیچے حصہ میں اترا اور بم پھینکنے کی کھڑکی کھلی اور وہ چیانگ کائے شیک کی موٹر پر بم پھینکنے کو ہوا کہ ایک نامعلوم ہاتھ چین کی حمایت میں اُٹھا بم باز کے سر پر ضرب لگی اور وہ ٹھنڈا ہو گیا۔

نکومہ نے دو ایک بار پھر موٹروں کی سیدھ میں اس خیال سے کہ شاید بم پھینکنے والا اس بلندی سے بم نہیں پھینک سکتا۔ اور بھی گھبرا کر غوطہ لگایا لیکن پھر بھی کوئی بم نہ گرا تو نکومہ بہت سٹپٹایا اور اُسنے مڑکر دیکھا۔ وہاں بجائے بمبار کے لائے پستول ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔ حیرت و استعجاب سے نکومہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، وہ صرف اتنا کہہ سکا "ہائیں لائے یہ تم"!

لائے نے مستقل مزاجی سے جواب دیا "ہاں میں ہی ہوں نکومہ۔ یہ میں نے ہی کیا ہے۔ بس اب ہمیں اس قصہ کو ختم کر دینا چاہیئے۔ میری دلی تمنا تھی کہ تم زندہ رہو۔ لیکن اگر تم زندہ رہے تو میرے وطن کے رقیب ہو میرے وطنی بھائیوں میرے وطن کے جانثاروں کی جان لیتے رہو گے۔ چینی غلام ہو جائینگے اور یہ میں ہرگز نہیں دیکھ سکتی۔ تم دنیا میں مجھے سب سے زیادہ محبوب ہو لیکن وطن۔ آہ! میں اپنے وطن کو بھی اس طرح برباد ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ میں تمہارے ساتھ ہی مروں گی۔ تمہارے بغیر میں بھی زندہ نہیں رہ سکتی" یہ کہتے ہوئے لائے نے نہایت استقلال سے نکومہ کے سر کو نشانہ بنا کر فائر کر دیا، ——

——(۸)——

اب جب کہ جہاز چلانے والا ہی نہ رہا تو جہاز کا بے قابو ہو جانا یقینی تھا چنانچہ انجن چلتے رہے جہاز نے غوطہ لگایا اور سنّاٹے کے ساتھ نیچے کی طرف گرنے لگا۔ ہوا کی تیزی سے لائے کا دم گھٹنے لگا تھا اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ایک دھماکے کے ساتھ جہاز گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور اس طرح یہ فدائے وطن خاتون اپنے وطن کے رقیب کے ساتھ ہی فنا ہو کر رہی۔

جسوقت جہاز گر کر پاش پاش ہوا ہے تو نکومہ اور بم باز بالکل مر چکے تھے۔ لائے سسک رہی تھی۔ لیکن اسکی ہڈیوں کا چورا ہو گیا تھا۔ گرنے کے بعد وہ ۲ گھنٹے اور ۲۹ منٹ تک ہاسپٹل میں آکسیجن وغیرہ کی مدد سے زندہ رہی اور افسانۂ محبت ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں سنا سکی جو ہدیۂ ناظرین ہے +

محبوبہ محمودہ بیگم (طیبہ)

اعلانِ آزادی

سنہ ۲۰۰۰ء کا ایک تخیلی افسانہ۔ صنفِ نازک سے معذرت کیساتھ

"لیکن آخر انہیں ہُوا کیا تھا؟" کملا نے کمرے میں گھستے ہُوئے چلاکر کہا: "ابھی گھنٹہ بھر بھی تو نہیں ہوا۔ پھول سجاکر دونوں گلدان رکھ گئی ہوں میز پر! نیچے کیوں پھینکدیا انہیں۔ آخر آپ کو سوجھی کیا تھی؟ کتنے ارمان سے خریدے تھے میں نے یہ گلدان! — جی ہاں چونتیس روپے کی جوڑی! ایک کا آپنے چُورا کردیا۔ اب اس ایک کا میں کیا کروں گی اس کو بھی پھوڑ دو!" یہ کہکر کملا نے دوسرا گلدان جو میز کے نیچے اوندھا ہوا میز پر سے گرنے کے بعد بھی نہ ٹوٹ کر اپنی قسمت پر ناز کررہا تھا۔ اُٹھاکر دیوار پر کھینچ مارا — ایک تڑاخے کیساتھ۔

"جی اب بھی سائنس کے ارنگے پھیلانے کیلئے آخر یہی میز رہ گئی تھی؟ اُف غضب! ایک نشد دو شد۔ یہ اس میز پوش نے کیا قصور کیا تھا آپ کا۔ کیسے کالے پیلے دھبے لگائے ہیں اس پر۔ ایک جان مصیبت میں کر رکھی ہے آپ نے میری۔ گھر چھوڑ کر نکل جاؤں آخر کیا کروں کیا نہ کروں؟"

پروفیسر بوس چپکے سے اُٹھ کر اپنی لیبوریٹری میں چلا گیا۔

پروفیسر اپنی بیوی کی ڈانٹ ڈپٹ کا کچھ عادی سا ہوگیا تھا۔ آخر ہوتا بھی کیوں نہیں؟ روزانہ کا معمول ہی تو تھا! کبھی کم کبھی زیادہ! اسے ہر معاملہ میں اپنی بیوی کی باتیں سُننی ہی پڑتیں۔ کملا کبھی کبھی تو اسے ایسا آڑے ہاتھوں لیتی کہ پروفیسر کو خاموشی ہی اختیار کرنی پڑتی۔ آہ! بیچارے کی خانگی زندگی کتنی بدمزہ تھی! اس کا اندازہ باہر کے لوگ لگا ہی نہیں سکتے۔

ادھر کملا عورتوں کے حقوق آزادی اور مساوات کی علمبردار تھی۔ اور اپنی صنف کی ایک مسلمہ لیڈر! اس نے نسائی دُنیا میں ایک ہلچل مچادی تھی۔ عورتوں کو مردوں کے برابر کھڑا کرنے کے لئے اس نے اپنی زندگی تیاگ دی تھی۔ "انجمن ترقیِ نسواں" جتنی تجاویز و تدابیر اس سلسلے میں اختیار کرتی وہ ان پر سب سے پہلے عمل کرتی۔

"آزادی اور مساوات": وہ اپنی مٹھی زور سے میز پر مار کر اپنی تقریر میں روانی اور جذبات پیدا کرتے ہوئے چلاتی: "ہم اپنا پیدائشی حق مردوں سے منوا کر رہیں گے۔ آخر مردوں کو کس طرح ہم پر فوقیت حاصل ہے؟ ہم ان سے بھی آگے بڑھکر دم لیں گے! آخر ہم کیا نہیں کرسکتے! مرد تو ہمارے غلام ہیں — پیدائشی غلام — ہمارے اور ہمارے بچوں کے لئے ضروریات فراہم کرنا آخر انہی کا تو فرض ہے۔ انہیں کرنا پڑتا ہے۔ سب کچھ کرنا پڑتا ہے! ہمارے لئے انہیں بھیک بھی مانگنی پڑتی ہے!"

اسکے الفاظ میں جادو کا سا اثر تھا — ایک سر چڑھتا ہوا جادو۔ عورتوں میں ایک ہیجان بپا ہوجاتا اور وہ ایک زبان ہوکر قسم کھاتیں کہ مردوں کے مظالم وہ کبھی نہیں سہیں گی۔ رفتہ رفتہ سارے شہر میں۔ شہر سے ملک میں آگ سی بھڑک اٹھی! جگہ جگہ اس انجمن کے ماتحت جلسے ہوتے۔ کانفرنسیں ہوتیں، اور کملا سب جگہ اس آگ پر تیل چھڑکتی۔

پروفیسر بوس، نسوانی دُنیا کی اس ترقی کو خاموشی سے دیکھتا رہا۔ خاموشی اور بے تعلقی کے ساتھ — اس نے موجودہ ترقی کی تمام مراعات اپنی بیوی کو دے رکھی تھیں — آزادی، مساوات اور جو کچھ وہ چاہتی تھی۔ یا اس کو مجبوراً کملا کے آگے ——— اس کی بے پناہ، قینچی سے زیادہ تیز زبان کے آگے ——— جھکنا پڑتا تھا۔

وہ ایک خاموش اور متین انسان تھا ——— حد سے زیادہ بُردبار ——— اس کی کشادہ پیشانی، لمبی ناک چھوٹی چھوٹی مگر تیز اور چمکیلی آنکھیں اسکی ذہانت اور قابلیت کا پتہ دیتی تھیں تو زرد رنگ۔ بکھرے ہوئے بال اُبھری ہوئی رگیں اسکے محنتی مستقل مزاج اور شب بیدار ہونے کا بین ثبوت تھیں۔

لیکن کچھ دنوں سے وہ اور بھی خاموش رہنے لگا تھا — کسی گہرے خیال میں مست ——— نہ معلوم کیا خیال اسے بےچین کررہا تھا؟ اکثر باتیں کرتے کرتے اپنے خیالات میں ایسا محو ہوجاتا کہ لوگ حیران رہ جاتے کہ کہیں پروفیسر بیمار تو نہیں ہیں اور پھر لوگوں کے استفسار پر کچھ اس طرح خالی الذہن ہوکر انکی طرف دیکھتا کہ لوگوں کا شک اور پختہ ہوجاتا۔ اس کی لیبوریٹری بھی ان اثرات سے محفوظ نہ تھی۔ شیشے کی نلیاں۔ عکسی شیشے ادویات کی چھوٹی بڑی شیشیاں اور دیگر آلات تتر بتر پڑے تھے۔

کچھ بھی ہو دنیا کے مشہور سائنسدانوں میں ڈاکٹر سر جگدیش کمار بوس کی دھوم تھی۔ علم کیمیا۔ تشریح الاعضاء اور علم ارواح کا "زبردست ماہر" موجودہ زمانے کا سب سے بڑا سائنسداں! آخر اسے کون نہیں جانتا تھا۔ اس کی ایجادات نے ساری دنیا میں ایک تہلکہ مچادیا تھا۔ اسکے سائنٹفک مقالات کے پڑھنے والے قائل! اس کا سنجیدہ طرزِ بیان! سارا سائنسداں طبقہ انگشت

بدنداں رہ جاتا۔ کیا واقعی کسی ایڈیسن۔ نیوٹن۔ یا جیمز نے ہندوستان میں جنم لیا ہے؟

لیکن ایک عرصے سے پروفیسر بوس کی ایجادات کا سلسلہ بند تھا۔ ——— بالکل بند ——— ایسے سنسنی خیز مقالات جن کے لئے لوگوں کی آنکھیں ترستی تھیں۔ ایسے ہیجان انگیز مشاہدات جنہوں نے سائنٹفک رسالوں کو پبلک میں مقبول کر دیا تھا۔ اب کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ کیا واقعی پروفیسر کا مشن ——— وہ بلند مقصد حیات جس کے لئے اس نے کبھی اپنی جان تک کی پرواہ نہیں کی تھی' اپنی زندگی کا آرام۔ راتوں کی نیند۔ بیوی کی محبت سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ پورا ہو گیا تھا؟ لوگ حیران تھے، سخت متعجب! ——— اور بعض مایوس بھی۔ کہ کیا انکی امیدیں ——— ہندوستان کی اُمیدیں ——— سب موہوم ثابت ہوں گی؟

لیکن اس سے بھی زیادہ مایوس کن، دلشکن لیکن سنسنی خیز وہ خبر تھی جو لوگوں نے اخبارات میں دیکھی۔ لوگوں کے ہاتھوں سے اخبار چھوٹ پڑے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟

"پروفیسر بوس۔ ڈاکٹر سر جگدیش کمار بوس۔ دنیا کا مایۂ ناز سائنسدان غائب ہے۔ کہاں؟ کدھر؟ اور آخر کیوں؟

قدرتی طور پر دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ نہایت ہی ہوشیار، تجربہ کار اور مانے ہوئے سراغ رسانوں کا ایک بورڈ تحقیقات و تفتیش کے لئے مقرر کیا گیا لیکن سب بے سود۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ پروفیسر ایک شام کو اپنی بیوی کملا کی درشت کلامی سے ——— دل میں چبھنے والے طعنوں سے افسردہ ہو کر بغیر کچھ کہے سنے باہر نکل گیا ——— اور ایسا تو اکثر ہوتا تھا! ——— لیکن اسکے بعد ——— گئی رات تک ——— صبح تک ——— بلکہ دنوں تک ——— اس کا کہیں پتہ ہی نہیں تھا۔

کملا حیران تھی ——— سخت متعجب ——— کہ کہیں پروفیسر کی گمشدگی کا عورتوں کے اس "اعلانِ آزادی" سے تو کوئی تعلق نہیں جو حال ہی میں ان کی بین الاقوامی کانفرنس نے متفقہ طور پر منظور کر کے شائع کیا ہے اور حقیقت یہ ہے ایک خوفناک حقیقت کہ یہ "اعلانِ آزادی" ایک زبردست عالمگیر انقلاب کا ذمہ دار تھا ایسا زبردست انقلاب کہ جسکی مثال دنیا کی تاریخ میں ——— کسی دور میں کسی زمانے میں ——— نہیں ملتی۔ موجودہ زمانے کی عورتوں کی بیباکی ——— بے شرمی' اور مردوں سے بے تعلقی کی انتہا!! کیا ۱۹۳۸ء میں عورتیں ایسی جرات کر سکتی تھیں؟

اور یہ حیرت انگیز اعلان جتنا عجیب اور مضحکہ خیز ہے اتنا ہی سنجیدہ بھی ——— تمام دنیا کی عورتوں کا متفقہ فیصلہ ——— اٹل اور ناقابل واگذاشت!! ترجمہ کا نمونہ ملاحظہ کیجئے:-

"عورتیں مدت مدید سے وضع حمل کی جان لیوا تکالیف برداشت کرتی چلی آئی ہیں جو انکی صنف کے لئے موجودہ زمانے میں ایک زبردست ظلم ہے! اسلئے ان کو مردوں کے پنجۂ استبداد سے بچانے اور ان کی ہوس کاری کا شکار بننے سے روکنے کے لئے یہ کانفرنس متفقہ طور پر منظور کرتی ہے کہ آئندہ عورتیں بچے جننے کی تکالیف کبھی نہیں برداشت کرینگی اور ہر عملی تدبیر اس تجویز کو بروئے کار لانے کے لئے اختیار کرینگی ——— .... وغیرہ وغیرہ"

(رزولیوشن نمبر ۲۱ مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۹۹ء)

اس اعلان کے شائع ہوتے ہی تمام دنیا میں ایک ہیجان بپا ہو گیا ——— ناقابل بیان طوفان ——— اخبارات نے اس "نسوانی حماقت" کی خوب ہنسی اڑائی۔ لیکن اہل بصیرت سمجھتے تھے کہ اس بیان کی کیا حقیقت ہے۔ وہ جانتے تھے کہ عورت کو ——— اگر وہ اڑ جائے ——— کوئی طاقت ——— کوئی ترغیب کوئی لالچ ——— اسکے راستے سے نہیں ہٹا سکتی۔ اُنہوں نے مصالحت کی کوشش بھی کی ——— نیک و بد نتائج سمجھائے لیکن سب بے سود۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس اعلان کے روح فرسا نتائج مردوں کو محسوس ہونے لگے۔ عورتوں نے بھی اسکی تشہیر کے لئے ہزاروں سوسائٹیاں ——— ملک بہ ملک شہر بہ شہر قریہ در قریہ ——— قائم کیں۔ نسوانی دنیا کے قابل ترین دماغ ——— آخر اب انہیں کام بھی کیا تھا؟ ——— اس کے پروپیگنڈے میں منہمک ہو گئے۔ نئے نئے وسائل اور طریقے اس کی توسیع کے لئے اختراع کئے گئے۔ رفتہ رفتہ اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہونے لگے۔

حوّا کی یہ ضدی بیٹیاں اب آزاد تھیں ——— بالکل آزاد ——— سب سے بڑی زنجیر ——— عورت اور مرد کو رشتۂ محبت میں کسنے والی زنجیر اولاد ——— اب شکستہ ہو چکی تھی۔ کنواریوں نے قسمیں کھا لیں کہ وہ شادی ہی نہیں کرینگی ——— آخر کیوں کریں؟ اب انہیں مردوں کے دست نگر رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے ——— شادی شدہ عورتوں کو بچے پیدا کرنے پر اب کون مجبور کر سکتا تھا؟ اس آزادی کے زمانے میں؟

مردوں کو محسوس ہونے لگا کہ دنیا اب تباہ ہو جائیگی کہ اچانک ——— بالکل دفعتاً ——— بجلی کی سی سرعت کے ساتھ یہ خبر تمام دنیا میں پھیل گئی ——— بلکہ گونج گئی ——— کوئی روزانہ جریدہ ایسا نہیں تھا جس نے سرخی نہ دی ہو "پروفیسر بوس زندہ سلامت"۔ "عورتوں کے غرور پر ایک کاری ضرب" "مردوں کے وقار کو قائم رکھنے اور عورتوں کے شرمناک اعلان آزادی کے خراب نتائج کا موثر ازالہ"

سارا کلکتہ اسٹیشن پر اسکے استقبال کے لئے ٹوٹ پڑا۔ لوگوں نے نہیں صرف مردوں نے —— "ڈاکٹر بوس زندہ باد" "مردوں کا محافظ سلامت" "پرش جاتی کے سیوک کی جے" کے فلک شگاف نعرے لگائے۔

اخباروں کے نامہ نگار، کیمرا مین، فوٹو گرافر، وکیل، بیرسٹر، پبلک لیڈر، تجار، سرکاری ملازمین، کسان، مزدور، کونسا طبقہ تھا جس نے تہِ دل سے پروفیسر بوس کو خوش آمدید نہیں کہا؟ تفصیل سے احتراز کرتے ہوئے ہم صرف اس پیام پر اکتفا کرتے ہیں جو پروفیسر بوس نے اسی شام اپنے ہزارہا ہمجنسوں کو کلکتہ ٹاؤن ہال میں پہونچایا جو تمام دنیا میں براڈ کاسٹ کیا گیا۔

"حضرات! یہ امر آپ سے پوشیدہ نہیں ہے کہ عورتیں —— ہماری ایک عرصہ دراز کی رفقائے حیات جنہیں ہم کبھی اپنا "بہتر نصف" کہا کرتے تھے —— دن بدن مغرور ہوتی جا رہی ہیں۔ انکے غرور کی انتہا —— بالکل لایعنی اور غیر فطری انتہا —— ان کے "اعلانِ آزادی" تک پہونچ چکی ہے۔ دنیا کے لئے یہ اعلان جتنا تباہ کن، خطرناک اور روح فرسا ہے، اس کا اندازہ آپ نہیں کر سکتے —— کر ہی نہیں سکتے!! جب سے اس اعلان کے خوفناک نتائج عملی طور پر ظاہر ہونے لگے ہیں تمام دنیا ایک ماتم کدہ بن گئی ہے۔ آہ حوا کی خود سر بیٹیاں!

لیکن حضرات! "پرش جاتی" کی طرف سے آپ بالکل مطمئن رہیں! جو کچھ میں کہنے والا ہوں شاید آپ اس کا اعتبار نہ کریں —— اور کون اعتبار کر سکتا ہے۔ آپ میرے منہ پر ہنسیں، قہقہے لگائیں، مجھے جھوٹا قرار دیں لیکن یہ سب جبھی تک ہے جب تک میں آپ کو یقین نہیں دلا دوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ وہ عملی طور پر ممکن ہے۔ تب کہتا ہوں کہ پرش جاتی کو کسی طرح کی فکر کرنی لاحاصل ہے "عورتیں اپنے غرور میں اس قدر آگے بڑھ گئی ہیں کہ انہوں نے خود اپنے آپ کو —— اپنے ہاتھوں ہی —— ساتھ ہی ہم کو بھی —— تباہ کرنے کی ٹھان لی ہے۔ انہوں نے اپنی نسل کا سلسلہ خود منقطع کر لیا ہے اور وہ زمانہ دور نہیں ہے کہ جب عورتیں صفحۂ ہستی کو ہمیشہ کے لئے مفقود ہو جائینگی۔ ان کی تصویریں اور مجسمے —— اور وہ بھی صرف عجائب خانوں میں۔

ہم کو ان کی یاد دلایا کریں گے۔"

یہاں تک پہونچکر پروفیسر نے اپنا گلا صاف کیا، پیشانی پر سے پسینہ پونچھا۔ اطمینان کا سانس لے کر چاروں طرف دیکھا اور اپنی تقریر کو جاری کیا،

"حضرات میں آپ کو زیادہ کشمکش و پیچ میں نہیں رکھنا —— چاہتا۔ میں نے ایک عرصۂ دراز کی تحقیقات —— مسلسل تین سال کی کاوشانہ تحقیقات —— کے بعد معلوم کر لیا ہے کہ **عورت کے بغیر** بھی انسانی نسل کی افزائش اور ترقی ممکن ہے! عملی طور پر! کیا یہ عہدِ حاضرہ کی سب سے بڑی ایجاد نہیں ہے؟" (تالیاں، چیرز، نعرہ ہائے تحسین و آفرین۔)

تمام حاضرین —— مرد حاضرین —— نے عورتوں کی طرف —— عورتیں بھی ایک کثیر تعداد میں مردوں کے پیچھے کھڑی تھیں (مردوں کے دل میں اب ان کے لئے کوئی وقعت نہیں تھی) —— ایک عجیب انداز مسرت سے دیکھا —— فوقیت کے ایک دلخوش کن احساس کے ساتھ! پروفیسر نے اپنی تقریر کا سلسلہ جاری کرتے ہوئے کہا۔

"یہی نہیں میں نے ایک ایسی مشین ایجاد کی ہے کہ جو ہم کو "پرش جاتی" کے بہترین نمونے —— بہترین بلحاظ تندرستی، خوبصورتی و مضبوطی —— مہیا کریگی اور (چٹکی بجا کر) کتنی آسانی سے! صرف دو چار ادویات بالکل معمولی ادویات —— مقررہ مقدار میں مشین میں ڈالئے —— بس صرف اتنا ہی۔ اور دو ماہ کے اندر ہی اندر جیتا جاگتا بچہ مشین میں کلبلانے لگے گا —— یاد رہے زندگی کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے۔ اجسام کی تکمیل ہی سے ان میں روح حلول کرتی ہے —— اور نو ہفتہ کے بعد آپ ایک مکمل بچہ —— لڑکا! لڑکی نہیں —— تیار لے لیجئے۔ اور اسکے ساتھ ہی ساتھ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں —— ایک شریف اور باعزت آدمی کی طرح —— مصنوعی بچے کی عمر ہمارے سے زیادہ طویل ہوگی اور ہوگا بھی وہ ہم سے ہر حال میں برتر —— خوبصورت جری، بہادر ——!! قدرتی بچوں میں بعض اوقات —— بلکہ اکثر —— جسمانی و روحانی عیوب بھی ہوتے ہیں اور ہمارا مصنوعی بچہ تمام عیوب سے بالاتر ہوگا۔"

"اب ہماری باری ہے" پروفیسر نے مٹھیاں بھینچ

کے عورتوں کی طرف بنظر تبہر دیکھ کر کہا "عورتیں مفقود ہوکر رہیں گی قطعی مفقود - ہم دنیا میں ایک عورت بھی نہیں دیکھ سکتے۔ آخر کیوں؟ کیا غرور کا سر نیچا نہیں ہوتا ؟

حضرات کل صبح آٹھ بجے ! میری لیبورٹیری میں ——— نمبر ۳ کولوٹولا اسٹریٹ ——— آپ سب کے سامنے پہلے مصنوعی بچے کی داغ بیل ڈالی جائیگی اور صرف نو ہفتے کے بعد بچہ نمائش کے لئے تیار ہو جائیگا ——— یاد رہے صرف نو ہفتے بعد ——— آپ کو نو ماہ کا طویل انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے - (قہقہہ) اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں ، مجھے امید ہے کہ آپ کل میری لیبورٹیری میں تشریف لاکر مجھے ممنون فرمائینگے"

اس حیرت انگیز، امید افزا اور پرجوش وعدے کے بعد مردوں کی خوشی کی انتہا نہیں رہی ——— اور کیوں رہتی ——— اسی وقت ——— بلکہ اسی لمحے ——— تقریباً ہر ایک "پرش" نے اپنے دلمیں قسم کھائی کہ عورت سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھے گا ——— جسمانی طور پر تو ممکن ہی نہ تھا - ذہنی طور پر بھی نہیں "ان ضدی حوا کی بیٹیوں کو ——— جو ان کی بھی نسل فنا کرنے کی فکر میں تھیں فنا ہی ہو جانا چاہیئے " بعض نوجوانوں کی طبیعتیں افسردہ بھی تھیں ——— نہ معلوم کیوں ——— شاید عورتوں کے اس ہولناک انجام پر !۔

عورتوں کے مجمع میں عجیب ہیجان بپا تھا، کانا پھوسی، قہقہے، بعض تو واقعی پروفیسر پر ایمان لے آئیں - آخر اس نے ابتک کبھی جھوٹ بھی تو نہیں بولا تھا بعض صرف ایک خفیف سے قہقہے کے ساتھ اس کا مضحکہ اڑانے کی کوشش کر رہی تھیں "کہیں ایسا ممکن ہے ؟ ایک مشین ! بچہ پیدا کر سکے وہ بھی جیتا جاگتا ! ہیں ! اور صرف لڑکا ہی ؟ ہو ہی نہیں سکتا " پھر بھی یہ ایک حقیقت ہو کہ سب کے دلمیں ——— اندرونی طور پر ——— ایک خوف و ہراس کی لہر ضرور دوڑ گئی تھی جسے وہ پروفیسر کا مذاق اڑا کر نکالنا چاہتی تھیں لیکن اس دعوے پر جسے پورا پورا الیقین تھا ——— جسکے نسوانی غرور کو ایک کاری ضرب لگی تھی ——— وہ پروفیسر کی بیوی کملا تھی ۔

اخباروں نے تعریف کے پل باندھ دئے اور اکثر نے ——— نسوانی اخبارات نے بھی بشرطیکہ یہ خیالی پلاؤ پک ہی جائے ! ——— پروفیسر کو پرش جاتی کا چمپین champion ——— قرار دیا لنڈن ٹائمز کے ایک نمائندے کے استفسار پر پروفیسر ایشلے بنگھم Ashley Bengham ——— یورپ کے ممتاز ترین سائنسدان نے کہا "ان تمام عناصر ——— گرمی، روشنی اور اجزائے ترکیب ——— کی موجودگی میں موعودہ نتیجے پر پہونچنا اگرچہ آسان ہے اور یہ بھی ممکن ہو کہ ہم ایک مصنوعی انسان کی ساخت میں کامیاب ہو جائیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ زیادہ عرصے تک زندہ بھی رہے ۔ ڈاکٹر شاڈول Shadwell کی رائے کے خیالمیں کامیابی ذرا متذبذب تھی - دوسرے سائنسداں مثلاً جیمز ہاروی James Harvey اور آرتھر لٹلٹن Arthur Littleton ——— کامیابی کی طرف سے بالکل مایوس تھے - ان کے خیال میں یہ صرف ایک "حماقت" تھی ۔

لیکن پھر بھی عورتیں بے چین تھیں ——— سخت منتظر !! ——— انکے قدیم اور متبرک حق پر مرد ڈاکہ ڈال رہے تھے ! ——— ایک سنگین ڈاکہ ! ——— دانتوں میں انگلی دینے کی شرط نہیں، جی ہاں ! یقین کیجئے چاہے نہ کیجئے آپ کو اختیار ہے - مگر یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہو ! ——— روزِ روشن کی طرح صاف اور واضح ——— ایسی حقیقت جس نے دنیا میں حیرت و استعجاب کی لہر دوڑا دی ——— مگر عورتوں میں افسردگی اور پژمردگی کی ! ——— بجلی کی سی سرعت کیساتھ، ایک جنگلی اور طوفانی آگ کی مانند ——— کہ پروفیسر کی مشین نے "موعودہ وقت پر" مردانہ صنف" کا ایک بہترین نمونہ پیش کیا ——— ایک بچہ ازحد خوبصورت، تندرست اور چونچال !! نمبر ۳ کولوٹولا اسٹریٹ پر لوگوں نے گویا دھاوا بولدیا، ہر وقت ہزار ہا نفوس ——— مرد، عورت بچے ——— مشاہدہ کرنے آتے ——— اور چلے آتے ——— ہزار ہا جگہ کی تنگی کی وجہ سے باہر کھڑے رہتے ——— سینکڑوں واپس بھی چلے جاتے ——— دو دو تین تین گھنٹے کے انتظار کے بعد اگر اندر جانے کا موقع مل جاتا تو لوگ خود کو بڑا خوش قسمت سمجھتے - رات دن ایک تانتا سا بندھا رہتا - ناقابل اختتام ! کروڑ ہا لوگ دیگر مقامات سے اردگرد کے مواضعات سے دیگر صوبہ جات سے ——— اور ہزار ہا دیگر ممالک سے بھی انسان کی اس حیرت انگیز کامیابی پر عش عش کرنے آتے اور "پرش جاتی کے سیوک" کی جے پکارتے ہوئے واپس چلے جاتے - بچے کو جو تحائف لوگوں نے ——— پروفیسر سے اظہار عقیدت کے لئے ——— بعض لوگ اسے واقعی دیوتا سمجھنے لگے تھے ——— اس ترقی اور روشنی کے زمانے میں بھی !! ——— صرف ایک ہفتے میں دئے، یا باہر سے ——— جس میں ہندوستان کے علاوہ تقریباً تمام دیگر ممالک بھی شامل ہیں ——— بھیجے - انکی مجموعی تعداد صرف چونتیس لاکھ ستاسی ہزار ایک سو پچپن تھی جس میں معمولی پیپیوں، سیٹیوں جھنجھنوں کے علاوہ ہزار ہا قسام کی بیش قیمت و مفید اشیا بھی شامل تھیں - اور جو پیغامات تہنیت پروفیسر کو

اس عرصے میں ملے ان کی مجموعی تعداد اس تعداد سے کم و بیش چھ گنا تھی۔ ان پیغامات میں سب سے زیادہ قابل ذکر ہز میجسٹی الزبتھ والیِ انگلستان، پنڈت ہنرو صدرِ حکومت اشتراکیہ ہندوستان، مہاتما دعیہ گان اور مولانا جنا کے برقیے تھے۔ لیکن کچھ نیم صنف نازک میں سے صرف دو کو توفیق ہوئی۔ آہ حوا کی ضدی بیٹیاں! جنہوں نے پروفیسر کی اس گرانقدر کامیابی کو قابل تحسین سمجھا۔ ایک مذکورۂ بالا ملکۂ انگلستان دوسرے مسز فائیڈو مشہور بلبل ہند جنہوں نے پچھلی جنگ آزادی میں اپنا سب کچھ وطن پر قربان کردیا تھا!

بچہ کو ایک خاص پرورش گاہ میں رکھا گیا جس کی دیکھ بھال کرنے والے سب مرد ہی تھے۔ —— آخر عورتوں نے اپنا یہ حق بھی گنوا دیا تھا تو دی!

اور لیجئے! ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر اور مشہور مفکر ڈاکٹر اندرا کیٹور نے اس سب سے پہلے مصنوعی بچے کو گود لے کر پروفیسر بوس کو اسکی پرورش کے بارے بھی سبکدوش کردیا! اور پروفیسر نے بھی انکے ادبی کارناموں کے اعتراف میں اس تحفہ کو پیش کرنے میں صد گونہ افتخار سمجھا!

اب سرکاری خرچ سے کلکتہ کے نواح میں ایک عظیم الشان فیکٹری قائم ہو چکی تھی —— صرف بچے پیدا کرنے کے لئے۔ جس میں بیک وقت تین ہزار بچے "زیر تعمیر" رہ سکتے تھے۔ کیونکہ آخر حکومت کو بھی تو رعایا کی ضرورت تھی! اور پروفیسر بوس اسکے نگراں اور منتظم مقرر کئے گئے۔ ہزاروں بچے ڈھل ڈھل کر نکلتے رہے اور پروان چڑھتے رہے۔ اور کتنے تندرست، خوبصورت اور چونچال تھے یہ بچے! ہر وقت خنداں و شاداں! اور پھر ان عورتوں کے بچوں سے کتنے ملتے ہوئے —— چال ڈھال، وضع قطع، چہرے مہرے میں کہ دیکھنے والے دانتوں میں انگلیاں دے لیتے۔

پروفیسر کی اس عدیم المثال کامیابی پر بھلا عورتوں کے پیچ و تاب کی حد رہ سکتی تھی؟ مردوں نے ان کے وقار کو کچل ڈالا تھا، اور کتنی سختی سے! ہر عورت کے پیش نظر اپنا خوفناک انجام تھا۔ آہ تباہی و بربادی! کیا واقعی ایسی لطیف جنس، مردوں کی ابدالآباد سے رفیق و غمخوار ہمیشہ کے لئے مفقود ہوجائے گی اور اسکی یادگار صرف تصویریں اور مجسمے رہ جائیں گے؟ عجائب خانوں میں؟

آخرکار عورتوں کی بین الاقوامی کانفرنس نے اٹھارہ گھنٹے کی بحث و تمحیص کے بعد یہ طے کیا —— بمجبوری —— کہ عورتیں —— تمام دنیا کی عورتیں —— ایک زبردست وفد —— delegation "شیطان مجسم" پروفیسر کی فیکٹری کے قریب احتجاجی مظاہرہ کرنے کے لئے بھیجیں۔ اور وہ اس سے بالمشافہ گفتگو کرکے اس کو اس شیطانی کام سے باز رکھنے کی کوشش کرے۔

پروفیسر پہلے تو گفتگو کے لئے تیار ہی نہیں تھا —— آخر اسے کیا ضرورت تھی؟ —— اپنی اس اعلیٰ و ارفع حیثیت سے ذرا بھی نیچے کی طرف جھکنے کی! لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کملا اس "وفد" کی رہنمائی کر رہی تھی تو وہ آخر تیار ہی ہو گیا! ہاں! اب اس کا موقع تھا —— سنہری موقع —— جس کا اسے عرصہ سے انتظار تھا۔ آخر اس کی بیوی کو —— تمام دنیا کی عورتوں کو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑیگا۔ اس کو سب یاد تھا۔ اپنی بیوی کا تشدد آمیز سلوک، اس کے زہریلے طعنے تشنیع! تلوار کا زخم تو بھر ہی جاتا ہے مگر زبان کا زخم؟ بھلا کہیں بھر سکتا ہے؟

"وفد" نے پہلے تو زبردست احتجاج کیا —— پُرشور مظاہرہ! —— پھر دھمکایا۔ ڈرایا۔ مگر آخرکار گڑگڑاتے ہی بن پڑی۔ اس نے پروفیسر کو یقین دلایا کہ "بین الاقوامی نسوانی کانفرنس" اپنے ایک خاص اور غیر معمولی اجلاس میں —— جو جلد ہی منعقد ہونے والا تھا —— "اعلانِ آزادی" کی اس خاص دفعہ کو جو اس قضیئے کی جڑ اور بنیاد ہے منسوخ کردیگی۔ اور —— وہ تیار تھیں بالکل تیار! تمام مزید مراعات دینے کے لئے جن سے ان کے نسوانی غرور کو مزید دھچکہ نہ لگے۔ وہ اس پر راضی تھیں کہ "انجمن ترقی نسواں" میں مرد ممبران کا اضافہ کرلیا جائے اور انکے مشورہ کے بغیر کوئی اہم تجویز نہ منظور کیجائے انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا —— اور کیوں ہوتا۔ اس وقت ان کی جنس کی بقا و حیات کا سوال تھا! —— اگر انجمن کے سرکردہ لیڈران کے لئے مرد کوئی مناسب سزا بھی تجویز کردیں —— وہ موت بھی قبول کرلیں گی، بخوشی تمام! —— اگر اس سے نسوانی دنیا کو ہلاکت آفرینی سے بچایا جاسکے! —— اور دیکھئے قدرت کی ستم ظریفی! آج کملا کتنی عاجز اور مسکین نظر آرہی تھی، اپنے اسی شوہر کے سامنے جس پر وہ کبھی حکومت کیا کرتی تھی! ایک زرخرید غلام کی طرح!

ادھر پروفیسر بوس عورتوں کے اس مجمع کے سامنے کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ کچھ بدحواس سا! —— ایک عرصہ دراز سے وہ عورتوں سے کنارہ کش تھا —— بالکل الگ تھلگ —— آج جب اتنی عورتیں —— جن میں سے اکثر حسن و شباب کا مجسمہ تھیں تو بعض نزاکت و خوبروئی کی جان —— اسکے سامنے آئیں تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں "حسن جنگلی درندوں کو بھی موہ لیتا ہے" ایک دفعہ تو انکی عاجزانہ —— مگر مسحور کن —— درخواست کے آگے پروفیسر کچھ پسیجتا ہوا معلوم دینے لگا!! اتنے حسین عنصر کے بغیر کیا زندگی بے کیف نہ ہوجائیگی۔ خدا کی یہ خوبصورت مخلوق کیا تباہ ہوجانی چاہیئے! بالکل معدوم و مفقود!" یہی اور کچھ ایسے ہی خیالات پروفیسر کے دل پر قبضہ

گئے ہوئے تھے۔ اور وہ حیران و ششدر کھڑا تھا ـــــ بالکل محو ـــــ ایک بُت کی طرح ساکن! عورتوں سے اس کا کرب و اضطراب چھپا نہ رہ سکا۔ انہوں نے اور عاجزی سے گڑگڑا کر اپنی درخواست کو دُہرایا ـــــ باریک اور شیریں آواز میں ـــــ "انصاف! ہم صرف انصاف چاہتے ہیں" اور پروفیسر کو وعدہ کرتے ہی بن پڑی!

"میں ہمدردانہ غور کروں گا!" اس نے کہا "مگر مجھے مہلت دو، کچھ دن کی، ایک ہفتے کی۔ مجھے نتیجے پر پہنچنے میں آخر کچھ تو دیر لگے ہی گی"۔ اور "وفد" برخاست ہوا!

جب بچے کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے۔ تو وہ اپنی ماں ہی سے شرارت کرتا ہے ـــــ معصوم اور بے ضرر! ـــــ اور پھر بھاگتا ہے اپنی ماں سے! اکڑتا ہوا! لیکن آخرکار جب اسے بھوک ستاتی ہے۔ تو وہ لوٹتا ہے اپنی ماں ہی کی طرف! اور ماں، ـــــ بیچاری ممتا کی ماری ماں ـــــ اسے محبت سے گلے لگاتی ہے، دودھ پلاتی ہے اور بھول جاتی ہے کہ کبھی اس نے کوئی شرارت بھی کی تھی! یہ تو فطرت ہے۔ انسان کی ماں۔ انسان اس سے بچکر کہیں جا سکتا ہے؟

اس ہی طرح عورتوں نے بھی شرارت کی تھی، معصوم اور بےضرر! اور وہ بھاگ رہی تھیں ـــــ یا صرف بھاگنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اپنی فطرت سے ہی! مگر اب ـــــ ایک عرصے کے تجربے کے بعد ـــــ انہیں احساس ہوا کہ وہ اپنی فطرت کو کیسے چھوڑ سکتی ہیں؟ اور آخر وہ اب اکتا گئیں تھیں فضا کی یکسانیت سے! ـــــ مردوں کی علیحدگی سے!!

نظامِ عالم کی اتنی بڑی تبدیلی خوشگوار ضرور تھی۔ مگر جب ہی تک! جب تک یہ نئی تھی۔ اب وہ پشیمان تھیں ـــــ اور آزردہ بھی ـــــ اور منتظر تھیں کسی ایسے حادثے کی ـــــ اتفاق کی! ـــــ جو انہیں پچھلی زندگی کی طرف دوبارہ لوٹا دے ـــــ مردوں کے پہلو میں! ـــــ مگر وہ خود اس طلسم کو ـــــ جس میں انہوں نے خود کو دیدہ و دانستہ پھنسا لیا تھا۔ کیسے توڑ سکتی تھیں؟

ادہر...... پروفیسر بوس کی نئی سائنس بالکل درست تھی۔ حیرت انگیز طور پر حق بجانب! ـــــ لیکن صرف سائنس کی حد تک! حق بجانب اور نامکمل! مشین کے ذریعہ انسان کی پیدائش وجود میں آگئی تھی اور افزائش نسل کا ذریعہ معلوم ہو گیا تھا۔ ایک نہایت کامیاب ذریعہ! لیکن انسانی زندگی کا منتہیٰ تو یہ نہ تھا! اور نہ ہی انسان کی خوشی ہی اس میں مضمر تھی۔ یہ نئے انسان دوسرے تمام نظریات کے پیشِ نظر چاہے کتنے بھی مکمل تھے لیکن آہ! کتنی مایوس کن ہے یہ حقیقت اور دلشکن بھی۔ کہ وہ انسانیت کے اصلی جوہر سے

بالکل بے بہرہ تھے! فطرتی طور پر! وہ آدمی ضرور تھے۔ صرف آدمی ـــــ نام ہی نام کے! ـــــ انسان نہیں! انکے پاس تھا جسم و دماغ مگر نہ تھا تو ایک درد آشنا دل نہ تھا۔ وہ بڑھ رہے تھے بڑی سرعت سے۔ مگر اس سے کیا فائدہ؟ وہ تو صرف چلتی پھرتی مشینیں تھیں۔ بےحس! ـــــ آرٹ، حسن و خوبصورتی ان کے نزدیک لایعنی سی چیزیں تھیں ـــــ بالکل بیکار! محبت و نفرت، رشک و رقابت، رحم و کرم ـــــ بلکہ تمام انسانی جذبات سے ناآشنا! ـــــ پتھر کی مورتیاں! پروفیسر کو اس لحاظ سے کتنی مایوسی ہوتی تھی سخت دلشکنی!

عورت اور مرد کے باہمی خلط ملط سے صرف افزائش نسل ہی مقصود نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ باعث ہوتا ہے ایک ایسی روحانی خوشی و انبساط کا بھی جو کسی اور طریقے سے ممکن ہی نہیں۔ گھریلو زندگی کتنی دلکش ہے! عورتوں اور بچوں کے ساتھ مل جُل کر رہنے میں کتنا سکھ اور آنند ہے! اس کا احساس مردوں کو اب ہو رہا تھا۔ سارے دن کی محنت ـــــ اعضا شکن محنت! ـــــ کے بعد شام کو جب مرد گردن لٹکائے ـــــ تھکے تھکائے ـــــ اپنے گھر کی طرف ـــــ نہیں جنت کی طرف ـــــ واپس آتے تھے تو ان عورتوں کی ایک معمولی سی مسکراہٹ، ایک ہلکا سا تبسم۔ ان کی ساری تھکن، ساری کوفت رفوچکر کر دیتا تھا۔ اور کتنی کامیابی سے! اور وہ پھر کھو جاتے تھے، ایک ایسی دنیا میں جہاں صرف پریم ہی پریم تھا ـــــ ازلی سکھ اور آنند! ـــــ

انتقام کی تند آندھی گزر چکی تھی اور مرد بھی اب منتظر تھے۔ خاموشی اور بےچینی کے ساتھ۔ عورتوں کے رویہ میں انقلاب کے! ایک ایسے خوشگوار انقلاب کے جو انہیں پھر اسی جنت زا ماحول میں لا پہنچائے۔

عورتوں کے وفد کے چلے جانے کے بعد پروفیسر نے کتنی راتیں آنکھوں میں کاٹ دی تھیں! پریشانی کے عالم میں! اس کے لئے یہ خیال سوہانِ روح بنا ہوا تھا کہ جب تک "عورتوں کے بیٹے" موجود تھے۔ وہ مشینوں سے حسبِ دلخواہ کام لے سکتے تھے۔ بچے پیدا کرنے کا! لیکن مصنوعی انسانوں کے لئے اور نئے مصنوعی انسان پیدا کرنا بالکل ناممکن تھا! وہ ایک خاص دوا جو اہم ترین جزو تھا۔ بچہ ڈھالنے کا۔ اور جس کے بغیر اجسام کی ساخت ممکن ہی نہیں تھی۔ مہیا ہی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا فراہم کرنا صرف "عورتوں کے بیٹوں" کا کام تھا۔ ظاہر ہے کہ جب تک اصلی انسان موجود تھے فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیکن آخر انسان رفتہ رفتہ فنا ہی ہونگے۔ اور پھر خود بخود انسانی نسل چاہے اصلی ہو یا مصنوعی ختم ہو جائیگی۔ کیونکہ مصنوعی انسان بھی آخر کبھی تو مرینگے ہی؟ اور پھر یہ دنیا ـــــ یہ خوبصورت اور سجی سجائی دنیا ـــــ برباد ہو جائے گی ـــــ ہمیشہ کے لئے؟ ـــــ اور بالفرض اگر یہ کمزوری لوگوں کو معلوم نہ ہو سکی؟ اور مرد اور عورتیں اس ہی طرح

—— اس ہی استقلال اور ہٹ دھرمی سے اپنے اپنے عہد پر قائم رہے
اور —— اور اگر وہ اپنی "مخلوق" کو مکمل کرنے سے پہلے ہی مرگیا؟ ——
اتفاقاً ہی! تو کیا ہوگا؟ یہ ایک انتہائی بھیانک خیال تھا اور پروفیسر کی قوت برداشت سے زیادہ! ٹھنڈا پسینہ اسکی رگ رگ سے پھوٹ نکلا، اسکی آنکھیں اس کے سرتا پا تیرتی ہوئی معلوم دینے لگیں۔ اندھیرا —— ایک خوفناک چادر کی طرح —— اسکی آنکھوں پر چھا گیا۔ اور اس کے قلب کی حرکت بند ہوگئی! مستقبل کا خیال ہی اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔

ایک نوجوان جوڑا جب ایک شام ایک پرفضا باغ کے ایک تاریک کونے سے برآمد ہوا —— مرد اور عورتیں آخر چوری چھپے ملنے ہی لگے تھے! —— تو اخبار بیچنے والے پوری طاقت سے چلا رہے تھے "پروفیسر کا انتقال پرملال" "ہزاروں بچوں کا باپ مرگیا" وغیرہ وغیرہ۔ پبلک میں تو ہلچل مچنی ہی چاہیئے تھی، تو وہ بھی! —— اور مچتی رہی۔ لیکن آپ اس ایک جوڑے۔ بلکہ ایسے ہزاروں لاکھوں جوڑوں کی خوشی کا اندازہ لگانے کی کوشش کیجئے۔ جو اس طرح کے ایک واقعہ کے انتظار میں زندگی گزار رہے تھے —— دن گن گن کر! —— گھریلو زندگی کی وہ سنہری دلچسپیاں —— جنکے وہ ایک عرصے سے خواب دیکھ رہے تھے اب ان کا استقبال کر رہی تھیں اور آخر کار مرد اور عورتیں —— فطرت کے شریر بچے! —— ایک دوسرے کے بازوؤں میں تھے!

عورتوں کا غرور اور مردوں کی ہٹ، دھوپ میں برف کی طرح پگھل کر رہ گئی! + (ترجمہ)

محمد حسین اعجازی (علیگ)

میری مملکت

شکر ہے خدائے رب العزت کا جس نے ذی مجھ کو یہ عزت اور بخشی مجھ کو یہ مملکت جو تمام سلطنتوں سے وسیع تر ہے۔ وہ حکومت جو عرض و طول میں وسعت خیال کی طرح پھیلی ہوئی ہے جس میں عجائبات قدرت سے پر بے شمار ممالک شامل ہیں۔ کہیں لق و دق صحرا دامن پھیلائے بھیانک سکوت میں منتظر ہیں کہیں بحر ناپیدا کنار ہیں جن میں سربفلک موجیں سرگرم طوفان ہیں کہیں سبزہ زار ہیں۔ پھولوں سے منڈھی وادیاں مہکتی ہیں۔ جہاں قمریاں کوکتی ہیں اور بلبلیں چہکتی ہیں۔ جا بجا چشمے رواں ہیں۔ وہاں پھولوں پر تیتریاں! اندھیری گھنگھور گھٹائیں بے پایاں چتر پھیلاتی ہیں۔ کہیں برباد شدہ باغوں کے مٹے ہوئے خشک نشانوں میں بھیانک کھنڈر دل ہلا دینے والے سکوت میں ملفوف ہیں جن کے ہر گوشہ میں موت پنہاں نظر آتی ہے۔ وہاں کے ہر تنہا ستون کے اندر کسی کی روح مقید معلوم ہوتی ہے۔ ہر جھکی ہوئی محراب سے کسی کی مٹی ہوئی تمناؤں کی یاد تازہ ہوتی ہے اور وہاں الّو کی ہر ہو پر لاکھوں روحیں جنبش کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ کہیں سربفلک پہاڑ جھاڑیوں اور گھنے جنگلوں سے دامن چھپائے کھڑے ہیں۔ انہیں میں شیر اور درندے گھات لگاتے اور چوپائے قلانچیں بھرتے کبھی برف سے ڈھکی چوٹیوں تک چڑھ جاتے ہیں کبھی وادیوں کی تیز رفتار ندیوں تک اتر آتے ہیں۔ اسیطرح کہیں چھوٹے چھوٹے قصبے بسے ہوئے ہیں تو کہیں بڑے بڑے بارونق شہر آباد ہیں۔

شکر ہے اس خدائے برتر کا جس نے اتنی بڑی بادشاہت مجھ کو دی۔ میرے خزانے زر اور جواہر سے اس طرح پُر ہیں کہ قارون ایسے سو سو خزانے ایک پل میں لٹا دیتا ہوں۔ میرے دربار کی وہ شان ہے کہ دربار سلیمانی بھی ہیچ ہے۔ قیصر و کسریٰ میری دربانی کرتے ہیں۔ فوجیں میری بیشمار ہیں۔ جن کا ہر سپاہی عزم میں ایک سکندر رزم میں ایک رستم ہے۔ میں چشم زدن میں سلطنتیں زیر و زبر کر دیتا ہوں + شکر ہے اس مالک ایزدی کا جس نے سب کچھ مجھ کو دیا۔ میں اس سلطنت کا مطلق العنان حاکم ہوں میرے احکام ناطق۔ میرے ارادے اٹل اور میرے اختیارات لامحدود ہیں میں چاہتا ہوں تو جنگل میں منگل کر دیتا ہوں۔ باغوں کو سرسبز۔ ویرانوں کو آباد کر دیتا ہوں غصہ میں آتا ہوں تو بستیاں ویران کر دیتا ہوں۔ شہروں میں آگ لگا دیتا ہوں۔ میرے غضب سے پہاڑ تھرا جاتے ہیں۔ دریا لہراتے ہیں۔ موسم پلٹ جاتے ہیں۔ میں حاکم مطلق ہوں، چرند اور پرند پہاڑ اور دریا ہوا اور پانی خوشی اور غم موت اور زیست سب میرے طابع ہیں۔

اے قادر ازل شکر ادا کرتا ہوں تیرا تو ہی نے مجھ کو یہ طاقتیں دی ہیں۔ میں بیماروں کو تندرست کرتا ہوں۔ تندرستوں کو مریض بناتا ہوں جس کو چاہتا ہوں جلاتا ہوں جس کو چاہتا ہوں مار ڈالتا ہوں۔ مُردوں کو زندہ کرنا کیا ہے۔ میں خود یوسف ایسے حسین۔ نمرود ایسے خودسر۔ حاتم ایسے فیاض۔ ابلیس ایسے گمراہ رات دن پیدا کرتا ہوں۔ جب تک چاہتا ہوں ان کو زندہ رکھتا ہوں۔ اور جب چاہتا ہوں مار ڈالتا ہوں۔ شکر ہے تیرا اے خالق اکبر تو نے مجھ کو ہر طرح مالا مال کر دیا ہے کیونکہ میں ایک صاحب قلم ادیب ہوں اور شکر ہے تیرا اے کارساز حقیقی کہ تو نے آج میرے گذشتہ مضمون کی اُجرت کا ڈھائی روپے کا منی آرڈر وصول کرا دیا۔ بیشک تو بڑا رحم والا رحیم ہے +

سیّد رفیق حسین

نواب چھمّن

میری اور نواب چھمّن صاحب کی کوئی آج کی ملاقات نہیں آٹھ دس سال سے یاد اللہ چلی آتی ہے۔ بڑی وضع کے بزرگ ہیں۔ محبت کے پتلے اور طبیعت کے ہیرا۔ مزاج میں رنگینی اور چہل ایسی کہ آجکل کے بانکے تیکھے ان سے شرمائیں۔ اللہ جیتا رکھے عمر بھی کوئی چھ سات سال اوپر نوّے کی ہے۔ اُن کے پڑپوتے مسٹر حیدری کا قول ہے کہ پر دادا میاں غدری ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں کوئی سولہ سترہ برس کے ہونگے۔ لبوں پر ہلکا ہلکا سبزہ آغاز ہو چلا تھا۔ اور مسیں بھیگ چکی تھیں۔ لیکن اللہ بُری نگاہ سے بچائے آج بھی نواب چھمّن عینک وینک کا غم نہیں پالتے۔ سنہری نا کے کی کشیدہ کاری کی سوئی میں تاگا آنکھ جھپکتے میں ڈال دیتے ہیں۔ بوٹا سا قد ہے اور تیر سا سیدھا۔ دُنیا کا گرم و سرد بھی کچھ چکھ چکے ہیں۔ کیسی کیسی ویرانی اور بربادی دیکھ چکے ہیں۔ مگر کمر میں خم کچھ ایسا نہیں۔ بس جیسے سرو کے بوٹے پر کوئی تولیہ سوکھنے کو ڈال دے اور وہ ذرا سا جھک جائے۔ اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے لیکن اُن کی وضع آج تک مغلئی ہے۔ حُباب سی دو کلیا ٹوپی سر پر۔ اور پردے کو اڑی کا ڈھاکے کا انگرکھا جسم پر۔ مغلئی شرعی پاجامہ پہنچے پر بیل لگی ہوئی۔ موری پر دو دو تاگے کے بٹن۔ پاؤں میں سلمہ ستارے کا کی سپاٹ سنہری جوتی۔ یہی پرانی وضع باپ دادا کی تھی۔ اسی کو نباہتے ہیں۔ مشکی جوڑی کی فٹن ہے جو سواری میں رہتی ہے۔ پوتے پڑپوتے سرکاری نوکر ہیں۔ موٹر کی سواری کرتے ہیں۔ بیسیوں مرتبہ چاہا کہ پردادا میاں موٹر میں قطب چلیں۔ ہمیشہ یہی بولے۔ نہ میاں ایسی بھاگم بھاگ سواری سے میرا دل اُلٹتا ہے۔ تم کامی آدمی ہو، اس تگ و دو میں پھنس گئے ہو سرگاڑی ہے اور سر پہیا۔ تم ہی موٹر گاڑی میں بیٹھو۔ ہماری بہت گذر گئی ہے، اور تھوڑی رہ گئی ہے۔ اب ہم اپنی جوڑی گاڑی کو کیونکر چھوڑیں۔ ان گھوڑوں کی وفاداری سے ہم جانے کیسے کیسے موقعوں پر بچے ہیں! اور میاں موٹر کا انجن بے جان چیز۔ بھلا کسی سے کیا وفا کریگا۔

نواب چھمّن شام کی ہواخوری کے بعد اکثر جامع مسجد کے چوک پر آجاتے ہیں۔ گذری میں پھرتے ہیں۔ کبھی کبھی بادشاہی دروازے پر چڑی ماروں میں بھی جاتے ہیں۔ اور اکثر لال، بیا، مینا، شیرازی، سکھی یا لقّا بھی خرید لیتے ہیں۔ میری اور نواب چھمّن کی ملاقات اکثر جامع مسجد کے اندر یا چوک پر ہو جاتی ہے۔ بڑی محبت اور اخلاق سے ملتے ہیں! اور اکثر فرماتے ہیں "میاں تم انگریزی پاس ہو لیکن اللہ کی مہربانی ہے کہ کرسٹانیت تم میں نہیں ہے۔ اسی لئے تم سے بات چیت میں بڑا دل لگتا ہے۔ دیکھو دُنیا کا رنگ بالکل بدل گیا ہے۔ خوشی زندگی سے بالکل نکل گئی ہے۔ بس ایک دَوڑ سی مچی ہوئی ہے جس میں نفسا نفسی طاری ہے۔ ہر ایک ہیوُلا خبطا بنا ہوا ہے۔ جو بھی نئی چیز ہاتھ لگتی ہے اُسی کو اختیار کر لیتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ اس شے کا مصرف کیا ہے اور یہ میرے کام کی بھی ہے یا نہیں۔ اللہ بخشے اسد اللہ خاں میرا ہم عمر سا تھا۔ بھئی خوب شعر کہتا تھا۔ اس نے کہا ہے ؎

جاتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

سو بھئی وہی حال اب مخلوق کا ہے۔ اور ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جب دلّی کا یہ رنگ ہے، تو عالم کا یہی رنگ ہوگا۔"

میں نے کہا "حضرت، دُنیا کو ایک حال پر کب قرار ہے۔ کہیں دھوپ ہے کہیں چھاؤں۔ اور پھر اب تو نئے علم کی برکت سے ہر کام میں آسانیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ سائنس نے زندگی کو گلزار بنا دیا ہے پہلے دلّی سے آگرہ کا سفر آٹھ دن کا تھا۔ اب ریل کی برکت سے چار گھنٹے کا اور ہوائی جہاز میں کوئی گھنٹے سوا گھنٹے کا ہے۔ تار برقی کے ذریعے پل کی پل میں بات کہیں سے کہیں پہونچتی ہے۔ صبح کو اخبار پڑھیے اور دُنیا بھر کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ بجلی کی روشنی سے شہر بقعہ نور بن جاتا ہے۔ گرمی میں بجلی کے پنکھے کی بدولت پہاڑ کا سا مزہ آنے لگتا ہے۔" بولے: "لو میاں میری بھی سنو۔ تم جانتے ہو بحث مباحثہ کی میری عادت نہیں۔ کوئی اور کہتا تو میں سُنی اَن سُنی کر دیتا۔ لیکن تم سے تو دل کی کہکر رہونگا۔ میاں ریل کے سفر سے سفر کا مزہ گیا۔ یہاں سے بھاگے وہاں پہونچے۔ نہ راستے میں شہر دیکھے نہ وہاں کی مخلوق کو دیکھا۔ اجنبی گئے تھے اجنبی لوٹ آئے۔ انسان سے انسان کا تعلق اور رابطہ کم ہو گیا ہے۔ ایک کی خوشی رنج میں دوسرے کو شریک ہونے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ تار کی خبر سے تو تم لوگوں کا بھی دل دہلنے لگتا ہے۔ تار دیکھا اور اوسان گئے۔ اللہ خیر اللہ خیر کہنے لگتے ہو۔ انتظار کی لذّت کو تم لوگ کیا جانو۔ تم لوگوں کی خوشیاں تو کھو کھلی اسی ریل اور تار نے کر دی ہیں۔ اخبارات نے تو انسانی مزاج سے بنی نوع انسان کی ہمدردی بالکل غائب کر دی ہے۔ جاپان میں زلزلہ

آیا۔ ادھر طوفان آیا۔ اُدھر بجلی گری۔ وہاں کوئلے کی کان پھٹ گئی۔ وہاں ریل لڑ گئی۔ سینکڑوں مخلوق مر گئی۔ ہزاروں لٹے۔ خانماں ہوگئے تم نے خبر پڑھی اور بس۔ اور جب یہ اخبار نہیں تھے تو اللہ کی قسم کسی کے دُکھ درد کا حال سنکر اپنے پرائے کا دل روتا تھا۔ اور ہر ایک مقدور برابر کا شریک ہوتا تھا۔ اب میں اور کیا کہوں۔ میرا تو کہنا صرف اتنا ہے کہ تم لوگ خوشی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہو، مگر خوشی سے ناآشنا ہو، آرام کے متلاشی ہو۔ لیکن تمہاری زندگیوں میں آسودگی اور آرام نام کو بھی نہیں۔ بڑی دل لگی ہے! جس چیز پر مٹے جتے ہو وہی نہیں ملتی۔ سائنس کا میں کب قائل نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ بجائے اس کے کہ سائنس تمہاری غلام ہوتی تم سائنس کے غلام ہوگئے ہو۔ اور جانتے ہو کہ سر چڑھا غلام برا۔"

میں نے کہا "حضت نواب صاحب۔ چھوڑیے اس قصے کو کہیے اب چوک کا کیا رنگ ہے۔ کیسی بہار ہے۔ لیکن اب چوک میں بھی کیا رکھا ہے؟"

بولے: "میاں صاحبزادے میں کوئی آج کل کی ہو حق تھوڑا ہی دیکھنے آتا ہوں۔ میری آنکھیں تو وہی خانم کا بازار اب بھی دیکھتی ہیں۔ میرے دولھا تجھے کیا رنگ بتاؤں اور کیا حال سناؤں۔ جب یہاں آجاتا ہوں تو خان دوراخاں کی حویلی اور خانم کا بازار اور بھی یہ گذری کیا کیا تماشے نہیں دکھاتی۔ میں تو سو سا جاتا ہوں۔ پھر یہ تمہاری ٹریم گاڑی گھڑ گھڑ کرتی گذرتی ہے اور میرے خیالات کو پریشان کر دیتی ہے تو اپنی نیند سے چونک اٹھتا ہوں۔ مالک کا شکر کرتا گھر چل دیتا ہوں .... لے لو ہاں مدت سے تم سے ایک بات پوچھنی تھی، خوب یاد آئی۔ یہ تو بتاؤ آج کل یہ گھر گھر شور سا کیا مچ رہا ہے۔ جسے دیکھو اُس نے چھت پر دو ڈنڈے کھڑے کئے۔ جیسے کبوتروں کی چھتری کے ڈنڈے ہوتے ہیں نا۔ اور اُن دونوں میں ایک تار باندھا۔ اور ایک لکڑی کا صندوقچہ سا گھر میں رکھ دیا۔ کل ظہیر بھی ایک خرید لایا ہے، یونہی ڈھائی سو تین سو پر پانی پھیر آیا ہے۔ اماں اس کے دو تین کان ہیں اور ایک آنکھ۔ ذرا کان مروڑے اور اُس کی آنکھ چمکی جیسے بھوت کا دیدہ۔ اور ادھر آنکھ چمکی اور بس پھر سہے نہ پیر۔ وہ صندوقچہ گانے بجانے لگتا ہے۔ کبھی وعظ کرتا ہے، کبھی تقریر کرتا ہے۔ کبھی بے وقت کی راگنی الاپتا ہے۔ کبھی تھیٹر کرتا ہے کبھی توپ گولے چھوڑنے لگتا ہے۔ کبھی ہمیں تو یقین نہ آتا تھا کہ یہ کچھ ممکن ہے۔ مگر اب آنکھ سے دیکھا اور کان سے سنا۔ کیا کفر کھلونا ہے۔ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ بیسویں صدی ہے۔ قُرب قیامت ہے۔ پر اب تو قیامت آئی کہ آئی، اب ہم شہر والوں کا یہ حال ہے تو بچارے دیہاتیوں پر کیا کیا نہ بیت جائے گی۔

میں نے عرض کیا "حضت، قیامت تو صدیوں سے آرہی ہے۔ میں نے بھی جب سے ہوش سنبھالا ہے، قیامت ہی کو آتے سنا ہے۔ قیامت تو ہوا ہو بس ایک کھیل بنا لیا ہو قیامت کو۔"

یہ سُنکر نواب چمٹن بولے "میاں تم ہو تو راہ راست پر لیکن آخر نئے زمانے کی تعلیم کے چٹے بٹے ہو۔ تم کیا جانو یہ ملک کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ زلزلہ پر زلزلہ آرہا ہے۔ آج بہار بنگالہ تباہ ہوا۔ کل کوئٹہ کا تختہ اُلٹ گیا۔ بیماری پر بیماری پھیل رہی ہے۔ یہ گردن توڑ بخار ہے، یہ خونی پیچش ہے۔ نئی سے نئی وبا آرہی ہے۔ قیامت قیامت کہتے ہو۔ قیامت کا کوئی اور دن ہے کیا۔ یہ سب کیا قیامت سے کم ہیں؟ ایک روزِ حساب ہے اور ایک قیامت۔ تم روزِ حساب کو قیامت کہتے ہو مگر نہیں، یہ قیامت ہے اور جس دن اس کا جواب دوگے وہ روزِ قیامت ہوگا۔ پہلے ایک مصیبت آئی اور پھر دوسری۔ یوں ہلکے ہلکے مخلوق مُصیبتوں کی عادی ہوگئی۔ اور دُکھ کو سُکھ سمجھ بیٹھی ہے۔ پہلے ٹک ٹک کرتی گھڑی آئی۔ پھر کمپنی بہادر کے ساتھ پانی پیتی، کوئلہ کھاتی، آگ اور دھواں اُگلتی کو کو پھک پھک گاڑی آئی۔ پھر خط کے بیبے کا جادو آیا کہ پرچہ یہاں ڈالو اور ہزاروں میل پہ پہونچے۔ اس پر طرہ اور کہ بابو کو پرچہ لکھکر دو اور اُس نے گٹ گر گٹ کی اور پل کی پل میں بات کہیں کی کہیں پہونچی، ہم توبہ توبہ کرتے تھک گئے .... روز عذاب الٰہی کا منتظر ہے اور روز عذاب الٰہی کی خبریں سُنیں۔ ان سب پر ہی تو بس نہیں۔ آج صبح ہی صبح گھڑڑ گھڑڑ سے آنکھ کھلی۔ بوکھلا کے دیکھا۔ اللہ رسول کا نام بھی زبان پر نہیں آیا۔ دیکھا تو آسمان پر بڑی چیل کہو، نئی قسم کی چیل کہو، اُڑن کھٹولا اُڑا چلا جا رہا ہے۔ جل تو جلال تو کا ورد کیا۔ تب کہیں اُس نے منڈلانا چھوڑا۔ اور پورب کی طرف کو چل دیا۔ اور تم کہتے ہو قیامت نہیں آئی۔ چین کھو بیٹھے۔ سکون کھو بیٹھے۔ اللہ رسول پر بھروسہ کھو بیٹھے۔ کیا ان چیزوں کو کھو بیٹھنا قیامت سے کم ہے۔ ع ؎

کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

وہ تمہارا کیا ہے، بائیسکوپ ہے تھیٹیکوپ، جسے سینما کہتے ہیں اُس نے ایک مصیبت ڈھا رکھی ہے۔ گھر میں جورو اور بچے بھوکے ہیں پر عفورا دھشتی بائیسکوپ میں ہے۔ میاں گھر میں بخار میں پڑے ہیں پر بیوی صاحبہ سہیلیوں بھنیلیوں کے ساتھ سینما گئی ہوئی ہیں۔ اور آپ تو بھی یہ

ٹکے کا غلام ہر وقت حاضر ہے۔ کان مڑوڑا اور اُس نے وقت بے وقت کی الاپ لگائی۔ ہم تو یونہی پچھلے وقتوں کے ہیں ٹانگے لٹکائے بیٹھے ہیں۔ آخر تم ہی سمجھا دو کہ یہ بلا ہے کیا شے، اور اس سے مخلوق کیونکر محفوظ رہے گی"؟

میں نے سوچا بھلا اب ان کو کیا کیا سمجھاؤں، بڑے بوڑھے اور بزرگ ہیں۔ ان کی ہاں میں ہاں ملا دوں۔ اور عرض کیا" حضرت آپ بجا فرماتے ہیں۔ بیشک یہ قربِ قیامت کی علامت ہے۔ مگر ہم تو اسی چکر میں پھنسے ہوتے ہیں اور مرغ کی ایک ہی ٹانگ نظر آتی ہے۔ اور اسے علم انسانی کی ترقی سمجھتے ہیں۔ اور ابھی تو ایک اور کرشمہ ہونیوالا ہے"

بولے" وہ کیا؟"

میں نے عرض کیا" وہ ٹیلیفون تو دیکھا ہی ہوگا آپ نے؟"

فرمایا" اماں لاحول ولا قوۃ۔ وہ تو میں بھول ہی گیا تھا جس میں ہمزاد اِدھر کی اُدھر لگاتا پھرتا ہے"

میں نے عرض کیا" جی وہی۔ اب اُس میں بات کرنے والے کا چہرہ مہرہ بھی نظر آیا کریگا۔ یعنی صرف بات چیت ہی نہ ہوگی، بلکہ رُوبرو ہوکر۔ اور اسی طرح اس ریڈیو میں"

بولے" ریڈیو کیا؟ ہاں وہی کفر کھلونا"

"جی ہاں یہی کفر کھلونا۔ اس میں ناچ گانے والے کی تصویر، بولنے چالنے والے کی صورت۔ یعنی جس کی آواز ہوگی وہ خود بھی پیشِ نظر ہوا کرے گا۔

یہ سنتے ہی نواب چھٹن جیسے سناٹے میں آگئے ہوں۔ ایک دو منٹ کے بعد چونکے اور کہنے لگے" انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بھئی اب تو ہمیں کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یہ تم نے بہت بُری سُنائی۔ کیا کریں۔ سوائے خودکشی کے کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ یہ ظلم ہے! اندھیر ہو جائیگا۔ اب تک عریانیوں میں کیا کمی رہ گئی تھی۔ جو اب پوری کیا چاہتے ہو۔ گھر کی بہو بیٹیاں غیر مردوں کو گھر بیٹھے کیا کیا بیباک دیکھیں گی۔ مگر میاں ؎

جو رونمائی کی رسموں پہ ہی مصر ابلیس
چُھپینگی حضرتِ حوّا کی بیٹیاں کبتک

پرَن گیا چولھے میں۔ بلا سے یہ دُنیا اُجڑے یا بسے۔ تم اسے ترقی کہو، مگر مجھ سے یہ بے آبروئی نہ دیکھی جائیگی۔ غیرت تو پہلے ہی غائب ہو گئی تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اب اِکّا دُکّا مجھ سا کوئی بوڑھا ٹھیرا پڑا ہے، سو میاں وہ اب ہے اور اب نہیں۔ پر میاں تمہاری اس نئی ایجاد سے پہلے ہم چل بسے تو الحمد للہ اور واہ وا۔ ورنہ بلا سے جہنم میں جائیں اور چاہے ہماری رُوح بھٹکتی پھرے پر ہم خودکشی ضرور کرلیں گے...."

یہ کہتے کہتے وہ اس ادا سے مجھے چھوڑ کر چلے گئے جیسے میں کم سے کم کوڑھی تو ضرور تھا۔

ڈاکٹر ہاشمی

شکستِ ساز

نہ ہم آہنگِ مسیحا، نہ حریفِ جبریل — تیرا شاعر کہ ہے زندانیِ گیسوئے جمیل
کس کی آنکھوں میں یہ غلطاں ہے جوانی کی شراب — کھولدی آہ یہ کس نے مئے گلگوں کی سبیل
کس طرف جائے کہاں جائے بتادو کوئی — زلفِ پُرخم کا گرفتار، نگاہوں کا قتیل
عالمِ یاس میں کیا چیز ہے اِک ساغرِ مے — دشتِ ظُلمات میں جس طرح خضر کی قندیل
کتنی دشوار ہے پیرانِ حرم کی منزل — اِس طرف فتنۂ ابلیس، اُدھر ربِّ جلیل
اُف یہ طوفانِ نشاط اور مری طبعِ حزیں — آہ یہ یورشِ ناز اور میں مجروح و علیل

آہ وہ ہوش کا عالم وہ غموں کی یورش
اُف یہ مستی کہ ہے پھر ہوش میں آنیکی دلیل

مجاز

مُسلم اور کافر

ہندوستانی بھاکا میں

(از افکار بھڑ بھڑے شاہ)

اسلام کے سُندر گیت نہ گا، بھید اس کے اگر معلوم نہیں　　سنسار کا مُسلم سیوک ہے، پر ایک کا بھی محکوم نہیں
مسکین سہی محتاج نہیں، کمزور سہی مظلوم نہیں　　ن تخت سے ہو محروم تو ہو، عزّت سے مگر محروم نہیں

اسلام ہے سچ کا تور جسے ہاتھ آئے یہ دھن منعم ہے وہی
بُدھ، ہندو، مسیحی، پارسی، سکھ، مل جائے جسے مُسلم ہو وہی

اک سب سے بڑی شکتی ہے وہ ذات، گُن اگنت اُسکے، نام نہیں　　یزداں وہ نہیں، رحمٰن نہیں، وہ گاڈ نہیں، وہ رام نہیں
گن گیان دیا کی سِکشا سیکھ، اور نام سے کوئی کام نہیں　　جپ تپ کی نمائش دھرم نہیں، ایمان نہیں، اسلام نہیں

جو حرص و ہوا کے بُت پوجے، توحید کا دعوی کیوں وہ کرے
مُسلم وہ نہیں مشرک ہے اگر باطل سے دبے، طاقت سے ڈرے

مسلم ہے وہ ست کا سیوک بیر ہو جس کو نہ تن اور جان کا غم　　تڑپائے جسے انساں کی تڑپ، بے چین رکھے ایمان کا غم
ہو بھوک سے بڑھکر بھیک میں دُکھ، حاجت سے سوا احسان کا غم　　ہے ہنس پریم کے ساگر کا، کیا مینہ کا ڈر، طوفان کا غم؟

بُدھ، ہندو، مسیحی، پارسی، سکھ، جس رنگ میں ہو، جس بھیس میں ہو
مُسلم ہے پجاری نیائے کا وہ جس میں روپ ہو جس دیس میں ہو

یہ آرتی پوجا پاٹھ بھجن، تسبیح و تلاوت صوم و صلوٰۃ　　بھگوان کو کچھ درکار نہیں، ہے حمد و ثنا سے پاک وہ ذات
دوزخ کا وہ وحشتناک سماں، جنت کی ہو سنا کانہ صفات　　تو مولوی پنڈت سے نہ کہے تو کان میں کہدوں راز کی بات

سب داس ہوس کے بھوت کے ہیں اور بندۂ باری کوئی نہیں
سب جپتے ہیں مالا اِشور کی پر حق کا پجاری کوئی نہیں

کیا ترک ملیچھ، کیا کافر زشت، کیا فرق زبان و نسل و وطن　　ہے سب کی رگوں میں ایک لہو ایک آتما، اک جیو، ایک بدن
گو پھول ہیں لاکھوں رنگ برنگ، پر ایک ہی بھومی ایک چمن　　بن میگھ دیا کا، سب پہ برس، بستی ہو کہ ریگستان کہ بن

سب دھرموں کا بابا ایک سے گُر، انسان بن اور انسان بنا
انسان نہ بنا تو شیخ سوامی جو بھی بنا شیطان بنا

مرسلہ: مُسلم

(بسلسلۂ گذشتہ)

زندہ اور فطری زبان

ادبی زبان میں یکرنگی اور ہم آہنگی کا ہونا لازمی ہے

تلفظ اور لب و لہجہ پر سطحی نظر

ہندوستانی مذاق فائن آرٹ (فنونِ لطیفہ) کا شیدائی ہے۔ اس فن کی پانچوں شاخوں، تعمیرات، بت تراشی، مصوری، ڈراما، شاعری میں ہندوستان نے وہ کمال کیا ہے کہ ساری دُنیا کو اس کا اعتراف ہے۔ ہماری معاشرت پر اس مذاق کا اتنا اثر پڑا ہے ہر کُڈھب چیز آنکھوں کو کھٹکتی ہے، تیز خوشبو ناک (دماغ) کو ناگوار ہوتی ہے اور سخت، کرخت یا بھدی آوازیں ہمارے لئے بارِ گوش ہیں۔ چنانچہ ہم لسانیات میں ثقالت، بھدا پن اور کرختگی سے بچنے کے لئے برابر کوشاں رہے۔ لفظوں کے وضع کرتے وقت تو ہم اُسے پیشِ نظر رکھتے ہی ہیں۔ جب کسی لفظ کا انتخاب کرنا ہوتا ہے تو ہم مقابل کے دو لفظوں میں سے اسی کو چُن لیتے ہیں جس میں زیادہ لوچ ہے۔ جب دو لفظوں کو جو علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے تلفظ کے لحاظ سے خوش آہنگ ہیں، ترکیب دیتے ہیں تو یہ مدِ نظر رکھتے ہوئے کہ مرکب لفظ بھی سبک اور خوش آہنگ ہے۔ ترکیب یافتہ تلفظ میں کرختگی نہ آنے پائے کچھ تبدیلیاں کر دیتے ہیں۔ "سندھی" اور اتصال (تعلیل، ادغام، تخفیف) کے قواعد اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سنسکرت اور فارسی میں وضع کئے گئے جو اسی متذکرہ بالا ذہنی تقاضے (نفاست پسندی) کے نتیجے ہیں۔ سنسکرت لفظ نربل کو ملاحظہ فرمایئے یہ مرکب ہے "نہ" اور "بل" سے۔ (ر) کا اضافہ صرف اس لئے ہوا کہ دونوں اجزا کی آوازیں فطری مناسبت سے مل جائیں۔ اسی طرح سابقہ اور لاحقہ لگاتے ہوئے مناسب تبدیلیاں کرتے ہیں۔ آرہ کے رہنے والوں کو آرہ وی نہ کہکر آروی، اور کوفہ کے رہنے والے کو کوفہ دی یا کوفوی نہ کہکر کوفی کہنا ہی صحیح مانا گیا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ زبان میں لوچ اور گھلاوٹ پیدا کرنے کی خاطر ہم طرح طرح کے قاعدے وضع کرتے ہیں اور وہی قاعدہ اگر کہیں ہمارے مقصد میں رکاوٹ ڈالتا ہے تو اُسے بھی توڑ کر دوسرا قاعدہ وضع کرتے ہیں۔ جس چیز (قدرتی لوچ) کی حفاظت ہم اس قدر کرتے آئے ہیں اُس کی حفاظت ہمارا ذہنی خاصہ بن چکا ہے۔

اب میں اُردو ہندی کے ایک لفظ کو لیتا ہوں جو دونوں میں دو مختلف طریقوں پر ترکیب دئے گئے ہیں اور ایک ہی معنی دیتے ہیں۔ وہ لفظ ہے اُردو میں "درگت" اور ہندی میں "کگت"۔ مذاق سلیم اُردو ترکیب کو ہندی ترکیب پر ترجیح دیتا ہے۔ "گ" سے پہلے "ک" کا سابقہ بے جوڑ ہے اور بنا بریں خوش آہنگی اور ہم آہنگی کے وصف سے خالی ہے۔ یہی باریک فرق "ان تھک" اور "اتھک" میں ہے جبکہ اَٹل اور امر میں "الف" کا نافیہ سابقہ موجود ہے ایک "معقول پسند" اُردو والوں پر اعتراض کر سکتا ہے کہ یہاں نیا قاعدہ برتنے یعنی الف نفی کے ساتھ نون لانے کی کیا ضرورت تھی مگر ذوقِ سلیم "ان تھک" اور "انجان" کی خوش آہنگی کے مقابلہ "اتھک" اور "اجان" کی بے سوادی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہماری زبان میں سنسکرت کے الفاظ ہندی الاصل تت سم، استعمال یا تدبھوا (مرورِ ایام سے بدلی ہوئی صورتوں میں) یہ ہماری ادبی زبان کا تیسرا نزاعی مسئلہ ہے۔ زبان فطرت آخر الذکر کو قبل الذکر پر ترجیح دیتی ہے اور اس کا سبب بھی وہی خوش آہنگی اور سہولت ملفظ و روانی ہے۔ زبان سنسکرت ہندی الاصل (تت سم) کے تلفظ چکر دار ٹھوکر کھانے سے بچنا چاہتی ہے۔ یہ مانا کہ ایک سنسکرت کا عالم فراٹے کے ساتھ اشلوک پڑھ سکتا ہے مگر سنسکرت میں تو سارے الفاظ ایک ہی ڈھب کے ہیں اور یہاں ۸۰ فی صدی الفاظ سادے تلفظ کے ہیں۔ جس طرح ٹیڑھی لکڑیوں کا سیدھے تختوں سے جڑنا مشکل ہے اُسی طرح زبان کے تدبھوا (مرورِ ایام سے بدلے ہوئے) الفاظ کے ساتھ سنسکرت تت سم (ہندی الاصل) الفاظ کا میل ملاپ نہیں ہو سکتا اور اسی لئے زبان کا فطری رجحان سنسکرت الفاظ کا جوں کا توں، اُسی صورتِ قدیم میں قبول کرنے سے عاجز ہے۔ اسی فطری رجحان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُردو میں سنسکرت الفاظ کی اصل صورتوں کی تلاش بے معنی سمجھی گئی اور مرورِ ایام سے ڈھلی ڈھلائی شکلوں کا استعمال مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ زبان کی فطری نشو و نما کا بھی یہی تقاضہ ہے جسے ہم اصولِ ارتقا کی کسوٹی میں پیش کر چکے ہیں۔ سنسکرت سے جو الفاظ ہماری زبان کو ملے ہیں وہ براہِ راست نہیں ملے، "گرام" ہماری موجودہ زبان میں ملنے سے پیشتر "گاؤں" بن چکا تھا۔ اب ہندوستانی قواعد کا لحاظ نہ کرکے گاؤں کے رہنے والے کو "گنوار" نہ کہہ گرام سے سنسکرت قواعد کی مطابقت سے گرامیٹرن (یعنی گنوار) مشتق کر...

دودھ، گھی، پھول، پھل کے بدلے دگدھم و گھرت، پشپم پھلم، کا استعمال جائز کرنا رجعت پسندی ہے۔ اس طرح کی کوشش میں ایک ساتھ دو غلطیوں کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہم پیچھے چل کر رفتار زمانہ کی مخالفت کرتے ہیں اور دوسرے خوبصورتی، آراستگی کے فطری میلان کو تعصب آمیز جذبہ پسندیدگی یا ناپسندیدگی سے کچلنا چاہتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں انسانیت سوز ہیں۔ اس طرح سے زبان یا بنی نوع انسان کی خدمت تو کیا ہوگی بلکہ اس کا گلا گھٹ جائیگا۔

لب ولہجہ۔

شکتِ یا شکتی۔ شکت
بھگتِ یا بھگتی۔ بھگت

ان دو لفظوں کی مثال سے میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی زبان کا سائنٹفک لب ولہجہ الفاظ کو حرف آخر کا متحرک رکھنا قبول کرتا ہے یا نہیں، اردو میں کہیں بھی کوئی لفظ متحرک باآخر نہ لکھتے ہیں نہ بولتے ہیں۔ اس لئے ان سنسکرت الفاظ کی حرکت آخر حرف ماقبل آخر کو مناسب تبدیلیوں کے ساتھ دیدیتے ہیں۔ شکتِ کے ہندی الاصل تلفظ میں ت حرف آخر ہے اور متحرک ہے جو اس کی حرکت "ک" کو منتقل کر دیگی تو یہ لفظ شکت کی صورت میں آگیا۔ برج بھاشا میں بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے یعنی حرکت آخر کو اس کے موافق حرف علت سے تبدیل کر دیتے ہیں "ی" زیر ہے تو "ی" سے، پیش ہے تو "واؤ" سے اور زبر ہے تو "الف" سے بدل دیتے ہیں اس طرح شکتِ سنسکرت اصل شکتی کی صورت میں تبدیل ہو کر آجاتی ہے۔ ہندی میں صرف لکھنے میں اصل صورت (متحرک بالآخر) پائی جاتی ہے۔ مگر بچے خاص و دوان، پنڈت شکتی، مکتی، جگتی، برودھی، مہذب سوسائٹیوں میں بولتے ہیں۔ پس ہم سہولت تلفظ کے لئے "حرف آخر ساکن" کے صوتی اصول کو ہندوستانی لب ولہجہ کے بالکل مطابق پاتے ہیں اور جیسا کہ زبان پر قدرت رکھنے والے شاعر اعظم حضرت اقبال نے اس شعر میں ان الفاظ کا تلفظ ادا کیا ہے لفظوں کے حرف آخر کو ساکن رکھنے کو جائز اور درست لکھتے ہیں ؎

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

ٹ اور ن کا فرق۔ زبان کی اصولی گفتگو کے سلسلہ میں میرے ایک دوست نے فرمایا کہ اردو میں براہمن کو ہمیشہ برہمن لکھا جاتا ہے حالانکہ ہندو مسلمان صدہا سال سے پاس پاس رہتے ہیں۔ میں نے اپنے دوست کو جن کی بدگمانی غلطی پر مبنی تھی بتلایا کہ اردو زبان کے رسم خط میں ٹ، ڈ، ڑ کے حروف ہندی کے ہی الفاظ شامل کرنے اور ان کے صحیح تلفظ ہی کے لئے داخل کئے گئے تھے۔ ورنہ فارسی وعربی کا کوئی لفظ نہیں ہے جس میں یہ حروف آتے ہوں، کھ، گھ، بھ، تھ کی مخلوط آوازیں ہندی ہی الفاظ کے صحت تلفظ کے لئے وضع کی گئیں یہ "تہنید" ہندی بنانا اردو قواعد صرف کا ایک مستقل اصول ہے اور اردو کا ہر قواعد نویس اسکا ذکر کرتا ہے، بھائی جان یہ اردو کے خلاف پروپاگنڈہ کرنے والوں کی آواز ہے جو کہیں آپ کے کان میں پڑ گئی ہے۔ آپ نے اپنے انگریز حکمرانوں کی زبان پر کبھی غور نہ کیا کہ ان کی زبان کے حروف تہجی میں "ٹ" اور "ڈ" کی آوازیں سرے سے نہیں ہیں اور نہ انہوں نے ہندوستانی زبان کا لحاظ رکھتے ہوئے اس میں اضافہ کیا۔ حالانکہ ان کی کوشش انگریزی کو ہندوستان کی قومی زبان بنانے میں اس قدر نمایاں ہے کہ محتاج تشریح نہیں۔ مدت تک رومن کریکٹر کو ہندوستانی زبان کا رسم خط بنانے کی اسکیم تجرباتی طور پر جاری رہی مگر اردو زبان اور اردو رسم خط تو سرے سے ہندوستان کو مد نظر رکھکر ہندوستانی ضروریات سے وجود میں آیا اس پر شبہ کی نظر ڈالنے والے کو تحقیقات اور تلاش سے کام لینا چاہیے۔ میں نے اپنے دوست کی توجہ لفظ شکلا، مصرا اور گپتا کی طرف مبذول کرائی کہ انگریزی میں شکلا اور مصرا اور گپتا بعینہ لکھے جا سکتے ہیں جس طرح وہ اصل زبان میں ہیں۔ پھر انگریزی زبان کی فطری ساخت کے بموجب انہیں کچھ نہ کچھ تبدیل کیا گیا۔ ٹھیک اسی طرح لفظ براہمن سنسکرت اصل سے فارسی میں آیا جہاں فارسی زبان کے تلفظ کے مطابق اسے برہمن لکھا گیا۔ یہ لفظ اردو میں بالواسطہ زبان فارسی آیا۔ ڑن اور ن کا اختلاف صرف اردو، ہندی ہی میں نہیں ہے بلکہ ہندوستانی کی صدہا مقامی زبانوں میں ڑن کا فقدان ہے۔ خود ہندی بول چال میں مطلق غائب ہے۔ اسی قسم کی غلط فہمیوں سے اکثر لوگ بدگمان ہو کر اردو زبان کو اپنی زبان نہیں سمجھتے۔ اور انہیں کمزور اور بے بنیاد باتوں کی تاویلات پیش کرتے ہوئے ہندوستانی زبان وادب کے ادائے بیان سے اسے قاصر اور عاجز دکھلانا چاہتے ہیں حالانکہ یہی باتیں پلٹ کر دیوناگری رسم خط اور ناگری ابجد کی آوازوں پر لگا کر فارسی کے مروج تلفظ و آوازوں سے ہندی حروف تہجی و زبان کی بے بسی دکھائی جائے تو معترض کے پاس سوائے چپ رہنے کے کوئی جواب نہ ہوگا۔

اب ہم مختصراً اردو یا ہندوستانی کے ڈھانچے (قواعد صرف) پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کے مسلم الثبوت قواعد نویسوں نے زبان کو قواعد کا محکوم بنانے کی کوشش کی ہے یا زبان کو آزاد کر کے اصول و قواعد اخذ کئے ہیں۔ ساتھ ہی ہندی ویاکرن کو بھی دیکھنا ہے آیا ہندوستان کی زندہ اور فطری زبان کو مد نظر رکھتے ہوئے اسکی قواعد کی دفعات مرتب ہوئی ہیں یا ایک منتہی کو پیش پیش رکھکر کھینچ تان اور توڑ

مروڑ سے کام لیا گیا ہے!

اُردو (ہندوستانی)

قواعدِ اُردو از (ڈاکٹر) عبدالحق۔ بی۔ اے۔ سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند)
شائع کردہ انجمن ترقی اُردو (ہند) اورنگ آباد۔ دکن

اسمِ کیفیت

وہ ہے جس سے کوئی کیفیت یا حالت معلوم ہو، جیسے سختی، روشنی، صحت۔

اسمائے کیفیت تین چیزیں ظاہر کرتے ہیں:۔

اوّل حالت۔ جیسے صحت، نیند، رفتار۔

دوم وصفی کیفیت۔ جیسے درد، خوشی، مطالعہ۔

اسمائے کیفیت کیونکر بنتے ہیں:۔

(۱) اسم یا صفت کے آگے ائی یا ئی یا ہی بڑھانے سے اسمائے کیفیت بنائے جاتے ہیں جیسے اچھائی، برائی، گولائی۔

(۲) ت یا تی کے بڑھانے سے۔ جیسے بچت، کھپت، بڑھتی، گھٹتی۔

(۳) ہٹ سے جیسے بہتات، بھلمنسات۔

(۴) وٹ، ہٹ، اٹ کے بڑھانے سے جیسے گھبراہٹ، بناوٹ، رکاوٹ، لگاوٹ۔ وغیرہ۔

(۵) بعض اوقات صفات کے آگے یہی علامت لگانے سے بھی اسمائے کیفیت بنتے ہیں جیسے چکناہٹ، نیلاہٹ۔

(۶) اؤ کے اضافہ کرنے سے جیسے بچاؤ، چڑھاؤ، چھڑکاؤ، جھکاؤ، بناؤ، لگاؤ، ہٹاؤ، رکاؤ۔ وغیرہ۔

(۷) پا، پن اور پنا اسم کے آگے بڑھانے سے، جیسے بڑھاپا، چھٹاپا، مٹاپا، لڑکپن، بچپن، شہدپن، دیوانہ پن، بچپنا، گنوارپنا، چھٹپنا۔

(۸) ک۔ کے بڑھانے سے اسم یا فعل کے بعد۔ مثلاً ٹھنڈک، بیٹھک۔ وغیرہ۔

(۹) کی۔ جیسے جھپکی۔

(۱۰) اس کے اضافے سے جیسے مٹھاس، پیاس، کھٹاس۔

(۱۱) اپ۔ جیسے ملاپ۔

(۱۲) پت جیسے سیان پت، کنوارپت۔

(۱۳) نا سے جیسے چاندنا۔

(۱۴) واس سے جیسے بکواس۔

(۱۵) وا جیسے بڑھاوا، بلاوا، دکھاوا، وغیرہ۔

(۱۶) یت۔ جیسے اپنایت۔

یہ سب ہندی صورتیں ہیں بعض فارسی ترکیبیں بکثرت استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً:۔

الف۔ بندگی، زندگی، مردانگی، دیوانگی۔ (گی) یہ علامت اُن فارسی الفاظ کے آگے اضافہ کی جاتی ہے جن کے آخر "ہ" ہے۔

ب۔ "ی" کے اضافہ سے جیسے گرمی، نرمی، جوانی، روشنی۔

ج۔ امر کے آگے ش۔ یا ئش۔ کے اضافے سے۔ سوزش، آزمائش گردش۔ وغیرہ۔

د۔ امر کے آگے "اک" کے بڑھانے سے جیسے خوراک، پوشاک۔

سنچھپت ہندی ویاکرن شائع کردہ کاشی ناگری پرچارنی سبھا

از کامتا پرشاد گرو

دفعہ ۱۰۳۔ جس سنگیا (اسم) سے پدارتھ (اشیا) میں پائے جانے والی کسی دھرم (خاصیت) کا بودھ (اطلاق) ہوتا ہے اُسے بھاوباچک سنگیا (اسم کیفیت) کہتے ہیں۔ جیسے:۔ لمبائی، چترائی، بڑھاپا، نمبرتا، (نرمی) سمجھ، بو، چال، مٹھاس۔

پرتیک (ہر ایک) پدارتھ (شے) میں کوئی نہ کوئی دھرم (خاصیت) ہوتی ہے۔ پانی میں شیتلتا (ٹھنڈک) آگ میں اشنتا (گرمی) سونے میں بھاری پن۔ منشیہ (انسان) میں بویک (عقلیت) اور پشو (جانوروں) میں آبویک (غیر عقلیت) رہتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اَمک پدارتھ (فلاں چیز) پانی ہے، تب ہمارے من (دل) میں اس کی ایک یا ادھیک دھرموں کی (وصفی کیفیتوں) بھاونا (تخیل) رہتی ہے۔ انہیں دھرموں کی بھاونا سے (انہیں وصفی کیفیتوں کے تصوّر سے) ہم اس پدارتھ (چیز) کو پانی کے بدلے کوئی دوسرا پدارتھ (شے) نہیں سمجھتے۔ پدارتھ انو یعنی چیز گویا کہ کچھ خاص وصفی کیفیتوں سے بنی ہوئی ایک مورتی ہے۔ کوئی کوئی وصفی کیفیت ایک سے زیادہ (ادھیک) پدارتھوں (چیزوں) میں پائے جاتے ہیں۔ جیسے لمبائی، چوڑائی، موٹائی، وزن۔ آکار (شکل)۔

پدارتھ کا دھرم (اشیا کی وصفی کیفیت) پدارتھ (شے) سے الگ نہیں رہ سکتا تو بھی ہم اپنی کلپنا شکتی کے دوارا (تخیل کے ذریعے) پرسپر سمبندھ رکھنے والی بھاونا (مخلوط تصورات) کو الگ کر سکتے ہیں۔ ہم گھوڑے کے اور دھرموں کا (اوصاف کا) بھاونا (خیال) نہ کر کے کیول (صرف) اس کے بل کی بھاونا من میں لا سکتے ہیں اور آوشکیتا (ضرورت) ہونے پر اس بھاونا (کیفیت) کو کسی دوسرے پرانی (جاندار) (جیسے ہاتھی) کے بل کے بھاونا کے ساتھ ملا سکتے ہیں۔ جس پرکار جاتی باچک سنگیائیں (جس طرح اسم عام) ارتھوان (کلمہ یا معنی دار) ہوتی ہیں

نی پرکار (طرح) بھاؤ باچک سنگیائیں (اسم کیفیت) ارتھوان (کلمہ) ہوتی ہیں۔ کیونکہ اُن کے سمان (برابر) اُن سے بھی دھرم کا بودھ (وصفی کیفیت کا اظہار) ہوتا ہے۔ بیاکت باچک سنگیا کے سمان (اسم خاص کی طرح) بھاؤ باچک سنگیا سے بھی ایک ہی بھاؤ نا (کیفیت) کا اطلاق ہوتا ہے۔

دفعہ ۱۰۴۔ بھاؤ باچک سنگیائیں بہندھا (اکثر) تین پرکار کے شبدوں (تین طرح کے لفظوں) سے بنائی جاتی ہیں۔

(ک) جاتی باچک سنگیا سے (اسم عام سے)، جیسے بڑھاپا، لڑکپن، متر تا، دوستی، داستو (غلامی) مون (خاموشی)،

(گھ) بشیشنوں سے (صفت سے)، جیسے گرمی، سردی، کٹھورتا (سختی) میٹھاس۔ بڑپن، چترائی، دھیریہ (دھیرج) پنڈتائی، راجیہ۔

(گ) کریا (فعل) سے۔ جیسے گھبراہٹ، سجاوٹ، چڑھائی، بہاؤ، مار، دوڑ، چلن۔

ناظرین کے سامنے اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کی معتدر ہستیوں کی شائع کردہ قواعد صرف ونحو کی مستند کتابوں سے میں نے اسم کیفیت کا بیان لیا ہے ہندی قواعد نویس نے اپنے بیان کی وضاحت کے لئے کہاں تک توضیحی انداز بیان و زبان استعمال کیا ہے۔ یہ سوال اس وقت میرے سامنے نہیں ہے، ہمیں یہاں صرف یہ غور کرنا اور دکھانا ہے کہ آیا زندہ زبان کو پیش نظر رکھتے ہوئے قواعد کی دفعات مرتب کی گئی ہیں یا نہیں؟ ہم دیکھتے ہیں کہ سنسکرت زبان کی قواعد سے ہندی قواعد نویس کا دماغ اس قدر متاثر ہے کہ ہندی کے ضروری اشارات اور علامات بھی چھوڑتے چھاڑتے تیزی سے نکل گیا اور فارسی اسمائے کیفیات جس کی مثالیں اُردو قواعد کے دفعات ا، ب، س، میں مذکور ہیں، جن کے استعمال سے ہندی کے انشا پردازوں اور ادیبوں کو مفر نہیں اُن سے ایک دم بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ زندہ اور فطری زبان کے علمبردار عبدالحق صاحب نے اپنی قواعد میں زبان کے ہر ایک خط وخال کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان کے تشریحات میں مستعمل الفاظ کی کوئی خصوصیت چھوٹنے نہیں پائی۔ برخلاف اس کے پنڈت کامتا پرشاد گرو کی مذکورہ دیاکرن کی دفعات ۱۰۳، ۱۰۴ کے پڑھنے سے یہ پتا بھی نہیں چلتا کہ آپ اُس زبان کی قواعد مرتب کر رہے جس میں "ہندی چھٹ" فارسی کا پٹ بھی ملا ہوا ہے۔ مگر یہ دفعات اپنی جگہ پر ہیں اور زبان اپنی جگہ پر۔ ہندی زبان اپنے قواعد کی زنجیروں سے آزاد ہو رہی ہے۔ ایک طرف نالش، نارافنگی، آرام، دگی ہندی تحریر و تقریر میں شامل ہو کر اسمائے کیفیت (بھاؤ باچک) کی دفعات میں وسعت چاہتے ہیں تو دوسری جانب پنکھ کش، اماکش، وغیرہ الفاظ ہندی میں آکر اسم فاعل کے حدود کو توڑ رہے ہیں۔ اگر بھاشا کی شدھی کے خیال سے ہندی قواعد کی دفعات میں ترمیم نہ ہوئیں تو اس کی دوسری صورت پر عمل کرنا لازم ہوگا یعنی یہ کہ اس قبیل کے الفاظ کا استعمال ناجائز قرار دیا جائے۔ مگر کیا یہ ممکن ہے کہ ہندی اِن الفاظ سے دامن چھڑا کر زندہ زبانوں کی صف میں کھڑی ہو سکے۔

اس صداقت کا تھوڑا بہت احساس ہندی ادیبوں اور ادب کی تعمیری خدمت کرنے والوں کو ہوا ہے۔ ہندی شبد ساگر میں فارسی وعربی کے بہت سے مروج لفظ شامل کر لئے گئے ہیں۔ ہندی قواعد نویسوں نے بھی تھوڑی بہت توجہ کی ہے مگر اُن کے دماغوں پر سنسکرت کے تت سم الفاظ اور خالص سنسکرت کے قواعد کا غلبہ اس قدر اثر انداز ہے کہ اس کے مقابل یہ کوشش صرف نام ہی نام ہے۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ "عذر گناہ بدتر از گناہ" سمجھنے کے لئے سنسکرت کو پیش نظر رکھنے والا قواعد نویس زندہ زبان کی طرف ایک ہلکی نظر ڈال کر پھر اپنے پروگرام کی تکمیل میں مصروف ہے۔ اس کی سند میں ہندی دیاکرن مذکورہ بالا کی پوری کتاب عام طور سے، اور بالخصوص دوسرا کھنڈ اَب ییہ، پہلا ادھیا کریا بشیشن (دوسرا حصہ۔ حرف۔ پہلا باب متعلقات فعل۔ تمیز) کی دفعات ۲۲۵، ۲۲۶ ہیں، ناظرین کی سہولت کے لئے اسے یہاں نقل کر دینا مناسب ہے۔

دفعہ ۲۲۵۔ یوگک کریا بشیشن (مرکب تمیزیں) دوسرے شبدوں میں نیچے لکھے شبد انتھوا (یا) پرتیہ (سابقہ ولاحقہ) جوڑنے سے بنتی ہیں۔

ا۔ سنسکرت کریا بشیشن۔ (سنسکرت تمیزیں)

(۱) پوربک۔ دھیان پوربک (غور سے) پریم پوربک (محبت ورحم سے)

(۲) وش۔ ودھی بش، بھے بش۔ (خوف سے)۔

(۳) اِن (آ)۔ سُکھیین (سکھ سے) ابن کبن پرکار ینٹر (کسی نہ کسی طور پر) نشا، باچا، کرمنڑا۔

(۴) یا۔ کرپیا، بشیشیا۔ (خاص کر)

(۵) انوسار۔ رینیا نوسار، شکتیانسار (طاقت کے مطابق۔)

(۶) تہ۔ سوبھاوتہ۔ (عادتاً) وستوتہ (اصل میں) سوتہ۔ (بذریعہ خود۔ نجی طور سے)۔

(۷) دا۔ سربدا، سدا، یدا (جب) کدا (کب۔ کبھی)

(۸) دھا۔ کُبدھا (اکثر) شتدھا (سو دفعہ) نودھا۔

(۹) شہ۔ کرمشہ۔ ایکہ شہ (یعنی حرف بحرف)

(۱۰) ئے۔ ایکتر (اکٹھا) سربتر (سب جگہ) اَن یتر (دوسری جگہ)

(۱۱) تھا۔ سرتھا (باطل) انیہ تھا (دگرنہ)

(۱۲) وَت۔ پوروت (پہلے کی طرح) تدوت (اس کی طرح)۔

(۱۴) چت - کداچت، (شاید) کنچت، (بعض بعض) اُچت، انوچت۔

(۱۵) ماتر - پل ماتر (پل بھر میں) نام ماتر (برائے نام) لیش ماتر (ذرا سا)۔

۲۔ ہندی کریا بشیشر ٹرں (تمیز)

(۱) تا، تے :- دوڑتا، کرتا، بولتا۔ چلتے، آتے، مارتے۔

(۲) آ، ئے :- بیٹھا، بھاگا۔ لئے، اُٹھائے، بیٹھے، چڑھے۔

(۳) کو :- اِدھر کو، اُدھر کو، دن کو، رات کو، انت کو۔

(۴) سے :- دھرم سے، پریم سے، من سے، ادھر سے، تب سے۔

(۵) میں :- سنچھیپ میں، اتنے میں، انت میں۔

(۶) کا :- سویرے کا، کب کا۔

(۷) تک :- آج تک، یہاں تک، گھر تک، رات تک۔

(۸) کر :- دوڑکر، کرکے، اُٹھ کر، دیکھ کے، دھرم کرکے، بھکتی کرکے، کیونکر۔

(۹) بھر - رات بھر، پل بھر، دن بھر۔

ایسے نکھے پریں یوں اور شبدوں سے سرب نایک کریا بشیشٹرں بنتے ہیں:-

ئے :- ایسے، کیسے، جیسے، ویسے، تیسے، تھوڑے۔

ہاں :- وہاں، کہاں، جہاں، تہاں۔

دھر :- اِدھر، اُدھر، جدھر، تدھر۔

یوں :- یوں، تیوں، جیوں، کیوں۔

لئے :- اس لئے، جس لئے، کس لئے۔

ب :- اب، تب، جب، کب۔

۳۔ اُردو کریا بشیشٹرں (تمیز)

اُردو پر نظر کرم۔ اً :- جبراً، فوراً، مثلاً۔

دفعہ ۲۲۶۔ ساماسک کریا بشیشٹرں ارتھات اَب یَیَ بھاو سماسوں کا بچار جو بیوت پٹ کرڑں میں کیا جائے گا یہاں اُن سے کچھ اُداہرٹرں دئے جاتے ہیں:-

(اس کا مطلب عام فہم زبان میں یہ ہے۔ اضافی مرکب تمیزیں جن کا بیان لفظی تجزیے کے ماتحت کیا جائیگا یہاں کچھ مثالیں دی جاتی ہیں۔)

سنسکرت اَب یَیَ بھاو سماس

۱۔ پرتی :- پرتی دن، پرتی پل، پرتی اکچھ۔

۲۔ یتھا :- یتھا شکت، (جہاں تک ہو سکے) یتھا کرم (بلحاظ ترتیب) یتھا سمبھو۔ (جہاں تک ممکن ہو)

۳۔ نِہ :- نہ سندیہہ۔ (بلاشبہ) نربھے۔ نِہ شنک (نڈر)

۴۔ یاوت :- یاوجیون (جیتے جی، جیتے دم)

۵۔ آ :- آجنم (تا دمِ زندگی) آمرن (مرتے دم تک۔)

۶۔ سم :- سمکچھ (نظر کے سامنے) سم مکھ۔

۷۔ س :- سدیہہ (ذاتی طور سے)، سپریوار (خاندان سمیت)

۸۔ آ۔ اَن :- اکارن۔ انایاس۔

۹۔ بِ :- بیرتھ، بشیش (خاص)

ہندی اب یَیَ بھاو سماس

۱۔ ان :- انجانے۔ اَن پوچھے۔

۲۔ نِ :- ندھڑک۔ نڈر۔

اُردو اب یَیَ بھاو سماس

ہر :- ہر روز، ہر سال۔ ہر وقت۔

بہ :- بجنسہ، بدستور۔

بے :- بے کار، بے فائدہ، بیشک، بے طرح۔

آپ تعجب کریں گے کہ ہندی قواعد نویس کو سب سے اوّل اپنی زبان کے سنسکرت خط و خال کے نمایاں کرنے میں اس قدر شغف۔ اُردو تو اُردو ہندی کے ٹھیٹ الفاظ کے پہلے اُن کا ذکر فرمانے میں کچھ بھی پس و پیش نہیں کرتا۔ حالانکہ زبان کے ٹھیٹ ہندی الفاظ و قواعد ہی ہماری زبان کی رُوح ہیں اور فارسی اور سنسکرت الفاظ اس کے ہاتھ پیر۔

پس زندہ زبان کی سچی خدمت کیا ہے۔ اس کو ہر قسم کی مصنوعی اور غیر فطری پابندیوں سے آزادی ملنی چاہیئے۔ ذخیرۂ الفاظ، تلفظ، لب و لہجہ، صرف و نحو میں اس کی فطری ساخت مدنظر رکھی جائے۔ اور نئے الفاظ کے شمول و اخراج میں اس کی صورت نمو کو ہرگز فراموش نہ کیا جائے۔ اس پر عملی اقدام کی صورت میں مرحوم پریم چند کا یہ قیمتی مشورہ ہمارے لئے شمع راہ ہے:-

"اپنے ہندو دوستوں سے میری درخواست ہے کہ جن الفاظ نے عوام میں اپنی جگہ بنا لی ہے، اُنہیں نکالنے کیلئے سنسکرت لغت کی طرف رجوع ہونا مضر ہے "موجود" کے بدلے "اُپستھت"، "ارادہ" کیلئے "سنکلپ" "بناوٹی" کیلئے "کرترم" کو کام میں لانیکی کوئی ضرورت نہیں اسی طرح مستعمل الفاظ کے اصل سنسکرت کی تلاش بھی بےمعنی ہے۔" ☆

☆ منشی پریم چند مرحوم کی ایک تقریر۔ بحوالہ اُردو جولائی ۳۶ء

غازی کمال پاشا کی یاد

ساقی شراب پھینکدے جامِ سفال سے	دل بیٹھا جاتا ہے غم و رنج و ملال سے
شکوہ ضرور ہے فلکِ بدخصال سے	ہم مسلموں کو عشق تھا غازی کمال سے

افسوس کتنے جلد جہاں سے گزر گئے
سُنتے ہیں تو یقیں نہیں آتا کہ مر گئے

کس سے کہیں سبب جو ہے رنج و ملال کا	آنکھوں کے آگے نقشہ ہے ماضی حال کا
طاقت جواب کی ہے نہ یارا سوال کا	ماتم ہے آج دہر میں غازی کمال کا

مجبور ہو کے یاس کے عالم میں رہ گئے
آنسو حسین آنکھوں سے گالوں پہ بہہ گئے

جو حرب کے فنون میں کامل تھا، وہ کمال	جو تاجِ خسروانہ کے قابل تھا، وہ کمال
جو پرچمِ ہلالی کا حامل تھا، وہ کمال	اعجازِ عیسوی جسے حاصل تھا، وہ کمال

مُردہ تھی سلطنت اُسے پھر زندہ کر دیا
ترکوں کے گھر کو علم و تمدن سے بھر دیا

تھے بے عمل جو لوگ اُنہیں عامل بنا دیا	شیروں کا سب کو مدِ مقابل بنا دیا
تھا یہ کمال ترکوں کو کامل بنا دیا	ہم مسلموں کو فخر کے قابل بنا دیا

تا حشر اُس کا دہر میں جاہ و جلال ہے
مُردہ کہے گا کون کہ زندہ کمال ہے

ثروت جہاں میں کس کی تھی؟ غازی کمال کی	وقعت جہاں میں کس کی تھی؟ غازی کمال کی
عزت جہاں میں کس کی تھی؟ غازی کمال کی	شہرت جہاں میں کس کی تھی؟ غازی کمال کی

یورپ میں اُسکے جوشِ شجاعت کی دھوم تھی
اور ایشیا میں خلق و عنایت کی دھوم تھی

بے چین دل نے چین ذرا سا پایا خواب میں	اُلفت نے آخر آج یہ دکھلایا خواب میں
روحِ کمال مجھکو نظر آیا خواب میں	میں خوش ہوا جو آکے یہ فرمایا خواب میں

"موجودہ ملک کا جو نگہباں ہے خوب ہے،
عصمت جواب محافظِ ترکاں ہے خوب ہے"

قطعۂ تاریخ انتقالِ پُر ملال غازی کمال در صنعتِ تخرجہ

ہم غم سے سر نگوں ہیں رسالے کے کیا کہیں	طاقت جواب کی ہے نہ یارا سوال کا
تاریخ لکھی ہے سرِ اعدا کو کاٹ کر	ماتم ہے آج دہر میں غازی کمال کا

۱۹۳۹
۱۹۳۸ء

بعہدِ تعزیتِ غازی کمال

رئیس احمد رضوی

یہ دلّی ہے[1]

تمہید

ساقی میں دلّی ریڈیو اسٹیشن کے متعلق دو مضمون شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مضمون ڈائریکٹر صاحب کی تقریر کے متعلق تھا اور اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ موجودہ ڈائریکٹر صاحب دلّی جیسے مرکزی اسٹیشن کے لئے قطعی موزوں نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ بہت اچھے آدمی ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ مزاج کے نہایت شریف ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کے جنٹلمین ہوں۔ اور یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ فوجی ہونے کی حیثیت سے وہ اٹھارہ اور بیس گھنٹے روزانہ کی ڈیوٹی دیتے ہوں لیکن ان سارے امکانات کے باوجود ہمیں افسوس کے ساتھ یہی کہنا پڑتا ہے کہ وہ کم از کم دلّی اسٹیشن کے لئے قطعی نااہل افسر ہیں۔ ایک سننے والے کی حیثیت سے ہمیں اُنکے حُسنِ اخلاق سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ دلّی اسٹیشن کے سب سے بڑے ذمہ دار افسر ہیں اور ہم اُن کی افسرانہ حیثیت ہی کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آجکل جو پروگرام پیش کئے جا رہے ہیں وہ کیسے ہیں؟ اگر اچھے ہیں تو واہ واہ! اور بُرے ہیں تو آہ آہ!۔ ذمہ دار بہرحال ڈائریکٹر صاحب ہیں اور اُن کے بعد ان کے ماتحت افسر۔ دوسرا مضمون جو "سخن فہم" کی طرف سے شائع ہوا تھا اُس میں دلّی ریڈیو اسٹیشن کے اسٹاف سے فرداً فرداً تعارف کرایا گیا تھا مگر صاحبِ مضمون نے بہت اختصار سے کام لیا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اگر تفصیل سے کام لیا جاتا تو ساقی کا ایک خاص نمبر "ریڈیو نمبر" کے نام سے شائع کرنا پڑتا۔ ع۔

سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بیکراں کیلئے

مسئلہ زبان

دلّی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر کیلئے پہلی ناگزیر شرط یہ ہے کہ وہ اُردو اور ہندی اچھی طرح جانتا ہو اور یہ بھی سمجھتا ہو کہ ہندوستانی کی تشکیل کس طرح ہونی چاہیئے۔ یہ وقت کا ایک نہایت اہم مسئلہ ہے جسے بڑی حد تک دلّی ریڈیو اسٹیشن حل کر سکتا ہے کیونکہ جو مرکزیت دلّی کو حاصل ہے وہ پشاور، بمبئی، لاہور، لکھنؤ اور مدراس کو حاصل نہیں ہے۔ دلّی اسٹیشن کے پروگرام روزانہ تین تین لہروں پر نشر کئے جاتے ہیں جن میں بیس کلوواٹ کی درمیانی لہر بھی شامل ہے۔ دلّی کا پروگرام ہندوستان کے ہر گوشے میں سُنا جاتا ہے اور چھوٹی لہروں کی بدولت دُنیا کے ہر حصّے میں یہاں کا پروگرام سنا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو زبان دلّی سے نشر کی جائیگی وہی ہندوستان کی خاص زبان سمجھی جائیگی اور جو تقریریں یہاں سے براڈکاسٹ کی جائیں گی اُنہی سے ہندوستانیوں کی زبان، اُن کے خیالات، اُن کے علم، اُنکے مذاق، اُنکی تہذیب، اُنکے تمدن غرض اُن کی زندگی کے ہر پہلو کا اندازہ کیا جائے گا۔ جب دلّی سے ایسی لغو اور مُہمل تقریریں نشر کی جائیں گی جن میں یہ کہا جائیگا کہ "اللہ میاں بیٹھے حُقہ پی رہے تھے اور نائی سے باتیں کر رہے تھے" اور جب یہاں کے ڈراموں میں یہ دکھایا جائیگا کہ شہنشاہ جہانگیر کو ایک ذلیل عورت جُوتیاں مار رہی ہے تو باہر والے ریڈیو کے نالائق افسروں کی تو تعریف کرینگے ہی لیکن اس کے ساتھ ہی اُنہیں اس کا بھی یقین ہو جانا چاہیئے کہ ہندوستانیوں کا خُدا حُقہ پیتا ہے اور اُن کے شہنشاہ عورتوں سے جوتے کھاتے تھے۔ جبھی تو ہندوستانی آجکل اتنے ذلیل ہیں اور یہ ہیں بھی اِسی لائق۔

---

[1] دلّی اسٹیشن سے جب کوئی اناؤنسمنٹ یا اعلان ہوتا تھا تو کہا جاتا تھا "یہ دلّی ہے" لیکن جب سے موجودہ ڈائریکٹر صاحب آئے ہیں اُنہوں نے اس میں بھی تبدیلی کر دی ہے۔ اب اناؤنسر صاحب فرماتے ہیں "ہم دلّی سے بول رہے ہیں" مگر جو خوبصورتی اور جامعیت اور ایمائی انداز پہلے فقرے میں تھا اُس کا عشرِ عشیر بھی موجودہ املا میں نہیں۔ "یہ دلّی ہے" کی آواز کے ساتھ ایک عجیب اثر دل پر ہوتا تھا۔ دلّی کا شاندار ماضی اور اُس کی تباہی اور اسکی تاریخی عظمت غرض سب کچھ ان تین لفظوں میں پوشیدہ تھا۔ مسٹر لکشمانند کو کیا معلوم کہ انہوں نے ان تین لفظوں کو بدلا نہیں ہے بلکہ جذبات کی ایک دُنیا مٹا دی ہے۔ اس فقرے میں میر کا خونِ دل شامل ہے۔ ہائے ——— "اور بستی نہیں یہ دلّی ہے!"۔ ڈائریکٹر صاحب آپ اس جذباتی تاثر کی قدر نہیں کر سکتے۔

میں رکھ لوں ریزۂ مینا کو دل میں
ارے کس پھول کی یہ پنکھڑی ہے (ریاض)

شاہد

جب کوئی مقامی سُننے والا اس بیہودگی کی شکایت زبانی کرتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ "چلو جی۔ تو کیا ہوا؟ تم میں اتنا بھی Sense of humour نہیں ہے؟" "لیجئے گدھے کی آنکھوں میں نون دیا۔ اُس نے کہا میری آنکھیں پھوڑ دیں۔ سُبحان اللہ! کیا احساسِ ظرافت ہے!

غلط تلفظ یا غلط محاورہ یا غلط زبان پر اگر ہم اعتراض کرتے ہیں تو ریڈیو اسٹیشن والے بہت جزبز ہو کر کہتے ہیں کہ اہلِ زبان کو بس نکتہ چینی ہی کرنی آتی ہے۔ اگر ایک لفظ کا تلفظ غلط ہو گیا تو کیا غضب ہو گیا، یا اگر ایک فقرے کی ترکیب اہلِ زبان کے نزدیک غلط ہو تو کیا قیامت آگئی؟ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ باہر والوں کو اردو زبان مسخ کرنے کے لئے یہاں کے اسٹیشن پر متعین کیا گیا ہے۔ انہیں آپ یہ کسی طرح نہیں سمجھا سکتے کہ "اُنہوں نے وہاں جانا ہے" "جو معاہدہ اُنہوں نے کیا ہولہ ہے" اور اسی قسم کے فقرے مکروہ حد تک غلط ہیں اور "بادشاہ سلامت کے نام پر کھولے ہوتے" اور "کھول کر دکھا دیا" قسم کے تمام فقرے فحش کی حد میں آتے ہیں۔ انہیں یہ ضد ہے کہ "کھول کر دکھانے" میں جو خوبصورتی ہے وہ کسی اور ترکیب میں ہے ہی نہیں۔ غلط تلفظ تو اُن کی گھٹی میں پڑا ہے۔ کیونکہ جب سے پیدا ہوئے کبھی اردو بولنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ اسٹیشن ڈائرکٹر اگر ان باتوں کو سمجھتا تو یہ بدعنوانیاں کیوں ہوتیں؟ اُس معصوم کو یہ تک معلوم نہیں کہ اردو کیا چیز ہے۔ دلی اسٹیشن کی اگر صرف ایک دن کی غلطیاں آپ نوٹ کرنے بیٹھیں تو کم از کم ایک صفحہ بھر جائے گا۔ اور پھر یہ غلطیاں مسٹر لکشمانند کی نظر میں غلطیاں نہیں ہیں کیونکہ اس سلسلے میں وہ اُمّی محض ہیں۔ حیرت ہے کہ بی۔ بی۔ سی سے آج تک کوئی غلط فقرہ He did not want to see ہے ... there کی قسم کا سُننے میں نہیں آیا اور دلی سے روزانہ دس بیس فقرے ایسے ہی سُن لیجئے۔ اس کا فخر صرف مسٹر لکشمانند کو حاصل ہے کہ انکی ڈائرکٹری کے زمانے میں دلی اسٹیشن نے یہ ترقی کی ہے۔

گانے کی موجودہ روش

ماشاءاللہ اس ترقی کے آثار ہر شعبے میں پائے جاتے ہیں خصوصاً موسیقی میں کہ ناموزوں او بیہل اشعار نشر کرنا اب ایک ہنر سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً انجمن آرا غالب کے مصرع میں یوں اصلاح کرتی ہے "قسمت میں میری صورت قفلِ ابجد" اور ایک دفعہ نہیں کئی کئی دفعہ اپنی اصلاح کو ذہن نشین کراتی ہے اور ایک دوسرا منہ چڑھا ڈوم "سینہ ہے اک دفینہ گھر ہائے راز کا" لہک لہک کر گاتا ہے۔ کم بخت کو کیا معلوم کہ یہ "دفینہ نہیں "دفینہ" ہے اور "گہر ہائے" فارسی تو کجا کسی زبان کی بھی ترکیب نہیں ہے بلکہ "گُہر ہائے" صحیح ترکیب ہے۔ مگر بوڑھا ڈوم تھا موزوں طبع کہ "دفینہ" پر ایک "ہ" رکھکر "گھر ہائے" کو بحر میں کھپا گیا۔ کانوں اور عقل کے پھوٹے اناؤنسرز اور اسٹینڈ بائی برابر میں کھڑے رہے اور اُنہیں پھریری تک نہ آئی۔ شعبۂ موسیقی کی تو وہ مٹی پلید ہے کہ آج تک کبھی اتنی پلید نہ ہوئی تھی۔ گانے والوں سے پست سے پست غزلیں گوائی جاتی ہیں۔ حالانکہ یہ کوئی بہت بڑا کام نہیں ہے کہ مشہور شعرا کے دیوانوں میں سے غزلیں انتخاب کر لی جائیں۔ مگر اسٹیشن بھر میں ایک کو بھی اس کی تمیز نہیں کہ اچھا شعر کیسے کہتے ہیں اور بُرا کسے۔ غالب کی غزلیں گواتے ہیں تو اُن کا پلیتھن یوں نکالتے ہیں کہ "قفل" کی جگہ "فضل" لگاتے ہیں اور "دفینہ گہر ہائے راز کا" کے بدلے "دفینہ گھر ہائے راز" کھپاتے ہیں۔ ڈائرکٹر صاحب کو یہ علم نہیں کہ کونسا گویا کیا چیز اچھی گا سکتا ہے۔ رحیم الدین خاں اور تانسین جیسے مشہور گانے والوں سے غزلیں گواتے ہیں، حالانکہ یہ اُن گانے والوں میں سے ہیں جو صرف الاپ کرتے ہیں۔ ذرا اور نیچے اُترے تو دُھرپد بھی گا لیں گے۔ خیال گانا بھی یہ لوگ اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ کہاں یہ کہ انہی سے ریڈیو والے ٹھمری اور غزل تک گواتے ہیں اور اُن کی ساکھ بگاڑتے ہیں۔ چاند خاں جیسے خیالیے سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ غزل گا کر اپنی ہنسی اُڑوائیگا۔ نتیجہ یہ کہ خوشامدی اور ٹٹ پونجئے ریڈیو پر گا رہے ہیں اور کلاسیکل موسیقی کو ذبح کر رہے ہیں۔ جب دس دس پندرہ پندرہ روپے میں کام چل رہا ہے تو ڈیڑھ سو روپے روز اور سوا سو روپے روز کے آرٹسٹ کیوں بلائے جائیں۔ رحیم الدین خاں کی الاپ کی کیا ضرورت جب چودھری کے گیت کم سے کم پیسوں میں سُنے جا سکتے ہیں؟ طوائف پرستی کا بھی یہی حال ہے۔ سب گا رہی ہیں چاہے گانا آتا ہو یا نہ آتا ہو۔ ایک صاحب فارسی یا اردو کی غزل اس خوبی کے ساتھ گاتے تھے کہ شعر گانے کے بعد آرکسٹرا کے ساتھ سیٹی بجاتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے کٹھ پتلیوں کے ساتھ ٹین کی سیٹی۔ حافظ کی غزل اور کٹھ پتلیوں کی سی سیٹی! ع۔

اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

ریلے اور ریکارڈنگ

دلی اسٹیشن نے ریلے اور ریکارڈنگ کی ایک نئی اسکیم بنائی ہے۔ پہلے کبھی کبھی کوئی ریلے ہوتا تھا، اب تقریباً روزانہ کسی نہ کسی اسٹیشن سے ریلے کیا جاتا ہے۔ مثلاً بی۔ بی۔ سی۔ سے حالاتِ حاضرہ انگریزی میں ریلے کئے جاتے ہیں۔ چاہے ہندوستان کی نوّے فی صد آبادی اُسے نہ سمجھ سکے۔ کیا ضرورت ہے کہ لندن کی تقریریں یہاں کے اسٹیشن سے نشر